

زندگی ایک روشنی

مختار علی خان

پاکستان
سوسائٹی

www.pakisociety.com

ویرگی لکھنؤی

مخسنانہ نگار عبدالمنان

UrduPhoto.com

خواتین ڈائجسٹ

37 - اردو بازار، کراچی

انتساب

مٹی کی ان دو ڈھیروں کے نام
جن کے تلے
میری پیاری امی جی
اور
اباجی ابدی نیند سو رہے ہیں

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اول 2007ء

ناشرین خواتین ڈائجسٹ

پریس پرنٹ لائن

سول ایجنٹ

سکریٹری عمران ڈائجسٹ

37 - اروو بازار کراچی

”او ہو بھی اُحد کرتی ہو رعنا اس میں اس درجہ رنجیدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے یہ تو نہیں ہوا کہ ہم نے ہر تھ ڈے مس کر دی۔ سلیس بیٹا تو کی ہے نا چاہے گھر ہی پر سنی پھر بھی سنی کے دوست آئے۔ جس کا یہ فنکشن تھا۔ ڈنر بھی ہم تینوں نے اکٹھے خوشگوار ماحول میں کیا اور سنی میری خواہش بھی تھی کہ میں جانے سے پہلے تم دونوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزار سکوں۔ دوپہتے مجھے بہت لمبے لگ رہے ہیں۔ تم دونوں کے بغیر وہاں تم خود سوچو۔“ وہ اٹھ کر چلتے ہوئے رعنا کے پیچھے آکھڑے ہوئے اور نرمی سے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھے۔ رعنا ہتھیلیوں میں چہرہ چھپائے بیٹھی رہی فخر نے اسے اپنی طرف گھما کر ہاتھ ہٹائے رعنا کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

”رعنا ڈارلنگ ڈونٹ ڈووس پلیز۔“ وہ گھنٹوں کے بل ڈر اساتھکے اور اس کے آنسوؤں کی بجائے انھیں انہیوں کی پوروں میں سمیٹنے لگے۔ رعنا نے بیگی پللیس اٹھا کر انہیں انتہائی کرب سے دیکھا۔ ان کا دل دانی بن کر پھٹنے لگا ان حسین کوروں میں تو فخر حیات کا دل بند تھا۔ ان مدد بھرے پالوں پر تو وہ پہلی نظر میں دیوانہ وار رفتار ہواٹھے تھے اور شادی کی رات انہوں نے رعنا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کبھی ان سرسختی پھیلوں کو ٹھیکین پائیلوں سے آلودہ نہیں کریں گی لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

”آپ کو معلوم ہے پھر بھی۔“ آنسو فخر حیات کی ہتھیلیوں کو بھگو گئے وہ تڑپ اٹھے۔ رعنا کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا اور انہیں سہارا لیتے ہوئے بیڈ تک لے آئے۔

”جیسے معلوم ہے سب میری جان۔“ وہ رعنا کی ٹھوڑی کو اٹھتی سے اٹھاتے ہوئے مدد ہم لہجے میں بولے۔ ”اس لیے تو میں آج نہیں گیا صرف تمہاری خوشی کی خاطر معلوم نہ تھا میں۔“ انہوں نے سر ہلا دیا۔

”پھر بھی ایسے کر کے میرا سفر آسٹریلیا نہیں کر دی ہو۔“ خشک وہ ان کے لبوں سے پھسلا۔

”سورجی فخر رعنا نے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

”تھی بے درود نہ بنو۔“ انہوں نے رعنا کے ہاتھ آنکھوں سے ہٹا کر نرمی سے کہا۔ اور اپنا چہرہ ان کی جانب جھکا دیا۔

”انہوں نہیں بھی۔“ ان کا چہرہ حیا سے سرخ ہو گیا وہ انہیں ہاتھوں سے پرے دھکیل کر بولے۔

”اب یہی ناں بات شہابش۔“ وہ مس کر بولے۔ ”یہی خوش رہنا ہے میرے پیچھے بھی۔ اپنا بھی خیال رکھنا ہے اور سنی کا بھی۔“

”اور آپ کو بھی اپنی بہت خیال رکھنا ہے۔ کھانا یا قاعدگی سے کھانا ہے۔ یہ نہیں کہ کام میں لگے اور لچکول کر گئے۔ یہاں کی طرح تیس وہاں بھاگ بھاگ لے کر آئیں نہیں پانچوں کی اور روز فون کرتا ہے۔ جگ کو اور شام کو۔“ رعنا نے ان کے ہاتھ محبت سے تھام لیے پھر یہ آیات دہرائیں۔

”یابا کہا ہوئے کہ روزانہ دو بار نہیں چار بار فون کروں گا کھانا یا قاعدگی سے لوں گا اور تم مجھے یہ آیات یوں دے رہی ہو جیسے میں پہلی بار جا رہا ہوں۔ کما بھی تھا کہ میرے ساتھ چلو صرف دو ہفتوں کی قویات ہے تم میری ہو جائے گی اتنے عرصے سے ہم باہر کھوٹے پھرنے نہیں گئے تم تو بس گھر کی ہو کر رہ گئی ہو۔“ وہ بیڈ کی بیک سے ٹیک لگاتے ہوئے ذرا اٹھکی سے بولے۔

”سنی کے ایگزام ہونے والے ہیں اور وہ اسٹڈیز میں انتہائی کیئرٹیس ہے ہمیں سر پر نہیں ہوں گی تو بالکل ہی ڈل ہو جائے گا۔ دوسری ہماری ابن بی او کی سالانہ تقریبات اسی ہفتے سے شروع ہونے والی ہیں۔ اتنے اہم موقع پر چیف ایگزیکٹو ہی کھوٹے پھرنے نکل جائے تو پھر تو ہو گیا کام۔“ انہوں نے کٹھنے سمیٹ کر سینے سے لگائے۔

”معلوم ہے مجھے یہ ساری ایکس کیوز جو تم ہر بار روتھوٹے کی طرح میرے سامنے دہرائی ہو۔“ وہ منہ بنا کر کچھ بے زاری سے بولے۔

”تو میں جھوٹ بول رہی ہوں کیا ہمارے بتا رہی ہوں۔“ وہ غرا کر ان کے اوپر چڑھ دوڑی۔

چاروں جانب دیکھا کہ میں کہاں ہوں۔

”بہنی برتھ ڈے ٹو پو، بہنی برتھ ڈے ٹو پو۔“ جیسے ہی ایک کٹا خوب صورت و براق لباس پہنے بچے زور زور سے ہائیاں پھینکتے ہوئے گائے لگے۔

”بہنی برتھ ڈے ٹو پو، سوٹ ہارٹ۔“ کہتے ہوئے رعنا فخر حیات نے جھک کر قیمتی آف وہائٹ شیروائی میں لمبوس سفیان کا خوشی سے دھکتا چہرہ چوم لیا۔

”تھینک یو ماہ۔“ اس نے بھی جواباً ”ان کے دونوں گل چٹ چٹ چوم ڈالے۔

”بہنی برتھ ڈے ٹو پو، سن! فخر حیات نے بھی آگے بڑھ کر سنی کا ہاتھ چوما۔

”تھینک یو بہا! اس نے مسکرا کر لوسہ انہیں لوٹایا۔

”چلو بہنی رعنا بچوں کو ایک کاکٹ کرو۔“ وہ سفیان کی شیروائی کا ٹیٹن بند کرتی رعنا سے بولے۔

”تو بہا! پہلے میرا آفٹ۔“ وہ ان کا بازو تھام کر لاڈ سے بولا۔

”آفٹ کون سا؟“ وہ انجان بن کر بولے۔

”میرے برتھ ڈے کا بہا۔“ وہ منہ بسور کر بولا۔

”وہ بے تو دیا ہے۔“ ان کی آنکھیں بھی ہونٹوں کے ساتھ مسکراتی تھیں۔

”کون سا؟“ وہ حیرت سے بولا۔ ”نام کون سا آفٹ دیا ہے بہا نے؟“ رعنا بھی دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

انہوں نے بھی کندھے اچکا کر لا علمی کا اظہار کیا۔

”بھئی یہ سارا اربنچمنٹ اور سب سے بڑھ کر یہ۔“ انہوں نے زور سے اس کے دائیں کمال کو چوم ڈالا تو شہر سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”بہا! وہ سرخ چہرہ کیسے ان سے لپٹ گیا۔

”اچھا بہنی تمہارا آفٹ یا ہر موجود ہے جا کر دیکھ لو۔“ وہ اس کے بال جھلا کر بولے۔

”کیا ہے بہا؟“ وہ جلدی سے ان سے الگ ہو کر بولا۔

”تمہاری اسپورٹس سائیکل جو اس روز تم نے پسند کی تھی۔“

”یابو! وہاں ہر کی طرف لپکا۔

”لیکن بہا! آپ نے تو کیسی بڑا وعدہ کیا تھا۔“ وہ جاتے جاتے ٹھٹک کر بولا۔

”نیکسٹ بائیم ہائی چائلڈ! انہوں نے اس کا اندھا تھپکا۔

”اول بہا! وہ لاڈ سے ٹھٹک کر بولا۔

”بہنی بات سنی! رعنا نے اسے بونٹی گھر کا۔

”آؤ فدا! رحمان! سب سائیکل دیکھ کر آئیں۔“ اس نے دو سنتوں سے کہا اور سب اس کے پیچھے باہر نکل گئے۔

”اس دفعہ آپ نے کمال کیا بچوں کے اور وہ بھی صرف سفیان کے فرینڈز کے سوا اور کسی کو اتواٹھیٹ نہیں کیا۔

کیا سوچیں گے ہمیا اور بھالی۔ نا آپ کا کوئی دوست آیا تا میری کوئی فرینڈ سب گلہ کریں گے۔ اس بار تو سنی کی سا لگ رہی تھی سنی رہی ہے۔“ رات کو ڈرنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی میک اپ صاف کرتی رعنا نے کہا۔ وہ تینوں لہٹی بی بی سے ڈنر کر کے لوٹے تھے۔

”اس کی دو دو بات تھیں اور تمہیں معلوم بھی ہیں۔“

فخر حیات نے ڈرنگ ٹیبل کے کون کی ڈوریاں باندھتے ہوئے تکیہ سیدھا کیا اور بیڈ پر نیم دراز ہو گئے۔

”وہ تو مجھے معلوم ہے سچ پانچ بچے آپ کی چاپان کی فلائٹ ہے فخری! یہ کاروباری مصروفیات تو ملتی رہتی ہیں لیکن ایسا واقعہ تو سال بعد آتا ہے اور پھر ہماری کون سی دس پانچ اولاویں ہیں ایک ہی تو ہوتا ہے اور وہ بھی۔“

رعنا کی آواز بھرائی۔ وہ نہٹ کاٹنے لگی ہاتھ میں پکڑی ٹائٹ کریم کی بیٹی اس نے ڈرنگ ٹیبل پر رکھی۔

"ارے رے!" انہوں نے تکیہ اٹھا کر اپنا بچاؤ کیا۔
 "حد ہے بھی۔" انہوں نے تکیہ نیچے کر کے غصے میں بولتی رہنا کو دیکھا۔
 "میں کب کہ رہا ہوں، جھوٹ ہے۔ اچھا اب پلیز مجھے سونے دو۔ دیکھو بارہ بیس ہو گئے ہیں۔ صبح مجھے اٹھنا بھی ہے۔" وہ ہاتھ جوڑ کر بولے۔
 "اچھا تھیک ہے سو جائیں۔" وہ اٹھنے لگی۔
 "تم کہاں چلیں تمہارے بغیر مجھے نیند آنے کی مائی میڈنگ پلور۔" وہ اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے بولے۔
 "اب دوپہتے ایسے ہی سونا ہے۔ آج ہی سے پریکٹس شروع کر دیں۔" وہ پھر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھیں اور ٹائٹ کریم ہاتھوں پر ملنے لگی۔ فخر حیات ڈریسنگ ٹیبل کی تیز روشنی کے نیچے پنک ٹائٹی میں دکتے حسین روپا کو دیکھ گئے۔

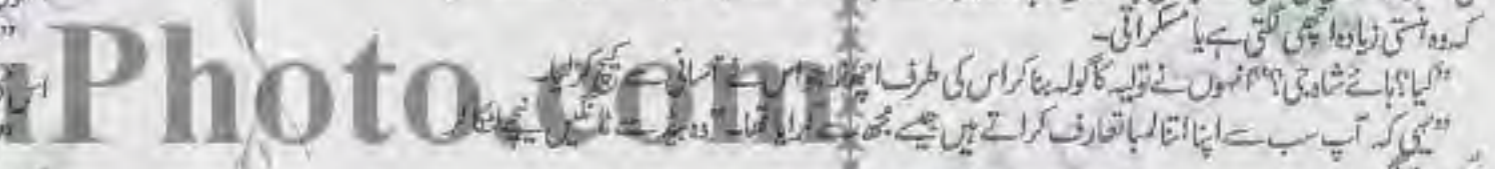
"وہی مشہور زمانہ پہلی نظر میں کیو پڈ کا نشانہ اور شکاری خود ہی گھائل ہے ناشادگی! بچوں کی سی قتل قتل کرتی ہنسی انہیں واپس لے آئی۔
 "تیس مائی پریٹی ڈول۔" وہ اٹھ کر اس کے قریب چلے آئے "اور اب تو یہ دل کہیں کا نہیں رہا بس تمہاری ان زلفوں میں الجھ لیا ہے چاہوں بھی تو نہیں نکل سکتا۔" وہ اس کی طرف جھٹکے تو وہ تڑپ کر ان سے دور ہٹ گئی اس کا چہرہ مل بھر میں سرخ آگ کی طرح دھکنے لگا جس کی تپش سلطان بخت کے دل کو سلگانے لگی۔
 "شادی پلیر!" وہ نیچی نظروں سے بمشکل کہہ سکی۔
 "اوکے اوکے ڈارلنگ! اب کچھ نہیں چلا کہیں آؤ ٹھنک پر چلتے ہیں۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولے اور ڈریسنگ ٹیبل سے برش اٹھا کر بالوں میں پھیرنے لگے۔
 "ہو نہ۔ اس اندھی گاڑی میں جس کے بلیک شیشے کوئی بھی منظر اپنی اصلی رنگت میں نہیں دکھائے۔ میں نہیں باؤں گی اس طرح۔" وہ ٹھنک کر بولی اور خفا سی ہو کر ریڈر پر بیٹھ گئی۔
 "اؤ نہوں جلال سلطان! یوں بات بات پر خفا نہیں ہوتے۔ بس کچھ عرصہ صبر کرو پھر جہاں ہی چاہے جیسے ہی چاہے میرے ساتھ کھڑی پھرنا۔" انہوں نے شیشے میں اس کے رونگھے رونگھے سے عکس کو ہلاتے ہوئے کہا۔
 "کچھ عرصہ، کچھ عرصہ آخر کتنا عرصہ؟" وہ پوچھے ہیں۔ "کم عمری کے پاس اپنے ہی صبر کے پیمانے ہوتے ہیں جو بڑی جلدی جلدی بھر جاتے ہیں۔ اس کا مزاج اسی طرح بڑا بڑا سا تھا۔
 "ارے صرف چھ ماہ ہی تو ہوتے ہیں لوگ تو سحرانے عشق عبور کرنے کے لیے صدیوں کا انتظار کرتے ہیں۔"
 انہوں نے ہنسنے ہوئے پرفیوم کی شیشی اٹھائی۔
 "شاہ جی اب ایسے بے وقوفوں کا زمانہ نہیں رہا۔ آج کل تو تو نہیں تو اور سہی اور نہیں تو اور سہی کا زمانہ ہے۔"
 اس کا لہذا نصف سلطان بخت کو بڑا لے والا تھا لہذا اس پر خوشبو اٹھانے لیتے ان کے ہاتھ ہنسنے لگے۔
 "میں تارا بڑا لے کی بونٹے خبر نہیں کہ تم ایسا کبھی سوچنا بھی نہیں۔" ان کا لہجہ خطرناک حد تک سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"سید سلطان بخت گدی نشین آف احمد پور شرقیہ ہائے شاہ جی!"
 کہتے کہتے وہ خواجواہ کھل کھلا کر جس پر ہی۔ بیڈر اوٹھ گئے لیکن اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سید سلطان بخت کی گولڈن نازک فریم میں منقید تصویر سامیڈ ریک پر رکھی اور سید سہی ہو کر سلطان بخت کو دیکھنے لگی جو دواش روم سے تو لہے سے منہ رگڑتے ہوئے یا ہر کھٹے تھے اور اب لوگ گردن کے گرد لپٹے اس حسن کی جوالہ کبھی کو دیکھ رہے تھے ہنسی سے جس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا اور سفید دانتوں کی موتیوں جیسی لٹکی اس کو اور حسین بنا رہی تھی۔ بعض لوگوں کی مسکراہٹ ان کی ہنسی سے بالکل جدا ہوتی ہے اور ہر بار اسے ہنسنے سکراتے دیکھ کر سید سلطان بخت نے سوچا کہ وہ ہنسی زیادہ اچھی لگتی ہے یا مسکرائی۔

"تارا جی! آپ کی طرف اچھا لگا رہا ہے اس نے اسانی سے کھج کر لیا۔
 "ہنسی کہ آپ سب سے اپنا اتنا لبا تعارف کراتے ہیں جیسے مجھ سے لگا رہا تھا۔" وہ ہنسنے لگی۔
 "نہیں جان جان! یہ تو خاص خاص صرف تمہارے لیے تھا۔" وہ لمبیر آواز میں بولے۔ وہ ٹھنکی ہاندھے اسے تنگے جا رہے تھے اس کے رخسار کو دیکھنے لگے۔ پلکیں لرزنے لگیں۔
 "مجھ سے ہی کیوں؟" یہ وقت اس کے منہ سے نکلا۔
 "کیونکہ پہلی نظر میں تم اس دل کی بلا شرکت غیرے ملکہ بن بیٹھی تھیں۔" تم سے سنا لہذا راز جو کرنا تھا۔ اسی لیے پورا تعارف پہلے جملے میں ہی کر دیا تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ تم کس سے ٹکرائی ہو۔" اس نے قریب بیٹھ کر انہوں نے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ بدک کر ان کے بازوؤں کے حلقے سے نکل گئی۔
 "تو شاہ جی! اس از فاول۔" وہ اپنی شہادت کی انگلی اٹھا کر انہیں وارن کرنے لگی جو دلچسپی سے اس کے نازک شامخ نوچھے چمک دار سراپے کو نگاہوں کے رستے دل میں اتار رہے تھے اور نزاکت تو اس کے سراپے سے زیادہ اس کی عمر میں تھی کہ سولہ ستر سال کی عمر میں تو ہر لڑکی پر بھی ٹوٹ کر روپ آتا ہے۔ تو پھر نہیں تارا جی۔ سراپا حسن ہی حسن جیسے شراب کی پوری بول میں نشہ ہی نشہ ہوتا ہے پہلے گھونٹ سے لے کر آخری قطرے تک شرط صرف ڈھکیں کھولنے کی ہے اور اس سے پہلے بول کے حصول کی۔
 اور بول کا حصول وہ کر چکے تھے۔ دو سزا مرحلہ باقی تھا اور یہ تو ان کو ایمان کی حد تک یقین تھا کہ وہ شراب کی طرح نشہ ہی نشہ ہے اور اس نشہ کا تصور ہی ان کے رگ و پے کو دھو ش کر دینا تھا اور یہ دھو شی ان پر اس پہلی ملاقات سے طاری تھی جب وہ اچانک ان کی گاڑی کے آگے آتے آتے لہرائی تھی۔ کالج روڈ کا موڑ انہوں نے ہوں ہی تیز رفتاری سے کاٹا۔ سفید لباس میں ملبوس ایک قیامت ان کی گاڑی کے نیچے آتے آتے پٹی تھی اور جس طرح وہ تیسریں بدن لہرانے کے بعد کھینچتے ہوئے تن کران کو کھڑی گھور رہی تھی۔ وہ ڈرا ہو کر ٹک سیٹ پر بیٹھے بیٹھے لڑکتی ہوئی ہنسنے لگی تھی اس کے حسن کا تصویر ہی دوش میں لایا تھا۔

"تارا جی! آپ کی یہی معصوم اداسی تو ہمیں لے ڈوبی ہیں۔" وہ اس کے قریب آئے اور پرفیوم کی ایک تیز پھواری اس کی جھکی ہوئی سنو واٹھ گردن پر چھڑکی۔
 "شادی!" اس نے ہاتھ اٹھا کر خوشبو کی بوتھو ڈکھڑکنا چاہا۔
 "پھر تم ہو گی تمہارے شاہ جی ہوں گے اور زمانے بھر کے عیش۔" انہوں نے شیشی واپس ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی۔
 "شادی ایک قید سے نکال کر دوسری جیل میں ڈال دینا چاہتے ہیں۔" اس نے شکوہ کیا۔
 "جیل؟ کون سی جیل؟" وہ ڈرا سا پوچھے۔
 "آپ کی خوبلی جیل نہیں تو اور کیا ہے! یہاں تو پھر میں آپ کے جانے کے بعد ادھر ادھر ہر جگہ گھوم پھر لیتی ہوں۔ مام کے ساتھ آؤ ٹھنک پر شہر سے باہر چلے جاتے ہیں۔ فریڈز سے ملنے چلی جاتی ہوں اور مام کے ساتھ اسٹوڈیو تو ویڈیو بعد میں شادی آپ کے نام کی زنجیر پاؤں بھی نہیں ہلانے دے گی۔ شادی! ایسی جس بھری فضا میں

9



تو نین تارا گھٹ کر مر جائے گی۔ اس کی آواز اپنی بچاریگی کے احساس میں سے بھرا گئی۔
 "نین تارا! ایسی باتیں کر رہی ہو، کیا میری رفاقت تمہارے لیے سزا ہو گی؟" وہ اس کے پاس آ بیٹھے۔
 "شاہ جی! میں آپ کو بچ بتاؤں۔" وہ ایک لمحے کو ان کی روشن آنکھوں میں جھانک کر بولی۔ "شاہ جی! آزاد پنجھی کے لیے قید سے بڑی بھی کوئی سزا ہوتی ہے آپ خود بتائیں۔"
 "مجت سزا ہے نین تارا؟" وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کچھ افسردگی سے بولے۔
 "ہاں شاہ جی! سزا ہی تو ہے۔ اس سزا کی سب سے پہلی اذیت پتا ہے کیا ہے؟" اس نے اپنی موٹی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا لیں۔

"اپنے آپ کو ختم کر دو دوسرے کے وجود میں ڈھل جاؤ۔ اپنی خواہشیں دوسرے کی محبت میں قربان کر دو۔ اپنی قربانی شاہ جی! سب سے پہلے اپنی ذات کی قربانی اور جو خود کو قربان کرنا نہیں چاہتا۔ وہ سچی محبت نہیں کر سکتا۔" اس کے لہجے میں سمندر کی سی گہرائی تھی۔
 "نین تارا! اتنی سی عمر میں تم نے یہ اتنی بڑی باتیں کہاں سے سیکھیں؟ کلج تو تم محض تقریباً جاتی ہو یا جاتی ہی نہیں۔" وہ حیرت سے اس کی چاکلیٹ براؤن کشادہ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔
 "شاہ جی! کلج کا تعلق عمر سے نہیں ہوتا اور یہ جس پر عیاں ہو جائے تو اس کی عمر گھٹاتا ہے اور یہ کہاں لکھا ہے کہ عقل کی باتیں کلج میں سکھائی جاتی ہیں۔ کلج میں جا کر تو بعض لوگوں کی رہی سہی عقل بھی جاتی ہے مجھ جیسوں کی۔" وہ چٹکی سی ہنسی سے بولی۔

"ہاں سنجیدی اس کے چہرے پر سوٹ نہیں کرتی، بعض چہرے صرف نسی کے لیے بنے ہوتے ہیں اگر وہ سنجیدہ ہو جائیں تو یکایک بوڑھے نظر آنے لگتے ہیں۔ اتنے نوجوان بدن پر بوڑھا چہرہ؟" انہیں سوچ کر ہی ہنجر جھری سی آ گئی۔
 "اے یہ کیا فلسفہ جھاڑ رہی ہو، چلو باہر چلتے ہیں تمہاری عمران بالوں کی نہیں ہے۔ تم بس کلج جایا کرو وہاں روز ایک تو لہ عقل رخصت کر آیا کرو۔ تمہیں اس کی اجازت ہے کیونکہ مجھے تمہاری عقل کی بہت زیادہ ضرورت نہیں اس لیے تم بس خوش رہا کرو اور ہم سے پیار کیا کرو۔" وہ اس کی طرف جھکے ہوئے کھسک گئی۔

"شاہ جی! مجھ سے اب پڑھا نہیں جانا اور میں نے کون سی پیچھری پیچھری کرنی ہے جو کتابوں میں اپنی جان ہلکان کروں اور شاہ جی! وہ کام ایک ساتھ نہیں ہو سکتے۔ بندھ یا تو عشق کر سکتا ہے یا پڑھائی اور آپ تو مجھے کلج کے پہلے روز ہی ٹکرا گئے تھے پھر میں نے کیا پڑھنا تھا بس وہی دن جب آپ احمد پور جاتے ہیں کلج چلی جاتی ہیں۔ کلج اس روز کے چکر لگا آتی ہوں۔ اب تو نام بھی افسوس کرتی ہیں کہ تاجی داخلہ نہیں بھری۔" وہ اٹھ کر ڈیسک ٹیبل کے پاس گئی اور بیئر برش اٹھا کر اپنے شانوں تک لہراتے گھٹے بالوں میں بڑی نرمی سے پیچھرنے لگی۔
 "اوسوں مینویاں؟ تمہیں کیا پیسوں کی کمی ہے جو یہ چھوٹے چھوٹے پچھتاوے پالتی ہو۔ رنکت خراب ہو جائے گی اور یہ میں کبھی نہیں چاہوں گا سنا تم نے۔" انہوں نے پیچھے سے آکر اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لینا چاہا وہ تڑپ کر دامن طرف نکل گئی۔

"ہاں شاہ جی! یہ پکار محبت نہیں۔ اس سے تنگ آ گئی ہوں۔ میرا کیرئیر داؤ پر لگ گیا ہے۔" اس نے بال غصے سے پیچھے کی طرف جھٹکے۔

"واہ؟" ان کے تیور بدل گئے۔
 "پانچ اشتہار کیا صرف یہی کام رہے گا میرا شاہ جی۔ میں اسکرین کی دنیا میں تھمک چکانا چاہتی ہوں اور آپ جانتے ہیں میں یہ کر سکتی ہوں۔ آپ مجھے قید نہ کریں۔" وہ کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی اور پرہ کھسکا کر نیچے سڑک پر دوں تریک کو دیکھنے لگی۔

"نین تارا بات سنو۔" وہ اس کے قریب آ کر انتہائی سنجیدہ لہجے میں بولے اس نے ایک نظر ان کے سنجیدہ چہرے پر ڈالی اور پھر نیچے دیکھنے لگی۔

"اس طرح کی خرافات اب تم بھول جاؤ۔ تم اب صرف میری ہو اور میری چیز صرف میری دسترس میں رہتی ہے۔ اسے صرف میں ہی دیکھ سکتا ہوں زمانے بھر کی نکلے نکلے کی نظریں میں اس پر پڑنے نہیں دیتا۔ انڈر اسٹینڈ اور میری محبت تمہیں اتنا کچھ دے گی کہ اشتہاری کمپنیاں تمہیں اپنے آگے پانی بھرنی نظر آئیں گی۔ تمہیں خبر نہیں کہ تم سلطان بخت کی منظور نظر ہو احمد پور کا کلہ توارث۔ دنیا کے خزانے تمہارے آگے ڈھیر کر دوں گا۔" اس نے ایک اچھتی سی بے اثر نگاہ سلطان بخت پر ڈالی اور پرہ آگے کرتے واپس مڑ گئی۔

"شاہ جی! یہ سب میرے لیے کافی نہیں ہے۔" وہ ہونٹوں کی لپ اسٹک درست کرتے ہوئے بولی اس پر سلطان بخت کی تنبیہ کا کچھ خاص اثر نہیں لگتا تھا۔
 "مطلب؟" ان کی پیشانی کے بل گہرے ہو گئے۔

"مطلب ظاہر آپ کو پتا ہے شاہ جی! اس نے نشوونما ہونٹوں کے کنارے درست کیے اور خود کو آکھینے میں تنجیدی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس کا بے نیاز رویہ سید سلطان بخت کو اندر ہی اندر اور بھڑکارا تھا۔
 "نین تارا! وہ بلند آواز میں دھاڑے۔ نین تارا نے شدید غصے سے انہیں گھورا۔

"شاہ جی پلیز۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں احساس دلایا۔
 "یہ سب تمہیں میرے نزدیک آنے کے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ اب اس کا وقت گزر گیا۔ سلطان بخت جب کسی چیز پر ہاتھ رکھ دیتا ہے پھر اسے کائنات کی کوئی طاقت اس سے دور نہیں کر سکتی Keep in mind۔" وہ برف لہجے میں بولے نین تارا نے ذرا سی آنکھیں سکڑا کر انہیں دیکھا۔
 "شاہ جی! میں مجھ نہیں ہوں۔ Keep in mind۔" اس نے ان کا لہجہ انہیں اٹھایا۔

"معم جو بھی ہوا اب صرف میری ہو اور تم میرے علاوہ کوئی اور اس طرح کی نگاہ نہیں ڈال سکتا اور یہ کیریر کا خناس بھی تمہارے دماغ میں تمہاری اس بدگئی کھوسٹ ناٹک مانا جانی نے ڈالا ہے مجھے معلوم ہے اسے یہ سب سمجھا دینا کورن بہت مشکل ہو جائے گی۔" انہوں نے بہت کو سنجیتے ہوئے حقیر لہجے میں کہا۔
 "شاہ جی! شایانہ درمناں اور سنجیدہ۔" نین تارا نے احتجاجاً کہا۔

"اوسہ درد۔ اس پر فتن میں کوئی ماں بس بھائی باپ نہیں ہوتا۔ یہ رشتے زمین سے اٹتے ہیں یا آسمان سے نازل ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی آگا چھپا نہیں ہوتا اور نہ ان کا آگا چھپا کھوجنا چاہیے بس ذلت اور شرمندگی ہی ہاتھ آتی ہے اس لیے تم بھی نین تارا اس ریڈی میڈ ماں کو ماں ہی سمجھو ورنہ وہ وہی ہے جو میں نے کہا ہے اور اب وہ یہ ماؤ ٹنک وغیمو کا رعب جھا کر مجھ سے تمہارے بڑے اونچے دام وصول کرنا چاہتی ہے۔ میں اس کی نیت کو سمجھ گیا ہوں۔" ان کے لہجے میں شیر کی سی غراہٹ اور حقارت تھی۔

"شاہ جی! میری ماں کے بارے میں یہ سب کہتے ہوئے آپ کو کم از کم میرے جذبات کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ مجھے بہت افسوس ہوا ہے آپ کے خیالات جان کر۔ آپ میری ماں کو جو کچھ بھی سمجھتے ہیں مگر اتنا یاد رکھیں میں اس عورت کی بیٹی ہوں گڈ بائ۔" وہ پل بھر میں انہیں آئینہ دکھا کر دروازہ کھول کر چھپاک سے باہر نکل گئی۔

"نین تارا! نین تارا! سلطان بخت اسے پکارتے ہوئے اس کے پیچھے گئے گمراہ تیزی سے سیڑھیاں اترتی چلی گئی وہ چند لمحے اسے جاتے دیکھتے رہے پھر سہلاتے ہوئے واپس مڑ گئے۔

رات کس قدر تاریک ہے حالانکہ سارا آسمان ستاروں کی روشنی سے جگمگ کر رہا ہے لیکن تاریک رات کے سبب اندھیروں کے لیے یہ روشنی نا کافی ہے۔ چاند نہ ہو تو ستاروں کی روشنی کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ روشنی کے لیے چاند بہت ضروری ہے اور اگر کسی کے پاس چاند نہ ہو تو؟

رستے میں آکر مسافر کو سیدھے رستے سے بھٹکا دیتے ہیں اور کبھی رابن سیدھی سوچ کے خزانے کو نکلنے چلے آتے ہیں۔ ان سے ہیشاری از حد ضروری ہے۔ کھرے اور کھولے گناہ اور نیکی میں فرق کرنے والی آنکھ کو کبھی بند نہ ہونے دینا۔ یہ فرق ہمیں کوئی نہیں بتائے گا تمہارے اندر یہ آنکھ موجود ہے۔ اس کی بات ہمیشہ کان لگا کر سننا راستے خود ہی سدھرتے چلے جائیں گے۔

وہ ایک لمحے کو رے انہوں نے اپنی عینک اتار کر اپنے آگے رکھی اور ہتھیاریاں بند آنکھوں پر رکھ دیں۔ یہ ان کی عادت تھی کچھ دیر بعد انہوں نے ہاتھ اٹھالیے۔

”مختصر رستے عموماً پرکشش اور دل کو بھانے والے ہوتے ہیں مگر ان کا انجام انتہائی تاریک غاروں میں جا کر ہوتا ہے۔ جہاں سے پھر واپسی کا کوئی رستہ نہیں ہوتا۔ سیدھا اور سچا رستہ لمبا اور کانتوں بھرا ہوتا ہے مگر اس کا انجام ہمیشہ بہت نیک بہت خیر سکون ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی بھی غلط قدم اٹھانے سے پہلے سوچ لینا کہ پہلا قدم ہی دشوار ہو گا پھر قدم خود بخود گناہ کے رستے پر بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔ اب تم اپنے تختہ خود ہونا احتساب کرنا تمہیں خود ہی کرنا پڑے گا۔ اس لیے جو بھی کرو۔ سوچ سمجھ کر کرنا۔ میرا خیال ہے کہ تم میری باتوں کو نا صرف دھیان سے سن رہے ہو بلکہ ذہن نشین بھی کر چکے ہو۔“ انہوں نے عینک اٹھا کر پھر سے لگا لی۔

”جی سر!“ اس نے ایک لمحے کو انہیں دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

”کوئی بات جو تم کہنا چاہتے ہو یا پوچھنا چاہتے ہو؟“ ان کی فراخ دلانہ گفتگو پر اس نے نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ تعجب کے عالم میں تھا۔

”ہاں ہاں پوچھو کیا کہنا ہے؟“ انہوں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

”سر! میں یہاں سے کہاں جاؤں گا؟“ اتنے دنوں سے ذہن میں کانٹے کی نوک کی طرح بیٹھا سوال اس نے بالآخر ان کی محبت بھری گفتگو سے متاثر ہو کر کر رہی دیا۔

”ہوں۔“ انہوں نے سر ہلایا مگر چپ رہے وہ مدد طلب نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔

”ہالانکہ میں ایڈمیشن لے لینا اور ہاسٹل میں رہ لینا۔ تمہارا کوئی رشتہ دار۔“ انہوں نے آنکھیں سکود کر اسے دیکھا۔

”اب تک تمہاری یہاں سولہ سترہ سالہ زندگی میں کوئی ملنے نہیں آیا۔ اس کا مطلب ہے کوئی ہو گا نہیں اور ہوا بھی تو کون ایسے میں کام آتا ہے۔ بہر حال یہاں سے جانے سے پہلے تمہیں تمہارے پیارے میں جو بھی معلومات ہمارے پاس ہوں گی بہم پہنچائی جائیں گی۔ شاید کوئی کلیو مل جائے۔ نہیں تو رستے میں ایک رشتہ گزار رکھو۔ میٹر کیولٹ تو تم ہو ہی جاؤ گے، تمہیں چھوٹی موٹی پارٹ ٹائم جاب کر لینا شہر میں ہاں مسئلہ ہیں اس طرح کے لوگوں کے لیے جہاں کمرہ لے لینا کسی کے ساتھ شیئر کر لینا۔“

یہ سب اسے طفل تسلیاں لگیں ”کیا ناظم صاحب نہیں جانتے تھے کہ آج کل ایم اے کر کے لوگ جاب کے لیے دھکے کھا رہے ہیں۔ مجھ میٹر کیولٹ کو کون جاب دے گا۔“ اس نے کڑھ کر سوچا۔

”بہر حال اب تم جاؤ۔ رزلٹ آنے کے بعد تم یہاں ایک ہفتہ یا زیادہ سے زیادہ رہ سکتے ہو۔ اس سے زائد نہیں کیونکہ تمہاری جگہ کسی اور بے سہارا کو بنا دی جا سکے۔ تم خود کو اس بڑی تبدیلی کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لو کہ اب تمہیں اپنے بل بوتے پر بھی زندگی میں قدم رکھنا ہے اور تم پونہمی کنفیوزمست ہو کچھ بھی نہیں ہو گا بس چند ایک روز مشکل ہوں گے جو سیٹ ہونے میں لگیں گے۔ اس کے بعد انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا بس گھبرانا نہیں اپنے جو حوصلوں کو بلند رکھنا۔ خدا تمہاری مدد کرے گا۔ کبھی بھی آتے جاتے رہنا ملنے کے لیے مجھے خوشی ہوگی۔“

یہ ان کی گفتگو کے شاید اختتامی جملے تھے جس کا اب صاف مطلب تھا کہ اٹھو اب جاؤ یہاں سے کیونکہ انہوں نے آہستگی سے اپنے سامنے پرار جسر کھول لیا تھا۔

”سر! وہ اسپتالی سے کھڑا ہوا۔“

”ہاں کمو۔“ ان کے چہرے پر ابھی بھی دوستانہ مسکراہٹ تھی۔

”سر! میں بہت پریشان ہوں، نا معلوم کیا ہو گا۔ میں کہاں جاؤں گا؟“ وہ اب رو دینے کو تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔

”اوہ ہو بگ میں بی بیو۔“ وہ ذرا سا ہنسے ”اس طرح کے واقعوں میں پڑو گے تو ضرور خوار ہو گے کہ نا معلوم کیا ہو گا کیسے ہو گا جب سر پر پڑے گی تو سب کچھ آسان ہوتا چلا جائے گا۔ ڈونٹ وری۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کسی ہاسٹل میں منتقل کر لینا پھر جب سمجھ آتی جائے گی تو خود ہی رستے کھلتے جائیں گے اوکے۔“

”ہاسٹل میں ایرجنٹ کر لینا جیسے میرا بینک بھرا ہوا ہے ہونہ۔“ وہ ان کے افسانوی دلاسوں سے جل گیا تھا وہ جانے کے لیے مڑا۔

”اور یہاں پریشان نہ ہو تمہیں جاتے وقت کچھ رقم بھی دی جائے گی۔ نئی زندگی شروع کرنے کے لیے پھر تم اتنے پریشان نہ رہو گے۔“ انہوں نے اپنے تئیں اسے بہت بڑی خوش خبری سنائی مگر اس کے دل کی کلی کھل نہ سکی۔

”تھینک یو سر!“ اس نے مر جھانے ہوئے لہجے میں کہا۔

”خدا حافظ۔“ کہہ کر اس نے چپ اٹھائی اور باہر نکل آیا۔ ناظم صاحب نے اسے جاتے دیکھا اور دھیرے سے خدا حافظ کہہ کر رجسٹر پر بٹھا گئے۔

اور اس دن سے وہ ان ہی ہولناک سوچوں میں گھرا ہوا تھا کہ یہاں سے نکل کر کہاں جائے گا۔ کوئی رشتہ دار نہیں کوئی احباب دوست ایسا نہیں جو کچھ دن کے لیے اسے اپنے پاس رکھ سکے۔ اب یہاں سے نکلنے ہی اگلے روز آگے بڑھنا پڑے گا۔ کل میں ایڈمیشن ملنے سے رہا۔ کل میں ایڈمیشن رزلٹ کے کم از کم ڈیڑھ دو ماہ بعد ہوتا ہے اور کلاسز اس سے دو تین ہفتوں بعد اشارت ہوتی ہیں۔ اس سارے عرصے میں وہ کہاں رہے گا۔ اس سائبان سے نکل کر جہاں اس نے اپنی ساڑھے سولہ سالہ زندگی کے دن رات گزارے تھے وہ سارے دن اس کی آنکھوں کے آگے کسی فلم کی طرح چلنے لگے وہ پھت پر تلنے کی مانند تھے اس فلم کو دیکھے گیا۔

”میں نے آج رات کی طرف فون کیا تھا پھر بھائی تو جاپان گئے ہیں اور دیکھیں جاتے وقت فون بھی نہیں کیا اور سنی کی برتھ ڈے پر بھی نہیں اتوائیٹ نہیں کیا۔ ان لوگوں نے تو بالکل ہی ہمیں دودھ میں سے ہال کی طرح نکال دیا۔ کھڑا کر دیا۔ سب ایسا ہی کیا۔“ عفت آرا جلے کئے لہجے میں دل کے پھپھو لے پھوڑ رہی تھیں۔

”سر! میں نے آج رات کی طرف فون کیا تھا پھر بھائی تو جاپان گئے ہیں اور دیکھیں جاتے وقت فون بھی نہیں کیا اور سنی کی برتھ ڈے پر بھی نہیں اتوائیٹ نہیں کیا۔ ان لوگوں نے تو بالکل ہی ہمیں دودھ میں سے ہال کی طرح نکال دیا۔ کھڑا کر دیا۔ سب ایسا ہی کیا۔“ عفت آرا جلے کئے لہجے میں دل کے پھپھو لے پھوڑ رہی تھیں۔

”سر! میں نے آج رات کی طرف فون کیا تھا پھر بھائی تو جاپان گئے ہیں اور دیکھیں جاتے وقت فون بھی نہیں کیا اور سنی کی برتھ ڈے پر بھی نہیں اتوائیٹ نہیں کیا۔ ان لوگوں نے تو بالکل ہی ہمیں دودھ میں سے ہال کی طرح نکال دیا۔ کھڑا کر دیا۔ سب ایسا ہی کیا۔“ عفت آرا جلے کئے لہجے میں دل کے پھپھو لے پھوڑ رہی تھیں۔

”سر! میں نے آج رات کی طرف فون کیا تھا پھر بھائی تو جاپان گئے ہیں اور دیکھیں جاتے وقت فون بھی نہیں کیا اور سنی کی برتھ ڈے پر بھی نہیں اتوائیٹ نہیں کیا۔ ان لوگوں نے تو بالکل ہی ہمیں دودھ میں سے ہال کی طرح نکال دیا۔ کھڑا کر دیا۔ سب ایسا ہی کیا۔“ عفت آرا جلے کئے لہجے میں دل کے پھپھو لے پھوڑ رہی تھیں۔

”سر! میں نے آج رات کی طرف فون کیا تھا پھر بھائی تو جاپان گئے ہیں اور دیکھیں جاتے وقت فون بھی نہیں کیا اور سنی کی برتھ ڈے پر بھی نہیں اتوائیٹ نہیں کیا۔ ان لوگوں نے تو بالکل ہی ہمیں دودھ میں سے ہال کی طرح نکال دیا۔ کھڑا کر دیا۔ سب ایسا ہی کیا۔“ عفت آرا جلے کئے لہجے میں دل کے پھپھو لے پھوڑ رہی تھیں۔

”سر! میں نے آج رات کی طرف فون کیا تھا پھر بھائی تو جاپان گئے ہیں اور دیکھیں جاتے وقت فون بھی نہیں کیا اور سنی کی برتھ ڈے پر بھی نہیں اتوائیٹ نہیں کیا۔ ان لوگوں نے تو بالکل ہی ہمیں دودھ میں سے ہال کی طرح نکال دیا۔ کھڑا کر دیا۔ سب ایسا ہی کیا۔“ عفت آرا جلے کئے لہجے میں دل کے پھپھو لے پھوڑ رہی تھیں۔

”سر! میں نے آج رات کی طرف فون کیا تھا پھر بھائی تو جاپان گئے ہیں اور دیکھیں جاتے وقت فون بھی نہیں کیا اور سنی کی برتھ ڈے پر بھی نہیں اتوائیٹ نہیں کیا۔ ان لوگوں نے تو بالکل ہی ہمیں دودھ میں سے ہال کی طرح نکال دیا۔ کھڑا کر دیا۔ سب ایسا ہی کیا۔“ عفت آرا جلے کئے لہجے میں دل کے پھپھو لے پھوڑ رہی تھیں۔

”سر! میں نے آج رات کی طرف فون کیا تھا پھر بھائی تو جاپان گئے ہیں اور دیکھیں جاتے وقت فون بھی نہیں کیا اور سنی کی برتھ ڈے پر بھی نہیں اتوائیٹ نہیں کیا۔ ان لوگوں نے تو بالکل ہی ہمیں دودھ میں سے ہال کی طرح نکال دیا۔ کھڑا کر دیا۔ سب ایسا ہی کیا۔“ عفت آرا جلے کئے لہجے میں دل کے پھپھو لے پھوڑ رہی تھیں۔

”سر! میں نے آج رات کی طرف فون کیا تھا پھر بھائی تو جاپان گئے ہیں اور دیکھیں جاتے وقت فون بھی نہیں کیا اور سنی کی برتھ ڈے پر بھی نہیں اتوائیٹ نہیں کیا۔ ان لوگوں نے تو بالکل ہی ہمیں دودھ میں سے ہال کی طرح نکال دیا۔ کھڑا کر دیا۔ سب ایسا ہی کیا۔“ عفت آرا جلے کئے لہجے میں دل کے پھپھو لے پھوڑ رہی تھیں۔

میں آتی تھی۔ پھرتی وہی میں آتی ماڈلز اور نماشتی گھروں ان کے رہن سہن سے لے کر پڑوس کے بچوں کے اپنے لباس تک کو دیکھ دیکھ کر وہ ٹھنڈی آہیں بھرا کرتیں اور رعنا سے تو انہیں اس معاملے میں خاص پر خاش تھی ان کے حساب سے وہ لاکھوں کروڑوں میں پھیل رہی تھی اور دنیا میں جنت کے مزے لوٹ رہی تھی۔ مثل کلاس سے وہ ایک دم سے ارب پائی کلاس میں جا پہنچی تھی جو عفت آرا سے ہضم نہیں ہوتا تھا اور رعنا کی اس دنیاوی جنت کے مزے لینے کے لیے ان کا بھی دل چاہتا وہ مہینہ دو مہینہ بعد ان کے سر پر جاسوار ہوتیں۔ سارا دن وہاں گزارتیں رعنا کا گھر اس کا اعلا اور منگا ترین فرنیچر لکڑی رہن سہن تو کر چکا کر رعنا کا لباس، جیولری، ڈو دو گاڑیاں ہر چیز پر ان کا دل کو نکلوں پر پڑے تیج کباب کی طرح پلٹ پلٹ کر سکتا رہتا اگرچہ رعنا ابھی پر انہیں سارے تحائف ان کے کپڑے جو تے جیولری پرس بچوں کے کپڑے امور ڈیفرنیوم نواز بھائی کے لیے قیمتی سوئٹشرٹس ٹائلیاں اور بہت کچھ لا کر بھیجتی مگر ان کا دل شاد ہو تا نہ ان کی آنکھ تشکر کے احساس سے چمکتی بس دل چاہے اور بچھ سا جانا کہ تو بہت کم ہے میں تو اس سے بھی زائد کی حقدار ہوں۔ نواز کا سمجھانا سمجھانا سب بے کار جانا۔

ان کے دل کی ہوس دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ تو انہیں یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن ان کے یہ دن پھر جائیں گے اس بات کا انہیں خدا کے وجود سے بھی زیادہ یقین تھا مگر اس وقت تک انہیں صبر نہیں آ رہا تھا دل بے گل بے گل ہو جاتا اور۔۔۔ اور اور لی پکار کے ہی جاتا۔ بازار جاتیں بڑے بڑے شاپنگ سینٹر میں کیتی قیمتی اور مہنگی ترین اشیاء ان کی حسرتوں کو اور بڑھادیتیں۔ نواز اسے سمجھاتے کہ تم بازار کم جایا کرو نا ایسا کچھ دیکھو کی نا جی چلے گا نا اس قدر ترس ترس کر مذہال ہو گا مگر وہ جانے بنا رہی نہ پاتیں۔ ایک دن پھوڑو سرے دن بازار نکل جاتیں۔ وہ کبھی اچھو یا رنگ محل نہیں گئی تھیں۔ ہیٹ لبرٹی پھوڑو رامایا فورٹیس جاتیں چاہے انہیں ایک رو مال ہی کیوں نہ۔ خریدنا ہوتا اور پھر دل میں ہزاروں حسرتیں سمیٹ کر واپس آتیں فرسٹریشن کا یہ بخار کئی کئی دن ان کے دل سے نہ اترتا وہ خن کو ہلکا ہلکا کر رکھتا تھا اور اس دور ان گھر میں ہر ایک سے جنگ کرتیں۔ کبھی بچوں کی ہار کٹائی اور کبھی نواز سے لڑائی۔ کبھی کام والی کی شامت آتی اس کے ہر کام میں میں شیخ نکال کر اسے بھگا دیتیں اور اب تو نواز نے انہیں سمجھانا بھی پھوڑو دیا تھا اور رعنا عفت آرا کی حاسد نظروں سے بہت خوف کھاتی تھی کہ کب بھائی کی حاسد نظر اس کے خوشحال و خوش باش گھر کو ن لگ جائے۔ وہ عفت آرا کو نظر انداز کرتی تھی۔ اکثر عفت آرا کی

آد کا سن کر کہیں نہ کہیں نکل جاتی۔ مگر عفت آرا اس کے آنے تک چاہے وہ رات گئے آتی گھر ہی میں موجود رہتی۔ رعنا اس بات سے بے حد مخالف تھی کئی بار فخر سے کہہ چکی تھی کہ ہم اسلام آیا دیا کراچی چلے جاتے ہیں وہاں کم از کم عفت آرا کی زندگی کی سمان نوازی سے تو جان چھوٹ جائے کی مگر فخر کا بڑا سسر کل ہی لاہور میں تھا وہ کہے کہیں اور چلے جاتے۔

”اور دیکھو اس بار ہمیں سا لگرہ پر بھی انوائیٹ نہیں کیا حد نہیں ہو گئی۔“ عفت آرا نے رنج کا ایک اور پہلو نکالا۔

”بھئی رعنا نے بتایا تو تھا کہ انہوں نے کسی کو بھی انوائیٹ نہیں کیا تھا۔ گھر میں ہی چھوٹا سا فنشن کیا تھا سنی کے دوستوں کو بلا کر۔“

”نواز ہم کسی نہیں ہیں۔“ عفت آرا نے کسی پر زور دے کر کہا۔

”چھا تو پھر کیا ہیں۔“ وہ جھجلا کر بولے۔

”معلوم ہے آپ کو اچھی طرح سے پھر بھی۔“ ان کا لہجہ حسرت زدہ ہو گیا۔

”اوہو بھئی عفت آرا بس بھی کروسیہ فضول کی ٹینشن حد ہوتی ہے خود اذیتی کی بھی۔“ وہ چڑ کر بولے۔

”یہ خود اذیتی ہے کوئی ہمارا اتنا قریبی عزیز ہمیں اس قدر اہم موقع پر انور کروے تو تکلیف نہیں ہوتی۔“

”وہ تو تمہیں ہر غیر اہم موقع پر بھی ہو جاتی ہے تمہاری تکلیف کون سی ہے۔“ نواز کندھے اچکا کر بولے۔

”کیا مطلب ہے آپ کا۔“ وہ ہاتھ پر تل ڈال کر بولیں۔

ہنستے اور ہنستے ہیں پھر بھی۔“ وہ افسوس سے سر ہلا کر بولے۔ ”پھر بھی ایسی ناشکری کرتی ہو۔ اللہ ناراض ہوتا ہے اس طرح کے گلے شکلوں سے۔“

”چلو پیکچر شروع ہونے۔ جس میں کچھ گن نہ ہو۔ وہ نصیحتیں زمانے بھر کی کرتا ہے نواز صاحب!“ وہ چلے گئے لہجے میں بولیں۔

”کیسی نصیحت؟ کیسا پیکچر؟ بھئی یہ تو خود تمہیں سمجھنا چاہیے۔“ انہوں نے لا پرواہی سے کہہ کر پھر سے اخبار کھول لیا۔

”خبردار جو اس جھوٹ سچ کے بلندے کو میرے سامنے کھولا تو۔“ وہ انگلی اٹھا کر دھڑکا دے گا لے لہجے میں بولیں۔

”حد ہو گئی جہاں میں سامنے آ کر بیٹھی دو باتیں کرنے کے لیے وہاں ضروریہ اعمال نامہ کھول حفظ کرنے بیٹھ جائیں گے پتا نہیں کون سے خزانے کا نقشہ دیا ہوتا ہے اس میں جو صبح سے رات تک آنکھیں گاڑے اسے حفظ کرتے رہتے ہیں۔“ عفت آرا کو ان کی اخبار پڑنی سے بے حد بچنے لگی۔

”اچھا لو بھئی بند کیے دینا ہوں۔ خزانے مل بھی جائیں تو بھی تمہیں یہی کہنا ہے کہ تم سے۔“ وہ چپکلی سی ہنسی شے۔ ”اور بھول گئیں ابھی پچھلے ماہ رعنا نے ہمیں کتنا نہیں دنازک کر لیا کاسیٹ دیا تھا جو خزانے سے منقل سے لا کر دیا تھا۔ تم نے حد سے زیادہ اس کی تعریف کی تو آتے وقت اس نے تمہیں ہی تمہارا دیا۔“ انہیں ایک دم سے یاد آیا تو جتا بیٹھے۔

”وہ کاغذ جتنا بلکا چمکے جیسا سیٹ اور وہ فخر اس کے لیے نہیں لائے تھے وہ تو خود ہی میری سا لگرہ کا تحفہ کہہ کر بیٹھے دیا تھا۔ فخر کے لائے ہوئے کھولوں میں تو اس کی جان ہوتی ہے۔“ انہیں بونسی اور اور دھرا ہوا منتی مرنہ جائے۔“

”عفت آرا! ہمیں کے لیے پوری کا کٹیا لہجہ نواز کو برا لگا۔“ وہ بھی لہجے میں بولے۔

”ہاں تو اور کیا فخر اس کے لیے گولڈ نہیں لائے۔“ انہوں نے اور بلا بیٹھے لائے ہیں گولڈ تو ہم بیسوں کے لیے ہے۔“ وہ جھسم لہجے میں کڑھ کر بولیں۔

”فونہ آبیوں خوا خواہ میں اپنا خون جلاتی رہتی ہو بھئی اگر خون ہی جلاتا ہے فضول میں جلتا کڑھنا ہی ہے تو زندہ یہ سوچ کر بھی جل کر رہ سکتا ہے کہ یہاں کنیوں کے ہاتھ روز ہمارے گھر جتنے بڑے ہیں اور ایسے لوگوں کی صبح پاکستان میں ہوتی ہے وہ پھر لندن میں اور شام پیرس میں تو اس بات پر جو لوگوں کی بات بھی ہے۔“ وہ اسے چھیڑنے کو بولے۔ ”دیکھو عفت آرا! وہ ذرا آگے کو بھٹکے۔“ میری اچھی بیوی خدا نے یہ دنیا ہی ڈھب پر پیدا کی ہے ہر کسی کو اس کے نصیب کا لکھا ہی ملتا ہے اور نصیب کے لکھے کو کوئی نہیں ٹال سکتا جو چیز جو روزی میرے نصیب میں لکھا ہے اسے کوئی مجھ سے چھین نہیں سکتا۔ چاہے ساری دنیا مل کر زور لگالے اور جو میرے نصیب میں نہیں ہے چاہے ساری دنیا مل کر کوشش کرے مجھے نہیں مل سکتا۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے اگر اس کو دل میں نقش کر لو تو بہت سی باتوں پر خود بخود صبر آجاتا ہے دل پر سکون ہو جاتا ہے۔ فخر محنت کرتا ہے اپنے بیوی بچوں کی جدائی بھی سہتا ہے دن رات ایک کرتا ہے تو پھر کہیں جا کر پھل پاتا ہے۔ اس کی محنت کی نوعیت اور بے میری اور بلکہ ہر کسی کی علیحدہ علیحدہ اس میں دوسروں سے حد کرنے سے فائدہ۔“ وہ عفت آرا کو سمجھا رہے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اس پر ان باتوں کا رتی برابر اثر نہیں ہو گا۔ شادی کے پہلے دن سے لے کر آج تک وہ اسے سمجھاتے رہتے تھے مگر اپنی کم مائیگی کا احساس تو اس کے دل سے ایک لمحے کے لیے بھی کم نہیں ہوتا تھا۔ نواز دیکھتا تھا یہاں ہمارے منٹ میں ایسی ڈی اونٹھے اور عفت آرا کے نزدیک ان کی تنخواہ کارپوریشن کے کسی کلرک کے برابر تھی وہ تنخواہ کو محض دس پندرہ دنوں میں اڑا دیتی تھیں۔ نواز ایماندار تھے کافی حد تک۔ مگر اتنے جتنے کہ آج کے دور کا ہر شخص ہے۔ تھوڑا سا جھوٹ۔ تھوڑا سا سچ تھوڑی سی دھاندلی تھوڑی سی نرمی ہر شخص کی طرح وہ اپنا حق سمجھتے تھے اور جو تھوڑی بہت مناسب حد میں رہتے ہوئے اوپر کی آمدنی آتی تھی اس سے باقی کے پندرہ بیس دن گزارتے تھے اور ان ہی پندرہ

جس دنوں میں عفت آرا جل جل کر اپنا خون کو نلکہ بنا لیتی تھیں۔ پھر یہی سخی ان کی باتوں ان کے لہجے ان کی سوچ

”بھئی یہ دیکھو۔“ انہوں نے ہاتھ جوڑے ”اب بخشو اس فضول کے ٹایک کو اور جا کر دو کپ چائے بنا لو۔ چائے پی کر باہر چلتے ہیں آؤنگ کے لیے۔ آج پھر تمہارا میٹر الٹا چل رہا ہے شام تک سر پر پی باندھ لوگی۔ اس سے بہتر ہے کہ باہر جا کر تازہ ہوا کھا آؤ۔“ انہوں نے صلح جو لہجے میں کہا۔

”ہاں ایک تازہ ہوائی تو آپ کھلا سکتے ہیں اور ہے کیا آپ کے پاس۔“ وہ افسردہ لہجے میں کہہ کر اٹھیں۔

”حد سے بھئی ہریات میں ناشکرے پن کا کوئی نہ کوئی موضوع نکال لیتی عفت آرا! تمہارا بھی جواب نہیں۔“ عفت آرا انہیں ٹھورنے لگیں۔

”اب جاؤ بھی۔ اتنی دیر میں ذرا منہ ہاتھ دھو لوں۔“ وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے تو وہ بے دلی سے بچن کی طرف بڑھ گئیں۔

”نہیں تارا! آخر کیا مسئلہ ہے تم شاہجی کو کیوں مسلسل نظر انداز کر رہی ہو ہفتہ بھر سے تم نے ان کی کوئی فون کال اٹینڈ نہیں کی اور اب آج پھر ان کا فون آیا اور تم علم ہونے کے باوجود آرام سے کالج چلی گئیں۔ میں ناٹ اے رانٹ وے مانی چائونڈ۔“ زیور گل اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی برسنے لگی اور وہ اپنے بیڈ پر اندھنی لپیٹ لیشن میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی ایک دم سے اچھل کر سیدھی ہو گئی۔

”تو بے مام ڈروا آپ نے۔“ اس نے دھک دھک کرتے دل پر بے ساختہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

”اگتا تو دل ہے میری جان کا پڑیا جتنا۔“ زیور گل اس کی حالت دیکھ کر اٹھی اور اس کے پاس آئی تھی اور پیار سے اس کے چہرے پر بٹھری نہیں درست کرنے لگی۔

”تو اور کیا مام! آپ کو پتا ہے پھر بھی اچانک۔“ وہ بچوں کی طرح بسوز کر بولی۔

”بیڈ تمہارے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اس لیے ناک نہیں کیا سوئی۔“ زیور گل نے اس کا کال تھمتھایا ”اچھا چلو اٹھو شاہجی! اب اٹھ کر یا تھ لوفرش ہو جاؤ اور اپنا سب سے اچھا ڈریس پہنو۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی ”تمہا شاہجی نے تمہیں لاسٹ ٹائم اسلام آباد سے لے کر دیا تھا سی گرین پر ملنے لنگر کی ایمر انڈری وہ والا پہنو وہ تمہیں بہت سوٹ کیا تھا اور خوب جی رنگا کرتا رہتا ہوتا۔ شاہجی شام سے پہلے ہی آجائیں گے اور انہیں احساس نہیں ہونا چاہیے کہ تم پچھلے پورے ہفتے انہیں انور کرتی رہی ہو۔“ وہ جو وہ زانو بیٹھی زیور گل کی باتیں سن رہی تھی سر ہینٹنے لگی۔

”اول ہوں مام! میرا دل بھر گیا ہے شاہجی سے مجھے اب وہ اچھے نہیں لگتے۔“

”اوہ یوشٹ اپ ڈارنگ! ایسے الفاظ تو خواب میں بھی نہیں سوچنا کم از کم ابھی وہ بھی وہی ہے یعنی خیر انداز میں مسکرا کر چپ کر گئی۔

”مام شاہجی بہت خراب ہیں حد سے زیادہ پونڈ ہو اور کافی زیادہ Congested mind میں ان کے مزاج میں نہیں چل سکتی۔“ اس نے چوڑی ماری اور پھر سے میگزین اٹھانے لگی۔

”تو نہیں تارا! شاہجی اس وقت میرے لیے سب سے اہم ہیں اور میں انہیں کبھی مس نہیں کرنا چاہوں گی۔ وہ پونڈ ہو نہیں سورا اور سمجھ دار ہیں اور نوجوانوں کی طرح چھپوڑے نہیں میری اتنی ریسیکٹ کرتے ہیں۔ یونو اور۔“

”مام! ادا لیے تو لڑائی ہوئی۔“ اس زیور گل کی بات کاٹی۔

”کس بات پر؟“

”انہوں نے آپ کی انسلٹ کی تھی کہ آپ مجھے استعمال کرنا چاہ رہی ہیں۔ شاہجی نے یہ کہا مجھے بے حد برا لگا۔ میں ان سے اس بات پر لڑی، مام شاہجی کو ایسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ مام! شکر ہونا کوئی بری چیز ہے آپ تو ملک کی اتنی مشہور سنگریں اور وہ پتا نہیں کیا کہہ رہے تھے۔ مجھے ان کا انداز قطعاً پسند نہیں آیا۔“ وہ غصے میں بول کر چپ کر گئی۔

”کیا کہہ رہے تھے شاہجی؟“ زیور کا لہجہ بے تاثر سا تھا۔

”انہوں نے کہا نہیں۔ بس ان کا انداز ایسا تھا۔“ اس نے زور زور سے میگزین کے ورق الٹے۔

”کیسا کیا؟“ زیور گل نے ہاتھ بڑھا کر میگزین اٹھایا اور اپنی گود میں رکھ لیا۔

”کچھ نہیں چھوڑیں مام! وہ کترانے لگی۔

”یو لوٹا!“

”مام! پور آراے سنگر Not a Prostitute ہے نا۔“ وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد جھج کر بولی۔ اب زیور گل پر خاموشی چھا گئی۔

”نہیں نام! ایم آئی رانٹ! اس نے اپنی مخروٹی انگلیوں سے زیور گل کے گال پھونکے۔

”ہوں!“ زیور گل نے کتھی ادھر کا رو کا ہوا سانس خارج کیا۔

”چھوڑو نہیں! ایسی بات نہیں کرتے تم نے خواہ مخواہ سوچا شاہجی کا ایسا ہرگز مطلب نہیں ہو گا۔“ زیور گل کا انداز نا احوال تھا۔

”نہیں مام! ان کا ہی مطلب تھا۔“ وہ زور دے کر بولی۔

”دراصل ہمارے ہاں انہیں تک سنگر ایکٹریس ماڈلز اور۔ اور پھر Prostitute (طوائف) کو ایک ہی کلاس سمجھا جاتا ہے۔“

”دش رو تک مام! یہ غلط ہے۔“ اس نے احتجاج کیا۔

”بس یہ صحیح نہیں ہے پھر بھی ایسا سمجھا جا رہا ہے گا نا ادا کاری کرنا یہ تو فن ہے اور اچھا چھوڑو تم یہ فضول بحث ہے۔“ اس نے موضوع کو سمیٹا ”اور اٹھ کر روٹی ہو جاؤ۔ شاہجی شاید دو تین بجے تک پہنچ جائیں گے اور اگر تم ان سے ناراض بھی ہو تو بھی اپنے ناراضی کو کیش کرنا ان کے سامنے روٹو مام کہ وہ تمہیں متا نہیں اور اس صلح کے بدلے میں ان کے ساتھ جا کر اٹھنے والے سے شائیک کر کے آؤ۔ یہ بہتر طریقہ ہے اور محبت میں یونہی ہوا کرنا ہے۔ اس طرح چھپ کر ان کی فون کالز کو نظر انداز کر کے تم انہیں اور Irritate (غصہ دلانا) کرو گی اور ہم ان کی ناراضی انورڈ نہیں کر سکتے۔ انہوں میں تمہارے لیے ڈریس نکالتی ہوں۔“ وہ وارڈروب کی طرف بڑھی۔

”مام آج کل آپ کی وی نہیں جا رہی۔“

”نی وی پر اب میرا کام ہوا کون سا ہے۔“ پچھلے ہفتے ایک ملی نغمہ ریکارڈ کر لیا تھا اور بس نی وی پر آج کل نوجوان نسل کے پاپ سنگرز کا قبضہ ہے ایک دم ہی سے ٹریڈ بدل گیا ہے ہم جیسی لائٹ سنسنگنگ کرنے والیاں اب گھروں میں بیٹھی برتن مانجھ رہی ہیں یا شاہجی بیباہ کے فنکشنز میں بڑے سنگرز کے گانے ہونے گیت کالی کرنے کے لیے بلائی جاتی ہیں۔ مارا ڈیرا اب میرے بزنس میں جاں نہیں رہی۔ ہر پرو فیشن میں فن بعد میں ہوتا ہے بزنس پہلے قائم والے بھی فریش آواز مانتے ہیں اور نی وی والے بھی۔ حد تو یہ کہ نی وی کے لیے معمولی سے اشتہار کے لیے چھوٹا سا جنگل گانا ہو اس کے لیے بھی ٹیک لڑکیوں کی ڈیمانڈ ہے۔ ہماری آوازیں بھی اب انہیں بھونڈی ہے سری اور تھکی ہوئی لگتی ہیں۔ ہمارے فن کی طرح آج کل ان طرح دار سنگرز لڑکیوں اور لڑکوں کی ڈیمانڈ ہے جو گلے سے گائیکی نہیں کرتے بلکہ بدن سے کرتے ہیں اینڈورٹائرنگ ایجنسیوں والے بھی کہیں دیکھ کر یوں نظر انداز کر دیتے ہیں جیسے دیکھا ہی نہیں۔“ وہ اس کے کپڑوں کا جائزہ لے رہی تھی۔

”بٹ مام پور آراے کریٹ سنگر۔ آپ نے اتنے عرصے نی وی فلم میں گانے گائے ہیں اور بڑے مشہور بھراتنی جلدی یہ لوگ آپ کو انور کیسے کر سکتے ہیں۔“ وہ بیڈ سے ناکھٹس لٹکا کر بیٹھ گئی۔

”تارا! یہ تو کتنے دنوں کی باتیں ہیں اور شو بزم میں کیا دن فلم کے برائے اور مجھے ہونے ٹیپ کی مانند آتا ہے جسے کوئی بھی دوبارہ ریلو انٹ کرنا پسند نہیں کرتا۔ اس وقت ہم لوگوں کی ڈیمانڈ بھی ہمارے گانے ہماری آواز ہمارا انداز سب پسند کیا جاتا تھا اور اب ہمارے دور کی سپر ڈھول رہی ہے اور ڈھلتے سپر رگون بھروسا کرتا ہے اب تو شام سر پر ہے اسی لیے تو کہہ رہی ہوں تم اپنے فلوچر کو جتنی جلدی ہو سکے محفوظ کر لو۔ وقت کا کچھ بھروسہ نہیں کب

آہٹکھیں بدل لے۔ اس نے ڈریس منتخب کر کے بڑھ کر رکھا اور اس کے پاس آئی تھی۔
 ”نام میں کیسے محفوظ کروں فیوج کو۔ مجھے تو گانا بھی نہیں آتا بقل آپ کے میری آواز بے سری ہے اور پھر
 گانگی ایچے اور خوشحال مستقبل کے لیے بہت سوٹ ایبل نہیں۔ ویسے بس میں آج کل کالج جا رہی ہوں۔“ وہ
 بچکانہ لہجے میں بولی۔

”بے وقوف۔ کبھی کالج گیا کر بھی کسی کا مستقبل محفوظ ہوا ہے۔ آج کل کی بے چاری شریف لڑکیاں جو کالج میں
 پڑھتی ہیں ان کا فیوج کیا ہوتا ہے ایسے رشتوں کے انتظار میں لڑکیاں دھڑا دھڑا کر رہی ہیں اور ایسے رشتے
 کل بھی جا میں تو وہ صرف باؤس وانف ہی بن جاتی ہیں اور یہ کون سا بھلا بہت روشن اور محفوظ مستقبل ہوا جب
 شوہر کا جی چاہا اٹھا کر بیوی کو استعمال شدہ نشوونما کی طرح ڈسٹ بن میں ڈال لیا۔ چار سال نہیں گزرے بیوی دوسرے
 پیدا کر کے شوہر کے لیے بالکل Use to قسم کی چیز بن جاتی ہے جس پر وہ بھولے سے ہی التفات کی نگاہ ڈالنا پسند
 کرتا ہے۔ کچھ سمجھوتہ کر لیتے ہیں اور کچھ ساری زندگی ادھر ادھر منہ مارتے پھرتے ہیں اور جو بیوی تو اس کا حجاج
 کرے اسے فارغ بھی کر دیتے ہیں اور پھر وہ بے چاری ساری زندگی اس کے بچے پالنے میں گزار دیتی ہے یہ ہوتا
 ہے محفوظ مستقبل۔“ وہ طنزیہ ہنسی ہی دیکھ نکالے اور دیکھ رہی تھی۔

”یہ فیوج نہیں ہوتا یہ تو بالکل غیر یقینی سا بھروسہ ہے کسی پر فیوج ہے وہ تو اسے انسان خود بنائے۔“
 ”وہ کیسے نام؟“ وہ ہنسی لہجے میں بولی۔

”یہ میں تمہیں بتاؤں گی۔ اس فیوج کا پہلا پڑاؤ شاہ جی ہیں تاہلا پہلی سیڑھی پہلا قدم کس قدر اہم ہوتا ہے۔
 تمہیں معلوم ہونا چاہیے اور پہلا قدم اگر مضبوطی سے اٹھایا جائے تو پھر میری جان بھرنے کو جانا ہر راستہ آسان ہو
 جاتا ہے اور تمہیں اپنے رشتوں کو یونہی آسان بنانا ہے۔ اب اٹھو جلدی سے تیار ہو کر شاہ جی کو آپ شاندار ویکم
 آمو اور آج کی ساری شاپنگ صرف ہاؤس باؤس سے کرنا۔ کم از کم ایک ہفت روزہ کا ایٹ اپنی ناراضی کو پیش کرنا اور کچھ
 اب جلدی کرنا چاہ رہے ہیں۔“

”مگر ماں! وہ تو مجھ سے شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔ جلد ہی اسے ایک دم یاد آیا۔
 ”حق ہم لوگ اگر شادیاں رچانے بیٹھ جائیں پھر ہم میں اور وہ شہ جی میں بڑی بے چاری گھریلو بیویوں میں کیا
 فرق رہ جائے گا۔ شادی تمہارا گول نہیں ہونا چاہیے۔ شادی نہیں کروں تو ہر روز دانتوں کے سے ناز اٹھواؤ گی،
 شادی کرو گی تو سارا چارم کھو بیٹھو گی۔ جب بھی شاہ جی شادی کی بات کریں۔ مجھے بتانا میں انکا قدم بتاؤں گی
 تمہیں۔ یاد رکھنا شادی ہمارا مقصد نہیں چلو اب اٹھو تیار ہو جاؤ وفاقت نہ چھوٹی بجا کر اسے ٹھکانے لگی۔
 ”نام ایچھے آپ کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ شادی کے بغیر شاہ جی میں مائیں گے اور شادی کے بغیر میں
 ان کو کیسے خوش کر سکتی ہوں۔“

”یہ بھی میں تمہیں بتاؤں گی۔ خوش کرنے کے ایک ہزار ایک طریقے ہیں کہ شاہ جی گاؤں کا راستہ بھول جائیں
 گے۔ تم فکر نہ کرو تاؤ ہری آپ۔“ اس کی مسکراہٹ معنی خیز تھی وہ نا سمجھی سے زیور کل کر دیکھے تھی۔
 ”چلو اب بت بنی کیا دیکھ رہی ہو۔ ہاتھ روم میں گھسو۔“ زیور نے اسے ہاتھ روم کی طرف دھکیلا اور خود باہر
 نکل گئی۔

”کیا شاہ جی بیچ کمرہ ہے تھے کہ ماں میرے دام وصول کرنا چاہ رہی ہیں۔ مجھے پہلے بھی کچھ شک تھا اور اب ان کا
 انداز مجھے اچھا نہیں لگ رہا اور شاہ جی بیچ کمرہ ہے تھے کہ یہ کیا ہیں۔ اس طرح تو ماں مجھے بار بار Use کریں گی پہلے
 شاہ جی پھر کوئی پھر کوئی اور۔“ وہ ہاتھ روم کے آئینے کے سامنے کھڑی سوچنے لگی۔
 ”نہیں یہ بیچ نہیں ہے۔ میں خود کو اس طرح استعمال نہیں ہونے دوں گی۔“ اس نے خود کو دلاس دیا اور
 شاد رکھنے لگی۔

اسے یہاں کون چھوڑ کر گیا تھا اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ اس کے ماں باپ کون تھے کہاں تھے یا ماں باپ کیا ہوتے

ہیں اسے کچھ بتا نہیں تھا اور آج سے پہلے اس نے ان سوالوں پر کبھی غور نہیں کیا تھا بس اسے لگتا تھا کہ وہ بس
 سائبان میں پیدا ہوا ہے۔ پہلے وہ سائبان کی ڈیوٹی برانچ میں تھا جہاں اس جیسے چھوٹے چھوٹے بے شمار بچے اور
 بچیاں تھیں۔ چھ سال تک وہ وہاں رہا تھا نہیں بلکہ بیچ میں ڈیڑھ سال اس نے سائبان سے باہر گزارا تھا اور ان
 اٹھارہ ماہ میں اسے ایک بار بھی سائبان کی یاد نہیں آئی تھی۔ کیا نام تھا ان کا اس نے سوچنا چاہا اسے یاد نہیں آیا ہاں
 ان دونوں کے بلکے سے یہ لے اسے یاد تھے۔

مرد ساناولا تھا۔ اونچا لمبا جیسے جٹ ہوتے ہیں اور عورت خوب موٹی تازی اور گوری چچی تھی۔ وہ سفید رنگ کی
 گاڑی میں تین بار سائبان آئے تھے اس کی عمر اس وقت ڈھائی تین سال یا اس سے کچھ اوپر ہوئی دو سہری بار جب
 وہ سائبان آئے تو اس روز وہاں کے سارے چھوٹے بچے جو اس کے ہم عمر تھے کو ایچھے کپڑے پہنا کر باری باری ان
 کے سامنے لے جایا گیا تھا۔ عورت نے اسے پسند کیا تھا، مرد نے عورت کی رضایا کر جوں نہیں کی تھی دونوں
 سائبان کے ناظم سیاحب کے آفس چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد وہ اسے اپنے ساتھ ایسی سفید لمبی سی گاڑی میں بٹھا
 کر لے گئے تھے۔ سائبان سے باہر لمبی سی شفاف سرکوں پر وہ گاڑی یوں دوڑ رہی تھی جیسے رخ نرم پانیوں پر روانی
 سے تیرتی ہے۔ اس نے اپنے ہوش میں پہلی بار گاڑی کا سفر کیا تھا۔ وہ عورت راست بھر جھک جھک کر اس کا جائزہ
 لیتی رہی تھی کبھی اس کی آنکھیں کبھی رنگت اور کبھی اس کی صحت کو اپنے شوہر سے ڈسلس کر رہی تھی۔ وہ بار بار
 اسے یوں جانچ رہی تھی کہ اس کو اپنانے کا فیصلہ کر کے اس نے کوئی غلطی تو نہیں کی گاڑی ایک خوب صورت سے
 گھر میں داخل ہوئی تھی اور اس گھر میں داخل ہوتے ہی جیسے اس کے لیے زندگی کا مفہوم یکسر بدل گیا تھا اور ایک دم
 سے بے حد اہم ہو گیا تھا۔

شاہ کو دونوں میاں بیوی اسے بازار لے گئے تھے اس کے لیے ہنگے ترین شاپنگ سینٹر سے بہت سارے
 کپڑے خریدے اور ابتدائی قاعدے خریدے گئے تھے۔ پھر اسے آنسو کیم کھلائی گئی تھی۔ اب وہ
 عورت مطمئن تھی کافی حد تک خوش بھی، صبح کی طرح غیر مطمئن اور اچھی ہوئی نہیں تھی اس کا شوہر بھی خوش
 تھا پھر اگلے سات ماہ اس کی زندگی کے حسین ترین دن تھے جو اس کی یادوں میں ایک رنگین جھولا تھا جس
 میں وہ اب بھی کبھی بھرا ہوا کرتا تھا۔ اس کا ناشتہ دو دو، دو دو، فروت مارلیٹڈ، جیم جینی انڈے، فخریج ٹوسٹ
 اور بنائے آیا یاہو تھا۔ اسے ایک ماہ سوسو ری میں داخل کر دیا گیا تھا جہاں وہ عورت اسے خود چھوڑنے جاتی
 تھی اور خود ہی لے کر آتی۔ دو بیچ اس کی پسند کا ہوتا تھا عورت اکثر اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتی ان دونوں
 کے کہنے پر وہ انہیں ماما یا کمنے لگا تھا۔ اس پورے گھر میں اب اس کا راج تھا۔ اس کا کمرہ اسی طرح سجھا ہوا تھا جیسے
 بیوی اور فلموں میں بچوں کے کمروں کو سجھا ہوا دکھاتے ہیں۔ اس کے کمرے میں بے تحاشا کھلونے تھے بہت
 سارے تو ماما یاہو نے خریدے تھے اور کافی اسے گفت ملے تھے۔ معاذ کو ایڈاپٹ کرنے کے بعد انہوں نے اپنے
 گھر میں بہت بڑا فنکشن کیا تھا۔ اس گیٹ نوگیڈر میں انہوں نے معاذ کو اپنے بیٹے کے طور پر متعارف کرایا تھا۔
 مہمان اس کے لیے ڈھیر سارے گفتس آئے تھے وہ بہت خوش تھا اس کے ڈھیر سارے کزنز دریافت ہوئے تھے
 ان سب کا تعارف ممانے اس لیے کرایا تھا وہ سب اس سے بظاہر خوشی خوشی ملے تھے مگر اندر سے کوئی بھی خوش نہ
 تھا۔ اس کا پتا اسے رات کو ماما یاہو کی گفتگو سے چلا وہ سب اس سے بیچس تھے کہ ایک انجان خون کو انہوں نے
 اپنا وارث بنا دیا ہے۔ اس بات پر بیباک کے قریبی عزیز ان کے بہن بھائی وغیرہ بے حد ناخوش تھے۔ مگر ان دونوں کو
 اس کی قطعاً پروا نہیں تھی۔

مگر اس کی خوشیوں کے دن بے حد مختصر تھے۔ صرف چھ ماہ اس دوران وہ ماما یاہو کے ساتھ مری بھور بن اور
 ایٹ آباد بھی گیا تھا۔ جہاں بے حد ٹھنڈ تھی اسے سی کے بغیر بھی۔ اسے بے حد مزہ آیا وہ مال روڈ پر ماما کی انگلی
 چھوڑ کر ان کے آگے بھاگ بھاگ جاتا تھا اور ماما مگر مندی سے بار بار آواز دے کر اسے واپس آنے کو کہتیں پھر
 مری ہی میں آخری روز ماما کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ماما بے حد پریشان تھے وہ دونوں ڈاکٹر کے پاس گئے اور جب

آہستہ آہستہ وہ پھر سے ساتیان کا عادی ہو گیا وہاں کا کھانا پینا پہننا اور حنا اب اسے ناگوار نہیں گزرتا تھا اس نے سمجھوتہ کر لیا تھا مگر ایک بات بروہ اڑ گیا تھا ناظم صاحب سے کہ وہ ضرور پڑھے گا چاہے کچھ ہو جائے۔ صفائی کی ڈیوٹی بدلو کر اس نے شام کو کروائی اور سب سے مشکل کہ یتیم خانے کے دو سرے بچوں کے ساتھ صاحب حیثیت لوگوں کے در کھٹکنا کر کھانا لے کر آنا جس کھانے میں پوشیاں زیادہ ہوتیں وہ خود بخود ناظم صاحب کے کمرے میں پہنچ جاتا۔ دو سراسر اعلیٰ تہیں میں تصفیہ کر لیتا اور بچوں کے حصے میں پھر وہی پانی جیسی وال آتی۔

کبھی کبھی کوئی صاحب ثروت گوشت چاؤلوں کی دیگ پکا کر یتیم خانے لے جاتا تو اس روز وہ سب بھی یہ نعمتیں کھا لیتے روزہ سال کے تین سو بیسٹھ دن وال سلامت۔

وہ صبح کو یتیم خانے کے چند بچوں کے ساتھ سرکاری اسکول جاتا۔ دوپہر سے شام تک بچن میں کام کروانا اور رات کو بستر بچھانا اب اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا اور پھر رات کو جب جسم ٹھکن سے ٹوٹ رہا ہو تا اور ہال کمرے میں تھیں بچوں کی چار پائیاں دو قطاروں میں پھینچی ہوتیں اور سب رات کے پہلے پہری ناظم صاحب کے مولا بخش سے ڈر کر سو جاتے تو وہ چپکے سے کتابیں لے کر باہر کھلے صحن میں لگے پول کی عطی روشنی میں پڑھنے کے لیے آجاتا۔ شروع پھر صبح میں سارا اعلیٰ اس کا ذرا اڑا تا تھا مگر وہ اپنی اس ضد پر مستقل مزاجی سے قائم رہا۔ چند دنوں بعد ان کا ذرا ختم ہو کر صبح سرائی میں بدل گیا۔ سب اس کی محنت کو سراہنے لگے اور اس محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ہر سال کلاس میں اول آئے لگا اور اب ہر سوں پھر رزلٹ ہے نا معلوم کیا ہو کتنے مار کس آئیں۔ اللہ میاں مجھے آسانی سے کلج میں ایڈمیشن مل جائے۔

ساری باتیں بھول کر وہ عا میں مشغول ہو گیا۔

دیکھا ہوا؟ "تو محنت پر بیٹھی کلام پاک کی تلاوت کرتیں اماں اس کی چیخ پر ایک دم سے گھبرا گئیں وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی۔ اس کا سارا اچھوٹینے سے تر تھا اور جسم اچھی بھی ہو لے ہو لے کچکا رہا تھا اس نے اپنی نگاہوں سے اماں کو دیکھا۔

"آمنہ آمنہ بیٹی! کیا ہوا؟" اماں اس کے پاس آ کر اسے محبت سے ہلاتے ہوئے بولیں۔

"جی ہاں۔" اس نے پللیں جھپکیں تو تیسے سارے ساکن منظر میں جان پڑ گئی۔

"کچھ نہیں۔" اس نے شکل بدلتی پر زبان پھیر کر انہیں تر کرنا چاہا۔

"خواب میں ڈر گئی ہو؟" اماں اس کے بال سنوارتے ہوئے بولیں۔

"ہاں اماں! بڑا عجیب خواب تھا اس نے کئی نیاں بولتے ہوئے کہا۔" اماں! تیسری بار آیا ہے یہ خواب مجھے۔"

"ہزار بار! بھائی ہے کہ بیٹا فجر کی نماز پڑھ کر مت سویا کرو بڑے اوٹ پانگ خواب آتے ہیں اور نحوست بھی پھیلتی ہے گھر میں اور رزق سے برکت بھی اٹھ جاتی ہے اور صوفی صاحب الگ تھا ہوتے ہیں۔ تمہاری اس عادت سے۔"

"اماں! نے ہزار بار کی دہرائی ہوئی نصیحت پھر اس کے کانوں میں اتر گئی۔

"اے! آہم۔" صوفی صاحب کھٹکنا رتے ہوئے بیرونی دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوئے آمنہ نے جلدی سے دوپٹہ کھول کر سر اور سینے کو ڈھانپا۔

"کیا ہوا راجہ بی بی اس طرح کیوں بیٹھی ہو؟" وہ اماں کو افسوس کی حالت میں بیٹھو دیکھ کر بولے۔

"کچھ نہیں صوفی صاحب! یہ آمنہ خواب میں ڈر گئی تھی۔ اسے ہی سمجھا رہی تھی کہ فجر کے بعد مت سویا کرے۔" وہ اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

"کیوں آمنہ بیٹا! تمہاری یہ عادت ختم کیوں نہیں ہوتی۔ اس سے نحوست پھیلتی ہے اور گھر میں برکت نہیں رہتی اللہ تعالیٰ خفا ہوتا ہے رزق بانٹنے والے فرشتے منہ موڑ کر چل دیتے ہیں اور یوں خدا کی رحمت ٹھکراتا اچھی بات نہیں ویسے بھی دن چڑھے کے خواب بھولے اور انسان کی قوت متممیلہ کا من گھڑت شاہکار ہوتے ہیں اس

واپس آئے تو اپنے ساتھ اس کے لیے بہت بڑی تبدیلی لائے تھاپے خوش تھے وہ باقاعدہ شور مچاتے تھے بار بار ماما سے لپٹ رہے تھے ماما کی خوشی شیرینی سی تھی ان کی رنگت خواجواہ سرخ ہوئی جاری تھی۔ معاذ کو یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اسے نیند آرہی تھی وہ ماما کے ساتھ سونا چاہتا تھا جب اس نے ماما کو اپنے ساتھ لینے کی ضد کی تو پھانے پولی بار اسے بری طرح ڈانٹا تھا۔ ماما نے انہیں ٹوکا تو بھی وہ اسے غصے سے گھورتے رہے تھے۔ پھر مری سے آنے کے بعد اس کی زندگی کی گلیا ایک بار پھر سے پلٹ گئی ماما کو یہ اس سے کافی بدل گیا تھا پھانے تو سفر کے دوران ہی اس سے بے زار ہو چکے تھے اور اب تو وہ اسے بلانا بھی گوارا نہیں کرتے تھے وہ اس کی ہر بات پر اسے خواجواہ ڈانٹ دیتے تھے وہ ماما سے کوئی ضد کرتا ماما پر اسی ہو جاتیں۔ وہ تو اب اسے اسکول بچھوڑنے اور لینے بھی نہیں جاتی تھیں۔ نا اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتیں نا اس کے کپڑے بدلتیں نا اسے باہر لے کر جاتیں دونوں خود ہی شام کو باہر چلے جاتے۔ کبھی کبھار اسے بھی لے جاتے مگر سارے راستے اس سے اجنبی بنے رہتے۔ وہ ان کے ڈانٹنے کی وجہ سے بے حد سہار دیتا تھا۔ اسے پاپا سے بے حد ڈر لگتا تھا ماما سارا وقت اپنے کمرے میں آرام کرتیں اسے ان کے کمرے میں جانے کی بھی اجازت نہ تھی۔

اور آخر ایک روز ماما کو پھانے ہاسٹل لے گئے۔ وہ ماما کی خراب طبیعت دیکھ کر رونے لگا تھا اس نے دل سے ان کی صحت یابی کی دعا کی تھی۔ ماما دن ہا ہسپتال رہی تھیں اور جب واپس آئیں تو ان کے ساتھ دو کالج کے مہلوے تھے ایک گڈا ایک گڈیا دونوں بے حد سرخ و سفید اور خوب صورت تھے۔ ماما کے گھر میں جیسے بھونچال آ گیا مٹھائیاں تقسیم کی گئیں ہر طرف فون کھڑکانے گئے سارا دن مہار کیا کے لیے لوگ آتے جاتے رہے۔ اتنی مہار بھی میں وہ نہیں چھپ ہی گیا اب تو وہ کسی کو بھی یاد نہیں تھا ماما اپنے کمرے میں ان دونوں کے ساتھ بیٹھی رہتیں پھانے ہر وقت ماما کے کمرے میں اور نوکروں کی دوڑیں لگتی رہتیں۔ اسے نہ وقت پر کھانا ملتا نہ صاف ستھرا لباس بالکوں نے آنکھیں بدلیں تو ملازموں کے تیور بھی اس سے بدل گئے۔ وہ ایک بار جب گھر نہیں گئے ماما کے کمرے میں گیا اس نے ان دونوں بچوں کو یاد کرنا چاہا ماما نے سمولت سے اپنے کمرے سے جانے کو کہہ دیا۔ اسے گھر میں آکر کتنی دیر رہا۔

پھر اسی گھر میں اس کے باقی کے دن بے حد شوار گزرے تھے ساتیان سے بھی زیادہ پھانے اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ اسے دیکھتے ہی خواجواہ چڑھ جاتے۔ ماما سے دیکھ کر نظر اٹھا کر دیتیں۔ ان کا سارا ناظم ان دونوں کی دیکھ بھال میں گزر جاتا ان کا کمرہ تھے تھے کھلونوں سے بھر گیا تھا۔ ایک روز جب ماما چھوٹے کا دورہ لینے کے لیے بوا کو کہنے گئیں تو معاذ نے رو تے پنے کو اٹھانا چاہا وہ جھک کر اٹھا ہی رہا تھا کہ ایک دم سے پھانے اسے پیچھے سے جھڑک کر آؤڑی۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" چھوٹا اس کے ہاتھوں سے پھسل گیا تھا پھانے اس کی وہ پٹائی کی کہ جو ساتیان کے ناظم نے بھی کبھی نہ کی ہوگی۔

بہت دنوں سے وہ اپنے واپس ساتیان چھوڑ گئے۔

اس وقت کی بات کچھ اور تھی وہاں سے نکل ساتیان واپس آ گیا مگر اب کہاں جائے گا۔ اس کا تو کوئی جاننے والا بھی نہیں اس چار دیواری سے باہر۔ اس نے کروش بدلی اور ساتیان واپس آنے کے بعد کتنی راتیں ابرا کا تکیہ آنسوؤں سے بھینٹا رہا تھا اسے وہ عالی شان گھر بے حد یاد آتا تھا وہاں کی آسائشیں اور اعلیٰ رہن سہن اور یہاں کی ٹولی پھوٹی پان کی چار پائیاں اور گندے بستر پر اسے کئی راتیں نیند نہیں آتی تھی اور روزانہ گدلے پانی جیسی وال دیکھ کر اسے اب کافی آتی رہی تھی ساتیان کا عملہ اور دو سرے بڑے بچے اس کا ذرا اڑاتے رہتے تھے بھیر چچا ہنستا۔

"جب گدھی تھانے سے ہو آئے پھر گدھیوں میں نہیں ملتی اب ان حضرت کے بھی مزاج نہیں مل رہے" وال حلق میں اٹکتی ہے کیا بات ہے۔" اور وہ محض دل مسوس کر رہ جاتا زندگی نے بڑا دکھ دینے والا مذاق کیا تھا جس کی شکایت وہ کسی سے بھی نہیں کر سکتا تھا اور تھا بھی کون جو سنتا۔

لے ڈراتے ہیں ان پر پریشان نہیں ہونا چاہیے وہ اس کے قریب پڑے موڑھے پر بیٹھ گئے۔
 ”بابا صاحب! یہاں تک خواب تھا۔“ وہ دھیمی آواز میں نظریں جھکا کر بولی۔

”خواب تو بیٹا بس دو طرح کے ہوتے ہیں نیک اور بد نیک نور سب اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں انسان کی زندگی میں مبارک لمحوں کی آمد کا پتا دیتے ہیں اور میرے پیارے آقائے دو جہاں کا قربان ہے کہ نبوت کے چالیس حصوں میں سے ایک حصہ اچھے اور نیک خواب ہیں اور آپ نے فرمایا کہ میرے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو جائے گا ہاں اچھے اور نیک خواب ہوں گے جو کہ بشارت کا درجہ رکھیں گے۔“

اور وہ گئے برے خواب وہ یا تو محدسے کی گرامی کی وجہ سے ہوتے یا پریشان خیالی کی وجہ سے اور اگر یہ دونوں وجوہ نہ ہوں تو پھر یہ شیطان کے بہکانے اور اس کے ڈراوے ہوتے ہیں جو انسانی ذہن میں واسطے اور وسوسے سے پیدا کر کے اسے منتشر کرتے ہیں۔ ایسے خواب دیکھو تو یا کسی طرف تھوک کر اٹھو یا اللہ پر دھوا اور لا حول و لا قوت پر دستوں کیسی کوسنانے کی ضرورت نہیں۔“

اسے بچپن سے بہت خواب آتے تھے اور جب بھی وہ خواب سنانے کی کوشش کرتی صوفی صاحبہ اسے یہ لہجے کی نصیحت سنایا کرتے۔ اس کا خواب نہیں سنا کرتے تھے کہ اچھے خواب مبارک ہوتے ہیں اسے خود تک محدود رکھو یا پھر اسے سناؤ جو اللہ کے حکم سے ان معاملوں میں کچھ سوجھ بوجھ رکھتا ہو اور برے خوابوں کو شیطانی وسوسے سمجھ کر بھول جاؤ۔

”بابا صاحب! بہت عجیب خواب تھا۔“ وہ ابھی تک خواب کے سحر میں تھی۔

”ہو گا یقیناً“ ہو گا پر بیٹا جو میں نے کہا ہے کہ دن میں آنے والے خواب جھوٹے اور محض ذہن کو پریشان کرنے والے ہوتے ہیں ان کو ذہن پر سوار نہیں کرنا چاہیے۔ چلو اٹھو شاہاں اٹھ کر وضو کرو اور دو نفل پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے سکون کی دعا مانگو۔“

وہ جی اچھا کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”راہجہ بی بی! ناشتہ اگر تیار ہو تو لے آئیں مدرسے کا ناٹم ہو چلا ہے۔ بچے پڑھنے کے لیے آچکے ہیں۔“ انہوں نے برآمدے میں چولہے کے آگے بیٹھی ماہاں سے کہا۔

”بس صوفی صاحب تیار ہے لا رہی ہوں۔“ وہ چائے مٹی کے بڑے پیالے پر بیٹھا تھوڑے بے بولیں۔

”زینب اور جویریہ کدھر ہیں؟“ وہ اندر کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھی۔

”جویریہ اسکول کے لیے تیار ہو رہی ہے اور زینب میری ٹیچر کی سلامتی کر رہی ہے۔“

”ہوں!“ وہ ہاتھ کی انگلیوں سے اپنی واڈھی میں خدال کرنے لگے آمنہ وضو کر کے اندر کمرے کی طرف جانے لگی۔

”عبدالصمد آج آئے گا مدرسے سے۔“

”جی صوفی صاحب! آج اتوار ہے ناپس آنے ہی والا ہو گا۔“ ماہاں ناشتہ ان کے آگے تپائی پر رکھتے ہوئے بولیں۔

”وہ آئے تو تم بھی اسے سمجھانا وہ حفظ قرآن میں دلچسپی نہیں لے رہا۔ اس کے قاری صاحب نے اس کی شکایت کی ہے یہی حال اس کا ادھر تھا اس لیے میں نے اس ناخلف کو قاری عبدالحفیظ کے مدرسے میں بھیجا کہ وہ پچوں کو قرآن حفظ کرانے کے باہر نہیں مگر وہاں جا کر بھی اس نے اپنی روش نہیں بدلی میں ابھی اس کا منہ دیکھ رہا ہوں کہ خود ہی سنبھل جائے جس روز معاملہ میری برواشت سے باہر ہو گیا تو پھر کام خراب ہو جائے گا یہ تمہیں معلوم ہے۔“ غصے سے ان کا بارش چرومخ ہو گیا۔

”جی! وہ سر جھکا کر ادب سے بولیں۔“

وہ خاموشی سے سہ ماہی پر دھ کر ناشتہ کرنے لگے وہ با ادب ان کے پاس بیٹھی رہیں۔

”عبدالصمد نے کب آتا ہے شہر سے؟“

”مشاید اگلے ہفتے آئے اس کے بعد تو اس کے امتحان شروع ہو جائیں گے۔“ وہ اسی مکتوب لہجے میں بولیں۔

”آمنہ! آٹھویں کی تیاری کر رہی ہے۔ اگلے ماہ امتحان ہیں اور اسے پرائیویٹ طور پر بیٹھنا ہے اس میں۔“ انہوں نے پیالہ اٹھا کر لیوں سے لگایا۔

”جی کر رہی ہے۔“

”وہ صوفی صاحب! وہ کچھ کہتے کہتے جھجک گئیں۔“

”ہاں کیسے کیا بات ہے۔“ انہوں نے نوالہ چائے میں بھگوایا۔

”عبدالصمد اسکول جانا چاہتا ہے۔“ وہ ڈر ڈر کر سچی نگاہوں سے بولیں۔

”جب اسکول بھیجتا تھا تو اسے وہ دشاوار تھا۔“ وہ گرجے آمنہ نفل ادا کر کے برآمدے میں آئی۔

”اور اب یہ اللہ کا کام دشاوار ہے اسے راہجہ بی بی! میری ایک بات سن لیں۔ آپ کا یہ ہونہار سپوت کچھ کرنا ہی نہیں چاہتا۔ وہ صرف شیطانی خرافات میں پڑنا چاہتا ہے۔ عبدالصمد بھی تو ہے پہلے قرآن حفظ کیا حدیث کی تعلیم حاصل کی اور اب ایف اے کا امتحان دے رہا ہے۔ آمنہ اس سال ملل کا امتحان دے لے گی اور زینب اگلے سال جویریہ اس سال پرائمری پاس کرے گی۔ ساتھ میں تینوں نے قرآن اور حدیث کی تعلیم بھی لی ہے مگر تمہارا یہ لاڈلا کچھ نہیں کرے گا۔ یہ تمہارے لکھو الوسیہ صرف اور صرف میرا نام ڈبوئے گا۔ صوفی عبدالرحمن باقی اللہ کا نام ڈبوئے گا یہ میرے باپ دادا کی کمائی ہوئی عزت کو مٹی میں ملائے گا۔ یہ بات تم میری لکھو لویہ دنیا میں صرف یہی خیانت دکھانے کے لیے آیا ہے۔ شیطان کا چیلہ خاص بنے گا اس لیے میں نے اسے اسکول سے ہٹا کر اس نیک رہنے پر ڈالا ہے کہ شاید خدا اس کے دل میں نیک خیالات کو جگہ دے مگر ایسا ہونا بے حد مشکل لگ رہا ہے مجھے۔ اس کے خیالات بہت کمزور اور ایمان کمزور تر ہے۔ یہ بہت جلد شیطان کے ہتھے چڑھ کر اس کا آلہ کار بن جائے گا اور میں اپنے مالک سے دعا کروں گا کہ وہ مجھے اس دن کے دکھانے سے پہلے اس جہان فانی سے اٹھالے۔“ انہوں نے غصے سے کہتے ہوئے دونوں ہاتھ دعا کے لیے آسمان کی طرف اٹھائے اور ناشتہ ادھورا چھوڑ کر عمامہ درست کرتے ہوئے باہر چلے گئے۔

”صوفی صاحب ناشتہ۔“ ماہاں صوفی اتنا ہی کہہ سکیں۔

اور صوفی صاحب کی پیشین گوئی پر یہ گاؤں ہی نہیں دو دروازے کے علاقوں کے لوگ بھی یقین رکھتے تھے۔ آمنہ کا دل آنے والے وقت کے خوف سے زور زور سے دھرنے لگا اور ماہاں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف منہ کر کے اللہ سے اس برکت سے پناہ مانگنے لگیں۔

چاہے کی دعا مانگنا ہمارا کام ہے اور پناہ دینا یا نہ دینا اس کی مرضی!

”اسلام علیکم بابا جان! آپ نے مجھے بلایا۔“ سید سلطان بخت نے کمرے میں داخل ہو کر سید سلطان شاہ کو سلام کیا جو بیڈ پر اپنے آگے رکھے زمینوں کے بھی کھاتے چاٹ رہے تھے۔

”ہاں ہاں۔“ اس سلطان بخت! ابھی تمہیں لاہور سے آئے چار دن ہونے کو آئے اور اس دوران صرف دو بار تم نے مجھے اپنی شکل دکھائی وہ ابھی میرے بلانے پر۔ آخر ایسی کون سی مصروفیت ہے کہ تمہیں باپ سے ملنے کا بھی ناٹم نہیں ملتا۔“ انہوں نے یہی کھاتہ ہاتھ سے پرے کھسکاتے ہوئے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا۔ انہوں نے سلطان بخت کو ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا وہ ان کے پاس پرچی کر سی پر بیٹھ گئے۔

”سوری بابا جان! ایسی تو کوئی خاص مصروفیت نہیں کام کی تھکن اور کچھ سفر کی تھکاوٹ اس بار نہ جانے کیوں زیادہ ہو گئی جس کی وجہ سے باکا سا نمپرینج فیل ہوتا رہا ہے اسی لیے دو ایک دن تو عمل بیڈ ریست ہی کرتا رہا ہوں۔ آپ کی خدمت میں بھی حاضر نہیں ہو سکا۔“ وہ کر سی پر بیٹھتے ہوئے کچھ شرمندگی سے بولے۔

”تم نے مجھے کیوں نہ بتایا ڈاکٹر کو بلوا کر چیک اپ کرایا؟“ وہ ایک دم سے ان کے لیے متشکر ہو گئے۔ ”اسی لیے چہرہ بچھا ہوا ہے اور مجھے تو کچھ کمزور بھی لگ رہے ہو۔ کیا ضرورت ہے اس قدر کام کو سرسوار کرنے کی۔“ ہمیشہ کے وہی بابا جان گھبرا اٹھے ان کی صحت و سلامتی میں تو ان کی جان انکی تھی۔

”بابا جان! ایسی کوئی بات نہیں۔ یونہی ذرا ماسو مبدل رہا ہے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے چھوٹی پتھولی تکالیف کے لیے ڈاکٹر بلانا مجھے پسند نہیں اسی لیے آپ کو نہیں بتایا تھا کہ آپ خواجواہ فکر مند ہوں گے۔ وہ محبت سے ان کے ہاتھ ہاتھوں میں لے کر بولے۔

”سلطان بخت! تم میں میری جان انکی ہے اور یہ وہم نہیں حقیقت سے اور انسان حقائق کے بارے ہی میں فکر مند ہوتا ہے۔ واہموں اور وسوسوں کو جھٹکا جاسکتا ہے۔ حقائق سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔“ وہ اس کے ہاتھوں کو لبوں سے چھوتے ہوئے گہری محبت سے بولے۔

”اوہ بابا جان! میں بچہ نہیں ہوں اب۔“ وہ یونہی ہنس دیے۔

”یہ بات تم۔ کہہ سکتے ہو میں نہیں۔“ وہ سر ہٹا کر ان کی انداز میں بولے۔

”اچھا چھوڑیں ان باتوں کو یہ بتائیں کہ مجھے کیوں بلایا تھا آپ نے۔“

”سلطان بخت! زمینوں کی طرف دھیان دیا کرو۔ ان کے حساب کتاب میرے بس کی بات نہیں رہے۔ کچھ عمر کا تھا صبا بھی ہے کہ بہت کام اب مجھ سے نہیں ہوتا اس لیے جلد چلنے لگتا ہوں۔ دوسرے میں چاہتا ہوں کہ تم اب ان کاموں میں دلچسپی لو۔ ان کے بارے میں تمہیں سب ظلم ہونا چاہیے کہ کہاں پر کیا ہو رہا ہے اور کون کر رہا ہے۔ تمہیں تو معلوم ہے اس سال میرا حج پر جانے کا پروگرام ہے۔ انشاء اللہ اگر میرے اللہ کو منظور ہو تو پھر وہاں کچھ عرصہ رہوں گا۔ تمام مقدس مقامات کی جی بھر کر زیارت کروں گا۔ اسی میں مجھے چار پانچ ماہ کا عرصہ لگ جائے گا پھر واپسی پر بوسے کے جانا ہے بالی پاس کے لیے اور اس کے بعد کیا ہوتا ہے یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ خدا جانے واپس آنا نصیب ہو یا نہیں۔ اس لیے اب تم سب کچھ سمجھ لو تاکہ میرے بعد اچھی طرح سنبھال سکو۔“ وہ دھیرے دھیرے ان کا ہاتھ پھینکا رہے تھے۔

”پلیز بابا جان! ایسی باتیں نہ کریں اور بالی پاس آج کل کون سا ہوا ہے۔ ہر دو مہینہ کر رہا ہے اور اللہ کے فضل سے آپ کا آپریشن بھی کامیاب ہو گا اور آپ ہنستے کھیلتے واپس آئیں گے۔ سب کچھ سنبھالنے۔ مجھے ابھی ان کاموں کی سمجھ نہیں مجھے ان میں نہ الجھائیں۔“

”نہ سلطان بخت! ایسی باتیں نہ کرو۔ زندگی اور موت کے ہی کھاتے اس کے ہاتھ میں ہیں۔ تم اس کے بارے میں کچھ بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتے اور تمہیں ایک نہ ایک دن ان کاموں میں الجھنا ہی پڑے گا۔“ وہ بڑھاپے سے کیوں نہیں۔ اب تم باقاعدگی سے زمینوں پر جایا کرو، مزارعوں سے ملو جلو۔ ان سے واقفیت پیدا کرو۔ اپنی زمینوں سے محبت کرو گے تو یہ بھی تم سے محبت کریں گی۔ کانٹن مل کا تو پورا ہولڈ تمہارے پاس ہے۔ اس کی تو مجھے فکر نہیں۔

آشرمنہ کے نام جو گلاس فیلٹری ہے وہ بھی تمہارے ایئر کنڈیشنوں سے اور لاہور میں دونوں فرمز کی دیکھ بھال تمہارے ذمے ہے جو تم بڑی اچھی طرح سے بھارے ہو۔ ان کی تو مجھے فکر نہیں۔ پرنس کو تم مزید پھیلا کر چاہو تو پھیلاؤ اسی کو اچھی طرح سے چھانا چاہو تو بھی کچھ حرج نہیں کہ انسان کو کثرت کالاج کہیں کا بھی نہیں رہنے دیتا۔ بس اب زمینوں کی طرف دھیان دو۔ ان سب کے وارث اب تم ہی ہو۔ ان کا سانس پھولنے لگا۔

”بابا جان! آثار گڈ سیک۔ زمینوں کے بکھیڑے میری سمجھ میں نہیں آتے۔ آہستہ آہستہ خود ہی سمجھ جاؤں گا۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”سمجھو گے تب نا جب یہاں رہو گے۔ تمہیں تو شہر کی ہوائیں اشارہ بھی کرتی ہیں تو تم اڑتے ہوئے جاتے ہو۔“ انہوں نے سلطان بخت کی بیزار ہی پر تب کر کہا۔ سلطان بخت نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں کچھ تھا جس نے سلطان بخت کو مضطرب سا کر دیا۔ وہ کرسی کی پشت پر خواجواہ ہاتھ پھیرنے لگے۔

کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی جو کم از کم سلطان بخت کے لیے معنی خیز تھی۔

”بابا جان! کام ہی سے تو جانا ہوں نا۔“ کافی دیر بعد وہ پست آواز میں محض یہی کہہ سکے۔

”خدا کرے تم کام ہی سے جاتے ہو۔“ ان کی آہ میں بہت کچھ تھا۔ ”سلطان بخت! کچھ بھی کرنے سے پہلے یہ سوچ لیجنا کہ تم احمد پور شرقیہ کے گدی نشین ہو۔ کیا یہ کام تمہیں نہیں زیادہ ہے؟ اپنے خاندانی وقار اور منصب سے کبھی نظر نہ اٹاؤ۔ تمہارے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا نہ کرواؤ کی شہادت نہ ابا کی کمائی ہوئی عزت۔“

ان کے ہٹلے پتھر کی طرح سلطان بخت کو جا کر لگے۔ کیا ان کو سب خبر ہے انہوں نے سٹولتی نظروں سے سبیلین شاہ کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور کچھ کچھ افسردگی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سلطان بخت کچھ اندازہ نہ لگا سکے۔

”بابا جان! آپ کو مجھ پر شک ہے کوئی۔“ وہ آہستہ سے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

سلطان بخت! یہ جو والدین ہوتے ہیں یہ قدرت کی بڑی انوکھی مخلوق ہوتی ہے ان کو قیاس گمان، شک، خیال سے کچھ غرض نہیں ہوتی اپنی اولاد سے متعلق تو ان کے اندر یقین کا جہان آباد ہوتا ہے۔ تمہارا ہر اٹھنا ہوا قدم مجھے بتا دیتا ہے کہ یہ تمہیں بہت کچھ کا مزن ہو گا۔ تمہاری ہر نگاہ مجھے ایک پل میں تمہارے اندر کا سارا احوال سمجھا جاتی ہے۔ میری ناکوں پر کسبل ڈال دو۔“

انہوں نے یہی کھاتے پرے کھڑکائے اور بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر ناک میں پھیلاؤ میں سلطان بخت نے اٹھ کر بیڈ کی پانچویں پڑا کسبل ان کی ناکوں پر پھیلا دیا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر کسبل سینے تک اوڑھ لیا۔ نیلے سمندر کے جھاگ جیسے کسبل سے نکلا ان کا چہرہ یکدم بوڑھا بوڑھا سا لگنے لگا تھا۔

بہر حال ان میں نے تمہیں ان باتوں کے لیے بھی بلایا تھا مگر سب سے ضروری بات ابھی رہتی ہے۔ ان کی کبھی ظہر سب بالکل ساہ ہو گئی تھی۔ سلطان بخت کا سانس جیسے بحال ہونے لگا۔

کل سیدہ آ رہی ہے پرسوں ہم بھائی صاحب کی طرف شادی کی تاریخ لینے جائیں گے۔ میرا کوشش ہو گی کہ تاریخ اسی ماہ کے آخر کی ہو یا پھر اگلے ماہ کے شروع کی۔ بہت لمبے دن میں ہمیں ڈالواؤں گا۔ ان کا۔ از سلطان بخت کو مطلع کرنے کا ساتھ حاصل لینے کا نہیں اور ویسے بھی وہ اپنے طے کر وہ حتمی فیصلوں پر کسی کی صلاح نہیں لیتے تھے۔

”بہن! مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔“ انہوں نے کرسی پر پلو بدل کر کچھ اونچی آواز میں کہا۔

”سید سلطان بخت!“ ان کی آواز نہ صرف اونچی تھی بلکہ گرج دار بھی تھی۔ سلطان بخت نے نظریں نیچیں کی۔

”اب کوئی بہانا نہیں سنوں گا۔ تم اب بچے نہیں ہو۔ میرے حساب سے تو تمہاری شادی آج سے دس سال قبل ہو جانی چاہیے تھی مگر یہ تمہاری فضول کی خد تھی کہ ابھی نہیں کرنی پھر اسٹینس جا کر تمہیں پانچ سال ہیرا کیے محض ایمپلی اے کی ڈگری کے لیے۔ اب پھر بہانا مگر اب کوئی ایکس کیوز میں نہیں سنوں گا۔ بہت ہو چکا۔“ وہ غصے سے سیدھے ہو کر بولے۔

”بابا جان! میرا دل نہیں مانتا۔ میں کیا کروں۔“ وہ جیسے بے بس ہو کر بولے۔

”سلطان بخت! اول کی سنو گے تو کہیں کے نہ رہو گے۔“

سلطان بخت نے ایک شکوہ بھری نگاہ ان پر ڈالی۔

”یہی مدت دیکھو مجھے میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کر رہا۔ میں تمہارا باپ ہی نہیں اس خاندان کا بڑا بھی ہوں اور ہر فیصلے کا حق مجھے حاصل ہے اور وہ بھی انصاف کے ساتھ۔“

”یہ انصاف ہے؟“ سلطان بخت نے احتجاج کیا۔

”کیا برائی ہے صالحہ میں۔“ وہ آنکھیں سکڑ کر بولے۔

50100

”میں نے کب کہا کوئی برائی ہے۔“ وہ چڑکرو۔

”تم سے بڑی ہے بس دو چار برس۔“ انہوں نے پھر ٹیک لگایا۔

”دو چار برس۔“ وہ حیرت سے چلا کرو۔ ”پورے سات برس۔ بابا جان کم ہوتے ہیں۔“

”تمہاری بہن حسین شاہ سے پورے نو برس بڑی تھی انہوں نے تو کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کبھی تمہاری بہن کو ذرا سا بھی طعنہ نہیں دیا۔ پھولوں کی طرح رکھا ہے اپنے گھر میں اسے۔ پھر تم کیوں چلا رہے ہو۔“ وہ آرام سے بولے۔

”بابا جان! اگر میں کہوں کہ میں حسین شاہ نہیں ہوں اور مجھے صالحہ سے شادی نہیں کرنی پڑے؟“

”سلطان بخت! سلطان شاہ کی آنکھیں جیسے پرنٹنے کو تھیں۔“

”اپنی حد پہنچا تو روتہ خطا کھا جاؤ گے۔“ ان کا نفس تیز چلنے لگا تھا۔ ”آج یہ بات کی ہے آئندہ کبھی خیال میں بھی نہ لانا۔ سب کچھ تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا۔ کچھ بھی نہیں بچے گا۔“ ان کا رنگ یک لخت زرد ہو چلا تھا۔

”بابا جان! آریو اکل رائٹ۔“ سلطان بخت گہرا کر ان کے پاس آئیٹھے ان کی ٹھنڈی پیشانی کی ہتھوڑا پوچھا۔

”ٹھیک ہوں میں۔“ انہوں نے آہستگی سے کہا۔ وہ کچھ دیر اپنے آپ پر قابو پاتے رہا۔

”بابا جان! میں آپ کی بہن سیدہ سلطانہ نہیں ہوں جس کا ہم عمر رشتہ خاندان میں نہ ملا تو وہ کنواری مر جائے گی۔“

”بابا جان! میرے ساتھ یہ ظلم نہ کریں۔“ انہوں نے آہستہ آواز میں التجائی۔

”سلطان بخت! ظلم تمہارے ساتھ نہیں ہو گا تو تمہاری بہن سیدہ کے ساتھ ہو جائے گا پھر کیا کرو گے؟ اس کا ہنسنا بستا گھرا بڑے میں ایک پل نہیں لگے گا۔ حسین شاہ اب اتنا بھی اچھا نہیں ہے اپنی بہن سے پار ہی نہ ہوگی سیدہ اسے۔“

”وہ اب دھیرے دھیرے سینے کو مسل رہے تھے۔“

”بابا جان! سلطان بخت نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔“

”جاؤ سلطان بخت! جا کر شادی کی تیاری کرو۔ کل سیدہ آئے گی تو یہ سب اس کو شہر لے جانا اب اس کام میں میں مزید تاخیر نہیں ہونے دوں گا اور اب تم ایک دو ماہ شہر چلے گا نام نہ لگنا۔ اوھر بہت کام ہو گا اور سب تم نے ہی کرنا ہے۔ اب جاؤ تم مجھے آرام کرنا ہے۔“ انہوں نے آنکھیں موند لیں۔

”بابا جان! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“

”میں ٹھیک ہوں میں آرام کروں گا۔“ انہوں نے کبیل اور تک لے لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

سلطان بخت کچھ دیر کھڑے انہیں دیکھتے رہے پھر تھکے تھکے قدموں سے آہستگی سے روانہ ہوا اور چلے گئے۔

”السلام علیکم اماں جان! عبدالمعین نے گھر میں داخل ہوتے ہی صحن میں بیٹھی رابعہ بی بی کو سلام کیا جو تخت پر بیٹھی شاہجہاں کاٹ رہی تھیں۔“

”وہ بڑا تازہ تھا کہ اگر جا نہیں رہے تو بڑھ ہی لو۔“ اس کا موڈ حد سے زیادہ خراب لگتا تھا۔

”یہ تو اچھی بات ہے عبدالمعین! میرا بیٹا جلدی حافظ بن جائے گا۔“ اماں جی خوش ہو کر بولیں اور بانو پکڑ کر اسے اپنے پاس تخت پر بٹھانے لگیں مگر وہ بیٹھا نہیں اسی طرح تن کر کھڑا رہا۔

”ابن آج اتنی دیر کر دی میں نے ناشتہ نہیں کیا تیرے انتظار میں۔“ وہ اس کے بالوں کو سلجھاتے ہوئے منہ چوم کر بولیں۔

”بھئی زیادہ تھی اماں جان! اس لیے ویر سے نکلا تھا۔ چھٹی ہونے کے باوجود قاری صاحب نے پچھلا آموختہ یاد کرنے کا حکم دیا تھا کہ اگر جا نہیں رہے تو بڑھ ہی لو۔“ اس کا موڈ حد سے زیادہ خراب لگتا تھا۔

”یہ تو اچھی بات ہے عبدالمعین! میرا بیٹا جلدی حافظ بن جائے گا۔“ اماں جی خوش ہو کر بولیں اور بانو پکڑ کر اسے اپنے پاس تخت پر بٹھانے لگیں مگر وہ بیٹھا نہیں اسی طرح تن کر کھڑا رہا۔

”اماں جان! آپ خوش ہوئی رہیں اور حافظہ میں کبھی نہیں بن سکتا۔ یہ میں آپ کو بتا رہا ہوں۔“ وہ غصے سے بولا اور انہوں سے اور اپنی شلو اور پتی کرنے لگا۔

”اند نہ کرے۔“ اماں جی نے نفی میں سر ہلایا۔

”آپ نے بابا صاحب سے بات کی تھی۔“ وہ اسی تیکھے چوتوں کے ساتھ اکڑا کھڑا تھا۔

”بات کرنے کا کیا ہے کرنی تھی میں نے بات۔“ اماں جی اس کے غصیلے انداز کو میسر نظر انداز کرتے ہوئے پھر سے شاہجہاں کاٹنے لگیں۔

”کیا کہا انہوں نے؟“ اس نے آنکھیں سکڑ کر انہیں دیکھا۔

”وہی جو پہلے کہا تھا کہ پہلے تم حفظ کرو گے پھر اسکول جاسکو گے جیسے عبدالمعین گیا تھا۔“ انہوں نے پھلے ہوئے شاہجہاں کے ٹکڑوں کو چھری کی نوک سے کچوکے لگانے شروع کیے۔

”ہاں پھر اسکول جاؤں گا جب بوڑھا ہو جاؤں گا کیونکہ جو انی گزرتے تک میں حافظ نہیں بن سکتا اور اماں جی! بڑھے طوطے کون بڑھائے گا اور آپ ان سے کہہ دیں۔ میں میں ہوں اور عبدالمعین عبدالمعین ہے۔ میں بھیا جتنا اچھا نہیں ہوں نہ مجھے ان جیسا بننے کا شوق ہے۔ ان کو شوق ہے سب کو خوش کرنے کا۔ مجھے نہیں۔“ وہ چڑ کر بولا۔

”اماں جی! میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ ان سے کہیں کہ مجھے اسکول میں داخل کروادیں ورنہ۔“ پتا نہیں اس کے فیصلے کی شدت زیادہ تھی یا صوفی صاحب کے خوف کا خیال آیا تھا کہ اس نے جملہ روک کر لب سختی سے بیچ لیے اسی وقت یا ہریوں کا شور اٹھا لگتا تھا۔

”عبدالمعین! پتر چھوڑ کیوں اپنا خون چلاتا ہے ان باتوں سے۔ میرا بچہ پہلے ناشتہ کر لے تیرے لیے میں نے کاجر کا حلوہ بنایا ہے۔ مویوں والا برا بھلا بھی ہے اور سبز چائے یا داموں والی۔ چل میرا بچہ ہاتھ منہ دھو۔“ وہ اٹھ کر اڑتے اس کے ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

”اماں جی! میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ ان سے کہیں کہ مجھے اسکول میں داخل کروادیں ورنہ۔“ پتا نہیں اس کے فیصلے کی شدت زیادہ تھی یا صوفی صاحب کے خوف کا خیال آیا تھا کہ اس نے جملہ روک کر لب سختی سے بیچ لیے اسی وقت یا ہریوں کا شور اٹھا لگتا تھا۔

”عبدالمعین! پتر چھوڑ کیوں اپنا خون چلاتا ہے ان باتوں سے۔ میرا بچہ پہلے ناشتہ کر لے تیرے لیے میں نے کاجر کا حلوہ بنایا ہے۔ مویوں والا برا بھلا بھی ہے اور سبز چائے یا داموں والی۔ چل میرا بچہ ہاتھ منہ دھو۔“ وہ اٹھ کر اڑتے اس کے ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

”اماں جی! میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ ان سے کہیں کہ مجھے اسکول میں داخل کروادیں ورنہ۔“ پتا نہیں اس کے فیصلے کی شدت زیادہ تھی یا صوفی صاحب کے خوف کا خیال آیا تھا کہ اس نے جملہ روک کر لب سختی سے بیچ لیے اسی وقت یا ہریوں کا شور اٹھا لگتا تھا۔

”عبدالمعین! پتر چھوڑ کیوں اپنا خون چلاتا ہے ان باتوں سے۔ میرا بچہ پہلے ناشتہ کر لے تیرے لیے میں نے کاجر کا حلوہ بنایا ہے۔ مویوں والا برا بھلا بھی ہے اور سبز چائے یا داموں والی۔ چل میرا بچہ ہاتھ منہ دھو۔“ وہ اٹھ کر اڑتے اس کے ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

”اماں جی! میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ ان سے کہیں کہ مجھے اسکول میں داخل کروادیں ورنہ۔“ پتا نہیں اس کے فیصلے کی شدت زیادہ تھی یا صوفی صاحب کے خوف کا خیال آیا تھا کہ اس نے جملہ روک کر لب سختی سے بیچ لیے اسی وقت یا ہریوں کا شور اٹھا لگتا تھا۔

”عبدالمعین! پتر چھوڑ کیوں اپنا خون چلاتا ہے ان باتوں سے۔ میرا بچہ پہلے ناشتہ کر لے تیرے لیے میں نے کاجر کا حلوہ بنایا ہے۔ مویوں والا برا بھلا بھی ہے اور سبز چائے یا داموں والی۔ چل میرا بچہ ہاتھ منہ دھو۔“ وہ اٹھ کر اڑتے اس کے ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

”اماں جی! میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ ان سے کہیں کہ مجھے اسکول میں داخل کروادیں ورنہ۔“ پتا نہیں اس کے فیصلے کی شدت زیادہ تھی یا صوفی صاحب کے خوف کا خیال آیا تھا کہ اس نے جملہ روک کر لب سختی سے بیچ لیے اسی وقت یا ہریوں کا شور اٹھا لگتا تھا۔

”عبدالمعین! پتر چھوڑ کیوں اپنا خون چلاتا ہے ان باتوں سے۔ میرا بچہ پہلے ناشتہ کر لے تیرے لیے میں نے کاجر کا حلوہ بنایا ہے۔ مویوں والا برا بھلا بھی ہے اور سبز چائے یا داموں والی۔ چل میرا بچہ ہاتھ منہ دھو۔“ وہ اٹھ کر اڑتے اس کے ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

”اماں جی! میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ ان سے کہیں کہ مجھے اسکول میں داخل کروادیں ورنہ۔“ پتا نہیں اس کے فیصلے کی شدت زیادہ تھی یا صوفی صاحب کے خوف کا خیال آیا تھا کہ اس نے جملہ روک کر لب سختی سے بیچ لیے اسی وقت یا ہریوں کا شور اٹھا لگتا تھا۔

”عبدالمعین! پتر چھوڑ کیوں اپنا خون چلاتا ہے ان باتوں سے۔ میرا بچہ پہلے ناشتہ کر لے تیرے لیے میں نے کاجر کا حلوہ بنایا ہے۔ مویوں والا برا بھلا بھی ہے اور سبز چائے یا داموں والی۔ چل میرا بچہ ہاتھ منہ دھو۔“ وہ اٹھ کر اڑتے اس کے ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

”اماں جی! میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ ان سے کہیں کہ مجھے اسکول میں داخل کروادیں ورنہ۔“ پتا نہیں اس کے فیصلے کی شدت زیادہ تھی یا صوفی صاحب کے خوف کا خیال آیا تھا کہ اس نے جملہ روک کر لب سختی سے بیچ لیے اسی وقت یا ہریوں کا شور اٹھا لگتا تھا۔

”عبدالمعین! پتر چھوڑ کیوں اپنا خون چلاتا ہے ان باتوں سے۔ میرا بچہ پہلے ناشتہ کر لے تیرے لیے میں نے کاجر کا حلوہ بنایا ہے۔ مویوں والا برا بھلا بھی ہے اور سبز چائے یا داموں والی۔ چل میرا بچہ ہاتھ منہ دھو۔“ وہ اٹھ کر اڑتے اس کے ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

”اماں جی! میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ ان سے کہیں کہ مجھے اسکول میں داخل کروادیں ورنہ۔“ پتا نہیں اس کے فیصلے کی شدت زیادہ تھی یا صوفی صاحب کے خوف کا خیال آیا تھا کہ اس نے جملہ روک کر لب سختی سے بیچ لیے اسی وقت یا ہریوں کا شور اٹھا لگتا تھا۔

”عبدالمعین! پتر چھوڑ کیوں اپنا خون چلاتا ہے ان باتوں سے۔ میرا بچہ پہلے ناشتہ کر لے تیرے لیے میں نے کاجر کا حلوہ بنایا ہے۔ مویوں والا برا بھلا بھی ہے اور سبز چائے یا داموں والی۔ چل میرا بچہ ہاتھ منہ دھو۔“ وہ اٹھ کر اڑتے اس کے ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

”اماں جی! میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ ان سے کہیں کہ مجھے اسکول میں داخل کروادیں ورنہ۔“ پتا نہیں اس کے فیصلے کی شدت زیادہ تھی یا صوفی صاحب کے خوف کا خیال آیا تھا کہ اس نے جملہ روک کر لب سختی سے بیچ لیے اسی وقت یا ہریوں کا شور اٹھا لگتا تھا۔

”عبدالمعین! پتر چھوڑ کیوں اپنا خون چلاتا ہے ان باتوں سے۔ میرا بچہ پہلے ناشتہ کر لے تیرے لیے میں نے کاجر کا حلوہ بنایا ہے۔ مویوں والا برا بھلا بھی ہے اور سبز چائے یا داموں والی۔ چل میرا بچہ ہاتھ منہ دھو۔“ وہ اٹھ کر اڑتے اس کے ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

”اماں جی! میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ ان سے کہیں کہ مجھے اسکول میں داخل کروادیں ورنہ۔“ پتا نہیں اس کے فیصلے کی شدت زیادہ تھی یا صوفی صاحب کے خوف کا خیال آیا تھا کہ اس نے جملہ روک کر لب سختی سے بیچ لیے اسی وقت یا ہریوں کا شور اٹھا لگتا تھا۔

”عبدالمعین! پتر چھوڑ کیوں اپنا خون چلاتا ہے ان باتوں سے۔ میرا بچہ پہلے ناشتہ کر لے تیرے لیے میں نے کاجر کا حلوہ بنایا ہے۔ مویوں والا برا بھلا بھی ہے اور سبز چائے یا داموں والی۔ چل میرا بچہ ہاتھ منہ دھو۔“ وہ اٹھ کر اڑتے اس کے ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

”اماں جی! میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ ان سے کہیں کہ مجھے اسکول میں داخل کروادیں ورنہ۔“ پتا نہیں اس کے فیصلے کی شدت زیادہ تھی یا صوفی صاحب کے خوف کا خیال آیا تھا کہ اس نے جملہ روک کر لب سختی سے بیچ لیے اسی وقت یا ہریوں کا شور اٹھا لگتا تھا۔

”عبدالمعین! پتر چھوڑ کیوں اپنا خون چلاتا ہے ان باتوں سے۔ میرا بچہ پہلے ناشتہ کر لے تیرے لیے میں نے کاجر کا حلوہ بنایا ہے۔ مویوں والا برا بھلا بھی ہے اور سبز چائے یا داموں والی۔ چل میرا بچہ ہاتھ منہ دھو۔“ وہ اٹھ کر اڑتے اس کے ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

”اماں جی! میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ ان سے کہیں کہ مجھے اسکول میں داخل کروادیں ورنہ۔“ پتا نہیں اس کے فیصلے کی شدت زیادہ تھی یا صوفی صاحب کے خوف کا خیال آیا تھا کہ اس نے جملہ روک کر لب سختی سے بیچ لیے اسی وقت یا ہریوں کا شور اٹھا لگتا تھا۔

”عبدالمعین! پتر چھوڑ کیوں اپنا خون چلاتا ہے ان باتوں سے۔ میرا بچہ پہلے ناشتہ کر لے تیرے لیے میں نے کاجر کا حلوہ بنایا ہے۔ مویوں والا برا بھلا بھی ہے اور سبز چائے یا داموں والی۔ چل میرا بچہ ہاتھ منہ دھو۔“ وہ اٹھ کر اڑتے اس کے ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

”اماں جی! میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ ان سے کہیں کہ مجھے اسکول میں داخل کروادیں ورنہ۔“ پتا نہیں اس کے فیصلے کی شدت زیادہ تھی یا صوفی صاحب کے خوف کا خیال آیا تھا کہ اس نے جملہ روک کر لب سختی سے بیچ لیے اسی وقت یا ہریوں کا شور اٹھا لگتا تھا۔

”عبدالمعین! پتر چھوڑ کیوں اپنا خون چلاتا ہے ان باتوں سے۔ میرا بچہ پہلے ناشتہ کر لے تیرے لیے میں نے کاجر کا حلوہ بنایا ہے۔ مویوں والا برا بھلا بھی ہے اور سبز چائے یا داموں والی۔ چل میرا بچہ ہاتھ منہ دھو۔“ وہ اٹھ کر اڑتے اس کے ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

”اماں جی! میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ ان سے کہیں کہ مجھے اسکول میں داخل کروادیں ورنہ۔“ پتا نہیں اس کے فیصلے کی شدت زیادہ تھی یا صوفی صاحب کے خوف کا خیال آیا تھا کہ اس نے جملہ روک کر لب سختی سے بیچ لیے اسی وقت یا ہریوں کا شور اٹھا لگتا تھا۔

”عبدالمعین! پتر چھوڑ کیوں اپنا خون چلاتا ہے ان باتوں سے۔ میرا بچہ پہلے ناشتہ کر لے تیرے لیے میں نے کاجر کا حلوہ بنایا ہے۔ مویوں والا برا بھلا بھی ہے اور سبز چائے یا داموں والی۔ چل میرا بچہ ہاتھ منہ دھو۔“ وہ اٹھ کر اڑتے اس کے ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

کوئی جاسوسی ڈائجسٹ چوری چھپے پڑھتے پکڑ لیا تھا۔ جسے پھاڑتے ہوئے انہوں نے واہیات اور فحش کتاب کا نام دیا تھا۔

”نہیں نہیں۔ تم تو دنیا کا سبق یاد کر رہی تھیں۔ بڑے نمبر لکھتے آتے ہیں تمہیں بابا صاحب کے آگے اور یہ مجھے بتا ہے تم اندر سے کیا ہو۔“ وہ لڑائی برصاٹنے کو دوہرا بولا۔

”کیا؟ کیا ہوں میں۔“ وہ ذرا جھجھک کر کمر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”چھپ چھپ کر انڈین فلموں والے اخبار پڑھتی ہو۔ وہ ممتاز کو جو ان کا بیٹا شہر سے اپنی ماں چھوڑ کر گیا ہے مجھے سب بتا ہے میں چپ رہتا ہوں اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے کچھ بتائیں۔“ وہ منہ پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

”کیوں اس کرتے ہو تم ایک نمبر کے جھوٹے ہو۔ تم اتنے اچھے ہوتے تو بابا صاحب تمہیں یوں اٹھا کر دوسرے مدرسے میں نہ بھیج تے۔“ وہ بھی جواباً اسی لڑا کا انداز میں بولی۔ آمنہ کتاب کھولے آنکھیں پھاڑے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں بونٹی لڑا کرتے تھے۔

”اس وقت میری نہیں تمہاری بات ہو رہی ہے۔ بابا صاحب آتے ہیں تو میں بتاتا ہوں ان کی ٹیکٹ پروین دوسری کتابوں کے اندر رکھ کر کیا حفظ کر رہی ہے۔“ وہ ایک دم سے پکا اور اس کے ہاتھ سے کتاب چھین لی۔

”دو میری کتاب۔ تمہیں کیا تکلیف ہے۔ میں جو مرضی پڑھوں۔“ وہ جھجھکی اور کتاب چھینتی چلائی۔

”میں نے کچھ اور میری کتاب۔“ وہ اس کے پیچھے لپکی۔ عبدالمعین نے اس کی اوٹ میں ہو گیا۔

”بابا صاحب آگے ہیں میں آگے دو اس کی کتاب۔“ آمنہ نے وہ دے دے لہجے میں کہا۔ اس نے کھڑکی سے بابا صاحب کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔

”اب یہ کتاب میں بابا صاحب ہی کو دوں گا۔ پھر دیکھنا اس چالا کو کی وہ کسی مٹھی اٹھاتے ہیں وہ بھی مزیدار۔ ہاں سب کھا میں کے۔“ وہ ہنسنے لگا اور لے کر بولا۔

”ہوں ہوں۔ دو میری کتاب۔ مجھے نہیں پتا۔“ زینب بھوں بھوں کر کے رونے لگی۔

”اب نہ ملی بچی۔“ وہ اسے چنکار کر بولا۔ ”تم تیار ہو جاؤ چھٹی بجنے کے لیے۔“

”ہاں جی! دیکھیں یہ مبین کے بچے کو۔“ وہ جھجھکی پر چھٹی۔

”اونٹوں میں نہ دوں۔“ وہ اسے غنچے دے کر کمرے کے دوسری طرف بھاگ گیا۔

”مبین بابا صاحب! آمنہ نے اسے خبردار کرنے کی کوشش کی مگر وہ ہو چکی تھی۔ بابا صاحب دروازے میں کھڑے غضب ناک لگا ہوں سے عبدالمعین کو گھور رہے تھے۔ زینب اور آمنہ اپنے اپنے دوپٹے اور دست کرتے لگیں۔

عبدالمعین! یہ کیا ہو رہا ہے۔“ وہ گرجے۔

”کچھ نہیں بابا صاحب! اس نے کتاب والا ہاتھ پیچھے کر کے سر جھکا لیا۔

”تو یہ شور کیا تھا؟“ انہوں نے تینوں کا جائزہ لیا۔

”کچھ نہیں بابا صاحب! میں تو ابھی آیا ہوں۔“ وہ ذرا سا پیچھے دیوار کی طرف کھٹکتے ہوئے بولا۔

”اور آئی وہ انکا فساد شروع کر دیا تم نے۔ سدھر نہیں سکتے تم اور یہ کیا ہے تمہارے ہاتھ میں؟“ ان کی عقابلی لگا ہوں نے آڑ لیا تھا۔ وہ ایک قدم عبدالمعین کی طرف بڑھے۔ وہ بھوڑا اور پیچھے ہو گیا۔

”کچھ نہیں بابا صاحب! کتاب ہے۔“ وہ ان کے قدم برصاٹنے سے ڈر گیا۔

”لڑا تھا مجھے۔“ انہوں نے ہاتھ برصاٹا۔

”اب نہ لیا۔“ انہوں نے الٹی اور پھر سر جھکا لیا۔

”اب نہ لیا۔“ انہوں نے الٹی اور پھر سر جھکا لیا۔

”عبدالمعین! کیا کہہ رہا ہوں میں۔ اوہر دو مجھے۔“ انہوں نے ہاتھ اس کے آگے پھیلا لیا۔ سرخ گہری لکیروں کے جال سے مرتن ان کی چوڑی ہتھیلی اس کے آگے تھی۔ اس نے کتاب ان کے ہاتھ پر رکھ دی۔ انہوں نے کتاب دیکھی اور جس طرح کے تاثرات ان کے چہرے پر پیدا ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر عبدالمعین کی ٹانگیں کانٹنے لگیں۔

”یہ کچھ بڑھنے جاتے ہو تم۔ اس نیک مقصد کے لیے اتنی دور بھیجتا ہوں میں تم کو۔“ فضا میں مولیوں والے پراٹھے کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔

”یہ شیطانی علم کیلئے جاتے ہو تم۔ جھوٹ کے پلندے اٹھائے گھر آتے ہو۔ منوں کے پاس۔“ وہ اس کے سر پر کھڑے بارود کے گولے کی طرح برس رہے تھے۔

”بابا صاحب! یہ تو سب۔“ اس کی زبان لڑکھا گئی زینب ڈر کر دیوار کے ساتھ لگ گئی۔

”ہاں یہ تو کیا ہے تو؟“ انہوں نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ ”بولو اس مقصد کے لیے میں تمہیں اوہر بھیج رہا ہوں۔ میں جتنا تمہیں ان چیزوں سے دور رکھنا چاہ رہا ہوں۔ تم اتنا ہی ان کے جال میں الجھتے جا رہے ہو ہر طرف سے تمہاری شکایتیں آرہی ہیں۔ قاری عبدالحفیظ نے اتنا بڑا فرقہ لکھ کر بھیجا ہے کہ تم سبق یاد نہیں کرتے۔ تمہارا دھیان سارے کی طرف ہو گیا ہے۔ اور اب تم مجھے بتاؤ کہ تمہارا دھیان کدھر ہوتا ہے ان کتابوں کی طرف۔“ شیطانی علم کی ان فریبوں کی طرف بول کر جواب دو مجھے۔“ انہوں نے کتاب کو دو ٹکڑے کر کے دونوں ہاتھوں سے اس کے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے۔

”بابا صاحب! میں۔“ تکلیف سے اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔

”ہاں کرو اس آگے سے تم اوہر اس مقصد کے لیے جاتے ہو؟ میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں مگر اس ملعون اورب میں حافظہ میں جاؤ۔ تم میری باتوں کا اثر کیوں نہیں ہوتا۔ کیوں تمہارے دل پر عمر لگتی جا رہی ہے۔ بولو بولو۔ کس مٹی کے بنے ہو تم۔“ انہوں نے زور زور سے دو ٹکڑے اس کے دونوں گالوں پر جڑے اور کندھے سے تھیں پکڑ کر اسے زور زور سے جھٹکے۔

”تم مجھے جانتے نہیں۔ میں نے تو بڑے بڑے اڑیل ٹٹوں کو سیدھا کیا ہے۔ تم کیا بلا ہو میرے آگے اب میں نہیں سیدھا کر کے ہی رہوں گا۔ بولو دھیان سے پڑھو کے یا نہیں۔“ انہوں نے کس کے دو تین کے اس کے کمر پر لگائے اس کی کمر بھری ہوئی اور وہ نیچے جھٹک گیا۔

”بولو جواب دو مجھے۔ تم نے پڑھنا ہے یا نہیں۔“ وہ اسے لاقوں سے مارنے لگے۔

”بابا صاحب! پڑھوں گا۔ بابا صاحب! پڑھوں گا۔“ وہ اسے لاقوں سے مارنے لگے۔

”یہاں میرے سامنے پڑھوں گا اور اوہر جا کر ان شیطانی کاموں کو سینے سے لگا لیتے ہو۔ جھوٹ تمہارے خون میں اتر گیا ہے۔“ اسے اختیار کر کے میں تمہارا عبدالمعین! تم نے میرا مان تو دیا ہے۔ گھر میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ حفظ تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا چاہے اس کے لیے مجھے تمہاری کھال ہی کیوں نہ کھینچنی پڑے۔“ انہوں نے جھٹک کر اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور بے دردی سے پٹینا شروع کر دیا۔ باہر ہاتھ کی ٹرے ہاتھ میں لیے رابعی بی خوف اور بے بسی سے رونے لگیں۔

”آمنہ! چھڑی لاؤ میرے کمرے سے۔“ وہ اسے پیٹتے پیٹتے ہانپنے لگے تو بولے۔ آمنہ کا خوف سے برا حال تھا۔

زینب کو نے میں سہمی سہمی کھڑی تھی۔

”یہیں بابا صاحب! نہیں خدا کے لیے۔“ وہ روتے ہوئے ان کے آگے کھڑی ہو گئی۔ ”بابا صاحب! اس بار معاف کر دیں اسے خدا کے لیے بابا صاحب! آئندہ پڑھے گا بابا صاحب۔“ اس نے صوفی صاحب کا بری طرح سے برستا ہاتھ تھام لیا۔

”تم ہٹ جاؤ آمنہ! آگے سے۔ آج میں اس کے دماغ سے یہ خناس نکال کر ہی رہوں گا۔ صابز اوڑے نے

32

اسکول جانا ہے اب یہ خرافات پڑھنے کے لیے۔ میں تمہیں اسکول کی شکل نہیں دکھاؤں گا جب تک تم قرآن حفظ نہیں کر لیتے۔ یہ تم یاد رکھنا اور نہ دوسرے بہت سے طریقے آتے ہیں مجھے۔ انہوں نے اس کے کرے ہوئے وجود کو ایک اور ٹھوکری ماری۔ عبدالعین اب سکیوں سے رو رہا تھا۔ سجدے میں گرا اس کا وجود ہولے ہولے جھٹکے کھا رہا تھا۔

بابا صاحب! ام میری خاطر خدا کے لیے بابا صاحب۔ آمنہ نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ ان کا سانس پھول رہا تھا ایک تہناک نگاہ اس کے گھڑی وہ خود پر ڈالی اور ہونہر بنا دیا اس کو سب اچھی طرح سے۔ کہہ کر غصے میں کھولتے باہر نکل گئے۔ رابعی بی جلدی سے واپس مڑ گئیں۔

”ہیں۔“ آمنہ نے جھک کر اسے اٹھانا چاہا۔

”فح ہو جاؤ تم بھی۔“ وہ اسی طرح بڑے بڑے چٹھا۔

”اگر ابھی نہیں گئی۔ آمنہ! چھوڑ دو تم اسے۔ شکر ہے میری جان بچ گئی۔“ زینب نے سکون بھرا بے غلجی کا سانس لیا۔ آمنہ نے ملامت بھری نگاہ سے اسے دیکھا۔ وہ کندھے اچکا کر پھٹی ہوئی کتاب کے دونوں حصے جوڑ کر دیکھنے لگی۔

”گوند سے جڑ جائے گی۔“ اس نے خود کو تسلی دی۔

گڈ آفٹرنون ام جان۔“ کیپٹن شہباز خان نے خاکم بدین میں تم سبزخان سے کہا جو اس کی آواز سن کر جیسے اچھیل ہی پڑی تھیں۔

”شہباز خان! میرا بچہ۔ تم کب آئے۔ مجھے نہیں بتایا۔“ وہ محبت اور خوشی سے بولیں۔

”ابھی ابھی آپ کے سامنے۔“ شہباز خان نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ اور ہاتھ جو ملے۔

”میں کتابس گزری تھی کیسے پتاؤں برسوں تمہارا فون آیا۔ میں دینی ہوئی تھی۔ مجھے یا زب نے بتایا۔ مجھے کس قدر افسوس ہوا کہ میں بات کرتی تو تمہیں آنے کا کہہ دیتی۔ میں نے رات کو کال بک کرائی۔ تم بیس میں سے ہی نہیں۔“ وہ ان کے زانو پر ہاتھ رکھے محبت پاش نظروں سے ماں کی جیسے قراری کو دیکھ رہے تھے۔

”مجھے آپ کا پیغام مل گیا تھا۔ خود میرا بھی دل چاہ رہا تھا آپ سے ملنے کو۔ اسی لیے تو پندرہ دن کی چھٹی لے کر آیا ہوں کہ کچھ دن آپ کے پاس گزار لوں۔ ادھر بہت بوری ت ہونے لگی تھی۔ آپ کو مس کر رہا تھا بہت۔“ انہوں نے اٹھ کر سبزخان کی وہیل چیئر دھکیل کر کھڑکی کے پاس کی۔ باہر دروازے کے پیچھے سورج گم ہو رہا تھا۔

”وہ تے سورج کی نارنجی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔“

”جھوٹ۔ تم مجھے مس کر رہے تھے یا کسی اور کو؟“ انہوں نے ہنستے ہوئے گرون موڑ کر کہا۔

”اول ہوں ام جان!“ وہ کھڑکی کی چونکٹ سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ سنے رہا تھا باندھے آری یونیفارم میں ان کا چہرہ فٹ سے نکلتا ہوا قد۔ مضبوط کمرتی جسم اور مروانہ کھڑے کھڑے نقوش سے مزین گندی چہرہ۔ ان کی مسکراتی چمک دار آنکھوں کو سبزخان نظر بھر کر نہ دیکھ سکیں۔ دل ہی دل میں ان کی نظرات آری۔

”بھائیوں سے ملے ہو۔“ وہ باہر دیکھتے ہوئے بولیں۔

”تو ام جان! آپ کو پتا ہے میں سب سے پہلے آپ ہی سے ملتا ہوں آکر ویسے بھی ابھی ان کے آفس آف ہونے کا تاخیر نہیں ہوا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں مل لوں گا۔“

”کھانا؟“ ان کا انداز سوالیہ تھا۔

”نہیں۔ اب تو تاخیر نہیں ہے۔ شام ہو رہی ہے۔ بس چائے لوں گا ابھی پیچ کر کے بعد۔ آپ زینون بانو سے کہہ کر اچھی سی چائے بنا لیں اور ساتھ میں کچھ اسٹیکس وغیرہ۔ بھوک لگی ہوئی ہے مجھے۔ صبح کا ناشتہ کیا ہوا ہے ام جان! بس پیچ کر لوں پھر بیٹھ کر دھیر سا رہی باتیں کرتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر سر ہلایا۔ وہ باہر کی طرف بڑھے۔

”بائی داوے ام جان! آپ مجھے کس لیے مس کر رہی تھیں“ آپ نے بتایا نہیں۔“ وہ جاتے جاتے پلٹ کر بولے۔

”مجھے پہلے ہی پتا تھا۔ تمہیں یہ جملہ ہضم نہیں ہو گا ضرور پوچھو گے۔“ وہ ہنس پڑیں۔

”ہاں تو تائیں نا۔“ وہ ان کے پاس آکر بولے۔

”کیوں شہباز خان! ایک ماں اپنے بیٹے کو کسی مقصد کے بغیر یاد نہیں کر سکتی۔ جو اس کی نظروں سے دور ہو۔“ ان کا لہجہ جتنا نے والا تھا۔

”وائے ناٹ ام جان! لیکن آپ نے اس کا ذکر تین دن پہلے نہیں کیا تھا؟ تب میں نے آپ کو تفصیل سے فون کیا تھا اور چھٹی کا ذکر بھی کیا تو آپ نے کہا کہ ابھی رہے دو۔ اب ایک آپ کو میری یاد کیوں ستانے لگی۔“

”صحیح ہے بھئی۔ تم پوچھا نہیں چھوڑو گے۔“ انہوں نے وہیل چیئر گھسیٹی۔ شہباز خان جلدی سے آگے بڑھے اور وہیل چیئر ہسٹلی سے دھکیلتے ہوئے ان کے پیڈ کے پاس لے آئے۔

”تمہارے ہاتھوں کی طبیعت آج کل بالکل اچھی نہیں ہے۔“ وہ افسردہ لہجے میں بولیں۔

”کیوں کیا ہوا؟“

”انجانگی تکلیف بڑھ گئی ہے۔ آج کل وقفے وقفے سے ہو رہی ہے۔ ان کا فون آیا تھا تین دن پہلے پھر کل میں نے فون کیا تھا۔ آج بھی کیا انہوں نے خود سے تو ذکر نہیں کیا مگر ان کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ مجھے نرزی نے بھی بتایا تھا اسی لیے۔“

”اسی لیے کیا؟“

”نہیں۔“ مس کر رہی تھی۔ تم ہوتے تو میں بھائی جان کو دیکھ آتی جا کر۔ ایاز اور اظہر کو تو تاخیر نہیں ملتا۔ میں سے کبھی ہو تو کبھی میں کبھی کبھی میں کس کے ساتھ جاؤں۔ تم چھٹی لے کر آئے ہو تو اگر کہو تو چلے چلتے ہیں۔“

”آپ کا دل چاہ رہا ہے جانے کو؟“

”ہاں بیٹا بالکل میرا برا دل چاہ رہا ہے ان سے ملنے کو۔“ وہ بے قراری سے بولیں۔

”تو چلیں ٹھیک ہے پھر کل میں ہی نکل چلتے ہیں۔ دو چار دن رہیں گے۔ میں اپنے ایک دو دوستوں سے بھی مل لوں گا۔ آپ کی بھی کتاب ہو اچھی ہو جائے گی ویسے بھی آج کل بیٹری کا موسم بہت اچھا ہو رہا ہے۔“

”دیکھنا مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ میرا بیٹا ضرور میرا کہا مانے گا۔ میں ایک اشارہ کروں گی میرا فون برا رہتا ہے۔ خراب نہیں ترتی دے۔ زندگی میں کامیابیاں دے۔“ ان کی آنکھیں خواجوا جھلسا گئیں۔

”ام جان! میں آپ کا کہا نہیں مانوں گا تو اور کس کا مانوں گا۔ آپ کا بیٹا ہوں نا۔“

”بیٹے تو وہ دونوں بھی ہیں۔ خیر۔“ انہوں نے ٹھنڈا سانس لیا۔ ”تم پیچ کر دے میں چائے منگوا آتی ہوں پھر رو آگی پروگرام بناتے ہیں۔“

”اوکے ام جان! میں بس پندرہ منٹ میں آیا۔“ وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ سبزخان زینون بانو کو چائے کے لیے آواز دینے لگیں۔

”سلطان بخت! کدھر جا رہے ہو۔“ سیدہ آپا کی آواز پر سلطان بخت جو تیزی سے گاڑی کی چکنر جھلا تے باہر جا رہے تھے ٹھٹک کر رک گئے۔ سیدہ آپا کی آواز سن کر انہیں خوشگوار سی حیرت ہوئی تھی وہ اپنی شمال کندھوں پر درست کر رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے ابھی ابھی انکی ہیں اور وہ کس لیے آئی ہیں۔ یہ سوچ کر ہی سلطان بخت کی ساری خوشی ہوا ہو گئی۔ ان کے قدم یک دم بھیلے پڑ گئے۔

”السلام علیکم آیا! آپ کب آئیں؟“ وہ دست قدموں سے ان کی طرف بڑھے۔

”و علیکم السلام ابھی آئی ہوں پر لگتا ہے تمہاری کہیں جانے کی تیاری ہے۔ کسی خاص جگہ کہ تیاری ٹھیک

ٹھاک ہے۔ انہوں نے ناقدانہ انداز سے ان کا سر سے باؤں تک جائزہ لے ڈالا۔ پستنی رنگ کے قیمتی ٹوپوں میں بلیک لیڈر کے شوز پہنے وہ غضب دھارے تھے۔ وہ سلطان شاہ کی جوانی کی ڈبلیو کیٹ تھے اور سلطان شاہ کو لوگ جوانی میں یوسف ثانی کے نام سے پکارتے تھے اور سلطان بخت بھی ان ہی کی طرح سرخ و سفید رنگت اور سیاہ گفتگو پرانے بالوں کے مالک تھے۔ سر مٹی آنکھیں ان کی شخصیت کی وجہ کشش تھیں۔

”تمہیں کچھ خاص نہیں ڈرا شہر تک جا رہا تھا۔ ان کی آواز سے بھی تاڑکی ٹانگ ہو گئی تھی۔“
”شہر کیا بہت نزدیک پرانا ہے تمہیں اور بہن کا گھر دور۔“ وہ کچھ طنز سے بولیں۔
”آپ کو معلوم تو ہے۔ ان کا لہجہ جڑا ہوا تھا۔ وہ ان کے پاس بڑے صوفے پر تکلف سے بیٹھ گئے۔
”چلو اب یہ پابندی بھی ختم ہو جائے گی۔ کل صبح جا رہے ہیں ہم تاریخ لینے۔ ابھی جانا تھا راب شام زیادہ ہو گئی۔ اس لیے بابا جان نے کہا ہے کہ صبح چلیں گے۔ مجھے کھر سے نکلنے خاصا ناگم لگ گیا اور تم ساڈا گیا حال چال ہے۔ لگتا ہے بہت مصروف رہنے لگے ہو۔“
”حیدرہ شہر یہ کہاں ہے؟“ سلطان بخت سے بات کرتے کرتے انہوں نے پاس سے گزرتی ملازمت سے پارعب آوازیں پوچھا۔

”جی ایسے کمرے میں ہوں گی۔“ وہ مویب ہو کر بولی۔ ”بلاؤں گی۔“
”ہوں گی کیا؟ تمہیں خبر نہیں کہ وہ واقعی اپنے کمرے میں ہے یا نہیں۔“ حیدرہ ڈرا غصے سے بولیں۔ ”اتنی بے خبر ہو تم۔“
”جی ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں باورچی خانے میں تھی۔ گھنٹہ پہلے میں نے انہیں اپنے کمرے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد میں کھانا لانے میں مصروف ہو گئی تھی۔“ وہ کھلم کھلا بیانے لگی۔

”گھر میں رہتی ہو۔ اپنے ہوش و حواس بحال رکھا کرو۔ جاؤ اب۔“ وہ اسے جھانڈتے ہوئے بولیں۔ وہ فوراً باہر نکل گئی۔
”ہاں تو شہر میں کوئی خاص کام ہے تمہیں؟“ ان کا پارعب لہجہ چوڑی برقرار تھا جو سلطان بخت کو خاصا ناگوار گزارا۔

”ظاہر ہے کام ہی سے جا رہا تھا میری تفریح کے لیے تو نہیں۔“ وہ بگڑ کر بولی۔
”سلطان بخت! مجھے معلوم ہے کہ تم اب بڑے ہو چکے ہو۔ اس کا ثبوت اپنے گستاخ لہجے سے نہ دو۔ میں نے تمہیں گودوں کھلایا ہے۔ اتنا حق ہے مجھے کہ تم سے ہر لہجے میں بات کر سکوں۔ اماں جان تمہیں صرف جنم ہی دے سکتی تھیں۔ اتنا تو دور رخت تمہیں ان ہاتھوں نے بنایا ہے۔“ وہ جماندیرہ صورت تھیں۔ فوراً سلطان بخت کے لہجے کو بھانپ گئیں۔
”سوری! آپ! میرا یہ مطلب نہیں تھا، میں کام ہی سے جا رہا تھا شہر۔ ادھر کام بیڑہ گیا ہے آج کل اس لیے۔“ وہ ذبح شرمندہ سے ہو گئے۔

”اچھی بات ہے۔ مرد کام کرتے ہی اچھے لگتے ہیں۔“ انہوں نے نخوت سے سر جھکا۔ ”لیکن اچھے اور کامیاب مرد ہی ہوتے ہیں جو کام اور گھر دونوں کو مناسب طریقے سے ڈیل کر سکیں کیونکہ گھر والوں کو بھی بہر حال تمہاری ضرورت ہے۔“ وہ پتا نہیں انہیں کیا سمجھانا چاہ رہی تھیں۔ سلطان بخت نے کوفت سے پہلو ہلا۔
”میں کھر کو بھی پورا وقت دیتا ہوں۔ آپ بابا جان سے پوچھ لیں۔“ ان کا انداز بھی جتنا والا تھا۔
”مجھے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تمہیں کھر کو کچھ زیادہ وقت دینا ہو گا۔ پہلے تو شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں۔ اس کے بعد نئی نوٹیوں لین کو۔ تم سمجھ رہے ہو نا۔“

”جی اچھی طرح۔“ ان کا انداز کچھ مستحضرانہ تھا۔
”تمہیں ان میں سے کون سی بات مضحکہ خیز لگی تیاریوں والی یا نئی نوٹیوں لین والی؟“ وہ بھی سیدہ تپا تھیں۔ کہاں چوکنے والی تھیں فوراً ان کے لہجے کی بوچھاڑ گئیں۔

”آپا پلیز! مجھے یوں کھرے میں کھڑا کر کے بات نہ کیا کریں۔ میں چھوٹا بھائی بھی ہوں آپ کا۔“ وہ کچھ اکتا کر بولے۔

”اسی لیے تو تم سے اتنے نرم لہجے میں بات کرتی ہوں ورنہ تمہیں معلوم ہے۔“ ہاں واقعی سلطان بخت کے ساتھ ان کا لہجہ نرم ہی ہوتا تھا ورنہ دوسروں سے تو وہ اس طرح سے بات کرتی تھیں جیسے وہ کیرے مکوڑے ہوں ان کا مزاج شاہانہ تھا۔ ادھر اماں جان کے مرتے ہی سارا کھر سنبھالا تو سسرال چلتے ہی ساس فوت ہو گئیں تو ادھر کا بھی سارا انتظام ان کے کندھوں پر چل رہا تھا۔ اسی یاد شاہت نے ان کے لہجے میں خواجواہر عنوت پیدا کر دی تھی۔
”جاننا ہوں میں آپ کا نرم لہجہ۔“ سلطان بخت جل کر بولے۔
”مطلب کیا ہے تمہارا؟“ وہ تنک کر بولیں۔

”معلوم ہے آپ کو سب۔“ وہ منہ دوسری طرف کر کے بولے۔
”میں معلوم ہے مجھے؟“ وہ کچھ دیر خاموش رہے۔
”آہ! آخر شادی کی اتنی جلدی کیا ہے؟“ نئی دیر سے ابلتا ہوا جملہ ان کے لبوں سے پھسل ہی گیا۔
”سلطان بخت! اتنی جلدی ہے تمہارے لیے۔“ ان کی آواز خاصی بلند تھی اور انداز مشتعل۔
”آہ! مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔“ وہ کچھ غصے سے بولے۔

”سنچے تو ہو نہیں۔ اس دسمبر میں پورے تینتیس سال کے ہو جاؤ گے تو شادی کیا سر سفید کر کے کرو گے۔“ آپا بچ کے معاملے میں خاصی منہ پھٹ تھیں۔
”میں تینتیس کا ہو جاؤں گا اور وہ آپ کی نئی نوٹیوں دلسن پھر پورے چالیس سال کی نہیں ہو جائے گی۔ آپا! چالیس سالہ بہن کو میرے پلے پلے ہیں کی آپ کیا کانا ہوں میں لنگڑا ہوں یا عیاش ہوں کیا کی ہے مجھ میں۔“ وہ جلا کر بولے۔

”اہستہ ہو لو سلطان بخت! آج سے بیس سال پہلے ہی باتیں اگر حسین شاہ کرتے تو آج تمہاری آپا بھی پچھلے قبرستان میں اپنی جگہ پانچھی ہوتی۔ مت بھولو اس کھر کے احسان کو اور وہ اگر کچھ عمر کی ہو جائے گی تو اس میں بھی تمہارا قصور ہے۔ ہم تو آج سے دس بارہ سال پہلے شادی کو تیار تھے جب تمہیں اسٹیٹس جانے کا ہنوں چڑھا تھا۔ اسی شادی سے فرار کے لیے نکل گیا فرار؟ ڈگری لے کر کیا تم ایسی نوکری تلاش کر سکتے ہو جو تمہیں اس جائیداد جتنی مراعات دے سکے یا اتنی جاگیر تمہیں بولس میں دے سکے جس کے تم اکلوتے وارث ہو اور جو صالحہ کے جینز میں آئے والی ہے۔“ وہ گرج دار آواز میں بولیں۔ ”نہیں نا اگر ایسا ہو تا تو اب تک تم صالحہ کے لیے نہ بیٹھے ہو۔“
”خدا اور صالحہ بھی تمہیں یوں بری لگ رہی ہے کہ تمہاری جو ادھر ادھر منہ مارنے کی عادت ہے۔ وہ تمہیں تمام عمر خوار کرے گی۔ سلطان بخت! عزت و وقار سے جینا سیکھو۔ صالحہ سے اچھی نیک پارہ اور سمجھ دار بیوی تمہیں کہیں نہیں ملے اور اگر تم اسے چھوڑنے یا اس سے شادی نہ کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہو تو ایسی کوئی بھی خواہش اپنے ذہن سے کھرچ کر نکال دو اگر تم ایسا کوئی بلکا سا بھی اشارا کرو گے تو حسین شاہ تمہاری پچاس سالہ آپا کو اس سفید چوڑے کے ساتھ اس کھر کی ویلن پر بیٹھ کے لیے بٹھا جائے گا۔ اس معاملے میں وہ کوئی صورت برتنے کا راہ نہیں رکھتا۔ سمجھے تم۔“

”آپا! یہ تو بلیک میلنگ ہے۔“ وہ بس یہی کہہ سکے۔
”بے شک ہو مگر اسی بلیک میلنگ کے تحت ہی تو حسین شاہ تمہاری بہن کی ڈولی لے کر گیا تھا کہ اسے اپنی بہن بھی تو بیانی تھی۔ اب تم ان فضول کی سوچوں سے پیچھا چھڑاؤ۔ اس کا کچھ فائدہ نہیں۔ صالحہ نہ صرف سلجھی ہوئی اور نیک طبیعت ہے بلکہ خوبصورت بھی ہے۔ یہ تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہو۔“ وہ شاید ان کی تاک بھانگی کی عادت پر طنز کر رہی تھیں۔ وہ کھس کر رہ گئے۔
”اچھا میں اب جاؤں۔“ کچھ دیر بعد وہ اکتا کر کھرے ہو گئے۔

کہاں؟

”مشرقا رہا تھا۔ بتایا تو ہے۔“ وہ تنک کر بولے۔

”کل دوپہر میں ملے جانا۔ ابھی ہم دونوں کو بابا جان نے بلایا ہے۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں اور صبح ہم نے ادھر جانا ہے تاریخ لینے اگلے ماہ کے پہلے ہفتے کی تاریخ ہوگی۔ دن ٹھوٹے ہیں اس لیے میں اب چندہ میں دن ادھر ہی رہوں گی تیاروں کے سلسلے میں۔ کل ہم تاریخ رکھ آئیں پھر کل دوپہر میں تمہارے ساتھ شہر چلوں گی زبور کا آرڈر دینا ہے۔ ادھر کا میں تقریباً سب کام کر آئی ہوں۔ اس لیے اب ادھر ہی رہوں گی۔“ وہ یہ سب کچھ فیصلہ کن انداز میں بتا رہی تھیں۔

”کل آپ ڈرائیور کے ساتھ چلی جائیں۔ مجھے آج ہی جانا ہے۔“ وہ کچھ تنگی سے منہ بسور کر بولے۔
 ”سلطان بخت! شاید آپ نے سنا نہیں۔ ابھی ہم دونوں کو بابا جان کے پاس چلنا ہے۔ کچھ ضروری معاملات دیکھنے کے لیے ہیں۔ میرا خیال ہے۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں۔“ وہ غصے میں انہیں اسی طرح آپ جناب سے مخاطب کرتی تھیں۔

”ابا پیڑا مجھے کام ہے۔“ وہ اب کے نرم پڑ کر بولے۔

”ہو گا مگر بابا جان کے حکم سے زیادہ ضروری نہیں۔ چلو بابا جان انتظار کر رہے ہوں گے۔“ وہ دو ٹوک انداز میں کہہ کر کھڑی ہو گئیں۔

”بس بھائی جان! برادری بے قرار سا تھا آپ کو دیکھنے کے لیے ملنے کے لیے۔ وہ تو شہباز خان آگیا چھٹی لے کر تو میں آئی اور نہ کہاں آسکتی تھی۔ قدرت نے مجھ کو ایسی ڈال دی ہے۔ اپنی مرضی سے کہیں آسکتی ہوں نہ جاسکتی ہوں چلو جو میرے اللہ کی رضا۔ اس نے بہت سوں سے بہتر تمہیں بنانے کا ارادہ رکھا ہے۔“ کہتے کہتے مسرتانہ طور پر آئی۔

”ہاں۔ میرا بھی بڑا دل چاہ رہا تھا کہ تم سے ملوں۔ نون کی بات اور ہوئی ہے۔ ان فاصلوں نے تو ایک دوسرے کی شکلیں کو ترسا دیا ہے۔ میں خود آج کل میں آنے کی سوچ رہا تھا اگر تم نہ آئیں تو مجھے تو اتنا ہی تھا۔“ وہ جیسے افسردہ سے ہونے لگی۔

”آپ اب میرے ساتھ ہی چلیے گا ایا ز اور اظہر بھی آپ کو دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔“

”ہوں دیکھتے ہیں۔“ وہ سرسری سے لہجے میں بولے۔ ”ہاں تک میں باگتھی چھٹی لے کر آئے ہوں۔“

”ماموں جان! چند دنوں کی۔“

”کیوں خیریت تھی تو اتنے دن کی چھٹی لی۔“

”بس ماموں جان! ویسے ہی دل چاہ رہا تھا۔ ایک تو پچھلے دنوں ہمارا کورس ختم ہوا تھا اسکو وہ میں کچھ ہنسنے تک بڑا کٹ پیرا تھا۔ اس کی تحن انارٹی تھی کچھ سیری چھٹیاں بھی ڈبو گئیں۔“

”ارے میں نے کہا بھی کہ چھٹیاں ابھی رہنے دو۔ اب آگے کام آئیں گی۔ بس بھائی جان! اب اور انتظار نہیں ہوتا۔ اس بار اسی لیے آئی ہوں۔ نہ بہت کالی ایس سی بھی مکمل ہو گیا ہے اور شہباز خان بھی آج کل کسی کورس پر نہیں وکٹسٹریشن کا ٹھوڑا سا کام رہ گیا ہے پچھلے حصے میں جہاں شہباز خان کا پورٹن ہوا رہتی ہوں تقریباً ایک دو ماہ لگیں گے سب کچھ مکمل ہونے میں۔ بس یہ آخری ارمان ہے اور اللہ سے دعا ہے کہ جیسے جی یہ آخری خواب بھی اپنی آنکھوں سے پورا ہو ناؤ کچھ لوں پھر بے شک بلاوا آجائے۔“

”مام جان! شہباز خان نے انہیں ٹوکا۔“

”ہاں عابدہ! اب مجھے کسی اپنی زندگی سے کچھ نہیں لینا۔ بس بیٹی کے فرض سے اللہ سبک دوش کرے۔ آج کل میری طبیعت ویسے ہی بہت خراب رہنے لگی ہے۔“ انہوں نے گہرا سانس لیا۔

”ڈاکٹر کو چیک کرایا ہے آپ نے۔“ وہ فکر مندی سے بولیں۔

”ہاں۔ وہ تو دکھایا ہی ہے میڈیسن بھی باقاعدگی سے لے رہا ہوں مگر پھر بھی۔۔۔ چلو چھوڑو۔“ وہ چھٹی سی ہنسی میں بولے۔ ”ارے بھئی نہ بہت تھی! چاہئے میں کیا دیر ہے۔“ انہوں نے دروازے کی طرف آواز لگائی۔

”سبیل تو شاید ابھی آئیں سے نہیں آیا۔ اس کی بیوی بھی نظر نہیں آ رہی۔“ مسرتانہ طور پر پوچھا۔

”اچھا ہے نہیں نظر آ رہی تھی۔ ہوگی کہیں۔ بس عابدہ اسی لیے تو۔۔۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے شاید شہباز خان کا خیال آگیا تھا اس وقت نہ بہت چاہئے کی برائی تھی ہونی اندر آئی۔

”چھو چھو سے ملی ہونا۔“ مسرتانہ طور پر پوچھا۔

”بی ابو جی۔“ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

”میرا بیٹا آج کل فارغ ہے۔“ مسرتانہ طور پر بولیں۔

”جی پچھو پچھو! وہ بیٹہ کر چائے بنانے لگی۔ مسرتانہ طور پر اور مسرتانہ طور پر چائے میں چینی بہت کم لیتے تھے۔ اس نے

دونوں کپ ان کے آگے رکھ دیے تیسرا مرحلہ دھوا رہا تھا۔ آخرت گناہی۔

”آپ چینی کتنی لیں گے۔“ پھر شکل اس نے نظریں اٹھا کر شہباز خان کو دکھا جو اس کے تاثرات کا بڑی دلچسپی سے جائزہ لے رہے تھے مسرتانہ طور پر اور مسرتانہ طور پر آپس میں باتیں کرنے لگے۔

”جتنی آپ ڈال دیں جتنا آگے بھی ڈالیں تو کچھ مضائقہ نہیں خاکسار ذرا بد مزہ نہ ہو گا۔“ دھیمی آواز میں

تقصیماً جواب ملا۔

”اوکے! اس نے بھی جواب دیا۔“ کہا اور پھر چائے کا کپ ان کے آگے سرکا دیا اور خود شوگر پاٹ ہاتھ میں اٹھا

کر رہا جانے لگی۔

”نہ بہت تھا! آپ چائے نہیں پیو گی۔“ مسرتانہ طور پر آواز لگائی۔

”چھو چھو! میں نے چائے چھو لیا ہے پر بھی نہیں ہوا۔ ادھر ہی بی بی لوں گی۔“ وہ کہہ کر نکل گئی۔ شہباز خان بد مزہ ہو

گئے انہوں نے کھل جانے کا کھوٹا کھوٹا اندر جا رہا تھا اور باہر تو وہ اگلنے سے رہے۔

”مام جان! چائے پی چکی ہے۔ چینی شاید نہ بہت ڈالنا بھول گئی ہیں۔“ وہ زیادہ بڑا ہوا نہ کر سکے۔

”اوہو اچھا۔ میں منگوا تا ہوں چینی۔ نہ بہت بیٹا! چینی تو لاؤ۔“ مسرتانہ طور پر جلدی سے بولے۔

”ماموں جان! میں ادھر ہی سے ڈال لیتا ہوں جا کر۔“ وہ ایک دم کپ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے تو مسرتانہ طور پر

اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اچھا تو آپ اپنے گہرائے مہمانوں کی اس طرح چھٹی چائے سے تواضع کرتی ہیں۔“ وہ ایک دم سے اس کے

پچھے جا کر لہجہ آواز میں بولے تو ہنسیا بھونکی نہ بہت اچھل ہی پڑی۔

”تو ہے۔ آپ نے تو ذرا ہی دیا مجھے۔“ وہ زور زور سے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

”اوہو اس قدر ڈر پوک ہیں آپ۔ لائیں دیکھیں۔ کس رفتار سے بھاگ رہا ہے آپ کا دل نازک۔“ انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھنا چاہا۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹی اس کا رنگ ایک دم سرخ ہو گیا۔

”کیا ہے آپ کو۔“ وہ دوپٹے ٹھیک طرح سے سینے پر پھیلائے ہوئے بولے۔

”وہی جو آپ کو ہے۔“ وہ اسی شرارت سے بولے۔

”بیٹی چاہیے آپ کو۔ یہ لیں اور جائیں یہاں سے۔“ اس نے جلدی سے شہباز خان پر پڑا شوگر پاٹ ان کے

آگے کیا۔

”صرف چینی پر نہ ترخانے۔ بس تو یہاں سے اور بھی بہت کچھ چاہیے۔“ ان کے ذہنی جھلے پر وہ سرخ ہو گئی

باہر بھی نہیں بھاگ سکتی تھی کہ دروازے میں تو وہ ایستادہ تھے۔

”نہ بہت آیا دیکھا تھا؟“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد انہوں نے مدہم لہجے میں پوچھا۔

”کس کو؟“ وہ انجان بن کر بولے۔

”دعا کرتی ہو میرے لیے؟“ وہ چونکھٹ سے ٹیک لگائے اس کے چہرے پر ڈوبتی ابھرتی قوس قزح کو نظروں کے رستے دل میں اتار رہے تھے۔

”دعا میں پتلا کر نہیں کی جاتیں۔ اوہ میری ہنڈیا۔“ وہ ایک دم سے سوں سوں کی تیز آواز پر ہنڈیا کی طرف پلٹی اور ڈھکن اتار کر دیکھنے لگی۔

”حد کرتے ہیں آپ بھی۔ مجھے فضول باتوں میں الجھا دیا۔ ساری ہنڈیا لگ گئی۔ اتنی محنت سے قورمہ بنا رہی تھی اینڈ میں آپ کی اتنی ضروری تھی۔ اندر جا کر بیٹھیں آپ ورنہ میں پھوپھو کو آواز دیتی ہوں۔“ وہ چونکھٹ بند کر کے تیز تیز بولے چلی گئی۔

”نہت! تم کسی کی دلہنی ہی اسٹوڈ ہو، چھٹی بچپن میں ہوتی تھیں۔ یہ نہیں کہ فیانی اتنی دور سے اتنے عرصے بعد ملنے آیا ہے۔ دو گھڑی اس سے کوئی محبت بھرے لہجے میں بات کر لی جائے۔ تمہیں اپنی ہنڈیا کی فکر ہے اور میں پاکلوں کی طرف بھاگا چلا آیا اور وہاں بیٹھی چوٹیوں پر بیٹھ کر تار تار اور وہ بھی تم جیسی فضول لڑکی کو۔“ انہیں بھی غصہ آیا۔ ہنڈیا کو ان پر فوقیت خودی جاری تھی۔

”ہاں تو کس نے کہا تھا مجھے یاد کرنے کو۔ دھیان سے اپنی ڈیوٹی انجام دینی تھی۔ ارنگازی تو فتنہ ہو گیا ہے ہماری قوم میں۔ اسی لیے تو مسلسل ناکام ہو رہی ہے۔ ہر ہنڈہ اپنا دھیان اپنی ڈیوٹی کی طرف رکھے تو سب کچھ درست نہ ہو جائے یہی دیکھیں میں اپنی ”ڈیوٹی“ سے غافل ہو کر آپ کی فضول باتوں میں لگی تو ہنڈیا جل گئی اور ابوتی کو تو ذرا بو آجائے لگے ہوئے سالن کی ”وہ توڑے“ واپس کر دیتے ہیں۔ اب اتنی جلدی میں دو سراساں کیسے تیار کروں۔ اب کھڑے کیا ہیں۔ جائیں یہاں سے۔“ وہ جھلا کر بولی۔

”بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری ہنڈیا۔“ وہ بھی کب سلیب رینج کر گیا ہر نکل گئے۔

”ہاں تو میں نے خط لکھا تھا آپ کو کہ آکر میرا کام خراب کریں۔ وہاں کابھی کوئی وقت ہوتا ہے ہونہ۔“ وہ بھی ہوا یا ”زور سے بولی۔ شہباز خان غصے میں اندر کمرے کی طرف بڑھ گئے۔



”اوہینا میرا دل کھو گیا نہ جانے کیا ہو گیا۔ اوہینا۔“ وہ چپ چاپ برآمدے کی سیڑھیوں پر سر جھکائے سوچوں میں گم بیٹھا تھا جب ظفر نے اس کے آگے ہاتھ لہرا لہرا کر گانا شروع کر دیا۔

”او میرے فلاسٹرا میرے بقراط اور ارسطو! آخر تجھے کن جہانوں کی فکروں نے آن لکھا ہے۔ کچھ اپنے پیاروں کو بھی تو بتا۔ اچھا بھلا تو ہوتا تھا۔ اب ہر وقت اداس الو کی طرح آنکھیں پھاڑے ارد گرد سے بچنے جانے کدھر کھویا رہتا ہے۔“ اس نے ایک دھپ معاذی کر پر رسید کی اور اس کے برابر سیڑھیوں پر آ بیٹھا۔

”بولتا نہیں کیا تو نگاہ ہو گیا ہے اور ویسے بھی آج کل تم جس رفتار سے محض ”ہاں گیا نہیں“ کہہ رہے ہو۔ بہت جلد تمہاری بولنے کی قوتیں تم سے رخصت مانگ لیں گی اور تم اشاروں کی زبان میں بات کرو گے پھر کوئی سمجھے گا کوئی نہیں سمجھے گا۔ بہتر ہے میرے پارا بھی ہمیں سمجھا دو کہ تمہاری ساتھ براہم کیا ہے۔ معاشی، معاشرتی، سماجی، اخلاقی، ذہنی، ذہنی، افلاکی کس قسم کی گھٹیاں درپیش ہیں تمہیں۔“ وہ اس کے کسی بھی جواب کا انتظار کیے بغیر تان اسٹاپ بولے چلا جا رہا تھا۔

”او پھوٹو بھی منہ سے کچھ۔“ اس نے زور سے اس کا کندھا ہلایا۔

”کچھ نہیں یار! بس ویسے ہی۔“ اس نے زمین سے تنکا اٹھایا اور اسے موڑنے لگا۔

”یار! ہم یار ہیں تیرے، ہم سے دل کی بات نہیں کہے گا تو کیا پوراوں سے کہے گا یا پھر ناظم صاحب سے جن کے پاس ہر بات ہر پریشانی کا حل ڈھیر ساری نصیحتوں کا پلندہ موجود ہے۔“

وہ سٹپ کے ساتھ اچھا رہا۔

”یار! بتاؤ گے نہیں۔ میرا تو اب دلغ خراب ہونے لگا ہے تمہاری اس منحوس خاموشی سے آخر کوئی وجہ بھی تو

ہو۔“ وہ جھلا اٹھا۔

”بتایا نا کچھ بھی نہیں۔ بس ویسے ہی دل نہیں چاہتا بولنے کو۔“ تنکا ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔

”خیر پہلے تو تم ٹھیک تھے آج سے چند ہفتے پہلے تک۔ یہ دورے تو تمہیں اب ہی پڑنے شروع ہونے ہیں اور آج تو میں سب پوچھ کر ہی بلوں گا۔ بہت تمہاری شکل دیکھی میں نے یہ سزئی ہوئی۔“ وہ پوچھے بغیر لٹنے والا تھا بھی نہیں۔

”بھئی بتایا نا کچھ خاص نہیں۔“ اس نے ریزے ہوا میں اچھا ل دینے۔

”چلو عام ہی بتاؤ۔“ وہ لا پرواہی سے بولا۔

”تمہیں معلوم تو ہے۔“ اس نے دور اڑتے پردوں کو اپنے آسٹونوں کی طرف جاتے دیکھا۔

”کیا معلوم ہے۔ بھئی مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں ان معاملوں میں کیا ہر معاملے میں کوڑھ مغز ہوں۔ ایسا نہ ہو تا تو آٹھ جہاں تیں ہی نہ کر لیتا۔ بس تم مجھے سمجھاؤ بلکہ بتاؤ۔“ اس نے معاذ کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”یار! سوں رزلٹ آ رہا ہے۔ بہت ڈیلے ہو گیا ورنہ اب تک آچکا ہوتا۔“ وہ افسردگی سے بولا۔

”تو تمہیں کس لیے ہونے کا ڈر ہے یا رزلٹ کے آنے کا۔“ اس نے نا سنجھی سے پوچھا۔

”یہ بات نہیں۔“

”تو پھر کیا بات ہے؟“ وہ اچھا ل بولا۔

”یار! تمہیں معلوم تو ہے کہ اوہر سا مہان میں ہمارا یہ آخری سال تھا اور اب رزلٹ کے بعد یہاں سے کوچ کرنا پڑے گا۔ میں کہاں جاؤں گا۔ میرا تو کوئی بھی نہیں ہے اس دنیا میں۔ بس اسی بات کی وجہ سے۔“ اس نے جملہ اوجھرا پھوڑ دیا۔ رونانا بہت آ رہا تھا۔

”بس اتنی ہی بات۔ اوکھا مڑ کر دھلے دھلے کیوں نہیں بتایا۔ ارے تیرا یار کس لیے ہے۔ یہاں سے جانا تو اکٹھے ہی ہے نا تمہیں میرے ساتھ چلنا۔“ وہ زور سے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔

”یار! میرے گھر۔ گاؤں اور کدھر۔“ وہ بے فکر سے بولا۔

”تمہارا گھر بھی ہے؟“ معاذ حیران رہ گیا۔

”تو تمہارا کیا مطلب ہے۔ میں نے گھر ہوں خدا نخواستہ۔“ وہ براہمان کر بولا۔

”نہیں۔ میرا یہ مطلب تو نہیں تھا مگر پھر اوہر رہتا۔“

”بھئی اوہر رہتا کیا؟“ اس نے ابرو اچکائے۔

”نہیں۔ فکر تمہارا گھر موجود ہے تو پھر اوہر کیوں رہ رہے ہو۔“

”اس لیے کہ میری ماں مجھے رکھنا نہیں چاہتی سو مجھے یتیم خانے میں داخل کر دیا گیا۔“ وہ لا پرواہی سے بولا۔

”تمہاری ماں بھی ہے؟“ معاذ کی حیرت سے آنکھیں پھیل گئیں۔

”سو سوتیلی ہے، یار! اپنا بے سگے والا ذاتی۔“ اس نے پاؤں جھلائے شروع کر دیے۔

”تو پھر تم اوہر کیوں پڑے ہو؟ وہ بھی اتنے پرسوں سے۔ یہاں کا ماحول تمہیں معلوم ہے کتنا اذیت ناک اور تعظیف وہ ہے۔ ہر وقت کی مار کٹائی ٹھکانی۔ پھر گھٹیا کھانا اور سب سے بڑھ کر گھر گھر جا کر کھانا مانگ کر لانا۔ کتنی اذیت ہوتی ہے اس کام سے۔ تمہارے تو سب موجود ہیں۔ ماں سوتیلی سہی، باپ، گھر، گاؤں۔ پھر تم اوہر کیوں رہے؟“ معاذ پریشان ہوا اٹھا۔

”اوہ میری جان! یہاں سب چٹنا ہے۔ وہ شبیر ہے نا اس کی ماں زندہ ہے پر اس نے دو سری شادی کر لی۔ دو سرا باپ شبیر کو بھراشت نہیں کرنا۔ اس لیے وہ بچپن سے یتیم خانے میں ہے۔ اوہر اسے یتیم اور لاوارث ہی لکھوایا گیا ہے میری طرح۔ امتیاز کے چچا، تاپا سب موجود ہیں مگر کوئی اسے رکھنے کو تیار نہیں اور میں تمہیں بتاؤں وہ منا

”آٹھ ماہ میں صرف ایک دن مجھے قلمی دریافت نہ ہونے پر مار نہیں پڑی تھی۔“
 ”اس دن تمہیں سبق جو یاد ہو گا۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”نہیں اس دن قاری صاحب کو بخار تھا اور انہوں نے میرا سبق نہیں سنا تھا۔ ہے نا لطیفہ۔“ وہ ہنسا۔
 ”اچھا تو تم اب نہ جاؤ۔ اتنی شام ہو رہی ہے صبح چلے جانا پلیرز۔“ وہ خواجہ خواجہ اور اس ہو رہی تھی۔
 ”نہ بابا! میں باز آیا۔ صبح بابا صاحب تھجہ سے بھی تھیلے مجھے اٹھاویں گے اور اتنی سردی میں دوڑ لگاویں گے۔ اس سے بہتر ہے میں ابھی چلا جاؤں اللہ داتا تکے کا آخری چکر ادھر چھوڑنے جا رہا ہے آوھے کھٹے تک ہمیں بھی ساتھ ہو لیتا ہوں۔ دیکھنا ذرا اماں جی مارے محبت کے میرے لیے صبح سے وال کا حلوہ بنا رہی ہیں، تیار ہو پایا نہیں۔ اگر دیر ہے تو انہیں کورہنے دیں اگلے ہفتے لے جاؤں گا۔“ وہ مز کر اپنے دھلے ہوئے تیلوں بوڑے تھیلے میں ڈالنے لگا۔

آمنہ تھوڑی دیر بعد اسٹیل کے ڈبے میں حلوہ اٹھائے اندر چلی آئی۔

”تھیلے میں ڈال لیتا۔ اماں جی کہہ رہی ہیں۔ گرم ہے جا کر ذرا دیر کے لیے اس کا ڈھکن کھول دو اور اس کے گرم دودھ کے ساتھ کھایا کرتا۔“ آمنہ نے اسے اماں جی کا پورا پیغام پتھیا۔
 ”گرم دودھ وہاں مجھے تم کر کے دو گی تا۔ ویسے بھی وہاں روز دودھ نہیں ملتا۔ ایک دن بعد ملتا ہے۔“ اس نے تھپتھپا اٹھایا۔

”آمنہ! تم نے داخلہ بھیجوا دیا ہے۔“

”ہاں! پچھلی بار متین بھائی فارم پر کروا کے لے گئے تھے۔“
 ”تمہاری تیاری کیسی جا رہی ہے؟“

”ٹھیک ہے۔ چلو! اماں جی سے مل لو پھر وہ مغرب کی نماز پڑھنے لگ جائیں گی۔“ اسے باہر نکلتے دیکھ کر وہ بولی۔
 ”ادھر ہی جا رہا ہوں اور دیکھنا اگلے سال ہم دونوں اکٹھے نوں بھانمت میں داخلہ لیں گے۔ تمہاں ہو جاؤ۔“
 وہ اس کے پاس رک کر بولا۔

”تم اس سال حفظ کرو گے؟“ وہ کچھ خوشی سے بولی۔

”حفظ تو میں بھی نہیں کر پاؤں گا۔ یہ تو تم لکھ لو۔ ہاں اسکول میں داخلہ ضرور لوں گا۔ میرا داغ متین بھائی جتنا تیز نہیں ہے کہ حفظ بھی کر لوں اور میٹرک کی سند بھی لے لوں۔ میں جس کچھ دن اور ہوں ادھر۔ میرا وہاں دل نہیں لگتا۔ آمت! میں جلد ہی ادھر آ جاؤں گا اور اگر بابا صاحب نے میری زیادہ مرمت کی تو میں یہ گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں گا کیس بھی۔ خدا کی زمین بہت بڑی ہے۔“ وہ بڑے بڑا لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”مہینہ ایہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ بابا صاحب کو بتا چل گیا تو تمہیں معلوم ہے نا۔“ وہ خوفزدہ ہو گئی۔

”معلوم ہے۔ کیا کر لیں گے میری کھال اتروا دیں گے تو اتروا دیں۔ مجھے اب کچھ ڈر نہیں۔ اب تو اپنی باڈی خاصی مضبوط ہو گئی ہے۔ چھوٹی موٹی مار سے ڈبٹ نہیں پڑتا۔“ وہ اپنے ڈولے پر ہاتھ مار کر لے خونی سے بولا۔
 ”سوئی! ایسا نہ کرنا پلیر! تم دل لگا کر پڑھو۔ حفظ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ بس ایک آدھ سال لگے گا پھر تم بھی اسکول میں داخل ہو جانا بابا صاحب بھی خوش ہو جائیں گے۔“ وہ اسے سمجھانے لگی۔

”بابا صاحب کو خوش کرنا اس جنم میں تو ممکن نہیں۔ ہاں شاید اگلے جنم میں ایسا کر سکوں فی الحال میرا خرچ ہونے کا کوئی پروگرام نہیں۔ تم کی چاہتی ہو مگر میرا ایسا کوئی پروگرام نہیں اور نہ اتنا احمق ہوں چاہے تو تم یہ سب اماں جی کو بابا صاحب کو بتا دینا۔ میں وہاں کھٹے والا نہیں بس چند ماہ اور ادھر ہوں مجھے خاص وقت کا انتظار ہے۔“
 وہ کہتے ہوئے اماں جی سے ملنے اندر چلا گیا۔ اس کا جواب سننے بغیر اور اس کے ہونق چہرے کی طرف دیکھے بغیر۔

”اگر بابا صاحب کو علم ہو گیا وہ تو اسے جان سے مار دیں گے۔ میں اماں جی کو بابا صاحب کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ یہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اللہ میاں سے دعا کروں گی کہ وہ اس کا دل پھیر دے اور اپنے علم کی طرف اسے

راغب کر دے اور بابا صاحب کے دل میں اس کی ڈھیر ساری محبت ڈال دے اور بغیر کسی کھوٹ یا ذاتی مفاد کے دوسروں کے لیے دعا کی جائے تو اللہ میاں ضرور قبول کرتا ہے۔ میں ابھی نماز پڑھ کر دعا کرتی ہوں۔“

”اوہو فخر! اور کتنے دن لگائیں گے۔ میں بہت مس کر رہی ہوں آپ کو اور سنی بھی۔ پلیز اب جلدی آجا نہیں۔“
 رعنا فون پر بے قراری سے بولی۔

”ڈارلنگ! تمہارا تو ہے کام سے کام نکل رہا ہے ہماں۔ ہمارے بزنس کا اس قدر اسکوپ ہے میں تو دیکھ کر ہی دنگ رہ گیا ہوں جس کمپنی سے میں ایگزیکٹو کرنے آیا تھا اس کے علاوہ دو اور پرائیویٹ فرمز سے بات چل نکلی ہے۔ سرمایہ ان کا ہو گا کام ہمارا۔ ان لوگوں کو ہمارا کام بہت پسند آیا ہے۔ ادھر دو ڈورک کی اور وہ بھی ہینڈ میڈ کی بہت ڈیمانڈ ہے شکر ہے میں یونہی چند ایک کمپنیل لے آیا تھا۔ کچھ چاہی تو دستوں کو گفٹ کرنے کے لیے ادھر تو بہت مانگ ہے۔ بہر حال میں اسی ہفتے تک پوری کوشش کروں گا کہ جلد سے جلد آ جاؤں۔ تم فکر نہ کرو۔ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔“ خرنے تفصیل بتائی جو رعنا کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔

”ہاں۔ میں ٹھیک ہوں۔“

”تمہاری جو کافرٹس یا کپڑے بنا کر کیا تھا؟“ وہ کیا اسلام آباد میں۔“ تو آواز خاصی کم آ رہی تھی۔
 ”نہیں برسوں ہے میں نکل جاؤں گی۔“

”بھئی اونچا بولو ذرا۔ میں نے تمہارے اور سنی کے لیے ڈھیر سارے گفٹس خریدے ہیں۔ ادھر موسم بے حد خوبصورت ہو رہا ہے۔ سنی کی اسٹریز کیسی جا رہی ہیں اس کے ٹیسٹ کیسے ہوئے ہیں۔“ فخر اب خاصی اونچی آواز میں بول رہے تھے۔

”سنی بھائی! میں بالکل انٹرسٹ نہیں لے رہا اس کارزلٹ بہت خراب آیا ہے وہ اب ٹیوٹر سے بھی توجہ سے نہیں پڑھ رہا۔ اسکول سے بھی شکایتیں آ رہی ہیں۔ پلیز فخر! آپ جلدی آ جاؤ۔ میں سنی کے بارے میں بہت پریشان ہوں۔ وہ لہر میں بھی نہیں لگتا۔ مجھے بھی کل جانا ہے۔ دو تین دن مجھے ادھر لگ جائیں گے۔“

”مجھے آواز نہیں آ رہی لگتا ہے لائٹوں میں کڑبڑ ہو گئی ہے۔ تم اپنا خیال رکھنا اور سنی کا بھی۔ اسے بتاؤ کہ میں اگلے ہفتے آ کر اس کے کان کھینچوں گا۔ اگر اس کارزلٹ اچھا نہ آیا۔ تم اپنا بہت خیال رکھنا۔ میں پھر فون کروں گا۔ تم موبائل اسٹیس پاس ہی رکھنا۔ میں رات کو یا پھر کل فون کروں گا۔“ تو آواز پھر گم ہو گئی تھی۔

”فخر! آپ ٹھیک ہیں نا۔ کتنا وقت پر لیتے ہیں۔“ اسے خیال آیا تو پوچھنے لگی۔

”ہاں۔ میں ٹھیک ہوں تم سنی کے اسکول وزٹ کر آؤ اس کے ٹیوٹر سے اس کے پرائیبلز ڈسکس کرو۔ میں انشا اللہ جلد ہی آ جاؤں گا۔ ڈونٹ وری مانی ڈارلنگ۔ اینڈ ٹھیک کیئر۔ میں پھر فون کروں گا۔“

”سارے گاما۔ سارے گاما۔“ ماسٹر خالد بخش لہک لہک کر گارے تھے۔

”گاؤ نا۔ تم بھی ماسٹر جی کے پیچھے۔“ زیور گل نے بیزار شکل بنائے بیٹھی نین مارا سے کہا۔

”نومام! میں ویری ٹیف اور ویسے بھی یہ سب مجھے پسند نہیں۔“ نین نار نے ٹاک چڑھا کر کہا اور فرشی نشست سے اٹھ کر صوفے پر جا بیٹھی۔

”پسند کی بیٹی۔ آخر تمہاری پسند کیا آسمان سے اترے گی۔ آخر تم زندگی میں کیا کرو گی۔ گایا تم سے نہیں جاتا حالانکہ اللہ نے اتنی سریلی آواز اس ناقدری کے حلق میں ڈال دی ہے۔ دو چار اشتہار کیے ہیں نے کہا چلو چل نکلے گی تو کسی نہ کسی فلم یا سپر ہٹ ڈرامے میں بھی انک ہی جائے گی کہ وہ سید زاہد مگر گیا۔ اس نے اس پر بھی پابندی لگا دی۔ ڈانس سے تم کو سوں دور بھاگتی ہو۔ چلو اسکرین کی اور بات ہے۔ ایک زیادہ بھتی ہے مگر یہ رقص تو ہماری وراثت ہے۔ بڑھ ہفتے میں ایک آدھ فنکشن گھر میں ہی سہی اینڈ کر لے تو پریٹنس ہوتی رہے۔ دو سرے کچھ

وسیلہ بھی لگا رہے اور مجھے اس کی فکر بھی بلکانہ نہ کرے کہ میرے بعد یہ کیا کرے گی۔ ماسٹر جی اس چھو کمری نے تو میرا بھیجا ہلا کر رکھ دیا ہے مگر کسی کام کی ہائی نہیں بھرتی۔“
زیور گل کب سے اس پر بھری بیٹھی تھی۔ اب اس کے انکار پر برس پڑی۔ مین تارا بے نیازی سے اپنے ہاتھوں کی ایک سرسبز کرتی رہی۔

”دیکھ رہے ہیں ماسٹر جی! اس کے اطوار۔“ اس کی بے نیازی اسے اور آگ لگا گئی۔
”ارے خاتم! تم چھوڑو یہ چھوٹے چھوٹے دھندے۔ اسے فلم میں لے آؤ۔ چائس میں دلوانا ہوں شہرت اور پیسے دونوں کے لیے یہ شارٹ کٹ ہے۔“ ماسٹر جی نے مفت مشورہ دیا۔

”اور ماسٹر جی! تپائی کے لیے بھی۔ ماسٹر جی جس طرح کی فلمیں ہمارے ہاں بنتی ہیں اسے دیکھ کر بے اختیار خود کشی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ ہمارے ملک کے بے چارے فلم بین بڑے حوصلے والے ہیں جو ایسی چیزوں کو ایک بند کمرے میں بیٹھ کر برداشت کرتے ہیں۔ مجھے ایسی کوئی چیز زبردستی بھی دکھانے کی کوشش کی جائے تو سینما اسکریں کو آگ لگا دوں۔ فلم میں تو مجھے کام نہیں کرنا اور وہ بھی خاص طور پر اوہر کی فلمیں۔ مین تارا نے تاغلیں سیدھی کیں اور پاؤں آگے کر کے ایک خاص انداز سے ان کی ایک سرسبز کرتی لگی۔ گورے سفید پلور جیسے باؤں بونے لچک دار انداز سے دائیں بائیں حرکت کر رہے تھے ماسٹر جی نے موبائل پر مین تارا کی ایک تار کر کے کے دامن سے صاف کی اور پھر لگا کر پاؤں کے اس بلوریں جوڑے کو دیکھ کر منہ سے پان کی بیک سائیڈ سے بے اختیار رہی تھی۔

”تو کتنا دیکھا اس کی بکواس کو۔ یہ نواب زادی آسمان سے اترتی ہے جو اس کے لیے خاص قسم کی فلمیں بنائی جائیں۔“ زیور گل پھر گرم ہو گئی۔
”ارے کو تو اوہر کام دلوانا دیتے ہیں۔ ایسی کیا بات ہے۔ ایک تو رات میں ٹھٹھو جاتی ہے۔ فلم نکلے گی۔“ ماسٹر جی بیک لنگتے ہوئے بولے۔

”نہ پایا کچھ بھی سہی اپنا دل بس تو اپنا ہے پھر اس دشمن کو چا کر اپنا من اپنا ہو دو ان کریں جسے ساری عمر وفا تو کیا دوستی بھی نہ کرنا آتی اور ماسٹر جی! دشمنی دوستی ایک طرف تو ہاں ہمارا سیرسٹ سے سیرسٹ ایکٹر بھی کیا تو ذلیل ہو کر ہی آیا۔ وہ اسے گھنیا کرنا روہتے ہیں۔ چار پیروں کے لیے اپنی عزت بھی خراب کی تو من کا نام بھی ڈبو یا اور ان کو مسخر کا موقع بھی دیا۔ میں باز آئی ایسے فن سے۔“ مین تارا کے پاس ہر بات کا گھڑا لگا رہا جو اب موجود تھا۔

”ماسٹر جی! یہ لڑکی مجھے کوئی نہ کوئی روگ لگا کر چھوڑے گی۔“ زیور گل نے بے بسی سے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

”جی ان کزنوں کو دیکھا ہے مموٹی اور بارو کو۔ کیسے دھڑا دھڑوٹ چھاپ رہی ہیں۔ اناسیر صاحب کام کر کے پلے اشتہارات میں کام کیا اور اب ہر دور سری فلم میں آ رہی ہیں۔ دونوں تیری ہم عمر ہیں اور ایک تو ہے کچھ نہ کرنے جوگی۔“ زیور گل کا بس نہیں پل رہا تھا۔

”مام! ان دونوں کا حوالہ نہ دیں تو بہتر ہے۔ ان جیسا کام کرنے سے بہتر ہے آوی جا کر کسی اندھے کو نہیں میں چھلانگ لگا دوں۔“ وہ آرام سے صوفے پر سیدھی لیٹ گئی اور پاؤں جھلانے لگی ”ویسے مام! ہماری فیملی میں بیسے کمانے کا کوئی باعزت طریقہ بھی ہے یا نہیں۔“
”ہاں ہے!“ زیور گل کا انداز جھلکا تھا۔

”کسی ارب پتی سے چند سالوں کے لیے شادی کر لو اور سارا کچھ اپنے نام کرا کے آرام سے طلاق لے لو اور پھر سے اس زندگی میں واپس آکر ہمیشہ کرو مگر تم سے تو وہ بھی نہ ہوگا۔“
”کرو آئیے یا۔“ مین تارا اٹھی۔ ”شاہ جی مام!“ اس نے یاد دلایا۔

”بیگم صاحبہ! وہ سید صاحب آئے ہیں۔“ تو کرنے اندر آ کر بتایا۔
”ہاں بلاؤ۔“ اس نے نوکر سے کہا۔ ”اور ماسٹر جی! آپ ذرا یہ ستار اور ہار موٹیئم اٹھا کر اوہر سے جائیں۔“ ماسٹر جی نے سر ہلایا اور ہار موٹیئم اٹھا کر اندر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔
”مین تارا! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“ زیور گل کچھ دیر بعد بولی۔
”کیوں مام؟“ وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔

”جیسا میں نے کہا ہے ویسا کرو۔ جاؤ یہاں سے۔“ وہ سختی سے بولی تو مین تارا اٹھ کر بیٹھ گئی۔
”مام! میں ان سے مل تو لوں۔“ اس نے دوبے لہجے میں کہا۔
”مین تارا! انھو یہاں سے۔“ کب کے ذرا زیادہ سختی سے کہا گیا تو وہ براسمانہ بنا کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔
”تو اب آئیے آئیے شاہ جی! آج اتنے دنوں بعد ہمیں درشن کرانے۔ ہم تو ترس گئے تھے۔ موبائل بھی آپ کا پورے سے آف تھا۔ مین تارا انتظار کر کے تھک گئی۔ دو بار فلیٹ بھی گئی۔ اوہر بھی لاک تھا۔ بہت ادا اس ہو رہی تھی وہ سب کے لیے۔“ زیور گل اٹھ کر شاہ جی کا استقبال کرتے ہوئے ایک ہی مناس میں اتارنے لگی۔
”میں نہیں پلیز۔“ اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

”کب کدھر ہے مین تارا!“
”جئے کمرے میں ہے۔ تین دنوں سے کمرے میں بند ہے۔ اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ یا ہر بلا کر تھک گئی ہوں کہ چلو میرے ساتھ شاپنگ کے لیے چلو۔ موسم بدل رہا ہے کچھ اپنے ڈریسز خرید لو جو تے اور جو لڑی مگر وہ تو میری ایک نہیں سن رہی۔ آج آپ آئے ہیں۔ آپ ہی اسے لے کر جائیں اور میری بیٹی کو ڈھیر ساری شاپنگ کرائیں۔ اسمانہ نکال لیا ہے اس نے آپ کی جدائی میں۔“ زیور گل نے آنتی ساڑھی کا ڈھلکا پلو گھما کر شاہ جی کو دکھایا اور غور سے اسے دیکھنے لگا۔
”میں تو شاپنگ شغل ہے گل جی۔ کچھ دنوں بعد لے جاؤں گا۔“ شاہ جی نے سنجیدگی سے کہا اور سگار کا کش لینے لگے۔
”زیور گل کے ہاتھ پر ایک پل کو بل اٹھا۔“

”شاہ جی! اب اسے چاہت کی ڈور میں پکڑ کر رکھیں۔“
”گل جی! بے بس نہیں کر رہا وقت کی کچھ کمی ہے۔ اصل میں مجھے اپنی فیکٹری کے لیے کچھ مشینری خریدنے جرمی جانا ہے۔ تقریباً“ ”میں لگ جا۔“ شاہ جی ہنسنے آیا ہوں اور یہ رکھ لیں۔“ انہوں نے گوٹ کی اندرونی جیب سے چیک نکال کر درمیان میں بڑی میسر رکھ دیا۔ زیور گل نے فوراً ”جھپٹ کر چیک اٹھا لیا تیس ہزار کا تھا۔“
”ایک لاکھ کے لیے صرف تیس ہزار شاہ جی اتنے تو مین تارا کو چندہ دن کے لیے کافی ہوں گے۔“
”میں اور لاکھ دیتا ہوں۔“ انہوں نے جیب سے چیک بک نکال کر پچاس ہزار کا چیک لکھ کر زیور گل کو تھمایا۔
”دونوں رکھ لیں۔“ وہ فراخ دلی سے بولے تو زیور گل کے سخت چہرے پر کچھ مسکراہٹ ابھری۔
”شاہ جی! یہ آپ اسے خود ہی جا کر دیں۔ مجھ سے نہیں لے گی۔ آپ کی بات اور ہے۔“ وہ کچھ سوچ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

”کدھر ہے مین تارا۔“
”اے کمرے میں۔ آئیے میں لے چلتی ہوں آپ کو۔“ اس نے دونوں چیک انہیں تھمائے۔
”مین تارا کھڑکی کے آگے کھڑی تھی شاہ جی نے دروازے پر پہنچ کر کھٹکھٹا کر گلا صاف کیا۔
”ہائے شاہ جی! تو اب۔“ وہ بے تحاشا خوش ہو کر بولی۔ اس نے اپنا خوبصورت چھوٹا سا ہاتھ ایک ادا سے ماتھے تک لے جا کر سلام کیا تو ایک پل کو شاہ جی کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ بے اختیار ان کا دل چاہنے لگا کہ وہ اسے اپنے دل میں چھپا کر ہمیں دور لے جائیں بہت دور۔ جہاں سالہ کے خیال کا سا یہ ٹک نہ ہو۔ صالحہ کا خیال آتے ہی ان کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

”آئیے نا۔ ادھر کیوں رک گئے۔“ اس کی سریلی آواز انہیں متعلق کے کانٹوں سے کھینچ لائی۔ وہ دھیرے سے آگے بڑھے۔

”یہ تم تین دن سے کمرے میں کیوں بند ہو گئی کہہ رہی تھیں۔“ شاہجی اندر آگئے۔
 ”میں؟“ اس نے سوالیہ انداز میں انگلی سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں تو شاہجی کے قریب آگئے۔“
 ”آپ نے جو اتنے دنوں سے پلٹ کر میری خبر نہیں لی۔“ اس نے منہ بسور کر بچوں کی طرح گلا کیا اور مصنوعی غمگی سے دوسری طرف رخ کر لیا۔ شاہجی جیسے بے اختیار ہونے لگے۔

”میں تم سے بے خبر رہ سکتا ہوں۔ بھلا کوئی اپنی زندگی سے بھی بے خبر رہ سکتا ہے۔“ وہ اس کے ٹاؤک کندھوں پر پڑی آخری زلفوں سے کھیلتے ہوئے جیسے بے خود ہو کر بولے۔
 ”اس لیے تین دن سے موبائل بھی آف کیا ہوا تھا۔“ اس نے پیار بھرا شکوہ کیا۔
 ”موبائل ادھر ہی رہ گیا تھا آفس میں آف نہیں کیا ہوا تھا۔“ انہوں نے دھیرے سے اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

”جھوٹ۔“ وہ اس کے بہت قریب کھڑے تھے۔ اس سے نظر نہیں اٹھاتی جارہی تھی ان کی گرم سانسوں سے اس کی گردن خم ہو رہی تھی۔
 ”تمہارے سر کی قسم جان۔“ وہ اس کے کندھے کے گرد بازو تھام لیں کرنے لگے۔ وہ تڑپ کر محبت کے حصار سے نکل گئی۔

”شاہجی! نوفاؤل۔“ وہ ان کی حالت کا مزہ لیتے ہوئے کھلکھلا جانے لگی۔
 ”آخر کب تک بھاگو گی اس فاقول سے نینو۔“ وہ ہنس کر پھر قریب آئے۔
 ”اس لیے تو کہتی ہوں۔“ وہ ایک اداس سے پلکیں جھپک کر بولی۔
 ”کیا؟“

”تھروپر اپر چینل پر کام کرنا چاہیے۔“ وہ تازک سراپے کی کہاں کو ذرا ساموڈ کر بولی۔
 ”یو مین۔“ وہ اور قریب آگئے۔
 ”شاہجی! انجان نہ بنیں۔“ وہ نروٹھے پن سے بولی۔
 ”کیا! پتاؤ نا۔“ وہ اس کی طرف جھکے۔

”شاہجی! آئی وانٹ نو میری یو۔ ڈیو وانٹ؟“ (میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں آپ بھی چاہتے ہیں؟) وہ ان کی شرٹ کے بٹنوں سے کھیلنے لگی۔
 ”نینو ڈارنگ! ابھی ان باتوں کے لیے عمر پڑی ہے۔“ انہوں نے یا زو اس کی کمر کے گرد رکھا۔
 ”تو شاہجی! ابھی وقت ہے ان باتوں کا جب پیار عروج پر ہو۔“ اس نے ان کی شرٹ کا بٹن کھولا۔
 ”پیار تو عروج پر ہے اسے اور بوجھانا ہے۔“ انہوں نے اسے اپنی طرف سمیٹنا چاہا۔
 ”پلیز شاہجی! میں مذاق نہیں کر رہی۔“ اس نے باہر نکلتا چاہا۔

”میں کب کہہ رہا ہوں کہ مذاق کر رہی ہو۔“ وہ اس کی ٹھوڑی کو چھو کر بولے۔
 ”پھر آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے۔“ وہ معصومیت سے بولی شاہجی کا دل بے گل ہونے لگا۔
 ”وہ تو کر رہا ہوں۔“ وہ جیسے خود سے بولے۔
 ”کب شاہجی۔“ وہ خوشی سے چلائی۔
 ”بہت جلد کب؟“ وہ بے قراری سے بولی۔

”چھاپھوڑو! ان باتوں کو نہ کر لیں گے شادی بھی۔ میں ایک ماہ کے لیے جرمنی جا رہا ہوں کام سے۔ فون روز کرتا رہوں گا۔ تم اداس نہیں ہونا۔“ وہ اداس لہجے میں بولے۔

”جرمنی شاہجی قریب کا گاؤں نہیں ہے۔ میں آپ کے بغیر اتنے دن نہیں رہ سکتی۔“ وہ ناراضی سے منہ موڑ کر بولی۔

”آئی نو مائی سو سیٹ ہارٹ! بس ایک مینڈ جیسے مجھے گزار لو پھر ہم ہمیشہ کے لیے اکٹھے ہو جائیں گے۔“ وہ اس کی پریشان لہجوں کو سمجھانے لگے۔
 ”ایک شریڈ پر شاہجی! وہ لاڈ سے بولی۔
 ”کیا؟“

”آپ مجھ سے نکاح کر کے جائیں۔“
 ”نکاح بچوں کا کھیل نہیں ہے نین تارا۔“ وہ شدیدگی سے بولے۔
 ”آئی نو شاہجی! اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ اس کے بغیر آپ کو جانے نہیں دوں گی۔“ وہ ضد سے بولی۔
 ”خند نہیں کرتے غیو آجاؤں گا نا شاید مینے سے بھی پہلے۔“ وہ اسے اپنے ساتھ لگانے لگے۔

”نہیں شاہجی! مجھے نہیں پتا۔ آپ مجھ سے نکاح کر کے جائیں۔ ورنہ مجھے ساتھ لے کر جائیں بس اسے آپ میری ضد سمجھیں ورنہ پھر آنا دوبارہ۔“ وہ شیلے پن سے بولی۔
 ”رہو گی میرے بغیر؟“ وہ اس پر جھک کر بولے۔
 ”آپ رہیں گے تو میں بھی رہوں گی۔“ وہ منہ موڑ کر بولی۔

”آئی طالم نہ بتو ڈارنگ۔“ وہ اسے محبت سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ”چھاپہ دو چیک ہیں۔ سیکس ہزار کا اور تیس ہزار کا بادل چاہے خریدنا اور خوش رہنا اور بس اگر تمہیں خوش کروں گا۔ تمہاری کوٹھی بھی تو مکمل ہونے والی ہے پھر تمہیں ادھر لے جاؤں گا۔“ وہ اسے بچوں کی طرح ہمارا ہے تھے۔

”نہیں شاہجی! آئی مجھے نہیں چاہیے۔“ صرف نکاح یا پھر مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔“ وہ بہل نہیں رہی تھی۔ ضد براڑی ہوئی تھی۔
 ”نین تارا! خند نہیں کرتے کہہ دیا نا کہ جلد آجاؤں گا۔“
 ”تو شاہجی! آج میری بات مانیں گے آپ۔“ وہ اسی انداز میں بولی۔

”چھاپھوڑو! میری بات مانیں گے آپ۔“ وہ اسی انداز میں بولی۔
 ”چھاپھوڑو! میری بات مانیں گے آپ۔“ وہ اسی انداز میں بولی۔
 ”چھاپھوڑو! میری بات مانیں گے آپ۔“ وہ اسی انداز میں بولی۔
 ”چھاپھوڑو! میری بات مانیں گے آپ۔“ وہ اسی انداز میں بولی۔

”نین تارا! شاہجی کا ہاتھ اٹھا اور اس کے پھول سے گال پر نشان چھوڑ گیا۔
 وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شاہجی کو دیکھے گی جو غصے سے لال بھبھو کاہور ہے تھے۔

”عابدہ! تمہیں تو معلوم ہے مجھے یہ مرض لگے جو تھا سال ہونے کو آیا ہے مگر ساڑھے تین سال میں نے اس کی وجہ سے اتنی تکلیف نہیں اٹھائی جتنی ان تین ماہ میں جھیل چکا ہوں۔“
 وہ چیخ آواز میں کہتے کہتے سینے پر ہاتھ رکھ کر زور زور سے سانس لینے لگے۔ ان کا رنگ ہارٹی کی طرح پیلا زرد ہو رہا تھا اور آنکھیں جیسے زندگی سے خالی یا نقل ویران اور وحشت زدہ۔ مسخرانہ کو خوف آنے لگا۔

”بھائی! بھائی جان! آپ ٹھیک ہیں نا؟“ انہیں پتا نہیں چلا کہ ان کی اپنی آواز بھی لرز رہی تھی۔ وہ کیوں ہی بہت صحت مند تو انہیں پانچ سالوں سے جسمانی معذوری انہیں اندر سے بھی دیکھ کی طرح چاہ رہی تھی۔
 ”ٹھیک ہوں میں اس طرح کا درد تو اب روز کا معمول بن گیا ہے۔“ وہ پھینکی سی بے رونق ہنسی ہنس کر بولے اور

”امت کو اس کو شادی۔ وہ تو ہماری بریادی تھی ہماری عزت غیرت کی لاش کا جنازہ تھا۔“ وہ زور زور سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جیسے ان لہجوں کو جھٹا رہے تھے وہ بہت غصے میں تھے۔

”ریشم کے گھر والے راضی نہیں تھے کیا؟“ وہ ان کے غصے سے خائف ہو کر آہستہ آواز میں پوچھنے لگیں۔
 ”عابدہ! بیسوں کے گھر والے نہیں ہوتے اس نے جھوٹ بولا تھا کہ اس کا باپ سو تھلا ہے اور اس کے بہن بھائی بھی بد چلن ہیں اور اس کا باپ اس کے وجود کا بیوپار کرنا چاہتا ہے۔ اس کی ماں مجبور ہے اس کے باپ کے ہاتھوں۔ اسی لیے وہ سہیل کو مجبور کر سکی کہ وہ اس سے گورٹ میرج کر لے، حالانکہ میں پہلی ملاقات میں ہی اس کی اصلیت جان چکا تھا۔ پھر بھی میں اس کی شادی سہیل کے حد سے زیادہ اصرار اور ضد کی وجہ سے کرنے پر راضی تھا۔ تھوڑی سی تحقیق سے ہی اس کی اصلیت کھل گئی تھی کہ۔“ وہ سانس لینے کو رکے۔ ”اس کی ماں کا تعلق اس بازار سے ہے۔ جہاں جسوں کا بیوپار ہوتا ہے اور ریشم اس کے عیاش لہجوں کا نتیجہ تھی۔ اس کی خبر سے خود بھی نہیں تھی پھر بھی اس کے باپ کا حوصلہ۔“ ان سے سانس کے ردھم کو جاری رکھنا وہ بھر ہو رہا تھا۔ کمرے کی خاموشی میں صرف ان کے سانس کے اتار چڑھاؤ کی آواز آرہی تھی۔ وہ اپنی قوت میں مجتمع کر رہے تھے۔

”کون سا باپ؟“ مسزخان نے پوچھا۔
 ”اس کی ماں کا وہ شوہر جس سے اس نے شرمی نکال نو سو جو ہے کھانے کے بعد کر لیا تھا۔ پتا نہیں وہ کس قسم کا شریف آدمی ہے جس نے آنکھوں دیکھی کبھی لگی ہے۔ بہر حال ریشم کے بہن بھائی بد چلن نہیں تھے بلکہ وہ خود ماں کے نقش قدم۔“ ان کا سانس پھر تیز تیز چلنے لگا۔
 ”بھائی جان پلیز! آپ آرام کریں۔ لعنت چھینیں اپنے لوگوں پر آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔“ مسزخان گھبرا کر لڑائی اور ہاتھ برسا کر انہیں لانا چاہا۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔

”عابدہ! آج غصے کے لیے دل کا بوجھ بھگتو تم ہو۔“ وہ ہانپتے ہوئے مدھم آواز میں بولے۔
 ”اور اس بے حیائے بہن کا خیال کیا نہ بوڑھے باپ کا اور اس گندی نالی کے کیزے کو اپنی دستار میں سجا کر لے آیا۔ وہ ابھی بھی اس کے کرتوتوں سے بے خبر ہے، کبھی ملوائف بھی کسی ایک کی بیٹی ہے۔ اب تو وہ اور بھی کھل گئی ہے دن رات۔“
 ان کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا جیسے میلوں بھاگ کر آرہے ہوں اور رنگ زرد ہو رہا تھا۔ وہ زور زور سے سینے کو مسلنے لگے۔

”بھائی جان پلیز! خدا کے لیے آپ لیٹ جائیں، آپ کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ دفع کریں ان باتوں کو۔ میں پھر سن لوں گی۔ آپ یقین آرام کریں۔“
 مسزخان ان کی حالت دیکھ کر گھبرا اٹھیں۔ ان کی تکلیف ان اذیت ناک باتوں سے اور بڑھ سکتی تھی اور خدا نخواستہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ مسزخان وہل گئیں۔

”عابدہ! میری بات سنو۔“ وہ ذرا سائیتے ہوئے پھولے سانس کے درمیان بمشکل بولے۔
 ”بھائی جان! میں ابھی بیس ہوں ایک دو دن پھر سن لوں گی۔ آپ آنکھیں بند کر کے ریلیکس کریں۔ خود کو اتنا ٹینس مت کریں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“ وہ ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر منت سے بولیں۔
 ”عابدہ! ہاتھ تو میں جوڑتا ہوں تمہارے آگے۔ پتا نہیں زندگی اتنی مہلت دے نہ دے مگر تم میری عزت کو اپنی بہو جلد از جلد بنا کر لے جاؤ۔ وعدہ کرو۔“ وہ خود کو کھینچ کھینچ کر بول رہے تھے۔

”وعدہ۔ بھائی جان! آپ کے سر کی قسم۔ عزت میری ہی ہو بنے گی۔ بس اب آپ چپ کر جائیں۔ کچھ نہ سوچیں۔“ وہ ان کی طبیعت سے سخت پریشان ہوا بھی نہیں۔
 ”تھینک یو عابدہ! تم نے میرا بوجھ ہٹا دیا۔ تھینک یو۔“ انہوں نے مدھم لہجے میں کہہ کر آنکھیں موند لیں۔



چھاتی کو ہولے ہولے مسلنے لگے۔
 ”یسا کیا ہو گیا ہے بھائی جان جو اب تکلیف بردہ گئی ہے، کسی اچھے اسپیشلسٹ کو دکھائیں نا۔ میں شہباز سے کہتی ہوں، آپ کو سی ایم ایچ میں لے جائے وہاں آپ کا مکمل چیک اپ ہو جائے گا۔ ابھی ہم ہیں یہاں دو ایک روز میں آج ہی شہباز سے کہتی ہوں۔“ وہ فگر مندی سے بھائی کے چہرے کے بدلنے رنگوں کو دیکھتے ہوئے بولیں۔
 ”اب اس کا کچھ فائدہ نہیں عابدہ! میری تو دعا ہے بس نزہت کا فرض ادا ہو جائے تو میں اسی گھڑی اسے خالق سے جا ملوں پھر مجھے ایک لمحہ بھی حیات سے ادھار نہیں چاہیے ایک لمحہ بھی نہیں۔“ ان کی آواز بھرا گئی اور سانس لینا جیسے اور بھی دشوار ہو گیا۔ سینے کا زبردست بوجھ گیا تھا۔

”بھائی جان خدا کے لیے ایسی مایوسی کی باتیں نہ کریں۔ آپ ہزاروں سال جنیں میری عمر بھی آپ کو لگ جائے۔ آپ کا ہونا میرے لیے کتنا بڑا سہارا ہے آپ کو کیا معلوم۔ میں آج ہی شہباز کے ساتھ آپ کو ہسپتال چیک اپ کے لیے۔“ مسزخان رونے لگیں۔
 ”ارے عابدہ! بے وقوف ہو تم اب یہ ڈاکٹروں کا کام نہیں ہے۔“ وہی مردہ لہجہ۔ مسزخان کو خوف آنے لگا۔
 ”بھائی جان پلیز۔“ وہ ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بے اختیار ہی کہنے لگیں۔
 ”آخر ایسا کیا ہو گیا کیوں اس قدر مایوس ہو گئے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو نزہت کو آپ اپنے ہاتھوں سے رخصت کریں گے اسے اپنے گھر میں آباد اور خوش و خرم دیکھیں گے انشاء اللہ۔“ وہ انہیں جو صلہ دینے لگیں۔
 ”اللہ کرے۔“ ان کا انداز وہی مایوس کن تھا انہوں نے بھئی آہ بھری۔

”سہیل کی آفس ٹائمنگ تو بہت ناٹھ ہیں۔ کل بھی رات گئے آتے تھے پھر سول سے ایک ماہی تو ملا ہے مجھے۔“ انہوں نے موضوع بدلا۔

”اسی کا تو سب کیا دھرا ہے۔“ وہ سیدھے ہو کر غصے سے بولے۔
 ”کون سا مطلب؟“ وہ کچھ حیرت سے بولیں۔
 ”تمہیں نہیں معلوم کیا۔ عابدہ! یوں انجان بن کر میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکو میں پہلے ہی اس کے کارنامے کی وجہ سے زخم زخم ہوں۔“ وہ شکست خوردہ لہجے میں بولے۔
 ”بھائی جان! مسزخان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہیں۔“

”نہ وہ یہ گھٹیا حرکت کرتا نہ میں اپنی نظروں سے گرتا۔ چلو یہاں تک بھی ٹھیک تھا لیکن اس کا انتخاب۔ عابدہ! میرا ہی چاہتا ہے کہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی جنگل میں بھاگ جاؤں۔ بس یہ نزہت کی زندگی ہے۔ وہ بھلا کی جکڑے ہوئے ہے۔ جو نمی بھاگ جانے کا سوچتا ہوں یہ میرے پیروں میں کھینکنے لگتی ہے۔ میں کیا کروں۔“
 ”کہاں جاؤں؟“ وہ بے بسی سے اپنی دائیں ہتھیلی پر مکا مارتے ہوئے بولے۔

”ہاں سہیل نے یہ اچھی حرکت نہیں کی۔ خاندان کی عزت کی پروا کی اس نے نہ اپنی۔ کوئی اس طرح کرتا ہے محض شادی کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا دیا مگر وہ تو شاید کہہ رہا تھا کہ ریشم کے گھر والے۔“ وہ کچھ کتے کتے رک گئیں۔

”سب کو اس ہے ان دنوں کا آرام۔ عابدہ! اس خزانہ نے سہیل کی آنکھوں پر ایسی پٹی باندھی ہے اسے کچھ اور دکھائی نہیں دیتا۔ وہ اگر ٹھیک ہوتی اس کا چال چلن مجھے اچھا لگتا، نیک شریف لڑکیوں جیسا ہوتا تو کیا میں سہیل کو اجازت نہ دے دیتا۔ میرا تو ایک ہی بیٹا تھا۔ اس کی خواہش میں کیسے ٹال سکتا تھا وہ ایک بار کتا۔ میں سو بار سر کے بل جاتا اس کا رشتہ لینے مگر۔“ ان کا سانس پھول گیا۔

”بھائی جان! کیا اس کے پاس گورٹ میرج کے سوا اور کوئی رستہ نہیں تھا۔ میں تو شادی میں آتی نہیں سکتی تھی۔ ان دنوں بیمار ہی اس قدر تھی۔“ مسزخان کافی حد تک اس واقعے سے لاعلم تھیں۔ واقعے کا علم تو سارے جہان کو تھا، بس اس کی جزئیات سے بے خبر تھیں۔

”صوفی صاحب! بس آپ کی دعاؤں سے اور اللہ کی مہربانی سے زندگی کے سارے فرائض سے سبکدوش ہو گیا ہوں۔ وہ پیشیاں تھیں۔ وہ فرائض۔ اللہ کے فضل سے دونوں اپنے گھروں کی ہوئیں۔ بہت خوشحال نہ سہی مگر اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ چھوٹی کا گھر والا ذرا تنگ کرتا ہے۔ چاروں کماتا ہے۔ آٹھ دن بیٹھ کر کھاتا ہے بلکہ اڑاتا ہے پھر فاقے تڑاکے خیرینی صبر والی اور سمجھ دار ہے سب سنبھال لیتی ہے تھوڑا بہت پس انداز کرتی لیتی ہے۔ اتنی پریشانی نہیں بس گھر والی ذرا بیمار رہتی ہے اس کی بھی عمر کا تقاضا ہے۔ ساری عمر کام کر کر کے ہڈیوں کے جوڑوں نے کھس کر تنگ تو کرتا ہی ہے۔ حکیم سہمی کی دوا دارو سے بھلی چلتی بھی ہو جاتی ہے۔ پشمن آ رہی ہے۔ اللہ کا شکر ہے گزارہ ہو رہا ہے۔ اب کوئی خاص فکر نہیں۔“

ماسٹر عنایت اللہ مدرسے میں صوفی صاحب کے پاس بیٹھے اپنا احوال سنارہے تھے۔

”اچھی بات ہے عنایت اللہ! ہر حال میں اللہ کا شکر ہی ادا کرنا چاہیے۔ وہ ہر بار رحیم ہے۔ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ ہم اس کی نعمتوں کا شکر کہاں ادا کر سکتے ہیں۔“ صوفی صاحب نے اپنی سفید سینے سے نیچے جاتی دائرہ سی کوٹھی میں لے کر بٹھایا اور اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ان کا رنگ اس عمر میں بھی سرخ و سفید تھا۔ آٹھ پچیس برس سے رنگ اور دیکھتے لگا۔

”چلو چلو! تم بھی اب چھٹی کرو۔ کل سبق اچھی طرح یاد کر کے آنا ورنہ کل چھٹی نہیں ملے گی۔“ انہوں نے اپنے آگے بیٹھے تین چھوٹے چھوٹے بچوں سے کہا جو زور زور سے بٹھے ہوئے سبق یاد کر رہے تھے۔ ان کے چہرے صوفی صاحب کی بات سن کر کھل اٹھے۔ انہوں نے فوراً ”سے پشمن قاعدے بند کیے اور صوفی صاحب جی السلام علیکم۔“ کہتے ہوئے نورانی قاعدے سینے سے لگائے کمرے سے باہر پڑی چھیل بیروں میں اڑتے گھروں کو بھاگ گئے۔

”کو شش تو کرتا ہوں صوفی صاحب کہ پوری یکسوئی سے پورے ششوں کو ششوں سے اس کی عملیات کروں۔ اس کا شکر ادا کروں۔ دل لگا کر نماز پڑھوں ویسے بھی اب اور کرنے کو ہے۔“ بیٹا کھس صوفی صاحب صوفی صاحب نہیں ہلتی ڈھیلا نہ چاہتے ہوئے بھی بٹ جاتا ہے۔ سورہ فاتحہ پڑھتے پڑھتے ہی ارٹکاڑوٹے لگتا ہے۔ خیالوں کے بے لگام گھوڑے اتنی سیدھی پگڈنڈیوں پر خواتمواہ ہی دوڑنے لگتے ہیں۔ دُوبوع اور سجدے میں بمشکل خود کو مجتمع کرتا ہوں کہ پھر قیام میں کھڑے ہوتے ہی ہلکنے لگتا ہوں۔ اللہ سے بچے دل سے رابطہ جوڑنا چاہتا ہوں پر کوشش کے باوجود ایسا نہیں کرپاتا۔“ ماسٹر عنایت اللہ جیسے بے بسی سے بولے۔

”کوئی بات نہیں ماسٹر عنایت اللہ! کوشش جاری رکھو۔ وہ تو تمہاری خلوص نیت کو جانتا ہے۔ تاہم ضرور تمہاری مدد کرے گا۔ تم ایک قدم اس کی طرف چلو گے۔ وہ دس قدم تم تک دوڑ کر آئے گا۔ عنایت اللہ تمہارے زیادہ پڑھے لکھے ہو۔ سائنس پڑھتے رہے ہو۔ اس ذات ماری نے انسانی جسم میں دل پوشی نہیں بنایا اپنے قیام کے لیے بنایا ہے۔ ہم انسان اس کی قیام گاہ کو شیطان کی آماج گاہ بنا کر پھر بھی اس کی توجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ صوفی صاحب پر اثر لے لے میں بول رہے تھے۔

”صوفی صاحب! میں نے بتایا نا۔“ ماسٹر صاحب نے کچھ کہنا چاہا۔

”دیکھیں ماسٹر صاحب! حق تعالیٰ انسان کی ان بشری کمزوریوں سے واقف تھا تب ہی تو اس نے انسانی دل کے چار حصے بنائے۔ سائنس یہی کہتی ہے نا۔“

وہ مسکرائے ماسٹر صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔

”یہ چار حصے انسانی جسم میں تازہ خون کی ترسیل کا کام تو کرتے ہی ہیں مگر ان کا روحانی مقصد حق تعالیٰ کا ذکر خیر ہمہ وقت کرنا ہے۔ چلو اگر یہ نہیں کر سکتے ساری توجہ اس کو نہیں دے سکتے تو تم اس دل کو تقسیم کرو۔ چار حصوں میں جیسے گھر کے چار کمرے۔ ایک آرام کے لیے۔ ایک سب گھروالوں کے لیے۔ ایک مہمانوں اور ملنے جٹنے والوں کے لیے اور ایک اللہ کی یاد کے لیے۔ پھر اس حصے میں اس کمرے میں کسی اور کونہ آنے دو۔ اسے صرف اللہ تعالیٰ

لے لیے مختص کرو پھر دنیا داری کے دھندوں کی فکروں سے اس حصے کو آلودہ نہ کرو۔“ ان کا بیٹھا لہجہ سیدھا دل میں اتر رہا تھا۔

”یہی تو کر رہا ہوں صوفی صاحب! پھر بھی کوشش کے باوجود دنیا داری کے دھندوں کی فکریں کسی نہ کسی کوٹنے کھدرے سے نکل کر اس حصے میں آتی جاتی ہیں۔“ ماسٹر صاحب کا لہجہ افسوس بھرا تھا۔

”اس میں تمہارا قصور نہیں ماسٹر عنایت اللہ! دیکھو ناں! اگر ایک کمرہ مکمل طور پر بھی بند ہو تو بھی کھڑکیوں دروازوں کی درزوں سے گرد آہی جاتی ہے۔ بس روز بھاڑ پونچھ کر لیا کرو۔ کچھ دیر کے لیے ہی سہی اس کو شش کے دوران مکمل ارتکاڑ حاصل کر دے لو گے۔“ وہ اسی محبت بھرے انداز میں بولے۔

”شکر یہ صوفی صاحب! بس آپ کی یہی باتیں ہیں جنہوں کو کھینچ کر ادھر لاتی ہیں۔ آپ سے کچھ باتیں کر کے دل کو سکون ملتا ہے۔“ ماسٹر صاحب کا لہجہ اطمینان بھرا تھا۔

”السلام علیکم صوفی صاحب! سلام ماسٹر جی! فقیر حسین دس ماہ کے بچے کو گود میں اٹھائے اندر داخل ہوا۔ اس کے پچیسے اس کا تیسرا چھ ماہ کا لڑکا بھی تھا۔“

”آؤ آؤ فقیر حسین! علیکم السلام۔“ صوفی صاحب نے خوش اخلاقی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

”صوفی صاحب! اس بچے کو مرنے کی ماں نری وہی ہے۔ کہتی ہے یہ دودھ نہیں پیتا اور کچھ کھا بھی نہیں رہا۔ پچھلے دنوں بخار چڑھا تھا اسے اسی لیے پڑ پڑا ہو گیا ہے کھاتا پیتا نہیں۔ میں نے سمجھایا بھی مگر ماں نہیں۔ کہتی ہے جا کر صوفی صاحب سے دم لے کے آؤ۔“ فقیر حسین نے بیٹھے ہوئے کد کا مقصد بیان کیا۔

”اگرے فقیر حسین! ماں تو ہوتی ہی وہی اور بھلی ہیں۔ ان سے بحث کرنا فضول ہے۔ ان کا سارا کچھ تو ان کی اولاد ہوتی ہے جس کے کھانے پینے اور سونے جاگنے میں ان کی جان ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے ماں کے دل کو بنایا ہی ایسا ہے اولاد کے کھانے پینے اور سونے جاگنے کے لیے۔“ مگر انہوں نے ایک لمحے کو آنکھیں بند نہیں اور پھر کھل پڑی۔

”اگرے فقیر حسین! ماں تو ہوتی ہی وہی اور بھلی ہیں۔ ان سے بحث کرنا فضول ہے۔ ان کا سارا کچھ تو ان کی اولاد ہوتی ہے جس کے کھانے پینے اور سونے جاگنے میں ان کی جان ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے ماں کے دل کو بنایا ہی ایسا ہے اولاد کے کھانے پینے اور سونے جاگنے کے لیے۔“ مگر انہوں نے ایک لمحے کو آنکھیں بند نہیں اور پھر کھل پڑی۔

”اگرے فقیر حسین! ماں تو ہوتی ہی وہی اور بھلی ہیں۔ ان سے بحث کرنا فضول ہے۔ ان کا سارا کچھ تو ان کی اولاد ہوتی ہے جس کے کھانے پینے اور سونے جاگنے میں ان کی جان ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے ماں کے دل کو بنایا ہی ایسا ہے اولاد کے کھانے پینے اور سونے جاگنے کے لیے۔“ مگر انہوں نے ایک لمحے کو آنکھیں بند نہیں اور پھر کھل پڑی۔

”اگرے فقیر حسین! ماں تو ہوتی ہی وہی اور بھلی ہیں۔ ان سے بحث کرنا فضول ہے۔ ان کا سارا کچھ تو ان کی اولاد ہوتی ہے جس کے کھانے پینے اور سونے جاگنے میں ان کی جان ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے ماں کے دل کو بنایا ہی ایسا ہے اولاد کے کھانے پینے اور سونے جاگنے کے لیے۔“ مگر انہوں نے ایک لمحے کو آنکھیں بند نہیں اور پھر کھل پڑی۔

”اگرے فقیر حسین! ماں تو ہوتی ہی وہی اور بھلی ہیں۔ ان سے بحث کرنا فضول ہے۔ ان کا سارا کچھ تو ان کی اولاد ہوتی ہے جس کے کھانے پینے اور سونے جاگنے میں ان کی جان ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے ماں کے دل کو بنایا ہی ایسا ہے اولاد کے کھانے پینے اور سونے جاگنے کے لیے۔“ مگر انہوں نے ایک لمحے کو آنکھیں بند نہیں اور پھر کھل پڑی۔

”اگرے فقیر حسین! ماں تو ہوتی ہی وہی اور بھلی ہیں۔ ان سے بحث کرنا فضول ہے۔ ان کا سارا کچھ تو ان کی اولاد ہوتی ہے جس کے کھانے پینے اور سونے جاگنے میں ان کی جان ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے ماں کے دل کو بنایا ہی ایسا ہے اولاد کے کھانے پینے اور سونے جاگنے کے لیے۔“ مگر انہوں نے ایک لمحے کو آنکھیں بند نہیں اور پھر کھل پڑی۔

”اگرے فقیر حسین! ماں تو ہوتی ہی وہی اور بھلی ہیں۔ ان سے بحث کرنا فضول ہے۔ ان کا سارا کچھ تو ان کی اولاد ہوتی ہے جس کے کھانے پینے اور سونے جاگنے میں ان کی جان ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے ماں کے دل کو بنایا ہی ایسا ہے اولاد کے کھانے پینے اور سونے جاگنے کے لیے۔“ مگر انہوں نے ایک لمحے کو آنکھیں بند نہیں اور پھر کھل پڑی۔

”اگرے فقیر حسین! ماں تو ہوتی ہی وہی اور بھلی ہیں۔ ان سے بحث کرنا فضول ہے۔ ان کا سارا کچھ تو ان کی اولاد ہوتی ہے جس کے کھانے پینے اور سونے جاگنے میں ان کی جان ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے ماں کے دل کو بنایا ہی ایسا ہے اولاد کے کھانے پینے اور سونے جاگنے کے لیے۔“ مگر انہوں نے ایک لمحے کو آنکھیں بند نہیں اور پھر کھل پڑی۔

”اگرے فقیر حسین! ماں تو ہوتی ہی وہی اور بھلی ہیں۔ ان سے بحث کرنا فضول ہے۔ ان کا سارا کچھ تو ان کی اولاد ہوتی ہے جس کے کھانے پینے اور سونے جاگنے میں ان کی جان ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے ماں کے دل کو بنایا ہی ایسا ہے اولاد کے کھانے پینے اور سونے جاگنے کے لیے۔“ مگر انہوں نے ایک لمحے کو آنکھیں بند نہیں اور پھر کھل پڑی۔

”اگرے فقیر حسین! ماں تو ہوتی ہی وہی اور بھلی ہیں۔ ان سے بحث کرنا فضول ہے۔ ان کا سارا کچھ تو ان کی اولاد ہوتی ہے جس کے کھانے پینے اور سونے جاگنے میں ان کی جان ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے ماں کے دل کو بنایا ہی ایسا ہے اولاد کے کھانے پینے اور سونے جاگنے کے لیے۔“ مگر انہوں نے ایک لمحے کو آنکھیں بند نہیں اور پھر کھل پڑی۔

حسین نے فوراً اپنی صفائی پیش کی "چلو اسکول اب نہیں جاتا میرے ساتھ کھینوں پر جائے اتنا کام اب مجھ اکیلے سے نہیں ہوتا۔ کون سا میرے ایسے کی زمینیں ہیں۔ مالکوں کو تو ٹیم (ٹائم) پر کام تیار چاہیے ہوتا ہے۔ براس کے ہڈوں میں پیک (پیک) پڑ گئی ہے۔ کام کا کون تو موت پڑتی ہے اسے۔" فقیر حسین کا بس نہیں چل رہا تھا کہ لڑکے کو کیا چاہا جائے۔

"ایسے نہیں کہتے فقیر حسین! لڑکا ایسی ڈانٹ ڈپٹ سے باغی ہو جائے گا۔"

"اوجھر آؤ بیٹا! میرے پاس۔" صوفی صاحب نے لڑکے کو محبت سے بلایا۔ وہ سر جھٹکا کر ڈرا سا آگے کو کھسک آیا۔ "بیٹا! والدین اولاد نرسہ کی خواہش اسی لیے کرتے ہیں کہ وہ بڑی ہو کر ان کا بازو بنے۔ ان کے کام میں ہاتھ بٹانے۔ باپ نے تمہیں کھلا پایا کرتا برا کیا ہے۔ اب تمہارا فرض ہے اس کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹاؤ۔ بڑا اچھا بچہ ہے قرآن شریف تو اس نے دو سالوں میں ختم کر لیا تھا۔ مانوگے نامیرا کہا؟" انہوں نے محبت سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا تو لڑکے نے اشکات میں سر ہلایا۔

"فقیر حسین! اسے دم کی ضرورت نہیں۔ میں نے سمجھا دیا ہے۔ اب اگر ضد کرے تو پھر پھرے پاس لے آنا۔" وہ بولے۔

"شکر ہے صوفی صاحب! بڑی مہربانی تھی آپ کی۔" وہ اوب اور تشکر کے احساس سے جھکا جھکا بولا "اچھا جی سلام علیکم۔" وہ کہتے ہوئے گود کے نیچے گولے کر کھڑا ہو گیا۔

"و علیکم السلام! صوفی صاحب نے لب ہلائے۔"

"بڑا ظالم شخص ہے جی نیچے کو قصائی کی طرح بیٹتا ہے اور مارنے پر آئے تو بیوی کا بھی بھرتا بھرتا ہے پھر یہ لوگ کہتے ہیں کہ اولاد بگڑتی ہماری۔" اس کے جاتے ہی ماسٹر صاحب سے بولے۔

"اللہ معاف کرے ہمارے گناہوں کو۔ بڑا حق ہوتا ہے اہل و عیال کا گھر کے سر پر۔" صوفی صاحب نے ایک پل کو سر جھٹکا کر اٹھایا۔

اس کا بڑا کڑا حساب ہو گا۔ اللہ ہمیں معاف کرے اور سب کو نیکی کی توفیق دے۔" خوف خدا سے ان کا چہرہ یکدم زرد سا ہو چلا تھا۔

"بالکل جی بالکل۔" ماسٹر صاحب نے تائید کی۔

"صوفی صاحب! السلام علیکم! ایک آدمی دروازے میں نمودار ہوا۔"

"و علیکم السلام! انہوں نے سراٹھایا۔"

"جی آپ کو بڑے شاہ جی نے حویلی میں بلایا ہے۔" اس نے پیغام دیا۔

"ٹھیک ہے۔ شام کو حاضر ہو جاؤں گا میرا شاہ جی سے سلام کہنا۔" وہ بولے۔

"اچھا جی۔ اللہ حافظ۔" کہہ کر وہ شخص واپس پلٹ گیا۔

"اچھا صوفی صاحب! میں بھی چلتا ہوں۔" ماسٹر صاحب بھی کھڑے ہو گئے تو صوفی صاحب نے الوداعی مصافحے کے لیے ان کا ہاتھ ہاتھ تھام لیا۔



وہ دن اس کی زندگی کا یادگار دن تھا۔ اس نے ہوش تو اسی شہر میں سنبھالا تھا۔ شاید آٹھ بھی نہیں کھلی ہو مگر اتنی کھلی آنکھوں سے اس نے شہر کو پہلی بار دیکھا تھا۔ ایک دو بار "سائبان" کی طرف سے سب نیچے مختلف تاریخی عمارتوں کی سیر کو گئے تھے مگر بڑی سی کھٹار اہل میں بھرے ہوئے کھپا کھپا بچوں کے ساتھ مینار پاکستان اور بادشاہی مسجد کی سیر کا وہ مزہ نہیں آیا تھا جو اس روز معاذ کو شہر، محسن اور ظفر کے ساتھ ریس کورس گارنس گارڈن اور چڑیا گھر جانے کا آیا تھا۔ وہ چاروں صحیح گیارہ بجے نائب ناظم خورشید کو بتا کر "سائبان" سے نکل آئے تھے۔ کس روٹ کو کون سی ویلن جاتی ہے۔ ظفر کو سب معلوم تھا۔ پونے بارہ بجے وہ چودہ نمبر میں بیٹھ کر ریگل چینیے تھے۔

"الفلاح" میں "دی جنگل کون" شروع ہونے والی تھی۔ ظفر نے رش کے باوجود چار ٹکٹیں خرید ہی لیں۔ فلم بالکل بیکواس تھی۔ معاذ کی طرح ان تینوں کا بھی یہی خیال تھا۔ وہ آدھی فلم دیکھ کر ہی اٹھ آئے۔ معاذ تو پہلی بار سنبھال آیا تھا۔ دیوار جتنی بڑی اسکرین پر چلتے پھرتے انسان اسے مافوق القدرت ہی لگے تھے۔ کتنی دیر تک وہ انہیں مہسوت ہو کر دیکھا رہا۔ اسٹوری پر تو جب اس نے بعد میں دی۔ اتنی دیر میں وہ تینوں اٹھ چکے تھے۔ وہ بھی ان کے پیچھے باہر نکل آیا۔

"کیو اس فلم تھی۔ میسے ضائع کیے۔" محسن بڑبڑایا۔

"چلو تمہارے کون سے پتے سے گئے ہیں۔" ظفر نے زور سے کان میں انگلی ٹھمائی۔

"دھر "ریگل" میں کون سی لگی ہے۔" اس نے ذرا آگے ہو کر لور ڈپڑھنا چاہا۔ "صرف بالٹوں کے لیے۔" انگلیش فلم کا نام تو ظفر نے پڑھ سکا۔ ہاں، وہ وہیں لکھا صرف بالٹوں کے لیے۔ پڑھ لیا "چلو بیا ڈریہ مزے کی ہو گی۔ یہی دیکھتے ہیں گویا تو بے کار ہی گئے۔" اس نے تینوں کو آنکھ مارا۔

"یار! شو شروع ہونے میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے کیا کریں۔" ان کا پکا پروگرام تھا فلم دیکھنے کا۔

"اب اوپس چلیں۔" دیر ہو گئی ہے ناظم صاحب کو پتا چل گیا تو وہ ناراض ہوں گے۔" معاذ ان کے پروگراموں سے کبہرہ کر بولا۔

"ار۔" ظفری یار! بولا بھی تھا اس الوکوتے لے کر آؤ یہ مزہ کر کر آکرے گا۔" محسن خفگی سے بولا۔

"ار۔" چھوڑو اس کی باتوں پر دھیان نہ دو۔ چلو تمہیں چین کی آس کریم کھلانا ہوں۔ ایک بار کھائی تھی۔ ابھی تک اتنا یاد ہے پتے یاد اس والی۔"

آگے چلے پلٹے تینوں اس کے پیچھے چلے۔

صرف بالٹوں کے لیے تو اسی دیکھنے کے کمال نہیں تھی۔ معاذ کے تو چھکے چھوٹ گئے۔ وہ دس مشٹ بعد ہی باہر بھاگ آیا۔ وہ تینوں جم کر اندر بیٹھے رہے اور وہ ان کے انتظار میں الووں کی طرح یاہر ٹھٹھا رہا۔ اس کے پاس تو ویلن کے کرائے کے لیے بھی نہیں تھے۔

"یار! قسم سے مزہ آ گیا۔" ظفر ختم ہوئے تینوں باہر آگئے۔

"چلو تیار! چلتے ہیں اب۔" تینوں جگے تھے۔ معاذ بہت بور ہو چکا تھا۔

"اس کی وہی رشتہ والی چاچا نا۔ چلو نا۔" شہیر بیزار ہو کر بولا۔

"چلو یار! اب پتہ کھاتے تھے ہیں۔ پتہ میں جو بھول کافائل سچ ہو رہا ہے۔" محسن بیٹھ پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

"بہت روڈ کے آؤتے یا گول کے۔" ظفر نے پوچھا اس پوچھی۔

"ارے گولی مارو گول گپوں کو۔ بڑی بھوک لگی ہے میں سے ایک ایک ہر گولے لو۔" شہیر کو بھی شدت کی بھوک کا احساس ہوا۔

"ہر گولے سے بیٹ نہیں بھرے گا، صبح آنے کی خوشی میں ناشتہ بھی بڑھنک سے نہیں کیا تھا۔ نان چنے لو۔" محسن کو زیاہی بھوک لگی تھی۔ نان چنے کھاتے ہی پھر معاذ نے جانے کی بات کی۔

"چھوڑو یار! جانا ہی ہے۔ اب ہمیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کل تو ہم نے چلے ہی جانا ہے۔ آج پیش کر لینے دو۔ چلو چڑیا گھر چلتے ہیں۔"

پھر معاذ کی کوشش کے باوجود کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔ انہوں نے تھپڑ میں ڈرامہ بھی دیکھا۔ جس میں ایڈمن گانوں پر کھلا ڈالواؤ انس کیا گیا تھا۔ ان تینوں نے خوب انجوائے کیا، معاذ کا تو خون خشک ہو رہا تھا۔ ناظم صاحب ان معاملوں میں بہت سخت تھے۔

"پتا نہیں کیا ہو گا۔ میں کیا کہوں گا۔" وہ اندر ہی اندر ہول رہا تھا۔

رات کو انہوں نے گوالمنڈی میں سردار کی مچھلی کا ڈنر کیا "ابھی تو ظفر کا برادری لپچا رہا تھا کہ مہیرا منڈی جائیں

پاس ہی تو ہے۔ جیسے کے سری پائے بھی کھائیں گے۔ کوئی رونق شوق دیکھتے۔ اس نے حسرت سے کہا۔
 "یار! تو سوچ گئے ہیں۔ کھانا کھاتے ہمیں دس بج جائیں گے۔ اب پھر سکی۔" شبیر نے اس کی بے لگام حسرتوں پر ہند باندھنا چاہا۔

اور واقعی جب گیارہ بجے انہوں نے سائین کا گیٹ کھٹکھٹایا اور چوکیدار نے ان چاروں کو دیکھ کر گیٹ کھول دیا۔ وہ چاروں جیسے ہی اندر داخل ہوئے چوکیدار نے انہیں گیٹ کے دوسری طرف بنے پھولے سے کمرے کی طرف چلیا۔

"چلو اور تمہارے لیے ڈنر کا اہتمام کیا گیا ہے۔" اس کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ معاذ کے پورے جسم میں خوف سے تھمر بھری سی دوڑ گئی۔

اندر کمرے میں کون تھا یہ تو اسے پتا نہ چل۔ کا مگر کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی چاروں طرف سے ان پر ڈنڈوں اور لاتوں سے حملہ کر دیا گیا۔

"مرا مزادوں! الفنگوں! آپہ صلہ دیا تم نے اتنے سالوں کی پرورش کا۔ نمک حرامو! تو! جس قبائلی میں ساری عمر بھائی اسی میں چھید کیا تم نے۔ آج تمہاری ہڈی پہلی ایک نہ کر دی تو نام میرا بدل دینا۔ یہ نائب ناظم کی آواز تھی۔ انہیں اس قدر بے دردی سے پتیا گیا کہ چند لمحوں بعد وہ چاروں بے ہوش ہو چکے تھے۔ نئے فرش پر وہ بے سدھ پڑے تھے۔

"ارے یہ کیا کیا۔ اس قدر مارا ہے تم لوگوں نے انہیں۔" معاذ کے ڈوبتے ہوئے حواسوں نے ناظم صاحب کی آواز سنی۔

"کیا معاذ بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس کا تو کل رزلٹ ہے۔ مورڈ سے اس کو مدعو کیا گیا ہے۔ اس کی کوئی پوزیشن بن رہی ہے۔ تم نے اس کا کیا حال کر دیا ہے، کل میں کیا جواب دوں گا سب کو۔" ناظم صاحب نے غصے اور افسوس سے بول رہے تھے۔ معاذ مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا تھا۔

وہ گال پر ہاتھ رکھے آنکھوں میں دو موٹے موٹے موٹی لیے بھونچکی کھینچ رہے تھے۔ انہیں دیکھے گئی۔ یہ اس کی سترہ سالہ زندگی کا پہلا ٹھیکر تھا اور وہ بھی اس ہستی سے جس کو وہ اپنا دل وان کیے بیٹھی تھی۔ تنہا کسی شرط کے وار نے کو تیار تھی اور نین کا تو سوال ہی کیا اس کا من تو بنا ہی شاہ تھی پر دیوانہ وار رفتار ہونے کے لیے تھا اور آج اس بے دردی سے اس تم کرنے اس کے پھول سے نازک رخسار کو پھیل ڈالا اور ابھی بھی ان کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا اور غصے جیسے سواہو تاجا رہا تھا۔ لہجہ بہ لہجہ۔

"اس طرح کی کوئی بھی کبواں کرنے سے پہلے نین تارا! اپنی اوقات ذہن میں رکھا کرو۔ ہماری ذرا سی نظر کرم نے اگر تمہیں فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا ہے تو یہ سب اٹھنے میں دیر نہیں لگے گی۔ کیا تمہیں سب کتنا سوٹ کرتا ہے، سوچنا اس بات پر۔ اللہ حافظ۔"

وہ غصے سے تن تن کرتے کمرے یا "کل کدہ" سے نکل گئے جس تیزی سے انہوں نے گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اشارت کی تھی اگرچہ چوکیدار بھی کی سی تیزی سے گیٹ وان کرنا تو یقیناً وہ گاڑی گیٹ سے نکل کر اوتارے۔ گل کدہ کی خاموش فضاؤں کو فنا کرتی ہوئی سید سلطان بنت کی بی ایم ڈیوں زن سے باہر نکل گئی تھی اور ریکارڈنگ پر جانے کے لیے تیار ہوتی زیور گل کے ہاتھ سے لپ اسٹک گر گئی۔ اس نے دوڑ کر کھڑکی کھول کر لان سے باہر جاتی مڑک پر شاہ تھی کی گاڑی کے وہیلوں کی آخری جھلک دیکھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ انہیں قدموں پر پلٹ کر نین تارا کے کمرے کی طرف بھاگی۔ وہ اپنے بیڈ پر اوندھی بیٹھی جھکیوں سے رو رہی تھی۔ جھکیوں کی شدت سے اس کا دھان پان سا وجود سارے کا سارا لرز رہا تھا۔

"تارو! کیا ہوا میری جان! زیور گل نے تیزی سے بیڈ کے پاس پہنچ کر جھکتے ہوئے نین تارا سے پوچھا۔ جس

نے زیور گل کی آواز کو ان سنی کر دیا تھا۔ وہ اسی اسپید سے رو رہی تھی۔

"تارو! میری جان! میری بیٹی! کیا بات ہے۔ کیوں اس طرح رو کر میرا دل دہلا رہی ہو۔ سیدھی ہو۔" زیور گل نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اسے سیدھا کرنا چاہا۔ نین تارا نے بری طرح سے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

"نین تارا! What's happened وہ ایک دم سے کل خانم بن کر ہوئی۔ نین تارا اس اسی لہجے سے ڈرتی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا۔" وہ سسکیاں روک کر سیدھا ہوتے ہوئے ڈراغصے سے بولی۔

"تو رو کیوں رہی ہو۔ سیدھی ہو کر بیٹھو اور مجھے بتاؤ۔" اس کی رعب دار آواز پر نین تارا اچھٹلا کر اٹھ بیٹھی اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ اور آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ آنسوؤں سے دھلا ہوا سر شو سفید چہرہ اور دکھنے لگا۔

"کیا ہوا ہے؟" زیور گل نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ایک دم سے اس کی نظر اس کے بولی کی طرح صریح رخسار پہنچی جہاں نین نشان ابھرے ہوئے تھے۔ انگلیوں کے زیور گل کو گویا کر نٹ لگا۔

"یہ ہے۔" نین تارا نے اس کے کال کو پھونکا۔ "کیا ہوا ہے؟" وہ بے یقین لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"پتہ نہیں۔" نین تارا نے بسورتے ہوئے پھر رخسار رگڑنا چاہا۔

"بتاؤ مجھے۔ کیا ہوا ہے۔ شاہ تاجی نے ہاتھ تھامیے تم پر۔ بولو؟" اس کے لہجے میں بے پناہ سختی تھی۔

پتہ دیر کی پتھپتھ سے بعد نین تارا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"وہاٹ! زیور گل پوری کی پوری گھوم گئی۔" اس سید زاہہ کی یہ جرات۔ میرے گھر میں میری لخت جگر پر۔ میری کئی جیسی نازک بیٹی پر۔ لہو تو۔" وہ سید بیٹی سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ "تم نے مجھے اسی وقت کیوں نہ بتایا۔ وہ شریف زاہہ صاحبہ جو کب سا تاجا اور ہرے پتیا گیا۔" غم و غصے سے زیور گل کا برا حال تھا۔ نین تارا کی بی بی بی پٹولوں پٹنے لگی۔

زیور گل نے ایک گندی کالی کی "میرے سامنے ہونا ابھی وہ۔ میں اس کا منہ نوچ لیتی۔ اس نے غصے سے پھر گالی دی۔ نین تارا ماں کی ہمدردی پا کر پھر سے اسٹک بہانے لگی۔ کچھ دیر زیور گل اپنے غصے پر قابو پاتی رہتی۔

"کیا ہوا تھا؟" اس نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ نین تارا چپ رہی "بولو نین! کیا ہوا تھا؟" وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے محبت سے اس کے بال سنوا کر بولی۔

"نام! وہ وہ تھی۔ وہ سکی۔

"نیں! کوئی ذرا لنگ۔" زیور گل نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔ وہ پھر سے سسکتے لگی۔

"پتھاب نہیں روٹا۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ بولو کیا ہوا تھا۔" زیور گل نے تری سے اس کا چہرہ صاف کیا۔

"نام! کچھ بھی نہیں۔" وہ ہسول بن سے بولی۔

"نام! میں نے شاہ تاجی سے کہا کہ جرمی جانے سے پہلے ابھی اور اسی وقت مجھ سے نکاح کریں۔ بس انہیں غصہ آ گیا۔" نین تارا نے بایاں پاؤں جھلاتے ہوئے کہا۔

"وہاٹ! آریو میڈ (تمہا گل ہو)؟" زیور گل چلائی۔

"کیوں ماس! اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے۔ آپ نے ہی تو کہا تھا کہ دولت کمانے کا یہ بہترین شارٹ کٹ ہے اور پھر مجھے تو واقعی شاہ تاجی سے محبت بھی ہو گئی ہے۔" آخری ہنسد ہم لہجے میں کہا گیا۔

"محبت کی پتی! کبھی کسی طوائف نے بھی محبت کی ہے؟" زیور گل نے دانت پیسے۔

"کیا؟ کیا کلام آپ نے؟" اب چلائے کی باری نین تارا کی تھی۔

"اگر شاہ تاجی نے تمہیں اس بات پر پھینکا مارا ہے۔ تو بہت اچھا کیا ہے کیونکہ اس بات پر میں تمہیں جان سے بھی مار سکتی ہوں۔" وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بول رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ نین تارا کو فخر

”نام! وہ احتیاجاً چلائی۔“

”تمت چلاؤ مجھے تم سے اس حماقت کی توقع نہیں تھی۔ اسٹیوڈیو گرل۔“ وہ غصے سے بولی۔ ”لیکن نہیں۔“ اس نے اثبات میں سہلایا۔ ”اس طرح کی احمقانہ عقل سے عاری بات صرف تم ہی کر سکتی ہو میں تارا صرف تم۔“ اس نے غصے سے کہا۔ ”نام معلوم میری تربیت میں کہاں کی رہ گئی تھی کہ تم مہمل نہ ہو سکیں۔“ وہ سر ہاتھوں میں پکڑ کر کاٹھ پڑھ رہی تھی۔

”نام! شاہ جی کو قابو میں کرنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں! اگر وہ ایک بار جرمنی چلے جاتے پھر انہوں نے اوہر کا رخ کیوں کرنا تھا اور ویسے بھی وہ ایک دن کا کہہ کر جاتے ہیں اور دو ہفتے تک نظر نہیں آتے۔ میں ان کی صرف دوست ہوں نا اس لیے بیوی ہوں تو ان کی مجال نہیں یوں غائب ہونے کی۔“ وہ اپنے تئیں زیور گل کو بولے پتے کی بات سمجھا رہی تھی۔

”میں تارا! میں تارا! ایک کوائف۔“ زیور گل شدید غصے کے عالم میں چلائی ”یو فوٹس گرل! تلاش میں تمہیں عقل سکھا سکتی یا نہیں سے خرید کر دے سکتی۔“ زیور گل بے بسی سے بولی۔

”بے وقوف لڑکی! کیا تم نے اس مرغی کی کہانی نہیں سنی جو روز سونے کا انداز تھی پھر اس کے احسن مالک نے سارے اندازے حاصل کرنے کے لیے اسے قح کر دیا اور احمق پن میں تم نے اس شخص کو کبھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو خود کو؟ اس سید زاوے کو نیک پار سا شریف لڑکیوں کی کمی ہے وہ تم جیسی طوائف زاوی کو اپنی عزت کا تحفہ بنانے کا۔ وہ اوہر آتا رہے گا تا قیامت اگر تم اس کی شخص دوست رہو گی جس دن بیوی بن جاؤ گی اس دن اسے کھو دو گی۔ میں تارا! میں تمہیں یہ بات طوطے کی طرح دہراؤں تو اگر تھک گئی اور آج تم نے وہی بکواس کر دی۔ میرا بی چاہ رہا ہے کہ تمہارا نگلا دیا ہوں۔“ زیور گل کا مارے غصے کے بر حال تھا۔

”نام! نام! زیور لیسٹو ج۔“ میں تارا کی سولی طوائف زاوی پر انک تھی۔
”شٹ اپ! مجھے لینگو ج نہ سمجھاؤ جو آئینہ وہ سید زاوہ تمہیں دکھا کر رہا ہے اس میں خود کو دیکھو اور پتہ چلاؤ اور کبھی نہ بھولنا کہ تم کیا ہو۔ اندرا آئینہ۔“ زیور گل کا بی بی ہانی ہو چکا تھا وہ غصے میں چلائی ہوئی کمرے سے نکل گئی اور میں تارا اس کے آخری جملے پر اچھل کر کھڑی ہو گئی۔
”آئینہ! کون سا آئینہ!“



”بس شاہ جی! کل شام کو شش کے باوجود حاضر نہیں ہو سکا آپ کی خدمت میں فیصل آباد سے کچھ مہمان آگئے تھے۔ بدر سے سے متعلقہ حضرت مولانا احمد خان رومی اور ان کے کچھ احباب ان کے ساتھ آئے اور خاطر پیدارت کی وجہ سے میں حاضر نہیں ہو سکا۔ میں نے قادر بخش کے ہاتھ پیغام بھجوایا تھا اور نہ آنے کی وجہ بھی بتادی تھی۔ آپ کو پیغام مل گیا تھا نا۔“ صوفی صاحب کین کی آرام وہ کرسی پر ابستادہ سید سلطان شاہ سے معذرت خواہ انداز میں کہنے لگے۔

”جی صوفی صاحب! آپ کا پیغام مجھے مل گیا تھا نا آنے کی وجہ آپ نے بتادی اس لیے معذرت کی تو ضرورت نہیں! ایسا ہو جاتا ہے اور اچھا ہی ہوا۔ کل آپ نہیں آئے کل میں شاید آپ کو وقت دے بھی نہ پاتا۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے۔

”کیوں شاہ جی! وجہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟“ صوفی صاحب نے مؤذب انداز میں کہا۔

”بس صوفی صاحب! کیا بتاؤں! اب اس دل کا بھروسہ نہیں رہا۔“ وہ پھینکی سی ہنسی ہنسنے لگا۔

”کیا مطلب؟“ صوفی صاحب نے پوچھا۔

”کل شام طبیعت کچھ بگڑ گئی تھی اس لیے کل شام تو ہم نے اپنے کمرے میں ہی گزار دی۔“ صوفی صاحب کو ان کا چہرہ گمزور سا لگا۔

”اللہ خیر کرے صحت کاملہ عطا فرمائے آپ کو۔ آپ کو ہمارے سروں پر تاقیامت قائم و دائم رکھے! اب کیسی

”لیبت ہے آپ کی؟“ صوفی صاحب فکر مند ہی سے بولے۔

”بہتر ہوں اب اور صوفی صاحب! تاقیامت کی تو دعا نہ دیں۔ یہ تو ہمارے لیے بددعا ہو جائے گی۔ اس مرض کا علاج کے ساتھ تو چند دن گزارنا بھی ہمارے لیے قیامت گزرنے سے کم نہیں۔ خدا ہر ایک کو اس موذی تکلیف سے محفوظ رکھے۔ بندہ کہتا ہے کہ کل کی آئی آج آجائے۔“ شاہ جی اپنی بیماری سے از حد تک آپکے تھے۔

”اللہ رحم کرے آپ پر میں تو ہر لمحہ آپ کی صحت کے لیے دعا گو رہتا ہوں۔ آپ جیسا رحم دل مہمان سالک خدا ہر علاقے کو نصیب فرمائے اور ہو خدا کے پیار سے بندے ہوتے ہیں وہ مخلوق کے بھی پیار سے ہوتے ہیں اور شاہ جی! اس گاؤں کا تو بچہ بچہ آپ کی صحت اور زندگی کے لیے دعا گو رہتا ہے آپ کا سلوک جو سب سے اس قدر مہمان اور محبت والا ہے پھر نماز کے بعد آپ کی صحت کے لیے مسجد میں دعا کروانی جاتی ہے۔ جب اتنے ہاتھ دعا کے لیے انہیں تو رحمت باری ضرور جوش میں آتی ہے۔ حق تعالیٰ آپ کو شفا سے کامل نصیب فرمائے گا۔ آمین! مجھے یقین ہے۔“ صوفی صاحب محبت و عقیدت کے جذبے میں ڈوبے ہوئے بول رہے تھے۔

”آپ کی صحت ہے صوفی صاحب اور گاؤں والوں کی بھی ورنہ میں تو بڑا گناہ گار بندہ ہوں اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ بندوں کے حقوق کب کوئی پورے طور پر ادا کر سکتا ہے۔ سرداری تو صوفی صاحب کا شوق کی بیج ہے ایک پل سکون کا نہیں ملتا۔“

”ماشا اللہ! ماشا اللہ۔“ صوفی صاحب نے عقیدت سے سہلایا۔ ”شاہ جی! ایسے سردار تو قسمت سے آپ کو ملتے ہیں اللہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم رکھے کہ جن میں اسے منصب کی نزالت اس حد تک احساس ہے جزاک اللہ۔“ صوفی صاحب نے آبی ریش مبارک کو مٹھی میں لے کر خور۔

”تو کیا کیا سمجھے ہم گناہ گاروں کے حق میں بھی صوفی صاحب! شاہ جی پھیلے لہجے میں بولے۔
”کیوں نہیں شاہ جی! کہاں کہاں نہیں ہمارا اور ہوں رواں آپ کے لیے دعا گو ہے۔ یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔“ انہوں نے شاہ جی کو یقین دلایا۔

”میں نے کل بھی آپ کو اسی لیے بلوایا تھا کہ ہم نے آپ کے چھوٹے شادی کی شادی کا ارادہ فرمایا ہے۔ اگلے مہینے کی چار تاریخ مقرر کی گئی ہے یعنی اب بمشکل بیس بیس دن ہیں۔ شادی تو ہم بے شک سادگی ہی سے کریں گے انکو تے مہینے کا باپ ہونے کی حیثیت سے سلطان بخت کے متعلق ہمارے بھی پیچھا ارمان ہیں جو ہم پورے کرنا چاہتے ہیں لیکن اس منصب کے بھی پیچھے تقاضے ہیں جو ہمیں ایسا کرنے سے روکتے ہیں کہ شان و شوکت اور دھوم دھڑکان تو ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور نہ ہماری خاندانی روایت۔ اس لیے ہم نے شادی کی تمام تقریبات سادگی سے کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کل صبح کی نماز کے بعد آپ پورے گاؤں میں اعلان کروادیں کہ کل صبح کی نماز میں جو ہا نہیں چلے گا۔ سب گاؤں والے جو ملی ہی سے کھانا کھائیں گے اور شادی کی تیاریوں کے لیے جو ملی کے اندرونی کام کاج کے لیے گاؤں کی عورتیں کل صبح سے جو ملی میں آجایا کریں۔ اس کے علاوہ آپ کل صبح نماز فجر کے بعد در سے کے بڑے لڑکوں کو لے کر مردان خانے میں آجائیے گا جہاں قرآن خوانی ہوگی۔ شادی کے دن تک روزانہ ایک قرآن پاک ختم ہو گا اور کل دوپہر کو جو ملی کے زنان خانے میں میلا و شریف ہو گا جس میں آپ کے گھر کی خواتین اور تمام گاؤں کی عورتیں شرکت کریں۔“ وہ سانس لینے کو رکھے۔

”اس کے علاوہ چونکہ میرا ارادہ سلطان بخت کو اس بار انیشین میں کھڑا کرنے کا بھی ہے۔ اس کے علاوہ سلطان بخت کے اور میرے بہت سے احباب شہر اور دوسرے ملکوں سے متعلق رکھتے ہیں جو شاید گاؤں آنے کا وقت نہ نکال سکیں اس لیے ویسے کی ایک تقریب لاہور کے پی سی ہال میں بھی ہوگی جس میں میری طرف سے شرکت کریں مجھے خوشی ہوگی۔“ یہ دعوت ایک بہت بڑے اعزاز کی بات تھی۔ صوفی صاحب کا سینہ خوشی اور فخر سے پھول گیا۔

”جی ہاں! بات تو شاہ جی! میری طرف سے آپ کو اس مبارک موقع کی بہت بہت مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ چھوٹے

شاہ جی کو زندگی کی ہر خوشی اسی طرح آپ کے سایہ عاطفت میں عطا فرمائے۔ دوسرے آپ کے تمام احکامات انشا اللہ میں پوری طرح سے بجالاؤں گا۔ گاؤں میں سب کو خبر ہو جائے گی اور سب کام انشا اللہ ہاتھوں ہاتھ ہو جائیں گے۔ آپ بالکل فکرت نہ کریں۔ انہوں نے شاہ جی کو تسلی دی۔

”جیسے آپ سے یہی امید تھی۔ شاہ جی نے اطمینان کا سانس لیا۔
 ”آپ صبح مدرسے سے فارغ ہو کر جو ملی آجایا۔ کھینچے گا اور دھڑکے پتھہ کاموں کی نگرانی ہو جائے گی۔“
 ”کیوں نہیں شاہ جی! آپ ہمارے مانی باپ ہیں۔ آپ کا علم سرتا کھوں پر۔“ وہ فرما بیٹھواری سے بولے۔
 ”شرمندہ نہ کریں صوفی صاحب! میں آپ کو کوئی حکم دے سکتا ہوں۔ تعویذ اللہ اور سنائیے۔ بچوں کا کیا حال ہے سب خیریت سے ہیں۔“ انہوں نے موضوع بدلا۔

”آپ کی دعاؤں اور مہربانیوں سے شاہ جی۔“ صوفی صاحب نے سینے پر ہاتھ رکھا۔
 ”عبدالستین کیا کر رہا ہے شہر میں؟“ ان کا انداز سرسری سا تھا۔

”انہر کا امتحان دے دیا ہے اب کوئی کورس کر رہا ہے۔ تھرڈ ایئر کی کلاس میں شروع ہوئے تھک گئی۔
 ”آگے پڑھانے کی کیا ضرورت ہے صوفی صاحب! گاؤں بلوائے اسے۔ اور اسکول میں آکر اسٹریٹن جائے۔“
 مستقبل سنور جائے گا اس کا۔ لی اے کر کے کیا کرے گا۔ شہر میں تو گریاں کہاں۔“ نہیں عبدالستین کا شروع ہی سے شہر میں پڑھنا پسند نہیں آیا تھا۔

”میں نے تو کہا تھا شاہ جی! پروہ نہیں مانتا۔ تعلیم کا دیوانہ ہے۔ پڑھنا چاہتا ہے میں نے کہا۔ چلو دو سال اور ہیں شوق پورا کر لے پھر تو ادھر ہی آتا ہے۔“ صوفی پست لہجے میں شرمندہ سے بولے۔

”کہہ دیتا ہے کہ ادھر آکر اسکول سنبھالے۔ گاؤں کے بچے اور کچھ نہیں برا کمری پاس تو ہوتی ہیں۔ حکومت کو اکثریت میں موڑا دیتے ہیں۔ شرح خواندگی بڑھانے کے۔ سارا ملک پراسر میں ہو جائے تو اس روزہ روزے کیسے دروست ہماری بھی جان پھوٹ جائے۔“ وہ نخوت و پزیراری سے بولے۔

”یا نکل جی! اب اگر ہر گاؤں قصبے کو آپ جیسے مہربان حاکم مل جائیں تو شرح خواندگی خود بخود سو فیصد ہو جائے گی۔“ صوفی صاحب خوشامد انداز میں بولے۔

”اور سچے بھی پڑھ رہے ہیں آپ کے کیا؟“ ان کا لہجہ بیکار تھا۔ بادشاہ بادشاہ ہوتا ہے عہد کا بھی اور ملک کا بھی۔

”نہیں جی۔ سب قرآن وحدیث کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میرے نزدیک تو سب سے ضروری یہی تعلیم ہے۔ دنیاوی تعلیم تو حد کی باتیں ہیں اور میں وہ اپنے بچوں کو دلانا بھی نہیں چاہتا۔ اتنا علم تو ہی جا لوں گا اور کاروبار ہو گا ہے۔ ہمارے بچوں نے آگے چل کر مسجدوں میں لڑائیں ہی تو دینی ہیں اور اس کام کے لیے دنیا کی تعلیم ضروری نہیں۔“ صوفی صاحب نے شاہ جی کی تسلی کرنا چاہی اور ان کی تسلی ہو چکی تھی۔

”یا نکل بالکل صوفی صاحب! یہی تو میں کہتا ہوں کہ کسان کا بچہ کسان نہیں بنے گا تو کیا ہوم سیکر شری بنے گا۔ ہر انسان اگر اپنے پیشے اپنے منصب اپنے کسب کو پہچان لے تو ہمارا معاشرہ سدھرنہ جائے۔ اور تو روڑی اٹھانے والا بھی اپنے بچے کو وزیر بنانا چاہتا ہے۔ الٹی سیدھی خواہشات دماغ میں فتور ڈالتی ہیں جس سے معاشرتی برائیاں جنم لیتی ہیں کہ ہر شخص اپنے اصل سے منہ موڑے ہوئے ہے۔ اسکولوں سے معاشرے کے باغی تیار ہو کر نکلتے ہیں جن سے ملک میں دغا فساد اور شہر چیلتا ہے۔ اسی انتہا پسندی نے ہمیں پوری دنیا میں بدنام کر دیا ہے۔ سب ہمیں شہر بند قوم سمجھتے لگے ہیں حالانکہ ہم تو اس دین کے پیروکار ہیں جس کی اساس ہی امن اور سلامتی ہے۔

کیوں صوفی صاحب؟“ شاہ جی کے اندر کا سیاہستان انکڑالی لے کر بیدار ہوا۔ اپنے طبقے کی برتری اور اخباری شہ سرخیوں کا سیر حاصل تبصرہ انہوں نے انڈر میٹرک صوفی صاحب کے سامنے اٹھایا۔ جن کی دنیا شاہ جی سے شروع ہو کر مسجد مدرسہ میں ختم ہو جاتی تھی۔

”یا نکل جی بالکل۔ آپ صحیح فرماتے ہیں۔“ اختلاف کی گنجائش یا تردید کی وجہ تو کوئی بھی نہیں تھی۔
 ”ٹھیک ہے اب آپ جائیں اور کل صبح جی سے آجائے گا۔“

”ٹھیک ہے شاہ جی! مجھے اجازت دیجیے۔“ وہ مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔
 ”تھہرے ذرا! شاہ جی ہاتھ اٹھا کر بولے۔

”دین محمد! انہوں نے آواز لگائی۔ دین محمد شاید دروازے سے ہی چپکا کھڑا تھا۔ وہ زاوڑا اندر آیا۔
 ”جی سرکار۔“ وہ ہاتھ باندھ کر بولا۔

”وہ لٹھو کووام سے دو پوری گندم، ایک بوری چاول اور ایک بوری چینی کی صوفی صاحب کے گھر پہنچاؤ اور ہال کھلی کے دو کنتراور گڑ کی بوری بھی۔“ سچھے۔ ”وہ بار عیب لہجے میں بولے۔

”بہت بہتر سرکار۔“ وہ اسی طرح ہاتھ باندھے چلا گیا۔
 ”یہی مہربانی شاہ جی! بڑی مہربانی۔“ صوفی صاحب نے جھک کر دوبارہ مصافحہ کیا اور خوشی خوشی باہر کی طرف بڑھ گئے۔

جیانی آر کسٹرنڈ ہم سبوں میں مغربی دھن بجارہا تھا۔ ہونٹل کے ڈائٹنگ ہال میں اکثر لوگ ڈنر کرنے میں مشغول تھے۔ ڈائٹنگ ہال کا ماحول بہت خوبناک سا تھا۔ ہال کی تمام لائٹیں بجھی ہوئی تھیں۔ صرف ہال کے سینٹر میں لگا ہوا سا جو بسورت سنہری فانوس روشن تھا فانوس آہستہ آہستہ اپنی جگہ پر حرکت کر رہا تھا اس میں لگے ننھے ننھے بلبوں سے نکلتی روشنی کی کرنیں سارے ماحول کو منور کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مگر ہال چونکہ بڑا تھا اور تمام میزیں بھی سینٹر سے ہٹ کر اونڈا ہاؤٹ کی شکل میں رکھی گئی تھیں اس لیے کوئی بھی میز مکمل طور پر روشنی کی زو میں نہیں آتی۔ ٹیبلز کے سینٹر میں ایک ایک کینڈل روشن تھی جس سے ماحول خاصا خوبناک سا ہو گیا تھا۔

ہال میں خاموشی تھی۔ صرف ہلی سرگوشیوں کے ساتھ چچھوں اور کانٹوں کی میوزیکل سی آواز تھی جو اسی ماحول کا حصہ لگ رہی تھی۔ ہلی پھلکی گفتگو کے ساتھ لوگ کھانا کھانے میں مگن تھے ہال میں اتنا روشن نہیں تھا۔ چند ایک میزیں خالی تھیں۔

”کل صبح گیارہ بجے میری فلائیٹ سے واپس کی۔“

”اوہ مسٹر حیات! آپ کے ساتھ وقت بہت اچھا بہت پلیزینٹ گزرا امید کرتی ہوں آپ فیکسٹ ٹائم بھی ہمیں اپنی میزبانی کی سعادت دیں گے۔“ مسز سائے نے روایتی مہمان نوازی کے انداز میں بولی اور یہ فخر حیات کو معلوم تھا کہ اس روایتی انداز کے جیسے سامنے کی محبت بھی تھی۔

”کیوں نہیں مسز سائے! امیر ابھی آپ لوگوں کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا۔“ فخر حیات نے جواباً کہا۔ ”آپ بہت خوبصورت عورت اور بہت اچھی میزبان ہیں۔“ فخر حیات کی تعریف کا اچھوتا انداز مسز سائے ہوشو من کے گال ایک بل کوڑتھیں کر گیا۔ ”آپ کو میکسٹ ٹائم پاکستان آنا ہو گا۔“

”کیوں نہیں مسٹر حیات! آپ کے ساتھ برنس کیا ہے۔ ہم کیوں نہیں آئیں گے حضور آئیں گے۔“ وہ فوراً بولی۔

”کیا صرف برنس کی وجہ سے؟“ فخر حیات نے ذرا آگے ہو کر پھینرنے والے انداز میں کہا۔

”اوہ نو مسٹر حیات! ڈونٹ ڈوس (ایسا نہ کریں)۔“ وہ چھڑ گئی۔ اس کی پبلیس لرزے لگیں اور ہینکمن منہ تک لے جاتی انگلیاں خواجواہ تھر تھرانے لگیں۔ چھینرنا سرو کی ہالی سہی لیکن عورت اگر چھڑ جائے اور چھڑی ہوگی عورت شاید خود اپنے بھی اس میں نہیں رہتی یہی حال مانتے ہوشو من کا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکتوں میں ارتعاش سا پیدا ہو گیا تھا فخر حیات اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں کو انجوائے کر رہے تھے۔

”میں نے تو کچھ نہیں کیا۔“ انہوں نے معصومیت سے سامنے کے لبو تری انگلیوں والے ہاتھ پر دھیرے سے اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اس معصوم ادا سے مسز سائے قہقہے ہوتے ہوئے بچی۔ حواسوں کا سارا سرکٹ جیسے معطل ہو گیا تھا اور ساری بجلیاں اس ہاتھ سے آگے دوڑ پڑی تھیں۔

”آریو میرا مشر حیات؟“ وہ کافی دیر بعد بمشکل بولی۔
 ”پلیز سز سائے! آپ مجھے حیات مت کہیں۔ مجھے ایسے لگتا ہے جیسے کوئی مجھے حیوانات یا پھر میرے ہونے پر لمبا سا ”ہا“ کر کے افسوس کر رہا ہو۔ آپ مجھے فخر کہہ سکتی ہیں۔“ فخر حیات نے خوبصورتی سے اس سوال کو نظر انداز کر دیا۔

”اوہ سو ری! اگر آپ ہرٹ ہوتے ہیں اس طرح۔ میں آپ کو ”فونر“ کہہ دوں گی۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”فونر وہاٹ۔ یعنی فونر طیارہ۔ اوہ میرے خدا۔“ فخر حیات نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

”کیا ہوا۔“ وہ پریشانی سے بولی۔

”تھنک (کچھ نہیں)“ وہ جبراً مسکرایا۔

”کیا آپ بیٹر کا شوق فرمائیں گے۔“ اس نے میرے گواوا سے اشارہ کیا۔

”آف کورس۔“ انہوں نے کندھے اچکا کئے۔

”آپ ایک اچھے بارنٹر ثابت ہوں گے۔“ وہ خوشی سے بولی۔

”بالکل آزمائش شرط ہے۔“ وہ فوراً بولے۔

”مسر ہو شو من نہیں آئے۔“ انہوں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

”He is busy (وہ مصروف ہیں)“ وہ ناک سکڑ کر بولی۔

اس نے اپنے گلے میں پڑے نیکلس سے کھیلنا شروع کر دیا۔ ”مصل میں صرف وہ ہی بڑی نہیں آپ دیکھو گے“ اوہ چلیان میں ہر شخص بڑی ہے کیا مود کیا عورتیں۔ یہ سچ ہے کبھی بات ہے۔“ نیکلس سے کھیلنے ہوئے وہ جیسے خود کا می کر رہی تھی ”ایک قوم کو نمایاں حیثیت کے لیے دنیا بھر میں ترقی کے لیے مصروف ہونا ہی پڑتا ہے مگر ہم سب انسان بھی تو ہیں اور حیات صاحبہ“ اس کی چمکیلی آنکھوں کی جوت کچھ رسی تھی ”ہم عورتیں تو کچھ زیادہ ہی انسان ہوتی ہیں“ انہیں تو ہر وقت ہر لمحہ توجہ اور محبت کی ضرورت ہوتی ہے چاہے عورت مشرب کی ہو یا مشرق کی ایم آئی رانٹ؟“ اس کے سوال پر فخر حیات خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔

”یہاں کا موزی بڑی رہتا ہے مگر مصروفیت کے دوران بھی وہ اپنی ضرورت کہیں نہ کہیں سے پوری کر لیتا ہے“ اسی لیے مطمئن ہو جاتا ہے مگر عورت مطمئن نہیں ہو پاتی اس کا اندر کچھ اور۔ اور کائنات الاچانی رہتا ہے۔ حیات! کیا پاکستان میں بھی عورت اور اور کرتی رہتی ہے یا وہ اندر باہر دونوں سے طرف سے مطمئن ہے۔“

اس کا سوال فخر حیات کے لیے اس کی گفتگو کی طرح بے محل تھا اس کی نظروں کے اصرار سے کھرا کر فخر حیات نے کندھے اچکا دیے۔

”معلوم نہیں۔ میں عورت تو نہیں ہوں۔“ انہوں نے خواہ مخواہ مزاج پیدا کرنے کی کوشش کی۔

”ہاں یہی تو بات ہے مشر حیات! جس معاشرے کے موافق معاشرے کی عورت سے اس کی خواہشات سے اس کی نفسیات سے بے خبر ہوں اس معاشرے کی عورت کبھی مطمئن نہیں ہوتی۔ ہمارے موز بھی ہماری نفسیات ہماری ضروریات سے بے خبر ہیں۔“ اس کے لہجے میں انجانے ان کے دکھ بول رہے تھے۔

”مشر حیات! عورت کو اگر موز بھی نہیں سمجھے گا تو کون سمجھے گا۔“ دکھی لہجے میں پوچھا گیا۔ سوال اور بھی الجھا دینے والا تھا۔

”آپ نے لٹریچر پڑھا ہے مشر حیات؟“

انہوں نے فنی میں سر ہلایا۔

”اس میں Swift کی کتاب ہے بلکہ یہ تو اب بچوں کے نصاب میں شامل ہے Gulliver's travels اس میں ایک سفر کی روداد میں بتایا گیا ہے کہ ایک سیارے کے لوگ جو بہت مصروف رہتے ہیں۔ اس سیارے کی عورتیں روائس لڑانے دو سرے سیارے پر جاتی ہیں۔ یہ بات کتاب میں مزاج کے طور پر پیش کی گئی ہے مگر یہ

بڑے اور گہرے دکھ کی بات ہے۔ ہے نا۔“ اس نے فخر حیات کی رائے جاننا چاہی وہ محض مسکرا کر رہ گئے۔
 ”چلیں چھوڑیں۔“ اس نے ہاتھ اور کندھے ایک ساتھ جھٹکے۔

”بزنس میں آپ دو فونل پارٹنر ہیں۔“ فخر حیات نے یونہی پوچھا۔

”اوہ نو۔ یہ سب بزنس میرے فادر کا تھا۔ اسی لیے ہو شو من نے مجھ سے شادی کی اور مجھے اب اپنی کم عمری کی اس حماقت پر افسوس ہے کیونکہ وہ ایک اچھا بزنس مین تو ہے مگر ایک اچھا لائف پارٹنر نہیں ثابت ہو سکا۔ اس کا دن رات صبح و شام سب بزنس ہے۔ اس نے میرے فادر کے بزنس کو بہت پھینا دیا ہے مگر میرے لیے اس کے پاس نام نہیں اور اب مجھے بھی اس کی پروا نہیں ہے میں اس بات پر بہت کڑھا کرتی تھی مگر اب نہیں۔“

اس نے اپنے چھوٹے سے ہینڈ بیگ سے لپ اسٹک اور ہینڈ مرڈرنگالا اور اپنی لپ اسٹک درست کرنے لگی۔

”تو آپ اس سے پیچھا چھڑائیں۔“ فخر حیات نے آسمان تجویز پیش کی۔

”یہ ممکن نہیں وہ بہت ضروری ہے ہمارے بزنس کے لیے اب یہ ہم دونوں میں ملے ہو چکا ہے کہ ہم اپنے اپنے طور پر اپنی زندگی گزاریں گے۔ اپنے طور پر ٹائم کو پلیئرٹ کرنے کے لیے دوسرے کی اجازت کی ضرورت نہیں۔“ وہ خود اعتمادی سے اپنی صراحتی وار گروں کو مزید ہوا میں اوپر اٹھا کر بولی۔ ڈارک بلوو پلوٹ کی شارٹ شیرٹ اور بلیک منی اسکرٹ میں پر لڑکی تھتی چو لری پنے وہ تمام چلیانی عورتوں سے زیادہ خوبصورت اور چار منگ تھی یا شاید مائول کا اثر تھا یا رعنا سے اتنے دنوں کی دوری کا۔ فخر حیات کو آج کل سب عورتیں حسین دکھائی دے رہی تھیں۔

”تو پھر آج کی شام تو ہمارے نام ہوئی چاہیے ویسے بھی آپ ایک خوبصورت عورت اور مہمان میزبان ہیں۔“ فونر نے انداز میں کہنے کے فخر سے سماتے ہوئے فونر کو بہت کچھ سمجھا گئے اس کی سفید چاندی سی رنگت کھل اٹھی۔

”اوہ شیور وائے ناٹ۔ میں واقعی ایک مہمان میزبان ہوں۔ دوسرے کپلیمنٹ کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ خود اعتمادی سے بولی گویسے بھی اتنے دنوں کی دوستی کا کچھ تو حق ہے نا۔ آپ شادی شدہ ہیں؟“ خوبصورت بملوں کے اختتام پر اس نے ایک بھدا اور فضول سا سوال کیا۔

”اوہ نو۔ بزنس کی مصروفیات نے اس طرح سوچنے ہی نہیں دیا۔“ انہوں نے فوراً کہا۔

”اوہ بوزی بزنس میں۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے زور سے ہنسی۔ اسی وقت وہ بیرونی اور دو گلاس ٹرے میں رکھے چلا آیا دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اور اس بار بار اور بورڈ کے میٹرک کے سالانہ امتحان میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی ہے معاذ اللہ نے۔“
 تالیوں کی کونج میں معاذ اللہ لڑکھڑاتی ٹانگوں اور کانپتے دود کے ساتھ اسٹیج کی طرف بڑھا۔ بورڈ کے چیمبر مین نے مسکراتے ہوئے اس سے مصافحہ کیا اور گولڈ میڈل اس کے گلے میں پہنایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میڈل پہننے کے لیے اس سے ذرا سی بھی گروں جھکا لی نہیں جا رہی تھی اور سیدھا کھڑے ہونے سے کمر میں ناقابل برداشت تکلیف ہو رہی تھی۔ یا یاں بازو اس قدر زور سے موزا کیا تھا کہ وہ اس سے ہلا بھی نہیں سکتا تھا وہ اسے اپنے دود کا حصہ لک بھی نہیں رہا تھا رات کی مار سے اس کے جسم کا جوڑو ڈو دکھ رہا تھا۔

اور جب مار کھانے والوں میں ناظم صاحب نے اسے بھی پایا تھا تو ان کا رنگ اڑ گیا تھا بورڈ کی طرف سے اس کے بااوب۔ ناخدا آپ کا تھا کہ اس کی پوزیشن بنی ہے جس کی وجہ سے کل رزلٹ کی اٹاؤ سنسٹ کے دوران اس کا موجود ہونا لازمی ہے دوسرے پہلی بار ”سائنس“ کا کوئی طالب علم اتنی آؤٹ اسٹینڈنگ پر فار ملس دکھا رہا تھا جو کہ ”سائنس“ کے لیے بہر حال ایک Regard (عزت) کی بات تھی دوسرے اس کا رڈ کو استعمال کر کے وہ ”سائنس“ کے لیے بہت سے فنڈز اکٹھے کر سکتے تھے۔ بورڈ میں پوزیشن حاصل کرنا کوئی چھوٹی بات نہیں تھی۔ وہ

بھی ایک پیٹیم ویسیر لڑکے کی۔ ”سائینان“ جیسے گھٹے گھٹے ماحول اور عام سرکاری اسکول کے ناقص طرز تعلیم اور سہولتوں کے فقدان کے باوجود اس قسم کی کارکردگی ہونا ناظم صاحب بہت پر جوش تھے۔ انکراں کا سارا ہوش معاذ کو یوں بے ہوش دیکھ کر وہ اہو کیا تھا اس کے ہاتھ سے بھی خون جاری تھا۔

یہ ٹھیک تھا کہ ان کی ہدایت تھی کہ ان لڑکوں کے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے۔
تعمیر بات بہر حال ان کے علم میں نہ تھی کہ معاذ بھی ان حرام زادوں میں شامل ہے۔ معاذ کو سب جانتے تھے اور اس کے شریفانہ چال چلن اور رویے کی وجہ سے سب اس کی عزت کرتے تھے۔

لیکن پر سوں رات ”سائینان“ کے رکھے گئے چندے کے باکس جب ناظم صاحب کے آفس منیجے تو اس وقت وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے ہوتے تھے وہاں انہیں دیر ہو گئی نائب ناظم تمام باکس آفس میں کھلے چھوڑ کر خود باہر نکلنے لگا ہوا خوری کے لیے حالانکہ کمرے کے باہر چچا غفور بیٹھا اور نگہ رہا تھا۔ معلوم نہیں کس وقت محسن ظفر اور شبیر پچھلی کھڑکی سے اندر داخل ہوئے اور تین بسوں پر ہاتھ صاف کر کے رفو چکر ہو گئے۔ رات تو ناظم صاحب کی ہاسپٹل میں ہی کٹ گئی۔ بیٹا بہت بیمار تھا نائب ناظم اور غفور بیٹا اسی طرح آفس لاک کر کے سوئے چلے گئے۔

اگلے دن گیارہ بجے جب ان بسوں کو کھولا گیا تو بائیں میں سے تین تو بالکل خالی تھے اور باقی میں صرف بیچاس اور ساٹھ روپے تھے۔ ناظم صاحب اور نائب ناظم کو آگ لگ گئی۔ نائب ناظم تو رات بسوں میں موجود رہ کر دیکھ چکا تھا سب سے پہلے شک غفور چچا پر کیا گیا۔ اسے بلا کر پوچھ چکے تھے ”نری اور کئی دونوں طرح سے ہی گئی مگر وہ ضعیف آدمی بری طرح سے رونے لگا وہ تو اس وقت ”سائینان“ میں آیا تھا جب اس نے ابھی پوری طرح سے بولنا بھی نہیں سیکھا تھا تمام عمر اس نے ہمیں گزار دی تھی اور اب تو وہ قبر میں بلوئے بیٹھا تھا اور پھر ہر روز چندے کے بکس اس کے سامنے ہی آتے تھے۔ کھلتے تھے بلکہ کھلے پڑے رہتے تھے۔ اس نے کبھی سنا تھا کہ انہیں دیکھا تھا پھر اب وہ ایسا کیسے کر سکتا تھا ناظم صاحب کو اس کا تین تھا۔

بہر حال تھوڑی سی تفتیش کے بعد ان تینوں کی غیر حاضری سامنے آئی اور ان تینوں کا کردار اس قسم کا تھا کہ شک کی گنجائش ہی نہیں تھی اور معاذ انجانے ہی میں پٹ گیا ناظم صاحب نے اس کی مزہم پی کر والی پین کلرز دے دے کمرات بھر میں اسے چلنے کے قابل بنایا اور اس کی پوزیشن فرسٹ ہو گئی اس کا لیٹن تو انہیں بھی نہیں آ رہا تھا۔

”معاذ احمد! بہت بہت مبارک ہو آپ کو اتنی شاندار کامیابی حاصل کرنے پر۔ میری ادا ہے آفس کی جانب سے آپ کو ڈیپوڈل ڈیپارٹمنٹ مبارکباد۔“ چیئر مین بورڈ نے مسکراتے ہوئے اسے خوش دل سے مبارکباد دی۔
”تھینک یو سر۔“ اس نے جبراً مسکرا کر کہا۔ اتنا سا مسکرانے پر بھی اس کے جڑے کراہ اٹھے۔
”کیا آپ کو امید تھی کہ آپ کی فرسٹ پوزیشن آئے گی؟“

”میں نے محنت فرسٹ پوزیشن کے لیے نہیں کی تھی۔ سراسر میں نے تو محنت یہ سوچ کر کی تھی کہ میری طرف سے کوئی کمی نہ رہ جائے کتابوں اور تعلیم کا حق ادا کرنے میں۔“ وہ بیچیدگی سے بولا۔
”ویل سیڈ معاذ احمد! مجھے امید ہے کہ اللہ آپ اپنی آئندہ زندگی میں بھی اسی طرح تعلیم کا حق ادا کرتے رہیں گے جیسے اب کیا ہے اور کیا خوب کیا ہے۔ ویل ڈن بنگ مین! ہمیں اپنی نوجوان نسل پر غرہ ہے آپ جیسے نوجوان ہی اس ملک کی قسمت سنواریں گے۔“ چیئر مین بورڈ نے اس کے کندھے چپکے۔ وردی ایک لہرا اس کے ذہن میں دوڑ گئی۔

”آپ کا کیا خیال ہے؟“ آپ کی اس کامیابی میں کس کا کنٹری بیوشن زیادہ ہے؟“ آپ کے پیر مٹس کا، آپ کے اساتذہ کا یا آپ کی محنت کا؟“
ایک صحافی نے مائیک آگے کر کے روایتی سوال پوچھا۔

”آپ کو شاید معلوم نہیں میرا تعلق Orphan House (یتیم خانے) سے ہے اور یتیم خانے میں وہ بچے بڑے ہیں جن کے والدین نہیں ہوتے اس لیے اس بارے میں آپ میرا خانہ خالی چھوڑ دیں۔“ وہ زخمی لڑکے کے ساتھ بولا۔ ”اساتذہ کی بھی محنت ہے اور میری بھی۔ مگر سب سے بڑھ کر میرے اللہ کی مہربانی جس نے میری محنت کو قبول کیا۔“

”مستحق میں آپ کا کیا بننے کا ارادہ ہے؟“ سوال کیا گیا۔ اس نے ایک لمحے کو سر جھکا کر سوچا۔
”میرا پاپا سیم پر چلنے کا۔“ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی ابھری ”مگر زندگی میں شارٹ کنس بہت ہیں اور بہت کنس کے ذریعے حاصل کردہ کوئی بھی کامیابی بہت جا۔ تاریک ناگاہی میں بدل جاتی ہے۔ اس لیے میں اپنے تھوڑی سی فوج تھوڑی سی کامرانی حاصل کروں۔ لیکن صرف صراطِ مستقیم پر چل کر۔“ ناظم صاحب کی نصیحت سے یاد تھی۔ وہ ایک عزم سے بولا اور سامنے بیٹھے ناظم صاحب مسکرائے۔ ان کی گرون فخر سے تن گئی۔
”اب تقریب کا اہتمام ہونے والا تھا۔ اس کے لیے فوٹو سیشن شروع ہوا۔ کھٹا کھٹ کیمروں کی فلش لائٹس پلپلپ اور جینٹل بورڈ بیسیٹر اساتذہ اور دوسری تیسری پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کے ساتھ کھڑے معاذ احمد کو کتے ہی کیمروں کے اندر متقید کر لیا اور یہ لمحہ۔ اس کی زندگی پر انٹ لفتش ثبت کرتا ہوا مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔

”تم نے نڈل کا امتحان دے دیا ہے۔ آج کل فارغ ہے میرا خیال ہے مصوفی صاحب! اسے ماسٹر صاحب کی بی بی کے پاس عطائی کڑھائی سیکھنے کے لیے بھیج دلو۔ وہ اس کام کی ماہر بھی جاتی ہیں پورے گاؤں میں۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو۔“

مصوفی صاحب عشاء کی جماعت کرانے کے لیے آئے تھے جیسے ہی انہوں نے کھانا ختم کر کے ہاتھ دھوئے اور اپنے کمرے کے لیے اپنے کمرے پر آ کر بیٹھے اور قلم اس کے کہ وہ اپنی بخاری کی تیسری ضخیم جلد اٹھا کر اس میں کچھ لکھنے لگے۔ مصوفی صاحب نے معلق قلمت جان کیا بات تھوڑی وہ بات سن کر کچھ دیر سوچتے رہے۔
”ایسا اتنی کڑھائی تمہارے نہیں سکھا سکتیں جا پار۔ اب لیتے میں پوچھا گیا۔“

”مصوفی صاحب! آپ کو معلوم تو ہے مجھے اس قدر کب آتا ہے۔ بمشکل چھتے کو ہی سکتی ہوں یا پھر کوئی کپڑا اچھی طرح قطع کر کے دے تو کسی لٹری ہوں اور آج کل کا تو زمانہ اس طرح کا ہے کہ لڑکیوں کو ہر ہنر آتا چاہیے پڑھائی لکھائی اور تھوڑی ہو کسی ہے تو کھریلو امور میں بھی انہیں طاق ہونا چاہیے۔ آپ کو تو معلوم ہے۔“ راجعلی بی نے ماہر سی بات انہیں زمانے کی ڈیما بڈز سے آگاہ کرنا چاہا۔

”یہ صاحب کے کمرے میں مجھے کوئی اعتراض تو نہیں کیونکہ ادھر ماسٹر صاحب کے سوا اور ہوتا بھی کوئی نہیں لیکن ان کا لٹھ تھوڑی دور ہے۔ باقی گاؤں کے کھروں سے ڈراہٹ کے۔“ وہ جیسے سوچ سوچ کر نکتہ اعتراض نکالنے لگا۔

”عبدالصہب ہوتا تو وہ اسے چھوڑ آیا کرتا۔“ راجعلی بی نے عبدالصہب کے ادھر ہونے کی افادیت بتائی۔
”اس کا نام مت لو۔“ وہ فوراً ”چیز کر بولے۔“ وہ ادھر آکر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ سوائے ہڈ حرامی کے۔ خیر میں خود ہی چھوڑ آیا کروں گا جیانا کس وقت ہو کرے گا۔“

”یہی کوئی گیارہ بجے سے ایک بجے تک دو گھنٹے کافی ہیں۔“ وہ بولیں۔
”تو پھر زینب کو بھی اس کے ساتھ کرو۔ دونوں اٹھی سیکھ لیں گی ورنہ اگلے سال اس کا بھی ٹٹا ہو گا۔“ وہ کچھ ناگوار سی سے بولے۔ ”اور ماسٹرنی ہی سے کتنا کہ انہیں ڈراجلدی اور توجہ سے سکھادیں یہی کوئی تین چار ماہ میں پھر امت کی دوسویں کی کتابیں شروع ہو جائیں گی۔“
”تمہ کو آپ اسکول جیجیوں کے امیر یا مطلب ہے ادھر تو لڑکیوں کی نویں دسویں کی کوئی جماعت نہیں ہوتی۔“ راجعلی بی تعجب سے بولیں۔ ”تو پھر کیا شہر میں۔“ وہ خود ہی ہنسنے کی نزاکت بھانپ کر چپ کر گئیں۔

مفتوں بائیں کرنے کا مطلب۔ وہ خفگی سے ابرو اچکا کر بولے۔ آمنہ نے جیسے اس سال ملل کا پرائیوٹ امتحان دیا ہے اسی طرح دوسروں کا بھی دے لے گی اور دس جماعتیں اس کے لیے کافی ہوں گی، لیکن اگر اس نے آگے بڑھنا چاہا تو اسی طرح بارہویں کا گھر بیٹھے پرائیوٹ امتحان دے دے گی۔ "راہجی بی صوفی صاحب کی روشن خیالی پر حیران رہ گئیں، مگر اظہار نہ کیا۔

"آگے تو بی پڑھائی مشکل ہو جاتی ہے۔ گھر میں کہاں پڑھا جائے گا۔" وہ انہیں مزید ٹوٹانا چاہ رہی تھیں۔ "تم نے کی ہیں بارہ جماعتیں جو ہمیں معلوم ہے کہ پڑھائی مشکل ہو جاتی ہے۔" وہ چڑ کر بولے۔ "بہر حال یہ میں نے ایک بات کی ہے۔ اگر وہ پڑھنا چاہے تو کیونکہ مجھے یقین ہے عبدالستین کی طرح اسے بھی پڑھائی لکھائی کا شوق ہے اور یہ زینب بھی عبدالستین کی طرح پڑھائی لکھائی سے بھارتی ہے۔ اسے گھر کے کاموں میں لگایا کرو۔" صوفی صاحب کی سب بیچوں پر نظر تھی، انہیں معلوم تھا کہ کون سے بچے کارخانہ کس طرف ہے۔ "اب تم جاؤ، مجھے رخصت ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"صوفی صاحب! عبدالستین کب آئے گا۔" پیاسی متاثر ہو کر بولی۔ "شاید اس ہفتے آئے۔ امتحان تو اس کے کب کے ختم ہو چکے ہیں اور اب شہر میں کوئی گورنر کر رہا ہے پڑھائی کا، کہہ رہا تھا اگلے سال دو جماعتوں کا لکھا امتحان پاس کرے گا۔ بہت شوق سے پڑھنے کے لیے کو علم حاصل کرنے کا۔ دیکھنا تم راہجی بی! میرا بیٹا بہت آگے جائے گا میری طرح۔" وہ فخر سے فخر ہو کر بولے۔ "آمین صوفی صاحب اللہ کرے۔" وہ بھی خوش ہو گئیں اور باہر جانے لگیں۔ "اور ہاں وہ جو گندم اور چاول شادی کی طرف سے آئے تھے تم نے وہ احتیاط سے سنبھال کر کوٹھڑی میں رکھوا لیے ہیں۔"

"جی صوفی صاحب! میں نے نوہ رکھوائے تھے۔" "اب تھوڑا تھوڑا کر کے انہیں صاف کروالینا۔ کل میرا ایک مزید چالیوں سے دیکھی گئی کا کھتر لائے گا وہ بھی سنبھال کر رکھ لینا۔" انہوں نے امام بخاری اٹھاتے ہوئے تاکید کیا۔ "جی اچھا۔" وہ تابع داری سے کہہ کر ہر چلی گئیں۔ اور آمنہ جو کب سے دروازے سے چچی ان کی گفتگو سن رہی تھی راہجی بی کو دیکھتے ہی خوشی سے ان سے پرت گئی۔

"ہائے اماں جی! بابا صاحب نے اجازت دے دی ماشینی جی کے گھر جانے کی اور مجھے آگے اور آگے پڑھنے کی بھی بنا۔ بابا صاحب کتنے اچھے ہیں۔ اماں جی! اوہر میں نئی کتابیں بھی لے جایا کروں گی۔" صوفی صاحب سے شروع کر دیں گی، "اب بابا صاحب کو یہ مت بتائیں وہ کہیں گے۔ کھر بیٹھ کر پڑھو یا بھائی سے پڑھو اور اماں جی! بھائی تو اب کئی مہینے گھر میں آتے۔" وہ سانس لیے بغیر دم آواز میں سب کچھ کہہ گئی۔ "اچھا اچھا لے جانا۔ تمہیں آگے صوفی صاحب سے اور یہ کون سا کوئی گناہ کا کام ہے پڑھنا ہی ہے۔ اور ماہستر صاحب تو خود بہت نیک بہت اچھے ہیں۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔" راہجی بی نے اس کی بائیں گلے سے نکالیں اور آگے بڑھیں۔

"اماں جی! زینب بھی نہیں ماننے کی، ساتھ جانے کے لیے وہ پہلے ہی انکار کر چکی ہے۔" آمنہ ان کے پیچھے چلتے ہوئے بولی۔

"اب اس کے بابا صاحب نے کہا ہے۔ میں نے تو ان سے نہیں کہا تھا، انہوں نے خود ہی کہا تھا۔ اب تو اسے جانا ہی پڑے گا تم بتاؤ تاکہ یہ صوفی صاحب نے کہا ہے۔ نہیں تو وہ ناراض ہو جائیں گے میں ماشینی جی کے گھر ذرا پیغام بھجوادوں کہ کل گیا رہ بچے سے تم دونوں آجایا کرو گی۔ زینب کو بھی بتا دو جا کر۔" وہ کمرے میں چلی گئیں۔ "اللہ کا شکر ہے بابا صاحب نے کوئی لمبا چوڑا اعتراض نہیں کیا گھر سے نکلنے پر اور مجھے آگے پڑھانے پر بھی۔"

ہائے جی تو میری آرزو ہے کہ میں بھی بھائی کی طرح جنوب پڑھوں وہ بھی شہر جا کر مولی موٹی انگریزی کی کتابیں۔ آج بابا صاحب پڑھائی پر راضی ہوئے ہیں۔ کل شہر بھی بھیج دیں گے۔ میں اللہ میاں سے دعا کروں گی۔ زینب دیکھیں کیا کہتی ہے۔ اسے بتاتی ہوں جا کر۔" وہ تیز تیز قدموں سے وسیع صحن عبور کرتے ہوئے اندرونی کمرے کی طرف بھاگی۔

شہر کے عالم میں وہ "قل کدہ" سے نکل آئے تھے اور اسی طیش کے عالم میں انہوں نے گاڑی بی بی روڈ سے اتار کر گاؤں جانے والی ذیلی سڑک کی طرف موڑ دی۔ آج انہوں نے بہت تیز ڈرائیو تک کی تھی۔ رستے میں انہیں نہیں رکنے تھے، بس اندھا دھند گاڑی دوڑاتے چلے گئے۔ غصہ شدید تھا کہ کہیں تارا انہیں کوئی عام سا گرا پڑا تماشا بین سمجھا ہے جو ہر ناپختہ والی کے پاس جاتا ہے، پچھڑوں ہوں سفر طے ہو تا کیا ان کا غصہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔

آج وہ صحن پر بھند کھول تھی۔ "ذیلی سڑک پر اترتے ہی ان کے ذہن نے نین تارا کے حق میں پہلا سوال جڑا۔

"تین میں اتنے دنوں بھولنے سے ملنے گیا اور بھائے میرا دل سے سواگت کرنے کے ہونا سبق کھول کر بیٹھ گئی۔ آگے اوہر کہہ کی ٹینشن کلم ہے۔ شادی؟" ان کی بھنوں خواجھا تن گئیں۔ "اس کی فرسٹریشن نے میرے اعصاب تھکا دیے ہیں جی چاہتا ہے نہیں بھلا بھالک جاؤں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔ سب رشتے ناتوں کی زنجیریں کاٹ لے۔"

انہوں نے اسٹیجنگ وکیل پر غصے سے منہ مارا۔ سڑک پر آگے ایک سات اٹھ سالہ بچہ بکریوں کا بوڑھنکائے لیے جا رہا تھا، انہوں نے مارا اور بھول کر رکھا تو بھائی بھول گئے۔ ہارن کی کرخت آواز سے بھیاں ہراساں ہو کر سڑک پر اٹھ کر بھانے لگیں۔ بچے نے اپنے انہیں ایک سمت میں بھٹکا دیا اور ہوا گیا۔ انہوں نے گاڑی قفل اسپید پر چھوڑ دی۔ ایک بکری کا تھا سا سفید بچہ جیسا بچہ جو تیزی سے ماں کے پیچھے سڑک کے دوسری طرف بھاگا گا۔ گاڑی کی اسپید اور ہارن کی آواز سے خوفزدہ ہو کر گاڑی کے آگے کھڑا رہ گیا۔ ذرا آگے جا کر انہوں نے یونہی گردن موڑ کر دیکھا اس بچے کے کپلے ہوئے جو جو کہ گرد تمام بکریاں اور مالک بچہ کھڑے تھا۔ "ہو نہ! وہ پھٹکارے،" غصہ معلوم ہے سڑک ٹرنک کے لیے ہوتی ہے تو یوں بھینڈ بکریوں کی چراگاہ بنانے کا مطلب؟ پچھ تو یہی پتہ ہوتا ہے۔" انہوں نے لاہروانی سے سر ہٹا کر انہیں ذرا برابر بھی ملال نہیں تھا، انہوں نے اسپید کم کرنے کی کوشش کی، گاؤں کی حدود شروع ہو چکی تھیں۔

تین تارا بھیج کتی ہے آخر نکاح کرنے میں کیا حرج ہے۔ آخر ہر محبت کا منطقی انجام یہی تو ہوتا ہے اور مجھے تو اس سے شدید محبت تھی ہے اور وہ بھی تو میرے بغیر نہیں رہ سکتی تو پھر شادی میں کیا حرج ہے اور شادی تو دونوں کے ملاپ کا نام ہے نہ کہ بھوری اور بلیک میلنگ کا جیسے آج کل میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ یہ کوئی شادی ہے اگر میرا دل خوش نہیں ہے تو یہ تو مجھے اپنی بربادی لگ رہی ہے۔" اسپید کم پر ان کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے اور اسپید پر رکھا پاؤں بھی۔

"ان تکلیف... نوں بو خوش کن و ولفریب بھی تو بتایا جا سکتا ہے۔" ان کے دل نے راہ بھائی۔ "اگر آج کل میں میں نین تارا سے نکاح کروں، تم از کم میرا دل تو خوش ہو جائے گا اور نین تارا بھی۔ اس مفت کی ٹینشن سے جی ریلیف مل جائے گا، جو آج کل شادی کی صورت میں میرے اعصاب پر سوار ہے اور نین تارا۔ آہ اس کے ساتھ میں اتنی بڑی زیادتی کر آیا ہوں۔" انہیں پچھتاؤوں نے ان کھیرا کیسی بے وردی سے انہوں نے اس کے چوں پیسے رخصت پر بھیج مارا تھا ان کا دل چاہا اسے ہاتھ کو کٹ ڈالیں انہوں نے اضطرابی کیفیت میں ایک دم سے اسپید پر رکھا پاؤں بھیج لیا۔ گاڑی ایک کھٹکے سے رگ گئی۔

"آخر میں اس ساری جائیداد کا تھا وارث ہوں اور بابا جان کا پائی پاس خدا نخواستہ ہو سکتا ہے... آخر کیوں نہیں

ممکن۔ انہوں نے پیشانی کو مسلا۔ "آخر سب کو خدا کے پاس جانا ہی ہے۔ کسی کو آج کسی کو ملے۔" انہوں نے کھینچتوں پر پھینچ کر تھک کر سہری سفید دھوپ کو پوری آنکھیں کھول کر دیکھا۔
"اگر میں نکاح کر لیتا ہوں نہیں تارا سے تو یا جان کے بعد بھلا کون پوچھے والا ہے میں کسی کے آگے جو اب وہ نہیں اور نہیں تارا میں کون سی برائی ہے تو کون سی برائی فیشنل ہے۔ اس کی ماں کا وہ ہند اس کے ساتھ میری نہیں تارا تو کھول کے پاکیزہ پھول کی طرح ہے اور ساتھ تو تمام عمر بھر ہی رہے گی اور شرم میں تو چار کی اجازت ہے پھر کیوں نہ میں اپنے دل کی خوشی پوری کروں۔"

ایک ایک کر کے سوچ کے پھر رات بے تھکے جا رہے تھے اور سب اب دور تک صاف نظر آ رہا تھا۔
"نہیں تارا شہر میں اور سالیہ گاؤں میں۔ کسی کو کیا خبر ہوگی اور ہو بھی جائے تو مجھے کسی کا ڈر نہیں۔" ہر طرف سے تسلی کی صدا آ رہی تھیں۔

"مجھے واپس جانا چاہیے نہیں کے پاس۔ وہ دور ہی ہوئی اس کا دل تو بڑیا کے بچے سے بھی تازہ ہے۔" انہوں نے میرے اس سنگدل رویے پر کیے ٹوٹ کر چور چور ہوا ہوا۔ "اس کے زخم کا مرہم تو اب میری محبت ہی ہوگی ہاں مجھے واپس چلنا چاہیے۔ ابھی اور اب۔"

ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا وہ تو سیدہ تارا کو جو لڑکے کے پاس چھوڑ کر نہیں تارا اسے ملنے گئے تھے دل کے ہاتھوں چھوڑ کر۔ سیدہ تارا کو کھنڈ ڈھنڈ کے بعد آنے کا کہہ کر اور اب تو۔" انہوں نے کھائی میں بندھی کھڑی کے چمکنے والے منہ کی طرف نگاہ کی۔ وہ کھٹے ہوئے کو آتے تھے۔

سارا انہی جیسے ہرگز ہو گیا۔ انہوں نے گاڑی ریورس کی اور پوری رفتار سے بھاگنے لگے کہ اچانک واپس طرف سے دو غورٹیں جیتوں سے نکل کر سڑک کی طرف بڑھیں تو ان کی گاڑی کے نیچے آتے آتے جھیں اور وہ کوئی بگرنی کے پے تو نہیں تھے۔ انہیں سلطان بخت پھل کر آگے نکل چلا۔ انہوں نے دور سے بریک لگائے اور آگے سے باہر کی طرف دیکھا۔ لڑکی پہلے ہی ان کی کھڑکی کی طرف آ چکی تھی۔ وہ صدمہ سے روئے۔

میرے بابا صاحب!
السلام علیکم!

امید ہے آپ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بخیریت ہوں گے۔ آپ کی اور محمد علی کی خیریت کی میں اللہ سے امید کرتا ہوں۔ ماں بی بی بھی بخیر و عافیت ہوں گی میرا اسلام ان کی خدمت میں عرض کیجئے۔
بابا صاحب! میں گاؤں آنا چاہتا تھا مگر مصروفیت کی وجہ سے آ نہیں سکا۔ پہلے "انٹرمیڈیٹ" کے امتحانوں کی مصروفیات تھیں۔ آپ کی دعاؤں اور اللہ کے کرم سے میرے امتحان بہت سہلے ہوئے ہیں اگلے ماہ کے امتحانوں میں آپ سے اگلے ماہ کے شروع میں رزلٹ آنے کی توقع ہے مجھے امید ہے آپ کی دعاؤں سے میرے مارکس بہت اچھے آئیں گے۔

بابا صاحب! عام طور پر لوگ امتحانوں کے بعد کے وقفے کو آرام اور تفریح کے لیے موزوں سمجھتے ہیں لیکن میرے خیال میں یہ ان لوگوں کے لیے ہو گا جن کے پاس واضح مستقبل کا کوئی خاکہ ہو یا خوش امید کی لیے وہافر وسائل ہوں۔ جبکہ میرے پاس ایسا کچھ نہیں ہے اور مجھے اپنے مستقبل کو بہت روشن بہت مضبوط بنانا ہے اپنے زور بازو پر اور ایسا کرنے کے لیے میرے پاس تفریح یا آرام کے لیے وقت نہیں ہے امتحانوں کے بعد کا وقت میرے خیال میں مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے اچھا وقت ہوتا ہے ایگزیم کے فوراً بعد میں نے ایک اکیڈمی داؤن کر لی تھی۔ جہاں میں تھری ایئر کا کورس دو ماہ میں گور کر کے اب سے چار ماہ بعد ہونے والے تھری ایئر کے ایگزیم میں بیٹھنے کے قابل ہو سکوں گا۔ میں نے اپنے پرنسپل صاحب سے بات کر لی ہے تھری ایئر کے ایگزیم کے رزلٹ آنے تک وہ مجھے فوراً تھری ایئر کی کلاسز میں بیٹھنے کی اجازت دے دیں گے اور میں ایک سال میں دو جماعتیں گور کر لوں گا جو کہ میری کامیابی کے لیے پہلا قدم ہو گا۔

بابا صاحب! مجھے بہت آگے جانا ہے مگر بہت اور سیدھے رہتے سے۔ اس کے لیے مجھے وقت کی قدر کرنی ہے۔ اسی لیے میں یہ سب کر رہا ہوں شام کو کچھ پڑھ کر اور انگلش لیکچرنگ کا کورس بھی کر رہا ہوں۔
صبح کے چار گھنٹے ایک دو اساز فیلٹری میں دو ایسوں کی پیکنگ کا کام کر رہا ہوں جس کا کچھ معاوضہ مل جاتا ہے جس سے میں اپنے کچھ تعلیمی اخراجات پورے کر لیتا ہوں۔ لیکن پورے کم میری ضروریات کے لیے کافی ہوتی ہے۔ اس لیے میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ مجھے میرے ماہانہ تعلیمی اخراجات کی مدد میں جو پیسے بھیجتے ہیں اس میں کچھ اضافہ کر دیں تاکہ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنا دل بڑھائی میں لگا سکوں۔ امید ہے آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے اور گاؤں کا چلنی الحلال میں نہیں لگا سکتا میری مصروفیات کے بارے میں تو آپ جان ہی چکے ہیں۔ اس لیے ابھی گاؤں آنا مشکل ہے ہاں جب میں باقاعدہ فوراً تھری ایئر میں ہو جاؤں گا پھر کچھ روز کے لیے گاؤں آؤں گا۔

اماں بی اور بہنوں کو میرا سلام کہیے گا۔ آمنہ کے پیپر کیسے ہوئے ہیں؟ امید ہے اچھے ہوئے ہوں گے اس کے لیے میں اپنے ایک دوست کے ہاتھ نویں جماعت کا کورس بھیج رہا ہوں اس سے کہیے گا کہ پڑھنا شروع کر دے۔ زینب بھی اب لکھنؤ کی تیاری کر رہی ہوگی۔

بابا صاحب! اگر آپ آمنہ کو شہر اسکول میں داخل کروا دیتے تو زیادہ بہتر تھا باقی آپ جو مناسب سمجھیں۔ عبدالعین کیسے ہے اس کا حفظ قرآن کیا جا رہا ہے؟ جویریہ کو میرا پیار کہیے گا۔ اب اجازت دیں۔ امید ہے آپ میری درخواست پر غور فرمائیں گے اور وہیوں میں خاطر خواہ اضافہ کر دیں گے۔ بابا صاحب! میرے بہترین مستقبل کے لیے ضروری ہے۔ نماز پنجگانہ میں باقاعدگی سے ادا کر رہا ہوں اور تلاوت قرآن بھی۔ اجازت آپ کا بیٹا عبدالعین

آخری جملہ اس نے شاید صوفی صاحب کو خوش کرنے کے لیے لکھا تھا جن کے ہاتھ کے بل اس کا خط پڑھتے رہتے گھر سے ہوتے چلے گئے تھے۔ اماں بی ان کے چہرے کے بدلتے زاویوں کا ہنسیا میں ڈوبی چلائے مشاہدہ کر رہی تھیں۔ خط پڑھ کر انہوں نے تہہ کر دیا اور خود جیسے کہیں دور پہنچ گئے۔ ہاتھ پر بل لیے لب تشنگی وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ اماں بی سے صبر نہ ہو گا تو آئندہ کبھی آئیں۔

"کب لکھا ہے عبدالعین نے آنے کے بارے میں۔" وہ پاس آ کر بے قراری سے بولیں۔
"ہوں۔" وہ پوچھنے کے پھر ایک گوراسانس لے کر خط تخت کے سرہانے ڈال دیا۔
"اماں بی! میں آپ نے کب لکھا ہے اس نے آنے کے بارے میں۔" وہ ان کی چپ سے خائف ہو کر بولیں۔
"راہدلی بی! یہ شہر کی ہوائی کڑی کے خیال کی طرح ہوتی ہے دارالتکلیف سب سے حقیر نظر آنے والا جہاں۔ درحقیقت سب سے مضبوط ہوتا ہے جو اس میں ایک بار جکڑا گیا وہ پھر سلامت واپس نہیں آسکتا۔" وہ اپنی ڈاڑھی کو سلجھانے لگے۔ "اللہ ہو۔" آسمان کی طرف نگاہ دوڑا کر انہوں نے کہا۔
"اللہ نہ کرے صوفی صاحب! کیا مطلب۔" اماں بی کچھ دال کر بولیں۔

"راہدلی بی! اب عبدالعین کا اس پیمانہ گاؤں میں آنا بہت مشکل ہے اسے آگے جانا بہت بہت اپنا مستقبل سنوارنے کے لیے۔ اس نے خط پیسوں کے لیے لکھا ہے نہ کہ آنے کے بارے میں بتانے کے لیے اس کا آنا ناممکن ہی سمجھو۔" اماں بی منہ کھولے انہیں دیکھے گئیں۔ "مغرب کی اذان ہونے والی ہے میں اب چلتا ہوں۔" انہوں نے کھٹکھار کر گلا صاف کیا اور متوازن قدموں سے چلتے ہوئے باہر نکل گئے۔
اماں بی نے خط اٹھایا اور اندر کر کے کی طرف بڑھ گئیں۔

"آمنہ سے براہو اتنی ہوں۔ یہ تو مشکل مشکل باتیں کرتے ہیں۔ پچہ پڑیس میں ہے پیسوں کی ضرورت تو پڑتی ہی ہے تو بھلا تارا کیسے دل دکھائے والی۔" مین کو سیاں کرنے لگ گئے ہیں اب صوفی صاحب۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

50700

”سہیل ڈیڑھ گھنٹہ پہلے جاؤ اب۔۔۔ رینگی آئی قفل بور۔۔۔ سیاہ ڈھیلی ڈھالی سکی نائی میں ملبوس ہاتھ سے جمائی روکتے ہوئے ریم رائڈنگ سیکل پر ایک فائل میں سر دیے سہیل سے بولی۔“

”ہوں۔ آ رہا ہوں۔ سو جاؤ تم۔“ وہ جیسے چونک کر بولا۔

”ڈارلنگ کم تھن۔ مجھے سینڈ نہیں آ رہی۔ باتیں کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔“ اس نے بیڈ پر پھیلتے ہوئے ایک صبرور آنکرائی لے کر کہا۔ سہیل ایک لمحے کو فائل شامل سب بھول گیا۔

”یار آتا ہوں، مجھے اس طرح سے ڈسٹرب نہ کرو۔“ وہ اس کے پوز سے نکلیں چرا کر بولا اور فائل کو پھر سے پڑھنے لگا۔

”آخر اس فائل میں کیا ہے تم گھنٹہ بھر سے اس سو کن پر نگاہیں جمائے بیٹھے ہو۔“ وہ تھلا کر اٹھ بیٹھی۔

”بنیانا ضروری ہے۔ بڑا اہم نوٹ لکھنا ہے مجھے، تم مجھے سیکورٹی سے کچھ کرنے دو تو پھر ہے نا۔“ سہیل چڑھ کر بولا۔

”معاملہ کیا ہے۔ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ نا۔“ وہ اٹھ کر آئی اور اس کے بالوں کو اپنی ریشمی انگلیوں سے سلجھاتے ہوئے پارتے ہوئے۔

”پینک لون کا مسئلہ ہے، نوڈ منسٹر کے اسپیشل ایڈوائزر کا کیس ہے اس کو ڈیڑھ گھنٹہ کروڑ کا لون چاہیے۔ اس سے مجھے بہت سے کام رہتے ہیں اور وہ منسٹر صاحب کے ذریعے منٹوں میں میرے کام کروا بھی دیتا ہے بڑا مہمان دوست ہے۔“

”اب اسے کام پڑتا ہے تو ہمارے پاس صاحب آگئے ہوتے ہیں اگر ان حضرت کے ذمے پہلے ہی پانچ کروڑ کا ترغیب وایب الاوائس ہے، پہلے وہ اس کا پتھ کریں پھر اگلی منظوری ہوگی۔“ سہیل نے کسی سے ٹیک لگاتے ہوئے ریشم کے بالوں میں حرکت کرتے ہاتھ کو نرمی سے اپنے ہاتھ میں لے کر ہمارے معاملہ اسے سمجھایا۔

”باس کا مسئلہ کیا ہے؟“ وہ گھوم کر آگے آئی اور سہیل سے اپنی نازک لہر نکا کر بولی۔

”شاید ایمان داری۔“ سہیل نے قیاس کیا ”لیکن نہیں اس کا پتھلا ریکارڈ اتنا ہی شفاف نہیں ہے اس طرح کے خاصے کام موصوف پہلے انجام دے چکے ہیں۔ حالانکہ واسطی صاحب نے اچھی خاصی گولڈن آفر بھی کی ہے اسے ای سیکرٹ میں دو سو گز کے پائٹ کی عمر وہ ماننا ہی نہیں اور مجھے یہ کام کروانا ہے وہ پائٹ ہمیں بھی تو مل سکتا ہے“

”واؤ۔“ کریم مسرت سے بولی ”ونڈر فیل اگر ایسا ہو جائے تو۔“

”منر مشکل ہے نا۔ کیس اپرو ہو تو پھر ہے نا۔“ سہیل مایوسی سے بولا۔

”تم کہو تو میں کوشش کروں۔“ اس نے سہیل کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

”تم؟“ وہ حیرت سے اس کی طرف آنکلی اٹھا کر بولا۔ ”تم کیا کرو گی وہ تو اسٹون مین ہے بلکہ آئرن مین۔“

”ڈارلنگ حسن کی گرمی سے تڑپے بڑے پتھر پھسل جاتے ہیں اور لوہا ہو تا ہی پھسلنے کے لیے ہے پھر جیسے چاہو بحال لویو نو۔“ وہ ایک ادا سے لہرائی اور اس کے کندھے سے ٹک کر بولی۔

”سب ہماری طرح موم کے نہیں ہوتے میری جان! محبت کی ایک کرن پڑی اور سیال بن کر بیٹھے لگے۔“ سہیل نے جھک کر اس کے چہرے کو اپنے ہونٹوں سے پھوسا وہ زور سے ہنس پڑی اور فائل اٹھا کر دیکھنے لگی۔

”تمہارا پاس ہم جانتے؟“ فائل پڑھتے پڑھتے وہ کچھ دیر بعد بولی۔

”میرا خیال ہے جانتے۔“ وہ ہنسنے سے کھیلنے ہوئے بولا۔

”اسے پاس کا سامنا کرو پھر دیکھتی ہوں وہ کتنے پانی میں ہے۔“ اس نے فائل بند کر کے میز پر پھینکی۔

”یار آپے کام بہت مشکل ہے اور میں اسے ہر حال میں کرنا چاہتا ہوں اگر یہ منظوری ہو جاتی ہے تو ریم ڈارلنگ! ہمارے وارے تیار۔“ وہ ہنسنے لگا۔ پائٹ کے علاوہ بیڈ کوارٹرس میں بروموشن اور اس کے بعد ترقی کی بیسی لائن کو عبور کرنا کچھ دشوار نہیں۔“ سہیل کی آنکھیں ایسے حسین مستقبل کے خواب بننے لگیں، جسے ایک رکاوٹ کے

عبور کرنا کچھ دشوار نہیں تھا۔

”سہیل! بتا ہے میں نے تمہارا انتخاب کیوں لیتا تھا مالک۔ یہ تو تمہیں بھی معلوم ہے میرے گرد پروانوں کا نجوم تھا اور تمہارے وقیان ہی بیک گراؤنڈ کے باوجود مجھے تم ہی کیوں بھائے تھے۔“ وہ جا کر ڈر رینگ ٹیبل کے آگے بیٹھ گئی اور شیشے میں بلیک کلر میں اپنے دستے رنگ وروپ کو دیکھ کر خود ہی محظوظ ہونے لگی۔

”اس سپاس نامے کو دہرانے کا یہ کون سا وقت ہے۔“ سہیل نے کچھ ناگواری سے کہا۔

”ہے ناؤ پیر۔“ وہ ہر ش اٹھا کر نرمی سے اپنے براؤن ریڈ بالوں میں کرنے لگی۔

”تمہاری پناہ میں نے اس لیے کی تھی کہ تم میں آگے بڑھنے کی بہت لگن ہے اور اس کے لیے تم کوئی بھی Source (ذریعہ) استعمال کر سکتے ہو۔ تم اسٹیشن کی بیس کا ہر طرح سے مقابلہ کر سکتے ہو۔ آگے والے کو گرا کر یا پیچھے والے کی ہمدردی پا کر۔“ مجھے تم میں یہی بات بھائی تھی۔ ”اس نے بال ایک جھٹکے سے لہرائے۔“ فوراً تمہاری کلر میں اس طرح کے Germs کا ہونا بڑی مشکل بات ہے۔ وجہ تمہاری کلر اس کے والدین کا اولاد کو حق حلالی کی صفائی کھانے کا مان کر ان کی اولاد شارت کنس میں نہیں بھٹک سکتی۔ مان تو تمہارے والد صاحب کا تھا کہ تم کچھ ہی غلط نہیں کر سکتے۔ ان کے کوڈ آف مورٹلٹی کے خلاف ہے نا۔“ وہ مسخرے سے ہنسی اس نے ایک ادا سے شیشے میں خود کو دیکھا۔ ”مالک ایم آئی رائٹ۔“

”نہیں۔“ سہیل نے بے حد عجب کہا۔

”تمہاری تربیت میں انہوں نے لاقی کی نہیں چھوڑی تھی، صرف دولت کی کمی کے سوا۔“ اس نے ہنسنے سے اسے سہیل پر ہنسا نہیں۔ سہیل خفیف سا مسکرایا۔

”اور اسی چیز نے تمہارے اندر بہت سی خواہشات کو جنم دے دیا اور ان تینہ خواہشوں کو صرف دولت ہی پورا کر سکتی تھی اور ڈارلنگ۔“ وہ ایک بھی میں تم کو اس میں حق بجانب سمجھتی ہوں۔“ اس نے ٹائٹ کریم کی پائل لہرائی۔

”آخر ہمیں زندگی ایک بار ہی ملتی ہے اسے ترس ترس کر سسک کر کیوں گزاریں۔ میرا تو یہ آئیڈیا ہے۔“ وہ نرمی سے کریم ہاتھوں پر ملنے لگی۔

”مالک۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔“

”اچھی زندگی گزارنا صرف معاشرے کے چند لوگوں کا حق نہیں ہمارا بھی تو ہے۔ وہ کون سا آسمان سے اترے ہیں کہ دنیا میں جنت کے عزت لو میں اور ہم ایک ایک چیز کو ترسیں۔ اس ترس سے کس قدر فرسٹریشن پیدا ہوتی ہے اس کا اندازہ شاید تمہیں بھی نہیں۔“ سہیل! میرا بچپن اسی ترس کا شکار تھا جب مجھے پھولی سی الیکٹریک ڈول کے ٹریسٹ کے ایک پیکٹ کو حسرت سے دیکھنا پڑا تھا میرے پیرنس مجھے جنم دینے کے سوا کوئی بھی کمال نہ کر سکے میرے لیے مجھے ایسی ترس زدہ حقیر زندگی سے نفرت تھی اسی لیے میں نے بہت بچپن میں ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ایسی زندگی نہیں گزاروں گی ”اچھی زندگی کی جو بھی قیمت مجھے ادا کرنی پڑی میں کروں گی۔“ وہ اب کریم کو زور زور سے ہاتھوں پر رگڑ رہی تھی۔

”میرا بھی یہی خیال ہے پتا ہے ہمارے ابو کا موٹو کیا تھا، تھوڑا کھانا، مگر حق حلال کا کھانا۔ ساری زندگی حلالی حلال کی گردان سنے میرے اندر سے اس جذبے کی محبت ہی حلال ہوئی۔ پھوٹا تھا خواہشیں بھی جھولی جھولی تھیں ”اچھا اسکول، اچھا بیک، اچھے شو، اچھا بابا ڈریس کچھ بھی میری دسترس میں نہیں تھا، ہم معمول کو مٹنے مٹنے کھانوں سے کھیلنے دیکھ کر حسرتوں کی جوالا مٹی اور بھڑک اٹھتی تھی۔ بڑا ہوا تو حسرتیں بھی جوان ہو گئیں، اچھی شرت سے لے کر اچھے ہوتے تک اچھے تعلیمی ادارے سے لے کر اچھی گاڑی تک سب کو حسرت سے سوچا کرتا تھا۔ اچھی گاڑی تو دور کی بات عام سی سیکنڈ ہینڈ کرولا بھی ہمارے لیے کوئی عجوبہ خاص تھی بس ان ہی حسرتوں نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں اپنے بارے میں صحیح فیصلہ کر سکوں، آخر معاشرے میں اور بھی تو لوگ ہیں جو ہر جائز

و تاج تازہ طریقے سے نکالتے اور اڑاتے ہیں۔ وہ کس کی پگھلاؤ میں ہیں نہ قانون کی نہ خدا کی۔ خدا تو تماشا دیکھ رہا ہے اور قانون کو پیسے کے ذریعے تماشا بنایا جا سکتا ہے ہمارے معاشرے کی سپر پاور پیسہ ہے اور ریشم مجھے اس سپر پاور کو کھر کی اوہڈی بنانا ہے چاہے مجھے اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے۔ اس کے انداز میں ذرا بھی چلک نہ سگی۔

"Yes that the man I chose for me"

(ہاں) کی وہ آوی ہے جو میری پسند تھا اور جوش سے بولی۔

سہیل! بس ہر معاملے پر ڈیٹنگ میں تمہاری پارٹنر ہوں مجھے تم صرف وائف نہ سمجھنا گھر کا چارج۔ وہ

استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

"حرام حلال کی تفریق صرف رزق کے معاملے ہی میں ہمیں بہت سی لذتوں سے محروم نہیں کرتی بلکہ زندگی کے ہر معاملے پر اپنی ناک اڑاتی ہے۔ بیوی تو میں تمہاری ہوں۔ یہ ایسی سبب مجھ پر سے کوئی نہیں اتار سکتا لیکن اگر میرا حسن میرا وجود کہیں بھی ترقی کے سلسلے میں تمہارے کام آسکتا ہے تو سہیل! میں سوچنے کے لیے ایک بل بھی نہیں مانگوں گی تم بھی یوٹیلٹی نوسٹی مردوں کی طرح اس بات کو اتنا غیرت اور جھولی عزت کا مسئلہ بنانا نہیں ایک دوسرے کو سمجھنا چاہیے ہم سمجھ رہے ہونا۔" وہ اسے مت کچھ سمجھا رہی تھی۔

"ہاں۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو بہت کچھ حاصل کرنے کے لیے ہم دونوں کو بہت کچھ کہنا پڑے گا تم فکر نہ کرو۔ میں یوٹیلٹی نوسٹی مرد نہیں ہوں ہویوٹی کو سات پرووں میں چھپا کر اسے بے کاری کی شہلا بنانا ہے میں تو اس بات پر فخر محسوس کروں گا کہ سب کو معلوم ہو کہ میرے پاس کون سا کوہ نور ہے۔ میں اس معاملے میں ذرا بھی mind Congested (جنگ ذہن) نہیں ہوں۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔"

اس نے مجھے ریشم کی مسوختی کی ہر رکاوٹ کو دور کر دیا۔ اب وہ خود کو مکمل طور پر آزاد محسوس کر رہی تھی سب کچھ کرنے کے لیے۔

"آئی براؤڈ آف مانی چو آس۔" وہ فخر سے بولی۔ "نکل مجھے اپنے ایم پی سے ملانا ہے۔ میں صرف دور سے مجھے دیکھا دیکھ کر شہ و دیکھنا اپنی پرنس کا۔" وہ اطمینان سے بیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"اور اب اس بوگس فائل کو بند کرو۔ اس پر نوٹ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اب تمہارا ایم ڈی خود لکھے گا۔ تاؤ کم آن۔" وہ کہتے ہوئے لستریڈر آؤ گئی۔ سہیل نے مسکرا کر فائل بند کی۔

"میں ذرا پیچ کر کے آتا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے ڈور رنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

♥ ♥ ♥ ♥

"کس قدر ناقابل یقین بات لگتی ہے میں نے بھلا اس قدر محنت کب کی تھی پھر بھی۔ پتا نہیں لگتا مجھ پر اس قدر مہربان کیسے ہو گیا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اس کا شکر کیسے ادا کروں۔"

وہ کتنی دیر سے گولڈ میڈل اور اعزازی سرٹیفکیٹ سامنے رکھے بیٹھا تھا۔ آج کے اخبار میں اس کی تصویر بھی آئی تھی اور اس کے خیالات کا اظہار بھی۔ اس نے ناظم اور نائب ناظم دونوں سے معافی مانگی تھی کہ اسے گلے فکڑ دینے کے ساتھ نہیں جانا چاہیے تھا۔ وہ ان تینوں سے دل ہی دل میں ناراض بھی ہو گیا تھا کہ ان کی کھلی حرکت کی وجہ سے اسے سب کے سامنے اتنی ہمت اور ذلت اٹھانا پڑی مگر ان تینوں نے اس کی ناراضی کی پروا کیے بغیر اسے خوب گلے لگا کر مبارکباد دی تھی اور ریشم کا مطالبہ بھی کیا تھا وہ سب باتوں کے جواب میں خاموش رہا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے یہ تو لے گا تو ہو گا؟" پیچھے سے وہ ظفر کی آواز پر اچھل ہی پڑا اس کا اشارہ معاذ کے ہاتھ میں پکڑے گولڈ میڈل کی طرف تھا۔

"کیا مطلب؟" اس نے ماتھے پر ہل ڈال کر پوچھا۔

"تو بڑی میری مینا کے تو ٹھیک ٹھاک پر پز سے نکل آئے ہیں۔ ایک ہی رات میں۔ صحیح ہے یعنی مشرت کا اپنا ہی نشہ ہوتا ہے جس کے سر پر چڑھ جائے اس کی نزدیک کی نظر اچھی خاصی کمزور ہو جاتی ہے اور دور تو وہ دیکھنا ہی

70

نہیں۔" ظفر نے زور سے معاذ کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"مفنیول یا نہیں نہ کیا کرو۔" معاذ نے کچھ غصے سے کہہ کر میڈل جھلیں ڈلی میں ڈالا اسے لٹافے میں بند کر کے اسے آگے بڑھے اپنی بیس میں رکھنے لگا۔

"کیا بات ہے میری جان! ایک ہی رات میں ہماری باتیں فضول ہو گئیں۔ بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے ویسے لگا خرید لیا ہے تم نے؟" وہ لہجے کی ٹون بدل کر ذرا اہم روی سے بولا۔

"وہ کس لیے؟" معاذ اسی جھکے چوتون سے بولا۔

"یعنی اس خزانے کو محفوظ کرنے کے لیے کم از کم لگا تو خرید لو بلکہ دو لو۔" اس نے آنکھ سے ڈلی میں بند میڈل کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" اس نے منگلی سے کہتے ہوئے سرٹیفکیٹ ایچی میں رکھ کر اسے بند کر دیا۔

"لو مجھ کو پھر کتنا۔ خبر نہ ہوئی وہ کیا ہے۔" اس نے انگلی سے چھٹی کو پتھپتھاپایا۔ "سسٹی اے تیرا لیا شہر کچھ جھوٹا ہے۔" وہ ٹکٹا لیا۔ لہجے میں بہت کچھ تھا۔ معاذ ایک لمحے کو چپ کر گیا۔

"اگر چاہا تو مجھ کو بناؤ تیار ہی ہے تمہاری۔ ابھی دو بجے کی گاڑی سے نکلتا ہے مجھے تو گاؤں کے لیے۔ چلنا ہے میرے ساتھ۔" اس نے معاذ کا دھیان دوسری طرف لگا دیا۔ وہ چپ رہا۔

"تین اور شیر کہاں گئے؟" معاذ نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"تین تو اپنی چوہ پیس کے پاس فیصل آباد چلا گیا اور شیر اور احمد ایک ورکشاپ میں کام کرتا تھا اب وہیں رہ لے گا۔ تم پھر تیار ہو۔" اس نے پھر کہا "میں ڈیڑھ گھنٹہ بستر باندھ کر آیا ہوں تم سے پوچھنے آیا تھا ساڑھے بارہ ہونے والے ہیں۔ تینا ہے تو تیناؤ۔" وہ کھڑے ہوئے ہوتے ہوئے بولا۔

"میں چھپو نہیں آتا ہوں۔ ذرا یہ میری لوں۔" اس نے اس پر ڈالنا سوٹ شدہ کرتے ہوئے کہا۔

"پتھو مجھ سے۔ جلدی اور کھر میں انتظار کر رہا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

"یہ ظفر کا پتہ نیت کا خراب ہے۔ اس کی نظر میرے میڈل پر ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے مجھے مارنے سے بھی گریز نہیں کرے گا مجھے میڈل ساتھ میں لے کر جانا چاہیے پھر کہاں رکھوں اسے۔" وہ سوچتے ہوئے پڑ گیا۔

"آئیڈیا۔" کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے خود ہی چنگلی جھلی اور میڈل کی ڈلی اپنی سے نکال کر میس کے اندر چھپائی اور احمد اور شیر سے ہونے باہر کی طرف بڑھ گیا۔

♥ ♥ ♥ ♥

"بھئی! ابو جتنا! کہاں مر گئی ہو۔" رعنا نے لاؤنج کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر آواز لگائی۔ اسی وقت ایک چائیس سالہ اوجیز عمر عورت کیلے ہاتھ چاؤر کے پلو سے صاف کرتی اندر داخل ہوئی۔

"جی ٹیکم صاحب! آپ نے آواز دی۔" وہ شاید بھلا بھلا لگا آئی تھی اس کا سانس کچھ پھولا ہوا تھا۔

"آواز کی زنی! کتنے بھر سے چیخ رہی ہوں کم سنائی دیتے ہیں۔ رعنا غصے سے دانت پیستے ہوئے جھنجھلا کر بولی۔

"میں نے تو جیسے ہی سنا فوراً بھاگی آئی۔" وہ سر جھکا کر عازت ہی سے بولی۔

"فوراً بھاگی آئی۔" رعنا بڑبڑاتی "پگن کی کیا پوزیشن ہے؟" کچھ دیر بعد وہ اپنے غصے پر قابو پا کر بولی۔

"جی کیا مطلب؟" وہ ناگہجی سے ہونک کر بولی۔

"مطلب تمہارا سر۔" رعنا کو پھر پیش آیا۔ "بھئی! میرا جی چاہتا ہے میری اب چھٹی کر دوں۔ سبھی کئی ہے تو اب بات تیرے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہے چاہے جیسی بھی ہو۔ میں بکواس کر رہی ہوں مینو میں کیا کیا پکایا ہے معلوم ہے مجھے یا وہ بھی بھول گئی کہ آج تین بجے صاحب کو آتا ہے اور اب ایک بج رہا ہے۔ مجھے ابھی تیار ہو کر انہیں اپریورٹ لینے جانا ہے۔"

وہ وقت کی کمی کی وجہ سے اور کچھ بھئی کی بدحواسیوں کی وجہ سے بری طرح سے جھنجھلا رہی تھی اسی وقت

"اسے رہنے دو تمہیں یہ مرد تو ہوتا ہی سہا نے کاسا تب ہے کس وقت ڈس لے اس کا کوئی پتا تھوڑی ہے اور تم سدا کی بھولی بس اعتبار کیے جانا۔ رہنا بے وقوف! آنکھیں اور کان کھلے رکھا کر یہ فخر جو جلدی جلدی باہر کے دورے کرتا ہے۔ اس کے ساتھ خود جایا کر ورنہ ایک دن بچھتاؤ گی۔" وہ اس کا دل دہلانے لگی۔

"خدا نہ کرے۔ بھابھی! فخر ایسے نہیں ہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ آپ فضول میں شگ نہ کریں۔"

"اسے شک نہ کروں تو اور کیا کروں۔ بتاؤ مجھ سے تم نے کہا تھا کہ ایک ہفتے کے لیے فخر جا رہے ہیں اور بیس دن لگا کر آئے بولوے ناشک کی بات۔" وہ آنکھیں پھیلا کر بولی۔

"کام سے گئے تھے وہ میرے پائے پر نہیں گئے تھے۔ روز دو بار فون کرتے تھے کہ کام کی وجہ سے رکنا پڑ گیا ہے ورنہ وہ کہاں رہنے والے ہیں۔" وہ فخر کی صفائی میں بولی۔

"اچھا بی بی! ہمارا کام تو سمجھانا تھا، آگے تمہاری مرضی ڈیڑھ بج رہا ہے۔ میں نے تو صبح ناشتہ بھی باکالیا تھا پورا کسی ملازم کو آواز تو دو کھانے کے لیے۔ میں تو بازار بھی گھنٹہ پھرتی رہی ہوں۔ بڑی زوروں کی بھوک لگ گئی ہے۔" عفت آرا لہتے ہوئے صوفے پر ہی نیم دراز ہو گئی۔

"نزدت بیٹا! میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تم سے کچھ باتیں کر سکوں۔" شہباز خان ایڑی چیر پر بیٹھے تھے۔

"کیسی باتیں ابو جی؟" وہ پوری توجہ سے بولی۔ ہاتھوں کے کنوڑوں میں معصوم سا چہرہ لگائے اپنی طرف محبت سے دیکھتی وہ انہیں پھونکی سی گڑیا لگی۔ پتا نہیں اس کی گڑیاں رکھنا نصیب ہوئی ہیں یا نہیں۔ ان کے دل نے آہ بھری۔

"باتیں کیا بیٹا! بس یوں ہی دل چاہ رہا تھا، تمہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کو۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"تو ابو جی! میں تو سارا وقت آپ ہی کی طرف متوجہ رہتی ہوں اور مجھے ہر میں کام ہی لیا ہے۔" وہ گری ان کے قہقہے کر کے بیٹھ گئی۔

"وہ تو گھر کے کاموں میں ادھر ادھر لگی مجھے کچھ وقت دے رہی ہو۔ ورنہ میں تو تمہاری فراغت کا ہی انتظار کرتا رہ جاتا ہوں۔ کب تم فارغ ہو گے ہم باپ بیٹی بھر کر باتیں کریں۔" وہ محبت سے بولے۔

"ابو جی! آپ مجھے کہہ دیا کریں۔ جب آپ کا دل چاہے اور گھر کے کام کون سے خاص ہوتے ہیں۔ صفائی ستھرائی اور کھانا پکانا اور یہ تو سب چلتا ہی رہتا ہے۔"

"سہیل! کیا؟" حالانکہ وہ ابھی ان سے مل کر گیا تھا پھر بھی پوچھ بیٹھے۔

"بی ابو جی۔ ابھی تو آپ سے مل کر گئے ہیں۔"

"ہوں معلوم ہے مجھے۔" وہ کسی سوچ میں پڑ گئے وہ ان کی شکل دیکھنے لگی۔

"ابو جی۔" اس نے دھیرے سے پکارا۔ میروں کلر کے ساتھ سوٹ میں اس کی گندمی رنگ دمک رہی تھی۔

"بیٹا! میری زندگی کا کچھ۔"

"ابو جی پلیز۔" اس نے اپنا ہاتھ ان کے منہ کے آگے رکھ دیا۔ "ابو جی! میں نے آپ کی وجہ سے خود کو سنبھالا ہوا ہے۔ اگر آپ اس قسم کی باتیں کریں گے تو میں بھی ٹوٹ پھوٹ جاؤں گی۔" اس کی آواز بھرانے لگی تہ عمر زیادہ تھی نہ حوصلہ۔

"معلوم ہے مجھے۔" ان کا سر جھک گیا۔ "مگر بیٹا! کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے لیے حوصلہ کرنا ہی پڑتا ہے۔" وہ نامعلوم کیا کہنے جارہے تھے۔

"ابو جی۔" وہ کچھ کہتے کہتے رنگ لگی۔

"بیٹا! خدا جانے آگے کیا حالات پیش آئیں تم بہر حال۔" وہ چپ کر گئے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ دونوں

اس کسی سوچ میں گم تھے۔

"تمہاری ماں کا زیور کدھر ہے؟" کافی دیر بعد ممتاز خان نے غیر متوقع سوال کیا۔

"لا کر میں ہے ابو جی! ماری لگے۔"

"لا کر کی چابی کس کے پاس ہے۔"

"میرے پاس۔" وہ حیرانی سے بولی۔

"ہوں۔ نزدت! وہ زیور تمہارے لیے ہے اگر کبھی اسے استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئے تو بے دھرمک استعمال کر لینا کہ وہ تمہارا ہی ہے۔"

"ابو جی! کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" وہ رووینے کو تھی۔

"میں نے عابدہ سے کہا تو ہے جلد سے جلد کا۔ لیکن پھر بھی پتا نہیں کون جیتتا ہے ہماری تدبیر یا تقدیر۔" ابو جی۔ "وہ رووینے پڑی۔"

"بیٹا! میں تمہیں حقائق سے آگاہ کرنا چاہ رہا ہوں۔ جو میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ تم نہیں دیکھ سکتیں۔ سہیل میرا بیٹا اور تمہارا بھائی سہی لیکن میں نے اس کی آنکھوں میں وہ اجنبیت دیکھی ہے جس نے مجھے یہ سب سوچنے پر مجبور کر دیا ہے پتا ہے بیٹا! جب بیٹوں میں فرق آتا ہے تو آنکھ خود بخود جھٹی بن جاتی ہے ایسی آنکھ سے پہچان اٹھ جاتی ہے اپنے کی دوست کی اور پرانے کی ایسی آنکھ بے دید بے لحاظ اور بے مروت ہو جاتی ہے اور ایسے میں کچھ بھی بعید نہیں تم اپنا حوصلہ مضبوط کرو اور خود پر اعتماد کرنا سیکھو ہر اس بات پر عمل کرنا جو تمہارا دل کہے کہ صحیح ہے۔" وہ ذرا رکے۔

"نزدت! یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ حق و باطل کی پہچان کا پیمانہ ہمارے اندر ہی ہوتا ہے وقت پڑنے پر اسی کو استعمال کرنا۔ تمہاری سچ رہنمائی کرے کہ عورت جو اس کی بیوی ہے اس کی صحبت سے رہیز کرنا ہر طور اور سہیل! میں اس کے بارے میں کیا کہوں۔ اب اپنا خون بے وفا کی براتر آئے میرا حال میری دعا میں تمام زندگی تمہاری راہوں میں رو سنی کرتی رہیں گی۔ اس کا مجھے یقین ہے اور تم بھی یہ یقین رکھنا اور کبھی کسی غلط راستے پر قدم نہ رکھنا۔ چند باتیں تمہیں جو تم سے کرنا تھیں۔" لاؤنج میں فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

"بیٹا! فون سنو جا کر۔" انہوں نے تھک کر بیٹھ کر سی کی بیک سے نکادی۔

وہ کم صدم اٹھ کر فون سننے چل دی۔

"ہیلو السلام و علیکم۔" اسے آواز کچھ جانی پہچانی لگی۔

"و علیکم السلام۔" وہ بے خیالی سے بولی۔

"سہیل! خیال ہے پہچانا نہیں۔" وہ سری طرف آواز فریش تھی۔ وہ لمحے کے ہزاروں حصے میں پہچان گئی۔

"ہیلو ہیلو بھئی گدھر گم ہو تم۔" دوسری طرف بے تابی زیادہ تھی۔

"سن رہی ہوں۔ سچ کیوں رہے ہیں۔" وہ تنک کر بولی۔

"بد تمیز! ایسے بولتے ہیں۔ ویسے کیا سن رہی ہو۔" انڈیا آؤ پھینٹنے والا تھا۔

"ابو آپ فرما رہے ہیں۔" وہ اب پوری طرح متوجہ تھی۔

"میں نے تو ابھی کچھ فرمایا نہیں جس روز فرماؤں گا محترمہ کے حواس ٹھکانے آجائیں گے۔"

"تپ کی کس پائی ہے میرے تو پہلے ہی حواس ٹھکانے آچکے ہیں۔" اسے ابو جی کی باتیں یاد آئیں۔

"خیر بہت ہے۔" عجب سے پوچھا گیا۔

"خیر بہت ہی ہے۔" اس کا لہجہ دھیما ہو گیا۔ "اس وقت فون کرنے کی کیسے زحمت کی؟" اس کی نظر تیارہ بجاتے کلاک پر پڑی۔

"اچھا وقت ہمیشہ دیر سے آتا ہے نا۔" شہباز خان کے لمحے میں ہنرارت تھی۔

”اور رے وقت کے بارے میں کیا خیال ہے وہ بہت اہستگی سے گزرتا ہے۔“ اس نے طنز کیا۔
 ”تڑپت! تم کبھی اچھی بات نہیں کر سکتیں مجھے تو کبھی کبھی شک ہونے لگتا ہے۔“

”کیا؟“ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

”یعنی کہ اس رشتے میں تمہاری رضا شامل نہیں۔“

”اگر ایسا ہو تو پھر۔“ وہ اکھڑے لہجے میں بولی۔

”تو کبھی کچھ نہیں۔ ہم فوجی، جوان زبان کے کہے ہوتے ہیں وعدے کے مضبوط۔ آزمائش شرط ہے۔ مقابلہ کی مرضی کی پروا نہیں کرتے۔“ پوری ہوشیاری سے کہا گیا۔

”Time will quility every thing (وقت سب کچھ ثابت کر دے گا) وہ جواباً بولی۔

”شیدر شیور۔“

”پتھر پتھر ٹھیک ہیں؟“ اس نے موضوع بدلا۔

”معلوم نہیں ابھر سے بند کر کے ابھر کر لوں گا، مگر اب تو وہ سوچنی ہوں گی۔ صبح کروں گا۔“

”تو اتنی رات کے فون کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا آپ کو شاک تھا کہ صبح نہیں ہوئی۔“

”صبح کا تین بجے تو ہے وہ سو سے بڑھ کر ہے مگر اس وقت دل نے افسوس کیا تھا کہ تم انتظار کروا رہی ہو گی۔“

”ابھا تو اب بھی دل کے اشاروں پر عمل کرتے ہیں۔“

”تمہیں نہیں معلوم۔“ بڑا جتانے والا اصرار تھا وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔

”ماں جان کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں اب۔“ وہ افسردگی سے بولی۔

”کیا مطلب۔“

”یہاں میں کیوں اتنی مایوس کن باتیں کرنے لگے ہیں میرا دل بہت پریشان ہے۔“ وہ کوشش کے باوجود بے اختیار ہی ہو کر کہنے لگی۔

”تم تو بہادر ہو تڑپت! مایوس جان بیماری کی وجہ سے ڈپریشن ہیں اور کوئی بات نہیں۔ تم ان کو حوصلہ دیا کرو۔“

”وہ میری کہاں سنتے ہیں۔ ابھی ابھی ایسی ایسی باتیں کر رہے تھے کہ میں۔“ اس کی آنکھیں پھر سے پھیلنے لگیں۔

”اچھا تم زیادہ نہیں نہ ہو سب ٹھیک ہو جائے گا میں اسی ہفتے شاید پکڑا لوں۔ اصل میں سہیل بھائی کی وجہ سے وہ بہت Lonely (ایکے) محسوس کرتے ہیں تم ان کو تا تم زیادہ دیا کرو انہیں اچھی اچھی کتابوں کا شوق ہے وہ

ان سے ڈسکس کیا کرو اسی بہانے تمہیں بھی کچھ پڑھنا آجائے گا۔“ وہ جو بڑے دھیان سے اس کی باتیں سن رہی تھی آخری جملہ سن کر تلملا اٹھی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا مجھے پڑھنا نہیں آتا یا مجھ میں اچھا پڑھنے کا ذوق نہیں ہے۔“ وہ غصے سے بولی۔

”میں نے یہ کب کہا۔“ وہ مصنوعی بھول پن سے بولا۔

”آپ! وہ واہنت نہیں کر رہی تھی۔“

”ہاں بولو تا آپ؟ میں تمہیں بہت یاد آتا ہوں مجھے بہت مس کرتی ہو تم نہ ہے نا یہی کہتا چاہ رہی تھیں نا۔“

شہباز خان نے جلدی جلدی کہا۔

”اچی نہیں خوش تھی ہے آپ کی۔ فون بند کریں میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہ رہی۔“ وہ غصے سے بولی۔

”لو اپنا دل چاہ رہا ہے باتیں کرنے کو اور مجھے کہہ رہی ہو کہ فون بند کروں۔ تم کرو فون بند۔“ اسے چھیڑنے میں شاید اسے مزہ آتا تھا۔

”فون میں نے نہیں آپ نے کیا تھا۔“ وہ بھی ہوشیاری سے بولی۔

”معلوم ہے تا میں فون بند نہیں کروں گا اور تم یونہی غصے میں مزے لیتی رہو گی دل میں تو پتھر پتھریاں

پناٹے لٹو اور معلوم نہیں کیا کیا پھوٹ رہے ہوں گے ہے نا۔“ تڑپت، جل کر رہ گئی۔

”یہی کوئی بات نہیں۔ بھاڑ میں کیا فون لٹو پتھر پتھریاں اور پناٹے۔ خدا حافظ۔“ اس نے زور سے کہہ کر فون بند کر دیا۔ فون بند کرنے سے پہلے اس نے شہباز خان کا بھر پور فقیہہ سنا تھا۔ جس سے اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آئی۔ اس کا دل جو ابھی کچھ دیر پہلے بو جھل سا تھا۔ اب ایک بیک بکا پھلکا ہو گیا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥ ♥

”آمنہ! ادھر آؤ، تمہیں ایک چیز دکھاؤں۔“ عبدالمعین نے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر اسے آواز دی اور وہ ہولماں جی کے ساتھ تیشی مٹر چھیل رہی تھی فوراً ”کچھ کھڑی ہوئی۔“

”عبدالمعین! کام نہ کرنے دینا۔“ وہ سر کے کھانے کو دیر ہو رہی ہے ابھی تمہارے بابا صاحب آتے ہوں گے۔“

”ماں! جی نے اسے اٹھ کر بھاگتے دیکھ کر فوراً ٹوکا۔“

”بس ماں! جی بلا ہی آئی دو منٹ میں۔“ وہ رک کر کہتے ہوئے اندر بھاگ گئی۔

”کیا ہے؟“ عبدالمعین حیرانی پر اپنا تھیلا نمابستہ لیے بیٹھا تھا۔ آمنہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

”جویریہ اور زینب کہاں ہیں۔“ اس نے بیٹے میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے پوچھا۔

”جویریہ تو ساتھ والوں کے پاس کھیلنے جی ہے۔ زینب اوپر دھوپ میں کپڑے پھیلانے گئی ہے اور آکر اسے نمازنا ہے۔ اس لیے تم ان دونوں کے آنے کی فکر نہ کرو۔ البتہ بابا صاحب آنے والے ہیں۔“

”ابھی نہیں آتے وہ۔ مدرسے میں کوئی ملا صاحب آئے ہوئے ہیں ان کے ساتھ مناظرے میں لگن ہیں دیر سے آئیں گے۔ ان کی تم فکر نہ کرو۔ وہ فخری سے بولا اور بیٹے میں سے ڈرائنگ کی موٹی کاپی نکالی جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھی سے ڈرائنگ کا بے حد شوق تھا وہ یہ کاپی مدرسے بھی لے جایا کرتا تھا اور چھپ چھپ کر پڑھا شوق پورا کیا کرتا تھا۔“

اس نے یہ کاپی عبدالمعین سے منگوائی تھی جب وہ اسکول جایا کرتا تھا بعد میں بابا صاحب نے اسے اسکول سے اٹھوا کر مدرسے میں ڈال دیا۔ باقی کتابوں کو تو اس نے واقعی خدا حافظ کہہ دیا مگر اس کاپی کو ابھی تک سینے سے لگایا ہوا تھا۔ اس کاپی میں اس نے بڑے بڑے شاہکار تخلیق کر رکھے تھے جو اگر کسی اسکول ایگزامینیشن میں رکھے جاتے تو یقیناً ”کوئی نہ کوئی انعام دیت کر لاتے مگر افسوس اس خدا داد صلاحیت کی انکوئی قدر دان اور فین آمنہ تھی وہ اسی سے اپنی خوشی شیر کیا کرتا تھا۔“

”کچھ بنا لیا ہے کیا۔“ وہ اس کی کاپی نکال کر دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا؟“ وہ جوش سے بولا۔ ”زبردست ہو زبردست۔“ اس نے کاپی نکال کر اپنے زانو پر رکھی۔

”آج صبح مدرسے سے چھٹی ہوئی نماز کے بعد درس تھا۔ سبق تو آج ہونا نہیں تھا میں نے تھیلا اٹھایا اور ادھر چل پڑا اور آج پتا نہیں کیا بات تھی وہ میدان کو جوان گاؤں کے باہر موجود نہیں تھا میں نے بھی اس کا انتظار نہیں کیا اور پیدل ہی چل پڑا سورج ابھی نکلا نہیں تھا۔ ہم مدھم مدھم سا اندھیرا اور دھیمی دھیمی سی روشنی آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ دونوں کے درمیان الوداعی ڈائیلاگ چل رہے تھے۔ میں ان سرگوشیوں کو منہ سے سے نکلتے ہوئے چل رہا تھا کہ راستے میں جھیل آگئی وہی جہاں لوگ مچھلیاں پکڑنے جاتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے تا آج صبح کتنی سردی تھی۔ ہر چیز جم رہی تھی۔ سردی تو مجھے بھی لگ رہی تھی مگر گرم کپڑوں اور تیز چلنے کی وجہ سے اس کا احساس ڈرا کم تھا۔ جھیل کے پاس پہنچ کر سردی میں یکایک اضافہ ہو گیا۔ میرے دانت جتنے لگے وہاں پیر مست سائیں کی جھونپڑی ہے۔ جھونپڑی میں آگ جل رہی تھی اور خالی لنگی پہننے وہ مست سائیں جھیل کنارے آ نکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ میں اس کی جھونپڑی میں جا کر آگ تاپنے لگا۔ چند قدموں پر تو جھیل بھی اور پتا ہے اس وقت جھیل میں پانی رواں دواں نہیں تھا۔ پانی کا باکا سا شور تو تھا مگر پانی پاگل سا کن تھا۔ پوچھو کیوں؟“ اس نے آمنہ کے اشتیاق کو بچھڑکانا چاہا۔

”کیوں؟“ وہ بھی مشتاق تھی پوری توجہ سے بولی۔

”کیونکہ پانی کی اوپری سطح پر ہلکی ہلکی برف جمی ہوئی تھی۔ اسی وقت سورج نکل آیا تو عجیب منظر تھا۔ سورج کی کرنیں جب پھیل کر پوری برف پر پڑیں تو ایسے لگا جیسے ہزاروں ہیرے جگمگاتے ہوں میں حیرانی میں اٹھ کر باہر نکل آیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ان ہیروں کو پکڑنا چاہا تو میری چیخ نکل گئی۔ پوچھو کیوں۔“ وہ اپنی کہانی کو ڈرامائی بنا رہا تھا۔ آمنہ اس کے ڈرامے کے سحر میں پوری طرح سے گرفتار ہو چکی تھی۔

”کیونکہ برف کی تیز قلم میری انگلی کو چیر گئی تھی۔ ایک دم سے خون چھوٹ گیا۔ دیکھو خون میرے دامن پر اور انگلی کا زخم بھی۔“ اس نے گیس کا دامن اور انگلی دکھائی۔

”پھر میں نے پنسل کالی لے کر وہ منظر بنانے کی کوشش کی، صرف کوشش کیونکہ میں اس منظر کو بالکل ویسے بنانے سے قاصر تھا جیسے قدرت نے بنایا تھا میں کتنی دیر تک وہ منظر بنا تا رہا۔ جب وہ مکمل ہوا تو ایک دم پیچھے سے آواز آئی۔

”دن رفل۔ بیونی فل، ایکسٹنٹ۔“ میں اچھل پڑا۔ میرے پیچھے در سے والے گاؤں میں چوہائی اسکول ہے اس کے ڈرائنگ ماسٹر بشیر صاحب کھڑے تھے۔

”لوکے! تم خود کو ادھر کیوں ضائع کر رہے ہو، تمہیں نہیں معلوم قدرت نے تمہارے اندر کتنی پاور ڈالی ہے اس فن کے لیے۔“ وہ میری کالی کے ورق اٹھاتے جاتے تھے اور سرو ہنٹے جاتے تھے۔ ”یہ دیکھو، انہوں نے کنکشن بھی لکھے ہیں۔ بہت کم تصاویر میں غلطی نکلی ہے۔ کہہ دیجئے تھے۔ تم شہر میں کسی ایسے آرٹ اسکول میں جاؤ۔ اگر یہ نہیں کر سکتے ہو تو ہمیں سے میٹرک کر کے لاہور میں برطانوی سٹوڈنٹ آرٹس کاڈو صروفہ لے لو۔ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ تم ایک دن اس فن میں بڑا نام کماؤ گے، میری بات لکھ لو۔ یہ دیکھو وہ اسویرن جوانی۔“ اس نے آخری ورق لٹائی تھا کہ کسی نے اس کے ہاتھ سے کالی چھین لی۔

”ہاں نام تم کیوں نہیں کماؤ گے۔ تم کمر سے نکلے ہی اس شیطانی وصف میں نام کمانے ہو۔ بد بخت بد نصیب ملعون نصیبت! میں تجھے کس سے پرڈالتا چاہ رہا ہوں اور تو کس راستے کی طرف رسیاں تڑا تڑا کر جا رہا ہے۔“ پیش بھری صوفی صاحب کی آواز نے گویا ان کے سروں پر بم برسا دیے۔ آمنہ تو اچھل کر دفن دور جا کھڑی ہوئی۔ عبدالعصین بیٹھے بیٹھے تھر تھر کانپنے لگا، انہوں نے بن دیکھے ہی اس کی کالی کے پرزے چمڑے کر دیے۔ وہ ورق پھاڑتے جاتے تھے اور مخالقات کا طوفان ان کی ہاؤنڈ زبان سے اڑتا جا رہا تھا۔

عبدالعصین کی عجب کیفیت تھی، چند لمحے پہلے وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ کالی کے پرزے ہوتے ہوئے دیکھ کر جیسے وہ ساکت ہو گیا تھا کسی پتھر کی طرح چھٹی چھٹی آنکھوں سے اپنے تین سال سے اٹھنے کیے خزانے کو ریزہ ریزہ ہوا میں بکھرتے دیکھ رہا تھا اور آمنہ کا رنگ پیلا زرد ہو رہا تھا اسے معلوم تھا ابھی کچھ دیر بعد جو سلوک کالی سے کیا گیا ہے وہی عبدالعصین سے کیا جائے گا اس کا دل پتے کی طرح لرزتے ہوئے عبدالعصین کے نہ پٹنے کی دعا کر رہا تھا۔ ”کالی کی تو خیر ہے بھائی اسے اور لاویں گے، لیکن اللہ میاں جی اب اسے بار نہیں پڑنی چاہیے اب تو وہ چند دن بعد آتا ہے۔ پھر بھی بابا صاحب ہر بار اسے بات بے بات بری طرح سے پیٹتے ہیں، اللہ میاں جی معاف کرونا، اب کے اسے مار نہ پڑے۔“ کالی کو اس کے انجام تک پہنچانے کے بعد صوفی صاحب خوفناک تیور کے ساتھ عبدالعصین کی طرف بڑھے ہی تھے کہ آمنہ کی چیخ نکل گئی۔

”نہیں بابا صاحب! نہیں پلیز بابا صاحب نہیں۔“ وہ ایک دم سے ان کے قدموں پر گر پڑی۔ صوفی صاحب نے جھک کر آمنہ کو بازو سے پکڑا اور چھیٹے ہوئے اسے دروازے تک لے گئے اور خاموشی سے اسے دروازے سے باہر نکلے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور چختی چڑھا دی۔

”بابا صاحب! نہیں پلیز! بابا صاحب نہیں۔“ وہ پانگلوں کی طرح دروازہ پیٹنے لگی۔

”اللہ امت روزا دھر آجاؤ۔“ اماں جی نے خوف سے کھٹی آواز کے ساتھ اس کو کندھے سے کھینچا۔

”اماں جی! بابا صاحب اس کو مار ڈالیں گے۔ اماں جی! موبی کو بچالیں اماں جی! میرا بھائی۔“ وہ پانگلوں کی طرح لپکتے چلانے لگی۔

”آمنہ! چپ کرو کچھ نہیں ہوتا۔“ اماں جی نے اسے دم تو اڑ میں جھڑکا۔ اندر مکمل خاموشی تھی۔ اور پھر چند منوں بعد جیسے کمرے میں چیخوں کا طوفان اٹھ اٹھا ہوا۔

”بابا صاحب! ہمیں۔ اب نہیں کروں گا اب تمیں بابا صاحب۔“ یہ چیخے جا رہا تھا۔ صوفی صاحب اسے ہنتر سے پیٹ رہے تھے۔ ان کے پاس مدرسے والا ہنتر کہاں سے آیا یہ سوال سوچنے کے لیے اس کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ کس دروازہ پیٹنے لگی۔

”بابا صاحب اللہ کے واسطے دروازہ کھولیں! بابا صاحب اللہ کے واسطے۔“ وہ چیخ رہی تھی اماں جی کے روکنے کے اور۔ اندر وہ شہر اس کی کھال اوھیر کر رہی دم لینا چاہتے تھے اس کی چیخ و پکار کا ان پر کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بے آواز اسے بیٹے جارت تھے اندر سے بس عبدالعصین کی چیخوں اور شرابی شراب کی آوازیں آرہی تھیں۔

”بابا صاحب! خدا کے واسطے اب معاف کر دیں اب نہیں کروں گا پھر نہیں کروں گا۔“ اس کی دل خراش التجا میں اماں جی آمنہ اور بیٹھیوں میں سلالت کھڑی زہن ب کے دل ہلا رہی تھیں۔

”بابا صاحب! ہنترے میں بڑے شاہ جی آئے ہیں۔ آپ کو فوراً بلا رہے ہیں۔“ ایک دم سے زہن ب بھانگی ہوئی آئی اور دروازے کے باہر بلند آواز سے بولی۔ اندر سے ہنتری آواز رک گئی اور چند لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ صوفی صاحب کا غصہ و غضب سے سر پہ ہوا ہر نظر اور عقاب جیسی بڑی بڑی سرخ آنکھیں زہن ب پر گاڑ کر اسے باہر نکال دیا۔

”ابھی اسے کسے پتا چلا؟“ وہ ان ہی غضب ناک تیور کے ساتھ بولے۔

”وہ تو کھل گیا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور کانام لیا۔

”اچھا اسے کمرے سے نکلنے نہ دینا۔“ دو بے انہوں نے عمامہ درست کیا اور باہر کی طرف بڑھے گئے۔ اندر عبدالعصین مجروح حالت میں زہن ب پر آتا تھا۔

”عبدالعصین! بھانگ جاؤ ابھی۔ نہیں بھی۔“ زہن ب نے اسے زور سے اٹھانا چاہا۔

”چھو زہن ب۔ میں نہیں جاؤں گا۔ آج ان کے ہاتھوں سے مر جاؤں گا۔ نہیں نہیں جاؤں گا۔“ وہ ہڈیاں انداز میں پکایا تھا۔

ٹرین کے جھنکوں پر دھیرے دھیرے ایسے حرکت کرنے لگتے، جیسے وہ اس کے وجود کا حصہ ہی نہ ہوں۔ عذیر پر وہ
 محاورہ بالکل فٹ آ رہا تھا، سو یا سو یا ایک برابر۔

ٹرین کے اندر جلتی لائٹ بھی کسی قبر پر جلتے دیبے سے مشابہ تھی۔ پہلی زبرد قوق سی۔ ڈبے کی کھڑکیوں کے اکثر
 شیشے ٹوٹے ہوئے تھے، جن سے ہوا اندر داخل ہو رہی تھی، مگر تھنے بھی لوگ تھے سب بے خبر سو رہے تھے۔ ویسے
 بھی رات کے تین بج رہے تھے، وہ پھر کی ٹرین لیٹ گئی۔ وہ رات گزارنے کے پختی اور سوا پارہ بجے چلی تھی۔ اسٹیشن
 پر ٹرین کے انتظار میں اکثر لوگ بیٹھے بیٹھے ان کی کمریں جو اب دسے گئی تھیں۔ اس لیے ظفر مرے ہوئے تیل کی
 طرح سو رہا تھا جب کہ معاذ کو سٹیشن میں اور نیند نہیں آتی تھی۔ وہ اوروں کی طرح جاگ رہا تھا۔

”پتا نہیں ابھی کتنا سفر باقی ہے۔“ اس نے اکتا کر پھر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔
 صبح کے پانچ بجے ٹرین کسی اسٹیشن پر جا کر کی۔ دو چار مسافروں نے سامان اٹھایا اور پیچھے اتر گئے۔ ظفر ابھی تک سو
 رہا تھا بے خبر۔ وہ بے خبر۔ معاذ نے اسے ہتھوڑا کر اٹھایا۔

”ظفر! یہ تو وہ اسٹیشن نہیں، جہاں ہم نے اترنا ہے۔“ اس کے دو قدم اونچا اونچا بولنے اور ہلانے سے اس
 نے بمشکل تمام آنکھیں کھول کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ باہر صبح کا ڈب کی مدھم مدھم روشنی پھیل رہی تھی۔ تیز اور زور
 دار ہوا، نسیم سحر کے لطیف ہتھوڑوں میں بدل چکی تھی۔ پلیٹ فارم کے ایک طرف چائے پانی کا کھوکھا تھا۔ جہاں
 چائیس واٹ کا پیلا، قوق بلب بلب رہا تھا، اس کی پیار روشنی کے برعکس اس کا مالک بے حد چست اور پھر پتلا تھا
 رگڑا ہوا ہر چائے کی پیلی بھر بھر کر کب بنا رہا تھا، اترنے والے اکثر مسافر جا کر اس کے کھوکھے کے آگے پیچھے دو
 چار پائیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ آگے اسٹیشن ماسٹر کا دفتر تھا۔

ظفر نے دو نکل بازو اٹھا کر پھر پورا ٹھکانا لیا۔
 ”پتا ہے، اٹھا سامان۔“ اس نے جوابی دیکھا، ہونے جسم کو ڈھیلا چھوڑا۔

”ہاں، تمہارا جاؤں۔“ معاذ نے اٹھا ہوا ڈھیلا سارا دیکھا، جیسے اسے امید نہیں کہ ظفر کا گاؤں کبھی آئے گا بھی۔
 ”ہاں مگر ابھی آگے تانگے کا گھٹے بھر کا سفر ہے۔ سب سے زیادہ تھکا دینے والا اچلو سامان اٹھاؤ۔ گاڑی چلنے والی
 ہے۔ ادھر زیادہ دیر نہیں رکھی۔“ اس نے جھک کر اپنا چھوٹا سا ٹرک اٹھایا اور قلیوں کی طرح سر ہٹا کر جوتے
 پاؤں میں اٹکاتے ہوئے باہر کی طرف بڑھا۔ معاذ نے بھی اس کی تقلید میں اپنی کپس اٹھایا اور اس کے پیچھے چل
 پڑا، جوتے تو وہ گھٹے پہلے ہی پہنچے، بیٹھا تھا۔

ظفر کی بات سمجھ گئی، تانگے کا سفر سب سے زیادہ تھکا دینے والا اور اکتا دینے والا تھا۔

آخر خدا خدا کر کے اس ڈھینگوں اور ڈھینگوں کا سفر تمام ہوا، دونوں اپنا اپنا سامان اٹھا کر پھر چل پڑے۔ ان
 کے آگے گندم کا وسیع کھیت تھا، گندم پلٹنے میں ابھی ان تھے۔ ہر سے ہر سے پودے لگنا رہے تھے اور ٹھنڈی مگر
 لطیف ہوا ان کے کانوں میں جانے کو نہی سرگوشیاں کئے جا رہی تھی کہ وہ سرد مہن رہے تھے۔ آسمان پر بادلوں کے
 ٹکڑے ادھر ادھر اٹھ رہے تھے۔ فضا میں خوشبو دار خاموشی سرسرا رہی تھی جس کی زبان وہی سمجھ سکتا تھا، جو اس
 لمحے میں جی رہا ہو۔ کہیں کہیں کسان کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ اطراف میں ایک ہی ٹریکٹر دیکھا، ایک کسان
 سیلوں کی سمیت منہ جوڑی کے ساتھ مل چلا رہا تھا۔ ظفر اس سارے حسین منظر سے بے خبر، تقانوں کے سے انداز
 میں بوہوں کو زور زور سے پاؤں مارتا چلا جا رہا تھا۔

”جلدی چلو تم تو دلکی چال چل رہے ہو۔ کھیت کا مالک آ لیا تو بس دیساڑی لگانی پڑ جائے گی، ہم اس کے سونے کو
 روندے جا رہے ہیں۔“ ظفر نے مڑ کر اس کی ست چال پر تنقید کی۔
 ”ہم کھیت سے ہٹ کر بھی تو جانتے تھے۔“ معاذ نے جواب دیا۔

”ادھر سے پھر گھنٹہ لگ جانا تھا۔ یہ شادرت کشت تھے۔ بس اب جلدی چلو۔“ وہ زور زور سے قدم اٹھاتے ہوئے
 بولا تو معاذ نے بھی رفتار بڑھا دی۔

سولہ سترہ سال کی عمر ہی ایسی تھی، نوڑی پر بھی ایک پار تو حسن آتا ہی ہے، مگر وہ روزی تو نہیں تھی وہ تو تباہی
 تھی، آگ تھی، جو سب کچھ تباہ کرنے آئی، سب کچھ جلا دینے۔ سلطان بخت اسے پلک جھپکے بغیر تگے جا رہے تھے کہ
 اس کے سوالن کا اپنے اوپر سب اختیار جانا رہا تھا۔

”اندھا ہے کیا؟ جنگلی جانور کی طرح موٹر سڑک پر لے کر نکل آیا ہے۔ انسانوں کو کیا کیڑے مکوڑے سمجھ رکھا
 ہے تو نے، جو اس اونچی موٹر میں بیٹھ کر چلے دیکھتے نہیں۔“ وہ خود بخوشی حسین تھی۔ اس کی گوازاں سے بھی سر ملی
 تھی، پھاڑن چشموں کی طرح چھم چھم کرنی سلطان بخت کی سماعتوں میں گھنٹیاں بجاتی دل میں اتر گئی یا شاید انہیں
 ہی اس کے لغزوں، فتنوں میں اس قدر شیرینی محسوس ہوئی تھی۔

”گو نگا بھی لگتا ہے نواب کا بیچ۔ آئندہ سے بندے کے پتر کی طرح گاڑی لے کر نکلتا اور نہ یہ پتھر اٹھا کر تیر اور
 تیزی موٹر گاؤں حشر کروں گی کہ کوئی بیچان نہیں سکے گا۔ سنا تو نے۔“ وہ سلطان بخت کی نظروں سے چلتی امرت اس
 سے بے خبر، اونچان پتھر سارے تھی۔

”اری چیل جھوٹا پتھر اس نامراد کو چلیں، ہمیں دیر ہو رہی ہے، دفع کر اس منجوں کو۔ مارنے چلا ہے کسی کو
 جان سے یا مرنے لگا ہے، ہمیں کیا۔ چل آچلیں۔“ پیچھے کھڑی ادھیڑ عمر عورت تیز اور کرخت آواز میں اس لڑکی
 سے بولے۔

جواب میں اونہ کہہ کر اسی عورت کی طرف مڑ گئی اور دھپ دھپ زمین پر پاؤں مارتی دونوں گاڑی کے پاس
 سے نکل کر گاؤں جانے والی پگنڈی کی طرف ہو لیں۔

دونوں اس علاقے کی نہیں لگتی تھیں۔ عورت چہرے مہرے سے پھر بھی پنجاب کی لگتی تھی۔ مگر لڑکی کے
 اندیش خانہ تھنا، پھٹائی یا پھاڑی تھی، کھڑے کھڑے جیسے خوب صورت نقوش جو پھاڑی چشموں سے دھلے ہوئے
 تھے۔ دونوں نے لمبے لمبے پھٹائی فراک پان رکھے تھے، پیروں میں سخت پیرے کے کسے نما جوتے اور پھٹائی عورتوں
 جیسے چاندی کے ڈھیر سارے زیورات پہنے ہوئے تھیں۔

لڑکی اب بھی پھلکے اور آکسادینے والے انداز میں لاہروالی سے چل رہی تھی جبکہ عورت کی رفتار میں پختگی
 اور تیزی تھی۔ وہ چلتے چلتے مڑ کر لڑکی کو آہستہ چلنے پر ڈانٹ بھی رہی تھی۔ سلطان بخت دور تک انہیں جاتے دیکھتے
 رہے۔

”اب کہاں جاؤں۔ کوئی رستہ نہیں رہا، جیسے دور دور تک کھٹائیاں ہی کھٹائیاں ہوں، مگر انہوں نے تھک کر
 گاڑی کی سائڈ سے ٹیک لگاتے ہوئے خود سے سوال کیا۔
 ان کا دل تھی سمٹوں میں اڑا جا رہا تھا، اس کی خبر انہیں بھی نہیں تھی۔



گاڑی چھکا چھک دوڑے جا رہی تھی اور وہ سوتے جاگتے دماغ کے ساتھ کھڑکی سے باہر گھور اندھیرے میں
 روشنی تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ باہر ہر طرف گہری تاریکی تھی۔ کہیں کہیں رستے میں کوئی نعمتانی سی روشنی
 ایک لمحے کو دکھائی پڑتی اور پلک جھپکنے میں اندھیرے کے بھوکے پیٹ میں جاساتی۔ چاند کی آخری تاریکیوں
 تھیں۔ جس کی وجہ سے اندھیرا کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ باہر اگر دیکھنے کو کچھ نہیں تھا تو اندر کے منظر میں بھی
 اسے زور برابر کشش محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

ظفر تو اس کے سامنے والی سیٹ پر بے سدھ منہ کھولے ہر طرف سے بے خبر زور دار خزانے لیے جا رہا تھا۔
 خزانوں کی وجہ سے اس کا منہ اور پیٹ بار بار پھول اور پھلک رہے تھے۔ جیسے کوئی سائیکل کے ٹائر میں ہوا بھر رہا ہو،
 خزانے کے سہ سات سروں میں تھے۔ کبھی مدھم مدھم تیز اور کبھی کسی چٹکھاڑی کی طرح اور معاذ نے بسی سے کسی سائڈ
 کی طرح ادھر موٹے اس کے وہوہو کو تگے جا رہا تھا۔ اس کا ایک ٹانگ اور بازو سیٹ سے نیچے لٹک رہے تھے۔ جو

کھیت کا سفر ختم ہوا کچی گلیوں کا شروع ہو گیا جن کے کناروں پر چوڑی چوڑی ٹالیوں تھیں کچھ ٹالیاں صاف تھیں کچھ گندگی اور غلامت سے لٹی ہوئی تھیں۔ کہ جنہیں ایک نظر دیکھتے ہی معاذ کروا لیتے تھے۔
 تین کے سبز رنگ کے دروازے کو ظفر نے زور سے لات ماری اور واہ پیلے ہی کھلا ہوا تھا شور مچاتا ہوا اندر جا کھلا۔

"اوتے کون سے والو ایترہ" اندر سے کرخت آواز آئی۔

"ابا! میں تیرا ظفری۔" اس نے بلا تھک اندر داخل ہوتے ہوئے بیان کی مضبوط اندکھری چارپائی بیٹھے کالے سیاہ جیشیوں کے سے ناک لٹکتے والے اپنے سے کہا۔ جو گڑ گڑھٹ پی رہا تھا۔ وہ ظفر کی آواز سے ہی محل اٹھا اور تختے کی تے کو پرست دھکیلتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ظفر کی طرف یا نہیں پھیلا دیں۔

"کو میرا ظفری آیا۔ اطلالیخ تو کرنی تھی پتر۔" ظفر اپنے باپ کے طویل و عراض بستے میں سما لیا۔

"ایا! سر پر (سر پر) من نا تھا۔" اس نے دانت کھوسے۔

"اوتے یاد دیتا تھا۔" وہ اس کے سر پر چپت لگا کر بولا۔

"ایا خوشی کی خبر کو سر پر بڑھتے ہیں۔" اس نے باپ کو سمجھایا۔

"ہاں پڑھ لکھتے آیا ہے سڈھے طوطوں کو بھی پڑھا بلکہ رٹوا۔" کچے صحن کے دو سرے طرف بے طول دو سبج ورائڈ سے دھوئی کرتا بیٹے اپنے سے بھی کالی بھنگ مٹی اور پھولی سی عورت مردوں جیسی بھاری کرخت آواز میں بڑتی ہوئی یا ہر آئی۔ ساڈا سے دیکھ کر ایک میل کو ڈر سا آیا۔

"ابا! بخش لوگوں کے لیے سر پر ایڑ عم اور دکھ کی خبر کو بھی کہتے ہیں" اٹھل معاذ؟" وہ اپنے کے شانے پر زور دار ہاتھ مارتے ہوئے معاذ کی طرف مڑا۔

"ایا! یہ این کا جگری یا ر سب معاذ بالیق (لا لاق) بڑا مکتی ہے۔ اٹھل آیا ہے اس بار وہیں جانتوں کے امتحان میں۔" اس نے معاذ کا ہاتھ سمجھ کر اس کا تحارف کرایا۔

"جیندارہ" اپنے نے معاذ کے سر پر زور سے ہاتھ پھیرا۔

"اماں ناراض لگتی ہے۔" ظفر چھینڑنے کو بولا۔ وہ دوسری چارپائی پر آکر بیٹھ گئی تھی۔

"میرے سلام کا جواب بھی نہیں دیا اماں نے۔" وہ جھٹ کھڑے ہوئے بولا۔

"نہ تجھے سلام کرنے کی توفیق کیسے ہوئی۔" وہ ہاتھ نچا کر لڑا کے انداز میں بولی۔ "تو تیری رگ رگ میں ہے۔"

"ابا! دیکھا تو نے یہی کچھ ہونا تھا اب میرے ساتھ پراسے تاراوں اب میں یہ سب نہیں ہونے والے تھے۔" اس کا انداز دھمکانے والا تھا۔

"اسے بھلی لوگ چپ کر جا۔ پتر کھرا ہے اس کا یا ر بھی کوئی لسی لکر کا انتظام کر۔"

"ہاں ملک سچ کر کے آیا ہے نا جو اس کے لیے دیکھیں پتر حاکوں۔" وہ اپنی ٹھنڈی سی ناک سکڑ کر مانتے پر بل والے ہوئے اسی مریچکے لہجے میں بولی۔

"تجراجھ ہو کھائے کا انتظام کر۔ میرا پیتر راست بھر سفر کر کے آیا ہے۔ اتے ہی تو نے کل کل شروع کر دی ہے۔" ابا غصے میں آکر گر جا تو پوار پر بیٹھا کالا کو ڈر کر اڑ گیا۔

"اب یہی کچھ سنا تھا میں نے۔ تو کرائی ہوں نا اس گھر کی اب اور ڈو تیاں کھاؤں گی اور مجھے صلہ کیا ملتا ہے۔" اوہر کون سا ڈر تھا۔

"یک بک کیسے جا۔ زبان تیری سولی پہ بھی نہ رکے۔ وہاں بھی چلتی جائے گی۔ جا دفع ہو جا جلدی سے روٹی لکر لے کر چلو پتر و ہم دونوں منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔ کھانا تیار ہے۔" وہ سڑ کر ان دونوں سے بولا تو ظفر اس کا ہاتھ تمام کر ورائڈ سے کی طرف آ گیا۔

"سامنے والے کمرے سے گزرے گا تو اس کے آگے قسمل خانہ ہے۔ اسی سال ابانے قسمل بھی ڈوانی ہے۔ بڑا اچھا قسمل خانہ بنوایا ہے۔" اس نے کہتے ہوئے معاذ کو برآمدے سے اندر کیا۔

وہ جیسے ہی بڑے کمرے سے گزر کر آگے پڑھا پھولی سی اندھیری ڈیوڑھی میں اچانک سامنے سے کوئی چڑیل اندر داخل ہوئی۔ ہاں وہ چڑیل ہی تھی کالے سیاہ بلکہ سیاہ کالے ہاتھ پاؤں منہ بال سب کالے بھنگ صرف لہے لہے دانت و دھیا سفید تھے۔ معاذ کی سچ شکل گئی ظفر وڑا آیا۔

"یہا ہوا۔؟" وہ پریشانی سے ڈرتے سے معاذ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا اس کے منہ سے کچھ نہ نکل سکا۔ بس شعلہ بار نکا ہوں سے گھورتی اس چڑیل کو دیکھنے گیا۔

"ارے تو ڈر آیا یہ کالو ہے اماں کی وھی تھے بتایا نہیں تھا۔" اس نے معاذ کے کان میں سرگوشی کی۔ "چڑیل ہے پوری ہے نا۔" وہ کم صم کھڑا اس کی ہاں میں ہاں بھی نہ ملا سکا۔

"یہا کون اس کی تے؟" وہ ہاتھ نچا کر چیختے ہوئے بولی۔

"میں کہہ گیا میں جنت سے حور آئی ہے۔ دودھ کی نہر سے صبح کا قسمل کر کے۔" وہ اس کے بالوں سے چپکتے نظروں کی طرف اشارہ کر کے بولا تو وہ اور چیختے لگی۔

"دیکھ اماں! ادر آہر آہ ظفری کھلے منہ والا اچھے سے بکواس کر رہا تھا اماں مجھے چڑیل کہتا ہے۔ اماں ادر آہر آہر تو چیختے لگی تو ظفر نے معاذ کا ہاتھ سمجھ کر جنت میں رہنے قسمل خانے کی طرف اسے دھکیلا اس نے جلدی سے اندر داخل ہو کر ڈروا نہ بند کر لیا۔ باہر وہ مستقل کئی ٹھیل کی طرح سچ رہی تھی۔

"یا خدا میں یہ کدھر آ گیا ہوں۔" اس نے پکار لیا۔ "ان کالے جیشیوں میں ظفر اور میں تو انگریز لگ رہے ہیں۔"

"ابا! ایک بڑے فکرمند کر کے تھے اور اس نے لگا کر آئے ہیں پتا ہے آپ کے بغیر میں خود کو کس قدر ادمورا سوس کر رہا ہوں۔ منہ کھانے کھانے کو کھانا کھانے کو کھانا کھانے کو کھانا کھانے کو کھانا کھانا۔"

"اور میرا حال نہیں پوچھو گی۔ کچھ بھی تو کوئی ہی چیز تھو کھل نہیں کرتی نہ کوئی یاد نہ کوئی شخص۔ بس ہر لمحے تمہاری دوری اور اپنے نامکمل ہونے کا احساس سنا آ رہتا ہے۔ اور یہ تو ہمیں معلوم ہی ہے کہ کام کی وجہ سے اتنے دن لگ گئے ورنہ میں تو تیس دن کھانا کھاتا۔ تم بن تو ایک لمحہ گزارنا دشوار ہوتا ہے جان۔" فخر حیات نے ٹھیل پر وہ اس کا نازک گورا سفید ہاتھ لپی کرخت میں لپیٹے ہوئے بڑے پیار بھرے انداز میں کہا۔

"ابھی سب ڈرا ہے۔ ایسا ہوتا تو جلدی نہ آجاتے۔" وہ بڑی اداسے ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "کام کے دوران آپ کو کچھ یاد نہیں رہتا مجھے معلوم ہے نہ میں نہ میرا احساس۔"

"یہ تو پھر ہو نا ہی ہے تا تم بھی تو ایک ہفتہ اسلام آباد اور پھر مری گڑا کر آئی تھیں نا چاہے سمینار کے لیے گئی تھیں تا م کے دوران مجھے بھولی تو ہو گی۔" ان کا انداز بھی جتنا نے والا تھا۔

"اؤہ ہاتھ تو پتھوڑیں میرا سب کہہ کر حساب تو برابر کر لیتے ہیں۔" وہ نکلنے سے بولی۔

"تو لگہ تو شکوہ۔ آج اتنے دنوں بعد ہم نے اکٹھے کھانا کھایا ہے۔ اس وقت صرف پیار کی باتیں ہوتی چاہئیں، آج تم لگتی حسین لگ رہی ہو یا نکل شادی کے اولین دنوں کی طرح رہنا آئی رہتی مس ہو۔"

فخر حیات نے اس کا دھیان ہر چیز ہر بات ہی سے ہٹا دیا۔ موہ کے پاس سب سے مضبوط مہنگی تو ہے جسے وہ ہر نازک اور کمزور لہجے میں استعمال کر کے فوراً "یازی ایسے حق میں کر لیتا ہے۔ اور عورت سب کچھ جانتے ہو جتنے بھی صدیوں سے اس مہر کے ہاتھوں بیٹی علی آ رہی ہے۔ مگر لفظوں کی حقیقت کو کبھی نہیں جان سکی یا جان کر انجان بن جاتی ہے۔

"آئی تو کھرا" آواز اس کے دل کی گواہیوں سے آئی۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں میں جہاں جاؤں ساتھ چلا کرو تم از کم اس ادمورے پن کے احساس سے تو نجات مل جایا

کوئی شہادت کو روک کر رہی۔

مگر آج کل تو اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا نہ زیور گل کا کوئی مشورہ نہ کوئی منظر اس نے آتا کرتا پاس پر سے بیگ سے موبائل نکالا اور گھر گاڑی کے لیے فون کیا۔

”بی بی بی بیوہ تو بیگم صاحبہ لے گئی ہیں بی بی وی اسٹیشن ان کی ریکارڈنگ تھی کوئی۔ یہ ایک گھنٹے بعد آئیں گی پھر گاڑی چھوڑ دیں گی۔“ تو کوہلا تو اس نے ”کوئی ضرورت نہیں گاڑی چھوڑنے کی۔“ تھی سے کہہ کر موبائل آف کر کے بیگ میں رکھا۔ اٹھ کر کپڑے بھاڑے اور ست قدموں سے گیٹ کی طرف چل پڑی۔

سڑک یا لنگل خالی تھی۔ دور تک رکشہ ٹیکسی کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اسی ڈھیلے ڈھالے انداز میں چلتی رہی کہ وائٹ شیراؤ اس کے پاس آ کر رہی۔

”ہیلو مین ناراماؤ آریو؟“ مانوس آواز پر اس نے رک کر پکارنے والے کو دیکھا۔

”ہیلو فائن۔“ انکل جی یال کالے سیاہ ڈائی کیے اپنی مخصوص فضول سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے اسے دیکھ کر رہے تھے۔

”آؤ میں ڈراپ کروں۔ کہاں جانا ہے۔؟“ وہ فوراً بولے۔

”تو تھینکس۔۔۔“ وہ اوہرا اوہرا دیکھتے ہوئے لاپرواہی سے بولی ”آپ کہاں جا رہے ہیں۔؟“

”بی بی وی اسٹیشن۔“

”چلیں پھر مجھے بس اوہری لے چلیں۔ سام اوہری ہیں۔“ وہ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

”کالنج آئی تمہیں؟“ وہ بہت خوش ہو گئے تھے۔

”نہا ہے۔“ اس نے گہرا سانس لے کر کالنج کی بیرونی باؤنڈری والے طرف دیکھا۔

”کیا خیال ہے کولڈ ڈرنک نہ ہو جائے۔“ وہ پھیلنے لگے اور مین تارا کو ان سے ہی چہ تھی۔ وہ خواہ خواہ پھیل جاتے تھے اگر ڈراپ اس لفٹ کر او۔ وہ دل میں سلگی۔

”تو تھینکس موڈ نہیں۔“ وہ خشک لہجے میں بولی۔

”ہی بی بی۔ اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ موقع بھی ہے دستہ بھی۔“ بعض لوگوں کی ہنسی اس قدر بے سہمی ہوئی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ انہیں اٹھا کر گاڑی سے باہر پھینک دیا جائے گا۔ گاڑی ان کی نہ ہو تو وہ خاموش رہتی۔

”آج کل کیا کر رہی ہو؟“ نہیں ایک بل چین نہیں آ رہا تھا۔

”نی الحال تو آپ کی گاڑی میں Suffer کر رہی ہوں۔“ اس نے سخر پر زور دیا۔

”تو میری گڈ لک ہے۔“ وہ پھر بے سگے بن سے بنے۔

”انکل پلیز اسپڈ اور برہائیں۔ میں سگے ہی بہت پور ہو رہی ہوں اور نہ گاڑی روکیں میں نیچے اتر جاتی ہوں۔“

وہ آتا کر تیز لہجے میں بولی تو انہوں نے کھیرا کر اسپڈ پر رکھا پھر زور سے دیا دیا۔ مین تارا نے ہاتھ برہا کر ڈیک آن کر دیا۔ کم از کم ان کی بے سگے گفتگو سے تو نجات ملے گی مگر میوزک میں ایسے بندے کی جوائس کیسے اچھی ہو سکتی ہے۔ اس نے دو منٹ بعد ڈیک آف کر دیا۔ گاڑی بی بی وی اسٹیشن کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔

زیور گل ریکارڈنگ روم میں تھی۔ وہ بدون صاحب کے کمرے میں بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگی وہ فون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔

”بی بی تو مین ناراماؤ ہیں دیکھ مین تارا! ہم تن یوں خود کو ضائع نہ کرونیجے۔ کام کرو خدا نے تمہیں جو حسن اور صلاحیتیں دی ہیں ان کا فائدہ اٹھاؤ۔“ فون سے فارغ ہوتے ہی وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے۔

”انکل! میرا موڈ نہیں ہے پلیز اس قسم کی گفتگو کرنے کا۔“ وہ تیز زاری سے بولی۔

”اوکے نہیں کرتے گفتگو۔“ انہوں نے ہاتھ بھاڑے ”تم میرا ایک کام کرو۔“

”بی بی فرمائیں۔“ تو وہ اسی جہازوں میں بولی۔

”میں پینک برائس کرو کہ کوئی۔“

”کام کیا ہے؟“ پتہ بتائیں کرنے والا ہوا تو کہوں گی۔“

”انکل کا نام نہیں کرو گی؟“ وہ خٹکی سے بولے۔

”انکل پلیز بتائیں کہ تو باہی بھڑوں گی۔“

”تو کوہلا انکل پر اعتبار نہیں میں تم سے کوئی ایسا ویسا کام کراؤں گا۔“

”اوکے برائس۔“ وہ موضوع چھینا نا چاہتی تھی۔

”ہی اسی وقت۔“

”اوکے ابھی اسی وقت۔“

”ہی دیکھو۔“ وہ ایک جہاز اٹھا کر اس کے پاس لے آئے۔ ”یہ اسکرین ہے ایک اشتہار کا اسے ایک نظر دیکھ لو ابھی شوٹ لیا جاتا ہے۔“

انہوں نے پتہ پتہ اس کے آگے کیا تو اس نے غصے سے ان کی طرف دیکھا۔

”تو کچھ تم پر برائس کر رہی تھی۔“

”انکل! یہ غلط بات ہے۔ آپ کو معلوم ہے۔“

”مجھے معلوم ہے سب اتنی اچھی تمہا تک کرتی ہو، دیکھا وہ وہ لڈ ز جو تم نے کیے تھے ایسے تھے ابھی تک بہت سی کمپنیاں تمہاری ڈیمانڈ کر رہی ہیں۔ پلیز تارا صرف یہ کہ بہت مزگا اشتہار کے کا سیدھے کی مشہور کمپنی تک۔“

”ٹھٹ کے فون“ بعد یہ منٹ ”انکل کا شمار کلا۔“ وہ اسے لالچ دیتے ہوئے بولے۔

”ہاں تو تمہاری سیراؤن ساتھیوں نے میں ان کے پیچھے اپنا کیریئر بھی واؤپر لگا رکھی ہوں۔ نہیں تو نہ سہی۔“ اس نے سر جھکا کر اسکرین کے کپڑے دکھائے۔

”قل قل قل قل“ وہ کوئی چشمہ تھا یا پرانی جھڑنا آتی تو بصورت ہنسی کی آواز صوفی صاحب نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ ان کے متوالان قدم ایک بل کو ٹھٹک کر رک گئے تیسرے گھٹے کی تسلیج کرتی ان کی زبان یک سخت رک گئی۔ انہوں نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر قہقہے کے جاسے وقوع کی طرف دیکھا۔

”یہ تو ما سٹر صاحب کا گھر ہے۔“ وہ اپنے دھیان سے چونکے۔ ان کی دونوں بیٹیاں بیٹیاں ہیں اور اگر وہ نہ بھی بیٹیاں ہوتیں تو بھی اس قدر خوبصورت ہنسی کی آواز ان کی ہر گز نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ما سٹر صاحب کی گھٹیا کی مریض پور تھی بیوی کو اتنی جوان ہنسی بننے کے لیے تو سہی بار کیا دوسوں بار بھی جنم لینا پڑا تو بھی ایسی ہنسی نہیں دس سکتی تھی۔ وہ جیسے الجھ کر رہ گئے۔

”صاحب کے قریبی عزیزوں میں بھی کسی کا ایسی بے تکلف نذر اور دلکش ہنسی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ ان سے۔“

”ان صاحبہ تمہا پھر۔“

”صوفی صاحبہ! ما سٹر صاحب تو گھر پر نہیں ہیں اگر آپ کو پتہ چھنا سے تو اندر اطلاع کروں۔“ بارہ چودہ سال کا لڑکا ان کو یوں ٹھٹکے کھڑے دیکھ کر ان کے پاس آ کر بولا تو وہ جیسے کسی طلسم سے باہر آ گئے۔

”میں۔۔۔ نہیں ان سے پھر مل لوں گا۔“ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے چلنے لگے کہ اس دل فریب آنٹی لے سحر سے باہر آسکیں، حالانکہ ان کے دل نے احتجاج کیا تھا کہ اس پیش کش کو ٹھٹکرائے گا کوئی جو از نہیں اندر چل کر بیٹھنے سے شاید یہ معرہ حل ہو جاتا۔

انہوں نے با آواز بلند لاجل ولاقوۃ کی تسبیح کرنی شروع کر دی ”سب شیطان کے جال ہیں“ تسبیح کے ساتھ وہ دل میں پڑھتا رہے۔

"ہائے وہ کیسی باتیں کرتی ہے آمنہ! قسم سے مزہ آجاتا ہے۔" زینب پتھر مارے لڑکیوں۔
"ہاں یہ تو ہے۔" آمنہ نے مصروف انداز میں جواب دیا۔

"ورنہ قسم سے وہاں بڑی بوریٹ ہوتی ماسٹرانی جی تو بابا صاحب سے بھی بڑھ کر بوریٹ ہیں۔ لڑکیوں یہ نہ کرو۔ لڑکیوں سانس بند ہو لڑکیوں زندہ کیوں ہو۔ لڑکیوں دیکھتی کیوں ہو۔ لڑکیوں تمہاری آنکھیں کیوں ہیں لڑکیوں زبانوں کو کٹ ڈالو۔ قسم سے آمنہ میں بہت عاجز آتی ہوں صرف ایک ہفتے میں اگر وہاں جھومر نہ آجائی تو میں نے تو آج کل میں پچا ہے بابا صاحب میری بڑی پبلی ایک کر دیتے۔ جواب دے دینا تھا اور ہر جانے سے۔ یہ ہر وقت لڑکیوں کی گردن انہم نے سیکھا تھا خاک ہے وہاں کچھ۔" وہ خالصتاً ماسٹرانی جی کے لیے میں نقل اتار رہی تھی بارعب بلند آواز میں "لڑکیوں اور دشمن آواز میں کلام کرو۔" آمنہ کی ہنسی نکل گئی۔

"زینب! آہستہ بولو بابا صاحب آنے والے ہیں۔"

"ہائے کبھی تو تم کو زینب خوب اونچا بولو۔ بابا صاحب باہر بیٹھے ہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ چنانچہ ہم کب آزاد نہیں ہنس سکیں گے۔ وہ حسرت بھرے لہجے میں بولی۔

"زینب! کو اس نہ کرو۔ بابا صاحب بہت اچھے ہیں۔" وہ ہر حالت میں یہی نعرہ بلند کرتی تھی بابا صاحب بہت اچھے ہیں۔"

"تمہارے لیے ہوں گے خیر چھوڑو بابا صاحب کا ٹاپک چودہ سال پرانا ہے۔" لڑکیوں نے زینب سے بولی آمنہ کو بہت برا لگا۔ مگر اس سے کچھ کہنے کا فائدہ نہیں تھا۔

"آمنہ وہ اتنی خوبصورت کیوں ہے۔ ہر لحاظ سے اس کی رنگت جیسے دودھ اور ملائی ہو۔ اتنی چمکنی جلد ہے کہ پانی بھی پھسلتا ہے اس کی آنکھیں ستاروں کو ماند کرتی ہیں۔ اور آواز اس قدر سرسلی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ سنے جاؤ اور نازک اتنی کہ جیسے ہاتھ لگاؤ تو ٹوٹ جائے گی۔" زینب کھوٹی کھوٹی ہنسی بول رہی تھی۔

"زینب! کیا ہو گیا ہے تمہیں فراق کی یا ڈی ایٹی جوڑ رہی ہو۔" آمنہ نے اس کا دھیان سلاتی ہوئی کسی طرف گھمایا۔

"آمنہ تمہیں وہ کیسی لگتی ہے؟"

"مجھے۔" آمنہ نے قہقہے ہاتھ سے رکھ دی۔

"ہاں بتاؤ نا! زینب اس کی دلچسپی دیکھ کر فوراً بولی۔

"زینب! اصل میں خوبصورت تو وہ واقعی بہت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں مگر مجھے اس کی جو بات اچھی لگتی ہے وہ اس کا اعتماد اور نڈر انداز ہے۔ اور سب سے بڑھ کر وہ میٹرک پاس ہے۔ میٹرک اور وہ بھی کسی پسماندہ علاقے سے حیرت ہوتی ہے نا۔" آمنہ نے زینب کی تائید چاہی۔

"وہ نڈر سی پاک ہے تو اس نے سوات سے مروان اگر میٹرک کیا اپنے چچا کے گھر چار سال رہ کر۔ اور اب۔۔۔" زینب بھرے سے کھسکی "بتا ہے وہ اور لڑکیوں آئی ہے؟"

"کیوں؟"

"اس کے باپ بھی ہمارے بابا صاحب کی طرح سخت ہیں وہ اس کی شادی کسی جاہل ٹرک ڈرائیور سے کر رہے ہیں۔ وہ اپنی اماں کو لے کر اپنی خال۔ یعنی ماسٹرانی جی کے گھر مروان سے اکیلی چلی آئی ہے نا ہمارا؟"

"بابا صاحب سخت تو نہیں ہیں اور وہ کبھی ہماری شادی کسی ٹرک ڈرائیور سے نہیں کریں گے۔ انہیں جہالت سے نفرت ہے۔" آمنہ کی سوتلی بابا صاحب پر رگ گئی تھی۔

"فضول بات۔۔۔" زینب کو جیسے اس کی بے عقلی پر افسوس ہوا۔ بابا صاحب کی علم دوستی کا یہاں کیا ذکر۔"

"زینب! کڑھ کر بولی۔" بے وقوف وہ ادھر آگے پرھنے کے لیے آئی ہے۔ اس کی ماں ادھر رہے گی اور وہ خود شہر جا کر آگے پڑھے گی کاغذ میں۔ پر میرے خیال میں اب اس کا شہر جانا مشکل ہے۔" زینب اور قریب کھسک گئی۔

"کیوں؟" آمنہ نے بھولپن سے پوچھا۔ اور یہ سچ بھی تھا جس دن سے جو مہر آئی تھی زینب سارا وقت ہی اس کے ساتھ چپکے رہتی تھی۔ مجال ہے جو ماسٹرانی جی کی لڑک دار لڑکیوں پر دھیان بھی دے۔
"اوصا کاؤں تو اس کا سچا عاشق ہو گیا۔"

"کیا مطلب؟" آمنہ سمجھی نہیں۔ "سچا عاشق کیا؟"

"جو اس کی خاطر اپنی جان کی بھی پروا نہ کرے اور اوصا کاؤں جھوٹا عاشق ہے۔"

"بے وقوف جو بوڑھے لوگ ہیں دل میں اس کے عاشق ہو چکے ہیں مگر انہما نہیں کر سکتے۔ تو ہونے نا جھوٹے عاشق زینب نے اپنے تئیں اسے بڑے پتے کی بات سمجھائی۔

"زینب! تم بہت فضول ہو گئی ہو میں بابا صاحب سے تمہاری شکایت کروں گی ایسی باتیں کرنے میں۔" آمنہ نے اسے جھڑکا۔

"اگر وہ شکایت بابا صاحب سے کچھ نہیں تو وہ بھی اس کے عاشق ہو جائیں گے۔ مگر پوچھو کون سے والے۔" وہ دیدہ دلیری سے بول رہی تھی۔

آمنہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا پوچھنے کو زبان ساتھ نہیں رہی تھی۔

"جھوٹے والے عاشق بابا بابا"

وہ زور سے ہنسی تو کمرے کے باہر کڑے ان کی باتیں سنتے صوفی صاحب کی پیشانی عرق آوہ ہو گئی ان کا جسم کمزور پڑنے لگا۔ انہوں نے چور نگاہوں سے ارد گرد دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ وہ دھیرے سے واپس مڑے اور کھلے دروازے سے دوبارہ باہر نکل گئے۔ ان کے قدموں کا رخ ماسٹر صاحب کے گھر کی طرف تھا۔

سلطان بخت آخر یہ کیا طرف ہے۔" سجدہ آیا نے اندر کمرے میں داخل ہو کر ناگواری سے کہا اور سلطان بخت جو پورے کمرے کے کھلے اندر صوفی صاحب کے کمرے پر نیم دراز پر بیٹھ ہوئی شیوے کے ساتھ کسی صوفی میں گم سگریٹ کا کش لگا رہے تھے۔ ان کی آواز سن کر اچھل ہی پڑے، کمرہ سگریٹ کے دھوئیں اور بو سے بسا ہوا تھا۔

"سلطان بخت! وہ مجھے! استہجاب و حیرت سے انہیں سگریٹ پیتے دیکھ رہی تھیں۔ سلطان بخت خوب شرمندہ ہوئے انہوں نے آگے بڑھ کر ٹیبل پر رکھے ایش ٹرے میں سگریٹ سجھادیا۔

"یہ فضول کام تم نے کب شروع کیا۔۔۔" ان کا اشارہ اسموکنگ کی طرف تھا انداز بے حد ناگوار و ناپسند۔

"آپا! کبھی کبھی سیشن میں۔" انہیں کچھ جواب نہیں سوجھ رہا تھا بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے قبالت سے بولے۔

"بالی! داؤے وہ کون سی سیشن تھی جس نے تمہیں اک منوں چیز کو ہونٹوں سے لگانے پر مجبور کر دیا۔ مجھے بے حد افسوس ہے تم پر۔" وہ ہنوز اسی اشاکل میں بازو کمرے سے نکلنے کھڑی تھیں۔

"کس بات کا افسوس آیا؟" وہ پچھلی ہی ہنسی کھڑے ہوئے اور کمرے کے پردے ہٹانے لگے۔ سیدہ نے آگے بڑھ کر انہیں کندھوں سے تھام لیا۔

"سلطان میرے بھائی میرے بچے! کیا تم بہت بڑے ہو گئے ہو جو اپنی پریشانیاں مجھ سے شیئر نہیں کرتے۔ میں تمہاری بہن ہی نہیں تمہاری ماں تمہاری دوست بھی تو ہوں۔ تمہیں کیا چیز تنگ کر رہی ہے۔" وہ محبت و ہمدردی سے ان کے چہرے پر ہاتھ پھیر کر بولی۔

"آپا! کچھ بھی نہیں مجھے بھلا کیا چیز تنگ کرے گی۔" وہ ٹالنے والے انداز میں بولے۔

"سلطان! غیر مجھنے لگے ہو مجھے۔" ان کا لہجہ دکھی ہو گیا۔

"آپا! پلیر میں پہلے ہی بہت ڈسٹرب ہوں۔" وہ جھنجھلا گئے۔

"آخر کس بات کی ڈسٹربنس ہے پتا بھی تو ہو۔" وہ اور بھی آواز میں بولیں۔

”آپ۔۔ آپ کو نہیں بتا ہے؟“ وہ استغراب سے انداز میں بولے۔

”وہ بات جن کا کوئی مقصد کوئی وجہ نہ ہو ان کو بار بار دہرانے سے فائدہ تم اللہ پر بھروسہ کیا نہیں کرتے یہ بھی تو ناممکن نہیں ذہن کو کسی بات کے لیے تیار کرنا کیا مشکل ہے وہ بات جو بظاہر نہیں ناممکن نظر آ رہی ہے اگر تمہارا اس سے واسطہ پڑ جائے تو کیا معلوم وہ کس قدر آسان ہو تم کیوں اس طرح محض سوچ سوچ کر خود کو الجھا رہے ہو۔ اس طرح الجھنیں بڑھتی ہیں کوئی حل نہیں نکلتا۔“ وہ اسے دھیرے دھیرے سمجھانے لگیں۔ وہ بید کے کنارے پر گئے غیر حاضر باغی سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔

”آپ! کیا واقعی ایسا ہوتا ہے۔“ وہ کچھ سوچ کر بولے۔

”کیا۔۔؟“ وہ ان کے پاس آئیں۔

”نہ کہ جو چیز نظر ہونا ناممکن لگ رہی ہو مشکل اور ناممکنی اگر کر گزرو تو کوئی زمین آسمان نہیں ملے۔“ وہ کسی دھیان میں بول رہے تھے۔

”یہ تو ہمارے ذہن کی بات ہے نا اگر ہم خود کو تیار کر لیں اپنے ذہن کو سمجھائیں تو کچھ بھی ناممکن نہیں۔“ وہ کسی اور رخ سے بات کر رہی تھیں اور پلو پلو سوچ رہے تھے۔

”آپ زندگی تو ایک بار ہی ملتی ہے نا؟“ سیدہ انہیں ناگہمی سے دیکھنے لگیں۔

”ہے نا آپ۔۔“ وہ اسرار سے بولے۔

”بالکل۔۔“

”اگر وہ بھی انسان اپنی مرضی سے نہ گزارے تو کیا فائدہ؟“

”انسان کی مرضی کیا ہے؟“ سیدہ نے التماس کیا۔

”جو اس کا دل کے کر گزرو۔“ وہ بلا جھجک بولے۔

”تو جو وہ کر گزرتا ہے اسی کو تو تقدیر کہتے ہیں، وہی کوئی تقدیر کہا جاتا ہے نا۔“

”اور انمولی کو۔“ وہ ہلکے والے نہیں تھے۔

”بظاہر یہ دونوں ایک دوسرے کی مخالف تکتی ہیں مگر انمولی ہی تقدیر ہوتی ہے اگر ہو جائے تو تقدیر ہے اور تقدیر کیا ہے۔“

”کیا ہے؟“ ان کا ذہن جھجک رہا تھا۔

”اللہ کی مرضی۔“

”اور انسان کی مرضی۔“ وہ اسی تکتے پر اٹکے ہوئے تھے۔

”جو ہو جائے وہ تقدیر جو نہ ہو سکے اس میں اللہ کی مصلحت۔“

وہ انہیں سمجھا نہیں پارہی تھیں یا وہ سمجھ نہیں پارہے تھے۔ دونوں اپنی اس لا حاصل کوشش کے نتیجے میں خاموش ہو گئے۔

”چلو انھو فضول ذہن الجھانے سے فائدہ۔“ آخر سیدہ نے خاموشی توڑی۔

”شادی میں دن کتنے رہ گئے ہیں دو ہفتے پایا جان تمہارے لا تعلق رویے سے بے بند پریشان ہیں اوپر سے ان کی طبیعت سلطان کچھ تو خیال کرو اور میں دونوں طرف کی تیاریوں میں پاگل ہو رہی ہوں۔ کچھ تو میری ہی خیال کر لو کہ تم از کمر جسے ذہنی سکون ہی دے دو اور اس طرح کا طریقہ بنا کر تم مجھے اور پریشان کرتے ہو۔“ سیدہ رووینے کو گھٹیں۔

”آپا میرے بس میں کچھ نہیں۔“ وہ بے بسی سے بولے۔

”آپا کی خوشی بھی نہیں اس کی زندگی بھی نہیں۔“ انہوں نے سر اٹھا کر سیدہ کے او اس چہرے کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

”انھو میرے چاند! میری خاطر خود کو سنبھالو۔“ وہ پیار سے ان کے بال سنوارتے ہوئے بولیں۔

”آپا بہت مشکل ہے۔“ وہ پھر سے بکھر نے لگے۔

”چند اچکھ بھی مشکل نہیں بس تمہیں لگ رہا ہے محالہ کو دیکھو گے تو سارا ذہنی خلیجان بھول جاؤ گے۔ جنت کی حور ہے جو خدا نے دنیا میں تمہارے آئین کو نصیب کی ہے تم ایک یار خود کو سنبھالو تو وہ سب گلے شکوے بھول جاؤ گے۔“ سیدہ کی بات سن کر وہ حلق تک گڑوے ہو گئے۔

”سلطان دیکھو تو اس گھر میں اتنے زمانوں کے بعد خوشی آ رہی ہے۔ پایا جان کس قدر خوش ہیں۔ شہریت کس قدر پُر جوش ہے اور میرا جو برسوں کا ارمان تھا کہ تمہیں شہزادہ بنا دیکھوں تمہاری خوشیوں کا ہی خیال کر لو۔“

”آپا۔۔ آپا میری خوشی۔۔“ وہ ٹوٹے دل سے بولے۔

”اپنیوں کو خوش کرنے سے ہی خوشی ملتی ہے۔“ وہ انہیں بے حد خود غرض لگیں۔

”تو مجھے خوش کر کے بھی آپ لوگوں کو خوشی ل سکتی ہے نہیں بھی تو آپ کا اپنا ہوں۔“ وہ تنہی سے گویا ہوئے۔

”سلطان! سخت ہو تم چاہ رہے ہو تو ناممکن نہیں۔“ وہ خود کو سمجھا کر آئی تھیں کہ غصے میں نہیں آتا۔

”کیوں ناممکن نہیں؟“ آپا کہہ رہی تھیں کہ کچھ بھی ناممکن نہیں۔

وہ غصے اور بے بسی کے اظہار کے تحت جب کر گئیں۔

”ہاں تو صحیح کہہ رہی تھی کہ یہ کچھ ناممکن نہیں نہیں میں ہی ہمت ہارے پیشا ہوں۔ بس آپا کچھ بھی ناممکن نہیں اگر انسان چاہے تو ہے نا آپا۔“ وہ ایک لمحے سے جوش میں آیا۔

”یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں۔“ سیدہ جوش ہو گئیں۔

”بس تو پایا جان آپ بے فکر ہو کر چائیں اب میری طرف سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ملے گی۔“ وہ ایک دم ہلکا سا لہجے سے کسی خیالی شخص سے بات کر رہی تھیں۔

”خوش رہو۔“ انہوں نے ان کا ہاتھ چوم کر عادی ”سہرا بندی“ والی رات میں تمہاری دستار بندی بھی ہوگی کہ پایا جان نے شادی کے فوراً بعد سچ کرنے کے لیے جانا ہے۔ تمام امور تمہیں تفویض کر جانا چاہ رہے ہیں۔“ وہ انہیں بتا رہی تھیں وہ سر ہلانے لگے۔

”ٹھیک ہے آپا! میں ابھی فون میں ہو کر نیچے آتا ہوں پایا جان کے پاس پھر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“ وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ سیدہ نے کل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور کھڑی ہو گئیں۔

”جلدی آنا! میں پایا جان کو سننگ روم میں لے کر آتی ہوں انکھے چائے پیئیں گے۔“ وہ کہتے ہوئے باہر نکل گئیں۔ سیدہ سلطان بخت کسی خیال کے تحت مسکراتے لگے۔

”کیوں خود کو اس طرح گھر بیٹھ کر ضائع کر رہی ہو ایم ایس سی میں ایڈیشن لے لو۔ میں یہی کہنے آئی ہوں تم سے۔“ ہاں اور آج یہ بات منوا کر جاؤں گی۔“ راحیلہ دعوئیں والے انداز میں بولی۔

”تمہیں معلوم تو ہے۔“ وہ پھیکے سے انداز سے بولی۔

”کیا معلوم ہے یہی کہ تمہارے ابو ٹھیک نہیں رہتے گھر گھر ہستی کی ذمہ داری تمہارے نازک کندھوں پر آ رہی ہے۔“ وہ غیور و غیرہ ”فضول بھانے“ نہت میری جان کی عمر ہے کیر کیر بنانے کی اپنے بارے میں سوچنے کی انگلی کی تیار ہی ہو ہے وہ تو ہے وہ تمہارے گھر بیٹھنے سے ختم نہیں ہو جائے گی اور چار بندوں کا کتنا کام ہوتا ہے بلکہ دو بندوں کا تمہارے بڑھالی اور بھانسی بقول تمہارے اکثر گھر سے باہر رہتے ہیں پھر کیوں خود پر ظلم کر رہی ہو۔“

”چھو تو یہ موضوع راحیلہ! اس واقعے بہت پریشان ہوں! ابو آج کل بالکل ٹھیک نہیں۔ مجھے معلوم ہے اگرچہ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتے میں کیا کروں؟“ وہ بے بسی سے رو پڑی۔

”بس۔۔ بس تو فون روٹی یوں ہو بھانسی سے بات کرو۔“ راحیلہ نے اس کے آنسو پونچھے۔

”بھانسی ہونہ وہ ملتے کب ہیں۔ رات کو آتے ہیں تو سیدھا بیڈ روم میں اور صبح دینک جانے کے لیے بیڈ روم

"صرف تمہاری ماؤننگ دیکھتے ہوئے فضل حسین صاحب تمہیں اپنی فلم کے لیے ہیروئن کاسٹ کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ ان کی فلم ریٹائر ہونے سے پہلے سیر ہٹ ہو جاتی ہے ایکسٹرنل ان کی فلم میں ایکسٹرا کے رول کے لیے مرے جاتے ہیں اور انہوں نے تمہیں مرکزی کردار دے دیا۔ پور آرگلی مانی ڈارنگ! میری توکل سے نیندریں اڑی ہوئی ہیں خوشی سنبھالی نہیں جا رہی۔"

"ماما ابھی کب تک ہوئی؟" وہ شوژین کر سیدھی ہوئی۔
"ظاہر ہے ایسے فنکشنر تو رات گئے تک چلتے ہیں۔ دو تین تو بج ہی جائیں گے کیوں؟"
"مجھے نیند آجائے گی نا۔" وہ مصومیت سے بولی۔

"نیند آنے کی تو ہم فوراً گھر آئیں گے۔ ڈونٹ وری پارانٹی کے بعد فضل حسین صاحب ایگزٹسٹ سائن کروائیں گے۔ میں ان سے کہوں گی کہ وہ فنکشن سے پہلے ہی یہ ٹیک کام کر لیں۔ فنکشن تو پھر پھیلنا ہی جانا ہے۔ ٹھیک رہے گا ہے نا۔" وہ اس کی رائے لینے کو بولی۔

"ہاں! صحیح ہے مگر ماما! سلور سکرین کے لیے تو بڑا کام کرنا پڑتا ہے۔ مجھ سے اس قدر کام نہیں ہو گا۔" وہ نزاکت سے بولی۔
"تو کام کوئی ایک دن میں تمہوڑا کروائیں گے۔"

"کچھ نہیں میں تم اب چلو۔ سرت دیکھو گئی ہے اس تو بج رہے ہیں۔" وہ گھڑی پر نگاہ ڈال کر بولی۔
"ماما! ایک بات پوچھوں۔" وہ آہستہ آواز میں بولی۔ زیور گل نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں لکھی تحریر کو وہ آرام سے پڑھ سکتی تھی۔

"تمہیں پوچھنا نہیں تارا! اتنے قیامت حسن پر یوں سو گوارا ہی مت ملاری کرو۔ حسن کو نظر لگ جائے گی۔ اور تم کسی سے کلمہ نہیں منکرانے والا ابھی بدلا نہیں ہوا اور جو ایسا کرنے کا سوچے گا وہ پچھتائے گا ضرور۔ تم کوئی روک ٹوک لگانی ہے دل میں لانا اگر تمہو کو یہ شان مت کرو۔"

اس نے محبت سے اس کے رخسار تھپتھپایا۔
"ماما! میں کوشش تو کرتی ہوں۔" اس کے حلق میں گول سا پھنسنے لگا۔ آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔
"نہیں تارا! پھر وہی بات جس کو تمہاری پروا نہیں تم اس کے لیے خود کو یوں کھلاؤ۔ تم کوئی گری بڑی ہو میری جان خود کو ایسے مضبوط قلعے کی طرح کرو۔ جسے کوئی ایریا غیرا سٹیرنڈ کر سیکے۔ تم زیور گل کی بیٹی ہو جس کا اپنے زمانے میں بھی کوئی رقیب نہیں تھا۔ مقابلہ کرنے کی ہمت کس میں تھی۔"

وہ جانتی تھی کیا بھاری تھی اور نہیں تارا کا سنبھلا ہوا دل پھر سے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ اسے شاہی بی بی کی طرح دیکھنے کی ہمت تھی۔ آج انہیں دیکھنے پورے گیارہ دن ہو گئے تھے اس کا دل چاہا نہیں بھاگ جائے۔
"بوتے ڈرا بیور سے کو گاڑی نکالے۔" زیور گل نے پاس سے گزرتے ملازم سے کہا۔

"ماما! آج جانا ضروری ہے۔" وہ رسیاں تڑوانے لگی۔
"نہیں تارا! زیور گل غصے سے بولی "چلو" اس کا لہجہ غضب ناک ہو چلا تھا۔ "نہیں تارا نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہیلو! کہاں جانے کی تیاری ہو رہی ہے لگتا ہے ہو اؤں نے ہمارے آنے کی خبر کر لی تھی۔"
مانوس آواز نے جیسے نین تارا کے پورے وجود کو ہلکان بنا دیا۔ خوشی اور بے قراری سے اس نے سر کر دیکھا۔

سید سلطان بہت سیاہ و نرسوٹ میں مسکراتا چہرہ لیے دروازے کے قریب میں ایستادہ تھے۔ زیور گل کا ہاتھ شکنوں سے اٹ گیا۔
"شادی آئی۔" وہ ٹیک کر ان کی طرف بڑھی ساری ناراضی دور ہو گئی۔
"نہیں تارا! زیور گل نے حلق سے آواز ڈی ڈی اس کے بے اختیار قدم ٹھٹھک گئے۔

سے سیدھا گیت میرا تو خیال ہے انہیں میری شکل بھی یاد نہیں ہوئی۔ ابو بھی آواز دے کر بلائیں تو ابو شام کو آؤں گا۔ کہہ کر پھر نکل جاتے ہیں۔ میں ابو سے کہہ کر تھک گئی ہوں کہ ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں گمراہ مسکرا کر ٹال دیتے ہیں میں کیا کروں۔"
"تمہاری بھانجھی۔"

"اس کا نام نہ ابو۔ وہ دوسری قسم کی عورت ہے ہم لوگوں سے بہت مختلف مجھے اس کی سرگرمیاں ہی بے حد مشکوک لگتی ہیں پتا نہیں کون کون سے لوگ اسے ڈراپ کرنے گھر آتے ہیں اور وہ خود بہ وقت کسی میک اپ کمپنی کا اشتہار بنی رہتی ہے۔"

"پھر اس کا کیا حل ہو۔ تمہارے ابو کیا کہتے ہیں؟"
"وہ صرف میری شادی کی رشتہ دگائے بیٹھے ہیں۔"
"تو پھر اپنے فیاضی سے بات کرو۔"

"ان سے کیا بات کروں! بے شرم بن کر کہوں کہ مجھے لے جاؤ! ابھی پھوپھو کہہ کر بھی گئی ہیں ابو سے کہ دو ماہ بعد انشاء اللہ۔" وہ حیرت سے بولی۔
"کیا کہہ کر گئی ہیں؟" راحیلہ کا انداز چھیڑنے والا تھا۔

"راحیلہ! میرا دل ڈرا بھی خوش نہیں ہے ایسے لگتا ہے جیسے کچھ ہوئے والا ہے۔ بس کیا کروں۔" وہ بہت وحشت زدہ ہو رہی تھی۔
"وہم ہے تمہارا۔" راحیلہ نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا پھر شادی کی تیاریاں تو ہو رہی ہوں گی خوب۔"

"کیوں مذاق اڑاتی ہو میرا۔" وہ دیکھی لہجے میں بولی۔
"خدا نہ کرے میں تمہارا مذاق اڑاؤں۔ تمہو سے ہی زور دینا ہو رہی ہو خود کو سنبھالو۔ شادی اگر جلدی ہونی ہے تو خود تھوڑی بہت تیاری کرو پیسے وغیرہ تو ہوں گے کہو تو وہ نون چلیں گے کسی دن یا وار۔"

"راحیلہ! میرا دل نہیں چاہتا۔ دل جیسے مجھ سا گیا ہے ابو کچھ ٹھیک ہو جائیں تو پھر تمہیں فون کروں گی کچھ کپڑے برتن وغیرہ خرید لائیں گے۔ ابو نے پیسے تو مجھے دے رکھے ہیں اور زیور تو امی کا پرانی ہے۔" وہ افسردگی سے بول رہی تھی۔

"تم اپنی شکل تو درست کرو تیر بہت اللہ پر بھروسہ رکھو وہ اچھا کرنے کا میں اگلے ہفتے ٹیکر لگاؤں گی۔ اور سناؤ کوئی فون نمون آیا؟" اس کا اشارہ کس طرف تھا نہ بہت سمجھ گئی۔
"نہیں کہاں اتنے دن ہو گئے ہیں۔" وہ اسی اداس لہجے میں بولی۔

اس وقت زیور گل اندر داخل ہوئی۔
"چشم بد و دیش صدقے میں قربان ایسا لگ رہا ہے جیسے چاند زمین پر اتر آیا ہے۔ خدا میری بیٹی کو بری نظر سے بچائے۔ اس کے حسن کو کبھی گمن نہ لگے۔" وہ اس کا سر جو متے ہوئے بولی۔

"ماما! میرا میک اپ خراب ہو جائے گا۔" وہ ہلکتے ہوئے ڈرا پرے کھسکی۔
"بہت تیار رہا ہے تم پر ڈر نہیں۔" وہ ذرا پیچھے ہٹ کر اس کا نقد اندہ جائزہ لیتے ہوئے بولی۔
"تھینکس۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

"ماما! سلور شوژینوں کا اس کے ساتھ۔"
"بس میں نکالتی ہوں۔" وہ فوراً اس کے شوریک کی طرف بڑھی۔

"خداون صاحب تمہارے کام سے بے حد خوش تھے ایک گھنٹے میں تم نے دو ریکارڈنگز کرائیں دونوں کی پرفارمنس Superb (شاندار) تھی! تمہو یاد مانو تمہارے اندر بہت ٹیلنٹ ہے۔ اب ہی دیکھ لو۔"
اس نے جو تہ صاف کرتے ہوئے نین تارا کے آگے رکھے۔

"کیوں مادام نھاہیں ہم سے کوئی بھول ہو گئی۔" وہ زیور گل کو جلائے والے انداز میں بولے اور آگے بڑھ کر نین تارا کے کندھے کے گرد بازو جامل کر کے پورے استحقاق سے کھڑے ہو گئے۔

"شاہی دس از تو بچ (یہ زیادتی ہے)۔" زیور گل غصے سے بولی۔
"نہیں تارا! چلو گاڑی میں بیٹھو چل کر۔"

"نہیں تارا! کہیں نہیں جائے گی مادام! کیوں تارا؟" انہوں نے جھجک کر اس کی ریشمی زلفوں کو لیں سے پھجوا دیا۔
نین تارا کے پورے بدن میں برقی رود وڑ گئی۔

"نام! آپ جا میں نہیں جاؤں گی۔ شاہی بہت دنوں بعد آئے ہیں۔" وہ ان سے ذرا پرستے ہوتے ہوئے بولی زیور گل کو فکر لگ گئی۔

"نہیں تارا! تم ہوش میں تو ہونا؟" وہ غصے سے چلائی۔

"نام! آئی ایم سوری پھر سہی آپ کے ساتھ۔" وہ اسی بے خوفی سے بولی محبت بردے کو اسی طرح بندھنے سے خوف کر دیتی ہے۔

"تھیں ک یومانی سوم۔" سلطان بخت نے دھیرے سے اس کے کان میں کہا۔

"شاہی! نہیں تارا میرے ساتھ جا رہی ہے ایک فنکشن میں، آپ پھر کسی وقت شریف لے آئیں۔" زیور گل بے تامل سے تڑپا کرتے ہوئے بولی۔

"نام! آئی ایم سوری، آج تو نہیں تارا کہیں نہیں جاسکے گی۔ بلکہ آپ بھی کیونکہ نکاح جناح میں سرپرست کے سامنے آپ ہی نے تو کرنے ہیں۔" سلطان بخت کی بات پر زیور گل کا گلہ اٹھنے لگا۔ وہ اسے دیکھ کر تڑپا کر رہی تھی۔

"زیور گل! میں سید سلطان بخت باہوش و جوانی اور اس وقت میں مارا دست زیور گل سے نکاح کے لیے تیار ہوں۔ قاضی صاحب اور گولہ بان میرے ساتھ آئے ہیں، آپ کی اجازت چاہتا ہوں کہ تم بھی آئیں۔" انہیں اندر بلا لوں۔

ان کا مسکراتا ہوا انداز اور آگ لگانے والے جملوں نے زیور گل کو بھڑکا کر رکھ دیا۔

"شاہی! آپ ہوش میں ہیں۔" غصے سے اس کا بدن کانپ رہا تھا۔

"مادام! میں بتا چکا ہوں۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سماج گئے۔

"انگڑ میں اس کے لیے تیار نہیں۔" اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شاہی کو انھوں نے شہر سے بلانے پھینکا اور وہ انہوں نے بے حس و حرکت کھڑی نین تارا کے ہاتھ کو تھام کر کہا تو وہ مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتے گئی۔

"یہ آپ کی بھول ہے شاہی! آپ کو شاید معلوم نہیں ہمارے طبقے میں اتنی کم عمری میں بیٹیاں نہیں بیاہی جاتیں۔ آپ جاسکتے ہیں چلو نین تارا۔"

وہ کہتے ہوئے باہر کی طرف مڑ گئی۔ سلطان بخت نے لیوں کو بھیج کر اس بات کو سنا، نین تارا نے مایوسی سے انہیں دیکھا اور آہستگی سے ماں کے پیچھے باہر نکل گئی۔

"سما سمان" میں گزارے گئے دن اگر مشکل تھے تو اوہر گزرنے والے دن مشکل ترین تھے۔ جس طرح اس وقت اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ "سما سمان" سے نفل کر کے ہر جائے اس طرح اب بھی وہ پریشان تھا کہ ظفر کے کمر سے بھاگ کر وہ کہاں جائے۔ کلچ میں ایڈمیشن کے لیے ابھی دن پڑے تھے اور اس کے پاس رقم بھی محدود ہی تھی، جو اسے آتے وقت ناظم صاحب نے خرچ کے لیے دی تھی وہی اس نے ایڈمیشن کے لیے سنبھالی تھی۔

کا اور شہر کی رقم میں تو ابھی بہت وقت تھا، کلچ میں داخل ہونے کے تقریباً دو تین ماہ بعد۔ اب اگر وہ اوپر سے آگے کر شہر چلا جاتا ہے تو یہیں اندازاً ہی ہوتی رقم اس کے کھاتے پہنچے اور سرچسپانے میں اٹھ جاتی تھی۔ اس رقم کو پیانے کے پیچھے دوپہر عذاب سے چار باٹھا تلفیو یہاں آکر اسے پیسے بھول ہی گیا تھا۔

وہاں پر سے نکل کر تین چار سے سو یا رہتا اس کا ابا اسے لائیں ہار مار کر اٹھاتا اور کسی گدھے کی طرح ہٹکاتا رہا۔ شہر کی طرف لے جاتا۔ ظفر خود کو کھینچ کھینچ کر گھنٹے بھر کھٹوں میں کام کرتا پھر وہیں کسی درخت کی چھاؤں میں چھپ کر چارپائی پر بیٹھتا تو وہ پھر ٹھٹھکے تک وہیں بڑا رہتا اس کا ابا اسے بے تکان گالیاں دیتا تھا۔ چارپائی کو آتے جاتے بھول کر اسے مارنا اور وہ کسسا کر پھر سے بے خبر ہو جاتا۔ وہ پھر ٹھٹھکے گھر آکر اور ابا سے میں بنے بچن میں کھس جاتا۔ جتنی روٹیاں پشیر میں دسترخوان میں لپٹی رکھی ہوئیں۔ وہ وہیں ہی میں موجود سالن کے ساتھ سانس لیے بغیر رہتا۔ اسے کھاتے دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہتا تھا کہ اس نے پہلے بھی زندگی میں کھانا کھایا ہو گا پھر پڑی ہو گا۔ وہ لیتا تھا تو روس میں کھس جاتا پھر پورے گھنٹے بعد کھیلے سر منہ کے ساتھ دھڑکے پر آدہ ہوتا تو کمرے میں کھس جاتا۔ یا تو وہ اس کی کاسوٹ زیب تن کرتا تیز رفتورم کی آوہی شیشی خود پر اندھیلٹل سر میں تیل لگا کر کھنکھی کرتا پھر وہاں کھانا شہری تلے والا کھنکھ ڈالے وہ کھن میں آتا، جہاں معاذ کسی مسکین قیدی کی طرح سر ہٹانے بان کی چارپائی پر بیٹھا ہوتا۔

"پہل جانا ہے مجھے میں اپنی ماں کے گھر جا رہا ہوں۔" وہ بڑی بے نیازی سے اس کے پاس تل بھر کو کھڑا ہو کر پوچھتا تو معاذ نفی میں سر ہلاتا۔ وہ روزانہ اسے یا پھوپھی کی طرف جاتا تھا ماں کی گڈی اور پھوپھی کی زمین اس کی منگھوڑ خاص تھیں کہ وہ دونوں کو برابر وقت دیتا۔ وہ ان کے گھر جا کر اپنی پیچھے کزنوں کی بیٹی میں اس بری طرح سے غرق ہو جاتا کہ معاذ کو بھول ہی جاتا اس کے معاذ نے ایک دو دفعہ کے بعد چائنا ہی پھوڑو یا۔ ان دونوں گھروں کی لنگر نے کھانے کو نہیں لگایا۔ اس کا نام ہی ظم۔ اس کا چائنا جہاں لڑکا دیکھو آپ سے باہر ہو جاتا تو زمین اور گڈی کی چھوٹی بیٹیاں کھانے کو نہیں لگتی۔ اس کی ماں اسے کہتی تھیں کہ وہ وہاں سے دم دیا کر بھاگ جانا مگر بھاگ کر جا تا کہاں۔ گھر میں کابوے تاک میں دم کر رہا تھا۔ ظفر کی سوتیلی ماں اور بہن معاذ کو پھانسنے کے چکر میں تھیں۔

"اوتے تم کہتے سو بنے ہو اسی لیے ضرور ہو۔" وہ ماں کے سامنے ہی بے تلافی سے اس کے پاس آ بیٹھتی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہتی۔ اس کے بران اور ماں سے پھوٹی بیٹنی کی ناقابل برداشت بومعاذ کا دلغ الما ہوتی۔

"نیز بات کرو۔" اوتے کہتے ہوئے غور کی طرح آٹھل کر رہے ہو جاتا۔

"اوتے نیز سے تم بات کرو، گھر میں بیٹھے ہو میرے۔" وہ بد معاشوں کی طرح اپنی چھاتی پر ہاتھ مار کر بولتی اور تیز جیسے سلیمان کہتی۔ "اوتے منٹ بھر میں آگے بولے ہو جاتی۔"

"اوتے منٹ بھر میں آگے بولے ہو جاتی۔" وہ بد معاشوں کی طرح اپنی چھاتی پر ہاتھ مار کر بولتی اور تیز جیسے سلیمان کہتی۔ "اوتے منٹ بھر میں آگے بولے ہو جاتی۔"

"اماں! اسے ادھر سے بیٹنی کی بات نہ کرنا ہاں۔ یہ اب کالو کا ہے۔" وہ بولتا "با تو از بلانہ معاذ پر اپنی ملکیت جاتی تو اس کا دل کرتا تھا نین کا وروانہ کھول کر مڑ کر دیکھے بنا ہاتھ چلا جائے۔" "تمہیں بھی تل پورنا دی کچھ خبر نہیں۔ کبھی پتھ کے کبھی کچھ۔" اماں نے زور لگا کر پھینکی میں پھونک ماری۔ آگے چل آئی۔

"اماں! تو جو بھی کہے تیرا اسے ادھر سے بیٹنی کی بات نہ کرنا۔ یہ اب اوہر سے سر کر ہی جائے گا ہاں۔" معاذ کے تین دن میں آگ لگ جاتی۔ وہ کس دھڑکے سے اس پر تامل کا استحقاق جتاے جا رہی تھی اور وہ کچھ جس نہیں کہتا تھا۔ بے بسی کی انتہا تھی۔
"بیش چاکل ہے تو کاوا!" اماں لاڈ سے آرا سے ذرا سا پرستے دھکا دیتی "تھیلے پسند ہے تو پھر تھلکتی کیوں ہے اس

کوئی اگر پوچھتے تو بصورت کسے کہتے ہیں تو اس کا جواب ہو گا وہی سوات۔
اس کے لیے میں خرنمور محبت اور نہ جانے کیا کیا تھا۔
”ایسا کیا ہے اس میں؟“ زینب نے کچھ منہ بنا کر پوچھا۔

”ایسا کیا نہیں ہے اس میں۔ پناؤ اتنے بلند ویلا کہ ہیبت کی تشریح ان سے ہوتی ہے۔ سرسبز و شاواہ گھاٹیاں
کہ انسان مجھے میں اپنی جنت میں واپس آیا ہوں۔ بریلے شفاف پانی کہ آئینہ ان میں اپنی صورت دیکھے تو ترخ
جائے اور سب سے بڑے کردیا کے سوات۔ ہا ہا۔ کیا کہتے۔“ اس نے جیسے آہ بھری آہ کے اظہار کے لیے شاید لہذا
نہیں مل رہے تھے اور وہ آنکھیں بند کیے اس کی خوبصورتیوں کی تصویر بصیرت کے آئینے پر لا رہی تھی۔
”میسے مرودہ ہے کون سے ہوتے ہیں؟“ وہ آنکھیں کھول کر ایک دم سے بولی ”سرخ کاکے مشین چلاتی آہ
بھی ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کی بیروں کی طرح جگمگاتی آنکھیں زندگی سے بھرپور تھیں چاشت کے
روشن لمحے اس کے چہرے کی سرخی و سفیدی کے آگے جیسے شہارے تھے۔

”میسے مرودہ ہوتے ہیں جو اوپر سے نیک اور مسکین سے دیکھیں اور اندر سے بدنیت اور موقع شناس۔
دریائے سوات بھی ایسا ہی ہے۔“ اس نے ٹیپ۔ تشبیہ گھڑی تھی۔
”یہ کیا بات ہوئی دریا نے سوات اور مرودہ۔“ بات زینب کے سر کے اوپر سے گزرتی تھی۔
”دریائے سوات کو میٹھورہ سے ذرا آگے دیکھو تو مسکین سا سا سہا سہا کھنکھرتے والے۔ یہی دریا کلام میں جا کر
بدست شیریں کر دھاڑنے لگتا ہے۔ اس کی روانی اور شور کے آگے جلدی آوازیں دم توڑ دیتی ہیں اس کا پلٹ اس
قدر بڑا ہو جاتا ہے کہ جو اس میں ایک بار دم ہو جائے پھر نہیں ملتا۔“

”تو کیوں؟“ استانی بی بی کی گریہ اور آواز سنائی دی۔ ”یہ کام ہو رہا ہے؟“ اس کا لہجہ ایک دم سے بدشگم ہو گیا۔
”شہا! اچھو مرودہ کو بولنے کی بیماری ہے اور بڑھ چکی ہے۔ اس کو اپنے پاس بلو۔ ان کو کام میں رکھنے کی اور
اس کی ہنسی کی آواز کھری دیواریں پھلافتی جنگل تک جاتی ہے۔ کل صوفی صاحب، ماسٹر صاحب سے حکایت
کر کے گئے ہیں کہ مہمان سے کہیں۔ وہی آواز میں ہنسا کریں۔“ استانی بی بی وہی آواز میں چپا چپا کر بول رہی
تھیں۔

”ایا کی طرح کوڑھ مغز ہوتی تو میٹرک۔ کرتی۔ تمہاری طرح لکڑیاں ڈھونڈ رہی ہوتی اور اب ایسے کسی ظالم سر
پھرے شوہر کی ہوتیاں سیدھی کر کے سواری ڈیا بھر رہی ہوتی۔“ وہ کون سا ڈرنے والی تھی۔ اسی والیوم میں ترخ
کر بولی۔

”اوہ میرے خدا! استانی بی بی نے اپنا سر پکڑ لیا۔“ لڑکی دبیرے بولے۔ شریفوں کا علاقہ ہے۔ ہاؤس کے لیے پہلا
شہیں جہاں کوئی سنے والا نہیں۔ کیوں ہماری عزت کے جیسے لٹھ لے کر پڑ گئی ہے۔ کوئی سنے تو جانے جنگل سے آئی
ہو۔“ استانی بی بی آخر میں بالکل ہی من من کرنے لگی۔ آخری جیسے انہیں سنائی ہی نہ دے۔
”کمال۔ (خالد) اوٹھا بولا کر۔“ لڑکیو۔“ جان نکال گئی ہو اور پانی سب کچھ پتا نہیں کس کو سناتی ہو۔ مجھے تو بس
کھیلوں کی بھین بھین سنائی دیتی ہے۔ اچھا اب وہیما بولوں گی۔ تم ماں سے بات کرو۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی؟“

”ماں کی بی بی! اس کی ماں نے جیسے بیٹھے پاؤں سے چپل نکال کر اس کی کمر کا نشانہ لیا۔
”ہائے میں سرخ کیاں کیا کہوں تجھے۔“ وہ دروسے جھلٹے ہوئے بولی۔
”اب حلق پھاڑ کر چینی تو بھٹی لکڑی لا کر تیرے حلق میں ٹھونس دوں گی نامراد۔“ اس کی ماں کا والیوم اس سے
بھی اونچا تھا استانی بی بی نے گھور کر بھین کو دیکھا۔
”میلے تم تو یہ ماہوں ہو۔ حد ہے۔ لڑکیو۔“ وہ ایک دم سے دونوں کو دیکھ کر گر جیں جو ماں بی بی کا کلیدی شو مزے
سے دیکھ رہی تھیں۔ استانی بی بی لڑکیوں پر تینوں سرسبز کا کھنکھرتی لگی کرنے لگیں۔

”بتا ہے۔ حویلی میں شادی ہے چھوٹے شادی کی۔“ زینب نے جھومرو کو اطلاع دی۔
”اچھا پھر؟“ وہ لاہروالی سے بولی۔

”تم چلو نا۔ آج کل اوہرہ ہولک بھی رکھی ہوئی ہے۔ صبح کو میلا دیکھی ہو تا ہے۔“
”یہ کیا بات ہوئی۔ صبح کو میلا۔ شام کو محفل سو سیتی۔“ وہ کھڑے پن سے بولی۔
”بڑے لوگوں کی بیوی باتیں۔“ زینب نے کندھے اچکاٹے۔
”تم تو جاتی ہو گی ڈھولک پر؟“ اس نے استفسار کیا۔

”نہیں صرف میلا میں۔ ایک دن تھوڑی دیر کے لیے گئے تھے اور بس۔“ زینب نے پاس نوہ لہجے میں کہا۔
”کمال۔ (خالد) سے کہوں گی کہ چلے۔ پر نہیں۔ وہ نہیں مانیں گی ویسے ہی ان کے ساتھ جانے سے بہتر ہے بندہ
نہ جانے۔“ وہ لہجے میں سر ہلا کر بولی۔

”کمال۔ (خالد) ساتھ چلنا میلا میں۔“ آہ نے یہ پیشکش کی۔
”جانا ہے تو جو ڈھولک میں چلیں گے تمہارے ساتھ۔ اماں سے کہوں گی۔“
”پھر کل چلیں گے شادی میں آٹھ دس دن تو رہ گئے ہیں بڑا مزہ آتا ہے ویسے اوہرہ۔“ زینب تو پچھلے ہی تیار
تھی۔

”پر میرے پاس تو اتنے کپڑے نہیں ہیں۔“ جھومروا پوسی سے بولی۔
”وہم نے کوئی شادی میں جانا ہے۔ اتنی تم ان ہی کپڑوں میں چلنا سب پر رعب پڑے گا کہ تم سوات سے کوئی
ہو۔“ آہ نے فوراً کہا۔

”ہاں۔“ یہی ٹھیک ہے۔ میں اہل سے پوچھوں گی۔ وہ مان جائے گی۔ تم کل صبح جلدی آ جانا۔“
”اوہ جی۔“ زینب بولی۔ ”ہمارے گھر نہیں آؤ گی؟“
”ہاں اوہرہ سے۔ تمہارے گھر پھر بھی ہے۔“
”پاپا صاحب کو بتانا ہو گا۔“ وہ ناز بھرا۔ ”آہ بولی۔

”نہیں۔ ہم ماں کی کو بتا کر آئیں گے۔ اس میں کیا ہے حویلی ہی تو جانا ہے۔ ماسٹر صاحب ہمیں پھوڑ آئیں
گے۔ ٹھیک ہے نا؟“
”بالہ یہ صحیح ہے۔“
”لڑکیو! استانی بی بی کرن پر دونوں سرسبز کا کلام کرنے لگیں۔ یہ مہرا لیتے کھکھلا کر بھنس پڑی۔

”بی بی صیبہ! چائے؟“ جنتاں کی آواز پر رعنا نے چونک کر اسے دیکھا۔ کافور پر نیم درازہ لہری سوچ میں گم
تھی۔

”ہاں رکھ دو۔“ اس نے گھنکھار کر گلاساف کیا اور تپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیدھی ہو بیٹھی جنتاں
چائے رکھ کر کھڑی ہوئی تو رعنا دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنی کپٹیاں بیا رہی تھی۔
”بی بی صیبہ! طبیعت ٹھیک ہے۔“ اس نے کچھ ڈرے ہوئے انداز میں پوچھا۔
”ہوں! اس نے یونہی کہہ کر گردن جھٹکی۔ ”ٹھیک ہوں میں صاحب نہیں آئے ابھی تمہارے۔“

”نہیں بی بی۔ انہی تو بچ بچے ہیں۔ صاحب بی چھ بچے تک آتے ہیں۔“
”اندھی ہو گئی تمہاری اپنی اپنی ساٹھ چیک کر آؤ۔ چہنچ رہے ہیں۔“ رعنا تھے پر دل ڈال کر ناگواری سے کلاک
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔
”معاف کرنا۔“ اس نے بی بی نظر گھوم رہی تھی۔
رعنا نے ایک نظر کچھ بیزاری سے اسے دیکھا پھر وہی چلی گئی اور سر کاؤچ کی بیک سے نکال دیا۔

"صبر و باور ہے جی آپ کا۔" وہ کچھ مجاہدت سے بولی زانا چپ رہی۔

"دباؤ۔ بہت دور ہے۔ بین نگر بھی لی ہے مگر۔" وہ آنکھیں موند کر بولی تو جنتاں آگے بڑھ کر دھیرے دھیرے اس کا سر دبانے لگی۔

اس کا بی بوجہ جھٹکے کے سوٹ پر نیوی بلو پیشوں اور کڑھائی کا کام تھا۔ سادہ سے سوٹ میں اس کا خوبصورت سراپا صحتی کی کاؤچ کی جیسے قیمت پر کا آیا تھا۔ سرخ و سفید رنگت میک اپ کے بغیر بھی دمک رہی تھی۔ غلابی بند پیٹوں کے نیچے اس کی سرستی آنکھیں جیسے ساکت تھیں۔ جنتاں کے بھڑوں بھرے ساندے موندے ہاتھوں کے نیچے نو شہید اور آخر میں کھٹکے پالی زانوں کی آبشار تھی۔

"کاش اتنے حسین وہ وہو کے اندر وال بھی اتنا ہی حسین ہوتا۔"

جنتاں کے دل سے سسکی سی آئی۔ اس کی بوڑھی آنکھیں پانیوں سے بھرنے لگیں۔

"ہاتھوں میں جان نہیں ہے تیرے۔ چل چھوڑ سارے بال خراب کر دیے۔" رعنا نے اس کے ہاتھ تھارت سے پرے ہٹانے اور بالوں پر نزاکت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے سیدھی ہو گئی۔

"سو اچھ ہو رہے ہیں یہ پھر آج کل کچھ زیادہ لٹ نہیں آتے لگے۔" اس کی بے چین نظروں پھر سے گھڑی کی سوئیوں سے جا گرا میں۔ جنتاں موند موند کھڑی رہی رعنا نے کپ اٹھا کر لبوں سے اگلا لیا۔

"اچھی چائے بنانے لگی ہو اب تم؟" پتا نہیں کیسے تعریف رعنا کے منہ سے نکل گئی۔

"سیٹی کھانا ہے؟" چند لمحوں بعد اس نے پوچھا۔

"نیا صاحب کا استاد آیا ہے جی۔ وہ پڑھ رہے ہیں۔" جنتاں دھیسے لہجے میں بولی۔ دو آنسو اس کی جھکی نظروں سے پھسل کر اس کے نیچے آچل میں سا گئے۔

"پڑھ رہے ہیں۔" رعنا بڑبڑائی۔ "اس لڑکے کے بھیجے میں پتا نہیں کتنی کوشش ہے کچھ اس کو پڑھ نہیں سکتا اس کا فائنل رزلٹ اوگاؤ۔" اس نے کپ تپائی پر رکھ دیا۔

"اسی دن سے فخری کا موڈ بے حد خراب ہے۔ آخر وہ بھی بے چارے کیا کریں۔ اس سیٹی کے نیچے کوہ نیا جہاں کی ہر سولت ہر آسائش میسر ہے۔ پھر بھی اس قدر پور رزلٹ میرا انتظار ہی شرم سے ٹھک گیا اس کا کارڈ فخری کو دکھاتے ہوئے سپا نہیں اس کا کہنے کا سارا الزام سارا تاؤ تو اس ہی سستی ہے۔" کہتے کہتے وہ افسردہ ہو گئی جنتاں چپ رہی مگر اس کے دل کو جیسے ایک گونہ نوشی کا احساس ہوا (نہ جانے کیوں؟)

"میں جاؤں گی؟" وہ ہنسنے لگی اور بولی۔

"جنتاں! جب میں باہر جاتی ہوں صبح شام میں تو بابا صاحب کیا کرتے رہتے ہیں اپنے کمرے میں؟" رعنا اس کے جانے کے سوال کو نظر انداز کر کے پُرسوج لہجے میں بولی۔

"اپنے کمرے میں ہی ہوتے ہیں جی۔" وہ سادگی سے بولی۔

"کمرے میں تو سارا ناٹم نہیں رہتا اور اگر رہتا بھی ہے تو کیا کرنا رہتا ہے کمرے میں کبھی دیکھا۔" وہ کچھ کڑے لہجے میں بولی۔

"نہیں جی۔ بابا صاحب خفا ہوتے ہیں کمرے میں نہیں آتے دیتے فون کرتے رہتے ہیں شاید اس لیے۔" وہ کچھ ڈرتے ڈرتے بولی۔

"یہ موبائل نے اس کا یہ بے غرق کر دیا ہے اسٹوڈنٹ۔" رعنا فون سے بولی۔ اسی وقت باہر پورچ میں گاڑی رککنے کی آواز آئی۔

"صاحب آگئے ہیں جی!" جنتاں فوراً بولی۔

"یہ کپ لے جاؤ۔" رعنا نے خالی کپ اس کی طرف ہدسایا جسے پکڑ کر وہ باہر نکل گئی۔

"سیلو آؤ رنگ! باؤ آریو؟" فخر حیات کمرے میں داخل ہوتے ہی حسب عادت فریض لہجے میں بولے۔

"فائن! وہ انٹیلیوں سے بال سنوارتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"حیرت ہے۔ آج آپ اس وقت گھر پر موند ہو ہیں۔" فخر حیات کا لہجہ طنزیہ تھا یا رعنا کو لگا۔ اس نے کچھ غور سے فخر کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"میں تو اب اکثری کھر پر ہوتی ہوں ہاں آپ آج کل خالصے مصروف ہونے لگے ہیں۔" وہ ان کا کوٹ اتارتے ہوئے بولی۔

"بزنس دو بڑھ گیا ہے جاناں لیکن۔" انہوں نے کاؤچ پر بیٹھ کر شوزا اتارنے شروع کیے۔ "آپ آج کل گھر پر کیوں پائی جا رہی ہیں؟"

"ویسے ہی۔ میں نے اپنی ایک میٹرو غیر کچھ کم کر دی ہیں۔" وہ سرسری سے لہجے میں بولی۔

"خیریت؟" وہ اچھے سے بولے۔

"میں کی الی پر فارمنس کی وجہ سے۔"

"مبارکباد! وہ راز کے مستحواں انداز میں شے" اس اسپیشل امین شن کا سیٹی صاحب پر کیا اثر ہو گا تھا۔"

"فخری پلیج باس طرح تو بہت بی ہو کریں۔ بچہ آپ کے دوسرے بچ (بھج) کر سکتا ہے۔" رعنا نے نرم لہجے میں احتجاج کیا۔

"آئی تو اور تمہیں معلوم ہے تاکہ میں نے اسے کبھی انور نہیں کیا مگر اس کے باوجود اس کا رزلٹ۔" انہوں نے سر ہٹا کر۔ "رعنا! میں سیٹی کی طرف سے بہت ڈس ہارن (دل برداشت) ہو چکا ہوں۔"

"پلیج فخری آپ اگر حوصلہ پارویں گے تو میں کیا کروں گی۔ مجھے یقین ہے اسے لیول میں وہ بہت اچھی پر فارمنس شو کرے گا۔ اسے رزلٹ پر فخرن دیتے ہیں آپ فکر نہ کریں۔" وہ فخر حیات کے کندھے تھامے انہیں حوصلہ دینے لگی۔

"اوکے دیکھتے ہیں۔" انہوں نے اندھے اچکائے۔

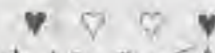
"تم ہرا چائے کا تو کہو۔ میں ہاتھ لے لیں۔ آج آٹس میں بھی چائے پینے کا ناٹم نہیں مل سکا پھر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ بلکہ چائے کے بعد لائٹ پیرا کھاتے ہیں۔" وہ کہتے ہوئے آٹس روم کی طرف بڑھے۔

"گورنر مینا پیراوں بیسیا جلد تو درست کرو۔ رعنا! میں تمہیں ہمیشہ فریض دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے نا۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔

"میں۔" وہ اپنی نیچے پر نگاہ کر کے کچھ شرمندہ سی ہو گئی "آپ ہاتھ لے کر آئیں۔ میں بھی تیار ہو جاتی ہوں۔" رعنا نے ہنسنے سے انکار کیا۔

"اوکے! وہ آٹس روم میں چلے گئے تو رعنا ان کا کوٹ وارڈ روم میں ہینگ کرنے لگی۔ وارڈ روم کا دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے کوٹ کا باہر لٹکا حصہ ہاتھ سے اندر کیا تو اندرونی جیب میں جیسے کوئی کانڈ سا چٹخا اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

وہ کوئی تصویر تھی کسی خوبصورت بلکہ بہت خوبصورت لڑکی کی۔ رعنا جیسے گنگ رہ گئی۔



"ابو جی نے مجھے کبھی بہو نہیں کہا تھا ہمیشہ بیٹی کہتے تھے اصل بیٹیاں تو بہو نہیں ہوتی ہیں کہ انہوں نے آخر دم تک ساتھ رہنا ہوتا ہے۔ بیٹیاں تو اپنے گھروں کو چلی جاتی ہیں ہمیشہ مجھے نہ بہت پر ترجیح دیتے کہتے تھے تم اس گھر کی اصل مالکین ہو یہ تو سہماں ہے۔ ہائے میرے اتنے پیار کرنے والے ابو جی، میں کیوں تمہا چھوڑ گئے۔ ہم بیٹیوں نے آٹھ کھانا کھایا رات کا نہ بہت چائے بنانے لگی تو میرا بھائی آیا مجھے لینے کہ ہاں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ہائے ابو جی میں کیوں اس کے ساتھ چلی گئی۔ آپ سے آخری بات بھی کوئی نہ کر سکی۔ آپ نے تو چھکے سے منہ موڑ لیا ہائے۔"

یہ بین بیہ وادیا ریشم کا تھا یا اس کے کان دھو کا کھار ہے تھے اگر یہ آواز ریشم کی تھی تو پھر واقعی دنیا میں ہر چیز دھو کا ہے۔ کسی کا کوئی اصل نہیں۔ ہر اصل کے نیچے ایک اور اصل ہے۔ کچھ بھی نقل نہیں۔ نہ بہت ابوبتی کی چارپائی کی پٹی پر سر نکالنے پتھر زوئی بیٹھی ریشم کی لہن ترانیاں سن رہی تھی۔

”سسر ہو گا اتنا پیار کہاں سننے میں آتا ہے آج کل۔ بچی صبر کر۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

ایک عورت پیچھے سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر رہی۔
 ”اگر ان لوگوں نے تو مشہور کر رکھا تھا کہ ہو ٹھیک نہیں مگر یہ تو۔۔۔“ ارد گرد کے گھروں کی عورتیں اور خاندان والے ریشم کی بیچ و بیکار سے متاثر ہو کر چہ گویاں کر رہے تھے پھر جنازہ اٹھنے پر اس نے جو کراہم بچایا لوگ نہ بہت کی غشی کو بھول گئے۔ اس کو کتنی عورتوں نے قہار کر کے اٹھ کر روہ بیچ کر بین کیے جاری تھی۔ جنازہ جانے کے کتنی ہی دن بعد وہ بمشکل سنبھلی۔ اس کے بعد کھانا شروع ہوا سو ب کو پوچھتے میں ریشم آگے آگے تھی اور نہ بہت دولا سادے میں تھی۔

”نزی میری، سن صبر کرو اللہ کو یہی منظور تھا۔“ وہ اسے بغل میں دبانے والا سادے لگی۔

”اللہ میری خطا میں معاف کرے۔ ان کی خدمت میری قسمت میں نہ تھی۔ میں نے ان کی قدر نہ جانی نہ تمہاری۔ مجھے معاف کرو۔ میری اچھی بہن! میں تم لوگوں کے لائق نہ تھی شاید۔ میں بھی کوشش کے باوجود اپنے دل کو تم لوگوں کے لیے وسیع نہ کر سکی۔ یہ سب اللہ کی مرضی سے ہوا۔ اللہ مجھے عاقبت کرے۔“

وہ نہ بہت کے آنسو پوچھتے ہوئے دھیرے دھیرے اس کے بال سلجھاتے ہوئے کھے جاری تھی اور نہ بہت تو ریشم کے اس روپ پر ابوبتی کا صدمہ بھی جیسے بھول چلی تھی۔ سوئم کے بعد دور پرے کے رشتے دار جانے لگے۔ گھرے سر مٹی کا لہن کے سوٹ میں لمبوس سلیقے سے دوپٹے کی بکل مارے ریشم دیکھ بھال میں آگے آگے تھی۔ نہ بہت تو ایک کونے میں بیٹھی بس کھام پاک پڑھے جاری تھی۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ کون آ رہا ہے کون جا رہا ہے۔

”سہیل بیٹا! ہم چاہتے ہیں ایک دو روز میں جب تک میں یہاں ہوں ہم نکاح کر لیں اور رخصتی چالیسویں کے فوراً بعد۔“

سزخان کی آنسوؤں میں بھگی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ وہ ابوبتی کے کمرے میں بیٹھی تھیں کمرے کی کھڑکی لاؤنج میں کھلتی تھی۔ جہاں وہ بیٹھی کھام پاک پڑھ رہی تھی دو موٹی اس کی آنکھوں سے ٹپک کر مقدس صحیفے میں جذب ہو گئے۔

”چھپو اس قدر جلدی کی آیا ضرورت ہے۔ مجھے معلوم ہے نہ بہت آپ کی امانت ہے۔ چالیسویں کے بعد کوئی سادہ رکھ لیں گے شادی کا۔“ سہیل نے جواب دیا۔

”نہیں بیٹا! اب اور دیر نہیں کرنی۔ اب میرے دل نے اس بات کی صلاح دی ہے۔ پہلے ہی بہت دیر گزری میں نے۔ میرا بھائی تشنہ لب پیلا گیا اللہ اس کی روح کو ٹھنڈا رکھے۔ میں بس آج کل میں یہ کام کر لینا چاہتی ہوں۔ تم فکر مت کرو۔ شہباز کی چھٹی بس آج کی ہے۔ اس لیے تم آج شام کا وقت رکھ لو۔ ٹیک کام ہے۔ اس میں کون سے ہم نے یا بچے گا بچوانے ہیں۔ یہ میرے دل کی خواہش ہے بیٹا!“

”مگر چھپو لوگ کیا کہیں گے۔ ابھی تو ابوبتی!“ وہ چپ ہو گیا۔

”سہیل! یہ بات تم مت کہو کہ لوگ کیا کہیں گے۔ تمہیں یہ سوٹ نہیں کرتا۔“ سزخان کے بڑے بیٹے ایاز کا لہجہ بہت کچھ جتا دینے والا تھا۔

سہیل نے ابو اپنا کرا سے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ معاملہ گرم ہو جائے سزخان بیچ میں آگئیں۔

”ایاز! تم چپ کرو۔ سہیل بیٹا تمہاری کیا صلاح ہے۔ بیٹا ہم کوئی غیر تو ہیں نہیں۔ نہ ہمیں جیڑ کا لالچ ہے نہ کسی اور کا۔ بس یہ بچی میرے دل کی خوشی ہے اور اس کے اپنا ہو جانے کا خوش کن احساس مجھے دے دے۔ مجھ پر

تمہارا۔ احسان ہو گا۔“ وہ عاجزی و محبت سے بولیں۔

”تمہارے پیچھے! ابھی آپ کی خوشی۔“ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

”پھر آج شام چھ بجے کا ناغم ٹھیک رہے گا۔ سارا انتظام ایاز اور اظہر تمہارے ساتھ مل کر کریں گے کیونکہ شہباز کو علی السبب یہاں سے روانہ ہونا ہے۔“ وہ باقی تفصیلات طے کرنے لگیں اس سے کھام پاک پڑھتا ہوا ہو یا ہاتھ پاؤں اٹھانے لگے۔

”نہ بہت! اب میرے ساتھ آؤ۔“ ایک دم سے ریشم اس کے پاس آ کر بوی محبت سے بولی۔

”کمال!“ وہ اس کی اچانک آمد سے اچھل سی تو پڑی تھی۔

ظہور آتھ روم تک۔ میری کچھ عزیز خواتین میں سے دونا چاہتی ہیں ان کے پاس۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولی۔ اس نے کھام پاک بند کر کے اوپر الماری میں رکھا اور دوپٹے و دست کرتے ہوئے اس کے ساتھ

دور کھڑے روم میں دو بیٹھیں چالیس کے درمیان کی عموں والی خواتین بیٹھی تھیں، قیمتی مکر ساہ لہاس میں ان کے چہرے۔ بونٹی کے تھے وہ شکل ہی سے خزانہ اور چلتا پڑھتا ٹائپ لگ رہی تھیں۔ سادہ سادہ سلونی رنگت پر وہ نونے کا سیاہی آپ کے کھانہ تعارف کرانے پر دونوں نہ بہت کو عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

”میرا آئی صوفیوں اور چھٹا۔“ ریشم تعارف کرانے کے ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

”بہت افسوس ہوا آپ کے والد کی بچھڑا سون کر۔“ صنوبر کے لیے میں نہیں بھی افسوس کا شائبہ نہیں تھا جیسے ابھی لکھا رہا تھا۔ بونٹا اس کی مٹی تھی گول گول آنکھیں نہ بہت کے سراسرے کا بھر پور اور باریک بینی سے جانچ رہی تھیں۔ اس کے اندر کے رونگٹے کھڑے ہوئے محسوس ہوئے صنوبر نے آنکھ سے عارف اور

پتھر ہی تھری طرح کمرے سے باہر نکل گئی اور تین قدموں سے کارپڈور میں چلتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھی کہ دو مری طرف سے آنے شہباز سے مل کر بولتے ہوئے تھی۔ اس کے وجود سے پہلے ہی بیٹھ چھوٹ رہا تھا۔ انہیں

ساتھ بگڑ کر اور تو اس بانٹت ہو گئی۔ وہ آواز کے آگے تو وہ کھڑے تھے۔

”پلیز نہ بہت ایک منہ لہو اپنی جگہ سے ہلے بغیر بولے تو وہ کھڑی رہ گئی۔“

”بہت افسوس! مجھے ماموں جان کا کہ میں جاؤں بھی تو لفظوں میں اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔“ ان کا لہجہ دیکھ کر غافل رہا تو وہ لہجے میں جھکائے چپ کھڑی رہی مگر آنسوؤں کا بار بار ماسا آنکھوں میں لہ آیا کرتے ہی لہے خاموشی سے

کھڑے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ایک ایک کر کے بہنے لگے۔

”بس کرو پلیز مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔“ شہباز نے آگے بڑھ کر اٹھتی کی پور سے اس کے اشک پونچھے۔ ”کاش میرے پاس تمہارے دکھ کا دوا ہوتا۔“

”تمہارے سب قدرت کی طرف سے جس کا کوئی دوا تو نہیں کر سکتا مگر میں یہ وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ تمہارا یہ دکھ آخری تھا۔ اس کے بعد آنسو بہانے کے لیے تم بھی تنہا نہیں ہو گی۔ ہر آنسو ہر ہنسی میں میں تمہارا شریک ہوں گا۔ میں وعدہ تو نہیں کرتا مگر میری یہ ہر ممکن کوشش ہو گی کہ کبھی تمہاری آنکھوں میں ایسی برسات نہ اترے۔ میرا پیار تمہارے ہر دکھ کا دوا بن جائے۔ اللہ!“

اس سے اب کھڑے رہنا محال ہو گیا تھا اگر کوئی دیکھ لے تو۔ اس کے دل میں خدشا ابھرا۔

”اور یہاں تک ہو۔“ وہ اب اس کے چہرے کو عمل طور پر فوٹس کیے ہوئے تھے۔ اس نے چوٹک کر ایک پل کو پللیں اٹھائیں۔ ان کی محبت پاش نگاہوں کی تاب نہ لا کر پھر سے جھکا دیں۔

”آج شام کو ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔ نہ بہت! اب یہ دوری بند دونوں کی ہے۔ کوئی میرے دل سے

پوچھتے کہ ان محلوں سے بڑھ کر قیمتی میری زندگی میں کوئی لمحہ نہیں ہو گا جب تمہارا نام میرے نام کو معتبر کروے گا۔ تم بھی ایسا ہی سوچتی ہو نا۔

وہ اس کے جھٹکے ہوئے چہرے کے قریب ہو کر بولے تو اس کی سانسیں کھنکنے لگیں۔

”نہیں! میں پلیر۔“ اپنی آواز خود اس تک بھی نہیں پہنچی تھی۔

”تم از کم مبارک ہی دے دو تجوس! وہ شاید اس کی حالت سے ملاحظہ ہو رہے تھے۔

”کس بات کی؟“ وہ بے ساختہ گھبرا کر پوچھ بیٹھی۔

”میرا شام کو نکاح ہے نا۔ تم آؤ گی؟“ وہ شہزاد سے بولے۔

”نہیں۔ بالکل نہیں۔“ وہ کہہ کر چھپاک سے کمرے میں گھس گئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

”تمہارے تو بڑے بھی آئیں گے۔ قاضی صاحب تمہیں کان سے پکڑ کر لائیں گے۔ کتنی اور چھو کی۔“ وہ کہتے ہوئے لاڈلج کی طرف مڑ گئے اور وہ بند دروازے کے پیچھے کھڑی اپنے دل کی منتشر دھڑکیوں کو سناتے لیں۔

”نہیں تارا! رگ جاؤ۔“ سلطان بخت کی غصیلی عمد ہم آواز نے قدم پر حاتی میں تارا کے قدموں کو جیسے جکڑ لیا۔ انہوں نے پیچھے سے اس کے کندھوں کو سختی سے پکڑا اور اپنی طرف اسے گھمایا۔

”ایسا۔ تمہارا مطالبہ نہیں تھا؟“ ان کے چہرے کے نقوش سن گئے تھے۔

”نہیں تارا! دل میں سم گئی۔ اسے اس دن کا تھپڑ مار دیا تھا۔ وہ خود کو کوئی بھی جواب دینے کے قابل محسوس نہیں کر پاری تھی۔ زیور گل کو بھی مجبوراً رکنا پڑا۔

”بولو۔ میں کیا پوچھ رہا ہوں؟“ اس کے نازک کندھوں پر جسے ان کے ہاتھوں میں مزہ سختی آئی تھی۔ نہیں تارا! کاناڑک بدن کانپ کر رہ گیا اور ہونٹ بولنے کی کوشش میں شخص پھر پکڑا کر رو گئے۔

”شاہ جی مجھ سے بات کریں۔ سچی کو ہر اسماں نہ کریں۔“ اب کے زیور گل سے برداشت نہ ہو سکا۔ غصے میں آگے بڑھ کر بولی۔

”خانم! تم چپ رہو۔ یہ تمہارا معاملہ نہیں۔“ وہ بھڑکے ہوئے انداز میں دھاڑے۔

”آہستہ بولتے شاہ جی! یہ آپ کی حویلی نہیں ہمارا غریب خانہ ہے۔“ زیور گل بغیر خوف کھائے چلائی۔

”غریب خانہ یا عیش خانہ؟“ وہ مسخر سے بنکارے۔

”آپ لوگوں کے لیے عیش خانہ اور ہمارے لیے غریب خانہ۔“

وہ کھلی چوٹ کر گئی۔ سلطان بخت نے اسے گھور کر دیکھا اور اپنی نظریں نین تارا کے زرد پڑتے چہرے پر جمائیں۔

”نینو! کیا تم میری نہیں ہونا چاہتیں؟“ ان کا لہجہ یک بیک شہمی ہو گیا تھا۔ نین تارا اہل بھر میں پانی بن کر بیٹھ گئی۔

”میں صرف آپ کی ہوں شاہ جی! وہ خود سپروگی کے تے انداز میں بولی شاہ جی کی روح تک سرشار ہوا تھی۔

”یو اوم! دام! اب کیا کہتی ہو؟“ وہ فاتحانہ انداز میں بولے۔

نین تارا اپنی اور مضبوطی سے قدم اٹھاتے ہوئے زیور گل کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”نام! شاہ جی تو مجھے ہر حال میں شاہ جی سے ہی کہتی ہے اور یہ ہم دونوں میں سے کسی کے لیے گھائے کا سووا نہیں۔ اب آپ خود سوچ لو۔“ نین تارا کے پیچاک انداز پر زیور گل نے پل بھر میں اپنی سوچ کا رخ موڑا۔ اس نے دونوں کو گہری نظر سے دیکھا اور وہ قدم پھیل کر سلطان بخت کے قریب آگئی۔

”شاہ جی! میری کچھ شراکتہ ہیں۔ نین۔“ اہم اور جراتور۔“ اس نے دور پڑے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

”معلوم ہے زیور گل! تم نے اس نازک موقع کے لیے بہت سی شرائط سنبھال کر رکھی ہوں گی۔ تمہاری کا اس

کی یہی تو خوبی ہے۔ موقع سے جی بھر کے فائدہ اٹھانا۔“ ان کا نظریہ لہجہ کاٹ دار تھا۔

”پھر بھی آپ جیسی باعزت کلاس ہماری کلاس کی جو تیاں چانتی ہے۔ ہے شاہ جی؟“ زیور گل کب چوکنے والی تھی۔

”تم اس وقت سب کچھ کہنے میں حق بجانب ہو خانم! سلطان بخت آرام وہ انداز میں پیچھے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ زیور گل ان کے سامنے بڑی کرسی پر آئی تھی۔ نین تارا البتہ اسی طرح کھڑی تھی۔

”میری پہلی شرط۔“ زیور گل نے آغاز کیا۔ ”سب کچھ لکھا جائے گا شاہ جی کے کاغذ پر۔ ابھی اور اسی وقت۔“ اس نے انہیں باور کرایا۔

”مجھے تمہاری ہر ادا کی خبر ہے اسی لیے میرا وکیل میرے ساتھ آیا ہے۔ کچھ کام نہیں کرنا ہیں۔“ انہوں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا اور پاپ میں تہا کو بھرنے لگے۔

”یہ نکل خفیہ رہے گا جب تک تم چاہیں گے۔“

”ایک منٹ۔“ شاہ جی ہاتھ اٹھا کر بولے۔

”ایسا صرف نکل کر ہی بڑھانے کا پروگرام ہے میں تو شادی کرنے آیا ہوں یارات بھی لایا ہوں۔“ ان کا انداز زیور گل کو ایک آنکھ نہیں بھارا تھا۔ ”مجبوری تھی سونے کی چڑیا کی جان اس بدست شیر میں آسانی تھی۔

”وہی میرا مطلب ہے۔“ وہ بادل خواہ بولی۔

”مختیگ گاؤ۔“ انہوں نے مستوی طور پر اطمینان کا سانس لیا۔

”حق مہر ہماری مرضی کا ہو گا۔“ لہجہ صاف و صمکائے والا تھا۔

”او کے۔“ ان کا اطمینان دیدنی تھا۔ نین تارا کھڑی ان پر سوجان سے تار ہو رہی تھی۔

”پچاس لاکھ بیس ہوں گے۔ ابھی اور اسی وقت۔“

”زیور گل! یہی بیخ راہی ہو لہجہ و سحر و سحر و سحر و سحر۔“

”شہت اب شاہ جی! اسے آگ لگ گئی۔“

”موشٹ اب سٹی کی سو اکر۔“ وہ جواباً اس سے بلند آواز میں دھاڑے۔

”شاہ جی۔ آئی ایم سوری۔ آپ جانتے ہیں۔“ وہ بہت کچھ برداشت کر کے یک لخت کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

”زیور گل! میں تمہاری بیٹی سے شادی کر رہا ہوں! سید سلطان بخت آف احمد پور اور تم چھوٹے دکانداروں کی طرح مول تول کر رہی ہو۔ میں خود ہی حق مہر میں نین تارا کے نام اس قدر لکھ دوں گا کہ تم چٹکی اپنے لیے کسی فزیشن کو بلا کر کہو کہ تمہارے جو اس جانے کا خطرہ ہے۔ گلزار اندر آؤ۔“ آخری جملہ انہوں نے دروازے کے باہر کھرتے کن مین سے کہا جو ان کی آواز سنتے ہی بوتل کے جن کی طرح حاضر تھا۔

”جاؤ اور باہر موجود میرے سب دوستوں کو اندر بلا لاؤ۔“ وہ ”جی شاہ جی“ کہہ کر باہر نکل گیا۔

”تور زیور گل اندر سے کوئی چادر لا کر نین تارا کو دے دو کہ یہ اپنے جسم کو ڈھانپ لے۔“ وہ اس کے باریک لباس سے جھانکتے گورے بدن سے نظریں چراتے ہوئے بولے۔

آدھ گھنٹہ بعد نین تارا سلطان بخت کی زوجیت میں آچکی تھی اور حق مہر میں اتنا کچھ تھا کہ زیور گل حقیقتاً ”بے ہوش ہو گئی۔ جس کی بے ہوشی وہ خبری سے فائدہ اٹھا کر سلطان بخت نے نین تارا کا ہاتھ پکڑا اور باہر کی طرف بڑھے۔ نکلج کے بعد سب لوگ جا چکے تھے۔

”چلو جان سلطان بخت! زلیت گئے ان حسین لحوں کو امر کر لیں۔“

وہ اسے اپنے ساتھ لگائے لگائے باہر پورج تک آتے ہوئے بولے۔ تو وہ کچھ اور ان کے پہلو میں سمٹ گئی۔ ان کے باہر جاتے ہی زیور گل نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں اور اپنے دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑے اس کاغذ کو نکالا اور از سر نو پڑھنے لگی۔

"انتا کچھ او میرے خدا! خوشی سے اس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔" کاش میری نین تارا جیسی دو بیٹیاں ہوتیں تو میں مرنے کے بعد کسی بہشت کی تمنائے کرتی۔ Nain Tara my heaven's key (نین تارا میری جنت کی چابی) اتنی لوبو مائی ڈائرا! اتنی لوبو مائی سویت ہارت۔ "وہ خوشی سے دیوانی ہو اٹھی اور جھوم جھوم کر کمرے میں ناپٹنے لگی۔"

"صوفی صاحب! زابدلی بی کچھ کہتے کہتے تھک گئیں۔ وہ چائے کا خالی پیالہ لیے باہر جا رہی تھیں۔ صوفی صاحب گل کے اخبار کو سرسری نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی جھجک پر سراٹھا کر انہیں دیکھنے لگے وہ ہنوز خاموش تھیں۔"

"کوئی خاص بات ہے کیا؟" انہوں نے اخبار کا اندرونی صفحہ کھولا۔
 "وہ عبدالسبین آئے گا اس اتوار کو۔" انہوں نے تھوک نکل کر بمشکل پوچھا۔
 "نہیں۔" وہ قطعاً لہجے میں بولے۔

"بائیس دن ہو جائیں گے گل سے۔" وہ دونوں کی گفتگو میں اپنی بے قراری عیاں کر رہی تھیں۔
 "زابدلی بی! اگر اب وہ پڑھ رہا ہے اور کچھ دل لگا کر تو اسے پڑھنے دو ایک دو سال کی بات ہے۔ اس نے کوئی تیار وہاں نہیں رہنا۔ کچھ بن جائے گا۔ ایک دو ماہ گھر نہیں آئے گا تو کوئی بچہ بچال نہیں آجائے گا دنیا میں۔" وہ تلخی و بیزاری سے بول رہے تھے۔

"یہ تو ٹھیک ہے۔" وہ سر جھٹکا کر بولیں "اس کے کپڑے میلے ہوئے ہوں گے سارے۔ دھونے کا مسئلہ ہو گا۔ وہاں سے آنا کپڑے دھونے سے کتنے تک روٹا پھر بھلے چلا جاتا۔" انہیں کچھ سمجھ میں نہ آیا تو یہی کہہ بیٹھیں۔
 "وہاں سب طالب علم چھٹی کے دن اپنے کپڑے خود ہی دھوئے ہیں ہم بھی دھوا کرتے تھے۔ وہ کسی ریاست کا شہزادہ نہیں۔ ہم بھی اپنے والدین کے اتنے ہی پیارے تھے مگر والدین بولنے والے ہیں۔ دل ہتھیلی پر چلا نہیں رکھے ہوتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر مرنے نہیں جاتے تھے۔ اللہ سے محبت کا بوت دینے کے لیے پڑھ تو قریابی دنیا ہی پڑتی ہے اور یہ تو بہت معمولی ہے۔ تم اللہ کا شکر ادا کرو وہ اللہ کے پاک کلام کو اپنے سینے میں سمور رہا ہے۔"

وہ ہنوز بے تاثر چہرے لیے کھڑی تھیں۔ صوفی صاحب کی گفتگو کا ان پر کچھ خاص اثر دکھائی نہیں رہا تھا۔
 "جلیل کیا تھا اس بھٹے اسے تمہاری دی ہوئی سوغا میں دیئے۔ بتا رہا تھا ٹھیک ہے وہ۔" اب وہ پھر بیزاری سے بولے۔
 "ماٹھے پر نشانیں ابھر آئی تھیں۔"

"جلیل نے ہی تو بتایا ہے۔" ان کی آواز بھرا گئی۔
 "کیا بتایا ہے۔ اس نامہ دار نے؟" وہ چونکتے ہو کر بولے۔
 "اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال رکھی ہے مولوی صاحب نے جس کی وجہ سے اس کا ٹخنہ زخمی ہو گیا ہے صوفی صاحب! وہ رونے لگیں۔"

"نامہ دار یہ چغلیاں کھاتا ہے گھر آکر۔" وہ بڑبڑائے۔ "زابدلی بی! جو صلہ۔ جو صلہ کرو۔ ایسی کیا بات ہے۔ میری کمر پر ہنسیوں کے شان دیکھیں ہیں نامہ نے ہمارے۔ تاہم گرامی کی نشانی ہے۔ ہمیں تو غر ہے اس مار پر۔ چار دن کی سخت جھیل لی۔ کچھ حاصل تو کر لیا نامہ دار تو نہیں رہے۔"

زابدلی بی کے آنسو اب تو اتر سے اتر رہے تھے۔
 "اور جوں اس کرتا ہے جلیل! آج میں اس کے کان کھینچوں گا ایک آدھ گھنٹہ کے لیے قاری صاحب نے یونہی زنجیر ڈالی ہوگی۔ کوئی ہمیش کے لیے تھوڑی۔ اب ٹھیک ہے وہ میں نے پتا کروایا تھا۔"

زابدلی بی کو معلوم تھا وہ ان کو جھولی تسلیاں دے رہے ہیں۔
 "وہ کہہ رہا تھا اگر مجھے لے جائیں نہیں تو مدرسے کی چہست سے کوہ کر جان دے دوں گا۔" وہ یو وار کو قہقہہ کر رہے

قاپو ہو کر بولیں۔
 "زابدلی بی! اپنے دل کو مضبوط کرو۔" وہ زوردار آواز میں گرتے "ایسی گینڈر بھجھکیوں میں آؤ گی تو اپنی ہی جان سے جاؤ گی۔ اسے کچھ نہیں ہو گا۔ اس کی میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں۔ ایسی دھمکیاں ہم بھی دیا کرتے تھے۔ عمل کرنے کے لیے ہماڑ کا جگر چلا ہے۔"

وہ دھیمی آواز میں ان کی طفل تسلیوں سے بے نیاز روتی رہی۔ صوفی صاحب نے قہر آلود نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"دیکھو تو عبدالستین! دوبارہ کوئی خط نہیں آیا۔" کچھ دیر بعد انہوں نے زابدلی بی کا دھیان دوسری جانب لگایا۔ وہ عمل کے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے لگیں۔
 "بہت جلدی شہر کی آب و ہوا میں رنج بس گیا ہے وہ۔" وہ خود سے بولے۔ زابدلی بی اٹھ کر باہر جانے لگیں۔
 انہوں نے ان کی تشویش پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔
 "اور بالکل وہ زابدلی بی کو باہر جاتے دیکھ کر بولے وہ رک گئیں۔"

"آمنہ اور زہدیت سے کوسمائی کا کام جلد سیکھ لیں۔ زیادہ سے زیادہ اگلے مہینے تک۔ یہ وہاں جو لڑکی آئی ہے۔ ماسٹر صاحب کی رشتہ دار وہ بہت تیز اور ہوشیار لڑکی ہے اور میرے خیال میں کسی حد تک بے باک بھی۔ تم آمنہ اور زہدیت کو سمجھاؤ تاکہ اس کے ساتھ زیادہ نہ انہیں بیٹھیں۔ صحبت کا بڑا اثر ہوتا ہے۔" وہ چپ چاپ سنے لگیں۔

"میں خود بھی گیا تھا ماسٹر کے پاس کہ اس لڑکی کو سمجھائیں بے پردہ گاؤں میں نکل آتی ہے۔ اوہ یہ بات اچھی نہیں سمجھی جاتی۔ شریف گھروں سے متعلق کچھ شاید اس کو قائل نہیں کر سکے۔ قرب قیامت کی نشانیاں ہیں رشتہ کے سچ میں چلتی ہے۔ شاید اسے آسانی نہیں لڑکیوں کے لیے یہ چیز بتانی ہے۔ تم آمنہ اور زہدیت کو سختی سے میری طرف سے سمجھاؤ۔ جب تک وہ ادھر ہے ہم انہیں نہ ہی سمجھیں تو اچھا ہے۔" یہ انہوں نے آخر میں تجویز پیش کی۔

"اب دونوں کا ہاتھ رواں ہو گیا ہے۔ میں ان کو سمجھاؤں گی۔" وہ کہتی ہوئی باہر نکل گئیں صوفی صاحب کو زابدلی بی کا ان کی تجویز سے انکار کرنا اچھا تو نہیں لگا تھا مگر یہ بھی وہ خاموش رہے اور اخبار کی طرف دوبارہ متوجہ ہو گئے۔

شام سات بجے قہقہے ہو گیا۔ نکاح کے وقت وہ کس قدر روٹی تھی حالانکہ محض ساتن ہی تو کرنا تھے۔ جو اس نے آج سے پہلے ہی بے شمار دفعہ کیے تھے امتحانوں کے واقعہ فارمز سے لے کر نہ جانے کہاں کہاں مگر آج کے دستخط کرنے میں کیا بات تھی کہ اس کا دل ہی قابو میں نہ آ رہا تھا۔ پچھو اور باقی لوگ اسے سنبھال سنبھال کر ہڈھال ہو گئے۔ ایک تو ابوجی کی اچانک موت کا صدمہ اور پھر سے یہ اتنا اچانک کام یہ اس کے لیے تو یہ بہت بڑا کام تھا جس کے لیے ابو ترستے چلے گئے تھے وہ کام ان کے جاتے ہی تیسرے دن انجام پا گیا۔ شادی کے معاملے میں رب نے شاید ان دونوں بہن بھائی کی قسمت ہی ایسی بنائی تھی۔ سہیل بھائی نے کورٹ میں جگ کر لی اور اس کی شادی ابوجی دنیا سے رخصت ہونے کے محض تین دن بعد ہوئی۔ اس کا دل چیخ چیخ کر رونے کو کر رہا تھا خوشی کی معمولی سی رفق بھی دل کے کسی کونے سے نہیں جھانک رہی تھی۔ بس آنسوؤں کی بوچھاڑ تھی ہوائے حلی آ رہی تھی پچھو نے اسے زور سے ڈانٹا۔

"ہر کام حکم الہی ہوتا ہے ہم بندے بے اختیار ہیں کچھ بھی اپنی مرضی سے نہیں کر سکتے۔ اگر ایک پاپ اپنی مرضی سے حرکت نہیں کر سکتا تو ہم بندے کیا چیز ہیں۔ بھائی کا اس طرح جانا نکاح کا ہونا سب اس کے حکم سے ہے ہم محض ادھام بھالانے والے ہیں۔ ٹیک کاموں میں اس طرح رو کر پد شکلی نہیں کیا کرتے۔ اس کی رضا میں دل کو راضی کر لو پھر دل ٹھہرائے گا۔ اب میں تمہاری آنکھ میں آنسو نہ دیکھوں۔"

اس کو سینے میں سمونے وہ سختی اور نرمی سے اسے سمجھادی تھیں اس کے آنسو جیسے خود بخود تھم گئے۔
 کپٹن شہباز تو نکاح کے فوراً بعد ہی چلے گئے اس سے یہ نیارشتہ استوار ہونے کے بعد ملے بغیر ہی اس کے
 دل میں تنگی سی رہ گئی۔ وہ ابو کے کمرے میں پھپھو کی آغوش میں مائی ہوئی تھی۔ وہ کمرے میں آگیاں کو خدا حافظ
 کہہ کر چلے گئے اور اسے بھی جو اس کے اندر آنے اور سمٹ گئی صبح پھپھو اور ان کے بڑے دونوں بیٹوں کو بھی
 روانہ ہونا تھا اس کا دل بہت اداں ہو رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے ان کے جانے کے بعد وہ بھری دنیا میں تنہا رہ
 جائے گی۔

راست کو اچانک مسزخان کی طبیعت خراب ہو گئی، غم اور خوشی کی ملی جلی شدتوں نے ان کے دل و دماغ پر کوئی
 اچھا اثر نہیں ڈالا تھا۔ ان کا دل پی شوت کر گیا تھا اور دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوئی جا رہی تھیں۔ ڈاکٹر کو بلوایا گیا
 اس نے فوری طور پر کچھ انجکشن وغیرہ لگائے مگر ان کے اثر کے تحت وہ سو گئیں۔
 ڈاکٹر نے انہیں سفر کرنے سے منع کر دیا۔

"تھیک ہے، ہم امی جان کو کچھ دنوں بعد لے جائیں گے بلکہ شہباز کو اگلے ہفتے آتا ہے وہی انہیں آتے ہوئے
 لے آئے گا۔" ایاز نے کہا تو بہت کے دل کو عجیب سی ڈھارس بندھ گئی جب کہ ریشم کا موڈ خراب ہو گیا نہ
 جانے کیوں بہت ہمت اس کے بگڑے تیور دیکھ کر ہنسنے لگی۔

"وہ تو اتنے کالو سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" ظفر کا سوال اس قدر اچانک اور فضول تھا کہ معاذ چارباٹی سے اچھل
 کر اٹھ بیٹھا اور حیرت سے چاند کی روشنی میں ظفر کے سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھنے لگا اسے فوری طور پر کوئی
 جواب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
 "میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" اس نے معاذ کی خاموشی سے جانے کیا کہا۔
 "ظفر! تمہیں معلوم ہے میں یہاں شادی کرنے نہیں آیا اور شادی کی ٹیبلٹ تو شاید میرے ہاتھوں میں نہیں ہے
 ہی نہیں۔"

اس نے دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر چاند کی روشنی میں لیکر دیکھنے کی کوشش کی۔
 "نیک زندگی میں ابھی بہت کچھ کرنا ہے، اتنا کچھ کہ زندگی کی روشنی میں ان لکھیوں سے وہ کچھ حاصل کر سکوں تو
 کچھ ان میں محروم نہیں۔ تم جانتے ہو نا؟"

اس نے مٹھیاں بند کرتے ہوئے ظفر کی طرف دیکھا جس نے معاذ کے جواب پر جیسے سکھ کا گھر اسٹافس لیا تھا۔
 "اماں اور کالو نے ایسا ہی جان کھائی ہوئی۔" معاذ سے یہاں کرنا چاہتے ہو۔ ان ہی دو فضول عورتوں کی وجہ سے
 میں شیم خانے میں رہتا رہا ہوں یہ دونوں عورتیں کسی ہی زندگی پر سکون گزرنے نہیں دیتیں۔ معاذ ان کی شکلیں
 تہ رہد صورت ہیں ان کے اندر ان سے زیادہ کہہ اور کالے ہیں کہ جو ان کی بد صورتی کی زد میں آ گیا۔ وہ
 زندگی بھر اپنے نصیبوں کی سیاہیاں دھوتا رہتا ہے۔ بد صورتی شکلوں میں نہیں ہوتی یہ تو دل بد صورت ہوتے
 ہیں جو بہت ارادوں سے وہ سروں کی زندگیاں بے سکون کرتے ہیں۔" وہ سختی سے کہہ رہا تھا۔
 "تم آرام کرو میں اب اسے کہہ دوں گا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا "لیکن مجھے معلوم ہے۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔
 "ایا؟" معاذ نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔

"معاذ! یہ دونوں اس انکار پر چین سے نہیں بیٹھیں گی، خیر تم فکر نہ کرو۔" وہ کہہ کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے اپنے
 سز کی طرف بڑھ گیا۔ معاذ کے لیے فکر کا نیا دوروا کر گیا۔

صبح کے پندرہ بجے امن سے گزرتے وہ دونوں ماں بیٹی اندر کے کمرے میں تھسی خدا جانے کیا کر رہی تھیں۔
 "مجھ سے کسی غلطی ہوئی میں ظفر سے کہہ دیتا ہوں اگلے مہینے چلا جاؤں گا۔" اب تو ایڈیشن ہونے میں بھی
 پندرہ بیس دن رہتے ہیں جا کر اپنا کوئی ٹھکانہ کرنی لیتا۔ جن کا کوئی نہیں ہوتا وہ اس طرح آکر وہ سروں کے در پر

نہیں بڑھاتے۔ میں اس معاملے میں اللہ سے مایوس کیوں ہوں، صبح کو محنت مزدوری کرتا رات کو کہیں نہ کہیں
 سونے کا ٹھکانا مل ہی جاتا۔" وہ خود کو سمجھا رہا تھا۔ اسی وقت ظفر کا ایازین کا دروازہ زور سے کھول کر اندر داخل ہوا۔
 "ہائے ظفری کے ابا! ہم لٹ گئے، ہم برباد ہو گئے۔ ہائے مجھ غریب پر قیامت لوٹ پڑی۔ ہائے۔"

ایبھی اب تک ایازین کی باتوں اور لہجے کے اندر وہ سراپو کھٹ میں تھا کہ ظفر کی ماں اپنا سینہ چمکتی ہوئی باہر نکلی۔ اس کی
 اچانک چیخ سے معاذ بھی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔
 "کیا ہوا ایازین؟ کیوں پانکوں کی طرح چلا رہی ہے۔" اس نے دروازہ زور سے بند کرتے ہوئے اسے جھڑکا۔
 "ہائے میں پاگل نہ ہوں کی کیا سمجھو پر یہ قیامت لوٹ پڑی۔" اس نے سینے پر دو ہاتھ مارے۔
 "کیا ہو گیا ہے؟ کیا ماں مگر تیری جو یوں بین ڈال رہی ہے۔" ایازین چلا۔
 "ماں مرے تو برس جیتے۔ اب تو میں اپنی بیٹی کی خوشیوں کے خواب دیکھوں۔ پر کسی نامراد کو وہ بھی نہیں
 بچھائے۔" وہ اور چیخنے لگی۔

"بچے جانے کے کچھ نہ بنا۔" ابا چارباٹی کھیٹ کر ریشم کے نیچے لے گیا اور اس پر بیٹھ گیا۔
 "میرا اس تو نے کاش سونے کا سیٹ ظفری کے ابا! ہار بندے، انکو بھی سب غائب ہائے میں مگر کیوں نہ گئی؟" وہ
 بری طرح اپنی رائوں کو پیچھے لگی۔
 "ماری نامراد! کیا کہے ہے ہتھے کچھ سمجھ میں نہ آئے۔" ایازین نے جھجلا کر کہا۔ اسی وقت ظفر باہر سے دروازہ کھول
 کر اندر داخل ہوا وہ شاید کھیتوں سے آیا تھا مٹی میں ہاتھ منڈھ سرائٹا ہوا تھا۔
 "قاری بولوں ہوں میں" وہ چیخا۔ "جو تیری سمجھ میں نہ آئے چوری ہو گیا میرا زیور، میری زندگی کا سارا سرمایہ،
 نہ چینیوں نہ پینوں میں۔"

"چوری ہو گیا تیری موت ماری گئی ہے، ہون چڑھے اوہر چور کہاں؟" ایازین اسے جیسے دن اور رات کا فرق
 سمجھا۔
 "چور کو کیا دکھ دن ہے کہ رات اسے تو بس چوری سے گرن (غرض) ہوئے ہائے میں لٹ گئی صندوق میں
 تالا لگا کر رکھا تھا، تالا ٹوٹا پڑا ہے۔ زیور غائب ہون لے گیا باہر سے کیوں آیا۔ ہائے کوئی جائے میرے بھائی کو بلا کر
 لائے اس کی تھانے واری سے تو بڑے سے بڑا چور بک پڑے ہے، وہ خود ہی تالا لگے گا چور کا۔" وہ اونچا اونچا بول
 رہی تھی۔
 "اماں! ایک بندہ مل گیا۔" کالو اندر سے بڑا سا سونے کا ٹائٹل لے کر آئی۔
 "کہاں کہاں سے ملا؟" اماں اس پر جھپٹی۔

"اماں! اس کے کپڑوں کے اندر سے کیسے میں۔" اس نے بلا بھجک معاذ کی طرف اشارہ کیا۔ معاذ کو ٹوٹو گیا کر شٹ
 چھو گیا ابا اور ظفر بھی اسے دیکھنے لگے۔
 "میں کیسے ہی کہوں تھی یہ کوئی گھر کا بندہ ہے چور باہر سے نہیں آیا ہائے کوئی میرے بھائی کو بلا کر لائے تو ہی اس
 گھر کے نمک حرام چور سے تیرا سارا زیور نکلوانے گا۔ احسان فراموش، آستین کا سانپ لے کر آیا تیرا بیٹا۔ ہم
 نے اس کی خدمت میں اس نے یہ صلہ دیا ہمارے ہی گھر میں لقب لگائی۔ ہائے ظالم تجھے حیا نہ آئی۔" اماں نے
 آگے بڑھ کر دو ہاتھ اسے مارے وہ اچھل کر زور جاکھڑا ہوا۔ "اسی لیے تو یہ آج جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔"
 انہیں سب خبر تھی اس کے ارادوں کی۔

"جو اس نے کر میں دیکھا ہوں اندر چل کر یہ کیوں چوری کرے گا۔" ابا اٹھ کھڑا ہوا۔
 "تو کیا میں نہ کستا تھا ان کی شکلیں جس قدر ہیانک ہیں اندر اس سے دل بھی کالے ہیں۔ معاذ اب تم ادھر
 نہیں رہ سکو گے اس کا بھائی اولی درجے کا غنڈہ بد معاش والدار ہے۔ وہ آیا تو شاید تم ادھر سے زندہ جاؤ گی نہ
 سکو۔ اسے کسی گواہی کی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوگی۔ قانون اس کے گھر کا ہے۔" ظفر اس کے پاس کھڑا دھیرے

دھیرے بول رہا تھا اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔
"میں۔ میں۔" اس کے لب ہلے۔

"تم اندر جا کر ایک دو ضروری کپڑے سمیٹو میں تمہیں رات میں اوہر سے نکال دوں گا۔ یہ عورت چین سے نہیں بیٹھے گی۔ اس کا بھائی ابھی گاؤں سے باہر گیا ہوا ہے صبح مجھے جاتے ہوئے ملا تھا۔ رات کو آنے کا تم رات کو نکل جانا موسم بھی مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔" اس نے سر اٹھا کر آسمان پر بادلوں کو دیکھا۔
"میں ظفیری کے ایسا صبر نہیں کروں گی۔ اس لڑکے کو تم تھانے بھجواؤ پوئیس اگلوائے گی۔ اس سے باقی بچ۔" وہ بولتی ہوئی باہر آ رہی تھی۔

"ارے بھلی لوگ صبر کر۔ شام کو نیا ز آجائے گا تو نہیں فیصلہ کریں گے یوں تھانے جا کر گھر کی عزت نہ رول نہ مسمان ہے ہمارا نیا ز شہر سے رات تک آجائے گا تیرا زیور نہیں تمیں جاتا مل جائے گا تجھے۔" ابا سے سمجھا رہا تھا۔

"میں صبر کروں تم اس چور کو کچھ نہ کہو۔ اسے تمہارا بیٹا سینے سے لگائے کھڑا ہے۔" وہ دونوں کو ساتھ ساتھ کھڑے دیکھ کر اور بیتی۔

"پو پھتا ہوں میں بھی تم اب اندر جاؤ۔ میں نیا ز کو پیغام بھجوواتا ہوں۔" ابا سے ٹھنڈا کرنا چاہ رہا تھا۔
"میری جان برتی ہے تم کو اندر جاؤں۔ میں جا رہی ہوں تھانے۔ ساری لے کر آؤں گی اس چور کی نگرانی کے لیے جو چوری کر سکتا ہے وہ بھاگ بھی سکتا ہے۔" وہ باہر کی طرف بڑھی۔

"ارے بھلی لوگ ٹیک بخت! تو اندر چل میں ہوں نایماں اس کی نگرانی کے لیے شام تو ہونے والی ہے دیکھو کتنا کالا سیاہ بادل آ رہا ہے سینہ نہ برس پڑے۔ تو رستے میں جاتے جاتے بھگ جائے گی۔ میں نیا ز کو پیغام بھجوواتا ہوں۔ تو چل اندر۔" ابا نے نرمی سے اسے کندھوں سے پکڑ کر موڑا۔
"دیکھو ظفیری کے ایسا اگر میرا زیور نہ ملا اور یہ پھوڑا اوہر سے بھاگ گیا تو خدا کی قسم قیامت آسمانوں کی ہاں۔" وہ ہنسی دیتے ہوئے منہ پر ہاتھ پھیر کر بولی۔

"مجھے معلوم ہے تو اندر چل۔" ابا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر گیا اسی وقت بادل زور سے گرے۔
"سینہ برسنے والا ہے۔" ابا نے۔ اوپر کر کے کہا۔

"کالو! پچھلے صحن سے کپڑے اور چار پائیاں اٹھالے۔" اماں کہتی ہوئی اندر بڑھی۔
"چلو تم دونوں بھی اندر۔" ابا نے انہیں دیکھ کر کہا تو ظفیری اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں آئی۔
"ظفر تمہیں معلوم ہے؟"

"یار! مجھے سب معلوم ہے تم اب یہ ایچی کیس رہنے دو کسی بڑے شاپر میں اپنے کپڑے اور کچھ ضروری سامان ڈال لو یہ عورت چین نہیں لے گی۔ مجھے معلوم ہے۔"
"ظفر! تمہارے ابا کیا سوچیں گے۔" وہ شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ اتنا گھٹیا التزام اسی وقت بادل زور سے گرے اور بچھاڑ کی صورت پارش برسنے لگی۔

"ابے کو سب معلوم ہے تم فکر نہ کرو۔ یہ اس کا ڈرامہ ہے سارا یہ بارش کہاں سے ہونے لگ گئی۔" وہ فکر سے کھڑکی کے آگے کھڑا ہو کر بولا۔

"چلو۔ رات گزارو۔ کل دیکھیں گے۔" وہ مڑ کر معاذ سے بولا جو دونوں ہاتھوں سے اپنا ماتھا دبا رہا تھا۔

"خیریت؟ تم تو یار پریشان ہو گئے۔ ہمارو ہنو۔" اس نے زور سے ہاتھ اس کے کندھے پر مارا۔

"نہیں یار! ویسے ہی صبح سے سر میں درد ہو رہا ہے۔" معاذ جبرا مسکرا کر بولا۔

"چلو پھر تم آرام کرو۔ میں باہر کے حالات کا جائزہ لوں۔" وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

ان تینوں کو ماٹر صاحب حویلی کے گیٹ کے آگے بھجوا ڈئے تھے چادریں اچھی طرح اوڑھتے وہ تینوں آگے پیچھے بولی میں داخل ہوئیں۔

"ہائے قتی کرئی لگ رہی ہے اوہر تو چادرا تارویں بنا۔ مسیت۔"

بھم مرنے ڈیوڑھی میں چار قدم آگے چلتے ہی چادر سر اور کندھوں سے اتار کر محض ساٹھ پر نکالی۔

"ابھی نہ اتارو۔" آمنہ تیز تیز چلتے ہوئے بولی وہ سب سے آگے تھی۔ اس نے چادر میں منہ بھی اچھی طرح سے پھسایا ہوا تھا۔ صوفی صاحب کی پردے کی تختی نے اسے محض پندرہ سال کی عمر میں ہی اتنی اچھی طرح پردہ کرنا سکھایا تھا سب کہ جھومر ہاٹوں کی آزاد فضا میں پھرنے والی لڑکی تھی اسے چادر سے محض ہور ہی تھی یہ چادر ایسی آمد اور زیب کے لئے پراور نہ کر آئی تھی۔

آمنہ ڈیوڑھی سے ہوتے ہوئے برآمدے سے آگے بنے بڑے ہال کمرے میں داخل ہو گئی۔ جب کہ وہ دونوں کمرے پر کھڑی بیٹھی آ رہی تھیں۔ ڈیوڑھی کے موڑ پر ہی جھومر کی دائیں طرف سے اپنے کمرے کی سیڑھیاں اتر کر آتے سید سلطان بخت سے بری طرح سے لگ رہی تھی وہ پکڑ پکڑا کر کرنے کو تھی اگر آگے بڑھ کر زینب سے تھا منہ لیتی تو شاید وہ اب تک وہیں بوس ہو چکی ہوتی۔ سلطان بخت پیش پیش آنکھوں سے اپنے ساتھ لگنے والے اس نشہ ہوش ربا کوٹے جا رہے تھے اس بھری دوپہر میں دیکھے جانے والے خواب کو انہوں نے بڑی مشکلوں سے آنکھوں سے کھرا تھا کہ یہ آج پھر سے کھل کر آئی۔ زینب اسے تھامے کھڑی تھی اور وہ خود اس کا ہاتھ تختی سے اپنے منہ پر ہاتھوں میں لیے کھڑے تھے۔ جھومر بھی ان کی بے خود نگاہوں میں جیسے اپنے ہوش بھلائے کھڑی تھی۔ دونوں ہی ہوش و خرد سے بے خبر نہ جانے کہاں گم تھے۔

"چلو نا۔" زینب نے زور سے اسے ہٹا دیتے ہوئے جھنک کر کہا۔ تو دونوں جیسے گہری نیند سے جاگ اٹھے۔ سلطان بخت نے فوراً جھومر کا ہاتھ پھیرا اور دونوں کے پسپاؤ سے کترا کر باہر نکل گئے اور جھومر تو ابھی بھی سانس کھڑکی تھی۔

"ایسا پتھر کی ہو گئی ہو مراد اندر۔" زینب نے اسے ہولے سے دھکا دیا۔

"یہ کون سا؟" وہ اسی نیند زدہ کیفیت میں بولے۔ چادر ڈھلک کر اب زمین پر جا گری تھی۔ جس کالے کچھ ہوش نہ تھا۔ زینب نے جھک کر اس کی چادر اٹھا کر اس کے سر پر لگا دی۔

رات اگرچہ کھڑی ہو چکی تھی مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ سر میں جیسے شب پر رات کے چاند کی روشنی رہے تھے و صحن و صناو صحن۔ ایک کمرے میں سر کے اندر رو دکی بے شمار میسٹیں اٹھ رہی تھیں جیسے اس کے سر پر ڈنڈوں سے وار کیے گئے ہوں۔ خون کا قطرہ نکلا ہوا اور درو کے لامتناہی سلسلے چھڑ گئے ہوں۔ جسم پر سات میں نکلے پھوڑے کی طرح جھک رہا تھا۔ پوزے تین پورے زور شور سے برس رہی تھی مگر اس کی آنکھیں بے تحاشا چل رہی تھیں۔ اس کا ٹیپریچر بھستا جا رہا تھا۔ ذہن کا سارا عذاب بدن جھیل رہا تھا۔ کسی کروٹ چین نہیں آ رہا تھا۔ جلتی جلتی آنکھوں سے نیند بھی جیسے دور بھاگ گئی تھی۔ سر درد اور بخار کی تکلیف کی وجہ سے یوں بھی نیند کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا ویسے بھی اس نے وہی ہر سے کچھ نہیں کھایا تھا اور بچ تو یہ ہے کہ سارا دن کسی نے جھومنے منہ بھی اس سے کھانے کو نہیں پوچھا تھا حالانکہ اسے کمرے میں بیٹھے سب پتا چل رہا تھا کہ گھر میں بھنگڑے کی بگل بگل کے باوجود کھانا بھی پکا ہے اور سب نے کھایا بھی ہے مگر شاید اس کے نصیب کا ایک دانہ بھی نہیں تھا جو اسے مل جاتا اور بظاہر تو اسے بھوک بھی نہیں تھی۔

بخار اور سر درد نے بے حال کر رکھا تھا اگر کچھ کھا بھی لیتا تو شاید ایسی آجاتی۔ حلق میں بھی جیسے شور مچ رہا تھا۔ پیاس سے اس کے ہونٹ خشک ہو چکے تھے۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اس نے جلتی آنکھیں کھولیں۔ کمرے کی روشنی جھٹی ہوئی تھی صرف باہر سے پارش برسنے کی آواز آ رہی تھی سفید بادلوں کی روشنی سے کمرہ کچھ روشن

تھانے وارزند آتی ہوئی تھی اس بے چاری نے اپنی نند کے ڈر سے مجھے چھپا کر کھانا دیا۔ روئی بھی ہے۔ آلو شوربے کے ساتھ۔ اب آجاؤ۔ مجھے بھی دو بار بھوک لگ گئی ہے۔ ان منحوسوں نے تو مسور کی دال پکائی ہوئی تھی۔ اتنے اچھے موسم میں موڈ کا خانہ خراب کر دیا۔ ان فسادی عورتوں نے۔

اس نے تپ کر زردے کا بڑا سا قلمہ منہ میں ڈالا اور پلٹ کر معاذ کو دیکھنے لگا۔
 ”آنا یا ر! کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ وہ اٹھ کر اس کے پاس آیا اور اس کا بازو پکڑ کر بولا۔ معاذ احساس بے چارگی سے اسے دیکھنے لگا۔

”تم ساری آنکھیں لال سرخ ہو رہی ہیں۔ روتے رہے ہو مرد بنو یا ر!“ اس نے معاذ کی پیشانی کو چھوا۔
 ”اوہو! تمہیں تو تیز بخار بھی ہے۔ مجھے شام کو بھی تمہاری طبیعت اچھی نہیں لگ رہی تھی۔“
 ”چلو آؤ پہلے کھانا تو کھاؤ۔“ شکر بے چاول ہیں۔ تمہاری کھانا۔ کھانے کے بعد چائے کے ساتھ تمہیں بخار کی کوئی گولیا دیتا ہوں۔ اب اسے پاس ہوگی۔“ وہ ہمدردی سے اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

”آؤ نا۔ کھانے سے تو ٹھنڈی ہوا آرہی ہے۔“ اس نے کھڑکی کا ایک پٹ بند کیا جو اسے فوراً ہی کھل گیا۔ معاذ آہستگی سے چٹا ہوا اپنے بستر پر آیا۔
 ”یا ر! تم نے رنے دینا تھا کھانا۔ خواجواہ تکلیف کی۔ رات ہی تو تھی گزر جاتی۔“ اسے واقعی بھوک نہیں تھی۔ ”اور شہ بھوک بھی نہیں ہے۔“

”یا ر! کیوں شرمندہ کرتے ہو پہلے ہی میں تمہارے ساتھ نظریں نہیں ملا سکتا۔ کتنے مان سے میں تمہیں لایا تھا کہ اب میں جوان ہو گیا ہوں۔ اب یہ عورت میرا ہاتھ نہیں بگاڑ سکتی مگر یہ میری بھول تھی۔ عورت کو ہر عمر میں مرد کو روک کرنے کے لیے لگنے کے ایک ہزار ایک طریقے آتے ہیں۔ اب جانتا ہے۔ وہ جسوںی ہے مگر اس کے سوا ہر شے نہیں لگ سکتا۔ جب اب باقی اس کے سامنے بے بس ہے تو میرے ہاتھ تو ابھی بالکل خالی ہیں۔ میں کس پر تے چہرے بھولوں۔ یہ مکار تو تھی سے زیادہ دشمن اپنے نام کر رہی ہے۔ میرا ابا شہر سے ہی سے زن مرید ہے۔ سارے رشتہ داروں کے منع کرنے کے باوجود اپنے ہاتھ لگا چکا ہے۔ رہی کسی کمر اس کا تھا نہ وار بھائی پوری کر دیتا ہے۔ آئے دن اس کا ڈنکا فساد ہوتا ہے۔ اب اب نہ صوف بڑھا ہو گیا ہے بلکہ کمزور بھی۔ بڑی جلدی ان لوگوں کے آگے ہمت ہار دیتا ہے۔ اگر حالات اسی طرح رہے اور باقی کی زمین بھی اس نے ہتھیالی تو شاید میں گاؤں ہی چھوڑ دوں۔“

فائدہ تمام عمر کی ذلت سنے کلمہ عورت باپ کے ہوتے ہوئے مجھے بارہ سال تک سیم خانے میں رکھ سکتی ہے۔ وہ کیا نہیں کر سکتی۔“ وہ بے دلی سے بدلے ہوئے لہجے میں رومال کا کونہ موڑتے ہوئے دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔
 ”جیل چھوڑ دو اور لوگوں کو۔ یہ سب تو چلتا ہی رہے گا۔ میں بھی اتنی جلدی ہمت ہارنے والا نہیں ہوں۔“

”دھیرے کیا بھی تو ایک آدھ کا کاٹا (گردن) اتار کر ہی جاؤں گا۔ ظفری نے بھی جوڑیاں نہیں پہن رکھیں۔“
 اگلے ہی بل وہ پہلے والا ظفری بن گیا۔ آدھی روئی کا نوالہ دینا کر شور بے بس بھگونے لگا۔
 ”کھانا یا ر! میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ تیرے لیے سچ بھی لایا ہوں۔“

اس نے ٹرے میں پیٹ کے نیچے پڑا سچ اس کی طرف بڑھایا جو اس نے آہستگی سے تھام لیا۔
 ظفری کی مایوس کن گفتگو نے اس کے دل کو مزید دہلا دیا اس کی بھوک ہرے ہی سے اڑ چکی تھی۔

♥ ♥ ♥ ♥
 ”سہیل! راس کیسے بنے ہیں؟“ سنجیدگی سے چاولوں کی پلیٹ پر جھکے سہیل سے ریشم نے بڑے لاڈ سے پوچھا۔
 ”اچھے ہیں ڈیسٹی۔“ اس نے سچ روک کر نارمل لہجے میں تعریف کی۔
 ”میں نے نہ بہت سے پوچھ کر بنائے تھے نہ بہت کی کو تک بہت زبردست ہے۔ چائیز اور کالڈیمنٹل کھانوں میں تو یہ ایک سپرٹ ہے۔“
 ست روئی سے چاول کھاتی نہ بہت کو دیکھتے ہوئے ریشم نے تعریف کی۔

لگ رہا تھا پہلے بادل بھی گرج رہے تھے اور بجلی بھی چمک رہی تھی مگر اب صرف بارش ہو رہی تھی۔ شاید زیادہ لینے سے بھی جسم دکھنے لگا ہے۔ وہ بمشکل اٹھ کر بیٹھا۔ وہ شام سے اندھیرے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ کھلی کھڑکی سے تیز سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا کھڑکی کے دونوں پٹ ایک شور سے بند ہونے پھر اگلے بل کھل بھی گئے۔ وہ پوری ہمت سے اٹھا اور دو قدم چل کر کھڑکی کے دونوں پٹ مضبوطی سے تھام کر کھڑا ہو گیا۔

ہوا کے جھونکے کے ساتھ آتی ٹھنڈی ہوا نے اس کے گرم چہرے کو چھوا اسے سردی سے بھر بھری سی آگنی۔ دل چاہا پلٹ کر پھر بستر میں لیٹ جائے مگر بارش اچھی بھی لگ رہی تھی بہت دنوں بعد اتنی موسلا دھار بارش ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ہتھیلی کھلے آسمان کے نیچے کی بارش کے موٹے موٹے قطرے بل بھر میں اس کے ہاتھ کو بھگو گئے اس نے گیلا ہاتھ اپنے منہ پر پھیرا۔ گھر میں مکمل طور پر اندھیرا ہو چکا تھا۔ لگتا تھا۔ سب سوچکے ہیں ظفر جو شام کو اسے کمرے میں بٹھا کر گیا تھا۔ پلٹ کر اس نے خبر نہ لی تھی۔

”پتا نہیں اب کیا ہو گا؟“ کمزوری اور تھکن سے اس نے اپنے جسم کا سارا بوجھ کھڑکی کی چوکھٹ پر ڈال دیا اور پڑنے سے کشادہ بھیکے آسمان کو دیکھنے لگا۔

”کاش میرا بھی اس دنیا میں کوئی ہو تا۔ ماں باپ کوئی بہن بھائی۔ کوئی بھی۔“
 بارش کا پانی تھا یا شاید اس کی آنکھ سے قطرے ٹپکے تھے۔ اسی وقت باہر دھیرے قدموں کی چاپ سنائی دی اس نے آستین سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

”معاف کرنا یا ر! کالی دیر ہو گئی۔ یہ چڑھیں سو تیں تو میں کچھ لے کر آتاں۔ حالانکہ اب تو مجھے کافی دیر سے کہہ رہا تھا کہ تمہیں کچھ کھانے کو دے آؤں۔ تم نے لائٹ کیوں نہیں چلائی۔“

ظفری ہم آواز میں وضاحت پیش کرنا ہوا اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں شاید کھانے کی ٹرے تھی جو اس نے معاذ کے بستر پر رکھ دی اور بستر کے اوپر دائیں طرف لگا لائٹ کا لیٹن دیا تو ساتھ والے کمرے کی پہلی شہری روشنی سے کمرے یک نخت روشن ہوا تھا۔

روشنی ہوتے ہی اندھیرا مایوسی اور دکھ کہیں کھڑکی سے باہر کود گئے۔ روشنی بہت سارے آن دیکھے دکھوں کو چاٹ جاتی ہے۔ اندھیرا مایوسی اور بے بسی کے احاس کے ساتھ اندھیرا اندیشوں اور خدشوں کا گھر ہے۔ روشنی یقین اور اعتماد کا۔

”پر نہیں یا ر! وہ دونوں نہیں سوئیں۔ اب تک کمرے میں جنگلی سپاہیوں کی طرح جاگ رہی ہیں جیسے کسی بھی وقت میدان جنگ سے دو دو لڑائی کا بلاوا آسکتا ہے۔ اب تک آکر سو گیا۔ میں باورچی خانے میں کچھ لینے گیا تو ماں کسی آدم خور بلا کی طرح میرے پیچھے نیچے جھاڑ کر پڑ گئی کہ ایک چور کو اس گھر سے کھانے کو کچھ نہیں ملے گا اور نہ جانے کیا کیا کیوں اس۔ اس کی زبان سے الامان الجھنڈ۔“

اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ”اس نے زیادہ سچ سچ کی تو میں باہر آ گیا۔ بڑی ہی بد بخت خانہ خراب عورت ہے۔ ساری عمر کو میرے سر پر عذاب۔ آجاؤ تم! اب کھا لو یہ میں چائے بھی لے کر آیا ہوں۔ تم نے دوپہر سے کچھ نہیں کھایا۔“

وہ اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کے کپڑے گیلے ہو رہے تھے۔ بالکل پانی میں نیچرے ہوئے۔

”باہر تو اچھی خاصی ٹھنڈ ہو گئی ہے۔ میں باہر نکلا تو مجھے سردی لگنے لگی۔ حالانکہ دوپہر کو موسم اچھا بھلا تھا۔“ وہ خود ہی بولے جا رہا تھا۔ معاذ روشنی سے منہ موڑے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے خدا جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔
 ”آہی جاؤ یا ر! کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ یہ افلاطون والی سوچیں پھر سوچ لیتا۔“ ظفر نے پلٹ کر اسے اسی پوزیشن میں دیکھ کر کہا۔

”پھوپھی کے گھر سے لایا ہوں۔ گوشت والا پلاؤ بھی ہے اور زردہ بھی۔ کچھ آج تیری دعوت ہے۔ پھوپھی کی

”ہوں۔“ سہیل نے سرسری لمحے میں کہا اور بیٹھ پر جھک گیا۔

نزہت کی آنکھوں کے گوشے ہنسنے لگے۔ ابوی اس کے کھانوں کے کس قدر ولد اوہ تھے۔ کہتے تھے اس کے ہاتھ میں ذائقہ اس کی ماں کے کھانوں جیسا ہے۔ پھر کہتے ”تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں“ وہ پوری طرح متوجہ ہو جاتی۔

”تمہارے کھانوں میں لذت اس لیے ہوتی ہے کہ تم نماز پڑھتی ہو تمہاری ولادی، شستن، عسکازہ نماز کی بڑی پابندی تمہیں ان کے ہاتھ میں بھی بڑی لذت تھی۔ وہ نمک مرچ کھول کر بھی دے دیتیں۔ ہم وہ بھی چٹ کر جاتے تھے۔ کہتی تھیں نماز پڑھنے والی عورت کے ہاتھ میں قدرتی طور پر لذت آجاتی ہے۔“

وہ اتنی تعریف پر جھینپ سی جاتی۔ ”ابوی! میں کب پابندی سے نماز پڑھتی ہوں۔“

”پڑھتی تو ہونا میرے لیے یہی بات خوشی کا باعث ہے۔“ وہ حوصلہ افزائی کیے جاتے۔ اسی حوصلہ افزائی کے نتیجے میں وہ اتنے اچھے اچھے کھانے پکانے لگے۔ وہ اسے خود بازار سے اچھی اچھی کھانا پکانے کی ترغیب دے لاکر دیتے۔ وہ خود اچھے کھانوں کے شوقین ہوتے۔ ”اسی شوق نے انہیں انجانا کی تکلیف لگانی تھی جو آج وہ دیکھتے یوں تمہا چھوڑ گئے۔“

چچا والوں کے دانے اس کے حلق میں اٹکنے لگے۔ اس نے پانی کا گلاس اٹھا کر گلوں سے نکالیا اور ایک نظریہ گالی سے کھانا کھاتے بھائی کی طرف دیکھا۔ حالانکہ ابوی کی وفات کے بعد ریشم کی سیدل کی تھی مگر سہیل۔ اس کا رویہ ہوا اس کے ساتھ بریکان اور اجنبی سا تھا۔ نزہت کے لیے اس کے رویے میں بس اس درجہ اپنائیت تھی جیسے وہ شناسا کسی اسٹیشن پر چند گھنٹوں کے لیے ساتھ ساتھ آئیے ہوں۔ اس نے دکھ سے سوچا۔ ایک تو باپ کی بددلی کا نیا نیا زخم۔ اوپر سے بھائی کا اتنا سرد رویہ اسے رلا رلا دیتا۔ وہ تو بچپن سے ابھی تک اوہر تھیں جو اسے سمیٹتی تھیں۔

ورنہ شاید وہ دو رو کر ہی ختم ہو چکی ہوتی۔ کل سے وہ اپنی بھاری طرف کی ہوں تھی۔ وہ چار روز اور رہے۔ پھر گرام تھا ان کا۔ پھر شہباز نے انہیں آکر لے جانا تھا۔

”میں کہہ رہی تھی سہیل جس طرح سے چھپو اصرار کرو رہی ہیں رخصتی پر تو اس حساب سے دن کتنے رہ گئے ہیں۔ ہمیں کچھ تو تیاری کرنی چاہیے۔“ ریشم کی آواز سے کھانے کی میز روایں کھینچ لائی۔

”ہوں۔“ بیورو کریش والا ”ہوں۔“

کہہ کر سہیل نے ڈونک اپنی طرف کھسکایا۔ ”میں تو نزہت سے کہہ رہی ہوں ایک دو بار میرے ساتھ بازار چلے۔ ہاتھ مولی ہوئی خریداری کر لیتے ہیں۔ سوگ اور دکھ اپنی جگہ دنیا داری بھی تو بھائی بھائی۔“

”مجھے تو خود اس کے دکھ کا پورا پورا احساس ہے۔ مگر کیا کروں۔ اب دنیا والوں کا سامنا ہے۔ تو ہم نے کرنا ہے۔ لوگ یہ تو نہیں دیکھتے کہ کسی کو کیا دکھ ہے۔ کسی پر کیا ہوتی۔ لوگ تو یہ دیکھیں گے باپ کے بعد بھائی بھانوج نے کیا دیا۔ کتنا دیا۔“

وہ اس وقت خالصتاً ”گھریلو خاتون خانہ بنی ہوئی تھی۔ آج کل اس کا حلیہ بھی ٹیپیکل گھریلو خاتون کی طرح ہی ہو تا تھا۔ گھر میں تعزیت کے لیے آنا جانا جو تھا۔ وہ سوسائٹی بٹو فلاحی کی ڈریسنگ اور گرومنگ سب فی الحال بقائے تھا۔ معلوم نہیں وہ واقعی یہ سب چھوڑ چکی تھی یا یہ کسی ڈرامے کا حصہ تھا۔ نزہت بس گھونٹ گھونٹ پانی پئے جا رہی تھی۔“

”اب چھپو بھلے کتنی رہیں کہ ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ ہمیں دنیا دکھانے کو ہی سہی کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔“ وہ سہیل سے نہ جانے کیا لگاؤ نے پرانا زور خطابت سرف کر رہی تھی۔

”ہوں!“ اس نے پھر ہنکارا بھرا ”تو چلی جاؤ کسی روز اسے لے کر بازار۔“ جیسے اس کا نام لینا کوئی گناہ کی بات ہو۔

بیروں کی حدیں تو ڈر کر باہر آتا پانی ہوتوں سے بیٹے اترنے لگا۔

”کس چلے جاتے ہیں۔“ چھپو بھی اپنے رشتہ داروں سے ملے گئی ہوتی ہیں۔ کسی کو کوئی اعتراض بھی نہیں ہو

گا۔ ”وہ فوراً تیار ہو گئی۔“

”لا کر کی چلی دراز میں تیس ہزار پڑے ہیں۔ فی الحال ان سے کام چلا لینا۔“ سہیل نے کھانا ختم کرتے ہوئے فیہکن سے ہاتھ پونچھے۔

”کل پھر تھیک رہے گا ناں نزہت! دس گیارہ بجے چلے چلیں گے۔“ اس نے نزہت کی رضامندی ضروری سمجھی۔

”نہیں۔ مجھے ابھی نہیں جانا نہیں چھی۔“ چھینسی چھینسی آواز میں کہہ کر وہ اٹھنے لگی۔ اس کے انکار پر ریشم نے بڑی مشکل سے ضبط کا ہونٹ بھرا۔ یوں نہیں کرنا اس کی فطرت کبھی بھی نہیں رہتی تھی۔

”بیٹھو تو۔“ اس نے نزہت کا ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھایا۔ ”سہیل! آپ اس کو سمجھا میں ناں۔ دنیا داری کی خاطر ہی اسے یہ سب تو کرنا پڑے گا۔ مرنے والوں کے ساتھ کون مر سکتا ہے۔ چیز کے نام پر کچھ تو ہونا چاہیے۔ دلہن کی حراں میں غم ہوتی ہے۔“ اس کی اس دلیل پر نزہت نے ایک عجیب سی نظر اس پر ڈالی اور پھر انگریز جھکائیں۔

”مجھے نہیں شوق ہے۔“ وہ بھی آواز میں بولی۔ ”اور مجھے بازار بھی نہیں جانا۔ کچھ بھی لینے۔“ لہجہ سختی اور ٹیلا سا تھا۔ ریشم نے اس کے ہنسنے اور نفرت سے دیکھا مگر پھر فوراً اپنی کیفیت پر کنٹرول پالیا۔

”نزہت! میری ماں! ایسے مت کہو۔ بھائی کا دل برا ہو گا۔ دل پر پھر رکھ کر اب یہ سب تو کرنا ہی پڑے گا نا۔“ اس نے آنکھ سے سہیل کو اشارہ کیا کہ وہ بھی اسی طرح سے کچھ بھوٹے۔

”چلو اگر اس کا ابھی نہیں موڑ تو ہفت بھر ٹھہر جاؤ۔ کچھ چھو چلی جائیں گی تو پھر چلی جانا۔ مجھے بھی دو چار روز تک اسلام آباد جانا ہے۔ وہاں مجھے ایک آدھ دن لگ جائے گا۔ میں ہو آؤں تو پھر تم چلی جانا۔“ سہیل نے کہہ کر بات ختم کر لی۔

”میں اسے کھانے کی طرف بٹھ گیا۔“

ریشم نے کھانے سے تھکتا غصہ آیا۔ بی چار نزہت کی گردن موڑ کر باجا کر سہیل کا سر پھاڑوے وہ غصے میں پیر پستی سہیل کے پیچھے لپک لی اور نزہت سہیل پر سر رکھ کر چپ چاپ آنسو بہانے لگی۔

رات آہستہ آہستہ بھیک رہی تھی مگر بھائی آنکھوں سے نیند کو سوں دور تھی۔ کتنی دیر تک تو وہ یونہی بیستر پر کروٹیں بدلتی رہی آخر تھک کر اٹھ بیٹھی۔ بید کی پشت سے نیک لگائے وہ نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی۔

کمرے کی خاموش فضا میں فخر حیات کے بلبلے بلبلے خزانے گونج رہے تھے۔ وہ رعنا کے دو سر کی طرف اس کی بے خوابی سے بے خبر ہوئے تھے۔ رعنا نے ایک نظر فخر حیات کی طرف دیکھا اور پھر ایک گہری سانس لے کر ماسٹے لگنے لگی۔

”کتنا سارا وقت گزر گیا۔“ اس کے اندر سے کوئی بولا۔ اس کے دل سے آہ نکلی۔ آنکھوں میں وہند چھانے لگی۔ وہ دھیرے سے اٹھی۔ اس کی سفید ریشمی نائی کی سرسراہٹ کا جھلا بے خبر سوئے فخر حیات پر کیا اثر ہوا تھا۔

رعنا نے ایک لمحے کو مڑ کر اسے دیکھا اور پھر کمرے کے شمالی کونے میں بی دیوار پر وارڈروب کی طرف بڑھ گئی۔

الماری کا پٹ کھول کر وہ نیچے کا پٹ پر بیٹھ گئی۔

سائڈ کینٹ سے اس نے لا کر کی چابیاں نکالیں لا کر کھول کر اس نے ذرا سا جھک کر اندر دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر

مخملیں اکبر باہر نکالی۔ لا کر اسی طرح کھلا چھوڑ کر وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔ بید کی پشت سے ٹپک لگا کر اس نے الم کھولی اور اس میں لگی تصاویر دیکھنے لگی۔ نائٹ بلب کی روشنی تصاویر دیکھنے کے لیے نکلتی تھی۔ گہرا سانس لے کر اس نے صفحہ پلٹا پھر ایک ایک کر کے وہ صفحے پلٹتی چلی گئی۔ ایک صفحے پر جیسے اس کی

بیخانی مجھ ہو گئی۔ اس نے تھک کر لب اس تصویر پر رکھ دیے اور اپنی مہر میں انکلیوں سے تصویر میں لگے بے بیان وجود کو چھونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گر کر تصویر کو جھلکے لگے۔

اس کا دل جیسے بے قابو ہونے لگا۔ وہ دیوانہ وار تصویر کو چھونے لگی۔ آنسو ایک تو اترے اس کی آنکھوں سے بہ

رہے تھے۔ ایک مدت کار کا ہوا اور جیسے پھوٹ نکلا تھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار سسکی نکلی۔
 فخر حیات کے وجود میں جنبش پیدا ہوئی انہوں نے کروٹ بدل کر اسے بائیں طرف دیکھا۔ رعنا الہم کھولے بے
 تحاشا رو رہی تھی اور یہ منظر فخر حیات کے لیے نیا نہیں تھا۔ انہوں نے بمشکل نیند سے بوجھل آنکھیں کھولیں اور
 سامنے لگے وال کلاک میں ٹائم دیکھنے کی کوشش کی رات کے پونے دو بج رہے تھے۔

”سو جاؤ اب۔“ لہجہ کچھ بیزار سا تھا۔
 ”نیند نہیں آ رہی۔“ بھاری نم لہجے میں رعنا نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔
 ”سیدنگ پلزلے لو اور سو جاؤ۔ یوں رونے سے فائدہ۔“ مشورہ دے کر انہوں نے پھر سے کروٹ بدل لی اور
 لمحوں میں پھر سے گہری نیند میں ڈوب گئے۔

رعنا نے ایک زخمی نگاہ اس کے بے حس وجود پر ڈالی اور نئے ہرے سے رونے لگی۔ سسکیاں دہانے سے اس
 کا گلا درو کرنے لگا۔ کچھ دیر رونے سے اس کے دل کا بوجھ کچھ کم ہوا تو اس نے سائیڈ رییک پر بڑے نشیماکس سے
 لٹے کر اپنا منہ اور آنکھیں رگڑیں اور بوجھل دل کے ساتھ الہم بند کر دیا۔ کچھ دیر یوں ہی بیڈ سے لٹائیں لٹکا کر
 بیٹھ رہی پھر اٹھ کر الہم دوبارہ لاکر میں رکھا اور کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ نیند ابھی بھی اس پر سواں نہ ہوئی تھی۔ آج
 شاید چاند کی بارہا تیرہ تاریخ تھی۔ چاند کی جگہ گاتی کرنوں کو دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا۔

”معلوم نہیں آج میرا دل اس قدر بے گل کیوں ہے نہ جانے وہ کس حال میں ہے۔ خدا یا میں کیا کروں۔“ اس
 کا دل پھر سے بکھرنے لگا۔ اس نے سر کھڑکی کی چوکھٹ سے نکا دیا۔ اس کا سردرد سے پھٹ رہا تھا۔ مگر آنسو نہیں
 رک رہے تھے۔ پھر سے ہنسنے لگے تھے وہ چپ چاپ روئے گئی۔

”یہ لو نیما۔ اور کھا کر ریٹ کرو۔ یوں خود کو بلکان کرنے سے کیا حاصل! خواہ مخواہ خود کو گھلا رہی ہو۔“
 یہ سچھے سے فخر حیات نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے مڑ کر دیکھا وہ سر سے ہاتھ کس پانی کا فلاس
 اور ٹیبلٹ لیے کھڑے تھے۔ اس نے چہرہ صاف کیے بغیر خاموشی سے ٹیبلٹ ان کے ہاتھ سے اٹھالی اور مڑے میں
 رکھ لی۔

وہ پانی پی رہی تھی جب فخر حیات واپس مڑ کر بیڈ پر لیٹ گئے اور سوچتی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔
 رعنا نے گلاس ریگ پر رکھ دیا۔

”آکر سو جاؤ اب۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔ بہت تھکاوٹ ہو جاتی ہے۔ آج کل آپس میں کام چوریہت ہے۔“
 فخر حیات کے کہنے پر وہ آہستہ روی سے چلتی ہوئی بستر پر آکر لیٹ گئی۔ پلاسٹک پیس کے خوبصورت ڈیزائن
 سے منقش چھت کو سیاٹ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”سو جاؤ جان! یوں نہیں مت ہو۔“ فخر حیات نے نرمی سے اس کے تکیے پر بکھرے ریشمی بال سلجھائے رکھائے
 ایک گہرا سانس لیا اور گردن کھماتے بغیر ترچھی نظروں سے اپنے پہلو نشین کو دیکھا۔

”آپ سو جائیں۔ میں بھی سو جاؤں گی۔“ فخر حیات نے پیار سے اس کے رخسار کو چھوا۔
 ”ہوگے ڈییر اب پلیز سو جاؤ۔“ کہتے ہوئے انہوں نے کروٹ بدلی اور پہلے کی طرح چند لمحوں ہی میں گہری نیند سو
 گئے۔ رعنا نے سینے میں دبی ہوئی سانس خارج کی اور ایک نظر فخر حیات کی طرف دیکھا۔

”یہ وہی شخص ہے جو مجھے ایک نظر دیکھنے کے لیے ڈیپارٹمنٹ کے دس چکر لگایا کرتا تھا۔“ اس نے دکھ سے
 سوچا۔

دونوں کی مڈ بھیڑ بچ سڑک پر ہوئی تھی جب سائیڈ لوجی کی بکس کو سینے سے لگائے رعنا فخر حیات کی گاڑی سے
 نکل آئی تھی۔ اسے چوٹ تو زیادہ نہ آئی مگر اس حادثے میں فخر حیات کا پیچھن سکون لٹ گیا۔ ایک مصروف بزنس
 مین ہونے کے باوجود وہ کمپیس کے ارد گرد منڈلانے لگے جو کبھی ان کے نزدیک گھٹیا رومانس کی شکل تھا۔ آج وہ خود
 اس کا شکار ہو چکے تھے اور رعنا اپنے بھائی اور بھانج کی دست نگر اور بھانج بھی ایسی جو اڑتی چیزیا کے پرگن لے اور
 ہنس کا بس نہیں چٹا تھا کہ اس مفت کے بوجھ کو گل کی جگہ۔ آج کہیں کسی کنویں کسی دریا میں لڑھکادے۔

”تو اڑکی متخواہ میں بچوں کا پورا نہیں بڑیا اور یہ مفت کی تنگی ماں باپ گلے ڈال گئے ہیں۔ اوپر سے پردھائیوں کے
 خرچ۔ ماں باپ ہوں تو یہ جو نچکے بھی اچھے لگتے ہیں۔ بھائی بیچارہ کہاں سے یہ چالان بھرتا پھرے پہلے ہی اس مہنگائی
 کے ہاتھوں عاجز آئے ہوتے ہیں۔ عفت آرادن کے چوبیس گھنٹوں میں چوبیس ہزار بار یہ جملے پچھتے پچھتاڑتے بچوں
 کی مرمت کرتے رعنا کے کانوں میں اینڈ فلٹنا۔ بھولتی اور وہ دن میں یہ سب سن سن کر سو بار مرنی۔

اور سے فخر حیات کا رومانس وہ تو شاید اس نئے عذاب کے ڈر سے یونیورسٹی ہی چھوڑ جاتی۔ ”اگر بھائی کو ڈر ابھی
 پتا چل گیا تو؟“ ”میں آکر اس کی سٹی کم ہو جاتی کہ فخر حیات اپنے والد کو لے کر اس کا رشتہ لینے چلے آئے۔ عفت آرا
 کی تو آنکھیں پھٹ گئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے الزامات کی پٹاری کھولتی۔ تو از بھائی نے ہاں کر کے ان لوگوں
 کے اصرار پر شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔

اور محض دو ماہ بعد ہی اس کے ایم اے کی پروا کیے بغیر بھائی نے اس کی رخصتی کر دی۔ محض چند جوڑوں اور
 چند سو روپوں میں۔ یہ تو اس کی قسمت اچھی تھی جو سسرال میں: گروہ سونے میں آلی اور شوہر کی بے پایاں محبت۔
 رعنا کو تو دنیا میں جستہ مل گئی۔ اس کے سارے خدشے ہوا ہو گئے۔ اپنے سے زیادہ خوش نصیب کوئی ملتا نہ تھا۔
 قسمت ہر طرح سے اس پر مہیاں تھی اور فخر حیات۔ جہاں وہ بیٹھ کر کھتی وہاں وہ آنکھیں پچھاتے۔

”مگر اب۔ اب کیا ہو گیا ہے ایسا۔“ اس نے زور سے درد کرتی اپنی پیشی دیا لی۔
 اگلی صبح آفس جاتے فخر حیات بڑی پریشانی کے عالم میں اپنی وارڈ روم کی درازوں۔ اپنے کپڑوں کی تلاشی لے
 رہے تھے جب رعنا نے ان کے آگے وہ تصویر کھڑی جو گل اسے ان کے کوٹ کی جیب سے ملی تھی۔

”اوہ تمہیں۔ کہاں سے ملی؟“
 ”آپ کے کوٹ کی جیب سے۔“ اس نے کھاتھی نگاہوں سے فخر حیات کو دیکھا۔
 ”ہاں یہ میرے کوٹ کی جیب ہی میں تھی۔ یہ ہمارے نئے کلائنٹ ہیں جاپان میں ان کی مسز کی تصویر ہے میں
 نے منگوائی تھی۔ اصل میں مسز شو شو من خود تو ہمیں آسکتے مصروفیت کی وجہ سے۔ ان کی وائف شاید اسی ہفتے یا
 اگلے ہفتے آئیں گی۔ ایک بزنس ڈیل کے سلسلے میں۔ ہالی ڈے ان میں ان کی بنگل کرانی تھی۔ آج کل میں ان کا
 فون یا فیکس آنے والا ہے۔ جس سے ان کی فلائٹ کے بارے میں پتا چل جائے گا۔“ کوٹ ہنسنے ہوئے وہ اسے
 ساری تسمیل سے آگاہ کرتے چلے گئے تو رعنا کا رات بھر سے عجیب خدشوں میں گہرا دل چسپے بر سکون ہو گیا۔

اور آج شام کو بھی فخر حیات نے اسے آکر بتایا تھا کہ مسز سانے نہیں آ رہیں۔ اس لیے اگلے ہفتے تک مجھے خود
 جاپان جانا پڑے گا۔ ”تو وہ جوان سے کہنے والی تھی کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی تو وہ خود ہی بولے۔

”بسنی تو آج کل سخت نگرانی کی ضرورت ہے۔ اس کا فائل قریب ہے۔ اس لیے تم تو جانا نہیں سکو گی ورنہ میرا
 مودہ تھا کہ تمہیں ساتھ لے کر جاؤں۔ وہاں کچھ دن تو لگ ہی جاتے ہیں چلو پھر کبھی سی۔“

رعنا کو ذرا اچھانہ لگا۔ ان کا لہجہ نہ انداز۔ شاید وہ طرز کر رہے تھے لیکن ان کے چہرے پر اب کچھ نہیں تھا۔ رعنا
 کا دل ٹھٹھک سا گیا۔ دل ان کی طرف سے آج کل پونسی بدگمان ہوا جا رہا تھا۔ ہر چیز اسے مشکوک کر رہی تھی اور
 اظہار کے لیے کوئی راستہ کوئی وجہ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

”کیا فخر حیات مجھ سے بیزار ہو چکے ہیں یا ان کے دل نے کوئی راؤ ڈھونڈ لی ہے؟“
 نیند سے بوجھل آنکھوں نے دل سے جو سوال کیا وہ حقیقتاً ”نیند اڑا دینے والا تھا مگر نیند کی گولی اپنا اثر دکھا چکی
 تھی۔“

”عبد العین! تم کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟“ اس کا ہم جولی اس کا ہم درس مبشر بڑی ہمد روییہ پیار سے اس سے
 پوچھ رہا تھا جو اپنے آگے پڑے وال روٹی کے خون سے بے نیاز سر نہیواڑے نہ جانے کن جہانوں کی سیر میں گم
 تھا۔

مبشر کی بات سن کر اس نے نہ تو سراٹھایا نہ کوئی جواب دیا۔

”عبدالصبین! کھانا نہیں کھانا؟“ مبشر اسی پیار سے بولا۔ عبدالصبین نے زور سے نفی میں سر ہلایا مگر اٹھایا نہیں۔

”کیوں؟“ بہت معصوم سے لہجے میں استفسار کیا گیا۔

مالا نکہ یہ کیفیت تو خوب بھی گئی بار گزر چکی تھی۔ جب بے تخاصا مرمت کے بعد اور لگا تار گدلے شیلے لیبانی جیسی بے ذائقہ والے کھانے سے اس کا من صاف انکار کر دیتا تو وہ خود سے بھی یہ سوال نہیں کر سکتا تھا اب بھی اس نے بد رنگ وال سے نظریں چرا کر اس سے پوچھا۔

عبدالصبین نے اس بے ہودہ سوال پر سر اٹھا کر اسے کچھ غصے سے گھورا مگر پھر خود ہی ڈھیلا پڑ گیا۔

”مبشر! مجھے ایک بات بتاؤ۔“ اس نے تھوک نکل کر صاف آواز میں پوچھا۔

”ہو لو۔“ مبشر اس کے اور قریب کھسک آیا۔

”ایا میں انسان ہوں؟“ اس نے عجیب سا سوال پوچھا۔

”نہا ہرے تمہیں کوئی شک ہے؟“ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”تم شک کی بات کر رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ میں انسان نہیں ہوں۔“ وہ مایوس و غمگین لہجے میں بولا اور سر اٹھا کر دو دو ہی اسفید بے رنگ آسمان کو دیکھنے لگا۔ وہ دونوں برآمدے میں بیٹھے تھے۔ صبح تک پھیلے کھلے وسیع صحرائے سخن کی دھوپ برآمدے تک آ رہی تھی۔

”یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ تم انسان ہو اور بلکہ وہ کیا کہتے ہیں اشرف۔ ہو۔“ اشرف المخلوقات اس کی زبان پر چڑھ نہیں رہا تھا۔ وہ تجالست سے سر کھچانے لگا۔

”ہو نہ۔“ عبدالصبین پھکی سی ہنسی مننے لگا۔

”جس قدر آج مجھے مار بڑی ہے۔ تمہیں معلوم ہے نا۔ میری پینے والے پیر کے نظروں سے ظن رس رہا ہے اتنی چیخیں اٹھا دو رہا ہے کہ تمہیں کیا بتاؤں۔ میری پوری کمزوری انہوں سے لڑنی ہوئی۔ کہ میں انسان بھی نہیں جھکا سکتا۔ لیٹنا تو دور کی بات ہے اور تم بتاؤ۔ اس طرح جھکا کسی انسان کو پیتا جاتا ہے۔ اس طرح کوئی کسی حیوان کسی گدھے کو نہیں مارتا جس طرح آج قاری صاحب نے مجھے مارا ہے اور یہ وال؟“

اس نے وال کی پلٹ کو ہلکی سی تھوکر ماری۔ وال تڑپ کر کناروں سے ہل چا کر گری۔ ”یہ تو کالے لیبانی کے قیدیوں کو بھی نہیں دی جاتی ہوگی جیسی ہمیں ملتی ہے۔ اسے کوئی انسان تو کیا جانور بھی نہ کھائے دولتی مار گرنالی میں گرا دے پھر بتاؤ۔ میں کہاں سے انسان ہوں۔“ اس کا لہجہ شخیر بھرا تھا۔

”تم سبق یاد کیوں نہیں کرتے؟“ وہ ہمدردی سے بولا۔

”اچھا اگر میں سبق یاد کروں گا تو کیا میری کھال نہیں ادھڑے گی؟ نہیں مبشر! کھال ادھڑنے کے لیے سبق یاد ہونا شرط نہیں۔“ وہ حد درجہ مایوس و غمگین تھا۔

”مبشر! مجھے بہت درد ہو رہا ہے بہت۔“ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ”ہائے میری کمر۔“

”صبین! میرے بھائی! مبشر اس کے اس طرح رونے پر خود بھی لیبانی بن کر بیٹے لگا۔ اسے گلے لگا کر اس کے پیالے سالنے لگا مگر ہاتھ تو کیا وہ انگلی بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ آج صبح قاری صاحب نے اسے پرانی چارپائی کے بیان کی طرح لہو ہیر کر رکھ دیا تھا۔ اس کی مرمت پر باقی لڑکوں نے لیبانی کی طرح سبق یاد کر لیا تھا۔

”چلو تم اندر بستر پر لے ہو کر لیٹو۔ میرے پاس زخموں کی ٹیوب ہے۔ میں وہ تمہیں لگا دیتا ہوں۔“

”اندر نہیں جانا۔ آج مجھے قاری صاحب نے سزا دی ہے کہ آج سارا دن اور ساری رات مجھے اس برآمدے میں اسی جگہ پر بیٹھ کر گزارنی ہے۔ یہ دیکھو زنجیر وال دی ہے انہوں نے میرے پاؤں کے ساتھ۔“ اس نے پاؤں سے بندھی زنجیر آگے کی جس کا دو سرا سرا برآمدے کے ستون سے بندھا تھا۔ مبشر کا دل رونے لگا۔

”اچھا میں ٹیوب میں لے آتا ہوں۔ تمہیں لگا دوں گا۔ یہ کھانا کھا لو پھر میں تمہیں چاچا کریم بخش کی دکان سے

دردی کوئی بھی لاؤں گا اور نیچے کیشن سے چائے کا کپ بھی۔ تم میرے اچھے بھائی کھانا کھا لو۔“ وہ پیار بھرے لہجے میں اس کا بازو تھام کر بولا۔

”مبشر! مجھے کھانا نہیں کھانا۔“ وہ آستین سے آنسو پونچھ کر خندی لہجے میں بولا۔

”عبدالصبین! خود نہیں کرتے اس طرح قافہ کرنے سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم نے ابھی سبق بھی یاد کرنا ہے ورنہ پھر گل سزاؤں مل ہو جائے گی۔ اس کا لیا فائدہ۔“ وہ اسے خطرناک نکتانج سے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔

”ہو جائے مجھے پروا نہیں۔ پہلے کون سا اچھا سلوک ہوتا ہے لو پھر۔“ وہ بے پروائی سے تندر لہجے میں بولا۔

”عبدالصبین! پڑھنا تو پڑے گا نا۔ تمہیں اپنے بابا صاحب کا بھی پتا ہے نا۔ انہوں نے تمہیں ادھر اسی مقصد کے لیے بھیجا ہے۔ چاہے کچھ کر لو۔ قرآن تو تمہیں حفظ کرنا ہی پڑے گا۔“ مبشر نے اسے ادھر بھیجے کا مقصد یاد دلایا۔

”کون سی حدیث میں لکھا ہے کہ اس طرح جانوروں کی طرح بیٹ بیٹ کر قرآن یاد کرواؤ۔ بتاؤ مجھے کون سی حدیث میں لکھا ہے۔ کون سا فرشتہ یہ حکم لے کر نازل ہوا تھا۔“ وہ زور سے گلا چھاڑ کر چیخا۔

”آہستہ ہو لو! اندر بیٹے کمرے میں قاری صاحب آرام کر رہے ہیں۔ ادھر صاف آواز جاتی ہے۔“ مبشر نے اسے خبردار کیا۔

”کیا کریں گے وہ آکر۔ مجھے قتل کر دیں گے اور ماریں گے۔ ماروں میں اس روز روز کے مرنے سے تو بہتر ہے ایک دفعہ ہی مر جاؤں۔“ وہ جذباتی بن سے اپنی طرح بولا۔

”تم سبق یاد کر لیا کرو نا۔ میں بھی تو کرتا ہوں باقی لڑکے کے بھی تو کرتے ہیں نا۔ زاہد کو تو کبھی وہ بھی تو ہے نا۔ قاری صاحب کتنی تعریف کرتے ہیں اس کی۔“

”تو ان باتوں سے کیا ہوتا ہے صبین! ہم نے بھی تو پڑھنا ہے نا۔ مرغ کھانے والے کا بھی دماغ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا وال کھانے والے کا۔ تم یہ بات کیوں کہتے ہو اور جتنا دماغ استعمال کرو۔ اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔“ وہ اسے سمجھا رہا تھا بڑی دانائی سے۔

”تم گرو اپنے دماغ کو استعمال۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔“ وہ اسی ڈھٹائی سے بولا۔

”تمہارے بابا صاحب۔ تمہیں ان کا پتا ہے نا؟“ مبشر نے اسے پھر زورانا چاہا۔

”جوت لو ان کا نام۔ میں اب ان سے نہیں ڈرتا اور میں اب کسی سے بھی نہیں ڈرتا۔ کوئی میرا کیا کر لے گا۔ مجھے مارے گا نا تو ہمارے اس سے زیادہ تو نہیں مار سکتا نا۔ ہے نا؟“ اس نے ہاتھ پیچھے لے جا کر اپنی کمر سے قمیص بٹانی چاٹی۔

”اور یہ بابا صاحب کی بھول ہے کہ اس طرح قاری صاحب ہا مار کر زنجیریں باندھ کر مجھے حفاظت کرا لیں گے۔ مبشر! میں تمہیں بتا دوں اب چاہے کچھ بھی ہو جائے میں حفاظت نہیں کروں گا۔ مجھے اب اس بات کی ضد ہے۔“ وہ جو شیلے پن کی آخری حد کو پہنچا رہا تھا۔

”تو برا متفقار۔ نحو بالہ۔ عبدالصبین! اللہ سے ڈرو۔ ایسی باتیں تو یہ تو یہ۔ ایک معلمین کے بیٹے کو ایسی باتیں زیب دیتی ہیں۔ ایک مسلمان کو تو یہ کرو۔“ اس نے زور زور سے توبہ کرتے ہوئے اپنے کان چھوئے اور آسمان کی طرف نگاہ کر کے اللہ سے توبہ کرنے لگا۔

”کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں وہ کچھ کروں گا جس کا بابا نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ مبشر! مجھے نفرت ہے ہر اس چیز سے ہر اس بات سے جو بابا صاحب کو عزیز ہے۔ جو انہیں پسند ہے میں ان کی پسند کو ان کے

خواب کو ان کی خواہش کو ان کی زندگی کو سب کو سب کو محسوس کر دوں گا سب کچھ کچھ بھی نہیں ہے گا۔ وہ زور زور سے چیخ رہا تھا اس پر جیسے ہسٹریا کا دورہ برپا گیا تھا۔ اس نے ہاتھ مار کر وال روٹی کی ٹرے دور محسوس میں پھینک دی اور اپنا سر زور سے برآمدے کے ستون سے ٹکرایا۔ میشر کو اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا اس کی پیٹھ دھاڑ سے اندر روٹی کمرے سے دو تین لڑکے بھاگ کر آئے اور میشر کے ساتھ اسے سنبھالنے لگے جو بے قابو ہوا جا رہا تھا۔



”یہنا لکڑیوں سے تے چنا لکڑیوں سے تے۔“

کاسنی دوپٹے والی اسے منڈا عاشق تیرے تے۔“

گاؤں کی میراٹن بے سری اور بھونڈی آواز میں ڈھولک پیٹ پیٹ کر پڑے گا رہی تھی۔ میراٹن کے ساتھ آئی چار پانچ لڑکیاں تالیاں بجا بجا کر گاتے ہوئے اس کا ساتھ دے رہی تھیں جبکہ باقی کی رشتہ دار خواتین اونچی لہنتوں پر بیٹھی بے توتھی سے اس شور کو سن رہی تھیں ان میں سے زیادہ تر اپنی ذاتی گفتگو میں مگن تھیں۔ سیدہ آپا شادی اور گھر کے انتظامات میں ادھر ادھر دوڑی دوڑی پھر رہی تھیں۔

”تم لوگوں کو جہاں موقع ملتا ہے فوراً ہڈی تراپی پر اتر آتی ہو گھر میں اتنا کام بکھرا ہوا ہے اور خود نواب زادیاں ادھر آکر ڈھول پیٹنے میں مشغول ہیں۔ نامر اویس کام چور۔ پیچھے محسن میں اماں لطیفہ ایللی بیٹھی چاول صاف کر رہی ہے اور یہ ساری ڈار کی ڈار ادھر آ بیٹھی ہے۔ صبح ہو جا کر اس کا ہاتھ ٹاؤ۔ شام تک دونوں بوریاں صاف ہونی چاہئیں اور پھیلتیرے کام پھیلے ہوئے ہیں۔“

سیدہ کی ہنستا کر میراٹن کے واکس طرف بیٹھی نوکرانیوں کی ٹولی سکندوں میں تتر بتر ہو کر ادھر سے بھاگ نکلی۔ ”بھابھی! آپ لوگ ادھر مال کمرے میں بری کے جوڑے تانے جا رہے ہیں ان کو ایک نظر دیکھ لیں۔ خدیجہ درزن صبح تانک رہی ہے یا نہیں۔ شہر سے دو درزی بھی بلائے ہیں وہ کل آئیں گے خاص اور قیمتی کپڑے وہ تانک کریں گے اگر۔“

سیدہ قیمتی کپڑوں میں ملبوس سٹنگل اور ڈبل صوفوں میں دھنسی بیگمات سے مخاطب ہوئی تو وہ پانچوں اپنے بھاری بھر کم جتنے لے کر بمشکل صوفوں سے نکلیں اور سیدہ کے پیچھے چل پڑیں۔ ”او تم لوگوں کو بھی بھابھی جان کے کپڑے دکھاؤں۔ دیکھنا کس غضب کے ہیں۔“ شہرینہ نے آمنہ کے کان میں سرگوشی کی تو زینب اور بھومر کے بھی کان کھڑے ہو گئے وہ تو پہلے ہی کپڑے دیکھنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھیں۔

”چلو چلتے ہیں۔“ زینب تو فوراً کھڑی ہو گئی۔

”زینب! اور ہو رہی ہے بابا صاحب آنے والے ہوں گے ہمیں لینے کے لیے۔“ آمنہ نے دے دے لہجے میں سراٹھا کر پاس کھڑی زینب سے کہا۔

”ابھی تو ہم آئے ہیں۔ اتنی دیر کیاں ہوئی۔“ وہ لاپرواہی سے بولی ”ہے نا بھومر؟“ اس نے اپنے خواجہ سے گواہی مانگی تو یقیناً ”اس کے حق میں تھی۔“

”ہاں تو اور کیا ابھی تو ہم آئے ہیں۔ دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔ توبہ سے آمنہ! تم تو بہت ڈر پوک ہو۔ اپنے بابا صاحب کو تم نے ہوتا بنا رکھا ہے۔ مجھے بھی تو دیکھو ابا کو چیکر دے کر ادھر آئی ہوں۔ بندے کو بہادر ہونا چاہیے۔“ وہ اپنے کارنامے پر نازاں تھی۔ ”چلو بس کپڑے دیکھ کر چل پڑیں گے۔“ بھومر نے زینب کو بازو سے آگے دھکیلا تو بھومر ”آمنہ کو بھی اٹھنا پڑا۔“

”چلو نا تم تینوں کیا کھسر پھسر کر رہی ہو۔“ شہرینہ نے مڑ کر انہیں ٹوکا۔

”ہاں چل رہے ہیں۔“ زینب اور بھومر تیزی سے شہرینہ کے برابر ہو گئیں۔

شہرینہ آمنہ کی ہم عمر تھی۔ سیدہ سلیمان شاہ کی چھوٹی صاحبزادی۔ باپ اور بھائی بہن کی لاڈلی۔ شکل و صورت

اور قد بت میں وہ سیدہ اور سلطان بخت دونوں کو کاٹ گئی تھی۔ اتنی خوبصورت تھی کہ آنکھیں بھی اسے مبہوت ہو کر دیکھتا رہتا تھا۔ اسی لیے سیدہ نے ابھی سے اسے سختی سے پرہ کرانا شروع کر دیا تھا۔ اب تک تو وہ مری کا نوٹ میں بڑھتی رہی تھی، لیکن اب سیدہ نے بھائی اور باپ دونوں سے کہہ دیا تھا کہ اب اسے گھر پر تعلیم والو لی جانے جس کے لیے شہرینہ ابھی راضی نہیں تھی اور ضد منوانے کے لیے اس کی ایک بھوک بڑھال ہی کافی ہوتی بابا جان کے لیے یہ اسے معلوم تھا۔ اس لیے اسے سیدہ کے غصے کی بھی پروا نہیں تھی اور سلطان بخت کو بھی منانا اس کے لیے زیادہ مشکل نہ تھا۔

وہ تینوں ہال کمرے کے دروازے کے آگے بھجک کر رک گئیں۔ دروازہ مضبوط چمک دار لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ اس کی چوکھٹ اتنی اونچی تھی کہ بندے کو سراٹھا کر دیکھنا پڑتا۔ ویسے تو ساری خوبی ہی میں قیمتی اور مضبوط لکڑی کا کام کیا گیا تھا مگر ہال کمرے کا دروازہ ہی اس کی انفرادیت کا گواہ تھا۔ چوکھٹ کی پانچ اونچ چوڑی بیڑے انتہا نفیس و تازہ بہل بونے بنے ہوئے تھے کہ آمنہ کی انگلیاں بے ساختہ انہیں چھونے لگیں۔ جیسے وہ اصلی ہوں۔ جھومر نے بھی سراٹھا کر توصیفی نظروں سے دروازے کو سراہا۔ زینب البتہ اس قسم کے احساسات سے بے نیاز دروازے سے اندر بھاگنے کی کوشش میں تھی۔

”آجاؤ نا۔ رک کیوں لکھیں؟“ شہرینہ مڑ کر آمنہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ اندر لے گئی۔ ویسے بھی تینوں ہی سیدہ آیا کی سخت طبیعت سے خائف تھیں کہ کہیں ڈانٹ کر بھاگتی نہ ویں مگر خیر گزری کہ سیدہ درزن کے سر پر سوار تھیں۔

”یہ دوپٹہ کیسے جوڑا ہے۔ اس کی نیل اور آبی چاہیے تھی یہ شرت اس طرح ہینگ کرتے ہیں۔ خدیجہ! تم اب بوڑھی ہو گئی ہو اپنی بیٹی کو یہ ہنر سکھاؤ۔ اس کو تم نے پڑھائیوں میں لگا رکھا ہے جیسے کشتہ لگوانا ہے۔“ سیدہ مظفر لہجے میں بولی۔

”کتنی تو تم بھولتی ہو! پانچ برس میں پڑھتی ہیں۔ میں نے کون سا اسے آگے پڑھانا ہے۔“ خدیجہ گٹکھیا کر بولی۔

”نہیں بی! اچھی ڈی کرو او اس کو۔ باپ کہاں مال درزن اور بیٹی ڈاکٹر۔ اتنے اونچے خواب مت دیکھو مجھے سب خبر ہے تم جو آج کل پر پرزے نکال رہی ہو اور اس دوپٹے کا پھول بنانا تھا نا کہ شہری کنارے چاروں طرف سے نظر آئیں اسے ادھر کر دو بارہ کا پھول یہ دیکھیں گا سوٹ تم نے صبح لگایا ہے۔“

وہ تنقید پر تنقید کے جا رہی تھیں خدیجہ کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ وہ الٹے سیدھے طریقے سے کپڑے رکھ رہی تھی اور آبی سیدہ کہہ رہی تھیں کہ یہ عام سے کپڑے دکھ رہی تھی یہ عام سے کپڑے ہیں خاص کپڑے تو درزی ہینگ کرے گا اگر۔ ”اگر عام کپڑے ایسے ہیں تو خاص کپڑے کیسے ہوں گے۔“ کپڑوں کی چمک دیکھ کر بھومر کی آنکھیں چندھیار رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں نے تو آج تک پیوند لگی فراموشی گھدر کی گھیدار قسم کی کڑھائیوں سے بو جھل ٹیصیں اور اونٹی شاملیں دیکھی تھیں یا زیادہ سے زیادہ مرینہ اور پشیدہ کے قیمتی کپڑے سے بنی پٹھانی فراموشی اور اس کی آخری پرواز شہنشاہ اور ویلیوٹ تھی جو اس کی اور اس کے علاقے کی تمام عورتوں کی پہنچ سے باہر کا کام تھا اور یہاں؟

اس کی آنکھیں پھٹ رہی تھیں اس کے جھونپڑی نما مٹی کے گھر میں کوئی لوہے جست کا صندوق تھا نہ پٹی۔ ایک لکڑی کا بکس سا تھا جس میں اس طرح کا ایک بھی دوپٹہ تو کیا ایک رومال بھی نہیں تھا جب میدانی علاقوں سے جانے والی بے فکر سیاحوں کی ٹولیاں ان کی واوی میں سیر کرنے آئیں تو ان کے قیمتی لباس سے اور اس کی ہم عمروں کو درپردہ حیرت میں ڈال دیتے تھے۔ مٹی کے جلتے لیمپ کی مدد سے روٹھی میں رات گئے تک ان فکر گندم سے آزاد لوگوں کے بارے میں سوچتی رہتی تھی کہ یہ کہاں رہتے ہوں گے کہاں سے آتے ہوں گے جہاں رہتے ہوں گے وہاں تو یقیناً ”دودھ کی شہرینہ“ ہوتی ہوں گی اور اب وہ انہیں فکر گندم سے آزاد لوگوں کے درمیان کھڑی تھی۔

"یہ آسمانی سوٹ کس قدر خوبصورت ہے اور وہ بیلا۔ ہائے کاش میرا بھی ایسا ہو تا اور آمنہ۔ وہ سبز سوٹ دیکھو! قسم سے آنکھوں میں اتر رہا ہے۔"

زینب بھی جھومری طرح ہر سوٹ پر ہنسا رہی تھی۔
"آہستہ بولو۔ کیوں نئی دیکھو کی طرح بھرتے کر رہی ہو۔" آمنہ نے اسے دھیمی آواز میں جھڑکا جس کا زینب پر کچھ اثر نہ ہوا۔

ہال کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ لمبی قطار بوتلوں کے ڈبوں کی لگی تھی۔
"ایک دو تین۔۔۔" جھومرے گنگے شہزادے کی پورے آکٹین ڈبے تھے۔
پورے آکٹین ہیں اتنے سارے۔" اس کے منہ سے بے اختیار پچھلا تو زینب نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

"جو تے ہیں۔" وہ سرگوشی میں بولی۔
"ابھی تو تیس ہوئے اور آنے ہیں قیمتی بوتلوں کے ساتھ آپا سب بچک لائی ہیں۔" شہزادے نے قہر سے کہا۔ ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"آپا! یہ چالیس جوڑے ہیں پورے۔" خدیجہ شاید گنگتی کر رہی تھی۔
"اتیس رہ گئے وہ کل کرونا مگر آج ان سب کو دیوار پر لیس کر کے سوٹ کسٹ میں رکھ کر جانا۔" سیدہ کڑے لہجے میں بولیں وہ نرم بات بھی سخت لہجے میں کہنے کی عادی تھیں۔

"آپا! میرا راست کاموٹ ٹیلر کب لائے گا؟" شہزادے نے بران کے پاس جا کر بولی۔
"زینب! ان لوگوں کے پاس اس قدر پیسہ ہے۔" جھومرے گنگے گنگے انداز میں بولی۔
"یہ پیسہ نہیں ہے وقفہ ہے تو کپڑے اور جوتے ہیں اور اگر تم ان کا پیسہ لو گناہگار بن جاؤ۔" شہزادے نے بڑی ادنیٰ میں جھانک جاؤ۔ ان لوگوں کے پاس پیسہ گنگے والا نہیں تو لے لو والا ہے۔
"زینب! ان لوگوں کے پاس اس قدر پیسہ کہاں سے آیا؟" وہ اسی بے پروا انداز میں بولی۔
"اللہ نے دیا۔" زینب لاپرواہی سے بولی۔

"تو اللہ ہمیں کیوں نہیں دیتا؟" اس کی نظریں ہنوز آنکھوں کے آگے پیچھے لے آتے رکتے ملبوسات پر تھیں۔

"اللہ کی مرضی۔" زینب اسی طرح بولی۔
"ہم اللہ کی مرضی میں کس طرح شامل ہو سکتے ہیں؟" جھومرے معلوم کیا سوچ رہی تھی۔

"اللہ کی عبادت کر کے۔" آمنہ نے اس کے دائیں پہلو سے بے اختیار جواب دیا۔
"ہو نہ ہے وقفہ! زینب نے ہنکارا بھرا۔" عبادت کر کے ہمیں صرف جنت کے وعدے پر بڑھا جاتا ہے۔ مال اور پیسہ پھر بھی نہیں ملتا۔ وہ ان لوگوں کو ملتا ہے جو کبھی بھولے سے بھی اللہ کو یاد نہیں آتے۔ رنج کے اللہ کی تافرمانیاں کرتے ہیں۔ اپنی من مانیوں کرتے ہیں۔ خلق خدا کو اپنے ظلم کے نتیجے میں عاجزی عطا کرتے ہیں جس کی وجہ سے اللہ کے ماننے والوں کی تعداد تو نہیں بڑھی ہاں اس کو پکارنے والوں کی بڑھ گئی ہے جو ہر ظلم پر صرف یہ فریاد کرتے ہیں۔" ہمیں پیدا کرنے والے تو کہاں ہے ان کو ایسا اور ہم کو اتنا حقیر پیدا کیوں کیا۔" یہ جب جی چاہے جس کو جی چاہے روزگار گزار جاتے ہیں۔ ان کو پیسہ ملتا ہے۔ ہمیں صرف وعدے ملتے ہیں۔ عبادتوں کے نتیجے میں بشارتیں ملتی ہیں جو کبھی پوری نہیں ہوتیں۔"

زینب جو گھر میں بیٹھ کر آنکھوں سے رو رہی تھی علامات زہر اس کے اندر کس طرح پیدا ہوا۔
"کیا کو اس کر رہی ہو زینب! اللہ سے ڈرو۔" آمنہ نے بمشکل بولی جس کا حق ادا کیا۔
"صرف ہم ہی ڈریں۔ یہ کیوں نہیں ڈرتے جو بغیر کسی ڈر خوف کے انسان کو یوں مار دیتے ہیں جیسے کوئی چوہنی

ہاتھ میں لے کر مسل دے پھر بھی اللہ انہیں کچھ نہیں کتنا بلکہ شہابی میں اور پیسہ دیتا ہے اور اگر عبادت کرنے سے پیسہ ملتا تو سب سے زیادہ پیسہ بابا صاحب کو ملتا چاہیے جو ساری ساری رات اللہ کی حاضری میں کھڑے رہتے ہیں۔ اور صبح سوئے جاؤں گئے جو اور خالی جیب کے ساتھ اپنے پورے پر سو جاتے ہیں۔" زینب نے اتنا زہر بھرا بیچ کہاں سے سیکھا تھا۔ وہ تو بہت لاپرواہی لڑکی تھی۔

"اور اگر تم جھومرے جی حقیقی پیسہ ہے۔" آمنہ صوفی صاحب کے لہجے میں بولی۔
"اگر یہ پیسہ ہے تو اس سے مجھے اس طرح کا ایک سوٹ ہی بنا دو۔ نہیں بنوا سکتیں ہاؤ وہ خود ہی تمہارے ہنسی۔" "اگر یہ پیسہ ہے تو تمہیں مبارک۔" آمنہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"بابا صاحب سن لیں زینب کو تو کیا سوچیں۔" وہ زینب کا لال بھبھو کا چہرہ دیکھ کر سوچنے لگی۔
"اچھا اس بہت کو چھوڑو۔ زینب! ہم بھی ان جیسے امیر کیسے ہو سکتے ہیں؟" جھومرے کی سوئی ادھر ہی اٹکی ہوئی تھی۔

"ان کے گناہ کا ہال کر۔" زینب بھل کر بولی۔
"اور کوئی آسان طریقہ نہیں؟" جھومرے لاپرواہی سے بولی۔
"ایک اور طریقہ بھی ہے گلاب دیر ہو گئی۔ تم پہلے آجائیں تو پھر قابل عمل تھا۔" وہ مسکرا کر بولی۔
"وہ کیا؟" جھومرے نے بے تاملی سے پوچھا۔

"اگر تم سیدہ آیا کی منہ کی جگہ ہو تیں تو اس سے سب کپڑے تمہارے ہوتے۔ اس ساری دولت جاگیر کی تمہا لگ ہوتیں اگر تم سیدہ آیا کی منہ ہو تیں۔" زینب کا لہجہ مذاق اڑانے والا تھا۔ جھومرے نے بولی۔
"تم بہت فضول بکواس کرتی ہو اور جی بہت طریقے ہیں اگر سوچو تو۔"
"جھومرے! میں نے تمہیں یاد دلا دیا کہ یہ کوئی طریقہ اگر تمہیں معلوم ہے تو مجھے ضرور بتانا مگر علیحدگی میں۔ یہ آج تمہارے اس عمل کو عمل کرنے سے کی مجھے معلوم ہے۔"

وہ آمنہ کی شکل بارنگاہوں سے منہ ہنسی طور پر ڈر کر بولی۔
"چلو تم لوگ اگر چلنا ہے تو دیر ہو گئی ہے۔ بابا صاحب آگے تو پھر ڈانٹ پر چائے گی۔ ادھر بہت ناگم لگ گیا ہے۔" آمنہ زینب کو گھورتے ہوئے پیچھے کی طرف مڑ گئی۔ تو وہ دونوں بھی کندھے اچکا کر اس کے پیچھے باہر نکل گئیں۔

"سینی! ادھر کجا۔" سینی جو رعنا کو سنگ روم میں بیٹھے دیکھ کر کئی کترا کر اپنے کمرے میں جانے کے لیے کارڈوں کی طرف مڑنے لگا تھا اس کی دیکار بے اختیار تھک گیا۔
"سنا نہیں ادھر آؤ۔" وہ اب کے ذرا کڑے لہجے میں بولی۔

تو سینی نے شکایتی نظروں سے ہال کو دیکھا کہ اسے اس لہجے کی عادت نہیں تھی پھر مست قدموں سے رعنا کی طرف بڑھا۔ بلکہ جینز اور اورنج شرٹ میں سفید باریہ تہہ سال کا صحت مند و رازد لڑکا تھا شکل و صورت میں رعنا سے زیادہ مشابہ تھا۔ نسبت فخر حیات کے۔
"کہاں سے آرہے ہو؟" رعنا نے اس کے حلقے کا ناقدانہ جائزہ لیا۔
"کوئی کی طرف سے۔" وہ بے خوف لہجے میں نظریں اٹھا کر بولا۔

"اس وقت۔ ناگم کجا ہے؟ شام کے ساڑھے پانچ بج رہے ہیں تمہیں معلوم بھی ہے پانچ بجے تمہارے بیٹے کو آجاتے ہیں تمہو کی کی طرف کیوں گئے؟"
رعنا باہر جا رہی تھی گاڑی ابھی پورج سے نکلی نہیں تھی کہ اس نے سینی کے بیٹے کو باہر جانے دیکھا تو معلوم کرنے پر پتا چلا کہ سینی صاحب تو موجود نہیں اور بیٹے چارہ آدھ گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد اب واپس جا رہا ہے۔ تو رعنا گاڑی سے نکل آئی کہ سینی کی کلاس لے کر باہر جانے لگی۔

”مما اور مجھے لینے آیا تھا۔ اس کے پاپائے اسے اسپورٹس کار لے کر دی ہے۔ وہ اسی میں آیا تھا پھر میرے انکار کرنے کے باوجود مجھے گھمانے لے گیا۔ میں آپ کے کمرے میں پریشانی لینے آیا تھا مگر آپ ہاتھ لے رہی تھیں۔ اس لیے۔“ وہ اسی طرح دیکھتے ہوئے وضاحت سے بولا۔

”غضب خدا کا عمریں ابھی پندرہ سال بھی نہیں ہوئیں۔ اسپورٹس کاروں کا بھی شوق چرا گیا ایسے والدین ہوتے ہیں ناجن کے بے جالاؤ بیار سے بڑے ہوئے سپورٹس کاروں پر حاوی کرتے پھرتے ہیں۔ تم اس بچی کے ساتھ میری اجازت کے بغیر گئے کیوں؟ مجھے تو تمہارا وہ دوست لگتا ہی رہ رہا ہے۔ بالوں کی پونی کانوں میں پالی ہاتھ میں کڑا۔ پتا نہیں کس جنس سے تعلق ہے اس کلمہ۔“ رعنا کو اور غصہ آیا۔

”مما سوری۔ آئندہ آپ سے اجازت لے کر جاؤں گا۔“ وہ رعنا کا خراب موڈ دیکھ کر فوراً آگے بڑھ کر اجازت سے بولا۔

”اوکے۔ جاؤ تم اپنے روم میں تمہارے سرورہارے ساڑھے چھ بجے آئیں گے۔ دس منٹ میں جا کر لیٹیں کھولو۔“ اسے معلوم تھا سینیٹی کے لیے یہ سزا ہی کافی ہے کہ سرورہارہ آئیں گے اور رعنا تو بڑے گا۔

”مما میں نے ہوم ورک تو کر لیا تھا۔ اب سر آ کر کیا کریں گے۔“ وہ احتجاجاً رعنا کا ہاتھ جھٹکتا کر بولا جو ابھی چند لمحے پہلے محبت سے تھا۔

”تو ایک کس کیوز۔ اب سرورہارہ آئیں گے۔ مجھے تمہاری کوئی شکایت نہ ملے۔ چلو اپنے کمرے میں۔ فائل سر ہے اور تم ہوم ورک لے کر بیٹھے ہوئے ہو۔ چلو ہوم میں لے کر ہے۔“ اس سختی سے بولی تو وہ پریشان ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”پتا نہیں اس کو پڑھنے کا شوق کیوں نہیں ہے۔ میں اور فخری تو۔“ سوچتے ہوئے اس نے اتنی زور سے ہونٹ کاٹے کہ خود ہی منہ سے ”سی“ نکل گیا۔ ہونٹ سے شاید خون نکل آیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اسے بھوک لگی۔

”تیار رعنا تو موجود ہے۔ کیا حال ہے بھی۔“ عفت آرا کی پر جوش آواز پر رعنا کا تکی چاہا۔ اپنا آپ ہی پچل ڈالے کہ وہ کیوں موجود ہے۔ وہ اسی طرح آیا کرتی تھیں۔ اچانک اور بن بلا۔ عفت آرا کے ساتھ ان کی دونوں بڑی بیٹیاں فرح اور ندا تھیں۔

”اب شام عاتق۔“ رعنا دل میں سگی۔ بیگم ہاشمی کی طرف پارٹی تھی اور بیگم ہاشمی کو ٹالنا بھی ایک درد سر تھا ابھی ان کا فون آجائے گا۔

”آپ بھابھی! بیٹھیں۔“ وہ حسب عادت دل پر جبر کر کے بولی۔

”ہاں ہاں۔ آجاؤ بھئی۔ تم دونوں کیوں رک گئیں۔“ عفت آرا نے مرکز ان دونوں کو چکارا۔ ندا ایک ہاتھ سے رکھ کر آگے بڑھی اور دونوں نے جیسے شرمناک سلام کیا۔ رعنا نے سوٹ کیس نمائیک کو گھورتے ہوئے دونوں کے سلام کا جواب دیا۔ تینوں ایک ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”شکر ہے رعنا گھر پر مل گئیں۔ وہ تمہاری موٹی بڑھی کھوسٹ ملازمہ کہہ رہی تھی۔ بیگم حبیب تو ابھی تکی ہیں گاڑی میں۔“ وہ بیٹیوں کے لیے کی نقل اتار کر بولی۔

”ہاں میں نکلی تھی باہر مگر ایک ضروری کام یاد آنے پر اندر آئی گاڑی اسی لیے باہر گیسٹ کے قریب کھڑی ہے۔ بس میں جانے والی تھی۔“ رعنا نے جلد سے جلد ان کی بے وقت آمد کا مقصد جان لینا چاہا۔

وجہ سے بہت نہیں ہو رہی تھی۔ اور سے عفت آرا بیگم آئے دن اس کے لیے کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کرتی رہتی تھی۔ بیٹیوں کو ادھر رکھنے کا مطلب تھا۔ عفت آرا کو بھی ادھر رکھنا اور ان کو تو چند گھنٹی برداشت کرنا ہی اپنے حواس تحمل کر دینے کے مترادف تھا۔ وہ اسی طرح ہندے کے اعصاب ناکارہ کر دیا کرتی تھیں۔ بے چین اور حسد بھری نظروں سے اور نیندوں والی گفتگو کر کر کے رعنا نے ایک گہرا سانس لیا۔

”بھابھی! مجھے خوشی ہوتی اگر یہ دونوں یہاں رہتیں۔ اصل میں کل شام کو ہم جاپان جا رہے ہیں۔ اس لیے گھر میں تو کوئی ہو گا نہیں۔“ فوراً ہی اس کے ذہن نے یہاں کھڑا۔

”اس۔ یہ اچانک جاپان کیوں؟“ عفت آرا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ جو جتنا کو چائے کے لوازمات سے بھری برائی تھی کھینٹ کر لاتے دیکھ کر فوراً بند بھی ہو گیا۔

”اچانک تو نہیں کچھ دنوں سے بن رہا تھا اصل میں فخر کو ادھر کچھ کام تھا پہلے بھی میں ساتھ نہیں گئی تھی تو ناراض ہو رہے تھے۔ سینیٹی کے ایگرام میں بھی خاصے دن ہیں ایک آدھ ہفتہ ان کے ساتھ کھوم پھرتے ہیں۔“ وہ بات سے محبت بناتی چلی گئی۔

”تو کیا گھر لوگوں کے سر پر کھلا چھوڑ جاؤ گی۔ آج کل تو کسی کا بھروسہ نہیں۔ یہ بچیاں ہیں نا۔ میں بھی آجایا کروں گی رات کو تمہارے بھائی آجایا کریں گے۔“ انہوں نے فوراً اپنی فی سبیل اللہ خدمات پیش کیں۔

”نہیں اس بار فخر کہہ رہے تھے۔ گھر کو لاک کر کے جانا ہے یا ہر جو کیدار رہے گا۔ دو چار ملازمین نے تو پچھٹی پر گاؤں جانا ہے اس لیے انہوں نے کہا ہے کہ سب کو ہی ایک ہفتے کی چھٹی دے دیتے ہیں۔“ رعنا نے کہا تو عفت آرا نے آدھا کباب توڑ کر منہ میں رکھ لیا۔ انہیں آگے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا کہ کس طرح رعنا کو مجبور کر کے دونوں لڑکیاں ادھر ہی چھوڑ جائیں۔ آخر فخری نے انہیں زیادہ دیر اس ذہنی رستہ نشی میں مبتلا نہ رکھا۔

”چلو جیسی تمہاری مرضی۔“ وہ منہ میں نے آدھا کھاتا کہ ہم رہ جاتے ہیں اچھا ہے گھر کی حفاظت بھی ہو جائے گی باقی تمہاری ہی ہمت دیکھتے ہو۔“ عفت آرا نے پیمبری اٹھا کر کھانا شروع کر دی۔

”مجھے تو خوشی ہوتی مراب۔ جو خرابی رہتی ہے تو انہیں بار بار انکار بھی نہیں کر سکتی۔“ حالانکہ فرح اور ندا کو رکھنے میں اسے کوئی حار نہیں تھا مگر عفت آرا کی کینسی فطرت نے اسے اپنے خون سے بھی دور کر دیا تھا وہ جتنا ان سے بچنا چاہتی وہ اتنا ہی قریب آتا تھا۔

”اب تو فخر سے کہوں گی۔ چاہے ہمیں ایک ہفتے کے لیے مری بھورین بھجوا دیں۔ بھابھی تو ہمیں چیک کرتی رہیں گی۔ سینیٹی کو سمجھاؤں گی۔“ ان تینوں کو فخری اشاکل انداز میں چیزوں سے انصاف کرتے دیکھ کر رعنا سوچنے لگی۔

”السلام علیکم صوفی صاحب! ما سٹر صاحب نے حجرت کے اندر داخل ہو کر چٹائی پر بیٹھے صوفی صاحب کو سلام کرتے ہوئے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

”اب جاؤ تم اور مسجد کی تمام صفیں باہر احاطے میں لے جا کر اچھی طرح جھاڑو اور مسجد کے صحن کو دھو دو۔ دو تین لڑکیوں کو ساتھ لگا کر اچھی طرح صفائی کرو ڈالو۔ عصر کی نماز تک صحن خشک کر کے صفیں جھاڑو۔“ وہ جلیں کو ہدایات دینے لگے۔ وہ رٹو طوطے کی طرح ان کے ہر پہلو پر ضرور سر ہلا کر ”جی صوفی صاحب۔“ گئے جا رہا تھا۔

ان کی بات ختم کرنے پر بھی ”جی صوفی صاحب۔“ کہہ کر وہیں بیٹھے رہا تھا باندھے موڈ کھڑا رہا۔

”جاؤ اب۔“ منتظر کھڑے دیکھ کر انہیں کتارہ اتوہ ”جی صوفی صاحب۔“ کہہ کر سر ہلا تا ہوا باہر نکل گیا۔

”بہت دنوں بعد آئے ہیں ما سٹر صاحب! صوفی صاحب ما سٹر صاحب کی طرف متوجہ ہوئے۔

"اللہ برکت دے آپ کے شوق میں۔ آج کل تو لوگوں میں مطالعے کا شوق غما ہو جا رہا ہے۔ معاشی مسائل نے لوگوں کے ذہنوں کو بری طرح سے جکڑ لیا ہے۔ سوال 'روٹی آنا چینی گوشت سبزی انہیں کچھ اور سونے ہی نہیں دیتے ہر شخص اس ذہنی جکڑن کا شکار ہے۔ چرواں بروہ پکلی ہی فرصتیں بے فکریاں نظر ہی نہیں آتیں۔ کتاب کس نے پڑھتی ہے اور کتاب تو بندہ تب ہی پڑھ سکتا ہے جب ذہن آزاد ہو ہر فکر سے۔ پھر کتابوں کی قیمت اللہ اللہ۔" صوفی صاحب بولے۔

"دوست فرمایا آپ نے یہ ٹھیک ہے آج کل ہر طرف معاشی مسائل کی وجہ سے پریشان ہے۔ ان مسائل نے اس کی ذہنی فراغتیں پھین لی ہیں مگر میرے خیال میں ایک کتاب ہی ہے جو اسے ان مسائل سے کچھ دور کے لیے دور لے جا کر ذہنی بے فکری دیکھ سکتی ہے۔ اگر ہم اپنی پریشانیوں کا حل کتاب پڑھنے میں تلاش کریں تو یقین کریں ہمارے ذہن پورے نہیں تو آدھے ضرور فریض ہو جایا کریں۔ مگر آپ کی بات بھی صحیح ہے کہ ایک تو لوگوں کا اس طرح دھیان ہی نہیں جاتا تو دوسرے کتابوں کی قیمتیں واقعی آسمانوں سے باتیں کرتی ہیں۔ عام آدمی سے دور جو سب سے زیادہ پریشانیوں اور الجھنیوں کا شکار ہے۔" ماسٹر صاحب نے اختلاف کرتے ہوئے اپنی صوفی صاحب سے اتفاق راستے پر قرار رکھا۔

"یہی ساری بات ہے جو لوگوں کو فرصت نہیں ملتا ہے اسے سو کر یا ایک دوسرے کے کدورتیں بڑھا کر یا پھر انہیں بے کار مسائل پر سوچ سوچ کر برباد کر دیتے ہیں حالانکہ بے کار وقت ضائع کرنے سے بترے کہ آدمی کتاب پڑھے۔" صوفی صاحب خود مطالعہ کے بے حد شوقین تھے۔ ذہنی کتابوں کے علاوہ مطالعے کا بھی شوق رکھتے تھے۔

"بالکل درست فرمایا آپ نے لیکن آج کل کا زمانہ اس طرح کا آیا ہے۔ ماحول اس طرح کا بن گیا ہے۔ کوئی چاہے خواہ نہ چاہے دوسرے اسے اپنے مسائل میں شامل کر کے ہی دوسرے پر۔ اسی طرح کی باتیں آج کل میرے گھر میں بھی آئی ہوئی ہیں۔"

ایک دم سے ماسٹر صاحب کا دھیان اپنے موجودہ مسائل کی طرف مڑ گیا اور زندگی کے مسائل کو انہوں نے بھی کتابوں کے مقابلے میں ساری زندگی اہمیت نہیں دی تھی۔ ماسٹر صاحب نے جاری لڑائی کر اب صابر و شاکر ہو گئی تھی۔ سارا گاؤں کہتا تھا کہ ماسٹر بہت صبر والی ہیں۔ بہت فصاحت والی۔ اب یہ کوئی ماشینی کے دل سے پوچھتے۔ انہوں نے یہ صبر و فصاحت کہاں سے حاصل کی۔ مہین کو مارتے جاؤ۔ خواہشوں کو پھلتے جاؤ۔ یہ نیک کام خود کرو حالات کریں۔ (تو ایک روز من مری جانا ہے۔ خواہشوں کا چوں چوں کا مرتہ پک کر چھوڑنا چاہنی میں ڈھل ہی جاتا ہے۔ یہی پتھہ ماشینی کے ساتھ بھی ہوا۔

"یہی سبب نہیں؟" صوفی صاحب چونکے "میں نے تو سنا ہے آج کل آپ کے گھر میں کچھ مہمان آئے ہوتے ہیں۔"

"مہمان! ماسٹر صاحب نے وائٹ پیسے "بلائے جان کہیں بی۔"

"نہیں ماسٹر صاحب! ایسا نہ کہیں اللہ ناراض ہوتا ہے۔"

"صوفی صاحب! آپ کو کیا معلوم خیر۔" انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔ "میری سالی کا شوہر اور اس کا کوئی مہمان جس سے وہ اپنی بیٹی بچھو مرنے کا نکاح کرنا چاہتا ہے دو روز سے اگر ہمارے سر پر سوار ہیں۔ باپ چلا تا ہے۔" ام ایسی نکاح کرنے کا مولوی کو بلاؤ۔ بیٹی چینی ہے۔" ایسا امری لاش سے نکاح کروائے گا تو کرو۔ ام نہیں کرنے گا۔" دونوں پٹھان دو ایوم میں بیچ بیچ کر سارا گھر سر اٹھا لیتے ہیں۔ میں دونوں کو ڈانٹ ڈانٹ پکڑ پکڑ کر ٹھنڈا کرتا ہوں۔ دونوں تھوڑی دیر میں پھر سے ہانڈی کی طرح چلنے لگتے ہیں۔ اب اس کے باپ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ سے پوچھ کر لوں کہ وہی یا سرپرست کی مرضی ہو اور لڑکی غل شپاڑہ چاتی ہو کہ اس کے دل میں کچھ غفل ہے تو کیا نکاح ہو سکتا ہے؟" ماسٹر صاحب نے مسئلہ بیان کیا۔

"کیا لڑکی یا گل ہے؟" صوفی صاحب چونک کر بولے۔

"کہاں صوفی صاحب! وہ تو اوسھی دنیا کو یا گل بنا دے۔" ماسٹر صاحب آگے ہوتے لیجے میں بولے۔

"تو پھر ایسی صورت میں تو نکاح نہیں ہو سکتا۔ اگر لڑکی راضی نہ ہو تو۔" صوفی صاحب بولے۔

"اس کا باپ کہتا ہے میں زبردستی پکڑ کر تیرا نکاح کروا لوں گا۔ تب تو ہو جائے گا؟" ماسٹر صاحب نے بے بسی سے اپنے ہم زلف کے روشن خیالات بیان کیے۔

"نئی جمالت ہے ماسٹر صاحب! نکاح کوئی مذاق نہیں ہے ایسے مہمان سے جا کر کہیں کہ نہ آپ اس طرح کے مذاق کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ سراسر گناہ ہے۔" انہوں نے سنجیدگی سے اپنی دائرہ میں خلال کیا اور دونوں ہاتھوں کی پتیلیاں رگڑ کر اپنے چہرے پر اچھی طرح سے پھیریں جیسے کوئی منہ دھو رہا ہو۔ ان کا من خوسفیہ رنگ اور سرخ ہو کر رہ گئے۔

"نئی تو میں بھی بیعت بیعت کر تھک گیا ہوں۔ یہ بات دونوں کی سمجھ میں آئی ہے۔ دونوں یہاں سے جاتے نظر آتے ہیں۔" ماسٹر صاحب حد سے زیادہ بیزار تھے۔

"اللہ دان لوگوں کو عقل دے۔ سبکی کی بددلت دے۔" صوفی صاحب بولے۔

صوفی صاحب کو روپے کھانے کے لیے آواز دینے کے لیے زینب بچرے کے اندرونی دروازے کے پاس پہنچی تھی۔ جب بچو مرنے کے نکاح کی بات اس کے کان میں پڑی۔ اوسھی پوری بات سن کر وہ اندر کمرے کی طرف بھاگی جہاں آمنہ بیٹھی اپنی نوین مصاحبت کی نگاہ کھولے کوئی سبق رٹ رہی تھی۔

"آمنہ! آمنہ تم نے کچھ سنا؟" وہ بھائی بھائی اس کے پاس پہنچ کر پھولے سانس کے درمیان بولی اندرونی کمروں اور صحن کے درمیان اچھا خاصا ماحول قائم کر رہی تھی۔

"کچھ؟" آمنہ نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"نہیں مہراصل ہو رہی ہے۔ اسی خاک ڈرا پور کے ساتھ۔ چتا نہیں آج چتا نہیں کل۔" اس نے پوری بات کب سنی تھی اس لیے اوسھی اسے پاس سے بنا کر بولی۔

"اچھا۔" آمنہ ایک پل کو تھک کر اور پھر کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی "ہو رہا ہو گا۔"

"جیس جیرت نہیں ہوتی؟" زینب اس کے ٹھنڈے انداز پر بولی۔

"اس میں جیرت کی کیا بات ہے وہ تھا تو رہی تھی کہ اس کے لیا کس طرح چاہ رہے ہیں تو ہو رہا ہو گا نکاح۔" وہ لاپرواہی سے بولی۔

"تو تو اسی طرح کی ہے۔ غیر جذباتی اور اتھن۔" زینب دل میں پڑھ رہی تھی۔

"ابا صاحب آگے ہیں۔ اماں جی کہہ رہی ہیں اگر دسترخوان چھٹا میں آپ دونوں۔" بچو یہ اندر آ کر دونوں سے بولی۔

"تم چھوٹی ہو دسترخوان نہیں بچھا سکتیں بہر وقت بڑھائی کا بہانہ۔ زیادہ لاڈلی بن کر اماں کی گود میں تھسی رہتی ہو۔ آمنہ! یہ پھولی ہے لب پانچویں میں پڑھتی ہے۔ اس عمر میں تو میں اماں جی کے ساتھ آنا گوندھتی تھی۔ سبزی پتی تھی اور یہ لاڈو دسترخوان نہیں بچھا سکتی۔" زینب بچو یہ پرالٹ پڑی جو اس اچانک افتاد کے لیے تیار نہیں تھی۔ ہرگز آمنہ کے پاس جا کھڑی ہوئی جس نے بچو یہ کا پیغام سن کر کتاب بند کر دی تھی۔

"بہت ہڈ خرام ہو گئی ہے یہ اماں جی اور بابا صاحب کے لاڈ میں۔ ہم سے تو کوئی اس طرح پیار نہیں کرتا تھا۔ یہ زیادہ انوکھی ہے۔"

زینب بولے جا رہی تھی۔ بچو یہ ہر اماں کھڑی تھی۔

"آئی! میں نے کیا کیا ہے؟" وہ ڈر سے ڈرے لیجے میں آمنہ کا کانہ جا پکڑ کر معصومیت سے بولی۔

"کچھ نہیں۔ یہ زینب بول رہی ہے۔ تم جاؤ۔ ہم آ رہے ہیں تم جا کر دسترخوان چھٹاؤ۔" زینب کی بدستور

گھورتی نگاہوں پر اس نے جویریہ کو دہشت کی۔ وہ تو میں بچھا آئی تھی۔ اب کھانا نکالنا اور لگانا ہے میں نے تو برتن بھی لگا دیے تھے۔ پانی بھی رکھ دیا تھا اور گلاس بھی۔ اس نے جلدی جلدی کاموں کو فرست گنوائی۔

”شباباش! آمنہ نے اس کے ماتھے پر آئے پال سنوارے بس آگیا تمہیں پھین۔ دسترخوان بچھا آئی تھی یہ۔“ آمنہ نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے بیزار سی بیٹھی زینب سے کہا۔

”ہو نہ۔ بچھا آئی ہے تو مجھ پر کوئی احسان کیا ہے۔“ وہ کہہ کر کھڑی ہو گئی جویریہ فوراً باہر بھاگ گئی کہ کہیں زینب سے خواہنا ہاتھ نہ جڑوے۔

”تم اتنی چڑچڑی کیوں ہو رہی ہو۔“ آمنہ نے اسے پیچھے سے ٹوک کر پوچھا۔

”میں کیوں چڑچڑی ہوں گی۔“ وہ اور چڑچڑی ہوئی۔

”مجھے معلوم ہے۔ تین دن سے جھومر سے ملاقات جو نہیں ہوئی۔ بابا صاحب نے منع کر دیا ہے۔ ان کے گھر میں مسماں جو آئے ہوئے ہیں۔ تم اس لیے اواس ہو۔“ آمنہ اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔

”آمنہ جھومر سے ملنے چلیں؟ وہ پھر کوجب بابا صاحب کھانا کھا کر سو جائیں۔“ وہ چاہتے تھے اس کا بارو تمام کر بولی۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بابا صاحب سے جوتے کھانے ہیں وہ جوتے ضرور ہیں مگر انہیں سب خبر ہوتی ہے کون کہاں ہے۔ نہ بابا! میں یہ خطرے والا کام نہیں کر سکتی اور بھلا جھومر سے مل کر کیا کرنا ہے تم نے۔“ وہ دروازے میں پہنچ کر بولی۔

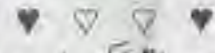
”ویسے ہی۔“ حالانکہ وہ اس کے ”بھلا“ کے متعلق جاننے کے لیے تپ ہو رہی تھی۔

”ویسے ہی تو پھر رہنے دو جو کچھ ہو گا۔ خود ہی پتا چل جائے گا۔“ وہ آگے چل پڑی۔

”جو بیلی جانے کا بہانا کر کے نکل جائیں گے۔“ وہ اس کی بات ان سچی کر کے بولی۔

”نہ بابا! پہلے ہی اماں جی ہم سے خفا ہیں۔ اس روز بھی جو بیلی چلے گئے تھے شکر ہے۔ بابا صاحب کو معلوم نہیں ہوا انہوں نے کہہ رکھا ہے اگر جو بیلی جانا ہو تو اماں جی کو ساتھ لے کر جائیں۔ اس لیے تم اس بات کو تو رہنے ہی دو اور چلو اب اماں جی آواز دے رہی ہیں۔“ وہ وہ پشیم دورست کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔

”تم نہ جانا۔ میں تو کسی نہ کسی طرح آج ضرور جاؤں گی انہی کھانے کے بعد۔“ وہ ٹوڈ سے کہتے ہوئے سوچنے لگی جووریہ کے ساتھ اماں جی سے کوئی بہانہ کر کے۔ وہ ترکیب سوچنے لگی۔



وہ شاید ٹیلے کے اثر کے تحت گہری نیند سو رہا تھا کچھ سارے دن کی سنسن بھار اور سرور کا اثر کھانا اور بخار کی گولی کھانے کے بعد بمشکل اسے نیند آتی تھی۔ اب کوئی اسے جھنجھوڑ چھوڑ کر اٹھا رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون ہے۔ نیند سے بوجھل آنکھیں کھل ہی نہیں رہی تھیں۔ سر ابھی بھی درد سے پھٹ رہا تھا۔

”معاذ! اٹھو۔ اٹھو۔ آنکھیں کھولو۔“ شاید ظفر تھا اس نے ہوی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھیں بخار کی وجہ سے جل رہی تھیں۔ سر نیند سے گھوم رہا تھا۔

”معاذ! اٹھو۔ اٹھ کر بیٹھو۔“ ظفر نے زبردستی اسے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھانا چاہا اس کا وجود بے جان ہو رہا تھا اس سے اٹھانی نہ کیا۔

”معاذ! اماں کا کھانے دار بھائی آگیا ہے۔ وہ تین کانٹیل لے کر اصراری آ رہا ہے۔ اس نے تمہیں چاہے کوئی شہوت ملے نہ ملے گرفتار کر کے لے جاتا ہے۔“

”وہیں تو سمجھا اب تم شاید ہی گاؤں کا رخ کرو۔ یہ شہری زندگی کی مصروفیات تو مکڑی کے جال کی طرح ہوتی ہیں۔ بندے کو چاروں جانب سے جکڑتی ہیں۔“

عبدالستین سعادت مندی سے ان کے آگے گردن جھکائے دونوں ہاتھ گود میں دھرے بڑے اٹھماک سے ان کی آنکھوں کی ٹھنڈی مار سہ رہا تھا۔

”بابا صاحب آپ کو معلوم تو ہے۔ میں نے دو تین برس سائی کے کورس شروع کر رکھے ہیں۔ ادھر رہنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے پاس علم اور ڈگریاں دونوں واقف ہوں۔ آپ کے دیے ہوئے سب سے قیمتی علم کی بنیاد پر میں ان ڈگریوں کے حصول کے لیے اٹھا ہوں اور بابا صاحب! میری سنی الامکان کوشش ہے کہ میرے کسی رزلٹ پر آپ کا سر شرم سے نہ جھلے بلکہ آپ شکر سے سب کو بتائیں کہ آپ کا بیٹا مخلصی اور کامیاب ہے۔“ وہ دستانے لہجے میں قول قول کر بول رہا تھا نگاہیں اور سر ہنوز جھکا ہوا تھا۔

”ابھی تمہاری یہ سوچ نیک بیٹی پر مبنی ہے تو میری دعا ہے اللہ تمہاری سوچ میں برکت دے اور تمہاری کامیابیوں میں بھی۔ میری دعا میں میری مناجاتیں سب تمہارے لیے ہیں کہ مخلصی ہو نہمار اولاد یوں ہی والدین کی دعاؤں کی حقدار ہوتی ہے جو بات تمہارے سلسلے میں از حد ناگوار گزری ہے بہتر ہے کہ تم اسے جان لو۔“

ان کے لہجے میں ابھی بھی اس کے لیے پہلے جیسا پیارا اور خصوصی توجہ نہیں تھی۔ لگتا تھا وہ اس سے بہت خفا تھے مگر بابا صاحب کو منانا اسے آتا تھا۔ وہی اولاد والدین کی کمزوری ہوتی ہے اور عبدالستین کو بھی ان کی اس کمزوری کا علم تھا اور اس کا اس نے بہت فائدہ اٹھایا تھا۔ مبین کو اگر معمولی عقلی پر بار پڑتی تھی تو عبدالستین کو صوفی صاحب کھنص سرزش کر کے جھوڑ دیا کرتے تھے۔ توجہ و محبت کے اسی تضاد نے ناصر عبدالستین کو صوفی صاحب سے نفرت کرنا تھا بلکہ دونوں بھائیوں میں ذہنی و قلبی دوری پیدا کر دی تھی۔

”ابھی تو بولنا بند ہے آپ حکم کریں بابا صاحب! میں اپنی جان پر کھیل کر آپ کا حکم جالاؤں گا۔“ اس نے ذرا سا سراٹھا کر ان کے بارعب پھرے کو دیکھا۔ اگر آپ کو میرا شہر جانا وہاں پڑھنا پانچ ہے تو بابا صاحب! میں آج ہی سے نہیں رہوں گا۔ کبھی دوبارہ شہر کا نام نہیں لوں گا آپ یقین کریں۔“ اس نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پورے یقین سے کہا۔

”مجھے معلوم ہے تم اسی قدر سعادت مند ہو۔“ صوفی صاحب اس کی سعادت مندی سے متاثر ہو کر بولے۔

عبدالستین تمہارا اس طرح شہری فضا میں کھل مل جانا بلکہ وہیں کے ہو کر رہ جانا مجھے سخت ناپسند ہے۔ تم گاؤں پورے ڈیڑھ سال بعد آئے ہو جبکہ شہر ادھر سے محض ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ تم وہ کچھ بھی کر لو جتنا بھی چاہو۔ کالنگ میں رنگ جاؤ تم ہو اصر کے ہی اتھ پور شہر کے۔ یہ تم یاد رکھنا اور جب بھی گاؤں میں پکارے تمہیں لوٹ کر اصراری آنا ہو گا اس بات کا تم مجھ سے آن وعدہ کرو۔“

وہ بے تامل بے اعتبار سے لہجے میں بولتے ہوئے باریک بین نگاہوں سے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کا جائزہ لے رہے تھے۔

”وعدہ بابا صاحب! وہ ان کی بات ختم ہونے سے پیشتر ہی بول اٹھا وہ اسے خاموشی سے دیکھتے رہے۔ اس کے جواب پر کسی خوشی کسی اطمینان کا اظہار نہیں کیا۔

”بابا صاحب! آپ جو کہیں گے۔ جب کہیں گے میں آپ کی خدمت میں سب کچھ چھوڑ بھگاؤ کر حاضر ہو جاؤں گا۔“ وہ دوبارہ مشروط لہجے میں گویا ہوا۔

”میرے عبدالستین! اب ایسا شاید ہی ممکن ہو۔“ کچھ دیر بعد انہوں نے کہا اور اپنا سر جھکا لیا۔

”کیوں بابا صاحب! ایسے کیوں کہ رہے ہر آس۔ میاں، میاں کیوں نہیں آؤں گا۔ میاں گھر ہے میرا۔ آپ ہیں میرے معزز والد میرے دوست۔ میری اتنی اپنی ماں جی۔ آمنہ زینب عبدالستین جووریہ سب ہی تو اصر ہیں۔ تو پھر میں کیوں نہیں آؤں گا۔“ وہ بے چینی سے انہیں جیسے یقین دلانے لگا۔

”مشکل سے بہت تمہاری بیٹنیں وہاں کے باوجود۔“ انہوں نے کتنی دیر کا رکھا ہوا لباس زور سے سینے سے خارج کیا۔ ”تمہارا اب اوہر اگر رہتا رہتا جس جانا مشکل ہے۔“ محض تین سالوں ہی میں تم پندرہ سال کے رہن سہن کو چھوڑ کر شہری بوہوشاں وہاں کے طور طریقے اپنا چکے ہو۔“ حالانکہ اس نے تو آتے وقت اپنے لباس میں ان تمام لوازمات کا خیال رکھا تھا جو باپا صاحب کو پسند تھے گردن تک بن بند نہیں جس میں سالس رکھنے لگتا تھا۔ کالوں سے اوپر تک تراشے ہوئے بال، ٹخنوں سے اونچی شلوار۔ پھول پھول والی ڈاڑھی، سر پر باریک جالی کی ٹوپی۔ سب اس کے دیہاتی رہن سہن کی غمازی کر رہے تھے۔ پھر باپا صاحب کو شہری بوہوشاں کی بوکھڑاہٹ سے آگے۔

”ہریات پر بلا سوچے مجھے جلدی سے وعدہ کر بیٹھنا، کمزور کردار کے لوگوں کا وتیہ ہوتا ہے اور میں نے تمہارا کردار اس قدر کمزور تو نہیں ڈھالا تھا کہ فوراً میرے کہنے پر وعدہ کر بیٹھے۔ حالانکہ اگر تم ایک لمحے کو سوچتے تو اس وعدے پر عمل کرنا خاصا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن کام ہے۔ تم اوہر بڑھ رہے ہو پچھ تو رہی اوہر کرو گے۔ کیونکہ گاؤں میں تو تمہاری ڈگریوں کے وزن کے مطابق کوئی نوکری نہیں ہوئی پھر ایک عرصہ شہری آزاد فضا میں رہنے کے بعد تمہارے لیے گاؤں اگر رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو گا۔ تم نے شاید سوچا نہیں۔“ وہ باریکی سے بول رہے تھے ٹوٹ ٹوٹ کر۔

”اور تمہارا یہ خلیہ۔“ ایک دم سے وہ جلال میں آگئے شہادت کی انگلی سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے وہ گھبرا کر اپنے لباس کو دیکھتے لگا۔

”تھک گیا ہوا یا یا صاحب! میرا لباس ٹھیک نہیں۔“ وہ اس پر ہاتھ پھیر کر ان دیکھی شہنیں صاف کرنے لگا۔ ”لباس میں تو تم نے کوئی کمی نہیں چھوڑی۔“ وہ طنز سے بولے ”مگر یہ یہ وہیوں جیسی ڈاڑھی کیا صوفی عبد الرحمن کے صاحبزادے کو زیبائے۔“ وہ اس کی فریج کٹ کو بغیر بھری نگاہ سے دیکھتے ہوئے بولے۔ حالانکہ یہ بھی اس نے گاؤں آنے کی وجہ سے محض ڈیڑھ ہفتے میں رکھی تھی وہ تو شہر میں رہتا تھا۔ صوفی صاحب کو اس کی یہ محنت بھی پسند نہیں آئی۔

”یا صاحب اصل میں گاؤں آنے سے پہلے مجھے وہ ہو گیا تھا چکن پلاس۔ وہ کیا کہتے ہیں اس کو گاؤں میں آکر آکا کڑا۔ سرخ رنگ کے تکلیف دہ آنے۔ سب سے زیادہ ڈاڑھی میں تھے اس وجہ سے مجھے شیو کرنا پڑی ورنہ آپ کو تو معلوم ہے کہ۔“ اسے جلدی میں اور کوئی ہمان نہ سوچا۔

”جھوٹ مت بولو مجھے خود سلیمان نے بتایا تھا ایوب کے بیٹے نے کہ تم کلین شیو رہتے ہو اوہر۔ آج کل کے رہتوان کے مطابق۔ ڈاڑھی رکھنے والوں کو اوہر بنیاد پرست سمجھا جاتا ہے، وہشت کر دی کی عظمت سب سے تا۔“ صوفی صاحب اس کے بارے میں کس قدر باخبر ہیں اسے آج علم ہوا تھا۔ اس کا دل دھڑ دھڑوڑھنے لگا تھا۔

”اسلام کی بنیادی شق ہے یہ مومن کا زیور اس کی شان ہے۔ نف ہے تم جو اپنے زیور کو ٹالیوں میں بہاتے ہو کیونکہ تمہیں شرم آتی ہے اب بنیاد پرست کہلاتے ہوئے۔ مومن اور مسلمان کہلاتے ہوئے۔ عبد المتین! مجھے تم سے یہ امید نہ تھی اور مجھے معلوم ہے تم اب بھی اوہر کیوں آئے ہو ورنہ اوہر کے دقیا نوسی گئے ہونے ماحول میں تم بھی قدم نہ رکھتے۔“ وہ کسی میزائل کی طرح اس پر برسے تھے اور اب جلال میں کھڑے ہو گئے تھے عبد المتین بھی اپنے کامیے وجود پر قابو پا کر فی الفور کھڑا ہو گیا۔

”کیونکہ پچھلے دو ماہ سے میں نے تمہیں پیسے نہیں بھیجے۔ تم صرف بیسوں کی خاطر اوہر آئے ہو ورنہ ڈیڑھ سال میں تمہیں ایک بار بھی توفیق نہ ہوتی میرے ہزار کہنے پر بھی۔ تمہارا اب اوہر گزارا مشکل سے اور سنو۔“ وہ جاتے جاتے مڑ کر وارننگ کے سے انداز میں بولے۔ ”اگر تم اوہر رہنا چاہو تو شوق سے رہو مگر تمہیں دینے کے لیے میرے پاس ابھی کوئی پیسے نہیں ہیں۔ بیچنے ہوئے تو اگلے ماہ کچھ رقم بچھو اداں گا جتنا مجھ سے ہو سکا اور اب اس طرح اوہر رہنے سے تمہارا قیمتی وقت ضائع ہو گا۔ پڑھائی کا حرج ہو گا مجھے یقین ہے تم مزید وقت ضائع نہیں کرو گے۔“ وہ بھنکارتے ہوئے مڑے۔

”اور عبد المتین مجھ سے اب زیادہ توقع مت رکھنا تم نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔“ وہ کہہ کر غصے میں بھرے ہوئے اپنے حجرے کی طرف بڑھ گئے۔ عبد المتین پیشانی سے پیسے خشک کرنے لگا۔

”تو یہ ہے کیا بچوں کے پیچھے ڈنڈا لے کر پڑے رہتے ہیں۔ مجھے چوڑے سمجھ رکھا ہے انہیں۔ خدا نے باب بنایا ہے مگر باپ والی شفقت سینے میں نہیں رکھی۔ بچے نہ ہونے مشینیں ہو گئیں۔ ان کے سانچے میں ڈھل کر نکلیں ان کے اپنے کوئی ارمان نہیں۔ بچہ اتنے دنوں بعد گھر آیا ہے میں تو اس کی شکل کو ترس گئی تھی اور انہوں نے تو اس طرح باتیں کرنے کی قسم اٹھا رکھی ہے کہ یہ دوبارہ اوہر کا رخ نہ کریں۔ ایک کو ویسے ہی نیل میں ڈال رکھا ہے دو مہینے ہو گئے اسے گھر آئے، کیسا ہنس مکھ شرارتی بچہ تھا میرا۔“ ماں بٹی دوپٹے سے آنکھیں صاف کرنے لگیں۔

”مار مار کر اسے شیطان بنا کر چھوڑیں گے۔ پھر کہتے ہیں اولاد بے اوب اور گستاخ ہو جاتی ہے۔ ارے مار سے تو جانور بھی بدک جاتا ہے۔ انسان کو تو پیار سے سدھارو مگر ان کو تو۔“

انکے باپ نے زبان پر فطرت ڈال دیا۔ وہ سوں سوں کر کے ہلکی ہلکی سسکیاں لینے لگیں۔ عبد المتین چپ چاپ انہیں روکے کھتا رہا۔

کل جب سے عبد المتین آیا تھا ماں جی کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اس کی پسند پر انہوں نے آج دوپہر کے کھانے میں پسندے اور انہیں بنایا تھا۔ کتنے شوق سے کھا تا ہے وہ دونوں چیزیں اور صوفی صاحب سارا مزہ خراب کر گئے۔ سوچ سوچ کر انہیں رونا لگتا تھا۔

”اب جتنا سخت بول گئے ہیں اسے یہ اوہر کئے گا اب۔“ وہ روتے روتے اسے گم صم بیٹھا دیکھنے لگیں جو سر جھکانے اپنے پاؤں کو کھور رہا تھا۔

یا صاحب اسے ٹکا سا جواب دے گئے تھے۔ اس کی ساری فنکاری دھری کی دھری رہ گئی تھی اب وہ واقعی واہسی کا سوچ رہا تھا۔

”چلے گئے شاہ جی۔“ زیور گل نے سوالیہ نظروں سے سستے ہوئے چہرے کے ساتھ اندر آتی عین تارا سے پوچھا۔ سلطان بخت کے ساتھ وہ پورے تین دن گزار کر آئی تھی نئی کو بھی میں۔ جو انہوں نے اس کے نام کی تھی۔ اگرچہ ابھی کنسرکشن کا کچھ کام باقی تھا مگر شاہ جی اس کے اصرار پر کام بند کر دیا اسے کہ اس میں لے گئے تھے۔

رات کا کھانا دونوں نے پی سی میں کھایا تھا اور ابھی کچھ دیر پہلے وہ اسے ڈراپ کرنے ”گل کدو“ آئے تھے زیور گل سے کچھ کھڑے دو چار باتیں کیں اور پھر عین تارا کے ساتھ واپسی کے لیے باہر نکلے۔ پندرہ منٹ بعد میں تارا انہیں گیٹ تک چھوڑ کر واپس آئی تھی۔ سائل گرین فیسٹی سوٹ میں اس کا گورا رنگ چمک رہا تھا مگر اب اسے حسین چہرے کا سب سے خوبصورت زیور اس کی مسکراہٹ عتاب تھی۔ تو چہرے کا، جگہ کاہٹ تھی جیسے ماند پڑی تھی۔

وہ مٹھے مٹھے سے انداز میں صوفی پر گر گئی۔ زیور گل کے سوال کا بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ زیور گل نے گردن موڑ کر اسے تنقیدی نگاہوں سے دیکھا جو اب ست ہاتھوں سے کالوں کے ٹاپس اتار رہی تھی۔

”ہائمنڈ کے ہیں انہیں بیڈروم میں جا کر اتار دو۔ اوہر نوکر چاکر پھرتے رہتے ہیں۔ کب کون ہاتھ دکھا جائے“ خیال رکھا کرو۔“ وہ کڑے کچھ میں بولی تارا کی فرخ پیشانی پر تل بڑ گئے۔

”معلوم ہے مجھے۔“ وہ ہونٹ سکڑ کر لا پرواہی سے بولی زیور گل نے کچھ غصے بھری نظر اس کے گستاخ انداز پر ڈالی۔

”بیٹیاں جیانی جائیں تو ایسے ہی گستاخ ہو جاتی ہیں سر۔“

کس۔ کوئی مدتوں پہلے اس کے کان میں بولا تھا جب اس نے بھی اپنی ماں کی رضا کے بغیر خفیہ نکاح کر لیا تھا۔ زندگی مکافات عمل کا نام ہے۔ اس نے فیڈ کا ٹھونٹ بھر کے گہرا سانس لیا۔

”ہنسی مومن کا کیا پروگرام ہے نیو؟“ زیور گل کا لہجہ خود بخود نرم ہو گیا تھا۔ کماؤ بیٹی اور وہ بھی سونے کی چیزیا جیسی۔ زیور گل کی نگاہ بے ساختہ وال بیننگ میں لگے مر میں نظر آتے اپنے ہنسیوں بھرے عکس پر پڑی تو اس کا لہجہ نرم ہونا ہی تھا۔

”جب وہ جرمنی کے ٹرپ سے واپس آجائیں گے تب۔“ وہ بڑے پیار سے سلطان بخت کا ذکر کر کے بولی۔

”کہاں کا پروگرام ہے؟“ زیور گل محبت سے بولی۔

”سوشل ریلینڈ۔“ اس نے جھک کر اپنے نازک پاؤں سینڈل کی قید سے آزاد کیے اور پاؤں کی انگلیاں ہاتھوں میں لے کر بولے ہوئے دبانے لگی۔

”تھک گئیں کیا؟“ زیور گل کا لہجہ ہنوز شدید میں لہجہ ہوا تھا۔

”ہوں۔“ پتا نہیں جواب لگی میں تھا کہ ہاں میں۔

”ہنسی مومن پر بھی جاؤ تو میری ہدایات کا خیال رکھنا۔“ زیور گل اس کے سامنے میں کہان جیسے جھکے سر لے کر نظروں میں توڑتے ہوئے بولی۔

”ہوں۔“ وہی مہم سنا ہوں۔“ زیور گل کو پھر بال اٹھنے لگا۔

”جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں کبھی بھی یہ بادشاہ لوگ ہوتے ہیں۔ بادشاہوں کے موڈ کا موسم کب بدل جائے کچھ پتا نہیں چلتا اور یہ نہ ہو کہ تم کوئی زنجیریں میں ڈال کر کھٹکنا ہی رہ جاؤ اور ان کا موڈ بدل جائے ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔“ نکاح والی رات سے زیور گل اسے یہ ہدایت نامہ اذیر کر رہی تھی۔

”نہیں تارا اجلا اٹھی اور ایک جھٹکے سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”ہام! کیا شاہ جی اسحق ہیں جو ایسا کریں گے؟ آپ کو کیا معلوم وہ اس معاملے میں خود کس قدر محتاط ہیں آپ کو اس فکر میں تھکنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہو گا۔“ کسی ہوشیار کے ہاں وہ یہ کہہ کر بھاگا۔

”نہیں تارا اجلا اٹھی اور ایک جھٹکے سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

شاہ جی کی اتنی اعتدال پسند طبیعت نے ویسے بھی ان تین دنوں میں اس پر خاصا تکلیف کا اثر ڈالا تھا۔ اسے یہ سب سب تو چین آئیز لگا تھا اور اب زیور گل کی پھر وہی تکرار۔ اسے جسے اتنا لازمی تھا۔

”یہ تو اچھی بات ہے۔“ زیور گل نے اطمینان بھر اس اس لیا۔

”ویسے بھی سچے ایہ شرفائیس کے بڑے بے قابو ہوتے ہیں۔“ بیچ میں کھلے کنول پر بھی پھسل پھسل جاتے ہیں مگر اپنی نسل کے معاملے میں بڑے وضع دار بڑے با غیرت ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے کہ اسی کچھڑ میں سے انہیں کوئی نہ کوئی اپنے کیے کا پھل لے جائے وہ بڑا درست ہوتا ہے ساری عمر اس آئینے میں اپنا من و دل دیکھ کر ذات سے نگاہیں چراتے رہتے ہیں۔“

زیور گل تعارت سے بول رہی تھی نہیں تارا چپ رہی۔

”تمہیں فی الحال ایسی کوئی غلطی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ تنبیہ کر کے بولی۔

”ناہیلہ! شاہ پاشا۔“ وہ بیزار کن لہجے میں بات تھا اٹھا کر بولی پہلے ہی دل اتنا داس ہو رہا تھا۔

”یہ سوٹ شاہ جی نے لے کر دیا ہے۔“ زیور گل کو اپنی تکرار کا احساس ہوا تو فوراً ”موضوع بدل کر بولی۔

”ظاہر ہے۔“ نہیں تارا کے انداز میں لاپرواہ سا بھرا تھا۔

”بندہ دل والا ہے۔“ زیور گل تحسین آمیز لہجے میں بولی اور سائیڈ پر پڑی چیک بک اٹھا کر مین تارا کے آگے کرنی۔

”یہ کس لیے؟“ انداز تیکھا سا تھا زیور گل کو ذرا نہ بھایا۔

”گاڑی بہت تھک کر رہی ہے بیچنیج کرنی ہے معلوم تو ہے تمہیں۔“ وہ بڑے ضابط سے بولی۔

”تجربہ رقم نکلاؤ اس کی۔“ وہ چیک بک ہاتھ میں لے کر بولی۔

”ابھی فی الحال پانچ لاکھ۔ کل جانا ہے جسے شوروم۔ تم چلو گی۔“

”نہیں میں کل ریسٹ کروں گی۔“ وہ تھکن کے اظہار کے لیے انگڑائی لے کر کچھ آگے ہونے لہجے میں بولی۔

کچھ بھی تو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”بیٹا تو ویس۔“

زیور گل نے فوراً ”سائیڈ ٹیبل کی دو راز میں سے پین نکال کر اسے تھمایا اس نے چیک پر سائن کر دیے۔

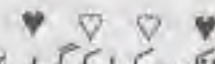
”اب تم آرام کرو کافی رات ہو گئی ہے ویسے بھی پچھلے پورے ہفتے سے تم بے آرام رہی ہو۔ دیکھو نا آنکھوں کے گرد حلقے سے پرگئے ہیں۔“ زیور گل چیک بک لیتے ہوئے بولی۔

”ہوں۔“ وہ سونے کی بیگ سے سر نکا کر کچھ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔

شاہ جی کے جاتے ہی سب کچھ خالی خالی سا لگنے لگا تھا۔ ان تین دنوں کے ساتھ سے اسے لگ رہا تھا اسے زندگی ملی ہی ان تین دنوں میں ہے پہلے تو شاید وہ زندہ ہی نہیں تھی۔ ان تین دن اور تین راتوں میں جس قدر محبت توجہ شاہ جی نے اسے دی تھی اس کا تو رواں رواں شاہ جی شاہ جی جب رہا تھا۔ جی کر رہا تھا کسی سے کوئی بات نہ کرے۔

اس ان کے خیالوں میں ان کی یادوں میں کھوئی رہے۔

یہ تین خوب صورت خواب آگئیں شب و روز۔ محبت کے خمار سے جیسے اس کے بدن کا بند بند ٹوٹ رہا تھا۔ وہ دور خیالوں کی دلدلی میں اتر گئی۔ جہاں شاہ جی نے محبت سے اس کا نازک بدن اپنی ہانہوں کے حصار میں لے لیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں ٹوٹ خوار خواہ مسکانے لگے۔



”کیا ہے کیا ہو گیا۔“ اس نے بمشکل تمام آنکھیں کھول کر گھبرائے ہوئے ظفر کی طرف دیکھا۔

اینٹیشن سے کمر جیسے تھکے ہو رہی تھی۔ سر اور آنکھوں میں ابھی بھی درد تھا اس کا بخار کم ہوا تھا مگر اترا نہیں تھا۔

”کیا ہے؟“ وہ اٹھ کر اٹھنے والی تھی اور بھائی و کا پیشیل لے کر ادھر آ رہا ہے بلکہ لوسنو۔“ اس نے کان پاہر ٹین کے حرکت سے دروازے کی طرف لگا کر کہا۔ ”لو آگے ہیں دروازہ بج رہا ہے۔ میرے بھائی امیرے دوست! تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔“

معاذ! تمہارا مستقبل۔ یہ یہ بد بھاش تھا نے وار بغیر کسی گواہی ثبوت کے تمہیں اندر کر دے گا۔ تمہارا کردار مشکوک ہو گیا تو پھر تمہیں کس داخلہ نہیں ملے گا۔ تم بھاگ جاؤ یہاں سے ابھی اسی وقت۔ کھڑکی سے کود کر پھیلے دیوار میں جو چھوٹا دروازہ ہے وہاں سے۔“

اس نے مڑ کر دوسری چار دیواری کے نیچے پر اس کے کپڑوں کا شاہراہ اٹھا کر ہاتھ میں لے لیا۔

”ہماری گلی سے نکلو تو درمیں طرف چلتے جانا۔“ وہ گلپاں گزر کر کماؤ کا کھیت ہے۔ اس کے کنارے کنارے سیدھے چلے جانا۔ کھیت ختم ہو گا تو درمیں طرف مڑ کر پلڈ ٹڈی پر ہو لینا۔ پلڈ ٹڈی کی سڑک پر ہی ختم ہوگی وہاں سے تمہیں کوئی نہ کوئی بس مل جائے گی۔ اٹھو اب شاہ پاشا! بہت گرو۔ یہ تمہاری ساری زندگی کا معاملہ ہے۔“

دروازہ اب بھی زور شور سے بج رہا تھا۔ ظفر نے اس کے سونے جاگے وجود کو بستر سے کھینچ کر نکالا اسے اب ظفر کی بات سمجھ میں آئی تھی۔ اپنے استقبال کو تو وہ کسی بھی صورت داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔ ظفر سے شاہ پاشا لے کر سینے سے لگایا اندھیرے میں ٹٹول کر جوتی پہنی اور کھڑکی کی طرف بڑھا۔

”ٹھہرو ذرا ایک منٹ۔“ ظفر نے اسے دھیرے سے پکارا۔ کمرے میں بس کھلی کھڑکی سے آسمان کی روشنی آرہی تھی جو اب بھی بادلوں کے گھیرے میں تھا اس نے مڑ کر دیکھا۔

”یہ لو۔“ اس نے اپنی پھیلی معاذ کے آگے کھولی۔ کوئی چیز اندھیرے میں اس کے ہاتھ پر چمک رہی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ وہ کوشش کے باوجود نہ جان سکا۔

”تمہارا گولڈ میڈل۔“

”یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟“ معاذ حیرت سے بولا۔ اس کا ذہن جیسے پوری طرح سے جاگ اٹھا تھا۔ ”یہ تو میں نے۔“ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا گلے میں شدید درد تھا۔ ذہن بیدار ہوتے ہی درد کا احساس

جاگ اٹھا تھا۔ اس نے بے اختیار گلے پر ہاتھ رکھا۔

”یہ تم نائب ناظم کو دے کر آئے تھے کہ ناظم صاحب کو کہیں اسے امانت اپنے پاس رکھ لیں۔ میں جب واپس آؤں گا تو ان سے لے لوں گا اور نائب ناظم پر لے کرے گا بے ایمان اور فراڈ شخص ہے۔ ہم نے اس روز چندے کا صرف ایک بکس خالی کیا تھا باقی کے سب پیسے اس نے اڑائے تھے۔ میں نے ہمیں اسے میڈل دیتے دکھا تو میرا ہاتھ ٹھنڈا۔ میں پچھلی کھڑکی میں کھڑا تھا تمہارے کمرے سے نکلنے ہی میں نے اسے قبضہ لگاتے سنا تھا۔ اس کا ارادہ یقیناً ناظم صاحب تک امانت پہنچانے کا نہیں تھا اور وہ جب گیٹ پر ہمیں ابوداع کہنے آیا تو آخری بار مصافحہ کرتے ہوئے میں اس کے گلے لگ گیا اور اس کی سائیکل کی جیب سے میڈل اڑا لیا۔ اب چلو تم وہ لوگ اندر آچکے ہیں شاید ایسا نہیں کچھ ویر روک سکتا ہے تم کھڑکی پھلانگو میں تمہیں راستہ سمجھانا ہوں۔“

اس نے جلدی سے ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑکی کی طرف کیا۔ معاذ نے دونوں ہاتھوں کا زور جو کھٹ پر ڈالا اور اچھل کر دوسری طرف پھلانگ لگا دی۔ دوسری طرف سے چھپاک کی آواز آئی۔ وہاں پانی اور پیڑ کا چھوٹا سا تالاب تھا جس کی سطح تختوں سے اوپر تک تھی۔

”ادھر سے نکلو۔“ ظفر جھانگ مار کر اس کے پیچھے کودا اور آگے بڑھ کر پھلانگ اور اڑا کھول دیا۔ دونوں تیزی سے باہر نکل گئے۔ بارش رک چکی تھی مگر آسمان اب بھی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہوا بالکل بند تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ بارش ابھی مزید ہوگی۔ تیز تیز چلتے ہوئے ظفر اسے راستہ سمجھانے لگا۔ وہ کچھ کچھ رہا تھا اور جو نہیں سمجھ رہا تھا اس پر بھی سر ہار رہا تھا۔ اب اس کے سوا چارہ بھی تو کوئی نہیں تھا۔

رستہ یاد دہرایا وہ بھول کر راستہ بھٹک گیا۔ ”کیس نہ کیس تو پہنچ ہی جاؤں گا۔“ اس نے سوچا۔ ”چھا نظروں سے تمہارا شکر یہ اب تم جاؤ ایمان نہ ہو کہ وہ لوگ تمہیں بھی غیر حاضر بنا کر کوئی گزیرا کریں۔ میں تمہارا احسان کبھی نہ بھولوں گا اگر کبھی زندگی میں دوبارہ ملاقات ہوئی یا میں اس قابل ہوا کہ تمہارے لیے کچھ کر سکوں تو تمہاری دوستی اور اس احسان کا حق ادا کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔ اس نے پلٹے پلٹے ایک دم سے رگڑ کر ظفر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر شکر بھرے انداز میں کہا۔

”یار اکیس شرمندہ کرتے ہو ایسی ہوتی ہے دوستی۔ تمہیں اس طرح اتنے خراب موسم میں جبکہ تم بیمار بھی ہو گھر سے نکلنے پر مجبور ہوں۔“ ظفر شرمندگی سے بھیکے ہوئے لہجے میں بولا۔

”تم نے اپنا حق ادا کیا پتی جو کچھ ہوا وہ میری تقدیر کا حصہ ہے۔ تمہیں اس پر شکر ملے ہوئے کی ضرورت نہیں۔ ہر کوئی اپنی تقدیر کا لکھا خود جھیلتا ہے۔ بس آگے اللہ میرے لیے آسمانیاں پیدا کرے۔ تم میرے لیے دعا کرنا۔ اللہ مجھے میرے مقصد میں کامیاب کرے۔“

”آمین۔ میری تو دل سے یہی دعا ہوگی۔ اچھا دوست انا تم کم ہے۔ کبھی زندگی میں دوبارہ ملاقات ہوگی تو پھر پھر کرو یا تمیں کریں گے۔ تمہارا یہاں سے جلد از جلد نکلنا ضروری ہے۔ یہاں سے سیدھے جا کر واپس ہاتھ مڑنا ہے کچھ گئے نا۔“ اس نے پھر سے راستہ دہرانے کی کوشش کی معاذ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”جیسے پتا ہے اب تم جاؤ۔ اللہ حافظ۔“ وہ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

”اللہ حافظ۔“ ظفر نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ ”بس اب مزید ویر نہ کرو۔“ وہ فوراً ہی اس سے الگ ہوتے ہوئے بولا۔

معاذ نے ہاتھ ہلایا اور تیز رفتاری سے اندھیرے اور کچے رستے پر مضبوطی سے پاؤں رکھ کر چلنے لگا۔ ظفر اسے موڑ مڑتے تک دیکھتا رہا جیسے ہی معاذ واپس طرف مڑا وہ گرا سانس لے کر واپس پلٹ گیا۔

کچھ دیر تک وہ صحیح راستے پر چلتا رہا مگر اندھیرا اور کچھ زیادہ ہونے کی وجہ سے اسے بار بار رستے سے ہٹنا پڑا تھا۔ کئی جگہوں پر ٹوکے لڑے تھے جن سے بچنے کے لیے وہ یقیناً رستہ بدل بیٹھا تھا کیونکہ اسے چلتے چلتے کافی دیر ہو گئی تھی مگر نہ تو کوئی پکڑ بندی ہی آئی اور نہ ہی سڑک آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چاند نہ ہونے کی وجہ سے

اندھیرا بھی زیادہ تھا۔ اسے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔

”وہ راستہ بھول گیا ہے۔“ اس کا جسم پہلے ہی سخت کن سے چور ہو چکا تھا اوپر سے رستہ بھولنے کا خوفناک خیال اسے تڑھال کر گیا۔ فل جاہر ہاتھ اسی کچھ میں گر کر سوچا۔

زور سے بادل گرتے تڑ تڑ موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ اس کے فوراً بعد بجلی کا جھماکا ہوا اور بارش تیزی سے برسنے لگی۔ دو روز بیک اسے کوئی سایہ وار درخت نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچی پکڑ بندی کے دونوں طرف چھوٹے قد کے پودوں والے کھیت تھے۔ جن کے کنارے بھی کوئی بڑا درخت نہیں تھا اس نے قدموں کی رفتار بڑھا دی۔

وہ چند ہی منٹوں میں مکمل طور پر بھٹک گیا تھا۔ بارش اس قدر تیز تھی اس نے ہاتھ اٹھا شروع کر دیا۔ اس کے منہ اور ناک سے دھواں نکل رہا تھا۔ بخار بھی جیسے تیز ہو رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اسے زور وار ٹھوکر لگی وہ کسی چیز پر گرتے گرتے بچا۔ زمین میں دھنسا ہوا کوئی بورڈ تھا بجلی زور سے چمکی۔

”آج رات شکر۔“ گارے سے اسے اٹھ بوریوں پر ہتھ پڑھ سکا۔

”کچھ سڑک پر چلتا رہا تو شاید کہیں نہ پہنچ سکوں۔“ اسی گاؤں کے اندر چلنا چاہیے شاید کہیں پناہ مل جائے۔“ اس نے سنبھل کر اگتے ہوئے سوچا۔

اس کے کپڑے اور جھان کا شمار کچھ سے بھر گئے تھے۔ وہ کچی سڑک سے اتر کر زمینی پکڑ بندی پر ہو گیا جو شاید گاؤں کے اندر جاتی تھی۔ سڑک سے اس کے دانت بچنے لگے تھے۔

”یتا نہیں ابھی اور کتنا چلنا پڑے گا۔“ اس نے کپکپاتے ہوئے اوپر برستے آسمان کو دیکھا بارش ابھی بھی ہو رہی تھی مگر اب اس کی شدت میں کمی تھی۔ پکڑ بندی پر بہت پھسلنے لگی وہ سنبھل کر چل رہا تھا۔ پہلے ہی دو قدم گزر چکا تھا۔ کپڑے ہاتھ پاؤں سب کچھ سے لٹ پٹ تھے۔

”شاید رات کی انتہا ہے۔“ اس نے سوچا۔

”یہاں آس سے بڑی اور آسمان مشکل بھی کوئی رستے میں کھڑی میرا انتظار کر رہی ہو۔“ کوئی اس کے اندر سے بھنسا۔ اس نے سوچوں سے سر ہٹا کر اپنی پوری توجہ سنبھل کر چلنے کی طرف مبذول کر دی۔ چلتے چلتے دور سے اسے مسجد کے مینار نظر آئے تو اس کا دل جیسے اٹو کھی خوشی سے بھر گیا۔

”اللہ تبارک ہے کچھ نظر آیا۔ تمہارے بڑے بڑے کپڑے اور کون دے سکتا ہے۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا اور ذرا تیزی سے اپنے ہاتھ اور سر کے کچھ حائل رستہ عبور کرنے لگا۔

آٹھ دس منٹ کی مسافت تھی وہ ہاتھ تھکے پلٹے پہنچ ہی گیا۔

مسجد کا دروازہ بند تھا اس نے لکڑی کے اونچے بڑے دروازے پر دستک دی۔ ایک دم سے بادل گرتے بارش اندھیرا بھی سے ہونے لگی۔

”پتا نہیں ان بادلوں کو کج کتنا برساتا ہے۔“ اس نے جھٹلا کر سوچا۔

وہ دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ دستک کی آواز قضا میں گونج کر رہ گئی تھی کافی دیر گزر گئی کوئی نہیں آیا۔ اس نے ایک بار پھر زور سے دروازہ بجایا بلکہ دھڑو دھڑایا۔ چند لمحوں بعد پھر وہی خاموشی۔ تیسری بار اس نے پوری قوت سے دونوں ہاتھوں سے دروازہ پیٹ ڈالا۔

”کون ہے کون ہے؟“ اندر سے کوئی رعب وار آواز میں زور سے چلاتے ہوئے دروازے کی طرف آیا۔

”اللہ کا بندہ ہوں اللہ کے گھر کی پناہ چاہیے۔ بارش میں بری طرح سے بھٹک چکا ہوں۔“ اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ اب تو بارش کی بوندیں تلوار کی طرح گات کر اسے گزر رہی تھیں۔ وہ جیسے گرجانے کو تھا۔ وہ سارا وزن دروازے پر ڈال کر کھڑا تھا کہ ایک دم دروازہ کھل گیا وہ دروازے سے چپکا کھڑا تھا دھاڑے اندر جا کر۔

”لوہو بھئی کیا مصیبت ہے۔ کون ہو؟“ جلیل نے جو اسے زمین پر سر کے تل چٹ لیٹے دیکھا تو جھنجھلا کر کہا۔ معاذ بے حس ہو چکا تھا۔



”اماں جی! مجھے کرتے کی پہ سلائی استانی جی سے سمجھنی ہے۔ جویریہ کو لے جاتی ہوں۔ بس تھوڑی ہی دیر میں آجاؤں گی! بابا صاحب کے اٹھنے سے پہلے۔“ کھانے کے بعد صوفی صاحب جیسے ہی اپنے حجرے میں گئے نہ سب نے اماں جی کی منت سماجت شروع کر دی۔

”زینب! تمہارا دل غور مت ہے۔ تمہارے بابا صاحب کو بتا چل گیا تو تمہیں ان کے غصے کی خبر ہے۔ تم رہنے دو کرتے کو پھر کبھی سیکھ آنا جا کر۔ آج کل ویسے بھی وہ بہت غصے میں ہیں۔ عبدالمعین کو ڈانٹ ڈیٹ کر شہر گھما دیا۔ اسے کچھ دیا نکالی ہاتھ نکال دیا۔ میرے بچے کا اتنا ساتھ نکل آیا تھا۔ بھلا بتاؤ لیکن ان کے آگے کچھ بول سکتی ہوں یا میرے بولے کی کچھ قدر ہے۔ اب تم منہ اٹھا کر چل رہو۔ وہ آجائیں تو میرے سفید چونڈے کا لحاظ کیے بغیر مجھے چوٹی پکڑ کر ہار کر دیں گے۔ تم رہنے دو ایسی سلائی جس میں ایسی ڈلت ہو۔“

اماں جی استین کے جانے سے پہلے ہی بہت ناخوش تھیں۔ دو دن تو چپکے چپکے روٹی رہی تھیں۔ صوفی صاحب نے ان کی منت سماجت کی کبھی پروا نہیں کی تھی جو شخص ایک بار ان کی نظر سے گر جاتا تھا پھر اس کا دوبارہ ان کی نظر میں سامانا ممکن تھا۔ عبدالمعین کو وہ نظر سے گرا چکے تھے پھر اب زینب کی کون سا منتا۔

زینب نے بارش مالی آمد تو باہر ترن دھور ہی تھی اس نے پہلے ہی ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔

”اماں جی! بس بند رہیں منتوں سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ باہر سے جب کو تو تیار بھی نہیں ملے گا ان کے اٹھنے سے پہلے ہی آجاؤں گی۔ ویسے بھی انہیں تو معلوم ہی ہے کہ اس وقت میں آمد کے ساتھ اندر کمرے میں ہوتی ہوں۔ وہ کون سا اندر آئیں گے ہمیں دیکھنے۔ اماں جی پلینز۔“ وہ اب رو دینے کو تھی۔

اماں جی کو اس پر ترس آنے لگا مگر صوفی صاحب کے جلال کی بھی خبر تھی۔

”زینب! یہ ٹھیک نہیں ہو گا۔ تمہیں پتا ہے نا انہیں سب خبر ہو چکی ہے کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ حجرے میں جا کر ضروری نہیں وہ سو ہی گئے ہوں۔“ وہ کچھ ڈھیلی بڑکٹی تھیں۔

”اماں جی میں دیکھ آئی ہوں وہ سو گئے ہیں۔ آج صبح سے تو وہ درختے میں تھے پوسا پوسا کر تھک گئے ہیں اس لیے مجھے پتا ہے وہ ضرور تھوڑی دیر آرام کریں گے اماں جی بس تھوڑی دیر کی تو بات ہے۔“ وہ ان کے گھنٹوں سے لپٹ کر منت بھرے لہجے میں بولی۔

”دیکھ لو زینب! وہ تذبذب میں تھیں۔“

”کہہ دیا نا بس تھوڑی ہی دیر لے گی چلو جویریہ! بس چادر لے آؤں اور کرتا تھی۔“ وہ ان کو نیم رضامند دیکھ کر فوراً سے پیشتر اٹھ کھڑی ہوئی جویریہ نے اماں جی کی طرف دیکھا وہ چپ تھیں وہ اٹھ کر زینب کے پیچھے باہر نکل گئی۔

زینب جاتے جاتے باہر رحمن میں برتن دھوتی آمد کو ٹھیک لگا دکھا کر گئی تو وہ مسکرائے لگی۔

”دیکھ لو نہیں واپسی پر یہی ٹھیک لگا نہیں نہ دیکھنا رہا ہے۔“ آمد نے اس کے پیچھے سے آواز لگائی۔

”برتنوں کے ساتھ منہ بھی دھو لو اپنا۔“ وہ ڈیوڑھی میں پہنچ کر بولی اور پھر آمد کا جواب سے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

چادریں اچھی طرح سے منہ سر لپیٹ کر وہ جویریہ کا ہاتھ تھامے تیز قدموں سے ماسٹر صاحب کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔

”اللہ کرے جو مری ملے جاتے ہی۔ اگر استانی جی نکر گئیں تو وہ جو مری ملے بھی نہیں دیں گی یا جو مری کا لڑا کا پاپ جس کی چادر دنوں میں ہی سارے گاؤں میں شہرت ہو گئی ہے اس لیے تو اماں جی نے ہمیں ادھر آنے سے روک دیا ہے اللہ میاں! بابا صاحب کو پتا نہ چلے۔“ اوپر اوپر سے تو وہ بہت بہادر بن کر چلی آئی تھی اندر سے دل پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

”جوئی! جلدی چلو نا۔ یہ جلیل کے بچے نے دیکھ لیا تو جھٹ بابا صاحب سے شکایت جڑوے گا۔“ شکایتی ٹوہ ہے

پورا۔“ وہ جویریہ کو سستی سے جلتے دیکھ کر بولی۔

”مجھے کھینٹے جانا تھا نسیم کی طرف۔ چھوٹی آئی! آج اس کی گڑیا کی مہندی ہے۔ بابا صاحب نہیں جانے دیتے اس نے اتنا مجھے بلایا ہے اور آپ مجھے ادھر لے آئی ہیں جا میں گے تو بابا صاحب اٹھ جائیں گے۔“ وہ منہ بسور کر بولی اس کے قدموں کی سستی کا یہی راز تھا۔

”ہر وقت کھیل۔ بابا صاحب صبح ڈانٹتے ہیں تمہیں۔ کبھی پڑھ بھی لیا کرو۔“

”اچھا چلو اب تیز۔ بس فوراً“ چلیں گے گھر تو تم کھینٹے چلی جا نا۔“ وہ اسے راضی کرتے ہوئے بولی تو اس نے اسپینڈ بڑھادی۔ ابھی وہ ماسٹر صاحب کے گھر کے آگے راستے میں تھی کہ اس نے قدموں کی آواز پر مڑ کر دیکھا تو ہکا بکارہ تھی۔

جھومرا کی اس کے پیچھے ہی آ رہی تھی وہ حویلی والی سمت سے آ رہی تھی۔ زینب کو شگ گزرا۔ وہ ٹھنک کر رک تھی۔

”جو مری! تم ادھر کہاں۔ میں تم سے ہی ملنے آ رہی تھی۔“ وہ اس کے قریب آئے پر بولی۔

”وہ میں خالہ کے ساتھ حویلی گئی تھی نہیں۔ کبھی کہ تم لوگ بھی ادھر ہو گے۔ خالہ کو ادھر کچھ کام تھا انہوں نے ابھی بیٹھنا تھا اور ڈھولک بھی نہیں بچ رہی تھی میں بوری ہو کر واپس آئی۔“ اس نے سوائی شمال لاپرواہی سے کندھے پر انکار کھی تھی اس کے اشاروں جیسے اخروٹی بال کو لوہوں سے نیچے جا رہے تھے۔ وہ اپنے ننگے سر سے بے نیاز کھلے رستے میں محو گفتگو تھی زینب کو اس کی آزادی پر رشک آیا۔

”اس طرح اگر ہم باہر نکل آئیں تو شاید بابا صاحب ہماری کھالوں میں بھس بھرو لوں۔“ اس نے جھم جھمری لے کر سوچا۔

”تم کس جا رہی تھیں۔“

”تم سے ہی ملنے آ رہی تھی اتنے دن ہو گئے تھے میں نے کہا کہ تم سے مل آؤں۔“ زینب نے سوچا اب وہ کے کی چلو گھر چل کر بیٹھتے ہیں پھر باتیں کریں گے۔

”اچھا۔“ وہ خواجواہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ اتنے دن ہو گئے تھے مجھے تو پتا نہیں چلا۔“

زینب کو اس کی ہنسی پر ایک دم سے اپنے دل کا احساس ہوا۔ اس کا چہرہ یکدم سرخ ہو گیا اسے لگا جھومرا اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔ اس نے اپنے نقاب کا لونہ ہاتھ میں زور سے موڑا۔

”تمہارا ابا آیا۔ اسے ساجت سے۔“ مجھس دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھ بیٹھی۔

”ہاں آیا ہوا ہے۔“ اس نے لاپرواہی سے اپنے چہرے کو چھوٹی لٹ کو بھلا کر پیچھے کیا۔

”اوتھارے گھر آ جاؤ۔ بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“ زینب کو بیچ رستے کا خیال بار بار ستا رہا تھا یہ تو شکر تھا کہ وہ ہر کا نام تھا زیادہ تر لوگ اس وقت کھیتوں میں یا گھروں میں آرام کرتے تھے۔

”نہ بابا تمہارا وہ مولوی ابا بہت ظالم ہے ایک دم سنگدل۔ بندے کو اپنی لال آنکھوں سے ایسے گھورتا ہے جیسے اگلے کا خون ہی پی جائے گا یا کایا چیر چبا جائے گا کسی آدم خور کی طرح۔“ جھومری بات زینب کو آگ ہی تو لگائی۔ وہ خود دل میں تھی ہی بابا صاحب کے خلاف تھی مگر یوں کسی غیر کے منہ سے باپ کی برائی اس سے برداشت نہیں ہوئی جویریہ نے بھی مڑ کر جھومر کو گھورا۔

”جھومر! وہ میرے بابا صاحب ہیں تمہارے ابا کی طرح کوئی جاہل گنوار نہیں جو بونہی کسی کو کھانچا نہیں گے۔ بابا صاحب تو ایسے دیوں کو منہ نہیں لگاتے۔“ زینب نے اس کے باپ کو جاہل کہہ کر بابا صاحب کی توجہ کا بدلہ لے لیا۔

”تو جاؤ پھر مجھ سے کیوں ملنے آئی ہو ایک جاہل باپ کی جاہل بیٹی سے۔ میں نے نہیں خط نہیں لکھا تھا کہ مجھ سے ملو اگر۔ اپنے عالم باپ کی چھپر چھاؤں میں بیٹھو جا کر۔ یوں چھپ چھپا کر کیوں ملنے آئی۔ وہ ہونہ۔“ وہ نخرت و نخرت سے کہہ کر وہ قدم آگے بڑھ گئی تو زینب کو بھی غصہ آیا۔

”مجھے بتائیے کیا ہے خود کو جاہل پھمائی سب تیز جھپٹی۔“ وہ دل میں جھپٹی ہوئی مزی۔

بڑے شاہ جی کے مٹی کا بیٹا سلیم ان سے چند قدم دور کھڑا شاید کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ زینب اسے راستے میں کھڑے دیکھ کر کھڑتے ہوئے ذرا ہٹ کر گزرنے لگی وہ اس کے رستے میں ہی کھڑا تھا۔ لامحالہ اسے سلیم نے پاس ہی سے گزرا پڑا سلیم نے عجیب سی نظروں سے زینب کو دیکھا۔ زینب نے رفتار اور بڑھادی وہ دل میں پچھتا رہی تھی۔ کہیں آمنہ کی بات نہ مانی اور اس جاہل اور مغرور لڑکی سے ملنے پہلی آئی۔

چند قدم آگے چل کر اس نے یونہی مڑ کر دیکھا سلیم بھگتے پاس جا بٹھایا تھا اور اس کے انتہائی قریب کھڑا خدا جانے کیا بات کر رہا تھا۔ اسے دور سے جھومر کے تاثرات کا اندازہ تو نہ ہو سکا مگر وہ بڑی توجہ سے اس کی بات سن رہی تھی اور اس کا ہلکا سا زینب کو نظر آ رہا تھا۔

”بابا صاحب صحیح کہتے ہیں کہ یہ لڑکی اچھی نہیں ہے۔“ اس نے دونوں کو اتنے پاس کھڑے دیکھ کر سوچا۔
 ”چلو نا چھوٹی آئی مجھے دیر ہو رہی ہے مجھے کھیلنے جانا ہے پھر بابا صاحب اٹھ جائیں گے۔“ وہ لڑکی اس کی محویت سے اکتا کر بولی۔

”اچھا چلتے ہیں۔“ اس نے ہلکی سی چپت ہو کر یہ کہنے کے سر پر لگائی تو وہ پیر پیرتے ہوئے اس سے آگے چلنے لگی۔
 وہ دونوں ابھی بھی ٹوکھٹو تھے زینب عجیب سا احساس لیے جو یہ کہنے کے پیچھے چل رہی تھی۔

”مگر ہمیں آپ کے ساتھ جاپان جانا ہے میں نے بھائی جی سے کہہ دیا ہے کہ ہم جاپان جا رہے ہیں اب اگر ہم نہیں جاتے تو وہ نہیں گی میں نے ان سے غلط بیانی کی اب تو ہمیں ضرور ہی جانا پڑے گا۔“ آج خیر حیات کا موڈ خلاف معمول اچھا تھا۔ دونوں نے شام کی چائے آگے لیا تھی آج ان کی کیونٹی میں انگلش اسکول کی سالانہ تقریبات کا فنکشن تھا اور عمار اور ہر جیف کیسٹ کی حیثیت سے کئی کئی بچوں کے سوارت بچوں نے بڑے خوبصورت پروگرام پیش کیے تھے۔

دونوں کا پروگرام تھا اور اسے ایک لمحے کے لیے بھی بوریٹ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس کا دل دماغ جیسے بہت دنوں بعد بڑھ چکا ہوا تھا سارے بچے اسے اپنے بہت قریب محسوس ہو رہے تھے۔ جی چاہ رہا تھا بہت سارا وقت مزید ان کے ساتھ گزارے حالانکہ اتنے چھوٹے بچے اسے کبھی بھی اڑھکیٹ نہیں کرتے تھے۔ اگلے سیدھے سوال کر کے سر کھالیے ہیں جب سیٹی اس عمر میں تھا تو اس کی سوال کرنے کی عادت سے رعنا بہت کوفت کا شکار ہوئی تھی۔ ایک ایک۔ تو وہ سب بار بہت انا۔ پڑنا تھا یعنی ملل توجہ۔ جو وہ کبھی بھی نہ دے پاتی اس کے پاس ٹائم ہی نہیں ہوتا تھا مگر ان تو اس کے ذہن کی کیفیت ہی اور تھی۔ وہ ان بچوں کے درمیان جیسے انداز سے محل اچھی تھی اپنی کیفیت اسے خود حیران کر رہی تھی۔

ابھی اس نے فخر کے ساتھ اپنے سارے احساسات شہزادے کیے تھے بہت دنوں بعد وہ دونوں بول مل کر بیٹھے تھے فخر نے بڑے دھیان بڑی توجہ سے اس کی ساری تفصیلات سنی تھیں جو کہ رعنا کے لیے ایک حیران کن بات تھی۔
 ”اسی لیے تو کتنا ہوں کھر میں کھس کر خود کو Spoil (ضاح) نہ کرو پاہر نکلا کرو تمہاری این جی او کا دائرہ کار تو بہت وسیع ہے۔ سوشل کاموں میں حصہ لینے سے بھی ذہنی سکون ملتا ہے انسان اندر سے مطمئن و خوش ہوتا ہے سب اچھا لگتا ہے اور وہ خود بھی اچھا لگتا ہے جیسے اس وقت تم مجھے بہت اچھی لگ رہی ہو۔“ فخر نے ایک دم کما تو وہ پل بھر میں سر بڑھائی۔

”تو کیا پہلے اچھی نہیں لگتی تھی۔“ وہ غپٹی سے بولی۔
 ”پہلے بھی اچھی لگتی تھی مگر رعنا ڈیر فضول کی مینشن لے کر تم اپنے حسن کو اپنی خوبصورتی کو گمن لگا رہی ہو۔ بے خوابی تمہیں پتا ہے نا چہرے کی تازگی کی کتنی بڑی دشمن ہے بے خوابی کا علاج سلیڈنگ پلٹس میں نہیں ہے خود کو ایکٹو کرو جیسے پہلے تم بہت ایکٹو رہا کرتی تھیں۔ بار بار جانا ہم جانا این جی او کی کوئی میٹنگ مس نہ کرنا۔ اپنے

سرکل کی ہر ایک ٹوٹی میں حصہ لینا تمہیں کتنا فریض رکھتا تھا مگر اب کچھ عرصہ سے معلوم نہیں تمہیں کیا ہو گیا ہے تم ایک دم ڈیل سی ہو کر رہ گئی ہو۔ تمہیں یاد ہے ناشادی کی پہلی رات میں نے تم سے کیا کہا تھا۔“ وہ جو بڑے دھیان سے ان کی باتیں کر رہی تھی۔ سوچنے لگی کہ فخر نے پہلی رات اس سے کیا کہا تھا۔

”عنا! مجھے ہیٹ ٹریش نظر آتا مجھے ڈل ناست اور اپنے آپ سے بے خبر لوگ خصوصاً ”منور تھیں بالکل پسند نہیں۔ میں تمہیں Ever Fresh دیکھنا چاہتا ہوں۔“ رعنا کو سوچتے دیکھ کر آہوں نے خود ہی اپنی پہلی رات کی ڈیمانڈ سے یاد کرادی۔ رعنا کچھ شرمندہ سی ہو گئی یہ تو ایک شو ہر کا حق تھی ہے۔
 ”میں مجھے یاد ہے مگر مجھے ڈل بنانے میں بھی آپ کا ہاتھ ہے۔“ وہ آج دل کی ہر بات شہزادے کو لیتا چاہتی تھی۔
 ”کیسے؟“

”آپ مجھ سے لا پرواہ ہو گئے ہیں بالکل دھیان نہیں دیتے کہ میں نے کیا پرسنا ہے۔“ کتنے دن کا شکوہ اس کی زبان سے پھسل ہی رہا۔

”رعنا! فخر میں تم سے کبھی لا پرواہ نہیں ہوا اگر لا پرواہ ہوتا تو کیسے جان پاتا کہ آج کل تم خود سے کس مندر غافل ہوتی جا رہی ہو۔ کتنے بندوقوں سے تم پار کر نہیں گئیں۔ تم جانا تم چھوڑ چکی ہو اور اگر میں تم سے لا پرواہ ہوا بھی ہوں گا تو یہ بڑے اتار چڑھاؤں سے ہو گا ہو گا کہ میں تم پر توجہ نہ دے سکا اور نہ کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔“
 ”بہر تو تھا فخری! آپ نہ مجھ پر توجہ دیتے تھے نہ گھر پر نہ سیٹی پر۔“ وہ پچھلے دنوں ان کے رویے کی وجہ سے بڑی ڈس ہارٹ رہی تھی۔ دکھ سے بولی۔

”سیٹی پر تم جو حد سے زیادہ توجہ دے رہی تھیں شاید اس لیے۔“ فخر نے بھی دل کی بات کہہ ہی دی۔
 ”اسے سمجھو تو اس کی توجہ کی ضرورت ہے فخری۔“ وہ نرمی سے بولی۔
 ”تو کیا توجہ کی ضرورت نہیں۔“ وہ ذرا اس کی طرف جھک کر بولے۔

”مگر تمہیں۔“ رعنا غور سے دیکھ کر بولی۔ ”ایک دم بھائی یاد آئیں اس نے فوراً اپنا سکہ فخر کے آگے رکھ دیا۔“

”تو دیکھو میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ میں بھی جاپان جاؤں یا نہیں۔“ انہوں نے گہرا سانس لیا۔ ”شاید اس فرم کے ساتھ ہماری ڈیل طے ہی نہ ہو سکے گی۔ وہ لوگ انٹرنیٹ شو نہیں کر رہے۔ اصل میں یہ ڈیل ان کا سائیڈ بزنس تھا اور آج کل جس طرح سے پوری دنیا میں بزنس کا ڈاؤن فال آیا ہوا ہے ہر بزنس میں ایکسٹرا انویسٹمنٹ کرنے سے پہلے دس بار سوچنا ہے۔ شاید اسی لیے وہ ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ کوئی ریسپانس شو نہیں کر رہے۔ سہرا حال آکر جانا ہوا تو تمہیں ضرور لے کر جاؤں گا آئی پر اس۔“ وہ اسے یقین دلاتے ہوئے بولے۔

”مگر بھائی جان کو کیا کہوں گی جنہیں میں نکا سا جواب دے چکی ہوں کہ ہم جاپان جا رہے ہیں۔ میں بچپنوں کو نہیں رکھ سکتی۔“ وہ پر تشویش انداز میں بولی عفت آرا کے مزاج کا اسے علم تھا۔

”رعنا! یہ تمہاری زندگی ہے۔ اسے دو سروں کے اندیشوں میں کیوں برباد کر رہی ہو۔ کون کیا اور کیسے سوچتا ہے اس بات کو مدد کر دیکھو کہ تمہیں کیا پسند ہے۔ تم کیسے جینا چاہتی ہو مجھے کیا پسند ہے تم صرف یہ سوچو اور اگر تم اس طرح اپنے رشتہ داروں کے معاملے میں ہلکان ہوتی رہیں تو خدا نہ کرے بہت جلد ہماری ازواجی زندگی کسی نہ کسی بڑے مسئلے کا شکار ہو جائے گی۔ میں تمہیں پوری سنجیدگی سے سمجھا رہا ہوں تم اس بات پر سوچو۔“ وہ بہت سنجیدہ تھے بھائی جان کے گھرانے کی طرف اس کا واضح جھکاؤ تھا۔ ”انہیں پسند نہیں تھا مگر وہ کیا کرتی اس نے کچھ بے بسی سے فخر کی طرف دیکھا۔

”یوں مت دیکھو میری طرف۔ سب کچھ تمہارے بس میں ہے۔“ وہ اس کی نظروں کا مفہوم جان کر بولے۔
 ”پتا نہیں مجھے تو خود پتا نہیں چلتا کہ کیا میرے بس میں ہے اور کیا نہیں آج آپ اتنی توجہ دے رہے ہیں کل بالکل اچھی بن جائیں گے۔ فخری! یہ چیز مجھے اندر سے تو ذکر کر رکھ دیتی ہے۔“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

”رُخنا! خود کو مضبوط کرو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں زندگی کا حصہ ہیں ان پر یوں اپنی جان بٹکان کرو گی تو جلد کوئی روگ لگا بیٹھو گی۔ تم اس مسئلے پر سنجیدگی سے سوچو اور اس کا حل خود سے نکالو جاپان جانا کوئی حل نہیں بنتا فرار ہو گی اتنا مسئلہ تمہارے سر پر سوار ہوتا جائے گا۔“

”کیا حل ہے اس کا میں تو ابھی سے تھک گئی ہوں ابھی تو بہت لمبا سفر ہے۔“ وہ بے بسی سے بولی۔
”تمہاری بہادری۔ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرو اگر وہ تمہیں بلیک میل کر رہی ہیں تو ان کی کمزوری بھی تو تمہارے پاس ہے۔ اس عورت کی کمزوری دولت ہے۔ اسی کمزوری کی خاطر اس نے اپنا بہت کچھ گروی رکھ چھوڑا ہے۔ تم اس کی اس کمزوری سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتیں۔“ وہ اسے سمجھا رہے تھے وہ ان کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

”رُخنا! مجھے خود احساس ہے کہ کہیں کچھ نہ کچھ ہم سے غلط ہو گیا ہے مگر اب اس غلطی پر سوچنے سے کچھ حاصل نہیں میں نے جو کچھ بھی کیا تمہاری خوشی کی خاطر کیا۔ ورنہ ہمارے پاس کس بات کس چیز کی کمی تھی۔ تم بانتی ہو۔“ وہ دیکھتے دیکھتے بولتے ہوئے اسے سمجھا رہے تھے۔
”مہاں کیا غلط ہو گیا۔“ رُخنا کو شش کے باوجود نہ جان پارہی تھی اس نے بے بسی سے سر ہونے کی پشت سے نکال دیا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھینکنے لگے تھے فخر حیات اسے دکھ سے دیکھنے لگا۔
”خوش نہیں میں وہ خوشی لا کر دے سکتا۔“ فخر حیات نے بے بسی سے اس کے سوا گوار روپ کو دیکھا۔

یاد پر چپ رکنے کی تو اواز آئی۔ اس نے بچن کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ چند لمحوں بعد بھاری بوتلوں کی چھاپ گھن سے ہوتی ہوئی پگن کے دروازے تک آ کر رگ گئی۔ اس نے برتن دھونے کا عمل جاری رکھا۔ جیسے اس وقت پوری کائنات میں اس سے اہم اور کوئی کام ہی نہیں۔ چہرے پر نظروں کی تپش کا احساس بردھا تو اس نے ذرا سا رخ سیدھا کر کے دروازے کی طرف دیکھا۔ پگن شہباز خان مل آری پو نیفارم میں کیپ ہاتھ میں لیے بے بسارتوں کی پوری شدتوں کے ساتھ اسے نکلے جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے پلیٹ چھوٹ کر سنگ میں جا گری۔

”سلام السلام علیکم۔“ آواز میں یکپاہٹ نمایاں تھی۔
”ارے یہ تم ہو نہ بہت! میں سمجھا برتن دھونے والی ماسی ہے۔“

اس کو سلام کے جواب میں جو یہ سننے کو ملا اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ صبح ہی پچھلے صبر پر اس نے سی گرین اور بلو امتزاج کا یہ کاشن کاسوٹ پہنا تھا جو اس پر بہت بیخ رہا تھا۔ پچھلے دو تین بار اس کی طرف کی تھی ریشم نے بھی سراپا۔ میک اپ تو خیر اس نے کیا کرنا تھا چالیسویں میں بھی ابھی کافی دن تھے۔ وہ تو ایسے کپڑے بھی پہننا نہیں چاہ رہی تھی۔ پچھلوں کے بعد اصرار بر تیار کی گئی وہ پیر کے کھانے پر بیٹن شہباز کا انتظار تھا پھر پچھلوں کے کہنے پر تین بجے سب نے کھانا کھایا۔ وہ بھی بے دلی سے کھانا کھا کر اب پگن میں آ کر برتن دھور رہی تھی جب وہ اچانک آٹکا۔ پچھلوں کو اس کے ساتھ ہی جانا تھا۔

”ہاں ماسی ہے برتن دھونے والی تو اتنی بد تمیزی سے دروازے میں کھڑے ماسی کو کیوں گھورے جا رہے ہیں۔“ وہ تنگ مزاجی سے بولی۔

”اے لڑکی حد ادب میں تمہارا مجازی خدا ہوں اور میں تمہیں کیوں گھورنے لگا ایسی کون سی تم قلوبطر ہو۔ عام سی گندی رنگت قابل قبول ناگ نقشہ اور قد بھلا دیکھو میرے ساتھ چچا بھی ہے۔ میں تو ام جان کے جذبات کا نیال کر کے مان گیا تھا ورنہ ایک سے بڑھ کر ایک۔“

”تو نہ کرتے خیال میں نے آپ کی منت نہیں۔“ وہ اپنی زبان سے کھانا نہیں آپ۔ یہی خوش فہمی مجھے نہیں آپ کو ہے۔“ کہتے کہتے اس کی آواز پھٹ گئی وہ بے اختیار رونے لگی اور دروازے میں اتنا سا وہ اس کے

لبے چوڑے وجود کو ایک طرف دھکا دے کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔
”ارے ارے نہ بہت! بات تو سنو۔“ شہباز کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اسے کیا پتا تھا وہ اس کے مذاق کو سیریس لے لے گی۔

”بے وقوف لڑکی۔“ وہ نہ میں بڑبڑا کر مسزخان کے کمرے کی طرف بڑھا۔
”کتنی گھنٹی ہوتی ہیں یہ شریف زاویاں بھی سب کچھ کر کے بھی ہاتھ صاف رکھتی ہیں۔“ ریشم اپنے کمرے کی کھڑکی سے کھڑی سب دیکھ رہی تھی۔ نفرت سے بڑبڑاتی اور کھڑکی سے ہٹ گئی۔
وہ کافی دیر تک ام جان کے پاس بیٹھا رہا وہ کمرے میں نہ آئی۔

”ام جان! بھوک لگ رہی ہے کچھ کھانے کو تو منگو آئیں اور پلیز جلدی سے تیار ہی بھی کر لیں۔ ہمیں آج ہی نکلتا ہے آج ہی کھنٹے تک سفر بھی لمبا ہے اور مجھے تو چھٹی بھی نہیں ملی۔ مجھے کل شام تک واپس پہنچنا ہے۔“ کافی دیر کے انتظار لا حاصل کے بعد اس نے ماں سے کہا۔

”شہباز! تمہاری بڑی عادت ہے ہر کام میں جلدی چلانے کی صبح نکل جائیں گے اب شام تو ہو رہی ہے۔“ وہ کچھ حنفی سے بولی۔

”نہیں ام جان! بتایا نا کل مجھے رپورٹ کرنی ہے چھٹی نہیں ملی۔ اب آپ پلیز جلدی کریں اور مجھے پلیز کچھ کھانے کو تو منگو آئیں صبح سات بجے کھانا شہتہ کیا ہوا ہے۔“
”تمیں بچے سب نے انتظار کر کر کے کھانا کھلایا تم کھنٹہ پہلے نہیں آسکتے تھے۔“ وہ بولی۔

”ام جان! میرا ذاتی آفس نہیں ہے۔ گورنمنٹ کا ملازم ہوں میں جب چھٹی ملتی تھی تب ہی آتا تھا۔“ وہ کچھ حنفی سے بولا اس کا مزاج بگڑتے دیکھ کر مسزخان نہ بہت کو آوازیں دینے لگیں۔
”جی پچھو۔“ پچھلوں نے جواب دیا۔

”جی پچھو۔“ مسزخان نے جواب دیا۔
”جی پچھو۔“ مسزخان نے جواب دیا۔

”بیٹا! اگر کھانے کو کچھ تھوڑا بہت ہے تو لاؤ اس کو اور پھر آ کر میرا ایک بند کرو۔ پیکنگ تو مکمل ہے میری۔ ابھی چلنے کو کہہ رہا ہے۔“ وہ ”جی اچھا“ کہہ کر باہر نکل گئی۔

”جی بہت پریشان ہے میرے ساتھ دل لگا ہوا تھا اس۔ اب میں بھی کیا کروں اور کسی ڈاکٹر سے آرام ہی نہیں آ رہا ورنہ رہ ہی سکتی۔“ وہ افسردگی سے بولی۔
”سہیل تو کچھ پریشان نہیں ہو گا۔“ شہباز نے پوچھا۔

”نہیں۔“ صبح ہی میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ میں آج چلی جاؤں گی اور باقی تفصیلات بھی بتا دی تھیں۔ اب دیکھو موڈی بند ہے۔ کہہ رہا تھا شام کو جلدی آ جاؤ گے گا آنا ہے کہ نہیں۔

اور شہباز! تم اس طرح کیوں نہیں کرتے کہ ماجا کر پگن ہی میں کھا لو وہ بھی بے چاری پھر ٹرے سجا کر لائے گی۔ صبح سے کام میں لگی ہوئی تھی اب تھک گئی ہوگی۔ وہ شہباز سے بولی تو اس کے دل کی مراد بر آئی۔

”جی اچھا۔“ کہہ کر وہ فوراً کمرے سے نکل گیا۔
وہ فرتح میں سے سالن نکال کر گرم کر رہی تھی۔

شہباز پگن میں کھانا کھا کر گرم کرتی رہی۔ چہرے پر واضح ناراضی تھی۔ وہ اسے دیکھتا رہا سی گرین اور بلو کا امتزاج اس پر بہت اٹھ رہا تھا۔ اس کا نازک بدن اور بھی کمزور ہو گیا تھا۔

شہباز نے سالن کے صدمے کی وجہ سے اس نے سالن کا ڈونگا اس کے آگے رکھا لچا لولوں کی پلیٹ اوور سے نکالی اور روٹی کے لیے تو اپنے لیے پر رکھا۔

”نہ روٹی رہتے۔“ میں بس جاؤں لوں گا شہباز یو۔“ اس نے خاموشی سے تو اتا دیا۔ پانی کا جگ۔ بھر کر رکھا

اور گلاس میز پر رکھ کر باہر کی طرف مڑنے لگی تھی کہ شہباز نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
 ”بہنو! وہ رہے“ وہ عکسہ لہجے میں بولا۔

”میں نے پیپسو کا بیگ دیکھا ہے جا کر۔“ وہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔
 ”ابھی میں نے کھاتے کے بعد چائے بھی پینی ہے اس لیے بیگ کی کوئی جلدی نہیں۔ تم اوہر بیٹھو میرا ساتھ نہیں دوگی۔“ ان کا اشارہ کھانے کی طرف تھا۔

”میں کھا چکی ہوں۔“ وہ بیٹھنے ہوئے سرد مہری سے بولی۔
 ”بارہتے سے مذاق کو سیریس لے لیا نہ بہت، تمہیں کیا پتا تم میرے لیے کیا ہو۔“ اس نے نہرہت کے خفا چہرے کو نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے وارفتگی سے کہا۔

”بہنو نہ۔“ اس نے ہونٹ سکڑے۔
 ”اگر ام جان کا دل اوہر نہ بھی ہوتا تو بھی تم صرف میرے لیے نہیں اتنا یاد رکھنا کہ تم مجھے کب سے بے ضروری تو مجھے بھی معلوم نہیں۔“
 ”اور تو ابھی کہا وہ۔“ وہ خفگی سے بولی۔

تم کتنی خالص، کتنی پاکیزہ ہو اور تمہاری پاکیزگی میرے لیے کیا ہے میں چاہوں بھی تو تمہیں نہیں بتا سکتا نہ بہت!
 I love Your purity اینڈ آئی لو یو۔ یہ کیلشے ہے لیکن اس کا کیلشے ہونا ہی چارم فل ہے جتنی بار اس کو ہوا میں اتنی بار اس میں نیلین محسوس ہو گا اور نہ بہت میری محبت میری چاہت صرف اور صرف تمہاری امانت ہے میں نے کبھی کسی اور لڑکی کی اور عورت پر وہ نگاہ نہیں ڈالی جو صرف تمہارا حق ہے۔ جسم قابل ہوتے ہیں مگر کردار امر ہوتے ہیں یہ میرا یقین ہے۔“ وہ کھانا آگے رکھے بڑی سنجیدگی سے اس سے مخاطب تھا۔
 نہ بہت کو یہ سب سننا کتنا عجیب لگ رہا تھا اسے کوئی شرم کوئی خجرت محسوس نہیں ہو رہی تھی معلوم نہیں کیوں۔ شہباز کے لفظوں نے جیسے اسے طیر لیا تھا وہ لفظوں کے شور میں ڈوب ابھرنے لگی تھی۔ ”میں سن رہی ہوں نا سب۔“ وہ اس کو بت بنے دیکھ کر ڈرا زور سے بولا۔

”ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔
 ”میں پیپسو کی بیکنگ دیکھ لوں۔“ وہ کھوٹے کھوٹے سے انداز میں باہر کی طرف بڑھی۔
 ”کیپٹن شہباز!“ وہ ایک دم سے رک کر بولی۔ ”شیشہ کتنا خالص ہوتا ہے کہ اس کے آئینے آپار سب نظر آتا ہے ہے نا۔“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تو اس نے سر ہلا دیا۔

”اگر شیشہ ٹوٹ جائے اس کو جوڑ دیا جائے وہ بڑ تو جائے گا مگر اس کی خوبصورتی ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گی تو کیا اس کا خالص ہونا اب مشکوک ہو جائے گا حالانکہ ہو گا تو وہ اب بھی شیشہ ہی۔“ وہ شاید اس سے سوال کر رہی تھی۔

”ظاہر ہے۔“

”اس میں شیشے کا تو کوئی قصور نہیں وہ خود سے تو نہیں ٹوٹا۔ اپنی خوبصورتی کو خود توجہ نہیں کرتا۔“ اس کے لہجے میں کیسا گمراہ دکھا تھا۔ کیپٹن شہباز جان نہ پایا وہ ایک ٹیک اسے دیکھے جا رہی تھی۔

”کم آن یار! میں نے تو یو ٹی ایک بات کہی تھی تم بتا نہیں کون سا فلسفہ جھاڑنے بیٹھ گئیں۔ اب مجھے کچھ کھانے دو خالی پیٹ اتنی بھاری بھاری باتیں کرو گی تو مجھے سفر میں دس بار رکنا پڑے گا اس لیے مجھے تم اپنے اتنے فضیلت فلسفے سے بچو۔“

اس نے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ کر جلدی سے کھانا شروع کر دیا۔
 نہ بہت چند لمحے کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر ایک گہرا سانس لے کر باہر نکل گئی۔

اسے آج ادھر آئے تین روز ہونے والے تھے جس انتہائی کی حالت میں وہ یہاں پہنچا تھا صرف پناہ مل جانا ہی بہت بڑی بات تھی مگر صوفی صاحب نے اس کی کتھاسن کر اس سے بڑی محبت و ہمدردی کا سلوک کیا تھا۔ اس رات جب وہ بے ہوش ہو کر مسجد کی چوکھٹ پر آگرا تھا، جلیل بھاگ کر صوفی صاحب کو بلا لایا تھا۔

اولاد کی تربیت کے معاملے میں حتی صوفی صاحب کی طبیعت کا حصہ تھی اور وہ اس کے لیے ذرا سی نرمی کے بھی حق میں نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے اولاد آنے والا کل ہے تیار ہونے والی فصل ہے اور جو لوگ آنے والے کل سے یا فصل کی تیاری میں کسی بھی مرحلے میں غفلت لا پرواہی اختیار کرتے ہیں وہ اپنا مستقبل خود تباہ کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں بہت زیادہ سخت تھے۔

یہ ان کی شخصیت کا ایک پہلو تھا، دوسری طرف اپنی معاشرتی زندگی میں وہ بہت معاون اور محنت کرنے والے انسان تھے جو شخص ایک بار ان کی صحبت میں کچھ دیر کے لیے بیٹھ جاتا پھر وہ ساری زندگی کے لیے ان کا مرید بن جاتا۔ بات کرنے کے دوران ان کا انداز ان کا لب و لہجہ انتہائی شائستہ مہذب اور مدلل ہوتا تھا کہ مقابل چاہنے کے باوجود بھی ان سے اختلاف نہ کر پاتا اور یہی ان کی شخصیت کا خوبصورت پہلو تھا کہ وہ عام لوگوں سے بھی بڑی محبت سے ملتے تھے اور ان کی اسی محبت کی ایک بوند پانے کے لیے ان کے گھر آگئے ان کا آسان اور اس کے سنے پرندے جو بچ کھولے ان کی طرف تکتے رہتے تھے اور اس معاملے میں ان کا دل ایک دم سے بانجھ ہو جاتا جیسے ان کے پاس گہروالوں کے لیے ایک قطرہ الوقت بھی نہیں ہے۔

نہی، ان کی طبیعت کا وہ پہلو تھا جس نے ان کے بچوں خصوصاً ”دونوں بیٹوں کو ان سے خائف کر دیا تھا۔ بڑا عبدالمعین تو بچہ بھی ان سے منہ دکھاوے کی محبت و الفت جتنا نارہم تھا کہ اسے ابھی اپنا مستقبل بنانے کے لیے صوفی صاحب کی مبالغہ معذرت کی ضرورت تھی مگر عبدالمعین ان کے سخت پتھر پلے رویے کی وجہ سے ان کے ہاتھ سے بچا جا رہا تھا اور اتنے بڑے صوفی صاحب کو اس کی بڑی حقیقت کا احساس نہیں ہو پاتا تھا یا وہ جان بوجھ کر پہلو تباہ کر رہے تھے کہ آہستہ آہستہ عبدالمعین بھی کاغذی ہو کر سدھ جائے گا۔ ان کے ساتھ مسجد اور مدرسے کی ذمہ داری سنبھال لے گا کیونکہ انہیں معلوم تھا عبدالمعین اب شہر سے کبھی نہیں لوٹے گا اسے ”پرائیٹ فیوچر“ کی سڑی نے اپنے مانے مانے میں جکڑ لیا تھا مگر اس مانے مانے سے وہ اسے بچھین بھی لاتے تو وہ ان کے کسی کام کا نہ رہتا مگر وہی نے اس کی ساری توانائیاں چھوٹی چھوٹی تھیں اور خالی بھس کا انہوں نے کیا کرنا تھا۔

سزا کو اتنی خستہ حالت میں دیکھتے ہی ان کے بنیادی انسانی محبت بھرے جذبات جاگ اٹھے انہوں نے اسی وقت جلیل کی مدد سے اسے حجرے کے اندر پہنچایا۔ جلیل کو حکیم صاحب کی طرف دوڑایا اور صبح جب اسے ہوش آیا صوفی صاحب اس کے پاس ہی تسبیح لیے بیٹھے تھے۔ ان کا پارعب، چہرہ، منقبوط جسم، سرخ و سفید رنگت اور جلالی کشادہ آنکھیں، جنہیں وہ تسبیح کے دانوں پر مرکوز کیے دھیرے دھیرے لب ہلاتے دانے پھیر رہے تھے۔ معاذ نے انہیں دیکھا اور پھر سہم کر آنکھیں بند کر لیں۔

”کیا نام ہے لڑکے تمہارا؟“ ان کی بھاری بارعب آواز پر اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔
 ”معاذ جی۔“ اس نے بمشکل خود کو سنبھال کر آنکھیں کھولیں۔
 ”کہاں کے رہنے والے ہو؟“

یہ سوال اتنا مشکل، اتنا تکلیف دہ، اتنا دکھ بھرا تھا کہ اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں کچھ اس کی صورت اتنی بھولی بھالی تھی کہ مقابل اس کے بارے میں کوئی برائمان کر ہی نہیں سکتا تھا اس کی بند آنکھوں کے گوشے کیا تم ہوئے صوفی صاحب کا دل جیسے پانی ہو گیا۔ تسبیح بستر کے سرہانے رکھ کر اس کا ہاتھ سہلانے لگے۔
 ”بتانا نہیں تم نے کہ کدھر کے رہنے والے ہو۔“ اب کے ان کا لہجہ نرم ہی نہیں محبت بھرا بھی تھا۔ معاذ کے دل کو وصلہ ہوا۔
 اس نے ”مسائبان“ سے لے کر ظفر کے گھر سے فرار تک ساری کہانی آہستہ آہستہ ان کے گوش گزار کر دی۔

”ہوں۔ اس کا مطلب ہے خوب ذہین ہو۔ ٹاپ کیا تھا تم نے بہت، اچھی بات ہے۔ یتیم خانے میں رہنا بری بات نہیں اور نہ قابل شرم یہاں ایسے بھی بچے ہیں جو محلوں میں رہتے ہیں اور ان کے ذہن کند ہوتے ہیں علم کے معاملے میں اور اگر چل بھی پڑیں تو توشی سب پر۔ مٹی ذہن والے یہ رہیں زادے جب معاشرے کی باگ ڈور سنبھالتے ہیں تو ہر طرف لاقانونیت و وحشت اور ظلم برپا کر دیتے ہیں کہ ان کے علم کا حق سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا پھر انہیں کس بات کا ڈر؟ جب کوئی حق کو مانتا ہی نہ ہو پھر وہ اس سے ڈرنا بھی نہیں۔“

حق سے تو وہ ڈرتا ہے جو علم رکھتا ہے اور معاذ علم والے ہر دور میں معاشرے میں اپنا اونچا مقام رکھتے ہیں۔ انسانوں کی نظر میں بھی اور خدا کی نظر میں کہ علم انبیاء کی میراث ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے یتیم خانے میں نہ کر علم کی قدر کو جاننا کتابوں کو اپنے سینے سے لگا کر اپنے سینے کو شرف بخشا۔ اگر ہمارے معاشرے کے سارے نہ سہی آوے تھے بچے بھی اس طرح علم سے محبت کرتے لگیں تو پھر اس معاشرے کی ترقی اور بہتری کے لیے ہمیں گرو نہیں اٹھا کر بڑی سرکار کی طرف نہ دیکھنا پڑے مجھے خوشی ہوئی تمہارے بارے میں جان کر۔“

معاذ کو علم نہیں تھا وہ اس کی تعلیمی کاوش کو یوں سراہیں گے۔ وہ دیکھتے میں ہی بہت سخت محبت گھر دورے لگتے تھے مگر ہر انسان کا باطن اس کے ظاہر سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ نظریں جھکا کر ان کو سنتا رہا۔ پھر تین دن تک انہوں نے اس سے وہی محبت بھرا خصوصی سلوک روا رکھا۔ گھر میں بھی سب کے سامنے اس کی خوب تعریفیں کیں۔

”راہجی بی بی! وہ والدین کس قدر خوش نصیب ہوتے ہیں جن کی اولاد معاذ جیسی ہوتی ہے آج اگر وہ زندہ ہوتے تو اتنے ہونہار نہ بنے کہ وہ دیکھ کر اپنے اللہ کا شکر نہ ادا کر رہے ہوتے۔ ایک ہم ہیں اپنی اولاد کے سروں پر موجود انہیں ہر گری سہوی بھوک تنگ سے بچانے کو موجود اور پھر بھی کوئی ایسا نہیں جس کو میں شکر کی نظر سے دیکھوں۔ ایک عبدالمعین تھا جس پر میرا دل خرقہ کرتا تھا کہ وہ ضرور میری محنت کا پھل سے کاشہ چھل تو ضرور سے کا مگر اس کو چکھنے والے کوئی اور ہوں گے اس کا فیض بھی ہمارے نصیب میں نہیں۔ عبدالمعین کا مجھے کیا سب ہی کو علم ہے کہ اس کا ذہن کیا وجود بھی کبھی ہمارے لیے باعث فخر نہیں رہا اور اگر وہ ایک بے ضرر اچھا انسان بھی بن جائے تو بھی میں اللہ کا شکر ادا کروں گا جو ہونا مشکل ہے اور راہجی بی بی بیٹیاں تو پرانے آنکھوں کے پھول ہوتی ہیں۔ ان پر کیا مان کرنا۔“ آخر میں آکر ان کا اجر بہت شکست خوردہ سا ہو گیا۔

”آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں جو تعلیم یہ لڑکا حاصل کر رہا ہے وہی تو ہمارا عبدالمعین بھی حاصل کر رہا ہے اگر وہ تعلیمی میدان میں آگے جائے گا تو آپ کا ہی نام روشن ہو گا۔“ اماں جی نے انہیں حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

”ہیں راہجی بی بی! عبدالمعین کی سرشت میں ہمارے لیے وفا نہیں ہے اور زندگی تو کھیل ہی وفا اور بے وفائی کا ہے افسوس صد افسوس۔ کاش زندگی اتنی وفا ضرور کرے کہ نہ میری بیٹیوں کو بچ ہو تا دیکھو۔ میں وہی نہیں ہوں نہ غیب کا علم رکھتا ہوں نہ یہ تو صاف سیدھے حقائق ہیں جو مجھے سب بتا رہے ہیں اگر ان کو کھلی آنکھوں سے دیکھا جائے۔“ وہ بہت پرشورہ سے تھے۔

”بابا صاحب کو صرف اپنی ہی اولاد میں کیڑے نظر آتے ہیں معلوم نہیں کیوں۔ دو سروں کا کھمبا بھی انہیں بھلا لگتا ہے۔“ زینب پر ہلانی۔

آمنہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ دونوں صوفی صاحب اور اماں جی سے کچھ فاصلے پر بیٹھی پرانا سوئیٹر اوڑھ رہی تھیں۔ جس کی اون سے اماں جی کو کھیل بتوانا تھا۔

”آپ اللہ سے دعا کریں۔ آپ اللہ کے نیک بندوں میں سے ہیں اور والدین کی دعا اولاد کے حق میں ضرور قبول ہوتی ہے۔“ اماں جی ڈرتے ڈرتے بولیں۔

”پرانا گناہ گار بندہ ہوں میں اللہ کا۔“ انہوں نے گہرا سانس لیا۔

”دعا۔ اب یہی ایک ہتھیار رہ گیا ہے۔ ہمارے پاس زندگی کی باقی جنگ لڑنے کے لیے۔ ورنہ دونوں بیٹوں سے مجھے کچھ خاص امید نہیں۔“

صوفی صاحب! اللہ کی رحمت سے ماہوسی کیسی۔ عبدالمعین اب برصالی میں خاصا بہتر ہو گیا ہے۔ تب ہی تو اس کے قاری صاحب نے اسے چار دن کی چھٹی دی ہے گھر آنے کے لیے۔“ اماں جی انہیں دلاسا دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

عبدالمعین اندر بستر میں لیٹا کھلی کھڑکی سے ساری گفتگو سن رہا تھا گویا صاحب کی کوئی بھی بات اس کے لیے نئی نہیں تھی۔

”برصالی میں وہ کبھی بہتر نہیں ہو سکتا راہجی بی بی!۔“ انہوں نے ہنکا، ابھرا۔ ”میں نے چھٹی پر بولایا ہے اسے بڑے شاہجی کی خصوصی تاکید تھی کہ دونوں بیٹوں کو شادی میں ضرور لے کر آؤں کہ وہ بھی اپنے مالکوں کی خوشی میں خوش ہو سکیں اور انہیں جھک کر سلام کر سکیں اور انہیں اپنے مالکوں سے بات کرنے کا طریقہ آسکے۔ عبدالمعین کو ایک ہفتے میں چار خط لکھے کہ چھوٹے شاہجی کی شادی ہے اور بڑے شاہجی نے خصوصی طور پر ہمارے پورے گھر لے کر نوکر عو کیا ہے اور ہمارا شریک ہونا کس قدر ضروری ہے۔ مدرسے کی آمدن اور مسجد کی بوجھ بھال سے جتنی تنخواہ ملتی ہے اس پر گزارہ کریں تو راہجی بی بی! ہمیں مہینے کے بیس دن فاقوں پر گزارا کرنا پڑے اور یہ تمہارے بڑے شہزادے کی تعلیم پر میں جو پائی کی طرح پیسہ بہا رہا ہوں۔ یہ کہاں سے آ رہا ہے سب بڑے شاہجی کی مہربانیاں ہیں۔ ان کی محبتیں ہیں جو اس قدر مہربان ہیں کہ بیدارے میں اتنا تو چاہیں گے کہ بیدارے والے محض انہیں سر جھکانے نکالیں سرنگوں کر کے سلام کریں تو ان کے تھے جذیوں کی خشکی دور ہو جائے مگر تمہارے صاحبزادے نے صفا حٹ لکھ بھیجا۔ امتحان ہیں میں نہیں آسکتا۔ یہی نظر رنگ میں شاہجی کے آگے بیان کروں تو وہ ہمیں اپنی بیٹیوں کے پاس بھی جگہ نہ دیں۔ سال بھر کارا شن پائی علیہ بندہ جو کھلا تا ہے وہ آنکھیں بھی دکھاتا ہے۔ ان کی عتاب بھری نظر۔ اس کا عذاب کون سے گا۔ وہ تمہارا لالہ لالا اور ہر ہو گا اور مجھے جھوٹ پر جھوٹ گھر کر شاہجی کو منگوانا ہو گا اس لیے اس ناخلف کو چاروں کی چھٹی پر اور ہر بولایا کہ شاہجی کی خشکی زیادہ نہ بڑھ سکے۔“ دونوں سے ہی بے حد نالاں تھا۔

”پڑے ابھی کچھ جائے گا آہستہ آہستہ میں سمجھاؤں گی۔“ اماں جی نے ماؤں والی روایتی جملہ اتنی آہستہ آواز میں کہا کہ صوفی صاحب بہت مشکل سن پائے۔

”بچہ نہیں ہے وہ پورے سولہ سال کا ہونے کو آیا ہے اتنا سمجھ نہیں کہ اچھے برے میں فرق نہ کر سکے۔ اس کی آنکھ دیکھی ہے تم نے کبھی۔“ وہ گرجے۔ ”اس کی آنکھ میں لحاظ نہیں مروت نہیں اور کسی کا بھی ڈر نہیں اس کی آنکھ ہی مجھے ڈراتی ہے راہجی بی بی! تم سے میں خاص کہتا ہوں اس کے لیے اللہ سے بھولی پھیلا پھیلا کر عا جزئی سے مانگا کرو۔ اس کے لیے اللہ کا زخم ہانگو اور نیکی کی ہدایت۔“

عبدالمعین بے چینی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”بابا صاحب مجھ سے اس قدر ناراض کیوں رہتے ہیں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

”وہ بھی میرا خون ہے اسے اگر کاٹنا چھوے گا تو درد مجھے ہی ہو گا اگر اس سے میں سختی سے پیش آتا ہوں تو اس کی بہتری کے لیے اسے آئندہ کے کائناتوں سے بچانے کے لیے مگر وہ بات نہیں سمجھتا۔ وہ ایک باپ کے جذبات کو نہیں سمجھتا جس کے دل نے اس سے ڈھیروں امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ راہجی بی بی! اسے سمجھاؤ نہیں اس کے لیے دعا کرو۔ بہت زیادہ دعا۔“ وہ ہنر بڑھاتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔

”پتا نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔“ بچے کے پیچھے ہی بڑھ گئے ہیں امیدیں لگا رکھی ہیں مگر کبھی دو بول پار کے نہیں بولتے۔ سختی سے تو پتھر پاش پاش ہوتے ہیں سنورتے نہیں۔ یہ بات نہیں سمجھتے۔“ اماں جی ہنر بڑھاتے ہوئے اندر کمرے کی طرف دیکھنے لگیں یہاں عبدالمعین لیٹا ہوا تھا۔

معاذ جی جان سے ان کا معتقد ہو گیا تھا محض تین روز میں۔ اگر اسے اپنے مستقبل کو سنوارنے کے لیے شہر نہ جانا ہوتا تو وہ شاید ہمیں صوفی صاحب کے پاس رہ جاتا۔ ان کی قربت میں اس کے دل کو بہت سکون ملا تھا اور صبح نماز

فجر کے بعد سحر کا اجالا پھیلنے سے پہلے جب صوفی صاحب خوش الحالی سے سورہ ہسین اور سورہ رحمن کی با آواز بلند تلاوت کرتے تو معاذ جیسے کسی سحر میں پکڑ جاتا۔ صرف تین دنوں میں اس نے ان کی صحبت میں گزاریں اسے لگا اب دل کو اور کوئی حسرت نہیں ان کی تو انہیں ان کی گفتگو میں جاؤ تھا۔

ان تین دنوں میں معاذ کو پتا چلا کہ روز موت زندگی میں اللہ سے رابطہ کتنا ضروری ہے۔
 ”مقام تو سب ہو جاتے ہیں۔ ہوتے چلے جاتے ہیں لیکن اگر انہیں اللہ کے نام سے شروع نہ کرو اس کے آگے وعاما تک کر ان کے انجام خیر کا نہ سوچو تو کام سے برکت اور لطفات اٹھ جاتی ہے۔“ صوفی صاحب نے اسے بتایا۔
 وہ ساتوں وقت پورے حضور و خشوع سے اللہ کے آگے جھکتے تھے۔ پانچ وقت مسجد میں یا جماعت اور دو وقت تنہائی میں۔ مذہب سے محبت ان کی زندگی میں رچ بس چکی تھی ان کا پرویشن بھی دین تھا اور محبت بھی۔ جیسے نولیسورت رنگوں سے نئی پھولدار چادر جس کے دھاگوں سے چاپیں بھی تو رنگ جدا نہیں کیے جاسکتے۔ اسی طرح دین سے محبت صوفی صاحب کی زندگی میں شامل تھی۔

کل شام اس نے صوفی صاحب سے جانے کی بات کی۔
 ”چلے جانا آپکے دور روز اور رک جاؤ پھر نہ جانے کب ملو۔ ملو بھی یا نہیں۔“ وہ محبت سے بولے۔
 ”نہیں صوفی صاحب! کلج میں داخلے شروع ہو چکے ہوں گے۔ مجھے اب جانا ہے۔ اللہ نے چاہا تو آتا رہوں گا۔“ وہ سعادت مندی سے بولا۔

”وہاں جاؤ گے کس کے پاس۔“ ان تین دنوں میں ہی وہ اس کی اس حذر فکر کرنے لگ گئے تھے۔
 ”کسی ہو گل وغیرہ میں پندوں رہوں گا۔ داخلہ ہو جائے گا تو پھر ہاتھ مل چلا جاؤں گا۔“
 ”میرا بیٹا ہے نا شہر میں عبدالمعین جس کا میں نے تمہیں بتایا تھا اب فوراً تھو لیتے ہیں۔ بہت لائق بہت ذہین ہے تمہاری طرح۔ وہ بھی کسی ہاسٹل میں رہتا ہے۔ میں تمہیں اس کھانا لکھوں گا تم اس سے مل لینا جا کر وہ تمہاری مدد کرے گا۔“ وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولے۔
 ”شکریہ صوفی صاحب! اور میں آپ کی کس کس بات کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نے مجھ پر اتنے احسان کیے ہیں۔ مجھے یہاں رکھا، میری بیماری داری کی۔ اور سب سے بڑھ کر جو میں ساری زندگی بھول نہ پاؤں گا۔ وہ آپ کی محبت ہے۔ جو آپ نے مجھے دی۔“

معاذ بہت شرمیلا لڑکا تھا۔ ”سائبان“ نے اس کے اندر اعتماد پیدا ہونے ہی نہیں دیا تھا لیکن اسے لگا آج اگر وہ صوفی صاحب کا شکریہ ادا نہیں کرے گا ان سے دل کی بات نہیں کہے گا تو پھر شاید اسے لکھنے کی میں دوبارہ یہ موقع مل ہی نہ سکے۔

”اسکی باتیں نہیں کرتے۔ تم بھی میرے بچوں جیسے ہو۔ بلکہ سچ پوچھو تو ان تین دنوں میں مجھے تم ان کے عزم و ہونگے۔ تمہارے اندر بہت قابلیت ہے اپنی قابلیت کے بل بوتے پر جب کچھ بن جاؤ تو کبھی کسی کی بھوری سے فائدہ نہ اٹھانا۔“

”دیکھو بیٹے! احسان اتارنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم اس طرح کا احسان زندگی میں اگر موقع ملے تو کسی دوسرے کے ساتھ کرو۔ تمہیں بہت سکون ملے گا اپنے علم کو ہمیشہ مثبت استعمال کرنا بھی اس کے منفی استعمال کے بارے میں خواہ اس میں کتنا ہی مان فائدہ کیوں نہ ہو کبھی نہ سوچنا۔“ وہ عقیدت سے سر ہلانے لگا۔

”میرا تو خیال تھا تم ایک دو روز اور رہو گے، ہسپتال تم نے وجہ ہی ایسی بتائی ہے کہ میں تمہیں روک نہیں سکتا۔ تمہارے لیے دعا کرتا رہوں گا کہ اللہ تمہیں نیک مقاصد میں کامیاب کرے اور برے افعال سے دور رکھے۔“ وہ اس کا ہاتھ تھپتھپاتا کر بولے۔

”صوفی صاحب! میں کبھی تمہارا آپ سے ملنے آیا کروں؟“ اس نے جھجک کر پوچھا۔
 ”دشوق سے بیٹا! میرا دل میرا گھر تمہارا انتظار رہے گا۔“ وہ محبت سے بولے۔

”تم ابھی جا کر ڈرا گاؤں کی سیر کر آؤ۔ کل دوپہر کا کھانا کھا کر نکل جانا۔ شام سے پہلے شہر پہنچ جاؤ گے۔ گاؤں کی سیر کے لیے میں تمہارے ساتھ عبدالمعین کو کر دیتا ہوں۔ میرا دوسرا بیٹا جس سے تم آج دوپہر ملے تھے آج ہی در سے چار دن کی چھٹی بر آیا ہے۔“ وہ اس پر بہت مہربان ہو رہے تھے۔

”صوفی صاحب میں کل صبح جلدی لگنا چاہتا ہوں تاکہ ٹائم پر پہنچ کر وہاں کہیں رہنے کا ٹھکانہ کر سکوں۔“
 ”چلو دیکھیں گے کل۔ میں جا کر عبدالمعین کو بھیجتا ہوں۔ تم گاؤں کی سیر کر آؤ۔ اگر جانا چاہو تو پورے شام ہی کی ہو چکی ہو آؤ وہاں آج کل رات میں بھی دن کا سماں لگتا ہے۔ چھوٹے شاہ کی شادی ہے نا۔ انکو تے وارث ہیں جو بیٹی کے اس لیے خوب دھوم دھام سے سب تقریبات ہوں گی۔ اگر شاہ جی دونوں میں سے کوئی بھی ملے تو دعا سلام لے لینا۔ عبدالمعین ساتھ ہو گا۔ اسے پتا ہے ان کا۔ بڑے لوگوں سے سلام دعا رکھنے میں بھی بڑا فائدہ ہے زندگی میں کبھی نہ کبھی نہیں نہ کہیں ایسوں سے کام پڑ ہی جاتا ہے۔ میں چلتا ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔
 ”عبدالمعین کو بھیجتا ہوں۔“ وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

عبدالمعین جتنا بیزار اسے پہلی ملاقات میں نظر آیا تھا اب بھی اس طرح اکتایا ہوا اور تنگ مزاج لگ رہا تھا۔ وہ اسے مارے بندھے صوفی صاحب کے سامنے سیر کے لیے لے کر نکل تو آیا تھا۔ مگر اس کا سیر کا بہر حال کوئی ارادہ تھا نہ پروگرام کیونکہ اپنے گھر اور مسجد کی حدود ختم ہوتے ہی اس کے قدم بے حد ڈھیلے پڑ گئے اور مزاج مزید کڑوا ہو گیا۔

”کہاں جانا ہے تمہیں؟“ وہ رک کر لڑنے والے انداز میں اس سے پوچھنے لگا۔
 ”پھر تم لے جاؤ۔“ معاذ راپیارسے بولا۔

”ہا ہا ہا۔“ وہ اویچی آواز میں ہنسنے لگا۔ ”اتنا اعتبار نہ کرو۔ مجھ پر تو میرے باپ کو اعتبار نہیں۔ میرا تمہیں اللہ سے تو میں پکے جا کر اس کی مندر سے دھکا بھی دے سکتا ہوں۔“ وہ معاذ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شجیدگی سے بولا۔

”کوئی بات نہیں مجھے کسی کے ہاتھوں میں منظور ہے مگر کسی کو مارنا نہیں۔“ وہ لاپرواہی سے بولا۔
 ”وہ تو تم مجھے شکل ہی سے بزدل اور ڈر پر لگ رہے ہو۔“ عبدالمعین ڈرا گردن اکر آ کر بولا۔
 ”ہاں وہ تو میں ہوں مجھے خواہ مخواہ کسی سے جھگڑنا نہیں آتا۔“ معاذ فوراً ”مان گیا۔“

”چاہے کوئی تمہیں گھونٹا ر جائے یا چوبے کی طرح تمہاری گردن مروڑ جائے۔ تم پھر بھی یہی کہو گے۔ مجھے خواہ مخواہ کسی سے جھگڑنا نہیں آتا۔“ وہ اس کی نقل اتارتے ہوئے بولا۔
 ”خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“ ہمیں کھڑے رہو گے چلنا نہیں۔“ وہ گلے کے بیچ میں کھڑے تھے چند قدموں پر تنگ دھڑنگ کپڑوں سے بے نیاز چھوٹے بچوں کا روپ سیکھنے کھیل رہا تھا۔ معاذ انہیں دیکھنے لگا۔

”بڑا شوق ہے تمہیں سیر کا۔“ میں تمہیں بتا دوں ادھر کوئی شالا مارا باغ نہیں نہ کوئی چڑیا گھر ہے جس کی تم سیر کو نکلے ہو یہ تو گاؤں ہے کھیت پٹی ظہیاں ٹوٹے پھو۔“ لگا ایک کنوارا چند ٹیوب ویل اور ایک جو بی بی بس۔ مسجد کی سیر تو تم کرای چکے ہو۔“ وہ اس کا مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔

”تو پھر تم مجھے کیوں لے کر آئے ہو میں جا کر صوفی صاحب سے کہہ دوں گا کہ تم کہہ رہے تھے یہاں سیر کے لائق کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔“ وہ واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اس نے پہلی ملاقات ہی میں اندازہ لگایا تھا کہ عبدالمعین صوفی صاحب کو دیکھتے ہی کانٹے لگتا ہے۔

”بوسے تم کہتے ہو تم کسی سے جھگڑتے نہیں اور اب۔“ عبدالمعین نے دانت پیس کر اسے دیکھا۔
 ”چلیں پھر واپس۔“ معاذ کو اس کی بے بسی اچھی لگی۔

”کھیت دیکھ لو۔ رہت پر لے جاتا ہوں۔“ وہ لٹھ مارنے والے انداز میں کہہ کر آگے بڑھ گیا تو معاذ بھی خاموشی سے اس کے پیچھے چلے لگا۔

”میں! ام پر ہتھے ہو۔“ معاذ کا دل چاہ رہا تھا اس ناراض لڑکے سے دوستی کرے۔ اس کے تھے ہوئے چہرے کے پیچھے چھپے اٹھلی چہرے کو جانچنے۔

”پڑھتا ہوں۔ تمہیں تکلیف ہے۔“ وہ بد تمیزی سے بولا۔ اصل میں وہ معاذ کو بیزار کر کے سیر والے منٹے سے اپنی جان چھڑانا چاہتا تھا۔

”تمہیں بھی پڑھنا تو بڑی اچھی بات ہے، مجھے تکلیف کیوں ہوگی بلکہ مجھے تو خوشی ہے۔“ معاذ اس کی بد تمیزی کو نظر انداز کر کے صلح جو انداز میں مسکرا کر بولا۔ عبدالمعین نے منہ پھیر لیا۔ اب وہ گاؤں سے نکل آئے تھے۔ کھیت شروع ہو چکے تھے۔ چاول کی بیجری کو پانی دیا گیا تھا۔

”کون سی کلاس میں پڑھتے ہو؟“ وہ پھر بولا۔

”حفظ کر رہا ہوں۔“ وہ اسی طرح منہ پھیرے دہقانی لہجے میں خفا خفا سا بولا۔

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے مبارک ہو۔ مجھے بھی پڑھنا شروع ہے۔“ وہ چپ کر گیا۔

”تو کلو اس کے لیے کون سی بیسیں بھروانی پڑتی ہیں بس اپنے جسم پر گینڈے کی کھال چڑھوانی پڑتی ہے اور پانی سب خیر ہے گوشت قاری صاحب کا ہڈیاں تمہاری۔“ ساری گفتگو کے دوران ایک بار بھی اس کا لہجہ نارمل نہیں ہو سکا تھا لہذا وہ ناراض سا۔

”اچھا تمہیں کیا پسند ہے۔ میرا مطلب ہے تمہیں حفظ کے علاوہ کون سا شوق ہے؟“ اوادھر بیٹھ جاتے ہیں۔

”یوب دل کی موٹی سی دھار کھیتوں میں بہ رہی تھی۔ وہ اس کے قریب ہی بنے تھڑے پر بیٹھ گئے۔ اوادھر بیٹھ کر ایک دم سے خشکی کا احساس ہونے لگا۔

”یہ شوق میرا نہیں بابا صاحب کا ہے۔“ وہ منہ بگاڑ کر بولا۔

”اچھا تو تمہیں کس چیز کا شوق ہے جیسے مجھے کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ میرا دل کتاب کا ایک ایک لفظ ایک ایک حرف کو اپنے اندر جذب کر لوں۔“

”مجھے بھی پڑھنا شوق تھا۔ بس اس سے اسٹیج۔“ اس نے زبان دانتوں تلے دیالی اور آنکھیں سکیر کر دوڑا عمرو کے درخت پر بیٹھے ہوئے طوطے کو غور سے دیکھنے لگا جو کچے عمرو کو جو نہیں مار رہا تھا۔

”اچھا یہ تو بڑا اچھا شوق ہے کسی سے سیکھا ہے تم نے؟“

”نہیں۔“ وہ ہاتھ مار کر کہتا۔ ”ویل کی موٹی دھار کو بکھیرنے لگا۔

”کیا کچھ بتایا ہے، مجھے دیکھو۔“ ”معاذ نے اشتیاق ظاہر کیا۔

”نہیں ہے کچھ بھی میرے پاس بابا صاحب نے سب پھاڑ دیا۔ میری اتنی موٹی کاپی تھی آتے تھے صورت منظر تھے اس میں اور۔۔۔“ وہ بالکل پالی کے قریب ہو کر آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ”اور اب میں دوبارہ کبھی تمہیں بناؤں گا بالکل بھی۔“ وہ جیسے خود سے عذر کر رہا تھا۔

”صوفی صاحب نے کیوں پھاڑی؟“

”میں میرے ہر شوق سے نفرت ہے۔ میری پسند انہیں ناپسند ہے مجھے اسکول جانے کا شوق تھا انہوں نے مجھے اسکول سے اٹھوا کر حفظ پڑھال دیا۔ مجھ پر جانوروں کی طرح تشدد کیا جاتا ہے اور بابا صاحب کہتے ہیں اس علم کو حاصل کرنے کے لیے اتنی ہی سختی سستی پڑتی ہے۔ کیا ہمارا دین ڈنڈے کے زور پر پھیلا ہے۔ مجھے بتاؤ اور حفظ کرنا تو محبت اور شوق کا سودا ہوتا ہے۔ مجھے حفظ کرنے سے بھی انکار نہیں تھا مگر بابا صاحب ہر کام سختی سے اپنی مرضی سے کرانا چاہتے ہیں۔ میں پڑھنا چاہتا تھا وہ مجھے بھائی کی طرح بنانا چاہتے تھے۔ ہر فن مولانا۔ ہر علم میں طاق۔ بھائی مجھ سے بہت زیادہ ذہین ہیں یہ وہ بھی جانتے ہیں۔ میرا دل نہیں لگتا حفظ کرنے میں۔ پھر قاری صاحب کی بار۔ میں بس کچھ ماہ ہوں ادھر پھر میں یہاں۔ سے بھاگ جاؤں گا کہیں بھی۔ میرا دل نہیں لگتا کچھ بھی اچھا نہیں لگتا صرف اماں جی اور آمنہ اچھی لگتی ہیں ان سے ملنے آجاتا ہوں اور اب تم مجھے سمجھانا مت۔ میں نے تمہیں

اس لیے یہ سب نہیں بتایا کہ تم مجھے سمجھاؤ اور اگر چاہو تو سب بابا صاحب کو بھی بتا دینا۔ مجھے اب کسی کا ڈر نہیں۔ ڈر تو مار کا ہوتا ہے نا اور میں اتنا بیٹ چکا ہوں کہ مجھے اب اس کا بھی ڈر نہیں رہا۔“

وہ بے خوفی سے پانی سے کھیلتے ہوئے بول رہا تھا۔ اس کے سارے کپڑے بھیگ چکے تھے۔ چہرہ ٹھنڈے پانی سے دھل گیا تھا۔ معاذ کو اس بگڑے ہوئے لڑکے پر بہت پیار آ رہا تھا مگر وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان تین روز میں اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ صوفی صاحب اپنے گھر والوں کے ساتھ خصوصاً ”عبدالمعین کے ساتھ بہت سخت ہیں اور اس کے حق میں بولا گیا کوئی نرم کلمہ انہیں قائل کرنے کی بجائے اور بھڑکا دیتا ہے۔“

”تم ایسا کرو نا حفظ کرنے کے ساتھ ساتھ پڑھتے رہو اور اپنی اسٹیج ڈرائنگ بھی جاری رکھو۔ یہ حفظ تو تمہارا بہت جلد ہو جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ سال میں جس حساب سے تمہارے قاری صاحب تمہیں مار پیٹ کر اس سے ایسے تیار کر رہے ہیں تم جلد حافظ عبدالمعین بن جاؤ گے پھر تم اسکول میں داخل ہو جانا اپنے بھائی کی طرح۔ پھر تمہیں جو مضامین پسند ہوں وہ رکھ لینا۔ چاہے ڈرائنگ رکھ لینا پھر کانچ میں داخلے لئے شہر آجانا۔ وہاں میں بھی تو ہوں گا پھر بہت مزہ آئے گا۔“ معاذ نے بچوں کی طرح اسے ہملا کر اس کے مستقبل کی مکمل تصویر کشی کر دی۔

عبدالمعین کے چہرے پر بڑی استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔

”اسٹیج ڈرائنگ تم مجھ سے زیادہ بہتر بن کر لو گے اگر کرو تو؟“

”خواب بننے میں کوئی حرج نہیں سب کو حق حاصل ہے مگر اپنے پارے میں خواب بنو تو زیادہ اچھی بات ہے۔ دوسروں کے معاملے دوسروں کے لیے چھوڑ دو چلو واپس چلتے ہیں یا تمہیں ابھی مزید میر گنی ہے۔“ وہ بڑے طنز سے ”میر“ پر زور دے کر بولا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”ایک اچھا لکھا نسخہ نہ ہو جائے۔“ معاذ کو راست بھر ایک عجیب سے ملام نے گھیرے رکھا۔ اسے عبدالمعین واقعی اچھا لکھا تھا مگر وہ شاید اسے پسند ہی نہیں آیا تھا محبت اور دوستی ون سے ٹریفک کی طرح ہو تو جلد ہی ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

دونوں کھٹے بھر میں واپس گھر پہنچ گئے۔ اس کے بعد معاذ کی عبدالمعین سے دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی رات گزری صبح ہوتے ہی اس نے اپنے کپڑوں اور دو چار کتابوں کا شمار جلدی سے تیار کر لیا۔ وہ جلد سے جلد شہر پہنچ جانا چاہتا تھا مگر ایک توضیح سے مسلسل ہارٹس ہو رہی تھی۔ کبھی بلکی کبھی تیز۔ دوسرے صوفی صاحب کے پاس کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ وہ صبح سے معاذ کے پاس آئے ہی نہیں تھے۔

”صوفی صاحب کہتے ہیں وہ تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔“ معاذ کے بار بار استفسار پر جلیل نے اسے آکر بتایا تو وہ خاموش ہو کر بیٹھ رہا۔ وہ پیر ہو گئی صوفی صاحب نے آئے اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے کے اندر وہی دروازے کی طرف آ گیا جو گھر کے اندر صحن میں کھلا تھا۔ اندر سے مختلف آوازیں آرہی تھیں۔ وہ ٹانم پاس کرنے کے لیے ان آوازوں کو سننے لگا۔

”اماں جی منع کرو میں اس میں کے بچے کو۔ سارے باوام جکھنے کے ہمارے کھا گیا ہے۔ ہم نے کھنڈہ لگا کر پھیلے تھے۔“ زینب نے زور داتہ بیچ مار کر اماں جی سے کہا۔

”عبدالمعین! انسان بنو کیوں بہنوں کو تنگ کر رہے ہو۔“

”اماں جی میں نے کب کھائے ہیں باوام میں تو کچھ رہا ہوں چلو لوں میں کڑوے باوام آگے تو پھر انہیں ہی بابا صاحب سے ڈانٹ پڑے گی۔ میں تو ان کا بھلا کر رہا ہوں۔“ اس نے دہشانی سے کہتے ہوئے ایک اور مٹھی پھیلے ہوئے باواموں کی بھری اور منہ میں ڈال لی۔

”رہے ہو جاؤ تم یہاں سے عبدالمعین! اماں جی سارے کھا گیا۔“ زینب نے عبدالمعین کو زوردار دھکا دیا۔

”صحت بول بھائی کو ایسا پہلے ہی وہ اتنے دنوں بعد گھر آیا ہے۔“ اماں جی نے لٹا زینب کو ڈانٹا تو وہ اسے منہ چڑانے لگا۔

"اماں جی آپ بھی تو اسے منع کریں ماسارے تو یہ کھا گیا ہے چاولوں میں کیا ڈالیں گے۔" آمنہ بھی پرے بیٹھی ناریل باریک باریک کا تھی عبد العبین کی شرارت دیکھ رہی تھی۔
"نہ کر پتہ صوفی صاحب آتے ہوں گے انہوں نے مہمان کے لیے پکوائے ہیں بطور خاص گزوالے چاول۔
موسم جو ایسا ہو رہا ہے ورنہ آج کوئی گھر میں چولہا جلنا تھا آج تو حویلی میں چھوٹے شاہ تی کی مندی ہے۔ تم لڑکیوں کو جلدی سے کام نپٹانے دو۔ انہوں نے اپنی تیاری بھی کرنی ہے ابھی جا کر۔ شام سر پر آئی ہے۔" اماں جی اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

"مہمان کے لیے بطور خاص پکوائے ہیں، کبھی میرے لیے تو کچھ نہیں پکویا بطور خاص۔ میں بھی تو اب چند دنوں کے لیے آتا ہوں وہ بھی مہینوں بعد۔ پھر آج کہتی ہیں کہ تمہارے بابا صاحب تم سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔" عبد العبین کی سوتی مہمان کی خاطر ڈاری پراٹنگ گئی۔

دل میں رنج کا ایک نیا سبب پیدا ہو گیا۔ وہ گھر چاہے ہفتے بعد آئے یا چھ ماہ بعد صوفی صاحب نے اسے کبھی پیار سے پھانسی سے نہیں لپٹایا، کبھی اس کی خاطر ڈاری کے لیے اماں جی کو کوئی خاص حکم نہیں دیا بلکہ انہیں تو شاید پتا بھی نہیں تھا کہ عبد العبین کو کیا پسند ہے کیا ناپسند۔ حالانکہ عبد العبین شروع شروع میں جب بھی شہر سے آتا۔ صوفی صاحب اس کے لیے باداموں والا فورم، گاجروں کا حلوہ، گوشت کا پلاؤ اور پنشن تیار کرواتے تھے۔ اس کی پسند کی ساری ڈشوں کا انہیں علم تھا ایک بیٹے سے اس درجہ الفت کا انہوں نے اور دوسرے سے غایت دوری کی ہے۔ نیازی۔ عبد العبین کے دل میں گریں بڑھتی جا رہی تھیں اور صوفی صاحب نے اس کے دل کی کوئی بھی گمراہی کھولنے کی کوشش نہیں کی، کبھی اس کے رونے کی بلاؤں کو سمجھنے کی ناراض ہونے کی وجہ دریافت نہیں کی تھی۔ کبھی کبھار اسے خیال گزرتا شاید وہ ان کی اولاد ہی نہیں یہ خیال آتے ہی اس کی آنکھیں اپنے پرانے پن پر بھر آتیں۔

"نہ بیٹا! مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں وہ بے چارہ بچہ تو بے گھر ہے، مجھ سے نہ سر پر پاپ میرا دکھانے والی ماں پھر اتنا نیک شریف اس کی۔"

"میں بد معاش ہوں لفتنگا ہوں وہ اگر پاک پوتر ہے۔" وہ اور جل گیا۔ غصے میں باداموں کے چھلکوں کی پلیٹ کو اتنی زور سے ٹھوکری کہ وہ دو سیر میٹھیوں کے پاس جا گری۔

"نہ پتہ اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔ شیطان ور فلانا ہے اپنے اندر برداشت پیدا کرنا۔ اماں جی کے ہاتھوں سے کفلیہ چھوٹ گیا۔"

"اماں جی جلدی کریں۔ ہم نے ابھی اپنے کپڑے بھی استری کرنے ہیں صبح سے بجلی بھی نہیں ہے۔ آپ اتنی شہی میں سے کونکے لوہے کی استری میں بھر دیں میں کپڑے تو استری کر لوں شام ہونے کو ہے۔ مہین کا تو کام ہے ہر وقت جھڑنا۔" زینب نے آخری جملہ بالکل زیر لب کہا اگر عبد العبین سن لیتا تو اینٹ اٹھا کر اس کا سر پھاڑ دیتا۔ زینب کا تو بس نہیں چل رہا تھا صبح ہی حویلی پہنچ جاتی حویلی کے باہر مسلسل بچے بھول کی آواز سے اور بے چین کر رہی تھی۔

"اچھا پہلے چاول تو دم دے لوں پھر کونکے لے لیتا۔" اماں جی نے سر جھکانے اپنے آپ میں کڑھتے عبد العبین کو افسوس بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"اماں جی! اسلام اماں جی! جلیل باہر سے تقریباً بھاگتا ہوا اندر آیا اور بارش سے پچھتا پچھتا صحن میں کھڑے پانی میں پھینچا چھپ کر ناسید ہا ہر تدمے میں آکر اماں جی کو سلام کیا۔

"تیرے پیچھے کیا گاؤں کے کتے لگے ہیں جو یوں حواس باختہ ہوا جا رہا ہے۔" عبد العبین اس کی اڑی اڑی رنگت دیکھ کر بیزاری سے بولا۔

"اماں جی! وہ جھومر نہیں تھی ماسٹر صاحب کی مہمان چھو کر جھومر۔ جو کئی دنوں سے اپنی ماں کے ساتھ ادھر

تھی۔" اس نے عبد العبین کی پھانکار کوئی توجہ نہیں دی۔

جھومر کے ذکر پر زینب بھی سر اٹھا کر جلیل کو دیکھنے لگی اماں جی کی شلواریں ازار بند ڈالتی آمنہ بھی رک گئی۔

"ہاں ہاں بول آگے وہ جو اسٹری کی بھانجی تھی پشاور سے آئی تھی بڑی سوہنی بچی ہے بہت خوبصورت۔ کیا ہوا اسے؟" اماں جی نے اس کی پریشان صورت دیکھ کر چاولوں کے کپڑے پر ڈھکن رکھ دیا۔

"وہ گھر سے بھاگ گئی ہے جی، آج صبح ہی پتا چلا شاید کل رات کو شاید تو وہی رات کو۔ وہ حویلی میں مٹی ہے نا اس کا بیٹا سلیم اس کے ساتھ۔ دوپہر تک کھروالے چکے چکے اسے ڈھونڈتے رہے اب جب سلیم کے بھی غائب ہونے کا پتا چلا تو انہیں یہ بات سمجھ میں آئی کہ جھومر سلیم کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ کئی دنوں سے گاؤں کے لوگ اسے سلیم کے ساتھ آتے جاتے دیکھ رہے تھے۔ حویلی کے باہر لوگ اکٹھے ہوتے ہیں سب یہی باتیں کر رہے ہیں۔" وہ ایک ہی سانس میں بول گیا۔ اماں جی ایک پل کو چپ ہی ہو گئیں غمزدگی ایسی تھی۔

"تو جی بہت خراب لڑکی تھی سب کہتے ہیں اس کا۔۔۔" ان کی چپ کی شہ پانچ جلیل پتھارے لے کر باقی کو اٹک یا ان کرنے لگا۔

"جلیل! تم جاؤ اور۔۔۔" اماں جی نے ایک چور نظر سے زینب اور آمنہ کو دیکھ کر کہا۔ جو اس کو بڑی توجہ سے سن رہی تھیں۔ ویسے جی! اب صوفی صاحب نے بیس کا گھر کے اندر آنا منع کر دیا تھا گھر وہ ابھی تک کوشش کے باوجود ان کے حکم کی مکمل تعمیل نہیں کیا تھا۔ روانی میں پہلے کی طرح نہ اٹھائے گھر کے اندر چلا آتا۔

"اس کی آج کل میں صوفی صاحب کے ہاتھوں مرمت ہوگی پھر اس کے پیچھے میں یہ بات آئے گی۔" اماں جی نے اسے دیکھ کر سوچا۔

"اچھا جی ٹھیک ہے۔" وہ صحت قدر میں سے باہر کی طرف برہم گیا۔

ڈھول سے لے کر وہی اسے صوفی صاحب بل گئے۔ جلیل کو اندر سے آتے دیکھ کر ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ انہوں نے اندر دیکھیں آئے پھر۔ "وہ کب تو جلیل کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، خبر سنانے کے جوش میں وہ ان کا حکم تو بھول ہی چکا تھا۔"

"وہ جی میں۔ وہ میں تو۔" وہ کھڑے کھڑے گھٹا ہونے لگا۔

"گدھے تیرے پیچھے میں دباؤ نہیں ہے جب ایک بار کہہ دیا کہ یوں اونٹ کی طرح منہ اٹھائے گھر میں نہ گھسا کر تو کیوں سمجھ میں نہیں آتا کہ جس۔" انہوں نے ایک زور دار ہاتھ اس کی گردن پر پھینچ مارا اور جلیل تڑپ کر دروازے سے لپٹ گیا۔

"مخالف کر دیں صوفی صاحب! آئندہ نہیں آؤں گا۔" وہ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پرے دھکیل کر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"روح ہو جاؤ اب تم مجھے ادھر کبھی نظر نہ آؤ۔" انہوں نے اسے دروازے سے یا ہر دھکیلا۔ وہ آنکھیں پونچھتا ہوا باہر چلا گیا۔

صوفی صاحب کی گرج سن کر زینب اور آمنہ فوراً کمرے میں بھاگ گئی تھیں۔ وہ صحن میں آئے تو عبد العبین بے نیازی سے بادام چھیل رہا تھا۔ انہوں نے ایک تنقید بھری نظر سے باحوال کا جائزہ لیا۔

"ہوں۔" انہوں نے ہنکارا بھرا۔

"گاؤ عبد العبین! بادام مجھے دے دو میں چاولوں کو دم لگا رہی ہوں۔" ان کی آواز پر عبد العبین سعادت مندی سے باداموں کی پلیٹ لے کر ان کے پاس آ گیا۔

"دیکھ گئے چاول؟" صوفی صاحب برآمدے میں چھٹی چار پائی پر بیٹھ گئے۔

"جی بس دم پر ہیں دس پندرہ منٹوں میں تیار ہوتے ہیں۔"

"معاذ جانی کو تیار بیٹھا ہے اسے شہر کے لیے بس چلانی ہے۔ دیر نہ ہو جائے اسے۔ بچے کو ابھی شہر جا کر اپنا

کوئی ٹھکانہ بھی کرتا ہے۔

”معاذ سے اتنی لگاؤ اتنی محبت!“ عبدالعزیز نے تفر سے باپ کو دیکھا۔

”سنا تم نے کچھ۔“ صوفی صاحب کچھ دیر بعد اماں جی سے بولے۔

”کیا؟“ وہ پوری طرح متوجہ تھیں۔

”وہ ماسٹر صاحب کی مہمان لڑکی۔ میں کیا کہتا تھا ایسی لڑکیاں ٹھیک نہیں ہوتیں جو رستے کے بیچ میں چلیں۔

بھاگ گئی ہے منشی کے لڑکے سلیم کے ساتھ۔ حالانکہ وہ منشی ستمیں کھا رہا ہے اسے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔

اس کی قسموں کو کس نے سنا ہے۔ اسی لیے میں منع کرتا تھا کہ جب تک وہ ناچار لڑکی اور ہے نہ سب اور آمنہ کو

ادھر نہ بھیجے۔ ایسوں کی صحبت سے بھی اللہ بچائے۔“ انہوں نے اپنی داڑھی کو منھ میں لیا۔

”کب جاتی تھیں وہ مینے بھرے جانا چھوڑ رکھا ہے۔“ راجو گھبرا کر بولیں۔

”میں نے تو کہہ دیا شاہ جی سے کہ اگر وہ مل جائے تو اسے سرعام سٹسار کیا جائے تاکہ گاؤں میں پھر کسی لڑکی کو

ایسی گندی حرکت کرنے کی جرأت نہ ہو۔ وہ ہمارے گاؤں کی نہیں تھی صد شکر ہے وہ علاقہ غیر سے آئی تھی ورنہ

ہمارے گاؤں کی کس قدر بدنامی ہوتی۔ بہر حال سلیم نے ایک گھٹیا حرکت کی حالانکہ ایسا لگتا نہیں تھا وہ اگر وہ

گرفت میں آیا تو اسے بھی سٹسار ہی کیا جائے گا۔ میرا اور شاہ جی کا فیصلہ ہے۔ جو گاؤں کے لوگوں کے سامنے کیا

گیا اور کسی نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا سنا ہے اس لڑکی کے ماں باپ والے بھی کاسمان باندھ رہے ہیں۔ ایسی

اولادیں والدین کا بھی منہ کالا کر دیتی ہیں۔ ایسی بد بخت اولاد تو پیدا ہوتے ہی مار دی جائے جو جوان ہو کر ماں باپ کو

بے شرمی کا زہر دے۔“ وہ غصے سے بول رہے تھے۔ عبدالعزیز باریک لکڑی کی نوک سے راکھ میں لیکر بس کھینچ رہا

تھا۔

”تم بھی تیار ہو جاؤ شام کو حویلی چلنا ہے سب نے۔ تمہیں یہاں کچھ کرنے کے لیے نہیں بلایا میں نے شاہ

جی آج بھی دونوں کا پوچھ رہے تھے۔ وہ ناخلف تو آیا نہیں میری تاکید کے باوجود۔“ امیں نے بھرے صدمے سے پریشانی

آگیا۔

”اب تم بھی جلدی سے فارغ ہو جاؤ اور لڑکیوں کو تیار کر کے حویلی لے جاؤ۔ شاہوں کے مزاج کا کچھ پتا نہیں

چلتا کب بگڑ جائے۔ میں دیکھتا ہوں جلیل کو اگر چاول لے جائے معاذ کے لیے اسے رخصت کر کے میں تو پھر

حویلی ہی چلا جاؤں گا سیدھا۔ تم لوگ بھی جلد آنے کی کوشش کرنا۔“ وہ اٹھ کر چہرے کی طرف بڑھے تو معاذ

دروازے سے ہٹ کر بستر پر بیٹھ گیا۔

وہ اندر آکر اس کا احوال پوچھنے لگے۔

تھوڑی دیر میں جلیل چاول لے کر آیا۔ وہ خاموشی سے چاول کھانے لگا۔ صوفی صاحب نے بھی تھوڑے

پایٹ میں نکالے۔

چاول کھاتے ہی وہ رخصت لینے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

”جلیل تمہیں شہر جانے والی سڑک تک چھوڑ آئے گا ساتھ خیریت کے پینچو میری دعا میں تمہارے ساتھ

ہیں۔ عبدالعزیز کا خط اور تپا میں نے تمہیں دے دیا ہے جا کر اس سے مل لینا وہ تمہاری مدد کرے گا اگر مل چاہے تو

بھی کبھی خط لکھ لیا کرنا یا آنا چاہو تو ملے آجانا۔“

وہ اسے محبت سے رخصت کرتے ہوئے بولے۔ وہ ان سے گلے مل کر مصافحہ کرتے ہوئے باہر نکل آیا۔ جلیل

دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ سے سامان کا تھیلا لے کر آگے چلے لگا۔

معاذ نے ایک الوداعی نظر دروازے میں کھڑے صوفی صاحب کے بارعب سراپے پر ڈالی اور ہاتھ ہلا کر جلیل

کے پیچھے چل پڑا۔

”راجہ بی بی! میں جا رہا ہوں حویلی تم لڑکیوں کو لے کر جلدی پینچو اس صا حراز سے کو لے کر بھی۔“ انہوں نے

حجرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا اور باہر نکل آئے۔

”دیکھا یا با صاحب کو ڈانٹ کر گئے ہیں۔ آمنہ جلدی کرو استری مجھے ابھی نہانے بھی جانا ہے اتنا ٹائم ہو گیا۔ وہاں

کیا کیا مزے ہو رہے ہوں گے۔ جمو مری ساری خبر تو ادھر ہی ملے گی۔“ زینب صوفی صاحب کی آواز سن کر بے

قراری سے بولی۔

”تم تو بالکل ہو جتنی تم شادی میں جانے کے لیے بے قرار ہو رہی ہو۔ کیا وہاں اتنا مزہ نہ ہی آئے۔“ آمنہ نے

کپڑے استری کر کے اسے پکڑائے۔ ”اور بے چاری جمو مری کیا کچھ ملے گی کسی کو اس کے بارے میں کیا پتا۔“

”میں نے بھی تو اسے سلیم کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس روز تو اس کا دل غمناک تو اس آسمان پر تھا مجھ سے تو سیدھے منہ

بات ہی نہیں کی ایسی مغرور ہو رہی تھی وہ۔ مجھے کیا پتا تھا اندر سے اس کا یہ چہرہ ہے۔“ زینب اس دن سے جمو مری

سے خار کھائے بیٹھی تھی۔

”کیا پتا وہ نہ بھاگی ہو، صرف اپنے باپ کے ادھر سے جانے کی منتظر ہو۔ وہ بھی تو اس کا رشتہ زبردستی اس ٹرک

ڈرا بیور سے کر رہا تھا۔“ آمنہ نے خیال ظاہر کیا۔

”ہو سکتا ہے کہ اسے کاموں میں اس کا دل غمناک کام کرنا تھا، کیا پتا اس نے باپ سے چھٹکارے کے لیے پیراہ

نکالی ہو۔“ زینب بھی اس کی ہم خیال ہو کر بولی۔

”اچھا تم جاؤ اور جلدی نہ کرنا کچھ مجھے بھی نہانا ہے۔ باقی باتیں بعد میں کر لینا۔ تمہیں یا با صاحب کا پتا ہے نا

دیر ہو گئی تو خفا ہوں گے۔“ آمنہ حسب عادت بولی۔

”ایک تو یا با صاحب کا ڈر ہر دم تمہارے سر پر سوار رہتا ہے۔ جا رہی ہوں میں۔ یا با صاحب کے ڈر سے سکون

سے نہانے بھی نہ دینا پہلے ہی بارش کی وجہ سے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔“ وہ پوچھتے ہوئے کپڑے لے کر باہر نکل گئی۔

”تو ہو یہ جو والو ادھر ہی رہ گیا اس لڑکے معاذ کا۔“ آمنہ کی نظر کرسی پر پڑے معاذ کے استری شدہ جوڑے پر پڑی

جو اس رات کچھ نہیں لبت تھا۔ اماں نے سو کر آج ہی اسے استری کے لیے دیا تھا۔

”وہ نہیں چلائی نہ کیا ہو۔“ وہ سوٹ اٹھا کر حجرے کی طرف بڑھ گئی اندر مکمل خاموشی تھی۔

”یا با صاحب! اس نے مدھم سی آواز دینی کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے دروازے کی جھری سے دیکھا جمو

بالکل خالی تھا وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آئی کمرے میں کوئی نہیں تھا۔

”اوہ وہ کہیں چلا تو نہیں گیا اس کا جوڑا۔“ اس نے ہاتھ میں کپڑے استری کیے ہوئے تہہ شدہ جوڑے کو دیکھا

اسی وقت حجرے کا بیرونی دروازہ کھول کر مدرسے کا ایک ساتھ آٹھ سالہ طالب علم اندر آیا اسے کھڑے دیکھ کر

تھشک گیا۔

”معاذ! ادھر جو مہمان لڑکا ٹھہرا تھا یا با صاحب کا وہ باہر تو نہیں ہے؟“ اس نے لڑکے سے پوچھا۔

”نہیں با جی جی! وہ تو چلے گئے ہیں ابھی جلیل بھالی کے ساتھ وہ انہیں شہر کی بس میں بٹھانے گئے ہیں۔“ وہ

جواب دے کر واپس مڑ گیا۔

”بے چارے کا جوڑا کچھ تھی۔“ وہ افسوس کرتے ہوئے واپس مڑنے لگی کہ اس کی نظر سرہانے کے نیچے پڑی کسی

چمکتی چیز پر پڑی۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے آگے بڑھ کر سرہانے کے نیچے ہاتھ ڈال کر دیکھا وہ معاذ کا گولڈ میڈل تھا۔ چاول کھانے

سے پہلے تک وہ اسے حفاظت سے اپنے تکیے کے نیچے رکھے بیٹھا تھا کہ جاتے وقت جب میں ڈال لے گا۔

”یہ تو گولڈ میڈل ہے شاید وہی جو یا با صاحب کہتے تھے اسے میٹرک میں فرسٹ پوزیشن لینے پر ملا تھا۔ وہ یہ بھی

ادھر ہی بھول گیا۔“ میڈل ہاتھ میں پکڑنے اسے ایک اور افسوس نے آن کھیرا۔

”آمنہ! آمنہ! تمہیں تو تمہیں؟“ اسے حجرے کے باہر عبد العزیز کی آواز سنائی دی۔

”اسے دیکھ لیا تو یونہی لے لے گا مجھ سے۔ اس غریب کی دس سالوں کی محنت کا اعزاز اسے لینے تو وہ دوبارہ

ادھر ضرور آئے گا۔ اس نے میڈل کپڑوں میں چھپالیا اور باہر نکل آئی عبدالمعین اسے آوازیں دیتا ہوا مال جی کے کمرے میں پلا گیا تھا۔

”یہ میں بابا صاحب کو دے دوں گی وہ خود ہی سنبھال کر رکھ لیں گے مگر آ۔ ات تو بابا صاحب شاید ہی حویلی سے واپس آئیں چلو کل سہی۔“ وہ خود کلامی کرتے ہوئے اپنے کمرے میں بڑے کمرے کے اچھکی کی طرف بڑھی۔ اس کا لاک کھول کر میڈل بڑی احتیاط سے نچلے کپڑوں کی تہہ میں رکھ دیا۔



اس کا بھلا شہر میں کون تھا۔ ”سائیان“ جانے کی اب کوئی تک نہیں بنتی تھی۔ وہاں تو اب کوئی اسے پہچانتا بھی نہیں۔ جو چلا گیا سو چلا گیا۔ وہ صوفی صاحب کے لیے ہوئے ایڈریس پر عبدالمعین کے ہاسٹل پہنچا شام پونے چکی تھی جب وہ اسٹیشن پر بس سے اترتا تو مغرب کی ازا میں ہو رہی تھیں۔

”کوشش کے باوجود بہت دیر ہو گئی اب اللہ کرے نہیں رہنے کا ٹھکانہ مل جائے۔“ اسٹیشن سے باہر نکلنے ہوئے اس نے سوچا۔

وہ پوچھتے پوچھتے عبدالمعین کے کمرے تک جا ہی پہنچا۔ دروازے پر دستک دی تو ایک لڑکا تڑکا داڑھی موچھ سے بے نیاز بیس یا بیس سال کا لڑکا بلیک شرٹ اور بلیوٹراؤزر میں باہر نکلا اس کے ہاتھ میں کتاب تھی شاید پڑھ رہا تھا اس نے معاذ کو جا چستی نظروں سے دیکھا۔

”جی فرماؤ کس سے ملنا ہے جناب کو۔“ عجیب طنز سا لہجہ تھا۔

”جی مجھے عبدالمعین سے ملنا ہے صوفی صاحب کا بیٹا۔ صوفی عبد الرحمان کا جو احمد پور شرقیہ میں رہتے ہیں۔“

”اوہ! اس نے ہونٹ سکیڑے۔“

”کیا کام ہے تمہیں اس سے۔“ اب کے اس نے معاذ کا سر سے پاؤں تک بغور جائزہ لیا۔

”مجھے ان تک صوفی صاحب کا خط پہنچانا ہے اور۔“ وہ جھجک گیا۔ ”ایک کام بھی ہے ان سے۔“

”خط مجھے دے جاؤ۔“

”وہ خود کہاں ہیں؟“ اس نے ذرا سا آگے ہو کر کمرے کے اندر بھاگنے کی کوشش کی۔

”اصل میں عبدالمعین ایک ہفتہ ہوا یہ ہاسٹل چھوڑ گیا ہے۔ اس کے ہاسٹل کے ڈیوڑ (واجبات) بہت زیادہ ہو گئے تھے جو وہ کلینر نہیں کر پارا تھا اس لیے اس نے ہاسٹل چھوڑ دیا۔“ لڑکا ابھی تک دروازے میں ڈٹا کھڑا تھا۔

”مم مگر مجھے تو سب نے یہی بتایا ہے کہ عبدالمعین یہاں ہی ہے یہ اس کا کمرہ ہے۔“ اس پر مجھے ناامیدی کا ہم آہن پہنا۔

”ہاں وارڈن صاحب کے اندراج میں تو وہ ابھی یہاں ہی ہے مگر حقیقت میں اس نے ایک ہفتہ پہلے یہ ہاسٹل چھوڑ دیا تھا دو تین دن چپکے چپکے اپنا سامان لے جاتا رہا۔ مجھے بھی پتا نہیں چل سکا اور پھر اچانک تائب ہو گیا۔ اپنا کوئی پتا پیغام چھوڑے بغیر اس کے والد صاحب اب اسے پیسے جو نہیں بیچتے تھے وہ بے چارہ ہمارے ہاسٹل کے ڈیوڑ کلینر کرنا۔“ لڑکے کا لہجہ عبدالمعین کے لیے ہمدردانہ تھا۔

”اوہ! معاذ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔“

”ان کا کوئی آتا پتا؟“ اس نے شمار پر اپنی گرفت مضبوط کی۔

”بتایا نا وہ کسی سے مل کر نہیں گیا، اگر خط دے کر جانا ہے تو دے جاؤ ورنہ جاؤ یہاں سے اب۔ مجھے پڑھنا ہے۔“ وہ رکھائی سے بولا۔

”نہیں خط تو میں انہیں ہی دوں گا۔“ اس نے صاف انکار کر دیا۔

”جاؤ پھر یہاں سے میرا نام کیوں برباد کیا فضول میں۔“ اس نے تلک مزاجی سے کہا اور مرکز دھاڑ سے دروازہ بند کر لیا۔

اب معاذ کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جا۔ اس کا تو شہر میں کوئی واقف کار بھی نہیں تھا۔ وہ افسرہ مرا ہاسٹل سے نکل کر فٹ پاتھ پر سڑک کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کافی دیر چلتے چلتے تھک گیا تو ایک پارک میں جا کر بیٹھ گیا پارک میں بھی اس وقت پتھروں کی بیخار نے غاچہ کر دیا۔ ہسٹل وہاں آدھا گھنٹہ بیٹھ رہا۔

ٹھکانے کی پریشانی نے بھوک پیاس بھی ختم کر دی تھی۔

”کسی ہوٹل کا پتا کرنا ہوں تو چار دن کی بات تو ہے۔“ وہ سوچنے لگا۔ سستے ہوٹل تو ادھر اسٹیشن کے پاس تھے اب شہر میں ہوٹل کہاں ہیں اسے کچھ علم نہیں تھا۔ اس نے ہاسٹل سے نکلنے سے پہلے ہاسٹل کے ایک کمرے کا کرایہ پوچھا تھا جو اس کی پہنچ سے بہت دور تھا اس لیے چپ چاپ باہر نکل آیا۔

چلتے چلتے وہ کسی پوشا میں نکل آیا تھا۔ خوبصورت پر شکوہ بڑی بڑی کشادہ کونچیاں جن کے دیوے کل گیسٹ ہنڈ کھڑے تھے۔ وہ دور کھڑا ان کو ٹھیلوں کو دیکھنے لگا۔

”کتنے خوش قسمت ہیں ان گھروں میں رہنے والے، ایک فرد کے پاس کتنے کتنے کمرے ہوں گے کئی کئی فٹ جگہ اور چھ چھ جگہیں ٹھکانے کے لیے دو فٹ جگہ بھی نصیب نہیں۔“ اس سے پہلے کہ فرسٹریشن پوری طرح اس پر حملہ کرنی اس نے قدم آگے بڑھا دیے۔

”خیر ولا“ بے حد خوبصورت مار لگا کر تھی جس کا نقشہ دو سری کو ٹھیوں سے مختلف بھی تھا اور بے حد پرکشش بھی۔ اس نے یونہی گیٹ کے اندر بھاگنا اور تک جاتی بھری کی سڑک کے اختتام پر پورچ میں تین گاڑیاں کھڑی تھیں پورچ میں چلتی لاکس نے گیٹ تک کو رہنمائی کر رکھا تھا۔

”لوئے کیا بات ہے؟“ اندر سے جو کیدار کی لڑکار تو از پر وہ اچھل ہی پڑا۔

”پورا ایک شام ہوتے ہی نکل پاتے ہیں۔ پھر تو جا کر تاہوں میں مجھے پولیس کے حوالے۔“ وہ کرخت تو از اور خوفناک شکل والا جو کیدار گیٹ کھول کر اس کو بکڑنے کے لیے لگا۔ معاذ نے وہ لگا دی وہ بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ اس کے ہاتھ میں بڑی سی کن بھی تھی اور وہ مستقل چلا تا ہوا آ رہا تھا۔

”صوفی کی تلاش میں تھا کہ وہ کھوں کوئی ہے کہ نہیں میں ہاتھ کی صفائی دکھا جاؤں ٹھہر تو سہی تو ذرا چور۔“ وہ مسلسل اس کے پیچھے بھاگا چلا آ رہا تھا۔ معاذ نے اپنی اسپید بڑھا دی۔ آگے موڑ آ گیا وہ جو تھی تیز رفتاری سے مڑنے لگا۔ دوسری طرف سے آتی کسی تیز رفتار گاڑی نے اسے اس زور کی ٹکرائی کہ وہ گاڑی سے بری طرح ٹکرا کر گئی فٹ دور جا کر۔ ایک سیٹھ اتنا اچانک اور شدید تھا کہ اگلے ہی پل اسے کچھ ہوش نہ تھا۔



”وہ کچھ نرہت! اب تو پیچھو بھی چلی گئی ہیں، تمہیں ان سے بھجک تھی نا اب تو کوئی بہانہ نہیں۔ ابو جان کو آج مہینہ ہونے کو ہے ان کا سوگ تو اپنی جگہ رہے گا اسی طرح مہینے گزرتے چلے جائیں گے، ہر وقت کو روک تو نہیں سکتے اس کا تو کام ہی بھاگنا ہے اور عقل مند وہی ہے جو وقت کی رفتار کو پہچانے، ریشم اسے آج پھر گھیر کر بیٹھ گئی تھی۔“

وہ ناشتے کی ٹیبل پر ابھی چائے پی کر فارغ ہی ہوئی تھیں۔ سہیل بینک جا چکا تھا مسز خان شہباز کے ساتھ کل شام کو لاہور واپس جا چکی تھیں دس روز بعد آنے کے لیے۔

”اور تم تو بہت سمجھدار بہت اچھی لڑکی ہو۔ خود سوچو ہماری عزت کا معاملہ نہیں تمہارے بھائی کی جسے اب دنیا داری بھائی ہے۔ آخر لوگوں کے منہ بند کرنے کے لیے کچھ تو دین گے نا۔ ورنہ لوگ کہیں گے ہاں باپ تو تھے نہیں سر پر۔ بھائی نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ چلو میں تو غیر ہوں۔ میرا تم بے شک خیال نہ کرو مگر اپنے بھائی کے بارے میں ضرور سوچو۔ تم سے کچھ نہیں کہتے مگر سوچ سوچ کر اپنا دماغ خراب کر لیتے ہیں۔ اتنی بری عادت ہے سہیل کی میں کہہ کہہ کر تھک گئی ہوں کہ آپ ہی نرہت۔“ کہیں وہ میرے ساتھ بازار چلے اور کچھ نہیں عوسی

جوڑا تو خریدنا ہی ہے نا مگر ان کی ایک چپ ریشم میں کیسے کہوں اس سے اسے ابوجان کا بہت غم ہے دو سرے مجھ سے مخفا تھا ہی رہتی ہے اور میں کسی بھی طرح اسے منانے سے قاصر ہوں۔
 ریشم اپنے پاس سے کہانی گھر کر رہی اور نہرت کو بھی اس کی کہانی پر ایک فیصد بھی یقین نہیں تھا۔ سہیل ایسا کم گو کبھی بھی نہیں تھا جتنا ریشم اسے بتا رہی تھی اور نہرت کے پارے میں سوچتا اس نے مدت ہوئی تھوڑا دیا تھا۔
 جب اس نے بھی ابوجان کے ساتھ ریشم سے اس کی شادی کی مخالفت کی تھی۔
 ”تم مجھے بتاؤ“ آخر بازار جانے میں کیا خرچ ہے نصف ایک دن کے لیے۔
 ”کوئی خرچ نہیں۔“ وہ کپ کے کناروں سے کھیلے ہوئے مدھم آواز میں بولی۔
 ”تو چلو اٹھو پھر تیار ہو جاؤ۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے لگیں گے۔ سہیل سے میں پیسے لے چکی ہوں۔“ وہ خود ہی بولتی جا رہی تھی۔

”کوئی ضروری ہے کیا؟“ اس نے شکست خوردگی سے سر اٹھا کر سر پر کھڑی ریشم کو دیکھ کر پوچھا۔
 ”بالکل ضروری ہے۔ اب وقت ضائع نہیں کرو چلو اور چل کر تیار ہو جاؤ میں بھی تیار ہوں اور جا کر سہیل کو بتا دوں کہ ہم جارے ہیں کہیں پیچھے سے فون کھڑکاتے رہیں۔“ ریشم جلدی جلدی چائے کے برتن سمیٹتے ہوئے بچن کی طرف بڑھی برتن رکھ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تو نہرت کو بھی بادل نخواستہ اٹھنا پڑا۔

وہ کمرے میں جا کر بے دلی سے تیار ہونے لگی تیار ہو کر وہ بیڈ پر گم غم سی بیٹھ گئی۔

”راجیلہ کو فون کرتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر ایک ٹینشن کی طرف بڑھی۔

”اچھا اوکے خدا حافظ۔“ وہ سری طرف ریشم شاید سہیل کو فون کر رہی تھی اس نے الٹا ہی جواب دیا کہ کون رکھا تو نہرت راجیلہ کا نمبر ماننے لگی۔ فون راجیلہ نے ہی اٹینڈ کیا۔

”میں تو تمہاری طرف ہی آ رہی تھی۔“ راجیلہ بولی۔

”ابھی نہ آؤ شام میں آجانا۔“ اس نے منع کر دیا۔

”تو اس میں اس قدر بیزار ہونے کی کیا بات ہے اچھی بات ہے ان کو تمہارا خیال تو آیا بائے واوے بازار کس سلسلے میں جا رہی ہو۔“

”شادی کی تیاری کے سلسلے میں۔“ وہ رو دینے کو تھی۔

”نہرت! خوش باش جاؤ دیکھو غم خوشی اس زندگی کے ساتھ جڑے ہیں انکل کی زندگی میں یہ خوشی نہیں تھی مگر ان کی زندگی کی سب سے بڑی تمنائیں تھی کہ تم اپنے گھر کی ہو جاؤ اب ان کی خواہش ان کے بعد پوری ہو رہی ہے۔
 تو ان کی خاطر اپنے دل کو شاد کر لو یوں آرزو خاطرہ کر تم ان کی روح کو تکلیف دے رہی ہو۔“ راجیلہ نے اسے سمجھایا۔

”راجیلہ! پتا نہیں کیا بات ہے کسی بھی بات سے میرا دل خوش نہیں ہوتا۔ پتا نہیں کیوں دل کو دھڑکا سا لگا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ اچھی کچھ ہونے والا ہے۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل ہی آئے۔
 اس نے ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کو رگڑا کہ ریشم ابھی اُدھر آجائے گی تو اس کے آنسو دیکھ کر پھر بے کاری لگا پڑا۔ کھائے گی۔ جس سے اسے الجھن ہوتی تھی۔

”تمہارا وہ ہم ہے سب مائی ڈیر ایسا کیا ہو۔“ اس نے ریشم کے خوش ہونے کے دن آ رہے ہیں۔ تم فکر نہ کرو بس چند دن اور۔ ہمارے دو لہا بھائی کی ساؤ خوش خوش تو گئے ہیں نا۔ ملاقات ہوئی؟“ وہ شروع لہجے میں اسے پھینرتے لگی۔

”فصلو یا تمیں نہ کیا کرو وہ پیچھو جان کو لینے آئے تھے۔“ اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”تو پھر اہم میں ناراض ہونے والی کون سی بات ہے تم ان کی منکوحہ ہو۔ خیر تم اب بازار جاؤ میں شام میں پلر

لگاؤں گی۔ اچھی اچھی شاپنگ کرنا شام کو آکر دیکھوں گی اور دیکھو اب بالکل اداس نہیں ہونا تمہیں میری قسم۔“
 ”اوکے اوکے۔“ اس نے گہرا سانس لیا۔

”چلو نا نہرت، دیر ہو رہی ہے۔“ ریشم اس کے کمرے میں آکر بولی۔ وہ پیرٹ کھر کے چار جٹ کے سوٹ میں لمبوس تھی۔

”اچھا راجیلہ! میں جا رہی ہوں تم شام کو ضرور آنا۔ میں انتظار کروں گی خدا حافظ۔“ ریشم نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔

”ریڈی۔“ وہ نہرت سے بڑی محبت سے بولی۔

”ہوں چلیں۔“ فون رکھ کر اس نے الماری سے اپنی چادر نکال کر اوڑھی اور ریشم کے پیچھے نکل آئی۔

”پہلے کہاں جائیں۔“ وہ احتیاط سے موڑ کاتے ہوئے بولی۔

”جہاں مرضی لے جائیں۔“ اس نے سب کچھ ریشم پر چھوڑ دیا۔

”تم بہت سادہ ہو نہرت! ریشم نے مسکرا کر کہا۔

”اس میں سادگی کی کیا بات ہے۔“ نہرت کہہ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ پھر ریشم نے گاڑی سپر مارکیٹ کے آگے جا کر ہی پارک کی گاڑی لاک کر کے دونوں مارکیٹ کے اندر چلی آئیں۔

”پہلے چار پانچ زبردست قسم کے ڈیسز دیکھتے ہیں پھر میک اپ اور جو تھ اس کے بعد اگر نا تم بچاؤ جو تم کو بھی وہ خرید لیں گے۔ اصل میں ان چیزوں میں تمہاری پسند شامل ہونا ضروری ہے۔ باقی تو کوئی بھی خرید کر لا سکتا ہے۔“ وہ کانوں کے آگے سے گزرتے ہوئے بولی نہرت نے کوئی جواب نہ دیا۔

پھر وہ ایک بہت بڑے بوتیک میں داخل ہوئیں جہاں بالوں کی وگ سے لے کر مصنوعی ناخن تک دستیاب تھے۔ وہ ہر قسم کی طرف آئیں۔ انہوں نے تین سوٹ پسند کیے ایک رسٹ کٹر کا نازک کام والا سوٹ دو سرا چڑی کا اور تیسرا لائٹ کا۔

”کیا خیال ہے اب لہنگا نہ دیکھ لیں۔“ بوتیک سے باہر نکل کر ریشم بولی۔

”ہوں۔“ وہ سر اٹھا کر بڑی بڑی جگہ ٹائی ٹھاپس گوا دیکھ رہی تھی۔ جہاں ایک سے ایک اعلا اور خوبصورت ڈیزائن والا سوٹ ہنگ کیا گیا تھا۔

”اب اتنی جلدی بندہ کھلا پسند کرے اور کیا نہ کرے اتنے دنوں سے کہہ رہی تھی مگر تم بات مانتی بھی تو نہیں ہو۔ اب دو تین گھنٹوں میں بھلا کیا کیا خریدیں گے۔“ ریشم بولتی جا رہی تھی۔

”شہین! میں جب ریشم ان کے گھر آئی تو کئی دن تک وہ اس سے ایک لفظ تک نہ بولی تھی اور نہرت اسے دیکھ کر سوچتی کہ شاید یہ مشورہ حسینہ زبان نہیں رکھتی اور اب؟ اس نے گہرا سانس لیا۔

”بھئی کہہ رہی ہو۔ دیکھو نایہ والا سوٹ۔“ ریشم نے جھنجھلا کر اسے گولڈن خوبصورت دیکے اور موتیوں کے کام والے لہنگے کی طرف متوجہ کیا۔ جو روشنیوں میں اور بھی جگمگا رہا تھا۔

”اچھا ہے۔“ اس نے ذرا سانس لے کر کہا۔

”کچھ خاص نہیں۔“ ریشم نے ناک حڑھائی پھر دکھاندار ایک کے بعد ایک اعلا سے اعلا روایتی لہنگا دکھانا چلا گیا مگر ریشم کو کوئی پسند نہیں آ رہا تھا۔

”جلدی بھی کریں ہمیں یہاں بیٹھے ٹھنڈے ہو گیا ہے۔“ نہرت نے آگے کر ریشم سے کہا تو اس نے بادل نخواستہ کافی کٹر کا سوٹ پسند کر ہی لیا۔

”تو یہ بھی ایک مہر کہ تھا۔“ لہنگا خرید کر وہ باہر نکلیں تو ریشم نے گہرا سانس لے کر کہا۔

”اب کاسیڈکس کی طرف چلتے ہیں۔“ وہ خود ہی فیصلے کیے جا رہی تھی۔ نہرت اس کے ساتھ چل پڑی کاسیڈکس کا سامان نکلا تو انہیں ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔ جب وہ دکان سے باہر نکلیں تو نہرت بری طرح تھک چکی

"بالکل سب پھرتی رہی ہے صرف تمہارا ہی انتظار تھا۔" عارفہ نے ایک معنی خیز نگاہ بے خبر نہت پر ڈالی۔
 "دور کا اثر کتنی دیر تک رہے گا۔" ریشم نے پوچھا۔
 "تین گھنٹے تک۔" عارفہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔
 "اور ہمارا کام تو دو گھنٹوں میں ختم ہو جائے گا۔"
 "کام ایک دوپہر میں ہونا چاہیے انڈرا سٹینڈ۔" ریشم صوفے سے ٹیک لگا کر سگریٹ پیٹے ہوئے بولی تو عارفہ سر ہلا کر دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

سردیوں کے سردیوں کا موسم تھا اور ہوا چل رہی تھی جس کی وجہ سے سر کے ارد گرد کھڑے پھولے پھولے پودے جھوم جھوم کر لہرا رہے تھے اور جو اونچے اونچے قد اور درخت تھے۔ ہوا کی وجہ سے ان کے پتے ایک دوسرے سے مل کر تالیاں بجا رہے تھے۔ ہوا اشانوں میں سے گزرتی تو شاں شاں کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ آسمان میں سے نیلا آبیسے سرخ اور کہیں سے تیز سلیٹی رنگ کا ہوا رہا تھا۔ ایسے جیسے ابھی بارش برسنے لگے کی حالانکہ پائل اتنے زیادہ نہیں تھے مگر موسم کا مزاج بے حد خوبصورت ہو رہا تھا۔ سر کا پانی سبک خرا می سے بہت مدھم سڑوں میں بہ رہا تھا یا کسی طرف آگے ہی آگے۔ سر کے کناروں سے آگے دور تک پھیلا سبز جیسے بارش میں نمایا ہوا تھا۔ کھلا کھلا سا سبز رنگ آنکھوں کو نئی زندگی بخشتا تھا۔ سر کے کنارے ننھے ننھے پودے دراصل پھولوں کے تھے۔ اس نے اب کے زانور کیا۔ سرخ سفید اور پیلے گلاب کے پھول سب پودوں کے سبز پنوں سے جھانک رہے تھے بڑے بڑے کھلے ہوئے گلاب۔ گلاب ہی گلاب۔ اس کی نظر سر کے دوسرے کنارے سے دور تک گئی۔ تاہم نظر گلاب کے پودے تھے۔ اتنے پھول ایک ہی جگہ اس نے پہلی بار دیکھے تھے۔ ان پھولوں کی خوشبو کا ایک پوری فضا میں پھیل گئی۔ سارا منظر ہی معطر ہو گیا۔ وہ پھولوں کو دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ کسی پرندے کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو نچوں کی ایک اور قسمی سر کے پانیوں کے بالکل اوپر۔ بلکہ اس کے سر کے بے حد قریب سر کے شفاف پانی میں ان کا سر بالکل واضح تھا۔ کونجیں بے قزوقی سے سر کے اوپر آگے پیچھے منڈلانے لگیں ان کے شور میں بھی اضطراب نمایاں تھا۔ سارا منظر ہی جیسے بے چین ہو اٹھا اور چند لمحے کا سکون اس اضطراب میں نہیں کھو گیا۔ وہ بھی بے چین ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کر نکلی ہوئی۔ اچانک کونجیں غول کی صورت میں سر کے پانی کے ساتھ اڑتی ہوئی دور چلی گئیں۔ سر کے پانی کے اوپر بائیں طرف دور ہی دور۔ وہ ابھی کونجوں کو دور جاتے ہوئے دیکھ ہی رہی تھی کہ اسے ماحول میں تبدیلی کا احساس ہوا۔ اس نے نو دیکھا کہ اس کے سامنے سر سرک رہی ہے اپنی جگہ سے۔ وہ حیران رہ گئی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے کونجوں کے تعاقب میں سر ہی اپنا پانی اور گلاب کے پھولوں سے لے کر پودے سمیٹ کر اسی سمت میں سرکتی ہوئی دور چلی گئی۔ اتنا حیران کن منظر اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا کہ سر چند کونجوں میں اپنی جگہ سے عائب ہو جائے۔ اتنی بڑی پانی سے بھری سر اور اب اس کی جگہ خشک بھوری مٹی کی زمین تھی۔ سارے پھول پودے درخت عائب ہو چکے تھے۔ فضا سے گلابوں کی خوشبو بھی غائب تھی حتیٰ کہ اونچے لے دو قامت درخت بھی۔ اتنا جاوونکی منظر کہ آسمان نے جو نئی تپتے سورج کی شکل میں آگ برسانی شروع کی اس کی چیخ نکلی تھی۔

"لو جی، یہ محترمہ تو بن گئیں کر خواب خرگوش کے مزے لے رہی ہیں۔ وہ بھی دن دیہاڑے۔ اماں جی! دیکھیں اگر آئینہ کی بجلی کو۔ فہد سے اٹھی سے اور وہ بھی کوئی خواب کچھ کہے۔"
 آئینہ نے ایک اجنبی نظریے اور گرد پر ڈالی۔ یہ تو ان کا کمرہ تھا۔ وہ مندی کے فٹکشن میں جانے کے لیے تیار بیٹھی تھیں کہ اچانک بارش بہت تیز ہو گئی۔ ہر طرف کالی رات چھا گئی۔ گھنٹے پائل آئے تھے اور خوب گرج گرج کر برس رہے تھے کہ ان کی گرج سن کر دل دال رہا تھا تو اماں جی نے کہا۔
 "ابھی بارش کا زور تو لے گا تو پھر جا میں کے گاؤں کے راستے کون سے پختہ تھے۔ کچی گلیوں سے گزر کر جو ملی بانا تھا۔ سب طرف بے تحاشا کچھ ہو چکا تھا۔ وہ اندر کمرے میں آکر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی۔ پھر وہ بستر

تھی۔ ایک تو اتنے عرصہ بعد شاپنگ کے لیے نکلی تھی پھر وہ بھی اتنی لمبی چوڑی شاپنگ۔ تھکن اس کے چہرے سے ظاہر ہے۔
 "تھک گئی ہو؟" ریشم نے باہر نکلتے ہی بڑے پیار سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔
 "اوہ مجھے یاد آیا یہاں نزدیک ہی بالکل مارکیٹ کی بیک سائیڈ پر عارفہ آئی گا گھر ہے۔ وہ جو اس دن آئی تھیں نا ابو جان کا افسوس کرنے۔ چلو ان کی طرف چلتے ہیں۔ کچھ کھائیں پیئیں گے اور تھوڑی تھکن اتاریں گے۔" ریشم نے تجویز پیش کی۔

"نہیں نہیں دیر ہو جائے گی بس اب گھر چلتے ہیں۔" نہت نے فوراً انکار کر دیا۔
 "بھئی نہیں دیر ہوئی ابھی تو ہمیں آنے صرف تین گھنٹے ہوئے ہیں میں سہیل کو شام چار بجے تک کہہ کر آئی ہوں اور ابھی تو صرف دو بجے ہیں۔ ہم چار بجے سے پہلے گھر پہنچ جائیں گے۔ تم چلو تو۔" پھر اس نے نہت کی ایک نہ سزا اور تھوڑے فلور پر موجود عارفہ آئی کے فلیٹ کے آگے پہنچ کر ہی دم لیا۔
 تیل بجانے پر بارہ تیرہ سال کے لڑکے نے دروازہ کھولا۔
 "آئی ہر گھر میں۔" ریشم نے پوچھا۔
 "جی بیک صاحب ہیں۔" لڑکا پیچھے ہٹ گیا تو دونوں اندر داخل ہو گئیں۔ عارفہ سامنے لاؤنج میں بیٹھی تھی ان کو دیکھ کر کھل اٹھی۔
 "تو کلم و کلم مانی چائڈ! ریشم آئی ہے۔" وہ اٹھ کر ریشم سے گلے ملنے لگی۔
 "آئی! یہ نہت اہلی تھیں نا آپ اس سے۔" اس نے تعارف کرایا تو عارفہ نے اسے پیار سے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"یاد ہے مجھے میں اسے بھول سکتی ہوں اتنی پیاری بچی کو۔" وہ نہت سے بولی۔ دونوں صوفے پر بیٹھ گئیں۔
 "آج کہاں رست بھول بیٹھیں۔" عارفہ نے شکوہ کیا۔
 "شاپنگ کے لیے نکلے تھے بس تھکاوٹ ہو گئی تو سوچا آپ کے گھر کچھ ایزی ہو جائیں۔"
 اسی وقت وہی لڑکا ۳ میننگ اسکو آتش لگے ہو گلاس رکھ کر لے آیا۔
 "ہائے آئی! یہ کیوں تکلف کیا آپ نے ہمیں تو بھوک لگی تھی۔" ریشم نے تکلفی سے بولی۔
 "کھانا ابھی تیار ہے پہلے پیاس تو بجھاؤ۔" وہ دونوں گھونٹ گھونٹ سوٹ اسکو آتش پینے لگیں۔ نہت کو تو ویسے بھی بہت پیاس لگ رہی تھی اس نے فوراً ہی گلاس خالی کر کے ٹرے میں رکھ دیا۔ عارفہ اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔
 "آئی فریج پر نیا لیا ہے۔" ریشم نے صوفوں کی طرف اشارہ کیا۔

نہت کو ایک دم سے اپنا سر کھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے زور سے آنکھیں جھپکیں۔ سامنے والے گلاس پر جہاں ابھی شاید دو بج رہے تھے۔ اب بارہ بج کر دس منٹ ہو گئے تھے۔ اس نے خود پر کنٹرول کر کے ریشم کی طرف دیکھا وہ کرسی پر بیٹھی بھول رہی تھی۔ اسے لگا اس کا صوفہ بھی گول گول گھومنے لگا ہے۔ تیز تیز اور تیز تیز گول چکر میں۔

اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں قھام لیا۔
 "مہم میں مجھے کیا۔" آگے ہی بل وہ صوفے پر گر گئی۔
 ریشم نے ایک اطمینان بھری نظر اس پر ڈالی اور ہاتھ میں پکڑا گلاس ٹرے میں رکھا۔ اپنے ہنڈ بیگ کی سائیڈ پکٹ سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دیا یا عارفہ نے سائیڈ ٹیبل پر پڑا لائٹ اس کے سگریٹ کے پاس لے جا کر ان کو لپکا۔ ایک شعلہ سا ایک بل کو لپکا۔
 ریشم نے ایک لمبا کش لے کر ڈھیر سارا دھواں ناک کے راستے نکالا۔
 "سب انتظام مکمل ہے نا۔" وہ عارفہ سے بولی۔

پڑ آڑی ترچھی ہو کر لیٹ گئی۔ زینب جلے جلے پیر کی بلی کی طرح اندر باہر پھر رہی تھی۔ بارش پر خفا ہو رہی تھی۔ کبھی آمنہ سے مکالمے بول جاتی۔ کبھی باہر آمدے میں اماں جی کے پاس چلی جاتی۔ پھر وہ باہر ہی نکل کر بیٹھ گئی۔ آمنہ کھلی کھڑکی سے بارش کا نظارہ کرتے کرتے نہ جانے کب سو گئی۔ اسے پتا ہی نہ چل سکا۔

”اور وہ خواب؟“ اس نے دھک دھک کرتے دل پر ہاتھ رکھا۔ اس کا جسم برف کی طرح خٹختا ہوا رہا تھا۔ خواب اور حقیقت جیسے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ اس جاوٹی منظر کو اس کا ذہن خواب تسلیم کرنے سے انکار کر رہا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے زینب کو دیکھے گی جو بولتی ہوئی اندر آئی تھی۔

”بھئی آمنہ بی بی! تم تو خوابوں کی شہنشاہ ہو جب دل چاہا۔ ستر دراز ہونے پٹ سے آنکھیں بند کیں اور کھٹ سے خوابوں کی کیسٹ کا ٹن دیا۔ لوٹی لے لے طویل مزے دار زہرا خواب بھٹ سے حاضر نہ حقیقت کی چیخیں نہ سچ کی کروا ہٹ۔ بس مزے ہی مزے وہ بھی مفت پیسہ نہ دھیلا لگے اور مزہ بھی چوکھا آئے۔“

زینب دھپ سے اس کے قریب آئی تھی۔ وہ ابھی تک قائبہ داغ بیٹھی تھی۔

”اے سوئی ہوئی ہو کہ جاگ رہی ہو؟ زینب نے اس کے ہاتھ کو زور سے جھٹک دیا۔ اس کے جھٹکنے نے پتھو کی طرح آمنہ کے ہاتھ پر جیسے ڈنک مارا۔ سارا فوں جیسے اڑ چھو ہو گیا۔“

وہ اجنبی آواز میں بے رخی سے بولی۔ تی چاہ رہا تھا پھر سے آنکھیں بند کر کے لیٹ جائے اور وہ اتنا عجیب خواب پھر سے ریواٹنڈ کر کے دیکھے جس کا چند لمحے پہلے وہ حصہ تھی اور اب وہ کچھ بھی نہیں تھا اور یہ ”کچھ بھی نہیں“ کا خیال اسے پریشان کر گیا۔ وہ سب کیا تھا۔ اس نے پریشانی سے اپنی پریشانی مسلی۔

”اچھا تو کیا میرے جانے سے پھر سے نہیں وہ خواب آجائے گا۔ اور آمنہ بی بی! یہ دن کے خواب تو ہوتے ہی سراسر جھوٹے ہیں۔ وہ بھی بھری شام میں آنے والے خواب۔ کچھ سوا۔“ وہ خود لطف لے لے کو ہنسی۔

”کب تک ان خوابوں کے کھلونوں سے خود کو بھلاؤ گی۔ حقیقت کیا ہے میں بتاؤں۔“ اس نے ان تمام خوابوں کی۔ زینب اٹھ کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”تم آمنہ بنت عبد الرحمان المعروف صوفی صاحب آف احمد پور شرقیہ کے ایک معمولی امام مسجد کی بیٹی ہو جن کی تم آٹھ آئی تخت جگر نہیں ہو۔ تمہارے علاوہ ان کے چار اور بی جگر کے ٹکڑے ہیں جو انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ ان کا بس نہیں چلتا۔ وہ ان جگر کے ٹکڑوں کو واقعی ٹکڑوں میں بیل میں لے کر کوئی بھی ان میں سے فرشتہ نہیں بن سکا۔ سب کے سب گوشت پوست کے ڈھیروں ڈھیر خواب نشین رہنے والے کینے انسان بن گئے ہیں۔ جس کی انہیں توقع نہیں تھی اور اب اپنی خواہشوں کے خوبصورت محل کا ملبہ جب انہیں ایسی نافرمان گستاخ اولاد کی شکل میں نظر آتا ہے تو بابا صاحب کا خون کھولنے لگتا ہے۔ ان کا بس نہیں چلتا۔ وہ ہم سب کو ایک شعلہ میں ڈال کر اپنی پسند کے سانچے میں ڈھالیں اور کسی توڑ میں جا کر بیک کر دیں۔“

وہ بغیر کسی ڈر خوف کے اوچی آواز میں بول رہی تھی۔

”اس پر بے چاری ان کی صابزادی دن دیباڑے آنکھیں موند کر حسین پھولوں اور کلیوں سے بچے سینے دیکھتی ہیں۔ جن کی تعبیر ایک۔ ہمایانک اور بھاری سی زندگی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ڈپر سسٹریوں خود کو دھوکا دینا چھوڑو۔ یہ حالات سے فرار کا کوئی بہترین یا قابل عمل طریقہ نہیں ہے۔ سمجھیں ہونہ!“

وہ طنز بھرے لہجے میں ہنکارا بھرتی باہر نکل گئی۔ وہ اکثر یونسی مقابل کا خواب سے بغیر اسے نظر انداز کر کے نکل جایا کرتی تھی۔

”کس قدر فضول ہے یہ زینب بھی۔ میں کیوں حالات سے فرار چاہوں گی بھلا۔ میں کوئی ناخوش ہوں اس کی طرح۔ بابا صاحب مجھے دل و جان سے پسند ہیں اگر وہ سخت ہیں تو ہماری بہتری کے لیے ہی سختی کرتے ہیں۔ وہ کوئی ہم پر ظلم تو نہیں کرتے اور خوابوں پر کس کا اختیار ہے۔“ وہ ہاتھوں سے بال سنوارتی ہوئی کھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔

”اگر خواب خود آئیں تو اس میں کسی کا کیا تصور میں تو یونہی لیٹی تھی اور وہ خواب۔“ وہ پھر سے اس خواب کو سوچتے ہوئے اس کے فوں میں کھونے لگی۔ ”کتنا تار تکیں“ کتنا خوبصورت خواب تھا مگر پھر وہ سب کہاں چلے گئے یکایک۔ منظر اس کی آنکھوں کے آگے روشن ہونے لگا۔

”اماں جی! یہ جھومرا بی لڑکی تو نہیں لگتی تھی جو گھر سے بھاگ جائے۔“ زینب کو نت نئے چسکے لینے کا شوق تھا وہ باہر تخت پر بیٹھی اماں جی سے آج کے دن کی گرم ترین خبر بصرہ کرنے لگی۔

”ہوں۔“ اماں جی نے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ وہ ایسے بھی زینب سے بہت احتیاط بہت طریقے سے گفتگو کرتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں اس سے ذرا بے تکلفی سے بات کر لو تو بہت آگے نکل جاتی تھی۔ اماں جی نے نیلی کرپ کی قبض کا دامن سیدھا کیا اور سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگیں۔

”بارش ہلکی ہو تو ہم جائیں۔ صوفی صاحب خفا ہو رہے ہوں گے۔ تمہارے تیار ہونے میں دیر لگائی ورنہ ہم بارش شروع ہونے سے پہلے بھی نکل سکتے تھے۔“ وہ زینب کو خطلی سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

”ہم نہیں صرف آ رہے۔“ وہ منہ بگاڑ کر بولی۔ ”میں تو بہت دیر سے تیار بیٹھی سوکھ رہی ہوں۔ یہ آمنہ بی سب سے آخر میں تیار ہوئی تھیں۔“ اس نے بارش کب رکے گی۔ حویلی میں کتنا مزہ آ رہا ہو گا۔

”آمنہ نے سارے گھر کا پھیلوا پھیلوا کر سب کے کپڑے استری کیے۔ صوفی صاحب کا تجرہ صاف کیا پھر وہ نہانے لگی تھی۔“ اماں جی نے اسے جتا کر آمنہ کے کپڑے کرنے کی وجہ بتائی۔ وہ ان سنی کر کے تانگیں بھلاتی رہتی۔

”ویسے اماں جی! آمنہ کا نام اصغری ہونا چاہیے تھا مرآة العروس والی۔ آپ نے پڑھی ہے نا؟ اپنی نذیر احمد کی جو بابا صاحب نے ہمیں پانچویں سے حفظ کرنے کے لیے دی ہوئی ہے۔“

”اور تمہارا نام ابھی ہے۔“ اماں جی نے بڑھاپے میں کھڑکی میں کھڑی آمنہ کو ہنسی آگئی۔

”حالا تم اب کبھی بھی کسی سٹل تو چھوٹی ہوں آمنہ۔“ خیر و خیر کریں۔ ہائے اماں جی! کب جائیں گے حویلی۔ بارش کو بھی ابھی اتنی شدت سے ہونا تھا۔ ”وہ بیکے بیچن ہو کر کھڑی ہو گئی۔“ اماں جی! جھومر کہاں لگی ہو کی بھلا۔ اتنی تو بارش ہو رہی ہے صبح سویرے سے۔“ اسے پھر سے جھومر کی یاد دہانے لگی۔

”بھیس بہت فکر ہے اس نام کو کی۔“ اماں اس کے سینک سائے ہوں گے چلی گئی ہوگی۔“ اماں جی سگ کر بولیں۔

”اماں جی! یہ اچھی بات تو نہیں ہے تاہم گھر سے بھاگ جانا۔“ یہ اس کا دل پسند موضوع تھا اور وہ اس پر بہت بولنا چاہ رہی تھی۔ اس اماں جی ہی اسے لفت نہیں کروا رہی تھیں۔

”ہوں۔“ اماں جی نے پھر ہنوں کہہ کر پچھا چھڑانا چاہا۔

”لیکن یہاں بھی تو اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہوتا تھا۔ اس کا ابا اس کی شادی اس غنڈے ٹرک ڈرائیور سے کر دیتا۔ تو اس نے اچھا نہیں کیا؟“ وہ اماں جی سے پتا نہیں کون سا سرٹیفکیٹ لینا چاہ رہی تھی۔

”زینب!“ اماں جی نے غصے سے اسے پھر گھر کا۔ ”وہ اندین کی نافرمان لڑکیاں انہیں اپنا دشمن جان کر گھر سے جرم کے ارتکاب کا احساس انہیں کرنے کے بعد ہوتا ہے۔“ مگر وہ یہ سب ابھی زینب سے نہیں کہنا چاہتی تھیں۔ اس کی عمر ابھی ان باتوں کے لیے بہت چھوٹی تھی۔ کہیں تجسس ہی میں وہ بھی اپنا نصیب خود تراشنے کا نہ سوچنے لگ جائے کہ ادھر باپ کے سخت رویے اور گھر کے پابند ماحول سے وہ ہر حال خوش نہیں تھی۔ اماں جی کو

اس بات کا علم تھا۔ ماں تھیں بیٹی کے ہر اٹھتے قدم کو دیکھ کر اس کے خیال گمان کے بارے میں اندازہ لگا سکتی تھیں مگر وہ اسے خوش کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ صوفی صاحب اپنے اصولوں کے معاملے میں بہت سخت تھے اور جس طرح کے خیالات تھے وہ بیٹیوں کو بھی ایسی تو کسی تقدیر سے باندھنے کی کوشش کریں گے جو ان کی طرح ہو۔

ڈنڈے کے زور پر انسان کو موم کرنے والی تقدیر اور یہ بات راہبعلی بی صوفی صاحب کو کبھی نہیں سمجھا سکتی تھیں کہ دل سختی سے نہیں نرمی سے موم کیے جاتے ہیں اور زینب کا دل تو بہت نرمی سے موم ہونے والا تھا مگر صوفی صاحب کی بے جا سختی نے اس موم کو گاڑ کر بے وقت سا کر دیا تھا جس کا انہیں احساس تک نہ تھا۔

اماں جی کی گھر کی پر زینب بچک کر اپنے جوتے کا اسٹریپ بند کرنے لگی۔
 ”بیٹا! ہر گھر کا اپنا ماحول اپنے طور طریقے ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ اس طرح کے ماحول سے آئی ہو جنہاں یہ معیوب نہ سمجھا جاتا ہو۔ اچھے بڑے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں نا! کوئی بھی علاقہ کوئی بھی گھر صرف اچھے یا صرف بڑے لوگوں کے لیے مخصوص نہیں ہوتا۔ ایک ہی گھر میں ایک ہی پتہ ت کے نیچے ایک جیسے حالات میں دو تین بہن بھائی ایک دوسرے سے بالکل مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔ فطرت وراثت نہیں ہوتی جو تر کے میں منتقل کی جاسکے۔ جیسے جھومر کی ماں ایک اچھی اور نیک اور عورت و اہلی ہے مگر بیٹی کا فعل؟ اس میں ایک حد تک تو اس کی ماں قصور وار ہے مگر مکمل طور پر ہم اسے الزام نہیں دے سکتے۔ ورنہ تو نیچے اچھی بیٹیاں والدین کی رضا اور ان کی فرمائش واری کو ہی اولیت دیتی ہیں چاہے طبعاً سرکش ہوں۔ یہی اللہ کو بھی پسند ہے اور ان کی اس فرمائش واری سے خوش ہو کر اللہ ان کی زندگی خوشگوار بنا دیتا ہے۔“

اماں جی نے بڑے پیار سے دھیرے دھیرے اسے سمجھایا۔
 ”آپ کی طرح خوشگوار زندگی؟ ہے نا۔“ وہ طنز سے بولی۔

”مجھے کیا ہوا ہے بیٹا! میں تو بہت خوش ہوں۔ صوفی صاحب نے جلدی زندگی میرا اپنی بساط سے بڑھ کر خیال رکھا ہے۔ اچھا کھانے کو، پہننے اور سنے کو، رنے کو محفوظ چھت سب کا ہی ہمیشہ خیال رکھا ہے۔ وہ بظاہر سخت دیکھتے ہیں مگر وہ میرا تمہارا ہم سب کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ بیٹا! دیکھو ہم کتنے لوگوں سے شاندار اور اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس گاؤں میں بہت سے گھرایسے ہیں جہاں دن میں ایک بار بمشکل جو لہا جاتا ہے یا مسالوں بعد ہر فرد کا ایک ایک نیا کپڑا بنتا ہے۔ ہم تو اللہ کا شکر ہے ہر طرح کی نعمت سے ہر وقت لطف اندوز ہوتے ہیں اچھا کھاتے ہیں اچھا پہنتے ہیں۔ یہ سب صوفی صاحب کی توجہ ان کے خیال کا طریقہ ہی تو ہے۔“

اماں جی اتنا نہیں بولتی تھیں۔ وہ تو ضرورتاً ”بھی چند لفظ استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھتی تھیں مگر آج زینب کے خیالات کو سدھارنے کی نیت سے وہ اپنی تمام قوت اور ذخیرہ الفاظ استعمال کر لیتا جاتا تھی۔

”اماں جی! کیا صرف اچھا کھانا اچھا پہننا ہی انسان کی ضرورت ہے۔ کیا توجہ اور محبت کے اظہار کا خدا نے انسان کو اور کوئی طریقہ نہیں سکھایا۔ اماں جی کھانا اور پینا تو حیوانوں کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے۔ انسان کو تو ان کے علاوہ اور بھی بہت کچھ چاہیے۔ بابا صاحب سختی کریں بے شک کریں۔ ہمارے سدھارنے کے لیے مگر کیا ہر وقت اماں جی؟ کسی وقت تو انہیں ہماری آنکھوں میں بھی جھانکنا چاہیے۔ ہمارے اندر کی خواہش کو کھوجنا چاہیے۔ میرا کتنا دل کرتا ہے بابا صاحب ہم سے کھل ل کر باتیں کریں۔ ہمارے ساتھ ہنس کر بولیں۔ پیار سے ڈالیں۔ جھڑکیں، جھگڑیں، زینب! تمہیں کھی ہوتی جارہی ہو پھلائی میں۔ زینب بیٹا! تمہیں اس بار عید پر کیسے کپڑے بنوا کر دوں؟ تمہیں چغوزے پسند ہیں سب کے لیے مونگ پھلیاں اور صرف تمہارے لیے چغوزے لایا ہوں۔ سب سے چھپا کر کھانا۔“ اماں جی اس وقت تو۔ کسی وقت تو میری طرف۔ ہماری طرف دیکھیں۔“ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ بھاگ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ شاید پانی پینے شاید آنسو بہانے! اماں جی دکھ سے اسے جاتا رہتی رہیں۔

”یہی تو میں تمہارے بابا صاحب کو نہیں سمجھا سکتی کہ ہر وقت کی سختی تو پتھروں کو بھی بیڑہ ریزہ کر ڈالتی ہے۔ یہ معصوم تو پھر انسان ہیں گوشت پوست کے۔“ اماں جی کی آنکھوں کے گوشے نم ہونے لگے۔

”اماں جی! اب کیا کریں۔ اتنی سویر ہو گئی ہے شام ہو چکی ہے۔“ آمنہ نے کھڑکی سے انہیں افسردہ ہونے دیکھا تو فوراً ”باہر آکر ان سے بولی۔“

”یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں۔“ وہ فوراً ”سنبھل کر بیٹھ گئیں۔“

”عبدالحمید کو بھیجا تھا کہ جا کر ٹانگہ ہی لے آئے دین محمد کا۔ وہ بھی ابھی تک نہیں اوتا، وہاں سیدہ بی بی کا منہ پھول جائے گا کہ ہم لوگ ان کی برابری کی کوشش میں خاص بنتے ہیں۔ گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح صبح سویرے کیوں نہیں آکر بیٹھے۔“ انہیں سیدہ کی طنز بھری نگاہ یا اونچی جو کل شام حویلی جانے پر سیدہ نے ان پر ڈالی تھی۔

”اس میں خاص بننے والی کون سی بات ہے، صبح سے جا کر وہاں کیا کریں۔ ہزاروں تو ان کے ملازم ہیں، عورتیں بھی مرد بھی کام کرنے والے۔ یہاں گھر کا بھی سارا کام ہوتا ہے اور نمازوں کی ادائیگی بھی۔ بابا صاحب خود ہی تو ہمیں منع کرتے ہیں، ادھر ہمیں سویرے سویرے جانے سے۔“ آمنہ بولی۔

”یہ بات بڑے لوگ نہیں سمجھتے۔ ویسویہ زینب کہاں چلی گئی۔ ابھی تو ادھر ہی بیٹھی تھی میرے پاس۔“ زینب نے اس طرح اٹھ کر جانے سے ان کا دل بے چین ہوا جا رہا تھا۔

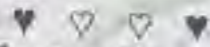
”اماں جی! اے کیا یوں ٹانگہ۔“ عبدالحمید ڈبوڑھی سے اندر آتے ہوئے بولا۔

”شامیاش پتڑا اب جاؤ تو کل شام کو آؤ۔“ صبح بولتے ہیں تمہارے بابا صاحب تمہیں۔ کوئی کام تو ڈھنگ سے کر لیا کرو۔“ اماں جی اسے دیکھ کر حنپلی سے بولیں۔

”سارا نزلہ میرے اوپر ہی گرتا ہے، میں ہی فالٹو ہوں اس گھر میں۔“ وہ غصے سے بولا۔ ”دین چاچا حویلی کو کچھ سواریاں لینے گئے ہوئے تھے۔ یہ آتے تو کل انہیں لے کر آیا خود آتے کے آگے جت جاتا۔ اب جلدی چلیں ورنہ ادھر بابا صاحب کو میری ہونٹاں کا ایک اور بہانا مل جائے گا۔ آجائیں باہر ہوں میں۔“ وہ غصے اور بیزارگی سے کہہ کر باہر نکل گیا۔

اماں جی نے کہی سانس لیتے ہوئے چلاؤ اوڑھی۔ بارش ابھی بھی ہو رہی تھی۔

”زینب! آمت! جلدی کرو بچے! بارش تو لگتا ہے آج نہیں رکے گی اور وہ سویرے کی بھی صبح کی حویلی جا کر بیٹھی ہوتی ہے۔ جا کر اس کی اچھی طرح خبر لے لوں۔ بہت خود سر ہوتی جارہی ہے یہ۔“ وہ ہر دوڑاتے ہوئے کمن عبور کرنے لگیں، آمنہ اور زینب بھی چادریں اوڑھ کر ان کے پیچھے آگئیں۔



پتوں کو اگر معلوم ہو جائے کہ ہرے بھرے ہونے کے بعد خزاں کی بے دروہا نہیں انہیں کہاں کہاں اڑالے جائیں گی کہ چمن کی زمین بھی انہیں اپنانے سے منکر ہو جائے گی تو شاید پتے شاخوں پر اگنے سے ہی منکر ہو جائیں۔

کلیوں کو اگر معلوم ہو جائے کھلنے کے بعد پھول بننے کے بعد پتلا ہر محبت بھرے ہاتھ ان کے نازک بدن کو کیسے پتی پتی کر کے آگ پر بکھیر دس گے تو شاید کسی شاخ پر بھی کوئی کلی نہ کھلتی۔

اور اگر بیٹیوں کو علم ہو کہ جس گھر کے آئینے نے انہیں زندگی کے لمس سے محبت سے آشنا کیا ہے، تقدیر کی بے درد ٹھوکریں انہیں کن پتھروں سے جا پھوڑیں گی تو شاید زمانے میں کہیں کوئی بیٹی جنم نہ لیتی۔

”میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہیے۔ سہیل کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ تم اپنا کام بہت ہو شامی سے کرنا اسی لیے تمہیں اتنے دن پہلے سے انفارم کر دیا تھا۔ اس پراجیکٹ کے بارے میں ویسویہ عارفہ آئی، اور معاملوں کی دیکھتی رہتی ہے مگر یہ معاملہ خالصتاً ”میری زندگی کی“ سمجھو بقا کا معاملہ ہے۔ تمہیں بتانا ہے نا۔“ زینب نے ٹانگہ پر ٹانگہ رکھی اور زور زور سے جھلاتے ہوئے کہنے لگی۔ پھر ہاتھ میں پکڑے سگریٹ کا ایک گھرا کٹس لے کر زور زور سے لا تعلق سی بیٹھی عارفہ کی شکل دیکھنے لگی۔

”بڑی معاملہ فہم ہو گئی ہے تو ریٹو! کیا سہیل کو شہد لگا ہے جو تو اسی کو چٹ کر بیٹھ گئی ہے۔ ہمارے پاس کام زیادہ ہے اور کرنے والے کم۔“ عارفہ آنکھیں پچھا کر بولی۔

آٹھ عمر کی بوڑھی عمتل کی موتی خالہ ان باتوں کو نہ سمجھو گی۔ "وہ ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
 "سب کام بہت ہو شیاری سے کرنا۔ مووی تصاویر سب بہت پر فیکٹ ہونا چاہیں ایک دم اور جھل۔ کہیں
 جھول نہیں چھوڑنا۔ انڈر اسٹینڈ۔" وہ اپنا شولڈر بیگ اٹھانے ہوئے بولی۔
 "تم نے بتایا نہیں۔ کام ختم ہونے کے بعد چھو کمری کا کیا کرتا ہے۔" عارف نے سگریٹ لٹش ٹرے میں سلا۔
 "تمہارے کسی کام آئے کی تو تم رکھ لیتا پوس کے طور پر ورنہ تصاویر اور مووی دکھاتا۔ خود ہی کہیں چلو بھربانی
 میں ڈوب مرے گی۔ اس طبقے کے لوگوں کو عزت کی خاطر خود کشی کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ میری کمانی
 Authentic (حقیقی) ہو جائے گی کہ نہ بہت راجیلہ کے کسی کزن کے ساتھ بھاگ گئی۔ آخری کال وہ راجیلہ کو ہی
 کر کے آئی تھی۔ آگے جو تمہارا دل چاہے کرنا۔ ایسا گولڈن چانس تمہیں زندگی میں دوبارہ نہیں ملے گا۔ مال انجیر
 و سیلا خرچ کیے مل رہا ہے وہ بھی کھرا ایک دم زبردست۔" وہ آنکھ دیا کر بولی۔
 "دعا نہیں دو اپنی رہیشو کو۔ چلتی ہوں۔ کافی ٹائم ہو گیا۔ گاڑی بڑی دور پارک کی ہوئی ہے۔" وہ بیگ کندھے سے
 لٹکا کر بیوی دروازے کی طرف بڑھی۔

"وہ جاتے جاتے تھے۔" وہ جاتے جاتے ترک کر بولی۔
 "فکر ہی نہ کرو۔ دونوں کی دہلیز میں میرے پاؤں تلے ہیں۔ بڑے لمبے چکروں میں چھانس رکھا ہے۔ دونوں کو۔ راشد تو
 ایک سپرٹ سے فوٹو کرائی اور مووی سیکنگ میں۔ اور عاصم کا کام بھلا کون سا دشوار ہے۔ اس کے تو مزے بنی مزے
 ہیں۔" وہ آنکھ دیا کر زور سے بولی۔ "تم جاؤ۔ ڈونٹ وری۔ سب فکرس اپنی بلا میں عارف۔ آئی کو دے جاؤ۔
 پائے۔" تو ریشم نے بھی مطمئن ہو کر ہاتھ ہلایا اور دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔
 "ارے چھو کرے! آکر دروازہ لاک کر۔" عارف نے کچن کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔

اس سے پہلے کہ وہ لڑکھائیں سے نکل کر دروازہ لاک کرنا۔ دو لڑکے بے حد گھبرائے ہوئے حواس باختہ دروازہ
 دھارے کھول کر اندر داخل ہوئے اور دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔
 "تمہارے عارف غصے اور جھڑپ سے ابھی جگہ سے اٹھتے ہوئے دونوں کو دیکھ کر زور سے چلائی۔
 "مزید افسوس ہو گیا۔ سارا کام ٹھیک ہو گیا تھا۔ رتی مال لے کر بھی فرار ہو گیا تھا بلکہ کے ساتھ۔ جو کیدار کو تو
 ہم نے جاتے ہی ختم کر دیا تھا۔ میں اور وحید بائیک تک پہنچنے والے تھے کہ اچانک پیچھے سے پولیس کی پش پشنگ
 آئی۔ رتی کبجٹ گاڑی بھاگنے لگا یا بائیک دور تھی۔ ہم بھاگ نکلے پڑی مشکل سے پولیس کو بچھوڑے کر اوھر
 تک پہنچے ہیں۔ یہی تمہاری سٹیٹن تھا کیا کرتے۔"
 بلیک لیڈر کی جیکٹ اور جینز میں ملبوس لہباڑ کا لڑکا بے تحاشا پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان تفصیل
 بتانے لگا۔ دو سرالڑکا بھاگ کر فلیٹ کی بالکنی میں چلا گیا تھا شاید شیپے دیکھنے کے لیے۔

"یا ہر پولیس آگئی ہے۔ اس کے ساتھ مزید فورس ہے۔ اوما کی گاڑی بھاگوا دھرے۔" پالکتی میں کھڑا لڑکا ایک دم
 سے چلا آیا اور چھلانگ مار کر لاونچ میں آگیا۔ اس کی پکار سنتے ہی پہلے لڑکے نے حڑ کر بیوی دروازہ کھولا اور دونوں
 آمدنی طوفان کی طرح بھاگ نکلے۔
 "اوما کی گاڑی۔ سٹیٹن ہوا ان دونوں کا۔ ہمارے پلان کا بیڑہ غرق کر گئے۔ یہ فلور تو پہلے ہی پولیس کی نظروں میں
 ہے۔" عارف کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"مزید پولیس۔" چھوٹا لڑکا جو کچن کی کھڑکی سے دیکھ رہا تھا اندر آکر فن چہرے کے ساتھ بولا۔ "آپ نے گاڑی
 کو بھی واپس بھیج دیا اب تو پولیس ضرور ادھر کی تلاشی لے گی۔ بھاگ نکلیں آپ بھی ادھر سے ہم تو مع ثبوت کے
 پکڑے جائیں گے۔" وہ اٹھنے ہی لگے کسی جست لگا کر دروازے سے باہر نکل گیا۔
 عارف جیسے خواب سے جاگی ٹیک کر اندر اسٹوڈیو کی طرف بڑھی۔
 "راشد! عاصم! پولیس کا ریڈ پڑ گیا ہے۔ بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ۔ سب سامان پیچھے پلاٹ میں پھینک دو۔ لڑکی

"باہ۔ باہ۔" ریشم نے ایک بھر پور تکتہ لگایا۔
 "واؤ آئی۔ آئی۔ آئی بات کہی ہے۔" ایک طویل تکتے کے بعد وہ دروازہ کھول کر کوری "شہد لگا سہیل۔"

"چلو یونہی سمجھ لو عارف۔ آئی! تم عمر میں اور تجربے میں یقیناً مجھ سے زیادہ ہو مگر زمانہ میرا بہر حال تمہارے
 زمانہ سے آگے ہے اور آج کا زمانہ سپر سوئک انفارمیشن کا زمانہ۔ آج کا پچھرا تمہاری عمر کے تیس سال فرد سے زیادہ
 ہو شیاری سوچ اور آگے کی نظر رکھتا ہے۔ اس کے پاس معلومات و مشاہدات کے انبار ہیں اور تم لوگ ابھی تک وہی
 پٹے پٹائے فارمولے سنے سے لگائے بیٹھے ہو۔ اسی لیے تو تم لوگوں کی آخری عمر سرکاری اسپتالوں کے برآمدوں میں
 اڑیاں رگڑ رگڑ کر گزرتی ہے اور تمہارے عاشقوں میں سے کوئی بھولے سے بھی تمہارے ورثہ کو نہیں آتا۔ ایم
 آئی رائٹ مائی ڈیئر آٹھ؟" اس نے آگے کو جھک کر لٹش ٹرے میں سگریٹ سلا۔
 عارف نے ناگہمی سے کندھے اڑکائے۔ "تو میں کون سی زبان بول رہی ہے تو۔"
 "وہ تو تم سمجھنا نہیں چاہتیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولی۔
 "مطلب؟" عارف نے گولڈ لائف کا بیگٹ کھولتے ہوئے ابھرا جگائے۔

"تمہارا سنہری فارمولہ۔ بازاری عورت بھی کسی کی نہیں ہو سکتی۔ کوٹھالی اس کا ایمان ہے۔
 کوٹھے سے پھرنے کی تو دھندے سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔ کوٹھا نہیں سجانے کی تو کھانے کی کمان سے نہ آٹھنی!
 میں اس فارمولے کو بائبل نہیں بائبل تو وہ زور سے سہرا کر بولے گئی۔

"یہ تم لوگوں کی بھول ہے۔ تم ہو تو میری ماما کی کزن مگر عقل میں ان سے بہت دور ہو۔ دیکھا ماما کو کیسا کانٹھ کا الو
 ڈھونڈا اس نے اور ماما ایک ٹکٹ میں دو مزے لے رہی ہے۔ جب چاہا منہ کا ڈاؤن آگے بدلنے کو تم سے آئی جب چاہا
 اس بیگ شریف سراج کے ٹیکسٹ کی عزت دار زہرین تھی۔ ہے نا عقل مندی۔ کوٹھا سجانے لگے وہت میں
 کھیل رہی ہے۔" وہ رکی۔

"میں نے بھی ماما کا سنہری اصول پلے سے باندھ لیا۔ سہیل جیسا کانٹھ کا الو مجھے کہیں نہیں ملے گا جو میری خاطر
 اپنے خاندان کی عزت واؤ برنگ کر مجھ سے کورٹ میں کر سکتا ہے۔ وہ بغیر دھماکے سہرا اٹھائے میرے اشاروں پر
 تا عمر بندر کا ناچ بھی دکھا سکتا ہے۔ سہیل کے ساتھ مجھے دیکھ کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ ہے گین پائی کی بیٹی جس نے
 اپنی زندگی کے بیس سال کوٹھے پر گھنگھروں کی چھن چھن پر ناپتے گزارے۔ اس کی بیٹی ایک بہت بڑے
 گورنمنٹ بینک آفیسری عزت دار بیگم ہے اور یہ نہ بہت چیز یا یہ تو میرے آگے پھرنے والی نہیں تھی۔ اس
 جیسی تو کئی میری جیب میں پڑی ہیں یہ تو بس اس کے بڑھے کھوسٹ مرحوم باپ نے مجھے ضد دلائی کہ میری بیٹی
 بہت شریف بہت پارسا ہے۔ مجھ جیسی گھٹیا شہرت کی حامل لڑکی اس کی بیوی تو اس کی مخصوص بیٹی کی پارسانی پر
 حرف آئے گا۔ بس اس دن سے ریشم نے سوچ لیا تھا کہ اس بڑھے کا غور ایک دن پاش پاش کر دوں گی۔ جب اس
 کی بیٹی کی عزت کے اشتہار گلی گلی لگیں گے۔ پر اس کی قسمت اچھی تھی۔ یہ دن دیکھنے سے پہلے ہی کبجٹ دنیا
 سے اٹھ گیا۔ خیر۔" اس نے رک کر گہرا سانس لیا۔

"یہ رہ گئی تھی بیوی۔ اس کو مسلنا ضروری تھا کہ سہیل زندگی بھر مجھ سے آنکھ اٹھا کر بات نہ کر سکے۔ صاف
 کہہ دوں گی۔ پہلے اپنی بہن کے گروت تو دیکھو پھر مجھ سے بات کرنا۔" ریشم کا بیان بہت واضح بہت زبردست تھا۔
 عارف رشک بھری نگاہ سے اس گل کی چھو کمری کو دیکھنے لگی جو عقل میں اس سے گئی کتابی لگ رہی تھی۔

"اور وہ گئی شہد والی بات تو عارف تھی! سہیل تو ہے ہی سونے کی کان اور اس کان کی دریافت کا سہرا میرے سر
 ہے۔ میں اس کان سے کھو کھو کر سونا نکالوں گی۔ اپنی اور تم سب کی بھولیاں بھروں گی اور جس دن یہ کان خالی
 ہوئی۔ سہیل نرا مٹی کا توہ بن گیا اس دن ریشم کھلے آسمان کو نئے سرے سے سج کرنے نکل پڑے گی اور کان کو مٹی
 کا توہ بنانے میں بہت دن نہیں لگاؤں گی آٹھنی! وقت کی قدر رہی تو میری زندگی کا سب سے اہم اصول ہے
 جوانی گزر گئی تو اس دن سمجھو و خدا چوٹ اور اس دن کے آنے سے پہلے مجھے بہت کچھ حاصل کرنا ہے اور تم ڈیئر

کو بے شک ادھر ہی پڑا رہے۔ عارفہ کی تیز آواز پر وہ دونوں اپنے کام میں مصروف تھے، اچھل ہی پڑے۔ عارفہ نے نفرت سے ایک تیز نظریے ہوش برہنہ نہت کے وجود پر ڈالی اور پھر بڑے اطمینان سے فلیٹ سے باہر نکل کر بیڑھیاں اتر گئی۔

عاصم بھی عارفہ کے پیچھے ہی بیڑھیاں پھلانگ گیا تھا۔ سب کچھ ایسے ہی پڑا تھا۔ ادھر جان بچانے کی فکر تھی سالان کی پروا کس کو تھی۔ راشد کمرے سے نکلے نکلے ایک پل کو غصہ کا۔ اس نے پلٹ کر اس بے گناہ بے قصور مجبور لڑکی کو دیکھا۔ اس کا دل جیسے کانپ اٹھا۔

”یہی کچھ تو میرے ساتھ کیا ان طعن لوگوں نے اور میں بھی یہی کچھ کرنے چلا ہوں مخلوق خدا کے ساتھ۔“ اس نے اگلے ہی لمحے بیڈ شیٹ تھینتی اور نہت کے اوپر ڈال کر اسے ہانپوں میں اٹھا لیا۔

اسٹوڈیو کی کھڑکی اس بلڈنگ کے پچھلی طرف کھلتی تھی۔ وہ ایک خالی پلاٹ تھا جس کے گرد چھوٹی سی اینٹوں کی دیوار تھی۔ پلاٹ میں لوگ کچرا پھینکا کرتے تھے۔ کارپوریشن کا ٹرک کئی گئی ہفتے ادھر سے کچرا اٹھانا قبول جاتا تھا اب بھی اس پلاٹ میں کوڑے کی کثیر مقدار جمع تھی۔ جگہ جگہ ڈھیر بنے ہوئے تھے۔ راشد نے کھڑکی کھینچوں سے کھول کر ایک پل کو سوجا اور ہانپوں میں اٹھانے اس بوجھ کو چار منزلہ نیچے کوڑے کے اس ڈھیر پر پھینک دیا چادر سمیت ڈھیر کے اندر چھپ کر وہ جیسے کوڑے کے ڈھیر کا ہی حصہ معلوم ہونے لگا۔ راشد نے پلٹ کر کمری پر پڑے اس کے کپڑے اٹھا کر اسی ڈھیر کے اوپر پھینک دیے۔

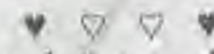
”اس کی بے ہوشی کی ذمہ دار بھی تین گھنٹوں کی ہے۔ اللہ کرے یہ ان تین گھنٹوں کے دوران ہی کچرے کے نیچے دم گھٹ کر مر جائے۔“ راشد نے اس کے حق میں صدق دل سے دعا کی۔

گندھے سے لٹکے کیمرے کو کھولا اور اس کی فلم نکال کر اس کے گلوے گلوے کیے اور اسی ڈھیر پر پھینک دیے۔ یہی حال اس نے وہ پوڈو فلم کا بھی کیا پھر کھڑکی اس نے اچھی طرح بند کر کے وہ دیوار کیا اور کمرے سے نکل کر یا لگائی کے وانہیں طرف جاتے پانی کے پائپ کے ساتھ لنگ کر نیچے اتر گیا۔ پائپ کے فلیٹ کے اندر داخل ہو چکی تھی۔ اس کے کان بھاری بوٹوں کی آواز سن چکے تھے۔ وہ پانی کے پائپ سے نکلتا ہوا پیچھے مٹی میں اتر گیا۔

”پینک ڈیکٹی کے ان مشور ملزموں کی تلاش میں پولیس نے تو ہمارے نئے میں ساری بلڈنگ کے فلیٹ چھان مارے۔ اس فلیٹ کی خصوصی تلاش ہی گئی جہاں سے کچھ مشکوک چیزیں ملی تھیں اور جس میں کوئی موجود نہیں تھا اسٹوڈیو کی کھڑکی کھول کر ہر طرح سے جائزہ لیا گیا کہ وہ دونوں ادھر سے ہی تو نہیں بھاگے۔“

کھڑکی کے نیچے کوڑے کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں تھا اور چار دیواری کے باہر سڑک پر ٹریفک بھاگ رہی تھی۔ سورج ڈھل چکا تھا اور شام کے اندھیرے ہر طرف پھیل رہے تھے۔

”وہ دونوں ادھر سے فرار ہو چکے ہیں۔“ پولیس انسپکٹر نے حتمی انداز میں کہا اور باہر نکل گیا۔ تلاش لینے والے چاروں سپاہی بھی اس کے پیچھے نکل گئے۔



”باباجان! آپ جلدی سے تیار ہو کر باہر جائیں۔ مہمان آنا شروع ہو گئے ہیں۔ بارش کی وجہ سے مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام تو اندر ہال میں کیا گیا ہے۔ مگر گیسٹ پر بھی تو کسی کو نوٹیکس کرنے کے لیے موجود ہونا چاہیے ناں اس بارش کو بھی آن ہی ہونا تھا بر سے جاری ہے بغیر سالن کے لیے۔“ سیدہ اندر کمرے میں داخل ہوتے ہی پولیس۔

سیدہ سلطان شاہ اپنا کلاہ سر پر سجا رہے تھے۔ کلف شدہ لٹھے کے سفید براق۔ وٹ پر بلیک ویسٹ کوٹ پہنے وہ تیار کھڑے تھے۔

”انشاء اللہ بہت اچھے لگ رہے ہیں باباجان۔ بہت ونڈ سم۔“ سیدہ باپ کو دیکھ کر محبت سے مسکرائیں۔

”شکر یہ بیٹا جی۔“ وہ بھی آئینے میں دیکھتے ہوئے جواباً مسکرائے۔

”سلطان بخت کدھر ہے؟ وہ تیار ہوا کہ نہیں۔ آج صبح سے میں نے اسے نہیں دیکھا حالانکہ انتظام تو سارا وہ

چکا ہے۔ بہت لوگ ہیں کام کرنے والے مگر سیدہ! تم خود سوچو، انتظامات کو دیکھنے کے لیے بھی تو کسی کو سر پر موجود ہونا چاہیے نا اور یہ سلطان بخت پتا نہیں یہ اپنی ذمہ داریوں کو کب محسوس کرے گا۔“ وہ پرفیوم لگاتے ہوئے بولے۔

”باباجان! امت پوچھیں۔ اسی کا تو رونا ہے سارا۔“ سیدہ بے دم سی ہو کر صوفے پر گر گئیں۔ ”سر پر موجود ہونے کے واسطے تو میں اس طرف اور اس طرف کھن چلن کر رہ گئی ہوں۔ ادھر کھر کے کاموں کی نگرانی کرنے والا کوئی نہیں۔ شہر نہ ہے مگر اسے بھی کدڑے بھرنے سے ہی فرصت نہیں۔ اس کا بچپنا بھی بھائی کی طرح خدا جانے کب رخصت ہو گا ورنہ تو اس کی عمر کی لڑکیاں ہمارے ہاں پورے پورے گھر کی ذمہ داری سر پر اٹھاتی ہیں۔ اماں جان رخصت ہوئیں تو میں کوئی بیس بیس برس کی تھی محض چودہ سال کی اور آپ گواہ ہیں باباجان! ابھی جو آپ کو گھر میں بد انتظامی کا گناہ ہوا ہو۔“ سیدہ بھری بیٹھی تھیں۔

”سچ ہے سیدہ! تم نے بڑی بیٹی ہونے کا حق ادا کر دیا۔“ وہ ان کے سامنے بڑی کین کی گول کمری پر بیٹھ گئے۔ سلطان بخت اسی قدر لا پرواہ اور احساس سے عاری ہے۔ اس کی وجہ سے تو میرا یہ حال ہے اگر جو یہ میرا دل خوش کر دیتا ہے۔ ذمہ داریوں کو اپنے سر لے کر احسن طریقے سے نبھالیتا تو کیا بیماری اس قدر جلد بچھڑے قابو پائتی تھی۔“ سیدہ سلطان شاہ کے تھکے تھکے لہجے میں بولے۔

”باباجان! یہی تو دکھ کی بات ہے سلطان بخت۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔ ”اسے یہ سب کچھ خود سمجھنا ہے ادھر تو سمجھانے کا بھی اثر دکھائی نہیں دیتا۔ ادھر سالہ اکیلی پھر پانچ بیٹھی وہ سب سنبھال تو لیتی ہے مگر ان دنوں میں تو کم از کم اسے آرام کرنا چاہیے۔ میڈا ایک پاؤں ادھر دوسرا ادھر۔ ابھی بھی ادھر سے آ رہی ہوں۔ سب کاموں کو فائل کر کے سوٹ کیسوں کو لالک لگا آئی ہوں۔ جینز کا آؤٹ سے زیادہ سامان تو آئی چکا ہے اور یہ بھی ادھر مسئلہ ہے کہ اسے سیٹ کون کروائے۔ اسی لیے تو میں نے سب سامان ایک کمرے میں رکھوا کر باہر سے کالا کلو اور تے خود ہی صاف کرنے کی تو اپنی مرضی سے سیٹ کر کے گی۔ میری تو اہمیت تو اب دے گئی ہے۔ پاؤں اور ٹانگوں میں شدید درد ہے۔ ان سبوت لڑکھوں کے پیچھے بھاگ بھاگ کر۔“ سیدہ نے ٹانگیں اٹھا کر صوفے پر رکھ لیں اور اپنے دونوں پاؤں ہاتھوں میں لے کر ہولے ہولے دبانے لگیں۔

”بیٹا! تم نے کچھ دیر آرام کر لیتا تھا۔ کسی سے دلو الینا تھا اتنا رپوڑوں کو کول کا یا ہر پھر رہا ہے۔ اس طرح جو تم اندر ریٹ رہو گی۔ تو بیمار پڑ جاؤ گی۔“ اسی تو اصل فائنل سن رہتے ہیں۔ ”باباجان! فکر مند ہی سے بولے۔“

”باباجان! اتنا تا کہ نہیں ہے میرے پاس بس۔ آج اور کل کا تو دن ہے۔ سو لینے کی خیر ہے ادھر تو کوئی خاص کام نہیں ہو گا۔ شام سے پہلے تو آپ سب کو شہر چلے جانا ہے ہوٹل کے فنکشن کے لیے۔“

”ہوں۔“ وہ کسی گہری سوچ میں لگے تھے۔

”کیا سوچ رہے ہیں باباجان؟“

”زندگی کا سب سے سیدہ! جو میں طے کر آیا ہوں اب تو چند قدم باقی ہیں تو چاہئے ایک حسرت میں طے کر لوں یا ذرا ٹھہر ٹھہر کر۔ مگر تا تم زیادہ نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے زندگی میری آنکھوں کے سامنے دور کہیں بہت دور بھاگی جا رہی ہو اور اس کے تعاقب میں میرا دم پھولا جا رہا ہے سیدہ یہ۔“ ان کے چہرے کا رنگ یک لخت زرد ہو چکا تھا آنکھوں میں عجیب سی وحشت برسنے لگی تھی۔ خالی خالی نظروں سے وہ سیدہ کو دیکھ کر بے بسی سے بولے۔

”باباجان! یہ سب ایسا مت کہیں۔ بہت کریں۔ انشاء اللہ آپ کا باقی پاس کامیاب ہو گا۔ ڈاکٹرز آپ کی تمام رپورٹوں سے مطمئن ہیں۔ بس ایک ماہ کی تو بات ہے۔ انشاء اللہ آپ ہنستے مسکراتے اپنے قدموں پر چل کر جو ملی

آئیں گے اپنی راہد حالی سنبھالنے۔“ سیدہ اٹھ کر ان کے فریب آئیں۔ ”ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر تسلی دیتے ہوئے بولیں۔“

”کیا ڈاکٹرز۔ کیا ان کی رپورٹس ہونے۔“ وہ استہزائی انداز میں ہلکا سا ہنسے۔ ”میرا دل مطمئن نہیں سیدہ! ڈاکٹرز

افعال کی خبر مل جاتی ہے۔ مجھے بھی آپ کو بھی۔ نظر انداز کر دیں تو الگ بات ہے اس کی موجودگی میں گاؤں کے لوگ خود کو محفوظ نہیں سمجھتے۔ یہ ہمارے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے جب حاکم کے سامنے میں رہنا خود کو غیر محفوظ سمجھے حالانکہ بارہا میں سلطان کو یہ یاد کر چکی ہوں کہ اس طرح کی چھوٹی حرکات اسے زبا نہیں دیتیں۔ اس کا منصب ان باتوں سے بہت اعلیٰ ہے مگر جس شخص کو اپنی پہچان نہیں وہ کسی کی کیا پہچان رکھ سکتا ہے۔

”شہر میں خدا جانے اسے کون سی بلا پڑتی ہے آج کل دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا ہے اس پر۔ اور سمجھتا ہے مجھے کچھ خبر نہیں۔ اس کے کارندے اس کے ساتھی بعد میں ہیں میرے وفادار پہلے۔ وہ پلک بھینکنے سے بھی پہلے مجھے سب خبر کر دیتے ہیں اور گھاسل کر دینے والیوں کے طریق کار سب وہی ہیں صرف شکار تازہ میں بدل لی ہیں۔ انہوں نے۔ کوٹھوں سے اتر کر کونٹھیاں آباد کر لی ہیں۔ سیدہ! میرے جانے کے بعد سلطان پر ذرا کڑی نگاہ رکھنا خاص طور پر جب یہ شہر جائے۔ تمہارا بیٹا زوار شاہ اب بڑا ہو رہا ہے اسے بہانے بہانے سے سلطان کے ساتھ کر دیا کرو۔ کچھ بڑنس کی اسجھ اسے بھی آجائے گی اور کچھ شاید سلطان کو بھانسنے کی حیا آجائے۔“

”ہونہ۔“ سیدہ منہ بنا کر بولیں۔ ”اسے ہونوئی کی حیا نہیں تو بھانسنے کی کیا آئے گی۔ کئی بار حسین شاہ نے مجھے سلطان کی شرکی مصروفیات کے بارے میں واضح الفاظ میں بتایا۔ میں جان کر انجان بن گئی۔ چھوٹ موٹ اس کی صفائی میں قسمیں کھاتی رہی مگر میرے قسمیں کھانے سے۔۔۔“ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

”کون ہے آجاؤ اندر۔“ سیدہ جماد اور اچھوڑ کر بولیں۔

”وہ شاہ جی! باہر مہمان آئے ہیں۔ آپ کا پوچھ رہے ہیں۔ دور سے آئے ہیں جی شاید اسلام آباد سے۔“

سبطین شاہ کا ملازم خاص اندر آ کر وہ دیکھنے میں بولا۔

”وہ آفریدی صاحب نہ ہوں۔ میں دیکھتا ہوں جا کر۔“ سبطین شاہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ”سیدہ! جاؤ دیکھو سلطان کو بھیجو جا کر۔ خاصا نام ہو گیا ہے چلتا ہوں میں۔“ وہ کہہ کر ڈرا تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔

بارش کی شدت کے باوجود ہال مہمانوں سے کچھ اسیچ بھر چکا تھا۔ ہال سے باہر بیوی رہنے سے اتنے تک سرخ سنہری شامیانے تھے ہوتے تھے۔ لٹلا ٹنٹس کی تیز روشنی نے در تک ساحلوں کو جگمگا رہا تھا۔ روشنی اتنی زیادہ تھی کہ زمین پر بڑی سوئی بھی ڈھونڈنا مشکل نہ تھی۔ سبطین شاہ اپنے خصوصی مہمانوں سے بڑی گرجوٹی سے ملے۔ انہیں لے کر وہ اسیچ پر اپنی نشست خاص کی طرف بڑھے۔ اسیچ کو بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ سارے اسیچ پر سرخ رنگ کا دبیز قالین بچھا تھا اور سینٹر میں خوبصورت رنگوں اور تیل پونوں سے سجائے ہوئے چھوٹے چھوٹے میز کے دو سرے طرف ڈارک میبل ویلوٹ کے بڑے بڑے صوفے اور سائیزوں پر کرسیاں رکھی تھیں صوفوں کے نرم و گداز کھنوں میں آدمی دھنستا چلا جاتا تھا۔ سینٹرل میبل کے عین اوپر خوبصورت فالوس روشن تھا شاہ صاحب اپنے خاص مہمانوں کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ لڑانے لگے اور اندر سے سلطان بخت کی غیر حاضری پر تپتی و تاب کھاتے رہے۔

صوفی صاحب اسیچ سے نیچے ہال کے بیرونی دروازے تک پھٹی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھے تھے۔ وہ شام کو ہی شاہ صاحب سے مل چکے تھے۔ اس لیے اپنی جگہ پر بیٹھے رہے انہوں نے ذرا گردن موڑ کر دیکھا۔ عبدالعصین ان کے بائیں طرف بڑی نیمری کرسی پر چیکے سے آکر بیٹھ گیا تھا۔ صوفی صاحب نے اسے گھور کر دیکھا وہ ان کی مائیک کے باوجود خاصا لٹ آیا تھا مگر وہ ان کی ”کھوری“ کو نظر انداز کیے سامنے اسیچ پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ صوفی صاحب نے اپنی کرسی پر پہلو دلا۔

”پتا نہیں اس گدھے کو کب سمجھ آئے گی۔“ وہ جھنجھلا کر لیوں میں بڑھلائے۔ جلیل اسیچ کے دائیں طرف کونے میں کھس کر کھڑا تھا۔ انہوں نے اسے آنکھ سے قریب آنے کا اشارہ کیا وہ بیوقوفانہ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ جلیل کی اس خوبی پر توجان دیتے تھے۔ بوتل کے جن کی طرح ہر وقت ہر جگہ دستیاب ہو جاتا تھا۔

”اس عبدالعصین کے پیچھے کو جا کر شاہ صاحب کو سلام کر کے آئے۔ آکر چوڑا ہو کر کرسی پر ڈھے گیا ہے۔ ابو خبیث۔“ وہ غصے سے وائٹ کچکا کر دھم ٹون میں بولے۔ جلیل ان کا پیغام لے کر عبدالعصین کے پاس چلا گیا۔ صوفی صاحب کا حکم سنتے ہی عبدالعصین اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھا وہ اسے شعلہ بار نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ اس نے دوبارہ گردن موڑ کر جلیل سے کچھ کہا۔

”وہ جی عبدالعصین کتنا ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ آئیں۔“ جلیل نے پاس آکر پیغام دیا تو صوفی صاحب مل کھا کر رہ گئے اور پھر ناچار انہیں اٹھ کر اسیچ کی طرف بڑھنا پڑا۔ عبدالعصین بھی ان کے پیچھے چل پڑا۔

”خدا کر دی شاہ صاحب! آپ نے بھی۔ صرف چار دنوں بعد آپ کی فلائٹ ہے جدہ کے لیے۔ ہم نے تو آپ کے اعزاز میں عشائے دنیا تھا لگے ہفتے دو لہا صاحب کے ہمراہ۔“ آفریدی صاحب سبطین شاہ سے کہہ رہے تھے۔

”مجھوڑی ہے نا آفریدی صاحب! معلوم تو ہے سب آپ کو۔“ شاہ جی سامنے آتے صوفی صاحب کو یکسر نظر انداز کر کے بولے۔

”واپسی کب ہوگی؟“

”انشا اللہ چار ماہ بعد بشرط زندگی۔“ شاہ جی اسکرانے ”زندگی نے وفا کی تو آپ کی دعوت ادھار رہی۔“

”اسلام و علیکم شاہ صاحب۔ مبارک ہو۔“ صوفی صاحب نے اسیچ پر آگے بڑھ کر شاہ جی کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھائے تو سبطین شاہ کو باطل خواستہ ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا اور بے دلی سے ہاتھ بھی تھامتے پڑے۔

”جو علیکم خیر مبارک۔“ انداز لٹھ مار سا تھا۔ وہ ایک پل کے لیے صوفی صاحب کی طرف متوجہ ہوئے تھے دوسرے پل پھر آفریدی صاحب کی طرف رخ موڑنے لگے۔

”شاہ جی! یہ عبدالعصین آیا ہے آپ کو سلام کرنے۔“ صوفی صاحب ملتجیانہ انداز میں انہیں متوجہ کرتے ہوئے بولے۔

”ہوں۔“ شاہ جی نے ابرو اٹھا کر عبدالعصین کو بڑی نخوت سے دیکھا اور مصافحہ کے لیے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو قطعاً ”نظر انداز کر دیا۔“

”تمہارا بڑا بیٹا نہیں آیا صوفی۔“ ان کا لہجہ حقارت بھرا تھا۔

”جی وہ آجائے گا آج رات یا۔۔۔“ صوفی صاحب اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھے مگر بڑا کر رہ گئے۔

”جھوٹ مت بولو۔ اتنی جی بلاؤ صوفی کے ساتھ جھوٹ تمہارے منہ پر بچتا نہیں بیٹے کو کشتہ بنوانے جارہے ہو جو اس پر گاؤں کی ہوا مسموم قرار دے دی ہے۔ بڑے پر بڑے نکال لیے ہیں تم جیسے لوگوں نے۔“ سبطین شاہ اپنے منصب سے بہت نیچے آکر بات کر رہے تھے مگر انہیں شاید اس کی خبر نہیں تھی۔

”وہ نہیں جی۔ وہ تو اس کے امتحان۔“ صوفی صاحب کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بڑے شاہ جی کے یہ روشے روٹھے انداز دیکھ کر ”اب آئے گا تو جی ادھر گاؤں ہی میں اسکول میں آپ ماسٹر لگوا دیں اسے۔“ وہ ہٹکا ہٹکا کر بول رہے تھے۔ عبدالعصین کے لیے ان کا یہ انداز اجنبی تو نہیں تھا۔ بچپن سے شاہوں کے سامنے اپنے باپ اور گاؤں کے دوسرے لوگوں کو پاؤں بڑکریات کرتے دیکھتا آیا تھا مگر پھر بھی آج اسے اس ماحول میں فضا میں بڑے شاہ کا اتنا حقیر رویہ اور بابا صاحب کا کڑکڑانے والا انداز بہت برا لگا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے جاؤ۔ ماسٹر لگوا دوں جیسے وہ لگ ہی جائے گا۔“ وہ نفرت سے بڑھلائے تو صوفی صاحب اٹنے قدموں ہوئے۔

”آفریدی صاحب! دیکھا آپ نے۔ یہ نتیجہ ہے چار حرف پڑھنے کا۔ ذرا ان لوگوں کو الف ب کی پہچان ہوتی نہیں۔ یہ اپنی اوقات بھول کر نکل پڑتے ہیں دنیا فراموش کرنے۔ اپنی اوقات بھول جاتے ہیں۔ یہ مولوی اس کا گھر میں ناک تک اتناج سے بھروا دیتا ہوں۔ تھاتے ہمارا ہیں۔ یہ کئی لوگ اور جوڑی جوڑی ہمارے ہی راج میں نقب لگانے

کی تیاری کرتے رہتے ہیں۔ آستین کے سنبولے۔ علم ہٹتا ہے تو عقل بھی بانٹو ان پیدائشی جاہل لوگوں میں اپنے گریبانوں میں جھانکنا بھی سکھاؤ ان کپڑے ٹکڑوں کو۔ ہونہ۔

سینٹین شاہ کا ایک ایک لفظ زہر میں بجا ہوا تیر تھا۔ صوفی صاحب اپنی نشست پر جا کر دوبارہ اسی عقیدت مندی سے اسٹیج پر بیٹھے اپنے ”ان داتا“ کو دیکھنے لگے اور ماتھے پر آیا پینہ اپنا تمام نیچے کر کے اسی میں جذب کرنے لگے مگر عبدالمبین اسٹیج کے پیچھے بنی جگہ پر کھڑا ان کی نفرت کا زہر اپنے اندر اتار رہا تھا۔

”چھوڑیں شاہ جی! آپ کیوں اپنا فشار خون برساتے ہیں۔ یہ تو پھوسے لوگ ہیں۔ قتالی میں زیادہ ڈال دو تو منہ کو آنے لگتے ہیں۔ ہاں خالی قتالی میں ہڈی ڈال دو تو دونوں اسی کوچے سے رہتے ہیں۔ ان کو جتنا زیادہ دوگے یہ اتنا ہی سر پر چڑھیں گے۔ ان کا علاج یہی ہے کہ انہیں ان کی اوقات سے ہرگز نہ لگاؤ۔ میرا تو یہی طریقہ کار ہے۔“

آفریدی صاحب بھی شاید ان ”چھوٹے لوگوں“ سے عاجز تھے فوراً بولے۔

”بس آفریدی صاحب! دل برباد کا ہے میرا۔ فوراً ان کی کسمپرسی پر رحم آجاتا ہے۔ کچھ خدا کا خوف کہ چلو خدا نے اتنا جو دیا ہے اس کا صدقہ سنی۔“

”شاہ جی! تمہیں اپنے ان جملوں پر کبھی دیکھنا پڑے گا بہت زیادہ۔ کاش تم اس دن کو دیکھنے کے لیے زندہ رہو تو میں تمہیں بتاؤں گا کہ چھوٹے لوگ کیسے ہوتے ہیں اور ان کو اگر قتالی بھر کر بھی دو تو کبھی بکھارو قتالی کو تم جیہوں کے منہ پر لٹا بھی دیتے ہیں۔ میں تمہیں بتاؤں گا ایک دن کہ بھری قتالی سے چھوٹے لوگ کیسے منہ پر دے مارتے ہیں جس کا مان تمہیں زمین پر ڈھنگ سے پلنے بھی نہیں دیتا۔ تم زمین کے خدا ہو تو آسمان پر بھی کوئی خدا موجود ہے۔ ایک دن تمہیں بتاؤں گا۔“

سینٹین شاہ کے رہبر کس نے عبدالمبین کے اندر آگ سی بھڑکا دی۔ ایک لاداسا کھولنے لگا تھا۔ غصے کی شدت سے اس کا جسم کانٹے لگا۔ وہ خود پر قابو پانے کے لیے زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

رات جب بارش تڑپ کر روئی تو وہاں چینی ریزیں مگر خوشبو نے

اپنی ساری پھول پتیوں اجاڑ رستوں کے حوالے کر دیں

”کاش میں نے کبھی جنم نہ لیا ہوتا نہ پیدا ہوتی اور اگر پیدا ہو گئی تھی تو اب کی مرگھپ چکی ہوتی اور آج ایک بھولی بھری کہانی بن چکی ہوتی۔“

یہ دعا بھی بی بی مریم نے اپنے لیے مانگی تھی جس پر خدا نے ان کی تسلی کے لیے فرشتے کو بھیجا تاکہ وہ اپنے ہونے پر شرمندہ نہ ہوں کہ ان کے وجود سے جنم لینے والا خدا کا نیک بندہ ایک انسانیت کے درویش اور عاجز

گیا۔ مگر وہ تو مریم نہیں تھی نہ اتنی پاک نہ پرہیزگار نہ اتنی خدا رسیدہ کہ اس دعا کے جواب میں خدا اس کے لیے آسمان سے فرشتے روانہ کر دیتا۔ وہ تو اس خالی زمین کی ایک عام ساخاک وجود بھی جس کا وجود ہی آج اسے عمر بھر کے لیے اپنی نظروں سے گرا گیا تھا۔

”کاش انسان کو وجود کے بغیر پیدا کیا گیا ہوتا۔“ آنسو بھری آنکھوں نے سراٹھا کر جگمگاتے ستاروں سے مزین خاموش تماشائی آسمان کو دیکھا۔

یا کم از کم عورت کو بے بدن پیدا کیا ہوتا کہ اس کا اپنا بدن اس کے لیے ساری زندگی کسی دشمن کی طرح صرف آرا رہتا ہے۔ وہ اپنی روح کی پروان کی طرف کیا وہ بیان کرے۔ جنم دن سے لے کر مرگن دن تک اس کا بدن ہی تو اسے اپنی طرف زیادہ متوجہ رکھتا ہے۔

بچپن ہے تو پھول سا کھلا بدن۔ جوان ہوتی ہے تو یہی بدن اس کی زندگی اس کی سلامتی کے لیے ہر لمحہ ایک ایٹم

بمبارتا ہے۔ کس لمحے ان دیکھے بے پروا ہاتھ اس ایٹم بم کے دھماکے سے اس کی ہستی کو مٹا ڈالیں پھر اسی بدن میں تو اس کی اپنی دلچسپیوں اپنے شوق کے ہزار روپے واہوتے ہیں۔ جیسا سنور ناخود کو آئینے میں رخ بدل بدل کر دیکھنا اور خود بصورت جوان جسم کو دیکھ کر خود ہی مظلوم ہونا یہ ہمہ وقت کا دھیان اسے کب اسی بدن کے اندر چھپی پراسی توجہ کی بھکارن روح کی طرف دیکھنے دیتا ہے۔

یہ بدن ساری زندگی روح کے حق کا غاصب بنا رہتا ہے۔ سب سے بڑا دشمن بھی سب سے بڑا حبیب بھی! اور پھر مرگن دن تک وہ اسی بدن کو سنوار سنوار کر اپنے مرد کی توجہ حاصل کرنے کے لیے سو سو جتن کرنی رہتی ہے اور عمر کی بوھٹی پر چھائیوں کو جھٹلانے کے لیے مصنوعی سماروں سے چھٹی رہتی ہے نا آنکھ لہجہ اجل آپہنچتا ہے تو اسے اس دکھی روح کا احساس ہوتا ہے جس کی طرف اس نے زندگی کی بہاروں میں آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا ہوتا تو جانو اس شخص کا کیا حال ہو جس کو تا عمر کی جستجو کے بعد منزل نظر آئے اور اسے چھوٹے کا اذن بھی نہ مل سکے۔

اور یہ تو احوال ہوا میں عورت کا جو تمام عمر بدن کی بھول بھلیوں میں بھٹکتی رہی۔ اسی میں کم ہو کر دھیان کی دنیا گم کر بیٹھتی ہے مگر وہ جس کلبھون ایٹم بم کی طرح بیچ رستے میں اس کے وجود و زمین کے پرچے اڑا ڈالے اس کے درد کا اندازہ کون کر سکتا ہے اور ایسے میں نہ تو آسمان پھٹتا ہے نہ زمین شق ہوتی ہے نہ مارے ٹوٹ کر گرتے ہیں۔ نہ پرندے سسم کر شور و غل کا طوفان اٹھاتے ہیں۔ بس چپ چاپ کوئی جیتے جی مر جاتا ہے اور مناظر فطرت چپ چاپ۔ تماشا دیکھتے چلے جاتے ہیں۔

”کاش میں ابوجی کے ساتھ ہی مر گئی ہوتی۔ کاش ان کی آئی مجھے آگئی ہوتی۔“ لائینی سوچوں کو جھٹک کر وہ نئے

سور سے گو میں سر دکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے گی۔

کس قدر اظہار ہے جسے جب اس کی آنکھ کھولے کے اس ڈھیر کے نیچے کھلی تھی۔ چند لمحے تو وہ سمجھ ہی نہ سکی کہ وہ کہاں ہے۔ زمین کے اوپر یا آسمانوں کے اوپر۔ اس کے چاروں اطراف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ گھٹا شور خاموشی اور جو بدبو کا طوفان اس کے ناک کے نتھنوں سے دماغ میں گھس رہا تھا اسے لگ رہا تھا اس کا دماغ چند لمحوں ہی میں پھٹ جائے گا۔ نامعلوم کہ کب سے۔ زندہ بھی تھی یا نہیں اور اگر تھی تو کب سے؟

اگر اس کی سائیس چل رہی تھی تو اس قائل جاں مشک ہونے کے ہاتھوں وہ اب تک مر گئی نہیں گئی اس نے جسم و جاں کی تمام طاقتوں کو بیکار کر کے اپنے اوپر بڑے غلاظتوں کے ڈھیر کو پرے جھٹکا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”یا اللہ میں کہاں ہوں۔“ چھوٹے سر کو تھامتے ہوئے اس نے بمشکل تمام چاروں طرف دیکھا۔

ساتھ اسے چاروں طرف دیواریں ہی دیواریں تھیں اور وہ کوڑے کے ڈھیر میں کوڑے ہی کی چھوٹی سی ڈھیر کی لگ رہی تھی۔ ماحول کا اندازہ ہوتے ہی اسے خود سے بھن آنے لگی۔ وہ جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوئی مگر اگلے لمحے اسے پھر سے اسی ڈھیر میں خود کو چھپانا پڑ گیا۔ اس کے بدن پر تو کپڑے کی ایک دو جگی تک نہ تھی۔

”یا اللہ یہ میرے ساتھ کیا ہو گیا۔“ اسے ایک دم سے کسی بہت بڑے نقصان کا احساس ہوا۔ اس نے کوڑے کے ڈھیر کو سٹوا۔ اس وقت گزرے ہوئے وقت یا آنے والے خطرے کا احساس نہیں تھا صرف بدن کو دھکنے کا سوال تھا ستر پوشی جو انسان کا سب سے پہلا احساس تھا۔ بھوک سے بھی پہلے اوم اور حوائے اپنے بدن کو چھپانے کے لیے پتوں کا لباس پہننا بے حد ضروری سمجھا تھا۔ اس وقت اسے بھی صرف اپنے جسم کو چھپانے کا خیال تھا۔ وہ

پانگلوں کی طرح کوڑے کے ڈھیر میں اس کی غلاظتوں کا احساس کے بغیر ہاتھ مارے جا رہی تھی۔

اس کی چند منٹوں کی کوشش یار آور ثابت ہوئی۔ اس کے ہاتھ اپنے کپڑے آگئے تھے۔ تاروں کی روشنی ان کو پہچاننے کے لیے کافی تھی۔

”میں یہاں کیسے پہنچی۔“ وہ کوڑے کے ڈھیر میں سسلا ہوا لباس پہن کر پلاٹ کی دیوار کے ساتھ سسکر بیٹھ گئی۔

”میں تو شاپنگ کرنے نکلے تھی اور۔“ اس نے زمین پر دو ٹوں ہاتھ مارے۔

”ترتیم! اللہ تجھے تباہ کرے جس طرح تو نے میری زندگی برباد کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور میرے اللہ وہ میرے

نہیں دیا تھا آج اس نے اذان کا ایک ایک لفظ اس طرح تول تول کر سنا جسے وہ اس پوری کائنات میں یہ مقدس الفاظ سننے والا تھا اور یہنا وجود ہے۔ ہر ہر صدا پر موتی ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی آنکھوں سے گرتے رہے جنہیں وہ ہتھیاریوں پر سجاتی رہی۔ کوئی دعا اسے یاد نہیں آ رہی تھی بس اذان کی گونج اور آواز کا احساس ہی ہر احساس پر حاوی تھا۔

”ہاں ابھی مجھے زندہ رہنا ہے۔ اگر خدا مجھے مارنا چاہتا تو اسی ڈھیر کے نیچے مار دیتا شاید میرا کچھ خاص کام ابھی کرنا باقی ہے۔ میرے خدا تو میرا گواہ ہے اور تو ہی حاکم اعلا ہے میرے بارے میں ایسا فیصلہ کبھی نہ کرنا جو مجھے از خود زندگی سے دور لے جائے کہ میں حرام موت بدتر سے بدتر حالت میں بھی قبول نہ کروں گی۔“ وہ دعا مانگ کر کچھ مطمئن سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

اسے اپنے وجود سے اٹھتی بدبو کا احساس ہوا اس نے سر جھٹک دیا۔ ”ظاہر ہے گندگی کے ڈھیر سے نکلنے والے بدبو کے جھکے بھی انھیں کے خوشبو تو آنے سے رہی اور جب یہ ناقابل برداشت بدبو دنیا سونگھے گی تو کون اس کا ایک بل کا ساتھ بھی گوارا کرے گا کون؟“

کیچن شہباز کی شبیہ اس کی آنکھوں کے آگے لہرائی تو وہ جیسے ڈھے جانے کو تھی۔ اس کے قدموں سے جان نکلنے لگی۔ اسے ملتے کافی وقت گزر گیا اور انسان کی سیاہی میں ہلکی سی نیلا ہٹ گھلنے لگی وہ کچھ دیر کھڑی اس نیلا ہٹ کو دیکھتی رہی پھر ”بسم اللہ“ پڑھ کر اینٹوں کی اس لائن کی طرف قدم بڑھایا۔ کیچن کے اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اس طرح کے ایڈو سنر کا اسے پہلی بار تجربہ ہو رہا تھا۔ انٹیں اس کے قدموں کے لرزے اس نے ہاتھ بڑھا کر کر دیوار کو مضبوطی سے تھام لیا اور ذرا سا سر اٹھا کر باہر کی طرف دیکھا۔

باہر ہلکا سا آواز آ رہی تھی اور کبھی کوئی آواز بھی نہ آ رہی تھی۔ اس نے پورا زور لگا کر اپنے جسم کو جھٹکایا اور دیوار پر تھک گیا۔ اور پھر وہ کھڑکی کے بل دیوار سے نیچے سڑک کے کنارے کود گئی۔ تکلیف کے شدید جھکے کا احساس ہوا مگر اگلے بل وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اپنی جاہر کھڑکی میں اپنے وجود کے گرد لیٹا اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

وہ کئی دن سے محسوس کر رہی تھی بلکہ دیکھ رہی تھی کہ فخر حیات کچھ اچھے اچھے اور پریشان سے دکھائی دے رہے ہیں۔ رعنا ان سے پوچھتی تو وہ صاف ٹال جاتے۔ ”تمہیں وہم ہوا ہے ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ کہہ کر وہ جگہ ہی چھوڑ جاتے مگر ان کے اس طرح کہنے سے نہ تو رعنا کی تسلی ہوتی نہ فخر حیات اسے کسی بھی لمحے ریلیکس محسوس ہونے لگتا تھا۔ فون میں رہتے تو فون موبائل ہمہ وقت ان کے کان سے لگا رہتا فون کے انتظار میں ٹھہر کر کمرے کی لمبائیاں ناپتے رہتے۔ کئی بار رعنا کی رات کو آنکھ کھلتی تو بیدار چرت لیٹے بھت کو گھور رہے ہوتے۔ رعنا کے سیدھے ہوتے ہی جھٹ سے آنکھیں بند کر کے سوتے بن جاتے۔ اکثر رات کو اس نے انہیں کھڑکی میں کھڑے اندھیرا کھوتے دیکھا تھا۔

”اوھر کیوں کھڑے ہیں؟“ وہ پریشان ہوا تھی۔
”ویسے ہی نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے کھڑکی میں آکر کھڑا ہو گیا۔ تم سو جاؤ۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیتے۔

”آپ کو نیند نہیں آ رہی تھی تو مجھے جگا دیتے۔“ وہ بید سے اتر کر ان کے پاس آکر کھڑا ہونا چاہتی تو وہ فوراً پلٹ کر بستر پر لیٹتے۔
”خدا تمہارا تمہیں کیوں تکلیف دیتا۔ تم گہری نیند سو رہی تھیں اور اب ویسے بھی مجھے نیند آ رہی ہے۔ سو جاؤ تم بھی۔“ وہ جھٹ سے سونے کے لیے آنکھیں بند کر لیتے۔ رعنا لب بلبھیج کر انہیں سنے جاتی۔
”خبر! آخر کیا بات ہے۔ کیا پریشانی ہے آپ کو۔ ایسا کون سا مسئلہ ہے جو آپ مجھ سے شیئر نہیں کرنا چاہتے۔“

خدا میں کدھر جاؤں کس سے کہوں میرے ساتھ کیا ہو گیا۔ مجھے کیا معلوم میرے ساتھ کیا ہو گیا۔“ عجیب سا احساس زیاں ہوتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”کیا ایسے بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی عورت اتنی شقی القلب بھی ہو سکتی ہے اس قدر ظالم۔ میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا تیرا میرا رشتہ ہی کیا تھا۔ بھلا ظالم بد بخت عورت۔ یا اللہ میں کیا کروں۔ میں کس کس کے آگے صفائیاں پیش کروں گی۔ میں اسی ڈھیر کے نیچے سر کیوں نہیں گئی۔ کیوں میں اتنی سخت جان ثابت ہوئی۔ کیوں میں یہ سب لذت جھیل کر بھی زندہ ہوں۔ کون دے گا میری باکبازی کی گواہی۔ مجھ پر یقین رکھنے والے تو منوں منی تھے چلے گئے۔ اس پتھر جیسے بھائی کا سامنا میں کیسے کروں گی۔ کیسے اسے اپنے دامن کے داغ دکھاؤں گی۔“

لحہ بہ لہہ شدت سے بہت کچھ کھوجانے کا احساس بڑھ رہا تھا۔ آنسوؤں میں روانی تیز تر ہوتی جا رہی تھی منہ بھینچ بھینچ کر سسکیاں روکنے سے اس کا گادرو سے گھٹنے لگا۔

لیکن اگر آنسوؤں کی شدت اس کے دامن پر لگے داغ دوھو سکتی اگر اس کا رونا چلانا اسے دوبارہ سے پہلے والی معصوم و بے گناہ نہ ہوت ہنا سکتا تو وہ رورو کر دیا بھاد پتی مگر ان آنسوؤں کی رائیگانی کا احساس اس کے درد کو اور بڑھا رہا تھا۔

”یا اللہ۔ میں کیا کروں کہاں جاؤں یہ کون سی جگہ ہے کون سا علاقہ ہے پتا نہیں شیر کوئی اور نہ ہو۔ میں کس کے پاس جاؤں گی۔“ سوچیں بے ربط ہوئی جا رہی تھیں کوئی راہ سمجھائی نہیں دے رہی تھی بس تھوڑی تھوڑی دیر بعد آنسوؤں کے جھرنے پھوٹ نکلتے تھے۔

سردی گرمی بھوک پیاس سب احساس مٹ چکے تھے۔ خیال تھا تو صرف اپنی حالت کا۔ اپنے ساتھ بیت جانے والے حادثے کا۔ جیسے سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اب زندگی کی کہاں کی کہاں سے شروع کرے اور کسے کرے۔ مجھے بچہ یہلا قدم اٹھانے تو اسے کچھ پتا نہیں ہوتا وہ سراسر قدم کس سمت میں اٹھے گا۔ اسے کاجھی یا وہ لڑکھڑا کر گر پڑے گا۔

حالانکہ سردی کافی زیادہ تھی مگر اسے کچھ احساس نہیں تھا بس منگھڑی سمنی گونے میں بیٹھی روئے جا رہی تھی سر اٹھا کر دیکھا۔ درد کی ٹہپس سر کے پچھلے حصے میں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ لگا کر سر کے اس حصے کو چھوا تو ”سی“ اس کے منہ سے نکلی۔

”شاید زخم ہے اوھر اس نے قیاس کیا مگر یہ زخم تو بھر جائے گا چند روز میں۔ اور یہ جو پوچھا بدن نیلا ہو گیا ہے اس کے داغ کیسے دھولیں گے۔“ وہ پھر سے رونے لگی۔ اس پلاٹ میں عمل اندھیرا تھا۔

باہر سے جو اسٹریٹ لائٹ کی روشنی آ رہی تھی۔ وہ بھی پلاٹ کو روشن کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ سر کے اوپر آسمان سے باتیں کرتی پلڈنگ بھی یہ پلاٹ اس پلڈنگ کے ساتھ بڑا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف دیواریں تھیں باہر جانے کا راستہ کہیں بھی نہیں تھا۔

”آپ اوھر سے کیسے نکلوں؟“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سانسوں کے احساس نے ستر پوشی کا احساس دلایا تھا اور زندگی کی طلب سے نہ چھت کی ضرورت کا خیال۔

”دن نکل آیا تو اوھر سے کیسے نکلوں گی۔ ابھی تو رات کی سیاہی نے سب کچھ ڈھانپ رکھا ہے۔“ اس نے اٹھ کر دیوار کی اونچائی کا جائزہ لیا ایک جگہ دیوار کے ساتھ دس پندرہ اینٹوں کی لائن لگی تھی۔

”یہ ٹھیک ہے اس پر پڑھ کر باہر کو جاؤں گی۔“ وہ اینٹوں کے پاس آکر رک گئی مگر کچھ دن نکل آئے اس وقت پاس ہی کی مسجد سے موزن نے ”اللہ اکبر“ پکارا تو وہ وہیں بیٹھ کر پھر سے رونے لگی۔

اعصاب بر قابو پانا سیکھو۔ ان کا اندازنا سجانہ تھا۔

”میری قوت برداشت کا اندازہ ہی نہیں ہوا جو سانچہ میرے ساتھ جتا ہے۔ کیا زندگی کے دامن میں اس سے بھی کڑا امتحان ہے باقی۔“ رعنا تنگی سے بولی اس کی آنکھوں کے گوشے از سر نو جھکنے لگے تھے۔ ”کیا میرے اعصاب کی مضبوطی کو آپ اب بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اتنا سب کچھ بیت جانے کے بعد بھی۔“

”آنسو تو اتنے اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ فخر حیات نے ہاتھ برہا کر اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔

”مجھے تم پر تمہارے اعصاب کی مضبوطی پر کوئی شک نہیں، میری جان! زندگی دراصل امتحانوں کا سلسلہ ہے ایک کے بعد دوسرے۔ کوئی چھوٹا کوئی بڑا اور ان کے وزن کا اندازہ بھی ہماری قوت برداشت ہی سے ہوتا ہے۔ اب جو حالات ہمیں آئندہ درپیش آئیں گے وہ بھی انہیں امتحانوں کی ایک کڑی ہوں گے اور تم نے مشکل سے مشکل وقت کو بھی بڑی ہمت سے سہا ہے۔ مجھے معلوم ہے بلکہ مجھ سے زیادہ کسے معلوم ہو گا۔“

وہ اس کے بال سہلا رہے تھے اس کے آنسوؤں سے فخر حیات کے گاؤں کا اندھا بھیگا جا رہا تھا۔ ”weep please dont“ (مت رو) انہوں نے ذرا جھک کر انگلیوں کی پوروں سے اس کے آنسو صاف کیے۔ کل شام کو ہم کسی پر سکون جگہ پر چل کر بیٹھیں گے پھر میں تمہیں سب بتا دوں گا اور کوئی خدا نخواستہ بڑا طوفان نہیں آنے والا ہے۔“ وہ جب کہنے لگے۔

”تم فکر مت کرو۔ مجھے تمہاری خوشی ہرگز ہے۔ اب تم سو جاؤ کیونکہ مجھے صبح جلدی بلکہ بہت جلدی دکھانا ہے۔ گھر سے تقریباً چھ بجے کے قریب اس کے مجھے کچھ ویر آرام کر لینے دو۔ کل کا دن فیصلہ کن ہو گا۔ لیٹ جاؤ اب۔“ کہتے ہوئے انہوں نے اس کی اس کے سر اپنے کندھے سے ہٹایا اور خود تکیہ درست کر کے لیٹ گئے۔ رعنا نے ایک نظر انہیں دیکھا اسے معلوم تھا اب چاہے وہ جتنی مرضی ضد کر لے فخر اسے کچھ نہیں بتائیں گے۔ اس نے ایک کراہی سے کہا اور اپنے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ فخر حیات تھوڑی دیر میں ہی کروش بدل کر شاید سو گئے۔ اسے یہی لگا ہوا ہے بہت دیر تک نہیں آئی۔ کروشیں بدل بدل کر وہ اس رات کو سر کانے کی کوشش کرتی رہی صبح کے قریب اسے نیند آئی تھی۔

انگلا سارا دن اس نے بہت بے قراری سے گزارا۔ گھر سے باہر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گیارہ بجے تو وہ سو کر اٹھی تھی۔ فخر حیات جا چکے تھے۔ سینی بھی اسکول جا چکا تھا اور اس کا سرور سے پھٹا جا رہا تھا اور بہت عرصے بعد اس نے معمول کے خلاف اور سنجھوس کے بجائے اسٹونگ چائے کا ایک کپ لیا۔ کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بس یہی بات ذہن کو کھائے جا رہی تھی۔ معلوم نہیں کیا معاملہ ہے۔ کب شام ہو گا اس الجھن سے بچھڑائے۔ وہ سارا دن خود سے الجھتی رہی۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں۔ لاؤنج سے لان میں۔ واکنگ بیس سے اسٹڈی میں۔ کہیں بھی سکون نہیں مل رہا تھا۔ حالانکہ آج اس کو صبح میں پار لڑ بھی جانا تھا اور شام میں ان کی اس بی اونی نے چائے لبر کے خلاف ایک واک کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں شامل ہونے کا اس کا اب کوئی ارادہ نہیں تھا۔

دو بجے کے قریب عفت آرا کا فون آیا۔ ”شکر ہے وہ خود نہیں آگئیں۔“ فون اٹینڈ کرتے ہوئے اس نے سوجا۔ وہ تو عفت آرا کا فون بھی اٹینڈ نہ کرتی۔ اسے تو فخر حیات کے فون کا انتظار تھا۔ اس نے تابی میں اس نے سی ایل آئی پر آئے نمبر پر بھی دھیان نہیں دیا۔

”لی! ہم ہی فون کریں تو کریں۔ تمہیں کبھی خیال نہیں آیا کہ ایک کل کر کے غریب بھائی بھانج کی خیر خبری لے لوں۔ اوہ مہینے بلوں نے جان سولی پر لٹکا رکھی ہے۔ بجلی کے بل اور فون کے بل تو آسمانوں سے باتیں کر رہے ہیں۔ ان بلوں کو دیکھنے سے پہلے بندہ طاقت کے انجکشن لگوائے۔ پر لی بی! یہ تو ہم غریبوں کی پریشانیوں ہیں۔ تم جیسوں کے لیے تو کوئی مسئلہ ہی نہیں پھر بھی تمہیں کبھی خیال نہیں آتا کہ خود سے فون کر کے بندہ پوچھ ہی لے کہ جیتے ہو یا مر گئے۔“

اس طرح آپ کی صحت بھی گرتی جا رہی ہے۔ آئینے میں خود کو دیکھیں کس قدر کمزور لگ رہے ہیں اور آنکھوں کے گرد کیسے خفے پڑ گئے ہیں۔ میں آپ کے بارے میں فکر کیوں نہ کروں۔ میں آپ سے الگ ہوں کیا؟ کل رات بھی انہیں سپاٹ چھت کو دیکھتے پا کر رعنا ان سے فیصلہ کن بات کرنے کے لیے اٹھ بیٹھی کہ آج ان سے اصل بات معلوم کر کے ہی رہے گی۔ معاملہ اب اس کی برداشت سے باہر ہو تا جا رہا تھا۔ ایسا پر اسرار رویہ کب دیکھا تھا اس نے فخر حیات کا۔

”رعنا! پلیز ڈونٹ ڈسٹرب می۔“ ان کا لہجہ انتہائی سرد تھا۔ رعنا اپنی جگہ ٹھنک کر رہ گئی۔

”فخر! کافی دیر بعد اس کے منہ سے محض یہی نکل سکا۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹے رہے۔

”آپ کی یہ بے سکون حالت مجھے جو مہنگی ڈسٹرب کر رہی ہے اس کا اندازہ ہے کچھ آپ کو۔“ شکوہ اس کے لبوں سے کیا پھسلا آنکھیں زار و قطار رونے لگیں۔ بہت دنوں کا وہا ہوا والا جیسے پھوٹ نکلا تھا۔ فخر حیات اسے خاموشی سے روتے سنتے رہے کہ آنکھیں تو انہوں نے ابھی بھی نہیں کھولی تھیں۔ وہ کتنی دیر یہی آنسو بہاتی رہی۔ فخر حیار پر اس کی اشک شوقی کا کچھ اثر ہونا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پتا نہیں ان کا فون اس قدر پتھر کیوں ہو چلا تھا اور یہ احساس ہی جان لیوا اور انتہائی تکلیف دہ تھا کہ محبوب بیوی پاس بیٹھی آنسو بہاتی رہے اور اس کی ایک آہر جان لٹانے والا شوہر عرف کی سل بنا لیتا رہے۔ اس خیال نے جیسے رعنا کو کسی پچھو کی طرح ڈنک مارا۔

کیا فخری میری نیندنگر سے اس حد تک بے نیاز ہو چکے ہیں کہ انہیں میرے آنسو بھی پانی کے بریکر قطروں سے بڑھ کر نہیں لگ رہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے رگڑ کر اپنا منہ اور آنکھیں صاف کر لیں۔ اس کا چہرہ اور ناک کی نوک خوب رونے سے سرخ اتار کی طرح دکھنے لگی تھی اور آنکھوں میں عم ناک لانی تیر رہی تھی۔ فخر حیات نے آنکھوں کے جھروکوں سے عزیز ازجان بیوی کے پرسوز روپ کو دیکھا اور ایک لمبے لمبے سانس لے کر آنکھیں کھول دیں۔

”فخر! آپ کو بتانا ہو گا آج کہ کیا بات ہے۔ آپ کی یہ چیپ میری جان لے لے گی۔ اگر آپ نے آج بھی کچھ نہ بتایا تو۔۔۔“ وہ کوئی سخت بات کہتے کہتے رک کر ہونٹ کاٹنے لگی۔

”رعنا! خدا نخواستہ ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ جس پر تم میری اپنی جان لینے کی بات کرو۔“ فخر حیات کنبیوں کے بل پیچھے کھسک کر اٹھے اور تکیے اونچا کر کے بڑکی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے سیٹ لیجے میں بولے۔

”اور ڈیزر بات اگر کوئی ہے بھی تو تم فکر نہ کرو۔ تمہیں شامل کیے بغیر میں کسی بھی قسمی فیصلے تک نہیں پہنچ سکتا۔ میں خود تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا بس اتنے دنوں سے حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ کوشش کر رہا تھا کہ کچھ باتوں میں جانے جیسے ڈوبنے والا ڈوبنے سے پہلے آخری کوشش کے طور پر خوب ہاتھ پاؤں مارتا ہے بالکل ایسے ہی میں نے بھی بہت کوشش کی۔۔۔“ انہوں نے ہاتھوں کی انگلیاں اپنے ٹھنکے والے بالوں میں پھنسا میں چہرے پر ہنوز گہری سوچ اور شجیدگی کے باطن تھے۔

”کس۔۔۔ کیسی کوشش؟“ رعنا کا رنگ اڑ سا گیا۔ اس کا دل یک بیک تیز دھڑکنے لگا تھا۔ ”کیا۔ کیا ہو گیا ہے فخر! کیا ہونے والا ہے۔“ وہ بری طرح سے ہراساں لگ رہی تھی۔

”اور ڈیزر! تم ان۔ ایسی سیرس بات کوئی نہیں ہے۔ بس تم تھوڑا سا ویٹ کر لو کل شام تک میں تمہیں سب کچھ تفصیل سے بتا دوں گا۔ پھر جو تمہارا مشورہ ہو گا وہی کر لیں گے۔“ فخر حیات نے دھیرے سے اس کا کندھا تھکا۔

”فخر! کیسی بات ہے۔ پلیز بتائیں مجھ سے کل شام تک انتظار نہیں ہو گا۔ کل میں اور آج میں کیا فرق ہے“ ویسے بھی ڈیزر ہنچ رہا ہے رات کا۔ نیا دن تو طلوع ہونے ہی والا ہے۔“ رعنا بے قراری سے بولی۔

”خدا کرے یہ دن واقعی نیا ہو۔“ فخر بڑھائے۔ ”رعنا! یوں بے قراری مت دکھاؤ۔ خود کو کمپوز رکھو۔ خود کو اس طرح آؤٹ آف کنٹرول کر دو گی تو کیا پتا زندگی میں کبھی کوئی اس سے بھی کڑا امتحان آپرے پھر کیا کر دو گی۔ اپنے

وہ سانس لیے بغیر سلام دعا سے بے نیاز، نان اشاپ شکوؤں کی پٹاری کھول کر بیٹھ گئیں۔ پہلے تو رعنا کا دل چاہا
 لائن ڈس کنکٹ کر کے ریسیور سائیز پر رکھوے مگر اسے معلوم تھا۔ اس کا فائدہ کیا لانا نقصان ہی ہو گا۔ یہ خود چل
 کر گھر آجائیں گی۔ آدھے گھنٹے سے بھی پہلے ایسا دوبارہ پہلے بھی کر چکی تھیں اور اس کا انجام رعنا ان کی چارپائی
 گھٹنوں کی میزبانی کر کے بھگت چکی تھی۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

”اس بار کبخت فون کا بل ہی چار ہزار آیا۔ لو بھلا بتاؤ۔ ہم کون سا لندن یا وہی فون کھڑا کرتے ہیں جو ہزاروں
 میں مل آیا شہر میں ہمارے ایسے کون سے احباب کی لائن لگی ہے۔ جن سے بات کیے بغیر ہمیں چین میں پڑتا۔
 ایک تمہاری تم تو ہو اور وہ بھی میں تمہیں فون کروں تو کروں۔ تمہارے بھائی تو وہ بھی نہیں کرتے۔ اب تمہیں ایسی
 بھانج کہیں گے جو بھائی سے زیادہ تمہاری پروا کرتی ہو۔“ وہ اسے جتاتے ہوئے بولیں۔

”تو از بھائی ٹھیک ہیں؟“ عفت آرا کے سانس لینے کو غنیمت جان کر رعنا نے پوچھا۔
 ”ٹھیک ہیں ان کو کیا ہونا ہے جو ہونا ہے ہماری جانوں کو ہی ہونا ہے۔ چار ہزار فون کا بل سراسر ہزار بجلی کا بل
 ایک ہزار گیس کا بل بیچوں کے اسکولوں کی فیس، ان کی دین کی فیس، یونیورسٹی فیس، گھر کا خرچ، یہ سب کابل اخبار
 والے کا بل، مجھ کو کپڑے دھونے والی ماسی کا بل۔ رعنا! تم جانو میں تو جلد ہی ان لائنوں کی وجہ سے پائل ہو کر
 کسی جنگل میں نکل جانوں گی اور تمہارے بھائی چند ہزار لاکھ روپے کی کو میری پھیل رہے ہیں تو گویا اپنے تئیں انہوں
 نے خزانوں کے منہ کھول دیے۔ ان چند فونوں کو ٹھکانے لگانے میں چند دن کیا کھتے ہیں نہیں لگتے اور پھر وہی
 فقر و فاقہ مگر تمہیں ان باتوں کا بھلا کیا بتا۔ تم تو ہمیشہ کی زندگی گزار رہی ہو۔ اللہ جانتا نہیں ہماری کس سے گا۔“

عفت آرا رعنا کی کوفت کا خیال کیے بغیر بغیر کوسے اور فل اشاپ کے بولے جا رہی تھیں۔ ویسے بھی وہ کسی کا
 خیال کم ہی کرتی تھیں اور بھلا رعنا کو ان باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اس کے اپنے اکاؤنٹ میں جتنی رقم
 تھی۔ اس نے بھی اس کا حساب رکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ایک پلے ہی وہ رات سے ریٹائر ہو گئی۔ اوپر سے
 عفت آرا کی فضول گفتگو۔ اس کا دل چاہا فون اٹھا کر سامنے دیوار پر دے کر۔
 ”بھائی جان! اس وقت میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں آرام کرنے جا رہی ہوں۔“ وہ جتنی ہزاری اپنے
 لہجے میں سموسکتی تھی سو کر بولی۔

”خیریت کیا ہوا طبیعت کو۔ نصیب دشمنوں۔“ انداز صریحاً ”طشہ لہا۔“
 ”سر میں شدید درد ہے اور کچھ نمب پکڑ بھی قیل ہو رہا ہے۔“ وہ اسی ہزاری لہجے میں بولی۔
 ”سو سو جو بدل رہا ہے۔ تم کہو تو میں آجاؤں۔ تم آرام کرنا۔ گھر کی دیکھ بھال میں کروں گی۔“ ان کی فی سبیل اللہ
 خدمت کی عادت نہیں بدل سکتی تھی۔

”جی نہیں شکریہ۔ گھر کی دیکھ بھال کے لیے ملازم موجود ہیں۔ مجھے گھر کی فکر نہیں ہے۔“ وہ تلخی سے بولی۔
 ”چلو اچھی بات ہے۔ تمہیں اپنوں سے زیادہ نو کروں رہو سنا ہے۔ بات میں سے منشی ترین پہلو کو جو عفت
 آرا کے یا نہیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ رعنا نے غصے کا گھوٹ بھرا مگر خاموش رہی۔
 ”خیر میں تمہارے آرام میں خلل نہیں ہوں گی۔ اس وقت فون میں نے تمہیں ایک نام سے کیا تھا۔“ خلاف
 معمول وہ جلد ہی اپنے لہجے کی ٹون بدل کر بولیں۔

”جی سن رہی ہوں میں۔“ جب وہ کافی دیر تک کچھ نہ بولیں تو رعنا کو کہنا پڑا۔
 ”تمہیں تو معلوم ہی ہے۔ میں نے دو سال پہلے اور والا پورشن ہونا شروع کیا تھا۔ نیچے تو چلو گھر ہماری ضرورت
 کے مطابق ہی ہے اگرچہ تمہارے محل کے آگے فقیر کی کنپائی لگتا ہے۔ مگر خیر ہم غریبوں کو یہی محل لگتا ہے۔“
 رعنا کو حسرت ہی رہی کہ عفت آرا بھی اپنی زندگی میں کبھی کسی لمحے بھر پور شکر کا انداز اختیار کریں کہ جس قدر
 نعمتیں انہیں حاصل ہیں وہ بہت سے لوگوں کو حاصل نہیں مگر وہ ہمیشہ دوسروں کو حاصل مراعات کو دیکھ کر اپنا
 کاغذ جلاتی رہتی تھیں۔ اسی جلا پلے نے انہیں ہاتھ نہیں کاٹنے کا تجربہ بھی دے دیا تھا مگر انہوں نے جلتا کڑھنا ترک
 نہیں کیا تھا۔

”میں نے سوچا تھا کہ چلو اور ایک پورشن ڈلو کر کر اسے پرچھاؤں گی۔ دو چار ہزار آجایا کریں گے۔ یہ جو بیلوں کی
 ادائیگی کے لیے مجھے بچوں کی ضروریات کی صحیح کھانچ کر چھائی کرنا رہتی ہے۔ اس میں کچھ سولت ہو جائے گی۔
 کام شروع تو کر لیا مگر اسے میں آگئی پھر تمہارے بھائی صاحب کی کتنی پیسہ۔ اب پیسے کے بغیر تو یہ کام نہیں ہو
 سکتا۔ تم نے جو کچھ رقم دی تھی۔ اس سے دیواریں تو ساری اٹھ گئیں۔ انہوں نے آس سے لون لیا۔ وہ بھی اس
 میں اثر چھو ہو گیا اب اتنے عرصے وہ دیواریں کھڑی میرا منہ چڑا رہی ہیں۔ کچھ پیسے ہاتھ میں ہوں تو میں لیٹر ڈلو آؤں
 چلو کم از کم وہ دیواریں ہی گرنے سے محفوظ ہو جائیں۔ ان میں خدا انخواستہ ایک آدھ بھی گریزی تو جانو کس قدر
 نقصان ہو جائے گا۔ ہم غریب تو کوئی بچہ بیمار پڑ جائے تو دعا کرتے ہیں کہ ایسے ہی لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو جائے کچا
 کوئی حاویہ۔ اللہ میری توب۔“

ان کے فون بند کرنے کے ابھی کوئی آثار نہیں تھے اور رعنا کا سراپ درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ شاید آج عرصے
 سے قائم موت کی دیوار ڈھسے ہی جاتے کی۔ اس نے اپنی کینٹی دیاتے ہوئے غصے سے سوچا۔

”بہر حال میں نے تمہیں فون کیا تھا کہ اگر تم ہمیں کچھ عرصے کے لیے تین لاکھ روپے اوجھار دے دو تو تمہاری
 بڑی مہربانی۔ گھر کر کے پرچہ جائے گا تو میں ایک دو کیشیاں ڈال کر آہستہ آہستہ تمہارا قرض اٹا دوں گی۔ پہلے
 بھی تم نے ہم پر بڑے احسان کیے ہیں ایک یہ بھی سہی۔ تمہیں معلوم ہے بینک سے قرض لو تو ایک آدھ سال ہی
 میں قرض سے دو گنا سو سو روپے چڑھ آتا ہے۔ آج کل لیٹر کے لیے موسم بھی موزوں ہے۔ اگر تمہاری بھرتی میں اپنے
 آرٹیکل سے رابطہ کروں ہماری کچھ مشعل تو آسان ہوگی۔ گھر کے اخراجات کی۔“ خلاف معمول ان کا لہجہ
 عاجزانہ سا تھا۔

”میں نے بات کر کے آپ کو بتا دیا کی۔“ رعنا نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

”تو تمہارے اپنے اکاؤنٹ میں کس موجود ہوگی۔“ خیر حیات سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ
 جیسے ہوئے لہجے میں بولیں۔
 ”بھائی آپ کو علم ہے میں کوئی بھی کام گھر کے علم میں لائے بغیر نہیں کرتی۔“ وہ غصے سے لہجے میں بولی۔
 ”صرف ہم سے متعلقہ کام۔“ وہ نکلا دھڑک رہی ہیں۔ ”ورنہ تو تم ہر کام میں خود مختار ہو اور خیر بھلا تمہیں کیوں
 انکار کرے گا۔“

”یہاں بعض لوگوں کی ہر بات میں گائے کیوں آگے ہوتے ہیں۔
 ”مگر میں کوئی بھی کام خیر کو بتانے بغیر نہیں کرتی چاہے وہ مجھ سے متعلق ہو یا کسی اور سے۔“ وہ زور سے کر

”اور خیر تمہیں بتائے بغیر چاہے جو مرضی کرتا پھرے اور تم اس کی مرضی کا دم بھرتی رہو۔ لیکن اتنی بھی قیورما
 نہ ہو۔ پتہ پیووں والے حقوق بھی رکھو۔ چہ اس کی بھی خبر رکھا کرو۔“ پتا نہیں وہ کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔ رعنا کی
 آنکھوں کے آگے خیر حیات کی آج کل کی کیفیت بھرنے لگی۔
 ”کہاں کھو گئیں۔ بہر حال خیر سے بات کر کے مجھے آج یا کل میں لازمی فون کر کے بتا دینا۔ میں نرمی آس میں ہی
 نہ ڈولتی رہ جاؤں پھر میں نے آگے بھی بات کرنی ہے۔“ وہ خواہ اور عیب بتاتے ہوئے بولیں رعنا چڑکی۔
 ”بتا دوں گی۔ اچھا خدا حافظ۔“ وہ ریسیور رکھ دینا چاہتی تھی۔

”چلو تم نہ بتانا۔ میں کل شام میں خود ہی پیکر لگاؤں گی تمہارے بھائی کے ساتھ۔ کئی دن سے تمہاری طرف
 نہیں آتی۔ تمہاری طبیعت کا بھی پوچھ لوں گی۔“ عفت آرا نے قناعت پر وگرام ترتیب دے ڈالا۔ اب رعنا
 انہیں آنے سے صاف منع تو نہیں کر سکتی تھی۔ بس جھٹلا کر رہ گئی۔
 ”لو کہ خدا حافظ۔“ اس نے فوراً سے پتھر فون کیڈل پر ڈال دیا اور اتنی زور سے سانس لیا جیسے صدیوں سے
 رکھا سانس سینے سے نکالا ہو۔

"نواز بھائی کی ہمت ہے جو اس عجیب و غریب نمونے کے ساتھ گزارا کرتے ہیں ان کی محض چند منٹوں کی گفتگو بندے کو پاگل کر دینے کے لیے کافی ہے۔" اس نے سردنوں ہاتھوں میں تمام لیا کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی۔
 "خیر نے فون نہیں کیا ورنہ اس وقت تک تو ان کا ایک آدھ فون ضرور آجاتا ہے۔" وہ بچنے کو تھے اس نے وال کلاک پر نظر ڈالی اور ریسیور اٹھا کر خیر حیات کے آفس کا نمبر بلانے لگی۔
 "سر تو سیٹ پر موجود نہیں ہیں۔ وہ آئیں گے تو میں انہیں آپ کا مسیج دے دوں گا۔" ان کا سیکریٹری بولا تو اس نے تھک کر ریسیور رکھ دیا۔

"اب کیا کروں؟" بیڈروم میں جانے کو مطلق دل نہیں چاہ رہا تھا۔ سرکار درپردہ گیا تھا۔
 "وہ تو بیگم صاحب! صاحب کا فون آیا ہے اور دوسرے کمرے میں وہ شہر سے باہر جا رہے ہیں۔ رات کو بہت دیر سے گھر آئیں گے۔ انہوں نے کہا کہ بیگم صاحب کو بتا دو۔" جنٹل اندر آکر ادب سے بولی۔
 "کب کب آیا فون؟" وہ بوکھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ابھی بتی جب آپ فون پر بات کر رہی تھیں تو انہوں نے دوسرے فون پر جو کھانے کے کمرے میں رکھا ہے اس پر بات کی تھی۔ میں نے کہا کہ بیگم صاحب کو بلاؤں تو وہ بولے نہیں بس یہ پیغام دے دینا اس وقت میں بہت جلدی میں ہوں۔ رات کو دیر ہو جائے گی مجھے کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔" جنٹل نے تفصیل بتائی۔
 "مائی گاؤ۔ وہ فون کرتے رہے اور ادھر بھاگی میری جان کھاتی رہیں۔"

"کلیا خیر صاحب آؤٹ اسٹیشن گئے ہیں کہیں؟" اب کے وہ زاریا رعب لہجے میں بولی۔
 "جی میرے علم میں یہ بات نہیں ہے وہ ایک گھنٹہ پہلے سیٹ چھوڑ کر باہر نکلے تھے اس کے بعد میرا ان سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔" سیکریٹری موبوب لہجے میں بولا۔
 "اوکے" کہہ کر اس نے تھک کر ریسیور رکھ دیا۔

"جنٹل میرے لیے چائے کا ایک اسٹرونگ سا کپ لاؤ اور ڈرائیو سے کو آؤ گئے تک مجھے باہر جانا ہے گاڑی تیار کرے۔"
 "چھائی! وہ سر بلا کر جانے کو مڑی۔" وہ بیگم صاحب آپ نے صبح اتنی بار تیز چائے پی ہے یہ تو صحت کے لیے۔" جنٹل رعنائی شعلہ بارنگاہوں کو دیکھ کر پانی کی ہمدردی ہونٹوں کے نیچے دبا کر رہ گئی۔
 "جاؤ یہاں سے اور زنا میرے بارے میں فکر مند نہ ہو جو کہا ہے وہ کرو۔" جی سے کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"تو یہ ہے لگتا نہیں یہ بارش آج رے گی۔ صبح سے بغیر سانس لیے برسے چلی جا رہی ہے۔ ساری شاہی کامنز کر کر آ کر دیا۔ سارا انتظام درہم برہم ہو کر رہ گیا۔" سیدہ اندر باہر آتے جاتے بیڑا رہی تھیں۔ حویلی میں کھیا کھیا مہمان بھرے ہوئے تھے۔ ہال کمرے میں عورتیں بیٹھی تھیں۔ ہال سے ملحقہ دونوں کمرے بھی خواتین کے قبضے میں تھے۔ باہر صحن میں بیٹھے کا بھی انتظام تھا مگر بارش کی وجہ سے وہ سارا پروگرام ٹھپ ہو گیا۔ اب مندی کا فنکشن بھی ہال ہی میں کیا جانا تھا۔ دوسرے شہروں سے تو تمام مہمان آپکے تھے ارد گرد کے قریبی گاؤں سے ابھی بھی اکاؤ کا آنا تک یا گاڑی بھر کر آ رہی تھی۔

"آٹھ تو بچتے کو ہیں پتا نہیں کب شروع کریں گے۔" ایک عورت بیڑا ہی اس کا گود کا بچہ روئے جا رہا تھا جس کی وجہ سے وہ نہ بیٹھ سکتی تھی نہ اسے لے کر پھر سکتی تھی اور گھر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا کہ آج رات تو تقریباً ساری ادھر گزارنی تھی۔
 گاؤں کی میراثی ڈھونگی بیٹے جا رہی تھی۔

"لڈی ہے ہمالو پاؤ لڈی ہے جھالو۔" لگتا تھا اس کا پسندیدہ گانا یہی ہے وہ شام سے کوئی سو مرتبہ یہ تان اٹھا چکی تھی اب پھر ڈھولک پر یہی تھاپ اٹھا رہی تھی۔ گانے کے سراپے تھے کہ ارد گرد بیٹھی لڑکیوں کے ہاتھ تالیاں

پیٹ پیٹ کر سس نہ ہو گئے تھے۔

"تو یہ ہے ماسی! تمہیں اور کوئی گانا نہیں آتا۔ شام سے یہی گانے جا رہی ہو۔ میرے ہاتھ تو ٹٹے والے ہو گئے ہیں تالیاں پیٹ پیٹ کر۔" ایک پناخہ سی لڑکی میراثی کے کالے بھنگ مولی انگلیوں والے متحرک ہاتھوں کو پکڑ کر بولی اور ساتھ ہی اس کے آگے اپنے دونوں ہاتھ بھی پھیلا دیے۔
 "یہ دیکھو۔" اس کے ہاتھ اتنے سس نہ ہو رہے تھے جیسے ابھی ان سے خون نکل پڑے گا۔

"چلو بھی وارنہ کے پیسے اس کو دے دو۔" میراثی اس کے پھیلے ہاتھوں پر روپیہ رکھ کر پھٹے ڈھول کی طرح ہنسنے لگی۔
 "فرض دور۔" لڑکی نے روپیہ اس کے منہ پر اچھالا اور اٹھ کر دوڑ چلی گئی تو پانی لڑکیاں بھی ہنسنے لگیں۔
 "آپ کب آئی تھیں؟" رابعہ بی بی نے ماشنی سے پوچھا۔ انہیں ادھر ہی بڑی مشکل سے جگہ ملی تھی آمنت اور نہ شبان کے پہلوؤں میں ٹھس کر بیٹھ گئی تھیں۔ پہلے ہی ان کا ٹکراؤ ڈوڈو ڈھمی میں سیدہ سے ہو گیا تھا۔
 "بڑی جلدی آگئیں آپ رابعہ بی بی! ملنڈ اور خیر ان کے انداز اور لہجے دونوں سے ہو رہا تھی۔
 "وہ بارش کی وجہ سے۔" رابعہ بی بی ہکھلانے لگیں۔

"تمہارے لیے یہ انوکھی بارش ہو رہی تھی۔ سارا گاؤں شام سے آیا بیٹھا ہے وہ بھی تو بارش میں بھگ کر ہی آئے ہیں۔ جن کو مالکوں کی خوشی کا خیال ہے اور پھر یہ بات ہے کہ تم لوگوں کو ویسے ہی کچھ پر لگ گئے ہیں خود کو کچھ بچھنے لگ گئے ہو۔ ہر فنکشن میں لیٹ نہ کوئی کام نہ وہاں۔" وہ خواستخواہ بڑبڑاتی ہوئی ہال کمرے کی طرف مڑ گئیں۔ رابعہ بی بی کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

"یہاں غرتے صرف پیسے والے کی سے رابعہ بی بی! صوفی صاحب اکثر کہا کرتے تھے۔" پیسہ نہیں ہے پاس تو پھر ہلکتا پھوٹتا ہے۔ مالکوں کو بچھلے ہوئے سر بہت پسند ہوتے ہیں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر اندر بڑھ گئیں۔
 ماشنی نے انہیں روک کر تو کھل کر انہیں فوراً اشارہ کر کے اپنے پاس بلانے لگیں۔ ورتے میں بیٹھی ہوئی عورتوں کے ہاتھوں اور کپڑوں سے پتی پتی ماسنی کیپاس پہنچ رہی تھیں۔

"میں تو کب سے آپ کی راہ کو بچ رہی تھی میں نے کہا شاید آنا ہی نہ ہو۔"
 رابعہ بیٹھیں تو آمنت اور زینب بھی ان کے ساتھ بچھنس کر بیٹھ گئیں ایک دو عورتوں نے ناگواری سے ان کو مڑ کر دیکھا پھر جب ان کے چہرے کو دیکھے تو سوتا مسکرانے لگیں۔
 "بس بارش کی وجہ سے دیر ہو گئی۔ رستے میں اس قدر کچھ پڑ تھی کہ پیدل تو آہی نہیں سکتے تھے اور آٹھ اتنی جلدی فائنڈل بن رہا۔ اس لیے دیر ہو گئی اور نہ آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔"

رابعہ بی بی نے اطمینان سے بیٹھے ہوئے جواب دیا اور زرا گردن اٹھا کر ارد گرد دیکھا۔ سارا ہال ہی عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ گاؤں کی سب ہی عورتیں موجود تھیں۔ سیدہ صبح خیا ہو رہی تھیں کہ وہی لیٹ آئی ہیں۔
 "اسی لیے تو میں دوپہر میں ہی ماسٹر صاحب کے ساتھ آئی تھی۔ مجھے معلوم تھا یہ بارش نہیں رے گی اور پایا سیدہ کی ناراضی کون مول لے سکتا ہے۔" آخری جملہ انہوں نے سرگوشی میں کہا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" رابعہ بی بی پھکی سی مسکراہٹ سے بولیں۔ "سیدہ کا بھی قصور نہیں ہے چہاڑی دونوں کے کاموں میں کھن چکری ہوئی ہیں۔ ایسے میں غصہ آہی جاتا ہے۔" وہ اپنی ازنی صروت کے ہاتھوں مجبور ہو کر بولیں۔
 "غصہ بھی ایک حد تک ہی اچھا لگتا ہے۔ بس بی بی! نہیں کہ اگلے کوچہ ہوں تے ہی کپیل ڈالو۔ کل میں شام کو ذرا دیر سے آئی۔ مت پوچھیں ساری عورتیں بیٹھی تھیں کیا کیا ہار کی پیوی کیا پوچھی کی سب کے سامنے میری انہوں نے وہ عزت افزائی کی کہ بس کیا بتاؤں۔" ماشنی رووینے کو تھیں۔

"تقریب تو بڑی اچھی ہو جاتی۔ یہ بارش نے کام خراب کیا ہے۔ کتنی مدت بعد اس حویلی میں اس طرح کی رونق لگی ہے۔ لڈا ادھر کی رونق برقرار رکھے۔"
 رابعہ بی بی نے سیدہ کا موضوع لپیٹ دیا۔ حویلی کی دیواریں بھی بہت تیز ساتیں رکھتی تھیں انہیں اس کا ایک

بارتھن تجربہ ہو چکا تھا۔ یہی ساری باتیں سیدہ یا بڑے شاہجی کو مرچ مسالے کے ساتھ بتا چلی سکتی تھیں اور اس کا سارا الزام رابعہ بی بی کے سر پر بھی آسکتا تھا اور صوفی صاحب نے انہیں حویلی میں جا کر بہت محتاط رویہ اختیار کرنے کی ہدایات کر رکھی تھیں۔

"ہاں بہت زمانوں بعد ایسی رونق لگی ہے۔ سیدہ کی شادی پر رونق لگی تو تھی مگر اس وقت بڑی بی بی کا غم بھی تازہ تھا اور تازگی کی تو بات ہی اور ہے۔ حویلی کے اگلوتے وارث کی شادی کا مبارک دن ہے اس لیے جتنے بھی ہنگامے جائیں کم ہیں۔ آج اگر بڑی بی بی زندہ ہوتیں یہ ساری رونق شور و گنگامہ چل پھل اپنی آنکھوں سے دیکھتیں تو کیسے پھولے نہ ساتیں۔ اولاد کی چھوٹی سے چھوٹی خوشی ماں باپ کے لیے کیا معنی رکھتی ہے۔ اس کا اندازہ صرف ماں باپ ہی کو ہو سکتا ہے۔" ماسٹری کو ہر موضوع پر بولنے کا ملکہ حاصل تھا۔

"یا نکل والدین سے زیادہ اولاد کی خوشی میں کون خوش ہو سکتا ہے۔" رابعہ بی بی نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"مگر بعض ایسے بھی بد نصیب ہوتے ہیں جو نعمت ربانی کو ٹھوکر مار کر زمانے کی ٹھوکریں گلے لگانے چلی جاتے ہیں۔" ماسٹری نے ایک دم سے کہا تو رابعہ بی بی ان کا منہ تھکنے لگیں۔ اگلے پل انہیں سمجھ آئی کہ ماسٹری کا اشارہ کس جانب ہے۔

"ہوں! وہ خود اس طرف آتا نہیں چاہتی تھیں۔"

"بد بخت لڑکی میری۔ بسن کو ساری عمر کے لیے بیٹے جی قبر میں ڈال گئی۔"

ماسٹری کی آواز اب خاصی دھیمی تھی۔ "بے چاری رات سے اس بارش کے ساتھ روئے جا رہی ہے۔ اگر شوہر کے غصے کا ڈر نہ ہوتا تو شاید وہ بین ڈالتی۔ اپنے کپڑے بھاڑ کر تبھو مگر کی سلاش میں گاؤں سے باہر نکل جاتی۔ اتنا بڑا داغ دیا ہے بنی نے۔ پھر بھی ماں کا دل دیکھیں۔ اس کی جدائی میں پاگل ہوا جا رہا ہے۔ اسے اس بد بخت کے اٹھانے کے غلط قدم کا نہیں آ رہا۔ بس اس کے غلط ہاتھوں میں چلے جائے گا تم سب کو چارہ ہے۔"

"جھومر تو اچھی لڑکی تھی میں خود اس سے ملی تھی پھر اس نے ایسا قدم کیوں اٹھایا اور وہ مرے وہ تو اس گاؤں میں اچھی تھی اور اسے ادھر آئے تو میرے خیال میں ابھی مہینہ ڈیڑھ مہینہ ہی ہوا تھا پھر ایسا کام؟"

رابعہ بی بی کا تجسس بھی لفظوں کی صورت میں ڈھل کر ان کے لبوں تک آئی گیا۔ آمنت اور زینب تو پہلے ہی پوری طرح سے ان کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں اور زینب بھی "مزے تو لینے حویلی آنے کے لیے بے تاب تھی اس نے معنی خیز انداز میں آمنت کو کہنی بھی ماری تھی۔ آمنت نے اسے گھورا۔

"بس بسن جی! بسب انسان کے برے دن آجائیں۔ اچھی بھلی لڑکی تھی اور میں تو انوں بہت ہلاک ہو شیار بھی نہیں تھی۔ بس اسے بڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ادھر سوات میں بھلا کب ہے اتنا بڑھنے کا روانہ اور وہ تو ان کی لڑکیوں کو بڑھانے کا جس کا باپ بھی ان بڑھ کر ڈرائیور ہو اور ماں ویسے بھی چچی ان بڑھ تو اسے کس نے بڑھانا تھا۔ چچا ایک دوبار ان کے گھر گیا۔ چچا کی بیٹی بھی ساتھ تھی جو مروان میں اسکول میں پڑھتی تھی اس کی کتابیں دیکھ کر جھومر کو بھی بڑھنے کا شوق چڑھا تو ماں باپ سے وہ ضد لگائی کہ مروان آکر ہی دم لیا۔ ماں باپ کی اکلوتی تھی۔ ماں نے دل پر پتھر رکھ کر اسے چچا کے گھر بھیج دیا اور باپ تو رہتا ہی ٹرک کی مال برداری پر تھا۔ ماں بے چاری اکیلی رہ گئی تو ادھر بھی کبھی کبھار جھومر سے ملنے مروان چلی آتی تھی۔ وہیں سے اس نے میٹرک کیا اور میں تو انوں۔ اس کے چچا کے گھر کا ماحول بھی بہت اچھا تھا بہت سخت اور پتھر پاتا تو ہمیں تھا جیسا اس کے باپ کے گھر کا تھا۔ شہری حد میں رہتے ہوئے پورے کی چال چلن کی پابندی پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے۔ اس کی بیٹی بھی سلجھی ہوئی سمجھدار عورت ہے۔"

ادھر پنجاب کی ہی ہے۔ بس جیسے ہی جھومر نے میٹرک کیا۔ اس کا باپ اس منحوس ٹرک ڈرائیور کا رشتہ لے آیا اس کے لیے۔ جھومر نے تو طوقان اٹھایا اور بات یہ عقل کی تھی بھی نہیں۔ کہاں جھومر دیکھا تو ہے آپ نے اسے اتنی خوبصورت کہ دیکھو تو لگتا ہے شیشہ بھی میلا ہے اس کے آگے۔ اور وہ ٹرک ڈرائیور چچا اس سال کا تھا پٹھان، نسوار کھا کھا کر اس کا سارا منہ گلا ہوا۔ شکل پر خباثت اور جھومر کا باپ اس سے بڑا خبیث۔ جس نے رقم جھومر کے

پولے ہو کر رکھی تھی اس بڑھے کھوسٹ سے۔ جھومر کے باپ کا تو ٹرک بھی اپنا نہیں تھا۔ وہ بھی اس بڑھے نے لے کر دیا تھا۔ اب بھلا وہ اس کی جان چھوڑتا؟ جب باپ زبردستی نکاح کا کام نہ کر ایک ہفتے کے اندر تیار کر کے کا حکم دے کر بندھی تیار تو دونوں ماں بھی ادھر آئیں میرے پاس۔ میں نے خدا ترسی کو رکھ لیا۔ ماسٹر صاحب کی گھر کی کی بھی پڑا نہیں کی۔ سچ کہوں تو جھومر بہت تیز ہو چکی تھی یا باپ کے گھسیا پن نے اسے اس قدر ہوشیار کر دیا تھا۔ بہر حال اس کا خیال تھا کہ اس کا باپ ادھر نہیں آسکے گا اور وہ مزے سے شہر جا کر کلچر میں داخلہ لے لے گی۔ عمروہ جس نے پیسہ لگا رکھا تھا وہ اس کے باپ کی جان بخشی کرنا تھا بھلا۔ دونوں ادھر آگئے۔ روز کی لڑائی بھگڑا۔ ایک دو دفعہ تو جھومر اس کے باپ نے ہاتھ بھی اٹھایا ماسٹر صاحب نے تو دو تین دفعہ منہ پھاڑ کر چلے جانے کو بھی کہا مگر ان کا کوئی فیصلہ ہونا تو وہ جاتے اور آج صبح وہ واقعہ ہو گیا۔ وہ شاید کل رات کے پھلے پھر ہی میں بھاگ چکی تھی کسی کو خبر ہی نہ ہو سکی۔" ماسٹری نے کب سے بھرا دل کا غبار نکالا اور سارا واقعہ من و عن رابعہ بی بی کے گوش گزار کر کے چلے گئی۔

"زیادہ شہتی تو اس کے باپ کی ہوئی نا ہوا اس کو اس طرح فروخت کر رہا تھا۔" رابعہ بی بی بولیں۔

"ان کے ہاں یہ سب کچھ چلتا ہے۔ جھومر کے باپ نے کچھ انوکھا نہیں کیا تھا اور اگر ایسا کچھ تھا بھی تو اسے یوں گھر سے فرار نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ماں باپ کے منہ پر تو جو کالک مل گئی سوں مل گئی۔ خود اللہ جانے کن حالوں سے گزر رہی ہو لی۔ بھلا ایسی لڑکیوں کو نصیب کوئی چھو لوں کی سچ پر بٹھاتا ہے۔ اسی لیے تو لوگ بیٹوں کے پیدا ہونے پر خوش ہو جاتے ہیں کہ اللہ ان کے نصیب اچھے کرے۔ ہماری بھی تو بچیاں ہیں۔ بیسی سیدھی بھلی ماں جانو اللہ تعالیٰ کی گامیں اور آپ کی تینوں بچیاں بھی اللہ ان کے نصیب اچھے کرے ماں باپ اگر غلط فیصلہ کریں بھی تو اولاد کو فریادیں اور رہنا چاہیے کہ والدین سے زیادہ اولاد کا خیر خواہ اور کوئی نہیں ہوتا۔ ہم تو یہ جانتیں۔"

ماسٹری نے اب چڑھا کر بولیں۔ "یہ کیا ہے لہر گھر سے بھاگ لگے اس طرح کیا وہ کسی ریاست کی مہارانی بن گئی ہو گی۔ خدا بچائے۔ کل ماری لڑکی پھر رہی ہو گی۔"

ماسٹری نے بھی اپنی بچیوں کی تربیت بڑے سخت طریقے سے کی تھی۔ خصوصاً بیٹیوں کے ساتھ نرمی کی وہ بھی قائل نہیں تھیں۔

"اللہ اسے اپنی حفاظت میں رکھے اور سچ رستہ دکھائے۔" رابعہ بی بی نے حسب عادت وعادی کیونکہ وہ کسی کو بھی برا نہیں کہہ سکتی تھیں۔

"ہو سکتا ہے ماں باپ کے ادھر سے جانے کا انتظار کر رہی ہو۔ کہیں جا کر چھپ گئی ہو۔"

"اگر وہ اب اس نے ادھر کا رخ بھی کیا تو سوائے جوتیوں اور لعن طعن کے اسے کچھ نہیں ملے گا بابا میں تو اسے دیکھنا چاہتی تھی۔ گھر کی دیوار پر قدم نہیں رکھتے وہاں کی۔ پہلے ہی میں ماسٹر صاحب کی بہت نا فرامی کر چکی ہوں۔"

ماسٹری کانوں کو ہاتھ لگا کر بولیں۔

"اس کے والدین چلے گئے۔"

"جہیں جی۔ بے چارے شرم سے منہ پھپھانے بیٹھے ہیں۔ رات ہونے کا انتظار کر رہے تھے اور پتہ پارش برس رہی ہے۔ آج رات کو نکل جائیں گے۔ جھومر کے باپ سے تو اس ملعون نے ٹرک بھی چھین لیا ہے۔ اب بیچارہ ادھر جا کر پتھر ہی ڈھونڈے گا۔ ایسی اولاد تو جنم لیتے ہی مر جائے جو ماں باپ کو اس بڑھاپے میں ایسی ذلت بھری زندگی سے دوچار کرے۔" ماسٹری کو پھر غصہ آ گیا۔

"کیا وہ واقعی شہتی کے بیٹے کے ساتھ گئی ہو گی؟" رابعہ بی بی نے پوچھا۔

"اللہ جانے کس کے ساتھ منہ کالا کیا ہے اس نامراد نے۔" وہ منہ بھر کے بولیں "سب کہہ رہے ہیں سلیم کے ساتھ گئی ہے بھلا اسے سلیم کا کیا کہاں سے چلا۔ پر بابا چل گیا ہو گا۔ گھر میں بھی تو نہیں گئی تھی چار بار تو ادھر حویلی آئی ڈھولک دیکھنے کے بہانے آتے جاتے نہیں میں لڑا لے ہوں گے کج بخت نے۔"

”میں نے کیا سوچنا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں ہے کیا؟“ وہ جتانے والے انداز میں بولی۔
 ”معلوم ہے مجھے سب جو تیر تم نے مارا ہے۔ دیکھو تارا! شاہ جی تمہاری منزل کے رستے میں آنے والا محض
 ایک شارٹ کٹ ہے منزل نہیں۔“

آج پھر زبور گل پر بندہ نصال کا دورہ پڑا ہے۔ نینن تارا نے ہزاری سے سوچا۔
 ”کیسا شارٹ کٹ؟“ نینن تارا صوفے سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔

”تمہارا کیا خیال ہے محض اس طرح خفیہ نکاح کرنے سے سلطان بخت نے تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا لیا ہے
 اپنی دولت و جاگیر کا حقدار بنا دیا ہے۔ نہیں تارا! یہ سب سراب ہے۔“ وہ خود ہی نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ”اس نے
 محض تمہیں ہلانے کے لیے چند ماہ یا کچھ عرصے کے لیے تم پر استحقاق جتانے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا ہے۔ وہ
 سمجھتا ہے میں نے یہ بال دعویٰ میں سفید کیے ہیں۔ اب یہ تمہارا کلام ہے کہ تم اس کے اس ڈھونگ سے کس قدر
 مالی فوائد حاصل کر سکتی ہو کہ پھر وہ بھی گزر اوقت بن جائے گا۔ جو پیچھے محض بچھتاوے چھوڑ جاتا ہے۔“ زبور گل
 کی لالہ سی ٹھنکوں میں تارا کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔

”مام! ضروری نہیں جو تجربہ آپ کے ساتھ ہوا ہے وہی میرے ساتھ بھی ہو۔“ نینن تارا اچھ کر بولی۔ ”مجھے
 معلوم ہے شاہ جی میرے ساتھ کتنے فیئر ہیں اور اگر انہوں نے میرے ساتھ کوئی فاول ٹیم کھیلنے کی کوشش کی تو یہ
 انہیں بہت منگاپڑے گا۔ میں تم کو یہ تجربے میں ان سے اور آپ سے بہت کم سہی مگر مجھ میں اتنی سمجھ ضرور ہے
 کہ اگر کوئی میرے ساتھ کوئی فاول کھیلنا چاہے۔ تو اس کو میں ہاتھ پکڑ کر روک سکتی ہوں۔ اتنی جرات ہے مجھ
 میں۔“ وہ کچھ غصے میں آکر بولی۔

”تمہارا کیا خیال ہے لی معصوم! اسے کوئی بھی فاول ٹیم کھیلنے کے لیے تم سے اجازت لینے کی ضرورت ہوگی
 جبکہ وہ تم سے پہلے کھیل بھی چکا ہے اور تمہیں اس کی کچھ خبر بھی نہیں۔ جس طرح اس نے تمہاری معصومیت
 اور بے تجربگی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اسی طرح تم بھی اس کو خبر کیے بغیر جس قدر بھی فائدہ حاصل کر سکتی ہو کر لو۔
 اسے میری نصیحت سمجھو یا اپنے لیے ایک گائیڈ لائن اور بہت جلد تمہیں اس گائیڈ لائن سے مدد ملنی پڑے گی۔ یہ
 تم میری بات لکھ لو۔ اور وہی بات میرے تجربے کی۔“ وہ سانس لینے کو روکی۔ کمرے میں چند منٹ کی خاموشی چھا
 گئی۔ ”تم نے تو محبت بھی پلاننگ کی طرح کی ہے اتنی کم عمری کے باوجود تم نے یہ بڑا کام کا لیا ہے کہ اس
 خوبصورت جذبے نے تمہیں عملی طور پر اندھا نہیں کیا۔“

محبت پہلی نظر میں ہی ہوتی ہے اور یہ ہماری دوسری نظر ہوتی ہے جو فیصلہ کرتی ہے۔ آیا ہمیں یہ محبت آگے
 پہنچانی چاہیے یا نہیں یا اپنے قدم ہمیں روک لینے چاہئیں اور جو دوسری نظر کے پیمانے پر اعتبار کرتے ہیں میں
 کبھی ہوں وہ لوگ کافی حد تک عقل مند کی ثابت دیتے ہیں۔ تم نے دوسری نظر میں شاہ جی کے ریمسازہ قدر کا ٹھہ
 کا اندازہ لگا کر اپنی پہلی نظر کی تائید کی۔ بہت اچھا کیا مجھے خوشی ہے کہ یہ سمجھ داری میری بیٹی کے حصے میں آئی جبکہ
 میں نے۔۔۔“

وہ ایک ٹھنڈا سانس لے کر بولی۔
 ”میں نے تو صرف محبت کی بھی پہلی نظری آخری تھی۔ میں نے دوسری نظر پر اعتبار کیا ہی نہیں وہ ایک ٹھل
 کلاسیا ٹیک شریف سمجھ دار شخص تھا جو نہ جانے کیسے کس کے ہر کاوے میں آکر میرے چہرے پر قدم دھر بیٹھا
 تھا پھر بہت عرصے تک ادھر سے اٹھ ہی نہ سکا اور میں اس کی پہلی نظر کے دھارے میں بہتی چلی گئی اور پھر مجھے کچھ
 سنائی نہ دیا۔ نہ اپنی ماں کی التجائیں نہ اپنی حیثیت و اوقات اپنے اور اپنے محبوب کے درمیان موجود معاشرتی
 عزت کے پیمانے بس میں اس کے ساتھ کچھ دھاگے میں بندھی چلی گئی۔“

اس نے مجھے شرعی طور پر اپنایا اور اس بات نے مجھے راتوں رات فرش سے عرش پر پہنچا دیا۔ طوائف کو تو چلو بھر
 عزت دے دو تو وہ عزت دینے والے پر اپنا تن من دھن سب کچھ لٹا ڈالتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس

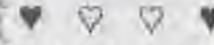
ما سنی کا بس نہیں چل رہا تھا کہیں سے ڈھونڈ کر جھوٹا قیام بناواؤں۔
 ”ہوں! رابعہ لی بی چپ رہیں تو ما سنی بھی دل کی بھڑاس نکال کر خاموش ہو گئیں۔
 ”اللہ تم دونوں کو صبر چھپ کر پیشگی ہو اور میں دس یا بیسیراں سے ڈیوڑھی میں جا کر پوچھ چکی ہوں کہ آمنہ اور
 زینب ابھی نہیں آئیں۔“

شریہ ان کے پیچھے سے آکر زوردار آواز میں بولی تو وہ دونوں جو محو ہو کر جھوٹا قیام بناواؤں۔
 شریہ ان کے پیچھے سے آکر زوردار آواز میں بولی تو وہ دونوں جو محو ہو کر جھوٹا قیام بناواؤں۔

”ہاں ہم ابھی آئے ہیں تھوڑی دیر پہلے۔“ آمنہ نے گردن موڑ کر ملائم مسکراہٹ سے شریہ کے سج
 سنورے روپ کو دیکھا گولڈن انٹو کے چوڑی دار پا جاسے اور قرآک میں اس کا گورا رنگ چمک رہا تھا۔
 ”چلو آؤ میرے ساتھ۔ اوپر چلتے ہیں۔ تمہیں اپنی بھانجی جان کا کمرہ دکھانی ہوں۔ قسم سے دیکھ کر دنگ رہ جاؤ گی
 اتنی خوبصورتی سے سجا ہوا ہے۔ آؤ نا!“

وہ آمنہ کا ہاتھ کھینچ کر بولی زینب کو تو اس دعوت کا سنتے ہی باچھیں کھل گئی تھیں۔ اس کے تودل کی مراد بر آئی
 تھی۔ آمنہ نے ایک نظر ماں جی کی طرف دیکھا وہ بھی ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”اما رتی! ہم جائیں۔“ اس نے اجازت طلب کی۔
 ”جاؤ مگر واپس ادھر ہی آجانا پھر میں تمہیں اتنے رش میں کہاں ڈھونڈتی رہوں گی۔“
 وہ اجازت دیتے ہوئے بولیں تو دونوں شریہ کے پیچھے عورتوں کے ہم غیر میں رستہ بتاتی ہوئی چل پڑیں۔



”میلو بام! نینن تارا کمرے میں داخل ہوتے ہوئے سامنے ایزی چیرر بیٹھی زبور گل سے بولی اور زبور گل کے
 پاس پڑے صوفے پر گرنے کے انداز میں ڈھیر ہو گئی ایک دوپل ایسے ہی لڑے۔ زبور گل سختی نظروں سے
 اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ نینن تارا سیدھی ہوئی ہاتھ میں پکڑی گاڑی کی چابی موبائل اور پینڈ بیک سینٹرل کھیل پر
 رکھے اور پیروں سے سینٹرل اتارنے لگی۔

”کہاں سے آ رہی ہو تم؟“ زبور گل زیادہ پر خاموش نہ رہ سکی کڑے توروں سے پوچھا۔
 ”لائنگ ڈرائیو سے۔“ اس نے پاؤں اٹھا کر صوفے پر رکھے اور آرام دہ انداز میں لیٹ گئی۔
 ”زندگی بھی لائنگ ڈرائیو سے نہیں! بٹ ناٹ فار انجوائے منٹ۔“ وہ چہا چہا کر بولی۔
 ”مطلب؟“ نینن تارا لاپرواہی سے ابھرا چکا کر بولی۔

”تمہیں کوئی ٹریفک سارجنٹ نہیں روکتا جبکہ ابھی تمہارا ڈرائیونگ لائسنس بھی نہیں بنا۔
 ”تو اتنی جرات ابھی کسی ٹریفک سارجنٹ میں نہیں کہ وہ نینن تارا کو روک سکے۔“

وہ اسی لاپرواہی سے بولی۔ ڈارک پریل کلر کے سوٹ میں اس کا نازک شانخ سایدن کسی سانچے میں ڈھلا ہوا لگ
 رہا تھا۔ شارٹ سیلو میں گورے سفید سر میں بازو جنہیں وہ بطور تکیہ سر کے نیچے رکھ کر نیم دراز ہو گئی اور ترچھی
 نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔

”آخر کب تک خود کو یوں Spoil (ضائع) کرتی رہو گی۔“ زبور گل کچھ افسوس زدہ لہجے میں بولی۔
 ”کیا مطلب ہے آپ کا مام! میں کب خود کو ضائع کر رہی ہوں۔“ وہ اچھٹے سے بولی۔
 ”یہ خود کو ضائع کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔ دیکھو تیناں! جب وقت گزر جاتا ہے تو وہ اپنے پیچھے بہت یادوں کے
 ساتھ بہت سے خسارے بھی چھوڑ جاتا ہے جن کو پورا کرنے کی پھر کوئی صورت نہیں رہتی۔“

زبور گل ایزی چیرر آگے ہو کر بیٹھ گئی۔
 ”کیسے خسارے؟“ وہ تھکے چہرے سے بولی۔

”تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے۔“ زبور گل دو ٹوک انداز میں بولی۔

نے مجھے چھوٹا سا مکان کرائے پر لے کر دیا جسے میں نے چند ہی دنوں میں گھر بنا ڈالا۔ صبح و شام اس پرانے گھر کو چوکائی۔ اپنے اندر کی انساں گھڑ عورت سے پوچھ پوچھ کر اس کے لیے پکوان پکائی۔ شام کو بن سنور کر کسی گاہک کا نہیں اپنے پیسے شوہر کا چلکس بچھا کر انتظار کرتی تو جانو مجھ سے برا خوش نصیب اس کہ ارٹس پر کوئی نہیں تھا۔ میں نے اس رشتے پر اپنے پچھلے سارے تعلقات قہبان کر دیے۔ اپنی سگی ماں سے ملنے سے انکار کر دیا کہ اس کے آنے سے میرے شوہر کا پوتر گھر تپاک ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس کی خاطر ساری دنیا سے کٹ کر گھر کے درتے دروازے آسمان کی طرف ٹھلنے والا رتہ ہر رستہ خود پر بند کر دیا اور بدلے میں اس کی ڈھیروں ڈھیروں بھرتیں رات بھر میرے وجود پر گل پاشی کرتیں۔ تو میں اپنے آپ سے باہر ہو جاتی۔ یہ پینا تو اس روز ایک چھتا کے سے ٹوٹا جب کہیں میرے وجود میں پرورش پاتے جو تھا مینہ تھا۔ وہ شریف زادہ ایک ملوا آف سے جی بھر کر مل بھلا کر کاغذ کا ایک تین حرفی ٹکڑا میرے سونے ہوئے وجود کے نیچے دیا کر ہمیشہ کے لیے چلا گیا اور میرے پاس تو ایسا کچھ آسرا بھی نہیں تھا کہ چھ آٹھ مہینے اس کے چھوڑے ہوئے کسی باوی گھنے کے سمارے گزار سکتی۔ مکان جسے میں نے جان مار کر رکھ پنا یا تھا پھر سے کرائے کا مکان بن گیا۔ اگلے مہینے مالک نے خالی کر لیا۔ زیور کے نام پر وہ صرف مہینے کے بار پھول گھرے میرے آشتہ وجود کی زینت بنا تا رہا تھا اور لباس کی قیمت تو کسی بھی زمانے میں تقاضا کر نہیں رہی یہ لباس اور بے لباس کا تصور تو انسان کے ذہن کی پیداوار ہے۔ کچھ لوگ بہت کچھ ہیں اور کچھ کم ہیں۔ کتنے ہی نظر آتے ہیں۔ ان کا اندر اس قدر غلیظ ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی بھی پوشین کوئی بھی شیش عینت پوشاک اس کی خلافت کو چھپانے میں ناکام رہتی ہے اور میں ایسے ہی شخص کے ہاتھوں کھلو بنا میں جی جو سن کا کالا تھا۔

زیور گل اپنی زندگی کے اس سانچے پر اس قدر رو چکی تھی کہ اب اسے یہ کہانی روئین کی کوئی بات لگتی۔ ایک بار بھی یاد کرتے ہوئے آنکھیں پٹی نہیں ہوتی تھیں۔ جزئیات کا علم تو تین تارا کو بھی تھا مگر اتنی تفصیل وہ ماں کے منہ سے پہلی بار سن رہی تھی۔

”اپنے ساتھ ہونے والے اس کھناؤ نے کھیل کو ایک یاد بنا کر میں تمام عمر تو نہیں سکتی تھی نہ اس بار کے سمارے عمر بتائی جاسکتی تھی اور اس کمین فطرت شخص کو حوند نا بھی جس وقت کا زیاں تھا کیونکہ وہ جاتے وقت اپنے سارے حساب بے باق کر گیا تھا حق مہر کے بیس روپے بھی اسی کا ندھی لٹانے میں موجود تھے۔ پھر اس پر انکی اٹھانے کا میرا کوئی حق نہیں تھا اور محبت تو لفظوں اور جذیوں کا کھیل ہے جو چاہے اسے جان سے بھہ کر سمجھ لے اور جو چاہے اسے پیروں کی وصول بنالے اگلا قدم اٹھاؤ پچھلا بھول جاؤ۔ میں نے بھی یہی سبق سیکھا کہ محبت زندگی نہیں زندگی کا ایک معمولی حصہ ہے۔“

اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

”اور تین تارا پھر وہی ماں جسے میں بدھا پنے کی دلہیز پر قابل رحم حالت میں ٹھو کر مار کر محبت کی اس کھنکی بانہی ٹپا اترنے چلی تھی حقیقت کا پہلا پتھر لگتے ہی مجھے ماں کے درد اس کے شہائی کا احساس ہوا۔ میں اس کی طرف لوٹ کر ٹوٹ گئی مگر اس کے دھندے کو وہ بارہ سینے سے لگانا مجھے گوارا نہیں تھا اور اس معاملے میں میں نے ماں کے بے تحاشا اصرار کی بھی پروا نہیں کی۔ تمہارے دنیا میں آنے تک کا عرصہ میں نے بہت خاموشی سے اپنی ماں کے ساتھ ایک پسماندہ علاقے میں کرائے کے ایک کمرے میں گزارا۔ تم تین ماہ کی تھیں جب میں تمہیں ماں کے حوالے کر کے روزی کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑی ہوئی اور یہ تو مجھے معلوم تھا مجھ جیسی عورت جس کے پاس نہ تعلیم ہے نہ ڈگری نہ کوئی ہنر۔ اسے کوئی قابل عزت نوکری ملے گی بھی نہیں اسی لیے اچھے وقت کے ایک دوست جولی وی اسٹیشن پر روڈ پور تھا اس کے پاس چلی گئی۔

ایک ٹنگ و غیرہ کا بھی مجھے کچھ تجربہ نہیں تھا۔ ہاں آواز بہت اچھی تھی جس کا اچھے وقت میں بہت چرچا رہا تھا اور کچھ دل کے اس روگ نے اس میں سوز بھر دیا تھا۔ روڈ پور سڑکوں میں نے اپنی دکھ بھری داستان نہیں سنا لی۔ یہی کہا کہ کچھ عرصہ ریٹ کے لیے مری اور بھورین گزار کر آئی ہوں اور اب اپنے پیسے سے بدل ہو کر تھوڑی سی لائسن بدانا

چاہتی ہوں۔ گانا چاہتی ہوں اگر آپ سر پرستی کریں تو شاید کچھ سیکھ سکوں۔ اگر میں اسے اپنی داستان خوب رودھو کر سناؤ تو میرے بھرم کا لباس اس کے سامنے تار تار ہو جاتا تو یقین جانو وہ مجھے پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہ دینا مجھے پھر آنے کا کہہ کر فرخادینا اور وہ ”پھر“ کبھی نہ آتا کیونکہ یہ معاشرہ نے کسوں اور مجبوروں پر رحم بھری نظر تو ڈالتا ہے۔ زبان ہلا کر ”چچ“ بھی کرتا ہے مگر ان کی بے کسی کم کرنے کے لیے کسی قسم کی مدد پر تیار نہیں ہوتا میں نے خود کو بہت فریش بہت خوش باش شو کیا۔ پروڈیو سوار اس کے ساتھ قہیوں میں بیسی مذاق اور ہلکی پھلکی گفتگو میں کہیں بھی انہیں اپنے اندر بڑے والی درازوں کی خبر نہ ہونے دی۔

”سنا ہے گل جی آپ نے شادی کر لی ہے۔“ اس کا ایک ساتھی بولا۔

”کیوں صاحب آپ بھی تو شادی شدہ ہیں۔ مجھے بتائیں شادی شدہ کا کیا مطلب ہے؟“

”شادی کا مطلب خوشی۔“ وہ فوراً بولا۔

”اور شدہ کا؟“ میں نے پوچھا۔

”تمام۔“ ختم۔ ”دوسرا جھٹ سے بولا۔

”یعنی شادی شدہ کا مطلب ہے آپ کی خوشی بھری زندگی ہوئی تمام۔“

میری بات پر اس کمرے میں محبت چھاڑتے رہے۔

”اور جناب مجھے ابھی اپنی زندگی سے قطرہ قطرہ بے تحاشا خوشی کشید کرنی ہے۔ جس دن اپنی خوشیوں بھری

زندگی سے آگیا تھی۔ اس دن یہ خود کشی کر لوں گی اور ساتھ میں آپ جیسے کسی چاہنے والے کو لے ڈروں گی۔“

میری بات کو سب نے بہت انجوائے کیا۔ پروڈیو سر صاحب نے اسی وقت پر تلفظ چائے کے بعد آؤیشن کا

اہتمام کیا اور میری آواز کو گانے کے دو سب سے اچھے میں ہی ادا کے کر دیا۔

اگلے دن سے میرے گانوں کی ویڈیو ایک شروع ہو گئی پر اپنی زندگی کو میں نے انجان پن کا کفن پرنا کر زینت کے

نہرے گانوں میں نہ کر دیا۔ نئی زیور کے لئے جنم لیا جسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں خوب کام

ملنے لگ گیا۔ دس فلموں میں سے چار کے تین چار گانے تو مجھے ضرور ہی ملتے ان کے ساتھ چھوٹے موٹے کام

اور بھی کرتی رہتی مگر جسم فریڈی کا گندا کام پھر کیا اور میں تمہیں بھی اس دھندے کی طرف نہیں جانے دوں گی

لیکن اس بات کی گواہ میں خود یا میرا خد ہے کہ میں نے وہ کام کلی طور پر شادی کے بعد چھوڑ دیا۔ مگر مجھ سے متعلقہ

لوگ مجھے دور دور سے جاننے والے لوگ اس بات کا کبھی یقین نہیں کریں گے اور میں نے اپنی زندگی کا ایک نیچوڑ

نکالا ہے کہ ہماری کلاں کی لڑکیاں چاہے کتنی ہی ٹیک پروین کیوں نہ بن جائیں۔ اس طبقے کی حیران پر لگی ہی رہے

گی اور اس معاملے میں یہ معاشرہ بہت بے رحم ہے فوراً ”سک“ ہاتھوں میں اٹھا کر کھڑا ہو جاتا ہے اسی لیے میں تم

سے کہتی ہوں کہ تم خود کو اتنا طاقتور کر لو کہ نہ تو کند میں اپنا وجود گندا کر سکو اور نہ معاشرے کے ہاتھوں سے پتھر کھا

سکو۔“

”نام! مجھے آپ پر فخر ہے۔“ نین تارا کافی دیر کے سکوت کے بعد آہستگی سے بولی۔ ”آپ نے ایک بے حد

مشکل زندگی گزار لی ہے اور مجھے ان مشکلات کی بھی ہوا نہیں لگنے دی۔ یو آر گرٹ مام۔“

”میری جان! یہی میں چاہتی ہوں کہ آئندہ بھی تمہیں کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ تم اپنے لیے خود

آسانیاں پیدا کرو۔“

”کیسے مام! آپ کو معلوم تو ہے۔ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔ شاہ جی کے استے مال وار ہونے کا علم بھی

مجھے بعد میں ہوا۔ اس میں میری کوئی پلاننگ نہیں تھی اور میں نے ان سے نکاح کیا ہے اور شاہ جی کوئی چھوٹی

آسامی نہیں ہیں بہت سا وٹو پرن ہیں ہر لحاظ سے آپ کو معلوم ہے۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”مگر میری جان یہ رشتے بڑے ناپائیدار ہوتے ہیں خاص طور پر ہماری کلاس میں اس طرح رات کے اندھیرے

میں جڑنے والے رشتے کچے دھاگے سے بھی ہونے ہوتے ہیں۔ ذرا سی تیز ہوا چلی تو ترانخ سے ٹوٹ جاتے ہیں اور

”گلو کاری۔ تمہاری آواز اچھی ہے بس تھوڑے سے ریاض کی ضرورت ہے ماسٹری کے پاس ہفتہ چند دن لگاؤ۔ آواز لے میں آجانے کی تو یہ کام مزو دینے لگے گا۔ میری بس تم سے یہی درخواست ہے۔“
 نین تار نے کچھ دیر سوچا اور پھر اثبات میں سر ہلا کر کھڑی ہو گئی۔
 ”او کے نام! جیسی آپ کی مرضی۔ میں بھی اپنی فراغت سے تنگ آپکی ہوں۔ کل سے ماسٹری سے کلاس لوں گی اب میں جاؤں۔“
 زیور گل خوشی سے حیرت زدہ رہ گئی اور اثبات میں سر ہلا کر اسے جانے کی اجازت دی تو وہ باہر نکل گئی۔



رات کے سیاہ بخت سینے پہ
 جو لفظ درج ہوتے ہیں
 تقدیر کے ان مٹ نقش بن کر
 سیاہ لیاؤ اوڑھے
 گردن کے روشن اجالوں میں نکل پڑیں
 تو تمام خلقت میں
 وحشت عام پھیل جائے

گھر کی طرف جاتے وہ تمام رستے وہ تمام گلیاں جن میں وہ کم سنی سے لے کر جوانی تک بے خوف و خطر چلتی تھی۔ اسے اس طرح سے اذیت تھی کہ اگر نیند میں آنکھیں بند کر کے بھی چلتی تو رستہ بھٹک نہیں سکتی تھی مگر وقت نے کیا کیا کھیلنا کھایا تھا کہ ماں کے پیار کی طرح مہمان ان رستوں میں کائناتوں کا جنگل آگ آیا تھا۔ اجنبیت اور نا اہلیت کا وہ دھندلا احساس ہر قدم پر بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ تمام رستے جو اس کے گھر تک جاتے تھے وہ آج تک ان پر پورے انتہائی سے بڑے اعتماد سے قدم اٹھایا کرتی تھی آج اس کے قدم ہی ساتھ نہیں دے رہے تھے ہار بار ڈنگا کر اسے اس کی بے وزنی کا احساس دلا دیتے تھے بار بار آنکھوں کے آگے ہی دھند کی دیویر چادر دن کے لمحہ بے لمحہ بڑھتے اجالوں کو دھندلا رہی تھی۔ کبھی چادر کے کونے سے آنکھوں کو گرگڑتی، کبھی ہاتھ کی پشت سے آنکھیں ملتی، چادر کو ہر کار رستہ دیکھنے کی کوشش کرتی رستہ تو نظر آجاتا قدم بھی آگے بڑھ جاتا مگر جیسے ایک قدم اور گرائی میں ڈوب جاتا۔ خوش آمدی خوش فہمی کا شفا سا جگنو بھی کہیں ٹٹمٹما نہیں رہا تھا۔

اسے بخوبی علم تھا کہ اب اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور جو ہو گا وہ کتنا سنگین ہو گا کہ وہ پیش بندی کے طور پر اس سے بچنے کے لیے کچھ بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ گھر کا رستہ طویل تھا، آئندہ کے لیے لائحہ عمل کے طور پر کچھ سوچا جاسکتا تھا مگر کوئی سوچ بھی اس کو دامن نہیں پکڑا رہی تھی۔ کوئی بھی نقطہ ذہن میں جم نہیں رہا تھا سوائے آنے والے ہولناک منظر کی تصویر کے۔

”یا اللہ! میں کیا کروں میں مر کیوں نہ گئی۔“ بے بسی کے احساس نے اس منبوطی سے جکڑا کہ اس نے قدم روک کر بے اختیار اور نیلے آسمان کی طرف دیکھا اپنے سوال کا اپنی بے بسی کا اسے کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ رگڑا اور پھر قدم آگے بڑھا دیے۔

روشنی کی سرگرمیاں شروع ہو چکی تھیں سرکوں پر گاڑیاں دوڑنے لگی تھیں۔ سویرے سویرے ڈیوٹی پر جانے والے بڑی تیزی سے کار یا موٹر سائیکل دوڑاتے ہوئے جا رہے تھے۔ پیدل چلنے والوں میں سے جو اس کے پاس سے گزرے، ایک توہ نے ذرا رک کر اس خستہ طبعے میں منہ سر جھپائے لڑکھرائی چال والی لڑکی کو بغور دیکھا اور صد شکر کہ کسی نے رک کر توجہ نہیں دی۔ کوئی سوال نہیں کیا کہ اس کے پاس تو کسی بھی سوال کا جواب نہیں تھا وہ آج خود سر یا سوال بن گئی تھی اب گھر جا کر اپنے ماں جانے کے سوالوں کے جواب کس طرح دے گی بھائی بھی وہ جو کسی پتھر سے کم نہیں۔ ساتھیوں میں بھی سہیل کا رویہ اس کے ساتھ کسی دور میں کے اجنبی سے کم نہیں تھا اور اب تو پھر اس کے دل سے آہ نکلی۔

خسارے میں، مرتب ہم ہی رہتے ہیں اور ہاتھ چنڑا نے والے اسی طرح پاک پوترا اپنے رستے کو چیل پڑتے ہیں۔“
 زیور گل تلخی سے بولی۔

”مام! میں نے بھی تو کوئی کچا کام نہیں کیا، بہت سی جائیداد پیسہ روپیہ اپنے نام کرایا ہے پھر آپ کو کاہے کی فکر ہے۔“ نین تار ابراعتماد لہجے میں بولی۔

”یہ سب تب صحیح ہوتا اگر تم اس سے محبت نہ کرتی ہوتیں۔“

زیور گل بولی تو نین تار اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”بیٹا! محبت انسان کو کمزور کر دیتی ہے اس نے یہ سب کچھ مجھے بھلائے کو اور تمہیں رجھانے کو تمہارے نام تو کرایا ہے۔ مگر وہ وقت دور نہیں جب وہ تم سے آنکھیں پھیرے گا تو یہ سب جاؤ گری کی طرح دھواں بن کر اڑ جائے گا اسے فریکٹر گئے کتنے دن ہو چلے ہیں دو ہفتے کے قریب ہے۔ تا؟“

زیور گل نے پوچھا تو نین تار نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”کتنے فون کیے اس نے تمہیں؟“ تو نین تار نے سر جھٹک لیا۔

”ایک بھی نہیں ہے نا۔“ زیور گل اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر بولی۔

”بھی تمہاری شادی کو سمجھو مہینہ بھی نہیں ہوا اور وہ تم سے اس قدر انجان ہے اس کی جذبول کی آگ تمہیں بابتے ہی سرد پڑی کیا؟ تم بے قرار ہو تو وہ کیوں نہیں۔ دو طرفہ محبت کا کوئی تقاضا ہے نا۔“
 زیور گل کہہ رہی تھی نین تار اسن رہی تھی۔

”تو جوانی جلدی بدل سکتا ہے صرف چند دنوں کے لیے سسی تو آئے اس کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ تمام عمر تمہاری زلف کا اسیر رہے گا۔ نین تار بازار حسن کے مکتوں میں اور اہل توہم و دولت مندوں میں ایک قدر مشترک ہے کہ یہ کسی ایک کے ہو کر نہیں رہتے۔ یہ کلیہ ہم سو فیصد پر نہ سسی مگر ناقصے فیصد پر لا کر لگتے ہیں حقیقت یہی ہے کہ طوائف اور رئیس زادے کسی ایک کے پیشہ کے لیے ہو کر نہیں رہتے۔“

”مام پلیز۔“ نین تار کو اتنے زہریلے لفظوں کی ماں کی زبان سے توقع نہیں تھی اس نے تو خود کو کبھی طوائف زادی بھی نہیں سمجھا تھا۔ زیور گل نے اسے حتی الامکان اپنے سابقہ نسب کی ہوائیں لگنے دی تھی اس لیے اسے یہ لفظ کسی گالی یا طمانچے سے کم نہیں لگتا تھا۔

”نام! اب کی ان تمام باتوں کا مقصد کیا ہے آخر؟ آپ کو جو کہنا ہے مجھ سے گھم ڈالے یوں ہیر پھیر کر بھجارتیں نہ بھجوائیں۔ میں پہلے ہی بہت تنگی ہوئی ہوں۔“

نین تار اکتا کر بولی۔ وہ شاہ جی کی بے اتفاقی سے پہلے ہی پرمردہ تھی، اوپر سے زیور گل کی ایسی باتیں سناستے اب غصہ آنے لگا۔

”میں صرف یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ اپنے آئندہ آنے والے مستقبل کے لیے خدا نہ کرے کہ وہ میرے جیسا ہو۔ خود کو تیار کرو۔ اپنے اندر کوئی ہنر پیدا کرو کہ کل کالوں کو اگر تم پر کوئی وقت آن پڑے تو تم کچھ کر سکو کیونکہ ڈگری تو تمہارے پاس بھی کوئی نہیں ہے۔ شوبز کی طرف تمہیں شادی کی محبت نہیں آنے دے رہی۔“ وہ طنزاً بولی۔

”پھر جانتیں۔ میں کیا کروں۔“ نین تار اڑچ ہو کر بولی وہ اب گفتگو کو پیشنا چاہ رہی تھی۔

”شاہ جی کو تمہارا سلور اسکرین پر اتنا پسند ہے مگر تم پس پر وہ تو کام کر سکتی ہو نا، اس کی شاہ جی کو بھلا کیسے خبر ہو گی۔“

”وہ کیسے؟“ نین تار ماں کی شکل دیکھنے لگی۔

”وہی پیشہ اپناؤ ہو میرا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”میں کیا کہوں گی سہیل بھائی سے؟“ لڑکھڑاتے قدم ایک بار پھر سڑک پر جم گئے۔

”میں کل سے کہاں گئی کہاں سے آ رہی ہوں۔“ سوالوں کا تازیانہ اس قدر زور دار تھا کہ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرے ابرائے لگے اس نے اپنے چکراتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے کو بھی کہتی پیچھے سے کسی نے اسے سنبھالا دیا۔

”کیا بات ہے بی بی! طہریت تو ٹھیک ہے تمہاری کدھر جانا ہے تمہیں؟“ ایک اور صخر عمر کا آدمی اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے مجتنب نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ٹھہر۔ ٹھیک ہوں میں۔ ویسے ہی چکر آ گیا تھا۔“ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیر لی اور صخرے سے پرے کھسک گئی وہ اسے ابھی بھی مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”کون ہو تم؟“ اب کے اس کا لہجہ کچھ کڑا تھا۔ اس کا حلیہ بھی تو مشکوک سا ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی لٹاپا مسافر گھر کا راستہ بھول گیا ہو۔

”میں ہاسٹل سے آ رہی ہوں۔ میری ماں ہاسٹل میں ہے۔ رات جاگتی رہی ہوں ان کے پاس اس لیے چکر ماسا آ گیا تھا اب ماں کے لیے گھر ناشتہ لینے جا رہی ہوں۔“ ایک دم اس نے بہانہ کھڑا۔

”کیوں تمہارے گھر میں اور کوئی نہیں کیا؟“ لہجہ ابھی غیر مطمئن سا تھا۔

”بھائی ہوتا ہے وہ یعنی میں اسے فون کیا ہے۔ ایک دو روز میں آجائے گا۔ میں چلتی ہوں مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ اس انتظار کر رہی ہوگی۔ اس آوی کا گلا سوال سے بغیر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ گئی۔

”ماں انتظار کر رہی ہوگی۔ ماں انتظار کر رہی ہوگی۔“

اس کا دل چاہا وہ وہاں بیٹھ کر روئے۔ اسے لگا اس کی ماں آج ہی اس سے پھٹتی ہے۔ آج ہی وہ مری ہے۔ آج ہی وہ ماں کی تدفین کے بعد اس کی قبر کی تانہ کلی مٹی میں وہ اپنے ہاتھ مٹے مٹے کر کے پھینکے۔ کاش ماں آج زندہ ہوتیں۔ تم نے رات بھر جاگ کر گھر کی چوٹ پر میرا انتظار کیا ہوتا۔ میری ساری ساری عمر کی میری عصمت و پاکیزگی کی حفاظت کی دعا میں خدا کے آگے لڑکھڑا کر مانگی ہو تیں تو ماں اگر میں اس حال میں بھی لوٹی تو چاہے تو مجھے

کوڑے مار مار کر میرا وجود بولساں کر دیتی۔ مجھے ٹھوکریں مار کر گھر سے نکل جانے کو کہتی۔ باپ دادا کی عزت مٹی میں ملانے پر میری ہڈیوں کا سرمہ بنا دیتی میرا چہرہ اپنے پھیپھوں کی بارش سے خون میں نہلا دیتی ماں تو مجھے مار مار کر اپنے ہاتھوں سے ختم کر دیتی مگر تو زندہ تو ہوئی۔ ماں میں کس سے اپنی بے گناہی بیان کرے گی۔ سال میں کس کس کو بتاؤں گی کہ دنیا نے میرے ساتھ کتنا بڑا دھوکا کیا ہے۔ میرے پھول جیسے معطر پاک و خود کو کیسے بچڑ میں میلا گیا ہے۔

ماں میں کہاں سے اپنی بے گناہی کے ثبوت لاؤں۔ کس کو گواہ بناؤں کون سے گامیری فریاد کون کون دھرے گا میری آہوں پر میں کس سے کہوں جا کر؟“

بین کرتی اس کی اپنی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ چیخیں اس کے گلے میں گھٹ رہی تھیں۔ شاید وہ سامنے سے آئی کسی گاڑی سے ٹکرا کر خود کو ختم کر لیتی کہ آگے اٹھانے پر اسے اپنے گھر Sweet Home کو جانا رست دکھائی دیا کہ وہ رست آج سے پہلے اسے کبھی اتنا انمول اتنا قیمتی نہیں لگا تھا۔ آج اسے اس کی قیمت لگانا بھی ناممکن لگ رہا تھا جیسے وہ اس رست پر چلی تو یہ رست میلا ہو جائے گا۔

شاید یہ بہت جلد میرے لیے نعمت ممنوع ہو جائے جیسے پہلی خطا پہلے گناہ کے بعد آدم سے اس کی حسین جنت ہمیشہ کے لیے چھین گئی تھی۔ اس کے آنسو اس کی فریادیں اس کی آہوں کا کچھ بھی تو اسے جنت کے حسین باغوں تک دوبارہ نہ لے کر جا سکی یہاں تک کہ توبہ کے بعد بھی جنت کا حصول ایک ناممکن عمل ہی رہا کہ ان باغوں تک جانے کے لیے بھی ساری عمر گناہوں سے دور رہنے کی ریاضت آدم کوئی کرنا پڑے گی آدم کی توبہ قبول ہو گئی کہ وہ اس کی یاد گاہ میں کی گئی تھی جو رحیم بھی ہے اور تبار بھی۔ میری توبہ تو انسانوں کے حضور ہوگی اور انسان خدا سے بڑا خدا بن بیٹھا ہے اگر اسے یہ منصب مل جائے تو۔

جوں جوں گھر قریب آتا جا رہا تھا۔ اس پر رقت طاری ہوتی جا رہی تھی زندگی سے دوری کا اندکان بڑھتا جا رہا تھا۔ جیسے جی موت کو گلے لگا لینے والی صورت بنتی جا رہی تھی۔ ابھی یہ گھر اس کی خوشیوں کا اس کے خوابوں کا گوارا تھا اس گھر میں اس نے پہلی بار آنکھ کھولی خدا کی عطا کردہ اس ارضی جنت کو دیکھا جس میں اس کے ارد گرد ماں باپ کی صورت میں خدا کے دو حسین و دلفریب محبت کے روپ کھڑے تھے۔ جنہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسے دان کر کے پروان چڑھایا تھا۔ اسے گوشت پوست کے اوٹھنے سے آرزوؤں امکانوں خوابوں اور خواہشوں کا متمنی انسان بنایا اس گھر کے آنگن میں ابوتی نے اسے جھولا ڈلوا کر دیا جہاں وہ اپنی پردہ خانی سے فارغ ہو کر تمام وقت جھومتی رہتی اور اپنی نرمسری پونمزور زور سے گاتی رہتی جس پر سہیل بھائی کا پارہ آسمانوں سے باتیں کرنے لگتا۔ وہ اپنے کمرے کی گھر کی میں کتاب ہاتھ میں لیے دھاڑتے آئی سے احتجاج کرتے اور اگر ای منہ خور نہ ہوتیں تو باہر آکر اسے ایک دو زور دار ہاتھ بھی جڑ دیتے وہ رونے لگتی تو امی گھر کے جس گوشے میں بھی ہوتیں اس کا رونا سن کر بھائی چلی آتیں۔

”سہیل! اپنے غصے کو کنٹرول کرنا سیکھو۔ معصوم بہن پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرم نہیں آتی تمہیں۔ آئیے دو تمہارے ابو جی کو آج ان سے تمہاری ٹھیک ٹھاک کلاس کراؤں گی۔“

وہ نرہت کو اپنی آغوش میں لے کر سہیل کو سرزنش کرتیں۔

”آج میں نے ہاتھ اٹھایا ہے اگر یہ اپنی طرف سے گلا بھاڑ پھاڑ کر اپنے بھونڈے گیت گاتی رہی تو ایک دن میں اس کا گلا یادوں گا۔ سہیل یہاں کے غصے کا رتی برابر بھی اثر نہ ہوتا۔

”تم نرمی کو ہاتھ کو کا کر دیکھو نہیں تمہارے ہاتھ نہ توڑوں گی۔ پھوٹی بہنوں پر لوگ جان دیتے ہیں ایک تم ہو مارے نہانے سے خرابہ خدانے اسے نہایت ہی تمہارے آسمے پر پڑے اور تم اس پر یہ ظلم توڑو اور اگر ایسا

و خرابا وہاں میرا زندگی میں نہ لائے کہ مجھے تم سے اسی کٹھورین کی امید ہے۔ تمہیں نہ ماں باپ سے پیار ہے نہ اس سخی بری سے۔ حد معلوم تمہارا اول اس قدر پتھر کیوں ہے۔ کس پر چلے گئے تم؟“

ای خواہ مخواہ رونے لگتیں تو سہیل بھائی سخت کڑبڑا جانے اور بڑی منت سماجت سے انہیں منانے لگتے۔ اور امی آج وہ دن آتی کیا کہ میں سہیل بھائی کے آسمے پر آ پڑی ہوں اور آج یہ دن آپ کی زندگی میں نہیں آیا اللہ نے آپ کی سن لی اور میں کس کو سناؤں امی جس کو بتاؤں۔ اب کون مجھے اپنی آغوش میں لے گا۔ کون میرے آنسو پونچھے گا۔ میں تو خود اپنے دیکھنے کے قابل نہیں رہی تو کون میرا چہرہ دیکھے گا۔

اس نے آنکھیں رٹڑتے ہوئے سڑک کراس کی۔ پھر سہیل اور اس کے درمیان کشورین کی یہ دیوار بڑھتی ہی چلی گئی کدو امی ابو کی لاٹھی تھی اور سہیل کو اس سے خواہ مخواہ کی چڑھی۔ سہیل پردہ خانی میں تو اچھا تھا مگر اسے ناچائز طریقے بہت بھاتے تھے۔ دو تین بار اٹھانوں میں نفل کے دوران پکڑا گیا جس کی وجہ سے ابو جی کی نظروں میں اس کا بیچ بالکل ہی ڈاؤن ہو گیا اور نرہت پردہ خانی میں بھی اچھی تھی اور ماں باپ کی خوب فرمائیدار تھی۔

اس چیز نے اسے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا بنا رکھا تھا۔ سہیل نے ابو جی کی سخت سرزنش پر دو تین بار اٹھانوں کی بد تمیزی کا مظاہرہ کیا جس کی وجہ سے امی ابو کو بہت صدمہ ہوا پھر بیٹے کی طرف سے ملنے والے ان صدموں میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ امی کے انتقال کے بعد سہیل کی دلچسپی گھر میں مقرر ہو کر رہ گئی۔ نرہت سے برتی جانے والی بے نیازی میں وقت گزرنے کے ساتھ مزید اضافہ ہو چکا تھا اور پھر اس کی ریشم سے کورٹ میں جس کی ابو اور نرہت نے بہت مخالفت کی تھی مگر سہیل نے ان کی مخالفت کی پروا کیے بغیر اس حسین ڈائن کولا کرا اپنے گھر کی زینت بنا لیا۔

ریشم اگر اچھی نفل آتی تو شاید ابو جی سہیل کے اس جرم کو بھی معاف کر دیتے مگر بازاری عورت کی اس بیٹی نے ان کے آباء کی صدیوں کی بتی عزت کی چادر کو اڑھٹنا شروع کر دیا۔

اس نے گھر کے آگے رک کر چادر کے کونے سے اچھی طرح اپنا منہ صاف کیا۔ ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں تر کرنا چاہا۔ حلق میں تو جیسے کانٹے آگے ہوئے تھے۔ چادر کو اچھی طرح اوڑھا اس کی تھیلیاں سینے سے تر ہو چکی تھیں اور ٹانگیں ہولے ہولے کانٹے لگی تھیں۔

"یہ میرا گھر ہے۔ میری حالت اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر پہلے تو کبھی نہ ہوئی تھی۔ میرے اللہ مجھے جو صلہ دے زندگی دی ہے تو حوصلہ بھی دے۔" اس نے سینے کے اندر زور زور سے دھڑ دھڑاتے دل کو سنبھالا اور کال تیل پر انگلی رکھ دی۔

"کاش سارے گھر کی برقی رو سمٹ کر اس ننھی گھنٹی میں آسکتے اور اس کی گنگی تاریں میرے وجود کو چھو کر اس کا خاتمہ کر دیں اور میں کسی کو کھلی آنکھوں سے نہ دیکھوں۔"

اس کے دل نے بے اختیار دعا کی، گھنٹی گھر کی خاموش فضاؤں میں دور تک گونجی تھی۔ انتظار کا دورانیہ سولی پر لٹکے کسی شخص پر گزرنے تکلیف دہ عمل کی طرح تھا اس نے اپنی کپلیں بچھیلیوں کو آپس میں جکڑا۔

کتنے لمحے خاموشی سے سرک گئے، اطلالی گھنٹی کا کوئی رسپانس نہیں ہوا تھا۔ اس نے خوف سے گرزتے دل پر قابو پا کر دو سری بار پھر تیل کو دبایا اس بار انتظار طویل نہ تھا۔ دوسری گھنٹی بجنے کے چند لمحوں بعد ہی مین گیٹ دھڑ سے کھل گیا، سامنے وہ حرافہ اس کی معصوم زندگی کی قاتلہ تھی سنوری کھٹی تھی۔ اور ج ڈبل جارحیت کے سوٹ پر اور بیچ بچھڑتا ہوا میک اپ کیے وہ شاید کہیں جانے کے لئے تیار تھی۔ اس نے ایک نفرت بھری اجنبی نگاہ سے مزہمت کو دیکھا جیسے کوئی بے وقت آنے والے بھکاری کو دیکھتا ہے۔

"کون ہو تم؟" لہجے میں نفرت، حقارت یا ناشائستگی اور گیٹ پر استحقاق بھرے انداز کے سارے تیر موجود تھے۔

"تم؟" مزہمت نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"کون ہو تم اور ادھر کیا لینے آئی ہو۔" وہ دیدہ دلیر عورت اب کے ڈپٹ کر رہی اس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ لیے تھے، آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔

"ہٹو میرے راستے سے تم یہ پوچھنے کا حق نہیں رکھتی۔ تم نے تو کچھ میرے ساتھ لیا ہے اس کا تو میں تمہیں ابھی بتاؤں گی، کیسے تم نے ہماری پیٹھ میں خنجر کھوپا ہے۔ ہٹو پھر لے تم۔" مزہمت نے اس کے کمر پر رکھے بازو کو دھکیل کر اندر جانے کے لیے رستہ بنا چاہا مگر اس آہن صفت عورت کا بازو پلٹنا کچھ آسان کام نہیں تھا۔

"آوارہ بے حیا۔" ریشم نے ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر جڑا، مزہمت لگی آنکھوں کے آگے نیلے نیلے اور بیچ ستارے سے جگمگانے لگے۔ "جو یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں۔ ان کو بھی بلوایا ہے، ہوں۔ سہیل! سہیل! ادھر آؤ" دیکھو تمہاری پاکیزہ، بن تمہارے پرکھوں کی عزت کو کیسا حسین بہ نگا کر کس دیدہ دلیری سے گھر کے اندر گھس رہی ہے۔

کیسا نقد بر نے ایک ہی رات میں پلٹا کھایا تھا تخت کو تختہ کر دیا تھا۔ وہ جو گھر میں آنگن میں کھیلنے والا معصوم و معطر بچوں تھا۔ کسی غیر نگاہی کے پاکیزہ کردار کو میلی نظر سے نہ دیکھا تھا اور جسے ابو جی بازار کی بیٹی کہتے تھے وہ گھر آنگن کی محفوظ چھت تلے با کردار بیٹی کھڑی تھی اور وہ بازار میں غیر محفوظ بچوں ہی کی نظر میں مشکوک و بے کردار بیٹی کھڑی تھی۔ سہیل کی نفرت انگیز نظروں نے اس کے رے سے حوصلے بھی منہدم کر دیے۔ اس نے خود اپنے اندر ان حوصلوں کی شکستہ عمارت کو دھڑ دھڑ کرتے سنا اس کا تمام بدن ٹھنڈے پینے میں بھیک گیا تھا۔ خوف کی سرد لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ رہی تھی۔ کانچنی ٹانگیں کے ساتھ اس سے کھڑا ہونا محال ہو رہا تھا۔ ان سب کے باوجود اس نے آخری بار اپنی ہمت مجتمع کرنے کی کوشش کی خشک پٹری زور زور سے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"بھائی بھائی۔" کہنے کی دیر گئی اس کی آنکھوں میں آنسو اس بری طرح سے اٹھنے لگے کہ سامنے کا منظر ہی بچھپ گیا۔

"دیکھو آئی ہو یہاں۔ جس کے ساتھ بھاگ کر رات بھر منہ کالا کیا ہے۔ اس کے پاس لوٹ جاؤ۔ اس گھر میں

اب تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ تم نے اپنے مرے ہوئے ماں باپ کی عزت کو گندگی کے جس پاتل میں پھینکا ہے۔ ہنترے تم خود بھی اس میں جا کر اور یہ تمہارے لیے اب کچھ دشوار نہیں کہ یہ سلا قدم تو تم افشانی چکی ہو اور اگر اس گندگی میں جانے کو دل نہ چاہے تو اس شہر میں بڑی بلند عمارتیں ہیں۔ کسی سے بھی کو کر مر جاؤ اس طرح کہ تمہارا چہرہ صبح ہو کر اتنا سنوٹا ہو جائے کہ کوئی بھی نہ شناخت کر سکے کہ تم کسی عزت دار شخص کی کبھی بیٹی رہی ہو اور تمہاری لاش وصول کرنے کوئی نہیں آئے گا۔ ناؤ گیٹ لاسٹ۔"

اس کا لہجہ برف کے اندر ٹخند ہوا تھا اور ایک ایک لفظ کسی برفیلے تیر کی مانند مزہمت کی سماعتوں پر برس رہا تھا اس نے بے یقینی سے منہ اٹھا کر بھائی کے برف چہرے کو دیکھا یہ تو اسے معلوم تھا۔ سہیل کا یہ ایکشن اس سے کم نہیں ہو گا مگر اس طرح کے لفظ اس طرح کا انداز۔ اسے لگا اسے دھوکا ہوا ہے اس کے سوا کہتہ بدن میں جنبش ہوئی۔ وہ ذرا آگے کو بڑھی تو ریشم اس طرح جھک کر پیچھے ہٹی جیسے اسے کسی پچھوٹے ڈنک مارا ہو۔

"بھائی! امیری بات تو سنیں۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ میں تو میں تو اس کے ساتھ۔"

وہ گڑ گڑا کر آگے بڑھ کر جیسے سہیل کے قدموں میں گرنے لگی۔ سہیل نے پھرتی سے ہاتھ بڑھا کر گیٹ کے پٹ اپنی طرف سمیٹ لیے اور چٹخنی لگاتے ہوئے تیز آواز میں چلایا۔

"تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ مجھے تم سے کچھ نہیں سنا۔ تمہارے مرجانے کی خبر میں نے سارے شہر کو بے ڈی ہے۔ اب زندہ بدن لے کر پھرو گی تو بد روزی کہلاؤ گی۔ لوگ وحشت زدہ ہو کر بھاگ جائیں گے ہنترے جہاں رات گزار آتی ہو وہیں ہمیشہ کے لیے چلی جاؤ۔ اب دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرنا یہاں کوئی تمہارا منتظر نہیں۔"

واسطہ بھائی! آپ کو میرے مرے ہوئے ابو جی کا واسطہ بھائی! میں آپ کی نزی ہوں، بھائی! امی ابو جی کی نزی بھائی مجھے پچانو۔ مجھ پر رحم کھاؤ تو مجھے ایک موقع دو بات کرنے کا۔ بھائی! دروازہ کھولو خدا کی قسم تمہیں سب کچھ سچ بتا دوں گی۔ بھائی میں کہاں جاؤں گی۔ مجھے ہمت نہ لگ رہا ہے۔ بھائی! میں بتا نہیں کس طرح یہاں تک آئی ہوں مجھے اس طرح مست دھتکارو بھائی! آپ کو اللہ کا واسطہ بھائی! امی کا واسطہ بھائی! دروازہ کھولو دس میں مرجاؤں گی۔ میں کھڑی کھڑی بے آسرا مرجاؤں گی۔ بھائی مجھے اس گھر کے سوا اور کوئی راستہ نہیں آتا خدا کے لیے دروازہ کھولو دو بھائی۔ بھائی سہیل بھائی میرے اچھے بھائی مجھے معاف کر دو میں نے کچھ نہیں کیا۔ کچھ نہیں کیا خدا کی قسم آپ کو اللہ کی قسم بھائی ایک بار مجھے اندر آئیے میں پھر میں کہیں نہیں جاؤں گی کبھی بھی بھائی بھائی بھائی۔"

بے ربط جملوں کے دوران اس کی آواز پھٹ رہی تھی اس پر دیوانگی سی طاری ہو گئی۔ وہ زور زور سے بند گیٹ سے سر ٹکرانے لگی۔ اس کی چادر ڈھلک کر اس کے قدموں کو چھو رہی تھی۔ وہ ہاتھوں سے دروازہ پیٹ رہی تھی۔ سر کو دروازے سے ٹکرا رہی تھی۔ اس علاقے کے پاس سویرا دیکھنے کے عادی نہیں تھے گھر بڑے بڑے ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے کافی کافی فاصلے پر بنے ہوئے تھے اس کی دیوانگی کو سننے والا کوئی نہیں تھا۔

سوائے خاموش آسمانوں میں بیٹھا فیصلے کا کارڈ محفوظ کیے خدا کے۔ اس کی، سہیلانی پتھوں میں شدت آگئی اور ہاتھ سے خون رسنے لگا مگر اسے کوئی ہوش نہیں تھا ہوش میں آنے کے بعد سے وہ جو خود کو سمیٹ کر حوصلہ کیے پیشی تھی یوں بھائی کے اجنبی سینے پر سارے حوصلے سارے ضبط کھو بیٹھی۔

"بھائی مجھے لے جاؤ۔ مجھے اندر لے جاؤ بھائی! یہ گھر میرا بھی تو ہے۔ بھائی! میں نے کچھ بھی نہیں کیا کسی سے بھی پوچھ لو میں قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤں گی۔ میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ میں تو نہیں بھی نہیں گئی تھی میں تو بازار گئی تھی۔ بھائی اللہ کے واسطے گیٹ کھولو۔ مجھے اندر لے جاؤ۔ بھائی مجھے اندر آئے۔ میری بات۔ بھائی میں نے۔"

اس کے ہوش و حواس گم ہونے لگے خود کو سنبھالنے کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اور وہ مٹی کی ڈھیری کی طرح سیاہ گیٹ کے آگے کسی ٹھہری کی طرح زور سے آن گری۔

مکان سے آگے لامبوں کی جستجو سے
 رستے کبھی باعث سفر نہیں ہوتے
 بھری بہار میں رونے کو جی چاہتا ہے
 جذبات موسموں کے زیر اثر نہیں ہوتے
 برستی ہے بارش اور آگ بجھتی نہیں
 کون کتنا ہے اب یہ قہر نہیں ہوتے
 کتنی ویران ہوتی انسان کی زندگی
 آنکھوں میں خواب اگر نہیں ہوتے

وہ بالکل کی طرح چار کنٹریوں سے گاڑی دوڑائے جا رہی تھی۔ پتا نہیں کسی فرسٹریشن اس کے اعصاب پر گاڑی
 ہو گئی تھی۔ وہ تین بیٹے کے قریب گھر سے نکلی تھی اور اب سات بیٹے کو تھے۔ روشن بھڑکلاؤں کے گھیرنے والے
 اندھیرے میں چھپ رہا تھا۔ شہر مرکزی لامبوں سے جگمگ کرنے لگا تھا۔ روشن نیون ہلائن دور سے دیکھنے والے
 کی توجہ کھینچ رہے تھے سڑکوں پر ٹریفک کا اوڈیو پیہہ گیا تھا۔ دفاتر اور کام وغیرہ سے آفت ہو کر لوگ اب گھروں کو رواں
 دواں تھے دن بھر کے کام کاج کے بعد اپنے گھر کے ہونے اعصاب کو پرسکون کرنے کے لیے گھر سب کے لیے کشش
 کا موجب تھا۔

دیکھا کروں گی میں گھر جا کر فخر کو تو رات کو دور سے آتا ہے اور گھر جا کر وہی ٹینشن سوار ہوتا نہیں کیا ہو گیا ہے فخر
 کو۔ دن بدن بدلتے ہی جا رہے ہیں۔ پتا نہیں وہ مجھ سے اس قدر دور کیسے ہو گئے۔ مجھے سنا بھی نہیں جاتا کہ انہیں
 اب مجھ میں کوئی انریکشن نظر ہی نہیں آتی۔ یہ سپاٹ سی زندگی۔ پتا نہیں ہم کتنے سالوں سے گزار رہے ہیں اور
 مجھے اس کا احساس تک نہ ہوا۔ اپنی ذات کے عم اور سوشل ایکٹیویٹیز کے خود ساختہ حال میں خود کو اس طرح سے
 الجھا بیٹھی کہ فخر اب مجھ سے مس ہونے لگے۔ مجھے خبر بھی نہ ہوئی اور اب جب میری آنکھیں کھلی ہیں۔ میں ان کی
 توجہ حاصل کرنا چاہتی ہوں تو وہ مجھ سے دامن کھینچتے جا رہے ہیں اور ان کی توجہ ہو گئی ہے۔ ان کا الجھا الجھا رویہ
 اور مہم سانداز۔ یا اللہ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے۔ اس نے زور سے اسیر لکھنے لگا۔ کارائسائے سڑک پر کوئی
 گاڑی اس کے آگے نہیں جا رہی تھی مگر وہ انجانے میں نہ جانے کب سے بارن پر ہاتھ رکھ رہی تھی۔

"لگتا ہے میں پاگل ہو رہی ہوں۔" اس نے بارن سے ہاتھ اٹھا کر اسپینڈر پر رکھا پاؤں ذرا پیچھے کیا۔ اسپینڈر میٹر کی
 سوئی اسی اور سٹر کے درمیان لرز رہی تھی۔ اتنی فاسٹ ڈرائیونگ اس نے کبھی نہیں کی تھی۔
 "اوہ میں نے تو شاید صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں۔"

اچانک دائیں طرف چائیز ریسٹورنٹ کی جگمگاتی لامبوں نے اسے یاد دلایا۔ وہ واقعی صبح سے بھوکی تھی اور اب
 بھی سات بج چکے تھے۔ اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا اس نے گاڑی ٹرن کرتے ہوئے ریسٹورنٹ کے پارکنگ
 میں کھڑی کی۔ گاڑی لاک کر کے موبائل اور پنڈ بیگ کندھے پر ڈال کر اندر بڑھی۔
 یہ ریسٹورنٹ فخر کا پسندیدہ سپاٹ تھا۔ ڈنر کے لیے اکثر وہ دونوں بہنیں آتے تھے جب بھی چائیز کا
 موڈ ہوتا تھا اور۔

"سینیٹی کو بھی تو چائیز بہت پسند ہے میں اس کو ہی ساتھ لے آتی جب میں گھر سے نکلی وہ اسکول سے آیا ہی
 تھا۔" اسے یاد آیا۔ پتا نہیں اس نے ٹیوشن لی یا نہیں۔ بہت پر بھائی کا چور ہے وہ کھانا کھاتے ہی میں گھر چلتی
 ہوں۔" ٹیبل کے گرد بڑی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اسے بہت سی سوچوں نے گھیر لیا۔

مینیو بک میں سے اس نے ویٹر کو آرڈر دیا اور نمود گھر کا نمبر لاکر سینیٹی کے بارے میں پوچھنے لگی۔
 "سینیٹی بابائی وی پر کارٹون لکھ رہے ہیں۔ ٹیوشن انہوں نے پڑھ لی تھی۔" بھٹائی نے بتایا۔
 "کھانا بھی انہوں نے کھالیا تھا جی۔" اس کے سوال پر بھٹائی بولی۔

"جی تھوڑی دیر کے لیے آرام بھی کیا تھا۔ کھیلنے یا ہر نہیں گئے۔"
 "صاحب کا کوئی فون آیا؟" اس نے پوچھا حالانکہ وہ خود بھی دو تین بار آفس فون کر چکی تھی۔ فخر کا موبائل تو
 مسلسل آف جا رہا تھا۔ پتا نہیں کس مصروفیت میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس نے جب تھلا کر موبائل چکھا تھا۔
 "نہیں ہی کوئی فون نہیں آیا۔" بھٹائی بولی۔

"ٹھیک ہے میں ابھی گھر آئی ہوں۔ تم سینیٹی کو پوچھ کر کھانا دو۔" اس نے موبائل آف کر دیا۔
 کچھ ہی دیر میں اس کی ٹیبل اشتہار انگیز انوشیوڈ اور اور ٹکڑوں کی ڈش سے سج گئی۔ وہ کھانے پر ٹوٹ پڑی
 اتنی بھوک اسے پہلے بھی نہیں لگی تھی۔ کھانے کے دوران اس نے سلاؤ کی طرف بھی دھیان نہیں دیا حالانکہ
 سلاؤ اس کی کمزوری تھی کھانے کے بعد اس نے کافی کا آرڈر دیا۔ کچھ اعصاب کو سکون ملے گا۔ اس نے کرسی پر
 پرسکون انداز میں بیٹھے ہوئے موبائل اور ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔

ہاں میں رش نہیں تھا۔ بس دو چار بیسلز ہی فل تھیں اس نے یونہی گردن گھما کر بائیں طرف دیکھا تو جیسے اس
 کی نگاہیں پتھر کی ہو گئیں۔ اس نے پلکیں جھپک کر بے یقینی سے سامنے کے منظر کو دیکھا۔ خود کو یقین دلانے کے
 لیے وہ پوری محوم گئی۔

فخر حیات کسی الزامیادرن خوبصورت خالوں کے ساتھ بہت خوشگوار موڈ میں کھانا کھا رہے تھے رعنا نے زور
 سے گردن کو جھکا دیا فخر حیات کا موبائل کھانے کی ٹیبل پر ان کے بائیں ہاتھ میں موبائل کی طرح پڑا تھا حالانکہ
 ابھی صرف پچیس منٹ پہلے اس نے فخر کے موبائل پر کانیٹکٹ کرنے کی کوشش کی تھی مگر۔
 اس کے کین بدلیں اب ایک گئی آنکھوں کے آگے اپنی کانٹوں بھری رات کا رت جگا اور دن بھر کی کوقت
 بھری ٹینشن محوم کی وہ کوشش کے باوجود خوب ضبط نہ رکھ سکی اور بڑے چارحانہ انداز میں ان کی ٹیبل کی طرف
 بڑھی وہ دونوں اس سے بے خبر خوش گویوں میں ملن تھے۔

"فخر آئین آئی سٹ بیٹر" (کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں) قریب جا کر اس نے فخر کے قریب جھکتے ہوئے زہریلے
 لہجے میں کہا۔
 تو ایک بل کو فخر حیات کا لہجہ اور جملہ دونوں جیسے طلق میں پھنس کر رہ گئے انہوں نے بے یقینی سے رعنا کو دیکھا
 اور دوسرے ہی لمحے میں خود پر قابو پایا۔

"ہائے ہائے شیور۔" فخر حیات نے اسی خوشگوار ٹون کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ "یہ میری کلاس فیلو۔ کبھی
 براہ چلی ہیں شہنشاہ وہ عورت دور سے جتنی انریکٹو نظر آ رہی تھی۔ قریب سے اور بھی جاذب نظر لگ رہی تھی۔
 فخر حیات جیسے جنس کا ذوق کوئی ایسا ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ اس نے جنس کے فصیح چہرے پر نظریں گاڑ کر سوچا۔
 "میرا تعارف نہیں کرواؤ گے" وہ دونوں تھیلیاں ٹیبل پر جما کر ڈراسا اور جھکی جن بھی دلچسپی سے اس کے
 چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہی تھی۔

"ہائی وانف رعنا۔" اب کے فخر حیات کا لہجہ بہت خشک سا تھا۔
 "اگر آپ کھانے سے پوری طرح لطف اندوز ہو چکے ہوں تو گھر چلیں۔" وہ دیکھنے لہجے میں فخر کے روکھے پن کی
 پروا کے بغیر فخر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"ہم نے ابھی ڈنر اشارت کیا ہے۔ تم جاؤ گھر میں آجاؤں گا۔" فخر حیات کا انداز قنصا "اب جی تھار رعنا
 جیسے بھلس کر رہ گئی۔

"میں پوچھ سکتی ہوں کیا ابھی آپ کی مصروفیت تھی جس کی وجہ سے آپ دن بھر آفس میں موجود نہیں تھے اور
 آپ نے اپنا موبائل بھی مسلسل آف کر رکھا تھا کہ اس کی ناخوشگوار بپ آپ کے خوشگوار موڈ کو ڈسٹرب نہ کر
 سکے۔" وہ چاہا کر دیکھنے لہجے میں برہ وراست فخر حیات سے بولی تھی۔
 "جنس لا تعلقی سے کھانا کھا رہی تھی اسے ان دونوں کی بحث الا حاصل لگ رہی تھی۔ کانٹے اور پیچ کے ساتھ

Urdu Photo.com

ان کی جانب بڑھے
تو اب کے شرمندگی ہی اس کا مقدر بنے
کہ یہ تو موت سے بھی قافل
غیر تشفی نیند
کی چادر اوڑھے ہوں سوئے بڑے ہوں
کہ شور محشر بھی انہیں نہ بگاٹکے
بس نیند میٹھی نیند بس نیند

”ڈاکٹر صاحب اسے ہوش کیوں نہیں آ رہا؟“ ایک اجنبی آواز اس کی سوتی جاگتی سماعتوں سے نکلائی۔ خون زیادہ بہ رہا تھا جس کی وجہ سے بے ہوشی طویل ہو گئی۔ لیکن خیراب انہیں ہوش آجائے گا۔ مجھے امید ہے جلد ہی

”نہیں، یہ تو ابھی نہیں آ رہا۔“ اس نے فوراً کہا۔ ”اے فرسٹ ایڈ باکس لے آئیے۔“
”ہوں۔“ ڈاکٹر نے اس کی کلائی چھوڑ دی۔ ڈیوٹ وری اب یہ بہت بہتر ہیں یہ اب بے
انگلکشن اور وہ اس کی وجہ سے تھک کے زرا اثر ہیں۔ آپ کی چھٹی کٹی ہوئی ہے۔“
”چھٹی مجھے مل کب رہی تھی بڑی مشکل سے یہ تین دن کی چھٹی لی تھی غسل شام کو جانا
اسے ہوش آجائے تو میں ذہنی طور پر مطمئن ہو کر جاؤں۔“
”آجائے گا ہوش آپ اطمینان رکھیں۔“ اگر آپ آج بھی جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔“
”نہیں جاؤں گا۔“ وہ لگاؤ اس کے پاس بیٹھ گئی۔
”اس کے لیے ڈاکٹر نے آؤں۔“ ڈاکٹر نے کہا کہ آگے بڑھ گیا کیپٹن شہباز۔ ڈاکٹر
بند سے ذرا پیچھے بیٹھی اور بیٹھ گئے۔ ایک نظر کمری نیند سونے ہوئے معاذ کو دیکھا اور پھر سائڈ
اٹھا کر روتی گرنے لگے۔

اس رات جب وہ بڈی سے سبزخان کو لے کر واپس آ رہے تھے معاذ اس قدر اچانک ان کی
فٹاک انہیں بریک لگانے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ وہ ان کی جیب کے پونٹ سے بری طرح سے نکل
ہی پل اپٹیل کر کسی گیند کی طرح کئی فٹ دور جا کر اٹھا جس کی وجہ سے اسے شدید جوش آئی
اور بیرونی جیب اس کے سر کا جو حصہ پونٹ سے نکل آیا تھا۔ وہی جا کر پھر لی سڑک سے نکل آیا تھا۔
کے سر کی چوٹ شدید تھی اور خون ان کی فرسٹ ایڈ کے باوجود بہت بہہ نکلا تھا اور ڈاکٹر نے
بے ہوشی کی کٹی پٹائی تھی۔ حالانکہ کل سے اسے دو یوٹیم خون کی دی جا چکی تھیں۔
اس کے خون کا گروپ A.B تھا اور یہی گروپ کیپٹن شہباز کا بھی تھا۔ انہوں نے خود ایک یو
اگر وہ چاہتے تو اس رات اسے یونہی زخمی حالت میں سڑک پر چھوڑ کر نکل سکتے تھے۔ لیکن ایک
گوارا نہ کیا وہ سرے سبزخان اپنا کے ساتھ تھیں، ہوا انہیں ہرگز ایسا نہ کرنے دیتیں۔ ”سبزخان
انہوں نے وہ دن کی چھٹی بھی لی تھی۔

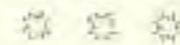
”بیٹا! اب تک اسے ہوش نہیں آیا۔ تم ڈیوٹی نہ جاؤ۔ خدا تمہارا ساتھ ہے۔“
ساری عمر مجھے ملامت کرتا رہے گا۔ کم سن معصوم سالگرہ کا ہے خدا جانے کس ناکخت جگر ہے۔
ڈیوٹے ہو رہے ہوں گے گاڑی کی بیجلی نشست پر کیپٹن شہباز نے اسے لٹا دیا تھا سبزخان
چار کی اولی حالت نہ بھول رہی تھی۔
”ڈیوٹے رہے ہوتے تو اب تک بیچ پھینکے ہوتے۔ لگتا ہے گھر سے بھاگ کر آیا ہے۔“

بڑی نزاکت سے ننھے ننھے تھے وہ اپنے چھوٹے سے دہانے میں انڈیل رہی تھی۔
”تاہم پورا دن برنس رعنا اور ہمیں تھا چھوٹے۔“ فخر حیات نے ساری رفاقت ساری محبت ساری مروت
پس پشت ڈال کر بڑی بے مروتی اور بے لگائی سے کہا تو جیسے رعنا کے پیروں کے نیچے کی زمین ہولے ہولے سرکنے

”آئی ایم یو روائل۔“ مگر تو ہوتی ساکھ کو سنبھالنے کا ایک ہی حوالہ اسے یاد آیا۔
”تو کیا پوسٹر پھیلواؤں اس بات کے۔“ شرکے چور ہے میں نکل نامہ لگاؤں فخر حیات کی آواز خلاف توقع بلند
ہو چکی تھی اور رعنا کو اندازہ تھا اب ذرا کی ذرا یہاں اس مہذب ماحول میں ایک تماشا شروع ہونے والا ہے۔
”یووی ہو تو اپنی حد کو بچاؤ یوں سڑکوں پر دندناتی مت۔“ پھو اور میری انویسٹی گیشن کے لیے مجھے chase

چاہیے۔ انڈر اسٹینڈ اور اب جاؤ یہاں سے۔ میں ایس بھاگ نہیں جاؤں گا۔ رات تک تمہارے گھونٹے
چھینتی جاؤں گا سارے موٹا ستاناں کر دیا۔“ آخری جملہ انتہائی بیزاری سے بیچ پیٹ میں شیگرہم آواز میں
کہا اور رعنا جیسے وہاں کھڑے کھڑے فرار ہو چکی تھی۔
”میرا خیال ہے تمہیں اب اس ڈنر پر رخت بیچو اور ام ابھی کہیں اور چلتے ہیں۔“ ان کو بڑی تیز کر کھڑے رہنے
اور تماشا دینے کا شوق سے کہا نہیں اپنا شوق پورا کر لینے۔“
انگلے ہی پل وہ اپنا مہیا نل اٹھا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ والٹ کی انڈر ہلی جیب سے ہزار کاونٹ نکال کر نیکل پر چٹا
اور دونوں زمین پر دھمک پیدا کرتے ہوئے ساتھ ساتھ ہال سے باہر نکل گئے اور رعنا کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ یہاں
کھڑی رہے کہ یہاں سے چلی جائے مگر کہاں۔

”میڈم آپ کی کافی۔“ ڈیوٹے قریب آ کر اسے دھیرے سے انداز میں کیا تو ڈیوٹے کے تھکنے کی طرح لگے اس
کے وہوٹ میں حرکت پیدا ہوئی۔
باہر روٹھنیاں دینے ہی جھٹک کر رہی تھیں۔ فخر حیات کی گاڑی پارکنگ میں موجود نہیں تھی۔ وہ تو شاید پہلے بھی
موجود نہیں تھی اگر ہوتی تو اس کی نظروں میں ضرور آتی تو شاید وہ سوچ سمجھ کر ریسیورٹ کے اندر رقیوم رکھتی مگر
اس وقت اسے یہ خیال بھی کب تھا۔ وہ اس ظالم کی بددلی اور بے رحمی سے لگی اور موٹی ہوئی جا رہی تھی جس نے
ایک ہی پل میں اسے جھٹک کر دوڑ پھینک دیا۔
اس نے گاڑی کالا کھولا۔ اس کے ہاتھوں میں لہرز سی تھی۔ مگر اس نے خود کو بہت کچھ نہ دیکھا تھا۔ ایک
بار نکل جاتی تو پھر اس مصروف شاہراہ عام پر اسے کون سمیٹتا۔
اس نے موبائل اور پرس بیجلی سیٹ پر اچھالا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔
”اب کہاں جاؤں؟“ اتنی عزت افزائی کے بعد بھی ”حیات ولا“ جانے کی گھانٹش باقی ہے۔“ اسٹیرنگ پر ہاتھ
رکھتے ہی پہلا سوال اس کے ذہن میں ابھر اور انگلے ہی پل اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ اسٹیرنگ پر سر رکھے پھوٹ
پھوٹ کر دوڑ رہی تھی۔



ستم نصیبوں پہ ہو بس اب اتنا کرم
آوازوں کا ٹھہرنا یہاں غفلت میں
یا یوم حساب سچا جانے
پہ جو بے حساب ختم سپہ کر آئے ہیں
مقدر کے ایسے پئے ہوئے مہرے
کہ اب جو
قضا بھی اپنا جام لہرز کیے بڑے جاؤ سے

”سروہو تک میں ایوں لڑکیوں کی طرح آنسو نہ بناؤ۔“
”پہلے اپنا نام بتاؤ۔“

”معاذ۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”کہاں کے رہنے والے ہو۔؟“ ان کے چہرے پر سنجیدگی تھی اس سوال پر معاذ نے کچھ پریشانی سے انہیں دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔ سامنے دیوار پر نایابہ نقٹے کو گھورنے لگا۔

”تم نے جواب نہیں دیا۔ گھر کہاں ہے تمہارا۔؟“ وہ غور سے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہے تھے۔

”گھر نہیں ہے۔“ اس کے گلے سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

”گھر نہیں ہے کیا مطلب۔؟“ انہوں نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا ”کیا کسی شلخ پر اگے تھے ظاہر ہے گھر تو ہو گا چھوڑ آئے ہو۔؟“ وہ کڑی نگاہوں سے اسے گھور رہے تھے۔

”نہیں۔“ معاذ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سوال کا جواب کس طرح آسان بنا کر پیش کرے۔

”پھر؟“ سوالیہ نظریں اسے تکیف دے رہی تھیں۔

”میں سائبان میں رہتا تھا پہلے۔“ اس کی آنکھوں میں پانی بھر بھر کر آ رہا تھا اور حلق میں گولہ سا پھنس رہا تھا۔ وہ آنکھ اٹھا کر بات نہیں کر رہا تھا۔

”سائبان آواٹ؟“ کیپٹن شہباز کی سمجھ میں نہ آیا۔

”مستقیم خانہ ہے۔“ معاذ نے اتنی آہستگی سے کہا کہ انہیں بمشکل سنانی دیا۔

”اوہ۔“ انہوں نے ہوٹ سکوڑے۔

”تمہارے پیر تھیں؟“

”اگر ہوتے تو کیا میں مستقیم خانے میں پلٹا۔“ وہ کچھ تلخی سے بولا۔

”اب کب کہاں رہتے ہو۔“

”فی الحال کہیں بھی نہیں۔ ایک دوست کے ساتھ۔“ گلاؤں گیا تھا ابھی ادھر ہی سے آ رہا تھا وہ گھر وہ تو تم ایسے بھاگ کر آ رہے تھے جیسے تمہارے پیچھے کوئی لگا ہوا تھا۔“ کیپٹن شہباز نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

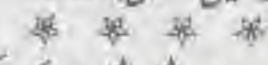
”میں یونہی ایک گھر کے اندر جہاں تک رہا تھا چوکیدار رہا نہیں کیا سمجھا۔ وہ میرے پیچھے پورے چور کہہ کر بھاگا تو میں بھی۔“ اس نے بات ادھوری پھوڑ دی۔

”ہوں۔“ کیپٹن شہباز نے گہرا سانس لیا۔

”اب کب کہاں جاؤ گے؟“ کچھ دیر کے توقف کے بعد انہوں نے پوچھا۔

”کانچ میں ایڈمیشن لینا ہے پھر ہاسٹل میں۔“ اس کی توہمی پلاننگ تھی۔

”چھاپ رہتے ہو بھی تمہارے سامان میں سے کتابیں نکلی تھیں کون سی کلاس میں پڑھتے ہو۔“ کیپٹن شہباز کے رویے میں اس کے لیے ایک دلچسپی پیدا ہو گئی انہیں پڑھنے کے شیدالوگ بہت پسند تھے۔ معاذ کا جو صلہ بڑھا و بڑھتا رہا اساتذہ کریشیا اور انہیں تفصیل بتانے لگا۔



جب سے وہ گھر آئی تھی۔ پہنچ کے بغیر پندرہ روم میں شل شل اس کی نائلیں شل ہو چکی تھیں۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے گھر میں نہیں کسی اجنبی کے گھر میں شل رہی ہے جس کی اجازت کے بغیر وہ اس گھر میں داخل ہو گئی ہو اور اب نہ جانے ہالک کا کیا رو عمل ہو۔

”آج مجھے یہ دن بھی دیکھنا تھا اوماٹی گاؤ۔“ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ گہرا سانس لیتی سروہو نواں ہاتھوں میں جکڑ کر

خود سے بے یقینی سے کہتی۔

فخر حیات کی شخصیت کا یہ کون سا پہلو تھا جو آج تک مجھ سے پوشیدہ رہا۔ یہ تو میں بھی جانتی تھی کہ ان کی دلچسپیاں شہر بھر میں میری ذات کے علاوہ کبھی بہت ہیں۔ پر اس حد تک کہ وہ مجھے Own کرنے سے بھی انکار کر دیں گے یہ تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ میں تو فخر پر اندھا اعتماد کرتی تھی کہ چاہے زمین آسمان ایک ہو جائے یہ دنیا ساری کی ساری بدل جائے۔ فخر مجھ سے دھوکا نہیں کر سکتے۔ انہوں نے مجھ سے محبت کی ہے ٹوٹ کر میں ان کی پسند میں کراس محل میں اتری تھی بلکہ کبھی ان کی ضد بھی رہی ہوں۔ انہوں نے اپنے اسٹیشن سے بغاوت کر کے اپنے سرکل کی پروا کیے بغیر مجھے حاصل کیا تھا۔ کیسے بھول جاؤں میں ان کی دیوانگیوں کو اور اس بات کو نہ دیکھوں۔ ان تو نہیں بیت گئیں یا شاید بیت گئی ہیں اور مجھے بتا بھی نہیں چلا۔“ وہ صوفے پر کرسی گئی۔

”اور آج ایک غیر عورت کے سامنے ان کے انداز اس قدر اجنبی تھے۔ وہ مجھ سے کب اتنے بیزار ہو گئے کہ مجھے وہ اپنے گلے میں لٹکا ہوا ایک طوق سمجھنے لگے کہ جو ان سے دور ہو تو وہ ذہنی طور پر خود کو مطمئن محسوس کرتے ہیں۔ میرے مالک! یہ دن دیکھنے سے پہلے میں مر گیا ہوں نہ گئی۔“ اس نے صوفے کی بیک سے زور سے سر لگرایا۔

”مجھے یہاں اتنا ہی نہیں چاہیے تھا۔“ کوئی اس کے اندر سے بولا۔ ”اتنی انسلٹ کے بعد میں کیوں یہاں آئی یہاں اب ایسا کیا ہے میرا جس کی وجہ سے میں پھر آئی، جس کی وجہ سے میں ادھر ہوں۔ انہوں نے آج محفل میں مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا تو پھر میں ادھر کیوں آئی۔“ اس نے آنکھیں پھٹتے پر نکا کر خود سے سوال کیا۔

”پھر کہاں جاتی کس کے پاس کون سا گھر ہے میرا۔ ماں باپ تو رہے نہیں اور بھائی بھالی خود میرے ہاتھوں کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ چلی تھی جاتی تو عفت آرا ایک دن مجھے وہاں جینے نہ دیتیں تو پھر اور کہاں جاتی۔“ بیکہ مہی اپنی بے بسی کا خیال کر کے اس کی آنکھوں کے کناروں سے آنسو امانڈے لگے وہ اتنی دیر تک سی خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

”انہوں نے مر جائے تو ہر طرف واؤں ہوتا ہے۔“ وہ نادھونا ہوتا ہے لوگ۔ بین ڈالتے ہیں اور کوئی جیتے جی مر جائے تو کسی کو بتا بھی نہیں چلا۔ وہ رو رو کر بلکان ہو گئی اور چار کنال کے اس وسیع و عریض محل میں کسی کی کو خبر بھی نہیں ہو سکی کہ رعنا فخر حیات آج مر گئی۔

اس کی دھیمی دھیمی سسکیاں کمرے کی خاموشی فضا میں گونج رہی تھیں۔ پانچ ماہیں وہ کس طرح گاڑی ڈرائیو کر کے گھر پہنچی تھی۔ کس نے گیٹ کھولا۔ رستے میں جہاں ملی تھی اس نے کیا کہا سینیٹیڈ کدھر سے آیا کہ نہیں اس نے کچھ کھایا یا نہیں رعنا کو کچھ خبر نہ تھی۔ وہ تو اسی بے خود سی کیفیت میں اپنے کمرے میں چلی آئی اور اب اس وقت سے اپنی خاموش موت کا ماتم منا رہی تھی۔

دیوار پر لگے وال کلاک نے ہلکی سی ٹن کے ساتھ رات کا ایک بجایا تو اس نے کچھ چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا۔ کوٹ بازو پر رکھے چہرے پر ہزاروں سالوں کی تھکن لٹکائے فخر حیات کمرے میں داخل ہوئے۔

اگر کوئی عام سا دن ہوتا تو رعنا سوئی ہوئی ملتی۔ فخر حیات کب اور کس وقت آئے اسے خبر نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی جاتی تو فخر حیات کے چہرے پر نکھی تھکن کی تحریر پڑھتے ہی رعنا سو جان سے اپنے محبوب شوہر پر غار ہو جاتی مگر آج؟

آج تو اس کا جی چاہ رہا تھا ان کی شکل دیکھ کر نفرت سے منہ پھیرے۔ فخر حیات نے موبائل سائیڈ ریک پر رکھا۔ کوٹ ہینگ کیا۔ بیڈرینڈ کر خاموشی سے جرابیں اور جوتے اتارنے گھڑی اتار کر سائیڈ ٹیبل کے دراز میں رکھی یہ سب ان کی رو میں کے کام تھے جیسے آج بھی کچھ ہوا ہی نہیں اس کے بعد وہ واش روم میں چلے گئے۔ پندرہ بیس منٹ بعد سیلینڈر سوٹ میں فریش ہو کر واپس آئے ڈائرینگ

اپنی بیوی بیوہ لانا کف کے بارے میں زمین آسمان کے فلاسفے ملائے اور اپنی بیوہ کو جس ہی رہا تھا کہ م سے اس کی طرح جی ہو گیا۔

”میں نے مس لی ہو گیا۔“ رعنا روتے روتے دھاڑی۔
 ”چلو غلطی میری تھی ہے، میں نے ڈنل مس لی ہو گیا مگر اس وقت سارے دن کی کوفت کے بعد میں اتنا ایگزاسٹ ہو چکا تھا کہ تمہارا غصہ مجھے بالکل بے جا لگا۔ مجھے کچھ کچھ میں نہ آیا اور میں اسے لے کر ہوٹل سے نکل آیا۔ واقعی غلطی میری تھی ہے اور اس کے لیے میں تم سے ایکسکوز بھی کرتا ہوں۔“

ان کا لہجہ اب بدل چکا تھا۔ اب وہ اپنے بیڈ روم میں جوتھے اور بیوی بیڈ روم کا ایک لازمی حصہ ہوتی ہے۔ بیوی اپنی سیٹ ہو تو بیڈ روم کا سکون اپنی سیٹ ہو جاتا ہے اور اس وقت انہیں سکون چاہیے تھا۔
 ”بس کریں۔ بس ضرورت مجھے آپ کے ایکسیکوز کی اٹھ گیا آپ کا اعتبار میری نگاہوں سے۔“

”رعنا! ہم ایک دو دن کے ساتھی نہیں ہیں ساری زندگی اسٹریٹ گزاریں گے ہمیں۔“
 ”اب مشکل ہے بہت فخر حیات! وہ سچی سے بولی۔“

”بچوں جیسی باتیں مت کرو اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔ چلو میں تم سے سو رہی ہوں۔ آئی ایم ایکسٹری پلے سو رہی ہوں۔ ہارٹ ہارٹ“ وہ پہلے والے فخر حیات کے سے انداز میں بولے مگر رعنا سپاٹ چہرے لے بیٹھی رہی۔
 ”اس کی ضرورت نہیں۔“ اس نے منہ پھیر لیا۔

”رعنا ہمارے پاس ان باتوں کے لیے وقت نہیں ہے آج مجھے تم سے تمام باتیں کرنی ہیں بلکہ ہمیں آج بیٹھ کر بہت سی تفصیلات طے کرنی ہیں۔ اس لیے پلیز اپنا موڈ درست کرو۔ یہ لڑائی کا وقت نہیں ہے۔“ فخر حیات صبح جو انداز میں بولے شام والے فخر حیات کا پرتو بھی انہیں تھا ان کے انداز میں۔
 ”مگر مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔“ وہ قطعیت سے بولی۔

”پھر وہی بچوں والی ضد۔“ وہ زچ ہو کر بولے۔ ”رعنا! یہ ہمارے فیوچر کا بلکہ ہماری زندگی کا معاملہ ہے بلکہ سیٹی کے فیوچر کا معاملہ ہے۔ آج بیٹھ کر کچھ فیصلہ کرنے میں میرا ساتھ دو۔ وہ لجا جت سے بولے رعنا کو ان کے ایک لفظ پر بھی اعتبار نہیں آتا تھا۔ خاموشی سے بیٹھی ہو کر کاتی رہی۔
 ”اچھا تم مجھے ایک بات بتاؤ۔“

”دیکھا تمہیں اس طرح کرنا چاہیے تھا ریٹائرمنٹ میں اگر میرے ساتھ بزنس سرکل کی کوئی خاتون ہوتی۔ کیا تب بھی تم اس طرح کرتیں کیا اس طرح کی پمپوشن میں تمہیں اس طرح ایکٹ کرنا زیب دیتا تھا۔ میں کوئی بیس سال کا نوجوان لڑکا تو نہیں جو تمہیں بھول کر کسی اور کے ساتھ رنگ رلیاں مٹا رہا تھا۔ تم مجھ سے یہ ساری اٹکوائزی گھر آکر بھی کر سکتی تھیں۔ جب تم نے مجھ سے اس کے ساتھ دیکھ ہی لیا تھا۔“ وہ آہستگی سے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”میں بیوی نہیں ہوں۔ آپ کا طوق ہوں۔ آپ کے گلے میں لٹکا ہوا ہے نا۔“ وہ غصے سے ان کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔
 ”پھر وہی غصہ وہی تکرار۔“ فخر حیات نے کوفت سے سر ہلایا۔ ”اب چھوڑو بھی اس موضوع کو جب میں نے سو رہی کہ دیا ہے۔“

”فخر حیات! یہ معاملہ اتنا چھوٹا نہیں جو آپ کے سو رہی کہنے سے سب جائے گا۔“ وہ چپا چپا کر بولی۔
 ”تو کیا چھوٹا ہی چڑھاؤ کی مجھے گولی مار دو مجھے کہ میں ایک غیر عورت کے ساتھ چھپنے سے اڑا رہا تھا۔ کسی کو گھر سے بھاگ کر لایا تھا جو تم سے پوراشت نہیں ہو سکا اور تم یوں خود کو اور مجھے تمہا شہانے لکڑی ہو گئیں میں نرمی اختیار کرتا جا رہا ہوں اور تم سر پر جھڑپتی جا رہی ہو۔ جاؤ بھڑاؤ میں جو جی میں آتا ہے کرو۔ مجھے بھی پروا نہیں۔ میں تم لوگوں کے لیے مڑکھ رہا ہوں جب تمہیں ضرورت نہیں تو سب جائے جہنم میں۔“

ٹھیل سے برش اٹھا کر بالوں میں پھیرنے لگے۔ وہ کسی معمول کی طرح اپنے سارے کام انجام دے رہے تھے اور رعنا کسی بہت کی طرح صوفے پر بے حس و حرکت بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھی۔ برش انہوں نے واپس ڈریننگ ٹبل پر رکھا۔

”میں پوچھ سکتا ہوں تم نے آج جو حرکت کی وہ تمہیں کرنی چاہیے تھی۔“ بیڈ کے کنارے اس کے مقابل کھتے ہوئے انہوں نے گفتگو کا تکیا اتھاڑ کیا۔

”مجھے آپ کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں دینا میں ادھر صرف اس لیے بیٹھی ہوں کہ اب میرے لیے کیا حکم ہے۔ کیونکہ مجھے اب یہاں نہیں رہنا۔“ رعنا نے بے چک کہہ کر درے انداز میں انہیں غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

”تمہیں میرے سوال کا جواب دینا پڑے گا تم نے آج جو گھٹیا حرکت کی اس کا تمہارے نزدیک کیا جواز بنتا ہے۔ کیا میں کوئی عین امیگر ہوں جو لڑکیوں کو ہولڈنگ کرتا پھرتا ہوں جو تم نے کسی ان پڑھ عورت کی طرح ایکٹ کیا۔“ آپ کے ان کی آواز بھی بلند تھی اور اس میں غصے کا عنصر بھی نمایاں تھا۔

”مجھ سے کوئی سوال مت کریں۔“ رعنا نے زور سے آنکھیں بند کر کے دھیمی مگر تڑش آواز میں کہا۔ ”مجھے میرا مقام بتائیں اب مجھے کہاں جانا ہے۔“
 ”رعنا! انہوں نے وادنت ہیں کر بھلوں کو جیسے کنٹرول کیا۔“

”تم نے آج بہت غلط حرکت کی جس کی میں کم از کم تم سے توقع نہیں کرتا تھا وہ میری نکلا اس فیلو تھی دشمن پندرہ سال بعد مجھ سے ملی تھی۔ یہ وہ لڑکی تھی جو یونیورسٹی میں میرے ایک لٹھارے پر سو جان سے مجھ پر تار ہونے کے لیے تیار تھی اور میں نے ساری نکلا اس کے سامنے علی الاعلان کہا تھا کہ میری بیوی وہ ہوگی جسے میرے ساتھ دیکھ کر دشمن جیسے لوگ بھی رٹھک کریں گے اور آج وہ گھر جا کر کس قدر رٹھی ہوگی میری حالت کے بارے میں سوچ سوچ کر۔“

”بھونڈے جواز مت پیش کریں میرے آگے۔“ رعنا زور سے بولی۔
 ”آہستہ بولو۔“ فخر حیات نے جواباً غصے سے کہا۔

”میں آہستہ نہیں بولوں گی فخر! جو ٹھیل آپ میری ناک کے نیچے پھینتے رہتے۔ آج وہ سب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اور آپ کہتے ہیں میں چپ رہوں آواز بھی نہ نکالوں۔“ نہیں ہو گا میں چیخوں گی جس طرح آج ایک غیر عورت کے سامنے آپ نے مجھے ڈی گریڈ کیا۔ تمہیں تو اس نے میری حالت دیکھ کر لگائے ہوں گے۔ فخر! جو کچھ آج آپ نے کیا۔ اس کے بجائے آپ مجھے گولی مار دیے مگر مجھے اس طرح ڈنیل نہ گوتے میں نے جو کچھ کیا اپنا حق سمجھ کر کیا اب غیر عورت آپ کے پہلو میں جو میری جگہ بیٹھی ہو اور میں آف بھی نہ کروں اور آپ نے میرے ساتھ۔“

اس کی ہنسی بندھ گئی آنسو اس کی پلکوں کے بند توڑ کر کسی ریلے کی طرح بہہ نکلے تھے۔
 ”رعنا رعنا میری جان! ایسے مت کہو۔“ اس کی حالت دیکھ کر فخر حیات بے قراری سے اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھے اسے کندھوں سے تھامنا چاہا وہ بدک کر ان سے دور جا بیٹھی۔

”تمہیں معلوم ہے۔ میں آج سچ چھبے گھر سے نکلا ہوں بلکہ اس سے بھی کچھ پہلے اسلام آباد کا پانچ گھنٹے کا سفر پھر تین گھنٹے کی طویل بزنس میٹنگ اس کے بعد میں اسلام آباد ایک منٹ کے لیے بھی نہیں رکا صرف میٹنگ کے دوران میں نے کافی پی تھی۔ چھ بجے میں ادھر پہنچا ہوں راستے ہی میں دشمن مل گئی یقین کرو اس کے اصرار پر ہی میں اس کے ساتھ ڈنر پر راضی ہوا وہ چودہ سال بعد اسٹیٹس سے آئی تھی پھر سارا دن میں نے اس قدر ٹینشن میں گزارا تھا تو اتنی ریلیکسیشن تو میرا حق بنتی تھی ورنہ شاید میرا نو س بریک ڈاؤن ہو جاتا تھا ہر دن آج کل میری نردر پر ہے تمہیں میں کیسے جفاؤں اور ڈنر کے وہ ران ہم صرف اسٹوڈنٹ لائف کی باتیں کرتے رہے اور میں نے

فخر حیات نے بیڈ کے پائے کو ٹھوکہ ماری بیڈ روم کا دروازہ کھولا اور زور زور سے بولتے ہوئے دروازہ دھارتے ہوئے باہر نکل گئے۔

اور عتا اس بل بل بدلتے روپ والے مرد کو دیکھتی رہ گئی۔

مسز خان اپنے بستر پر سو رہی تھیں یا بیوش تھیں ڈاکٹر اسٹیک کو بلیے ان پر جھٹکا کھڑا تھا گھر کے باقی افراد ان کے بستر کے گرد پریشان صورتیں لیے کھڑے تھے۔ جیسے ہی کیپٹن شہباز کمرے میں داخل ہوئے اندر کا منظر ان کے لیے شاکنگ تھا۔

شام کو تو وہ مسز خان کو بھلی چنگلی اپنی وہیل چیئر پر بیٹھا چھوڑ کر گئے تھے اور اب وہ معاذ کے ہوش میں آجانے کی خوشخبری انہیں سننے آئے تھے کہ اندر داخل ہوتے ہی انہیں یہ منظر دکھنا پڑا۔

”کس۔ کیا ہوا ام جان کو۔“ وہ بے جان قدموں سے آگے بڑھے اور بڑے بھائی سے مخاطب ہوئے۔

”طبیعت خراب ہو گئی تھی اچانک۔“ وہ کیپٹن شہباز سے نگاہیں ملانے بغیر بولے۔

”کیسے خراب ہو گئی شام کو تو میں انہیں اچھا خاصا چھوڑ کر گیا ہوں۔ بالکل فریش موڈ میں۔“ وہ مسز خان کے سر پائے کی طرف بڑھے مسز خان کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا زرد ہو رہا تھا۔ جیسے بستر پر کوئی مڑوا پڑا ہو۔

”طبیعت خراب ہوئی ہی تھی خبر ہی ایسی ملی تھی۔“ ایاز کی بیوی پلٹ کر بولی۔

”کون سی خبر؟“ وہ چونک کر سیدھے ہوئے۔

”تم چپ کرو۔ یہ موقع ہے ان باتوں کا۔“ ایاز نے بیوی کو جھڑکا۔

”کوئی خبر نہیں ویسے ہی امی جان کا بی بی لو ہو گیا تھا۔“ ایاز کا انداز سراسر بالنے والا تھا۔ کیپٹن شہباز کی دونوں

بھائیوں نے معنی خیز انداز میں آنکھیں مٹکا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

شہباز نے پریشانی سے بھائی کی طرف دیکھا وہاں کی طرف متوجہ تھے۔

کیپٹن شہباز کے اندر عجیب سی گھٹی بجنے لگی جیسے کچھ ہو گیا ہے۔ کچھ بہت عجیب بہت پریشان کن۔ کچھ بہت غلط ان کا دل اندر ہی اندر جیسے بیٹھ سا گیا جیسے کچھ ان سے متعلق ان کی ذات سے وابستہ کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ اندر

ایک عجیب سا کچھ کھوجانے کا احساس جاگ اٹھا تھا۔

”کیا؟ کچھ اتنا شدید کہ جس کے نتیجے میں مسز خان نیم مرده حالت میں ان کے علاج لیتی تھیں۔“

کیپٹن شہباز نے ان کے بیڈ کی کپت کا سہارا لے کر خود کو سنبھالا دیا۔

ڈاکٹر انہیں چپک کر کے سیدھا ہوا۔ سب ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگے جس کے چہرے کے اشارات یقیناً خوشگوار نہیں تھے۔

● ● ● ● ●

”کاش میں ادھر نہ آیا ہوتا۔“ اس نے گھٹے بھر میں بیچا سوئیں بار سوچا تو اسے یاد آیا کہ اس نے اپنی سولہ سترہ

سالہ زندگی میں اس لفظ کاش کو کروڑوں بار سوچا تھا۔

بہت بچپن ہی میں اس ”کاش“ نے اس کی انٹی پکلی تھی جب وہ ناظموں یا ”سائبان“ کے دوسرے حملے کے

باتوں پڑتا تھا جب بے تحاشا بھوک میں اسے کھانے کو ایک لقمہ بھی نصیب نہ ہوتا اور جب گھر گھر در کھٹکھٹاتے

روٹیوں کے ٹکڑے اور کھانوں کے خوان اکٹھے رتے وہ غالباً نشان گھروں کے مالکان کا انداز سخت دیکھتا ان کی ترس

بھری یا تحقیر بھری نظروں کو اپنے اندر اترتا ہوا محسوس کرتا تو یہ کاش دھیرے سے اس کا دامن ہلاتا۔

”کاش میں بھی ان جیسے کسی گھر میں پیدا ہوا ہوتا۔ یہی مالکان انداز مجھے بھی نصیب ہوا ہوتا۔“

”پھر ایک دفعہ نہیں بہت دفعہ اس سحر جی لفظ نے اس کی سوچ کے رستے میں آکر ڈیرہ جمایا اور ہر دفعہ ایک

گہری سرد آہ اس کے لبوں سے خارج ہوئی۔ مگر آج تو یہ لفظ مسلسل اس کے کانوں میں بجے جا رہے تھے۔

”کاش میں ادھر نہ آیا ہوتا۔“ بستر پر ڈالے ہوئے ہوش پر مرده مسز خان اور ان کے گرد بٹکے ارد گرد موجود ان کا پورا

خاندان جن میں ان کے تینوں بیٹے دونوں بہوئیں اور چار پوتے پوتیاں تھیں اور وہ۔“

وہ بھلا کس حیثیت سے اس عمل گھر کو کاظم رنگ دیتے بیٹھا تھا شام کو جب اسے ہاسپٹل سے ڈسچارج کیا گیا

اگرچہ ابھی اس کا زخم مندمل نہیں ہوا تھا بلکہ ڈاکٹرز اسے ڈسچارج کرنے پر راضی بھی نہیں تھے مگر کیپٹن شہباز نے

زبردستی اسے ڈسچارج کرایا تھا۔

”ڈاکٹر صاحب! صبح مجھے ڈیوٹی جوائن کرنی ہے پھر اس کی دیکھ بھال کے لیے کون آئے گا۔ گھر میں تو سب موجود

پڑے۔ اسے دیکھ لیں گے مگر ادھر بہر حال کوئی نہیں آئے گا۔ باقی میڈیکل ٹرینمنٹ کے لیے بھی گھر پر کوئی مسئلہ

نہیں ڈاکٹر ہمارے ہمسائے ہیں انہیں ٹرسٹ کر لیں گے۔ آپ اس بات کی فکر نہ کریں۔“

ڈاکٹر ز کو پوری تسلی دے کر وہ کمرے سے اس کی ڈسچارج شیٹ لے کر ہی نکلے اور اس دوران معاذ اپنے بستر پر

دراز سوچتا رہا کہ کیپٹن شہباز سے اتنی جلدی کیوں ڈسچارج کرانا چاہ رہے ہیں۔

”شام ہاسپٹل کے اخراجات سے گھبرا کر مگر ابھی تو میرا زخم بھی ٹھیک نہیں ہوا۔“ اس نے بی بی کو ہاتھ لگایا۔

”مگر میں کھانا چاؤں کا ہسپتال سے نکل کر شام بھی تو ہو چکی ہے۔ اس وقت میں کھانا کھا کر لوں گا۔“ بی بی فگر و

پریشانی نے اسے ان کی طرف

”میرا سامان بھی خداجاتے کدھر ہے اس میں رقم موجود بھی ہے یا نہیں؟“

وہ کیپٹن شہباز سے کہنا چاہ رہا تھا۔ مگر ابھی ایک دو روز یہاں رہنے دیں میں خود ہی چلا جا جاؤں گا۔ مگر کس

ٹائٹ سے کہتا۔ ہسپتال کے اخراجات ان ہی کو ادا کرنے تھے انہیں احساس ہو گا اس بات کا جب وہ ہسپتال سے نکلے

ریسیشن پر گئے تو اس کا دل گھبراسا گیا وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”اب بھلا کدھر جاؤں گا یا اللہ کیوں مجھے بے ٹھکانا پیدا کیا؟ ایک مدت سے اپنے ہونے کی جنگ لڑ رہا

ہوں۔ آخر کہاں تک دفاع کیوں اتنی دنیا اپنے لوگ بے وجہ مرے جا رہے ہیں کوئی ٹرین کے حادثے میں کوئی

بس کے حادثے میں کوئی راہ چلتے سڑک کے بیچ آخر میری جان ایسی کون سی جیتی ہے جو تو اسے بچانے چلا جا رہا

ہے۔ اس جان کو اس وجود کو لے کر میں کدھر جاؤں کہ تیری اس اتنی بڑی زمین پر دو چار فٹ جگہ بھی تو اس کے

سمانے کے لیے نہیں ہے نہ زمین کے اوپر نہ زمین کے نیچے۔“ وہ اللہ سے گلہ کرتے ہوئے رو دینے کو تھا۔

”چلو بیگ میں آئیے اترو۔ بہت نام ہو گیا ساتن۔“ بی بی ہاسپٹل والوں کے ڈیوٹی کلینر ہونے میں

نہیں آ رہے تھے۔ اس کا چارج تو اس کا چارج! وہ اس کے کمرے میں داخل ہو کر بولے اور اس کی طرف دیکھے

بغیر سائیڈ ریڈ پر رکھی ہوئی اور چیزوں کو الگ الگ شمار میں ڈالنے لگے۔

معاذ ایک ٹنگ ان کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی سوچوں کو زبان کس طرح

دے۔ کیسے انہیں اپنے خدشوں سے آگاہ کرے یا کم از کم ان سے اپنے اگلے ٹھکانے کا بی بی بوجھ لے

”تھو تاپا یا کم از کم جوتے ہی پہن لو۔ میں پہلے ہی خاصا لیٹ ہو چکا ہوں۔“ اسے یوں تم غم بیٹھے دیکھ کر انہوں

نے جھنجھلا کر کہا تو اس کے وجود میں جنبش پیدا ہوئی۔

”وہ نہ چاہتے ہوئے دھیرے سے بستر سے نیچے اتر اور جوتے پہننے لگا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا تھا

اس نے ایک ہاتھ سے بیڈ کو اور دوسرے ہاتھ سے گھومتے سر کو تھام لیا۔

”بی بی بریو بیگ میں اب تم ٹھیک ہو بس ذرا بہت کرو۔ ٹھیک ہو جاؤ گے دو چار روز میں چلو اب سامان تو سمٹ

گیا۔“ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے تو وہ پھر کچھ نہ کہہ سکا کہ یہ چکر کمزوری یا بیماری سے نہیں

آ رہے۔ یہ تو خدشوں اور واہموں کے چکر ہیں جو اسے ایک مدت سے آ رہے ہیں۔ اس نے بیڈ سے اتر کر آہستگی

سے قدم آگے بڑھائے۔

”کچھ رہ تو نہیں گیا؟“ کیپٹن شہباز نے مڑ کر آخری نظر بیڈ اور سائیڈ ریڈ پر ڈالی ریڈ کے دروازہ کھول کر

”نہیں کچھ نہیں ہے اب۔“ وہ شاپرز تھا سے اس کے پاس آکر بولے دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہسپتال سے باہر آگئے۔ کیپٹن شہباز اس کی وجہ سے آہستہ چل رہے تھے۔ پارکنگ میں ان کی جیب کھڑی تھی وہ اس کی طرف پڑھے معاذارکنگ کے باہر کھڑا رہا کہ شاید وہ اسے باہر کسی اسٹاپ تک اتاریں گے پھر آگے کا سوچ کر اس کی جان اٹکی جا رہی تھی۔

”چلو آؤ بیٹھو۔“ انہوں نے فرنٹ ڈور کھول کر اسے کوازدی آوہ آہستگی سے سیٹ پر جا بیٹھا۔ انہوں نے جیب ہسپتال سے نکالی اور سڑک پر لے آئے۔

”یار بقرط! ایک تو تم سوچتے بہت ہو تمہیں دیکھ کر مجھے شیکپیر کا ہیڈلٹ یاد آجاتا ہے کیا کروا تھا وہ بھی۔ سوچیں ہی سوچیں اور عمل صفرا سے لوگ زندگی میں ناکام ہوتے ہیں یہی بات شیکپیر کے ڈرامے کے آخر میں سامنے آئی کہ جو لوگ عمل کا ہاتھ ایا ج سوچوں کو تھما دیتے ہیں وہ بالآخر زندگی کو دوڑا رہا جاتے ہیں اس لیے میرے ننھے دوست! اتنا مت سوچا کرو۔ تم بھی بغیر سوچے مجھے بھی کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔“ وہ اسے سوچ میں ڈوب دیکھ کر تنبیہ کی سے بولے۔

یہ تو شام ہی سے نوٹ کر رہا تھا کہ کیپٹن شہباز آج غیر معمولی طور پر نہ صرف سنجیدہ ہیں بلکہ کچھ پریشان بھی ہیں ورنہ تو وہ اس کے ساتھ بہت ملنے جھٹکنے انداز میں بات کیا کرتے تھے اور پہلی ملاقات ہی میں اسے بہت خوش باش بھی لگے تھے مگر شام ہی سے وہ اسے کچھ اچھے اچھے اور کچھ افسردہ سے دکھائی دے رہے تھے اور اپنی یہ بات وہ ان تک نہیں پہنچا سکتا تھا کہ اس کا بہر حال ان سے ایسا کوئی تعلق نہیں تھا۔

”پھر کھو گئے کہیں۔“ موڑ کھٹے ہوئے کیپٹن شہباز نے اسے دیکھ کر کہا تو وہ جیب کی۔

”نہیں تو۔“ اس نے گردن گھما کر انہیں دیکھا۔ وہ اس کی طرف مہیاں نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”سرا ہم کہاں جا رہے ہیں میرا مطلب ہے۔“ وہ ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے لگا۔

”سر۔“ کیپٹن شہباز کے لیوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ”یار ایہ تم مجھے سرکس حساب میں کہتے ہو۔ میں تمہیں کچھ شہر فی ٹیوشن پڑھاتا ہوں یا ایبرا سمجھاتا ہوں یا تم میرے پاس جا کر رہتے ہو یا میں نے کسی سبجیکٹ میں ڈاکٹریٹ کر رکھا ہے یا گورنمنٹ نے مجھے کسی اعلیٰ فوجی یا شہری اعزاز سے نوازا ہے جو تم مجھے اس قدر اعلیٰ ”سرینم“ سے پکارتے ہو۔“ کیپٹن شہباز نے اس کی پکڑ پھلے ہی لفظ پر کرنی اور اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ان کے سوال کا کیا جواب دے کہ وہ انہیں سرکیوں کہتا ہے۔

”معلوم نہیں۔“ انہوں نے دوبارہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ دھیرے سے بولا۔

”تمہیں کچھ معلوم بھی ہے یا نہیں۔“ وہ ڈرا سا ہے۔ ”یار زندگی میں یوں شکست خوردہ رویہ اپناؤ گے تو بہت جلد میدان عمل میں ڈھیر ہو جاؤ گے۔ اپنے اندر جرات پیدا کرو۔ قوت فیصلہ کی اور آرگیکو (دیل) دینے کی۔ یوں ایک ہی لمحے میں تمہارا پھینک کر چپ نہ ہو جایا کرو۔ خیر ہم کھر جا رہے ہیں۔“

”اب کس کے گھر؟“ یہ سوال کوشش کے باوجود وہ پھر یوں پر نہ لاسکا۔ ظاہر ہے ان کا ہی گھر ہو گا وہ تو بے گھر ہی اس دنیا میں نازل ہوا تھا۔ اس نے تنہی سے سوچا اور چند منٹوں بعد ہی جیب خان والا کے خوبصورت گیٹ کے آگے جا رکی۔

گیٹ سے مسز خان کے کمرے تک کا سفر بھی اس نے خدشات کے درمیان ہی طے کیا کہ اب تک کوئی بھی سا تبان اس کے سر پر چھتہ بن کر نہ شہر کا تھا کچھ اس معاملے میں اس کا نصیب ہی اس کا قریب بنا بیٹھا تھا کہ گھر تو ہوتے ہی نصیب والوں کے ہیں۔ بہت بچپن میں جب گھر کا تصویر بھی اس کے ذہن میں نہ تھا وہ تو سا تبان کو ہی گھر سمجھتا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ معاشرے کے باقی لوگ بھی اسی طرح کے ”سا تبانوں“ میں رہتے ہوں گے بڑے بڑے ہال کمرے اور پینتہ سینٹ سے بنے برآمدوں والے گھروں میں جہاں ایک ناظم اور دو سرانائب ناظم ہوتا ہو گا وال

پکانے والا چاچا نبی بخش اور ناظم صاحب کے احکام بجالانے والا غفور چاچا کپڑے تو اسے سب لڑکے خود ہی دھوتے تھے یا پھر جو کیدار چاچا جو دیر سویر سے آنے والے لڑکوں کی جی بھر کر ٹھکانی کرتا تھا یا اگر کوئی لڑکا مٹھی گرم کرویتا تو اس کا یا رہی بن جاتا تھا۔ پھر اس کے اپنے بھی بہترے کام ہوتے تھے جو ان لڑکوں کی فوج سے نکلا کرتے تھے وہ علاقے کا تھانیدار تھا کہ اس سے کوئی نہیں بگاڑ سکتا تھا اس کے بگڑنے کا مطلب تھا کہ جو چند گھنٹوں کی آزادی ملتی ہے وہ بھی سلب نظر کا تو وہ بکاپار تھا اور معاذ کو تو وہ ویسے ہی سہمی ہوئی چیز یا کہہ کر موت میں کبھی بھسار باہر جانے دیتا اور وہ گیٹ سے باہر ڈرا سا حمل کروا پس آجاتا۔

گھر سے پہلی بار اس کا واسطہ تب بڑا تھا جب وہ مالدار جوڑا اسے اپنے عالی شان سٹک مرمر سے بنے محل میں لے گیا تھا وہاں وہ جتنا بھی وقت رہا یہی سمجھتا رہا کہ اصل میں یہ گھر نہیں جنت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پسندیدہ بندوں کے لیے دنیا میں بنا رکھی ہے۔ جب اسے واپس سا تبان بھجوا دیا گیا تو اس نے سوچا وہ واقعی جنت تھی اور وہ چند دنوں کے لیے اس کی سیر کو کیا تھا۔

پھر اس نے گھر کی تلاش کے سفر کو ملتوی کر کے خود کو علم کے سفر کی راہ میں ڈال دیا۔ کتابوں میں پینٹ کیا گیا گھر بہر حال اس کے لیے خواب ہی رہا تھا۔ بسن بھائیوں کی چکاریں ہوں ماں باپ کا لڑا اور بچوں کی ضدوں اور فرمائشوں پر ہلکی سی پھٹکار ہو۔ جہاں سا تبان بھیجے ادا رہے گا تو یہی نہ ہو چاہے چھوٹا سا ہو مگر اپنا گھر ہو۔ اپنا پھر ظفر کا گھر جس نے اس کے تصوراتی متبوں کے خیر سے گدھے گھر کے تصور میں اچھل چاڑھی ہے زاری نفرت لڑائی جوس اور برے تصورات کے رنگوں کے وہ چھینے اڑے کہ اس کے خوبصورت پاکیزہ گھر کی تصویر ہی

ہلکی ہو کہہ کی۔

پھر صوفی صاحب کا نام ہاں اور ہر آکر اس کا دل کچھ ٹھہر سا لیا تھا۔ کچھ پر سکون سا جیسے وہ اپنے گھر کے کہیں اس پاس ہی ہے بہت قریب صوفی صاحب کی سخت طبیعت اور کچھ دہکتے رویے سے اس کی طبیعت کچھ دیر کو ملد ر ضرور ہوتی تھی مگر پھر ان کی محبت اور کئی رنگوں سے تنہی ان کی شخصیت نے اس کے آگے اپنا رنگ جمائی لیا تھا۔ پھر جبرے کے اس طرف سے آئی خالص گھریلو ماحول کی فونڈھی سوئدھی خوشبو۔ جو اسے اپنے حصار میں جکڑتی چلی گئی تھی اس ماحول کا حصہ بن جانے کو اس کا دل چل چل کر رہ گیا تھا۔ جہاں سے ماں بی کی پیار بھری ڈانٹ اسے جبرے میں بیٹھے سنائی دیتی تھی۔ بسن مگر جذبات سے بھر پور اپنی اولاد سے گہرے تعلق کا احساس لیے اور صوفی صاحب کون سا لہجہ بولنے کے مفادات سے لگاتار تھے۔ ان پر غصہ ہوتے مگر ان کی بہتری کے لیے جب کوئی ان کے بچوں کی بھلائی کی راہ میں حائل ہوتا وہ اس کے آگے چٹان بن کر کھڑے ہو جاتے اسی طرح کے ماں باپ کی تو اس کا دل خواہش کرتا تھا۔ پھر زینب آمنہ اور جویریہ کی نوک جھونک اور اس نوک جھونک کو تیزی اور تیار رنگ عبدالتین کی آمد نے دیا تھا۔ عبدالتین وہ سڑیل سا بیزار لڑکا جیسے خود سے تو لیا سارے زمانے سے تھا وہ صوفی صاحب کی ہر پھٹکار کا خاص ٹارگٹ مگر پھر بھی ماں بی اور بہنوں سے محبت کرنے والا عبدالتین وہ سب اس مکمل گھر کے کلین کس طرح اس کے دل میں گھر کر گئے تھے کہ چند ہی دنوں میں اسے سب کچھ اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا اور آج جب وہ انہیں سوچ رہا تھا تو لگ رہا تھا وہ سب پاس ہی ہیں اس کے آس پاس۔

”اور وہ بھی۔“ وہ بیان سے۔ ”بر آمدے کی پہلی بیڑھی اس کے پاؤں سے ٹکرانی تو کیپٹن شہباز کی آواز اس کے آگے سے ابھری۔“

”یار اتنم کہاں کھو جاتے ہو۔ لڑکیوں کی طرح سوچ بچار میں گم ابھی پھر سے زمین بوس ہو جاتے تو سمجھو پھر سے نیا کیس بن جاتا۔ لگتا ہے تم مجھے ڈوبی جو ان نہیں کرنے دو گے۔“ انہوں نے کھڑے کھڑے ٹھیک ٹھاک اس کی کلاس لے لی۔ وہ شرمندہ ہو کر آگے بڑھا۔

مسز خان کے کمرے میں جا کر کیپٹن شہباز شاید اسے بھول ہی گئے تھے وہ مسز خان کے بستر کے آگے سر جھکانے

نہ جانے کس گیان دھیان میں گم ہو گئے تھے اور معاذ شرمندہ سا ایک کونے میں بڑی کرسی پر بیٹھا رہا تھا۔ ان کے گھر کے باقی افراد خاموشی سے آ جا رہے تھے۔ کوئی چار گھڑی کو بیٹھتا پھر اٹھ کر چل دیتا۔ شاید سب بہت مصروف تھے اور کسی نے بھی اس کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یا پھر کیپٹن شہباز سب کو بتا کر گئے تھے وہ کمرے میں موجود چند ایک فالتو چیزوں کی طرح خود کو سمجھ رہا تھا کہ آدھے گھنٹے بعد کیپٹن شہباز کو جیسے یاد آیا۔

”اوہو معاذ! تم ادھر ہی بیٹھے ہو۔ ابھی تمہارے لیے اتنا بیٹھنا ٹھیک نہیں۔ تم رست کرو جا کر۔ یہ میری ام جان ہیں۔ اس وقت ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ورنہ تم سے مل کر بہت خوش ہوتیں۔ جب سے تم ہاسپٹل میں تھے تمہاری صحت اور سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی تھیں۔ بہت اچھی ہیں میری ام جان۔ کل تمہیں ان سے ملو اور گا بلکہ مجھے تو صبح سویرے ہی چلے جانا ہے۔ جانے سے پہلے ام جان کو تمہارے بارے میں بتا کر جاؤں گا۔ گھر کے باقی لوگوں سے ام جان تمہیں ملو ادیں گی۔ آؤ تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں اور اب تمہیں ادھر ہی رہنا ہے۔ سنا ام جان کے پاس کہیں ہاسٹل وغیرہ جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ اب تمہارا بھی کمرہ ہے۔ چلو اٹھو۔“ کیپٹن شہباز کے آخری جملے پر کمرے میں موجود چار نفوس نے کچھ حیرت اور شاید غصے بھری نظروں سے انہیں دیکھا۔

”یہ میرے بڑے بھائی ہیں دونوں ادھر ہی ہوتے ہیں اور یہ دونوں ان کی سبز بھر حال۔ یہیں ام جان کے ساتھ رہنا ہے۔“ کہہ کر اس کے آگے چل پڑے تو وہ بھی ان کے پیچھے کمرے سے نکل آیا۔

”ان لوگوں کے پورشنز علیحدہ ہیں۔ اس پورشن میں صرف ام جان اور ان کی ملازمہ رہتی ہیں یا پھر جب میں چھٹی پر آ جاؤں اب تم رہو گے۔ ام جان تم سے بہت پیار کریں گی۔ انہیں ذہین لڑکے بہت اچھے لگتے ہیں۔ وہ پہلے ہی تمہیں ادھر رکھنے کا کہہ چکی ہیں۔ اس لیے تم اب یہاں سے جانے کی بات نہ کرنا۔ کل میں ایڈمیشن کے بعد دل لگا کر پڑھنا اور یہ تمہارا کمرہ ہے۔ میں فون کر رہا ہوں گا۔“ وہ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر ادھر بڑے اور لائٹ کاٹن آن کر دیا۔ سارا کمرہ دو دو دھیا روشنی میں نما گیا۔ چھوٹا سا خوب صورت کمرہ تھا۔ کمرے میں سٹول اور ٹویٹر صوفہ، رائٹنگ ٹیبل اور چیئر تھی۔ زمین پر پردوں کا ہم رنگ کارپٹ بچھا تھا۔

”یہ اس طرف واش روم ہے یہ سامنے الماری اور تمہارے کپڑے بڑے ہیں۔ فریش ہونا چاہو تو ہو جاؤ۔ ابھی ملازم کھانا لے کر آئے گا۔ کھا کر تم اپنی میڈیسن لینا اور پھر مکمل رستہ کرنا۔ انشاء اللہ کل تک تم بہت بہتر ہو جاؤ گے۔ میں چلتا ہوں اب جانے سے پہلے ملنے آؤں گا۔“ تمہیں کچھ پوچھنا تو نہیں؟“ جاتے جاتے انہیں خیال آیا تو رک کر لالے۔

”جی۔“ اس نے تھوک نٹھا اسے بہت پیاس لگی ہوئی تھی۔

”مجھے ادھر نہیں رہنا سرامیں ہاسٹل میں۔“

”اچھا بس۔ اس وقت یہ بحث نہیں۔ یہ باتیں اگلی میٹنگ میں ہوں گی۔ تم اب آرام کرو کھانا تمہارا ابھی آنا ہوگا۔ میں بھی جا کر ام جان کو دیکھوں۔ اوکے۔“ وہ ہولے سے اس کا کندھا تھپک کر یا ہر نقل گئے تو ان کے پیچھے بند ہوتے دروازے کو دیکھا رہ گیا۔

”یہ کیا مصیبت ہے۔ میں اس طرح کسی کے گھر کیسے رہ سکتا ہوں۔“

اس نے مڑ کر ایک نظر کمرے کو دیکھتے ہوئے جھنجھلا کر سوچا۔ ”بتا نہیں کون لوگ ہیں، کیسے ہیں پھر ان کے باقی گھر والے۔ وہ تو شاید میرا ادھر آنا بھی پسند نہیں کر رہے تھے۔ میرا رہنا کیسے گوارا کریں گے۔ بیٹھے بٹھائے نئی کہانی میں ادھر لوگوں میں اپنا ذہن سیٹ کرنا پھوں گا یا پڑھوں گا۔“ وہ سر پکڑ کر بیڈ کے کنارے ٹک گیا۔

”یہ کل چلے جائیں گے تو میں ان کے پیچھے یہ گھر چھوڑ جاؤں گا۔ ہاں یہ میرے لیے بہتر ہے۔ ضروری نہیں ان کی بات پر تنگی کر کے بیٹھ جاؤں اور ان کے گھر والے مجھے دھکے دے کہ نہیں مجھے نئی ایجنسیوں میں نہیں پڑنا۔ میں کل ہی یہ گھر چھوڑ جاؤں گا۔ یہ سب تو مجھے بہت عجیب لگ رہا ہے۔ بہت عجیب۔“ وہ سوچ رہا تھا۔

رات تو گزری گئی تھی جیسے سبے فخر حیات رات بھر کمرے میں نہ آئے۔ وہ کدھر سوئے گھر میں موجود بھی تھے یا نہیں۔ رعنا کو اس کی کچھ خبر نہ تھی۔ رات بھر غیند اس کی آنکھوں سے روٹھی رہی تھی اور آج دوسری رات بھی اسے جاگتے ہوئے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد آنسو بہاتے ہوئے گزری تھی اور اب تو اسے لگ رہا تھا۔ اس کا نموس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔ نہ دل سمجھوتہ کرنے پر آمادہ ہوتا تھا نہ اپنی بے بسی سے چھٹکارا مانے کا کوئی رستہ سوچا تھا اگر سمجھوتہ نہیں کرتی تو کہاں جاتی۔ بھائی کے گھر جانے سے بہتر ہے خود کسی کمرے اور خود کسی۔“ اسے تو موت سے بہت ڈر لگتا تھا۔ زندگی سے پیار جو بہت رہا تھا۔ یہ پیار اسے فخر حیات ہی نے تو دیا تھا۔ جب کوئی دن رات آپ کے حسن کے قصیدے پڑھے آپ پر والد و شیدا ہوں۔ آپ کو سوئی چھوے وہ اپنی جان فدا کرنے کو تیار ہوں۔ آپ کی ذرا سی آہ بھی اسے سینے پر پرچی کی مانند لگے تو پھر زندگی سے پیار ہو ہی جایا کرتا ہے۔

اور اب یہی پیار اس کی جان لینے پر مل گیا تھا۔ فخر حیات کو اب نہیں بلکہ کچھ عرصے سے اس کی کچھ بھی پروا نہ رہی تھی۔ وہ ان کے سامنے بیٹھی بھی ہوتی تو انہیں نظر نہ آتی۔ نامعلوم ان کی نظروں میں ایسا کیا سا گیا تھا جس نے رعنا کی شہید تک کھج ڈالی تھی۔ ایک خود ساختہ مصوفیت کا چولا تھا جو فخر حیات رعنا کو دیکھتے ہی زیب تن کر لیتے، پھر رعنا کچھ بھی نہ کہتی ہاں اسی مصوفیت کے چولے کو پہنے پہنے وہ اسے یلنک چیک تھما نہ بھولتے تو رعنا از خود فخر حیات کے چولے سے نقل کو بھی بھول جاتی مگر اب تو کچھ عرصے سے یہ نظر کرم بھی خاصا کم ہو چکی تھی۔ رعنا کو دھیٹ بن کر خود سے بتانا پڑا کہ اس کا بیلنس ختم ہونے کو ہے۔

”آخر میں نے پہلے آنکھیں کیوں نہ کھولیں۔ کیوں اتنا کچھ ہو جانے دیا۔“ کیوں انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے کھونے دیا۔“ مٹلیں بہتر میں تو جیسے بول کا صحرا آگ آیا تھا کسی پہلو چین نہیں مل رہا تھا۔ اپنی بے ونسی کا احساس نہ لے کر کیسے جا رہا تھا۔

”فخر حیات اگر صرف میرے شوہر ہوتے تو شاید آج کے واقعے میں اس قدر ہرٹ نہ ہوتی مگر انہوں نے تو مجھ سے محبت کی تھی۔ محبت بھی وہ جس کی کوئی حد نظر نہ آتی تھی۔ ان کی حد کو اگر چھو نا چاہتی، تھلا شتا چاہتی تو محبت کا سمندر اسے اپنے اندر سمولیتا۔ اسے پھر اور کچھ سوچنا ہی نا۔“

اور اب یہ ایک محبت کا وہ تھا جسے مارا سمندر ایک قطرہ آب بن کر سمون کی تیز کرن کی تاب نہ لا کر ہواؤں میں کہیں تحلیل ہو چکا تھا اور ہوا کو کھنکھانچ سکتا ہے کون جھان سکتا ہے کہ اس قطرہ آب کو ہی کوئی دھونڈ لائے اس کے دل نے دہائی دی، آنسو گھر بھر پھر آنکھوں سے بہنے لگے۔

”آخر اس بات سے کیا حاصل یہ تو معلوم ہو ہی چکا کہ فخریدل چکے ہیں بہت دیر ہوئی مجھے خراب ہوئی ہے مگر اب کیا کرنا۔“ اس نے زور سے آنکھیں رگڑیں سمجھوتے کے سوا کچھ جانے کے سوا اور جو کچھ دیکھا ہے اس کو فراموش کر دینے کے سوا اور کوئی راستہ قابل عمل لگ ہی نہیں رہا تھا۔ اس راستے میں اس کے دل کے ہزار ٹکڑے ہو رہے تھے اور ہر ٹکڑا فریاد کناں تھا۔ وہ کیا کرتی۔ وہ تو فخر کی محبت میں اس طرح کھولی تھی اتنی براعتا بھی کہ کل کو اگر یہ محبت کا سورج ڈھل گیا تو وہ کیا کرے گی۔ اپنے لیے کچھ بھی تو پس انداز نہ کر سکی تھی کوئی قیمتی مالیت کی جائیداد کوئی پنڈ سم اکاؤنٹ کا بینک بیلنس کوئی بیش قیمت گوہر نایاب کوئی پلازہ کوئی پراپرٹی کچھ بھی تو نہیں وہ تو ان کی محبت کو ہی اپنی دولت سمجھے بیٹھی تھی۔ جسے کوئی چور لہو بھی نہیں چرا سکتا تھا ورنہ آج اس کی سوچ کا رخ دوسرا ہوتا۔ کوئی تو تھوس، مضبوط راہ اسے بھی سوچتی یا پھر وہ گوہر نایاب جسے وہ کھوپٹلی ہے۔ کچھ بھی تو اس کی جھولی میں نہ بچا تھا اب وہ روٹی نہ تو کیا کرتی وہ پھر سے ماتم کناں انداز میں تکیے پر ہاتھ مار مار کر رونے لگی۔

اسی طرح آہ لگا کرتے جب دن کا دم اجالا ہر سو پہنچنے لگا۔ سلطان سے برندوں کے چنگے کی آوازیں آنے لگیں تو غیند اور غم کے بھاری احساس سے بو جھل اس کی پللیں آنکھوں پر گرنے لگیں۔ وہ شاید کچھ ہی دیر سوئی تھی جب کمرے میں ہونے والی کھٹ پٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے بھاری پپولے بمشکل کھولے۔ سامنے وال کھاک میں دس بج رہے تھے اس کا مطلب ہے وہ کم از کم پانچ گھنٹے غمور سوئی ہے۔ اس نے اڑے ہوئے بدن کو سمیٹ کر کوشلی۔

فخر حیات ڈریسنگ ٹیبل کے آگے تیار ہو رہے تھے۔ وہ نہا چکے تھے۔ ان کی کھڑ پڑ سے ہی تو اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ سیاٹ نظروں سے انہیں بالوں میں برش پھیرتے دیکھتی رہی۔ انہوں نے برش ٹیبل پر رکھ کر پرفیوم اٹھا کر چھڑکا۔ شیشے میں نظر آتے اس کے عکس پر اک ناراض سی نظر ڈالی۔
”اٹھ کر ناشتہ کر لو۔“ وہ ایک لمحے کو رکے۔“

”یوں بے کار سوچوں سے خود کو باکان مت کرو اپنے ذہن کو وسیع کرو۔“ آج بھی تم ہی میری محبت اور میری پیروی ہو اور تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ فضول کی سوچیں صرف تمہارے لیے نہیں، ہم دونوں کے لیے ہی تباہ کن ہیں۔ ہماری فیملی کے لیے بھی۔ بس اٹھ جاؤ۔“ وہ اس کے بہت قریب ہو کر بولے۔ وہ سیاٹ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”گڈ مارننگ! اینڈ آئی لو یو مائی ڈیئر وائف۔“ انہوں نے ذرا سا جھک کر اس کے ہاتھ کا بوسہ لیا اور آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

”ایک آنسو اس کی واٹس آکھ سے دھیرے سے نکل کر کان کے پیچھے گم ہو گیا۔ رات بھر کی سبے چین سوچوں کے بعد اس کا ذہن جیسے خالی ہو چکا تھا۔ اب کچھ بھی سوچنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ہی چاہ رہا تھا۔ یونہی لٹی رہے۔ اور کوئی اسے ڈسٹرب نہ کرے۔“

”اس گھر کے سوا اور کون سا ٹھکانا ہے میرا۔ میں کسی افسانے کے ناول کا کردار تو ہوں نہیں کہ شوہر نے نظریں پھیریں راہ سے بھٹکا تو میں گھر چھوڑ کر نئی دنیا دریافت کرنے نکل پڑوں! اسی زخمی وہ جو دروازہ ذہن کے ساتھ مجھے اسی گھر میں رہنا ہو گا کہ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔“

فخر حیات کا ذرا سا التفات اسے آج بھی پہلے دن کی طرح یکھلا دیتا تھا۔ رات کی بات علیحدہ تھی جب وہ بہت طیش میں تھی اسے کچھ بھی سوجھ نہیں رہا تھا۔ فخر حیات کی سوری بند کوئی دلیل اور اب تو دن تھا دن جو روشن ہوتا ہے اور روشن دلیلیں لاتا ہے۔ رات خود بھی تاریک ہے اور اکثر وہ چیزوں کے تاریک پہلو ہی دکھاتی ہے۔ زندگی کو بہت کٹھن بہت دشوار بنا کر پیش کرتی ہے۔ یہ دن ہے جو ان کٹھنائیوں کا توڑ پیش کرتا ہے اور پھر بندے کو ان کٹھنائیوں کو دور کرنے کے لیے کمر بستہ ہونے پر پل بھر میں آمادہ بھی کر لیتا ہے۔ اس نے کھڑکیوں پر پڑے پردوں سے چھن چھن کر آتی تیز روشنی کو دیکھا۔

اس طرح لیٹے رہنے سے رونے دھونے سے ایک دو سرے سے پہلو تھی اختیار کرنے سے کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ اس کے نیم خوابیدہ ذہن نے انگڑائی لی۔ اور وہ ذرا سی کھسک کر بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ سر ابھی بھی بھاری اور بوجھل ہو رہا تھا مگر رات کے مقابلے میں کم اس نے سامنے لگے ڈریسنگ ٹیبل کے جھوسا زمرہ میں خود کو دیکھا وہ برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ اچھے ہوئے پیالہ ستا ہوا چہرہ مسوئی ہوئی آنکھیں بے رنگ چہوئے آتر ہونٹ اور منگیا مسلا ہوا لباس۔ کچھ بھی تو اسے رعنا ثابت نہیں کر رہا تھا وہ تو کوئی نفل نکاس کی لڑا کا چہرہ مسائل میں گھری خود سے بیزار ہو ہی گئی تھی۔ اسے اپنا عکس دیکھ کر خود سے ابھرنے لگی۔

”یہ مسائل سے پیٹنے کا کون سا طریقہ ہے رعنا! اٹھو اور خود کو فریش کرو۔ یہ تو حالات کا معمولی سا کڑا رخ تھا۔ جس پر تم نے خود کو اس حد تک بگاڑ ڈالا کہ خدا انخواستہ اس سے کڑی مصیبت ٹوٹ پڑے تو تم پہچانی نہ جاؤ۔“ اس نے خود کو چھڑکا اور بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

وارڈروب کھول کر لباس منتخب کرنے لگی۔ پریل گلر کاسوٹ اسے اچھا لگا اور وہ واش روم میں گھس گئی۔
”شاید میرا ہی رویہ غلط تھا مجھے اس طرح ہونٹ میں ری ایکٹ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جاہل ان بڑے عمر رتوں کی طرح میں فخر حیات سے لڑنے کھڑی ہوئی۔ اگر وہ ان کی کوئی پرنس پارٹنر یا کوئی کلائنٹ ہوتی تو فخری رہی ہو۔ میں کتنی خراب ہو جاتی۔ واقعی غلطی کلنی حد تک میری بھی تھی اور فخری بھی تو ہے جنہوں نے مویا کل سے آ رہا تھا۔ مجھے تو شک میں پڑنا ہی تھا۔ بالوں میں برش کرتے اس کے ہاتھ اور اپنا تجزیہ کرتا ذہن باہر سے آنے والی تیز آواز پر تھک کر رک گیا۔“

”ہائے میرا دل تو رات ہی سے ریشاں تھا کہ ضرور کوئی بات ہے۔ مجھے رعنا کی طرف سے بے چینی ہی لگی ہوئی ہے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اسی لیے تو میں بے چین ہو کر صبح ہی بھاگی۔ ان کو بھی آفس سے چھٹی کرانی کہ نہیں آج تو ضرور رعنا کی طرف جانا ہے۔ وہ بیٹھتی ہوں کمرے میں، کیسی طبیعت ہے۔ کسی ڈاکٹر کو نہیں بلوایا۔“
عفت آرا کی تیز آواز تو رعنا لاکھوں کے جھوم میں سے پہچان سکتی تھی۔ یہ تو اس کے اپنے گھر میں تھی جہاں سناٹا اور سکون ان کے لڑائی جھگڑے سے بھی بے سکون نہ ہو پایا تھا۔ رعنا نے جلدی سے برش ڈریسنگ ٹیبل پر چٹا لپ اسٹک اٹھا کر تیزی سے ہونٹوں پر پھیری۔ بیڈ پر ادا ہوئے۔ کھینچ کر گلے میں ڈالا اور لائٹ آف کر کے تیزی سے کمرے سے نکل گئی اور کمرے سے نکلے ہوئے کمرے کا دروازہ بند کرنا نہ بھولی۔

فخر حیات کو کسی کا بھی اپنے بیداروں میں داخل ہونا سخت ناگوار گزر آتا تھا۔ یہ ان کی خاص بدایت تھی کہ چاہے کوئی بھی کیوں نہ ہو اسے بیداروں میں نہیں لے کر آتا۔ مجھے یہ بات سخت ناپسند ہے۔ ملا زمین میں سے بھی صرف جھٹکا کو کمرے میں آنے کی اجازت تھی وہی کمرے کی صفائی بھی کرتی تھی اسی لیے رعنا عفت آرا کے کمرے میں آنے کے لیے ہی باہر نکل آتی کہ ابھی اس کا فخر حیات سے ملا۔ جھگڑا پٹنا بھی نہیں تھا کہ یہ نیا ایڈوکلر ہو جاتا۔
”اوہو رعنا! ماشاء اللہ اب تو ٹھیک لگ رہی ہو! تمہا دھو کر آئی ہو فریش۔“ سامنے سے آتی عفت آرا نے آنکھیں سکوڑ کر رعنا کو دیکھا۔ ”چلو اچھا سے طبیعت خود ہی ٹھیک ہو گئی۔ رنہ مجھے تو بہت فکر لاحق ہو گئی تھی کہ خدا خیر کرے کیا بات ہو گئی۔“ وہ رکے بغیر بولے۔

”سلام بھائی جان!“ رعنا نے بیزار آواز میں کہا۔ صبح کی ابتدا ہی اچھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے اندر جنم لیتی خوش امید قوری ہی دم توڑنے لگی تھی۔ سامنے ڈاکٹنگ ٹیبل پر فخر حیات اور گرو سے بے نیاز ناشتہ کرنے میں مگن تھے۔ دروازہ بھائی ان سے ذرا پرے چائے پی رہے تھے۔

”وعلیکم خوش رہو۔“ آدا رہو۔ اسی طرح مسکرائی رہو۔ میری تو دعا ہے۔ بھئی ماں کی جگہ ہوں۔ دعائیں ہی دے سکتی ہوں۔“ وہ بھائی سے تو کہے۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر جاثرا انداز میں بولیں تو رعنا ایک گہرا سانس لے کر آگے بٹھ گئی۔

”السلام علیکم بھائی جان۔“ وہ ان کے پیار بجا کھڑی ہوئی۔
”وعلیکم السلام آؤ بیٹھو بھئی۔ کیا بات تھی۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا اب تمہاری۔“

”یہ اس کی ناسازی طبیعت کی خبر خدا جانے کس نے اڑائی تھی۔ اس نے کن آنکھوں سے فخر کی طرف دیکھا جو اس سارے منظر سے ابھی بھی لالعلیق نظر آ رہے تھے۔ اور سچ تو یہ تھا عفت بھائی انہیں ایک پل کو بھی برواشت نہ ہوتی تھیں رعنا کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

”ٹھیک ہوں بھائی جان! بس سر میں درد تھا ذرا۔“ وہ دھیسے لیٹھے میں بولی۔

”یہ تمہاری بھائی نے صبح سے شور مچا رکھا تھا کہ میں آج آفس نہ جاؤں۔ تمہیں دیکھتے جانا ہے میں نے بھی سوچا بہت دن ہو گئے ہیں تمہیں دیکھے ہوئے۔ تم نے تو آنا جانا ہی کم کر دیا ہے۔ لگتا ہے بہت مصروف ہو گئی ہو۔ کچھ بھی یاد کر رہے تھے۔“ وہ شکوہ بھرے انداز میں بولے۔

”اچھا کیا بھائی جان! آپ نے میں خود سوچ رہی تھی آپ سے ملنے کے لیے اور آپ کی طبیعت کیسی ہے۔“ وہ رسمی سے انداز میں بولی۔

”ارے اپنے کج مزاجی تو کروں سے کہو کھانے کو کچھ لے آئیں۔ بھئی میری تو عادت ہے صبح منہ اندھیرے اٹھنے کی۔ نماز پڑھتی ہوں قرآن کی تلاوت کرتی ہوں پھر اپنے لیے چائے کا ایک کپ بناتی ہوں۔ بس پھر بچوں کے اٹھنے کے بعد تو سمجھو میری دوڑ لگ جاتی ہے۔ ان کے لیے ناشتہ بناؤ، یونیفارم تیار کرو، نواز کا ناشتہ، بچوں کے بیج باکس بنانے میں تو سمجھو کٹھن پیکری بن جاتی ہوں۔ اب تمہاری طرح ملازم تو ہیں نہیں ہمارے گھر میں۔ پھر جب یہ سب گھر سے جاتے ہیں۔ نواز آفس اور بیچے اسکول تو گھر جیسے کسی کتھی کے اکھاڑے کا منظر پیش کر رہا ہوتا ہے۔“

پھیلاوا سینٹے سینٹے ہی بارہ بج جاتے ہیں۔ اپنے کھانے پینے کا تو کجخت ہوش ہی نہیں رہتا۔ آج بھی صبح سے چائے کا ایک کپ ہی پی رکھا ہے۔ آتے آتے کچھی گھر کے سو کام کر کے آئی ہوں وہ سہرے کے لیے کل کا سالن پر پاتھا آنا گوندھ کر آئی ہوں بچوں کے لیے گھر کے کپڑے نکال کر آئی ہوں لیکن کے برتن دھو دھا کر یہ گھر کے کام تو سمجھو جان ہی کھا جاتے ہیں پھر بھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ تم خوش بخت ہو جوان جھیلوں میں نہیں پڑیں۔ سینی کتنے بچے آتے۔ اسکول سے وہ تو ماہی نہیں ہم سے۔ ”وہ ذرا سا بھی سانس لیے بغیر بولے جارہی تھیں اور فخر حیات کے چہرے کے تاثرات شدید ہوتے جا رہے تھے وہ ناشتہ اوجھوڑا پھوڑ کر چائے پینے لگے تھے۔

”دوبچے آنا ہے۔“ رعنا دھیرے سے بولی۔ وہ عفت آرا کے آگے بے بس تھی۔ آپس پلٹ کر جواب بھی نہیں دے سکتی تھی۔ یہ تو آج اسے احساس ہوا تھا کہ قدرت نے ہر طرف سے اس کی بے بسی کا اہتمام کر رکھا ہے۔ وہ اپنے آگے بڑے سانس پر جیم لگانے لگی۔

”ہاں۔ سچے سچے بھی گھر دو بجے ہی آتے ہیں۔ اس پر آج فخر حیات آفس نہیں گئے۔“ انہیں ایک بل کو خیال آیا اور بے دھڑک پوچھ بیٹھیں۔

”نہیں۔“ فخر حیات نے محض لب ہلائے۔

”چلو اچھا ہوا۔ آپ گھر پر مل گئے آپ دونوں سے بات ہو جائے گی اور پھر ملاقات بھی تو ہوگی اور نہ تو کبھی کبھار ہی آتی ہوں تو آپ گھر پر ملتے ہی نہیں۔ آج تو میں آئی بھی خاص طور پر آپ سے ملنے بھی چاہے آپ کے انتظار میں مجھے رات کے بارہ کیوں نہ بج جاتے۔“ رعنا کا دل دھڑکا پھر کوئی خاص مطالبہ۔ وہ ہی تقاضا جو اس دن دن پر کر رہی تھیں۔ نواز بھائی بے تاثر چہرے کے ساتھ چائے پی رہے تھے جیسے پوری کی گفتگو سے ان کا کوئی تعلق ہی نہیں یا پھر وہ کچھ سن ہی نہیں رہے۔

”تجربہ ہے۔“ انہی آیات ہے جو مجھ سے ملاقات ضروری تھی۔“

”زیادت نے ایروڈ کا کپڑا بچھا۔ کپڑے ستور ان کے لبوں سے لگا تھا۔“

”بتاتی ہوں۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ ناشتہ تو کر لیں۔ آپ اور میری ہیں نا۔“ اسی وقت جتنا ناشتے کی ٹرالی کھینچی ہوئی لے آئی تو ان کی زبان کو بریک لگ گئی۔ جتناں نے ناشتہ کھلی پر چنا تو عفت آرا ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ فخر حیات اور نواز اٹھ کر لاؤنج میں جا بیٹھے۔ رعنا نے صرف اور جگہ جوس ہی لیا۔

”گونا بھئی تم ابھی بھی ڈائنڈ وائنڈ کرتی ہو ہزار نعمتوں کے ہوتے ہو گے کبھی ناشکروں کی طرح پانی کا گلاس پی کر اٹھ جانا ناشکرا نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک دنیا ان نعمتوں کو ترستی ہے اور تم اپنی علم نہیں کے پتھروں میں ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں اور سچ کہوں رعنا! تم تو ابھی بھی اس قدر اسارت ہو کہ کچھ لے جا رہے تو کہیں اور دیکھ بھی نہیں سکتا۔ ویسے بھی اب تمہاری شادی کو سترہ اٹھارہ سال تو ہونے کو آئے ہیں۔ چھوڑو اب ان احتیاطوں کو۔ اب فخر حیات کہیں بھانگے والے نہیں۔“

وہ آنکھ دیا کر بولیں تو رعنا کے دل نے ایک آہ بھری۔ اس نے نظریں اٹھا کر سامنے بیٹھے فخر حیات کی طرف دیکھا جو انگلی اشار کا سطل بڑے اٹھا کر سے کر رہے تھے اور نواز بھائی خاموشی سے بیٹھے تھے۔

”اسٹینس میں تو وزن نہ ہو تو رشتے بھی بے وزن ہو جاتے ہیں۔“ اس نے فخر حیات کے بے نیازانہ انداز کو دیکھ کر سوچا۔ عفت آرا کا ناشتہ پورے سٹینس منٹ میں تمام ہوا۔ رعنا نے اٹنا کر چائے کا ایک کپ پی ہی لیا۔

”اللہ تیرا شکر ہے۔ بڑا اچھا ناشتہ تھا۔ بہت مزہ آیا۔ ہمیں ایسا ناشتہ روز روز کمان نصیب ہوتا ہے۔ یہ تو اللہ نے تم بیسوں کے نصیب میں لکھ رکھا ہے۔ مجھے بھی چائے دینا۔ جب تک چائے کے دو تین کپ نہ پیوں۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ ناشتہ کیا بھی ہے یا نہیں۔“ انہوں نے رعنا سے چائے کا چوتھا کپ مانگا۔ وہ بے بسی سے سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ کپ اٹھا کر لاؤنج کی طرف بڑھ گئیں تو رعنا بھی اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ ملازم آکر ٹیبل سے برتن سمیٹے گئے۔ بتناں کی موجودگی کا یہ فائدہ تھا کچھ بھی کہنا نہیں پڑا تھا وہ سب کچھ خود ہی کروا لیتی تھی۔

”اب تو موسم کافی بدل گیا ہے۔ رات کو کافی ٹھنڈ ہو جاتی ہے اور رات کو تو میں نے لحاف نکال لیے۔ سچے روز سردی سردی کرتے تھے۔ میں نے کہا اب لحاف میں آرام سے لیٹنا۔ روز کبیل دیکھ کر بولنے لگ جاتے تھے۔“

”کس قدر فضول باتیں ہوتی ہیں اس عورت کی۔ جن کا نہ کوئی سر نہ پیر۔“ فخر حیات کا جی جاہا اٹھا کر کوئی چیز عفت آرا کے سر پر سے ماریں۔

”آپ کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتی تھیں کیونکہ مجھے ابھی ایک ضروری کام سے جانا ہے اور رعنا کو بھی میرے ساتھ جانا ہے۔ اس لیے آپ پہلے بات کر لیں۔“ فخر حیات نے بڑی مشکل سے اپنے اندر اٹھتے اشتعال کو دبا کر مناسب لہجے میں کہا۔ ان کی بات پر نواز اور رعنا دھڑکیٹھے لگے۔ اس عورت کی وجہ سے انہیں ہمیشہ ہی سخت اٹھانی پڑتی تھی۔ وہ دل میں کہنے لگے۔

”ارے لو تم لوگ کہیں جا رہے ہو۔ میں نے تو کہا آج آفس نہیں گئے تو چھٹی ہی ہوگی۔ دن گھر پر گزاریں گے۔“ وہ خواجھا پوچھ نہیں خراب رہے۔

”تھیک ہے آپ لوگ جا میں۔ ہم اور میری ہیں شام کو یا جب بھی آپ لوگ آئیں گے پھر بات کر لیں گے۔“ پتا نہیں عفت آرا کتنے کس مٹی سے اٹھا تھا۔ کسی بھی بات پر شرمندہ ہوتی ہی نہیں تھیں۔

”نہیں آپ ابھی بات نہیں۔ ہماری واپسی معلوم نہیں تب ہو ہمیں ذرا پاسپورٹ آفس جانا ہے پھر ٹریول ایجنسی اور پھر شاپنگ کرنے بہت کام ہے شاید ہمیں واپسی پر رات ہو جائے۔ آپ لوگوں کو گھر بھی جانا ہو گا۔ سچے اور اصرار کیے ہوں گے آپ کے۔“ انہوں نے جھکا کر کہا تو نواز نے گھور کر پوری کو دیکھا۔

”ہیں یہ پاسپورٹ آفس کیوں جانا ہے۔ یہ ریت ہے کہیں سیر سپائے کا پروگرام ہے باہر کا۔“ وہ چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر اچھبے سے بولیں۔

”نہیں۔“ فخر حیات نے جھکا کر کہا۔

”نہیں باتیں نہ کیجیے بھی نہیں ہے۔ کچھ خاص نہیں اور آپ کے لیے تو بالکل بھی بڑی بات نہیں۔ ہمیں پانچ لاکھ کی ضرورت تھی۔ گھر کے اوپر پورشن ڈلوانا ہے بس اس لیے۔ میں نے رعنا سے بات کر لی تھی کہ وہ رہی تھی۔ بھالی کل پرسوں آکر لے جائیں۔ پورشن بن جائے گا تو کرائے پر وے دیں گے۔ ایک دو سالوں میں کمپنی ڈال کر آپ کا قرض لوٹا دیں گے۔ بس اتنی چھوٹی سی بات تھی۔“ عفت آرا نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہوں۔“ فخر حیات نے جھکا کر کہا۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ بات اتنی چھوٹی نہیں بہر حال پانچ لاکھ چھوٹی رقم نہیں ہوتی۔ وہ بھی اس صورت میں جب کہ میرا اہلیہ ہو چکا ہے۔ میرا کاروبار عمل طور پر تباہ ہو چکا ہے۔ میں مقروض ہو چکا ہوں۔ دو پینک کیٹ قرار دے دیے ہیں جن کے قرض مجھے اپنے بزنس کے تمام سیمیزز فروخت کر کے ادا کرنے پڑے باقی کے واجبات بھی میں نے سب کچھ بیچ کر ادا کیے ہیں۔ میری کاروباری تباہی کی وجہ کیا ہے۔ اس سے یقیناً“ آپ کو کچھ غرض نہ ہوگی۔ بس اب یہ گھر بچا ہے۔ دونوں گاڑیوں کا بھی سودا ہو چکا ہے۔ اس لیے ان حالات میں میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم یہ ملک چھوڑ جائیں۔ میں نے جاپان سہیل ہونے کا فیصلہ کیا ہے بلکہ اس سلسلے میں کافی کام کر بھی چکا ہوں۔ وہاں گھر لے لیا ہے۔ بزنس کے لیے آفس بھی۔ ادھر سے سب کچھ وائٹ اپ کر چکا ہوں بس اب ٹکٹ کٹفرم کرانے ہیں یا تھوڑی بہت شاپنگ کر کے سفر کی تیاری کرنی ہے یعنی ہم لوگ اگلے ہفتے کسی بھی دن ادھر سے روانہ ہو سکتے ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں آج کل میں آپ لوگوں سے ملنا بھی تھا کہ آپ کو یہ سب بتا دوں بس بزنس کی الجھنوں نے سانس ہی نہیں لینے دیا کہ کسی کو کچھ بتا سکوں۔ بہر حال اب جو کچھ بھی ہے۔ آپ کے گوش گزار کر دیا ہے۔ امید ہے آپ میری پتویشن سمجھ گئے ہوں گے۔ ورنہ میں نے کبھی آپ کی ویلپ کرنے سے نہ تو رعنا کو روکا ہے نہ خود انکار کیا ہے۔“

فخر حیات کے الفاظ تھے یا ہم کے گولے جوان تینوں کے سروں پر آکر پھٹے تھے۔ عفت آرا کا دل تو اگلے ہی بل

خوشی سے جھوم اٹھا تھا کہ رعنا کا بھی دل الیہ ہو چکا ہے۔ رعنا پھٹی پھٹی آنکھوں سے فخر حیات کے چہرے کو تے جاری تھی۔ ان کے انکشافات ست اچانک اور جان لیوا تھے۔ نواز بھی پریشانی سے فخر حیات کو دیکھ رہے تھے جیسے وہ سب مذاق میں کہہ رہے ہوں۔

”ہمیں افسوس ہے۔ آپ اس قدر کٹھن حالات سے گزر رہے ہیں۔ اور ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے، مگر فخر حیات! کیا یا ہر جانے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں؟ آپ ادھر ہی کاروبار نئے سرے سے سیٹ کریں۔ ادھر آپ کا گھر بھی تو ہے۔“ نواز نے کچھ دیر بعد کہا۔

”نہیں اب یہ ممکن نہیں میں سب طرف سے جائزہ لے چکا ہوں۔ ملک چھوڑے بغیر چارہ نہیں۔ ادھر ہماری کاروباری سادھ بائلنگ تباہ ہو چکی ہے۔ جاپان میں میرے دوست ہیں جن کے بزنس میں میں شریک ہو رہا ہوں اسی لیے میں ادھر جانے کو ترجیح دے رہا ہوں پانی رہا ادھر کا مسئلہ جب بھی ہم لوگ سیٹ ہوں گے واپس آجائیں گے کیونکہ ہمیں ادھر ہی آنا ہے چلو رعنا! تم تیار ہو جاؤ باقی تفصیلات میں تمہیں راستے میں بتا دوں گا۔ آج بہت سارے کام کرنے ہیں ہماری روانگی میں صرف تین چار دن تو ہیں ابھی سیٹی کے اسکول بھی جانا ہے۔ سرکٹ لینے اب تم ویر مت کرو میں ذرا کمرے سے موبائل اور گاڑی کی چابی لے آؤں۔“ کہہ کر وہ اٹھے اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

”یہ کیا کہہ کر گئے ہیں فخر حیات۔ رعنا! یہ سب کیا ہے۔“ صفت آرا جیسے سناک سے نکلیں۔ یہ باہر جانے کی بات کیوں کر رہے ہیں۔“ وہ جیسے حواس باختہ ہی لگ رہی تھیں۔

”مجھے تو خود بخود بھی! کچھ علم نہیں۔ یہ سب باتیں ابھی ان کے منہ سے سن رہی ہوں۔ آپ کے سامنے اور یہ سب کچھ اتنا اچانک ہے کہ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کہوں! کیا کہوں۔“ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کا دماغ جیسے خالی ہو کر رہ گیا تھا۔ نواز نے افسوس سے بہن کی طرف دیکھا۔

”چلو صفت آرا چلیں رعنا! میں پھر چکر لگاؤں گا تم خود کو سنبھالو تم اس قدر پریشان ہو تو سوچو فخر حیات کس قدر پریشان ہوں گے۔ برسوں کا جمانا یا بزنس جھٹ پٹ ختم ہو جائے تو بندے پر کیا نہیں گزر جاتی تم اس کو بھی حوصلہ دو اور خود بھی ہمت باندھو اپنی یہ زندگی۔ اس میں یہ سب چلنا ہی رہتا ہے۔“ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولے۔

”لو ہم آئے تھے کہ کچھ تو مدد ملے گی ان کی طرف سے، یہاں تو الٹی گناہ بنے گئی۔ انہوں نے کہا کہ وہ طریقہ اختیار کرو کہ یہ لوگ خود ہی شرمندہ ہو کر چلے جائیں اور اب اندر سے دونوں میاں بیوی کی کیا صلاح سے اللہ جانے اوپر سے یہ ڈراما ہو رہا ہے۔ حد ہے ویسے رعنا! تم اچھا نہیں کر رہی ہو میں نے تو ہمیشہ تمہارا خیال ہی رکھا تمہارے ماں باپ سے بڑھ کر۔ قیمتی سے قیمتی چیز کے لیے بھی تمہارے آگے دریغ نہ کیا۔ اور آج مجھے یہ صلہ مل رہا ہے۔“ صفت آرا برہم دار رہی تھیں۔ رعنا ہنوز سر پکڑے بیٹھی تھی۔

”چلو! اب اٹھو وہ خود اتنی پریشان ہے۔ تم اپنی مصیبت ڈال دو۔“ نواز نے انہیں بازو سے کھینکا تو وہ برہم دار بنی ہوئی شوہر کے پیچھے باہر نکل گئیں۔



ماں
تیری یاد کو لفظ بناتی ہوں
تو وہ تیرے لیے کی خوشبو کو ترستے ہیں
جیسے
کوری مٹی کے ٹھکانے برتن پر
پانی کے چند قطرے گریں
تو شخص کھن کی آواز آتی ہے

کوئی لہجہ ہاتھ آتا ہے نہ کوئی لہجہ

اور
شب و روز کی محنت سے جوڑے یادوں کے وہ چند لفظ
حقیقت کی ایک ہی ٹھوک سے ترس جاتے ہیں کہ
تو نہیں ہے

اور جو ہستی کی تکان سے بوجھل آنکھیں
تیری یاد کے خواب بنا چاہیں
تو خاموش دھندلے سے خاکے

تیری شبیر کے رنگوں کو ترستے ہیں
آنکھوں کی محنت بڑھتی ہے
خوابوں کی الجھن بڑھتی ہے

بے صد لفظ

بے شبیر تصویریں

دکھوں کی جھجھکیاں ہیں
زلیست کی تکان کو برصالی ہیں

کوئی کندھا نہیں

کوئی آنکھ نہیں

کوئی دلاسا نہیں

اور تیری طرف جانا کوئی راستہ نہیں

بس

مٹی کا گھونڈہ ہے

جو تیرا نشان بنا ما ہے

بچھ کر پاس بلاتا ہے

بے حتم کیے جاؤں

اپنے درو کیے بتاؤں

یادوں کے تانے بانے بنتے ہیں ٹوٹتے ہیں
تو بے بسی ہاتھ تھام لیتی ہے

کچھ کرنا ہو گا۔“ اس نے مڑ کر سیاہ گیٹ پر ایک الوداعی نگاہ ڈالی اور بے جان قدموں سے اس کی مخالف سمت میں چلنے لگی۔

”نصیب تو سارا ہی بگڑ چکا ہے۔ کہتے ہیں جب بخت ساتھ نہ دے تو اپنا سایہ بھی پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے۔“ میرے ساتھ بھی یہی کچھ نہ ہو پھر کہاں جاؤں گی۔“ وہ ست قدموں سے چلتے ہوئے سوچے جاری تھی۔ اس نے چادر سے اپنا منہ اچھی طرح ڈھانپ لیا تھا۔

قدم جانے بوجھے رستوں پر پڑ رہے تھے حالانکہ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس رستے پر اتنی دور اسے یوں بھی تباہ پڑے گا اور اس کے پاس تو پھولی کوڑی بھی نہیں تھی جو کوئی سواری لے لیتی۔ چلتے چلتے اسے واقعی گہری شام ہو گئی۔ جب اس نے کال بیل پر انگلی رکھی تو مغرب کی آذانیں ختم ہو چکی تھیں۔ اندھیرا بڑی مہارت سے کونے کھدروں میں گھسی روٹنی کو سیاہ کرنے میں مصروف تھا۔ اس کی پہلی بیل کے جواب میں کوئی نہ

آیا تو اس نے چند لمحوں بعد دوبارہ کال پیل برہا تھر رکھ دیا۔ اسی وقت گیٹ کے اندر کھنسر بیڑ ہوئی۔
 "کون ہے یہ؟" فرید بابا کی جانی پہچانی آواز اس کے کانوں میں بڑی تو اس کے دل نے طمانیت بھر سانس لیا۔
 "ٹانگیں چل چل کر شل ہو چکی تھیں اب منزل پر پہنچنے ہی کرنے کو بے تاب ہو گئیں۔
 "میں فرید بابا نہ ہست۔" اس نے گلا صاف کر کے ذرا اونچی بشارت آواز میں کہا۔ گیٹ کھل چکا تھا فرید بابا
 نے اسے کچھ تنقیدی نظروں سے دیکھا اندازاً جیسا تھا۔ نہ ہست کے دل کو دھچکا لگا۔
 "را۔۔۔ راحیلہ ہے۔؟" وہ اس کی نظروں سے گزیرا کر بولی۔
 "اچھا جی۔؟" وہ کچھ بھی جواب دے بغیر اندر مز گیا وہ اس کے پیچھے اندر داخل ہونا چاہتی تھی کہ اس نے مڑ کر سختی
 سے گیٹ بند کر دیا۔

"آپ باہر رہو میں پہلے اندر سے پوچھ لوں۔" درستی سے کہہ کر وہ اندر مز گیا تو نہ ہست کے جیسے پاؤں تلے سے
 زمین سرکنے لگی۔ یہ فرید بابا تو اسے دیکھتے ہی نہال ہو جایا کرتا تھا۔ "نہ ہست یہی آئی ہے۔ جی آیا لوں جی آیا لوں"
 آپ تو جی ادھر آتے ہی نہیں ہو اور راحیلہ نے بی ہرل آپ کی طرف آنے کو بے قرار رہتی ہیں جی۔" اور آج۔۔۔
 اس نے آنسوؤں کو پیچھے دھکیل کر ایک گہرا سانس لیا۔
 "نہیب واقعی ہر ہنستی سے مگر کیا ہے میرے لیے بدل گیا ہے۔" اس کے دل نے یہ یقین انداز میں کہا۔
 "کہہ دو۔ میں گھر پر نہیں ہوں۔" اسے دور سے راحیلہ کی بانوس آواز سنائی دینی تو اس کا جی چاہا۔ یہیں زمین کے
 اندر کہیں غرق ہو جائے۔ اسی وقت قدموں کی چاپ نر ویک آئی اور گیٹ کھل گیا۔ سر پر سیاہ اندھیرے کی چادر تھی
 جا رہی تھی۔

"جی بی گھر پر نہیں ہیں جی۔" وقتی رو کھا خشک ناشائسا لہجہ۔ نہ ہست نے دیوار کو تھام لیا۔
 "را۔۔۔ راحیلہ گھر پر ہے بابا! خدا کے لیے اس سے کہیں میری بات سن لے میں اندر نہیں آتی ہائی گاڈ بابا! میں
 اندر نہیں آؤں گی مگر اس سے کہیں صرف چند لمحوں کے لیے میری بات سن لے۔ اسے اللہ کا واسطہ۔ میری اپنی
 پرانی دوستی کا واسطہ۔" وہ بے اختیار روتے ہوئے گڑ گڑانے لگی۔ تو فرید بابا نے اسے ترس بھری نظروں سے دیکھا
 اور اندر کی طرف مڑ گیا مگر جانے سے پہلے دروازہ بند کرنا نہ بھولا۔
 "بابا! کہہ دو میں گھر پر نہیں ہوں۔ میں اس سے نہیں مل سکتی خالہ گھر پر ہیں۔ انہیں پتا چل گیا تو آفت
 آجائے گی۔ میں کتنی صفائیاں پیش کروں۔ وہ یقین نہیں کریں گی۔ پہلے ہی وہ مشکوک ہو رہی ہیں۔ امی ابو تھی سے
 منہ کر کے گئے ہیں مجھے۔ پلیز آپ جا کر اس سے کہہ دیں کہ راحیلہ بازاری گئی ہے پھر جی تمہارے "راحیلہ کی سخت
 آواز پر اس کا دل یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔

"بیٹا! وہ سخت مشکل میں دھتی ہے۔ ایک بار جا کر اس کی بات سن لو۔ بے شک اس کی مدد نہ کرنا ہوگا اللہ کا
 واسطہ دے رہی ہے۔ سن لو جا کر۔ بیگم صاحبہ کو مس دیکھا ہوں ادھر آنے لگیں گی تو روک لوں گا یا آپ کو بتا دوں گا"
 آپ اس کی بات سن لیں جا کر۔" فرید بابا کا لہجہ سراسر ترس کھانے والا تھا۔ اب لو کر بھی اس پر ترس کھائیں گے۔
 اس نے دیوار سے ہولے سے سر مگر لیا۔
 اندر چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی پھر قدموں کی آواز ابھری۔ رخ گیٹ کی طرف ہی تھا۔ شاید راحیلہ نے
 جواب دے کر بھیج دیا تھا۔ اس نے مایوسی سے سر اٹھا کر تاریک آسمان پر غنٹاتے اکا دکا ستاروں کو دیکھا۔ اسی وقت
 گیٹ کھل گیا۔

راحیلہ اس کے سامنے کھڑی تھی جس کی آنکھوں سے اس کی پہچان تک مٹ چکی تھی۔ چہرے ناثر اور
 روکھا۔ وہ تو اسے دیکھتے ہی اس قدر خوش ہوئی تھی جیسے عید کا چاند نظر آیا ہو۔
 "کیوں آئی ہو ادھر جاؤ جہاں رات گزار کر آئی ہو ادھر ہی چلی جاؤ۔ تم نے میری دوستی کو دھوکا دیا ہے آج مجھے
 تمہیں اپنی دوست کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔ میری خالہ آئی ہوئی ہیں۔ ان کے کانوں میں تمہاری آمد کی ہنک

بھی پڑ گئیں تو وہ میرا رشتہ اپنے بیٹے سے تو کیا توڑیں گی۔ پچھلے بھی تمام تعلق توڑ کر چل پڑیں گی۔ رات کو تمہارے
 بھائی اور بھائی نے خوب تماشنا لگایا تھا ان کے سامنے آ کر۔ میری عزت دو کوڑی کی نہیں رہنے دی۔ امی ابو گھر پر
 نہیں ہیں بہتر ہے کہ تم ادھر سے چلی جاؤ تم نے بات سننے کے لیے اللہ کا واسطہ دیا تھا تو میں نے سن لیا۔ اب میں
 تمہیں اللہ کا واسطہ دیتی ہوں کہ تم یہاں سے چلی جاؤ کیونکہ مجھے تمہاری جھوٹی سچی کوئی کہانی نہیں سنی۔" وہ ذرا سا
 گیٹ کھولے بمشکل چہرہ ہر نکالے اس سے تندرے میں مخاطب تھی۔

اس دوران اس نے ایک بار بھی نہ ہست کی آنکھوں سے بہتے جھروں اور ان سے پھوٹی بے بسی کو پڑھنے کی
 کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تو اس راحیلہ سے بے حد مختلف اور انجان لگ رہی تھی۔ جو کبھی نہ ہست کی بے حد قریبی
 دوست عم خوارو ٹکسارہ چکی تھی۔

نہ ہست نے جواب دینے کی کوشش کی۔ اس کے لب ذرا سا کانپنے مگر آواز اور الفاظ نے ساتھ نہ دیا۔ راحیلہ
 نے ایک بل کو اس کے اجڑے ہوئے چیلے پر نظر کی وہ فقیروں سے بدتر لگ رہی تھی۔ گرو اور مٹی سے اٹنے ہاتھ
 پاؤں اور کھلا ہوا میلا لباس اور اس کے وجود سے اکتی بے حد ناخوشوار گندگی کی بدبو کسی کو بھی دوپل اس کے پاس
 گھرا نہیں رکھ سکتی تھی۔ رو رو کر سوتی ہوئی آنکھیں خشک بے رونق چہرہ روٹھے پٹری زدہ ہونٹ راحیلہ گیٹ
 بند کرنے لگی۔ نہ ہست نے اس کا ارادہ بھانپ لیا۔ وہ کچھ کھنا چاہتی تھی مگر کیا کہتی "آج تو اس کے سارے الفاظ"
 سارے انداز بے اثر ثابت ہو رہے تھے۔ زمین اور آسمان کے درمیان کسی بھی ذی مدیج پر اثر نہیں کر رہے تھے۔
 اگلے ہی بل وہ آگے بڑھی اور ادھر سے دروازے کو دھکیل کر راحیلہ کے قدموں میں گر پڑی۔

"راحیلہ خدا کے لیے اللہ کے واسطے مجھے صرف آج کی رات سہرا چھپانے کی جگہ دے دو۔ صرف آج کی رات
 میں صبح کا اجالا ہوتے ہی یہاں سے چلی جاؤں گی۔ راجی! میں بے قصور ہوں۔ میں وعدہ کرتی ہوں صرف آج کی
 رات۔" پلٹے پلٹے اللہ کی قسم اپنے امی ابائی قسم "صرف ایک رات۔ صرف آج کی رات پناہ دے دو۔" وہ
 اس کے کہنے پر سر پٹنے جا رہی تھی۔

ترپ میرے بے قرار دل کی
 کبھی تو اللہ بھی چلیں گے اس میں
 کبھی تو اللہ بھی چلیں گے اس میں
 جو آگ دل میں دہک رہی ہے
 ہزاری سانسوں میں آج تک
 وہ حنا کی خوشبو ہمک رہی ہے

یہاں نہیں قات کے دو سری طرف کون مہدی حسن کا چائین بورے سرنال کے ساتھ با آواز بلند گارہا تھا۔
 گانے کی سلیکشن فنکشن کی مناسبت سے بالکل موزوں تھی۔ گانگی میں کہیں بھی جھول نہیں تھا۔ پختہ انداز
 میں لفظوں کا ٹھیک ٹھاک جہاؤ صرف آواز میں ناچتگی اور کچا پن نہ ہو تا تو کوئی بھی نہ جان سکتا کہ یہ آواز کسی نونیز
 و نو عمر لڑکے کی ہے۔ یہی لگ رہا تھا کوئی مجھا ہوا گلوکار بڑی لگن سے گارہا ہے۔
 "واہ زبردست۔ تالیاں اونٹے ہوئے۔" سننے والوں میں سے کسی لڑکے کی بلند آواز گونجی ساتھ ہی زور زور سے
 تالیاں بجنے لگیں۔

"عبدالحمید! زبردست! کیا آواز ہے۔ کیا گلا ہے یا ر! لگتا ہے تو قاری عبدالحمید کے پاس حفظ قرآن کی نہیں
 بلکہ سرنال کی تعلیم لینے جاتا ہے۔ زبردست مزہ آگیا۔ ایک بار پھر۔"
 وہی لڑکا تالیوں کی گونج ختم ہوتے ہی بے اختیاری سے بولا تو دوسرے لڑکے بھی اس کی تعریف کرنے لگے ساتھ
 میں ہنسی مذاق بھی۔

"ارے صوفی صاحب! یہ تو آپ کا لخت جگر لگتا ہے۔ یہ آپ نے اسے کس کام پہ لگا دیا! اچھا بھلا آپ مسجد

مدرسہ سنبھالے ہوئے ہیں۔ ٹھیک ٹھاک گورنمنٹ سے تنخواہ لیتے ہیں پھر جو ملی سے بھی خوب انجان چاتے ہیں اور بھی جو ممکن ہو ہم مدد کر دیتے ہیں۔ مگر پھر آپ نے اولاد کو اللہ کی راہ پر لگانے کے بجائے یہ بھانڈوں اور میراثوں کے کام پر لگا دیا۔ مانا آج کل اس پیشے پر بھی خوب ہن برس رہا ہے۔ نکلے سے نکلا بھانڈا میراثی پجاروں میں گھوم رہا ہے۔ جہازوں میں اڑتا پھر رہا ہے۔ پر یہ تو خاندانی پیشہ دہوں کے کام ہیں آپ کو تو اپنے خاندان نام منصب اور پیشے کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

بادشاہ کے عتاب سے یونہی تو غریب غریبا نہیں لرزا کرتے۔ آسمان پر اللہ بادشاہ اور زمین پر یہ بنے بنائے بادشاہ اگر جلال میں آجائیں تو کیزے مکوڑوں کو تو کہیں پناہ نہیں ملتی اور صوفی صاحب نے پیشہ اس قسم کی صورت حال سے بچنے کی کوشش کی تھی جو آج عبدالمبین کی بے ہودہ حرکت کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔

”آپ تو کہتے تھے آپ کا عبدالمبین حفظ کر رہا ہے آج کل۔ بہت جلد آکر مدرسے کے نظم و نسق میں آپ کا ہاتھ بٹانے کا پروا تو عبدالمبین شہر کا ہو کر رہ گیا اچھا آپ نے اسے اتر کرنے کے لیے شہر بھیجا۔ صوفی صاحب آپ کی اولاد کے خون میں کیا وفا نہیں رہی۔ حق حلال کا کھلا رہے ہونا ذرا خیال کرنا تھا۔“

بڑے شاہجی کے طنز و تحقیر میں ڈوبے جملے صوفی صاحب کو پاتال میں دھکیل رہے تھے۔ کھانا کھایا جا چکا تھا جس کے بعد لڑکے بالے دوسری طرف چلے گئے تھے۔ دوسری قنات میں جا کر انہوں نے اپنی محفل جمالی تھی۔ گاؤں کے کچھ معززین اور کچھ مہمان نالیوں کی شکل میں کرسیوں پر بیٹھے خوش گپوں میں ملن تھے جبکہ سببیں شاہ اپنے خاص مہمانوں کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھے ہلکی پھلکی گفتگو کر رہے تھے کہ عبدالمبین کی پرکشش اور بلند آواز نے یکایک سارے ماحول کو جیسے خاموش کر دیا تھا۔ سب ہی دھیان سے اس کا خوبصورت گیت سننے لگے جو بڑے جذب کے عالم میں گارہا تھا۔ جیسے ہی تالیوں کی آواز بلند ہو کر خاموش ہوئی اور شاہجی کو علم ہوا کہ گلوکار عبدالمبین تھا۔ صوفی صاحب کا بیٹا۔ وہ فوراً بغیر کسی اگھے پچھلے لحاظ کے برس پڑے اور صوفی صاحب جو پہلے ہی یہ جان کر کہ آواز عبدالمبین کی ہے غصے سے بھر گئے تھے۔ بڑے شاہجی کے جملوں نے آگ پر مٹی کا کام کیا وہ ایک بل کو زمین میں جیسے دھس سے گئے۔ دوسرے ہی بل وہ بڑے شاہجی کو کوئی بھی جواب دے ان سے نہ کہیں ملائے بغیر جلال میں بھڑے ہوئے اٹھے اور دوسرے ٹینٹ کی طرف بڑھ گئے۔ سببیں شاہ نے انہیں ایک نظر بغیر جواب دے جانے تو دیکھ کر کچھ ناگواری سے انہیں گھور کر دیکھا اور پھر آفریدی صاحب کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آفریدی صاحب نے بھی بڑے دھیان سے عبدالمبین کا گانا سنا تھا۔

”ماشاء اللہ کیا گایا یا ہے جو ان نے۔ اگر اس لڑکے کی ٹھیک ٹھاک سرپرستی کی جائے تو شاہجی التوبہ آگے چل کر پروا نام کمانے گا میں تو متاثر ہو گیا ہوں اس کی آواز سے۔ بہت اچھی اور دل کو چھیننے والی آواز ہے جو اسے بلوائیں تو سہی کچھ اور بھی سنتے ہیں۔ ذرا لطف رہے گا۔ کیا یہ صوفی صاحب کا بیٹا ہے؟“ آفریدی صاحب نے شاید سببیں شاہ کے کلمات دھیان سے نہیں سنے تھے اس لیے اپنی دھن میں کہتے چلے گئے۔

”ارے چھوڑیں آفریدی صاحب! یہ اس ٹائپ کے لوگ نہیں جو بہت آگے جاتے ہیں یا کسی بھی فیلڈ میں بہت نام کمانے ہیں۔ یہ تو بس صبح و شام گھر گھر سے روٹیاں اکٹھی کرنے والے لوگ ہیں۔ ان کا مقصد حیات صرف روٹیوں کا حصول ہوتا ہے یا پھر مسجدوں میں جا کر صفیں بچھانا اور آذان میں دہنا۔ کوئی پروا کام ان سے نہیں ہوتا۔ لڑکے کی آواز اب اتنی بھی خاص نہیں جو تہلکہ مچا دے۔ آواز میں لوج نہیں ہے اور کچا پن تو بہت زیادہ ہے۔“

یہاں نہیں آج کل سببیں شاہ صوفی صاحب کے اس قدر خلاف کیوں ہو رہے تھے۔ شاید عبدالمبین کے شاہجی میں شرکت نہ کرنے سے مگر یہ تو کوئی بہت بڑی بات نہیں تھی۔ عبدالمبین کون سا شہر میں ڈیٹی کلکٹر لگا تھا جو اس کے نہ آنے سے شاہجی کی جنگ ہوئی تھی بس انہیں آج کل ویسے ہی وہم ہونے لگا تھا کہ صوفی صاحب اپنی اولاد کے ذریعے کوئی اونچا مقام حاصل کرنے کے چکر میں ہیں۔ وہ بھی شاہجی کو زندہ بنائے بغیر شاید صوفی صاحب کے کسی مخالف کا پروپیگنڈہ کام کر گیا تھا کہ آج کل صوفی صاحب کی ہر ”ادا“ ان کی نگاہوں میں کانٹا بن کر کھٹکنے لگی

”خیر۔ وہ کون سا کوئی پیشہ ور گانے والا ہے۔ آواز میں کچا پن تو ہو گا ہی ویسے مجموعی طور پر میں تو کہوں گا۔ لڑکے کی آواز زبردست تھی۔ میں تو مان گیا۔“

آفریدی صاحب نے اپنی کھنی موچھوں کو خواہ مخواہ موڑتے ہوئے سببیں شاہ کی بات کو رد کیا۔

”ارے چھوڑیں جی۔ کیا بچوں والی باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ اس بار آپ کا میٹھ کی سیٹ پر کھڑے ہونے کا ارادہ ہے کیا؟“ شاہ صاحب نے اکتا کر موضوع بدلا۔

”بالکل جی۔ بالکل کیوں نہیں۔“ آفریدی صاحب پر جوش ہو گئے۔

”میں یار! اب کوئی دوسرا گانا ہو جائے۔ یار! تیری آواز میں تو نکھار آ گیا ہے۔ لگتا ہے دن رات ریاض کرتا رہے۔ اوہ ہار سے میں۔“

دس یا دس لڑکے گول دائرے میں پھسکر ا مارے دوری پر بیٹھے تھے عبدالمبین ان کے درمیان میں آگے ہو کر بیٹھا ہوا تعریف کے ڈو ٹکرے سمیٹ رہا تھا۔ اپنی تعریف سن کر اس کا چہرہ مرکزی بلائیں میں سرخ انار کی طرح دھک رہا تھا۔ اس کا رنگ بھی آج کل کافی صاف ہو گیا تھا۔ اس کی میس بھیک رہی تھیں۔ قد بھی خاصا لمبا ہو گیا تھا۔ جسم بھی بھر راعا ہو رہا تھا۔ کالے سیاہ کھٹکھٹے بال سر پر سیتے سے جھے ہوئے تھے۔ سیاہ آنکھوں میں عجیب سی خوشی ہلکورے لے رہی تھی شاید اپنی ذات پر اعتماد کی خوشی تھی۔ صاف ستھرے کریم کلر کاشیلا ر سوٹ اور اوپر بلیک کلر کا سوٹ کوٹ پہنے دور سے دیکھنے پر وہ ایک پرکشش اور خوبصورت لڑکا لگ رہا تھا۔

مگر اس وقت صوفی صاحب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دیں۔ اس کا چہرہ اس پر ہی طرح سے مسخ کر دیں کہ کوئی اس کی طرف دیکھتا بھی پسند نہ کرے۔ اس کا گلا گھونٹ ڈالیں کہ دوبارہ اس کے گلے سے گانے کے لیے کوئی شخص آواز نہ نکل سکے عبدالمبین کو یوں خوش و مسرور دیکھ کر خون آگ کے شرابوں کی طرح ان کی رگوں میں دوڑنے لگا تھا۔ ہاتھوں کی مٹھیاں اچھے سے تیزی سے مضبوط قدم اٹھاتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ غصے سے ان کی جھنجھکیاں تھیں اور آنکھوں سے جیسے آگ کے شعلے لپک رہے تھے جو دور ہی سے عبدالمبین کو جسم کر دینا چاہتے تھے انہوں نے اسے کس نیک رستے پر ڈالنا چاہا اور وہ بھٹک بھٹک کر کس طرح شیطانی رستے کو اپنا ناچار رہا تھا۔ یہ خیال ہی صوفی صاحب کی ہستی ہلا دینے کو کافی تھا مگر اس وقت کسی بھی دکھ اور افسوس کی جگہ غصے اور طیش کی انتہا تھی کہ بجائے اس کی اس معصومانہ حرکت کو نظر انداز کر دینے کے اسے جان سے مار دینے پر تل گئے تھے۔ عبدالمبین کی ان کی طرف سائیڈ تھی۔ وہ انہیں دیکھ ہی نہیں سکا کہ وہ کس جلالی موڈ میں اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اچانک سامنے بیٹھے لڑکے کی نظر بالکل قریب آتے صوفی صاحب کے پر جلال مسخ چہرے پر پڑی۔ وہ اگلے ہی بل چھلانگ مار کر اٹھ بھاگا۔

”صوفی صاحب آگے۔ صوفی صاحب آگے۔“

دیوانہ وار کہتا وہ لمبی لمبی چھلانگیں مارتا ٹینٹ سے باہر بھاگ گیا۔ دوسرے لڑکے بھی بوکھلا کر اٹھے اور عبدالمبین کو تو اٹھنے کی بھی مہلت نہ مل سکی تھی انہوں نے پیچھے سے ہی اس کی گردن اپنے آہنی پنچے میں جکڑ لی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اس کی کمر پر کے پر سامنے شروع کر دیے تھے۔

”غیبیت! ملعون! الو کے سپے! میں نے تجھے اس کام کے لیے اس کام کے لیے اوہر بھیج رکھا ہے کہ تو جائے اور یہ میراثوں اور بھانڈوں والا تاج گانا سیکھے۔ کیوں تیرا دل اتنا شیطانی تماشوں کی طرف کھینچتا ہے۔ کیوں تو نے میری میرے باپ دادا کی عزت نیلام کرنے کا ٹھیکہ اٹھا لیا ہے۔ کیوں یار یار میری عزت اوڑھنے سے تیرا جی نہیں بھرتا۔ تجھے نیک کام کی طرف ڈالتا ہوں اور تو بدی کی طرف دوڑتا ہے۔ کیوں؟ کیوں؟“

اب وہ اسے لائقوں اور دونوں ہاتھوں کے زوردار چھٹوں سے پیٹ رہے تھے ان کی مار پیٹ اور طیش بھری آواز سن کر لوگ ان کے گرد اکٹھا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ مگر آگے بڑھ کر صوفی صاحب کا ہاتھ روکنے کی ہمت کسی میں بھی نہیں تھی۔ صوفی صاحب اسے کسی جانور کی طرح چوہا دھپ کوٹے جا رہے تھے اور وہ کٹھڑی کی طرح ان کے

مکوں کی زد میں اوہر اوہر لڑھکے جا رہا تھا۔ چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپائے بغیر کوئی آواز نکالے جیسے بیٹا اس کا معمول ہو اور بیٹا صوفی صاحب کا۔

”تو گانا گانے سے پہلے یہ ڈھونڈنی تالی سیکھنے سے پہلے مرکیوں نہ گیا۔ عبدالمعین اتیری ہزار نسلوں میں کوئی گویا پیدا نہ ہوا تو تو کہاں سے ہمارا نام ڈونے کو جنم لے بیٹھا۔ عبدالمعین! تو میرے گناہوں کی سزا بن کر آیا ہے۔ اپنے سیاہ منجوس چہرے کو لے کر بیٹھ کے لیے میری نظروں سے اوجھل ہو جا۔ مجھے اب اپنا یہ لعنتی چہرہ نہ دکھانا میں اب تجھے نہیں دیکھنا چاہتا نہ اپنے گھر میں نہ اپنی نظروں کے سامنے۔ تو مر جا، دفع ہو جا، مگر مجھے کبھی دکھائی نہ دینا۔ زمین میں دفن ہو جا۔ سمندر میں غرق ہو جا کہیں جا کر۔“ وہ اسے مار مار کر خود بھی تڑھال ہو چکے تھے۔ ان کا سانس دھونکتی کی طرح چل رہا تھا اور ان کے ہاتھ لال سرخ ہوئی کی طرح ہو رہے تھے۔ جیسے ان سے انہی لوہور سننے لگے گا۔

”ارے اس صوفی کو کہو۔ بس کرے اب۔ کیوں بد شکونی پھیلا رہا ہے۔ اس اچھے اور نیک دن میں اپنی فضول بکواس کر کے۔ اس سے کہو تمہارا گانا ہے تو اپنے گھر جا کر گائے۔ نکالو ان کو یہاں سے۔“

دوسرے ٹیٹ سے آئی سیطین شاہ کی خفگی بھری آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ کسی بھی پیامبر کے سندرے کے بغیر آسانی سے سنی جاسکتی تھی۔ صوفی صاحب کے زور زور سے برستے ہاتھ ایک لمحے کو بے جان ہو کر رہ گئے۔

”بس کریں صوفی صاحب! بہت ہو گیا۔ بچہ اوہ موہ ہو گیا ہے۔“ ماسٹر صاحب شاید انہی آئے تھے آگے بڑھ کر صوفی صاحب کے ہاتھ تمام کر لوے۔

”ارے جاؤ۔ اصرارے جا کر پانی والی بلاؤ۔“ وہ مڑ کر کسی سے بولے۔

”چھوڑو ماسٹر صاحب! آج میں اس کو مار کر ہی دم لوں گا۔“ وہ اپنے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کمزور لہجے میں بولے۔

شاہ تہی کی بیزار خفا آواز نے جیسے ان کی ساری طاقت پھوڑی تھی باوجود خفا ہو جائے تو عوام کی طاقت یونہی پھرجایا کرتی ہے۔

”ارے چھوڑیں بھی صوفی صاحب! کیا ہو گیا ہے۔ یہ کوئی جگہ ہے۔ اس طرح کا تشاگاہ لے کر خود کو تشاگاہ بنا رہے ہیں آپ۔ جلیل پاپانی لے کر آؤ صوفی صاحب کے لیے اور عبدالمعین کو گھر لے جاؤ۔“ وہ مڑ کر پاس کھڑے جلیل سے بولے۔

”اسے گھر نہ لے کر جانا ورنہ میں اسے جان سے مار ڈالوں گا۔“ وہ غضب سے بولے۔

”کہا ہو گیا ہے صوفی صاحب! اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔ بچہ ہے اور بچے ایسے کام کیا ہی کرتے ہیں۔ جوان خون ہے۔ دلچسپی کے سو طریقے نکالے گا۔ آپ کو اسے اتنا سیریس نہیں لینا چاہیے تھا ہو جائے گا ٹھیک۔ آپ کو اپنی تربیت پر بھروسہ نہیں ہے۔“ وہ انہیں کرسی پر بٹھا کر دھیرے دھیرے ان کا ہاتھ دباتے ہوئے نرمی سے بولے۔

صوفی صاحب شاید اس وقت ماسٹر صاحب کو بھی خاطر میں نہ لاتے اگر سیطین شاہ کی بیزار بیزاری خفگی کا انہیں خیال نہ آتا وہ خاموشی سے ماسٹر صاحب کی نصیحتیں سنتے گئے۔

”تو یہ سب کچھ اس طرح سے ہونا تھا۔“ کتنی دیر کے بعد اس نے اپنی گود میں رکھا سر اٹھا کر کالے سیاہ آسمان پر جگمگاتے ستاروں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ رات کا شاید آخری پھر خاستاروں کی جگمگاہٹ پر ہم گئی تھی۔ آسمان کی سیاہی نیلاؤں، ہونے والی تھی فضا میں خفگی بڑھ گئی تھی مگر اسے بالکل بھی سردی نہیں لگ رہی تھی وہ رات بارہ بجے کے بعد یا ہر آئی تھی تب سے وہ اسی مارشل کی سیزھی پر بیٹھی نہ معلوم کون کون سے حسابات کھول رہی تھی۔

پرسوں غنٹ آرا اور تواز کے چلنے کے بعد خیر حیات اسے شاپنگ کے لیے لے گئے تھے وہ اس کے لیے ڈھیروں ڈھیر شاپنگ کیے جا رہے تھے۔ یونہی بغیر کسی وجہ کے۔ اور وہ کسی بے جان ڈی کی طرح ان کے ساتھ گھٹ رہی تھی۔ اس کی عدم دلچسپی کو دیکھتے ہوئے آدھ کھٹے بعد ہی خیر حیات نے شاپنگ ختم کر دی اور اسے لے کر ایک ریستورنٹ میں آگے ویسے بھی ریح قائم ہو چکا تھا۔

”رعنا! کب تک اس طرح بے حسی کا مظاہرہ کرتی رہو گی حالانکہ میں تم سے اپنے دل کی گہرائیوں سے ایک کیو ذکر پکھا ہوں۔ اگرچہ تمام قصور میرا نہیں تھا پھر بھی۔“

انہوں نے اس کے سیاہ چہرے کو دیکھ کر ایک گہرا سانس لیا۔ ویٹر آرڈر لے کر جا چکا تھا۔ ہال میں اکاؤنٹ میز پر بھری ہوئی تھیں۔ ابھی تو صرف ڈیڑھ بجا تھا۔ انہوں نے یونہی گردن گھما کر ہال کا جائزہ لیا۔ ان کی نظریں ہال میں لگے والے کلاک پر ایک بل کو رکھیں۔ رعنا نے ان کی تمہید کا کوئی رسپانس نہیں لیا تھا۔

”مجھ کو کچھ میں نے تو اڑھائی اور بھابھی جان کے سامنے کہا۔ تم کیا اس پر مجھ سے خفا ہو؟“

انہوں نے اس کے بے تاثر رویے کی وجہ جاننے کی کوشش کی۔ رعنا اپنی انگلیوں سے الجھنے لگی جواب کوئی نہیں دیا۔

”میں اسی سلسلے میں تو تم سے بات کرنا چاہتا تھا سب تفصیلات ڈسکس کرنا چاہتا تھا، مگر پھر حالات ایک دم اتنا اچانک سب کچھ الٹ پلٹ ہوا کہ میرے پاس وقت ہی نہ رہا کہ تم سے بات کر سکوں۔ اس میں کچھ غلطی تمہاری بھی ہے۔ لیکن اگر ہم اسی طرح ایک دوسرے کی غلطیوں کو پکڑ کر بیٹھ رہے تو جو تھوڑا بہت سنوارنے کو بچا ہے وہ بالکل ہی بزدل کر رہ جائے گا۔ پلیز رعنا کچھ تو کہو۔ میں تمہارے خیالات جاننا چاہ رہا ہوں۔“ آخر میں وہ بالکل عاجز ہو کر بولے۔

”کیا رہ گیا ہے میرے کہنے کو اب؟ کیا جاننا چاہ رہے ہیں آپ اب کیا رہ گیا ہے اب سلیجے کو جو میری انٹینشن سے سلجھ جائے گا۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر تلخی سے بولی۔ ”جب باتیں اس کی توقعات کے بالکل برعکس ہوتی تھیں۔ ایسا کچھ تو اس نے سہرا لیا سوچا بھی نہیں تھا کہ خیر حیات اتنی اچانک یہاں سے کوچ کا حکم دے دیں گے۔ اس کا ذہن جو پہلے ہی کی دلوں سے منتقل تھا۔ اب اور پریشان ہو گیا تھا۔“

”بہت کچھ۔ بہت کچھ اس کی بھی باقی ہے۔ میں۔ تم۔ سیٹی اور ہماری آئندہ کی زندگی جس کو ہمیں سیٹ کرنا ہے۔ رعنا! کیا تم میرے حوصلے میرے دل پیاور کو دلوں میں دو گی کہ اتنے کڑے حالات میں بھی میں نے خود کو کس طرح سے سنبھال رکھا ہے۔ اگر میں بھی ٹوٹ پھوٹ جاتا۔ اتنے ٹینس حالات میں کچھ بھی مثبت پہلو سامنے نہ رکھوں تو تمہیں احساس ہے حالات کتنے بے قابو ہو جائیں۔“

وہ رعنا کو حالات کی سنگینی کا احساس دلانا چاہ رہے تھے۔ پرانی رعنا۔ ان پر جان لٹانے والی رعنا کو جھینچوڑ رہے تھے مگر بتا نہیں اس کی سیات پر کیسی برف جم گئی تھی جو خیر حیات کی عاجزتی، نرم رویے اور محبت سے بھی پکھل نہیں رہتی تھی۔

”کیا ابھی حالات بے قابو ہونا باقی ہیں؟“

اس نے لا تعلقی سے شیشے سے باہر بھاگتی دوڑتی ٹریفک کو دیکھا حالانکہ پوچھنا تو وہ یہ چاہ رہی تھی کہ حالات اتنے بے قابو کس طرح ہو گئے کہ ہمیں یہاں سے اپنا سب کچھ اکھاڑ کر ہجرت کرنا پڑ رہی ہے۔ ایک جمابھایا مضبوط پھیلا ہوا برنس کیسے چند مہینوں میں ڈوبا گیا۔ کیسے حالات اتنے بگڑ گئے کہ وہ اب اپنے وطن میں رہ سکی نہیں سکتے۔ وطن سے محبت و انسیت اپنی جگہ مگر رعنا کی ادھر رہنے کی مجبوری اس محبت و انسیت سے بھی سوا بھی جس نے چند گھنٹوں میں ہی اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ انہیں پاکستان سے باہر جا کر رہنا پڑے گا چند سالوں کے لیے یا شاید ہمیشہ کے لیے تو اسے خیر حیات کی بے وفائی کا رنج بھی بھول گیا۔ اس کا اضطراب ویدلی تھا مگر خیر حیات اس کی بے چینی سے لا تعلق نظر آتے تھے۔

”بہت کچھ باقی ہے رعنا جان! بہت کچھ۔۔۔ تم میرا ساتھ تو دو میری بہت تو بندھاؤ رعنا! آگے کی تمام تر جنگ مجھے تمہاری بہت اور تمہاری محبت کے بل بوتے پر جیتی ہے۔ پلیز رعنا! مجھے مضبوط کرو۔ مجھے اپنے دائمی ساتھ کا یقین دلا کر میرا حوصلہ بڑھاؤ پلیز۔ میں بہت پریشان ہوں۔ اس نئی افادے نے مجھے توڑنے میں کوئی کسر نہیں رکھی۔“

رعنا! میں آج بھی تمہاری محبت اور توجہ کا اتنا ہی طلب گار ہوں جتنا تمہارے اولین ساتھ کے دن سے بڑائی۔
نوائڈر اسٹیشن مانی پوزیشن پلیز۔“

بہت مدہم آواز میں اس کے نمبل پردھرے ٹاؤک ہاتھ پر وہ اپنا ہاتھ رکھے التجا کر رہے تھے۔ رعنا کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ اسی ساتھ کا تو بہت دنوں سے اس کا دل بھی متقاضی تھا۔ اسی حوصلے اسی محبت کا۔ فخر حیات نے اس کی ڈیمانڈ کو اتنے دنوں سے کیوں محسوس نہیں کیا؟ وہ خود کو اتنا تنہا محسوس کر رہی تھی۔ جیسے پوری کائنات میں وہ بالکل اکیلی رہ گئی ہے۔ بالکل تنہا اور اب فخر حیات کو اس کے ساتھ کی ضرورت تھی تو بلا تھک انہوں نے ہاتھ پھیلا دیے۔ فقیری کا یہ انداز پروردگار نے عورت کو کیوں عطا نہیں کیا کہ وہ جب بھی مانگنا چاہے۔ بلا تھک اپنے پیلوں میں سونے والے ۶ سے پورے استحقاق کے ساتھ اس کا ذہنی و قلبی ساتھ مانگ لے اور مانگنے پر اس کی جھول بیٹھ ہی بھر جائے جیسے جیسے اب۔

رعنا نے ایک گہرا سانس لے کر اپنا دوسرا ہاتھ فخر حیات کے ہاتھ پر رکھ دیا کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا کہ جو پچھلے چند دنوں میں جیتا سے یکسر بھول کر پرانی سنگت کی بھرائی میں نئے خواب بنے جائیں۔ اس نے دل کو سمجھایا۔

”تھینک یو تھینک یو مانی سویٹ ہارٹ۔“ فخر حیات کے انداز ممنونیت پر ایک مدہم سی بے جان مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو کر گزرنی اور وہ جواب میں ”یو ویلیم“ بھی نہ کہہ سکی۔
پھر سب کچھ جلدی جلدی طے ہو گیا۔ ان کی اگلے ہفتے کی مجلس بھی کنفرم ہو گئیں پاسپورٹ تو تینوں کے موجود ہی تھے۔ تھوڑی بہت پینٹنگ کی گئی۔ قیمتی سلمان دو بڑے کمروں میں رکھ کر کمرے لاک کر دیے گئے صرف نیوی لائونج کھلا چھوڑا اور یہ سب کتنے عرصے کے لیے تھا اسے کچھ اندازہ نہیں تھا۔

”کیا پتا یہ گھر بھی فروخت کرونا پڑے۔ کچھ عرصے بعد۔“
سامان لاک کرتے ہوئے اس کے دل سے ہوک ابھری۔ ”یہ سب کچھ اس نے اتنے سالوں میں دینا بھر کے ملکوں سے کتنے چاؤ سے خریدا تھا۔ اپنے گھر کو سجانے کے لیے۔ ان پیش قیمت اشیاء کی سمولتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے گھر کو بیچ معنوں میں ہوم سویٹ ہوم بنانے کے لیے۔ ان ہی خوبصورت قیمتی اور پیش قیمت اشیاء کو دیکھ دیکھ کر تو عفت آرا جلا کرتی تھیں۔ رعنا کی قسمت کو حسد و رشک کی نگاہ سے دیکھا کرتی تھی اور آج سب کچھ ہوتے ہوئے بھی جیتے جی انہیں چھوڑ جانا تھا۔

”اگر یہ گھر بھی بیک گیا تو؟“ اس کا دل جیسے اس خیال پر ٹھہر سا گیا وہ کتنا ہی بھول گیا ایک لمحے کی۔
”نہیں بس ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ گھر سیل ہو گیا تو آخری آس بھی دم توڑ جائے گی۔ میں یہ گھر کم از کم کبھی نہیں سیل ہونے دوں گی۔“ وہ جو سیفی کاسوٹ کیس پیک کرنے جا رہی تھی۔ اس کی بلیک ہائی ٹیک کسٹ کیس پر پینٹنگ کر مڑی اور تیزی سے کمرے سے نکل کر بیڈ روم میں مصروف فخر حیات کے پاس چلی آئی۔
”فخر! میں نے بلا جوں پر آپ کی ہر بات مان لی۔ کچھ بھی انکار نہیں کیا، کوئی پس و پیش نہیں کیا۔ آپ کو معلوم ہے نا۔“ ان کے ہاتھ میں پکڑی قابل اس نے ایک طرف رکھ کر ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ایک دم سے کہا۔

”ہاں بالکل۔ یہ صحیح ہے اور میں اس کے لیے تمہارا شکریہ۔“
”میں فخر! ہمارے ریلیشن شپ میں شکریہ تھینک یو جیسے نکلتا کی کوئی گنجائش نہیں نہ اس کی ضرورت ہے۔“ وہ تیزی سے ان کی بات کاٹ کر بولی۔ ”مجھے اس کے بدلے آپ سے صرف ایک بات کا اقرار چاہیے۔ ایک وعدہ۔ ایک یقین دہانی اور اس میں کوئی بھی اتار چڑھاؤ یا ترمیم حالات کے مطابق میں برداشت نہیں کروں گی۔ آپ کو میرے سر پر ہاتھ رکھ کر یہ قسم کھانا ہوگی اور جس دن آپ نے یہ قسم توڑی اس دن رعنا بھی ختم ہو جائے گی۔ ہمیشہ کے لیے۔“ وہ جذباتی انداز میں کہنے لگی۔

”پلیز رعنا! تمہاری ہر بات میرے سر آنکھوں پر۔ بسھی میں نے آج تک تمہاری کسی بات سے انکار کیا ہے۔“
وہ نرمی سے اس کے گل سہلا کر بولے۔

”بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ کر آرام سے بات کرو۔“ وہ کھڑی رہی۔ اس نے جیسے ان کی پوچش کو سنا ہی نہیں تھا۔
”پہلے کی تمام باتوں کی اور بات مگر آج کا وعدہ۔ پلیز فخر! ایم میر بس۔“ اس کی آنکھوں میں بھی التجا تھی۔
چہرے کا رنگ جیسے اڑا ہوا سا تھا۔

”تھو وعدہ۔ میں جان پر کھیل جاؤں گا مگر تم سے کیا گیا یہ وعدہ ضرور ایفا کروں گا۔ آئی پرامس۔“ اس کی سنجیدگی دیکھ کر فخر حیات نے گھبر کر آواز میں کہا۔

”آپ یہ گھر کبھی بھی سیل نہیں کریں گے چاہے ہم سڑکوں پر دل جا میں یا فٹ پاتھ پر آجائیں۔ آپ یہ گھر سیل نہیں کریں گے۔ کبھی بھی۔ اس گھر کے باہر گلی نیم پلینٹ کبھی بھی نہیں اترے گی۔ کبھی بھی نہیں۔ پرامس۔“

وہ ان کے ہاتھوں کو سختی سے اپنے ہاتھوں میں لیے کھڑی تھی۔ اس کی نگاہیں جیسے فخر حیات کے چہرے کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔

”آئی پرامس۔ تمہاری نہیں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ گھر میں کبھی نہیں سیل کروں گا۔ ٹھیک تاؤ یو ریلیکس۔“ وہ اس کے ہاتھوں کو ذرا سما دیا مگر محبت بھرے لہجے میں بولے تو وہ جیسے ہلکی پھلکی ہو گئی۔ اثبات میں سر ہلانے لگی۔

”تھینک یو۔“ اس کے ہونٹوں سے خفیف سا نکلا اور اگلے لمحے وہ ان کے ہاتھ چھوڑ کر جانے لگی۔
”رعنا! جو کچھ سکتا ہوں۔“ اچھے سے انہوں نے دھیرے سے پکارا۔

”کیا وجہ پوچھنے کی ضرورت ہے آپ کو نہیں معلوم وجہ۔“ وہ خوب چبا کر بولی اور ایک دم سے اس کی آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیروں پانی اتر آیا۔

”آپ کو نہیں معلوم فخر! آپ اس قدر انجان ہیں کہ ادھر کسی کو آنا ہے۔ کبھی نہ کبھی اور اگر خدا نخواستہ اس گھر کی نیم پلینٹ بدل چکی ہو۔ اس کی تلاش ایک تھکا دینے والی مسافت کے بعد اس کے لیے لا حاصل ثابت ہو تو رعنا کو ابھی مر جانا چاہئے۔ فخر! بسھی۔“

وہ زور زور سے سر ہلاتی رہی، کوئی کمرے سے نکل گئی تو فخر حیات کے آدھے دھڑے جیسے جان ہی ختم ہو گئی۔ اس کے آنسوؤں اور دھمی فریاد نے انہیں بہت کچھ یاد دلایا، وہ اسی جگہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ سنی چاہا سب کچھ چھوڑ چھاؤں گے جس صحرا میں نکل جائیں مگر صحرا میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک جلتا ہلا صحرا تو ان کے اپنے اندر برسوں سے گرداڑا رہا ہے۔ اس کی پیاس کب بجھے گی۔ وہ بیڈ پر گرے گئے۔ سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر خود کو لا حاصل سوچوں میں کھوجانے دیا۔

اور آج وہ عفت آرا سے ملنے گئی تھی۔ آخری بار کہ اگلے روز انہیں یہ شہزادہ نہیں ہی چھوڑ جانا تھی۔ سیفی بھی اس کے ساتھ تھا۔ فخر حیات کو کسی سے ملنے جانا تھا۔ وہ انہیں ڈراپ کر کے خود چلے گئے تھے رات کا کھانا ان کا نواز بھائی کی طرف ہی تھا۔

مگر عفت آرا کا رویہ بہت دل دکھانے والا تھا، انہوں نے رعنا سے سیدھے منہ بات بھی نہ کی۔ بس ہر بات کا منہ ٹیڑھا کر کے جواب دیتی رہیں۔ رعنا نے اپنی فخر حیات کی ساری مجبوری کھول کر ان کے سامنے رکھ دی مگر جواباً وہ صرف طنز پر ہنکارا ہی بھر کر رہ گئیں۔ نواز بھائی بھی موجود تھے۔ وہ بیوی کو اس کے رویے پر گھورتے رہے مگر انہوں نے ذرا پروا نہ کی۔ یہ بھی نہ سوچا کہ رعنا خود کس قدر رنجیدہ ہے اور آخری بار ان سے ملنے آئی ہے۔

”اے بی بی رہنے دو۔ یہ جھوٹ اس کی پوٹ ہمارے سامنے نہ کھولو۔ ہمیں نہیں معلوم کیوں جا رہے ہو تم لوگ یہاں سے؟“ وہ ہاتھ اور آنکھیں نچا کر بولے گئیں۔

”یہاں رہے تو غریب بھائی کی کوئی نہ کوئی ضرورت ہر دوسرے روز تمہارے گلے ہی پڑے گی تو کیوں نہ ادھر سے کوچ ہی کرو نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ نہ ہوں گے نہ کوئی آکر تم سے اپنی ضرورتیں بیان کرے گا۔ چاہے تم اس کی ضرورت پہلے پوری کرتی تھیں یا نہیں۔ کم از کم اگلے کا من تو ہانکا ہو جاتا تھا اب پردیس جا کر اللہ جانے صورت کو ہی ترس جاؤں میں دکھاری۔“

وہ اچانک چمکوں پہ کیوں رونے لگیں۔ نواز اٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ رعنا شرمندہ سی ہو کر اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔ عفت آرا کو دلاسا دینے کا۔ کو کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور وہ دلاسا دیتی بھی تو کون سا اس نے ٹھہرتا ہو جانا تھا۔ اس لیے وہ چپ چاپ بیٹھی اس کی سسکیاں سنتی رہی اور جواب میں جھولی جی کوئی بھی تسلی نہ دے سکی۔

”بھابھی! میں فون کر لیا کروں گی۔ جلدی جلدی آخر جب عفت آرا کا رونا طویل ہو گیا تو رعنا کو کہنا ہی پڑا جس پر عفت آرا نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور روٹے کے پلو سے منہ رگڑنے لگی۔

”تمہاری مہمانی ہو گی لی بی! ہم کیا کہہ سکتے ہیں مجبور ہو گئے۔“ کچھ دیر بعد وہ طنز سے بولیں۔ پھر رات کے کھانے تک وہ اسی طرح عفت آرا کی کڑوی کسلی باتیں سن کر ہی لاپتہ جاتی رہی۔ شاید وہ کھانے سے پہلے ہی واپس آجاتی اگر فخر حیات کو واپسی براوہر آنے کا نہ کہہ سکتی ہوتی۔ سینی سارا وقت بچوں کے ساتھ کھیلتا رہا۔ اسے عفت آرا کے رونے سے یار رعنا کے شرمسار ہونے سے کچھ غرض نہ تھی۔

”چچو جو ہوا۔“ رعنا نے اس کے کھلے کھلے چہرے کو دیکھ کر سوچا کھانا کھاتے ہی وہ لوگ اٹھ کر واپس آگئے۔ ”ہاں معلوم نہیں اب کب یہ صورتیں دیکھیں۔“ اس نے گرا سانس لے کر گود میں رکھی اہم کھولی جس کا مہلیس کو اس کے آنسوؤں سے گیلا ہو چکا تھا۔ وہ کافی دیر تک اس پر سر رکھتی رہی تھی۔ اس نے ایک ایک کر کے ورق لٹنے شروع کیے ہر تصویر آنسوؤں میں بھیکتی رہی۔ دوسرے روز ان آوازوں کے گزر جانے کا اعلان کیا اس کی کمر بٹینہ پینٹہ کرا کر چمکی تھی۔

اب سے صرف تین گھنٹے بعد ان کی فلائٹ تھی جاپان کے لیے اور اس بات کا علم صرف اسے تھا کہ وہ اپنا دل اپنی روح یہاں ہی چھوڑے جا رہی ہے۔ صرف اس کا مٹی کا وجود جہان میں بیٹھ کر ہجرت کرے گا۔ آنسو پھر سے ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

”رعنا! فخر حیات نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے پکارا تو اس نے چونک کر اٹھ کر بند کر دی۔“ پلو کب تک یہاں بیٹھی رہو گی۔ رات گزر گئی۔ ہم انشاء اللہ آئیں گے اوہ۔ یہ گھر ہمارا ہے۔ ہم پھر سے اسے آباد کرنے آئیں گے۔ او مل کر اللہ کے حضور دعا کریں کہ جب ہم لو میں تو ہمارا یہ گھر جی خوشیوں سے ہمک اٹھے کوئی کی کوئی کٹھنی نہ رہے۔ سب محرومیوں کا ازالہ ہو جائے اور جو دعائیں دل سے کی جائے۔ میری جان! وہ ضرور پوری ہوتی ہے۔ اٹھو آؤ میرے ساتھ اور پورے یقین سے خدا کو پکارو۔ وہ تمہاری ضرورت سنے گا۔ آؤ۔“ فخر حیات نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور دھیرے دھیرے کمرے کی طرف لے کر بڑھے۔ وہ لٹی پٹی ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتی رہی۔

اور آج آخری بار جب اس نے جہاز کی کھڑکی سے اپنے اس آشیانے کو کھوجنے کی کوشش کی جو ہزاروں میل نیچے کہیں حسرت سے تکتے ہوئے انہیں الوداع کہہ رہا تھا۔ اس محل جیسے گھر میں جس میں وہ لسن بن کر اتری تھی سوا سنگھار کئے اور جس میں اس کے ہر خواب نے حقیقت کا روپ دھارا تھا۔ اب ایک اجازت خواہیہ محل کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ جس کے ویران برآمدے میں بستان کھڑی یقیناً انہیں ہاتھ ہلا کر الوداع کہہ رہی ہو گی۔ رعنا نے تھک کر اپنا سر فخر حیات کے کندھے پر ٹکا دیا۔ وہ دن سے وہ سونہ سکی تھی۔ ظالم یادوں نے اس کے ذہن سے سکون اور آنکھوں سے نیند ہی لوٹ لی تھی۔ اب جبکہ دل کو یقین ہو گیا کہ وہ جو بہت کچھ پیچھے رہ گیا ہے۔ اسے ایک بار کھوجنے تو آنا ہی ہو گا۔ ضرور آنا ہو گا۔ اس نے خود کو یقین دایا تو دل کو جیسے قرار سا آ گیا۔ اس نے آنکھیں

موند لیں۔

تھوڑی دیر میں فخر حیات کے کندھے سے سر نکالنے وہ گہری نیند سوچکی تھی



”دیکھیں جی۔ یہ کام ہی ہو گیا۔ اب تو گل جی! آپ خوش ہیں نا بہت گلے رہنے لگے تھے آپ کو ہم سے کہ اب ہم آپ کو بھول گئے ہیں۔ جو بھی بھول کر بھی یاد نہیں کرتے۔ اب تو سارے گلے شکوے رخص ہو جانے چاہئیں آپ کے دل سے۔“

قریشی نے چیک برساؤں کر کے چیک زبور گل کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ ”تھنک یو قریشی جی! دیکھیں جی گلہ تو اپنوں ہی سے ہوتا ہے نا۔ اپنے اگر منہ پھیر لیں۔ دیکھ کر بھی آنکھیں پھر ایسے تو قریشی جی آپ کو تو معلوم ہی ہے۔ یہ دل تو ہوتے ہی کالج جیسے نازک ہیں ایسے دل خراش مناظر پر تو چور چور ہوتے ہی ہیں۔“ زبور گل نے چیک تھام کر ایک ادا سے اپنے ہونٹوں سے چھو اور اٹھلا کر بولی۔

”تو پھر اس چھوڑ کر شیشہ دل کو بھی تو ایوں ہی نے جوڑ دیا ہے نا اب بتائیں۔ کہیں ذرا سے جوڑ کا بھی نشان باقی رہا، کیا۔“ خوبصورت عکس جھلملا رہا ہے اپنوں کی محبت کا۔ ”قریشی نے پرے صوفے پر بھی سنواری نازک سی مین تارا کو آنکھوں ہی آنکھوں میں دل میں سموتے ہوئے کہا۔

اس کی پاگل بھوکی نگاہوں سے بے نیاز ٹانگ پر ٹانگ دھرے اسے زور زور سے جھلائے جا رہی تھی۔ وہ جیسے اس سارے منظر میں نہیں موجود ہی نہیں تھی اور اس کی یہ بے توجہی قریشی صاحب کی بے چینی کو اور ہوادے رہی تھی۔

”دل میں سر تھکی ہوئی تھی جی! اپنوں کی پوری میں دل ان ہی بھر پور نرم گرم محبتوں کو تو ترستا ہے۔“ زبور گل نے چیک پر بڑی شراکت سے اپنی لمبی انگلیاں پھیریں۔ قریشی کی نگاہوں کی گستاخی سے یا تو وہ آگاہ ہی نہیں تھی یا جان بوجھ کر انہیں گستاخ ہونے کا موقع دے رہی تھی۔

”پھر یہ سر کل کب شروع کی جائے۔ میرا خیال ہے کل صبح ہی رکھ لیتے ہیں۔ قلم کی آدھی سے زیادہ شوٹنگ تو عمل ہو چکی ہے گالوں کا کام رہتا تھا۔ جو آج اس کی بھی امید سن گئی ہے۔“ قریشی اب براہ راست مین تارا سے مخاطب تھا۔ اس نے ایک سرسری سی نظر قریشی کے بے ہنگم پھیلے ہوئے سراپے پر ڈالی اور لا پرواہی سے کندھے اچکا دیے۔

”ہوں یہ سر کل بھی شروع کر دیں گے جلد ہی۔ ویسے تو قریشی جی! میں نے تو کہا تھا۔ قلم کے باقی تین گالے بھی مین تارا ہی گالے کی مگر آپ نے بھروسہ ہی نہیں کیا۔ اصل میں تو وہ تینوں گالے ہی قلم کی جان ہیں۔ سارا عیش ہی ان گالوں میں ہے اور اپنی نیناں کی آواز اتنی بھی بچی نہیں ہے۔ چند ہنٹوں کے ریاض ہی سے پیشہ ور گالے دایوں کو پیچھے چھوڑ گئی ہے اتنا ٹیلنٹ ہے اس کے اندر۔ گائی ہے تو ایک سال بندھ جاتا ہے کوئل اس کی آواز سن لے تو کو کنا بھول جائے سنی تو ہے آپ نے اس کی آواز۔“

زبور گل نے مبالغہ آرائی کی اتنا کر دی ورنہ تو اسے بھی معلوم تھا۔ مین تارا کی آواز نہیں اس کے وجود کی شراکت کا جاو چند ہی دنوں میں ہر طرف سر جھک کر بولنے لگا ہے۔ سب کو ہی ایک عام سی آواز والی پرانی زبور گل کی بیٹی کی آواز میں شمر کی دیوی گائی نظر آنے لگی ہے اور یہی الفاظ اب قریشی کے منہ میں تھے۔

”اس میں کیا شک ہے مین تارا کے گلے میں ہی تو سر کی دیوی نے جنم لیا تھا۔ جو ایک بار سنا ہے اس کا دل راج ہو جاتا ہے اور گل جی! یہ تو اب کو بھی معلوم ہے۔ آج کل کی یہ سنگرز جن کے گلے میں سر ملی آواز کی جگہ بلیاں دو رہی ہوئی ہیں۔ صرف میوزک کی دھما دھم میں شہرت کی سیڑھیاں پھلا گئے جاتی ہیں ان کو تو میں گھاس بھی نہیں ڈالتا یہ تو مین تارا کی آواز کی کشش تھی کہ میں نے اپنی اتنی مہنگی قلم کے چار گالے فوری طور پر اس کے لیے بیک کر

لیے اور جو ایک رسک ہی ہے۔ کوئی بھی فلسفہ ساز جس نے اپنا کل سرمایہ واؤپر لگا رکھا ہو۔ ایسا رسک کبھی نہیں لیتا مگر میں نے نین تارا کے اندر چھپے ہو کر پوکھ لیا ہے۔ تب ہی تو یہ رسک بڑے آرام سے لیا ہے۔ رہ گئے بانی کے تین گانے تو وہ آپ کو معلوم ہی ہے پہلے ہی سے میڈم ہمارا گانچلی تھیں۔ فلم کی شوٹنگ بھی اشارت ہونے سے پہلے میں ناصر ان کو بیک کر چکا تھا بلکہ ایک موٹی رقم ان کو ایڈوانس میں بھی دے چکا تھا۔ اس لیے مجبوری سمجھیں۔

پتلیں اس کی تلافی اگلے پراجیکٹ میں کریں گے۔ وعدہ رہا میری اگلی فلم انشاء اللہ ایشیا کی میگا ہٹ فلم ہوگی۔ پورا ایک کروڑ لگانے کا ارادہ ہے میرا اس میں بس آپ جیسے مہیاں دعا کریں گے تو۔۔۔

اتنی لمبی بات کے اختتام سے پہلے ہی قمریشی کا سانس بری طرح سے پھول گیا۔ اسے دے کا مرض تھا اور یہ بھی بڑی ہمت کی بات تھی جو وہ پچھلے چار منٹ سے بغیر رگے مسلسل بول رہا تھا۔

”خیر یہ تو ہمیں بھی معلوم ہے میڈم ہمارا کو آپ نے کب تک کیا تھا میڈم نے آپ پر نظر کر م۔۔۔“ زیور گل نے ماچس کی تیلی پھینک کر قمریشی کے بھڑکنے کا مزہ لیا۔ ”مارکیٹ میں بیٹھے ہیں آخر ہم بھی۔“ قمریشی نے پھولے سانس کے درمیان کچھ غصے سے زیور گل کو دیکھا پھر اگلے ہی پل وہ ڈھیلے پڑ گئے۔

”دفع کریں جی۔ کہا جو ہے اگلی دفعہ ساری کسریں نکال دوں گا۔ آپ رسرسل کی تاریخ اور وقت بتائیں جی۔ مجھے ابھی ڈاکٹر کے پاس بھی جانا ہے۔ اپنا سنٹ ہے میرا آج۔“

”قمریشی جی بوڑھے ہو رہے ہو۔ اپنی صحت کا دھیان رکھا کرو۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے کہ جو گوشت کا پھاڑ بنے جا رہے ہو۔“ زیور گل نے ٹھٹھا لگایا۔

”نکل جی! رہتے دیکھو۔ تمہاری بوڑھا نہیں ہوتا۔ آزمائش شرط ہے۔“ وہ کیمٹنگی سے بائیں آنکھ دیا کروا۔ ”اس پر گوشت کا کوہ ہالیہ بھی ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بشرطیکہ وہ کوہ ہالیہ سونے کی کان پر بیٹھا ہو۔ یہ تو تمہیں بھی معلوم ہے۔ اندر سٹری کی ساری نشانات ہی کوہ ہالیہ کو سہا کرنے کے پیکر میں رہتی ہیں اگر میں جتنی نہ بگھاروں تو الگ بات ہے۔“

قمریشی صاحب نے اگلے پچھلے سارے حساب چکا دیے۔ زیور گل بھی دیک سی گئی۔ ان باتوں میں کوئی مبالغہ بھی نہیں تھا۔ یہ قمریشی کبخت سونے کی کان پر ہی تو بیٹھا تھا۔ لگا کر وہ سوالوں سے اس کی ہر فلم سپر ہٹ جا رہی تھی

یا کس آفس پر۔ اس کی ہر نئی آنے والی فلم اس کی پچھلی فلم کا ریکارڈ توڑتی تھی۔ اسی وجہ سے تو وہ سب سے ہنگامہ فلم ساز اور پروڈیوسر تھا۔ کسی ہاشما بیرون یا سنگر کو تو وہ منہ ہی نہیں لگا تھا۔ یہ تو زیور گل کی خوش نصیبی تھی جو نین تارا کو دیکھتے ہی گوشت کے پھاڑ میں چھپا اس کا تھا سادل دھڑکنے ہی بھول گیا تھا۔ نین تارا کو مستانہ خاک بھی نہیں تھا۔ اس کی ساتھیوں تو اس کی بھارتوں میں آکر رہی ہو جاتی تھیں۔

”زیور گل نے یہ ہیرا کدھر چھپا رکھا تھا مگر بڑھیا۔“ وہ آڈیشن کے دوران ایک ٹک نین تارا کو ملتے ہوئے سوچے جا رہے تھے۔ دل چاہ رہا تھا۔ اس فوجیان چھوٹی تھلی کو ابھی اپنی منہ میں چھپا کر اڑالے جانے پھر اس نے ہناسوچے تھے نین تارا کو اپنی ہی فلم میں بطور گلوکارہ بک کر لیا اور اب اس کبخت لالچی بڑھیا کو چیک تھمانے کے باوجود اس تھلی کو چھو کر دیکھنے کی کوئی امید پیدا نہیں ہو رہی تھی اس خواہش نے اس کے اندر کے اضطراب کو بھڑکا دیا تھا۔ بار بار سانس ناہموار ہوتی جا رہی تھیں۔

”رسرسل کا پھاڑ پھر مجھے اپنا شیڈول بھی میٹ کرنا ہے۔“ وہ ایک اور گلاس چڑھانے کے بعد کچھ بیزار سی بولا۔

”دیکھ سچ کیا رہے ہم آئیں گے اسٹوڈیو۔ ٹھیک ہے ناہیال۔“ زیور گل جیسے اس کی بے تابیوں کے مزے لے رہی تھی لاپرواہی سے بولی۔

”تو ٹھیک ساڑھے دس بجے میرا ڈرائیور آجائے گا نین تارا کو یک کرنے۔“ قمریشی کی جیسے مراد بر آئی۔

”نہیں۔ تمہیں ڈرائیور بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ہم خود آجائیں گے پورے گیارہ بجے اسٹوڈیو۔“ زیور گل فوراً بولی۔

”تم کیا کرو گی زیور گل! اگر اب تمہارے آرام کے دن ہیں آرام کرو۔ اولاد کے سکھ تو نصیبوں والوں کے حصے میں آتے ہیں۔“ وہ لوچی آواز میں بے ہنگم سی ہنسی بٹتے ہوئے بولا۔

”تو اس عمر میں میں طے سنوں کہ بیٹی کی کمانی پر بیٹھ کر پیش کر رہی ہوں ناپایا میں خود آؤں گی اس کے ساتھ۔ پھر میری بیٹی بھولی بھالی ابھی تو اسے گھر کا رستہ صحیح سے نہیں آتا میں اسے اسٹوڈیو کی بھول بھیلوں میں بھیج دوں

قمریشی اتنا اتحق سمجھ رکھا ہے مجھے۔ یہ بال زیور گل نے دھوپ میں سفید نہیں کیے۔“ زیور گل پیشہ وارانہ انداز میں چبا چبا کر بولی۔

”گھر کا رستہ ہم اسے سمجھا دیں گے تم فکر کیوں کرتی ہو؟ کیوں سوئی؟“ وہ اپنے پیٹے پیٹے پان زہدانت نکوستے ہوئے بڑی بے تکلفی سے بیزار چٹھی نین تارا سے بولا۔

”مہرا بہتر جانتی ہیں۔ میں ان کے ساتھ ہی آؤں گی۔“ وہ بھی فوراً بولی۔ سہرا حال اکیلے جانے کا رسک تو وہ نہیں لے سکتی تھی۔ اس گوشت کے پھاڑ کی نیت کوئی ڈھکی چھپی تو نہیں تھی۔ قمریشی کا منہ لنگ گیا اور حرا دھری دو چار باتیں کرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”کل گیارہ بجے کا مطلب کل جی! گیارہ بجے ہی ہے۔“ وہ جاتے جاتے رک کر بولا۔

”فکر ہی نہ کرو قمریشی جی! اسی جان پر کھیل کر تمہارے شیڈول کی پابندی کریں گے۔ آخر بیٹی کا پہلا کسٹریکٹ ہے۔ پہلا کام صحیح کرنے کی تو کامیابی کے لیے ہر قدم بھانے کی ہل۔“ زیور گل بڑی ذہ۔ واری سے بولی تو قمریشی سہرا لگ رہا ہر نکل گیا۔ دروازے کے پاس بیٹھا اس کا سیکرٹری بھی اس کے ساتھ نکل گیا۔

”زیور گل! سمجھتا ہے۔ میں اس کے واؤ بیچ سے انجان ہوں بہت اچھی طرح آتے ہوئے ہیں اس کے یہ انداز میرے۔“ زیور گل اس کے کیا ہر گتے ہی بڑھتی۔

”مہرا جان! مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ کل پتا نہیں میں ٹھیک سے رسرسل کر بھی پاؤں گی یا نہیں۔ مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں۔“

نین تارا زیور گل کی بڑھاپہ سن کر اور بھی گھبرا کر بولی اور کچھ قمریشی کی بہکتی نظروں نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔

”ڈونٹ وری میری جان! تمہاری مہرا جان تمہارے ساتھ ہوگی نا اور یہ رسرسل وغیرہ تم کو کھنا کچھ بھی مشکل نہیں تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا اور تم اتنا اچھا کام کر آؤ گی۔“ زیور گل بھول کی طرح اسے چمکارتے ہوئے بولی۔

”مہرا! میرا دل اس لیے ہے قمریشی گھبرا رہا ہے اگر شاہجی کو پتا چل گیا تو بڑی کڑی ہو جائے گی۔ انہوں نے اس طرح کے سب کاموں کے لیے مجھے سختی سے منع کر رکھا ہے اور میں نے ان سے پراس بھی کر رکھا ہے۔“ اپنی گھبراہٹ کی اصل وجہ بیان کرتے ہوئے نین تارا بولی۔

”ابھی جی ہو میری جان! زیور گل کھکھلا کر ہنس پڑی۔“ اسے چھوڑو بڑے ایسے وعدے وفا ہوتے ہیں۔

شاہجی نے کون سے وعدے وفا کئے ہیں۔ پندرہ دن کا کہہ کر گئے تھے۔ مہینہ ہونے کو آیا ہے۔ لی کوئی خیر خبر تمہارے شاہجی نے تمہاری تم کیوں اس کی جھوٹی قسموں میں ہلکان ہوئی جا رہی ہو۔ سرکار کی قسمیں پیار کے وعدے میری جان ٹوٹ جانے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔“

زیور گل خواہتا ہنس پڑی۔ آج تو بات بات پر اس کی ہنسی پھوٹ رہی تھی۔

”نہوں تو اسے پتا ہی نہیں چلے گا اگر کل کو پتا چل بھی گیا تو میں کہہ دوں گی میں نے زبردستی تم سے گواہ کیا تھا۔ تم نہیں تمہیں ٹینشن رہے کر نے کے لیے اوکے اب کوئی فکر نہ کرو۔“ وہ کندھے جھاڑ کر جیسے اپنی جگہ سے اٹھی۔

”بالکل لازمی ہو کر سونا۔ کوئی بوجھ دل پر نہ رکھنا۔ ابھی تمہاری عمر اس طرح کی ٹینشن پانے کی نہیں ہے۔ انجوائے کرنے کی ہے۔ اب سو جاؤ جا کر۔ میں اب آرام کروں گی۔ سارا دن ریٹ کا کام نہیں لے سکا۔ صبح سائرس جی آؤ تمہیں گے پھر تم کوئی نینڈ پوری نہیں ہوئی پھر صبح گیارہ بجے اس گوشت کے پھاڑ کی رسرسل بھی ہے۔ اس کی تیاری کے لیے بھی کچھ وقت تو چاہیے ہو گا۔ اوکے مانی سویت ہارٹ اب جا کر کلبلیٹ ریٹ اوگڈنٹ۔“

227

”مجان یہ معاذ ہے۔ دیکھیں آپ کی دعاؤں سے یہ اب صحت یاب ہے اور آپ کے سامنے بیٹھا ہے اور آپ خواہ مخواہ اس کی فکر میں سرسبز بن کر بیٹھ گئیں یا پھر مجھے ہی آپ نے ہفتے بھر کی چھتیاں کروانا تھیں۔ اپنی پیٹ سے لگا کر ہتھار کھا ہے۔“

کیپٹن شہباز نے بستر پر لیٹی مسز خان کا ہاتھ چوم کر لاڈ سے کہا اور ذرا پرے کرسی پر بیٹھے معاذ کا ان سے تعارف کرایا۔

مسز خان بیٹے کی بات سن کر یونہی ہلکا سا نہیں۔ اگلے ہی لمحے ہنسی جیسے ان کے لبوں پر بچھ سی گئی جیسے آگ کا شعلہ ایک پل کو بھڑکے اور اگلے ہی پل بجھ جائے۔ ایک عجیب سی فکر کل جب سے ہوش میں آئی تھیں کیپٹن شہباز کو ان کی آنکھوں میں ہلکورے لگی نظر آ رہی تھی جیسے سب کچھ ختم ہو جانے پر عجیب سی بے بسی کا احساس انسان کے چہرے سے چھلکنے لگتا ہے یا بہت کچھ جو زندگی بچانے کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔ لٹ گیا ہے اور جو باقی بچا ہے وہ کچھ ایسا قابل ذکر نہیں کہ کل سے کوئی بھی بات انہیں خوش نہیں کر رہی تھی۔ ایک عجیب سی افسردگی ان کے پورے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ کیپٹن شہباز نے ساری زندگی بھی ان کو ایس قدر پر مشورہ نہیں دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی نہیں جب وہ دونوں ناگلوں سے محروم ہوتی تھیں۔

”بیٹا! اب آپ ٹھیک ہیں۔ زخم یسے پیا۔“

کچھ دیر بعد مسز خان نے معاذ کو مخاطب کر کے پوچھا۔ کیپٹن شہباز اب بالکل خاموش تھے ماں کے چہرے کی بھیانک خاموشی انہیں کل سے بار بار چپ کرانے جارہی تھی۔ وہ بڑے جوش سے کوئی بات شروع کرتے اگلے ہی لمحے ماحول کی افسردگی انہیں دودھ کے جھاگ کی طرح خاموش کر ادیتی۔ سارا ولولہ ختم ہو جاتا۔ اب بھی ماں کی استہزائیہ ہنسی جیسے ان کی ساری قومیں متحد کر گئی تھی اور نئے سرے سے توانائی جمع کرنے میں کچھ وقت تو لگتا ہے۔ مسز خان نے معاذ سے کیا پوچھا؟ انہیں کچھ بتا نہیں چل سکتا۔

”جی ٹھیک ہوں اب۔“ معاذ نے دھیرے سے کہا۔

”ادھر آئیں میرے پاس۔“ انہوں نے محبت سے کہا تو معاذ جھجک کر اٹھا اور ان کے بیڈ کے پاس آکر روک گیا۔

”ادھر بیٹھیں۔“ انہوں نے ہاتھ سے بیڈ کی سائیڈ کی طرف اشارہ کیا وہ جھجکتا ہوا ذرا سا ٹک گیا۔

”بڑھتے ہو۔ مجھے شہباز نے بتایا تھا۔ سائٹا اللہ لائق اور ذہین ہوئے مجھے جان کر بہت خوش ہوئی۔ تم ادھر رہو گے تو تمہیں ادھر کوئی تکلیف نہیں ہوگی، کیسوی سے پڑھنے کا موقع مل سکے گا۔ تم ادھر رہتے پر خوش ہونا۔“

وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہی تھیں جیسے ان سے بولا نہ جا رہا تھا۔ وہ دن کی بیماری نے ان کی ساری طاقت سلب کر لی تھی رنگ بھی پیلا زرد ہو گیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں ہاتھوں پر ہلکا ہلکا لرزہ طاری تھا۔ شہباز نے ماں کی طرف دیکھا۔

”جی! معاذ نے ہولے سے کہا اور ایک نظر پاس بیٹھے شہباز کی طرف دیکھا۔ ”مگر میں ہاشل جانا چاہتا ہوں۔ میں ادھر ملنے کے لیے آتا رہوں گا۔“ اس نے جھجک کر اپنا مدعا بیان کیا۔ کیپٹن شہباز نے اسے گھور کر دیکھا۔ اس نے کل سے دو تین دفعہ کہنے کی کوشش کی تھی کہ وہ ادھر نہیں رہنا چاہتا۔

”دیکھو بیگ مین! فضول گفتگو سے پرہیز کرو تو زیادہ اچھا ہے۔ جب میں نے تم سے کہہ دیا کہ تمہیں ادھر ہی رہنا ہے تو پھر بار بار ہاشل کا تذکرہ کیوں؟ ہاشل میں پر مہمانی کم اور عیش زیادہ ہوتے ہیں۔ کیا تمہیں وہ عیاشیاں چاہئیں۔“ وہ اسے گھور کر دیکھ رہے تھے اور وہ جیسے شرمندہ ہوا جا رہا تھا۔

”جی نہیں مجھے تو پڑھنا ہے بہت اور میں ہاشل پڑھنے کے لیے ہی جانا چاہتا ہوں۔ عیش کے لیے نہیں آپ کو معلوم ہے۔ میری آپ سے ریکورسٹ ہے میں ادھر نہیں رہنا چاہتا۔ میں خود میرا مطلب ہے۔ آپ کا بہت شکریہ آپ نے اتنی محبت دی۔ میرا علاج کروایا مگر اب مجھے اجازت دیں۔ میں کل چلا جاؤں۔ کل سے ایڈیشن بھی

اوپن ہو رہے ہیں۔ اب تو مجھے کچھ مشکل نہیں ہوگی۔ آرام سے ہاشل اور کالج میں داخلہ مل جائے گا۔“ وہ ایک ہی سانس میں جلدی جلدی کہہ گیا کہ کہیں بیچ میں بھول نہ جائے۔ کیپٹن شہباز ابھی اسے تیز نگاہوں کی گرفت میں لئے ہوئے تھے۔

”معاذ! میں نے تم سے۔“ وہ کچھ تیزی سے بولنے لگے۔ مسز خان نے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں خاموش کرا دیا۔

”کیوں بیٹا! یہاں آپ کو کوئی تکلیف ہے۔“ وہ معاذ سے بولیں۔ ان کا محبت بھرا مہذب لہجہ معاذ کو شرمسار کر رہا تھا اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”دیکھو بچے! خودداری اچھی چیز ہے بلکہ بہت اچھی چیز ہے۔ مضبوط اور بائیدار فیوچر کے حصول کے لیے خودداری سے بڑا ہتھیار کوئی نہیں۔ یہ انسان کو اپنے مقصد کی خاطر لڑنے کے لیے توانائی فراہم کرتا ہے، لیکن اگر کسی ہتھیار مقصد کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بننے لگے تو اسے نیام میں کر دینا چاہئے۔ تم ہاشل میں جا کر رہو گے۔ پڑھو گے۔ کلن ہاشل کے اخراجات کا کیا کرو گے؟“

”میں پارٹ ٹائم۔“ اس نے تیزی سے بولنا چاہا۔

”میشرک کے بعد پارٹ ٹائم نہیں ملا کرتی اگر مل بھی گئی تو کسی ہوٹل میں پیرا گیری یا اور کوئی بہت معمولی سی نوکری ہو تمہاری اچھی سوچ کو ہو سکتا ہے کرپٹ کروے پھر وقت الگ ضائع ہو گا اور اگر میرے بچے پارٹ ٹائم کے بغیر اپنا وقت ضائع کئے بغیر تمہیں پڑھنے کا موقع مل رہا ہے تو تم فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔ یہاں تمہیں گھر کا آرام بھی ملے گا اور پڑھنے کے لیے سازگار ماحول بھی۔“ وہ ایک پل کو رکیں۔ ”اور میں تمہیں یہاں صرف اس لیے روک رہی ہوں کہ تم بہت اچھے لڑکے ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ میں خدا نخواستہ تم غلط ہاتھوں میں پڑ کر ضائع نہ ہو جاؤ۔ دوسرے جیٹا اگر ہم تمہیں رکھ کر تم پر افسانہ کریں گے تمہارے خیال میں ورنہ سچ تو یہ ہے کہ یہ تمہارا ہتھیار بنا دیا جائے گا۔ میری تمہاری تھالی بٹے جائے گی۔ میرے لیے شہباز کی دوری کو سہنا آسان ہو جائے گا۔ کیا تم اس بیمار ضعیف بڑھیا کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرو گے؟“

انہوں نے اپنے مہلی مہلی بڑبڑاتی رکول بھرے کمزور ہاتھ میں معاذ کا ہاتھ لے کر اتنی محبت سے پوچھا کہ پھر اس سے انکار نہ ہو سکا۔

”بس دو چار سالوں کی تو بات ہے پھر تم خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ گے پھر چاہے جہاں مرضی جا کر رہنا۔ ہم اعتراض نہیں کریں گے۔ میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ تم اپنا فیوچر بناؤ۔ خود کو ضائع کئے بغیر۔ شہباز! میں سچ کہہ رہی ہوں نہ۔“

”جی۔ جی۔“ وہ چونک کر بولے۔ انہوں نے بیٹے کی خاموش ابھی ہوئی کیفیت کو افسوس بھری نظر سے دیکھا۔

”تو پھر یہ طے ہو گیا نا کہ تم یہاں ہی رہو گے۔ بار بار ادھر سے جانے کی بات نہیں کرو گے۔ میں تمہاری سرپرستی کر کے خوشی محسوس کروں گی۔ تمہیں اگر ادھر کوئی تکلیف ہو یا کچھ چاہئے ہو تو تم بلا جھجک مجھ سے آکر کہہ سکتے ہو۔ ام جان کہہ کر یا کیپٹن شہباز تمہارے بڑے بھائی جان ہیں۔ ان سے کہہ سکتے ہو ٹھیک؟“

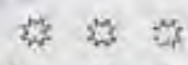
معاذ نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا کر کیپٹن شہباز کی طرف دیکھا

”معتدیک پو بیٹا! مسز خان نے ہاتھ اٹھا کر اس کے سر پر ہا دیا۔

”چلو تم تیار ہو کر آؤ۔ میں تمہیں بازار سے کچھ شاپنگ کروا لاؤں۔ تمہارے پاس تو بس یہی سوٹ ہے پھر بعد میں تمہیں وقت ہوگی۔ تم تیار ہو جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔“

کیپٹن شہباز کو جلدی تھی کہ ماں سے اس اچانک ہونے والی خرابی طبع کی بوجھ دریافت کریں پھر سب کا معنی خیر تم صدم رویہ بھابھیوں کی خفیہ اشارے بازی۔ انہیں کل سے بے چین کیے ہوئے تھی۔ وہ معاذ کو بھیج کر ماں سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔

”شہباز بیٹا یہ کھڑکیوں کے پردے برابر کر کے دروازہ بند کر جانا۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔ بہت تھک گئی ہوں۔ تم سے ان شاء اللہ رات کو بات ہوگی۔“
مسز خان نے فوراً ہی ان کی بات کاٹ کر کہا اور تھکاوٹ کے اظہار کے طور پر آنکھیں بھی بند کر لیں۔ کیپٹن شہباز دل مسوس کر رہے اور کھڑکیوں کے پردے گرا کر ست قدموں سے باہر چلے گئے۔



حویلی کی رونقیں عروج پر تھیں۔ ویسے بھی بارش کافی دیر سے رک چکی تھی۔ نوکروں نے حویلی کے اندر اور باہر اوسر تو صفائی کر دی تھی۔ حویلی کے بڑے گیٹ سے لے کر اندرونی عمارت کے صدر دروازے تک کاراستیاں لٹک کر دیا گیا تھا۔ جیسے وہاں کبھی بارش ہوئی ہی نہ ہو۔ باہر بھی جدھر مردان خانے کا انتظام شامیانوں میں کیا گیا تھا۔ مرکزی لائینس کی تیز روشنیوں میں صفائی اور بہترین انتظام منہ سے بول رہا تھا۔ کھانے کی میزوں پر جہاں سات اقسام کے کھانے چنے گئے تھے۔ سفید براق میز پوش بچھے ہوئے تھے۔ صاف ستھری پتھر اور چینی کی کرسیاں جھمک کر رہی تھی اس بار تو گاؤں کے عام لوگوں کے لیے بھی اعلیٰ انتظام کیا گیا تھا۔ اگرچہ ان کا کھانا اور چائے ٹینٹ میں لگایا گیا تھا۔ انہیں بھی چینی کے نازک برتنوں میں دیا گیا تھا اور گاؤں کے لوگوں نے بھی یہی میز اور تہذیب کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھانا کھایا تھا کہ ایک پلیٹ بھی نہیں ٹوٹی تھی۔ بڑے شامیانے میں اب کھانے کے بعد موسیقی کی محفل جمی ہوئی تھی ویسے تو اصل محفل رات گئے سہرا بندی اور دستار بندی کی رسم کے بعد شروع ہونا تھی جس میں ملک کے نامور گلوکاروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ جو حویلی کے پچھلے حصے میں موجود گیٹ روم میں سید صاحب کی فرارخ دلانا میزبانی سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے بلاوے کے منتظر بیٹھے تھے۔

حویلی کے اندر اب خواتین کا کھانا شروع ہو چکا تھا۔ پچھلا صحن سفید براق میز پوشوں سے ڈھکی ترتیب وار میزوں سے سج چکا تھا۔ جن پر رکھی کھانوں کی ڈشوں سے انتہائی شگفتہ خوشبو خواتین اور بچوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی مگر سید کی کڑی نگرانی کرنی نظروں کے باعث سب بہت دھیان اور سلیقے سے کھانے کی میزوں کی طرف بڑھی تھیں۔ سیدہ کسی سخت ماشینی کی طرح صدر دروازے کے آگے کھڑی ایک ایک کا جائزہ لے رہی تھیں کہ کوئی بد تہذیبی کا مظاہرہ تو نہیں کر رہا۔ سیدہ کو بد تہذیبی اور بے سلیقگی سے چڑھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی موجودگی میں حویلی کے ملازمین بھی پوری طرح سے چوکس تھے اور بڑی پھرتی سے کھانے کی فرمائشیں اور گندے برتنوں کی صفائی ہو رہی تھی۔ روسٹ مرغ اور روسٹ مشن گاؤں والوں کے لئے من و سلوی سے کم نہیں تھا۔ قورم۔ توخیر کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی دعوت میں مل ہی جایا کرتا تھا یا ذرا خوشحال گھروں میں یک بھی جایا کرتا تھا جبکہ سچ کیا سب تکہ بونی گوشت کی بڑی بڑی بوٹیوں سے انی بریانی ان کی برسوں کی خواہیدہ بھوک کو بیدار کر رہی تھی۔ اوھر دس بھرتی اوھر خالی ہو جاتی۔ جیسے ہی پھاڑی کی شکل میں بھری ڈش ٹیبل پر رکھی جاتی لیگ پیرس تو میز پر رکھنے سے پہلے ہی اچک لے جاتے۔

اماں کی ایک پلیٹ میں تھوڑے سے چاول اور سالن لے کر ایک طرف زمین پر بیٹھ کر ہی کھانے لگی تھیں۔ پہلا قلمہ منہ میں لے جانے سے پہلے ہی انہیں خیال آیا کہ انہوں نے سارے میں آمنہ اور زینب کو تو نہیں دیکھا ہی نہیں دونوں شہزادہ کے ساتھ دسمن کا گروہ کھینچنے لگی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے دوبارہ انہیں نہیں دیکھا تھا۔ ان کا دل ایک دم سے پریشان ہوا تھا انہوں نے قلمہ وہیں پلیٹ میں رکھ دیا اور خود اٹھ کھڑی ہوئیں۔
”خیریت آپ کھانا نہیں کھا رہیں؟“ انہیں کھانا چھوڑ کر اٹھنے دیکھ کر یاس کھڑی ماشینی کچھ حیرت سے بولی۔

”آمنہ اور زینب پتا نہیں کدھر ہیں۔ میں نے کافی دیر سے انہیں دیکھا نہیں۔ پتا نہیں کھانا بھی کھا رہی ہیں یا نہیں۔“ وہ کچھ فکر مند ہی سے بولیں۔

”لڑکیاں بالیاں ہیں۔ ہوں گی اوھر اوھر۔ لڑکیاں آج خوش بھی تو بہت ہیں ایسی شادی پہلے کب دیکھی ہے انہوں نے اوھر اوھر نہیں کد کڑے لگا رہی ہوں گی۔ چین تو نہیں انہیں ہونا نہیں۔ جو یہ تو ابھی آپ سے کھانا لے کر گئی ہے۔ وہ دونوں بھی نہیں کہیں کھا رہی ہوں گی جانا کہاں ہے۔ آپ فکر مند کیوں ہوتی ہیں۔ کھانا کھا میں ایمان سے روسٹ مرغ کا تو جواب نہیں۔ اس قدر ڈانٹتے دار ہے کہ کیا بتاؤں اور پھر گرا کر مہ۔ آپ نے تو شاید ابھی چکھا بھی نہیں۔ یہ چاول سالن تو زندہ کھڑیں بھی کھا تا رہتا ہے۔“

انہوں نے پلیٹ کر ان کی پلیٹ میں بڑے تھوڑے سے چاول اور سالن کو دیکھا۔ ماشینی کی قل سائز پلیٹ مشن روسٹ مرغ کی دو ٹانگوں اور تکہ بونی سے بھری ہوئی تھی۔

”نہیں مجھے کچھ خاص بھوک نہیں۔ رات کو اس طرح کی مسالے والی چیز کھاؤں تو رات بھر سینہ جھتا ہے۔ آمنہ اور زینب ایسی غیر ذمہ دار تو نہیں کہ اتنی دیر سے غائب ہوں اور ماں کی خبر بھی نہ لیں میں انہیں پہلے دیکھ لوں۔ پھر کھانا کھاؤں گی۔“

وہ ایک ایک قدم آگے بڑھا کر بولیں۔ واقعی انہیں ہال کمرے سے گئے کوئی آدھا گھنٹہ تو ہونے والا تھا۔ انہوں نے پہلے دھیان ہی نہیں دیا تھا اور اب دیکھا کہ ان کا دل بے چین ہوا تھا تھا۔

”ارے بی بی جی! زینب تو وہ رہی۔ جھیم چراغ کی بیٹی ثریا کے ساتھ۔ وہ دیکھیں نیلے کپڑوں میں کھڑی ہے۔ آمنہ بھی اوھر ہی ہوگی۔“

ماشینی نے تیز آواز میں کہا تو وہ بھی کڑی ہو کر ماشینی کی بتائی ہوئی سمت میں دیکھنے لگیں زینب ثریا کے ساتھ پیٹریا میں کرتے ہوئے مرغ کی ٹانگہ بھینسوا رہی تھی۔ ان کے دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ انہوں نے خواتین کے بھاری جسموں سے اوھر اوھر ہو کر آمنہ کو دیکھنے کی کوشش کی مگر آمنہ انہیں نہیں نظر نہ آئی۔

”ثریا! یہ مجھ تو بڑی خراب لڑکی تھی۔ تمہیں پتا چلانا اس کے بارے میں نہ دیکھو کیسے غائب ہو گئی جیسے گدھے کے سر سے سیٹل کی طرح بلکہ ٹیبل دوڑھس سے بال کی طرح ہے نا۔“

زینب کے پاس ان ایک ہی موضوع تھا جو مرہ سے ثریا ملی تو وہ اس سے شروع ہو گئی۔
”میں تمہیں بتاؤں مجھے پہلے ہی شک ہو گیا تھا۔ وہ سلیم کے ساتھ کسی چکر میں ہے۔“ زینب ذرا آگے ہو کر رازداری سے بولی۔

”یہ تو سارے گاؤں کو پتا ہے۔ دن رات اس کے ساتھ آتی جاتی جو تھی حویلی میں اس میں کون سی نئی بات ہے۔“ ثریا نے منہ بنا کر کہا اور پورا کتابتہ میں ڈال لیا۔

”تمہیں بھی پتا تھا اس بات کا؟“

”ہاں دوبارہ میرے ساتھ ہی حویلی گئی تھی۔ پہلے خواخوہ اوھر اوھر پھرتی رہی۔ اوھر اس کا کوئی واقف تو تھا نہیں پھر غائب ہو گئی۔ میں اسے ڈھونڈنے لگی مگر جانے کے لیے تو وہ باورچی خانے کے پچھواڑے سلیم کے ساتھ منہ منہ جوڑے اللہ جانے مجھے تو بتاتے ہوئے شرم آتی ہے کیا کیا حرکتیں کرتی تھی۔ میں تو دوسری بار اسے حویلی چھوڑ کر ہی بھاگ آئی تھی۔ کبخت لڑکی یا اسی کے ساتھ واپس آئی ہوگی۔ میں نے پایا آئندہ اس کے ساتھ جانے سے توبہ کر لی۔ ویسے بھی اب اتنی اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ میں جھومر جیسی لڑکی کے ساتھ پھولوں اسے تو سارا گاؤں ہی اچھی لڑکی نہیں سمجھتا تھا۔“

ثریا نے دوسری بار بریانی کی پلیٹ منہ تک بھرتے ہوئے ”راے عامہ“ کا ذکر کیا۔

”ارے رہنے دو۔ یہ گاؤں والے سارے بیٹے ہیں ہاتھ نہ چھینے تھو کوڑی۔ جھومر کسی کے ہاتھ چونہ آئی تھی۔ تم جاؤ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر وہ کتنی خوبصورت تھی کہ جی کرنا تھا اسے آٹھ جھکے بغیر دیکھتے جاؤ اس سے نفرت کرنے اور خار کھانے کو کس کا دل کرنا ہو گا۔ یہ تو سب گاؤں کے مردوں کے ڈھکولے تھے۔ اوھر جھومر انہیں لفت کر دیتی اوھر وہ اچھی لڑکی بن جاتی۔“

زینب ادھر ادھر کی پروا کیے بغیر جھومر بصرہ کئے جا رہی تھی۔ اس نے کہا باب پلاؤ بر رکھے اور کھانا شروع کیا۔
 ”اتنی اچھی ہوتی تو پھر بھاتی کیوں؟“ ثریا نفرت سے بولی۔ ”دوسری لڑکیوں کا بھی تو اعتبار خراب کیا ہونہ۔ اچھی لڑکی۔“ ثریا نے بوسا سناوالہ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔

”تم رہنے دو یہ سب۔“
 ”مجھے گھریا ہر اور کوئی موضوع نہیں ملتا اس منحوس لڑکی کے سوا۔“ بیچھے سے آگرا ماں جی نے اتنی زور سے اس کی چوٹی موڑی کہ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

”سچ سے اسی پر بولے جا رہی ہے اور کھاپوں رہی ہے جیسے زندگی میں پہلی بار کچھ دیکھا ہو۔ جانوروں کی طرح زور زور سے منہ چلاتے ہوئے اور وہ بھی کھڑے ہو کر۔ سیدھا شیطان کی آستوں میں جائے گا۔“ ماں جی اس سے سخت مخالفت رہی تھیں۔

”افوہ ماں جی! آپ میں بھی بابا صاحب کی روح حلول ہو گئی ہے گھر میں وہ سانس لیتے ہوئے بھی تو اب تو شریعہ بیان کرتے نہیں تھکتے ادھر آپ شروع ہو گئی ہیں۔ شادی میں بندہ اتنا بھی نہیں کر سکتا کہ جیسے میں شادی میں نہیں جمعہ کی نماز میں آتی ہوں۔“

زینب بایوں کی تکلیف سے دوہری ہو گئی تھی۔ خاصی بد لمٹائی سے آنکھیں نکال کر بولی۔ ارد گرد کی خواتین اس کی اونچی آواز سن کے گرد میں موڑ کر دیکھنے لگیں۔ ماں جی خون کے گھونٹ لی کر رہ گئیں۔ زینب سے انہیں ایسی ہی بد تمیزی کی توقع تھی اسی لیے تو وہ اسے زیادہ منہ نہیں لگاتی تھیں اس کی بدست سی فضول حرکتیں بھی نظر انداز کر جاتی تھیں۔

”کھاتے ہوئے بھی پڑ پڑ بولے جا رہی ہو۔ کچھ طرفتہ کچھ تمہیں نہیں ہے تمہیں۔ باپ کا نام بدنام کرو گی۔“ انہوں نے آہستہ آواز میں گھر کا۔

”باپ کا جتنا نام ہے نا ماں جی! وہ ان کے لیے کافی ہے۔ مزید میرے باپ کی اور کے اعمال سے بس کا وہ نہ تو گھنے گا نہ بڑھے گا۔ اس لیے آپ فکر مند نہ ہوں۔“ وہ اسی بد تمیزی و سختی سے بولی

”آمنہ کہاں ہے؟“ وہ بدست کچھ اپنے اندر تار کر تھل سے بولیں۔
 ”مجھے کیا پتا۔“ وہ اسی کڑوے پن سے کندھے اچکا کر بولی۔

”تمہارے ساتھ گئی تھی۔ شہینہ! تم دونوں کو دلہن کا کمرہ کھانے گئی تھی یا نہیں؟“ وہ جیسی آواز میں ذرا سختی سے بولیں۔

”اوہ ہاں ہم تینوں اوپر ہی جا رہے تھے کہ راستے میں مجھے ثریا مل گئی۔ یہ مجھے اتنے دنوں بعد تو ملی تھی۔ لہذا جی! یہ آج کل شہر میں اپنی خالہ کے گھر رہ رہی ہے نا۔ چھٹیوں میں گاؤں آتی ہوتی ہے انہوں کا امتحان دے گی یہ۔“

آپ بھی بابا صاحب سے کہیں مجھے بھی شہر بھجوادیں۔ میں اسکول میں پڑھوں گی۔“ اس کی بے وقت کی رائی ماں جی کو سخت بری لگی۔

”فضول وقت میں فضول ضد تمہاری۔ یہ موقع ہے اس قسم کی باتوں اور فرمائشوں کا اسحق لڑکی! میں پوچھ رہی ہوں آمنہ کدھر ہے۔“ وہ اب کچھ غصہ میں آئی تھیں۔

”وہ دونوں اوپر چلی گئی تھیں میں تو ثریا کے ساتھ ادھر آئی تھی۔ ہم دونوں باتیں کرنے لگ گئیں تو پھر کھانا لگ گیا تو مجھے پتا نہیں وہ کدھر ہے۔ ہوگی ادھر ہی کہیں شہینہ کے ساتھ۔ بڑی دوستی ہے اس کی سید زادی قلو پٹہ شہینہ کے ساتھ۔“

آخری جلیہ اس نے ذرا جھک کر آسکلی سے کہا کہ اگر سیدہ نے سن لیا تو آکر بیچھے سے اس کا گلا ہی دبا دیں گی۔ شہینہ وہ طوطا تھی جس میں جوہلی کے ہر فرد کی جان اٹکی تھی۔

”ہمن کی کچھ خبر نہیں اور خود بیٹ کا دوزخ بھرے جا رہی ہو۔ زینب! میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تمہاری تربیت

میں مجھ سے کون سی کی رہ گئی تمہارے اندر نہ احساس ذمہ داری ہے نہ دوسروں کا خیال۔ خود غرض و بے حس لڑکی!“

اماں جی بڑبڑاتے ہوئے برآمدے کی طرف بڑھ گئیں وہاں کھڑے ہو کر انہوں نے پھر ایک نظر میزوں کے اطراف میں ڈالی کہ شاید آمنہ انہیں کہیں نظر آجائے۔ آمنہ کہیں بھی نہیں تھی۔ جو یہ بھی اپنی ہم جوہلیوں کے ساتھ کھانا کھانے میں مگن تھی۔ ان کی تشویش بڑھ گئی۔ وہ کچھ تیز قدموں سے ہال کمرے کی طرف پڑھیں کمرہ بالکل خالی تھا۔ صرف دو چار چھوٹے بچے سوئے ہوئے تھے یا ایک دو جسمی لڑکیاں اپنا کھانا لے کر کھانے اور باتوں میں مگن تھیں وہ ہال کمرہ عبور کر کے اگلے برآمدے کی طرف نکل آئیں۔

”بواجی! آپ نے شہینہ بی بی کو دیکھا ہے؟“ میٹھیوں اترتی حویلی کی پرانی عمر رسیدہ ملازمہ سے انہوں نے پوچھا۔

”وہ تو جی شاید تھوڑی دیر پہلے بڑی بی بی کے کمرے میں جا رہی تھیں۔“ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں چندھیا کر بولی۔

”ساتھ میں کون تھا ان کے؟“ وہ دھڑکتے دل سے بولیں۔
 ”کوئی نہیں بی بی! اکیلی تھیں۔ خیر تو ہے نا۔“

”ہاں ہاں سب خیر ہے۔ دلہن کی کدھر اور ہے نا؟“ انہوں نے بواجی کی تشویش نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔
 ”ہاں جی۔ اوپر ہی ہے یہ بیٹھی سیڑھیاں ختم ہوئی کی تو دائیں طرف کے برآمدے میں دوسرا کمرہ ان کا ہے۔ پر آپ کو ادھر جا کر کیا کرنا ہے؟“ وہ جاچتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ کر بولی۔
 ”کچھ نہیں کرنا مجھے۔“ وہ بواجی سے کترا کر بیٹھیوں چڑھنے لگیں۔

یہ زینب کی بیٹی کدھر رہی؟“ وہ دونوں باتوں میں مگن اوپر جا رہی تھیں کہ آمنہ کو زینب کی غیر موجودگی کا احساس ہوا تو وہ رک کر بولی۔

”اسے رستے میں اپنی کوئی سہیلی مل گئی تھی۔ شاید حکیم صاحب کی بیٹی اسی کے ساتھ گپ شپ کرنے کھڑی ہو گئی ہے۔“

وہ دونوں برآمدے میں ہی کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگیں آمنہ شہینہ کو اپنی توہیم کے بارے میں بتا رہی تھی کہ اس نے اس بار میٹرک کا ریسٹ امتحان دینا ہے۔

”ریسٹ کیوں ریگور کیوں نہیں؟“ شہینہ نے اعتراض کیا۔
 ”بابا صاحب کہتے ہیں۔“

”ارے بی بی! آجائیں۔ کھانا لگ گیا ہے بڑی بی بی کہہ رہی ہے سب آجائیں جلدی جلدی۔“

حویلی کی ملازمہ زور سے آمنہ سے گلرائی۔ وہ کرتے کرتے بیٹی ملازمہ اسی طرح شور مچالی برآمدے سے گزر گئی۔ ہال میں بیٹھی خواتین میں ہڑ بونگ مچ گئی۔ سب فی الفور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ ہجوم سے بچنے کے لیے بیٹھیوں پر کھڑی ہو گئیں۔

”ہم چلتے ہیں اور۔ وہ خود ہی آجائے گی۔ کھانا بھی لگ گیا ہے ہم جلدی سے کمرہ دیکھ کر آجاتے ہیں۔ زینب! بعد میں دیکھ لے گی۔“ شہینہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھیوں چڑھتے ہوئے بولی۔

”ثریا سے اس کی بچپن کی دوستی ہے۔ اب وہ شہر چلی گئی ہے تار بڑھنے اپنی خالہ کے گھر۔ اس لیے دونوں دنوں بعد ملی ہیں اتنی جلدی ان کی باتیں کہاں ختم ہوں گی۔“ آمنہ بھی اس کی تقلید میں اوپر چڑھتے ہوئے بولی۔

”یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں۔ آمنہ! تم اس قدر ذہین ہو۔ پورے امتحان میں تمہارے اتنے اچھے مارکس آئے تھے پھر تم ریگور کیوں اسکول میں داخل نہیں ہو جاتیں۔ ریگور پڑھنے کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔“

”میں نے پایا نابا صاحب کو پسند نہیں اس لیے۔“ وہ اسی ٹون میں بولی۔
 ”اس میں پسند ناپسند کی کیا بات ہے۔ یہ تو تمہارا حق ہے ہر لائق فائق طالب علم کا حق۔“ شہرینہ منہ بنا کر بولی۔

”بابا صاحب کو جو بہتر لگتا ہے وہ وہ کرتے ہیں۔ اس میں حق یا فرض والی کوئی بات نہیں۔“
 وہ خشک لہجے میں بولی۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ بابا صاحب کے مخالف مذاق میں یا سنجیدگی میں کچھ بھی نہیں سن سکتی تھی۔ فوراً ”روکھا سا لہجہ بنا لیتی تھی۔“
 ”بھئی تم تو اپنے بابا صاحب کی ہر غلطی صحیح پر پکا ایمان رکھتی ہو اور میرا تمہارے ایمان کو چیلنج کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔“ شہرینہ ہنس کر بولی۔

”لو آئیہ کمرہ۔ پورا ایک ہفتہ لگا ہے۔ کمرے کی ڈیکوریشن وہ کیا کہتے ہیں تزیین و آرائش میں۔ تم دیکھو گی تو دو ٹوک رہ جاؤ گی۔ کل تو بھائی بیگم آجائیں گی پھر کمرہ دیکھنے کا موقع نہیں ملے گا۔ کل تو بربارش ہو گا شہرینہ نے کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی چابی سے لاک کھولنے کی کوشش کی۔ لاک پہلے ہی کھلا ہوا تھا اسی وقت دروازہ کھلا اور سید سلطان بخت و جہد سراپا لیے ان کے سامنے کھڑے تھے۔

”لاالہئی! آپ ہیں اوھر؟“ شہرینہ ایک دم سے انہیں اپنے سامنے دیکھ کر ڈر گئی۔
 ”ہاں کیوں؟“ انہوں نے کچھ ناراضی سے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔ انہیں بھی شاید اس کا ادھر آنا اچھا نہیں لگا کچھ نہیں۔ ہم بس کمرہ دیکھنے آئے تھے۔ یہ آمنہ ہے میری دوست۔“ اس نے پیچھے کھڑی آمنہ کا سائیڈ پر ہو کر تعارف کرایا تو سلطان بخت کی اس پر نظر پڑی۔

نظر کیا پڑی جیسے نظر ٹھہری گئی۔ ایک دو تین چار اکٹھے پانچ بل گنوا گئے۔ وہ اسے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے زمین پر وہ پہلی لڑکی ہو۔
 ”کمال سی! ہم کمرہ دیکھ لیں۔“ ان کی محویت سے شہرینہ کچھ خائف ہو کر بولی۔
 ”آں ہاں۔“ وہ جیسے صدیوں کا سفر ان پانچ لمحوں میں کر آئے تھے چونک کر بولے۔
 ”آمنہ کون؟“ ان کے لب اتنی آسٹلی سے ملے جیسے وہ کسی سحر کے اثر میں ہو۔

مصوفی صاحب کی بڑی بیٹی اور کون۔“ اب کے شہرینہ کچھ بیزاری سے بولی جبکہ آمنہ اپنے آپ میں سمیٹے ہوئے دیوار کے ساتھ لگ رہی تھی۔
 ”یہ اتنی بڑی ہو گئی۔“ ان کے لہجے میں خوشگوار سی حیرت و وارفتگی تھی۔ نظریں ایک لمحوں کے چہرے کے طواق سے منکرنہ ہوئی تھیں اس کے سادہ سے نقوش سے مزین گندی چہرہ جس کی جان اس کی پچھلی کالی سیاہ آنکھیں تھیں اور سلطان بخت کو ایسا لگا ایسی آنکھیں انہوں نے دنیا میں پہلے نہیں دیکھیں۔ بے اختیار ہی چہا ان آنکھوں کو قریب سے بہت قریب سے ہو کر دیکھیں۔ ان کا دل تھکنے لگا۔ بے اختیار ہی!

”شہرینہ پلیز۔ ذرا سیدہ آیا سے پوچھو کہ میرے کپڑے کہاں ہیں، کمرے میں تو موجود نہیں ہیں اور بابا جان کے دس بلاوے آچکے ہیں۔ میں تیار ہونے سے عاجز بیٹھا ہوں۔“
 ان کے ذہن نے تریکسوں کی بنیاد میں سے جھٹ تھوڑ نکالی۔ شہرینہ نے کچھ بدول ہو کر سر ہلایا۔
 ”میں بتا کر آئی ہوں جا کر۔“ وہ جانے کے لیے بلٹنے لگی۔

”میں بھی آئی ہوں تمہارے ساتھ شہرینہ۔“ آمنہ فوراً اس کے پیچھے لپکتے لگی۔
 ”میرے تم ادھر ہی رہو نا۔ میں بس ابھی گئی اور ابھی آئی۔ تم دو منٹ ٹھہرو اوھر۔“ وہ چٹکی بجا کر بیڑھیاں پھلا گئی ہوئی نیچے اتر گئی۔

اور اتنی بر وقت حویلی میں جیسے یک بیک موت کا سامنا نا اچھا گیا تھا۔ پوری کائنات میں صرف دو نفوس رہ گئے تھے۔ ایک ٹھہر ٹھہر کا پتا وجود لئے تو خیر آمنہ اور دوسرے اس کی قربت کا طلب گار لہجہ اس کی طرف بڑھتا سلطان

بخت کا ہل دیوانہ بل۔

”کمرہ نہیں دیکھنا آمنہ؟“ ان کی گھبرائی نفاذی آواز آمنہ کو اپنے بہت قریب سے سنائی دی تو جیسے اس کے ہاتھ پیروں میں سے جان ہی نکل گئی۔ قدم زمین میں لڑے رہ گئے اور پلکیں بے جان سی ہو کر آنکھوں پر گری رہ گئیں۔
 ”نہیں۔ نہیں جی مجھے جانا ہے۔“ اس نے خود کو سنبھالنے کی پوری کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اس کی کپکپاتی ہوئی آواز اس کی اندرونی کیفیت کی غمازی کر رہی تھی۔
 ”شہرینہ ابھی آجانے کی۔ پہلے آکر کمرہ تو دیکھ لو پھر چلی جانا۔“

وہ ایک دم سے آگے بڑھے اور اس کی نازک گندی کلائی اپنے ہاتھ میں لے لی اور آمنہ کے پورے وجود کو جیسے ہزار واٹ کے جھٹکے لگنے لگے۔ وہ بھاگ جانا چاہتی تھی۔ وہ ہاتھ چھڑا لینا چاہتی تھی مگر کچھ بھی تو اس سے ہو نہیں پا رہا تھا۔ وہ ہاتھ بڑھا کر اپنا ہاتھ بھی نہ چھڑا سکی۔ انہوں نے ہلکا سا جھٹکا کر اسے خود پر گرا سالیہ شاید زمین پر ہی ڈھے جانی کہ وہ اسے خود سے لگا کر پھینتے ہوئے کمرے کے اندر لے گئے اور وہ کسی بے جان لاش کی طرح پچی پچی آنکھیں لے کر ان کے ساتھ کھسکی چلی گئی۔

”میں کیسے نہ تم سے بھری پھرتی، تمہیں دیکھ کر اجنبی کیوں نہ بن جاتی۔ اگر تم میری جگہ ہو تیں اور رات جو تماشا تمہارے بھائی اور بھائی کے ہاتھ لگا گیا۔ اگر تم میری جگہ ہو تیں نہ بہت، تو شاید تم میری مشکل بھی دیکھنا پسند نہ کرتیں۔ تمہیں معلوم ہے رات پہلی بار زندگی میں پہلی بار میں نے پار پار میں سوچا کہ کاش میں تم سے بھی نہ ملی ہوتی۔ کبھی زندگی میں میں نے تمہاری صورت نہ دیکھی ہوئی اور اگر دیکھی تھی زندگی کی راہوں میں طمرانے والے ہزاروں چہروں کی طرح فراموش کر چکی ہوتی، مجھے رات کو تمہاری دوستی پر اتنا کچھتاؤ اتنی ندامت ہوئی کہ بہت سارے لفظ لکھ کر بھی اس شرمندگی کو بیان نہیں کر سکیں گے۔“

بیدار چلے گئی اور اس کی زبان کمان کی ایک لہر رہی تھی۔ اگر نہ بہت کے بس میں ہو تا تو وہ اس کے بیڈ پر بیٹھنے کے بجائے نہیں زمین کی اتھاہ کمرائیوں میں جا رہی ہوتی۔
 راحیلہ اس کی فریاد اور اس کے آنسوؤں سے پھل گئی اسے اپنے قدموں میں گرے دیکھ کر شاید اس لمحے خدا کا خوف اس کے سارے احساسات پر غالب آ گیا تھا کہ اس نے جھٹک کر اسے بازوؤں سے اٹھایا۔

”او آندر آجاؤ کیوں سڑک پر تھماؤ، تو اوکی۔“ اسے گیٹ سے اندر کرتے ہوئے بھی اس کا لہجہ اور آنکھیں بے حد اجنبی تھیں۔ نہ بہت کے آنسو جیسے خود بخود خشک ہو گئے اگرچہ اسے رات بھر کے لیے نہ ادا ل گئی تھی راحیلہ پر اس کے آنسوؤں کا اثر ہوا تھا مگر نجانے اس کے اپنے اندر کیا کچھ ٹوٹ گیا تھا ترخ۔

راہیلہ جو اس کی اس سال پرانی دوست تھی۔ ان دونوں نے بچپن کی حدود ایک ساتھ عبور کر کے لڑکپن اور پھر جوانی میں قدم رکھا تھا راحیلہ کے سوا اس نے کوئی اور دوست نہ بننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ یہی حال راحیلہ کا بھی تھا اس کی بھی ساری نشانی نہ بہت ہی سے ہو جاتی تھی۔ دونوں کے دل کے تار ایک دوسرے کی دوستی میں اس طرح ملے ہوئے تھے کہ اکثر انہیں ایک دوسرے سے بہت سی باتیں کہنی بھی نہیں پڑتی تھیں۔ ان کی قلبی دوستی انہیں بہت کچھ بن کے سمجھا جاتی تھی اور آج اس قلبی دوستی کی موت ہوئی تھی۔

دوستی کی بھی بہت سی اقسام ہوتی ہیں۔
 ایک نمائشی دوستی ہوتی ہے شخص اوپر اوپر سے جیسے بندہ اپنے کسی روز ملنے والے سے ملنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ یہ دوستی اسی روز کے ملنے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ دوسری دوستی جو ہر دم ساتھ رہنے سے ہوتی ہے مگر یہ بھی قلبی دوستی نہیں ہوتی یہ بھی بس اوپر اوپر سے ہوتی ہے دل کی اندرونی تہوں سے اوپر اوپر۔ جیسے دو دو یا کسی کے اوپر تیرا لکھن کھ یا کوئی بال جسے جب چاہو ہاتھ سے پکڑ کر الگ کر دو بس سخر کا ساتھ اوھر سفر تمام ہوا۔

غم، خوشی یا عادات کی نسبت ایک ہونے سے بھی دوستی قائم ہو جاتی ہے۔ کسی کا غم دو چار دفعہ بانٹ لیا میں لیا

اس سے بھی دوستی کا تعلق قائم ہو جاتا ہے یا وہ ہنس مکھ لوگوں میں ہنسی بھی وجہ دوستی بن جاتی ہے اور بہت سے لوگوں میں تو عادات کے ایک جیسا ہونے کی وجہ سے بھی یہ رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔

مگر راحیلہ سے تو اس کی دوستی ان تمام اقسام سے بالا تر تھی بہت پرانی تھی اور بہت گہری تھی۔ اس کے اندرونی پر توں سے بھی نیچے تک اپنی جڑیں مضبوطی سے جمائے ہوئے۔ یہی قلبی دوستی ہوتی ہے جس میں ایک دوسرے کو بہت کچھ بتانے بہت کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑتی بس خود بخود احساس اور اک اور محبت کا انوکھا سا تعلق قائم ہو جاتا ہے اور اس کے لیے بہت ملنا بھی ضروری نہیں۔ وہ گریبوشن کے بعد گھر بیٹھ گئی تھی جبکہ راحیلہ نے ماسٹرز کرنے کے لیے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ دونوں کی ہفتوں یا مہینوں ملاقات نہ ہو پاتی مگر پھر بھی دونوں کو ایک دوسرے کا بے حد خیال رہتا تھا ایک دوسرے سے فون پر رابطہ بحال رہتا جو نئی نئی بہت کادول اسے یاد کرنا راحیلہ خود بخود اس سے ملنے چلی آتی۔

عجیب سی کشش تھی دونوں کے تعلق میں اور دونوں کے گھر والوں نے بھی ان کی دوستی پر کبھی اعتراض نہیں کیا تھا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ دونوں بہت سچی ہوئی اور سمجھ دار ہیں۔ کبھی کسی معاملے میں دوسرے کو خاطر صلاح نہیں دین گی اور آج؟

آج ایسا کیا ہو گیا کہ وہ سارا زمانہ تو کیا اپنی اتنی مضبوط اور محبت کرنے والی دوستی اس کے گھر والوں کی نظروں میں بھی معصوم نہ رہی تھی۔

راحیلہ کا سرد انداز اجنبی روکھا رہتا اسے جو کچھ سمجھا رہا تھا اس حقیقت سے اس کی نگاہیں چار نہیں ہو پاری تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ یہ جو ترخ ترخ کی آواز آتی یہ اس قلبی دوستی کے چکنا چور ہونے کی آواز تھی بس اس کے کان ہی ہرے ہو گئے ہیں اور جو اس جیسے معطل!

وہ مرے مرے قدموں سے اس کے پیچھے گھسٹی ہوئی اس کے پیچھے آئی تھی۔ وہی اس کے گھر کا نقشہ وہی اس کے بید روم کا رستہ وہی سارا سامان وہی گھر وہی عمارت وہی سب کچھ۔

پھر کیا بدل گیا تھا۔ اس نے کارڈز میں داخل ہونے سے پہلے بھی نظروں سے آسمان کو دیکھا تھا سب کچھ ویسے ہی رہتا ہے بس انسان بدل جاتے ہیں بلکہ انسان بھی نہیں بدلتے۔ ان کی تقدیریں ان کے مقدر بدل جاتے ہیں جو ارد گرد کے سارے ماحول سارے لوگوں کو ہی بدل ڈالتے ہیں۔

”تمہارا لباس بہت خراب ہو رہا ہے اور جلیبے بھی۔ تم پہ میرا سوٹ پین کو باجھ لے لو۔ میں اتنی دیر میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتی ہوں شاید تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔“

راحیلہ کا لہجہ میکانیکی تھا جیسے کوئی مشین بول رہی ہو۔ نہ بہت کسی بہت کی طرح کمرے کے وسط میں گھڑی رہی۔ راحیلہ نے خود ہی آگے بڑھ کر اوڑھوب کھولی اپنا ایک سوٹ اسے سمجھایا اور خود باہر جانے لگی۔

”تم جلدی سے نما کر فریش ہو جاؤ۔ میں اتنی دیر میں چائے وغیرہ لاتی ہوں۔“ وہ کہہ کر جانے لگی۔ بات دہرانے کی ضرورت اسے کیوں پیش آئی شاید وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔

”اور ہاں پلیز تم اگر نما کر جلدی فابریں ہو جاؤ تو باہر نہ آنا۔ بلکہ باجھ روم ہی سے باہر نہ آنا میں آجاؤں گی تو خود ہی دروازہ ناک کروں گی۔ خالہ جان لاؤج میں ہی بیٹھی ہیں ہو سکتا ہے وہ میرے کمرے کی طرف آجائیں اور تم شاور بھی نہ بھر کر جلد بند کرونا تاکہ آواز نہ تم سمجھ رہی ہونا۔“

اس کا انداز اب کے بیزار سا تھا۔ وہ گلے پڑا ڈھول بجانے پر بے حد مجبور لگ رہی تھی اور دل میں شاید اس دوستی کو بھی کوس رہی تھی جس نے اسے آج یہ ڈھول گلے میں لٹکانے پر مجبور کیا تھا۔ نہ بہت نے سر ہلا دیا اور باجھ روم کی طرف بڑھ گئی راحیلہ نے باہر جا کر بید روم کا دروازہ اچھی طرح بند کر دیا۔

”کبھی کبھی موت زندگی سے بھی ناپاب لگتی ہے ناقابل حصول خواہ اس کے لیے کتنا ہی گڑگڑاؤ۔ آج کتنے لوگ ہوں گے جو زندگی پانے کے لیے کسی نہ کسی حادثے کا شکار ہو کر گڑگڑا رہے ہوں گے۔“

وہ باجھ روم کا دروازہ بند کر کے شیشے کے آگے گھڑی بے آواز آنسوؤں سے روٹی رہی۔ بار بار موت کی آرزو اس کے دل سے نکل رہی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونک اٹھی کہ وہ لا حاصل خواہش کے حصول کے لیے گڑگڑا رہی ہے مگر اسے موت آتی ہوئی تو رات اس کوڑے کے ڈھیر پر ہی آجاتی۔ اس نے بیسن کی ٹوٹی کھول کر ہاتھوں کے پالے میں پانی بھر کر پینا شروع کر دیا۔

”وہ کچھ نہیں تمہارے لیے ابھی کھانا لے آئی ہوں ایک تو شاید تم صبح سے بھوکی ہو تمہیں بھوک بھی لگی ہو گی۔ اس لیے خالی پیٹ چائے کیا پینی۔ دوسرے ایک آدھ گھنٹے میں جب کھانا لگے گا تو مجھے خالہ جان کے ساتھ ہی ڈر کر ناپڑے گا اور اس وقت تمہارے لیے کھانا لانا بھی مشکل ہو گا۔ تم سمجھ رہی ہونا۔“

مگر اس وقت اس کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس کے سامنے بیسن پر دوڑے اشتہار انگیز کھانوں کے ڈوٹکوں سے بھری رکھی تھیں۔ ایک ڈوٹکے میں قیمرہ مڑ تھا دوسرے میں قورمہ شیرے میں اس کا پیسٹریڈیا لک گوشت ایک پیسٹریڈیا میں چکن بریانی اور کیا ب تھے اور ساتھ رومال میں لٹیڑیاں۔

اسے بہت بھوک لگ رہی تھی حالانکہ اس سے پہلے اسے بھوک کا احساس تک نہیں تھا شاید نہانے سے یا پھر اپنے سامنے پورے ڈیزائن کے بعد کھانا دیکھ کر اس کی بھوک چمک اٹھی تھی۔

”ویسے یہ اہتمام خالہ جان کے لیے کیا گیا تھا ورنہ اتنی جلدی شاید میں تمہارے لیے صرف چائے ہی لا سکتی۔ تم اچھی طرح پیٹ بھر کر کھالو میں ذرا باہر کی خبر کھتی ہوں۔“ وہ اسے نہ جانے کیا جتاتے ہوئے بولی۔

”اور ہاں تم پلیز نہ کھانے کے بعد یہ برتن وغیرہ بیسن پر سے رہنے دینا میں آتے ہوئے کوشش کروں گی تمہارے لیے جانے لے کر آؤں۔ اوکے۔“ وہ جاتے ہوئے دروازہ اچھی طرح سے بند کر گئی۔

شاید اسے مرے دوستی کی کچھ باقیات ابھی ہیں جو راحیلہ اس کی کیفیت سمجھ کر باہر چلی گئی تھی۔ وہ واقعی اس کے سامنے کھانے پر اوت پڑنے سے ٹھک رہی تھی۔ اس کے باہر جاتے ہی وہ کھانے پر ٹوٹ پڑی۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا کہ کل سے اس کے ساتھ کیا بہت چکن ہے واقعی پیٹ کو دوڑا کھا گیا ہے کہ اس کی آگ سب سے طاقت ور ہوئی ہے جو صرف خوراک کے ایندھن سے سمجھاتی ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر اس نے میز کی طرف دیکھا آدھے سے زیادہ کھانا وہ ہڑپ کر چکی تھی۔ اسے ایک دم ہنسی سی آئی۔ ایک پارچہ بوتلی کا کوئی کالم شاور ہی تھی اخبار سے جب اس نے پڑھا تھا۔

اسلام کے بنی رکن

پیسو ال نہ ہوئے تو بیوں جان تک

(اسلام کے پانچ رکن ہیں اور پختہ روٹی اور اگر چھٹا نہ ہو تو پانچوں رکن خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔) تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کہاں اسلام جیسا پرکشش مذہب اور اس کے مقدس ارکان اور کہاں روٹی جیسی معمولی چیز۔ تب ابوبی نے اسے سمجھایا تھا۔

”بیٹا! خدا نہ کرے تمہارا کبھی بھوک سے واسطہ پڑے تو تمہیں معلوم ہو کہ اگر روٹی نہ ہو پیٹ میں تو انسان اسلام تو کیا خدا سے بھی منکر ہو سکتا ہے۔ بھوک سے پروا نہ جب آج تک دنیا میں کوئی نہیں گزرا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں غموت کی انتہا کفر تک لے جا سکتی ہے۔“

اسے ابوبی کی بات اچھی نہیں لگی تھی اور شاید سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی اور آج اسے یہ تجربہ بھی ہو گیا تھا۔ واقعی بھوک سے پروا کوئی اور نہ ہے نہیں۔

پھر راحیلہ کمرے میں آئی ہی نہیں اس نے برتن سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیے اور خود خالی ذہن کے ساتھ کمرے میں غسلے لگی۔

”یہ تو محض ایک رات کا ٹھکانا ہے اس کے بعد۔“ اس نے آگے بڑھ کر گھڑی سے پرہوشا کر دیکھا چاہا۔

”پلیز تم نہ تو کمرے سے باہر آنا اور نہ دروازے کھولیں کے پروے پٹانا۔ روشنی دیکھ کر یا یونہی خالہ جان کو کوئی

شک گزر گیا تو میرے حق میں بالکل بھی اچھا نہیں ہو گا۔ اس کے کانوں میں راحیلہ کی التجا گونجی تو وہ پرہ چھوڑ کر کرسی پر گر سی گئی۔

”یا اللہ! یہ زندگی جو اک امتحان کی طرح میرے سامنے کھڑی ہے۔ میں اس امتحان کا اہل صراط کیسے عبور کروں؟ کوئی راہ دکھانے والا نہیں۔ کوئی ہاتھ تھامنے والا۔“ اس کی سوچ اس جملے پر ٹھنک کر رک گئی۔

”پتا نہیں اب وہ مجھے قبول کرے یا نہیں۔“ اس نے انگلی سے اپنی پیشانی کو مسلا۔

”پتا نہیں اوہ خبر کس انداز میں پہنچانی گئی ہے اور پھوپھو جان کیا سمجھیں اور۔ اور کیپٹن شہباز۔“ اس نے کرسی کی پشت سے اپنا سر ٹکرایا۔

”ہاں بھی خوش گھنٹی سے نوبت بی بی! جب تمہارا اپنا خون تمہارا ماں جایا تمہیں اپنانے کو تیار نہیں۔ وہ تو پھر اور ان سے جو رشتہ ہے وہ کس قدر نازک ہے اور تم اب داغ داغ دو جو پر کس طرح ان کی بے داغ براق عزت کی چادر اوڑھ سکو گی۔ کون تمہیں یہ حق دے گا۔ کیپٹن شہباز۔؟ ابھی نہیں۔ یا وہ ہے آخری ملاقات میں لیکن میں انہوں نے کیا کہا تھا شاید قدرت نے وہ الفاظ ان کے منہ سے نکلوائے تھے۔“

”نوبت! عورتیں تو دنیا میں کڑوٹوں ہیں ایک سے بڑھ کر ایک شوہر جو حسین چہرے کی مارکیٹ ہے ان میں سے کتنی ہیں جن کو سچی محبت نصیب ہوتی ہے۔ نزی! عورت کے نقوش اس کے حدود و خال کتنے ہی انریکٹو کیوں نہ ہوں۔ مگر صرف ایک بات پر جان دیتا ہے وہ ہے عورت کا کردار اس کی عزت۔ عورت کے اندر کا خالص عین خالص عورت اگر تم دنیا بھر میں سروے کرو تو ننانوے فیصد مردوں کی پہلی ڈیمانڈ ہوگی خالص عورت اور تم کتنی خالص، کتنی پاکیزہ، دو اور تمہاری پاکیزگی میرے لیے کیا ہے۔ میں چاہوں میں تو تمہیں Explain نہیں کر سکتا۔ نوبت!

”I love purity and I love you“

مجھے خالص سے محبت ہے اور میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ یہ سب گلے (ہم سے بٹے جملے) مگر اس کا گلہ ہے ہونا ہی چارم فل ہے۔ جتنی بار اس کو ہوا اتنی ہی بار اس میں تیار ہوں۔ ہوتا ہے اور نوبت میری چاہت میری محبت، صرف اور صرف تمہاری امانت ہے۔ میں نے ابھی کسی اور عورت اور لڑکی پر وہ نگاہ نہیں ڈالی جو صرف تمہارا حق ہے۔

جسم فانی ہوتے ہیں مگر کردار امر ہوتے ہیں یہی میرا یقین ہے کہ تمہارا بے داغ کردار ہی میری محبت ہے۔ یہ کیپٹن شہباز کے واضح الفاظ تھے اور جو اس نے جواباً کہا تھا۔

”کیپٹن شہباز! شیشہ کتنا خالص ہوتا ہے کہ اس کے آریا سب نظر آتا ہے۔ اگر شیشہ ٹوٹ جائے اس کو چھوڑ دیا جائے اور وہ جڑ بھی جائے مگر اس کی ظاہری خوب صورتی یقیناً تباہ ہو جائے گی تو کیا اس کا خالص ہونا بھی مشکوک ہو جائے گا۔“

”بالکل۔ ظاہر ہے۔“

”شیشہ ترخ جائے اپنی خوبصورتی کھو بیٹھے یونہی کسی کے ہاتھ سے پھسل کر چور چور ہو جائے تو اس میں شیشے کا کیا قصور۔ یہ تو اس کی تقدیر ہوتی نا اور کوئی تقدیر کے لکھے کا سزاوار کیسے ہو سکتا ہے کیپٹن شہباز! لیکن مجھے معلوم ہے۔“ وہ اضطراری کیفیت میں کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”یہاں سب تقدیر کے لکھے ہی سزاوار ٹھہرتے ہیں اور یہ داغ۔ یہ دراز جو میری تقدیر میں لکھی تھی جس میں میرا ذمہ بھر بھی ہوش نہیں۔ میں تا عمر اس کے لیے سزاوار ٹھہروں گی سب کی نظروں میں مجھے معلوم ہے۔ یہ سزا میری آخری سانس کے تمام ہو جانے تک مجھے ملتی رہے گی۔ کوئی بھی مجھ سے اس معاملے میں رعایت نہیں کرے گا۔ کیا شہباز۔ کیا پھوپھو اور کیا مجھ سے قریب ترین کوئی بھی شخص اور میں بھی اپنے حق میں صفائی پیش نہ کر سکو گی۔“ اس کا سر کا ایک درد سے پھٹنے لگا۔

”کیا ضروری ہے۔ میں ان سب سے اپنے ناکرہ گناہ کی معافی مانگنے جاؤں جبکہ مجھے معلوم ہے۔ مجھے کوئی بھی معاف نہیں کرے گا۔ اگر نوبت و رسوائی تقدیر میں لکھی ہی جا چکی ہے تو ہمت نہیں کہ میں اسے تمہاری پھیل جاؤں اب کسی کو بار بار اپنی رسوائی کی داستان کیوں سناؤں جب میں نے کچھ کیا بھی نہیں۔“ کیپٹن شہباز نے یہ سب سن کر ہی مجھ سے قطع تعلق کا فیصلہ کر لیا ہو گا۔ کیا ضروری ہے جو وہ طے کر چکے ہیں۔ جا کر ان کی زبان سے سنوں اور پھر سے موت کی تمنا کروں اور پھوپھو۔۔۔ پھوپھو شاید ان کے دل میں میری دکھ بھری کہانی سن کر ہتھ ترس پکھ ہمدردی جنم لے لے مگر وہ بیٹے کے دل میں تو وہ جذبات نہیں جگا سکیں گی پھر جہاں محبت و چاہت کی جگہ ترس و ہمدردی لے لے اس جینے سے تو مرنا اچھا ہے۔

میں اب کسی سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گی، کسی سے بھی نہیں نہ سہیل معافی سے نہ شہباز سے نہ پھوپھو سے۔ اس نے رک کر فیصلہ کن انداز میں سوچا۔ ”بس اوہ رات گزار کر کل یہ شہر چھوڑوں گی لاہور کے علاوہ اس ملک میں اور بھی بہت سے چھوٹے بڑے شہر اور قصبے ہیں۔ نہیں نہ کہیں جا ب کر کے چھوٹا موٹا سر پہنچانے کا آسرا کروں گی۔ بس رات گزار جائے۔“

یہ صحیح ہے۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اب وہ خود سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی۔ شاید خود کو دلاسا دینے کا اس سے اچھا اور کوئی طریقہ نہیں تھا جو مجھ سے گیا تھا۔ اس خسارے کے احساس کو کم کرنے کے لیے۔

”میں جتنی منت سماجت کروں گی، جتنی دلیلیں پیش کروں گی جس قدر رووں گی۔ اسی قدر سب مجھ سے کنارہ کریں گے تو کیوں نہ میں ان سے کنارہ کر جاؤں ان کے منہ پھیرنے سے پہلے۔“

”سوری۔ مجھے دیر ہو گئی اصل میں خالی جاؤں نے کھانے کا کہہ دیا تھا اور پھر کھانا کھاتے یہ ٹائم ہو گیا۔ مجھے معلوم ہے تمہیں چاہئے کہ کب اور کب ہوگی۔ تمہارا چاہئے کی بہت رسیا ہو۔“ راحیلہ اچانک اندر آئی تھی۔

نوبت خاموشی سے اسے دیکھنے لگی اس کے ہاتھ میں بھاپ اڑاتے چائے کے دو گتے تھے جو اس نے نوبت کے سامنے ٹیبل رکھ دیے۔

”ہاں۔ کبھی ایسا تھا جب اس کی صبح کی ایڑیاں اور دن کی اتھار چائے سے ہوتی تھی اور آج اس نے شاید چالیس گھنٹوں بعد چائے کی شکل دیکھی تھی۔ اس کا ہر آنے اس کو یاد کرنے کو ایک عمر باقی ہے۔ اس نے خاموشی سے ہاتھ بڑھا کر گک اٹھایا راحیلہ نے بھی گک اٹھانا چاہا کہ اس کا ہاتھ گک پر ٹھنک کر رہ گیا۔

”آئی ٹھنک خالی جان آواز دے رہی ہیں مجھے تم نے سنا۔“ اس کے کان شاید باہر ہی لگے تھے نوبت نے کچھ جواب نہیں دیا۔

”کبھی وہ یہاں ہی نہ نکل آئیں۔ میں اب کھنڈ ڈیڑھ گھنٹہ تک ہی آؤں گی۔ تم چائے پی کر بے شک لاسٹ بجھا کر لاسٹ کر لیتا۔ اوکے۔“ وہ جگت میں اسے مدد دیتے ہوئے اپنا کپ اٹھا کر باہر بھاگ گئی۔

”یہ وقت بھی دیکھنا تھا۔“ اس نے راحیلہ کے پیچھے ہلتے پردے کو دیکھ کر سوچا اور چائے کے گرم گرم گھونٹ جلدی جلدی حلق سے اتارنے لگی۔



”مجھے نہیں معلوم شہباز بیبا! اس سارے واقعے میں کس قدر سچائی ہے اور کتنا بھوٹ تمہا ہسپتال میں تھے معاذ کے پاس جب سہیل کا فون آیا تھا۔ میں کارپڈو رہی میں تھی فون میں نے ہی اٹینڈ کیا۔ زنون یا تو میرے پاس بیٹھی میری نا نہیں دیا رہی تھی۔ سہیل کا لہجہ اس کا انداز بہت عجیب سا تھا۔ خیر بہت اچھا بہت خوش اخلاقی سے تو وہ کبھی بھی نہیں بولا تھا مگر ہر سون رات تو جیسے اس کے منہ میں زبان ہی کوئی اور تھی۔

اس کا پہلا جملہ ہی مجھے منوں مٹی تلے دفن کر دینے کے لیے کافی تھا۔ ”پھوپھو! نوبت اپنی کسی دوست کے کزن کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے۔ آج دوپہر کو۔ اور میں اب رات گئے تک سارے شہر میں اس کو تلاش کر چکا ہوں۔ اس کا کہیں نام و نشان نہیں اور وہ لا کر سے امی مرحومہ کا سارا زور میرے کمرے کی درازوں اور سیف سے

جیولری اور تقریباً "پچاس ہزار نقد لے گئی ہے۔ میں آپ کو یہ سب بتانا نہیں چاہتا تھا، میرا خیال تھا۔ میں اس کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ آپ لوگوں کو اس کی اس شرم ناک اور ٹھٹھا حرکت کا علم نہیں ہو گا مگر افسوس میں اس کمزورت کو تلاش نہیں کر سکا۔ رشیم نے اور میں نے اسے بہت ڈھونڈا ہے اور اب جبکہ رات کے دو بج رہے ہیں وہ اگر اب مجھے مل بھی جائے تو بھی میں اسے اپنے گھر میں اپنی زندگی میں دوبارہ کبھی داخل نہیں ہونے دوں گا۔ اس نے میری ماں باپ کی آپ کی اپنے شوہر کی عزت کا کچھ خیال نہیں کیا اور ایسی بدذات کی میں شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں کروں گا۔ مجھے بس آپ کو یہی اطلاع دینی تھی۔ اب میرا اس سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔"

وہ بتا کر کے ہنسا کچھ سوچے مجھے میرے سر پر آسمان گرا تا چلا گیا اور اس کے بعد مجھے بتا نہیں چلا سکا کہ ریل پور کب میرے ہاتھ سے چھوٹا اور کب میں وہیل چیئر پر ہی دوہری ہو گئی۔ آٹھ کھلی تو یہ کرب ناک حقیقت پوری آنکھیں کھولے موجود تھی۔

سہیل نے اس کے بعد ایاز اور اظہار دونوں کو یہ ساری باتیں سنائی تھیں۔ سہیل نے اسے سب ہوش ہوتے ہی زندیوں بالوں کے واویلے سے پورا گھر جمع ہو گیا، اس دن کنیکٹ نہیں ہوئی تھی۔ سہیل نے ساری بات مزید اضافے کے ساتھ تمہاری بھابیوں کو بھی سنا ڈالی تھی۔ اب بتاؤ۔ مجھ سے بڑا سخت جان اور کون ہو گا کہ اتنے بڑے حادثے کا سن کر بھی تمہارے سامنے بیٹھی جا سکتی بیٹھی ہوں۔"

سمرخان کیپٹن شہباز کو اپنی اچانک بیماری کی وجہ بتاتے ہوئے وہ بھی رتی نہیں اور کیپٹن شہباز کے تو جیسے سارے وجود سے زندگی کی ریشم تک چڑ گئی تھی۔ وہ بے یقینی و بے حسی سے ماں کے زور جھروں پھرے چہرے اور دھیرے دھیرے ملتے ہوٹوں کو یک ٹک دیکھے جا رہے تھے۔ سمرخان شاید سانس لینے کو رکھی تھیں یا بیٹے کے احساسات جاننے کو وہ اب بہت غور سے کیپٹن شہباز کو دیکھ رہی تھیں۔

"شہباز! تم ٹھیک ہو نا۔۔۔ کافی دیر بعد وہ شہباز کا ہاتھ ہلا کر بولیں۔

"جی۔ بہت مدد ہم آواز سے ان کے ہونٹ ہلے۔

"بیٹا! میری کچھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ اس سارے معاملے کو میں کیا سمجھوں۔ ایک بات تو میرے بچے! تم بھی جانتے ہو کہ نزہت ایسی نہیں تھی بالکل بھی بیسیا سہیل اور رشیم کے جھگڑا ہے۔ تمہیں بتا ہے نا۔" وہ زور دینے والے انداز میں بولیں وہ ان کی رائے جاننا چاہ رہی تھیں۔

"جانتا نہیں۔" وہ بے کیف انداز میں ان کا ہاتھ واپس ان کی گود میں رکھتے ہوئے بولے۔

"کیا مطلب بیٹا! نزہت تو بہت اچھی تھی بہت اچھی۔ وہ ایسی حرکت کر ہی نہیں سکتی کہ تمہیں بھی ہو گا نا۔ اب تک بہت دیکھ چکے ہو تم۔" وہ بیٹے کی موسم سی کیفیت دیکھ کر بے رعب انداز میں بولیں۔

"کیا بتا چلتا ہے ام جان! دنیا کس وقت کس رنگ میں ڈھل جائے ام جان! کچھ بھی تو بتا نہیں چلتا کسی بھی بات کا۔ کچھ بھی تو یقین سے نہیں کہنا جا سکتا یہاں سب کچھ بے یقین سا ہے۔ کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا موسم بھی عجیب سی ڈھب سے بدلنے لگے ہیں۔ اب جون میں اس سال درجہ حرارت دو تین درجے تک پہنچ گیا تھا اور اس بار دسمبر میں نیچے آؤ تیس تک رہا ہے۔ ام جان! کچھ بھی تو کفرم نہیں ہے نہ موسم نہ وقت نہ لوگ۔ کچھ بھی بتا نہیں چلتا۔" وہ کتنے عجیب انداز میں بول رہے تھے۔

سمرخان کو گاگا کیپٹن شہباز کی دماغی رو بہک گئی ہے۔ وہ بالکل سپاٹ چہرہ لیے اسنے اہم ایسوشنل واقعہ پر اتنے غیر منطقی انداز میں بیچہ کر رہے تھے جیسے یہ کوئی بہت ہی عام سی بات ہو۔

"مگر مجھے بتا سے یقین ہے۔ نزہت میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ جو کہانی گڑھی ہے یہ ان دونوں میاں بیوی کی گھٹیا سوچ کی اختراع ہے اور کچھ بھی نہیں۔ معلوم نہیں بچی کے ساتھ کیا گزری ہے۔ وہ تو پہلے ہی مجھے آنے نہیں دے رہی تھی میں نے ہی خواستوار آنے کی ضد کی۔ اب اس وقت کو بچھتا رہی ہوں۔" وہ جیسے خود سے باتیں کر رہی تھیں کیپٹن شہباز نے جواباً "کچھ بھی نہ کہا۔ ان کا دل چاہ رہا تھا یہاں سے بھاگ جائیں۔ ایک لمحے کی تاخیر

کے بغیر اور پھر دوبارہ کبھی اوھر کا رخ نہ کریں۔

"لیکن اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں کہاں سے نزہت کی خبر لوں۔" وہ پریشانی سے بولیں۔

"بچھلے دو دن کے اخباروں سے۔" ان کا انداز سراسر سڑھ لاق اڑانے والا تھا۔

"شہباز خان! سمرخان کو بہت برا لگا۔

"ام جان! آپ کو نہیں معلوم ایسی خبریں ایسے واقعات کی مسالے دار رپورٹیں صرف اخباروں کے اندرونی صفحات اور اکثر بیرونی صفحات پر بھی آتی ہیں۔" وہ سمرخان کے ٹوکنے کے باوجود سنجیدگی سے بولے۔

"متم معاملے کی نزاکت کو نہیں سمجھ رہے یہ کوئی پھولی بات نہیں۔" انہوں نے کچھ نرمی سے کہا۔

"سہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں یہ کوئی پھولی بات نہیں اور ایسی نازک خبریں چھپ نہیں سکتیں اور نہ ان کی نزاکت کو چھپایا جا سکتا ہے۔" ان کے سٹک والا جواب پر سمرخان نے کچھ بے بسی سے انہیں دیکھا۔

"لیکن یہ ایسی بات نہیں کہ ہم سہیل یا رشیم کے من گھڑت قصے پر قناعت کر کے بیٹھ جائیں۔ ہم میں سے خود کسی کو جا کر کھانے کی تصدیق کرنا پڑا ہے۔ وہ دونوں تو بڑے درجے کے غلط ہیں۔"

"پلیز ام جان! مجھ سے کچھ سمرخان نے کچھ ڈرا اور عزت سے انہیں دیکھا۔" کتنے غلط ہیں وہ بتا میں مجھے کتنے غلط ہیں۔ کبھی آپ نے دیکھا ہے کسی نے کچھ سے بھرے گندے ہونٹوں میں خود سے چھلا لگ لگا دی ہو۔ اپنے کپڑے کچھ چہرے کو کچھڑے سے لت پت کر لیا ہو۔ کون کرنا ہے۔ بتائیں مجھے۔ کون ہی ہوش ایسا کر سکتا ہے خود سے کون اپنا لباس اٹھانا کرمانا کرتا ہے۔ کون خود سے برہنہ ہونا گوارا کرتا ہے۔ کبھی دیکھا ہے آپ نے کوئی شخص بھرے ہونٹوں میں کسی چوراہے پر خود اپنے کپڑے ایک ایک کر کے اتار ڈالے برہنہ ہو جائے کوئی ہوش و خرد سے بیگانہ باطل بھی ہوا سے بھی اپنی ستر پوشی کا احساس ہوتا ہے۔ ام جان! کون اپنی عزت کی حادوں کے تحت خود کو اتار اتارے ام جان! کون اپنے بے داغ لباس کی دھجیاں اڑاتا ہے کوئی کتنا ہی کرپٹ کتنا ہی گھٹیا کتنا ہی ذلیل کیوں نہ ہو اپنے آپ کو خود سے نکال کوئی بھی نہیں کرتا۔ کیا سہیل اس قدر گھٹیا دیوانہ ذلیل اور بے غیرت ہے جو اپنی عزت کی نیلا می کی خبر خود گھر گھر فون کر کے پہنچائے گا۔ خود سب کو بتائے گا کہ اس کے گھر کی چھت اڑ گئی ہے، آسمان ان پر ٹوٹ پڑا ہے۔ وہ بے لباس ہو گئے ہیں۔ ذلت و رسوائی کے دوران پروا کر دیے گئے ہیں۔ کون اس حد تک گر سکتا ہے کہ اپنی ذلت کا سامان خود تیار کر کے سارے زمانے میں اپنی نفسی اڑوائے پھر بھی آپ اتنی ہیں کہ یہ ان کی خود ساختہ گھٹیا سوچ کا فسانہ ہے۔

ام جان! آپ خود ان کے غلط ہونے کی آڑ لے کر خود کو فریب دے سکتی ہیں ام جان میں نہیں۔"

وحشت سے ان کی آنکھیں سرخ آنکھوں کی طرح دکھنے لگی تھیں اور چہرہ حدت جذبات سے سرخ ہو چلا تھا۔

"تو کیا تم سمجھتے ہو نزہت واقعی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے نقدی اور زور لے کر۔" سمرخان ان کی حالت کو

نظر انداز کر کے بھڑکتے ہوئے بولیں۔

"کیا ابھی یہ سب تصور کرنے کی سمجھنے کی گنجائش باقی ہے آپ کے نزدیک۔" وہ تلخ لہجے میں بولے۔

"گنجائش تو ہمیشہ باقی رہتی ہے اگر ہم جذبات کی عینک اتار کر حالات کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لیں تو۔" وہ مضبوط لہجے میں بولیں انہوں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

"ام جان اگر یہ سب سن کر کوئی شخص اپنے جذبات کو ٹھنڈا ٹھنڈا رکھ سکتا ہے تو پھر ارواہت میں ایسے شخص کو بہت ہی رزق القابلیت سے نوازا گیا ہے۔" وہ اسی زہر خند لہجے میں گویا ہوئے۔

"تو اس کا منطقی نتیجہ کیا ہونا چاہیے۔" انہوں نے جیسے ان کی بات سنی ہی نہیں۔

"کیا آپ اس قسم کے واقعات کے منطقی نتائج سے بے خبر ہیں۔" وہ طنز سے بولے۔

"شہباز خان! ماں کے ساتھ طنز مت کرو میں اس مسئلے کو بہت تحمل و برداشت اور حقیقت پسندی سے سلجھانا

چاہتی ہوں تمہاری رضامندی کے ساتھ۔ وہ مضبوط لمحے میں بولیں۔
 ”کیا آپ اس سارے واقعے یا اس کی جزئیات پر یقین نہیں رکھتیں۔ کیا آپ کو یقین ہے سہیل نے آپ کو
 یہ سب محض بہکانے کے لیے کہا ہے جبکہ ایسا کرنے سے اسے کچھ بھی مفاد حاصل نہیں ہو سکتا سوائے اس کی
 اپنی رسوائی کے۔“ وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔
 ”بات سہیل یا ریشم کی سچائی کی نہیں یہ تو بعد میں پرکھا جائے گا۔ پہلی بات تو زہرت کی بازیابی ہے۔ وہ کس حال
 میں ہوگی۔ مجھے اس بات کی اذہد بے چینی ہے۔ وہ زبور اور نقدی تو کسی حال میں نہیں لے کر جاسکتی۔ مجھے اس کا
 یقین ہے۔“ وہ ہنسنے سے بولیں۔
 ”ہاں۔ کسی کے ساتھ فرار ہو سکتی ہے۔ ہے نا۔“ وہ پھر طنز سے بولے تو مسز خان نے انہیں تنبیہی نظروں
 سے دیکھا۔

”وہ کسی بھی بات کے بارے میں اس قدر جلد فیصلہ مت کرو۔ کم از کم زہرت کی بازیابی تک۔“
 ”اس کی بازیابی کے لیے آپ پولیس سے رجوع کریں۔ وہ ایسے کیسز بہت بہتر طریقے سے حل کرتی ہے۔
 مغویہ کی بازیابی تو پولیس کے پاس ہاتھ کا کمال ہے اگر مغویہ واقعی انوا ہوئی ہو۔“ ان کا طنز لہجہ، نوزیر قرار تھا۔
 ”شہساز خان! آہینہ جاؤ۔ بیٹھ کر بات کرو۔“ وہ نکل سے بولیں۔
 ”ام جان! آپ کون سی بات کرنا پاتی ہے۔“ وہ کرسی کی پشت پر جھک کر بولے۔
 ”زہرت کچھ پاتی ہے، ابھی اگر تم مجھو تو۔“

”کچھ بھی پاتی نہیں رہا۔ اتنا ہی سمجھ چکا ہوں اور مزید مجھے کچھ بھی سمجھنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ تلخی سے بولے
 تو مسز خان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب انہیں مزید بات کرنے پر کیسے آمادہ کریں۔ کچھ دیر کے لیے کمرے میں خاموشی
 چھا گئی صرف کھڑکی کی سوئیوں کی ٹک ٹک تھی۔
 ”میں چاہتی ہوں بلکہ میں صبح ایاز کو پھنڈی کو بھیج رہی ہوں۔ اس طرح جیسے رہے سے کیا ہو گا۔“ وہ کچھ دیر بعد
 کھٹکھٹا کر بولیں۔ وہ چپ رہے۔
 ”وہ حالات کا اچھی طرح سے جائزہ لے کر آئے گا اور میں نہیں چاہتی کہ یہ معاملہ ہم کسی بھی طرح پولیس کے
 حوالے کریں مجھے یہ گوارا نہیں۔“

”ام جان! بہت ساری باتیں جو ہمیں زندگی میں ناپسند ہوتی ہیں کہ ان کا ہونا شاید ہم کو ہار نہ کریں مگر وہ جو جاتی
 ہیں۔ ہماری ناپسندیدگی کے باوجود بڑی ہوشیاری سے کہ ہم ان کا ہونا نہیں روک سکتے۔“ وہ ایک لمحے کو روکے۔
 ”آپ کسی کو بھی پھنڈی نہیں بھیجیں گی۔ جتنی عزت افزائی میری اس رشتے کے حوالے سے ہوئی تھی وہ سب کچھ
 اب میری آپ سے ریگوسٹ ہے۔ پلیز ام جان! اس بات کو ہمیں ہمیشہ کے لیے ختم کریں۔ میں اس پر دوبارہ کبھی
 بھی بات کرنا پسند نہیں کروں گا۔ یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔“ وہ حتی انداز میں چپا چپا کر بولے۔
 ”شہساز! ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اس معاملے کو بونہی نہیں چھوڑ سکتی۔ اس کا کوئی نہ کوئی۔“

”ام جان! شب بخیر۔ آپ بھی سو جائیں اب۔“ کالی رات ہو چکی تھی مجھے صبح جانا بھی ہے میں صبح جاتے ہوئے
 آپ سے مل کر جاؤں گا۔ اگر آپ سوئی ہوئیں تو میں آپ کو ڈسٹرب نہیں کروں گا۔ آپ اس بات کو مانتا مت
 کیجیے گا۔ لوگ گڈ نائٹ۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر مسز خان کے ماتھے کو بولے سے اپنے ہونٹوں سے چھوا ان
 کی کھڑکی کا ایک سمنڈا ہوا پردہ برابر کیا اور سڑکر ان کی طرف دیکھے بغیر ٹیلیفون کی لائٹ آن کی اور دروازے سے
 نکلے۔ ہونٹوں میں لائٹ آف کی اور بہت آہستگی سے دروازہ بند کر کے باہر نکل آئے۔

ان کا رخ اپنے کمرے کے بجائے باہر لان کی طرف تھا۔ رات پوری طرح سے ٹھیک چلی تھی سیاہ تاروں بھری
 رات کی چادر سارے آسمان پر پھیل چکی تھی فضا میں پھولوں کی منگ رہی ہوئی تھی اور ہلکی ہلکی خنکی اس باس کو
 چار سو پھیلا رہی تھی مگر اس وقت ان کا ذہن ان کی حیات ہر احساس ہر خوشبو سے بیگانہ تھیں۔ وہ رشت پر ہاتھ

باندھے گھاس پر غلٹنے لگے۔

”تو یہ سب یوں ہونا تھا۔“ کالی بویر غلٹنے کے بعد انہوں نے مراثا کرکالے سیاہ آسمان کو دیکھا۔
 ”بعض لوگوں کے بارے میں ہمارے مشاہدات کس قدر فضول نکلتے ہیں۔ بالکل الٹ اور میری زندگی۔ کیا اس
 میں اس واقعے کے بعد روشنی کی کوئی رمت پڑی ہے جس کے ذریعے میں کوئی قدم کوئی بہتر قدم اپنے حق میں اٹھا
 سکوں گا۔“

کمرے میں بے حد خاموشی تھی۔ صرف کھڑکی کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس کی کمر
 تختہ ہو چکی تھی۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر وال کلاک کی طرف دیکھا۔ رات کے سائے سے لوہج رہے تھے۔
 اس کا سرور سے پھا جا رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا دکھتا ہوا سر دیا۔

”جیسا نہیں یہ راحیلہ کہاں رہ گئی۔ وہ آئی تو میں اس سے کوئی تین کلریا سیپنگ بلڈری لے لیتی۔ یا اللہ یہ نیند ہی
 کیوں نہیں آجاتی اور۔“ اس کے منہ سے سی کی آواز نکلی۔

”یہ درد کیسے کم ہو گا۔“ رو رو کر آنکھیں سوخ چکی تھیں پونے اتنے بھاری ہو گئے تھے کہ شاید اب ان میں
 رونے کا دم بھی نہیں رہا تھا۔ وہ کھڑکی میں جیسے رو کر کا جہان آ گیا تھا۔
 ”ابھی رات اتنی طویل ہے اور پھر صبح رات سے بھی خوفناک تکلیف وہ سوچوں نے اس کی آنکھوں سے
 نیند بالکل ہی اڑا دی تھی۔“

”مجھے خود جا کر دیکھنا چاہیے شاید راحیلہ نظر آجائے۔“ وہ اٹھ کر کھڑکی ہو گئی۔ کہیں وہ مانتا نہ کر جائے وہ مجھے
 سچ کر کے کہتی تھی۔“ دروازے کی طرف بڑھتے اس کے قدم ٹھم گئے۔
 ”پھر ایک لمحہ کا سینے والی سوچنے ناس کاوا سن ہلایا۔“

”مگر میں اب تک اس کمرے میں اس کا انتظار کروں۔ اسے خود خیال ہونا چاہیے تھا۔ وہ سات بجے گئی تھی
 اور اب پونے دس بج رہے ہیں۔“ بھاری بھاری آنکھوں کے نیچے آنکھوں کی زمین پھر سے پھٹنے لگی اپنی بے پرواہی کا
 احساس پھر سے رلانے لگا تھا۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں دروازے کا ہینڈل پکڑ کر گھمایا اور باہر نکل گئی۔
 کاریڈور میں کوئی نہیں تھا۔ وہ مختصر قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی۔ راحیلہ کے سامنے والا کمرہ اس کے امی ابو
 کا تھا جو شاید لاک تھا۔

”اگر وہ بھی اوپر ہوتے تو شاید کبھی مجھے اپنے گھر میں شہرے کی اجازت نہ دیتے حالانکہ انکل اور آنٹی کبھی مجھے
 بہت پسند کرتے تھے۔ میری کم کوئی اور ڈینٹ مینوز کی میرے منہ پر تعریف کرتے تھے۔“
 ”زہرت راحیلہ کی طرح بالکل بھی بے مقصد نہیں بولتی بہت ڈینٹ ہے۔“ اس کی امی اکثر پیار سے کہتیں
 مگر یہ تو گئے دنوں کی بات ہے۔ اس کے دل نے آہ بھری۔

وہ آہستگی سے کاریڈور عبور کر کے لاؤنج کی طرف بڑھی۔ لیکن سے برعکس کی کھڑکی پر آواز آرہی تھی۔
 ”راحیلہ! اوہ نہ ہو۔“ اس کے دل میں خیال گزرا۔ ابھی انہوں نے ڈنر کیا ہی نہ ہو اس کی خالہ ہانی کا اس سے
 تعلق رکھتی ہیں جد ہر رات کا کھانا کیا کسی بھی کھانے کے اوقات مقرر نہیں ہوتے۔ اس نے ذرا سا آگے ہو کر
 لیکن کی کھڑکی سے اندر جھانکا۔ ان کی نوکرانی سنک کے آگے کھڑی برتن دھو رہی تھی۔

”اس کا مطلب ہے ڈنر ہو چکا ہے۔ لاؤنج میں دیکھوں گی اگر راحیلہ نظر آئی تو ٹھیک ورنہ واپس چلی جاؤں
 گی۔“ اس نے دل میں طے کیا۔ لاؤنج سے آوازیں آرہی تھیں۔

”میں سونے سے پہلے میڈیسن پیتی ہوں۔ ملازمہ سے کہہ جانا۔ میرے بید روم میں گرم دودھ کا گلاس رکھ
 جائے۔ دو ایسے بغیر نیند نہیں آتی آیا اور بھائی جان تو کل ہی آئیں گے پارہ ایک بجے تک۔“
 یہ آواز یقیناً اس کی خالہ کی تھی۔ وہ لاؤنج کی کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔ تھوڑا سا پردہ مڑکا ہوا تھا۔ کھڑکی کے آگے
 پڑے صوفے پر اس کی خالہ ہی بیٹھی تھیں سامنے چھ پر راحیلہ متوجہ بیٹھی تھی۔

”جی ان کا خون آگیا تھا شام کو۔ کل صبح قتل کر کے ہی لوٹیں گے۔“ راحیلہ بہت ادب سے بول رہی تھی کوئی اور موقع ہوتا تو نہرت اس کا خوب مذاق اڑاتی۔

”یہ مسئلہ بھی بیچ میں ہونا تھا خیر۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر بولیں۔ اس کی خالہ ہاتھ چلا چلا کر بات کرنے کی عادی تھیں۔ والیوم بھی ان کا خاصا بلند ہوتا تھا ہاتھ چلا چلا کر بات کرنے کا ایک فائدہ انہیں یہ بھی ہوتا تھا کہ جس جس کی نگاہ ان کی ڈائمنڈ کی انگوٹھیوں پر نہیں پڑتی تھی وہ بھی دیکھ کر مرعوب ہو جاتا اب بھی ان کے دونوں ہاتھوں کی تین انگلیوں میں قیمتی ڈائمنڈز جگمگا رہے تھے۔

نہرت کی ملاقات ان سے راحیلہ کی دونوں بہنوں کی شادیوں میں ہو چکی تھی۔ وہ کروڑپتی یا شاید ارب پتی بزنس مین کی بیوی تھیں۔ یہ کروڑپتی ہونا ان کے ایک ایک انداز سے جھٹکتا تھا وہ بات سہراٹھا کر مخاطب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھی دایاں اور کبھی بائیں ہاتھ بڑے مقررانہ انداز میں اٹھا کر اور جسم کو ایک خاص زاویے پر کی گمان کسی طرح سیدھا اٹھا کر بات کرنے کی عادی تھیں ان کی آواز تو بہت بھاری نہیں تھی مگر والیوم بہت بلند ہوتا تھا کہ جب وہ بول رہی ہوتی تھیں تو کسی کی بات سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ سب آوازیں ان کی بارعب کی طرف آواز کے نیچے دب کر رہ جاتی تھیں ویسے بھی وہ بہت کم کسی کو مت لگانا پسند کرتی تھیں۔ خاندانی تقریبات میں بھی کم کم شامل ہوتی تھیں اور جب کبھی شرکت کرتی تھیں۔ ایک تو ان کا پیش قیمت لباس قیمتی جیوکر می اور شخصیت کا رعب ہی انہیں سب سے ممتاز کرتا تھا۔ دوسرے وہ خود بھی خاندان کے لوگوں سے الگ تھلگ رہتی تھیں۔

بہت خاص اور بہت کم لوگوں سے بات کرنا پسند کرتی تھیں۔
”ہاں معلوم آج کل ادھر کیسے پانی جا رہی ہیں۔ یہ غرور تکبر کی دولت مند بوٹی۔“ نہرت نے تپتے فکر کے قیمتی سوٹ میں ملبوس اس عورت کو دیکھ کر سوچا۔

”ہاں یاد آیا۔ راحیلہ بتا رہی تھی کہ وہ کوئی رشتہ جوڑنے۔“ سے یاد آئی۔
”ان کا تو شاید ایک ہی بیٹا تھا تو کیا راحیلہ سے۔“ اس کے ذہن میں خیال ابھرا پھر راحیلہ کی گڑبگڑ سے کوئی اور موقع ہوتا تو وہ راحیلہ کا ٹاک میں دم کر دیتی چھیڑ چھیڑ کر مگر اب ان دونوں کے درمیان ایسے کسی بھی مذاق کا کوئی رشتہ نہیں رہ گیا تھا۔

”رات کو خوب تماشا بنایا اس میںٹل عورت اور اس کے شوہر نے، علی تمہاری دوست یا نہیں۔“
”جی معلوم نہیں۔ میں نے معلوم نہیں کیا۔“ راحیلہ کچھ ہنلائی۔

”مجھے تو یقین نہیں آتا۔ اتنی گرمی ہوئی اور بے ہودہ حرکت کرنے والی لڑکی تمہاری دوست ہو سکتی ہے جس کے گھر والے اس قدر ال مینورڈ ہوں۔ اس کی بھالی کیسے بڑھ بڑھ کر بتا رہی تھی کیا نام تھا اس لڑکی کا۔“ وہ پونہی انگلیں۔

”نہرت۔!“ راحیلہ کے ہونٹ جیسے خواب کے عالم میں ملے۔

”ہاں وہی اس کی بھالی کہہ رہی تھی کہ وہ تو شروع ہی سے بدگوار تھی مختلف لڑکوں سے اس کا کھلے عام ملنا جلتا تھا باپ زندہ تھا تو وہ اس کو شہ دیتا تھا اس کی آزادی پر کوئی روک ٹوک نہیں کرتا تھا بلکہ بھابھی کے روکنے پر اس نے اسے گھر سے نکالنے کی دھمکی دے دی تھی اور اس کا بھائی کیسے مزہ میں گھسکتا تھا ڈال کر کھڑا تھا۔ پونہی کی فینچی کی طرح چلتی زبان پر ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کسی سدھائے گدھے کی طرح سر ہلانے جا رہا تھا۔ تمہارا ایسے لوگوں سے دوستانہ کیونکر ہو گیا۔ یہ لوگ تو موری کے لیڑے ہوتے ہیں۔ کچھ میں رہ کر ایک دوسرے پر کچھ اچھا انسان کا مشغلہ ہوتا ہے۔ میں تو شکر کرتی ہوں تمہارے انکل ساتھ نہیں تھے۔“

وہ تو پہلے ہی اس پر پوزل پر بہت خوش نہیں ہیں۔ ان کے سرکل میں رہ جان کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت، طرح دار امیر گھرانوں کی لڑکیاں موجود ہیں۔ ایک تو تمہارے انکل کے بزنس پارٹنر کی بیٹی تھیں تھی۔ بے پناہ حسین اور اوپر سے ارب پتی باپ کی انکوئی اولاد۔ سناو اس رشتے پر آکر تو مجھے کتنے دن تمہارے انکل

سے باقاعدہ جنگ کر لی بڑی۔ پتا نہیں کیسے جا کر راضی کیا انہیں۔ وہ بھی میں نے رحمان کو اپنا ہم خیال کیا تب آئندہ ایسی لڑکی سے بالکل کسی قسم کا تعلق نہیں رکھنا کجا دوستی رکھنا۔“ وہ اپنی شیخیوں بگھارتے ہوئے اسے تنبیہ کر کے بولیں۔

”وہ میری دوست تو نہیں تھی۔ وہ تو محض کلاس فیلو تھی صرف سیکنڈ ایر میں۔“ راحیلہ کی گھٹکی سی ہوتی آواز پر اسے یقین نہیں آیا اس نے کچھ حیرت اور رنج کے عالم میں پرہہ ڈرا سا اور سر کا کر راحیلہ کا جھکا ہوا چہرہ دیکھنا چاہا۔

”میں اسی وقت راحیلہ کی نگاہ اس پر پڑی تو اس کے چہرے کا رنگ ہی اڑ گیا۔“
”محض کلاس فیلو شپ اور وہ بھی کب کی بات اور وہ لوگ اس طرح تم پر الزام دھرنے چلے آئے جیسے وہ تمہاری بہت گلوڑ فریڈ ہو۔ بہر حال آئندہ تم احتیاط کرنا اس قسم کے تعلقات بنانے میں بلکہ اب تمہیں ایسے تعلقات اور دوستی وغیرہ کو ہماری کلاس کے مطابق جانچنا چاہیے۔ پہلے کی بات اور تھی کسی بھی ایرے غیرے کو تم دوست بنا سکتی تھیں مگر اب تمہارا تعلق ہم سے جڑ رہا ہے۔ اس لیے ایسے معاملات کو ہماری نظر سے اڑ کے کرنا۔ انڈر اسٹینڈ۔“

راحیلہ تو شاید لڑکی کے طنز اور دھمکیوں میں سے کچھ بھی نہیں سن رہی تھی بس مضطرب انداز میں کبھی یہاں سے تیلھی قرعون کو دیکھتی اور کبھی لڑکی میں ایسا ستارہ نہرت کو۔ اب وہ نہرت کے آگے ہاتھ بھی نہیں جوڑ سکتی تھی کہ خدا را تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اس کی آنکھوں کی التجا بڑھتی ہی نہرت وہاں سے ہٹ گئی۔

”کچھ بھی نہ کرنے پر اتنا بڑا داغ میرے پاس پر لگ گیا ہے بلکہ پورا وجود ہی جیسے کوڑھی ہو کر رہ گیا ہے۔ کوئی میرے سائے کے قریب سے بھی گزرتا نہیں چاہتا۔ آخر ایسا کیا کر دیا میں نے۔“ وہ کمرے میں آتے ہی کرسی پر گر کر ان کے سر کو پھوٹ پھوٹ کر روئے گی۔

”راحیلہ اس قدر غمگین تھی مجھ سے تعلق رکھنے پر۔ میرے اللہ! مجھے موت دے دے۔ ایسی ذلیل زندگی مجھے نہیں چاہیے۔“ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپانے روئے جا رہی تھی۔ کتنی ہی دیر وہ بے آواز آنسوؤں سے روئی رہی۔

”رونے سے کیا ہوتا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ چاہے وہ صبح تک روئی رہتی یا تمام عمر اسے کس نے چپ کرانا تھا۔“ کافی دیر بعد اس نے خود ہی روئے سے اپنا چہرہ صاف کر لیا۔

”یہ رونا تو اب شاید گھر گھر کا ہے۔“ خود کو منجھالتے ہوئے اس نے افسردگی سے سوچا۔ گھڑی گیارہ بج رہی تھی۔ شاید مجھے اس گھڑی پر پیشہ ہی رات تمام ہو جائے گی۔ کرسی پر اپنے وجود کو سیدھا کرتے ہوئے اس نے سوچا۔
”نہرت! تمہیں ادھر نہیں آنا چاہیے تھا اگر خالہ دیکھ لیتیں تو جانو میرا کیا حال کرتیں۔ تمہیں اپنی عزت کا میں تو میرا خیال ہی کر لینا چاہیے تھا اتنے کڑے حالات میں میں نے تمہیں ادھر رکھنے کا رسک لیا ہے تمہیں اس بات کا ہی خیال کر لینا چاہیے تھا۔ خالہ جان کی گنتگو تو تم سن ہی آتی ہو اگر انہیں ڈراسی بھی بھٹک مل جائے تمہاری موجودگی کی تو وہ میرا کیا حال کریں۔ تم تو شاید ایک رات گزار کر یہاں سے چلی جاؤ۔ میں ساری زندگی اپنے خاندان والوں اور گھر والوں کے آگے سزا دھار کر بات کرنے کے قابل نہ رہوں گی۔“

راحیلہ شاید بے قدموں سے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ مدھم آواز میں سخت لہجہ اور سخت ترین الفاظ بولتی وہ اس کے سر پر گھڑی بیماری کر رہی تھی۔ دوسرے لفظوں میں ایسے سخت احسان فراموش اور گھٹیا گردن رہی تھی اور اس کی بے بسی کی انتہا تھی کہ وہ جواہر کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔

”سوری۔“ اس نے جھکے سر اور شکست لہجے میں کہا تو کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی پھر کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔

”نہرت! میں مجبور ہوں۔ پلیز تم میری مجبوری کو سمجھو۔ ہم لڑکیاں ایسی ہی ان دیکھی زنجیروں سے بندھی ہوتی ہیں۔ اپنے اچھے مستقبل کی زنجیریں ہاں باپ کی عزت و غیرت کی زنجیریں۔ تمہیں معلوم ہے نا۔“ راحیلہ اس کے

ساتھ بیڈ پر آ بیٹھی اور نرم لہجے میں بولی۔
”ہوں۔“ وہ ابھی بھی سر نہ اٹھا سکی۔

”تم اب لیٹ جاؤ۔ آرام کر لو۔ میں تمہارے لیے چائے بھی لاتی ہوں اور گرم دودھ بھی تو لینا پسند کرو۔“ اس نے شاید ٹرے پیچھے شیل پر رکھ دی تھی۔ ہر کام وہ بہت احتیاط سے کر رہی تھی کہ ذرا سی آواز بھی کمرے سے باہر نہ نکلے۔

”تو تھینک یو۔“ اس کا واقعی اب کسی چیز کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

”چائے لے لو۔ ساتھ میں سردی کی میڈیٹ بھی ہے۔“ راحیلہ اس کے تھینک یو کو سنے بغیر اٹھی اور اسے چائے کا ٹک اور میڈیٹ دینے لگی۔ ابھی بھی اس کے دل کو اس کی احتیاج کی خبر ہو جاتی تھی کہ وہ اسی میڈیٹ کے لیے تو بہت مجبور ہو کر کمرے سے نکلی تھی۔ اس نے خاموشی سے میڈیٹ لے کر پانی کے ایک گھونٹ کے ساتھ نکل لی۔ راحیلہ اپنا کپ لے کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ دونوں خاموشی سے چائے پینے لگیں۔

”تم نے اب کیا سوچا ہے؟“ کچھ دیر بعد راحیلہ نے پوچھا۔ ”اس“ راجھی کو توڑا۔

”کیا سوچنا ہے کل سچ اس شہر سے نہیں بھی چلی جاؤں گی کسی اور شہر یا قصبے میں۔“ وہ اس سے نظریں ملانے بغیر چائے کی بھابی پر نظریں جمھا کر بولی۔

”تمہارا دماغ تھینک ہے۔“ راحیلہ کو اس کی بات ذرا پسند نہ آئی۔

”تھینک ہونا تو یوں در بدر بھٹک رہی ہوں کسی گاڑی کے نیچے نہ خیر کوہنے چلی ہوتی۔“ اس نے غم آواز میں ملتی سے جواب دیا۔

”نہ بہت لپ کوئی حل نہیں ہو چکا وہ ہو چکا مگر آگے کے لیے تمہیں کچھ قابل عمل کچھ بہتر حل سوچنا چاہیے ایک باعزت زندگی گزارنے کے لیے۔“ راحیلہ چونکہ بالکل محفوظ اپنے گھر میں بیٹھی تھی۔ اس لیے خوش قسمتی کے جھولے بھول رہی تھی۔

”باعزت زندگی ہاں۔“ وہ ہلکا سا ہنسی ”کیا اب مجھے کبھی مل سکتی ہے۔“ نہیں راحیلہ یہ تو آدم کی جنت ہم کشتہ کی طرح ہمیشہ کے لیے میرے ہاتھوں سے نکل چکی ہے اور اب کوئی چھوٹی چھوٹی مجھے پہلے جیسی باعزت زندگی نہیں دلا سکتا۔“ اس کی نظریں تک کی تہ میں نیچے آخری چند گھونٹوں پر تھیں۔

”نہ بہت! اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔ یہاں۔“

”راحیلہ! پلیز! تمہاری باتیں مجھ سے مت کرنا۔ کل سے آج رات تک میں اس دنیا کا چھوڑ دیکھ چکی ہوں اس کے بعد کوئی خوب صورت ترین ہلاوا ابھی مجھے ہلا نہیں سکتا۔“

”اچھا اس بات کو چھوڑو مجھے یہ بتاؤ بلکہ شروع سے کہ یہ سب کیا ہے۔ کیسے ہوا مجھے تو وہی معلوم ہے نا جو کچھ اس سہیل اور رشیم کر کے گئے وہ بھی مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔“ راحیلہ اپنا کپ سائڈ ٹیبل پر رکھ کر بولی۔
”بلکہ پلیز تم اب بستر پر آ جاؤ ایسے خود کو اتنا نہ تھکاؤ ابھی۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔
”وہ جو کچھ کہہ کر گئے ہیں سمجھو وہی سچ ہے۔“ وہ اسی ملتی سے بولی۔

”جب تم نے مجھے فون کیا تھا میں نے تب ہی کہا تھا کہ کیا ضرورت ہے اس کے ساتھ بازار جانے کی۔“ راحیلہ اس کی بات ان سنی کر کے بولی۔

نہ بہت کو یاد نہیں آیا کہ راحیلہ نے ایسی کوئی تاکید سے کی تھی یا نہیں یا غم کے جھٹکوں نے اس کے ذہن سے ایسی بہت سی تاکید کی باتیں محو کر دی تھیں۔ وہ سامنے دیوار پر ناویہ نکتے کو دیکھتے ہوئے سوچتی رہی۔

”تم اس کے ساتھ بازار سے کہاں چلی گئیں اور وہ کیر واپس آج کر خود کو مستحضر ثابت کرنے میں کامیاب ہوئی۔“
”راحیلہ بتا نہیں انسانی جبلت کے ہاتھوں جس قسم کی یا اس کا دکھ یا تھکا چاہ رہی تھی۔ اس کی نیت جو بھی تھی نہ بہت کم از کم آج کی رات اس کی خفگی مولا نہیں لے سکتی تھی یہی تو وہ بتا تھا جس نے آج بے بسی کے بحرے

کینار میں اسے سہارا دیا تھا۔ چاہے رات بھر کے لیے وہ بھی اسے دھکا دے دیتی تو وہ کناں جاتی؟

وہ دھیرے دھیرے جتنا کچھ اسے ہوش و خرد سے برکازہ ہونے سے پہلے معلوم تھا اور جیسی حالت میں اس نے خود کو ہوش میں آنے کے بعد پایا بغیر کسی اضافے یا ترمیم کے اسے سنا ہی چلی گئی۔ راحیلہ خاموشی سے سنی رہی۔

”کم از کم سہیل بھائی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا جبکہ انہیں اپنی بیوی کے بارے میں علم بھی تھا اور بہن کے کردار کی بھی خبر تھی کہ وہ خود سے اپنی مرضی سے کبھی رات گھر سے باہر نہیں گزار سکتی۔ انہیں نہیں اندر بلا کر سب کچھ اطمینان سے معلوم کرنا چاہیے تھا۔“ راحیلہ سب کچھ سن کر افسوس زدہ لہجے میں بولی۔

”ان کے نزدیک حقیقت اور افسانے کے پیمانے بدل چکے ہیں۔ ان کے حواس اور دماغ اب بیوی کی زبان و احساسات کے سوا اور کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا۔“

”شاید وہ اس وقت بہت غصے میں ہوں جب انسان نے۔“ اسے تو بہت سی باتوں بہت سے حقائق کو وہ سمجھ ہی نہیں یا تا جب ان کا غصہ اترا ہو گا۔ آج دن بھر میں یا شام کو یا اب رات گئے تک رات بھی بہت سے بھیدوں پر پڑنے والے افسانے ہیں۔ انوکھے انکشاف سچائی کے بارے میں اکثر رات ہی کو ہوا ہوتے ہیں۔“ راحیلہ نہ جانے کیا کہنا چاہ رہی تھی۔

”مگر جب وہ تو ہو چکی ہے لیکن ابھی رات کا ایک حصہ ہی تو گزرا ہے۔ کیا پتا سہیل بھائی کو کچھ عقل آئی ہے گی ہو۔“ غصہ اترا گیا ہو تو شاید عقل کا کوئی اور حصہ تازہ ہوا سے نکل ہی گیا ہو۔“

”پتا نہیں۔“ وہ سر زور سے کرسی کی پلٹھ سے ٹکرا کر بے بسی سے بولی۔

”نہ بہت! ایک آخری کوشش کرو۔“ راحیلہ بولی۔

”کیسی کوشش؟“ وہ اسی طرح سر رکھنے لگی رہی۔

”ہم کھل بھائی کو فون کرتے ہیں۔ میں خود ان سے بات کروں گی دیکھو ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ تم خود ان سے بات کرنا۔“ عالی خانگ لپٹا کر اسیوں نے تمہارے سرال میں یہ خبر بیوی کے کہنے میں آ کر کر دی ہو تو یہی ان سے معذرت کی جا سکتی ہے۔ نند بھانج کی فرسٹی جنک میں عم غصے کی حالت میں میری گھر آ کر رات رہ گئی تھیں وغیرہ بات کچھ ابھی سہیل سمیٹا جا سکتا ہے۔ اگر سہیل بھائی چاہیں تو نہ بہت۔ انہیں فون کرتے ہیں شاید وہ ہماری بات سمجھ لیں۔ اس وقت ویسے بھی وہ چل سکتی ہوگی۔“ راحیلہ اسے آسار ہی تھی۔

”کوئی فائدہ نہیں۔“ سہیل بھائی کے دل میں نہ پہلے میرے لیے کوئی جگہ تھی اور اب تو شاید بالکل بھی نہیں۔ چاہے میں ان کے سامنے حاضر ہو کر مر جاؤں۔“ وہ اپنی تھکی تھکی آنکھوں کو مسل کر باپوسی سے بولی۔

”مگر کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ میں فون لے کر آتی ہوں خدا خدا کر کے خالہ جان اپنے بیڈ روم میں آئی ہوں اور وہاں نہ بہت! میں تم سے معافی بھی مانگنا چاہتی ہوں خالہ جان کے الفاظ کی اور اپنے رویے کی۔“ وہ جانتے جانتے رک کر بولی۔

”معافی کیسی میں نے برا نہیں مانا۔ تو ہاتھ تقدیر نے میرے ساتھ کیا ہے۔ اس کے بعد کسی کے بھی الفاظ مجھے برے نہیں لگتے چاہیں اور نہ لگے ہیں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”نہ بہت! یہ میری مجبوری تھی اور ہے۔“ وہ بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔ ”تمہیں معلوم ہے نا ہمارے اور خالہ جان کے اشتیاق کا فرق۔“ انکل کا شمار ملک کے دس بڑے صنعتکاروں میں ہوتا ہے اور اتنے بڑے گھر سے میرے لیے ہر پوزل آتا کوئی چھوٹی بات نہیں اور میرے والدین جو پہلے ہی دونوں بیٹیوں کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ کیا اور نیلہ دونوں ہی اپنے گھروں میں معاشی لحاظ سے بہت ٹک ہیں۔ آیا کاتو سسرال ہی اس قدر بڑا ہے کہ دونوں میں اور ایک دیور بیٹے کے باوجود ابھی بھی چار افراد ساجد بھائی کو بیٹے ہیں۔ بچو کی ذرا ذرا سی ضروریات تو امی ابو پوری کرتے ہیں اور نیلہ کا شوہر ہمیں پتا ہے پانچ سالوں میں اس نے بیس کام بدلے ہیں اور بیس ٹک کر کوئی کام نہیں کیا نیلہ کی بھی سب ضرورتیں امی ابو کے ذمے ہیں۔ ایسے حالات میں خالہ جان کا ہمارے گھر کا رخ کرنا جبکہ

خاندان میں ان کے جوڑکی نہ سہی بہر حال ان کے برابر کی ایک دو فیملیز موجود ہیں پھر بھی خالہ جان نے امی کا خیال کیا۔ امی ابو تو ان کے احسان کے بوجھ سے ابھی سے دے جا رہے ہیں تو پھر تم ہی بناؤ میں کیوں نہ اپنے بوڑھے والدین کی خوشی کی خاطر اپنی ایک دوستی۔۔۔ صرف ایک دوستی کو ہی قربان کرنا ہے اور یوں بھی لڑکیوں کی دوستیاں کب دہریا ہوتی ہیں۔ والدین کے گھر نہ ختم ہوں تو شوہرا سسرال والے ناپستیدگی کی سند دے کر انہیں ایک ہی جھٹکے سے ختم کر ڈالتے ہیں میں فون لاتی ہوں۔ وہ جیسے خود سے باتیں کر رہی تھی پھر نزہت کا کوئی بھی جواب لیے بغیر فون لینے باہر چلی گئی۔

فون کی بیل سسل جا رہی تھی کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔

”گلتا ہے گھر میں کوئی نہیں۔“ راحیلہ نے ریسیور کلن سے لگا رکھا تھا۔

”ہیلو جی! میں راحیلہ ہوں سہیل بھائی! نزہت کی دوست۔“ دوسری طرف شاید سلسلہ مل گیا تھا۔ راحیلہ پر جوش آوازیں بولی۔ نزہت نے جلدی سے اسٹیکر کاٹیں آن کر دیا۔

”کہو کیا کام ہے۔“ وہی سردانہی لہجہ۔ نزہت کا جسم بے جان ہونے لگا۔

”سہیل بھائی پلیز! آپ نزہت کے لیے دل میں کوئی گنجائش پیدا کریں وہ بے قصور ہے گھر کے ساتھ دھوکا کیا گیا تھا۔ ریٹیم اسے دھوکے سے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ آپ خود پوچھ۔“

”شٹ اپ۔ دل پوٹ اپ۔“ سہیل کی وجہ سے راحیلہ کا بیڈ روم بھی کوچ اٹھا ”تم فون رکھو گی یا میں تمہارے گھر فون کر کے تمہارے والدین کو تمہارا کچا چٹھا کھول کر بتاؤں ایک تو اس ذیل کو اپنے کسی پیار کے ساتھ بھاگا دیا اور اب اس کی سفارشی بن کر آئی ہو You wagabond تو اور لڑکی۔“

”اتنی انسٹنٹ۔۔۔“ راحیلہ کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا۔

کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی دونوں سر جھکائے بیٹھی تھیں۔

”میں نے منع کیا تھا نا تمہیں۔“ راحیلہ کی بے عزتی کے احسان اور اپنے بھائی کی اتنی گندی زبان نزہت شرمسار تھی بہت۔

”اب کیا کرو گی؟“ راحیلہ شاید موضوع بدل دینا چاہتی تھی۔

”جی تو چاہتا ہے کہ میں سے زہر مل جائے۔“

”صوت مٹنی ہوئی تو کل ہی نہ مل جاتی تمہیں اس پر سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

”پھر کیا کروں؟“ وہ سر قہقہہ کر بولی۔

”اور صرف فون کر ہی چکے ہیں خبیث بوگ۔“

”معلوم نہیں شاید۔۔۔“

”پیارے تھے رات کو کہ یہ خوشی کی خبر کو تمہاری سسرال پہلے دے کر آئے ہیں۔ کیا عجیب اور گھٹیا بھائی ہے مجھے تو یقین نہیں آتا ہے اچھا ہی ہے خدا نے ہمیں کوئی بھائی نہیں دیا۔“ راحیلہ بولی۔

”اور اب تم کوئی بھی افسانوی پتویشن کے بارے میں سوچنے کے بجائے حقیقت کو فیس کرنے کا سوچو۔“

”کیا مطلب؟“

”میں کل تمہیں ٹرین پر بٹھاؤں گی یا کوچ میں۔ تم لاہور چلی جاؤ۔ تمہاری پھوپھو تم پر مہمان ہیں پھر وہ ریٹیم کی حقیقت سے بھی واقف ہیں۔ اس سارے گھٹیا افسانے پر یقین کرنے سے پہلے ایک بار ضرور تمہاری بات سیں گی پھر تمہارا نکال ہو چکا ہے۔ تمہیں ادھر ہی جانا چاہیے۔“

”نہیں۔ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔“ وہ خوف زدہ انداز میں انہی میں سر ہلا کر بولی۔

”نزہت! that's better فون کرنے کا کچھ فائدہ نہیں تمہیں خود جانا چاہیے اب اگر میری پوزیشن یوں آگے بڑھ نہ ہو چکی ہوتی تو میں خود تمہارے ساتھ جاتی یا کم از کم ابو کو بھیجتی مگر اب یہ سب مشکل ہے۔ تمہیں خود ہی

جانا ہو گا۔ رات ابھی بڑی ہے تم اچھی طرح سوچ لو نزہت! میرے خیال میں یہی بہترین ہے۔“ وہ اسے کھولی کھولی نظروں سے دیکھتی رہی وہ ان لوگوں کا سامنا کیسے کر سکتی تھی وہ بھی اس طرح۔ اسے یہ ناممکن لگا۔

”نہیں راحیلہ! میں یہ نہیں کر سکتی۔“

”نزہت! اگر تمہیں تھوڑی بہت عزت کی زندگی چاہیے تو ادھر ہی جاؤ۔ تم ان کے نکاح میں ہو جب تک نکاح قائم ہے۔ تم ادھر ادھر کیسے جا سکتی ہو۔ اگر وہ خدا کا خواست قبول نہ کرنا چاہیں تو پھر اللہ کرے ایسا نہ ہی ہو ان کے سینوں میں سیل سیل سیل نہ ہو۔“

نزہت نے کوئی جواب نہ دیا۔

”اچھا اب پلیز تم آکر لیٹو تو رات بہت ہو چکی ہے۔ تمہیں اب ریسٹ کرنا چاہیے بہتر ہے نیند کی کوئی لے لو۔“

”نہیں دے دو۔“ وہ خود بھی ان تکلیف دہ سوچوں سے نجات پانا چاہتی تھی۔ سلیپنگ پلیر لینے کے بعد بھی اسے فوراً نیند نہ آئی۔

مختلف چہرے بچھوٹے منظر کول دائروں میں بننے بگڑتے رہے اس کا جسم آہستہ آہستہ بے جان ہونا شروع ہوا اگلا دن طلوع ہونے میں کئی گھنٹے گزر گئے مگر وہ بے خبر سوئی رہی اور راحیلہ جو اسے امی ابو کی آمد سے پہلے ہی یہاں سے صبح دینا چاہتی تھی اس کی لپٹ کی وجہ سے مجبور ہوئی۔

آخر ساڑھے گیارہ بجے راحیلہ نے ہی اسے جھنڈوڑ کر اٹھایا ”تا تم ویکہ کرو خود بھی حیران رہ گئی۔“

راحیلہ اس کے لیے ناشتہ لینے گئی تو وہ منہ ہاتھ دھو کر آگئی۔

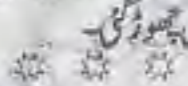
”پھر تم نے کیا سوچا ہے اب تو بہن کا وقت ہے۔“ ناشتے کے بعد اس نے چائے کا کپ رکھا ہی تھا کہ راحیلہ بول پڑی۔ ”اب اسے ہر گز دینا چاہتی تھی۔ اس کے امی ابو آجاتے تو پھر بہت مشکل ہو جاتی! ابھی تو خالہ نے ہی ناٹھ دینا چاہا تھا۔“

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ وہ کھنڈ بول رہی۔

”نزہت! یہی بہتر ہے۔ باقی اللہ پر چھوڑ دو۔“

”راحیلہ! راحیلہ! آگے ہر ہو بھی۔“ اس نے راحیلہ کی امی کی آواز سنائی دی تو دونوں ہی اچھل پڑیں۔

”تم کمرے سے باہر نہ نکلتا بلکہ کمرہ اندر سے لاک کر لو میں ابھی آتی ہوں۔“ وہ فی الفور دروازہ بند کر کے باہر بھاگ گئی اور نزہت کو پھر سوچوں کی منجھار میں چھوڑ گئی۔



وقت کے بارہ بجتے والے تھے اور نیند کی پٹن شہساز کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

”کیا یہ چھوٹی بات ہے جسے میں بھلاؤں فراموش کر دوں۔“ ہر پہلو پر جیسے کانٹے آگے تھے۔

”گھر سے بھائی ہوئی ایک لڑکی نہیں بلکہ میری منگولہ۔ اسے میں اپنا لوں، صرف اس یقین کی بنیاد پر کہ اس کا ماضی اس سلسلے میں بے دماغ ہے۔ نہیں۔“

سوال و جواب کا عجیب بھنور سا تھا جس میں وہ ڈوب ابحر رہے تھے کہ انہیں کال بیل کی آواز سنائی دی۔

”اس وقت کون آ گیا۔ شاید میرا وہ تم ہے۔“ انہوں نے ناگہم بکھلا ہارہ جتنے میں پانچ منٹ تھے۔ وہ دوسری کھنٹی کا انتظار کرتے رہے اور پھر تین منٹ بعد دوسری بیل بجی۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

زنتون بانو شاید سونے جا چکی تھی ورنہ وہ تو بلی بیل پر دوڑ کر دروازہ کھول دیتی تھی۔ زنتون بانو کے کوارٹر کی بجھی ہوئی لائٹ کچھ کر انہوں نے سوچا اور گیٹ کی طرف بڑھے۔

”کون؟“ ان کے ہاتھ ایک بل کو گیٹ کے لاک پر رکھے باہر سے کوئی آواز نہیں آئی۔

”کون ہے؟“ اب کے انہوں نے ٹیپٹ کر پوچھا۔

میں میں ہوں۔ بہت بدھم۔ بہت باریک سی آواز۔
ان کے دل کی گھنٹی نے انہیں بہت کچھ بتایا۔ انہوں نے اگلے بل گیت کھول دیا۔
ان کے سامنے نہت کھڑی تھی۔ سیاہ چادر میں لپی وہ سیاہ رات کا ہی حصہ معلوم ہو رہی تھی۔

”آمنہ!“ وہ آواز تھی یا صور اسرائیل۔

اتنی بڑی حویلی جو انسانوں کے ایک جم غفیر سے بھری ہوئی تھی، ابھی چند لمبے قبل جب سید سلطان بخت نے اس کی کلائی پکڑی تھی تو کسی سوئے ہوئے محل کی طرح جامد و ساکت ہو گئی تھی۔ صرف حیات کی دنیا آباد معلوم ہوئی تھی۔ اس کے سینے میں دھڑکتے دل کی دھمک نیچے نیچے دھول کے شور سے بھی زیادہ تھی اور اس کی کلائی کا وہ حصہ جہاں سے سلطان بخت نے اسے تھام رکھا تھا وہ زندہ تھا اور باقی اس کا تمام وجود جیسے برف کی سل بن چکا تھا اور کسی بے جان معمول کی طرح سلطان بخت کے ساتھ کھینچا جلا جا رہا تھا۔ اس کا داغ ماؤف ہو چکا تھا کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مزاحمتی قوتیں سب کی سب ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس نے ایک بار بھی سلطان بخت کو پرے دھکیلے یا خود کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی، بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے بیرو مرشد خدا کے لیے اپنے پیچے بادشاہ کے ولی محمد کا یہ روپ دیکھتی رہ گئی تھی۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ سلطان بخت یہ حرکت بھی کر سکتا ہے جبکہ اسے ابھی اصل حرکت اور اس سے پیدا ہونے والے کسی بھی نتیجے کی خبر نہیں تھی۔ ابھی تو اس کے وجود میں جو حوالے عمر کی تبدیلیاں آرہی تھیں وہ ان سے بے خبر تھی۔ چہ جائیکہ کسی مرد کا اس طرح اسے چھونا اور پھر کھینچ کر تھام کرے میں لے جانا بس خوف کی ایک بے پناہ طاقت تھی جس نے اسے چار جانب سے کسی آنکھوں کی طرح اپنے پنجوں میں جکڑ لیا تھا کہ اس کے منہ سے ”سی“ تک نہیں نکل سکا تھا۔ کلائی سے نیچے اس کا پورا بدن کئی ٹولی ہوئی ڈال کی طرح جھول رہا تھا اس سے پہلے کہ اس پر وہ قیامت گزر جاتی جس کا تصور کیا کمان تک کا گزر رہا ہے۔ اس کے منہ میں وہاں سے آواز نہیں آ رہی تھی کی گونج و آواز پکارنے سے اسے ہوش و حواس کی دنیا میں لانا چاہا۔ ہزاروں نفوس کے ساتھ وہ جو یہی ہو چکا ہے۔ خوف نے یقینی اور مسمر پریم کے حصار کو اس پکارنے تک نہ ہی گٹ ڈالا۔ وہ سلطان بخت کو پرے دھکا دینا ہی چاہتی تھی کہ اماں جی دروازے پر نمودار ہوئیں۔

”آمنہ!“ ان کی آواز سے لگاؤ صرف آمنہ ہی کو دیکھ رہی ہیں سید سلطان بخت کہیں سیالانی ٹولی پہن کر ان کی نظروں سے روپوش ہو چکے ہیں۔ جیسے ہی اماں جی کا وہ دروازے کی چوکھٹ پر نظر ہوا سید سلطان بخت کو ہزار وولٹ کا کرٹ لگا۔ انہوں نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

وہ آگے بڑھیں اور ٹولی ہوئی شاخ کی طرح ٹٹکتا آمنہ کا ہاتھ وہیں سے تھام لیا جہاں سے سلطان بخت نے چھوڑا تھا اور اسے تقریباً کھینچتے ہوئے واپس مڑیں۔ سلطان بخت وہیں کسی قدم اور پول کی طرح کڑے کھڑے تھے۔ ”گر بادشاہ ہی عوام کے گھروں میں نقب لگانے لگیں تو پھر کسی پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا شاید خدا پر بھی نہیں۔“ دروازے کی چوکھٹ پر ایک لمحے کو رک کر گردن موڑے بغیر انہوں نے کانپتے لہجے میں کہا اور آمنہ کو کھینچ کر تیزی سے چوکھٹ عبور کر گئیں۔ ان کی رفتار بہت تیز تھی جیسے کبھی جوانی میں وہ کسی اجنبی ناعلم شخص کی نگاہ کی غلاظت کو محسوس کر کے تیز قدموں سے رستہ بدل لیا کرتی تھیں۔ انہوں نے میڑھیاں بھی بہت روانی سے عبور لیں میڑھیاں اتارنے کے دوران ایک بار بھی ان کے گھٹنوں نے کسی تکلیف کی شکایت نہیں کی کہ جو تکلیف وہ منظور دیکھ کر آئی تھی اس کے بعد انہیں اپنے بدن کی کسی تکلیف کا ہوش ہی کہاں رہا تھا۔

آمنہ کی زبان لکڑی کی طرح اس کے تاویں سے چبک کر رہ گئی تھی گوشش کے باوجود وہ اپنی صفائی میں اماں جی سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ اماں جی اسے اسی طرح کھینچتی ہوئی اس جگہ لے آئیں جہاں عورتیں کھانا کھا رہی تھیں۔ منظر ابھی بھی وہی تھا جو وہ چند لمحے پہلے چھوڑ کر گئی تھیں۔ کھانوں سے سخی میزوں اور ان پر ٹوٹی مخلوق

اگرچہ اب اس کی شدت میں کمی آچکی تھی مگر اشہاک میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ سب ہی گوشت مرثیہ بھینچوڑے میں لگی ہوئی تھیں۔ کسی نے بھی اماں جی یا آمنہ کی آمد کا ٹوکس نہیں لیا تھا تو ان کے جنوں پر گزرتی آفت کو دیکھنے کی فرصت کے تھی۔

اماں جی نے پہلی رو میں ذرا آگے کھڑی زینب کا کندھا زور سے اپنی طرف کھینچا۔ وہ ابھی بھی بے تحاشا کھاتے ہوئے تریا سے محو گفتگو تھی۔ اس مداخلت پر تڑپ کر مڑی کہ کھینچنے والے کو بے نقط بنائے۔ اماں جی کا متغیر چہرہ اور ساتھ میں اڑی رنگت لیے کھڑی آمنہ کو دیکھ کر اس کا نوالہ منہ ہی میں رہ گیا۔

”چلو گھر۔“ ان کی دھیمی سی گھر کی میں کیا تھا کہ زینب کچھ پوچھ رہی نہیں سکی۔
”تریا! میں ابھی آتی ہوں۔“ کہہ کر وہ اماں جی اور آمنہ کے پیچھے چل پڑی۔ اماں جی کی رفتار اب نارمل تھی۔
اگر وہ اس رفتار سے دوڑتیں تو سیدہ ضرور انہیں جا سکتی اور پھر سیدہ کی آنکھوں کی کو بھٹکانا ناممکن ہو جاتا تھا۔
”اماں جی! اماں جی! کیا ہوا ہے؟“ زینب بھاگ کر ان سے آئی۔

”کچھ نہیں ہم گھر جا رہے ہیں۔“
وہ اسی صیانت لہجے میں کہتے ہوئے ہال کمرے کے دروازے کے پاس۔ گاجر کے حلوے کی پلیٹ اٹھانے کھڑی جویریہ کی طرف بڑھیں۔

”جویریہ! ادھر آؤ۔“ ان کی آواز خاصی اونچی تھی اور جویریہ تو ان کے غصے سے بہت ڈرتی تھی جو انہیں بہت ہی کم آتا تھا مگر بہت شدید آتا تھا۔ وہ پلیٹ وہیں چوکھٹ پر رکھ کر ان کی طرف مڑی۔

”جی اماں جی!“ وہ سعادت مندی سے بولی۔
”ہم گھر جا رہے ہیں دروازے پر دوڑ کر کیوں چلے۔“ تو اس سے کہو ہمارے لیے مانگہ کروادے، نہیں تو ہمارے ساتھ پیدل ہی چلے۔ دوڑ کر جاؤ دروازے کی طرف۔“ وہ حکمیہ لہجے میں بولیں تو جویریہ کو وہ سری بات پوچھنے کی بہت تھیں، وہ بھی وہاں سے دوڑنے کی طرف بھاگ گئی۔

”خوارس! تو تم دونوں۔“ وہ ہال کمرے کے کھلے طاق سے اپنی چادر اٹھاتے ہوئے بولیں۔ دونوں نے بڑھ کر اپنی چادر میں اٹھائیں اور اچھی طرح اوڑھنے لگیں۔
”اماں جی! کیا ہوا ہے؟“ زینب سے رہانہ جاہ کا پھر سے بولی۔

”کچھ نہیں اور اب دوبارہ کچھ نہیں پوچھنا۔“ وہ کچھ غصے سے بولیں تو زینب خاموش ہو گئی۔
”ہم کہاں چلی گئی تھیں تم نے کھانا بھی نہیں کھایا۔“ وہ زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکی تھی ڈیوڑھی کے پاس پہنچ کر آمنہ سے بولی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا، اس کی کلائی ابھی تک اماں جی کے ہاتھ میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس نے چادر میں ایک ہاتھ سے اوڑھی تھی۔

”کیا یاں اماں جی کو خیال ہے کہ میں نہیں بھاگ جاؤں گی اگر انہوں نے میرا ہاتھ چھوڑا تو۔“ اس نے خور سے ایک قدم آگے جاتی اماں جی کو دیکھ کر سوچا۔
”چتا نہیں کیا آفت آپڑی ہے۔ کوئی بھی خوشی ڈھنگ سے منانے نہیں دینا کوئی۔“ زینب دونوں کو چپ دیکھ کر بڑبڑائی۔

”اماں جی! کہاں جا رہی ہیں اس وقت؟“ پاس سے گزرتی گاؤں کی ایک عورت نے رک کر پوچھا۔
”گھر۔“ وہ مختصر جواب دے کر آگے بڑھ گئیں۔ وہ عورت حیرت سے انہیں دیکھے گی۔ اس وقت لوگ گھروں سے آرہے ہیں نہ گھر جا رہی ہیں۔ وہ حیران ہوئی ہوئی اندر کی طرف بڑھ گئی۔
”اماں جی! چلیں مل گیا تھا وہ مانگہ لینے گیا ہے۔ کہہ رہا تھا پیدل نہیں جاسکتے بہت کچھ ہے، آپ دروازے تک پہنچیں گی تو وہ مانگہ لے آئے گا۔“

جویریہ بھائی بھائی داپس آئی اور انہیں بتانے لگی۔ اس کی سانس پھول گئی تھی۔ اماں جی نے کوئی جواب نہ دیا

”دروازہ کھلا ہے، کیوں خیریت تم آخر میں نکلا تو ڈال کر گئے تھے پھر دروازہ کس نے کھولا۔“ وہ حیرت زدہ سی آگے بڑھ کر بولیں۔

”عبدالصغیر اندر ہے جی۔“ وہ اسی طرح سر جھکائے بولا۔
 ”کیوں؟ وہ کیوں آیا تو شادی میں گیا تھا۔“ ان کے اندر بڑھتے قدم ختم گئے۔
 ”وہ جی۔“ جلیل جھجک گیا۔

”کیا ہوا اسے، طبیعت تو ٹھیک ہے نا اس کی؟“ وہ پریشان ہو گئیں۔
 ”وہ جی صوفی صاحب نے اسے مارا تھا تو ماسٹر صاحب کے کہنے پر میں اسے گھر چھوڑ گیا تھا۔“ اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

زینب نے بیزاری سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ”یہ تو بابا صاحب کا روز کا کام ہے، کون سی نئی بات ہے ہونے والا؟“ وہ بڑبڑاتی۔

”موجودہ حال بھی نہیں دیکھتے صوفی صاحب! اب بھلا سب کے سامنے بچے کا تماشا لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہر وقت کی مار کھانی اسے کھانی کر دے گی اتنا نہیں سوچتے۔ وہ جوان ہو رہا ہے بچہ نہیں رہا اب۔“
 وہ بڑبڑاتی ہوئی اندر کی طرف بڑھیں۔ ان کے ہاتھ ہاتھ میں ابھی تک آمد کی کلائی تھی۔ دروازے سے اس کا برا حال تھا۔ یوں لگ رہا تھا ان کے ہاتھ کی گرفت اس کی کلائی ہی توڑ دے گی مگر وہ اماں جی سے ہاتھ چھڑا بھی نہیں سکتی تھی۔

”کیا کیا تھا عبدالصغیر نے؟“ وہ مڑ کر دروازے سے باہر کھڑے جلیل سے بولیں۔
 ”وہ جی گانا گایا تھا دوستوں کے بیچ میں صوفی صاحب نے سن لیا۔ انہیں غصہ آ گیا تو۔“ وہ چوکھٹ کے قریب ہو کر بولا۔

”جی ہاں، ان سا جرم کرنا تو اس نے شادی کا موقع تھا اور یہ بھی کوئی نہ کوئی غلط حرکت کیے بغیر وہ نہیں سکتا۔ اب بھلا گانا گانا اسے زیب دیتا ہے، اللہ کے پاک کلام کو سینے میں اتار رہا ہے، کون سمجھائے آج کل کی نادان نسل کو۔ ماں باپ کی عزت کو دوڑی ٹا کر دیتی ہے۔ دروازہ بند کر کے تم جاؤ واپس۔“
 وہ اسے جانے کی اجازت دیتے ہوئے اندر کی طرف مڑ گئیں۔ زینب اور جویریہ پہلے ہی کمرے میں جا چکی تھیں۔ آمد تو ان کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

اماں جی نے کمرے میں جا کر آمد کو بان کی کھری چار پائی پر ایسا دھکا دیا جیسے وہ کوئی ربوہ کی گیند ہو۔ وہ ذرا سا اچھلی اور پھرو ہیں۔ سر جھکا کر سناٹ بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں اپنی سرخ بوٹی کی طرح ڈکھتی کلائی پر جمی تھیں۔
 ”مجھے تم سے کم از کم یہ امید نہیں تھی آمد! تم کوئی بچی تو نہیں تھیں جو اس کے ساتھ اٹھ کر چل پڑیں اور۔“

اماں جی کو غصے کی وجہ سے آگے کے کوئی الفاظ نہیں سوچے تو خود بھی دوسرے بستر پر بیٹھ گئیں۔ پریشانی میں وہ چادر بھی اتارنا بھول گئی تھیں۔ غصے اور رنج سے سناٹ بیٹھی آمد کو دیکھے جا رہی تھیں جو کوشش کے باوجود ان سے اتنا ہی کسپا لٹی تھی۔

”اماں جی! میرا کوئی قصور نہیں تھا میں تو۔“ آنسوؤں کا گولہ اس کے حلق میں اٹکنے لگا۔ اسے محسوس ہوا اس کا گلا دروازے پھٹ جائے گا۔ اگلے ہی بل پٹپ آنسو اس کی لالہ سرخ کلائی پر گر رہے تھے۔

”واہ نہیں جی واہ! بالکل اسی طرح گانا ہے اب نے جیسی ریسرسل کی ہے مگر ”کو“ ہی لے کو تھوڑا بڑھا کر اور ”ول“ پر مائیک کو ذرا ہونٹوں کے پاس کر کے کہ آواز میں جذبات کی پوری شدت ابھرے، آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا۔ اس طرح سے مائیک کو ہونٹوں کے قریب لاکر آگھوں میں جذباتیت سمو کر اور۔“

اور بڑے دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ جویریہ ان سے ذرا پیچھے ہو کر زینب کے ساتھ چلنے لگی، اب دونوں سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ یقیناً ”ایک دوسرے سے اس اچانک واپسی کا سبب پوچھ رہی ہوں گی۔ وہ دروازے تک پہنچیں تو جلیل وہاں موجود تھا۔

”نانگہ لے آیا ہوں اماں جی!“ وہ نظریں جھکا کر منسوب لہجے میں بولا۔ اماں جی ہولے سے سر ہلا کر باہر کھڑے نانگے کی طرف بڑھ گئیں۔ اماں جی اور آمد پیچھے بیٹھ گئیں جبکہ زینب اور جویریہ آگے بیٹھ گئیں۔ نانگہ چل بڑا۔ جلیل آگے دوسرے پاسیدان پر کھڑا تھا۔ آسمان پر ستارے نکل آئے تھے۔ بارش کے بعد کا آسمان بہت نکھر نکھر لگ رہا تھا جیسے اس پر بھی پاول آئے ہی نہیں تھے۔ دروازے سے بھیجنے کے بولنے اور مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ جنوں جنوں نانگہ حویلی سے دور ہو رہا تھا، روشنی اور آواز معدوم ہوتی جا رہی تھیں۔ حویلی سے باہر ات اپنے اندھیرے کے ساتھ جوان ہو چکی تھی، شاید گیارہ بجے کا نام تھا۔ تقریباً سارا گاونڈ تو حویلی میں دعوت اڑا رہا تھا۔ اکثر گھروں میں روشنی بھی نہیں جل رہی تھی۔ نانگہ کچی کی کچھڑوں پکڑنے یوں پر چلتا جا رہا تھا۔ چونکہ نانگے میں بیٹھے سبھی سوار خاموش تھے اس لیے بھی فضا کی خاموشی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ صرف کھوڑے کے ٹاپوں کی تھوڑی بہت آواز جب کچھڑے کے نیچے کوئی پکا ٹکڑا آجاتا یا پھر پیوں کی چرچر ہوتی۔ ایسی ہی خاموش بھینک فضا آمد کے اندر چھانی جا رہی تھی۔ ایسی خاموشی جس کا مفہوم نہیں ہوتا، بس خوف ہی خوف تھا اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے اندھیرے کی طرح۔ وہ اپنی قمیص کے دائیں گویک تک گھورے جا رہی تھی جیسے اس میں کچھ ٹھونک رہی ہو۔

اماں جی کے اندر باہر کی اس خاموش فضا کے برعکس ایک طوفان مچ رہا تھا۔
 ”اگر مجھے کچھ دیر ہو جاتی؟“ سب سے بلند آواز اس خدشے کی تھی۔
 ”اگر خدا نخواستہ کچھ ہو جاتا تو صوفی صاحب کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ اگر وہاں میرے بھانے کوئی اور آجاتا تو یہ سب دیکھ لیتا۔ وہ تو بڑا آدمی ہے اس کو کسی نے کیا گناہا چاہے وہ سب کچھ کر لڑا۔ میری بچی کی زندگی برباد ہو جاتی نہیں کس کے پاس فریاد لے کر جاتی۔“ وہ خود سے ہی ابھری جا رہی تھیں۔
 ”یہ آمد اور گھر کی ہی کیوں۔ یہ بچی تو نہیں ہے اتنی سمجھ نہیں اس میں۔ اس کو تو میں گھر جا کر ٹھیک کروں گی۔“ کبھی وہ غصے سے بت بنی آمد کو گھورنے لگتیں۔

”میں صوفی صاحب کو کیا بتاؤں گی وہ نہیں گے تو۔“
 ”وہ کیا کر سکیں گے۔ جیسے میں خاموشی سے اپنی عزت سنبھال کر چلی آئی اسی طرح وہ بھی چھپ کر جائیں گے۔ شور تو زور آوروں کا ہوتا ہے، کمزور کب کچھ بول سکتا ہے۔ بولے گا تو اس کی سنے گا کون؟“
 وہ خود ہی سوال جواب کے بھنور میں پکرا رہی تھیں۔ رستہ بھی تو طویل ہو گیا تھا۔ انہوں نے اکتا کر چپے کے دلدلی رستے کو دیکھا جس میں نانگہ اوہرا اوہرا دوڑتا جا رہا تھا۔

”پتا نہیں اماں جی پر اب کون سی وجہ اتنی ہے اچھا بھلا کھانا ابھی شروع ہوا تھا۔ گاجر کا طوطہ تو میں نے پکھا بھی نہیں۔ ٹہن اور سبز چائے کی خوشبو تھی اچھی تھی۔ ابھی تو ڈھولک بجی تھی مہندی لگنی تھی۔ یہ اٹھا کر لے آئیں واپس اسی قید خانے میں۔“

زینب دل ہی دل میں جھنجھلا رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اماں جی سے لڑ پڑے۔ جویریہ پر پیچھے کی نیند حاوی ہونے لگی تھی۔ وہ زینب کی گود میں لڑھکتی جا رہی تھی، زینب نے کچھ ناگواری سے اسے دیکھا۔ یوں اسے سوتا دیکھ کر اپنا بازو اس کی کمر کے گرد حائل کر لیا، کہیں نیچے کچھڑی میں نہ لڑھک جائے۔ آخر خدا خدا کر کے نانگہ کمر کے دروازے کے آگے جا کر کاجیل نیچے اتار کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

”جلیل! چالی لائے صوفی صاحب سے؟“ اماں جی کچھ سے بچ کر نیچے اتارتے ہوئے بولیں۔
 ”دروازہ کھلا ہے جی۔“ جلیل دروازے کے قریب پہنچ کر بولا۔

قربانی اپنے بے ہنگم وجود کے ساتھ اس کے اوپر ہی گر رہا تھا۔ اس کے کپڑوں سے پرفیوم کی بہت تیز حیات کو چبوتی ہوئی خوشبو اٹھ رہی تھی تو منہ سے غلیظ بو کے صبحکے آ رہے تھے۔ اس کے کمر کے منہ جیسا بوسا سا ہونا جب عین تارا کے منہ کے بالکل قریب آ کر کھلتا تو اس کے پیلے کالے بدنما اونچے نیچے وانت صاف نظر آتے۔ تبا کو بان، سگریٹ اور شاید کثرت نوشی سے کالے سیاہ موڑھے ان دانتوں سے دور کھسکے جا رہے تھے اور جو بدبو آتی عین تارا کو لگا کر وہ چند منٹ اور اس بدبو کے گھرے کو برداشت کرتی رہی اس کا یا تو منہ غ پھٹ جائے گا یا وہ اسے دھکا دے کر اوھر سے بھاگ جائے گی یا پھر اسے بہت زور کی ایکالی آجائے گی۔ وہ جو اس پر تعریف کے ڈونگے برساتے جا رہا تھا وہ بخوبی جانتی تھی کہ یہ اس پائے کی سنگر ہے نہ قریبی کی اتنی قربت اسے کچھ بھی اچھا لگائے دے رہی ہے۔ وہ محض چالیسویں میں اس کی تعریف کیے جا رہا تھا اور زیور گلہ سا نے نرم گداز صوفے میں دھنسی قریبی کے میجر کی فراہم کردہ ریفریشمنٹ سے پورا پورا انصاف کر رہی تھی۔ عین تارا کے منہ کے بگڑتے زاویے شاید دور سے اسے نظر نہیں آ رہے تھے۔

"یہ اس طرح نہایتیک کو پاس لائیں۔ ہاتھ ڈر اسارہا کر آنکھوں میں نشہ سا ترے۔"

"قربانی صاحب! اسٹاپ اسٹاپ! وہ غصے سے پھٹ پڑی۔" میں یہاں گانا گانے آئی ہوں ایکٹنگ کرنے نہیں آئی جو آپ مجھے مسلسل ہدایات دے رہے ہیں۔ ہونٹوں کو موڑ کر آنکھوں کو چڑھا کر ابرو کو لہرا کر وغیرہ وغیرہ۔ اگر اسی طرح گانا گانا ہے تو فارگازیک مجھے معاف کر سکتی ہیں اور سگریٹ سے گانا گالیں۔"

وہ اس سے دس فٹ دور بڑی کرسی پر دھم سے جا بیٹھی۔ قریبی اس کے تیور دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا۔ دل میں غصہ تو بہت آیا، پالشت بھری چھو کر نہ کٹے میں سڑنہ تو آڑ میں لے اور اترا ہٹ دیکھو جیسے ملکہ ترمم اس کو اپنا جانشین بنا کر گئی ہیں، کجنت قابو میں ہی نہیں آ رہی۔ گوری بڑی اور کھٹے نہیں کاوار ہوتے اس جیسی تو ہر روز میں دس جیب میں لیے پھرنا ہوں، ہمسوں بہوٹوں کا جھانسا دلا کر، اور یہ بڑھاپا کار کھو کے جا رہی ہے۔ کابو نہ اس کا بھر نہیں رہا اور دیدے بیٹی کی نگرانی پر لگے ہیں۔ کوئی پابند نہیں زیور گلہ دکھا لو جس قدر ہوسٹیری دکھانی ہے۔ میرا نام بھی قریبی نے اس الٹو تخی کو بھرے پرے گلشن سے مٹی میں بند کر کے لے گیا تو میرا نام بدل دینا۔ سارے رنگ اس کے چرا کر نہ تیری اور اس کی اترا ہٹ کو خاک میں ملا لیں، بس تھوڑا سا انتظار اور قریبی!

وہ دل میں تل کھاتے ہوئے خود کو لاسا دے کر آگے بڑھا۔

"نہیں جی! آئی ایم سوری آپ کو غصہ آ گیا۔ جوانی کا غصہ ہے نا، پیل پیل من میں سانا ہے اصل میں میں بھول گیا تھا کہ آپ کوئی اناڑی گانے والی نہیں ہیں جو مجھے یوں ہدایات دینی پڑیں۔ اصل میں سربا بہت کھانا کھا ہوں نا اس قلم میں پاکستان کی پہلی اتنی متعلی قلم نہیں رہی ہے اس لیے دل ڈر مارتا ہے۔ خدشوں میں گھبر جاتا ہے کہ چلو ڈنک نہ سہی ہو لگایا ہے وہی وصول کر لوں تو یہ تجربہ برائیں۔ کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے، بھول نہ رہ جائے ایکٹنگ میں سٹنگ میں۔ بس عجیب وہی سا ہو چلا ہوں ان دنوں۔"

وہ اتنے بر آیا پسینہ پوچھتے ہوئے لگاوٹ سے بولا۔

"آپ کو تا کو اور گزرا میں معذرت خواہ ہوں۔ اب آپ غصہ تھوک دیں اتنے حسین کھنڈے پر یہ ناراضی اچھی نہیں لگتی۔ یہاں تو بس میٹھی میٹھی مسکان ہی جتنی ہے کیوں گل جی! وہ پھر سے اس کے قریب چلا آیا تھا اور زیور گلہ نے جو دور سے بیٹی کے بگڑے تیور دیکھے تو گھبرا کر کھلی آئی۔

"کیا ہوا غنی! آریو آل رائٹ مائی لونگ چائلڈ۔" وہ گھبرائی گھبرائی سی اس کے اوپر آجھکی اور بڑے لاڈ سے اس کا غصیلانیزا ہر چوم کر بولی۔

"نہیں مام! وہ ہیزاری سے کہہ کر گروں گھا کر قریبی کی مخالف سمت میں دیکھنے لگی۔

"آئیے نا، عین جی! اب میری توبہ مزید انٹرکشنز۔ (ہدایات) نہیں دل گا۔ کجنت تالاق سنگرز کے ساتھ کلام کر کے عادت پڑ گئی ہے خواجواہ اس زبان کو چلنے کی ورنہ آپ کی بات تو دو سہری ہے جتا میں نا گل جی! پہلی

کو۔" اس نے زیور گلہ کی ہمدردی حاصل کرنا چاہی، اگرچہ دل میں بہت کلس رہا تھا اتنے ناز تو اس نے کسی بیویوں کے بھی نہیں اٹھائے تھے۔ یوں عین عین کرنا اس کی عادت نہیں تھی۔ لڑکیاں تو خود اس کے قدموں میں بچھ جاتی تھیں۔ سب سے کامیاب ہدایت کار تھا وہ آج قلم اینڈ سٹری کٹ۔

"لکنا ہے نہیں! اٹھک گئی ہے۔ سچ سے تو کام کر رہی ہے۔ مسلسل دگھنٹے سے آپ کی ریسرسل ہی ختم نہیں ہو چا رہی۔ گیارہ بجے سے شروع ہوئے تھے اور اب دو بجے کو ہیں۔ قریبی جی! میرا خیال ہے اتنی ریسرسل کافی ہے، آج پہلا دن ہے نا اور تارا کو تو عادت بھی نہیں ہے اتنا کام کرنے کی کھر میں بھی باسٹر صاحب صرف ایک گھنٹہ ریاض کرواتے ہیں پھر دو تین گھنٹے ریسٹ کے دیتے ہیں۔ بہت نازک ہے میری بیٹی! آپ اس کو اپنی دو دو تین تین من کی بیویوں یا سنگرنہ سمجھیں جن کا سارا زور اپنا وزن بڑھانے پر ہوتا ہے اور کام زیور۔ اور میری بیٹی کا تو آج پہلا دن ہے کیوں نیو! اٹھک گئی ہونا؟"

وہ ایک بار پھر عین تارا پر جھکی۔

"ارے لڑکے ایک کلاس اہل جوس کا تو لاؤ کچھ اس میں جان پڑے۔ دیکھو ان تین گھنٹوں میں اتنی سی شکل نکل آئی ہے میری بیٹی کی۔"

زیور گلہ کے لاڈلے قریبی کو آگ ہی لگ گئی مگر کیا کرنا اس آگ کو رستہ نہیں دکھا سکتا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے تو وہ دونوں آئی تھیں۔ ایک گھنٹہ پھر سے میگیٹاپ فریش کرنے میں لگا یا صرف پینتیس منٹ کی ریسرسل ہوئی تھی جس میں یہ نازک پری تھک کر چور ہو گئی تھی اور اب قریبی کو نظر آ رہا تھا کہ یہ تیل مشکل سے منڈھے چڑھے کی چلو اچھا ہے نہ گانے گانے تو میں کسی سے کروا ہی لوں گا مگر یہ ہاتھ آئے تو سہی جس کے لیے اتنی موٹی رقم کا چیک اس حرام خورد برد کا لکھ کر دیا تھا۔

قریبی نے نظر بھر کر عین تارا کے نازک بدن کو دیکھا، اس کے سارے جسم پر جیسے چوہنیاں سی ریگنیے لگی تھیں۔ دل چاہا یہاں کھڑے کھڑے اپنا سارا بدن کھرچ ڈالے۔ عجب سی وحشت اس کے سر پر سوار ہو رہی تھی۔ نظروں میں صرف عین تارا کا گریا سا بدن سا گیا تھا، باقی سب لوگ آؤٹ آف فوکس ہو گئے تھے۔

"چلو چنوا! جو سنی کر گھر چلتے ہیں تم جا کر ریسٹ کرو، تمہیں تمہاری طبیعت ہی خراب نہ ہو جائے۔ مجھے اپنی بیٹی کی صحت سے بڑھ کر کچھ بھی عزیز نہیں کیوں قریبی! اٹھک ہے نا؟"

عین تارا اپنے چھوٹے سے دہانے سے اہل جوس کے غصے غصے سب لے رہی تھی۔ زیور گلہ کی آواز نے ایک بار پھر سارے عطر میں جان بھری تھی۔ سب پھر سے قریبی کو اپنی جگہ پر نظر آنے لگے۔ ہزار شیشے کی بیروٹین، بیروٹین میں بیٹھے آؤیو ایڈیٹرز اور کرسی پر بیٹھی عین تارا اور اس پر جھکی زیور گلہ۔ اس نے ایک گرا سانس لیا۔ عین تارا تک رسائی ناممکن نظر آ رہی تھی۔ قریبی کی سانسیں ناہموار ہونے لگیں۔ قریبی سٹیشن کو ہی رستہ نظر آیا تھا وہ ہانپتے ہوئے صوفے پر ڈھے گیا اور جیب سے Inhaler (دسے کے مریضوں کے لیے دوا) نکال کر لیے لیے سانس لینے لگا۔ اس پر استھما کا شدید دورہ پڑا تھا۔ زیور گلہ نے ہیزاری سے اس کو شت کے پہاڑ کو دیکھا اور عین تارا کو اٹھنے کا اشارہ کرنے لگی۔

"نام! آپ نے مجھے یہ کس فضول کام میں لگا دیا ہے اور یہ بندہ سب سے بڑھ کر فضول ہے۔ اف مائی گاڈ! اس بیوہ شخص کو برواشت کرنے کے لیے پھر کے اعصاب ہونے چاہئیں۔ مام! میں اس کے ساتھ کام نہیں کر سکتی۔"

اسٹوڈیو سے نکلنے ہی عین تارا شروع ہو گئی وہ سخت ہزار تھی۔ شاہ جی کی بے اعتنائی کا بدلہ لینے کے لیے اس نے جو ایڈوٹو شروع کیا تھا اس کا پہلا موڑ ہی اسے اتنا دور بچے کی کوڈت میں جتا کر گیا تھا۔

"عین تارا! یہی شخص تمہارا اینڈ سٹری میں مقام بنائے گا تمہیں کیوں بھول جاتی ہو۔ اس وقت یہ اینڈ سٹری کا سب سے مضبوط ہلہ ہے۔ یہ کرے گا تو اینڈ سٹری طے گا ڈھیر بن جائے گی اور دوسرے ہم اس سے ایڈوائس کے طور پر

ساری رقم لے چکے ہیں۔ اب تو ایگریمینٹ پورا ہی کرنا پڑے گا۔" زیور گل نے اسے سمجھایا۔

"میں ایسے کسی چھوٹے کو نہیں مانتی۔ میرے اکاؤنٹ میں اتنی رقم موجود ہے کہ میں اس بے ہنگم شخص کے منہ پر بار سکوں۔ سام! مجھے اس شخص کے ساتھ کام نہیں کرنا۔ دوسرے گانا بے حد مشکل کام ہے اور محنت طلب بھی۔ مجھ سے نہیں ہو گا اور اس طرح تو بالکل بھی نہیں ہو گا جس طرح کی اس آپ لگا کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ تیسرے میں خود کو بہت کھٹی فیل کرتی ہوں کہ میں نے شاہ جی کو بیٹھا کیا ہے۔ جس دن آپ میرے اس دھوکے کا علم ہو گیا، ان کا اعتبار ہی مجھ سے اٹھ جائے گا۔ اس وقت آپ تو پیچھے ہٹ جائیں گی، میں ہی شاہ جی کی نظروں میں معتوب ٹھہریں گی۔ وہ ویسے بھی اسی ہفتے واپس آ رہے ہیں اور یہ سہرا سل و جیوہ میں ان کی موجودگی میں تو بالکل نہیں کر سکتی۔ کسی نہ کسی دن بات کھل جائے گی اور نتیجہ کیا ہو گا۔ مجھے اس نتیجے کی پروا زیادہ ہے۔ ہر بات سے زیادہ سام! میں شاہ جی کی محبت سے محروم نہیں ہونا چاہتی۔ سام! Heismy love! (وہ میری محبت ہے) میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتی اور ان کو دھوکا دینے کا مطلب ہے ان کی محبت سے محرومی اور یہ میں کسی صورت میں گوارا نہیں کروں گی۔ میں کل سہرا سل پر بالکل نہیں آؤں گی۔ آپ اس گوشت کے پہاڑ سے ایگریمینٹ کیسے کر سکیں گی۔"

گٹھڑی جیسے ہی پوریج میں رکی نین تارنے اپنی بات ختم کی۔ گاڑی کا دروازہ کھولا اور تھوڑے قدموں سے اندر کی طرف برہہ گئی زیور گل کا جواب سنے بغیر۔

"شاہ جی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تیری ایسی محبت کو میں آگ نہ لگا دوں گی جو ہمارے پیشے کے درمیان حائل ہوگی۔ نین تار تو میری بیٹی ہے تو یاد رکھ میں تیری ماں ہوں اور ہمارا پیشہ صرف وہی ہے میں خود ہی چاہتی ہوں تو شاہ جی کے بغیر نہ رہ سکے مگر ایک شاہ جی نہیں۔ ہر موڑ پر جتنے شاہ جی ملیں وہ سب تیرے لیے ضروری ہو جائیں گے یہ کبھی نہ لکھی شاہ جی جیسوں پر مرنی ہے اور میں اس لکھی دیوی پر۔ ساری عمر اس کے ساتھ میں گزار دی ہے۔ اب وہ یہ قابو آئی ہے۔ ایسے کیسے ہار مان لوں۔ دیکھتی ہوں کون کون سا باب ہوتا ہے۔ میری محبت یا میری دیوانگی۔

زیور گل غصے سے بھٹاتے ہوئے گاڑی سے اترتی اور نین تار کے پیچھے چلی گئی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں راجدلی بی! صوفی صاحب کی حیرت بھری آواز خاموش فضا میں گونجی۔ "تمہارا شاید آدھی رات کو داغ چل گیا ہے جو ایسی نفلہ بات کر رہی ہو۔ کیا ایسے ہو سکتا ہے میں تمہیں چاہتا۔ تم کو غلط قسمی ہوئی ہوگی وہ کوئی اور ہو گا۔"

یہ بات جتنی صوفی صاحب کے لیے شاکنگ تھی اس سے زیادہ عبدالمبین کے لیے تھی۔ وہ درود کے لیے دعا مانگا۔

باغیانہ خیالات کے ساتھ ہی اس کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔ آنکھیں موٹے موٹے آنسوؤں سے بھر گئیں۔ کافی دیر گزر گئی اس نے آنسو خشک کر لیے۔

"مجھے خود جانا چاہیے اماں جی کے پاس اور انہیں بتانا ہوں میں صبح ہی یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا اور پھر واپس نہیں آؤں گا۔"

وہ دل میں ارادہ کر کے چارپائی سے اٹھا۔ وردی ٹیس کی وجہ سے اس کے منہ سے "سی" کی آواز نکلی۔ اچھی بے بسی پر اور دل بھر آیا۔ وہ بمشکل اٹھ کر دروازے تک ہی گیا تھا کہ اسے صوفی صاحب کے کھٹا ہارے اور گھر میں داخل ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس کے قدم وہیں جم گئے۔ صوفی صاحب با آواز قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"اب یہ اماں جی سے میری خوب شکایت لگاؤں گے اپنی طرف سے سارا قصہ بڑھا چڑھا کر بیان کریں گے مجھ کو۔ وہ بھی پوری کریں گے۔ کہیں پھر نہ دوبارہ میری مرمت کرنے اور اٹھا جائیں۔ ابھی ان کا دل بھر ہی کہاں تھا اگر صاحب ہاتھ نہ روک لیتے تو ان کا وحشی پن اتنی جلدی کب اترتا ہے پتا نہیں کون کون سے بولے مجھ سے لیتے رہتے ہیں۔ عبدالمبین صبح رہا ہے نا جو شہر چلا گیا ہے ان کے مقابلے سے جان چھڑا کر۔"

وہ تنفر سے سوچتا ہوا ان کے کمرے کی طرف بڑھا کمرے میں مدھم سی روشنی تھی۔ اماں جی آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہی تھیں۔

"تو اماں جی جاگ رہی ہیں پھر بھی میرا بتا نہیں کرنے آئیں۔ یہ بھی بابا صاحب کی بیٹی ہیں ان کی فحش کے ڈر سے میرے پاس نہیں آئیں۔ کیا فائدہ ایسی ماں کا۔ مجھے تو لگتا ہے میں ان دونوں کا بیٹا ہی نہیں انہوں نے مجھے کسی کو بڑے کے ڈر سے اٹھایا ہو گا۔ اسی کی سزا دے رہے ہیں یہ مجھے۔" اماں جی کے جانے کا پتا چلتے ہی وہ سٹک گیا۔ غصے سے سوچتا ہوا کمرے کی آگ کی کھلی کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا کہ اپنے متعلق مزید ان دونوں کے خیالات جان سکے۔

"میں خدا کا شکر کس زبان سے ادا کروں کہ اس نے ہماری عزت و افتادار ہونے سے بچالی۔ اگر میں ہر وقت نہ پہنچتی تو آج چھوٹے شاہ جی کی عیاشی کی نذر ہو جاتی۔ صوفی صاحب! ہم کسی کو منہ دکھانے کے قائل نہ رہتے ان کو تو کوئی اف بھی نہ کرتا۔ میں ابھی اتنی بوڑھی نہیں ہوتی کہ چھوٹے شاہ جی کو نہ پہچان سکوں اور آپ کہہ رہے ہیں مجھے غلط قسمی ہوئی ہوگی۔ اچھی اتنی نہیں سمجھائی ہیں۔"

اماں جی کے منہ سے اٹھنا انکشاف سن کر وہ اپنی جگہ جیسے پتھر کا ہو کر رہ گیا۔ اماں جی بولتے بولتے اب رونے لگی تھیں۔ صوفی صاحب بھی حیرت زدہ سے چپ تھے کتنی دیر تک تو ان کے منہ سے کچھ بھی نہ نکل سکا۔

"میں کھانے کا سہلا لقمہ اٹھاتے ہی میرے دل کو کچھ ہوا کہ میں آمنہ اور زینب کو کھوں۔ دونوں شہرینہ کے ساتھ دلہن کا گھر دیکھنے گئی تھیں۔ زینب تو وہیں مجھے کھانا کھاتی نظر آئی مگر آمنہ مجھے نہ مل سکی اور میرا دل کے جا رہا تھا کچھ غلط ہونے والا ہے۔" اماں جی نے زور سے اپنی ناک رگڑی۔

"تم نے ان دونوں کو شہرینہ کے ساتھ جانے ہی کیوں دیا۔" صوفی صاحب کی لرزتی ہوئی آواز کمرے کی تاریک فضا میں بولے سے ابھری۔

"لو کیاں بالیاں ہیں شوق ہوتا ہے انہیں دلہن کا گھر دیکھنے کا۔ اب مجھے کیا علم کہ یہ۔ مجھے تو سوچتے ہوئے بھی شرم آتی ہے چھوٹے شاہ جی۔ انہوں نے آمنہ کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اسے کمرے میں لے جا چکے تھے اور شاہ جی دروازہ بند کرنے لگے تھے کہ میں نے آمنہ کا ہرا دیشہ دروازے میں سے اندر جاتے دیکھ لیا۔ میں نے اسے اسی پل پکار لیا تو اس شیطان کے کے قدم بھی رک گئے اور دیدہ دلیری دیکھیں کوئی شہر مندگی کوئی شہر ساری نہیں۔ صوفی صاحب! اگر ہم جیسے لوگوں کی عزت رہاں محفوظ نہیں وہ بھی شاہوں جیسے بظاہر نیک لوگوں کے ہاتھوں تو عام آدمی کا سوچیں پھر میں وہاں کیسے رکتی۔ میں اللہ پاک کا کیسے شکر ادا کروں۔"

وہ پھر سے رونے لگیں اور صوفی صاحب تو جیسے کچھ بول ہی نہ پارہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں اس واقعے کی توجیہ گھڑ رہے تھے شاید۔

”اس لیے تو جب بی بی پیدا ہوتی ہے تو ایک بار دل کانپ جاتا ہے ورنہ آمنہ جیسی بیٹیاں کبھی زندگی میں دکھ دے سکتی ہیں۔ اتنی اچھی اتنی سعادت مند۔“ اماں جی بولیں۔

”معم نے آمنہ سے نہیں پوچھا اس کا کیا کام تھا یوں اکیلے میں اوپر جانے کلمہ چھوٹی بی بی اسے چھوڑ کر کہاں گئیں۔“ صوفی صاحب کا دل دیر بعد بولے۔ شاید وہ ابھی بھی شاہ جی کو مورد الزام ٹھہراتے بیچپن رہے تھے۔

”وہ تو اس قدر سہمی ہوئی تھی میں اس سے کیا پوچھتی۔ صوفی صاحب! ہمارے گھر کا ماحول آپ کے سامنے ہے کوئی غلط بات آپ کو کم از کم آمنہ کے متعلق نہیں سوچنا چاہیے۔ خدا جانے شہین بی بی اسے یوں تنہا چھوڑ کر

کیوں گئیں اور چھوٹے شاہ جی کہاں سے آئے۔ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے مگر اب میرا دل تو بہت ڈر رہا ہے صوفی صاحب! ہم بہت کمزور لوگ ہیں بہت کمزور۔ اگر ایسی کوئی بات خدا نخواستہ پھر ہو جائے ہم تو کچھ بھی کرنے جو گے

نہیں۔ ہماری بیٹیاں ہیں اور آگے پیچھے کون سے فیصلے کئے والے ہیں دو چار رشتہ دار ہیں وہ بھی ہمارے طرح روٹیاں گین گین کر پکانے والے۔ ہم شاہوں کے مقابل کہاں آسکتے ہیں اور چھوٹے شاہ جی۔ صوفی صاحب!

ایک بار مرو کی نظر کہیں ٹھہر جائے تو اس سے چھپنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میرا دل ڈر رہا ہے۔ جی چاہ رہا ہے اپنی بیٹیوں کو کہیں جا کر چھپا دوں۔ انہیں تو اتنی بھی حیا نہیں آئی کہ کل ان کی شادی ہونے والی ہے۔ ان کے گھر والوں کو ان کی ہونے والی بیوی کو پتا چلے تو ان کا کردار کتنا کر جائے گا مگر یہاں نہیں بڑے لوگوں کا کردار کن چیزوں سے گرتا

اور اونچا ہوتا ہے پھر ہمارے لیے تو کردار اور بد کرداری میں عزت ہوتی ہے۔ صوفی صاحب! کچھ تو ہمیں مجھے تسلی دیں میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔“

اماں جی گھبرائی ہوئی تھیں کبھی رونے لگتیں اور کبھی تارل ہو جاتیں اور پھر کلمے عبدالتین کا دل چاہ رہا تھا جا کر چھوٹے شاہ جی کا گلا دبا دے یا اسے کوئی مار دے۔ وہ اپنا سارا اور دیکھیں کیا تھا اسے تو آمنہ سے بیار بھی اس قدر تھا۔ کبھی اس سے معمولی سا جھگڑا بھی اس نے نہیں کیا تھا اور آج اس کے ساتھ شاہ جی نے ایسی گھٹیا حرکت

کر دی۔

”میری معصوم بہن کس قدر ڈری ہوگی۔ یا اللہ! تو نے ظالموں اور شیطانوں کو اس قدر طاقتور کیوں بنایا ہے۔“ اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔

”میں کیا تسلی دوں تمہیں میں خود ریشاں ہو گیا ہوں۔ بات ہی ایسی ہے اور بی بی چھوٹی تو یہ سب جھوٹ بھی نہیں ہو سکتا۔ چھوٹے شاہ جی کی رپورٹ واقعی اچھی نہیں ہے۔ یہ تو بڑے شاہ جی ہیں جو ان کے گندے چہرے پر اپنی نیکیوں کا پردہ ڈالے بیٹھے ہیں ورنہ۔“ صوفی صاحب کچھ کہتے رک گئے۔

”سننا ہے چھوٹے شاہ جی تو شادی پر راضی ہی نہیں تھے انہیں سیدہ بی بی کی یہ مند پند ہی نہیں تھیں۔ بہت عرصے سے بڑے شاہ جی ان پر دباؤ ڈال رہے تھے مگر وہ راضی نہیں ہوتے تھے اور سننا ہے انہوں نے کہیں شہر میں

بھی کسی سے شادی رچا رکھی ہے یا کوئی رکھیں رکھی ہوئی ہے جو بھی کہانی ہے بہر حال ان کی شہرت اس معاملے میں ہرگز قابل بھروسہ نہیں۔ بہت کچھ سن رکھا ہے جو یوں تک نہیں آسکتا مگر ان سب باتوں کے باوجود آج جو کچھ

ہمارے ساتھ ہوا اس سے واقعی میرا بھی دل ڈر رہا ہے پھر ہم واقعی بہت کمزور لوگ ہیں۔ اللہ نے گناہگار کے لیے سزا اور نیکو کار کے لیے جزا کا اعلان تو کر رکھا ہے مگر گناہگاروں کو جب وہ ڈھیل دیتا ہے اور مظلوم جب اس ڈھیل کی روش آتے ہیں تو پھر اللہ فوری طور پر سزا دینے کے لیے نیچے نہیں آتا بلکہ مظلوموں کو اپنے لیے خود ہی کچھ کرنا

پڑتا ہے اور مجبوروں کا آج کل دور نہیں۔“

وہ اندھیرے میں نامعلوم نعلے پر نگاہیں جمائے بہت آہستہ آہستہ بوجھل لہجے میں بول رہے تھے۔ باہر رات کی خاموش فضا تھی اس لیے باہر کھڑے عبد العین اور دوسرے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی آمنہ کو ان کی باتیں صاف

سمجھ میں آ رہی تھیں۔ لہٰذا اور ہوریہ تو کب کی سوچتی تھیں آج اس کی زندگی نے شعور کی پہلی پیڑھی پر قدم رکھا تھا اور پہلے قدم نے ہی اس کی نیند اچھلی تھی۔

”اگر شعور اس قدر اذیت ناک ہوتا ہے تو خدا یا تو کسی اچھی لڑکی کو یہ شعور نہ دے، یہ بہت خوف ناک ہے بہت ڈر والا۔ وہ کھڑکی کی چوکھٹ سے لگی چپکے چپکے روتے جا رہی تھی اور اتنے بھیا نک واقعے کو ذہن میں لاتے ہوئے بھی

ڈر رہی تھی جس نے اس کے ماں باپ کی نیند بھی اڑا دی تھی۔“ اور جو بھومر کا واقعہ ہوا ہے وہ؟“ اماں جی کو یاد آیا۔

”اللہ بہتر جانتا ہے ہم بندے تو صرف قیاس کر سکتے ہیں۔“ صوفی صاحب کھل کر اس بات پر اپنی رائے نہیں دینا چاہتے تھے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔

”بہت خوبصورت تھی بھومر اور گاؤں کی سب ہی عورتیں یہی کہہ رہی تھیں کہ چند ہی دنوں میں اس کا حویلی میں بہت آنا جانا ہو گیا تھا۔ منشی کا بیٹا تو یوں ہی مفت میں مارا جائے گا۔“

”راجہ بی بی! اوہر اوہر کی باتوں پر جتنا سوچو گی اتنا ہی ذہن خراب ہو گا۔“ صوفی صاحب شاید اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتے تھے تو ک کر بولے۔

”صوفی صاحب! میں تو وہ باتیں کرتی ہوں جن پر سوچ کر زندہ کسی نتیجے پر پہنچتا ہے۔“ دیکھا مطلب؟“ صوفی صاحب چونکے۔

”بڑے شاہ جی حج کرنے جا رہے ہیں۔“

”ہاں یہ تو سب کو پتا ہے شاہ جی شادی کے اگلے ہفتے ہی جا رہے ہیں شاید۔“

”اور آج چھوٹے شاہ جی کی دستار بندی بھی ہو چکی ہے حج کی مدت تو چلو مینے دو مینے کی ہوگی مگر اس کے بعد بڑے شاہ جی اپنے علاج کے لیے شاید ولایت بھی جائیں گے سننا ہے۔“ اماں جی بولیں۔

”نہیں تو پھر وہاں آئیں بہت دن تک جائیں گے اس دوران سب کچھ چھوٹے شاہ جی سنبھالیں گے۔“ ظاہر ہے۔

”یہی بات تو صوفی صاحب! مجھے ہوا ہے دیکھ رہی ہے۔“

”کچھ نہیں ہو تا راجہ بی بی! یوں ہی ڈر رہی ہو۔ میں بڑے شاہ جی سے بات تو نہیں کر سکتا کہ ایسی بات سن کے تو وہ میری کھال ہی کھینچو اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے۔“ کچھ کچھ تم بھی صحیح کہہ رہی ہو۔“ وہ پھر سوچ میں پڑ گئے۔

”بیٹیوں کے معاملات صوفی صاحب! بہت نازک ہوتے ہیں، آپ کو تو معلوم ہے وہ بڑے شاہ جی کے جاتے ہی کوئی ایسا حکم دے دیں۔ کوئی ڈروا، کوئی پیشکش، کوئی دھمکی، صوفی صاحب! ہم تواف بھی نہیں کر سکیں گے۔“ اماں جی بہت ڈر گئی تھیں۔

”پھر کیا کریں؟“ صوفی صاحب کا سارا جلال اوپری تھا یا پھر بیٹیوں کے معاملے ہی ایسے ہوتے ہیں کہ بڑے سے بڑا طرفہ خان بھی خود کو بہت بے بس محسوس کرنا ہے۔

”صوفی صاحب! ایک طرفتہ ہے۔“ اماں جی بولیں۔

”دیکھا؟“ انہیں تو اس اندھیرے میں کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔

”ہم آمنہ کا نہیں آج کل میں نکاح کر دیتے ہیں۔“ اماں جی کی بات جتنی صوفی صاحب کے لیے اچانک تھی اتنی ہی آمنہ اور عبد العین کے لیے بھی۔

”نکاح! وہ حیرت سے اچھلے۔“ وہ بھی آج کل میں ناممکن۔“ انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اتنی جلد ہی اور اچانک! اول تو رشتہ دعوت نہائی ناممکن ہے پھر بڑے شاہ خاں کے کہ بالا ہی بالاسب کام کر لیے ہیں۔“

”ہماری بیٹی کا معاملہ ہے، کل کلاں کو کوئی اونچ نیچ ہو جاتی ہے تو کون ذمہ دار ہو گا۔ بڑے شادی اس وقت بیٹے کو قصور وار ٹھہرائیں گے؟ کبھی نہیں۔ ہمیں ہی کچھ سوچنا ہو گا۔“

”سوچتے ہیں مگر نکاح نہیں اس پر تو سب لوگ اس اچانک افتاد کی وجہ پوچھیں گے کہ اچانک صوفی صاحب کو کیا سوچھی۔ کل شادی ہے پھر جانے کا کیا کرنا ہے؟“

”میں نہیں جاؤں گی تو سیدہ کا عتاب کون جھیلے گا اور اب میں ادھر بچوں کو بالکل نہیں لے کر جانا چاہتی اور انہیں گھر میں ایسا کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔“ اماں جی کی جان و سوسوں میں گھر گئی تھی۔

”تم تو بہت ڈر گئی ہو اور اب بی بی! چلو اللہ بستر کرے گا۔ میں کچھ سوچتا ہوں۔ کوئی نہ کوئی حل نکالنا ہی پڑے گا، کیونکہ بڑے شاہ جی کے جاتے ہی چھوٹے شاہ جی کو کھلی چھٹی مل جائے گی پھر وہ تو ہم بیسوں کو کچھ سمجھتے بھی نہیں کچھ نہ کچھ سوچنا پڑے گا۔ تم بھی اب سو جاؤ آمنہ سو گئی؟“

”سو گئی ہوگی بیٹی کا اتنا سامنا نکل آیا تھا۔“ وہ فکر مندی سے بولیں۔

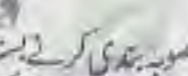
”غلطی تمہاری ہے، تمہیں ان کو ایسا جانے ہی نہیں دینا چاہیے تھا سو جاؤ اب۔“ کہہ کر شاہ جی کو بستر لیٹ گئے تھے۔ اماں جی کچھ دیر چپ بیٹھی رہیں پھر وہ بھی لیٹ گئیں اور باہر کھڑے عبدالرحمن کے کمر میں تو جیسے چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔

”چھوٹے شاہ جی کی بے راہ روی کی سزا میری بہن کیوں نکلتے کہ اسے بلند بازی میں کسی ایسے ویسے بابا صاحب جیسے موبوٹی کے پلے سے باندھ دیا جائے جو ساری زندگی اس سے کسی بے رحم و درندے کا سلوک کرے۔ نہیں، میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ آمنہ کا نکاح بھی میں نہیں ہونے دوں گا۔ بابا صاحب اپنے جیسا کوئی قصائی ڈھونڈ لیں گے۔“ وہ بولیں کمرے کی طرف مڑا۔

”اور چھوٹے شاہ جی آپ کو تو میں ایسا منہ چکھاؤں گا اس گھنڈی حرکت کا کہ آپ ساری زندگی اپنے ہی چائے چاہتے رہیں گے تب بھی مجھے آپ پر ترس نہیں آئے گا۔ عزت جیسا کہ تم جیسے کمزور لوگوں کی نہیں ہوتی۔ تم جیسے ظالموں کی بھی تو ہوتی ہے اور میں دیکھوں گا تم کس طرح اپنی دولت سے اپنی عزت کی تار تار چادر کو بستے ہو میں دیکھوں گا۔“

وہول میں پختہ ارادہ باندھتا ہوا مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے بستر پر اتر گیا۔

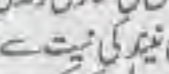
اور آمنہ کو لگا اماں جی نے اس کے نکاح کا کہہ کر اس کے وجود کو کسی سولی پر لٹا دیا ہے۔ اس گناہ کی پاداش میں جو اس نے کیا ہی نہیں اور اب کب اس کا وجود اس سولی سے نیچے اتارا جائے گا اسے کچھ پتا نہیں تھا۔



دستار بندی سے لے کر مندی کی رسم تک مندی سے لے کر سہرا بندی تک اور پھر رات کی روائی سے لے کر واپسی تک سیدہ کا دل سلطان بخت کا ہزار موڈ دیکھ کر اتنا سیدھا دھڑکتا ہی رہا۔ انہیں لگا ابھی سلطان بخت ساری رسیاں تڑا کر نہیں بھاگ جائیں گے اور ان کی ساری زندگی کی محنت اکارت علی جائے گی۔ مندی کی رات سے رات کی صبح تک انہوں نے ایک بار بھی نیند کی نیت سے آنکھیں بند نہیں کیں۔ طے پیر کی ٹلی کی طرح سلطان بخت کے کمرے کے باہر بیڑھیوں میں جو ٹلی کے کمروں میں بڑی کے بکسوں اور زیور کی تساری کے پاس ہی یا رہا رہ سکتی رہیں ایک بار جب بڑے شاہ جی تہجد کے لیے اٹھے تو سیدہ کو یوں بے قراری سے اوھرا دھڑ پھرتے دیکھا تو ٹوک دیا۔

”تم بھی سو جاؤ سیدہ! اب ساتویں رات گزر گئی۔ چند گھنٹے آرام کرو، کل پھر بہت کام ہو گا۔ تمہاری آنکھیں لال سرخ ہو رہی ہیں؟“

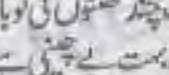
”نہیں بابا جان! مجھے نیند نہیں آرہی اور اب چند گھنٹوں کی تو بات ہے۔ صالحو اس گھر کی روشنی بن کر آجائے گی تو پھر میں خوب چینی کی نیند سوں گی۔ ابھی تو مجھے بہت بے چینی ہے۔“



”مہو نہ! سنبھال تو لے گی نا جیسے اس عمر میں بھی مجھے اماں جان کی ضرورت ہے۔ کوئی نادان بچہ ہوں میں جسے اس کی سرپرستی اس کی متا کی ضرورت ہے۔ بڑی آیا یہ کیوں نہیں سمجھتیں، مجھے اس عمر میں ماں کی نہیں ایک سا بھی ایک خوبصورت ہم سفر کی ضرورت ہے۔ جو گلیوں کی طرح ان پھولوں کی طرح شگفتہ اور رنگوں



”مہو نہ! سنبھال تو لے گی نا جیسے اس عمر میں بھی مجھے اماں جان کی ضرورت ہے۔ کوئی نادان بچہ ہوں میں جسے اس کی سرپرستی اس کی متا کی ضرورت ہے۔ بڑی آیا یہ کیوں نہیں سمجھتیں، مجھے اس عمر میں ماں کی نہیں ایک سا بھی ایک خوبصورت ہم سفر کی ضرورت ہے۔ جو گلیوں کی طرح ان پھولوں کی طرح شگفتہ اور رنگوں



”مہو نہ! سنبھال تو لے گی نا جیسے اس عمر میں بھی مجھے اماں جان کی ضرورت ہے۔ کوئی نادان بچہ ہوں میں جسے اس کی سرپرستی اس کی متا کی ضرورت ہے۔ بڑی آیا یہ کیوں نہیں سمجھتیں، مجھے اس عمر میں ماں کی نہیں ایک سا بھی ایک خوبصورت ہم سفر کی ضرورت ہے۔ جو گلیوں کی طرح ان پھولوں کی طرح شگفتہ اور رنگوں

”صرف بے چینی سے بھائی کی شادی کی خوشی نہیں۔“ وہ ذرا سا ہنسے۔

”بھائی خوش نہیں تو مجھے کیا خوشی ہوگی۔“ وہ بڑبڑائیں۔

”ایسا کہا تم نے؟“ وہ کچھ جو کہے۔

”کچھ نہیں بابا جان! خوشی بے چینی ہی تو ہے جس نے میری نیند اجاٹ کر دی ہے، بس اب تو وہ خوشی بھرالحو آئے ہی والا ہے۔ کچھ نفل پر عموں کی اتنے میں بخر ہو جانے کی نماز پڑھ کر ایک چکر گھر کا بھی لگاؤں گی۔ سہرا بندی سے پہلے واپس آجاؤں گی پھر رات کی روائی۔ تو اب سونے کا وقت ہی کون سا ہے، اب تو مصروفیت کا وقت ہے۔ آپ جا کر آرام کر لیں، آپ کے لیے جاگنا اور بے آرام رہنا درست نہیں۔“ وہ باپ کو مطمئن کرتے ہوئے بولیں۔

”میں آرام کر چکا۔ اب سلطان کے سہرا بندھنے کا انتظار ہے۔ اللہ مجھے وہ گھڑی دیکھنا نصیب کرے۔“

”آمین!“ سیدہ بے اختیار بولیں تو وہ مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف مڑ گئے۔ سیدہ نے ایک گہرا سانس لیا اور سر اٹھا کر سلطان بخت کے کمرے کی طرف دیکھنے لگیں جس کی لائٹ ساری رات تپتی رہی تھی اور کتنی یار جب وہ کمرے کے پیچھے سے گزریں ان کے بولنے کی آواز بھی آرہی تھی۔ شاید وہ موبائل پر کسی سے باتیں کرتے رہے تھے۔ سیدہ نے وہ پورا پورا کان دروازے سے لگائے بھی مگر ان کے خاکے بولے نہ پڑا تھا۔ کچھ دو تین دن سے وہ پھر نہیں اچھا اچھا سا دیکھ رہی تھیں۔ یہی بات ان کے لیے پریشانی کا باعث تھی۔ ایسے موڈ میں سلطان بخت کچھ بھی کر سکتے تھے۔ پتا نہیں انہیں کس کی شرم روکے ہوئے تھی یا شاید سیدہ کی دعا میں اثر دکھارہی تھیں جو وہ دن رات چپکے چپکے اللہ سے اپنی عزت رکھنے کے لیے کیے جا رہی تھیں۔

اور سیدہ سمجھتی تھیں کہ سلطان بخت سے ان کی بے چینی مخفی ہے، حالانکہ اندر لیے سلطان بخت کو معلوم تھا سیدہ کس طرح ان کے کمرے کے پیچھے لگا رہی تھیں۔ بار بار آکر کی ہول سے دیکھنے کی کوشش کرتیں اور جب وہ موبائل پر کسی نمبر پر کال کر لیتے تو کوئی سا یہ سا کیوں دروازے سے چپک جاتا ہے۔ سلطان بخت کو اپنا آپ کسی بے بس پرندے کی طرح لگ رہا تھا جس کے پر کاٹ کر اس کمرے میں مقید کر دیا گیا ہو۔

ان کے بر تو بڑے شاہ جی کی روائی نے باندھ رکھے تھے یا پھر سیدہ کی ہزار منتوں نے سیدہ کی تیس سالہ ازدواجی زندگی کی بقائے ورنہ وہ اس عورت کو صاف سے کبھی شادی نہ کرتے جو کل آکر اس بیڈروم کے سارے حقوق شیئر کرنے والی تھی۔ یہی سوچ سوچ کر ان کا مزاج بے حد بڑبڑاتا تھا۔

صالحو کا سوچ کر ہی ان پر کوفت سوار ہونے لگتی تھی۔ انہیں بڑی عمر کی بچی کی عورتیں سخت ناپسند تھیں جو ہر بات ہر کام میں اپنی رائے کو آخری اور حتمی سمجھتی ہیں۔ ایسی بیبیجو رچنے پونے عورتوں کا خیال ہوتا ہے جس قدر بچہ ان میں سے اتنی کسی میں بھی نہیں۔ انہوں نے ہوش سنبھالا تو حویلی کی بوڑھی ملازما میں انہیں بے پناہ متا دینے کی کوشش کرتیں۔ ایک اماں جان کیا اس جہان سے انہیں لگان کے ارد گرد موجود ہر عورت نے ان کے لیے اماں کا کاروبار دھار لیا ہے اور سب ہی اپنی متا کے خزانے سلطان پر لٹانا چاہتی ہیں، جوان سیدہ تو اماں جان کی آنکھیں بند کرتے ہی ان کی سیٹ پر آٹھنسی تھیں ان کی پیدائشی گارڈین۔

”سلطان! یوں نہ کرو پادش میں نہ بھاگو، ملازموں کو منہ نہ لگاؤ، بیچوں جیسی حرکتیں نہ کرو، یہ تمہیں زیب نہیں دیتا، تم اس حویلی کے وارث ہو، عقل سے کام لو۔ اچھا ہو اماں جان تمہاری نسبت صالحو سے طے کر لیں، صالحو تو بہت سمجھ دار ہے، ہر کام پھونک پھونک کر کرنے والی بہت عقل مند، تمہاری طرح لاپرواہی نہیں، کم از کم تمہیں سنبھال تو لے گی نا۔“

”مہو نہ! سنبھال تو لے گی نا جیسے اس عمر میں بھی مجھے اماں جان کی ضرورت ہے۔ کوئی نادان بچہ ہوں میں جسے اس کی سرپرستی اس کی متا کی ضرورت ہے۔ بڑی آیا یہ کیوں نہیں سمجھتیں، مجھے اس عمر میں ماں کی نہیں ایک سا بھی ایک خوبصورت ہم سفر کی ضرورت ہے۔ جو گلیوں کی طرح ان پھولوں کی طرح شگفتہ اور رنگوں

”مہو نہ! سنبھال تو لے گی نا جیسے اس عمر میں بھی مجھے اماں جان کی ضرورت ہے۔ کوئی نادان بچہ ہوں میں جسے اس کی سرپرستی اس کی متا کی ضرورت ہے۔ بڑی آیا یہ کیوں نہیں سمجھتیں، مجھے اس عمر میں ماں کی نہیں ایک سا بھی ایک خوبصورت ہم سفر کی ضرورت ہے۔ جو گلیوں کی طرح ان پھولوں کی طرح شگفتہ اور رنگوں

”مہو نہ! سنبھال تو لے گی نا جیسے اس عمر میں بھی مجھے اماں جان کی ضرورت ہے۔ کوئی نادان بچہ ہوں میں جسے اس کی سرپرستی اس کی متا کی ضرورت ہے۔ بڑی آیا یہ کیوں نہیں سمجھتیں، مجھے اس عمر میں ماں کی نہیں ایک سا بھی ایک خوبصورت ہم سفر کی ضرورت ہے۔ جو گلیوں کی طرح ان پھولوں کی طرح شگفتہ اور رنگوں

”مہو نہ! سنبھال تو لے گی نا جیسے اس عمر میں بھی مجھے اماں جان کی ضرورت ہے۔ کوئی نادان بچہ ہوں میں جسے اس کی سرپرستی اس کی متا کی ضرورت ہے۔ بڑی آیا یہ کیوں نہیں سمجھتیں، مجھے اس عمر میں ماں کی نہیں ایک سا بھی ایک خوبصورت ہم سفر کی ضرورت ہے۔ جو گلیوں کی طرح ان پھولوں کی طرح شگفتہ اور رنگوں

”مہو نہ! سنبھال تو لے گی نا جیسے اس عمر میں بھی مجھے اماں جان کی ضرورت ہے۔ کوئی نادان بچہ ہوں میں جسے اس کی سرپرستی اس کی متا کی ضرورت ہے۔ بڑی آیا یہ کیوں نہیں سمجھتیں، مجھے اس عمر میں ماں کی نہیں ایک سا بھی ایک خوبصورت ہم سفر کی ضرورت ہے۔ جو گلیوں کی طرح ان پھولوں کی طرح شگفتہ اور رنگوں

”مہو نہ! سنبھال تو لے گی نا جیسے اس عمر میں بھی مجھے اماں جان کی ضرورت ہے۔ کوئی نادان بچہ ہوں میں جسے اس کی سرپرستی اس کی متا کی ضرورت ہے۔ بڑی آیا یہ کیوں نہیں سمجھتیں، مجھے اس عمر میں ماں کی نہیں ایک سا بھی ایک خوبصورت ہم سفر کی ضرورت ہے۔ جو گلیوں کی طرح ان پھولوں کی طرح شگفتہ اور رنگوں

”مہو نہ! سنبھال تو لے گی نا جیسے اس عمر میں بھی مجھے اماں جان کی ضرورت ہے۔ کوئی نادان بچہ ہوں میں جسے اس کی سرپرستی اس کی متا کی ضرورت ہے۔ بڑی آیا یہ کیوں نہیں سمجھتیں، مجھے اس عمر میں ماں کی نہیں ایک سا بھی ایک خوبصورت ہم سفر کی ضرورت ہے۔ جو گلیوں کی طرح ان پھولوں کی طرح شگفتہ اور رنگوں

”مہو نہ! سنبھال تو لے گی نا جیسے اس عمر میں بھی مجھے اماں جان کی ضرورت ہے۔ کوئی نادان بچہ ہوں میں جسے اس کی سرپرستی اس کی متا کی ضرورت ہے۔ بڑی آیا یہ کیوں نہیں سمجھتیں، مجھے اس عمر میں ماں کی نہیں ایک سا بھی ایک خوبصورت ہم سفر کی ضرورت ہے۔ جو گلیوں کی طرح ان پھولوں کی طرح شگفتہ اور رنگوں

”مہو نہ! سنبھال تو لے گی نا جیسے اس عمر میں بھی مجھے اماں جان کی ضرورت ہے۔ کوئی نادان بچہ ہوں میں جسے اس کی سرپرستی اس کی متا کی ضرورت ہے۔ بڑی آیا یہ کیوں نہیں سمجھتیں، مجھے اس عمر میں ماں کی نہیں ایک سا بھی ایک خوبصورت ہم سفر کی ضرورت ہے۔ جو گلیوں کی طرح ان پھولوں کی طرح شگفتہ اور رنگوں

کی طرح شوخ شوخو کی طرح چٹکل اور اس کی ہنسی کسی جھرنے کی مانند ہو، خوبصورت اور بے اختیار۔ نہ کہ کسی دریا کی مانند جو ایک ہی سمت میں بہت دھیان سے بہنے جا رہا ہو، انہیں معلوم نہیں مجھے خوبصورت کم عمر نوان لڑکیاں اچھی لگتی ہیں جن کی ہر حرکت میں بے اختیاری ہو، شوخی اور شرارت کہ اس کی نا کجی ناوانی کو میں ٹوکوں نہ کہ وہ میری اماں جان بن کر، میری استغلی بن کر گھٹے ہر وقت قاعدہ ہاتھ میں دے کر نہانے اور زندگی کی اونچ نیچ سمجھاتی رہے۔ "I hate sensibility" وہ جھلا کر بستر سے اٹھے۔

آمنہ کی معصومیت اور کم سنی نے رات بھر کے لیے پھر انہیں اس تھلے جہنم میں دھکیل دیا تھا کہ وہ ایک بڑی عمر کی بختہ عورت نما لڑکی کے شوہر بننے جا رہے تھے۔ جو کل شب اس بستر پر بے استحقاق سے براجمان ہوئی اور وہ سوائے اسے دیکھنے اور کڑھنے کے کچھ نہیں کر سکیں گے۔

"اگر میں آمنہ کو ذرا سا چھو کر ذرا سا قریب ہو کر دیکھ لیتا تو۔۔۔" ایک لطف بھرے احساس نے ان کے اندر انگڑائی لی "مگر اس ملائی جی نے کام خراب کر دیا۔ خیر بابا جان ایک بار حج پر چلے جائیں پھر ذرا آمنہ کو قریب سے دیکھیں گے بہت قریب سے۔ پھر تو کوئی آڑ نہیں ہوگی سیدہ کی حجت بھی تو تمام ہو جائے گی۔ اس کی سرور میرے لیے جو بڑ جائے گی، حسین شاہ کی دھمکی کا تو ڈر بھی ہو جائے گا۔ اگر وہ سیدہ کے بارے میں کچھ بھی غلط سوچنا چاہیں تو صالحہ تو ہوگی ہی سارے حساب بے باق کرنے کے لیے۔

بس کل رات کی تو بندش ہے پرسوں ویسے کے فوراً بعد میں نین بناؤں اسے ملنے جاؤں گا، ہاں کتنے دن ہو گئے اپنی اس معصوم چٹکل، قلوبطرح سے ملے۔ "ہمیں نین تارا کی یاد دہانی ملے گی۔ کتنی بار انگلیاں بے چین ہوں گی کہ نین تارا کا نمبر ڈائل کریں مگر انہوں نے بڑی مشکل سے خود کو کٹھن کر لیا۔ صرف دو دن کی تو بات ہے، ہر بار خود کو سمجھاتے اور بابا جان حج کے لیے روانہ ہوں گے اور خوشی کے سبب رستے خود بخود کھل جائیں گے۔ ابھی تو وہ نین تارا کو جرمنی کا کہہ کر گاؤں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بس کل ہی اسے بتادیں گے کہ وہ وہاں آچکے ہیں۔ اگلے دن اس کے پاس ہوں گے۔ بس دو راتیں تو درمیان میں ہیں پھر میں ہوں گا اور میری نینڈ ڈار لگا۔ وہ سرسبز کرو میں لینے لگے۔

"کبھی کبھی وقت کتنی سست روی سے گزرتا ہے کہ ایک ایک بل بلبوں پر محیط لگتا ہے جیسے آج کی رات اور کل کی رات بھی تو ان کے اندر سے کوئی بولا "ہاں کل کی رات شاید آج سے بھی بھاری ہو اور طویل ترین بھی۔" وہ آنے والی رات کا تصور اپنے ذہن میں تراشنے لگے۔

خدا خدا کر کے سیاہ رات نے دھیرے دھیرے اپنی باقی پوشاک کھنکھائی اور اپنا روشن بدن دکھایا اور کیا جیسے ہی سورج نے آنکھیں کھولیں سلطان بخت کی بو بھل آنکھوں میں نینڈ اتر آئی۔ چند لمحوں میں وہ ایک تیز اور کن رات گزار کر گری نینڈ سوچنے لگے۔

دس بجے سہرا بندی تھی اور بارہ بجے بارات کی روانگی۔ ساری رسمیں کرتے ایک ڈیڑھ بج گیا۔ بارات روانہ ہوئی۔ سلطان بخت نے ساری رسمیں کسی روٹ کی مانند نبھائیں۔ آف وائٹ قیمتی ڈریس جس کی شیر والی کے گلے پر نازک گولڈ کا کام تھا۔ سلطان بخت کا سرخ و سفید رنگ اور بھی دمک اٹھا تھا۔ وہ تیار ہو کر اپنی خوابگاہ سے باہر آئے تو سیدہ نے انہیں دیکھتے ہی دل میں سو بار ان کی نظر تازی اور دو کالے بکرے تاریخ دین کے حوالے لے کر دیے۔ وہ پیڑھیوں اتر کہاں کمرے میں آئے خاندان کی عورتیں انہیں دیکھتے ہی "ماشاء اللہ" کا ورد کرتے لگیں۔

"کسی بد نگاہ کی نظر نہ لگ جائے میرے چاند سے دو لہا کو۔" سیدہ نے دل میں سوچا اور اسی وقت دو کالے بکرے اور منگوا کر باہر بھجوائے۔

"اللہ آپا جان! لالہ تو آسمان سے اترے ہوئے کوئی پری زاو لگ رہے ہیں۔ کتنے پیارے، آپا جان! دیکھا نہیں جا رہا ان کی طرف ہے نا؟"

شہرینہ اچانک ہی ہال کمرے میں داخل ہوئی اور اپنی فطری بے ساختگی سے بولی۔ سلطان بخت ہولے سے

مسکرائے اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"ماشاء اللہ کو شہری! اللہ نظر بد سے بچائے، ہمارے راج ولارے کو۔" سیدہ نے اسے ٹوکا۔
"چلو، سلطان بخت بابا جان پہلے ہی بہت تھا ہو رہے ہیں بہت دیر ہو گئی۔" سیدہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سلطان بخت کو اٹھا کر قاضی کے سامنے جائیں۔

اور پھر وہ لمحہ بھی آگیا جس نے سالوں سے سیدہ کا خون خشک کیا ہوا تھا۔ حسین شاہ نے بارات کا شایان شان استقبال کیا تھا کہ سلطان شاہ کو شش کے باوجود انتظام میں ایک بھی نقص نہ نکال سکے۔ سیدہ نے اطمینان کا سانس لیا کہ بابا جان خوش ہیں، جاتے ہی بارات کی تواضع ٹھنڈے مشروبات سے کی گئی تھی۔ اس کے فوراً بعد ہی نکاح تھا جس کے پیچہ زہر سلطان بخت نے بڑی دل جمعی سے سائین کیے تھے۔ سیدہ کے سارے خدشے ہوا ہو گئے تھے۔ انہیں ایک دم سے لگا کہ دنیا کس قدر حسین ہے اور زندگی کتنی پر لطف۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا بوجھ جو ان کی حواس کشش اور ماں بہشتن ان کے کندھوں پر ڈال گئی تھی۔ آج وہ اس سے سبک دوش ہو گئی تھیں۔
"بابا جان! اچھا لوگ ہو بہت بہت۔"

سیدہ نے چادر میں الجھ کر چھپا رکھا تھا۔ سلطان شاہ سے بولیں۔ "تمہیں بھی سلطان بخت بہت مبارک ہو، اللہ پاک تمہیں دنیا جہان کی خوشیاں نصیب کرے، تم نے والدین کا مان رکھا۔ اللہ تمہیں نیک اولاد نصیب کرے۔" سیدہ تمہیں بھی مبارک ہو بہت یہ سب تمہاری ہمت اور کوشش کا نتیجہ ہے۔" سلطان شاہ نے بیٹی کے سر پر ہار سے ہاتھ پھیر کر کہا۔

"اللہ کی مہربانی بابا جان! اچھا میں اب اندر چلتی ہوں، میرا خیال ہے اوہراب میرا کام ختم ہو گیا ہے۔ صالحہ کو دیکھیں جا کر۔" کمرے کے دروازے کے پچھلی طرف اتریں اور حویلی کے اندر چلی گئیں۔ جب وہ صالحہ کے کمرے میں داخل ہوئیں تو صبح کے پیچہ زہر کے پاس سائین ہونے کے لیے آٹھکے تھے، اہجاب و قبول کا مرحلہ بخوبی ملے ہو چکا تھا اور اب صالحہ بین ہاتھ میں پکڑے کپکپاتے ہاتھ پیچہ زہر دھرنے بیٹھی تھی۔

"صالحہ! امیری بہن مبارک ہو، سائین کر لو، سب لوگ انتظار میں کھڑے ہیں۔" سیدہ نے جھک کر صالحہ کا سر اپنے ساتھ لگایا اور اس کے کان میں بولیں۔ صالحہ کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

"صالحہ! تم تو بہت بہادر ہو، ہمت کرو، یہ مرحلہ تو آتا ہی تھا۔ چلو شایان بہن میری بہن۔" وہ آہستگی سے اس کا لہذا تھپک کر بولیں تو صالحہ نے کانٹے کانٹے کر زتے تھپتھپوں سے پیچہ زہر سائین کر دیے۔

مبارک سلامت کا شورا اٹھا سیدہ نے سراٹھا کر فضا میں ایک گہرا سانس لیا۔
"اللہ تبارک و تعالیٰ نے مجھے اس فرض سے بخوبی سبک دوش کیا۔" سیدہ نے دھیرے سے کہا اور پھر تھک کر روٹی صالحہ کو چپ کرانے لگیں۔

بعد کے سب مرحلے بہت تیزی سے طے ہو گئے۔

کھانا چھوٹی موٹی دو چادر رسمیں اور پھر نصستی۔ سیدہ صالحہ کے ساتھ حویلی آئی تھیں۔ کلام پاک کے سامنے میں صالحہ کو حویلی میں لے جایا گیا۔ کچھ دیر کے لیے دلہن کو ہال کمرے میں بٹھایا گیا، منہ میٹھا کرانے کی رسم کی گئی۔ خاندان کی عورتیں دلہن کی تعریف کرتے ہوئے ہانکا پھانکا مذاق کرنے لگیں، مگر اب سیدہ کو کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ جلدی سے دلہن کو اس کی خواب گاہ میں پہنچا کر خود آرام کرنا چاہ رہی تھیں۔ ان کے پاؤں کی اینٹیوں میں جیسے کسی نے کیل ٹھونک دیے تھے۔ ایک ایک قدم اٹھانا محال ہو رہا تھا۔ کئی دنوں سے تو وہ پاؤں کی طرح ادھر ادھر مصروف تھیں۔ سب سے اجازت لے کر انہوں نے صالحہ کو اٹھایا اور اوپر خواب گاہ کی طرف لے گئیں۔ شہرینہ نے دوسری طرف سے دلہن بھا بھی کا پاؤں تھام رکھا تھا۔

"آپا جان! دلہن بھا بھی کتنی پیاری لگ رہی ہیں مگر یہ تو تیس نہیں۔" میز چھپاں چڑھتے ہوئے شہرینہ نے کہا۔

”میرا بیٹا کی شہری بی بی ابولیس کی دامن بھائی اور جب یہ پولیس کی تو پھر کوئی نہیں بول سکے گا۔“ شہزادہ کی ایک شادی شدہ کزن نے شہزادہ کے کان میں بلند سرگوشی کی۔ ”تمہارے والد بھی نہیں۔“

”بتول! کیا بے کاری باتیں کر رہی ہو تم اپنی کے ساتھ۔“ سیدہ ماتھے پر شکنیں ڈال کر بولیں تو بتول سنبھل گئی۔

سیدہ بھی ہو کر میڑھیاں چڑھنے لگی۔

دلہن کو کمرے میں بٹھا کر کچھ دیر سیدہ اور شہزادہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔

”چھا صالحہ! اب تم اپنی ہو جاؤ بلکہ نیک لگا کر کچھ ریلیکس ہو جاؤ ہم اب چلتے ہیں۔ میں جا کر سلطان بخت کو بھیجتی ہوں۔ تمہارا ناٹ سوٹ ادھر سامنے ڈریسنگ میں لٹکا ہے۔ یہ سائیز ٹیبل پر پالی دودھ گولڈ ڈرنک قروت سب موجود ہیں کچھ کھانا پینا چاہو تو کھالی لینا۔ تم نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا“ ٹھیک ہے اب ہم چلتے ہیں۔ چلو شہری۔“ سیدہ نے اٹھتے ہوئے پیار سے صالحہ کا منہ چوما اس کا جھومرا اور رنگہ درست کیا اور شہزادہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

”شب بخیر دلہن بھائی!“ وہ جھک کر صالحہ کے پاس ہو کر بولی۔ صالحہ نے ہولے سے گروں ہلا کر محبت سے اسے دیکھا۔

دونوں آگے پیچھے کمرے سے نکل گئیں جیسے ہی ان کے پیچھے کمرے کا دروازہ بند ہوا صالحہ نے کب کا سینے میں رکھا ہوا ساکس خارج کیا اور سر اٹھا کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کمرہ ویل ڈیکوریشن تھا۔ خوبصورتی سے زیادہ اس میں کشادگی تھی۔ پلاسٹک پیس سے بنی بہت خوبصورتی اور پختہ ڈیزائننگ تو جانی نہیں گئی تھی نہ مصنوعی لڑیوں سے نہ پھولوں سے۔ کمرہ اس لحاظ سے بالکل سادہ تھا۔ صرف پتے کے سامنے دیوار پر پھولوں سے ”دیلم“ لکھا ہوا تھا اور کونے کی میزوں میں مانہ پھولوں کے گلدستے تھے جن کی بھیجی پھٹی خوشبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

”پتا نہیں سلطان بخت کس مزاج کے ہوں؟ سنا ہے بہت خشک مزاج ہیں سیدہ بھائی کی طرف سے میں تو پہلے ہی ان کے ساتھ اپنی زندگی کے بہت کھن سال گزار کر آئی ہوں، اگر یہ بھی ایسے ہوئے تو۔“ اس نے کمرے کی سجاوٹ سے دھیان ہٹا کر سلطان بخت کو سوچنا شروع کر دیا۔

”اماں بابا کے بعد سیدہ بھائی نے میری کتنی کڑی تربیت کی ہے کہ میں ہی جانتی ہوں جیسے وہ اپنی پسند کے سانچے میں بھائی ڈھال رہی ہوں۔ اللہ کرے یہ اچھے ہوں، حسین بھائی تو ان کو اچھا نہیں سمجھتے تھے بہت غلامی باتیں سن رکھی تھی سلطان بخت کے بارے میں انہوں نے پتا نہیں کیا ہو گا۔“ وہ سوچوں نے اس کا گھیراؤ کرنا شروع کر دیا اور جوں جوں انتظار طویل ہوتا گیا سو سے بڑھتے چلے گئے۔

رات کا شاید ڈیڑھ بج رہا تھا اس کا وہاں غصہ کی گھنٹی بج رہی تھی۔ وہاں آئی وہ ایک دم سے اٹھ کر دوڑ کر بیٹھ گئی۔ سانس روکے سر جھٹکا کر پتی نظروں سے دروازے کی سمت دیکھنے لگی۔

سلطان بخت نے ایک نظر بیڈ پر اجماع اس ڈھیر بڑائی اس وقت ان کے دل میں کتنی خواہش تھی کہ جاتے ہی وہ بستر پر دراز ہو جائیں، کل کے رت جگے اور دن بھر کی مصروفیت سے بہت تھکن ہو رہی تھی۔ انہوں نے حسرت سے اپنے بستر کو دیکھا اور صوفے پر بیٹھ گئے، کچھ دیر بولیں ہی بیٹھے سوچتے رہے پھر اٹھے اور بیڈ کی طرف بڑھے۔ صالحہ کا دل بہت رفتار سے دھڑکنے لگا۔ وہ بیڈ کے پاس آ کر رک گئے۔ جھک کر سائیز ٹریک کا دراز کھولا اس میں سے سگار کیس نکالا اور واپس پلٹ گئے۔ صالحہ کا دل ایک پل کو تھم کر پھر ہولے ہولے دھڑکنے لگا۔ اب سلطان بخت صوفے پر بیٹھے ہوئے آرام سے سگار پی رہے تھے جیسے وہ پارچہ لاونگ میں بیٹھے ہوں اور ان کی گفتگو ابھی ایٹ ہو۔

صالحہ کی کمر آگہنی اور سر جھکاتے جھکاتے گردن دیکھنے لگی مگر ان کے اٹھنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ دس بارہ منٹ اور گزر گئے۔ صالحہ کو اپنی بے بسی پر رونا آنے لگا۔ سلطان بخت اٹھ کر ڈریسنگ روم میں چلے گئے۔ صالحہ نے

تھوڑی سی گردن اوپن کی۔

”صالحہ! میں بہت تھک چکا ہوں اور اس وقت میں صرف آرام کرنا چاہتا ہوں، کچھ ان لوگوں کی جلد بازی۔ میں ابھی ذہنی طور پر شادی کے لیے تیار نہیں تھا مگر سیدہ آیا اور بابا جان نے ہرجال تمہیں شاید کچھ دن یا کچھ مہینے انتظار کرنا پڑے میرے ذہنی طور پر تمہیں قبول کرنے کے لیے تم اٹھ کر چھینچ کر لو اور بستر خالی کرو میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ ڈریسنگ روم سے وہ چھینچ کر کے آئے اور اس کے پاس رک کر بولے۔ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بیڈ کے دوسری طرف چلے گئے شاید لیٹنے کی غرض سے۔ صالحہ اس طرح رخ موڑنے کی سہولت سے بیڈ سے پیچھے اترتی۔

”اور ہاں یہ تمہارا رو نمائی کا تحفہ آیا جان نے کہا تھا ضروری ہوتا ہے انہوں نے خود ہی مجھے خرید دیا تھا۔ معلوم نہیں کیا ہی تم خود کھول کر دیکھ لینا اوکے گڈ ٹائٹ۔ پلیز ٹائٹ آف کرو یا لیڈٹ سائیز پر مبن ہے تھوڑا لا۔“ انہوں نے اس کی طرف بیڈ پر کوئی چیز اچھالی تھی۔ صالحہ نے مرکز نہیں دیکھا۔ اسٹاکٹ کا مبن آف کیا اور ڈریسنگ کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے کے دوسرے حصے میں ہلکی روشنی جل رہی تھی اس لیے کھلے طور پر اندھیرا نہیں ہوا۔ صالحہ کے ڈریسنگ روم میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا جیسے تقدیر نے پہلی رات ہی اس پر شوہر کی محبت اور استحقاق کا دروازہ بند کر دیا تھا اور بند دروازے سے مرنے کا کپھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”کل بڑے شاہ جی جج کے گھر جا رہے ہیں اور چھوٹے شاہ جی کے تیور بھانپنا کچھ مشکل نہیں۔“ مصطفیٰ صاحب ویسے سے اچھی رات راجہ بی بی سے کہہ رہے تھے۔

”پھر؟“ وہ کچھ خوف زدہ ہو کر بولیں۔

”میں آج گیا تھا سرکار کے دفتر اپنے جاوے کے لیے۔ میں سوچ رہا ہوں جب تک بڑے شاہ جی واپس نہیں آجاتے ہم عارضی طور پر یہ گھر پر علاقہ چھوڑ دیتے ہیں۔ دو چار مہینوں کی تو بات ہے پھر واپس آجائیں گے کیا خیال ہے؟“ مصطفیٰ صاحب کی بوجھ بھاتی اچانک تھی کہ اماں جی کچھ بول ہی نہ سکیں۔

وہاں سرکار کے دفتر میں جو تیار لے والا افسر تھا۔ قدرت خدا کی دیکھو وہ میرا اشارہ نکلا۔ پورے پانچ سال اس نے مجھ سے بڑھا تھا اور اس کا باپ میری بڑی عزت کرتا تھا۔ افسر تو مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا تمہیں میں سے کیا پہچانتا؟ اس نے حوالے دے کر مجھے یاد آیا۔ میں نے اس کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا اور کہا کہ مجھے ایک دو دن میں ہی نہیں اور تبدیل کر دیا جائے چاہے کسی شہر میں کسی گاؤں یا کسی قصبے میں۔ اس نے میری بڑی عزت کی بجائے مشکواتی ساتھ یہ مشراں، بسکٹ وغیرہ میں نے آٹھ اٹھا کر کسی طرف نہ دیکھا۔ بس یہی کہا کہ پہلے میرے آرڈر جاری کرنے پھر میں کسی پھر کو ہاتھ لگاؤں گا۔ اس نے اسی وقت اپنے ٹائیسٹ کو ہلایا اور میرا آرڈر ٹائپ کر دیا۔ میں آرڈر ساتھ لے کر آیا ہوں۔ شو پورہ میں بتاؤ کہ کیا ہے انہوں نے۔ کل شاہ جی جا میں گے تو کل رات ہی ہم ادھر سے نکل جائیں گے۔ تمہارا شک درست نکلا پھوٹے شاہ جی کا وہ دن مجھ پر خصوصی التفات رہا ہے جس کو بڑے شاہ جی بھی ناپسند کر رہے تھے مگر انہیں باپ کی پروا کب سے مجھے ان کے رویے سے خطرے کی بو آ رہی ہے وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں اور ہم ماننے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔ تم ادھر ابھی کسی سے اپنے تہا دلے کا ذکر نہ کرنا۔ بس موٹا موٹا ضروری سامان باندھ لو باقی سامان کو ایک کمرے میں بند کر کے تالا ڈال دو۔ ہم چند ماہ بعد آئی جائیں گے۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ تم سن رہی ہو نا سب راجہ بی بی! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔“ اماں جی حیران ان کا منہ دیکھ کر جاری نہیں ہو سکیں، کچھ نہ بول سکیں۔

”تم!؟“ بیٹیں شہباز کے لبوں سے نکلنے والے اس دو حرفی لفظ کی آواز اس قدر خفیف تھی کہ نہ بہت سن ہی نہ سکی۔ بس ان کی حیرت زدہ آنکھیں گولائی میں کھلے ہونٹوں کو دیکھ کر وہ سر جھٹکا کر کھڑی ہو گئی۔ ہاتھ سے ماتھے تک اوڑھی سیاہ چادر کو مزید نیچے سڑکانے لگی۔ اس کی پلکیں لرز رہی تھیں مگر وہ انہیں اٹھا نہیں پارہی تھی۔ پلکوں کا

لرزا کی پیشین شہباز کو بھی نظر آ رہا تھا۔ مین گیٹ پر جلتی لائٹ ان کے سروں پر روشن تھی مگر اسے معلوم تھا آج کی پیشین شہباز کو تو لرزنی پلوں میں کوئی خوبصورتی کوئی نزاکت نظر نہیں آرہی ہوگی۔ ان کے چہرے کے مابثرات ان کے دل کی دھڑکنوں کے بدلتے رخ کے ساتھ بدل رہے تھے ان کے چہرے پر چند لمحے پھیلی حیرت کی جگہ اب نفرت غصہ اور بیزاری ظاہر ہونے لگی تھی۔

نزہت کی صرف پلکیں ہی نہیں پورا جسم ہولے ہولے کپکپا رہا تھا بلکہ ٹانگوں کی لڑکھڑاہٹ تو بروحتی جا رہی تھی اسے لگتا تھا وہ چند لمحے اور کھڑی رہی تو یقیناً "یا تو گر پڑے گی یا پھر اس کی روح پرواز کر جائے گی مگر اسے اپنے سخت جان ہونے کا بھی یقین تھا۔ یہی یقین تو اسے اس رات کے اندھیرے میں ادھر تک لے آیا تھا اور کیپٹن صاحب پورے کے پورے اپنے پوڑے چھپے دراز وجود کے ساتھ دروازے میں بیٹھے کھڑے تھے۔

"کس کے ساتھ آئی ہو؟"

ان کی تو از اسے بے حد خوفناک لگی۔ سرد ہاتھوں کو منجمد کر دینے والی اس نے ذرا کی ذرا آنکھیں اٹھا کر ان کے اچھی چہرے کو دیکھا پھر نظرس جھکا لیں۔ اس کی زبان میں تو شاید اب بولنے کی طاقت بھی نہیں رہی تھی۔

راجیلہ اسے کوچ میں سوار کروا کر چلی گئی تھی کیونکہ ٹرین کا ٹائم تو گزر چکا تھا کوچ میں کھلی آنکھیں عورت سوار نہیں تھی۔ زیادہ تر عورتیں یا پھر میاں بیوی۔ کنڈیکٹر بھی اسے دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ کئی منٹ اسے گاڑی کے اندر ہی کھڑے ہونا پڑا۔ بالاخر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی جو اپنی بیوی کے ساتھ سلیٹ آنھ نمبر کی سیٹ پر بیٹھا تھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"نہیں ادھر بٹھاؤ۔" اس نے اپنی سیٹ خالی کر کے کہا تو نزہت اور کنڈیکٹر دونوں نے اسے مشکور نظروں سے دیکھا وہ چپکے سے اس کی بیوی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ کوچ چل پڑی۔

"گاہور جا رہی ہو؟" اس کی بیوی نے تعقیب کا آغاز کیا۔

"جی۔"

"جی میں میڈیکل کالج میں پڑھتی ہوں ویسے میری پچیسو بھی اڑھریں اگر کوچ لیٹ نہ ہوئی کیونکہ ہمارے ہاسٹل کا ٹیٹ آٹھ بجے کے بعد بند کر دیا جاتا ہے اگر دیر ہو گئی تو شاید میں پچیسو کے پاس چلی جاؤں۔" اس نے فوراً مہمانانہ انداز میں کہا۔

"ساتھ کوئی نہیں جا رہا تمہارے؟"

"نہیں جی تقریباً مہینے میں ایک دفعہ آتی جاتی ہوں۔ میری ایک سی۔ بی۔ بی۔ ہے جو ادھیڑی کے پاس رہتی ہے۔ ابو نہیں ہیں میرے۔ میری سسٹرنے چھوڑنے آئی تھی۔"

"تو ادھیڑی میں کالج نہیں ہے اور ادھیڑی لے لیتا تھا۔"

"جی اس نے کہا کھڑی تھی اس لحاظ سے تو اسے پڑی میں ہی داخلہ لینا چاہیے تھا۔"

"جی ادھیڑی میرا داخلہ نہیں ہو سکا تھا۔"

کہہ کر اس نے منہ دوسری طرف کر لیا مزید سوالوں سے بچنے کے لیے پھر اس کے بعد اس عورت نے بھی اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ بس دوران سفر ادھیڑی کی چند باتیں ہی کہیں۔

پھر جب کوچ نے انہیں اڈے پر اتار تو بہت رات ہو چکی تھی۔ راستے میں گاڑی کا وہیل بدلنا پڑا تھا۔ اس میں کافی وقت لگ گیا۔ تین چیک پوسٹ آئیں۔ وہاں پہلے ہی گاڑیوں کی لمبی قطار تھی۔ ان کی باری آتے آتے آہ پون گھنٹہ لگ گیا اور نتیجتاً وہ رات گیارہ بجے کے قریب اڈے پر پہنچے۔

"اب تو تمہارا ہاسٹل نہیں چاسکوگی؟" جیسے ہی وہ کوچ سے نیچے اترتی اس عورت نے کہا اور باہر پھیلی کالی سیاہ رات کی چادر دیکھ دیکھ کر اس کا اپنا دل کانپا جا رہا تھا۔ اگرچہ اڈے پر کافی روٹ تھی۔ ٹیکسی اور رکشہ والے ہی اس کے گرومنڈل لے گئے تھے مگر اسے معلوم تھا اڈے کے باہر کیسی تاریک رات ہوگی۔

"جی۔ اب تو بہت نام ہو گیا جو کیدار کبھی بھی دروازہ نہیں کھولے گا۔" اس نے رو ہانسی ہو کر کہا۔

ہاتھ گھنٹے سینے سے منہ پورے تھے۔ ایک تو اس کی زندگی کا پہلا تھا سفر پھر اس جان لیوا حادثے کی جو تک جو اس کی جان کو چھٹی تھی۔ اس کا لہجہ خشک کیے دے رہی تھی جیسے تو جو کچھ وہ کیا تھا وہ تو اس کے لیے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا مگر جو آگے پیش آنے والا تھا۔ اس کا سامنا کیے کرے گی۔ کیسے اپنے منہ سے سب کو اپنی ذلت کی داستان سناے گی۔ کیسے ایک ایک کا دامن پکڑ کر کے گی کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔ جو ہے تقدیر کی سازش ہے۔ اسی کا دھوکا ہے اور اس دھوکے نے میری جیتی جاتی پاکیزہ زندگی کو بچھڑا دیا ہے۔ گندے جوڑ کا کچھڑا۔ اسے رونا آنے لگا۔

اردگرد گاڑیوں، رکشوں کے ہارنوں کی بلی بلی پائی پائے آسمان سربراٹھا رکھا تھا۔ اڈے پر زندگی پوری طرح سے جاگ رہی تھی۔ کنڈیکٹر سب کا سامنا نکال نکال کر دے رہا تھا۔ وہ ہتھیالیاں سلنے لگی۔

"اگر میں دن میں بیچ جاتی تو کم از کم اس خوف کے عذاب سے تو نہ گزرنا پڑتا۔"

اس خلعے سر اٹھا کر مصنوعی جگمگ کرتی روشنیوں سے بہت اوپر ٹھنڈے ستاروں سے مزین سیاہ آسمان کو دیکھا۔

"اب کہہ جاؤںی پھر اتنی رات گئے۔" وہ عورت اس کی پریشان و ہراسنا صورت دیکھ کر بولی۔ اسے شاید اس پر رحم آ رہا تھا۔ اس کا شوہر اپنا سالانہ نکلا رہا تھا۔

"پچیسو۔ پچیسو کے گھر۔" اس کے گلے سے پھنسی پھنسی تو آواز نکلی۔

"کہہ رہے تمہاری پچیسو کا گھر۔" وہ عورت ہمدردی سے بولی تو اس نے ایڈریس بتایا۔

"چلو جی لے لیا سامان۔" رکشہ کھینچا ہوا آج بٹھا تھا کے پورے دو گھنٹے ضائع کیے۔ "اس کا شوہر اپنی بیوی کے ساتھ آ رہا۔"

"تو ادھیڑی کے پچیسو کی مہراں جی کو مل رہی ہے۔ بے چاری کو ہاسٹل جانا تھا۔ اب اس کا ٹیٹ بند ہو گیا ہو گا۔ بے چاری اب جانے کی کہاں آتی رات گئے۔" عورت ہمدردی بھرے لہجے میں نزہت کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"اوہ۔ پھر؟" وہ فکر مندی سے بولا۔ "دونوں میاں بیوی ہی نیک دل لگتے تھے جو آج کل کے زمانے میں کسی سے آدھی رات کو ہمدردی کا رنگ لے رہے تھے۔"

"اس کی پچیسو کا گھر ہے اور آپ کہیں تو ہم جاتے ہوئے نہ چھوڑ دیں اسے گزرنا تو ادھیڑی سے ہے۔"

عورت شاید شوہر سے ڈرتی تھی ڈرے ڈرے لہجے میں اجازت لیتے ہوئے بولی۔ شوہر نے ایک پل بیوی کو کھڑی نظر سے گھورا پھر شاید اسے ساتھ کھڑی مسکین صورت بنا کے نزہت پر ترس آیا۔

"چلو۔ کوئی حرج نہیں میں پھر ٹیکسی کرا لیتا ہوں۔" وہ آدمی مڑتے ہوئے بولا۔

اگرچہ اب اسے کسی راستے بڑے حادثے کے بعد اعتبار تو نہیں کرنا چاہیے تھا وہ دوسری بار حادثے کے سوراخ سے ڈرتے جا رہی تھی۔ مگر کیا کرتی اس کے سوا اس کے پاس چارہ بھی کوئی نہ تھا۔ خود اکیلے جانے کا حوصلہ بھی تو نہیں ہو رہا تھا۔ ٹھیک ہے اکیلے اتنا لبا سفر بھی کر آتی تھی۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک گمراہ تو کوچ تھی اور کوچ میں تو اس کے علاوہ بہت سے مسافر اور بھی تھے اس لیے وہ پریشان نہیں ہوئی تھی مگر اس وقت کسی رکشے یا ٹیکسی میں اکیلے جانے کی وہ ہمت ہی اسے مار ڈالنے کے لیے کافی تھی۔

"ہاں نہیں یہ اللہ نے اس کے لیے فرشتے بھیجے ہیں یا اس بچی کبھی زندگی کو مزید ریزارنا لے کے لیے راہزن۔"

ٹیکسی میں اس عورت کے برابر میں بیٹھے ہوئے اس نے سوچا۔

کیلیں شکر ہی ہوا وہ اسے پچیسو کے گھر کے دروازے کے آگے ہی اتار کر گئے اور جب تک دروازہ کھل نہیں گیا وہ ٹیکسی روکا کر بیٹھے رہے۔

اور وہ انہیں ان کی ہنسی کے صلے میں اندر آنے کو بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ ابھی تو اسے خود بھی یقین نہیں تھا کہ اسے بھی اندر جانے کا راستہ ملتا ہے یا نہیں۔

وہ انسانوں کے روپ میں حاضر تھے اسے منزل تک پہنچا کر چلے گئے۔ اب پتا نہیں یہ منزل تھی یا نہیں۔ کیپٹن شہباز کی پیچھتی نگاہوں سے بچنے کے لیے وہ سر ہٹھکانے سوچتی رہی۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے؟“ وہ بھی مگر کرحت آواز سے اس کی سوچوں سے باہر کھینچ لے آئی۔
”ارے کون آیا ہے؟ اتنی رات گئے کون آیا۔ شہباز کون ہے۔“ ایاز کی آواز اتنی اچانک تھی کہ دونوں ہی جیسے اچھل پڑے اور نہت کام تو مزید ہوا ہونے لگا۔

”جائیں آپ جا کر دیکھیں نا۔ کون آیا ہے کسی نے گیٹ کھولا بھی یا نہیں۔“
ایاز کی بیوی فائزہ اس کے ساتھ ہی بولتی چلی آ رہی تھی اور وہ دونوں پتھر کے بت سے ان کو گیٹ کی طرف آتا دیکھتے رہے۔ کیپٹن شہباز کو لگان کے سارے سوال دم توڑ گئے ہیں۔ اب کسی سوال جواب کی ضرورت نہیں۔

”کون ہے؟ پوچھ کر روانہ کھولنا تھا۔ پارہ تو ج رہے ہیں اس وقت تو۔“ اور نہت پر نظر پڑتے ہی ایاز کو نیچے بولنا ہی بھول گیا۔

”ہاں نہیں تو کیا اس وقت تو نالے کر تو قتل والے ہی آتے ہیں جو ریلوے یہ کوئی اچھے لوگوں کے آنے کا وقت۔“ فائزہ اگر پہلے ہی نہت کو دیکھ چکی تھی مگر جملہ تقریباً ”پورا کر کے ہی ایاز کے حیران ہونے کی ایک ننگ کی۔

”نہت! تم اس وقت کہاں سے آ رہی ہو؟“ ایاز کے حیرت زدہ سوال نے اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر دیں۔
کتی دیر کا رکاوٹ سیلاب بر جانے کو تیار تھا۔

”اللہ میری توبہ اللہ میری توبہ۔“ فائزہ نے کانوں کو ہاتھ لگایا توبہ تلخ کرنے لگی۔ وہ ساتھ ساتھ نفی میں زور زور سے سر ہلا رہی تھی جیسے کسی کا بہت ہی ناقابل یقین منظر اسے نظر آ گیا تھا۔

”جیسی۔ کون آیا ہے۔ یہ شور کیسا ہے گیٹ پر؟“ ظہر کیوں پیچھے رہتا اور شہباز کی ویڈیو کچھ میں نہ آتا تھا کہ اتنی رات گئے ان لوگوں کو ڈور تیل کی ایک ہی آواز نے کیسے اٹھا دیا جب کہ ان دونوں کے پور منتر بھی خامسے ہٹ کر

”آپ دیکھیں جا کر۔ کیا ہو گیا آدھی رات کو ام جان کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔“
اظہر کی بیوی عالیہ ان کے ساتھ بولتی آ رہی تھی۔

”کمال ہے ویسے آدھی رات کی گردان سارے ہی کر رہے ہیں اور سویا ہوا کوئی بھی نہیں تھل سب جو کس آنکھوں اور ہوشیار چروں کے ساتھ اوہڑی ہوڑے چلے آ رہے ہیں۔“

کیپٹن شہباز نے ہنسیلا کر سوچا۔ ایک گہرا سانس لیا اور دروازہ پھوڑا کر واپس جانے کو مڑ گئے۔
”اب ظاہر ہے۔ میرے پھل کھڑے رہنے یا سوال جواب کرنے کی ضرورت تو ہے نہیں۔ اب تو ”دنیا“ آگئی ہے۔ سب سوال خود ہی کر لے گی۔

”کون آیا ہے شہباز یا کوئی اور مسئلہ ہو گیا ہے۔ کیا بات ہے؟“ ظہر بھائی کی مستوحی حیرت اور بے رعبہ جملے کیپٹن شہباز کو اندر تک جیوار کر گئے۔ ان کا جی چاہا بوش کے لیے اس منظر سے ایس عتاب ہو جائیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے برآمدے کی طرف بڑھ گئے۔ اظہر کے کسی سوال کا انہوں نے جواب نہیں دیا۔ نہ مڑ کر نہ کھاکہ نہت کو دیکھتے ہی ان دونوں میاں بیوی کی کیا حالت ہوئی ہے۔

”ہائے یہ تو نہت ہے دیکھ رہے ہیں آپ؟“ ظہر کی بیوی عالیہ نے ایک چیخ ماری تھی۔
”ارے گردو کے ہمسائے بھی اٹھ کر آجائیں کہ نہت آئی ہے۔ آدھی رات کو اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے عالیہ کی چیخ سن کر دل میں جلتے ہوئے سوچا۔

”تم اس وقت کہاں سے آئی ہو؟“ ظہر نے کڑے لہجے میں اس کے قریب آ کر پوچھا۔

”ہائے اللہ میری توبہ جو صلہ دیکھو دیکھو اور کچھ۔ آدھی رات کو ایسی کیسے آگئی۔ کیا دن نہیں چڑھتا تھا؟“ عالیہ نے اپنی شہادت کی انگلی ہونٹوں پر رکھ کر افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”ارے دن تو بھلے کاموں کے لیے ہوتا ہے کوئی لوگ رات میں نیکیاں کھاتے پھرتے ہیں۔“ فائزہ کیوں چپ رہتی۔ نہت نے روتی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”کوئی منفیت میں ہی سب مسئلے حل ہو گئے وہ کیا کہتے ہیں ہنگ لگے نہ پھٹ کر ہی۔ رنگ بھی چو کھا آتے۔ نہ مایوں، مسندی کا خرچا نہ پارٹ لے جانے کا بکھیرا نہ ڈوبی اٹھانے نہ چند بجانے اور نہ ویسے کا مٹھنا۔ اس بیگم خود ہی چل کر گھر آگئیں۔ زمانہ جو کیپوٹر کا آیا ہے ابھی پتا نہیں ان گناہگار آنکھوں نے کیا کیا دیکھا ہے۔“

فائزہ کی پلتی زبان کے آگے تو بڑے بڑوں کی بولتی بند ہو جایا کرتی تھی اور کن تو اسے ”ان ٹائم“ موقع ملا تھا۔ وہ کیوں چانس مٹس کرتی۔

”ارے آگ لگاؤ ایسے کیپوٹر کے دور کو جو اس طرح ویڈیو کا پانی ماروے۔ میں تو کہتی ہوں۔“ عالیہ نے اپنی زبان کی اظہر تیز کرنا چاہی۔

”چپ کرو تم۔“ اظہر نے پلٹ کر انہیں جھاڑا۔
”کیسے آئی ہو تم؟“ اور نہت کی طرف متوجہ ہوئے۔ لہجہ ہنوز زار دینے والا تھا۔

”مہم مجھے پیچھو سے ملتا ہے۔ سنگ حلق کو تھوک نکل کر تر کرتے ہوئے اس نے ہنسنے کہا۔
”مہم جان کی طبیعت ٹھیک نہیں اس وقت انہیں نہیں دکھایا جا سکتا۔“ محض تمہاری ”ملاقات“ کے لیے۔“

انہوں نے کورا سا جواب دیا۔ اب چاروں اس کی شکل دیکھ رہے تھے کہ اب جاؤ یہاں سے۔ اوہر تمہارا اور کوئی نہیں رہتا۔ گھر بھی آج ڈھٹائی کے سارے ریکارڈ توڑ کر ہی جانے کی اوہر سے۔ اسی طرح جاؤ کھڑی رہی۔ ان کی سوار نہیں رہا۔ وہ اپنے اوپر جھونک کر رہی۔

”اب اوہر سے کچھ کہنا ہے تو اس نے دل میں طے کر لیا تھا کیونکہ اب اس جو کھٹ کے سوا اس کے لیے اور کوئی قدم ہٹانے کی جگہ نہیں رہی تھی اور ویسے بھی اتنی رات گئے وہ اور کیس بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اس اچھی شہر میں۔

”میں ان سے ملنے آئی ہوں۔ زور زور لہجے میں ہولے سے بولی۔
”ہاں۔ وہ بھی تو تمہارے درجن کو جیسے مری ہی جا رہی ہیں۔ انہیں مرنے کے قریب تو کر دیا ہے۔ اب لگتا ہے مار کر ہی جاؤ گی۔“ عالیہ کی سرگوشی اگرچہ فائزہ کے کان میں کی گئی مگر سب نے سن لیا۔ جواب کسی نے نہیں دیا۔

”اب کیا اوہر کھڑے ہو کر رات گزارنی ہے جو فیصلہ کرنا ہے کریں۔“ فائزہ نے کچھ دیر بعد اٹھا کر کہا۔
”مہم جان تو سو رہی ہیں۔ بہتر ہے انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ عالیہ! تم نہت کو گیسٹ روم میں لے جاؤ۔ یہ صبح ان سے مل لے گی پھر بوان کا فیصلہ ہو گا۔“

اظہر نے کچھ دیر بعد سوچ کر کہا تو نہت کو لگا اسے دوبارہ زندگی کا پروانہ مل گیا ہو۔ چار دیواری ایک گھر میں اسے رہنے کی نوید جو مل گئی تھی۔ رات بھر کے لیے اور صبح سے چاہے کچھ پیو کے پاؤں ہی کیوں نہ پکڑنا پڑیں وہ پکڑ لے گی۔

سیدہ نے ہولے سے دروازہ بجایا اور آدھ پہلے ہی کھلا ہوا تھا ان کی ہلکی سی دستک پر مزید کھل گیا۔
”بھئی اٹھے نہیں ابھی تک۔“

وہ کہتی ہوئی اندر آگئیں اگر انہوں نے سلطان بخت سے کہا تھا تو وہ پہلے ہی کمرے میں موجود نہ تھے اور صالحہ کرسی پر چپ چاپ ہاتھ کی انگلیاں ایک دوسرے میں جکڑے گود میں رکھے ہاتھوں کو تھلے جا رہی تھی۔ اس نے سیدہ کی آمد کا نوٹس نہیں لیا تھا۔

”جی زندگی کی پہلی صبح پیڑ۔“

سیدہ نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی ہولے سے چوم کر کہا۔ صالحہ کا سنا سنا اوس و ملول چہوا نہیں رات کی ساری کہانی سمجھا گیا تھا۔

سیدہ کی دعا پر صالحہ نے غم آنکھوں سے جن میں شکوے ہی شکوے تھے، انہیں دیکھا سیدہ صاف نظریں چرا گئیں اور آگے بڑھ کر کھڑکیوں کے پردے ہٹانے لگیں۔

”میں نے سوچا کافی ناگم ہو گیا ہے۔ میں خود ہی جا کر اٹھا آؤں۔ میں گھر سے بھی ایک چکر لگا آئی ہوں۔ ناشتہ جو ادھر بھجوانا تھا۔ اب تم جلدی سے شاور لے کر فریش ہو جاؤ تو میں تمہارے کپڑے نکال دیتی ہوں۔ نیچے ڈاکٹنگ ٹیبل پر پایا جان سب کا انتظار کر رہے ہیں۔“

جلدی جلدی مصروف لہجے میں کہتی پڑے ہٹا کر وہ ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئیں۔
”وہ کون سا نکالوں؟“

انہوں نے تین سوٹ جو وہ اندر الماری سے نکال لائی تھیں۔ اس کے آگے کیے۔ اس نے سرسری نگاہ سے انہیں دیکھا اور پھر اپنے پہلے مشغلے میں مصروف ہو گئی۔

”میرا خیال ہے پورا اور صبح والا صبح ہے۔ شروع شروع کے دنوں میں اس طرح کے شوخ رنگین اور بھاری کام والے کپڑے پہنے جائیں تو پینے جائیں ورنہ بعد میں تو ایک دو نیچے ہو جائیں تو یہ ساری قیمتی چیزے عند وقتوں میں بند ہو جاتے ہیں اور تمہارے تو وہ دنوں طرف کے کپڑے ہی اتنے قیمتی اور نادر ہوں گے اب اتنے زیادہ ہیں کہ تمہیں تو دن میں کم از کم چار دفعہ ڈریس چینیج کرنا چاہیے۔ ٹھیک ہے نا پھر یہ۔ تمہاری کام والا اور صبح سوٹ انہوں نے اس کے آگے کیا۔ اس نے بہت مشکل سر ہلادیا۔

”چلو پھر تمہارا ش روم میں میں کسی کو بلا کر استری کروا دیتی ہوں اور تیار! جلدی کرنا۔ پایا جان کا ناشتہ پہلے ہی خاصا لیٹ ہو چکا ہے۔ آج انہوں نے ایک ہی ضد پکڑی ہے کہ ہر وقت کے ساتھ ناشتہ کروں گا۔ ورنہ بھی ادھر تو آج دوپہر کا ولیمہ ہے۔ اور تین گھنٹوں بعد ہی فنکشن شروع ہو جاتا ہے جب کہ رات کو سب کو شہر چلانا ہے۔ لوگ میں وہ فنکشن رکھا ہے نا جس میں۔“

سیدہ بغیر سانس لیے پوچھنے لگی تھیں صالحہ خاموشی سے اٹھ کر اوش روم کی طرف بڑھ گئی۔ سیدہ نے اسے ایک نظر دیکھا اور چپ کر گئیں۔

”میں کیا کروں صالحہ! تم کیا سمجھتی ہو میں تمہارے دکھ سے انجان ہوں مگر تمہارا یہ دکھ ایسا ہے کہ تمہیں خود ہی اسے اپنے سینے پر سنا ہوا گا۔ اپنا خون جگر جلا کر اس کی پرہ واری کرنا ہوگی اور جس دن اس کو خلق خدا کو بیان کرو گی اس دن تمہارا اپنا وجود بھی سچائی کھو بیٹھے گا۔ ہماری عورتیں اسی طرح کے غم سہہ کر رہی اور کھڑی ہوتی ہیں۔“

سیدہ بیڑ پر بیٹھ کر سوچنے لگیں۔ رات انہوں نے سلطان بخت کی بیزار گوشت زور شکل ہی سے بھلا چکا تھا کہ اس کا صالحہ کے ساتھ کوئی بھی ٹیک سلوک کرنے کا ارادہ نہیں پھر انہوں نے سلطان بخت کو رات تین بجے باہر میز پر بٹھکے۔ گار پیٹے دیکھ لیا تھا اور اس کے ایک گھنٹے بعد بھی۔

سیدہ کے خدشے درست ثابت ہوئے تھے۔ انہیں پہلے سے معلوم تھا۔ سلطان بخت کو صالحہ پسند نہیں اور وہ کسی مصیبت کی طرح ہی اسے اپنے ساتھ قبول کریں گے۔

”جو مرضی آئے کرے۔ میں کیا کروں سالوں اس پریشانی نے میری جان سولی پر لٹکانے رکھی ہے کہ اگر سلطان بخت نے صالحہ سے شادی نہ کی تو حسین شاہ میرے ساتھ کیا کرے گا۔ کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہ تھی اب کم از کم یہ عذاب تو میرے سر سے اتر گیا نا ہر بندہ اپنے مفاد کی سوچتا ہے میں کیوں نہ سوچوں اب یہ صالحہ کی قسمت اس کے نصیب۔ میں بہت قریبیاں دے چکی ہوں گھروں کی خاطر جس طرح میں نے اپنے مسئلے کو خود سمجھ داری ہوا کا رخ دیکھ کر حل کیا۔ اسی طرح صالحہ کے سب اسی طرح کرتے ہیں۔ کوئی کسی کا مسئلہ حل نہیں کرتا۔ سلطان بخت اس کے ساتھ کیسے نباہ کرتا ہے، کرتا ہے یا نہیں کرتا، عقل مند ہوگی تو قابو کر لے گی۔ بے وقوفی

کرے گی تو خود کو تباہ کرنے والی بھی خود ہوگی۔ اب یہ میرا درد سر نہیں۔“
وہ سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور سوٹ کی پین نکالنے لگیں۔

”اور اس بے وقوف کو دیکھو جہاں اتنے دن صبر کیا ہے، خوب کہاں کچھ دن اور صبر کر لے۔ پایا جان صبح پر چلے جائیں گے تو پھر بے شک جو مرضی من مانی کرنا پھرے واپس آکر بھی انہوں نے تجھ ہی سنبھالنا ہے اور دیکھا جائے تو سلطان بخت بھی صبح ہے۔ یہ صالحہ کہاں اس کے ساتھ چھٹی ہے۔ چہرے اور ہاتھوں پر ابھی سے جھمیراں بڑھ رہی ہیں رنگ کچھ صاف ہے اس لیے کچھ اور نمایاں ہوتی ہیں سلطان بخت شہزادہ لگ رہا تھا کل ایسی دلمن پایا کر اس کا تول رکھنا ہی تھا ناہ! ہمارے بیوں کے فیصلے۔“

وہ ایک سرد آہ بھر کر اٹھ کھڑی ہوئیں کہ باہر جا کر کسی ملازمہ کو کپڑے استری کرنے کے لیے آواز دیں۔



یہی سی کاٹھ بھرت و سبغ ہاں اس وقت سلطان شاہ کے معزز مہمانوں سے کچھ کچھ بھرا ہوا تھا۔ لوگ خوش گپیوں میں مگن تھے۔ جس کی وجہ سے بیگ گراؤنڈ میں بچتے میوزک کی آواز بہت کم آ رہی تھی چہرے ادھر ادھر مختلف آوازوں میں گرتے پھرتے تھے۔ آج سید سلطان شاہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ خواب جوان کی آنکھیں مدتوں سے دیکھ رہی تھیں۔ آج اس خواب کی تکمیل ہو گئی تھی۔ سید سلطان بخت کے سر پر سہرا چ گیا تھا۔ اور مرحوم بھائی سے کیا گیا وعدہ وفا کرنا ان کی زندگی کی دو بڑی خواہشات تھیں اور سلطان بخت کی مثال منوں کی وجہ سے کئی بار انہیں اس خواہش کا تکمیل پانا ناممکن لگا تھا۔ اسی کشمکش نے تو ان کے دل کو تانواں کر ڈالا تھا۔ بات صرف بیٹے کو دہا بنانا یا مرحوم بھائی سے کیے گئے وعدے کی تکمیل نہیں تھا بلکہ سیدہ کی بیس سالہ پرانی گرجہستی کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنے کا بھی مسئلہ تھا اور وہ حسین شاہ کی طبیعت سے بھی واقف تھے اگر سلطان بخت اس شادی کے لیے راضی نہ ہوتا تو حسین شاہ عین توجہ کے برعکس یا ان کی بیماری کا خیال کرنا تھا نہ اپنی جوان ہوتی اولاد کا نہ اپنی بیس سالہ پرانی اولاد کی زندگی کا وہ صرف تین حرف سیدہ کے منہ پر راکر اسے حوصلے سے پلٹا کر دیتا کئی بار کھلے الفاظ میں سیدہ کی زبانی حسین شاہ نے پچا کو کھلا بھی بھیجا تھا بس یہ دو دھاری تلوار تھی جس نے کئی سالوں سے سلطان شاہ کی آنکھوں سے پر سکون نیند کو ہٹا رکھا تھا۔ کل خیر و عافیت سے نکاح ہوا تو ان کو لگا۔ وہ ایک بار پھر جوان ہو گئی ہیں اور سہت کے ان کے سینے میں دل کی توڑ پھوڑ ہوئی ہی نہیں۔ اور اس تمام عرصے میں سلطان بخت کا رویہ بہت گور ایڈور رہا تھا کہیں بھی انہوں نے چوں چاں نہیں کی تھی اور آج کی دعوت نے ان کی سالوں کی تنگی ہی ارا ڈالی تھی۔ وہ اب خوش دلی سے اپنے دیرینہ دوستوں سے گپ شپ لڑا رہے تھے۔

”بھئی شاہی! یہ کیا بات، ہوئی ادھر بیٹے کے سر پر سہرا سجا، ادھر آب جہاز میں اڑ کر ولایت جا رہے ہیں کچھ دن تو ہوسو بیٹے کی خوشی کو انجانے کرتے۔“ ان کے بے تکلف دوست ہشام بیگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بیس بیگ صاحب اس سے بڑی خوشی اور کیا ہوگی بیٹے کو دہا بنانا دیکھ لیا بیٹی ماشاء اللہ سے پہلے ہی اپنے گھر بار کی ہے۔ رہ گئی پچھوئی بیٹی تو وہ میں نے شروع دن سے سلطان بخت سے کہہ رکھا ہے کہ وہ میری نہیں اس کی ذمہ داری ہے۔ وہی اس کا باپ وہی اس کا بھائی اور وہی سر پرست اور شہرینہ سچ پوچھنے تو مجھ سے زیادہ بھائی کا ہی باپ سمجھتی ہے۔ ہر بات اس کے گوش گزار کرتی ہے کیوں، بھئی سلطان بخت اس میں تو کم از کم کوئی مبالغہ نہیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں نا؟“ وہ پاس کھڑے بیٹے کا کندھا ہلا کر بولے جو اپنے دوست سے کوئی بات کر رہے تھے۔

”جی بابا جان اس میں کوئی شک نہیں انکل! شہرینہ میری ہی ذمہ داری ہے اور یہ ذمہ داری مجھے ہی جان سے عزیز ہے۔ اس میں بھی کوئی مبالغہ نہیں۔“

سلطان بخت نے فوراً ”مسکراتے ہوئے باپ کی ہاں میں ہاں ملائی۔ سلطان شاہ کا سر فخر سے بلند ہو گیا اور اس میں جھوٹ بھی کچھ نہ تھا۔ شہرینہ میں واقفی سلطان بخت کی جان تھی۔ اور سلطان شاہ نے بھی شہرینہ کے معاملے میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ اسے اسکول میں داخلہ بھی سلطان بخت نے کرایا تھا اب جب کہ سلطان شاہ کا خیال

”نہیں کوشش نہیں شاہجی! آپ کو اتنا ہوگا۔ آپ کو میری قسم۔“ وہ پیلے لہجے میں بولی شاہجی تو اس لہجے پر
قربان ہو کر سو پار آنے کو تیار ہو جاتے۔

”اول۔“ وہ کچھ کہنے جا رہے تھے کہ زوردار مردانہ قوتوں کی آوازاں کے کانوں میں پڑی۔
”کون۔“ کون بیٹھا ہے اوہر تمہارے پاس؟“ وہ چونک کر لڑے۔ ”نہیں تارہ جیسے ایک لمحے کوچپ کر گئی۔
”کلب۔ کوئی نہیں۔“ وہ ہٹلا گئی۔

”یہ کوئی نہیں تھا کوئی مسمان آیا ہوا ہے تم اپنے بیڈ روم میں ہو۔“ سلطان بخت کا لہجہ مشکوک تھا۔ یہ
کیجنت ٹیوڈل لارڈز کو ذرا گھاس ڈال دو۔ یہ ہمیں اپنی پاپائی ہی سمجھنے لگتے ہیں اور اگر ان کی پراپرٹی کو ہتھ
کرتا ہے تو یہ ہی شو کرتے رہو کہ سرکار ہم آپ کی جاگیر ہی تو ہیں۔“ ”نہیں تارا کو زور گل کی بات یاد آئی۔
”آں۔ ہاں مسمان تھے۔ ساما کے پاس بیٹھے ہیں۔ میں تو اوہر ہوں کا جن روم میں ماما کے پاس ہی تھی وہیں سے
اٹھ کر آئی ہوں۔ آپ پھر آ رہے ہیں نابات ٹائیس نہیں بتائیں تھے۔“ وہ اٹھ کر اپنی پہلی ٹون میں واپس آتے
ہوئے بولی۔

ایک تو یہ آلو کا پھل بھی خود جس قدر بے ہنگم ہے اسی طرح بیہوش اس کے قوتوں میں۔ اوہر بیٹھ کر مٹا ہے۔
ایزپورٹ تک آواز جاتی ہے جھلا لہڑ کرنا بھول جاتے ہیں۔

نہیں تارا نے دانت کچکا کر سامنے ڈانٹ کھینک نیل پر بیٹھے قہرشی کو گھور کر دیکھا۔ وہ آج ریسرسل کے لیے نہیں گئی
تھی اور وہ خبر لینے گھر چلا آیا تھا۔ زیور گل نے اسے ڈنر پر روک لیا۔ زیور گل کھانا لگاوانے گئی قہرشی پر رومانس سوار
ہونے لگا۔ وہ نین تارا پر باقاعدہ فریڈت ہی ہو گیا۔ اس کی تھی وار کھٹکونے بیچ جج نین تارا کے سادہ مزاج کو جکڑنا
شروع کر رہا تھا۔ ابھی چند منٹ پہلے اس کا نازک ہاتھ تمام کراس کی نزاکت اور خوبصورتی میں زمین آسمان کے
فاصلے دار تھا اور میں تارا کا لگا لگا دل بے شاہجی کی جدائی میں اوہر مواہو جا رہا تھا۔ قہرشی کے موٹے نرم گداز
ہاتھوں کا لمس پائسل بے قابو ہونے لگا تھا۔ اس کی بیزار اور اکثرین کہیں دور جا بیٹھے تھے وہ قہرشی کی بیٹھی
مسکان اور ویل کویز تو سنی جملوں کے حصار میں گھر کے تھوڑا مسکر رہی تھی۔ قہرشی کے دل کی دھڑکنیں بے
ہنگم ہونے لگیں۔ اس کی محنت ٹھکانے لگنے جا رہی تھی۔ وہ خود بخود ہموار ہو رہی تھی۔ نین تارا بہت آسٹی سے
اس کے جال میں آنے ہی والی تھی کہ اس کے موبائل کی بپ بج اٹھی قہرشی کے کیے کرانے پر پائی پھر گیا۔ وہ اپنا
ہاتھ چھوڑ کر موبائل پر جھینگی اور پھر اسکرین پر آنے نمبر کو دیکھتے ہی موبائل نے گراؤنچ میں چلی گئی۔ قہرشی کا
دھڑوہر کرنا دل ٹھنکا تھا ہر کرست روی سے دھڑکنے لگا۔ اب وہ زیور گل اوپے اوپے ٹھنکا ہوا کے ساتھ خدا
جانے کون کون سی تھی کے گول گپے سارا تھا۔

اور شاہجی کی آواز سننے ہی نین تارا کو اپنی کچھ دیر پہلے کی بے اختیار ی یاد آئی۔
”ہاں میں آتا ہوں کہنے تک۔“ وہ اس کو انکار تو نہیں کر سکتے تھے اسی لیے تو اتنے دنوں سے فون نہیں کیا تھا کہ
پھر اس کی تو ازبقتیا“ نہیں اور بے قرار کر دیتی۔ اور وہ اس سے طے بغیر نہ پاتے۔
”گو کہ پھر میں آتا ہوں کہنے ڈیڑھ کہنے تک۔“ وہ رابطہ منقطع کرنے جا رہے تھے۔

”اوسٹل۔ سیں شاہجی۔“ وہ ذرا سا چلائی۔
”ہاں کو کیا بات ہے؟“ انہوں نے پارکنگ سے اپنے کچھ دوستوں کو اندر آتے دیکھا تھا۔ وہ اب کارڈور کی
طرف دھڑ رہے تھے سلطان بخت انہیں ریسو کرنا چاہ رہے تھے جلدی سے بولے۔
”وہ اصل میں شاہجی میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ اوہر ماما کے کچھ گیٹ آئے ہوئے ہیں وہ خدا چلنے کب
جاتے ہیں۔ آپ اوہر آئیں گے تو ہم دونوں کی پرائیویسی ڈسٹرب ہوگی۔“ وہ رک رک کر بولی۔
”تو پھر؟“ وہ ماتھے پر تھخن ڈال کر بولے۔ ”ایسے کون سے خاص مسمان ہیں جو اتنی دیر تک رکھیں گے تم
زیور گل سے میری بات گراؤ۔ میں بات کرتا ہوں۔“ وہ خشک لہجے میں بولے ان کا سارا اٹھ اس بد مزگی پر ہون
ہوئے کو تھا۔

تھا کہ شہریت کی تعلیم اس کی جائے تو سلطان بخت نے کہہ دیا تھا کہ شہریت ان کی ذمہ داری ہے اور اس کے بارے
میں ہر فیصلہ کرنے کا حق صرف انہیں ہی حاصل ہے جسے سلطان شاہ نے خوش دلی سے مان بھی لیا تھا۔
”پھر واپسی کب تک ہوگی ہمیں تو آپ کی واپسی کا انتظار رہے گا۔“ ہشام بیک بولے۔

”انشاء اللہ تین چار ماہ میں اس سے زیادہ سہرا حال نہیں۔“
وہ پر اعتماد لہجے میں بولے تو سلطان بخت نے کچھ بدمزہ ہو کر ہاتھ میں پکڑا بیٹھی کا گلاس پاس سے گزرتے تو میز کی
ٹرے میں رکھ دیا۔ آج ان کی بوریٹ کی انتہا ہو چکی تھی۔ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا جا رہا تھا۔ مسلسل فار میلیٹی
بھاتے بھاتے وہ تھک چکے تھے اور رات کی بیزار ی نے انہیں اور کوفت زہ کر دیا تھا۔ صابن کے بارے میں جیسے
ان کے خیالات بھلے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر بھی رتی برابر تبدیل نہ ہوئے تھے۔ کوئی بھی مثبت تبدیلی ان میں نہ آسکی
تھی وہ جیسی ان کے تصور میں تھی خاموش بڑی بڑی سی۔ بیچپور و ساسی انہوں نے رات اسے دہانے کے
روپ میں پایا۔ وہ ایک پل کو بھی انہیں متاثر نہ کر سکی تھی۔ اور یہ سوچ ان کے سکون کو غارت کر دینے کے لیے
کافی تھی کہ اب اس کوفت زہ شخصیت کو انہوں نے نامرخصتہ پیشانی سے نہ صرف سنا ہے بلکہ اس کے ساتھ
قدم بقدم زندگی بھی گزارنی ہے۔

انہوں نے سینے سے ایک گھرا سانس کھینچا۔ ایک نظر پاپ کے مہلکن پر ڈالی جو دوست سے باتوں میں
گن گن تھے۔ سارا ہال ہی انہیں مہلکن اور خوش باش چہروں سے بھرا نظر آیا۔ ایک وہی تھے بے چین و مضطرب
جن۔ عزاز میں یہ فنکشن ہو رہا تھا۔ انہوں نے کوٹ کی آسٹین ہٹا کر گولڈن ریسٹ و اچ میں ٹائم دیکھا۔ نو بجتے
کو تھے۔ فنکشن ابھی ایک دو گھنٹے اور جاری رہنا تھا مگر اب ان کی برداشت کا پیمانہ تھکنے کو تھا۔ وہ پاس کھڑے
دوست سے معذرت کر کے ہال سے باہر آگئے۔ کارڈور میں بھی لوگوں کا رش تھا وہ کسی بے مزہ ہم تھا اس وقت
ہوٹل میں عموماً رش ہی ہوتا ہے وہ پیزار ہو کر باہر لان میں چلے آئے ان کے ہال سے باہر لان میں کالیاں ہی
گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ لان کے نسبتاً کم رش اور ذرا ٹائم کی واسے حصے میں چلے آئے اور کوٹ کی جیب سے
موبائل نکال کر نمبر ڈائل کرنے لگے۔

”ہیلو نین تارا! ہیلو۔“ وہ اس کی آواز سننے ہی پہچان گئے تھے۔ ان کے دل کی دھڑکنیں ایک مخصوص لے میں
آگئیں۔

”شاہجی آپ ہیں۔ ہائے اللہ میں آپ کو کس قید میں کر رہی تھی یہ آپ ہیں کس دنوں کے وفائے اتنے دنوں
کے بعد فون کیا۔ ابھی بھی فون کرنے کی کیا ضرورت تھی میں مرحا ہی تو پھر فون کر لیتے۔“
وہ بیچ رونے لگی اور سلطان بخت کو یہ احساس ہی بے چین کر دینے کے لیے کافی تھا کہ نین تارا کی جین
آنکھوں میں آنسو آئے۔

”نینو! مائی سوٹ ہارٹ! مائی ڈارنگ! آئی ایم ساری ٹریٹلی سوری مگر تمہیں تو پتا ہے میں بڑی تھا بہت آج ہی
پہنچا ہوں جرمنی سے میں۔“

”آپ آ رہے ہیں ابھی۔“ وہ تیزی سے ان کی بات کاٹ کر بولی۔
”آپ آ رہے ہیں نا؟“ وہ بہت پر جوش ہو گئی تھی۔ وہ تذبذب کا شکار ہو گئے۔ آج تو ان کا روادہ نہیں تھا۔ اس
کی طرف جانے کا ٹرین تارہ کی دعوت دیتی پر جوش کھٹکتی آواز نے ان کے ارادے کمزور کر دیے۔
”نہیں۔ آج تو نہیں۔ ابھی آیا ہوں۔ ابھی تو گاڑی۔“ وہ کچھ ہچکچا کر بولے۔

”شاہجی! آپ کو میری قسم شاہجی! اگر آپ آج نہ آئے تو قسم سے آپ کی نین تارا مر جائے گی۔ بہت انتظار
کر لیا میں نے آپ ایک پل نہیں رہ سکتی آپ کو دیکھے بغیر۔ نین نے قسم کھالی ہے آپ یاد رکھیں۔“ اس کی
دھمکی اتنی دلفریب تھی کہ سلطان بخت کا پی چاہا فنکشن پر لخت بھیج کر وہ اڑتے ہوئے اس تک جا پہنچیں۔
”اچھا بابا کوشش۔“ وہ ذرا سا ہنسے۔

”وہ تو اوصرفاتوں میں ملن ہیں۔ میں انہیں نہیں بلواؤں گی، وہ مہا کے کوئی کزن ہیں۔ شاید اسلام آباد سے آئے ہیں اور اوصرفاتوں کو بھی کسی کو بھی ہمارے تعلق آتی ہیں نکان و فیو کے بارے میں نہیں بتایا اور آپ جب آئیں گے تو میں آپ کو رات کو نہیں جانے دوں گی تو اس طرح پھر۔“ وہ ہنک کر چپ کر گئی۔

”تو پھر کیا کریں؟“ سلطان بخت الجھ کر بولے۔
 ”آپ ہی بتائیں، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ وہ بڑی لگاؤ سے بولی۔
 ”تو ایسا ہے کہ تم پھر سید ہاؤس آ جاؤ۔ ڈرائیور تو ہے نا۔ اس کے ساتھ آ جاؤ۔“
 ”وہیں آ جاؤں گا۔“ ان کے ذہن میں ترکیب آئی۔

”سید ہاؤس کھلا ہے اور ابھی تو اوصرفاتوں شاید کنسرکشن ہو رہی ہے۔“
 ”نہیں، کام مکمل ہو چکا ہے، فنشنگ بھی تقریباً ہو چکی ہے اور جو کیدار ایک دو ملازموں کے ساتھ موجود ہے اوصرفاتوں ابھی فون کر کے کہہ دتا ہوں کہ وہ سب روم کھلوادے۔“ وہ جلدی جلدی بولے۔
 ”شادی اچھے آپ سے گل ہے۔“ وہ منہ بنا کر لڑاؤ سے بولی۔

”اب کیا ہے؟“ وہ کچھ اکتا کر بولے۔
 ”آپ نے کو بھی تو میرے نام کر دی اور نام وہی رکھا ہوا ہے اپنا فیملی نیم ”سید ہاؤس“ وہ کچھ رنجیدہ لہجے میں بولی۔

”بھئی تمہارا ہی ہے وہ گھر، بلکہ سب کچھ جو کچھ تمہارے نام ہے اور جو نہیں بھی تمہیں فکر کرتی ہو۔ جب میں نے اپنا آپ تمہارے نام کر دیا تو پھر چیخوں اور کوشیوں کی کیا اوقات۔“ وہ سراوچا کر کے بارعب لہجے میں بولی۔

”بہر حال تم وہاں ایک ڈیرہ گھنٹے تک پہنچ جانا میں بھی گھنٹے تک اٹھ اٹھوں گا۔“
 ”اوسے شاہ جی ہائے۔“ وہ بھی خوش دلی سے بولی تو سلطان بخت نے موبائل آف کر دیا اور نین تارا مسکراتی ہوئی ڈانٹنگ نیکل کی طرف آگئی، آج قریشی کا اتفاق اس کے لیے مبارک ثابت ہوا تھا۔ پارٹ ٹائم کے لیے قریشی کی محبت بھی بری نہیں۔ اتنے بے ہنگم وجود میں دل بڑا رومانٹک ہے قریشی کا۔ وہ مسکراتے ہوئے قریشی کے سامنے جا بیٹھی۔



اور پھر ٹھیک ایک گھنٹے بعد جب کہ ابھی فنکشن جاری ہی تھا۔ سلطان بخت سلطان شاہ سے اجازت لے کر ہوٹل سے نکل آئے۔

”بابا جان! ایک ضروری کام سے جانا ہے، بہت ایمر جنسی ہے اس لیے جانا پڑ رہا ہے ہمیں گاؤں رات کو کچھ دیر ہی سے پینچوں گا“ آپ گھر جا کر بتا دیجئے گا پلینز۔“ وہ ہولے ہولے ان کے کان میں کہہ رہا تھا اور سلطان شاہ اپنے کسی مہمان کے پاس گھر سے سرہلانے لگے، انہوں نے نظروں ہی نظروں میں اپنی خنکی کا اظہار بھی کرنا چاہا۔ سلطان بخت کو روکنا بھی چاہا۔

”ہیں تمہوڑا سا تو نام ہے، سلطان بخت! اب میرے ساتھ ہی چلنا اس طرح فنکشن چھوڑ کر جانا اچھی بات نہیں۔“ وہ منہ نہ کے انہیں پیچھے سے روک کر آہستگی سے بولے۔

”جی ایم سوری بابا جان! مجھے ابھی پہنچنا ہے میں دو ایک گھنٹے تک آ جاؤں گا۔“ وہ اب ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔

”سلطان بخت! سب مہمان کیا سوچیں گے برا لگتا ہے، فنکشن تمہارے لیے تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے اگر تم ہی۔ اس طرح۔“ وہ الٹ الٹ کر ان کے بہت قریب ہو کر بولے۔

”بابا جان! آپ ہیں نا اوصرفاتوں پلینز برائے نو انڈر اسٹینڈ، مجھے ضروری کام نہ ہو تا تو میں کبھی نہ جاتا، خدا حافظ۔“ وہ بجلت میں ان سے پیچھا چھڑا کر باہر نکل گئے۔ سلطان شاہ کا دل بے ہنگم لہجے کے برا حال تھا۔

”یہ کبھی نہیں سدھرے گا۔ اپنی حرکتوں سے مجھے مار کر ہی دم لے گا۔ تالا تکی ہو وہ احمق۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہے تھے۔ ”اس کے ضروری کام اونہ! جیسے مجھے پتا نہیں اسے میں دیکھ لوں گا۔ بہت اس نے من مانی کر لی۔“ وہ غصے سے بل کھاتے پیچھے مڑ گئے۔

پھر تمام فنکشن کے دوران لوگوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے ایک ایک کے پاس جا کر احوال پوچھنے کے دوران بھی ان اوصرفاتوں کی طرف لگا رہا۔
 ”جانے سے پہلے کچھ ایسا انتظام کر جاؤں کہ سلطان بخت کے پرکٹ جائیں۔ انڈنا بھی چاہے تو پھر پھڑا کر رہ جائے۔“

صاف سے ان کا رویہ صبح ناشتے کی میز پر ہی ان سے ڈھکا چھپا نہیں رہا تھا، نئے نئے شادی شدہ جوڑے کے ایک دوسرے کے بارے میں شادی کی پہلی صبح کیا تاثرات ہوتے ہیں، کیا انہیں معلوم نہیں تھا اور اس کی ذرا سی جھلک بھی انہوں نے دونوں کے چہروں پر نہیں پائی تھی پھر صاف کا بڑا بڑا سا روپ ٹیک اپ اور منجی لہاس کے یاد جو چہرے اور آنکھوں سے چھٹی اداسی، بے حد سنجیدہ چہرہ اور لیے لیے سے اندازاً نہیں بہت کچھ سمجھا چکے تھے۔ وہ صبح ہی سے اس لفظ پر سوچنے سے بچنا چاہ رہے تھے اور اب سلطان بخت کے غیر ذمہ دارانہ رویے نے انہیں پھر سے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

پھر ایک ایک کر کے مہمان رخصت ہونے لگے وہ استقبال پر کھڑے سب سے الوداعی کلمات بولتے رہے اور سلطان بخت کی غیر موجودگی پر مختلف بہانے گھڑ کر سب سے معذرت بھی کرتے رہے، آخر میں گاؤں کے چیدہ چیدہ مہمان رشتے دار ہی رہ گئے۔ وہ بھی جا کر گاؤں میں بیٹھنے لگے۔

”غلام بخش! میری بات سن لو پھر آگے۔“ انہوں نے دوڑ کھڑے سلطان بخت کے محافظ خاص کو آواز دی۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھنے لگا تھا۔ بڑے شاہ جی کی آواز سن کر مستعدی سے مڑا اور کندھے سے گلی اپنی کا مشکوف درست کرنا ان کی طرف بڑھا۔

”جی شادی! وہ پاس آ کر موبوب لہجے میں بولا۔

”تم کدھر جا رہے ہو؟“ وہ اس پر نظر پڑا، جمائے کھڑے تھے۔

”گ۔ گاؤں جی۔“ وہ کچھ کھٹا لیا۔

”تم چھوٹے شاہ جی کے ساتھ نہیں گئے؟“ ان کا انداز کڑا تھا۔

”جی انہوں نے صبح کر دیا تھا۔“ وہ سر جھکا کر بولا۔

”بخت میں نے تم سے کہہ رکھا ہے کہ تم کو ہر وقت ان کے ساتھ رہنا ہے۔ جب بھی وہ کہیں باہر جائیں تو پھر۔“ وہ سخت کھردرے لہجے میں بولے۔

”جی میں نے کہا تھا کہ وہ نہیں ہائے۔“ وہ دھت سے بولا۔

”تم اپنی گاڑی کسی اور کو دے آؤ اور میرے ساتھ آ جاؤ۔“ وہ اسے حکم دے کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وہ وہاں سے مڑ گیا۔ اور چند لمحوں بعد ان کی گاڑی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ کا دروازہ کھولنے لگا سلطان شاہ پیچھے بیٹھے تھے۔

”بیچھے آؤ غلام بخش۔“ انہوں نے حکم دیا۔ غلام بخش فوراً فزٹ ڈور چھوڑ کر ان کے ساتھ پرے ہٹ کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔

”گاڑی چلاؤ مگر رفتار بہت کم رکھنا۔“ انہوں نے ڈرائیور کو حکم دیا اس نے سر ہلا کر گاڑی اشارت کر دی۔

”تم کب سے ہو سلطان بخت کے ساتھ؟“ وہ نیچی آواز میں غلام بخش سے بولے۔

”جی تقریباً تین سال سے۔“

”ہوں جب سے سلطان بخت باہر سے آیا ہے تم ہی اس کے ساتھ ہو۔ اب مجھے بتاؤ وہ جب اوصرفاتوں میں

آتا ہے تو کہہ کر ہر جگہ جاتا ہے۔ ان کی آواز ابھی بھی مدھم تھی۔

”جی ٹیکسٹی“ آفس اور۔“

”ان رسمی جیکوں کو پھوڑ کر ان کا مجھے پتا ہے۔“ وہ تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ کر بولے۔
”جی اور تو کہیں نہیں ہنس گاؤں۔“ وہ سر جھٹا کر بولا۔

”جیکو اس مت کرو غلام بخش اہم سلطان بخت کے ساتھ رہتے ہو اس لیے شاید مجھے نہیں جانے میں تمہاری پٹیوں کا سروہ بنا سکتا ہوں کہ تمہارے گھر والوں کو اس کی راکھ بھی نہ مل سکے گی۔ سنا تم نے۔“
”جی شاہ جی۔“ وہ مشتایا۔

”شاہ جی کا بیٹا۔“ وہ سر اٹھا کر غصہ سے بڑبڑائے۔ ”جو میں نے پوچھا ہے وہ بتاؤ مجھے۔“
”میں کیا بتاؤں شاہ جی! جو آپ پوچھ رہے ہیں۔ بتاؤ رہا ہوں۔“ وہ اب کے دروازہ پر بولا۔
”تمہیں سلطان بخت کا کارڈ کس نے مقرر کیا تھا؟“ وہ ٹھنڈے لہجے میں بولے۔

”جی آپ نے۔“
”تمہیں کیا سمجھتے ہو سلطان بخت اتنا بڑوں ہے کہ کوئی اس پر حملہ کرے تو وہ حملہ کرنے والوں کی تہ تکس نکال کر ان کی پٹیلی پر نہ رکھ دے اور اپنی حفاظت کے لیے تم جیسے تمک حراموں کی شکل دکھنے والا مارے اس قدر دشمن ہیں کہ میں اپنے بیٹے کو چند میل کے فاصلے پر بھی گاڑ کے بغیر نہ بھیج سکوں۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے؟“ وہ دانت پیس کر بول رہے تھے۔ وہ چپ رہا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے اور میں نے تم سے پہلے دن کہا تھا کہ تم نے ناصر فک کے چھوٹے شاہ جی کی حفاظت کرنی ہے بلکہ ان کی تمام سرگرمیوں کی وقتاً فوقتاً مجھے رپورٹ دینی ہے۔ یاد ہے نا تمہیں؟“
”جی شاہ جی! وہ دوسرے لہجے میں بولا۔

”تمہارے اور تمہارے خاندان کے حقیقی تانی کا میں نے ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔ میں نے وہاں ہونا نہیں چاہتا۔“
”کام سے تمہیں چراتے رہو۔“ وہ اب بھی خاموش رہا۔ سلطان شاہ نے گہری نظر سے اسے دیکھا۔
”ہاں اب مجھے آرام سے بتاؤ۔ وہ کون کون سی جگہیں ہیں جہاں سلطان بخت گزشتہ ایک سال میں چار بار سے زیادہ گیا ہے۔ یا خاص طور پر اور جاتا ہے۔ میرا منڈی کو پھوڑ کر۔“ وہ اس کی تمکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرو لہجے میں بولے۔

غلام بخش نے بے بسی سے انہیں دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

”بولو میں کیا بکواس کر رہا ہوں میرے پاس تمہارے ایکشن دیکھنے کے لیے ناغم نہیں ہے۔“ وہ مختصر ہے اب کے ان کی آواز بھی خاصی بلند تھی۔

”وہ جی اگر چھوٹے شاہ جی کو کچھ معلوم ہو گیا تو وہ تو بتی انہوں نے۔“ وہ بے بسی سے اپنی انگلیاں موڑنے لگا۔
”تم بکواس کرو باقی کی ذمہ داری میری ہے۔“

”وہ جی ادھر ایک کو بھی سے گل کدو وہاں جلتے ہیں جی صاحب۔“ وہ اچکھا کر بولا۔

”کیا اس نے بھی کوئی کوٹھی نہیں دیسی اس کو ادھر کس سے ملے جاتا ہے کون رہتا ہے ادھر اس کا ڈوٹھ سے اس کی گردن پر مگھار کر بولے۔

”وہ کوئی ماں بچی سے مجھے اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی صرف باہر ہی گاڑی کے پاس۔“

”کب سے یہ سلسلہ چل رہا ہے۔“ وہ سوچ لہجے میں بولے۔

”تقریباً سال بھر سے یا شاید اس سے زیادہ۔“

”کب بھی جاتا ہے میرا مطلب ہے آج کل۔“

”جی آج کل کا تو مجھے پتا نہیں پچھلے دنوں غفلت سے تو وہ جو جلی ہی میں تھے۔“

”اور جو جلی آنے سے پہلے کب گیا تھا۔“

”اسی روز جی۔ ادھر سے ہو کر پھر جو جلی آئے تھے۔“

”کوئی گمراہ پکڑ کر تو نہیں؟“ وہ شاید خود سے بولے تھے اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہے تھے وہ گڑبڑا گیا۔

”پتا نہیں جی! وہ نظریں چرا کر بولا۔

”ڈرائیور کو ادھر کا ایڈریس بتاؤ۔“ وہ حکم سے انداز میں بولے۔

تقریباً بیس منٹ بعد ان کی گاڑی گل کدو کے گیٹ کے آگے کھڑی تھی۔

”جاؤ دیکھو یا بتا کرو سلطان بخت ادھر آیا ہے۔“ اگر اس کی گاڑی کھڑی ہے تو مجھے بتاؤ اگر۔“ ان کے حکم پر وہ جھانک مار کر گاڑی سے اتر اور گیٹ کی طرف بڑھا انہوں نے ایک نظر کوٹھی کو دیکھا پوٹش اریا تھا شہر کا۔ کوٹھی کاٹی ہوئی تھی خوبصورت اور ماڈرن طرز پر بنی ہوئی۔ گیٹ کھل گیا تھا۔ سلطان شاہ نے سرواگے کر کے گیٹ کے اندر پورچ میں دیکھا یا۔ پورچ میں کوئی گاڑی نہیں کھڑی تھی۔

”وہ جی جو کیدار تھا۔ ادھر کوئی نہیں آیا۔“ غلام بخش چند لمحوں بعد آکر بولا۔

”گھر میں کون کون ہے۔ اس وقت۔“

”جی جو کیدار کہہ رہا ہے گھر میں اس وقت ملازمین کے سوا کوئی نہیں ہے۔ دونوں ماں بیٹی شاید کسی دعوت وغیرہ میں گئی ہیں۔“

”اچھا تم ادھر ہی رہو۔ کہیں بڑے سے بڑے گھر کی نگرانی کرو۔ چھوٹے شاہ جی اگر ادھر آئیں تو مجھے فون۔“

غلام بخش نے اس کی کوئی چیز نہیں سمجھی اور اپنا موبائل وہ اسے نہیں دے سکتے تھے پھر خود کیے رابطہ کرتے۔

”چلو تم بیس رو۔ تیس واپسی پر تمہیں ایک کراؤں گا اگر مجھے تاخیر ہو جائے یعنی دو گھنٹے سے زائد تو پھر تم ادھر سے گاؤں چلے جانا۔ چلو ڈرائیور۔“ کہہ کر انہوں نے سر اندر کر کے ڈرائیور کو حکم دیا اور چند لمحوں میں ہی گاڑی تیزی سے سڑک پر بھاگی جلی گئی۔ غلام بخش نے بے بسی سے گاڑی کی ہیڈلائٹس کو دور ہوتے دیکھا اور گہرا سانس لے کر سڑک کراس کرنے لگا۔

عبدالستین کا رویہ صوفی صاحب کے لیے بہت حیران کن تھا۔ سید سلطان بخت کے ویسے میں جو جلی ہی میں ہو رہا تھا جوئے شاہ جی نے پورے گاؤں میں سے بس دو چار ہی معززین کو شرکت کی دعوت دی تھی رسمی دعوت تو وہ پھر کو گاؤں میں ہوئی تھی اور گاؤں کے چند خوش قسمت افراد میں سے ایک صوفی صاحب بھی تھے جنہیں اس تقریب میں شرکت کی دعوت ملی تھی اور دعوت میں شرکت نہ کر کے صوفی صاحب بڑے شاہ جی سے خفگی مول نہیں لے سکتے تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ بڑے شاہ جی کو دو چار ماہ بعد واپس گاؤں ہی آنا تھا اور یہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا بڑے شاہ جی کی موجودگی میں چھوٹے شاہ جی کو کبھی کھیلنے کی اجازت نہیں مل سکتی اور صوفی صاحب نے دل میں سوچ لیا تھا جیسے ہی بڑے شاہ جی اپنا اعلان اور جگہ کے واپس آئیں گے صوفی صاحب واپس گاؤں آجائیں گے اور آتے ہی آتے کسی مناسب جگہ جلد سے جلد نکاح کریں گے۔

وہ وہ ہیں ہی شر آگئے تھے کہ عبدالستین سے ملاقات کر کے اسے اپنے نر سفر کے بارے میں بتائیں اور ساری صورت حال بھی جس سے آج کل ان کا گھرانہ گزر رہا تھا بتاتے تو ہی دل میں اپنے اس ہونہار بیٹے سے خفا تھے۔ ہر وہ اس سے زیادہ دن تھا بھی نہیں رہ سکتے تھے کیونکہ اپنی اولاد میں انہیں آمنت اور عبدالستین ہی سے تو بہت پیار تھا بلکہ سب سے زیادہ پیار اور توجہ عبدالستین کے حصے ہی میں آئی تھی شہر آنے سے پہلے وہ ان کی آنکھ کا تارا ہوا کرتا تھا اس کی کوئی بھی بات، کوئی بھی فرمائش مانگنے کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے ویسے بھی ان کے

خیال میں اس نے کبھی ان سے کوئی بے جا فرمائش کی بھی نہیں تھی اور وہ عبد العین کی طرح نالائق اور ناقربان بھی نہیں تھا بلکہ تعلیمی میدان میں ہمیشہ اپنی کارکردگی دکھا کر ان کا سر ہی فخر سے بلند کرنا تھا اسی لیے تو بڑے شاہجی کی حقیقی کے باوجود انہوں نے اسے شہر اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیج دیا تھا۔ عبد العین کی خواہش پر ہی انٹر کے بعد بھی اسے تعلیم جاری رکھنے کی اجازت دے دی تھی۔ اسے بڑھنے کا شوق بھی بہت تھا۔

عبد العین کی طرح نہیں جس نے مسلسل کئی سالوں سے انہیں زچ کر رکھا تھا، پہلے اسکول میں ڈالا تو وہاں نہیں پڑھتا تھا وہاں بھی اس کی اونٹ پانگ حرکتیں اور کھیل تماشے صوفی صاحب کو برا فوجتہ کرنے کے لیے کافی ہوتے تھے اور جب سے حفظ قرآن کی تعلیم میں ڈالا تھا تب سے تو اس نے انہیں بہت عاجز کر رکھا تھا اور ابھی تک جہاں سے چلا تھا وہیں کھڑا تھا نالائقوں کا سینکڑہ اسے اکثر دل ہی دل میں یہ خطاب دیتے تھے اور برسوں جب سے انہوں نے مسند کی تقریب میں گانا گانے پر اس کی خوب دھتائی کی تھی۔ وہ انہیں دوبارہ نظر ہی نہیں آیا تھا۔ روتا گھری میں تھا مگر صوفی صاحب کی آمد کی خبریاتی ہی کسی کو نہ کھدرے میں روپوش ہو جاتا تھا پتا نہیں وہ انہیں اپنی صورت نہیں دکھانا چاہتا تھا یا ان کی نہیں دیکھنا چاہتا تھا انہیں کون سی اس کی پروا تھی۔ وہ تو اس کے نظرنہ آنے پر ہی مطمئن تھے اور عبد العین سے تو وہ اس لیے خفا تھے کہ وہ گاؤں ان کے اصرار کے باوجود بہت کم آتا تھا اور اب تو بہت بلانے پر بھی تو جبر نہ دیتا جیسے اس بار شاہجی میں بڑے شاہجی کے سامنے انہیں شرمندہ کروا دیا تھا۔

”وہ لڑکا معاذ آیا تھا تمہارے پاس میرا خط لے کر۔“ اس کے روکنے کے باوجود صوفی صاحب اس سے بہت لگاؤ سے بول رہے تھے۔

اور وہ مسلسل انہیں نظر انداز کیے کیپوٹری کی پورٹ سے کھیل رہا تھا۔

”کون سا لڑکا؟“ وہ انہیں دیکھے بغیر بولا۔

”معاذ جو اوھر شہر میں پڑھنے آیا تھا میٹرک میں ٹاپ کیا تھا اس نے انہیں نے اسے تمہارے پاس بھیجا تھا کہ تم اس کی کچھ رہنمائی کرو۔“ اوھر اس کا کوئی واقف کار نہیں تھا اس لیے۔

”بابا صاحب! میں یہاں فارغ نہیں ہوتا جو ہر اے غیرے کی رہنمائی کرنا پھولوں۔ مجھے اوھر پڑھائی سے فراغت نہیں پھر میں نے دو شارت کو رسز بھی شروع کر رکھے ہیں کہ یہاں نوکری محض ڈگری کی بنیاد پر نہیں ملتی اور مجھے یہاں بہت اعلیٰ مقام بنانے کے لیے بہت محنت کرنا ہے اور اس محنت کے دوران میں بھلا کہاں سے وقت نکالوں کہ لوگوں کی رہنمائی کروں۔ آپ گاؤں میں بیٹھے یہ ٹیک کام کر رہے ہیں۔ یہی کافی ہے اور ویسے بھی وہ میرے پاس نہیں آیا تھا آتا تو شاید آپ کی وجہ سے میں اس کے لیے بھٹہ نہ کچھ کر دیتا۔“

عبد العین کا بوجہ حد درجے بیزار کن تھا اور تیکھا بھی۔ صوفی صاحب کچھ دیر تو حیران ہی رہ گئے تھے عبد العین نے تو کبھی ان سے اوچی آواز میں بات نہ کی تھی شاید بہت محنت کر رہا ہے اس لیے چیز اہو گیا ہے۔ ان کے دل سے اس کی حمایت کی۔

”ویسے بھی اپنی تعلیم کا خرچ اٹھانے کے لیے میں ایک جگہ پارٹ ٹائم بھی کر رہا ہوں۔ ایک ہوٹل میں رات کو چھ گھنٹے کاؤنٹر میں کی جاب ہے۔ آپ تو میرا بوجہ نہیں اٹھا سکتے اس لیے۔“ وہ تڑپتا کر بولا۔

”کیسی تو کوئی بات نہیں عبد العین! تم نے جب جب جتنی رقم مانگی میں نے تمہیں بھیجی ہے۔“ وہ مست لہجے میں بولے۔

”پہلے کی بات اور تھی۔ جب میری تعلیمی اخراجات کم تھے مگر اب ان میں اضافہ ہو گیا ہے اور آپ کی بے نیازی میں بھی۔ کتابیں اس قدر مہنگی ہیں پھر شارت کو رسز کی فیسیں اٹھانے سے پہلے اوڑھنے کا خرچ اور پھر ہاسٹل کے اخراجات مگر آپ کو میری کوئی پروا ہی نہیں رہی کہ مجھے اوھر کس چیز کی ضرورت ہے، مگس کی نہیں۔ ایک ایک روپے کے لیے مجھے کس قدر سوچنا اور کتنا کام کرنا پڑتا ہے۔ آپ کو کیا علم۔“

”تو یارنا مجھے لگے بھیجا تھا میں۔“

”بس بابا صاحب! میں بار بار آپ کے آگے ہاتھ پھیلا کر آپ کی ہمدردی اور ترس کی بھیک نہیں مانگ سکتا۔ صرف اس کمرے کا کریم ہی پندرہ سو روپے ہے کھانا بنا علیحدہ ڈور سب۔ اور آپ محض ڈیڑھ ہزار روپے بھیج کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں، ہر حال کچھ دنوں کی بات ہے مجھے کوئی نہ کوئی اور اچھی جاب مل جائے گی میرے ایگزام ہو جائیں تو گریجویشن کی ڈگری بھی مل جائے گی پھر مجھے مقابلے کے امتحان کی تیاری کرنا ہے۔ اس کی کتابوں کی قیمت خرید کم از کم آپ کی خیرات کی ریش سے بہت دور ہوگی۔“ وہ ان کی بات کاٹ کر اٹھ لیجے میں بولا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہو عبد العین! اپنا! میں نے تو سنی الامکان کوشش کی ہے ہمیشہ تمہاری ضروریات کو ترجیح دی ہے اور ہر مہینے اپنی بساط سے بڑھ کر تمہیں رقم بھیجتا ہی رہا ہوں۔ تمہیں معلوم تو ہے میری تنخواہ کتنی ہے۔ یہ تو شاہجی کی مہالی ہے جو زندگی کی گاڑی سہولت سے چل رہی ہے ورنہ اس تنخواہ میں اپنے لہجے کے ساتھ گزارہ بھلا کس طرح ممکن ہے پھر تم لوگوں کی تعلیم بھی۔“

”بس بابا صاحب! میں نے بتایا میں میرے سلسلے میں آپ کی تکلیف اب چند روز ہے۔ پہلے بھی کئی ماہ سے کون سا میں آپ کے آسرے پر بیٹھا ہوں۔“ وہ روٹھے ہوئے بیزار انداز میں بولا۔

”ایسے نہیں کہتے۔ مجھے سب سے پہلے تمہارا خیال ہے۔ تم بس اپنی تعلیم کی طرف دھیان دو ویسے تمہیں چھوٹے شاہجی کی شاہجی میں شرکت ضرور کرنا چاہیے تھی۔“

”میرے پاس ٹائم نہیں تھا۔ مجھے ترجیح کر بولا۔ صوفی صاحب نے ایک گہرا سانس لیا۔

”ایسے کاموں کے لیے ٹائم نکالنا پڑتا ہے۔“ انہوں نے روک کر اس کی شکل دیکھی۔ ہر حال میں آج اوھر ویسے کی تقریب میں شامل ہونے آیا ہوں اگر تم ساتھ چلو تو اچھا ہے۔ شاہجی خوش ہو جائیں گے۔“ انہوں نے بہت نہ باری

”میں نے بتایا“ صوفی صاحب نے اسے بھیج دیا۔ بابا صاحب! میں ابھی بس شام کی ڈیوٹی کے لیے نکلتے والا ہوں۔

وہ کوئی بھی لحاظ رکھے بغیر بولا۔ صوفی صاحب نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ وہ کتاب لے گیا تھا یا شاید وہ خود بدلتے جا رہے تھے ورنہ اتنی بد تمیزی پر تو وہ سامنے والے کی کھال اوجھڑوا کرتے تھے۔

”میری ٹرانسفر ہو گئی ہے۔“ وہ کچھ دیر بعد بولے۔

”اچھا آپ کی بھی ٹرانسفر ہو گئی ہے۔“ اس کی تسخیر انہی صوفی صاحب کو غصہ دلانے کو کافی تھی مگر موقع محل کا لحاظ کر کے کچھ ضبط کا لھوٹ بی گئے۔

”شہنشاہی میں۔“ وہ خود ہی بولے۔ ”شہنشاہی کا نام سن کر عبد العین کے ماتھے کے بل اور گہرے ہو گئے۔

”اور کوئی جگہ نہیں ملی تھی؟“ وہ منہ بکا ڈر بولا۔

”پوچھو گے نہیں کیوں ٹرانسفر ہو گئی میری۔“ وہ خود ہی اس کی بات نظر انداز کر کے بولے۔

”مجھے کیا لینا۔“ وہ بے نیازی سے کندھے اچکا کر بولا اس کے سارے انداز ہی صوفی صاحب کے لیے نئے تھے۔ وہ شہر کے طرز زندگی میں پوری طرح ڈھل چکا تھا۔

”بڑے شاہجی سچ کرنے جا رہے ہیں اور وہیں سے انہیں اپنے علاج کے لیے لندن جانا ہے۔ انہیں تین چار ماہ لگ جائیں گے، اس لیے میں نے اپنی ٹرانسفر کروالی ہے۔“

”اس میں ٹرانسفر کروانے کی کیا بات تھی بھلا۔ انہیں تو جانا تھا۔ وہ کون سے آپ کے آن دواتا ہیں۔“

”بھجوتے شاہجی کا مزاج بہت فرق ہے بڑے شاہجی کی نسبت۔ دوسرے ان کی شہرت بھی کچھ اچھی نہیں مگر وہار کی معیوبی کے لحاظ سے اس لیے۔“ ان کی زبان ان کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

”تو اس کا آپ سے کیا تعلق۔ انہوں نے کیا در سے پر تالا ڈالوا دینا ہے جو آپ گاؤں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔“ اس نے بد تمیزی سے کہا۔

”عبدالمتین!“ وہ غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”مجھے نہیں معلوم تھا۔ اس شہری تعلیم کا تمہارے دل پر اتنا اثر ہو رہا ہے۔ تمہیں بات کرنے کی تیز اور تہذیب نہیں رہی، تمہیں اتنا بھی احساس نہیں کہ میں کس پریشانی میں تمہارے پاس آیا ہوں کس لیے بچوں کو لیے در بدر دھکے کھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ تمہاری ہمیں جوان ہو رہی ہیں مگر تمہیں اس سے کیا تم اس درجہ خود غرض ہو کہ محض غرض کی خاطر ہر رشتہ قائم رکھنا چاہتے ہو۔ اور اگر غرض نہیں تو کوئی رشتہ نہیں، ماں ہمیں تمہیں کس قدر یاد کرتی ہیں، تمہیں اس کا ذرا بھی خیال نہیں۔ ان کے ساتھ تمہاری کوئی غرض جو نہیں انکی ماں کے بلاوے کا کوئی احساس نہ میرے کہنے کا۔ خود غرض انسان اچھے تم سے ایسی امید نہ سنی تھی بہت افسوس ہوا ہے تمہاری گفتگو سن کر تم۔ تم۔ یہ۔۔“

وہ انکی اس کی طرف اٹھا کر غصے اور افسوس سے بولتے چلے گئے۔ ”بس ہم نے اسی ہفتے کے آخر میں گاؤں چھوڑ دینا ہے۔ اللہ حافظ۔“

کہہ کر وہ تیز قدموں سے آگے بڑھے۔ زور سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئے۔ عبدالمتین چند لمحوں کے لیے ان کے غصے سے خوفزدہ ہوا تھا پھر ہوشیاری سے کندھے اچکا کر بیٹھ گیا۔

”ہمیں جوان ہو رہی ہیں تو میں کیا کروں۔ مجھے اپنے بکھیرے ادھر کیا کم ہیں۔ در کروا دی مجھے اس فضول کی گفتگو میں اور پیسے بھی نہیں دے کر گئے۔ الٹا میرا وقت ہرا دیا گیا۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا اچھا دوڑم کی طرف بڑھ گیا۔



رات کے شاید پونے تین بجے کا عمل تھا جب سید سبطین شاہ کی بلیک بجا رو ”سید ہاؤس“ کے گیٹ پر پہنچ کر بارن دینے لگی۔ نیم غنڈوگی میں بیٹھا چوکیدار ہڑبڑا کر اٹھا اس نے جلدی سے گھڑی میں ٹائم دیکھا اور گیٹ کی دروزوں سے آتی گاڑی کی تیزلاٹس کو۔

”اس وقت کون آیا کوئی گزرنہ ہو جائے۔“

اس نے ہڑبڑا کر پیچھے مڑ کر اندرونی عمارت کی طرف دیکھا۔ باہر کی گاڑی نے زور زور سے بارن دینا شروع کر دیا تھا اس نے جلدی سے مین گیٹ وا کر دیا۔ ”بڑے شاہ جی ہیں۔“ گیٹ کے ہول سے جھانکتے ہی وہ حواس باختہ ہو گیا۔

”پانگل، الو کے پٹھے سو رہے تھے تم۔ تمہاری نیندیں پوری کرنے کو ادھر رکھنا ہے تمہیں موٹی اجرت پر۔“ گاڑی رکھتی ہی شاہ جی اس پر برس پڑے۔

”وہ جی شاہ جی! زوراً جھونک آئی تھی۔ معاف کروں۔“ وہ گزبڑا کر بولا۔

سبطین شاہ نے حقارت بھری نظر اس کے مسکین چہرے پر ڈالی اور اندر پورچ کی طرف دیکھا انکا پل ان کو حیرت زدہ کر گیا۔

سلطان بخت کی بی بی ایم ڈبلیو پورچ میں کھڑی ان کا منہ چڑا رہی تھی۔

”یہ۔۔ یہ سلطان بخت۔“ وہ انکی اٹھا کر گاڑی کی طرف اشارہ کر کے چوکیدار کی طرف بڑھے چوکیدار کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”سلطان بخت اندر ہے۔“ دو سرے پل وہ خود کو سنبھال چکے تھے ڈپٹ کر بولے۔

”اس وقت رات کے تین بجے یہ ادھر کیا کر رہا ہے۔ گاؤں نہیں گیا۔“ وہ کلائی پر بندھی رست و اچ پر نگاہ ڈال کر خود سے بولے۔

غلام بخش کو گل کدو کے آگے اتار کر وہ اپنے لیگل ایڈوائزر ہمایوں خان کے پاس گئے تھے۔ انہوں نے اپنی وصیت لکھوائی۔ کچھ قانونی مشورے کیے اور پھر سب سے اہم نقطہ اپنی وصیت کا جس کی خاطر انہوں نے ہمایوں خان کو رات کے سوا بارہ بجے بستر سے اٹھایا تھا وہ خاص طور پر لکھوایا تھا اسرار کچھ کرتے کرتے انہیں تقریباً ”وہاٹی“ بن گئے۔

”اب گاؤں جانے میں تو بہت وقت لگ جائے گا“ سید ہاؤس ”نہی چلنا چاہیے تو تین گھنٹوں بعد تو صبح ہو جاتی ہے۔“ اپنے ٹھکے ہوئے اعصاب کو سکون دینے کے لیے انہیں فوری طور پر آرام دہ بستر کی ضرورت تھی۔ دو سرے وصیت نامہ مکمل کرانے کے بعد ان کی طبیعت بھی بہت بھلی پھلکی ہو چکی تھی۔ اس لیے انہوں نے سید ہاؤس کا رخ کیا مگر ادھر سلطان بخت کی موجودگی ان کے لیے بہت حیران کن تھی۔

وہ چوکیدار کو نظر انداز کر کے اندرونی عمارت کی طرف بڑھے۔

ماستر بیڈ روم کا دروازہ بند تھا۔ شاید لاکڈ تھا۔ وہ بند دروازہ دیکھ کر سوچ میں پڑ گئے۔ کسی نوکر کو آواز دینا ہی چاہتے تھے کہ اندر سے کسی لڑکی کی کھٹک دار آہی کی آواز ان کے بوجھل اعصاب پر کسی تازیانے کی مانند لگی۔

اور وہ سرری آواز یقیناً سلطان بخت کی تھی۔

ان کی ہواشت کی حد یہیں تک تھی۔

”سلطان بخت! نکلو باہر بخت انسان!“ انہوں نے طیش کے عالم میں بند دروازے کو زور زور سے ٹھوکریں مارنا شروع کر دیں جس کی گوج سے پوری کو بھی ہل کر رہ گئی۔

وہ تکلیف دہ راستہ میں نے آنکھوں میں ہلکی سی کٹ وی آ کر چہرہ آج بستر بھی نرم تھا اور کچھ صلہ رحمی کی امید بھی جوان تھی۔ کم از کم پیچھو آگے بولے یا رو دنگار تو دھکانہ دس کی۔ یہ اس کے دل کو یقین تھا۔ عالیہ بھانسی نے جانتے سے سرسری سے انداز میں اس سے کھانے کی صلاح ماری مگر اس نے نفی میں سر ہلایا تو وہ دروازہ بند کر کے چلی گئی اور یہ تو اسے آدھی رات کے بعد احساس ہوا کہ خالی پیٹ اسے نیند نہیں آسکتی۔ وہ بہارہ ایک بچے راجیلہ کے گھر بمشکل دو چار گھنٹے کھائے تھے اس کے بعد سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا جس کی بانی بھی نہیں پیا تھا اور اب رات کے آخری حصہ میں وہ اٹھ کر باہر ہی نہیں جا سکتی تھی۔ گھر والوں کے استقبال کے اندازے اسے بہت کچھ کھایا تھا۔ سب اس کے لیے انکی کڑواہٹ (اشارہ) تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ اس سنگر کاروبار اس کی توقع کے خلاف تو نہیں تھا مگر پھر بھی اس کے دل کے کسی نہ کسی گوشے میں کینین شہباز کی طرف سے کچھ تو نرم سلوک کی توقع تھی۔ شاید۔ شاید۔ پیچلی محبت کی کوئی رسم کوئی یاد کوئی نرم احساس انہیں اس سے اچھانہ سنی قابل قبول سلوک کرنے پر مجبور کر دے مگر یہ سب اس کی خوش خیالی تھی کہ اتنے زہر آلودہ موسم میں بھی جب کہ ہر طرف سے بے مروتی اور غمخیز کی لہریں ہوا چل رہی تھی۔ اس کے دل نے ابھی بھی خوش قسمی کے چند شکوے کھلا رکھے تھے اور ان شکوؤں کے دم گھٹ کر مرتے ہی اس کی اہمیت جیسے دم توڑ گئی تھی۔ وہ بے نوم سی ساری رات بستر پر پڑی رہی۔ کئی بار اٹھا اٹھا کھنٹا آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی مگر نیند تو اس سے اس کے نصیب کی طرح ہی روٹھ گئی تھی۔

اور صبح شاید پانچ بجے تھے جب اس نے بیرونی گیٹ کھلے اور کسی گاڑی کے اشارت ہونے اور باہر جانے کی آواز سنی دل چاہا اٹھ کر کھڑکی میں جا کر دیکھے۔ باہر کون ہے مگر پھر اسی بے ہمتی نے اس کے بدن کو چمک کر دیا وہ بے حس بڑی گیٹ کے بند ہونے اور گاڑی کے جانے کی آواز سنتی رہی۔

پھر دن نکل آیا۔ روشنی کھڑکی کے پردوں سے اندر آنے لگی جب نیند نے اس کے دل کھٹکھٹائے اور وہ جو پیچھو سے ملاقات کے بعد اپنے حق میں ہونے والے فیصلے کی بے چینی سے غمتگر تھی۔ نیند کی اس دستک کو لیا وہ ویرنہ ٹال سکی اور پھر دن کے گیارہ بجے تک بے سدھ بڑی سوئی رہی۔

عالیہ اسے دیکھا جگانے آئی اسے بے خبر سوتے دیکھ کر واپس چلی گئی۔

”نہرہٹ! اٹھ جاؤ۔ ام جان کافی دیر سے اٹھ چکی ہیں۔ وہ بار بار ایاز کو نیندنی جانے کا کہہ رہی ہیں۔“ عالیہ کی زور دار آواز پر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی چند لمحے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ہے کدھر، سمجھنے پر سارے حواسوں پر جیسے اوس ہی رہ گئی۔ وہ جیسے سے دوپٹے شانوں پر پھیلا کر بیٹھ گئی۔

”تم منہ ہاتھ دھو کر ڈانٹنگ روم میں آ جاؤ۔ میں تمہارا ناشتہ اودھری منگوادیتی ہوں۔ پھر جا کر ام جان سے مل لینا۔“ وہ سپاٹ لہجے میں کہہ کر باہر نکل گئی۔

اگر وہ باعزت طریقے سے دلہن بن کر گھر میں اترتی تو کیا عالیہ کی جرات تھی۔ اس سے اس لہجے میں بات کر سکتی۔

”میرے خدا مجھے یہ کس کڑے امتحان میں ڈال دیا ہے تو نے“ شکوہ پھر سے اس کے لبوں سے پھسل گیا۔ وہ ست قدموں سے وائش روم کی طرف بڑھ گئی۔

ناشتہ کرنے کو اس کا منی نہیں چاہ رہا تھا، پیچھو کا سامنا کرنے کا خیال ہی اسے ہراساں کیے ہوئے رہا تھا۔ بے دلی سے اس نے اسپٹ کی پلیٹ اپنی طرف کھسکائی اور سلائس توڑ کر لقمہ منہ میں ڈالا تو پہلے لو الے پر ہی اسے احساس ہوا کہ اسے تو شدید بھوک لگی ہوئی ہے۔ پھر ساری سوچوں کو جھٹک کر اس نے پیٹ بھر کر ناشتہ کیا۔

یہ بھی نہ دیکھا کہ عالیہ آتے جاتے اسے یوں ندیدوں کی طرح کھاتے دیکھ کر منہ کے کیسے زاوے بنا رہی تھی۔

”آخر میں ہی کیوں ساری دنیا کی پروا کروں، جب میں نے کچھ نہیں کیا۔ حد ہو گئی میں مر بھی جاؤں تو تب بھی مجھے ہی قصور وار ٹھہرائیں گے۔ تو بھاڑ میں جانے یہ دنیا“

پیٹ میں ایندھن پڑتے ہی اپنی ذات کی ہونے والی مسلسل نفی کا اسے احساس ہوا۔ اس نے بھر بھر کر چائے کے دو کپ بڑے اطمینان سے گھونٹ گھونٹ کر کے پئے۔ اس کا اطمینان دیکھ کر عالیہ کی بے چینی بڑھ گئی۔ اب وہ بالکل ہی اس کے آس پاس منڈلا رہی تھی۔ نہ بہت انجان بنی چائے پیتی رہی۔ دوسرے کپ کا آخری گھونٹ پی کر اس نے کپ سائیڈ پر رکھے۔

”چلیں۔“ اسے عالیہ کی بے چینی شکل پر ترس آ گیا تو اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اصل میں میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔“ اپنی فطرت سے مجبور ہو کر وہ صفائی دینے بغیر نہ رہ سکی۔ عالیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ دونوں چلی ہوئی مسزخان کے کمرے تک جا پہنچیں۔

”ام جان اندر ہیں۔ تم جا کر ان سے مل لو۔“ وہ کہہ کر اجنبی انداز میں واپس مڑ گئی۔ نہ بہت نے بے بسی سے اسے جاتے دیکھا۔ اس کی ہتھیالیوں میں پیمانہ آنے لگا تھا۔ ”میں پیچھو کا سامنا کیسے کروں گی۔ اس نے فضا میں گہرے گہرے دو تین سانس لیے اودھر پھر سے دروازے پر دستک ہوئی۔

”کون ہے آ جاؤ۔“ پیچھو کی نجیف آواز ان کی علامت کا پتا دے رہی تھی۔ وہ لڑا کر کے دروازہ کھیل کر اندر چلی آئی۔ مسزخان بستر پر بیٹھی دروازے کی طرف ہی دیکھ رہی تھی اسے دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔

”نہ بہت تم!“ ان کے بوڑھے لب ہولے سے چکیائے۔

”پیچھو، پیچھو، امیں پیچھو۔“ وہ خود پر ضبط نہ رکھ سکی اور بھاگ کر ان کی ٹانگوں سے لپٹ گئی اور ہچکلیوں سے رونے لگی۔ کتنی ہی در روئے گزر گئی۔ تو اسے خیال آیا کہ پیچھو نے اسے چپ نہیں کرایا۔ کوئی تسلی کوئی دلاسا نہیں دیا۔ اس نے آہستگی سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں کوئی بھی تاثر نمایاں نہ تھا۔ نہ ہمدردی کا منہ نہ محبت کا نہ نفرت کا۔ نہ اس سے اپنے دوسرے رشتے کا بس وہ اسے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی شخص نظر آنے والی کسی چیز کو دیکھتے پر مجبور ہوتا ہے۔

اور یہ سپاٹ نظر اسے بہت دلالت آمیز لگی ان تین چار دنوں میں پیش آنے والے حالات سے بھی زیادہ اس کی ہر طرح کی امید بلکہ خوش امید کی بھی پیچھو سے ہی بندھی تھی۔ اور اب ان کی اجنبی نگاہ نے اسے بتا دیا کہ اب خوش امید کی کرن بھی باقی نہیں وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اپنے ہاتھوں سے اپنا چہرہ صاف کر کے سر پر روپوشا چھپی

اسے یقین تھا اب بیچند لمحوں بعد پیچھو اسے اودھر سے جانے کے لیے کہیں گی۔

”تم یہاں تک کیسے پہنچیں؟ کس کے ساتھ آئی ہو؟“ شاید دس منٹ بعد ان کی آواز کمرے کی خاموش فضا میں گونجی۔

”کیلی آئی ہوں۔“ وہ جی کڑا کر کے حلق سے آواز نکال کر یوں ہی بہت مضبوط لہجے میں مگر نگاہیں ہنوز گود میں دھرے ہاتھوں پر جم رکھی تھیں۔

”تم نے گھر سے باہر قدم کیوں نکالا وہ بھی اکیلے؟“ ان کا انداز بہت کڑوا تھا۔ نہ بہت کو اندازہ نہیں تھا۔ وہ اس سے اس طرح سوال و جواب کریں گی۔ وہ تو بس انہیں اپنی دکھ بھری ذلت میں ڈوبی، کمائی سنانا چاہ رہی تھی اور ان کا وہ پار پانا چاہ رہی تھی۔ جو ان چار دن کی ملی بے تحاشا ذلت کے احساس کو کہیں اور پیچھو تک دے کہ مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا تھا۔

”میں خود نہیں گئی تھی وہ تنہی سے بولی۔

”زیتم کے ساتھ گئی تھیں، کیا تمہیں اس کے بارے میں علم نہیں تھا یا تم نے بھی نہیں۔ اس نے کہا اور تم اس کا ہاتھ پکڑ کر پل پڑیں۔“

وہ غصہ کر سکتی تھیں۔ انہیں غصہ کرنے کا حق بھی تھا مگر یہ غصہ تو نہیں تھا۔ یہ تو بڑی گائی تھی۔ نہ بہت نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

”سب مجھے ہی قصور وار کیوں ٹھہرا رہے ہیں آخر میں نے کیا کیا ہے کوئی میری بات کیوں نہیں سنتا۔ میرا یقین کیوں نہیں کرتا آخر۔“ وہ چیخ پڑی اس کی براہ راست کی حد ہو چکی تھی۔

”چیخومت اور تمہیں اودھر آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ بھی اس طرح اکیلے۔ آخر میری میرے بیٹے کی بھی کوئی عزت ہے تمہیں۔ اس بات کا خیال کیوں نہیں آیا۔ اس طرح آدھی رات کو جو ان کو توبہ لڑکیاں کیا اپنی ہونے والی سسرال میں آئی ہیں جہاں آج تک ایسا ہوتے ساتھ نے۔“ غصے سے ان کا سانس پھول گیا تھا اور نہ بہت حیرت خوف سے جھٹکانا بھی رسول لٹی گئی۔

”تمہارا شو الیا تم نے اس گھر میں مجھے میرے بیٹے کی نظروں میں گرا دیا ہے اگر کچھ ہو بھی گیا تھا تو تم سے اتنا نہ ہوا کہ بھائی کے پیر پڑ لیتیں۔ اس سے معافی مانگ لیتیں، مگر کم از کم یوں تن ٹھا گھر چھوڑ کر ہماری اپنی عزت یوں بھرے بازار میں تو نہ لے آئیں۔ چلو ناکہ رہے۔ تمہارے ساتھ کوئی فراڈ کیا۔ اس کے جال سے اگر تم صحیح سالم نکل بھی آؤ، اس تو کیا ضمانت ہے ان دونوں میں تم کہاں کہاں سے آئی ہو اور یوں آدھی رات کو اپنے سسرال کا در کھٹکنا کر خود کو مستر بلاوت کرنا چاہ رہی ہو۔ میں نے اس دن کے لیے تمہیں اس گھر میں لانے کے خواب دیکھے تھے نہ بیٹھ بچے نہ بھانجے کوئی بارات چلے نہ ذلی اترے اور تم سیاہ رات کا تاریک حصہ اڑھ کر اس گھر کی عزت بننے چلی آؤ اور میں تمہیں سسرال آنکھوں پر ہتھکڑیاں تمہاری حماقتوں اور شرمناک حرکت پر تمہیں شاباشی دوں ساری دنیا میں تمہاری مظلومیت کا ڈھول تمہارے ساتھ مل کر پیٹوں۔

بولو اتنا بلکا سمجھ لیا تم نے مجھے میرے گھر کی بنی برسوں کی عزت کو اتنا بلکا سمجھ لیا تم نے۔ اور یہ سمجھ لیا کہ پھر بھی میں تمہیں اپنالوں گی۔ اپنے گھر میں بنا وہ دے دوں گی۔ کبھی نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔ میرا بیٹا اتنا ارزاں نہیں ہے تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تم منہ کالا کر کے آؤ اور ہم تمہیں چودھویں کا چاند جان کر اپنے آکلن میں اتار لیں گے۔ کبھی نہیں، کبھی بھی نہیں۔“ ان کا سر زور زور سے نفی میں مل رہا تھا۔ اور نہ بہت تو شاید اپنے حواسوں ہی میں نہیں تھی۔

اعمال ہی، آخر ایسی کیا بات ہو گئی ہے کہ ہمیں اپنا گھر چھوڑ کر جانا پڑ رہا ہے وہ بھی سارا سامان سمیٹ کر؟“

زینب نے منہ بنا کر ٹنک میں نہ شہہ کیڑوں کو اوپر نیچے رکھتی اماں ہی سے پوچھا۔

”بھیا تو ہے تمہارے پایا صاب کی بڑا سفر ہو گئی ہے اس لیے جانا پڑ رہا ہے گھر چھوڑ کر۔ آخر کتنی بار پوچھو گی۔ صبح سے پچاس بار تمہیں بتا چکی ہوں، تم دھیان سے صرف کام کیوں نہیں کرتیں۔ اتنا کچھ سمیٹنا پڑا ہے ابھی“

رات ہونے کو ہے بیچ میں صرف کل کا دن ہے۔ پر سوں وہ پھر کویا پھر اس سے اگلی صبح ہمیں جانا ہے اور تم کام سمیٹنے کی بجائے میرا بھیجا چائے جارہی ہو۔"

اماں جی نے زور سے کپڑے ٹرنک میں پٹھے اور زینب کو بھڑکتے ہوئے بولیں۔ یہ سچ تھا اس طرح ایک دم سے بیٹھے بٹھائے اپنا گھریا چھوڑ کر جانا انہیں بھی بہت دکھ دے رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر مضطرب بھی بہت تھیں اور احتجاج کا ایک لفظ یوں منہ سے نہیں نکال سکتی تھیں کہ یہ سب کچھ وہ اپنی بیٹیوں کے تحفظ کے لیے ہی تو کرنے جا رہی تھیں ڈرنہ اس گھر سے تو جیسے ان کا جنم جنم کا رشتہ تھا۔

وہ بیواہ کر سولہ سال کی عمر میں اسی بچی مٹی کے گھر میں آئی تھیں۔ چند روز سولہ سالہ کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ ماں باپ کے گھر سے ہندو کھانا پکانی لگڑیا اور مٹی کے کھلونوں سے کھیلتی وہ صوفی عبدالرحمن کی زوجیت میں آئی تھیں۔ اسی گھر میں ان کی آنکھیں کھلی پائی بار۔ سہری سپنوں اور ان کی تعبیر سے آشنا ہوئی تھیں۔ گھر میں تھا ہی کون صوفی صاحب اور ان کی ضعیف اندھی والدہ جو راجدلی بی کے آنے کے بعد محض چار سال ہی زندہ رہیں۔ پھر عبدالرحمن کی پیدائش اس کے ساتھ ہی صوفی صاحب نے پچھلے کمرے گرا کر پختہ کر رکھے تھے۔ اینٹوں اور شہتروں کی جگہ سینٹ اورٹی آر کی پختہ پختہ ڈولوائی تھیں پھر ہرنے کی آمد کے ساتھ گھر کی پختگی اور تزئین میں اضافہ ہوتا رہا اور اب تو ان کو اپنے مرنے کا خیال بھی آتا تو تصور کی آنکھ انہیں اس آنگن سے ان کا جنازہ اٹھتے دکھاتی تھی کہ یکایک یہ درپردہ کی اقدان پر آن پڑی تھی۔ انہوں نے ایک کمری سانس لی اور صوفی صاحب کے کپڑے احتیاط سے یہ کر کے ٹرنک میں رکھتی آئے گود لکھا۔ اس دن سے وہ جیسے مرجھا کر رہ گئی تھی۔ اس نے ایک بار بھی زینب کی طرح گھر چھوڑنے کی وجہ نہیں پوچھی تھی نہ اس سلسلے میں ذرا بھی لب ہلانے تھے۔

"جگہ بدلے گی، تینا ماحول ملے گا، جو وہی آمنہ کا دھیان رکھتا ہے۔ جگہ ہو جائے گی۔ اور پھر ہم کون سا مستقل جا رہے ہیں، سچہ آٹھ مہینوں کی تو بات ہے۔ بڑے شادمانی آجائیں گے، ایک ہو کر ہم بھی واپس آسکتے گھر آجائیں گے۔" انہوں نے سر جھٹک کر خود کو تسلی دی۔

"اماں جی! پہلے تو کبھی بابا صاحب کی ٹرانسفر وغیرہ نہیں ہوتی تو اب کیوں بھلا۔"

زینب پر بھی کسی ڈانٹ ڈپٹ کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ برائے نام سے بھرا ہونے بل پھر سے بولی تو راجدلی بی نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر جیسے افسوس سے سر ہلانے لگیں۔

"بہت ڈھیٹ ہو تم! پہلے اگر ٹرانسفر نہیں ہوتی تھی تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ کبھی بھی نہیں ہوگی۔ وہ حکومت کے ملازم ہیں، سرکار جب چاہے بدھر چاہے کسی کی بھی ٹرانسفر کر سکتی ہے۔ اتنی پراگندگی کبھی تو تم ہونا کہ یہ بات سمجھ سکو۔" انہوں نے ہلکا سا صحو کا اس کے کندھے پر لگایا۔

"تو اماں جی! اب ہم کبھی اپنے گھر میں دوبارہ نہیں آئیں گے۔ ہمارا تو اتنا زیادہ سامان ہے، ہم سارا لے جائیں گے۔" زینب کا واقعی اب کام کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ صبح سے کپڑے جوڑتے کتائیں بدترن اور نہ جانے کیا کیا سمیٹتے شام ہو گئی گی پھر اپنے گھر کو چھوڑ کر جانے کا احساس وہ پھسکا مار کر زمین پر بیٹھ گئی۔

"آئیں گے، آئیں گے کیوں نہیں۔ ان شاء اللہ جلد ہی جب بڑے شادمانی ج کر کے واپس آجائیں گے تو۔"

اماں جی نے فوراً کہا۔

"بڑے شادمانی اگر سرکار سے میرا مطلب ہے گورنمنٹ سے سفارش کریں گے واپس ادھر ٹرانسفر کی۔"

زینب بھی منہ کی بات کپڑے والی تھی جھٹ سے بولی۔

"ہوں۔" اماں جی سنبھل کر بولیں۔

"تو وہ تو ابھی ادھر ہی ہیں۔ ابھی بابا صاحب جا کر ان سے بات کر لیں وہ جانے سے پہلے ان کی سفارش کر دیں۔"

زینب کا دماغ ان باتوں میں خوب چلتا تھا۔

"مٹری! میں تمہارا کیا کروں، مفصل کی بحث کیے جا رہی ہو۔" اماں جی سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

"کیوں اب کیا ہوا ہے میں نے کیا کہا ہے۔" زینب پریشان ہو کر بولی "اور اماں جی! آپ نے یہ کیوں منع کیا ہے کہ ابھی گاؤں میں کسی سے بھی ذکر نہیں کرنا کہ ہم جا رہے ہیں۔ جو یہ بے چاری کو بھی صبح سے گھر میں باندھ کر رکھا ہوا ہے۔ اسکول بھی جانے نہیں دیا۔ اپنی سہیلیوں سے بھی نہیں ملی وہ روئے جارہی ہے کمرے میں اور اپنے کھلونوں کی گھڑی باندھ کر اس کے سر ہانے بیٹھی ہے مجھے تو اس پر ترس آ رہا ہے۔"

زینب کو ایک دم سے اماں جی کا فرمان اور جو یہ کارونا دھونٹا یاد آیا جو صبح سے گھر میں قید تھی۔

"یا اللہ میں کدھر جاؤں اس لڑکی کے ہاتھوں ایک تو میں پہلے ہی پریشان ہوں۔" وہ زنج ہو کر بولیں۔ "زینب! تم مجھ پر ایک احسان کر سکتی ہو۔" وہ عاجزی سے بولیں۔

"اماں جی! خدا کے لیے اب کوئی کام مت کہے گا۔ صبح سے گھڑیاں باندھ باندھ کر میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ اب میں مزید کچھ نہیں کروں گی۔" وہ فوراً انہیں اپنی منہ پھیلایا دیکھتے ہوئے بولی۔

"نہیں میری بچی! تم اب کچھ مت کرو، صرف جا کر ہنڈیا چلے سے اتار کر چپ کر کے وہیں بیٹھ جاؤ، بس ادھر واپس میں کھڑی رہو، اگر وہاں پکائی ہوں تم بس ادھر سے اٹھ جاؤ۔" اماں جی نے جیسے اس کی منت کی۔

"جلی جاتی ہوں، کھانا ہنڈیا تو میں دس منٹ پہلے ہی آپ کے کمرے پر اتار کر آئی تھی، آپ بھول گئی ہیں شاید۔"

اس نے پیچھے ہٹ کر کدھر سے ٹیک کائی اور ناقہ انداز میں سر اٹھا کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

"اماں جی! جب ہم واپس آئیں گے تو اس کمرے میں قلعی ہلکے سبز رنگ کی کراؤں کی جیسا سونف کارنگ ہوتا ہے۔ یہ پیلے رنگ کی سفیدی مجھے زہر لگتی ہے۔ دیکھتے ہی لگتا ہے کمرے کو پر قان ہوا ہے۔ اماں جی! بدھر ہم جا رہے ہیں وہ ہمارا گھر کیسا ہو گا؟" وہ چپ نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

"معاذ اللہ نہیں جاؤ گی تو دیکھ لینا۔ آمنہ یہ تھلا ہوا سوٹ اپنے بابا صاحب کے اس ٹرنک میں رکھ دو، ان کے رومال اور ٹوپیوں بھی رکھیں، پھر اپنی اور گورنمنٹ کی یاد سے رکھ لینا۔"

"ان ساری باتوں میں کچھ نہیں ہے۔" زینب نے اس سے بھی زیادہ گرمی بڑتی ہے۔ ویسے اماں جی! ایک بات ہے، یہ آئیڈیا گورنمنٹ کو بہت اچھا ہو جائے تو پھر بھی تو شیخوپورہ کے بالکل پاس ہے۔ ہم لاہور جائیں گے سیر کرنے بلکہ ہم لاہور ہی میں گھر لے لیں گے۔ عبدالرحمن بھی تو وہیں ہے، سب مل کر رہیں گے۔ ادھر واپس آ کر کیا کرنا ہے، پھیلنے سے گاؤں میں۔ ہم لاہور جا کر رہیں گے، کتنا مزہ آئے گا۔ میں تو اسکول میں داخلہ لے لوں گی۔ اس کے بعد کلج اور پھر یونیورسٹی اور آٹھ مہینے بھی دو سو میں جا کر ادھر اسکول میں ہی داخلہ لینا۔ اماں جی! آپ بابا صاحب سے کہہ دیں۔ ہمیں واپس ادھر نہیں آنا۔ یہاں ہے ہی کیا کوئی چھوٹی دھول مٹی سے اتنی سڑکیں، گندے سڑے کچی مٹی کے گھر، ایک سزا ہوا وہ چار کھوکھے نما دکانوں والا بازار، ہوائی گندی سندی لڑکیاں، مگور تیں اور تنگ سڑکیں، سچ کھیت ہی کھیت۔ رات میں پھر اس قدر ہوتے ہیں کہ میں ساری رات نہیں سو پاتی اور دن میں کھیوں کی یلغار بھین بھین کرتی رہتی ہے۔ اماں جی! ہم لاہور ہی میں رہ جائیں گے، آپ بابا صاحب سے کہیں گی، بیٹھے بیٹھے اس نے خوابوں کی ایک نئی دنیا بسالی تھی۔ جتنی لہجے میں آگے بڑھ کر ان کے گلے تھام کر بولی۔ اماں جی نے بے بسی سے اسے دیکھا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"گناہ جا رہی ہیں بابا صاحب سے بات کرنے؟" وہ سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔

"رہنیاں بکانے اور سرور کی دوا کھانے۔ تم نے بول بول کر میرا سر کھالیا ہے، بے وقوف لڑکی۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

"اماں جی! بھی حد کرتی ہیں، اتنی اچھی تو میں نے بات کی ہے، ہے نا آمنہ! وہ اب آمنہ کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

"ہوں۔" وہ سر تھکا کے اپنے کام میں مگن رہی۔

"معم کیا ہر وقت گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھی رہتی ہو، شکل پر بارہ بجے رہتے ہیں اتنے دنوں سے، آخر ہوا کیا ہے

تمہیں۔ دو تین دن سے میں دیکھ رہی ہوں لگتا ہے نیند میں چلتی رہتی ہو۔“ وہ اس کا بازو ہلاتے ہوئے ذرا زور سے بولی۔

”اماں جی صحیح کہتی ہیں تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے اور اب تم باقی لوگوں کا بھی خراب کر رہی ہو۔ بھو مجھے کام مکمل کرنے دو اماں جی پہلے ہی غصے میں گئی ہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر ناراضی سے بولی اور اٹھ کر چارپائی پر پڑا کپڑوں کا ڈھیر ٹٹولنے لگی۔

”میرا دماغ ٹھیک ہے مگر باقی سب لوگوں کے دماغوں کو اللہ جانے کیا ہوا ہے۔ اٹنے اٹنے کام کر رہے ہیں۔ لو بیٹھے بیٹھے بٹھائے اپنا گھر بار چھوڑ کر مہاجرین کی طرح چل پڑو، یوریا بستر گدھے پر لاؤ کر۔ مجھے یہ سب بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔ پتا نہیں یہ سب کس کے دماغ کا فتور ہے اور بابا عصاب۔ بابا عصاب پہلے کون سا نارمل موڈ میں رہتے تھے اور اب تو جیسے غصہ ان کے اعصاب پر بھی سوار ہو گیا ہے۔ صبح مدرسے کے دو تین بچوں کی اس بے دردی سے پٹائی کی انہوں نے بے چاروں کی چیخوں نے میرا دل ہلا دیا۔ بھلا ان کی مار کٹائی کی مہم کے لیے عبد العزیز کیا تم تھا جو۔ اس۔“

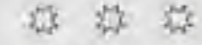
اس کی زبان اٹک گئی۔
 ”آمنہ! عبد العزیز تو کل صبح مدرسے چلا گیا تھا اسے تو شاید علم ہی نہیں کہ ہم ادھر سے جا رہے ہیں۔ اس کے جانے کے بعد ہی تو اماں جی نے یہ سمینا سمیٹی شروع کی ہے ہے نا۔“

زینب کبھی بھی بڑے پتے کی بات کر جاتی تھی اس بات کا خیال تو اسے بھی نہیں آیا تھا کہ عبد العزیز کو تو پتا ہی نہیں کہ وہ ادھر سے جا رہے ہیں۔ آمنہ کے تیزی سے چلتے ہاتھ رک گئے۔ اس نے زینب کی طرف دیکھا۔
 ”ہاں یہ بات تو ہے عبد العزیز کو تو پتا ہی نہیں۔ ٹھہرو تمہیں اماں جی سے پوچھتی ہوں۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

”زینب! تم پوچھو جا کر میں ٹرک تو بند کر لوں پھر دسترخوان بھی لگاتا ہے مجھے اگر۔“ وہ جو تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی تھی پچھلے ہی میں رک کر بولی اور واپس مڑ کر خواجہ ٹرک میں رکھے کپڑے اٹے سیدھے کرنے لگی۔

”ہاں میں پوچھ کر آتی ہوں۔ یہ بھی اچھی رہی۔“ زینب نے آمنہ کی طرف کچھ خاص دھیان نہیں دیا اور اٹھ کر باہر کی طرف چل پڑی۔

”یہ سب میری وجہ سے تو ہو رہا ہے زینب! میں تمہیں کیسے بتاؤں میری وجہ سے میرے بابا عصاب اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اپنا گھر اپنی چھت اپنا آنگن جسے چھوڑنے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جس میری وجہ سے اور میں اس معاملے میں بھی اپنے ماں باپ سے سرائھا کر تمہاری طرح سوال نہیں کر سکوں گی اور ان سے یہ بات کبھی نہیں کہہ سکوں گی کہ بابا عصاب! مجھے یہ گھر یہ آنگن اس میں لگے ام چامن امود اور لیموں کے پیڑ اس کی بچی بچی بیڑھیوں اس کی کشادہ بہت بڑی چھت اس کی منڈیریں اس کا ایک ایک گوشہ مجھے کس قدر پیارا ہے۔ بابا عصاب ہم ادھر سے نکلے تو کیا ہمیں وہ بارہ کبھی بھی ایسا گھر مل سکے گا۔ اماں جی! اپنا گھر چھوڑ کر نہ جائیں۔“ میں کبھی ان سے یہ فرمائش نہیں کر سکتی کبھی نہیں۔ میرا دل ادھر سے جانے کو نہیں چاہ رہا نہ جائیں۔“



سلطان شاہ کی ٹھوکروں سے بیدار روم کا دروازہ تو کیا پورا ”سید ہاوس“ لرز کر رہ گیا۔
 ان کے سر پر جیسے جنون طاری ہو گیا تھا۔ وہ ہاتھوں اور ٹانگوں سے دروازہ پھینٹے جا رہے تھے۔ باہر سے ملازموں کے دوڑنے کی آواز آئی اور اگلے ہی بل دروازہ کھل گیا۔
 سید سلطان بخت سرخ بے تحاشا نیند سے بوجھل آنکھیں لیے بے ترتیب چلتے میں ان کے سامنے کھڑے

تھے۔ ان کے ریشمی گاؤن کی ڈوریاں بھی کھلی تھیں اور ماتھے پر شکنوں کا جال بچھا تھا۔
 ”کون ہے باہر؟“ دروازہ کھولتے ہوئے انہوں نے ایک غلیظ گالی بھی بگی بگی مگر سلطان شاہ کی شکل دیکھتے ہی جیسے ان کے حواس اپنے ٹھکانے پر آگئے۔ آنکھیں ایک دم سے پوری کھل گئیں ”لاشعوری طور پر ان کے ہاتھ گاؤن کی کھلی ڈوریاں بند کرنے لگے۔“

”آپ۔ آپ۔ بابا جان! آپ اس وقت یہاں۔“ وہ ہکا بھکا کر بول رہے تھے۔
 سلطان شاہ نے انہیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور کوئی بھی جواب دیے بغیر انہیں دونوں ہاتھوں سے دھکیل کر کمرے میں داخل ہو گئے۔

کمرہ مکمل طور پر بند تھا کھڑکیوں کے پرے گھرے ہوئے تھے عسائڈ ٹیبل پر لمب کی روشنی آن تھی باقی تمام لائٹیں بجھی ہوئی تھیں۔ کمرے میں ناخوشگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ اتنی زیادہ کہ سلطان شاہ کو اپنی ناک پر ہاتھ رکھنا پڑ گیا۔ کبھی اپنی بھری جوانی میں وہ بھی اس ”بو“ کے بڑے رسیا ہوا کرتے تھے مگر وہ تو گئے دنوں کی بات ہے۔ سلطان بخت کے بیڈ کی چادری ٹھکن گئی۔ تکیے اور کٹن بے ترتیبی سے اوہرا دھر بڑے تھے۔ اسے سی کی کوٹنگ زیادہ ہونے کی وجہ سے لمبل بھی کھلا ہوا تھا جو کہ آدھا بیڈ پر آدھا بیڈ سے نیچے جھول رہا تھا۔

انہوں نے آگے بڑھ کر ڈر سٹک روم کا دروازہ کھلیا۔ اندر ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی مگر کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ اسی طرح حواش روم کی طرف بڑھے وہاں بھی انہیں اس کھٹک دار ہنسی کا وجود نہ ملا۔

”سلطان بخت! ابھی تمہارے کمرے میں تمہارے ساتھ ادھر کون تھا بلکہ میں نے خود اس کی آواز سنی ہے وہ کون تھی؟“ بالآخر وہ کمرے کے وسط میں رک کر سلطان بخت کی بوجھل آنکھوں میں جھانکتے ہوئے چبا چبا کر بولی۔

”کون؟“ سلطان بخت حیرت سے کہتا ہوا ہے۔ ”کون بابا جان! میرے کمرے میں کس نے ہونا تھا۔ آپ کو وہ ہم ہوا ہے کوئی۔“ وہ بہت معصومیت سے انہیں دکھاتا رہے تھے۔ سلطان شاہ اس معصوم جھوٹ کو سچ مان بھی لیتے اگر انہوں نے وہ کھٹک دار ہنسی اپنے کانوں سے نہ سنی ہوتی۔

”سلطان بخت! امت جھٹلاؤ مجھے۔“ وہ بھڑک کر بولے ”اب ان سے کھڑے رہنا محال ہو گیا تھا وہ آگے بڑھ کر رائٹنگ پیئر بیٹھ گئے۔“

”بابا جان! میں کیا جھٹلاؤں گا آپ کو خدا نخواستہ۔ میں تو سویا ہوا تھا گہری نیند“ آپ کو ضرور کوئی وہم ہوا ہے۔“ وہ بخت میں سے بولے۔

”ہاں جب تم جیسے خود سر بیٹے جوان ہو جائیں تو بوڑھے باپوں کو ایسے وہم ہوا ہی کرتے ہیں مگر سلطان بخت! میں ابھی اتنا بوڑھا اتنا خطی نہیں ہوا کہ دو انسانوں کی آوازوں میں فرق نہ کر سکوں۔ تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے بہت۔ میری ساری خوشی کو طیا میٹ کر کے رکھ دیا ہے تم نے۔ اتنا بے وقوف کچھ رکھا ہے تم نے مجھے کہ میں اس کمرے کے ماحول کو نہ پہچان سکوں۔“ وہ ٹھکت خورہ لہجے میں رک رک کر بول رہے تھے۔

”بابا جان! میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ میں تو ادھر بالکل آ گیا تھا۔“
 ”بس کرو سلطان بخت! میرے اعصاب تمہاری مزید غلط بیانی سننے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر غصے سے بولے۔ ”کہیں میں نے کسی دانائی کی بات پڑھی تھی جس کا مفہوم آج کچھ میں آ رہا ہے کہ تمہارے نیچے کمالوں سے نکلے ہوئے تیرے تم انہیں اچھی یا بری تربیت تو دے سکتے ہو مگر ان کے خیالات کو جگڑ نہیں سکتے ان کے دل کو اپنی سوچ کے مطابق نہیں چلا سکتے۔ مجھے آج اس کا مطلب سمجھ میں آ رہا ہے۔“

وہ افسوس زدہ لہجے میں سر ہلا کر بولے۔ کچھ زیادہ جاننے سے ان کے اعصاب بری طرح سے تھک گئے تھے۔ شادی کے اتنے دنوں کی مصروفیات، زارت کا تشکش اور آخری مصروفیت نے تو جیسے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اب ان کے دل میں ایک ہی خواہش تھی کہیں بھی گہری نیند اور وہ ادھر نیند ہی تو اوڑھنے آئے تھے۔

کیا ہے ہوٹل کی انتظامیہ نے بتایا ہے۔ فنکشن ختم ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا ہے، ختم فضول کی صفائیاں پیش مت کرو۔

ان کا انداز بہت اگڑا اگڑا تھا۔ سن کی یہ بے وقعتی ان سے سہی نہ جارہی تھی۔ صالحہ کے انداز میں کچھ بھی تو انہیں نئی دلیلیوں والا نظریہ آیا تھا نہ شرمیلی لجائی نہ کئی سہیلی۔ وہ خاموش بے حد چپ تھی۔ محفل میں موجود سب لوگوں کے وجود سے بھی شاید بے خبر۔ حسین شاہ نظریوں ہی نظریوں میں اسے جانچ چکے تھے۔ حسین شاہ کے اگڑے چلنے انداز نے سیدہ کو پریشان کر دیا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ معاملے کو کیسے سنبھالیں۔ صالحہ کی سلطان بخت سے شادی ہی میں تو ان کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس شادی کو بہت خوش باش دکھانا بھی تو ضروری تھا۔

ورنہ سیدہ کو حسین شاہ کا علم تھا وہ دل کے کس قدر سخت ہیں۔ سیدہ کو معاملہ ہاتھوں سے نکلتا نظر آ رہا تھا۔

”چلو صالحہ! بہت انتظار ہو گیا، ڈیرہ بچنے کو ہے۔ گاؤں کا راستہ محض ایک پون گھنٹے کا ہے، اب تو ڈیرہ دو گھنٹے ہو چکے ہیں تم گاڑی میں چل کر بیٹھو۔“

ان کے حکم پر صالحہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ یوں بھی تھا کوشش سے اس کا برا حال تھا وہ فوراً ہی اس تکلیف دہ حالت سے نکلتا چاہ رہی تھی پھر حسین شاہ کے انکار کے باوجود سیدہ زبردستی ان کے ساتھ چلی آئیں اور من گھڑت کے بعد واپس حویلی چلی گئیں اور صالحہ نے تمام دن سوتے ہوئے گزارا تھا۔ نیند بھی ٹوٹ ٹوٹ کر آتی رہی۔ بار بار ٹھکرانے جانے کا احساس اسے گہری نیند سے بچھوڑ کر اٹھاتا رہا۔

”باباجان اور سلطان بخت آگئے ہیں۔ ہم شام سے پہلے ہی تمہیں لینے آجائیں گے پھر باباجان کو جانا بھی ہے۔ ان کی رات دس بجے کی فلائٹ ہے۔ تم اٹھ کر نماز پڑھو اور تیار ہو جاؤ، کولڈن پشواز میں نکال کر آتی ہوں“

تھوڑی دیر پہلے آنے والا سیدہ کا فون بھی اس کے دل میں خوش کن دھڑکن کو نہ جگا سکا بلکہ یہ چند گھنٹوں کی طے ہوئی آزادی بھی ماضی کا حصہ بنتی نظر آ رہی تھی۔ اس نے کوئی بھی جواب دیے بغیر فون رکھ دیا تھا اور اب حسین شاہ کا پیغام

اس نے قریب ہو کر کاشن کا بیٹ گرین کو بھائی والا سوٹ پہنا یا لوں میں ہر ش کیا اور وہ پٹا اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر اسٹڈی میں آئی۔ حسین شاہ اسی کے منتظر بیٹھے تھے۔

”ابو صالحہ بیٹا! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ نیند پوری ہو گئی۔“ انہوں نے اٹھ کر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر کہا۔

”جی لالہ! وہ نظر بھی کیسے کاٹھنچ رہے تھے۔“

”کھانا کیا لیا تم نے سچ پر میں نے تمہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ حنا دیوار تمہیں بلائے گئی“

”جی! اس نے مختصر جواب دیا۔ کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔“

”تم نے سلطان بخت کو کیا پایا؟“ ان کا سوال اتنا اچانک اور ڈائریکٹ تھا کہ صالحہ ایک دم سے بوکھلا گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ حسین شاہ اس سے یہ سوال پوچھیں گے اس سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔

”میں پوچھ رہا ہوں تم سے کچھ سلطان بخت کو تم نے کیا پایا؟“ اب کے لیے میں کچھ سخت تھی۔

”ایک دو دن میں کیا پتا چلتا ہے لالہ! اس نے نظریں جھکا کر بولے سے جواب دیا۔“

”ایک دو دن نہیں، محض پونوں رات کے چند گھنٹے ہے نا۔“ وہ ترش روئی سے بولے۔ صالحہ کا سر کچھ اور جھک گیا۔ اسے حسین شاہ سے ایسے سوالوں کی توقع نہ تھی۔

”اس کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا تھا؟“ یہ سوال بھی خاصا تکلیف دہ تھا وہ چپ رہی۔

”صالحہ! وہ اونچی آواز میں بولے۔“

”جی لالہ! اس کی آواز میں کمی سی اتر آئی۔“

”سلطان بخت کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا تھا؟“ انہوں نے جیسے گن گن کر الفاظ ادا کیے۔

”باباجان! میرے خیال میں آپ تھک گئے ہیں بہت زیادہ۔ کل دن بھر بھی آپ نے آرام نہیں کیا اور اب بھی اس وقت خدا جانے کہاں سے آرہے ہیں۔ فنکشن تو میرے خیال میں بارہ ساڑھے بارہ بجے ختم ہو گیا تھا۔ میں خود اس قدر تھک گیا تھا ویسے بھی مجھے لوہر آتے آتے ڈیرہ نہ ج گیا تھا اس لیے گاؤں بھی نہیں جاسکا۔ میں سمجھا آپ چلے گئے ہوں گے، میں صبح سویرے نکل جاؤں گا۔ ہر حال آپ اب اوہر آرام کریں میں کوئی دوسرا بیڈروم کھلو لیتا ہوں۔ اب تو صبح ہونے میں کچھ ہی دیر ہے۔ میں اتنی دیر میں قریب ہوتا ہوں۔ آپ کچھ رست کر لیں پھر گاؤں چلے ہیں رات کو دس بجے آپ کی فلائٹ ہے۔ آپ کو آرام کرنا چاہیے۔“

”تم اوہر ہی لیٹ جاؤ، میں کسی دوسرے بیڈروم میں چلا جاتا ہوں۔“ وہ تھکے تھکے لہجے میں کہہ کر کھڑے ہو گئے۔ اس کمرے کا ماحول انہیں ایک بل پر سکون نہ ہونے دیتا۔

”باباجان! مجھے آرام نہیں کرنا، آپ لیٹ جائیں۔“

”میں میں ساتھ والے بیڈروم میں چلتا ہوں۔“ سہلواتے ہوئے وہ باہر نکل گئے۔

دوسرا بیڈروم کھلا ہی تھا۔ انہوں نے اندر جا کر صرف جوتے اتارے اور بیڈروم پر دراز ہو گئے۔ ان کا بدن تھکن سے چور ہو رہا تھا۔ شاید وہ چند منٹوں ہی میں گہری نیند سو جائے کہ اچانک ان کے کانوں میں باہر کسی گاڑی کے اشارت ہونے کی آواز سنی۔ ان کا نیم خوابیدہ بدن جیسے کسی اسپرنگ پر اچھلا۔ انہوں نے جلدی سے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا۔ سلطان بخت کی بی ایم ڈی کیٹ سے باہر جاری تھی۔ پورا ایونگ میٹ پر سلطان بخت ہی تھا اور اس کے ساتھ دوسرا جو بھی تھا، سلطان شاہ کو اتنا پتا چل گیا کہ وہ کوئی بڑی تھی۔

”بہت بچھتاؤ گے سلطان بخت! تم بچھتاؤ گے آنے والے محض چند دنوں میں تم بہت بچھتاؤ گے۔“ انہوں نے کھڑکی کے بریکٹ پر زور سے مکارا مارا۔

”Horrible Experience“ (خوفناک تجربہ) شادی! اولیٰ کی طرف سے یہ خبر تھی۔

نہیں تارا کا زور دار قہقہہ سلطان شاہ کے اندر کسی نیزے کی آئی کی طرح گزر گیا۔ انہوں نے زور سے کھڑکی بند کی اور غصے میں کھولتے اپنے بستری طرف بڑھ گئے۔

”چھوٹی بی بی! آپ کو حسین شاہ ہی بلا رہے ہیں۔“ ملازم نے دووازے پر دستک دے کر پیغام دیا۔ صالحہ جو ستا ہوا چہرے کے بیڈروم ساکت بیٹھی تھی ملازمہ کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ جواب کی منتظر کھڑی تھی اور جانچتی ہوئی نظریوں سے اس کے اجڑے اجڑے روپ کو بھی دیکھ رہی تھی۔ ایک دن کی بیابان ہے وہ دن چوہا شکر زور لباس اپنے حال سے بے خبر صالحہ کو دیکھ کر اس نے تو جھجھکنا ہی تھا۔

”لالہ کہاں ہیں؟“ صالحہ نے ذرا سنبھل کر پوچھا اور چہرے کے تاثرات میں جان پیدا کرنے کی کوشش کی۔

”کتا بوں کے کمرے میں جی۔“ اس کی آنکھوں کے ڈیلے ابھی بھی متحرک تھے۔

”تم جاؤ میں ابھی آتی ہوں۔“ صالحہ نے فوراً ہی جواب دیا تو وہ سہلا کر مٹ گئی۔

”اب تم از کم لالہ کے سامنے تو مجھے اس حال میں نہیں جانا چاہیے۔“ اٹھ کر خود کو تائینے میں دیکھتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا۔

”سلطان بخت! تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا بالکل بھی۔“ اس نے اپنے ویران چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ پہلی رات ہی ٹھکرانے جانے کا احساس کیا کم تھا کہ وہ کل رات حویلی ہی نہیں آیا۔ ایک طویل انتظار کے بعد حسین لالہ اسے خود ہی لے آئے تھے۔ شرمندہ شرمندہ ہی سیدہ بھی ساتھ تھیں۔

”فنکشن میں دیر ہو گئی ہوگی۔ لوگ بھی تو اتنے اٹوائف تھے اتنی جلدی کہاں آسکتے ہیں دونوں۔ باباجان کے ملحقہ صاحب کالو آپ کو علم ہے۔“ وہ تھوڑی دیر بعد بولیں۔

”سیدہ! میں دو گھنٹے ہوئے اوہر ہی سے آیا ہوں، مہمان رخصت ہونا شروع ہو چکے تھے اور اب حویلی میں نے فون

”ٹھیک۔“ وہ رو رہے تھے۔

”یہ کوئی جواب نہیں۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور پشت پر ہاتھ باندھ کر ٹھٹھکے لگے ساتھ سر جھکا کر ان کے اٹھتے پڑتے قدم لگتی رہی۔

”مجھے اس سے یہی امید تھی وہ جس قدر آگے جاوے گا بے فہمی کچھ کر سکتا تھا۔“ وہ تاسف بھرے لہجے میں جیسے خود سے کلام کر رہے تھے۔ ساتھ سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔

”اور اب بیچا جان کا جانا بھی کچھ اچھی بات نہیں۔ انہوں نے بھی فوراً یہی بوریہ بستر باندھ لیا جیسے جان چھڑا کر جا رہے ہوں۔“ وہ اب ہنسی بھرا ہے تھا۔

”وہ مجھو صالح! میری بات غور سے سنو۔“ وہ اس کے قریب بڑی کرستی پر آ بیٹھے۔ مجھے تمہاری خوشی اور خوش باش زندگی اس دنیا کی ہر چیز سے پیاری ہے۔ میں نے اپنے مرتے ہوئے والدین کو اس بات کا عہد دے رکھا ہے کہ میں تمہاری خوشی کو اپنی خوشی سے مقدم جانوں گا اور میں مرتے دم تک خود کو اس عہد کا پابند جانتا ہوں۔“ وہ نہایت منسوب لہجے میں بول رہے تھے۔ ”یہ تو مجھے معلوم ہے سلطان بخت کا رویہ تمہارے ساتھ بالکل بھی اچھا نہیں رہا۔“ صالح نے فوراً لٹی میں سر ہلایا۔

”نہیں لالہ۔“ وہ کہنا ہی چاہتی تھی انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر دیا۔

”مجھے سب معلوم ہے کچھ نہیں ہوں میں۔ کوئی جھوٹ مت بولنا اور نہ مجھے کسی خوش فہمی میں الجھانا ایک وفادار بیوی بننے کے چکر میں۔“ وہ جیسے سچ کر بولے۔ ”تم کوئی لاوارث نہیں ہو نہ کسی غریب پسماندہ گھرانے کی بیوی ہو لی والدین کی مجبوریوں میں بکری ہوئی بیٹی ہو اور نہ کسی بے نام گھرانے سے تعلق ہے تمہارا۔ تم حسین شاہ کی بہن ہو جس کی بیوی سیدہ سلطان بخت کی بہن ہے۔ ایک بات میری جان کھول کر سن لو اگر مجھے سلطان بخت کی کسی بھی زیادتی کا علم ہوا۔ سیدہ بیچ طلاق کے کاغذات۔ اسی دن سلطان بخت کی حویلی میں موجود ہو اور میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی بھی صفائی نہیں سنوں گا نہ اپنی اٹھارہ بیس سالہ لڑکی کا خیال رکھوں گا نہ تم سے کچھ کر مجھے کچھ بھی عزیز نہیں اور سلطان بخت کے کڑوٹوں کا علم ہے مجھے اور اس کو پڑھنا بھی مجھے آتا ہے۔ تمہیں اس سے ڈرنے یا خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم اس حویلی کی مالکن بن کر رہو اس کو پڑھنا بھی مجھے آتا ہے۔ تمہیں من من کوئی تو ساری زندگی سڑتی رہو گی تم میری بات سمجھ رہی ہونا۔“ اس نے سر ہلایا۔

”جاؤ جا کر تیار ہو جاؤ وہ لوگ تھوڑی دیر میں آنے والے ہیں اور یہ تیاری ظاہری نہ ہو۔ خود کو دلہر سے تیار کرو۔ ہر قسم کی صورت حال کا منسوبی سے مقابلہ کرنے کے لیے۔ صالح! خود کو کبھی کمزور نہ ظاہر کرنا اور تم کو خود بھی نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اتنا یاد رکھنا اپنی زمین پر کسی کو قدم نہ رکھنے اور نہ بے دخل ہو کر رہ جاؤ گی۔ اب یہ فیصلہ کر کے حویلی میں داخل ہونا کہ اس حویلی میں تمہارے سوا اور کوئی جگہ نہیں پا سکتا جاؤ اب۔“ وہ کسی معمول کی طرح ہاتھ کراپتے کرتے میں آئی۔

حسین شاہ کی باتوں نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ تو یہی درنا قسم کی بیوی بننے کا فیصلہ کر چکی تھی کہ اس کے شوہر کو خرقہ کار اس کے پاس لوٹ ہی آتا ہے۔

”اور یہ“ آخر کار۔“ کب آنے گا کون جانے اور میں اس دن کو دیکھنے کے لیے زندہ بھی رہوں یا نہیں اور میں انتظار کیوں کروں گی۔ اگر قدرت نے گیند میرے کورٹ میں ڈال ہی دی ہے تو میں کیوں نہ اسے سلیتے سے کھیلوں۔ آخر سیدہ بھانگی کی ساری سختیاں بھی تو میں نے سہی ہیں۔ کیا اس دن کے انتظار میں کہ پہلی رات ہی ٹھکرا دی جاؤں۔ جو منصب میرا ہے اس حویلی میں وہی تو سیدہ کا ہے اس گھر میں۔ اگر وہ ساری زندگی اپنے منصب کا ناجائز فائدہ اٹھاتی رہی ہیں تو میں کیوں جائز فائدہ نہ اٹھاؤں اب میں اس طرح اپنی باری کھیلوں گی سیدہ بھانگی کہ آپ کو اور آپ کے بھائی کو بھی اس کھیل کا مزہ آجائے گا۔ آخر میرے ساتھ لالہ بھی تو ہیں۔“

آئینے کے سامنے تیار ہوتے ہوئے وہ مسلسل خود سے باتیں کیے جا رہی تھی۔ لپ اسٹک کا آخری کوٹنگا کر اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔

پائل گرین اسے شہب کی شہرت اور تنگ پا جاسے میں سلیتے سے میک اپ کیے وہ صبح والی اجڑی اجڑی مایوس صالح سے بہت مختلف نظر آ رہی تھی۔

”گولڈن پشوانہ۔ نکال آئی ہوں۔“ اس نے منہ بنا کر سیدہ کے لہجے کی نقل اتاری۔

بس سیدہ بھانگی! آپ کا دخل میری زندگی میں نہیں بلکہ تھا۔ آج ایک نئی صالح نے تخم لیا ہے۔ اپنے بارے میں ہر فیصلہ خود کرنے والی صالح! اس نے مسکرا کر خود کو دیکھا اور گلاب کے گہرے بالوں میں اٹکانے لگی۔

”لی لی! مسلمان آگتے ہیں آپ کو بڑی مالکن اپنے کمرے میں بلا رہی ہیں۔“ اسی وقت خلاصہ پیغام لے کر آئی تو اس نے بیٹھے میں دیکھ کر سر ہلایا۔

”اے آمنہ! وہ تو کچھ تو کتنی تیز کی بارش ہو رہی ہے۔ کالے سیاہ بادل ٹھٹھکا سوراگھٹائیں ٹھنڈی بن ہوا۔ جو یہ۔“ اماں نے ایک لمحہ میں تو آکر۔“

زینب کی پر جوں تک وار آواز جس میں انوکھی مسرت کا احساس تھا نے سارے آنگن میں جیسے شور مچا دیا۔ آمنہ تو جیسے اپنے دھیان ہی سے چونک اٹھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ گڑ گڑا کر صاف کیا اور دوپٹہ درست کرتے ہوئے باہر نکل آئی۔

باہر واقعی موٹے موٹے قطروں کے ساتھ چھما چھما بارش برس رہی تھی۔

”اس اندر تو بالکل پتا نہیں چلا کب پائل آئے کب ایسا مو سم بنا۔“ وہ بھی آسمان کی طرف منہ کر کے حیرت زدہ خوشی سے بول رہی تھی۔ ”چنا منٹ پکے جو جی۔“ وہ بول رہی تھی اور ہاتھ اٹکے دم سے کھل اٹھا۔

”مغرب کے وقت آیا تھا۔ موسم نہیں تھا ایک دم سے ہی اند کی رحمت ہو گئی۔“ اماں نے بھی ان کے چہرے آکر کھڑکی ہو گئی۔ ”اور تو یہ یہ کو توں کچھ شام پر کر گئی ہے۔ میں اندر اسے جگانے ہی تو گئی تھی تمہارے پایا صاب آگے تو اس کے بے وقت سونے پر تھا ہوں گے۔ ابھی کھانا کھا کر سو جاتی اٹھ رہی ہوں اٹھ نہیں رہی۔“

اماں جی کہتے ہوئے برآمدے میں سے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔ تو اچھو لے رہی تھا۔ وہ بیڑھی پر بیٹھ کر پیڑھے بنانے لگیں۔

”ہاں صبح سے تو یہی تھی اب تو اس کو سونا ہی تھا۔ گھر چھوڑنے کا سب سے زیادہ رنج اسی کو تو ہے۔ اس کا تو اسکول بھی لوم ہے اور سہیلیاں بھی۔ ہمیں تو کچھ خاص فرق نہیں پڑے گا ایک چار دیواری سے لگائیں گے۔“ وہ بول رہی تھی جاتی ہوں گے کیوں آمنہ؟“ زینب ہاتھ پیچھا پیچھا لپٹا کر بارش کے قطروں سے کھیل رہی تھی۔

”ہر وقت اوٹ پٹانک نہ بولا کرو تمہارے پایا صاب آگے ہوں گے کھانے کے لیے ڈسٹر خان لگاؤ جا کر۔“ اماں نے تیز ایٹاتے ہوئے زینب سے کہا۔

”زینب! یہ تمہاری اس آنگن میں شاید آخری بارش ہو۔“ اس دم بادل زور سے گریے اور بجلی کا ایک گونڈا پکا زینب اور آمنہ سمٹ کر پیچھے برآمدے میں ہو گئیں پالی کی تیز لہجہ اڑان کے کپڑے پھلو گئی۔

”شاید ہو سکتا ہے ہم واپس آجائیں پایا صاب کا کچھ پتا تھوڑی ہے۔“ زینب لاپرواہ انداز میں بولی۔

”زینب! جتا نہیں ابھ اتنا کھلا آنگن اتنا ہوا آسمان اتنا روشن دن ہو گا کہ نہیں۔“

”مجھے ایک بات بتاؤ آمنہ! زینب پھر سے آکر برآمدے کے کنارے کھڑی ہو گئی۔

”بھئی وہاں کھلا آسمان ہو گا کہ نہیں روشن دن نکلے گا کہ نہیں۔“ اس نے دیکھے اندیشوں سے اب جو خوشی ملی ہے اس کو کیوں غارت کر رہی ہو۔ کل جو ہو گا وہ کل دیکھیں گے۔ آج تو دیکھو کیسی اچھی کیسی ٹھنڈی خوشبو دار بارش برس رہی ہے۔ مزہ آیا اماں جی! تھوڑا سا سوئی کا حلوہ تو بنا لیں۔“ وہ منہ بوڑ کر پٹائی۔

”آمنہ! اٹھنا نہیں۔“ زینب خوشی سے جیسے پائل ہو رہی تھی وہ صبح سے تو بیزار بیٹھی تھی۔ اب سارے موسم

ہوئے ناراضی سے کپڑے نکالنے لگی۔

”اب نہانا پڑے گا تو نانی یاد آجائے گی۔“ وہ کپڑے اٹھا کر غسل خانے کی طرف بھاگی۔ نہ نہب کی بھی وہی حالت تھی۔

ایمان کی جبرے کی طرف پڑھیں کہ جا کر جلیل کا حال پوچھیں۔

”نسل رتی ہوں جا کر کہ مجھے ساتھ ہی لے کر جائیں گے۔“ وہ خود سے کہتے ہوئے اندر داخل ہوئیں بچوں جلیل منہ لپیٹ کر رہا تھا۔

مسز خان بیگم پر سر رکھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگیں۔ مسلسل بولنے سے ان کا سانس پھول گیا تھا۔ چہرے کی زردی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ ہونٹ چپ ہونے کے باوجود بھی جیسے پھڑپھڑارے تھے۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ نہ بہت ساکت و نہ خود پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ انہیں ایک ننگ دیکھے جارہی تھی۔ اسے ابھی تک اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب ابھی پیچھونے میں سے کہا ہے۔ اسے لگا آج ایک بار پھر سہیل نے اس پر گھر کا دروازہ بند کر دیا ہے اور وہ ویران سڑک پر دھکے آسمان تلے اس سیاہ گیت سے غمگین مار رہی ہے۔ برسوں والا ساتھ آج ایک بار پھر دہرایا گیا ہے۔ اس دروازے سے اٹھ کر اب وہ کدھر جائے گی؟ اسے کچھ جھانکی نہیں دے رہا تھا۔

اس نے ایک لمبے وقفے کے بعد پلکیں جھپکیں، کتنی دیر کا سینے میں رکنا سانس بہت آہستگی سے خارج کیا تو اسے معلوم ہوا اس کے سینے میں دل ابھی بھی دھڑک رہا ہے اس آخری پناہ گاہ کے چھین جانے کے بعد بھی۔ اسے لگ رہا تھا اس نے اس جنبشی بے مہر دنیا میں آج ہی جنم لیا ہے۔ اسے خود ہی اٹھنا ہو گا بیچوں کے بل خود ہی زمین پر قدم ہمانے ہوں گے، خود ہی سر اٹھانا ہو گا۔ اپنے آپ کو اپنے وجود کو خود ہی پورے قدم کے ساتھ زمین پر کھڑا کرنا ہو گا ورنہ شاید وہ زمین بیٹھی لوگوں کی ٹھوکریں کھاتی رہے گی۔ ہر کوئی اگر اسے بساط حیرات ضرور سمجھنے گا۔ کبھی کوئی نکل بھی کر جاتا ہے اس کا فعل قابل گرفت نہیں سمجھا جاتا اور کبھی کوئی پتا کچھ کئے ہی نہانے کی ٹھوکروں کا حقدار نہ رہتا ہے جیسے وہ مسلسل چاروںوں سے سب کی دی ہوئی وقت سیٹھی جارہی تھی۔ بنا کچھ بھی غلط کیے اور کوئی اس کی فریاد سننا تو دور کنار جانے کا بھی روا دار نہیں تھا تو پھر وہ کھلا ہوا ایک کے آگے دامن پھیلائے جارہی تھی آخر کس آس میں۔

”اگر نصیب میں ٹھوکروں سے مرنا ہی لکھا ہے تو کیا اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر ایک بار بیٹھنے کی کوشش بھی نہیں کی جا سکتی۔“ کوئی اس کے اندر سے بولا۔

وہ ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی ایک آخری خاموش فریاد بھری نظر اس بوڑھے وجود پر ڈالی جس سے اس کے دل نے بہت آس لگائی تھی اور آس بھی اسی سے پوری ہوئی ہے جس کے دل میں خدا ارجم ڈالے۔ وہ خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ عالیہ دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے کی معنی خیز مسکراہٹ بتا رہی تھی وہ سب کچھ سن چکی ہے۔ نہ نہب خاموشی سے اس کے پاس سے گزر گئی۔

دروازہ کھلنے پر ہلکی سی چول کی آواز آئی تو مسز خان نے آنکھیں کھول دیں۔ اب ان کا سانس نارمل رفتار میں چل رہا تھا۔ سینے میں بے قابو ہونے والی اب جھم جھم کر دھڑک رہا تھا۔ نہ بہت کمرے سے جا چکی تھی۔ انہیں یکدم ایک بے گلی نے آن گھیرا۔ وہ آہستہ سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

”کیا میں نے صحیح کیا ہے؟“ ان کے دل نے گویا پوچھا۔ ”میں تو اتنے دنوں سے پاگلوں کی طرح نہ بہت کے لیے بے چین تھی اور آج میں نے اسے دیکھتے ہی دھتکار دیا۔ مجھے اگر اس پر یقین ہے تو پھر اس بے یقینی کا مظاہرہ کیوں۔“

”اسلام و علیکم ام جان! اسی لمحے معاذ کھلے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ انہوں نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”کیا بات ہے ام جان! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ ان کی سپاٹ نظروں اور سلام کا جواب نہ دیتے

پروہ گھبرا کر ان کے پاس آکر بولا۔

”و علیکم السلام ٹھیک ہوں میں۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔ ”تم اتنی جلدی کا رخ سے لوٹ آئے۔“

”ابھی کا سزا قاعدہ کننا اشارت ہوئی ہے۔ میں تو یونہی چلا گیا تھا کالج دیکھنے نکلا سزا تو شاید اگلے ہفتے سے اشارت ہوں گی۔ شہباز بھائی رات کس وقت گئے؟“ وہ اس جگہ پر بیٹھ گیا جہاں ہند لکھے پہلے نہ بہت بیٹھی تھی۔

”جاؤ نہ بہت کو بلا کر لاؤ۔“ انہوں نے شاید اس کی بات نہیں سنی تھی بے چینی سے بولیں۔

”کون نہ بہت؟“ معاذ حیرانی سے بولا۔ رات کو وہ سوچ کا تھا ”وہ جلدی نکل گیا تھا اس لیے اسے نہ بہت کی آمد کے بارے میں پتا ہی نہیں تھا۔“

”تمہیں نہ بہت کا نہیں پتا۔“ وہ کچھ حیرت سے بولیں۔ معاذ نے مشکوک نظروں سے انہیں دیکھا۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نام جان! وہ آہستگی سے انہیں چھو کر بولا۔

”ابھی باطل نہیں ہوئی میں۔ چلو مجھے وکیل چیئر پر بٹھاؤ میں خود اس کے پاس جاتی ہوں کہیں کچھ کرتی نہ بیٹھنے کی آخری جملہ انہوں نے لبوں میں ادا کیا۔ معاذ نے اٹھ کر کمرے کے کونے میں رہی ان کی چیئر تھپیٹ کر بیڈ کے پاس گئی اور انہیں سہارا دے کر چیئر بٹھایا۔

”چلو جلدی۔“ وہ خود ہی بل دھکیلے لگیں تو معاذ نے چیئر کا رخ باہر کی طرف کر دیا

”پتا نہیں وہ کس کمرے میں ہے۔ نہ تو ان کو بلاؤ اس کو علم ہو گا۔“ وہ وہیں رک کر بولیں۔ اسی وقت نہ تو ان کو بلانے سے نکل کر آئیں۔

”نہ بہت کدھر ہے نہ تو ان؟“ وہ بے قراری سے بولیں۔

”جی گیسٹ روم میں ہے شاید۔“ ابھی تو آپ کے کمرے میں تھی۔

نہ تو ان نے خود اپنے جگہ مسز خان نے خود ہی چیئر آگے بڑھائی شروع کر دی۔ گیسٹ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نہ بہت کمرے کے وسط میں کھڑی جاؤ اور ادھر رہی تھی۔ وہ شاید جارہی تھی۔ ہلکی سی آہٹ پر اس نے مڑ کر دیکھا ”مسز خان اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ معاذ کے لیے یہ لڑکی باطل ابھی تھی غلوں چہرہ اور سرخ سوئی آنکھیں لیے وہ اسے ہلکی نظر میں اچھی لگی۔

”معاذ! نہ تو ان سے کہو تمہیں کب جا سکتے ہیں؟“ اس کمرے میں لے آئے میں نے صبح سے چائے نہیں پی اور ہاں کو ہر آگے سامنے۔“ وہ معاذ سے کہہ رہی تھیں وہ چیئر چھوڑ کر سامنے آ گیا۔

”یہ نہ بہت ہے تمہارے بھائی کیپٹن شہباز کی دلہن۔ میں شاید تم سے ذکر کرنا بھول گئی تھی۔ شہباز کا نہ بہت سے نکاح ہو چکا ہے۔ ایک بھائی تھا اسے اب ہر جنسی طور پر جا ب کے سلسلے میں باہر جانا پڑا۔ وہی رات کو میرے فون کرنے پر نہ بہت کو ادھر چھوڑ گیا ہے۔ تم رات کو سوچ کے مجھے اس لیے تمہیں پتا نہیں چلا۔“

وہ بہت پر یقین لگنے میں بول رہی تھیں۔ نہ بہت نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”اور نہ بہت! یہ معاذ سے شہباز نے اسے اپنا چہرہ بنا بھائی بنا لیا ہے بہت اچھا لڑکا ہے۔ ابھی اس نے ایف ایس سی میں ایڈمیشن لیا ہے میٹرک میں ٹاپ کیا تھا اس لیے اب ہمارے ساتھ ہی رہتا ہے۔ معاذ! جاؤ نہ تو ان سے چائے کا بولو اور ہاں دونوں پورقنڈ میں جا کر میرا پیغام دے دو کہ آیا زبھائی اور انظر بھائی شام کو جب بھی گھر آئیں اپنی بیویوں کے ساتھ فوراً میرے پاس آئیں۔ مجھے ان سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ معاذ سر اثبات میں ہلا کر باہر نکل گیا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ معاذ کے باہر جاتے ہی وہ نہ بہت سے مخاطب ہوئیں وہ اسی طرح کھڑی رہی۔

”بیٹھ جاؤ نہ بہت! اب کے ان کا لوجہ حلیمہ تھا وہ پیچھے ہٹ کر بیڈ کے کنارے پر ٹنگ گئی۔

”اتنی سرزنش کرنے کا حق تو ہاں کو نہیں ہوتا ہے اگر بھائی تمہیں اتنا ڈانٹتے تو کیا تم چاروں کو گھر چھوڑنے پر قائل جا سکتی۔“ ان کا لوجہ اپنا ہی تھا۔ کچھ دیر پہلے ان کے برساتے لب اب ہلکی سی مسکان لیے ہوئے تھے۔

”نہ بہت کا دل جیسے پانی ہونے لگا۔“

ساتھ دیا تھا۔ اوہر سے جانے کا خیال بھی صرف سیدہ اور شہرینہ سے چدانی کا سوچ کر بھاری تھا۔ انہیں بیٹے کا بھی ارمان تو بہت رہا تھا مگر اس کی عجیب سرکش طبیعت نے سلطان شاہ کو اس سے متنفر کر دیا تھا۔
"میرے پاس بہت نام نہیں ہے بس چند منٹ اور۔" سلطان شاہ نے رست واپس پر نگاہ ڈال کر کہا۔ سیدہ کی آنکھیں از سر نو جھکنے لگیں۔ صالحہ کا چہرہ بے تاثر تھا۔
"شہرینہ کہاں ہے؟"

"اوہر ہی ہے بلواؤں اس کو۔"
"نہیں رہنے دو۔ جاتے ہوئے اسے ساتھ لے کر جاؤں گا ایئر پورٹ۔" انہوں نے منع کر دیا۔ کمرے میں کچھ دیر کو خاموشی ہو گئی۔

"صالحہ بیٹی! یہ کھڑیہ جو ملی آج سے سب تمہارے حوالے ہے ٹھیک ہے آج سے پہلے سیدہ ہی سب دیکھ بھال کرتی تھی اور یہ اس کا بڑا پل ہے۔ ہم پر احسان بھی کہ اپنی گھر داری کے باوجود وہ اس گھر کے ذرے ذرے کا بہت دھیان سے خیال رکھتی تھی اس لیے ہم اس کے شکر گزار ہیں۔ اللہ اس کو اس کی بے لوث خدمت کا اجر دے اور میں تم سے بھی تمہارا کہہ بیٹھ سیدہ کی کسی ماں کی طرح عزت کرنا کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اس سے مشورہ لے لیا کرنا۔ اگرچہ سب اختیار تمہارا ہے مگر تجربہ سیدہ کا بہر حال تم سے زیادہ ہے اور سیدہ بیٹی! تم بھی پہلے ہی کی طرح اس گھر کو اپنا گھر جانتا۔ صالحہ کوئی غیر نہیں تمہاری بہن ہے۔ اس سے تمہارے بہت سے رشتے ہیں ان کو میں دہرائتا نہیں چاہتا اور اس سلسلے میں تو مجھے قطعاً کوئی فکر نہیں کہ صالحہ گھر کا نظام اچھی طرح نہیں چلا سکے گی۔ صالحہ ایک سمجھ دار ذہین لڑکی ہے اور مجھے خوشی ہے میں اس گھر کو ایک اچھا تحفہ صالحہ کی شکل میں دے کر جا رہا ہوں۔ صالحہ تم چاہو گی تو یہ کہ جنت بن جائے گا تم چاہو گی تو دوزخ کہ گھر کو جنت اور جہنم بنانا عورت کے اختیار میں ہوتا ہے۔ میری پوری نیت وہی ہے کہ تمہارے ذمے ہے۔ سلطان بخت — سلطان بخت سارے کام نہیں دیکھ سکتے سب کچھ تمہاری طرح سے کر سکتا ہے۔ سوائے اپنی دیکھ بھال کے۔ اس میں کچھ کمزوریاں ہیں ان کمزوریوں کو جاننا اور ان پر قابو پانا تمہارا کام ہے۔ جو صلے سے ذمہ داری اور محبت سے زندگی کے سفر کو شروع کرو گی تو اختتام پر خود کو بہت کامیاب محبت مند ملے گی۔ میری بات سمجھ رہی ہوتا۔" انہوں نے صالحہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ اس نے اذیت میں سر ہلا دیا۔
"جی چاہا جان!"

"سلطان بخت تمہارے ہزاروں بندوں میں اس نے اقرار کیا ہے۔ تم ہی اس گھر کی محقر اور سلطان کی زندگی کی شریک ہو جاؤ گی۔ جو جی کام جو بھی فیصلہ کرو بہت اعتماد اور بھروسے سے کرنا میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔ سو گوارا پانچ مشکل نہیں مگر اسے نامہ اپنا بنانے رکھنا کہ وہ کہیں بھی جانے تمہارا اپنی رہے۔ یہ مشکل کام نہیں اپنی انجام دینا پڑے گا باقی اللہ سب خیر کرے گا۔"

"بابا جان! اب صرف تین ماہ کے لیے جا رہے ہیں۔" سیدہ نے انہیں ٹوکا۔
"معلوم ہے مجھے۔" وہ پھیلی سی مسکراہٹ سے بولے۔ "اور ہاں ایک میری التجا سمجھو اور خواست یا حکم۔" وہ دونوں کی طرف دیکھ کر بولے۔
"جی بابا جان! سیدہ سعادت ہندی سے بولیں۔"

"شہرینہ میری امانت ہے تم لوگوں کے پاس اس کا بہت خیال رکھنا۔ بیٹا وہ کالج کی طرح ہے کسی کالج کی طرح ہی اس کی دیکھ بھال کرنا بہت پیاری ہے وہ مجھے اس کالج کو کبھی بکھرنے نہ دینا۔" کہتے کہتے وہ اب دیدہ ہو گئے۔
"بابا جان! شہرینہ ہمیں بھی جان سے بڑھ کر پیاری ہے آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔ محض تین ماہ میں ہم شہرینہ کو کوئی ایسی تکلیف نہیں دے سکتے جو آپ کو دکھ دے۔" سیدہ نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ سلایا۔
"اوہو بابا جان! فلائٹ کا ٹائم ہوا جا رہا ہے اور آپ ابھی تک اوہر ہیں۔" سلطان بخت نے دروازے میں نمودار ہو کر کہا۔

"کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔" وہ چیخو پھیل کر اس کے پاس لے آئیں۔ نہ بہت نے نفی میں سر ہلا دیا اور سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی ان کی آنکھوں میں پہلی ہی منہ سہی مگر ایک اپنائیت ضرور چمک رہی تھی۔ نہ بہت کی آنکھوں میں آنسو آگئے وہ ایک دم سے اٹھ کر ان کے قدموں میں جا بیٹھی ان کے زانو پر سر رکھ کر رونے لگی۔
"پچھو! آپ میری کھال بھی اویڑ سکتی ہیں آپ کو پورا حق ہے مگر میرا یقین کریں میں بے قصور ہوں میں نے کچھ نہیں کیا۔"

وہ روتے ہوئے کہنے لگی۔ مسزخان کا بھروسہ پھر ہاتھ اس کے سر تک گیا۔
"میں جانتی ہوں مگر سب لوگ نہیں۔ میں یقین کر لوں گیا سب بھی کر لیں گے۔ میں تمہارے حق میں دعا کر سکتی ہوں۔ اللہ غیب سے تمہاری گواہی پیدا کرے۔" وہ آہستگی سے بولیں۔ نہ بہت نے رونا بند کر دیا۔
"پتا نہیں وہ کب سرخرو ہوگی ہوگی بھی یا نہیں۔ اس نے آزردگی سے سوچ کر میرا اٹھایا اور چہرہ صاف کرنے لگی۔
"نہ بہت! تمہیں اس گھر میں جگہ دینا میرا کام ہے اور جگہ بنانا تمہارا۔ نہیں معلوم ہے نا جگہ دینے اور بنانے میں بہت فرق ہوتا ہے یوں کہ پھر تم وہ جگہ چھوڑنا بھی چاہو تو وہ زمین تمہارے قدم جکڑنے لے لے تم سے جدا ہوا رہتا ہے۔"

تمہارا سفر تمہیں بھی ہے اور شاید طویل بھی باقی لوگوں کی خیر ہے نہ مجھے نہ تمہیں اس کی پروا ہونی چاہیے مگر شہباز بری طرح سے بدگمان ہو چکا ہے۔ اس کے دل کا آئینہ صاف کرنا تمہارا کام ہے میری تمام تر دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔"

وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے کہہ رہی تھیں اور نہ بہت تو ابھی دل میں جگہ ملنے کی خوشی ہی منارہی تھی جگہ بنانے کا مرحلہ تو ابھی بعد میں آتا تھا۔ وہ اس بل کی خوشی کو کیوں تباہ کر لینی جو اسے کتنے ہزار آنسوؤں کی قیمت پر ملا تھا۔ اس نے پھر سے مسزخان کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ وہ کچھ دیر کے لیے کچھ بھی نہیں سوچا چاہتی تھی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

ہال کمرہ مہمانوں سے کچھ کچھ بھرا ہوا تھا پارش نے لوگوں کو کھلے سے اندر ہال میں آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ابھی سلطان شاہ سب لوگوں کے درمیان سے اٹھ کر اندر گئے تھے۔ زیادہ تر لوگوں کے قریبی عزیز ہی تھے جو شادی کے بعد سے ابھی تک یہاں تھے اور شاید سلطان شاہ کا فوری طور پر جانے کا مقصد ہی یہی تھا کہ لوگوں کو دو تین دن بعد دوبارہ نہ آنا پڑے۔ ایک پارٹی آمد میں ہی دونوں کام بھگتا لیے جائیں۔ کل ابھی وہ بدمختم ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی روانگی جو چار دن بعد تھی آج کے لیے کنفرم کر دی تھی۔ پتا نہیں کیوں وہ اب جلد سے جلد اس ماحول سے دور بھاگ جانا چاہتے تھے۔ سلطان بخت نے جیسے انہیں اندر سے نہ بھال کر دیا تھا۔ اتنی جلدی جانے پر سیرگاہوں سے خوب فضا ہوتی تھیں مگر انہوں نے اپنی تکلیف کا پتا کران کی ناراضی دور کر دی تھی۔

"چلیں یہی جلدی کریں جن لوگوں کو ایئر پورٹ ساتھ جانا ہے وہ چل کر گاڑیوں میں بیٹھیں تاکہ تمہاری رہ گیا ہے۔ سز بھی ہے اور پارش کی وجہ سے موسم بھی خراب ہو گیا ہے۔ چلیں جلدی کریں بڑے شاہجی کہہ رہے ہیں سب لوگ چل کر گاڑیوں میں بیٹھیں۔"
شاہجی کا مصاحب خاص سب کے لیے پیغام لے کر آیا تو ہال میں پچھلی سی جگہ لوگ آہستہ آہستہ اٹھ کر باہر جانے لگے۔

"کو سیدہ! مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ صالحہ نہیں آئی۔" شاہجی بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹھل رہے تھے۔ سیدہ کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر فوراً بولے۔
"آئی ہے بابا جان! سیدہ نے مڑ کر دیکھا۔ صالحہ ان کے پیچھے اندر داخل ہوئی تھی۔ سیدہ کی آنکھیں سوتی ہوئی تھیں تاکہ کی لوگ بھی سرخ ہو رہی تھی۔ سلطان شاہ کے دل کو عجب سے دکھ نے آن گھیرا۔ اپنی سخت کیر طبیعت کے باوجود انہیں اپنی بی بی بہت پیاری تھی۔ شریک حیات کے گزر جانے کے بعد اس نے ان کا ہر قدم پر باقاعدہ

”اللہ کے حوالے میرے بچوں خدا تمہیں ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔“ کہہ کر انہوں نے تم آنکھوں کے ساتھ دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور سلطان بخت کے پیچھے باہر نکل گئے۔ سیدہ چونکھٹ میں کھڑی ہو کر دعا میں پڑھتے ہوئے تم آنکھوں سے ان کی سلامتی ہانکتے لگیں۔ سالہ صوبے پر بیٹھ کر گری سوچ میں گم ہو گئی۔ گاڑیوں کا قافلہ گاؤں سے باہر نکلا گاؤں کے تقریباً سب ہی لوگ بیرونی سڑک پر شاہ جی کو الوداع کہنے آئے تھے، خراب موسم کے باوجود لوگوں کی محبت دیدنی تھی۔ شاہ جی بڑے والہانہ انداز میں سب کو ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہہ رہے تھے۔

حالاً تکیہ اس سے پہلے بھی سلطان شاہ دوج کر چکے تھے، کئی بار ملک سے باہر جا چکے تھے مگر آج جیسی کیفیت پہلے کبھی نہ تھی، انہیں لگ رہا تھا وہ یہ منظر آخری بار دیکھ رہے ہیں۔ اپنا گاؤں اپنی حوٹلی، اپنی کئی کئی بیٹیاں اندھیرے میں ڈوبے لگاتے کھیت، اونچے سرسبز درخت مسجد کے دو سفید مینار اور قیالے سے رنگ کا گنبد، میلی مٹی سے آتی سوندھی سوندھی خوشبو، کچھ بھی انہیں دوبارہ نظر نہیں آئے گا۔ انہوں نے تھک کر سر اندر کر لیا اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

پھر وہ تمام رات کچھ نہیں بولے بس آنکھیں بند کیے اپنے اندر کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ کب گاڑیوں کا قافلہ ایئر پورٹ کی روشنیوں کی زد میں آیا انہیں پتا ہی نہیں چلا۔ فلائٹ روانہ ہونے میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا تھا اس لیے الوداعی مرحلہ بہت تیزی سے چلایا گیا۔

”سلطان بخت! اب سب کچھ تمہارے حوالے اللہ کے بعد یہ سلطنت یہ جاگیریں یہ باغات میں نے تمہارے باپ دادا نے بہت محنت سے بنائے ان کا خیال رکھنا مجھے بچپن سے لے کر آج تک میں تمہارا رکھتا آیا ہوں، اسی طرح میری اپنے باپ دادا کی عزت کا خیال رکھنا مجھے بس تم سے ہی کہنا ہے۔“ وہ ہیکلی آنکھوں کی ساتھ بیٹے کو سینے سے لپٹا کر بولے۔ سلطان بخت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

”اللہ حافظ پھر ملیں گے بشرط زندگی۔“ وہ ان کا ہاتھ چوم کر ہاتھ پر مٹھی سے ملاتے ہوئے پارٹے لاؤنج سے آگے بڑھ گئے اور سلطان بخت خالی خالی نگاہوں سے انہیں جانے دیکھتے رہے۔

پھر بہت سارے لمحے چپکے سے گزر گئے۔ سلطان بخت کے کانوں نے جہاز اڑنے کی تیز آواز سنی تو ایک گہرا سانس ان کے سینے سے خارج ہوا۔ چند لمحوں کی مغموم کیفیت چلے جہاز اڑنے کے ساتھ ہی کہیں اوپر فلاحی کر گئی۔

سلطان بخت نے سر اٹھا کر دیکھا تو جہاز کو دیکھا تو انہیں لگا جہاز کے اڑنے پر ان کے ساتھ ہی ان کے پر بھی کھل گئے ہیں اور کھلے پروں کے ساتھ وہ بہت اوپر ہی اوپر بنا کسی رکاوٹ کے اڑنے چلے جا رہے ہیں، کھلی بدست ہواؤں میں کسی اثر ان کے ساتھ۔

”لو بھلا بتاؤ۔ ہم کوئی چور ہیں جو یوں چھپ چھپا کر نکل جائیں، ایسا تو کوئی گناہ نہیں کیا کہ سب سے منہ چھپا جائیں تمہارے بابا صاحب کی بھی عجب منطقت ہے۔ کہتے ہیں بس ایسے ہی پلو کسی سے بھی ملے بغیر۔ ایسے کوئی اچھا لگتا ہے، برسوں کا ساتھ ہے۔ اب یونہی اٹھ کر چلے جائیں پھر واپس بھی آتا ہے، رہتا تو ہمیں سے پھر کوئی ہمیں منہ لگائے گا۔ ہمیں آکر رشتے نانتے جوڑنے ہیں۔ قبیل دار ہیں ہم۔ بیچیاں بیاہتی ہیں، بھوسے لاتی ہیں اس طرح خدا انخواستہ منہ کالا کر کے جائیں گے تو کوئی دوبارہ ہمیں اپنی رہنمائی پر قدم رکنے دے گا۔ تو یہ کہو۔ لوگ سو طرح کے شک میں نہ پڑیں گے کہ خدا انخواستہ کیا معاملہ تھا جو یوں چھپ چھپا کر گئے تھے۔ دو چار مہینوں کے لیے اور ہی کہانیاں نہ بنیں گی۔ اللہ معاف کرے میں تو ایسے نہیں جاؤں گی۔“

اماں کی چائے کا پیالہ آگے رکھے مسلسل خود سے بولے جا رہی تھیں۔ آمنہ کھرے میں بیٹھی دوپہر کے کمانے کے برتن دھو رہی تھی۔ زینب جو ریہ کے ساتھ مل کر صحن میں بکھرا ہوا اسلمان سمیٹ رہی تھی۔ ابھی صوفی صاحب کہہ کر گئے تھے، سامان تیار رکھو۔ جلیل نالر لے کر ابھی آتا ہے۔ شام سے پہلے نکل جائیں گے اور کسی

سے ملنے ملانے کی ضرورت نہیں ہے۔ خواجہ سو طرح کے سوال کریں گے لوگ، کیوں جا رہے ہیں، کیسے جا رہے ہیں پھر واپس آتا ہے تو کیوں واپس آتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ تم بس تیاری پکڑو۔ کھٹے تک نکلتا ہے۔“ وہ اپنا عمامہ درست کرتے ہوئے آرڈر دے کر باہر چلے گئے اور اماں بی، جن کے سر میں صبح ہی سے شدید درد تھا۔ چائے کے ساتھ اسپرولے رہی تھیں یہ نیا حکم سن کر جیسے آل بگولائی ہو گئیں۔ مگر صوفی صاحب کے آگے بولنے کی تو مجال نہ تھی۔ ان کے جاتے ہی دل کی بھڑاس نکالتے بیٹھ گئیں۔

”ہاں تو اماں جی! آپ مت کریں بابا صاحب کے حکم کی پروا، آپ جا کر اپنی سیلیوں سے مل آئیں۔ ہاسٹنی جی سے خدیجہ درزن سے، چاچا صابر کی بیوی سے اور کونو میں والی نالی سے۔ آدھے گھنٹے میں جا کر سب سے مل آئیں بلکہ میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں، میں بھی اپنی سیلیوں کو آخری سلام کر آؤں گی۔ پھر اللہ جانے کب واپس آئیں۔ بابا صاحب تو ابھی نہیں آئیں گے، ہم ان کے آنے سے پہلے ہی واپس آجائیں گے انہیں بھلا آیا پتا چلے گا۔“

”چپ کرو تم اپنے فضول مشورے، پچاس ہی رکھا کرو۔“ وہ اسے ڈانٹ کر بولیں۔ اور پھر چائے کا پیالہ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ آمنہ اب برتن دھو کر پلاسٹک کی بڑی سی نوکری میں رکھ رہی تھی۔

”آمنہ! اسی نوکری میں سارے برتن ڈال دو، ادھر سے تو اور چمٹا بھی اٹھا لو، چھری بھی رکھ لینا دھیان سے دیکھ کر۔ کوئی چیز نہ جائے یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں ضرورت کے وقت بہت کام آتی ہیں یہ نوکری اسی طرح ٹرے میں رکھ لیں گے، پھونکنی بھی رکھ لینا یاد ہے۔ اب تو جو لانا نہیں جانا پڑے گا۔ ہائے یہ دن بھی آنا تھا۔“

پھر سے جہاں ایک دم سے ان کا دل تیرنے لگا۔

”تیری مٹھی میں مولا! ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ اس میں ہماری کوئی بہتری ہوگی۔“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں اور پھر چائے پینے لگیں۔ آمنہ چیزیں سمیٹ کر نوکری میں رکھنے لگی۔

”یہ لو پیالہ، یہ بھی دھو لو اور اسی نوکری میں رکھ دو۔“ انہوں نے چائے پی کر پیالہ زینب کو تھمایا اور خود اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”جو ریہ بیٹے! جاندر سے میرا برقعہ لے کر آ، میں کم از کم سدھ سے تو مل آؤں۔ واپس آکر میں نے اپنا سفید چوندہ نہیں کٹا، انا کا کافی سے وہ اس بات کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔“ جو ریہ بھاگ کر لینا کمرے سے ان کا برقعہ لے آئی وہ اوڑھنے لگیں۔

”نکلنا کی باتیں بھی آؤں؟“ زینب لہجا کر بولی۔

”چپ کر کے بیٹھو، پہلے ہی بھگت رہے ہیں۔“ وہ آمنہ کی طرف دیکھ کر منہ میں پروہا کہیں۔ ”اور دیکھنا“ صوفی صاحب آئیں تو کہنا دھری ہیں اسٹور وغیرہ میں یا کہہ دینا ساتھ والی کے ہاں گئی ہوں۔“ وہ کچھ سوچ کر بولیں اور پھر جو ریہ کا ہاتھ تھام کر باہر نکل گئیں۔

باہر چلائی دھوپ تھی۔ رات کی بارش کے بعد آسمان بالکل صاف تھا، صبح سے خوب سفید دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ حوٹلی تک جاتے جاتے انہیں پیسٹہ سا آگیا، ایک تو دھوپ کی تیزی تو دوسرے صوفی صاحب کی حتمی کا خیال اور رفتار جی توان کی خاصی تیز تھی، جلد واپسی کا جو خیال تھا۔

”سیدہ ہیں اندر؟“ انہوں نے ہال کمرے کے باہر رک کر نوکرائی سے پوچھا۔

”اندر ہی ہیں۔“ وہ بولی تو رابعہ بی بی سر ہلا کر اندر چلی آئیں۔ سیدہ مٹھے پر بیٹھی صبح پڑھ رہی تھیں۔ رسمی سلام دعا کے بعد رابعہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

”وہ بی بی! میں آپ سے ملنے آئی تھی، صوفی صاحب کا ہاتھ لہو گیا ہے ادھر سے۔ دو چار مہینوں کے لیے۔“ آہستہ آواز میں انہوں نے مدعا بیان کیا، جگہ کا نام قصداً بتانے سے گریز کیا۔

”کیا؟“ سیدہ تیوری چڑھا کر بولیں۔ ”یہ رات رات میں صوفی کا کدھر بتاؤ۔ ہو گیا؟“
 ”جی۔ کافی دنوں سے سرکاری چھٹی آئی ہوئی تھی۔ ادھر شادی کی خوشی تھی پھر بڑے شادی کی روانگی اس لیے کہہ نہ سکے۔“ وہ بہت عاجزی سے بولیں۔

”آپ بھی صوفی صاحب کے ساتھ جا رہی ہو تو تپتے اکیلے رہیں گے کیا؟“ سیدہ کا سوال سراسر پچکانہ تھا۔
 ”جی سب ہی جا رہے ہیں۔ صوفی صاحب کہہ رہے تھے۔ وہ شاہ جی سے کہہ کر جلد سے جلد واپس ادھر آکر بتاؤ کہ کرائس گے بس تھوڑا سا سامان لے کر جا رہے ہیں۔“ ان کا لہجہ اور مسکین ہو گیا۔
 ”چھوڑو بسے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔ بابا جان ادھر ہوتے تو صوفی صاحب کو کبھی جانے نہ دیتے۔ کسی افسر کی مجال نہیں تھی کہ ان کی بات ٹال سکے۔“ سیدہ سراسر اٹھا کر بولیں۔
 ”جی! رابعی بی سرحہا کر بولیں۔“

”اچھا کب جانا ہے؟“
 ”آج ہی جی شام کو۔ کل ادھر مسجد کا انتظام سنبھالنا ہے نا۔“
 ”اور ادھر کا انتظام کون ویسے گا۔“ ایک دم سے انہیں خیال آیا۔
 ”جی ادھر بھی کوئی امام صاحب آگئے ہیں وہ مسجد میں ہی ہیں۔ صوفی صاحب بتا رہے تھے ویسے مجھے کچھ خاص معلوم نہیں۔“

”اچھا میں سلطان بخت سے کہوں گی اس مسئلے کے بارے میں وہ ضرور کچھ کریں گے۔ آپ تسلی رکھیں۔“ وہ یہی سمجھیں کہ رابعی بی سفارش کا کہنے آئی ہیں۔
 ”بڑی مہربانی ہی آپ اجازت دیں۔“ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔
 صوفی صاحب کو بتا نہ چل جائے گا ہوا ان کی جان بلکان کر رہا تھا۔ سیدہ نے لٹا بے میں سر ہلا کر معاف کیا اور رابعی بی بی جویریہ کی انگلی پکڑ کر کمرے سے نکل آئیں۔

عین اسی وقت سلطان بخت کی گاڑی پھانک سے اندر داخل ہوئی گاڑی سے بیچ کر پھانک کی طرف بڑھیں۔
 گاڑی ان کے پاس ہی رک گئی اور سلطان بخت گاڑی کا دروازہ کھولا گیا ہر نکل آئے۔ انہوں نے رابعی بی بی کو پہچان لیا تھا شاید۔
 ”اماں بی! ہم سے ناراض ہیں کیا؟“ اواب۔ ”وہ ان کا رست روک کر خاصی بے تکلفی سے بولے۔ رابعی بی بی نے ہر قسم سے اندر ہی آستنی سے سلام کا جواب دیا اور آگے بڑھنے لگیں۔

”اتنی جلدی کس بات کی ہے اندر تو آئیں۔“ سلطان بخت کی یہ بے تکلفی انہیں بہت عجیب لگ رہی تھی۔
 ”جی میں اندر سے ہی آرہی ہوں مجھے ذرا جلدی ہے اجازت دیں۔“ آجویریہ۔ ”وہ جویریہ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر پھانک کی طرف بڑھیں۔
 ”کیا بات ہے ملانی جی کے مزاج نہیں مل رہے۔“ سلطان بخت کا لہجہ عجیب بہکا بہکا سا تھا۔ انہیں خوف سا محسوس ہوا انہوں نے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔

”شاہ جی! اسٹا ہے صوفی صاحب ادھر سے جا رہے ہیں گاؤں چھوڑ کر۔ انہوں نے کسی کو نہیں بتایا بالکل چوری جیسے جا رہے ہیں۔ پر آپ کے خدام تو آٹھیں اور کان کھلے رکھتے ہیں نا۔“
 ”خفے کے معنی چیز بند لہجے نے جیسے ان کے قدموں سے جان ہی بھینچ لی ان کے قدم خود بخود پھیلے پڑ گئے۔
 ”جا رہے ہیں کہاں؟“ سلطان بخت نے حیرانی سے پوچھا۔
 ”پتا نہیں جی کہیں بتاؤ لے کا چکر چلایا ہے۔ ہم تو ادھر کی مصروفیت میں مگن تھے صوفی صاحب نے فائدہ اٹھایا اور اب کسی خطرناک جاسوس کی طرح فرار ہوا چاہتا ہے۔“ نیکے کو سب خبر تھی۔
 ”ہوں شام تک مجھے پوری خبر دو کہ صوفی صاحب کدھر تشریف لے جا رہے ہیں اور کیوں۔ مکمل رپورٹ“

”مجھے“ دور سے آتی سلطان بخت کی آواز نے رابعی بی بی کی جیسے جان ہی چوڑی۔
 ”یہ ہوتا ہے انجام مجازی خدا کے حکم کو رو کرنے کا۔ اب اس شیطان نے اپنے ہر کارے پیچھے بیچ دیے خدا معلوم اس کی کیا نیت ہے۔ اللہ رحم کرے صوفی صاحب تو مجھے زندہ و تندرست کر دیں گے۔“
 رابعی بی بی کے سینے پھوٹ گئے اور جسم ہولے ہولے کانپنے لگا۔

”میں نے تم سب کو یہاں اس لیے بلایا ہے کہ مجھے تم سے ضروری بات کرنی تھی شہباز اور نہت کے بارے میں۔“

مسزخان کے کمرے میں ان کے دونوں بیٹے اور دونوں بہنیں موجود تھیں۔ معاذ جوٹی وی لاؤنج سے اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا ادھر محلے دروازے سے مسزخان کی آواز سن کر دروازے کی اوٹ میں ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ایک بخش تھا جس نے اسے یوں چھپ کر اندر کی گفتگو سننے پر مجبور کیا تھا۔ نہت کو وہ صبح سے دیکھ رہا تھا وہ جہاں بھی ہوتی تھی وہی تھی وہی دیر بعد سر جھکا کر رونا شروع کر دیتی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو ایسے گرنے ہوتے جیسے بارش کے قطرے ہوں ٹپ ٹپ کرتے۔

معاذ حیران تھا کہ اس کی آنکھوں میں اس قدر آنسو کہاں سے آگئے ہیں اور اسے یہ بھی حیرت تھی کہ وہ کیوں مسلسل رونے جا رہی ہے اور کوئی اسے چپ نہیں کر رہا۔ سب اسے رو تے تو کچھ کریوں انجان بن جاتے جیسے یہ اس کا معمول ہو۔ وہ اس طرح رات کو اچانک کسے آئی پھر صبح کیپٹن شہباز کا سب سے بغیر ملے چلے جانا اور سب گھر والوں کا نہت سے اتنا قریبی رشتہ اور اتنا روٹھا سا انداز ان سارے سوالوں نے اسے دروازے کے باہر ہی رکھنے پر مجبور کر دیا حالانکہ وہ جانتا تھا اگر اس طرح کسی نے اسے کھڑے دیکھ لیا تو شاید اسے ادھر سے چلتا ہی کر دیا جائے مگر اس وقت اسے کسی خوف کی پروا نہ تھی نہت کیسٹ روم ہی میں تھی۔

”اور قیقا“ رو رہی تھی۔ اس نے دل میں تجاس کیا۔
 ”ام جان! آپ کا حکم سر آنکھوں پر آپ جو سنیں کی ہم سنیں گے اور بجالائیں گے۔ نہت اور شہباز کا معاملہ یقیناً ہمارے گھر کا معاملہ ہے مگر گستاخی معاف مجھے آپ سے کچھ اور کہنا ہے۔“
 اظہر نے ان کی بات سے بغیر جلدی سے کہا تو مسزخان سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگیں۔
 ”یہ لڑکا جس کا نام معاذ بتایا جاتا ہے یہ ادھر کس حساب میں رہ رہا ہے۔“ اظہر کی آواز اور الفاظ اتنے صاف تھے کہ بچن میں برتن دھونی زخمت بانو نے بھی یقیناً ”سنے ہوں گے معاذ نے دیوار کا سارا لیا۔“
 ”اس وقت معاذ کا کیا ذکر میں نے تم لوگوں کو دوسرے مسئلے پر بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔“

”آپ آئی ہیں نا کہ معاذ کا معاملہ بھی ایک مسئلہ ہے اور ام جان! یہ سچ بھی ہے۔ آپ نے کیا سوچ کر اور ہم سے بن پوچھے ایک انجان اور غیر لڑکے کو اس گھر کا فرد بنایا ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں زمانے کے کیا حالات ہیں اس طرح کے لڑکے گھروں میں جگہ بناتے ہیں پھر اس گھر کا صفایا اور گھر والوں کو ختم کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔ مجھے آپ کے اس خود ساختہ فیصلے سے نہ صرف ہلی رنج ہوا ہے بلکہ میں کہتا ہوں اسے ابھی اور اسی وقت ادھر سے چلتا کریں۔“ ان کے لہجے میں کوئی لحاظ نہ تھا۔

”صرف یہی نہیں ہے لڑکا اگر کسی گینگ کارکن نہیں تو بھی یہ کل کو ہمارے لیے مسئلہ بن سکتا ہے۔ ہماری پتیلیاں ہیں اور بیٹھے یہ گوارا نہیں کہ ایسا کوئی بھی انجان لڑکا گھر کا فرد بن کر ہمارے درمیان رہے۔ اظہر بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ اسے صبح ہی ادھر سے نکالیں۔“

ایاز بھی اظہر کے چپ ہوتے ہی ہل اٹھے عالیہ اور فائزہ بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں تو یا ہر کھڑے معاذ کا بی چاہا وہ ابھی ادھر سے بھاگ جائے۔
 ”بس کرو تم لوگ۔“ مسزخان غصے سے بولیں۔ ”شہباز ہی یہاں لایا تھا وہی اس کے بارے میں فیصلہ

کرے گا۔ اس وقت معاذ کا کوئی ذکر نہیں۔ اظہر اتم فون اٹھا کر لاؤ اور شہباز کو فون کرو میں اس سے بات کروں گی کہ اگلے ہفتے اس کی رخصتی۔

ان کی زبان لڑکھرائی گئی رخصتی کا تو اب کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ ”اگلے ہفتے سادگی سے ویسے کی تقریب ہوگی“ وہ اگلے ہفتے کے روز ایک ہفتے کی چھٹی لے کر آجائے میں بات کرتی ہوں اس سے فون لاؤ۔

وہ حکمہ لہجے میں بولیں چاروں میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔

”ام جان! پہلے معاذ کے بارے میں فیصلہ ہو گا۔“

اظہر نے دو ٹوک لہجے میں کہا جس میں ذرا ابھی جکڑ تھی۔ مسزخان بے بسی سے اسے دیکھنے لگیں۔

• • • • •

کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی جیسے کوئی اہم فیصلہ سنانے سے پہلے کمرہ عدالت میں چند لمحوں کے لیے خاموشی ہو جاتی ہے اور اس خاموشی میں معاذ کو اپنے دل کی دھک دھک صاف سنائی دے رہی تھی۔

”ایک اور دیر دیری؟“ اس نے دکھ سے سوچا۔ ”اب کدھر جاؤں گا؟“ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

”اظہر! تم مجھے مجبور مت کرو کچھ بھی سخت کہنے پر۔“ اس بھیانک خاموشی کو مسزخان کے گھوس لہجے نے توڑا۔

”ابھی میں زندہ ہوں اگر تو یہ گھرائیوں اور دیواروں کا ہے تو بھی یہ اینٹیں اور دیواروں کاغذوں میں میرے نام ہیں اور اگر یہ مکان ایک منظم گھر ہے تو بھی اس کی سربراہ میں ہوں۔“ وہ ذرا سہل لہجے میں۔

”میں نے تمہیں الگ ضرور کیا ہے مگر یہ عیحدگی بھی اسی چہرے کے نیچے ہے جس کا مختار فی الحال اللہ نے مجھے بنایا ہے۔“

ان کا لہجہ ہی نہیں الفاظ بھی بہت سخت تھے۔ شاید اس کے جواب میں ان کے دونوں بیٹے یہ گھر چھوڑنے کی ہی

دھمکی دے ڈالتے۔

”مگر اس کے باوجود میں کوشش کرتی ہوں کہ کسی بھی جگہ اپنے اس حق کا غلط استعمال نہ کروں۔“ وہ بے چارہ

معصوم لڑکا بے سہارا ہے خدا نے اگر ہمیں اس کے سہارے کے لیے وسیلہ بنایا ہے تو اس میں ہمارا کچھ کمال

نہیں۔ جو کچھ اللہ نے تمہیں اس دنیا میں دیا ہے اس میں اس نے بہت سے جائز حقداروں کا حق بھی رکھ سے۔

اگر یہ لڑکا غنڈہ سے یا بد معاش یا کسی گینگ کارکن ہو سکتا ہے تم درگت سے کہہ رہے ہو لیکن پھر بھی شہباز کو آئیے

دو تینوں بھائی مل کر کوئی فیصلہ کر لیتا۔ وہ مجھے منظور ہو گا۔“ وہ آخر میں آکر نرم پڑ گئی۔

”انصوہ فون لے کر آؤ اور شہباز کا نمبر لاؤ۔“

وہ اپنی بات ختم کر کے بولیں تو ایاز نے اظہر کی طرف دیکھا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی فیصلہ کیا

اور ایاز نے اٹھ کر کمرے کے کارنر اسیڈ پر پڑا فون اٹھا کر سینٹرل ٹیبل پر رکھا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ فون ڈیڑھ

میں اس کا رابطہ شاید کیپٹن شہباز سے ہو گیا تھا مگر کسی سلام دعا کے بعد اس نے ریسیور مسزخان کو پکڑا دیا۔

”السلام علیکم کیپٹن شہباز! کیا حال ہے؟ مسزخان نے کھنگ وار آواز میں بیٹے کو مخاطب کر کے کہا۔

”و علیکم السلام ام جان! میں ٹھیک ہوں۔“ ماں کے پہلے سلام کرنے پر ان کا لہجہ کچھ شرمسار سا تھا۔

”میں نے کہا کہ تم نہ تو مل کر رہی گئے مجھ سے اور نہ جا کر رہی فون کیا اپنی خیریت سے پہنچے۔“ وہ دن بھرول پریشان

سا ہی رہا تو اب میں نے ایاز سے کہا کہ تمہیں فون کر لے۔ میں خود بات کروں گی۔“ وہ بہت نارمل انداز میں بول

رہی تھیں۔

”میں سچ آپ سے ملنے آپ کے کمرے میں آیا تھا آپ سوری تھیں میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔“ وہ

بہت سادہ لہجے میں بول رہے تھے۔

”اور فون کیوں نہ کیا؟“ وہ جتا کر بولیں۔ اظہر اور ایاز اب مال کی بیٹے سے دلار بھری گفتگو بیزاری سے سن رہے

تھے۔ عالیہ اور فائزہ پہلے ہی بھاگنے کو پرتول رہی تھیں۔

”بڑی تھا۔“ مختصر جواب دیا۔

”چلو خیر ہے میں نے کر لیا۔ اب ایسا ہے شہباز کہ میں نے تمہارے دونوں بھائیوں کے ساتھ مل کر فیصلہ کیا

ہے۔“ وہ ایک پل کو رکھیں۔ ”تمہیں معلوم ہے ناگزہت آجکل ہے۔ یہاں ہمارے گھر۔“ وہ جواب سننے کو رکھیں

دو سرئی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔

”سہیل نے بہت بے غیرتی کا ثبوت دیا، جوان بہن کو یوں گھر سے نکال کر خیرہ ہے ہی ایسی خصلت کا مالک

اس کا کیا لگہ کرنا۔ اب چونکہ نکاح تو ہو چکا ہے تو اگلے جمعہ کو ویسے کی تقریب رکھ لیتے ہیں۔ میں اظہر سے کہہ کر

ہالی ڈے ان میں بنگل کروا لیتی ہوں۔ تم بس چھٹی کی درخواست دے کر آنے کی تیاری پکڑو۔“

ان کا لہجہ اتنا ہلکا پہلکا تھا جیسے ان کا ترتیب دیا گیا پروگرام سن کر کیپٹن شہباز خوشی سے اچھل ہی توڑیں گے۔

”سوری ام جان! مجھے ابھی فی الحال دو تین ماہ تک چھٹی نہیں مل سکتی آپ اس قسم کے کسی بھی پروگرام کو

پہلے جانیں۔“ وہ سنی سے بولے۔

”کیپٹن شہباز! تمہیں معلوم ہے تم کس سے مخاطب ہو۔ ماں ہوں میں تمہاری۔ تمہارا بیٹا میں نہیں۔“ وہ

غصے سے بھڑک کر بولیں ان کی آواز میں درد تھا۔

”میں نے ایسا کچھ غلط نہیں کہا ام جان! جس نے آپ کو اس قدر غصے۔“ کیپٹن شہباز نے توجہ نہ پیش کرنا

چاہتی تھی۔

بجٹ نہیں چاہیے شہباز! بیویات میں کہہ رہی ہوں۔ اس کو توجہ سے سنو۔ تم اگلی جمعرات کی شام کو

میرے کمرے میں موجود ہو گے۔ اگر اس کے لیے تمہیں نوکری سے ریزائن بھی کرنا پڑے تو کر آنا یہ گھر تمہاری

چھ چڑا کی نوکری پر نہیں چل رہا۔ یہ محض تمہارا شوق تھا جو دو تین سالوں میں یقیناً پورا ہو چکا ہے۔ آنا تمہیں ہر

حال میں ہے۔ تم میرے گھر آ جاؤ۔ وہ فیصلہ کن انداز میں بولیں۔

”ام جان! ابھی میں اسکا۔ آپ مجھے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔“ وہ جھنجھلا کر بولے۔

”تمہیں ابھی ہی آنا ہے جمعرات کو ڈنر تم ہمارے ساتھ کرو گے۔ میں کھانا تمہاری پسند کا بناؤں گی۔ تمہارا

ویسے کا ڈریس اظہر تمہارے ٹیلر کو آرڈر کر آئے گا۔ تم کلر بناؤ صرف۔“

”ام جان پلیز سن لیں آپ۔“ وہ ایک دم سے غصے میں آکر بولے۔ ”میں نہیں آؤں گا۔ کبھی بھی نہیں اس

ذلت کو اپنے گلے کا بار بنانے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔ آپ کو اپنے بیٹے کی خوشی اور عزت سے زیادہ اپنے بھائی کے

گھر کا گند غمٹنے کی فکر ہے۔ تو معاف کیجئے یہ گند صاف کرنے میں میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ تمہیں کی تو

کاغذی کارروائی ہی لگھ بیچوں گا۔“ وہ سارے لحاظ بالائے طلاق رکھ کر بولے۔

”سٹ آپ کیپٹن شہباز اول پوشٹ آپ۔“ غصے کی شدت سے ان آواز جیسے پھٹنے کو تھی۔ جمعرات کی شام کو

تم گھر نہ آئے تو جمعہ کی صبح مری ہوئی ماں کا چہرہ دیکھنے بھی مت آنا اور میرے دونوں بیٹے اتنے سعادت مند ضرور ہیں

کہ میری وصیت کی لاج رکھیں گے اور تمہیں میرے جنازے کو کندھا تو کیا میری صورت بھی دیکھنے نہیں دیں

گے۔ خدا حافظ۔“ غصے سے ان کا جسم کانٹ رہا تھا۔

”پانی۔ اظہر! مجھے پانی دو۔“ وہ تیز تیز دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ اظہر نے تیزی سے سائڈ ٹیبل پر پڑا پانی کا

ڈھکا ہوا گلاس انہیں تھمایا۔ انہوں نے دو بڑے گھونٹ لے کر گلاس واپس تھمایا۔

”ڈارک بلو کلر کا ٹوپیس آج کل کے فیشن کے مطابق ٹھیک رہے گا۔ تم صبح ہی شہباز کے ٹیلر کو آرڈر بیک کرا

آنا اور عالیہ تمہیں جو ٹیبلٹس نے شاپنگ کے لیے دی تھی۔ کل اس سے جا کر ایک خوبصورت پرائیڈل ڈریس اور

تقریباً ”گیارہ مزید ریڈی میڈ خوبصورت دلہنوں والے لباس خرید لیتا۔ دو ایک دن میں کپڑوں کا کام مکمل کرو۔ اور

چیور کو جو میں نے تین سیٹیوں کا آرڈر دیا ہوا ہے۔ اسے جا کر یاد دلا دینا شاید میں خود بھی اس کی طرف چکر

لگاؤں۔ جو تے اور میک اپ وغیرہ کا سامان باقی کے دو تین دنوں میں ہو جائے گا۔ جمعرات تک سب تیاری مکمل

ہو جائے۔“

ہونی چاہیے۔ چند لمحے پہلے کی فرسٹریشن ان کے چہرے سے غائب ہو چکی تھی۔
 ”اور ہاں ایاز اتم صبح چلی فرصت میں باری کے پرپس چلے جانا ویسے کے کارڈ بہت خوبصورت ہونے چاہئیں
 اور ہالی ڈسے ان میں ویسے کے فنکشن کی بنگ کل ہی کروا لو تو اچھا ہے۔ باقی اور جس بات کی کمی بیشی ہوں وہ پھر
 دیکھ لیں گے، سرورست تو یہ اہم تیاریاں مکمل ہونی چاہئیں، منگل کی شام کو نہت کو مایوں ہٹھانا ہے اور بدھ کو
 ہندی کا چھوٹا موٹا فنکشن گھری میں ارج کروالینا۔ کھانا وغیرہ وہ مل سے آجائے گا۔ انظر! میری الماری کی درواز
 میں میری چیک بک پڑی ہے۔ میں نے اس میں دو چیک سائن کر دیے ہیں، ایک پچاس ہزار کا اور دو ہر شاید ستر
 ہزار کا ہے۔ باقی فنکشنی ضرورت ہوگی مجھے جتانے۔ شادی میں کوئی کمی نہیں ہونا چاہیے اب تم لوگ جاؤ میں اب آرام
 کروں گی۔“

وہ چاروں انہیں ایسے دیکھ رہے تھے جیسے ان کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔
 ”اور ہاں ایاز! شہباز کا کمرہ کل ہی ڈیکوریشن کو دکھانا، میرا خیال ہے اس کے کمرے کو پینٹ کی ضرورت تھی
 ہوگی باقی جو پھر وہ کہے، ہر لحاظ سے بہت منفرد ہونا چاہیے، تمہیں معلوم ہے ناشہباز کو انفراسٹ سے لٹنا گا وہ ہے
 اب جاؤ تم لوگ۔ شب بخیر۔“
 انہوں نے تکیے پر سر رکھ دیا وہ چاروں ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے باہر نکلنے لگے۔
 ”لائٹ آف کر جانا۔“ وہ آٹھیس بند کیے بولیں۔
 معاذ آسٹلی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔

ابھی اس کی تقدیر کا فیصلہ ہونا باقی تھا۔ وہ پھر ایک بار فیصلے کی تکلیفی سے بندھ گیا تھا وہ نہت کی حالت قطعاً بھلا
 چکا تھا۔ اب صرف اپنے بارے میں ہونے والے آخری فیصلے کا انتظار سا لگ گیا تھا۔

”صوفی صاحب! صوفی صاحب! وہ دیکھیں، جی وہ چھوٹے شاہی کے ہیں۔“
 وہ چھوٹے ہوئے سانسوں کو قابو میں لاتے ہوئے بولا تو صوفی صاحب کے علمایہ باندھتے ہاتھ وہیں کے وہیں تھم
 گئے۔ باہر بڑا لڑپر سامان لاوا جا چکا تھا۔ ساتھ میں ایک پک اپ انہوں نے کرائی تھی جس میں راجعلی بی اور تینوں
 بچیاں بس بیٹھنے ہی والی تھیں۔
 گاؤں چھوڑنا ان کے لیے بہت تکلیف وہ تھا۔ انہوں نے اس گاؤں میں آگے کھولی تھی اپنے والدین کی وہ
 اکلوتی اولاد تھے۔ اس ناتے سے ان کی تمام تر محبتوں کی دولت کے اکلوتے وارث بھی۔ ان کے والد بھی اسی مسجد
 اسی مدرسے کا نظم و نسق سنبھالتے رہے تھے۔

صوفی صاحب نے اپنے والد کی تمام امیدوں کو پورا کیا تھا۔ قرآن حفظ کرنے کے علاوہ حدیث اور فقہ کی خاطر
 خواہ تعلیم بھی انہوں نے حاصل کی تھی پھر والد صاحب کی زندگی ہی میں مدرسہ سنبھال لیا تھا۔ انہوں نے اس مسجد
 اور مدرسے کو پختہ کرا کے ایک نئی شان بخشی تھی جب بھی مدرسے کے لیے مسجد کے لیے کوئی بھی نئی تعمیر ہوتی وہ
 سمجھتے ان کے قدم اپنی سلطنت میں اور مستحکم ہو گئے ہیں۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ تو روز اول سے ہواؤں میں بیتر
 ہمانے کی کوشش کر رہے تھے اور تین پرواز کا حکم بھی مل گیا تھا بلکہ ویدری کا۔

وہ بار بار اپنے دل کو تسلی دیتے۔
 ”بس تھوڑے دنوں کی بات ہے فقط چند ماہ کی بڑے شاہی کے آتے ہی ہم واپس آجائیں گے اس میں اتنا تم
 زور ہونے کی کیا ضرورت ہے۔“ اور ہر بار ان کا دل اس تسلی کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا۔
 جلیل نے اس آفت کے آنے کی اطلاع دی جس سے سچا کر وہ ادھر سے جا رہے تھے۔
 ”السلام علیکم صوفی صاحب! ہمیں اسی وقت سید سلطان بخت حجرے کے نیچے دروازے سے سر ہٹھا کر اندر
 داخل ہوئے۔ صوفی صاحب نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں تر کرنا چاہا۔“

”و علیکم السلام شاہی! مجھے حکم کرتے ہیں خدمت میں حاضر ہو جاؤ۔“ وہ سلطان بخت سے مصافحہ کرتے
 ہوئے عاجزی سے بولے۔ ان کے ہاتھوں کی خفیف لرزش سلطان بخت سے چھپی نہ رہ سکی۔
 ”نہیں صوفی! اجاڑ تو ہمیں ہونا چاہیے تھا۔ آپ نے معرکہ ہی اتنا بڑا سر کر لیا ہے۔“ وہ کھڑے کھڑے طنزیہ
 لہجے میں مخاطب ہوئے۔

”مہم نے کیا کیا ہے؟“ وہ کھیانے لہجے میں بولے۔ ”آپ بیٹھیں تو شاہی! کھڑے کیوں ہیں ارے
 جلیل! شاہی کے لیے کچھ۔“
 ”کچھ تو اسح و خاطر کی ضرورت نہیں ہے صوفی صاحب! سلطان بخت نے ہاتھ اٹھا کر ان کو وہیں روک دیا۔
 ”ان سب کو ادھر سے چلنا کرو مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“

صوفی صاحب کا دل الٹی روحم سے دھڑکنے لگا۔ انہوں نے جلیل اور اس کے ساتھ کھڑے دو لڑکوں کو باہر
 جانے کا اشارہ کیا۔ سلطان بخت کے ساتھ آئے دو بندے باہر ہی کھڑے تھے۔
 ”یہ اس طرح اچانک یوریا بستر باندھنے کا طوفانی خیال آپ کے مبارک ذہن میں کیوں کر پیدا ہوا؟“ صوفی
 صاحب ابھی خود کو سنبھال ہی رہے تھے کہ انہوں نے پوچھا۔
 ”مہم میں نے تو نہیں شادی کی۔“ صوفی صاحب ہٹکا کر بولے۔
 ”آپ بیٹھیں تو میں بتاتا ہوں۔“

”اتنا قاتل وقت میرے پاس نہیں ہے میں تمہارے ساتھ بیٹھ کر تمہیں ہاتھوں۔ بیٹھے ہٹھائے اس ہجرت کا سبب
 مجھے بھی معلوم ہے اور تمہیں بھی۔ اس ربات کرنے کا کچھ فائدہ نہیں میں ادھر کچھ اور کہنے آیا ہوں۔“ آخری
 جملے پر سلطان بخت کا درشت لہجہ کچھ حرم پر لگا تھا۔
 ”عظیم شاہی! تمہیں آپ کے غلام ہیں۔“ صوفی صاحب نے سینے پر ہاتھ باندھ کر نرم آنکھوں کو جھپکتے ہوئے
 کچھ لے جی سے کہا۔

”پہلی بات تو یہ کہ آپ ادھر سے نہیں جاؤ گے۔“ ان کا انداز صاف حکمیہ تھا۔
 ”جی۔۔۔“ صوفی صاحب کا کھلامنہ ان کی اندرونی کیفیت کی غمازی کر رہا تھا۔
 ”کہاں تیار ہو رہے تمہارا؟“ وہ آنکھیں سکڑ کر پیچھے چٹوٹن سے بولے۔
 ”جی وہ۔۔۔“ صوفی صاحب نے ٹھوک نکلا۔ ”لاہور میں۔“ ایک دانستہ جھوٹ جو ان کی چلتی سانسوں کو پھانسی کی
 سولی پر بھی چڑھا سکتا تھا۔
 ”کس سلطنت میں؟“

”مہم۔“ صوفی شاہی۔۔۔ ”ان کے ذہن میں یہی نام آسکا۔“
 ”تمہیں اگر جانا ہے تو ایک دو دن لگاؤ۔ میں دو چار دنوں میں دوبارہ ادھر جانے کا انتظام کرتا ہوں۔ سارے
 گھر کو اٹھا کر لے جانے کی ضرورت نہیں۔“ شاہی کا واضح اشارہ اتنا ناقابل فہم نہیں تھا کہ صوفی صاحب کو بات
 سمجھ میں نہ آتی۔
 ”اور دوسری بات۔“ صوفی صاحب نے جواب دینے کے لیے منہ کھولنا چاہا۔ سلطان بخت نے ہاتھ اٹھا کر
 انہیں روک دیا۔

”اسے میری درخواست سمجھیں، حکم یا خواہش جو میں کہنے جا رہا ہوں۔“ سلطان بخت کی اگلی بات نے صوفی
 صاحب کے رہے سے حوصلے بھی منہدم کر دیے وہ نہ حال بھارتوں سے انہیں نکلنے لگے۔
 ”میں آپ کی بڑی صاحبزادی! یا نام ہے اس کا۔“ وہ ایک پل کو شان بے نیازی دکھانے کو رکے۔ ”آمن ہے
 نا۔ اس سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ کیونکہ اسلام کی اس واضح شق کو آپ
 کے سوا اور کون اچھی طرح جان سکتا ہے کہ اسلام میں چار شادیاں جائز ہیں اس میں کچھ بھی قیاحت نہیں۔“

صوفی صاحب کی کشادہ پیشانی پر پسینہ تہوار موتیوں کی طرح چمکتا لگا۔ ان کے دل میں بھروسے پر نے لگے۔
 ”شاہ شادابی! بچو، نامہ بڑی بات، تحمل میں بھی ٹاٹ کا۔“

”بس بس، یہاں اور وہی کلاس لینے نہیں آیا جو کہانت اسی کو کافی جانو بات دہرانے کی یا وضاحتیں پیش کرنے کی مجھے عادت نہیں۔ میں کیا کر رہا ہوں اس کا آمد دار میں ہوں اور جواب وہ بھی میں۔ آپ کو اس سلسلے میں ہر اسماں یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں یہ نکاح اسی جفتے کرنا چاہتا ہوں اور اب مزید کوئی دلیل نہیں سنوں گا۔“

سلطان بخت نے حاکمانہ انداز میں اپنی بات ختم کی۔

”بڑے شاہی آپس کے تو۔“ صوفی صاحب نے گھٹکیا کر آخری ہتکے کا سہارا لیا چاہا۔
 ”ان کو مطمئن کرنا میرا کام ہے، آپ کو اس سلسلے میں اپنی پوری عقل کے گھوڑے دوڑانے کی ضرورت نہیں۔“ سلطان بخت کا لہجہ انتہائی تحقیر آمیز تھا۔ ”کیا یہ اعزاز تمہارے لیے کم ہے کہ ہم تمہارے اس بیٹی چست والے ٹاٹ کے حجرے میں آئے ہیں اور تمہیں اتنا بڑا اعزاز بخش رہے ہیں۔ اپنی قربت داری میں شریک کر رہے ہیں، تمہیں تو اس خوشی میں ہی مرنا چاہیے۔“ سلطان بخت نے مستحزافہ انداز میں صوفی صاحب کے پریشان چہرے کو دیکھ کر کہا۔

”خوب خوشی تو بہت ہے شاہی، کیوں نہیں۔ میں اس قابل کہاں۔ یہ تو میری قسمت ہے جو آپ میرے غریب خانے میں مجھے اتنا بڑا انعام۔“

”مجھے سیاسی نامہ نہیں چاہیے۔ جو کہا ہے گھر میں جا کر اس کی خبر کرو اور معذرت کی شام چھ بجے میں گاؤں کے چند معززین کے ساتھ آؤں گا۔ رات کے کالے اندھیروں میں یہ کام نہیں کروں گا۔ دن کے اجالوں میں آؤں گا۔ مجھے نہ کسی کا ڈر ہے نہ میں کسی کے آگے جواب دہ ہوں چاہو تو اسی سارے گاؤں میں چر جا کر آؤ۔ آج سے تم اور تمہارا گھرانہ ہمارے خاص سادیہ عاطفت میں ہو۔ کوئی تمہاری طرف آنکھ نہ پھری کہ تمہیں دیکھ سلاگ پھلے ہوں میں۔ اللہ حافظ۔“ وہ جانے کے لیے مڑے۔

”وہ شادابی! ایک درخواست تھی۔“ صوفی صاحب نے ذرا آگے بڑھ کر کہا۔

”بولیں۔“ سلطان بخت نے اپنی مثال کو بلا سا بھارا۔

”وہ مجھے بہت خوش تھے کہ لاہور جا رہے ہیں، میرا کرلیں گے سب تیار تھے اگر آپ کی اجازت ہو تو صرف ایک دن کے لیے انہیں گھمانے لے جاؤں۔ برسوں شام کو واپس آجائیں گے، یہ سب خوشی ہے ورنہ ان کے دل مر جاتا ہے۔“ صوفی صاحب نے اٹک اٹک کر اپنی بات پوری کی۔ سلطان بخت نے ایک گہری نظر سے صوفی صاحب کو دیکھا۔

”آپ کب سے بچوں کی خوشی کا اس درجہ خیال رکھتے آئے ہیں۔ صوفی صاحب! انہوں نے نظریہ سنبھال لیا۔“

”نہیک ہے لے جاؤ مگر برسوں شام کو واپس ہونی چاہیے ورنہ تمہیں معلوم ہے میں لاہور تو گیا تو دنیا کے کسی گناہ گوشے میں بھی چلے جاؤ گے تو میں تمہیں تمہاری کھال سمیت نکال لاؤں گا۔ کوئی ہو شکاری مت دکھانا اور یہ جو کاغذ کباب کا لڑا لڑا کھرا کیا ہے باہر اس کو واپس گھر لے آؤ۔ خدا حافظ۔“ وہ صوفی صاحب کے مصافحہ کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر کے حجرے سے نکل گئے۔

”شاہی! یہ زیادتی ہے۔ آپ نے مجھ سے اچھا نکاح کیا ہے۔ آپ تو ملنے سے بھی گئے۔ پہلے تو آپ کو میرے بن ایک پل بیچیں نہیں آتا تھا۔ اب کیا ہو گیا ہے شادابی! میں تنگ آئی ہوں ان دوریوں سے کیسا نہ ہو کہ وقت بدل جائے پھر آپ قریب آنا چاہیں اور میں قاصطے بھساتی چلی جاؤں۔“ عین تارا کے تیور ہی آج بدلے ہوئے تھے۔ وہ بہت غصے میں لگ رہی تھی اور غصے میں تو اسے ہونا بھی چاہیے تھا۔ ایک تو سلطان بخت اسے ذرا بھی ٹانم

نہیں دے پار رہے تھے۔ دوسرے اس رات کی ذلت جب سلطان شادابی نے اچانک ان کی کتنے دنوں کی پیاسی جدائی پر دھاوا بول دیا تھا ان سے تھا تو وہ اسی رات سے تھی۔

”میں اس رات کا واقعہ کبھی نہیں بھول سکتی۔ وہ گھر میرا ہونا ”سید ہاؤس“ پھر دیکھتی کون ایسے کو اسی رات کو سید روم کے دروازے کو ٹھوکریں مار کر مجھے نکال پھاڑ کر تارک میں لانا کو سب بتا دیتی تو وہ طوفان اتحاد تھی۔ اس قدر پیار سے تمہیں مجھ سے اور ایک آپ ہیں کہ پلٹ کر۔“

اس کی سسکیوں میں تیزی آئی۔ سلطان بخت کے دل پر چھریاں سی چلنے لگیں۔
 ”پلیز نہیں تارا پلیز کول ڈاؤن۔ تم تو بہت کچھ وار ہو اسی لیے تو میں نے تم سے کبھی کچھ غلط کرنے کا سوچا ہی نہیں، سیدھا اور صاف رشتہ اپنایا بس کچھ مجبوریوں تھیں۔ اب وہ بھی نہیں رہیں۔ میں تمہارا ہوں، سہرا پنا تمہارا۔ میں بھی ”میرا مال و دولت“ بھی اور میری سب جاگیر بھی۔ میں کل آؤں گا، تمہارے پاس پھر پورے دو دن رہوں گا۔ اور۔“

”میں نے تمہیں اس کی کوشش کرو، کل آؤں گا تو پھر بیٹھ کر دیکھیں گے سب کچھ۔ دیکھو نا، پورا ہی تو پایا جان گئے ہیں سلطان سے رابطہ بھی تو رکھنا ہوتا ہے۔ اپنے آنے والے بہترین کل کے لیے مجھے آج تو کچھ کام کرنا ہی ہو گا نا۔ تم تو مجھ دار ہو نا اگر میں یہی باتیں مانا سے کروں تو وہ ایک پل مجھے تمہارے پاس نہ بیٹھنے دیں فوراً ”جانگیر“ کے کاموں کی خبر گیری کرتے آئیں۔ یہی تو موقع ہے سب کچھ اپنے ہاتھوں میں لینے کا۔“ سلطان بخت نے بہت مدہم لہجے میں عین تارا کو ہسٹایا اور وہ بھی رو دنا بھول گئی۔

”مگر مجھے اس کا کیا فائدہ ہے جو پہلے میرے نام کیا ہے وہ کون سا مجھے سونے کے انڈے دے رہا ہے۔ آج رات کو آپ کے ابا حضور اگر مجھے سب سے بے دخل کر دیتے ہیں۔“ وہ منہ بسور کر بولی۔

”اور کبھی کبھی یہ بات بہت دل سے اب شتم کرو، اس قصے کو۔“ سلطان بخت نے جھنجھلا کر کہا۔ ”آگے دیکھو کتنی زبردستی، کتنی خوبصورت زندگی، تمہارا میرا انتقال کر رہی ہے۔ اب ہم ہوں گے تم ہوگی اور خوبصورت تمہاریاں۔“

”کون ہے یہ چڑیل، کس اپنی لٹکی کو پھراؤ، خرافات سنار ہے ہیں آپ۔“ صالحہ نے اچانک پیچھے سے آکر موبائل ان کے ہاتھ سے چھیننا چاہا۔ وہ تو ان کی گرفت بہت مضبوط تھی جو موبائل ان کے ہاتھ سے چھوت کر ان کے پاس ہی مسز بڑھ کر گیا۔ صالحہ شہلا پارنگا ہوں سے انہیں گھور رہی تھی۔ اس کے سینے کا زبردست اس کے اندر بولی فشار کا پتا دے رہا تھا۔ اس کا پھر غصے سے آگ کی طرح دھک رہا تھا اور ناک کے ٹھنڈے پھر پھڑکا رہے تھے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سلطان بخت کو اڑھیز کر رکھ دے۔

”لو کہ پھر بات کریں گے یا نہ۔“ سلطان بخت نے موبائل اٹھا کر عین تارا سے کہا ”دوسری طرف اس کے ”کون تھا کون تھا؟“ کی پکار کو ٹیکس نظر انداز کر کے موبائل آف کر دیا۔

”تم شاید اپنی اوقات بھول رہی ہو کہ میں نے تمہیں کس اوقات میں رکھا ہوا ہے۔“ موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے انہوں نے سرد مگر نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

”میں آپ کو اپنی اوقات ہی تو یاد دلا رہی ہوں، آپ شاید بھول رہے ہیں کہ میری اوقات کیا ہے۔ مسٹر سلطان بخت! جانتے ہیں میں کون ہوں؟“ وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کے مقابل پوری طرح سے تین کر کھڑی تھی۔

اسی تھوڑی دیر میں حسین شاہ کی طرف جانا تھا ”آج ان کی دعوت تھی اور اسی لیے تو وہ ڈرینگ روم میں تیار ہو رہی تھی۔ وہ ہی بھول گئے تھے کہ صالحہ اندر سے اور انجانے میں عین تارا کا نمبر پانچ۔“

”میں اس وقت کوئی جھگڑا نہیں چاہتا اور نہ تم بیسی جاہل سے اٹھنا چاہتا ہوں، اگر تم تیار ہو تو پلیز تمہارے طرف خان بھائی کے گھر جس کی شہ پر یوں آکر کھڑی ہو۔“ وہ اس سے کترا کر گزرنے اور ڈرینگ ٹیبل کے سامنے

جا کر برش سے باہل سنوارنے لگے۔

”سلطان بخت! تم نے میرے بھائی کی شہ کو ابھی دیکھا ہی نہیں۔ تم مجھ سے الجھتا نہیں چاہتے جھگڑنا نہیں چاہتے مگر میں تم سے الجھتا چاہتی ہوں۔ جھگڑا کل پر سوں اس جوہلی میں ہونا ہے اسے آج ہی ہونے دو ابھی اور اسی وقت۔ پولو کس سے وہ بازار میں جملے بول رہے تھے۔“

”تزاں۔۔۔“ سلطان بخت نے برش ٹھیل پر پٹا اور سڑک ایک زوردار طمانچہ صالحہ کے منہ پر بڑویا۔ ہاتھ اس قدر زوردار تھا کہ صالحہ بری طرح سے گول گھومتی ہوئی بیڈ کے کنارے سے جا ٹکرائی۔

”شٹ اپ گھٹیا عورت! ہائیز پور لینگویں! اینڈ گیسٹ لاسٹ۔“ وہ قریب آکر اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر خواتین لہجے میں بولے۔ ”نوح ہو جاؤ یہاں سے اور جس کو چاہو بلا لاؤ۔ اپنے بھائی کو۔ اپنے باپ کو قبر سے۔“ انہوں نے پاؤں کی ایک زوردار ٹھوکرا سے ماری اور پلٹ کر جانے لگے کہ صالحہ نے ایک دم سے اٹھ کر انہیں پیچھے سے ایک زوردار دھکا دیا۔

”باپ اور بھائی کی بات بعد میں مجھ سے کرنا۔ پہلے مجھے تو دیکھ لو۔“ وہ الجھے ہوئے باہل سرخ تھپڑوں پر اور آنسو بھری آنکھیں جن میں نفرت ہی نفرت تھی، آئے ان کے سامنے کھڑی تھی اور یہ دھکا سلطان بخت کی زندگی کا پہلا دھکا تھا اور نہ آج تک تو انہیں کوئی نرم انگلی سے نہیں چھوس سکا تھا۔

اس اچانک زوردار دھکے نے ایک بل کو انہیں گنگ کر دیا۔ وہ دیوار سے ٹکرائے سے بمشکل بچے تھے اور اس کی آمد انہیں کم از کم صالحہ سے ہرگز نہ تھی۔

وہ تو سمجھے تھے کہ پہلی رات میں ٹھکرائے جانے کے بعد وہ ماری زندگی ان کی جوہلی کے کسی کونے میں روتے دھوئے گزار دے گی مگر آج جب وہ ان کے مقابل آئی تو انہوں نے اس کا علاج مار پیٹ اور نفرت بھری ٹھوکروں میں ڈھونڈا، مگر وہ تو ان سے بھی چار قدم آگے بڑھ گئی۔ گاؤں کی عورت پھر سیدہ راوی اور شہر سے راستہ

یہ تو ان کی زندگی کا پہلا ہی واقعہ تھا، وہ بھی آنکھوں دیکھا۔ مگر اگلے ہی لمحے ان کی حیرت پر شدید ترین غصے اور وحشت کا حملہ ہوا۔ وہ کسی زخمی شیر کی طرح اس پر چبھنے لگے تھے کہ شاید اسے مار کر ختم ہی کر ڈالنے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

صالحہ جو اپنی جان بچانے کے خیال سے بھاگنے کا سوچ ہی رہی تھی دستک پر وہ بھی ٹھکرتی رہی۔ سلطان بخت نے زور سے اپنے سر کو جھٹکا اور نفرت سے صالحہ کی طرف دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ چند لمحوں بعد وہ صاف پر پلچر دستک ہوئی۔

”ہنس جاؤ۔“ وہ بارعب تو اڑ میں بولے صالحہ جلدی سے ڈرنگ ٹھیل کے آگے کھڑی ہو کر اپنے چہرے کو رگڑنے لگی۔ اسی وقت شہر نہ کمرے میں داخل ہوئی صالحہ برش اٹھا کر بال سلجھانے لگی۔

”او شہر نہ بیٹا! خیریت۔۔۔؟“ سلطان بخت نے شیریں لہجے میں کہا ”لالہ! جوہلی سے سیدہ آپا کافون آیا ہے کہ آپ لوگ ابھی نکلنا نہیں۔“

”آں ہاں۔۔۔“ انہوں نے دزدیدہ نگاہوں سے انجان بنی زلفیں سنواری صالحہ کو دیکھا۔ ”بس نکلنے ہی والے ہیں تم نہیں جا رہے۔“ وہ منہ سورا کر بولی۔

”کیوں بیٹا! تم کیوں نہیں جا رہے؟“ شہر نہ نے کہا تمہارا پوچھنے گی کہ میری سہیلی خالہ کو کیوں نہیں لائے۔“ وہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولے صالحہ نے برش زور سے ٹھیل پر پٹا اور سڑک پر بیٹھ کر کلہنڈر سے چہوصاف کرنے لگی۔

”لالہ! آپ کو میرا کچھ خیال نہیں ہے۔“ وہ روٹھے ہوئے لہجے میں آنکھوں میں آنسو لاری بولی۔

”کیسی بات کی تم نے مجھے تمہارا خیال نہیں تو اور کس کا ہے بھلا۔ اس پوری دنیا میں ایک تم ہی تو سب سے زیادہ میرے دھیان میں رہتی ہو۔“ وہ بہن پر پوری جان سے ذرا نظر آ رہے تھے۔

”دھیان کی دنیا کے کسی کونے کھد رہے ہیں۔“ صالحہ زور سے ہنس کر بولی۔ ”جی بھابھی بیگم! آپ نے کچھ کہا۔“ شہر نہ شاید کسی اور ہی تھی وہ صالحہ کے جملے کو سمجھی ہی نہیں۔

”ہو لو شہر نہ! کیا کہنا ہے تمہیں۔ سلطان بخت اس کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بولے۔ ”لالہ! مجھے ایڈیشن لینا ہے فرسٹ ایئر میں۔“ اگلے دن نکلے جا رہے ہیں اور آپ کو کچھ خیال ہی نہیں ہے۔ اتنے سارے دن شادی میں لگ گئے ہیں اس لیے بھولی رہی مگر آج میری دوست کافون کیا تھا کہ کل ایڈیشن فارم جمع کروانے کی آخری ڈیڈ تھی۔ اب میرا کیا ہو گا۔“ وہ پچھلے آنکھوں میں آنسو لانے لگی۔

”پہلی اتنی سی بات کے لیے روتی ہو! میگزین سے ایک منٹ پہلے تک میری بہن کے لیے ایڈیشن کٹا نام ہے۔ تمہیں۔ تم اس کی فکر کیا کرتی ہو۔“ انہوں نے ہولے سے اس کے سر پر چپٹا لگائی۔

”کیا مطلب؟“ شہر نہ ذرا نہ سمجھی۔ ”اپنا کام آج ہی مجھے اپنے ڈاکو نہیں دے دو مجھے کل شہر جانا ہے۔ میں ایڈیشن فارم دل کروا کے جمع کروا دوں گا۔“

”سیدہ آپا کہتی ہیں تمہیں کسے نہیں پڑھنا، بس اب جوہلی میں بیٹھو اور دیواروں کو ٹکرو۔“ آنسو اپنی اس تصویر کشی پر جھلک پڑے۔

”آپا سے میں خود بات کروں گا۔“ لہجے میں شوق ہے تو کوئی اس کی راہ میں نہیں آسکتا۔“ وہ پیار سے بولی۔

”میں پھر تو ٹھیک ہے لالہ۔“ وہ خوشی سے کھڑی ہو گئی۔ ”اب سیدہ آپا سے بات کر لوں، وہ تو کہہ رہی تھیں حتماً بھی بس اولیوں کرے گی آگے اسے بھی نہیں پڑھنا۔“

”بھئی یہ ان کے کھر کا معاملہ ہے جنا کے فادر چاہیں گے تو اسے پڑھائیں گے، نہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔“ وہ بھی وہ ذرا تنگ ذہینت کے لوگ ہیں۔ تعلیم کی اہمیت کو کیا جانتیں۔ ”سلطان بخت نے زلفیں آن لگائی صالحہ کو سنایا۔

”تنگ ذہن شاید ہوں، بد کروا نہیں۔“ صالحہ شہر نہ کا خیال کیے بغیر رخ کر بولی تو سلطان بخت کو غصے کے ساتھ شہر نہ کی بھی ہوئی۔

”اس عورت نے اپنی زبان کھولنے کا فیصلہ کر لیا ہے، بہتر ہے سلطان بخت اس کو کبھی چوراہے پر منہ نہ لگانا۔ ان کے حال نے تنبیہ کی۔“

”اوکے شہر نہ! اب تم کمرے میں جا کر ریڈی ہو، تم ہمارے ساتھ جا رہی ہو۔ چلو شاپاٹ ہری آپ۔“ سلطان بخت نے اسے کھڑا کر کے کہا تو وہ ”جی اچھا لالہ“ کہہ کر کمرے سے چلی گئی۔

”سلطان بخت! بہت پیار ہے نا تمہیں شہر نہ سے تو اتنا یاد رکھنا آتا بلکہ اس سے کہیں زیادہ پیار میرے لالہ کو مجھ سے ہے اور میں حسین شہادی اکلوتی بہن ہوں۔ شہر نہ تمہاری اکلوتی بہن نہیں سیدہ آپا بھی ہیں۔ یاد رکھنا۔“ صالحہ تیز لہجے میں کہتی ہوئی ڈرنگ روم میں گھس گئی۔

”گلتا ہے اس رات کی صبح نہیں ہوگی۔ کتنی لمبی رات ہے اور کاش اس کی صبح ہو بھی نہیں۔“ صوفی صاحب نے ایک گہرا سانس لے کر ساتھ والے بستر کی طرف دیکھا۔ راجعلی بی کرٹ کے بل بیٹھی ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

بندھا بندھایا سارا سامان نرالے اتروا تے اور کمروں میں رکھواتے، نہیں اچھی خاصی چھکن ہو گئی تھی۔ ”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں؟“ صوفی صاحب آگے آ کر اٹھ بیٹھے۔ وہ خاموش رہیں، کیونکہ

انہیں معلوم تھا کہ ان کی "سمجھ" صوفی صاحب سے زیادہ تو بزرگ نہیں ہو سکتی۔

"چتا نہیں یہ سلطان بخت کے دلخ میں کون سا شیطان کیزا کلبلا رہا ہے۔ مجھے یاد ہے۔ بچپن میں یہ مجھ سے قرآن شریف پڑھتا تھا تو میں اسے بہت نیک بامیز اور کجھدار سید زاہد سمجھتا تھا۔ جس نے جوان ہو کر اپنے خاندان کی ناموس کو یقیناً اپنی ہر نفسانی خواہش سے برتر جانا ہے۔ مگر شام کو وہ مجھ سے جس بد تمیزی اور جسالت سے بات کر رہا تھا مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ شاید دولت کی فروالی اسی طرح نیک بچوں سے کائنات دار بھول اگاتی ہے۔" وہ ایک آدھ بھر کر بولے۔

کل شام زیادہ دور تو نہیں۔ "رابعدلی بی ہولے سے بولیں۔" اور جھرت صرف تین دن بعد صوفی صاحب کیا سوچا ہے۔

"میرا تو داغ لگتا ہے خالی ہو گیا ہے یہ ہماری قسمت سے اگر سمجھا جائے کہ سلطان بخت نے اپنے گندے گروار کے چھینے ہم پر نہیں مارے اور ایک شرعی راستہ اختیار کیا ہے مگر اس راستے میں کتنے تکلیف دہ موڑ ہیں یہ میں جانتا ہوں۔ اس دوران اگر بڑے شاہ جی آگئے وہ تو میری کھال ہی اتروا دیں گے کہ میں نے ان کی برابری کرنے کی کوشش کی۔ اپنے بیٹے کو انہوں نے کیا کہنا ہے۔ اور آمنت آمنت کے ساتھ جو سلوک وہ کریں گے۔ اس کی جتنی بھی انتہا سوچو۔ کم ہے۔" وہ جھرم جھری سی لے کر بولے۔

"اور بڑی مالکن کو بھول گئے آپ وہ تو جگ کرنے نہیں گئیں اور ہری ہیں ان کے قبر سے خدا بچائے انہیں اس احتقان خواہش کی بھنگ بھی پہنچ گئی تو صوفی صاحب وہ ہم غریبوں کی کٹھا کو اک لکوائے میں ایک بل کی وبر نہیں کریں گی اور اس معاملے میں تو اب بڑی حویلی والے بھی شامل ہیں۔ حسین شاہ کی خالمانہ فطرت کو کون نہیں جانتا۔ وہ تو ہم سب کو زندہ زمین میں گڑوا دے گا۔ وہ تو بڑی مالکن سے بھی سخت طبیعت کا ہے۔ اس وقت کون سے پھولے شاہ جی ہماری مدد کو آئیں گے۔" رابعدلی بی رو رہی ہیں۔

"یہی سوچ سوچ کر تو میں پاگل ہو رہا ہوں رابعہ! ہم کوئی ایک دو تین نہیں پورا کھینچے، ہاں آمنت کو لے کر ہم زمین کے اندر تو رو پوش ہونے سے رہے۔ اور اس کا مطلب ہے چھوٹے شاہ جی کا ساری عمر کا پیر اگر عمر بچی تو اس کی آنکھ میں تو ذرا بھی لحاظ نہیں وہ تو پوری طرح سے برائی پر آمادہ نظر آتا ہے۔ اگر اس کی خواہش کو رو کیا گیا تو وہ کچھ بھی بہت غلط بہت برا کر سکتا ہے۔ یا اللہ! رحم کریں اتفاقاً قہور نہیں کہ پھر شاہ جی کے اٹھے ہاتھ کو روک سکوں۔"

وہ گھبرا کر اٹھے اور چلے ہوئے کھڑکی کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ آسمان پر چاند ستارے ان کی ہوشیاری سے بے خبر اپنی ہی انجمن میں گن گن تھے۔ رات کے اس پہر آسمان کا جو بن عروج پر تھا۔ وہ ایک بل کو اپنی پریشانی بھول کر آسمان کی چھت دیکھنے لگے۔ گہری نیلی تاحہ نظر پہنچی جگمگاتے ستارے سے روشن آسمان کی چادر جیسے انہیں اپنی طرف دیکھتے گئی۔ آسمان کا یہ روپ ان کے لیے کب نہ آلا تھا وہ تو بہت کم سنی سے طویل راتوں کو نیلے سیاہ روشن چھیکے ٹیالے آسمان کو جانتے تھے۔ جب سبق یاد کرنے کے لیے انہیں رات رات بھر جاگنا پڑتا، سرد ٹھنڈے اور پینے والی راتوں میں اٹھ کر بیانی سے وضو کرنا پڑتا تو بھی ان کی نگاہ بے اختیار آسمان کی طرف اٹھ جانا کرتی تھی۔

"آپ نے بتا دیا آپ کا بتا دیا کہ صبر ہوا ہے۔" رابعدلی بی کی آواز نے ان کا اٹھنا ک توڑا۔
"ایک نکمسا نکمسا بھوت۔ شیخ پورہ نہیں اور کابنایا ہے بھلا شیخ پورہ کون سا لاہور سے میلوں میل کے فاصلے پر ہے۔" وہ جیسے اپنی ہی ہنسی اڑا کر بولے۔

"میں سوچ جاؤں ہدی مالکن کے پاس ان سے ذرا طریقے سے بات کر کے کسی حل کا پوچھوں۔" رابعدلی بی ہولے سے بولیں۔

"داغ تو اب ہے تمہارا۔" وہ غصے سے پلٹے۔ "یہ تو چند گھنٹے طے ہیں آزادی سے کچھ سوچنے کے وہ بھی چمن جائیں گے۔ حویلی میں کوئی بھی شخص ہماری اس سلسلے میں مدد نہیں کر سکتا اور رابعدلی بی! یہ بھی طے ہے کہ میں

اپنی آمنت کو اس درخت سے کی ہوس کی بھوک مٹانے کو پیش نہیں کروں گا۔ نکاح کر کے چار دن یا چار ہفتوں میں جب اس کا بٹی بھر جائے گا وہ اسے حویلی کے پتھوڑے بنائے آبائی قبرستان میں ڈال دے گا۔ یہ امیرزادوں کا دتہ ہے۔ وہ ہوتوں اور کپڑوں کی طرح خواہشیں بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اس سے بہتر ہے میں آمنت کو اپنے ہاتھوں سے زہرے دل مگر شمع کی آڑ میں اسے اس لیے ہونہ کھیل کا حصہ نہیں بننے دوں گا۔"

"شمع ان لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا ہی تو ہے انہی پر میں اس بد بخت کی شادی ہوتی ہے۔ بیس و ساتوں نے اس کی شادی کے دھوم دھڑکوں میں حصہ لیا ہے اور آج جو تھوڑے دن یہ ایک اور نکاح رچانے چلا ہے۔ بے شرم انسان اور جو کھلونے اس نے شہر میں رکھے ہوں گے وہ علیحدہ۔" ان کی سانس تازہ ہو رہی ہو چکی تھی۔

"اب ایک ہی رات ہے آریا پار میں ابھی آتا ہوں تمہاری زمین میں۔ تم سونا نہیں۔" وہ جیسے کوئی فیصلہ کر کے بولے اور جوتے پہن کر دروازے کی طرف جانے لگے۔

"اس وقت کہاں جا رہے ہیں کچھ تو بتا کر جائیں۔" رابعدلی بی گھبرا کر بولیں۔
"کچھ غلط نہیں کرنے جا رہا بس تھوڑی دیر میں آتا ہوں تم اٹھ کر اٹھ کر اٹھ کر اللہ سے دعا مانگو وہ ہمارے حق میں ضرور بہتری لکھی ہے گا۔" اللہ کے حوالے کر کے وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔

"آمنت! سو گئی ہو؟" زینب صاحبہ سے بولی کہ اگر آمنت سو بھی گئی ہو تو اس کی آواز سن کر ضرور اٹھ جائے۔
"نہیں۔" آمنت نے آہستگی سے جواب دیا۔

"یہ بابا صاحب کو کیا ہوا۔ ایک سارا انسان اتروا لیا اور ہمیں بستر بچھا کر سنے کا حکم دے دیا۔"
"مجھے کیا معلوم۔" وہی ہے اس صاحب زینب کو غصہ آنے لگا۔

"ایک دو تین گھنٹے ہی تک آئی ہوں۔ اللہ جانے کس کے پاس اپنی زبان رکھوا آئی ہو۔ تمہیں تکلیف کیا ہے آخر وہ اس پر اصرار ہی کیا ہے۔"
"کچھ بھی نہیں۔" آمنت کی آنکھیں تھملا گئیں۔

"یہ بابا صاحب! اس وقت کہاں گئے ہیں اور صبحی رات کو۔" اس کے تیز کانوں نے صوفی صاحب کو باہر جانے سنا۔
"بابا صاحب کی سرگرمیاں کچھ خراب رہی ہیں، ہو گئیں اب تو ڈانٹتے اور ڈپٹتے بھی کم ہیں بس کچھ نہ کچھ سوچتے رہتے ہیں اور اب کبھی رات کو خدا جانے کہاں گئے ہیں۔"

"چتا نہیں۔" آمنت نے بیزار سی سے کہا۔
"چتا نہیں تمہیں کسی بھی معاملے سے دلچسپی کیوں نہیں۔ تمہیں تو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ شام کو چھوٹے چاند کی آنت تھے بابا صاحب سے ملنے حجرے میں۔"

وہ اچانک بولی تو جیسے آمنت کو ہزاروں ٹکڑا کر ڈالے گا۔ وہ اچھل کر اٹھ بیٹھی اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر زینب کو دیکھنے لگی۔

"کیا کیا آتا تم نے۔" آمنت نے اپنی آواز کی کپکپاہٹ صاف سنی۔
"چھوٹے شاہ جی آئے تھے بابا صاحب سے ملنے۔ حویلی تک ہمارے جانے کی خبر پہنچی تھی اور ہم وہیں کے وہیں۔ اور تمہیں کیا ہوا ہے اس طرح حیرت زدگی کی طرح اچھل کر کیوں بیٹھی ہو۔"

"وہسہ کیا کہتے آئے تھے۔" آمنت اٹھ کر زینب کے پاس آئی۔ زینب حیران سی ہو کر سے دیکھنے لگی۔
"مجھے کیا معلوم کیا کہنے آئے تھے۔ دیے بھی انہوں نے کہنا سنا کیا تھا امیر آوی نے بھلا غریب مولوی سے کیا کہنا ہو گا۔ بابا صاحب کے جانے کا سن کر ملنے آئے ہوں گے۔ مجھے تو جو میری نے بتایا تھا میں نے کون سا خود نہیں دیکھا تھا۔ مگر تمہیں کیا ہوا ہے؟" آمنت اس کے ساتھ جڑی جا رہی تھی۔
"زینب! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ اس سے چٹ کر بیٹھ گئی۔

”اگرے اپنے دل کو قابو کرنا سیکھو۔ اس اندسٹری میں تو قہریشی سے بھی زیادہ ناقابل برواشت لوگوں کی قہریت برواشت کرنا پڑتی ہے۔“ زیور گل بولی۔

”نام ویس فاول۔“ وہ رک کر بولی۔ ”آپ نے مجھ سے پراس کر رکھا ہے کہ صرف قہریشی کی اسی فلم میں سنگٹ کرنی ہے۔ اس کے بعد کچھ نہیں۔ مجھے اس اندسٹری سے وحشت ہوئی ہے اور سب سے بڑھ کر شاہ جی۔“

”اس کو یہ شادی نامہ شاہ جی جیسے پرندے کبھی اس منڈیر پر بیٹھے ہیں تو کبھی اس پر ان کا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں ہوتا۔ ان کے بھروسے پر اپنا فیوچر تباہ نہ کرو۔ ہزار دفعہ طوطے کی طرح رٹا چلی ہوں پھر بھی نہیں جھکتیں۔“ زیور گل کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔

”نام پلیز ایک دم سے غصہ نہ ہو جایا کریں۔“ مینن نارالجا جت سے بولی۔ اسے زیور گل کے غصے سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ بچپن ہی سے زیور گل نے اس پر بڑی سختی رکھی تھی اور اسی بات نہ ماننے پر اسے رات رات بھر کے لیے کاٹھ کپڑے پھسول اور کپڑوں سے بھرے اسٹور میں بند کر دیا کرتی تھی۔ پھر مینن نارالجا چٹنا چٹانا روٹا دھونا معافی کچھ بھی زیور گل پر اثر نہیں کرتی تھی۔ اس خوف کا اثر مینن نارالجا کے ذہن پر ابھی تک تھا۔

”جلدی چلو بہت نام ہو گیا ہے۔“ زیور گل غصے سے کہہ کر پورے کی طرف بڑھی۔ جہاں قہریشی کا ڈرا بیوران کے انتظار میں کھڑا تھا۔ دونوں کو گاڑی کی طرف آتے دیکھ کر اس نے مستعدی سے پچھلے دونوں دروازے کھول دیے۔ دونوں بیٹھ گئیں تو ڈرا بیور نے دروازے بند کر کے فرنٹ ڈور کھولا اور ڈرا بیورنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ چونکدار نے فوراً گیٹ وا کر دیا۔

”آخر تم اس فراڈیے سے تمام برابری کے کاغذ پر کب لکھو آؤ گی۔ نکاح والی رات تو وہ مجھ سے ہاتھ کر گیا۔ جعلی ہے زیور سب کچھ تمہارے نام لکھ کر میری آنکھوں میں دھول بھونک گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس رات تم ”سید باؤس“ سے یوں دھول دے کہ۔“ مینن نارالجا جی جیسے ہی گیٹ سے باہر نکل کر سڑک پر دوڑنے لگی زیور گل دھیمی آواز میں پھر شروع ہو گئی۔

”کل آ رہے ہیں نا شاہ جی دو تین دن رہیں گے۔ میں بات کروں گی۔“

”میں خود بات کروں گی اس سے۔“ زیور گل پھر تپ کر بولی۔

”اب اس سے کوئی نہیں جوئی لے جائے اصل ٹھکانا تو وہی ہے نا تمہارا اب تو اس کا باپ بھی ادھر نہیں۔ جس کے سامنے امیر زادے کی کھٹکی بندھ جاتی ہے۔ تمہیں لے جائے جوئی باپ آئے تو کہہ دے کہ اس نے تم سے نکاح کر لیا ہے۔ آخر اکلوتا ہے منو اسکتا ہے کچھ بھی۔“ زیور گل نے اپنا پلان اس کے سامنے رکھا۔

”میں کبھی تو یہی چاہتی ہوں نام کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔ میں نے شاہ جی سے محبت کی ہے نام اور ان کے علاوہ یہ ڈال ڈال تیرتی کی طرح پھرتا مجھے پسند نہیں۔ مجھے تو صرف شاہ جی کا ساتھ اچھا لگتا ہے۔“ وہ بڑے جوش سے وہ نام آواز میں کہہ رہی تھی پھر بے پروائی سے اس کا اثر رنگ بھر رہا تھا۔

”یہ شاہ جی سے بھی تو پوچھو نا کہ اسے صرف تمہارا ساتھ ہی پسند ہے یا اس کے علاوہ بھی۔“

”نام پلیز! میں پہلے ہی بہت ڈر رہتی ہوں۔“ وہ جیسے درد سے کراہی۔ زیور گل اس دن کی اس کی دکھتی رنگ کو بار بار بار چھیڑے جا رہی تھی۔ وہ ذرا سا ہنسا کیا بیٹھی تھی۔

”مینن نارالجا! آخر کب تک تم یہ فریب کھاتی رہو گی۔ اسی فریب میں اگر تم نے اس سے نکاح کر لیا۔“

”نام اسی لیے تو لیا ہے کہ مجھے صرف اسی کا ہو کر کھانا ہے۔“ وہ ایک عزم سے بولی۔

”ہو نہ یہ تجر۔ تیری ماں نے بھی تو کیا تھا کیا ہاتھ آیا اس کے سوائے تکیوں بھری زندگی کے۔ یہ شریف لوگ اندر سے بڑے عیار ہوتے ہیں۔ مطلب پرست، چار دن کی عیاشی کی اور پھر تو کون کون اور میں کون؟“ زیور گل دکھ سے بولی۔

”کیا مطلب۔ تمہیں کیوں ڈر لگ رہا ہے؟“ زینب نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

”زینب چھوٹے شاہ جی بہت غلط آدمی ہیں یہ۔ سب میری وجہ سے تو ہوا ہے۔“ اتنے دنوں سے وہ سب کچھ اپنے اندر دبا کر بیٹھی رہی تھی اب اسے لگتا تھا وہ بولے کی نہیں تو مرجائے گی۔

”کیا مطلب؟ کیا ہوا ہے آمنہ! مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ تم سیدھی تو ہو کر بیٹھو۔“ وہ کچھ جھنجھلا کر بولی۔

”اس روز جوہلی میں مندی والے دن ہم دہن کا کرو دیکھتے گئے تھے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ آنسو اس کی آنکھوں میں جمع ہونے لگے۔

”ہاں مگر تم کی تھیں۔ مجھے تو وہ پاتنی شیا ٹکرائی تھی۔“

”میں شہرینہ کے ساتھ اوپر گئی تھی، کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر چھوٹے شاہ جی تھے ان کی آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں جیسے خون ہو۔ انہوں نے بہانے سے شہرینہ کو نیچے بھیج دیا اور پھر۔“ وہ رونے لگی۔

”پھر۔؟“ زینب کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

”انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے کمرے میں گھسیٹ کر لے جانے لگے۔ ان کی حالت یا گلوں کی سی ہو رہی تھی۔ جیسے مجھے کھا ہی جائیں گے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا مگر میں کوشش کے باوجود جھنجھکی اور ان کے ساتھ گھسنے لگی۔“ وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ زینب بہت مشکل سے باری تھی۔

”تم چلی گئیں اندر کمرے میں۔“ زینب حیرت سے بولی۔

”میں اسی وقت ماں جی آئیں۔ انہوں نے مجھے آواز دی تو چھوٹے شاہ جی نے میرا ہاتھ چھو ڈیا اور ماں جی مجھے نیچے لے آئیں۔ پھر اسی وقت ہم کمرے آ گئے تھے۔“

”اچھا تو یہ قصہ تھا۔“ زینب کو اس دن کی اقرار تفری کی وجہ اب سمجھ میں آئی۔

”زینب! شاہ جی اچھے آدمی نہیں ہیں۔ بابا صاحب اور ماں جی نے اسے لوٹا تو پھر پھولے کا ٹیبلہ کیا تھا۔ اب شام میں وہ پھر آ کر کیا کہہ گئے ہوں گے کہ بابا صاحب نے ارادہ بدل لیا۔ اس نے آنسوؤں سے تر ہوا اس کے گھٹنوں سے اٹھایا۔“

”ہاں تم سچ کہہ رہی ہو ایسا ہی ہو گا تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“ اس کے کانوں نے بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ ”کون آیا ہے باہر اس وقت آمنہ۔“ وہ ڈر کر بولی یا ہر گاڑی رستے کی آواز آئی۔ آمنہ نے زینب کا ہاتھ مضبوطی سے جکڑ لیا۔

”مہ۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے زینب! اس وقت کون آیا۔ بابا صاحب بھی نہیں ہیں۔“

وہ کانپ کر بے حد وہم آواز میں بولی اسی وقت قدموں کی چاپ مچن سے گزر کر ان کے کمرے کے کھیل پر آکر رک گئی۔ ان کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔



”مینن نارالجا! جلدی کرو، قہریشی کا پھر فون آیا ہے۔ گھنٹے بھر میں وہ چار فون کھڑکا چکا ہے۔ تمہاری تیاری ہی تمام نہیں ہو رہی۔“ زیور گل تیز تیز بولتی، مینن نارالجا کی تیاری کو فائل ریج دے چکی تھی۔ ہنڈ پر ہنڈ بیک اس نے ہاتھ بڑھا کر اٹھایا، گلے میں پڑا اسے کارف درست کیا اور مسکرا کر کہا کوئی کئے گی۔

”آئی ایم ریڈی نام! چلیں۔“ اور جی شرٹ کے ساتھ ڈارک بلوٹڈ ڈر میں اس کا نازک بدن نگاہوں کے رستے میں اترا جا رہا تھا۔

”کیوں قہریشی کو تم نے پارٹ فیل کروانا ہے وہ تو پہلے ہی تمہیں دیکھ کر مرنے والا ہو جاتا ہے۔“ زیور گل نے ٹھٹھا لگایا۔

”وہ نام اس کا نام نہ لیا کریں، میرا جی متلائے لگتا ہے۔“ وہاں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اٹھلائی۔

”ہر ایک کے ساتھ ایک جیسا احوال نہیں ہو تا۔“ عین تارا بولے۔

”ایک جیسا ہی ہوتا ہے مجھے میری بات پر یقین نہیں آتا تھا تاہم اس لیے تو مجھے سلطان بخت کے عقد میں دے دیا اور نہ میں سختی کر کے بھی تجھے روک سکتی تھی۔ صرف اس لیے کہ تجھے خود تجربہ ہو جائے اس کھیل کا۔“ زیور گل نے سیٹ کی پشت سے سر نکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ عین تارا نے ایک نظر ہاں کو دیکھا اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

”نام کو بھی وہم ہو گیا ہے۔ شاہ جی کم از کم میرے ساتھ فریب نہیں کر رہے اور کل تو انہوں نے آتا ہے سب دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر لوں گی۔ انہیں ضرور ہی مجبور کر لوں گی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ احمد پور لے کر جائیں۔“ عین تارا دل میں ارادہ باندھنے لگی۔ گاڑی قہشتی کی پریشانی کو مٹانے کے لیے آگے جا کر رکی ہارن پر گیٹ کھل گیا۔

”صاحب اندر ہیں۔ آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔“ جیسے ہی گاڑی پورنگیو میں رکی ملازم نے آگے بڑھ کر گاڑی سے اترتی زیور گل سے کہا۔

”خیریت۔“ وہ حیرت سے بولی۔ ”کہاں تو جلدی آؤ کا طوفان اٹھا رکھا تھا اس قہشتی سے اور اب کہاں خود کمرے میں کھس کر بیٹھ گیا ہے۔“ زیور گل عین تارا سے بولی۔

”مجھے خود یہ شام کو رات سہرے والا آئیڈیا یا نکل پسند نہیں آیا بھلا اس وقت بھی کوئی کام کرتا ہے۔“ عین تارا آگے بڑھی۔

”تم اندر ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھو میں آتی ہوں ابھی۔“ زیور گل نے اسے ڈرائنگ روم کے دروازے کے پاس چھوڑا اور خود قہشتی کے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔ عین تارا نے جھنجھلا کر کندھے جھٹکے اور دروازے کے پاس بڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”ڈرائنگ روم بہت شاندار تھا۔ بڑا سا ہال نما کمرہ چار قسم کے تختی صوفے سے سجایا گیا تھا۔ چار ڈارک براؤن اور لائٹ پھولوں والا قالین اور اسی رنگ کے پردے چھت سے قیمتی قالینوں تک رہے تھے۔ سائڈ ٹیبلز پر قیمتی نازک کرشل کے شو پیسوں کی بھاری بھاری ڈیواریں پر قیمتی تصاویر تھی۔

”گوشہ کے پہاڑ کی چوائس اچھی ہے۔“ خود سے کہہ کر عین تارا نے ڈرائنگ روم کا جائزہ موقوف کیا اور سینٹرل ٹیبل پر بڑے میگزین اور انکشاف اخبار اٹھا کر دیکھنے لگی۔

”ہمارے گھر میں تو کافی ڈائریکٹری کی شکل میں موجود ہے وہ بھی لکھا ہوا۔“ عین تارا نے دو چار منٹ بعد فیشن میگزین بھی بند کر دیا اور اخبار اٹھا دیکھنے لگی۔ اخبار اسی ہفتے کا تھا۔ وہ موٹی موٹی دو چار خبریں پڑھنے کے بعد صفحے اٹھنے لگی۔ اندرونی صفحے کے تیسرے صفحے کے درمیان میں چھپی بڑی سی گروپ فوٹو پر اس کی نظریں جیسے جیم کی گئیں۔

وہ شاہ جی کو تو ہزاروں لوگوں میں آنکھیں بند کر کے پہچان سکتی تھی۔ اس نے آہستگی سے صفحہ پلٹ کر دیکھنے اپنے آنکھوں کے قریب کیا۔ درمیان میں سلطان بخت تھے اور ان کے دائیں بائیں تقریباً ”آٹھ لوگ کھڑے تھے۔“ سید سلطان شاہ کے اگلے صابز اوے سید سلطان بخت کی دعوت و لیمہ کی تصویر جس کا فیکشن مقامی ہوٹل میں کل شب ہوا۔

اس نے ذرا وقت سے تقریبی میں لکھی ہوئی شیچے کی ڈیرہ سٹری خبر پڑھ لی۔ خبر پڑھ کر وہ بے جان نظروں سے پھر تصویر کو دیکھنے لگی۔ یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہ پائی تھی۔

آج مندی تھی مسز خان نے شادی کی ساری رسمیں روایتی طریقے سے کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس سلسلے میں وہ کسی کی بھی نہیں سن رہی تھیں اور ویسے بھی ان کے آگے کوئی بول بھی نہیں سکتا تھا۔ کل رات انہوں نے

مائیوں کی رسم کروائی تھی۔ زیادہ لوگ تو انوائٹ نہیں تھے صرف گھر کے افراد کچھ قریبی ہمسائے اور کچھ شہر میں بیٹوں اور مرحوم شوہر کے احباب کے گھرانے تھے۔ ڈھولک تو پر سوں ہی منگوالی تھی۔ اگرچہ بھائی کسی کو بھی نہ آئی تھی۔ اظہار اور ایاز کی چھوٹی بچیاں اسکول سے آنے کے بعد ڈھول پر طبع آزمائی کرنے ضرور آئی تھیں یا ذنون بانو لیکن کے کام سے فارغ ہو کر بڑے جوش سے ان بچیوں کو آواز دے کر بجانے بیٹھ جاتی۔ مسز خان کو اس نے ہنگام شور سے عجیب طرح کی مسرت کا احساس ہوتا تھا۔ اگرچہ دل کے اندر دور کیس خدشے اور وابہ سے بھی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد انہیں سہانے کو سراٹھانے لگتے تھے۔

”اگر جمعرات کو شہباز نہ آیا اور جمعہ کو بھی تو۔“ اس ”تو“ کے آگے ان کی نبھیں ڈوبنے لگیں۔ شادی کی ساری تیاریاں بہت دھوم دھام سے کروائی تھیں انہوں نے۔ عالیہ اور فائزہ کی طنزیہ نگاہوں کے باوجود جیولر کے پاس وہ خود کئی تھیں ایک بار ان دونوں کے ساتھ ویسے کاسوٹ بھی منتخب کرنے گئی تھیں۔ اگرچہ انہوں نے نہایت سے بھی کہا کہ وہ بھی ساتھ چل کر اپنی پسند کا سوٹ لے لیں اس نے بڑی التجا سے انہیں منع کر دیا تھا۔

”پچھو پلینڈے ایسے کسی بھی کام کے لیے مجبور مت کریں۔ آپ کو تو سب معلوم ہے۔“ وہ رو پڑی تھی۔ عالیہ اور فائزہ کی جیسے والی نظریں اس کے شکستہ بدن کے آریاں جاتی تھیں۔ وہ دن میں بیس دفعہ مسز خان سے کوئی مشورہ کرنے آئیں اور چالیس دفعہ کوئی دل کو چیر دینے والا طنزیہ فقرہ نہایت کے کانوں میں ضرور ہی اتار کر جاتیں۔

”واہ بھی نہایت کے تو مزے ہیں نہ داغ کا۔“ بھٹ مندرخصتی کے جوڑے کا کھڑاگ نہ جیز کا بکھیرا اور تو اور شخص کی زحمت سب کچھ ریڈی میڈ بلکہ ہم جیسوں کا ورد سر۔ لوگوں کے نصیب اچھے ہوتے ہیں سب کچھ دیکھنا اور خود بخود ان کی بابت میں آجائے۔“ فائزہ ہنسی۔

”اور لوگ تاٹھکے ہونے میں پھر بھگتا رہے ہرے منہ بنا کر حلق سے اتارتے ہیں۔ شکل پر سارے جہاں کی مسکنی برستی ہے یہ بھی تو کمال دیکھیں۔“ عالیہ کی چونچ کھول بند رہتی بھلا اور نہایت کو اس دس عمر لے کے پورشن میں کوئی کونا کھدرا نصیب نہ ہوتا۔ ان کی پاٹ والی نواہوں سے بچنے کے لیے اور ان سب کا اسے ایک ہی علاج نظر آتا۔ آنسو۔ وہ روئے جاتی۔ اٹھتے بیٹھتے پن میں چھوٹا موٹا کام ذنون بانو کے منع کرنے کے باوجود کرتے کھانا کھاتے چائے پیئے بیٹھتے بیٹھتے اس کی آنکھ بھر آتی۔

البتہ مسز خان کے ہلکتے بہت محتاط رہنے کی کوشش کرتی کہ ان کے سامنے آنکھ نہ بھینچے اس لیے نظریں جھکائے ہی رہتی۔

اس اندر ہناک سانچے نے اس کو چھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان پندرہ سترہ دنوں میں ہی وہ سوکھ کے ٹانگیاں گئی تھی۔ بھوک اس کی ختم ہو چکی تھی تیند رات بھر نہ آتی۔ جودن چڑھتا تو عالیہ اور فائزہ کی باتیں اسے پاگل بنا دینے کو کافی ہوتیں۔

اس کا جی ہزار بار ملامت کرتا کہ اگر زمانے کی نظروں میں وہ گھر سے بھاگ ہی گئی تھی تو پھر کہیں بھاگ ہی جاتی کم از کم دن رات کی اس تہمت بھری ذلت سے تونج جاتی۔ ہر لمحے وہ ہزار بار مرئی تھی ہزار بار جیتی تھی اور جب بھی مر کر جیتی اپنے جینے پر خوب ہی روتی۔

”آخر آپ کی آنکھوں میں اتنے آنسو کہاں سے آگئے ہیں میں تو سخت حیران ہوں۔“ معاذ مسز خان کی دو انہوں کا شاپراٹھانے ان کے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ لاؤنج میں دھواں دھار روتی نہایت پر اس کی نظریں پہلے تو اس نے ہمیشہ کی طرح نظر انداز کر کے گزر جانا چاہا کیونکہ وہ جس دن سے اسے دیکھ رہا تھا وہ بس رو رہی تھی آج اس سے ضبط نہ ہو سکا تو پاس آ کر پوچھ ہی بیٹھا۔ دو انہوں کا شاپراٹھانے نے سائڈ ٹیبل پر رکھا اور اس کے قدموں کے پاس کارپٹ پر بیٹھ کر ہلا تو نہایت اس کی آواز سن کر اچھل ہی پڑی یہ تو اسے معلوم تھا کہ اس

کے اس محبوب مشغلے میں کوئی نخل نہیں ہوتا اسی لیے بڑے مگن انداز میں رو رہی تھی۔

”نہ نہ۔ نہیں میں تو ویسے ہی۔“ اس نے جلدی سے اپنے پیلے بوٹے سے منہ رگڑنے کی کوشش کی۔
 ”آپ کا منہ رگڑ کر کڑکڑا کر نکلی ہی پھیل گیا ہے اور پالپسٹروا تری چکا ہے اندر سے پیلا زرد بے رونق چروٹکل آیا ہے پرسوں شہباز بھائی آپ کو دیکھیں گے تو پوچھنے ہی سے انکار کر دیں گے کہ میری ذہن تو بدل دی گئی ہے اور آپ اس بات پر ایک بار پھر دھواں دھار انداز میں رونا شروع کر دیں گی۔“ وہ بہت سنجیدگی سے بول رہا تھا۔ نظریں اس کے جھپکے چہرے اور پھلکی پلکوں پر جمی تھیں جہاں ابھی بھی اوس بڑی تھی۔

”آپ کیوں روتی ہیں اتنا۔“ وہ بہت پیار سے بولا ”بہت نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا اور پھر نظریں جھٹکا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔

”میں کب رو رہی تھی۔“ وہ کچھ دیر بعد بولی۔

”میں آپ کو کیا کہوں شہباز بھائی کے حوالے سے تو آپ میری بھابھی لگیں گی تم۔“ اس نے جیسے ہی شہباز کا نام لیا تڑپت کی آنکھیں پھر بھرنے لگیں۔

”وہ اللہ کے واسطے۔“ معاذ نے بے ساختہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”یہ سبھی بھانڈوں کا بقیہ پروگرام اگلے سینن کے لیے اٹھا رکھیں۔ اچھا میں آپ سے شہباز بھائی کے حوالے سے کوئی رشتہ نہیں جوڑتا میں آپ کو آپنی کہہ سکتا ہوں میری کوئی بہن نہیں۔“ وہ شوق سے بولا۔ ”بلکہ میں کیا میرے تو ماں باپ بھی نہیں اور اس سے بڑا لطیف یہ کہ میرا کوئی گھر بھی نہیں۔ نہ بہت آپنی اچھے اس لئے بڑے لطیف بہت رونا چاہیے تا بلکہ پیروں رونا چاہیے میرا تو کوئی بھی نہیں۔“ وہ سنجیدہ تھا نہ بہت اپنے آئینہ بھول کر اسے دیکھنے لگی۔

”یہ گھر۔“ اس نے ہاتھ پھیلا کر لاؤنج کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ڈیڑھ کنال کا ہے مگر اس میں میرے لیے چند فٹ کی جگہ نہیں اور ہو بھی کیوں۔ میرا بھلا اس گھر سے اس کے کھنوں سے کیا بنا ہے جو مجھے یہاں جگہ ملے اور آپ کو بتا ہے اب کے شہباز بھائی آپس گے تو ظہر بھائی اور ایسا بھائی ام جان کے گھر پر مجھے یہاں سے جٹا کرنے کے لیے بھر پور دباؤ ڈالیں گے بلکہ مجھے لازمی ادھر سے جانا ہو گا اور یہاں سے کہاں جاؤں گا یہ مجھے نہیں معلوم۔ یہ گھر جہاں آکر مجھے ایک مدت بعد کچھ سکون کچھ اپنائیت کا احساس ملا تھا۔ اگرچہ مجھے پتا تھا مجھے یہاں نہیں رہنے دیا جائے گا اور میں دیکھیں کتنا ڈھیٹ ہوں پھر بھی نہیں رونا؟“

”اور اگر میں آپ کو اپنی پچھلی زندگی کی تکلیف دہ کہانی سناؤں تو آپ کے حساب سے تو مجھے آج سے پانچ سات سال پہلے ہی رو رو کر خود کو ختم کر لینا چاہیے تھا مگر بتا ہے نہ بہت آپنی میں کیوں نہیں رونا اور سدا ہو کر بولا۔

”میرے ایک بچہ تھے وہ کہتے تھے اگر تم زندگی کے دکھوں پر نوٹ کر لو گے تو تم بکھر جاؤ گے اور جب بکھر جاؤ گے تو کوئی بھی تمہیں سمیٹنے نہیں آئے گا۔ تم اگر روتے رہو گے تو کرجی کر جی ہو کر بکھر جاؤ گے پھر بتنا زیادہ کھرو گے اتنا ہی زیادہ تمہیں خود کو سمیٹنے میں وقت لگے گا اور ہو سکتا ہے جب تم خود کو سمیٹ کر اٹھو گے تو اتنے پیچھے رو چکے ہو گے کہ تمہارے ساتھ چلنے والے تمہاری آواز بھی نہ سن سکیں۔“

انہوں نے کہا تھا۔ ”معاذ بیٹا! میری ایک بات یاد رکھنا کبھی مت رونا آنسو تمہیں کمزور کر دیں گے خود کو پیش جمع رکھو گے تو طاقتور رہو گے اور زمانے کے مصائب کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکو گے ہنسنے والوں کے ساتھ سب ہنستے ہیں رونے والوں کا ساتھ کوئی نہیں دیتا۔“

آنسو انسان کو ختم کر دیتے ہیں اور میں تو اس بھری پڑی دنیا میں اس قدر تنہا ہوں کہ مزید تنہا ہونا فوراً کر ہی نہیں سکتا کیونکہ میں جانتا ہوں اگر میں روؤں گا تو مجھے چپ کرانے کوئی نہیں آئے گا۔ آپ اتنے دنوں سے رو رہی ہیں آپ کو کس نے چپ کر لیا بلکہ آپ کے آنسوؤں سے وہ سروں کو شہہ ملی کہ آپ میں صرف اتنی طاقت ہے کہ آپ اپنے ہرزخم کا انتقام خود سے لیتی ہیں۔

آپنی آپلیز مت رو میں آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں پہلے دن سے میں آپ کے لیے بہت دعا کرتا ہوں۔ آپ

اپنے آنسو خود صاف کریں اپنے چہرے کو اپنے دکھ کا اشتہار نہ بنائیں۔ آپنی اللہ نے آپ کا بھرم رکھا پھر آپ اللہ کا بھرم کیوں نہیں رکھتیں۔“

”اللہ کا بھرم۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”اللہ نے آپ کو محفوظ رکھا بقول آپ کے آپ اللہ کی اس مہربانی کا اس انداز میں شکر ادا کر رہی ہیں کہ رو رو کر سارے زمانے کو بتا رہی ہیں کہ اللہ نے آپ کے ساتھ بڑا کیا۔ اس نے تو آپ کے ساتھ اچھا کیا آپ کو اس کڑے وقت میں اچھے برے کی پہچان دی اور آپ کو ایک کھن عم عطا کر کے اپنے قریب کر لیا کہ غم والے دل اللہ کو بڑے محبوب ہوتے ہیں۔“

آپنی! آپ اگر خود کو پاک دامن سمجھتی ہیں تو پھر یوں رو رو کر لوگوں کے آگے صفائیاں کیوں دیتی ہیں۔ آپ کی حاجت لوگوں سے تو نہیں اللہ سے ہے پھر صاف دل سے فقط اللہ سے سوال کیوں نہیں کرتیں۔ لوگوں سے آپ کو کچھ نہیں ملے گا سوائے تمہوں اور الزاموں کے۔ اگر آپ خود کو حق پر سمجھتی ہیں تو پھر اپنے اندر مضبوطی پیدا کریں لوگوں کی پروا مت کریں لوگ آپ کو محض کمزور کریں گے جیسے آپ کے آنسو خود آپ کو۔“

”تم نے اتنی بڑی بھلائیوں کہاں سے دیکھیں۔“ وہ اپنی حیرت چھپانے لگی۔

”وقت سے آپنی وقت سے بڑا کوئی استاد نہیں۔ بس آپ روتی اچھی نہیں لگتیں مجھے آپ سے صرف یہی کہتا تھا اور بتا نہیں کیا کیا کہہ گیا ہوں۔“ وہ دراصل اسے کہتا تھا۔

”معاذ! مجھے لوگوں کی پروا کب ہے میں تو چھپو اور شہباز۔“

”آپنی! آپ کی ذات کے باہر سب لوگ ہی ہیں زمانہ ہی ہے بس اپنی خبر لیں۔ اپنے اندر کی مضبوطی چیک کریں پھر کوئی بھی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور بس تو ام جان کو دوا میں دینے جا رہا تھا۔ انہوں نے فوراً ”لا“ لگنے کو کہا تھا۔“

”میرا کوئی بات یاد نہ رہی تھی ہو تو سوچی ویسے میں آپ کو آپنی کہہ سکتا ہوں۔ کم از کم جتنے دن ادھر ہوں۔“ وہ کھڑے کھڑے بولی۔

”کون جانے کون کب تک یہاں ہے۔“ وہ کھٹکتی سے بولی۔

”آپنی! ادیش ناٹ فیر۔ میرا تمام تر کجا کھانے کے باوجود پھر وہی راگنی۔“ وہ افسوس سے سر ہلا کر بولا۔

”اوکے میں کوشش کروں گی۔“ وہ دھیرے سے مسکرائی۔

”متھینک بو۔“ کہہ کر وہ تیزی سے مسزخان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

پھر اس کے بعد واقعی نہ بہت نے خود کو ضبط کے مرحلے سے گزارا آنسو آنکھوں میں آتے وہ اٹھ کر کسی نہ کسی بے ضرر سے کام میں ملن ہو جاتی۔ ڈسٹنگ کرنے لگی استری کیے ہوئے کپڑوں کو از سر نو درست کرنے لگتی۔ بالوں میں برش پھیرنے لگتی وہ زیادہ تر اب کمرے ہی میں رہتی۔ عالیہ اور فائزہ کی دل جلی گفتگو سے بچنے کے لیے۔ مندی کا فنکشن جمعرات ہی کو رکھا گیا تھا۔ باہر لان ہی میں سارا انتظام کیا گیا تھا۔ مسزخان شام ہی سے باہر لان میں بیٹھی تھیں اور آنے والے چیدہ چیدہ مہمانوں کا بڑی کرجوشی سے استقبال کر رہی تھیں۔ رات دس بجے تک تمام مہمان آگئے کھانا بھی سرو کر دیا گیا کھانے سے فارغ ہوتے باہر نچ گئے تو لوگ بیزار ہونے لگے بسوں کے بار بار کہتے پر مسزخان نے مندی کی رسم شروع کرنے کی اجازت دے دی۔

نہ بہت کو مسخ زرتار دہنے کی چھاؤں میں باہر لان میں رکھی بھولے نماشت بر بٹھایا گیا۔ زرد سوٹ میں اس کے چہرے کا رنگ بھی زرد ہی لگ رہا تھا۔ ایک عجیب سی اداس روشنی نے اس کے چہرے کے گرد ہالہ سا کر رکھا تھا اس کی لائبریاں پلکیں پار پار لرز رہی تھیں مہمان سہانوں نے اس کے ہاتھ پر رکھے پتے پر مندی رکھی بالوں میں تیل لگایا۔ مندی اور تیل سے لٹھڑے ہاتھوں کے ساتھ ہی اسے مٹھالی کھلائی گئی۔ زیتون یا نوزور زور سے ڈھولک بیٹ رہی تھی لڑکیاں بالیاں اوٹ پٹاٹک گانے گارہی تھیں۔ مسزخان اس خوبصورت منظر میں جیسے

کھو سی گئی تھیں۔ چہرے پر وحشی سی مسکان لیے وہ نہت کے ادا اس شرمیلے چہرے کو نکلے جا رہی تھیں۔ جب ایاز نے موبائل لا کر ان کو تھمایا۔

دوسری طرف شہباز تھے جنہیں اب تک ان کے حساب سے گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔
 ”ام جان! میں معذرت چاہتا ہوں، میں نے بہت سوچا بہت کوشش کی مگر میں خود کو آنے پر مجبور نہیں کر سکا۔
 ہو سکے تو میری اس خطا کو معاف کر دیجئے گا میں نہیں آسکتا۔ کچھ عرصے بعد ہمیشگی تو شاید آجاؤں خدا حافظ۔“ وہ ابھی کچھ بول ہی نہ پائی تھیں کہ دوسری طرف سے کال آف ہو گئی۔
 انہیں لگا ساری روشتیاں بچھ گئی ہیں۔ ہر طرف گھٹاؤپ اندھیرا چھا گیا ہے۔ موبائل ان کے ہاتھ سے پھوٹ گیا اور وہ اپنے ڈولتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر کرسی کے ایک طرف گر سی گئیں۔

اماں جی کی مدد ہم سسکیوں بھری فریاد ہوا کی لہروں پر لرزتی ہوئی پورے کمرے میں گردش کر رہی تھی۔ سجدے میں گرا ان کا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ با آواز تلاوت و ترجمہ کے ساتھ وہ اس طرح گریہ و زاری کر رہی تھیں کہ سننے والے کا دل پانی بن کر بہنے لگے۔ رات کا تیسرا پہر اور ایک گھنٹہ بڑھ چاہے کہ ویران محل میں قدم رکھتی آواز کی فریاد تو عرش ہلا سکتی تھی جس طرح ان کا سجدے میں گرا وجود صوفی صاحب کے دل کو اندر تک پہنچا گیا۔
 ”یوں زبردستی کی ہجرت انہیں بھی کب گوارا تھی۔ دل اندر سے روئے جا رہا تھا مگر وہ کس پروا داشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو مضبوط ظاہر کرتے رہتے تھے مگر راجہ بی بی تو سہرا حال اتنا مضبوط دل نہ رکھتی تھیں۔ خود پر کتنے پروا داشت اور ضبط کے بند باند تھیں پھر سلطان بہت کی دھمکی نے انہیں اندر تک سما دیا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ آمد کو اپنے پیروں میں چھپا کر کہیں دور غائب ہو جائیں۔ وہ صوفی صاحب سے کھل کر اپنے دل کا احوال تو نہیں کہہ سکتی تھیں مگر اللہ سے تو رورور کر دعا کر سکتی تھیں۔
 صوفی صاحب کچھ دیر کھڑے انہیں دیکھتے رہے پھر آہستگی سے ان کی طرف بڑھے۔
 ”راجہ بی بی! انھوں اللہ مہربان نے یقیناً تمہاری فریاد سن لی ہو گی۔ سو یقیناً ہمیں کوئی روشن اور نیک راستہ دکھائے گا۔ انھو اپنے کی تیاری کرو۔“

صوفی صاحب کی مدد ہم سمیر آواز انہیں اپنے بے حد قریب سنا لی وہی اور جھکے ہوئے کندھے بران کے بھاری گرم ہاتھ کا لمس راجہ بی بی کو لگے ہی پل ہوش کی دنیا میں لے آیا۔ وہ آہستگی سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ عمل کے دوپٹے آنسوؤں سے دھلا چہرہ صاف کیا۔ صوفی صاحب ان کی طرف ہی متوجہ تھے۔
 ”کہاں جانے کی تیاری؟“ وہ کچھ اچھٹے سے بولیں۔

”کسی جاننے پناہ کی طرف جہاں ہماری عزت جو ہماری جانوں سے بڑھ کر معتبر ہے۔ محفوظ ہو سکے۔“ وہ آہستگی سے بولے۔
 ”میں یک اپ لینے گیا تھا یا ہر کھڑی ہے۔ تم بس بیچوں کو اٹھا کر ضروری ضروری سامان کی دو تین گٹھریاں اور جو اشد ضرورت کا سامان ہے وہ گاڑی میں رکھو۔ جلیل باہر گاڑی کے پاس انتظار کر رہا ہے۔ ہمیں صبح کی پوچھنے سے پہلے ہی ادھر سے چلے جانا چاہیے۔“ وہ بہت اداس لہجے میں پست آواز سے بول رہے تھے۔
 ”مگر آجھی تو رات۔“ اماں بی نے کچھ کہنا چاہا۔

”ہیں راجہ بی بی! سوال نہیں! کوئی سوال نہیں۔ اکثر بہت زیادہ سوال رستہ کھوٹا کرتے ہیں۔ بس انھو اور بیچوں کو اٹھاؤ بلکہ وہ میرے خیال سے جاگ ہی رہی ہیں۔ میں جلیل کو اندر لے آؤں گا اگر سامان گاڑی میں رکھواؤ۔“
 وہ سیات لہجے میں کہہ کر باہر نکلے۔ دروازے کے پاس ہی آمد اور نہت دروازے سے جڑی کھڑی تھیں۔ صوفی صاحب انہیں دیکھ کر ایک پل کو ہنسلے اور پھر مرتجعا کر خاموشی سے ڈیوڑھی کی طرف بڑھ گئے کچھ بھی ان سے کہنے کے بغیر!
 اور آمد کو ان کا ہتھکا سر دیکھ کر اپنے وجود پر بہت سخت محسوس ہوئی۔

”کاش میں پیدا نہ ہوتی ہوتی تو میرے بابا صاحب کا سر آج نہ جھٹکا۔“ زینب اس کی کیفیت سے بے خبر لپک کر اماں جی کے پاس جا پہنچی۔

”اماں جی! تم جارہے ہیں؟ خوشی اس کے چہرے سے ہو رہی تھی۔
 ”آں ہاں! آمد اور جویریہ کو بھی اٹھاؤ۔“ اماں جی نے سنجیدگی سے کہہ کر زینب کو کابل آف کیا اور سوپاؤر کا فلیس کابل جا لیا کمرہ ایک دم پہلی روشنی سے جگمگا اٹھا۔
 اماں جی کمرے کے سامان کا جائزہ لینے لگیں۔

”کہا تھا منع بھی کیا تھا ہم نے ام جان کو۔ یہ شادی بیاہ کوئی گڈی گڈی کا کھیل نہیں۔ یہ زبردستی کے سوتے نہیں ہوتے۔ دل کی خوشی کی بات ہوتی ہے۔ اگر شہباز نہیں ماننا تو رہتے ہیں۔ اس کے لیے کیا جہان بھر کی لڑکیاں مرنے ہیں جو یہ نہت ہی اس کے گلے ڈالنے پر تل گئیں۔ مگر ام جان کو تو اپنی بات اپنی ضد سے بڑھ کر کچھ بھی عزیز نہیں لگتا۔“ اماں جی کی خاطر بے شک۔ مینا جو مرضی کر لڑے۔ انہوں نے بس اپنی منوائی۔“ انہوں نے غصے سے شہتے ہوئے بولے جا رہے تھے۔

”اور اب جو خاک انہوں کی ہماری عزت پر۔ اس کی کچھ خبر ہے آپ کو۔“ ایاز چمک کر بولے۔
 ”سہی خیال تو مارے دے رہا ہے۔ سارے شہر کو دعو کر رکھا ہے اور شام ہونے میں کتنے کتنے ہیں۔ محض تین چار۔ ام جان۔ تو بے ہوش ہو کر بستر چھل گیا ہے۔ لوگوں کو جواب دینے کو تو ہم ہی رہ گئے ہیں نا۔ کیا بمانا کریں گے سب کے سامنے کیسے ایسے جھوٹ گھڑیں گے۔ ایاز! میرا تو سوچ سوچ کرواں غماؤف ہو جا رہا ہے۔“
 انہوں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور وحشت سے اپنے سر پر دو ہتھڑ مارے۔

”ام جان جیسی خود خدی ہیں وہاں ہر شہباز ہے۔ میرے سامنے آجائے میں تو اس کا منہ تھپسوں سے لیں کر دوں۔ میں وقت پر۔“ کراہنے لگی۔ اماں جی نے عزت کو کھیل بنا رکھا ہے اور ایک وہ دیال جان جو اگر او سر بیٹھ گئی ہے۔“ وہ سانس لینے کو رکھے۔ ”گھر سے نکل گئی تھی۔ کہیں منہ کالا کر لیا تھا تو وہیں وضع ہوئی رہتی۔ اوھر ہماری زندگیاں کیوں عذاب بنانے لگی۔“

ان کے منہ سے جیسے کف نکلے لگا۔ طیش کے مارے انہیں اپنی زبان اور اپنے جذبات پر قابو بحال لگ رہا تھا۔
 ”ہاں وہی تو ہے فسادی چیز۔ اس رات نہ گھر میں داخل ہونے سے پہلے۔ دروازے بند کر لیتے۔ خود ہی وضع ہو جاتی۔ شہباز نے اسے کون سا منہ دکھایا تھا۔ ام جان کو بھی پتا نہ چلتا۔ خود ہی رو دھو کر دفنان ہو جاتی۔ دید و لیر لڑکی آوھی رات کو تھی۔ ہمیں ڈری۔ کیسے ڈھٹائی سے اتنا بڑا جرم کرنے کے بعد بھی اپنی سرال چلی آئی۔“
 ”سوچیں۔“ راجہ بی نے لڑکی کے بعد میں ادھر کیا کیا نہ تماشے دکھائے گی۔“ ایاز نے لہجہ دیا۔

”سہی سب کچھ تو شہباز کو نظر آیا ہے۔ اس نے آنے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ تو پہلے ہی نہیں مان رہا تھا۔ ام جان نے اپنی جسدِ حری سے اس شادی بلکہ بربادی کی تیاریاں کروائیں۔ بڑی۔ پیسہ برباد کیا۔ زیور بنایا۔ ہونٹ کی بنگ اور کمرے کی آرائش۔ ام جان کی ذہنی صحت اب کسی بھی طرح قابل اعتبار نہیں رہی۔ یہ اپنی فضول خواہشوں سے ہمیں برباد کر رہی ہیں۔“
 ”بہت بولیں وہ جاگ گئیں تو کھڑے کھڑے دو کوڑی کا کر دیں گی۔“

ایاز محتاط لہجے میں بولے۔ دونوں ام جان کے کمرے کے باہر بیٹے کارڈور میں مثل رہے تھے۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ رات فون سننے ہی مسزخان کی جو طبیعت بڑی ابھی تک سنہ سنبھلی تھی۔
 ”شہباز کو چھٹی نہیں ملی۔ صبح آجائے گا۔ اسی غصے میں تو ام جان کالی بی ہائی ہو گیا ہے۔“ عالیہ ہنس ہنس کر سب کو ٹال رہی تھی۔
 ”کیا ادھر مثل مثل کر شہباز کو زمین سے برآمد کرنا نہیں گے۔ پارلر سے دوبار فون آچکا ہے۔ اس مہمانی کو پارلر

لے کر جانا تھا۔ بنگلہ جو کروا رکھی ہے۔ اب بتائیں کیا کریں۔" عالیہ اس وقت ان کے سر پر آکر بولی۔
 "ہم کیا جانتا ہیں۔ پوچھو جا کر اپنی بیماری ام جان سے جنہوں نے یہ سارا کھڑا کیا ہے۔ ہماری تو خود
 عقلیں پریشان ہیں سوچ سوچ کر۔ شہباز کو دوس فون کیسے وہ فون کا پتہ آواز سنتے ہی فون بند کر دیتا ہے۔ اب تو اس
 نے موبائل بھی آف کر دیا ہے۔ سامنے آجائے تو میں اسے شوٹ کر دوں۔" اظہر ایک بار پھر غصے سے بھڑک کر
 بولے۔

"اب دولہا ہمارے بغیر تو یہ فنکشن ہونے سے رہا۔ عالیہ نے ان کے غصے کو اور ہوا دی۔

"ظاہر ہے اور جگہ ہسانی کروانی ہے ہمیں۔" ایاز کڑھ کر بولے۔

"اب سب سے کوئی ہمانہ کر دیتے ہیں کوئی فوننگی وغیرہ کا۔" اظہر کچھ دیر بعد بولے۔

"فوننگی سے باہر جانے والوں میں تو یہ ہمانہ چل جائے گا۔ یہ جو گھر میں جلوس اٹھا ہوا ہے۔ اس کو کیا کہیں۔"
 ایاز نے تھک کر دیوار کا سارا ایا۔

"یہی تو مصیبت ہے ساری۔"

"ام جان اٹھ گئیں؟" ایاز کو خیال آیا تو عالیہ سے پوچھا۔

"جانتا نہیں۔ میں نہیں گئی کمرے میں۔" وہ ہزاری سے بولی۔ "میری امی جان بھائی بھائی اور دونوں بہنوں نے
 صبح سے پوچھ پوچھ کر میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ دولہا ابھی تک کہلا نہیں لیا۔ انہیں تو پہلے ہی یہ بات ہضم
 نہیں ہو رہی کہ رخصتی سے پہلے دلہن گھر میں موجود ہے۔ سہیل کے ہاں ہر جانے والا ہمانہ بھی ہوا نکلا۔ میرے ہنوتی
 اپنے کسی کزن سے ملنے یڈی گئے تھے۔ وہ سہیل کے بینک ہی میں کام کرتا ہے۔ وہ ہیں انہوں نے اسے بھی دیکھ
 لیا۔ ابھی اسی ہفتے کی بات ہے۔" سوال پر سوال "نفتیش پر نفتیش۔" میرا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ فاترہ الگ منہ
 بجائے پھر رہی ہے۔ اس کے میکے والوں نے اس کی جان کھا رکھی ہے۔"
 "پہلے اس کام میں کون سا میزہ رہ گیا تھا۔ کہا بھی کہ سادگی سے دو چار لوگوں کو بلا کر فنکشن کر لیتے ہیں مگر آپ کو
 اتنا ہی شوق ہے۔ بیٹے اور بیٹی کو دولہا دلہن کے روپ میں دیکھنے کا۔ نہیں۔ ایک ہی ضد سارے جہان کو
 بلاؤ۔ خوب ہنسی آؤ گی ہماری اس عمر میں۔ لوگ ہنس رہے ہیں۔ بھیتیاں کس رہے ہیں۔ دلہن کی موجودگی پر
 تشہول کر رہے ہیں اور خود ساسو سالی بنگلہ سنبھال کر بیٹھ گئی ہیں۔ منہ سے تو ہمیں ہی سب کے گلتا ہے نا۔" عالیہ تو
 جیسے پھٹ سی ہوئی۔

"ایا۔ کیا حل ہے۔ آپ کی نظر میں اس کا؟" وہ تھک کر بولی۔

"ایک آخری کوشش۔"

"وہ کیا؟" ایاز نے سوالیہ نظروں سے بھائی کو دیکھا۔

"شہباز سے کانٹیکٹ کرنے کی۔ اسے سمجھانے کی آخری کوشش۔"

"فضول۔ وہ صبح سے فون ہی اٹینڈ نہیں کر رہا۔ موبائل اس کا آف ہے۔ بات کس سے کریں۔ اور نا تم اب اتنا
 شارٹ رہ گیا ہے۔ کوئی اسے جا کر زبردستی لا بھی نہیں سکتا۔"
 "تو چلو پھر ام جان کو اٹھاتے ہیں۔ ان کی پیدا کردہ اس درد سمری کا علاج ان ہی سے دریافت کرتے ہیں۔" وہ دو
 ٹوک انداز میں بولے۔

"بھابھی! پارر سے فون آیا ہے کہ۔ دوں ہم نہیں آرہے۔ اپنا ٹنٹرنٹ کینسل کر دیں۔" قانزہ کا ریڈور میں
 داخل ہوتے ہی عالیہ سے بولی۔ عالیہ استغما میہ نظروں سے شوہر اور دیور کو دیکھنے لگی۔
 "ابھی ٹھہر جاؤ۔ اس سے کو تو اٹھ گھٹے تک انفارم کر دیں گے۔"

اظہر نے کہہ کر مسزخان کے کمرے کی راہ لی۔ عالیہ اور ایاز بھی ان کے پیچھے ہی تھے۔

مسزخان جاگ رہی تھیں۔ ستر پر چٹ لیٹی پھٹ کو گھور رہی تھیں۔ زیتون بالوں کی پائنٹی بیٹھی ہوئے ہوئے

ان کی بیٹیاں دیار ہی تھی۔

اظہر نے کھنکھار کر کہاں کو اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہا مگر وہ متوجہ نہ ہوئیں۔ ہنوز تکلی باندھے چھت پر
 ناپیدہ نقطے کو گھورتی رہیں۔

"ام جان! اب کتنی طبیعت ہے آپ کی؟" اظہر ان کے قریب آکر نرمی سے بولے۔

"تھک۔" بہت آستلی سے ان کے لب بٹے۔ نگاہیں ابھی تک اسی مختلطیسی نقطے پر جمی تھیں۔

کچھ آگایا آپ نے؟ وہ ان کے قریب کرسی چھینج کر بیٹھ گئے۔

"ہوں۔" جسم سا جواب تھا۔ اظہر کو اور کوئی سوال نہیں سوجھ رہا تھا۔ ان کی سچ میں نہیں آ رہا تھا۔ ماں کو
 حالات کی سنگینی کا احساس کیسے دلائیں ایاز اور عالیہ بے تابی سے ان کے اگلے ڈانہلاگ کا انتظار کر رہے تھے۔
 عالیہ نے دائیں ٹانگ کا بوجھ بائیں پر منتقل کیا۔ کمرے میں کچھ دیر کو خاموشی چھا گئی اور اس خاموشی سے سب کا
 دل بھرا رہا تھا۔ خاموشی سے تو کچھ بھی واضح نہیں ہوتا۔

"ایا وقت ہو گیا ہے؟" مسزخان نے اچانک نگاہیں چھت سے ہٹا کر اظہر کو دیکھا۔

"پارر جگہ ہے؟" اظہر نے کن اکھیوں سے وال کلاک کی طرف دیکھا جہاں ساڑھے تین بج رہے تھے۔

"اسے اب تک آجانا چاہیے تھا۔" اظہر بولے سے بڑبڑائیں۔ تینوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"شاید ام جان کے دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔" ایاز بھائی کے کان میں بولے۔

"پہلے کون سا درست تھا۔" عالیہ جل کر بولی۔

"سب انتظامات مکمل ہیں؟" مسزخان کا کان اٹھ گیا۔ بھی انہیں جزیب کر دینے والا تھا۔

"ام جان! انتظامات آپ کے سے مکمل ہیں۔"

"حیرت پارر چلی گئی۔" اظہر کی بات سن کر بولیں۔

"نہیں ملے۔"

"سازھے تین بجے جانا تھا اس نے۔ ابھی تک بھیجا کیوں نہیں اسے؟ وہ بات کاٹ کر بولیں۔

"شہباز نے آنے سے انکار کر دیا ہے۔ تو نہ بہت کو کس لیے پارر بھیجیں۔ ہمیں تو اور پریشانی لگی ہے۔ سب

لوگوں کو مہمانوں کو ہم کیا بتائیں اور وہ مل کی بنگلہ سارے انتظامات اور۔" اظہر غصے سے بول رہے تھے۔

"تمہیں کس بات پریشانی ہے؟" مسزخان ہنوز پر سکون لہجے میں بولیں۔

"ایا آپ نکل جانتیں۔ بنا تو دیا ہے آپ کو شہباز نہیں۔"

"آئے گا۔ وہ لازمی آئے گا۔ مجھے پتا ہے۔ تم کیوں فکر کرتے ہو۔ وہ میرا بیٹا ہے۔" وہ بڑے آرام سے بولیں۔

"ہمیں کسی نوکر سے اٹھایا تھا کیا؟" ایاز نے جل کر بول میں سوچا۔

"ام جان! وہ کیسے آسکتا ہے۔ فون پر اس سے رابطہ نہیں ہو رہا۔ موبائل اس کا آف ہے۔ آٹھ بجے فنکشن کا

ٹائم ہے۔ چار گھنٹوں میں کیا ہو سکتا ہے؟" وہ اضطراب بھرے لہجے میں ہاتھ مل کر بولے۔

"الحق ہوا اظہر تمہ۔" مسزخان بولے سے ہنس۔ "اتنا نہیں جانتے۔ فون پر وہ کیسے مل سکتا ہے۔ وہ سفر میں

ہو گا۔ موبائل وہ سفر کے دوران آف رکھتا ہے۔ بڑی بڑی عادت ہے اس کی اور سمجھانے کی اسے کھلا کیا ضرورت

ہے۔ وہ کھلا میری بات رد کر سکتا ہے۔"

تینوں کو پکا یقین ہو گیا کہ مسزخان کا دماغی توازن بگڑ چکا ہے۔

"ام جان کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ رات اس نے آپ سے کیا کہا تھا۔ آپ کو یا وہ

نہیں شاید۔" اظہر جھنجھلا کر بولا۔

"ایا ہے۔"

"السلام و علیکم ام جان! کمرے میں گونجنے والی اس آواز نے سب کو جیسے دم بخود کر دیا۔ شہباز اپنا سفری بیگ

صوفی صاحب نے غصے سے کہا تو وہ جواب ہی ہو کر
چلے گئے۔

صبح صادق کی ہلکی ہلکی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی جب ان کی گاڑی کی سڑکوں پر دوڑنے کے بعد اس
پھوٹے سے شہر کی اندر چلی گئی تھی وہاں کو رو روئی ہوئی ایک شہر کی بلکہ خستہ حال گلی کے آخری گوشے میں بنی
پھولٹی سی مسجد کے آگے جا کر کی۔

مسجد چو کو رقبے پر بنی ہوئی تھی مسجد کی چھت بہت اونچی تھی جس کی وجہ سے اوپر کی گلیوں پر ہوا گھرا اور بھی
اونچا بلکہ آسمان سے بائیں کرنا دکھائی دے رہا تھا۔ نہ شب نہ دن نہ صبح نہ شام کسی آنکھوں سے دور رہی سے مسجد اور عمارتیں
کھانسی لے کر گھر کو تپا رہا تھا اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ صوفی صاحب کے اشارے پر چاروں بچے اتریں تو
زیب کا دل اترنے سے صاف انکار کر دے۔

گلی میں بالکل خالی تھی۔ صوفی صاحب نے کہا کہ یہاں پر بھی جمل رہا تھا۔ مجھے کے نیچے دو مہرے
سے کتے جسم کھینچ کر اٹھائیں لے رہے تھے انہیں دیکھ کر سیدھے ہو چکے۔ مسجد میں شہر کی جماعت ہو رہی
تھی۔

صوفی صاحب نے آگے بڑھ کر مسجد کی گلی میں بنی میٹھیوں کا دروازہ جس پر ایک رنگ اور بڑا سا ناگ بھول
رہا تھا چیب سے چالی ٹھل کر اسے کھولا۔ گلی کی گاڑی کے ڈرائیور کے ساتھ مل کر سامان اتار رہا تھا۔

”آج تو کب اور۔“ صوفی صاحب کی گاڑی پر وہ چاروں آہستہ آہستہ ان کے پیچھے اندر چری میٹھیوں پر
لکھیں۔ صوفی صاحب میٹھیوں پر کھڑے ہوئے اور پھر ہاتھ مار کر ناویہ روشنی کے لیے کسی ٹرن کا وہود نکالتے رہے
کھانسی لکھنا لگا۔

میٹھیوں پر کھڑے ہی چھوٹا سا گھنٹا بج گیا تھا مکمل طور پر پھٹا ہوا سواں پر بھی گھپ اندر صبر ایسی ہوتا مگر گلی کے
رخ کی ایک کھڑکی اوپر کھلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے خیالی سی روشنی اس اندھیرے کھر میں پھیلی ہوئی تھی۔
ساتھ ہی وہ کمرے کے دروازے نظر آتے تھے۔ دونوں بند تھے۔

گلی کی اس کھڑکی کے نیچے گلی کے تیل کا پوٹا اور پورا ایک سلیم سی بنی ہوئی تھی شاید برتن رکھنے
کے لیے۔ ایک ٹولہ میٹھی پلٹ اور ایک میٹھی کی بیانی پٹے ای وہاں رکھی ہوئی تھی جس سے ظاہر ہوا تھا یہ کچن ہے
اس کچن کے بالکل اوپری طرف شاید غسل خانہ تھا اس کا لکڑی کا دروازہ جس کی درزوں کو لوہے کی پتھریاں لگا
کر بند کیا گیا تھا۔ سارا کھر مٹی اور دھول کی دھیز تھوں سے اٹا ہوا تھا پورا ریلوں سے لگتے جانے تک جھک
کر ان کو شاید سلام کرنے نیچے آ رہے تھے۔ انہیں لگا جیسے وہ وہ بچو واٹو کے کسی گھنڈر میں آ گئے ہیں۔

صوفی صاحب نے آگے بڑھ کر کمرے کے دروازے کھول دیے۔ عجب طرح کی تیز بدبو کا جھونکا تھا جو سب
تھنوں سے نکل آیا۔ سب نے ہی بے اختیار منہ اور ناک پر ہاتھ رکھ لیے جیسے مزے ہوئے چوہوں کی یا کسی اور مزہ
جانور کی رو ہوئی ہے۔

زیب کا ہی چہرہ وہ جو آخری میٹھی کے بالکل پاس کھڑی ہے وہیں سے بھاگ جلتے اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھے۔
”تو بے گناہ اس کا کب کو کبھی کسی نے نہیں کھولا۔“

اماں بی رو نہ سکیں تو بولیں اور کہہ کر کچھ گھبراہٹیں گئیں اور وہ قدم صوفی صاحب سے پرے کھسک گئیں۔ ان کی
بات پر انہیں خشکیں لگا ہوں سے گھر رہے تھے۔

”چیلے نام صاحب اکیلے ہی رہتے تھے۔ اہل و عیال جیسے ان کے کسی گاؤں میں تھے وہ نیچے مسجد میں بنے
خیرے ہی میں رہ لیتے تھے۔ یہ جھڑ تو انہوں نے استعمال ہی نہیں کیا۔“ پتا نہیں انہوں نے کس طرح جواب دے
دیا۔ شاید وہ خود بھی مکان کی حالت دیکھ کر پریشان تھے۔ گھنٹوں پر بندوں کے فضیلت کے ہیرے لگے تھے اس کی بدبو
نے بھی ماحول کو ناقابل برداشت بنا رکھا تھا۔

اٹھائے چہرے پر ہر سوں کی تھکن لے کر کمرے کے وسط میں کھڑے تھے ان کی شیوہ برسی ہوئی تھی اور جلیہ بہت رف
ہو رہا تھا۔

”و علیکم السلام آج میرا بیٹا۔ میرا شہباز میرا کھانے ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ مسز خان ہشاش لبے میں کہتے
ہوئے اٹھ بیٹھیں۔

شہباز آہستہ سے قدم اٹھا کر ان کے بستر کی سائیڈ پر جا بیٹھے۔ مسز خان نے ہاتھ بڑھا کر ان کا سر اپنے سینے سے
ڈگایا۔

”میرا بچہ میرا دل ہے۔ پیشہ خوش رہو سواں کی دعا تیں ساری عمر تیرے رشتے کے گلے پختی رہیں گی۔ تو نے ماں
کا دل خوش کیا۔ اللہ جیسے خوشیوں بھری زندگی دے گا۔ مجھے یقین ہے شکر یہ بیٹا۔“

وہ اس کا ساتھ دیا اور سر ہموں کر خوشی کے عالم میں بول رہی تھیں۔
”مہر جان! میں آپ کی محبت میں نہیں کر سکا کہ شکر کے باوجود۔“

”چلنا اٹھو بیٹا! آج رات کھانا کھاؤ اور کچھ انعامات کا جائزہ لو۔ عالی! تم شہباز کے کھانے کے لیے کچھ لے کر آؤ
اور فاتحہ سے اہل ذہن کو فوراً پار لے کر جانے اور سب مہمانوں کو غلاموں اور تم دونوں کے میکے والے جو
بہت بے قرار تھے شہباز کی غیر موجودگی سے ان کو جا کر کھادو بے چین گلیوں کو سکون آجائے۔“ وہ بہت ہلکی پھلکی
ہوئی تھیں۔

”نہ توں بانو! آج تم چار بچن میں دیکھو۔ کیا صورتحال ہے۔ بازار کے لیے کچھ اڈو اور میں اچھی بھلی
ہوں۔ یونہی نہ سوچ بے موقع مجھے بٹانے بیٹھ جایا کرو۔“

وہ زون بانو کو جھڑک کر بولیں تو وہ دانت کھوٹے گلی اور اٹھ کر باہر چلی گئی۔
”شہباز بیٹے! تم اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو۔ تمہارے میٹھیوں میں بھی کچھ سے ابھی تک تمہارے انتظار میں بھوکی
تھا تھی ہوں۔ فریش ہو کر تو ماں پیشال کر کھاتے ہیں۔ کچھ آخری کھانا کھانے کے بعد تو تم اپنی دلہن کے ساتھ ہی کھایا
کر کے کہیں عالی! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟“

انہوں نے بیار کھڑی عالی سے کہا۔ کوئی بھی جواب دینے پر پختی کر کے کھانسی لگی۔ ایاز اور انظر بھی
فورا ان کے پیچھے چل پڑے ماں بیٹے کے یہ الگ الگ طریقے انہیں ہنسنے نہیں ہو رہے تھے۔

”پہلے تمہارا ہوا بیتے ہیں پھر جس کر ایک ہو جاتے ہیں۔“ ایاز بڑبڑا کر باہر نکلے تو شہباز نے حیرت سے بھائیوں
کی طرف دیکھا جنہوں نے اس سے بات کرنا گوارا نہ کیا تھا۔

”مہر جان! یہ۔“ وہ ذرا حیرت اور دکھ سے بولے۔
”یہ! مسز خان! میرے سے نہیں۔“ یہ دیکھا ہے میرے بچے نہیں بھائی بھی شریک ہو جاتے ہیں تمہارا بیٹوں کی
صاف تھلنے والوں میں۔“ وہ ایک بار پھر اسے محبت سے اپنے ساتھ لپٹانے لگیں۔

۱۱

سزاوار تھا۔ لیبل آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ صوفی صاحب ان چاروں کے ساتھ جیسے بیٹھے ایک
اپ بٹ باہر دیکھتے ہوئے رات میں پکڑی شہج کے والے آہستہ آہستہ گرا رہے تھے ان کے ماتھے پر تسکینوں کا جال
بنا تھا۔ شہج کے والوں کے ساتھ جتنے لب چپ تھے کھد جیسے کسی کھری سوچ میں کم تھے۔ آہستہ چادر میں پوری
تھوڑی ہوئی تھی۔ چہرہ بھی اس نے چادر کے اندر کر رکھا تھا۔ زیب پوری کی پوری اس پر لکھی سو رہی تھی یہی حال
جو پر یہ کا تھا۔ آدھی اماں بی کی گود میں اور آدھی کپڑوں کی گھڑیوں پر بند ہوش ہو کر سوئی ہوئی تھی۔ اماں بی بولتے
وٹنے سے آنکھوں کے نم کو شے صاف کرتیں اور سینے سے ایک سرداہ خارج کرتیں تو صوفی صاحب گھور کر ان کو
غور دیکھتے۔ وہ سر ہٹا کر رو رہے کھال سنوارتے لگتیں۔

”عبدالرحمن کو تو کچھ بھی نہیں پتا۔ وہ پریشان ہو گا۔“ پورے سفر کے دوران اماں بی نے صرف یہ دو جملے بولے تھے۔

صوفی صاحب نے کمرے کی باتیں دیوار کے ساتھ لگے ڈیش بورڈ پر پہلے ہٹن کو دبایا، کمرے کا اکلوتا بلب پوری شان سے جل اٹھا مگر کمرے کی حالت تو سخن سے بھی ناگفتہ تھی۔ ایک دیوار تو بالکل سیاہ زہ تھی اور سفیدی جو کبھی شاید پہلے رنگ کی تھی اب اس کا رنگ بالکل فق ہو چکا تھا۔ دیواروں اور فرش کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا پھست لٹی آرکی تھی۔ اس کی اینٹوں کی درازوں میں پتھریکیاں اور نامعلوم کون کون سے حشرات تھے جو روشنی ہوتے ہی کونے کھدروں میں چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔ کمرے میں اگلا تو بیان کی چارپائی تقریباً ٹوٹی ہوئی تھی اور وہی اس کمرے کا اکلوتا فرنیچر تھا۔ کمرے میں نہ کوئی روشندان تھا نہ کوئی کھڑکی۔ اماں جی سمیت سب کے والوں پر جیسے اس پر گئی۔

دوسرا کمرہ البتہ کچھ بہتر تھا۔ پہلے کمرے سے کچھ کشادہ بھی تھا اور اس میں کھڑکی بھی تھی۔ کمرے کی سفیدی بھی کچھ بہتر حالت میں تھی۔ ایک کمرے کے پتھوں بیچ بڑی شان سے بڑی شاید ان کا منہ چڑا رہی تھی۔ ہم اُدھر کیسے رہیں گے۔ آمنے کے دل میں سوچا وہ بس رو دینے کو تھی۔ یہی حال زینب کا بھی تھا۔

اماں جی! واپس چلیں گھر مجھے نہیں اُدھر رہنا یہ کمرہ آہ واپس چلیں۔ جو یہاں کے ٹھنک کر رونا شروع کر دیا۔

”خاموش یہ وقت! چپ کر اؤ اسے راجہ بی بی!“ صوفی صاحب جو مرے کے روتے پر غصے اور جھنجھلاہٹ میں بولے۔ اماں جی ٹھنک کر جو ریا کو پیار سے سمیٹنے لگیں جو ان کی گود میں چلی جا رہی تھی۔

اسی وقت عیال نے سامان اوپر لانا شروع کر دیا۔

”تم لوگ صفائی کرو لکھری۔ صاف ہو جائے گا تو اچھا لگے گا۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ سفیدی دوبارہ ہو جائے۔ میں ذرا مسجد میں انام صاحب اور دو سرے لوگوں سے مل لوں۔ قلا کا وقت ہی لگا جایا ہے۔ تم لوگ جلدی سے نماز پڑھ کر صفائی شروع کرو۔“ صوفی صاحب گھر کی حالت اور ان چاروں کی سرصفائی صورتوں سے نظریں پرا کر نیچے میز جیوں کی طرف بڑھے۔

”اور ہاں ناشتہ نہ بنانا۔ ابھی تو سامان کھلنے میں بھی کچھ ٹائم لگے گا۔ عیال سامان رکھ لے تو میں اس کے ہاتھ ناشتہ باہر سے منگو لیتا ہوں شہو ایک میل کو رکے۔“

”راجہ بی بی! ابھی ہمیں کچھ عرصہ اُدھر ہی رہنا ہے شوق سے نہ سہی مجھو پوری سے تمہیں اس لیے بیچوں کو سمجھاؤ۔“

”اے میرے اللہ۔ اماں جی! ہم اُدھر رہیں گے۔ کبھی نہیں۔“ زینب نے بہت ویر کار کا ہوا سانس اچھے ہٹنے سے خارج کیا اور تاک چھا کر ایک حقارت بھری نظر پورے گھر پر ڈالی۔

”سننا نہیں۔ تمہارے بابا صاحب کیا کہہ کر گئے ہیں۔ ہمیں ابھی اُدھر ہی رہنا ہے۔ کچھ عرصہ۔“ اماں جی سنجیدگی سے بولیں اور اپنی چادر اتار کر تہہ کرنے لگیں اور پتھر پر پھیلا حائل ٹارپٹ کھول کر سر براؤزہ لیا۔ آمنہ نے حالی ہی ہو کر چھت کو جالی میز جیوں پر بیٹھ گئی۔ نیچے سے آئی میز جیوں کے پاس سامان کا ڈھیر لٹکا جا رہا تھا۔ جو ریا انہیں گھڑیوں پر بیٹھ کر پتھر سے اونگھنے لگی تھی کہ اسے ایک دم سے پھر کچھ یاد آیا۔

”اماں جی! گھر چلیں نا۔“ وہ پتھر سے رونے کی تیاری پکڑنے لگی۔

”اچھا بچے! چلیں گے۔ کیوں نہیں چلیں۔ تم پریشان کیوں ہوتی ہو۔ بس تھوڑے دن ہی اُدھر رہیں گے۔ اچھے بچے تو اماں کا کہنا ہے ہیں نا پھر اُدھر تمہارا بھائی بھی تو آئے گا عید التین وہ میری دعوتی کو سیر کروا کے لائے گا۔ ابھی اچھی چیزیں لے کر دے گا۔ وہ تو تم سے بہت پیار کرتا ہے نا۔“ اماں جی اسے ساتھ لپٹا کر پتھر کرنے لگیں۔ جو ریا نے بڑے دھیان سے ان کی بات سنی۔

”سچ اماں جی! بھائی آئے گا۔“ اس کے معصوم چہرے پر چمک سی آگئی۔

”ہاں آئے گا۔ میں تمہارے بابا صاحب سے کہوں گی۔ آج یا کل جا کر اسے لے کر آئیں پھر جو ریا کو اپنے

ساتھ سیر کروانے لے جائے گا۔“

”کئی بات اماں جی نا!“ جو ریا کی خوشی کا جیسے کوئی ٹھکانا نہ رہا۔

”یہی بالکل سچی۔“ اماں جی نے اس کے پھیلے منہ سے ہاتھ پراپنا ہاتھ رکھ دیا تو وہ چند منٹ پہلے گھر کا نم بھول کر عیال، نوسلمان اٹھا اٹھا کر اوپر لا رہا تھا۔ اس میں سے کچھ صوفی جیوں نے اٹھانے لگی۔

”اؤ نہ! کئی بات۔ اتنا اچھا بھائی ہو نا تو کاؤں نہ کبھی بھولے سے ملے آتا۔ پچھ ماہ سے اوپر ہو چلے نواب صاحب نے کبھی مڑ کر نہیں دیکھا اور اُدھر سیر کروائیں گے۔ سوچنا تمام اب ہم اس گند خانے سے کہیں بھی نہیں جا سکیں گے کبھی بھی نہیں۔ ہمیں پڑھ کر مر جائیں گے۔ میں تم اماں جی سب۔“

زینب کا دلیر آواز میں بولی اور آمنہ کے پاس جا کر سیڑھی پر بیٹھ گئی اور گھٹنوں میں سر دے کر خاموش آواز سے رونے لگی۔

”بچے۔ زینب یہ باطل ہوئی ہو۔ خدا نہ کرے میں ہمارے دشمن۔ بیٹا! جبر کرتے ہیں۔ کچھ مصیبت کی گھڑی میں۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ وہ ہماری حالت سے ہم سے زیادہ باخبر ہے۔ یوں تو صلہ نہیں ہارتے۔ اس میں بھی حضور اللہ کی کوئی بہتری ہوگی۔ تم تو کچھ وار پٹی ہو میری۔ اس طرح جو کمر میرے پیچھے پریشان مت کرو۔“ اماں جی اس کے پاس آکر اس کا سر پھیلے ہوئے بولیں۔

”بابا صاحب ہمیں کیوں اُدھر لائے۔ اتنا گند اٹھاتا چھوٹا سا گھر ہے یہ۔ میرا اُدھر دم کھٹنے لگا ہے۔ ہمیں بس واپس لے جائیں مجھے نہیں اُدھر رہنا۔ جھوٹا گناہم اُدھر ہی جھیل لیں گے۔ بس آپ بابا صاحب سے کہیں۔“ اس نے ایک منٹ میں اپنی آنکھیں چھوڑ کر آنکھوں سے تر کر لیا تھا۔ زینب کے اس طرح بے ساختہ رونے سے آمنہ نہایت حیرت سے اُدھر اُدھر زینب بہت مہیٹ تھی۔ چھوٹی موٹی پریشانی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔

”اچھا بچے! تمہیں کچھ سہارا دے دوں گا۔ تمہیں جا سکتے۔ کچھ دن صبر کرو۔ میں بات کروں گی تمہارے بابا صاحب سے۔ اُدھر ہم تم لوگوں کی بہتری کے لیے ہیں اگر تم لوگ خوش نہیں تو ہم واپس چلے جائیں گے۔ چلو اٹھو شتاباش۔ سن کے ساتھ مل کر کام کرو۔ صفائی کرو۔ سامان لگاؤ جگہ ٹھکانے پر پھر دیکھنا یہ گند اگھر بھی اچھا لگنے لگے گا۔ تم تو میری بہت حوصلے والی ہوئی ہو نا۔ اماں جی خلاف معمول اسے بہت اچھے طریقے سے پنڈل کر رہی تھیں۔“

”آمنہ! بہن کو سمجھاؤ۔“ انہوں نے بالکل چپ۔ بیٹھی دونوں کا دکھالہ۔ سنی آمنہ سے کہا۔

آمنہ نے ایک افسوس بھری نظر سہا کو دیکھا۔

”اماں جی! میں کون سا زینب سے پانچ سات سال بڑی ہوں۔ کیا میرا دل نہیں رونے کو اُدھر سے بھاگ جانے کو چاہ رہا۔“ اس نے بولتی نظروں کا رخ بدل کر زینب کو دیکھا۔

”اؤ زینب! صفائی کریں۔ ہم بھلا اپنا سامان کون سے کمرے میں لگائیں گے۔“ وہ اس کا بازو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولی۔

”اؤ نہ! بڑا یہ شیش محل ہے نا جو تمہیں علیحدہ سے کوئی شاندار کمرہ ملے گا۔ کہیں بھی گھس جاؤ اس ڈربے میں بڑے چوہوں کے نل ہوں گے۔“ وہ گلے کر بولی مگر اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔

”اچھا تم اٹھو تو۔“ کہتے ہیں۔ تم کس مل میں پوری آجیاؤ گی اور میں کس میں۔ تم اٹھو تو سہی۔“ آمنہ نے زبر دستی اس کا ہاتھ کھینچا تو وہ بڑبڑاتے ہوئے آمنہ کے ساتھ اٹھ گئی۔

اماں جی بچن میں بیٹھ کر چوما کھول کر جاڑو لینے لگیں۔

”لگتا ہے کچھ ٹھیک نہیں ہوا۔ بہت کچھ غلط ہو گیا ہے۔ بیچوں کا یوں رونا اور دل برا کرنا۔“ جو لہے کی پتیاں اوپر کھینچتے ان کے ہاتھ دکھتے وہ تو ہم پرست نہیں تھیں اور ایک مولوی کی بیوی تو ہم پرست ہو بھی نہیں سکتی۔ مگر نہ جانے کیوں ان کا دل خود گدہ رہا تھا۔ انہوں نے اُدھر آکر اچھا نہیں کیا۔ ایک ان دیکھے طال کے غبار

نے ان کے بحال رہنے کو چاہیے چار جانب سے اپنے حصار میں لے لیا۔

”یہ کیا ہے مسٹر سلطان بخت؟“ سلطان بخت اتنی تیز آواز پر اپنی نشست سے بچھے اچھل ہی پڑے۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ گل کدہ بیچنے تھے۔ اندازم انہیں لاؤنج میں ہی بیٹھا کیا تھا۔

”میں بی بی کو اطلاع دیتا ہوں گی۔“ وہ نین تارا کو ان کی آمد کا بتانے چلا گیا تو وہ گار۔ سٹاکراں کی آمد کے بعد کے حسین تصویر میں کھوکے جب بیچنے سے نین تارا کی چیل جیسی آواز نے انہیں گرنٹ لگا دیا۔ وہ انگلیں اخبار کا کوئی صفحہ ان کی آنکھوں کے آگے لہرائی تھی۔ وہ ٹھیک سے دیکھ نہ پائے۔

”واشٹن ان مینس تارا ڈارلنگ لیب ویکم کا کون سا انداز ہے۔“ وہ ٹھٹ سے کچھ برامان کر بولے۔
”س ازناٹ تان سینس مسٹر شاہی! تان سینس تو یہ ہے جو آپ نے میرے ساتھ کیا ہے۔ میں آپ کو کیا بھتی رہی۔ آپ کو میں نے اپنے خدا کا درجہ دیا۔ آپ کی خاطر میں نے اپنی ماں کی نافرمانی کی اور آپ نے مجھے صلہ دیا۔ یہ سب وہ اخبار ان کے آگے بچ کر ابیدہ لے لے میں ہوئی۔

”آخر ہوا کیا ہے۔ ایسا کیا لکھ لیا تم نے اخبار میں جو نیک ایک یوں بچھتانا لگیں۔“
انہوں نے کچھ اتنا بٹ بھرے انداز میں بھٹ کر بیٹے کا رپٹ پر کر کے اخبار کو اٹھا کر دیکھا۔ صفحے کے مرکزی حصے میں سلطان شاہ اور کچھ قریبی اصحاب کے ساتھ گروپ فوٹو تھا۔ ان کے بیچے کے تنکشی کی تصویر اور نیچے لکھی موقی کی تفصیل۔ ایک پل کو تو انہیں کوئی جواب ہوئی۔ بھوٹ نہیں سو جھان انہوں نے تو ایسا سوچا بھی نہیں تھا کہ نین تارا تک یہ خبر اس ذریعے سے پہنچے گی اور گھر سے نکلنے کے بعد تو یہ بات ان کے گمان میں بھی نہ تھی۔ ورنہ وہ ان میں کوئی نہ کوئی مفصل ہنگامی لکھ کر لکھتے۔

”تصویر ہے بھئی میری بابا جان کے ساتھ۔“ وہ پھینکی سی ہنسی ہنس کر بولے۔ چند لمحے لگتے ہی انہیں خود کو سنبالتے میں اور اب وہ نین تارا کے ہر حملے کے لیے خود کو تیار سمجھ رہے تھے۔
”مگر ایسا کون سا اہم موقع تھا جس کی تصویر اتنے ظہور سے اخبار میں شائع ہوئی ہے۔ وہ یہ جھٹے ہوئے لے لے میں بیچ کر بولی۔

”میرا خیال ہے اتنی انگلیں تو تمہیں بھی آتی ہے۔“ وہ ہلا ہوا انداز میں لہ لہ کر بولی۔
”غصہ زرا بھی نہیں دکھانا۔ نین تارا کے شعلہ بوالہ موڈ کا جواب صرف اور صرف اس ہے۔

”آتی ہے مگر میری انگلیں اتنی اچھی نہیں۔ براہ قوی ہے میں نے مرے مطلب سمجھ میں لیا۔ میں نے آپ سے اس نمایاں خبر کا ترجمہ پوچھ رہی ہوں۔“ وہ غصے سے ان کے سامنے تن کر آگڑی ہوئی۔ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوفی سے بولی۔

”کم آن ڈارلنگ! میں اتنا اچھا موڈ لے کر آیا تھا اور تم کیا یہ فضول کی بخت لے کر کھڑی ہو گئی ہو۔ چلو تیار ہو جاؤ۔ نہیں پار چلتے ہیں۔“ وہ بولے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

”نشٹ اپ مسٹر سلطان بخت! نشٹ اپ۔ اتنا سستا سمجھ لیا ہے آپ نے مجھے۔ جب بی چاہے گا آکر مجھ سے کھیل لیں گے۔ مخالف کھینے گا میں آپ کی باری ڈول نہیں ہوں۔ آپ مجھے داموں خرید کر اسے ہیں اور اب کبھی تمہارا یاد آئے پر اس پر بیٹی مچی محبت کی ایک نظر ڈالتے آجاتے ہیں۔ میں بیوی ہوں آپ کی نکاح کیا ہے آپ نے مجھ سے اور جو کھیل آپ نے مجھ سے کھیلا ہے وہ آپ کو بہت مزہ کا پڑے گا بہت مزہ گا۔“ وہ خوفناک انداز میں غرارہتی تھی۔

”تارا ماٹی سوٹ ہارٹ۔ اتنا غصہ۔“ انہوں نے اس کی مسخ ہوتی ناک کو چھوا وہ تڑپ کر بیچھے ہٹی اور ان کے ہاتھ کو زوردار جھٹکا دیا۔

”تم غصے میں یہی قیامت ڈھار رہی ہو۔ یہ کوئی میرے دل سے پوچھو۔“ وہ اس پذیرائی پر ذرا بھی بے مزونہ

ہوئے بڑے تھوڑے ہی بولے۔

”قیامت تو آپ نے مجھ پر ڈھائی ہے شاہی۔ میرا وجود بازار کا کوئی رلا ہوا اٹھلوتا نہیں تھا۔ آپ سے پہلے تو مجھے ہو کے سوا کسی نے چھوا تک نہیں تھا۔ مجھ سے پوچھیے کن کن جیلوں بہانوں سے میں نے اپنی ماں کی لاکھوں کروڑوں کی ڈینگ کو الٹ ماری تھی۔ صرف آپ کی محبت آپ کی چاہت کے حصول کی خاطر اور آپ نے یہ صلہ دیا مجھ کو۔ سچی ہی نظروں میں بے مول کر دیا مجھ کو۔“ وہ صوفے پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”نین تارا میری جان یوں مت رو۔ پلیز۔ میرا دل پھٹ جائے گا۔ نیو آئی لو یو آئی رہی۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لیتا چاہا۔ وہ روتے روتے ایک لٹ چپ کر گئی اور اچھل کر دوسرے صوفے پر چاٹتی تھی۔

”تمت چھو میں جھٹے آپ سے کچھ آ رہی ہے۔ مجھ نے اپنا ہاؤز فریجی ماما ٹھیک کتنی تھیں۔ تم لوگ تو بھنورے ہوتے ہو۔ پیوں کی جھٹک دکھا کر پھول پھول کا رس چوستے والے اب مجھ سے کیا چاہیے آپ کو۔ قدموں میں تو رول دیا اور کتنا ذلیل کریں گے۔ تیری بیچھے کر خوش ہوں۔ آئی ہیٹ ہو۔“

وہ بولتے ہوئے کئی رونے لگی۔ کبھی بیچھے لگتی۔ عجیب مسرمانی کیفیت ہو رہی تھی اس کی اور سلطان بخت کو اس کے اتنے سخت رد عمل کی توقع نہ تھی۔

”پلیز نین تارا! مجھے کی کو نہیں کرو میں نے شادی ضرور کی ہے مگر وہ مجھے قلعہ پسند نہیں۔ میں نے اسے چھوا تک نہیں سوہ میری مجبوری تھی۔ صرف بابا جان کی خاطر آپا کی خاطر۔“ اب وہ لڑکھانے لگے تھے۔ منتوں پر اتر آئے تھے۔

”شاہی! اتنے کم عمر تو نہیں ہیں آپ۔“ انہیں بھی بہت دیکھ رکھی ہوں گی اور گھنٹا اواسٹوریز بھی پڑھ رکھی ہوں گی۔
”ہاؤز لگائی جا چکا تھا۔“ وہ زہر خند لگتے میں چبا چبا کر بولی۔

”نن تارا! اسے زور سہلے۔“ اتنی اس کا پر سلطان بخت کا چہرہ مسخ ہو گیا۔

”رو۔“ آپ نے آپ اپنے غور کریں مسٹر سلطان بخت! اگر یہ آپ کی مجبوری تھی تو بھی آپ نے مجھ سے اجازت لینا تو درکنار مجھے بتانے کی بھی زحمت کو ارا نہیں کی۔ اتنا بھوٹ اور فریب سے مجھے الوہاتے رہے کہ آپ ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ آپ کا ہر لڑکا گھنٹا ہو گا۔ مجھے سوچ کر کچھ آ رہی ہے۔ یہ تھی آپ کی مجھ سے محبت۔
”نین تارا! میری بات اولم سے سٹو میں جاری بات تمہیں بتانا چاہتا تھا مگر اس وقت۔۔۔“

”تمت بھوٹ بھوٹ کھڑیں۔“

”جھٹک نہیں آپ اس قدر بھوٹ بول کر۔ میرے اعتماد کو میرے اختیار کو چکنا چور کیا ہے آپ نے۔ میں آپ کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔ طے چاہیں آپ یہاں سے۔“ وہ مسلسل لٹی میں سہلاتے بول رہی تھی۔

”نین تارا! میری بات تو سنو۔ دیکھو یہ بات نہیں ہے کہ میں نے تمہیں کبھی یہ بات نہیں بتائی تھی۔“ سلطان بخت کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس معاملے کو کیسے سمجھالیں۔ نین تارا میری طرح ان سے بدظن ہو چکی تھی۔

”بات مجھ سے کرو مسٹر سید زادے! یہ کیا کھیل کھیلا تم نے میری پھولوں جیسی معصوم بیٹی کی ساتھ۔ ارے دھوکے باز۔ میں نے تیرا اٹھار کیا اپنی ان پھولی بیٹی تیرے ہاتھوں میں دی۔ یہ قدر جانی تم نے ہاتھ میں تجرہ کار گھاگ بڑھا دھوکا کھائی تمہیں فریبی سے۔“

زیور گل کو شاید اب ان کی لہ کی خبر ہوئی تھی۔ جینتی ہوئی اندر آئی اور سلطان بخت کا جی چاہا۔ دونوں کو شوٹ کر دیں۔ زیور گل کی بکواس سن کر تو ان کا خون کھول اٹھا۔

”زیور گل! یہ میرا اور نین تارا کا ذاتی معاملہ ہے۔ تم بیچ میں مت بولو۔

”اور نین تارا میرا ذاتی معاملہ ہے۔“ وہ جواب دہ تھی۔ ”تم میرے آگے جواب دو ہو۔ میری بیٹی معصوم ہے۔ تم پھر اسے اپنی چینی چہری باتوں سے چالو گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ بولو کیوں دیا تم نے یہ دھوکا۔ وہ بازاری عورت

تھی۔ تماشا لگانا بھی جانتی تھی اور تماشا بنا تا بھی۔

اس کی آواز لاؤنج کی دیواروں کو پھلانگتی ہوئی کس کس کی سماعتوں میں جاری تھی اسے اس کی کچھ خبر نہ تھی وہ بے تکلف بولے جارہی تھی۔

”نہیں تارا میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں ساری بات بتاتا ہوں اگر بات تمہاری سمجھ میں آئی تو پھر جو تم کہو گی۔ میں وہی کروں گا۔“

وہ بات کو سمیٹنے کے خیال سے نین تارا کی طرف بڑھے اور اس کا ہاتھ تھام کر باہر جانا چاہا۔ زیور گل پتیل کی طرح زیور تارا پر بھی۔

”اس کو ہاتھ لگانے سے پہلے مجھ سے بات کرو، سمجھو۔“ وہ تن کر دونوں کے چچ آکھڑی ہوئی۔

”داغ خراب ہو گیا ہے تمہارا اس پرہاے میں۔ بٹو پیچھے، مجھے اپنی بیوی سے بات کرنے دو۔“ سلطان بخت نے اسے دھکا دے کر بیچ میں سے ہٹانا چاہا مگر ان کا دھکا اسے ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا سکا۔

”بیکم میب! ملک صیب کا ڈرا نیور آیا ہے آپ کو اور بی بی کو لینے۔“ اسی وقت ملازم کے اندر آکر اطلاع دی۔ اندر کا منتظر اس کے لیے نیا نہیں تھا۔

”آ رہے ہیں ہم۔“ وہ ملازم سے بلند آواز میں بولی۔ ”چلو نین تارا!“ ان کے پلٹ کر نین تارا کا ہاتھ پکڑا اور دونوں بیرونی دروازے کی طرف بڑھے گئیں۔

”نین تارا! تم نہیں جا سکتیں۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔“ وہ دروازے کے پاس آکر ٹیٹ کر بولے۔

”ہمت آپ کے اس طرح کے فضول حکم مان چکی ہوں میں، صیب آپ نے میرا کوئی مان نہیں رکھا تو مجھے بھی آپ کی کوئی پرواہ نہیں۔ چاہے آپ چوراہے پر کھڑے ہو کر حکم حکم چلاتے رہیں مگر سلطان بخت“

وہ جاتے جاتے ایک پل کو رکھی اور ایک بھر پور نظران کے پڑھنے پڑھانے اور اس کے ساتھ باہر نکل گیا۔ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

”یہ تو میری توقع سے زیادہ تیز نفی ہے۔“ تھوڑی دیر بعد وہ خود کو کنبھال چکے تھے اور اب نین تارا کو دوبارہ قابو کرنے کی ترکیب سوچنے لگے۔

رات کا ایک بجنا تھا، زیور گل اور نین تارا کی گاڑی کل کدہ کے گیٹ میں داخل ہوئی۔ گیٹ کے بالکل پاس سلطان بخت کی بی ایچ ڈبلیو کھڑی تھی۔ نین تارا اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ یہ لڑکی تک نہیں ہیں۔“ وہ

ماں کی طرف دیکھ کر بولی، ”ہو گاڑی سے باہر نکل رہی تھی۔ سلطان بخت گاڑی کے اندر موجود تھے اور اسے تک سیٹ کا دروازہ کھول کر باہر نکلے اور نین تارا کی طرف بڑھے۔

”چلو میرے ساتھ۔“ انہوں نے بے حد مضبوطی سے اس کی نازک کلائی پکڑی اور اس کی مزاحمت کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے اندر دھکیل دیا۔

”نام بام! پیلپ می۔ مجھے ان کے ساتھ نہیں جانا۔“ نین تارا چی رہی تھی۔

”سلطان بخت! اتارو میری بیٹی کو۔ تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو، میں پولیس کو فون کروں گی۔ یہ کوئی مذاق نہیں۔“ زیور گل وہیں کھڑے کھڑے چلائی۔

”نام پیلپ۔“ نین تارا کی پکار پر زیور گل آسکی سے سلطان بخت کی گاڑی کی طرف بڑھی مگر اتنی دیر تک وہ گاڑی گیٹ تک لے جا چکے تھے۔

اسکے ہی پل کھلے گیٹ سے گاڑی باہر جا چکی تھی۔

”پتو کیدار! ایٹ بند کرو۔ زیور گل نے مطمئن لہجے میں پتو کیدار کو حکم دیا اور خود اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گئی پتو کیدار نے کچھ حیرت سے مالکن کو دیکھا اور پھر کندھے اچکا کر گیٹ بند کرنے لگا۔

جگہ عروسی انتہائی خوبصورت طریقے سے سجایا گیا تھا۔ پہلی نظر ہی میں کمرو کی آرائش کرنے والے کے ماہر ہاتھوں کو داہنے کوئی چاہتا تھا۔

گرے گولڈن بے حد قیمتی مگر نازک فرنیچر کے ساتھ کارپٹ بھی ڈارک گرے اور لائٹ کٹر کا بچھا تھا۔ کبھی کیپٹن شہباز کے دل نے اس طرح اپنے جگہ عروسی کو جانے کی دل میں خواہش کی تھی اور اسی کٹر کے فرنیچر کا ذکر

یونہی باتوں باتوں میں ام جان سے بھی کیا تھا۔ آج ان کی وہ تمام خواہشیں تو مجسم ہو کر نگاہوں کو سیر کر رہی تھیں مگر ان کا دل بری طرح سے بچھا ہوا تھا۔ کمرے کی مین لائٹ کے ساتھ خوبصورت فانوس عین ڈرنگ ٹیبل کے اوپر

چھت پر جگہ گارہا تھا۔ خوبصورت سلکی گرے گولڈن پردے کمرے کی خوبصورتی میں حصہ دار تھے۔ کمرے میں گلاب کی تیز اور موستے کی مدھم بھنی بھنی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہر چیز مکمل تھی۔ خوشبو خوشبو آرائش اور وہ

بھی جو کبھی ان کے دل کی پہلی آرزو تھی۔ ان کی نگاہوں کے سامنے لی ٹیبل کٹر کا خوبصورت عروسی جوڑا زیب تن کیے ہوئے تقریباً گھنٹوں میں وہیں ان کی توجہ کی منتظر نظر بھی تھی۔ مگر اس کو مخاطب کرنے کی اس کے جگر جگر کرتے

حسن کی اور دلچسپ روپ کو چھو کر قریب سے دیکھنے کی ذرا بھی تمنا ان کے دل میں نہ تھی۔ بس دل چاہ رہا تھا۔ اس خوبصورت ماحول سے اسے ناپسندیدہ وجود کو اٹھا کر کہیں بہت دور پھینک آئیں جہاں وہ زندگی بھر انہیں دوبارہ نظر نہ

آئے نفرت کی ایک تازہ لہر ہی ان کے سینے میں ابھری۔

غصہ اور نفرت اس قدر زیادہ تھی جو اس ماحول کی خوبصورتی اور حسن سے بھی کم نہ ہو رہی تھی۔ النان کا دم گھٹ رہا تھا۔

ہوش کا خشک بڑا زبردست رہا تھا۔ ان کی آنے سب کے منہ بند کر دیتے تھے۔ پھر وہ لہا لہا من کا ایک طویل فوٹو سیشن اور عروسی کا مرحلہ، جل میں اسوں نے ذرا بھی یہ ظاہر نہیں کیا کہ یہ تمام مرحلے ان کے دل کی خوشی سے

میں طے کیے جا رہے ہیں۔ یہاں صرف اپنی ماں کی محبت کے ہاتھوں بندھ کر بیٹھے ہیں اور یہ جو نازک سی خوبصورت لڑکی ان کے پہلو میں بہت قریب آئے قریب کہ اس کے جسم کی نرم سی حرارت ان کے وجود کو مسلسل بے چین

کیے جا رہی ہے۔ جو لوگوں کے تعریفی جملوں اور کمنٹس پر بھی بالکل بے حس بیٹھی ہے۔ ان کے دل کی مراد نہیں۔ ان کے من کی خوشی نہیں۔ انہوں نے اپنے مضبوط دل کی بے قرار یوں کو ذرا بھی چہرے سے ظاہر نہ ہونے

دیا۔ ان کی ایکٹنگ ایک دم بے باک تھی۔ ان کے شو میں کہیں بھی بھول نہیں تھا۔

مگر اسے۔ وہ تھکا چڑھی تھی دنیا کو دھوکا دے دیا مگر اب۔

انہوں نے لوٹ کے من کھولے۔

وہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتے تھے مگر اسے اپنی شدید نفرت سے بھی آگاہ کرنا چاہتے تھے۔

پشت پر ہاتھ باندھ کر کمرے میں ٹھلٹھا شروع کر دیا۔

نزدت کا بھی چاہا پینڈولم کی طرح مضطرب انداز میں چکر کاٹتے اس سفاک شخص سے ہاتھ باندھ کر پوچھتے۔

”آخر مجھے اور کتنی سزا دو گے۔“ ایک باغی آنسو اس کی بو جھل پکلیوں کا بند توڑ کر اس کی کلائی کے گہرور میں کہیں گہر ہو گیا۔

کیپٹن شہباز نے وارڈ روم کھول کر کپڑوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ان کے کپڑوں کے ساتھ نزدت کے کپڑے لنگے ان کا منہ بڑا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے دو سوٹ ڈنگر سے نکالے اور بیڈ پر رکھا کرتے شروع کر دیے۔

نزدت نے سچی نظروں سے ان کی اس عجیب مصروفیت کو حیرت سے دیکھا۔ سوٹ تہہ کر کے انہوں نے ڈرنگ روم سے اپنا بیگ گھسیٹا۔ زپ کھول کر دونوں سوٹ اس میں رکھ زپ بند کی۔

کوٹ اتار کر بیڈ کی پائنتی رکھ لگا لی کی گھڑی اتاری۔ بیڈ کی سائیڈ پر بیٹھ کر جوتے اتارنے موزے کھینچ کر فرش پر ڈالے اور کھڑے ہو کر ایک نظر اسی پوزیشن میں بے حس بیٹھی نزدت کو دیکھا اور واش روم کا رخ کیا۔

اور ٹھیک چند منٹ بعد وہ دوبارہ سے کوٹ موزے جوتے اور گھڑی چڑھا کر بیگ ہاتھ میں تھامے کہیں جانے کو

نزہت کے سینے میں ہر کتا دل جیسے تھم جانے کو تھا۔

”یہ تمہارا رو نمائی کا آفٹ ہو مجھے شام کو ام جان نے دیا تھا۔ کھول کر دیکھ لینا۔ کیا ہے۔“ انہوں نے کھڑے کھڑے کوئی چیز اس کی طرف پھینکی۔ جانے کو قدم بڑھانے پھر کچھ سوچ کر ایک بل کو رکے۔
”رو نمائی کا آفٹ اپنی پسند سے میں نے نکاح کے بعد اوجھڑ آنے کے اگلے روز ہی خرید لیا تھا۔ اب سوچ رہا ہوں۔ جاتے ہوئے اسے دریائے جہلم کی نذر کروں۔ یہ اس کا بہتر مصرف ہو گا۔“ وہ بہت شرمناک رہا تھا۔

”میں جا رہا ہوں۔ اپنی عزت کا مان رکھنے آیا تھا۔ شاید دوبارہ آؤں یا شاید کبھی نہ آؤں۔ مجھے ابھی کچھ بتا نہیں۔“ انہوں نے سر کو جھٹکایا اور یاہر کی طرف قدم بڑھائے۔
”اور یاد۔“ نزہت کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ وہ اچھل کر اپنی شرم و حیا کو چومے میں جھونک کر ان کے سامنے کھڑی تھی سر اٹھا کر۔

”اور میری عزت میرا نام کون رکھے گا؟“ کب کے آنسو بھل بھل اس کے حسین بے آواز سے چہرے پر پھیلنے لگے اور کیپٹن شہباز تو جیسے اس کو دیکھ کر ہلکا جھپکنا ہی بھول گئے۔ وہ نزہت میں تھی۔ وہ تو انہیں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔

”کیا یہ دلہن بن کر اتنی حسین بھی لگ سکتی تھی اس کی ستواں کھڑی ایک سرخ ہو گئی تھی۔ خوبصورت ترشے ہوئے لب کی لپکا رہے تھے۔ وہ سر لیا شہر لیا سوال بنی ان کی سامنے کھڑی تھی۔
بس اسی لمحے کا ڈر تھا انہیں۔ سب۔ سب کچھ اس لمحے میں تھس تھس ہو سکتا تھا۔

انہوں نے بمشکل تمام خود کو دوسرے رخ پر گھمایا اور نظروں کا تیرا تیرا بدل تو لے ایمان ہو چکا تھا نظروں کے سامنے بننے لگے کھڑا تھا۔

”پلاؤ اور دیکھو۔ دیکھو۔ ایک بار۔ ایک بار اور صرف ایک بار مزہ دیکھو تو کسی دیکھو نا۔“ حکم پر حکم دیے جا رہا تھا ان کے ماتھے پر پستے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ بیگ کے اسٹریپس پر انہوں کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔
”تم جانتے ہو تم جانتے ہو دل کی گہرائیوں سے۔ نزہت بے قصور ہے۔ پھر اس بے جا کی انا اور اکثر سے کیا حاصل۔ یہاں اپنے دل کی خوشی سے منہ موڑ رہے ہو۔ سوچو تو؟“

”چپ کرو تم بند کرو اپنی فضول بیک بک۔“ انہوں نے دل کو زور سے جھڑکا اور دوبارہ سے نزہت کی طرف رخ موڑ لیا۔ وہ ابھی بھی زار و قطار رو رہی تھی۔

”کون میری عزت رکھے گا۔ آپ کو میرا ذرا بھی خیال نہیں۔“
اس کا وہ سرا باندہ ان کو زمین بوس کرنے کے لیے کافی تھا۔ جی چاہا بس سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کے حسین چہرے کو اپنے سینے میں چھپا لیں۔ اس کے نازک بدن کو اپنی ہانہوں کو گھیرے۔ کبھی نہ نکلتے دیں۔ کبھی بھی نہ۔
”میں ان کی عزت رکھنے آیا تھا جو میری عزت کا خیال رکھے رہتے ہیں اور عزت کا دھیان بھی ان کا رکھا جاتا ہے۔ جن کی کوئی عزت ہوتی ہے اور بیباک تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہو۔“

وہ اس کو جھٹک کر دروازے کی طرف بڑھے۔

”جھوٹ ہے سب۔ جھوٹ ہے میں نے کچھ نہیں کیا پھر کوئی کہا نہیں مانا۔ میں بے گناہ ہوں پاک ہوں پہلے دن کی طرح جب میں پیدا ہوئی تھی۔ آخر کوئی میری بات کیوں نہیں مانتا کیوں نہیں سنتا لیکن شہباز آپ تو مجھے جانتے ہیں۔“ وہ بری طرح سے پکھڑ رہی تھی۔ ان کے کوٹ کی آستین کھینچ کر روئے جا رہی تھی۔

”جانتا تھا پہلے اب۔“ انہوں نے۔ اتنی زور سے اپنا ہونٹ کاٹا کہ اس میں سے خون رسنے لگا۔
دل مسلسل ان کی انا کی راہ میں مزاحم ہو رہا تھا۔ فرار کے سارے رستے جیسے بند ہوتے جا رہے تھے۔ شاید وہ

تھک کر بیگ پر بے پھینک ہی دیتے اور پلٹ کر اس در نایاب کو اپنے ساتھ لپٹا ہی لیتے مگر پھر انا کا کوڑیا لہ ساپ پھن اٹھا کر ان کے سامنے اپنی سیاہ زہریلی زبان نکال کر کھڑا ہو گیا۔

”یہ وہی لڑکی ہے جو دو راتیں گھر سے باہر گزار کر آئی ہے۔ اس کے گھر والوں نے بھی اسے قبول نہیں کیا مگر اس قدر بے غیرت ہو کہ اس گند کو سینے سے لگاؤ گے۔ کیپٹن شہباز اتم تو بہت دعوے کرتے تھے اپنی ہم سفر کی پاکیزگی کے لیے۔ یہ تمہاری پاک یا زہم سفر۔ دو راتیں نہ جانے کس کس کے بستر کی زینت بن کر تم تک پہنچی ہے۔“ نقیب نے کیپٹن تم پر۔

انہوں نے ایک تھپتھپ سے دروازہ کھولا۔

”یوں داویلا کرو گی تو خود ہی تماشا بنو گی۔ جتنی عزت مل گئی ہے اسی پر قناعت کرو تو زیادہ بہتر ہے اور یہ بھی تمہاری اوقات تمہارے کردار سے بہت بڑھ کر ہے۔“ وہ جو پیچھے سے ان کا دامن پکڑ کر روک لیتا چاہتی تھی۔ انہیں پاؤں پر کر روک لیتا چاہتی تھی۔ زور سے بند ہوتے دروازے سے جا کھرائی۔ کیپٹن شہباز جا بکے تھے۔

”ابھی تو شروعات ہے اس کا۔ انہوں نے بھرے سفر کی یوں روٹی تو کھڑ جاؤ گی۔ ہاں جو عزت مل گئی ہے۔ اسی کو غیرت جانو۔ کبھی میری عزت کا مان رکھنے میں یہ شخص سب سے آگے ہو وہ وقت بھی تو آنے گا۔

ہم سفری تو اب تا عمر کی ہے صرف کئی رات تو نہیں۔ یہ رات رائیگاں گئی تو کیا! ابھی تو بہت عمر باقی ہے ایک رات کے بعد ایک اور رات پھر ایک اور۔“ آنسو بھیسے جا رہے تھے اسے خود کو تسلی دینا بھی نہیں آ رہا تھا۔

”اللہ سے مانگو وہ ضرورے گا۔ ضرورے گا۔“ اندھیرے میں جیسے کوئی کرن چمکی۔

”یہ تو بے شک اللہ سے مانگنا ہے۔ ضرورے گا۔ اور تم جو یہ آنسو بے کار میں بندوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے بھانپ رہے ہو۔ تو پھر ہاتھ نہیں آتا۔ ان ہی آنسوؤں کو اس خالق کے آگے پیش کرو وہ ان کو موتی سمجھ کر چین لے گا۔

”اس گھر میں جگہ دینا میرا کام ہے۔ جگہ بناؤ تمہارا۔“ بہت سی آوازیں سوچیں اس کے اندر آپس میں ٹکرا رہی تھیں۔

”یہ دنیا تو محض چند دنوں کی ہے۔ اس کے لیے ابدی خوشیوں کا کیا مانگنا اور بندوں کی کیا خبر لاکھ دامن پھیلاؤ ایک بھی سگہ محبت کا نہیں پھینچے دامن میں دالیں نہ ڈالیں۔ بندے تو مین کے موتی ہوتے ہیں۔ اپنے من کی سنتے ہیں۔ دوسروں کی اضراد لب ان کو پالی کرتی ہے۔

”یہ تو اللہ ہے جو ایک سچے موتی کے بدلے خزانوں کے خزانے بخش دیتا ہے۔ بغیر جھٹکائے۔ اسی نے تو پہلے بھی مجھے اپنی رحمت کی چادر میں چھپا کر میری عزت کو داغ دار ہونے سے بچایا۔ وہ مجھ پر اس درجہ مہربان ہے۔ معاذ شکر کہتا ہے اور میں اس کی مہربانیوں سے بے خبر بندوں کی آگے گڑا رہتا جا رہی ہوں ایک لاج حاصل عمل۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ڈور تک ٹھیل کے سامنے بیٹھ کر اس نے اپنے بے روپ کا ایک ایک گنا آنکھ سے نکلتے ایک ایک موتی کے ساتھ اتارا۔

جس کے لیے یہ سب کچھ سوارا تھا۔ سجایا تھا۔ وہی نہیں تو یہ قیمتی گننے مٹی کا پھر ہیں۔ مٹی کا پھر۔“ اس نے سارے زیور بے دلی سے اٹھا کر دراز میں ڈال دیے اور کپڑے بدلنے کے لیے ڈور تک دم میں چلی گئی۔

پندرہ منٹ بعد وہ کان کے سادھ سے سوٹ میں دھلے چہرے کے ساتھ پورے خصوص و خشوع سے اپنے رب کے آگے بھلی لگن اور توجہ کے سچے موتی بکھر رہی تھی۔

جب کیپٹن شہباز کا واپسی کا سفر شروع ہوا تو ان کے دل نے پیچھے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ اس کو ہر نایاب کی طرف جیسے وہ ٹھوکر مار آئے تھے۔

”ہر شخص کو تجربہ کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ شاید بے سے دوسروں کے تجربے سے کوئی بھی نہیں سیکھتا۔ کوئی نہیں مانتا۔ میں نے ماما کی بات کو ان کی تصیوری کو نہیں مانا۔ ان کی پریکٹیکلائف کے تجربے کو نہیں مانا۔ ان کی اسٹوری کو صرف اسٹوری سمجھا اور آج میرے پریکٹیکل کا تجربہ بھی ان کی کہانی سے مختلف نہیں نکلا۔ سلطان بخت نے وہی کیا جو ان کے خاندانی لاء آف سٹریٹ نے کہا اور وہ آئندہ بھی وہی کریں گے جو ان کی خاندانی روایت حکم کرنے کی ہے۔ ابھی میری خاطر ایک گائیکہ کی بیٹی کی خاطر اپنے خاندانی وقار سے نہیں ٹکرائیں گے۔ میری حیثیت ان کی بیوی ہونے کے باوجود ہمیشہ ثانوی سیکنڈری رہے گی۔ بنیاد تو خاندان ہوتی ہے۔ نا اور میری تو اپنی کوئی بنیاد نہیں۔ میں کسی کی کیا بنیادوں کی۔“

وہ فاؤنڈیشن اٹھا کر آہستہ آہستہ چہرے پر ملنے لگی۔ رات گزر گئی اس کے نشان باقی تھے اور اب کوئی اس سے کہہ رہا تھا کہ اسے ان نشانوں کا ماتم بہت دور تک نہیں منانا بلکہ ان کو دیکھ کر اذیت کا دواؤ صوبہ ہے۔ وہ رات سلطان بخت کے سو جانے کے بعد ایک بل نہیں سوئی تھی۔ پہلے تو بہت دیر تک سہلے اور آواز آسوں سے روٹی رہی۔ اتار روٹی کہ اسے لگا اس کا تکیہ بھیگ گیا ہے پھر اس نے محسوس کیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ختم ہو گئے ہیں۔ اب اور نہیں رو دیا جائے گا اور یوں بھی زیور گل کہتی تھی۔

”نہیں تارا! تم بھی نہ رونا میں تمہارے ہتھے کے سارے آنسو بہا چکی ہوں ان ہی آنسوؤں کو چراغ بنا کر اپنی راہوں کے اندھیرے دور کرنا۔“

”سب کچھ کھانے کے بعد مام کو اپنے تھی وامن ہونے کا احساس ہوا تھا۔ عزت جو اپنی حسن جب سب کچھ لٹ گیا تو خبر ہوئی۔ وہ تو خالی ہاتھ ہیں مگر میں وقت کو اپنے ساتھ بیروا فہ میں پھیلنے دوں گی۔ آج سے خواب کا دور ختم۔ آگنی کا شروع۔ نین تارا اوقت کی بیکار سو جاو اور اپنی رفتار پر غور کرو۔ آجیں اب پیچھے مڑ کر ٹوٹے ہوئے وعدوں سے کچھ نہیں تلاشنا۔ آگے ہی محسوس کی راہوں پر قدم مچانے ہیں۔ اس نے بہت نرمی سے اپنے گالوں کو تھپتھپایا۔

”بریک فاسٹ کے بعد آج کا کیا روگرام ہے؟“ سلطان بخت نے اس کو ڈرنگ روم سے نکلے تو پیچھے خوشبو کا جھونکا کمرے میں آیا۔ وہ ڈرنگ ٹیبل سے برش اٹھا کر از سر نو پونسی اپنے ہتھے جمانے بالوں کو پھر سے سیٹ کرنے لگی۔

”میں تو ریڈی ہوں۔ جو آپ کہیں۔“ وہ ہفت کے ذریعے فاؤنڈیشن درست کرتے ہوئے فریٹش لہجے میں بولی۔

”آج تمہیں شاپنگ کراتے ہیں۔ ڈھیر ساری۔ سارا دن باہر ہی گزاریں گے۔ موسم بھی کافی خوشگوار ہے۔ سچ اور ڈنر تمہاری پسند کی جگہ پر ہو گا۔ کیا خیال ہے۔“ سلطان بخت ہر طرح سے اپنی غلطی کا دوا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”ٹھیک ہے۔ تمسکارا لگاتے ہوئے وہ مصروف لہجے میں بولی۔

پھر واقعی ان کا سارا دن بے حد مصروف گزرا۔ سلطان بخت نے اسے دل کھول کر شاپنگ کرائی تھی۔ سچ دونوں نے ”کمانہ“ میں کیا تھا اور ڈنر ”بی سی“ میں اور اس سارے کے دوران نین تارا نے ایک بار بھی سلطان بخت کو محسوس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ ایک رات میں کتنا بدل گئی ہے۔ اس کا ذہن کس رفتار سے مستقبل کی پلاننگ کر رہا ہے۔

”آپ نے واپس کب جانا ہے۔ احمد پور؟“ ڈنر کے دوران ملاوٹو نکلے ہوئے نین تارا نے بڑے عام سے لہجے میں پوچھا۔

”کل صبح۔ کیوں؟“ انہوں نے ابھرا چکا کر پوچھا اور پور آنکھوں سے نین تارا کے تاثرات کا بھی جائزہ لیا۔

”یونہی کل صبح آپ مجھے جاتے ہوئے گل کدہ ڈراپ کر دیں کیونکہ گاڑی تو میری گھر ہی کھڑی ہے۔“

”تو تم سیدھا دس میں رہ لینا۔ وہ بھی تو تمہارا گھر ہے بلکہ تمہارا اپنا۔ میں دو چار دنوں میں چکر لگاؤں گا۔“

”میرا اپنا ہے صرف کانڈول میں۔ اور ویسے بھی میں ادھر اکیلی کیسے رہ سکتی ہوں۔“ اس نے اپنی طنزیہ نون کو فوراً مٹا کر لیا تھا۔

”فکر کیوں کرتی ہو مجھ سمیت ہر چیز تمہاری ہے۔ اس وقت آنے دو۔“ وہ حسب عادت اسے تسلی دینا نہ بھولے۔ جس سے وہ اب الارواہ ہو چکی تھی۔ ”اور پہلے بھی تو تم اکیلی رہ لیا کرتی تھیں۔ اس فلیٹ میں جو میں نے شادی سے پہلے تمہیں گفٹ کیا تھا۔“

”پہلے کی بات اور تھی۔ پہلے آپ کی غیر تقسیم شدہ محبت اور میری بے انتہا چاہت مجھے کبھی بھی تنہا نہیں ہونے دیتی تھی۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کڑوے پن سے بولی۔

”اب بھی کچھ نہیں بدلاؤ۔ میری محبت میں کمی آئی ہے نہ تمہاری چاہت میں کمیوت۔“ انہوں نے فریڈلش کی فلیٹ اپنی طرف کھسکائی۔ ”ارے ہاں اس فلیٹ کا کیا بنا دو یا نہ ادھر نہیں گئیں کبھی۔ اسی طرح الیکٹریٹ ہے۔“ انہیں یاد آیا۔

”وہ تو میں نے سیکل کر دیا تھا۔“ وہ بڑے اطمینان سے بولی۔

”کب؟“ وہ حیران رہ گئے۔ ”اور مجھے بتایا تک نہیں۔“

”کیونکہ آپ بھی بہت سے کام مجھے انفارم کیے بغیر اپنی مرضی سے کرتے ہیں اور اس پر شرمندہ بھی نہیں ہوتے۔ وہ تو پھر میری چیز تھی۔ اس پر اعتراض کرنے کا کم از کم آپ کو کوئی حق نہیں۔“ وہ درسا سہی چوکے بغیر بڑے آرام سے بولی۔

”کم آن نین تارا! اب بھول بھی جاؤ اس کا خراج دے دو۔“ وہ تھنی سے کانٹا پلیٹ میں بیچ کر بولے۔

”میں شادی اپنی قصہ نہیں ہے۔ یہ میری نامراد محبت کا کینسر ہے جو کھا لیا ہے اسے۔ اور آپ کو پتا ہے اس کینسر کے میری تمام محبت کو زہر لگا دیا ہے۔ اب تو میرے اندر زہری زہری ہے۔“ وہ چپا چپا کر ان کی آنکھوں میں آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”نہیں! تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہی ہو۔“ وہ اونگ رہ گئے تھے اس کی شدت پسندی دیکھ کر۔

”جیسے ڈانڈلاگ ہیں نا شادی کی دوا کینڈم سے کھانک ا۔ کر نہیں پڑی۔“

”مام کے لولیک ہیں نا منسور کوئی کہہ سکتے ہیں میری ڈانڈلاگ ڈیورنی بہت اچھی ہے۔“ وہ فوراً ”بات کا رخ ہی بدل گئی۔“

”انہوں نے تم سے کون سے ڈانڈلاگ بلوائے تھے اور تم ان خرافات میں کیوں پڑتی ہو۔ یہ تمہاری ماں کا پرویشن ہے۔ اسی تک محدود رہنے دو۔“ وہ کچھ غصے سے بولے۔

”شاہہ بی! ماں تو میری ہے نا۔ اس فیکٹ کو تو آپ نہیں بھٹلا سکتے۔ پھر گھر میں اسی پرویشن سے متعلقہ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ آپ تو جو ملی چلے جاتے ہیں تو میں اپنی تثنائی سے گھبرا کر ان کی پٹنی لینے آجاتی ہوں تو ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں ویسے بھی یہ لوگ اچھوت نہیں ہوتے۔ میں بھی ان ہی میں سے ہوں۔ آپ بھول جاتے ہیں۔“ وہ ابھروالی سے چانٹنیز رائس کا بیج منہ میں بھر کر بولی۔

”گھبراہ تمہارا تعلق مجھ سے ہے۔ تم بھی یہ بات بھول جاتی ہو۔“ وہ اسے دتا کر بولے۔

”گوا چلاؤ! اس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا میرا بھی وہی حال ہوا ہے آپ لوگوں جیسی بننا چاہتا تو اپنے بیچ کر مارا اور میری اوقات یاد دلا دی کہ میں کون ہوں۔ مام کی بیٹی میں رہنا چاہتی ہوں تو آپ کو گوارا نہیں۔“ وہ پھر خواہ مخواہ ہنس کر بولی۔

”ویسے آپ میرے بارے میں اس قدر پوزیٹو کب سے ہو گئے ہیں اپنی پہلی شادی کے بعد یا دوسری کے بعد؟“ وہ آج شاہدتی سے خوب دل لگی کر رہی تھی۔ تاک تاک کر نشانے لگا رہی تھی۔

”نین تارا پلیز۔ مجھے ڈنر کرنے دو اور یہ منحوس ٹاپک تو اب لگتا ہے ساری زندگی ہی چلے گا۔“ وہ کڑھ کر بولے تو نین تارا ان کی شکل دیکھ کر پھر سے ہنس پڑی۔

اور اگلی صبح جب سلطان بخت نے اسے گل کدہ کے آگے ڈراپ کیا تو اس نے بڑی گرجوشی سے انہیں خدا حافظ کہا۔

اور گل کدہ میں جو زمین تیار داخل ہوئی وہ برسوں رات زبردستی سلطان بخت کی بی ایچ ڈیو میں پٹے کر جانے والی زمین تیار سے بالکل مختلف تھی۔ آج وہ صرف اور صرف زیور گل کی بیٹی اس کے بیوی کا گولڈن چانس بن کر داخل ہوئی تھی۔

دونوں اس نے زیور گل کی اس ہدایت پر کہ اپنے جذبات پر بند باندھنا سے گریز کرے تھے۔ زمین تیار جذبات میں آکر بھی سجالی بساط لٹا دینا۔ بے مصلحتی اور پر لگائی تھی۔ اب اس کا بچہ مولیٰ اس سید زادے سے وصول کرنا۔



شام تک سارا گھر دھل بھی گیا تھا اور تمام سامان بھی سیٹ ہو گیا تھا یوں بھی سامان تھا ہی کتنا کتنے میں سے بھی آدھا سلطان بخت کی دھمکی کے بعد وہیں چھوڑ آئے تھے۔ تھوڑے سے سامان سے بھی بڑی فضا گھر خوب بھرا بھرا سا لگ رہا تھا۔

”اچھا ہی ہو ابو ہواں آدھے سے زیادہ سامان وہاں چھوڑ آئے ورنہ سامان نے اس ڈربے میں ہونا تھا اور ہم نے باہر لگی ہیں۔“ زینب صغالی کے بعد بولی تھی۔

زینب نہا کر اب ماں بی کے پاس بیٹھی روٹیاں پکتے دیکھنے لگی۔ کچھ وہ متعارف تو قیاس کا سر بھی نہیں کھا رہی تھی اور فضول بول بھی نہیں رہی تھی۔ بس گھنٹوں پر سر رکھے ان کی کسی بات پر ہنسی نہ آتی تھی۔ آدھ نہا کر اگلی تو اسے بھی زینب کی خاموشی پر قیاس ہوا۔

”گھر جو کسی کو بھی پسند نہیں آیا۔ اس لیے اس سے اور چپ تھی۔“ اس نے سوچا اور کنگھی اٹھا کر پال سنوارنے لگی۔ سویرے پہلے ہی ماں بی کے کھٹے سے جڑی بیٹی تھی۔ زینب کی طرف بالکل چپ اور گرم جسم آتے کو روٹا آئے لگا۔

”یہ سب میری ہی وجہ سے تو ہوا ہے جو یہ دونوں چپ ہیں ماں بی سوچوں ہیں اور بابا صاحب چپ چپ ہیں۔ اللہ میاں ہی ہماری آزمائش جلدی ختم کر دینا۔ وہ دھیرے دھیرے کنگھی نیلے بالوں میں چلاتے ہوئے سونے لگی۔

شام کو گل کی کچھ عورتیں ان سے ملنے آئی تھیں۔ اپنی بچیوں کو قرآن پڑھانے کے لیے ماں بی کے پاس کرنے

”بچے مسجد میں مدرسہ بھی تو ہے۔ صوفی صاحب تو فجر کی نماز کے بعد بچوں بچیوں کو قرآن پاک بھی پڑھاتے ہیں۔“ ان کی بات پر ماں بی نے کہا۔

”وہ جی اصل میں چچیاں بڑی ہیں۔ تقریباً“ آپ کی بیٹیوں۔ یعنی یا اس سے تھوڑی بڑی۔“ ایک عورت ذرا توجک کر بولی۔ ”تو انہیں ہم مسجد یا مدرسہ میں تو نہیں بھیج سکتے نا۔“

”اتنی بڑی بچیوں کو اپنے اچھے تک قرآن نہیں پڑھایا۔ ماں بی سے رہا نہ کیا تو کہہ ہی نہیں۔“ بس بیٹی چھوٹی تھی تو مسجد میں کوئی مولوی صاحب ہی ڈھٹک کے نہ آئے تھے۔ کنگھی میں ایک آبا جی تھیں انہوں نے بہت سی لڑکیوں کو قرآن پڑھایا تھا۔ ان کی وفات کے بعد تو کوئی بھی نہیں۔ آپ لوگوں کا سنا تو اسی لیے چلے آئے۔“ ایک عورت نے ان میں ذرا آجھ دار تھی بولی۔ باقی تینوں تو مسلسل اندر گھروں کا آئینہ اور زینب کا جائزہ لینے میں لگی ہوئی تھیں۔

”جیسے تو کوئی اعتراض نہیں۔ تو کارڈ اب ہے۔ آپ جب بی چاہے بچیوں کو بھیج دیجئے گا۔ میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔“ لڑکا نام ابھی بکھرا ہوا تھا۔ ماں بی نے انہیں فارغ کرنا چاہا۔

”ارے نہیں جی شکریہ۔ آج تو آپ لوگ ہمارے مہمان ہیں۔ آج تو آپ کھانا بھی گھر نہ پکائیے گا۔ ہم جا کر بیٹھے ہیں۔“ وہ عورت ماں بی کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔ اس لیے اٹھتے ہوئے بولی۔

”نہیں شکریہ۔ کھانا تو میں ہمارے ہوں۔ ہم آکر آپ لوگوں کے کام آسکیں تو مجھے خوشی ہوگی۔“ ماں بی انہیں بیڑھیوں تک پہنچانے لگیں۔ وہ ایک ایک کر کے بیڑھیاں اترنے لگیں۔

”عجیب سی تھیں، ایسے دیدے گھما گھما کر سارے گھر کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے پہلے یہ ڈربہ دیکھا نہیں اور ہمیں یوں دیکھ رہی تھیں جیسے ہمارے سول پر سینک ہوں۔ ان کے جاتے ہی زینب بھاڑا رخ کر بولی۔ اسے تو آج ایسے ہی فضا آتے جا رہا تھا۔

”بول نہیں کہتے۔“ ماں بی نے اسے ٹوکا۔

”ایسے نہیں کہتے ویسے نہیں کہتے، ہر وقت نصیحت۔ اس گھر میں اور کچھ ہے بھی نہیں۔ اور زینب کی یہ بیچنا۔ عٹ کئی روز تک اس پر طاری رہی۔ اس کی بیچنا۔ عٹ اس دن خوشی میں بدل گئی جب اچانک عبدالتین گھر آئے۔ عٹ نے گھر میں جیسے خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ پورے آٹھ ماہ بعد گھر آیا تھا۔ ماں بی تو اسے دیکھتے ہی نہال ہو گئیں۔

”میرا پتر۔ کتنا جی کر رہا تھا تجھے دیکھنے کو اور اب اوہر آئے کتنے دن ہو چلے۔ کئی ہی بار کہا صوفی صاحب سے۔ عبدالتین کو تو بلائیں۔“ ماں بی اسے گلے سے لگا کر بولی۔

”ان ہی کے باوجود پرتو آیا ہوں ورنہ کس طرح کہاں تھا؟“ وہ آہستگی سے ان سے طلحہ ہوتے ہوئے بولا۔

”میرا پتر! کون سی ماں ڈامری کے کلام توں بڑے ہیں جو تو حد درجہ مصروف رہنے لگا ہے۔ بدلتا ہوا۔ کس گھبراہٹ ہو گئی ہے۔“ ماں بی نے کہا۔

”مصروف ہو گیا ہے۔“ ماں بی نے بولے۔ اس کے سر پر چیت لگا کر بولی۔

”ماں جی! پڑھنا آسان کہاں ہے اور پڑھنے کے لیے بہت بڑا مقام بھی حاصل کرنا ہے۔ آپ لوگوں کے ہی سرخسے ملنے ہو جائیں گے۔“ وہ ان کی بات پر کچھ کھسکا کر بولا۔

”ماں جی! بھائی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بہت پڑھنے اور نام کمانے کے لیے بہت مصروف نظر آتا بھی ضروری ہے۔ کوئی بھی پڑھنے کے وقت نہیں ہے۔ زینب عبدالتین کا لہو پکڑ کر شہادت سے بولی۔

”تو بہت تھوڑی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں۔“ عبدالتین نے اس کے ہال آہستہ سے چپکے

”ہائے بھائی! شکر ہے آپ آئے اب تو میرے دل کی مراد پوری ہوئی ورنہ تو میرا دل چاہ رہا تھا اوہر سے بھاگ ہی جاؤں۔“ اس کا نرم رویہ یا گرن زینب خوش ہو کر بولی۔

”اب کیا ہے اوہر؟“ وہ سرسری لہجے میں بولا۔

”ماں بی! اتنے دنوں سے تو بھائی کا انتظار میں کر رہی تھی۔ اب مجھ سے اور صبر نہیں ہوتا۔ مجھے بات کرنے دیں۔“ عبدالتین پلنگ پر بیٹھ کر جوتے اتار رہا تھا۔ کچھ نہیں بولا۔

”چھوٹی آئی، میری بات کرنی ہے نا؟ جو یہ فوراً“ زینب کا لہو اڑھلا کر بولی۔

”بس تم ہر جگہ موجود۔“ زینب اسے تھوک کر بولی۔ ”ماں بی اسے اسکول میں داخل کیوں نہیں کراتیں آپ؟“ وہ آج کل جو یہیہ سے بہت بڑی ہوئی تھی۔

”کہا تو ہے تمہارے بابا صاحب سے۔ آج کل میں ہو جائے گی۔“ صوفی صاحب ابھی واپسی کے خیال سے جو یہیہ کو ادھر داخل کرانے سے گریزاں تھے۔

”بھائی! کھانا کہ چائے؟ آہ نے پوکھت پر کھڑے ہو کر پوچھا۔

”ابھی صرف چائے کھانا بعد میں۔“ وہ آرام سے پلنگ پر بیٹھ گیا اور سر گھما کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

”تو بہت کتنا چھوٹا گھر ہے ماں بی ہمارے گاؤں والے گھر کا تو بڑا گھر ہی اس پورے گھر جتنا ہوتا ہے۔

”تو ادھر آنے کی ضرورت کیا تھی۔ بیبا صاحب کا جذباتی پن ابھی تک کم نہیں ہوا ہر کام میں عجلت پسندی اور دھونس۔“ وہ منہ بنا کر بولا۔

”زینب! تم جاؤ ادھر سے اور آمنہ کا ہاتھ بٹاؤ کھانا پکھلنے میں۔ مغرب کی اذان ہونے والی ہے۔ صوفی صاحب آنے والے ہوں گے۔“ اماں بی نے سنجیدگی سے کہا۔

”بس ہر وقت خوف ہی سر سوار رکھتی ہیں۔ کوئی بات تو کرنے دیں۔“ زینب بد تمیزی سے بولی۔

”زینب! وہ غصے سے گرج کر بولیں۔“ عبدالستین ابھی ادھر ہی ہے۔ کر لینا اپنی امتحان باتیں اچھڑیں۔“

”میسر کروانی ہے بھائی آپ نے ہمیں سارے لاہور کی۔ سن لیا اور اس معاملے میں بیبا صاحب والی دھمکی سے بھی نہیں ڈروں گی ہاں۔“ وہ پیرتخت کروہاں سے چلی گئی۔

”تو بھیک اس لڑکی کا دل خون بدن کتنا خراب ہو جا رہا ہے۔“ اماں بی غصے سے بولیں۔

”تو ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے بیبا صاحب بھی ہریات میں اتنی زیادہ سختی اور روک ٹوک کرتے ہیں۔ بیبا بی تو ہوتا ہی ہے۔“ وہ آرام سے بولا۔

”وہ یونہی نہیں کرتے سختی۔ زمانے کا حال دیکھا ہے۔ اپنی آمنہ ہمارے لیے تو اتنی ہی تھی اور وہ چھوٹے شاہ جی اس سے تین گنا عمر میں بڑے ہمارے لیے کتنے محترم ہیں۔ اس کا تعلق ہر فرد اور کٹھی خدمت کی ہے تمہارے باپ نے اس حویلی کی۔ انہوں نے یہ لاج رکھی ان کی وفاداری کی۔ بچی پر غلام نگاہ والی۔“ اماں بی اپنی ناقدری کا سوچ کر رو روئے کو بھیں۔

”اماں بی! آپ کو نہیں پتا زمانہ کہاں جا رہا ہے۔ آپ لوگ ابھی تک زمانے سے سو سال پیچھے ہی رہے ہیں نئے زمانے کی کوئی بات کان میں پڑے گی تو آپ کے لیے تو وہ انوکھی بات ہی ہوگی بیبا صاحب نے سب کو کتوں کا مینڈک بنا رکھا ہے۔ باہر نکل کر دیکھیں دنیا کہاں جا رہی ہے ہم ابھی تک اپنی فرسودہ سوچوں کے غلام بنے ہوئے ہیں۔ چادر چار دیواری پر قہر پرہ مذہب کو جان سے بڑھ کر سر پر سوار کر رکھا ہے۔ کسی کے سیدھے فعل کو بھی بد بختی جانتا۔“ وہ اپنی بے پروگی ہانکے جا رہا تھا۔

”صوفی صاحب سچ کہتے تھے۔ عبدالستین بہت بدل گیا ہے۔“ اس کی بات سن کر اماں بی نے دکھ سے سوچا۔

”پتہ زمانہ کتنا ہی کیوں نہ بدل جائے۔ آبرو عزت اور نیک نامی تو نہیں بدل سکتی۔ اس کا سوہا تو کسی بھی زمانے میں اچھا نہیں سمجھا گیا۔“ وہ نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

اماں بی! کیا ہے یہ عزت آپ کے نزدیک؟“ وہ تنگ کر بولا۔

”تجھے نہیں معلوم عزت کیا ہے؟“ اماں بی حیرت سے بولیں۔

”اماں بی! آپ ابھی تک وہیں کھڑی ہیں جہاں سے پیدا ہونے کے بعد چلی تھیں اگر آپ زمانے کے ساتھ چلتیں تو آپ کو معلوم ہوتا۔ آج زمانے میں عزت صرف پیسے کی ہے اور آبرو پیسے والے کے گھر کی اونڈی ہے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے۔“

”چل بیسی سہی۔ ہم پیسے والے ہوتے تو کسی کی جزات بھی نہ ہوتی ہماری عزت کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی لیکن سارا زمانہ تو پیسے والا نہیں تو لوگ یوں اپنی عزت انار کر چور ابہرے تو نہیں لٹکا دیتے اگر ان کے پاس پیسہ نہیں ہوتا۔ ہم بھی یوں ورید رہتے ہوتے اپنی عزت بچانے کو ہی آئے ہیں۔“ اماں بی دکھ سے بولیں۔

”یہی تو غلط کیا آپ نے۔“ وہ زور دے کر بولا۔

”کیا غلط کیا ہم نے؟“ وہ حیرت سے بولیں۔

”یہاں اگر اپنا گھر بار چھوڑ کر وہیں رہتے کوئی آپ کو منہ میں تو نہ ڈال لیتا۔“

”منہ میں کوئی ڈال سکتا بھی نہیں۔ اس نے صرف اپنی گندی نیت کی ہوس پوری کرنے کے لیے ہماری بچی پر نگاہ ڈالی تھی اور صرف نگاہ ہی نہیں وہ تو پوری طرح سے ذلت پر آمادہ تھا پھر ہم وہاں کیسے رہ سکتے تھے۔“

”کیا کر لیتا وہ زیادہ سے زیادہ؟“

”پتہ تو ان باتوں کو نہیں سمجھتا۔ وہ صرف وقتی طور پر اپنا دل ہلانے کے لیے۔“ آگے ان کی زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ ”اور ہماری بچی کوئی راہ میں چڑی چیز تو نہیں۔ ابھی اس کے ماں باپ زندہ ہیں۔ ہم یہ برداشت کر سکتے تھے۔“ اماں بی غصے سے بولیں۔

”فضول کی سٹ دھری۔ اماں بی کیا تھا اس میں۔ وہ نکاح ہی تو کرنا چاہتا تھا۔ کوئی اٹھا کر تو نہ لے جاتا آمنہ کو بظن کر لیتا۔ حویلی لے جاتا اس سے بڑی عزت کی بات اور کیا ہوگی۔ آمنہ حویلی کی مالکن کے برابر آجاتی۔ حق میں خوب لمبی چوڑی رقم لکھوا لیتے زمین۔ جاگیر۔ کوئی کوٹھی آمنہ کے نام لکھا لیتے۔ آپ کے بھی دارے نیارے ہو جاتے آمنہ کے طفیل ہم بھی اتنے دن ویٹھ لیتے۔ لہذا بیبے آجاتا سب کا مستقبل بن جاتا پھر بھلے وہ بعد میں آمنہ کو چھوڑ دیتا۔“

”بھلا کونسی گھر کی پخت بھی اماں بی پر آگرتی تو انہیں حیرت نہ ہوتی تابتاد کہ اتنا رنج ہوتا۔ انہیں نکاح وہ زندگی بھر پلک نہیں چمک سکیں گی۔ عید آستین کی باتیں یا پاتال کی گھڑیوں سے آتی کسی گندے جوڑی کی سرانجام ان کا سانس بند کرنے لگا۔“

”تھیٹ! شیطان! مرود! بد بخت! حرام مزادے۔ تو نے اپنی بہن اپنی معصوم پاک بہن کو بکاؤ مال سمجھ لیا ہے بد معاش۔“ الو کے پٹھے بے غیرت میں بوجھ بھون کر وہ گامچون۔“

صوفی صاحب کی آواز سن کر کسی تیری کی گرج اور عبدالستین پر ہونے والا حملہ اس قدر اچانک تھا کہ وہ اپنے بچاؤ کے بارے میں بھی نہ سوچ سکا۔ وہ کسی بھوکے بھوکے طرح اس پر پل پڑے تھے۔

”اس دن کے لیے میں نے تجھے جوان کیا تھا۔ تو بھون کی عزت کی بولی لگوائے گا۔ مرود کے پانچویں پیسے کے پیاری۔“ تیری تیریت میں کسی توہ کی۔ کسی بے غیرت کا خون لگتا ہے تیری رگوں میں۔ میرا اتنا گندا آلودہ خون میں ہو سکا۔ یہ الفاظ بولنے سے پیسے زمین کے اندر کیوں نہ دفن ہو گیا۔ آستین کے سانپ! ہم تیری موت پر صبر کر لیتے۔“

”نکل جا ادھر سے! چلا جا۔“ وہ جاب میں۔ بھونوں گا تو شہر میں یا کسی حادثے میں مر گیا۔ اسپتال والوں نے تیری لاش لاوارث سمجھ کر دفنادی۔ تو مر گیا ہمارے لیے عبدالستین! تو مر گیا۔ نکل جا ادھر سے۔“

بھوش و جنون میں ان کا خیال دن قاتب رہا تھا۔

انہوں نے اسے کال سے پکڑ کر کھینا اور صحن کی طرف زوردار دھکا دیا۔

”ہاں چلا جانا ہوں۔ جا رہا ہوں مجھے بھی اس جیل خانے میں آئے کا کچھ شوق نہیں جہاں آپ ہمیں انسان نہیں جانور سمجھتے ہیں کیونکہ آپ خود وحشی ہیں۔ غیر تہذیب یافتہ۔“ وہ آستین سے لپٹے ہونٹ سے بہتے خون کو زور سے رگڑ کر بولا۔

”نکل جا ادھر سے گندی تہذیب کے نمائندے اور میں کبھی مرتے دم تک تیری صورت نہ دیکھوں حرام خور عزت کے دلال تو آج سے میرے لیے مر گیا۔ نکل و فغان ہو ادھر سے۔ دوبارہ کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔ تیرا منہ کالا کر دوں گا۔“

انہوں نے اسے پیڑھیوں کی طرف زوردار دھکا دیا اور وہ زخمی چیتے کی طرح قلا ٹھپیں بھرتا ٹھپے پاؤں ایک لمحے ہی میں سناری پیڑھیاں پھلانگ گیا۔

اور پیڑھیوں کے آخر میں بلیبل جو کھانے کا ڈھکا ہوا خوان لیے آ رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر حیرت سے پیڑھیاں چڑھتا بھول گیا۔

آمنہ جو چائے کی پیالیاں لڑے میں سجا رہی تھی۔ اس اچانک ہنگامے پر اپنے سینے پر ہاتھ رکھے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی جب غصے بھوش اور غم سے کانپنے صوفی صاحب نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اس کا رنگ سفید لٹھے

جیسا ہو رہا تھا بالکل بے رنگ۔ زینب بیڑھی پر سناکت بیٹھی تھی اور اماں کی کمرے کی دہلیز پر دل تھامے کھڑی تھیں۔

”ابھی تیرا باپ زندہ ہے آمنہ! تیری آبرو پر کوئی میلی نگاہ ڈالے میں اس کی آنکھ نہ پھوڑاؤں۔ میرے بچے تو کوئی غم نہ کرنا ابھی تیرے ماں باپ زندہ۔“

صوفی صاحب نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر اپنا کانچا ہاتھ رکھا اور جملہ پورا کپے بغیر سینے سے اٹھتی وردی نہیں کودائے بیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ وردی شدت سے ان کا سینہ دوہرا ہوا جا رہا تھا اور وہ ضبط کی آخری انتہا کو چھوتے بیڑھیاں اترتے چلے جا رہے تھے۔ جمیل نے ان کے ہلدی ہوتے چہرے کو دیکھا تو صوفی صاحب کی زوردار پکار کے ساتھ انہیں ٹھانسنے کو آگے بھجوا دیا۔ ”یہاں آؤ، بیڑھیوں پر لہ لہنے ہی کو تھے۔“

وہ تو درت کے اندر کا منظر دیکھ کر ہی ٹھنک گیا حالانکہ وہاں کچھ بھی اٹو کھانا تھا۔ چھوٹے بچے اسی طرح سپارے رطلوں پر رکھے بل بال کر اپنی آواز میں بڑھ رہے تھے ان کا شور مسجد کے باہر تک آ رہا تھا۔ انہیں مہلک میں اس کے لیے جو انوکھی بات تھی وہ ان بچوں کو پڑھانے والا استاد تھا۔ اس کی سترہ اٹھارہ سالہ زندگی میں شاید یہ پہلی بار اس نے دیکھا تھا کہ صوفی صاحب کی جگہ کوئی اور مولوی صاحب بچوں کو قرآن پاک کا درس دے رہے تھے۔

”بابا صاحب! ان بچوں کو کیوں نہیں پڑھا رہے۔“
 وہ منہ میں بڑبڑایا ”ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔ ان کی جگہ سے کتنی ہی طبیعت کیوں نہ خراب ہوتی وہ درس کی چھٹی بالکل نہیں کرتے تھے۔ وہ بیٹھے رہتے اور کوئی بڑا لڑکا یا بچی لڑکوں کے سبق کی تکراری کیا کرتا تھا کہ درس سے وہ نادمہ نہیں کرتے تھے۔“
 پوچھتا ہوں اندر جا کر شاید بابا صاحب کی طبیعت ٹھیک نہ ہو۔ اس دن جب میں اوہر سے جا رہا تھا کافی چپ چاپ لگ رہے تھے۔ جاتے وقت مجھے کوئی بھلا بھلا بھلا پائی اور میرے قاری صاحب کو کوئی کڑا پیغام بھی نہیں بھیجا کہ عبدالعزیز کو خوب کھینچ کر رکھنا۔“
 وہ خود ہی سوچتا ہوا مدرسے کی بیڑھیاں اترنے لگا۔ وہ تو آج بھی معمول کے مطابق صبح کا سبق سنانے ہی مدرسے سے چل پڑا تھا۔ گھر آنے کے لیے وہ جیسے ہی مسجد کے دائیں طرف مڑ کر گھر کے بیرونی دروازے کی طرف آیا تو اسے ایک اور جھٹکا لگا۔

دروازے پر پھاسا تالا لگا ہوا تھا۔
 ”یہ کیا ایسا تو آج تک نہیں ہوا تھا کہ صوفی صاحب کے گھر کو تالا لگا ہو۔“
 ”کیا ہو گیا ہے بھلا اور مجھے پتا نہیں چل سکا۔“ وہ گم گم کھڑا تھا۔
 ”سرس سے معلوم کروں؟“ ابھی دن پوری طرح سے روشن اور پیکارا تھا۔ آسمان کی نیلا نیلیاں ابھی باقی تھیں اسبک رفتار خشک ہوا آج سویرے کا پتا دے رہی تھی وہ وہاں مدرسے کی طرف مڑا۔
 ”صوفی صاحب کی تو بڑا سرفروشی وہ اوہر سے چلے گئے ہیں۔“ بچوں کو پڑھانے والے مولوی صاحب کا جواب اسے حیران کر گیا۔

”نہیں۔ نہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے ان کا بڑا سرفرو اور مجھے پتا نہیں میں ان کا بیٹا ہوں عبدالعزیز۔ قاری عبدالعزیز کے مدرسے میں پڑھتا ہوں ایک ہفتے بعد تو آیا ہوں مجھے بھلا علم کیوں نہ ہو گا کہ ان کا بیٹا۔ ہو رہا ہے اور انہیں کہیں جانا ہے۔“ وہ بے یقینی سے بول رہا تھا۔ اسے لگا یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے یا شاید اس سے مذاق کر رہا ہے۔
 ”وہ چھٹی لے کر گئے ہیں یا یونہی کہیں کسی کام سے۔“ اس نے مولوی کی تائید چاہی۔
 ”نہیں وہ چھٹی لے کر نہیں گئے ان کا بیٹا ہو گیا ہے۔ شاید لاہور میں سرکاری حکم پر۔ تم نے گھر کے دروازے پر تالا نہیں دیکھا ویسے ابھی ان کا سارا سامان نہیں گیا اس لیے وہ تالا لگا گئے ہیں۔ جب لے جائیں گے تو گھر مجھے مل جائے گا۔ میں ان کی جگہ اوہر آیا ہوں نا۔“

اس کے جواب پر عبدالعزیز کا دل چاہا ایک زوردار مٹکا اس کے ہڈیوں بھرے بیڑھے پر کس کر مارے۔ یہ ہوتا کون ہے ہمارا کھینے والا۔“

وہ اسے غور تاہوا کوئی جواب دے بغیر مسجد سے باہر نکل آیا۔
 ”اب کدھر جاؤں؟“ اس نے ہاتھ میں پکڑے گندے کپڑوں کے تھیلے کو دیکھ کر سوچا اور اب تو بھوک بھی لگ رہی تھی اس وقت تک تو اماں ہی اس کے لیے دو دو کئی کئی کے بل دار پرائے مسان اور حلوے یا وہی کے ساتھ تیار رکھتی تھیں۔ وہ کدھر کی ایوار کے ساتھ ٹیک اگا کر کدھر گیا۔
 ”ایسا کیا ہو گیا تھا کہ بابا صاحب اچانک گھر چھوڑ کر چلے گئے وہ بھی مجھے خبر کیے بغیر۔“ اس نے پشت ہٹا کر دروازے کو ہولے سے دھکا دیا۔

”خیر میں کون سی ان کے نزدیک کوئی اہم ہستی ہوں جسے وہ جانا یا پوچھنا ضروری سمجھیں گے ہونگا۔“ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنی پکڑندگی پر آیا۔

”اب کدھر جاؤں۔“ اس نے چاروں طرف سرگھما کر دیکھا۔ مسان کھیتوں میں بل چلا رہے تھے۔ اس کے ڈھور ڈھور ٹکرال کے ساتھ جتے ہوئے تھے۔ کچھ کھیتوں میں ٹریکٹر چل رہا تھا ہر طرف صبح کی کھانسی تھی۔ ایک وہی گم گم بے خبر سا کھڑا تھا۔ چاروں طرف گھومتی نگاہیں دائیں طرف ایستادہ خواہ صورت اور کئی جوبلی برنگ کھیں۔
 ”جی چاہتا ہے اس جوبلی کو آگے لگا دوں یا اس پر بل چلا دوں اس نے ہی تو ہمارے گھر کو آگ لگائی ہے۔ چھوٹے شاہتی میں کبھی اس قابل ضرور ہوں گا مجھے تیری حرکت کا مطلب سمجھا سکوں۔“ اس کا جہل کڑھتا ذہن اور سلگنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ماسٹر صاحب کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

”ارے عبدالعزیز! تم کب آئے۔“ ماسٹر صاحب اسے دیکھتے ہی خوش ہو گئے۔
 ”جی ابھی آیا ہوں تو کدھر آیا۔“ وہ جھٹک کر چپ ہو گیا۔
 ”ہال میں اندر آؤ۔ آج تو تمہاری چھٹی کا دن ہو گا اسی لیے آئے ہو۔“
 وہ اس کی بات نالتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر کے اندر لے آئے۔ صحن میں بچھے تخت پر اسے بٹھایا اور خود پاس رکھے موڑھے پر بیٹھ گئے۔

”جی آج چھٹی ہے مگر میں گھر گیا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا اور مسجد میں بھی۔“
 اس کی آواز رندہ تھی یہ بات بیان کرتا ہی اس کے لیے بہت اذیت دہ تھی کہ صوفی صاحب کی جگہ کوئی اور شخص مسجد کی اجازت داری سنبھالے ہوئے تھا۔

”اب صاحب کچھ اچانک ہی ہوا صوفی صاحب نے کچھ ٹھیک سے مجھے بتایا بھی نہیں کہ بیٹا ہوا گیا ہے ان کا اور میں اچانک ہی اور اس قدر جلد۔ ویسے ایسا ہوتا تو نہیں پتا نہیں کیا بات تھی میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ انہوں نے تو وجہ نہیں بتائی اور پریشان بھی بہت لگ رہے تھے۔“ ماسٹر صاحب بولے۔ عبدالعزیز پریشان نظروں سے انہیں تک رہا تھا۔

”چلو تم فکر نہ کرو میرا خیال ہے ابھی وہ اپنا سامان بھی پورا نہیں لے کر گئے ابھی آئیں گے دوبارہ تو تمہیں بھی لے جائیں گے۔“ وہ اس کی پریشانی سمجھ کر بولے۔

”سامان کی طرح میرے بغیر بھی ان کا زوارہ بہت خوب ہو سکتا ہے مجھے معلوم ہے۔“ وہ کڑھ کر بولا۔
 ”ارے نہیں تم کوئی غلط سوچ نہ پاؤ۔ اصل میں انہیں فوراً جانا ہوا گا اس لیے تمہیں ساتھ نہیں لے جائیں گے۔ سر حال تم ان کے لیے سامان تو کیا دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر قیمتی ہو اولاد ہوان کی۔“ ماسٹر صاحب اس کا ہاتھ ٹھیک کر بولے تو اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس اسے گرد آلود جوتوں کو کھڑا کر دیا۔
 ”اچھا تم اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو منگواتا ہوں۔“ وہ اس کی گود میں دھرتے میلے کپڑوں کے تھیلے کو تخت پر رکھتے ہوئے بولے۔

"ارے نیک بخت چچہ آیا ہے عبد العین۔ اس کے لیے کچھ کھانے کو لاؤ۔" انہوں نے برآمدے سے آگے باہر جی جانے کی طرف منہ کر کے آواز لگائی "جہاں سے برتنوں کے کھڑکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔" چلو تم باہر غسل خانے سے منہ ہاتھ دھو لو۔" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

"ناشتہ کرنے کے بعد چائے کا پیالہ ہاتھ میں لے وہ پھر سوچ رہا تھا۔ "اب کہہ جائے ماشنی بی نے اس کے لیے بڑے مزے کا ناشتہ بچھوایا تھا۔ کسی غمی میں ترتر اٹھے اور شہیم گوشت کا ساغ ان اس نے ہی بھر کر کھلایا۔

ماسٹر صاحب برآمدے میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ وہ چائے بھی پی چکا اور اب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔

"ماسٹر صاحب! میں کہہ جاؤں؟" رونا کا تو خود ہی اٹھ کر ان کے پاس چلا آیا۔

"ارے جانا کہہ رہے کی تمہارا کمر نہیں۔ میاں اوہ رہے ہی کون ہمہ پڑھا ہے ہی تو ہیں۔ تم نے کل شام ہی کو در سے چائے بنا تو پلے جانا، اہری سے اب چاہے جا کر آرام کر لویا جو بی چاہے۔" بے فکرگی سے اخبار کے صفحات پلٹتے ہوئے پوئے۔

"مگر کچھ۔" وہ اٹک کر بولا۔

"کچھ؟" انہوں نے اخبار پلٹ کر گو میں روک لیا۔ "مگر کام مسئلہ تو ہے ویسے تو صوفی صاحب کو ہمیں ساتھ لے کر جانا چاہیے تھا۔ خیر ہوئی ان کی کوئی مجبوری۔ مجھ سے بھی جانتے وقت مل سکے۔ میں نے ورنہ میں کم از کم ایڈریس تو پوچھ لیتا۔ بہ حال وہ تمہاری طرف سے بے خبر تو نہ ہوں گے۔ ان یا کل میں تمہارے دور سے کاچکر ضرور لگائیں گے اس لیے کل نہیں اوہ ضرور ہی جانا چاہیے۔"

"میں اس دور سے نہیں جاؤں گا۔" وہ ضدی لہجے میں بولا۔

"کیوں بھی اُدھر سے کا کیا تصور اور اب تو میرا خیال ہے تمہاری منزل تو یہ ہے جس بارے میں توہ جکے ہیں تمہارے بیٹھے صوفی صاحب بتا رہے تھے۔"

"بی بی! وہ نوٹس پن سے بولا تو وہ اس کی شکل دیکھنے لگے۔

"کیا کروں گا پڑھ کر قرآن حفظ کر کے کسی مسجد میں ہالوی لگ جاؤں گا یا امام اور پھر بس۔ جس کا بی چاہے؟ مجھے نہ ہی انتہا پسند کہہ کر جیل پہنچاؤں یا مجھے اور میری عزت کو وہ کوڑی کا جان کر کاؤں سے اٹکواوے۔"

"اسی لیے تو میں کہتا تھا نا تم سے کہ نوس ہمارے سے نہ بھاگو اگرچہ وہ میری رعایت کا آخری سال تھا اب تم نے اتر کر لیا ہو اب ایک سہ ماہیہ آجانی اور قرآن حفظ کی ڈگری بھی پھولی نہیں۔ ساتھ سے اٹھ کر آج میں محض اسی ڈگری کی بنیاد پر تمہیں داخل مل جانا پھر کوئی بھی تمہیں عزت وار تو کری مل جاتی۔ قرآن کے قاری ہونے سے دیوانوں کو ہر کسی انتہا پسند کہہ دینا محض ایک پروردگار کا ہونے اور نہ ہمارے مذہب کو دین اور اسلام کی تحریک کو ابھی بھی پڑھے لکھے حفاظ قرآن کی اشد ضرورت ہے بلکہ۔ جتنی آج اسلام کو چاشما پروانوں کی ضرورت ہے جو ہر میں کھولتے جوش کے بجائے باہوش عقل رکھتے ہوں۔ اتنی ضرورت کبھی بھی نہ رہی تھی۔" ماسٹر صاحب ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے۔

"بابا صاحب مجھے اسکول میں پڑھنے دے رہے تھے ان دنوں۔" وہ ضدی سانس لے کر بولا۔

"تمہارا اپنا بھی جی نہیں تھا پڑھنے میں بیچ آؤں تو۔" ماسٹر صاحب لگی لگی لہجے میں بولے۔ "تمہارے بھلے کا ہی سوچا تھا انہوں نے۔ چلو اگر کوئی ڈگری نہیں لیتے تو قرآن کی تعلیم حاصل کر کے کم از کم مسجد تو سنبھال ہی لو گے نا۔ خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا چاہو تو وہ چار ماہ بعد میٹرک کے امتحان ہونے والے ہیں۔ تھوڑی تیاری کر کے بیٹھ جاؤ۔ آرام سے نکل جاؤ گے ذہن تمہارا اچھا ہے۔"

ماسٹر صاحب کا بس پلٹا تو روئے زمین پر ہر ذی روح خواہ وہ انسان ہوں یا حیوان حج نہ پڑھتا کبھی سے مکوڑے سب کو میٹرک کے امتحان میں ضرور بٹھوا دیتے۔ ابھی بھی ان کے اندر عشق کے اس شعلے نے لپکایا تھا۔

"کیا کروں گا بی امتحان دے کر میٹرک پاس کو کون پوچھتا ہے؟" عبد العین بیڑی کی انتہا پر تھا۔

"ارے اسی طرح تو بیڑی جی چڑھو گے نا۔ ساتھ میٹرک کر لو گے ساتھ قرآن حفظ۔ ایف اے کتنے ہی لوگ نہ کوئی اچھی نوکری مل جائے گی۔"

ماسٹر صاحب نے اس کا بی لپٹا جانا مگر وہ بھی چکنا کچر اٹھا۔ عبد العین جسے صوفی صاحب کا ہوتا ہوا زمانہ علم کے رستے پر ڈال سکا تھا تو ماسٹر صاحب کے وام میں بھلا وہ کیوں کرتا۔

"سوچوں گا۔" وہ اٹا کر اٹھ کھڑا ہوا اور چلتا ہوا بیڑی پر روانہ کھول کے باہر نکل گیا۔

"عجیب سر پھرا لڑکا ہے۔ صوفی صاحب بے چارے سے صحیح معنوں میں اس سے عابز تھے۔ تالا لٹی کندھن، غمی سا۔" وہ اسے بول جاتے تو کچھ کر غصے سے بیڑا دیے۔

وہ سارا دن عبد العین نے گاؤں میں گاؤں سے باہر مشاقت کر کے گزارا۔ شام کو وہ پھر ماسٹر صاحب کے کمر چلا آیا۔ ماشنی نے اس کے لیے کپڑے دو کر تار پر لٹکادے تھے۔ اس کے کتے ہی ماسٹر صاحب نے اسے ہاتھ منہ دھر کر لے کر کھانا کھانے کے ساتھ ساتھ ماسٹر صاحب کی نماز ہو چکی تھی۔ کھانا کھاتے ہی اندھیرا پھیل گیا۔

"نن من رات کو ٹھنڈ ہو جاتی ہے تمہارا بستر اندر برآمدے میں لگایا ہے میں بھی اوہ رہتی بیٹوں گا۔"

ماسٹر صاحب کا اندر لے کر روٹھا روٹھا سا تھا مگر اسے کون سی پروا تھی "بی اچھا" کہہ کر اٹھ گیا۔ کچھ دیر صبح والا اخبار جو تخت پر ہوا تھا اٹھا کر کچھ رخصا ہو چار لائیں پڑھیں وقت اٹھ پھر بیڈ سے کیے اور اخبار دوبارہ تخت پر دھر کر صحن میں ٹھنڈے لگا۔ ماسٹر صاحب کوئی مہلی سی کتاب لے کر اپنے بستر پر بیٹھے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے نیک کے پیچھے سے ٹھہر لیتے۔

کچھ بعد وہ آراستہ بستر پر گیا۔ ماشنی اندر کمرے میں تھیں۔

"چچہ! چچہ! چچہ! میٹرک کے امتحان کے بارے میں۔" اسے بیٹھا دیکھ کر ماسٹر صاحب بولے "بی بی ان کے صحن میں اس کی بستر لگایا گیا۔" وہ اٹھ کر آیا۔

"نہیں۔" وہ رکھائی سے بولا تو برآمدے میں خاموشی چھا گئی۔ بلب کی چلی چمک وار روشنی اس کی آنکھوں میں بچھ رہی تھی۔ وہ ماسٹر صاحب سے بلب بند کرنے کو تو نہیں کہہ سکتا تھا۔

"بی بی عمر ہوتی ہے کچھ بن جائے گی۔ تھوڑی محنت کر لو گے اپنی جان پر سختی جھیل لو گے تو مستقبل بنا لو گے اپنا۔ حفظ میں تو تمہارے اور چارچہ جیسے لکھیں گے۔ میری ماٹو تو میٹرک کے امتحان میں بیٹھ جاؤ۔" ماسٹر صاحب اسے سہارا دینے کی طرح سے تلے نظر آ رہے تھے۔

"ماسٹر صاحب! میں میٹرک چھوڑا ایم اے بھی کر لوں نہ تو میرا مستقبل بے گناہ میں بابا صاحب کو پسند آؤں گا۔" صحن میں تو انہیں مجھ سے دل سے نفرت ہے۔ یہ اسی نفرت اور بے زاری کا تو اظہار ہے کہ وہ مجھے بنا بتائے گاؤں چھوڑ کر چلے گئے۔ میں کس لیے اپنی جان جو کھوں میں ڈالوں۔" وہ بہت بیزار تھا اور شاید غصے میں بھی۔ اس سے اپنی یہ بے عزتی ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ اس کے مال باپ اس کے گھر والے بنا اس کی پروا کیے اسے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔

"ارے یہ تو واقعی بات ہے صوفی صاحب آج نہیں تو نکل آئی جائیں گے تمہیں لینے۔ بتایا نا ان کی کوئی مجبوری ہوگی ورنہ کون شوق سے ایسے اپنا کھ پانچھوڑ کر جاتا ہے اور یہ تم سے کس نے کہا کہ کوئی باپ اپنی اولاد کو خود صا اپنے بیٹے سے نفرت رکھتا ہے۔ وہ تو تم سے بہت محبت کرتے ہیں اسی لیے تو تمہیں سدا ہارنے کو ہر وقت ڈانٹ دہٹ کرتے تھے۔"

"ہاں جیسے میں کوئی جانور ہوں جب دیکھا نہ ڈالے کر بیٹھا شروع کر دیا۔" وہ گڑ بڑ بولا۔

"تم بہت کر کے میٹرک کی تیاری کرو اور امتحان میں بیٹھ جاؤ پھر دیکھنا صوفی صاحب تم سے کتنا خوش ہوں گے وہ تو علم سے بہت محبت کرنے والے ہیں انہیں تو ذہن کی حد تک شوق ہے اپنے بچوں کو بہت پڑھانے کا اور میں

”اس حویلی میں نقب لگانی ہے کہ کسی کو علم بھی نہ ہو۔“ اس کے لب مسکراتے لگے چوکیدار کچھ کہتے ہوئے اس کی طرف لپکا تو وہ تیزی سے بھاگ کر وائیں طرف مڑ گیا۔



”دونوں دورا تیں“ آخر ایسا کیا نام تھا شہر میں کہ آئے کوئی نہیں چا اور ہاتھ منظر صاحب مجھے بتا چکے تھے کہ آپ نے صرف ان سے فون پر بات کی تھی۔ کوئی ان سے میٹنگ نہیں تھی کوئی بزنس میٹنگ اور کوئی بزنس ڈیل بھی نہیں تھی۔ نہ کوئی کاروباری مصروفیت نہ کوئی دو سر الام کام پھر سلطان بخت آپ نے یہ دونوں دورا تیں کہاں گزاریں۔ ”سید باؤس“ کے پیرے دار تمہارا کھاتے ہیں اور تمہاری بولی بولتے ہیں۔ سناؤ تو ابھی نہیں آئے رات کو آئے تھے صبح چلے گئے رات کو نہیں آئے شام کو ہی چلے گئے تھے۔ سہوٹے ڈوٹے اور بے ایمان۔ عیسائوں کی طرح۔“

”تیرے تیرے بھری تیرے پکار اور پکار کے بیڈ روم سے نیچے لاؤنج تک صاف آ رہی تھی۔“ تمہارے صاب کا ملازم نہیں ہوں میں نہ تمہارا زر خرید کہ تمہیں رپورٹ پیش کروں کہ میں کدھر تھا اور کدھر نہیں۔ تم اپنی اوقات میں رہو بے ہووہ عورت۔“ سلطان بخت ہوا یا ہوا ڈھلے۔ ”بے ہووہ میں نہیں تم ہو سلطان بخت اور میں بھی تمہاری زر خرید یا گھر میں بندھی کوئی بھیڑ بھری نہیں جو تمہارے سارے کربوت دیکھ کر میں میں بھی نہ کر سکے۔ میں بیوی ہوں تمہاری اور مجھے پورا حق ہے میں تمہاری خبر رکھوں کہ تم اس گھڑی کون سا کھلے کھلانے جا رہے ہو۔“ وہ ان سے بلند آواز میں چبھی تھی۔ ”اور تمہیں معلوم ہے میں اس گھڑی لاؤنج میں ہوں اور تمہارے حسد، جلن اور رشک کی آگ میں جل رہا ہوں۔ ابھی یہ نصیبی کے گل گل جانے پر رو رہا ہوں۔“ انہوں نے سائیزڈ سبیل پر رکھنا تاکہ کمرشل کا کھلانے ہاتھ اور آواز بے پردہ مارا۔ وہ لپ بھر میں لٹ کر چکتا چور ہو گیا۔

”نصیبی کو تو میں اپنی دورانی ہوں بھلا تم جیسے دھوکے باز سے زندگی جڑ گئی اور یاد رکھو سلطان بخت! میں کوئی عیشے کا کھلانے نہیں جو تمہاری دسترس میں ہے اور جب تمہارا جی بھر جائے تو تم اٹھا کر اسے دیوار پر لٹا دو۔ میں میں ہوں سید صاحب شاد۔ تمہیں مجھے سناؤ جو گا کہ تم نے یہ دونوں کہاں گزارے جبکہ تمہیں شہر میں کوئی نام بھی نہیں تھا۔“ وہ ہناؤرے خوف کھاتے اس کے سامنے تن کر آ گھڑی ہوئی۔ ”صاحب شاہ! دفع ہو جا میری نظروں کے سامنے۔ تم نے چند ہفتوں میں میری زندگی کا سکون فنا کر کے رکھ دیا ہے اور میری پروا کت اب تم ہو رہی ہے دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ سلطان بخت اپنے ہی بال دونوں ہاتھوں سے لوج لوج کر بخت بھرے عالم میں بولے۔

”میں سلطان بخت! یہ تمہاری بھول ہے کہ میں دفع ہو جاؤں گی اور ہے۔ تم نے میری زندگی تباہ کی ہے میں تمہاری زندگی سے سکون خوشی، اطمینان سب کچھ لوج بھینکوں کی سب کچھ۔ اور میں تمہارے ان ڈراموں کے فریب میں بھی نہیں آنے والی۔ جب زندگی ہی داؤ پر لگ گئی سب کچھ پہلی رات ہی اچھا کیا تو پھر ڈر کس بات کا ڈر تا تو وہ ہے جس کے کسی چیز کے کھو جانے کا خوف ہو میرے پاس تو ایسا کچھ بھی نہیں جس کے لٹنے کے ڈر سے میں خاموش رہوں گی زبان بند رکھوں گی۔ جانا تمہیں اور ہے ہو گا یہ میرا کمر ہے میرا دل چاہے گا تو میں جاؤں گی نہیں تو تم مجھے دھکے کر بھی نہیں نکال سکتے۔“

وہ جا کر اڑی تیز پر پہنچ گئی اور بڑے سکون سے تھولنے لگی۔ سلطان بخت کی وجہ تھوڑے سے ایک گون ناگوں سکون اس کے دل میں اتر رہا تھا۔ یہی منظر تو اس کی آنکھیں دیکھنا چاہ رہی تھیں۔ سلطان بخت نے صرخ انگار آنکھوں سے اسے لکھ کر دیکھا اور پھر پیر پیر دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ تیز تیز قدموں سے سیدھی اتر کر جو نئی وہ لاؤنج میں داخل ہوئے ان کی نظر سامنے بیٹھی سیدہ آپا پر پڑی جو بہت افسوس اور رنج بھری نظروں سے ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ سلطان بخت کے اعصاب اور تن گئے۔

تمہیں ایک بات بتاؤں۔ اس دنیا میں وہی بڑا نام پیدا کر سکا ہے اور مقام بھی جس نے علم کی اہمیت کو جانتا ہے علم ہوتا ہے۔ آدمی کو تخت پر بٹھاتا ہے اور یہ علم ہی ہوتی ہے جو آدمی کو تخت کی طرح الٹ میں جوتی ہے جو اہمیت علم کی ہے اس کا اندازہ تم اس بات سے لگا لو کہ علم حاصل کرنے کے لیے چین تک جانے کا علم ہے اور۔“ وہ بڑے جوش سے بول رہے تھے۔ سانس لینے کو رکے تو انہیں عبد العین کے ہلکے ہلکے خزانے سنا لی دیے۔ انہوں نے انگلی سے ناک پر ہلکتی عینک کو اونچا کر کے دیکھا وہ منہ کھولے سو رہا تھا۔ سائز صاحب کا جی چاہا تھا ہاتھ میں پکڑی یہ مہلی ہی کتاب اٹھا کر اس کے سر پر سے ماریں۔

”محق کا لوق، آلو کدھال۔“ وہ خاصی اونچی آواز میں اسے ان القابات سے نوازتے رہے اگلے دن بھی اس کی بیکی رو نہیں رہی۔ ناشتہ کر کے گھر سے نکل گیا اور رات گئے لوٹا۔ اب سائز صاحب اسے منہ پھار کر ادھر سے جانے کا بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ شام کو گرد آؤ حلیہ لے کر لوٹا تو وہ اس کی شکل دیکھ کر رہ گئے۔

”تمہا لو بنا کر کتنے گندے کپڑے ہو رہے ہیں تمہارے۔“ وہ روتے ہوئے بولے۔ ”اگلی صبح وہ پھر ناشتہ کر کے باہر جانے لگا تو سائز صاحب نے اسے پیچھے سے آواز دی۔ ”عبد العین! تمہیں آج در سے نہیں جانا تمہاری پھٹی ہوئی شام کو ختم ہو گئی تھی۔“ اب اسے بھگانے کا یہی طریقہ ان کی سمجھ میں آیا تھا۔

”جب تک پاپا صاحب نہیں آتے میں یہاں سے نہیں جاؤں گا اور میں سائز صاحب! میں نے سوچ لیا ہے کہ میں میٹرک کا امتحان دوں گا۔ آپ شام کو میرے لیے کتابیں نکال کر رکھیں میں رات کو پڑھنا شروع کروں گا۔“ بہت سوچنے کے بعد سائز صاحب کے گھر میں ٹھنڈے کاٹ سے یہی نسخہ کجی میں آیا تھا۔ سائز صاحب کا چہرہ کھل سا گیا۔

”واقعی یہ تو بہت اچھی بات ہے تو آؤ ابھی مل کر اندر الماری سے کچھ کتابیں نکال لیتے ہیں۔“ وہ جوش سے اٹھتے ہوئے بولے۔

”ابھی نہیں شام کو میں آؤں گا پھر۔ ابھی مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔“ وہ انہیں ٹال کر باہر نکل گیا۔ ضروری کام تو اسے ادھر کوئی بھی نہیں تھا دن میں دو چار بار جا کر گھر دیکھنا شاید تالا کھل گیا ہو اور پاپا صاحب لوٹ آئے ہوں انہاں جی کو اڑھو لے اس کے انتظار میں بیٹھی ہوں مگر دو روز سے وہ ایسا کھنکھن بھی نہ ہوا تھا۔ وہ ذاتی طور پر بہت باغی ہو رہا تھا۔

وہ دن میں ایک بار حویلی کی چار دیواری کے گرد بھی چکر لگانا نہ بھولتا۔ اسے معلوم تھا اسے بھلا ادھر کس نے پہچان لینا ہے۔ میں کون سا کسی امیر سید زاوے کی اولاد ہوں۔ ایک معمولی مولوی کا بیٹا ہوں جسے اس حویلی کے ایک شیطان نے اپنی گندی نظروں سے نکال باہر کیا۔ حویلی کی بیچلی دیوار سے ٹیک لگائے وہ سوچ رہا تھا۔

”اس حویلی میں نقب لگانی ہے ایسے کہ کسی کو علم بھی نہ ہو اور حویلی لٹ جائے۔“ وہ دیوار کو گھومتے ہوئے ہونٹے لگا۔

”اسے کون ہے تو۔ ادھر کیا کر رہا ہے؟“ حویلی کا کوئی ملازم تھا۔ پچھلا گیت کھولتے ہوئے اسے دیکھ کر گرجا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظروں حویلی کے کھلتے گیت سے نکلی سیاہ شیور لٹ پر تھیں جو آہستہ آہستہ باہر کی طرف پھرتی تھی۔ جیسے ہی گاڑی اس کے قریب سے گزرنے لگی اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پچھلی سیٹ پر کوئی خاتون بھی حویلی کی کوئی نہ لقا اور اسے معلوم تھا یہ کون تھی۔ ”شہزادہ بنت سبطین شاد شادی کی چھوٹی صاحبزادی۔“ گاڑی دھول اڑاتی ہی بیڈنڈی پر ڈوٹتی جا رہی تھی۔

”اور میرا مشورہ مانیں تو بھابھی بیگم! آپ بھی اب ہوش کے ناخن لیں۔ یہی وقت ہے جو آپ ادھر کے تماشے دیکھنے میں برباد کر رہی ہیں اپنے گھر کی خبر لیں۔ خیر سے آپ کے دونوں بچے بھی تو توجہ والی کی دہلیز پر قدم دھر چکے ہیں جن کو آپ پر دے میں بٹھا کر سمجھ رہی ہیں نسلوں کی نیک نامی محفوظ کرنی۔ ذرا پروے کے اندر بھی خبر رکھیے گا اور اپنے فرزند ارجمند کو محض سید زاہد سمجھ کر نظر انداز نہ کیجئے۔ یہ سید زاہد کے تماشے میں ہوتے ہیں۔ بڑی رتقین طبیعت ہوتی ہے ان کی۔ دور کیوں جائیے آپ کے بھائی کی مثال سامنے ہے۔“ سیدہ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی صاحبہ ہے وہ تو بغیر پلک ہینکے اسے دیکھنے جا رہی تھیں۔

”میری باتوں پر غور فرمائیے گا اور اس حویلی کے معاملوں کو اس حویلی کے افراد کا ہی درد سر رہنے میں آپ کی مہربانی ہوگی۔ میں اب آرام کروں گی آپ تو شاید شام تک ادھر ہی قیام فرمائیں گی۔“
 وہ ایک بار پھر انہیں حویلی میں بار بار آنے کا طعنہ دے کر بیڑھیاں پھلا تھی اپنے کمرے میں غائب ہو گئی۔
 ”اوہ میرے اللہ! اس کے اندر کون سی بدروح سما گئی ہے ایسی شیطان طبیعت صاحبہ کی تو نہ تھی۔“ سیدہ نے بے یقینی سے اپنا سر تھام لیا۔

اور شام کو جب وہ یہ دکھ بھری داستان حسین شاہ کو سنانے میں تھیں تو وہ بھی بول اٹھے۔
 ”غلام تو نہیں گناہگار نے کچھ اپنے گھر کی بھی خبر لو اور تمہارے بھائی کے چھین کیا تمہارے آنے جانے سے سدھر جائیں گے وہ ایک چمکا گھڑا ہے اپنی فطرت نہ بدلے گا۔“ حسین شاہ کا خیر بھرا لہجہ انہیں آگ لگا گیا۔
 ”آخر کیا لیا ہے میرے بھائی نے۔ آپ دونوں اس کے پیچھے ہی چلے گئے ہیں۔“ وہ تڑپ کر بولیں۔

”یہ پوچھو وہ کیا نہیں کرتا۔ یہ اس کا شہریا ریا آنا جانا تمہیں پتہ نہیں آتا۔ شہر کے ہر بدکاری کے اڈے برتنے تلور مال کی پھلی بولی سید سلطان بخت کی ہوتی ہے اور شہر میں جو اس کا من پسند کھیل ہے اس کا تو تمہیں علم ہی ہو گا اور گاؤں کے اندر بھی کئی مثالیں پھوڑی ہیں آپ کے بھائی نے وہ لڑکی جو تمہارے گاؤں میں مہمان آئی تھی اور تمہارے بابا جان کے مٹی کے بیٹے کے ساتھ بھاگ گئی تھی ابھی بھی نہیں ہو سکا کہ وہ سلطان بخت کی ہوس بھری نگاہوں سے بچ سکی ہو اور نیا واقعہ تو تمہیں معلوم ہے۔ تمہارے گاؤں کی مسجد کے صوفی صاحب ادھر سے کیوں چلے گئے۔ سیدہ! میں ادھر انجان نہیں بیٹھا جیسے اس کے دل کی خبر ہے۔ یہ تو میرا حوصلہ ہے جو میں ابھی تک اس کی حرکتوں کو برداشت کیے جا رہا ہوں نہ جانے کس شیطان کی روح ہے اس کے اندر کہ اس کی ہوس کی سیری نہیں ہوتی۔ جوانی ہم پر بھی آئی تھی مگر ایسی اندھی نہیں کہ ہر طرف سے نہ مارتے پھریں۔ سب کو خبر ہے ایک بس تم ہی آنکھیں بند کیے اس کے اذخالی سے بے خبر ہو اس کو سمجھاؤ اور نہ اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی زیادہ دن برداشت نہ کر سکو گاہاں۔“ حسین شاہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے اور انہاں کاشافات نے تو سیدہ کو پیسے گنگھی کر دیا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

”پتا نہیں کیا کیا کہانیاں گھر گئے ہیں، بھولی یا اللہ! بابا جان جلد سے جلد آجائیں تو وہی اگر اس تماشے کو ہمیشہ پھر سب کے منہ بند ہوں گے۔“ وہ روتے ہوئے دل میں دعا کرنے لگیں۔

صوفی صاحب کو انجانا کا نا کا سا انیک ہوا تھا۔ انہوں نے ساری زندگی کسی غم، فکر یا پریشانی کو خوب برداوی نہ ہونے دیا تھا۔ بیٹھ اپنے سخت دل اور سخت رویے سے غم و فکر کو پھینکا ہی تھا۔ شکست نہ کھائی تھی۔ یہ بیکار کیا ہو گیا کہ انہوں نے ایک فکر سے آٹھ کیا ملائی تمام غم اور پریشانیاں ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگیں۔ ابھی در بدری کے زخم تازہ تھے کہ جان سے پیارا بیٹا ان کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ ان کے فیصلے کو جھٹلانے لگا اب ان کا دل اس قدر بھی سخت جان نہ تھا کہ یہ سختی بھی چپ چاپ جھیل جاتا۔

”عبدالعبید نے در سے سے چھٹی لے کر چلا گیا تھا تو تم نے اسے گاؤں میں دیکھنا تھا جا کر۔“ ان کی آواز میں ابھی نقابوت تھی۔ انہوں نے پاس مہرب کھڑے طیلیل سے کہا جو چند لمحے پیشتر عبدالعبید کے مدرسے سے اس کا پتا کر کے لوٹا تھا۔

”گاؤں جانے سے آپ نے منع کیا تھا جی! وہ اسی طرح سر جھکائے ہوا۔“

”ہاں یاد آیا میں نے منع کیا تھا نہیں۔“ وہ ایک گہری سانس خارج کر کے بولے۔ ”گاؤں ہی گیا ہو گا ہے بھی زمانے بھر کا احق، کچھ ایسا کر دے یا بول دے۔ چھوٹے شاہ جی کا اللہ جانے مزاج کیسا ہے۔ اچھا ہوتا ہے اسے وقت ساتھ ہی لے آتے۔“

صوفی صاحب تاسف بھرے لہجے میں بولے۔ ”راہے ان کی یا نعتی پر بیٹھی ہو لے ہو لے ان کے پاؤں دیا رہی تھیں۔ مکمل کی شکل میں ان کا پورا وجود ال رہا تھا اور سر جھکا ہوا تھا۔ شاید وہ رو بھی رہی تھیں اور رو تو گزشتہ دو دنوں سے مسلسل رہی تھیں۔ جیتے جی عبدالعبید کے چھڑنے کا غم اور عبدالعبید بھی تو ان کی پیاسی نگاہوں کو نظر نہیں آ رہا تھا۔ صوفی صاحب پر دل میں غصہ بھی آتا جو اسے یوں بھوڑ کر چلے آئے۔“

”چلو غم جا کر ہاتھ منہ دھو لو، کھانا پیئے لے جا کر کھا لینا۔“ میں عصر کی نماز کے وقت نیچے آ جاؤں گا۔ جماعت بھی میں ہی کر اؤں گا۔“ انہوں نے طیلیل کو جانے کے لیے کہا۔

”ابھی کبھی طبیعت ٹھیک نہیں پوری طرح سے پھر ڈاکٹر نے بیڑھیاں چڑھنے اترنے سے بھی منع کیا ہے۔“ والیہ دیر سے بولیں۔

”تو لیا میں بستر سے جڑ جاؤں، والیہ جی بی! میری روزی اللہ نے اسی میں لکھی ہے کہ میں اس کی مسجد اور اس کی مخلوق کی خدمت کرتا رہوں۔ اگر اس خدمت کا معاوضہ میں بستر پر لیٹ کر وصول کروں گا تو اپنے بچوں کو حرام کھاؤں گا اور اگر میری موت بیڑھیاں اترنے پر چڑھنے سے لکھی ہے تو ڈاکٹر کی ہدایت اسے ٹال نہیں سکتی۔“ عبدالعبید کو گھر سے نکالنے کے بعد آج پھر انہیں جلال آیا تھا۔ چہرہ یکدم سرخ ہو چلا تھا اور آنکھیں غصے سے کھلی گئی تھیں۔ والیہ چپکی ہو کر بیٹھی رہیں۔ صوفی صاحب سے بحث تو خیر انہوں نے زندگی بھر نہ کی تھی اب کبھی لیتیں گے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی کیا ہر بھی خاموشی تھی۔ آتی سروپوں کی وہ ہر کے آخری پل تھے۔ سناٹا گھروں کے کونوں میں پھار رہا تھا۔

”بچیاں کہاں ہیں؟“ کچھ دیر بعد وہ خود ہی بولے۔
 ”آمنہ پڑھ رہی ہے اور تویریہ بھی۔ اس کا تو اسکول نیا ہے ابھی کام بہت ملتا ہے اسے اسی لیے آمنہ کے پاس بیٹھ کر کام کر رہی ہے۔“

”اور زینب کیا کر رہی ہے؟“ صوفی صاحب سب کی سرگرمیوں پر شروع ہی سے نگاہ رکھتے تھے۔
 ”جویریہ کی قیص کی پرانی کر رہی ہے۔ اسکول کا یونیفارم ہے اس کا۔“ انہوں نے آہستگی سے جواب دیا۔ چند لمحے اور خاموشی سے سر کے کمرے میں ملا جاسا اندھیرا پھیل رہا تھا۔
 ”طیلیل! تم جا کر منہ ہاتھ دھوؤ۔“ ان کے کہنے پر طیلیل باہر نکل گیا۔

”میں چاہتا ہوں زینب بھی آمنہ کے ساتھ ہی میٹرک کا امتحان دے لے۔“ وہ کچھ دیر بعد بولے تو اماں بی کے پاؤں ہاتھ ہم سے گئے۔ انہوں نے کچھ اچھٹے سے صوفی صاحب کی صورت دیکھی۔

”وہ کیسے دے سکتی ہے اس نے ابھی ایک دو ماہ پہلے تو رور و کرمل کا امتحان دیا ہے۔ ابھی تو اس کا نتیجہ بھی نہیں آیا۔“

”نتیجہ آنے والا ہے چند دنوں تک۔ آمنہ اور زینب کی عمروں میں بمشکل سال ڈیڑھ سال کا فرق ہے۔ میں چاہتا ہوں دونوں۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

”تم نے بات کی تھی اس رشتہ کرانے والی سے۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ پھر بولے۔
 ”نکی تھی۔“ والیہ پر شرمیلی سے بولیں۔

”پھر؟“ صوفی صاحب کا لہجہ مشتاق تھا۔

”اس کے پاس تو وہی رشتے ہیں زریہ جی والا پان والا میزنی والا بیکری میں ملازم مسمو سے تلنے والا۔“

”اصول ولاقوتہ“ بھی شاید اپنی کی فہرست اور بھی ہوتی مصوفی صاحب اونچی آواز میں بڑبڑاتے۔
 ”اس سے کہنا تھا تم نے ہم سے اس طبقے سے تعلق رکھتے نظر آتے ہیں۔ کل شام کو بھی اس رنگ ساز کا رشتہ اٹھالائی تھی۔ اس کی گھر والیاں کسی تو پر روٹیاں لگانے والی نظر آتی تھیں۔“
 صوفی صاحب نئی سے بولے۔ کل جو تین عورتیں آمنہ کے رشتے کے لیے آئی تھیں مصوفی صاحب نے انہیں گھنٹن سے گزرتے دیکھ لیا تھا۔ عبدالمبین کو گھر سے نکالنے کے بعد انہیں بیک ایک ہی لگا ان کے کندھوں پر بڑا بوجھ آن کر ہے اور اس بوجھ کی وجہ سے ان کے کندھے جھکے جا رہے ہیں۔ انہیں لگان کا جسم کمزور پڑ رہا ہے اس بوجھ کو اٹھانے کے لیے۔

”چند ایک ماہ بعد گاؤں جانا پڑا یا نہیں۔ دونوں صورتوں میں وہ نوں بچوں یا کم از کم آمنہ کا کہیں نکاح یا شادی ہو جائے تو بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔“ یہ ان کی تین دن پہلے کی سوچ تھی اور انہوں نے اپنی بیوی کو بھی اس پر راضی کر لیا تھا کہ وہ نکلے میں رشتہ کرانے والی کو بلوا کر اس سے بات کریں۔ ان کی بات کے نتیجے میں کل جو وہ رشتہ لے کر آئی تو دونوں میاں بیوی کو بے حد تاؤ اور گزرا۔ جلد بازی میں بھی بھر حال ان کا آمنہ یا زہیب کو کسی گھر میں گرانے کا ارادہ ہرگز نہیں تھا۔

”اس سے کہو کسی پر سے لکھے اچھے گھر لے کر رشتہ لائے۔“ مصوفی صاحب چند لمحوں بعد بولے۔
 ”یہی کہا ہے میں نے اسے کہہ رہی تھی کہیں چہرہ اسی یا کلرک ہے۔ اس کا رشتہ لائے کی ادھر دفتر ہی کتنے ہیں چھوٹا سا تعلق ہے بے پیاری کوشش تو کر رہی ہے مہلتوں کے لحاظ سے رشتے ہوں گے نا۔“
 ”بہر حال کوشش کرو ان دو چار ماہ میں اگر ہو جائے تو اچھا ہے۔“

صوفی صاحب کو جلدی لگ گئی تھی۔
 ”تم جا کر جلیل کو کھانا دو صبح منہ اندھیرے کا ٹھکا ہوا تھا۔ ہاتھیں راستے میں اس نے پچھ گیا بھی یا نہیں۔ ایسے بیٹوں سے اچھا تو یہی ٹھکا اپنی اولاد اسی لیے انسان۔“ عبدالمبین کا دکھ ان کے لیے ان کی آنکھوں میں بٹنے لگا تھا۔ انہوں نے آنکھوں پر پاؤں رکھ لیا تو اماں کی ایک گہرا سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔
 ”اور ہاں زہیب سے کہو آمنہ کے ساتھ امتحان کی تیاری کرے یا نہیں کافی دن ہیں ہو جائے گی اس کی تیاری۔ سارا دن فارغ ہی رہتی ہے وہ۔“ رابعہ چو کھٹ کے پاس پہنچیں تو انہوں نے یاد دلایا۔

جلیل برآمدے میں چولہے کے پاس بیٹھا تھا۔ انہیں اس پر ترس آیا اور یہاں تک کہ بے چارہ صبح سے ہمارے واسطے خوار ہو کر آیا ہے اب بھوک لگی ہوگی۔
 وہ بیڑھی پر بیٹھ کر چولہا جلانے لگیں۔
 ”تم اتنی دور جو گئے تھے تو گاؤں بھی چلے جاتے کوئی پوچھتا تو کہہ دیتے میں تو صوفی صاحب کے ساتھ گیا ہی نہیں۔“ رابعہ چولہے رکھ کر وہ بولیں۔

”صوفی صاحب نے مجھے بھوٹ کہنے سے منع کر رکھا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے سر جھٹکے جھٹکے بولا تو اس کی بات پر اماں کی خواہ مخواہ شرمندہ ہو گئیں۔
 ”تفصیلاً“ بھوٹ بولنے میں تو کوئی حرج نہیں ہوتا۔ وہ کچھ دیر بعد بیٹھ جاتے ہوتے تھتے مٹانے کو بولیں۔
 ”میں کل پھر چلا جاؤں گا عبدالمبین کے مدرسے بھی اور ادرہ ہو تو گاؤں بھی۔ آج شام کو تو وہ یوں بھی مدرسے چلا ہی جائے گا۔ اس کی تھٹی ہو سکتی ہو جائے گی۔“ وہ ان کی شرمندگی رفع کرنے کی خاطر بولا۔
 ”جلیل! تیرا یہاں دل لگ گیا۔“ وہ موضوع بدل کر بولیں۔

”کچھ کچھ اماں ہی اصل میں میرا کام تو پہلے بھی مسجد ہی میں ہوتا تھا اور اب بھی اسی لیے مجھے کچھ خاص فرقی نہیں پڑا۔ اماں ہی! جو نیچے مؤذن صاحب ہیں تا شوق بھالی آوہ بہت پڑھے لکھے ہیں ان کے پاس بہت مولی مولی کتابیں ہیں۔ اسٹر صاحب کی طرح حدیث اور تفسیر کے علاوہ انگریزی کی بھی۔ انہوں نے بہت پڑھ رکھا ہے۔“

فارسی یعنی انگریزی۔“ وہ ہوش سے انہیں بتانے لگا۔
 ”اچھی بات ہے علم حاصل کرنا تو۔“ انہوں نے روٹی تیل کرتے پر ڈالی۔
 ”میں نے ان سے کہا کہ مجھے بھی پڑھا دیا کریں رات میں میں ان کے پاس ہی سوتا ہوں نا! انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ پڑھا دیا کریں گے۔“

جلیل بہت خوش تھا اپنی بات ان سے کہہ کر اسے تو کسی سے اپنے دل کی بات بھی نہیں کہنی آتی تھی۔ ہوش میں آکر آٹھ کھولی تو خود کو مسجد میں پایا اور صوفی صاحب کے رعب نے کتنا عرصہ اسے پونے کی طاقت بھی نہ دی تھی۔

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ جلیل نے اپنے اہل گھر کے اپنا کوئی مستقبل بنانے کے لیے مسجد میں رہنے سے تو تمام عمر نمازوں کی جو تیاں سپرد ہی کرنے اور محنتیں جھاڑنے میں گزارو گے۔ کچھ یہ بھی ہر فعل نہیں مگر علم سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔“

وہ اسروز بے چین بول رہی تھیں اسی طرح کے خواب تو انہوں نے عبدالمبین اور عبدالمبین کے لیے بھی بنے تھے اور ادھر تو جیسے جگہ ہی الٹ ہوئے جا رہا تھا۔ انہوں نے سنا ان پلیٹ میں ڈال کر روٹی جلیل کے آگے رکھی۔ وہ لقمہ توڑ کر کھانے لگا۔



”داستان چھوڑ آتے ہیں۔“ کیپٹن شہباز بڑے فقر و بالکل صادق آتا ہے۔ وہ اپنے پیچھے ایک داستان ہی تو چھوڑ آئے تھے۔ کیا وہ سوچ سکتے تھے کہ وہ دن کیسا ظلمت ہوا ہو گا جب نہ بہت شمالی کمرے سے نکلے ہوگی۔ کیا وہ دن ایک عورت کے لیے طلوع ہو سکتا ہے جس کی رات میں اس کا رویہ سمانوں جیسا ہو اور دن کے اسیاں میں اسیاں جیسا ہے اس کا چہرہ چھوٹے بن و بچے بن برتے ٹھوکر مار کر چلا گیا ہو اس سے بڑی اہانت کسی بھی عورت کے لیے دنیا میں اور کوئی ایسی ہوگی۔ دنیا کا وہ معاشرہ جس کا کوئی قاعدہ قانون یا ضابطہ اصول ہو گا وہ اسے گوارا نہیں کرتا تھا۔ یہ شادی کا ڈھونگ شہباز کے نزدیک ڈھونگ تھا سوانگ تھا اور خود پر جبر کر کے انہوں نے سوانگ بھرا تھا تو یوں ہی سہی شخص چند گھنٹے صرف دنیا داری کی خاطر وہ اس کمرے میں بنا اس کی طرف دیکھے بنا اس سے بولے جتنا جاتے تو شاید اسے اتنی ہی ذہانت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ کل اور آج میں کچھ خاص فرق تو نہ تھا۔ کل ساری دنیا کے سامنے تمنا شہباز نے چلا تھا اور آج گھر کے اندر اٹل خانہ کے سامنے اور گھر آئے مہمانوں کے سامنے۔

اس نے اپنے دل کو تو بھرا لیا تھا اور کراہی وقت کے نشان مٹانے کی کوشش کر لی تھی مسجد میں سر پر گڑ گڑ کر لڑنے کے سامنے آہو زاریاں کر کے دل کا سکون بھی حاصل کر لیا تھا۔ صبح دم اسے پر سکون سی نیند بھی آگئی تھی مگر دنیا۔ دنیا اسے اس طرح سکون کی نیند لیے سونے دے سکتی تھی بھلا۔ وہ جانتی تھی اس کا شوہر اسے ناپسندیدگی کی سند عطا کر کے جا چکا ہے مگر دنیا نے کہا اس سامنے پر سونا نہیں نام کرنا چاہیے۔ اونچے اونچے بین والے چاہئیں سارے زمانے میں اپنی کم نصیبی کا اوپلا کرنا چاہیے۔

پہلی صبح عالیہ بھانجھی کی تھی۔ اسے کمرے میں پر سکون انداز میں سوتے دیکھ کر ادھ کھلا دروازہ بیڈ کے دوسری طرف بے تحشہ اور کیپٹن شہباز کا ڈریسنگ کے ساتھ پر اعجاب بیگ۔ انہیں بل بھر میں خاک کے سمیت کہانی کے بیچ دار مراحل سے آگاہ کر گیا تھا۔

پھر عالیہ بھانجھی کے داویلے کے ساتھ ہی بہت سی مہمان خواتین بھی کمرے میں آئیں۔ اسے عجیب عجیب نظروں سے دیکھنے لگیں۔ اس کا ذہن اس ہنگامے پر نیم سوا نیم جاگا سا تھا۔ ایک تو رات بھر کا رت جگا وہ بھی آنسوؤں کے چر انگوں کے ساتھ۔ اس کا دل غویسے ہی ترین کے بھاری انجن جیسا ہورہا تھا اور اسے یہ ہنگام۔
 ”آخر ایسی بھی کیا آفت آگئی شہباز میاں پر کہ راتوں رات چند گھنٹوں کی بیانیوں کو چھوڑ چھاڑ کر نوکری کو

سدا ہمارے۔ کیا فوجی سپاہی شادی وادی نہیں کرتے۔ انہوں نے تو زالا ہی تماشا کھڑا کر رکھا ہے، نکل پر سوں سے سب دیکھ رہے ہیں۔ کیوں نہ ہوتے! اب رات کو ایسی کیا بات ہو گئی کہ صاحبزادے بالکل ہی اٹھ کر چل پڑے۔

شاید یہ عالیہ بھانسی کی والدہ محترمہ تھیں وہ خاموش رہی۔ نہ اس کے پاس ان کے لایعنی سوالوں کے جواب تھے نہ انہیں اس کے جواب سے مطمئن ہونا تھا سوچ رہی۔

”ارے اچھا بھلا تو کمرے میں آیا تھا، موڈ بھی ٹھیک لگ رہا تھا، باہر سے تو ہنستا کھیلتا ہی کمرے میں گیا تھا۔ اب اندر اللہ جانے کیا چتا پڑی کہ دو لہا میاں نو دو گیا رہ ہو گئے۔ عالیہ! اپنی ساس کو بتاؤ جا کر جو بیٹے کو جلد عروسی میں بھیج کر شانت ہو کر سو رہی ہیں۔“

دوسری خاتون کو خیال آیا۔ ”ہاں تو نہت کیا کیا شہباز نے۔ بھلا دلہن پسند نہیں آئی، کوئی بہانہ بنا دیا یا سیدھا سیدھا منہ پر کہہ دیا کہ تم مجھے پسند نہیں۔“

خاتون منہ پھٹ تھیں۔ پر شوق نظروں سے نکلنے ہوئے بولیں تو نہت نے ایک زخمی نگاہ ان پر ڈالی۔

”ارے اس کو بہانے کی کیا ضرورت۔ آج کل کے مرد لڑکی پسند نہ آتے منہ پر کہہ جاتے ہیں، میں کس کا ڈر اور دلہن کی بے فکری دیکھو، کوئی علم کوئی افسوس نہیں۔ مزے سے سو رہی ہے۔“

تیسری خاتون نے دونوں طرح کے بھروسے کیے۔

”دیکھ ہی آیا جان سے کہا تھا۔ یہ زہرستی کی کھیر نہ کھلا نہیں اسے۔ نتیجہ اس سے مختلف اور کیا ہونا تھا بھلا۔“

عالیہ بھانسی کیوں پیچھے رہیں، ناک چڑھا کر بولیں۔

”اے زہرستی کی کھیر۔ کیا شہباز میاں راضی نہ تھے۔ یہ تو خلی سنی ہم نے۔“ سب سے پیچھے کھڑی مجلس لگا ہوں والی دبی تکی اور میٹر عمر عورت آگے آ کر بولی۔

”ہاں تو اور کیا سب کو پتا ہے اتنے دنوں سے ادھر اور کیا ہو رہا ہے۔ ان کے ہاتھ جو ڈر کر پڑا ہے اور ہلا گیا تھا۔ آگے۔“

”فاز بولی ہی ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھی پیچھے سے بولی۔

”پلیز فائر گاڈ سیک۔“ ان سب کے درمیان مجرمہ ہی تھیں نہت کے صبر کا پیمانہ لہرز ہو گیا وہ ایک دم سے سر اٹھا کر زور سے چلی۔

”پلے جائیں آپ لوگ یہاں سے میں آپ لوگوں کے آگے جواب دہ نہیں ہوں۔ مجھے اکیلا چھوڑ دیں، پلے جائیں یہاں سے۔“

اس کی تیز آواز پر سب خواتین کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ وہ تیزی سے اٹھی اور اس دوہم کا دروازہ کھول کر اندر گھس گئی۔

دروازہ لاک کر کے وہ آتش بیسن کے آگے جا کھڑی ہوئی۔ اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا اور آنکھیں بے تحاشا دکھ رہی تھیں۔ اب تو شاید ان میں رونے کی بھی سکت بھی نہ رہی تھی۔ بھولے بھولے ہو آنسو پیلوں پر آن ٹھہرے اور پھر ایک کے بعد ایک قطار بنتی چلی گئی۔ کمرے سے ابھی بھی آوازیں آرہی تھیں۔

”آخر میں کیوں روؤں، صرف میں ہی کیوں۔“ اس نے زور سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں اور ٹونٹی کھول کر پانی کے چھینٹے اپنی آنکھوں اور چہرے پر مارنے لگی۔

”بی بی! آپ بڑی بیگم صاحبہ کے کمرے میں ناشتہ کریں گی یا ادھر ہی لے آؤں۔“ اسی وقت زیتون بانو نے دروازے پر آ کر اس سے پوچھا تو وہ چونکا اٹھی۔

”پچھو اٹھ گئی ہیں؟“

”جی اٹھ چکی ہیں اور آپ کا پوچھ رہی ہیں۔“

”ٹھیک ہے آپ ناشتہ ان کے کمرے میں لگائیں، میں فریش ہو کر ادھر ہی آرہی ہوں۔“ وہ اٹھ کر اور روپ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

مسزخان کے کمرے میں اظہر اور ایاز بھی موجود تھے۔ سینئر ٹیبل پر ناشتہ چنا ہوا تھا۔ مسزخان وہیل چیئر پر ٹیبل کے پاس ہی بیٹھی تھیں، جب وہ زیتون بانو کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی اور سب کو سلام کر کے مسزخان کے ساتھ بڑی خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

ناشتہ سب نے بالکل خاموشی سے لیا، کسی نے اس سے کوئی سوال نہ کیا۔ ناشتہ کے فوراً بعد اظہر اور ایاز تو اجازت لے کر چلے گئے، وہ خاموشی سے چائے کے چھوٹے چھوٹے سب لیتے رہی۔

”شاید پچھو اب مجھ سے کچھ پوچھیں۔“ وہ خود کو ذہنی طور پر تیار کرتے گئی۔

اس کا کپ بھی خالی ہو گیا اور زیتون بانو ناشتہ کے برتن بھی سمیٹ کر لے گئی۔ مسزخان نے اسے خود سے مخاطب نہ کیا۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”پچھو! میں سونا چاہتی ہوں، میرے سر میں درد ہے اور میں دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھاؤں گی۔“ وہ انگلیاں پٹکا کر اپنی زبان کی خاموش نظروں سے مخالف ہو رہی تھی۔

”ٹھیک ہے، کوئی تمہیں ڈسٹرب نہیں کرے گا۔“ ان کا بھلا ختم ہوتے ہی وہ کمرے سے نکل گئی۔

پھر شام تک وہ اپنی کرسی سے ڈسٹرب نہیں کیا۔ اس نے جی بھر کر نیند پوری کی اور جب اٹھ کر بیڈ روم سے باہر آئی تو شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ ویسے بھی مو سہیل رہا تھا، ان کافی جلدی سمٹ جاتا تھا شام کو آنے کی بہت جلدی ہوتی تھی وہ یکن میں جا کر اپنے لیے چائے بنا تا چاہتی تھی۔ ابھی اس نے ماچس کو ہاتھ ہی لگایا تھا کہ زیتون بانو بیل کے جن کی طرح اس کے سر پر آن نمودار ہوئی۔

”بی بی! اچھوٹے صاحبہ کا فون ہے، بیگم صاحبہ آپ کو بلا رہی ہیں۔ آپ ان کے کمرے میں چلیں میں چائے دینے لے کر آتی ہوں، کھانا نہیں کھاؤں گی آپ؟“

”میں صرف چائے لے کر ساتھ پیچھے آؤں، تو لے آؤں اور نہ خالی چائے۔“ وہ باہر نکل آئی۔

کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ لگتا تھا تمام مہمان جا چکے ہیں۔ مسزخان فون پر بات کر رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی پر جوش ہو گئیں۔ ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ صبح والی پڑھو کی غائب تھی۔ سر حال جو بھی کیا تم نے اچھا نہیں کیا۔ اس پر تو تب بات ہوئی جب تم آؤ گے فون پر میں کیا بحث کروں۔ سب کیے کرانے پر تم نے پانی پھیر دیا۔ سب کی نظروں میں مجھے شرمندہ کرا دیا جس کی مجھے تمہارے امتیاز تھی۔ اب تم جلد سے جلد چند روپوں کی پچھنی لے کر آؤ، مہنی مہون کے لیے اور اب میں کوئی رطبت نہیں کروں گی۔ بہت تم نے اپنی من مانی کر لی۔ یہ لو نہت سے بات کرو اور معذرت بھی کرنا۔“

بات کر کے کرتے انہوں نے کارڈ ریس اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے ذرا سا جھجک کر فون ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ اس نے کان سے لگاتے ہی دھیرے سے سلام کیا مگر دوسری طرف لائن بالکل بے جان ہو چکی تھی۔ بے ترقی کے احساس سے ایک دم ہی اس کے کانوں کی لویں دھک اٹھیں۔ مسزخان مسکراتے ہونٹوں اور مشتاق نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ غیر محسوس طریقے سے ذرا سناوروازے کی طرف کھسک گئی۔

”جی۔ جی۔ میں سن رہی ہوں۔“ بہت آہستگی سے اس نے بے جان لائن کو مخاطب کیا اس کی آنکھوں کے گوشے بھینکنے لگے۔

”ہوں۔“ پچھو یونہی چند سیکنڈ اپنے ہونٹ ہلاتی رہی۔ مسزخان کی نظریں مسلسل اس پر جمی تھیں اس نے فون بند کر کے ان کے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

”شرمندہ ہے نا، مجھ سے بھی معافی مانگ رہا تھا۔ بہت جلد باز ہے، مقلوب مزاج۔ جتنی جلدی ناراض ہوتا ہے اتنی جلدی بیان بھی جاتا ہے۔ دل کا بہت سا وہ ہے میرا بیٹا۔ تم فکر نہ کرو بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“

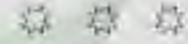
وہ اسے تسلی دے رہی تھیں، وہ ان کی طرف سے ذرا سناوروازے پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ پچھلے لان میں اتار اور کلوچے کے درخت تھے، شام ڈھلے پرندے شور مچاتے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔

”تم سے کیا بات ہوئی؟“ سزخان ابھی بھی پرچوش تھیں مگر بہت نے عاقبت دماغی سے انہیں دیکھا اور پھر گردن موڑ کر شام کے ڈولتے رنگ دیکھنے لگی۔

”کیا لائن کٹ گئی تھی یا شہباز نے خود بند کیا تھا فون؟“ وہ اس سے سنا چاوری تھیں۔

”جی لائن کٹ گئی تھی۔“ اس نے ایک گہری سانس لے کر مریخ پوری طرح سے ان کی طرف گھمایا تھا۔

”آج کل یہ بڑا مسئلہ ہے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا اگلے ہفتے چھٹی لے کر آؤں میں نے بھی نائیڈ کی ہے مگر بھی دل بران کرنا نہ ہوتا۔ بگلے ہوئے معاملے کو سوار کرنے کے لیے جی کو مارنا پڑتا ہے، انا کو پکنا پڑتا ہے۔ وہ اگر تمہاری طرف متوجہ نہیں ہو تا تو بھی تم اپنے التفات کا اظہار کرنے میں کریز نہ کرنا۔ میاں پیو میں کوئی انایا شرمندگی کی بات نہیں ہوتی۔ ایک اگر روٹھ جائے تو دو سرا میں کہنے منالے تو یہ اس کی بڑائی ہوتی ہے۔ اس میں چھوٹا نہیں ہو تا۔ میرے بچے تمہارا معاملہ ابھی نیا نیا ہے مگر ہے اپنے جی کو مار کر اپنی گرتی ہے اسے سہاگ کو راضی رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرنا۔ نکاح کے بواؤں میں جاوے ہو تا ہے بڑے سے بڑے پتھریل کو دم کرنا ہے۔ مان جائے گا وہ بھی پھر تم تو اس کی پسند ہو، کتنا عرصہ منہ موڑے گا۔ میں کوشش کروں گی وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائے یا اس کی ڈانس فراہم ہو جائے، جتنا دنوں قریب رہو گے اتنی ہی انجینس کم ہوں گی غلط فہمیاں دور ہوں گی۔“



گاڑی کے ٹائز زور سے جرج اٹے تھے۔ اگر فضل دین بریک نہ لگاتا تو آگے لیٹا ہوا لڑکا یقیناً اب تک مرحومین کی صف میں جا کھڑا ہوتا۔ فضل دین غصہ میں پھٹکارا ہوا گاڑی کا روڑہ کھول کر باہر نکلا۔

”اوتے اندھے، اوتے کان گدھے، نامراد، تجھے مرنے کے لیے لڑکی گاڑی نظر آئی تھی جو بیچ سڑک پر آن لیٹا بد بخت! میں مار بھی دیتا تو مجھے کسی نے کچھ نہیں کہتا تھا۔ تیرے بچپوں نے ہی تمہی بھری جوانی کو دونا تھا اور کسی نے انہیں روئے نہ دینا تھا، بے غیرت انسان۔“

فضل دین کا مارے غصے کے برا حال تھا۔ اس نے جھٹکے سے پیچھے لیٹے لڑکے کو ٹھڈا مارا جو پہلے ہی گاڑی کے ٹائزوں سے ٹکرا کر کچھ دور جا رہا تھا۔

”ہائے میں مر گیا اندھے ہو نظر نہیں آتا، اچھا بھلا موڑ مڑنے لگا تھا۔ کانٹا سارا ایزی کے اندر چلا گیا۔ اس کو نکالنے جھکا تھا کہ تو نے وحشیوں کی طرح گاڑی میرے اوپر چڑھا دی ہائے۔ تمہیں بت کر کے اٹھ بیٹھا۔ فضل دین نے جھک کر اس کا پاؤں دیکھا جس کی ایزی میں کانٹا اندر تک چلا گیا تھا اور خون نکل رہا تھا۔

”تو پرے کہیں مگر یہ کانٹا نکالنا تھا اُدھر سڑک پر دفن ہونے کی کیا ضرورت تھی۔“ اب فضل دین کی جھاڑ میں نرمی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر زور لگایا اور کانٹا باہر کھینچ ڈالا۔

عبدالعبین کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی۔

”جو ان لڑکا ہے، کیا زانوں کی طرح چیخ رہا ہے۔“ فضل دین نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کے پاؤں پر باندھنا شروع کر دیا۔

”تجھے دیکھا ہے کہیں یاد نہیں پڑتا۔“ پی باندھتے ہوئے وہ اسے بخور دیکھ کر بولا۔

”صوفی صاحب کا چھوٹا بیٹا ہوں میں عبدالعبین۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”اوہ اچھا، آیا۔“ فضل دین پی کی گرہ لگا کر سر ہلائے لگا۔

”صوفی صاحب تو چلے گئے اور ہر سے بالکل اچانک ہی۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلا اور مل کر بھی نہیں گئے۔ کسی سے مجھے بھی کل پر سوں ہی پتا چلا۔“

وہ ہاتھ بھاڑ کر کھڑا ہوا گیا تو عبدالعبین بھی اس کے ہاتھ کا سارا لے کر ہائے کرتا کھڑا ہوا۔

”ہاں، یہی تو ہوا میرے ساتھ۔ میں مد سے میں تھا، بابا صاحب اچانک ہی چلے گئے مجھے پتا چلا ہے کہ ان کا تار لہا ہوا ہے۔ میں پرسوں ہی تو آیا ہوں اور ہر اب اس لیے بڑی سڑک کی طرف جا رہا تھا کہ لاہور جا کر ان کو

ڈھونڈوں۔“ اس نے چہرے پر زمانے بھری مسکینی طاری کر کے کہا۔

”باؤلا ہوا ہے لاہور کوئی تیس چالیس گھروں کا بیڑہ نہیں انسانوں کا سمندر ہے اور ایک شخص کو اس سمندر میں سے ڈھونڈنا ایسے ہی ہے جیسے کوئی بیٹی (پھولی) پکڑتا ہے۔ تو انہیں کہاں ڈھونڈے گا چاہا جاوے نہیں وہ خود ہی تجھے لینے آجائیں گے۔“ فضل دین اسے نصیحت کر کے مڑنے لگا۔

”چاچا فضل دین! مجھے اپنے کہ جانا ہے اپنے بابا صاحب کو ڈھونڈنا ہے وہ ادھر شہر میں ہیں، آپ ادھر ہی تو جا رہے ہو، مجھے شہر اتار دیں میں خود ہی انہیں تلاش کر لوں گا ہائے۔“ اس نے بے چارگی کا احساس بوجھانے کے لیے اپنا کندھا دیا اور پھر اپنے رگڑ شدہ گال کو سہلانے لگا۔ اس کے منہ پر ایسی خاصی رگڑ آئی تھی۔

”لو پتہ! میرے بچے! شہر جا کر کسی کو ڈھونڈنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ تو خود ادھر جا کر کم ہو جائے گا یہ غلطی نہ کر۔ جا گاؤں جا کر بیٹھ۔ کوئی تجھے خود ہی لینے آجائے گا۔“ فضل دین اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

”نہیں چاچا! آپ مجھے بس شہر چھوڑ دو۔“ وہ جلا جت سے بولا۔ ”اچھا اگر وہ مجھے نہ ملے تو میں شام میں خود ہی واپس آتا ہوں گا وعدہ کرتا ہوں۔“ وہ اس کا بازو تھام کر بولا۔

”اوتے امتحان میں چھوٹی بی بی کو کلج پھوڑے جا رہا ہوں، چھوٹے شاہ جی کو غلم ہو گیا تو میری کھال میں بھس بھروا دیں گے۔ اگر بی بی بھرتے ساتھ نہ ہوتیں تو ضرور تیری بات مان لیتا۔ چل جا شہباز گاؤں واپس پھر کسی دن لے جاؤں گا۔“ فضل دین اسے پھونکنے سمجھاتے ہوئے نرمی سے بولا۔

”نہیں چاچا! میں گاؤں واپس نہیں جاؤں گا، مجھے اپنے کھر جانا ہے، اماں جی کے پاس۔ اچھا تم جا کر چھوٹی بی بی سے اجازت لے لو، ان سے میرا مسئلہ بیان کر دو، اگر انہوں نے اجازت نہ دی تو پھر بے شک نہ لے جانا۔“

وہ رووئے کہ تھا، فضل دین کچھ دیر اسے اٹھوس بھری نظروں سے دیکھتا رہا پھر اپنی چادر کا پلو بھاڑ کر گاڑی کی طرف مڑ کر چھٹی کی مڑکی کے اوپر اٹھ بیٹھے، اسے پاس جا کر شہرینہ سے بات کرنے لگا۔ وہ پہلے ہی اس ساری صورت حال پر غور کر رہا تھا۔

”بی بی! وہ بے چارہ رو رہا ہے۔ اسے میں شہر شروع ہوتے ہی اتار دوں گا، صوفی صاحب کے ہم پر بڑے احسان ہیں ہمارے بچوں کو پرھایا ہے انہوں نے۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے گاڑی میں بٹھاؤں۔“ ساری بات بتا کر فضل دین سفارشی لہجے میں بولا۔

”یہ تھیک بات نہیں۔“ اس کے سوچ کر اٹھ کر بولا۔

”اچھا بی بی میں اسے اتار کر دیتا ہوں۔“ فضل دین مؤذب لہجے میں بولا اور جانے لگا۔

”اچھا بی بی میں اسے اتار کر دیتا ہوں۔“ اسے شاید عبدالعبین کی خستہ حالت پر رحم آیا تھا۔ جو بڑی سہولت لگاؤں سے گاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اچھا بی بی میں پتا چلے گا چھوٹے شاہ جی کو۔“ فضل دین اپنی سفارش ماننے پر خوش ہو کر بولا۔

چند لمحوں بعد عبدالعبین فضل دین کے ساتھ بیٹھا شہر کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ سفر کے دوران کن اکیوں سے کبھی کبھی بیک مر میں دیکھ لیتا تھا۔ شہرینہ نے عمل نقاب کر رکھا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں باہر تھیں جو کھڑکی سے باہر کے مناظر پر لگی تھیں۔ ایک دو بار شب عبدالعبین کے منگلی باندھ کر دیکھنے پر اس نے کھور کر اسے دیکھا تو اس نے ڈھٹائی سے مسکرا کر نگاہوں کا رخ بدل لیا۔

”کہاں اتاروں تمہیں۔“ شہر کی حدود شروع ہوتے ہی فضل دین نے کچھ اگڑ لہجے میں پوچھا۔

”فضل دین! اسے مجھے کالج چھوڑ دو، مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ شہرینہ نے نکالی پر بندھی ریٹس واچ پر نگاہ ڈال کر بیزارگی سے کہا تو فضل دین نے ”جی اچھا“ کہہ کر گاڑی کی اسپڈ بڑھا دی۔

شہرینہ کالج کے سامنے اتری تو فضل دین نے عبدالعبین کو بھی کالج گیٹ سے ذرا فاصلے پر بنے بس اسٹاپ پر اتار دیا۔ وہ لنگر اتارنا ہوا نیچے اترا اس کے منہ سے ”سی سی“ کی ہلکی آواز بھی نکل رہی تھی۔ پاؤں میں واقعی تکلیف

تھی اور کچھ کندھے میں بھی باقی کی بے چارگی اس نے خود سے چہرے پر طاری کر لی تھی۔
 "ہاں سنو میں لی کو دو بیٹے لینے آؤں گا اگر تم دو بیٹے تک ادھر آسکتے ہو تو آجانا میں تمہیں واپس گاؤں لے
 "شکر یہ چاہا! میں کتنے جانوں گا۔ آپ مجھے لے کر جائیے گا مجھے ادھر کے رستوں کا علم نہیں۔" وہ کہہ کر
 اسٹاپ کی طرف بڑھ گیا تو فضل دین گاڑی موڑنے لگا۔

اور وہ پھر کو وہ جتنے میں دس منٹ تھے جب وہ کالج کے گیٹ کے پاس ہی کھڑا تھا۔ یہ الگ بات تھی وہ کالج سے
 زیادہ دور نہیں گیا تھی نہیں تھا۔ بس ارد گرد کی سڑکوں اور مارکیٹ میں آوارہ گردی کرتا رہا تھا۔
 "کچھ پتا چلا صوفی صاحب کا" فضل دین بھی اسی وقت پہنچا تھا اس کی شکل دیکھتے ہی بولا۔
 "نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا اور اپنے ہاتھ سے بائیں ٹانگ کو آہستہ آہستہ دبائے لگا۔
 "تمہیں درد ہو رہا ہوگا ایک تو کٹا رہا تھا گاڑی کی چوٹ الگ اور پھر اس مشقت میں پرگئے۔ تو بیٹھ جاؤ

گاڑی میں لی لی آنے والی ہو گی۔" فضل دین کی آفر پر وہ جھٹ سے قرنت سیٹ پر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔
 شہریت چند منٹوں بعد ہی آئی تھی۔ کالج کے باہر زیادہ رش نہیں تھا۔ لگتا تھا چھٹی ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔
 عبدالعزیز کو ترکیب سے بھی جیسے ہی فضل دین نے گاڑی اشارت کی وہ بول برہا۔

"چاہا! وہ سناستم۔" اس نے انکی کے اشارے سے "وہ" کو خوب سمجھ کر لیا گیا۔ "جو آدمی نہیں کھڑا سفید
 گاڑی کے باہر وہ آپ کو بارہا ہے۔"

اس نے سر دک پارڈر اٹھاتے پر سفید گاڑی کے باہر کھڑے باوردی ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ ادھر ہی دیکھ رہا
 تھا بلکہ شاید وہ وہ گیٹ کی طرف رہا تھا۔"

"اس اٹھے کھل بارہا ہے میں تو اسے نہیں جانتا۔" فضل دین کچھ حیرانی سے بولا۔
 "معلوم نہیں جا کر پوچھ لو۔" وہ کندھے اچکا کر بولا تو فضل دین نے گاڑی بند کی اور نیچے اتر گیا عبدالعزیز
 کے پاس چند سیکنڈ ہی تھے۔

"شہریت لی لی! آپ کو معلوم ہے جب چوٹ لگتی ہے تو بہت درد ہوتا ہے مجھے بھی صبح گاڑی سے چوٹ لگی اور
 کٹا پچھا بہت درد ہوا مگر آپ کو معلوم ہے میں نے یہ پوچھا تو وہ کہہ دیا کہ خود بھی خود سہا۔ کس
 لیے؟" فضل دین واپس آ رہا تھا۔

"صرف آپ کے لیے آپ کے قریب آنے کے لیے آپ کو قریب سے دیکھنے کے لیے کیونکہ۔ کیونکہ
 آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں بہت زیادہ۔" اور شہریت کا ہارے حیرت کے ہر حال تھا۔

"تمہاری تو لگتا ہے آگے میں بھی اندھی ہو گئی ہیں صبح کی چوٹ سے لگتا ہے بھیجا بل کیا ہے تمہارا۔ وہ آدمی
 بھلا مجھے کیوں بلائے گا؟" فضل دین کو چچا اور چچا بڑھاتے ہوئے گاڑی میں آ بیٹھا اور گاڑی
 اشارت کر دی۔

عبدالعزیز کے چہرے پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی اور وہ سامنے لگے چھوٹے سے آئینے میں شہریت کے
 تاثرات دیکھ رہا تھا جس کی آنکھوں میں حیرت اور غصہ تھا۔ اس نے خود پر ضرب کر کے اپنا رخ کھڑکی کی طرف موڑ
 لیا۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی اس بے ہوش بد تمیز لڑکے کو ابھی گاڑی سے اتار دے تو پھر اس کی نظر الی ٹانگ کا
 خیال آیا۔

"ہم آج کالج نہیں گئے؟" شہریت لاؤنج میں داخل ہوئی تو معاذ کو کتابیں لے کر بیٹھے دیکھ کر بولی۔
 "آج کالج میں اسپورس آئے تھا اور کل ہمارے ٹین ٹیسٹ کیسٹری کے ہیں ٹین چیمپئنز کے فزولس کے دو
 اور انکس کا ٹیسٹ۔ اس لیے میں نے سوچا کھربہ رو کر تیاری کرتا ہوں بڑے اہم ٹیسٹ ہیں اس لیے چھٹی
 ماری ہے۔" وہ ٹوٹس فائل میں ترتیب لگاتے ہوئے مصروف ایسے میں بولا۔

"میں مجھے بھی ایف ایس سی میں بہت پڑھنا پڑا تھا مگر میں تمہاری طرح پڑھا کرتی تھی۔ اصل میں مجھے
 ڈائجسٹ پڑھنے کی لت لگ گئی تھی ان دنوں۔ اس لیے میرٹ نہ بن سکا تو بسے تھوڑے مارکس سے ہی میرا
 میڈیکل کالج میں رہ گیا تھا۔ ابوی کو بہت شوق تھا اسے دونوں بچوں میں سے کسی ایک کو ڈاکٹر بنانے کا۔ سہیل
 بھائی تو شروع ہی سے سائنس کے کیڑے تھے اس لیے ابوی نے اپنی ساری امیدوں کا رخ میری طرف موڑ دیا
 اور جب میرے مارکس کم آئے تو انہیں بہت غصہ آیا تھا۔ بہت سارے دنوں بعد اس نے اتنی طویل بات کی
 تھی۔ وہ بھی سب کچھ بھول بھال کر اپنی سنجیدی کا بھوت سر سے اتار کر
 "پھر تو انہوں نے آپ کو خوب ڈانٹا ہوگا؟"

معاذ نے دلچسپی سے پوچھا۔ اس نے بھی شاید پہلی بار بہت کاچھو آنسوؤں کے بغیر دیکھا تھا اس کا دھیان
 بنانے کو بولا۔

"ڈانٹا تو خیر بہت نہیں تھا۔ البتہ مجھ سے وہ دن صبح سے نہیں بولے تھے بس چپ کر رہا پھر ان کا غصہ اٹھا تو
 میرے ڈائجسٹ کے خیرے پر انہوں نے طرہ طرہ میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ڈائجسٹ آٹھنے گئے اور ایک پوری میں
 بھرے اسٹور میں چھری رکھ کر اسٹور کو تالا لگا کر چابی اپنے لاکر میں رکھ لی۔ اف ابوی جی کی یہ سزا بہت کڑی تھی اور
 ہا کر سے بھی سختی سے کہہ ڈالا تھا انہوں نے کہ کوئی ڈائجسٹ نہ لے کر آئے اسے انتظار کے بعد تو فراغت کے وہ
 دن نصیب ہوئے تھے ڈائجسٹ پڑھنے کا خیال ہی تو مجھے جلدی جلدی توٹس رٹنے کی طاقت دینا تھا۔ ابوی نے
 ساری خوشی پر اپنی پیروی کیا۔ چند دن تو میں کھڑے ہوئے کڑا رے پھر ایک دن میں نے بھی کام والی کے ذریعے
 چابی بنانے والے کو بلوایا اور تالے کی ایک چابی اور بنوائی۔ روز ایک ڈائجسٹ نکالتی پڑھ کر ابوی کے آنے سے
 پہلے واپس رکھ آئی۔"

اس کے بعد وہ بھی باہر نکل گیا۔ وہ ماضی کے ان خوبصورت ان مول لمحوں کے سحر میں کھوئی ہوئی
 تھی۔
 "آپ کے ابوی کو پتا نہیں چلا؟" معاذ نے مسکرا کر پوچھا۔
 "نہیں بالکل نہیں۔ ان کے سامنے تو میں بہت معصوم بن کر بھرتی تھی۔"

"یہی تو فن آتا ہے لوگوں کو۔ سب کچھ کھرا کر بھی معصوم شکلیں بنا کر ساروں کی ہمدردیاں بھی سمیٹتے ہیں اور
 دنیا بھر میں اپنی مظلومیت کا ڈنکا بھی بجاتے ہیں۔ کسی بھی ہمدردی سے لے کر سہارے تک دیکھ لو سب کی ایک ہی پالیسی
 ہے۔ چہرے پر چرو۔" عالیہ بھائی اچانک ہی ٹپکی تھیں اور آتے ہی زہرا نشانی کرنے لگی تھیں۔ خدا جانے انہیں
 زہرت کی مسکراہٹ سے کیوں چڑھی ضرور ہی اسے رلانے پہنچ جاتی تھیں۔ زہرت کو چہرہ پڑا کر چپ ہو گئی۔ معاذ
 کتابیں پڑھنے لگا۔

"کیا پتا میں کر رہے تھے جتنی کرونا میں نے خواہ مخواہ رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ اتنی اچھی کھیتی میں خوشگوار باتیں
 ہو رہی تھیں۔" وہ کچھ کانگاتا بھولیں۔

"کوئی خاص بات نہیں ہو رہی تھی میں بس معاذ سے اس کی کالج سے چھٹی کی وجہ پوچھ رہی تھی۔" زہرت
 سے رہانہ کیا تو سنبھل کر بولی۔

"ارے تو میں نے کون سا پوچھا ہے کہ خیر سے کون سے راز و نیاز ہو رہے تھے؟"
 وہ ٹھٹھا لگا کر ٹپس۔ "خیر سے دونوں جوان بہانہ تو اس عمر میں تو یونہی بھی بیٹھے مسکرائے کوئی چاہتا ہے۔"

ساسو جی ہماری کھٹیا سنبھال کر بیٹھ گئی ہیں۔ بیاسہ ہار گئے پڑوس لو کیوں نہ کریں۔ جس جہتی۔" وہ تہہ جوان کی زبان
 سے زیادہ نظموں سے وار کر رہے تھے زہرت اور معاذ کو ہراساں کرنے کے لیے بہت کافی تھے معاذ نے کڑوا کر
 کتابیں ہی سمیٹ لیں۔

"کیسی تو کوئی بات نہیں بھا بھی! میں تو کچن میں جا رہی تھی معاذ سے سبزی لانے کے لیے کہنے آئی تھی۔"
 زہرت کا رنگ یکدم ہی اڑ گیا۔ حلق خشک سا ہو گیا کھڑکھڑاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے بی بی! میں نے وجہ پوچھی ہے تم سے اور تم کب بتاؤ گی مجھے اصل بات۔ اس گھر میں پوچھنے یا چھنے کا رواج خاک ہوا۔ اب تو جس کی جو مرضی میں آتا ہے کر کر دو چاہے سڑکوں سے لاکر لوگوں کو تخت پر بٹھا لو۔ اب یہ اپنے معاذ میاں کو ہی دیکھو بیٹا دھلا کون کرنا ہے آج کل ایسی انمولی نیکیاں۔ ہمارے دیورتی کو بھی نیکیاں پالنے اور ان کو پروان چڑھانے کا شوق ہے دیکھو کب تک رہتا ہے۔“

اور جو معاذ میاں انہوں نے یہ نیکی بغیر کسی اجر کے کرنے کا سوچ ہی لیا ہے تو تم ہی کچھ خیال کرو۔ انسان میں کچھ تو غیرت ہونی چاہیے۔ ”ان کا حملہ بہت ڈائریکٹ تھا۔ معاذ کا رنگ سرخ ہو گیا۔ وہ خود پر ضبط کر کے ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔“

”آپ کہنا کیا چاہتی ہیں۔“ بہت نیچی آواز تھی اس کی۔

”لو دھلا میں نے تم سے کیا کہنا ہے۔ یہ تو تمہارے جاننے کی باتیں ہیں۔ اپنے گھر میں کتابھی یا تو وہ بھی گھر کی رکھوالی کرنا اپنا فرض جان لیتا ہے تم اتنا ہی سوچ لیتے۔“ معاذ کو ضبط کرنا مشکل لگ رہا تھا۔

”میں سمجھا نہیں۔“ وہ ہونٹ بھیج کر بولا۔

”ہاں بھئی! اپنے بو ٹھہرے پر اسی بچنے میں نہ رہ جانا ہمارے جاؤ گے۔ ہمارے دیورتی لاکھ نیکیاں پالنے کے شوقین سہی۔ تھوڑی بہت غیرت تو ہوئی ان میں۔ کوئی بھی کھیل سوچ سمجھ کر کھیلتا۔“

معاذ بچہ سہی مگراتا بھی نہیں کہ ان کی بکواس کا مطلب نہ سمجھ سکتا۔ اس نے جھک کر کتابیں اٹھائیں اور جانے لگا۔ اس سے بہتر جواب اسے ان کی بکواس کا نہیں دیا تھا۔

”ارے میاں! بجاتے کہاں ہو میں نے گھر کی رکھوالی کی مثال اس لیے دی تھی کہ کچھ غیرت دکھاؤ۔ آخر مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہو۔ گھر کا فرو بننے کا بڑا شوق ہے تو کچھ گھر کے کاموں کی بھی فکر کرو باقی کے معاملات تم جانو تمہاری یہ نئی نوٹی اپنی جانے اور ہمارے سیدھے سادے دیورتی جانیں۔ تم یہ پکڑو یہ کلی کا کل ہے اس کی آج آخری تاریخ ہے اور آج ہی گیس کے بل کی بھی آخری تاریخ ہے اور وہ تو کل گیس کے جاؤ سناؤ جس پینچا آنا کل بھی تو جانا پڑے گا۔ یہ لوٹے اور چھو واپس آکر سیدھا اب جلدی جاؤ اور یہ معمولی سا کام کر آؤ واپس آکر بے شک اپنی آپنی کی خوشگوار یعنی میں انجوائے کرنا میں دخل اندازی نہیں کروں گی مگر ہاں واپس آکر تمہیں گوشت بھی لانا ہے وہ تو یہ قریب کی مارکٹ سے مل جائے گا دس پندرہ مشن کا لظہم ہے ٹھیک ہے کھلایا یا بندہ حلال کر لے تو اچھا لگتا ہے۔“

انہوں نے بل اور رقم اس کے ہاتھ میں تھمائی اور زور زور سے زلفیں پر پیر مارتی چلی گئیں۔

”شادی! اس بار آپ نے باقاعدہ ”سید ہاؤس“ میرے نام کرنا ہے، کے کاغذ یعنی نو یو کس پیپر۔ جو کام آپ نے پچھلی بار کیا تھا وہ نہیں کرنا۔ اس بار آپ نے یہ کام ضرور کرنا ہے۔ میں نے مام سے وعدہ کیا ہے اور ہم اس کے بعد ”سید ہاؤس“ میں منتقل ہو جائیں گے۔ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے مجھے وہ گھر بہت پسند ہے۔“ ”میں تار ان کے کالوں میں رس کھول رہی تھی۔“

”اوکے اوکے“ اس بار یہ ٹیک کام بھی کر لیں گے۔ ویسے تو رہنے کے لیے ”کھل کدہ“ بھی نسبتاً مناسب ہے۔ ابھی دو سال پہلے تو خرید ا تھا پھر دو دنوں ہی تو ہوئی ہو۔ ”سید ہاؤس“ تو تم دونوں کے لیے بہت بڑا ہے۔“ سلطان بخت کا انداز سرسری سا تھا۔

”یہی تو بات ہے شادی! ”سید ہاؤس“ کی کیا بات ہے۔ ”کھل کدہ“ تو اس کے آگے کچھ بھی نہیں پھر مجھے یہ بھی تو خیال ہے کہ ”سید ہاؤس“ آپ نے خود اپنے شوق یعنی توجہ سے بنایا ہے۔ باہر سے آرکیٹیکچر بلوائے تھے اور عمارت کا خوبصورت آرائشی پتھر بھی امیورنڈ ہے جس پر آپ نے اتنی توجہ دی ہوگی۔ مجھے تو وہ چیز اپنی جان سے بڑھ کر عزیز ہوگی نا“ محبوب کی پسند کو جی جان سے پسند کیا جاتا ہے، محبت کا یہی اصول ہے نا شادی! ”وہ آنا وہم لہجے میں

انہیں محبت کے اصول اذیر کروا رہی تھی۔

”آف کورس تمہاری یہی باتیں تو مانی ڈیر مجھے دیوانہ بنا دیتی ہیں۔“

”پھر تو آپ کی اس دیوانگی سے مزید فائدہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں زور سے کھلکھلائی۔

”سے بنائے دیوانے کو کیا دیوانہ بنانا۔ اپنی اہم تو پہلے سے آپ کے دیوانے ہیں اور دیوانے سے ہو جی چاہے کروالو نکھو الو مٹوالو۔“ شادی بھی فل موڈ میں تھی انہوں نے دائیں طرف کروٹ بدلی۔

”رہنے ہیں بڑے ہوشیار دیوانے ہیں۔“ ”میں تارا نا از سے بولی۔“

”آزاد کش شرط ہے جان جیاں! آپ کے حق میں تو ہم سر پاپا دیوانے ہیں ہوش کا کچھ بھی کام نہیں کر سکتے۔“ سلطان بخت نے۔

”سلطان بخت ہے تو دیکھتے ہیں اس بار دیوانے کی دیوانگی۔ سب سے پہلے ”سید ہاؤس“ کی منتقلی میرے نام اور اس کے ساتھ ہی منتقلی ہو رہی ہے۔ کیا خیال ہے مشر دیوانے۔“ ”میں تارا نے اٹھلا کر نی فرمائش جڑی۔“

”ارے وہ تو انہی زبانی ہے۔“ سلطان بخت ذرا سا چونکے۔

”تو کیا ہوا“ دو چار ماہ میں منتقلی تو ہو جائے گا۔ میں آپ سے پہلے کہے دے رہی ہوں شاہ جی! یہ پلازہ اور ”سید ہاؤس“ میرے ہی نام ہونے چاہئیں۔ کم از کم اپنا خرچ پورا کرنے کے لیے تو میرے پاس کوئی اپنا ذریعہ آمدن ہو۔ اب کیا ہر وقت آپ کو فون کرنا کتے رہا میرا بیٹلس ختم ہو رہا ہے۔ رقم بھی نہیں مجھ سے یہ ہر وقت کی منتقلی نہیں سہی جاتی۔ میرا اپنا بھی تو کوئی سوس ٹک اٹم ہونا چاہیے نا۔ آپ کو تو خود خیال کرنا چاہیے تھا میرے کہنے سے ہی پہلے ”دو ذرا سا روٹھ کر بولی۔“

”اوکے بھئی سوچتے ہیں اس بار سے میں بھی۔ ویسے تو تمہارا بیٹلس تو ہر وقت ہی تل ہونے پر تیار ہوتا ہے اس میں کون سی بات ہے۔“ ”ان کا انداز کچھ بچہ جتانے والا تھا۔“

”دیوانے سوچا نہیں کرتے بس کر گزرتے ہیں۔ میں آپ سے کہہ رہی ہوں پھر ”سید ہاؤس“ اس بار پورے استحقاق کے ساتھ میرا ہے شاہ جی! وہاں گفتا خوبصورت اور کتنا بڑا سوٹنگ پول بھی تو ہے۔ ”کھل کدہ“ میں تو وہ بھی نہیں اور مجھے سوٹنگ سے جتنوں کی حد تک عشق ہے مگر یہ شوق پورا کہاں کروں ”اسی لیے تو میں ”سید ہاؤس“ کے لیے اس قدر بے چین ہوں۔“ وہ پھر سے یاد دہانی کروانا نہ بھولی۔

”اوکے کہاں اس بار یہ نام بھی ہو جائے گا۔“ اسے لگا سلطان بخت کا لہجہ کچھ خاص پر یقین نہیں پھر بھی اس نے جتنا صاحب سمجھا۔ بہت پیچھے پڑنے سے کیا خبر پڑ جائیں اس نے سوچا۔

”ویسے تو آپ اسلام آباد گئے ہوئے تھے، لیکن دو دن تو آپ نے جیسے موبائل آف ہی رکھا۔ مجھے یاد آیا سب سے پہلے تو میں نے آپ سے یہ لگ کرنا تھا۔“ اس نے موضوع بدلا۔

”جسٹی بتایا نا میں اسلام آباد تفریح کے لیے نہیں گیا تھا۔ سینار تھا اور انٹرنیشنل لیول کا ”کیپوٹرز“ کے بارے میں پھر جرمن فرم سے ہماری مینٹگ سہی ان ہی کے ساتھ ڈیل طے ہوئی ہے۔ ہم اپنا شوروم کھولیں گے ابھی تو تمام کیپوٹرز اور حری سے منگوا میں گے پھر جلد ہی بنیادی مینو پیکرنگ ہم خود شروع کریں گے۔ بڑا زبردست پلان ہے اور میرا راجہ کٹ بھی تو دیکھنا۔“ سلطان بخت عوش سے اسے بتا رہے تھے۔

”شاہ جی! گاڑیوں کا شوروم کب شروع کریں گے ہائے میں تو روز ایک نئی گاڑی بدلوں گی۔“ وہ ان کے موضوع سے الٹا کر اپنے موضوع پر آئی۔

”تم ایک نہیں دو بد لگا۔“ وہ ہنسے۔ ”کوئی تمہیں نہیں روکے گا۔“

”آپ نے آکا کب ہے؟“ اسے ایک دم خیال آیا۔

”ابھی چند دن تک نہیں۔“

”یہ کیا بات ہوئی شادی!“ وہ مزہ بنا کر بولی۔

”سمجھا کرو نا ڈیر! ادھر گاؤں میں بھی تو سو کام ہوتے ہیں۔ کیاس کی فصل تیاری کے آخری مراحل میں ہے، چاول کی بوائی ہونے والی ہے، گندم کی فصل میں تو ابھی وقت ہے ٹر بانوں کے فروٹ میں اس بار پیداوار بہت زیادہ ہوئی ہے اور میں ہر کام اپنی عمر لاتی میں کروانا چاہتا ہوں۔ اس بار جان! ٹوٹ ہی ٹوٹ ہوں گے اللہ کے فضل سے ہماری فصلیں بہت اچھی ہوئی ہیں۔ فیکٹری اور کارخانے کی پیداوار نے بھی مقررہ ہدف سے بڑھ کر پیداوار کی ہے۔ اتنی ایم سو پی پی۔“ سلطان بخت جوش سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔

”پھر تو اس بار مجھے شاپنگ بھی ٹوب کرنی ہے بلکہ مجھے یاد آیا، وہ سنی کے وزٹ کا جو آپ نے وعدہ کیا تھا، یہ آپ ہی کی بات ہے جو میں دہرا رہتی ہوں اور نہ میرا تو لندن جانے کو بے تمنا شادل چاہتا ہے۔“ اسے پھر سے اپنی خواہشات یاد آنے لگیں۔

”بس کچھ دن صبر کرو نا میں ان چند ایک موٹے موٹے کاموں سے فراغت بالوں پھر وہ سنی لندن پیرس جگہ کم از کم ایک ڈیڑھ ماہ کے لیے چلیں گے۔ میں تو خوبست تھک گیا ہوں، ریٹیکس ہونا چاہتا ہوں، بلکہ فرسٹ سے تمہاری خوبصورت قیمتی انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔ ان دوروں نے تو مجھے تھکا دیا ہے۔“

”یہی تو بات ہے شاہی! ہم جس قدر دور رہیں گے ایک دوسرے سے اتنا ہی زیادہ غمگین گے، مایوس ہوں گے محبت تو تازگی ہے، شاہی! وہ رومانیک کبے میں بولی۔

”محبت تازگی ہی نہیں محبت زندگی ہے مانی ڈیر لڈی۔“

”شاہی! کب آرہے ہیں۔“ وہ بے چین کبے میں بولی۔

”اگنا ابھی کچھ دن۔“ اس وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

”اوکے، کوئی آیا ہے۔ میں رات میں فون کروں گا، پائے ڈیر، ٹیک کبے۔“ انہوں نے موبائل تھک کر رکھا۔

”بس“ موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

”خدا ہے سلطان بخت تمہاری بھی ہر وقت عورتوں کی طرح بیڈ روم ہی میں گھسے رہتے ہو، کوئی کام دھندے کی بھی فکر کیا کرو۔ دو گھنٹے سے مٹی آیا بیٹھا ہے، سارے حساب کتاب کھولے کھنڈ بھر سے منظر ڈرا تک روم میں سوکھ رہا ہے اور تمہارے یہ فون ہی تمام نہیں ہوتے۔“

سیدہ بولتے ہوئے اندر داخل ہوئیں۔ سلطان بخت کا کھلا کھلا سا چہرہ تن کیا۔

”واقعی میں بات کرنے گئے تھے؟“ ان کا لہجہ مشکوک تھا۔

”جی! آخر آپ یہ کس قسم کی انکو اڑتی مجھ سے کر رہی ہیں۔ آخر میں نے کیا کیا ہے۔ آج اگر وہ بد تمیز عورت اور نہیں ہے تو آپ سوائیڈ لے کر ان کھڑی ہوئی ہیں۔ آخر میں کس کس کے آگے جواب دہ ہوں۔“ وہ بھڑک ہی اٹھے۔

”سلطان بخت! تم آرام سے بات نہیں کر سکتے، میں نے ایسا کچھ نہیں پوچھا تم سے۔ ہر ایک کو تم نے صالح ہی سمجھ رکھا ہے۔“ وہ بھی غصے میں آ گئیں۔

”وہ بھی صحیح جانتی کر سکتی ہے۔ کچھ تو تمہارا مزاج ہی اس درجے کا ہے، کیا ہے اور کچھ تمہیں اس کا خیال بھی نہیں۔ اب جو تین دن اسلام آباد کا کر آئے، تو اسے بھی ساتھ لے جاتے، وہ بھی گھوم پھر آئی، اس کا مزاج بھی کچھ بہتر ہو جاتا۔“

”تمہیں اور ہر کام سے کیا تھا میرا تفریح کرنے نہیں کیا تھا۔“

”اب تمہارے دوران ہی سیدہ تفریح ہو سکتی ہے، ویسے تو تمہارے پاس اس کے لیے وقت ہے، سیدہ تفریح کے لیے، سنی موبائل پر کرام بھی تم نے کینسل کر دیا۔ چلو بندہ گھوم پھر آتا، کچھ ایک دوسرے کے مزاج کی خبر ہو جاتی ہے۔“

وہ تو ہر صورت میں دونوں کی ذہنی ہم آہنگی چاہتی تھیں۔

”مجھے اس کے مزاج کا پتہ پتا چلنا تھا، سب کچھ پتہ چل گیا، مزید میں۔“ ان کے موبائل کی سپرنچے لگی بات روک کر انہوں نے موبائل اٹھا لیا۔

”کی۔۔۔ میں بات کر رہا ہوں۔“ وہ دوسری طرف متوجہ تھے۔

”کی۔۔۔ سلطان بخت ہی ہوں نا، ان۔۔۔ ان کے ماتھے پر گل سے پڑنے لگے۔

”کی۔۔۔ کیا تمہاری امانی کا۔۔۔ انہوں نے ہر اسان نگاہوں اور پریشان چہرے سے سیدہ کی طرف دیکھا۔

”اگنا اللہ وانا الیہ راجعون۔“

سیدہ کابل سینے کی دیواریں توڑ کر باہر آئے گا۔

”عبدالصبین“ حسین اللہ وانا حسین اللہ بھی جاؤ۔“ کوئی مسلسل اس کے پیر کا انگوٹھا ہلا کر اسے جگا رہا تھا۔

تو ازبے جدید ہم گئی۔ اس نے کمری نیند سے بے ہوش کچھ جھنجھلا کر آنکھیں کھولیں۔ اسے اپنے باؤں کی طرف جلیں کھڑا نظر آیا۔ اس کی نیند ایک دم سے اڑ چھو ہو گئی۔ اس نے زور سے آنکھیں پھینکیں، وہ غمگین ہی تھا۔

”عبدالصبین“ تقریباً پھلانگ کا لڑائی بیٹھا۔

”تم۔۔۔ کہاں۔۔۔“ وہ حیرت سے بولا۔

”ہاں۔۔۔ میں نہیں سینے آیا ہوں۔ مجھے صوفی صاحب نے بھیجا ہے، چلو میرے ساتھ۔“ جلیل اس کے پاس آکر ہوا وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ عبدالصبین نے سر اٹھا کر دیکھا۔ آسمان تھوڑا تھوڑا سا گہرا لہلا تھا۔ صبح کی روشنی اپنے قدم جمار ہی تھی۔ فضا میں خنکی سوریے کی ہلکی ہلکی سی تھی۔

”کہاں۔۔۔ کہاں سے آئے ہو تم، کیا تم بابا صاحب کے ساتھ چلے گئے تھے اور اتنی صبح صبح۔“ اس نے جلیل کا چہرہ غور سے دیکھا۔ اس پر سفر کی نشان تھی۔

”ہاں“ میں ان کے ساتھ ہی کیا تھا۔ چلو اب پھر دن نکل آئے گا اور صوفی صاحب نے مجھے ہدایت کی تھی کہ تمہیں جلد از جلد گاؤں سے لے کر چلا آؤں اور کسی سے طوں بھی نہیں۔“ وہ جلد ہی جلدی بول رہا تھا۔

”تم ہائیر صاحب سے نہیں ملے؟“ عبدالصبین حیرت سے بولا اور ایک نظر سخن سے آگے کھلے بیرونی دروازے کو دیکھا۔

”ماسٹر صاحب نماز پڑھنے کے لیے نکلے تو میں اندر آئی۔ اب چلو جلدی سے۔ وہ آگے تو پھر مجھے ان سے ملنا ہی پڑے گا۔“ جلیل کچھ جھگڑت سے بولا۔ ماسٹر صاحب کے آنے کا وہڑکا سے لگا تھا۔

”ہوں۔“ عبدالمعین نے پرسوج انداز میں اسے دیکھا۔ ”وہ ایسا ہے جلیل بھائی کہ میں وہاں میں آجاؤں گا۔ خود ہی تم مجھے ایڈریس دے جاؤ۔ اس وقت میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ سر میں شدید درد ہے رات ٹھیک سے سو نہیں سکا تھا۔ کچھ دیر سووں گا تو پھر طبیعت ذرا تازہ دم ہوگی۔ ایسا نہ ہو جاتے ہوئے بخار ہو جائے۔ جسم پہلے ہی درو سے ٹوٹ رہا ہے۔“

اس نے ہاتھ سے ہاتھ دباتے ہوئے چہرے پر تکلیف کے آثار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جلیل نے اسے کچھ غصہ بھری نظروں سے دیکھا۔

”دیکھو عبدالمعین! مجھے صوفی صاحب نے حکم دیا تھا کہ تمہیں اپنے ساتھ لے کر آؤں۔ اماں بی بھی تمہیں بہت یاد کر رہی ہیں اور۔ اور صوفی صاحب کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتا۔ بھر بہت بیمار رہے ہیں۔ تم میں اب چلو گھر جا کر آرام کر لینا۔ میں دو تین دن پہلے بھی تمہارے در سے گیا تھا۔ اوھر بھی تم نہیں جلتے۔ بس اب اٹھو۔“ وہ اصرار سے اور کچھ سختی سے بولا۔

”بھئی۔ میں نے کہا نا۔ مجھے ابھی نہیں جانا۔ تم وہاں تک رک سکتے ہو تو رک جاؤ۔ میں تو وہاں کے بعد ہی آؤں گا۔“ وہ ڈھٹائی سے دوبارہ تکیہ درست کر کے بستر پر لیٹ گیا۔

”عبدالمعین! اماں بی تمہیں بہت یاد کر رہی ہیں“ اسی لیے میں آیا ہوں اتنی صبح سویرے میں اگر اوھر رکا تو سب کو میری آمد کا علم ہو جائے گا پھر وہ صوفی صاحب کے ایڈریس کے بارے میں ضرور پوچھیں گے خاص طور پر ماسٹر صاحب پوچھیں گے۔ وہ کچھ کہتے کہتے رکے گا۔“ مجھے انہوں نے رکے سے منع کیا تھا۔ تم سمجھتے کیوں نہیں۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”میں نہیں سمجھتا تو تم سمجھ جاؤ۔ میں ابھی تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ ایڈریس دے کر جاتا ہے تو دے جاؤ ورنہ تمہاری مرضی۔ مجھے غیب آ رہی ہے۔ اور ویسے بھی اوھر کون میرے فراق میں مرا جا رہا ہے۔ جاتے ہوئے کسی نے بتانا یا انتظار کرنا تو اور نہیں کیا اور اب ہر کار سے بچنے جا رہے ہیں۔ اب میری مرضی ہوگی تو میں جاؤں گا۔“ اس نے سر اٹھا کر سر کے نیچے رکھا تکیہ مزید اونچا کیا اور آنکھوں پر بازو رکھ کر سوئے لگا۔

”تم۔“ جلیل اسے کچھ سخت سنانا چاہتا تھا پھر قمیص کی سائڈ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے ایک شدہ کانڈ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”ٹھیک ہے تم اماں جی کو بتا دینا۔ میں شام سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔“ عبدالمعین نے روکھے انداز میں کہہ کر کانڈ لے کر اپنے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ جلیل پھر چھی کھڑا رہا کہ شاید وہ جانے کی ہامی بھر لے عبدالمعین کے آنکھیں بند کر لیں۔

”خدا حافظ۔“ جلیل نے ایک گہرا سانس لے کر آہستگی سے کہا۔ اور باہر نکل گیا۔

”ہوں۔“ اس کے جانے کے بعد عبدالمعین نے یہ شدہ کانڈ تکیے کے نیچے سے نکال کر کھولا اور ایڈریس پڑھنے لگا۔ ایڈریس پڑھ کر اس نے کانڈ پھر سے تیرا دیا اور ہاتھ سینے پر رکھ کر ان بھر کی پلاننگ سوچنے لگا۔ اس کا ذہن بڑی تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا۔

”شہر نہ لی بی کے کلج جانے کا نام ہونے والا ہے۔ فضل دین اسے لے کر صبح نکلتا ہے۔ بس آج جیصلہ کن قدم اٹھایا ہی لیتا چاہیے۔ تیاری شروع۔“ اس نے ایک بھر پورا انگڑائی لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا اس نے سر گھما کر اپنے دائیں طرف دیکھا۔ لکڑی کی میز پر میٹرک کے کورس کی کتابوں کا ڈھیر بڑا تھا۔

”ماسٹر صاحب کو صبح بے وقوف بنا رہا ہوں میں ورنہ تو وہ مجھے یہاں ایک دن نہ نکلے دیتے۔“ وہ خود ہی ہنس۔ پھر اس کی قیمت بھی میں ہی چکارا ہوں۔ آدھی رات تک کتابیں رٹنے کی۔

وہ حویلی کی طرف سے آنے والے راستے پر کھڑا تھا۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ فضل دین کی گاڑی کے راستے پر کم رفتار سے آئی دکھائی دی جیسے ہی گاڑی اس کے نزدیک پہنچی۔ اس نے ذرا آگے بڑھ کر ہاتھ سے گاڑی رکے کا اشارہ دیا۔ فضل دین نے گاڑی توجہ روکی مگر رفتار ذرا کم کر دی۔

”سلام چاچا! گاڑی کو روکو۔“ اس نے کھڑکی کی طرف ذرا جھٹک کر سلام جھانڑا۔

”و علیکم السلام دیر ہو رہی ہے ہمیں ہنورا سے۔“ فضل دین نے کچھ نروٹھے پن سے جواب دیا۔

”چاچا! ایک منٹ بس پلینز۔“ اس نے منت بھرے انداز میں فضل دین کا کندھا پکڑ لیا۔ فضل دین کو مجبوراً رفتار بالکل ہی کم کرنی پڑی۔ عین گاڑی کے ساتھ تیز تیز چل رہا تھا۔

”اے لڑکے! تیرے پاس اور کوئی کام نہیں سوائے مجھے ٹھک کرنے کے میری شکایت مجھے بھولے شادی سے کرنی ہی پڑے گی۔ تو نے مجھے بہت عاجز کر رکھا ہے۔“

”پلینز چاچا! صرف آج مجھے شہر تک چھوڑ دو۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں کرائے کے میرے پاس آئے کھانا ہے۔ بس آج میں کاؤں بھوڑ کر جا رہا ہوں پھر نہیں آؤں گا نہ تمہیں تنگ کروں گا۔ یہ دیکھو میرے کپڑے مسلمان کی طرح ہیں۔ بس آج آخری دفعہ۔“ اس نے التجا سے لہجے میں کہہ کر اپنے ہاتھ میں پکڑے بڑے سے شانگ بیگ نکال کر دکھایا۔ اس کی آنکھوں میں بھی سچائی تھی۔ فضل دین کا جی اس کی منت پر کچھ چکھل سا گیا۔ عبدالمعین نے اس کے چہرے پر نرمی کے آثار دیکھے تو اور پر جوش ہو گیا۔

”پلینز چاچا! مجھے بس آج شہر چھوڑ دو۔ میرے پاس پیسے نہیں اور کوئی ایسی چیز بھی نہیں جسے بیچ کر کرائے کے پیسے اکٹھے کر سکوں اور اوھر ادھار مجھے کون دے گا۔ بس آئندہ میں آپ کے راستے میں نہیں آؤں گا۔ آپ

جانے لی بی جی سے میری منت کر لیں۔ بس آج کا دن۔“ وہ رو دینے کو تھا۔ سر اونچا کر کے اس نے جیسے بیٹھی شہر کو سنا دیا۔ اوپر چہرے سے اس کی رائیگمانی سن رہی تھی۔ اسے پہلے ہی کلج سے دیر ہو رہی تھی اور آج کل وہ سلطان محلہ کے مسائل میں رہنے کی اجازت لینے کی کوشش کر رہی تھی۔

”فضل دین! بھانا سے تو بھالو۔ ورنہ چلو مجھے دیر ہو رہی ہے۔ روز کا تماشہ ہے یہ تو مجھے آج الالہ سے بات کرنا ہی پڑے گی۔“ وہ کڑی نظروں سے عبدالمعین کو گھور کر بولی تو فضل دین نے جلدی سے اپنی طرف کا دروازہ کھول دیا۔ عبدالمعین جھٹ سے گاڑی میں لوٹ گیا۔

جیسے ہی حدود کا آواز دیا وہ بول اٹھا۔

”بس چاچا! مجھے نہیں آتا روں۔“ فضل دین نے گاڑی روکی تو وہ نیچے اتر گیا۔

”اوہو چاچا! گاڑی کے پچھلے دونوں بیسوں میں ہوا بالکل نہیں ہے بے شک اتر کر دیکھ لو۔“ اس سے پہلے کہ فضل دین گاڑی دوڑا لے جا تا عبدالمعین تیزی سے بولا۔ فضل دین نے کوفت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ گاڑی بند کر کے نیچے اتر آیا جیسے ہی وہ پچھلی جانب مڑا عبدالمعین نے تیزی سے منٹھی میں بند کانڈ شہر نہ کی طرف اچھال دیا۔

”یہ آپ کے لیے۔“ کہہ کر وہ تیزی سے سڑک کے دوسری طرف دوڑ گیا۔

اسی وقت فضل دین پرورداتے ہو گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔

”اچھا خاصا کھسکا ہوا لکھا ہے صوفی صاحب کا یہ لڑکا۔“ شہر نہ نے اپنے آؤں کے پاس پڑی کانڈ کی اس کوئی کوکن آنکھوں سے دیکھا مگر اٹھایا نہیں۔

”فضل دین صبح کھتا ہے۔“ وہ سوچ کر بیدھی ہو گئی۔

جیسے ہی گاڑی اس کے کلج گیٹ کے پاس رکی اس نے وہ اپنا شو لڈر بیگ اور فائل اٹھالی۔ پھر ذرا سا جھٹک کر اس نے کانڈ منٹھی میں دیا اور گاڑی سے اتر گئی۔

پھر سارا دن کا سڑک کے دوران بھی اس کا دھیان اپنے بیگ کی اندرونی جیب میں پڑے اس کانڈ کی طرف رہا مگر

کھول کر دیکھئے گا نہ تو وقت ملاوٹ اس نے خود میں بہت پائی۔

”گھر جا کر دیکھوں گی۔“ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا۔

”اچھا خاصا فاصلہ ہے گھر سے کلج گا۔ اتنی تھکاوٹ ہو جاتی ہے اور وقت برباد ہوتا نہیں لالہ کیوں نہیں مانتے“ سفر کی طوالت سے اکتا کر اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی آج اسے سفر چھ اور بھی طویل لگ رہا تھا۔ بی تو جیسے اس کا تھکا ہوا ہاتھ پڑھنے کی اسے بے چینی ہو رہی تھی۔

جیسے ہی گاڑی جوہلی کی طرف مڑی جوہلی کے باہر اسے لوگوں کا جھوم سا نظر آیا اس کا دل یک بیک تیز رفتاری سے دھڑکنے لگا۔

”یہ گھر کے باہر لوگ کیوں جمع ہیں؟“ اس نے کھڑکی سے آگے ہو کے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ فضل دین بھی لوگوں کا جھگڑا دیکھ کر پریشان سا ہو گیا۔ گاڑی جوہلی کے پچھلے گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ گیٹ پہلے سے کھلا تھا اور وہ بھی کافی لوگ آ جا رہے تھے اور پچھ رو بھی رہے تھے۔ شہریت کی حالت دگرگوں ہونے لگی۔ وہ گاڑی سے اتر کر تیزی سے اندرونی عمارت کی طرف دوڑی۔

ہاں کمرے سے عورتوں کے رونے اور مین کرنے کی آواز باہر تک آرہی تھی۔ رک کر کسی سے پوچھنے کی اس میں بہت تھی۔

ہاں کمرے کے دروازے کے پاس ہی اسے سیدہ سفید لباس میں سرخ بیجا چہرہ لیے روتی نظر آئیں۔

”آیا۔ آیا! کیا ہوا آیا؟“ وہ شکل ہونٹوں پر زبان پھیرتی ان کی طرف بڑھی۔

”شہریت! میری بیٹی! میری بہن! ہم لٹ گئے ہم شہریت ہو گئے ہمارے بابا جان ہم سے روٹھ گئے۔ بیٹ کے لیے تیرا بھی کچھ خیال نہ لیا انہوں نے۔ اللہ سے ملنے گئے تھے۔ اللہ نے کیا اس شہریت لہا جا پلے گئے۔“ سیدہ کے ٹین اور چیخیں جیسے اس کا سینہ چیر گئے۔

”نہیں! بابا جان نہیں نہیں۔“ یہ شاک اس قدر اچانک تھا کہ وہ ان کی باتوں میں بھول گئی۔ صاف۔

بارش ابھی کچھ دیر پہلے ہی شروع ہوئی تھی۔ اس سے پہلے تیز ہوا جاتی تھی ہوا چل رہی تھی۔ شام ہی سے گھر کے یادوں نے اطراف میں اندھیرا کر رکھا تھا۔ خزاں کی سحرزورہ خاموشی نے ساری فضا کو اپنے دھار میں لے رکھا تھا اس موسم میں تول کی اداسی کچھ اور بھی سوا ہو جاتی تھی۔ عجیب ہی بے گلی تھی اس کی طبیعت میں جی چاہ رہا تھا ابھی ایسی خزاں کی اداس شام اوڑھ کر کسی کو نے کھد رے میں جا چپے اور اپنے گھر کوئی پر سر رکھ کر چپ چاپ روٹی جانتے۔

دن تو کسی نہ کسی طور کٹ ہی جاتا تھا جیسے جی کی سو مصروفیات ہوتی ہیں سو وہ دن چڑھتے ہی خود کو ان مصروفیات میں گم کر لیتی تھی۔ خود بناتی پھر وہ پھر کا کھانا بھی صفائی والی کے سر پر کھڑے ہو کر کھڑکا کونہ کونا صاف کرنا بلکہ صاف ستھرے گھر کو خواتین اور لڑکوں کی خاص مصروفیت تھی۔ پھر وہی میں سوتی نہ تھی۔ اسے ڈر تھا کہ ایک پل کو بھی سو گئی تو پھر شب بھر جاگنا پڑے گا۔ وہی میں کوئی نہ کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتی۔ مسز خان کی ایک شرت پر اس نے سیدہ ورک شروع کر رکھا تھا۔ ان کے دو بیٹوں پر فارغ نہیں کرو شہیہ کی بیلیں بتاتی رہتی۔ شام کی چائے اور رات کا کھانا بھی خود تیار کرتی کہ کسی طرح یہ بدن سگن سے چور ہو جائے اور رات کو لوٹ کر تھکا آئے مگر اس کی یہ کوشش ہر روز نقش بر آب ہی ثابت ہوتی۔

سب کاموں سے فارغ ہو کر وضو کرتی۔ جیسے ہی کمرے میں جا کر عشاء کی نماز کے لیے بیٹھ کر کھڑی ہوتی آنکھوں میں غیمہ کے گھیرے پاؤں اٹھنے لگتے شیطان چٹکیاں دے دے کر میٹھی غیمہ کا چوگا دکھانے لگتا۔ اس طوعاً کرہاً نماز سے فارغ ہو کر کھانا پک پڑھتی اور لائٹ آف کر کے بستر ڈھبے جاتی۔ بس وہی آخری پل ہوتا تھا اس دھوکے باز غیمہ کی آمد کے گمان کا۔ پھر تو اس کی آنکھیں یوں کھلتیں کہ گروٹیں بدل بدل کر آدھی سے زیادہ

راستہ پر جاتی۔ جہاڑی سا تیز بیڑ کی دو سری خالی جگہ اسے اپنے وجود کے خالی پن کا ثوب احساس دلاتی۔ زندگی امتحان مسلسل ثابت ہو رہی تھی۔ اور اس کی ہر دعا ہر سعی اس کی طوالت کم کرنے میں ہی احوال کا کام ثابت ہو رہی تھی۔ بہت دنوں سے اس نے تہجد کی نماز بھی یا قاعدگی سے ادا کرنا شروع کر دی تھی۔ خشوع و خضوع کے باوجود اکثر دل سکون سے خالی رہتا۔

اور جو خدا نے فرمایا ہے کہ ذکر الہی میں دل اطمینان پاتے ہیں تو اس کا دل مطمئن کیوں نہیں ہوتا تھا۔ کیوں اس کی بے گلی اسے پر سکون نہیں ہونے دیتی تھی۔

”شاید میری عبادت خالص ہے۔ میری ریاضت میں کلوٹ ہے۔ اس میں غرض کی ملاوٹ اس قدر ہے کہ بے غرضی غالب آئے ہی نہیں پائی۔ خالص عبادت خالص ذکر ہی سے تو دل اطمینان پاتے ہیں اور اس کا تو ہر ہر سجدہ صرف ایک شخص کی توجہ محبت اور انعامات کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے خدا کے حضور ہوتا تھا۔

اپنی عبادت کے ناخالص ہونے کا اس کے دل کے نماں گوشوں کو علم تھا بلکہ وہ اس بات پر اللہ سے شاک رہتی کہ اتنی عبادت کے باوجود بھی اللہ اسے سکون کیوں نہیں دیتا۔

کیونکہ اللہ کو دل کی بات پتا ہوتا ہے۔

اور اس کا دل تو ایک خاکی وجود کی محبت کا طالب تھا۔ اللہ کی محبت اور اس کی توجہ کا طالب کب تھا؟ سوچتے سوچتے اس نے سرور فضا میں ایک گہرا سانس لیا۔

”اب عبادت میں خلوص اس حد تک خالص پن میں کہاں سے ملاؤں اللہ کو اصل بات پتا ہے تو میری بے بسی کا بھی علم ہو گا میں خاکی بدن خاک پر رہنے والی اور خاکی وجود کی طالب خاک میں سمانے کی حقیقت سے گریزاں اس سے رب ہی خالص ہے۔ کلوٹ بے غرضی اپنے اندر کیسے پیدا کروں کیسے؟

جو دنیا کی طلب کرتے ہیں انہیں دنیا مل جاتی ہے اور جو اس کی طلب کرتے ہیں وہ دنیا بھی پالیتے ہیں اور سچے رب کی سب تھی۔“ کوئی اس کے اندر رسالت صاف بول رہا تھا۔

”تو کیا میں دنیا کی طالب ہوں۔“ اس نے خود سے سوال کیا۔ اسے لگا اور گھر کا گیٹ بند رہا ہے۔ بارش کے مدھم مدھم سروں میں گیٹ بند کرنے کی آواز زیادہ نمایاں نہ تھی اسے یاد آیا کل سے ڈور بیل خراب ہے۔

”صحا سے کنا بھی تھا۔ الیکٹریشن کا بلو اگر ٹھیک کرالے۔“ وہ پوچھا۔ اچھی طرح اوڑھتے ہوئے بیڈ سے اترتی۔

”شاید میرا وہم ہی ہے۔ عزات کے ساڑھے بارہ بجے بھلا کون ہو گا۔“ وہ ایک نظر کا ک پر ڈال کر کمرے سے نکل آئی۔

والی ڈور اڑے پر زور و شور سے دستک ہو رہی تھی۔ وہ تیز قدموں سے باہر گیٹ کی طرف بڑھی۔ بارش کافی تیز ہو چکی تھی وہ کارڈور کا دروازہ کھول کر بیڑھیان اترتی بیچ کھنڈی ہوائے اس کا استقبال کیا اس نے جھر جھری ہی لے کر گیٹ تک کا فاصلہ تقریباً دوڑ کر عبور کیا۔

”کون۔؟“ گھر کے سناٹے میں اسے اپنی آواز کو سنی ہوئی سنائی دی۔

جواب میں چند ثانیے کو خا۔۔۔ شہی چھا گئی۔ وہ جھنجھلا کر وہ بارہ بولنا ہی چاہتی تھی کہ باہر سے جواب آ گیا۔

”میں شہبانہ۔“ رات کے سناٹے کی طرح خمیر خمیرہ اور سرد آواز اس کے سروہوتے جسم میں ایک سنسنی سی وہ ڈاگنی۔ اس نے سناٹے میں گیٹ کی دیوار کو اس طرح کھوکھو کر دیکھا جیسے اس کے ہاں سب کچھ نظر آ رہا ہو۔

ہاتھ بڑھا کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ لیپٹن شہبانہ نے زور دیا دھکے سے پورا گیٹ کھولا اور اس پر ایک بھی نظر ڈالے بغیر لوٹوں کی تیز دھک پیدا کرتے اندر کی طرف بڑھ گئے۔ اس کا دھمکے لہجے میں کیا گیا سلام جیسے اس کے اپنے من پر کسی زور دار خمیر کی طرح لگا۔ اس نے کچھ کھسیا کر گیٹ بند کیا اور خاصے ست قدموں سے اندر کی طرف بڑھی۔

نزہت جب کمرے میں داخل ہوئی تو وہ وارڈ روم میں سر کھینٹے اپنے کپڑے نکال رہے تھے۔ وہ خاموشی

سے جا کر میڈ کے کنارے ٹھک گئی وہ کپڑے اٹھا کر واش روم میں کھس گئے۔
”پچھو نے تو ان کے آنے کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ شاید انہیں خود بھی معلوم نہیں ہو گا تو اس کا مطلب ہے پ
خود ہی اپنی مرضی سے آئے ہیں۔“ اس کا دل انجانا ہی خوشی سے معمور ہونے لگا۔ اسے لگا پتھر گرنا قطرہ قطرہ جالی
پتھر کے قلب تک جا پھنچا ہے۔

”کھانا گرم کروں آپ کے لیے؟“ جیسے ہی شہباز ہاتھ روم سے نما کر نکلے وہ مستعدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
تو لیے سے بال خشک کرتے ان کے ہاتھ ایک ہی پل کو رکے بس اور پتھر سے انہوں نے بال رکڑنے شروع کر دیے
وہ جواب کی منتظر کھڑی تھی۔ بال خشک کر کے وہ ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھے اور برش اٹھا کر بالوں میں پھیرنے
لگے۔ نہت نے پتھر جو صلہ کیا۔

”کھانا گرم کروں میں جا کر؟“ وہ بس روٹی دینے کو تھی۔
”تو تھکنس۔“ نوب چپا کر کہا اور برش ڈریسنگ ٹیبل پر پھینک دیا۔ تو وہ جیسے بے دم سی ہو کر بیڑ پر بیٹھ گئی۔
اس کے قریب سے ہو کر باہر نکل گئے۔

ارادہ کیست روم میں ہی قیام کرنے کا تھا اور پھر جو نگر الماری میں کپڑے بڑے تھے۔ اس لیے اتنا بڑا اور نہ آنے
سے پہلے وہ دل میں مصمم تہہ کر کے آئے تھے کہ نہت کی شکل بھی نہیں دیکھنی۔ بس ام جان کے پاس ایک دن
گزار کر اگلے روز واپس آجائیں گے۔ ماں سے دور اتنا عرصہ وہ کہیں بھی نہ دہتے تھے۔ اور اب مزید ان سے جدائی
سہی نہ جا رہی تھی۔ ام جان بھی آج کل انہیں بہت ڈپریشن لگ رہی تھیں۔ اسی بے چینی میں وہ بغیر اطلاع کے ہی
چلے آئے۔ کیست روم کی لائیں آج انہیں سو روزانہ زور سا کھلا تھا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر روزانہ وہ کھلیلا اندر معاذ
بیٹھا اپنے گرد کتابیں پھیلا کے پڑھ رہا تھا انہیں دیکھتے ہی کھل اٹھا۔

”ارے شہباز بھائی آپ۔!“ اس کے لہجے کی چمکار اس کے دل کی خوشی کا پادے رکھی تھی۔ ”سر
پرائز۔ آپ نے اطلاع بھی نہیں دی آئے کی۔“

”بس دیکھ لو میں نے کہا۔ سر پرائز دیتے ہیں کیسے ہو؟“ وہ اس کو گتے سے لگاتے ہوئے مسکرا کر بولے۔
”فائن اللہ کا شکر ہے۔ آپ سنا میں۔ اتنے دنوں بعد گھر کی یاد آئی میں اور آپ کے آسرنے پر آیا تھا اور آپ
مجھے ادھر ڈال کر رہی بھول گئے۔“ شکوہ اس کے لبوں سے پھسل ہی گیا۔ لیکن شہباز نے چونک کر اس کی شکل
دیکھی۔ انہیں انکا یہ جملہ معاذ نے نہیں نہت کے لبوں نے ادا کیا ہے اور آواز معاذ کی ہے۔
”آسرا تو بس سے بڑا اللہ کا ہے۔ میں کس قائل ہوں۔“ وہ بولے سے کہہ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ ”اس وقت
پڑھ رہے ہو؟“ وہ یونہی اس کی کتابیں اٹھا کر ورق الٹ پلٹ کرنے لگے۔

”جی ایگزیم ہونے والے ہیں نا اس لیے۔ آپ نے کھانا کھا لیا؟“
”نہیں بھوک نہیں راستے میں اسٹیکس لے لیے تھے۔ اپنے روم میں کیوں نہیں پڑھ رہے؟“ وہ سرسری
لہجے میں بولے۔

”ادھر کی نیوب لائٹ خراب ہے شام سے اور میرا کل ٹیسٹ ہے اس لیے ادھر پڑھ رہا ہوں۔“ اس نے کتاب
اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

”خٹریز کیسی جا رہی ہیں تمہاری؟“
”سے دن! آپ چھٹی لے کر آئے ہیں نا میں گے کچھ دن۔“ معاذ نے پوچھا۔
”نہیں بس ایک دو دن۔ زیادہ چھٹی نہیں مل سکتی۔“ انہوں نے ایک طویل جمالی کی سوز کے آگے رکھے ہاتھ
سے ہی نیند سے بوجھل آنکھوں کو ذرا سا مسلا۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔
”آپ کو چھٹی لے کر آنا چاہیے تھا۔ اتنا عرصہ تو ہو گیا۔“ معاذ کچھ افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال
ہے شہباز بھائی! آپ کو نیند آرہی ہے۔ آپ جا کر آرام کریں۔ انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی میں کالج سے آجاؤں گا تو

پتھر۔“ وہ ان کی آنکھوں میں تیرتے مس ڈوڑوں کو دیکھ کر بولا۔

”ہاں پتلنا ہوں۔ بس تھکاوٹ کی وجہ سے نیند بہت آرہی ہے۔ تم بھی سوچا تے جا کر۔ کافی رات تو ہو چکی ہے۔“
انہوں نے اس کا ارادہ جاننا چاہا تھا۔

”نہیں بھائی! میں تو شاید رات بھر پڑھوں۔ دن میں تو بالکل۔“ اس نے ایک دم سے بات روکی۔ ”پڑھ نہیں
سکا اس لیے آج تو باکنا پڑے گا۔“

”او کے! پتھر شب بخیر میں چلتا ہوں۔“ وہ آگیا کر گیا ہر نکل آئے۔

”ام جان کے کمرے میں سونے سے صبح ایک اور کنبہ کھل جانے کا ڈرا تھک روم اور لاؤنج میں تو ویسے بھی
بہت ٹھنڈا ہوتی ہے۔ دونوں کمروں میں فل سائز کھڑکیاں تھیں جن کی وجہ سے دونوں کمرے آگے کے آخر میں ہی
رات کو نہ ہو جاتے تھے۔

”میں بھلا اس سے ڈرتا ہوں، مجھے اپنے کمرے میں جا کر سونا چاہیے۔“ انہوں نے اپنی سوچوں کو تازا اور اپنے
بید روم کی طرف رہنہ گئے۔

کمرے کی لائٹ پتھر چکی تھی۔ کمرے میں آتے ہی انہیں خوشگوار گرمیٹ کا احساس ہوا۔ زیرو کے بلب کی
مدد ہم روشنی میں نہت کے لیے شاید سوچگی تھی۔ غصے کی ایک لہری ان کے بدن میں دوڑ گئی۔

”کتاب میں کہاں سوؤں بھلا تمہارا لیڈر بر سوئی پڑی ہیں۔“

انہوں نے بھنا کر سوچا اور صوفے کا رخ کیا۔ نیند اس قدر غالب آرہی تھی کہ مزید سوچنے یا کسی اور ٹھکانے
کے بارے میں غور کرنے کا ارادہ ملتی کر کے وہ صوفے پر بی ڈھیر ہو گئے چند منٹوں بعد ہی ان کے ہلکے ہلکے
غرائے کمرے میں گونج رہے تھے۔ نہت نے یہ سوشلی سٹی رہی پھر اسے بھی نیند آگئی۔ ویسے بھی رونے سے
اس کا ہتھیار ہوا تھا۔ شہباز کے پاس ہی وہ بی بھر کر رہی تھی۔

”یہ اسی طرح وہ ہیں گے میرے ساتھ ساری عمر۔ پتھر دل پتھر نظر۔“ اپنی بے قدری پر وہ رہ کر آنسو سے چلے
آ رہے تھے۔

رات کا اللہ جانے کون سا پتھر تھا جب شہباز کی آنکھ کھلی کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ شاید لائٹ جا چکی تھی
اور سردی سے ان کا پورا جسم اکڑا ہوا تھا۔ اللہ میرے سے مانوس ہونے میں انہیں چند منٹ لگے۔

”لاحول ولا قوۃ میں ادھر جاؤں پتھر پتھر اور کبیل کے پڑا ہوں انہوں کی طرح وہ بھی اپنے کمرے میں۔“ وہ
خود کو کہتے ہوئے سردی سے سے کپکپا کر اٹھ بیٹھے۔ سامنے بیڈ پر نہت مزے سے سر تک کھیل اوڑھے سو رہی
تھی۔

یہ میری بیوی ہے بے حس میری کوئی پروا نہیں۔ خود مزے سے کھیل اوڑھے سو رہی ہے۔ اور میں یہاں
سردی سے اکڑ کر میرا دل یہ مزے کر لی رہے اور سب کی ہمدردیاں علیحدہ ہو رہے ہوں۔“ وہ شکتا کراٹھے اور بیڈ
کے وہ سر ہی طرف جائے ہاتھ بڑھا کر کھیل اس کے سوتے وہ جو سے کھینٹا اور اپنے اوپر تان لیا اور اس بات کا
انہیں پتا بھی نہیں چل۔ تاکہ کھیل کنارے کے ساتھ گھسیٹتا اس کا نرم گرم ہاتھ بھی ان کے ہاتھوں میں آسایا۔
نہت کے سوتے بدن میں جیسے تیز رفتی رو دوڑ گئی اس نے کسسا۔ کراپنا ہاتھ کھینچنا چاہا چند لمحوں کی مزاحمت نتیجہ
خیر ثابت ہوئی ہاتھ تو ان سے نہ چھڑا سکی بس اس کا سامرا وہ ہوتی کسی بے جان شے کی مانند اس مزاحمتی روم میں رہتا
چلا آیا۔

بارش کافی دیر سے رکی ہوئی تھی مگر اب ایک دم سے پھر برسنے لگی تھی۔ ایک گھنٹہ پہلے برسنے والی بارش اس
کے بے چین دل کو ساگاری تھی۔ اور ایک گھنٹہ بعد برسنے والی بارش جیسے اس کے پتھر دل کی ساری زمین سرسبز
کرنے چلی تھی۔ ٹپ ٹپ بوندیں کھڑکی کے شیشے پر پورے زور و شور سے پڑ رہی تھیں۔

عبدالمبین تو جلیل کے ساتھ آیا مگر جلیل جو خبر لے کر آیا اس نے جیسے صوفی صاحب پر بجلی ہی گرا دی۔
 ”جی میں گاؤں سے باہر ہی عبدالمبین کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔ اماں جی سے وعدہ کر کے کیا تھا کہ اسے ساتھ
 لے کر آؤں گا۔ میں نے سوچا۔ دو تین گھنٹے تک ضرور شہر جانے کے لیے روانہ ہو گا۔ تو میں اس کے ساتھ ہی چل
 پڑوں گا مگر وہ پھر سے پہلے ہی گاؤں میں روٹا بیٹھا بیٹھا گیا۔ سارے گاؤں میں خبر جنگ کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ جی
 کہ بڑے شاہ جی کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہیں سعودی عرب ہی میں۔ ابھی تو شاید عمر وہی کر رہے تھے اس کے دوران
 ہی۔ میں نے دو تین لوگوں سے پوچھا جو حویلی جا رہے تھے یا ادھر سے آ رہے تھے پھر میں مزید ادھر نہ ٹھہرا کہ آپ
 کو بتاؤں اگر۔“

جلیل ان کے پاس کھڑا تفصیل بیان کر رہا تھا اور صوفی صاحب سے تو کافی دیر تک کچھ بولا ہی نہ گیا۔ راجہ جی کے
 تسلیج کرتے ہاتھ خواہوا کر زنے کے۔ وہ کب تک صوفی صاحب کے چہرے کے اڑنے اڑنے رنگ کو دیکھ رہی
 تھیں خبر ہی اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھا۔ ان کے تو پورے خاندان کی زندگی کی کشمی بھنور میں پھنس گئی تھی۔
 ”تنت۔۔۔ تم نے کس سے پوچھا؟“ کافی دیر بعد صوفی صاحب نے بھلا کر پوچھا۔

اور سوال کے غیر اہم ہونے کا ”میں خود ہی احساس ہو گیا۔ وہ اپنی اذھیاں بچھانے لگی۔
 ”حالی اللہ دے کے بڑے بیٹے سے ماسی خیراں سے اور بشیر چاچا تو عورتوں کی طرح رونا ہوا آ رہا تھا۔ بڑے شاہ
 جی اسے بہت عزیز پور رکھتے تھے اور ماٹھر صاحب بھی دو تین لوگوں کے ساتھ حویلی جا رہے تھے افسوس کرنے پتے
 پتے کی زبان پر یہ خبر تھی صوفی صاحب۔ ”وہ ان کی ذہنی کیفیت سے آگاہ تھا بہت آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔
 ”یہ قسم ہونا پائی تھا میرے انداز میں لیا کریں گے۔“ صوفی صاحب بے چینی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مڑ مڑ
 کر اماں جی کی شکل دیکھنے لگے جو خود سوالی نظروں سے انہیں تنگ رہی تھیں۔

”وہ خبیث تمہارے ساتھ کیوں نہیں آیا؟“ انہیں اور کچھ کچھ میں سے آیا تو اپنی توجہ عبدالمبین کی طرف
 مبذول کر کے بولے۔

”وہ کہہ رہا تھا کہ اسے گاؤں میں کوئی ضروری کام ہے۔“
 ”کیوں اس نے اپنے باپ دادا کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے جانا تھا؟“ ان بے حیا اتنے دنوں سے مدد سے بھی نہیں
 گیا۔ بے شرموں کی طرح ماٹھر صاحب کے در پر بیٹھا روٹا ہوا توڑا ہوا غریب آدمی خود نہ جانے کس طرح
 گزارہ کرتا ہے اور یہ مرود جا کر ان کے گھٹنوں میں بیٹھ گیا۔ ”صوفی صاحب کو عبدالمبین کے بارے میں سوچتے
 ہی غصہ آنے لگتا تھا۔“

”اب کیا کریں گے صوفی صاحب! آپ جا میں کے حویلی تعزیت کرنے۔“ راجہ جی نے ان کی توجہ عبدالمبین
 سے زیادہ اہم مسئلے کی طرف دلائی۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا بھٹیڑی کی کھار میں منہ دینے پلا جاؤں تمہیں خبر ہے نا اس پھولے شاہ جی کی
 وہ تو پہلے ہی غصے سے مل کھا رہا ہو گا۔ میری شکل دیکھ کر اسے سب کچھ از سر نو یاد آئے۔ اور جو بتائی میں کسر ہے۔
 وہ میں جا کر پوری کروں۔ احمق عورت بھی تو عقل سے کام لے کر بولا کرو۔ جاہل کنوارا عقل سے پیدل۔“
 صوفی صاحب کا تمام تر رنج اور افسوس اب غصے اور کوفت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا
 تھا۔ اس افسوس ناک خبر کا اثر زائل کرنے کے لیے وہ کس کا گلا دیا میں۔ راجہ جی نے سر تھکا کر جلدی جلدی تسلیج کے
 دانے گرائے لکیں ”ان کی آنکھوں کے گوشے جھکنے لگے تھے۔“

”میں جاؤں گی۔“ جلیل ان کے غصے سے خائف ہو کر بھاگنے کی صورت نکال کر لایا۔
 ”جاؤ عصر کا وقت ہونے والا ہے۔ جا کر صفیں درست کرو میں آتا ہوں ابھی۔“ اس کی طرف مڑ کر غرائے تو وہ
 سر پھاؤں رکھ کر بھاگ نکلا۔ کمرے میں جا کر خاموشی چھا گئی۔ صحن میں بیٹھی زینب کی صورت اس خبر کو سنتے ہی اتر
 گئی۔ وہ رات کے سامنے کے لیے آلو پھیل رہی تھی۔ آمنہ بیڑھیوں میں کتاب لیے کافی دیر سے چپ چاپ

بیٹھی تھی۔ جو یہ اس کے پاس ہی زمین پر پوری بچھا کر اسکول کا کام کر رہی تھی۔
 صرف وہی اس خبر کے اثرات سے پرکھ لگ رہی تھی۔ نئے اسکول میں اس کا دل بھی لگ گیا تھا۔ دو چار
 سیلیاں بھی بن گئی تھیں گاؤں اب اسے کچھ کچھ بھولتا جا رہا تھا۔ بچکانہ ذہن تھا۔ نقش بننے اور مٹنے میں زیادہ
 وقت نہیں لگتا تھا۔

”پتا نہیں اللہ کو کیا منظور ہے۔ آزمائش پر آزمائش۔“ صوفی صاحب کی پریشان آواز کمرے میں ابھری۔ آمنہ
 اور زینب کے سر کچھ اور جھک گئے۔

”میں تو گن گن کر ان کے آنے کے دن گزار رہا تھا۔ ابھر زندگی بتانا کس قدر دشوار ہے۔ میں تمہیں کیسے
 بتاؤں۔ گاؤں والے سارے آرام و آسائش میں خواب ہونے چلے ہیں۔ یہ دو چار ماہ تو میں نے پس انداز کی ہوئی
 کچھ رقم کے بل پر گزار دیے ہیں۔ اب اگر مستقل ادھر رہنا پڑا تو راجہ جی بی ہم۔ ہم کیسے زندہ رہیں گے۔“ آخر
 میں ان کی آواز بھرا سی گئی۔ وہ رگ رگ کر بول رہے تھے۔ پریشانی ان کے ایک ایک لفظ سے ہو رہی تھی۔

راجہ جی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ابھی تو وہ اپنی محدود عقل کی شان میں قصیدہ سن کر بیٹھی تھیں۔ اب اتنی
 جلدی کیسے کوئی عقل کی بات کر سکتی تھیں۔ بس شوہر کا پریشان چہرہ دیکھ کر وہ کہیں۔
 پورے گھر میں جیسے صدمہ لگ گیا۔ کئی ایک جاہد خاموش تھے۔

”میرے تو خواب و خیال میں جی اس بات کا گمان نہیں تھا۔“ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔
 ”صوفی صاحب! بڑے شاہ جی بہت اچھے تھے۔ بہت نیک غمخیزوں کے ہمدرد اور ہم جیسوں کے بھی خواہ اللہ
 جنت نصیب کرے اور ان کے جنت میں درجات بلند کرے مگر آپ خود علم والے ہیں عقل میں بھی خداوند تعالیٰ
 نے آپ کو بہت خوبی سے نوازا۔ آپ جانتے ہیں شاہ لاکھ اتنے سہی ہمارے ہی خواہ اور خیر خواہ سہی مگر خدا تو
 نہیں ہے۔ یا خدا سے جوہر کو نہیں۔“ میں اللہ نے پیدا کیا ہے۔ صوفی صاحب! وہ ہمارے وہو سے ہم سے زیادہ
 آگاہ ہے اور ہمارے وجود کو بے حس و حرکت ہے۔ وہ ہم سے زیادہ بہتر جانتا ہے۔ اس نے پیدا کیا ہے اسی نے زندہ
 رکھا ہے وہی زندگی کے اسباب پیدا کرتا ہے اور جب اور جس طرح اس کی مرضی ہوگی ہمیں اس خاکی زمین سے
 اٹھا کر اپنے پاس بلا لے گا۔ وہ رب ہے ربوبیت اس کی سب سے بڑی شان ہے صوفی صاحب! وہ سب کا پاپن ہار
 ہے۔ آپ کا میرا ہمارے بچوں کا وہی حکیمانہ وہی مستبب الاسباب ہے۔“

راجہ جی بی بے حد مضبوطی سے اپنی بات بڑی سہولت سے کہہ کر کمرے سے باہر نکل آئیں اور صوفی
 صاحب اپنی جگہ پر بیٹھ کر دق رہ گئے۔ پریشانی میں وہ اللہ کو تو بھول ہی گئے تھے۔ جس کے نام کا پرچار وہ صبح آنکھ
 کھلنے سے لے کر رات کو آنکھ بند ہونے تک کرتے تھے، اب اللہ صرف تسلیج کے دانوں پر پھرانے والا نام ہے یا نماز
 اور قرآن میں بار بار رٹنے والا ایک نام اور بس۔

راجہ جی بی کی بات نے صوفی صاحب کی پریشانی عرق عرق کر دی۔
 انہوں نے جھلی کی پشت سے پسینہ صاف کیا۔ اور اپنی نفرت کم کرنے کے لیے زور سے کھانسا ر کر گلا
 صاف کیا۔ اور سر پر بندھا ہوا عمامہ اتار کر از سر نو پاندھنے لگے۔

”ہائے اللہ اماں جی دیکھیں تو کون آیا ہے۔“ زینب کی اچانک تسلیج نے گھر میں موجود سب
 افراد کو بے اختیار بیرونی بیڑھیوں کی طرف متوجہ کر دیا جس کے آخری زینے پر تھا تھا کا سا عبدالمبین کھڑا سر کھما
 کھما کر جھونے سے امان ملے میں بنے اس کا بک نما کھڑا جائزہ لے رہا تھا۔

”عبدالمبین! میرا بچہ! اسم اللہ آئے تمہ۔“ راجہ جی بوجھ لے کر چائے کا پانی رکھ رہی تھیں۔ زینب کی اپکار پر بیٹے
 سا اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور مڑ کر عبدالمبین کی شکل دیکھنے ہی بولیں۔

”اسلام علیکم اماں جی!“ اس نے بھی کھ کھائی جائزہ ترک کیا۔ اور آگے بڑھ کر اماں جی کی پیٹلی ہونٹیاں ہانہوں
 میں مائی۔

”صبح جلیل کے ساتھ کیوں نہیں آیا“ کتے دلوں سے انتظار کر رہی تھی تمہارا آنکھیں ترس گئی تھیں تمہیں دیکھنے کو۔ وہ اس کے جسم پر چار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ ہاتھوں میں چہولے کرو بارہ چوما۔

”آپ لوگوں نے کون سا میرا خیال کیا۔ مجھے بتائے بغیر کوئی بھی اطلاع دیے بغیر چلے آئے۔ وہ خفگی سے ان کے دونوں ہاتھ جھٹک کر ناراض لہجے میں بولا۔

”تو نہ آتے تو اب کے بچے! تمہیں کسی نے خط نہیں لکھے تھے کہ اگر ہمیں اپنے دیدار کراؤ کہ ہم تمہاری یہ صورت دیکھنے کو مرے جا رہے ہیں۔“ صوفی صاحب کمرے سے نکل کر اپنے اسی اذنی ناراض لہجے میں بولے۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ عبدالمعین کو دیکھتے ہی ان کا غصہ جیسے ایال کی طرح اٹھنے لگتا تھا اور کچھ نہیں تو اپنی چند لٹے پیشتر کی خفت کا اثر بھی زائل کرنا تھا۔

”تم مدرسے کیوں نہیں گئے ہفتہ ڈیڑھ ہفتے سے ادھر سے تم مسلسل غیر حاضر ہو اور ماسٹر صاحب تمہارے کون سے کتے لگتے ہیں جو بے شرمیوں کی طرح ان کے در پر جا بیٹھے۔“

صوفی صاحب غصیل چہولے لیے اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ عبدالمعین ایک بل ان کے غصے سے خائف سا ہوا۔ دو سرے بل اس نے زور سے اپنا سر جھکا اور ان سے ڈرا پرے ہو کر میز صوفیوں کی دیوار کے پاس پڑے تخت پر جا بیٹھا۔ وہ خود کو ان کے غصے سے لاپرواہا ہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”وہ کم از کم آپ سے اچھے ہیں۔ انہوں نے مجھ کو بچانے سے انکار نہیں کیا۔ آپ لوگ مجھے اپنا کچھ سمجھتے تو کم از کم مجھے بتا کر آتے۔ آپ نے مجھ سے جان چھڑانے کا اچھا طریقہ سوچا۔“

صوفی صاحب غصے سے پھٹکارتے اس کے سر پر آکھڑے ہوئے تھے۔ وہ اس کی طبیعت عمل طور پر صاف کرنے پر تلے نظر آ رہے تھے۔ اس کی لاپرواہی کا کھولتے دماغ کے ساتھ معائنہ کرتے انہیں ایک دم سے عجیب احساس ہوا۔ عبدالمعین ان دو ڈھائی ہفتوں میں ہی انہیں خاصا بدلا بدلا دکھائی دے رہا تھا۔ صرف وہی طور پر بلکہ جسمانی طور پر بھی انہیں لگا جیسے وہ بہت بڑا ہو گیا ہے۔ سوکھا سڑا سا اس کا ہنر اور بدوں والا چہرہ بھرا بھرا سا نظر آ رہا تھا۔ کندھوں کی ہڈیاں جو باہر نکلی نظر آتی تھیں۔ ان کی جگہ مضبوط اور چمڑے شانے اس کے ایک تو اتنا جوان ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ ہاتھ پیر بھی نمایاں طور پر بڑے اور گوشت سے بھر پور کھائی دے رہے تھے۔ چہرے پر بیچکی مسوں کی جگہ ہلکی ہلکی براؤن ظفر کی موچھیں تھیں۔ چوڑی چھاتی اٹھی ہوئی گردن اور لہجے کا تو بیشاہو اقد بھی عبدالمعین سے لبا نظر آ رہا تھا۔

صوفی صاحب کے دل کی عجیب سی حالت ہو گئی کچھ خوشی کچھ بے چارگی اور کچھ کمزوری کی ملی جلی کیفیت تھی۔ خوشی اس کے جوان ہونے کی تھی بے چارگی اور کمزوری اپنے بوڑھے ہونے کی اور عبدالمعین کے لکھڑے رویے کی بھی۔ پھر ایک دم سے عبدالمعین کی جدائی اور گستاخی کے دردناک لمحے انہیں یاد آئے۔ انہوں نے اپنے اٹھتے ہوئے وائیں ہاتھ کو بے اختیار غصے کی شکل میں لپیٹ لیا۔ ان کے کندھے جیسے جھک سے گئے۔ عبدالمعین ان کی ان تمام کیفیات سے بے نیاز آستین کے کف اٹھنے میں مگن تھا۔ اماں جی خوفزدہ نظروں سے صوفی صاحب کے تیور بھانپ رہی تھیں۔ آمنہ نے کتاب بند کر دی تھی اور کمرے میں جانے کو کھڑی تھی۔ ابھی عبدالمعین کی دھناتی شروع ہونا تھی۔ سو اسی پر حشت ناک منظر کے احساس کے تحت بویریہ نے بھی اپنا ہاتھ بند کر لیا تھا۔ اور اب بوزی سمیٹ کر اندر جا رہی تھی۔

”چلا جاؤں گا۔ ادھر ہی چلا جاؤں گا میں۔ کون سا اس ڈرے میں مستقل رہنے کو آیا ہوں۔ یہاں تو عمدہ چار دن رہے اس کی سانس رک جائے۔ ویسے بھی میں ماسٹر صاحب کے پاس میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا ہوں اور ادھر میں ایک دو دن کے لیے ہی آیا ہوں۔ اس لیے آپ ٹینشن نہ لیں۔ میرے ادھر رہنے کی۔“

آستین لپیٹ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بڑے آرام سے صوفی صاحب کے بد مقابل کھڑے ہو کر اس نے تفصیل سے جواب دیا۔

”اور مدرسے سے کون جائے گا؟“ بمشکل تمام صوفی صاحب نے اپنے لہجے کو ہموار کیا۔ اسی وقت نیچے سے موذن نے اذان دینا شروع کر دی۔

”اللہ اکبر اللہ اکبر۔“ فضا کو جگمگائی۔

”وہ بعد میں دیکھ لوں گا ابھی تو میں اتندی کے ساتھ ہی امتحان دے رہا ہوں میری حفظ کی ڈگری سے مجھے کچھ نہیں مل سکتا۔ اماں بی! میں نماؤں کا میرے پڑے نکال دوں پھر کھانا کھاؤں گا۔ بہت بھوک لگ رہی ہے اور کھانے کے ساتھ ہی چائے کا بڑا پیالہ بھی صبح ناشتی جی کے ہاتھ کا ناشتہ اور چائے پی کر نکلا ہوں۔ اب تو برا حال ہے۔ بس جلدی کریں۔“ وہ صوفی صاحب کے آگے سے گزر کر میز صوفیوں کے پاس بیٹے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

تو صوفی صاحب بے حدست قدموں سے نیچے میز صوفیوں کی طرف بڑھ گئے۔

”میں چائے آ کر پی لوں گا۔“ اب جماعت ہونے والی ہے تم عبدالمعین کو کھانا دے دو۔“

صوفی صاحب راجعلی بی کی سوالیہ نظروں کو جواب دے کر آہستہ آہستہ میز صوفیوں کی طرف اترنے لگے۔

بجز کھین میری پیاس کو اکثر تیزی آنکھیں
صحرا میرا چہرہ ہے سمندر تیزی آنکھیں
جو جھل نظر آتی ہیں بظاہر مجھے آنکھیں
کھلتی ہیں بہت دل میں اتر کر تیزی آنکھیں

دن میرا ایک کتاب کی صورت
جس میں وہ ہے گلاب کی صورت
حسن ہے گھڑے کا شیدائی
عشق موج چناب کی صورت

اس نے کوئی دسویں یا بیسواں اشعار کا مضمون اخذ کرنے کی کوشش کی اور بظاہر ان کا مفہوم کچھ ایسا مبہم بھی نہیں تھا۔ چار جماعتیں پہلے کلاس میں بھی ان کا مطلب بخوبی سمجھ سکتا تھا مگر اسے نہ جانے کیوں یہ سہواً مطلب بھی ابھائے جا رہا تھا۔

”آخر اس نے یہ اشعار مجھے کیوں لکھے اس کی اتنی ہمت۔ سید سبطین شاہ کی بیٹی سید سلطانہ بخت کی ماں کے ساتھ کھلیا مذاق یہ سب اس فضل دین بد معاش کا کیا دھرا ہے۔ جو بار بار اس اوباش کو گاڑی میں بٹھالیتا تھا۔ میں آج ہی والد سے بات کر کے اس بڑھے فضل دین کا انتظام کرواتی ہوں۔ اور اس کے بعد اس مولوی کے پتے کا ذیل کھنڈا تیز اس نے مجھے کھنڈا کیا ہے۔ اس نے جٹ ٹٹھی میں بیچنی اور اٹھ کر ٹٹھنے لگی۔“

آن سبطین شاہ کا دسواں بھی ہو چکا تھا۔ تعزیت کے لیے آنے والوں کا ابھی بھی حویلی میں رش لگا تھا۔ صبح و شام زنانے اور مردانے میں قرآن خوانی ہو رہی تھی۔ کھلیاں پڑھی جا رہی تھیں۔ مرحوم کی روح کے ایصال ثواب کے لیے زور و شور سے پڑھائی ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ دس دن سے گاؤں کے کسی گھر میں چولہا نہیں جلا تھا، پہلے تین دن تو کھانا حسین شاہ ہی نے کھجوا یا تھا۔ چھ دن سے جو حویلی کے بچھوڑے دیکھیں چڑھنا شروع ہوئی تھیں ان کا سلسلہ آج بھی جاری تھا اور روز و رات سے آنے والے والوں کا آنا بند تھا۔ آدھا خاندان تو حویلی ہی میں مقیم تھا سید سبطین شاہ خاندان کے سب سے بڑے بزرگ تھے اور پھر سارے خاندان میں ہر دل عزیز بھی اپنے ڈیوٹی تک فیصلوں سے انہوں نے کبھی خاندان کے کسی فرد کو ناراض نہیں کیا تھا۔ وہ سب کے ہمدرد تھے بظاہر اسی لیے جوان کی موت کا منتابہ اختیار روڑا چلا آتا پھر سیدہ بھی خاندان میں ہونے والے ہر چھوٹے بڑے موقع پر

ضروری شامل ہو کرتی تھیں تیسرے سارے خاندان کے آنے کی ایک وجہ وہ چہ میگوئیاں بھی تھیں جو سلطان بخت کے کھلے ذمے کروا اور شاہی کے بعد دن رات کی لڑائیوں کی تھیں جن کی کن سونیاں لینا تھیں اور اس میں بھی لوگوں کو ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑا۔

سلطان بخت نے تو خیر باپ کی موت کے صدمے کو اس طرح اوزار رکھا تھا کہ ان کا بھرم قائم رہ گیا تھا۔ سب کو ہی یقین ہو گیا کہ سلطان بخت کے لغو کرکٹ کے بارے میں افواہیں محض افواہیں ہی تھیں۔ اگر ان میں کچھ سچ بھی تھا تو وہ اب نہ رہے گا کیونکہ سلطان بخت نے باپ کی موت کے صدمے کو دل سے لگا لیا ہے اور شاہی کی ناکامی کا کچھ کچھ ثبوت سناٹ کے بے نیاز اور بیزار رویے سے مل رہا تھا۔ وہ اتنے مہمانوں کی موجودگی کے باوجود زیادہ تر وقت اپنے بیڈروم میں گزارتی تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک بار بھی سیدہ کی بیسی نظروں کی پروا نہ کی تھی۔

”لیکن میں اللہ کو کیا بتاؤں گی کہ فضل دین نے کیا حرکت کی ہے؟ اگر لالہ کو علم ہو گیا کہ فضل دین نے اسے دو تین بار گاڑی میں لٹائی تھی تو جو شہ فضل دین کا ہو گا سو ہو گا۔ میری بھی شامت آجائے گی کہ میں نے انہیں پہلی بار ہی کیوں نہ بتا دیا۔“ مگرے میں ٹٹکتے ہوئے وہ سوچے جا رہی تھی۔

بھڑکائیں میری پیاس کو اکثر تیری آنکھیں

اس نے بے اختیار ہی میں رقعہ پھر سے کھول لیا۔ پہلے ہی منسوع پر اس کے دل میں عجیب سی گدگدی ہوئی۔ ایک سستی خیر لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ ”شکل و صورت قدیمت کا بقیہ اتنا نہیں مگر حرکت کیسی گھٹیا کی ہے۔ اپنا مقام اور مرتبہ کو سوچ لیتا۔“ وہ عبدالعزیز کی شکل و صورت کو نگاہوں میں آتے ہوئے خود سے بولی۔

”محبت کب مقام اور مرتبہ کو سمجھتی ہے۔ یہ کوئی منصوبہ بندی سے تھوڑی ہوتی ہے۔ بس ہو جاتی ہے۔“ وہی گدگد اپنے والی لہر اس کے اندر کسائی۔

”اور کوئی یہ رقعہ پڑھ لیتا تو؟“ اس کے دل میں خدشے نے سرا جھانکا۔ جو ملی آتے ہی اس کا ایک خور و ننگے میں بھا بھی بیگم کے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ گل سے وہ اپنا بیگ چلے چلے تو وہی تلاش کرتی رہی تھی۔ اس میں جو سا جو تھا، صبح سا لہ شاہ سے پوچھ ہی لیا تو نہ جانے کیوں بھا بھی بیگم کے سخت تھے ہوئے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ آئی تھی۔ وہ گہری نظروں سے شہرینہ کے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔

”بھا بھی بیگم! میرا بیگ۔ شاید برسوں سے میں کالج جانا شروع کروں اور بیگم بنتے کی چھٹی لی تھی۔“ اس نے ان کی معنی خیز نگاہوں سے نظرس چرا کر پھر سے اپنا سوال دہرایا۔

”میرے کمرے میں رکھا ہے جا کر لے لو۔ شکر کرو تمہارے بھائی کے ہاتھ نہیں لگا۔“

”ایسا مطلب؟“ شہرینہ نے حیرت سے پوچھا مگر صالحہ شاہ وہاں سے جا چکی تھیں۔

”بھائی کے ہاتھ نہیں لگا یہ بھا بھی بیگم نے کیوں کہا۔“ وہ رک کر سوچنے لگی۔

”ہیں انہوں نے خود تو میرے بیگ کی تلاشی نہیں لے لی اور یہ رقعہ وہ پڑھ چکی ہوں۔“ اس کا ننھا سوال اس خدشے پر کانٹ سی اٹھا۔

”نہیں! تمہیں بھلا کیا ضرورت تھی تلاشی لینے کی۔“ اس نے بیڑا گر رقعہ کھولا اور پھر سے بے خیالی میں اشعار پڑھنے لگی۔

”ہائیں! یہ کیا لکھا ہے؟“ اچانک اس کی نظر کافذ کے دوسری طرف گونے میں پڑی۔

”کالج کے پچھلے گیٹ پر دن بارہ بجے برسوں۔“ بہت باریک لکھائی میں لکھا تھا۔ اس نے کافذ کو بالکل آنکھوں سے لگا کر پڑھا۔

”برسوں کو تو بہت دن بیت گئے توہ آیا ہو گا۔ کاش میں اس دن جا سکتی تو اس غیبت کو اس کی گھٹیا حرکت کا مزہ ضرور چکھ سکتی۔ خیر کوئی بات نہیں برسوں کالج جانا ہی ہے۔ دو چار دن کالج کے پچھلے گیٹ پر بارہ بجے جاؤں گی ضرور کسی دن تو آئے گا پھر اسے مطلب بتاؤں گی۔ ایک سید زادی سے اس طرح کے بیوہ مذاق کرنے کا۔“ وہ دل میں پلا تھک کرنے لگی۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ اچانک دروازہ کھلا اور صالحہ شاہ نے اندر بھاٹک کر کہا تو شہرینہ جیسے اچھل ہی پڑی۔ وہ تو اس وقت بالکل ہی اپنے دھیان کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ حال کے سب کروا تو اسے بیکر بھولے ہوئے تھے۔ اس نے گھبرا کر صالحہ کی طرف دیکھا جو جیسا جیسی نظروں مگر مسکراتے ہوئوں سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ شہرینہ نے بہت آہستگی سے اپنی منجھی پشت کی طرف کر لی۔ کافذ ٹٹٹٹ میں زور سے بھینچ لیا۔ اس کی یہ خفیف سی حرکت بھی صالحہ کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ انہوں نے فوراً ”نظروں کا زاویہ اس کے پیچھے جاتے ہاتھ کی طرف کر لیا۔“

”مصروف نہیں کیا؟“ وہ وقت اندر بڑھیں۔

”نہیں۔ نہیں۔ بس یوں ہی کتا میں دیکھ رہی تھی۔ پرسوں کالج جانے کا سوچ رہی ہوں۔“ اس نے تھوک نکل کر حلق کو تر کیا اور رفتے والی منجھی نکل میں دبا کر رائٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھی۔

”تکریک تو تمہارا بند بڑا ہے اور کتا میں۔“ صالحہ کا انداز بہت کچھ جتا دینے والا تھا۔ ”کچھ پریشان لگ رہی ہو؟“

”تواری طبیعت تو تھیک ہے نا۔“

اسی ہر وہی صالحہ نے اس سے پہلے تو کبھی نہیں بتاتی تھی بلکہ وہ تو سلطان بخت کی ضد میں شہرینہ سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں۔

”نہیں تو بالکل نہیں۔“ شہرینہ کرسی پر جا بیٹھی۔

”کوئی مسئلہ تو نہیں؟“ تا نہیں صالحہ اس سے کیا گلو انا چاہ رہی تھیں۔

”آپ کو مجھ سے کوئی کام تھا؟“ اس کا اتنا کھال ہو چکا تھا۔

”نہیں مجھے بھلا تم سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ تمہاری کیا جان ہی تمہیں یاد فرما رہی ہیں۔ جا کر ان کو حاضر ہی دے آؤ۔“ صالحہ لہ سے اچکا کر مزے اور باہم جاتے لگیں۔ شہرینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”پتا نہیں اب میں کون سی راہ رو رہا ہوں؟“ صالحہ نے کہا۔ ”نہیں۔ نہ سچ کی نہ بھوٹ کی نہ کھرے کی نہ کھوٹ کی۔“ پاجان بھا سے کچھ اور چاہتی ہیں لیکن کچھ اور۔ اور یہ بھا بھی بیگم ان کی تو مجھے ذرا سمجھ نہیں یہ تو بہت عجیب ہیں۔“ وہ کرسی سے سر ٹکا کر سوچنے لگی۔ ”سبٹین شاہ کی اچانک موت نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے صدمے کو کس سے شہر کرے۔“

”اور بھا بھی بیگم میری سب سے بڑی ہمدرد بقول ان کے، ان کی تو لالہ سے نہیں بنتی تو مجھ سے یہ اچانک ہمدردی۔ بات سمجھ میں نہیں آتی۔“

اور شہرینہ کو علم نہیں تھا۔ صالحہ نہ صرف اس کے بیگ کی تلاشی لے چکی تھیں بلکہ وہ رقعہ پڑھ چکی ہیں جس پر عبدالعزیز کے اشعار کے علاوہ جانے ملاقات لکھ رکھی تھی اور اس رفتے کی روشنی میں صالحہ کو ملی پر تہائی کا ایک ہم نگرانے کی منصوبہ بندی کافی حد تک کر چکی تھیں۔

محض ایک کمزور لمحے کی زد میں آ کر اپنی نظروں میں گر جانا کیا اذیت ناک کیا شرمناک ہوتا ہے۔ اس کا حال کوئی کیپٹن شہباز سے پوچھتا جو رات ایک کمزور لمحے کی زد میں آ کر اپنی ساری ضد انا بھول کر بے اختیار ہی کے دھارے میں بہ گئے تھے۔ بے اختیاری کا وہ احساس اس وقت انہیں ایک پچھو کی طرح اس رہا تھا جب وہ سو کر اٹھے تو خود سے لگا ہی ماتے شرم آ رہی تھی۔ جس بات کو دل نہ مانے اسے چھوڑو اور وہ دل کو اس بات پر قائل کر کے اٹھے تھے کہ اب جا کر ام جان سے نکل کر بات کر لی ہے کہ وہ نہ بہت کو ”فارغ“ کرنے میں ان کا ساتھ دیں۔ ان کا دل اس کی رفاقت پر نہیں مانتا انہیں اس کشمکش کے عذاب سے نجات دلا میں ورنہ وہ خود کو کچھ کر سکتے تھے۔ اتنے دن جو گھر سے دور رہے ہیں تو یہی سوچ سوچ کر بلکان ہوتے رہے ہیں کہ نہ تو ان کا دل نہ ان کا ذہن نہ بہت کو قبول کر سکتا ہے کبھی بھی تو پھر ایسے فضول میں نام ساتھ جڑے رہنے سے کیا حاصل؟

اور حاصل کیا تھا کہ ان کا خود پر اختیار ہی نہ رہا۔ اس نفس نے وجہ بنایا مو سم کی شدت کو۔ کس قدر رووی وجہ

ہے اس انا کے قلعے میں شکاف ڈالنے کی۔

ان بے ترتیب سوچوں کی وجہ سے ان سے ناشتہ بھی ہسٹنک سے نہ ہو رہا تھا جب آنکھ کھلی تو زہرت کمرے میں موجود نہ تھی مگر ان کا شعور پوری طرح سے بیدار ہو چکا تھا۔ خود پر بے تحاشا غصہ آنے لگا۔ تو بچنے والے تھے جب خود سے ایک لمبی لڑائی لڑنے کے بعد وہ تیار ہو کر ام جان سے آکر ملے تھے۔ ام جان کی خوشی دیدنی تھی تو ان کا مزاج بے حد چرخا ہوا رہا تھا۔

”اب تو ام جان سے بات کرنے کا کوئی جو از ہی نہیں رہا۔“ ڈاکٹرنگ ٹیمبل پر ان کے سامنے بیٹھے ہوئے انہوں نے بے دلی سے سوچا۔

ٹیمبل پر زہرت ہی ناشتہ سرو کر رہی تھی رات بلو کھر کے کڑھائی والے سوٹ میں اس کا نازک سر لیا اور بھی دلکش لگ رہا تھا۔ رات کے دوپٹے کے نیچے کھلے نم بال رات کی ساری کہانی کھول کر بیان کر رہے تھی۔ اگرچہ وہ خود بہت خاموش تھی مگر اس کا حلیہ سب کچھ کے لئے رہا تھا۔ ٹھہری ٹھہری اور کچھ ہشاش بشاش تھی۔

”زہرت! اب تم بھی آکر ناشتہ کرو تو نچائے زنتون بانو لے آئے گی۔“ وہ گرم گرم خوشبودار آلیٹ کی پلٹ ٹیمبل پر رکھ کر مڑنے لگی تو ام جان نے اسے بکارا۔

”آری ہوں پچھو! زنتون بانو کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے میں بس چائے لے کر آ رہی ہوں۔“ وہ بہت مدہم لہجے میں جواب دے کر مڑی۔

”تم یہ آلیٹ لونا۔“ مسز خان شہباز کی طرف متوجہ ہوئیں تو انہوں نے خاموشی سے پلیٹ اپنی طرف کھ کالی۔

زہرت نے گرم گرم چائے والی ٹیمبل کے سینٹر میں رکھی اور کپڑوں شہباز کے بالمقابل کرسی چھین کر بیٹھ گئی۔

کپڑوں شہباز نے چائے اپنے کپ میں امدلی۔ ایک پیچ جینی ملائی اور کپ ہاتھ میں لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”یہ تم کہاں چلے آئیے؟“ ام جان نے ٹوٹک۔

”میں ذرا اظہر بھائی اور بچوں سے مل لوں وہ ابھی نکلے نہیں ہوں گے۔“ انہوں نے کرسی کھسکائی۔

”پتا نہیں اس کے دلغ کا خناس کب کم ہو گا تم سے تو کوئی ایسی بات نہیں کی۔“ انہوں نے ہنکے سر کے ساتھ ناشتہ کرتی زہرت سے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ سوکھا سا کس اس کے حلق میں اٹکا۔ آنکھوں میں غمی اترنے لگی تھی۔ اس کے آتے ہی وہ اٹھ کر ٹیبل پر چلے گئے اس سے بڑی بے عزتی اور کیا ہوگی۔

اور رات رات کا فائدہ بھی عجیب تھا۔ ”ضرورت“ کی تھی وہ داستان اور تو اس فساد کے نہیں کوئی رنگ نہ تھا۔

کوئی سرگوشی، سرگوشی، کوئی پیاں نہ کوئی معذرت نہ دعائی نہ محبت نہ کوئی نہ کوئی سوال نہیں چھپے ہر طرف ”ضرورت“ ہی کی کار فرمائی تھی اور صبح جب وہ سو کر اٹھی یہ اس کا پہلا احساس تھا اور اب تک یہ احساس اس کے دلغ سے کسی چونک کی طرح چھینا ہوا تھا کہ اسے شخص ”ضرورت کی تکمیل“ کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ زہرت تو رات کے آخری پہر میں نہیں تھی نہیں جس جسم ہی جسم تھا جس کی ”ضرورت“ تھی اور زہرت کا صبح سے ہی چاہ رہا تھا۔ اپنے جسم پر پہنچول چھڑک کر خود کو آگ لگانے کے لیے اس جسم کو راکھ کر دے۔

”تم ناشتہ تو ٹھیک سے کرو۔“ ام جان کی آواز سے پھر سے ناشتے کی میز پر لے آئی۔ وہ پلیٹ آگے رکھے ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر مسز خان کو دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر چائے والی اٹھائی۔

”میرا ناشتہ کوئی نہیں چاہ رہا بس چائے لوں گی۔“ کہہ کر اس نے چائے کپ میں نکالی۔ مسز خان نے ایک دکھ بھری نظر سے اسے دیکھا۔

”ام جان! یہ معاذ کو کیا کھر والوں نے مفت کا ملازم سمجھ لیا ہے۔ میں وہ بہت سے دیکھ رہا ہوں وہ جب سے کالج سے آیا ہے سب اسے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے دوڑاتے جا رہے ہیں۔ عالیہ بھابھی اور فائزہ بھابھی کے کام ہی تمام نہیں ہو رہے۔ میرے خیال سے تو اس نے ڈھنگ سے کھانا بھی نہیں کھایا اگر ابھی۔ رات کے کھانے پر

بھی وہ عتاب تھا۔“ کپڑوں شہباز حلقی سے مسز خان کے کمرے میں آکر بولے۔

”میں کیا کہہ سکتی ہوں ایک دو بار میں نے معاذ کو ٹوکا عالیہ اور فائزہ کو بھی بھاڑنے کی کوشش کی مگر معاذ نے مجھے روک دیا کہ اگر میں گھر کے چھوٹے موم نے کام نہیں کروں گا تو مجھے لگے گا میں اوہر منت کی روٹیاں توڑ رہا ہوں۔ آپ پلیز گھر والوں سے کچھ نہ کہیں اگر میں یہ چھوٹے چھوٹے کام کر رہا ہوں تو کسی پر انسان تو نہیں کرتا۔

کیا یہ میرا گھر نہیں اگر آپ مجھے غیر سمجھتی ہیں تو پھر بے شک انہیں روک میں پھر میں اوہر نہیں رہوں گا۔“ مسز خان نے ہنکے بے چارگی سے کہا۔

”ام جان! یہ سب ایک حد تک تو ٹھیک ہے مگر اس طرح ذرا ذرا سے کاموں کے لیے اسے بھگانا اس طرح تو اس کی اسٹریز متاثر ہوگی وہ اوہر محض اپنی تعلیم کے لیے رہ رہا ہے۔ بہر حال آپ اپنی بسوئوں کو سمجھائیں ورنہ میں خود ان سے بات کروں گا۔“ وہ حلقی سے بولے۔

”میں نے سوچا تھا تم کچھ زیادہ دل کی چھٹی لے کر آؤ گے تو زہرت کو اپنے ساتھ کھلا لائے مہو مہو بھی آج کل اچھا ہو رہا ہے پھر تو سہوی شروع ہو جائے گی۔ تم چھٹی دو چار دن اور بڑھو نہیں سکتے۔“

”ام جان! میرے انگرام ہونے والے ہیں ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے اس لیے چھٹی نہیں مل سکتی۔“ وہ کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے۔

”اچھا تو امتحانوں کے بعد چھٹی ملے لیتا۔“ وہ اصرار سے بولیں۔ شہباز نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”نکل ذرا ٹیکسٹی کا تو پیکر لگا آؤ اور ساتھ ہی جو ہمارا نیا شی پلازہ بنا ہے اس کے تینوں فلور زپر تو شاپس اور شورومز ہیں اور تینوں ہی بک ہو چکے ہیں۔ اب میں اگھر سے کہہ رہی تھی کہ فوراً فلور پر جو فلیٹس بن رہے ہیں کیا خیال ہے ان ہی مالکانہ حقوق پر نہ وہ فلیٹس لیتا بھی انہیں شورومز کے اور دکانوں کے مالک چاہ رہے ہیں۔“

”میں آپ کو ایسی لہجہ کی ضرورت آن پڑی۔ جیسے دکانیں اور شورومز نہ بنٹ پر وے رکھے ہیں اسی طرح فلیٹس کی ڈسٹ بن رہی ہے۔“

”ہاں میں نے بھی اظہر کو یہی مشورہ دیا تھا کہ کل کو اگر پلازہ سیل کرنا پڑ جائے تو پھر مشکل ہوگی۔ بہر حال تم ایک دفعہ اوہر جا کر وزٹ کر آؤ۔ بس دو چار ہفتوں میں اوہر کام مکمل ہونے والا ہے۔“

”تو آؤں گا“ آج تو سارا دن وہ سٹوں سے ملنے ہی میں گزر گیا۔ اب تو بہت تھکاوٹ ہو رہی ہے آپ بھی اب آرام کریں۔“ انہوں نے حلقی روکی اور کمرے سے جانے لگے۔

”شہباز! میں نے ایک بات مانو گے۔“ وہ پیچھے سے نرم لہجے میں بولیں تو ان کے جاتے قدم رک گئے۔

”جی بولیں ام جان! میں نے کبھی آپ کی کسی بات سے انکار کیا ہے؟“ وہ پاس آکر نرمی سے بولے۔

”جی ہاں اور گزرا آپھی چیز ہے اور اللہ کی پسندیدہ بھی۔ اپنے دل کو ڈرا اور وسیع کر لو تو زندگی بہت سسل ہو جائے گی تمہاری بھی اور تم سے منسلک وہ سرے لوگوں کی بھی۔“ وہ ان کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے مدہم لہجے میں بولیں۔

”کو شش۔“ انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”ام جان! میں اس سلسلے میں صرف کوشش کر سکتا ہوں تو مفت اللہ دینے والا ہے دعا کریں مجھ سے میرے وجود سے کبھی کسی کو کوئی ضرر نہ پہنچے شب بخیر۔“

معاذ پھر ریٹ روم میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔

”ابھی بات سے تمہارے کمرے کی لائٹ ٹھیک نہیں ہوئی۔“ وہ کچھ بیزاری سے بولے۔

”نہیں بھائی! وہ ٹیکنیشن کہہ رہا تھا۔ بورڈ کے اندر کوئی فالٹ ہے کل دن میں آکر ٹھیک کروں گا۔ آپ آئیں، بیٹھیں۔“ وہ بیڈ پر اپنے قریب کتابیں اٹھا کر جگہ بنا تے ہوئے بولا۔

”تو ٹھیکس“ مجھے نیند آ رہی ہے دن بھر ذرا ریٹ نہیں کیا تم بڑھو۔“ وہ مڑے۔ ”اور ہاں! اپنی توتیہ صرف بڑھنے کی طرف لگاؤ یہ چھوٹے چھوٹے گھر کے کاموں میں اپنی توانائی کو برباد مت کرو۔ تم اگر کام سے انکار کرو تو کوئی تم سے جت نہیں کر سکتا اور یہ تمہاری ذمہ داری ہے بھی نہیں آئندہ میں تمہیں صرف اور صرف پڑھتے

ہوئے نہ کھانا چاہتا ہوں " ایڈرا شیڈ۔ "وہ اس کے پاس کھڑے کچھ سخت لہجے میں بولے۔
 "جی بھائی! وہ سر جھٹکا کر آہستگی سے بولا۔

"اوکے شب بخیر۔" کہہ کر وہ اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئے۔

کمرے میں زیرو کے بلب کی روشنی چمکی ہوئی تھی۔ نہت کھل کی طرح بیڈ کے ایک جانب سر تک کھیل اوزھے سو رہی تھی یا شاید جاگ رہی ہو۔ وہ جاگ ر صونے پر دراز ہو گئے۔ آج صبح ناشتے کے بعد جو وہ کمرے سے نکلے تو ابھی کچھ دیر پہلے ہی لوٹے تھے۔ وہ پہر کا کھانا اور رات کا ڈنر بھی دو سنتوں کے ساتھ ہی کیا تھا۔

"ٹائم بھی تو بہت ہو گیا ہے۔" بارہ بجتے کو تھے، ان کی آنکھوں میں غیند آنے لگی اور ساتھ ہی پچھلی شب کا آخری پہر بھی جس پر نہامت کے احساس نے انہیں سارا دن نہت کی شکل نہ دیکھنے دی۔ یہ ضد کی اتالی تھی جس نے ایک جائز نعمت کو ان کے لیے ممنوع بنا رکھا تھا۔

"نعمت میں اتنا ہے تو ضد اس میں بھی ہے۔ یہ خود سے مجھے نہیں بلا سکتی۔" کوٹ بدل کر انہوں نے کھیل میں پیشی نہت کو دیکھا۔

"وہ تو تمہیں اول دن سے بلا رہی ہے، معافیاں مانگ رہی ہے اور کیا کرے۔" دل تو پہلے دن سے اس کے حق میں تھا مورا بولا۔

اور مجھے اس کی صورت دیکھتے ہی بے وقعتی کا احساس زیادہ ہونے لگتا ہے۔ جب ہی نفرت گھیراؤ کرنے لگتی ہے اس لیے بہتر ہے میں اس کی شکل ہی نہ دیکھوں جیسے آج کا دن اچھا گزارا۔ بس کل کا دن ہے پرسوں صبح تو نکل ہی جاتا ہے یا شاید کل شام کو۔ کل شہی پلازہ جاؤں گا اور ام جان کے کمرے سے ملنا ہے اور۔۔۔" وہ کل کی مصروفیات ترتیب دیتے دیتے نہ جانے کب غیند کی واوی میں اتر گئے۔

اور رات کے آخری پہر پھر اسی شدت کی سردی نے انہیں غیند سے پرور کر دیا۔ وہ اپنے اپنے کھنوں میں جکڑے اور ٹانگیں سینے سے لگائے صوفے پر بڑے تھے۔ سردی کے احساس نے کل کی طرح آج بھی انہیں زیادہ سوچ بچار کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اس وقت بھی ضرورت صرف اور صرف گرم ستر کی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ بیڈ پر جا لیٹے۔ ہاتھ بڑھا کر کھیل کھینچا چند لمحوں میں ہی گرم کھیل کی حرارت نے ان کے جسم کو سکون بخشا، جسم کے گرم ہوتے ہی اس کی ضرورت میں بھی جاگ اٹھیں۔

اور پاس لیٹا ناہم خوابیدہ جسم پھر سے ایک "ضرورت" کا عنوان بن گیا۔ انہیں پچھلی نہیں چلا کہ "ضرورت" کبھی اپنے استعمال پر دیا بھی کرتی ہے۔ ان کی بانہوں کے حصار میں بے حس بڑی نہت چپکے چپکے رو رہی تھی۔ آنسو قطرہ قطرہ اس کے کانوں کی اوستے ہوتے ہوئے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

"شاہ جی اور کتنا بڑیا تمہیں گے۔ آخر میں کب تک آپ کی بانہوں کی قید میں جکڑی رہوں گی، بس میں گاؤں آ رہی ہوں آج ہی۔ آخر آپ کے بابا جان میرے بھی تو کچھ لگتے تھے۔ آخر کب تک اس تعلق کو آپ کسی کنواہ کی طرح چھپائیں گے یہی تو موقع ہے جب سب کو میری حیثیت کا اور آپ کی محبت کا علم ہو جائے تو اچھا ہے۔" نین تارا ان اسٹاپ بول رہی تھی۔

سلطان نہت والی کمرے میں تعزیت کے لیے آئے والوں کے پاس سو گوار چہرہ بناتے بیٹھے تھے، جب ان کے موبائل کی آواز آئی تھی۔ اسکرین پر نین تارا کا نمبر دیکھتے ہی وہ حاضرین سے معذرت کرتے ہوئے کمرے کے کونے میں چلے آئے تھے۔

"تم بات کو اور پوزیشن کو سمجھتی ہو۔ اس وقت حالات اوھر کس قدر نازک ہیں میں تمہیں کیسے بتاؤں اور میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ ابھی چند دن مجھے فون مت کرنا اور تم آنے کی بات کر رہی ہو۔" انہیں اس پر شدید غصہ آ رہا تھا، جھٹکا کر بولے۔

"تمہاری ماں کا ہی مطالبہ تھا یہ پروا دیاں۔" وہ چاچا کرہ ہم لہجے میں بولے۔

"تو اب میری ماں اس مطالبے سے مستبردار ہو جاتی ہے، بس آپ مجھے اوھر آنے کی اجازت دیں تو میں۔۔۔" نین تارا افسانہ گڑھ سیک۔ میں پہلے ہی نہت پریشان ہوں، مجھے اور زوجہ مت کرو اور ضروری نہیں میری زندگی کے سارے رنگ تمہاری ماں کے مطالبوں کے مطابق طے ہوں۔ میری اپنی بھی کچھ مجبوریوں ہیں، میں صرف تمہارا شوہر ہی نہیں۔ اوھر ایک پورا خاندان ایک پورا علاقہ میری ذمہ داری بن گیا ہے اور مجھے سب طرف نظر رکھنی ہے۔ اب یہاں تم نے اتنا صبر کیا ہے وہاں صرف دو چار دن اور۔ کل چالیسواں ہے۔ اس کے بعد میں ایک روز ہی میں ضرور تمہاری طرف چلے گاؤں گا۔ اب تم فون نہ کرو۔"

"آخر اس بار کو گلے میں ڈالنے کی ضرورت کیا تھی۔ نین تارا کو یوں بھی اپنے بستر کی زینت بنایا جا سکتا تھا۔ سلطان نہت تمہاری جلد بازیاں ایک دن تمہیں بریاد کریں گی۔" وہ دل ہی دل میں غصہ کو کوس بھی رہے تھے۔ "پھر وہی بہلاؤ سس۔" وہ جوایا "ترخ کر بولی۔" میں تنگ آچکی ہوں میں۔ میں گاؤں آ رہی ہوں۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"نین تارا! آریڈ ناؤ۔ اس وقت مجھے باکل مت کرو میں تمہیں رات کو فون کروں گا، خدا حافظ۔" "شاہ جی! آپ کا فون ہے۔" چند منٹوں بعد ایک ملازم نے آکر انہیں اطلاع دی تو انہوں نے ملازم کو گھور کر دیکھا اور پھر سب سے معذرت کر کے اٹھ گئے۔

"کس قدر احمق عورت ہے۔ پھر سلطان نہت! یہ تو طے ہے کہ قدرت نے نہانے بھری کی احمق اور چند عورتیں تمہارے نصیب میں لکھ رکھی ہیں۔ کیا نین تارا۔ کیا صالحہ بن گیا۔" وہ بڑھکتے ہوئے اس کمرے سے نکل کر رات کو فون میں آئے فون میٹ کارپینیور سائیڈ پر دھرا تھا۔ انہوں نے بیزارگی سے دیکھا اور اٹھایا۔ ان کا ارادہ نین تارا کو سخت ستانے کا تھا۔

"بھلا۔" وہ کھٹکے اور اس میں غرات۔ "نین تارا! سلطان نہت! السلام و حکم میں رہنے شاہ جی کا لیکل ایڈوائزر برابر احمدیات کر رہا ہوں۔" وہ دوسری طرف کی آواز سن کر خشک سے گئے۔

"جی جی۔۔۔ میں نے پہچان لیا ہے، کبھی کیسے حال ہیں آپ کے۔" "شکر ہے اللہ کا، آپ سنا میں کبھی طبیعت ہے آپ کی۔ ہمیشہ بڑے شاہ جی سے بات ہوتی تھی تو اب ان کے بغیر سب بہت عجیب لگ رہا ہے۔" وہ سحر سحر کر بول رہے تھے۔ "جی بالکل درست قرار ہے ہیں آپ ان کے بغیر تو سب ہی کچھ بدالہ لاسالگ رہا ہے۔" وہ لہجے کو افسردہ بناتے ہوئے بولے۔

"بس ہم لوگوں کی زندگی ہی کچھ ایسی مصروف ہوتی ہے کہ پہلی دفعہ کے بعد کوشش کے باوجود چکڑی نہیں لگا سکتا۔" وہ معذرت خواہ لہجے میں بولے۔

"میں نے ابھی اس لیے فون کیا ہے آپ کو کہ کل چٹلم کے بعد میں آپ کا کچھ ٹائم لینا چاہوں گا۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کیوں۔"

ان کی بات پر سلطان نہت کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ "جی! وہی! سے بولے۔"

"اصل میں کل آپ کے خاندان کے پیوہ پیوہ افراد تو ہوں گے اور میں کل بڑے شاہ جی کا وصیت نامہ آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس موقع پر سب کو ان کی وصیت کی خبر ہو جائے اور باقی جو بھی قانونی کارروائی ہو تو وہ آپ کے مشورے اور حکم سے میں عمل کر سکوں۔"

"جی ضرور تمہیں نہیں اچھا ہے سب لوگوں کی موجودگی ہی میں وصیت نامہ پڑھ کر بتایا جائے۔ ویسے کیا بابا جان جانے سے پہلے وصیت نامہ لکھوا گئے تھے۔" وہ دراز کر بولے۔

”جی وصیت نامہ تو انہوں نے کوئی سال بھر پہلے سے لکھوا رکھا تھا مگر اس میں کچھ ترامیم دوتین ہفتے پہلے کروائی تھیں انہوں نے آپ کی شادی کے فوراً بعد۔ ان ہی ترامیم کی وجہ سے میں یہ وصیت نامہ سب کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں۔“ ان کی بات پر سلطان بخت کا دل جیسے کسی بھتور میں آگیا۔

”یسی ترامیم۔“ وہ ہنسی کر کے۔
 ”یہ تو اب کل ہی آپ کو پتا چل سکیں گی۔ اوکے پھر مجھے اجازت دیں میں انشاء اللہ کل دوپہر کے بعد حاضر ہو جاؤں گا“ خدا حافظ۔“

”لالہ! آپ ادھر اکیلے بیٹھے ہیں۔“ شہزادہ کی آواز پر وہ چونک اٹھے۔
 ”کانچ تو جا رہی ہونا اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں۔“ وہ اٹھنے کا ارادہ ملتوی کر کے پھر سے بیٹھ گئے۔
 ”جی بالکل ٹھیک۔“ وہ انہیں چپ چپ سی لگی۔
 ”سلطان بخت! شہزادہ اب کے بعد تمہارے حوالے ہے۔“ انہیں سلطان شاہ کی آخری التجا یاد آئی تو بے اختیار بسن پر پیار آگیا۔

”چپ چپ کیوں ہو گڑیا! کوئی مسئلہ ہے تو مجھ سے کہو میں ہوں نا۔“
 ”کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں بسن بھائی میں۔“ صالحہ اچانک ہی داخل ہوئیں۔ شہزادہ نے گڑبگڑ کر انہیں دیکھا۔
 سلطان بخت کے ماتھے پر البتہ بہت سی شکنیں نمودار ہوئیں مگر انہوں نے جواب نہیں دیا۔
 ”آئیں بھائی بیگم! کچھ خاص بات تو نہیں ہو رہی تھی۔“ شہزادہ کی سکرابٹ کے ساتھ بولی۔
 ”خاص ہی ہوئی جو یوں اکیلے ہی میٹنگ ہو رہی ہے۔“ وہ سامنے بیٹھ گئیں۔

”وہ بس میں البتہ کہہ رہی تھی۔ کانچ گاؤں سے خاصا دور ہے گاؤں میں بھی روز آتے جاتے میں دوڑھاتی کھینٹ لگ جاتے ہیں اس قدر تھکاوٹ ہو جاتی ہے کہ پھر پڑھا نہیں جا سکتا۔ لالہ! مجھے ہاسٹل میں داخل کروادیں تو اچھا ہے۔“ وہ ذرا انگ انگ کر بھائی کی شکل دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیوں نہیں بالکل صحیح بات ہے۔ تمہارے لالہ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ آخر تمہیں پڑھنا بھی تو ہے خوب ڈھیر سارا۔ اس خاندان کا نام روشن کرنا ہے کیوں شادی۔“ ان کا انداز مستحزانه تھا۔ سلطان بخت نے انہیں گھور کر دیکھا۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا شہزادہ! کانچ سے اگر گھنٹہ دو گھنٹہ آرام کر لیا کرو مگر ہاسٹل میں نہیں۔“
 ”پلیز لالہ!“ وہ ملتی انداز میں بولی۔

”اس وقت مجھے تنگ مت کرو کل چم ہو جائے پھر اس مسئلے پر بات کریں گے باہر لوگ بیٹھے ہیں انتظار کر رہے ہوں گے۔“

وہ اپنی شال جھٹک کر باہر نکل گئے، حقیقتاً ”ان کا دل بیرسٹر صاحب کی ”ترامیم“ میں اٹکا ہوا تھا کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا اور کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”تم فکر نہ کرو شہزادی! میں تمہارے لالہ سے سفارش کروں گی کہ تمہیں ہاسٹل میں داخلہ لے دیں تم ذرا فکر نہ کرو کسی بھی بارے میں۔ دیکھنا تم میں تمہاری راہ کے سارے کانٹے کیسے دور کرتی ہوں۔“

صالحہ نے اس کے قریب آ کر اسے تسلی دی تو شہزادہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔
 صالحہ کے چہرے پر وہی پر اسرار سی سکرابٹ کھیل رہی تھی۔ شہزادہ کو ذرا خوف سا محسوس ہوا اس کے کندھے پر صالحہ کے ہاتھ کا دباؤ پڑھتا جا رہا تھا اور چہرے کی سکرابٹ بھی۔

شہزادہ نے ایک جھٹکے سے اپنا کندھا ان سے چھڑایا اور ہاگ کر باہر نکل گئی تو صالحہ خود بخود زور سے ہنسنے لگیں۔
 ”جی۔۔۔ معصوم لڑکی۔“ وہ اب بھی ہنس رہی تھیں بے وجہ۔

”ویسے تو سلطان شاہ صاحب مرحوم اللہ ان کی مغفرت فرمائے انہوں نے تقریباً ”سال“ بھر پہلے ہی وصیت نامہ لکھوا رکھا تھا اور اس میں کوئی بھی انوکھی بات نہیں لکھوائی تھی، اسلام کے موروثی قوانین کے عین مطابق۔ پر اپنی کا آوا خاصہ سید سلطان بخت کے نام اور اس کا نصف دونوں صاحبزادیوں سیدہ بتول بی بی اور سیدہ شہزادہ بی بی کے نام ہے۔ سید سلطان بخت ان کی منقولہ وغیر منقولہ جائیداد کے تمام وارث ہیں۔ سیدہ بی بی کا حصہ انہیں اس کارروائی کے بعد ان کو منتقل کر دیا جائے گا اور چھوٹی صاحبزادی شہزادہ بی بی کا حصہ ان کی شادی تک سلطان بخت کے زیر انتظام ان کی تحویل میں رہے گا۔ صاحبزادی کی شادی ہو کہ شاہ صاحب کی وصیت کے مطابق خاندان میں ہی ہونی چاہیے اگر ان کی شادی غیر سید گھرانے میں ہوئی تو پھر انہیں اپنے حصے سے محروم ہونا پڑے گا۔ شادی پر صاحبزادی کا حصہ ان کو برا سفر کر دیا جائے گا۔ یہاں تک تو وصیت میں کوئی تردید کی نہیں۔“

بیرسٹر صاحب کی باتیں سلطان بخت کے اندر کے شاہ بی کو خوب پھلا رہی تھیں۔ ان دیکھی خوشی کی لہر تھی جو اندر ہی اندر اترتی جا رہی تھی۔ حسین شاہ کے چہرے پر حسی اور کچھ کچھ کوہنٹ کے آثار تھے۔ حسین شاہ کا بیٹا جو اس کی دین تھا بولہ سترہ سال کا لالہ بی بی کو جوان۔ اسے بیرسٹر صاحب کی گفتگو بالکل بے مزہ محسوس ہو رہی تھی۔ خاندان کے دو تین بچے برنگ بھی محفل میں موجود تھے۔

”اس میٹنگ کے بعد کچھ ضروری کاغذی کارروائی ہے جس کے بعد کل شام تک تمام بیچر زپر سلطان بخت کے دستخط ہو جائیں گے تو پر اپنی قانونی طور پر ان کے نام منتقل ہو جائے گی البتہ۔“

انہوں نے بیچر ز سے سرائیا اور ایک کراٹھاس لیتے ہوئے حاضرین کی طرف دیکھا۔
 ”جج پر جانے سے پہلے ایک رات بڑے شاہ بی میرے پاس آئے تھے اور انہوں نے اس وصیت نامے میں کچھ ترامیم کروائی تھیں جس سے سلطان بخت کے لیے اپنے اختیار استعمال کرنے میں کچھ مشکل تو ہوگی لیکن میرا خیال ہے ایسی کوئی شخص کی بات بھی نہیں۔“ کراٹھاسی معاملہ ہے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“

بیرسٹر صاحب کے جتنی نے سلطان بخت کو کچھ پریشان کر دیا تھا اور باقیوں کو بے چین۔

”اصل میں سید سلطان بخت کی زوجہ محترمہ سیدہ صالحہ شاہ کو بڑے شاہ بی نے آٹھ بیس سال تک ہر معاملے میں ان کا حصہ وار قرار دیا ہے۔ سلطان بخت کوئی بھی پر اپنی یا کوئی اور چیز جس کی مالیت ایک لاکھ روپے سے زیادہ ہوئی نہ تو صرف اپنے دستخط شدہ چیک کے ذریعے خرید سکتے ہیں نہ بیچ سکتے ہیں۔ اس کے لیے ان کے چیک پر ان کی دستخط شدہ شاہ کے سائن ہونا لازماً ضروری ہوں گے جس کے بغیر چیک لیش ہو گا نہ کوئی کریڈٹ کارڈ بھی Valid ہوگا۔ سید سلطان بخت کے دستخط کے بغیر ان کے تمام سائن کام نہیں کر سکیں گے اور سلطان بخت پر یہ پابندی صرف بیس سال تک ہے، بیس سال بعد وہ اس شرط سے آزاد ہوں گے اور صرف اپنے دستخط سے ہی سارا کام چل سکتا ہے۔“

”اس کی وجہ شاہ بی نے یہ لکھوائی ہے کہ جو تک سلطان بخت تمہوڑے جذباتی ہیں اور کچھ شاہ خرچ بھی۔ کسی کی بدو کا معاملہ ہو یا برنس کنسرن کا۔ اکثر بہت گہرائی میں جائے بغیر فیصلہ کر لیتے ہیں جو کہ سوہنہ نہیں ہوتا اس لیے ان کی مشاورت اور پر اپنی کے تقلم و تسق کو بہتر انداز میں بیان کرنے کے لیے ان کی مسز کو ان کا شریک کار بنایا گیا ہے اور بڑے شاہ بی کا خیال تھا کہ سلطان بخت کو ان کا یہ اقدام ناگوار نہیں گزرے گا۔ بس یہی بنیادی ترامیم تھی۔ اب جیسے ہی تمام پر اپنی سلطان بخت کے نام ترا سفر ہوئی ہے یہ شرط بھی اٹا گو ہو جائے گی اور خدا نخواستہ مسز سلطان بخت اگر حیات نہیں رہیں تو یہ حق بڑی صاحبزادی سیدہ بتول کو تقویاً ہی کر دیا جائے گا بیس سال تک اور خدا نخواستہ ان دونوں کی اگر ملحدی ہو جاتی ہے تو بھی یہ شرط موہو رہے گی۔ امید ہے سب کو بات سمجھ میں آئی ہوگی۔“

”البتہ سلطان بخت اپنا ذاتی اکاؤنٹ اپنی مرضی سے استعمال کرنے کا حق رکھتے ہیں۔“ بیرسٹر صاحب نے فائل بند کرتے ہوئے آخری سطر پر رسمی اور سب کے چہروں کی طرف دیکھا۔

"یہ فائل میں شاہ صاحب! آپ کی اسٹڈی کے لیے جھوٹے جاہلوں میں اگر کوئی نقطہ یا پوائنٹ کلینڈر ہو تو آپ کل صبح تک مجھے انفارم کر سکتے ہیں کیونکہ کل شام تک تمام کانڈی کارروائی قانونی طور پر مکمل کر لی جائے گی۔ آپ کے سائن جہاں ضروری ہیں وہ اسپاٹس میں لے جاؤں گے۔"

انہوں نے فائل سلطان بخت کی طرف بڑھائی۔ سلطان بخت نے فائل لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ وہ چند لمحے پر شہ صاحب کو کھورتے رہے پھر اٹھ کر کھڑے ہوئے۔
"آپ فائل چھوڑ جائیے گا مجھے ایک ضروری کام سے ابھی جانا ہے" ایک کیوڑی۔
انہوں نے بہت مشکل سے یہ دیکھ لیا کہ وہ جتنے ادا کیے۔ ان کی زبان لڑکھڑائی تھی۔ غصے اور رنج کے طے طے جذبات نے ان کا چہرہ تاریک کر دیا تھا۔ اگلے ہی لمحے تیز تیز قدم اٹھاتے وہ بال کمرے سے باہر نکل گئے۔ سب لوگ کچھ تعجب سے انہیں جاتے دیکھتے رہے۔ حسین شاہ کو البتہ کوئی تعجب نہیں تھا۔ ان کے چہرے پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ کچھ ایسی ہی کیفیت سالہ شاہ کی بھی تھی۔ سیدہ البتہ مضطرب و بے چین ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر یونہی کھڑی ہاتھ مسکتی رہیں پھر وہ دہلی دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ انہیں سلطان بخت کی گاڑی اشارت ہونے کی آواز آئی تھی۔ وہ بے چینی سے باہر کی طرف لپکیں۔

جس تیزی سے سلطان بخت نے گاڑی ریورس کی تھی اس سے گاڑیوں کی رگڑ بولنے کے اندر تک گونجی تھی۔ دریاں نے دوڑ کر جوڑی کا آہنی گیٹ وا کر دیا۔ سلطان بخت کی بی ایم ڈبلیو کا ایک طوفان جیسے چھوڑ کر کوئی کی رفتار سے گیٹ سے نکلی تھی۔ گاڑیوں کی پٹی پگڈنڈی پر بھی انہوں نے ہتھ مارا۔ ان کی کھینچوں میں شام کے آخری کام نمٹانے کے سائوں نے کچھ حیرت سے اپنے ہاتھ روک کر اتنی اسپینڈر کے جاتی گاڑی کو دیکھا۔

اور سلطان بخت کو تو کچھ ہوش نہیں تھا۔ تم اور غصے نے ان کے سونے بچھنے کی تمام صلاحیتیں جیسے مجھد کر دی تھیں۔ اسٹیمنگ کو انہوں نے اتنی زور سے اپنی آہنی انگلیوں میں سمیٹ کر رکھا تھا
"بابا جان۔۔۔ بابا جان! تو آخر آپ نے اپنا انتقام لے ہی لیا۔ ابی جی کے کھر کو بچانے کی خاطر آپ نے میری زندگی سے ہر خوشی کو کوچ پھینکا" آپ کا کیا خیال ہے اس طرح سے میں آپ کی تمام نیک خواہشات کو پورا کر دوں گا کبھی نہیں کبھی نہیں۔"

انہوں نے اسٹیرنگ وہیل پر دوبارہ کے مارے اور وہیل کو اس تیزی سے گھمایا کہ گاڑی دائیں بائیں پوری طرح سے ڈولنے لگی۔ ان کا دماغ ٹپک رہا تھا اگر بابا جان اپنی زندگی میں یہ کام کرتے اور مجھے خبر ہو جاتی تو خدا کی قسم آج سے بہت دن پہلے ان کا چالیسواں ہو چکا ہوتا۔
انہوں نے کچھ سے ٹانگ ہٹا کر سامنے زوردار ٹھوکری ماری۔

"ایسی فقیرانہ زندگی سے بدرجہا بہتر تو موت ہو گی۔ اس سکار اور قابل نفرت عورت کے آگے میں ساری زندگی بھیک مانگتا رہوں اور وہ میری خوشیوں کی قاتلہ اپنی مبینہ فطرت کے ہوتے مجھے بھیک نہ دے کی۔ بابا جان! کاش آپ کی جگہ مجھے موت آگئی ہوتی یا میں نے سالہ شاہ کا پینڈا اپنے گلے میں ڈالا ہوتا۔ ہونا یا بہت پہلے میں اس جوڑی کو آگ لگا چکا ہوتا۔"

غصے سے وہ لوٹ پلٹا نگ بائیں سوچے جا رہے تھے۔ گاڑی اب مین روڈ پر بہت اسپینڈر سے دوڑ رہی تھی۔ جب ان کی بی ایم ڈبلیو "کل کدہ" کے گیٹ کے اندر داخل ہوئی تو شہر کی روشنیاں جل چکی تھیں۔ اگرچہ ان کے اپنے اندر بالکل اندھیرا تھا۔ "کل کدہ" کا گیٹ کھلا ہی تھا۔ مین مارا کی گاڑی ابھی چند لمحوں پہلے اندر داخل ہوئی تھی۔ سلطان بخت نے اپنی گاڑی گیٹ کے پٹیوں سے کھڑی کر دی۔ مین مارا نے گاڑی سے نکلنے ہی مڑ کر سلطان بخت کی گاڑی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ مکمل سا لیا۔ وہ تقریباً "وہ ڈیڑھی ہوئی ان کی گاڑی تک آئی۔"

"شاہ جی! آپ۔۔۔ آئی آپ کو میری یاد؟" سلطان بخت نے دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا تھا۔ خود اسی طرح ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے تھے۔ مین مارا ذرا سا اندر ہو کر خوشی اور شکایت سے بولی۔

"میں مارا کم ان سپاٹس۔" سلطان بخت نے سنجیدگی سے سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔
"ابھی شاہ جی! وہ کب سے بولی۔"

"ابھی اور اسی وقت۔" وہ ہنوز سنجیدہ تھے۔ وہ توں ہاتھ اسٹیرنگ وہیل پر جمار کھے تھے
"کہاں جانا ہے؟" وہ دروازہ کھلا کر کھڑی تھی۔
"تم اندر آ کر بیٹھو تمہیں پتا چل جائے گا۔" انہوں نے ہاتھ بڑھا کر دروازے پر رکھا اس کا ہاتھ اپنی طرف کھینچا۔

"میں مام کو تو بتا آؤں۔" وہ ہچکچا کر رہی۔
"یہ سارے ملازم اندھے ہیں بتا دیں گے۔ نہیں تو تم ادھر آ کر خون کر لو مگر اب مزید دیر مت کرو" آؤں۔"
انہوں نے اسے جھٹکے سے اوپر کھینچ کر تقریباً "اپنے اوپر کر لیا۔ مین مارا جلدی سے سیدھی ہو کر سیٹ پر بیٹھ گئی اور گاڑی کا کھلا دروازہ بند کرنے لگی۔ سلطان بخت نے گاڑی اشارت کر دی۔ مین مارا اپنے چہرے پر آنے والے ہٹانے لگی۔ اسکا ریٹ ریڈ شرٹ اور بلیک اسکن ٹائٹ ٹراؤزر میں اس کا نازک جسم بہت نمایاں ہو رہا تھا۔ سلطان بخت نے گاڑی بائیں طرف موڑتے ہوئے ایک ترچھی نظر اس کے قاتل سراپے پر ڈالی تو ایک پل کو انہیں کچھ دیر پہلے کی ساری کیفیت ساری ذلت محو ہو گئی۔

"کیا بات ہے شاہ جی! موڈ بڑا اچھا لگ رہا ہے۔" مین مارا نے اپنے بریسلٹ کا الاک ڈرائیونگ کرتے ہوئے سلطان بخت کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"ہوں! سلطان بخت کا دھیان اب ٹریفک کی طرف تھا جہاں گاڑیوں کا اثر وہاں دوڑ رہا تھا۔
"جانا کہاں ہے؟" وہ ہاتھ بڑھا کر۔ کبھی چیک کرنے لگی۔ سلطان بخت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

تو وہ روٹن کر گیا۔
چند منٹ بعد ان کے جواب پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا گاڑی "سیدہ ہاؤس" کے گیٹ کے آگے کھڑی تھی۔ ان کی پسلی آواز پر ہی چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔
"آپ کم از کم آنے کی اطلاع تو کر دیتے۔ میں شاپنگ کے لیے گئی تھی۔ راستے میں موڈ نہ بنا اس لیے جلدی واپس آگئی۔ شاید دل کو آپ کے آنے کی خبر ہو گئی تھی۔"

بیڈروم میں داخل ہو کر مین مارا بولی۔ سلطان بخت نے کوئی جواب نہ دیا۔
"میں ذرا فریش ہو سکے گا۔ آج۔۔۔" رت جگا "منامیں گے۔"

سلطان بخت نے جھک کر جوتے اتارے اور واش روم کی طرف جاتے ہوئے فون مانی انداز میں کہا تو ڈور تک پہنچنے کے آگے کھڑی ایٹا جائزہ لیتی مین مارا نے ذرا چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ اندر جا چکے تھے۔ مین مارا کے لبوں پر دلکشی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے آئینے میں دیکھ کر اپنا میک اپ درست کرنا شروع کیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ باہر آئے تو ان کا موڈ کافی حد تک بحال ہو چکا تھا۔ گنگناٹے ہوئے وہ کمرے کے بغلی حصے کی طرف بڑھے جسے ڈورک کے ایک خوبصورت سیٹ کے ذریعے بیڈروم سے علیحدہ کیا گیا تھا۔ مین مارا نے لپ اسٹک کا آخری کوٹ کیا اور لپ اسٹک وہیل پر رکھ کر سلطان بخت کے پیچھے گئی۔ انہوں نے سامنے کی دیوار میں ہی خوبصورت الماری کا الاک کھولا۔ الماری کے کھلے پٹ کے سامنے بالکل سپاٹ لکڑی کی دیوار تھی۔ سلطان بخت نے ایک طرف سے اسے ذرا سا دیا یا تو سامنے ایک بڑا سا ایک کھل گیا جس میں مختلف اقسام کے ڈرگس کی بوتلیں قطاروں میں لگی تھیں۔ سلطان بخت نے ہاتھ بڑھا کر ایک بوتل باہر نکال کر الماری الاک کر دی۔

مین مارا نے آگے بڑھ کر الماری کے دوسرے خانے میں لگے کرشل کے جام میں سے دو اٹھائے اور بیڈروم والی سائیڈ میں آگئی۔ فرنج سے برف کا سانچہ نکال کر وہیل کے پاس بیٹھ کر برف کرشل کے نازک صراحی دار گلاسوں میں ڈالنے لگی۔ سلطان بخت نے بوتل اس کے آگے رکھ دی۔ اس وقت ان کے موبائل کی بپ بجنے لگی۔ انہوں نے سائیڈ ریک پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ اسکرین پر سیدہ کا موبائل نمبر تھا۔

نظر پڑے پر ہی ہمارے تھیں۔ شہزادہ اس کی ٹنگی سے ایک لمحے کو ہی مہوٹ سی ہوئی تھی۔
"اچھا لگ رہا ہوں نا میں۔ شکر ہے آپ نے پہچان لیا اور نہ۔"

"شٹ اپ! شہزادہ نے اس کی بات ٹالی۔ "تمہیں تمہیں اتنی جرات کیسے ہوئی کہ تم مجھے سید سلطان شاہ کی بیٹی کو ایک اہمیت رقعہ لکھو۔ اگر میں اللہ کو وہ رقعہ دکھاؤں تو تم اس زمین پر چلتے پھرتے کیسے بھی نظر نہ آؤ۔"
وہ غصے میں آگئی تھی یا غصہ دکھائی دیتا تھا۔ عبد الصبیر کو فرق جانچنے میں صرف ایک بل انگلہ دو سرے بل وہ پھر سے مہلکتی تھا۔

"تو اتنے دنوں سے دکھایا کیوں نہیں رقعہ اپنے اللہ کو۔ میں ڈرتا ہوں ان سے میں تو کسی سے بھی نہیں ڈرتا۔ شہزادہ کی اچھوت کرتے ہیں وہ پھر کسی سے نہیں ڈرتے محبت تو کام ہی جان پر کھیل جانے والوں کا ہے۔"
اس نے پھر سے بڑے اسٹائل سے ہونٹوں کو گول کر کے ڈائیلگ مارا تو اب تھوڑا سا لٹ کے اندر کھسک آیا تھا۔ وہ کیدار گیت سے خاصے فاصلے پر کھڑا کسی وین والے سے گپ شہزادہ تھا۔ شہزادہ نے پورے نظروں سے باہر دیکھا۔ گیت رزٹ نہیں ہوتا تھا۔ یوں بھی اچھی پھنسی بھی نہیں ہوئی تھی۔
"تمہیں معلوم ہے تم کیا کیوں کر رہے ہو اگر میں نے رقعہ نہیں دکھایا تو اس وجہ سے کہ یہ تمہارے دماغ کا غلط ہو گا۔ مفت میں غلطی کی وجہ سے مارے جاؤ گے اور نہ جانتے ہو تم آگ کے شعلوں سے کھیلنے کی کوشش کر رہے ہو۔ کیوں اپنی جان سگور نہیں ہو رہے ہو۔" وہ اسی لمحے میں غصے سے پھٹکاری۔

"محبت کا وہ سرا نام ہی آگ سے کھیلنا ہے یہ پھولوں کی تاج تو ہے نہیں اور کیا مجھے نہیں پتا کہ میں کون ہوں تم کون ہو میرا کیا وجہ ہے تم کس رتے کی حامل ہو۔ جس باعزت خاندان سے تمہارا تعلق ہے میرا کھرا نہ اس کی جو تیاں سید گئی تو تباہ تو بھی کوئی خاص نہ ہے میں پاتا۔ میں یہ سب باتیں پہلے دن سے جانتا ہوں اس دن سے جب پہلی بار تم کو دکھا تھا اس بل بھی ہے بل نے تمہیں جاننے کی نایمکن خواہش اس دل میں پالی تھی اور اس روز کی شب ہماری گاڑی کے آگے جان بوجھ کر آنے کی جسارت کی تھی اور اس گھڑی بھی میں اپنی اوقات اور تمہارا مقام ہرگز نہیں بھولا تھا جب رات کے آخری پیر کھنٹوں کی سوچ بچار کے بعد میں نے تمہارے حسن کی تعریف میں چند لائنیں کھینچی تھیں اگر وہ لائنیں کسی اور کے ہاتھ لگ جاتیں میرا کیا انجام ہوتا مجھے سب احساس تھا مگر میں کیا کروں محبت کرنے والا دل ان ڈراؤوں سے ڈرتا ہی نہیں۔ اس کی تو ایک ہی رٹ تھی شہزادہ اور بس۔"

"اگر میں یہاں سے اٹھتا ہوں تو اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھو اور دوبارہ تمہیں نظر بھی نہ آؤں تو کیا تمہارا دل یہ جہانی سہکتے گا؟ ایسا ہے تو تم مجھے ڈھونڈ کیوں رہی تھیں ذرا پوچھو تو اپنے دل سے۔ میرا یہاں کھڑا ہوتا تم سے بات کرنا لیا لگا ہے اسے؟"

وہ محبت بھرے انداز میں اس کے ذرا پاس ہو کر بہت دیکھے لمحے میں بولا تھا۔ شہزادہ کے دل کی دھڑکنیں اٹھل چٹھل ہونے لگیں۔

"اگر میرے بغیر وہ سکتی ہو تو پھر کہو میں تمہارے رتے میں دوبارہ نہیں آؤں گا۔ شاید تمہاری جدائی میں اس جہان ہی سے گزر جاؤں کیونکہ مجھے تو اس زمین پر زندہ رہنے کا سبب تم ہی نظر آتی ہو۔" وہ لمحے کو ذرا سادھی بنا کر بولا۔

"تو تمہیں بہت دیکھتے ہو اور لگتا ہے فارغ بھی بہت ہو۔" وہ طنز سے بولی۔ "اپنے دماغ کو کسی ڈھنگ کے کام میں لگاؤ تو یہ خرافات نہ آئیں تمہاری کھوپڑی میں۔"

"یہ خرافات نہیں زندگی کا انمول تحفہ ہے محبت! کہ محبت کو تو دنیا کیا کوئی بھی آسانی زینتی مذہب فرقہ نہیں بخلا سکتا تم اسے خرافات کیسے کہہ سکتی ہو۔ سیدہ شہزادہ شاہ! جس کو یہ خرافات لاحق ہو جاتی ہیں وہ تو قدرت کے منتخب کردہ ہوتے ہیں اور مجھے فخر ہے کہ میں ان میں سے ایک ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ آئی لو یہ شہزادہ! آئی رہتی آئیو۔"

"کو ٹوڈا ہیل آف آف یو۔" وہ منہ میں بڑبڑاتے اور سوجا کل آف کر کے اسے بیڈ کی طرف اچھال دیا۔
"شاہی! آج سب وعدے پورے کرنے ہیں اس پار میں آپ کو ایسے نہیں جانے دوں گی۔ نئی گاڑی اور "سید ہاؤس" کے پیچہ ز میرے نام ہوں گے تو آپ ابھر سے جا سکیں گے۔ مام نے سب پیچہ ز تیار کر رکھے ہیں صرف آپ کے سامنے ہوں گے۔" زمین تارا ڈرنک گاڑیوں میں اٹھ بیٹھے لگی۔
"جان سلطان بخت! آج کی رات کچھ نہیں گولی وعدہ نہیں گولی بیان نہیں جام ہی جام بس پیاری پیاری۔" نشہ ہی نشہ۔

زمین تارا کچھ بول ہی نہ سکی۔

پانچویں پیر بیڈ کے بعد وہ فری تھی۔ ابھی فضل دین کے آنے میں بھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔
"اگر میں ہاسٹل میں ہوتی تو اب تک ہاسٹل جا چکی ہوتی۔ ڈیڑھ گھنٹہ میں کالج میں کیا جھک ماروں؟"
شہزادہ نے کھینچا کر کھاس پر پڑے پھولے سے پتھر کو کھو کر ماری۔
"سید ہاؤس" میں رہ لوں گناہوں پر پیلا نکل بھلا تو کروں کے پیش کے لیے بنا ہے۔" اسے غصے میں ایک اور غلط سوچا۔ "اس بار تو میں ڈٹ کر لالہ سے بات کروں گی۔ یہ روز روز کی مشقت مجھ سے نہیں ہوتی۔ فضول کی بیگار دو کھنٹوں میں لڑھک لڑھک کر پہنچو اور دو گھنٹے میں کھٹ کھٹ کر واپس آؤ اور ہو جاؤ تو پہلا پیر بیڈ مس ہو جانے کی کھوار لگ سر پر لگتی رہے ہو نہ۔" وہ خود ہی بڑبڑاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

"نکل سے لالہ بھی غائب ہیں خدا جانے کدھر۔ ان کے چکر بھی سمجھ میں نہیں آئے۔ غائب ہیں تو کھر میں سکون ہے ورنہ تو ان کے بیڈ روم میں ہر وقت ٹاپ کلاس ایکشن پھیل جاتی مودی چلتی رہتی ہے۔ بھلا بھی بیگم تو ان کے لیے جیسے مولا جٹ ہی بن گئی ہیں اور لالہ سلطان راہی اور آپا بھلا کیا ہیں۔"
وہ رات کر بھرت سے ویٹھے لگی۔ اسے خیالات کی بانگاریں پتا ہی نہیں چلا تھا کہ وہ پچھلے گیت پر پہنچ گئی تھی۔
"وہن جو ہر وقت ڈسٹرب رہتا ہے گھر کی ٹینشن کی وجہ سے۔" گول نے مصحوبیت سے اس غائب دماغی کی توجیہ پیش کی۔

بھڑکا تیں میری پیاس کو لکھ میری آنکھیں
صحرا میرا چہرہ ہے سمندر میری آنکھیں

جسپاک سے ایک شعر اور ساتھ ہی عبد الصبیر کا خیال آیا۔ یہاں پر شعر ہر آنے ہوئے وہ سوچنے لگی۔
"لگتا تو تمہیں اس کا شعری ذوق اتنا اچھا ہو گا کیا نام تھا اس کا بھلا۔"

وہ سوچنے لگی۔ "ہاں۔ عبد الصبیر۔ بھلا اس نے مجھے یہ اشعار کیوں لکھے تھے ایک بار ملتا تو شکر آتی۔"
اس روز تو پایا جان کی خبر آگئی۔

اس نے افسروں سے پوچھی ذرا سی گروں اونچی کر کے گیت کے بار دیکھنے کی کوشش کی۔
"وہ تو تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے کا رقعہ تھا جب اس نے اوہر آنے کا لکھا تھا اب تو وہ بھول بھال بھی گیا ہو گا۔"
وہ سوچتے ہوئے ذرا سائٹ سے آگے ہو کر گیا ہر جھانک رہی تھی۔ اس نے اپنے بڑے سے دوپٹے کو کانوں کے پینے اڑس کر غائب کر لیا تھا۔ مانتا بھی اچھی طرح ڈھکا ہوا تھا۔

"صیلا السلام علیکم۔ کیا حال ہے۔ آپ کو آج مجھے تلا شایا د آیا ہے۔ میں تو اوہر گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے کھڑا ہوں۔ یہ عشق تو غری خوار ہی ہے۔ اب مجھے پنا پلا جتوں میں ہوا اور راجھا کیوں مر کھپ گئے" اسی راہ محبت میں دل کر۔

اس کی گاڑی شہزادہ کو چوٹا دینے کے لیے کافی تھی اور اس کے ڈائیلگ اس کے دل کو غیر متوازن تال میں دھڑکانے کو۔ وہ بائیں بیٹ کے بائیں طرف دیوار سے جڑا کھڑا تھا۔ چہرہ دھوپ کی تمازت سے چمک رہا تھا مگر ہونٹ و گلش مسکراہٹ لیے ہوئے تھے جیسے ابھی کھل کر نہیں پڑیں گے۔ اس نے آنکھیں شہزادہ کے گیت سے

"مصلحتی والا ایمان والا ایمان یعنی فروش اور سبزی فروش اور ہاں ایک ظہر کا بھی آیا تھا جسے تمہارے بابا صاحب نے یہ کہہ کر دھکا دیا "اوپر کی گمانی" بہت کھانا ہے۔ اوہر سے تقریباً سب رشتے تمام ہوئے تو اب بے چاری شاہد رے سے لانے شروع ہو گئی ہے۔ اس نے اپنی استعداد اور بھائی ہے ہم کیا کریں اور سب سے پیٹھ کر مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے روزانہ تمام کہاں سے ہو۔ صوفی صاحب یہ باتیں نہیں سوچتے۔ اب تو گھر میں چائے کے لیے پتی بھی نہیں کہ مہمان کو خالی چائے ہی پیش کر دی جائے۔"

وہ اٹھیں اور غسل خانے میں ہاتھ دھوئے چلی گئیں۔ جویر سے صحن ہی میں دسترخوان بچھانے لگی۔ کمرے تو ویسے ہی چھوٹے چھوٹے تھے۔ آمنہ بے دلی سے اٹھ کر برتن رکھنے لگی۔

"نفل آؤ تم دونوں بھی اندر کیا کوئی مراقبہ کر رہے ہو نہ نب! عبدالمعین!" آمنہ نے بیزارگی سے ان دونوں کو آواز لگائی۔

"تمہارا مذاکرہ ختم ہو گیا ہو تو ہمارا مراقبہ بھی سمجھو تمام ہوا۔" عبدالمعین تو شاید آواز گاہی خنجر تھانے سے باہر میں کنگھی کرنے کے بعد کھرا کھرا آیا ہر آگیا۔

"نہیں کوئی مذاکرہ یا مکارہ نہیں کر رہی تھی۔ یوں بھی اوہر مذاکرہ ہو یا مناظرہ کیا جا سکتا ہے۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"اجازت کی خنجر رہو گی تو پونہ جلتی کڑھتی رہو گی۔" زینب اندر سے آتے ہوئے بولی۔

"ختم کچھ بلا اجازت کر سکتی ہو تو کر کے دکھاؤ۔" آمنہ کا موڈ آج خراب تھا۔

"کر کے دکھاؤں گی اور ادھرین رکھو۔ وقت آنے پر ضرورت بڑی ضرورت کچھ بلا اجازت بھی کر کے دکھاؤں گی۔" اس کی سوچ کا قرینہ اور گفتگو کا انداز عبدالمعین سے بہت میل کھاتا تھا۔ دونوں میں بغاوت کے جراثیم بہت تھے۔

"خوش کیا زینب کی سوچ نے۔" عبدالمعین فوراً بولا۔

"یہ خوشی دینے والی سوچ نہیں ہے۔" آمنہ نے پانی کا جگ لاکر لکھا۔

"تو کیا وہ دینے والی ہے۔ اس کنویں میں اندھیری کو ٹھہری میں کھینچ رہی ہو اور یہ سوچ کر کڑھتی رہو۔ کوئی اجازت دے گا تو نکلے گا سوچیں گے۔ اوہر سے نکلے تو کدھر جائیں گے۔ یہ سب تمہیں پر نظر کر رہی پتا چلے گا کہ روشنی کدھر ہے رستے کدھر ہیں۔" اس موضوع پر زینب اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتی تھی۔

"اگلی اپنی سوچ ہے مجھے ہر کام اجازت سے اور جائز طریقے سے کرنا اچھا لگتا ہے۔ مجھے خیال میں یہی پیش کی خوشی کا ذریعہ ہے۔" آمنہ سنجیدگی سے بولی۔

اسے دونوں کی سوچ ہو کہ سراسر صوفی صاحب کے خلاف تھی ذرا پسند نہ آتی تھی۔

"جس میں اپنا دل خوش نہ ہو دو سروں کی خوشی کے لیے خود کو خوش ظاہر کرنا خوش نہیں۔ میں تمہیں بتاؤں گا اپنے دل کو خوش کرنے سے کیسی جی خوشی ملتی ہے اور میں وہ کام کروں گا جس میں میرے دل کی خوشی ہوگی اور جو دو سروں کی پروا کرتے ہیں وہ کبھی کبھی نہیں کر سکتے اور میں تمہیں بہت کچھ کر کے دکھاؤں گا اتنا کچھ کہ تم کو یہ تم ہو عبدالمعین۔ اور میرے پاس تمہیں جواب دینے کو نا تم بھی نہیں ہو گا۔" وہ کار بھار ذکر سینیاں بکھار رہا تھا۔

پاں کیونکہ تمہارے سر پر سیٹک جو آگ آئیں گے اور تمہیں انہوں کی بدنت کا وارنہ ہو دیا جائے گا پھر میں تمہیں بھلا کیسے پہچان پاؤں گی۔" آمنہ نے روٹیوں کی پچھیر دسترخوان پر رکھی۔

"میں صحیح کہہ رہا ہے آمنہ! خوشی وہی ہوتی ہے جس میں ہمارا اپنا دل خوش ہو۔ ابھی تمہیں کھانا میں یہ خوشی کیسے حاصل کرنی ہوں۔ آج میں سب کو ایک سر پرانہ زوروں کی۔ ناممکن کو سمجھو ممکن بنانے کی کوشش۔ پہلی کوشش۔" زینب بھی ان کی بدنت میں شریک ہو چکی تھی۔

"ختم دونوں کے پرزے دھیلے ہو گئے ہیں ابھی بابا صاحب آئیں گے۔ انہوں نے ایک گریڈ اور آواز لگائی ہے اور

عبدالمعین کے شمارے کی ساری ہوا نکل جاتی ہے۔ "آمنہ نے جویر سے کوٹھاس لانے کا اشارہ کیا۔

"یہ بھی باغی بعد کی باتیں ہیں اب بابا صاحب مجھے کچھ نہیں کہتے۔" عبدالمعین رعب سے بولا۔

"کیوں تمہاری تک کہے ہو یا کوئی تیرا امریکہ دریافت کر بیٹھے ہو گا۔"

"پہلے سے دریافت شدہ امریکہ نے دنیا کو مصیبت میں ڈال رکھا ہے میں ایسا بے ہودہ کام ہرگز نہیں کروں گا مگر بابا صاحب سے ڈرنے والا مشتعل بھی میں نے ترک کر دیا ہے اپنے پاس نا تمہی نہیں ان باتوں پر غور کرنے کا۔"

وہ پھر سے کار بھار کر بولا۔ آمنہ نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کا دماغی تواناں بڑھ گیا ہو۔ وہ آج کل ویسے ہی ہواؤں میں اڑتا نظر آ رہا تھا۔

"اپنا بھی جیک لگنے والا ہے۔" اس کی بات ابھی منہ میں ہی تھی کہ صوفی صاحب کے بیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی تو سب خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

"پہلے سے وضو کی بک بک باب کے سامنے شروع کرونا وہ ویسے ہی آج کل پریشان بہت ہیں۔" اماں نے غسل خانے سے دھو کر کے ہی لگی تھیں وہ ان کی باتیں و سوا کے دوران سنتی رہی تھیں۔ نمل کے دوپٹے سے اپنا منہ صاف کرتے ہوئے بولیں۔

صوفی صاحب کے سامنے یہ سب "چھوڑنے" کی کس میں بہت تھی۔ ان کے آتے ہی سب خاموشی سے کھانا کھانے لگ گئے۔

"یہ آج پھر وال۔ اماں نے رات کو جی وال تھی نکل ہو پھر کو بھی۔ پرسوں آؤ اور اس سے ایک دن پہلے چٹے میں نہیں کھاؤں گا وال۔"

دو ٹلے سے ڈسکن اتھری وال آئی تھی۔ کچھ کر تریب اٹھا۔ صوفی صاحب کا بھی لحاظ نہ کیا۔

"تو اب کی آواز جا نہیں سے کچھ مکارے آؤ۔ نئے جوتے تو نہیں ہو اٹھارہ انیس سال کے بچے کے ہو بیٹھے ہیں کھلی کھنور نہیں ہاتھ پیر ہاؤ تو پھر یہ نکتے دکھانا۔ نظر نہیں آتا اب کا پیشہ کیا ہے۔ صبح سے رات گئے تک اللہ کے چار حرفوں کا سبق لوگوں کو پڑھا تا ہوں تو یہ وال روٹی ملتی ہے جو تم جیوں کے طلق میں اٹکتی ہے۔ شکر ادا کر کے کھاؤ۔"

صوفی صاحب نے اس کی اچھی خاصی جبر کے لیے شک اب انہوں نے اسے مارنا پینٹا مو قوف کر دیا تھا مگر لفظوں کے تیر ہر وقت نوک زبان چو اس کے لیے تیار رکھتے۔ اس کے لیے ان کے پاس پیشہ ٹیڑھی نظر ہی ہوتی تھی۔

"پہلے بھی کبھی پیشہ تھا پہلے تو والوں کا ہفتہ نہیں منایا جاتا تھا۔" وہ بے دھڑک بولا۔

خوب دیکھتے پھوڑو اور گئے وہ ۱۱ سال کے۔ وہاں سے دوسرے شہر کی کوٹھان کی مہربانیاں تم سب کو اتنا بڑا کر گئیں۔"

"ان کی مہربانیاں ہی تو ہمیں ان حالوں کو پہنچائی ہیں بھول گئے آپ! "عبدالمعین کب چو کہنے والا تھا فوراً "بتا کر بولا۔"

"کیوں اس مت گرو کھانا کھانا ہے تو کھاؤ نہیں تو فوج ہو جاؤں ماں۔" وہ غصے سے بولے۔

"کھانا تو میں نے کھانا ہے مگر یہ وال نہیں میرا قان زور۔" وہ دھمکانی سے وال کی کٹوری ہاتھ سے برسے دھکیل کر پیشہ ربا تو صوفی صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے کھانا کھا لگے۔ وہ "بنا سب کو کھور تارہا۔ اسی وقت بیڑھیوں کے پاس سے ٹیلی کی آواز آئی۔

"ابا! آیا میں بوسلوی۔" عبدالمعین اچھل کر کھڑا ہوا اور ٹیلی کے کھانے سے نرت لے آیا۔

"پالک گوشت ہے اماں ہی! آپ میں کی؟" اس نے پالک آپ آگے رکھتے ہوئے اماں جی سے پوچھا "صوفی صاحب کو قطعاً نظر انداز کر کے انہوں نے ایک نظر اسے کھور کر دیا اور جی بات تو یہ بھی وال کھانے کو ان کا

بھی جی نہ چاہ رہا تھا بس زہر مار ہی کر رہے تھے۔ اب جو گرم گرم پالک گوشت کی پلیٹ سامنے دیکھی تو انہیں وال اور بھی نگہنی مشکل لگنے لگی۔

”لاؤ اور دھو کھاؤ مجھے۔“ انہوں نے رعب سے کہہ کر ہاتھ پر دھایا۔

اماں جی نے جلدی سے پلیٹ اٹھا کر صوفی صاحب کو دینی چاہی۔

”اماں جی! ایک منٹ۔“ اس نے جلدی سے سامن اپنے لیے علیحدہ پلیٹ میں نکال ہی لیا۔

”آج مینے کی سولہ تاریخ ہے۔ ابھی مہینہ ختم ہونے میں چودہ دن باقی ہیں یعنی تنخواہ ملنے میں اور ان چودہ دنوں میں شاید وال بھی نہ ملے۔ یہ اس طرح کا کوئی بھولا بھٹکا خزانہ آجائے تو آجائے یا تو تم کچھ کام کرو یا مدرسے واپس جاؤ۔ میں اتنے کتبے کو اس طرح نہیں پال سکتا۔ وہ ایک فرخ ہو گیا تا عبدالمعین جسے میں نے ساری زندگی سونے کا نوالہ کھلایا۔ مجھے منہ بگلی دے کر چلا آیا بد بخت۔ تم بھی اب مجھ سے کسی بڑی بھلائی کی توقع نہ رکھنا کہ میں تمہارے لیے تر نوالوں کا برداشت کروں گا اور تم بیٹہ کر پانگ تو ڈوگے۔“ صوفی صاحب نے غصے سے کہا۔

ہری ہنڈی کھائی۔

”وہ تو آپ پہلے بھی نہیں کرتے تھے۔ سب کچھ عبدالمعین کے لیے ہی تو ہوتا تھا۔ میں تو کبھی کبھی ”میوے“ میں ہی مل گیا ہوں۔ ویسے فلرٹ کریں میں اور ہر زیادہ دن رہوں گا بھی نہیں۔ دیکھیں تو لوگ یہی کہتے سنا رہے ہیں اپنے لیے اچھی اچھی بوٹیاں رکھ لیتے ہیں اور مسجد میں یہ ہڈیاں اور تھپچھڑے پھینک دیتے ہیں۔“ اس نے ہڈی نکال کر پلیٹ میں پٹی۔

”میں کل گاؤں جا رہا ہوں۔“ اس نے اطلاع دی۔

”مدرسے؟ اپنا حفظ پیلے مکمل کرو۔“ صوفی صاحب اس کے جانے کا سن کر خوش ہو گئے۔ ایک تو وہ انہیں پسند ہی نہیں تھا دوسرے اسے دیکھ کر انہیں خواجواہ عبدالمعین کی یاد آئے تھی۔ جس نے پلٹ کر ان کی خبر بھی نہ لی تھی۔

”میں پہلے میں میٹرک کا امتحان دوں گا۔“ اس نے کہا۔ ”وہ قطعی انداز میں بولا۔ ان کے مشورے کو رو کر کہے۔“

”اور جو حفظ پر اتنا عمر آگا وہ بے کار گیا؟“ صوفی صاحب سے بھی بونی نہیں ٹوٹ رہی تھی۔

ہو پریہ نے ایک دو بار بیٹی نظموں سے ان کی پلیٹ میں برسی بونی کو دیکھا۔ اس کا دل بہت ہی چاہ رہا تھا بونی کھانے کو کتنے دنوں سے گوشت کا ذائقہ چکھنا ہی نہیں تھا۔ اماں جی نے ہو پریہ کی ”مدیدی“ نظر لگوا کر تڑا تڑا سے ہولے سے نمونہ ٹماڑ دیا۔ وہ سر ہٹا کر روٹی وال میں ڈبو کر کھانے لگی۔

”وہ آپ کی ضد تھی۔“ وہ گستاخی سے بولا۔

”عبدالمعین!“ صوفی صاحب دھاڑے۔ بونی نہیں ٹوٹی تھی۔ انہوں نے ثابت ہی نکل لی۔ عبدالمعین ان کے لیے ایسی ہی بونی ثابت ہو رہا تھا۔ ان کو ساری محنت ان کا رت جاتی نظر آ رہی تھی۔

”میں کب انکار کر رہا ہوں حفظ کرنے سے مگر بابا صاحب! میں پہلے میٹرک کا امتحان دوں گا۔“ ماسٹر صاحب اگر مجھے امتحان دلوا رہے ہیں تو مجھے اس موقع سے فائدہ اٹھانے دیں۔ ویسے میں مدرسے بھی جاتا رہوں گا پھوٹوں گا تو نہیں نا باقی کا امتحان کے بعد۔“

وہ ایک دم سے لہجہ بدل کر بولا۔ اسے اب سارے فن آتے جا رہے تھے۔ کون سی ٹون کب اور کہاں استعمال کرنی ہے، کس کو کس طرح حرام کرنا ہے۔ اس وقت اس کی ساری ذہنی توجہ شہرت کو پانے میں تھی اور کسی سے لہجہ کر وہ اپنا مانع خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے نرمی سے بولا۔

”اچھی بات ہے میٹرک لے۔ بعد میں تو آٹھ ماہ میں حفظ بھی کرے گا تو آپ ہی اسے کسی اچھی جگہ نوکری دلوا دیجئے گا۔ آپ کے شاگرد تو ہر جگہ میں اچھی جگہ کام کر رہے ہیں۔“

اماں جی نے فوراً اس کی سائیڈ لی۔ ”ویسے اللہ بھلا کرے ماسٹر صاحب کا جو تمہیں میٹرک کروا کے ہمارے ساتھ بھی لگی کریں گے۔“

”اگر یہ کرے تو؟“ صوفی صاحب نے پالک کی پلیٹ اچھی طرح نوالے سے چوکانی۔ ”اور یہ بات بھی لکھ لو راجعلی بی بی! لاکھ مجھے چکروے، دسویں بار ہوں کیا یا ایک جماعت بھی پاس نہیں کر سکتا، حفظ کر سکتا ہے۔ اس لیے یہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جب تک اپنی نیت کے چور سے خود آگاہ ہو کر اسے بھگانہ دے۔ یہ بات تم میری لکھ لو۔ اس کے سارے چلن میں جانتا ہوں۔“

انہوں نے دسترخوان سے ہاتھ صاف کیے۔ عبدالمعین اب بھی دلجمعی سے کھانا کھا رہا تھا البتہ ماتھے پر بے شمار شگنیں اور سے نظر آ رہی تھیں۔

”ابھی صاحب! ایسے نہ کہیں۔ ماں باپ کی بری بات بھی خدا نخواستہ بدوعلیٰں جاتی ہے۔ دعا کریں اللہ اسے کھلیا کرے۔“ راجعلی بی بی نے دہل کر نظموں ہی سے بیٹے کی سات بلا میں دوڑ گئیں۔

”تم چاہے اس کے لیے دعا میں کرو چاہے بدوعلیٰں۔ تمہارے ہمارے یہ کسی کام کا نہیں لکھو تا سکہ۔“ وہ اسی عقارت سے بولے۔ عبدالمعین نے سر اٹھا کر ایک طنزیہ نظران پر ڈالی اور پھر سر جھکا لیا۔

”تم سناؤ زینب! تیاری کر رہی ہو امتحان کی؟“ انہوں نے اپنا رخ پھیرا۔ زینب کے ہاتھ سے نوالہ پھوٹ گیا۔ وہ اس جملے کے لیے تیار نہیں تھی۔

”گگ۔ کون سے بابا صاحب؟“ وہ ہٹکا کر بولی۔ ہو پریہ منہ بچا کر کے مسکرانے لگی۔

”میٹرک کے اور کون سے۔ میں نے کھا تھا تا کہ آنت کے ساتھ دیتے ہیں تم نے بھی۔ ابھی ایک دو ماہ ہیں تیاری کر سکتی ہو۔ جماعت کی تیاری تو تم نے کر ہی رکھی ہے۔ دسویں کے چیدہ چیدہ باب آمنت سے پوچھ کر تیار کر لو۔ میں وہاں کا اعلیٰ اعلیٰ مشیون کا۔“ وہ کسی انداز میں بولے تو زینب کا سانس رکنے لگا اس کی تو ذرا بھی تیاری نہ تھی۔

”بابا صاحب! میں ایسا نہیں کر سکتی۔“ ہو پریہ تیاری نہیں۔ ”وہ رو دینے کو تھی۔“

”میں نے تمہیں کئی ماہ سے کہہ رکھا ہے۔ اب تو تمہیں دینے ہی ہوں گے۔“ کہہ کر وہ اٹھے اور اندر کمرے کی طرف جانے لگے۔

”بابا صاحب!“ زینب کھمکھ کر کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے مڑ کر اسے دیکھا ایک لمحے کو تو اس کا دل ڈرا اور دوسرے ہی بل اس نے خود کو منسوب کر لیا۔

”بابا صاحب! میں ایک بات پر امتحان دوں گی۔“

سروا کے لفظ کو اس نے قصداً ”حذف کر دیا۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”اگر ہم پاس ہو جائیں میں اور آنت تو آپ ہمیں کالج میں داخلہ دلوا دیں گے۔“ وہ ہمت کر کے کہہ ہی گئی۔ ان کی ”گھوری“ میں شدت آ گئی۔

”بابا صاحب! سب ہی لوگ تو کالج میں پڑھتے ہیں۔ ہم تو چار سالوں سے اسکول بھی نہیں جا رہے پھر اوہر تو کالج بھی انٹر تک ہے۔ صرف دو سال کے لیے بابا صاحب! ریکورڈ کی شدت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ پرائیویٹ تو۔“

اس کے ہاتھوں میں پینسٹن ”ایلیا“ ٹائٹس لہز نے لگیں وہ ہاتھ پر ہنسا دوپٹہ درست کرنے لگی۔

”تم نے اہمیت پیدا کر کے کیا کرتا ہے؟“ وہ اسی بارعب لہجے میں بولے۔

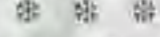
وہ کچھ نہیں بولی۔ بس اندر ہی اندر کھڑی لڑنی رہی اماں جی اس کی جرات پر تلملا رہی تھیں۔ آنت بھی ششدر رہ گئی تھی۔

اچھا تو یہ سر راز تھا اس کا۔ ”آنت نے سوچا۔“

”پچھا چلو ٹھیک ہے آکر تم دونوں کے نمبر ایسے آئے تو میں تمہیں داخلہ دلوا دوں گا۔ ان کا پر واٹہ اجازت اس

قدر اچانک اور ناقابل یقین تھا کہ زینب پر جیسے شادی ہو گیا۔ حلق سے نکلنے والی چیخ کو اس نے بڑی مشکل سے کنٹرول کیا۔ صوفی صاحب کمرے میں چلے گئے تو وہ پلٹ کر آتے سے پلٹ گئی۔
 ”وہاں میں اپنی بات کہہ سکتی ہوں اور منوا بھی سکتی ہوں ہر۔ یہ تھا سربراہ ہم کالج جائیں گے۔“ وہ اس کے کان کے پاس دیکھی آواز میں چیختی تو آتے کو جہاں خوشی ہوئی وہیں اسے اندر اٹھار کی طاقت نہ ہونے پر ایک آن لائن کے مال نے بھی آن گھیرا۔ عبدالستین اس سارے منظر سے بے نیاز غسل خانے میں کلیاں کر رہا تھا۔
 کلیاں کر کے وہ منہ صاف کرتے ہوئے تیزی سے بیڑھیوں اتر گیا اور مسجد کے اندر بے خبرے کی طرف بڑھا۔
 جیل سانسے زمین پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

”تم کیا پڑھ رہے ہو؟“ عبدالستین نے انکسفی سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔
 ”جیسے بھی میٹرک کا امتحان آتا ہے۔ اسی کی تیاری کر رہا ہوں۔“ وہ خمیدگی سے بولا۔
 ”اب۔“ اب عبدالستین نے خوب اونچا تہہ لگایا۔ ”کی میٹرک کو بھی زکام نہ ہو۔ اوہ تو ایسے لگ رہا ہے۔“
 اب کو میٹرک کا میٹر ہو گیا ہے۔ ”ایک سے دو سرے کو۔“ مزا آتا تھا علیحدہ ہوا۔



وہ دو راتیں ہوا اس کی ہزار مناجاتوں کا ثمر بن کر آئی تھیں اسے کسی قیامت سے کمر نہیں لگی تھیں۔ اس کے دل و دماغ کی دنیا سر تاپا بول گئی تھی۔ امید اور خوش فہمیوں کا ایک اور جہان سما رہا تھا۔ یہ تو اسے یقین تھا کہ یقین شہباز ایک نیا ایک دن ضرور اس کی طرف لوٹ آئیں گے اور جب بھی آئیں گے تو نہ صرف اپنے پچھلے رویے کی تلافی کریں گے بلکہ معذرت بھی اور اپنے بد نما سلوک کا بدل اپنی بھرپور محبت سے دیں گے تو اس کے آنسوؤں اور دھوکوں کا آثار بڑے خوبصورت انداز میں اوارا لیں گے۔

گرا ایسا تو کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ یہ تو ایسے ہی تھا جیسے کسی قافلے کا رہنما رہنما بننے کے لیے کچھ لوٹ کر منہ پھیر کر چلے بڑے نہ کوئی معافی نہ کوئی معذرت اور پھر بھی رہنما کا رہنما۔ اس کی قیامت پر کسی گوشہ بھی نہیں اور اس کی قیمتی متاع کوئی گئی اس کے زخموں کے لیے کوئی دوا بھی نہیں۔ کوئی آس کوئی امید کوئی خواب بھی نہیں۔ اس کی تو آنکھیں بھی بے خواب ہو چلی تھیں بھلا اب کس کے خواب کیے۔

فارمیٹھی کے سارے خواب تو بدمسود کے پورے کر دیے گئے تھے۔ دنیا دار کی نظر سے دیکھا جائے تو اب تو اسے کسی بھی بات کی چاہو، کتنی محسوس نہیں ہوتی چاہیے تھی۔ اب تو وہ ایک ”مطلوبہ صاف کن“ تھی اور اس سماگ بننے کے یاد ہو اس کے گہن دل میں دیر اپناں آندھیوں کے بلوں کی صورت اڑتی پھرتی تھیں۔ اس کے سپنوں کی خاک لے۔ خوابوں کی نوپز کلیوں اور شکوفوں کے زرد بدن لیے کہ ان کو دفن کرنے کے لیے بھی اسے اپنے دل میں کوئی جگہ نہیں مل رہی تھی۔

گیتین شہباز تیسرے دن صبح ہی اس کے بیدار ہونے سے پہلے جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ وہ سوئی آنکھوں کے ساتھ بمشکل اٹھی۔ وہ بیگ باہر لے کر نکل رہے تھے ایک اچھٹی سی نظر اس رات کی ضرورت پر ڈالی اور بیگ گھسیٹ کر دروازے تک گئے۔

”ہو پکچھ ہوا اس پر میرا کچھ اختیار نہ تھا۔ بہر حال میں ایک بشر بھی تو ہوں اور بشریت کے تقاضے کسی قدر منہ زور ہوتے ہیں کہ سب اختیار رہ جائے ہیں مگر شعور کی بھی کچھ ڈیمانڈ ہوتی ہیں۔“ وہ رکے۔ ”میں کوشش کے باوجود اپنے شعور کو اپنے ذہن کو تمہاری طرف سے مطمئن نہیں کر سکا۔ یہ آخری جہت تھی جس کے بعد ہمارے رشتے کی تکمیل ہوگی اگر اس کے بعد بھی دل نہ مانے تو پھر ضرور سوچنا چاہیے اور جو کچھ سوچنا چاہیے وہ میں نے سوچ لیا ہے۔“

گیتین اور وسعت کی ہوا امید تھی وہ ان دو راتوں میں کھلنے کی بجائے مزہا کروم توڑ گئی ہے نہ بہت! میرے دل میں اب تم کہیں بھی نہیں ہیں اپنے دل کو ٹھٹھل ٹھٹھل کر تھک گیا ہوں اس لیے اب جا رہا ہوں کسی بھی قسمی فیصلے پر

تختے کے لیے اب شاید میں آسکوں میرا فیصلہ پہلے آئے گا تم اپنے لیے اوھر سے جانے کے لیے یا اوھر ہی رہنے کے تمام امکانات سوچ لیتا۔ اللہ حافظ۔“ انہوں نے بیگ آگے دھکیلا اور دروازہ کھٹاک سے بند ہو گیا۔

دل کی دل تک رسائی کیسے ہوتی ہے اسے آج بتا چلا جو کچھ اس کے دل میں تھا وہی کچھ شہباز کے دل میں بھی تھا۔ اس کے دل کی کلی بھی اس کی قربت میں نہ کھل سکی تھی تو اس کا منطقی نتیجہ تو اب اس فیصلے کی صورت ہی نکلتے گا جس کا یہ کہے گئے ہیں۔

اس نے تھک کر بیڈ کی پشت سے سر نکا دیا اور آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی بو بھل آنکھوں سے گرنے لگے۔ پھر دن ایک ہی انتظار کی کیفیت میں گزرنے لگے کہ کب فیصلے کی وہ گھڑی چوکھٹ پر آکر دستک دیتی ہے۔ اس کا دل اور بھی بچھ گیا تھا۔ اب تو اسی کام میں بھی نہ لگتا تھا۔ سارے ہی دلوں کے جیسے دم توڑ گئے تھے۔ وہ کئی کئی گھنٹے کسی کو مخاطب کرنا ہی بھول جاتی۔ مسز خان اسے دیکھ کر سرد آہیں بھرتی رہتیں۔ شہباز کا فون آجنا تھا۔ بھولا بھٹکا مینے بند رہا اب بعد غمگن وہ اب بھی نہ بات نہ کرنا تھا اور نہ ماں سے اس کا ذکر۔

”نہت کے کان تو اسی آخری پیغام کی پیکر پر لگے تھے۔ وہ گھنٹوں ایک ہی جگہ پر بیٹھی نہ جانے کس اوٹھڑیوں میں گم رہتی۔ عبادت میں بھی یکسوئی کم ہو گئی تھی اور اس راہ میں تو یوں بھی ذرا سا انکاؤنڈ پڑا تو کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ خود کو کھینچ کھینچ کر نماز سے لے جاتی تھی۔“

”نہت بیٹا! دیکھنا ذرا اجا کر معاذ کو کیا بات ہے۔ وہ آج کالج بھی نہیں گیا۔ ناشتہ بھی نہیں کیا۔ ذہنوں بانو بانے لگی ہے دو بار پھر بھی اٹھ کر نہیں آیا۔ وہ ناشتہ کے بعد دوپہر کے لیے سبزی لے کر بیٹھی ہے ہولی سے مٹر چھیل رہی تھی کہ مسز خان کی آواز نے اسے چونکا دیا۔“

”بی اچھا! وہ کہہ کر اٹھ گئی۔ بہت دیر سے اس نے معاذ کی خیر خبر رکھنا بھی ترک کر دیا تھا۔ اول تو وہ خود ہی بہت مشغول تھا۔ وہ آتھا تو جہاں کالج تو تھا۔ تک بھائیوں کے گھر کے کام اور آدھی رات تک پڑھتے رہتا۔ معاذ تو کبھی نظر ہی نہیں آتا۔“ وہ سوچتے ہوئے اس کے کمرے کی طرف بڑھی۔ یوں بھی عالیہ بھابھی کے گھنٹا رہا کس کے بعد وہ خاصی غماض ہو گئی تھی۔

”معاذ! معاذ! معاذ! کیا بات ہے دس بج رہے ہیں اور تم ابھی تک سو رہے ہو کالج بھی نہیں گئے۔“ وہ کھیل میں منہ سر پینے بے سدھ بڑھا تھا۔ نہت نے اسے کاندھا لگا کر اسے جگایا۔

”گھنٹا ہوں آئی! طبیعت کچھ تھک نہیں۔ اس لیے کالج بھی نہیں گیا۔“
 کمزور آواز میں کہتے ہوئے اس نے سر کھیل سے باہر نکالا اس کا چہرہ اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نہت نے پونہی اس کا ہاتھ پھولا۔

”معاذ! معاذ! تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔ کل کہاں سارا دن پھرتے رہے تھے اتنی بے آرامی کرو گے تو بیمار ہی پڑو گے۔“ وہ کچھ ڈانٹ کر بولی۔

”میں کب پھرتا رہا ہوں۔ عالیہ بھابھی اپنے ساتھ شاپنگ کے لیے بازار لے گئی تھیں وہ ابھی پر گاڑی بند ہو گئی پھر جو خود انہوں نے مجھ سے دھکے لگوائے ہیں کہ خدا یا د آ گیا جو تو ڈو ڈو کھ رہا ہے۔“ وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔
 ”لینے رہو تم اور کیا ضرورت ہے اس قدر موت و کھانے کی جب تمہیں معلوم ہے ان کی عادت کا تم تریخ

صرف اپنی تعلیم کو دیکھو! اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔“

”میں انکار نہیں کر سکتا کسی کو بھی۔“ وہ کمزور لیجے میں بولا۔

”جھکتو پھر جو اتنی موت و کھاتے ہیں وہ زندگی میں کسی نہ کسی بڑے نقصان سے خود کو دوچار کر لیتے ہیں۔ میری مثال تمہارے سامنے ہے۔ وہ سچی سے بولی۔“

”اچھا تم اب لیجے رہو میں بتا کر داتی ہوں ڈاکٹر حبیب کا اگر وہ ابھی کلینک نہیں گئے تو جانے سے پہلے تمہیں چیک کر لیں۔“ وہ باہر نکلنے لگی۔

"آئی آر بیٹے میں ٹھیک ہوں۔ بس ایک بخار کی گولی اور کوئی دین کھروے دیں دو ہر تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔ مجھے تو آج کل بھی ضرور جانا تھا۔ آج کل بڑے اہم پیکرز ہوتے ہیں۔ وہ ہفتوں بعد ہی تو فائنل ایگزام ہیں اگلے ہفتے تک تو یوں بھی ہمیں فری کر دینا ہے۔ آج تو مجھے جانا تھا۔"

مال نے اسے آن کھیرا بھائی سے تانڈا اس کے ساتھ ساتھ میں بھی نہیں کیا تھا اور اگر موت کے ہمنور میں الجھ گیا تھا عالیہ اور فائزہ بھی اس کی موت سے خوب فائدہ اٹھاتی تھیں۔

"میں تم خلیق خدا کی خدمت کو کسی فلاحی ادارے کے رکن بن جاؤ یا کسی ایجنسی کے ہونے سے ہمیں اسٹڈیز کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا ایسی حال رہا تو شاید ہی تمہارا میرٹ بن سکے۔" نرہت اسے ٹھیک ٹھاک ڈانٹ رہی تھی۔

"خدا نہ کرے آئی! دعا نہیں دے سکتیں تو بدعا تو دے دیں۔" میرٹ میں تو اس کی جان اٹکی تھی۔

"تم کام بھی دعاؤں والے نہیں کر رہے۔ اچھا میں ڈاکٹر صاحب کا پتا کرتی ہوں۔" وہ کہہ کر باہر نکل آئی۔ ستر خان کو معاذ کی طبیعت کا پتا کر وہ ڈاکٹر صاحب کو فون کرنے لگی۔

"وہ تو کلینک کے لیے نکل چکے ہیں۔" ان کے ملازم نے بتایا تو اس نے مایوس ہو کر فون رکھ دیا پھر خود ہی اس نے ایک بخار کی ٹیبلٹ اور ایک درہم کرنے والی دوا دی۔

"نرہت! اسے خالی پیٹ دوا کی نہیں دینا پہلے تھوڑا بہت کچھ کھالے۔" چاہے وہ کچھ ہی تھی مگر ذرا دوا کسٹوڈینا د پھر دوا دینا۔ ستر خان نے اسے دوا کی لے جاتے دیکھ کر آواز لگائی تو وہ سر ہلا کر بچن کی طرف مڑی۔

ایک دم سے اسے کچھ ہوا۔ زمین بانو نے بچن میں چلے پر خدا جانے کیا چڑھا رکھا تھا شاید مکھن کا بھی پتہ ہی تھی۔ پیچ کھشی کھشی سی بو پورے گھر میں پھیل رہی تھی۔ بچن میں تو بہت زیادہ تھی نرہت کا جی اٹنے لگا۔ ایک دم سہلی سی ہونے لگی اس نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر اس نے دوا کی بچن کے کاؤنٹر پر ہی پھینک کر اپنے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔ بھاگ کر واش روم تک پہنچی اسے دوا نہ ملنے کا بھی ہوش نہ رہا۔ اس کے تے کرنے کی آواز سن کر زمین بانو اس کے پیچھے آئی۔

"لی لی لی! آخریت تو ہے لی لی!" وہ اس کے پیچھے آ کر بولی۔ اس کا سر جھک رہا تھا۔ اس نے بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ زمین کو مضبوطی سے تھام کر خود کو گرنے سے بچایا۔ زمین بانو نے اسے پیچھے سے سہارا دیا تو وہ جیسے ہوش ہی میں نہ رہی۔

دیرانے ٹیبلٹ کے کنارے اس کی سرک رو لہروں کو ہولے ہولے جتے دیکھ کر بھی نہ جانے کیوں دل کی بے کلی کو چین نہیں آ رہا تھا۔ شام ڈھل رہی تھی۔ گزشتہ رات کی برفباری سے سردی میں یکدم اضافہ ہو چکا تھا۔ اس وقت بھی تیز سردی ہو آئیں چل رہی تھیں۔ سورج ڈھلنے لگا تھا۔ اگرچہ سارا دن سورج لندن شہر کے باسیوں کو اپنا چہرہ نہیں دکھا سکتا تھا مگر اس کی روشنی نے بادلوں کے پیچھے سے بھی شہر کو اتار روشن ضرور کیے رکھا تھا کہ اس کے ہونے کا احساس ملتا نہیں تھا۔ گھڑیاں دیکھ کر سب کو اندازہ ہوتا رہا تھا کہ سورج اب آسمان کے کس رخ پر ہو گا۔

اب تو بہت دنوں سے بلکہ بہت مہینوں سے اس پر قوتیلت کا یہ دورہ نہیں بڑا تھا۔ جاپان میں تو انہوں نے صرف ایک ہی سال گزارا تھا اس دوران فخر حیات نے لندن میں اپنی فرم کی پرائیکٹس امپورٹ کرنا شروع کیں۔ ادھر رسپانس بھی اچھا تھا اور ڈیمانڈ بھی زیادہ تھی۔ جاپان میں ان کے قدم نہیں جم رہے تھے بس ایک سال بعد ہی وہ لندن آئے تو پھر لندن کی سترزدہ فضا نے جیسے انہیں اپنے حصار میں ہی جکڑ لیا۔ سال بھر ہی میں فخر حیات کی فرم کا کام عروج پر چا پہنچا تھا۔ محنت بھی انہوں نے دن رات کی تھی اور رعنا حیات نے بھی سوشل سرکل میں انہیں پروموٹ کرنے میں بہت سرگرمی دکھائی تھی۔ دنوں میں ہی بزنس کی بوٹی میں ان کا اچھا مقام بن گیا تھا۔ فخر حیات کی کاروباری ساکھ ایک بار پھر جم رہی تھی۔ کچھ ایسا بھی تھا کہ دوسرے تمام "مشاغل" سے انہوں نے فی الوقت منہ موڑ لیا تھا۔ بزنس اور صرف بزنس۔ ان کی محنت شائد بالا خرگ لے ہی آئی تھی۔

"فخر! ہم واپس کب جائیں گے۔" فخر حیات آج کل اس پر دل و جان سے فریڈت تھے۔ ایسے ہی خوشی کے ایک پل میں اس نے پوچھ لیا۔

"ابھی نہیں۔ تم از کم دو تین سال کے لیے تمہارا پاکستان کو بحال جاؤ۔" فخر حیات نے بغیر کسی گلی لہجے کے کہا۔

"گزشتہ تین برسوں سے بھی تو بھولی ہوئی ہوں اور کتنا صبر کروں؟" وہ کچھ بے چارگی سے بولی۔

"وہاں رہ کر بھی کیا حاصل تھا صبر تو ادھر بھی تھا۔ جب انسان کے اختیار میں کچھ نہ ہو تو پھر صبر ہی کیا جاسکتا ہے۔ مجبوری ہے۔"

"ایک آس تو تھی امید۔" اس کی آنکھیں بے اختیار جھلکانے لگیں۔

"آس اور امید تو مرتے دم تک آدمی کی اٹلی تھکتے رکھتی ہے۔" فخر حیات کے پاس اس کی ہر بات کا جواب موجود تھا۔

"آپ اپنے بزنس کو پاکستان ٹرانسفر کر دیں، بے شک ادھر مینے میں دو چکر لگانے دیں لیکن پاکستان میں۔" وہ بے چین بھلا بولی۔

"ابھی نہیں جانے دیجیے بالکل نہیں۔ دو تین سال مجھے اپنے بزنس کو مضبوط کر لینے دو پھر جو تم کوئی دہی کریں گے پہلے بھی ان ہی جلد پا لیں گے میرے بزنس کو تباہ کیا تھا۔" فخر حیات میں یہ خوبی تھی انہوں نے کڑے سے کڑے وقت میں بھی رعنا کی کوئی بات نہیں مٹائی تھی۔

"ادھر رہنا بھی تو۔" وہ چپ کر گئی۔

"تم ادھر خوش تو ہو۔ این کی او کی چشمہ سب تمہارے پاس ہے، پاکستان سوسائٹی کی سوائیکٹور میٹرز میں سارا دن تو تمہیں فرصت نہیں ملتی رات کو کوئی نہ کوئی گید رنگ۔ پھر یہ فصول کی یاسیت کہاں سے پال لیتی ہو تم۔"

فخر نے خوبیا نہیں چلا۔ جتنے بھی ایک دم سے ہی اچھا ہو جاتا ہے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جاؤں اس کے پاس۔ "وہ بس رو جینے کو تھی۔ نشو کے گونے سے آٹھ کے گوشے صاف کیے۔"

"وہ جیسے تمہارے پاس ہی تو ہے۔" فخر حیات ہنکارے۔ "فزیکل ایکٹیو میٹرز کے ساتھ اپنے ذہن کو بھی مصروف کرو۔ لندن لائبریری دنیا کی مشہور ترین لائبریری ہے۔ تمہارے پاس اس کی ممبر شپ بھی ہے اور کبھی تمہیں پڑھنے کا بھی بہت عرصہ ہوتا تھا اس کو جگاؤ، وقت نکال کر ادھر چل جایا کرو۔" ان کے پاس مشورے بے حساب ہوتے تھے۔

"آپ نے بھی تو خود کو حد درجہ مصروف کر لیا ہے اور اب یہ رات کی شفٹ بھی۔"

"مجبوری ہے۔ تمہیں پتا تو ہے کڑے حالات ہو گئے تھے۔ خدا نخواستہ ادھر بھی قدم نہ جتے تو پھر ہم کیا کرتے؟ شکر کرو ہماری فرم کی ریپوٹیشن دن بدن بہتر بن رہی ہے میرا یہ ٹائٹل شیڈول بس دو ایک سالوں کی بات ہے پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ سنی کی اسٹڈیز تو ٹھیک جارہی ہیں نا؟"

انہیں ایک دم سے خیال آیا تو اس کا دھیان بٹانے کو پوچھ بیٹھے۔

"اسی کی تو فکر ہے مجھے اسٹڈیز تو بس سو سو ہی جارہی ہیں مگر دوسری ایکٹیو میٹرز میں بہت ایکٹیو ہو چلا ہے۔ فخر! سنی کے لیے ادھر کا ماحول بالکل بھی ٹھیک نہیں وہ ادھر کی خرافات میں پڑنا چاہا ہے اسی لیے تو میں آپ سے واپس جانے کا کہہ رہی ہوں۔"

"تو رعنا ڈارنگ! واپس جانا کوئی مذاق نہیں، واپسی کا تو ابھی سوچہ بھی نہیں۔ سنی پر خود توجہ دو کی عمر ہے اس کے بگڑنے اور سنورنے کی۔"

"وہ بگڑ رہا ہے۔" وہ زور سے کہی۔

"اور میرے پاس نا تم نہیں اس کو سدھارنے کا یہ کام تو تمہیں ہی کرنا پڑے گا۔"

"فخر اور میری منتا کب ہے بہت خود سر ہو جاتا ہے۔ جب سے آپ نے رات کی شفقت بھی شروع کی ہے وہ رات کو بھی بہت دیر سے آنے لگا ہے۔ مجھے اس کے ایک دو فریڈز نے بتایا ہے وہ کسی ٹائٹ کلب میں بھی جانے لگا ہے کچھ کہوں تو پختہ چلانے لگتا ہے میں اس کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔"

"میں بات کہوں گا اس سے۔ فخر حیات نے سرسری لہجے میں کہا۔
 "آپ سے تو وہ پہلے ہی نالاں سا رہتا ہے۔ آپ اسے نام جو نہیں دیتے۔"
 "کلب میں برسوں کو نام دیوں یا گھر کو کم از کم گھر پر تو یہ دینا تو تمہارا کام ہے نا اتنا تو تم کر سکتی ہو۔ کہ بے کاری سوچوں میں بیٹھ کر کھوئے رہنے سے بہتر ہے تم اپنے ارد گرد دھیان دو۔ جو کچھ بگڑ رہا ہے کم از کم اسے تو سنوارنے کی کوشش کر سکتی ہو۔" فخر حیات اتنی سے بولے۔ تھوڑی دیر پہلے والی حلاوت ان کے لہجے سے غائب ہو چکی تھی پیرتے ہوئے باہر نکل گئے۔

اور اب اسے دریا کے کنارے بیٹھ کر جیسے شاید دو کھٹے ہو چلے تھے۔
 "فخر! آپ کے نزدیک یہ بے کاری سوچیں ہیں اور میرے لیے یہی سوچیں راحت بخش ہیں فخر آپ کبھی سمجھیں گے۔"

اس نے ایک گہرا سانس لے کر ویران ساحل کو دیکھا۔ برون پر تو کافی لوگ جارہے تھے مگر ساحل بالکل ویران پڑا تھا۔ لہجے لہجے اور کوٹ پٹے بے حد مصروف انگریز لوگ ان کو اپنے سنی کی کچھ فکر نہیں ہوتی۔ اس نے تیز قدموں سے آتے جاتے انگریزوں کو دیکھ کر سوچا۔ چاروں طرف دھند پھیل رہی تھی۔ اوس سے ہینکی دھند نے ہر جگہ کو گیلا گیا کر دیا تھا اس نے اپنے کوٹ کے اوپری ٹین بھی بند کئے اور ست قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھی۔
 "سنی ہاتھوں سے اٹھ گیا تو فخر حیات آپ کا یہ جیسہ اور برس ہمارے ہاتھوں سے چھسکتی اس آخری خوشی کو بھی نہیں تھا س کے گا۔"

گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے اس نے سوچا مگر فخر کو وہ یہ پتہ نہیں لگتا تھا سنی تھی۔ ان پر آج کل صرف اور صرف برس کی دھن سوار تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی گاڑی اجنبی شہر کی اجنبی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

"یہ اوہر سائن کرو۔" سید سلطان بخت نے میگزین کی ورق گردانی کرتی حالت کے آگے کوئی اشارہ پیر تائپ کاغذ آگے کیا۔

"کیا ہے؟" اس نے میگزین بیز پر رکھ کر پیر ہاتھ میں لہجے میں پوچھا۔
 "میں سید ہاؤس" سیل کرنا چاہتا ہوں اس کے پیپر نہیں۔" وہ لاپرواہی سے کہ کر ریو لوٹک پیپر پر جا بیٹھا۔
 "کیوں؟" وہ حیلے چوٹن سے بولیں۔

"میری مرضی۔" وہ پیپر بھلاتے ہوئے بولے۔ صالح خاموشی سے پیپر پڑھنے لگیں۔
 "مگر میں سیل کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔" چند منٹوں بعد سر اٹھا کر وہ نارمل لہجے میں بولیں۔
 "میں نے تم سے تمہاری مرضی نہیں پوچھی صرف سائن کرنے کو کہا ہے۔" وہ بے نیاز لہجے میں بولے۔

"مگر جب میری مرضی ہی نہیں تو میں سائن کیوں کروں۔" انہوں نے پیپر ان کی طرف اچھال دیا۔
 "میرا سائن اسنو پے عورت، تمہاری اتنی مجال کہ تم انکار کرو۔" وہ غصے سے تن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔
 "اچھا تو کیا کریں؟ میرا گاگھونٹ دیں گے۔ مجھے گولی مار دیں گے تو بعد شوق۔" وہ ہنس دیں۔ "مگر پھر بھی آپ کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا سید سلطان بخت! آئندہ بیس سال تک سارے آپ کے تے قدرت نے میرے ہاتھ میں رکھ دیے ہیں۔" وہ بڑا قول قول کر بول رہی تھیں۔ ساتھ ہی سلطان بخت کے ہاتھ رات سے بھی لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

"یہ بھول ہے تمہاری کہ بیس سال تک میں تمہیں برداشت کروں گا۔ تم میرے پیروں کی سیل ہو۔ دیکھنا کیسے

جان چھڑانا ہوں تم سے۔" وہ حقارت سے بڑکے پائے کو ٹھوکر مار کر بولے۔
 "اچھا کیسے، ذرا مجھے بھی تو بتائیں۔ ایسا کوئی طریقہ ہے آپ کے ذریعہ ذہن میں؟" وہ پھر ہنسیں۔ بس اس دن سے تو انہیں بات بات پر ہنسی آئے جارہی تھی جس دن سے وصیت نامے کی اس شق کا علم ہوا تھا۔ وہ آج کل اتنی مسرور تھیں کہ سلطان بخت کی دونوں کی غیر حاضری بھی نہیں کھٹکی تھی۔
 "یہ نہیں وقت بتائے گا کہ میں تم سے کیسے جان چھڑاتا ہوں، ابھی تم اس پر سائن کرو۔" انہوں نے کاغذ پیر سے ان کے آگے پٹا۔

"سائن کرتی ہے میری جوتی مسٹر سلطان بخت! اور یوں بھی میں سید ہاؤس کو کبھی فروخت کرنا نہیں چاہوں گی بلکہ میں تو سوچ رہی ہوں آج کل جا کر چند ہفتے اوہر گزاروں، موم، بخودا ڈو کی اس حویلی میں مجھے پڑے پڑے سڑک نہیں مرنے۔ حسین اللہ بھی مجھ سے کہہ رہے تھے سید ہاؤس بہت خوبصورت ہے۔ تمہارا بی خوش ہو گا اوہر جا کر۔" وہ اٹھ کر اٹھیں اور شملتی ہوئی ان کے پاس آکر کھڑی ہوئیں۔
 "آئی کی جیسی تمہارے حسین اللہ کی۔ وہ کون ہوتا ہے ہمارے گھر کے معاملات میں اپنے مشورے دینے والا۔ سلطان بخت نے سارا ادب لگانا بالائے طاق رکھا۔

"زبان سنبھال کر بات کرو مسٹر سلطان بخت! میرے بھائی کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات کی تو اچھا نہیں ہوگا۔" وہ شیرینی کی طرح غرا کر بولیں۔
 "اچھا! تو جو اب ہو گا تم دیکھنا۔ بس چند دن کی زندگی کے جو مزے لینے ہیں ہمیں لے لو۔" وہ آنکھیں سکود کر اسے دھمکی دیتے ہوئے بولے۔

"کیا؟ کیا کر لیں گے آپ مجھے مار ڈالیں گے۔ ہاں ہاں مجھے مار ہی ڈالنا چاہتے ہیں، پہلے دن سے پہلے روز سے یہ میں ہوں تو صدمہ من کر رہا ہوں۔" اس نے بھائی کو خبر کروا دیا تو وہ بھی اسی دھن سوار کی نمبریں ہمہ جا میں یہ میں ہوں تو صدمہ من کر رہی ہوں۔" وہ سڑیاتی انداز میں بیٹھنے لگیں۔

"اس سے کہو اپنے طرم خان بھائی کو کہنے اور خون کی نمبریں ہاؤس اوہر بھی کسی نے چوڑیاں نہیں پھین ر کھیں۔ ابھی دو حرف تمہارے من پر ماروں تو اس گھر میں کھڑے ہونے کو تمہارے پاس ایک انچ کی جگہ نہ رہے۔ جا کر اس بھائی کے گھر دھکے کھاؤ تمہیں بخت عورت۔" ان کے من سے مارے غصے کے گف نکلتے لگے۔ ان کے ناک کے تھنے پھر پھر رہے تھے اور آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔

"میرا بھائی مجھے سہارے گا تم سہار لو گے اپنی اس بڑھیا کٹنی بہن کو جس نے میرے نصیبوں میں یہ سیاہی پھیری ہے۔ زبان کی سیسی مکار ڈانٹن، دونوں گھروں میں جس کی حکومت ہے لے آؤ جا کر اسے اپنے گھر میں خود بخود ادرتے ہیں، سنی جاؤں گی پر یاد رکھنا وہ اوہر بھی نہیں آئے کی دست برداری اسے کبھی گوارا نہ ہوگی۔ تم سب نے میری زندگی تباہ کی ہے۔ میں تم سب کی زندگی تباہ کروں گی۔ جو کالک میرے نصیبوں میں بھری ہے تم لوگوں کے موضوعوں پر پھیر دوں گی، تم سب کے من کا لے کے تو صالحہ شاہ۔

"تزانخ۔ تزانخ۔ تزانخ۔ سلطان بخت نے کس کس کے ایک نہیں تین بھر پور تھپڑان کے منہ پر پڑ دیے ان کا ہونٹ پھٹ گیا۔ خون بہنے لگا۔ آنکھوں میں وحشت اور ہونٹوں پر چیخیں ساری حویلی میں گونجنے لگیں۔

"سلطان بخت! سلطان بخت! کیا ہوا کیا ہو گیا؟" سیدہ کی تیز گھبرائی ہوئی آواز روزے کے باہر سے آ رہی تھی۔ سلطان بخت نے آگے بڑھ کر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔

"لے جائیں اٹھا کر اس فساد کو بد زبان بے حیا عورت کو اس نے میری زندگی دو بھر کر دی ہے۔ بس تنگ آیا ہوں میں اس زندگی سے مگر یہ میرے سر پر ایسے ہی سوار رہی تو آپا خدا کی قسم میں اپنی زندگی ختم کر لوں گا۔" وہ صالحہ شاہ سے دگنا چیخ کر بول رہے تھے۔
 "زندگی تم کیا ختم کرو گے بزدل بے غیرت انسان، دیکھیں اس نے میرا کیا حشر کیا ہے۔ کسی ہم زور مرد سے بچے

لڑایا ہوتا آج تمہاری گردن پر یہ چہرہ ہی نہ ہو تا گھٹیا انسان۔"

صالحہ شاہ ساری حدیں پار کر گئی۔ وہ اپنا زخمی پتھر زہرہ چہرے لیے سیدہ کے سامنے آکھڑی ہوئیں اور سیدہ تو دونوں کے انداز گفتگو پر حیرت زدہ سی کھڑی تھیں۔

"بے غیرت تو تو ہے جو میرے دھتکارنے کے باوجود اسی وہیلز سے بڑی بیٹھی ہے اور وہ تیرا بد معاش بھائی جس نے بلیک میلنگ کے ذریعے مجھے میرے گلے سے لٹکایا ہے۔" وہ شاید پھر اس پر پل پڑتے اگر سیدہ سچ میں نہ آجاتیں۔

"کچھ خدا کا خوف کرو۔ تم دونوں کو کوئی خیال، کوئی لحاظ، شرم ہے ساری جو ملی میں تمہارے اس بیوہ بنگلے کا داویلا چاہے ملازموں کے سچ نمونوں نے اس جو ملی کی عزت کو دو کوڑی کا کر دیا ہے۔"

"آپ کو جو ملی کی شان کے دو کوڑی ہونے کا تم اٹھایا جا رہا ہے میری جتنی جاگتی زندگی وہ نہ بناؤالی اس کا کچھ دکھ نہیں، کوئی ملال نہیں۔"

صالحہ کے منہ میں تو زبان کی جگہ قہقہی فٹ تھی ہر منٹ کے بعد کتر کتر پیوند اصرارے جاتی۔

"تمہاری زندگی بے سکون ہوتی ہے تو ہم سب کی زندگیوں میں کون سا سکون رہ گیا ہے۔ اس کی یہ منحوس شادی ہو گئی ہے ہمارا تو سارا خاندان غلامی میں تماشیاں کر رہ گیا ہے۔ ہمارے بابا جان پہلے گئے ابھی ان کا کفن بھی میلا نہیں ہوا کہ تم دونوں کے جھگڑوں نے ہر احساس کو مس نس کر ڈالا ہے۔" سیدہ سچ اٹھیں۔

"منحوس تھی یہ شادی تو کیوں کروائی؟ کیوں میری زندگی تباہ کی؟ میں جتنا رہا مگر کسی نے پروا نہ کی۔" سلطان بخت نے دھاڑ کر کہا۔

"آخر اب کیا اقدام پڑی ہے اب جھگڑا کس بات پر ہے۔" سیدہ کو خیال آیا اگر اسی طرح سب ایک دوسرے کو الزام دیتے رہے تو سچ ہو جائے گی مگر کمرے کا ماحول ٹھنڈا نہیں ہوگا۔

"پوچھیں اس سے۔" سلطان بخت نے نفرت سے صالحہ کو دیکھا۔

"اپنے منہ سے اپنے کروت کی تفصیل بتادیں تو اچھا ہے میں کچھ زیادہ کہہ دوں گی تو تمہیں مر جائیں گے۔" وہ اپنے گلے جا کر نشو سے اپنے ہونٹ کا بہتا خون صاف کرنے لگیں۔

"دیکھا تو دیکھا آپ نے اس کی زبان۔" سلطان بخت نے چلا کر سیدہ کو دیکھا۔

"دیکھ رہی ہوں سب اب تم دونوں کچھ کو گے یعنی آخر یہ فساد کس بات پہلچایا ہے؟"

"میں سیدہ اس سیل کرنا چاہتا ہوں اس دو گے کی عورت کو سامن کرنے کو کہا تو اسے ٹالک لگ گئی جیسے میں اس کے باپ کی جائیداد فروخت کرنے جا رہا ہوں۔"

"آج اپنے باپ کی فروخت کرنے جا رہے ہو کل میرے باپ کی بھی فروخت کرنے کی نوبت آجائے گی۔" وہ نخواست سے بولیں۔

"مگر تم سیدہ اس کیوں سیل کرنا چاہتے ہو۔ بابا جان نے کس چاؤ سے تمہارے لیے بنوایا تھا کہ شہر جا کر تمہیں ہوٹلوں میں نہ رہنا پڑے۔" سیدہ کے لیے یہ انکشاف حیران کن تھا۔

"میرے لیے بنوایا تھا اب میں ہی فروخت کرنا چاہتا ہوں میری مرضی۔" وہ ہٹھائی سے بولے۔

"یہ تو اچھی بات نہیں سلطان بخت! اچھی بھلی کروڑوں کی پراپرٹی تم پر اپنی دل چاہنے پر سیل کرو۔" سیدہ بیچے کے حق میں کبھی بھی نہیں ہو سکتی تھیں۔

"تو کروڑوں کی پراپرٹی کو سینے سے لگا کر رکھیں مجھے کہیں سے زہر لادیں اگر میں اپنی مرضی سے ایک بچہ بھی نہیں توڑ سکتا تو ایسی زندگی سے مر جانا ہی اچھا۔" سلطان بخت نے شدید غصے کے عالم میں کہا اور دروازے تک راستے میں آئی ہر چیز کو گھوم کر مارتے باہر نکل گئے۔

"سلطان! سلطان بخت! بات تو سنو۔ دیکھو اور پھر آؤ بیٹھ کر بات کرو یوں غصے میں یا ہر نہ جاؤ۔ سلطان! سیدہ

کارڈیور تک ان کے پیچھے گئیں مگر انہوں نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

"اگر میرے بھائی کو کچھ ہو گیا تو اپنی زندگی کے یل بھی گن رکھنا صالحہ شاہ! ہمارے صبر کو اور نہ آزماؤ۔" دروازے میں کھڑے ہو کر ایک تقاربت بھرے انداز میں سیدہ نے صالحہ شاہ کو مخاطب کیا اور تیز قدموں سے چلتی

کارڈیور سے آگے بیڑھیاں اتر گئیں۔

"یہ دھمکیاں مجھے مت دو۔ اپنے مینٹل بھائی کو سنبھالو سیدہ بھابھی!"

"صالحہ ادھار رکھنے کی قائل نہیں تھیں۔ پیچھے لپک کر کارڈیور سے چلائیں سیدہ نے کوئی جواب نہیں دیا وہ نیچے جا چکی تھیں۔ صالحہ نے زور سے پاؤں زمین پر مارا اور مڑ کر اپنے بیڈ روم میں جانے لگیں تو شہرینہ کو اپنے کمرے کے دروازے میں دھواں دھواں سا چہرہ لیے کھڑے دیکھا۔ جیسے ہی صالحہ کی نظر اس پر پڑی وہ محبت سے اندر کی طرف مڑ گئیں اور دروازہ بند کر لیا۔

سلطان بخت اور صالحہ کے جھگڑے کی آوازیں وہ اپنے کمرے میں بیٹھی سنتی رہی تھی اس سے بڑھتا مثیل ہو گیا ان کے جھگڑے کے زور دار انتقام سے ڈر کر وہ باہر نکلی تھی۔ سیدہ اور سلطان بخت جا چکے تھے۔ شہرینہ اپنے کمرے میں بچھپ کر فون گئی۔ اسے بہت ڈر لگ رہا تھا اسے لگتا تھا دونوں میں ایک دوسرے کو یقیناً مار ڈالے گا

آج نہیں تو کل۔

وہ دو گھنٹے کمرے میں بیٹھی بابا جان کو یاد کر کے روتی رہی۔ جب ملازم نے دروازہ کھٹکھٹا کر اسے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو وہ اس لیے نیچے آئی کہ شاید اسے کھانا آپسے ہوں یا بھابھی بیگم کمرے سے نکل آتی ہوں جس کی امید تو کم ہی تھی۔ جمائی سا تڑوا ٹنگ ٹنگ ٹنگ جس پر چار اقسام کی لذیذ ڈشز چتی گئی تھیں۔ خوبصورت نازک انگلیں

کراری ٹھنڈے مشروبات، دو قسم کی سوٹ ڈشز اور ویران کرسیاں اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔

"تھو نے شاید تو اچھی میں ہیں انہوں نے کہہ دیا ہے کہ انہیں بھوک نہیں۔ بیگم صاحبہ نے اپنے کمرے میں کھانا منگوا لیا ہے اور بڑی باگن تو شام کو ہی چلی گئی تھیں۔" اس کے انتہا پر ملازم کے جواب نے اسے

باؤس کر دیا۔ اس نے دو چار بیچ پلاؤ کے لیے اور پلاؤ کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا میرا کسی کو بھی خیال نہیں گیا میں اس کمرے میں بالکل خال تو ہوں۔ ناماں نہ باپ نہ بھائی کی ترجیحات میں سے نہ بہن کے لیے ضروری تو پھر میں کھان ہوں۔" کمرے میں آکر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ آج سے پہلے اس طرح کا احساس تمہاری اس کے اندر نہیں جا کا تھا۔ جو ملی میں نوکروں کا راج تھا۔ صالحہ کو کسی بات سے دلچسپی نہ تھی۔ جب جو ملی کے مالک کو ہی اس سے دلچسپی نہ تھی تو وہ کیوں لیتی۔ سیدہ کتنی گمراہی کر سکتی تھیں اور ویسے بھی جب سے صالحہ نے انہیں ہر وقت اور ہر بے کاہل دیا تھا تو سیدہ نے اتنا کم کر دیا تھا۔

اسل سل روٹنے سے اس کا سر دیکھنے لگا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر وال کلاک کی طرف دیکھا ابھی تو صرف نو بجے تھے۔

"آٹھ اور نو بجے کے درمیان میں آؤں گا۔"

ایک دم سے اسے یاد آیا وہ سارا رونا دھونا بھول کر مارے جتنس کے کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر جا کھڑی ہوئی۔

نیچے جو ملی کا پائیں باغ تھا اور اس سے آگے دیوار جو ایک جگہ سے چنڈ اینٹیں اکھڑنے سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ دیوار سے آگے قبرستان تھا۔ اسی ٹوٹی دیوار کے پاس جا کر اس کی نظریں جم گئیں۔ ادھر نیم اندھیرے میں کوئی کھڑا تھا۔

"عبدالحمید۔" تو یہ آیا اپنے وعدے کے مطابق۔ صرف میری خاطر۔" وہ بڑبڑائی۔ "میں کیا کروں جاؤں۔ ہاں آج تو جی چاہ رہا ہے ادھر سے بھاگ جاؤں۔ کسی سے تو اپنے دل کی بات کہوں، کوئی تو میری بھی سے کوئی تو ہو جسے میں مخاطب کروں وہ مجھ سے کلام کرے جس کے آگے میں اپنا سینہ کھول دوں، کوئی تو ہے نا جس کو میری پروا ہے میری ضرورت سے۔"

وہ بے خودی کے عالم میں اس تاریک سائے کو تکتے ہوئے سوچنے لگی۔

اور کسی ٹرانس کی کیفیت میں دروازے سے باہر نکلی تھی کارڈور میں عمل خاموشی تھی اب تو رات بہت بھینک چکی تھی دو سرے گھر میں کشیدگی جاگنا بھلا کس نے تھا جب گھر کے مالکان کو گھر کی پروا نہیں تھی تو ملازمین کیوں بلکان ہوتے پھرتے وہ بھی سر شام ہی جا کر اپنی کوٹھریوں میں دیک جاتے تھے۔

شہرینہ کے لیے اوہرے دکھنا بے حد آسان تھا۔ اس نے ذینے کے پہلے قدم پر پاؤں دھرے۔ یہ میں لیا کرنے جا رہی ہوں۔

اچانک اس کا اور کایاؤں اور ہنسی رہ گیا۔ اس نے پہلے قدم کو عمل کرنے سے یکسر انکار کر دیا ایک چیخ تھی جو اس کے اندر سے نکلی تھی۔ "اے! ابھی گھر پر ہیں نہ بھی ہوں تو اس حویلی کی پتھر ملی دیواروں میں بھی آنکھیں جڑی ہیں جو کسی کو خبر ہو گئی تو؟" اس کا دل خوف سے دھڑک اٹھا۔

"اے! تو میری لاش کی بھی کسی کو ہوا نہیں لگنے دیں گے اور کیا۔" وہ کانپ اٹھی۔ "سیدہ تبا نے مجھے دیکھ لیا تو۔ نہیں۔ نہیں۔" وہ بھر پھری سی لے کر پلٹی اور بے جان قدموں سے واپس اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ "جو بھی ہو مجھے یہ حماقت زیب نہیں دیتی۔ اس وقت گھر کے حالات کس قدر بریشان کن ہیں اور میں سب کے لیے ایک اور پریشانی کھڑی کروں اور وہ وہ کٹے کاڑ کا وہ بھلا کیا دکرے گا۔ دو چار گھنٹے دلچ کر مجھے لگا ہے کہ وہ بہت ہیرو لگتا ہے اپنے قدم ابھی زمین پر نہیں اور میری خاطر زمانے سے لگنے کی شیشیاں بگھارتا ہے۔ شہرینہ! تم بھی اتم ہو گیا پچکانہ حرکت کرنے چلی گئیں۔ ایک۔ ایک۔" اس نے اپنے گھر والوں پر فوقیت دینے چلی گئیں کس قدر افسوس کی بات ہے۔ نہیں یہ میں ہرگز نہیں کروں گی۔"

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے باہر کی طرف دیکھے بنا کھڑکی بند کر دی۔ کمرے کی مین لائٹ بند کر کے اس نے ٹائٹ بلب جلایا اور بستر پر لیٹ گئی۔

"اوہ شاہتی آپ! میں آپ ہی کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔ دیکھیں تو ابھی صرف مین نمبر ہی ڈائل کیے تھے کہ آپ میرے سامنے موجود۔ اس کو کہتے ہیں پچے دل کی لگن پچے دل سے طلب کرو تو اللہ بھی سامنے آگھڑا ہو۔ ایم آئی رائٹ شادی؟"

زمین تارا ابو واقعی موبائل پر نمبر ڈائل کر رہی تھی اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ پر چونک کر مزہ اور سلطان بخت کو دیکھتے ہی پھیل اٹھی۔ اس کی آواز میں ایک انوکھی سی چکار تھی جو بہت دنوں بعد سلطان بخت کو اس کے لہجے میں سنانی دی تھی۔

"صحیح۔" سلطان بخت نے ایک گہرا سانس سینے سے خارج کر کے کہیں کی کرسی گھسیٹ کر بیٹھا چاہا مگر زمین تارا نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"یہاں نہیں شاہتی! اندر چلیں آپ کو ایک بہت زبردست خبر دی ہے بلکہ خوشخبری۔" اس کے چہرے پر دیا دیا سا جوش تھا دھوپ کی تمازت اتنی نہیں تھی بقنا اس کا چہرہ دمک رہا تھا ہلکی ہلکی سرفی سے آنکھیں چلتوں کی طرح جھلک رہی تھیں۔ سلطان بخت کو اس میں کسی انوکھی تبدیلی کا احساس ہوا۔ "ایسی کیا بات ہے جو یہاں نہیں ہو سکتی دھوپ اچھی لگ رہی ہے پچھو دیر بیٹھتے ہیں ادھر ہی۔" سلطان بخت نے سر سر ہی انداز میں کہا۔

"نہیں نا اندر چلتے ہیں۔ آئیں نا میں رات سے آپ کا بہت بے صبری سے انتظار کر رہی تھی۔ صبح بھی آپ کا نمبر ڈائل کیا تو شاید آپ کی سز نے ریسیو کیا اور میں نے بند کر دیا۔ اب مجھ سے اور صبر نہیں ہوتا۔" وہ بے صبری سے ان کا ہاتھ کھینچ کر بولی۔

"زمین تارا! میں نے تمہیں منع کیا ہے نا تم حویلی فون مت کیا کرو۔ وہ مینٹل عورت اور بالکل ہو جاتی ہے پوہنی

مراضہ ہے وہ ساری حویلی کو سر رہا لیتی ہے۔" سلطان بخت نے پرشوری سے کہا۔ "معلوم ہے مجھے شادی ایسی لے تو ادھر فون نہیں کرتی مگر خبر ہی ایسی تھی کہ مجھ سے صبر نہیں ہو پارہا تھا۔"

"خیر ایسی کون سی خبر ہے بتا بھی دو اب۔" سلطان بخت کچھ اکتا کر بولے۔ رات کے بھٹکے سے پہلے ہی ان کا ذہن بہت ڈپر لیس ہو رہا تھا اس وقت ان کا ہونٹ بھی "پوہنی" بوجھتے کاموڈ نہیں ہو رہا تھا۔

"پہلے اندر آئیں بات بتانے کی نہیں آپ کی اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرمانے کی ہے۔" زمین تارا کی شوخی اسی طرح بحال تھی۔ سلطان بخت نے ایک کرسی نظر اس کے خوش خوش چہرے پر ڈالی اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ انہیں اپنے نیند روم کی طرف لے گئی۔ اندر کمرے میں قدرے نکلی تھی سیاہ دھوپ سے اٹھ کر آئے تھے۔ اسی لیے شہناک کچھ زیادہ ہی محسوس ہوئی تھی۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑے رہے۔ بیٹھنے کا ان کا ارادہ نہیں تھا۔ زمین تارا نے ڈرنگ ٹیبل کی دروازہ کھولی اور ایک سفید لٹافہ نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔

"اس میں کیا ہے؟" انہوں نے الجھن بھری نظر سے دیکھا۔ "خود ہی پڑھ لیں۔ نہیں تارے شہر میں مسکراہٹ سے نظریں نہ اٹھیں۔ انہوں نے اللہ کر لٹافہ کھولا اندر زمین تارا کے میڈیکل ٹیمٹ کی رپورٹ تھی اور سامنے خوب پراسا لکھا "پوزیٹو" ان کا منہ چا رہا تھا۔

"ذات مان سینس" انہیں جیسے اس کا ہی لگ لگی۔ ہاتھ میں پکڑی رپورٹ انہوں نے زمین تارا کی طرف دیکھی۔

"شادی! زمین تارا کا مسکراہٹا چہرہ ایک لمحے سے تاریک ہو گیا۔ وہ ان کے رمی ایکشن پر حیرت زدہ سی رہ گئی تھی۔ وہ تو مجھ رہی تھی تو وہ بے حس و حرکت ہی کیونسی ہو گئی۔ یہاں ہو جائیں گے۔ رات سے وہ خود کو کئی بار ان کی باتوں کے بے اختیار اٹھنے کے لیے کوشش کر رہی تھی۔

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے جو ان خرافات میں پڑ رہی ہو۔" ان کی آنکھوں سے شعلے سے لپکنے لگے۔ "میں۔ میں پڑ رہی ہوں شاہتی! ان خرافات میں۔" اس نے حیرت اور رنج سے شہادت کی انکی اپنے سینے کی طرف کرتے ہوئے بہت آہستگی سے کہا۔

"زمین تارا "Listen to me carefully" وہ دانت چرس کر بولے اور وہ قدم اس کے قریب ہنہ آئے اپنے آہنی ہاتھ کاٹنے اس کے نازک کندھے پر دیا کرور شتی سے بولے۔

"میں نے تم سے کتنا ضرور کیا ہے تمہیں اپنی بیوی بھی نہ پایا ہے تمہیں تمہاری مصومیت کو کسی بھی گندے رشتے کے لٹل سے بچانے کے لیے مگر اس کے باوجود تمہیں اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہیے تھی۔ تم ایک طوا نف کی بیٹی ہو اور رہو گی۔ چاہے تجھ جیسے دس سید زادے دس ہزار بار تمہیں اپنے عقد میں لے لیں مگر اپنی نسل بھی خراب نہیں کریں گے کوئی راسخینڈ۔"

ان کی آنکھوں کی گرفت اس قدر سخت تھی کہ زمین تارا کو لگا اس کے کندھے کی ہڈیاں ٹوٹ کر گوشت کے اندر سرایت کر رہی ہیں۔ وہ کتنی ہی حیرت زدہ سی ان کے لفظوں پر غور کرتی رہی۔ اسے تو اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا ان کے جملوں کا منہ مسموم سمجھ میں آ رہا تھا اور جب چند لمحوں بعد سمجھ میں آتا تو اسے لگا کسی نے اسے شیخ کر ساتویں آسمان سے زمین کے پائال میں دے مارا ہے۔ اس نے اپنا کندھا ان سے چھڑا کر انہیں ایک زور دار دھکا دیا۔

پچھو اور لغزت کی پینڈاریاں اس کی خوبصورت آنکھوں سے لپک رہی تھیں۔ "مگر سلطان بخت! اوقات تو شاید آپ اپنی بھول جاتے ہیں۔ آپ کو خبر ہی نہیں ہوتی جب آپ "مکمل گندے" کی اس بچہ میں بیٹے آرام سے قدم اٹھا کر میری خواہ گاہ تک چلے آتے ہیں۔ آپ اپنی اوقات اپنے مقام سے کتنا کر چلے ہیں کہ اگر آپ اب سات ہزار بار بھی کسی گڈنگل میں خود کو جا کر کھڑک کرنا چاہیں تو بھی اس غلاظت سے چھڑا لیں گے کیونکہ یہ اقرار تو آپ کرتے ہیں کہ آپ نے اس گندے سے ایک کتول اٹھا کر

میں بائیس برس کی عمر میں شادی کرونا چاہتے تھے۔ تم نے ہی اپنی بیٹی کو شادی میں ان کی خواہش کو نشہ رکھا۔“
سیدہ کی بے وقت کی رات سلیمان بخت کو قتل کیا۔ پسند نہیں آئی۔ یوں بھی باباجان کی وصیت کے بعد سے انہیں باباجان کے ذکر سے بھی بڑھ گئی تھی۔

”بدر تو اس تشنگی کا جانتے جانتے وہ لے ہی گئے۔“ سلطان بخت پر برائے۔
”کیا تم نے؟“ سیدہ نے اپنی غم آنکھیں صاف کیں۔

”کچھ نہیں اچھا۔ میں چلتا ہوں آرام کروں گا۔“ سلطان کا ہاتھ کھوٹا ہوا تھا۔ ”آپ ابھی اوہری ہیں نا؟“
”ارے نہیں میں تو بس جا رہی ہوں۔ شام کو چکر لگاؤ آجائوں گی اور نہ کل سہی۔ یہ تو مجھے صاف نے فون کر کے بلوایا تھا کہ اس کی طبیعت کچھ اچھی نہیں۔ دوسرے ایک اور بات۔“ وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئیں۔
”جی! سلطان بخت ہم تن گوش تھے۔ بہت دنوں بعد انہیں سیدہ آپا کی ہر بات اچھی لگ رہی تھی۔“
”ڈاکٹر نے کہا ہے کہ صاف ویسے تو بالکل ٹھیک ہے۔ بس خوش رہے، خوراک کھائے اور دوسرے کو تو بھلا

بہت سفر کسی دوسری جگہ کا کر لے تو اس کے لیے تبدیلی آج رہا ہو جائے گی۔ یوں بھی جب سے اس کی شادی ہوئی ہے تم اسے نہیں لے کر گئے۔ لے کر جاؤ گے تو اسے یقین بھی ہو جائے گا کہ اب تمہاری تمام تر توجہ اسی کی طرف مینڈول ہے پھر تم دونوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے میں کئی عرصے کی۔ کچھ وقت کسی پر فضا جگہ برائے گزرو گے تو مزاج کی بہت سی تبدیلیاں آئیں گی۔“

”اوکے آجائیں کوشش کروں گا۔“ وہ گرا مانس لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔
”کوشش نہیں بنانا ہے تم نے۔ ہفتہ دن دن میں گزارو جا کر۔ میں چاہتی ہوں ادھر دیکھ بھال کے لیے۔ اس کا دل بہل جائے گا۔“ سیدہ ہنسنے لگی۔

”ٹھیک ہے آجائیں جیسے ہی کوئی پروگرام میٹ کرتا ہوں آپ کو بتا دوں گا۔“
”جیتے رہو اللہ بیٹے کی صورت خوشی دے اس حویلی کے آگے میں اس کی کلاریاں کو نہیں۔ باباجان اماں جان کی رو میں کس قدر شاد ہو جائیں گی۔“

سلطان بخت مسکراتے ہوئے لاؤنج سے نکل گئے تو سیدہ بھی منظر انداز میں اٹھ کر باہر آگن میں آگئیں۔
صاف کروٹ لے کر شاید سو رہی تھی کیونکہ دروازہ کھلتے اور بند ہونے کے کھلنے پر بھی اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا اور نہ وہ تو ہر وقت چوٹی کی طرح ہوشیار رہتی تھی۔ سلطان بخت نے کھانا کھا کر اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہا۔ وہ ڈرا کی ڈرا ابلی۔ سلطان بخت اس کی سائیڈ پر پڑی روم چیر کر جا بیٹھے۔ وہ نیم مندی آنکھوں سے انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔ سلطان بخت کی نظروں میں آپ ہی آپ کا گوت کاٹھا نہیں مارا سمندر اٹھ آیا۔ انہوں نے ہنسی محبت سے اس کی پیشانی پر آتے بال سنوارے۔

”ٹھیک ہے اب طبیعت؟“ ایسا پتھا لہجہ تو شاید وہ بھی نہیں مین تارا سے بھی نہیں بول پائے تھے۔
”آج خیال بہتر آئے گا اور طبیعت پوچھنے کا؟“ صاف اپنے مزاج کے کڑوے پن سے مجبور ہو کر بولی اور نہ سیدہ تو اسے خوب کھول کھول کر بھینس بلا کر گئی تھی جن پر عمل کرنے کا اس نے ان کے سامنے تو نہیں دل میں عہد کر لیا تھا مگر اب سلطان بخت کو سامنے دیکھ کر لہجہ از خود گڑوا ہوا گیا۔
”خیال آیا ہے تو یہاں موجود ہوں نا۔“ وہ اسی نرم لہجے میں بولے۔ ”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو تم نے مجھے کہا نہ بتایا؟“

دل چاہ رہا تھا آج ساری محبت جو اس رشتے کی متقاضی ہے عطا دیں۔
”مجھے خود کب علم تھا۔“ وہ شرمیلیں لہجے میں نظروں بھرا کر بولی۔
”ڈاکٹر کون سی دوا میں لکھ کر دے گی؟“ سلطان بخت نے کسی کی تلاش میں سائیڈ ٹیبل پر دیکھا۔
”وہ سیدہ بھابھی لے گئی ہیں دوائیں منگوانے کے لیے۔“

”تم نے کچھ کھلایا یا جوس پی لینا تھا۔“ سلطان بخت کو وہ کافی کمزور سی لگ رہی تھی۔
”جوس پی لیا ہے اب میں آرام کروں گی پھر اٹھ کر کچھ کھاؤں گی۔“

”اوکے میں فریض ہو کر ذرا بیٹھے جا رہا ہوں۔ مردان خانے میں کچھ مسمان آئے ہوتے ہیں۔ تم اٹھو گی تو پھر آگے کھانا کھالیں گے۔“
وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور واش روم کی طرف بڑھ گئے۔ صاف نے مسکراتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

”اماں جی ابھوک لگی ہے کچھ بھی نہیں ہے کھانے کو۔ صبح بھی میں چائے کے ساتھ آدھی سوکھی روٹی کھا کر گئی تھی۔ سارا دن بیٹ میں درد ہوتا رہا۔“
اماں جی تلخ کے بعد کی کھینچاوت میں مشغول تھیں۔ جب چوریہ ان سے آکر پلٹ گئی۔ ان کے تسبیح کے ڈالوں پر چلتے پھرتے رک گئے۔ وہ اسے کیا جواب دیتیں وہ نہیں واقعی کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر بونہی اس کا سر سلطانی رہیں۔

”اماں جی ابھوک لگی ہے وہ گود میں سر تھینے زور سے منڈائی۔“
”چھانچے میں آمنہ سے گئی ہوں، تمہیں کچھ کھانے کو دے۔“ انہوں نے اسے تسلی دی۔
”آمنہ۔ آمنہ بیٹا۔“ انہوں نے منہ اٹھا کر کے آواز لگائی۔
”جی اماں جی! وہ کتاب ہاتھ میں لیے باہر آئی۔“

”بیٹے اس کو کچھ کھانے کو دے اگر ہے تو۔“ ان کے لہجے میں عجیب سی عاجزی تھی آمنہ کو روٹا آنے لگا۔
”اماں جی! وہ تو ہے کہ ان کے پاس تخت پر ہی آئی تھی۔“ آج تو کچھ بھی نہیں ہے ڈال بھی ختم ہو چکی ہے اور آگے تو بائیں رو میں کھڑا ہے۔ میں نے سوچا تھا نمک ڈال کر بابا صاحب کو اور آپ کو پکا دوں گی۔“ وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی جیسے کوئی سن نہ لے۔
”بابا صاحب کو۔“ چوریہ چمک کر بولی۔ ”اور جو مجھے بھوک لگی ہے وہ اماں جی! اس کی آنکھیں جھلملانے لگیں ناں سے فریاد کرتے ہوئے۔“

”جا آمت! اس کو پکارے یہ کھائے۔ باقی بابا صاحب کو پکا دینا۔“
”نرا اماں جی! اس کے ہاتھ۔ چائے کے لیے نہ دووہ ہے نہ پتی۔“
”نمک مرچ کی کھینچ بھول لو تمہوڑا سما دھنیا اور یہاں زمین نے پراہ کھا ہے تو کمری میں۔“
”اماں جی! سر نہیں ختم ہیں۔ چلیں نمک ڈال کر بنا دیتی ہوں۔ براہی تو میں پڑھ رہی ہوں تمہوڑے سے تو دن رہ گئے ہیں امتحان میں۔ چوریہ کی پٹی اچھے بھی بے وقت کی بھوک لگتی ہے۔“
آمنہ نے پرہیز کر کے چوریہ کو کھوڑا ہوا اٹھ کر اس کے پیچھے ہی پل بڑی۔

”یا اللہ یہ اب کون سی آزمائش ہے ابھی تو صوفی صاحب کو نیکوہ ملنے میں بھی پورے سات دن باقی ہیں ان سات دنوں میں کیا کریں گے تو زندگی دینے والا ہے اور زندگی کو پرقرار رکھنے والا تمہارے حال پر رحم فرما۔“ تسبیح کرتے کرتے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

انہیں پکانیک گاؤں کے اسٹور میں رکھے گئی کے دو کسٹریچاؤلوں کی تین بوریاں ڈوگنڈم کی بوریاں ڈالوں کے ملنے لڑکی آدھی بوری اور چینی کا تھیلایا د آنے لگا۔ ابھی تو ان کا روز کا معمول بن گیا تھا، رات کو سونے سے پہلے ان تمام وظائف کا اٹھ ہی رات تک دور کرنا جن سے رزق خود چل کر گھر کی دلہیز تک آتا ہے ٹکرت جانے ان وظائف کی تاثیر کہاں ملتی تھی۔ کچھ اثر ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ ان بدن گھر کی معاشی حالت بگڑتی جا رہی تھی اور جب دن لڑے آتے ہیں تو زمین بھی تنگ پڑنے لگتی ہے۔ رزق بھی ہوا کے ساتھ اڑا جاتا ہے اور انسان کا تو پہلا امتحان ہی شلم سے شروع ہوتا ہے کہ شلم کی مار سے سخت ہوتی ہے۔ رزق کی تنگی بندے کو کفر تک لے

جاسکتی ہے۔ ”یا اللہ اس وقت کی لُحُحی کے آنے سے بچانا۔“ وہ بے اختیار سجدے میں گر کر گڑگڑاتے ہوئے دعا کرنے لگیں۔

”آمنہ! میرے لیے بھی روٹی پکاؤ۔ صبح سے پڑھ کر حد سے دھواں اٹھنے لگا ہے۔“ زینب بھی کتاب ہاتھ میں لیے آمنہ کے سر پر آکھڑی ہوئی۔

”صرف تین روٹیوں کا آنا ہے ایک مجھے جو ریزہ کو دینی ہے اور دو بابا صاحب کے لیے۔“ آمنہ روٹی جلتے ہوئے رکھائی سے بولی۔

”تو ہم“ زینب چلائی۔ ”میں کیا کھاؤں گی مجھے تو سخت بھوک لگی ہے۔ مجھے تو تم ہی والی روٹی دے دو بابا صاحب خود ہی کچھ کھالیں گے نیچے مسجد سے مجھ سے تو صبر نہیں ہوتا۔“ وہ ندیدوں کی طرح آمنہ کے بالکل پاس ہی بیٹھ گئی کہ روٹی تو سے اترے اور وہ تھپٹ لے۔

”زینب! بابا صاحب نے صبح بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ اب آنے والے ہیں بابا صاحب کہہ رہے تھے غلام کو آنا منگوا دیں گے شام ہونے میں چند گھنٹے ہی تو ہیں۔ کچھ دانے بڑے ہیں بھونے ہوئے ہم دونوں وہ کھالیں گے جو ریزہ تو اسکول سے آئی ہے اسے بھوک لگی ہے۔“ آمنہ نے اسے گل سے سمجھایا۔

”ہاں ہاں تمہارے زمانے کو بھوک لگی ہے سب کا خیال ہے اور ہمارے لیے بھونے چند دانے آخر کس حکیم نے مشورہ دیا تھا بابا صاحب کو گاؤں چھوڑ کر آنے کا۔ وہاں کم از کم کچھ کن کن کر لقمے تو نہ ملتے تھے۔ میں تنگ آئی ہوں ان ناقوں سے۔“ وہاں کھا کھا کر میرے منہ کا ذائقہ ہی ختم ہو گیا ہے۔ آخر ساری دنیا ہی تو مزے کر رہی ہے ہم ہی کیوں یہ سزا بھیل رہے ہیں۔ آخر ہم۔“ وہ کمر پر ہاتھ رکھے خوب اونچا اونچا بول رہی تھی۔

”زینب! دلخ شک ہے تمہارا کیوں اول فول بول رہی ہو۔“ اماں جی کی گڑگڑ دار آواز زینب کی طرف سے آئی۔

”اماں جی! میں غلیظ نہیں کہہ رہی۔ میں تنگ آ چکی ہوں کچھ کچھ کھوں گی۔ مجھ سے بھوک برداشت نہیں ہوتی۔“ وہ روہینے کو بھی ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

”زینب! پتھر انفس کے اتنے غلام ہوتے اسے تھوڑا سختی میں بھی ڈالتے ہیں۔ اگر ایک وقت کم خوراک ملے یا اچھی نہ ملے تو یوں داؤد بنا کر اللہ کے بندوں کو زینب نہیں دیتا۔“ اماں جی نے پار سے اس کا کندھا تھپکایا۔

”کیا اللہ کے بندے صرف ہم ہی ہیں۔“ وہ تنگ کر بولی۔ ”کھانا کھانا انفس کی غلائی ہے کیا؟ اگر غلائی ہے تو اللہ نے ہی اس نفس کو ہمارے ساتھ لگایا ہے۔ جس طرح ہمارے ہاتھ پاؤں انفس میں کان دے کر ہمیں پیدا کیا ہے اسی طرح نفس کو بھی ہمارے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اب اگر اس کی ضرورت نہیں ستانی ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور۔“ وہ معصوم سا چہرہ بنا کر بولی۔

”بچے! انفس کی ضرورتوں کا ہر وقت ہی خیال نہیں ہونا چاہیے۔ کبھی کبھی اسے فراموش بھی کرونا چاہیے۔“

”اماں جی! ہمارے گھر میں کبھی کبھی نہیں ہر روزی نفس کو فراموش کرونا پڑتا ہے۔ ہر حال مجھے بھوک لگی ہے۔ آمنہ! اگلی روٹی میری پکاؤ۔“ وہ دو ٹوک انداز میں بولی۔

”اماں جی! ایک بات کہوں۔“ روٹی بننے دیکھ کر وہ مطمئن ہو گئی۔

”بولو۔“

”اماں جی! آپ عبد المتین بھائی کا پتا کروائیں، جیل کے ذریعے وہ تو ادھر کہیں نوکری بھی کرتے تھے وہ کچھ نہ کچھ تو ہمیں بھیج دیا کریں۔“ زینب آہستگی سے بولی۔

”زینب! آج یہ بات کہی ہے آئندہ مت کہنا۔ تمہارے بابا صاحب کو پتا چل گیا تو زمین آسمان ایک کر ڈالیں گے۔“

”اماں جی! بابا صاحب سے کہیں زمین آسمان ایک نہ کریں ہم سب کو ایک ایک کر کے زمین کے اندر اتار دیں۔ ان کا برا کرم ہوگا ہم پر۔“ وہ جمل کر بولی۔

”بد تمیز! بے ادب لڑکی! تیرا تو ماں خ ہر وقت اٹنا چلتا ہے اس بے حیا کو اگر خیال ہو تو وہ ٹونڈ پلٹ کر خبر لیتا کہ یوڑھے ماں باپ، جوان بہنوں کے ساتھ کس حال میں ہیں۔ لوگ بیٹوں کے پیدا ہونے کی آرزو میں مرے جاتے ہیں اور ہمیں اللہ نے دو دیے اور دونوں ہی بے حس اور نافرمان۔ دوسرے کو ادھر سے گئے دس بارہ دن ہونے کو آئے۔ بد رست کا کہہ کر کیا تھا اور تمہارا بابا صاحب بتا رہے تھے وہ دوسرے پہنچا ہی نہیں۔“

”اماں جی! آپ لوگوں نے بھی خواہ مخواہ دوسرے کی بیخ کنی کے ساتھ لگا رکھی ہے۔ اس نے کچھ نہیں پڑھنا پڑھنا روٹی کس کے ساتھ کھاؤں؟“ روٹی تو سے اترتی دیکھ کر وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

”خبردار! بابا صاحب کے لیے ہے۔“ آمنہ نے چٹخیر جلدی سے دوسری طرف کر لی۔

”ارے تم رہنے دو یہ تو میں ہی کھاؤں۔“ اسی وقت صوفی صاحب کے اٹھنا سار کر آخری سیڑھی پر قدم رکھنے کی آواز آئی۔ زینب اپنا دوشہ درست کرنے لگی۔ صوفی صاحب جا کر تخت کے دوسری طرف بیٹھ گئے۔

”میں نے انہیں نہیں لگایا۔“ انہوں نے بغیر کسی کو مخاطب کیے پوچھا۔

”میں نے تو انھی کا ام یا ک بڑھانا ہے صبح دیر سے ناشتہ کیا تھا۔ آمنہ اور زینب کہہ رہی تھیں ہم تھوڑی دیر میں بڑھ کر کھائیں گے۔“ وہ بولی تو بھوک لگی تھی وہ کھار ہی ہے۔ آپ کے لیے کھانا لگائے آمنہ؟“ اماں جی نے سنبھل سنبھل کر کہا۔ ”صبح بھی آپ نے کچھ نہیں کھایا تھا۔“

”نہیں میرا روزہ ہے آج۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”روزہ! وہ کب سے ہوئیں۔“ سحری کے وقت تو آپ نے کچھ لیا ہی نہیں؟“

”میں صبح اٹھا تو نیت کر چکا تھا۔ تم لوگ کھانا کھاؤ میں ذرا آرام کروں گا۔“ وہ اٹھ کر جانے لگے۔ ان کے کندھے جتنے ہوئے تھے بہت خراب لگ رہے تھے۔ اماں جی کا دل دکھ سا گیا۔

”وہ شام کے لیے آپ کب کھاتے تھے؟“ آنا اور وال منگوا دیں گے۔“ وہ جھجک کر بولی۔

”ہاں جیل کو پیسے دے آیا ہوں وہ آنا والی تھوڑے سے چاول اور آلو یا ز سائتھ میں ایک سبزی لے آئے گا ابھی۔ وہ بچہ تھا نا صبر اس نے قرآن ختم کر لیا تھا اس کے والد صبح دو سو روپے دے گئے تھے کہ پچاس روپے کی مسجد کے بچوں میں شیرینی منگوا کر پانٹ دیتے گا باقی آپ رکھ لیجئے گا۔ سنی میسے میں جیل کو دے آیا ہوں۔“ لہنے گیا ہے وہ سووا۔“ وہ وضاحت کر کے اندر کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ اماں جی افسردگی سے اس میں جاتا دیکھتی رہیں۔ ”کتنے کمزور ہو گئے ہیں ان چھ آٹھ ماہ میں ہی۔“

”اماں جی! جیل سے کہیں ایک پاؤ بڑا گوشت ہی لے آئے۔ اتنے دن ہو گئے ہیں گوشت کا ذائقہ چکھے ہوئے۔“ زینب پاس آکر فوراً ندیدے پن سے بولی۔

”بچے! ان بیٹوں میں سات دن کا آنا وال آجائے تو اللہ کا شکر ادا کرو جاؤ جا کر تم روٹی کھاؤ اور اب مجھے تنگ نہیں کرتا۔“

وہ آنکھیں بند کر کے تسبیح کرنے لگیں اور زینب پر اسامہ بنا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہیلو ہاں شہباز و علیکم السلام! جیتے رہو۔“ مسز خان جیسے خوشی سے جھک اٹھیں۔

”میں نے رات کو بھی تمہیں فون کیا تھا، کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ صبح بھی ڈرائی کی تم ملے نہیں۔ اچھا ہوا، اب تمہارا فون آیا۔ میں شدت سے تمہارے فون کی منتظر تھی۔“

ان کے لہجے سے خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔

”رات کو مجھے آپ کا پیغام مل گیا تھا۔ صبح وقت نہ مل سکا اس لیے اب کر رہا ہوں خیر تو ہے۔ ویسے مجھے بھی آپ سے ضروری بات کرنا تھی۔“ مسز خان شہباز کا لہجہ اسی طرح نارمل سا تھا جیسے کئی مہینوں سے چلا آ رہا تھا۔

”تم فون بھی تو اب کئی دن نہیں کرتے۔ آج تم پندرہ دن بعد فون کر رہے ہو۔“ وہ گلہ کرتے ہوئے بولی۔

”ام جان! جب بھی وقت ملتا ہے سب سے پہلے آپ کو فون کرنا ہوں۔ آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟“
 ”اللہ کا شکر ہے میں تو آج کل اپنی سب بیماری بھولے ہوئے ہوں۔“ وہ اسی لمحے میں بولیں۔
 ”خیریت! کسی کیا بات ہے۔“ ان کے لمحے نے بالآخر کیپٹن شہباز کو چومکنے پر مجبور کر دیا۔
 ”خوشخبری میرے بچے! بہت بڑی خوشخبری۔“ وہ سینس پیدا کرتے ہوئے بولیں۔
 ”ابھی کیا میری زندگی میں کسی خوشخبری کی گنجائش باقی ہے۔“ وہ پھیرے سے بڑھائے۔
 ”ایسا کہا میں نے نہیں سنا۔“ مسزخان سن کر بھی انجان بن گئیں۔
 ”کچھ نہیں! آپ کیا کہہ رہی تھیں! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے! آپ میری بات سن لیں۔“
 ”تم آگے رہو۔“ وہ ان سنی کر کے بولیں۔
 ”بھی بی الحال نہیں۔“ وہ کچھ آگے بڑھے۔

”ہو! کیا بات ہے۔ کوئی بات ہوتی ہے تو تمہیں ماں کو فون کرنا یاد آتا ہے۔“
 ”ام جان! میں نے بہت سوچا ہے بہت غور کیا ہے اتنی سوچ بچار کا نتیجہ یہ نکلا ہے اس لئے میں نے آپ کو فون کیا ہے کہ میں نے فیصلہ لیا ہے۔“
 ”دیکھو شہباز بیٹا! جتنا نہیں تم لیا ہے جارہے ہو تمہاری باتوں سے لگ رہا ہے کوئی کسی بات ہے تو بچے ایسی باتیں سامنے پیش کر کے والی ہوتی ہیں۔ میرا بھی دل تم سے ملنے کو بہت چاہ رہا ہے تم چلے آؤ اور جو خوشخبری میں تمہیں سنائے جارہی ہوں۔ اس کے بعد تم روک بھی نہیں سکتے فوراً دوڑے چلے آؤ گے۔“ وہ شہباز کی لمبی چوڑی تمہید سے بیزار ہو کر بولیں۔

”پھر سنا چکیں آپ سی اور میں ابھی نہیں آسکتا یہ بھی سن لیں! آپ! وہ جیسے چل کر بولے۔
 ”شہباز! بہت تمہیں بہت قیمتی گفت دینے جارہی ہے جو نہ تو کوئی کسی دکان پر جاسکے نہ سارا مال وہ دولت دے کر خریداجا سکتا ہے۔ تم نے تو اسے اب تک کوئی ایسی خوشی کوئی ایسا لطف نہیں دیا جو اس کے چہرے پر خوشی بن کر جھلک سکے۔ شہباز! تمہا پ بننے والے ہو اور میں دباؤ میں بول رہا ہوں اسے اس خوشخبری کا کوئی مول۔“
 بہت کچھ جنتاے ہوئے انہوں نے بالآخر وہ خوشخبری اکل ہی دیکھی اس نے کل سے ان کی آنکھوں کی نیند تک چرائی تھی۔ دوسری طرف ایک لمبی خاموشی تھی وہ ڈر رہی تھیں کہ شاید ان میں کنبہ کٹ ہو گئی ہے یا۔۔۔
 ”بھلا! وہ شہباز بیٹا! تم سن رہے ہو تم نے سنا! وہ روک روک کر بولیں۔
 ”جی ام جان! سن لیا۔“ ایک لمحے کے بعد انہوں نے ایک گہرا سانس لیا جیسے ان کے اندر حوصلے پرتوں میں بوجھ آن کر رہا ہو۔

”تمہیں خوشی نہیں ہوتی سن کر۔“ وہ حیرت سے بولیں۔
 ”جانتا نہیں ام جان! میں جو کچھ دل کی خوشی کے لیے کہنے لے کرنا چاہتا ہوں وہ خدا کو کیوں منظور نہیں ہوتا۔ میرے لیے اس زمین پر جی خوشی کیوں سمجھا ہو گی ہے میں کچھ سوچتا ہوں اس پر عمل کرنا چاہتا ہوں کہ سب کچھ الٹ پلٹ جاتا ہے سب کچھ۔“ وہ بے سختی سے جملے بول رہے تھے یا شاید مسزخان کو لگا۔
 ”شہباز! تم لیا کہہ رہے ہو بیٹا! تم ٹھیک تو ہونا نہیں تمہاری بات سمجھ نہیں سکی۔ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“ وہ الجھ کر بولیں۔

”ام جان! کہی تو مصیبت سے ساری۔ آپ اول دن سے ہی میری کوئی بات نہیں سمجھ پارہیں نہ سمجھنا چاہ رہی ہیں اور اب شاید میں آپ کو کبھی بھی نہ سمجھا پاؤں۔ خدا حافظ۔“ فون بند ہو چکا تھا۔
 ”عجب لڑکا ہے یہ! نہ کوئی رسپانس دیا نہ کوئی ہمت کی بات کی۔ اوٹ چاٹک بات کر کے خود ہی فون بند کر دیا۔ جانتا نہیں کیا کہنا تھا اس نے مجھے تو اس کی کوئی بات کچھ نہیں آئی۔ معلوم نہیں اسے جو کیا کیا ہے۔“ وہ ریپورر ہاتھ میں پکڑے خود سے کہے جارہی تھیں۔

”ام جان! خیریت! آپ کس سے باتیں کر رہی ہیں۔“ عالیہ اچانک کمرے میں داخل ہوئی۔ انہوں نے گڑبڑا کر ریپورر کر ڈیل پر رکھ دیا اور مسکراتے لگیں۔

”کسی سے بھی نہیں! شہباز کا فون آیا تھا! ابھی بند ہوا ہے نا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔
 ”ہاں! کل اظہر کے پاس بھی آیا تھا۔ بتایا نہیں اس نے کب آتا ہے؟“
 ”جلد ہی آئے گا کہہ رہا تھا۔“ وہ المیہ منان سے سہلا کر بولیں۔
 ”مگر کل بھائی سے تو کہہ رہا تھا! میں وہ نہیں آسکتا! وہ تین ماہ تک۔“ عالیہ کمری پر بیٹھ گئی۔
 ”اچھا! مجھ سے تو ایسا کچھ نہیں کہا اس نے۔“ وہ آرام سے بولیں۔
 ”میں اس لیے آئی تھی کل آپ نے مشائی بیٹی بھی کوئی خوشخبری ہے کیا۔“ وہ مشائی نظموں سے سانس کا پتلا ترہو لے رہی تھی۔

”نہیں! کوئی تو کوئی بات نہیں۔ میرا کل کھانے کو بی چاہ رہا تھا، منگوا لی تھی پھر۔۔۔ چاہتے بھی کھا لیں گے اس لیے وہ تو ان طرف بھی بچوا رہی۔“ وہ ابھی عالیہ کو کسی بھی خوشخبری کی ہوا نہیں لگنے دینا چاہ رہی تھیں۔
 ”اچھا۔“ وہ اچھا کہ خوب لہا لہا کر کے بولی۔ ”کل ڈاکٹر عاتق کی مسز آئی تھیں ڈاکٹر سائز۔ خیر تو کبھی؟“ ”آف کس قدر باخبر عورت ہے یہ۔“ مسزخان نے ہنسیلا کر سوچا۔
 ”خیر کبھی میرا لی بی کو ہو گیا تھا میں نے بلوایا تھا۔“
 ”اچھا! میں بھی شاید۔“ اس نے وہ بھی انداز میں ادھر ادھر جملہ چھوڑ دیا۔
 ”آپ کی ہو بیگم نظر نہیں آرہیں۔“ عالیہ نے یونہی ادھر ادھر کمرے میں دیکھا جیسے ہو بیگم کسی دیوار پر بھی نظر آجاتی تھی۔

”آجائیں گی۔“
 ”میں ہو بیگم تو تمہیں جو سنا ہے۔“ مسزخان نے طنز اس کی طرف لوٹایا۔
 ”مگر وہ تو اب کی خاص خاص وقت ہے۔“ وہ زور سے کہی۔
 ”اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے ویسے اپنے کہنے ہی میں ہو گی۔“
 ”خیر! وہ زیادہ تر اپنے کمرے ہی میں باقی جاتی ہیں۔ یہ شہباز سے ساتھ کیوں نہیں لے جاتا آخر آرمی میں اتنی سہولت تو ہوتی ہے کہ بندہ ٹیلی کو سلنگ سے اس کے ساتھ ساتھ آئے ہونے کو آئے ہیں۔“
 ”ابھی تو زمر بہت میرا سنا ہے ابھی رے کی۔ شہباز کو ابھی اپنے کیریئر کی فکر ہے پچھتاہ میں اس کے انگریز ہونے والے ہیں اسے ابھی ملنا کام نہیں ملتا کہ بار بار ادھر دوڑا آئے۔ میں نے خود اس سے کہہ رکھا ہے کہ یکسوئی سے اپنے امتحان دینے لے پھر کہی جائے گی۔ معاف۔ معاذ بیٹا! یہ فون تو ڈر رہا۔“

”وہ آگے کے باہر سے گزرتے معاذ کو دیکھ کر انہوں نے آواز لگائی۔ اس نے اندر آکر ان کے بستر پر ا فون اٹھا کر سائڈ ریک میں رکھ دیا۔
 ”گورنمنٹ ہانوسے کتنا میں آرام کرنے لگی ہوں۔ چائے میں اٹھ کر ہی پیوں گی۔ دو امیں نے لے لی ہے اس لیے غنودگی سی آرہی ہے۔ سر بھاری ہو رہا ہے، تھوڑا آرام کروں گی تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ تم نے کھانا کھا لیا؟“

”جی! وہ مختصر جواب سے کر رہا ہے نا لگا۔
 ”معاذ! تم فارغ ہونا ڈرا میرے ساتھ مارکیٹ تک جانا ہے مجھے کچھ بیکن کا مسلمان لینا ہے سب کچھ ہی ختم ہے۔“ عالیہ سانس کی غنودگی کا سن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ معاذ متذہب سا کھڑا رہ گیا۔ وہ کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں پڑھنے ہی جا رہا تھا۔ فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکا۔ مسزخان نے اس کی شکل دیکھی۔
 ”عالیہ! معاذ تمہارے ساتھ کل چلا جاتے گا! ابھی اسے زینون بانو کے ساتھ بازار جانا ہے۔ اسے بھی بیکن کا مسلمان اور سبزی وغیرہ لینی ہے۔ میں نے ابھی زینون بانو کو بلا کر فرسٹ اور پیسے دیے ہیں تم کل جلی جانا۔ معاذ! تم

بناؤ زینتون بانو کے ساتھ۔

سزخان نے دو ٹوک انداز میں کہہ کر تکیہ کر کے بیچے سے اوپر کی طرف کھسکا اور لیٹ گئیں۔ عالیہ کو غصہ تو بہت آیا مگر ساس کے منہ پر کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ پیر چلتے ہوئے باہر نکل گئی۔ معاذ بھی باہر جانے لگا۔

”معاذ بیٹا! تم جا کر دھو زینتون بانو نے کہیں نہیں جانا یہ دروازہ بند کر جانا۔“ سزخان کی بات پر معاذ نے کچھ حیرت سے انہیں دیکھا پھر ان کے لبوں پر مسکراہٹ لیکر کہہ کر باہر نکل گیا۔

”نہیں تارا! اب کیسی طبیعت ہے تمہاری۔؟“ زیور گل کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

”فائن نما! وہ بیڈ پر بیٹھی میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی۔“

”میڈم! میں تم نے؟“

”نہیں ماما! وہ ماں کی طرف دیکھے بغیر جواب دے رہی تھی۔“

”کیسا زور رنگ ہو گیا ہے میری معصوم بیٹی کا۔ کہا تھا اس کھیل میں مت پڑنا۔“ زیور گل پاس بیٹھ کر اس کے بال ستوارنے لگی۔

”پلیز ماما! میں اس ٹاپک پر اب کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ اسی طرح میگزین کے رٹیلین صفحے پر نظریں جمائے سر دلیجے میں بولی۔

”اوکے میری جان۔!“ زیور گل نے اس کا ہاتھ پونم لیا۔

”اب اگر تمہاری طبیعت ٹھیک ہے تو ذرا باہر آ جاؤ یا باہر گھوم پھر آؤ۔ تین دن سے کمرے میں بند پڑی ہو جب سے کھینک سے آئی ہو۔“

”شام کو باہر جاؤں گی ماما!“

”اس سید زاوے کو فون کیا؟ جتا دینا تھا اسے خوشخبری کے بارے میں۔ اس کی جان بچاؤ ہو گئی تم نے اپنی جان پر کھیل کر۔“

”صبح فون کرویا تھا۔“

”پھر لیا کہہ رہا تھا وہ۔؟“ زیور گل تنقیر سے بولی۔

”کچھ خاص نہیں۔ انہیں کسی کام سے اسلام آباد جانا ہے اسی ہفتے جاتے سے پہلے شاید چکر لگائیں۔“ نین تارا آہستگی سے بولی۔

”وہو کے باز فرمیں!“ زیور گل بڑبڑائی۔

”جان! تم دل پر مت لیتا۔ پڑہا ہو تو پھل تو آتا ہی رہتا ہے۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ اچھا ہے ان بھائیوں میں پڑ کر خود کو مزید مشکل میں نہیں ڈالو۔“

”مما پلیز۔!“ نین تارا نے میگزین بند کر دیا اور بیڈ سے ٹیک لگا کر مت دوسری طرف پھیر لیا۔

”اچھا میری بات سنو نین تارا! وہ قریشی کا پونٹ مری جا رہا ہے۔ اس کی فلم کے کچھ شائے وہ گئے ہیں اس کے لیے وہ ہم دونوں کو ساتھ چلنے کو کہہ رہا تھا۔ اچھا ہے تمہارا بی بی بہل جانے کا اور طبیعت بھی فریض ہو جائے گی۔ کیا خیال ہے تمہارا۔؟“

”میں سوچوں گی۔“

”کیوں بیٹا! خیریت؟“

”ویسے ہی۔ آپ جانتیں تو۔؟“

”کچھ خاص تو نہیں ہے جو آتا ہے وہ زہو کے اخراجات میں اٹھ جاتا ہے۔ معلوم ہے نا اس کلاس میں اسٹینڈرڈ میں تین رکھتے ہیں ہی سب کچھ لگ جاتا ہے پھر پانچ گریڈ لوملا زین ڈوڈرا بیور مالی وراچ میں ان سب کے

اخراجات۔ بینک بیلنس کیا خاک ہو گا اور پراپرٹی میں یہ گہر ہے۔ وہ ایک کنال کا پلاٹ اور چار وکانیں جو اچھے وقتوں میں اس شاہ کے بچے نے میرے نام سے خرید دی تھیں۔ تم ”سید ہاؤس“ اپنے نام کروا لیتیں تو ہمیں کہیں اور دیکھنا ہی نہ پڑنا۔“

وہ آزدگی سے بولی۔ نین تارا ماں کی شکل دیکھ کر رہ گئی۔

”مما! جو میں لاکھوں کے چیک آپ کے اکاؤنٹ میں بیج کر دیتی رہی ہوں شاہ جی سے لے کر وہ۔“

”سوٹ ہارٹ! بتایا نا اخراجات کم ہیں پھر آئے دن کی پارٹیز فنکشنز ان کے لیے تو ویسے ہی کھلا پیسہ چاہیے تھیں معلوم تو ہے۔“ زیور گل اٹھ کر آئیے میں اپنا جائزہ لینے لگی۔

”تو کیا ضرورت ہے اپنی چادر سے بڑھ کر پاؤں پھیلاتے کی۔ جب کہ آپ کو بھی آج کل کوئی خاص کام نہیں مل رہا نہ ہی وی میں نہ فلم میں۔“ نین تارا چڑ کر بولی۔

”میری جان! ڈیما نڈ۔ یہ ہماری کلاس کی ڈیما نڈ ہے۔ میرا اور تو چلو تمام ہوا۔ اب مجھے کیا کام ملے گا۔ اور ماں بھی تو مجھے ہنر ہزار کا۔ اب تمہارا ٹائم آنے والا ہے بلکہ آچکا ہے جسے تم اشارت ہی میں اس گدھے سید زاوے کے پیچھے تباہ کر چکے ہو تلی ہوئی ہو۔ اب جو یہ جاوڑہ ہوا ہے اس کا اثر کیا تمہاری فزیک پر نہیں پڑے گا تمہاری چار منگ بیوی نہ سنا کر ہو گی نین تارا! یہ تو خود کو کیش کرانے کا ٹائم ہے۔ اور تم ایک ہی بھنورے سے جٹ کر رہ گئی ہو۔ جو کہ اب کسی بھی کام کا نہیں۔“ محض ایک وہ ”سید ہاؤس“ تمہارے نام کرنے کو تیار نہیں مسلسل سال بھر سے دلا سے بر رکھا ہوا ہے۔ تمہاری ٹیکٹ منی سکڑ کر محض چند ہزار رہ گئی ہے۔ وہ بھی دس فون کرنے پر۔ میری جان! کیوں اس طرح خود کو اسپوئل (ضائع) کر رہی ہو وہ تمہارے ساتھ محض کھیل رہا ہے اور میں دیکھ رہی ہوں بہت جلد اس کا اس کھیل سے جی بھرنے والا ہے۔ پھر تم کہاں ہو گی۔ سزا سوچو۔“

زیور گل اس کے سامنے سوالیہ نشان بن کر کھڑی تھی اتنا کام تو نین تارا لادماغ ہی کر رہا تھا نہ ہی کے پونچلوں میں اب وہ بیٹے کی ترواٹ نہیں رہی ہے بڑا اتنا آکٹایا بیزار سا انداز ہو تا تھا ان کا جیسے بہت مجبور ہو کر آتے ہوں یہی چیز بہت فونوں سے نین تارا کے اندر لگی تھی جانے جا رہی تھی۔ اور وہ اس گھنٹی کو سن کر بھی انجان بن رہی تھی۔

”تو نام! میں کیا کروں؟“ وہ بے بسی سے بولی۔

”اس طوطے کو دوبارہ قابو کرنے کا ایک آخری طریقہ تو یہ ہے کہ مرغی پھر سے سونے کے انڈے دینے لگ جائے۔ تم اس سے آگے نہیں پھیرو اور اپنے لیے دانستہ طور پر کسی اور ڈالی کا انتخاب کرو۔ سلطان بخت سے اپنی انسٹلٹ کا دل لینے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ اسے پتا چلے گا کہ تم اس کی رکھیل نہیں ہو اور بے لاپرواہی اور س وغیرہ کی دھمکیوں سے ان کے گھروں کی شریف بیویوں کے دم نہکتے ہیں۔ ہم بیویوں پر ان کا اثر نہیں ہونا چاہیے اگر وہ کسی ڈرا بیورس رہتا ہے تو کو مالی فٹ۔ اچھا ہے اس فصول کے طوق سے تمہاری جان بچوٹ جائے گی۔“

طلاق کی دھمکی پر اگر تم نہ ڈریں تو وہ ڈر جائے گا۔ پھر تمہارا کام بہت آسان ہو جائے گا مگر میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ اب اس کے ساتھ زیادہ چھٹنے کی ضرورت نہیں۔ سال چھ مہینے میں اگر یہ تمہارے نام کچھ اور پراپرٹی کرنا ہے تو ٹھیک نہیں تو اسے فارغ کرو اور تمہارے پاس بھی محض پانچ سات سال ہیں مگر تم سمجھنے کے اس کے بعد تو ذرا چھانچو ہی ملتا ہے۔ اب ہوش کے ناخن لو۔ پہلے میں تمہاری ہر ضد اس لیے مانتی رہی ہوں کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ یا تم اس کی محبت میں مری جا رہی ہو۔ ٹھیک تھا مگر اب اس اندھی محبت کا ایک نتیجہ تو تم نے بھگت ہی لیا ہے۔ اگر وہ تم سے جی محبت کرتا تمہیں اپنی زندگی میں جائزہ مقام دینے پر تیار ہو تا تو نین تارا اپنی سویر میں تمہیں کبھی رستہ بدلنے کا مشورہ نہ دیتی اگر وہ اس طرح بچے کو دنیا میں آنے سے پہلے ہی ہلاک کر دینے کا فائدہ فیصلہ نہ سنا۔ اسی سے اس کے دل کی کمینگی اور منافقت ظاہر ہے۔ اب تم اور کتنا خود کو دھوکا دو گی۔“

زیور گل اسے پوری طرح سے ٹریپ کر چکی تھی۔ بائیں اتنی جی تھیں کہ نین تارا انہیں جھٹکا بھی نہیں سکتی تھی۔

407

"بس اب اس فضول کی محبت سے اپنا دامن کھینچ لو۔ کچھ اپنے فیوض کی سوچو۔ میری زندگی کا سوچو کہ میری زندگی تمہارے فیوض سے ہی تو متسلک ہے۔ اب خود کو اس پوٹو یا سے باہر نکالو میری بات سمجھ رہی ہونا؟"

"بس مام! وہ اس کا ہاتھ تھام کر آسکی سے بولی۔

"تو بس پھر خود کو اس قنوطیت سے باہر نکالو اور اپنے آپ کو فریش کرو۔ اس فیلڈ کی پہلی ڈیمانڈ ہی فریش نہیں ہے۔ ٹھنڈے دل اور دماغ سے سارے حالات کا تجزیہ کرو اور آئندہ کے لیے پلاننگ کرو کہ جو تمہیں کرنا ہے میں ہر طرح سے تمہیں سپورٹ کرنے کو تیار ہوں اس وقت ہر ٹاپ کا اس پروڈیوسر ڈائریکٹر تمہیں ہاتھوں ہاتھ لینے کو تیار ہے۔ پھر اس بلک میں محض ایک ہی سلطان بخت نہیں ہے۔ اس سے کہیں زیادہ دولت مند صاحب حیثیت اور صاحب دل نہیں بہت سے ملیں گے جو تمہارے حسن کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے چند لاکھ کی پراپرٹی نہیں اپنی پوری جائیداد تمہارے نام کر سکتے ہیں۔ اپنی اہمیت کا احساس تو اپنے اندر پیدا کرو۔ آنکھیں کھولو خود کو دیکھو محسوس کرو اور پھر اپنی قیمت آپ لگاؤ۔ میں تمہیں صرف سمجھا سکتی ہوں۔"

زیور گل آج ہر صورت شادی کے آنکھوں سے اس کا پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ نون ٹار اسٹری سے آکر کھڑی ہو گئی اور خاموشی سے جا کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گئی۔ پھر پرش اٹھا کر اپنے اچھے ہونے ہال سنوارنے لگی۔

"مام! آپ پروگرام اریج کریں۔ ہم قریشی کے پونٹ کے ساتھ بھونچا ہوں۔ جس میں کسی پر فضا مقام پر جا کر میں اپنے دماغ کو فریش کرنا چاہتی ہوں۔ باقی کی پلاننگ آکر ہوگی۔ چند لمحوں بعد اس کے ہونٹوں سے نکلنے والے ہنسلوں نے زیور گل کو ہنسا کر دیا۔

"گند۔ ویری گند! اس نے آگے بڑھ کر چٹا پٹ مٹی کا منہ چوم لیا۔

"میں بھی یہی چاہتی ہوں میں ذرا قریشی کو فون کر کے آئی۔ تم تیار ہو جاؤ پھر وہ لوگوں میں باہر نکلیں گے۔ تمہاری شاپنگ کریں گے اور سچ تمہاری پسند کی جگہ پر مل کر کریں گے۔ کیا خیال ہے؟"

زیور گل نے قناعت نہ کر رہا ہنسیا۔

"سچ آپ فون کر آئیں میں تیار ہوتی ہوں۔" اس نے اذیت میں سر اٹھایا تو زیور گل خوش خوش کمرے سے باہر نکل گئی۔ مین ٹار آئینے میں اپنے خالی خالی وجود کو چپ چاپ دیکھنے لگی۔



عبدا الہین کی راتیں جاگتے گزرتی تھیں اور دن بریشان خیالوں میں۔ مسلسل پانچ راتیں ہو چکی تھیں۔ اسے جو پہلے قبرستان میں جا کر اس ٹولی منڈیر کے پاس سڑے ہو کر نارچ سے کھنڈل دیتے ہوئے اس ظالم شہینہ کا دل نہیں پگھلا تھا حالانکہ اسے تو امید تھی کہ شہینہ پہلی رات نہیں تو دوسری رات ضرور ہی آجائے گی۔ وہ ایک بار اس کے پیچھے دن میں کالج کا چکر بھی لگا آیا تھا۔ مگر شہینہ سے وہاں بھی ملاقات نہیں ہو سکی تھی شاید وہ اس قدر چپٹی نہ تھی جس قدر وہ سمجھا تھا۔ پھل پکنے کے لیے اسے ابھی اور محنت کی بلکہ شاید بہت محنت کی ضرورت تھی یا ہو سکتا ہے یہ پھل پیک تو جائے مگر اس کی جھولی میں نہ کر سکے۔ اسی طرح کے سوسے اسے دن میں بھی ہراساں رکھتے اور رات کو قبرستان کی ہڈیوں کے گودے میں اتر جانے والی عجیب سی خشکی۔ اسے لگتا وہ دو چار راتیں اور آتا رہا تو یہ خشکی مستقل اس کی ہڈیوں میں جم کر اسے بھی ٹھنڈا ٹھنڈا کر دے گی۔ پہلے کسی سے اسے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ عام خشکی اور قبرستان کی خشکی میں کس قدر فرق ہوتا ہے۔ قبرستان کی ٹھنڈک تو جیسے آبی کو اندر تک سرور کو دیتی تھی بلکہ بھرتی۔

ماسٹر صاحب کا رویہ بھی بدل رہا تھا حالانکہ رات کے پہلے پھر پڑھنے کا ڈرامہ رچاتا تھا۔ کوٹھڑی کا بلب ساری

رات جلتا پھوڑ کر پچھلی کھڑکی سے باہر لوہا آنا کوٹھڑی کا اندرونی دروازہ بند کر جاتا تھا کہ کہیں ماسٹر صاحب پچھلے مارنے نہ آجائیں۔ دن میں بھی کتابیں کھول کر شہینہ کی سنگ دلی پر غور کرتا رہتا ماسٹر صاحب کا رویہ اس بدل رہا تھا کہ اس کے اس قدر پڑھنے کے باوجود اسے کوئی بھی سوال مکمل طور پر یا صحیح طور پر یاد ہی نہیں۔ تاہم امتحان میں مہنت بھری رہ گیا تھا۔ اور ماسٹر صاحب کو پہلے بھتلاہٹ ہوتی تھی اور اب غصہ آنے لگا تھا کہ اس نے پڑھنے میں نہیں کہیں اور لگا ہوا ہے۔ وہ بھی دل میں ماسٹر صاحب کے تجزیے کا قائل ہو گیا تھا۔ وہ کتنا صحیح پہچانے تھے۔

ابھی بھی وہ اسے ٹھیک ٹھاک بھارا کر گئے تھے۔

"اگر تم نے نہیں پڑھنا تو یہ شکیدر سے واپس چلے جاؤ۔ کم از کم ہاتھ پر یہ الزام تو نہیں آئے گا میٹرک بھی نہ کرانا اور اللہ کے نیک رستے سے بھی اٹھو الیا۔"

اور اس نے ایک بار پھر ان سے جھڑپیں چھیننے سے بچنے کیلئے بار بار اسے امتحان میں بیٹھنے کو دیا۔ ضرور انہیں کامیاب ہو کر دکھائے گا ماسٹر صاحب پریشانی اور غصے سے پرہیز کرتے ہوئے چلے گئے تھے۔

تو شاید میرے مستقبل کے نونے پھولے لگنے میں تیل بونے جڑ جائیں۔ جنیل یا تھانہ یا چھوٹے شاہ جی کا عقوبت خانہ نہ خدا ہی ملانہ و صبر و تحمل والا حال نہ ہو۔ یہ شہینہ کی بیٹی اس قدر پختہ ارادوں کی مالک لگتی تو نہ تھی۔ یہ تو اس پہلی ملاقات ہی میں پکھلی جا رہی تھی۔ اب اس کے دماغ میں کیا خناس بھر گیا ہے۔ میرے پاس وقت کم ہے اور کام بہت۔ ماسٹر صاحب شاید دو چار دن ہی غصے اور پروا نہ کر سکیں ماسٹر صاحب کے تصور الگ جگہ پر ہے۔ آج دوپہر کے کھانے میں بھی انہوں نے ہری جھنڈی کھادی۔ آخر مفت کے اس مہمان کو وہ کب تک بیٹھیں۔

وہ اٹھ کر نکلے لگا۔

"بس آج اور کل کی رات دو راتیں اور پھر شہینہ نہ آئی تو کوئی بھی آخری قدم آریا پار۔ اس کا کمرہ پچھلے باغ کے کونے میں ہے اور وہ کار لائی کھڑی کھلی دکھ کر رات بھر میری بے بسی کا تماشا بھی دیکھتی ہے۔ میں اس کھلی کھڑی کا فائدہ ضرور اٹھاؤں گا۔ اس پر دو راتیں۔ اس کے بعد فیصلہ ہو جائے گا۔"

وہ سر ہلاتے ہوئے مسلسل خود کو ٹھونک بھارتا تھا۔



"کتے دنوں کا پروگرام بنایا ہے تم لوگوں نے۔؟" سیدہ نے سلطان بخت سے پوچھا۔ ملازم نے دو سوٹ کیس لاکر لاؤج میں رکھے تھے صالحہ تیار ہو رہی تھی۔

"ابھی تو دو دن کا ہے۔ ویسے زیادہ بھی لگ سکتے ہیں۔" سلطان بخت نے بہت مطمئن انداز میں جواب دیا۔

"ابھی بات سے مگر پھر بھی خیال رکھنا زیادہ اونچائی اترا لینی پر نہ چڑھے صالحہ اور میرا تو مشورہ ہے، بس اسلام آباد میں ہی ہجوم پھر لیتا۔ بلکہ مہینہ بھر صالحہ اور اسلام آباد والی کو بھی میں روکے تو زیادہ اچھا ہے۔ اور کام بہ سم آج کل بہت خوشگوار ہے اور کو بھی ہے بھی بہت اچھی لوکیشن میں صالحہ کا بیٹھل جائے گا۔"

"کوہ آیا! کوہی میں تو شاید آم نہ رہیں۔" سلطان بخت گڑبڑا کر بولے۔

"کیوں وہاں کیوں نہیں پھر میں نے منع کیا ہے کہ مری جموں میں ایبٹ آباد وغیرہ کا رخ نہ کرنا۔ صالحہ کے لیے ٹھیک نہ ہو گا۔"

"آپا! کوہی میں اصل میں کچھ کنسٹرکشن کا کام ہو رہا ہے اس لیے وہاں تو ہم قیام نہیں کر سکیں گے۔"

"اور کھریا کنسٹرکشن کا کام بھلا۔ تم نے پہلے تو ذکر نہیں کیا۔ پھر برسوں منظور آیا تھا اور اوسر کاؤراچ میں اس نے بھی مجھ سے تذکرہ نہیں کیا۔" وہاں سے پر بل ڈال کر بولیں۔

"آپا! سے یاد نہیں رہا ہو گا۔ اصل میں پچھلے دنوں بلکہ دو تین ماہ پہلے جو طوفان بادیاں آیا تھا اسی کے دوران پچھلے لان اور انیس کے سینئر میں پانی پڑ گیا تھا۔ میں پچھلے دنوں گیا تو مجھے پتا چلا میں نے فوراً ہی کام شروع کر دیا۔"

تھا۔ اور ابھی رات کو میری میٹھی سے بات ہو رہی تھی کہ ابھی کام مکمل نہیں ہوا۔ کام کو ہاتھ لگاؤ تو پھوٹے پھوٹے بہت سے کام نکل ہی آتے ہیں اب کنسٹرکشن کا کام مکمل ہو گا تو میں نے کہا پینٹ بھی ساتھ ہی کروا لیتے ہیں اس لیے میدان بھرتوان کاموں میں لگ ہی جائے گا۔

”حیرت سے تم نے پہلے تو ذکر کیا نہیں۔ میرا تو خود دس پندرہ دنوں تک جانے کا پروگرام ہے۔ چلو میں خود بھی دیکھ آؤں گی جا کر۔ کیا کام ہو رہا ہے۔“

”آپ نے کس کام سے جانا ہے اور۔“ سلطان بخت سائے پر نکل ڈال کر بولے۔

”جو اڈائیڈیشن شاید ادھر کرواؤں اور وہ ہے میرا۔“

”تو جو ادھر میرے ساتھ چلا جائے گا۔ آپ کو جانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”جیتے رہو۔ اس کے باپ کو تو فکر ہی نہیں کہ بچے کے لیے بہترین تعلیم اور تعلیمی ادارہ کس قدر ضروری ہے۔ یہ صاف نہیں آئی ابھی۔“

ان کے الفاظ منہ ہی میں تھے کہ صاف تیار ہو کر آئی۔ ڈارک براؤن ویلوٹ کے خوبصورت ڈریس میں اس کا سر بالہت نمایاں لگ رہا تھا۔ کچھ وہ تیار بھی خوب دل لگا کر ہوئی تھی لہذا وہ کچھ ان چند دنوں کی سلطان بخت کی توجہ نے اس کے چہرے کو بھی نکھار سادیا تھا۔

”ماشاء اللہ اللہ نظریہ سے بچائے۔ تم دونوں کی جوڑی یونہی سلامت رہے۔ مگر سبزو شاداب رہو۔“

سیدہ اسے دیکھتے ہی محبت سے بولیں۔

”تو پھر تم لوگ کہاں رہو گے؟ فون وغیرہ کاروبار بھی تو ضروری ہے نا۔ مجھے فکر رہے گی، صاف کی صحت کے بارے میں۔“

”موبائل تو ہے نا آپ میرے پاس۔ ویسے ابھی تو میں نے پی سی میں بنگ کروالی ہے ایک بخت کی۔ اس کے بعد مری والا بنگلہ تو ہے نا۔“

”ہوٹل میں ریڈ رومز تو میٹرھیاں چڑھ کر ہی ہوتے ہیں۔ یہ تو صاف کے لیے ٹھیک نہیں۔“ سیدہ تشویش سے بولیں۔

”یہاں بھی تو بیڈ روم اوپر ہی بٹے پھر تیار پھر پی سی ہوٹل ہے کوئی بنگلہ بنا لیں۔ بہت آرام دہ میٹرھیاں ہوتی ہیں بہر حال آپ فلر نہ کریں میں ایک ڈاکٹر ساتھ لے لوں گا جو ہر میٹرھ میں اس کا چیک اپ کرتا رہے۔“

”سلطان بخت! سیدہ جس پر اس صاف شرمائی۔ اسی وقت شہزادہ اندروا داخل ہوئی۔ وہ اندر کا منظر دیکھ کر کچھ حیران سی رہ گئی۔ کئی دنوں سے تو وہ اپنی ہی الجھنوں میں الجھی ہوئی تھی۔ عبدالعزیز والے مکتے نے اس کا وہاں اچھا خاصا خراب کر دیا تھا۔ وہ ہر رات قبرستان کے آس پاس موجود ہونا ساری رات لائٹ جلا بجا کر اس کی فینڈیں حرام کرتا رہتا۔

اور وہ دل کا یہ غبار اندر ہی اندر اٹھائے پھر رہی تھی۔ کسی سے کہہ نہیں سکتی تھی اور سنا کسی نے تھا۔ گھر کا ماحول بھی تو بہت کشیدہ تھا اور اب جو وہاں چائیک اندروا داخل ہوئی تو سب کو ہستے مسکراتے دیکھ کر حیران ہی رہ گئی۔ اس کی دوسری نظر ان سوٹ کے سوں پر پڑی۔

”کیس۔ جارہے ہیں آپ؟“ وہ انک کر بولی۔

”ہاں شہزادہ! تمہیں نہیں بتا تمہارے والد اور بھائی اسلام آباد جا رہے ہیں تقریباً دو ہفتوں کے لیے۔“ سیدہ نے اسے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

”مگر مجھے تو کسی نے نہیں بتایا۔“

”تم کیسے نظر آؤ تو تمہیں کوئی بتائے نا۔ ہر وقت تو کمرے میں گھسی رہتی ہو۔ آٹھ سے زیادہ دن کلچ میں گزار کر آتی ہو۔ تمہیں کون سا کسی کا خیال ہے کہ کسی کی خبر ہی لے لو۔“ صاف نامعلوم کب سے اس کے خلاف بھری

بٹھی تھی۔ فوراً چمک کر بولی۔

”کلچ میں آؤ صاحبان گزار کر آتی ہوں تو اس میں میرا قصور ہے۔ دو گھنٹے کا آنے جانے کا راستہ ہے اور میری کون خبر لیتا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”ارے شہزادہ! صاف مذاق کر رہی تھی تم سے۔ تم دل چھوٹا نہ کرو۔ ہم سب کو تمہاری خبر ہے ابھی کیا بات ہے۔“ سیدہ نے اسے ساتھ لگا کر بھلا بھلا کر وہ اپنی جگہ سے ہلی نہیں آج کل ویسے ہی اس کا دل گھروالوں کی طرف سے بدگمان ہوا جا رہا تھا۔ اب یہ سلمان باندھے کہیں جانے کو تیار بیٹھے ہیں اور اسے خبر تک نہ دی۔ سیدہ نے سلطان بخت کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا کہ وہ شہزادہ کو تسلی دیں۔

”گڑیا! روتی کیوں ہو صرف پندرہ دن کے لیے تو جا رہے ہیں۔ پھر آپا ہوں گی تمہارے پاس بولو تمہارے لیے کیا لے کر آؤں؟“ سلطان بخت کی انگوٹ اوپر ہی تھی۔ شہزادہ کو صاف لگا۔

”مجھ نہیں۔“ وہ نہوٹھے پن سے بولی تو صاف چمک اٹھی۔

”تو مجھے کیا آتا اس گھر کے بچوں تک کو میری ذرا سی خوشی گوارا نہیں ہاں میں میرے سہیلیوں کے لیے جو جا رہی ہوں تو موڈ تو خراب ہو گا نا۔“ صاف جاہلوں کی طرح ہاتھ نچا کر بولی۔

”ایسا ہو گیا ہے صاف شہزادہ نے ایسا کچھ تو نہیں کہا یوں بھی تمہیں کم از کم شہزادہ سے تو ذکر کر دینا چاہیے تھا۔ ہفت بھر سے تیاریاں کر رہی تھیں۔ کیا حرج تھا جو اسے بھی بتا دیتیں۔ اس نے کون سا تمہارے ساتھ اٹھ کر چل رہا تھا۔“

سیدہ کو نکالیک، من برترس آیا۔

”ہاں! مجھے معلوم تھا بس میرا ہی قصور لگتا ہے۔ ہر بار خاک میرے سر پر پڑتی ہے۔ آپ جو دن میں دس پیسے لگاتی ہیں۔ یاد رہے ہاں باؤن کھڑی ہیں۔ آپ بتا دیتیں جو کچھ میں چھپانا چاہ رہی تھی۔“

صاف پوری طرح سے لگ بول رہی تھی۔ سلطان بخت و پھر سے پانی پت کی بنگ کے آثار نظر آنے لگے۔ ”گرمو! گرمو! سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھو۔“ انہوں نے منہ دروازے کی طرف کر کے آواز لگائی۔ گرمو بھاگا بھاگا آیا اور سوٹ کیس اٹھا کر باہر لے گیا۔

”آہا! یہ کیا فضول کی بخت آپ لوگوں سے شروع کر دی ہے۔ شہزادہ اب بھی تو نہیں ہے کہ اب ایک ایک بات اسے سمجھائی جائے۔ اسے خود گھر کے معاملوں کی خبر رکھنی چاہیے بہر حال اب ہمیں چلنا چاہیے یوں بھی دوپہر ہونے کو ہے شام تک پہنچ جائیں تو اچھا ہے۔“

سلطان بخت کے اہم اہم خالص بدل چکے تھے۔ سیدہ کچھ حیرت زدہ سی رہ گئیں۔ مگر شہزادہ آج ان کے سب وقت دیکھ لیا جانتی تھی۔

”والد! پلیز! ایک منٹ میری بات سن کر جائیں۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سلطان بخت جو پہلے ہی اپنی جگہ سے کھڑے ہو چکے تھے۔ کچھ ناواری سے اسے دیکھا۔

”اور میں آپ سے بہت دنوں سے بلکہ مہینوں سے کہہ رہی ہوں کہ مجھے ہاسٹل میں داخل کروادیں۔ سنا پھر سیدہ ہاؤس میں رہنے کی اجازت دیں۔ اس طرح روزانہ دو تین گھنٹے میں کلچ سے آنے جانے میں میری پرہیزی کا بہت حرج ہو تا ہے۔ یوں بھی ادھر گھر میں رہ کر میں کون سا کسی کا بھلا کر رہی ہوں یا کوئی کون سا ہاتھ سے خوش ہے۔ جو میری کی محسوس کرے گا۔“ اس نے صاف صاف پرچوٹ کی تھی۔

”شہزادہ! بہت بڑھتی جا رہی ہو۔ ابھی تم اتنی خود مختار نہیں ہو کہ اپنے فیصلے خود کرتی پھرو۔“ سلطان بخت کچھ غصے سے بولے۔

”میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا، صرف آپ سے اجازت مانگی ہے اور میں آپ سے کتنے مہینوں سے تو کہہ رہی ہوں۔ آپ ٹال دیتے ہیں۔“ اس نے پھر بھی لیے کو نرم رکھا۔

”میں تمہیں نال نہیں دہا بلکہ تمہیں صاف صاف بتاؤ گا ہوں کہ نہ تمہیں ہاسٹل میں داخل ہونے کی اجازت دے سکتا ہوں نہ ”سید ہاؤس“ میں اکیسے رہنے کی۔ تمہیں اگر پڑھتا ہے تو اسی طرح پڑھنا ہو گا جس ایک سال اور بڑھ لو۔ اختر کے بعد آگے پڑھنے کا سوچنا بھی نہیں۔ آج آپ اس کے بارے میں سوچیں ہمارے خاندان میں یوں بھی لوگوں کی اتنی تعظیم کا رواج نہیں ہے اس کی ضد سے مجبور ہو گیا تھا۔“

سلطان بخت نے آنکھیں ماتھے پر رکھی ہوئی تھیں تو شہزادہ کے صبر کا بیان بھی لہرز ہو چکا تھا۔

”تمہیں مجبور ہونا تھا آپ نے میری ضد سے۔ پہلے ہی انکار کر دیتا تھا۔“ وہ سچ گروالی۔

”تو کیوں اس کی خود سری اور ستانی۔“ مسالہ فوراً بڑھ کر بولی۔

”میں خود سر اور ستان نہیں، آپ اپنی شکل آئینے میں دیکھیں۔“ شہزادہ چیخا۔

”شہزادہ! سلطان بخت نے آگے بڑھ کر ایک پھیتر اس کے منہ پر جڑوا ”تم اس قدر گستاخ ہو چکی ہو مجھے خیر نہ تھی۔“ شہزادہ تو جیسے اپنی جگہ پتھری ہو کر رہ گئی تھی اس کا چہرہ سن ہو چکا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”تم ابھی کلج نہیں جاؤ گی۔ اب تک میں واپس نہیں آتا۔ آٹھ کے بعد تمہارے بارے میں فیصلہ ہو گا۔ چلو سالہ! اچھا آیا اجازت دیں۔“

سیدہ کا منہ خود سلطان بخت کی اس اچانک حرکت پر کھلے کا کھارہ گیا تھا۔

”سلطان بخت! جاتے وقت یوں بسن کا دل دکھا کر جاؤ گے۔ بہت بری بات ہے۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئیں اور اٹھ کر شہزادہ کو اپنے ساتھ لگانا چاہا۔ اس نے زور سے ان کے بازو جھٹک لیے۔

”تو کیوں آیا آپ نے؟ اس کی نظر میں کسی کی عزت، کسی کا احترام نہیں ہے۔“

”صرف چند ماہ میں تم ان نہ داریوں سے اکتا گئے سلطان بخت۔“ سیدہ افسوس زدہ لہجے میں بولیں۔

”بس تیرا بحث نہیں چلتے ہیں ہمیں خدا حافظ۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر باری سے کہا اور قدم باہر کی طرف بڑھائے۔ ”مجبوراً سیدہ کو بھی ان کی تقلید کرنا پڑی۔ زبردستی آگے بڑھ کر صاف کونسل سے لگا کر اوواں گناہ اور نہ اس وقت شہزادہ کی حالت نے انہیں بہت رنجیدہ کر دیا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ انہیں رخصت کر کے اندر آئیں۔

شہزادہ وہیں صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھ میں ایک آنسو نہیں تھا۔ اس کا چہرہ لہجے ساکت بیٹھی تھی۔

”شہزادہ میری بیٹی! تم ٹھیک تو ہونا۔“ سیدہ بے قراری سے آگے بڑھیں۔

”میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”ارے ییل بھر میں غصہ آتا ہے۔ تھوڑی دیر میں اتر بھی جاتا ہے۔ ابھی راستے ہی میں دیکھا تھا میں فون کرے گا۔ بیٹا! بھائی کے غصے کو دل پر نہ لو۔“ سیدہ ان سنی کر کے کمرے سے نکل گئی۔

”دل پر تو میں اب کچھ بھی نہ لوں گی۔ آیا! آپ دیکھیے گا! اللہ کو یہ پھیتر کس قدر منگوا رہے گا۔ بہت میں نے ان کی عزت کا خیال رکھا۔ وہ وہی کی اس بے جا طرفداری پر چہتا میں نے ضرور آیا آپ کیجیے گا۔“

وہ دل ہی دل میں فیصلہ کرتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

سیدہ نے اسے جاتے دیکھا پھر اس صوفے پر جا بیٹھیں جس کے نزدیک فون رکھا تھا اور کوئی نمبر ڈائل کرنے لگیں۔

”بیٹو بیٹو۔ کون بات کر رہا ہے؟“ وہ ہارعب لہجے میں بول رہی تھیں۔ ”میں حویلی سے سیدہ بات کر رہی ہوں۔“

”اچھا منظور! ہاں میں نے تم سے ہی بات کرنا تھی۔ سنو وہ کو بھی میں ہو کنسرکشن کا کام ہو رہا ہے وہ کہاں تک پہنچا ہے؟“

”کون سا کام ہے؟“ منظور حیرت سے بولا۔

”کوئی میں جو پچھلے لاؤنج کے اور انیکسی کے سینٹر میں پانی پڑ گیا تھا اس سلسلے میں؟“ وہ اس کے حیران لہجے پر

سنبھل کر بولیں۔

”نہیں جی۔ کو بھی میں تو کوئی کام نہیں ہو رہا اور سب کمروں کی چھتیں بالکل درست ہیں اسی کوئی بات ہوتی تو میں پچھلے صفحے آپ سے ذکر نہ کرتا۔“

”کچھ عرصہ پہلے کام ہوا ہے؟“ وہ کچھ سوچ کر بولیں۔

”جی نہیں، کو بھی میں پچھلے سال، نو پینٹ ہوا تھا بڑے شاہی کے آخری بار آنے سے پہلے اس کے بعد تو کوئی کام نہیں ہوا۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

”تمہارے چھوٹے شاہی آج آ رہے ہیں اوہری تمہیں گے نا؟“

”جی معلوم نہیں۔ انہوں نے تو ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔“

”سنو منظور! آج تانا۔“ وہ کچھ لمحوں بعد بولیں۔

”جی ہاں لکن! حکم کریں۔“

”اوہری کو بھی میں کوئی ٹھہرا ہوا ہے یا اگر کبھی کبھار ٹھہرتا ہے؟“ انہوں نے اندھیرے میں تیر پٹایا۔

”جی جی۔ جی نہیں تو یکم صاب! اوہری کو بھی نہیں رہتا۔ بس چھوٹے شاہی ہی بھی کبھار آتے ہیں۔“ منظور کا ہنکا تاجہ جیسے سیدہ کو کوئی ہرا پکڑا گیا۔

”منظور! میری ایک بات یاد رکھو۔ میں نے تمہارے بیان میں جھوٹ پایا تو تم سمیت تمہارا پورا خاندان اس آوارض پر کہیں نہیں پایا جائے گا۔“

انہوں نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔ ان کا شخص تیز تیز چل رہا تھا جیسے وہ کسی بہت مشکل مرحلے سے گزر کر آئی ہوں۔ انہوں نے ایک دو روز میں خود اسلام آباد جانے کا فیصلہ کیا اور صوفے کی بیک سے سر اٹھا کر گہرے سوچنے لگیں۔

سلطان بخت! تمہاری عزتیں میرے بابا جان کو قبل از وقت قبر کی تاریکیوں میں لے گئیں مگر تم نہیں سدھرے۔“ وہ ہونٹوں میں ہریرا رہی تھیں۔

”اگر تم آج رات کو مجھ سے ملنے چھٹے باغ میں نہ آئیں تو میں کھڑکی سے کود کر تمہارے کمرے میں آ جاؤں گا اور وہیں خود کو ختم کر لوں گا۔ تمہاری آنکھوں کے سامنے اور اس بات کو دیکھ کر تم کو بھی کبھی نہ سمجھتا میں نے آج تم کھال سے نہیں کر گزروں گا۔“

شہزادہ کے ہاتھ سے ”تذکرہ باری“ ڈھرام سے نیچے گر پڑی۔ وہ اس قدر اچانک ایک طرف سے نکل کر اس کے مقابلہ ہوا تھا کہ شہزادہ اس لم ہونے لگا۔ ایک ٹوہ اس کے اوہر آنے کی توقع ہی نہیں کر رہی تھی پھر اس طرح اچانک۔

”تم سن رہی ہونا۔“ وہ آہستہ آواز میں دھاڑا۔ شہزادہ چھٹی چھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کلج سے چھٹی ہوئی تو اس نے ڈرا سیور سے کہا کہ اسے ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ کلج روڈ پر ہی ایک بڑی سی بک شاپ تھی ڈرا سیور نے وہیں گاڑی روک دی۔ وہ کتاب لینے اندر آ گئی۔ سیکڑ میں کو کتاب کا پتہ آیا وہ کتاب لینے آیا اور وہ یونہی شلٹی ہوئی کتابیں دیکھنے لگی۔ کچھ رنگ میں رکھی ”تذکرہ باری“ اس نے ہونسی اٹھائی۔

وہ کسی شیطان کی طرح اس کے سامنے آموہو ہوا۔ شہزادہ کو سنبھلنے میں چند سیکنڈ لگے۔

”تمہارا دل آج خراب ہو چکا ہے تو کیا میں بھی تمہیں بالکل نظر آتی ہوں جو تم سے ملنے آؤں گی۔ تمہاری حرکتیں حد سے بڑھتی جا رہی ہیں۔ میں آج ہی اللہ سے بات کروں گی تمہیں تو وہی درست کریں گے۔“

دیکھتے ہوئے وہ قدم پیچھے ہٹتی۔

”چھوٹے شاہی کاؤں میں نہیں ہیں مجھے معلوم ہے اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے اگر تم نے اس پر عمل نہ

کرتے ہو تو وہ قدم پیچھے ہٹتی۔

”چھوٹے شاہی کاؤں میں نہیں ہیں مجھے معلوم ہے اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے اگر تم نے اس پر عمل نہ

کیا تو پھوٹے شاہی کے آنے سے پہلے بہت کچھ پتھروں کی اس جوتلی میں ہو گزرے گا جس کا تمہارا تمہارے لالہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کمزور مت سمجھنا یاد رکھنا۔ میں نے آج تم کو کھار بھی ہے۔ آریا پار۔

اس نے ایک قدم آگے بڑھا کر ہنسنے سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ شہزادہ کے پورے جسم میں برقی زور دوڑ گیا۔

”چھوڑو میرا ہاتھ بد معاش آوارہ نافر۔“ وہ پورا زور لگاتے ہوئے اپنا ہاتھ کھینچنے لگی۔

”یہ ہاتھ اب میری آخری سانسوں تک میرے ہاتھ میں ہی رہے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے اب مجھ سے نہیں چھڑا سکتی۔ آج اسی رات کے بعد میں کمڑ کی پر تین پتھر پھینکوں گا۔ اگر تم نہ آئیں تو چوتھے کا انتظار مت کرنا۔ میں خود آجاؤں گا تمہاری خواب گاہ میں۔ خدا حافظ۔“

اس نے اتنی زور سے اس کا ہاتھ دبا یا کہ اس کی ہڈیاں کڑکڑا اٹھیں۔

”بھولنا نہیں۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ اس کا ہاتھ چھوڑ کر جس طرح اچانک آیا تھا اسی طرح اچانک غائب ہو گیا۔ شہزادہ اپنا دکھتا ہوا ہاتھ دوسرے ہاتھ میں لے کر دیا نے لگی۔

”یہ تو بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس کا کچھ علاج کرتا رہے گا میں آج ہی۔“

”کس سے بات کروں۔ اللہ نے اسلام آباد جا کر ایک بار بھی میری خبر لینے کی بات کرنے کی زحمت نہیں کی۔ آیا جان سے فون پر بات کر لیتے ہیں اور میں۔ میں جیسے انہیں بھول ہی گئی ہوں۔“ اس کے آنسو بہنے لگے۔ ”اور کیا ہے۔ آہ سے بھلا میں کیا بات کروں گی۔ وہ الٹا مجھے کمر بٹھانے لگی۔ انہیں میرا کالج آنا جانا ویسے بھی پسند نہیں۔“ اس نے کمر سانس لے کر چہرہ صاف کیا۔

”ایک بابا جان کیا گئے نکا ایک میں کس قدر تمہارے گئی ہوں بالکل اکیلی۔ بابا جان کے ہوتے لالہ کس قدر مجھ پر مہمان تھے۔ میری ہر بات، ہر فرمائش، ہر جان چھڑکنے کو تیار اور اب۔ اس روز مجھے پتھر کھینچ مارا۔ زندگی میں پہلی بار کسی نے مجھے اس طرح مارا تھا۔ مجھے تو کبھی بابا جان نے ڈانٹا تک نہیں تھا۔ اس طرح ہارنا۔“ اس کے آنسو پھر بہنے لگیں۔

”مجھے پتا ہے میں اس بھری دنیا میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں۔ بھلا بھی پتھر بہت عجیب ہی ہیں۔ کیسی مکاری ان کی آنکھوں سے جھلکتی ہے، ایسے لالہ کو اپنے آگے لگایا ہے۔ کہاں وہ انہیں ایک بل برداشت نہیں کرتے تھے اس روز ان کی وجہ سے مجھے پتھر مار دیا۔ اسلام آباد جانے کی مجھے خبر تک نہ کی۔ پتھر کی کس کو پروا ہے، آہا کو نہ لالہ کو نہ کسی اور کو۔ آیا کو مجھ سے زیادہ جو بلی کی دیکھ بھال نوکروں کی فکر رہتی ہے۔ مجھ سے تو انہیں بات کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ میں کس سے اپنی پریشانی کہوں، کس پر بھروسہ کروں۔ لالہ سے کہوں گی تو وہ اتنا غصہ چھپانے پر مجھے ہی تصوروار بھیجیں گے۔ اب تو ویسے بھی انہیں مجھ سے ڈر ایسا نہیں رہا تو میری پریشانی کی کیا فکر کریں گے۔“

وہ دکھی دل کے ساتھ سوچتے ہوئے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی جہاں سیلز مین اس کی مطلوبہ کتاب لگائے ہوئے ڈالے اس کا منتظر کھڑا تھا اس نے ایک نظر بیوی دروازے سے باہر سڑک پر دیکھا۔ شاید وہ پھر کہیں کھڑا نظر آجائے۔ گلاس ڈور سے باہر ڈرائیور اس کا منتظر کھڑا تھا۔ اس نے جلدی سے اوٹیلی کی اور کتاب اٹھا کر باہر نکل آئی۔

منظر کچھ ایسا عجیب یا تو کھا بھی نہیں تھا مگر عین تارا کے حسب توقع بھی نہیں تھا۔

سید سلطان بخت اس سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ انہوں نے ڈھیروں ڈھیر شاپنگ سیکڑا اٹھا رکھے تھے۔ ان کے ساتھ شاید نہیں یقیناً صالحہ شاہ تھیں۔ سچ سچ گریوٹیک کی بیڑھیوں سے قدم اتارتی ہوئی اور سارے شاپنگ ایک ہاتھ میں شعل کر کے سلطان بخت نے جلدی سے انہیں سہارا دینے کے لیے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا جسے آنسوؤں نے بہت نراکت سے تمام لیا۔ اس کے بعد صالحہ شاہ کے چلنے والے محض تین قدموں میں ہی عین تارا نے جان لیا کہ صالحہ شاہ اس ”حالت“ میں ہے جس ”حالت“ میں سلطان بخت نے عین تارا کو ایک بل کے لیے گوارا نہیں کیا تھا۔ عین تارا کی اس ”حالت“ کا سن کر ہی وہ آگ بگولہ ہو گئے تھے اور اب کس

منظر کچھ ایسا عجیب یا تو کھا بھی نہیں تھا مگر عین تارا کے حسب توقع بھی نہیں تھا۔

سید سلطان بخت اس سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ انہوں نے ڈھیروں ڈھیر شاپنگ سیکڑا اٹھا رکھے تھے۔ ان کے ساتھ شاید نہیں یقیناً صالحہ شاہ تھیں۔ سچ سچ گریوٹیک کی بیڑھیوں سے قدم اتارتی ہوئی اور سارے شاپنگ ایک ہاتھ میں شعل کر کے سلطان بخت نے جلدی سے انہیں سہارا دینے کے لیے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا جسے آنسوؤں نے بہت نراکت سے تمام لیا۔ اس کے بعد صالحہ شاہ کے چلنے والے محض تین قدموں میں ہی عین تارا نے جان لیا کہ صالحہ شاہ اس ”حالت“ میں ہے جس ”حالت“ میں سلطان بخت نے عین تارا کو ایک بل کے لیے گوارا نہیں کیا تھا۔ عین تارا کی اس ”حالت“ کا سن کر ہی وہ آگ بگولہ ہو گئے تھے اور اب کس

منظر کچھ ایسا عجیب یا تو کھا بھی نہیں تھا مگر عین تارا کے حسب توقع بھی نہیں تھا۔

سید سلطان بخت اس سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ انہوں نے ڈھیروں ڈھیر شاپنگ سیکڑا اٹھا رکھے تھے۔ ان کے ساتھ شاید نہیں یقیناً صالحہ شاہ تھیں۔ سچ سچ گریوٹیک کی بیڑھیوں سے قدم اتارتی ہوئی اور سارے شاپنگ ایک ہاتھ میں شعل کر کے سلطان بخت نے جلدی سے انہیں سہارا دینے کے لیے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا جسے آنسوؤں نے بہت نراکت سے تمام لیا۔ اس کے بعد صالحہ شاہ کے چلنے والے محض تین قدموں میں ہی عین تارا نے جان لیا کہ صالحہ شاہ اس ”حالت“ میں ہے جس ”حالت“ میں سلطان بخت نے عین تارا کو ایک بل کے لیے گوارا نہیں کیا تھا۔ عین تارا کی اس ”حالت“ کا سن کر ہی وہ آگ بگولہ ہو گئے تھے اور اب کس

طرح مستعمل کر صالحہ شاہ کے ساتھ چل رہے تھے کہ کہیں اسے ذرا سادھ چکا نہ لگے اس کے قدم نہ ڈول جائیں یا تو ان دن نہ بگڑ جائے۔

عین تارا کا بے اختیار جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اس دو غلے شخص کے چہرے پر تھوک دے وہ تمام زہر جو اسے دنوں سے اس کے اندر چل رہا تھا۔ محبت کا ڈراما رچانے والا ظالم انسان جس نے اس کی کوکھ ہری ہونے سے پہلے ہی اجاڑنے کا حکم دے ڈالا تھا اور یہ زہر ان پانچ دنوں میں بھی کم نہ ہوا تھا جب وہ قریبی کے قلمی یونٹ کے ساتھ بھورین ایٹ آباد منتقلی کے پر فضا مقامات پر قریبی کی والمانہ مینٹی میں گزار کر آئی تھی۔ انہیں ابھی اسلام آباد آئے چند گھنٹے ہی ہوئے تھے، تھوڑی دیر پہلے قریبی نے عین تارا کو اسی بوتھک سے اور اس ہارکٹ کی شاہدیں دکاٹوں سے کپڑوں، جوتوں اور جیولری کی بے تحاشا شاپنگ کروائی تھی۔ شاپنگ سے تھک کر وہ اس کیفے میں فریش ہونے آئے تھے اسٹیکس، گولڈ ڈرنک اور کافی کے بعد زیور گل اور قریبی خوش گپیوں میں مگن تھے۔ جب اپنے

گھر کے نالے سے اٹا کر وہ باہر نکل آئی تھی یا شاید قدرت کو اسے سلطان بخت کا دیدار کروانا تھا وہ بے حرکت کھڑی ایسے قلمی بیوفا ہر جانی خاوند کو دیکھ رہی تھی جواب کسی اور کی دلداریوں میں مگن تھا۔

اس کے پاس سے گزرتے ہوئے سلطان بخت کے ہاتھ سے اچانک ایک شاپر پیچے کر گیا۔ وہ اٹھا نہ کو جھٹکے اور جیسے ہی شاپر اٹھا کر سیدھے جوتے ان کی نگاہ عین تارا پر ٹک گئی۔ ان کے لب ہونے سے کپکپائے اس کا نام لے کر مگر اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ قدم بڑھا کر کیفے کے اندر جاتی زیور گل اور قریبی باہر نکل آئے۔

”ارے ڈر! تم باہر کیوں چلی آئیں۔ لکنا ہے، تھک گئی ہو۔“ زیور گل نے ہونٹوں میں سگار دبا رکھا تھا۔ ایک بھر پور کش لے کر بولی۔ قریبی فکر مند ہی سے تھک بڑھا۔

”نالی سوٹ کر لیں! تم نے کہا یوں نہیں کہ تم تھک گئی ہو۔ میرا خیال ہے واپس چلتے ہیں۔ عین تارا واقعی تھک گئی ہے۔ قریبی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ قریبی کا یہ التفات اسے اندر تک شامت کر گیا۔

سید سلطان بخت نے ایک پھینکارتی ہوئی نظر اس پر ڈالی اور تیز قدموں سے باہر کی طرف بڑھ گئے۔ عین تارا کے لب خود بخود مسکانے لگے تو قریبی کا من کسی پھول کی طرح کھل اٹھا۔ ان پانچ دنوں میں بہت کم کم عین تارا کے ہونٹ اس طرح مسکانے تھے وہ بھی قریبی کی قربت میں۔

”جلس ڈارنگ!“ وہ اس کے بالکل قریب ہو کر سرگوشی میں بولا۔

”ہیں۔“ وہ سر ہلا کر آگے چل پڑی۔ قریبی نے اس کا ساتھ دینے کے لیے اپنے قدم تیز کر لیے۔ زیور گل دونوں کو اس طرح جانتے دیکھ کر مطمئن انداز میں کش لیتے ہوئے آہستہ قدموں سے ان کے پیچھے چلنے لگی۔

”ہاں! میں رست کروں گی۔“ ہوٹل پہنچے ہی اس نے قریبی کو ہری جسنڈی دکھادی اور اپنے کمرے میں گھس کر دروازہ لاک کر لیا۔

”تو یہ تھی تمہاری اصلیت سید سلطان بخت! اتنی ہیٹ یو۔“

اس نے دونوں سینڈل زور سے سامنے دیوار کی طرف اچھالے۔ برس گھما کر بیڈ پر پھینکا اور خود دروازے کے ساتھ پڑے صوفے پر گر سی گئی۔ آنکھیں بند کیے صوفے سے ٹیک لگائے اسے چند منٹ بیت گئے۔ یکدم اس کے پرس میں رکھے موبائل کی بیل بجنے لگی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ دونوں آنکھوں کے کناروں سے گرم گرم دیوندیں تیزی سے نکل کر اس کے کانوں کے پیچھے گم ہو گئیں۔

”اؤنہ!“ اس نے ہنسنے سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

”No more Tears“ (مزید رونا دھونا نہیں۔) وہ خود سے بولی۔ موبائل بجے جا رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر پرس کھول کر موبائل یا ہر نکالا۔ اسکرین پر سید سلطان بخت کا نمبر بنگا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ مسکرائے لگے۔

”مجھے امید تھی شاہ کی آہ آپ ہی ہوں گے۔“ وہ خواہ مخواہ ہنستے ہوئے بولی اور خود کو بیڈ پر گر لیا۔ دوسرے بل وہ

اسی کئی ناقلین کھڑی کر کے زور زور سے جھار رہی تھی۔

”نہیں تارا! یہ کیا ناک ہے؟“ وہ غصے سے دانت کھینچ کر بولے۔

”کون سا شاہی! آپ والا جو آپ کر رہے تھے ہمیں دیکھ کر بھی نہ دیکھنے کا۔ ویسے ایک تو آپ کمال کے ہیں“ مان گئے۔

”وہ پھر کھلکا کھلا کر رہی۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”تم اوہرا سلام آیا میں کیا کر رہی ہو وہ بھی اس گوشت کے ہاڑ کے ساتھ۔ کون تھا وہ۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”اوستہ شاہی! میرے کانوں کے پردے بہت تازک ہیں کوئی انگریزی و سنجری ہو گئی تو میں نام پر آپ نے تو فرار ہو جاتا ہے۔ میں تمام عمر کے لیے سہری ہو جاؤں گی۔“ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہستی ملی جائے۔

”نہیں تارا! تو جو ک۔ میں پوچھ رہا ہوں تم اوہرا کیا کر رہی ہو۔“ وہ اسی طیش کے عالم میں بولے۔

”جو آپ کر رہے ہیں سہرا اپنی طبیعت فریش۔ آپ وہا کی تبدیلی۔ وہ کیا شہر ہے کسی کا۔“

رستہ بدل کر دیکھیں گے ارادہ بدل کر دیکھیں گے

زور زور سے اس شہر کی فضا ہم آب و ہوا بدل کر دیکھیں گے

بس یہی ارادہ تھا آپ کی طرح۔ آئی تنگ۔ پورا ایک ماٹ۔

”میرا خیال ہے تم اپنے حواسوں میں نہیں تمہارے دل میں اس دوکے کی فکر نے پھر کوئی کیزا کھسا دیا ہے

جو یہ عزافت کے جا رہی ہو۔ مت بھولو کہ تمہ۔ تمہ۔“ وہ اس سے کہنے لیا ہے جا رہے تھے۔ نین تارا کو معلوم

تھا۔ وہ ایک نکلے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”ماہر پور لینڈکو بیج مسٹر شاہ! میری ماں کے بارے میں ایک بھی لکھو اس منہ سے نکالنے سے پہلے سوچ لیں“

میں آپ کے خاندان کی باہر وہ پاپیڑہ صاحب زاویوں کے اگلے پچھلے کو نکال دوں گی۔ میں باہر مجھے میری

اوقات یاد دلا کر اپنے گھر کے بوئے taste کا احساس مت دلا دیا کریں۔ مجھے انہی طرح سے معلوم ہے کہ میں

کون ہوں اور آپ کس طرح کبھی اس گندہ کرتے پرتے تھے۔ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔

”نہیں تارا! میرے منہ کو مت آزماؤ۔ تم نے ابھی میرا پیار دیکھا ہے میرے جلال کی ابھی تمہیں خبر نہیں۔“

وہ لہجے کو حتی الامکان خوشخوار بنا کر بولے۔

”سب خبر ہے شاہی! سب خبر ہے۔ جاہوں تو پھر عدالت میں سارے اٹھانے کے سامنے آپ کی خبر لے

لوں۔ آخر تو آپ کی فرسٹ وائف ہوں۔ اپنے حق کو چیلنج کر سکتی ہوں کہ آپ کسی صاحب کھانے کے لائق نہ

ہیں اور یوں بھی ملو انہوں کی کون سی عزت ہوئی ہے بقول آپ جیسے سید زاویوں کے جو اس کی غصے پر ابولی۔

فکر تو آپ اپنی ناموس کی بیٹھتے ہو آپ میرے پاس گروی رکھوا چلے ہیں مسٹر شاہی! جس وقت چاہوں یہ غصے کا پتا

کھیل کر آپ کو منہ کے بل کر سکتی ہوں۔ آئندہ وہ شہ سے سوچ سمجھ کر بات کیجئے گا۔ آپ کو نہ سہی ہمیں تو خیال

آتا ہے اپنی سابقہ محبت کا۔ آپ نے نہ سہی ہم نے تو کبھی آپ سے دل لگایا تھا پورے خلوص سے پوری چاہت

سے تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔“

نین تارا کا یہ روپ سلطان بخت نے کب دیکھا تھا۔ اس کی باتوں کے دوران انہیں لگان کے پیروں کے نیچے

کی زمین ہولے ہولے ٹھکر رہی ہے۔ انہوں نے عموماً کل ایک کان سے دوسرے کی طرف منتقل کیا۔

”تم صدمے سے بڑھ رہی ہو اور صدمے سے بڑھنے والوں سے مجھے پتہ آتا ہے پتہ پتہ اپنی ماں کو۔“ انہوں نے لہجے کو

مضبوط بنانے کی کوشش کی۔

”جی۔ شاہی! آپ کو تو جسمکیاں بھی دینا نہیں آتیں۔“ وہ کھنک دار آواز میں ہنسی۔ ”ابھی بھی کیا ہے

بسی۔ صاحب شاہ نے تو آپ کو نہیں کائنات بھوڑا اور نہ شاہی! آپ تو اسی لئے آگے بڑھ کر میری گردن نہ دو بوج

لیتے۔ جی۔ جی۔ آپ تو یہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ شاہی! آپ نے کبھی چڑیا گھر میں شیر دیکھا ہے۔ قوی توکل“

خوفناک بچنے والا۔ ہواڑ ایسی کہ ایک چڑیا گھر تو کیا اس پاس کی عمارتوں کی دیواریں بھی لرزائیں ٹھکر بے چارہ

ایک چڑیا گھر میں نہ ڈال سکے۔ آپ کی طرح چسپ۔ چسپ۔“ وہ زور سے تھکا لگا کر ہنسی۔

”او کے شاہی! انجوائے پور یعنی مہون ٹرپ اور یوں پھیل پھیل پھیل ہی گینڈر بھجھکیاں دے کر میرے ٹرپ کا مزہ

بھی کر کرنا کریں۔ ایسا کچھ بھی سوچنے یا کرنے سے پہلے صرف اتنا جان لیں جس طرح آپ کو اپنی زندگی کو بھر پور

اور مزہ دار بنانے کے لیے ہال ڈال پرنے کا پورا حق ہے۔ اسی طرح کسی اور کو بھی۔ اگر میں آپ سے باز پرس کا

حق نہیں رکھتی تو آپ بھی ایسا کوئی حق استعمال کرنے کا۔ سوچیں اور نہ اس وقت یہ فون کال پہلے میں آپ کو

کر رہی ہوتی کیونکہ وفاداری کا اصول پہلے آپ نے تو ڈالتا ہے۔ آپ کو اگر چاہئے والوں کی کمی نہیں تو ڈیڑہ شاہی!

ہم بھی دنیا کے بازار میں بیٹھے ہیں۔ دو چار قدر دان تو ہمارے بھی ہو سکتے ہیں۔ آخر ایسی بھی شکل و صورت بری

نہیں ہماری کہ کوئی نگاہ ہی نہ ڈالے۔ ٹھیک ہے ناشادنی؟“ وہ کسی نیچے کی طرح انہیں سمجھا رہی تھی۔

”نین تارا! اول پوشٹ آپ۔“ انہوں نے دانت کھینچا ہے۔ ایسا بے بس انہوں نے زندگی میں خود کو کبھی

محسوس نہ کیا تھا۔

”او کے شاہی! اب لاہور جا کر ملیں گے۔ میرا خیال ہے ہم شاید اوہرا ایک دو دن اور رہیں گے۔ اگر ماننا چاہیں

تو ”کل کڈے“ کے لیے کھلے ہیں۔ چاہو گے لیے اگر آئیں گے تو چشمہ مارو شن دل ماشا! اگر

دھمکیوں کے لیے تشریف لانا چاہیں گے تو اس کا ”خارج“ بھی ہو جائے گا اور پلیز! اب مجھے ڈسٹرب نہ کیجئے گا“

مجھے اب ریسٹ کرنا ہے۔ رات کو کھانا کھانے سے مجھے اس میں بھر پور طریقے سے شامل ہونا ہے۔ میں موبائل آف

کر رہی ہوں۔ بے شک انہیں گھسا کے کھائے جائے۔“ ایک خوبصورت ہنسی کی جھلک کے ساتھ اس نے

موبائل آف کر دیا۔

اب پھر وہ پورے راندھی لٹی لٹی کے ساتھ آ رہی تھی۔

”شاہی! یہ آپ کے لیے ہے“ انہوں نے آپ کے پیچھے پیچھے پیچھے پیچھے پیچھے پیچھے پیچھے پیچھے پیچھے پیچھے

میں سے کاٹ لیا۔ آپ کے چہرے سے اس وقت دیکھ سکتی۔ صاحب شاہ کے چہرے میں پھر پھر اتے ہوئے

میرے ہر چہرے شوہر۔“ وہ اوپنی آواز میں خود ہی بولے جا رہی تھی۔

باہر دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔

”یہ کون اسٹوڈیو دروازہ بجا رہا ہے۔ بھانا رتب۔“ اس نے کھل کھینچ کر ٹانگوں پر لیا اور کروٹ کے بل لیٹ

گئی۔ اتنا ہنسنے اور خوش ہونے کے باوجود جیسے دل پر ایک بوجھ سا آن کر رہا تھا۔ وہ پہلو جس میں دل دھڑکتا تھا یوں

جل رہا تھا جیسے وہاں کوئی انکارہ رکھ دیا ہو۔

”شاہی! میری سچی محبت کا مذاق اڑا کر آپ نے بہت برا کیا ہے بہت برا۔“ وہ غم آنکھوں کو کھینچنے پر برداری۔

ڈیڑہ سو روپے کا نو سو اسلف آیا تھا وہ بمشکل پانچ دن ہی چل سکا تھا۔ آج پھر گھر میں نہ آتا تھا۔ وال نہ کوئی

سبزی وغیرہ۔ صوفی صاحب کو راجہ جلی بی نے منجھی سارا احوال سنا دیا تھا۔ جب وہ مسجد کی نماز پڑھ کر فجر کے لیے نیچے

آنے لگے تھے۔

”ناشتے کے لیے بھی آتا نہیں۔ سوچتی ہوں تو میریہ کو کیا ہوں گی۔“ وہ فکر مندی سے کہہ رہی تھیں۔ جب

صوفی صاحب خاوشی سے نیچے اتر آئے۔

نماز کے دوران بھی اور نماز کے بعد بھی ان کا ذہن اسی مسئلے میں الجھا رہا تھا۔ یہ دو تین دن کیسے تائے جائیں

تھا وہ ملنے میں ابھی کم از کم تین دن باقی تھے۔ قرض لینے کی نہ تو کبھی عادت رہی تھی نہ مانگنے کا طریقہ آتا تھا۔ آج

تک اس سے مانگنے آرہے تھے جو اکثر ہی بن مانے ان کی بھولی بھردیا کرتا تھا مگر آج کل نہ جانے کیا ہو رہا تھا یا تو

انہیں مانگنے کا جھنگ بھول چا تھا یا اور والا ہی ان کی ہر طلب سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ ان کا ذہن بے حد پریشان

تھا۔ کوئی ایسا موٹس وہمہ رو میں تھا جس سے حالات کتنے۔ کسی سے کہنے میں یوں بھی غیرت آتی تھی۔ نہ انہیں

یہ گوارا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی شکریت بندوں کے آگے کریں۔

اس نے اتنے دن بھی تو اچھے حالوں میں رکھا تھا اب راتیں دن آئے تو لیا وہ لوہا عجایبیہ ہر ایک سے اللہ تعالیٰ کے خلاف گلے شکوے کرتے پھرتے۔ یہ چیز بھی انہیں کسی سے اپنا حال کہنے سے روکتی تھی۔ گاؤں میں تو بڑے شادمانی بن گئے ہی عنایت کا اشارہ لگا دیا کرتے تھے۔

شہر وہ یوں بھی اٹھ آئے تھے کہ سال دو سال میں عبدالمستین کی اتھنی نہ لگ جانی گی۔ گاؤں وہ بارہ نہ بھی لوٹ سکے تو خود کوئی مسجد سنبھال لیں گے اور عبدالمستین کی ذہانت اور اعلا تعلیمی ڈگری کے نتیجے میں ملنے والی نوکری ان کا اتنا پانازو بن جائے گی۔ شاید نہیں پھر لٹ کر بڑے شادمانی کی طرف دیکھتا ہی یہ بڑے مہروانے نصیب۔ ایسا کچھ بھی نہ ہو سکا تھا۔ عبدالمستین جو اس دن کا لڑ بھڑ کر گیا اس نے پلٹ کر خیر نہ لی تھی۔ چند دن پہلے یہ نئی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اس کی خیر لینے گئے تھے۔ اس نے کسی اچھی کمپنی میں پارٹ ٹائم نوکری کر رہی تھی اور صبح میں اسی طرح پونہ روٹی جا کر اپنی تعلیم مکمل کر رہا تھا۔ یہی میں آیا جا کر اس سے ملاقات کریں۔ شاید وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہو مگر پھر وہی نوہواری آنا اور غیرت نے امن پکڑا لیا۔

”اگر اس نے دلچہ کر بھی نہ دیکھا جان کر بھی انجان بن لیا تو صوفی عبد الرحمان تمہارے پاس بیٹا رہ جائے گا۔ بھرم چھتا رہے۔ چلتا ہے قائم رہے۔۔۔ بھی تو اس کا خون ہوش مارے گا۔ بھی تو پلٹے گا۔“

وہ دل کو سمجھا کر واپس آئے۔

مگر اب رات سے پھر اس کی بے انتہائی کا احساس انہیں کسی بڑے شہادت کا احساس دلانے جا رہا تھا۔ ”لیا اس دن کے لیے میں نے اس پر اس قدر محنت کی تھی۔ یہ جان سے اس کی پڑھائی کے لیے کوششیں کی تھیں۔ بڑے شادمانی کی شکل کی پروا کیے بغیر اسے شرعاً تعلیم کے لیے لے جاتا تھا۔ اس دن کے لیے بس یہ پودا تیار درخت بن جائے تو ہم اس کے پھل کو آٹھ اٹھا کر دیکھنے کے بھی مجاز نہ ہوں۔“ ان کا دل رات سے بے کل تھا۔

”عبدالمستین آیا تھا وہ ہر میں۔ جب آپ بیٹے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے اور پھر چلا گیا کہ خیریت معلوم کرنے آیا تھا امتحان میں بیٹے کا اس لیے جا کر پڑھنا ہے۔“

راجلی بی کی یہ اطلاع ان کے شکست خوردہ دل پر بری طرح سے آئی۔ انہوں نے خود عبدالمستین کو آتے اور مسجد کے آگے سے گزر کر بیڑھیاں چڑھ کر اور جاتے دیکھا تھا۔ وہ مسجد کے صحن میں سامنے ہی تو بیٹھے تھے۔ وہ انہیں بیکسر نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔ ان کے دل پر کھو ناسا کا ٹھکانا لیا وہ سہی بار ہوا تھا۔ پہلے بھی ایک دن وہ ان کی غیر موجودگی میں آکر ان سے ملے بغیر واپس چلا گیا تھا۔ اس کے رنگ تو عبدالمستین سے بھی زیادہ خوں ناک تھے۔ خیر اور بھلائی کی توقع تو انہیں اس سے بھی نہ رہی تھی مگر وہ اتنی جلدی پر پوزے کھائے گا اس کی بھی انہیں امید نہ تھی۔

اور کل شام رشتے کرانے والی جس شخص کا رشتہ آہستہ کے لیے لے کر آئی وہ محکمہ تعلیم میں سینئر کلرک تھا۔ چالیس پینتالیس سال کا لڑکھوٹا، بھٹی نما رنگ، واہو آواز کو دیکھنے ماسی کے ساتھ خود چلا آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی صوفی صاحب کو جیسے آب سی لگ گئی۔ انہوں نے ماسی کو تو جو سنائی تھیں سنائیں۔ اس شخص کی بھی خوب خبرلی۔

”ہم شریف لوگ ہیں۔ یہ دیکھو اور بڑھکھاؤ۔ ہمارے ہاں نہیں ہوتے۔ ہم کوئی بازار میں دکان سجا کر نہیں بیٹھے جو ہم اپنی منہوس شکل لے کر خریدار بیٹے جیسے آئے۔ تمہاری جرأت کیسے ہوتی کہ تم صوفی عبد الرحمن کی بیٹی کو خود دیکھنے اور پسند کرنے پلے آئے ہو۔“

وہ ابھی اتنی ہی بول سکے تھے کہ وہ شخص ان پر ہاتھ اٹھانے لگا۔ وہ تو ماسی نے آگے بڑھ کر اسے دو جا پھر دو مختلفات اس شخص کے منہ سے نکلیں صوفی صاحب کو لانا دل دلا تو وہ بھی بھول گیا۔ ایسی ایسی وہابیات گالیاں جو ان کے گمان سے بھی نہ لگتی تھیں وہ مارے شرم اور غصے کے تیز تیز بیڑھیاں چڑھتے اوپر آگے۔ بیٹے غلی میں لوگ اٹھتے ہو چکے تھے۔ تمنا مالک چکا تھا۔ ان کی زندگی کا پہلا تماشا جس نے رات بھر ان کی نیند اڑائے رکھی۔ ان

کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ یہاں سے کہیں اور بھاگ جائیں۔ زندگی اس قدر خاردار ہو جائے گی ایسا تو انہوں نے گاؤں سے نکلنے سے پہلے قدم سے لے کر آخری قدم کے دوران ایک بار بھی نہیں سوچا تھا۔

رات گئی باران کا تلیہ آنسوؤں سے بھیا کا دل سے نکلنے والی آہوں اور دعاؤں میں وہ کچھ امتیاز نہ کر پاتا ہے تھے۔ اللہ سے کچھ مانگنے کو دل چاہ رہا تھا نہ گلہ کرنے کو۔ سوچ کے عجب مرحلے پر وہ کھڑے تھے۔

رات بھر کی کشمکش پھر صبح قاتلے کی خوشخبری۔ ان کے اعصاب بری طرح سے سنج رہے تھے۔ چپے دھلوں پر سپارے رکھے زور زور سے ہلے ہوئے اپنا سبق یاد کر رہے تھے۔

”کو فویل للمصلین الذین۔“ پچھ سالہ لڑکے ہامر کی زبان پر یہ الفاظ ہی نہیں چڑھ رہے تھے۔ وہ کوئی ساتویں یا ان لفظوں کو ہر رات کہتے اور اس کی زبان پر یاد ہی لڑکھڑا جاتی تھی۔ سانس رستے ہی میں ٹوٹ جاتا۔

”مجھ میں نہیں آ رہا میرے ہو جس طرح کہ رہا ہوں ویسے کہو اب نہ بولے بیچ تو تمہاری کھال اوہڑووں گا۔“ ان کا بارہری طرح سے ہانی ہونے لگا۔

لڑکے نے کائناتی آوازیں پھر اسی طرح پونپا پونپا کہانی تھا کہ صوفی صاحب اپنے آپ میں شہر ہے۔

”لوگے کلن لکھے، احمق، خبیث۔“ تھے دو دن سے یہ چار حرف نہیں یاد ہو رہے۔ گھر جا کر کیا پرتن ہو تے ہو یا باپ کی ناملیں دبا کے دیتے ہو۔ کام چور پڑھ جرم اور مغز ہمارا کھانے آجاتے ہو۔ کوڑھ مغز خوردہ ماغ، ٹھیلے کو ہونے کے سارے فن آتے ہیں نامر لکھوں کو۔ جان کھانے کو ہماری۔“

وہ اسے بری طرح سے پیٹتے جا رہے تھے۔ پہلے لمبی سی چھتری سے جو تھوڑی دیر میں ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری پھر مکوں سے لالوں سے ہاتھوں سے۔ آخر میں انہوں نے اس کی رطل اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری۔ خون کا ایک فوارہ تھا جو اس کے ماتھے سے نکلا تھا۔

”صوفی صاحب۔ صوفی صاحب۔“ ہوش کریں۔ کیا جان سے مارنا ہے اسے۔“

مجھ کام زین پھلایا۔ کھلنے لے انہیں بیٹھے سے آکر کھینچا۔ لڑکا اب نیچے گر پڑا تھا۔ خون میں اس کا چہرہ ہاتھ اور پیرے لٹ پرت ہوئے جا رہے تھے۔ سارے بیٹے پارے رکھ کر خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ چار تو مارے ڈر کے بھاگ ہی نکلے انہوں نے سیدھا اس لڑکے کے گھر جا کر خبر کر دی۔

وہ ایک کاتھ مرخٹ کا اٹھو تا بیٹا تھا۔ باپ ابھی دکان پر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جب اسے اقلوتے تخت جگر کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی۔ وہ تو کھینچاؤں دیوانہ وار مسجد کی طرف دوڑا۔ لوگ اس کے بیٹے کو اٹھا کر پانچری کی طرف لے جا رہے تھے۔ جمیل صوفی صاحب کو زبردستی چند لمحے پہلے اوپر لے لیا تھا۔

لڑکے کے ماتھے پر گہرا زخم آیا تھا چار ٹانگے لگے۔

”مجھ پوئیس میں ایف آئی آر لکھو اؤں گا۔ مولوی کا یہ بڑ خود کو سمجھتا کیا ہے بد معاش ہے کیا اس علاقے کا کہ اس کو کوئی پوچھ نہیں سکتا اور یہ معصوم بچوں کو ذبح کرتا ہے۔ میں اس کو نہیں چھوڑوں گا۔ پولیس کے حوالے کر کے ہی دم لوں گا۔ جاؤ ہمیں گا۔ بھانسا سے بچوں کو کہ ان کی کھال اتارتا ہے۔ ظالم انسان۔“

”میں جا رہا ہوں تمہارے دیکھتا ہوں مجھے کون روکتا ہے۔ نہ شام سے پہلے اس کو تو اٹات میں بند کرو لیا تو میرا نام نہیں۔“ وہ بری طرح سے پھرا ہوا تھا۔ لوگ اسے زبردستی پکڑ کر کھڑے تھے وہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں بی بی بیج کہ رہا ہے بے چارہ یہ کون سا طریقہ ہے پڑھانے کا پکڑ کر بیٹے کو لوہا لہان کر دیا۔ پہلے بھی اس مولوی کی بہت سی شکایتیں ملی ہیں۔ بچوں کو یہ اسی طرح زہر کوب کرتا ہے۔ اس کا علاج تو وہ نا چاہیے۔ علم کیا بچوں کی جان لے کر دیا جاتا ہے۔“ کھلے کا ایک اور آدمی بولا۔

”بالکل میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ چلو میرے ساتھ تمہارے وہی اس کو پوچھیں گے یہ کون سے طریقے سے پڑھاتا ہے۔“ نامر کا باپ فوراً بولا۔

”یہ سب تو ٹھیک ہے مگر شریف آدمی ہے پھر اللہ کا نام لیا۔ یوں بند بانی ہو کر تمہارے جانے کی ضرورت نہیں۔“

بس جھکے والوں کو عرضی وہ اور اس کو ادھر سے چھٹی کراؤ۔ خود ہی عقل ٹھکانے آجائے گی۔ یوں تھانے پکری میں معاملہ اچھالتے سے اپنی بھی عزت خراب ہوگی اور وقت کی بربادی الگ۔ بستر طریقہ ہے کہ سب مل کر عرضی لکھتے ہیں اور اس کو ادھر سے فارغ کرتے ہیں۔

ایک اور سیانے نے آگے بڑھ کر صلاح دی تو یہ رائے سب کے لوگوں کو لگی۔ عزت اور وقت ہی تو آج کل سب کی کمزوری ہے۔ سب سہلانے لگے۔

صوفی سادب پڑ سے بدل کر بستر چالیٹے۔ کالی کی طرف سے بھٹنے والی اوندھ کھلی کھڑکی سے لوگوں کی توازیں صاف آ رہی تھیں۔ انہیں لگ رہا تھا کہ کون سا چل گیا ہے۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ان کے دماغ میں عجیب سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ پاٹ چہرہ لیے وہ بستر لیٹ کر پھرت کر گھورنے جا رہے تھے۔

راہی کی تلبیز کے پاس کلبہ تمام کر کھڑی پریشانی کے عالم میں ایک تک انہیں دیکھتے جا رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ اور زہنت بھی سہمی ہوئی نظروں سے گھٹن میں کھڑی باپ کو دیکھ رہی تھیں۔ بیل چپ چاپ آخری سیر کی پر سہر ہنگامے کھڑا تھا۔ "آگے نامعلوم کیا ہونے والا ہے۔" سب کے لوگوں میں یہی خدشہ ابھر رہا تھا۔



"یہ تم کیا ہر وقت کمرے میں کھسی رہتی ہو۔ صالحہ صبح تم سے گفتگو نہیں کچھ کھر کی بھی خیر ہے یا نہیں۔ شہرہ! اب تم بچی تو نہیں ہو تم ساری عمر میں میں نے دو دو ٹولپوں کے سارے امور سنبھال رکھے تھے۔ نری کتاہیں ہی نہیں چالی تھیں اور کتاہیں یوں بھی مٹلی زندگی میں کسی کام نہیں آتیں۔ تم انوکھی بڑھنے والی پیدا ہوئی ہو۔ اپنے اندر شعور پیدا کرو اور چار مہینوں بعد صالحہ مصروف ہو جائے گی تو اس کھر کو کون دیکھے گا کچھ تو احساس پیدا کرو اپنے اندر۔"

وہ جیسے ہی شام ڈھلے اپنے بید روم سے نکل کر آئی لگتا تھا سیدہ اس کی ہی ناک میں بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھ کر جیسے پھٹ ہی پڑی تھیں۔

"پہلے کون اس کھر کو دیکھتا ہے۔ بھابھی بیگم اپنا اور اپنے بھائی خدا کا بھی مہیاں کر لیں تو بڑی بات ہے۔" وہ چند سیکنڈ میں ہی ان کی ڈانٹ سے سنبھل کر بے خودی سے بولی۔

"زیان بہت چلنے لگ گئی ہے تم ساری۔ سلطان بخت اس روز صبح تھا ہوا تھا تم پر۔" سیدہ کو اس کی حاضر جوابی گراں گزری۔

"ہر شخص ہی صبح تھا ہے میرے بارے میں۔ ایک میں ہی آپ کو غلط نظر آتی ہوں۔ ظاہر ہے میرا لائی پوچھنے والا دور میرا موجود نہیں۔"

وہ سچ کر بولی۔ پہلے ہی ساری ہو پھر عبد العبین کی بات پر عمل کرنے یا نہ کرنے کی جنگ خود سے لڑ لڑ کر ڈھال ہو چکی تھی اور کمرے سے باہر لڑتے ہی سیدہ کی پشتکام۔ اس کی سرخ تھکی تھکی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ سیدہ اس کے یوں چپخنے پر ایک لمحے کو چپ سی رہ گئیں۔

"ہم مر گئے ہیں کیا؟" چند لمحوں بعد وہ شکست خورہ لہجے میں بولیں۔ شہرہ نے ایک زخمی نظروں پر ڈالی اور کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم کھر والوں سے اس قدر بدظن یوں ہوتی جا رہی ہو؟" وہ سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"اچھا میرا شہ ہے۔ میرے کھر والوں کو میرا حکم ہے۔" وہ سچ کر بولی۔

"تم نے شام کو چائے بھی نہیں پی اور میرا خیال ہے تم نے وہ پھر کو کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔" وہ موضوع بدل کر نری سے بولیں۔

"کالج میں برگر کھالیا تھا اس لیے دو برہنہ جھوک نہیں گئی۔" وہ ناخن کھرینے لگی۔

"چلو اب کھانا تیار ہے۔ تم کو تو لگواؤں۔ ویسے بھی ساڑھے سات تو ہو چکے ہیں پھر میں عشاء کی نماز پڑھ لوں گی۔"

"نکلو ایس۔" وہ بے دلی سے بولی۔ اس کے سر پر رات بارہ بجے کی گھوڑا رنگ رہی تھی۔

"میں شاید برسوں صبح شام تک کے لیے اسلام آباد بھی جاؤں جو اڈ کے ساتھ۔ اس کے ایڈیشن کے سلسلے میں۔ رات سے پہلے لوٹ آؤں گی تم اس روز کالج سے چھٹی کر لیتا۔" ملازم کو کھانے کی ہدایت دے کر وہ بولیں۔

"کیوں گئی۔" وہ نوزیرا تھی۔

"ایا بات ہے تم آج کل مجھے۔" تبدیلی بدلی نظر آ رہی، وہ جیسے کسی بات نے تمہیں الجھا رکھا ہے۔ کوئی پریشانی ہے تو تم سے کسو۔" وہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

"نہیں تھا آپ کو لگتا ہے کہ میں پریشان ہوں۔" وہ آہستہ آہستہ انداز میں بولی۔

"شہرہ! تم مجھ سے بات کس طرح کر رہی ہو؟" وہ غلطی سے بولیں۔

اسی وقت فون کی آہنی بجتے لگی۔ سیدہ فون اٹینڈ کرنے آئیں۔ دوسری طرف حسین شاہ تھے۔ وہ کل سے کھر نہیں جاسکی تھیں، اسی بات پر حسین شاہ کامبوڑا اچھا خاصا آف تھا پھر حسین شاہ کو منانے اور بات کرنے میں ہی سیدہ کو بیس منٹ لگ گئے۔ ملازمہ اسٹیبل میں ڈانٹنگ ٹیبل پر کھانا لگا چکی تھی۔

"تو بے میں تو کھن چکر ہی بن گئی ہوں۔ ایک طرف کی خبر نہ لوں تو دوسری طرف کاپیڈا ڈولنے لگتا ہے۔ دوسری طرف جاتی ہوں تو ادھر والے خفا میری تو جان عذاب میں آگئی ہے۔" وہ فون رکھ کر بڑبڑاتی ہوئی ٹیبل تک آئیں۔ ملازمہ اب کرم کرم روٹیاں لاری تھیں۔

"آپ کا اسلام آباد کھر اور کرام ایڈیٹنگ گیس بن گیا۔" جیسے ہی وہ کرسی پر بیٹھیں شہرہ کہنے لگی۔ سیدہ نے کچھ پونٹ کر کے دیکھا تھا۔

"آں ہاں۔ بنا تو اچانک ہی ہے وہی تو میں ابھی حسین شاہ سے بھی اجازت لے رہی تھی۔ چاہتا بھی ضروری ہے۔" وہ پلیٹ میں سالن نکالنے لگیں۔

"جو اڈ کے ایڈیشن کو تو ابھی وقت ہے پھر وہ تو لالہ بھی کروا سکتے ہیں۔ آتے جاتے رہتے ہیں ادھر پھر آپ کیوں جا رہی ہیں؟" وہ پلیٹ میں چاول نکال رہی تھی۔

"کام ہے مجھے ابال بہت ضروری۔" وہ منہ میں بڑبڑاتیں۔ شہرہ ان کی شکل دیکھنے لگی۔

"ان کا کیا کام؟" وہ حیرت سے بولی۔

سیدہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے کھانا کھاتی رہیں تو شہرہ نے بھی کندھے اچکا کر چاول کھانے لگی پھر باقی کھانا دونوں نے خاموشی سے کھایا۔

کھانا ختم کرتے ہی وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں جانے لگی کہ سیدہ بول اٹھیں۔

"ویسے تمہیں لگ رہتا ہے کہ کوئی تمہارا خیال نہیں رکھتا اور تم خود ہر وقت اپنے تجربے میں کھسی رہتی ہو۔ میں اگر چند دنوں کے لیے آئی ہوں تو تمہیں کم از کم مجھے مٹھی دینے کے خیال ہی سے پاس آ کر بیٹھنا چاہیے۔"

"مجھے پڑھنا ہے میرا اسٹاپ کل۔" وہ جانے کو مزئی۔

"اچھی بات ہے۔ جتنا پڑھنا ہے پڑھ لو۔ مجھے اب سلطان بخت کی بات پر غور کرنا چاہیے یہی مناسب بھی ہے۔" وہ جیسے خود سے کہ رہی تھیں۔

"کیا مطلب؟" شہرہ جیسے تڑپ کر مزئی۔

"کچھ نہیں جاؤ تم۔" وہ کھاتی سے بولیں۔ "اور جو پڑھنے لکھنے سے فرصت مل جائے تو گھر واری بھی سیکھ لو۔ آگے جا کر یہی سلیقہ کام آتا ہے۔ نری قلم حوات نہیں۔"

"ہو نہ! وہ ناک چڑھا کر باہر نکل آئی۔
کچھ دیر باہر لان میں ٹھہرتی رہی۔

"یہ کیا جان کو بھی مجھ سے خواہ مخواہ کا عناد ہو چلا ہے، ہر وقت میرے خلاف ہی چڑھی رہتی ہیں جیسے اللہ کی نظروں بدلی ہیں ان کی، وہ جینیں بھی بدل گئی ہیں۔ نہ کسی کو میرا خیال نہ دھیان مگر طے سے سب کو یاد ہیں۔" وہ شہلے ہوئے سوچتی رہی اور کڑھتی رہی۔

کمرے میں آکر بھی اس کا ذہن یکسو نہیں ہو رہا تھا۔ کتابیں اٹھائیں، ٹھکی لیں اور پھر بند کر کے رکھ دیں۔
"آخر وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔" وہ اٹھ کر شہلے لگی۔

"لاتا تو تمہیں معلوم ہے، وہ تم سے کیا چاہتا ہے۔" کوئی کھٹاک سے اس کے اندر سے بولا۔

"پیار محبت، عشق عاشقی سب کتابی افسانے ہیں اور اس گھر کا ماحول، آپا اور لالہ پہلے ہی میرے دشمن بنے ہوئے ہیں، یہ فضول کی عاشقی کر کے میں اپنی جان گواہوں۔" وہ لگی میں سر ہل رہی تھی۔

"مگر اس سے پتھا کس طرح پتھرایا جائے اور آج کی دشمنی..... وہ کمرے میں آ گیا۔" اسے جھڑپیں ہی آئی۔

کافی دیر وہ سوچتی رہی مگر کوئی حل اسے اس مسئلے کا نہیں سوچا۔ اس نے کھڑی پر نگاہ کی تو بچ چکے تھے۔

"تین گھنٹے بعد۔" وہ بیڈ پر جا بیٹھی۔ "میں سو جاتی ہوں کھڑکی بند ہے، کمرے کا اندھیرا۔ خود ہی اوجھ ہو جائے گا۔" اس نے سوچا اور فوراً ہی عمل کر ڈالا۔ اٹھ کر مین لائٹ آف کی، زبرد کا بلب آن کیا اور بیڈ پر کھیل اوڑھ کر چیت لیٹ گئی۔ آنکھیں بھی بند کر لیں کافی دیر گزر گئی۔ مسلسل آنکھیں بند کرنے کے باوجود نیند کا ڈراما سا جھوٹا بھی پاس نہ بچ سکا۔

"کیا مصیبت ہے؟" مسلسل کروٹیں لے لے کر اس کے چلو دیکھنے لگے تھے۔
"اس طرح بھلا نیند آئے گی۔" وہ جھٹلا کر اٹھ بیٹھی۔

"آج مجھے جا کر اس سے دو ٹوک بات کرنی ہی پڑے گی، میں روز ڈیڑھ گھنٹہ اپنی جان بھگان کرنے سے قانع نہ آیا، جان تو اب نماز اور وظیفے کے بعد سو ہی چکی ہوں گی۔ بس چند منٹ کے لیے جاؤں گی اور اس کا دماغ درست کر کے آ جاؤں گی۔" اس نے دل میں سوچا اور فیصلہ کر لیا۔ اٹھ کر مین لائٹ بدلائی اور آنکھیں اٹھا کر پڑھنے لگی۔
نام بھی بے حد ست روی سے گزر رہا تھا۔

آخر خدا خدا کر کے بارہ بجے تھے وہ بے چینی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں بھلا اس سے کیا کہوں گی۔" وہ اپنی انگلیاں پٹکانے لگی، جو سر ہو رہی تھیں۔ اسی وقت کھڑکی کی جھلکی پوکھٹ سے کوئی پتھر آ کر ٹکرایا تھا وہ اچھل ہی پڑی۔

"وہ اچکا ہے، نیچے آ کر میرے کمرے میں آیا تو گالہ بھی نہیں جن کا ڈر ہو گا۔" اس کا دل دھک دھک کرنے لگا اور پیشانی پر پینہ سا آئے گا۔

چند منٹ بعد وہ سر اٹھایا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑکی کھولنے کے لیے پڑھے، وہ سر سے لمحے اس نے ہاتھ پیچھے ہٹائے۔

ساز سے بارہ بجے تیسرا پتھر گر تھا۔

"چوتھے کا انتظار نہ کرنا۔"

عبداللطیف کی آواز شہرینہ کے کانوں میں گونجی، اس نے فیصلہ کن انداز میں الماری کھولی اپنی سیاہ چادر نکال کر اپنا جسم اس میں اچھی طرح سے چھپایا، چہرہ اور ماتھا نقاب سے ڈھانپ کر اس نے کمرے کی لائٹ آف کی اور دھک دھک کرتے دل کو سنبھال کر اس نے دروازہ کھولا، سیلیں پیروں میں ڈالے کمرے کا دروازہ اچھی طرح بند کیا اور باہر نکل آئی۔ کاریڈر اور بیڑھیوں میں کھل خاموشی تھی وہ بیڑھیوں اتر کر نیچے آگئی، کیا کے کمرے کی لائٹ

آف تھی۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ سب دروازے بند تھے وہ آستلی سے قدم اٹھاتی ہوئی گھر کے پچھلی جانب چلی آئی۔ پتھلا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے آستلی سے چھتی گرائی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

باہر اچھی خاصی خشکی تھی، سردی کی تیز لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر باہر کے لان میں چلتی تھیں لائٹوں میں سے وہ بند کر دیں۔ لان خاصا بڑا تھا۔ اس نے سائے قبرستان کی ٹولی دیوار کو دیکھا، اسے عبدالمبین نظر نہیں آیا۔

"جاؤں کہ نہ جاؤں۔" وہ پھر تذبذب میں پڑی، اس وقت کوئی مندر پر ریڈ لائٹ چلتی، بجتی نظر آنے لگی۔

"آج آریا پار ہو ہی جائے۔" اس نے دو ٹوک انداز میں قدم بڑھائے اور تیز تیز چلتی لان عبور کر گئی۔ جیسے ہی وہ دیوار سے چند قدموں کے فاصلے پر تھی، وہ کسی پتھلا دیوار کی طرف اشارہ کر کے اس کی طرف آیا۔

"تھینک یو۔ تھینک یو۔ مجھے یقین تھا۔ تم سرور آؤ گی۔" اس کا چہرہ لان کی دیوار سے آئی مدھم مدھم روشنی میں بھی چمکاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"جو اس صحت کرو یہ بتاؤ مجھے اور تمس لیے بلایا ہے۔" وہ غصے سے غرائی۔ "تم اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہے ہو۔"

"اب اس بات کا وقت گزر گیا ہے کہ میں اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہا، اپنے حق میں بہت برائیوں نے اسی روز کر لیا تھا جس روز تم سے جی لگنے کا فیصلہ کیا تھا۔" وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"تم نے مجھے یہاں کس لیے بلایا ہے؟" وہ چبا چبا کر بولی۔

"تمہیں معلوم ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

وہ آگے بڑھی۔ "مجھے نہیں معلوم۔"

وہ خانہ خونی کے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔

"یہ تو مجھے نہیں بتا کہ کوئی کسی کے پیچھے کیوں پڑتا ہے اور میں تم سے کیا چاہتا ہوں۔ یہ تو میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ شہرینہ آئی دیوار اور مجھے تمہاری محبت چاہیے جو اب میں۔" وہ اس کی طرف جھک کر بولا۔

"اور میں نے تمہیں اس روز بھی کہا تھا کہ تمہیں کم دیکھا کرو۔" وہ طنز سے بولی۔

"جب سے تمہیں دیکھا ہے اور کچھ دیکھنے کوئی میں چاہتا۔" وہ اسی رومانیک لہجے میں بولا۔

"میں اب بلاؤں؟" وہ جیسے اکتا کر بولی۔

"تھینک یو اور چل بھی آئیے حسن والوں کی یہ ادا خرابی ہے۔" وہ گھٹکتا ہوا۔

"پلیز۔" وہ کچھ عاجزی سے ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "مجھ سے اس وقت یہ بھونڈی شاعری مت کرو۔ میں پہلے ہی بہت مشتعل ہوں۔"

"شہرینہ! تم کیوں مشتعل ہو۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں تم میرے لیے اس دنیا میں پہلی اور آخری ہستی ہو جس کے لیے میں ہر انتہا سے گزر سکتا ہوں، اپنی جان تک دے سکتا ہوں۔ یہ احساس تو انسان کو خوشی اور فخر میں مبتلا کرتا ہے کہ کوئی اسے اس قدر چاہتا ہے نہ کہ شہرینہ اور انتہا میں۔" وہ دیوار سے ہٹ کر قدم اس کے پاس آ کر بڑی محبت سے بولا۔

"مجھے تمہاری ان فضول باتوں سے پتہ بھی مطلب نہیں۔"

"مجھ سے بھی نہیں؟"

"نہیں۔"

"میری محبت سے بھی نہیں؟"

"نہیں۔"

"تو پھر تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

”تم سے پیچھا پھرانے کے لیے۔“ وہ توقف سے بولی۔
 ”وہ تو تم اپنے کمرے میں اپنے کمرے کے اندر رہ کر بھی پھڑکتی تھیں۔ اصل میں تم مجھ سے نہیں ان سوچوں سے پیچھا پھرانے آئی ہو، بلکہ مسلسل مجھے سوچتی ہیں۔“
 اس نے کئی صحیح بات کی تھی۔
 ”یہی سمجھ لو۔“ وہ اس سے ذرا برے لہجے میں کہنے لگی۔
 ”مگر افسوس۔۔۔“ وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولی۔
 ”اس کا مطلب؟“

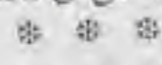
”تم۔۔۔ اب کچھ بھی کر لو، کہیں سے بھی اس دردوں کا علاج کر لو۔ اتفاقاً نہیں ہوگا۔ تمہاری جان سے چاہو گی تو یہی میری سوچوں سے پیچھا نہیں پھڑکیاؤ گی۔ کیونکہ تمہاری محبت اثر رکھتی ہے یہ اتنی آہستگی سے اتنی سبک دہی سے انسان کے دل کے اندر اس کے دماغ کے اندر اس کی رگوں میں دوڑنے والے خون کے اندر اس طرح سرایت کرتی ہے کہ پھر اس سے چھٹکارے کا مطلب اپنی جان سے پہنچا کر اپنا ہے۔ محبت سے پیچھا پھرانے کا کوئی نسخہ اس دنیا میں دریافت نہیں ہوا۔ شہرینہ! میں تمہاری رگوں میں دوڑ رہا ہوں۔ تمہارے دل کے اندر تمہارے دماغ کے اندر رہتی ہر سوچ کے اندر میں ہوں، تمہارے لیے پیچھا پھڑکیاؤ گی۔“
 اس نے ایک دم ہاتھ بڑھا کر اس کا سر دہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں تھام کر اپنے دونوں سے لگا لیا۔ شہرینہ کا پورا جسم جیسے کسی جلتے آوے میں جا کر ا۔ وہ تڑپ کر چیخے ہوئی۔ عبدالمصعب کے مسکراتے ہوئے بڑے اطمینان سے اس کا ہاتھ پھونکا۔

”میرا نام عبدالمصعب ہے، صوفی عبدالرحمن کا بیٹا۔ لوٹرڈل گلاس سے میرا تعلق ہے۔ دینی تعلیم اور صوفی دنیاوی تعلیم کا مکمل شہ کوئی نوکری کا دوبارہ روزگار، شکل و صورت میں ایسی کہ کسی زمانے میں تمہیں برسرِ منہ نہ تیار ہوگی۔ ان سب باتوں کے باوجود میرے دل نے چاند کو پانے کی تمنا کی ہے کہ وہ تو دنیاوی زندگی کے شہنشاہوں کو نہیں جانتا، نہیں مانتا، وہ آہستگی سے پیچھے پیچھے دیوار سے جاٹا تھا۔ شہرینہ کسی ہستے کی طرح سانس کھڑکی سے دیکھے جا رہی تھی۔

”تم اب جاؤ کل پھر اسی وقت آنا، اس کے بعد میں تمہیں پورا ایک ماہ نہیں ملوں گا۔ نہ ملنے کی کوشش کروں گا۔ اس ایک ماہ کے دوران تم اپنے دل میں خوب سوچنا، میرے بارے میں۔ اگر تمہارا دل تمہیں مجبور کرے تو ایک ماہ بعد ٹھیک اسی جگہ اس وقت آنا۔ میں تمہارا شدت سے انتظار کروں گا۔ اب تم جاؤ کہ کل ضرور آنا۔ خدا حافظ۔“ شہرینہ کے سانس جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اسے جیسے کسی نے پینا مانا کر دیا تھا۔
 ”سنو ایک درخواست ہے، کمرے کی کھڑکی کھلی رکھا کرو۔“

وہ چیخے سے بولا تھا۔ وہ کسی نراس کے زیر اثر آہست آہست قدم اٹھاتی پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر لان عبور کر گئی۔ عبدالمصعب اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر شہرینہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا، کوئی دیوار ویران تھی۔ وہ شاید جاچکا تھا۔

وہ تیزی سے مڑی اور آواز بند کیا اور تیز تیز قدموں سے چلتی بیڑھیوں تک آگئی۔ بیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے اپنا نقاب اور چادر اتار دی۔ بیڑھیاں ختم ہوتے ہی وہ بھاتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور آواز اندر سے لاک کیا اور تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھی، کھڑکی کھولی، کھولی ہوئی سنڈری کے اس طرف دیکھا اسے سوائے اندھیرے کے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ وہ نوں! انہیں آن کرنا وہ بھول گئی تھی۔ لان میں اچھا خاصا اندھیرا تھا۔



سیٹی کو واش روم میں گھسے آوہ گھنٹہ ہونے کو آیا تھا۔ رعنا اس کے کمرے کے دو پکڑ لگا چکی تھیں مگر وہ ابھی تک نما کر نہیں نکلا تھا۔ انہیں کوفت ہونے لگی۔

”افوہ یہ لڑکا تجھے اندر آیا کر رہا ہے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ پارٹی مسزیا قری سے ٹائم کے بارے میں جس قدر شبلی وہ ہیں شاید ہی کوئی اور ہو گا۔ اور مصیبت میری گاڑی بھی آج ہی خراب ہوئی تھی۔ جو میں اس لڑکے سے ڈراپ کرنے کا کہہ بیٹھی اس سے تو اچھا تھا کہ ٹیکسی سے ہی چلی جاتی۔“
 وہ جھنجھلا کر اس کے کمرے میں داخلہ جاری تھیں۔

”تو بخیر، میں پارٹی اشارت ہو چکی ہوگی۔ پھر سب کی باتیں سنو۔“ وہ گھڑکی دیکھتے ہوئے پردہ اٹھائیں۔
 ”اب یہ نما کر لے گا اور پورا گھنٹہ کپڑوں کی سلیکشن میں لگائے گا۔ میں خود ہی اس کے کپڑے نکال دیتی ہوں۔“ انہیں ایک دم سے خیال آیا آکے بڑھ کر اور ڈروب کا دروازہ کھولا اس میں بس چھ سوٹ ہی لگے ہوئے تھے۔ باقی کپڑوں کا ڈھیر بغیر استری کے بڑا تھا۔ رعنا نے دوسرا دروازہ کھولا۔ سامنے لگا ہوا بلیک اور اسٹ اور سٹ سوٹ انہیں اچھا لگا۔ انہوں نے وہی نکال لیا۔

”یہ ٹھیک ہے۔“ وہ ٹیکریڈ پر رہنا موزے بھی نکال دیتی ہوں۔“ وہ الماری میں دھونڈنے لگیں۔
 دروازے کے اندر دینی چھوٹی سی مین الماری کاپٹ انہوں نے کھولا۔ الماری کا اک کھلا تھا۔
 دوسرا کھلا تھا۔ اس میں لہجے جگہ بچھ کر لے لو کافی تھا۔
 اوپر نیچے دونوں ریف انہیں کی عمدہ رائی سے سجے ہوئے تھے۔ لمبی صراحی دار گردن والی ہری میبلون رنگین آب وانی بوتلیں ان کی نگاہوں کے سانسے تکی کھڑکی تھیں۔
 ”یہ سب یہ سیٹی کے کمرے میں۔“ وہ کھٹک میں کھڑکی تھیں۔

”تو یہ اس حد تک جاچکا ہے۔“ رعنا نے لہجے جان باتوں سے پٹ بند کیا اور وارڈروب آہستگی سے بند کر کے مودہ قدموں سے باہر نکل آئیں۔ باہر نگہ رعنا نے مسزیا قری سے پارٹی میں آنے سے معذرت کر لی۔
 ”میری طبیعت اچھا ہے خراب ہو گئی ہے۔ اس لیے میں بی لو ہو گیا ہے۔ آئیں سکوں گی۔“ دو جملے معذرت کے کئے اور چپ چاپ آنے کے لیے گئی۔

”اسی لیے اسی لیے میں آپ سے کہتی ہوں واپس چلتے ہیں۔ یہ لڑکا میرے بس سے باہر ہوا جا رہا ہے۔ جس کا ڈر تھا مجھے آج وہ کچھ ہمیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔“ رات ساڑھے گیارہ بجے ڈنر کے بعد جیسے ہی فخر حیات بیڈ روم میں داخل ہوئے وہ برس برس۔
 ”کیا ہوا؟ کیا ہو گیا ہے؟“ وہ لاپرواہی سے اپنے بال برش کرتے ہوئے بولے۔ نظریں آئینے میں رعنا کے ہونٹوں پر چرے پڑیں۔

”اس کے کمرے میں گئی تھی میں شام کو۔ پوری کینٹ وائن سے بھری پڑی تھی۔ اسٹڈیز میں وہ بالکل ویک۔“
 ”وہ کون ہے؟ رات کو دو تین بجے سے پہلے کمر نہیں لوٹا۔ مزید اور کیا ہو جانے کے منتظر ہیں؟“

”ریلیکس، ریلیکس مائی ڈیر وانف، اتم یوں نہیں کیوں ہو رہی ہو، بیٹھو، اُدھر۔“ انہوں نے رعنا کو کندھوں سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا اور پھر خود بھی اس کے برابر بیٹھے۔

”تم۔۔۔ تم جن باتوں پر حواس باختہ ہو رہی ہو۔ مجھے ان کی خبر آج سے چھ ماہ پہلے سے ہے۔“
 ”کیا۔۔۔؟“ رعنا کو ایک اور کرنٹ لگا۔ ”آپ کو خبر تھی تو آپ نے مجھے کیوں نہ بتایا؟“
 ”تو تم کیا کر لیتیں؟“ وہ مطمئن لہجے میں بولے۔ ”اب کیا کیا رہتی ہو۔“
 ”خیر! وہ بے بس ہی ہو کر بولی۔ ”انس ویری سیریس۔“

”معلوم ہے مجھے، تمہیں پتا ہے پچھلے سمسٹر میں سیٹی بری طرح سے قیل ہو چکا ہے۔ کالج سے اس کا نام کلتے کلتے بچا ہے۔“

”اوہ نو! وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔“
 ”تم رعنا! عجیب ہو، کبھی کسی مسئلے کے پیچھے شدت سے پڑتی ہو اور کبھی اس کو بالکل فراموش کر دیتی ہو۔ سیٹی کی

اسٹڈیز کے بارے میں گزشتہ سال سو اسال سے تمہارے بالکل بے تیزی اختیار کر رہی تھی۔
 "مجھے معلوم ہے اصل میں وہ نہیں غلط سلط پر گریس رپورٹس اور جموں تیلیوں سے بہلا تا رہا ہے میں
 وہ بار اس کے کالج یا ہوں۔ اس کے اپنے کسی نکاس فیو سے زبردست بھڑا ہوا تھا۔ پچھلے ماہ اپنی ایک گرل فرینڈ
 کی خاطر۔ یہاں کے یہ نام ٹائٹ کلب کا وہ گزشتہ ماہ سے باقاعدہ رکن ہے۔ یہاں کی کون سی باریا ہے وہاں
 وہ باقاعدگی سے آتا جاتا نہیں۔" فخر حیات سنی سے کہہ رہے تھے۔
 "اومانی کاؤ فخر! آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" رمننا کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔
 "دو تین گرل فرینڈز ہیں اس کی خاص ایک فلیٹ بھی رہت ہے رکھتا ہے۔ سینی کے بارے میں میں پچھلے
 تین ماہ سے اس قدر پریشان ہوں۔ تمہیں کیا بتاؤں مجھے لگتا تھا میرا برین ڈیمبرج ہو جائے گا اس لڑکے کے
 ہاتھوں "وہ پریشانی سے تار پے تھے۔

"تو! رمننا کے چہرے کا رنگ بیلا زور ہو رہا تھا۔
 "تو اب واپس چلنا ہے۔ اگر یہ اب چا لیا ہے۔ مگر پھر بھی بہت کچھ تباہ ہونے سے رو گیا ہے۔ شاید اللہ اسی
 میں کوئی بہتری کرے۔ اس کو سٹوارٹ کی کوئی راہ نکل آئے جس کی امید بھی کم نہیں ہے۔"
 "اس کا رینویویشن؟"

"ان تمام حالات کو سننے کے بعد بھی تمہیں لگتا ہے کہ یہ گریجویٹس کر پائے گا؟"
 "اور آپ کا اوہر کا سارا ایڈ اپ بزنس فرم وہ سب۔" رمننا لہجہ کر بولی تھیں۔
 "وہ سب میرے سوچ لیا ہے۔ یہاں سے سب کچھ سینٹا ایل جلدی ممکن تو نہیں مگر جتنا کچھ ہو گا وہ تو کرنا
 ہی بڑے گا۔ فرم ابھی ادھر ہی رہے گی۔ پاکستان میں میں نے فیکٹری لگانے کا فیصلہ کیا ہے۔ زمین خریدی جا چکی
 ہے نقشہ بھی تیار ہے بلکہ ابتدائی کام بھی شروع ہو چکا ہے۔ فیکٹری میں سفیان کے نام ہی سے لگا رہا ہوں اور اس
 کے حوالے کروں گا۔ اب اگر اس نے بڑھنا ہو تو ادھر جا کر پڑھنے کے کاورنہ فیکٹری سنبھال لے گا۔ اگر بڑے
 ہوتے امیر زاوے ذمہ داریاں پڑنے پر سنبھال چایا کرتے ہیں۔"
 "چتا نہیں۔" رمننا بے حد مایوس تھیں۔
 "دیکھو جہاں تک ہم سے بن پڑا ہم اسے سدھارنے کی پوری کوشش کریں گے۔ آگے جو اللہ کو منظور۔"

انہوں نے تکیہ سیدھا کیا۔
 "کب تک جانا ہو گا؟"
 "دو تین ماہ تو لگ جائیں گے۔"

"گروہ جانے کے لیے نہ مانا تو؟" رمننا کو ایک نیا خدا شراہق ہوا۔
 "ہاں اس کا اہ کان تھا مگر میں نے اس سے بات کر لی ہے کہ وہ فرم کے سلسلے میں ادھر آتا جاتا رہے گا۔ دوسرے
 فیکٹری اس کے نام ہوگی سارا بزنس ایک طرح سے اس نے سنبھالنا ہے۔ میں اپنا عمل دخل کم کر رہا ہوں۔ اس
 بات پر وہ خوشی راضی ہو گیا ہے۔ تمہیں معلوم ہے ناپیے کی محبت تو اس کے خون میں شامل ہے۔"
 ان کا لہجہ ایک بار پھر بڑھ گیا تھا۔ چہرہ بالکل سیاہ۔
 "آپ اس طرح اتنی بن کر ہوں کہہ رہے ہیں؟" رمننا کو وہ ساہوا۔ "تو جوانی میں سبھی اس طرح کے کام کیا
 ہی کرتے ہیں۔"

"اسی لیے تو اس کی بہتری کی خاطر اپنا بزنس اپنا ایڈ پرنٹنگ کار باہوں۔ پھر بھی تمہیں گلہ ہے کہ میں اجنبی
 بن رہا ہوں۔" فخر حیات نے بید کی پشت سے سر نکال لیا۔ ان کی نظریں چست بر تھیں۔
 "فخر! ہم نے اپنے بیٹے کے بارے میں ایسا تو نہیں سوچا تھا۔" رمننا کھوسی گئیں۔
 "ایسا کب ہوتا ہے۔ جیسے ہم چاہتے ہیں ڈیڑ۔" فخر حیات کا لہجہ بیجا بیجا سا تھا۔

"آپ اللہ سے اچھی امید رکھیں۔"
 "اسی امید پر تو سب کچھ کر رہا ہوں۔" وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ "تم بہر حال اپنی تیاری رکھو ہو سکتا ہے ہمیں
 کچھ جلدی جانا پڑ جائے۔ جب جانا ہی پھر تو یہ۔"
 "فخر! اب تو کوئی پریشانی نہیں ہے نا، کم از کم بزنس کے حوالے سے۔" رمننا نے کہا۔
 "نہیں وہ سب تو۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ "سو جاؤ اب تم بھی مجھے بھی نیند آرہی ہے۔"
 "سینی ابھی تک نہیں آیا۔" وہ اٹھ کر کھڑکی کی طرف بڑھیں۔

"وہ دو تین گھنٹے سے پہلے نہیں آئے گا۔ ابھی تو ادھر رات جو ان ہوئی ہے۔ تم اب فضول کی فکر چھوڑو لائٹ
 آف کرو اور مجھے بھی سونے دو۔" انہوں نے کروٹ لے لی تو رمننا نے مین لائٹ آف کر دی۔

"ام جان! مجھے چھ ماہ کے لیے ہارڈ ایریا میں بھیجا جا رہا ہے وہاں سے آتے ہی پروموشن مل جائے گی۔ میرے
 ٹیسٹ بھی آپ کی معاونت سے بہت اچھے ہوئے ہیں۔" سینیٹن شہباز فون پر مسزخان کو خوشی خوشی بتا رہے تھے۔
 "اللہ کا شکر ہے بیٹا اللہ تمہیں بہت ترقی دے۔ ہارڈ ایریا میں تمہیں کیوں بھیجا جا رہا ہے۔ یا تم نے خود اپنا لیا
 ہے؟"
 "ام جان! ضروری ہوتا ہے اس جگہ کے بعد ادھر جانا۔ مجھے کیا ضرورت تھی خود سے جانے کی۔"
 "جانے سے پہلے تمہیں پتہ ہی تو ملے گی؟" انہوں نے آس بھرے لہجے میں پوچھا۔
 "نہیں۔" حالانکہ انہیں ایک ہفتے کی چھٹی مل چکی تھی۔ جو انہوں نے اسلام آباد میں اپنے دوستوں کے
 ساتھ گزارنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔

"ہاں سے مل کر تمہیں جانو گے؟" انہوں نے آخری حربہ آزمایا۔
 "ہاں تو بہت زیادہ چاہ رہا تھا ام جان! وہاں میں کوشش کروں گا اگر ایک آدھ دن کے لیے آسکا تو۔" لہجہ کچھ
 شرمسار سا تھا۔
 "معاذ ٹھیک ہے نا؟ اس کی اسٹڈیز کیسی جارہی ہیں؟"
 "بڑبڑت کا نہیں پوچھو گے؟ اسے آج کل تمہارے پوچھے جانے کی کس قدر ضرورت ہے۔" انہوں نے
 شہباز کو احساس دلانا چاہا۔

"وہ آپ کے پاس ہے ام جان! اور مجھے معلوم ہے آپ اچھا خیال رکھتی ہیں۔"
 "شہباز! بے درشت نہیں۔ ان رشتوں میں یہ گولورویے اتھے نہیں لگتے۔ جو کہنا چاہتے ہو کھل کر کہتے
 ہیں نہیں ہو۔" یہاں اس غریب کی جان کو بھی سولی پر لٹکا رکھا ہے۔ اور جو میری اذیت ہے
 "آپ کو کیا خبر ام جان! میں تو فیصلہ کر چکا تھا۔ پیچھے رہی تیار کروالے تھے بس سائن کرنے تھے اور آپ کو
 پوسٹ کرنے سے پہلے فون کر بیٹھا۔ آپ نے خوشخبری ہی سنا ڈالی اور مجھے پیچھے بھاڑ کر ڈسٹ بن میں ڈالنے
 پڑے۔ ورنہ پڑھ دو ماہ پہلے ہی فیصلہ آپ کو مل چکا ہوتا۔" وہ دل میں سوچ کر رہ گئے۔
 "کیا سوچنے لگے ہو؟" خاموشی کے لہجے بولتے پر ام جان نے کہا۔
 "معاذ کے تو اب ایگزام ہونے والے ہوں گے انہوں۔"

"ہاں بڑھ رہا ہے۔ میڈیکل تو اس کا کریز ہے۔ آج کل ادھر عالیہ نے ایک ہنگامہ کھڑا کر رکھا ہے۔ کل اس کی
 ڈاکٹر رنگ کم ہو گئی ہے۔ سارا کھر اس نے سربراٹھا رکھا ہے۔ تم فون کر کے پوچھ لینا بھائی سے۔"
 "ہاں کاتو کام ہی کی ہے کوئی نہ کوئی فساد ڈالے رکھنا۔"
 "اسی لیے تو وہ فون کو علیحدہ کر دیا تھا کہ یہ روز کی چیخ چیخ مجھے بہت تکلیف دیتی تھی تم مجھے آتے کا۔"
 "ام جان! ایک بہت ضروری بات ہے۔" عالیہ اور انظر اکٹھے کمرے میں داخل ہوئے تھے انہیں فون پر بات

کرتے دیکھ کر بھی نظر انداز کرتے ہوئے عالیہ نے اونچی آواز میں کہا۔ مسزخان نے ماتھے پر ہل ڈال کر اسے ٹاپنڈیدہ نظروں سے دیکھا۔

”او کے شہباز بیٹا! تم رات میں فون کرنا یا ذرا ٹھہر کر۔ میں عالیہ اور اطہر کی بات سن لوں اللہ حافظ انہوں نے کہہ کر ریپور رکھ دیا۔“

”ہاں کوئی ایسے میرا خیال ہے کسی سے بات کرنے کے کچھ مہینوڑ ہوتے ہیں ہو بیگم!“ وہ ناگواری چھپان سکیں۔

”ام جان! جب کسی کی کوئی قیمتی چیز کم ہو جائے تو اسے یوں بتانا کہ مہینوڑ نہیں بتائے جاتے کہ صدمے سے نقل کروہ کوئی گستاخی کر بیٹھے۔ عالیہ فوراً بد تمیزی سے بولی۔

”کوئی کیا بات ہے؟“ انہوں نے فون اٹھا کر سائیڈ ٹیبل رکھ دیا۔

”میرے جیولر کا فون آیا تھا ابھی اس کے پاس میری وہی رنگ کوئی لڑکا فروخت کرنے آیا ہے۔ جیولر میری رنگ پہچان گیا تھا۔ ابھی پچھلے مہینے ہی تو میں نے یہ سب اس سے بنا لیا تھا۔ جیولر کے شک کہنے پر وہ لڑکا تو ہلکا گیا مگر جیولر نے اس کا جو حلیہ بتایا ہے اس سے ہمیں بتا چل گیا ہے۔“ وہ جلدی جلدی ہنسنے لگی۔

”یہ تو اچھی بات ہے۔ چوڑا کاپٹا چل گیا۔ تمہارا صدمہ تو رفع ہو گا۔“

”مگر یہ اچھی بات نہیں ام جان! اگر چوڑا کھر کا فرو ہے۔“ اطہر نے ہنسنے سے کہا۔

”کیا مطلب؟“ مسزخان نے تیوری پر ہل ڈالے۔

”جیولر نے جو حلیہ بتایا ہے وہ بالکل۔“ اطہر ذرا رکاموں کا چہرہ دیکھا۔ ”وہ معاذ کا حلیہ ہے اور ہم اسے لینے آئے ہیں۔ جیولر کی دکان تک لے جانے کے لیے۔“

”تمہارا دامخ تو درست ہے نہ۔ بولنے سے پہلے سوچ تو لینا تھا۔“

”ام جان! دامخ تو پتا نہیں کس کا خراب ہے جو ایک انجان غیر لڑکے کو یوں اٹھا کر کھر میں بسا لیا ہے۔ میں تو پہلے ہی کہتا تھا یہ سب درست نہیں۔ نتیجہ دیکھ لیا نا۔“

”کیا شہوت ہے تمہارے پاس اس بک بک کا؟“ وہ غصے سے بولیں۔

”شہوت کے لیے ہی تو اسے لے جانا چاہ رہے ہیں اور اگر آپ کو بھی اس پر یقین ہے تو اسے ہمارے ساتھ جانے دیں۔ ہم معاذ کو نہیں بتائیں گے۔ بس جیولر کی دکان پر لے جا کر پہچان ہی تو کروالی۔ اس بات پر تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ دیکھیں ام جان! آج چھوٹا نقصان ہوا ہے کھل کو بڑا بھی ہو سکتا ہے۔ ہمز نہیں کہ آج ہی معاملے کو گرفت میں لے لیا جائے۔“

”اطہر! مجھے بہت افسوس ہے۔ بیوی کی عقل کے پیچھے چلے چلے تمہیں انسانوں کی بھی پہچان نہیں رہی ہے۔“ وہ افسوس بھرے لہجے میں بولیں۔ ”معاذ۔ معاذ بیٹا! ادھر آؤ۔“ انہوں نے منہ اونچا کر کے دروازے کی طرف آواز لگائی۔ چند سیکنڈ میں ہی معاذ دروازے پر نمودار ہوا۔

”ہی ام جان!“

”معاذ بیٹا! تم اپنے بھائی اور بھانجی کے ساتھ ذرا جاؤ۔ انہیں جیولر کی دکان تک جانا ہے۔“

”ٹھیک ہے ام جان!“ وہ سر ہلا کر ان دونوں کے ساتھ چل پڑا۔

”انہیں گے جب آدھ گھنٹہ سے زیادہ ہونے لگا تو مسزخان کو بچھتاوا سا ہوا۔“

”مجھے معاذ کو ان دونوں کے ساتھ نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔ وہ کبھی اس کا اچھا نہیں سوچیں گے۔ وہ تو شروع ہی سے اس کے یہاں رہنے کے خلاف تھے اور میں نے سب وقتوں میں اس کو ان کے ساتھ کروایا۔“

اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف ان کے حسب توقع اطہر ہی تھا۔

”ام جان! ہم کچھ کہتے تھے نا کہ یہ لڑکا اعتبار کے قابل نہیں ہے۔ جیولر نے اسے پہچان لیا ہے اور۔۔۔“

”اطہر! اسے کھر واپس لے کر آؤ میں خود اس سے معلوم کروں گی۔“ ان کی برداشت کی حد ختم ہو چکی تھی۔ وہ جیسے چیخ کر بولیں۔

”ام جان! میں اس چوڑا کو اب کھر واپس نہیں لاسکتا۔ ہاں حوالات ضرور پیشا سکتا ہوں اور اب اسے ادھر پناہ کر رہی آؤں گا۔ میں ایک چوڑا پر مزید اعتبار نہیں کر سکتا کہ اسے اپنے گھر لا کر کوئی اور نقصان اٹھاؤں۔ ہم کچھ دیر تک آئیں گے اور۔۔۔“

”اطہر! میں کہہ رہی ہوں کہ اسے گھر لے آؤ۔ میں خود سارا معاملہ دیکھوں گی تم اس طرح کرنے کے مجاز نہیں ہو۔ اسے۔۔۔“

”ام جان! میں آپ کے بعد ہی سہی اس گھر کا کچھ لگتا ہوں۔ کچھ فیصلے کرنے کا اختیار بہر حال مجھے بھی ہونا چاہیے۔ ایک احتقان قدم شہباز نے اٹھایا۔ آپ نے فوراً اس کی تائید کر دی۔ ایسے ہزاروں لڑکے فٹ پاتھوں اور سڑکوں پہ مارے پھر رہے ہوتے ہیں۔ کوئی انہیں اٹھا کر یوں اپنے گھروں میں نہیں لے آتا۔ میں اسے اٹھانے لے کر جا رہا ہوں خدا حافظ۔“

اطہر نے مزید ان کی بات سے بغیر بڑی بدگامی سے فون کھٹاک سے بند کر دیا اور جیسا اس کا موڈ لگ رہا تھا اس نے ان کی بات ماننی یا سنی نہیں تھی۔ مسزخان نے بے بسی سے فون کو دیکھا۔

”اس کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ ان کی بیٹھائی پر بسنے کے ننھے ننھے قطرے پمکنے لگے تھے۔ ہماری ہمدردی اسے ہنگی پڑی۔ یہ اطہر! حق۔۔۔“ انہیں کچھ کچھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”نزہت! نہ جھٹس۔“ ذہنی خطرات نے ایک کمر سے ان کے سارے جسم سے توانائی چھوٹی تھی۔

”ہی بیٹھو۔“ اس کی آواز شاید لافون سے آئی تھی۔

”معاذ! ادھر آؤ۔ یہ ایسے کس پڑی ہے اس میں شہباز کا موبائل نمبر لکھا ہے۔ دیکھ کر جلدی سے ڈائل کرو۔“ اس کی شکل دیکھتے ہی وہ فوراً بولیں۔

نزہت ایک بل کو ان کی اس اچانک فرمائش پر جھبکی پھر ان کا پریشان چہرہ دیکھ کر فوراً ”اٹھ ٹیکس اٹھا کر نمبر دھونڈنے لگی۔ نمبر ملنے پر اس نے سراسر کھر خان کو دیکھا۔

نزہت نے نمبر ڈائل کیا تو دوسری طرف ہل جا رہی تھی۔ نزہت کے ہاتھ ٹھنڈے ہونے لگے۔

”ہیلو!“ اس پتھر کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

”میں نزہت۔“ خشک ہوتے حلق سے چند سیکنڈ بعد ہی نقل لگا۔

”اٹھو! پتھر پھاڑ تھا۔“

”تو کاش تو سارا بھگڑا ہے۔“ اس نے شرمساری ہو کر ریپور مسزخان کو تھما دیا۔

”شہباز! اگر اس غریب سے نیکی کی تھی تو اس کا خیال بھی رکھنا تھا۔ معاذ کو اطہر اٹھانے لے گیا ہے اس اٹھو تھی کی گشتگی کے سلسلے میں۔ اس بچے کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ بن ماں باپ کا بچہ۔“ مسزخان جیسے رو دینے کو نہیں۔

”اومانی گاڈ! ام جان! میں نہانی کرتا ہوں تم نے کی رات تک۔ آپ انہیں چند گھنٹوں کے لیے تو روک لیں گی۔“ وہ میری کہاں سن رہا ہے۔ تم آؤ تو خود ہی کچھ کرو۔ اطہر کی آنکھوں پر تو بیوی کے پاگل پن کی پٹی بندھی ہے۔“

”میں دیکھتا ہوں اوکے اللہ حافظ۔“

نزہت ان کے بل پر ہی بیٹھی گو میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھے جا رہی تھی۔

”بیٹا! یہ فون رکھ دو ادھر۔“ اس کی کیفیت کو جاچتے ہوئے انہوں نے نرمی سے کہا۔ وہ فون ریک پر رکھ کر فوراً باہر نکل گئی۔

شہرینہ اگلے روز کالج ہی نہ جاسکی۔ رات بھر کی بیداری کا نتیجہ کہ اسے صبح تک بخار ہو چکا تھا۔ ٹیپر بچہ زیادہ نہیں تھا مگر سر میں بہت درد تھا۔ سیدہ نے اسے کالج جانے ہی نہ دیا۔ سارا دن وہ کمرے میں پڑی رہی اور آٹے والی رات کے بارے میں سوچتی رہی۔

”میں اب کسی صورت نہیں جاؤں گی اس سے ملنے۔“ وہ سارا دن وقفے وقفے سے یہ فقرہ دہراتی رہی تھی۔ خود کو تسلی دینے کے لیے اسے کمرے میں بڑے بڑے شام ہو گئی۔ بخار اس کا ترچکا تھا۔

سیدہ اسے دو بار باہر آنے کی تاکید کر کے جا چکی تھیں۔ وہ اٹھ کر کچھ دیر کے لیے باہر گئی۔ تھوڑی دیر ہی بیٹھ سکی اور پھر اٹھ کر اندر آئی۔ رات کے کھانے کے بعد اس کی پریشانی سوا ہونے لگی۔

”شہرینہ! ایوں ڈر رہی ہو، وہ تمہارے کمرے میں تو نہیں آسکتا اگر تم یہی جاؤ گی تو وہ تمہیں کھاتا نہیں جانتے گا۔ یوں خود کو ہلکان کرنے سے کیا حاصل۔“ اپنا سمجھانا بھی بے سود جا رہا تھا۔

”یا اللہ! میں کیا کروں؟“ بارہ بجے تک اس کی یہ چیخ اور پریشانی کا عجیب سی عالم تھا اور اب تو دل بار بار جانے کا تقاضا کر رہا تھا۔ وہ دل کے تقاضے کو جھڑکے جا رہی تھی۔ بارہ بجے کے بعد اس کی ہمت اپنی ہی ڈانٹ چھٹکارے آگے بالکل دم توڑنے لگی تھی۔

”بس ایک بار چلی جانی ہو۔“ بار بار اندر سے فرمائش اٹھ رہی تھی مگر جاوہ پھر بھی نہ نکلی تھی۔

”بس آج کے دن چلی جاؤں۔“ دل گڑ گڑایا۔
 ”نہیں۔“ اس نے حق سے سر جھٹکا۔
 ”شہرینہ! چلی جاؤ۔“ دل نے پھر ہمت کی۔
 ”نہیں جاسکتی۔“ گزور سا انکار تھا۔

شاید وہ چند منٹوں بعد چلی ہی جاتی کیونکہ جاوہ وہ الماری سے نکال چکی تھی۔ جب وہ تھا پھر اس کے قدموں کے قریب آکر گر اٹھا اس کے ساتھ کوئی کانٹہ لپٹا ہوا تھا اس نے جھک کر کانٹہ اٹھلایا۔

”تو تم نہیں آئیں۔ گویا تم نے میری محبت کا مذاق اڑایا میری جاہت کی قدر شاید تمہیں نہیں شہرینہ! میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اب پھر کہہ رہا ہوں اس دنیا میں تمہیں مجھ سے زیادہ جاننے والا اور کوئی نہیں ملے گا۔ آئی رہی لو۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جیسے پھولی پانی کے بغیر نہیں رہ سکتی شہرینہ! تم میرا پانی ہو میری زندگی ہو اور وجہ زندگی بھی۔ اگر تم نے میری محبت کو نظر اویا تو میں زندہ رہنے کی اور کوئی وجہ تلاش نہ کر پاؤں گا اور میرا خون ناحق تمہارے پتھر دل کی سختی پر ہو گا۔ تمہیں میری محبت کا یقین کیوں نہیں آتا، تمہیں کونسا علاج کے لیے میں کیا کروں تمہاری بے بسی پر وحشی جا رہی ہے اور میری بے قراری۔“

اب میں جا رہا ہوں ٹھیک ایک ماہ بعد اسی جگہ تمہارا انتظار کروں گا اور تمہیں آنا ہی ہو گا۔ میری خاطر میری محبت کی خاطر اور اپنی خاطر بھی۔ مجھے یقین ہے تم میرے بغیر رہ نہیں سکو گی، مجھے یقین ہے۔

تمہارا اور صرف تمہارا
 عید المیلین!
 وہ آخری لائن بمشکل پڑھ پائی تھی کہ کوئی زور سے دروازہ کھول کر کمرے کے وسط میں آن کھڑا ہوا تھا۔ شہرینہ کی جان اس کی شکل دیکھ کر ہی فنا ہو گئی تھی۔

سید سلطان بخت میں سامنے کھڑے کڑی نظروں سے اس کو گھور رہے تھے اس کے ایک ہاتھ میں کھلا پیغام محبت تھا تو دوسرے ہاتھ میں چادر۔ سلطان بخت کے پیچھے داخل ہونے والی صالحہ شاہ تھیں جنہوں نے ایک ہی نظر میں شہرینہ کی کیفیت کو جان لیا تھا اور اب وہ بہت مضبوط قدموں سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ شہرینہ کو لگا آج ابھی اسی وقت اس کی موت کا مقررہ وقت آن پڑتا ہے۔ اس کے پورے جسم میں دوڑنے والی حرکی لہریں بالکل ساکت

ہو چکی تھیں۔ اس میں اتنی ہی ہمت نہیں تھی کہ ہاتھ میں پکڑا وہ رقعہ ہی منٹھی میں بھینچ لے۔
 ”تم ابھی تک جاگ رہی ہو، ہاتھوں سے آؤ گی رات ہو رہی ہے۔ چادر لے لیں جانے کا ارادہ ہے کیا؟“
 سلطان بخت کی بھاری بھاری غصیلی آواز اسے جھپٹے عالم فتنے عالم ہوش میں لے آئی۔

”مہم میں۔ سن۔ نہیں۔ اللہ!“ اس کے صدیوں کے پیارے ہوشوں اور حلق کو تھوک نکل کر تر لڑنے کی کوشش کی۔

”کیا مطلب؟“ اس کی غصیلی نظروں میں اس کے اندر اتری جا رہی تھیں۔

”سوئے والی تھی میرا مطلب ہے۔“ اس سے کوئی بھی مناسب بہانہ بن نہیں پاتا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا اپنی موت کا پیغام آہستہ سے سمیٹا۔

”رات کے اس پہر بھائی، چہ نوب، عشق وہ بھی ایسا۔“ صالحہ کا نظریہ اور مختصر منہ اسے پھر سے وحشت زدہ کر گئی۔

چادر لے کر کہیں جانے کا ارادہ تھا اور یہ دکھاؤ، شاپنگ لسٹ ہے کیا؟“ صالحہ شاہ نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے رقعہ چھین لیا۔

”میں سونے جا رہی ہوں، تمہارے لیے یونیفارم الماری میں لٹکایا تھا اور اب یہ چادر رکھ رہی تھی۔ آپ کب آنے لالہ؟“ ایک لمحے کی بات کسی خیر اچانک اس کے اندر اتنا اعتماد کہاں سے ور آیا تھا۔ اس نے اسی چادر کو رقعے کے اوپر رکھا اور مرکز الماری میں رکھنے لگی۔

”ابھی آئے ہیں۔ سیدہ آپ شاید سو رہی ہیں اس لیے انہیں ڈسٹرب نہیں کیا۔ تم اب سو جاؤ، شخص پر بھائی کے لیے یوں خود کو آؤ گی رات تک ہلکان کرنے کی مشہورت نہیں۔“ انہوں نے شاید صالحہ شاہ کی بات پر دھیان نہیں دیا تھا ان کی رقعہ والی بات۔

”جی ہاں۔ میں سونے والی ہوں۔ آپ کو شاید دو چار روز بعد آنا تھا۔“

وہ اب عمل طور پر اعتماد ہو چکی تھی۔ الماری ان نے آہستہ سے بند کر دی اور اس سے پشت ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔ صالحہ نے اسے کھانے والی نظروں سے گزرا۔

”ماں! آنا تو دو چار روز بعد ہی تھا پھر ادھر کے ہمارے اور کام۔ اتنے دن تو میں سیریا یا انور ڈ نہیں کر سکتا تھا، اسی لیے آگے۔ ایک دو ضروری کلام ارخصت کو عیت کے تھے۔ سو جاؤ اب تم بھی۔“ صبح نائستے پر ملاقات ہو گی تو تمہیں تمہارا گفت دین گے۔ صالحہ نے بہت اچھی شاپنگ کی ہے تمہارے لیے اور آپ کے لیے بھی۔ سلطان بخت کا لہجہ سہلے دنوں جیسا ہو چکا تھا۔ خیال رکھنے والا اور محبت بھرا۔

”تھیک ہے لالہ۔“ (آپ کا اس طرح بولنا ہی میرے لیے گفت ہے۔ مجھے صالحہ شاہ کی اچھی شاپنگ کی قطعاً) ضرورت نہیں۔ کاہل ہی میں کہہ سکی۔ وہ آہستہ سے چلتے ہوئے کمرے سے جانے لگی۔

”لالہ! آپ نے کھانا کھا لیا ہے؟“ اس نے صالحہ کو جانے کے لیے بڑی فکر مندی سے پوچھا۔

”ہاں کمرے میں کچھ اسٹیکس لے لیے تھے اب تو میں آرام کی ضرورت ہے۔ سخت تھکاوٹ ہو رہی ہے۔ آجاؤ صالحہ! تم بھی ریست کرو، اتنا لپٹا کھا لیا ہے۔“ وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ صالحہ شاہ ابھی بھی کھڑی اسے کڑے تیوروں سے گھور رہی تھیں۔

”الذات ہے بھابھی بیگم کو نہیں آتی یہ میرا لٹا ابھی مجھ سے کر جانیں گی۔“ وہ ذرا سا مسکرا کر بولی۔ اسے صالحہ کی کیفیت لطف سے رہی تھی۔ صالحہ نے ”مٹی خیر انداز میں سہلایا۔“

”شہرینہ! شاہ! تمہارا گفت تو واقعی میں تمہیں دونوں کی فکر ضرور ہے۔ جس طرح میں اس وقت کر رہی ہوں۔ اب تم بھی ایک بے خبر سکون چند کے مزے لے لو۔ جب تک تمہارے لالہ اسی طرح بھولہن کا شکار رہیں گے۔ تم عیش کرو۔ آؤ گی رات تک بھائی کا چہنچہ۔“ وہ کوسب کھیل کھیل لو۔ ابھی میری باری نہیں آئی۔

”کیا مطلب میں کچھ سمجھی نہیں؟“ وہ معصومیت سے بولی۔

”بہت جلد سمجھ جاؤ گی تم بھی اور سارے سمارتے سمارتے بھی۔ بس تھوڑا انتظار تو جیسے نکلتا ہے ہوتے ہوئے بولی
”مجھے تو آپ کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ ویسے بھابھی بیگم! آپ اچھی لگ رہی ہیں۔ لیٹ ہنی مومن
ٹرپ نے آپ کے حسن و صحت پر ایسے اثرات مرتب کیے ہیں۔ مزاج کے تھکے پن میں بھی خاصی بہتری ہوئی
ہے۔“ وہ جیسے صاف کو چرانے کے لئے بولی۔

”بہتری آنے کی ابھی تو اور بھی آنے کی ہم آمانا تو سہی۔ شب بخیر۔“

وہ کہتے ہوئے بیٹھ کر کمرے سے نکل گئیں تو شہباز ان کے پاہر جاتے ہی زور سے ہنس پڑی جیسے کئی گھنٹوں
کے بعد اس کے پیچھے پھڑوں نے کھل کر ہوا میں تازہ سانس لیا ہو۔ اس نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ لاک کیا
اور پھر مسکرا کر کھڑکی بھی بند کی۔ منڈیر کے دوسری طرف ٹلس اندھیرا تھا۔ اس نے ایک سرسری نظر ڈالی تھی۔
اور پھر بہت آہستگی سے لٹاری لٹول کر چادر کے اندر دبا رکھا۔ ٹالا۔ ٹین لائٹ آف کر کے زیر کابلج آن کیا اور
اپنے بیڈ پر شیم وراز ہو کر رتھ پر ہنسنے لگی۔ ایک بار نہیں دو بار نہیں اور پھر تین بار۔ اسے لگا اس کا پورا وجود کسی
سرور میں ڈوبا جا رہا ہے۔ اس نے بے اختیار رتھ کو اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا۔ اس کا دل بے قابو آہستہ آہستہ ٹینڈ میں
ڈوب رہا تھا۔ ایک انورٹھی کیف ٹینڈ۔۔۔

رات کے ساڑھے دس بجے تھے جب شہباز کینیٹن شہباز معاذ کو اپنے ساتھ لیے مسزخان کے کمرے میں داخل
ہوئے۔ وہ اپنے بستر پر تکیوں سے ٹیک لگائے ان کی ہی منتظر تھیں۔ نزہت ان کے دائیں طرف سنگھل صوفے پر
بیٹھی اخبار کو پونہی گود میں رکھے بیٹھی تھی۔

”آگے اللہ تیرا شکر ہے۔ معاذ! بچے تم ٹھیک تو ہونا؟“ انہوں نے بے قراری سے معاذ کی طرف بازو پھیلائے۔
”جی ام جان! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ابھی تک سوکھ نہیں۔“ معاذ کی باتوں میں سلسلے سے ہنسنے لگا۔ چند
منٹوں میں ہی اس کا چہرہ اتر گیا تھا اور آنکھیں جیسے اندر گودھنک رہی تھیں۔
”زیادہ مسئلہ تو نہیں ہوا شہباز بیٹا؟“ شہباز اب کرسی پر بیٹھنے لگے تو ان کے تھے کھول رہے تھے۔
”نہیں ام جان! کچھ خاص نہیں۔“ ہونٹوں پر جھلکے جھلکے انہوں نے مختصر جواب دیا۔
”ظہر آیا ہے؟“

”جی! انہوں نے ایک ایک کر کے دونوں بوتے اتارے اور پھر جرابیں بھی اتار دیں۔ انہوں نے اندر رکھ دیں۔
وہ دھیاسفید مضبوط پاپوں کی انگلیوں کو اب وہ ایک ہاتھ سے دبار سے تھے۔ نزہت کی بیٹی نظریں ان کے پاپوں پر جمی
تھیں۔ ایک لمحے کو بے اختیار اس کا بی چاہا وہ دونوں پاپوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر آہستہ آہستہ دیا کہ ان کی
ساری تھکن اس کی انگلیاں چھن گئیں۔

ایک بے شوو بے اختیار سا خواتش کا لمحہ۔ دوسرے پل اس نے ایک گرا سانس لے کر نظریں کا زاویہ اس
دل پہنچنے والے منظر سے بدل لیا۔
”بہت بگناہ ذہنت کا شوٹ دیا ہے اظہر نے۔ محض بیوی کی باتوں میں آکر۔“ انہوں نے متاسف لہجے میں کہا۔
شہباز نے کوئی جواب نہ دیا۔

”معاذ تم دن بھر ہاتھ دھو لو پھر کھانا کھاتے ہیں تمہیں بھوک لگی ہو گی۔“ شہباز نے معاذ کے تھے ہونے چہرے کو
دیکھ کر کہا۔

”جی ایٹھا!“ اس نے کہا مگر اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔

”تم بھی شہباز بیٹا! فریش ہو جاؤ۔ میں زیتون پالو کو آواز دیتی ہوں کھانا گرم کرے بلکہ نزہت بیٹا! تم اٹھو ذرا
دیکھو یہ زیتون پالو کھیں کچن میں اوکھ تو نہیں رہی؟“

نزہت کوئی بھی جواب دے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر نکل گئی۔ شہباز نے پنک کاٹن کے سوٹ میں بلبوس اس
کے سر آپ کو نظر بھر کر دیکھا۔ ایک متوقع تبدیلی کا ہلکا سا احساس انہیں اس کے وجود سے ہوا تھا۔ انہوں نے
نظریں کا زاویہ بدل کر معاذ کو دیکھا۔

”شہباز بھائی! ان کے متوجہ ہوتے ہی معاذ نے آہستگی سے کہا۔

”ہاں کہو۔“ وہ کافی دیر سے دیکھ رہے تھے وہ کچھ کہنا چاہ رہا ہے مگر کہہ نہیں پا رہا ہے۔

”مجھے معلوم ہے تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد شہباز خان نے خود ہی کہا۔

”آپ کو معلوم ہے نا۔“ اس کی آنکھیں چمکیں۔

”معاذ! دیکھو! ایک دو ماہ تک تمہارا فائل امتحان ہونے والے ہیں۔ تمہاری زندگی کا سب سے ہوائنگ
میل اس لیے تم محض ادھر ادھر کی باتوں پر۔ توجہ دے کر اپنا ذہن خراب کرنے کے بجائے صرف پڑھائی کی
طرف توجہ دے۔ تیس میرٹ بنانا ہے بہترین رزلٹ شو کرنا ہے میری اور ام جان کی امیدوں کو پورا کرنا ہے۔ اس
کے بعد کارٹ بہت آسان نہ سہی مگر اتنا دشوار بھی نہیں ہے۔ کم از کم منزل کا تعین تو ہو جائے گا نا۔ بس اب جب
کر کے ایگزیم کی تیاری کرو۔ محض جی لگا کر۔ اب آئندہ اس طرح کے معاملات تمہیں ڈسٹرب نہیں کریں گے۔
میں نے اس کا سدباب کر دیا ہے۔ تم اب ادھر۔“

انہوں نے اشارے سے دونوں بھائیوں کے پورشنز کی طرف اشارہ کیا۔ ”کسی بھی صورت میں جاؤ گے اور
نہ وہ لوگ تمہیں اپنی خدمت گاری کے لیے بلانے لگیں گے۔ ام جان! میں نے اظہر بھائی اور ایاز بھائی دونوں سے
تختی سے کہہ دیا کہ اب معاذ ان کی طرف نہیں آئے گا۔“

اسی وقت اظہر کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ایک مختصر بھری نظر مسزخان کے ساتھ جڑ کر بیٹھے معاذ پر
ڈالی۔

”آؤ اظہر بیٹا! مسزخان نے کھلے دل سے کہا وہ خاموشی سے شہباز کے دوسری طرف آ بیٹھے۔

”آپ کو شہباز کو نہیں پانا چاہیے تھا۔ میں نہیں اس گھر کا دشمن نہیں ہوں۔“ وہ سختی سے بولے۔

”مجھے ام جان نے نہیں بلوایا نہیں تو کیا ہوں۔ مجھے ایک ہفتے کی چھٹی ملی ہے اس ”معاذ“ کا علم تو مجھے
یہاں آکر ہوا اور دوسری بات معاذ کو اس گھر میں نہیں لے کر آیا ہوں۔ جب بھی اس سے متعلقہ کوئی بات ہو گی
اس کا علم سب سے پہلے مجھے ہی ہونا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں بلکہ آپ کی نظریں میں مجھ پر یہ ایک الزام بھی ہے
کہ میں بغیر جانچے پڑھے ایک اجنبی لڑکے کو اپنے گھر میں لے آیا ہوں۔ عمر اور تجربے میں میں آپ سے کم سہی
مگر اس کا دل کی پچھان مجھ سے بلکہ اس سے بڑھ کر میرا نہیں ہے۔ جو مجھے ہمیشہ کھتا رہا ہے کہ میرا فیصلہ غلط نہیں۔“
انہوں نے وہ ٹوک انداز میں کہا۔

”تو ہم گھر والے تمہاری نظر میں بھولے ہوئے۔ تمہارے بھائی تمہاری بھابھیاں۔“ بھڑک کر بولے۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ معاذ! تم جا کر فریش ہو، میں ابھی آتا ہوں۔“ انہوں نے اس سے کہا تو وہ معاذ کی
گرا گری دیکھ کر فوراً ہی کمرے سے نکل گیا۔

”شہباز! تم اچھا نہیں کر رہے۔ اپنے ساتھ نہ ہمارے ساتھ اور نہ اس گھر کے ساتھ۔“

”مجھے معلوم ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں! البتہ آپ کو علم نہیں کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ اظہر بھائی! ایک معمولی
سی انگوٹھی کی چوری کے لیے آپ نے میرے اعتماد کو نہیں پختائی۔ اس گھر کی عزت کو داؤ پر لگا دیا۔ کوئی بھی ایسا
قدم اٹھانے سے پہلے آپ کو کم از کم مجھ سے بات کرنا چاہیے تھی۔ آپ کی بیگم کی رنگ اس گھر کی ناموس سے
زیادہ قیمتی نہیں۔ معاذ! اس گھر کا فرد ہے آپ لوگ تسلیم کریں یا نہیں مگر ہمارے پورشن کا وہ حصہ ہے اور رہے
گا۔ آپ کی رنگ کی جو بھی مالیت تھی وہ میں ادا کر دیتا ہوں۔ کتنے کی تھی وہ رنگ دس ہزار کی نہیں تیس یا چالیس
پچاس ہزار کی تھی۔ میں دینے کو تیار ہوں مگر آپ کو یوں معاذ کو اٹھا کر تھانے لے جانے کا کوئی حق نہیں تھا جبکہ

آپ کو تفرم بھی نہیں تھا کہ اس نے چوری کی بھی ہے یا نہیں۔ "کیٹین شہباز کا چہرہ غصے سے سرخ ہو چلا تھا۔
 "تو تمہارے خیال میں میں نے یہ جان بوجھ کر کیا۔" وہ بھی غصے میں بولے۔
 "یہ میں نہیں جانتا جبکہ ایسی چیز کوئی اور بھی اٹھا سکتا ہے۔ آپ لی کوئی ملازمہ یا۔"
 "یا کون؟" کوئی نہیں بھی تو سنوں۔"

"مجھے وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں آپ کو اپنے گھر کی خود خبر ہونی چاہیے۔ آپ کے بیٹے بھی اب ماشاء اللہ بڑے ہو رہے ہیں۔ ایسی نادالی ان میں سے بھی کسی سے سرزد ہو سکتی ہے۔
 "شہباز زبان کو گام دو۔" نظر نے سچ کر کہا۔

"آپ بھی کوئی قدم اٹھانے سے پہلے سوچیں ضرور کہ دوسروں کی بھی کوئی عزت ہے جو آپ کے اس کھیل تقاضے سے بھروسہ ہو سکتی ہے مگر آپ کو تو صرف اپنے بندہ ار کی فکر ہے۔"
 "تم ہمد سے بڑھ رہے ہو۔ ایک غیر اچھی شخص پانچھے کے لیے۔" وہ کف اڑانے لگے۔
 "اب اگر میں کہوں کہ زبان سنبھال کر بات کریں تو آپ اسے بد تمیزی کہیں گے مگر آپ مجھے ایسا کچھ پر مجبور کر رہے ہیں۔"

"شہباز! سزخان نے دلی زبان میں کہا۔
 "شٹ اپ شہباز۔ ام جان! اس کو کٹھنوں کریں ورنہ بہت کچھ آؤٹ آف کنٹرول ہو جائے گا۔ میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ میں اس سے زیادہ بے ہودہ کی پروا شٹ نہیں کر سکتا۔ سن لیا آپ نے۔" وہ غصے سے پیر پتتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔
 "نظر! نظر! میری بات سنو۔ امہر آؤ ٹھنڈے دل سے۔ سزخان کی پکار نساخ گئی۔ شہباز نے اپنے دوڑتے اٹھانے اور کمرے سے نکل گئے۔
 "میں ذرا فریض ہو لوں ام جان! مجھے بھوک بہت لگی ہے۔"

جنتاں ڈرائنگ روم کی ڈسٹنک کر رہی تھی جب اس نے باہر آسمان پر اڑتے جہاز کی آواز سنی۔ اس کے تیزی سے چلتے ہاتھ رک گئے۔ وہ ڈسٹرینشل نیبل پر چھوڑ کر لان کی طرف صحنے والی کھڑکی کی طرف لپکی اور کھڑکی سے سر نکال کر دیکھتا ہوا کہ جہاز کو دیکھنے لگی۔

"شاید وہ لوگ آنے والے ہیں۔" وہ کھڑکی کی پوکھٹ سے ٹیک لگا کر کھڑکی ہو گئی اور پتھہ سمجھنے لگی۔
 "ان کی درپردہ کی ذمہ داری تو نہیں پھر احساس جرم میرے اندر سے کیوں نہیں جاتا اور یہ احساس جرم غریب کے اندر ہی کیوں پلتا ہے کیوں اسے ہی پل پل ڈسٹا ہے۔ بڑے لوگوں کو اپنی غلطیوں اپنے جرائم کا احساس ایک پل کو بھی کیوں نہیں ہوتا۔ وہ تو شاید کبھی بھی میرے غم پر نہیں روئے اور میں ان کے لیے کچھ کچھ مری ہوں۔ آخر یہ خمیر نام کا زہر یا اسباب میرے اندر مریوں نہیں جاتا۔ اسے کیوں موت نہیں آتی۔ کیوں چوہیں کھنکھوں میں چوہیں ہزار بار پھین پھینا کر میرے سامنے ترن جاتا ہے جیسے جیسے میں سنب۔"

"سو سٹیک پول تو میں نے اچھی طرح صاف کر دیا ہے تمہارے کہنے کے مطابق صرف اور سوا اڈال کر پھر بھی تم آکر اپنی تسلی کر لو پھر میں اس میں پانی بھرو ڈال۔" گرم دین کھڑکی کے یاہری سے جھانک کر بولا۔ جنتاں نے جلدی سے بیسی پلٹیں اپنے ہاتھوں سے مسکیں۔

"آری ہوں میں مانی پر بھی نظر رکھنا۔ نیا بندہ ہے ٹھیک کام بھی کر رہا ہے یا نہیں۔ ان کے آنے میں اب تھوڑی سی دیر ہے پھر صاحب مجھ پر تھا ہوں گے۔ ان صاف تھراؤ ہو تو صاحب کو شروع ہی سے غصہ چڑھ جاتا تھا اور مجھ ایسی بوڑھی جان نے اس طرح چند دنوں میں ملازم اکٹھے کیے ہیں میں ہی جانتی ہوں۔ صاحب لوگ تو بس حکم دیتے ہیں۔"

وہ پردہ ہاتھ ہوتے ڈرائنگ روم سے نکل کر باہر لان کی طرف ہو گئی۔

ایک گھنٹے بعد ہی گیٹ کے باہر لان کی آواز سنائی دی اور چند لمحوں بعد ہی پور ٹیبلو میں کھٹا کھٹ گاڑیوں کے دروازے کھلنے کی۔ جنتاں ہانپتی کانپتی کچن میں ملازم کو چاول دم لگانے کی ہدایت کرتی پور ٹیبلو کی طرف بڑھی۔ رعنا اور فخر حیات اسے بالکل ایسے نظر آئے جیسے یہاں سے جانے وقت تھے۔ بیٹے سالوں کی واصل ذرا بھی ان کے خوبصورت چہروں اور جوان جسموں پر نہ لگی تھی۔

"کیا وقت ان لوگوں کو ان چھوٹے گڑھانا ہے دولت کی باندی تمہارا لیے سر پر کھڑی ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے وقت بھی ڈر ڈر کر ان کے پاس سے گزرتا ہے۔" جنتاں اپنے بوسیدہ بوڑھے بدن کو لے کر بمشکل چار پیڑھیوں اترتی۔

"مسلم بیگم صاحب! صہب تی! اس نے رعنا کے پاس جا کر ٹائیداری اور محبت سے سلام کیا بو گاڑی سے نکل کر اپنی کمرے ساڑھی کی قال درست کر رہی تھی۔
 "وہ مسلم بیگم۔ کیسی ہو جنتاں! ٹھیک تو رہیں؟" اس نے سرسری سی نظر کے ساتھ اپنی پرانی بوڑھی ملازمہ کو دیکھا۔

"اللہ کے کرم سے اور آپ کی مہربانیوں سے جی۔" وہ جھک کر رعنا کا ہاڈا سا سوٹ کیس اٹھانے لگی جبکہ وہ ملازم پیچھے آنے والی گاڑی سے اترنے والا آسمان اٹھا رہے تھے۔
 "ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔ سینی بیبا تو کتنی جوان ہو گئے ہیں۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ خوب بڑے ہو گئے ہیں۔" جنتاں نے پیچھے سے آتے سینی کے جسم کو ذرا سا چھو کر کہا۔

"ہاں بڑے ہو گئے ہیں تمہارے سنی بیبا۔" رعنا کا اوجہ جنتاں کو ذرا عجیب سا لگا۔ اس نے سر اٹھا کر اپنی بالکنی کو دیکھا جن کچھ رہا بالکل بے تاثر تھا۔

"کیوں مہربانیوں پر اوجہ کر رہی ہو کہ آپ کو اچھا نہیں لگ رہا؟" سینی نے بھی سن لیا تھا۔ براساتہ بنا کہاں سے بولا۔
 "بہت اچھے لگ رہے ہو یہ بات بھلا کسی اللہ سے پوچھنے کی ہوتی ہے۔" رعنا کا اوجہ اور چہرہ ابھی بھی بے تاثر تھا الفاظ کے برعکس۔ اس نے جھک کر گاڑی کی سیٹ پر بڑا اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا۔
 "چلو بھئی جلدی چلو اندر۔ کیا جلدی بائیس بیس پر ہوں گی۔ مجھے تو نوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔ بس ہم ہاتھ منہ ہی دھوئیں گے مگر کھانا کھادو۔"

"بہت عرصے کے بعد اپنے گھر میں اپنی پھت تلے اپنے ٹریڈیشنل کھانوں کا مزہ لیں گے کیوں رعنا؟" فخر حیات کا اوجہ پہلے کی طرح فریض تھا۔ وہ اپنا بریف کیس اٹھا کر اندر کی طرف بڑھے۔
 "کب کھانے آپ کی پرنہ کے کلمے ہیں بی اور سب کچھ تیار ہے۔ بس آپ منہ ہاتھ دھو کر آجائیں میں اسٹے میں نیبل پر لگوائی ہوں۔" جنتاں ان کے پیچھے آہستہ آہستہ پیڑھیوں چڑھتے ہوئے بولی۔

"بھئی جنتاں! اگر تو تم نے خوب چکارا کھا ہے۔ ویری گڈ۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم یہاں سے کبھی گئے ہی نہیں ہوں۔ وہ ہم سوٹ، وہ ہم۔ کیوں رعنا؟" فخر حیات لاؤنج کو گھوم گھوم کر دیکھ رہے تھے۔
 "نیر! ایسے تو نہ نہیں۔ اتنے دنوں کی کڑی مسافت کے بعد تو کھڑکی شکل نصیب ہوئی ہے۔" رعنا نے تھک کر خود کو صوفے پر ڈالا۔

"اسی لیے تو کھرا پھا لگ رہا ہے۔ بہت زیادہ اپنا اپنا سا۔" فخر حیات نے کہتے ہوئے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا۔ جھانک کر اس کا جائزہ لیا اور پھر واپس آکر میز پر بڑا اپنا بریف کیس اٹھانے لگے۔
 "میں ذرا فریض ہو جاؤں تم بھی اٹھ جاؤ جلدی سے۔ مجھے واقعی بہت بھوک لگ رہی ہے۔" وہ کہتے ہوئے لاؤنج سے نکلے۔
 "آپ نے پلین میں بھی تو کچھ نہیں لیا تھا۔ شروع کی عادت سے آپ کی سفر کے دوران کچھ نہ کھانے کی۔"

دے کہ وہ ان آنکھوں کی مزید آفرینت دیکھ سکے۔

”میرے اندر کوئی گلت نہیں۔ نہ میں نے ایسا کچھ کیا ہے نہ مجھے ایسا کوئی احساس جرم ہے۔ آپ کے اندر کے چھوٹے انسان میں ہی تو صلا یا طرف نہیں کہ حقیقت کے آئینے کو نظر بھر کر دیکھ سکے۔ اگر آپ اس آئینے کو دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کا قد کس قدر چھوٹا ہے۔ بالکل بونے نظر آتے ہیں آپ۔ آپ کی جھولی انا آپ کی نام نہاد سواگتی آپ کو کسی سے نگاہیں ملا کر بات کرنے کی اجازت نہیں دیتی مجھ سے بھی نہیں۔ آپ تو مجھ سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔ جو شخص اپنے اندر کی کمزوری کا مقابلہ نہ کر سکے اسے کسی دوسرے پر اتنی اٹھانے کا بھی کوئی حق نہیں۔ میں اندر باہر سے مطمئن ہوں۔ مجھے کسی سے نگاہیں چرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی توجہ آپ کی بے نیازی سے اب مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا جو میں بدل چکا ہے کاسوچوں۔ یہ آپ کا انداز فکر ہے میرا نہیں۔“

اس نے ایک جھٹکے سے اپنی گائی چھڑائی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

”ہاں میرے اندر کی کمزوری ہی تو ہے جو تم ابھی تک یہاں نظر آرہی ہو۔“ وہ جیسے اقرار کرتے ہوئے افسوس سے بولنے لگا۔
”مگر تم فکر نہ کرو۔ جس دن میں نے اس کمزوری کو پچھا ڈوبا تمہاری یہ جھولی نیک نامی بھی تمہارے ساتھ ہی رخصت ہو جائے گی جس کا سچا سچا ترجمہ ام جان کی نظروں میں بہت اچھی بنی پھرتی ہو۔“ وہ چہا چہا کر بولے تھے۔ ان کے لفظ ان کی نظروں ان کا لہجہ۔ تڑپت کا ایک بار پھر مرجانے کوئی چاہا۔

”شاید اس کی نوبت ہی نہ آئے کہ آپ کو بہت کرنی پڑے۔ میں اس سے پہلے ہی بقول آپ کے اپنی نیک نامی سمیٹ کر یہاں سے دوپٹے جاؤں اور آپ کو جو یہ گلے پڑا ڈھول بجانا پڑتا ہے اس سے بھی نجات مل جائے گی۔“ اس نے ہنستے آنسوؤں میں ہنرے سے رگڑا لہاری ہول گرائس کے پچھلے کیبٹ میں رکھا سٹیک کیبل کھینچا اور باہر جانے لگی۔

”میں اس دن کا شدت سے انتظار کروں گا جب میں آؤں اور تم مجھے اس کمرے اس گھر کے اندر نظر نہ آو اور میری بوجھل آنکھوں کو سکون مل جائے۔“ وہ ہنستے دیکھتے ہی بے سکون ہو جاتی ہیں۔ ”تڑپت نے پلٹ کر آنسوؤں بھری ایک زخمی نظران کے بے رحم چہرے پر ڈالی۔
”آپ کو یہ سکون بہت جلد مل جائے گا۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ کر باہر نکل گئی۔
”کیا میں واقعی ایسا چاہتا ہوں کہ یہ یہاں سے چلی جائے۔“ کمرے میں چھا جانے والی خاموشی کے چند منٹ بعد انہوں نے خود سے سوال کیا۔

”اگر یہ یوں اگڑنے کے بجائے مجھ سے معافی مانگ لے اپنے جرم کا اقرار کر لے تو شاید میرا دل نرم پڑ جائے۔“ ان کے اندر کا کٹر مزہ بولا۔

”معافی کی ضرورت تو انہیں ہوتی ہے جس نے کوئی جرم کیا ہو اس کے باوجود تڑپت نے تو پہلی رات بھی معافی مانگی تھی پھر بھی تمہ۔“ ان کے اندر بیٹھا شخص بزدل نہیں تھا۔ کم از کم ان کے سامنے ٹڈر ہو جاتا تھا۔ انہوں نے اٹھ کر مین لائٹ آف کی اور بستر پر آکر لیٹ گئے۔ ٹھنڈا اٹھار تھا۔ بستر اور بیچ کے مچھلے کوڑے مارتان کا ہرجائی خمیرا نہیں لگا وہ اب تمام رات نہیں سو سکیں گے۔

”تم نے ناشتہ بھی دستک سے نہیں کیا۔ آخر اٹھتے ہی ایسے کیا کام یاد آگئے ہیں جو صبح صبح ہی چل پڑے ہوتیار ہو کر۔“ سیدو نے سلطان بخت کو تیار ہو کر گاڑی کی چابی اور موبائل ڈائٹنگ ٹیبل سے جگت میں اٹھاتے دیکھ کر فوراً ٹوکا۔
”صبح صبح کب ہے آپا جان! بس بچتے کو ہیں۔“

رعتانے گردن موڑے کہا جواب نہ یا کر اس نے گردن سیدھی کی۔ فخر حیات جا چکے تھے۔

”مما! کیا نہیں میرا یہاں دل لگے گا بھی یا نہیں۔“ سیٹی لاؤ راج میں داخل ہوتے ہوئے کچھ بیزاری سے بولا۔
”دل لگے یا نہ لگے۔ رہنا تو ہرے کا ہی اصرار۔“ رعتا کا لہجہ ایک بار پھر خشک ہو گیا۔

”زبردستی تو نہیں سے ہاں! میرا دل لگے گا تو میں اوجھروں کا اور نہ مشکل ہے۔“ وہ ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ رعتانے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مزہ کر لاؤ راج سے نکل گیا۔

رعتا کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ لرا لری کی کھڑکھڑاہٹ بر اس نے گردن گھما کر پیچھے ڈائٹنگ روم کی طرف دیکھا۔ ٹیبل کے وائٹ پر دست کے پیچھے بھٹاں بھیل پر برتن رکھتی نظر آئی۔

”بھابھی جان کا کوئی فون تو نہیں آیا؟“ رعتا کرنے کی طرف جاتے جاتے اس کے پاس رک کر بولی۔

”آیا تھا ہی آپریٹوں بھی نکل بھی اور آج بھی دوبارہ فلائٹ کا ٹائم پوچھ رہی تھیں۔ میں نے کہہ دیا مجھے بالکل صبح جاتا تو نہیں ہے مگر صاحب بی نے کہا تھا آج ہم کھ آرہی کریں گے۔“ وہ بڑے مصروف انداز میں ٹیبل پر بیٹریز کے آگے پلٹیں اور چیچ سیٹ کر رہی تھی۔

”تو کیا کہا انہوں نے؟“

”کہہ رہی تھیں پھر تو ٹھیک ہے ہم شام پانچ یا چھ بجے تک آجائیں گے۔ فلائٹ کا سچ ٹائم ہونا تو ایئر پورٹ چلے جاتے۔“ بھٹاں نے پلٹیں سیٹ کر کے رعتا کی طرف دیکھا۔

”اچھا اور کچھ اب ان کا فون آئے تو کہہ دینا فلائٹ لیٹ ہو گئی ہے۔“ اس لیے ہم لوگ رات کو دیر سے یا شاید کل صبح سویرے پلٹیں گے۔“ سمجھ نہیں بنا۔

”ہی سمجھ گئی۔ کہہ دوں گی۔“ بھٹاں سر ہلا کر بولی تو رعتا اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔

”کب تک وامن بچا میں گی۔“ عفت آرا تو آپ کی جڑوں میں نشینی ہے جگر صاحب۔“ ایک طرف سے مگر اہٹ بھٹاں کے چہرے پر پھیل گئی تھی۔



شہباز خان جب رات ساڑھے گیارہ بجے بیڈ روم میں داخل ہوئے تو نہایت ہاتھ میں کوئی کتاب لیے بیڈ کی پشت سے نیک گائے بونے اشماک سے پڑھ رہی تھی۔ شہباز سیدھے واش روم میں چلے گئے۔
”یہ آج کیسٹ روم میں نہیں سوئیں گے۔“ وہ انہیں کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر صوفی میں بڑھی تھی۔
”اور اتنا بڑا سفری ٹیکہ۔“ اس نے کونے میں پڑے ان کے بیگ کو دیکھا۔ ”اس دفعہ زیادہ دن رہے ہونگے جو صلا کر لیا۔“

وہ ابھی نہیں تھک سوچ پائی تھی کہ وہ واش روم کا دروازہ کھول کر باہر آگئے۔ ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر یہاں ستوار سے پھر جیسے ہی پلٹ کر بیڈ کے دوسری طرف آکر بیٹھے تڑپت نے کتاب سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ شہباز خان نے اسے ٹیکھی نظروں سے دیکھا وہ اپنا وہ پٹہ درست کرتے ہوئے باہر جانے لگی۔ جیسے ہی ان کے پاس سے گزری انہوں نے ہاتھ بوسا کر اس کی گائی پکڑی۔

”تم اس طرح بیڈ روم سے جا کر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو کہ تمہیں اپنے نفس پر مجھ سے زیادہ کنٹرول ہے یا مجھے انور کر کے بدلہ چکانا چاہتی ہو؟“ وہ ہنسی آواز میں فرمائے۔

”میں ایسا کچھ بھی ثابت نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ گائی سے انٹھی روکی ٹیسوں کو ضبط کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ ”یہ تو آپ کے اپنے اندر کا Guilt (احساس جرم) ہے جو آپ کو ایسا کچھ محسوس ہوتا ہے۔“ اس نے بھرپور طنز انداز میں جیسے انہیں چڑایا۔

”گلت میرے اندر نہیں تمہارے اندر ہے۔ جو تم کسی سے نگاہیں ملا کر کسی کا سامنا نہیں کر سکتیں۔“ ان کے لہجے میں نفارت سی تھی۔ تڑپت ثابتی چاہا ابھی وقت فرشتہ اہل آجائے اللہ اپنا وعدہ پورا کرنے سے ابھی بھیج

"آج ہی رات کو تو تم سوئے ہو۔ صبح سے آرام بھی نہیں کیا۔ سفر کی تکان کیا اتری ہوگی اور تمہارا پروگرام تو ابھی ایک ہفتہ اور رہنے کا تھا۔ میرا تو خود آج ارادہ تھا اور اسلام آباد کا پیکر لگانے کا۔" سیدہ اپنے ارادے کے چوپٹ ہونے پر خاصی بیزار سی تھیں۔ سبز ارادہ رات کو ہی سلطان بخت کی آمد کا سن کر ہو چکی تھیں۔

"ہستہ رہنے لگے آپ ایک ہفتہ تو بہت مشکل تھا۔ ویسے مجھے پتا چلا تھا آپ کے آنے کا۔"

"ویسے تمہیں کیسے پتا چلا؟" وہ چونک کر بولیں۔

"جو اونے کل فون کیا تھا مجھے اسی نے پتا چلا تھا۔"

"اس کا تو مانع فراغ ہے۔ میں نے منع بھی کیا تھا۔" وہ زیر لب بڑبڑاتیں۔

"ایسا کیا کام ہے آپ کو ادھر؟"

"بتایا تو تھا جو ادا کے ایڈیشن کے سلسلے۔"

"کہہ جو دیا تھا میں نے آپ سے کہ میں لے جاؤں گا اسے ادھر۔ ویسے آپ فکر نہ کریں میں نے جو ادا کیے ہیں سب یونیورسٹی کا سوچ رکھا ہے۔ اسلام آباد میں ایسی کون سی خاص پڑھائی ہوتی ہے۔ اب وہ لوگ باہر نہیں ہیں دو چار ماہ میں اس کا انتظام کروں گا۔"

سلطان بخت نے جھٹ پٹ انہیں اپنا منصوبہ سنا کر ان کا اسلام آباد کا رستہ ہی جیسے بند کر دیا کہ سیدہ وہاں میں نیا بمانا سوچتی رہ گئیں۔

"صاف اچھا کچھ لے نہیں رہیں۔" سیدہ کافی دیر سے دیکھ رہی تھیں کہ وہ اور نچوڑے گا اس وقت بھر سے آگے رکھے بیٹھے تھیں۔

"لے رہی ہوں۔" ان کا موڈ سخت آف لگ رہا تھا۔ سلطان بخت نے ایک نظر ان کے گزرنے کو دیکھا تو ابھی واپس آتا نہیں چاہ رہی تھیں۔ رات سے اسی بات پر ان کا مزاج بگڑا ہوا تھا۔

"اوکے آپ! میں پلٹتا ہوں۔ شام تک لوٹ آؤں گا۔ بہت کام ہیں آج۔"

سلطان بخت نے بھاگنے میں ہی عافیت جانی۔ صاف ایک بار شروع ہو جاتیں تو پھر شاید انہیں آج وہاں ادھر ہی لگ جانا اور اب انہیں پتا تھا صاف سیدہ پر ضروری پیمت بڑی ہوں گی۔ انہوں نے اگر ایک آدھ سوال ان سے اور پوچھ لیا تو۔ گاڑی اشارت کرتے ہوئے ان کے لب مسکرائے۔ ان کا خود بھی اتنی واپس آنے کا ارادہ نہیں تھا مگر نین تارا۔

نین تارا نے دور اتوں سے جیسے ان کے بستر میں۔ انکار سے نکال دیا۔ اس کی آنکھوں میں کانٹا اڑا۔ اس کی ہسی ایک ایک بات نے انہیں اندر تک بھلا کر رکھ دیا تھا۔

اگر صاف اس لئے ان کے ساتھ نہ ہوتیں تو شاید وہ نین تارا کو شوٹ ہی کر دیتے۔

"میں تو واپس آیا ہوں اگر وہ ابھی نہ لوٹی تو؟" آدھے رستے میں انہیں خیال آیا۔

"نہیں وہ آئی ہوگی۔ نہ بھی آئی ہوگی تو میں گاڑی کا رخ اسلام آباد کی طرف موڑ دوں گا۔ آج تو اس سے ملاقات ضروری ہے۔ ورنہ میرا فراغ پیمت جائے گا۔ ایسا بے باک اور بے اندازہ بھی نین تارا کا نہیں ہو سکتا۔"

کل کدہ کے گیٹ کے آگے انہوں نے زور زور سے ہارن بجایا تھا۔ چوکیدار نے بغلی گیٹ کھولا۔

"نین گیٹ کھولو۔" وہ ڈپٹ کر بولے۔

"وہ جی بیگم صہب تو۔ کمر میں۔ نہیں ہیں۔" وہ بولا۔

"مجھے تمہاری بیگم صہب سے کوئی کام نہیں پھونکی بی بی تو کمر پر ہیں۔" وہ تیوری چڑھا کر بولے۔

"وہ بھی تو یہاں نہیں۔"

"کہاں تھی ہیں؟"

"وہ تو جی اسلام آباد۔"

"بیکو مت ان کے ہوٹل سے معلوم کرو آیا ہے میں نے۔ وہ رات کو نکلی ہیں۔" انہوں نے اندھیرے میں تیر پھوڑا۔

"نہیں جی۔" وہ سخت لڑ بھایا تھا۔

"تم ادھر سے صبح ہوتے ہو کہ میں خود تمہیں دیکھ لوں۔" وہ جست لگا کر ڈرائیونگ سیٹ سے اترے اور بارخانہ انداز میں سٹڈیٹ کی طرف بڑھے۔

"صاف۔ صاف ہماری نوکری کا سوال۔ بیگم صہب تھا ہوں گی انہوں نے منع کر رکھا ہے۔ بلا اجازت۔" وہ گڑ گڑاتے ہوئے ان کے پیچھے اچکا۔

"شٹ اپ۔" انہوں نے پلٹ کر ایک زوردار تھپڑ اس کے کال پر رسید کیا تھا۔

وہ اندرونی عمارت کا دروازہ کھٹکے سے کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ لاؤنج بالکل بویراں تھا۔

نین تارا کی کیدار ٹھیک کر رہا ہوں۔ "کمری خاموشی پر انہوں نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔

نین تارا کے کمرے کا دروازہ لاک تھا۔ انہوں نے ذرا زور سے دستک دے ڈالی۔ چند لمحے انتظار کیا کوئی جواب نہ ملا۔ انہوں نے دوبارہ دروازہ کھڑکھڑایا۔

"کون ہے؟" نین تارا کی نیند میں بوٹی آواز ان کے کان میں پڑی تو ان کا دل جیسے کھل اٹھا۔ انہوں نے کوئی بھی جواب دینے بغیر پھر سے دستک دے ڈالی۔

"کون سے بھئی جو بالکل ہوا جا رہا ہے۔" وہ کمرے میں کتے ہوئے اٹھی تھی۔ اور دھڑ سے دروازہ کھول دیا۔

سلطان بخت کو سامنے دیکھ کر اس کی غصہ میں مست آنکھیں پوری کی پوری کھل گئی تھیں۔

"آپ! تمہارے اقتباسی طور پر کہے گا ان کی ڈوریاں باندھنے لگی۔"

"نہیں کیا میرے آنے کی تو تمہیں پتا نہیں تھا؟"

انہوں نے کان میں پچھنے اس کے قائل ہوا ہے کہ نظر بھر کر دیکھا۔ اوپٹے سے بے نیاز صراحتی وار گردن اور نیچے بہت نیچے تک جاتا گاؤن کا کراٹھا۔ ان کے دل کی دھڑکنیں بے تامل ہونے لگیں۔ اس کے بدن سے اٹھتی جھنکی جھنکی کھون کی خوشبو انہیں بے قابو رکھتی تھی۔

"اندر آئے کو نہیں ہوگی؟" وہ اس کے بالکل قریب آکر کھڑے ہوئے۔

رہتی آخر وہی زلفیں کھانوں پر جمول رہی تھیں۔ کچی نیند سے جاگا اس کا بے پروا حسن سلطان بخت کو بالکل بیٹا رہا تھا۔ چہرے کی سفیدی میں کھلی گلابیاں اور آنکھوں میں سرخ باریک ڈورے۔ ان کے دل میں اچھل سی بج تھوڑی تھی۔

"آپکے ہیں آپ اندر۔" وہ ماتھے پر ہل ڈال کر بولی اور فوراً پلٹ ہو گئی۔

"ناراض ہو مجھ سے؟" وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔ اس روپ میں تو اس کی ایک پل کی نقلی ایک قدم کی دوری ان سے نہ کسی جارہی تھی۔ وہ ڈرنگ ٹنگ ٹنگ کے ساتھ نہ جا کھڑی ہوئی تھی۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ ہنسی برش اٹھا کر بہت نرمی سے ان کے بال سوارنے لگی۔

"نین تارا! یہ بیکانوں والے انداز مجھ سے متا بر تو۔ تھا ہوا تو پاس آکر لو۔ نگہ کرو شکایت کرو۔ یوں اور دور رہ کر مجھے بالکل متاؤ۔ اس کے علاوہ شانوں کے بالکل قریب آکر بے اختیار ہی سے بولے۔

"پاکل تو آپ نے مجھے بنایا ہے شاہی اور مزے کی بات میں بالکل نین بھی گئی محبت جو کی تھی آپ سے۔" وہ پھینکی سی ہسی نہیں کر بولی۔

"تو کیا اب نہیں کرتیں؟" انہوں نے بہت آہستگی سے اس کے بالوں کو چھوا۔

"یہ تو آپ خود اپنے دل سے پوچھتے ہیں۔ آپ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں جتنی محبت آپ مجھ سے کرتے ہیں۔ میں بھی اتنی آپ سے کرتی ہوں۔ نہ رتی کم نہ رتی زیادہ۔" اس نے کھٹکے سے زلفوں کی

آبشار دوسرے شامے پر گرائی۔

”کیوں نہیں شک ہے۔ مجھ پر میری محبت پر۔“ اس کے کشور انداز انہیں مارے دے رہے تھے۔
 ”شک! وہ کھٹکھٹا کر ہنسی۔ ”ابھی شک کی کنجائش باقی ہے کیا؟“
 ”نہیں ہوں بے اعتبار نہ ہوں میری محبت کو کرو۔“ وہ دکھ سے بولے۔
 ”بس شاہی بس!“ اس نے برش ڈارنگ ٹیبل پر چٹا۔
 ”بہت ہو گیا یہ تا تک پیار کا۔ محبت کا اور اعتبار کا۔ اب کچھ کاروبار کی بات ہو جائے۔ کچھ ویپار کی حساب کتاب کی خالی خوبی محبت سے تو بڑے کا دوزخ نہیں بھرا جاتا تو خواہشوں کا سمندر۔“
 ”واٹ!“ وہ بے یقینی سے بولے۔

”آپ کی محبت نے مجھے کیا دیا سوائے اپنی ذلت کے بے اعتباری کے۔ میں نے تو آپ سے بچے دل سے محبت لی تھی۔ اس لیے تو آپ سے نکاح کیا تھا۔ شرمی رستہ اختیار کیا تھا۔ مگر آپ نے مجھے کیا سمجھا۔ محض ایک طوائف ایک ہلونا جس سے جب آپ کا دل دنیا کے وہندوں سے بیزار ہو جائے آپ ہیٹے چلے آئیں۔ کیا اس کھلونے کے سینے میں دل نہیں تھا۔ شاہی! میں نے آپ سے دل سے محبت کی تھی۔ دل سے۔“ اس نے اپنی شہادت کی انگلی سے ان کا سینہ ٹھوکا۔ ”مگر آپ نے تو یہی دل ہی تو دیا۔“ اس کی آواز گھونکی گئی پل بھر کے لیے۔
 ”نہیں تارا! اپنی سویت ہارٹ۔“ تین تارے ان کے لبوں پر اپنا نازک ہاتھ رکھ دیا۔

”پلیز شاہی! بس کریں۔ بڑی مشکل سے اس دل کی کرچیوں کو جیتنا ہے۔ اب محبت کی یہ بلیک میلنگ بند کریں۔ یہ الفاظ آپ کو خود معلوم ہے بھولے ہیں۔ آپ سوچتے بھی نہیں اور بول دیتے ہیں اور کوئی اپنی زندگی ہار دیتا ہے ان گفتگوں پر اعتبار کر کے۔ مگر آپ کو اس کی پروا بھی نہیں ہوتی۔“
 ”نہیں تارا میری جان! تمہیں مجھ سے جو دکھ پہنچا تھا۔ جو تکلیف پہنچا ہے مجھ سے کس جوں اجنبی مت بنو۔ دور دور کھڑے ہو کر مجھے نہ ترساؤ۔“

انہوں نے اسے کھینچ کر اپنی بانہوں میں لپیٹا چاہا۔ وہ مچھلی کی طرح تھک کر پیچھے ہوتی۔
 ”ابھی نہیں شاہی! یہ کھلونا آپ کا ہے۔ آپ کی دسترس میں ہے۔ مگر اس پیار اس سے کھیلنے سے پہلے آپ کو مجھ سے کچھ معاملات طے کرنے ہوں گے۔ پھر اپنا بنا دلی محبت کا کھیل کھیلے گا۔“ اس کا لہجہ دو ٹوک تھا۔
 ”تمہارا دل خراب ہوا ہے۔ کیا اوت پنا تائب تائیں کر رہی ہو۔ تم میری بیوی ہو سکتی ہو۔ محبت کا حسن کا شہ جہ رہا تھا اور وہ بار بار انہیں اس نشے میں دستکارے جا رہی تھی۔
 ”اوت پنا تائب نہیں شاہی! اب یہی تو اپنا حق مانگنے کا سلیقہ آیا ہے۔ بیوی ہونے کی حیثیت سے آپ کی اس زر خرید بوندی کو۔“ وہ بالکل ڈری نہیں تھی ان کے غصے سے۔
 ”مطلب؟“ وہ ماتھے پر ہل ڈال کر بولے۔

”مجھے میرا حق چاہیے۔“ وہ بے خوفی سے بولی۔
 ”کیا حق؟“ ان کے ماتھے پر بڑے بڑے گل گہرے ہو رہے تھے۔
 ”آپ کی بیوی ہونے کا جس کا آپ نے ابھی اقرار کیا تھا۔“
 ”سب حقوق تو تمہیں حاصل ہیں اور کیا حق چاہیے۔“ وہ الجھ کر بولے اس کی بے خوفی انہیں اندر سے پریشان کر رہی تھی۔

”مجھے سب سے پہلے ایک گھر چاہیے۔ اپنا گھر میرا اپنا۔“ سید ہاؤس کے لیے آپ کے آگے گڑگڑاتی رہی۔
 آپ ہنسی میں اڑاتے رہے مگر اب نہیں شاہی! اب نہیں بھلاؤں کی آپ کے جھوٹے وعدوں سے۔ مجھے گھر چاہیے۔“ اس کا لہجہ مضبوط تھا۔
 ”گھر ہے تو تمہارے پاس۔ میری ساری جائیداد تمہاری ہے پھر یہ گھر بھی تو ہے۔ یہ کیا چھوٹا ہے تمہارے

نازک سے وجود کے لیے۔“ وہ بونہی بنے۔

”آپ کی جائیداد آپ کو مبارک اور کیپ ان مانڈ شاہی! یہ گھر میری ماں کا ہے۔ میں نے اس لیے آپ سے شادی نہیں کی تھی کہ شادی کے بعد بھی اپنی ماں کے گھر رہوں۔ میں آپ کو صرف ایک ماہ کی مہلت دوں گی حکم از کم دو کنال کی خوبصورت فرنیچر کو بھی ڈیکوریشن یا کسی اور پوش اس لیے میں مجھے چاہیے۔“ سید ہاؤس پر تو آپ کا اپنا اختیار نہیں۔ وہ صرف جعلی کاغذات میں ہی آپ میرے نام کر سکتے تھے۔ ”وہ طنزاً بولی۔
 ”نہیں تارا!“ وہ جیسے غصہ ضبط کر کے بولے۔
 ”تجلیں نہیں شاہی! گھر کے علاوہ نئے ماڈل کی گاڑی میں پسند کر آئی ہوں۔ شوروم میں صرف تمیں لاکھ کی ہے مجھے چاہیے اپنے گھر کے کیران میں۔“

”میں نے کبھی تمہارے اخراجات میں کمی رکھی ہے؟“ وہ اس کی فرمائشیں سن کر حیران تھے۔
 ”اخراجات کی بات بھی ابھی ہوگی۔“

”اچھا! ابھی اخراجات رہتے ہیں۔“ وہ طنز بنے۔
 ”آپ کے دیے جانے والے کبھی بھٹا جیب خرچ کے نام پر ہیں تمیں ہزار روپے میری اوقات سے بہت کم ہیں۔ وہی اوقات جو آپ کے مجھے ان دو چار ماہ میں بار بار یاد دلاتی ہے۔ مجھے ماہانہ پچاس ہزار روپے چاہئیں صرف جیب خرچ کے لیے۔ گھر کے اخراجات اس کے علاوہ ہوں گے۔“ وہ ایک پل کو رکھی۔ ان کے چہرے کے بدلے بدلے رنگوں کو دیکھا۔

”مگر آپ کو میری یہ شرائط منظور ہیں اور آپ ان پر عمل کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں تو جس وقت گھر پسند کر لیں اس کی رقم کی ادائیگی کر لیں۔ جعلی کاغذات میں گھر کی ملکیت میرے نام منتقل ہو جائے گاڑی میں خودوں کی آپ کے ساتھ گاڑیوں کی اپنے منٹ کریں تو پھر آپ کو نہیں تارا اسی رات اس عالی شان گھر کے بچے سجائے گا۔ میں ہی کوئی ملن کے روپ میں مل جائے گی۔ آئی پر اس پھر آپ کے اور میرے درمیان ایک پل ایک ایچ کی بھی دوری نہ ہوگی۔“

”اور اگر میں یہ سب ماننے سے انکار کروں تو؟“
 ”آئی ڈونٹ کیئر۔ فکر کی تو کوئی بات نہیں۔ میں اپنا حق کورٹ کے ذریعے وصول کر لوں گی۔ آپ کے خلاف دھوکا دہی کا بڑا مضبوط کیس بن سکتا ہے۔ آپ نے جو شرائط نکال جتانے میں لگھو آئی ہیں یہ میری فرمائشیں تو اس کا عشر عشر بھی نہیں۔ میں آپ کی بیوی ہوں یا آسانی کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہوں خلع کے لیے بھی درخواست دے سکتی ہوں۔ دونوں صورتوں میں آپ کو اپنی جیب ٹھیک ٹھاک خالی کرنا پڑے گی۔ عزت کی نیلامی کا تو ان طریقے میں ان دونوں صورتوں کے مقابلے میں میری یہ تین فرمائشیں تو بہت معمولی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے نا۔“
 وہ انہیں غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”تمہارا دماغ آخر خراب کس نے کیا ہے۔ زیور گل کدھر ہے میں یہ تماشا ابھی تمام کرتا ہوں۔ تین حرف تمہارے منہ پر مار کر۔“ انہوں نے بندھے کے کپڑے کو زوردار ٹھوک کر ماری۔
 ”نہ نہ شاہی! یہ ستم مت کیجئے گا۔ آپ ہی رسوا ہوں گے اپنی زبان سے۔ آپ یہ تین حرف چاہے تین کروڑ روپے کدھا لیں اس گھر کی دیواروں سے زیادہ کوئی نہیں مانے گا اور دیواریں چرچہ۔ ان کی تو زبان ہی نہیں ہوتی۔ وہ آپ کے تین حرفوں کی کیا گواہی دیں گی۔ اس صورت میں بھی مجھے یہ تین حرف سنائے کے لیے آپ کو کورٹ کا سہارا لینا پڑے گا۔ میں آپ کو لے کر جاؤں گی وہاں آپ سے درخواست کروں گی کہ اب تین حرف کہیں اور اس کا ہر جانا بھی بھٹکتیں۔ بھی! میں ٹھہری طوائف زاوی میرا مذہب، شرع اور حرام حلال سے کیا واسطہ۔ آپ کے یہاں اس تما کرے میں کے گئے تین حرفوں سے مگر نامیرے لیے کیا مشکل۔ کیوں شاہی! آپ کو تو معلوم ہے نامیری اوقات حسب نسب ذات قبیل۔“

وہ دست بڑھ رہا کہ پول دسی تھی۔ سلطان بخت کو اس کی باتیں سن کر لگا وہ کسی آہنی جال میں جکڑے جا رہے ہیں۔ جال کے باریک خاردار تار ان کے گوشت میں کڑے جا رہے ہیں اور وہ کسی بھی نہیں کر سکتے۔ اپنے ہاتھوں سے پہلے ہی وہ جعلی دستاویز لکھ کر اپنی موت کا سامان ان لوگوں کے ہاتھوں میں دے چکے ہیں۔

”تین مارا۔ مانی ڈارنگ! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ اتنی ایم سواری اتنی ایم رینگ سواری۔ تم آکر مجھ سے تھا ہو کسی بات پر تو میں دل و جان سے اس کے لیے۔“

”اسٹاپ اس شاہ بی! میں ڈرا ہوا ہوں اس کے بعد میں بڑیک فاسٹ ایل کی پھر مجھے ذرا اسٹوڈیو جانا ہے۔ آپ کو اگر رات تک اور اس کے بعد آنے والی کئی راتوں تک بھی اور ہر شے بنا ہو تو بعد شوق بیٹھے مگر ایک ماہ بعد میری طرف سے کورٹ کے بلاؤں کے منتظر ضرور رہیے گا۔ گڈ بائے۔“

وہ تیزی سے اٹھی اور بیدروم کے دو سرے کوٹے میں بنے واش روم کے دروازے سے اندر کھس گئی۔ دروازے کا لاک اگانے کی آواز سانس دہی تھی۔

سلطان بخت کو اتنی بڑی شکست اتنی ذلت کا سامنا زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ ان کا پورا وجود جیسے سٹالوں میں ڈوبا جا رہا تھا۔ انہیں اب اگا قدم نہیں سو بھر رہا تھا کہ اٹھ کر کوٹے یا رستہ کدھر جائیں۔



”ایک بات کہوں صوفی صاحب آپ سے۔“ رابعی بی نے جیسے ڈرتے کہا تھا۔ دونوں تہجد کی نماز کے بعد فارغ ہوئے تھے۔ فجر کی اذان ہونے میں ابھی دس منٹ باقی تھے۔

”ہوں۔“ صوفی صاحب نے آہستگی سے کہا۔ اس دن سچے کو پہنچنے والے واقعہ کے بعد وہ بہت جلد چل رہے تھے۔ بچوں کو پرہیزانہ وقت بھی بہت محتاط ہوتے تھے۔ ہتھکڑی کی شکل میں کسی بھی ہاتھ اٹھاتے تھے۔ ہتھکڑی کی طرف سے انہیں جیسے ہی ٹوئس مل چکا تھا کہ آئندہ اگر ان کی کوئی شکایت آتی تو انہیں نوکری سے برخاست کر دیا جائے گا۔

اور نوکری سے برخاست کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔ صرف روزگار کے نام پر جو دو چار ہزار روپے آتے تھے نہ صرف ان سے ہاتھ دھونا تھا بلکہ سر برتی اس چند گز کی پھت سے بھی محروم ہونا پڑتا اور اس پھت کے علاوہ بھری دنیا میں ان کا اور کون سا ٹھکانہ ہو سکتا ہے۔ بہت سوچنے کے بعد ان کی کتھ میں نہ آیا تھا۔ وہ چھڑے چھانٹتے تھے نہیں کہ نوکری کو الٹ مار کر اس ڈنٹی ٹوئس کا وہ اب دے دیتے۔ ایک بے پروا کلب اور پھر ہوانہ دہی تین بیٹیاں ان کے سر کو چاہی نچا کے جا رہی تھیں۔

اور معاشی حالات تھے کہ کسی خون آشام بھیڑیلے کی طرح ان کے گرد بچے اور نوکیلے انت پھیلنے لگے تھے۔ دن بدن گزارا مشکل ہو جا رہا تھا۔ تنخواہ صرف پندرہ دن تک وال روٹی کے ساتھ ہتھکڑی چلتی تھی۔ کوئی کھانا کاوا تھا انہیں جیسے جیسے عرصہ ہو چکا تھا۔ کھانے سے کبھی کھانا آجاتا تو آجاتا کھلے والے بھی ان سے اس واقعہ کے بعد اپنے خاصے منتظر ہو چکے تھے اور روزگار بڑھانے کا اور کوئی طریقہ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”آپ عبدالمعین کو خیر لکھیں یا جلیل کے ذریعے پتا۔“ رابعی بی نے چند لمحوں کے توقف سے کہا۔

”ہاں۔“ انہوں نے تسبیح والا ہاتھ بلند کر کے قبر بھری نظروں سے یہی کیوں کہا۔ ”آج یہ بات کسی سے آئندہ مت کہنا اور نہ شاید تمہیں بھی اس بچہ سے کھ میں جلد مل سکے۔“ حالات کی سختی کے باوجود ان کے کس بل باقی تھے۔

”بہت دورا ٹھہ رہا ہے تمہیں بیٹے کی محبت کا۔“ وہ بڑبڑا کر بولے۔

”نہیں۔ نہیں۔ میں تو کھر کے حالات۔“ وہ لڑبڑا کر بولیں۔

”کیا ہوا ہے کھر کے حالات کہ ابھی تک تو کوئی قانون سے نہیں مرایا بستر مرگ پر نہیں پڑا۔ جس دن اس کھر کا آخری قرو آخری سانس نہیں لے لیتا تم عبدالمعین سے رابطہ کا۔ چنتا بھی نہیں۔“ ان کا غصہ استہارہ پہنچ چکا تھا۔

”پالا پوسا ہے ہم نے اسے حق ہے ہمارا اس پر۔ اب اگر پھیل کھانے کا وقت آیا ہے تو اس کی تالابی کی وجہ سے

ہم اسے چھوڑ دیں۔ بچہ سے دنیا کی سمجھ نہیں اسے۔ اتنی شاندار نوکری کر رہا ہے شہر میں مجھے بھیلے نے بنایا تھا۔ ہم نے بیٹیوں کا بھی آگے کچھ کرنا ہے۔ ان حالات میں تو وال روٹی حال ہو رہی ہے۔ آپ ایک بار پیار سے اسے سمجھائیں گے تو سمجھ جائے گا۔ پہلے بھی صرف آپ کی بات ماننا تھا۔“

رابعی بی دست آواز میں سنت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ نگاہوں میں التجا تھی۔

”ہاں یا تم نے اس غبیث کی حمایت میں مزید کیا اس کرلی ہے؟“

بلیش سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ رابعی بی اپنی زبان دانتوں تک دبا کر مرتجھ کائے تسبیح کے دانے گرانے لگیں۔ نظریں مٹھنے رہتے خازن خدا کے عکس پر تھیں۔

ان کے ہتھکڑی سر کو کچھ کر صوفی صاحب نے بھی مزید کچھ نہ کہا۔

”یہ عبدالمعین اب کیوں آیا ہے؟“ کچھ دیر بعد انہوں نے خود ہی پوچھا۔

”اسکا دن بتائیں اس نے بھی دسویں کے۔ بہنوں کے ساتھ ہی دسے گا وہ دن تو رہ گئے ہیں

”اچھا۔ دو ماہ کچھ کئے گا۔ اسے پڑھنے لکھنے کی تمیز سے یا علم سے کچھ شغف۔ مدرسہ میں تو میرا منہ کالا کروا دیا ہے نا۔ میں اس کے قاری محمد افضیلا سے آنکھیں ملانے کے قابل نہیں رہا۔ وہ بھی کہتا ہو گا صوفی عبد الرحمن کا فرزند اور ایسا نالائق ناخلف۔“ قرآن کو رستے میں چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ میں تو اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔“ وہ غصے سے بولے۔

”آپ ناسخ خود کو پریشان کرتے ہیں۔ وہ کہہ رہا ہے امتحان دیتے ہی مدرسے سے چلا جائے گا۔ بائیس دن کا تو امتحان ہے۔ وہ کہہ کیا ہے اس نے مجھ سے۔ ایک تو خوب دل اگا کر پڑھ رہا ہے۔ ایک شدت تو ہاتھ آجائے گی۔ کچھ نہ کچھ تو کریں گے گا۔“ وہ بیٹے کی حمایت میں بولیں۔

”میں بھی تمہارے لکھو الودہ خود نوکری کچھ بھی کبھی زندگی میں حاصل نہیں کر سکتا۔ حفظ میں تین سال بہاؤ کیے۔ کچھ حاصل نہ کر سکا۔ اس جیسے نالائق زندگی میں کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ یہ بال میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے۔“ وہ طنز سے بولے۔

”یہی تو وہ کہہ رہا تھا۔ اگر تین سال پہلے وہ میٹرک کا امتحان دے لیتا تو آج تیر ہو میں کے پرچے دے کر فارغ ہو چکا ہوتا۔“ وہ فوراً بولیں۔

”تو کھنا نہیں آپ نے خساء اللہ بڑا بڑا لگتا ہے۔ اتنا تو قدر کا ٹھہ نکالا ہے اس نے۔ قد میں تو یہ عبدالمعین کو بھی پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ میں تو نظر بھر کر نہیں دیکھتی اسے۔“ وہ جیسے فخر سے کہہ رہی تھیں۔

”میں بھی تو کمال کیا ہے اس نے ان برسوں میں سوائے بڑھنے کے۔ تین سال پہلے تو اسے نوے دسویں پڑاؤ لگ رہی تھی اسکا۔ اس سے روز بھاگ جاتا تھا۔ تم مجھ سے لکھو الودہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ کم از کم شرفاء والا کوئی اچھا بستر کام۔“

”آپ خود ہی تو کہتے ہیں صوفی صاحب! ابو سی کفر ہے۔“ انہوں نے جیسے یاد دلایا۔

”یہ مقولہ اس جیسے غبیث کے لیے نہیں ہے۔“ وہ بے نیازی سے بولے تو رابعی بی نے بحث ترک کر دی۔

"کیسا وعدہ۔" وہ حیرانی سے ان کی شکل دیکھنے لگیں۔

"اس نے دو سال کالج میں پڑھنے کا وعدہ کیا تھا، جہ سے۔"

"کالج کی پڑھائی کا خرچہ بھلا کہاں سے پورا ہو گا؟" وہ حیرت سے بولیں۔
"اللہ مالک ہے۔"

"اللہ تو مالک ہے۔ پر روزی کو کھڑکی دہلیز تک لانے کے لیے ہاتھ پیر بھی تو مارنے پڑتے ہیں۔"

"میں کوشش کر رہا ہوں، میرا تارا۔ کسی گاؤں میں ہو جائے۔ وہاں کم از کم دو الٹیں چاول مفت نہ سہی سٹے داموں مل جاتے ہیں۔ چلو یہ بعد کی بات سہی، فی الحال میں نے بچوں کو قرآن پڑھانے کا انتظام کیا ہے۔ اس سے کچھ رقم آتی ہے۔ کم از کم دونوں کی فیس نکل آیا کرے گی۔"

"کتنی رقم مل جائے گی بھلا۔ دو سو تین سو۔" وہ مایوسی سے بولیں۔

"میرے لہانے کے پتے ہیں۔ زیادہ دوس کے۔ شام کو عصر کے بعد جایا کروں گا۔ کچھ اگر دو تین ٹیوشن اور بھی مل جائیں تو۔" وہ خاصے پر امید نظر آ رہے تھے۔

"صوفی صاحب! دونوں میٹرک کر لیں گی تو کالج میں پڑھانے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ ایک اور سال میں ہونی جائیں گے دونوں کے رشتے۔ اللہ کا نام لے کر ان کے ہاتھ پیلے کر دیں۔"

"رشتوں کا حال تم دیکھ ہی چکی ہو رابعہ بی بی! اور جب تک کوئی ذہن تک کارشتہ نہیں ملتا اس وقت تک یہ کچھ پڑھ لیں۔ کوئی ڈگری، کوئی ہنر ان کے ہاتھ آجائے گا تو مجھے فکر نہ رہے گی۔ بھائیوں کے تیور تم دیکھ ہی چکی ہو۔ ان سے تو تم کوئی امید نہ رکھو۔ دونوں انٹر کر لیں گی۔ دو سال تو لگیں گے شاید۔ اس دوران کوئی اللہ کی رحمت ہو جائے"

کوئی اچھا رشتہ مل جائے وقت بھی ضائع نہ ہو گا ان کا۔ اور ذہن بھی درست سمت میں لگا رہے گا۔ علم سے بڑھ کر کون سی اچھی مصروفیت ہے۔" صوفی صاحب کی منطق رابعہ بی بی کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔

"اچھا وہ جیل سے کہیں آکر اوپر کی چھت تو صاف کر جائے۔ سنڈیس بھولی ہیں۔ میں لڑکیوں کو اوپر نہیں بھیجتی اور رات کو ہوا ڈوبنا اچھا نہیں لگتا۔"

"اچھا کمرہ دوں گا۔ ویسے میرا خیال ہے اسے بھی بخار ہو رہا ہے۔"

"بخار؟" رابعہ بی بی پریشانی سے بولیں۔

"بیاری کا نہیں رابعہ بی بی! وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "مجھے بھی میٹرک کے امتحان کا بخار ہوا ہے۔ اسی کے دن رات رتے مارتا رہتا ہے۔ چلو اس کا تو فائدہ ہے، چار حرف پڑھ لے گا تو کہیں چڑا اسی کلرک تو لگ ہی جائے گا، اس لیے میں نہیں روکتا تو کتا ہے۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے، ہمیں اور کیا چاہیے۔" وہ اٹھ کر

ٹھامہ درست کرنے لگے۔ اذان کا وقت ہو چلا تھا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" رابعہ بی بی نے سر ہلایا۔

"یہ عبدالمبین کہاں سونا ہے؟" وہ باہر جاتے جاتے دہلیز پر رک کر بولے۔

"باہر آمد سے میں چار پائی، پچھا، بتی ہے زینب اندر تو کمرے میں بمشکل تینوں کے بستر آتے ہیں۔"

"ہوں۔" وہ سر ہلا کر باہر نکل گئے۔ "بچیوں کو اٹھا دو نماز کا وقت ہو چلا ہے۔"

حالانکہ کمرے میں جگہ بھی مگر ماں بی نے خود ہی ان تینوں سے کہہ دیا تھا کہ عبدالمبین کا بستر باہر ہی لگانا۔

صوفی صاحب کی شغلی طبیعت سے وہ بخوبی واقف تھیں۔ وہ تو جوان ہوتے بہن بھائی کے رشتے میں بھی بہت سختی کے قائل تھے۔

"اسلام علیکم۔ بھئی! حد ہو گئی صبح سے تین بار فون کر چکی ہوں، کوئی اٹینڈ ہی نہیں کر رہا۔ کل سے یہ جنتاں بی بی نے ایک ہی گردن لگا رکھی ہے۔ فلائٹ لیٹ ہے۔ فلائٹ لیٹ ہے۔ جیسے اس نے اڑا کر لانا تھا جہاز اور جہاز بھی اس کی طرح بوڑھا اور سنبھلیا ہوا۔"

عفت آرا کی پاٹ وار آواز سے الفوج میں بیٹھے تینوں نفوس ٹھنک سے گئے۔ ابھی رعنا نے فخر حیات کی فرائض پر کافی کے تین کپ بنا کر بیٹھی تھی۔ ناشتا کے انہیں کچھ ہی دیر گزری تھی۔

رعنا اٹھ کر بھانج سے گلے ملنے لگی۔ فخر حیات نے بھی اٹھ کر نواز بھائی سے معافہ کیا۔

"یہ فرزین ہے، پہچانا تم نے۔ رات سے ضد لگا رکھی تھی پچھو سے ملنے میں ضرور جاؤں گی۔ باقی دونوں تو بڑی ہو گئی ہیں۔ ویسے بھی بڑی تو ماشاء اللہ اسکول میں پڑھانے جاتی ہے۔ دوسری کو کالج جانا تھا، عفان بھی اسکول گیا ہے۔ تینوں دوپہر تک آجائیں گے۔ اس نے آج چھٹی کر لی، پچھو بھی کی چاہ میں۔" عفت آرا نے کئی شرمیلی سترہ

اشمارہ سال کی فرزین کو رعنا کے آگے کیا۔ رعنا نے ہاتھ پڑھا کر پار سے اسے سینے سے لگا لیا۔

"ماشاء اللہ فرزین تو بہت بڑی ہو گئی ہے۔" رعنا نے بیٹی کو غور سے دیکھا۔

"ہاں تو فرسٹ ایئر میں ہے۔ چار چھ مہینے بعد سینڈ ایئر میں چلی جائے گی۔"

"اسی وقت عفت آرا کی نظر اندر آتے سیٹی پر بڑی۔ ان کی چلتی زبان جیسے ایک جگ تھم سی گئی تھی۔

"ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔ یہ سیٹی ہے، ناسفیان۔" وہ جیسے کسی سحر کے تحت آہستہ آہستہ بول رہی تھیں۔

سیٹی بھی مہمانوں کو دیکھ کر ٹھنک گیا تھا۔

"رعنا! یہ سیٹی ہے نا؟"

عفت آرا نے عجیب سے لہجے میں رعنا سے تصدیق چاہی اور پھر رعنا کا جواب سنے بغیر آگے بڑھ کر سیٹی کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔

"کتنا سوہنا، کتنا جوان نکل آیا سے ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔ نظریہ سے اللہ بچائے۔ تصویروں میں تو اتنا بڑا نہیں لگتا تھا۔"

"تیسری تمہاری مہمانی ہیں سیٹی! پہچانا تم نے۔" رعنا جو عفت آرا کے انداز پر کچھ ہراساں سی کھڑی تھی، سنبھل کر بولی۔

"آداب مائی بی! اس نے کچھ شہرا کر کہا۔ عفت آرا کے اتنے چار بھرے انداز پر وہ کچھ شہرا سا گیا تھا۔

"تمہارے ماموں نواز! رعنا نے اس کا اور بکڑ کر نواز کے سامنے کیا۔ نواز نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا اور پھر گلے سے لگا لیا۔ ان کی آنکھوں میں عجیب سی جگ آگئی تھی۔ فخر حیات نظر میں چڑا کر سامنے دیوار پر گلی موٹا لیزا کی پینٹنگ کو غور سے دیکھنے لگے۔

"سیٹی! یہ فرزین ہے، تمہاری سب سے چھوٹی کزن۔ جب تم اوھر سے گئے تو یہ چھوٹی سی تھی۔" رعنا نے تقریباً کچھ کھینچ کر سیٹی کو نواز سے الگ لیا اور فرزین کے سامنے کھڑا کر دیا جس نے سنبھلے ہوئے سلام کیا تھا۔

"اسلام سیٹی بھائی! اس نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ سیٹی کی آنکھوں میں پرہوش جھلک بھری تھی اور ہونٹوں پر ولقرب سی مسکراہٹ۔ وہ بھرپور نظروں سے فرزین کا جائزہ لے رہا تھا۔

"جنتاں! بھئی جلدی سے کچھ تو اشع کولاؤ۔ بھابھی اور بھائی آئے ہیں، تم کدھر کونے کدھرے میں بھپ جاتی ہو کام کے وقت۔" رعنا کی اونچی آوازوں نے جیسے سب کو ہوش دلا دیا۔ عفت آرا بغور نظر میں گھما گھما کر پورے گھر کا جائزہ لینے لگیں۔ نواز فخر حیات کا احوال پوچھنے لگے۔ فرزین ماں کے ساتھ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ سیٹی نے اس کے سامنے ہی صوف سنبھال لیا تھا۔ وہ ابھی بھی سیٹی کی نظروں سے فرزین کو دیکھ رہا تھا۔

پھر وہ لوگ شام تک اوھر ہی رہے۔ عفت آرا کی باتیں تو یوں بھی تمام ہونے والی نہ تھیں۔ فخر حیات دو گھنٹوں کے لیے اٹھ کر باہر گئے تھے۔ دوپہر کو بیچ سے پہلے عفت آرا کی دونوں بڑی بیٹیاں اور بیٹا عفان بھی آیا تھا۔ رعنا کا پروگرام بھی اس روز اپنی پرانی احباب سے ملنے جانے کا تھا مگر مہمانوں کی وجہ سے اس نے اپنا پروگرام کل پر رکھ دیا تھا۔

آخر خدا خدا کر کے وہ لوگ شام سات بجے رخصت ہوئے۔ وہ بھی نواز بھائی کو کوئی ضروری کام تھا، ان کے تین

فون آگئے تھے۔ اگرچہ عفت آراء کا بھی ارادہ نہیں تھا۔

”اچھا بھئی! اب پرہیزوں سنڈے کو ہمارے ہاں دعوت ہے، دوپہر اور رات کا کھانا۔ آپ لوگوں نے ضرور آنا ہے۔“ عفت آراء اور نواز نے جانتے سے بڑے اصرار سے انہیں دعوت دی۔

”نہیں نواز بھائی! صرف رات کو ہم آسکیں گے۔ مجھے تو ابھی ادھر بہت کام ہے۔ سنڈے کو بھی آف نہیں کر سکتا۔ ہاں ڈنر میں آجائیں گے اور اگر میں نہ آسکا تو میری جہنمی معذرت قبول کر لیجئے گا پھر کسی دن حاضر ہو جاؤں گا۔“

فخر حیات نے سلیقے سے اپنی معذرت پہلے ہی پیش کر دی۔ وہ محض ایک کھانے کے لیے عفت آراء کی بے سرو پا آنکلو سے اپنا بیجا خالی نہیں کرانا چاہتے تھے۔

”نہیں یہ ایسا بات ہوئی۔ وہ بھی صرف ڈنر اور آپ نے آنا نہیں۔“ عفت آراء کو بحث کے لیے موضوع عمل گیا۔

اوکے بھائی! ہم دیکھیں گے انشاء اللہ ضرور پہنچیں گے۔ آپ انوائٹ کریں اور ہم نہ آئیں گے تو آپ میں ہو سکتا ہے۔ ہمارا آپ کے سوا قریبی رشتہ دار اور کون ہے۔ فخر بھی آئیں گے ہمارے ساتھ انشاء اللہ کیوں فخر! رعنا نے بحث کو جلدی سے سمیٹا۔

”بالکل کیوں نہیں۔“ فخر حیات نے یونہی سر ہلا دیا تو عفت آراء اور نواز دوبارہ تاکید کرتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ فخر حیات گاڑی اور انہیں یہ چھوڑنے جا رہا تھا۔

”لوکے پر مٹی کر لے بہت جلد دوبارہ ملاقات ہوگی۔“ انتظار کرو گی کیا؟“

پاس سے گزر کر گاڑی میں بیٹھتی فرزین سے سنی نے ہونے سے ہنس کر کہا تھا۔ وہ جلدی سے شہر آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ رعنا نے ایک نظر بیٹے کے بشارت چہرے کو دیکھا اور وہ جہنمی نظر فرزین کے سر نکال پھرے پر ڈال۔ رعنا کے اندر عجیب سی بے چینی کا لہانے لگی تھی جسے وہ کوئی بھی علم دینے سے قاصر تھی۔ اس نے یونہی سر ہلا کر فخر حیات کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر لکھی بیزاری اور سے پوری جارہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی پیشی دبا رہے تھے۔ سنی اڑتے بہت خوش تھا نا معلوم کیوں؟

”مما! فرزین اچھی لگی نا آپ کو؟“ ہے نا پاپاشی از پرینی اور کتنی مہنگی ہے۔ ناما! وہ اپنی رو میں گئے جا رہا تھا۔ ”مجھے وہ بہت اچھی لگی ہے۔ ماما! اب مجھے لگتا ہے میرا پاکستان میں مل لگ جائے گا۔“

ڈنر کے لیے وہ تینوں بیٹے کھانا کھا رہے تھے۔ سنی نے بے اختیار کہنا شروع کیا کہ فخر حیات نام نہان کھلے کا کھلا رہ گیا اور رعنا کے ہاتھ سے بیچ پھوٹ کر پیٹ میں گر گیا۔ اس نے اتنا ہی خوف زدہ نظموں سے فخر حیات کی طرف دیکھا جو خود گنگ بیٹھے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

پانی کا جگ اٹی ہڈیاں کے ہاتھ سے جگ چھوٹے چھوٹے بچا۔ البتہ ڈھیر سا پانی پھلک کر اس کے کپڑے اور قالین کو بھگو لیا تھا۔ وہ بھی حیران نظموں سے سنی کے خوش باش چہرے اور بے فکرے انداز کو دیکھ رہی تھی۔ سنی کی باتوں نے جیسے اس کے پیروں تلے سے بھی زمین نکال دی تھی۔



”پچاس پچیس سال آزادی کے گزارنے کے باوجود میں سمجھتی ہوں بلکہ ہماری قوم کا ہر ہاں شعور فروریہ سمجھتا ہے کہ وہ آزاد نہیں۔ معاشی اہتری، اخلاقی گراؤ اور اخلاقی قدروں کی پامالی نے ہم سب کی ذہنی آزادی کو سلب کر رکھا ہے۔ دوسری قوموں نے جس تیزی سے ترقی کی ہے اور کر رہی ہیں ہم محض جاہلانہ انداز میں گردن اٹھانے یا تو انہیں حیرت اور حسرت سے دیکھ رہے ہیں یا پھر ان کی تہذیب کے تمام تر منفی اثرات کو بوسے بے ڈھنگے طریقے سے اوڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور اس کوشش میں شاید اپنی ہنسی بھی اڑوا رہے ہیں مگر ہمیں

احساس نہیں۔“ رعنا فخر حیات نے ایک کمر اساس لیا۔

”ہمیں احساس نہیں کہ اس وقت ہم اقوام عالم سے تعلیمی تہذیبی اخلاقی معاشی اور اقتصادی طور پر کس قدر پیچھے رہ گئے ہیں۔“

زندگی کی اذیت ناک کی یہ ہولناک تصویر آپ روز اخبارات میں دیکھتے ہیں۔ آئے دن خود سوزی کے کیسز ہمارے معاشرے کے بے انصاف طبقاتی فرق کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ معاشی بد حالی نے عوام کو بے حال کر رکھا ہے تو ہمارے حکمرانوں کو اپنے ہمیشہ و عشرت سے فرصت نہیں رہا تھا اٹھانے ایک ہی سلو کن الاپ رہے ہوتے ہیں۔ سب ٹھیک ہے۔ کیا آپ کے خیال میں سب ٹھیک ہے۔؟“ اس نے سوالیہ نظموں سے جمنازی سائز ٹیبل کے دونوں اطراف ٹیپٹی کچھ بیزار کن شکلیں لیے پور ڈوا طبعی کی نزاکت پسند خواتین کو دیکھا۔

”یہاں کچھ بھی ٹھیک نہیں اور نہ ہوا رہا ہے۔ بہت کچھ ٹھیک کرنے کے پلڑے بہت کچھ بلاتا جا رہا ہے پکھڑتا جا رہا ہے، حکمران بے نیاز ہیں۔ عوام کی حالت سے اور عوام بے جسی کی اتناؤں سے گزر رہے ہیں۔ حکومت کوئی سی بھی ہو کسی کی بھی ہو وہ ہمارے ساتھ کچھ بھی کر گزرے یا کر گزرنے کے عزائم رکھتی ہو۔ ہمیں اس سے ذرا بھی غرض نہیں۔“

ہماری حالت تو ان پوچھ پوچھنے والے گروہوں کی ہی ہو چکی ہے جنہیں صرف پوچھ ڈھونڈنے سے غرض ہے۔ ان کا مالک کون ہے کوئی چور ٹھہرایا کھلا جو انہیں اس سے کچھ بھی فرق نہیں پڑتا۔

میری ان تمام خشک باتوں کا مقصد آپ کو حالات حاضرہ سے باخبر کرنا نہیں۔ وہ تو آپ لوگ آئے دن نیوز پیپر ڈ میں پڑھتی ہی رہتی ہیں۔ میرا مقصد آپ کو حالات کی سنگینی سے آگاہ کرنا اور اس سنگینی کو کم کرنے کے لیے اپنا کردار طے کرنا ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں اس لیے غور کریں جس کے تحت ہم سب آج یہاں جمع ہیں۔

میں نے سچ پچھ سالوں تک گزارے۔ صرف ایک ملک میں نہیں ہمارا قیام دنیا کے ترقی یافتہ چار پانچ ملکوں میں ساہواں میں نے ایکس باسٹ نوٹ کی۔ ان لوگوں کی علم سے محبت اور تعلیم سے لگاؤ۔ اور یہی وجہ ہے جس نے انہیں دنیا بھر میں سر بلند کر رکھا ہے۔ ہاں تعلیم عام ہے اور مفت ہے۔ قوم کا ہر فرد پڑھا لکھا باشعور ہے۔ اپنے مقام اور حکومت کے فرائض سے بخوبی آگاہ ہے۔ اعلا طبقے کی ایک بھی لغزش ان کی تیز نگاہوں سے چھپی نہیں رہ سکتی اور ہمارے یہاں علم بے دوری اور جمالت نے ہمیں احساس کمتری میں مبتلا کر دیا ہے کہ ہم غیروں سے کیا ایسوں سے بھی سزا کا لیا جات نہیں کر سکتے۔

ہماری ترقی کا عفت ایک ہی رستہ ہے۔ ایک ہی رستہ ہے کہ ہماری قوم کا ہر فرد با علم یا نہ ہو جائے، ہمیں ترقی کے حصول کے لیے مغربی اقوام کے اوٹ پٹانگ فیشن اور منفی رویوں کو اپنانے کی ضرورت ہی نہ رہے۔ آپ کو دلچ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟“

رعنا نے بالآخر اپنی بات کو سمیٹا لیا کیونکہ بیگمات کے چہرے خلاصے بیزار ہو چکے تھے۔

”بہت اچھا جائزہ پیش کیا رعنا! آپ نے مجھے خوشی ہوئی ہے آپ کے خیالات جان کر میں تو خود بھی چاہتی ہوں کہ ہم اپنی قوم کی ترقی میں کوئی رول ملے کریں۔ جو کچھ اور رعنا ہماری رنج اور تنظیم کے دائرہ کار میں ہو سکتا ہے، کیونکہ صرف فیشن ورک سیاستدانوں کے ساتھ میٹنگز میں خواتین کے مسائل پر بات کرنا، تصاویر اتروانا اسکولوں کی تقریبات کا افتتاح کرنا یا کسی چھوٹی موٹی عمارت کے عمل ہونے پر فخریہ کانٹے سے ہم کوئی بھی مثبت کام نہیں کر رہے۔ صرف ایک این سی او بنانے سے یا مینے میں دو چار بار اس کی میٹنگز کر لینے سے معاشرے میں کوئی فعال کام نہیں کر رہے۔ اس سلسلے میں رعنا اگر آپ کے ذہن میں کوئی پلان ہو۔؟“

مسز سر فریڈ آن گل ان کی این سی او کی صدر تھیں۔ خاصی پڑھی لکھی ہوئی اور سنجیدہ خاتون تھیں رعنا کی بات پر جھوم کر تے ہوئے بولیں۔

”پلان تو یہی ہے جو میں ذکر کر چکی ہوں، تعلیم کا پھیلاؤ، پورے معاشرے میں تعلیم کو عام کرنا، مشروں کی بات

وہاں تیشیلہ لٹی مل جائے گی۔۔۔ سرے کوئی پریشانی بھی نہیں ہوگی میرا مطلب ہے کیس سے متعلق۔۔۔ سلطان بخت بہت احتیاط اور کم رفتار سے گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے۔

”میرا خیال ہے اس کی ضرورت تو نہیں ویسے بھی اس آئیڈیلے کے لیے کم از کم سیدہ بجا بھی نہیں مانیں گی۔“

صالحہ شاہ اپنی چڑیوں سے بھلتے ہوئے بولیں۔

”آپ کا کوئی مسئلہ نہیں۔ میں انہیں مناسکتا ہوں۔ ویسے بھی یہ آپ کا نہیں ہمارا مسئلہ ہے۔ سچے کی سیٹھی اور بہتری کے لیے ہم جو بھی فیصلہ کریں انہیں اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہم ان کی فکر مت کرو۔ اپنا خیال بناؤ۔“

صالحہ شاہ نے کچھ مسکراتے ہوئے حیران نظروں سے اپنے اکھڑے شوہر کی طرف دیکھا۔ چند ماہ میں وہ کس قدر بدل گئے تھے اگر یہ تبدیلی صرف آنے والے کی مرہون منت تھی تو صالحہ شاہ کے دل کی خوشگوار دھڑکنیں ایک ہی دغا کر رہی تھیں کہ مجھے مسمان کی آمد کا سلسلہ دراز سے دراز ہوتا چلا جائے۔

”میرا تو خیال ہے اس کی ضرورت نہیں آپ تو ہمارے اپنے ملک میں میڈیکل کے ہر شعبے میں بہت ترقی ہو چکی ہے۔ پھر آپ کو کیا کی ہے آپ کی ایک کل پر ڈاکٹرز کی لائن لگ سکتی ہے۔۔۔“

”معلوم ہے مجھے مگر گاؤں کی تنگ فہم عورتوں اور حویلی کا وارث پیدا کرنے والی صالحہ شاہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“ سلطان بخت کے جملے نے صالحہ شاہ کو ہواؤں میں اڑا دیا۔ اسے نگاہ دنیا کی پہلی معترف عورت ہیں جو یہ معرکہ انجام دینے جا رہی ہیں۔

”آپ اس قدر بڑی اپنے بچے کے بارے میں ہیں یا میرے بارے میں۔؟“ کچھ دیر کے توقف کے بعد وہ بولیں۔

”دونوں کے بارے میں۔“ سلطان بخت کی نظریں سڑک کی ٹریفک سے ایک بل کو نہیں اور صالحہ شاہ کو محبت بھری نظریں مسکان سے دیکھا ان کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

”ایک بات ہوں صالحہ۔“ کرون موٹر سلطان بخت نے بہت آہستہ تمبیہ آواز میں کہا۔

”کیا۔؟“ صالحہ کی آواز جیسے گرائی سے آئی۔

”تم آج کل بہت خوبصورت ہو رہی ہو بخت حسین کہ میری نظریں تمہارے چہرے کو ٹھنکی پاندھ کر نہیں دیکھ سکتیں۔“ انہوں نے بہت آہستہ سے اپنے بائیں ہاتھ میں ان کا خوبصورت ڈائمنڈ رنگرز سے سجا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دیا۔

”مجھے کیا پتا۔۔۔ وہ بری طرح سے ہلش کر گئی تھیں۔ بمشکل پلکیں اٹھا کر بولیں۔

”تو تم کو کیا ہو گیا۔ وہ کیا ہے ایک سیڈنٹ کروائیں گے کیا؟“ انہوں نے ان کی توجہ سڑک پر بھاگتی دوڑتی ٹریفک کی طرف والائی۔

”شاید آج ایک سیڈنٹ ہو ہی جائے۔“ وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر ہوشوں میں بہیڑا۔

”ایک بات کہوں۔“ وہ چند لمحوں بعد شوہر پر قابو پا کر بولیں۔

”نہیں کہو۔“ وہ فراخ دلی سے بولے۔

”آخر آپ الٹا ساؤنڈ کی رپورٹ میں کیس انکو از کیوں نہیں کرتے۔؟“ وہ جھجک کر بولیں۔

”کیونکہ مجھے یقین ہے ہمارے ہاں پریشانی ہو گا۔ تمہاری کوکھ میں اس حویلی کا وارث ہے میرا دل پکارا پکار کر مجھ سے کہہ رہا ہے ایسا نہیں یہ پکار شافی نہیں دیتی۔“ سلطان بخت پر یقین لگنے میں بولے۔

”لیکن اگر۔۔۔“

”پلیز اس وقت کوئی نیکی بات نہیں کرنا۔ میرا موڈ بہت اچھا ہے۔“ انہوں نے اپنا بایاں ہاتھ بے ساختہ اس کے لبوں پر رکھ دیا۔

”تمہیں معلوم ہے نا ہمارے خاندان میں لڑکیوں کی پیدائش نہ ہونے کے برابر ہے۔ تمہارے بابا اور میرے

رہنے دیں شہوں میں تو پہلے ہی بے تحاشا انگلش میڈیم اور سرکاری اسکول موجود ہیں امراء کے لیے علیحدہ اور عوام کے تین چار طبقوں کے لیے علیحدہ ہماری تو تعلیم بھی نئی ہوئی ہے۔ ہماری طبقاتی فکر کی طرح میں دیہات اور ان کے قرب و جوار کا ذکر کر رہی ہوں شہوں کی تو کوئی سڑک جو کسی افسر کے گھر کے آگے سے گزرتی ہے تو وہاں سے گزرنے والے افسر پریشان ہو جاتے ہیں اور اکثر شام سے پہلے اس سڑک کی تعمیر نہ سہی اس پر پیوند ضرور لگ جاتے ہیں۔ اس لیے یہاں کی بات آپ رہنے دیں۔“

”میں تو دور دراز علاقوں۔۔۔“

”اف اس قدر گرمی میں اور دور دراز کے علاقے؟ مسز حیات! آپ کو معلوم ہے چند دنوں تک کیسی غضب ناک گرمی پڑنا شروع ہو جائے گی۔ اور پھر پچھ ماہ تک الامان بندہ اے سی سے باہر قدم نہیں نکال سکتا۔“ سب سے زیادہ نازک مزاج نازک بدن اور نازک خیالات کی مسز خالد تڑپ کر بولیں۔ کئی چہرے مسکرائے تھے۔

”ہوں گرمی گرمی تو بہت صدیوں سے جمیل رہے ہیں مسز خالد! اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوا تو کیا یہ نہیں ہو سکتا۔ آنے والے اچھے دنوں کے لیے ہم چند سال کے لیے اس موسمی تغیر کو ذہن سے نکال دیں۔“ مسز سرفراز نے کچھ سنجیدگی سے کہا تو مسز خالد نے کچھ ناگواری سے اپنے قریب پڑی منسل واٹر کی بوتل اٹھا کر گلاس میں پانی اٹھلنا شروع کر دیا۔

”میرا خیال ہے اب کچھ پریکٹیکل باتیں ہو جائیں۔ رعنائی تجویز اچھی ہے ابھی بھی اس ملک میں ایسے دیہات کی کمی نہیں جہاں ہمارے لیے کچھ نہ کچھ کام پائی ہو نا اشر حسن فرخندہ جنہیں اور مسز حیات آپ تینوں کے ذمے یہ کام ہے۔ ایک ہفتے کے اندر لاہور کے ارد گرد جتنے بھی دیہات ہیں۔ آپ وہاں سروے کر آئیں کہ کہاں کہاں ہماری ضرورت ہے۔ ہم اپنا کام شروع کریں اور اگر سروے والا کام بقول مسز خالد کے شدید گرمی شروع ہونے سے پہلے مکمل ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔“ مسز سرفراز نے مسکرا کر کہا۔

”ویسے میری بھی ایک تجویز ہے۔“ مسز حیات بولیں۔

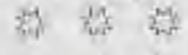
”جی کہیے۔“

”ہم ایک ماڈل اسکول بنائیں گے وہاں تین شفٹیں ہونی چاہیں مارچک میں بچوں کی کلاسز دوسری عورتوں کی کیونکہ عورتیں اس وقت عموماً فارغ ہوتی ہیں اور شام میں مردوں کی کیا خیال ہے۔؟“

”اچھا آئیڈیا ہے مگر یہ تو بہر حال بعد کی بات ہے پہلے تو آپ سروے کریں پھر ہمیں اوپر زمین اور اسکول کی بلڈنگ اگر کوئی نئی بنانی مل جائے تو اچھا ہے۔ اور ہماری ممبرز اپنی صاحب ثروت تو ہیں کہ دو چار سکول بنا سکیں کیا خیال ہے آپ لوگوں کا۔؟“

”شیور شیور ہم تو خود کام کرنا چاہتے ہیں اپنی انرجیز اپنے لوگوں کی سروس میں لانا چاہتے ہیں۔ اپنے لوگوں کے کام آکر ہمیں خوشی ہوگی۔“ فرخندہ جنہیں ہوس سے بولیں۔

”بہت اچھی بات ہے۔ اگلی میٹنگ ایک ہفتے بعد ٹھیک اسی وقت ہوگی۔ اس دوران آپ تینوں اپنا سروے مکمل کر لیں۔“ کہتے ہوئے مسز سرفراز نے بات ختم کی تو سب خواتین کرسیاں پیچھے کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔



”ڈاکٹر نے کیس تو نارمل ہی کہا ہے نا کوئی پیچیدگی تو نہیں۔؟“ جیسے ہی صالحہ شاہ سلطان بخت کے برابر گاڑی میں آکر بیٹھیں تو سلطان بخت نے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا اور ساتھ ہی گاڑی اشارت کر دی۔

”ہوں ویسے تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ابھی تو نارمل ہی ہے ویسے بھی ابھی تو تین چار ماہ ہیں ڈاکٹر کہہ رہی تھیں ابھی فی الحال کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ اب ہم کدھر جا رہے ہیں عمومی۔؟“

”میں سید ہاؤس“ ویسے میں سوچ رہا تھا کیوں نہ ہم اپنے بچے کی ڈیوری لندن میں کروائیں ایک تو اسے

بابا دونوں بھائی تھے اور ان کے بابا اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے۔ صرف آپا اور شہزادہ پانچ نسلوں کے بعد وہ نہیں
 اکتسی ایک گھر میں پیدا ہوئے اور نہ تو یہ خاندان بیٹیوں کا ترسا ہوا ہے۔ اسی لیے تو بابا جان آپا کو مجھ پر بھی فوقیت
 دے جایا کرتے تھے اور مجھے شہزادہ اسی وجہ سے پیاری ہے۔ اب اس موضوع پر اور کچھ نہ کہنا اور نہ سوچنا کیونکہ
 اکثر بری سوچیں کہی کھار مجھ سے ہو کر آجاتی ہیں۔ ہمارے ڈاکٹر سچ ثابت ہو جاتے ہیں تم اچھی سوچ رکھو۔
 خوبصورت صحت مند بیٹے کے بارے میں سوچو جیسی خوبصورت ڈاکٹر ساری تصاویر میں نے بیڈ روم میں سجا رکھی
 ہیں۔

وہ اب مزید اس موضوع پر کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں اس لیے چپے ہو گئیں۔

”تو پھر ہمیں ڈیوری کے لیے شہر آنا پڑے گا۔ پھر حویلی میں ہی سارا انتظام۔“ سلطان بخت بہت ایسا بیڑ
 ہو رہے تھے۔ جیسے کل ہی ولادت متوقع ہو۔

”پلیز سلطان بخت! ابھی تو بہت نام باقی ہے۔ اس پر پھر بات کریں گے۔ ویسے بھی وہی ہو گا جو سیدہ بیڈ روم
 فرمائیں گی۔“ آخر میں وہ کچھ ہنسی سے بولیں۔

”پھر وہی سیدہ بیڈ روم! سلطان بخت نے غصہ کر کے گاڑی ”سیدہ ہاؤس“ کے عالی شان پکیٹ کے آگے کھڑی
 بارن بجاری تھی۔ چوکیدار نے بہت پھرتی سے گیٹ کھولا تھا۔

”واؤ! بہت زیورست بہت آرائش کمرے یہ تو محل لگتا ہے۔“ سارا شاہ گاڑی سے اتر کر تو حیدری نظروں
 سے اپنے سامنے کھڑی سیدہ ہاؤس کی خوبصورت عمارت کو دیکھ کر بولیں۔

”تمہیں اچھا لگا کھڑا؟“ سلطان بخت نے گاڑی کا دروازہ بند کر کے ہونے پوچھا۔

”بہت۔ بہت زیادہ۔“ وہ پوری طرح سے آگے نکل آئے تھے۔

”بابا جان نے بہت شوق سے بنوایا تھا“ آرکٹیک پر ترکی اور انٹی سے بولے تھے انہوں نے اس زمانے میں
 اس گھر پر دس کروڑ کی لاگت آئی تھی۔ ابھی اندر سے دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔“ خود شہزادہ نے کہا۔

”اسی لیے آپ سے سیل کرنا چاہ رہے تھے۔ اتنا خوبصورت گھر کسی کے خوابوں سے بھی حسین نہیں تو کبھی
 اس کو سیل کرنے کا کبھی سوچوں۔“ سارا کچھ ناراضی سے گویا ہو گئی۔ بڑی احتیاط سے سنگ مرمر کی بیڑھیوں
 چڑھ کر انہوں نے کاریڈور میں قدم رکھا۔

”بہن! میں اب اینڈ ڈائن آتے ہی رہتے ہیں۔ بابا جان نے ساری زندگی زمین و آری پر اتنا کیا نہیں
 اینڈ سٹری کے شعبے میں بھی قدم چھسالیے۔ دونوں فیکٹریوں کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر تیسری فیکٹری جب شروع کی
 تو اس کی مشینری کے لیے مجھے بہت سرمائے کی ضرورت تھی اس لیے اس کو سیل کرنے کا سوچا تھا۔“

”پھر بھی اس گھر کو کبھی سیل کرنے کا نہ سوچتے گا۔ ہمارے بچے اس گھر میں آکر کس قدر خوش ہوں گے۔
 سارا! پانی کھرتے صبح دیکھ لیتا۔ کافی رات ہو جی ہے۔ تمھارے جاؤ گی پلو بیڈ روم کی طرف چلتے ہیں۔“ سلطان
 بخت نے اوریجن میں ہی اس کا ہاتھ تمام کر محبت سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ہاشم ہاشم۔“ سلطان بخت نے ملازم کو پکارا۔

”جی شاہ صاحب! اسی وقت ہاشم تقریباً دوڑتا ہوا آیا۔

”وہ کچھ گاڑی میں ایک پیکٹ رکھا ہے گاڑی کی پیچلی سیٹ پر وہ لے آؤ۔“

انہوں نے گاڑی کی چابی اسے تھماتے ہوئے کہا۔ وہ چابی لے کر مڑ گیا۔

”یہ بیڈ روم ہے۔ Gorgous (شاندار) ونڈر فل۔ بہت کشادہ ہے۔ حد خوبصورت اور لگژری اسٹائل میں
 ہے۔ بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی صالہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”ابھی تو ہمارا اچانک اوجھڑنے کا پروگرام بناؤ۔ میں اسے تمہارے شایان شان ضرور ڈیکوریٹ کروانا۔“
 سلطان بخت اپنے موڈ کی انتہا پر تھے۔

”مجھے تو یہ سب بھی بہت اچھا بہت زیورست۔“

”صاحب! یہ پیکٹ جی۔“ ہاشم نے اندر داخل ہو کر پیکٹ انہیں تھمایا اور گاڑی کی چابی دے کر نکل گیا۔

”یہ لو اس کو کھلو۔“ انہوں نے پیکٹ صالہ کو پکڑا دیا اور خود سٹنگ کاؤچ پر جا بیٹھے۔

”اس میں کیا ہے؟“ وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

”تم کھول کر تو دیکھو۔“

صالہ دیکھی اور شوق سے پیکٹ کھولنے لگیں اندر دنی خوشی اور اپنی اس درجہ پذیرائی پر ان کا چہرہ گلگلوں ہوا
 جا رہا تھا۔

”واؤ! تمہیں نیکلس زیورست۔ یہ۔ یہ کس کا ہے؟“ وہ فضیلا ہر رخ سے نیکلس سے پھوٹ رہی تھیں،
 جو صالہ کے ہاتھوں میں جگہ گارہا تھا۔

”تمہارے لیے حویلی کی اکلوتی مالکن اور اس کے وارث کی والدہ محترمہ کے لیے اور یہ کس لیے ہے پوچھو
 ڈرا۔“ وہ ان کے بہت قریب ہو کر بیٹھ گئے۔

انٹلی سے ان کے سرو کرم و خسار کو ہولے سے چھو کر بولے۔

”کس لیے بھلا۔“ ان کے موتیوں جیسے دانت ہونٹوں کی مسکراہٹ کا ساتھ دے رہے تھے۔

”آج تم پہلی بار سیدہ ہاؤس آئی ہو ناں لے۔“

”اؤ۔“ وہ کسمسا کر پرے کھسکیں پوچھیں اور بھی دیکھنے لگا تھا۔ سلطان بخت کی نظریں ان کے چہرے کے
 آ رہا جا رہی تھیں۔

”تمہیں نیکلس سلطان بخت! خاندان یونیک ویلم۔“ انہوں نے جھجکتے ہوئے سلطان بخت کے
 ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے لگا کر کہا۔

”اؤ۔“ وہ کسمسا کر پرے کھسکیں پوچھیں اور بھی دیکھنے لگا تھا۔ سلطان بخت کی نظریں ان کے چہرے کے
 آ رہا جا رہی تھیں۔

”مجھے خود پریشان نہیں آ رہا۔ آپ مجھ سے اس قدر محبت کرنے لگے ہیں۔“ وہ بے یقینی سے انہیں دیکھتے
 ہوئے بولیں۔

”کرتے لگے ہیں ہاں تو پاپیلے نہیں کہتا تھا۔“ وہ فوراً بولے۔

”نہیں پاپیلے تو۔“ انہوں نے فوراً زبان دانتوں سے دیا۔

”وہ تو تم خوا خواہ تھے۔“ سگڑتی تھیں مجھ پر شک کرتی تھیں۔ اس لیے مجھے بھی غصہ آجاتا تھا۔“ انہوں نے
 جھک کر اپنے منہ سے انکار نے شروع کیے۔

”نہیں سگڑتی تھی بھلا وہ تو آپ خود۔“

”پلیز صالہ! ان خوبصورت لمحوں کو پھر کسی فضول بحث کی تذرمت کرو۔ مجھے یہ نیکلس بہن کر دکھاؤ۔“
 انہوں نے سراٹھا کر انہیں تو کا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کر نیکلس
 پہننے لگیں۔

”یہ زحمت تو آپ کو کرنی پڑے گی۔“ وہ نیکلس کا کھلا لاکہ گرون کے پیچھے تھامے کھڑی تھیں انہوں نے اٹھ
 کر اک بند کر دیا۔

”زیورست بیوٹی فل مائی ریٹی وانٹ۔“ سلطان بخت نے ان کے بائیں کان کی اوکے بہت پاس کہا تھا ان
 کے کندھے ان کے بازوؤں کے دھار میں تھے۔

”چھوڑو میں نا مجھے تو دیکھنے دیں۔“ وہ اپنا آپ چھڑا کر بیٹھے بیٹھے۔ اور خود کو آئینے میں دیکھنے لگیں۔ انہیں لگا
 نیکلس نے ان کی گردن کو اور حسین بنا دیا ہے۔

”لیا پتھروں میں بھی اتنی طاقت ہوئی ہے جو کسی کو اس درجہ حسین بنا دیں۔“ اپنی جی سنوری گردن کو دیکھتے

ہوئے انہوں نے سوچا۔

”صالحہ! ادھر آؤ۔“ انہوں نے اسے بیڈ سے پکارا۔

”جی۔“ وہ ان کے پاؤں کے پاس جا کر بیٹھ گئیں وہ تمہارا تھے۔

”تم سے ایک بات کہنا ہے۔“

”کہیں نا۔“ وہ ابھی بھی سیکس پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

”میرے دل کی ایک خواہش ہے۔ خوشی سمجھ لو۔“ وہ ذرا سا ٹھہ کر ان کے قریب ہو گئے۔

”بولے نا۔“ صالحہ پوری طرح سے متوجہ ہو کر بیٹھ گئیں۔

”پتا ہے میری خواہش ہے کہ جب میں اپنے بچے کو پہلی بار دیکھوں تو اسے کوئی ایسا زیروست گفتہوں کہ پیدا

ہوتے ہی اس کے قدم زمین پر مضبوطی سے پڑیں۔“

”کیا مطلب؟“ صالحہ ناگہمی سے بولیں۔

”میں نے ایک کوٹھی دیکھی ہے۔ یہ کھر موٹی زمینیں یہ سب تو ہم دونوں کی ہیں نا وہ کوٹھی صرف اور صرف

میرے بیٹے کی ہوگی۔ بہت خوبصورت بہت شاندار سی سیدھاؤس کی طرح۔ اصل میں میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں

تھا۔ ایک دوست کو کھر خریدنا تھا۔ اتفاقاً میں اس کے ساتھ چلا گیا۔ میں نے وہ کوٹھی دیکھی اور سمجھو میرا دل

وہیں رہ گیا کہ یہ میں اپنے نومولود بچے کو گفتہ کروں۔ میں سربراہی دینا چاہتا تھا۔ تمہیں بھی۔ مگر بابا جان کے فیصلے نے

مجھے بائیکاٹ رکھا ہے۔ ہم دونوں کا جو انٹہ اکاؤنٹ میں اکیلا کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اپنے دل کی خوشی ہی خوشی بھی

پوری نہیں کر سکتا۔ ورنہ یہ شخص میں تمہیں بھی سربراہی دینا چاہتا تھا مگر کیا کر سکتا ہوں۔“ جیسے صدیوں کا ملال

سلطان بخت کے لہجے میں امتداد آیا۔

”تو آپ خرید لیں نا وہ کوٹھی۔ اس میں مسئلہ کیا ہے؟“ صالحہ ذرا ابھی نہ سمجھیں۔ فوراً بولیں۔

”جوہانی کروڑ کی ہے وہ کوٹھی اور مجھے صرف پچاس ہزار تک اکیلے لمان کرنے کی اجازت ہے۔ مگر بولوں میں کیے

اپنے دل کی خوشی پوری کر سکتا ہوں۔“ وہ یاسیت سے بولے۔

”اتنی رقم ہوگی اکاؤنٹ میں؟“ صالحہ نے پوچھا۔

”صالحہ۔“ وہ ناراضی سے بولے۔ ”تم نے ہمیں کیا سمجھ رکھا ہے اتنی رقم سے تین چار گنا تو شاید اسلام آباد

کے اکاؤنٹ ہی میں ہوگی۔ جہاں ہمارا زیاہہ کام بھی نہیں ہوتا۔“

”تو پھر آپ نکلوا میں میں سائن کر دیتی ہوں۔“ وہ بغیر کسی بخت کے پھرے کارنگ سی

بدل گیا۔ انہوں نے فوراً بیڈ کی سائیڈ والی ایک دروازے سے چیک بک نکالی۔

”ویسے پار! یہ بھی فضول کاغذ ہے۔ جو بابا جان وصیت کرتے ہم دونوں کے جو انٹہ سائن کا۔ اب ویسے نا وہ

تین ماہ بعد مجھے کس قدر مشکل ہوگی۔ ذرا ذرا سے کاموں کے لیے ہمارے سائن چاہیے ہوں گے اور تم اس

کنڈیشن میں۔ یہاں سائن کر دو رقم میں لکھ لوں گا۔“ انہوں نے چیک بک اور پین اسے تھما دیا۔

”خیر۔ ابھی تو کچھ مسئلہ نہیں۔“ صالحہ نے مسکرا کر سائن کیے اور چیک بک انہیں تھما دی۔

”پھر بھی صرف پچہ ماہ کے لیے تم مجھے انارنی بنا دو تو اس سٹیٹ میں پڑنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔“ وہ

مطلب کی بات پر آئے۔

”اچھا بھلیں گے۔ مجھے تین دن آرہی ہے۔“ وہ بے نیازی سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

حسین شاہ نے اس معاملے میں انہیں سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ کبھی سلطان بخت کو انارنی بنانے کی

ہدایت نہ کرنا اپنے پیروں پر خود کھانا ڈالی ماروگی۔

”میں پہنچ کر لوں۔“ کہتے ہوئے وہ ڈور رنگ روم میں گھس گئیں۔

”بہت چالاک ہو تم صالحہ شاہ! مگر میرا نام بھی سلطان بخت ہے۔ تمہیں تو بتایا تو میرا نام بدل دینا۔“ انہوں

نے اٹھ کر الماری کے اندر کالا کر کھولا۔

”مائی سوٹ نین تارا! ایسا پہلی بار ہو رہا ہے۔ میں اس شہر کی فضاؤں میں ہوں اور تم سے مل نہیں سکتا۔ یہ ظلم

بھی تمہاری طرف سے ہے۔ چلو اسی جتنے میں اس ظلم کا حساب بھی بے باق کروں گا۔ بعد سو۔“ انہوں نے

چیک کو بے اختیار چوما اور چیک لار میں رکھ کر لاک لگا دیا۔

”اتنی رینگی مس یو۔“ ان کے دل سے نین تارا کے لیے ہوک ہی اٹھی تھی۔

انہوں نے کپڑے بھی پہنچ نہیں کیے اور مین لائٹ آف کر کے بستر پر لیٹ گئے۔

اوسے کھٹے بعد جب صالحہ ڈور تک روم اور واش روم سے قریب ہو کر آئیں تو ان کا مہو بہت اچھا تھا۔ انہوں

نے بلیک میٹ کی خوبصورت ناچی کے اوپر بلیک سلٹی گاؤن پین رکھا تھا۔ کھلے بالوں کے ساتھ اسٹائٹ میک اپ

اور ان کے بدن سے اٹھتی خوشگوار مہک انہیں یقین تھا آج وہ سلطان بخت کی مہاسر صحبتیں پائیں گی۔ آج کی

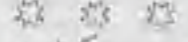
ہر ایک یادگار ہوگی۔ ”سوچتے ہوئے مسکراتے ہوں کے ساتھ جب وہ بیڈ روم میں داخل ہوئیں تو مین لائٹس آف

تھیں اور ناٹ لائٹ کی روشنی میں سلطان بخت بے خبر سو رہے تھے۔ ان کے اوپر کھلے منہ اور ہتھوں سے ہلکے ہلکے

خراٹوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

صالحہ شاہ کے اندر جیسے بے اختیار آگ سی بھڑک اٹھی ان کا بی چاہا اس خوبصورت بیڈ روم کو اس دھوکے باز

سمیت آگ لگا دیں اور خود کو بھی اس آگ میں جھسم کر ڈالیں وہ وہیں کاؤنچ پر ڈھیر ہو کر سٹلنے لگیں۔



”اور کچھ تو نہیں چاہیے تھا تمہیں۔“ جیسے ہی معاذ کی پیشین شہباز کے ساتھ شائنگ سال سے نکلا انہوں نے مڑ

کر اس سے پوچھا۔

”نہیں۔ جیسے ہی آپ نے بہت کچھ ایکسٹرا۔۔۔ ارے یہ کیا ہے؟“

اس نے جھک کر گاڑی کے پیسے کے بیس کے پاس کر والٹ اٹھایا براؤن کلر کا لیدر کا خوب پھولا پھولا سا والٹ

”کسی کا کر گیا ہو گا۔“ انہوں نے گاڑی نکال کھولتے ہوئے مزہ کر دیا۔

”ادھر ادھر دیکھوں کسی کا نہ ہو۔“ معاذ نے والٹ کھولے بغیر گردن تھماتے ہوئے کہا۔ گاڑیوں کی قطاریں

کھڑی تھیں۔ ورنچ مین پارکنگ والٹ سے کافی دور کھڑا تھا اور کوئی شخص کچھ ڈھونڈتا ہوا اسے نظر نہ آیا۔

”تو بیٹھو گاڑی میں خوالٹ کے اندر ہی مالک کا کوئی آئی ڈی کارڈ یا کوئی ایڈریس فون نمبر وغیرہ ہو گا۔“ انہوں نے

ہاتھ میں پکڑے شائنگ بیگز چھپٹی سیٹ پر رکھے اور ڈرائیو ٹلک سیٹ پر بیٹھ گئے۔

”ہاں۔ واقعی ایڈریس یا فون نمبر تو اس میں ضرور ہی ہو گا۔“ معاذ سر ہلاتے ہوئے بیٹھ گیا۔ دروازہ بند کر کے

والٹ انہیں تھما دیا۔

”ہوں خوب موٹی رقم ساتھ لیے موصوف پھر رہے تھے۔“ کیپٹن شہباز نے والٹ کی بیرونی جیب میں ہزار ہزار

کے نوٹ کھتے ہوئے کہا۔

”نین تھا وزنڈ اور کریڈٹ کارڈ بھی ہے۔“ انہوں نے نوٹ اور کارڈ دوبارہ والٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”ظاہر ہے شائنگ کے لیے جو آئے ہوں گے۔ آپ ایڈریس دیکھیں نا۔“ معاذ نے جھس سے والٹ کے اندر

بھاگتے ہوئے کہا۔

”لو باقی کی رقم سچ تم کرو میں گاڑی نکالوں۔“ انہوں نے والٹ اسے تھما دیا اور گاڑی ریورس کرنے لگے۔

”ہوں یہ ہے اندر کس اس میں دیکھتے ہیں۔“ معاذ نے اندر کس نکالتے ہوئے کہا۔ والٹ کو وہیں رکھ کر اس نے

ایڈریس کھولی۔

”کوئی فخر حیات صاحب ہیں اور ایڈریس ہے۔“ وہ ایڈریس پڑھنے لگا ساتھ ہی فون نمبر اور موبائل نمبر بھی لکھا

تھا۔

"چلو یہ تو مسئلہ ہی آسان ہو گیا۔ مگر ایسا ہے۔ اس وقت ان کا گھر تو ہمارے روٹ سے کافی جٹ کر ہے۔ میرا خیال ہے رات کو یا پھر فریش ہونے کے بعد میں نکلوں گا تو دسے آؤں گا یا پھر انہیں فون کر کے بلوائیں گے۔ اب تو بہت تھکاؤٹ ہو چکی ہے۔ بس چائے کی شدید طلب ہو رہی ہے۔ مجھے سچ کے بعد چائے کی بہت بری عادت پڑ چکی ہے اور ہم کھانا کھاتے ہی گھر سے نکل آتے تھے۔" انہوں نے گاڑی کی اسپڈ بڑھا دی تھی۔

شام کے تقریباً "پچھتے پچھتے" سورج ڈوبنے کو تھا۔ سڑکوں پر گماں مٹی بڑھ چکی تھی۔ بڑے شہروں کی شاہیں اور راتیں بہت پروٹی ہوئی ہیں۔ وہ پھر کی نسبت سڑکوں پر رش بڑھ چکا تھا۔

"تمہارا ایسا پیر کب ہے؟"

"اگلے پچھتے منڈے کو۔" اس نے والٹ اٹھا کر ویش بورڈ پر رکھ دیا۔

"تمہاری تیاری تو مکمل ہے؟"

"یا نقل۔" وہ اعتماد سے بولا۔ "آپ کی چھٹی کتنی رہ گئی ہے۔"

"بوسوں صبح نکل جاؤں گا۔ اس پچھتے کا تو یہ نہیں چلا۔ مصروفیت اس قدر زیادہ رہی۔ ام جان کا مکمل چیک اپ کرایا پھر ان کے وکیل سے میٹنگز پانچ بجے کا کام بھی مکمل ہو چکا ہے۔ اس کی ساری تیاریاں طے کرنی گئیں۔ تم نے دیکھا ہے یا نا انڈیا؟"

"جی ایک دو بار گیا ہوں ام جان کے ساتھ ہی۔"

"معاذ تمہیں سال کوئی تکلیف تو نہیں ہے نا؟" کچھ دیر بعد انہیں خیال آیا تو پوچھنے لگے۔

"نہیں بالکل بھی نہیں۔ آپ سب لوگ بہت اچھے ہیں۔ قدر تکرانج تک تو تیمم خانے میں ہی۔" اس نے ہونٹ کھینکے ان دونوں کی طرح یادوں نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔

"کبھی تمہیں سوچتا ہوں بلکہ بہت دفعہ کہ میں کون ہوں؟"

ساتھ سیاہ تار کول کی چمکی سڑک پر نظر میں آئے اس کی آنکھیں پورا کی ڈراؤن ہوئی تھیں۔

"اوسوں لیے کون سا نام ہے سوچتے تھ۔ وہ بھی ایسی باتوں کو جب کہ تمہارے فاضل انگریز سر رہیں۔" انہوں نے ٹوٹا۔

"جو لوگ تیمم خانوں میں پرورش پاتے ہیں۔ ان کا بھی کوئی نہ کوئی رشتہ وار ہوتا ہے۔ کبھی نہ کبھی ملنے آتا ہے اور پھر جب وہ ان تیمم خانوں سے باہر نکلتے ہیں۔ ان کے والدین کی شناخت کا کوئی نہ کوئی سراغ ملتا ہے کوئی رشتہ ضرور ہوتا ہوتا ہے۔ جب کہ مجھ سے آج تک کوئی کبھی ملنے نہ آیا۔ والدین کی کوئی شناخت نہ حوالہ نہ ہو۔ کبھی نہ کوئی قصہ کہانی۔ بس میں ہی میں ایک پورا وجود پورا انسان بغیر کسی جڑ ہونے کے ہے۔ تاہم بات۔ کبھی نہ کبھی میں بہت گہرائی سے سوچتا ہوں اور اپنی پہچان کا کوئی سراغ نہیں آتا تو مجھے بہت خوف آتا ہے۔ ان دنوں اندیشے پریشان کرتے ہیں۔ کہیں میں کوڑے کے کسی ڈھیر کی پیداوار تو نہیں اپنے والدین کے کسی خوف فراموشی کے لہجے کی لہجہ۔ بھول۔ اگر ایسا ہوتا۔" اس کی آواز بھرائی۔

"میں کچھ بھی بن جاؤں اس معاشرے میں نہیں کہاں کھڑا ہوں۔" وہ اپنی پیشانی مسلتے لگا۔

"بس کرو معاذ! انہوں نے بے اختیار ہی اس کے لیے دیر باقیہ رکھ دیا۔" اتنی دور مت جاؤ کہ وسوسے تمہارا کیراؤ کر کے تمہیں بالکل ہی رستے سے ہٹا دیں۔ دیکھو۔ میں تو ایک بات جانتا ہوں جس طرح حلال کے ایک لہجے کی تاثیر حرام کے ہزار لہجوں سے بڑھ کر طاقتور ہوتی ہے اور اپنا آپ منوا کر رہتی ہے۔ اسی طرح اچھے لوگوں کی جڑیں کبھی ایسے گناہ کے بیج سے نہیں اٹھتی جو وقت کی کوئی بھول ہوتے ہیں۔ تم کون ہو یہ تو مجھے معلوم نہیں مگر جس طرح اتنے کم عرصے میں تم نے ہم سب کے دلوں میں گھر کیا ہے تمہاری صورت تمہارے کردار کو دیکھ کر کوئی بھی اس بات پر یقین کر سکتا ہے کہ تم۔ خیر چھوڑو۔ تم یہ کیا فضول کی باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ بس وہیمان سے انگریز ام دو اور۔" انہوں نے ہوا میں بوکی لاپرواہی سے ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"مگر یہ سوال جو آج میرے وجود کے اندر بصورتی طرح گھوم رہا ہے ایک نہ ایک دن تو سب کے لبوں پر ضرور آئے گا۔ کہ میں کون ہوں؟ میرے والدین کون تھے۔ مجھے کون تیمم خانے میں پھینک کر گیا۔" وہ ابھی تک اسی ٹرانس میں تھا۔

"اچھا جب ان سوالوں کا وقت آئے گا تو دیکھی جانے گی ابھی تو کم از کم چار پانچ سال تم ان کو بھول جاؤ۔ تم کچھ بن جاؤ گے اپنے قدم زمین پر مضبوطی سے۔ ہمالو کے تو تم کو جتنا لوگ یہ سوال کر رہے ہیں بھول جائیں گے۔"

"میں آپ کی بات نہیں مانتا یہ سوال ہر انسان کی بقا اس کے Survival کا سوال ہے۔ کم از کم میں جیتنے کی اس سے چھٹا نہیں چھڑا سکتا جب تک میں جان نہ لوں۔" وہ بیسے دل میں عزم کیے بیٹھا تھا۔

"تم نے تیمم خانے سے نکلنے وقت وہاں کے تنظیمین سے کچھ پوچھا نہیں تھا۔"

"پوچھا تھا" انہوں نے مجھے کچھ تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ شاید سال بھر کے پتے کے کپڑے ہوں گے جو انہوں نے مجھے دیے اور یہ کہ ایک آدمی جس کا تعلق اس نے خود بتایا تھا کہ ملتان کے کسی دیہات سے تھا۔ وہ مجھے چھوڑ کر گیا تھا۔ اس بچے کے والدین روڈ ایکسیڈنٹ میں مارے گئے ہیں۔ اور یہ بچہ معجزاتی طور پر بچ گیا۔ میں اس کی پرورش کی ذمہ داری نہیں لے سکتا اس لیے۔" اس نے ایک بار پھر اپنے ہونٹ کھینکے اگلوں میں آئی ٹی کو پلٹیں پھٹک کر اندر مارنے کی کوشش کی۔

"ویسے تمہارا کیا خیال ہے۔ اس کمانی میں کوئی صداقت ہو سکتی ہے۔ کم از کم پچاس فیصد بھی؟" انہوں نے موڑ کھانٹے ہوئے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔"

"اس آدمی کو کوئی ایڈریس تو ہو گا۔ انہوں نے تمہیں دیا ہو۔"

"ہے پھر کیا۔" وہ تسلی آواز میں بولا۔

"چلو آئی بار میں آیا تو پھر کچھ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے ابھی فی الحال ایک ڈیڑھ ماہ کے لیے تم یہ سب کچھ بھول جاؤ۔"

"آپ تو اب کافی مہینوں بعد آئیں گے۔" وہ یاسیت سے بولا۔

"ہاں یا راتر آؤ جاؤں گا نا۔ تمہارا۔" انہوں نے گھر کے گیٹ کے آگے گاڑی روک کر بارن بجایا۔

"وہاں تو میں آپ کے لیے اس گھر کے ہر فرسے کے لیے ہر لمحہ کرنا ہوں۔ جنہوں نے مجھے۔"

"پاس انوارہ حسان مندی دکھانے کی ضرورت نہیں بلکہ نہیں وہ کیا کہتے ہیں مشکور ہونے کی۔ چلو اندر چل کر مجھے چائے کا آرڈر کرو۔ میں فریش ہو کر ام جان کے کمرے میں ہوں۔"

آج اسے پونہ تھی رات تھی، خوار ہوتے ہوئے چار راتوں سے سیدوں کے قبرستان کی ٹوٹی منڈیر کے پیچھے خوف اور رت جھنگے کی بے چین حالت میں وہ جاگ رہا تھا۔ مگر کوہر مقصود نہ تو باقیہ آ رہا تھا نہ آسکنے کے کوئی امکان نظر آ رہا تھا۔ شہر کے کمرے کی کھڑکی تو کھلی ہوئی تھی مگر کمرے میں ہلکی روشنی کے سوا کچھ دکھائی نہ پڑتا تھا۔ جاسا اور ہیرا جلی کے اس تھتے میں پوری رات چھانچا رہتا۔ پچھلے دوران باغ کی لائٹیں بھی خاصی مدھم ہوتی تھیں۔ سلطان بہت چار راتوں سے گھر میں تھے اور کھڑکی کھلی ہونے کے باوجود وہ اس کو پھلانگنے کا خور میں حوصلہ نہیں پارہا تھا۔

آج بال پیلے ہی وہ مایوس و پرشورہ قبرستان کے پچھلے رستے سے باہر نکل آتا اور اب تو اس فضول ایڈو سنر سے اس کا جی بھی بھر کا تھا۔ گھروں نے ایک ہی ضد پکڑ رکھی تھی کہ یہ مہر کر سر کرنا ہے۔ مگر آج جو بھی صبح تو اسے دل کی ضد کو بھی نظر انداز کرنا پڑ رہا تھا۔ تین دنوں سے وہ ماسٹر صاحب کا بن بلایا مہمان بلکہ ان کا بلائے جان بنا ہوا تھا۔ پہلے دو دن تو انہوں نے اسے اس لیے جھٹلایا کہ بقول اس کی لفظی کے اس کے تمام پیچھے بہت اچھے ہوتے ہیں۔

امتحالی پرچے اس کے پاس تھے۔ ان پر نشان بھی لگے تھے۔ ماسٹر صاحب کو یقین ہو گیا کہ اس نے ایگزیم ویلے ہیں۔ اس نے ماسٹر صاحب کی منت کی بھی سربسب ہی تعریف کی تھی وہ خوش بھی بہت ہونے لگے۔ اس کی ایگزیم میں شمولیت کا جان کر۔

”اب میرا خیال ہے جب تک رزلٹ نہیں آتا۔ تم ہمدرد سے چلے جایا کرو۔ ادھر پر دعائی بھی تمہاری مکمل ہونے کو ہے۔ اتنی دیر میں رزلٹ بھی نکل آئے گا۔“

”ماسٹر صاحب کے مفت کے مشورے پر اس کا حلق پیٹے تک کڑوا ہو گیا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے ماسٹر صاحب! مگر اصل بات یہ ہے۔“ اس نے جھجکنے کی ایکٹنگ کی۔

”کیا؟ کیا بات ہے؟“ وہ اس کی جھجک پر چونکے۔

”گھر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں خالی بابا صاحب کی تنخواہ میں گھر کا گزارہ نہیں ہو پارہا میں چاہ رہا تھا کوئی جاب کروں۔ چھوٹی موٹی ہی سہی۔ کچھ تو ان کا ہاتھ بٹے گا۔ قرآن تو میں بابا صاحب کے پاس رات کے وقت سنتے میں وہ تین دن لگا کر بھی حفظ کر سکتا ہوں۔“ اس نے آواز میں حساسیت پیدا کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ ماسٹر صاحب حیران رہ گئے۔

”بہت خوب بہت اچھی سوچ ہے تمہاری بہت خوشی ہوئی مجھے سن کر۔“ مگر بیٹا کو کڑی وغیرہ اتنی آسانی سے تو نہیں ملتی تھی۔ ”انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔“

”وہ تو مجھے پتا ہے اگر آپ کوشش کریں تو۔“ وہ پھر جھجکا۔

”میں۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔“ وہ حیرانی سے بولے۔

”ادھر اسکول میں مجھے چرائی وغیرہ وی لکوادیں۔ ساتھ ساتھ میں اپنی تعلیم بھی مکمل کروں گا۔“

”ارے بیٹا! میں تو رہنا چاہتا ہوں اگر حاضر مروس بھی ہو تاکہ میں کچھ کر سکتا ہوں۔ کل تمہیں پتا ہے چرائی کی آسانی کے لیے بھی چاہے وہ کسی پسماندہ گاؤں ہی میں کیوں نہ ہو بہت ہاتھ پیرا رہتے ہیں۔ تم ادھر ہی شہر میں کہیں کسی دکان پر سیکلزمین وغیرہ لگ جاؤ یا اس طرح کی کوئی اور جاب بلکہ میری ماں تو خصوصی صاحب سے بات کرو ان کی بہتری واقفیت ہے۔ وہ تمہیں ضرور نوکری دلوادیں گے اور تم سے خوش بھی ہو جائیں گے۔“

”ہونہہ! انہیں تو اس بات پر بھی یقین نہیں کہ میں نے امتحان دیا ہے تو وہ تو آپ کو معلوم ہے ہر وقت ہاتھ سے خنارتے ہیں۔ ان سے کوئی بھی امید نہیں رکھ سکتا۔“

”ارے میں کہتی ہوں سبزی لے آئیں جا کر رات کو ہانڈی نہیں بڑھانی کیا۔ کھانے کو تیار وقت پر آجائیں گے میری بابائے جان۔“ اسی وقت ماشینی کی تیز آواز گونگی تھی۔ ماسٹر صاحب جواب دینا بھول گئے تھے۔ اور فوراً اٹھ کر سبزی لینے چل دیے۔

اور پھر رات کو انہوں نے اسے مرثہ سنایا تھا کہ وہ کل صبح اپنی بیٹی کے گھر جا رہے ہیں۔ وہاں ہفتہ بند رہ دن رہیں گے اور اس کے بعد دو سہری بیٹی کی طرف جائیں گے۔ اس لیے مہینہ بھر تو لگ جائے گا۔ وہ اپنا آئینہ کے لیے کہیں اور بندوبست کر لے۔ اب ویسے بھی گاؤں میں اس کا کچھ کام نہیں۔

اشاروں کنایوں میں وہ اسے بہت کچھ بتا گئے تھے اور اسے معلوم تھا یہ سازش بھی ماشینی کی تھی۔ اور اب وہ ماسٹر صاحب کے گھر بھی نہیں جاسکتا تھا۔ ان کے دروازے پر آٹا لگا تھا تھیر اور ذہنی کوفت سے اس کا برا حال تھا۔ اسے اس وقت صرف ایک آرام دہ استری ضرورت تھی۔

”اس شہرینہ کی بیٹی کو تو میں دیکھ لوں گا۔ میں نے اس کی زندگی اسی طرح خوار کی تو میرا نام بھی عبد العین نہیں۔“ شہر کی طرف جانے والی سڑک پر سست قدموں سے چلتے ہوئے اس نے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرا۔

”گرائے کے پیسے بھی پورے نہیں بھوک بھی لگی ہے اور اب تو اس کے لیے میں شہر سے گاؤں بھی نہیں آسکتا۔ ماسٹر صاحب بھی غیبت دے گئے۔ اب کیا کروں گا۔“ ایک دم اس کے پیچھے گاڑی کے ٹائر چرچرائے۔ وہ

اپنے خیالوں میں غم سڑک کے درمیان میں چل رہا تھا شکر ہے گاڑی اوپر نہیں چڑھ ہوئی۔

”اندھے ہو نظر نہیں آتا۔ ان دہاڑے سڑک کے درمیان چل رہے ہو۔ پو پو اسٹرو! پیچھے سے کسی نے اس کا کندھا پکڑ کر زور سے جھجھکا اور اسے پورا ہی گھما ڈالا۔ وہ تقریباً اسی کی عمر کا لڑکا تھا۔“

لپے لپے کندھوں سے نیچے جھولتے سیاہ بال، میٹلی سی شہرت، اسکن ٹائٹ جینز جو کبھی نیلی رہی ہوگی مگر اب جگ جگ سے سفید مٹیالی ہو چکی تھی۔ اس کے گلے میں دو موٹی موٹی زنجیریں بھول رہی تھیں۔ اللہ جانے سونے کی

تھیں یا پتیل کی۔ اور بائیں کان میں گولڈ کٹا ٹاپس چہرے کے نقوش تو مروانہ تھے مگر ان میں فراکت سرا سر زنانہ تھی۔ ایک کلائی میں چاندی کا بریسلیٹ اور دوسری میں کالے رنگ کے بیڈز عبد العین نے اس کا رٹون کو دیکھ کر

بہ شکل اپنی ہنسی بندھ لی۔

”گوٹھے ہو گیا اگر میرا ایکسٹری مکمل ہو گیا ہو تو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ پہلے ہی میرا موڈ خاصا خراب ہے۔“ اس نے ایک بار پھر اسے شانے سے پکڑ کر دھکا دینے کی کوشش کی تھی۔ عبد العین نے نظریں اٹھا کر اس کے پیچھے دیکھا۔ ایک اور بڑے طہر کی اسپورٹس کار تھی۔ اس میں دو لڑکے اور بھی بیٹھے تھے۔ جو جیسے میں اسی کارٹون سے ملے جلتے تھے۔

”آج جو جی! دفع کرو اس ریٹیٹی مخلوق کو ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔“ ایک لڑکا کھڑکی میں سے منہ نکال کر چلا آیا۔

”آ رہا ہوں صبح صبح ایسی سنگھینوں کو تو سوچو ان کیسا کڑے گا۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا گاڑی کی طرف مڑ گیا۔ جیسے ہی وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھا۔ عبد العین کے ذہن میں جھمکا سا ہوا وہ ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کرنے لگا تھا۔ جب عبد العین دوڑ کر اس کے پاس پہنچا۔

”بھائی! اب لوگ شہر جا رہے ہو؟“ وہ لحاظ سے دروازہ تمام کر بولا۔

”ہاں! تمہیں تکلیف سے بائیں لے کوئی ٹول لیکس لینا ہے۔“ وہ اسی جیسے یں سے بولا۔

”میں مجھے لفٹ دے دینے بھی جاتا ہے۔ پیچھے پیچھے ہی اتر جاؤں گا۔“ تنخو پورہ کے پاس میرے پاس کرائے کے پیسے نہیں۔ اس لیے سوچتا ہوا سڑک کے درمیان۔ چل رہا تھا۔ اس نے کچھ کو مزید مسکین بنایا۔

”تاکہ جان بوجھ کر اپنا ایک ڈنٹ کروا کر کسی سے لفٹ لے سکو۔“ گاڑی کا ڈرائیور طنز سے بولا۔

”نہیں اس لیے کسی کی منت کر کے لفٹ لے سکوں۔ پلیز۔“

”اچھا بیٹھ جاؤ جہاں ہمارا دل کھڑے گا۔ اٹھا کر سڑک پر پھینک دیں گے۔“

”ارے مارا گیا کرتے ہو؟ اللہ جانے کون ہے کون نہیں دفع کرو۔“

جسکی اسے گھوڑے ہوئے بیزاری سے بولا۔

”جی! تم آن یا ر اس کموڈے نے ہمارے ساتھ کیا کرتا ہے۔ بیٹھنے دو اسے let's move ہمیں پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ بیٹھو اونٹ۔“ آگے والے لڑکے نے بازو پیچھے کر کے عبد العین کی کلائی پکڑ کر اندر دھکیلا۔ وہ جلدی سے گاڑی کے اندر ہو گیا۔ پچھلی سیٹ پر ایک بڑا سا کٹار اور پانچ پانچ اس کے بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔

”پیچھے تو جگہ نہیں ہے کٹار اور پانچ پڑے ہیں۔ اسے کہاں ڈھیر کرو گے۔“ جسکی ماتھے پر بل ڈال کر بولا۔

”بیچھے بیٹھ جاؤ۔“ ڈرائیور لاپرواہی سے بولا اور گاڑی اشارت کر دی۔ عبد العین کو زور کا دھکا لگا وہ سیٹ کے کونے میں ذرا سا ٹک کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں میں ہی گاڑی ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔

”let's sing some thing (چلو کوئی گانا گا میں)“

آگے والے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے لڑکے نے بال بھٹکتے ہوئے کہا تو چند لمحوں بعد تینوں کو رس کی شکل میں کوئی بے سرائیہ سمجھ میں آنے والی زبان میں گانا گانے لگے۔ عبد العین کا بی چاہا گاڑی سے چھٹا ٹک لگا دے۔

”اوتے تھے گانا آتا ہے؟“ وہ عبد العین سے مخاطب تھا۔ عبد العین سوچ میں پڑ گیا۔

ہے۔ ذرا رو کر دکھاؤ۔ ہنڈ سم کوڑے۔ ”ذرا نیور لڑ کے نے ایک ادا سے کہا تھا۔

”میری یونیک یا ر دو تا رو کر دکھاؤ۔“ جبکی نے عبدالمبین کی کالی کو جھٹکایا۔ عبدالمبین گرنے کو تھا۔ ابھی وہ سنبھل ہی رہا تھا کہ تینوں بلند آوازیں تھمتھرتھرتے لگے۔ بے ہنگم بے سرے تھمتھرتھرتے۔

”واٹ اسے پیس آف ہوک یا ر یہ تو مجھے کسی مولوی کی اوا دلگتا ہے اس سے کو کوئی نصیحت سنانے ذرا نیور کے ساتھ بیٹھا لڑکا جیسے مڑ کر عبدالمبین کے بال ذرا سے بچنے لگا۔

”اسے روٹا نہیں آتا۔ تم کہہ رہے ہو وہ کچھ سناٹے۔“ جبکی بھڑا ہو کر بولا۔

”لو کم آن یا ر! سناؤ نا کچھ درنہ تم تمہیں نہیں اتار دیں گے اور یہاں سے تمہیں کوئی کتو نہیں بھی نہیں ملے گی۔ اور لٹت تو بالکل نہیں۔“ ذرا نیور لگ سیٹ پر بیٹھنے لڑکے نے لہجہ سخت بناتے ہوئے دھمکی دی۔

”سنا نہیں سناؤ کچھ۔“ جبکی نے اسے سیٹ سے دھکارتے دیا وہ نیچے گر گیا۔

ہماری سانسوں میں

آن تک وہ حنائی خوشبو مہلک رہی ہے

”واؤ مہدی حسن کا بانشین۔“

”جگجگت سنگھ کا پیسٹر پارٹ۔“

بھی تو وہ بھی جلیں گے اس میں

جو آگ دل میں دیک رہی ہے

وہ بمشکل چار لائیں ہی کاہ کا تھا۔ ان کے مکٹس لگا جا رہی رہے تو وہ چپ ہو گیا۔

”تالیاں۔“ جبکی زور زور سے تالوں کے انداز میں تالیاں پیٹنے لگا۔

”موری یار! میں تمہارے جیسی تالیاں پیٹوں گا تو ہم سب کو کتے میں رسوا کر دیتا ہوں۔“ ذرا نیور لڑکے نے معذرت کی۔

”نہ تمہیں کوئی ڈھنگ کا گانا نہیں آتا۔ انیس سو ڈیڑھ کے انگریزوں نے بیٹھ گئے۔“ جبکی نے اسے بہت باریک چنگلی کالی تھی لڑکیوں جیسی۔ اور عبدالمبین کو بے ساختہ صوفی صاحب کی وہ مرمت یاد آئی جو انہوں نے یہی گانا گانے پر اس کی سلطان بخت کی شادی پر کی تھی پورے پنڈال کے سامنے۔

”اور کچھ سناؤ نا۔“ آگے والا کچھ مشتاق ہو کر بولا۔

”مجھے بس یہی آتا ہے۔“ وہ عاجزی سے بولا۔

”ویسے ایک بات ہے یار! آواز تو اس کوڑے کی اچھی ہے۔ ہمارا بیٹا جو ان کرو کے۔“ ذرا نیور نے ہنڈ سم کوڑے کو فریاد لائے پیش کش کی۔

”تمہارا دل ٹھیک ہے۔ اگر ان جیسی چیزوں نے ہمارا بیٹا جو ان کر لیا تو میں ریزائن دے دوں گا۔“ جبکی چکر بولا۔

”نہیں تمہیں یہ ماننا پڑے گا۔ اس کی آواز اچھی ہے۔“ ذرا نیور لڑکا مڑ کر چیلنج کرنے والے انداز میں بولا۔

”تم کون سا ساؤنڈ ماسٹر ہو تمہیں اس کچی ٹیشن میں کس نے بیج بنایا ہے۔“ جبکی کا مزاج کچھ زیادہ ہی گڑوا تھا۔

”میں غلط کہہ رہا ہوں شیریں! تم سناؤ نا۔“ اس نے اپنے ہمراہی کی تائید چاہی۔

”بھئی لڑو نہیں ایک آئیڈیا ہے۔ چنا چل جائے گا کہ کون بیج کہہ رہا ہے۔“ شیریں نے صلح جو انداز میں کہا۔

”ہو لو۔“ جبکی ہاتھ پر تل ڈال کر بولا۔

”اس کو بھی کل شام کو اس آڈیشن میں بلا لیتے ہیں جو ہم نے ویسے جانا ہے اسٹوڈیو۔“ دودھ کا دودھ پانی کاپانی

ہو جائے گا۔“ شیریں اب تقریباً ”جیسے مڑ کر بیٹھ چکا تھا۔

”گنڈ آئیڈیا۔ یہ بیج ہے۔“ ذرا نیور لڑکا خوش ہو کر بولا۔

”ہو گس ایک دم فلاپ۔ یہ کیزا لکوڑا اور آڈیشن۔ تمہارا بھی دل خچل گیا ہے۔“ جبکی کو اور غصہ آیا۔

”اوٹے کھامڑا یہ پکڑ کارڈ اور کل شام کو اس ایڈریس پر پہنچ جانا۔ وہاں آڈیشن ہو گا۔ کالوں کا۔ سنی اچھی آواز کا اورین کچی ٹیشن۔ جو کچھ ہو گا۔ سب کے سامنے ہو گا۔ میڈیا کے لوگ ہوں گے۔ تیری لگ اچھی ہوئی تو تیری گڈی اور جی ہی اور جی ڈرنہ دھکتے تو کہیں نہیں گئے۔ گنڈے ایڈوں اور ٹماٹر سمیت۔“ شیریں نے ایک سفید رنگ کا وزٹنگ کارڈ اسے کھلایا اور دوسری ایڈریس کی چپٹ۔

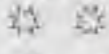
”ہمت ہوئی تو ضرور آتا۔“ وہ اسے آکھاتے ہوئے بولا۔

”اگر اس کے اس اسٹوڈیو تک آنے کا کرار یہ ہوا تو۔“ جبکی ہنوز جلا بھنا تھا۔

”مڑ کر لٹنے میں تو باسٹر ہے۔ آجانا۔ تیرا مستقبل سنو جاوے گا راتوں رات اشار۔“ ذرا نیور لڑکے نے کہتے ہوئے ایک زور زور سے کتے سے گاڑی روکی تھی۔

”پہل اتڑتی ہو پورے کا مڑا آیا ہے اور صر سے پیدل مارچ کر۔“ شیریں نے ہاتھ پیچھے کر کے لاک کھولا اور عبدالمبین کو کالر سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا اور ابھی وہ پوری طرح اتر کر کھڑا بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ گولی کی اسپینڈ سے گاڑی بڑھالے گئے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے کھارڈ اور دو ردھول اڑا کر جاتے اس سرخ شعلے کو دیکھا۔

”جتا نہیں کیا چیزیں تمہیں یہ بھی اور مجھے کیا ضرورت ہے ایسی فضول جگہوں پر جانے کی۔ بابا صاحب میری پڑھی نہ اور حضوں گے۔“ اس نے کارڈ سڑک رہے پھٹک دیا اور دوسری طرف مڑ گیا۔



UrduPhoto.com

”بڑی آلی اماں کی کہاں ہیں۔“ وہاں پر سخت پشیمانی لہائی کی چادر کے کناروں پر کوشیے کی تیل بناری تھی۔ جب جویریہ ہاتھوں میں اپنی کتابیں اٹھائے اس کے پاس آئی۔

”اماں کی اور زینب بیچ ظہور صاحب کے کمر خیلاد میں گئی ہیں۔ تمہیں بتایا تو تھا میں نے اسکول سے آنے کے بعد۔“ اس نے ایک نظر جویریہ کو دیکھا تھا اور پھر سے تیل بننے میں مگن ہو گئی تھی۔

”میں کل سے اسکول نہیں جاؤں گی۔“ جویریہ نے ہاتھ میں پکڑی کتابیں تخت پر پھیلائیں۔

”ہیں۔ یہ تمہیں کیا ہوا ہے۔ کتابوں کی یہ بے حرمتی اور اسکول کیوں نہیں جاؤ گی۔ تمہاری نئی نئی کلاس ہے۔ تمہیں تو ایک کچی پیمپی نہیں کرنا چاہیے اور تمہیں تو خوش خوش جانا چاہیے کہ تم انٹھوس جماعت ہا قاعدہ اسکول چلا کر پڑھ رہی ہو۔“ آسنے دہنہ گود میں ڈال لیا تھا اور جویریہ کی روہانی شکل کو دیکھنے لگی۔

”بڑی آلی ایس۔ یہ کتابیں ہیں۔ دیکھ رہی ہیں آپ! اس نے رو دینے والی آوازیں لگیوں کی طرف اشارا کیا۔

”ہاں تو کیا ہوا ہے انہیں ذرا پرانی ہیں۔“ آسنے نے یونسی اردو کی پیمپی پرانی کتاب اٹھا کر کہا۔

”ذرا پرانی؟“ جویریہ جیسی۔ ”یہ عبدالمبین بھائی کے انٹھوس کرنے کے زمانے کی ہیں۔ انہوں نے بھی کسی سے لی تھیں پھر چھوٹے بھائی نے پڑھیں۔ پھر آپ نے اور چھوٹی آپی نے۔ دیکھیں تو ان میں بیجا کیا ہے سارے صفحات گلے ہوئے، بھٹے ہوئے ہیں اور جلدیں تو ہیں ہی نہیں اور سب سے بڑھ کر ان کتابوں میں کئی چھپوڑ جو کٹھنہ لیس میں ہیں سمرے سے ہیں ہی نہیں۔ کلاس میں میں نے کیا خاک پڑھنا ہے۔“ کہتے کہتے وہ جیسے بے دم ہی ہو کر تخت پر بیٹھ گئی۔

”تنتی خوشی سے میں جا رہی تھی نئی کلاس میں۔ ایک سال میں میں نے دو کلاسوں کا امتحان دیا ہے۔ ہماری ہیڈ مسٹریس بھی میری اتنی تعریف کر رہی تھیں کہ تنتی ڈیڑھ ہجرتی ہے ایک سال میں دو جماعتوں کا امتحان دیا ہے۔ گاؤں میں تو میں نے دو سال پانچویں پڑھی تھی وہاں پھٹی جماعت کی کوئی بیچہ نہیں تھی اور اب ساری لڑکیاں

میری پیشی پرانی کتابیں اور کپڑے کے تھیلے کا بیگ دیکھ کر مذاق اڑاتی ہیں۔ مجھے بچہ نے ماٹیر بنایا ہے، کتنی دفعہ کلاس کو مجھے ہی پڑھانا پڑتا ہے۔ مس ایک دفعہ پڑھا کر مجھے پڑھانے کو کہتی ہیں اور میرے پاس کتاب یہ ہوتی ہے، لیوں لیر۔ وہ ایک دم سے کہتے کہتے رونے لگی۔ بے اختیار آنسو اس کے سینے و سفید رخساروں پر بہنے لگے۔

”ارے جوتی! کیوں روتی ہو، کوئی اتنی سی بات پر بھی روتا ہے بھلا۔ تمہیں معلوم تو ہیں گھر کے حالات۔ بابا صاحب اکیلے کمانے والے اور ہم سب آخر وہ بے چارے کیا کیا کریں، تم خود سوچو۔ چلو تھوڑے دنوں تک میں بابا صاحب سے کہہ کر تمہیں ایک ایک کر کے چاروں کتابیں منگوا دوں گی۔ ابھی تو تمہیں اسکول جانا چاہیے۔

”ہرگز نہیں، میں کل سے اسکول نہیں جاؤں گی۔ مجھ سے لڑکیوں کی نمسی برداشت نہیں ہوتی۔ یونیفارم تو وہ میرا اتنا خراب ہو چکا ہے۔ بوٹوں میں سوراخ ہو چکے ہیں۔ پارش ہو جائے تو سارے جوتے کچڑے سے بھر جاتے ہیں۔ پارش نہ ہو تو چھوٹے چھوٹے پتھران سوراخوں سے اندر جا کر چلنا مشکل کر دیتے ہیں۔ آپ ایسا کیا لے کر دیں

کی بہتر ہے میں آپ دونوں کی طرح گھر بیٹھ کر ڈل کا امتحان دے لوں۔“ وہ جیسے سر ہلا کر فیصلہ کن انداز میں لالی۔ آمنہ نے نظر بھر کر جویریہ کو دیکھا۔ ایک ڈیڑھ سال میں ہی جویریہ کتنی بڑی بڑی لگنے لگی تھی۔ کد بھی اس کا اچھا خاصا نکل آیا تھا۔ ناک آغوش کی انھان بھی خوب تھی۔ وہ سارے بہن بھائیوں سے زیادہ خوبصورت تھی۔ صراحی وار گروں کے اوپر سناخو خوبصورت نقوش والا سن خوشید ہرہ خوب گورے گورے ہاتھ پاؤں۔

آمنہ تو اسے دیکھ کر حیران سی رہ گئی۔
”اسی لیے تو بابا صاحب آج کل بہت پریشان ہیں، تین تین جوالی بیٹیاں۔“ آمنہ کی آنکھوں کے آگے صوفی صاحب کا منتظر چہرہ پھر گیا۔

”دیکھو جلیں! میں چار ہا ہوں دو بچوں کو سبق دینے۔ تم اور موذن دونوں مل کر مسجد کے بچوں کو پڑھالینا ابھی آنے والے ہوں گے۔ میں مغرب تک آھاؤں گا۔“
”مگر صوفی صاحب! میں بچوں کو کیسے۔“ جلیل پہلکایا ”پھر موذن صاحب تو اپنے حجرے میں پڑھ رہے ہیں کس

وقت تو سچے آپ ہی سے پڑھتے ہیں۔“
”میں لوگوں کے بچوں کا تو کرتی ہوں، جتنی تنخواہ سرکار دے دیتی ہے اس میں مسجد کے تمام امور اور صبح کو بچوں کو قرآن شریف پڑھا دینا ہی بہت بڑا کام ہے۔ اور اتنی تنخواہ تو آج کل سرکاری محکمے کا کوئی چہرہ ای نہیں لیتا اور لوگوں کے بچے ہوتے۔“ انہوں نے تشریح سے بنا کر ابھرا۔

”میں ان لوگوں کے نخرے بھی اٹھاؤں اور یہ میری شکایتیں اوپر لکھ کر بھیجیں۔ بچوں کو اللہ کے کلام کی تعلیم بھی سنت دوں اور پھر یہ مجھے آنکھیں بھی دکھائیں۔ جو میں نے تم سے کہا ہے وہ کرو اور آئندہ سے بچوں کو سبق بھی تم ہی دو گے اور یہ لو دس روپے اوپر جا کر اپنی اماں جی سے پوچھ کر کوئی سبزی دھیرولے آؤ۔ میں چلنا ہوں اور ہاں میٹھیوں میں ہی کھڑے ہونا۔ سبزی وغیرہ دے کر فوراً مسجد آجانا۔“ وہ اسے تاکید کرتے شاید چلے گئے تھے۔

اسی وقت کسی کے میٹھیوں جڑنے کی آواز آئی۔ آمنہ نے جلدی سے دوپٹا اچھی طرح اوڑھ لیا۔ جلیل میٹھیوں کے آخری سرے پر کھڑا تخت کی طرف ہی دیکھ رہا تھا کیونکہ اماں جی عصر کے وقت عموماً ”میں بیٹھی ہوتی تھیں۔“

”وہ۔۔۔ اماں جی کہاں ہیں۔؟“ آمنہ سے نظریں ملنے پر وہ جھجک کر بولا۔
”اماں جی میلا میں گئی ہیں۔“ آمنہ نے ہاتھ پڑھا کر جویریہ کی کتابیں بھیجیں۔

”بس۔ میں نے بتا دیا، میں کل سے اسکول نہیں جاؤں گی۔“ جویریہ ایک دم سے پھر پھر کر بولی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا وہ پٹہ شانوں پر بڑی بے نیازی سے پڑا تھا۔ براؤن بالوں کی ٹیس چہرے کے اطراف میں جھول رہی تھیں۔ وہ عین جلیل کے سامنے کھڑی تھی۔ آمنہ اسے گھور کر اس کے لاپرواہا سا کمال کا احساس دلانا چاہ رہی تھی۔

گروہ بے خبر آنسوؤں سے جھجکے چہرے اور آنکھوں کو صاف کر رہی تھی۔
”کیا۔ کیا ہو جویریہ؟“ جلیل کچھ اور جھجک کر ایک دم اوپر آیا۔

”یہ کیوں رو رہی ہے؟“ اس نے آمنہ سے دریافت کیا۔

”یونہی بے وقوف ہے۔ تم کس کام سے آئے تھے؟“ آمنہ نے جیسے اسے یاد دلایا۔

”یونہی نہیں رو رہی میں۔“ جویریہ چمک کر بولی۔ ”میں کل سے اسکول نہیں جاؤں گی۔ ساری لڑکیاں جم جم کرتی نئی نئی کتائیں خوبصورت بیگ، نئے اگلے یونیفارم پہن کر آتی ہیں اور میں یہ۔۔۔ جیتھوڑوں کا پلینڈہ لے کر جاتی ہوں۔ پیلا بند رنگ یونیفارم پہنے پرانے جوتے۔ بس میں نے کہہ دیا، کل سے میں اسکول نہیں جاؤں گی۔“ وہ اسی طرح اونچا اونچا بول رہی تھی۔

”دکھاؤ اپنی کتابیں۔“ وہ ذرا اور آگے بڑھا جویریہ نے، ہٹ سے کتابیں اٹھا کر اسے تھما دیں۔ اس نے بوسیدہ کتابوں کو پونہ دیکھا۔ ”یہ کتابیں تو بہت بد حال ہیں۔“

”تو میں کیا غلط کہہ رہی تھی۔ میں باز آتی ایسی ریکورڈ رکھاتی سے۔“ وہ جلیل کے بالکل پاس کھڑی اسی فری اسٹائل میں بول رہی تھی۔ آمنہ کو غصہ آ رہا تھا۔

اسکول میں صوفی صاحب اسے اب قل نقاب اور چادر میں بھیجنے لگے تھے اور جلیل کا پردہ صرف ذہن اور آمنہ سے ہی نہیں تھا بلکہ جویریہ سے بھی اور یہ بے وقوف۔ آمنہ نے اسے گھورا۔

”جلیل! تم کس لیے آگے تھے اور۔“ اس نے کھٹکھٹا کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ جویریہ اب مزے سے ایک ایک گلا ہوا صفحہ کھول کر دکھا رہی تھی۔

”اچھا۔ تم کل اسکول ضرور جانا، میں کل شام کو تمہیں چاروں نئی کتابیں لا دوں گا۔ میرے پاس کچھ پیسے جمع ہیں، تم چھٹی مت کرنا اور رو دو بھی نہیں۔“ جلیل کی بے اختیار نظریں جویریہ کے آنسوؤں سے دھلے چہرے پر جمی تھیں اور آمنہ کو اب سخت کوفت ہو رہی تھی، وہ بالکل بھی آمنہ کے سوال کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔

”تم کہاں سے لا کر آؤ گے، بابا صاحب کو بتا چل گیا تو وہ خوب ہی ڈانٹیں گے۔“ جویریہ نے کتابیں لپیٹ دیں اور دروازے کی طرف جلیل کی آنکھوں کی طرف دیکھ کر بولی۔
”میں لا دوں گا اور صوفی صاحب بھی کچھ۔“

”جویریہ! چلو اندر سنا نہیں تم نے۔“ آمنہ ایک دم سے اٹھی تھی اور ڈپٹ کر بولی۔ جویریہ ڈر کر ایک دم پیچھے ہٹی اور بڑبڑ کرئی اندر چلی گئی۔ جلیل نے اسے جانتے دیکھ کر پھر سے نظریں تھمکائیں۔

”تم اماں جی سے سبزی کا پوچھنے آئے تھے تو آؤ اور دھنیا لے آؤ اور اب جاؤ، دیر ہو رہی ہے۔ مجھے کھانا بھی پکانا ہے، جلدی سے آنا اور بے شک کسی بچے کے ہاتھ بھیجنے، خود آنے کی ضرورت نہیں۔“

”تم نہیں جا رہے ہو شہباز؟“ مسز خان نے شہباز خان کے تیار چیلے کو جا بختی نظروں سے دیکھا۔
”جی ام جان! ذرا باہر جا رہا ہوں، کلام ہے۔ دوسرے ایک دو دوستوں سے بھی ملاقات کرنی ہے، اس لیے۔“ انہوں نے تفسیلاً ”جواب دیا۔“

”میرا صبح واپسی ہے تمہاری؟“
”جی اب تو آپ خوش ہیں نا، پورا ڈیڑھ ہفتہ آپ کے پاس گزار لیا ہے۔“
”پھر کب آؤ گے؟“ وہ اداس سی لگ رہی تھیں۔

”مجھ ماہ کی تو ڈیوٹی ہے، زیادہ عرصہ بھی لگ سکتا ہے۔ دیکھیں، ویسے میں فون وغیرہ کرنا رہوں گا۔ اصل میں ادھر لائسنس کا بھی پورا مسئلہ ہوتا ہے، بہر حال میں کوشش کروں گا۔ آپ کو دو تین دن میں ایک بار ضرور کال کروں۔“ وہ انہیں تسلی دیتے ہوئے بولے۔

”تو ڈیوٹی ماں کی تو خیر ہے، اس کے حقوق کا تو تمہیں خیال رہتا ہی ہے۔ میری تاکید کی ضرورت نہیں۔ ڈیوٹی سے بھی پیار ہے۔ جی جان سے اپنی نوکری کی خدمت کرتے ہو، دل میں نرم جذبات بھی بہت ہیں۔ معاذ کا بھی

بھائیوں سے بڑھ کر خیال رکھ رہے ہو وہ سنتوں کی دوستی کا بھی بڑا خیال رہتا ہے۔ جب بھی آتے ہو تو زیادہ وقت ان کی چٹنی میں ہی گزارتے ہو مگر شاید تم بھول رہے ہو۔ ان تمام حقوق کی ادائیگی کے باوجود تم ابھی بھی کچھ لوگوں کے حقوق سے چشم پوشی اختیار کیے ہوئے ہو۔ کیا تمہارا ضمیر تمہیں احساس نہیں دلاتا کہ تم صحیح نہیں کر رہے ہو۔" وہ ہمت اکھڑے ہوئے کچھ میں بولیں۔

"میں نے کس کے حق میں کوتاہی کی ہے؟ کوشش تو کرتا ہوں۔"

"کوشش بھی نہیں کرتے تم! زہت کا ایک بھی حق ادا کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ جب سے آئے ہو ایک بار بھی میں نے تمہیں اس کی طرف ذرا توجہ دیتے نہیں دیکھا۔ معلوم ہے نا تمہیں وہ کس حال سے ہے۔ آج کل اس حالت میں تو عورت ویسے ہی بڑی حساس ہو جاتی ہے۔ شوہر کی ذرا سی بے توجہی اسے دکھ دیتی ہے اور اس حالت میں ذرا سی ٹینشن، الجھن پریشانی اس کے لیے اور نہ بچے دونوں کے لیے اچھی ہے۔ کچھ احساس ہے تمہیں شہباز؟" وہ اپنے پرانے بارعب لہجے میں بول رہی تھیں۔ انہوں نے جواب نہیں دیا، سر جھکا کر جوتوں کو دیکھنے لگے۔

"آپ کو کیا معلوم۔ آپ کی یہ کھنتی زہت اس نے اس بار میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ ڈیڑھ ہفتے سے علیحدہ سو رہی ہے جا کر جیسے میں کوئی شور ہوں۔ جس کے بچھونے سے یہ تپاک ہو جائے گی۔ ناقص آپ کو مجھ ہی میں نظر آتے ہیں۔" وہ دل میں تلملائے۔

"بیٹا، وہ اگر زبان سے کچھ نہیں کہتی، کچھ طلب نہیں کرتی، مجھ سے تمہاری شکایت نہیں کرتی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے دل میں کچھ ارمان نہیں۔ بیادتا عورت کی تو اپنی خواہشیں ہوتی ہیں، چاہے اور چاہے جانے کی۔ پھر پہلی بار میں نے کانٹا کھا احساس اور خوشی۔"

جب میرے ہاں اظہر ہونے والا تھا تمہاری داوی تمہارے والد کے ہاتھ سے تم نہیں اتارنے دیتے تھے اور تمہاری دادی روزیلا نامہ مجھے شام کو میرے لیے بھیجا کرتی تھیں اور وہ اس بے جااری کے کچھ بھی ارمان پورے نہ ہوتے۔ میں بیمار محض ہوں، تم بے خبر انجان اور تمہارے بھائی بھائی ہیں۔ انہوں نے خواہ مخواہ کا میرا اس سے پال رکھا ہے۔ کبھی اگر جھوٹے منہ سلام دعا نہیں کی جیسے وہ گھر سے۔" کہتے گئے انہوں نے جیسے اپنی زبان دانتوں تلے دبالی۔ شہباز خان نے ایک جھٹکتی ہوئی نظر ان کے شرمندہ سے چہرے پر ڈالی۔

"بہر حال اب تم اسے اپنے ساتھ لے کر جاؤ۔" وہ اگلے بل سنبھل کر بولیں۔

"کہاں کہاں ساتھ لے کر جاؤں؟" وہ حیرانی سے بولے۔

"ابھی جو جا رہے ہو وہ سنتوں کی طرف ان کا پروگرام ملتوی کر دو اور زہت کو باہر نر کر لاؤ۔"

"مگر میں نے بتایا نا۔"

"زہت۔ زہت۔ بیٹا، تیار ہو گئی ہو تو آ جاؤ۔" انہوں نے شہباز کی بات سے بغیر زہت کو بلاند آواز میں پکارا جیسے وہ دروازے سے گلی کھڑی ہوگی۔ شہباز خان کا موڈ سخت آف ہو گیا۔

کافی کلر کانسٹ کا جدید تراش کا سلاہوا سوٹ تھا جس پر ہم رنگ میوٹیوں کا لہکا سا کام ہوا تھا۔ لائٹ جیولری کے ساتھ روشنی لیے بالوں کو ہاف کلپ کیسے جھجکتے ہوئے اندر آئی تھی۔

"جی پچھو! آپ بھلا کیا تھا؟" اس کی آواز خاص ہی بدصم تھی۔

"اس کے ہاں اتنے لیے ہیں۔" شہباز خان نے زہت کے دراز سلکی بالوں کو دیکھ کر سوچا۔

"ہاں ماشاء اللہ۔ چشم بدور بہت پیاری لگ رہی ہو۔ تیار ہونا تم۔" انہوں نے نیاس بلا کر اس کا ماتھا چوما۔ "جی!"

"چلو شہباز! جاؤ بیٹا رات تو سمجھو ہونے ہی کو ہے۔ ساڑھے سات تو ہو چکے۔ میری بیٹی کو میر بھی کرانا۔ اس کا دل ذرا ہلے۔ سارا دن گھر میں بڑی رہتی ہے۔ بس معاذ امتحان دے لے میں اسے ڈرائیونگ سکھا دوں گی پھر ہم

ماں بیٹی کو سہولت ہو جائے گی۔"

"اچھی بات ہے۔ سیکھ لے گا چند دنوں میں زمین ہے۔" شہباز نے بیٹھے بیٹھے کہا۔ نظریں خواہ مخواہ ام جان کے آس پاس کے منظر میں الجھ رہی تھیں۔

"اب جاؤ تم لوگ۔" انہوں نے جیسے یاد دلایا۔

"آپ بھی چلیں نا پچھو!" وہ پھرتے سے بولی۔

"نا بیٹا! میرا تو اب آرام کا وقت ہو چلا ہے۔ کھانا میں کھا چکی ہوں، تھوڑی دیر تک دوالوں گی۔ تمہارے گھومنے کھانے کے دن ہیں۔ پہلے ہی۔"

"اچھا ام جان! میں گاڑی نکالتا ہوں۔" اس سے پہلے ان کا لیکچر پھر سے شروع ہوا، شہباز خان گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ جیسے ہی کمرے سے نکلے ام جان نے زہت کو بھی جانے کا اشارہ کر دیا۔

وہ انہیں خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

انہیں کچھ دلچسپی اور فضول گاڑی دوڑاتے شاید آدھ گھنٹہ ہو چلا تھا۔ دونوں کے درمیان خاموشی اور بیگانگی کی دیوار تھی۔ زہت کھڑکی سے باہر زندہ دلان شہر کی رونقیں دیکھنے میں مگن تھی۔

کیپٹن شہباز نے بھی عین ایسی ہی اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں زہت نے بے اختیار نگاہیں جھکا لیں۔

"فرصت مل گئی باہر کے نظاروں سے لطف اٹھو ورنہ ہونے سے۔" وہ طنز سے بولے۔

"میرے متوجہ ہونے نہ ہونے سے آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ دل میں جھلسی۔

"آپ پر سوں سچ جا رہے ہیں۔" چپکے چپکے بعد اس نے نظریں اٹھا کر پوچھا۔

"ہاں اور تمہاری جان سے کچھ جاننے کی میری موجودگی کی کوفت سے اور بیڈ روم کی بے دخلی سے۔"

وہ تھیں آپ کی سہولت کے لیے کھلی رہتی ہوں۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"سہولت۔" انہوں نے زور دے کر کہا۔ "پول تو میرا بھی بہت چاہتا تھا۔ تمہیں بھی ایسی کوئی سہولت مستقل دے دوں تمہاری اس ڈھونگ سے جان چھوٹ جائے مگر۔ چلو چند ماہ اور اس کوفت کو چھیل لو۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونکی۔

"کچھ نہیں۔" وہ چپ کر رہی تھی۔

"دیکھیں آپ لوں چینیوں نہ بچھو آئیں، میرے اعصاب اب ان بھارتوں سے ٹوٹنے لگے ہیں جو بھی آپ کو کہتا ہے، فیصلہ کرنا ہے مگر گزریں۔ میں اب دن رات کی اس سولی پر مزید نہیں ٹھکی رہ سکتی۔ بہت تھک گئی ہوں میں۔" اس نے میڈ سے سر اٹھا کر جیسے بے بسی سے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے، مجھے بہت شوق ہے اس برزخ میں چلنے کا۔" وہ چمک کر بولے۔

"فیصلہ تو ہو چکا ہے، بس چند ماہ انتظار کر لو پھر جی بھر کر اپنی تھکاوٹ اتار لینا۔ میں خود اب اس کھیل سے تنگ آچکا ہوں۔"

"آپ مجھے چھوڑیں گے۔" وہ ایک دم سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"تمہیں ابھی بھی تنگ ہے؟" وہ چپا کر بولے تو وہ جیسے ایک لمحے کو سکتے میں آئی۔

"نہیں۔ طلاق دین گے؟" اس کا چہرہ یکدم زرد ہو چلا تھا۔ انہوں نے نظریں اس کے چہرے سے ہٹا لیں۔

سائے لہجے کا ہو مل تھا۔ انہوں نے کوئی بھی جواب بے بغیر گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر دی۔ گاڑی بند کر کے وہ نیچے اترنے لگے۔

"مہمہ مجھے جواب دیں شہباز! آپ سے آپ نے کیا فیصلہ کر رکھا ہے۔" اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھول کر نیچے اترتے اس نے بے اختیار ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ان کا گرم مضبوط ہاتھ اس کے ٹھنڈے رخ کا پتے ہاتھ کی

کنزور گرفت میں تھا۔

”تمہیں معلوم ہے میں بارہا تمہیں بتا چکا ہوں جس چیز پر آپ کا دل راضی نہ ہو اسے۔ اس کا ساتھ کہاں تک چل سکتا ہے۔“ انہوں نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر اس نے اور مضبوطی سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔



”میں چیز نہیں ہوں آپ کو معلوم ہے۔ اور اب۔ اب۔ آپ مجھ سے جان چھڑائیں گے جبکہ یہ۔“ وہ ایک پل کو رکھی۔ اس کا واضح اشارہ اپنے بدن میں دسڑتی اس زندگی کی طرف تھا۔ ”شہباز! میں نے کچھ نہیں کیا، کبھی بھی۔ آپ کو آخر یقین کیوں نہیں آتا۔ آپ مجھے کبھی بھی نہیں چھوڑ سکتے، آپ کو معلوم ہے۔“ وہ بے دردا انداز میں بول رہی تھی۔ اس کا چہرہ ہنوز زرد تھا۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ بالآخر آنسوؤں کی لڑی دونوں آنکھوں سے نکل پڑیں۔

”یہاں یہ تماشا کرنے کی ضرورت نہیں۔ ڈیڑھ ہفتے سے تو علیحدہ چھپ چھپ کر سو رہی تھیں۔ اس وقت یہ سوال جو جواب کرنے تھے اب اس طرح پلک پلک میں برسے اور نیچے گھر جا کر بات کرنا۔“ وہ سختی سے کہتے ہوئے اپنا ہاتھ چھڑا کر دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ نہتے لے نیک گھراسانس لے کر انہیں چالنے دیکھا اور اپنا چہرہ سامنے پڑے نشوونگال سے نکال کر اپنی طرح نکالتا گیا۔

پھر کھانے کے دوران دونوں کے درمیان بالکل خاموشی رہی۔ اس نے بہت تھوڑا کھانا کھایا تھا۔ بس گھونٹ گھونٹ کو لڈو ٹرٹک ہی چتی رہی۔ اس کا رویا رویا روپ شہباز خان کو ڈسٹرب کر رہا تھا۔ ان سے صحیح طرح سے کھانا بھی نہیں کھایا جا رہا تھا۔

”تم کھایوں نہیں رہیں؟“ چند منٹ کی صبر آنا برداشت کے بعد انہوں نے کچھ غصے سے کہا۔ ”بھوک نہیں۔“ اس نے جھکا کر سر اٹھا کر تلوں ہی ان کا غصلا چروا کھاتا جیسے سنبھل گیا۔ ”کھانا تو رہی ہوں۔“ وہ جلدی جلدی پلیٹ میں بیچ کھانے لگی۔ اتنی پریشان کن سوچوں کے ساتھ بھی کچھ کھایا جا سکتا ہے بھلا۔ اس نے بے ہوشی سے کھانے کو دیکھا۔

”اگر یہ ہی سب کچھ کرنا تھا تو آنے کی کیا ضرورت تھی۔ ام جان کے سامنے فرہاتی واری کا ڈرامہ ضروری نہیں تھا۔ وہ یوں بھی تمہاری طرف وار ہیں ہر حال میں۔ چاہے تم کچھ بھی کر گزرو۔ تمہیں چاہا جا کر بولے۔“ میں نے ایسا کیا ہے ایسا جس کا ہر لمحہ آپ مجھے طعنہ دیتے رہتے ہیں۔“ اسے بھی غصہ آ گیا۔ ”بہت معصوم ہو تم اسی لیے تو ہر بار اس طعنے کی وجہ پوچھنے بیٹھ جاتی ہو۔“ ان کا طعنا سے اندر تک کاٹ گیا تھا۔ وہ ہونٹ چبانے لگی۔ آنکھوں میں غم اترنے لگی۔

”آپ میرے ساتھ اچھا نہیں کر رہے۔“ وہ آنکھیں جھپکنے لگی۔ (کجنت آنسو) ”اچھا! انہوں نے ”اچھا“ کو خوب سمجھا۔“ ہاں تقدیر نے جیسے میرے ساتھ بڑا اچھا کیا ہے۔“ ”تقدیر نے تو اپنے تئیں آپ کے ساتھ بڑا اچھا ہی کیا تھا۔ اب آپ کا وہ عابدل آیا ہے تو اس میں تقدیر کا کیا قصور۔ اس نے تو دینے میں کچھ کی نہیں چھوڑی۔“ وہ محض دل ہی میں سوچ سکی۔ ”کھانا کھالیا ہے تم نے؟“ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی جیسے یہاں ڈنر کرنے نہیں اس بحث میں الجھنے آئی۔

”ہی کھالیا ہے۔“ وہ نشوونگال ہاتھوں میں لائسی مسلتے ہوئے بولی۔ ”چلو اٹھو پھر۔“ وہ یکدم کرسی کھسکا کر کھڑے ہو گئے۔ نیل پر پڑی کھانے کی ڈشز اسی طرح بھری ہوئی تھیں۔ اس نے ایک حیران سی نظر ان پر ڈالی۔ انہوں نے والٹ سے بل کے پیسے نکال کر ایک پلیٹ کے نیچے رکھے۔ موبائل اور چائیاں اٹھا کر باہر نکل گئے۔ وہ بھی تیزی سے اٹھی اور ان کے پیچھے چل پڑی۔ جب تک وہ گاڑی میں بیٹھتی وہ گاڑی اشارت کر چکے تھے۔

وہ بہت سنجیدگی سے گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے اور وہ کن انکیوں سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد انہیں دیکھتی جا رہی تھی۔ ”ایک بات پوچھوں آپ سے؟“ تھوڑی دیر بعد اس نے آہستگی سے کہہ ہی دیا۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، صرف ایک ترچھی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

”آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“ پتا نہیں اسے کیا جان لینے کی جلدی تھی کہ بس پتا چل جائے جو ہونا ہے۔ آئینہ غیب سے سارا منظر سارا انجام نظر آجائے۔ ”میرا خیال ہے میں بتا چکا ہوں۔“ بے حد روکھا ہوا تھا۔

”ایک دفعہ پھر بتادیں۔“ ”معمو فیصلہ ہو چکا ہے بلکہ میں کر چکا تھا۔ طلاق کے پیچہ زبہمی میں تیار کروا چکا تھا۔ پچھلی بار ہی تمہیں سمجھا گیا تھا کہ اس تعلق پر میرا دل راضی نہیں ہے اور جس پر دل راضی نہ ہو اس سے الگ ہو جانا ہی بہتر ہے اس لیے بہت سوچ بچار کے بعد میں نے طلاق کا فیصلہ کر لیا تھا۔ صرف پیچہ زبہمی سے پہلے ام جان کو فون کر بیٹھا کہ انہیں اپنا قلم دے دینا۔ اشارے میں انہیں بتا دوں تاکہ وہ بھی طور پر تیار ہو جائیں۔“ وہ رکتے۔

”ماں کی کس قدر فکر ہے۔ جس پر پھاڑ ٹوٹا تھا اس کے لیے ایک بار بھی دل نہ تڑپا۔“ نہتے نے سنگ دل ہم سفر کو شکوہ بھری نظروں سے دیکھا۔

”ام جان نے مجھے تمہارے پرل کھنٹ ہونے کی خبر دی تو۔“ انہوں نے ایک گھراسانس لیا۔ ”اب جو یہ خدا نے موقع دیا ہے، معلوم نہیں تمہیں یا مجھے۔ اگر تمہیں مجھوں پر یقین ہے تو دعا کرو، مجرہ ہو جائے اور میرا دل پلٹ جائے اپنی پچھلی سوچوں اور فیصلے سے ورنہ میں چھ ماہ کے لیے جا رہا ہوں۔ شاید مزید چھ ماہ اور لگ جائیں اس سے زیادہ بھی۔ شاید میں لٹ آؤں شاید آسکوں اس لیے اب تم مجھ سے کم از کم کوئی امید مت رکھنا۔ میں اپنے آپ سے بہت لڑا چکا ہوں مزید لڑنے کی ہمت نہیں مجھ میں۔ ہونے والا پتہ میرا ہے وہ میری ذمہ داری ہو گا اس سے بھنے انکار نہیں۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔“

”اور میں! وہ ابھ کر بولی۔“ میں کس کی ذمہ داری ہوں۔“ ”میرے دل میں جو تھا جو ہے، میں بتا چکا ہوں اور اب آج کے بعد مجھ سے اصرار نہیں کرنا۔ میں جو اب نہیں دوں گا نہ کوئی وضاحت کروں گا۔ تمہیں اپنے لیے جو سوچنا ہے سوچ لینا۔ میری طرف سے تم پر کوئی پابندی کوئی جبر نہیں ہو گا اور اگر تم روضہ کر مت سناجت کر کے میرے دل کو نرم کرنے کی کوشش کرتی ہو تو یہ بے سود ہو گا کیونکہ میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ یہ زندگی بھر کے معاملے یوں خود پر جبر کر کے نہیں بٹھائے جا سکتے اور نہ ایسی سمجھوتے والی زندگی کی مجھے عادت ہے۔“

وہ اس سے جیسے ہزاروں میل کے فاصلے پر کھڑے خود ہی سارے فیصلے سارے معاملے طے کیے جا رہے تھے۔ ”اس جبر کے بارے میں آپ نے نکالنا ہے پر سامن کرتے وقت میں سوچا تھا۔“ وہ سلگ کر بولی۔

”وہ میری مجبوری تھی۔ میں مجبور ہو گیا تھا ام جان کی وجہ سے۔“ انہوں نے خود کو ہر معاملے سے بری الذمہ قرار دینے کا عہد کر رکھا تھا۔ ”آپ کی ہر مجبوری حق ہے، سچ ہے، تو کیا دوسرے کی کوئی مجبوری کوئی بے بسی آپ کے نزدیک کچھ معنی نہیں رکھتی۔“ وہ آج سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی۔ انہوں نے ایک نظر اسے دیکھا وہ ان ہی کو دیکھ رہی تھی۔ ”آپ اپنی ہر مجبوری کو Justify کر سکتے ہیں کیونکہ آپ نے معاشرے نے آپ کو اپرینڈ دیا ہے۔ چھوڑو بیٹے کا الگ کر دینے کا طلاق دینے کا۔“ وہ چپا چپا کر بول رہی تھی۔

”آپ کی نام نہاد مجبوری نے مجھے بیچ بھنور میں کس طرح پھنسا دیا ہے آپ کو احساس ہے۔“ ”وہ کچھ ان باتوں کا ذرا بھی فائدہ نہیں میرے دل میں تمہارے لیے جو کچھ تھا میں نے یہ پہلی رات ہی تم سے کہہ دیا تھا بلکہ اس سے بھی پہلے جب ہر موقع پر میں چپے ہٹا رہا ہوں۔ تم انجان تو نہ تھیں جو میرے رویے کو

سمجھ نہ سکیں۔ اس وقت تم بھی کوئی فیصلہ کر سکتی تھیں۔ نہ آئیں میری مجبوری کی لپیٹ میں۔ پہلے بھی تو ایک بولہ اسٹیپ انٹھائی چکی تھیں گھر سے نکلنے کا۔ دوسری بار تو کوئی الزام بھی نہ دیتا۔ "وہ طنز سے بولے۔

"شہت اب شہباز خان! آپ کو کوئی حق نہیں یوں بار بار میری تذلیل کرنے کا جبکہ آپ کے پاس میری اس منحوس مجبوری کا کوئی ثبوت بھی نہیں۔"

وہ کہتے ہوئے پوری کی پوری کھڑکی کی طرف گھوم گئی۔ اسے اگاواہ ایک پتھر سے سر پہ ڈرتی ہے۔

"اسی لیے تو کتابوں ہمارے حق میں علیحدگی ہی بہتر ہے۔ کوئی تمہیں تمہاری اس "مجبوری" کا طعنہ تو نہیں دے گا پھر جوئی چاہے کرتی پھرنا۔"

اسے یہ ایک ان سے بے حد گھن آئی۔ وہ تو ابھی تک انہیں دل کا نرم سمجھتی تھی کہ ایک نہ ایک دن پکھل ہی جائے گا۔ پر انی محبت کا احساس دل کے کسی کونے کھدرے سے نکل کر ضرور ایک دن ہر کھنور سوچ پر قابض آجائے گا مگر ان کا دل تو مکمل طور پر اس سے بدظن ہو چکا تھا۔ وہ کیا اس گھر میں اس دل میں جا۔ بنا سکتی۔ وہ سچ کہہ رہے تھے۔ اسے اب ان کی فضول مست سماجت نہیں کرنا چاہیے خود کو اس علیحدگی کے لیے تیار کرنا چاہیے۔ ان آٹھ دن ماہ میں کیا ہو گیا جو اب ہو جائے گا یوں داویلا کرنے سے وہ آج بھی ایک دوسرے سے بچیں۔

دو روز گھر سے تھے جیسے پہلی رات کو۔ تو پھر کیا فائدہ۔ وہ کشادہ سڑک کے دونوں اطراف گلی روٹیوں کو ایک ٹک دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی پھر دونوں نے ہی ایک دوسرے کو مخاطب نہیں کیا۔ نہ بہت کو لگا جیسے آج ہی ان کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ اب دوبارہ انہیں مخاطب کرنا یا کوئی اور معاملہ کرنا ناجائز ہو گا۔ اس کے دل نے جیسے صبر کی لکڑی تین چار بیڑھیاں پھلائی۔

"اوہ! ایک کام تو میں بھول ہی گیا۔" اس نے شہباز خان کی آواز سنی۔ انہوں نے گاڑی وائیں طرف موڑ لی تھی۔

"واؤ! زبردست ڈنڈر فل۔ واٹ اے پلیزینٹ سربر انڈیا ڈرم ہاؤس۔"

نہیں تارا حیرت زدہ سی اسے سامنے کھڑی پر شکوہ عمارت کو دیکھ رہی تھی۔ سلطان بخت نے گاڑی کیٹ سے ذرا اندر ہی روک دی تھی اور وہ فوراً "چیے اتر گئی تھی۔ سنگ سیاہ سے بنی خوبصورت عمارت میں لگے جا سوائشے دورتی سے جگمگا رہے تھے۔ گول سیاہ مینا لے چکے تین ستونوں پر وہ عمارت پوری شان سے کھڑی تھی۔ اس کے ارد گرد چاروں جانب خوبصورت سرسبز لان تھے۔ قیمتی پھولوں اور پودوں کی ٹھیک ٹھیک لائنز کی خوبصورتی کو اور بھرا رہے تھے۔ کوٹھی کے دائیں طرف ذرا عقب میں بہت بڑا سوئمٹک پول تھا۔ اس کے چاروں طرف پرستار پتھر کے مور بنے تھے جن کی شہری چونچوں سے پانی موتیوں کی شکل میں قطرہ قطرہ پول کے اندر گر رہا تھا۔ حد خوبصورت منظر تھا۔ نین تارا سراسر اٹھا کر عمارت کے سامنے والے حصے کو دیکھ رہی تھی۔

"کو پینڈ آئی۔" سلطان بخت اس کے اٹھناک کو دیکھ چکے تھے۔ قریب آ کر بولے۔

"پینڈ۔" وہ خیر زوہ سی مڑی۔ "شادی ویری پی ٹی فل۔ میرے خوابوں سے بھی بڑھ کر جیسی ہیں نے سوچ کر گئی تھی۔ شادی اپنے میرے نام ہے نا؟" وہ بے یقینی سے ان کا ہاتھ تھام کر بولی۔

"بھی بھی یقین نہیں آ رہا۔ ابھی تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہارے وکیل نے تمام بیڑا اچھی طرح چیک کیے ہیں۔ تمہیں پڑھ کر سنا ہے ہیں تمہارے سائن لے لیے ہیں اور اپنے لاکر میں تمہاری آنکھوں کے سامنے محفوظ کیے ہیں۔ ٹھہر تو تمہیں بے اعتباری ہے۔ کم از کم اپنے وکیل کا یقین ہے نا جس کے کٹے میں تم مجھے ابھی کھڑا کر کے لاتی ہو۔" وہ ہاتھ رن اور دے دے لٹے سے بولے۔

"سوری شاہ جی! میرا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ آپ ہرٹ ہوں۔" اس نے کچھ لاپرواہی سے اپنے تراشیدہ بال جھٹکے۔ "ویکیس نا ہو جانا ہے کسی کھجاریا سے بھی۔ پچھلی بار آپ نے یہی کھیل کھیلا تھا ہمارے ساتھ۔ کیسے مجھے مام کی نظروں میں گرایا تھا۔ اب اگر میں نے صرف مام کی تسلی کی خاطر یہ گرایا تو آپ برا کیوں مان رہے ہیں۔" وہ

کہتے ہوئے کئی قدم ان سے آگے جا چکی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلنے لگے۔

"برا کہب مان رہا ہوں۔ بس افسوس سا ہوا ہے کہ تمہیں اب مجھ پر میرے چار پر بھی اعتبار نہیں رہا۔ تم نے کہہ دیا تھا کہ تمہیں اپنا کمر چاہیے تو میں بھلا اس میں کوئی فراڈ کیسے کر سکتا تھا۔ تمہاری خوشی تمہاری خواہش مجھے دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر عزیز ہے۔" وہ اس کے قریب آ کر رکے۔

"تھنک یو شاہ جی! یہی مان تو ہے مجھے آپ پر بھروسہ ہی تو چھوٹا نامہ بڑی بات اتنی بڑی فرمائش کر بیٹھی تھی۔ یقین تھا نا کہ آپ ضرور پوری کریں گے۔" وہ ادا سے ان کی پیشانی کے بال اٹھا کر بولی۔

"دیکھ لو پھر پوری کر دی نا۔" اسے خوش دیکھ کر وہ بھی مطمئن سے ہو گئے۔

"اسی ویسی پوری۔ چاہے یہ خوبصورت کھریج بیج کر مجھ سے کیا کہ رہا ہے۔" وہ بڑے پیار سے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔

"ہاں! انہوں نے مسکرا کر اس کی چمکتی آنکھوں میں بھانٹا۔

گھر میں دنیا کی وہ خوش قسمت ترین عورت ہوں جسے سلطان بخت جیسے انمول شخص نے اپنی محبت کے قابل سمجھا ہے اور میں ہی آپ کی آنکھوں کی طراوت آپ کی محبوبہ خاص ہوں۔ ہے نا؟"

"بالکل ہو تمہی ہو۔ اب تو تمہیں مجھ پر شک نہیں اب تو خوش ہونا مجھ سے؟"

منشک تو پہلے بھی نہیں تھا۔ اس نے ہاتھ چھوڑ دیے اور آگے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ "اور خوش تو شاہ جی! میں آپ سے تب بھی رہتی بھلتے آپ مجھے کہوڑوں کی یہ گوٹھی نہ لے کر دیتے۔ دو چار گز کا کوئی لو اڑنے دیتے مگر میری کوٹھ کو تو یاد رہنے دیتے۔ آپ کی محبت کی نشانی میرے بدن سے جنم لیتی۔ پھلتی پھولتی تو شاید آج کی خوشی سے ہزار گنا خوشی اس وقت مجھے نصیب ہوئی۔" وہ چلتے ہوئے آہستہ آہستہ بول رہی تھی جیسے خود سے کہہ رہی ہو۔ سلطان بخت نے صبر سے سن لیا تھا مگر اسے جان سے ہن گئے۔

"خوب! ڈنڈر چل کر تو دیکھ لے۔" اسے ابھی انگریز والے کام کر رہے ہیں۔ ان کا کام دو چار دنوں کا اور ہے پھر یہ گھر مکمل ہو جائے گا۔ ایک آرٹسٹک گھر۔ جسے ان کے کام میں کوئی کمی خالی لگے تو انہیں چل کر بتا دو۔ جو آئیڈیاز ایک گھر کی مالکن کے ہوسکتے ہیں اپنے گھر کے متعلق وہ دوسرے کیا جانیں۔" وہ اس سے دو قدم آگے بڑھ کر بیڑھیاں پڑھ گئے اور منتقلی آخری دروازہ تک چل کر اس کے لیے کھولا۔ نین تارا نے مسکراتے ہوئے اندر قدم رکھا۔

کوٹھی اندر سے بھی اتنی ہی خوبصورت تھی جتنی باہر سے۔ ہر چیز دیکھتے ہوئے اسے عجب ہی خوشی کا احساس ہوا تھا۔

"آپ کیا پروگرام ہے؟" وہ لاؤنج میں لان کی طرف کھلنے والے پردے سے درپے کے آگے کھڑی باہر کا نظارہ کر رہی تھی۔ جب سلطان بخت نے آکر پوچھا۔

"جو آپ کہیں۔" وہ لہجے میں ڈھیر سا راپا ر سمو کر بولی۔

"پروگرام تو ہوا زبردست تھا۔" انہوں نے بائیں آنکھ دبا کر کہا۔ "مگر میرا خیال ہے اس کو اگلے ہفتے برن اٹھا رکھیں۔ یہ لوگ اپنا کام مکمل کر لیں تو پھر ہم بھی اپنا پار کا پروگرام شروع کریں۔" وہ اس کی خوشبودار زلفوں پر ہنک کر مضمحل لہجے میں بولے۔

"شاہ جی! اگلے ہفتے آپ پورے ایک ہفتے کے لیے آکر میرے ساتھ رہیں گے۔ پورا ایک ہفتہ نہ ایک دن کم۔ زیادہ اہلہ ہو سکتا ہے۔"

"چلو پراس پورے سات دن تمہارے نام ہوں گے۔" انہوں نے فوراً اس کا نازک ہاتھ تھام لیا۔

"میرے نام نہیں اپنے اس گھر کے نام۔ جہاں ہم سات دن اکٹھے رہ کر اسے گھر کا ماحول دیں گے۔ ایک مکمل گھر گا۔"

”بالکل۔ تمہاری خوشی اسی میں ہے تو یہ ہی سہی۔“

”اور میری گاڑی؟“ سے جیسے یاد آیا۔

”گاڑی کل صبح۔ ویسے اچھی ڈنر میں قائم ہے۔ کو تو ابھی چل کر بند کر لیتے ہیں۔ نہیں تو کل صبح۔ میں ادھر کل شام تک تو ہوں۔“ وہ بہت مہیاں موڈ میں تھے۔

”نکل دیکھ لیں گے“ آج تو کافی۔۔۔“ اسی وقت تین تاراکے موبائل کی ہب بٹی۔ اس نے جلدی سے شوٹرز بیک سے موبائل نکالا۔

”نام کا فون ہے۔“ وہ نمبر دیکھ کر بولی۔

”تین تاراکے تم انہیں نہیں ابھی تک“ قہرشی انتظار میں بیٹھا سوکھ رہا ہے۔ ”زیور گل چھوٹے ہی بولی۔

”اوہام! اتنی زبردست کوٹھی ہے اتنی خوبصورت۔ آپ دیکھیں گی تو یقیناً بے ہوش ہو جائیں گی جو شاہ کی نے مجھے گفت کی ہے۔“ وہ اس کی بات ان کی کر کے بوسے ہوش سے بولی۔

”ارے یہ شاہ کا پتہ دس نمبر کا بھوننا اور بے ایمان ہے پھر تمہیں کوئی چکر دے جائے گا اور تم مزے سے بے وقوف بن جاتی ہو۔“ زیور گل تنگ کر بولی۔

”نام! آپ کو کل دیکھاؤں کی گل شام کو۔“ اس نے زیور گل کی بات کا جواب نہیں دیا۔ سلطان بخت کی نظریں اس کے چہرے پر بھی تھیں۔

”پیلو سیلو نام! او پچا بولیں! تو از نہیں آرہی۔ اوہو! میرا خیال ہے سنگھل ڈاؤن ہو رہا ہے۔“ کہتے کہتے وہ لاؤنج سے باہر نکل آئی۔

”نام! یہوں فکر کرتی ہیں۔ اب نہیں تارا وہ بے وقوف ہی لڑکی نہیں ہے جو بڑی آسانی سے اس شاہ کے ہاتھ آجاتی تھی آخر کو آپ کی بھی ہے۔ پلے کام کیے ہیں اس بار گھر آکر سب کچھ سنبھال لیاؤں گی۔“

”اور یہ جو قہرشی میرے سر سوار ہے؟“

”اسے تو آپ چلا کریں۔ میں شاہ کی کو لے کر گھر ہی آرہی ہوں۔“

”نہیں تارا بے وقوف مت بنو! اسے گھر نہیں لانا اور قہرشی تمہارے انتظار میں ادھر رات بھی گزار سکتا ہے۔ یہ سوں اس کی فلم کا پریمیٹر ہے جس میں وہ تمہیں ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ اسی سلسلے میں بات کرنا ہے اور میرے خیال میں وہ کیش بھی لایا ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”نام! پورے ڈھائی کروڑ کی کوٹھی ہے۔ فی الحال مجھے قہرشی کے کیش کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اسے کسی بھی طرح سے ٹالے اور پرہیزوں میں تو میں ساتھ نہیں جا سکتی۔ گانے اس کی فلم کے گاویے ہیں بہت ہے۔ آپ سمجھائیے اسے! ابھی تو مجھے شاہ کی کو اور بھی پھوڑنا ہے۔ صبح گاڑی لینی ہے۔ ساتھ ستر ہزار روپے کے کپڑوں کی۔

اوکے ہائے۔ میں آتی ہوں ڈنر کے بعد۔“ سلطان بخت کو یہ بڑھیاں اتر کر آتے دیکھ کر اس نے فوراً ”موبائل گل آف کر دیا۔

”چلیں شاہ کی! مجھے تو سخت بھوک لگ رہی ہے۔“ ان کے آف سے موڈ کو دیکھ کر وہ فوراً ”موبائل بیک میں رکھ کر ان کی طرف بڑھی۔

”پیلو ویسے ابھی تو صرف سات ہی بٹے ہیں۔“ انہوں نے دست و پاچ کو دیکھ کر کہا۔

”میں نے بیچ بھی نہیں لیا تھا“ آپ کے آنے کی خوشی میں۔ بس تیار ہی ہوئی ہوں آپ کا فون سن کر کہ آپ آگئے۔“

”پیلو پھر ہوش ہی چلتے ہیں۔ گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا جاتے ہوئے اور آرہ کر تے۔“ وہ کہتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھے۔

”کیا فرما رہی تھیں تمہاری والدہ صاحبہ؟“ گاڑی رپورس کرتے ہوئے انہوں نے ذرا پیچھے ہوتے لہجے میں

پوچھا۔

”کچھ خاص نہیں۔ ڈنر کے متعلق کہ ہم لوگ گھر آ رہے ہیں تو وہ ڈنر تیار کروائیں۔“ وہ ڈیٹر برش اپنے بیک سے نکال کر اپنے بالوں میں ہلکے ہلکے پھیرنے لگی۔

”ہوں۔“ بڑا معنی نیر ”ہوں“ تھا ان کا۔ نین تاراکے آنکھیں سکڑ کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کہیں انہوں نے میری مام کے ساتھ گفتگو سن تو نہیں لی۔ اسے پوچھی شک سا ہوا۔

”شاہ کی! ڈنر کے بعد آپ میرے ساتھ گل کدو ہی چلیں گے نا؟“ اس نے برش بیک میں رکھ کر میک اپ کٹ نکالی اور اپنا میک اپ ٹھیک کرنے لگی۔

”نہیں۔“ وہ بخیرگی سے بولے۔

”کیوں؟“ اس نے چونک کر انہیں دیکھا اور میک اپ کٹ بند کر دی۔

”میرے پاس ہے۔“ وہ لا پرواہی سے بولے۔

”آپ۔۔۔ عارض ہیں مجھ سے؟“ وہ جیسے ڈر کر بولی۔

”نہیں بالکل ہی نہیں۔“

”تو پھر میرے ساتھ کیوں چلیں جائیں گے؟“

”تم تو میرے ساتھ جا رہی ہو۔“

”کہاں؟“

”سید ہاؤس ویز راستہ ہو گی ماہر کے ساتھ۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بولے تو اس نے خوش خوش اثبات میں سر ہلا دیا۔

”شاہ کی! کچھ دنوں میرا روتیہ آپ کے ساتھ تھا“ آپ اس پر ناراض تو نہیں۔“ اسے پھر خیال آیا۔

”نہیں۔“

”شاہ کی! میں اس روسیہ پر شرمندہ نہیں ہوں بلکہ میں تو سمجھتی ہوں کہ میں حق بجانب تھی۔“ اس نے سیٹ کی پشت سے سر نکال لیا۔

”وہ کیسے؟“ انہوں نے ذرا سی گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

”شاہ کی! ایک بہت پوچھوں؟“ وہ آہستگی سے ان کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولی۔

”پوچھو۔“

”مجھ تائیں گے نا؟“

”بالکل میں نے کبھی تم سے جھوٹ نہیں بولا۔“ وہ یقین سے بولے۔

”خیر یہ تو نہ کہیں۔“ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ”ایسا تو کئی بار کر چکے ہیں آپ۔“

”تم کچھ پوچھنا چاہ رہی تھیں۔“ انہوں نے اسے یاد دلایا۔

”شاہ کی! وہ رک گئی۔“

”پوچھو۔“ وہ اصرار سے بولے۔

”صاحب! شاہ پر گھنٹ ہے؟“ بہت مدھم مدھم آواز تھی اس کی۔ سلطان بخت نے گاڑی کی اسپید کم کر کے اس کی طرف دیکھا کہ تیز روشنی میں اس کے چہرے کے تاثرات کو وہ صحیح طرح سے نہیں دیکھ پا رہے تھے۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے آپ سے؟“ چند لمحوں کے توقف سے وہ پھر بولی۔

”ہاں ہے۔“ انہوں نے جیسے گرا سانس لیا۔

”وہ آپ کی بیوی ہے نا؟“ وہ ان کے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔

”کم آن۔ اس سوال کا قصہ۔“ وہ جھنجھلا کر بولے۔

”میں بھی تو آپ کی بیوی ہوں نہ۔“
”پھر؟“ نہیں اب غصہ آنے لگا تھا۔

”پھر آپ نے یہ حق مجھ سے کیوں چھینا مجھے کیوں اپنے سچے سچے کی ماں نہیں بنے دیا۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔
”نہیں نار! اس مسئلے پر بات ہو چکی ہے۔“ وہ روکھے لہجے میں بولے۔

”شاہ جی! بات نہیں ہو چکی۔ میری اوقات طے کی جا چکی ہے اور مجھے آپ آئینہ دکھا چکے ہیں مگر پھر بھی میرا دل اس آئینے کے عکس کو بچ نہیں مانتا۔ شاہ جی! میں نے بھی تو آپ سے نکاح کیا تھا میں شرمی طریقے سے اور صالحہ شاہ نے بھی تو پھر فرق کیا ہوا؟“ وہ الجھ کر بولی۔

”نہیں نار! اس بحث سے کچھ حاصل نہیں۔ ماں بن کر تمہیں کیا کرنا تھا۔ میری جائیداد میری پر اپنی کا وارث ہی پیدا کرنا تھا اور میرا تو سب کچھ ویسے ہی تمہارا ہے۔ میں تمہارا ہوں۔ صالحہ شاہ کے پاس تو کچھ بھی نہیں سوائے آنے والے سچے کے۔“ وہ اسے ہلانے لگے۔

”کیا۔۔۔ یعنی تو سب کچھ ہے شاہ جی! یہی تو ایک عورت! ایک بیوی کا سب کچھ ہے۔ اسی مقصد کے لیے تو عورت کو پیدا کیا گیا ہے اور وہ اپنے عورت ہونے پر نازاں ہوتی ہے کہ ایک دن وہ ماں بنے گی تو عقلمندی پیدا کر وہ مخلوق میں سب سے ممتاز ہو جائے گی۔ آپ نے مجھ سے یہ خیر یہ اعزاز کیوں چھینا۔ میں آپ کی محبوبہ ہوں اور بقول آپ کے آپ کی محبت کی منتظر کل بھی۔ صالحہ شاہ فقط آپ کی بیوی اور آنے والے سچے کی ماں۔ شاہ جی! وہ آپ کی محبت کی بھلے نہ سہی! آپ کی نشانی تو اس کی کوکھ میں پل رہی ہے۔ ایک پل! ایک لمحے کی بھرپور محبت کی نشانی جو مجھے ملا تو مگر آپ نے سب خاک کر دیا۔ جیسی تو وہ شاہ جی! آج یا اب تو وہ ہوتی۔ میں تو کھلونا ہوں۔ محبوبہ! لہذا آف! تو فنی ہلاؤ اور اس۔“ وہ سر ہٹکاتے رو رہی تھی۔

”نہیں نار! اسٹاپ اس۔ تم کسی حال میں خوش کیوں نہیں ہوتیں۔ میری محبت میری جاہ و ختم زمین جائیداد سب تمہارا ہے پھر بھی تم ناشکری ہو۔ ایک فضول بات کو ایشو بنا کر میرا بیٹا بھرا اب کر دیا ہے۔ تمہاری جاہ رہا ہے کہ تمہیں چلتی گاڑی سے دھکادے دوں یا خود کو دھاؤں۔“ وہ غصے سے اسے سترنگ پر ہاتھ مار کے بولے۔
”سوری شاہ جی! آپ کا موڈ آف ہو اس فضول ایشو سے۔“

وہ روتے روتے جس دی اور چپکے سے اس نے اپنا چہرہ صاف کر لیا اور سلطان تخت کے اسٹیرنگ و ہیل پر رکھے ہاتھ پر اپنا تازک آنسوؤں سے بیجا ہاتھ رکھ دیا۔

”آئی ایم سوری۔ میں بار بار بھول جاتی ہوں کہ آپ تو میرے ہیں نا شاہ جی! وہ زخمی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”یہ ہی بات تو تمہیں سمجھانا ہوں کہ میں تو تمہارا ہوں نہ۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر لیوں سے لگا لیا تو وہ چپ کر کے ان کے کندھے سے سر کا کر سامنے سرک کی طرف دیکھنے لگی۔



”مما! میری یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر آپ لوگوں کا ادھر واپس آنے کا مقصد کیا تھا؟ وہ بھی یوں افراتفری میں۔“

سیفی نے الجھ کر رعنا سے پوچھا۔ وہ تینوں ڈائمنگ نیبل پر بیٹھے تھے۔ رات کا کھانا کھایا جا چکا تھا۔ اب جتنا رعنا اور فخر حیات کے لیے کافی لینے لگی تھی۔ جب سیفی نے یہ موضوع پھینکا۔

”کیوں تمہیں پاکستان آنا اچھا نہیں لگا؟“ رعنا نے یونہی پوچھا ورنہ رعنا کو معلوم تھا کہ سیفی جب سے پاکستان آیا ہے پتہ چلا ہوا ہے۔

”نہیں بالکل بھی نہیں۔“ اس نے فوراً صاف گوئی سے کہا۔

”مسا جڑاؤ نے! آپ کو اچھا لگے یا نہ لگے، آنا تو تھا واپس اور رہنا بھی ادھر ہی ہے مستقل۔“ فخر حیات نے سویش ڈش کا آخری سچ لے کر پلیٹ پر سے کھسکاوی۔

”یہ تو آپ مجھے پہلے بھی دس دفعہ بتا چکے ہیں۔ مجھے بتائیں میں ادھر کیا کروں۔ کم از کم میرا گریجویٹیشن ہو لینے دیتے پھر واپس آجائے۔“

”سیفی! میری جان! ادھر کیا تعلیمی اداروں کی کمی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک یونیورسٹی موجود ہے۔ تم کہیں بھی داخلہ لے لو پھر تمہارے پایا تو تمہیں خاص طور پر ادھر لانے ہیں کہ نئی فیکلٹی جیسے ہی شروع ہوتی ہے بلکہ اس کی کنسٹرکشن کا کام بھی وہ تمہیں سونپ دیں گے۔ رعنا نے اسے پار سے پکھارا۔

”پہلی بات تو یہ کہ ادھر کی ایجوکیشن اور یونیورسٹی کا پابندی یونیورسٹی سے کیا مقابلہ۔ اور پھر میرا وہاں ایک سیٹ اپ بنا ہوا تھا۔ میں وہیں سے گریجویٹیشن کرنا چاہتا ہوں اور پایا کا فیکلٹی والا پروگرام تو اچھا خاصا اپ سیٹ ہو چکا ہے اور یہی اب سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں ادھر کیا کروں۔“ وہ سخت کوفت کا شکار نظر آ رہا تھا۔

”ہاں! فیکلٹی والا کام بھی ٹنک ہی کیا۔ ساری غلطی میرے فیجر کی ہے۔ ایک تو اس نے جھگڑے والی زمین لے لی۔ دوسرے وہ فخر نے اسے خاصا ہٹ کر ہے۔ مجھے وہ جگہ فیکلٹی کے لیے بالکل موزوں نہیں لگی۔ اس زمین کا کیس بھی چل رہا ہے کورٹ میں۔ زمین کے کچھ اور دعوے دار بھی اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اس لیے میرا راہ تو اس زمین کو لینے کا نہیں رہا۔ ابھی تو جھگڑا ہے ہم نے فل پے منٹ نہیں کی تھی۔“ فخر حیات نے کہا۔

”تو کچھا ماما اب بتائیں اور کیا رہ گیا ہے مہرے کرنے کو۔“ سیفی منہ بنا کر بولا۔

”مائی سن! اتنے بے صبرے کیوں ہو رہے ہو۔ زمین دوسری جگہ میں پسند کر چکا ہوں۔ اسی لوکیشن میں ہے بہت اچھی اور سستی جگہ ڈیل ہو رہی ہے۔ میں ایک دو ہفتے میں خوشخبری سناؤں گا تمہیں۔ ویسے تم اس چلا کرو میرے ساتھ۔“ پھر اس نے اسے سیکر لود۔ انہوں نے ریمان سے کہا۔

”یہ تو بہت اچھی بات جانی آپ نے۔“ سیفی! تمہیں معلوم ہے نا تمہارے پایا جس کام کو کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں اس کے پیچھے ہی بڑھاتے ہیں اور کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ تم اس دوران پنجاب یونیورسٹی میں آنرز کے لیے ایڈمیشن لے لو، آفس بھی کبھی تمہارا ملے بھایا کرو۔ تمہارا وقت بھی ضائع نہیں ہوگا اور پورے کام بھی خاتمہ ہو جائے گا۔“ رعنا نے سیفی کا ہاتھ سیرا کر مشورہ دیا۔

”تو ماما ادھر تو میں نے ایڈمیشن بالکل نہیں لینا۔“ وہ منہ بسور کر بولا۔ ”اور آپ نے فریزن والے معاملے میں بھی کوئی پیش قدمی نہیں کی۔“

”گرمیوں کے میرا بیٹا پہلے کچھ بن تو جائے۔ تمہاری تعلیم مکمل ہو جائے۔“ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ تو پھر دیکھو سی جی معاملے میں ذرا سی تاخیر تمہاری ماما پر گز نہیں کریں گی۔“ فخر حیات نے کچھ کھور کر رعنا کو دیکھا۔

”اور آپ دوبارہ ماموں ممالی کی طرف بھی نہیں گئے۔ کم از کم اشارہ تو اتنا نہیں بتائیں۔“ سیفی کی سوتلی ادھر ہی اٹکی ہوئی تھی۔

”بیٹا! اسٹوڈنٹ ویک تو گئے تھے اب روز روز جانا تو اچھا نہیں لگتا۔“ رعنا نے فخر حیات کی طرف دیکھا۔

”مائی تو روز آئے کو تیار ہوتی ہیں۔ اسٹوڈنٹ ویک کے بعد سے وہ پکڑ تو وہ یونہی لگا چکی ہیں اور ان کی کمپنی میں بیٹھنا اپنا بیجا خالی کر داتا ہے۔“

”ایسے نہیں کہتے۔ وہ ہم سے محبت کرتی ہیں اس لیے چلی آتی ہیں۔“
”اور محبت بھی بہت خاص قسم کی۔“ فخر حیات نے دھیرے سے کہا۔

”خاص قسم کی کون سی محبت ہوتی ہے ماما؟“ سیفی نے سن لیا تھا۔
”یہ بھی ہوتی ہے محبت کی بڑی ظالم قسم۔ سمجھ جاؤ گے خود ہی آہستہ آہستہ اب بتاؤ تمہارے ایڈمیشن کا کیا کیا جائے۔ میں کل پتا کروانا ہوں یونیورسٹی سے۔“ فخر حیات نے موضوع بدلا۔

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کے کہنے پر ایڈیشن لے لیتا ہوں مگر میری ایک شرط ہے۔"
"ہو لو بیٹا! ہم نے پہلے کبھی تمہاری کوئی فرمائش رد کی ہے۔" رعنا فوراً بولی۔
"پہلے آپ لوگ میری ایکسٹرنٹ کریں فرزین کے ساتھ شادی بے شک جب مل چاہے کریں۔ پانچ چھ سالوں میں۔" اس کی فرمائش پر دونوں چپ سے ہو گئے۔
"مما! بولیں نا۔" وہ ضدی لگتے میں بولا۔

"سینیٹی! ہم نے آپ کی کبھی کوئی ضد یا فرمائش نہیں نالی تو کبھی آپ کو بھی میری کوئی خواہش مان لینی چاہیے۔"
فرحیات نے محبت سے اسے سمجھایا۔
"میں نے بھی ہمیشہ آپ کی ہر بات مانی ہے اس لیے تو چپ چاپ نہ چاہنے کے باوجود ادھر آ گیا ہوں۔"

"پیلو تم آنرز کرو پھر تم جو کہو گے وہ ہم کریں گے۔"
"پلیز پاپا! آئی ایم نو مور اسے چائلڈ۔" (میں کوئی بچہ نہیں ہوں) وہ غصے سے بولا۔ "جو آپ مجھے چوٹی کی طرح بہلا رہے ہیں۔ جو بات میں آپ سے کہہ دیا ہوں اس پر ہاں یا نہ کہیں صاف صاف۔" اس کے زور سے ٹیبل پر مٹکا مارا۔

"سینیٹی ابی ہو پور سلٹ۔ تمہیں پیرتس سے بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں۔ کہہ دیا ہے کہ کریں گے فرزین بھانگی جا رہی ہے نہ تم۔ کل جا کر ایڈیشن کرواؤ اپنا اور سچیدگی سے بھانگی کرو۔ ان مسئلوں کے لیے زندگی پڑی ہے۔ تمہارے پاپا نے کہہ دیا ہے تاکہ آنرز کرو پھر ویسے گے۔"
رعنا نے غصے سے کہا تو وہ پیش میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کرسی کو ٹانگ سے جھکے کی طرف دھکیلا۔

"میں ایڈیشن لوں گا نہ ہی کچھ اور کروں گا۔ جب تک آپ لوگ میری بات نہیں مان لیتے انڈر اسٹینڈ۔ وہ زور زور سے زمین پر پاؤں مار مارا چلا گیا۔
رعنا نے ایک گہرا سانس لیا۔
"تو کچھ لیا تم نے۔" فرحیات نے غصے سے کہا۔
"دیکھ لیا۔" رعنا نے تو بھر کر کہا۔

"صاحب بی! یہ کوئی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔" ملازم نے کوئی دزینٹک کھڑا نہیں لاکر تھمایا۔
"کیپٹن شہباز خان یہ کون ہیں؟" کارڈ پڑھ کر بولے۔
"کیا کہتے ہیں؟" انہوں نے ملازم سے پوچھا۔
"کہہ رہے تھے آپ سے کچھ ضروری کام ہے۔"
"ٹھیک ہے،" انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ میں آ رہا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔
"کون ہے؟" رعنا نے پوچھا۔

"معلوم نہیں،" تم بھی آ جاؤ۔" کہتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکل گئے تو رعنا بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔
"جنتاں! کالی ڈرائنگ روم میں لے آنا جو ممان آئے ہیں ان کے لیے بھی۔" جاتے جاتے رعنا نے ڈرائنگ روم سے آگے چلنے کے کارڈور سے جنتاں کو دعا بت کی۔
"آئی ایم کیپٹن شہباز خان اینڈ۔ شی از مانی وانف۔" جب وہ اندر داخل ہوئیں تو ایک پینڈ سم سانو جوان فرحیات سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا تعارف کروا رہا تھا۔ اس کی مسز اس کے پیچھے کھڑی تھیں۔

"ہیہیں آپ! یہ رعنا ہیں میری مسز۔" فرحیات نے ان دونوں کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔
رعنا کا تعارف کروایا۔
"ٹائٹس ٹومیٹ پور۔" رعنا دونوں سے کہتے ہوئے ان کے بال تقابلی بڑے صوفے پر جا بیٹھی۔
"ویسے معاف کیجئے گا میں نے آپ کو فرسٹ ٹائم دیکھا ہے۔" فرحیات نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی میں بھی فرسٹ ٹائم آپ سے مل رہا ہوں۔"
"آپ آ رہی ہیں ہوتے ہیں آج کل کہاں پوسٹنگ ہے آپ کی۔" فرحیات نے پوچھا۔
"چھٹی پر آیا ہوا ہوں۔ اس کے بعد سیاحتیں چارہا ہوں۔ پہلے میری پوسٹنگ پیڑی میں تھی۔"
"اور۔" فرحیات نے ہونٹ سکڑے۔ "رعنا! کافی کا کمرہ دینا تھا یا آپ لوگ کولڈ ڈرنک لیں گے؟" فرحیات نے پہلے رعنا سے کہا اور پھر شہباز خان سے پوچھا۔

"تو تھیں کس۔ کچھ بھی نہیں۔ ہم ڈنر کر کے آئے ہیں۔ اصل میں آپ کی۔"
"پھر تو کافی بیچ رہے گی۔" فرحیات نے خود ہی کہا۔
"میں نے کہہ دیا ہے کافی کا پہلے ہی۔" رعنا نے جواب دیا۔ "آپ ٹھیک سے بیٹھیں نا۔"

صوفے کے کنارے پر ٹکی رو یا رو یا سا روپ لیے نہرت کو رعنا نے دیکھ کر کہا۔ وہ اس طرح بیٹھی تھی جیسے اس ماحول یا اس میں موجود کسی بھی فرد کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں اور ابھی اٹھ کر چل دے گی۔
"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے دھیرے سے کہا مگر اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔
اسی وقت جنتاں کالی لواٹھ کے ساتھ ٹرالی میں تھسیٹ کر لے آئی۔

"یہ آپ نے خواجہ کلف کیا تھیں کریں کسی بھی چیز کی طلب نہیں ہے اس وقت۔" جنتاں ٹرالی رکھ کر چلی گئی تو رعنا اٹھ کر کافی سرو کرنے لگی۔
"ارے بنگ مین! کلف کیا۔ ہم بھی پیئے لگے تھے آپ لوگ ہمارا ساتھ دینے آگے ویسے بھی کھانے کے بعد کافی کا پانی لطف ہوتا ہے۔"

فرحیات کا وہ اچھا ہوا تھا۔ لے جانے والی انہیں یہ نوجوان اچھا لگا تھا۔
"آپ کا کچھ بچہ آج یا کل کھو گیا ہوگا۔" کیپٹن شہباز کی بات اس قدر اچانک تھی کہ رعنا کے ہاتھ میں پکڑا کافی کا کپ چٹک گیا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ گر کر گیا۔
"میرا؟" فرحیات نے کچھ اچھے سے پوچھا۔

"جی آپ کا۔" شہباز خان نے کافی کا کپ تمام لیا۔ رعنا نہرت کو کافی تھما کر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔
"نہیں۔۔۔ وہاں یاد آیا رعنا! میں تمہیں بتانا بھول گیا تھا۔ آج دوپہر میں نہیں بلکہ شام کو جب میں آفس سے شاپنگ مال گیا ہوں تو وہاں پر معلوم نہیں کس طرح میرا والٹ کوٹ کی جیب سے گر گیا۔ آئی تو تھنک مین تھا تو زندہ تھے اس میں نیلی پتھ کارڈ زونیمو۔ میرا خیال ہے یہی کم ہوا ہے میرا آج۔" فرحیات نے سوچ کر کہا۔

"ٹھیک بتایا آپ نے۔ یہ آپ کا والٹ۔" کیپٹن شہباز نے اپنے کوٹ کی جیب سے ان کا والٹ نکال کر آگے بڑھایا جسے فرحیات نے اٹھ کر تمام لیا۔
"میں بھول تو گیا تھا مگر سوتے وقت مجھے یاد آ جانا تھا۔ اصل میں اس میں ضروری تو ایک دو کارڈز تھے اور ایک بینک کارڈ جس کا پین کوڈ بھی ساتھ ہی تھا۔ کسی اور کے ہاتھ لگ جاتا تو اس کے وارے تیارے ہو جاتے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے والٹ سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔
"کالی بہت زبردست ہے۔" کیپٹن شہباز نے پہلا ٹھونٹ بھرتے ہی کہا۔

"ہماری ملازمہ بریکٹ ہے کالی بنانے میں۔ ویسے رعنا اس سے بھی اچھی کالی بنا لیتی ہیں۔ آپ ساتھ کچھ لیں نا۔" انہوں نے گم قسم سی بیٹھی نہرت کو مخاطب کیا تو اس نے لٹی میں سر ہلا دیا۔ اسے تو کالی کا کپ ختم کرنا دشوار لگ رہا تھا۔
"آپ کیا کرتے ہیں؟" شہباز خان نے پوچھا۔
"چھوٹا موٹا بزنس ہے جو اکثر ڈوب جاتا ہے اور ہمیں بھی ڈبو جاتا ہے۔" انہوں نے خوش دلی سے کہا۔ "ابھی حال ہی میں کئی ملکوں کی خاک چھانے کے بعد چار پانچ سال بعد پاکستان آئے ہیں۔"

کافی کے دوران ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ رعنا کی ساری شکستگی کھوپچی تھی۔ پتا نہیں کیوں طبیعت پر
 ایک جیسے اوس سی آن گری گئی۔ عجیب سے نقصان کے احساس کا زہریلا درد اس کے دل میں بلکورے لینے لگا۔
 تھا۔ سامنے ٹیبل پر پراواٹ جیسے انہیں بہت طرز سے دیکھ رہا تھا۔
 "اوکے اب ہمیں اجازت دیں۔ میں واپس آؤں گا تو پھر آپ آئیے گا ہماری طرف۔ میرا کارڈ تو آپ کے پاس
 موجود ہے۔ بہت خوشی ہوگی میری ام جان کو آپ سے مل کر۔" کیپٹن شہباز کے الوداعی کلمات پر رعنا چونکی۔
 "مجھے بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ انشاء اللہ ضرور چکر لگائیں گے۔ آپ آئیں تو پھر رابطہ ضرور
 کریں۔" رعنا اور فخر حیات انہیں گیٹ تک الوداع کہنے آئے تھے۔
 "کیپٹن شہباز! ایک منٹ۔" رعنا نے انہیں آخری قدم باہر نکالنے سے پہلے روکا۔ نہ بہت باہر جا چکی تھی۔
 "آپ کی سز بہت خوبصورت ہے مگر ان کے چاند چہرے کے گرد اسی کا ہالہ یا نکل اچھا نہیں لگتا۔ یہ اواسی
 نہیں آپ کی۔" رعنا کے ادھورے فخرے پر کیپٹن شہباز نے ایک بے ساختہ سی نظر نہرت پر ڈالی۔
 "ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں برسوں جا رہا ہوں تو شاید اس لیے۔" انہیں فوراً ہی ہمانہ سوچا۔
 "مگر یہ ہالہ تو مجھے مستقل ہی لگتا ہے۔ بہر حال خیال رکھا کریں۔ بیٹ آف لک۔ عدا عدا۔" رعنا نے کہا تو
 کیپٹن شہباز بھی خدا سا مذاق کہہ کر گاڑی کی طرف ہنسنے لگے۔
 "لگتا زبردست کیل تھا۔" رعنا نے مڑ کر فخر حیات سے کہا۔
 "ہماری طرح۔"

"اچھا آپ کو یاد ہے۔" وہ طرز سے بولی۔
 "کو تو تمہیں بھی یاد دلاؤں۔" انہوں نے نزدیک ہو کر سر گونجی کی۔ آسمان پر چمکتا چوہو میں کا چاند بھی جیسے
 نیچے جھکا جا رہا تھا۔
 "بہت بہت شکریہ۔ میں نے بہت مشکل سے اپنے دل کو آپ کی بے اعتنائی پر راضی کیا ہے۔ اب اس کی
 عادت نہ خراب کریں۔" کہتے ہوئے وہ تیزی سے اندر چلی گئی۔

 "یا اللہ! ہمارا جلدی سے زلٹ نکل آئے۔ میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہو جاؤں۔ بابا صاحب مجھے فوراً
 کالج میں داخلہ لے دیں۔" آج کل زینب کی نمازیں طویل ہو گئی تھیں۔ سجدے طویل تر اور ہر نماز کے بعد وہ
 با آواز بلند دعا مانگا کرتی تھی۔
 "دیکھو زینو! زلٹ تو اپنے نام پر نکلے گا اور نکلے گا بھی۔ یہ سہا ہی جیسے تم پیپر زدے کر آتی ہو۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی
 ہے پھر ہر دعا میں جلدی کی رٹ کیوں لگاتی ہو۔ کہیں جلدی میں فرشتوں سے بھی کوئی چوک نہ ہو جائے۔" آمنہ
 مشین پر جھکی کچھ سی رہی تھی۔ اس کی بار بار ایک ہی دعا کی گروان پر سر اٹھا کر جھنجھلا کر بولی۔
 "دعا کرنے سے اللہ پر بدل جاتی ہے تم زلٹ کی بات کرتی ہو۔" کہتے ہوئے اس نے جائے نماز سمیٹی۔ "دیکھنا
 مجھے پکا یقین ہے۔ میں پاس ہو جاؤں گی اور بابا صاحب مجھے داخلہ بھی لے دیں گے۔ میں تو داخلے کے لیے پیسے بھی
 جوڑ رہی ہوں۔" وہ رازداری سے اس کے پاس آ کر بولی۔
 "پاں تمہیں لے دیں گے جسے میں ان کی سوتیلی ہوں نا۔" آمنہ چڑھ کر بولی۔
 "میں ان کی سوتیلی نہیں لڑائی مگر صابر بنی ہو۔ میں نے تو ان سے عہد لے رکھا ہے اس لیے میرا تو ایڈیشن پکا
 ہے نا۔"
 "پھوٹی آئی! یہ دیکھیں میری نئی کتابیں۔ آپ نے نہیں دیکھیں نا۔" اسی وقت جویریہ اپنی نئی کتابیں اٹھائے
 چلی آئی۔
 "واہ تم نے کہاں سے لے لیں نئی کتابیں۔ ادھر تو زہر کھانے کو کہیں سے پیسہ نہیں ملتا۔" اس نے کتابیں بونٹی

الٹا لٹ کر دیکھیں۔
 "جیل نے لے کر دی ہیں۔" جویریہ نے فخر سے بتایا۔
 "واہ! یہ جلیل تم پر برا مہیاں ہے۔ ہم پر تو کوئی ایسے آج تک مہیاں نہ ہوا۔" زینب نے معنی خیز انداز میں پہلے
 جویریہ کو اور پھر آمنہ کو دیکھا۔ جویریہ حیرانی سے زینب کا منہ دیکھنے لگی۔
 "کیا بکواس کر رہی ہو زینب! ایسی باتیں کرتے ہیں چھوٹی بہن سے۔" آمنہ نے فوراً اسے لتاڑا۔ "جاؤ
 جویریہ! تم اندر جا کر بڑھو اور سنو آئندہ کسی کو یہ کتابیں دکھانے اور بتانے کی ضرورت نہیں کہ جلیل نے لے کر دی
 ہیں۔ نہ بھائی کو نہ بابا صاحب کو۔ سن لیا تم نے۔" آمنہ نے سختی سے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر چلی گئی۔
 "زینب! تم کس قدر فضول ہو۔ بھلا اس طرح بات کرتے ہیں وہ نا سمجھ ہے۔"

"آجائے گی سمجھ اسے بھی۔ تم دیکھنا آمنہ! اس روز تم بھی جانتی تھیں صاحب کے گھر۔ میا داد کے بعد اماں جی تو
 خواتین کو درس دیتے لگیں۔ میں سب صاحب کی بیٹی سالہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ مجھے چپکے سے ہاتھ پکڑ کر اندر لے
 گئی آئیے مگر میں۔۔۔ تم سے اس کا علیحدہ کمرہ اتنا خوبصورت اور اتنا بڑا ہے جتنے ہمارے یہ دو ڈرہے ہیں وہ نونوں
 کو ملا کر ایک کمرے میں نکالیں بچھا تھا۔ بڑے بھی لگے تھے۔ نرم نرم فوم کا بیڈ اور سب سے زبردست بات۔ اس
 کے کمرے میں اپنی وی بی تھا۔ ساتھ میں پتا نہیں وہ کیا وی سی آر تھا یا پچھ اور۔ مگر وہ تو خیر اس نے نہیں چلا کر
 دکھایا۔ لی وی پر کیبل لگا رکھی ہے اس نے۔ پورے ایک دو نہیں ستر چھیل آتے ہیں کیبل پر۔ ہائے آمنہ! پچھو جو
 اس نے مجھے ریموٹ سے چھیل بدل بدل کر دکھائے۔ نہیں گانے کہیں فلمیں کہیں ڈرامے کہیں جنگلی جانور
 کہیں انگلش فلمیں تو کہیں کارٹون اور ایک دو سچے سچے جو میں نے دیکھے۔"
 وہ آہستہ سے کہتے ہوئے آمنہ کے قریب ہو گئی۔ "میں سے مجھے پسند آ گیا۔ خوب کھلے ڈالے سین تھے۔
 انگریزوں کے ایک چھیل جوتے صرف مسائل سمجھ کر کی فلمیں آتی ہیں۔ سچ مجھ سے تو دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ انگریزوں کی
 پہلی چھیل جوتی تھی۔ ایک دم تنگ و تنگ ریت پر الٹی سیدھی لٹی تھیں۔ وہ ساتھ تو خوب مزے لے کر دیکھ
 رہی تھی۔ اس کے بار بار اس نے بر میں نے دیکھا۔ بر اسی وقت اماں جی کا بلاوا آ گیا اور مجھے اٹھ کر اتار دیا۔"
 وہ گل سے یہ سب چھپاتے بیٹھی تھی مگر اب ہضم کرنا مشکل ہو گیا تھا پھر شمالی کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ چھوٹا
 سا گھر تھا، ایک کمرے میں بیٹھ کر بات کرنا سب کو پتا چل جاتا تھا کہ کیا بات ہو رہی ہے۔ اس وقت تو اماں جی سو رہی
 تھیں۔ عبدالمعین بھی اندر سو رہا تھا۔ بابا صاحب نیچے تھے تو زینب کا موقع مل گیا۔
 "زینب! تم کو شرم نہیں آتی یوں آنکھوں کو گناہ کار کرتے ہوئے۔ تم بھول گئیں بابا صاحب کہتے ہیں۔ ان
 آنکھوں کو بھی حساب دینا ہے اللہ کے حضور کہ انہوں نے کیا کیا دیکھا۔"
 "موتے جانے دو۔ میں نے تو اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے یہ سب کچھ اور جو وہ دیکھتے ہیں۔ انہوں نے
 حساب نہیں دینا۔ تم ہزار سال پہلے کی بات کر رہی ہو۔"

"ان کا حساب کتاب ان کے ساتھ۔ ہمارا ہمارے ساتھ۔ وہ گڑھے میں پھلا ٹنگ لگائے تو تم بھی لگا دو گی!۔"
 "ارے رہنے دو یہ کتابی باتیں۔ ہمارے گھر میں ہے کیا۔ ایک ریڈیو تک تو ہے نہیں۔ ہر وقت وال روٹی کی نورا
 کشتی چلتی رہتی ہے۔ نمازیں پڑھ لو قرآن پڑھ لو یا پھر بابا صاحب سے ڈراؤ۔ دوپٹے اوڑھ اوڑھ کر بوبو بن جاؤ تو کیا
 ملتا ہے کچھ بھی نہیں۔ اتنی اس کی عبادت اتنی اس کی تابعداری کرتے ہیں پھر بھی کون سا اللہ ہم سے خوش
 ہو جاتا ہے۔ خوش تو وہ پھر بھی ان ہی لوگوں سے ہے جو عیش و عشرت کے رستے پر چلتے ہیں۔ وہ انہیں خوب روپیہ
 پیسہ دھیلا خوب مال بومال کے جا رہا ہے اور ہم ترس ترس کر اپنی زندگی کو اور بھی مختصر کیے جا رہے ہیں پھر بھی اللہ کو
 ہم پر ترس نہیں آتا۔ یہ فقیریوں جیسی زندگی یہ پھٹے پرانے کپڑے، خالی برتن، خالی جیب۔ یہ صلہ ہے اللہ سے
 ڈرنے کا۔" وہ جیسے بھری ہوئی بیٹی تھی مٹی پھٹ سی پڑی۔
 "بس کرو زینب! کفر کے جملے مت بولو۔ اللہ کے غضب کو آواز مت دو۔ جو عیش و عشرت کے رستے پر چلتے

ہیں اس نے ان کا بھی حساب لینا ہے۔ بس انہیں ایک وقت مقررہ تک ڈھیل دے رکھی ہے اور ہماری زندگی کو کیا ہوا ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔ کھاتے پیتے ہیں بھوکے نہیں سوتے۔ سر پر بھت ہے سڑک پر تو نہیں رہتے۔ تن پر کپڑے ہیں ننگے تو نہیں پھرتے پھر کس بات کا دکھ ہے تمہیں اس قدر۔

”بس رہنے دو۔ ایسے کھانے پینے پہننے اوڑھنے رہنے سنے سے ہم بے گھر ہی ہوتے تو کوئی ترس تو کھاتا ہم

”نفعو باللہ۔ تمہیں یہ پسند ہے کہ کوئی ترس کھائے تم پر؟“

”دیکھو آمنہ! تم یہ میری بات لکھ لو کہ ترس کا انجام ہمیشہ صبر نہیں ہوتا اور ایسا صبر تو نرا جبر ہے۔ اکثر ترس بہت خطرناک نتائج لاتے ہیں۔ میں کوشش کروں گی اور ضرور کروں گی جب بھی مجھے زندگی نے موقع دیا ذرا سا بھی کسی شارت کٹ کو اپنانے کا میں اختلافات کی کسی شق کے بارے میں ایک لمحے کو بھی نہیں سوچوں گی فوراً اس رستے پر چل پڑوں گی۔ یہ زندگی ہمیں ایک بار کے لیے ملی ہے اور میں اسے بھی گھٹ گھٹ کر سوکھ و افلاس کے اندھیرے میں بسر کر کے مٹی نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے اپنی زندگی کے لیے ایک روشنی چاہیے لہذا ایک روشنی۔ اس کے بعد چکا چوند اجالے میں خود پیدا کروں گی۔ تم دیکھنا۔“ وہ بہت عزم سے بول رہی تھی۔

”ویل سیڈ ویل سیڈ۔ مائی سسٹر ویل سیڈ۔ بہت اچھی بہت اعلیٰ سطح پر تمہاری۔ مجھے خوشی ہوئی ہے بے حد بہت زیادہ۔ کوئی تو ہے زندگی کی اس کال کو ٹھہری میں جو روشنی کی بات کرنا ہے اجالے اور روشن سویرے کی بات کرتا ہے۔ آخر ہم ہی کیوں غم کے ان اندھیروں میں گھسکتے رہیں۔ جو روپے پیسے کی ریل پیل میں پیش کر رہے ہیں وہ کیا زیادہ اللہ کا نام لیتے ہیں زیادہ اس کی عبادت کرتے ہیں جو ہر نعمت ان کے قدموں میں ڈھیر کر دی گئی ہے اور ہمیں نرے وعدوں پر ٹر خایا جا رہا ہے۔ وہ بھی جنت کے وعدوں پر۔ وہ کیا ہے کہ غضب کیا تیرے وعدے پر اعتبار کیا اور خاک ہو جائے گے ہم تجھ کو خیر ہونے تک۔“ بچا لگتا تھا کہ کون آیا ہے آج تک اس جہان خاموشاں سے یہ بتانے کے لیے کہ وہ جنت کے مزے لوٹ رہا ہے اور میں تو کتنا ہوں۔ جنت دراصل اسی دنیا میں ہے اور ان ہی لوگوں کو مل رہی ہے جو پیسے میں کھیل رہے ہیں اور پیسے کسے ملتا ہے۔“

عبدالعبین نہ جانے کب سو کر اٹھا تھا اور زینب کی جذباتی تقریر سن کر باہر آیا تھا۔ اس کے پاس اس موضوع پر ابھی کافی تقریر موجود تھی۔

”جو محنت کرتے ہیں۔“ آمنہ نے آہستگی سے کہا۔ اس کے لیے دونوں کے خیالات حیران کن تھے۔

”وہ تم جیسے احمق ہوتے ہیں جو محنت کرتے ہیں۔ روز کے چالیس پچاس گنااتے ہیں۔ ان میں سے انچاس روپے روز کا خرچہ اور ایک روپے یا آٹھنسی پچا کر رکھ سکیں تو اپنی بچت پر نازاں ہوتے ہیں۔ وہ کبھی پیسے میں کھیلا تو دور کی بات آٹھنسی دس بیس ہزار روپے بھی نہیں سکتے۔“ عبدالعبین نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

”پیسہ ملتا ہے ان کو جو فائدہ اٹھانا جانتے ہیں۔ اور ایک گولڈن چانس تو سب کو زندگی ایک بار ضرور دیتی ہے جو فائدہ اٹھا لیتا ہے۔ وہی اس دنیا میں جنت پاتا ہے۔“

”یہ تو ہونا ہی ہے۔ یہ تو پیدا کرنے والے نے انسان کی تقدیر میں لکھ رکھا ہے۔ جسے جینا ہے اسے مرنا بھی ہے۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑ رہے کہ جو جنت کے مزے لوٹتے ہیں وہ مرتے نہیں۔ ہم تو جینے کی بات کر رہے ہیں زندگی کی۔ اس کے روشن اجالوں کی اور مزے کی وہ کیسے لایا جائے۔ کیوں نہ ہو؟“ عبدالعبین نے زینب کی تائید چاہی۔

”بالکل اصل چیز تو جیسے جانا ہے۔ موت کیسے آتی ہے کب اور کیوں یہ ہمارا مسئلہ نہیں۔ جیتے ہیں تو اپنی پسند سے نہیں گے کیوں سسک سسک کر جینا ہمیں گوارا نہیں۔“ زینب اور جوش سے بولی۔

”تم دونوں احمق ہو اور بے وقوف بھی۔ چمکتی چیز کو سونا سمجھنے والے ہو سکتا ہے تم دونوں ایسی کسی جنت کو پا لو مگر اس کے بعد کے پچھتاوے، خدا نہ کرے تمہارا مقدر نہیں۔“

”عبدالعبین تم نے امتحان تو دے دیا ہے۔ مگر سے تم دوبارہ گئے نہیں۔ آگے تم نے کیا سوچا ہے؟“ آمنہ

نے بحث کا موضوع بدل دیا۔

”بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔ تم دیکھتی جاؤ۔“ وہ لاپرواہی سے بولا۔

”بات دیکھنے کی نہیں، غور کرنے کی ہے۔ بابا صاحب کی فکیل تنخواہ میں گھر کی گزر اوقات کس طرح ہو رہی ہے۔ یہ تم سے یا مجھ سے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس کے علاوہ بچوں کو یوشن پر مہلے بھی جاتے ہیں پھر بھی گزارہ مشکل ہے۔ منگالی بڑھتی جا رہی ہے۔ عبدالعبین نے تو مزہ کر نہیں دیکھا تم کچھ کیوں نہیں سوچتے۔“ آمنہ کئی دنوں سے عبدالعبین سے بات کرنے کا موقع ڈھونڈ رہی تھی۔

”سوچتا ہوں بہت کچھ سوچتا ہوں۔ مگر ابھی فی الحال کچھ نہیں کر سکتا۔“ اس کا لہجہ ہنوز بے پروا تھا۔

”کیوں نہیں کر سکتے۔ کوئی چھوٹی موٹی نوکری، کمپنیاں، محنت مزدوری کچھ تو کرو کہ بابا صاحب کے پریشان دل کو کچھ تو اطمینان حاصل ہو۔“

”اچھا ان کا دل بھی پریشان ہوتا ہے بابا۔“ نئی خبر ہے میرے لیے۔“ وہ بے ڈھنگے پن سے ہنسا۔

”پر تمہاری نہیں کرو عبدالعبین! بابا صاحب بہت پریشان ہیں آج کل۔ تمہیں خود خیال ہونا چاہیے۔“ آمنہ نے اسے بھڑکاتا دیکھا۔

”اچھا جی مجھے خیال نہیں ہے تو تم خیال کر لو۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔

”میں۔ میں کرنا چاہتی ہوں بہت کچھ مگر کیا کروں تم بتا دو۔“ وہ جیسے بے بس ہو کر بولی۔

”یہ یہ دیکھ رہے ہو؟“ اس نے کسی پھولے نیچے کا ادھ بٹلا کر تماشین کے نیچے کے نیچے سے نکال کر اسے دکھایا۔ یہ بیس سی رہتی ہوں جو دو نیچے مجھ سے یوشن پڑھنے آتے ہیں ان کی ماں نے سلائی کے لیے دیا ہے۔ بیس روپے دو کی سلائی کے اور دونوں بچوں کی یوشن ساٹھ روپے ہے میں اسی طرح کی چھوٹی موٹی محنت کر سکتی ہوں بابا صاحب کا ہاتھ بنانے کے لیے مگر سلائی تماشین چلنے کے لیے نیچے کے گھر سے لا کر دی ہے۔ صرف آج کے لیے اور یہ نیچے آج ہی سمٹا ہے اور تماشین واپس لگنی ہے۔ اب بتاؤ اور میں کیا کروں۔“

”تمہارا حال بھی اس اپنا بیل کا سا ہے۔ پورے پورے پانی لے کر جا رہا ہوتا ہے آتش نمود بھانے کے لیے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے جلائی گئی تھی۔ کسی نے پوچھا تمہارا یہ چونچ بھریانی کیا آگ بھادے گا تو اس نے لاپرواہی سے کہا نہ بھانے مگر روز قیامت میرا نام ان ناموں کی فہرست میں ہو گا جو اس آگ کو بھانے میں کوشاں تھے۔ ویل ڈن! اچھی جا بے لگتی رہو، کسی نہ کسی دن تو اپنے بابا صاحب کی پریشانیوں کم کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گی۔“

”میں تمیں روپے کمانے سے۔“ زینب نے لقمہ دیا۔

”اور تم کچھ نہیں کرو گے؟“ آمنہ نے افسوس سے کہا۔

”مگر آزم اس طرح کی مروس نہیں۔ بیس بیس روپے والی میں تو پہلی بار ہی لسا ہاتھ ماروں گا اور یہ سارا منظر جادو کی چھتری سے بدل دوں گا۔ تم دیکھنا۔“ وہ شیخ چلی کی طرح بولا۔ دونوں ہی کچھ نہیں سمجھیں گے۔ آمنہ نے جان لیا تھا اور جھک کر کر تماشین میں لگا کر سینے لگی۔ زینب کنگھاتے ہوئے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

”آمنہ! عبدالعبین نے اسے پکارا۔

”ہوں۔“ اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

”مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔“ وہ آہستہ آواز میں بول رہا تھا۔

”کس لیے؟“ اس کی توجہ ابھی بھی سلائی کرتی سوئی کی نوک پر تھی۔

”چاہیے نا! وہ جھنجھلا کر بولا۔

”کس لیے وہی تو پوچھ رہی ہوں۔“ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تم اس بات کو چھوڑو بتاؤ دو گی؟“

”تپ کیس اور ہم نہ آئیں۔“ عبدالمعین نے کچھ جہان نظروں سے زیور نگل کی بے باک نظروں اور ہنسی کو دیکھا اس نے تو ایسی صورت بھی پہلی بار دیکھی تھی جو ایسے لباس میں تھی جس میں اس کا سارا برہنہ بیٹ سب کو نظر آ رہا تھا پھر بھی وہ ذرا نہیں جھجک رہی تھی۔ کہنے لگے سے بھانکتا معنی خیز خلا جیسے سب کو دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔

اس نے تو اپنی زندگی میں ماں ہی جیسی عورتیں ہی دیکھی تھیں۔ یا گاؤں کی محنت کش عورتیں کھیتوں میں کام کرتی۔ اپنی سوانحیت اپنی جوانی و حسن سے بالکل بے خبر۔ عورت کا یہ روپ تو اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ لی وی وغیرہ دیکھنے کا بھی اتفاق کم ہی ہوتا تھا۔ لیکن پھر بھی اتنے قریب سے اس طرح کا نظارہ۔؟ اس کی عقل ماؤف سی ہو رہی تھی۔

”جی میں آجاؤں گا۔“ وہ نظریں جھکا کر بولا۔

”جی اللال نگل میں تمہیں پانچ سو روپے دے دوں گا ایڈوانس۔ باقی ریکارڈنگ کے بعد۔ فارم بھی کل نفل کر لینا۔ پڑھتے ہو؟“

”جی۔!“

”کون سی کلاس میں۔؟“

”جی ابھی پڑھ رہا ہوں۔“ اس نے کول مول جواب دیا۔

”دیکھتے نہیں ریاض صاحب اونیا کو پڑھنے لگا ہے اور اس پر بھائی کی کوئی کلاس کوئی درجہ نہیں ہوتا۔ بس پڑھتے جاؤ پڑھتے جاؤ۔ کورس ہی تمام نہیں ہوتا۔“ وہ پھر سے ہنسی۔

”اور جو سلیبس آپ جیسا ہو گل جی! پھر تو عمریں بیت جاتی ہیں۔“ ریاض صاحب نے معنی خیز نظروں سے اس کے کھڑی کمان جیسے تنے کو بے باک نظروں سے دیکھا۔

”ارے جانے بھی دو۔ گئے وہ زمانے اب تو نیا سلیبس نیا زمانہ۔“ زیور نگل نے بری ادا سے ریاض صاحب کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

”بھوت نہیں کتا۔ ابھی بھی سڑک کے درمیان کھڑی ہو جاؤ دونوں طرف کی ٹریفک گرین سگنل کے باوجود ختم جائے۔ کیوں عبدالمعین۔؟“ اس نے عبدالمعین کو کھینچا اس نے سر جھکا لیا۔

”بھئی تمہارا نام بڑا مشکل ہے پوری توجہ سے لیکنا پڑتا ہے۔ اس قبیلہ میں ایسے نام نہیں چلتے۔ ایسا لگتا ہے بندہ کسی حافظہ قرآن سے مخاطب ہو سب سے پہلے اپنا نام بولو۔ کیوں گل جی؟“

ریاض صاحب کی بات پر اسے لگا کسی نے اس کے دل پر مگادے مارا ہو۔ یا با صاحب نے سب کے نام رکھے تھے اور دونوں بھائیوں کے نام خاص طور پر قرآن سے نکال کر۔ ”نام بدل لوں۔“ اس کے اندر کوئی حیرانی سے بولا۔

”ہاں بھئی کوئی اچھا سا مختصر نام رکھ لو۔“ زیور نگل لاپرواہی سے بولی۔

”اچھا بھئی ریاض صاحب! میں چلتی ہوں۔ کوئی کام ہو تو یاد کر لیا کرو۔ تم نے تو اب بھولے سے بھی مجھے یاد کرنا چھوڑ دیا ہے۔“

”شرمندہ نہ کرو گل جی! سب کام تمہارے ہیں بس تمہارے اسٹینڈرڈ کا کام آج کل آ نہیں رہا۔ بڑی اچھل کود اور بے سرائی ایسے میں کتے ہوتے تو شرم آئے کی تاشے۔“

”ارے رہنے دو یہ ہمارے بازیاں سب سمجھتی ہوں۔ سنی ٹولی بلبلیں پھنسا رکھی ہیں تم نے۔ ایسے میں ہم جیسی بوڑھی کو گل تمہیں کیا یاد آئے گی۔“ وہ ناک سکڑ کر بولی۔

”ٹھیک نہ کیا کرو دوستوں کی محبت پر گل جی۔“ ریاض صاحب اس کی طرف پلٹ کر بڑی لگاؤ سے بولے۔

”اچھا بھئی میں چلتی ہوں لو کے بائے۔“ وہ کہتے ہوئے اسٹیج سے اتر گئی۔

”میں بھی جاؤں گی؟“ عبدالمعین نے پوچھا۔

”ہاں جاؤ گل صبح نوبت کے یہ میرا کارڈ ہے۔ ریسپشن پر دکھا کر ڈی اسٹوڈیو میں آجانا میں وہیں ہوں گا۔“ ریاض صاحب نے اسے اپنا کارڈ دکھایا تو وہ سر ہلا کر ”خدا حافظ“ کہتے ہوئے نیچے اتر آیا۔ جیسے ہی وہ اسٹوڈیو سے نکل کر کارڈنگ کی طرف آیا زیور نگل اپنی شاندار کردار میں بیٹھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ رگ کئی اور اشارے سے بلانے لگی۔

”جی۔!“ وہ پاس جا کر اوب سے بولا۔

”یہ میرا کارڈ ہے، کبھی ضرورت ہو گانے میں مدد وغیرہ کے لیے یا کانڈکٹس کی تو بلا جھجک ”گل کدہ“ چلے آنا۔ مجھے خوشی ہوگی تمہاری ہیپلپ کر کے اچھی آواز کا حق ہے کہ اس کی قدر کی جائے۔ پھپھانا جانے اور مانا جانے اوکے دوش یو گڈ لک۔“

وہ اس کے کندھے کو تختہ سا کر اریکٹرز کا ڈیوٹی میں بیٹھ گئی۔

عبدالمعین غور سے اس کا کارڈ پڑھنے لگا۔

”کیا قسمت بھئی اتنی آسانی سے بھی مہیاں ہو سکتی ہے۔ یقین نہیں آ رہا۔“ وہ کارڈ پڑھ کر وہیں کھڑے کھڑے سوچنے لگا۔



”وہ میرے خدا تم یہاں بیٹھی ہو میں پورے کالج میں تمہیں ڈھونڈ آئی ہوں۔“ نورین نے پیچھے سے آکر نوٹس بناتی شہرینہ کو چونکا دیا۔

”خیریت تم مجھے کیوں ڈھونڈ رہی تھیں اگلا پیر تو فری ہے۔“ شہرینہ نے اس کے پھولی ہوئی سانسوں اور سرخ رخسارے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”بھئی میں نے انیس میڈیم آفتاب نے تمہاری ڈھنڈیا پڑوائی ہے۔“ وہ کچھ جھنجھلا کر بولی۔

”نہیں آفتاب نے وہ کیوں؟“ وہ حیرانی سے بولی۔

”تم اٹھو تو سہی یہ اسباب سمیٹ کر۔“ اس نے شہرینہ کی کتابوں اور فائل کی طرف اشارہ کیا تو اس نے جلدی سے سب کچھ بیگ میں ڈال لیا۔

”تمہارے بھائی آئے ہیں تم سے ملنے شاید تمہیں لینے میڈیم آفتاب کے انٹس کے ساتھ جو ویٹنگ روم سے وہیں بیٹھی ہیں جا کر مل لو۔ شاید انہیں کوئی ضروری کام ہے۔ میں کینٹین جا رہی ہوں۔ کچھ ٹھنڈا اٹھا رہی ہے۔“

وہ اسے پیغام دے کر گراؤنگ کے درمیان ہی سے واپس مڑ گئی۔

”لالہ آئے ہیں؟“ وہ حیران رہ گئی۔ نورین کا پیغام سن کر۔ ”الہ ہلا کس لیے آئے ہیں۔ پہلے تو وہ کبھی میرے کالج نہیں آئے۔“ وہ تیز قدموں سے چلنے لگی۔

”شاید لھر جا رہے ہوں سوچا ہو کہ جاتے ہوئے مجھے بھی ساتھ لے جائیں۔“ اس نے دل میں سوچا۔

”ویسے تو اب وہ اتنے اچھے رہے نہیں جتنا نہیں انہیں کیا ہو گیا ہے ہر وقت بس بھالی بیگم اور انہیں کچھ نظر ہی نہیں آتا اور سیدہ آیا بھی ان ہی کے آگے پیچھے پھرتی ہیں۔ جیسے وہ کوئی دنیا کا لوکھا پتہ پیدا کرنے جا رہی ہوں۔ میری تو نہ کسی کو پروا ہے نہ فکر۔“ وہ پھر سے کڑھنے لگی۔

آج کل وہ ویسے بھی بہت بریشان تھی عبدالمعین کتنے دنوں تک قبرستان کی منڈیر کے اوہر آتا رہا تھا۔ اور اب تین چار دنوں سے وہ اسے نظر نہیں آیا تھا۔

”وہ ناراض ہو کر چلا گیا ہے۔ اب کبھی نہیں آئے گا کیا تھا تم ایک بار چلی جاؤ۔ اس سے بات کر لیتیں۔ سب کچھ اسے سمجھا دیتیں۔ یوں کسی کا دل توڑنا تو اچھی بات نہیں۔ وہ تو تم سے اس قدر محبت کرتا ہے اور تم نے کس بے دردی سے اسے ٹھکرا دیا ہے۔“

اس کا دل کئی دنوں سے مسلسل اسے لعن طعن کیے جا رہا تھا۔ اور اسے خود بھی تو کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا تین راتوں سے مسلسل جاگ کر وہ اٹھ اٹھ کر کھڑکی سے بھانکتا کہ شاید وہ اسے نظر آجائے۔

پتا نہیں کیوں ان دنوں اس کا دل بے گل ہو جا رہا تھا اس کی دید کی تڑپ میں بار بار اس کے خط نکال کر پڑھتی اور کئی بار رونے لگتی۔

”تو کیا مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے؟“ کئی بار وہ اپنی حالت دیکھ کر خود سے سوال کرتی۔
 ”شاید۔“ اس کا دل بوجاب دیتا اور اسے یقین ہو چلا تھا کہ یہ شاید سچ ہے۔ اسے واقعی اس سے محبت ہو گئی تھی۔

”اب میں اسے کہاں بھونڈوں۔“ آج صبح آتے ہوئے بھی پورے رستے وہ خود سے یہی سوال کرتی آتی تھی۔
 جیسے ہی وہ وینٹنگ روم کا پرہہ بنا کر اندر داخل ہوئی تو جیسے حیران رہ گئی وہ بے یقینی سے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ رہی تھی۔

شہساز کی ٹھنڈی خوشگوار ہوا اٹل رہی تھی، امروہ اور آلوپے کے درختوں کے سرسراتے پتوں کا وہ میاں دھبہ ماٹھور کاٹوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا۔ کئی اور کیاروں میں لگے گلاب، مومبیا اور جینیلی کے پھولوں سے آئی تھی۔ یہی خوشبو نے فضا کو اور بھی مہل بنا رکھا تھا۔ شہساز کی ہری ہری گھاس آنکھوں کو ٹھنڈک بخش رہی تھی۔ کچھوں اور پرندوں کی چنگار کا شور صبح کی اولین ساعتوں کا نواز رہا تھا۔ مسزخان وکیل بیسیز بیٹھی ہاتھ میں پکڑی بیچ کو بہت آہستہ آہستہ گھما رہی تھیں۔ ان کے لب خفیف انداز میں ہل رہے تھے ان کی آنکھیں اور کان ماحول کی خوبصورتی کی طرف متوجہ تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر ماربل کے بیچے لگائے ہیں اور نوٹس پھیلائے بڑے انہماک سے پڑھ رہا تھا۔ سورن کی روشنی بہت آہستگی سے آسمان کی نیلا آئینہ بن چکی تھی۔

”اللہ تبارک و تعالیٰ نے تمہیں کو کھلی میں لپیٹا اور بے انتہا سزا دیا۔ تمہاری آنکھوں کی طرف دیکھ کر کہا۔“ اتنی ساری پیش ہمتیں تو نے بغیر کسی معاوضے کے ہمیں عطا کر دی ہیں۔ اور تم شکر کرنے سے بھی عاجز ہیں زندگی کی پھولی پھولی ضرورتوں سے محرومی کا احساس ہمیں کس حد تک غیر مطمئن اور بے سکون کر دیتا ہے کہ ان پھولوں، ستاروں، ہوا، روشنی، پتھروں، مہاروں کے نظاروں جیسی انمول نعمتوں کی طرف ہمارا دھیان جانا ہی نہیں کہ ہم دل سے ایک بار ہی سہی اس ذات پاک کا شکر ادا کر سکیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمیں یہ نعمتیں دیں بغیر کسی حساب کتاب کے اور ان کو محسوس کرنے والا دل بھی، نگاہ اور سماعت بھی۔“ انہوں نے آہستگی سے وکیل چیئر کا ویل گھمایا اور معاذ کی طرف دیکھنے لگیں۔

”اسلام علیکم ام جان! بیچھے سے شہباز خان کی آواز آئی تھی۔
 ”و علیکم السلام، بخیر جیتے رہو۔ خوش رہو۔ لمبی صحت مند عمر پاؤ۔“ انہوں نے بے پناہ چہرے کے ساتھ شہباز خان کے جھکے سر کو چومنا اور بار بار کرتے ہوئے دعا دی۔

”یہ کیا؟ تم جا رہے ہو؟ آتش بھوکھ کی شرٹ اور بلیک پینٹ میں وہ تیار کھڑے تھے۔
 ”جی ام جان! میں نکلنے ہی والا تھا۔ اس لیے آپ سے ملنے آپ کے کمرے میں گیا تھا۔ اچھا کیا آپ نے جو اٹھ کر باہر آ گئیں۔ صبح کا سماں اذیت ہو اور پوری کے لیے اور وہ بھی آپ کے لیے بہترین ہے۔“

”ہاں میں تو نماز کے بعد کمرے ہی میں رہتی تھی۔ نیند تو آتی نہیں تھی یہ تو اللہ بھلا کرے معاذ کا۔ کئی ہفتوں سے اس کا معمول ہے اور پڑھنے آتا ہے نماز کے بعد تو ساتھ مجھے بھی لے آتا ہے۔ بہت دیر خوش ہوتا ہے صبح سویرے اور آکر۔ ورنہ زنتون بانو کی منگانی نے تو مجھے کمرے تک ہی محدود کر دیا ہے۔“ ان کی صحت واقعی اچھی ہو رہی تھی۔

”ابھی بات ہے اس سے آپ کی صحت پر بھی خوشگوار اثر پڑے گا۔“ شہباز خان نے محبت سے ماں کے جگہ گاتے چہرے کو دیکھ کر کہا۔

”اب کب آؤ گے؟“ ان کے چہرے سے یکایک اداسی چھلکنے لگی تھی۔ شہباز خان نے ذرا رک کر کہاں کے اداس چہرے کو دیکھا۔

”معلوم نہیں ام جان! وہ کوشش کے باوجود تھوٹ نہ بول سکے۔“
 ”کیوں؟“

”آپ کو بتا ہے ایک اسٹیشن پر کم از کم دو سال تو رہنا پڑتا ہے۔ اب دیکھیں۔“ انہوں نے چہرے کے تاثرات کو نرم کیا۔

”پھر بھی چھٹی وغیرہ تو آؤ گے نا۔“ براہ اس بھرا لہجہ تھا ان کا۔
 ”اول تو بارہ مہینوں میں اتنی جلدی چھٹی ملتی نہیں اگر ملی تو کوشش کروں گا۔“

”کوشش کیوں نہیں آنا چاہیے۔ معلوم ہے نا بڑی محنتوں کا ایک ایک بل تمہاری راہ دیکھتے گزرتا ہے۔ اور پھر نہایت وہ بھی اس حال میں۔ کیا آنے والے کی امید تمہیں آنے پر مجبور نہ کرے گی۔“ وہ جیسے جتا کر بول رہی تھی۔

”آپ نے نا، دھرا اس لیے مجھے کچھ فکر نہیں۔“ وہ ایک ہاتھ ان کے ویل پر دو سر ان کے کندھے پر رکھ کر ذرا سا بھٹکا۔

”میں اپنی جگہ مگر تمہارا ہی مقام ہے یہ کیوں بھول جاتے ہو۔“

”میں تو نہیں بھول سکتا ایک بل تمہیں بھولتا دل۔“ وہ ایک سرو آہ بھر کر بولے۔
 ”کیوں کیا تم بھولنا چاہتے ہو۔؟“ وہ ماتھے پر ہاتھ ڈال کر بولیں۔

”شاید ہاں شاید نہیں۔“ وہ سر افریقہ شاید انہوں نے ماں کا دل رکھنے کو کہا تھا۔

”شہباز! اپنے صاف صاف بات کیا کرو۔“ کہا تو میں اس عمر میں مجھ سے نہیں بوجھی جاتیں۔“
 ”کئی بار تو دیکھا ہوں۔ آپ کبھی ہی نہیں کوشش ہی نہیں کرتیں کھٹے گی۔“ وہ پلٹ کر ان کی ویل چیئر کو آہستہ آہستہ دیکھنے لگی۔

”تم جا کر فون وغیرہ تو کیا کرو گے نا؟“ انہوں نے پند لہجوں بعد پوچھا۔

”جی ظاہر ہے۔ ہفتے میں ایک دفعہ تو لازمی آؤں گا۔“

”بہنا! از بہت سے بھی بات کر لیا کرو۔“ کس کسک بولوں سے باندھا ہے تم نے اسے۔ تمہارے نام سے بندھ کر بیٹھی ہے وہ ادھر اور اب تمہاری امانت اس کی تو کھٹیں ہی رہتی ہے۔ اتنا حق تو ہے نا اس کا تم پر کہ تم بدلتی کے دنوں کو کچھ عمل کر سکو۔“ وہ چار دنوں بعد اس سے بات کر کے۔

”ام جان! میں بار بار آپ سے کہہ چکا ہوں۔ میں کوشش کے باوجود اپنے دل کو اس بات پر آمادہ نہیں کر سکتا تو تمہیں کیا کروں۔“ وہ جیسے زنج ہو کر بولے۔

”شہباز خان! تم اس کے معاملے میں اللہ کے آگے جواب دو۔“ براہ شاکہ سنا انداز تھا ان کا۔ ”اور تم اس قدر سخت دل بھی کبھی نہ تھے۔“

”ام جان! اسی اللہ نے مجھے بنایا ہے۔ میرے دل کی ساخت میں کون سی سختی شامل کی ہے تو مجھے اس کے لیے نرم نہیں بننے دیتی۔“ آپ لاکھ دلا تلے لیں مگر میرے دل کو مجبور نہیں کر سکتیں۔“ براہ و نوک سنا انداز تھا ”بس۔“ مسزخان نے ہاتھ اٹھا دیے۔

”یہ میری زندگی کی بہت بڑی بھول تھی کہ نکاح کے بندھن میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور یہ طاقت دلوں کے سب فاصلوں کو نکل جاتی ہے۔ مگر اس سال ڈیڑھ سال کے عرصے میں میں نے ایک دن بھی تمہارے انداز تمہارے خیال میں اس مظلوم لڑکی کے لیے کچھ نہیں دیکھی۔ کاش میں نے شادی سے پہلے اس پہلو پر سوچا ہوتا تو کم از کم اس معصوم کی آہوں کی زد میں تو نہ آتی۔ تم نے بہت برا ایسا میرے ساتھ کیا شاید میں نے خود۔“ وہ جیسے بڑبڑا رہی تھیں۔ براہ راہ ہوا لہجہ تھا ان کا۔

”شہباز خان! میری بات سنو۔“ وہ ان کی طرف دیکھ کر بولیں۔
 ”تم آج سے آزاد ہو اپنے ہر فیصلے میں ہر معاملے میں۔ تو تم چاہو اس پر عمل کر گزرو۔ میں نے تمہیں اپنی

"تمہیں معلوم ہے۔ محبت کا پہلا درس ہی بے غیرتی اور ڈھٹائی ہے۔" وہ ذرا سا اس کے پاس آتے ہوئے بولا۔

"تم اب کیا چاہتے ہو یہاں سے خود جاؤ گے یا میں کسی کو بلاؤں۔" وہ سختی سے بولی۔
 "تو اس ایک ماہ میں تمہارے پتھر پر میری محبت کا کچھ اثر نہیں ہوا؟" وہ مایوس لہجے میں بولا۔
 "نہیں۔" وہ بے دھڑک بولی۔

"شہرینہ! ایسے مت کہو تمہارا یہ دیوانہ مر جائے گا۔" وہ رووینے کو تھا۔
 "خدا کے لیے تم اب اوہر سے جاؤ کوئی آیا تو۔۔۔ جاؤ یہاں سے۔" وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر بولی۔
 "ایک بار چلا گیا تو پھر نہیں آؤں گا۔"
 "مت آنا میں تمہیں نہیں بلاؤں گی۔"
 "تو تم میری محبت کو ٹھکرارہی ہو؟"
 "جی بالکل مجھے آپ کی محبت کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔" وہ چہچہا کر بولی۔
 "تو میں چلا جاؤں؟" وہ بے یقینی سے بولا۔

"تمہیں اب تک یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا۔" وہ زور دے کر بولی۔
 "اوکے! اس نے کمراساں لیا۔" اب میں دوبارہ تمہارے رستے میں کبھی نہیں آؤں گا۔ مگر میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گا۔ تم میری زندگی کی پہلی اور آخری محبت ہو شہرینہ! میں نے دل کی لہرائیوں سے تم سے محبت کی ہے۔ اور تم نے اس کی قدر نہیں کی۔ تمہیں احساس ہو گا مگر اس وقت جب شاید میں تمہاری صداؤں کے جواب میں پلٹ بھی نہ سکوں۔" وہ کئی لمحے میں آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔

"پہلو ٹھیک ہے میں تمہیں صداؤں کی تم نہ پلٹنا اور کچھ۔" وہ جیسے اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔
 "اور کچھ رہ گیا کیا ہے۔" عبدالعصین نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے کسی لہرائی۔ اس نے ایک سر آہ بھر کر شہرینہ کو دیکھا۔
 "اب جاؤ بھی۔" شہرینہ جھنجھلا کر بولی۔
 "کیا تمہیں ذرا بھی دکھ نہیں؟"

"اف خدا یا! اس نے جیسے سر پکڑ لیا۔" کتنی بار بتاؤں۔"
 "ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں۔ مگر میری ایک خواہش پوری کرو جانے سے پہلے۔"
 "کیا مطلب؟" وہ ہاتھ بربل ڈال کر بولی۔
 "محبت کی کوئی نشانی۔ تم نے تو نہیں کی محبت مگر میں نے تو کی ہے نا۔ کچھ ایسا جسے میں دیکھوں اور تمہاری محبت کی یاد میرے بے قرار دل کو سکون بخش سکے۔" عبدالعصین کے پاس ڈانہ لگا۔ ختم ہوتے جا رہے تھے۔
 "میں ابھی بھی نہیں کبھی۔" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

"شہرینہ! یہ۔۔۔" وہ رکا اور اس کے کانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ ناپس اپنے یہ ناپس مجھے دے دو۔ یہ میرے دل میں تمہاری یاد کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ اور یہ مجھے یاد دلاتے رہیں گے کہ میں نے کس بے وفا سے دل لگایا تھا۔" وہ لہجے میں افسردگی بھر کر بولا۔

شہرینہ نے پہلے تو اسے بول دیکھا جیسے اس کا دماغ پلٹ آیا ہو پھر ایک دم سے کھٹکھا کر غصے پڑی اور دوسرے لمحے اس کی ہنسی گوبریک لگ گیا۔ اور وہ بے حد طنزیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
 "آگے نا اپنی اوقات پر۔ یہی اوقات ہے تمہاری۔ مجھے پہلے بتانا تھا کہ تمہیں کچھ روپوں کی ضرورت ہے۔ اتنے مہینے یہ ڈھونڈ رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے پہلے بتایا ہوتا۔ مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہوئی مگر حال یہ تو میں تمہیں نہیں دے سکتی یہ میرے لالہ کا گنٹ ہے اور بے حد قیمتی ہیں۔"

"تو میں بھی یہاں سے نہیں جاؤں گا۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"تو مت جاؤ میں چلی جاتی ہوں۔" وہ جانے کو مڑی عبدالعصین نے پھرتی سے آگے بڑھ کر اس کی کلائی کو زور سے اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا۔

"تم یہاں سے ایک قدم بھی باہر نہیں نکال سکتیں میری خواہش پوری کیے بغیر چاہے تم شور مچاؤ چاہے چپ چاپ کھڑی رہو مجھے تو عزت پد نامی نیک نامی کا کچھ خوف نہیں۔ مگر سنا ہے تمہارے سید خاندان کو اپنی عزت نیک نامی ہر چیز سے پیاری ہوئی ہے۔ یہاں اسی حالت میں کھڑے ہو کر چند لمحوں کو سوچو۔ تمہارے بھیا کا یہ گنٹ زیادہ قیمتی ہے۔ یا تمہاری عزت۔۔۔" وہ اس کے کان کے پاس غرا رہا تھا۔ "مجھے تو چار جوتے پر بھی جا میں گے تو کچھ فرق نہیں پڑے گا۔"

"چھوڑو میرا ہاتھ زور نہ میں شور مچا دوں گی۔" شہرینہ نے پورا زور لگا کر اپنی کلائی اس سے چھڑانا چاہی۔
 "مچاؤ شور مگر میں ایسے نہیں چھوڑوں گا۔" وہ بے خوفی سے بولا حالانکہ اس کی نظریں مسلسل سیدھنی دروازے سے چہچہا رہے۔ وہ کو دیکھ رہی تھی۔ اگر چند لمحوں میں بھی کوئی آیا تو اس کی اتنے سا کی سختی کا رت چلی جائے گی۔
 "تم ڈھٹائی کر رہے ہوئے اور کھنیا انسان ہو۔" وہ بے بسی سے نفرت زدہ لہجے میں بولی۔

"ٹھیک یو۔" اس نے شہرینہ کی کلائی پر ہاتھ بڑھا دیا۔
 "جی۔۔۔" اس کے منہ سے زور کے باعث بے اختیار نکلا۔
 "ٹھیک سے میں رہتی ہوں پتھو۔" وہ ہاتھ لگا رہا تھا۔ "اسے جان چھڑانے کا اور کوئی طریقہ نظر نہ آیا تو بولی۔ تکلیف سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"ایک ہاتھ سے پہلے ایک اتار دو سر میں خود اتار لوں گا۔" اس نے ہاتھ نہیں چھوڑا۔
 "شٹ اپ یہ ایک ہاتھ سے نہیں اتارے گا اور تم مجھے ہاتھ لگا کر تو دیکھو۔"
 وہ وہیں کھڑا رہا اور قانڈہ کی اچھا لوں۔ وہ کینگی سے ہٹا اور اس کی کلائی چھوڑ دی۔
 شہرینہ کی کلائی اس جگہ سے کھینچ لی گئی وہ کچھ نہیں بولی۔ اور خاموشی سے دونوں ٹاپس اتارنے لگی۔

چھوٹے چھوٹے سے خوبصورت ٹاپس جن میں تین سفید کھینچے گئے تھے جو اسے بہت عزیز تھے۔
 "انہیں عام کھینچے نہ سمجھنا۔ نیچے جاؤ تو یاد رکھنا۔ یہ ڈانڈہ زہیں۔ بیٹو کے تو تمہارے دو تین سال کسی اور امیر زادی کو چھانے بغیر آرام سے گزار جائیں گے۔" اس نے دونوں ٹاپس عبدالعصین کی کلائی پر پٹے۔
 "ٹھیک یو۔" ٹھیک یو۔ کلائی سے لے کر اس نے ٹاپس کھینچیں گئے شہرینہ نے اسے کھور کر رکھا۔
 "تین سال کیا تمام عمر تو اس سے کئی ایس نے ٹاپس کھینچیں گئے شہرینہ نے اسے کھور کر رکھا۔

"ابھی تو چھ سال ہے کیا رہ گئے ہیں۔ تمہارے کالج کالکٹ ساڑھے کیا رہ گئے کھل جاتا ہے۔ میں ٹھیک بارہ بجے تمہارے کالج کے دوسرے کورڈ پر کھڑا ہوں گا۔ تم وہیں آ جانا۔" وہ اس بڑے آرام سے کہہ رہا تھا۔
 "تمہارا دل تو ٹھیک ہے نا۔"

"بالکل ٹھیک یہ تمہارے ٹاپس میری محبت کی نشانی اور تم سے قربت کے گواہ ہیں کہ میں نے تمہارے کتنے قریب کتنے مل گزارے ہیں۔ میرے ہاتھ تمہارے کانوں کی اووں تک جا پہنچے جب سلطان بخت اور تمہاری آپا جان کو اس دلکش حقیقت کا ادراک ہو گا میری تو شاید کھال ادھڑدی جائے تمہارا کیا حشر ہو گا ذرا سوچنا۔ ابھی ایک آدھ گھنٹہ ہے۔"

وہ جانے کو مڑا۔ شہرینہ پچھنی پچھنی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
 "اور اگر تم نہ آئیں تو اس کو گیدڑ بھسکی مت سمجھنا۔ یہ محبت کی نشانی لیے اپنی جان کی پروا کیے بغیر سلطان بخت اور تمہاری آپا جان کے سامنے شام سے پہلے پہنچ جاؤں گا کہ اب تم دونوں سے مگر رہی ہو میرے اتنے قریب اگر وہ اپنا دیا گیا گنٹ تو پہچان ہی لیں گے نا۔"

اور اگر میں اپنی جان اور عزت کی پروا کیے بغیر اوہر آسکتا ہوں تو تمہیں ہاں مجھے سلطان بخت کا بھی کچھ ڈر نہیں
تمہاری تپان کا۔ خدا حافظ۔ ”وہ دروازے تک پہنچ چکا تھا۔
”تمہاری گاڑی ڈیڑھ بجے تک آتی ہے تمہیں لینے میں تمہیں ٹھیک ایک بجے گیٹ کے آگے دوبارہ ڈراپ
کر جاؤں گا۔“ بارہ بجے یا در لکھنا خدا حافظ۔“
اگلے پل وہ شہرینہ کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا اور وہ پریشان نظروں سے ہٹے پردے کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ کیا کواں ہے؟“

نین تارا آنکھیں بند کیے لان میں پڑی کین کی کرسی پر اپنی اسٹائل میں بیٹھی تھی۔ جب کوئی چیز زور سے اس
کے منہ پر آکر لگی اور کسی نے دھاڑ کر کہا۔ اس نے کھرا کر آنکھیں کھول دیں۔ سامنے سلطان بخت غصیل چہرہ اور
شعلہ پار آنکھیں لیے کھڑے تھے اور نین تارا کے قدموں میں گرنے والی چیز فولد کیا ہوا اخبار تھا۔ اس نے بڑے
آرام سے جھک کر اخبار اٹھایا۔ اور کھول کر دیکھنے لگی۔ سامنے ہی قمری کی نئی قلم کے پرستری تصاویر سے بھر پور
تھا۔ اور وہ ہر جگہ قمری کا ہاتھ تھا۔ مسکراتی ہوئی کھڑی تھی۔ اب اسے معلوم ہوا سلطان بخت کے یوں آگ
بولہ ہونے کا سبب۔

”میرے خیال سے یہ کواں نہیں اخبار ہے شاہی! آپ کو اس قدر غصہ کیوں آیا ہے۔ اس بے چاری سی چیز
پر۔“ وہ بڑے مستحزبان انداز میں بولی۔ اس نے ذرا بھی ظاہر نہ کیا کہ اسے شاہی کی یہ حرکت کس قدر ناگوار گزری
ہے۔

”شٹ اپ نین تارا! مجھ سے اس وقت کوئی مذاق کرنے کی کوشش نہ کرنا۔“ انہوں نے اٹلی اٹھا کر اسے
خوفناک انداز میں تنبیہ کی۔

”مذاق اور میں۔“ وہ زور سے کھلکھلا کر ہنسی۔ ”اور وہ بھی آپ کے ساتھ۔ اس کی ہنسی اور چٹیلی۔“ میں
کیوں کروں گی شاہی! میری یہ مجال یہ اوقات کہاں۔“

”یکو مت میں اس وقت ان چوچکوں کے موڈ میں نہیں ہوں۔ مجھے بتاؤ تم نے یہ حرکت کیوں کی جب میں نے
تمہیں منع کر رکھا ہے کہ شوہر کی طرف تم نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھنا۔“ ان کا ہنس نہیں چل رہا تھا کہ آگے بڑھ
کر اس کی نازک سی گردن دو بوج لیں۔

”آنکھ اٹھا کر حضور میں نے کب دیکھا ہے۔ دیکھ لیں آپ۔ سب تصویروں میں میری نظریں کبھی کسی طرف
ہیں آنکھ تو میں نے ایک بار بھی نہیں اٹھائی۔“ وہ پھر سے مذاق اڑاتے ہوئے بولی۔

”شٹ اپ شٹ اپ یو اسٹوپ۔“

”یوشٹ اپ اینڈ ڈونٹ شاؤٹ مسٹر سلطان بخت! اور آگے ایک لفظ مت کہے گا زبان میرے منہ میں بھی
ہے اور آپ نے مجھے خرید نہیں رکھا۔“ وہ ایک دم سے کرسی سے اچھلی تھی۔ اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال
کر چلائی۔

”تم۔ تمہاری اس قدر خیال کہ تم مجھ سے اس لہجے میں بات کرو۔“ وہ شاید اسے تھپتھپانے کو آگے بڑھے
تھے کہ نین تارا نے ان کا فضا میں اٹھا ہاتھ تھام لیا۔

”شاہی! آپ بھول رہے ہیں یہ آپ کی جو بیٹی نہیں۔“ گل کدہ“ ہے۔ یہاں آپ کے اصول اور قاعدے
نہیں چلیں گے۔ آپ اگر مجھ سے غلط بات کریں گے تو اس کا حق مجھے بھی حاصل ہے۔ پھر گدہ مت کیجئے گا۔“ وہ
بست بے خوفی سے بول رہی تھی۔

”جاننا ہوں یہ“ گل کدہ“ ہے اور یہاں کس قسم کے گل کھلتے ہیں۔ اس کا بھی علم ہے کہ جیسی ماں تھی بیٹی
جیسا اس کے رنگ سے پیدا ہو سکتی ہے۔“ سلطان بخت کے لہجے میں نفرت ہی نفرت تھی۔

”اچھا! وہ طنز“ بولی۔ ”ویسے آپ کو تو پہلے روز سے ہی علم تھا کہ یہاں کس قسم کے گل کھلتے ہیں۔ پھر آپ
اپنے قدم اس کی چوکھٹ پر رکھنے سے پرہیز کر لیتے۔“ وہ لا پرواہی سے کہتے ہوئے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

”دیکھو میں اس وقت یہ کواں سنے نہیں آیا۔ اچھے مجھے یہ بتاؤ تم نے میرے منع کرنے کے باوجود اس گندگی
میں قدم کیوں رکھا۔ جب کہ میں نے تمہیں کہہ رکھا تھا جس دن تم اس گندگی میں جاؤ گی انسان کی خود زہد وار
ہوگی۔“ وہ ابھی بھی کھڑے تھے لہذا ابھی بھی غصہ زہ تھا۔ مگر نین تارا کی جرات نے اس کی حدت کم کر دی تھی۔

”تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔“ وہ ذرا سا اکتلتاتی۔ ”شاہی! مجھے وہ دن یاد آ رہا ہے جب ایک روز اسی طرح اخبار
میں جھینے والی ایک تصویر نکلا۔“ آپ کی شادی کی تھی اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ اس وقت مجھ سے شادی کر چکے
تھے پھر بھی آپ نے میرا خیال کیے بغیر مجھ سے پوچھے بغیر اور مجھے انوائٹڈ کے بغیر پردے دھڑلے سے دو سہرا بیاہ
رچایا تھا اور اسی طرح کی نوٹو چھپی تھی آپ کی اخبار میں۔ اور میں بے چاری بیچ پٹا کر رو دھو کر آپ کی سہوائے
زمانہ محبت کو اپنا جان کر چپ ہوئی تھی۔ کچھ یاد آیا آپ کو؟“

”جانتی نہیں وہ پہلے بھی اس قدر ذہن کی یا اب ہو گئی تھی کہ کوئی بھی موقع طنز کا یا کسی اور حوالے کا ہاتھ سے جانے
نہ دیتی تھی سلطان بخت نے اسے لکھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

”ارے شاہی! انا غلط اچھا نہیں۔ بیٹھ جائیے۔ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ میں آپ کو بتاتی ہوں میں نے ایسا کچھ
غضب نہیں کیا تو آپ نا حق اپنا خون جلا رہے ہیں۔ آپ بیٹھیں تو سہی۔“ اب گے اس نے لہجے میں خواہ مخواہ کا
پیار سمو کر کہا۔

”میں اس وقت یہ گڑے موڈے اکھاڑتے نہیں آیا۔ صرف تم سے باز پرس کرنے آیا ہوں کہ تم نے ایسا کیوں
کیا؟“ وہ کافی حد تک ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔

”باز پرس کا لفظ بھی آپ کو سوت نہیں کر رہا تھا۔ آپ نواب بن نواب ہیں۔ ڈکشنری کا کوئی بھی لفظ آپ کی راپٹی
ہے۔ چاہیں استعمال کریں۔“ پھر نین تارا نے کہا۔ ”آپ بیٹھیں تو سہی۔“ سلطان بخت کو پادل خواہت بیٹھنا ہی پڑا۔ مگر ان
کے چہرہ ابھی بھی ہلرے ہوئے تھے۔

”آپ کو معلوم ہے میں نے کسی فلم میں کام نہیں کیا۔ اور کچھ بھی ایسا نہیں کیا جو آپ کو یوں غضب ناک
کر ڈالے صرف تین گانے گائے ہیں قمری صاحب کی فلم میں وہ بھی ان کے بے حد بے حد اصرار پر۔“
”اور یہ تصویریں بھی اس کے بے حد اصرار پر اور ہاتھ میں ہاتھ بھی۔“ سلطان بخت نے میز پر بڑے اخبار کو ہوا
میں اچھالا۔

”قمری صاحبہ میری ماں کے پرانے خیر خواہ ہیں۔ ان کے بے حد اصرار کو میں ٹال نہیں سکتی تھی۔ پھر اگر
میری ایک کچھ تصویر اخبار میں آچھی گئی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ کی مجھ سے شادی کی خبر کس کو ہے۔ میں بتاؤں۔
آپ کو۔“ وہ رکی ”میرے گھر کے چند ملازمین کو میری ماں کو۔ آپ کے سیدھاؤں کے چند ملازمین کو بلکہ وہ بھی
شاید مجھے آپ کی خلوتوں کا کوئی کھلوانا ہی سمجھتے ہوں۔ نکاح کی ان کو کہاں خبر ہوگی۔ اور اس کے علاوہ ”گل کدہ“ کی
دیواریں کو اس لان کے چند تیل بوٹوں کو اس گھر کے بے جان قریب کو میرے بیڈ روم کو میرے کاسینٹس کو،
میرے ڈرسنگ روم کو اس شہر کی چند سڑکوں کو دو چار ہوٹلز کو اور۔“

”نین تارا! اسٹاپ! تم میرا مذاق اڑا رہی ہو یا اپنا۔“

”ظاہر ہے آپ کا مذاق اڑانے کی جرات تو میں نہیں کر سکتی۔ اپنا ہی اڑا رہی ہوں آپ نا حق تھا ہر ہے ہیں
ان چند بے جان تصویروں سے کچھ بھی فرق نہیں پڑے گا تم از کم ہمارے اس خفیہ کاغذی رشتے پر نہ صالحہ شاہ
آپ سے باز پرس کر سکے گی نہ آپ کی اس طرح کی کوئی اور خفیہ محبت۔“

”اس وقت بات کسی اور کی نہیں ہو رہی۔ میری ہو رہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم میرے نکاح میں ہو اور نکاح
جیسا پاکیزہ بندھن میں نے تم سے اسی لیے باندھا تھا کہ تم ان خرافات میں نہ پڑو اور تم نے پھر وہی۔“

”پلیئر شاہ جی! میری دکھتی رگ پر ہاتھ مت رکھیں میں نے بھی یہ پاکیزہ ہونڈھن آپ سے اس لیے باندھا تھا کہ مجھے بھی ایک بیوی کے سب حقوق حاصل ہوں گے۔ مجھے بھی اپنی ماں کی طرح ہزاروں محبتوں کی طرف پناہی چوچ اٹھا کر نہیں دیکھنا پڑے گا۔ مجھے صرف آپ کی صرف ایک شخص کی محبت درکار تھی اور آپ نے مجھے کیا دیا۔“

”کیا نہیں دیا۔ ناشکری عورت! وہ چلائے۔“
 ”ڈھائی کروڑ کی کوٹھی۔ دس لاکھ کی گاڑی ساٹھ ستر ہزار کا ماہانہ ریب خرچ تھوڑے سے سیر پائے وہ بھی سیاہ شیشوں والی گاڑی میں۔ آپ اس رشتے کو کسی گناہ کی طرح چھپانا چاہتے ہیں۔ جب آپ مجھ سے شادی کر کے اس قدر شرمندہ ہوں تو شاہ جی! کچھ تو مجھے بھی سوچنا ہے تاکم از کم اپنے بیوچ کے بارے میں۔“

”کیا ہوا ہے تمہارے بیوچ کو؟“
 ”میں ہوا تو ہو سکتا ہے یہ رشتہ ہو ہم دونوں کے بیچ ہے۔ ایک بھلا ہوا ہے آپ کے نزدیک نکل کو اس بھلاوے سے آپ کا جی بھر جائے تو میرے پاس تو ایک آٹھ بیٹے کی زنجیر بھی نہیں جسے ایسے من بھرے وقت میں آپ کے سامنے ٹھکانا سکوں اس رشتے کے جوڑے رکھنے کی انتہا کر سکوں۔ آپ مجھے بیچ رستے میں چھوڑ جائیں تو میں کیا کروں گی۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”تمہارے دامغ سے یہ بیٹے والا بھوت اتر کیوں نہیں جاتا۔“ وہ زچ ہو کر بولی۔
 ”اڑتا ہے تو اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوتی ہوں۔“ وہ افسردگی سے بولی۔

”یہ۔۔۔ یہ کچھ سوچنے پر مجبور ہوتی ہو۔“ انہوں نے زمین پر پڑے اخبار کی طرف اشارہ کیا۔
 ”شاہ جی! یہ تو کچھ بھی نہیں۔ محض چند تصویریں ہیں۔ میں تو آپ کے تصور پرین کے باوجود ابھی بھی اس رشتے کا پاس رکھ رہی ہوں۔ صرف تین گانے گانے ہیں۔ حالانکہ فلم میں کام کرنے کی میرے پاس ڈھیروں آفرز موجود ہیں اور مام کا اصرار بھی بہت سے مگر صرف آپ کی خاطر یقین کریں میں نے کبھی ان آفرز کے بارے میں سوچا تک نہیں۔ اس کے باوجود آپ مجھے بے وفائی کا الزام دے رہے ہیں اور یہ سن گانے کیوں آج گئے تھے۔ جب آپ نے صالحہ شاہ سے شادی کی میں ان دنوں بہت فرسٹ کلاس ہو رہی تھی پھر آپ کی طرف سے بھی توجہ دیکھ کر ہو گئی تھی۔ بس اس صدمے اور دکھ کی کیفیت میں میں نے قریبی صاحب سے لابی بھری۔ حالانکہ میں جانتی ہوں میری آواز میری ماں کی طرح بہت خاص نہیں اور میرا ریاض بھی کوئی خطا نہیں پھر بھی قریبی صاحب کی مہربانی کہ انہوں نے مجھے اپنے ٹیلنٹ کو آزمانے کا موقع دیا اور وہ صریح بات وہی تھی۔ لہذا سانس لینے کو رکھی۔“

”کون سی؟“
 ”میرے دوست نکل کو آپ مجھے چھوڑ دیں تو میں کیا کروں گی۔ میرے پاس کچھ تو ہونا ہے۔ میں نے کئی ہولڈرز ہوں۔ میری ماں میرا پاپ اتنی جائیداد چھوڑ جائیں گے کہ میں ٹیٹھی تا عمر کھاتی رہوں اور تیسری بات۔۔۔“
 تیسری بات آپ گاؤں چلے جاتے ہیں۔ اکثر کئی کئی ہفتے خبر نہیں لیتے۔ فون کرنے کی حوصلی میں مجھے اجازت نہیں۔ شاہ جی! میں آپ کی محبت کے دوریا کی جمل پھلی ہوں اور جس دن اس جمل کا پانی سوکھ جاتا ہے۔ میں مرنے کے قریب ہو جاتی ہوں۔ ایسے میں کچھ ایکٹیوٹیٹی کچھ کرنے کو بھی تو میرے پاس ہو نا چاہیے۔ یہ کانا کچھ ایسا ناز بنا فعل بھی نہیں کہ آپ مرنے مارنے پر اتر آئیں۔ میری تمنا ہی کا مشغلہ سمجھ لیں جو آپ سے دوری میں کام آتا ہے۔ آپ مستقل میرے پاس ہوں تو مجھے ان چیزوں کو دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں۔“ اس نے بڑے بھلاوے سے سلطان بخت کو ٹھنڈا اٹھا کر دیا تھا۔

”میں کچھ دنوں سے سوچ رہی تھی کہ آپ کو یہ سب بتا دوں اور آپ سے اجازت بھی لے لوں۔ اگر کبھی کبھار ایک آٹھ کام اس طرح کا پروہ اسکرین سے او بھل رہ کر لوں تو آپ اجازت دے دیں گے نا؟“ وہ بڑے لاڈ سے ان کے قریب کھسک آئی اور ان کا بازو تھام کر بولی۔ سلطان بخت نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ کہا ان کا ذہن جیسے کہیں اور ہی پرواز کر رہا تھا۔

”میں چلتا ہوں۔“ وہ ایک دم سے اٹھے اور عین تارا کو دیکھے بغیر تیزی سے گیٹ کے پاس کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ عین تارا نے پتھو حیران ہو کر انہیں دیکھا اور پھر کندھے اپ کا کر اخبار اٹھایا اور تصاویر دیکھنے لگی۔

عبدالعصین نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا۔ اس کی اتنے مہینوں کی محنت انکارت نہیں گئی تھی۔ شہرینہ قل نقاب کے شامیا۔ ٹائپ چادر میں خود کو لپیٹے گیٹ کے پاس کھڑی تھی۔ عبدالعصین کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ آئی۔ وہ ہنستہ قدموں سے چلتے ہوئے اسی کی طرف آ رہی تھی۔

”میں کیا اس پر بیٹھوں گی؟“ وہ اس کے پاس آ کر دھیمی آواز میں غصے سے بولی۔
 ”تو اور کیا میں تمہارے لیے بچارو لے کر آتا۔ یہ بھی کراے کی ہے کون سی میری اپنی ہے۔“ اس نے بڑے فخر سے بائیک پر ہاتھ پھیرا۔

”میں تم نے جو بکواس مجھ سے کرنی ہے اور سہری کر لو۔ میں کبھی ایسی سواری پر نہیں بیٹھی۔ میں گر جاؤں گی۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔
 ”تو میں کس لیے ہوں میں تمہیں کرنے دوں گا۔“ وہ گردن اگڑا کر بولا۔
 ”پھیامت بیٹھو، پہلے ہی تمہاری گاڑی آنے میں تھوڑا وقت رہ گیا ہے پھر مجھے الزام نہ دینا۔“
 ”جانا کہاں ہے۔ دیکھو میرے ٹائپس والوں کو۔ تمہارے معاملے پر ضرور سوچوں گی۔“ کئی پر اس۔“
 ”اب سوچنے کا نہیں بات کرنے کا وقت ہے۔ تم بیٹھو گی یا میں جاؤں اور تمہارے کھر بیچنے سے پہلے تمہارے ٹائپس تمہارے بھیا کے پاس ہوں گے۔“

وہ اسے دیکھتی دیکھتی ہونے لگا۔ اس نے بے بسی سے اس ڈھیٹ کو دیکھا اور موٹر بائیک کیریئر کو مٹیوں سے تھامتے ہوئے عبدالعصین کے جتنے ہونے سوت کے کنارے پر نکل گئی۔
 ”اس طرح جو تم ضرور ہی کرو گی۔“ اسے بول کر اٹھو۔“ وہ رعب سے بولا۔
 ”مجھ سے نہیں بیٹھا جاتا۔“ وہ اترنے کو تھی۔

”بیٹھ جاؤ ڈرو نہیں۔ بس پہلی پار بیٹھنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے بعد آئندہ انجوائے کرنا ہے۔“
 ”یہ میں پہلی اور آخری بار بیٹھ رہی ہوں۔“ اس نے کہتے ہوئے بادل نحوست اپنا نازک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر خود کو سنبھالا اور پھر فوراً کھلی ہاتھ ہٹالیا۔ عبدالعصین نے مسکراتے ہوئے موٹر بائیک اشارت کر دی۔
 اس نے یہ کہاں کئی چند دنوں میں سیکھا تھا۔ موٹر بائیک کراے پر لیتا اور کسی سنسان سڑک پر جا کر بیٹھ دو گھنٹے آہستہ آہستہ چلا تا۔ ٹائپس لینے والے آئیڈیے پر تو اس نے ”ٹکا“ ہی مارا تھا۔ اس کا اندھیرے میں چلا گیا تھیر کام کر گیا تھا۔ اس کا دل ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ اس نے موٹر بائیک کی رفتار بڑھا دی اور تیز۔ اور تیز۔

”آہستہ چلاؤ۔“ تیز شاہیں شاہیں کان کے پاس آتی ہوا کے ساتھ شہرینہ کی پکار اسے سنائی دی۔ اس کا ہوش اور بڑھ گیا۔ اس نے اسپید اور بڑھا دی۔ ”تم پاگل ہو گئے ہو مارو کے مجھے۔ روکو اس کو۔“ شہرینہ نے زوردار مکا اس کے کندھے پر جڑا تھا اور زور سے چیخی تھی۔ عبدالعصین پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ ”خدا کے لیے روکو اس کو۔“ وہ اب رو دینے کو تھی۔ اس کا سر جھک رہا تھا۔ سامنے کا کوئی بھی منظر واضح طور پر اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک تو ذہنی طور پر وہ اس قدر ڈسٹرب تھی دو سرے پہلی بار بائیک پر بیٹھی تھی وہ بھی جبراً۔ ہوا سے یا تمں کرتی یہ غیر یقینی سی سواری۔ اس کی چیخیں نکلنا لازمی تھیں۔

”روکو خدا کے لیے روکو۔“ وہ بے اختیار رونے لگی اور اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ کر آنکھیں زور سے بند کر لیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے عبدالعصین کے کندھوں کو جکڑ رکھا تھا۔ عبدالعصین کو لگا کہ آج زمین اس کے پاؤں کے نیچے نہیں۔ وہ فضا میں خلا میں اوپر ہی اوپر اڑا چلا جا رہا ہے۔ شہرینہ کا اس کے کندھے سے لگا سراسے

بے حد طمانیت بخش رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے اسپید کم کردی جیسے ہی موٹر بائیک رکی۔ شہرینہ نے بے اختیار سر اٹھا کر دیکھا۔ موٹر بائیک کسی پارک کے سامنے کھڑی تھی۔

”ہمت ڈر پوک ہو تم۔ چلو اترو۔“ وہ نیچے اترتے ہوئے مزے سے بولا۔ شہرینہ کی بھیگی آنکھیں اور نقاب پر گرنے آنسوؤں کے قطرے اسے بہت اچھے لگے تھے۔

”اب منزل دور نہیں۔“ اس کے دل نے بے ساختہ کہا۔

”آؤ نا۔“ عبد العبین نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے بھی بغیر کسی مزاحمت کے اپنا منہ ڈانچ ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ دونوں چلتے ہوئے پارک کے اندر ایک بیچ پر آئے۔ بھری دوپہر میں پارک بالکل سناٹا تھا۔ بیچ گھنے درختوں کے سامنے میں تھا۔ دونوں چپ چاپ اس پر بیٹھ گئے۔ شہرینہ نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔

”میں کچھ لے کر آتا ہوں۔“ وہ ایک دم سے اٹھا اور پارک سے باہر نکل گیا۔

شہرینہ کا دل بالکل بھی حاضر نہیں تھا۔ کٹ تلک آنے سے پہلے اس نے خود سے بہت جنگ لڑی تھی۔ جائے پائنہ عبد العبین کے جانے کے بعد اس نے کوئی پریڈ اینڈ نہیں کیا تھا۔ ایک کونے میں بیٹھی وہ اپنی دہلیز تھی۔ ”اگر اس نے ٹاپس لالہ کو یا آگیا کو کھانسیہ جا کر۔“ سب سے برا خوف ہو اس کے سر پر سوار تھا۔

”آخر اتنے ماہ تو ہو گئے ہیں اسے تمہارے پیچھے غوار ہوتے۔ آخر تمہاں کیوں نہیں جاتیں کہ وہ واقعی تم سے محبت کرتا ہے۔“ سب سے مضبوط دلیل ہو اس کا دل دیے جا رہا تھا۔ آخر دل کی اس دلیل پر اس نے عبد العبین کے ساتھ آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”یہ اونٹنی لالہ۔“ دو اور بیچوں کے پیک اس نے ہاتھ میں پکڑ رکھے تھے ایک اس کی طرف بڑھایا۔

”مجھے پیاس نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”میو کی تو معلوم ہو گا کہ تمہیں پیاس لگی ہے۔“ اس نے کہنے ہوئے جوس اس کے ہاتھ میں تھا دیا اور دوسری طرف بیٹھ گیا۔ شہرینہ کچھ دیر جوس کو اسی طرح لے کر بیٹھی رہی پھر آہستہ اپنے لگی۔

”آخر تمہیں پیاس کیوں نہیں آتا کہ میں بیچ بیچ تم سے محبت کرتا ہوں۔ بہت زیادہ۔“ جوس کا آخری سب لے کر عبد العبین نے جوس کا خالی ڈبہ دوڑسٹ بن کی طرف اچھالا۔ شہرینہ چپ رہی۔

”تم کچھ نہیں بولی؟“ اس کی چپ پر وہ ہنسیا کر بولا۔

”کیا بولوں؟“ وہ جیسے بے بس ہو کر بولی۔

”کچھ بھی کچھ تو کہو۔ تم کچھ سوچ کر ادھر آئی ہو لی نامیرے ساتھ۔“ وہ اس کی طرف منہ کر کے بولا۔

”کچھ خاص نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”کچھ اپنے دل کا حال کہو۔“ وہ اسے بولنے پر اکسار رہا تھا۔

”مجھے خود اپنے دل کا حال معلوم نہیں۔“ وہ خالی الذہنی سے بولی۔

”میرے دل کا تو معلوم ہے نا۔ اس پر پھر لعن طعن کرو یا مذاق اڑاؤ۔“

”کیا مذاق اڑاؤں۔ مذاق تو خود میرا دل میرا اڑا رہا ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”تمہارے ساتھ ہو آگئی ہوں۔ سمجھو آگ پر چل کر آئی ہوں۔“ وہ بہت سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔

”اور واپس جا کر۔“

”واپس۔ اب واپس کا کوئی رستہ نہیں۔“ اس نے جوس مائیڈ پر رکھ کر براہ راست عبد العبین کو دیکھا۔

”مطلب؟“ وہ تھوڑا خوش ہوا تھوڑا حیران۔

”تم خوش قسمت ہو۔“ وہ اپنی انگلیاں مسکتے ہوئے بولی۔

”وہ کیسے؟“

”سب کچھ اپنے دل کا حال زبان پر لا سکتے ہو۔“

”اور تم؟“

”میں۔“ اس کی بڑی بڑی آنکھیں رونے سے دھلی دھلی لگ رہی تھیں۔ سیاہ شفاف آنکھیں۔

”میں نے بہت کوشش کی میں تمہیں ٹھکرا سکوں اپنے دل کے حال کو جھٹلا سکوں تمہارے۔“ وہ رکی۔ ”تم جیت گئے۔“ اس کی لڑتی پلکیں اس کے بیان کی سچائی کی گواہ تھیں۔

”میں نہیں تمہاری محبت جیت گئی۔“ عبد العبین اس کے قریب ہوتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔

”اس محبت کا انجام کیا ہو گا۔ تم نے سوچا ہے؟“ شہرینہ نے اس کو ہر اسان نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہمارا ملن اور کچھ نہیں۔“

”تم ابھی نا سمجھ ہو اور میں بھی۔ یہ سب اتنا آسان کبھی نہیں ہو گا۔ جبکہ نہ تمہارے پاس تعلیم ہے نہ کوئی ذہنی۔“ کا دل باریک بینی سے دیکھ رہی اور پھر ہمارے خاندان میں باہر شادیاں نہیں کرتے تمہیں معلوم ہے نا؟“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔

”شہرینہ! مجھ پر یقین کرو میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا اور تم بھی نہیں رہ سکو گی اور خاندان سے باہر شادی نہ کرنا کسی حدیث میں نہیں لکھا۔ رکنی نوکری یا ڈگری کا سوال تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں جب تم سے بندھن باندھوں گا جب تمہارے قدموں گئے نیچے زمین دینے کے قابل ہوں گا اور اس کے لیے میرا سفر شروع ہو چکا ہے۔ بس تھوڑے عرصے کا انتظار ہے جو تمہیں کرنا ہو گا۔“ وہ بہت ہنستے لہجے میں بول رہا تھا۔

”یہ سب خواب ہیں سراب ہیں۔“ وہ شکتے لہجے میں بولی۔

”کیا محبت بھی خواب ہے سراب ہے یا نہیں ملتی؟“ وہ اس کے چہرے کے قریب ہنک آیا۔

”میں محبت خواب نہیں سمجھتا۔ یہ روشن دن کی طرح۔“ شہرینہ نے مسکرا کر اس کے چہرے کو دیکھا ایک ایک یہ چہرہ اسے اچھا لگنے لگا تھا۔

”تو ہمارا ملن بھی خواب نہیں ہو گا سراب نہیں ہو گا۔ تم دیکھنا۔“ وہ عزم سے بولا۔

”اور تم نے مجھے بہت ستایا ہے بہت تڑپایا ہے۔ اتنے مہینوں بعد اقرار کی صورت بنی ہے بہت ظالم ہو تم۔“

”اور جو میں تڑپی ہوں خود سے جھگڑنے میں تمہیں تو اس کی خبر بھی نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”سب خبر ہے تب ہی تمہیں پیچھے نہیں ہٹنا تمہاری لاکھ دل چھکنی کے باوجود۔“

”چلیں اب شہرینہ نے سر اٹھا کر پارک کے سائے کو محسوس کیا۔

”ہاں چلو۔“ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں کل آؤں اسی نام پر۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”کل سنڈے ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”وہ کس پرسوں یا رہے آؤں نا۔“

”نہیں۔“ وہ اسے چراتے ہوئے بولی تو وہ ہنس دیا۔

”ٹاپس دوں تمہارے؟“ وہ اس کے پیچھے سے بولا۔

”نہیں اب یہ میری نشانی ہے تمہارے پیاس۔“

”اتنا یقین آیا ہے تمہ پر؟“ وہ بائیک پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”اس سے بھی زیادہ۔“ اس بار وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے آرام سے بیٹھی تھی بائیک پر۔ اب اسے ذرا بھی ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ نہ بائیک کی تیز رفتاری سے نہ کسی کے دیکھ لینے کا۔ اپنا ہاتھ عبد العبین کے کندھے پر رکھے وہ اس سے بائیں کر رہی تھی۔



”حد ہو گئی یہ سلطان بخت نے کیا مذاق بنا رکھا ہے۔ کبھی لاہور تو کبھی کبھی گھر تو تک کر بیٹھتا نہیں۔ بھلا یہ

کوئی دن ہیں کہیں جانے کے غلہ کٹا ہوا تیار بنا ہے منڈیوں میں ٹرک بھر بھر جا رہے ہیں۔ وصول کون کر رہا ہے
 ٹاپ تول کون کر رہا ہے کسی کو خبر نہیں۔ اب یہ کیا کدھر ہے؟

سیدہ بہت غصے میں تھیں۔ بولتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ سامنے صالحہ شاہ صوفے پر بیٹھی کوئی میگزین
 دیکھ رہی تھیں۔ سیدہ کی باتوں کا انہوں نے ذرا نوٹس نہیں لیا۔ ایک نظر ان کے لال بھیسو کا چہرے کو دیکھا اور پھر
 میگزین کے صفحے پر نگاہیں جمادیں۔

”میں سلطان بخت کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔“ وہ اونچی آواز میں کہتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئیں۔
 ”اسلام آباد کا کہہ کر گئے ہیں بلکہ مجھے فون کر کے بتایا ہے۔ ویسے کدھر ہیں مجھے علم نہیں۔“ صالحہ شاہ نے
 سیدہ کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

”تم نے رو کا کیوں نہیں اسے جانے سے۔“ بریزے چکن کے اٹھوری کلر کے سوٹ میں ان کا سرخ و سفید
 رنگ دکھ رہا تھا۔ صحت مند چہرہ ایسا لال ہو رہا تھا جیسے ابھی خون ٹپک پڑے گا۔
 ”جیسے وہ میرے کہنے پر کہیں آتے جاتے ہیں۔“ صالحہ جل کر بولیں۔

”بی بی! اسے سمجھا تو سکتی ہونا اب تو وہ تمہارے کہنے کا میں ہے ناشلے کے حساب کتاب کا وقت ہے۔ سارے
 سال کی آمدنی کا دارودار ہونا ہے ان دنوں کی ہوشیاری پر اور یہ خدا جانے کدھر لڑے پھر رہے ہیں۔“
 ”جو اوکے کام سے گئے ہیں اسلام آباد۔ اس کا یونیورسٹی میں داخلہ تو ہو چکا ہے۔ کہہ رہے تھے ایک دو پپر
 نامکمل ہیں اس لیے جانا پڑ رہا ہے۔“

”جو اوکے کاموں کے واسطے اس کا باپ ابھی زندہ ہے یہ تو اپنے بھروسے پر کیا جانے لگا۔“
 روڈ کے پاس زرعی زمین کا ایک قطعہ خرید تھا۔ خیال تھا کہ ادھر ریٹ ہاؤس اور شاہ کوئی فارم ہاؤس بنائیں گے
 مگر وہ زمین ایسی زرخیز نکلی کہ ہماری تمام زمینوں کے نصف غلے کے برابر اڑھتے آئے۔ سونا کھنڈے لگا دیا
 جان تو اس زمین کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ سال بھر گندم کی کٹائی کے بعد موسم تک اپنے بچوں کی طرح اپنی کمرانی میں
 اس زمین کا سارا کام کرواتے تھے اور اب تو میں نے منشی کو بلوایا ہے۔ اسے کے پیچھے کھاتے چیک کے نوٹسے وہ بتا رہا
 ہے۔ اس سال اس زمین پر کچھ فصل نہیں اگی یا شاید تھوڑی بہت آئی ہے۔ یعنی لاکھوں کروڑوں کا نقصان۔ مجھے
 تو اس وقت سے آگ لگی ہوئی ہے۔ پردہ بچ میں نہ ہوتا تو میں اس منشی کا کربان بھی لیتی۔ حرام خور ہو رہے ہیں
 سارے ملازم۔ ظاہر ہے جب مالکان سب کچھ ان کمیوں پر پھوڑوں کے تو یہی کچھ ہو گا اور خون جالانے کو روکئی
 میں۔“ سیدہ بھڑک رہی تھیں۔

”تو اب مت جلا میں خون چا کر اپنی حویلی سنبھالیں۔“ صالحہ شاہ رکھائی سے بولیں۔
 ”بی بی! میں یہ سارے جتن تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے ہی کر رہی ہوں اور نہ فکر مت کرو۔ میں ادھر
 آکر بیٹھنے سے رہی۔ اپنی حویلی ہی میں رہوں گی۔ کروا بات ٹیکسی کا کوئی زمانہ نہیں۔ عقل کی بات کوئی نہ بتائے
 اچاڑے جاؤ سارا کچھ باپ دادا کی صدیوں کی محنت کا۔“ اسی وقت شہرینہ اندر داخل ہوئی۔ وہ کلچر یونیفارم میں
 تھی۔ سیدہ کی چیخ و پکار سن کر شاید وہ ادھر ہی آگئی تھی۔

”آئیے آپ بھی یکم صاب! بھلا یہ کالج سے لوٹنے کا ٹائم ہے۔“ وہ شہرینہ پر برس پڑیں۔
 ”گاڑی میں آئی ہوں ڈیڑھ دو گھنٹے کا رست ہے۔ ہزار پار کما ہے مجھے اس عذاب سے نجات دلائیں۔ صبح دوپہر
 کی یہ بیگار۔ کون سا میں یہی کاپڑ میں آتی ہوں کہ گھڑی بھر میں پہنچ جاؤں۔“ شہرینہ بھی چمک کر بولی۔
 ”تمہیں یہی کاپڑ کی کیا ضرورت تمہ تو آج کل دیسے ہی ہو اؤں میں اڑ رہی ہو۔“
 ”آپ کو بڑی خبر رہتی ہے میری کہ میں ہو اؤں میں ہوں یا فضاؤں میں۔“ وہ صالحہ کے سامنے آکر بولی۔
 ”تمہیں یہ بات کرو بھلا مجھی سے تمہاری۔ اس گھر کا تو آوے گا تو ابھی بگڑ گیا ہے۔“ سیدہ غصے سے بولیں۔
 ”تمہیں کی ضرورت صرف مجھے نہیں آج جان ابائیوں کو بھی ہے۔ انہیں بھی سمجھائیں۔“ وہ جھٹ سے بولی۔

”دیکھ لیا آپ نے۔ کیا کیا اور کس کس کو سدھاریں گی۔“ صالحہ شاہ نے فوراً کہا۔
 ”دیکھ رہی ہوں بی بی! دیکھ رہی ہوں۔ بس آلے سلطان بخت اس کا انتظام تو میں آپ کرتی ہوں۔“ وہ شہرینہ کو
 دھمکا کر بولیں۔

”میں کوئی بھینز بکری نہیں ہوں۔ اب کچھ بھی سوچنے سے پہلے سوچ لیجئے گا۔ میں کوئی بے زبان جانور نہیں ہوں،
 ہونہ۔“ شہرینہ پیر پختی کمرے سے نکل گئی۔
 ”وہاں زیادہ خراب ہو رہا ہے اس کا۔“ وہ بڑبڑائیں۔

”تم لاؤ مجھے فون تو دو، میں سلطان بخت کا پتا کروں ہے کدھر۔ کم از کم آکر اس منشی کو تو لگام ڈالے، حساب
 کتاب چیک کرے۔“
 ”ہا جرائی! ہا جرائی!“ صالحہ نے فوراً اٹھ کر فون دینے کے بجائے پکار کر کہا۔ اسی وقت ملازم دوڑی دوڑی

”بی بی! لکن!“
 ”فون دو بھلا بھی بیگم کو نہ لگنا۔“ نے بے نیازی سے میگزین کے صفحے پلٹتے ہوئے کہا۔ اس کی بے نیازی جیسے
 سیدہ کو آگ لگا گئی۔ ملازم نے فون اٹھا لیا نہیں اٹھایا اور وہ خاموشی سے نمبر ملانے لگیں۔
 ”تو موبائل بھی آف کر رکھا ہے اس نے۔“ وہ خود ہی بڑبڑائیں۔

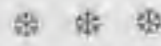
وہ کوئی دو سرائے نمبر ملانے لگیں۔ بیل جا رہی تھی وہ کان سے ریسیور لگا کر صالحہ کو گھوڑے لگیں۔
 ”ہیلو ہاں منظور! میں بول رہی ہوں حویلی سے سیدہ۔“ وہ بارعب لہجے میں بولیں۔
 ”جی میں نے پتہ پا لیا ہے ما لکن! اٹھم۔“ وہ فوراً بولا۔

”سلطان بخت ہے اگھر؟“
 ”جی ہمارے۔“ بی بی ہیں۔“ وہ بولتے ہوئے لڑکھا لیا۔
 ”تمہارے ہیں تو انہیں کو قاریغ ہو کر مجھے فون کر لیں۔“

”جی وہ تو تمہا کر جا چکے ہیں۔ ادھر نہیں ہیں۔“ منظور نے کہا۔
 ”ابھی تو تم کہہ رہے تھے تمہارے ہیں اور ادھر ہی ہیں؟“ وہ ماتھے پر ہل ڈال کر بولیں۔
 ”جی ابھی ادھر تھے اب نہ لگتا رہا ہو کر جا چکے ہیں۔ کہہ رہے تھے یا ہر کے ملکوں کا وزیر اچھڑ گتا ہے اس دفتر
 میں جا رہے ہیں۔“ نام نہان بڑا ہے۔“ منظور جلدی جلدی بولا۔

”منظور! ایک بات یاد رکھنا سلطان بخت بہر حال مجھ سے زیادہ با اختیار نہیں۔ جس دن میں ادھر آگئی اور
 تمہارے بول کا پول کچھ اور اٹکا تو میں نے تمہیں پہلے ہی کہہ رکھا ہے۔ تمہاری تسلیں بھی زمین پر کہیں رہتی نظر
 نہیں آتیں کی سیاور کھنڈ۔“ وہ بہت دھیمی آواز میں دھمکی دیتے ہوئے بولیں۔
 ”ما لکن! جھوٹ نہیں بول رہا۔ آپ یقین۔“

”مجھے اب ادھر آنا ہی پڑے گا۔“ کہتے ہوئے انہوں نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ صالحہ شاہ ان کی طرف ہی
 دیکھ رہی تھیں۔ سیدہ نے فون اٹھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔



”اماں بی بی! یہ رکھ لیں۔“ عبد العین نے اماں بی بی کے ہاتھ میں کچھ دیتے ہوئے دھمکے سے کہا۔ وہ برآمدے
 میں چولہے کے آگے بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھیں۔ جب عبد العین چپکے سے ان کے پاس آکر بیٹھ گیا تھا۔
 ”کیا ہے یہ؟“ انہوں نے منہ پر آیا پینٹہ لعل کے دوپٹے سے پوچھتے ہوئے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا تو ایک دم
 جیسے انہیں کرنٹ لگا۔ وہ ہزار کانٹ تھا۔

”مجھ کو یہ سیر پھیر مت سنا، سچ بتا یہ کہ ہر سے آئے ہیں۔ جو اٹھیا ہے کوئی نشہ پیچا ہے یا کوئی اور کالا دھند آ گیا ہے۔ بالکل سچ بول۔“ وہ جیسے بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے ذرا تحمل سے بولے۔
 ”کوئی ایسا غلط کام نہیں کیا میرے ہیں۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بے خوفی سے بولا۔
 ”یہ نہیں بتائے گا تو یہ چاہتا ہے کہ پولیس میرے دروازے پر آئے اور تجھ سے سچ اگلوائے۔“ انہوں نے نفرت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”بابا صاحب! میں کیسے سمجھاؤں آپ کو ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ کو وہ ہم۔“ وہ تیزی سے اس کی طرف جھٹکتے اور اس کے تپکنے سے پہلے ہی ایک زوردار دھمکائی کے جڑے پردے مارا۔ عبدالعین کے منہ سے ایک کراہ نکل گئی۔ اس کے اوپری ہونٹ سے یکایک خون نکل رہا تھا۔
 ”ہائے میں مر گئی۔“ ماں جی بے ساختہ تڑپ اٹھیں۔
 ”بابا صاحب! اسے آئیے پیئیں؟“ اسے یوں زخمی دیکھ کر صوفی صاحب کے دل کو عجیب سا اطمینان ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بولے۔

”میرے ہیں میرے ہیں میرے ہیں۔ ہزار بار لاکھ بار بھی پوچھیں تو بھی یہی کہوں گا۔“ وہ زور سے چیخا اور قیاس کے دامن سے اپنا ہونٹ صاف کرنے لگا۔

”نکل جا ادھر سے دفغان ہو جا۔ تیرے جیسے جھوٹے فرائضے چور اچھے کی اس گھر میں کوئی جگہ نہیں۔ دفع ہو جا نکل۔“ انہوں نے اسے کندھے سے پکڑ کر زور سے دھکا دیا تھا۔ وہ بیڑھیوں کے پاس جا کر تڑپ سنبھل سکا۔

”یہ گھر میرا نہیں ہے تو آپ کا بھی نہیں ہے اور آپ جاے مجھے دھکے دے کر نکال دیں میں شب بھی ادھر سے نہیں جاؤں گا۔ میں عبدالعین نہیں ہوں بابا صاحب! میں عبدالعین ہوں۔ اس گھر کو اپنی ماں جی کو اور اپنی بیٹیوں کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“ وہ اپنے پیچھے وں کا پورا زور لگا کر چیخ رہا تھا۔

”چوری اور سیرت زوری۔ بد معاش، ملعون، خبیث، شیطان فرج ہو گیا۔“ انہوں نے نپاؤں میں پراپنا ہونا اتارا اور کھینچ کر اسے مارا تھا۔ وہ فوراً پرے لٹک گیا۔ ”میں تیرے منحوس وجود کو ایک پل اس گھر میں برداشت نہیں کر سکتا اور تو بھول جا کہ میں تیرے دو بارہ کھلی اس گھر کی دیلیز عبور کرتے ہوں گا۔ جہاں وہ منحوس بے دید دفغان ہوا وہیں تو بھی چلا جا میں۔“ بیٹیوں کا جھپٹتے ہوئے بھری زبانی میں مر گئے۔ میری کوئی تریبہ اولاد۔“

والدہ بی بی تڑپ کر آئے۔ ”میں اور بے اختیار صوفی صاحب کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔“
 ”اللہ نہ کرے، میں ایسے کلمات منہ سے نکالتے ہیں۔ آرام سے پوچھیں اس۔“

”میں نے تم پر اہلی بی بی اندر مجھے اس حرام خور سے خود پختہ دیا۔ ایسی ملعون اولاد تو کسی کی نہ ہو جیسی اللہ نے مجھے دی۔ نکل جا ادھر سے۔“ وہ ایک پاؤں میں جوتا پٹنے سے مارنے کو لٹکے۔

”جا رہا ہوں میں مجھے خود اس دونٹ میں رہنے کا کچھ شوق نہیں مگر میں یہاں سے جاؤں گا نہیں۔ ماں جی! میری روتی پکا بیجے گا میں کھانا کھانا ہوں ابھی آکر۔“ وہ قیاس کے دامن سے مسلسل رستے ہونٹ کو ساف کرنا ہوا بیڑھیوں اترنے لگا۔

”یہ جنم کا اندھن بھی لے جا ادھر سے اور اپنی منحوس شکل لے کر ادھر دوبارہ مت آنا ورنہ ان ناکوں سے بیڑھیوں نہ اتر سکو گے۔“ وہ اسی طرح دھاڑے لگے اور ہزار کانٹ مروڑ کر اس کے پیچھے اچھال دیا تھا۔

”ابو نہ! میں کیوں نہیں جا رہا ہے فکر رہیں۔ ادھر ہی ہوں۔“ وہ تیزی سے بیڑھیوں اتر گیا اور آخری بیڑھیوں کے پاس اس کلفظ کی گولی کو جھک کر اٹھایا کھول کر سیدھا کیا اور قیاس کی جیب میں رکھ لیا۔ صوفی صاحب نے تنفر سے اسے الٹ نظر دیکھا اور الٹے الٹے بڑھ گئے۔

”اب آکر میں نے اسے دوبارہ اس گھر میں دیکھا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔ سنا تم لوگوں نے۔“ وہ پلٹ کر خالی صحن اور سامنے کمروں کی طرف دیکھ کر زور سے بولے۔ ”مجھ سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ مجھ سے بیڑھتے ہوئے

”یہ یہ کہاں سے آئے تمہارے پاس؟“ انہوں نے نوٹ ایک دم سے نیچے گرا دیا۔
 ”ماں جی! میری محنت کی کمائی ہے۔ اڑائے نہیں کسی کے۔ آپ رکھ لیں۔ گھر کا سودا وغیرہ منگوا لیجے گا۔“ اس نے کہتے ہوئے دوبارہ نوٹ انہیں تھماتا چاہا کہ اچانک کسی نے پیچھے سے چھینا مار کر نوٹ اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ وہ تڑپ کر مڑا اور دھک سے رو گیا۔

صوفی صاحب ہاتھ میں ہزار کانٹ پکڑے اسے قہر آلود نگاہوں سے گھور رہے تھے۔
 ”یہ کہاں سے آئے؟“ انہوں نے نوٹ اس کے چہرے کے آگے لہرایا۔

”مہم۔ میرے ہیں۔“ اس نے یکدم خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری۔
 ”اچھا۔“ انہوں نے غصے سے ہنکارا بھرا۔ ”تو یہ کس رہ گئی تھی چوری چکاری کی باقی کے سارے تیل بوٹے برائیوں کے تیرے ماتھے پر جج چلے۔ اب یہ داغ تو نے ہمارے چہروں پر لگانا تھا۔ بولو کہاں سے آئے؟“ ان کا ہاتھ بے اختیار اٹھا اور اس کے دائیں رخسار پر اس قدر زور سے بڑا کہ وہ بری طرح لڑکھڑا گیا۔

”حرام خور، بد بخت، منحوس، چور اچھے، ڈیل، کھنڈیا۔ ایسی سو قاتل رہ گئی تھیں میری اولاد بننے کو۔“ وہ اس کے پیچھے عقاب کی طرح جھپٹے اور کالر سے اسے زور سے پکڑ کر اپنی طرف کھمبایا۔ اس کے کہنے کھٹکے والے بالوں کو دو سری مٹھی میں جکڑا اور دو سرا پھیرا اس کے چہرے پر رسید کرنا ہی چاہتے تھے کہ اس نے پورا زور لگا کر خود کو جھکائی دی اور اپنا آپ چھڑا کر پیچھے ہو گیا۔

”میں نے کوئی چوری نہیں کی یہ میری محنت کی کمائی ہے اور یہ میں آپ کے لیے لایا بھی نہیں۔ یہ ماں جی اور۔“ اس نے گردن زور سے جھٹک کر اپنا گردن درست کیا اور ہاتھ سے بال جھیک کرنے لگا۔ چہرے کے دائیں رخسار سے علیحدہ چنگاریاں ہی پھوٹ رہی تھیں۔

”ماں جی۔ تیری تو۔“ وہ پھر اس کی طرف جھپٹے۔ ”نکل جا ادھر سے چور ہمیں حرام کی لت ڈالنے آیا ہے۔ ہم بھوکے مر رہے ہیں قاتلوں سے ہماری آخری سانس سینوں میں اٹک رہی ہے اور تو ہمیں یہ بول بھری عیاشی، جنم کا اندھن کھلانے آیا ہے۔ بد معاش، تینا کس کے اٹھائے ہیں یہ پیچھے؟“ انہوں نے جیسے ہی مارنے کو منکا ہوا میں لہرایا۔ وہ ایک بار پھر انہیں جھکائی دے کر غسل خانے کے دروازے کے پاس چلا گیا ہوا۔ آمنہ زینب اور جویریہ چھوٹے کمرے کی دیلیز سے چپکی کھڑی تھیں۔ ماں جی اپنا سینہ تمام کر بیٹھی تھیں۔

”میں آپ کو بتا چکا ہوں بابا صاحب! یہ میرے اپنے پیسے ہیں اور میں نے خود کمائے ہیں۔“ وہ ان کی ”وہشت“ سے سنبھل چکا تھا۔ بڑے آرام سے بولا تھا۔

”ایسا کون سا راتوں رات مجھے جا دو سو جہ گیا ہے جس میں پہلا ہاتھ ہی ہزار کے نوٹ پر پڑا ہے۔ میں پورا مینہ مغز ماری کرتا ہوں کہنے کی طرح ہمارا مارا لوگوں کے گھروں میں ٹوشن پڑھانے جاتا ہوں اپنی جان حلال کر کے پھر مجھے ایسے تین چار نوٹ نظر آتے ہیں اور تو ایک دن میں کما کر لے آیا ہے۔ سچ بتائے گا یا میں خود مجھے پولیس کے حوالے کروں۔“

ان کی آنکھوں میں ذرا بھی پہچان یا لحاظ نہیں تھا۔ ان کا ہنس چلا تو وہ فوراً اسے وہ پولیس کے حوالے کر دیتے۔
 ”بابا صاحب! یہ میرے پیسے ہیں۔ آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔ یہ میں نے خود کمائے ہیں اور میرا کام آپ جیسا نہیں جو زور کر دو تین ہزار روپے کماؤں۔ میں۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون سا ایسا پروفیشن یا جاب کا نام نہیں بتائے کہ صوفی صاحب قائل من ہو جائیں۔

”عبدالعین!“ وہ اتنی زور سے دھاڑے کہ جویریہ کی چیخ نکل گئی۔ اس کا دل بہت کمزور تھا۔ اونچی اور اچانک آواز سے وہ ایسے ہی ڈر جایا کرتی تھی۔ صوفی صاحب نے جویریہ کو کھاجانے والی نظروں سے گھورا۔
 ”دفع ہو جاؤ تم تینوں اندر۔“ ان کی کرخت آواز پر تینوں جلدی سے اندر کمرے میں مڑ گئیں۔

مغسل خانے میں وضو کرنے چلے گئے۔

عبدالعبین نیچے اتر کر مسجد میں چلا گیا اور ٹوٹی کے آگے بیٹھ کر کلیاں کرنے لگا۔ کافی دیر تک خوب پانی ہونٹوں پر ڈالنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ خون رک گیا ہے تو وہ قمیص کے دامن سے منہ صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ جلیل اس کے پیچھے کھڑا اسے حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے عبدالعبین کے ہنسنے ہونٹ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔
”نظر نہیں آ رہا۔“ وہ رکھائی سے بولا اور آگے بڑھ گیا۔

”لگتا ہے صوفی صاحب نے ”تواضع“ کی ہے آج تمہاری بڑے عرصے بعد۔“ جلیل اس کے پیچھے آہستگی سے بولا۔

”کیا کہا تم نے؟“ عبدالعبین نے غرا کر کہا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ کندھے اڑکا کر بولا۔

”اندر کمرے میں کوئی ہے تو نہیں۔ میں تمہارے بستر میں سونا چاہ رہا ہوں مجھے نیند آرہی ہے۔“
”نہیں کوئی نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے میں سوئے جا رہا ہوں۔“ وہ کہہ کر مسجد کی بغل میں بے چہوئے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
”اور سنو۔“ وہ رک کر بولا۔ ”اگر بابا صاحب میرا پوچھیں تو کہہ دینا میں ابھر نہیں آیا۔“

”اور کدھر؟“ جلیل نے کچھ حیرانی سے پوچھا۔

”تمہارے کمرے میں اور کدھر۔“ وہ تھلا کر بولا۔

”تمہیں معلوم ہے میں جھوٹ نہیں بولتا۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

”زیادہ میرے سامنے حاجی صاحب بننے کی ضرورت نہیں۔ اگر تمہارے بارے میں بابا صاحب کو بتا دیا دیکھتا ہوں تمہیں سچ جھوٹ کچھ بھی بولنے کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ اسے دھمکی دیتے ہوئے بولا۔

”تم مجھے دھمکا رہے ہو؟“ جلیل نے کچھ غصے سے کہا۔

”تم جو بھی سمجھ لو ویسے میں بتا رہا ہوں۔ اگر کچھ کرنا ہو گا تو دھمکانے کی مہلت بھی نہیں دوں گا“ سمجھے۔“ وہ انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کرتے ہوئے کمرے میں گھس گیا۔

”زیادہ ہی حضرت آج کل ہواؤں میں اڑ رہے ہیں۔ بتا نہیں خود کو کیا سمجھنے لگا ہے۔“ اور اس سے ڈرنا بھی نہیں۔ اگر صوفی صاحب نے پوچھا تو صاف بتا دوں گا۔“ جلیل منہ میں بڑبڑایا۔

گاڑی کی تیز بیڈلائٹس پر اس کی آنکھیں چند حیا گئیں۔ رعنا نے جلدی سے اپنا ہاتھ دونوں آنکھوں پر رکھ لیا جیسے ہی گاڑی کی لائٹس بند ہوئیں وہ ہاتھ ہٹا کر گاڑی کی طرف دیکھنے لگی۔ فخر حیات نے بریف کیس ڈرا یور کے حوالے کیا اور اتر کر اندر جانے لگے کہ اچانک ان کی نظر ان کے سٹی بیچ پر بیٹھی رعنا پر پڑی تو وہ کچھ حیران ہوتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔

”خیریت“ تم اس وقت تک جاگ رہی ہو؟“ وہ رعنا کے پاس آ کر بولے۔ رعنا سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔

”تھکن ان کے چہرے سے اور ڈھیلے ڈھیلے انداز سے ہویدا تھی۔“

”تاہم کبھی کبھی ہے ڈھائی بج رہے ہیں۔“ فخر حیات نے پھر کہا۔

”آپ کو معلوم ہے ڈھائی بج رہے ہیں۔“ وہ سچی سے بولی۔

”معلوم ہے تو کہہ رہا ہوں تاہم سو میں نہیں ابھی تک؟“ وہ کچھ آگرا کر رعنا کے برابر بیٹھ گئے۔ فضا میں اچھی خاصی خشکی تھی۔ نیلا آسمان تاروں سے جگمگا رہا تھا پھولوں اور سبزے کی ملی جلی خوشبو نے سارے ماحول ہی کو

مضطرب کر رکھا تھا۔

”اگر رات کے ڈھائی بجے ہر انسان کو سو جانا چاہیے تو آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔“ وہ طنز سے بولی۔
”رعنا! پلیز میں اس وقت کوئی کسولی کھیلنے کے موڈ میں نہیں ہوں نہمت تھکاؤٹ ہو رہی ہے۔ چلو اندر باقی کے

سوال جواب اندر جا کر کر لیں“ میں اتنے میں فریض ہو جاؤں گا۔ مجھے بہت سخت نیند آرہی ہے۔“ وہ سخت بیزار لگ رہے تھے۔

”رات کے ڈھائی بجے تک گھر سے باہر آپ بالکل نہیں تھکے جیسے ہی گھر کا گیٹ عبور کیا“ آپ پر تھکاؤٹ مکمل طور پر طاری ہو جاتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے فخر؟“ وہ باچا کر کہنے لگی۔

”اس کی وجہ تم ہو۔“ وہ سرو لگا ہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

”میں۔“ رعنا نے اپنے سینے پر انگلی رکھی۔ ”مطلب؟“ اس کی آنکھیں سکڑ گئی تھیں اور ماتھے پر ہل پر گئے تھے۔

”تمہاری یہ فعل کی انکو اڑی۔ کچھ پوچھتا ہے تو سیدھے سیدھے پوچھ لو کہ فخر حیات صاحب! آپ رات کے ڈھائی بجے کدھر سے گھر لائے ہیں۔ اگرچہ یہ بات پہلے سے تمہارے علم میں ہے کہ میں کدھر تھا۔“ وہ بتا کر بولے۔

”رات ساڑھے گیارہ بجے کے بعد تمہارے آپ کا موبائل مکمل طور پر آف ہے تو مجھے کیسے معلوم ہو گا کہ آپ کہاں ہیں۔“ وہ غصے سے بولی۔

”جتنی بتا کر دیا تھا کہ صبح صاحب کی اکلوتی صاحبزادی کی برتھ ڈے تھی آج۔ جیم خانہ میں اتنا گریڈ فلکس تھا“ کتنے فلیٹرز تک آئے ہوئے تھے۔ وی کی ہیڈ کا ہجوم تھا۔ فلکس بار بجے تو اشارت ہوا بعد میں ڈنر اور

دوسرے پروگرامز اور اس میں ڈھائی بجے زیادہ نہیں۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تفصیل بتانے لگے۔

”ہاں دو ڈھائی بجے ایسے رنگین فلکس میں آپ کے لیے کچھ بھی زیادہ نہیں اور صبح صاحب کی صاحبزادی بزنس سرکل میں آج کل کس طرح سوسائٹی ہو گلائی جی اڑ رہی ہے۔ کیا مجھے اس کا علم نہیں۔“ وہ پھر طنز سے بولی۔

”نہر ان رعنا! ابھی تک تمہارا فون آٹھ سوں صدی کی پھیل رہا ہے۔ ڈیرا یہ سب کچھ ہماری سوشل ایکٹیویٹیز کا لازمی حصہ ہے اور مجھے ابھی ادھر آئے دن ہی کہتے ہوئے ہیں۔ جیم کے الیکشن ہو رہے ہیں اور مجھے کسی مضبوط شخص کی ٹیور کے ساتھ ان الیکشن میں اپنے قدم جمانے ہیں اور صبح صاحب اس وقت شہر کے کاروباری حلقوں کا سب سے مضبوط ستون ہیں“ تمہیں معلوم ہے نا۔ بزنس میں پیر جمانے کے لیے یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے اور میں نے تم سے کہا تھا کہ تم بھی میرے ساتھ چلو مگر تمہارے دماغ پر آج کل پھر وہی قنوطیت کا

بھوت سوار ہے۔ اب میں تمہارے ساتھ جڑ کر گھر میں تو نہیں بیٹھ سکتا۔“

”آپ پہلے کب جڑ کر گھر میں میرے ساتھ بیٹھے ہیں۔ میں تو اول روز سے تنہا تھی۔ آپ اور آپ کی بزنس ایکٹیویٹیز کتنا بھاتی ہوں میں آپ کے ساتھ مگر پھر مڑ کر دیکھتی ہوں تو آپ ساتھ ہوتے ہی نہیں۔ مجھ سے آگے ہی آگے الگ تھلاک دوڑ رہے ہوتے ہیں۔“ وہ جیسے تھک کر بولی۔

”پھر وہی ڈپریشن۔ یا راتم اپنا کنسلٹنٹ بیچ کر او۔ بجائے اتفاق ہونے کے تمہارا دماغ پھر الٹی سمت چلنے لگا ہے۔ چلو اب اندر چل کر ریسٹ کرو۔ نیند نہیں آرہی تو کوئی دوائی لے لو مگر خود کو یوں سوچ سوچ کر بلکان مت کرو۔ اس طرح ڈپریشن رہو گی تو بعد میں مصیبت بھی مجھے ہی اٹھانی پڑے گی۔“ آخری فقرہ وہ بڑبڑانے والے انداز میں انہوں نے کہا۔

”ہاں مجھے معلوم ہے۔“ رعنا نے سر اٹھا کر گرا سانس لیا۔ ”اب آہستہ آہستہ میں آپ کو مصیبت ہی تو لگنے لگی ہوں۔“

”رعنا پلیٹو۔ اتنی رات کو اتنی بوری فرسٹریشن سے بھر پور گفتگو مت کرو۔ تمہاری دلجوئی کے لیے اس وقت میرے پاس جذبات تو ہیں مگر تمہارے لیے ڈیڑھ سارے نکلے نہیں۔ میں بہت تھک چکا ہوں۔“ وہ شیخ سے سر تکا کر بولے۔

”آپ کے پاس میری دلجوئی کے لیے نہ تو جذبات ہیں نہ الفاظ۔ بس دکھاو اپنی دکھاو ہے۔“ وہ رکھ سے بولی۔

”تمہاری این جی او کی ورکنگ کمیٹی کا ایجوکیشن پراجیکٹ کیسا جا رہا ہے؟“ آئی مین ”متم لوگ کچھ ماڈل اسکول وغیرہ جو پلان کر رہے تھے ایجوکیشن اور ایس (آگاہی) کے سلسلے میں؟“ انہوں نے موضوع بدلا۔

”ابھی ہو مہرک ہو رہا ہے۔“ رعنا نے اپنی کینٹی ویائی۔

”سیٹی سو کیا۔“ فخر حیات اب اندر بھاگے کو اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”میں یہاں کس لیے بیٹھی رو رہی ہوں۔“ وہ جھلا کر بولی۔

”مطلب؟“

”سیٹی گھر پہ نہیں ہے وہ شام پانچ بجے گھر سے نکلا تھا اور ابھی تک نہیں لوٹا۔ اس کا موبائل بھی آف ہے۔ میں اسی لیے تو اس قدر پریشان تھی۔ آپ دونوں باپ بیٹے یونہی بے فکر ہو کر گھر سے نکلے ہو۔“

”اس نے کال بھی نہیں کی کوئی؟“ فخر حیات فکر مندی سے بولے۔

”نہیں کوئی بھی نہیں۔ حالانکہ مجھ سے کہہ گیا تھا کہ ماما! میں ڈنر آپ کے ساتھ کروں گا میں نے اس کے انتظار میں کھانا بھی پارہ بچے کے بعد کھایا ہے پھر بھی۔“

”اور تم نے کچھ سہلے کیوں نہیں بتایا؟“ فخر حیات پھر بیٹھ گئے۔ ”اس کے فریڈ سے معلوم کیا تھا۔“

”کیا تھا اس کے فریڈ کو سہلے ہی کہتے۔ عام بتا رہا تھا وہ رات میں بیٹے کے قریب اس کے پاس سے اٹھ کر گیا تھا کہ وہ اب گھر جا رہا ہے اور ابھی تک نہیں پہنچا۔“ رعنا بہت فکر مند آواز میں فخر حیات کی ہونے لگی۔

”چھاپو! اندر میں ادھر ادھر فون کر کے معلوم کرتا ہوں۔“ وہ پھر اٹھ کر رعنا کی گود میں پڑے موبائل کی ہپ بچا لگی۔

”اوہ سیٹی کا فون ہے۔“ رعنا نے بے اختیار کہا۔

”سیلو سیٹی جان! تم کہاں ہو؟ تم کو نام ہو کیا اور۔“

”مام میری گاڑی خراب ہو گئی تھی اس لیے وہ یہ کہتی۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”تو جیسا مجھے انفارم تو کر دیتا تھا۔ میں ادھر پریشان نہیں تھی۔“ وہ بے قراری سے بولی۔

”اب گاڑی کی پریشانی میں لگا رہا۔ آپ سو جائیں آرام سے میں ٹھیک ہوں۔“ وہ شاید آف کرنے لگا تھا۔

”تم گھر نہیں آؤ گے کیا کہاں سے بول رہے ہو؟“

”مام! میں اب سب سچ آجاتوں گا۔ میں مای کی طرف سے بول رہا ہوں۔ گاڑی ان کے گھر کے پاس آکر خراب ہوئی تھی۔ میں نے کھانا بھی ادھر ہی کھا لیا تھا اب بہت رات ہو چکی ہے ماسوں جان اور مای مجھے آتے نہیں دے رہے۔ اب میں سب سچ ہی کہوں گا۔ آپ بھی سو جائیں کوئی فکر نہ کریں۔“ گلا تھپتھپا کوئی دیکھنے لگا۔ ”اس نے کال آف کر دی۔“

”کہاں سے بول رہا تھا؟“ فخر حیات نے جلدی سے پوچھا۔

”بھائی جان کی طرف سے ان کے گھر کے قریب گاڑی خراب ہو گئی ہے اس کی۔“ وہ جیسے نظریں چرا کر بولی۔

”دونوں خاموش ہو گئے۔ کئی دیر انہیں اسی طرح خاموش بیٹھے گزار گئی۔ رات کا آخری چہر اور لان کا سناٹا جیسے خاموشی منظم ہونے لگی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ کافی دیر بعد فخر حیات نے دیکھی گواہ میں پوچھا۔

”مجھے کیا سوچتا ہے۔“ رعنا نے ایک طویل گہرا سانس لیا۔ ”انسان جو کچھ سوچتا ہے بیٹھ وہ کب ہوتا ہے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نے شہر بھر کے بلکہ کراچی اور اسلام آباد کے بہترین کالج اور یونیورسٹیز کے پراپٹیشن اور داخلہ فارمز نکلاوا کر سیٹی کے آگے رکھے کہ جہاں اس کا دل چاہے اس کا ایڈمیشن ہو جائے گا مگر اس نے ریپاس نہیں دیا۔ وہ بالکل بھی انٹرسٹڈ نہیں ہے یہاں پڑھنے میں۔“ فخر حیات نے لان کی مدد صدم لائٹس میں رعنا کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”پھر وہ کیا چاہتا ہے؟“ وہ سختی سے بولی۔

”میرا خیال ہے ہم نے جلد بازی کی۔“ فخر حیات اپنی سختی سے بولے۔ ”واپس آئے ہیں۔“

”تو وہاں کون سا وہ قابلیت کے جھنڈے گاڑ رہا تھا۔“ لعلی کا گرو کی اس کی زیرو سے ہاتھ اوپر تھی اور کرکٹرز کی ٹیسٹ کے لحاظ سے وہ زیرو سے بھی نیچے جا رہا تھا۔“

”وہ کچھ ٹھیک ہے مگر تین چار سال میں اس کی تعلیم تو کسی نہ کسی طرح مکمل ہو جاتی۔ وہاں کی ڈگری اور گریڈ میں ہو تو بھی ہائی اسکول ہی جاتی ہے۔ ویسے بھی اس نے کون سا جواب کرنی ہے۔ اگر فیکٹری کا مسئلہ کھٹائی میں نہ پڑ جاتا تو میں اسے کسی نہ کسی طرح ادھر ہی نکال لیتا۔“

”پھر اب آپ کیا کہتے ہیں۔ میں اسے دوبارہ ادھر بھیج دوں۔ شراب اور شباب کے سمندر میں غرق ہونے کے لیے۔“ وہ تڑپتی سے بولی۔

”تمہارا کیا خیال ہے ادھر وہ یہ؟“ شعل ”ترک کر چکا ہے۔ رعنا! ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ ادھر یہ کام چھپ چھپا کر کرتا تھا یہاں اسے اتنا ہی ڈر نہیں رہا۔ ضد میں آکر ہر دوسرے پوتے روز کسی نہ کسی جگہ پر رات گزارتا ہے تمہارے علم میں نہیں شاید اور پھر یہ فرزین کا چکر تازہ کیا کریں۔“ وہ جیسے زنج آکر بولے۔

UrduPhoto.com

”میرا خیال ہے اسے لندن بھجوا دیتے ہیں۔ میرا تو یوں بھی وہاں مینے دو مینے بعد وزٹ لازمی ہے۔ وہاں کی مین براؤنچ رہی ابھی ہمارے ادھر کے سارے بزنس کا انحصار ہے۔ ادھر ابھی میری توجہ کی ضرورت ہے۔“

”تو پھر ابھی واپس آنے کی کیا ضرورت تھی دو چار سال اور گزار لیتے۔“

”تم خود انخواہ اس کو تو بھی ہو رہی ہو۔ تین چار سال کی بات ہے وہاں رہے گا تو کوئی نہ کوئی ڈگری ہاتھ آجائے گی۔ دیکھنا تو تین چار سال بعد ایک بالکل سٹیج مین بنیں گے۔ ادھر آؤں میں بھی کسی نہ کسی سیٹ پر میں اسے جگہ ملے گی۔ مصروف بھی ہو جائے گا تم یقین کرو۔“ وہ اسے قائل کر رہے تھے۔

”جیسے تو اب کسی بھی بات کا یقین نہیں رہا۔“ وہ بڑبڑائی۔

”چھاب اندر تو چلو میرا تو جسم تھکن سے اڑ گیا ہے۔ صبح اس پر مکمل ڈسکشن کریں گے آجاؤ اندر۔“ وہ ایک دم سے اٹھے اور لے لیے ڈگ بھرتے اندر کی طرف چلے گئے۔ رعنا نے ایک گہرا سانس لیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ سٹی بیچ پر بیٹھے بیٹھے اس کا اپنا جسم بھی اڑ گیا تھا۔ وہ ست قدموں سے چلنے لگی۔

وہ سروٹ کوارٹرز کے پاس سے گزر رہی تھی جب اس کی یونہی نظر جتناں کے کوارٹرز کے اوپر کھلے دروازے پر پڑی۔ کوارٹرز کے صحن میں جتناں بان کی کھری چار بان کی برمنڈ کھولے بے خبر سو رہی تھی۔ حالانکہ بلب کی روشنی میں اس کے سر پر منڈلاتے چھمکوں کا غول دور سے نظر آ رہا تھا۔ ”گلوہ بے خبر سو رہی تھی۔“

”کس قدر خوش نصیب ہے یہ عورت جسے ایسی پرسکون نیند نصیب ہے۔“ رعنا نے ایک رشک بھری نظر اس پر ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔

”آہم۔ کیا ہو رہا ہے سسٹرز۔“ عبدالعین نے کمرے میں داخل ہو کر کھٹکھا رتے ہوئے پوچھا تو نہ سنبھو

کرتی پر بیٹھی جھانپاں لے رہی تھی سیدھی ہو گئی
 "بابا صاحب! نیچے گئے تھے ابھی۔" زینب نے دہلی آواز میں اسے بتایا۔
 "معلوم ہے مجھے۔ وہ یوشن پر بھانے گئے ہیں انہی لیے تو اوپر آیا ہوں۔" وہ آرام سے آمنہ کے سر کی طرف
 پینک کی پائنٹی پر ٹک گیا۔

"وہ پھر سے کہاں تھے؟" زینب نے مجھس ہو کر پوچھا۔
 "جیل کے بستر میں سو رہا تھا۔ بڑے مزے کی نیند آئی۔"
 "ہاں وہ سنائی بھی تو بہت دنوں بعد ہوئی تھی۔" زینب نے سر ہلا کر کہا۔
 "ہم ایسی چھوٹی موٹی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔" اس نے کار بجاڑا۔
 "تم نے پیسے کہاں سے لیے تھے؟" آمنہ نے پوچھا۔
 "چلو ایک تم رہ گئی تھیں بابا صاحب کی جائشین ہریات ان کی طرح سر پر سوار کرنے والی۔" وہ منہ بنا کر بولا۔
 "میں کون سا۔"

"تم لوگوں کا زلت کب ہے؟" وہ آمنہ کی بات کاٹ کر بولا۔
 "جب تمہارا ہے۔" زینب فوراً بولی۔
 "اپنا تو سمجھو نکل آیا۔" وہ فوراً بولا۔
 "کیا مطلب؟"

"مطلب کو چھوڑو تم دونوں نے آگے کا لچ میں داخلہ لینا ہے؟"
 "وہ تو لازمی لینا ہے۔" زینب جھٹ سے بولی۔
 "چاہے نکل ہو جاؤ۔" عبد العین نے اسے چرایا۔

"تمہارے منہ میں خاک۔ بابا صاحب کو بتا کر تمہاری اور خاطر کرواؤں گی۔" وہ منہ بنا کر بولی۔
 "اب ایڈیشن خالی پاس ہونے سے تو نہیں ہو جاتا زینب بی بی! عبد العین نے جیسے اس کی دھمکی گوسا
 نہیں۔

"معلوم ہے پیسوں سے ہوتا ہے بابا صاحب نے وعدہ کیا ہے وہی نہیں گے۔"
 "وہ کہاں سے دیں گے۔ ان کے پاس تو گھر کے خرچ کے لیے پیسے نہیں ہو گئے۔"
 "ہاں وہ تم لا کر دیتے ہوتا۔" آمنہ بیروانی۔

"پینک! عبد العین نے آمنہ کو بیخیزا۔" ویسے زینب! تم کا لچ کا پتہ معلوم جاؤ تو پوچھا ہے۔
 "عبد العین! تم اب مجھ سے پونگے۔ سب کچھ تو پھوڑو رہا ہے اپنا گھر کاؤں! اچھی خوشحال زندگی۔" اس نے
 خواب بھی پھوڑو دیں پھر ہم زندہ کس لیے ہیں۔" وہ رو پیٹے کو تھی۔
 "اچھا رومت۔ یہ لو اپنے داخلے کے لیے رکھ لو۔" اس نے جیب سے ہزار کا نوٹ نکال کر زینب کے
 آگے کیا۔

"اے۔" اس کی آنکھیں جیسے پھٹ سی گئیں۔ "یہ مسج والا نوٹ ہے اب کیا مجھے پتاؤ گے۔" زینب نے
 دل چاہنے کے باوجود نوٹ نہیں تھا۔

"مسج والا نہیں ہے۔ تمہارے لیے ہے۔ لینا ہے تو لے لو پھر یہ موقع نہیں آئے گا۔" عبد العین نے نوٹ والا
 ہاتھ اور آگے کیا تو زینب نے ایک پل کو سوچا اور نوٹ تقام لیا۔

"تم عقل مند ہو رہو! اچھا میرے لیے ایک چائے کا کپ تو بنا کر لاؤ۔" سر میں درد ہے۔ قافٹ لانا بابا صاحب
 کے آنے سے پہلے مجھے اوہر سے رو چکر ہونا ہے۔"
 زینب سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی مٹھی میں نوٹ کیا آیا تھا اس کی ساری سستی رفع ہو گئی تھی۔

وہ تیزی سے چائے بنا کر چلی گئی۔

"تمہارے پاس آخر اتنے پیسے آئے کہاں سے؟" آمنہ اس کے جاتے ہی بولی۔

"میں نے کمائے ہیں۔ اب میں مکاؤ پوت ہو گیا ہوں۔" وہ فخر سے بولا۔

"میں نہیں مانتی۔ نہ تو تم گھر سے زیادہ بر تک فائدہ رہے ہو نہ کہیں باقاعدگی سے جاتے رہے ہو تو کیا سونے
 میں کماتے رہے ہو؟"

"بس سمجھ لو جب قسمت مہربان ہوتی ہے تو سوتے میں بھی بچھڑ پھاڑ کر مہربان ہو جاتی ہے۔"

"ہمین! دیکھو یہ اچھی بات نہیں ہے تم اس طرح کسی بھی غلط راستے پر چل کر پیسوں کے لالچ میں خود کو تباہ
 کر لو گے ہم میں سے کسی کو بھی منظور نہیں۔ ایسا پیسہ خوشی یا خوشحالی نہیں لانا دکھ اور خدا انخواست تباہی لاتا ہے۔"
 "اچھا استانی صاحب! ابھی آخر تم لوگ مان کیوں نہیں لینے کہ میں اتنے پیسے کہا بھی سکتا ہوں۔ آج کے زمانے
 میں یہ کوئی انمولی بات تو نہیں۔" وہ جھٹا کر بولا۔

"تم نے اس کے لیے یہ انمولی ہی ہے جبکہ تم میں ہمیں نہ کوئی قابلیت نظر آتی ہے نہ ڈگری نہ ہنر۔"

"اف میں کیسے سمجھاؤں تمہیں آج کل پیسے ڈھیروں ڈھیروں کمائے گئے ہیں ان تینوں میں سے کوئی بھی بات
 ضروری نہیں۔ آج کل تو لوگ جو میرے جیسے تھے ہوتے ہیں چچا ہیں تو وہ بھی راتوں رات نوٹ چھاپ سکتے ہیں۔"
 اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح آمنہ کو سمجھائے۔

"ہم شاید تمہاری طرح غیر معمولی ذہین نہیں ہیں اس لیے نہیں سمجھ سکتے۔ ایسے کون سے نکلے لوگ ہوتے
 ہیں جو نوٹ چھاپ سکتے ہیں۔"

"تم کی بابا صاحب کی بیٹی ہو! وہ وراثت لکھا کر بولا۔ وہ چپ رہی۔

"وہی بات ہے تو واقعی ناقابل تین گروہ لو کی بیٹی ہے۔ میں نے نہ تو یہ پیسے کسی کے چرائے ہیں نہ کسی کی
 جیب کٹی ہے نہ فراڈ کیا ہے۔"

"پھر کہاں سے لیے؟" وہ جیسے رنج منہ کر بولی۔
 "جیسا تو تم لے لو گی؟"

"بالکل سچ بتاتا۔"

"بالکل سچ بتاؤں گا تم وعدہ کرو کہ پھر تم لے لو گی۔"

"بشرطیکہ حلال طریقے سے کمائے ہوں۔" وہ سوچ کر بولی۔

"اف میرے خدا! یہ آج کل کے زمانے میں کون دیکھتا ہے حلال سے کہ حرام۔ آج کل ایسے ایسے ذرائع
 آمدن نکل گئے ہیں کہ حلال حرام کے درمیان اتنی باریک لیکر ہوتی ہے کہ اکثر نظر ہی نہیں آتی وہاں بندہ کیا
 کرے۔" وہ جیسے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"حلال وہ ہوتا ہے جس پر آپ کا خمیر آپ کو ملامت نہیں کرتا۔ خمیر مطمئن ہو جائے تو سمجھو سب درست
 ہے۔"

"خمیر! خمیر! مطمئن ہے۔"

"تو پھر تمہیں ڈر کس بات کا ہے سب کو سچ بتاؤ۔"

"سب کو نہیں! صرف تمہیں۔ تم وعدہ کرو کسی کو نہیں بتاؤ گی؟"

"اگر تمہارا خمیر مطمئن ہے تمہیں معلوم ہے تمہارا ذریعہ آمدن حلال ہے تو پھر کیوں چھپانا چاہ رہے ہو؟"
 "آمنہ بحث نہیں نہیں صرف تمہیں بتاؤں گا اور تم کسی کو نہیں بتاؤ گی وعدہ کرو۔"

"اوکے وعدہ کسی کو نہیں بتاؤں گی۔" وہ جیسے ہار کر بولی۔
 "اور مجھ سے پیسے بھی لے لو گی۔" اس نے دوسری شرط لگائی۔

"اچھا بابا! لے لوں گی پولو بول۔" وہ تنگ آکر بولی۔ وہ چند لمحے چپ رہا۔
 "تیس بیوی آواز کیسی لگتی ہے؟"

"اچھی ہے۔ تلاوت کرو تو بہت اچھی لگتی ہے۔ تمہارے حلق میں اللہ میاں نے ایک خوش الحان پرندہ رکھا ہے۔ خاص طور پر جب تم سورہ رحمن کی تلاوت کرتے ہو تو بس سامنے والے پر سحر ہی طاری ہو جاتا ہے۔ مجھے تمہاری آواز اس وقت بہت اچھی لگتی ہے۔ بابا صاحب کو بھی تمہاری قرأت اچھی لگتی ہے۔ وہ ایک دفعہ تعریف کر رہے تھے نا۔" وہ صاف گوئی سے بولی تو وہ جیسے چپ ہو گیا۔

"آگے تو پولو تم نے یہ سوال کیوں کیا؟" اسے چپ بیٹھے دیکھ کر وہ بولی۔

"تلاوت کے علاوہ بھی میری آواز اچھی ہے نا؟" وہ آہستگی سے بولا۔

"ہاں اچھی ہے، تمہارے ہم سب سے مختلف اور منفرد ہے۔"

"اگر گانا گاؤں تو بھی اچھی لگتی ہے نا۔"

"یہ فضول خیال کہاں سے آیا تمہارے دل میں۔ ہمارے خاندان میں شاید سو پشتوں نے بھی اس وارثیت کا کام کا نہیں سوچا ہو گا۔" وہ ناگواری سے بولی۔

"آج کل یہ قابل عزت پروفیشن سے عن اور ہنر ہے۔" وہ کمزور لہجے میں بولا۔

"ہو گا مگر گلوں اور میراثیوں کے لیے۔ ہم جیوں کے لیے نہیں۔"

"میں نے نیلی وینٹن پر ایک بسکٹ کے اشعار کے لیے جنگل گایا تھا جس کے مجھے یہ پیسے ملے ہیں۔ اب بتاؤ میں نے کون سا ڈاکا ڈالا ہے۔ بیٹھے بیٹھے قسمت تمہ پر مہربان ہو گئی ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔

"اسے تم مہربانی کہتے ہو۔" وہ شاکھی لہجے میں بولی۔ "اگر بابا صاحب کو بتا چل گیا تو انہیں کس قدر دکھ ہو گا۔"

"بھوکے مرنے سے بہتر ہے کہ انسان کچھ کرے جو کچھ وہ کر سکتا ہے۔"

"اس کے علاوہ بھی دنیا میں بہترے کام ہیں۔ تمہیں اور کوئی نہیں سوچتا۔"

"کیا بھری ڈھونڈا روڑے اٹھاتا، قلی بن جانا پیراگری کرتا اور سارا دن اپنی ہڈیاں بڑوانے کے بعد بھی اسے لوٹوں کی شکل تو کیا پرچھا میں بھی نہ دیکھ پاتا۔"

آمنہ کو اب کوئی جواب نہ سوچا۔

"بہر حال میں یہی کام کروں گا، کسی کو اعتراض ہے تو ہوتا رہے۔ مجھے سسک سسک کر نہیں جینا۔ قدرت اگر مجھے آگے بڑھنے ترقی کرنے کا موقع دے رہی ہے تو میں کیوں اسے لات ماروں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ ہزار روپیہ تمہارے داخلے کا اور یہ اماں جی کو دے دینا، گھر کے خرچ کے لیے۔ چاہو تو خود کہہ کر گھر کا خرچ چلا لینا۔ دل چاہے تو کسی کو نہ بتانا۔ دل چاہے تو سب کو بتا دینا۔ میں نیچے جا رہا ہوں، جیل آکر چائے پیلے جائے گا۔"

"آپ کہیں جا رہے ہیں۔" سیدہ نے حسین شاہ کے تنگ تنگ سے تیار چلے پر نظر ڈالی۔

"ہاں۔" انہوں نے پارک سے جے میں چھٹرا "کہا اور پر فیوم اٹھا کر خود پر چھڑکنے لگے۔

"کہاں؟"

"اسلام آباد۔" انہوں نے ایک تنہیدی نظر آئینے پر ڈالی۔ اپنا جائزہ لیا اور پر فیوم کی بوتل ڈر تنگ نیچل پر رکھ دی۔

"خیریت؟"

"خیریت ہی ہے۔ اجلاس ہے سینٹ کا، آخری ہی سمجھو۔ اس کے بعد تو نئے الیکشن ہوں گے۔" وہ مڑ کر بولے۔

"کتے دنوں کے لیے جا رہے ہیں؟" سیدہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"صرف ایک دن کے لیے، کل رات تنگ واپسی ہے۔"

"اگر آپ برا نہ مائیں تو ایک بات کہوں؟" سیدہ نے خوشامدی انداز میں کہا۔

"بولو۔" حسین شاہ کا لہجہ ہنوز بے نیاز سا تھا۔

"میں۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں۔" وہ کچھ ڈرتے ڈرتے بولیں۔

"کیوں تم نے کیا کرنا ہے ساتھ چل کر؟" وہ ماتھے پر ہل ڈال کر بولے۔

"وہ کام ہے اور مجھے کچھ۔" حسین شاہ کے ماتھے کے تل گہرے ہو گئے تو وہ فوراً بولیں۔ "وہ بابا جان نے اوھر جو کو بھی لے رکھی ہے۔ میں کہہ رہی تھی میں ڈرا اوھر چکر لگا آئی۔ کافی عرصے سے اوھر جا ہی نہیں سکی۔"

"سیدہ! مجھے کچھ نہیں آتا تمہاری ساری فکریں چاچا جان کے ترکے اور اولاد کی فکروں سے شروع ہو کر ان ہی پر ختم ہو جاتی ہیں۔ کبھی اتنی تشویش تمہیں اس حویلی کے معاملات کے بارے میں بھی ہوئی۔" وہ جتا کر بولے۔

"شاہ سائیں! اوھر آپ جو ہیں سب معاملات کو خوش اسلوبی سے دیکھنے والے۔ اوھر مجھے ساری فکریں صالحہ

کی ہوجاتی ہیں۔ ہوتی ہیں۔ اسے ابھی سب معاملات کو دیکھنا اور سمجھنا نہیں آتا۔ جنوں جنوں وہ حویلی کے معاملات کو

جھکتی جاگتی نہیں، خود بخود چھپتی جاؤں گی۔" وہ مدبرانہ انداز میں بولیں۔

"ہوں!" حسین شاہ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"پھر میں چلوں اگر آپ نہیں سیدہ نے ان کی "ہوں" کو نیم رضامندی سمجھ کر پوچھا۔

"تیساری میں کتنا وقت لگے گا تمہیں؟"

"باناظر بھی نہیں۔ میں تیار ہوں بس ایک آدھ سوٹ دکھ لیتی ہوں۔" وہ فوراً بولیں۔

"چلو پھر آنا پانچ منٹ میں۔ میں باہر گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے غلٹ میں باہر نکل گئے تو سیدہ جلدی سے اپنی داد ڈروہ کی طرف بڑھیں۔

رات کے نو بج رہے تھے جب ان کی گاڑی کو ٹھی کے گیٹ میں داخل ہوئی۔ سیدہ کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر ملا زمین کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"شاہ جی! آپ اطلاع کرویتے ہم کچھ اجتام وغیرہ۔" منظور نے آگے بڑھ کر حسین شاہ کا بریف کیس لیتے ہوئے گھبرا کر کہا۔

"اجتام کی کیا ضرورت ہے، ہم کوئی غیر ہیں اپنا گھر ہے۔ مجھے تو خیر ہو مل جانا تھا کہ مگر تمہاری بیگم صاحبہ کا اچانک بروگرام بن گیا۔" وہ نے اندر کی طرف بڑھ گئے۔ سیدہ پہلے ہی اندر جا چکی تھیں۔

"منظور آج آگے گئے تک کھانا لگاؤ، تیار نہیں ہے تو بازار سے منگوا لو۔ اتنی دیر میں شاہ صاحب فریض ہو جاتے ہیں۔" سیدہ نے بارعب نواز میں لاؤنج سے نکار کر کہا تو منظور اسے قدموں واپس مڑ گیا۔ حسین شاہ نے ہانپنے کے

تھے سیدہ نے اٹھ کر ساری کو ٹھی کا سروے شروع کر دیا۔ سب کمرے کھلے تھے، کہیں بھی کسی خاص تبدیلی کے آثار نہیں تھے۔ وہ تین سال پہلے اوھر آئی تھیں حسین شاہ کے ساتھ ان کے چیک اپ کے سلسلے میں اس کے بعد آج آئی تھیں۔

"کنکسرکشن کا کام کہیں بھی نہیں ہوا تو پھر سلطان بخت نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟" وہ سارے کمروں کی چھتوں اور دیواروں کا پارک بنی سے جائزہ لیتے ہوئے خود سے بولیں۔

انہوں نے سلطان بخت کے زیر استعمال بیڈروم کا دروازہ کھولنا چاہا وہ لاکڈ تھا۔ وہ ٹھک گئیں۔ جھک کر لاک کے سوراخ میں اندر جھانکنے کی کوشش کی مگر اندر اندھیرا تھا۔ کچھ بھی نظر نہیں آسکا۔ انہوں نے زور زور سے ہینڈل گھمایا، دروازہ تھپتھپایا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔

"کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئیں دوبارہ لاؤنج میں آگئیں پھر کھانا بھی انہوں نے بے دلی سے کھایا اور بے مہری سے حسین شاہ کے سونے کا انتظار کرنے لگیں۔ وہ کھانا کھاتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

”مجھے گل کی میننگ کے لیے کچھ نوٹس تیار کرنے ہیں میرے لیے کافی بنا کر بھجوا دو۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولے۔
 ”ٹھیک ہے میں بھجوا دیتی ہوں۔ مجھے تم کا نوٹ ہو رہی ہے میں دوسرے بیڈروم میں سو جاتی ہوں۔“ سیدہ نے فوراً کہا تو حسین شاہ سر ہلا کر ہر نکل گئے۔

”سلطان بخت کا بیڈروم لاکڈ کیوں ہے؟“ چند منٹوں بعد ہی منظور ان کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔
 ”جی وہ شاہی خود لاک کر کے جاتے ہیں۔“

”بلو اس مت کرو سلطان بخت کو ادھر سے گئے تین دن ہو چکے ہیں اور بیڈروم سے پرفیوم کی فریش خوشبو آرہی ہے جیسے ابھی کوئی لگا کر گیا ہو۔ کیا سلطان بخت اسے سی چلتا چھوڑ گئے ہیں کمرے کا دروازہ بندل اور اندر سے آئی ٹھنڈک اس بات کی گواہ ہے کہ اسے سی کچھ دیر پہلے ہی بند کیا گیا ہے۔ دیکھو منظور! میرے ساتھ کوئی کیم کھینے کی کوشش مت کرو ورنہ تم شاید مجھے جانتے نہیں۔“ وہ غصے سے بولیں۔

”بیکم صاحب! میں غریب آدمی ہوں میری کیا مجال ہے کہ میں آپ کے ساتھ کوئی کیم کروں جی! وہ کھجھو یا کروا۔“

سلطان بخت کی تیر مہجوری میں اس کا بیڈروم کون استعمال کرتا ہے۔“ وہ سرو لہجے میں بولیں۔

”کوئی نہیں جی! منظور نے ذرا سی آنکھیں اٹھا کر سیدہ کے غصیلے چہرے کو دیکھا۔

”تو تم یوں نہیں ہاتھو گے۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں جی۔“ منظور اب باقاعدہ کنب رہا تھا۔

”تو میں لاک تڑوا دوں۔“ سیدہ اٹھتے ہوئے بولیں تو منظور کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

”نہن۔ نہیں جی۔ وہ شاہی جی۔“

”کیا شاہی جی۔ بولو۔“ وہ غرا میں۔

”وہ ناراض ہوں گے جی۔“

”ان کو چتا نہیں چلے گا کسی بھی بات کا۔ میں تمہیں اس بات کی گارنٹی دیتی ہوں اور یہ لولاک گھر بچھری سے جا کر۔“ سیدہ نے ہزار ہزار کے دس نوٹ اپنے پرس سے نکال کر منظور کے آگے بڑی میز پر پھینکے۔ منظور نے کن اکھوں سے تو لوں کو دیکھا مگر اٹھائے نہیں۔

”نہن۔ نہیں جی۔ مگر شاہی جی۔“ وہ اب رو دینے کو تھا۔

”شاہی جی اگر تمہاری کھال کھینچوا سکتے ہیں تو میں تمہاری شہ رگ بڑی آسانی سے کھا سکتی ہوں۔ سوچ لو تمہیں کون سی موت پسند ہے۔“ سیدہ بے رحمی سے بولیں۔

”میرے پاس کمرے کی چابی نہیں ہے جی۔“ اس نے آخری کوشش کی۔

”میرے پاس پائل ہے۔ چلو میرے ساتھ میں اس کا لاک اڑا دیتی ہوں۔“ سیدہ نے جھک کر اپنے چہرے سے لیڈرز پائل نکالا تو منظور کا ہکا بکا رہ گیا۔

”میں۔ وہ۔ شاہی جی۔“

”سلطان بخت کو علم نہیں ہو گا اگر لاک پائل کے فائر سے ٹوٹا تو پھر تم خود سوچ لو وہ تمہارا کیا شہ کرے گا۔“
 ”میں چابی لے کر آتا ہوں جی۔“ وہ گھبرا کر مڑا۔

”ہوں۔ تو یہ وجہ ہے سلطان بخت کے اسلام آیا دھماگ بھاگ کر آئے کی۔“ کمرے میں داخل ہوتے ہی سیدہ کو چہتے سب کچھ سمجھ میں آیا۔

”کلب سے یہ کھیل ہو رہا ہے ادھر؟“ سیدہ نے مڑ کر منظور سے پوچھا۔

”جی۔“ اس نے سر جھکا لیا۔ ”ڈیڑھ سال یا کچھ اوپر۔“ سیدہ نے آگے بڑھ کر وارڈروپ کھولی۔ سارا ریک لیڈرز خوبصورت اور اشانلشن ملبوسات سے بھرا ہوا تھا۔ نیچے والے ریک میں لیڈرز مینڈل اور ضرورت کا دوسرا

سلطان رکھا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر میک اپ کا اسپورٹس سامان رکھا تھا۔
 ”یہ اب کہاں ہے؟“ سیدہ نے بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی ہو شریا حسن کی مالک لڑکی کی تصویر کو ہاتھ میں لے کر پوچھا۔

”بھورن شاہی کے ساتھ۔“

”جھوٹ سلطان بخت تو آج صبح گاؤں میں تھا۔“ وہ چہکار کر بولیں۔

”وہ شام کو آئے تھے اور انہیں لے کر چلے گئے۔“ وہ سر جھکا کر بولا۔

”نکاح کر رکھا ہے یا رکھیل ہے؟“ سیدہ نے تصویر بیڈ پر بٹنی۔

”نکاح کیا تھا جی! وہ دہیسے لہجے میں بولا۔

”کھیل بنا رکھا ہے نکاح کو بھی اس نے۔“ وہ بڑبڑائیں۔

”واپس کب آئیں گے؟“

”عظیم نہیں جی۔“

”انچھائیں گے جارہی ہوں تم کمرہ لاک کرو۔“ سیدہ کے کندھے جیسے یکدم جھک گئے تھے۔ وہ ہشکل اپنا وجود کھینچی ہوئی کمرے سے نکلی گئیں۔



”سرس۔ سر پلین۔ میری بات تو سنیں۔“ عبد العین نے کارڈیور سے اپنے آفس کی طرف جاتے ہوئے ریاض صاحب کو بڑے سنجی انداز میں پکارا۔

”اوہو بھئی کیا مسئلہ ہے؟“ انہوں نے مڑ کر بھجواتے ہوئے کہا۔ ان کے مونے شیشوں والی ہینک پھسل کر لاک کی نوک پر رکھی تھی۔ وہ آئیں ہاتھ میں پکڑے کافندوں کے پلندے کو انہوں نے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا۔

”سراسر پھسل پھسل بھرتے آپ کی پاس آ رہا ہوں۔ پلیز سر! کچھ تو سوچیں میرے بارے میں۔“ وہ ان کے پاس ہنسنے لگی۔

”میاں! تم تو ہفتہ بھر سے آرہے ہو۔ جاؤ باہر چلا کر دیکھو لوگ سالوں سے ادھر ایڑیاں رگڑ رہے ہیں قطاروں میں کھڑے ہیں آڈیشن دے دے کر تڑھال ہو چکے ہیں پھر بھی انہیں اسٹوڈیو اور کمرے کا منہ دکھانا نصیب نہیں ہوتا۔ تم تو خوش قسمت ہو جو پہلے ہی آڈیشن میں کامیاب بھی ہو گئے اور کام بھی مل گیا۔ اب کیا کہتے ہو؟“ ریاض صاحب سخت اکتائے ہوئے لگ رہے تھے۔

”سر! اب کیا ایک ہی کام آگیا کروں۔ مجھے آگے بھی تو کچھ کام ہیں نا۔“

”او بھائی! میں نے تم سے کوئی ایگریمنٹ نہیں کیا تھا کہ ایک کام دینے کے بعد تمہاری ساری زندگی کا بیڑہ میں اٹھاؤں گا۔ جاؤ مجھے معاف کرو مجھے بہترے کام ہیں آج سر کھجانے کی فرصت نہیں۔“ وہ آفس کا گلاس ڈور دھکیل کر اندر چلے گئے۔

”پلیز سر۔ میں تو ادھر آپ کی حوصلہ افزائی اور آپ کی محبت کی وجہ سے ہی آیا ہوں۔ اگر آپ مجھے یوں نظر انداز کریں گے تو میرا دل کھٹکے گا تو بیکار کیا نا۔ آپ جیسی بوہر شائس نظرس کس کی ہوں گی! آپ نے میرے اندر سونے ہوئے فنکار کو دکھایا ہے اور میں تو ادھر آپ کی نظر کرم کی وجہ سے ہوں۔ اب آپ ہی بتائیں میں کدھر جاؤں۔ مجھے اور کسی کا علم بھی نہیں۔ پلیز سر!“

اس نے لہجے میں سارے زمانے کی عاجزی اور مسکینی سمو کر خوشگدلی انداز میں کہا۔ ریاض صاحب نے کافندوں کا پلندہ ٹیبل پر بٹھا اور عبد العین کو ہینک کے مونے عد سول کے پیچھے سے گھور کر دیکھا پھر کرسی پر بیٹھ کر انہوں نے نیلی فون سیٹ اپنی طرف کھسکایا اور کوئی نمبر ڈائل کر کے کسی سے بات کرنے لگے۔ اسی دوران کوئی اور پروڈیو سر صاحب ان کے کمرے میں آگے اور ساتھ ہی دو تین غیر مقبول فنکار بھی۔ تھوڑی دیر میں ان کا کمرہ اسی

نوع کے لوگوں سے بھر چکا تھا۔ عبدالمبین ایک کونے میں سٹھ کر بیٹھ گیا۔ ریاض صاحب کی مصروفیت کا عجیب عالم تھا۔ کبھی کسی ایکٹر کا اسکرپٹ سنتے، کبھی فون پر مصروف ہو جاتے، کبھی ان کا موبائل بج اٹھتا۔ وہ بارہ اٹھ کر آفس سے باہر گئے۔ بیٹھے بیٹھے عبدالمبین کی کمر لڑ گئی۔ وہ نوبے ان کے آفس آیا تھا اور اب بارہ بجتے کو تھے۔ آج اس کو شہرینہ سے بھی ملنے جانا تھا۔ اب اس کا دل چاہ رہا تھا اسکرپٹ کے دھوئیں سے اٹے اور مختلف خوشبوؤں اور مستوعی چروں کے اس ہجوم زور کمرے سے بھاگ نکلے۔

”ہاں، بھئی عبدالمبین ابھی تک بیٹھے ہو۔“ ریاض صاحب باہر سے آکر ایک دم اس کی طرف متوجہ ہوئے وہ فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”ایسا ہے کہ آپ پرسوں صبح دس بجے آ جانا ایک اشتہار ہے بمشکل ایک منٹ کا جنگل ہے میرا خیال ہے پرسوں ہی ریکارڈنگ ہو جائے گی اس کے علاوہ منٹ وہ سوچنے لگے ایک پلے ہے جو جعفر صاحب کر رہے ہیں اس میں تین تین منٹ کے دو سین ہیں کوئی بڑا رول نہیں اس سرسری سا ہے کرو گے نا؟“

”جی ہاں، فوراً بولا۔“

”بس تو پرسوں آ جانا جعفر صاحب کی ریکارڈنگ تو مسلسل تین چار دن ہوگی تمہارا کام بالکل پورے میں کہہ آیا ہوں ان سے تم پرسوں صبح میرے آفس میں آ جانا، وہ مزکر اپنی نشست کی طرف بڑھے۔“

”ہمت ہمت شکریہ سر بہت مہربانی۔“ وہ ان کی توجہ پا کر شمال سا ہو گیا۔

”دیکھو عبدالمبین! میں یہ مانتا ہوں تمہاری آواز بہت اچھی ہے اتنی کہ میں نے تمہیں پہلے آڈیشن پر ہی ک لیا تھا مگر تمہاری آواز اصل میں ابھی بریکنگ پیریڈ سے گزری ہے۔ جنگلی دو طرح سے آنے کی ایک تو کچھ نام گزرے گا میرا خیال دو تین سال تک دو سرے تم ریاض کی تمہیں سنگنگ میں نام پیدا کرنا ہے تو محنت کرو ریاض کرو چاہو تو کوئی بیڈ جوائن کر لو کسی کی شاگردی اختیار کر لو اور ساتھ ساتھ کبھی کتاب سے تو بہت اچھا ہے تمہارا ٹیلنٹ خود بخود نکھرنا جائے گا شرط محنت اور۔۔۔ اے ندیم میاں! اچھے تمہارے جو کچھ کرنا ہو میرا مفادہ تمہاری تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہیں چلو جلدی سے جھگڑا رول سٹاؤ اور ان کے آفس جاؤ ان کی ریکارڈنگ اشارت ہونے والی ہے اب تو وہ سیٹ پر بھی جا چکی ہوں گی“ وہ جھگڑا کسی ندیم سے مخاطب ہوئے۔

”اوکے سر میں اب جاؤں۔“ عبدالمبین کو یقین تھا اب وہ مشکل ہی سے ادھر متوجہ ہوں گے۔

”ہاں ٹھیک ہے جاؤ۔“ وہ بے خیالی میں سر ہلا کر بولے تو وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

”تھیویرنگاوی میں تو اب واپس اندر جانے لگی تھی“ وہ بیٹھے ہی ناراضی سے بولی۔

”بس ایک کام کے سلسلے میں پھنس گیا تھا بڑی مشکل سے بھاگا ہوں ادھر سے۔“ اس نے جلدی سے بائیں اشارت کی۔

”میں جی شاید تم بھول گئے۔“ وہ شائستگی سے بولی۔

”مگر ان شہرو! میں تمہیں بھول سکتا ہوں؟ اب تم کبھی بھول کر بھی نہ سوچنا“ اس کی طبیعت ایک دم سے ہلکی پھلکی ہو گئی تھی ایک تو کام مل گیا تھا دوسرے شہرینہ کا ساتھ۔

”مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”یہی کہ تم میرے ساتھ بیٹھی ہو میرے اتنے قریب ہو کہ کے چند جھومکے ہی ہمارے درمیان گزر سکیں وہ بھی تمہاری احتیاط کی وجہ سے شہرینہ چپ رہی۔“

”تمہیں یہ سب اچھا نہیں لگتا۔“ عبدالمبین نے چند لمحوں بعد پوچھا۔

”پہلے نہیں لگتا تھا سوچ کر اب یقین ہوئی تھی اور پریشانی بھی۔“

”اور خوف بھی“ عبدالمبین نے لقمہ دیا۔ ”اور اب؟“

”اب سب اچھا لگتا ہے۔“

”چلو آج کچھ کھاتے ہیں۔“

”نہیں مجھے بھوک نہیں۔“

”فاسٹ فوڈ بھوک کے لیے نہیں ہوتی۔ ہیزا ہٹ چلتے ہیں۔“

”تم کون سا کام کرتے ہو؟“ شہرینہ نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

”کیا مطلب؟“

”تم کہہ رہے تھے نا ایک کام میں پھنس گیا تھا۔“

”لو۔۔۔ وہ بتاؤں گا کبھی۔“ وہ ہولے سے ہنسا۔

”کبھی کیوں ابھی کیوں نہیں۔“

”اگلی۔“ وہ سوچ میں پڑ گیا ”چلو ابھی بتا رہا ہوں کہیں اطمینان سے بیٹھے ہیں تو پھر بتا رہا ہوں۔“

”یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔“ شہرینہ بولی۔

”کیا کیا ٹھیک نہیں ہے؟“

”میرا تم سے یوں ملنا۔“

”تو تمہارا کیا خیال ہے تمہارے برادر صاحب! تمہیں گے تمہیں مجھ سے ملوانے۔“

”مجھے بہت ڈر لگتا ہے کسی نے کچھ لیا، کسی کو تھاپل گیا تو۔۔۔“

”تو مانی ڈیڑھ! جب اوکھلی میں سر دیا تو مسلوں سے کیا ڈرنا میرا خیال ہے یہی محاورہ ہے شہرینہ محبت کا کمزور پورا اور خوف کی کھال میں ہی رہنا کر مجھ سے اور سخت ہنسا ہے تم کس بات سے ڈرتی ہو اور یہ کیوں بھول جاتی ہو۔۔۔ میں تمہارے ساتھ ہوں تمام اعلیٰ تو میں ہوا اگر خدا استخوات تمہیں کچھ ہو گیا تو کیا میں تمہیں پھوڑ کر بھاگ جاؤں گا نہیں کسی میں لہنا عبدالمبین بیٹھے کے اولوں میں سے نہیں ہے آؤ اندر چل کر بیٹھے ہیں۔“

اس نے ایک فاسٹ فوڈ کارنر کے آگے بائیں روک کر کہا تو شہرینہ نے اترتے ہوئے احتیاط سے اپنا نقاب چیک کیا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے عبدالمبین کے ساتھ ریسٹورنٹ کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

”بیاری ماں جان!“

”السلام علیکم“

”ہمت ساری باتوں بعد آپ سے مخاطب ہو رہا ہوں امید ہے خیرت سے ہوں گی اور میں اللہ سے دعا کرتا ہوں۔“

”کیا اللہ ٹھیک ہوں اور ٹھیک رہیں اور میرے لیے دعا کرتی رہیں۔“ بابا صاحب کے بارے میں نہیں پوچھوں گا کیونکہ انہوں نے مجھے کبھی سے نہیں دل سے بھی نکال پھینکا ہے ان جیسا سخت دل اور پتھر پاپ میں نے نہیں نہیں دیکھا نہ سنا ہے اور نہ کتابوں میں پڑھا ہے۔ سال بھر بلکہ اس سے بھی اوپر ہو گیا میں انتظار کرتا ہی رہا کہ شاید بابا صاحب مجھے متلنے آجائیں میری محبت میں ملنے آجائیں مگر میری تمام امیدیں نقش بر آب ثابت ہو میں بابا صاحب کا پتھر دل جیت گیا۔ سو آج میں نے بھی ان کو اپنے دل سے نکال پھینکا ہے۔ جس طرح انہوں نے مجھے اپنے گھر اور زندگی سے نکال دیا ہے۔“

”ماں جان! مجھے ادھر بہت اچھے لوگ مل گئے ہیں بہت اچھے انہوں نے میری زندگی سے ہر خرابی ہر کئی گدوڑ کر دیا ہے میری تعلیم تقریباً مکمل ہونے کو ہے اب مجھے مزید پڑھنے کے لیے باہر بھجوا رہے ہیں شاید میں لندن چلا جاؤں پھر کب لوگوں کا کچھ پتا نہیں۔ بہر حال جب بھی لوٹا اس قدر کمزور نہیں ہوں گا کہ بابا صاحب جب پاپ میں مجھے گھر کی سیڑھیوں سے وٹھیل دیں اور میری بات لکھ لیں میں آگے مساوی میں جب بھی واپس آؤں گا بابا صاحب خود مجھے ملنے آئیں گے اس وقت انہیں احساس ہو گا کہ ان کا اپنی اولاد کے ساتھ ساتھ شہرینہ کی صورت۔“

تھا اور گھٹیا بھی اور اس کا انتقام وقت ان سے لے گا جب وہ عالی ہاتھ خالی وامن میرے پاس آئیں گے آپ میری بات لکھ لیں پھر میں انہیں بتاؤں گا کہ غصہ نفرت وحشت و بربریت ہی اولاد کی تربیت کے طریقے نہیں ہوتے محبت اور چلندار رویہ اور وقت کی نبض کو دیکھ کر چلنے والے انسان ہی کامیاب اولاد کے والدین ہوتے ہیں اور ان جیسے ناکام منہ کے بل گرنے والے ہوتے ہیں یہ ان کی ناکام حکمت ہی تھی جو گاؤں سے یوں ڈیکل ہو کر آپ سب کو لیے چلے آئے اس طرح ادھر کسمپرسی کی زندگی گزارنے۔

بہر حال میرا اب ان تمام باتوں سے کچھ تعلق نہیں رہا میں ویسے ہی اس ملک سے دور جا رہا ہوں بس خیال آیا کہ جاتے وقت آپ کو خدا حافظ کہہ جاؤں اگر زندگی نے بھی موقع دیا تو ملنے آؤں گا آمنہ زینب اور جویریہ کو میرا پیار اور عبدالمصیب سے کہنے کا خود ہمت کرے اور اپنا مستقبل بنائے بابا صاحب کے زیر سایہ رہا تو وہ اسے مارا کر دہشت گرد بنا لیں گے کہ اس کے علاوہ تربیت کا انہیں اور کوئی طریقہ آتا نہیں۔

خدا حافظ
آپ کا بیٹا عبدالمصیب
آمنہ! اماں بی کو خدا سناٹی جا رہی تھی اماں بی کی آنکھوں سے آنسو پھسلنے جا رہے تھے۔ خود آمنہ کی بری حالت تھی زینب بھی اماں بی کے پاس ہی بیٹھی تھی کس قدر نفرت بھری تھی عبدالمنین کے دل میں بابا صاحب کے خلاف کہ اس کا اندازہ ان بیٹیوں کو بالکل نہیں تھا اماں بی تو یہی سمجھے بیٹھی تھیں کہ ناراض ہے کچھ مہینوں تک خود ہی من جائے گا اور ملنے چلا آئے گا اس نے تو آج پرنا تا ہر تعلق ہی تو ڈالا تھا اس نے کیا سنا تھا۔

آمنہ نے خط تہہ کر کے آنسو بھری آنکھوں سے اماں بی کی طرف دیکھا جن کا چہرہ گریہ و زاری سے سرخ ہو گیا تھا آنسوؤں سے پورا چہرہ بیگا ہوا تھا۔

”عبدالمنین! میں مجھے کیا کہوں۔ اس پیٹ سے جتا ہے۔ پروحا بھی نہیں دے سکتی کہ تو نے میرے سر کے سائیں کو اتنا غلط اتنا برا بھلا کہا ہے چودھویں صدی کی اولاد سے ناقصیت کی سب نشانیوں پوری ہو کر رہی ہیں وہ روتے روتے بولیں دوپٹے کے پلو سے اپنا ناک منہ صاف کرنے لگیں۔

”ایسی ہوتی ہے اولاد اور ایسے ہوتے ہیں بیٹے کہ جن کی آرزو میں انسان سجدوں میں گر کر گڑا تا ہے بد نصیب تھے سے تو سب سے زیادہ محبت تھی اور تو آستین کا سائب بن کر ڈٹے لگا۔ آہ میں کس بات کو روں تیری بد نصیبی کو یا اپنی کہ خدا نے دو بیٹے بھی دیے اور دونوں کھوٹے گئے۔

آمنہ! میرے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے آخری بار جاتے وقت پوچھا کیا میرے بعد بھی دنیا میں آؤ گے تو انہوں نے جواب دیا ہاں پانچ بار آؤں گا ایک بار والدین کے دل سے اولاد کی محبت نکالنے دو سری بار اولاد کے دل سے والدین کی محبت اور اسلام نکالنے تیسری بار رزق سے برکت نکالنے چوتھی بار عمر سے برکت نکالنے اور پانچویں بار وقت سے برکت نکالنے دیکھو تو کیسے ساری باتیں پوری ہو رہی ہیں پانچوں کی پانچوں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

”اماں بی! جو صلہ کریں اس طرح روئیں گی تو آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔“

زینب نے ان کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

”لندن جا رہے ہیں تو جائیں جب انہیں ہمارا احساس نہیں تو آپ کیوں رو رہی ہیں ایسے پتھر کے لیے۔ وہ بابا صاحب کو پتھرول کہتے ہیں اور شوہ۔“ زینب کو سخت غصہ آرہا تھا۔

”آمنہ! اس خط کو پھاڑو یا جلا دو کہیں تمہارے بابا صاحب نے دیکھ لیا تو۔“ وہ ایک بار پھر رونے لگیں اسی وقت صوفی صاحب کے گھٹکا ہارنے اور آخری میڑھیوں پر قدموں کی آواز سنانی دی۔

آمنہ نے جلدی سے خط منٹھی میں چھپا لیا اور اماں بی نے سیدھے ہو کر اپنا منہ دوپٹے سے رکھ کر صاف کیا۔

”چلو تم دونوں جا کر کھانا لگاؤ دسترخوان پر ہمیں آ رہی ہوں۔“ ان کے کہنے پر وہ دونوں جلدی سے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔

گاڑی کس قدر طوفانی رفتار سے گیٹ کی طرف بڑھی تھی اگر عبدالمصیب پھرتی سے پیچھے نہ ہٹ جاتا تو اب تک اس کی پکلی ہوئی لاش گیٹ کے ساتھ چپکی ہوتی اس کا دل بے اختیار تیز تیز دھڑکنے لگا تھا اپنی متوقع موت کا سوچ کر ہی۔ اس نے کچھ غصے سے گھوڑ کر گاڑی کی طرف دیکھا ایک خوبصورت کم عمری لڑکی ڈراؤنگ سیٹ پر بیٹھی تھی اب اس کا ہاتھ مسلسل ہارن پر تھا اس نے تو شاید عبدالمصیب کو دیکھا بھی نہیں تھا وہ شدید غصے میں لگ رہی تھی اس کے تیور دیکھ کر عبدالمصیب اپنی جگہ برسمت کر کھڑا رہ گیا۔

”اسی وقت گیٹ برق رفتاری سے کھلا تھا اور وہ گولی کی طرح زوں کر کے گاڑی گیٹ کے اندر لے گئی تھی چوکیدار پھرتی سے گیٹ بند کرنے لگا تھا جب عبدالمصیب تیزی سے آگے بڑھا۔

”مجھے میڈم سے ملنا ہے یہ ان کا کارڈ ہے اس نے فوری طور پر زیور گل کا وزیننگ کارڈ چوکیدار کی آنکھوں کے آگے لہرایا چوکیدار بھی مالکوں کی طرح کڑوے مزاج کا لگتا تھا کارڈ کو سرسری نظر سے دیکھ کر اس نے عبدالمصیب کا اوپر سے پیچھے ہٹ جانے لگا۔

”تم کون ہو؟“ وہ اسے بل ڈال کر بولا جیسے عبدالمصیب اسے بالکل پسند نہیں آیا۔

”میں عبدالمصیب ہوں میڈم زیور گل سے ملنا ہے انہوں نے مجھے اپنا کارڈ دیا تھا کھر آکر ملنے کے لیے“ وہ جلدی جلدی بولا مبادا چوکیدار گیٹ ہی بند نہ کر دے۔

”کیا نام بتایا تم نے وہ اسی بیٹھے چتون سے بولا۔“

”عبدالصیب۔“

”ٹھیک ہے میں بول دینا ہوں میڈم سے ملنا تو چاہیے گی تم باہر کھڑے ہو جا کر۔“ اس نے تیزی سے گیٹ کے دو ٹول بٹ بند کر کے دیکھا کہ آج جاوایا۔ عبدالمصیب باہر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

”اگر تم نے بل کر لیا تو شاید پھر کبھی نہ سکو۔“ اس نے مر اٹھا کر ”کل کدے“ کی پر شکوہ عمارت کو دیکھا گل کدہ صرف نام کا گل کدہ“ نہیں تھا گیٹ کی بیرونی دیواروں سے لے کر اندر جہاں تک عبدالمصیب کی نظر گئی خوبصورت جنگل پھولوں کی بیلوں اور پھولدار شاخوں سے اس طرح سجایا ہوا تھا گویا دیواریں ریت اور سیمنٹ کی نہیں سرخ سفید پیلے جامنی گلابی نیلے چھوٹے چھوٹے خوبصورت پھولوں کی بنی ہوئی ہیں۔

”بہت باذوق لوگ لگتے ہیں اس نے تو سبھی نظروں سے درو دیوار کو دیکھا اس وقت بھلی گیٹ کھل گیا۔

”آجاؤ“ وہی چوکیدار کھڑا تھا عبدالمصیب جھٹ سے گیٹ کے اندر ہو گیا۔

”اسے اندر میڈم کے پاس لے جاؤ چند قدموں پر ایک دو سرے کھڑے ملازم سے چوکیدار نے کہا تو عبدالمصیب اس کے پیچھے چل پڑا۔

کارڈور سے آگے ایک بڑا سا کمرہ تھا ملازم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

کمرے میں تین بے حد قیمتی صوفہ سیٹ لگے تھے۔ چھت تک بڑی بڑی خوبصورت کھڑکیاں تھیں جن پر قالین کے ہم رنگ ویلوٹ کے بھاری پروسے پڑے تھے کمرے میں روشنی باہر کی نسبت خاصی کم تھی اس لیے عبدالمصیب کو شروع میں کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کمرے کے کس رخ کی طرف جاتے نہ اسے دائیں طرف صوفے پر بیٹھی زیور گل پر نظر آئی وہ کچھ پریشان سا کھلے دروازے میں کھڑا رہا۔

”اندرو آجاؤ۔“ اس نے فوراً ”آواز کی سمت نظر اٹھائی دائیں طرف بڑے صوفے پر زیور گل بیٹھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی اس دن کے جلے کہ برعکس آج وہ بالکل ساوا تھی میک اپ اور خوبصورت لباس سے بے نیاز وہ پنک کھر کا کائن کا سوٹ پہنے بغیر ڈوپٹے کے وہ دونوں ٹانگیں صوفے پر رکھے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

”السلام علیکم میڈم“ عبدالمصیب نے تنجک کر سلام کیا تو زیور گل نے سر کے اشارے سے جواب دے کر اپنے دوسری طرف بڑے سنگل صوفے کی طرف اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”شکریہ ہے، وہ بیٹھتے ہوئے کے آہستگی سے بولا۔

”تمہارا نام اس قدر آوٹ آف فیشن ہے کہ مجھے پہلے یاد ہی نہیں آیا کہ میں اس نام کے کسی شخص کو جانتی بھی ہوں میں نے تم سے کہا تھا تاکہ اپنا نام بدل لیتا۔“ یہ وہ اپنی ازلی بے تکلفی سے بولی۔

”جی ہاں!“
 ”کیا پوچھو گے ٹھنڈا یا گرم؟“ وہ اپنے ہاتھوں پر کسی کریم کا ساج کر رہی تھی۔
 ”جی کچھ نہیں۔“
 ”آنا کیسے ہوا؟“

”جی وہ اس دن آپ نے کہا تھا کہ اگر کبھی کوئی ضرورت پڑے تو۔۔۔“ وہ جھجک کر بولا۔
 ”اوہ! وہ زور سے ہنسی ”اتنی جلدی ضرورت پڑی۔“ عبدالعصین قتل سا ہو گیا۔ ”ریاض نے ایک ہی ایڈیٹا ہو گا اس کے بعد ہری بھنڈی سے ہے نا؟“

”جی وہ کہتے ہیں ابھی کچھ کام نہیں دوسرے وہ کہہ رہے تھے تم ریاض کو کسی اتھے ماسٹر سے۔“
 ”یہ بڑے فن آتے ہیں اس ریاض کو۔ تمہارے ایڈ کارپانس تو اچھا لگتا؟“

”جی وہ بھی کہہ رہے تھے۔“
 ”تم ابھی کم عمر ہو۔“ زیور گل نے اپنے تیزی سے چلنے ہاتھ روک کر عبدالعصین کا جائزہ لیا۔ ”ہمت نام پاؤ گے مگر وہ یا تین سال بعد۔ ریاض درست کتاب ہے۔“
 ”تو اب کیا کروں جی مجھے تو کام چاہیے نا اس کے بغیر تو گزارا نہیں۔“

”ہاں جیسی۔ کام کے بغیر تو تھوڑی عورت بھی نہیں رہتی تم تو بیٹنڈا ہم لوگے ہو فلموں میں کام کرو گے؟“
 ”جی ”زیور گل کی اچانک آفر سے حیران کر گئی۔“
 ”جی پھوٹو ماڈل کی اچانک تجربے کے لیے۔ اس فیلڈ میں آئے ہو جی صاحب ہاتھ پاؤں مارو گے نا اس کی کرا سکیں کو سمجھو گے۔“

”مجھے فلم میں کام کون دے گا۔“ وہ ہانسی سے بولا ”میری تو کوئی واقفیت بھی نہیں آپ کے سوا۔“
 ”او میرے بچے آ“ زیور گل پھر ہنسی آگے ہونا (گل کدہ) گھمسی تو سمجھواتی منزل تک آن پہنچے ہو فلم میں چھوٹا موٹا کام دلوانا کچھ مشکل نہیں ویسے بھی ہماری فلمیں جو جھنڈے کا جیلی کے کاڑھی ہیں ان میں چھوٹا موٹا کام کون سی بڑی بات ہے۔“

”پر جی مجھے تو گانا ہے ٹھوٹو ڈاری میں نام پٹانا ہے۔“ وہ جھجک کر بولا۔
 ”اسی کے لیے تو رستہ بنا رہی ہوں۔ یوں تو کوئی اٹھا کر نہیں راتوں رات شار نہیں بنادے گا۔“
 نام پاؤ گے نا۔ اوہ چار بجتے کو ہیں۔ ”نہیں تارا تم کیا کر رہی ہو ادھر سے زیور گل نے کمرے کے آخری کمرے پر ریو لوگ جیسے ریو یا ٹل کلن سے لگائے جھولتی ٹین تارا کو پکار کر کہا تو عبدالعصین نے بے اختیار اس جانب دیکھا وہ گاڑی والی لڑکی تھی۔

”جی ہاں! وہ اسی وقت اٹھ کر آگئی بلکہ ڈاؤن پر ٹنگلی شرٹ پہنے بلاشبہ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔“
 ”قہرشی نے کتے بے آنا ہے؟“
 ”معلوم نہیں۔ وہ ناک چڑھا کر بولی۔“

”پانچ بجے تک آئے گا وہ میرے خیال میں تم تو سو جاؤ۔“
 ”نام! میں ابھی نہیں جا سکتی۔“ وہ گرنے والے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی۔
 ”ابھی تو نہیں جانا۔ آتے آتے وہ گوشت کا پیرا لچھ سات بجائے گا۔ تم ابھی ریسٹ کرو اور ہاں بھی یہ عبدالعصین ہے۔“ زیور گل نے اس کا تعارف کرایا۔

”اس نے کیا نام ہے؟“ وہ چونکنے کی ایک ٹنگ کرتے ہوئے سیدھی ہوئی۔

”یہ کون حضرت یوں نام! لڈ کنگ ہے ہینڈ سم بھی ہے چرے سے ”گاڑی لگتا ہے“ وہ بلا جھجک بولی۔
 ”جی تو میں کہہ رہی ہوں بے چارے کو کام چاہیے آج قہرشی سے بات کر کے اسے کوئی کام دلوا دو۔ دوسرے ماسٹر جی کا فن نمبر میری ڈائری میں لکھا ہے۔ وہ مجھے دیتا یہ ان سے ریاض سیکھے گا اصل میں اس کی آواز بہت اچھی۔“

”ہاں! آپ ہر ایرے غیرے کو سر رن بٹھا لیا کریں اور میں شاہ جی کو دیکھیں خدا جانے اسلام آباد میں کون سا تیل کا کنواں کھو رہے ہیں کہ ہفتہ بھر سے کتے کا نام ہی نہیں لے رہے تو منہ بنا کر بولی۔“

”تو تم کیوں مری جا رہی ہو نہیں آتے تو مت آئے۔“ زیور گل ناک چڑھا کر بولی ہزار دفعہ کہہ چکی ہوں اس جاگیر دار کے پیچھے اپنی جوانی کو خوار مت کرو۔ قہرشی کی نئی قلم سائن کر لو پورے دو کروڑ کا پروجیکٹ ہے پھر وہ آفریدی صاحب۔ تمہارے ایک جلوے کے لیے مرے جا رہے ہیں۔“

”معلوم ہے مجھے۔“
 ”تو پھر کیا سوچا تم نے؟“

”قلم تو میں سائن کر رہی ہوں مجھے شادی کا کچھ ڈر نہیں اس سلسلے میں اور آپ کو معلوم نہیں آفریدی صاحب کے ساتھ میں اس ویک اینڈ پر ان کے فارم ہاؤس میں جا رہی ہوں انہوں نے میرے اعزاز میں وہاں کوئی پارٹی رکھی ہے۔ چار کنال کا پلاٹ بھی میرے نام کر رہے ہیں برسوں تک پیپر ز تیار کر کے گھر دے جائیں گے۔“
 ”اس۔۔۔ یہ تم نے بالائی بالا مہر کے مارے شروع کر دیے مجھ کو بتائے بغیر۔“ زیور گل پر جیسے شادی مرگ طاری ہوئی۔

”ہاں! میں اب بڑی ہو گئی ہوں اور میں شادی کو بتانا چاہتی ہوں کہ اگر وہ مجھے ایک احمد پوری حویلی نہیں دے سکتے تو لیا ہوا دنیا کی سبھی چیزیں میرے قدموں پر پھینک کر دے دیتا ہے۔“
 عبدالعصین نے چونک کر ٹین تارا کو دیکھا احمد پور اور شاہ جی اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور ہمت سی کڑیاں مل گئیں۔

اب اس گل کدہ سے نہیں جانا شاہ جی کی اپنی حویلی میں نقب لگانے کا ایک اور رستہ مل گیا۔ وہ دل ہی دل میں مسرور ہوا۔

”میڈم! میرے بارے میں کیا حکم ہے“ وہ جلدی سے بولا۔
 ”تم ادھر ہی رہو ابھی قہرشی آئے گا تو تمہارے سامنے بات کر دیں گی شاید آج ماسٹر صاحب بھی آجائیں ان سے بھی بات کر لوں گی۔“ زیور گل کی ”مہمانی“ اسے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

”تھک لگتی ہے یو میڈم یو آرسو کائنڈ۔“ وہ عقیدت مندی سے بولا۔
 ”ہاں! میں اسے کمرے میں جا رہی ہوں۔ تھک گئی ہوں ریسٹ کروں گی ٹین تارا اٹھ کر باہر نکل گئی۔“
 ”ابھی نہیں ٹھکانا ٹین تارا! ابھی تو سفر شروع ہوا ہے سہائی پر بیٹی ڈول۔“

زیور گل بیڑا نکلی۔

”اور میڈم میں اس سفر میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

عبدالعصین نے ہمت آہستگی سے لب ہلانے اور بونے سکون سے صوفے پر جیم کر بیٹھ گیا۔

یاویار کے جیسی
 پھیلی پھیلی شام سبیر کی
 ہمت بچھو یا ودالی ہوئی زور لب ہر آتی ہوئی
 اس کی زلفوں کے شبھیں قطرے
 اور قطرہ قطرہ پھیلی شام سبیر کی

اپنے دامن میں سمیٹے

بارہ مہینوں کی سرد گرم نرم قلع شامیں لیے آتی تھیں شام و سہری
حجر کا بوجھ اٹھائے میرا تھکا تھکا سا بوجھ دل اس کی رخصتی پر نہ ملوں ہے نہ شاد ہے
جو میرے بوجھل دل پر دستک دے رہی ہے اور ہولے ہولے اپنی سرد بانوں میں مجھے لیے کمر رہی ہے

کل یکم جنوری ہے

اور اس کے بعد میں سوچو نسوہ دنوں کا بھرا بھرا سال

اپنے بوجھل دل کو جواں کرو امیدوں کو پھر سے ہرا کرو

تین سوچو نسوہ دنوں میں اک بل اک گھڑی اک دن

ایسا بھی آسکتا ہے جو ہر ذمہ کا دوا بن جائے دل کی خبر میں کو ہرا بھرا کرو

کہ زندگی اک روشنی

اک امید سے عبارت رہتی ہے دم آخر تک

امیدوں کو اپنی ہرا کرو آنکھوں کو سینوں سے روشن کرو

اپنے دل کو جواں کرو

ذکر سب و ہراتی ہوتی تھیں شام و سہری

صوفی صاحب کو ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے بیچیں منٹ ہونے کو آئے تھے جو ملازم انہیں یہاں تک چھوڑ
کر گیا تھا ان کے بعد سے ابھی تک کسی ذمی نفس نے ادھر قدم نہیں رکھا تھا۔ انہوں نے آگیا کر کوئی گیارہ سو برس بار
ڈرائنگ روم کا تفصیلی جائزہ لینا شروع کیا۔ بہت بڑا ہال کمرہ تھا جو کسی کمر کا ڈھانچا تھا اور کسی قانونی ادارے کا
جایا ہال کمرہ زیادہ لگ رہا تھا۔

بیش قیمت فرنیچر امپورٹڈ بے حد قیمتی قالین اور بڑے پچھتے سے لگے بیش قیمت سہری فانوس نادر و نایاب
ڈیکوریشن پیسز ڈیو اور برقی بے حد قیمتی اور اچھوتے مناظر سے سجی پیشنگز کمر کے مالک کے ذوق اور دولت کی
فراوانی کا پتہ دے رہی تھیں۔

"کیا عبد المتین اتنا امیر ہو گیا ہے محض ان ساڑھے چار سالوں میں؟" انہوں نے ڈرائنگ روم میں داخل
ہونے کے بعد سے اب تک خود سے پچاسویں بار یہ سوال کیا تھا۔ وہ تو اس سے ملنے آئے تھے کسی پدرانہ شفقت
محبت یا جدائی سے بے حال ہو کر نہیں بلکہ اپنے حالات سے عاجز آ کر بہت راتیں جاگ جاگ کر سوچ سوچ کر

انہوں نے خود کو اس بھکاؤ پر آمادہ کیا تھا۔ وہ آج سے پانچ چھ سال پہلے عبد المتین کو کس طرح دھتکار کر اپنے
سے نکال چکے ہیں اس آخری منظر کو یادوں کے فریم سے نکال کر۔

"عبد المتین میرا سب سے لائق بیٹا ہے اور فرمایا اور کچھ دار پٹا ہے وہ میرے ان حالات کو ضرور سمجھے گا اور
میرے کہنے سے پہلے ہی سب کچھ جان جائے گا ساری ناراضی کو بھلا دے گا مجھ سے دل سے پیار جو کرتا ہے مجھے
یقین ہے۔"

یہ آخری سوچ تھی جو بار بار ان کے دل کے دروازے پر دستک دے رہی تھی جس کی ٹھک ٹھک سے مجبور
ہو کر وہ آج عبد المتین سے ملنے چلے آئے تھے جو بیرون ملک سے اعلا تعلیم حاصل کر کے واپس آچکا تھا۔

"جی فرمائیے کس سے ملنا ہے آپ کو کمرے کی ٹھنڈی خاموشی میں اچانک ابھرنے والی اس آواز نے انہیں
بے اختیار چوٹا کیا۔ چھریزے بدن کا دراز قد اور جڑ عمر جنس سلٹی کلر کا ٹوپیوں پہنے آنکھوں پر نازک شیشوں کی
ٹو بسورت تنک سجائے استغمامیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"جی عبد المتین سے وہ وہ گہرا کراٹھ کھڑے ہوئے۔
"اچھا۔ عبد المتین سے۔" اس آدمی نے سر ہلایا۔

"اوکے میں بھجواتا ہوں اسے ویسے وہ ابھی لکھنے ہی والا تھا آفس کے لیے۔ بانی دادے آپ اس سے کیوں ملنا
چاہتے ہیں؟" وہ جانے کے لیے کھڑا تھا پھر یکدم رکتے ہوئے بولا۔

"جی میں۔" صوفی صاحب کی زبان کبھی اس طرح لگت نہ نہیں ہوتی تھی۔ وہ آج تک کسی کے سامنے اس
طرح نہیں بکھلے تھے جی کہ سید بسطنین شاہ کے سامنے بھی وہ بے حد احتیاط سے بات کر لیا کرتے تھے مگر آج تو
جیسے ان کی زبان ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس بے حد قیمتی گھر کی طاقت انہیں مغلوب کر رہی تھی یا اپنی
کمزوری کہ ان سے بات نہیں ہو پارہی تھی۔

"میرا خیال ہے۔ آپ اس کے مولوی صاحب ہوں گے اس کے گاؤں میں۔ بتایا تھا اس نے مجھے اور آپ کے
حلے سے میں نے آپ کو پہچان لیا۔ بہت عزت کرتا ہے وہ آپ کی کہ کس طرح ماں باپ کے مرنے کے بعد آپ
نے اس کی ذہنی و دنیاوی تعلیم کا خیال رکھا۔ ایسے اچھے نیک لوگ آج کے زمانے میں کم ہی پائے جاتے ہیں جو
عبدالمتین جیسے شیم بے سارا بچوں کے سر پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ اپنی وے میں اسے بھیجتا ہوں جا کر۔ ہو چاہیے ہو گا
کھل کر بیان کر دیتے گا اب اس کے پاس روپے پیسے کی کچھ کمی نہیں۔ آپ کے سب احسان ادا کرنے کے قابل
ہو چکا ہے۔" وہ بے حد فخر سے بتا رہے تھے۔

"میرا دادا ہے وہ مردانا دلچسپی ملے میرا بیٹا ہے۔ بہت اچھا بہت نیک ملائق اور فرمانبردار بیٹھیں آپ میں
کچھ آپ کی تواضع کو بھی بھجواتا ہوں۔"

وہ شخص صوفی صاحب کے قدموں کے نیچے سے زمین سر کا کر انہیں بیٹھنے کو کہہ رہا تھا۔

"شیم بے سارا۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد۔" صوفی صاحب کے کانوں میں جیسے بیٹیاں ہی بج رہی تھیں۔
بیت باز کے محل میں حلے والی جو گرد آلود آدھیوں کی بیٹیاں! آندھی کا طوفانی شور۔

میں کایا شور ہے آندھی انہیں کس اڑا لے جا رہی ہے۔ ان کے قدم زمین سے اکٹڑ رہے تھے مگر جسم
جیسے کسی چٹان کے نیچے دبا جا رہا تھا۔ ہلنے سے قاصر۔ ان کا نفس تیز تیز چلنے لگا۔ سینے کے بائیں جانب ہکا ہکا درد
اس آندھی کے شور میں بھی صاف اپنے ہونے کا پتہ دے رہا تھا۔ ان کی پیشانی پر پسینے کے تھمے منے قطرے چمکنے
لگے۔ رو کو ضبط کرنا دشوار ہو رہا تھا۔

"مونا تم پلیز گاڑی میں بیٹھو جا کر کہہ دو کسی مولوی کو نہیں جانتا۔ بیٹا بھی حد کرتے ہیں۔ ہر ایک سے کڑھسی
(مروت) بھانے بیٹھ جاتے ہیں سچا ہے وہ شخص جان پہچان کا ہو یا نہ ہو۔ تم گاڑی میں بیٹھو۔ میں ایک منٹ میں
آیا۔" عبد المتین کی آواز انہوں نے اس آندھی کے ہولناک شور میں بھی با آسانی پہچان لی تھی۔ جیسے ہی
عبد المتین نے کمرے میں قدم رکھا۔ آندھی اس کا جان لیوا شور طوفان سب کے سب ایک دم سے غائب ہو گئے۔

خمرے میں کس سے سی حلے کی ملکی سی گھوں گھوں تھی یا عبد المتین کے آخری جملوں کی بازگشت۔ انہوں نے
زخمی نظروں سے گردن ہمارے بغیر اپنے تخت جگر کو دیکھا جس کی آنکھوں میں ایک پل کو پہچان کی لہری ابھری تھی
اور دوسرے پل ڈوب گئی۔ اس کا ماتھا شکنوں سے ات گیا۔ ہونٹ بھیج گئے اور چہرہ تن گیا۔ آنکھوں میں سرد
بے حد سرد پہچان کے بچھے بچھے سے ویے نمٹا رہے تھے۔

"آپ۔" آواز اتنی بد علم تھی کہ صوفی صاحب نے ہلکا سا
"آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟ آپ کا اب مجھ سے کیا تعلق ہے۔ آپ تو مجھے اپنی زندگی سے نکال چکے ہیں
اور۔ اور میں بھی آپ کو بھول چکا ہوں تو پھر۔"

"بھول نہیں چکے تم ہمیں مار چکے ہو۔" خود پر قابو پا کر صوفی صاحب اونچی آواز میں فرمائے۔
"بے شرم بے غیرت۔ بے حیا انسان! جیتے جی والدین کو قبر میں اتار دیا تو پے پیسے کی خاطر خود کو بیٹھتا لیا
ارے اس طرح تو مجھ نے بھکاری بھی نہیں کرتے۔ چند سکوں کی خاطر وہ بھی ایسا بھٹ بولنے سے پہلے۔"

"بس کریں۔" وہ ہاتھ اٹھا کر پتی آواز میں فرمایا "میں نے جھوٹ بولا یا سچ آپ کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

میں آپ کو نہیں جانتا آپ نے خود مجھے دیکھا تھا۔ اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا اور جو لوگ زندگی سے نکل جاتے ہیں وہ زندہ بھی ہوں تو بھی مر جاتے ہیں اور میرے لیے آپ لوگ اسی دن مر گئے تھے جب آپ نے مجھے دھکے دے کر نکالا تھا۔ اس کا لہجہ ہر قسم کی پہچان سے عاری تھا۔

عبدالمتین! یہ تمہا ہے۔ تم؟ وہ ہنسنا شروع ہو گیا۔ ہاں یہ میں ہوں۔ اتنے برس آپ نے میری خبر نہ لی اب پتا چلا ہو گا کہ میں کیا بن چکا ہوں چاہوں تو آج شہر خرید کر زیب میں ڈال سکتا ہوں تو آپ کے پتھر دل میں میری محبت کا سند رکھا تھا میں ہارنے لگا۔ اگر والدین آپ کی طرح بے جس ہوں تو اولاد کے دل بھی پتھر کے بن جاتے ہیں۔ وہ بھی ایسے موقع شناس والدین کے ہونے سے تیم ہونا بہتر سمجھتے ہیں۔ وہ بڑی نفرت سے پھینکا رہا تھا۔

”بہر حال میرے پاس اتنا فال تو وقت نہیں ہے کہ میں آپ کو آئینہ دکھا تا پھروں آپ کو یقیناً پیروں کی ضرورت ہوگی جس کے لیے آپ نے اپنی سنگا خانا کو چل کر مجھ تک آنا گوارا کیا۔ یہ کچھ روپے ہیں رکھ لیں اور مجھے ایڈریس دے جائیں۔ چہاہ آپ کو ایک مقبول رقم بھجوادیا کروں گا۔ آپ کو وہ بارہ ادھر آنے کی ضرورت نہیں۔“ اس بے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ہزار ہزار کے سات آٹھ نوٹ نکال کر ان کے سہلے میز پر پھینکے اور باہر کی سمت مڑنے لگا۔

”ایڈریس لکھو ادیس مجھے۔“ جانے سے پہلے رکتے ہوئے اس نے کہا اور زیب سے پھوٹی سی انڈس اور پین نکال کر یوں۔ صوفی صاحب نے ایک افسوس بھری نگاہ اس پتھر دل بیٹے پر ڈالی جس کی پیدائش کی خوشی میں کئی دن اور راتیں سو نہیں سکے تھے۔ اس شخصے وجود نے انہیں کئی دن تک نہال رکھا تھا۔ تو یہ بھی وہ خوشی! مستقبل کی امید! آنے والے کل کا سارا۔

انہوں نے جینے میں کب کارک رک کر آنا سانس بڑی سہولت سے خارج کیا۔ ایک نظر میز پر پڑے ان نئے نوٹوں پر ڈالی خود کو لہجہ بھر میں مجتمع کیا زمین میں گڑے قدم اٹھائے اور باہر کی طرف بڑھے۔

”ایڈریس تو لکھو ادیس۔“ عبدالمتین نے انہیں پکارا۔ ”اس کی ضرورت نہیں اور تمہیں معلوم نہیں عمروں کے ایڈریس نہیں ہوا کرتے، قبرستان چلے جاؤ۔ کسی بھی مٹی کی بے نام قبر ہاتھ رکھ کر کہہ دینا یہ میرے مال باپ کی قبریں ہیں۔ دل چاہتے تو کبھی کسی بے نام قبر پر فاتحہ پڑھ لیتا اگر تمہارا ایشیاس اس کی اجازت دے۔ اللہ تمہیں ہدایت دے اور تمہیں جس زندگی میں ایسے حالات سے دوچار نہ کرے کہ تمہاری اولاد کو تمہیں جینے ہی قبر میں انا رہنا پڑے اور اس درد کا ڈھیر تمہیں کھڑے کھڑے مار ڈالے کھڑے کھڑے مٹوں مٹی تھے آماروے مٹوں مٹی تھے۔“ ان کی آنکھوں میں آنی بھی تھی۔ واضح شکل اختیار کر لی تھی۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھے اور باہر نکل گئے۔ عبدالمتین نے جھک کر نوٹ اٹھائے جیب میں ڈالے اور باہر نکل آیا۔

”تمہیں جاؤ اتنی دیر لگا دی۔“ اس کی بیوی گاڑی میں بیٹھی ناگوار سی سے بولی۔

”کون تھا تمہارا وزیر؟“ جیسے ہی وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا مونا نے پوچھا۔ ”کوئی نہیں۔“ اس نے اگلی سیٹ میں چالی گھنٹہ کی اور گاڑی اشارت کر دی۔ مونا نے ایک نظر اس کے سپاٹ چہرے کی طرف دیکھا اور کندھے اڑکا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی اس نے شاید صوفی صاحب کو باہر جاتے نہیں دیکھا تھا جیسے ہی گاڑی تین روڈ پر پہنچی۔ سرخ سنگل کے اشارے پر رکتے ہوئے عبدالمتین نے دائیں طرف فٹ پاتھ پر بیٹھے صوفی صاحب کو دیکھا۔ وہ کوئیوں کی شیشی میں سے ایک کوئی نکال کر اپنی زبان کے نیچے رکھ رہے تھے۔

”متین! تمہارا پاس کچھ ریزگاری ہوگی؟“ مونا کی آواز پر اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”نہیں۔“ وہ سرد مہری سے بولا۔ ”کیوں؟“

”یہ بابا بے چارہ جو دوائی کھا رہا ہے اس کو دیتے ہیں کتنا غریب لگ رہا ہے کپڑوں پر چونڈ لگے ہیں۔ ایسے لوگ ہی

تو اصل مستحق ہوتے ہیں۔ شریک گاڑا کہ اس نے مجھے غریب نہیں بنایا ورنہ۔ ثوبہ غربت تو بہت مشکل زندگی ہے۔ پیسے سے تمہارا پاس؟“

”نہیں۔“ مونا سنگل کھلتے ہی عبدالمتین نے تیز رفتاری سے گاڑی آگے بڑھادی اس کا جی چاہ رہا تھا گاڑی کسی اندھی اگائی میں اسے مار۔

”ہاں۔ ادھر سے باڈرا زور سے۔ جان نہیں ہے تیرے ہاتھوں میں۔ سیدہ نے تیز لہجے میں کہا۔ گاؤں کی دوائی نیچے زمین پر بیٹھی ان کی پنڈلیاں اور پاؤں دیار ہی تھی۔ گزرتے وقت نے سیدہ کو ہونٹوں کے دروازے پر مہا پے کا تحفہ دیا تھا۔

”ہاں ادھر سے۔“ سیدہ نے پر سکون انداز میں آنکھیں بند کیں کچھ دیر یوں ہی گزری۔ صالحہ بی بی کے پاؤں دیا آئی ہو؟“

”میں کئی کئی گئی ان کے کمرے میں وہ سو رہی تھیں۔“ وہ سر جھکائے ہوئے بولی۔ ”اتنا سوئی ہے یہ صالحہ نہیں کبوت پھرنے لگی ہو۔“ سیدہ منہ میں بڑبڑائیں۔ ”جی آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“ دانی نے سن کر بھی انجان بنے ہوئے پوچھا۔

”نہیں تیرے کان بڑے بڑے ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھ۔“ انہوں نے ایک ہلکی سی لالت اس کے گھٹنے پر ماری۔

”تیرا اندازہ کیا کرتا ہے کب تک ہوگی صالحہ بی بی کے ہاں بچے کی پیدائش؟“ چند لمحوں کے بعد سیدہ نے پوچھا۔

”انگلے میں سے چھ ماہ کی پہلی بار نہیں رہی۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

”تیرا اندازہ کیا کرتا ہے کب تک ہوگی صالحہ بی بی کے ہاں بچے کی پیدائش؟“ چند لمحوں کے بعد سیدہ نے پوچھا۔

”نہیں تیرے کان بڑے بڑے ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھ۔“ انہوں نے ایک ہلکی سی لالت اس کے گھٹنے پر ماری۔

"ہاں ہوں۔" سیدہ نے پھر ٹانگ بدلی۔

"وہ جی میرے پتر کا سٹی دوست ہے طارق شہر میں ڈاکٹری پڑھ رہا ہے بلکہ پڑھ لی ہے اس بار پڑھا آیا تو بڑی دیر ہمارے ورنے میں بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ اس نے ایک بڑی عجیب بات کہی جی۔" والی نے پاؤں کی انگلیاں آہستہ آہستہ دباتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" سیدہ نے ماتھے پر ہل ڈال کر پوچھا۔

"وہ کہہ رہا تھا جی عجیب سی بات ہے پر یہ تو ہمارے بڑے سیانے بھی کہتے ہیں کہ رزق عورت سے اور اولاد مرد کے نصیب سے ہوتی ہے۔ پر کہہ رہا تھا سینس (سائنس) کہتی ہے کہ اگر مرد کے گھر لگا تار لگیں ہوں تو ڈاکٹر اس کا کوئی علاج کرتے ہیں جس سے پھر لڑکے پیدا ہونے لگ جاتے ہیں اور۔"

"کیا ہوا اس کی تو نے؟" سیدہ نے ایک دم سے ٹانگیں کھینچیں۔

"ذبح دور۔ حرامزادی کہتا۔ میری باوضو زبان کو پلید کیا تو نے مسٹری تیرا مطلب ہے شاہ جی میں نقص ہے غرابی ہے علاج کرا میں اپنا۔ حرام خور! تیرا علاج کراؤں میں۔ تیرا بیہوش درست کراؤں میں۔ سبب الٹا لگا کر" سیدہ نے ہاتھوں اور لاقوں سے والی کو بیٹھا شروع کرویا۔

"نہیں سائیں۔ نہیں سلیم صیب میرا یہ مطلب (مطلب) نہیں جی۔" لالہ لیں گھونٹے اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہے تھے۔

"ذبح وہ رہو جا یہاں سے کٹیا۔ آئندہ میں تیری صورت نہ دیکھوں۔ اس حویلی کے اور گرد ہزار کوس کے اندر۔"

نہ تیری نہ تیری آل اولاد کی۔ دور ہو جا میری نظموں کے سامنے۔ پتھراں فیضان رسولان۔ کہاں مرگئیں ساری اڑھنے دے کر نکالو اس حرام خود کو۔" سیدہ کی جی پکارت پر آنا "انگنا" ساری ملازمائیں اکٹھی ہو کر آگئیں اور چند منٹوں میں روٹی دھوئی معافی مانگتی والی کو اٹھا کر حویلی سے باہر پھینک آئیں۔ سیدہ کا جلال بھر اچھو لال بھسوا ہوا تھا۔ ہاتھ والی کو مار مار کر سرخ ہو چکے تھے اور بولے بولے پکپکارتے تھے۔

"تمک حرام بے غیرت ہو اس کرتی ہے آگے سے شاہ جی انکا علاج کرا نہیں رسولان ٹھنڈے ہوس کا گلاس لے کر امیرے لیے جلدی سے۔" سامنے سے آتی ملازمہ کو دھاڑ لگاتوں نے حکم دیا۔ وہ لے لے قدموں پلٹ گئی۔

"خیر تو ہے کیا! اس پر چلا رہی ہیں اسی وقت؟" سلطان بخت اندر داخل ہوئے مسٹر فکرا کا سفاری سوٹ پہنے ہاتھ میں گولڈن کی چین گھماتے وہ کہیں جانے کو تیار دکھائی دے رہے تھے۔ دونوں اینٹیوں پر سفید گرتے بال مل چل کر ان کی پیچھوٹی کا اعلان کر رہے تھے۔ چہرے کا رنگ البتہ اسی طرح سرخ و سفید تھا۔ منہ لپٹا اونا جسم لڑی کمان کی طرح تانھا۔ سیدہ نے دل میں بھائی کی نظر اتاری۔

"میرے صحت مند شہزادے کو تو کسی کالی زبان والی کی بدخواہی کی نظر نہ لگے۔ سات بیٹیوں کا منہ دیکھے جو جی دھن دولت اس کی پوکھ کی بوٹھی رہے وہ دل ہی دل میں بھائی کی بدائیں اتار رہی تھیں۔"

"جی اک تمک حرام ذبح کرو اس کے ذکر کو۔ تم کہیں جا رہے ہو؟" وہ اب خود پر قابو پا چکی تھیں۔ آرام سے بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"بھول گئیں آپ آج ہماری ملٹی میشل کمپنی کی سب رائج کی افتتاحی تقریب ہے وہیں جا رہا ہوں۔ کل تک واپس ہوگی۔ سین شاہ نو آئیں گے نا ادھر آپ نے تاکید کی تھی؟"

"ہاں کی تھی دیکھو کہہ تو رہے تھے آگے ان کی مرضی تم شام تک واپس نہیں آسکتے؟" کیوں خیریت کوئی کام ہے؟"

"کل بابا چراغ شاہ کے مزار پر چادر چھانی ہے۔ لنگر تو خیر ادھر ایک ماہ سے جاری ہے۔ حویلی کی طرف سے سو مٹا ہوں کو کھانا کھلایا جا رہا ہے۔ کل حضرت بی بی کی سیر کار بھی جانا ہے۔ انہوں نے آخری تعویذ دیا ہے۔ اس کے بعد تو ضرورت نہیں جانے کی۔ بس پھر شوٹی کی ویلیں چھانے ہی جائیں گے۔" وہ جلدی جلدی بتانے لگیں۔

"آیا! آپ خود ہی ہو آئیے گا میں رات کو جانے کب فارغ ہوتا ہوں۔ آج کل رات کا سفر یوں بھی خاصا ڈنچرس ہو چکا ہے۔ میں کل صبح ہی آسکوں گا۔"

"کل صابن نے چیک اپ کے لیے بھی جانا ہے۔"

"معلوم ہے مجھے۔" ان کی چہرے کے تاثرات کا ایک بدل گئے تھے پیشانی پر ناگواری کی شکنیں ابھر آئیں۔

"کل ڈاکٹر لعل چیک اپ کے بعد ایکورٹ ڈیٹ بناوے گی۔ الٹرا سائونڈ بھی کرے گی اور دوسرے ایک ڈیٹیسٹ بھی۔" سیدہ نے بھائی کی ناگواری کو محسوس کرنے کے باوجود بیان جاری رکھا۔

"کل اس سے معلوم کر ہی جیتے گا اس بار صابن کی کیا" کل "کھانے والی ہیں۔" وہ طنز سے بولے۔

"اللہ کا نام لو سلطان شاہ! پچھلی بار تیسری بیٹی کی وفات اتفاقاً کھانے کو پہلے قلم ہو لیا تھا کہ پتی ہونے والی ہے تو دیکھا کیسا ڈپریشن ہوا تھا اسے مرتے مرتے پٹی تھی۔"

"مری تو نہیں تھی نا۔" وہ کٹی سے بولے۔

"اور میں جیوں کی بھی نہیں بے فکر ہو تم۔ تمہارے سینے پر مونگ دینے کو زندہ رہوں گی ہزار برس تک بلکہ اس سے بھی زیادہ کھانے جانے کب کرے میں داخل ہوئی تھی اور سلطان بخت کا آخری جملہ سن کر تیزی سے دھاڑی۔

"اور تم مرنے والی ہو بھی نہیں۔ میری جاؤ گی تو تمہاری منحوس روح میری زندگی کے پیچھے بڑی رہے گی۔ میں نے تو اب اس گھڑی کو بھی رونا چھوڑ دیا ہے جب تم میری زندگی کو عذاب بنانے چلی آئی تھیں۔" سلطان بخت نظرت بھرے لہجے میں بولے۔

"عذاب تو میں سر رہی ہوں اس دور میں آنے کے بعد۔"

"تم نے تم عذاب سے میں رہی عذاب ہے اگر رہی ہو۔ ہر سال ایک تنگی تلواریک بیٹی کی شکل میں ایک عذاب کی صورت میں میری زندگی پر مسلما کر رہی ہو منحوس عورت۔" سلطان بخت قہقہے سے چلائے۔

"من رہی ہیں آپ یہ ساری بکواس۔" صابن ہانپتے ہوئے پچالی۔

"من رہی ہیں ڈیکھ رہی ہیں اور بھلت رہی ہیں تمہاری صورت میں جیتا جاگتا عذاب کا ٹھنڈ۔ پیچھے کی ضرورت نہیں۔" سلطان بخت نے دانت چستہ ہوئے یا ہر کارخ کیا۔

"ہمت سے تو یہاں کھڑے ہو کر مقابلہ کرو میں۔ میں بھلت رہی ہوں جیتے جی ہر رخ میں جل رہی ہوں۔ پتا نہیں کب میرا چہرہ کارا ہو گا اس اس۔" وہ لہرا کر گرتے کو بھی کہ سیدہ نے لپک کر اسے تھما۔

"صابن! لعل! ہوش کرو کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑی ہو وہ تو بے وقوف ہے تم تو نادان نہیں۔ رسولان! کہاں مری ہو اس لے کر آجلدی سے۔"



ڈگر بچوٹس فوجوں ٹرینڈ "آن ٹرینڈ ایڈی ٹیچرز کی فوری ضرورت ہے۔ ڈاکو منٹس ہمراہ لائیں اسٹریو کلک صحیح نو بجے ہو گا مستحق تنخواہ اور الائنس دیے جائیں گے۔"

"بڑھا تم نے؟" آمنہ نے اونچی آواز میں پڑھتے ہوئے زہن سے پوچھا۔

"بڑھنے کی ضرورت نہیں بڑی تم نے جو شادیا ہے۔"

"کیا خیال ہے پھر؟" آمنہ ہلکے بے مابلی سے بولی۔

"بس بارے میں؟"

"بھئی اپنی کرنے کے بارے میں؟"

"تم نے بڑھا نہیں انہوں نے گر بچوٹس ٹیچرز ڈیمانڈ کی ہیں۔"

"تو کیا میں گر بچوٹ نہیں ہوں۔" آمنہ جلدی سے بولی۔ "اب تم کلج میں رہے جانے کے شوق میں یا نچواں

سال بھی اودھ رگا رہی ہو تو میرا کیا قصور بالکل گھر کے پاس ہے اسکول۔ تمہارا اور جویریہ کا کالج بھی پاس ہے اگر مجھے اودھ جناب مل جائے تو بس۔" وہ جوش سے اسکول کی نئی خوبصورت عمارت کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"تو بس۔" زینب نے اس کی نقل اتاری۔

"بابا صاحب کو بتا چل گیا تو وہ بھی تمہاری "بس" کر دیں گے۔"

"کالج میں پڑھنے کی اجازت بھی تو انہوں نے دی تھی تا' اب میں پچھلے ماہ سے گھر میں فارغ التحصیلی کیا کمال کر رہی ہوں۔ گھر کے حالات دیکھے ہیں نا تم نے۔ بابا صاحب نے چارے کیا کریں تو تین سال ان کی ریٹائرمنٹ میں رہ گئے ہیں پھر ہم کیا کریں گے۔" آمنہ نے ایک بار پھر مڑ کر اسکول کی عمارت کو دیکھا۔

"اس میں بھی زیادہ قصور بابا صاحب کا خود اپنا ہے۔ کیوں اس قدر ضدی ہیں وہ دونوں بھائیوں کو نکال باہر کیا تو اب خود ہی ساری ذمہ داریاں بھرتیوں کے نا' اس قدر بھی انسان کو انا پرست نہیں ہونا چاہیے۔" زینب نے اپنا موقف پرایا۔

"تو ان دونوں نے کون سا پلٹ کر خبر لے لی۔ اگر بابا صاحب قصے میں آکر انہیں برا بھلا کہہ کر گھر سے نکال دیے ہیں تو وہ پلٹ کر معافی مانگ لیتے دو چار بار معافی مانگ لیتے تو کیا بابا صاحب ان کو معاف نہ کر دیتے؟ کسی باپ کا دل اس قدر سخت نہیں ہونا کہ اولاد کو یوں خود سے الگ کر دیتے اور معافی مانگنے پر معاف بھی نہ کرے۔ ان دونوں کے دل تو بابا صاحب سے بھی سخت نکلے۔" آمنہ نے ہمیشہ کی طرح جناب کی طرف اشارہ کیا۔

"کسی باپ کا دل اس قدر سخت نہیں ہوتا مگر بابا صاحب کا تو ہے نا اور وہ دونوں بھی ان کے بیٹے ہیں۔ عبد العزیز کو کیسے انہوں نے نکالا۔ اماں جی اور ہمارے ہزار اصرار پر بھی کسی کو بارہ پلٹ کر اس سے رابطہ نہیں کیا۔ ٹیلیفون نے بتایا نہیں کہ وہ شہر میں کیسی اصلاح زندگی گزار رہے ہیں۔ کسی بڑے آدمی کے دامادوں کو کمزوروں میں کھیل رہے ہیں اگر بابا صاحب اپنی انا کو اپنی ضد کو پس پشت ڈال کر ایک بار ان سے ملنے چلے جاتے تو کیا معافی کا دل نرم نہ ہو جاتا۔" زینب تیزی سے بولی۔

"بھائی کو خود کون سا خیال آیا۔ صرف بابا صاحب نہیں اماں جی بھی تو ہیں ہم بیٹوں بھی تو ہیں انہوں نے کسی کا بھی خیال نہ کیا اور وہ ان کا آخری خط یاد ہے نا تمہیں؟"

"یہی فضول باتیں لکھی تھیں بابا صاحب کے بارے میں۔ ہمیں کچھ نہیں کر اس قدر غصہ آیا اگر بابا پڑھ لیتے تو نہ جاتے ان کا ایسا حال ہوتا۔"

"تمہیں خبر ہے کہ وہ دل میں پچھتاتے ہیں؟" آمنہ تنک کر بولی۔

"ارے آمنہ بی بی! میں اتنی بھی نا سمجھ نہیں ہوں مجھے معلوم ہے آج کل ہو گھر کے حالات بارہے ہیں بلکہ گزشتہ چار پانچ سالوں سے بابا صاحب دل ہی دل میں خوب پچھتاتے رہے ہیں مگر اس کا انہماک نہیں کرتے۔ اگر کرنا نہیں آج تک کچھ بھی نہیں ملا۔ ٹھنک جائیں تو شاید بہت کچھ پالیں۔" وہ دونوں بے حد سست رفتار میں سے گھر کی طرف جارہی تھیں کالج نہیں کانو کیشن تھا آمنہ اپنی ذکر سے لے کر آئی تھی اور زینب اس کے ساتھ گئی تھی۔

"ہاں مجھ سال ہو گئے بلکہ اس سے بھی زیادہ گھر کے تنگ حالات نیچے ہی نیچے جا رہے ہیں اور کوئی حل نظر نہیں آ رہا جویریہ کے کالج کے اخراجات بھی شامل ہو گئے ہیں اگر عبد العزیز یوں پھپھپا کر ہماری مدد نہ کرنا تو شاید ہم دونوں پڑھ بھی نہ سکتے مگر گھر کے خرچ کے معاملے میں بابا صاحب کی کڑی نظر ہوئی ہے ہم عبد العزیز کے دیئے ہوئے پیسے خرچ میں شامل نہیں کر سکتے۔ وہ اس کمائی کو حلال کب سمجھتے ہیں۔ اس کا ایک آنہ بھی خود پر حرام قرار دے رکھا ہے۔" آمنہ افسردگی سے بولی۔

"اتنے سال ہو گئے عبد العزیز پھپھپا کر آتا ہے۔ ایک دو بار بابا صاحب سے معافی بھی مانگی انہوں نے اسے کون سا معاف کر دیا۔ آمنہ! میں اب ٹھکنے لگی ہوں۔" زینب ایک سرو آہ بھر کر بولی۔

"تو تیز چلو نا تمہیں من من کے قدم اٹھا کر سست رفتار میں چل رہی ہو۔ سر پر دھوپ چمک رہی ہے اور تم

چوٹی کی رفتار سے چل رہی ہو۔ ٹھنکا تو ہے۔" آمنہ تیزی سے بولی۔

"میں اس ٹھنکنے کی بات کب کر رہی ہوں۔" زینب کے قدم اور سست پڑ گئے۔

"تو پھر کون سی ٹھنکنے؟" آمنہ نے رک کر پوچھا۔

"ہماری زندگیوں کو لگتا ہے کندے جو پڑ گئے رکے پانی کی سی ہو گئیں۔ ایک ہی جگہ ایک ہی مقام پر جیسے ساکن ہو گئی ہیں۔ کہیں بھی کوئی تازگی کوئی نیا بین نظر نہیں آتا اور نہ ان ٹھنکنے حالات سے نجات کا کوئی حل کوئی رستہ آخر یہ بیماری تکلیف دہ زندگی ہم کب تک یوں ہی جیتے رہیں گے؟ ترس ترس کر دل روٹی کے چار نوالے ملتے ہیں اور تن ڈھانپنے کو جو کپڑے ہوتے ہیں۔ ٹھنکنے مانو خود پر ترس آتا ہے۔ ہمارے تو چروں سے بھوک اور مسکینی چلتی ہے۔ میں نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ میں صوفی عبد الرحمن کی بیٹی ہوں پھر بھی نہ جانے کیسے سارے کالج کو میرے پہلے قدم سے ہی پتا چل گیا تھا کہ میں ایک مولوی کی بیٹی ہوں جس کی خواہ میں اس روز ختمی زندگی کی سانسوں کا رشتہ بمشکل برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ تم نے دیکھا ان چار سالوں میں کسی بھی اچھی معقول لڑکی نے ہم سے دوستی کرنے کی کوشش بھی نہیں کی نہ ہمارے قریب آنے کی جیسے ہمیں کوئی موٹی روگ لگا ہو جو ہمارے قریب آنے سے ان کو بھی لگ جائے گا۔ آخر ہماری اس بے کار زندگی کا مصروف کیا ہے اور آخر کب تک ہم اسے یوں ہی جیتے چلے جائیں گے؟" زینب بولتی ہوئی اسے معلوم تھا کہ اب آمنہ ایک ایسا لیکچر بھاڑنے کی بہت سوں سے بہتر زندگی گزارنے پر تیار ہو گئے پختہ سڑک پر اس کے قدموں کی ہلکی چاپ تو سنائی دیتی رہی مگر آمنہ کچھ نہ بولی۔ زینب نے سر اٹھا کر بہن کا چہرہ دیکھا۔ آمنہ سپاٹ نظروں سے گھر کی طرف جاتی گئی کو دیکھ رہی تھی۔

"تم نے کوئی جواب نہیں دیا؟"

"میرے پاس اس کا کچھ جواب نہیں سوائے اس کہ تم اس زندگی اپنی اس بیکار زندگی کے بارے میں جتنا زیادہ سوچو گی اتنا ہی اسے گزارنا مشکل ہو جائے گا۔ آئی جاتی سانسوں کا ہواؤ رک رک جائے گا۔ اسے چپ چاپ اسی طرح جیتے جاؤ اس کے متعلق سوچو نہیں اور پتا نہیں کیا ہو جائے گا۔ بہت جگہوں سے ضبط کے ٹائٹل اکٹرا جائیں گے تو آنے والے سیلاب کو کون روکے گا۔" آمنہ جیسے خود سے بڑبڑا رہی تھی۔

"تمہیں تم بھی مایوس ہو اندر سے؟" زینب نے گویا سرکوشی کے انداز میں پوچھا۔

"میں کل اودھ اسکول میں اٹھو بولتی آئی تھی۔" آمنہ نے غلی میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"کیسے بابا صاحب اجازت سے ہیں؟" زینب حیرت سے بولی۔

"ضرور دیں گے تمہیں کھائیں لوں کی اجازت۔ میں بھی کتوں میں رہ کر جیتتی ہی اپنے مرنے کا تمہا نہیں دیکھ سکتی کسی کو تو ان کتوں کی منڈیر سے باہر بھاگنا ہو گا۔ کب تک ہم دونوں بھائیوں کے خیالات بدلنے کا انتظار کریں گے وہ آئیں اور ہمارے ہاتھ پکڑ کر ہمیں اس اندھے کتوں سے باہر نکالیں۔ ہمیں خود ہی کچھ کرنا ہو گا۔ خود ہی۔" کتے ہوئے آمنہ تیزی سے گھر کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ زینب ابھی تک حیران تھی آمنہ کے خیالات سن کر وہ بہت سست قدموں سے چل رہی تھی۔

"یہ ایک اچھی خوش آئند نشانی ہے کہ آمنہ بی بی کے خیالات بدل گئے ہیں۔ اب ضرور کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔" خوشگوار جھوٹے کی سرسراہٹ کا احساں اس کے اندر جا کا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے آمنہ کے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"میرا مشن کارڈ لٹ آیا ہے۔" شہرینہ نے چھوٹے ہی فون پر عبد العزیز سے کہا۔

"اچھا۔" عبد العزیز نے منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر بتائی ہوئی۔

"یوٹیو گے نہیں آیا آیا ہے؟" وہ کچھ حقیقت سے بولی۔

"مجھے معلوم ہے تم بہت اچھے مارکس لے کر پاس ہوئی ہو گی اور میرے پوچھنے سے پہلے ہی بتا دو گی۔" وہ

لاپرواہی سے بولا۔

”مگر تمہیں پوچھنا تو چاہیے تھا نا؟ اول تو فون تمہیں خود کرنا چاہیے تھا۔ میں تمہیں بتا چکی تھی کہ آج صبح میرا رزلٹ آؤٹ ہونے والا ہے۔ سارا دن ساری شام میں نے تمہارے فون کا بے تابی سے انتظار کیا۔ آخر مجبور ہو کر میں نے خود فون کیا۔“ وہ ہلکے کرتے ہوئے بولی۔

”شہو جان! تمہیں معلوم ہے میں آج کل کس قدر مصروف ہوں۔ اہہ گاؤ! آج کل میرے پاس سر سنبھالنے نہ آیا کھانے پینے کی فرصت نہیں ہے۔ خدا خدا کر کے تو یہ دن آئے ہیں بڑا انتظار کے بعد۔“

چار سال کی دن رات محنت اور جمل خوارگی کے بعد اب جو میرا کچھ مقام بننے والا ہے لوگ مجھے پہچاننے لگے ہیں میں زندگی کے کشمکش بھرے سماں پر میں ایک اشار بننے پلا ہوں تو اس کے لیے کچھ نہ کچھ تو قربان کرنا پڑے گا۔ تمہیں خود بھی تو میرے کچھ بن جانے کا انتظار تھا اب گلے کیوں کرتی ہو؟“

عبدالعسین نے وضاحت پیش کی مگر لوجہ ابھی بھی کچھ بیزار سا تھا۔

”مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم مجھے ہی فراموش کر ڈالو۔ آج کتنے دنوں بعد فون پر ہماری بات ہو رہی ہے تمہیں کچھ اندازہ ہے۔“

”پھر وہی گلہ، بھئی کہہ دو رہا ہوں کہ مصروفیت ہے آج کل۔ میری تین فلمیں اسٹیج آن ایئر آ رہی ہیں میرا دوسرا الیم آرہا ہے۔ اگلے ماہ مارکیٹ میں اس کی افتتاحی تقریب ایک بڑے ہوٹل میں ہوگی جسے پیانے پر یہ الیم میرے کیریئر کا سنگ میل ہو گا۔ اس کے بعد ایک خوبصورت زندگی کو جانی شاپرا اور سٹارٹ بائٹل سیدھا اور صاف ہو گا پھر نام دونوں کو ایک ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا پھر یہ چھپ چھپ کر آئے اور فون کرنے کی معیشت سے بھی چھٹکارا مل جائے گا۔ بس ایک بار مجھے اپنا کچھ نام بنالینے دو پھر میں ساری ایک نہیں سنوں گا تمہیں اٹھا کر لے آؤں گا۔ مجھ سے خود اب یہ دوری نہیں سہی جانی اور یہ روٹھی جانی ملاقاتیں پچھپ پچھپ کر ڈر ڈر کر ملنا، کوئی راتوں کو ستر میں چھپا کر فون کرنا کوئی آرہا ہے کہہ کر نازک مجلس میں فون بند کر دینا مجھ سے اب نہیں برداشت ہوتا۔“ وہ جیسے پھٹ پڑا۔

”تمہارے پاس اب شاید یہ چند ماہ ہی ہوں۔“ شہینہ اسی مدہم لہجے میں بولی۔

”اب کیا ہو گیا؟“ وہ جیسے ٹھک آ کر بولا۔

”صاف بھابھی کے فارغ ہوتے ہی اس بار تو مجھے شاید ایک ماہ کی بھی سہولت نہ دیں۔“

”مطلب؟“

”مطلب بھی میں بتاؤں۔“ وہ تلخی سے بولی۔

”میں واضحی نہیں سمجھا۔“ وہ سمجھتے ہوئے بھی انجان بن کر بولا۔

”تپانے بڑی مشکل سے میرے ہاسٹرز کو ہضم کیا ہے۔ اب وہ میری شادی کے لیے ایک دن بھی نہ کر سکیں گی۔“

”بھابھی بیگم کے فارغ ہوتے ہی۔“

”تمہاری بھابھی بیگم فارغ ہوں گی تو تمہاری تپا جان کو سوگ یا خوشی منانے میں میں لگ جائیں گی۔ ویسے تو قرین از قیاس ہے اس بار بھی وہ نوبلی کی ایک اور وارڈ کو جنم دیں گی۔“ وہ مسخرانہ انداز میں بولا۔

”خدا نہ کرے عبدالعسین! کم از کم تمہیں تو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“ شہینہ نے دہلی کر کہا۔

”میرا تو خیال ہے کہ مجھے ہی یہ کرنا چاہیے بلکہ اس کے لیے باقاعدہ منت مانتی چلا ہے۔“

”کیوں تمہارا آیا، قناد ہے اس میں؟“ وہ کچھ غصے سے بولی۔

”میرا حقا تو اس میں ہے کہ شہینہ بہت سببطن شاہ میری ہو جائے اور یہ دوریاں دور ہو جائیں اور مجھے نوبلی سے کچھ غرض نہیں چاہیے۔ وہاں لڑکیوں کی قطاریں لگیں یا لڑکوں کی۔“ وہ فوراً بات بدل کر بولا۔

”تم نے بتایا نہیں تمہارے ماہ کس کتنے آتے ہیں؟“

”تمہیں اس سے کیا۔“ وہ ناراضی سے بولی۔

”پھر وہی فضول کی فحشلی۔ اچھا ملنے کب آ رہی ہو۔ تمہاری کامیابی کی خوشی میں رُست تو رہی ہے اور گنت بھی۔ اس بار ڈنر کسی ایتھے سے ہو گل میں نہ کریں۔“ شہینہ کو لگا ”آج اس کا داغ ہمک گیا ہے۔“

”نہ جانے تم کیسی باتیں کر رہے ہو میرا خیال ہے تمہیں نیند آ رہی ہے۔ سو جاؤ جا کر۔“ وہ نمونٹھے پن سے بولی۔

”تمہاری آواز سن کر تو میری نیند اڑ جاتی ہے اور جو یہ ہلکی ہلکی باتیں ہیں یہ تو پیار کا نشہ ہے۔“ وہ لہجے کو خمور بناتے ہوئے بولا۔

”میرا خیال ہے اب اس کرتے ہیں کافی ناظم ہو گیا ہے۔“ شہینہ اس کے انداز سے ڈر کر بولی۔

”تم فون بند نہیں کرو بلکہ میری بات غور سے سنو۔ میں ذرا پانی ٹا ایک گھونٹ بھروں۔“ کہہ کر اس نے پاس پر ہی بوتل کا ٹارک ہٹا کر منہ سے لگا پانی دو تین لمبے لمبے گھونٹ بھرے اور بوتل رکھ دی۔

”یہ تھوڑا سا“ اس نے ”کل کدہ“ سے حاصل کیا تھا جہاں ہر دوسرے فنکشن میں اس کا کھلے عام استعمال ہوتا تھا اور زور پور مل کا نہ ہوا بیٹا ہونے کے ناطے وہ اس بلا سے کتنے دن بیچ سکتا تھا اور اب تو خود بھی وہ اس سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔

”شہو ڈارنگ! تم ذہنی طور پر تیار ہو جاؤ، ان دو چار ماہ میں ہمارے خفیہ پیار کے رشتے کو نام ملنے والا ہے۔ میں نے پختہ ارادہ کر لیا ہے میں اب تم سے فوری طور پر فون بند نہیں رہ سکتا۔ بس دو چار ضروری کام بنانے ہیں۔ ہم دونوں اب شادی کر لیں گے تم میرے ساتھ آنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لو۔“

”شادی کب کی ہے؟“ شہینہ حیران رہ گئی۔

”جیسے سہ کرتے ہیں۔ ہم کو کٹ جیج کریں گے یا دو چار گواہوں کی موجودگی میں خفیہ نکاح وہ بھی اس لیے کہ تم جو بھی سے جیبت میں ہو تو ان میں ڈر ہے کی جوش پر بات الٹے کو تیار ہوں۔“

”کیا نہیں نہیں۔ کیا تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں؟“ وہ ہلکے کر بولا۔

”کیوں نہیں کرنا چاہتی مگر اس طرح۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”اسی طرح ہوگی ڈر ہماری شادی تمہیں ہمار کھو اور کوئی رستہ نہیں ہے۔ اور اب تم مجھ سے دامن چھڑانے کی کوشش بھی نہیں کر سکتیں کیونکہ ہمارے پیار کی دلدل میں گمشدوں تک وہ گھس چکا ہوں۔ اب اس سے باہر نکلنا ممکن نہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں؟“

”معلوم ہے۔“ وہ چپچپی آواز میں بولی۔ اسے عبدالعسین کے ان خطرناک ارادوں کا پہلے سے اندازہ نہیں تھا۔ اس کے بارہا عراغہ مانتے تھے کہ وہ اسے اٹھوا نہیں سکتا تھا۔ وہ بری طرح سے ڈر گئی تھی۔

”تو پھر یہ کچھ کیسے؟“

”مجھے ڈر لگتا ہے اس طرح۔“

”وہ تو تمہیں اول روز سے لگتا ہے۔ اب سب کچھ اسی طرح ہو گا جس طرح میں کہہ رہا ہوں۔“ اسی وقت اس کے پاس پڑے ہوئے فون سیٹ کی بیل بج اٹھی۔ اس نے گردن گھما کر ہی ایل ایل پر نمبر دیکھا۔ تین کارڈ فون تھا۔

”اسے بھی یہی وقت ملا تھا فون کرنے کو۔ اب ایک گھنٹہ اس کے ساتھ عشق بگھا دو۔“ وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔

”اوکے ڈارنگ! باہر ڈر دہلی بیچ رہی ہے۔ میں ذرا دیکھوں باہر کون ہے۔ کل فون کر کے ملنے کی ڈیٹ اور جگہ بتاؤں گا“ اوکے ہائے۔“ اس نے شہینہ کو اٹھی بات کا موقع دے بغیر موبائل آف کر دیا۔ اسے معلوم تھا شہینہ ایک بار پھر کال کرے گی اسی لیے اس نے موبائل آف کر دیا اور فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”جیتے رہو تمہاری فرمائیداری دیکھتی ہوں تو جیسے بہت سے زخموں کو مرہم مل جاتا ہے۔ ذرا یونیورسٹی تک جانا ہے۔“ وہ کیوں؟“ وہاں تھے پر مل ڈال کر بولا۔

”مشی کو لے کر آتا ہے۔ اس کی گاڑی آج خراب ہو گئی تھی، صبح اظہار سے ڈراپ کر آیا تھا۔ ابھی ابھی اس کا فون آیا ہے۔ لہ میں کہتی اور تو ہے نہیں میں نے اس سے کہہ دیا کہ آؤ گے کھٹے تک تم اسے پک کرنے آ رہے“

”ام جان! وہ احتیاجی لمبے میں بولا۔“ آپ کو معلوم ہے مجھے یہ سب۔“ وہ اپنے ہونٹ چبانے لگا۔
”معلوم ہے مجھے، پر بیٹا اب مجبور ہی ہے۔ جاؤ اپنی انتظار کر رہی ہو گی۔ پتا نہیں کیسے آئے گی۔ تم سے تو بہت محبت سے پیش آتی ہے اپنے والدین کے برعکس۔“
”معلوم ہے مجھے۔“ وہ خوشی سے بولا۔

”ایھا کلب سہاذا اس کا فون آئے بھی آدھا گھنٹہ ہو چلا ہے۔ انتظار کر رہی ہو گی۔“ مسز خان کے کتے پر وہ دل میں کڑھتے ہوئے لہجہ بولا۔

اظہار بھائی کی یہ صاحبزادی سے زیادہ اس پر فریفتہ تھی۔ معاذ کے خشک اور اجنبی رویے کے باوجود وہ معاذ کے آگے پیچھے بھرتی تھی۔ اسے دیکھے ہی مشی کی آنکھوں کی چمک چہرے کی رنگت اور چال کی روانی میں اس طرح نمایاں فرق آجاتا کہ ایک اجنبی کو بھی اس کی جھلکی کا فوراً ”علم ہو جاتا۔“ مسز خان اس کی دیوانگی سے آگاہ تھیں اور انہیں بظاہر کچھ اعتراض بھی نہیں تھا مگر معاذ اس سے بے حد چیز مانتھا۔

”بہت آہستہ بچھ جائے گا اس کے معصوم دل کی خوشی کو۔“ مسز خان سوچتیں۔
”تھا ہے۔“ مشی نے مسرت سے کہا۔ اس کی کھڑی لگی۔ اپنی دوستوں کو ہاتھ ہلاتی وہ گاڑی کے پاس آگئی۔

معاذ نے کوئی جواب نہیں دیا ہاتھ بڑھا کر نیلے دروازے کا لاگ کھول دیا۔
”تمہیں میرا ذرا سیر کرنے کا بہت شوق ہے؟“ اس نے فرٹ ڈور کھولا اور بیٹھ گئی۔ ”مگر مجھے تمہارے ساتھ بیٹھنے کا شوق ہے مگر یہ ہے بلکہ میرا خواب ہے تمہارے ساتھ زندگی کے لمبے سفر میں ساتھ ساتھ رہنے کا۔“ وہ گاڑی کا دروازہ بند کر کے بڑے آرام سے بولی۔

”تم نے ام جان سے کہا کیوں بولا؟“ معاذ نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے کچھ خفگی سے کہا۔
”کون سا بچہ؟“ وہ اپنے ہنڈ بیک سے ہنڈل نکال کر آہستہ آہستہ اپنے بالوں میں پھانسنے لگی۔
”تمہاری گاڑی خراب ہے۔ جبکہ صبح میں نے خود تمہیں گاڑی ڈرائیو کرتے یونیورسٹی جاتے دیکھا تھا۔“ معاذ نے ذرا سی گھبراہٹ سے فرمایا۔

”بڑی عمر آتی کرتے ہو پھپھ پھپ لہ۔ سامنے آکر جو اس قدر ہماری خیر رکھو تو شاید ہم خوشی سے مری جائیں۔“ وہ ہنس کر بولی۔
”تمہیں فضول فلمی ڈراما بند کرو اور میری بات کا جواب دو۔“ وہ بڑے کڑواہٹ سے بولی۔

”یار انو اتھو اتھو۔“ وہ بولے میری گاڑی صبح ہی سے خراب دکھائی تھی۔ ابھی ایک دوست کو ضرورت تھی اس نے کہا۔ میں گاڑی کا عمل چیک اپ بھی کروا دوں گا اور صبح واپس بھی کرواؤں گا اور میں نے بھی سوچا اتنے سامنے موسم میں ایسے اتنی بڑی بڑی ویران تھا سڑکوں پر ڈرائیو کرنا اچھا نہیں لگتا۔ کوئی پیکنگ سم سا ہم سفر ہونا چاہیے پھر یوں لگے۔ ”ہم چلے تو ہمارے سنگ سنگ یہ نظارت چلیں۔“

”ار تمہارے بپا کو تمہارے اس دن سے رومانس کی خبر ہو جائے تو۔“ معاذ نے اسے ڈرایا۔
”تو میری جان۔“ وہ اس کی طرف بھولی۔ ”مگر تم کرو پیپا کی میں جان ہوں پیپا میرے دن سے رومانس کو دو طرفہ

”لیجئے ام جان! سنبھالیے اپنے اس شیطان کو سائڈ میشن کروا آیا ہوں میں اس کا پلے گروپ میں ہے۔ حضرت تو ابھی سے اسکول میں بیٹھتے کو تیار تھے۔ زبردستی لے کر آیا ہوں۔ دو تین بچوں سے کئی دوستی بھی گاتھ آئے ہیں۔ ایک کیوٹ سی بی بی تو کلاس روم کے دروازے تک چھوڑنے آئی تھی انہیں۔ یہ ابھی سے اتنے سوشل ہیں تو بڑے ہو کر کیا عالم ہو گا ان کی شہرت کا۔“ معاذ نے خوبصورت، صحت مند مسخ و سفید رنگت اور شرارتی آنکھوں والے چار سالہ ارتضیٰ کو مسز خان کی گود میں بٹھاتے ہوئے کہا۔ مسز خان نے پناہ پٹ تین چار بار ارتضیٰ کا منہ اور ہاتھ چوم ڈالا۔

”میرا بیٹا سب ہی اتنا بیدار اور انریکٹو بھی کہ ہو کوئی دیکھتا ہے، خود بخود اس کی طرف کھینچا جاتا ہے۔ اس میں میرے چکنو کا کیا تصور۔“ مسز خان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بچے کو اپنی آنکھوں کے رستے دل میں پھپھالیں۔
”یا نکل دادو! ہم ہیں ہی اتنے چارے نیولی فل اور۔“ وہ سوچنے لگا۔ ”سمانے کہ سب ہم سے پیار کرتے ہیں۔“ وہ مسز خان کی گود میں اور پھیل کر بیٹھ گیا۔

”پر نیپل صاحبہ تو مان نہیں رہی تھیں کہ یہ تین سال کے ہیں۔ وہ تو میں نے زبردستی تین دلا یا اور سب سے زیادہ بار کے جا میں ہم چار سال کے ہیں ہم چار سال کے ہیں۔ آپ بھول رہے ہیں معاذ بابا۔“ معاذ نے جواب دیا۔
”زیتون بی! ہمیں بھوک لگی ہے جلدی سے کچھ لادو اور ارتضیٰ نے کہا۔“
”کیوں! معاذ نے تمہیں رستے میں کچھ نہیں کھلایا۔“
”کچھ بھی نہیں۔“ وہ معصوم شکل بنا کر بولا۔

”ار ارتضیٰ کے بچے نیپل کے بچے سے ایک بوس کا بن نہیں کے دو کٹ اور ایک چاکلیٹ اور واپسی پر آؤں کریم کس نے غولائی تھی۔“
”آپ نے میں نے تو صرف چیکھی تھی۔“ وہ چھلانگ لگا کر نیچے اترا اور زیتون کو ہاتھ دیکھنے لگا۔

”زیتون بی! انہوں نے فرج کی پین کی تلاش کی تو مجھے بھوک لگی ہے۔“
”میاں! تلاش کی تو آپ پہلے لے چکے ہوں گے۔ کچھ نہیں ملا ہو گا تو میرا خیال آیا ہو گا۔ کتنا اچھا دن ہے۔ آج ہمارے ارتضیٰ میاں اسکول میں داخل ہو گئے اسی خوشی میں اٹھ جاتی ہوں۔ آج ان کے والدین۔“
”زیتون یا نو! ارتضیٰ کو کہہ رہا ہے اسے بنا کر دو۔“ مسز خان فوراً سخت لہجے میں بولیں تو زیتون بانو جلدی سے سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور ارتضیٰ کے پیچھے باہر نکل گئی۔
”تمہارا بوس باب کب سے شروع ہو رہا ہے؟“ مسز خان معاذ سے بولیں۔

”اگلے ماہ۔“ وہ کرسی پر ایزی ہو کر بیٹھ گیا۔
”باؤس باب مکمل ہو جائے تو میں تمہیں کلینک سیٹ کروا کے دل کی بریعا میشن قسم کا۔ میری بڑی تمنا تھی کہ میرا کوئی بیٹا ڈاکٹر بنے۔ ایاز اور اظہار کا ذہن اعلا تعلیم کی طرف ویسے ہی نہیں تھا۔ دونوں پرنس کی طرف نکل گئے۔ شہیاز کو ویسے ہی آرمی کا؛ نون تھا۔ میرا خواب نقشہ ہی وہ ایسا دیکھ لو قدرت نے تمہاری شکل میں وہ بھی پورا کروایا۔“

”آپ لگی ہیں ام جان! یہ قدرت نے آپ کا کوئی بھی خواب نقشہ نہیں رہے دیا۔“ وہ ہنستے آتارنے کو بٹھکا۔
”تمہیں ایسا مجھے ہو؟“ وہ ایک دم سے دنگھی ہو کر بولیں۔

”سووری ام جان! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ اسے ایک دم سے احساس ہوا تو فوراً ”سیدھا ہو کر بولا۔
”کوئی بات نہیں مجھے معلوم ہے تم اب فارغ ہو؟“
”ہی کوئی کام ہے؟“

”ہاں ہے تو سہی اگر تم کرو گے۔“
”آپ نہیں اور میں انتظار کروں ایسا کبھی ہو سکتا ہے۔“

بنادیں کے ہر صورت ہر حال میں۔ تم اگر میرے رومانوی اثرات سے بچنا چاہتے ہو تو دعا کرو میرے پیارے خبر
ریں اور نہ تمہاری خبر نہیں۔ ” وہ لاپرواہی سے بولی۔
”تم بہت ڈھیٹ ہو۔“ معاذ نے اٹت چکپا کر کہا۔

”آپ ڈاکٹر کو چیک کروانی آتے تو اچھا تھا۔ اتنی لمبی رات پڑی ہے خدا انخواستہ اگر درد بڑھ گیا تو۔“ اماں نے
نے آہستہ آہستہ صوفی صاحب کا سینہ مسلتے ہوئے کہا۔
”درد بڑھ گیا تو کیا ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ جان سے چلا جاؤں گا۔“ صوفی صاحب اپنے چہرے سے تکلیف کے
اثرات کم کرتے ہوئے بڑی مشکل سے مسکراتے۔

”اللہ نہ کرے بابا صاحب! ایسی باتیں کر رہے ہیں۔“ آمنہ نے دہل کر کہا۔ وہ ان کے بازو پارسی تھی نہ نہیب
ان کی باتیں دیکھ رہی تھی اور جویریہ سرہانے کی طرف پھولی میز پر بیٹھی ان کا سر دیکھ رہی تھی۔
صوفی صاحب کی طبیعت دوسرے خراب تھی۔ جب سے وہ عہد امتین کی طرف سے ہو کر آئے تھے ان کے
سینے کا درد بڑھتا جا رہا تھا۔ سہ پہر تک وہ ضبط کرتے رہے اور مغرب بڑھ کر ہو اوپر آئے تو پھر ہشام کے لیے نیچے
مسجد بھی نہ جاسکے۔ ان کے چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا سینے میں درد تھا تو دل میں درد تھا تو ان مڑوہ اس طوفان سے
کسی کو بھی آگاہ نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔

”بابا صاحب! بھیل سے کہہ کر ڈاکٹر کو ادھر بلو لیں۔“ نہیب نے آہستگی سے کہا۔
”ڈاکٹر کیا کرنے کا نہیب بیٹا! وہ امیں نے کھالی ہے۔ ڈاکٹر نے بھی وہی دینی تھی۔ اب آہستہ آہستہ ہی آرام
آئے گا۔ تم لوگ سو جاؤ جاگ رات کٹی ہو گئی ہے۔ میں بھی سو جاؤں گا۔ دو امیں خیند بھی تو ہوتی ہے۔“
وہ بہت نرم لہجے میں بات کر رہے تھے۔ پتا نہیں وقت نے یہ نرمی ان کے لہجے میں بونی کی یا پتی بے بسی کے
اساس سے۔ وہ اب تینوں بیٹیوں سے بھی بہت نرمی سے بات کرتے تھے۔ اب وہ دوسری بیٹیوں کے کام لینے کے بھی
روا دار نہیں تھے۔

”جب تک آپ نہیں سوئیں گے ہمیں خیند نہیں آئے گی۔“ جویریہ نے آہستگی سے کہا۔ ”آپ نے کھانا بھی
نہیں کھایا۔“

”جویریہ! تم جا کر سو جاؤ صبح تمہیں کالج بھی جانا ہے۔“ وہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولے۔
”بابا صاحب! اب آپ ٹھیک ہیں نا طبیعت کچھ بہتر ہوئی؟“ آمنہ بولی۔
”ہاں بچے اللہ کا شکر ہے کچھ بہتر محسوس کر رہا ہوں۔“ وہ محبت سے اس کی طرف دیکھ کر بولے۔
”بابا صاحب! آپ سے ایک بات کہنی تھی۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

نہیب نے بے اختیار آمنہ کی طرف دیکھا۔ اشاریے سے اسے بات کرنے سے منع کیا کہ ابھی موقع نہیں
ہے صبح اٹھو پو تھا اور آمنہ یہ موقع کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے نہیب کی تنبیہ کو نظر انداز کر کے نظریں
صوفی صاحب پر جمادیں۔

”تم نے اس وقت کیا کہنا ہے؟“ اماں نے ناگواری سے بولیں۔
”بابا صاحب! آپ سے ایک اجازت لینا تھی۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔

”جویریہ! جویریہ بیٹا! یہ سامنے کی کھڑکی کھول دو۔ تازہ ہوا آئے گی۔“ ان کے کہنے پر جویریہ نے اٹھ کر کھڑکی
کھول دی اور پوئنی غیر ارادی طور پر کھڑکی سے باہر سسٹان گئی تو اس نے ایک نظر دیکھا۔ اس کا دل زور سے دھڑکا
وہ تیزی سے آگرا اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور صوفی صاحب کا سر دبانے لگی مگر اب اس کے ہاتھوں میں پتلے جیسا دم نہیں
تھا اٹکیاں بھی آہستہ آہستہ سر ہونے لگی تھیں۔

”بابا صاحب! ہمارے کالج کے سامنے ایک ٹڈل اسکول کھلا ہے وہاں ایڈمیٹی ٹیچر کی ضرورت ہے بچوں کے

لیے کمرنگیٹ ٹیچر۔ صبح اٹھو پو ہے مستقل تنخواہ ہے اور گھر سے زیادہ دور بھی نہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو۔۔۔“
آمنہ نے ایک ہی سانس میں اپنی بات پوری کر دی۔
”آمنہ! صوفی صاحب نے اسے گھور کر دیکھا۔

”بابا صاحب! پلیز۔ آخر میں نے اتنا پڑھا ہے گھر بیٹھ کر کیا کروں گی۔ میری تعلیم کسی کے کام آنے کی، خود
ہمارے اپنے بھی۔ میں اس تعلیم کو سینے میں سمیٹ کر بیٹھی رہوں اور وہیں دفن کروں تو اس کا کیا فائدہ ہو گا
”آمنہ! بحث نہیں کرو اپنے بابا صاحب سے۔ وہ پہلے ہی ٹھیک نہیں ہیں۔“ اماں نے اسے ٹوکا۔

”ٹھیک ہے تم ہو اچھا بھلا۔ اگر تمہیں اس اسکول کا ماحول اچھا لگے۔ ویسے میں خود بھی صبح پڑھا کروں گا پھر
تمہیں بتاؤں گا۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔
”پر بابا صاحب! اٹھو پو تو صبح ہے۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”جویریہ! تم نے آنا اور۔“ اس وقت پھر میں لپٹی کانڈ کی ایک کوئی ٹھکی کھڑکی سے آکر صوفی صاحب کے سینے پر
گری۔

اس سے پہلے کہ اسے کوئی اور ہاتھ بڑھا کر اٹھاتا، صوفی صاحب نے فوراً اس چھوٹے سے پتھر کو منٹھی میں لے
لیا۔ جویریہ کی تو پورے جسم سے جھنجھان نکلی گئی۔ صوفی صاحب جلدی سے اٹھے اور پتھر کے گرد لپٹنا کانڈ کھول کر
پڑھنے لگے۔

”جوئی! آج اتنے دن ہو گئے تمہاری صورت دیکھے۔ پلیز چند منٹ کے لیے کھڑکی میں آؤ ہمیں منتظر کھڑا ہوں۔“
دو لائیں کسی نے جلدی سے کانڈ پر کھینچی تھیں۔

صوفی صاحب، ہیٹ لڑائے اور کھڑکی میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ نیچے گلی میں کھڑکی کے سامنے ایک نونو ان
کھڑا تھا۔ وہ سمجھتی تھی صوفی صاحب کو ان کا کارٹ فیل ہونے لگا ہے۔ ان کے جسم میں خون کی جگہ جیسے آگ کے
شرارے دور رہتے تھے۔

انہوں نے جلدی سے کھڑکی کی چوکھٹ کو کھانا اور دو تین گہرے گہرے سانس لیے اور مڑ کر جویریہ کو کھانا جانے
والی نظروں سے دیکھتے گئے۔ جویریہ کا جسم ہلکے پتلے کی طرح کپکپا رہا تھا۔ صوفی صاحب مڑے اور اس کی طرف
بڑھے۔

اماں نے نہیب اور آمنہ کو لگا لگا وہ آج جویریہ کو مار رہی ڈالیں گے۔ سب کی سانسیں رکنے لگیں۔

”جلد اٹھو صوفی بابا صاحب نے بھی جیسے جسم کھار کھی ہے کہ اس گھر میں اپنے سوا اور کسی مرد کو رہنے نہیں دینا۔“
نہیب نے حد اٹا کر بولی بے چارہ جلیل چرچ۔

اس نے سر جھکا کر آمنہ کو افسوس بھری نظروں سے دیکھ کر کہہ کر کہی بھری جویریہ نے ایک پل کو سر
اٹھا کر ایک غصیلی نگاہ بس پر ڈالی اور پھر سر جھکا کر اپنے کام میں مگن ہو گئی۔

”بابا صاحب نے ویسے زیادتی کی ہے۔“ آمنہ نے آہستگی سے کہا۔ ”وہ تو اس قدر اچھا تھا، ہم سب کے کام آنے
والا اور۔“

”ہم سے بے حد محبت کرنے والا بھی تو ہے۔ کہ ہمیں دیکھے بغیر وہ نہیں سکتا تھا، ہم نظروں آتے تو اس کی آنکھیں
دیکھنے لگتی تھیں۔ دل میں درد سا اٹھنے لگا تھا۔“ نہیب جان بوجھ کر ”ہم“ پر خوب زور دے رہی تھی آواز بلند بھی
اور نام سراسر مستحزاد اور مخاطب بھی جویریہ تھی۔

”اچھا خاصا تماشا ہو گیا ہر سوں رات کو“ آمنہ نے شاید نہیب کے جملوں اور ان میں چھپے طنز پر دھیان نہیں دیا
تھا اسے پر سوں رات کا منظر یاد آ رہا تھا۔ کس طرح بابا صاحب کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔ نیچے جانے سے
پہلے انہوں نے جویریہ کو زور دار دھکا دیا تھا۔ وہ دیوار سے بری طرح سے ٹکرائی تھی اور بابا صاحب کسی جوان لڑکے

کی طرح سیڑھیاں پھلانگتے نیچے اتر گئے تھے اور نیچے گلی میں کھڑکی کی طرف دیکھتے جلیں کو پیچھے سے جاوے چاہتا پھر بابا صاحب کو خود پر جیسے قابو نہ رہا تھا ہاتھوں اور پیروں کے ساتھ ان کی زبان بھی جیسے بارود کے گولے برسا رہی تھی چنگھاڑتا ہوا انداز میں بھر میں سارے محلے کو جگا گیا تھا لوگ دروازے کھول کھول کر باہر نکل آئے تھے ویسے بھی ابھی کون سی رات گھری ہوئی تھی اور صوفی صاحب تو لگتا تھا اسے مار کر ہی دم لیں گے۔

”آخر ہوا کیا؟ اس نے کیا کیا ہے۔ صوفی صاحب! کچھ بتائیں تو سہی کیا اسے جان سے مار ڈالیں گے۔“ ہر کوئی انہیں روکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں میں اسے جان سے مار ڈالوں گا۔ زندہ دفن کروں گا اس آستین کے سانپ کو اس حرام خور کو۔ ارے بلی بھی سات گھر چھوڑ کر حملہ کرتی ہے تو اس قدر احسان فراموش نکلا! ایسا مردار۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ ان کے منہ سے کف نکل رہا تھا اور اسے مارتے مارتے وہ ہانپنے لگے تھے سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور سینے میں ہونے والا ہلکا ہلکا درد اب تیز ہو رہا تھا مگر انہیں اس کی کچھ پروا نہیں تھی نہ تو ان کے ہاتھ رک رہے تھے نہ زبان۔

”خدا کے لیے صوفی صاحب! کچھ تو ہاتھ ہولار کھیں! کیا جان سے مار دیں گے اس غریب کو سامنے والے خان صاحب نے صوفی صاحب کو قابو کرنا چاہا مگر صوفی صاحب کے اندر تو جیسے کوئی خون تھا کیا کسی طور قابو میں نہیں آ رہے تھے۔“

”میں جان سے مار ڈالوں گا۔ اس نمک حرام کو۔ یہ صلہ دیا اس نے میری بے غرض محبت کا نیک تریپت گا۔ میں اس کو کیا کچھ تاربا اور یہ کیا نکلا سنبولیا۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا چھوڑ دو مجھے۔“ جس کے منہ سے واقعی خون نکل رہا تھا اس کا ٹھلا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔

”آخر اس نے کیا کیا ہے کچھ بتا بھی تو چلے۔ جلیں! تم ہی بتاؤ تو آخر صوفی صاحب کے اس درجہ جلال کی وجہ کیا ہے۔ ایسا کیا کر دیا تم نے ان کے ساتھ۔“ ایک شخص تنگ آ کر بولا۔

”یہ کیا بولے گا! کیا پتائے گا بے شرم اپنے منہ سے اپنی نمک حرامی کی داستان کوئی بے حیابی سنا سکتا ہے۔“ انہوں نے زور دار لہجے سے اسے وہ کا دیا تھا۔

”میں نے جویری کی ہے جی ان کی ڈاکو والا ہے اور مجھ سے بڑے غیرت بھی کوئی نہیں۔“ جلیں نے بمشکل جواب دیا تھا۔ اس کے جواب پر صوفی صاحب کے ہاتھ جیسے پھیلے پڑ گئے۔ پورا جسم ہی جیسے ٹٹک گیا انہوں نے ایک بے جان سا پھیتر اس کے منہ پر مارا۔

”جویری کی ہے؟ کیا چرایا ہے بولو؟“ شیخ صاحب نے غصے میں اس کا گرجاں نوجا۔

”بتا نہیں سکتا۔“ وہ آہستگی سے بڑھو لیا۔ ”بس آپ میری ان سے سفارش کریں یہ مجھے پولیس کے حوالے نہ کریں۔“ وہ جیسے منت کرتے ہوئے بولا۔

”پولیس کے حوالے نہیں اسے زندہ چھوڑوں گا تو یہ پولیس کا نام لے گا۔“ وہ پھر جوش و خروش سے اس کی طرف بڑھے تو محلے والوں نے بڑی مشکل سے جلیں کو ان سے چھڑا لیا انہوں نے اسی وقت اسے نکال دیا تھا وہ جاتے وقت اپنا ایک جوڑا اور چند کتابیں لے گیا۔

”صوفی صاحب! ہو سکے تو مجھے معاف کریں مگر آپ مجھے غلام سمجھے۔“ جاتے جاتے وہ رک کر بولا اور اگلے ہی لمحے رات کے اندھیرے میں کہیں گم ہو گیا۔

”ویسے آمنہ کیسی عجیب سی بات ہوتی ہے۔ ہے نا ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔“ زینب کی آواز پر وہ چونکی۔

”کون سی بات؟“

”یہ گھر بلووا فیئر۔“ وہ آہستگی سے بولی آمنہ نے اسے گھور کے دیکھا۔

”ہاں ہوئی تو عجیب سی مگر جلیں اچھا لڑکا تھا۔ شروع سے ساتھ رہ رہا تھا سب کام کرنا تھا۔ محنتی بھی بہت تھا۔“

دیکھا نہیں اس نے سب امتحانوں میں ہم سب سے اچھے مار کس لیے تھے۔ گریجویٹیشن میں بھی مجھ سے زیادہ ہمیشہ فرسٹ ڈویژن آتی تھی اس کی۔ اس کے رزلٹ پر تو عبدالستین کی یاد آتی تھی۔ بھائی کی طرح اصلاح پوزیشن آتی تھی اس کی اب تو وہ سی ایس ایس کی تیاری کر رہا تھا مقابلے کے امتحان کی ساری ساری رات پڑھتا تھا۔ ”آمنہ کو صبح صبح میں جلیں کے جانے اور اس طرح بے عزت ہو کر جانے کا بہت دکھ ہوا تھا۔“

”مقابلے کے امتحان کی تو وہ واقعی تیاری کر رہا تھا وہ بھی راتیں جاگ جاگ کر۔“

مگر مقابلہ کر نہیں سکا۔ وہ بھول گیا تھا۔ یعنی مرضی تیاری کر لے بابا صاحب سے وہ مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ”زینب نے پھر طنز کیا۔ جویریہ نے آنا گوندھ لیا تھا اور اب پرات پرے دھکیل کر ہاتھ دھو رہی تھی۔ سراسی طرح جھکا ہوا تھا۔“

”فضول باتیں مت کرو۔ وہ بابا صاحب کی بہت عزت کرتا تھا۔“

”عزت کرتا تھا بس ہی تو ان کے برابر آنا چاہتا تھا ویسے آمنہ! یہ جویریہ کس قدر گھنی نکلی۔ ہماری ناک کے نیچے کھیل ہونا اور ہمیں خبر بھی نہ ہوئی اور ہم اتنے بدھو کے بدھو رہے مگر کیا نکل اناڑی۔“

”چھوٹی آبی! میں آپ کے منہ نہیں لگنا چاہتی بہتر ہے کہ آپ مجھ سے بات نہ کریں۔“ جویریہ جیسے پھٹ پڑی اور روتے ہوئے اندر کمرے میں بھاگ گئی۔

”ہاں تمہارا منہ جو بہت سہنا ہے کھلی اور کے منہ جو لگنا چاہتی تھی۔ اچھا منہ کے مل گری ہو۔“ زینب نے بلند آواز میں جویریہ کو سنایا۔

”ہاں سنا ہے محبت کرتے ہوئے کچھ بتا نہیں پتلا۔ یہ نثر ہی ایسا ہے کہ کچھ بھائی و سنا ہے نہ سنا لی دتا ہے تو بتا کیا پتا تھا۔ یہ تو دھڑوں کو پتا چلتا ہے جلا جلا اور خشک کب پچھتا ہے۔“ وہ ہوشیاری سے بولی۔

”تم بہت نصیحت ہو۔“ آمنہ نے اذیت کی پانے اور اٹھ کر جانے لگی۔

”رک تو میری بات سنو۔“ زینب نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”اب کیا ہے؟“ آمنہ جھلا کر بولی۔

”مجھے بازار جانا ہے ایک بک خریدنے۔“

”تمہارا دل غ ٹھیک ہے۔ بابا صاحب کو پتا چل گیا تو ابھی پرسوں والا قصہ گرم ہے تمہیں بازار جانے کی سوجھ رہی ہے۔“ آمنہ نے اپنا ہاتھ پھیرا لیا۔

”یہ واقعات تو ہمارے گھر کا معمول بن چکے ہیں۔ پہلے عبدالستین کے ساتھ پھر عبدالعزیز کے ساتھ اور اب جلیں کے ساتھ۔“ زینب منہ بنا کے بولی۔ ”مجھے لی ایس ایلیٹ کی ایک ریفرنس بک لینی ہے۔ بابا صاحب تو بچوں کو پڑھانے کیے ہوئے ہیں ڈیڑھ دو گھنٹے تک آئیں گے۔ چلو نا اماں جی سے پوچھ لیتے ہیں۔“ زینب جیسے سب کچھ سوچ چکی تھی۔

”بھیس لی ایس ایلیٹ کی بک کیا کرنی ہے۔ تمہارا سپاس کوئی لڑکچہ ہے؟“

”میری دوست ہے نا؟ اس کو چاہیے۔“

”کیوں وہ خود نہیں جا سکتی بازار؟“ آمنہ نے ماتھے پر ہل ڈال کر کہا۔

”اس کی کرن کی شادی ہے بلکہ آج بارات ہے۔ صبح اسے یہ کتاب ضروری چاہیے اس نے بہت منت کی تھی اور پیسے بھی دے رکھے ہیں بلیر چلو نا۔“ زینب منت پر اتر آئی۔

”زینب! یہ اچھی بات نہیں۔ بابا صاحب پہلے ہی بہت اپ سیٹ ہیں۔ انہوں نے تمہیں بھی اسٹوارٹنگ دے دی ہے۔ چھ ماہ بعد تمہارے فائنل ایگزام ہیں اگر تم اس بار بھی کامیاب نہ ہو گئیں تو کھریں گے جویریہ کے ساتھ گورنمنٹ اسٹوڈنٹنگ حرکتیں سوجھ رہی ہیں۔“

”بس آج چلی چلو آمنہ! آئندہ نہیں کھوں گی ذرا اماں جی سے پوچھ کر آئی ہوں تم چادریں نکالو۔“ وہ جھٹ پٹ

اٹھ کر اندر بھاگی اماں جی سے اجازت لینے تو آہٹ گہرا سانس لے کر چادریں لینے کے لئے کمرے میں آگئی اسے معلوم تھا وہ اماں جی سے اجازت لے کر ہی آئے گی جویریہ اندر پلنگ پر منہ تک چادروڑھے شاید سو رہی تھی۔
 ”جویریہ! سو گئی ہو؟“ آہٹ نے چادریں نکالتے ہوئے پوچھا۔ جویریہ نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ ایک گہرا سانس لے کر باہر آگئی۔

”چلو، بڑی مشکل سے اماں جی کو منایا ہے۔ انہیں بھی جلیل کے جانے کا درد ہے جویریہ ہی کی طرح لگا ہے۔ پرسوں سے تم صبح ہی پڑی ہیں۔ چلو اب دیر نہ کرو باپا صاحب کے آنے سے پہلے آجاؤ گے۔“ زینب نے جلدی جلدی چادروڑھ کر نقاب چہرے پر اچھی طرح کیا اور دونوں میڑھیوں اتر گئیں۔
 ”ہم جا رہے ہیں اماں جی!“ آہٹ نے میڑھیوں اترنے سے پہلے آواز لگائی۔

بازار میں کچھ خاص رش نہیں تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ کتابوں کی دکان تقریباً خالی تھی ایک دو کسٹرن کتابیں دیکھ رہے تھے زینب نے سلیزین کو کتاب کا نام بتایا۔ وہ کتاب لینے گیا۔

”چلو آہٹ! آجاؤ لیلیٰ ہے میں نے کتاب۔“ زینب اسے آواز دے کر باہر نکل آئی۔ کتاب دکاندار نے کسی اور دکان سے منگو کر دی تھی اسی میں چند دنوں تک گئے تھے اب زینب کو کچھ خوف محسوس ہونے لگا تھا۔
 ”گھر پہنچنے تک اگر باپا صاحب آگے تو؟ اس نے لرز کر سوچا تھا۔ اسی تیزی میں وہ دکان سے لگی تھی اور دکان کی آخری میڑھی پر کسی سے بری طرح سے ٹکرائی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا کتاب کاشا پیچے کر بڑا تھا اور اس کے کندھے سے ٹکرانے والا کسی کا ٹوٹا کتھا اسے پوری طرح سے ہلا گیا تھا نہانے کی آواز کے ساتھ وہ بمشکل گرتے گرتے پڑی تھی۔

”سو رہی۔“ چوت تو نہیں لگی آپ کو؟“ وہ نوجوان ذرا سا نیچے جھکا اسے کندھے سے پکڑ کر سیدھا لیا تو اس کے ہاتھ سے اچھ کر زینب کا ڈھیلا ہو جانے والا نقاب چہرے سے سرک گیا۔ اٹھانے والے کے ہاتھ اور آنکھیں جیسے ساکت ہو گئیں۔

”اوہ!“ اس کے ہونٹوں نے جیسے سرگوشی کی زینب بھی اسی کو دیکھ رہی تھی۔ خوبصورت اور چالباہر پرشش نقوش اور براؤن آنکھیں اور آنکھوں میں بے تحاشا جھک۔ زینب چند لمحوں سے زیادہ نہ دیکھ سکی۔

”آپ کو کبھی کسی نے نہیں بتایا کہ آپ کس قدر خوبصورت ہیں اور اس ہو شرا حسن کو نقاب میں چھپا کر رکھتی ہیں تو اچھا لگتی ہیں ورنہ آپ کا یہ حسین چہرہ ساری کائنات کو سانس دے کر بے بالکل ساکت جیسے مجھے کر دیا۔“ وہ بہت آہستگی سے بولا تھا۔ زینب اپنا کندھا اس سے چھڑا کر نقاب درست کرنے لگی۔

”چلو نا۔“ آہٹ نے پیچھے سے آکر زینب سے کہا تو وہ جیسے ہوش میں آکر میڑھیوں اترنے لگی۔
 ”مس! یہ آپ کا شمار۔“ اس نے شمار آہٹ کو تھمایا جو اس نے کچھ حیرت سے تمام لیا۔

”یہ کون تھا؟“ وہ زینب کے پاس آکر بولی۔
 ”بتا نہیں۔“

”خوبصورت تھا اور پنڈ سم بھی ہے نا؟“ آہٹ نے آہستگی سے کہا تو زینب چپ رہی۔ وہ جان بوجھ کر آہٹ سے ایک قدم آگے چل رہی تھی اس کا دھڑکتا دل قابو میں نہیں آ رہا تھا۔
 ”تم ذرا آہٹ تو چلو بھاگ رہی ہو۔ ایسی کیا آفت آگئی اب۔“ آہٹ اس کے پاس آکر جھنجھلا تے ہوئے بولی۔
 ”باپا صاحب آنے والے ہوں گے۔“ زینب آہٹ سے بولی۔

”تو اب پہلے سوچنا تھا بے وقت گھر سے نکلتے ہوئے۔“ آہٹ نے حنا کر کہا تو زینب نے کوئی جواب نہ دیا۔
 ”پتا نہیں مجھے باب ملے گی یا نہیں۔ اسٹرو بوتل اچھا ہوا تھا۔ میڈم کہہ رہی تھیں اپنا اسٹرنٹ لیٹر آپ کے گھر بھیج دیا جائے گا۔ اگر آپ سلکٹ ہو میں تو۔“

اسکول کے پاس سے گزرتے ہوئے آہٹ کو یاد آیا تو اس نے کہا۔ زینب نے جیسے سنا ہی نہیں اس کے کان تو

کسی اور ہی بازگشت پر لگے تھے۔

”آپ کو کسی نے بتایا نہیں کہ آپ کس قدر خوبصورت ہیں۔“ کس قدر خوبصورت۔ اس کے اندر جیسے ٹرین کی چل رہی تھی اور وہ قرب جوار سے بے خبر جیسے بھاگی جا رہی تھی اس ٹرین کے تعاقب میں۔



”شہزادہ! کہاں جا رہی ہو؟“ سیدہ کی بارعب آواز نے تک تک سے تیار ہو کر دے پاؤں جاتی شہزادہ کے قدم بے ساختہ روک دیے۔ اس نے ذرا سا رخ موڑ کر خائف نظموں سے سیدہ کی طرف دیکھا مگر جواب نہیں دیا۔

”سنا نہیں کیا کچھ پوچھ رہی ہوں کہاں جا رہی ہو اس وقت؟“ سیدہ کے لہجے میں اور بھی سختی آگئی۔ شہزادہ نے ایک گہرا سانس لیا۔ اصل میں تو اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ سیدہ ادھر آئی ہوئی ہیں۔ سنا انہوں نے خود ہی فون کر کے کہا تھا کہ وہ آج نہیں آئیں گی۔ اسی لیے تو شہزادہ نے فون کر کے عبدالعزیز کے ساتھ ”سٹینڈ“ کی تھی۔

”آپ کو کس سے ملنے جا رہی ہوں اور کچھ شاپنگ بھی کرتی ہے۔“ اس نے بے حد ست لہجے میں جواب دیا۔
 قدم ابھی تک اسی جگہ پر لگے تھے۔

”اتنی تیاری کے ساتھ شاپنگ اور تم کس کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہو سیدہ شہزادہ لیلیٰ!“
 وہ سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیتے ہوئے ترشی سے بولیں۔ شہزادہ نے ڈارک میوٹن ٹیڈ کاشیفون کا سوٹ پہن رکھا تھا جس کی آستینیں ہاتھ میں اور ٹیسٹ پر بڑے بڑے سیاہ پھول بنے تھے ساتھ میڈیک ٹیبلٹوں والے ٹاپس اور گھٹے میں پیسین تھی۔ کلائی میں برہسلیٹ اور یہ ہلکی پھلکی تیاری لیا تو ٹھیک ٹھاک نظر آ رہی تھی۔

”بتایا نا دوست کی طرف جاؤں گی پہلے۔“ وہ کچھ جھٹلا کر بولی۔
 ”شہزادہ! ادھر آکر کھینچو میرے پاس۔“ وہ کچھ سر دھونے میں بولیں۔

”یہاں آگئے خبر ہو رہی ہے مجھے کچھ شاپنگ بھی کرنی ہے چاچا افضل دین انتظار کر رہا ہے میرا گاڑی میں۔“ اس نے بری طرح چڑھ کر کہا۔ میوٹن ٹیڈ کاشیفون لپ اسٹیک اس نے بہت ہلکی لگائی تھی مگر اس کے گورے رنگ پر خوب نمایاں ہو رہی تھی۔ سیدہ کے دل کو یکایک کسی بہت بڑی تبدیلی کا احساس ہوا شہزادہ میں انہوں نے اسے غور سے دیکھا تو جیسے اپنی بے خبری کا یقین سا ہو گیا۔

”یہ شاپنگ کا کون سا نام ہے چار بجے کو ہیں۔ ابھی تمہیں جانا ہے دوست سے ملنا ہے پھر مارکیٹ جانا ہے جبکہ میں تین دن پہلے لگی تھی شاپنگ پر اور تم سے پوچھا بھی تھا کہ تمہیں کچھ منگوانا تو نہیں اور تم نے ساف جواب دے دیا تھا۔ اب ایسی کون سی اچانک ضرورت آن پڑی ہے جو کہ یوں برہنہ کر زیداری کو نکل رہی ہو۔“ وہ اس کے سر پر بے رنگاں ہنسا کر رستی سے بولیں۔

”پرسوں واقعی مجھے کچھ نہیں منگوانا تھا اور آج مجھے اشد ضرورت ہے میں سات بجے تک آجاؤں گی۔ خدا حافظ۔“

شہزادہ نے بے خوفی سے جواب دیا اور جانے کو مڑ گئی۔ اس کی ہلکی سیٹل کی باریک ہیل کی ٹک ٹک نے سیدہ کے ارد گرد جیسی گھنٹیاں سی بجادیں اور سیدہ سن ہی ہو کر ان گھنٹیوں کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں۔
 گاڑی شہزادہ نے ”آواری“ کے سامنے رکوائی تھی۔

”چاچا افضل دین! یہ اسٹے ہے کچھ چیزوں کی۔“ مین مارکیٹ کے سیر اسٹور سے سب کچھ مل جائے گا اور یہ پیسے ہیں آپ ایک گھنٹے میں جا کر سب کچھ خرید لائیں یا ور ہے ادھر ایک گھنٹے بعد آنا ہے۔“ گاڑی سے اترتے ہوئے شہزادہ نے فضل دین کو لٹ اور رقم تھماتے ہوئے حکم دیا لہجے میں کہا۔

”میں جی۔“ وہ جھجک گیا۔ اس نے تو اس شاپنگ کا بھی جواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔
 ”ہاں تم۔“ جاؤ۔“ وہ سختی سے بولی پھر کچھ سوٹنے لگی۔ ”اصل میں ہونٹل میں میری دوست کی انجینئرنگ

میرا مطلب منگنی ہے اور آپ کو پتا ہے سیدہ آپ مجھے کبھی ہوٹل کا سن کر آنے نہ دیتیں اور میں اپنی دوست کی منگنی چھوڑ نہیں سکتی۔ اس لیے دوست سے ملنے اور شاپنگ کرنے کا بہانہ کر کے آئی ہوں تم نے گھر میں کسی کو نہیں بتانا کہ میں ہوٹل گئی تھی منگنی میں شرکت کے لیے اور یہ لوہ۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے بلیک پرس کی اندورنی جیب سے ہزار کا نوٹ نکال کر اسے تمھارا۔ اس سے اپنے بچوں کے لیے کچھ خرید لیتا اب جاؤ اور تھیک ایک گھنٹے بعد آنا میں تمھیں اسی گیٹ پر ملوں گی۔ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی ہوٹل کے اندر چلی گئی۔ فضل دین نوٹ اور لسٹ ہاتھ میں تھا سہ مشکوک انداز سے اندر جاتی شہرینہ کو دیکھ رہا تھا۔

”ہمیں کیا آم کھاؤ پیڑمت گنوہڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔“ دوست نے اسے اچکائے اور گاڑی میں بیٹھ کر من بارکیٹ کو روانہ ہو گیا۔

شہرینہ بڑے آرام سے چلتی ہوئی مخصوص ٹیبل تک پہنچ گئی تھی۔ وہ اس ہوٹل میں گزشتہ تین سالوں سے اسی ٹیبل پر آکر بیٹھتے تھے۔ ہال کے کونے میں رکھی گئی یہ ٹیبل بالکل الگ تھلگ تھی۔

”آئی دیر لگاوی نہ عبدالمعین نے شہرینہ کو دیکھ کر کچھ بے چینی سے کہا۔

”گھر سے نکلتا آسان ہے کیا؟ پھر پختا لمبار راستہ تم تو آنے کا کہہ کر بری الذمہ ہو چلتے ہو میں کس طرح آتی ہوں مجھے پتا ہے۔“ اس نے تھک کر پرس میز پر رکھا اور خود گرنے کے سے انداز میں گری بیٹھ گئی۔

”معلوم ہے مجھے بس اب یہ ٹینشن بھی ختم کر دینی ہے۔“ عبدالمعین نے گہری نظروں سے اس کی تیاری کا جائزہ لیا۔

”کیا مطلب؟“ شہرینہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی پھر اس کی خوب باریکٹری سے جائزہ لیتی نظروں سے سمٹ سی گئی۔

”بہت اچھی بہت دلکش لگ رہی ہو۔ اس خوبصورت شام کی طرح۔“ وہ اس کی طرف ڈرا سا جھکتے ہوئے رومانٹک لہجے میں بولا۔

”تھینک یو۔“ وہ آہستگی سے نظریں جھکا کر بولی۔

”صرف تھینک یو۔“ وہ حتیٰ خیر انداز میں بولا۔

”عینین! شہرینہ نے احتجاجاً اسے دیکھا۔ ”بہت مشکل سے آئی تھی زیادہ تاہم نہیں ہے میرے پاس۔“

”اب مشکلیں تمام ہونے کو ہیں۔“ عبدالمعین نے گہرا سانس لے کر رو کر نظریں دھڑکاتا اشارے سے پاس بلا لیا۔

”مطلب؟“ شہرینہ نے اس بھری نظروں سے دیکھا عبدالمعین نے سینئر فاروہ پھر سے لے کر اسے تھما دیا اور وہ سری خود کہنے لگا۔

”جو مرضی منگو اوجائے یا کافی کے ساتھ کھانے کا نہ تو تاہم ہے نہ مجھے بھوک ہے۔“ شہرینہ نے یہ جملہ کاروبار بند کر دیا تو عبدالمعین میٹر کو آرڈر نوٹ کروانے لگا۔

”پرسوں میرا کنسرٹ ہے۔“ وہ میٹر کے جانے کے بعد وہ بولا۔

”بتایا تھا تم نے۔“ شہرینہ نے کچھ بے چینی سے کہا۔

”اس کے بعد میری بالمبارکیٹ میں آجانے کی اور مجھے امید ہے بہت گرامر کم رسپانس ملے گا اس اہم کا۔“

”تمہارا شو کون فنانس کر رہا ہے؟“ شہرینہ کو ایک دم سے خیال آیا۔

”میڈم کر رہی ہیں اور کچھ ان کے خاص سرمان دوست۔“

”میڈم کون؟“ شہرینہ نے سنی لہجے میں پوچھا۔

”میڈم زیور بھل اور کون فنی تو میری گارجین ہیں اس قیلد میں۔“

”اور ان کی بیٹی؟“ شہرینہ جیسے اصل بات کی طرف آئی۔

”وہ تو میری دوست ہے۔“ عبدالمعین اس کے تاثرات سے لطف اندوز ہوا۔

”صرف دوست؟“

”ہاں صرف دوست تھی لڑکی۔“ وہ چڑ کر بولا ”ویسے سچ بتاؤ تم یہ فضول بحث کرنے آتی ہو اتنی دور سے۔“

”نہیں۔“ شہرینہ نے گہرا سانس لیا۔ ”تم کہو میں سن رہی ہوں۔“ وہ ٹیبل کے سینٹر میں پڑے گلدان میں لگے گلاب کے پھولوں کو پھینکنے لگی۔

”اگلے ہفتے میری فلم کی اوریٹنگ ہے بہت بڑا فنکشن ہو گا۔ میری تو خواہش تھی کہ اس فنکشن میں تم میرے ساتھ ہوتیں۔“ شہرینہ بھی جلد ہی مملو ہو جائے گا۔ ”وہ جسے خود کو تسلی دے کر بولا۔

”تمہارا پاپان کیا ہے؟“ شہرینہ نے پوچھا۔

”اگلے ماہ کے ایڈ تک ہم دونوں نکاح کر لیں گے۔ میں گتہ کا بندوبست کر رہا ہوں۔“

”عبدالمعین! میں اس طرح کے نکاح کر سکتی ہوں بغیر گھر والوں کی رضامندی اور شمولیت کے۔“

”نہ تمہارا گل ہونہ میں۔“ وہ مطمئن لہجے میں بولا۔ ”اب یہ تو ممکن نہیں کہ میں تمہارا پر پوزل لے کر تمہارے والد کے پاس جاؤں وہ سونے کے لیے رہا۔“ دو چار دن مائیلیں اور پھر ہاں کہیں اور ہماری دھوم دھام سے شادی ہو جائے تمہارے گھر والوں کی رضامندی اور شمولیت کے ساتھ۔ کیا خیال ہے تمہارا؟

”تم میرا دل لڑا رہے ہو؟“ بے بسی کے احساس سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”تم بھی تو بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔ کیا وہ مان جائیں گے؟“

”نہیں۔“ وہ کمزور لہجے میں بولا۔

”تو پھر؟“

”پھر کیا مجھے خود نہیں پتا۔“ اس نے بے بسی سے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

”تم ذہنی طور پر تیار ہو جاؤ۔ تمہیں رات کے اندھیرے میں ہی خولی چھوڑ کر میرے ساتھ آنا ہو گا۔ یہی ہماری محبت کا منطقی انجام ہو سکتا ہے۔“ وہ بڑی بے رحمی سے بولا۔ شہرینہ نے خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں بس یہ کہنے کے گھولوں عبدالمعین ایسے ممکن نہیں۔“ وہ رونے کو تھی۔

”اسپاٹ اٹ شہرینہ! تمہارے یہ فضول ڈانڈیلاگ اور فلمی بیروٹن والے آنسو میں گزشتہ چھ ماہ سے دیکھ رہا ہوں۔ تمہیں یہ سب کچھ مجھ سے محبت کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا اب تمہارا سر کر ہی اس محبت کے آسیب سے اپنی جان بچا سکتے ہیں۔ کیا تم مگر سکتی ہو میری محبت سے؟“ وہ تیز لہجے میں بولا

شہرینہ نے سنی میں سر ہلا دیا۔

”پھر؟“

”پھر میں کیا کروں مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اپنے گھر کو اپنی جویلی کو اپنے گھر والوں کو ہمیشہ کے لیے ایسے کچھ چھوڑاؤں تاکہ قابل یقین سی بات ہے۔“

”بالکل بھی ناقابل یقین اور ناقابل عمل نہیں۔ بس ایک ڈیڑھ ماہ انتظار کر لو پھر سب کچھ خود بخود ہو جائے گا۔ چائے آگئی۔ چلو انجوائے کرتے ہیں چائے کے بعد لائیک ڈرائیو پر جانے کا پروگرام ہے نا۔ تمہیں تمہاری پسند کا کھٹ خرید کر دوں گا۔“ وہ ہلکے سہلکے لہجے میں بولا۔

”نہیں۔ میں نہیں بعد چلی جاؤں گی۔ فضل دین باہر میرا انتظار کر رہا ہو گا۔“ وہ رونے سے لہجے میں بولی۔

”چلو کرو اپنی من مانی۔ ہمارے ارنالوں کا خون کچھ دن اور پھر دیکھنا ہم ہوں گے تم ہو گی اور ہمارا حکم ہو گا۔ اور تمہانوی۔ کوئی یا بندی کوئی ڈر خوف نہیں ہو گا بس کچھ دن اور۔“ اس نے گرامر پر اپنی طرف کھسکایا۔

شہرینہ بے جان نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ بے وفا ہے
ہر جالی ہے۔

محبت سے منکر ہے۔

عقد و بیاہ کی ہر قسم سے انکاری ہے۔
"میں ہر بار کاٹھ محبت لیے اس کے دل کی چوکھٹ تک جاتا ہوں اور وہ ہر بار مجھے دعا دے کر جھوٹی الفت کا سکہ
لکھن سے اس کلمے میں ڈال دیتی ہے۔ کب تک؟ کب تک۔ میں ان جھوٹے سکوں سے خود کو بہلاؤں جبکہ
میں جانتا ہوں وہ میری نہیں ہے۔
وہ کسی کی بھی نہیں ہے۔
وہ ایک حسین چل پری ہے۔

یوں دن رات میں ہزاروں بار سمندر کی نیلگوں کو کھ سے سراٹھاتی ہے اور ساحل پر کھڑا اس کی دید کا ہر دوانہ اس
کی محبت بھری اک نظر کے لیے مرنے کو تیار ہے (مجھ سمیت) اور وہ!
ستم کر نظام کسی کی بھی نہیں۔
وہ کسی ایک کی ہو بھی کیسے سکتی ہے۔
وہ تو طوا نغ ہے۔ (بے وفائی جس کا مذہب ہے)

مگر۔

وہ نین تارا ہے۔ نین تارا ہے۔
میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ خود سے الگ کیسے سوچ سکتا ہوں۔
مگر اس کی بے وفائی۔! انہوں نے زور سے اپنی کٹیٹی دیالی تو سر سے ہاتھ میں دبا کر سائیڈ ٹیبل پر پھینکا۔
سلطان بخت اطوا نغ کو چھوڑنا کیا مشکل ہے۔
تم کیوں اپنے دامن میں یہ گند سمیٹے بیٹھے ہو۔ کیوں یہ ذلت تمہیں اس قدر پار کی ہے چھوڑ دو اس کو۔

چھوڑ دو اس خرافہ کو۔ بد چلن آوارہ کو۔
تم نے اس کی خاطر کیا نہیں کیا وہ پھر بھی تمہاری نہیں بن سکی وہ تمہاری کبھی بھی نہیں بن سکتی۔ زمانے میں
کیا حسین کا کال بڑ گیا ہے یا جوانی کی قلت بڑ گئی ہے جو تم اس بے وقار قناعت کر بیٹھے ہو۔
"فوج کرو اس کو چھوڑ دو۔" وہ اٹھ کر آئینے کے سامنے آکھڑے ہوئے اور پشت دلی سے اپنا بکھرا بکھرا حلیہ دیکھنے
لگے "مگنا لباس اچھے ہوتے یا الٹا ہوا چہرہ آنکھوں میں سرخ دوزے۔

"تم نے ایک مرد ہو کر اس کی بے وفائی میں اپنا یہ حال کر لیا ہے۔ آخر تمہیں کس چیز کی کمی ہے کیوں اس
خواب صورت زندگی کو یوں قلعہ و قلعہ ختم کر رہے ہو چھوڑ دو اس دشمن جان کو۔"
"چھوڑ دوں۔" وہ جیسے آئینے پر غرائے "تاکہ وہ کھل کر پیش کر سکے۔ خوب انجوائے کرے میری بے بسی کو اور
میری بخشش ہوئی دولت پر۔ نغ سے مجھ پر جو اپنا سب کچھ لٹا کر بھی اسے اپنا نہ بنا سکے۔ میں مرد تو جاؤں گا مگر اسے
نہیں چھوڑوں گا۔" وہ بے چینی سے کمرے میں گھسٹنے لگے۔

ابھی کچھ دیر پہلے وہ "کل کدہ" سے آئے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرنے کے باوجود نین تارا نہیں آئی تھی۔ وہ
اپنے کسی نئے عاشق کے ساتھ اپنی قلم کے سیٹ پر گئی ہوئی تھی۔ دو چار روز میں قلم کی ادھنتک تھی اور تین بار
سلطان بخت کے کال کرنے پر بھی وہ شاہ جی ابھی آئی ہوں۔ بس دس منٹ میں بس پانچ منٹ میں ابھی پہنچتی
ہوں۔ بھولی تیلیوں سے وہ اٹھیں ڈیڑھ گھنٹہ بے وقوف بناتی رہی اور آخر وہ آگ بکول ہو کر وہاں سے اٹھ آئے۔
زیور گل بھی موجود نہیں تھی ورنہ وہ اسے ہی ٹھیک ٹھاک سا کر آتے۔
اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"بس۔" انہوں نے گہرا سانس لے کر دونوں ہاتھوں سے اپنے بال سنوارے۔

"کیا بات ہے؟ کب سے کمرے میں بند ہو۔" موبائل بھی آف کر رکھا ہے۔ تمہارے بیچر کے دو فون آپکے

ہیں اسے کسی فائل پر تمہارے سائن چاہئیں اور تم نے آفس آنے کا وعدہ کیا تھا اور وہ بے چارہ اب تمہارے
انتظار میں وہاں بیٹھا سوکھ رہا ہے۔" سیدہ دروازہ کھول کر اندر آتے ہوئے کچھ خفگی سے بولیں۔

"اس سے کہہ دیں آپ میں اب صبح آؤں گا۔ اس وقت بہت تھکا ہوا ہوں۔" وہ آہستگی سے بولے۔
"تھکے ہوئے تو اب تم بیٹھ ہی لگتے ہو۔ سائن بہت ضروری ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا کوئی بینک کی کنٹرا منمنٹ ہے۔
میں نے اسے کھر بلوایا ہے، آتا ہی ہوگا۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" انہوں نے تشویش سے بھائی کے
مرخصانے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

"ٹھیک ہوں میں۔" وہ کچھ بیزاری سے بولے۔
"میں گھر جا رہی تھی تمہارے انتظار میں بیٹھی تھی۔ تم سے ایک بہت اہم بات کرنا تھی۔" وہ خود ہی آگے بندھ
کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"جی بولیں۔" وہ باہل خواست ان کے سامنے بیٹھ گئے۔
"تم نے کیا سوچا ہے؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولیں۔
"کس بارے میں؟" وہ کچھ چونکے۔
"شہرینہ کے بارے میں۔"

"کیوں اسے کیا ہوا ہے؟" وہ ماتھے پر ہل ڈال کر بولے۔
"ہونا اسے کیا ہے شادی کے قابل ہے۔ اس کی عمر میں میں دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ اس کی شادی تو آج
سے چھ سات سال پہلے ہی ہو جانا چاہیے تھی مگر اس کی بڑھنے کی ضد اور تمہاری بے جا حمایت۔ خیر اب میں
اس کے سلسلے میں ایک سال تو کیا چند ماہ کی بھی تاخیر نہیں کر سکتی۔"

"کوئی رشتہ ایک ہے؟"
"مگر دو ہوں اب بچائی کلن سارے۔" وہ جیسے سرو آہ بھر کر بولیں۔ دو رشتے تھے آج سے پانچ برس پہلے سید طالب
حسین کا اور سید زہیر عقی کا دونوں کو تم نے اور شہرینہ نے ٹھکرادیا اور اب تو خاندان بھر میں نہ تو کوئی اس کا ہم عمر
کنوارا بچا ہے اور نہ عمر سے کچھ بڑا۔
"تو پھر؟"

"پھر کیا شادی تو کرنی ہے نا اس کی۔" وہ تیزی سے بولیں۔
"ہاں تو میں کب انکار کر رہا ہوں۔ کوئی رشتہ بھی تو ہو۔"
"سیدہ عجم بخاری کو جانتے ہونا!"
"کون؟" وہ اچھے ہوئے انداز میں بولے۔

"وہ جو بابا جان کے کزن ہیں۔ آج کل سینٹ کے ڈپٹی چیئرمین ہیں اسلام آباد میں ہوتے ہیں۔"
"وہ ہاشم بخاری۔ وہ تو۔" سلطان بخت کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایسے اپنی اچھن بیان کریں۔
"مجھے معلوم ہے۔" وہ مطمئن لہجے میں بولیں۔

"ان کے دو جوان بیٹے ہیں اور وہ خود بابا جان کے ہم عمر نہ سسی ان سے دو چار سال ہی چھوٹے ہوں گے۔"
سلطان بخت نے جیسے انہیں یاد کرایا۔

"معلوم ہے مجھے۔ ان کے دو بولوں بیٹے شادی شدہ ہیں۔ ایک نیویارک میں دو سرانچسٹر میں ہارٹ مرچن ہے
دونوں سیٹ ہیں۔ باپ پر ان کا کچھ بوجھ نہیں ہاشم بخاری کی بیوی سالوں پہلے مریض ہو چکی تھی بڑی موٹی آسامی ہے۔
بے تحاشا زمینیں دولت جائیداد وارث ہیں۔"

"ان کا پروپوزل کیا ہے؟" سلطان بخت نے پوچھا۔
"انہوں نے شہرینہ کو سال بھر پہلے دیکھا تھا جب حسین شاہ سینٹ کے ممبر بنے تھے اور ہم نے حویلی میں ہی

نکشن کیا تھا۔ وہاں دیکھا تھا انہوں نے۔“

”مگر آپا جان! شہرینہ کا اور ہاشم بخاری کا کیا جوڑ؟“ ان کی الجھن زبان پر آئی گئی۔

”ہاں ہاشم بخاری ذات برادری کے ہیں۔ دونوں پڑھے لکھے ہیں حیثیت میں بھی کم نہیں۔ ہمارے ہم پلہ ہیں۔ شہرینہ کو بہت خوش رکھیں گے۔ اپنی عمر سے دس سال کم ہی دیکھتے ہیں۔ اس عمر میں بیوی اور وہ بھی جوان بیوی ملے تو سرو ناز اٹھاتے نہیں تھکتا۔“

”مگر آپا جان! یہ سب سے ممکن ہے؟“ سلطان بخت کے حلق سے یہ بات نہیں اتر رہی تھی۔

”کیوں ممکن نہیں؟ کیا بہن کو خاندان برادری سے باہر دے کے؟“ وہ تیزی سے بولیں۔

”یا نکل نہیں۔“ وہ فوراً بولے۔

”تو بس پھر اس کے علاوہ اور کوئی رشتہ نہیں ہمیں دو ماہ میں پورا خاندان کھنگال چکی ہوں۔ شہرینہ سے میں بات کر لوں گی۔ میرا ارادہ ہے کہ صالحہ کے فارغ ہوتے ہی اگلے ماہ نکاح کے بعد رخصتی کر دیں گے۔ کیا خیال ہے؟“

”جی! سلطان بخت کچھ ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پا رہے تھے۔“

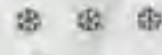
”انہیں آج ہی فون کر کے ہاں کہہ دینی ہوں۔ وہ جمعہ کے دن ادھر آ رہے ہیں۔ چھوٹا سا گھر میں نکشن کر لیتے ہیں انکو بھی پرسانے کی رسم ہو جائے گی اور سب کو پتا بھی چل جائے گا۔ ٹھیک ہے نا؟ وہ بلندی جلدی سارا معاملہ طے کرتے ہوئے بولیں۔“

”جب آپ نے سب کچھ سوچ لیا ہے تو پھر مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

”یہ سب کچھ بہت ضروری ہے ہمارے لیے بھی اور شہرینہ کے لیے بھی یہی عمر ہوتی ہے ان کاموں کی اور دیر سو رہے تو خدا نخواستہ بچہ تانا پڑ جاتا ہے۔ میں چاہتی ہوں اب تم صالحہ سے دل چاہے تو بات کر لینا ورنہ رہنے دینا۔ میں خود ہی کر لوں گی۔ اسے کون سی دلچسپی ہے مزد کے معاملے میں مجھ میں تو صرف چار دن ہیں کل اگر کچھ تیاری کا سوچتی ہوں اور شہرینہ سے بات بھی کر لوں گی۔ ٹھیک ہے نا؟“

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں اور دروازے سے نکلی شہرینہ کے مراد خواہشوں میں جیسے جان آئی۔

”تو آپا جان یوں مجھے ٹھکانے لگانے کا سوچے بیٹھی ہیں۔ کسی کو ڈانٹنے کرکٹ کی طرح اٹھا کر پھینک دینا چاہتی ہیں سر پر پڑے بوجھ کی طرح۔ اتنا ہی اچھا رشتہ ہے تو اپنی بیٹی جنا کے لیے کھولیں نہیں سوچ لیتیں۔ اس صلیب کے لیے میں ہی انہیں نظر آئی، آپا جان! دیکھ لی آپ کی محبت اب جو اب میں میری محبت بھی دیکھیے گا۔ میں آپ لوگوں کے لیے مری جا رہی ہوں اور آپ کے دلوں میں یہ مقام ہے میرا۔ اب مجھے کوئی بچھڑا نہیں ہو گا کچھ بھی کرنے پر۔“ اس نے دل میں سوچا اور چپکے سے اپنے کمرے میں آئی۔



”سے آئی کم ان میڈم! آمنہ نے آفس کے دروازے پر کھڑے ہو کر رعنا حیات سے اندر آنے کی اجازت مانگی۔“

”بس۔“ انہوں نے گولڈن فریم کے نازک گلاسز سے جھانکتے ہوئے اسے اجازت دے دی۔ آمنہ اپنی فائل اور چادر سنبھالتے ہوئے اندر آئی۔

”بیٹھیں! رعنا حیات نے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کیا وہ ”شکریہ“ کہتے ہوئے بیٹھ گئی۔“

”میڈم! یہ میرا پائنٹمنٹ لیٹر۔“ اس نے فائل میں سے سفید لفافہ نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔

”ہوں! لفافہ کھول کر لیکچر پڑھنے کے بعد وہ بولیں۔“ آپ کو ابھی بی بی اخال نرا کل ہیسٹری پر رکھا گیا ہے جو آپ کی نا تجربہ کاری ہے۔ اگر آپ کی کارکردگی اچھی ہوئی تو آپ کو مستقل چاب مل جائے گی۔ ابھی آپ کو چھوٹی کلاسز ملیں گی نرسری سے فٹنہ تک۔ میں نے آپ کا اکیڈمک ریکارڈ پڑھا ہے جسے مارکس اور ڈویژن حاصل کرتی رہی ہیں۔“

آپ میٹرک تک پرائیویٹ امتحان دینے کے باوجود آپ نے فرسٹ ڈویژن لی تھی اس طرح سیکنڈ ایئر اور فورٹھ ایئر میں بھی۔ اصل میں ہمیں ایسے ہی قابل اور ڈین ٹیچر کی ضرورت ہے جو ہمارے اس ماڈل اسکول کو کامیابی سے چلانے میں ہماری مدد کر سکیں اسکول میں تین شفٹیں چلتی ہیں۔ سارے ٹک میں بچوں کے لیے نوپہر میں خواندگی کے لیے اور ایوننگ میں نو جوانوں کے لیے۔ مقصد ظاہر ہے شرح خواندگی کو بڑھانا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں آپ جیسی سختی ٹیچر کی ضرورت ہے جو ہم سے مل سکا تو ہم سے مل جائے گا۔ اس لیے تجربے کو ضروری نہیں قرار دیا گیا۔ تنخواہ اور الالائس وغیرہ کی تفصیل آپ لیٹر میں پڑھ چکی ہوں گی۔“

”جی میں نے پڑھ لی ہے۔“ آمنہ انہیں پوری توجہ سے سن رہی تھی۔

”تو قابل قبول لگیں آپ کو؟“ رعنا مسکرائیں۔

”جی ٹھیک ہے۔“

”صرف ٹھیک ہے۔ ہوں صحیح کہا تم نے بھی۔“ انہوں نے اپنے سامنے پڑا رجسٹر کھولا اصل میں آج کل کی معاشی زندگی اس قدر مشکل ہو چکی ہے کہ اگر ہر فرد کی تنخواہ سو فیصد بھی بڑھادی جائے تو بھی گزارہ مشکل سے ہوتا ہے۔“

وہ اسے دیکھ کر مسکرائیں تو آمنہ نے بھی صرف مسکرانے پر اکتفا کیا رعنا نے تیل بجائی اسی وقت ایک ماسی اندر داخل ہوئی۔

”دیکھو انہیں اسٹاف روم میں لے جاؤ وہاں مس فرخندہ ہوں گی ان سے انہیں ملو اور وہ آپ کو آپ کی کلاسز اور ٹائم ٹیبل سمجھا دیں گی ٹھیک ہے اب آپ جاؤ۔“

”تھینک یو میڈم! آگے کر وہ ماسی کے پیچھے نکل گئی۔“

کل ہی اسے پائنٹمنٹ لیٹر ملا تھا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ گھر کے حالات واقعی بہت دکھ گول جبار ہے تھے۔ اس لیے چاہتے کے باوجود طوفانی سانس نے بھی کوئی خاص اعتراض نہیں کیا تھا۔ اماں جی نے البتہ کوئی رسپانس میں دیا تھا جس دن سے ٹیبل لیا تھا انہیں ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ دونوں بیٹے اور بھی شدت سے یاد آنے لگتے تھے۔ ہر وقت ان کی آنکھیں روٹی روٹی سی رہتی تھیں اور ناک سرخ۔ صوفی صاحب کے سامنے وہ خود کو بہت کمپوز ظاہر کرتی تھیں۔ گھر کے کاموں میں بھی ان کی دلچسپی بہت کم ہو گئی تھی یوں گھر کے کاموں کا سارا بوجھ آمنہ اور زینب پر آ گیا تھا۔ خود وہ ہر وقت بیٹی یا تو کچھ سوچتی رہتیں یا عبادت میں مصروف رہتیں۔ جویریہ کو صوفی صاحب نے پہلے ہی گھر بٹھا دیا تھا۔

”یہ اب کالج نہیں جائے گی۔ پڑھنے کا اگر بہت شوق ہے تو گھر بیٹھ کر پڑھے۔ زینب کے پاس صرف تین چار ماہ ہیں۔ اس کے بعد یہ بھی گھر بیٹھے گی۔“ صوفی صاحب نے ایک بار نہیں تین چار بار غصے کے عالم میں زینب کو باہر کرایا تھا کہ اس کے پاس آزادی کے صرف تین چار ماہ ہیں اور زینب بھی جیسے اس آخری چانس سے خوب فائدہ اٹھانا چاہتی تھی اس لیے پابندی سے روز کالج جا رہی تھی۔

”آمنہ! میں کالج سے تمہارے اسکول آجاؤں گی دونوں اکٹھے ہی گھر جائیں گے۔“ صبح اس نے کالج جاتے ہوئے آمنہ سے کہا۔

”تم تو تیار ہا رہو بچے فارغ ہو جاتی ہو۔ میری تو اسکول سے ڈیڑھ بجے چھٹی ہوگی۔“

”کوئی بات نہیں۔ میں انتظار کر لوں گی گھر آکر میں نے کرنا لیا ہے جویریہ نے ناکام کالج کے لیے نو چار روٹیاں بیلنے کے لیے اور وہاں کو تڑکا لگانے کے لیے۔ میں اتنی جلدی گھر آ کر پوری ہوں گی۔“ اس نے صاف کہہ دیا تھا۔ اور اب وہ حسب وعدہ سوا بارہ بجے ہی اسکول میں موجود تھی۔ پہلے کافی دیر پابندی کے سامنے بیٹھی رہی۔ پھر گرمی لگی تو اسٹاف روم میں آئی۔ ایک نیچر بیٹھی تھی اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی پھر اس کا پیڑ اشارت ہوا تو وہ بھی اٹھ کر چلی گئی۔

”فہم! یہ آمنت کب آئے گی؟“ اس نے جھنجھلا کر گھڑی دیکھی۔ ابھی تو صرف ایک بجتا تھا آمنت کی گلاس ڈیڑھ بجے ختم ہونا تھی۔ وہ باہر آکر پھر کدے میں ٹھلنے لگی۔ ایک دو بار پر نیل کے آفس میں بھی جھانکا آفس میں کوئی نہیں تھا۔ شاید کسی گلاس میں تھیں۔ صاف تھرا سجا جایا آفس۔ زینب چند منٹوں بعد آفس میں آئی پکھا کل اسپڈ سے چل رہا تھا اور اس کی ہوا سے نیل پر رکھا اخبار پھڑپھڑا رہا تھا۔ وہ اخبار اٹھا کر دیوار کے ساتھ رکھے صوفے پر بیٹھ گئی اور اخبار کی شہ سرخیوں پر نظر دوڑانے لگی، کمر میں تو ان کے کبھی اخبار نہیں آیا تھا، کبھی کبھار کالج میں پڑھ لیتی تھی ورنہ اسے کچھ خاص شوق نہیں تھا۔ آج بھی نام پاس کرنے کو لے کر بیٹھ گئی تھی۔

”اوں ہوں۔ ایک کی روزی۔“ کسی نے کھنکار کر اسے مخاطب کیا۔ اس نے چونک کر اخبار چرے کے آگے سے ہٹایا تو اسے جھنجھلا سا لگا اس کے سامنے اس دن والا نوجوان کھڑا تھا جو اسے بازار میں ٹکرایا تھا۔ اس کا دل جیسے تیزی سے دھڑکنے لگا، وہ دن پہلے کی وہ اتفاقاً ملاقات نہ تو وہ بھولی تھی نہ اس کے خوبصورت ہنسلے بھولے دے رہے تھے۔ رات کو سوتے میں جتنی بار بھی آنکھ کھلی ”آپ بہت خوبصورت ہیں“ کی بازگشت ضرور سنائی دیتی اور پھر کافی دیر تک وہ سو نہ پاتی۔

”آپ! وہ بھی کچھ حیران کچھ شاداں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔“ آپ وہی ہیں نا جو اس دن شام کو بازار میں ملی تھیں حسن کی دیوی۔“ وہ ایک قدم آگے بڑھا تو زینب کو احساس ہوا وہ بے حجاب بیٹھی ہے۔ اس کی چادر اس کے شانوں سے ڈھلتا کر سینے پر پڑی تھی۔ اس نے جلدی سے چادر درست کرنا چاہی۔

”رہنے دیں نا۔ آپ کو کیا خبر آپ کے قاتلانہ حسن سے کسی کی آنکھیں کیسی ٹھنڈی ہو رہی ہیں۔“ کسی کو زندگی کی خوبصورتی کا بے تحاشا احساس ہو رہا ہے۔ مجھے تو رنج پتا چلا ہے کہ حسن اگر مجسم ہو تو وہ کیسا ہوتا ہے۔ تین راتوں سے ڈھنگ سے سو نہیں سکا، آپ کے دل کش ضد و خال آنے میری آنکھوں سے پھر جالی ہے کیا آپ کو میں یاد نہیں آیا؟“ وہ بے تکلفی سے بولتے ہوئے اس کے قریب آ گیا تھا۔

”مہم مجھے۔ میں جا رہی ہوں پلینز۔“ وہ گھبرا کر اٹھ کر گھڑی بولی خوشی کے باوجود وہ چہرہ نہیں ڈھانپ سکی تھی اس کے ہاتھ بری طرح سے پکپکا رہے تھے اور آنکھیں ان دیکھے بولنے سے جھکی جا رہی تھیں وہ اس کے سامنے تا کھڑا تھا اور زینب کو بھاگ جانے کا رستہ نہیں مل رہا تھا۔ اس کی بے وار ڈھانٹ شرٹ سے اٹھتی بھینتی بھینتی کولون کی خوشبو بری طرح سے اس کے حواسوں پر چھا رہی تھی۔

”اس دن تو آپ چلی گئی تھیں میری زندگی کا سارا سکون لوٹ کر آج میں آپ کو ایسے نہیں جانے دوں گا۔“ اس نے بے اختیار ہی اس کا ٹھنڈا برف ہاتھ تھام لیا تھا۔

”بھبھ بھوڑو میں مجھے۔ کون۔ کون ہیں آپ؟“ اب وہ روہینے کو تھی ایسے حسین لیڈو پتھر کا خواب تو دیکھ سکتی تھی مگر سامنا ہونے پر کیا حال ہو گا اس کا اندازہ اب ہو رہا تھا۔

”ایسا بار آپ کا ہاتھ تھام لیا ہے تو اب نہیں بھوڑو لگا۔ میں سینی ہوں سفیان فخر حیات جو شاید اس دنیا میں فقط آپ کے لیے بھیجا گیا ہے، صرف آپ کے لیے آپ کا سینی۔“

”آپ کا داغ تو ٹھیک ہے نا۔ لکس۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“ اس نے اپنی پوری توانائی صرف کر کے اس کے جاوٹی سرے سے نگاہیں ہٹا کر کہا۔

”بہلے ٹھیک تھا“ آپ کو دیکھنے کے بعد تو نہ دل غم نہ دل گروے پھینٹے کچھ بھی صحیح سے کام نہیں کر رہے۔ پلینز رٹم کرو مجھ پر۔ میرا تو پورا پاؤں سٹم ہی ڈس آرڈر ہو گیا ہے۔ اس خریب کار دیوی کا نام پوچھ سکتا ہوں میں پلینز۔“ زینب کا ہاتھ اب تک اس کی مضبوط گرفت میں تھا اور زینب کا پورا وجود جیسے بجلی کے ٹھکوں کی زد میں تھا۔

”زینب! تم یہاں آکر بیٹھو۔“ آمنت اندر آتے ہوئے بولی مگر سامنے کھڑے نوجوان اور اس کے اونچے لمبے

سراپے کے پیچھے چھپی کھڑی زینب ایک بل کو اسے نظر نہ آئی تھی۔

”مہم۔ میں آ رہی ہوں چلو۔“ سینی نے اسی لمحے اس کا ہاتھ چھو ڈیا تھا اور زینب دیوانہ وار باہر کی طرف بھاگی۔ آمنت نے حیرت سے پہلے سینی کو اور پھر زینب کو دیکھا۔ اسے کچھ ہو جانے کا احساس سا ہوا تھا۔

”اوتارک کیوں گئی ہو؟“ زینب نے نقاب درست کرتے ہوئے پیچھے مڑ کر آمنت سے جھنجھلا کر کہا۔

”یہ کون تھا؟“ آمنت اس کے پاس آ کر بولی۔

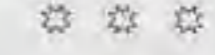
”کوئی نہیں چلو تم۔“ وہ جیسے بھاگ رہی تھی۔

”زینب! مجھے بتاؤ یہ کون تھا؟“ وہ سختی سے بولی۔

”مہم۔ مجھے کیا معلوم، میں تو آفس میں تمہارا انتظار کر رہی تھی کہ یہ آکر کسی کا پوچھنے لگا، ساتھ ہی تم بھی آگئیں اور بس۔“ اس کا نفس تیز تیز چل رہا تھا جیسے میلوں دوڑ کر آئی ہو۔

”تو نہیں اس نوجوان کا چہرہ دیکھا دیکھا سا لگ رہا ہے، ہے نا۔ کہیں دیکھا ہے اسے۔“

”معلوم نہیں چلو اب۔“ زینب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر راستہ طے کر لے اور آفس میں ریوالتنگ چیئر پر جھومتے ہوئے سفیان کو لگا اس نے زندگی کو دریافت کر لیا ہے۔ ایک حسین روشن زندگی کو۔



کبھی تو تم کو یاد آئیں گی وہ ہماری وہ سماں تم سے پھڑکے صدیاں نہیں پھر بھی تم یاد آئے سماں بن کے آتے ہیں کے آج بھی تم نہ آتے ہو زندگی کتنی بے ادب ہے تم نے ابھی تو مجھ سے کہا تھا تم سے جا رہے

کہاں گئیں وہ ہمار کی قسمیں پیار کا وعدہ کیا ہوا۔۔۔ پرانے گانے کی ری سکسٹک تھی اور عبدالصہب عرف مولیٰ کی دلکش آواز کا جاوہ رات کا آخری پہر اور پنڈال سے آتی ہزاروں لوگوں کی ایک سہڑ میں جتنی تالیوں کی آواز۔ مجمع جھومتے ہوئے سن رہا تھا جیسے کوئی جاوہ گر ان پر کوئی سر بھونک رہا ہو اور وہ سب اس کی آواز کے زیرِ دم میں گم ہوتے جا رہے ہوں۔

”دس مور ڈنسر۔“ جیسے ہی گانا تمام ہوا مجمع نے ہاتھ ہلا ہلا کر خوب ہی شور مچایا اور لوگوں کے اصرار پر مولیٰ کو گانا دوبارہ گانا پڑا تھا۔ اس کنسرٹ کا آخری گانا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ مسلسل گارہا تھا۔ گانے کے ساتھ ناچنے کو دیکھنے کی ایسرسائز علیحدہ اب تو اس کے ہم کا جوڑو جوڑ تھک چکا تھا اور سکون سے کہیں بیٹھنے لینے کی شدید خواہش کر رہا تھا۔

”اوکے گائیز پھر ملیں گے امید ہے آپ کو میرا نیا البم پسند آیا ہو گا اور میری پرفارمنس بھی۔ یہ چند کیسٹس آپ لوگوں کے لیے بہت محبت بہت چاہت سے جس جس کو مل جائیں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں میں پکڑی چھ سات آڈیو کیسٹس مجمع کی طرف اچھائیں ”ہو ہاؤ۔ واؤ“ کا زبردست شور اٹھا تھا۔ اسٹیج پر مختلف فون نمبرز اور میاٹل نمبر کی برتیوں کا ڈھیر لگا تھا جو اس کے لیے مجمع کی طرف سے آئی تھیں۔ کتنی حسیناؤں نے اپنے کانٹیکٹ نمبرز اس کی طرف اچھالے تھے۔ وہ ان برتیوں سے نظریں چراتا ہاتھ ہلاتا اسٹیج کے پیچھے چلا گیا۔ چہرے پر آئے سینے کو اس نے کرسی پر پڑے توالیہ سے خوب رگڑ کر صاف کیا۔

”اوکے حامدی صاحب! مجھے اب اجازت باقی کے معاملات کل طے کر لیں گے۔ اس وقت میں بہت تھک چکا ہوں پھر اس سے پہلے باہر رش لگے اور لوگ آتے کر اف کے چکر میں مجھے پاگل کر دیں میں اب چلتا ہوں۔“ وہ اپنے بیچر سے بولا تھا۔

”کچھ ریفریشنٹ سہلی صاحبہ“ حامدی نے آگے بڑھ کر جوابت سے کہا۔

”نو ٹھینکس۔ اس وقت کچھ نہیں۔“ اس نے ٹھنڈے کٹینز میں لگی کولڈ ڈرنکس میں سے ایک کاٹن اٹھا کر منہ سے لگالیا۔

”ڈراپیک کروائیں یا ہیری گاڑی آگنی ہے۔“ ایک طویل گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے اس نے کہا۔

”جی گاڑی تو آپ کی کھڑی ہے، مس نین تارا آپ کو لینے آتی ہیں اور کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔“

”اوہ تو پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اوکے بائے۔“ وہ غلٹ میں دو تین بڑے بڑے گھونٹ بھرتا ہوا ہر نکل گیا۔

کھلے پنڈال کے پیچھے یہ چھوٹا سا کمرہ سا بیڈروم کے طور پر کام کر رہا تھا۔ پارکنگ پنڈال کے باہر بھی ٹرین تارا کی گاڑی اس کمرے کے پیچھے بنے طویل برآمدے سے آگے کھڑی تھی۔ برآمدے کے سامنے بنا چھوٹا سالن اس وقت بالکل ویران تھا۔ عبدالصمیم لمبے لمبے ڈگ بھرتا نین تارا کی پوٹھو پارکے پاس آیا۔

”ہائے کیسا ہا کسٹ؟“ وہ جیسے ہی گاڑی میں بیٹھا نین تارا نے خوش دلی سے پوچھا۔

”زیروست بہت بہت زیروست۔ بہت اچھا اور عظیم ملا۔ لوگوں نے سب گاڑوں کو بہت پسند کیا۔ ہر گاڑی کو دو بار دیکھا گیا۔ آج میں بہت خوش ہوں نین تارا! بہت خوش۔ آج میری محنت رنگ لائی ہے۔ تم کسٹ میں کیوں نہیں آئیں؟“ ایک دم سے یاد آیا تو پوچھ بیٹھا۔ نین تارا نے گاڑی اشارت کر دی۔

”آئی تھی تھوڑی دیر کے لیے پھر مام کا فون آیا کچھ امپورٹنٹ کیسٹ آئے ہیں ان سے میرا ملنا ضروری تھا“ اسی لیے گھر چلی گئی تھی۔ وہ لوگ ابھی گھر میں ہی بیٹھے تھے کہ میں تمہیں لینے چلی آئی۔ مجھے معلوم تھا کہ تمہاری کھٹار اور کشاپ میں کھڑی ہے اور تم نے گھگھام سے اسے ورکشاپ سے لانے کو کہہ رکھا ہے۔“

”اور دیکھا تم نے گھگھام کا نام گاڑی ابھی تک لے کر نہیں لیا۔ تم نہ آئیں تو میں ابھی تک ادھر ہی بیٹھا ہوتا“

حامدی سے لفت لینے کے لیے۔

”تم ہی گاڑی کیوں نہیں لے لیتے؟ اتنی بار مام نے تم سے کہا ہے۔“

”اب لے لوں گا اس کسٹ سے مجھے اتنی اکم ہو جائے گی کہ میں دو گاڑیاں آرام سے خرید سکتا ہوں۔ اگلے

بہتے ایک کسٹ کراچی میں ہے اور اس کے تین دن بعد اسلام آباد میں۔ اب تو گاڑیاں ہی گاڑیاں آگے پیچھے۔“

وہ بہت خوش تھا بہت پرجوش۔ اس نے ٹائٹس آگے نیک پھیلا دیں اور گاڑی کی سیٹ سے نیک لگا کر آیزی ہو لیا۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر مام نے بھی تو آفر کی تھی، تمہیں اتنی دفعہ کہا۔ کیا ہم تمہارے لیے نہیں ہیں۔“ نین تارا نے گدہ کیا۔

”یہ مت کہو ایسی بات کبھی سوچنا بھی نہیں۔ میں اپنے لیے تو غیر ہو سکتا ہوں مگر میڈم کے لیے میں ایسا بہت

بھی نہیں سکتا۔ نین تارا! جس طرح تم لوگوں نے مجھے سپورٹ کیا ہے مجھے سہارا دیا ہے مجھے میرے قدموں پر

پورے وجود کے ساتھ کھڑا کیا ہے میں اس کا بدلہ کبھی نہیں چکا سکوں گا۔“ وہ تشکر بھرے لہجے میں بولا۔

”ایسے مت کہو کہ احسان کیا۔ تم میں ٹیلنٹ تھا تو کچھ بن سکتے ہو، ورنہ مام نے تو بہت لڑکوں اور لڑکیوں کو

سپورٹ کیا ہے۔ اتنا شائنگ اشارہ تو کوئی بھی نہیں بن سکا۔ تمہارا نام تم نے کہا لیا ہے۔ اتنا تو شاید مام بھی نہیں کر سکی

تھیں، میرا ذکر تو اور بات ہے۔“ شہری سڑکیں سنسان تھیں۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ صرف پول لائٹس روشن تھیں۔ انار کا گاڑیاں آجاری تھیں۔

”ٹیلنٹ ہونہ۔“ وہ ہنسا۔ ”خالل خولی ٹیلنٹ سے کیا ہوتا ہے ٹیلنٹ تو نہ جانے کتنا ہمارے پسماندہ علاقوں

میں رہا ہے۔ کون اسے پہچانتا ہے، کس کو فرصت ہے کہ جا کر اسے تماشے سے پالش کرے اور اگر کوئی خود

سے دھکے کھا کر نامزدیا تک پہنچ بھی جائے تو جب تک اسے مناسب سپورٹ نہ ملے اس کا ٹیلنٹ بیکار ہے، کوئی

اسے پوچھے گا بھی نہیں۔“

”ہاں کہتے تو تم ٹھیک ہو لیکن سپورٹ اپنی جگہ، ٹیلنٹ اپنی جگہ۔ اکثر لوگ صرف اونچی میٹر جی کے سہارے ہی

آتے ہیں مگر ان میں ٹیلنٹ نہیں ہوتا اور وہ چند دن سے زیادہ نہیں چمک سکتے۔ تمہیں قدرت نے دونوں نعمتوں

سے نوازا ہے۔ تمہیں فل چانس دیا گیا ہے کہ اپنے ٹیلنٹ کو بھرپور طریقے سے آگے لانا اور خود کو نوازا۔ تمہارا یہ

اہم خوب طے گا اور ہماری نئی آنے والی فلم کے گانے تو سب بھرے لوگوں میں خوب پاپو رہ چکے ہیں۔ مان لو سولی

ڈیجیٹل کہ تم لگی ہو ”پارس پتھر“ میری پہلی فلم تو سو سو گئی تھی مگر یہ والی تو لگتا ہے پربہت جانے کی۔“ نین تارا نے مسکرا کر کہا۔

”پارس پتھر“ کوئی یونمی نہیں بن جاتا نین تارا! وہ افسروگی سے بولا۔ ”تمہیں کیا معلوم میں نے اس راہ سے

کن کن پتھروں کو کاٹا ہے۔ وہ وہ کی شہر کاٹنا آسان ہے مگر خود کو نونا مشکل ہے اور اس مشکل تک پہنچنے میں

میرے پاس کیسے آبلہ پا ہو گئے ہیں میں چاہوں بھی تو تمہیں نہیں جتا سکتا۔“ وہ ذرا سار کا۔

”شروع شروع میں میڈم نے چند دن کی سرپرستی کے بعد مجھ سے بے نیازی برتاؤ شروع کر دی تھی۔ سائبرٹی نے

بھی چند دن کے ریاض کے بعد ہری جھنڈی دکھا دی تھی۔ میرے پاس ان کو خوش کرنے کے لیے کچھ بھی تو نہ تھا

پھر خالی ہاتھ خالی بھولی۔ بس کچھ پاس تھا تو دل میں لگن بھی شوق تھا جذبہ تھا۔ کچھ کر گزرنے کا اور بھی جذبہ مجھ

سے کیا کیا کروا گیا سوچوں تو مجھے خود بھی نہیں آتا۔ سائبرٹی کے نذرانے کے لیے میں قلی بنا۔ مزدور بنا سارا سارا

دن ریت۔ جبری ڈھونڈ کر میڈم میں۔ سمنٹ کے تھیلے اٹھا اٹھا کر کئی منزلہ میٹر مہیاں چڑھتا۔ میں نے لوگوں کے

پوٹ بھی پالش کیے۔ موٹرسے کے ہار بھرے بھی بیچے لوگوں کی گاڑیوں کے آگے بھاگ بھاگ کر ان کے شیشے

چمکائے گاڑیاں دھو میں اخبار بیچے، تنور میں روٹیاں لگا میں، سلیز میں بنا ہا کر بنا ٹیرا گیری کی اور کشاپ میں کام کرتا

رہا۔ وہ کون سا کام ہے جو میں نے میں کیا ہر طرح سے چند روپے کمائے مگر کبھی کوئی جرم نہیں کیا، کسی کی جیب

نہیں کالی پوری نہیں کی کسی کے پیسے لے کر نہیں بھاگا۔ بس کچھ بن جانے کی لگن تھی۔ محنت مزدوری الگ

کرتا تھا دن میں ایک بار میڈم کے پاس جا کر ضروری ضروری دیتا تھا اور اسٹوڈیو کے دھکے بندھنے کی وی اسٹیشن ریڈیو

اسٹیشن، غرض جہاں جو کام مل گیا۔ ماہ جس کا اشتہار، بسکٹ کا ٹائی کا کیا بیان ساری کا۔ میں نے ہر کام منت سے اور

محنت سے حاصل کیا۔ کچھ بھی تو مجھے پلیٹ میں سجا جایا نہیں ملا۔ بس دل میں ایک عمدہ کر لیا تھا کہ مجھے ٹاپ کلاس

سنگر بننا ہے۔ ایک شائنگ اشارہ اور دیکھ لو آج میں اسی ہائٹ اسی ایک (چولی) پر کھڑا ہوں۔ بشیر ہاتھ ہلائے سب

کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہوں اور اب میں اپنی یہ کتھاسی کو سٹاؤں تو کوئی تعین نہ کرے کہ میں نے اتنی لف

لائف گزارنی ہے۔

ان ایسی تیر سالوں میں کتنی راتیں میں نے بھوکا رہ کر گزارنی ہیں کہ خالی بیت بند بھی نہیں آتی تھی۔ کروٹیں

بدل بدل کر رخ کرتا تھا کہ دن چڑھے اور مجھے کہیں سے سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا ہی مل جائے۔ کئی بار کتنے ناختم کے

فانے کے ساتھ ”کل کدہ“ جاتا تم اور میڈم مجھے دیکھ کر بھی نہ دیکھتیں۔ میرے سلام کا جواب بھی نہ دیتیں اور

آپ دونوں کی بے نیازی اور حقارت کے باوجود میں چپکار رہتا۔ میڈم مجھے ہانوں سے ٹالتیں۔ امتحان بن کر چل

دیتیں مجھے دیکھتے ہی کسی فضول سے کام میں مصروف ہو جاتیں، موبائل پر خواہ مخواہ نمبر دھن کرنے لگتیں اور اس

وقت میں چپکے سے ان کے بچن میں چلا آتا پانی پینے کے بہانے تو کروں سے کچھ نہ کچھ سامنے پڑا مانگ کر کھالیتا۔

اس وقت مجھے وہ ذرا سی نعمت بھی دنیا جہاں کی نعمتوں سے بڑھ کر لگتی تھی اور میرے دل سے میڈم کے لیے دعا میں

نکلتیں اور کچھ وہ وقت بھی گزر گیا اور میرے پاس ان تکلیف دہ لوگوں کو یاد کرنے کا اب وقت بھی نہیں۔“

وہ پھٹکی سی ہنسی ہنسا۔

”جج مجھے اسٹوڈیو ایک گانے کی ویڈیو ریکارڈ کروانے جانا ہے۔ اس کے فوراً بعد حامدی صاحب سے میٹنگ

ہے فلم کی لاپٹک کے سلسلے میں۔ دوپہر کو ہالی ڈے ان میں فنکشن ہے اور خان فریدی صاحب کی فلم کے دو گانے

بھی کل ہی ریکارڈ کروانے ہیں۔ اف بہت مصروفیت ہے اور آرام کے لیے صرف یہ دو تین گھنٹے۔“

”تم بھی کوشش کرو اور اس ایجوٹڈ سائنیکل سے نکل کر زندگی بہت حسین ہے اور ایک بار ملتی ہے اسے انجوائے کرو یوں جمل جمل کر کڑھ کر اسے ضائع مت کرو۔ جتنی تم خود حسین ہو اتنی حسین اپنی زندگی بنا سکتی ہو اگر چاہو تو۔“ وہ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ گاڑی ”کل کدہ“ کے گیٹ کے آگے کھڑی تھی۔

”میں سمجھی نہیں۔“ وہ ڈھیلے سے انداز میں بولی۔
 ”وقت آنے پر سمجھ جاؤ گی۔“ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھا کر ہارن بجانا شروع کر دیا اگلے پل چوکیدار گیٹ کھول رہا تھا۔ عبدالعین کو اب بری طرح سے فینڈ آ رہی تھی اور عین تارا کو لگا اس کی فینڈ کم از کم آج رات کے لیے اڑ چکی ہے۔

آپریشن تھیٹر کے باہر نمل نمل کر سیدہ کی ٹانگیں نمل ہونے کو تھیں۔ اسی وقت ڈاکٹر نائلہ تھیٹر سے باہر آئیں۔

”ڈاکٹر صاحب! سالہ ٹھیک ہے آپریشن ہو گیا؟“ انہوں نے بے باکی سے آگے بڑھ کر پوچھا۔
 ”ہمیں کچھ بھی ٹھیک نہیں۔ لی کی کنٹرول نہیں ہو رہا اس لیے آپریشن میں دیر ہو رہی ہے آپ دعا کریں۔“ وہ مصروف لہجے میں کہہ کر دوبارہ آپریشن تھیٹر میں کم ہو گئیں اور سیدہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ عجیب سا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

”اگر سالہ کو کچھ ہو گیا تو؟“

”اگر کچھ نہ ہو تو خدا نخواستہ۔“ ان کا دل اسی حدیث پر تو جیسے بند ہونے کو تھا۔

اسی وقت سلطان بخت حسین شاہ کی صحبت میں آئے۔

”ہو گیا آپریشن؟“ حسین شاہ نے برہان چہرے کے ساتھ سے سیدہ کو دیکھا۔

”جی نہیں۔ وہ بہت آگے چلی ہے۔“

”چھا بھلا مارا مل گیس ہوتا تھا پھر آپریشن کی نوبت کیوں آئی؟“ حسین شاہ نے سیدہ سے پوچھا تو وہ نظریں

چرا گئیں۔ اب کیا بتائیں کہ سالہ اور سلطان بخت میں کس قدر زور دار ٹھنڈا ہوا تھا۔ وہ عین تارا کا فون اٹینڈ کر

بیٹھی تھی بس پھر اور جھگڑے کے دوران ہی وہ چکر اکر گر پڑی اور اس کی حالت خراب ہو گئی ایمر جنسی میں اسے

اُدھر لانا پڑا تھا اور یہ بات وہ حسین شاہ کو نہیں بتا سکتی تھیں سو منہ پھیر کر دل میں دعا کرنے لگیں۔

”مبارک ہو سیدہ صاحبہ آپ کو؟“ اسی وقت ڈاکٹر نائلہ کا خوش خوش چہرہ ان کے سامنے آ گیا اور ان کی آواز پر

تینوں نفوس کے چہرے جیسے گل اٹھے تھے۔

”آپریشن ہو گیا؟“

”جی بالکل کامیاب ہو گیا۔ آپ کی بھالی بالکل خیریت سے ہیں اور۔“

”اور۔“ سیدہ نے پرامن روشنی نظروں سے ڈاکٹر کے مسکراتے چہرے کو دیکھا۔

.....

”جزواں۔“ ڈاکٹر ایک لحظہ کے لیے دکی تھی۔ سیدہ کے چہرے پر شادی مرگ والی کیفیت تھی۔ حسین

شاہ اور سلطان بخت کے دلوں نے بھی جیسے ایک پل کے لیے دھڑکنے موقوف کر دیا تھا۔

”بیٹیاں ہوتی ہیں۔“ ڈاکٹر نے ڈرامائی انداز میں ہنسل پورا کیا۔ سیدہ کو یوں لگا شہر کے اس منگے ترین خوبصورت

ہاسپٹل کی وسیع۔ بلڈنگ ان کے سر پر آن گری ہے بے اختیار انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

خود کو بچانے کی لاشعوری کوشش۔

اور سلطان بخت کا چہرہ ایک دم سے جیسے سیاہ پڑ گیا تھا۔ کسی حیدر کی سیاہ زلف کی طرح۔ دوسرے پل ان کا چہرہ

بے رنگ سا ہو گیا تھا۔ بالکل سپاٹ بے تاثر اور تیسرے ہی پل غصے اور طیش سے سرخ انگارہ جیسے کسی نے

”واقعی بہت محنت کے بعد تم نے یہ مقام حاصل کیا ہے۔ مجھے تو امام کے نام نے سب کچھ دلا دیا ورنہ تو اس دشت کی سیاحتی میں پاؤں واقعی آبلے پاہو جاتے ہیں تمہاری اسٹریٹل (جدوجہد) قابل تحسین ہے صحیح کہا ہے کسی نے صبر کا پھل واقعی میٹھا ہوتا ہے۔“ وہ اسے سراہتے ہوئے مسکرائی۔

”یہ یونیورسٹی ٹیوٹور (آفاقی سیٹائی) ہر دفعہ سچ نہیں ہوتا کچھ لوگوں کو کچھ بھی کیے بغیر میٹھا پھل تا عمر ملتا رہتا ہے۔ اس کی بہترین مثال تم ہو اور تمہارے شاگرد ہیں۔“ وہ جان کر اس موضوع کی طرف آیا۔ ”ان جیسے لوگوں کو تو یہ سویٹ فروٹ حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی تنگ ہو نہیں کرنا پڑتی۔“

”ان کا ذکر اس وقت کدھر سے آیا؟“ عین تارا ناگواری سے بولی۔ ”ان کا نام مت لو میرے سامنے۔“

”کیوں؟ کیا آج کل ان کے ساتھ پھر شہتی ہوئی ہے؟“

”ان کے ساتھ بنی کب ہے۔“ وہ افسردگی سے بولی۔ مجھے لگتا ہے عمریں بیت گئیں نہ میں انہیں چھوڑ سکتی ہوں نہ وہ مجھے چھوڑتے ہیں نہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ پتا نہیں اس جیرا ”ساتھ کا انجام کیا ہو گا۔“

”انجام کی کیا بات ہے۔ جن سے محبت کی ہو جن سے دل ملے ہوں چھوٹے موٹے جھگڑے تو ان کے ساتھ چلتے رہتے ہیں اور ان ہی میں مزہ ہے۔“ عبدالعین نے کن انہیوں سے عین تارا کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

”رہنے دو۔ یہ محبت چاہت سب دکھاوا ہے۔ بھوت اور فریب۔ نظر کا دھوکہ۔ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں مگر

کچھ کنڈیشنز کے ساتھ اور میں ان کی محبت چاہتی ہوں ہر کنڈیشن سے ایلا تر پھر یہ محبت تو نہ ہوئی۔ یہ تو سوچا سمجھا

منصوبہ ہو گیا جو مسلسل نمل جا رہا ہے، میں اس محبت کے ڈرامے سے تنگ آ چکی ہوں۔ انہیں چھوڑ دینے کی

دھمکی دے کر کچھ نہ کچھ اٹھ لوں چند دن ان کا دل بسلاؤں اور پھر انہیوں کو پھر وہ بھی اکر جائیں پھر کچھ دینے والے

پر کسی سوچے پر مصالحت ہو جائے پھر لڑائی۔ یہ سائنیکل کہاں رکے گا کچھ خیر نہیں۔ میں تو خیر آپ ہو چکی ہوں۔“

اس نے زور سے اسٹیئرنگ و ہیل پر ہاتھ مارا۔

”تو چھوڑ دو انہیں۔ کل آؤ اس سائنیکل سے۔“

”یہ آسمان کب ہے کہ وہ مجھے چھوڑنے کو تیار نہیں اور میں۔“ وہ کھوسی گئی۔ ”میں چھوڑنا چاہتی ہوں اور

چھوڑ نہیں سکتی۔“

”کیوں؟“

”پتا نہیں؟“ اس نے سر وہ بھری ”تم سناؤ یا گھر لے رہے ہو نام بتا رہی تھیں۔“

”ہاں دو چار کوٹھیاں دیکھی ہیں مگر مجھے کچھ خاص پسند نہیں آئیں سوچ رہا ہوں زمین کھل کر کسی اچھے

آر کیٹیک سے خود کمر ہواؤں۔ خوبصورت بہت آرٹسٹک سا اپنی ہر حسرت کو اس کی بیٹیوں میں بہت گراؤں

گروا کے خوابوں کا کل تعمیر کرواؤں۔“ وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”اوہ وہ ایہ ارادے ہیں جناب کے۔“

”ارادے تو اور بھی بہت ہیں۔“ وہ مسکرایا۔ ”مگر اب ایک ایمر جنسی آن پڑی ہے۔“

”ایمر جنسی کیا مطلب؟“ عین تارا نے گاڑی ”کل کدہ“ کی سڑک کی طرف موڑی۔

”مجھے لگتا ہے گھر سے پہلے گھر والی آجائے گی اس کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔“ عبدالعین کی بات پر عین تارا

کا دل زور سے دھڑکا۔

”کیا مطلب؟ میں کچھ سمجھی نہیں؟“

اسٹیئرنگ و ہیل پر اس کے ہاتھ کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔

”مطلب اس وقت نہیں سمجھا سکتا مجھے لگتا ہے مجھے جلد ہی میڈم سے بات کرنا پڑے گی اس سلسلے میں ان

کی اجازت تو سب سے ضروری ہے۔“ اس کی معنی خیز بات پر عین تارا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

جاگرا۔

”ایک اور آفت تباہی نے رنجیدی سے ٹوٹے بے وقاسینڈل کو یکساں پاؤں کے درد کو وہ پی گئی تھی۔
 ”اب تو آجائیں۔ اب تو لٹ لٹ لیتے کی بیخوش ریزن مہ جو ہے۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔ جوتے نے بروقت نوٹ کر
 اس کے دل کی مراد پوری کر دی تھی۔
 ”اے میاں! کیا بات ہے۔ کیوں لڑکی کو ستا رہے ہو یوں پیچھے پیچھے گاڑی دوڑا کر۔“ ایک اوجھڑ عمر آدمی نے
 ڈپٹ کر سفیان سے کہا۔ وہ کالی دیر سے دونوں کی حکمران کو دور سے ملاحظہ فرما رہا تھا۔
 ”لڑکی۔! سفیان پہلے تو ذرا سا جھجکا پھر بندر سا ہو کر بڑے میاں کو دیکھنے لگا۔
 ”یہ میری بہن ہے۔ میں دیر سے لینے آیا ہوں۔ اس لیے خفا ہو گئی ہے۔ اب ابھی جاؤ۔ گھر میں سب انتظار
 کر رہے ہوں گے۔ پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔ مجھے اور ڈانٹ پڑواؤ گی۔“
 زینب نے حیرت سے اس کی دیدہ دلیری دیکھی اور اس کے سفید جھوٹ کو بھی۔ سفیان تیزی سے گاڑی سے
 اتر کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گاڑی کی طرف کھینچنے لگا۔

”پھوڑیں کھینچے۔“ وہ کس مسالہ۔

”جلدی چلو ورنہ اور لوگ اکٹھے ہو جائیں گے۔ کیا تماشا بناؤ گی سب کے سامنے۔ میری تو خیر ہے۔ اپنا
 سوچو۔“ اس کی دھمکی واقعی سخت خوفناک تھی۔ تماشے کا سن کر تو اس کے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی اگر
 تماشے کی خبر بابا صاحب کو ہو گی تو؟ اس سے آگے وہ کچھ نہیں سوچ سکی اور سیٹی کے کھنچاؤ کے ساتھ کھینچتی چلی
 گئی۔ اس کے ایک پاؤں میں جو تھکا اور دو سر لٹکا۔

جیسے ہی وہ ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ بیٹھی۔ سیٹی نے دروازہ بند کر کے گاڑی تیزی سے اشارت کر دی۔ وہ
 اوجھڑ عمر آدمی ابھی بھی دونوں کو مٹھوک نظر دینا سے دیکھ رہا تھا۔

”اب۔ اب کس قدر بھولے ہیں۔ کوئی اس قدر فضول جھوٹ بھی بولتا ہے۔“

”عجبت اور جنگ میں سب جا بڑ ہو تے ہیں۔ جھوٹ موٹ کسی اگنی کے سامنے تمہیں بہن کہہ دیا تو کیا تم
 میری بہن ہو گئیں؟ نہیں نا۔“ وہ مزے سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔
 زینب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گاڑی اب گزرتی تھی اور بھیجی بیٹنی خوشبو خاصی مسکور کن تھی۔ یہ زینب کی
 زندگی کا گاڑی میں پہلا سفر تھا۔ وہ بھی اتنی زبردست گاڑی میں۔ نرم بے حد گواہ نہیں۔ اسے ایک بہ یک ہی بہت
 خوشگوار سا احساس ہوا۔ کچھ بہت اچھا لگنے کا احساس۔

اس نے ایک گہرا سانس لے کر ایر فریشنگی خوشبو کو اپنے اندر اتارا۔

”بھئی۔ آپ کدھر جا رہے ہیں۔“ گاڑی بازار کے رستے پر جا رہی تھی وہ گھبرا کر بولی۔

”پہلے تمہیں جو تاتو لے دوں۔ کیا ننگے پاؤں گھر جاؤ گی۔“ وہ خاصی بے تکلفی سے بولا جیسے ان دونوں میں پرانی
 جان پہچان ہو۔

”پلیز مجھے جو تادو تا نہیں لینا۔ آپ مجھے گھر چھوڑ دیں۔“ وہ گھبرا کر بولی۔

”بے فکر ہو۔ میں تمہیں گھر ہی چھوڑوں گا۔ کہیں اور بھاگ کر نہیں لے جاؤں گا۔ پہلے جو تاتو لے لو۔“ وہ بے
 فکری سے بولا۔

”نہیں مجھے جو تا نہیں لینا۔ مجھے گھر جانا ہے۔ پلیز۔“ اس کا رنگ اڑنے لگا تھا۔ ”بابا صاحب کو پتا چل گیا تو؟“
 اس کا خون خشک ہونے لگا۔

”میں دس منٹ لگیں گے۔ لو آگیا بازار اور یہ شو باؤس۔ چلو اترو۔ میں تمہیں سینڈل لے دوں۔“ گاڑی واقعی
 بازار کی سب سے بڑی بوتلوں کی دکان کے آگے کھڑی تھی۔ زینب سیٹ پر جیسے جم کر بیٹھ گئی۔
 ”مجھے نہیں اترنا۔“

انہیں جلتی ہوئی بھٹی میں لایا ہوا۔ انہوں نے ایک غصیلی نفرت بھری نظر حسین شاہ کے ساکت چہرے اور سیدہ
 کے شکم مرودہ جو در ڈالی۔ ایک ٹھوکریاں پڑے صوفے کو زور سے ماری اور پیر پٹختے ہوئے باہر چلے گئے۔
 ڈاکٹر نے کچھ حیرانی سے سلطان بخت کو اس طرح جاتے دیکھا اور پھر سیدہ کے فن چہرے کو بات سمجھ میں
 آگئی۔ ڈاکٹر نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے گاؤں سے ان دیکھی رہ بھڑائی۔

”ہم آپ کی ہسپتال کو تھوڑی دیر تک روم میں شفٹ کر دیتے ہیں۔ بے بیڑ کو زمری میں بھیج دیتے ہیں۔ آپ
 پلیز۔ بے بیڑ کے کپڑے اور وہ سراسمان بھجوا دیں۔“ کہہ کر وہ رکی نہیں اور دوبارہ آپریشن ٹیم میں چلی گئی۔ اس
 کے پیچھے آپریشن ٹیم کا چوں چوں کی آواز کے ساتھ جھومتا دروازہ جیسے آکر سیدہ کے منہ پر ٹھماٹے مارا۔

”بشیراں!“ کافی دیر بعد ان کے ساکن جسم سے آواز برآمد ہوئی برآمد کے پچھلے حصے میں فرش پر بیٹھی دونوں
 ملا زائیں فوراً حرکت میں آئیں۔

”جی سائیں!“ بشیراں ہنکے سر کے ساتھ بے حد متوجہ تھی۔ ”خوش خبری ان کے کان بھی سن چکے تھے۔
 ”بچے کے کپڑوں کا بیک لے آؤ۔“

سیدہ نے بہت مشکل سے یہ جملہ کہا تھا اور پھر ٹوہ کو گھسیٹ کر انہوں نے صوفے پر گر لیا۔ کراٹھانے کی بہت
 تھی۔ کچھ کہنے کی۔ سیدہ کو یوں لگا جیسے آج کے بعد وہ کسی پیرا تھا کر بات نہیں کر سکی گی۔ کسی سے بھی۔

بابا جان کی سر بند جو ملی انہیں مٹی کا گھر وندہ لگ رہی تھی جو لوفانی۔ بھڑوں کی نڈ میں دائیں بائیں جھول رہی
 تھی۔ اسے ہی بے تماشاً زور زور کے بھولے ان کے سر کو بھی آ رہے تھے۔ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر
 صوفے پر گر کر تکی چلی گئیں۔

”سیدہ! سیدہ!“ حسین شاہ بے اختیار ان کی طرف بڑھے۔



”ایک کیو زی۔ آئیے میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔“

تین اس کے قریب گاڑی کے چرچا اتے ٹائز اور پھر مخالف کی آواز زینب ایک دم سے بدک کر رو رہی تھی اور
 خوف زدہ نظروں سے سامنے کڑی وہاٹ سیلون کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے کھینچنے لگی جو زینب کے اس طرف ڈور
 جانے سے جیسے محفوظ ہو رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ زینب کو اور تیا گئی۔ اس نے غصیلی نظروں سے سیٹی کو دیکھا
 اور ہاتھوں سے لڑھکتی قائل اور کندھے سے نیچے گرتے شوڈر بیگ کو سنبھالا اور گردن خشک لہر آگے جانے لگی۔

آج کل کلج میں اسپورٹس ڈس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس کی دوست فرزانہ نے ”بشیرا! بھائی میں جلد لیا
 تھا۔ اسی کی ریسرسل دیکھنے کے لیے وہ رک گئی تھی۔ ریسرسل تو ابھی بھی جاری تھی مگر دیر ہو جانے کے خیال سے

وہ نکل آئی اور اس کے ساتھ جو مٹھے کی دو لڑکیاں جاتی تھیں وہ پہلے ہی گھر جا چکی تھیں۔ نتیجتاً اسے اپنے گھر
 جانا پڑ رہا تھا سارا کلج تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ صرف ریسرسل کرنے والی لڑکیاں ہال میں موجود تھیں۔ زینب تیز
 قدموں سے جا رہی تھی۔ اسے اب اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا وقت کافی ہو چکا تھا اگر بابا صاحب وہاں کے
 کھانے کے لیے اوپر آگے ہوں تو اسے فاسل سے پہلے ہی گھر بٹھالیں گے۔

”پلیز آئیں نا۔ میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ شاید اللہ نے اس کو جلدی گھر بھجوانے کا یہ انتظام۔ کیا تھا
 گھر اسے قسمت کی یہ مہربانی لوارا نہیں تھی۔

”شکر ہے۔“ اس نے دھیمی آواز اور خشک لہجے میں کہا اور قدموں کی رفتار تیز کر لی۔ وہ جیسے بھاگی جا رہی تھی۔
 دھوپ میں چمکتی وائٹ سیلون ست رفتاری سے اس کے ساتھ چل رہی تھی۔

”پلیز آئیں ناں۔“ اس نے اصرار کیا۔ زینب جھنجھلا گئی۔ وہ جیسے بھاگنے لگی۔ سال خوردہ جوتے سے یہ تیزی
 برداشت نہ ہوئی اور اس کے بائیں جوتے کی دونوں اسٹریپ نکل گئیں۔ پاؤں مڑا اور جو تاپاؤں سے نکل کر دور

"عجیب لڑکی ہو۔ ہر کام ہریات میں ضد پہلے اور ہر سڑک پر جوم لگوانے لگی تھیں۔ اب اوہرازا میں۔ اب میں نے گاڑی روکی ہے تو اس کا مطلب ہے ہم یہاں کچھ خریدنے آئے ہیں۔ میری تمہاری منت کرتا رہوں گا اور تم یونہی لڑکی رہو گی تو آتے جاتے لوگ کیا تمہیں کے ڈرا سوچو۔" اس نے پرانی وٹھکی دی۔

"مجھے نہیں پروا۔ آپ مجھے گھر چھوڑیں یا پھر میں خود ہی چلی جاتی ہوں۔" اسے ایک دم سے خیال آیا تو اترنے لگی۔ یہاں سے گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولنا چاہا تو نظر اپنے ننگے پاؤں پر پڑی۔

"اتر آؤ لوگ بھی دیکھیں اور اچھوٹے کریں کہ یہ لڑکی شاید کوئی کرتیب کھانا چاہ رہی ہے۔ ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر۔" وہ اس کے تاثرات دیکھ رہا تھا، مزے سے بولا۔ "زینب کی کچھ میں نہ آیا کہ اب کیا ہے

"چلو آؤ شوڑے لو پھر میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں گا۔" وہ کہتے ہوئے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر گیا کیونکہ اب اسے یقین تھا کہ زینب اس کے پیچھے ضرور اترے گی اور واقعی اگلے منٹ وہ درکان کے اندر اس کے ساتھ جو آتا پند کر رہی تھی وہ یہ ہو جانے کے خوف سے جو پہلا جو اس کے پاؤں میں پورا آیا اس نے فوراً سر ہلا دیا۔

"یہی عجیب ہے۔"

"اوکے" وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ کاؤنٹر پر ادائیگی کر کے وہ اس کی طرف مڑا۔

"تم بہن یو بیہ جوتے۔ یوں ننگے پاؤں نکلوانی تو اتنی بڑی شاپ کی بھی افسلٹ ہوگی۔" زینب جو شمار پاتھ میں تھا کھڑی تھی۔ جلدی سے ڈبیا ہر نکال کر جوتے پہننے لگی۔

"یہ تو بہت مہنگا جوتا ہے۔ میں آپ کے پیسے کیسے واپس کروں گی۔" وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔

"نہیں میں کروں گا۔" وہ اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے بولا۔

"نہیں میں۔ کیا مطلب؟" وہ گاڑی میں آئی تھی۔

"تھوڑے تھوڑے کر کے دیتی رہنا۔ کبھی اوقیت چھٹتا ہو ہی جاسکتی۔" اس کی بات پر وہ سیدھی ہوئی۔

"پیسے دینے کے لیے پھر آپ سے ملنا پڑے گا؟"

"ظاہر ہے۔"

"مجھے نہیں لیتا یہ جوتا۔" اس نے قنات دونوں جوتے اتار دیے۔ سفیان نے ایک نظر اس کے سفید نازک پیروں پر ڈالی۔

"تمہارے پاؤں بہت خوبصورت ہیں۔ ان کی خوبصورتی کا خراج کچھ لو بی۔" سفیان نے بولی۔ اس نے اسے دیکھا۔ انداز میں کہا کہ زینب نے جلدی سے جوتے پہن کر پاؤں میٹ کے نیچے کر لیے۔

"آپ۔" اس سے کچھ کہا نہ کیا تو سر موڑ کر گاڑی سے باہر دیکھنے لگی۔

"ہم دونوں اچھے دوست بھی تو ہیں۔ دوستی کا پہلا تحفہ کچھ لو۔" سفیان بولا۔ زینب نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"مرد اور عورت میں دوستی؟" پتلی پارا اتنی عجیب بات اس نے سنی تھی۔

"تم نے اپنا نام نہیں بتایا؟"

"یہاں کر کے میرا نام جان کر۔"

"اوصاف نہیں لیا تو توں کی قسط۔ نام بتاؤ گا تو پیسے ملیں گے نا؟" وہ مسکرا کر بولا۔

"کچھ کہا میں؟" ایک ریٹورنٹ کے آگے اس نے گاڑی روک دی اور پیٹی بے تکلفی سے پوچھا۔

"نہیں پلیز تمہارے لیے مجھے گھر چھوڑیں۔" اس نے بے ساختہ دونوں ہاتھ سفیان کے آگے جوڑ دیے۔

"لوکے۔ میں ابھی آیا۔" کہیے کہ وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے بندھے ہاتھ بکسر نظر انداز کر کے۔ گاڑی ایک ریٹورنٹ کے آگے کھڑی تھی۔

"آج تو میری موت یقینی ہے۔" زینب نے دل میں سوچا۔

"تو بھی۔ بڑے مزے کے چکن سینڈویچ ہوتے ہیں ان کے اور ساتھ میں ٹھنڈی ٹھنڈی ٹھنڈی۔" چند منٹوں میں ہی وہ سینڈویچ اور پیٹی کے دو ٹرن لے کر گاڑی میں آکر بولا۔

"مجھے نہیں کھانا کچھ بھی۔ پلیز مجھے گھر چھوڑیں مجھے۔ استوری ہو چکی ہے۔ میرے باہا صاحب تو مجھے جان سے مار دیں گے۔" وہ اب باقاعدہ رو پڑی تھی۔

"ارے ارے آپ تو کچھ رو پڑیں۔" وہ کھیرا کر بولا۔ "بھئی میں دل کا بڑا کمزور ہوں کسی کے آنسو نہیں دیکھ سکتا اور پوچھنے کا تو بالکل بھی بجز۔ نہیں ایں تو آج یہ تجربہ بھی کر دیکھوں؟" اس نے زینب کے آنسو پونچھنے کے لیے ہاتھ اس کے چہرے کی طرف بڑھایا۔ زینب بدک کر پیچھے ہٹی تو وہ پیش پڑا اور ٹھوٹا اس سے ٹٹو کھینچ کر اسے پکڑا دیا۔ زینب آنکھیں اوپر جو صاف کرتے لگی۔

"پلیز چلیں اب۔" وہ لہجے میں بولی۔

"چلے ہیں پہلے آپ کچھ کھاؤ لیں۔" وہ اسی ہوشیاری سے بولا۔

"مجھ سے نہیں کھایا جائے گا۔ آپ یوں نہیں سمجھتے۔" وہ غصے سے بولی۔

"تو کچھ کھاؤ۔" میں بھی گاڑی اشارت نہیں کروں گا۔" وہ ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔

"نہیں رکھتی ہوں۔" کھر جا کر کھاؤں گی۔ اب تو چلیں۔" اس نے سینڈویچ والا لفافہ اٹھا لیا۔

"اور کولڈر تک۔" اس نے لفافے میں اس کی طرف بڑھایا۔ زینب نے ایک گرا سا اس لے کر شکر پکڑ لیا۔

"اب تو چلیں۔" سفینی اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ زینب جھنجھلا کر بولی۔

"یہ ہاتھ میں پکڑی ہے۔ پو تو سہی اسے۔" وہ گاڑی اشارت کرتے ہوئے بولا۔

"اسی ہمارے ہم بھی اپنی آنکھوں کو سکھانے بخش لیں گے۔ ذرا جو حجاب کے بیہ باول نہیں۔ چاند کا نظارہ ہم بھی کر لیں۔" وہ سفینی سے بولا۔

"خود بخود کھانے کو دیا ہو۔ زینب اور سفینی نے گاڑی اشارت کر دی۔

"رستہ بھر دوں گا۔" اس نے بولی۔

"میں کل توں پھر لے گا۔" وہ سفینی سے بولا۔

"نہیں۔ نہیں یا نقل نہیں۔"

"میں گاڑی آپ کے گھر کے سامنے لے جاؤں؟"

"نہیں نہیں۔ صواکس کے مجھے۔" وہ بے ساختہ بولی۔

"پھر اپنا نام بتاؤ۔" سفیان نے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"زینب۔" زینب نے سفیان کے سامنے جلدی سے بولی۔

"میں نے تمہارا نام ہے تمہاری طرف سے۔" وہ کہتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"زینب تمہارے گھر فون لگا ہے؟"

"نہیں۔ بس نہیں روک دیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ ان کی لگی چند قدموں پر تھی۔

"پھر رابطہ کس طرح ہو گا؟" وہ گاڑی روک کر بولا۔

"مجھے نہیں ضرورت رہا لے گی۔" وہ جھلا کر گاڑی کا دروازہ کھولنے لگی۔

"مگر مجھے تو ہے اگر تم کل بارہ بجے کالج میٹ کے آگے نہ ملیں مجھے تو میں تمہارے گھر آ جاؤں گا اور آج کے سڑک کی داستان بانیہ کسی ترمیم کے آپ کے والد محترم کے گوش گزار ہوں گا اور تمہارا ہاتھ مانگ لوں گا۔"

"آپ۔ آپ پاگل تو نہیں؟" وہ شدید رو رہی۔ سفیان کی ہوشیاری بتاتی تھی وہ یہ بھی کر کر رہے گا۔

"پتا کل تھا تو نہیں۔ تمہارے حسن تمہاری محبت نے کر دیا ہے تو پھر ملوں گا؟"

"نہیں۔" وہ سفینی سے بولی۔

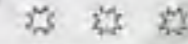
"تو پھر میں کل تمہارے والد سے مل لوں گا۔ جوتے خریدنے کی رسید وغیرہ سب ہے میرے پاس اور بھی بہت

”ہمت کچھ کیا؟“ وہ چونکی۔

”ہم دونوں کی یہ ٹیپ شدہ گفتگو۔“ اس نے گاڑی کے ڈیک کی طرف اشارہ کیا۔ زینب نے بے ساختہ ادھر دیکھا۔ کیسٹ چل رہی تھی اسے لگا آج اس کی زندگی کا منحوس ترین دن ہے۔

”یہ بی بیٹیک میٹنگ ہے۔“

”یہ محبت ہے تو پھر کل ملو گی نا؟“ وہ پھر بولا تو زینب نے ہنس سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ اب اس جال میں پھنسے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ جال بھی وہ ہمت پر کشش اور پیش قیمت ہے۔ اس کا دل خود متمنی تھا، اس جال میں جکڑے جانے کا۔ وہ گاڑی سے اتر آئی۔



”نہین تارا! تمہارے شاہ جی۔“ عبدالمبین کی نئی گاڑی کی ڈرائیو سے محفوظ ہوتی نہیں تارا سے عبدالمبین نے اچانک کہا تھا۔ نہین تارا نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ آنکھوں سے سڑک کے دوسری جانب اشارہ کر رہا تھا۔ نہین تارا نے گردن کھمانی۔ شہر کا مزگا ترین میٹرنی ہسپتال تھا جس کے مین گیٹ کی پیڑھیاں کھڑے کراؤ پر جانے والا وہ شخص یقیناً سلطان بخت تھا۔ نہین تارا نے آنکھیں سکود کر سلطان بخت کو اندر جا کر کھانا بونٹے دیکھا۔

”ایک منٹ موبل پار! گاڑی ادھر روکو ذرا۔ میں ابھی آئی شاہ جی سے ملاقات کر کے۔ میں بھی کہوں۔ اتنے دنوں سے ریلوے میں کیوں نہیں آ رہے۔“ وہ کہتے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیر کر پیچھے اترنے لگی۔

”مبارکباد کے لیے کوئی پھول شول تولے جاؤ۔ آخر کو تم بھی ملائی ہو۔ دو دو خوبصورت لڑکیوں کی سوتیلی سہیلی“ شاہ جی کی منظور نظر بیوی کی حیثیت سے۔ عبدالمبین نے حنا کر کہا۔

”اوہ ایس۔ مجھے کچھ لے کر جانا چاہیے۔ تھینک یوری ما سٹڈ کریوٹے کا۔“ وہ کہتے ہوئے اپنا شولڈر بیگ جھلاتی باہر نکل گئی۔ عبدالمبین کا دل پھلا کر کسی پر گانے کی دھن بجانے لگا۔ نہین تارا نے ہسپتال کی برابر میں بنی فلاور شاپ لگی کے پھولوں کا ایک خوبصورت لیے خرید اور ہسپتال کے اندر آئی۔ ریسپشن سے صالہ کا روم نمبر پوچھا اور پھول سنبھالتی اپنے گھراپے کو نافذ اندہ نظروں سے جا چکی وہ روم نمبر فائیو کے سامنے کھڑی تھی چند لمحوں کے لیے کچھ سوچا اور پھر محکومت ہوئے دروازے پر ہونے سے دستک دی۔

”ایس! سلطان بخت کی بھاری آواز سنائی دی۔“

”ہیلو شاہ جی!“ اس نے اندر داخل ہوتے ہی کھٹک دار آواز میں سامنے صوفے پر بیٹھے سلطان بخت سے مسکرا کر کہا۔ ایک لمبے کو سلطان بخت کے چہرے کا رنگ ہی اڑ گیا۔

”ہائے یوری ماؤی۔“ اس نے دوسرا سلام صالہ کے بیڈ کے بالکل پاس بیٹھی سیدہ کو بھاڑا تھا جن کے ماتھے پر بے شمار بل اسے دیکھ کر ہی آچکے تھے۔ انہوں نے سر سے پاؤں تک نہین تارا کا جائزہ لے ڈالا۔ ایک ٹراؤڈر پر اس نے جینز کا بلوکرٹ پہن رکھا تھا۔ کندھے پر لٹکا بیگ۔ شام کے پلکے پھلکے میک اپ میں بلاشبہ ہمت پر کشش نظر آ رہی تھی۔

”کون ہو تم؟“ سیدہ نے بغیر کسی گلی لٹی کے کڑے لہجے میں پوچھا۔ صالہ تکیوں کے سہارے آنکھیں موندے نیم پورا نہ تھی۔ نہین تارا کی آمد کے ساتھ ہی اس نے بھی آنکھیں کھول دی تھیں اور اب حیرانی سے اس لڑکا مارن انجی لڑکی کو دیکھ رہی تھی جس نے بڑی بے تکلفی سے آتے ہی سلطان بخت کو مخاطب کیا تھا۔

”شاہ جی! لگاتے، آپ نے میرا تعارف نہیں کر دیا تھا۔“ اس نے شکوہ کنال نظروں سے ہونٹ کاٹتے سلطان بخت کو دیکھا۔ وہ کہہ کر آگے بڑھی اور پھولوں کا بے صالہ کے تکیوں پر ٹکا دیا۔

”بیٹیاں مبارک ہوں صالہ سلطان بخت!“ مبارکباد دیتے ہوئے اس نے صالہ کے خوب پھیلے ہوئے وجود اور

چہرے کا جائزہ لے ڈالا۔ اس کی آنکھوں میں تمسخر آچکا تھا۔

”تم نے بتایا نہیں تم ہو کون؟“ سیدہ جلدی سے بولیں۔

”میرا بھی آپ سے کچھ ایسا ہی رشتہ بنتا ہے۔“ اس نے کن آنکھوں سے صالہ کو دیکھا اور خواہ مخواہ ہنسی۔

”ویسے میں شاہ جی کی بڑی پرانی دوست ہوں۔ پرانی سے مراد عمر سیدہ۔ کچھ لہجے لہجے گات۔ ہمت قریبی اور ہمت خاص، کیوں شاہ جی؟“ سلطان بخت کے ضبط کی حد تمام ہو گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”دوست ہو سلطان بخت کی۔ عام یا خاص، ہمیں اس سے کچھ غرض نہیں۔ تمہیں یہاں آنے کی اجازت کس نے دی؟“ سیدہ غصے میں آچکی تھیں۔

”دوستوں سے ملنے کے لیے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان سے تو جب دل چاہا مل لیا۔“ وہ لاہ پروا انداز میں کچھ اٹھا کر بولی سیدہ کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔

”کچھ لڑکی! تم جو کوئی بھی ہو۔ ہمیں اس سے غرض نہیں۔ تم جیسی حسین بلائیں پونہی راہ چلتے دولت مند مردوں کے کندھوں پر سوار ہوتی پھرتی ہیں اور کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں ہو تا اور ہو بھی جیسے وہ تو خود کا معلوم کس بیچ کا پھل پھول ہوتی ہیں۔ کدھر آگتی ہیں، کدھر گرتی ہیں۔ تمہیں سلطان بخت نے ذرا مت لگایا۔ تم دوست بن بیٹھیں۔ سلطان بخت! وہ گرتے گرتے سلطان بخت سے بولیں۔“ اسے اس ”دوستانے“ کی سوغات کو اٹھا کر ہسپتال سے باہر پھینک دو تو تمہارے اور اس کے حق میں زیادہ ہمت ہو گا۔ حسین شاہ آنے والے ہیں پھر مجھ سے کچھ مت کرنا۔“ سیدہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اٹھا کر نہین تارا کو کمرے سے باہر پھینک دیں۔ سلطان بخت کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

”چلو ادھر سے۔“ وہ نہین تارا کے قریب آ کر دھتے مگر غصیلے لہجے میں بولے۔

”جلدی ہوں مجھ سے اس آتا ہے مجھے آپ جیسے لوگوں پر۔ ڈرے ہوئے خوف زدہ، کھل کر اپنے خوف کا اظہار بھی نہیں کر سکتے۔ تب حسین شاہ سے ڈرتی ہیں اور میں انہیں بھی بتا سکتی ہوں کہ میں کون ہوں۔“ وہ تدر لہجے میں سیدہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”رہ جوتی ہو تم یہاں سے کہ نہیں؟“ سیدہ چلائے ہوئے اٹھیں۔

”سلطان بخت نے نہین تارا کو باہر کی طرف کھینٹا۔“

”یہ اپنا منحوس تحفہ بھی لے جاؤ۔“

سیدہ نے پھولوں کا بگے اس کی طرف اچھالا جو نہین تارا کی کمر سے نکل کر نیچے گر گیا۔ نہین تارا نے پلٹ کر ایک نفرت بھری نظر سیدہ پر ڈالی وہ سرے پل وہ خود کو نارمل کر چکی تھی۔ دروازے کے دوسری طرف بے بی کات پڑے تھے اور خوبصورت مسخو سفید صحت مند بچیاں گلالی اور پیلے فراگوں میں بیٹھی نیند سو رہی تھیں۔

”بیوی فل!“ نہین تارا رہ نہ سکی تو انہیں دیکھ کر ستائش بھرے لہجے میں بولی۔

”نہین تارا! چلو ادھر سے۔“ سلطان بخت نے دروازہ کھول کر اسے باہر دھکیلا۔

”شاہ جی! آپ بڑے قسمت کے دشمنی ہیں۔“ وہ باہر نکلتے ہی بولی۔ سلطان بخت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اصل میں تو وہ نہین تارا کی ٹھیک ٹھاک کلاس لینا چاہ رہے تھے۔ مگر اس کے لیے انہیں تہائی کی ضرورت تھی اور ہسپتال میں اس وقت دزبیز کا کارڈ لگا تھا۔

”آپ جیسے لوگ اس دنیا میں بھی مزے میں ہیں اور آخرت میں بھی جنت کے حق دار۔“ وہ چلتے ہوئے بول رہی تھی۔ سلطان بخت نے حتی سے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔

”آپ نے بھی سن رکھا ہے اللہ کا وعدہ جس نے تین بیٹیوں کی پرورش کی وہ جنت کا حق دار ہے۔ چلو جی آپ کو بیٹھے بیٹھے اس دنیا میں ہی اس جنت کا ٹکٹ بھی مل گیا۔“ اسے سیدہ کے ہاتھوں ہونے والی اپنی بے عزتی کا جیسے ذرا بھی ملال نہ تھا۔

”وہیے ایک اور بات بھی ہے۔“ اس کی زبان میں مسلسل کھلبلی ہو رہی تھی۔ سلطان بخت بس چلنے جا رہے تھے۔ نقل خاموش لب بکھینے بیرونی دروازے کی طرف۔

”چلتی خوبصورت آپ کی برٹیاں ہیں ہمارے گھرانوں میں ایسے انمول بیویوں کی پیدائش پر وہوں نہیں مینوں جشن مناتے ہیں۔ آپ تو خاصہ بد فاق۔“

”شٹ اپ!“ سلطان بخت کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ نزارخ کی آواز کے ساتھ ایک زوردار تھپڑ اس کے نازک گال پر ہمارا۔ تھپڑ کھا کر عین تارا تو جیسے پتھر کی ہو گئی۔ آتے جاتے لوگ بھی حیرت زدہ ہو کر وہوں کو دیکھنے لگے۔

”کیا ہو اجنب!“ پاس سے گزرتا ایک لڑکا فوراً ”رک کر بولا۔ عین تارا گال پر ہاتھ رکھے ڈیڈ پائی آنکھوں سے سلطان بخت کو دیکھ رہی تھی۔

”اب جس طرح ادھر آئی تھیں اسی طرح چلی جاؤ۔ تم زندہ سلامت جا رہی ہو جا کر اپنی زندگی بچ جانے پر جشن مناؤ ورنہ جو حرکت آج تم نے کی ہے ہاسپتال آنے کی۔ اس پر تمہارا میرے ہاتھوں سے سچ جانا ہی مجھ سے قسمت کی دھنسی ہو۔ میں نہیں تم جاؤ اب۔“ کہہ کر وہ رکنے نہیں۔ تیز تیز قدموں سے واپس پلٹ گئے۔ عین تارا کے قدم تو جیسے ہمیشہ کے لیے زمین میں پیوست ہو چکے تھے۔ اسٹن شہیدہ محل کی توقع اسے سلطان بخت سے نہیں تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس سے کیا مذاقت سرزد ہو چکی ہے۔ اور اسے معلوم تھا کہ اس مذاقت کی سزا صرف یہ پھینکی نہیں ہوگا۔ سلطان بخت کا غصہ کیسے ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے سوچنے لگی تھی۔

”زنہب! اٹھو کیا منہ سر لپیٹے پڑی ہو جب سے کلچ سے آئی ہو۔ کون سا رات ہے تمہارے صبر۔“ آمنت نے تقریباً اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا تھا۔

”کیا کیا مصیبت ہے۔ سوئے دو مجھے۔“ زنہب نے جھنجھلا کر اس کی طرف سے کروٹ بدلی۔ اس کے بال لکھنے ہوئے تھے اور آنکھیں رات سونے کے باوجود سو جی سو جی تھیں۔

”پہلے تو تم دن میں کبھی نہیں سوتی تھیں۔ آخر آج کیا آفت آئی ہے۔ پانچ گنہ اس کے پاس ہی بیٹنگ پر بیٹھ گئی۔

”اچھا! اگر پہلے میں کبھی دن میں سوتی نہیں تو کیا میں نے لکھ کر دے دیا ہے۔ کتنے دن کی بھر بھر کبھی دن میں نہ سوتی گی۔“ وہ جھلا کر اٹھ بیٹھی اور ہاتھوں سے اپنے بھروسے پال سمیٹنے لگی۔

”مترے کلچ سے آکر کھانا بھی نہیں کھایا ورنہ تو بھوک کی بھاری بھاری بیڑھیوں ہی سے کھانے دیتے لگتی تھی۔ آخر معاملہ کیا ہے؟“ آمنت نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا تو وہ گڑبڑا کر بال سمیٹتے ہوئے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔

پٹنگ کے نیچے ذرا جھک کر اپنی تپیل دیکھنے لگی۔

”زنہب! میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔“ آمنت نے مشکوک انداز میں اسے دیکھا۔

”بھئی! معاملہ کیا ہے۔“ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ”کلچ میں اسپورٹس ڈسٹریکٹ کی ریپرسل تھی۔ سارا دن وہی دیکھتے رہے۔ کینٹین تو ہمیں پتا ہے میں پہلے بھی کبھی نہیں گئی۔ پیسے ہی نہیں ہوتے۔ گھر آکر بھوک تو لگ رہی تھی مگر فینڈ تھا کان کی وجہ سے زیادہ آ رہی تھی۔ اسی لیے بغیر کچھ کھانے پیے سو گئی۔“ وہ وضاحت دیتے ہوئے بولی۔

”اور سچی بات کہو گی؟“ آمنت رکی۔ ”تم تو مجھے سوتی ہوئی بھی نہیں لگ رہی۔“ آمنت کی نظریں جیسے اس کے وجود کے آریا جا رہی تھیں۔

”اچھا تو میں کیا تھا جو جھوٹ جھوٹ موٹ لٹی تھی۔ اپنی بھوک کو دھوکا دے کر۔“ وہ تنگ کر بولی۔ ”اٹھو اور میرے لیے کچھ کھانے کواؤ۔“ وہ پھر سے سر جھکا کر اپنی تپیل تلاش کرنے لگی۔

”زنہب! یہ جو تار کس کا ہے؟“ آمنت کا وہ سراسر سوال بھی گڑبڑا دینے والا تھا حالانکہ زنہب نے بہت احتیاط سے دیباؤں کرنے میں آکر جو تار پٹنگ کے بالکل نیچے رکھا تھا۔ آمنت کی عقابانی نظریں نے پھر بھی اسے دیکھ لیا تھا۔

”کس کون سا جو تار؟“ وہ ہکا بکی

”جو تم کلچ سے پہن کر آئیں۔ پٹنگ کے نیچے بڑا ہے۔“ وہ سکون سے بولی۔

”تو سو۔“ زنہب نے ایک بل کو سوچا۔ ”شازیدہ کا ہے۔“

”کون شازیدہ؟“ آمنت نے نیچے انداز میں پوچھا۔

”میری کا اس فیلو۔“

”تم اس کا جو تار کیوں پہن کر آئیں؟“

”میرا جو تار ٹوٹ گیا تھا اس کے گھر کے قریب تو اس نے مجھے اندر سے اپنا جو تار لاد لیا۔ آخر تم اس قدر اکتواؤری کیوں کر رہی ہو؟“ وہ قہقہے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تمہاری کا اس فیلو اس قدر امیر ہے کہ اس نے تمہیں اندر سے اپنا نیا گور جو تار لاد لیا جس پر سے قیمت کا اسٹیکر لگا دیا۔“ آمنت نے اٹھ کر تمہیں دے دیا وہ بھی بغیر پینے۔ آمنت نے جھک کر وہ تار پٹنگ کے نیچے سے نکالا اور زنہب کے آنکے کر دیا۔

”تو۔۔۔ اس میں کتنی کتا ہے؟“ اس نے مجھے ایک دن کے لیے دیا ہے۔ کوئی ساری عمر کے لیے تو نہیں۔“ زنہب پڑ کر بولی۔

”زنہب! جھوٹ مت بولو۔ کوئی اپنا تار قیمتی نیا جو تار کسی کو یونہی ایک دن کے لیے پینے کے لیے نہیں دیتا۔ معاملہ کیا ہے۔ مجھے سچ سچ بتاؤ۔“

”تمہارا تو دلغ خراب ہو چکا ہے۔ کوئی معاملہ نہیں ہے۔ چار بچوں کو پڑھانے سے تم خود کو بہت افلاطون سمجھنے لگی ہو۔ ساری دنیا تمہیں چلو گے وہی ہے اونٹ!“

”وہ پتا چلتے ہی بد آمنت اس کے اندر اس کے بدلے سے نظر آ رہے تھے۔

”زنہب! ادھر آکر بیٹھو میرے پاس۔“ آمنت نے ٹھنڈے لہجے میں اسے پکارا۔

”میں نہیں آ رہی۔ کھانا کھانے جا رہی ہوں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ رکی بغیر بولی۔

”میرے پاس تمہارے لیے ایک اونٹ لگا ہے۔ میں وہی تو تمہیں سنانے آئی تھی مگر تمہارے انداز نے مجھے الجھا دیا۔“

”کیسے انداز۔“ زنہب نے جھنجھلا کر رکی۔

”پھر بتاؤں گی۔“ وہ پہلے ادھر آؤ۔“ وہ صاف ٹال گئی۔

”اسی معاملہ ہے آمنت کی گرفت میں میری کوئی غلطی۔ کوئی کنواری آپٹلی ہے۔“ وہ دل میں سوچتے ہوئے اس کی طرف بڑھی۔

”یہ میں اپنی کوئیگ سے لائی ہوں۔ وہ آج اسکول میں اپنی فرینڈز کو دکھانے لائی تھی۔ اسٹاف روم میں دونوں دیکھ رہی تھیں۔ میری نظر پڑی تو مجھے شک سا ہوا۔ میں نے گورنر کو دکھا تو عبدالمبین تھا۔“ آمنہ نے تفصیل بتائی۔

”تو تب میں نے اپنی منزل پائی۔ مولیٰ! زینب دے دے جوش سے بولی وہ پھر سے کوراٹھا کر تصویر دیکھ رہی تھی۔“ آمنہ! عین اتنا خوبصورت ہے پینڈنٹ نم ڈھنڈھنگا لکھو تو۔“ اس نے تصویر آمنہ کے سامنے کی۔

”ہاں ہے تو۔“
”بھائی کتنا اچھا لگ رہا ہے اور اب تو مشہور بھی ہو گیا ہے۔ لڑکیاں مرتی ہوں گی اس پر۔ پیسہ بھی خوب آگیا ہوگا۔ ادھر تو اس نے کتنے بیٹوں سے پکڑ نہیں لگایا۔“ وہ ایک تک تصویر کو نگے جارہی تھی۔
”ہاں فرحت وغیرہ بتا رہی تھیں۔ آج کل یہ کیسٹ بازار میں ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہے بلکہ ادھر تو شارٹ ہے اس کے بھائی نے لاہور سے اسے لا کر دی ہے۔ ہر طرف مبین کے کانوں کی دھوم مچ رہی ہے۔ راتوں رات وہ ایک جگہ کا ناٹا اشار بن چکا ہے اس نے کور مجھے بڑی مشکل سے دیا تھا۔“ آمنہ کچھ افسردہ سی گئی۔
”تم نے بتایا یہ ہمارا بھائی ہے۔“ زینب عجیب سرخوشی کے عالم میں گئی۔

”پاگل ہو تم! بتا دینا تھا۔ تمہاری ٹور بن جاتی ایک دم سے تم نے وی اتنی پی بن جانا تھا۔ میں اماں جی کو دکھا کر آؤں۔“ وہ کور لے کر بیٹنے لگی۔
”حق مست ہو! نہیں دکھ ہوگا۔“ آمنہ نے اس کا بازو کھینچا۔

”میں۔ مشہور ہو جانے کا دکھ۔ ان کا بیٹا پا لہر ہو گیا راتوں رات شہرت کی بلند یوں پر جا پونچا ہے۔ یہ تو خوشی کی بات ہے دکھ اس میں کہاں سے آگیا؟“

”زینب! جوش کرو وہ بھانڈ میرا بی بی گیا۔ یہ اماں جی کے لیے خوشی کی بات ہوگی بکریا ہاری سلسلوں میں کسی نے یہ ڈگڑگی بجانے کا نہ ناپنے کا کام کیا ہے جو یہ عبدالمبین۔ عبدالمبین نے خاندان کی عزت کو بٹا لگا دیا۔ اماں جی تو صدمے سے بستر سے اٹھ نہیں سکیں گی۔ پہلے ہی وہ بہت پریشان ہیں۔“

”آمنہ! یہ تم کس زمانے کی بات کر رہی ہو۔ عزت کو بٹا لگا دیا۔ کون کی عزت یہ۔ یہ ہے عزت۔“ اس نے ہاتھ پھیلا کر دیواروں اور لکڑی کے شہتیروں والے ڈربے نما کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ۔ یہ عزت۔“ اس نے سینٹ کے اکھڑے فرش سال خورہ کوٹے پھولے فرنیچر کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کو بھلا کیا بٹا لگ سکتا ہے میری بہن! وہ مستحزبانہ انداز میں ہنسی۔
”اس عزت کو تو کوئی کوڑیوں کے مول بھی نہ خریدے کہا بیے بھی اس عزت کو دیکھ کر منہ پھیر کر پیل دیں۔ تم کس دنیا میں رہ رہی ہو۔“

”عزت اینٹ گارے لکڑی تانبے یا کانڈ کے رنگ برنگے ٹوٹوں میں نہیں ہوتی۔ عزت تو سلسلوں کی کمانی ہوتی ہے جسے یہ گانے بجانے والے ٹوٹوں کی پوریاں دے کر بھی خرید سکتے۔ خرید سکتے ہوتے تو شرفاء کی آبادیوں سے دور الگ تھلگ بڑے بڑے محلوں کو ٹھیوں میں نہ رہ رہے ہوتے۔“ آمنہ جو اپنا بولی۔

”اوہ نہ! پاگل ہو تم۔“ زینب بے تاثر لہجے میں بولی۔ ”میں جو یہ کہتا ہے جا رہی ہوں تم اس عزت کو سوچ کر خوش ہوتی رہو۔“ وہ کور لے کر جانے لگی۔
”زینب! جب بابا صاحب کو پتا چلے گا تو؟“ آمنہ اٹھ کر اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔ اس کے سوال پر زینب بھی چپ سی ہو گئی۔ دو سرے لہجے کدھے آچکا کر باہر نکل گئی۔

اور اسی شام صوفی صاحب بیٹن پڑھا کر نکلے تو انہیں یاد آیا۔ آمنہ نے اتے ہوئے کہا تھا کہ ”چاول نہیں ہیں“ اتے ہوئے لیتے آئیں۔“ وہ چاول لینے کے لیے رستے میں رکے تھے۔ کربانے والے کی دکان کے ساتھ ہی اسے چراتے ہوئے بولا۔

میوزک سینٹر تھا اور ڈیک پر لگے تیز بے ہنگم میوزک کا شور سارے بازار میں گونج رہا تھا۔ پاس کی دکانوں پر کھڑے گاؤں کو دو دو تین تین پار اپنی ڈیمانڈ زور پرائی تھیں۔ صوفی صاحب نے بھی میوزک میں مست دکاندار کو دوبارہ گئی تو ان میں آدھا کلو چاولوں کا کہا تھا تب اس نے سنا تھا۔

”لا حول ولا قوت۔ آوے کا تو ابی بگڑا ہوا ہے اس شیطان نے خنے نے ساری خدائی کو جیسے بگڑ لیا ہے۔ کسی کو بھی اس شور قیامت سے وحشت نہیں ہوتی۔“ وہ منہ میں بڑبڑائے اور گردن گھما کر میوزک سینٹر کی دکان کو گھورنے لگے جو یہ صور اسرافیل پھونک رہی تھی۔

دکان کی راہداری کو گھورتے گھورتے ان کی نظریں دکان کے شیشے کے دروازے میں لگے بڑے سے پوسٹر پر چارکیں۔

”مت بھگدو! مت۔“ بہت بڑا بڑا لکھا تھا اور اس سے بڑی۔ بہت بڑی نیچے تصویر لگی تھی۔ ان کی نظریں اس تصویر تک پہنچیں تو جیسے پتھرا سی گئیں۔
”عبدالمبین! ان کے لب پھر پھڑپھڑائے۔ آنکھیں جیسے پاہر ایلنے کو تھیں۔

”یہ عبدالمبین۔“ خود کو تعین دلانے والے انداز میں بڑبڑائے۔
”سینے سے ہوتی ہوئی بائیں بائیں ہاتھ کی انگلیوں تک درو کی ایک تیز لہرا تھی۔

”یہ لیس صوفی صاحب چاول! دکان دار نے شمار ان کے آگے کیا۔ انہوں نے اجنبی نظریوں سے دکان دار کو دیکھا۔ ان کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔ پیشانی پر پینچے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔
”خیر تو ہے صوفی صاحب! کیا ہوا؟“ دکان دار نے ان کے چہرے کو دیکھ کر تشویش سے پوچھا۔

”یہ۔ یہ۔“ انہوں نے بمشکل انگلی سے اس پوسٹر کی طرف اشارہ کیا۔
”یہ پوسٹر! یہ بولا۔ انہوں نے اسات میں سر ہلا دیا۔

”یہ مولیٰ ہے جی! بڑا سگر ہے اللہ نے بڑا دکھ دیا ہے اسے کیا آواز ہے۔ جاوہ ہے جاوہ۔ راتوں رات شہرت کی ساری سیڑھیاں پھلانگ گیا ہے۔ ہاتھوں ہاتھ اس کی کیسٹ بک رہی ہے۔ بڑا قسمت کا دھنی ہے۔ اسی کا گانا تو گنا ہوا ہے ڈیک میں۔ اچھا میوزک ہے نا۔ آپ نے لینی ہے کیسٹ تو لا دوں گی!“ آخر میں وہ جیسے ان سے مذاق کرتے ہوئے بولا۔ شور کی وجہ سے وہ چیخ مچی کر ڈول رہا تھا۔ ان کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔

”مم۔ میں یہاں بیٹھ چلاؤں۔“ کہہ کر وہ اس کا جواب سے بغیر یا ہر پڑے اسٹول پر بیٹھ گئے۔ ان کا سر جھکا رہا تھا مگر سینے کا درد اور وہ کی اس نہیں بے حال کر رہی تھیں۔
”یہ۔ یہ۔“ انہوں نے سہمی جان لے کر ہی گئیں گے۔ وہ سینے کو دباتے ہوئے خود سے بولے۔ میوزک کا شور ان کے سر پر پھر کونٹے والے انجن کی طرح نوگڑ نوگڑ کر رہا تھا۔

”کتو ار باپ۔“ آج کی نئی شاہکار فلم جسے ایک بار دیکھیں اور پھر بار بار دیکھنے آئیں۔“ وہ اس کی شکل دیکھتے ہی با آواز بلند بولی تھی۔
”شٹ اب مشی! معاذ نے کچھ غصے سے کہا۔

”غلط تو نہیں کہہ رہی۔ یہ بالشت بھر کا بچہ تمہیں بابا بابا کہتا ہے اور تم کسی شفیق باپ کی طرح اس پر نرمال ہوئے جا رہے ہو۔ دیکھنے والوں کو تو یہی یقین ہو جائے گا کہ باپ سے کس درجہ الفت ہے بچے کو اور ہم جیسے دل میں کتو ار باپ جیسی شاہکار فلم بنانے کا منصوبہ سوچتے رہیں گے اور یہ ہمارا خون جلاتے رہیں گے۔“

وہ دل جلے انداز میں بولی۔ معاذ ار تعنی کا ہاتھ پکڑ کر کبلی گرائی کی کالی میں اہلکار شمس کی مشق کر رہا تھا۔
”سوچتی رہو سوچتے رہتے میں کیا حرج ہے۔ اکثر رشک و کیٹوں پر لکھا ہوا ہے نا جتنے والے کامنہ کالا۔“ وہ اسے چراتے ہوئے بولا۔

”ناؤ پوسٹ ایپ۔“ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

”ار تفضی جانو! آپ دادو کے پاس جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔“ ار تفضی حیران چہرے لیے معاذ اور مٹی کے مکالے سن رہا تھا۔ معاذ کے کنبے پر سر ہلا کر اٹھ کھڑا ہوا اور باہر نکل گیا۔

”اس کو کمرے سے باہر مت بھیجو۔ کچھ دیر کے لیے جب میں تمہارے پاس آتی ہوں تو اسے اپنے دل اور دماغ سے باہر بیچ دیا کرو۔“ وہ تپتے ہوئے چہرے کے ساتھ بولی۔

”دل اور دماغ سے میں ار تفضی کو نکال دوں؟ ایسا کیسے؟“ وہ سنیل انگلیوں میں تھمتاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں بہتر ہے۔ جب میں اور ار تفضی بیٹھے ہوں تم ادھر آنے سے گریز کیا کرو۔“

”اور اگر میں یہ وعدہ کروں تو میرا خیال ہے تم وراثت روم بھی اس ننھی بلا کو اپنے ساتھ لے کر جاؤ۔“ وہ وراثت کچکا کر بولی۔

”یو آر رائٹ۔“ وہ مسکرایا۔

”معاذ! وہ پیالی۔“

”کیوں ایسا خون جلا رہتی ہو۔ یہ معصوم تمہیں کیا کرتا ہے؟“

”وہ مجھے کچھ نہیں کہتا اور کہہ بھی نہیں سکتا مگر تم تو وہ کہو جس کے لیے میں دن رات تمہارے پیچھے خوار ہو رہی ہوں۔“ وہ ہلکا جھک بولی۔

”خوار بھی تم اپنی مرضی سے ہو رہی ہو میرے کنبے سے نہیں۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔ ”اور میں تمہیں بتاؤں۔ اس خوار کی میں تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آنے والا سوائے بالوسی اور فرسٹیشن کے۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔

”تم جتنا پی چاہے مجھے ہاؤس کرو مگر میں پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ سہاری بہت اب میری رگوں میں خون بہن کر رہی ہے۔“

”قلامیں کم دکھا کرو جیٹلی ایڈی اور ایک کیوڑی! مجھے ذرا ام جان سے کام ہے راستہ دیں گی آپ! وہ دروازے میں اس طرح کھڑی تھی کہ اسے ہٹانے بغیر معاذ باہر نہیں جا سکتا تھا۔

”ام جان کے پاس میں بلکہ ہوں کہو اس شیطان کے بغیر چند لمحوں میں تمہارا دم الجھنے لگا ہے۔“ وہ مل کر بولی۔

”تم اس سے اس قدر جھلس کیوں ہوتی ہو؟“

”اس کے ماں باپ نے اس کی پروا کی جو تم اس کے لیے مرے جا رہے ہو۔“

”اس کے ماں باپ نے میری تو پروا کی تھی نا۔ ان کی اسی پروا اسی محبت کا تو قرض ہے جس سے میرے کنبے سے نکلے ہوئے ہیں اور مجھے ان کے جگر گوشے کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔“ وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔

”تم اس سچے کی آڑ لے کر اب تک مجھ سے گریزاں رہو گے۔“

”تائیم۔“ وہ ہلکا آہستہ بولا۔

”اور اگر یہی نہ رہے تو۔“ وہ سگ دلی سے بولی۔

”مٹی! معاذ کا چہرہ ایک دم سے سرخ ہو گیا۔ ”صوبچ سمجھ کر کیوں کیا کرو۔ یہ پتہ میری جان ہے۔“ سہارا بھائی اور نزہت آبی کی حیرت سے اس امانت اور میں اس امانت کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کروں گا۔“ انہیں تمہ سے بولا۔

”بہت سرچہ کر رہا ہے اس بالشتیے کی محبت کا بھوت! اتار دوں گی دیکھنا تم۔“ وہ دھمکی دیتے ہوئے واپس مڑ گئی۔

”پاکل! احمق پتا نہیں میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے۔“ وہ اس کے جاتے ہی بڑبڑایا۔

اسے تو آج بھی وہ راتیں یاد تھیں جب ار تفضی ابھی سال بھر کا بھی نہیں ہوا تھا بلکہ ایک دو ماہ بعد ہونے والا

تھا تو رات کو بہت رویا کرنا تھا۔ اکثر اس کی آنکھ ار تفضی کے رونے سے کھل جایا کرتی تھی۔ وہ بے چین ہو کر نزہت کے کمرے کے دروازے تک تو جانا مگر اندر جانے کی خود میں ہمت نہ پاتا تھا۔

”نزہت! ار تفضی رات کو اس قدر کیوں روتا ہے؟“ ام جان نے کئی دفعہ نزہت سے دریافت کیا۔ وہ اکثر گول مول جواب دیتی یا ٹال دیتی۔ اس دن ناشتے کے دوران بھی ام جان نے یہی پوچھا تھا۔

”میں اس کا دودھ چھڑا رہی ہوں۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”اس! مسز خان کے ہاتھ سے سلاکس پلیٹ میں جا کر۔“ وہ کیوں ابھی تو وہ سال کا بھی نہیں ہوا۔

”آپ کو آسانی ہوگی۔“ وہ اسی انداز میں بولی۔

”کیوں تم کہیں جا رہی ہو خدا نخواستہ اسے چھوڑ کر جو ہماری آسانی کا سوچ رہی ہو؟“ اوٹ پٹانگ باتیں۔ وہ آخر میں منہ میں بڑبڑا میں۔

”جائیں رہ سکتا ہے۔“ نزہت کا چہرہ تھوڑے سا اثر تھا۔

معاذ بہت کھلی نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

”کیسی باتیں کر رہی ہے تمہارا؟“ مسز خان نے لہجے میں کہا۔

”آپ فکر نہ کریں آپ کو پریشانی نہیں ہوگی بلکہ شاید آپ کی ساری پریشانیوں ہی تمام ہونے کو ہیں۔“ اس کا لہجہ میسم سا تھا اور انداز پر اسرار۔

”نزہت! اس مطلب کیا ہے تمہارا؟ میں قطعا نہیں سمجھی۔“ مسز خان پریشان ہو کر بولیں۔

”سمجھ جائیں گی آپ ناشتہ تو کریں۔“ اس نے فوراً بات پلٹی۔

”آہ! ایسے تو خیال سے ار تفضی کی سالگرہ کی تیاریاں شروع کر دینی چاہئیں۔ اگلے ماہ تو اس کی برتھ ڈے ہے۔“ معاذ نے موضوع بدلا تھا۔

”ہاں تو تم کرو۔“ وہ چائے کا کپ پو کی ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔

”کیوں آپ نہیں کریں گی؟“

”تمہارے ہوا اس کا۔ سب کچھ بہت پیچھے۔“ وہ اٹک اٹک کر بولی۔

”نزہت! یہ کیا کہا تم نے۔“ ار تفضی کے ماں باپ ہیں اور۔“ مسز خان نے فوراً اسے ٹوکا تھا۔

”اور وہ رات۔“

فون کی بجلی بجتی تھی نے اس کی سوچ کے ارتکاڑ کو توڑا تھا۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر کوریڈور میں رکھے فون کی بجلی بجتی تھی۔

ایرپورٹ جانا ہے۔ پہلے لیج کے لیے ہالی ڈسے ان لے کر جانا ہے پھر میٹنگ ہے پھر چیمبر کے پریزیڈنٹ کی طرف سے انوائٹمنٹ ہیں وہ لوگ۔ بہت دیر ہو جانے کی آج تو شاید گھر آتے آتے بھی۔ انہوں نے پیپر زپر نظریں دوڑاتے ہوئے تفصیل بتائی۔

”یعنی آج آپ کا بڑی ڈسے ہے؟“

”بالکل۔“ انہوں نے سر ہلایا۔

”اچھا میں نے تو سوچا تھا۔“ وہ چپ ہو گئیں۔

”کیا؟“ فخر حیات نے سر اٹھا کر پوچھا۔ ”کیا سوچا تھا؟“

”آج کا دن آپ کے ساتھ گزاروں کی سچ باہر کریں گے یا پھر ڈنر۔“

”تم نے پہلے پوچھا ہی نہیں ڈنر میں تمہیں بتا دیتا۔ چلو کل سہی۔ کل تو میں بالکل فارغ ہوں گا۔ آفس سے بھی جلدی آسکتا ہوں سچ کے لیے۔“

”نہیں کل تو ہماری بھی میٹنگ ہے۔ مجھے اپنے اسکول کی پروگریس رپورٹ پیش کرنی ہے۔ ہمارے ٹیک میں اسکول کا بھی وزٹ کریں گی ہماری پریزیڈنٹ صاحبہ۔ کل تو مشکل ہے۔“

”تو تم آج چلو میرے ساتھ سارا دن ہمارے ساتھ رہو اچھا لگے گا تمہیں۔“ انہوں نے آفر کی۔

”اوہ نہیں آپ کی برنس ڈیپننگز نرمی سرور ہوتی ہیں۔ مجھے تو اس فریڈنڈ لائن آفر سے باز رہی رہیں۔“ رعنا نے مسکرا کر کہا۔

”ایرپورٹ لائیگ۔ یہ سینی تیاری میں ہی آدھا دن لگا دیتا ہے کام کیا کرنا ہو گا اور۔“

”آپ خود بھی چیک رکھا کریں نا۔ ہفتے میں ایک آدھ دن فیکٹری کا وارنٹ کیا کریں۔ ابھی وہ نا تجربہ کار ہے۔“

”بھئی! میں ایسا بندہ کدھر کدھر دیکھوں۔ تم چکر لگا لیا کرو۔“ وہ فائل کی ورن کر دالی کہہ رہے تھے۔

”میں تو لگا لیتی ہوں چکر مگر مجھے ان کاموں کا تجربہ نہیں۔“

”تجربہ بھی آتے آتے آتا ہے۔ ویسے اب سینی صحیح کام کر رہا ہے۔ میرا ٹکنٹیکٹ اس کے فیچر سے رہتا ہے۔ میں کہتا تھا نا تین چار سال ایروڈ لگا آنے کا تو سدھر جائے گا۔ تعلیم بھی مکمل ہوئی اس کی اور دھیان بھی بٹ گیا۔

دیکھا آکر دوبارہ نام لیا فرزین کا؟“ فخر حیات نے کہا۔

”ہاں یہ بات تو ہے۔ ویسے بھی آتے ہی فیکٹری میں جٹ گیا ہے۔ ہن اس کا ادھر ہی لگ گیا۔ بھابھی جان کی طرف ویسے بھی کم ہی گیا جب سے باہر سے آیا ہے۔ فقط دوبارہ ادھر گیا ہے بلکہ بھابھی جان کا لگتی ہیں کہ سینی سے کب آکر مل جائے۔“

”وہ خود جو آجاتی ہیں ہر دوسرے دن ملتے۔“

”ان کی تو پرانی عادت ہے ویسے ہمیں بھی اب سوچنا چاہیے۔“

”کس بار سے میں؟“ انہوں نے فائل بند کر دی۔

”سینی کی شادی کے بارے میں۔ اب تو وہ ہسپتال ہو گیا ہے۔“

”ہمیں ایک آدھ سال ٹھہراؤ۔ برنس میں قدم ہمالینے دوا سے۔ شادی کے جھیلے کے لیے تو عمر بڑی ہے۔“

”میں کون سا بھی کرنا چاہ رہی ہوں۔ لڑکی ڈھونڈنے میں پسند کرنے میں وقت لگتا ہے۔ منگنی کر دیں گے ایک آدھ سال میں شادی۔“ رعنا جوش سے بولی۔

”تم لڑکی پسند کرنے کے منصوبے بنا رہی ہو کیا پتا صاحبہ! جڑوے پہلے سے کسی کو پسند کر بیٹھے ہوں اور تمہیں زحمت ہی نہ کرنی پڑے۔ اس لیے لڑکی کی تلاش میں لگنے سے پہلے سینی سے ضرور پوچھ لیتا۔ آگیا ہے تیار ہو کر ہر میٹر ہے ابھی پوچھ لو۔“

سانسے سے بیڑھیان اتر کر آتے سینی کو انہوں نے دیکھ کر کہا۔ چاکلیٹ کھر کی شرٹ کے ساتھ بلیک ٹوپیں

میں دو بہت وچہر لگ رہا تھا۔ رعنا نے دل ہی دل میں بیٹی کی نظر اتاری۔ اس کے لاؤنج میں آتے ہی لاؤنج خوشبو سے مہک اٹھا تھا۔

”ماشاء اللہ۔ میرا بیٹا تو بہت پیارا لگ رہا ہے اپنی نظر اتار کے جانا۔ رستے میں کسی فقیر کو کچھ پیسے دے جانا۔“ رعنا نے پیار بھرے لہجے میں سینی سے کہا۔

”تھینکس ماما! آپ دونوں آج گھر پر ہیں۔“

”نہیں بھئی! میں تو جا رہا ہوں تیار ہونے تمہاری ماما البتہ آج گھر پر ہیں۔ چاہو تو انہیں گھر پر رہ کر کہتی دے سکتے ہو۔“ فخر حیات اٹھتے ہوئے بولے۔

”اوہ سو ری! میرا تو ابھی فیکٹری پہنچنا ضروری ہے۔ آل ریڈی آئی ایم گیٹنگ ایسٹ۔ اس نے عجلت میں گھڑی پر نگاہ ڈالی اور جانے لگا۔

”یہ کیا تم ہر وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے ہو دو گھڑی میرے پاس بیٹھ جایا کرو۔“ رعنا نے کہا۔

”سو ری ماما! پھر سہی مجھے دیر ہو رہی ہے۔ رستے بھی تو ٹھنڈ بھر کا ہے اوپر سے ٹریفک اللہ کی پناہ اللہ حافظ۔“ کہتے ہوئے دھما پھرتی نکلی۔

”اچھا بھئی بیگم! ہم بھی طے تیار ہونے۔“ فخر حیات رعنا کا جواب سے بغیر لاؤنج سے چلے گئے۔

”خدا ہے۔ میں ہی فارغ ہوں اور ہر۔“ رعنا جھنجھلائی۔ ”میرا خیال سے میوں ریکارڈ گھر میں پڑے رہنے سے بہتر ہے آج پار لڑ چلا جائے۔ فیشنل کروا لیں ہوں اور بالوں کا کٹر بھی پہنچ کر وائیٹی ہوں۔ بہت دنوں سے یہ معاملہ بھی ٹل رہا ہے۔“ خود سے کہتے ہوئے رعنا اندر کی طرف بڑھ گئیں۔

سینی گاڑی چلاتے ہوئے بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔

”اگر چھٹی ہو چکی ہو۔ بولو لاڑی! اس نے میرا انتظار کیا تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ اف۔ یہ ٹریفک سڑک پر گاڑیوں کی لمبی قطار تھی۔ پھر رنگ رنگ کر چل رہی تھی۔ سینی کا ہاتھ مسلسل ہارن پر تھا۔ اس کے پیچھے گاڑیوں والے اسے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے مگر اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔

خدا خدا کر کے ستر تمام ہوا۔ اس کی گاڑی کراچ کے مین گیٹ کے پاس پہنچی۔ آگ کا کڑکایاں باہر نکل رہی تھیں۔ چھٹی ہونے کافی دیر ہو چکی تھی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

”اس کا مطلب ہے وہ جا چکی ہے۔“ اس نے بائوس سے گاڑی موڑی اور آہستہ آہستہ گاڑی چلاتے ہوئے پچھلی سڑک کی طرف نکل آیا۔ سامنے ہی زینب ست روٹی سے جا رہی تھی بالکل اکیلے۔ سینی کے دل کی تکی ٹھیک لگی۔

”مبارک ہو مبارک ہو ہاشم بھائی! آپ کو بھی اور سیدہ بھابھی! آپ کو بھی۔“ انگوٹھی پہنانے کی رسم ہوتے ہی حاضرین میں سے تقریباً سب ہی نے بلند آواز میں مبارکبادی تھی۔

”شکر ہے شکر ہے۔“ سیدہ اور ہاشم نے مسکرا مسکرا کر جواب دیا۔ سلطان بخت بہت ریزرو بیٹھے تھے اور شہریت گھونگھٹ کی آڑ میں کوفت زدہ تھی۔ لائٹ پربل اور رنگ کمر کے کاغذانی قیمتی سوٹ میں اگرچہ اس کا پورا وجود وہیٹے میں اچھی طرح سے چھپا ہوا تھا مگر اس کے باوجود دیکھنے والوں کو نظر آ رہا تھا کہ یہ کھر یہ سوٹ اس پر کس قدر چنی رہا ہے اور دیکھنے والے کچھ تو دل ہی دل میں اس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے اور کچھ افسوس۔ رشک کرنے والوں کو ہاشم بخاری کی لمبی جائیداد تین شہروں میں عالیستان کو گھسیاں اور تین کارخانوں کی تفصیل نظر آ رہی تھی اور جو افسوس کر رہے تھے وہ ہاشم بخاری اور شہرینہ کی عمروں میں اتنے بڑے فرق کو دیکھ رہے تھے۔

”سچی ستیاری۔“ ایک دو نے تو وہیں افسوس سے کہہ ڈالا۔

”رسم ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے شہرینہ کو کمرے میں بھیج دیتے ہیں۔ اس کے بعد ڈنر شروع کرواتے ہیں۔“

سیدہ نے سلطان بخت اور حسین شاہ سے مشورہ لیا۔ دونوں نے اثبات میں سر ہا دیا تو سیدہ نے شہر نہ کے پاس بیٹھی حنا کو اشارہ کیا اسے لے جانے کا وہ شہر نہ کا بازو تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاشم بخاری نے بھرپور نظروں سے اس کے سامنے میں ڈھلے نازک بدن کو دیکھا تو ان کی گہرائی میں جیسے اور کلف آیا۔ شہر نہ جیسے ہی اپنے کمرے میں داخل ہوئی اس نے دوپٹے کوچ کر سامنے بیڈ پر اچھل دیا۔

”یہ کیا؟“ حنا حیرانی سے بولی۔ ”اتنی پیاری تو لگ رہی تھیں مجھے ڈھنگ سے دیکھنے بھی نہیں دیا۔“

”شٹ اپ۔“ شہر نہ غصے سے چلائی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”جاؤ تم یہاں سے۔“ اس نے حنا کو تقریباً وہ کاٹے کر کمرے سے باہر دھکیل دیا اور کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ کچھ دیر دروازے کے ساتھ لگی کھڑی رہی پھر بیڈ پر گر کر رونے لگی۔

”دیکھا بابا جان! میرے بھڑائی بہن نے میرے ساتھ کیا کیا اتنی سالہ بڑھے کو میرے پلے پاموہ دیا۔ دیکھ لی میں نے ان کی محبت۔“ روتے روتے وہ جیسے بیٹھین شاہ کی روح سے مخاطب ہو کر بولی۔

”میں ان سے اس زیادتی کا ایسا بدلہ لوں گی کہ یہ یاد کریں گے۔ میں کبھی بھی اس بڑھے کے ساتھ نہیں ہوں گی۔ آپا! میں آپ کو اس زبردستی کا مزہ ضرور چکھاؤں گی۔“ وہ کہتے ہوئے غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور لاساری کھول کر کچھ ڈھونڈنے لگی۔

”میرا وہ بالکل۔“ اسے موبائل نہیں مل رہا تھا۔ ”اودہ تو میں رات کو اسٹریٹ لائٹ چھوڑ آئی تھی۔“

”بیٹا۔ بیٹا۔ میں شہر نہ۔“

”کیسی ہو کو کوئی بار۔“ سنو میں تمہارے ساتھ شاوی کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ چھوٹے ہی بولی تھی۔

”ہاں ہاں! ابھی کر سکتے ہو تو میں ابھی تیار ہوں۔“

”بالکل نہیں ہوئی۔ پورے ہوش و حواس میں بول رہی ہوں۔“ کچھ غصے سے بولی۔

”معتنی کروئی ست انہوں نے میری اس اتنی سالہ بڑھے کے ساتھ۔“ حنا نے حنا سے کہا۔ ”میں اس کے ساتھ رخصت ہو کر جانے سے بہتر ہر کھالینا سمجھتی ہوں۔ سناؤ۔“ وہ حنا کے اٹھنے والی رہی تھی۔

”تم جو کو چاہتے ہو کو میں سن رہی ہوں۔“

”ہاں! عمل کرنے کے لیے ابھی تیار ہوں! اسی لیے تو تمہیں فون لیا ہے۔“ وہ دوسری طرف عبدالعصیب کی بات غور سے سنتی لگی۔

”بہن! میں بہت ڈپر ہوں بہت پریشان۔“ حنا جان اور لالہ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ انہوں نے میری رائے تک نہیں لی۔ میرے انکار کو رور خور اٹھنا نہیں سمجھا۔ میرے جتنے چلائے کیے وہاں کے بٹھیوں میری انگلی میں معتنی کی انگلی تھی ڈکواوی جیسے کسی گائے بکری کو کھونٹے سے باندھتے ہیں۔“ وہ روتے ہوئے چلائی تھی۔

”میں نے تم سے محبت کی ہے تو میں بھی تمہاری ہوں گی۔“

”روپ۔“ شہر نہ اس وقت میرے روپ کی پٹی ہے۔ میں اپنے اس روپ کو آگ لگا دوں گی جو تمہارے علاوہ کسی اور کے لیے ہو۔ سن رہے ہو تم۔“ وہ جیسی آواز میں چلائی۔

”پلیز مجھے ساری تفصیل بتاؤ تمہارا کیا پلان ہے۔ میں اب اس پتھروں کی حویلی میں جہاں پتھروں انسان رہتے ہیں ایک منٹ اور نہیں رہ سکتی۔“

”آج رات۔“

”کل رات ٹھیک ہے۔“

”مسلمان مسلمان کون سا؟“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ معتنی جیولری میرے پاس ہے وہ بھی اور جو گھر میں نقد یا زیور۔ ٹھیک ہے۔“ بولتے بولتے یکدم اسے اپنے پیچھے آہٹ کا احساس ہوا تو اس کا دل جیسے بند ہونے لگا۔

اسے یاد آیا اس نے دروازے کا لاک نہیں لگایا تھا اسے لگا وہ پتھری ہو چکی ہے۔ سڑک تمہیں دیکھ سکے گی اور اس کے پیچھے کوئی کھرا خفا موشی سے سانس نہیں لے رہا تھا۔

بالکل غیر محسوس طریقے سے اس نے موبائل آف کر دیا اور موبائل والا ہاتھ نیچے کرتے ہوئے گہراں موبائل پر نیچے دیکھا۔

سالہ شاہ بہت سکون سے کھڑی اسے دیکھ رہی تھیں۔

”آپ بھالی بیگم! اس نے خشک حلق میں تھوک لگا کر ”خیریت!“

”میرے ساتھ تو خیریت ہے تم البتہ لگ رہا ہے کسی ایمر جنسی میں گرفتار ہو یا ہونے جا رہی ہو۔“ سالہ شاہ کی تیز نظریں شہر نہ کے چہرے کے تاثرات کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لے رہی تھیں۔

”ارے ایسی تو کوئی بات نہیں ہے کیوں کسی ایمر جنسی میں گرفتار ہوں گی بھلا۔“ وہ ذرا سا ہنسی۔ ”معلوم نہیں ہے کیا ہو رہا ہے۔“ اس نے دل میں سوچا۔

”اچھی لگ رہی ہو۔“ سالہ نے نگاہوں کا رخ بدلا۔ ”بہت اچھی“ یوں باتیں بناتے۔ ”وہ معنی خیر انداز میں بولیں۔“

”کس۔ کیسی باتیں؟“ شہر نہ کا دل جیسے سینے میں پھر پھر اڑ رہا تھا۔

”تم نے موبائل کب لیا؟“

”کچھ ہی دن ہوئے ہیں۔“ وہ نظریں پڑا کر بولی۔

”پاسی نے کھٹ دیا ہے۔“ پھر بہت ذرا ہی انداز میں بولیں۔

”میں نے کھٹ دیا تھا۔ میں نے کھٹ دیا ہے۔“

”اچھا کھٹیں تو تمہاری اس شاپنگ پاسی کو علم نہیں۔“ وہ اس کی حالت کا مزہ لے رہی تھیں۔

”مگر میں کون سے ایسے معاملات۔“ اپنی خرید و فروخت سے باخبر رہتا ہے ہنو میں اپنی شاپنگ سے سب کو خبردار کرتی پھروں۔ ”اب کے وہ کڑے لہجے میں بولی۔

”خبردار! سالہ ہنسی۔“ ہوں خبردار تو یہاں کوئی بھی نہیں تمہاری۔“ وہ تقریباً دھور اچھوڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

”کیا میری؟“ شہر نہ کا دل تیز تیز اڑ رہا تھا اس کی جگہ کے ٹھیل سے

”شہر نہ! تمہیں ڈر نہیں؟“ وہ ایک پھر سے بات بدل کر بولیں۔

”دکس بات کا۔“

”جیو! لڑ رہی ہو۔“ سالہ کی آنکھوں میں واضح اشارہ تھا کہ وہ شہر نہ کی بہت سی باتیں سن چکی ہیں۔

”کیا؟ میں کیا کر رہی ہوں؟“ وہ خود کو نہ رخصت ہر کرتے ہوئے بولی۔

”چلو جو کچھ تم کرنے جا رہی ہو۔“ سالہ کی بات پر وہ ایک لمحے کو سناٹے میں آئی۔

”تو یہ سب کچھ سن چکی ہیں۔“ اس سے جواب نہیں بن رہا تھا۔

”اگر تمہارے لالہ کو یا بھالی بیگم کو علم ہو جائے یا میں بتا دوں۔“ سالہ نے اس کے خوف زدہ چہرے پر نظریں گاڑیں۔

”کیا کیا باتیں آپ؟“ اس کا رنگ اڑنے لگا تھا۔

”جو کچھ تم کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔“

”میں۔“ معلوم نہیں آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں وہ پتھج کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں اور میں۔“ وہ وارڈ روپ کی طرف بڑھی۔

”تمہیں اس پتھج کی قیمت کا اندازہ ہے؟“ پھر پھر ذرا ہنسی تھا۔

”مطلب؟“ وہ مزے بغیر بولی اور الماری کھول کر کپڑوں کا جائزہ لینے لگی۔

”مطلب تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو جو کچھ میں تم سے کہہ رہی ہوں۔ انجان بن رہی ہو تو علیحدہ بات ہے۔“
”آپ جو بچہ کہنا چاہتی ہیں، کھل کر کہیں۔“ وہ سندھی اجڑک کا بلیک سوٹ منتخب کرتے ہوئے پلٹ کر بولی۔
”اگر میں نے سب کچھ کھل کر کہہ دیا تو جانتی ہو اس جو بلی میں بھونچال آجائے گا۔ کچھ بھی نہیں بچے گا۔“

سب کچھ سس سس ہو جائے گا کیا تم ہم سب کی بربادی چاہتی ہو؟“
”بھائی بیگم! آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔ لگتا ہے کہ آپ کی طبیعت اچھی نہیں، پلینز جا کر ریسٹ کریں اور مجھے ہنسرت مت کریں میں پہلے ہی بہت اب سیٹ ہوں اس نئے کھڑاگ سے۔“ اس نے بائیں ہاتھ کو پیسری انگلی میں پنی ڈائمنڈ کی انگوٹھی انگلی سے نکال کر بیڈ پر اچھالی صالہ اس کو دیکھتے ہوئے اب کچھ سوچ رہی تھیں۔

”ہنسرت تم نہیں ہو۔ تم تو شاید بہت کچھ سوچ کر اب کسی فیصلے پر پہنچ چکی ہو۔“ وہ جیسے خود کو گامی کر رہی تھیں۔
”اور مجھے ابھی کسی فیصلے پر پہنچنا ہے بہت جلد۔“ وہ بڑبڑا کر۔

شہرینہ کو یقین ہو گیا کہ وہ سب کچھ سن چکی ہیں۔ اس نے کپڑے بیڈ پر رکھ دیے اور خود جیسے بے جان سی ہو کر کرسی پر گر گئی۔

”آپ نے جو کچھ سنا۔ معلوم نہیں کیا سمجھیں، میں اپنی دوست کو فون کر رہی تھی بلکہ اس کا فون آیا تھا مجھے مبارک باد دینے کے لیے تو میں جذباتیت میں نہ جا بے کیا کچھ کہہ گئی اور اب نے جانے کیا سمجھا۔“
وہ بہت آہستہ آواز میں اپنی صفائی پیش کر رہی تھی۔ صالہ نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی کسی نادان بچے کی باتوں پر مظلوم ہوتا ہے۔

”اس جو بلی کی ہر کھوں کی عزت داؤ پر لگی ہے شہرینہ! اور تم کہہ رہی ہو جذباتی بن میں وہ کون ہے؟ ہتاؤ مجھے۔“ انہوں نے اس کی آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کون کس کی بات کر رہی ہیں آپ؟“
”جس سے تم ابھی فون پر بہت کچھ ملے کر رہی تھیں۔“ صالہ کا لہجہ پر سکون تھا۔
”دامخ خراب ہو گیا ہے آپ کا۔ اپنی بد نصیبیوں کا بدلہ مجھ سے لے لیا جا رہی ہیں۔ مجھ پر یوں جھوٹے الزام لگا کر۔“ وہ بد تمیزی سے چلائی۔

”آپ سے برواشت نہیں ہو رہا کہ میں اتنی اچھی جگہ پر جا رہی ہوں جہاں آپ کی طرح نہ سیدہ آیا جیسی مند ہیں اور نہ لالہ جیسے سخت گیر شوہر۔ آپ بل رہی ہیں مجھ سے۔ اس لیے گھنٹیا بن پر اترا آئی ہیں یہ دیکھیں کیا جان یہ بھائی بیگم مجھ پر الزام تراشی کر رہی ہیں۔“ شہرینہ نے کھلے دروازے سے اندر آئی سیدہ کو دیکھ کر بے حیا متہمتا بدلا تھا۔ اس وقت اسے اپنے بچاؤ کا یہی رستہ نظر آیا تھا۔

”کیا بکواس کر رہی ہو تم نہیں کیوں جلوں کی تم سے۔ میں کیا بھوکی نکلی ہوں کچھ دیکھا نہیں میں نے کبھی جو میں تمہاری اس بڑھے سے منگنی پر بل جاؤں گی۔ اپنے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اب یہ ڈرامہ رچا رہی ہو۔“ صالہ کون سی تم نہیں فوراً بچ کر بولی۔

”صالہ! یہ کیا تمہارا شاہ۔ کھڑے مہمانوں سے بھر اڑا ہے اور تمہیں کون سا جھگڑا کھڑا کر رہی ہو۔ اسی کی کسر رہ گئی ہے کیا؟“ سیدہ نے اس جھگڑے کو بھی صالہ کی جھگڑا اور طبیعت کا نشانہ سمجھا۔

”دیکھ لیں آپ! یہ میرے کمرے میں آکر چھپ چھپ کر میری باتیں سنتی ہیں اور پھر اٹے سیدھے الزام لگاتی ہیں۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا ان سے، میں تو اپنی دوست سے فون پر بات کر رہی تھی کہ انہوں نے نہ جانے کیا اتنی سیدھی داستان گھڑ لی۔“

شہرینہ جھٹ سیدہ کے پہلو سے جا لگی اور روتی آواز بنا کر بولی۔

”بہت افسوس کی بات ہے صالہ! تم تو اس کی بڑی بھائی ہو اس کی مال کی جگہ بجائے اس کی خوشیوں پر خوش ہونے کے تم نے مقابلے بازی شروع کر دی ہے۔ مجھے تم سے یہ توقع نہ تھی۔“ سیدہ کے الزام نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ صالہ بھڑک اٹھیں۔

”کیو اس کر رہی ہے یہ جھولی ڈرامہ باز۔ اپنے کسی یار کے ساتھ بھاگنے کے پروگرام ملے کر رہی ہے، آپ دونوں بہن بھائی کی آنکھوں میں دھول بھونک کر بدگھنا دیواروں سے سر ٹکرا کر روئیں گے آپ دونوں پھر کہیں ہم نے صالہ کی بات کیوں نہ سنی۔ بہت برا کیم کھیل رہی ہے اس جو بلی کی عزت کے ساتھ ہماری لسلوں کے ساتھ اور اب ڈرامہ کر رہی ہے مظلوم بننے کا۔ پوچھیں اس سے کون سا یار ہے اس کا جس کے ساتھ۔“ ان کی بات ابھی منہ ہی میں تھی کہ سلطان بخت نے کمرے میں داخل ہو کر ایک زوردار پھیران کے منہ پر چڑھایا۔ ان کی آگ اظنی زبان یک دم چپ ہو گئی تھی۔ وہ حیران نظروں سے گال پر ہاتھ رکھنے سلطان بخت کو دیکھے گئیں۔ شہرینہ کی جھپٹاں اب کمرے میں کون رہی تھیں۔ سیدہ اسے اپنے ساتھ لگائے تھکیاں دے رہی تھیں عمر سہارا رہی تھیں۔

”آئندہ اس قسم کی خطا نہ کرو، تو زندہ دیوار میں چٹواؤں کا حرام۔“

سلطان بخت نے منہ پر ان کی ہلکی بڑی مشکل سے روکی۔ ”میرا یہی معصوم بہن پر اتنا گھٹیا الزام لگانے سے پہلے تم مر گئیں نہ گئیں۔“ منہ سے نکلتے ہی زندگی حرام کی تھی اب میری بہن کی پہلی پہلی خوشیوں کو بھی آگ لگانے چلی ہو۔ خبیث عورت۔ دغ ہو چلی جاؤ گھٹیا اس سے اور آپ اس کو لے جائیں یہاں سے جب تک میری بہن اپنے گھر رخصت نہیں ہو جاتی اس کا منہ اس پر نہ پڑے۔ میں آخری بار آپ سے کہہ رہا ہوں حسین شاہ سے کہہ دیں گے لے جائیں اس غلاموں کی کھوپڑی کو اپنے ساتھ مجھے ہمارے سر پر مسلط کیا ہے تو جیسے خوشیاں اس جو بلی کا دستہ ہی جھل گئی ہیں۔ اب تک شہرینہ اور صالہ میں اس کی شکل یہاں نہ دیکھوں سنا آپ نے۔“ وہ دروازے کو اشارے کرتے ہوئے تھکیاں دے کر باہر نکل گئے۔

”بچھٹاؤ گے تم سلطان بخت! بہت بچھٹاؤ گے، روو گے اس وقت کہ اس کے کھوئے ہوئے نشان ڈھونڈتے چھو گے پھر تمہیں صالہ کی سچائی بہت دکھ دے گی بہت دکھ۔ یہ جو بلی روئے گی۔ اس کے دو دیواروں کے آج میں رو رہی ہوں کل سب رو میں گئے۔“ صالہ کا جیسے دماغ چل گیا تھا۔ نفی میں زور زور سے سر ہلاتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔
”کیا بات ہوئی ہے صالہ کے ساتھ شہرینہ! مجھے کچھ بتاؤ؟“ سیدہ اس کے جانے کے بعد اسے خود سے الگ کرتے ہوئے بولی۔

”شہرینہ! کیا جان! آپ بھی مجھ پر شک کر رہی ہیں۔“ وہ رونے لگی۔ ”الالہ نے تو مجھ پر شک نہیں کیا۔ کیا میں کچھ ایسا کرتی ہوں جس پر آپ یا لالہ کا خدا انتہا سے شک کرے؟“ آپ خود سوچیں ذرا۔“

”شہرینہ میری جان! بیٹیوں کے معاملے ایسے ناؤک ہوتے ہیں کوئی ذرا سی انگلی اٹھائے تو ڈار لگتا ہے۔ صالہ غصے کی تیز ہے، زبان بھی بے قابو ہو جاتی ہے، ممدول کی بڑی نہیں۔ تم اس کی باتوں کو دل پر نہ لیتا، اس چند دنوں کی تو بات ہے۔ ایک ماہ بعد تو رخصتی ہے۔ پتے پتے لیتے اس کچھ سے رخصت ہو تو اچھی بات ہے۔ پھر کون سا تم کو روز روز اوھر آتا ہے۔ معاف کر دینا اسے وہ تمہارا بڑا نہیں چاہ سکتی۔“ سیدہ اس کے یوں رونے پر سنبھل کر بولی۔

”آپ ساری زندگی ان عورت کی حمایت کرتی رہی ہیں جس نے ہمارے بھائی کی زندگی کو دفن بنا رکھا ہے اور اس کچھ کو بربخ۔ معلوم نہیں آپ کس مٹی کی بنی ہیں۔ بیٹھ ہی اس کی طرف داری ہو نہ۔“ اس نے جھک کر بیڈ پر پڑنے اپنے کپڑے اٹھائے اور واٹس روم کی طرف بڑھ گئی۔ ”آپا جان! میں ہاتھ لے کر ریسٹ کروں گی۔ دامخ خراب کر دیا ہے آپ کی منہ صالہ نے کتے ہوئے وہ ہاتھ روم کے اندر چلی گئی تو سیدہ باہر نکل آئیں۔ معاملہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ممدول میں جسے کاٹنا سا چھہ کیا تھا۔ کہیں کچھ غلط ہو جائے گا۔ کیونکہ انہیں یقین تھا

صالحہ جنتی بھی بری سی۔ بھوٹ نہیں بول سکتی۔
 "تو کیا پھر شہریت بھوٹ بول رہی ہے۔" وہ کم قسم سی برآمدے کے ستون کو تھام کر کھڑی ہو گئیں۔



"تم کیا سمجھتی ہو میں تم سے فلرٹ کر رہا ہوں۔" وہ کتنی معنوں کے بعد اس کی گاڑی میں بیٹھی تھی۔ نہ تو دھوپ گڑھی تھی نہ سڑک پر لوگوں کا رش تھا بظاہر لٹ لینے کے لیے کوئی بھی عذر نہیں تھا مگر دل کے عذر سے بڑا پیمانہ اور کون سا ہو سکتا ہے۔ وہ اس کے مستقل اصرار پر مسلسل انکار کرتی رہی۔ گاڑی فٹ پاتھ کے پاس کھڑی تھی اور وہ خود فٹ پاتھ پر کھڑی سفیان کی ٹھکار پر انکار کیے جا رہی تھی۔

"اچھا صرف ایک پارہ بیٹھ جاؤ۔ مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے اس کے بعد میں تم سے قسم کھا کر کہتا ہوں نہ کبھی تمہارے راستے میں آؤں گا نہ تمہیں اپنے ہمراہ چلنے کو کہوں گا آئیے اس۔" اس کی آخری بات زینب کے دل کو لگی تھی۔ وہ مجبور ہو کر بادل خواست گاڑی میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد سفیان نے اس سے یہ فقرہ کہا۔

"اس کے علاوہ میں اور کیا سمجھ سکتی ہوں جب میرا اور آپ کا کچھ بھی برابر کا نہیں۔" وہ بھڑکے سے بولی۔

"دل تو ہے نا برابر کا۔ ایک عیسایا۔ وہ تو خدا نے سب کے سینوں میں ایک جیسے بنائے ہیں نا۔ اس دل کے ہاتھوں ہی تو مجبور ہو کر میرے ساتھ آئی ہو۔" اس کی بات سن کر سفیان نے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ کہیں جو آپ کو کہتا ہے۔ مجھے دیر ہوں ہی ہے کھر جانا۔" گاڑی کی خوشبودار خوشک فضا آرام دہ نشست کو بصورت خوش لباس ہم سفر اور حقیقت ایک منگھلے کے لیے بھی اسے کھر کا خیال نہیں آیا تھا۔

"میرے۔" ابھی تو کالج میں پھٹی ہوئی تھی۔ کوئی اتنی دیر نہیں ہو رہی تھا تھوڑی دیر تک چلیں پھر بس بات کرنا ہوں۔" وہ اس کے ریلیکس انداز کو بھانپ رہا تھا۔

"نہیں۔ پلیز مجھے دیر ہو جائے گی۔" وہ جڑ ہو کر بولی۔

"بس آؤ مجھے کھنڈے بس کچھ فرق نہیں پڑے گا جنتی دیر میں تم نے پیدل کچھ پینچنا تھا اتنی دیر میں تمہیں پانچواں گا۔" اب گاڑی کالج کی مخالف جانے والی سڑک پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔

"اچھا اب جلدی سے بات کریں اور سسٹے۔"

"سفیان، بیٹنی میں نے پہلے ہی بتایا ہے۔ مجھے تمہارے منہ سے اپنا تک نیم سننا بہت اچھا لگتا ہے۔" وہ اسے ٹوٹتے ہوئے بولا۔

"یہ شہر اس۔" رہو نہیں کہ میں یوں حجاب اوڑھ کر جس کے ساتھ چاہوں پھرتی رہوں اور کوئی مجھے پوچھنا نہ سکے۔ صوفی عبد الرحمن کی بیٹی اگر اس طرح گاڑی میں کھر یا کالج آئے ہائے لی تو آپ سوچیں میرے کھر والوں کی کیا عزت رہ جائے گی؟"

"مجھے احساس ہے زینب! مجھے خود بھی یہ اچھا نہیں لگ رہا اسی لیے کہ آج آپ سے گاڑی میں آخری بار بیٹھنے کی درخواست کی ہے مجھے۔ میں۔"

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ زینب نے گرون موڑ کر اس کی طرف دیکھا وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ محبت بھری بھری نظر۔ زینب کا دل جیسے سینے کا پتھر توڑ کر باہر آنے لگا اس نے جلدی سے رخ پھیر لیا اور ہاتھوں کی انگلیوں کو اضطرابی انداز میں موڑنے لگی۔

"آئی او یو زینب! آئی رینلی او یو! آئی کائنات بھوہ آؤٹ یو۔" (میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا) وہ بالکل اس کے کان کے پاس ہوتے ہوئے بولا۔ اور اپنا ایشیئرنگ پر رکھا ہاتھ اس نے آہستگی سے زینب کے کانپتے ہاتھوں پر رکھ دیا۔

ٹھنڈے رخ لپکاتے ہاتھ نرم گرم مضمبور ہاتھوں کی گرفت میں آچکے تھے۔ زینب کے کانوں کی لوئیں حدت دینے لگیں اور اس کی زبان جیسے ٹالو سے چاگلی۔ جسم میں شرارے سے چھوٹے لگے تھے۔ وہ ہاتھ چھڑانا چاہ رہی تھی مگر جیسے ساری مزاحمتی قوت دم توڑ گئی تھی۔ وہ بے حس سی اسی طرح بیٹھی رہی۔ سفیان کے ہاتھ کی گرفت لچھ۔ لچھ مضمبوط تر ہوئی جا رہی تھی۔ سامنے ارد گرد دور دور تک سڑک بالکل سفیان تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک آواز تیز رفتار گاڑی گزرتی یا آگاہ کاموٹر سا شکل۔ نہ جانے۔ کون سی سڑک تھی۔

اس کا ہاتھ متحرک ہوا اور بہت آہستگی سے سائب کی طرح اس کی نازک تپتی کمر کے گرد متاعل ہو گیا۔ زینب کا سینے میں دم رکنے لگا۔ بیٹ میں ایک دم سے مرو سا اٹھا تھا مروہ احتجاج نہ کر پار ہی تھی۔ سفیان نے اسے کھینچ کر اپنے بے حد قریب کر لیا۔

"بے۔ پلیز۔" اس کے ہاتھ تھراتے لیوں سے نکلا تھا۔

"تم۔ تمہارا وجود سراپا نشہ زینب! آپ تو آگ سے بھڑکی ہوئی اور کوئی اس کے پاس آکر بھی نہ بھڑکے ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔" اس نے پاس ہو کر کون کافر نشہ رہنا چاہے گا۔ "مجھے کے ہزاروں حصے میں اس نے بے خود سے انداز میں "وہ کتنا تھی" کہہ کر اس کا گمان تک زینب کو نہ تھا۔ اسے جیسے کسی پچھوٹے کاٹ لیا۔

"مہم۔ مجھے۔ کھر۔ کھنڈے اتار دیں آپ۔ پلیز مجھے کھر جانا ہے۔" وہ اسے پرے جھٹک کر بولی۔ اس کا جسم بھی ابھی تک کانپ رہا تھا جیسے جارحانہ کا بخار ہو گیا ہو۔ اور گرون کا وہ حصہ جسے ابھی سفیان کے ہونٹوں نے چھوا تھا وہاں جیسے کسی نے جھٹا ہوا سکہ رکھ دیا تھا۔ صحت تیز چھین تھی نا قابل برداشت جلن اور اس جلن کے اندر کہیں لپکا سا سرور۔

"سوری!" وہ سپرھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "مخالف کرنا" مجھے معلوم نہیں کیا ہو گیا تھا۔ اس میں قصور میرا نہیں تھا۔" اس نے کہا۔

"مجھے نہیں اتار دیں۔" وہ تھکی ہوئی بولی۔

"بس! بھی چلتے ہیں تمہیں اپنی فیکٹری تو دکھا دوں۔ بس آئے والی ہے۔" وہ شہر کا منصفاتی علاقہ تھا بالکل سفیان۔ زینب کو خوف سا محسوس ہوا۔

"من۔ نہیں مجھے نہیں دیکھنی۔" اس نے کہا۔ "وہ خوف نہ لہجے میں بولی۔

"پائل ہوئی ہو یہاں کب اتار دوں۔ چلو فیکٹری پھر کسی دن دیکھ لیں گے واپس چلتے ہیں۔" اس نے گاڑی موڑ لی۔ زینب کی جان میں اچانک آئی۔

"بس! کھنڈے! کرو کولڈ ڈرنک سے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر پھٹی نشست پر پڑے شاپر میں سے پیپسی کے دوٹن نکالے۔ ایک اسے تھما دیا۔

"مجھے نہیں پینا مجھے بس جلدی کھر چھوڑیں۔" وہ لیتے ہوئے متردد ہوئی۔

"زینب! پلیز ہر بات میں ضد اچھی نہیں ہوتی۔" اس کے چڑ کر کہنے پر زینب نے من تمام لیا۔

"وہ ضروری بات ہے۔" سفیان نے ڈرنک کا لمبا گھوٹ لے کر کہا۔

"زینب! آئی وائٹ ٹومییری یو۔" (میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں) وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا اور وہ جونن کی ٹھنڈک کو اپنے سینے ہونے ہاتھوں میں جذب کر رہی تھی سناکت رہ گئی۔

"میں اپنی ماما کو تمہارے کھر لانا چاہ رہا ہوں۔" اس کی دوسری بات نے من کی ٹھنڈک جیسے زینب کے اندر تک اتاری۔

"تم سمجھتی تھیں نا کہ میں تم سے فلرٹ کر رہا ہوں ایسا بالکل نہیں ہے۔ میں پہلی نظر میں تمہیں اپنا دل دے بیٹھا ہوں اور تمہارا ہمیشہ کے لیے ساتھ چاہتا ہوں۔" زینب کو یوں لگا جیسے اسے اس دنیا میں ہی جنت کی نوید مل گئی ہو۔ وہ جنت جس کے لیے اس کے یا باصواب راتوں کو اٹھ کر سجدے کرتے تھے وہی جنت۔ وہ حیرت زدہ

"میں اپنے پیر نس کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ ان کی گردنوں کی پراپرٹی کا اکیلا وارث۔ اب اپنے پیروں پر بھی کھڑا ہوں۔ اوہر جو فیٹری ہے وہ آج کل میرے انڈر کنٹرول ہے۔ وہی تو تمہیں دکھانے لے جا رہا تھا۔ مہا پیانے میری شادی کا فیصلہ مجھ پر چھوڑ رکھا ہے۔ مجھے کوئی لڑکی پسند نہیں آئی تھی۔ یورپ امریکہ کئی سال رو کر آیا ہوں مگر کوئی لڑکی دل کو نہیں بھائی سوائے تمہارے۔ تمہیں دکھا ہے تو جیسے اب نہیں اور دیکھنے کی حسرت نہیں رہی۔ میرا دل تمہاری طلب میں پاگل ہوا جا رہا ہے۔ کیا تمہارے دل تک میری محبت کی چمک نہیں پہنچ رہی تھی؟" اس کا لہجہ بے حد سچا تھا۔ زینب کے دل میں اتر گیا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے سفیان! ہمارا تمہارا کیا جوڑ پھر تمہارے پیر نس وہ کبھی بھی مجھے پسند نہیں کریں گے نہ میرے گھر والوں کو اور مجھ میں اتنی کیا خاص بات ہے بہت معمولی سی لڑکی ہوں۔"

"خیر معمولی اور خاص تو تم میرے لیے ہو۔ یہ تم میرے دل سے پوچھو تم ہو جس نے میرے دل کے بند دروازے کو دھڑلے سے کھول ڈالا ہے۔ اس سے بڑھ کر میرے لیے اور کون خاص ہو گا پھر شادی مجھے کرنی ہے زندگی مجھے بسر کرنی ہے اس میں اعتراض کرنے والے میرے والدین کون ہوتے ہیں پھر زینب! انہوں نے مجھے اجازت دے رکھی ہے کہ اپنی مرضی سے لڑکی میں پسند کروں۔ وہ لوگے کر دیں گے انہیں تو صرف میری پسند سے غرض ہے۔" اس کی انگلی بہت متاثر کن تھی۔

"پھر بھی سستی! میں۔ تمہیں معلوم تو ہے میرے والد ایک معمولی اماں سید چند ہزار تنخواہ پانے والے نہ ہمارا گھر شہر میں نہ وہاں پیر نس کس طرح یہ ممکن ہو سکتا ہے۔" وہ متذکرہ تھی۔

"اب مجھے ہواؤ میں نے یہ سوچ کر تو دل نہیں لگایا کہ جس سے محبت کرتا ہوں وہ میری کلاس کی بیٹیا نہیں۔ محبت میں یا تنگ کب ہوتی ہے منصوبہ بندی کون کرتا ہے۔ یہ تو بس ہوجانی ہے یا نکل جا سکتا ہے۔ اولیٰ کی بارش کی طرح جیسے مجھے تم سے پہلی نظر میں ہوئی۔ کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہوئی تھی کہ اب میں تمہیں سب سے بڑھ کر نہیں لگتا؟"

"میں نے یہ کب کہا؟" وہ اب سن کھول کر اعتماد سے تجاب کے نیچے سے بولی تھی۔

"تو میں تمہیں پسند ہوں نا؟"

"وہ چیپ رہی۔ ہوشوں پر مسکان تھی مگر زبان پر نا۔"

"بولو نا۔" وہ مسر تھا۔

"میں بول سکتی نا تم خود سمجھ لو۔" وہ بے شکل بولی تو وہ اس پر نا۔

"زینب! ایک ریگاریٹ ہے۔" وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔

"وہ کیا؟"

"یہ تجاب اتار دو۔"

"نہیں۔ نہیں۔" وہ کھبر آئی۔

"پلیز میری خاطر گھر کے قریب پن لینا۔" اس نے ہنسی لہجے میں کہا۔

"نہیں۔" وہ ہنسی سے بولی۔

"اچھا چہرہ دکھا کر پھر تجاب کر لینا۔" اس کے اصرار پر اس نے آہستگی سے تجاب کھسکا دیا۔ وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سرے کے زینب نے تجاب کر لیا۔

"چلو پھر تو زنا سفر ہوا میرے۔" وہ کنگھلیا۔

"اب مجھے گھر اتار دیں۔"

"ہاں چل رہے ہیں زینب! اگل میں تمہیں صبح نو بجے کالج کے پچھلے گیٹ پر پک کرنے آؤں گا تمہیں شہری میر

کراؤں گا۔ تھوڑی شاپنگ کریں گے گھومیں پھر اس کے اچھے سے ہو گل میں بیچ کریں گے۔"

"نہیں۔"

"یا نکل تمہیں پہلے مہم سے ملو اؤں گا اس کے لیے مناسب تیاری تو ہونا چاہیے۔ اس کی شاپنگ کریں گے پھر تمہیں ایک دن تک مہم سے ملوانے لے جاؤں گا۔ تمہیں یہ کتنے ہی انہوں نے راستی ہو جاتا ہے۔"

"اچھا! کھیل گے۔" اس کے گھر کی سڑک نزدیک آ رہی تھی وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"پھر گل صبح تو بجے ایک میں کمرہ پینے لے آنا کالج میں پہنچ کر کے باہر نکل آنا میں پچھلے گیٹ پر سمار اوٹ کروں گا۔" سڑکی سڑک پر اتارتے ہوئے وہ اسے تکیہ سے بولا۔ وہ لڑکی جواب لے لے بغیر کچھ اتر گئی۔ اوہر اوہر دیکھتے ہوئے اس نے سفیان کو خدا حافظ لکھا اور تیز قدموں سے اپنی گلی کی طرف بھاگ گئی۔ سفیان نے سرشار ہو کر گاڑی اشارت کر دی۔

"ہاں بابا! مجھے آپ دونوں سے ایک سرورشی بات کرنا ہے۔" رات کے کھانے کے بعد اظہار اور یا سمین اظہار کرنا مہم تھیل سے جانے لگے تھے کہ مٹی نے ان سے کہا وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے بیٹھ گئے۔ اسی کا رویہ۔ دونوں سے وہ ویسے ہی بدلا بدلا محسوس کر رہے تھے۔ ابھی کی کھولی کھولی ہی اور آج انہوں نے کھانا کھانی پر اسے نام لھایا تھا۔

"آپ دونوں کو ام جان کی طرف لھانا ہو گا۔" اپنے دونوں ہاتھوں کی محرومی انگلیاں ایک دوسرے میں بکڑتے ہوئے وہ بولی۔

"ام جان کی طرف؟" ظہر کا لہجہ استغراب تھا۔ "ام جان کی طرف تو ہم جاتے رہتے ہیں اس میں ایسی کون سی خاص بات ہے؟"

"پھر آج اسے ایک خاص کام کے لیے جان کی طرف جانا ہو گا۔" اس کا لہجہ دونوں کو اچھا خاصا پر اسرار سا لگا۔

"میرا پروپوزل لے کر۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے گویا صاف کہا۔

"پروپوزل۔" یا سمین جیسے خواب سے جاگیں۔ "کیسا پروپوزل؟"

"معاذ کے لیے میرا پروپوزل۔" وہ بے حاشی سے بولی بغیر کسی جھجک کے۔

"ہوا۔" ظہر کو ہزاروں سوالوں کا گرنٹ لگا۔ "Are you in your senses" (کیا تم اپنے

ہوا سوں میں ہو)

"میں پوری ہوش مندگی سے کہہ رہی ہوں کہ آپ کو میرا پروپوزل! اکثر معاذ کے لیے ام جان کے پاس لے کر جاتا ہوں گا۔ وہ کسے منظور کروا کے ہی لگا ہو گا۔" وہ ایسے کہہ رہی تھی جیسے ام جان سے کسی طرح ٹرپ پر جانے کی بات نہ جا رہی ہو۔

"دیکھ رہی ہو تمہا جزادی کے اظہار۔" ظہر نے بے حد غصے میں یا سمین سے کہا۔

"امام خراب ہے کیا ہے اس کا۔" یا سمین ظہر سے زیادہ غصے میں تھیں۔

"آپ سے میرے دماغ کا غلط سمجھیں یا کچھ اور مجھے معاذی سے شادی لھانا ہے ہر صورت میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"اے شہر! بے جا۔" ظہر کا ہاتھ اس پر اٹھنے لگا تھا کہ یا سمین نے جلدی سے اظہر کو قہام لیا۔

"پلیز ریٹریس اظہر کو پھانسل ہو رہی ہے۔ تم تو اسے حواس کنٹرول میں رکھو۔" مٹی تم دغ ہو جاؤ اپنے گھر سے میں اور آئندہ اس مہم کی نگو اس کرنے سے پہلے اس کا انجام سوچ لینا یہ تمہارے حق میں زیادہ اچھا ہو گا۔ معاذ سے تمہارا رشتہ تو دور کنار اس دو گئے کے بیچ اسٹیٹ کا نام بھی اس گھر میں لینا لگتا ہے۔ سمجھیں تمہیں تمہیں کہنے تیاروں سے مٹی کو گھورتے ہوئے تنبیہ کر رہی تھیں۔

"مہا! آپ کا ہانا صرف اور صرف معاذی ہے گا۔ آپ بھی یاد رکھیں اگر آپ میرا پروپوزل لے کر نہ

میں نے سنا بھی اپنا تو نہیں کر سکتا تھا۔ جلیں گی نا آپ میرے ساتھ؟ وہ اس بھری نظروں سے
 اماں کی طرف دیکھ کر بولا۔
 ”جیسے سوچ لیا تم نے کہ ہم سب تمہارے ساتھ چلیں گے۔ ابھی تمہارا باپ تمہارا غیرت والا باپ زندہ
 ہے۔ اس کو بے چھوٹے گھر میں روکھی روکھی ہوئی ہمیں ہم پر پتیا رہا ہے اور بڑی عزت کے ساتھ رہے ساتھ
 جا کر حرام گھروں اور اپنی بیویوں کو بھی حرام گھروں میں لے کر آئے۔ یہ جیسے سوچ لیا عبدالعزیز! وہ فوراً بولیں پھر کسی گلی
 لٹی کے۔

”اماں بی! میں حرام نہیں کھاتا سمجھ کر رہا ہوں۔“ وہ کہہ کر بولا۔
 ”تمہیں عبدالعزیز! یہی محنت اگر تو اللہ کے کسی بندے کو کام میں لگاتا تو ہاں باپ کے دل جیت لیتا۔ پر تو نے وہی
 کچھ کیا۔ جس سے تیرے باپا صاحب تیرے بارے میں شروع سے غصے سے آ رہے تھے۔ حفظ تو نے دور میان میں چھوڑ
 دیا۔ اب شہر جا کر وہاں کے سارے بچوں اپنا لے اس بے بددینی اور کھانا سے کہ ہم تیرے ساتھ چلیں گے۔
 عبدالعزیز نے ہمیں بیٹے جی مار دیا۔ ابھی مڑ کر آیا ہی نہیں اور تو نے ہمیں کسی کو ٹھٹھکا کے لائق نہیں
 پتہ توڑا۔“ اماں نے جواب دیا۔ ”میں دو بیویوں کے ہوتے ہوئے بھی ان پر غصہ نہیں کر سکتی۔ انا تمہارے باپا صاحب
 کے سامنے مجھے شرمندگی سے سر جھکانا پڑتا ہے۔ جب وہ مجھے تم دونوں کے ملنے دیتے ہیں۔“ اماں نے اپنا غبار
 نکالا جو کل صوفی صاحب کے گھر میں چلی گئی سناتی تھیں۔

”اماں جی! ہم کوئی چورا چکے نہیں کھاتے۔ یہ سب محاش نہیں جو آپ کو شرمندگی ہو۔“ وہ بھی گرم ہو گیا۔ ”خیر۔“
 اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”جب آپ کا دل ہی قابل نہیں میری کمائی کو اچھا نہیں سمجھتے۔ میرے پیسے کو کتنا
 جانتی ہیں تو میرے ساتھ کیسے چلیں گی۔ میں ہزار ہزار نہیں کرتا اور نہ ہوسکتی بھی نہیں صرف آپ سے درخواست
 کر سکتا ہوں۔ یہ میرا کارڈ ہے۔ جب کسی ضرورت پڑے میرے پاس آجا میں مجھے بلا لیں میں سمر آنکھوں پر
 آپ کے بلائے کو رکھوں۔“ وہ بھی اس کا ہاتھ لے کر لگا لگا کر بولے گا۔

اس نے سب سے ہار ڈھال کر غصہ برپا کیا۔ اب تمہیں نہیں ایک حسرت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔
 ”یہ کچھ پیسے ہیں رکھ لیں۔“ اس نے ہزار ہزار کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر کارڈ کے ساتھ رکھ دی۔
 ”حرام خور! حرام کھانے والے گدھے۔“ خلیفہ شیطان کے کچھ تو پھر آگیا میرے گھر میں توٹوں کا یہ سنہری جال
 پھینکنے۔ ابھی میں زندہ ہوں یہ بڑھلائی زندگی زندگی کے سب کو چند گنے روکھی روٹی کھلانے کے قابل۔ تو نے مجھ پر
 گیا ہو گا پڑھا جا کر ان لوگوں کی چمک، کھار کر پھینکاؤں۔ اٹل رہاں سے نکلتی۔ ”صوفی صاحب! جانے کب اوپر
 آئے۔ انہوں نے عبدالعزیز کو کارڈ سے پکڑ کر پھینکا ہر سے دھکا دیا۔ اس عمر میں بھی ان میں بلا کا زور تھا۔
 عبدالعزیز ہاتھ پر دم تک لڑکھا لیا۔ ”اور یہ تیرا شیطانی حربہ۔ یہ توٹوں کا طلسم حرام کی کمائی ہے۔“
 انہوں نے محنت پر بڑی نوٹوں کی گڈی چھٹی اور دوسرے گڈے وہ ایک ایک نوٹ کھینچ کر اس کے گڈے کرنے
 لگے۔ وہ نوٹ پھاڑتے جا رہے تھے ایک جنون کے عالم میں۔

”صوفی صاحب! صوفی صاحب! واپس کروں! ایسے نہ کریں۔ یہ میرے بچے کی کمائی ہے۔“
 ”راہ بی بی!“ صوفی صاحب اتنی زور سے دھارنے کہ اماں بی کی آخری سانس لیں تک آتے آتے رہ گئی۔
 ”یہ نہ ہو کہ میرا کارڈ لے۔ تمہیں اس گھر سے باہر چلیں دے۔“ اپنی زبان اور تھیل کو لگا لگا ہوا۔ اور نکل جاؤ گھر سے
 اور وہ پارہ کبھی ادھر کارڈ نہ کرنا۔ ہزار ہزار کے نئے کارڈے نوٹ پھاڑتے ہوئے ان سب کو وہ ایک جتنی باکل
 بڑھے ہی لگ رہے تھے۔ زینب کا تو بس نہیں پٹیل رہا تھا کہ سارے نوٹ ان سے چھٹ لے۔
 ”نکل رہاں سے۔“ وہ نوٹوں کے ٹکڑے عبدالعزیز کی طرف اچھالتے ہوئے حقارت سے بولے جس کی
 آنکھوں میں سرخ زوروں کے ساتھ نمی اتر آئی تھی۔ اس کی محنت کی کمائی اس کی آنکھوں کے سامنے نظر آئی
 بیٹ گئی تھی۔

”دھکے ہم کیوں ماریں گے میرے لعل! پر تو نے کام بھی تو دھکوں والے کیے ہیں۔ اب یہ کس روٹی تھی بھانڈ
 میرا پیٹنے کی تباہی تھی۔ تم دونوں بھائیوں نے میرا پتہ چھڑا ہے باپ کے ہاتھوں اس عمر میں ذلیل کروانے کی قسم
 کھا رہی ہے۔ کل وہ بازار میں تیرے کانے والی کیسٹ دیکھ آئے پھر جو کھر آکر انہوں نے میری عزت افزائی کی
 ہے کل سے کچھ مری پڑی ہوں۔“ اماں بی نے اس کا چہرہ اپنے سامنے کیا زینب کمرے سے نکل آئی تھی۔
 ”عبدالعزیز! مہولی! ہائے اللہ کتنے پیارے ہو گئے ہو۔ کتنے چہرے مل دار اور پیسے والے آئے۔“ وہ چیخے
 سے ہی آکر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”زینب کی بڑی بڑی بوسہ کی بوسہ ہے۔“ وہ پتہ دار آنکھیں لپے پلٹا۔
 ”شوہر سے ہے۔“ وہ جلدی سے بولی۔
 ”نہیں لائی ہے۔ اور قنصل۔“
 ”اور۔“ وہ آنکھوں میں غمگینی بھر کر بولی۔
 ”اور بہت خوبصورت اور خوش مزاج میری طرح۔“ وہ ہنسا۔

”ہاں باقی سارے تو یہاں سڑے مزاج کے ہیں نا تو کیوں آئے ہو پھر یہاں؟“ آمنت فوراً حلق سے بولی۔
 ”وہ تو تمہارا ہے اچھا تم ہانڈ کرو۔ زینب تم سب میں زندہ بولی ہے اور جوئی! میری جھگڑا کیا حال ہے۔ اماں
 بی! یہ تو بڑی بڑی ہو گئی ہے اور لگتا ہے اس کی زبان خاصی پھولتی ہوئی ہے۔ لگتا ہے خوب چلائی ہے جو کھس گئی
 ہے بھائی کے پاس نہیں آئی۔“ وہ محبت سے اور ٹیٹھی ہو کر یہ سب بولا۔ اوسب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بھائی کی
 فرمائش پر اچھ کر اماں بی کے تحت پر آئی۔

”یہ بہت بڑی بڑی ہو گئی ہے مہولی!“ زینب بولی۔ جو یہ نے شکایتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ آمنت نے
 زینب کو شہ کاویا۔ ”خیر رہو تم۔“
 ”کیسی ہو ہوئی! میں تمہیں بہت پس کرتا ہوں۔“ کلاس میں ہوا۔ ”اس کے شرم گھونٹے گھونٹے اتھ
 تھاہ کر بولا۔

”کلاس۔ ہا۔ بڑی اونچی کلاس۔“ زینب نے ہی۔
 ”زینب! آپ رو تم۔“ اماں بی نے اسے جھڑکا۔ ”تم مجھ سے بات کرو۔“
 ”جی ہاں۔“ وہ اماں بی کی طرف مڑ گیا۔
 ”تم نے یہ کام کیوں کیا بھانڈوں والا عبدالعزیز! تمہارے باپ کی اپنے خاندان کی عزت کا اپنے پیٹے کا کچھ
 خیال نہ آیا۔“ وہ بھی ہو کر بولی۔

”اماں بی! آج کل کوئی بھی پیشہ برا نہیں اب مجھے زندگی گزارنے کو کچھ تو کرنا تھا۔ تعلیم میرے پاس نہیں تھی
 ہنر مجھے کوئی نہیں آتا تھا۔ مزدور بننے سے میں رہا۔ لو نے کر اللہ کی عطا کردہ یہ نعمت ہی تھی جسے کام میں لایا ہوں
 تو زمانہ مہسوت ہو کر رہنے لگا میری آواز کو۔“

”ارے کم نصیب! اللہ نے یہ آواز تو تجھے اپنے پیارے کلام کی تلاوت کے لیے عطا کی تھی۔ سورہ رحمن کتنی
 خوبصورت قرأت میں پڑھتے تھے تم کہ راہ چلنے لوگ رگ رگ جاتے تھے تجھے سننے کو اور تو نے اللہ کی عطا کردہ اس
 نیک نعمت کو اس شخصوں گندے دھندے میں ڈکھایا۔“ وہ انہوں سے بولیں۔
 ”اماں جی! آپ نہیں سمجھیں گی کوئی کام گندا نہیں ہوتا پھر جس سے بندے کی روزی بندھی ہو وہ دھندہ کیسے
 گندا ہو سکتا ہے۔ میری روزی رب نے ایسے لکھی تھی۔“

”ہائے بھائی! ہمیں بھی لے چلو اپنے ساتھ۔ تمہارا تو اب خوب بڑا سا گھر ہو گا گاڑی بھی۔“ زینب اس کے
 کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہنے ہی وہ زانو بیٹھ گئی۔
 ”ہاں۔“ لیتے ہی تو آیا ہوں اماں بی! میں آپ لوگوں کو لینے آیا ہوں میرے ساتھ چلیں۔ بہت بڑا سا گھر لیا ہے

"خدا حافظ! امان بتی! وہ وہ کئی دن سے کہہ کر مڑا اور دست قدموں سے بیڑھیاں اتر گیا۔ امان ہی کا دل سینے میں تڑپ اٹھا۔ بے ساختہ چاہا کہ اس کے جاتے قدموں کو روک لیں مگر صوفی صاحب کا آتشیں چہرہ انہیں ایک پل میں گھٹا اٹھا کر گیا۔

"کیا جان! میں شہر جا رہا ہوں، کل واپس آؤں گا۔" سلطان بخت نے لاؤنج میں بیٹھی سیدہ سے گزرتے ہوئے کہا۔

"تو سلطان بخت!"

"جی ہاں! وہ رک گئے مگر پاس نہیں آئے۔"

"تم نے صالح کے ساتھ زیادتی کی ہے۔"

"تو کیا معافی مانگوں جا کر؟" وہ بڑ کر بولے۔

"میں یہ نہیں کہتی وہ غصے میں حسین شاہ کے پاس چلی گئی ہے۔"

"تو کیا جا کر حسین شاہ کے پاؤں پکڑ لوں۔"

"میں یہ کب کر رہی ہوں تم اور تو آؤ۔"

"کیا کروں گا اور آکر۔" وہ جیسے جھکے جھکے سے انداز میں مڑے اور قریبی صوفی صاحب کے کنارے پر دک کر بولے۔

"متم شہر جا رہے ہو، صالح کو بولی جا چکی ہے اور میں بھی تھوڑی دیر میں گھسے والی ہوں۔ رات کو حسین شاہ کے کچھ فلاحی مہمانوں کو جمع کر رہے ہیں انھیں باگروٹ کا انتظام کرنا ہے، میں اور رات نہیں رکھ سکتی۔ اب تم بھی جاؤ۔" وہ آواز دیا۔

"تو کیا کروں؟" وہ سوچنے لگا۔ "شہر پہنچنے سے پہلے اس کے پاس لے جاؤں گا۔" وہ بولے۔ "صالح مسئلہ بتایا۔" "تو کیا کروں؟" وہ سوچنے لگا۔ "شہر پہنچنے سے پہلے اس کے پاس لے جاؤں گا۔" وہ بولے۔ "صالح مسئلہ بتایا۔" "تو کیا کروں؟" وہ سوچنے لگا۔ "شہر پہنچنے سے پہلے اس کے پاس لے جاؤں گا۔" وہ بولے۔ "صالح مسئلہ بتایا۔"

"اب اس لئے جاؤں کبھی بھی نہیں۔" وہ سچے سے اصرار سے بولے۔ "اس کا دل اگلے ہی ساتویں آسمان پر رہتا ہے اور وہاں اپنے بھائی کے گھر میں اس نے تو شاکر کر دینا ہے اور میرے دل میں اتنا بھیجا نہیں کہ اس کے ساتھ مغز باری کروں۔ آپ سے جو ہو جائے۔" وہ بولے۔ "وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔" "اچھا سنو، مجھ تو کسی۔" "خدا حافظ! سیدہ کاموڈا اچھا تھا۔" سلطان بخت کی آواز کی کسبلی جھنجھکی اور اس سے ہم کیے جا رہی تھیں۔

"جی بولے مجھے وہ یہ وہی ہے۔"

"شہرینہ کی رخصتی ایک ماہ بعد کر دینی ہے۔ پہلے صالح کا تم سے حکم لے لیا جائے۔ شہرینہ ہم دونوں سے ابھی تھی اس میں بات کا دل میں شہر لانا کہی تھی کہ نہ ہوا۔" وہ بولے۔ "اس میں کئی گراہی ہے۔" "شہرینہ کے بعد میں سوچ رہی ہوں۔" "جی جلدی، وہ شہرینہ کی رخصتی کر دی جائے۔ اس سے پہلے کہ صالح کی الزام تراشیاں پکھ اور ایک اختیار کر لیں۔" "شہرینہ کی سوچ آئی۔"

"اچھی بات ہے! آئی آ کر بولے۔"

"تم سیدہ کی رخصتی کی تیاریاں کرو۔ میرے کہنے کا یہ مطلب ہے۔"

"کیا جان! ہم کوئی بھوکے ننگے ہیں۔" وہ ٹٹک کر بولے۔ "جس جس چیز کی ضرورت ہے اس کی لسٹ بنا کر میسر کو فون کر دوں۔" ساتھ جانا چاہیں تو ساتھ چلی جائیں۔ وہ سب کچھ ایک ہفتے میں پروا دینے کے لئے گا۔ شہرینہ خود شاپنگ کے لئے جانا چاہے تو آپ ساتھ چلی جائیں یہ کوئی مسئلہ نہیں۔" انہوں نے چٹیلوں میں مسئلہ حل کر دیا۔

"سلطان بخت! شاہیاں اس طرح نہیں ہوا کرتیں۔" "پھر بتائیں مجھے کس طرح ہوا کرتی ہیں۔" "وہ بڑ کر بولے۔" "کیا جان! میں اس لمبی بحث کا میرے پاس وقت نہیں ہے اور ہاں۔" وہ رکے ایک ضروری بات مجھے بھی آپ سے کرنا تھی۔" "وہ کیا؟"

"بس۔ مجھے ۳ نہیں جیسے صحیح بدلہ نہیں سوجھ رہا تھا۔" اس حویلی کو ایک وارث کی ضرورت ہے۔" "اس میں شک الی کون سی بات ہے۔"

"میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔" ایک لمحے کو تھوڑے کامنہ کھلے کا ظاہر کیا اور جو اسلام آباد میں تھوڑے رکھا ہے اگر وہ یہ اعتراف طشت از باہر کر دیتیں تو اب تک حسین شاہ انہیں کب کا قاضی کر چکے ہوتے۔ "تمہیں معلوم ہے سلطان بخت، تم کیا کر رہے ہو؟" وہ بولے۔ "میں نے سنا ہے۔"

"اس کا فرق اس بات کے درمیان ہے تم آگاہ ہونا؟" وہ جیسے یقینی سے بولیں۔

"کیا جان! اپنی عمر کی زندگی آپ کی زندگی کے عوض رہن رکھ دی گئی ہے۔ اگر میں دوسری شادی کر لوں گا تو کیا ہوگا۔ حسین شاہ آپ کو ملنے سے دے گا۔ آخر اس دوسرے نے اور میری زندگی کتنی تباہ کر لی ہے، کیا جان! کیا میرا اپنی زندگی پر کچھ حق نہیں اور میں یہ سب اپنے لئے نہیں کرنا چاہ رہا اس حویلی کے لیے اس کے وارث کے لیے کیا آپ چاہتی ہیں میں بے نشان مر جاؤں؟" "تم تیز تیز بول رہے تھے۔" "خدا نہ کرے۔ کسی بد فال باتیں منہ سے نکال رہے ہو۔"

"کیا جان! میں نے بہت سوچا ہے۔ کیا آپ نہیں سوچیں پھر آپ میری کیسی خیر خواہ ہیں۔ اپنی خاطر میری زندگی کو کس کی خاطر رہی ہے۔" "صالح نے کوئی ذہنی دلی نوشی دی ہے جو میں آسودہ حال رہوں۔ اس پر اکتفا کروں۔" "وہ بولے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے میں کچھ نہیں سوچتی اس حویلی کے متعلق۔" "سیدہ کو غصہ آیا۔"

"سوچتی ہیں مگر پہلے اپنے مفاد کو سامنے رکھ کر۔" "مجھے پالنے کا اچھا تاوان لیا ہے آپ نے اور کتنا خرچ ہوں آپ کی قربانیاں کو۔" "تم کریں اب مجھ کو کچھ نہیں آپ سے کہہ رہا ہوں۔ یہ ہو کر رہے گا ایک دن۔" "خدا حافظ۔" "تیز تیز بولتے ہو کہ نہیں اور اگلے سیدہ کی بیکار کو نظر انداز کر کے باہر گاڑی میں آئیے۔" "مجھے کھلونا سمجھ لیا ہے انہوں نے اور میری زندگی کو کھیل سپانچ بیٹیوں کا طریق گلے میں بڑھکا ہے پھر بھی ان کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔" "سین شاہ چھوڑیں۔" "سین شاہ بھڑکیں۔" "ایک ہی رشتہ وہ بڑی تیزی سے گاڑی حویلی سے نکلتی ہے۔" "سیدہ کو کئی دن کی سلامتی کی دعا میں مانتی رہیں۔"

"تین نار۔" "کھلی فضا میں آتے ہی انہوں نے اپنا ذہن بدلا کیا ان اس کی خاطر تو وہ شہر جا رہے تھے اس دن کی تلخ ملاقات کے بعد تین نار ان کا کوئی فون آئینڈ کر رہی تھی۔ اس نے خواہ نہیں فون کیا تھا۔ ایک دن جلدی میں "کل کدہ" بھی گئے تھے وہ ملی نہیں تھی۔"

"اس کو منانا بھی ایک علیحدہ دور ہے۔" انہوں نے اکیسٹرنگ پر ہاتھ مارا۔

"تین نار اس روز بھی ان کے لئے دوسرے ثابت ہوئی تھی۔ کسی طرح قابو میں نہیں آ رہی تھی۔"

"شہرینہ! میں مر رہی ہوں اس کی تھک لے وہ پھر بھی نہیں بھول سکتی۔"

"کتنی بار تو معافی مانگ چکا ہوں۔ تمہیں معلوم بھی تھا اس روز میرا ذہن کس کیفیت میں تھا پھر بھی تم میرا ذہن اڑاتے ہو۔" "میں نے تم سے محبت کا دعویٰ ہے پھر یہ کیسی محبت ہے تین نار جو تم میرا مسخر اڑاتے ہو۔" "میں نے تمہیں میرے ذہنوں پر ٹھک چھڑکنے۔ تمہیں ذرا بھی میرے احساسات کی فکر نہ تھی۔" "وہ دیکھی لیجے میں بولے تو تین نار کو یہ ایک احساس ہوا کہ اس روز واقعی اس نے غلط کیا تھا۔"

”تمہیں جو ملی کی چاہ تھی یا بالکل انجلی تو بندش سے رکاوٹ ہے پابندی ہے آزاد زندگی کے لیے۔ تم ادھر ہر طرح سے آزاد ہو۔ میں نے تمہیں کیا کچھ نہیں دے رکھا۔ تمہارے ایک اشارے پر بھاگا چلا آتا ہوں۔ جب چاہتی ہو ملکوں ملکوں میرے ساتھ گھومتے چل پڑتی ہو جتنی گاڑی یا گھر ہو یہ پیسہ کس چیز کی کمی ہے تمہیں۔ پھر شوہر میں بھی اپنا شوق پورا کر رہی ہو۔ تم نے کون سا میری پابندی کی پروا کی ہے۔ جاؤ جا کر جو ملی میں ویسے صاف کیسی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں نہ شوہر نہ اس کی محبت نہ توجہ نہ ہر وہی آزادی کچھ بھی نہیں۔ اس کا سب کچھ تو تم نے لوٹ لیا ہے۔ وہ تو اب صرف نشانِ عبرت بن کر رہ گئی ہے ہر وقت ڈیپریژن کی مریض۔ تم میری محبت میری زندگی ہو اور وہی زندگی بھی۔“ اتنے پیار اتنی نرمی سے میں تارا کو سلطانِ بخت نے کبھی نہیں سمجھایا تھا اس کے بالوں کو سلجھاتے ہوئے وہ اسے بہت پیار محبت و حیان سے سمجھا رہے تھے۔ ان کی نرم انگلیوں کا لمس سیدھا اس کے دل میں جا اترتا تھا۔

”سوری شادی! میں نے اس دن واقعی غلط کیا تھا۔ آئی ایم سوری۔“ وہ فوراً ”من گئی تھی۔“ اس کے۔ تمہارا بھی قصور نہیں۔ سو کن کی جگہ ہی ایسی ہوتی ہے کہ بندے کا خود پریشانی اختیار کرنا پڑتا ہے چلو آج ڈنریا ہر کرتے ہیں پھر گھر چلیں گے۔ آج رات بس ادھر ہی رہوں گا۔ پھر صبح اپنے رویے کی تلافی کروں گا۔“ وہ آج دل و جان سے اس کے ہو رہے تھے۔

”شادی! ایک فرمائش۔“ وہ ان کے ”مضبوط ہاتھوں سے کیلتے ہو۔“

”وہ کیا؟“ وہ تو سراپا محبت بھری نظر بنے ہوئے تھے۔

”گاڑی۔۔۔ میری گاڑی برائی ہو گئی ہے۔ نئی چاہیے۔“ اس نے ان کی شرٹ کے پٹوں سے کھیل رہی تھی۔

”کل صبح چلیں گے اور پچھ؟“ وہ دل نواز مسکراہٹ سے بولے۔

”کچھ شاپنگ بھی کرنی ہے اس کے لیے۔“ وہ چمکی۔

”کل صبح چیک لکھ دوں گا بیٹے کا کوئی اور کچھ۔“

”بس۔ میں ڈنر کے لیے تیار ہوتی ہوں۔“ اس کے دل کا پتہ ان کی محبت کے سرو سے لہا لہا بھر گیا تھا۔

پھر ڈنر کے دوران ہی سلطانِ بخت کو نہ جانے کیا ہوا۔ عجیب سا خیال آ رہا تھا۔

اگر تاجان بھی چلی گئی ہوں تو شہریت اعلیٰ ہوئی اور وہ ضدی سا لگا رہا۔ تو بھی نہیں آئے گی۔ مجھے جو ملی جانا چاہیے۔“ کھانے کی دوران بھی یہ سوچ بار بار ان کا ذہن چمکاتی رہی۔

”تھک سے کھا نہیں رہے آپ بیابا ہے؟“ مین تارا اسے نہیں لوظ۔

”میں کچھ نہیں۔“ وہ مسکرائے۔

”مین تارا ایسا ہے کہ میں کل صبح یار بیک کے قریب آ جاؤں گا تمہیں شروع شروع میں لے جانے کے لیے۔“ اس نے مجھے جو ملی جانا ہے۔ ایک اہم کام یاد آ گیا ہے پلیز تم مائنڈ مت کرنا۔ کل کی رات تمہاری۔“ کل کہہ کے آگے ہی انہوں نے گاڑی روک لی تھی۔ مین تارا نے چہرے کے تاثرات ایک دم سے بدل گئے تھے۔

”کیا مطلب؟“

”ضروری کام ڈیپریٹر اس کل رات کا۔“ مین تارا الجھ سی گئی اس نے ایک نظر اپنی تیاری پر ڈالی۔ سکاڑا ریڈ کلر کی شارٹ شرٹ بلیک ٹراڈرز جیک جیولری اور میچنگ ایک اسپاٹ تیار ہی ہونے میں دو گھنٹے لگ گئے تھے۔

”تمہارا ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ مصوفی صاحب کی آواز رات کے سٹائے میں بخوبی سنی جا سکتی تھی۔

”زنہب کو فینڈ نہیں آرہی تھی کہ میں کھن میں کھن کچھ است۔ آج کل رات کو فینڈ بھی نہیں آتی تھی۔ مرم میں خوابوں کی تعبیریں اسے سونے ہی نہیں دیتی تھیں۔ وہ چپکے سے باہر نخت پر آکر بیٹھی ہی تھی کہ مصوفی صاحب کی

”آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

”کون نذیر! اماں جی کی آواز کانوں میں گونسی۔ کمزوری کی وجہ سے آج کل بہت دھیمی آواز میں بولنے لگی تھیں۔“

”یہ جو نیا مڈن آیا ہے مسجد میں۔ تم نے دیکھا ہے نا۔“

”کچھ خاص نہیں دیکھا۔ پچھلے دنوں کو کھانے کی رے لو پر ویسے آیا تھا تو میٹریوں کے پاس ذرا سی تھلک دیکھی تھی آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”میں اس سے زنہب کا رشتہ لے کر رہا ہوں۔“ تمہارا ایک دم تھا جو رات کی تاریکی اور سٹائے میں زنہب کے بالکل پاس آکر بیٹھا تھا وہ تو نخت پر نیم دراز فضا کی خنکی کو محسوس ہی کرنے لگی تھی ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”کیا۔ کیا مطلب؟“ اماں جی کو بھی یقیناً ”گرتا دکا تھا۔“

”مطلب کیا۔ میں نے کوئی مشکل بات کی ہے۔“ مصوفی صاحب نے ناگواری سے کہا۔ ”اچھا لڑکا ہے۔“

”میں نے اب وہ لڑکا نہیں چاہا۔ سال کا مہر ہے کمزور تھی سا۔ آوی سا اماں جی نے جیسے انہیں یاد دلایا۔“

”مہر بھی چاہیں سال کا نہیں ہوتا۔ کنوارا ہے ابھی تک۔ شادی نہیں کی گاؤں میں اپنا پکا کوٹھا ہے۔ ایک بوڑھی ماں ہے ادھر اور بھی ایک بہن ہے شادی شدہ ہے۔ ادھر تنخواہ بھی پاتا ہے اور ایک دوسرے مدرسے میں پڑھانے بھی جاتا ہے۔ ادھر بھی اچھا پڑھ لے لیتا ہے۔ بیوی کا بوجھ بخوبی اٹھا سکتا ہے۔ شریف ہے عقل مند ہے گھر بیٹانے کا شوقین بھی۔ میں نے اسے آٹھ ماہ میں اچھی طرح پرکھ لیا ہے۔ کوئی خالی جگہ اس میں نظر نہیں آتی۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ ایک دو ماہ تک زنہب کا نکاح کر کے اسے رخصت کروں گا۔ آٹھ کے لیے بھی میں نے اپنے ایک وقف کار سے کہہ رکھا ہے۔ دو چار دنوں تک وہ بھی کوئی نہ کوئی اچھا رشتہ لے آئے گا۔ بس اب میں اپنے ان اوصاف سے جلد جلد رخصت ہونا چاہ رہا ہوں۔ میری رشا رنٹ میں دو سال ہیں۔“ مصوفی صاحب نے کچھ طے کیے بیٹھتے تھے۔

”معاف بیٹے کا مصوفی صاحب! اس کو بگوش ہونا نہیں سر سے بوجھ اتارنا کہتے ہیں۔“

”تم اس کو جو بھی کہو میں نے یہ سب سوچ لیا ہے۔ ان دنوں کے بعد جو یہ بھی ہے میں تو بلکہ سب سے پہلے جو یہ یہی کا کرنا چاہ رہا تھا نذیر نے زنہب کی خواہش ظاہر کی تو میں نے ہامی بھری۔“

”ہامی بھر بھی لی۔“ اماں جی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ اماں کی چار پائی زور سے چرچائی تھی۔

”وہ پولیو زہہ“ منجھو رنٹ میں نذیر میرے لیے رہ گیا ہے۔“ زنہب نخت پر بیٹھی مٹھیاں بھینچ رہی تھی۔

”ہاں تو اور میں نے کیا کہہ رہا ہوں اتنی دیر سے۔“ مصوفی صاحب اپنے اسی بارعب لہجے میں بولے۔

”مصوفی صاحب! آپ کو زنہب کی خبر ہے نا۔“

”کیا۔ کیا خبر ہے بیٹے زنہب کے بارے میں۔“ وہ غصے سے بولے۔

”وہ بنگامہ کھڑا کر کے۔“ وہ بے لہجے میں بولیں۔

”را بھری بی بی!“ مصوفی صاحب دہشتے لہجے میں اصرار سے۔ ”کیا تمہاری تربیت ایسی ہے کہ وہ ایک جائز بات پر ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔“

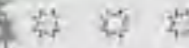
”بہر حال میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ میں اپنی ہی زندگی میں ان تینوں قرآنص سے فارغ ہونا چاہتا ہوں عزت اور آبرو کے ساتھ۔ خدا نے وہ بیٹے دیے تھے۔ کبھی سوچا تھا دونوں میرا بوجھ بنائیں گے میرے بازنہب کے ایک نے جیتے جی مجھے مار ڈالا دوسرا حرام کاموں میں الجھ گیا اور آگ کے انکارے بھر بھر کر ادھر بھی لانا ہے۔ اس سے پہلے کہ تمہارا تمہاری بچیاں ان انکاروں کو جسم و جاں کی حرارت کے لیے فرط اشتیاق سے اپنے دامن میں بھریں۔ میں ان سے بچنے کا انتظام کرنا چاہتا ہوں۔ آٹھ اور زنہب کا نکاح انشاء اللہ ایک دو ماہ میں اکٹھے کروں گا جو کچھ تم نے جمع کر رکھا ہے اس کی تفصیل بھی مجھے ایک دو دن میں بتا دینا۔ میں نے بھی کچھ لوگوں سے جن کے گھروں میں بچوں کو

قرآن پاک پڑھانے جاتا ہوں ان سے کہہ رکھا ہے بڑے لوگ ہوی ذکوۃ نکالتے ہیں۔ انشاء اللہ ہم اپنی بچیوں کو بڑے اچھے طریقے سے رخصت کر سکیں گے۔ اس کے بعد جو یہ رہ جائے گی۔ اس کا بھی اللہ نے چاہا تو اس سال کے آخر تک کہیں نہ کہیں کر دوں گا۔" وہ رکے "رابعہ بی بی! میں دل کا میرا پس ہوں۔ میری زندگی کا اب کچھ بھروسا نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے مرنے کے بعد میری بچیاں ویرانہ کی ٹھوکریں کھائیں یا بھائیوں کے آگے جا کر ہاتھ پھیلا لیں۔ یہ میرا بوجھ ہے۔ انہیں میں ہی اٹھاؤں گا تم بس دعا کرنا۔"

مگر صوفی صاحب! اس طرح جلد بازی میں رشتے ناتے طے نہیں کیے جاتے۔ آپ کچھ دن اور دیکھ بھال کر کچھ اور رشتے۔"

"رابعہ بی بی! بس اب میں اس موضوع پر اور کچھ نہیں سنوں گا۔ زینب کا رشتہ طے ہو چکا ہے۔ آمنہ کا چند دنوں تک ہو جائے گا۔ بہتر ہے تم زینب سے کہو اب کلج جانا بند کر دو۔ اپنی زبان میں اپنی اس گستاخ لڑکی کو سمجھاؤ تاہم کچھ کہنے کی نوبت نہ آئے۔ اب سو جاؤ صبح پھر تجھ کے لیے آنکھ نہیں کھلتی۔" انہوں نے کہتے ہوئے کروشلی تھی۔

"سمجھاؤں گی تو میں اب آپ کو بابا صاحب! زینب کوئی بھیڑ بکری نہیں ہے جسے آپ نڈر چیلے کلو کے پٹے سے باندھ دیں گے۔ میں کوئی عام لڑکی نہیں ہوں۔ ذرا جا کر سیٹھی کے دل سے تو پوچھیں۔ آپ چاہتے ہیں۔ میں ایک زندان سے نکل کر دوسرے میں دفن ہو جاؤں۔ کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔" وہ زور زور سے سر ہلا رہی تھی۔



سلطان بخت کو جو ملی آتے آتے بھی ایک بیچ گیا تھا معلوم نہیں کون ان کا دل تنگ سا ہو رہا تھا۔

"آخر کیا ہونے والا ہے۔ میرا دل اس قدر پیچھے پیچھے کیوں جا رہا ہے۔" انہوں نے پریشانی سے سوچا۔ ان کی گاڑی اب حویلی کی طرف جانے والی کچی پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔

"بہت دیر ہو گئی۔ آیا تو چلی گئی ہوں گی۔" دل کی کیفیت کا اثر زائل کرنے کے لئے وہ ادھر ادھر کی باتیں سوچ رہے تھے۔

گاؤں میں ہو کا عالم تھا۔ دور کہیں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ قریب کے کسی کھیت میں کوئی گیدڑ رو رہا تھا۔ اس کی منٹوس آواز اور ان کا دل برا کر رہی تھی۔ ان کی گاڑی پچی پگڈنڈی پر ڈولتی جا رہی تھی کہ سامنے سے آئی ایک اور گاڑی نے جیسے ان کا رستہ روک لیا تھا۔ گاڑی کی بیڈ لائیس میں ایک شخص کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"اس وقت حویلی کی طرف سے کسی گاڑی آ رہی ہے؟" ان کا ہاتھ ٹکا۔

"کون۔۔۔ کون ہیں آپ؟" سلطان بخت نے گاڑی کی کھڑکی سے سر نکال کر دوسری گاڑی کے ڈرائیور سے بخت لہجے میں پوچھا۔ بیڈ لائیس کی روشنی میں وہ انہیں اب صاف دکھائی دے رہا تھا بلیک ٹوپیں میں وہ ایک خوبصورت نوجوان لڑکا تھا جس کا روشن چہرہ اور سے انہیں کچھ دیکھا دیکھا سا لگ رہا تھا۔

"اور کدھر سے آ رہے ہیں؟" اس کے چہرے پر نظریں جم کر انہوں نے اسی درشتی سے پوچھا۔

"جی میں رستہ بھول گیا تھا، آپ کی حویلی کے ملازم نے گائیڈ کر دیا ہے، میں روڈ سے بھٹک گیا تھا اب جا رہا ہوں۔" اس کی آواز بے حد صاف تھی اور لہجہ براعتا۔

سلطان بخت کی نگاہیں ابھی بھی غیر مطمئن تھیں، پھر بھی انہوں نے خفیف سا سر ہلا کر اپنی گاڑی آگے عبدالمعبین نے ایک گہرا سانس لے کر سیٹ کے نیچے بیٹھی شہینہ کو دیکھا اور گاڑی اس کچی پگڈنڈی سے نکالنے لگا۔



صبح بہت ہنگامہ خیز تھی اور بہت خوف ناک بھی۔ شہینہ پوری حویلی میں گھوم رہی تھی۔

سلطان بخت رات کو حویلی لوٹے تو تقریباً "سب ملازمین سو چکے تھے۔ حویلی کی مین لائٹس بجھ چکی تھیں جو کیدار سے انہیں اس نوجوان کے بارے میں پوچھنا یاد نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے ذرا سی دیر کو شہینہ کے کمرے کے آگے رکے بھی۔ اس کے کمرے کا دروازہ لاکڑ تھا اور دروازے کے نیچے سے ٹائٹ بلب کی روشنی کی ہلکی سی لکیر باہر آ رہی تھی وہ مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں آگے۔

صبح ناشتے کے لیے بھی وہ جلدی اٹھ گئے۔ ڈائمنگ ٹیبل پر بیٹھ کر ملازمہ کو شہینہ کو بلاانے کے لیے بھیجا جس نے آ کر بتایا کہ شہینہ اپنے کمرے میں نہیں ہے۔

اس کی اطلاع اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ اخبار کا سپورٹس والا صفحہ ان کے ہاتھ سے ہی نیچے گر گیا۔

"کیا بک رہی ہو؟" وہ قہر ناک نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"شہینہ جی! میں ان کے کمرے کے ہاتھ روم اسٹڈی لائونگ سب طرف دیکھ آئی ہوں اور حویلی میں تو میں نے انہیں صبح سے نہیں دیکھا۔ میں تو بیٹھی چرویلے سے انہی ہوئی ہوں۔"

وہ بڑے یقین سے کہہ رہی تھی۔ ان کا اظہار جملہ کیا ہونا چاہیے وہ اس کے یقین لہجے پر ٹھنک کر سوچنے لگے۔

"اوپر مجھے یاد آیا۔ میں رات کو پورے آیا تھا۔ شہینہ نے مجھے اپنی طرف پھلنے کو کہا تھا۔ میں ہی اسے اوپر چھوڑ کر آیا تھا۔ تم وہ کارڈ لیس آؤ۔ ملازمین آپ کو فون کرتا ہوں۔"

وہ سوچ سوچ کر بول رہے تھے۔ ملازمہ کی نظریں صاف اس کے بے یقین ہونے کی چغلی کھا رہی تھیں۔ وہ جلدی سے کارڈ لیس اٹھلائی۔

"اور تم۔" ملازمہ جانے لگی تھی کہ سلطان بخت نے اسے روکا۔

"جی! وہ ہلٹ کر دیکھنے لگی۔"

"تم ادھر جا کر کون سے کمرے میں بیٹھ جاؤ، ابھی اس کمرے سے باہر نہیں جاؤ گی؟" انہوں نے ڈانٹ کر اسے ڈائمنگ روم کے آخری کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ حیرانی سے انہیں دیکھنے لگی۔

"کیوں شاہ بی؟" ملازمہ نئی لگتی تھی جو یوں حال کرنے کی جرأت کر رہی تھی اور سلطان بخت نے اسے حویلی میں دیکھا بھی پہلی بار تھا۔

"میں نے تم سے کہا ہے وہ کرو سوالیہ صحت کرو دفع ہو جاؤ۔" وہ زور سے دھاڑے تو وہ سمجھ کر اس کمرے کی طرف دوڑی اور چھوٹے سوٹ کے پیچھے دیک کر بیٹھ گئی۔ سلطان بخت مدھم آواز میں سیدھے سے بات کرنے لگی۔

"آپ! میں ابھی پوری حویلی چیک نہیں کر سکا اگر یہ خبر ڈالت، پھر یہ خبر درست ہوئی تو ہم سب کو نہ زمین کے نیچے جگہ ملے گی۔" ملازمہ نے کہا تو اسے ایک پل سے بھی پہلے یہاں آئیں اور آکر خود دیکھیں اور اس جوابی زاویے کو دیکھیں۔ اس نے اسے جس کے دفع ہو جانے کی وجہ سے وہ یہاں سے جانے کی جرأت کر سکتی ہے۔"

انہوں نے شعلہ بارنگاہوں سے دور بیٹھی سہمی ہوئی ملازمہ کو گھورا اور فون بند کر دیا ان کے خون میں جیسے پتنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ لہجہ بے لحد فشار خون بلند ہو گیا تھا۔

سیدہ گیارہویں منٹ میں صاف کے ساتھ حویلی میں موجود تھیں۔

ان دونوں نے خود ہی آدھ کھٹے میں پوری حویلی چھان ماری۔

شہینہ اس عالی شان حویلی کے ماتھے پر بدنامی اور ذلت کا جھومر سجا کر جا چکی ہے۔ انہیں یقین ہے کہ گیا اور اس یقین کی سند اس کے بیڈ روم کے دروازے سے بھی مل گئی۔

"آپا جان اور مال! آپ دونوں نے میرے ساتھ بے حد زیادتی کی۔ کیا میں آپ دونوں پر اس قدر بوجھ تھی کہ مجھے اٹھا کر آپ نے اسی سال بڈھے کے سر پر تھوپ دیا۔ میرے بابا جان زندہ ہونے تو کیا میرے ساتھ وہ یہ زیادتی ہونے دیتے؟ میں نے تو ان کے بعد آپ دونوں کو ہی اپنا سب کچھ سمجھا تھا اور آپ نے شدید دھوکا کیا میرے ساتھ اور میرے احتجاج انکار کو کچھ بھی نہ سمجھا تو پھر میں آپ لوگوں سے مزید کیا توقع رکھوں جب آپ کو میری پروا

میری فکر نہیں تو مجھے بھی آپ کا خیال نہیں آپ کا نہ آپ کی عزت و آبرو کا۔ مجھے اپنی زندگی اپنی مرضی اور اپنی خوشی سے گزارنے کا پوری طرح سے حق حاصل ہے میں بائخ ہوں آزا اور خود مختار اپنے لیے جو بہتر سمجھوں گی کر سکتی ہوں۔ ابھی میں اُدھر سے کچھ بھی نہیں لے کر جا رہی۔ سوائے تھوڑی بہت نقدی اور زیور کے۔ لیکن میں اپنے حق سے دست بردار نہیں ہوتی۔ اپنے قدم زمین پر مضبوطی سے تھامنے کے بعد اپنا حق لینے ضرور آؤں گی اور وہ دن کل صبح کا بھی ہو سکتا ہے اور چند ماہ بعد کا بھی۔ آپ لوگ تیار رہیں گے۔ میں اس طرح چلانا نہیں چاہ رہی تھی آپ لوگ اپنا فیصلہ اگر اس طرح کچھ پر نہ کھوئے تو شاید میں یہ قدم بھی نہ اٹھاتی۔ ہر کلمہ کو منطقی مسلمان اللہ کا پیارا ہوتا ہے۔ صرف سید زادے نہیں اور مجھے کلمہ گو ٹیک ہم عمر مسلمان ہم نوا کی ضرورت ہے، اتنی سالہ ارب تی بڑھے کی نہیں۔ میں اس کی دولت کا تقن پین کر بھری جوانی میں مرنا نہیں چاہتی نہ سونے کے ڈھیر میں دفن ہو کر خود کو جتنی قبر میں اتار سکتی ہوں۔

امید ہے آپ لوگوں کو میری بات کچھ میں آئی ہوگی۔ مجھے ڈھونڈنے کی حماقت مت کیجئے گا اور آپس سے امید تو آپ یقیناً نہیں کریں گے۔ میں خود ہی چند دنوں تک آپ سے رابطہ کر لوں گی۔

”وہوٹڈ نے۔“ سلطان بخت نے مٹھیاں بھینجیں۔ ”بد بخت آپ مجھے ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آنے کی۔ میں تیرے ہونے کا جوازی شتم کروں گا۔ بے غیرت تیرا ہر نشان مٹا دوں گا۔“
 دو روکنے میں سہمی ہوئی بیٹھی ملازمہ پر نظر بٹاتے، انتہی بیچھے شہر غصے کے عالم میں بدروائے۔ سیدہ ہاتھ میں کلفڈ لیے بے حس بیٹھی تھیں صاف کاچرو ہر تاثر سے عادی تھا۔
 ”اب کیا کریں سلطان بخت؟“ سیدہ کی آواز کسی قبر سے آئی تھی۔
 ”کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی آتا ہوں آپ اس کو باہر میں جانے دینا۔“ سلطان بخت باہر جاتے ہوئے اس ملازمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے جو اب رو دیکھئے کو بھی سلطان بخت کہہ گیا ہے۔“ سیدہ سوچنے لگیں۔

بروقت طبی ادا ملنے سے مشی کی جان توج گئی تھی مگر خون بہت بہہ گیا تھا اور زخم بھی بہت گہرا آیا تھا حالت بھی خطرے سے باہر نہیں بتائی جا رہی تھی آگے وہ آئی ہی بوید رہی تھی۔
 یا سمین اور انظر آئی سی یو میں کئی گھنٹے سے مسلسل نپھل رہے تھے۔ معاذ صوفی پر بیٹھا ان کی پریشان صور توں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خود کچھ ہی دیر پہلے آئی سی یو سے باہر آیا تھا۔
 ”آپ لوگ بیٹھ جائیں۔ اب مشی ٹھیک ہے۔“ کافی دیر انہیں یوں بے قراری سے غمگین دیکھ کر معاذ نے کہا۔
 ”میری بیٹی اسے کچھ ہو جاتا تو میں تو اس کے ساتھ ہی مر جاتی۔“ یا سمین سینے پر دو ہتھ مارتے ہوئے بولی۔
 ”کچھ ہو“ سے تو اپنی ہی وجہ سے ہوتا۔“ انظر غمی سے بولے۔
 اس نازک گھڑی میں تو آپا سے کچھ مت کہیں۔“ یا سمین روتے ہوئے بولی۔
 ”جب کر جاؤ تمہاری تربیت اور اڈ کا نتیجہ ہے جو نوبت یہاں تک آئی۔“ انظر غمی سے چلائے۔
 ”پلیز انظر غمی! ہاسپٹل ہے۔ پھر آئی سی یو کے باہروں بولنا۔“ آئیے ادھر وینٹنگ روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ معاذ ان کا بازو تھامتے ہوئے بولا۔
 ”میں میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔“ وہ آہستگی سے اپنا بازو اس سے چھڑانے ہوئے بولے تو معاذ دوبارہ اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔
 صبح کا اجالا ہر طرف پھیل چکا تھا جب ڈاکٹر نے آکر بتایا کہ مشی کی حالت خطرے سے باہر ہے ہم تھوڑی دیر

تک نہیں روم میں شقت کر رہے ہیں تو دونوں میاں بیوی کی جان میں جان آئی۔
 پھر تھوڑی دیر بعد اسے روم میں شقت کر دیا گیا۔ ایک ہی رات میں وہ اتنی لاغر دکھائی دے رہی تھی جیسے برسوں سے بستر پر ہی ہو رنگ زرد پٹری زرد ہونٹا گندہ کو دھکی آگھیں اور بے جان جسم۔
 ”حق لڑکی! معاذ سے دیکھتے ہی پر راپا یا سمین دونوں کی طرح اس کے ہاتھ متے چومے جا رہی تھی۔
 ”پلیز آپ ایسا نہ کریں۔ ابھی انہیں رست کرنے دیں یہ تین دن کی دواؤں کی وجہ سے سو رہی ہیں۔ انہیں ابھی سونے دیں۔“ سسٹر نے ان کی دواؤں کی دیکھ کر بے نیازی سے ٹوکا تو یا سمین دل پر صبر کر کے پاس پڑے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

”ظہر یہ اپنی بہن ابھی! میرا خیال ہے آپ لوگ اب گھر جائیں میں ہوں مشی کے پاس۔“ دونوں کے متے ہوئے پیرے اور غمگین چلے دیکھ کر معاذ نے اذرا کہہ دی وہ کچھ دیر بعد کہا۔
 ”معاذ! تمہارا شکر یہ تم ساتھ نہ آتے تو یہاں کوئی بھی ڈاکٹر اسے ایڈمٹ نہیں کرتا۔“ انظر نے جھجکے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا معاذ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ”یہ تو میرا فرض تھا۔“ جیسا روایتی جملہ بھی وہ بول گیا۔
 ”میرا خیال ہے پھر میں چلتا ہوں گھنٹے دو گھنٹے تک آجاؤں گا تمہیں کے لیے سوپ وغیرہ خواہاں ہوں۔“ اپنی دیر بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا تو دونوں نے گھبرا کر اسے جیسے جانے کی اجازت دے دی۔
 ”معاذ! ہم جان کو علم ہے“ انظر نے غور وازے کے پاس اسے پکار کر پوچھا۔
 ”نہیں۔ ابھی تو نہیں۔“ وہ رک کر انہیں حوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا کہ ”جا کر بتاؤں۔“
 ”میرا خیال ہے اب جا کر بتاؤ نہ بتایا تو وہ کھائوں گی کہ مجھے لاعلم رکھا۔“ انظر کے کہنے پر وہ سر ہلاتے ہوئے باہر نکل آیا۔

دو دن اگر جب اس نے ام جان کو بتایا تو وہ کھڑا ”چلنے کو تیار ہو گئیں۔“
 ”میں نے خبر تک نہ کی۔ میں بستر میں پڑی بے قرار ہوئی رہی کہ میرے دل کو چین کیوں نہیں۔ میری بیٹی موت کی دہلیز سے واپس آئی۔ اللہ میں کیسے تیرا شکر ادا کروں۔“ وہ اونچا اونچا بول رہی تھی۔
 ”ام جان! میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ رات بھر کے رنجگے سے مزہ بھاری ہو رہا ہے میں ذرا کمر سیدھی کروں پھر ہاتھ لے کر آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔“ معاذ تیزان چہرے کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔
 ”تم ٹھیک گئے ہو تو مجھے وہ میں کسی اور کے ساتھ چلی جانی ہوں۔“
 ”نہیں! ام جان! یہ بات نہیں۔ اچھا آپ ٹھہریں میں پہنچ کر کے ابھی آتا ہوں۔“ وہ انہیں انکار نہیں کر سکتا تھا اور ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔

”بتا نہیں یہ لڑکی کیا چاہتی ہے مجھ سے“ یوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے بڑگی ہے انظر بھائی نے اپنے منہ سے نہیں بتایا کہ اس نے نہ حرکت کیوں کی ہے مگر مجھے معلوم ہے۔ اس نے خود کسی کی کوشش کیوں کی ہے۔“
 وہ تیار ہوتے ہوئے مسلسل بدروا رہا تھا۔ پتا نہیں کیا وجہ تھی مشی اس پر بتانا دہوئی معاذ کو اس سے اسی قدر چڑھتی جا رہی تھی کچھ اس کی حرکتیں بھی صاف پڑانے والی ہوتی تھیں۔ بچپن ہی سے ماں باپ کے بہت زیادہ اذیتا رہنے اسے ضدی اور خود سیرت دیا تھا جس چیز پر ہاتھ رکھ دیتی وہ اس کی ہونا لازمی تھی اور اب یہ ”بیڑ“ معاذ تھا جس پر اس کی ضدی نگاہیں تھی اور وہ معاذ کو حاصل کرنے کے لیے بے قرار تھی اور پتہ نہ کی چیز مل جانے کے بعد وہ اس کا پتہ ستر کرتی ہے یہ بھی معاذ کے علم میں تھا اور اگر ایسا ہو جاتا تو معاذ کو اپنا انجام بہت خراب نظر آ رہا تھا کہیں ایسا بھی نہیں ہونے والی گا۔ ضدی جلال لڑکی۔“ وہ دل میں پختہ عزم کرتے ہوئے مسر خان کو ہاسپٹل لے آیا۔
 مگر اس کے سارے پختہ ارادے عمد اور عزم خاک کا ڈھیر ہو گئے۔ جب ایک ہفتے بعد مشی کو ڈسچارج کر دیا گیا۔

اگرچہ اب وہ کافی بہتر تھی مگر مسز خان کا زیادہ وقت اوجھری گزار رہا تھا اور ساتھ میں معاذ کو بھی گھسیٹ لائیں اب وہ مارا بندھا مٹھی کے کمرے میں بیٹھا تھا وہ نظروں ہی نظروں میں اپنی بے قراروں کی شدتیں اس پر وارے جا رہی تھی اسے سخت الجھن ہو رہی تھی۔

”پھر ام جان آپ نے کیا سوچا ہے؟“ ظہر نے پوچھا تھا معاذ کی حسیات الٹ ہو گئیں۔ وہ تینوں لادونچ میں بیٹھے تھے۔

”کس پارے میں؟“

”معاذ اور مٹھی کے رشتے کے پارے میں؟“ یا سمین جلدی سے بولی۔

”کوئی کچھ یا سمین! یہ رشتے تانتے تو دونوں کے معاملے ہوتے ہیں اور عمر بھر کے سلسلے؟“ وہ رکیں۔ ”میں نے معاذ سے بات کی تھی۔“ وہ ذرا کی ذرا رکیں۔

”پھر یہ کیا معاذ نے؟“ یا سمین بے قراری سے بولی۔

معاذ پر سلیوں ہو کر بیٹھ گیا۔ مٹھی کا وہ بیان بھی اب یاہر ہونے والی گفتگو پر تھا۔

”وہ نہیں مانتا ظہر۔“ ام جان بے بسی سے بولیں۔

”کیوں۔ کیوں ام جان؟“

”وہ کہتا ہے۔ میرا دل نہیں مانتا اور مجھے ابھی شادی کرنی بھی نہیں چھوڑنا کرتے جانتا ہے۔“

”ابھی شادی نہ کرے۔ غلطی کر لے جب کہ گاتب شادی کر لیں گے ام جان۔“

”ہماری ایک ہی بیٹی ہے۔ وہ موت کے منہ سے نکل کر آئی ہے اور میں دوبارہ اسے کسی کڑے مرحلے سے گزرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ پلیز! آپ اس سے بات کریں گے۔ سمجھا میں وہ آپ کی بات نہیں مانتا۔“

یا سمین رو پینے کو تھی۔

”یا سمین! بچوں جیسی باتیں نہیں کرتے۔ ایسی ایک حماقت میں نہ جت اور شہباز کے معاملے میں بھی گریچکی ہوں۔ دیکھا ہے ساری دنیا نے اس کا انجام۔“

ہائے۔ میرا کاجبہ کھٹکا ہے سوچتی ہوں جب دونوں کی صورتوں کو دیکھ گئی ہوں کہ کیوں میں نے زبردستی کی۔

کیوں اپنے ہاتھوں سے اپنے بچوں کو تباہ کیا۔ تم دونوں بھی یہ غلطی مت کرو۔“ وہ بولیں۔

”ام جان! ہم کیا کریں۔ بتائیں کیا کریں۔“ ظہر بے بسی سے بولا۔

”بھلاؤ اس کو یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ دل ملنے کی بات ہے۔ یہ زبردستی کے سودے نہیں ہوتے۔“ وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

”ام جان! سمجھائیے ہیں بہت اور اس کا نتیجہ آپ بھی دیکھ چکی ہیں۔ وہ نہیں مانتی۔“ یہ بتائیں کیا کریں؟

ظہر اس وقت ام جان ہی آخری سہارا نظر آ رہی تھیں جو ان بیٹی کی زندگی کی ذمہ داری نیا کو پار گا سکتی تھیں۔

”کیوں اسے اتنا سہرا چھوڑ دیا تھا کہ وہ اس قدر خود سر ہو گئی۔“ آنسوؤں نے نظریں یا سمین پر ٹپکائیں۔

”ام جان! اب ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔ آپ معاذ سے بات کریں۔“

”وہ نہ مانے تو کیا زبردستی کروں؟“ وہ زبردستی سے بولیں۔

”کیوں نہیں مانے گا اتنا اچھا رشتہ اور کہاں سے ملے گا اسے اور آپ نے کیا نہیں کیا اس کے ساتھ

ام جان۔ یا سمین اتحق ہے بے وقوف ہے اسے بات کرنا نہیں آتی۔ پلیز آپ غصہ نہیں کریں۔ آپ کو شکر ہے کہ میں اپنی محبت کا واسطہ دین۔ وہ مان جائے گا۔ مٹھی کی زندگی کا سوال ہے۔“

”ظہر! میرے بچے کیوں مٹھی کو تباہ کرنے پر تلے ہو۔ یہ حماقت میں بھی تو گریچکی ہوں۔ پانچ برس ہونے کو آئے

اپنے بچے کی شکل کو ترس گئی ہوں۔ پانچ برس پہلے ڈیپویشن پر جرمی منی کیا تھا۔ ابھی تک نہیں لوٹا اور میرے دل کا

کیا حال ہے۔ کس سے کہوں۔“ وہ رو پینے کو تھیں۔ ان کا ضعیف دل تو اب بات بات پر بھرتا تھا۔

”شہباز کا فون بھی نہیں آتا اب؟“

”آیا تھا چار ماہ پہلے۔ میں نے کہہ دیا کہ اب تو فون نہ کیا کر ایک سی پاروں کے مرنے کا فون تجھے آئے گا تو پھر

کر لینا۔ اس کے بعد دوبارہ نہیں آیا۔“

”وہ آتا کیوں نہیں؟“

”کہتا ہے۔ کس منہ سے آؤں۔“

”بہن! بہت سے حرکت بھی تو ایسی کی ہے۔ کوئی مرد کہاں تک ایسی عورت کو برواشت کرے۔“ یا سمین جلدی سے بولی۔

”یا سمین! کیوں اپنے مرد بھائی کا گوشت کھانے پر تلی ہو جس بات کا علم نہیں۔ اس کو مت بڑھا چڑھا کر بیان

کرو۔ میں نے ان دونوں کا معاملہ اپنے اللہ کے سپرد کر دیا ہے وہی بہتر کرے گا۔ بس دل کھتا ہے تو اس معصوم

اور غصی کو بچھ کر اور تو۔“ وہ شاید اپنے آنسوؤں پر پھر قابو نہیں رکھ سکی تھیں۔

معاذ اٹھ کر کھڑا ہو گیا مزید ”نہ کالہ۔“ مستجاب اس کے بس سے یاہر تھا۔ اس نے جانے کے لیے ایک ہی قدم

اٹھایا تھا کہ مٹھی اپنے بستر سے تیزی سے اٹھی اور اس کے قدموں میں آگرمی۔ اس نے معاذ کے جوتوں میں قید

پاؤں دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیے تھے۔

”پلیز معاذ! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ پلیز۔“ اس کی ڈبڈبائی آنکھوں میں کیا تھا بلکہ

کیا کچھ نہیں تھا۔ اتنا فریاد یا رحم کی بھیک اور سب سے بڑھ کر محبت کا تھا جسے مارنا سمندر اور محبت تو اللہ کا تختہ

ہے جس خوش نصیب کو مل جائے اس پر گناہ خدا امیران ہو جاتا ہے اور میں مسلسل اس کی مہربانی اس کے تھے کو

کھٹکائے جا رہا تھا۔ میں ناکی ہوا از کے معاذ کا دل ایک دم جیسے پھل کر پانی ہو گیا۔

”مٹھی! کیا کر رہی ہو۔ ام۔“ وہ اسے لہجوں سے پکڑ کر اٹھانے لگا۔

”جس پہلے میری محبت قبول کرنے کا قرار کرو۔“ وہ ضدی لہجے میں بولی۔

”مٹھی! میں کچھ بھی نہیں۔ تم لوگوں کے نظروں پر ملنے والا ایک حقیر انسان تمہیں میں کیا دے سکوں گا۔“

وہ آہستہ آہستہ کہتے ہوئے اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”تم میرے لیے کیا ہو۔ یہ میرے دل سے پوچھو اور تم مجھے اگر کچھ بھی نہ دو صرف اپنا ساتھ اپنا نام دے دو تو

میں سمجھوں گی اللہ نے مجھے گل کائنات دے ڈالی۔ حقیر تو میں ہوں معاذ! مجھے تمہاری محبت کی بھیک مل جائے تو

میں اسیر ہو جاؤں گی۔ اس دنیا میں سب سے اسیر۔“ وہ اسی طرح اس کے پاؤں پکڑنے بیٹھی تھی۔

”مٹھی! تمہارا جانتی ہو مجھے؟“ وہ اس کے ہاتھ اپنے پیروں سے ہٹاتے ہوئے نرمی سے بولا۔

”اس سے بھی زیادہ۔ کو تو جان سے گزر کر دکھا دوں۔“

”دکھا تو چکی ہو چلو اب آنسو پونچھ لو اور بیڈ پر جا کر لیٹو۔ ابھی تمہارا زخم کچا ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے

ہوئے بولا۔

”تمہاری محبت مل جائے گی تو تمہارے زخم سب جاتیں گے۔“

”میں کہتا تھا اس قدر ظہمیں مت دیکھا کرو۔“ وہ اسے بیڈ تک لے آیا۔

”زندگی بھی تو ظہم ہے اور میرا دل تو یہی ہے محبت کی بھنگارن۔“ وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس کا سانس پھول گیا تھا

کمزوری کی وجہ سے آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آ رہا تھا۔

”تم نہیں مدد کرو گی۔“ معاذ نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”میں چلتا ہوں۔ سٹو اب بستر سے نہیں اٹھتا۔“

”معاذ! اس نے بے قراری سے پکارا کہ کہاں جا رہے ہو؟“

”تمہاری سو کن کے پاس۔“ وہ بے ساختہ بولا۔

”کیا؟“ وہ اچھیل ہی پڑی۔

”بھئی۔ ار ترضی کے پاس جا رہا ہوں۔ کتنے دنوں سے تمہاری بی بی سے اگا بیٹھا ہوں۔ اسے بالکل اکتور کر رہا ہوں۔ ابھی کچھ دیر میں آتا ہوں۔ تم اب سو جاؤ۔“ وہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا تو مٹی نے پرسکون ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

اتنا برا شاپنگ آرکیڈ اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا جس میں اتنی بڑی بڑی شاپیں تھیں اور ان میں اتنی قیمتی چیزیں ڈھیروں ڈھیر بڑی تھیں جیسے یہ مفت ملتی ہوں۔ پہلے تو اس کی آنکھیں شہر میں داخل ہوتے ہی کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ ”اتنا برا ہوتا ہے؟ شہر بڑی بڑی کھلی کشادہ سڑکیں، بے تحاشا لوگ بڑی بڑی قیمتی خوبصورت گاڑیاں، ٹرفٹ کا جوم، مہربانک خوبصورت عمارتیں، عالیشان محل نما گھر، رنگ مرمر کے بنے ہوئے بنگلے، سبزے اور ہریالی سے بے ہوش بڑی بڑی وکائیں مارکیٹیں۔ وہ تو ساتھ بیٹھے سیٹی کو بھی بھول چکی تھی اسے یوں لگ رہا تھا گاڑی کی کھڑکی سے باہر کوئی پر وجہ کٹھن پر تیز تیز فلم چلا رہا ہے اس نے تو کبھی سینما گھر بھی نہیں دیکھا تھا بس سن رکھا تھا کہ اس میں ایسے فلمیں دکھاتے ہیں۔

”بس بھی کرو زینو! ایک نظر میری طرف بھی دیکھو اوہم بھی پرے ہیں راہوں میں۔“ سیٹی کی آواز پر وہ کھٹک کر مڑی جیسے پہلی بار بنا چلا ہو کہ گاڑی میں کوئی اور بھی موجود ہے۔
”میں نے بھی شہر نہیں دیکھا اس لیے۔“ وہ جھینپ کر بولی۔
”ابھی تو تم بہت کچھ دیکھو گی ہو پہلے کبھی نہیں دیکھا تو کیا پونہ محو ہوتی رہو گی خود سے بھی بے خبر اور یہ بے خبری بڑی خطرناک ہوتی ہے۔“
وہ ”حقی نیز انا ازش بولا۔“

”تم کہاں جا رہے ہیں؟“ وہ مٹی ٹاور کی بلند دیوالا عمارت کو دیکھتے ہوئے بولی۔
”اپنی انا ل شاپنگ پر۔“
”مگر آپ تو کتنے غصے کہ آپ مجھے اپنی مدد کے پاس لے جا رہے ہیں۔“
”کیا اس جیلے میں لے جاؤں؟“

وہ اس کے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا حالانکہ وہ اپنا سب سے اچھا اور قیمتی جوڑا پہن کر آئی تھی۔ یہ سمٹ اس نے بیچلی عید پر بنایا تھا جب عبد العین اسے پانچ سو روپے دے گیا تھا اور آج وہی جوڑا اپنے بیگ میں رکھ کر کون لے آئی تھی کالج میں تو وہ دس منٹ بھی نہیں رہی تھی بس لباس تبدیل کیا اور باہر نکل آئی جہاں سیٹی اس کا منتظر کھڑا تھا۔ آمد سے اسپورٹس ڈسے کا کہہ کر آئی تھی کہ چار پانچ بجے لو گے لی اس نے زینب کو متوجہ بھی کیا تھا کہ بابا صاحب پوچھیں گے تو لٹنا ہونے کے گور زینب نے صاف کہہ دیا کہ جو ہو گا دیکھا جاوے گا اب بابا صاحب کے ڈر سے وہ طرح کی غیر فصالی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے سکتی تو کیا وہ یہ بھی نہیں سکتی۔ وہ پانچ بجے سے پہلے نہیں آئے گی اس کی بے خوفی پر آمد حیران اور منتظر نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

”یہ ہمارے ساتھ بیٹھ کر کس خاص القاص ہستی کو اتنے وہمیاں سے سوچا جا رہا ہے؟“
”کسی کو نہیں۔ ہم جلدی جیلے جا سکیں گے نا گھر۔ میں بس دو تین گھنٹے کا کہہ کر آئی ہوں۔“
”کالج قائم کے بعد وہ تین گھنٹے نا۔“ گاڑی لاہور کی خوبصورت سڑکوں پہ دوڑ رہی تھی۔ زینب پھر سے باہر کی رونقوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”نہیں۔ بس آپ چلری کریں۔“ وہ بے سوچے سمجھے بولی۔
”میں تو بہت جلدی کرنا چاہ رہا ہوں۔ تمہیں کیا معلوم۔“ سیٹی کی ذہنی بات پر زینب نے مڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پائے یا تھا جس نے زینب کو وہ بارہ سٹیموڈ نے پر مجبور کر دیا۔
”آپ کا گھر کب آئے گا؟“ وہ چند لمحوں بعد اتنی ہی ڈرائیو سے گھبرا کر بولی۔
”گھر سے پہلے شاپنگ مائل چھوڑ دو۔“ گاڑی شہر کے منگے ترین خوبصورت شاپنگ مال کے آگے کھڑی تھی۔

اور ایسا سپر اسٹور اور اتنی قیمتی اشیاء ایک ہی جگہ زینب کو پہلی بار دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ سیٹی اسے اپنی پسند کے ڈریسز لہنے کو کہہ رہا تھا اور اسے تو کچھ کچھ میں نہیں آ رہا تھا نظریں مختلف رنگوں میں تھی اشیاء اور خوبصورت لمبوسات پر بھٹک رہی تھیں۔ قدم ایک ایک چیز کے آگے بڑھ رہے تھے۔
”یار چلو تاپنڈ کرو۔ تم تو ادھر ہی شام کرو گی۔“

سیٹی اس کی محویت سے اتنا کر بولا پھر اس نے خود ہی زینب کے لیے تین خوبصورت ڈریسز منتخب کر لیے ساتھ ساتھ چنگ ہوتے اور چھو لری بھی۔
”اتنا کچھ اور اتنا مزہ گا میرے لیے؟“ اس کی آنکھیں جیسے پھٹی جا رہی تھیں۔ اتنا خوبصورت لباس خود شہووار پر ابزن اسے لگ رہا تھا وہ کسی سہانے سنے میں سما سکیں لے رہی ہے۔

”زیوایہ زانی روم میں جا کر پین آؤ۔“ سیٹی نے مسرؤ اور براؤن گھر کا سوٹ اسے تھماتے ہوئے کہا ”یہ ادھر سے زانی روم۔“ اس نے گاؤ ٹرکے آخر میں بے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔
وہ شاپنگ کرتے ہوئے جھگ رہی تھی اور حیرت زدہ بھی۔ شاپ کے اندر جا کر اپنے کپڑے پہنچ کرنے پر اسے لگ رہا تھا وہ کئی اور سارے پر آئی ہے۔

”جاؤ نا! اسے اسی طرح جسے کھڑے دیکھ کر سیٹی نے کہا تو اس میں حرکت پیدا ہوئی۔
”اور پلیز یہ حجاب وغیرہ نا گور آنا اس شہر میں تمہیں کوئی پہچانے والا نہیں۔“ وہ اس کے ساتھ آتے ہوئے بولا۔
زینب پھر تھک کر روک گئی۔
”کیا؟“ وہ آنکھیں پھاڑ کر پٹی ”حجاب اتار دوں۔“

”ہاں نا میں یہ کہہ رہا ہوں ابھی ہم نے ہو مل بھی جانا ہے لہجے کے لیے تو کیا تم یہ پردے کی یو یوین کر جاؤ گی؟ پلیز اس جاؤ۔ سخت گھبر کر لگ رہی۔
سیٹی نے پھر اسے سارے سارے بولے ”بس قدر رکھو۔ جیٹ ہوتی ہیں یہ دیہاتی لڑکیاں۔“ وہ دل میں تھما لیا۔
زینب اس کا ہڈا موڑ دیکھ کر مہرے مہرے قدموں سے زانی روم میں گھس گئی۔

”اومالی گاڑا! یہ تم ہو؟ زینب سے۔“ منٹ بعد وہ ڈریس زینب تن کر کے آئی تو سیٹی حیران رہ گیا۔ حجاب کے بغیر اور اس خوبصورت لباس میں شہر کی کوئی لڑکی ماڈرن لڑکی لگ رہی تھی۔ تن کے ساتھ کھلی ہوئی بے حد ٹائٹ شرٹ کے ساتھ ماڈرن طرز کا ٹیلا ہوا ٹراؤز اور پتھو ٹاڈو شہر جس کو اس نے اپنے سر اور سینے کے گرد لپیٹنے کی کوشش کی تھی اور جس اس کے آگے سر اور گردن کو بھی چھپا دیا تھا۔

”زینب! تم اس قدر خوبصورت ہو آتی اسٹارٹ تمہارا ٹکر تو قیامت ڈھا رہا ہے مائی گاڈ!“
”میں اس کے بے حد قریب آ کر اس کے ساتھ میں ڈھلے جسم کو دیکھ کر بولا تو وہ اسے آپ میں سمٹ گئی۔“ میں اپنی چادر لول کی پکڑے میں نے پین لیے ہیں۔“ وہ جلدی سے ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیگ میں سے اپنی چادر نکالنے لگی۔

”خبردار۔“ سیٹی نے شمار اس کے ہاتھ سے چھٹ لیا ”چلو آؤ ادھر ایک پارلر ہے ادھر چلتے ہیں۔ ماما کو تو میں نے آج بے ہوش کرنا ہے۔“ وہ کہتے ہوئے آگے بڑھا تو مجبوراً زینب کو اس لباس کے ساتھ اس کے پیچھے چلنا پڑا۔ اس کے قدم اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ ڈولنے قدموں کے ساتھ نظریں پٹی کیے وہ جیسے سب سے پیچھے کی ناقام کوشش کر رہی تھی۔

پارلروالی نے اسے آگے کھٹے میں بیٹے پائش ہی کر دیا۔ وہ باہر نکلے تو سیٹی دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ ”زینب! تم زینب ہو نا!“ وہ پاس آ کر بولا ”تم نے آئینے میں دیکھا ہے خود کو۔“ زینب نے لگی میں سر ہلا دیا۔
مار سے شرم کے اس کی نگاہیں نہیں اٹھ رہی تھیں اس کے سیدھے باریک بالوں کو انہوں نے شارٹ اسٹائل دیا تھا جس کی وجہ سے وہ بالکل پاجبالی نہیں جا رہی تھی۔

”تھیں نا اب جہاں سے۔“ وہ سیفی کی نظریں اپنے اوپر گڑے دیکھ کر کسمپاسی۔

”چلو! سیفی جیسے ہوش میں آکر بولا۔ وہ فیصلہ جو وہ کئی دنوں سے نہیں کر پار رہا تھا ہمیں کھڑے کھڑے اس نے طے کر لیا۔

”خچ کے لیے وہ اسے چائیز لے آیا تھا۔

”زینب سے تو کچھ کھایا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ارد گرد ٹھیلو پر رش کم تھا مگر پھر بھی اسے لگ رہا تھا وہاں بیٹھے سارے لوگ اسی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

”زینب! ابھی ریلیکس ہو جاؤ۔ تم اپنے گھر سے تیلوں دور بیٹھی ہو ارد گرد تمہارا کوئی فیملی ممبر دیکھ بھی لے گا تو بھی نہیں پہچانے گا۔ کھانا اچھا نہیں ہے کیا۔“

”بہت اچھا ہے۔“ اتنا اچھا کھانا اور اتنی واقفقدار میں اس نے کب دیکھا تھا جن نعمتوں کے لیے وہ ترساکرتی تھی اب سامنے میز سجی ہوئی تھی مگر اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کچھ بھی کھانے کو۔ اس کا دل چاہ رہا تھا اس مصنوعی مائوں سے بھاگ جائے۔

”زینب! مجھ سے شادی کے بعد تمہیں اسی طبقے میں رہنا ہے اسی ماحول میں مو کرنا ہے پھر اس قدر اسی عیث کیوں جان! سیفی نے اس کا ٹھنڈا پنج تھتھہ تمام کر محبت سے کہا۔

”آپ اپنی مہماتے کب ملو انہیں گے مجھے؟“ سیفی کے گرم مضبوط ہاتھ نے جیسے اس کے پتے کی طرح لرزتے دل کو سارا دیا تھا۔

”ابھی اوپر ہی تو لے کر جا رہا ہوں۔ تم اچھی طرح کھانا تو کھاؤ۔ پھر چلتے ہیں۔“ ماما کے سامنے یوں کا پیمانہ شروع کر دیتا۔ کافیز اس سے ان سے بات کرتا۔ ”وہ اسے سمجھا رہا تھا۔“ زینب یہ سب انسان ہیں۔ ان میں کچھ بھی انوکھا نہیں سوائے پیسے کی فراوانی کے اور اب تو تم بھی ان لوگوں میں شامل ہونے جا رہی ہو۔ اس لیے خود کو سنبھالو مضبوط بنو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں پھر بھی تم ڈرتی ہو۔ اسے گھر والوں کا ڈر ہے تو ان کے ساتھ اب تو محض چند دن کے لیے ہو۔ بس ماما تمہیں اوکے کر دیں پھر میں چند دن بھی صبر نہیں کروں گا اور تو مجھ سے ابھی بھی نہیں ہو پارا۔“

”زینب کا دل کچھ مطمئن سا ہو گیا اور وہ مطمئن ہو کر کھانے لگی۔

کھانا کھا کر دونوں اکتھے جیسے ہی بیرونی دروازے کی طرف بڑھے۔ ایک اور سراجو دروازے سے اندر آ رہا تھا۔ سیفی سائیڈ سے ہو کر باہر نکل گیا۔ زینب نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کا اٹھا سر اور قہقہہ دونوں اپنی جگہ جیسے سائت ہو کر رو گئے۔

وہ عبد العتین تھا اس کا بڑا بھائی۔ زینب کو ان کا دل اس کا سینہ توڑ کر یا ہر نکل جائے گا یا وہ نہیں کھڑے کھڑے زمین میں گڑ جائے گی۔ عبد العتین بھی اسے ابھی ابھی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”ہاں گارڈ ہے؟“ عبد العتین کی بیوی پلٹ کر سائت کھڑے شوہر سے بولی جو ایک الٹرا ماڈرن لڑکی پر نکاہیں بنائے کھڑا تھا۔

”ہاں چوہ۔“ وہ ہیر ہیرا اور جاتے جاتے پھر ایک بھر پور نظر اس پر پالی۔

”کیا تم جانتے ہو اس لڑکی کو؟“ زینب نے اس کی بیوی کی آواز سنی۔

”جانتی نہیں جانتا بھی ہوں یا نہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”جو میں سمجھا ہوں یہ وہ نہیں ہو سکتی اور مشابہت اس قدر کیسے ہو سکتی ہے۔“ وہ جیسے الجھ کر بولا۔

”اوہ بہت سے چہرے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوتے ہیں تمہیں کوئی دھوکا ہوا ہو گا۔“

”ہاں شاید دھوکا ہی ہے۔“ عبد العتین کی دور سے آواز آئی تھی۔ زینب کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔

”دھوکا کوئی ان میں بھی دھوکا کھا سکتا ہے کھلی آنکھوں میں روشن دن کے ساتھ بھی دھوکا کھا سکتا ہے۔“ وہ خود سے بوجھ رہی تھی۔

”آرے بھئی! ابھی جاؤ۔“ سیفی اسے دوبارہ لینے آیا تھا جھٹکا کر بولا۔ زینب ایک گہرا سانس لے کر اس کے ساتھ چل پڑی۔

واپس کا سفر خاموشی سے کٹا۔

”تمہیں یہ سب اچھا لگ رہا ہے نا؟“ سیفی نے اس سے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“ ابھی تو یہ سب خواب لگ رہا ہے۔ ”زینب چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔

”خواب! وہ ہنسا ”شاید خواب ہی ہو۔“

”کیا مطلب؟“

”کچھ نہیں یہ لو تمہارا کمر آگیا۔“ گاڑی ایک بے حد خوبصورت کوئٹھی کے گیٹ کے آگے کھڑی تھی۔

”آپ کا گھر ہے؟“ وہ سر اٹھا کر دور نظر آتی سنگ مرمر کی عمارت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”جیلے میرا تھا۔ اب تمہارا ہو گا۔“ آؤنا! ”وہ دروازہ کھول کر اس کے باہر نکلنے کو مانتا تھا۔ زینب نے کچھ جھٹک کر سیفی کا ہاتھ ہوا ہاتھ تمام لیا۔

گیٹ کھلا رہا تھا۔ ٹرک کے دونوں طرف ہرے بھرے کشادہ لان تھے۔ باؤنڈری وال کے ساتھ خوبصورت پھولوں کی کھدیاں تھیں۔ وہ اس کھانا تھا سے اندر جا رہی تھی۔

”کوئی بھی نظر نہیں آ رہا۔“ چند لمحوں بھر ہی اسے وہاں پھیلے گھمبیر ستائے کا احساس ہوا۔

”ہونا کس نے سے کیا آفس میں ہوں گے ماما اپنے روم میں ملازمین کچھ کچن میں باقی اپنے کاموں میں لگے ہوں گے اور میں تمہارے ساتھ۔“ ”کوئی ادھر تو رونق ہوگی۔ دو چار ہمارے چیاؤں کیاؤں ہو جائیں پھر رونق ہی رونق۔“

سیفی کی بات پر اس نے ایک دم ان کا ہاتھ چھڑا لیا۔ اس کا سرخ و سفید رنگ ان کے اجالے میں دیک رہا تھا۔

”آؤنا یار! آئی ایم جرسٹ جو کنگ! وہ اس کی معترض نگاہوں کے جواز میں بولا۔ دونوں اندر آ گئے۔

بڑے بڑے سجے سجائے خوبصورت کمرے اور ان میں ایسا ایسا مسلمان عیش سجا تھا جس کے بارے میں زینب نے نہ کہیں پرہا تھا نہ سنا تھا۔

”آپ کا گھر بہت خوبصورت ہے۔“ وہ مبہوت سی چلتے ہوئے بولی۔

”اب تمہارا ہے۔“ وہ بے تکلفی سے بولا۔

”اچھا تم ادھر نظر بیٹھو۔ میں ماما کو لے کر آتا ہوں۔“ وہ شاید ڈرائنگ روم تھا۔ وہ اسے صوفے پر بٹھا کر باہر نکل گیا۔

وہ کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ پورا روم پر لگی بڑی بڑی بیٹنکھو اٹل خانہ کے ذوق کا پتا دے رہی تھیں۔

دروازے کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ سیفی نہیں تھا۔ ملازمہ کولڈ ڈرنکس لے کر آئی تھی۔

وہ خاموشی سے کولڈ ڈرنک اس کے آگے رکھ کر باہر نکل گئی۔ پانچ سے دس منٹ گزر گئے۔ یہ سیفی کہ مہر رہ گیا مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ اس کی نگاہوں کا کلاک پر پڑی۔ ”دو بج رہے تھے۔“

”ادھر سو رہی یار! مجھے دیر ہو گئی۔ ماما ہاتھ لے رہی تھیں بس آ رہی ہیں چند منٹ تک۔ تم نے یہ پیا نہیں۔“ اس کا لباس بدلا ہوا تھا اور موڈ بھی۔

ہیں۔ "سینٹی نے گلاس سے تھمھایا تو مجبوراً وہ پینے لگی اسے واقعی پیاس لگ رہی تھی۔ چار گھنٹوں میں ہی اس نے گلاس خالی کر دیا۔

سینٹی اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ گلاس رکھ کر اس نے ایک گھراسانس لیا اندر جیسے ٹھنڈک سی اتر چکی۔ اس نے سونے کی پشت سے سر نکالیا اور آنکھیں موند لیں۔

"زنو! سینٹی اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"ہوں! آنکھیں بند کیے مسکراتے ہوئے لبوں سے وہ بولے۔

"تم ریڑھی ہونا! تو اس کے بے حد قریب سے آئی تھی۔

"ہوں۔ دست اچھا ڈرنک۔" وہ مسکراتے ہوئے بے خود سے لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں۔ ذہن جیسے شیشی ٹینڈ کے پتھکولے لے رہا تھا۔

سینٹی نے اس کا ٹھنڈا ہاتھ تھام لیا نہ بے حس ہڑی رہی۔

"چلو اندر بیٹھے ہیں۔" وہ سر کو تکی میں اس کی گردن کے پاس آ کر بولا۔

"نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔" اس کا ذہن سو رہا تھا۔ جاگ رہا تھا اسے کچھ بتا نہیں چل رہا تھا۔

"پہلا نا۔ اٹھو بھی۔ اب مجھ سے اور برداشت نہیں ہو رہا۔" سینٹی نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد مائل کر کے اسے کھڑا کر دیا وہ لڑکھڑاتے قدموں اور کھلی آنکھوں سے جا کے ذہن کے ساتھ ڈوٹی ہوئی سینٹی کے پہلو سے نکلی چلنے لگی۔

"نار تھے لا۔" من روڈ پر آتے ہی شہرینہ سیٹ کے پیچھے سے اٹھ کر اور بیٹھ گئی اور عبدالمعین کا سنجیدہ چہرہ دیکھ کر پوچھنے لگی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ گاڑی کی اسپڈ بہت تیز تھی اسپڈ میٹر کی سوئی اتنی توتے کے درمیان ٹھکر رہی تھی۔ باہر رات کا اندھیرا اور جھانکا جھلا ہوا تھا کہیں کہیں بول لائینوں چل رہی تھیں اور کہیں بالکل اندھیرا تھا۔ سڑک کے ارد گرد تاریکی ہی تاریکی تھی۔

"یہ میں نے کیا کیا؟" ایک بیک شہرینہ اندھیرے سے خوف زدہ ہو کر خود سے بولی۔

"تم بولتے کیوں نہیں بولو نا میرا دم گھٹ رہا ہے۔" وہ اسٹیرنگ پر رکھے عبدالمعین کے ہاتھ کو جھنجھوڑ کر چیختے ہوئے بولی۔

"کیا بات ہے؟" وہ کچھ غصے سے بولا۔ "دیکھ نہیں رہیں۔ میں ڈرائیو کر رہا ہوں۔" اس نے جلد از جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہیے سلطان بخش جو ملی جا چکا ہے اگر اسے جاتے ہی تمہارے اس طرح کے نکل جانے کا علم ہو گیا تو وہ اب تک ہماری تلاش میں بندے دوڑا چکا ہو گا خاموشی سے بیٹھو۔ مجھے یہاں سے نکل جانا ہے۔"

عبدالمعین نے کہتے ہوئے گاڑی کی اسپڈ اور بڑھادی۔ گاڑی جیسے ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ رات کے اس پھر سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی کئی منٹوں بعد ایک آدھ گاڑی ٹرک یا ٹریکٹر وغیرہ گزرنا تھا چند لمحوں کے بعد پھر بولتا سانا۔

"میں مجھے واپس چھوڑ دو۔" چند لمحوں بعد وہ روتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تمہارا دلخ خراب ہے۔ چپ کر کے بیٹھو مجھے بھی پاگل مت کرو۔ اس وقت میں کچھ نہیں سن رہا۔" وہ پھر غصے میں آیا۔

تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ مجھ سے کس طرح بات کر رہے ہو؟" اپنے دل کی کیفیت بتاتی ہوئی اسے عبدالمعین کا رقبہ بری طرح سے چہرہ رہا تھا۔

"شہرینہ، ڈونٹ ڈسٹرب می! عبدالمعین نے گردن اس کی طرف موڑی۔

"میں گاڑی کہیں دے ماروں گا۔ خاموش ہو کر بیٹھو۔" وہ سم سی گئی۔ عبدالمعین کا دل خود اس وقت الجھنوں کے ہمنور میں گواہوا تھا۔

"یہ میں نے غلط کیا یا درست۔ بھلا اپنے کیرر کے اس نازک موڑ پر مجھے یہ حماقت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ چند سال ٹھہر کر بھی یہ بریکنگیل ہو کر لپکا جا سکتا تھا۔" اس کے اندر بیٹھانا صح عبدالمعین اسے جھڑک کر بولا۔

"یہ سب اس شہرینہ کی بیٹی کی جلد بازیوں کا نتیجہ ہے۔" اس نے ہنسی بھرا کر سہمی ہوئی شہرینہ کی طرف دیکھا۔

"اب یوں منہ بسور کر کیوں بیٹھ گئی ہو؟ اس وقت اس منٹ اور پھر ہم اپنی منزل سے قریب تر ہو جائیں گے تمہارا برا مت کرو۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے تسلی دینے لگا۔ شہرینہ نے شکوہ آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا اور اپنی ہتھیلیوں کو مسلنے لگی۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ شاید رو رہی تھی۔ "میں نے اچھا نہیں کیا۔ میرا دل کہہ رہا ہے۔ سب کچھ غلط ہو جائے گا۔ کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو گا۔" عبدالمعین نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی حالت سے محفوظ ہو رہا ہو جیسے اسے شہرینہ سے اسی رد عمل کی توقع تھی۔

"عبدالمعین! مجھے بتاؤ نا میں نے صح کیا یا غلط؟" وہ اس کی خاموشی سے تنگ آ کر بولی۔

"مجھے کیا بتانا؟" وہ اپنے دل سے پوچھو۔ "وہ اسے تنگ کرنے کو بولا۔

"میرا دل کہتا ہے کہ میں نے کچھ کر لیا۔" عبدالمعین نے اسے دیکھا جیسے اس کی حالت سے محفوظ ہو رہا ہو جیسے اسے شہرینہ سے اسی رد عمل کی توقع تھی۔

"کبھی کبھی یہ باتیں کرنا ہی کچھ نہیں ہو گیا؟" وہ مسکرایا۔

"کسی کے پاس لانا رکھو اور اچھا۔" عبدالمعین نے اسے سنبھالا بھی یا نہیں۔

وہ کن آنکھیں سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"آج کل زمانہ خراب ہے۔ کوئی اپنی چیزوں کی حفاظت نہیں کر سکتا کسی دوسرے کی کیا کرے گا۔ تمہیں خیال نہیں آیا۔"

"آپنا تھا۔" وہ غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ "تمہارے والا مضر تھا وہ اپنی جان سے بڑھ کر اس کی حفاظت کرے گا میں نے اس کی باتوں پر بھروسہ کر لیا۔"

"جب بھروسہ کر لیا تو اب کیوں ڈانواؤں ہو رہی ہو۔"

"کوئی خود کب ڈانواؤں ہوتا ہے۔ یہ تو اس کے اندر سے پکار رہی ہے۔" عبدالمعین نے اندر بھی محسوس کیا ہے کچھ سنائی نہیں دے رہا۔ آوازیں ہی آوازیں غلو فانی جھکنوں کی آوازیں ہیں اور رونے پینے کی آوازیں اور اس سناٹے میں یہ آوازیں اور کبھی کبھی بھوری ہیں۔ رات کو اس قدر خاموشی اور سناٹا کیوں ہو آہے کہ اندر کی آوازیں پاگل کرنے لگتی ہیں۔ وہ اندر زور سے سر ہلاتی تھی۔

"تمہیں خیال کبھی آتی ہو۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ؟" اس نے سر سر ہی انداز میں تسلی دی۔

"میں نہیں سمجھ رہے میری کیفیت۔" وہ جیسے تھک گئی اپنا آپ سیٹ کی پشت سے لگا لیا اور آنکھیں موند لیں۔

"میں ہی تو سمجھ سکتا ہوں تمہاری کیفیت۔" وہ آہستگی سے بولا۔ شہرینہ نے سنا بھی مگر کوئی جواب نہیں دیا وہ شاید اندر کی آوازوں میں گم ہو گئی تھی۔

"مجھے لگتی ہے کہ مزید ڈرائیو وہ شہر کی حدود میں داخل ہو گئے سڑکیں بول لائٹس اور سائن بورڈز کی مرکزی لائٹس سے جگمگ رہی تھیں سڑکیں پر ٹریفک بہت کم تھی مگر مضافات جیسا سناٹا بھی نہیں تھا اور سب سے بڑھ کر روشنی تھی۔

روشنی جو سویرے کی تمہید ہے زندگی کی سلامت ہے اسے لگاؤ دوبارہ زندہ ہو گئی ہے اسے نئی زندگی ملی ہے۔ واقعی یہ سفر اسے نئی زندگی کے موڑ پر ہی تو لے آیا تھا۔ اب آگے کیا ہو گا۔ وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ اسے روشنی بھی پاگلی نہیں لگ رہی تھی اس نے اپنا بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

”تیند آ رہی ہے کیا؟“ عبدالمبین نے پوچھا۔
”نہیں۔“

”روشنی سے ڈر لگ رہا ہے؟“

”ہاں۔“ اس نے فوراً اقرار کر لیا۔

”روشنی سے ڈر۔“ وہ ہنسنا۔ ”ذریعہ اسٹیج۔“

”یہ ایسی روشنی ہے بالکل غیر مجھے اس ناواقف روشنی سے خوف آ رہا ہے۔“ وہ آنکھوں سے بازو ہٹاتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

”کم آن شو! کیسی پاگلوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔ لگتا ہے کہ تم میرے ساتھ آنے سے خوش نہیں ہو۔“

عبدالمبین کا دل ہلکا ہلکا ہوا گیا تھا۔ منزل بہت پاس دیکھنے لگی تھی۔ سارے ڈرو سے پیچھے رہ گئے تھے۔

”شاید نہیں۔“ وہ مسکرتنہ لہجے میں بولی۔

”تو پھر کیوں آئی ہو؟“ وہ تنک کر بولا۔

”معلوم نہیں۔“ وہ اپنے ہاتھ کھول کر دیکھنے لگی اس لگا اس کی ہتھیلیوں میں آئینے لگے ہیں اور ان آئینوں میں حویلی کی چھ ویکار بھاگ ڈور لالہ کا غضب آپا کے بین پریشانی صاف کی تھی۔ شریکوں کا ہر سب دکھائی دے رہا ہے اس نے جلدی سے ہتھیلیاں بچھنے لیں۔

”چلو جب کچھ معلوم ہی نہیں تو کیوں خود کو بلکان کر رہی ہو بی بی ہم دونوں ہمیشہ کے لیے ایک ہونے جا رہے ہیں تو ہماری منزل آئی۔“ کہتے ہوئے اس نے براؤن گیٹ کے آگے گاڑی روک دی اور بارن بجانے لگا۔

”یہ۔ یہ کون سی جگہ ہے ہمارا گھر۔“ وہ گیٹ سے آگے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”فی الحال نہیں۔“ وہ بے فکری سے بولا۔

”میں ہم ابھی نکاح کر لیں گے نا۔“

”بالکل ڈونٹ وری انڈروکیل صاحب موجود ہوں گے گواہوں کے ساتھ۔“ گھٹ گھل رہا تھا کچھ کیوں نہ

عبدالمبین کو دیکھ کر دونوں پشوا کر دیے۔

”یہ کس کا گھر ہے؟“ شہرینہ کا دل اب بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔

”میری گاؤں اور بلکہ بدر سمجھ لو زیور گل کا کل کدہ تم نے نیم پائی مجھے نہیں پڑھی۔“ شہرینہ کو رات کے اس سے یہ ہوش ہی کہاں تھا چپ چاپ عبدالمبین کے ساتھ چلتی رہی۔ دونوں ایک جگہ سے کمرے میں کھڑے تھے۔

”میڈم کہاں ہیں؟“ عبدالمبین نے ساتھ آئے ملازم سے پوچھا۔

”سنگ روم میں آپ کا ریٹ کر رہی ہیں۔“

”اوکے۔“ وہ شہرینہ کو ساتھ چلنے کا اشارہ کر کے ایک اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

زیور گل میروں اور کمرے کھڑکے سکی گاؤں میں کاؤنچ پر نیم اور کوئی میگزین دیکھ رہی تھی عبدالمبین کو دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی۔

”اوہ کم آن مولی! اس ٹویٹ۔ کب سے تمہارا ریٹ کر رہی ہوں لیکسٹ ڈے اشارت ہو گیا ہے۔“ اس نے کچھ بیزارگی سے کہتے ہوئے شہرینہ کو سرسری نظر سے دیکھا۔

”سب کاموتی۔ اچھا ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

”آپ کو معلوم تو تھا اتنی دیر ہو جائے گی۔ سب کچھ ریڈی ہے نا۔“

”ہاں لائٹ صاحب کب سے آئے بیٹھے ہیں بلکہ بیٹھے بیٹھے سو بچی چکے ہوں گے تم لوگ بیٹھو۔ میں کچھ کھانے کو

بھجواتی ہوں۔“ وہ جانے کو مڑی۔

”نہیں میڈم! اس وقت بھوک نہیں۔ شہرینہ! تمہیں بھوک ہے؟“

”نہیں۔“ وہ تھوک نکلتے ہوئے بولی۔ زیور گل کے چیلے نے اسے کچھ مشکوک سا بنا دیا تھا کہ وہ اچھے لوگوں میں نہیں آئی۔

”اوکے تو چلیں پھر۔“ وہ بولا۔

”کہاں؟“

”اوہ۔۔۔ یہ بے خبری۔“ زیور گل ٹھٹھا کا کر پھی۔

دیکھیں کہاں نصیب لے چلے
گھر سے تو فراز چل پڑے ہیں

شہرینہ جیسے کٹ کر رہ گئی۔

”نکاح کے لیے۔“ مبین نے اس کی مشکل آسان کی تو وہ سر ہلا کر چادر درست کرتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑی۔

اس کا دل مطمئن ہو گیا تھا۔ کم از کم عبدالمبین اس کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کر رہا وہ اس سے نکاح کے لیے ہی تو اس طرح اپنے کمرے سے آئی تھی اور نکاح ہونے جا رہا تھا۔

کمرے میں پانچ افراد موجود تھے۔ انہیں آتے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ چند رسمی باتوں کے بعد وکیل صاحب نے کاغذات کھولے ایک نظر ان کا جائزہ لیا۔

”آپ تیار ہیں؟“ اس نے شاید عبدالمبین سے پوچھا تھا۔ شہرینہ کی نگاہیں تو جھکی ہوئی تھیں۔ دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ کانوں کی لومیوں تک رہی تھیں۔ زندگی کا اتنا تازک اور اہم موڑ اور وہ بالکل تنہا اپنی سے میلوں دور۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

دس منٹ بعد وہ عبدالمبین کی بیوی کی حیثیت سے اس کمرے میں آگئی بیٹھی تھی عبدالمبین ان لوگوں کو باہر پھولنے لیا تھا۔

”گھر کے سیرے ساتھ بہت اچھا کرنا لگا ہے میں نے اپنیوں کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا مگر تو کو واہ ہے میرا یہ فعل ان کے رویے کا رد عمل ہے میں معافی مانگ لوں گی جلد ہی نکاح سے بھی اور آپ سے بھی۔“ وہ اپنی انگلیاں جھٹکتے کمرے میں شعلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”آپ کیا بے چینی ہے؟“ عبدالمبین نے کمرے میں داخل ہو کر اسے بے چینی سے شعلتے دیکھ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ سر جھکا کر ہوا سا مسکرائی۔ اسے نکاح کے بعد عبدالمبین سے ڈھیروں شرم آنے لگی تھی۔

”چلیں اب۔“ وہ اس کے جھکے سر کو دیکھ کر بولا۔

”کہاں؟“ وہ خیر ان نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”اپنے گھر جو تمہاری میرا مطلب ہے ہماری منزل ہے۔“

”وہ کہاں ہے۔“

”میرے ساتھ آؤ گی تو بتا چلے گا نا۔“ اس نے آگے بڑھ کر شہرینہ کا ہاتھ بڑے استحقاق سے تھام لیا۔ شہرینہ کے ہاتھ میں کرٹ سا وہ ڈگیا وہ جھجک کر پیچھے ہونا چاہتی تھی کہ عبدالمبین نے اس کا ہاتھ پھوڑ کر اسے اپنی باتوں میں لے لیا۔

”بہت ظلم کر رہا ہوں خود پر جاننا ہوں مگر مجبور ہوں۔ بہت مجبور۔“ وہ اس کے چہرے کو اپنے چہرے سے چھو کر مہرے میں بولا اور اسے چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ”آجاؤ۔“ شہرینہ حیران حیران ہی اس کے پیچھے چل پڑی زیور گل وہ بیان نظر نہیں آئی۔ دونوں گاڑی میں آ بیٹھے۔

اسے نکاح کے بعد عبدالمبین سے خوف سا آنے لگا تھا اس کا چہرہ اسے بہت بدلا دیا اس کا لگ رہا تھا وہ بار بار مٹھیاں دھوتی رہتی رہتی کن اکھیوں سے اس بد لے بد لے ہم سفر کو دیکھتی رہی کہ کب اس کے چہرے کے زاویے پہلے جیسے

لائم ہوں اور وہ کچھ پوچھنے کی ہمت کرے مگر وہ سختی سے منہ پھینچے جڑے کسے آنکھیں سیڑھے اجنبی بنا بیٹھا تھا۔
 باہر رات گہری تھی۔ کالی سیاہ تاریک رات روشنیوں کے باوجود ساری کائنات کو اپنی سیاہ چادر میں لپیٹے خوف کا
 تاثر پھیلائے چپ چاپ کھڑی تھی۔ رات کے ڈھالی بجے وہ اپنی زندگی میں پہلی بار رات کے اس پہرےوں سڑکوں پر
 ماری ماری پھر رہی تھی۔ رات کے اس پہرے وہ کبھی جاکی بھی نہیں تھی گھر سے کھٹا تو درکنار۔ صرف ایک بار اللہ
 کی شادی میں ہندی کی رات۔ اللہ اللہ! آپ کوئی تو رستہ میرے لیے کھلا رکھتے۔ محبت کا تری کا دوستی کا واپسی کا۔
 میری کوئی ثوابت سمجھنے کی کوشش کرتے پھر شاید میں اتنا برا قدم بھی نہ اٹھاتی۔
 آخر لوگ بیلوں کو پھولوں کی طرح چالتے ہیں۔ جوان ہوتے ہی انہیں کاتوں میں کیوں پھینک دیتے ہیں ان
 نازک گلیوں کے جذبات کا خیال کیوں نہیں کرتے جنہوں نے آگے جا کر بھی ساری زندگی صبر اور ضبط کی جھٹی میں
 بننا ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں جھکنے لگیں۔

تیز میوزک اور شور کی آواز پر وہ جیسے ایک دم سے سیدھی ہو بیٹھی پوڑی سی روشن گلی تھی جس کے دونوں
 اطراف گھرے ہوئے تھے۔ ہر طرف روشنیاں تھیں شور مچا رہا تھا۔ آوازیں جیسے کسی کی شاہی کا فکشن ہو تقریباً
 ہر گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ لوگ آ جا رہے تھے اس گلی میں رات اپنے خوفناک تاثر کو قائم کرنے میں بالکل ناکام نظر
 آ رہی تھی۔

”یہ۔“ وہ پوچھا چاہ رہی تھی کہ گاڑی ایک گھر کے آگے رک گئی تھی۔
 ”اتر دیجیے۔“ عبدالمعین ابھیں بنا اس کی طرف کا دروازہ کھولنے کے کھڑا کر رہا تھا۔ وہ آہستگی سے باہر نکل آئی اور
 سر اٹھا کر سامنے کے گھر کو دیکھنے لگی گھر وہ سڑک تھا اور دونوں طرف زخوب روشن تھے۔ اسی وقت ایک اویز عمرنی
 سنوری عورت دروازے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے بہت گراؤ لگا کر کہا تھا۔ ”گلی کی شاگنگ پک
 قیص اسے بے حد ٹانٹ تھی۔ آنکھوں میں بھر بھر کر کاہل لگا رہا تھا۔ رنگ اس کا اچھا خاصا سا لالہ تھا۔
 عبدالمعین اسے دیکھ کر مسکرایا۔ وہ بھی دونوں کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ عبدالمعین نے اسے سلام کیا۔
 ”آگے۔“ وہ کھل کر مسکرائی۔

”یہ سرور کہاں گیا ہے؟“ عبدالمعین نے پوچھا۔
 ”میں نے کسی کام سے بھیجا ہے۔ کیوں؟“ وہ عورت بولی اس کی نظریں مسکرائی تھیں۔
 ”میرے گھر کی چالی اس کے پاس ہے میں اسے دے گیا تھا کہ گھر صاف کروائے اور پانی سبستھا کروا دے
 اور ڈیکورٹ من بھی کروا دے۔“ وہ انہیں ابھی تک باہر ہی کھڑے تھے۔ یہ شہر ہے میری وانٹھنٹھ
 ”ماشاء اللہ بہت خوبصورت ہے۔ بہت حسین۔“ عبدالمعین نے اسے کھورا۔
 ”تم دونوں کی جوڑی بہت حسین ہے۔ تم لوگ اندر آ جاؤ۔ سرور آتا ہی ہو گا۔“ وہ عورت شہریت کا ہاتھ پکڑنے
 کو آگے بڑھی۔ وہ ہدایت کر چھپے بٹ گئی۔

”آ جاؤ۔“ تھوڑی دیر اندر بیٹھ جاتے ہیں۔ معلوم نہیں وہ کتنی دیر میں آتا ہے مجھے تو اب سخت متعلق ہو رہی
 ہے۔“ عبدالمعین سرسری لہجے میں کہتے ہوئے اندر کی طرف بڑھ گیا تو مجبوراً ”وہ بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔
 یہوٹا سا بیٹھک نما گھر تھا۔ نیچے زمین پر چٹائی پھیٹی تھی۔ کمرے کی دو دیواروں کے ساتھ لکڑی کے صوفے
 لگے تھے جن پر چمک دار کوشن پڑے تھے۔ بیٹھک کے بیرونی دروازے کے سامنے دو کرسیاں پڑی تھیں کمرے کے
 وسط میں چھوٹی سی لکڑی کی میز پڑی تھی سامنے کی دیوار سے پھولوں کی ایک باسکٹ لٹک رہی تھی جو کمرے کی واحد
 ڈیکوریشن تھی۔ بیرونی دیوار میں دو کھڑکیاں تھیں۔ میلے سے دو پروے ان پر پڑے تھے۔
 ”آؤ بیٹھو۔“ وہ عورت اندر آتے ہوئے بولی۔ دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔
 ”میں کچھ کھانے پینے کو لاتی ہوں۔“

”نہیں اس وقت کسی شے کی طلب محسوس نہیں ہو رہی۔“ عبدالمعین نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔
 ”نہیں نہیں مگر یہ غریب تو میلوں کا سفر کر کے آئی ہے اسے تو ہوگی۔“ وہ عورت جھٹکے لہجے میں بولی اور اٹھ کر
 اندر چلی گئی۔

”چلیں نا گھر مجھے اچھا نہیں لگ رہا یہاں۔“ وہ کچھ ہی دیر صبر کر سکی تھی۔
 ”ہوں۔“ وہ چونکا۔ ”چلتے ہیں میں پہلے اس سے چالی تو لے آؤں ڈیٹھا ہوں باہر جا کر اسے قریب ہی میں اس
 کا گیاراج ہے ادھر نہ گیا ہو۔ تم بیٹھو ادھر میں آتا ہوں ابھی۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
 ”میں ادھر۔“ اکیلی۔ ”وہ روہا کسی ہو کر بولی۔

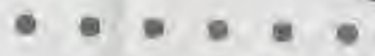
”میں ادھر ہی ہوں ڈیرا میں ابھی آتا ہوں پانچ منٹ میں تم ڈرو نہیں۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ ”اور
 ہاں۔“ اس نے پینٹ کی بیب میں ہاتھ ڈال کر ایک تہہ شدہ کاغذ نکالا۔ ”تم اتنی دیر میں یہ پتھو نہیں آتا ہوں۔“ وہ
 کاغذ اسے تھما کر کانٹیں ڈروانہ کھول کر باہر نکل گیا۔

یہ۔ وہ اچھا ہی لہجے میں رہ گئی پھر بے اختیار کھول کر پڑھنے لگی۔
 ”بتانے لگا تو شاید رات سے صبح ہو جاتی اس لیے لگ رہا ہوں وہ بھی مختصر۔
 سنو۔ تم کبھی میری محبت میں نہ ہو اور نہ ہوگی۔“
 اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانٹنے لگا۔

”تمہارا عیاش امیر زاہد بھائی جس نے میری تمام من بہن کی عزت پر ہاتھ ڈالا میں نے اسی دن دل میں عہد کر لیا
 تھا کہ جو نقب تمہارے ہمد معاش بھائی نے ہماری عزت کی فصیل میں لگائی ہے وہی زخم ایک دن میں بھی اسے
 لگاؤں گا۔ آج میں نے اپنا عہد پورا کر لیا۔ اب کل کے اخباروں میں میں یہ خبر نمایاں سرخیوں کے ساتھ
 لکھاؤں گا کہ۔“ اس نے غصے سے صاف صاف کہا اور اسے سلطان بخت کی ماہن رات کے تاریک اندھیرے میں ان کی
 عزت کی جلاوٹ اور ان کا منہ پوش لگے۔ کالہ گھر سے فرار۔

تکاح اس لیے کیا کہ تم گناہ کی اذیت کئی گنا چھوٹیں۔“ اس سے مزید کچھ نہیں پڑھا جا رہا تھا۔
 دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف چھٹی بیرونی دروازہ یا ہر سے لاک ہو چکا تھا۔ اس
 نے بے اختیار نظریں اٹھائیں۔ اندر وہ دروازہ کھلے ہی بند تھا۔ وہ اس دروازے کی طرف دوڑی زور سے اسے
 اپنی طرف کھینچا۔ وہ بھی لاک تھا اس کا داغ۔ ”جھننا اٹھا۔ وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔
 ”کھولو۔ دروازہ کھولو۔“ عبدالمعین امیرے ساتھ یہ کھیل مت کھیلو۔ کھولو پلین۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ میرے
 بھائی کے جرم کی وجہ سے۔ پلین کھولو میں واپس۔ ملی جاؤں گی کھولو۔“

”وہ دوڑی۔“ کا شور تو اسے پہلے ہی سنائی دے رہا تھا۔ یہ تو پہلے اور کھٹکوں کی آواز تھی۔ کھٹکوں کی آواز۔
 اس کا دل بیچھے ہی نیچے ڈوبتا چلا گیا۔ آنکھیں اٹھاہ اندھیروں میں ڈوبنے لگیں ان اندھیروں میں لالہ اور تپا سے پکار
 رہے تھے ان کی روٹی آنکھیں ڈوبتی شہید۔
 وہ دروازے کے ساتھ تھکتی چلی گئی۔



”کہاں سے آ رہی ہو تم۔ یہ تمہارے گھر آنے کا وقت ہے؟“
 جیسے ہی زینب نے آخری میز پر قدم رکھا۔ سخت پریشانی آتے اٹھ کر اس پر جھپٹ پڑی۔ زینب کو بے حد
 نقاہت ہو رہی تھی۔ جسم اس طرح ٹوٹا ہوا تھا جیسے کسی نے ڈنڈوں سے پھا ہوا۔ سیرا بھی تک سویا سویا سا تھا۔
 آنکھوں پر جیسے کسی نے بھاری پتھر رکھے ہوں۔ وہ ہمشکل میز پر ہاتھ چڑھ کر اوپر آئی تھی۔ اس نے وہی براؤن اور
 مسٹرڈ کلر کا خوبصورت اور قیمتی لباس پہن رکھا تھا جو اب مسلا ہوا اور میلا کچھلا سا لگ رہا تھا۔ چہرے پر مٹے مٹے
 سے میک اپ کے نشان تھیں بالکل اچھے ہوئے جیسے کسی نے بری طرح سے کھسکے ہوں۔ اس کے قدم بھی اگلے

سیدھے بڑھے تھے۔ ہاتھ میں وہی شاپنگ بیگ تھا۔ اس نے آمنہ کے سوال کا جواب نہیں دیا بلکہ اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ سیدھا سامنے اپنے اور آمنہ کے مشترکہ کمرے میں دوڑ گئی اور دروازہ بند کر کے اندر سے چینی لگالی۔

”زینب! زینب! دروازہ کھولو۔ میں کہہ رہی ہوں دروازہ کھولو۔“ آمنہ نے دروازے پر آہستگی سے دستک دی لہجہ البتہ بہت سخت تھا۔ اماں جی اس وقت سو رہی تھیں ”انہیں زینب کے اس وقت آنے کی خبر نہیں ہوئی چاہیے اسی لیے آمنہ احتیاط کر رہی تھی۔“

”دروازہ کھولو زینب۔ کھولو رت میں۔“ آمنہ کو شدید غصہ آ رہا تھا۔
”آمنہ! مجھے تنگ مت کرو میں سونا چاہ رہی ہوں۔“ اس کی ڈولی ڈولی سی آواز آئی تھی۔
”ہم سب کو پریشانوں کے حوالے کر کے تم ایسے کیسے سو سکتی ہو۔ کھولو دروازہ۔ میں کہتی ہوں۔“ اب کے وہ غصے سے چلائی۔ آواز بھی خاصی اونچی تھی۔

”نہیں۔ نہیں کھولو گی۔ دفع ہو جاؤ تم یہاں سے۔“ وہ ضدی اور اکٹھ لہجے میں چینی۔
”کھولو میں کہتی ہوں ورنہ میں اسے توڑ بیٹھوں گی۔“ اس نے زور زور سے دروازے کو جھٹکے دیے۔ وہ واقعی لڑنے لگا تھا۔ اس بوسیدہ سال خورہ دروازے کو تو ایسے تین سے چار جھٹکے ہی اکھاڑنے کے لیے کافی تھے اندر کمرے میں چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ زینب نے اس کی وہ جھٹکی کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ آمنہ نے دوبارہ جھٹکے کے لیے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ زینب نے دروازہ کھول دیا۔

آمنہ نے تفصیلی نظروں سے اسے دیکھا وہ بھی آمنہ کو گھور رہی تھی۔
زینب کپڑے تبدیل کر چکی تھی۔ بالوں کو کھینچ کر جوڑا سا بنا کر ان پر اپنی حیرت انگیز اور اب چادر لپیٹ رہی تھی۔ آمنہ نے بھرپور نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ کڑبڑ۔ شدید کڑبڑ کا لالہ اس کے اندر بچا ہوا تھا۔
”ٹھہرو! آمنہ نے اس کے چادر لپیٹتے ہاتھ روک دیے۔“

”یہ کیا ہے؟“ اس کی گردن پر تین جگہ سرخ بھڑکتے ہوئے نشان تھے ایک ہرے پر اور۔
”چھوڑو مجھے۔“ زینب نے غصے سے اس کے ہاتھ جھٹکے اور چادر لپیٹ کر مڑی۔
”زینب۔ زینب! آمنہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اپنے سوال ناکامی کے بعد اس نے شروع کر کے۔
”میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔ اس وقت آئی ہو گھر شام ڈھلے اور وہ بھی اس جھٹکے سے یہ لباس کس کا ہے اور تمہارا یہ حال۔؟“ آمنہ نے اس کا کندھا پکڑ کر اپنی طرف موڑا اور اس پر نظریں جما کر بولی۔

”تم نہ خود چین سے رہتی ہو نہ دوسرے کو جیسے دیتی ہو۔ میں کہاں گئی تھی؟ کہاں سے آئی ہوں؟“ آمنہ نے اس سے کیا مطلب؟ جاؤ جا کر آرام کرو اور مجھے بھی کمرے دو۔“ وہ بے حد اکتائے ہوئے لہجے میں کہہ کر مڑی اور بستر پر گر سی گئی۔

”تمہارا کیا خیال ہے۔ تم اس طرح کی بکواس کر کے بیچ جاؤ گی۔ بولو کہاں سے آ رہی ہو؟“ آمنہ نے آگے بڑھ کر غصے سے اس کا گریبان کھینچا تھا اور اسے چارپائی سے کھینٹ کر کھڑا کر دیا تھا۔ زینب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا یہ غصیلاروہ دیکھ رہی تھی۔ آمنہ کو تو اس نے کبھی غصے میں نہیں دیکھا تھا وہ بھی اتنے شدید غصے میں۔
”چھوڑو مجھے۔“ وہ اپنا آپ چھڑانے لگی۔ اس سے مزاحمت بھی نہیں کی جا رہی تھی۔ سارا جسم ہی بے جان سا ہو رہا تھا۔

”کہاں سے آ رہی ہو اور کیا گل کھا کر آئی ہو۔ زینب! بیچ بالکل بیچ پو لانا ورنہ۔“ وہ دانت پیس کر شدید غصے سے بولی۔
”ورنہ کیا کرو گی تم۔ کوئی مار دو گی مجھے تو مارو مارو مجھے۔ لاؤ پستول مار دو مجھے مار دو۔“ وہ ہڈیانی انداز میں چیختی لگی اور اپنا گریبان اس سے چھڑانے لگی۔

”تمہیں ڈراسے بعد میں کرنا۔“ آمنہ کا زور دار ہاتھ اٹھا اور اس کے گال پر چار انگلیوں کا نشان چھوڑ گیا۔ زینب کی کی آنکھیں جیسے باہر اڑنے لگی تھیں۔

”تم۔ تم۔“ اس نے اپنا لڑتا ہوا ہاتھ اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم نے مجھے مارا۔ مجھے۔“
”ہاں۔ میں نے تمہیں مارا اور اس سے بھی زیادہ مار بیٹھوں گی۔ بتاؤ کہاں سے آ رہی ہو تم۔“ آمنہ کا لہجہ اتنا سخت تھا کہ زینب کو لگا۔ اب اس کے اندر صوفی صاحب کی روح حلول کر گئی ہے وہ اسی طرح چھٹی چھٹی آنکھوں سے ہونٹ سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”بولو بیکو۔ کہاں سے آ رہی ہو۔“ آمنہ نے اس کا گریبان اس زور سے مٹھی میں بھینچا کہ اس کا انگوٹھا زینب کے زخروں کو سختی سے دبانے لگا۔ اس کا سانس تنگ ہونے لگا۔ آنکھوں میں پانی سا آ گیا۔
”چھوڑو مجھے۔“ زینب نے پوری طاقت سے اسے دھکا دیا مگر اس کا وہ کھانکنا ایک لہجے میں نہ ہلا سکا۔ پتا نہیں زینب کی ہماری طاقت کہاں جا سکتی تھی۔ اس کا جوڑ ہوڑو تو کھ رہا تھا۔

”انہیں میں بتاتی ہوں۔ تم چھوڑو مجھے۔ مجھے بیٹھنے دو۔ میں گر جاؤں گی۔“
وہ واقعی کرنے کوئی نہ چھٹی لہجے میں بولی تو آمنہ نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ وہ چارپائی پر گر گئی۔
”میں۔ میں کلج سے آ رہی ہوں۔ اسپورٹس ڈس۔“

”زینب۔“ آمنہ چیخی۔ جھوٹ ممت کو لہجے میں بتاؤ۔ کہاں سے آ رہی ہو۔ تم کلج گئی ہی نہیں۔“
”نہیں۔ سچ بتا رہی ہوں۔“ اس سے بولا میں جا رہا تھا۔ ذہن جیسے کسی گہری نیند میں ڈوبا جا رہا تھا۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔

”تم کلج یوں نہیں بولو گی۔ آج فیصلہ دینا ہے گا۔ پایا صاحب ابھی آنے والے ہیں اور اب میں ان سے ایک حرف نہیں بچھاؤں گی۔ تمہارا یہ ویرہ دوسرے گھر آنا ہیتمی تھا نف پھینچا پھینچا کر لانا۔ ہیتمی کپڑے بچوتے لے کر آنا مجھے پہلے ہی انہیں باہر کر دینا چاہیے تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم کیا ٹھیل ٹھیل رہی ہو۔“ آمنہ اسے کھاجانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ”تمہاری کا اس فیو لورین آئی تھی۔ کیا رہے جیسے تمہیں لینے اس نے بتایا کہ کلج میں تو کوئی اسپورٹس ڈس نہیں ہو رہا۔ بلکہ ایکن نام ہونے والے ہیں۔ وہ ڈیٹ شیٹ لے کر آئی تھی کہ زینب کلج نہیں آ رہی آج کل۔ کہیں بیمار نہ ہو۔ کھانا کھا کر دے آئے ڈیٹ شیٹ۔ اسے کیا معلوم ہماری تو قسمت ہی بیمار پر پڑتی ہے۔ بستر مگر بر جس کا کس کی کے پاس علاج نہیں۔“

”تمہیں تمہاری سرورہ گئی تھی۔ کوئی نہ کوئی گل کھلانے کی۔ بولو دو کہاں سے آ رہی ہو۔ اس مشکوک جیلے میں۔“ زینب بے شکل سے دیکھ پارہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ اسے آمنہ کی ہاتھ باتیں سنائی دی تھیں مگر سمجھ میں نہیں آئی تھیں اور کچھ تو اس نے سنی ہی نہیں تھیں۔

”زینب۔ زینب! تمہیں ہوا کیا ہے؟“ آمنہ جیسے تھک کر اس کے پاس بیٹھنے ہوئے بولی۔
”تم نے کوئی نشہ چاہا ہے؟“ آمنہ اس کی حالت دیکھ رہی تھی اور یہ کوئی پوچھنے والی بات بھی نہیں تھی۔ زینب اپنے حواسوں میں قطعاً ”نہیں لگ رہی تھی۔“

”کس کے ساتھ گئی تھیں؟“
”کس کے ساتھ۔“ اس کی زبان لڑکھرائی۔ بیماری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ آمنہ بے بسی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”مراؤ اللہ کرے۔ اب دوبارہ اٹھو ہی نہیں۔ ایسی بیٹیوں کو مرنی جانا چاہیے جو ماں باپ کی عزت کا جنازہ چپکے سے دفن کر آئیں۔ انہیں خود بھی کہیں دفن ہو جانا چاہیے۔ کسی کو بھی منہ دکھانے بغیر۔“ آمنہ کے سر پر عجیب سی وحشت سوار ہوئی۔ وہ اٹھ کر اسے کندھوں سے چھوڑنے لگی اور پھر تباہ توڑنے کے اس پر برسانے لگی عمر جاؤ

زینب! تم ہم سب کو زندہ درگور کر باؤ گی امر کر بھی۔ بابا صاحب! آپ کی ساری اولاد کیسی تھی۔ کیسی۔" وہ بے اختیار رونے لگی۔
 "آئی! آپ لوگ ادھر کیا ڈرامہ لگا کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ ادھر ہاں جی کب سے بے ہوش ہیں۔ میں انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی ہوں مگر ان کی آنکھیں نہیں کھل رہیں۔ وہ کیسے انہیں آکر۔" جو یہ اندر آ کر اونچی آواز میں پتلاتی تھی۔ ماں جی کو پھٹے بھر سے بخار تھا اور کمزور تو وہ ویسے بھی بہت ہو چکی تھیں۔
 آنتہ بے ساختہ سڑی اور اپنا چہرہ صاف کر کے کمرے سے نکل گئی۔
 زینب وہیں گھمری جی ہو چکی تھی۔

"سیلو گڈ مارننگ!" عبدالمعین ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا جب عین تارا اندر داخل ہوئی تھی گلابی رنگ کی سیلویس ناپ کے ساتھ اس نے سیاہ ٹراؤڈر پہن رکھا تھا۔ آدھے بال کپ میں تھے۔ باقی لمبوں کی شکل میں ادھر ادھر بھول رہے تھے۔ لگتا تھا ابھی بیدار ہو کر آئی تھی۔ چہرہ ٹھنڈا ہوا تھا چمک دار روشن روشن تھا۔ ایک اپ سے بے نیاز۔ لپ اسٹک کے بغیر بھی اس کے ہونٹ گلابی تھے جیسے۔ عبدالمعین کو کوئی استعارہ نہیں سوچا اس وقت یوں بھی اس کا دل غ حاضر نہیں تھا۔ اس کے سامنے پراناشتہ ٹھنڈا ہوا تھا مگر اس سے کچھ نہیں کھایا جا رہا تھا۔ وہ ناشتہ میں بیٹھ تھی میں تریٹر بل دار پر اٹھا آلیٹ پارا اسٹ کا پھاٹکا لے لیتا تھا۔ وہ ہر کو صرف سلاویا پھل کھاتا تھا۔ پراٹھا اس کی کمزوری تھا مگر آج تو اسے وہ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے آگے آپ میں پڑی چائے بھی ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

"گڈ مارننگ!" وہ چمکی سی مسکراہٹ لیے بولا "تو ناشتہ کر لو!" اسے اس وقت عین تارا کی آمد قیمت لگی تھی کہ از کم ان ظالم سوچوں سے تو نجات ملے گی جنہوں نے رات بھر اسے ایک پل کو نہیں ہونے دیا تھا۔
 "ٹھیک ٹھیک! کہہ کر وہ کرسی کھینٹ کر بیٹھ گئی۔

"کیا لوگی؟" وہ نیزبان بنا بیٹھا تھا۔ گل کہ وہ میں ذرا سی خاموشی کے دہننے بھی اسے ڈس رہے تھے۔
 "کچھ نہیں۔ صرف فریش جوس۔ سائٹ! اس نے ملازمہ کو آواز دی جو اسے پل حاضر ہو گئی۔ "میرے لیے فریش اور جوس لے آؤ۔" اس نے ملازمہ سے کہا وہ سر ہلاتے ہوئے بی گئی۔
 "تم کچھ نہیں لے رہے؟" اس نے ٹیبل پر بے تمام آنے کے پھوٹے لوازمات کا جاڑا لگایا۔
 "ہل نہیں چاہ رہا۔" عبدالمعین نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔
 "ہل! عین تارا سر ہلا کر بولی۔ "مبارک ہو بہت بہت۔" وہ اس کی طرف عجیب بکھی سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ہونٹوں کی مبارک باد بھی بے تاثر تھی۔

"کس بات کی؟" عبدالمعین نے ٹھنڈی چائے کا بد مزہ گھونٹ نکلا۔
 "شادی کی۔ رات کی تاریکی میں ہونے والی تمہاری شادی خاتہ آبادی کی۔" اس کا لہجہ بہت کچھ جتا دینے والا تھا مگر آنکھوں میں جیسے ہشت اترو تھی۔
 "ویسے تو یوں بھی سب شادیاں رات کی تاریکی ہی میں ہوتی ہیں۔ فیشن ہے نا آج کا۔" عبدالمعین آرام سے بولا۔ "اور مبارک باد کا شکریہ اگر تم اس کو شادی سمجھتی ہو تو۔ اور ہاں یاد آیا۔"
 وہ کچھ یاد کر کے بولا۔ "رات کی تاریکی پر یاد آیا۔ غالباً تمہارا عقد مبارک بھی تمہارے شاہجی سے رات کی تاریکی ہی میں ہوا تھا۔"
 "خوب یاد دلا گیا۔" ملازمہ جوس سے بھرا جگڑے میں رکھ کر لے آئی تھی۔ آگے رکھ کر شیشے کے گلاس میں اندلیٹے لگی۔
 "اور ایسے تاریک اندھیروں میں جڑنے والے رشتے کتنے پائیدار ہوتے ہیں۔ تمہیں میرے افسانے سے سبق

نہلا۔" جو نئی ملازمت گئی۔ وہ بولی۔
 "کوئی کسی سے سبق نہیں سیکھتا۔ مائی ڈیرا سب کے لیے زندگی نے علیحدہ علیحدہ اسباق تیار کر رکھے ہوتے ہیں۔" اس نے چائے کا بھرا کپ پرے دھکیل دیا۔ "تم سنا چکا ہو کب جا رہی ہو؟"
 "آج رات کو بلکہ آدھی رات کے بعد۔" وہ گھونٹ گھونٹ جوس پی رہی تھی۔ "تمہیں بہت مس کر دی گی میں۔ اگر تم بھی ساتھ چلتے تو کتنا اچھا لگتا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ تم میرے اصرار کے باوجود ہمارے ساتھ بیوں نہیں چل رہے۔ تم نے یہ کارنامہ میرے سہرا بنانے والا ہوا انجام دیا تھا۔"
 "ساتھ جانے کا کوئی فائدہ ہے نہ ضرورت۔ قلم کا میوزک میں دسے چکا ہوں۔ گانے رنکار ڈکروا چکا ہوں اور میرا قلم میں کوئی رول بھی نہیں۔ اور ساتھ نہ جانے کی وجہ وہ نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔ میرے گھر کا یہ قلم تھا تخلیق میں پچھلے مینے خالی کر چکا تھا۔ گھر کا مسئلہ اس ہفتے یہاں رہ کر حل کرنا تھا۔ سو کر بھی لیا۔ برا زبردست گھر لیا ہے۔ گھر کا ختم ہے۔ آج میں ادھر شفٹ ہو رہا ہوں۔ میرا سامان تو جا رہا ہے۔ میں بھی بس اب نکلنے والا تھا۔ ناشتے کے بعد گھر کے سامنے تھکی۔

"مجھ سے کتنی غمناک نظر آتی ہے۔" عین تارا نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کی شکایت کے علاوہ کیا امیدیں ہلا کر لے لے رہی تھیں۔ عبدالمعین سے بہت زیادہ دیر تک ان تیری ڈو جی امیدوں کی طرف دیکھتا نہ گیا۔

"میں تمہیں ساتھ لے کر ہی جاتا۔ بکلی انٹری تو تمہاری ہونا تھی۔ اور پھر گھر کے پارے میں تمہارے کھنٹس مہرے لیے بڑے اہم ہوں گے۔" وہ پتا نہیں اس کا دل رکھ رہا تھا یا واقعی عین تارا کے کھنٹس اس کے لیے اہم تھے۔

"یاد آ رہی ہے۔" عین تارا نے کہا۔ "وہ بتا کر بولی۔" وہ عبدالمعین نے مسکرا کر محض کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"بائی داؤے تمہاری گھر والی ہے کہ ہر اونے تم اپنے دل سے دل دن اکیلے اکیلے بیٹھے۔ پیڈوؤں والا ناشتہ تناول فرما رہے ہو۔ پراٹھا اور بھجیا۔ سام بتا رہی تھیں بڑا اچھا ہاتھ مارا ہے تم نے۔" اسے پھر اصل دکھ دینے والا موضوع یاد آیا تھا۔

"نہ اونچا نہ نیچا۔" وہ غلی خالی ہاتھ ہوں میں بالکل۔ "اس نے کھڑے ہوتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ جھاڑ کر اسے دکھائے۔
 "سید زولفی سے نام بتا رہی تھیں۔ وہ تو تم نے بھی بتایا تھا مجھے۔" وہ یاد کرتے ہوئے بولی۔ "ایسا نام بتا رہی تھیں وہ ہونے لگی۔

"شہرینہ۔" وہ عین تارا کی نام لے رہی تھیں وہ احمد پور۔ احمد پور سے تعلق۔ "وہ انک انک کر بولتے ہوئے کھڑے عبدالمعین کی شکل دیکھنے لگی جیسے کوئی عقدہ اس سے حل نہ ہو پارہا ہو۔
 "شاہجی کی چھوٹی سسر کا نام بھی تو شہرینہ ہے وہ بھی احمد پور۔ اور تمہاری۔" موبی کیا میں صحیح کہہ رہی ہوں؟" وہ اٹھ کر اس کے مقابل کھڑی ہو گئی۔

"ہاں!" عبدالمعین نے بے نیاز نظر آنے کی حتی الامکان کوشش کی۔
 "ایسا شہرینہ گھر سے بھاگ کر تمہارے ساتھ۔" اومانی کا شاہجی کی بہن۔ ساقابل نشین۔ "وہ بے یقینی سے لگے جا رہی تھی۔

"ہمیں یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ شاہجی کی بہن گھر سے نہیں بھاگ سکتی۔" وہ چڑ کر بولا۔
 "اور۔" شاہجی کو اس کی۔ اس واقعے کی خبر ہے۔" اس کا رنگ ازا جا رہا تھا۔
 "نہیں ہوگی تو اب تک ہو چکی ہوگی اور یارا اب بوریست کرو۔ چلنا ہے میرے ساتھ تو پلو ورنہ میں چلتا

ہوں۔ "عبدالعزیز نے پچھلے دنوں کے انداز میں بولا۔
"وہ ہے کہاں؟" وہ مضطرب نظروں سے اسے دیکھ کر بولی۔

"کیا کرو گی؟ جان کر؟ اپنے شادی کو خیر کرو گی؟"
"مہو بھی سنا ہے۔ تم بتاؤ تو سہی۔" وہ بے قراری سے بولی۔

"اولیں نہیں۔ تم شادی کو فون کرو۔ انہیں بلک سبیل کرو۔ اس سے اچھا موقع ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا۔ تو میں تمہیں راستے میں ساری تفصیل بتاتا ہوں۔ جو کچھ تم نے اس سید زادے سے جھوٹا ہوا اس ذیل کے عوض منوالینا۔ ساری زندگی میرا شکر ادا کرتے نہیں تھکو گی۔" وہ جوش سے بولا۔

"شکر یہ تو میں ادا کرتی اگر تم اپنی رفاقت کے لیے شہر بند کے بجائے۔ مہولی تم کچھ انتظار نہیں کر سکتے تھے۔"
وہ ہنسیلا کر بولی۔

"او کم آن گوڈ لیس آف بیوی۔ تمہارے منہ سے یہ کچھ تو اے ملال اچھے نہیں لگتے۔ تم تو بس خوش خوش خوش مسکراتی ہی اچھی لگتی ہو۔ کھیلے ہوئے گلاب کی طرح فریض۔ ناؤ کم آن! وہ اس کا ہاتھ چپتے ہوئے باہر لے جانے لگا۔

"میں مام کو تو بتا دوں۔"

"راستے میں بتا دینا۔ آؤ تو۔ اتنے دنوں بعد تو ملاقات ہو رہی ہے تمہارے ساتھ یوں آہنی میں۔ سنی بھر کر دل کی باتیں کریں گے۔ انجوائے کریں گے۔ آج لہجہ اور ذمہ داری طرف سے۔ ان میرا آف ہے ہر کام سے۔ کل پھر سے مصروفیت ہو گی۔ آؤ اپنے آج کو انجوائے کریں۔" وہ خوش خوش خوش خوش پانچ پانچ کرنے لگا۔

"میرے کپڑے تو دیکھو۔ میں پہنچ تو کروں۔" اس نے احتجاج کیا۔

"نہیں بہتی۔ تم اس وقت کسی میٹ پر شوٹنگ کے لیے نہیں جا رہی ہو۔ اپنے دوست اپنے عزیز مہولی کے ساتھ ہو۔ اس لیے نوٹ کلفت۔" "بھئی چلو۔"

"وہ اسے گھستے ہوئے اپنی گاڑی تک لے آیا۔ کچھ عبدالعزیز کا انداز اتنی اپنائیت لے ہوئے تھا۔ کچھ شہر بند کے بارے میں جاننے کا جس اور کچھ عبدالعزیز کا کیا کہہ دیکھنے کا شوق۔ مین مار اپ پ کر کے اگلی میٹ پر بیٹھ گئی عبدالعزیز نے گاڑی اشارت کر دی۔

مثنیٰ کی رسم خاصی سادگی سے انجام پائی تھی۔ سادگی لڑکے والوں یعنی مسزخان کی طرف سے تھی۔ اور مسزخان نے تو اپنے چیدہ چیدہ قرہی سب دوست احباب اور رشتہ داروں کو انوائٹ کیا تھا پھر مثنیٰ کی ہونے سے پہلے مثنیٰ کی خاصی تعداد میں تھیں۔ اس لیے کافی اچھی تقریب ہوئی تھی۔ سندی اور آف وانٹ کے کسی سٹین کے ساتھ شہر سے میں مثنیٰ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ عام دونوں سے ہٹ کر بہت خوبصورت اس میں کچھ تو اس کی پوپیشن کا کمال تھا۔ کچھ دل کی مراد پوری ہونے کی خوشی جو اس کے کھلے ہوئے چہرے اور چمکتی آنکھوں سے عیاں تھی۔

"ماشاء اللہ چاند سورج کی جوڑی ہے۔" جب معاذ کو مثنیٰ کے ساتھ لاکر بٹھایا گیا تو ہر ایک کی زبان سے یہی نکلا مسزخان کو ماضی کے کچھ مناظر یاد آنے لگے۔ نہ بہت اور شاید ازان کے سینے میں رکھے دو دیکھتے انگارے تھے جو نہ جلتے تھے نہ بجھتے تھے۔

معاذ آف وانٹ سوٹ میں زبردست لگ رہا تھا۔ مسزخان دل ہی دل میں اس کی نظر اتارے جا رہی تھیں۔
"کیا تھا اگر شہباز بھی آجاتا۔ دیکھتا جو نازک شان پاپہر کی اڑتی دھول اور ناموافق ماحول سے بچا کر اس نے گھر کے آگن میں لگائی تھی وہ تو اتنا اور خست بن کر کیسی ہمارا دکھا رہی ہے۔" ان کے دل سے ہو کر سی آئی تھی۔

پراس کا آخری فون آئے بھی تو تین ماہ بیت چکے تھے۔ اور مسزخان کے پاس اس کا نمبر بھی نہیں تھا۔ اس نے

شاید جان بوجھ کر نہیں نہیں دیا تھا اگر ہوتا بھی تو شاید وہ خود سے اسے فون نہ کرتیں انہوں نے خود کو جبراً اس علامتی ناراضگی پر مجبور کر رکھا تھا اور بدلہ تو شاید اسے دیکھ کر ایک بل بھی ناراض نہ رہتا۔

انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔ معاذ مثنیٰ کو انکو مثنیٰ پستا چکا تھا۔ اب وہ اپنے نازک مسندی اور زیورات سے بچتا تھا۔ اسے انکو مثنیٰ پستا رہی تھی۔

"آہا! آج میرے بابا کی شادی ہے۔" اچانک اسے تفضی ایک گہرا معاذ کی گود میں جا بیٹھا مثنیٰ کا نازک ہاتھ اسے تفضی کی اس اچانک "کو" "کو" سہ نہ پایا اور انکو مثنیٰ اچھل کر اسے بچھنے سے بھی بچھنے جا کر گئی۔

"ہاں ہائے کیسی بد شگونی ہو گئی۔" یا سمین مثنیٰ سمیت سب لوگوں کے دلوں میں بے اختیار یہ بات آئی اور مثنیٰ کا تو ہی چاہ رہا تھا۔ اٹھ کر اسے تفضی کو کس کس کر تین چار پھیر جڑوے۔ اس کا علیہ بگاڑنے پھر انکو مثنیٰ اسے دوبارہ سے بھی دی گئی۔ اس نے پستا بھی دی مگر اس کا موڈ نہ درست ہوا۔

اس کے بعد کھانا تھا۔ اس کے بعد میوزک کا پروگرام جس کے دوران ہی معاذ اسے تفضی کو سمانے اٹھ کر چلا گیا تھا پھر مثنیٰ چلا گیا ہی بیٹھ سکی اور سب لوگوں کی مہربانی کی پروا کیے بغیر تنگاتے ہوئے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

اس کا ہی چاہ رہا تھا۔ ہاتھ کی تھیری انکی میں پڑی ڈائمنڈ رنگ کو اتار کر ڈسٹ بن میں ڈال دے۔
اس نے اپنا سجا سورا روپ زخمی نظروں سے آئینے میں دیکھا جسے ایک بار بھی اس کے محبوب نے سہرا ہتی نظروں سے نہ دیکھا تھا۔ نہ کوئی پار بھراری سیلا۔ ہی اس کے کان میں گیا تھا حالانکہ اس کی فریض نہ کہہ رہی تھیں۔
وہ آج بچپانی نہیں جا رہی۔ اس پر اتنا روپ لگے کہ نظر نہیں ٹھہر رہی۔ ممانے دوبارہ اس کی نظر اتاری تھی اور ایسے مستکمل سے کہ ذرا بھی تعریف نہیں کی۔ ایک بھی مثنیٰ نظر نہیں ڈالی۔ وہ رو دینے کو تھی۔

انکو مثنیٰ سمانے ہی اس سے وہ تھاری خاطر نہیں بدلے گئے تھیں وہ چاہے تھا۔ وہ تمہیں پسند ہے تمہارے دل کی اس کی نظر اتاری تھی مثنیٰ اس کی پسند کی خاطر بہت کچھ سہنا پڑے گا۔ "رات گئے جب وہ اسی لباس میں سلتی پڑ رہی تھی یا سمین نے اسے پیار کرتے ہوئے سمجھایا تھا۔

"ممانا! مجھ سے یہ سب نہیں ہو گا۔" وہ دلوں کے سینے میں منہ چھپا کر بولی۔

"یہ سب تو کرنا پڑے گا۔ سہنا پڑے گا میری جان۔ اور نہیں بدلے گا۔ ہاں شادی کے بعد بدل سکتا ہے۔ اتنی بلدی تم اس سے بہت سی توقعات مت لگاؤ۔ اپنے اندر برواشت پیدا کرو اسے تفضی کا تو میں رندوست کرتی ہوں جلد ہی۔ باب مثنیٰ کچھ آچھ رہا ہے۔ پتا اور ہمارے سینے پر مونک دلنے کوڑا ہے۔ گفت میں بیایا یا ایل جانے کا تم دیکھنا میں جلد ہی اس کا کوئی نہ کوئی انتظام کر لوں گی۔ تم کچھ عرصے تک اس کو سہ لو بہتر ہے اس کی مہربانی میں اپنے پھر کے زاویے درست رکھو معاذ کو قابو کرنا ہے تو اس شوق کڑے کے ساتھ کچھ بیٹھا بول۔ معاذ تمہاری مثنیٰ میں آجائے گا۔ اس کچھ دنوں تک میری جان۔" یا سمین اسے بٹھار ہی تھی۔

اور پھر صبح تک واقعی اس نے خود کو راضی کر لیا تھا کہ وہ جا کر معاذ سے ملے

معاذ ناشتہ کر رہا تھا۔ بلکہ اسے تفضی کو کھرا رہا تھا۔ مسزخان بھی بیٹھی تھیں مثنیٰ کچھ جھکتے ہوئے ڈائمنڈ روپ میں داخل ہوئی۔ وادی اور معاذ کو سلام کر کے وہ مسزخان کے کمرے پر گئی تھی۔

"ناشتہ کرو گی مثنیٰ؟" مسزخان نے محبت سے پوچھا۔

"نہیں! میں کر کے آئی ہوں۔"

"اتنی صبح اول تو میری کڑیا اٹھتی نہیں۔ بحالت مجبوری اٹھ بھی جائے تو کچھ کھاتی نہیں۔ یہ تو مجھے معلوم ہے۔" مسزخان نے مسکراتے ہوئے اس کے کمرے کے کمرے کو دیکھا۔

"آپ کو معلوم تو ہے داؤد! وہ بھی جو ابیا" مسکرائی۔ اسے تفضی اس کو ل جا رہا ہے۔ "اس نے خود ہی اس ننھے شیطان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔

”آپ دیکھ تو رہی ہیں۔ میں اسکول جا رہا ہوں اس کا صاف مطلب ہے کہ میں اسکول جا رہا ہوں۔“ وہ تڑخ کر بولا۔

”مشی کے چہرے پر ایک رنگ آکر کڑ گیا۔ اس نے ضرباً کانٹھونٹ بھرا۔

”دیکھی جا رہی ہیں ار تفضی کی اسٹڈیز؟“ اس نے پھر ہمت کی۔

”اچھی جا رہی ہیں تو اسکول والے کسے پروا کت کر رہے ہیں۔“ اتنا سا پچھ اور اتنے بڑے بڑے جواب۔

”مشی سبک کر رہ گئی۔

”ار تفضی جانو! ہری بات۔ ہر یوں کو یوں جواب نہیں دیتے۔“ معاذ اس کا ڈوبو صورت کتے بالوں والا سر جو م کر لاؤ سے بولا۔

سو رہی! وہ لٹھ مار انداز میں بولا۔

”معاذ! آج رات کہ“ آواری میں میں اپنی فرینڈز کو ڈنڈے رہی ہوں۔ انکے جھمنٹ کی خوشی میں۔ آپ تیار کتے گا۔ آٹھ بجے تپ چلیں گے۔“ اس نے بڑے ٹٹھے لبتے میں معاذ سے کہا تو معاذ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”مشی! تمہیں معلوم ہے نا۔ میرا ہاؤس جا ب پل رہا ہے۔“

”نک۔ آج کل تو تم نہیں جا رہے۔ میرا خیال ہے چھٹی پر ہو۔“ وہ اس سے اتنی غافل نہیں تھی۔

”ہم ایک میڈیکل ہسپتال کا رہا ہے۔“ تنو پورہ کے وہاں ہی علاقوں میں ایک ہسپتال ہے۔ آج تو مجھے وہ یہ ہو گئی تکتے میں۔ کل سے میں علی الصبح ہی جاؤں گا اور ابھی بھی میں ار تفضی کو ڈوبت کر کے اور رہی جا رہا ہوں۔ رات بھی بہت دیر میں داپسی ہو یا شاید نہ ہی آسکوں۔ تم میری طرف سے اپنی فرینڈز کے ایک کوزہ کر لینا۔“

اتنی صفائی سے انکار۔ مشی کا ہی چاہا نا کتے کی ٹیبل اس پر لٹا دیا۔

”معاذ! یہ ڈنڈے تمہارے اعزاز میں ہے۔ یعنی ہم دونوں کی خوشی میں اگر تم ہی تہ ہو گے تو۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”سو رہی مشی! اہم رتگی سو رہی۔ تم پر وگرام مجھ سے پوچھ کر کتے تکتے آج اور لازمی چلنا ہے۔ نہیں آسکوں گا۔ مٹتے بھر کا ڈنڈے پر وگرام سے سارا۔ ایک ایک دن جتنی سے جتنی معاذ نے فری سے کہا۔

”معاذ! مشی! کہ رہی ہے تو چلو۔ شام کو جلد ہی آجانا۔ کچی کا دل اور جانے گا۔“

مسز خان کو پوتی کے تیور بہت کچھ بتا رہے تھے وہ کل دینا بنا رہا۔

”سو رہی ام جان! آج سلاؤں سے۔ میں نہیں آسکوں گا ہمارے کتے پر فرینڈز کو ڈنڈے ہوں گے۔ کسی کی غیر حاضری پروا کت نہیں ہوگی۔ میں کو کتس بھی کروں تو نہیں آیاؤں گا۔“ اس کے بھرنی سے کہا۔

”مشی! یہاں تم اپنی فرینڈز سے معذرت کرو۔ کسی اور دن کا پر وگرام بناؤ۔ میں معاذ کا ڈنڈے جو جائے۔“ مسز خان نے ہنسنے لبتے میں کہا۔

”تھینک یو اس مہمانی کا ڈنڈے تو آج رات کو ہے اور آپ مسز معاذ کو اپنی زبان میں سمجھا دیجیے گا۔“ اس نے ہنسنے لبتے میں کہا۔

”مشی! یہاں تم اپنی فرینڈز سے معذرت کرو۔ کسی اور دن کا پر وگرام بناؤ۔ میں معاذ کا ڈنڈے جو جائے۔“ مسز خان نے ہنسنے لبتے میں کہا۔

”معاذ! یہاں تم اپنی فرینڈز سے معذرت کرو۔ کسی اور دن کا پر وگرام بناؤ۔ میں معاذ کا ڈنڈے جو جائے۔“ مسز خان نے ہنسنے لبتے میں کہا۔

”مشی! یہاں تم اپنی فرینڈز سے معذرت کرو۔ کسی اور دن کا پر وگرام بناؤ۔ میں معاذ کا ڈنڈے جو جائے۔“ مسز خان نے ہنسنے لبتے میں کہا۔

”مشی! یہاں تم اپنی فرینڈز سے معذرت کرو۔ کسی اور دن کا پر وگرام بناؤ۔ میں معاذ کا ڈنڈے جو جائے۔“ مسز خان نے ہنسنے لبتے میں کہا۔

”مشی! یہاں تم اپنی فرینڈز سے معذرت کرو۔ کسی اور دن کا پر وگرام بناؤ۔ میں معاذ کا ڈنڈے جو جائے۔“ مسز خان نے ہنسنے لبتے میں کہا۔

”کنو رہی بھی بہت محسوس کرتی ہیں۔“

چائے کے ساتھ سو کھی روٹی کا ناشتا کرتے صوفی صاحب جو لئے کے پاس بیٹھی آمنہ کو دایا ت دے رہے تھے اماں کی طبیعت یوں تو کئی دنوں سے اچھی نہیں تھی مگر کتشتہ دو دن سے تو وہ بالکل تڑھال ہی تھیں۔ ہانکا ہکا سا نمیر پتھر بھی ہر وقت رہتے لگا تھا۔ نیم بیوش بستر پر بی رہتیں۔ نہ کتھ کھاتیں نہ کتیں ہر چیز سے دلچسپی تو بہت عرصے سے ختم ہو چکی تھی ان کی کتروں تو سے بھی کتگی نہ تھیں۔

”بابا صاحب! حکیم صاحب کی دوا تو کتھیلے ڈیڑھ ماہ سے کھا رہی ہیں۔ ذرا بھی افادہ نہیں ہو رہا۔ پھر ان کی دوا کترو ہی بہت ہوئی ہے۔ اتنی بڑی بڑی پڑیاں کئی بار تو ان کے کھانے سے اماں کی کتے آگئی طبیعت بھی تھوں کی تھوں ہے۔“ آمنہ نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔

”تو پتھر؟“ انہوں نے اپنی بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تو پتھر؟“ انہوں نے اپنی بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تو پتھر؟“ انہوں نے اپنی بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تو پتھر؟“ انہوں نے اپنی بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تو پتھر؟“ انہوں نے اپنی بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تو پتھر؟“ انہوں نے اپنی بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تو پتھر؟“ انہوں نے اپنی بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تو پتھر؟“ انہوں نے اپنی بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تو پتھر؟“ انہوں نے اپنی بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تو پتھر؟“ انہوں نے اپنی بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تو پتھر؟“ انہوں نے اپنی بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تو پتھر؟“ انہوں نے اپنی بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تو پتھر؟“ انہوں نے اپنی بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تو پتھر؟“ انہوں نے اپنی بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تو پتھر؟“ انہوں نے اپنی بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تو پتھر؟“ انہوں نے اپنی بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

کہ خواہ مخواہ کہ میں فساد اٹھائے گی اور اسے کون سا ماں جی کی پروا تھی۔ ایک بار بھی ان کے پاس نہیں آئی تھی خیر کہہ کر گئی۔

”جویریہ۔ آکر ناشتہ کر لو۔“ روٹی تو سے اتار کر اس نے جویریہ کو آواز لگائی۔

”اماں نے بس یہ دو نوالے لیے ہیں اور چائے تو پی نہیں۔“ جویریہ اماں کا ناشتہ دونوں کاتوں واپس لے آئی تھی۔

اس نے ایک دو گھنٹہ بھری نظر نرے پر ڈالی اور اپنے لیے چائے نکالنے لگی۔
دونوں خاموشی سے ناشتہ کرتے لگیں۔

”تم اپنا ایڈیشن بیچ رہی ہو انٹر کے لیے؟“ آمنہ نے اس سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ وہ ادا تعلق سے بولی۔

”یہ کیا بات ہوئی؟“

”میری ابھی تیاری نہیں۔“ اس نے بات ہی ختم کر دی۔ آمنہ نے دیکھا تھا اس کی دلچسپی مصالحتی میں بالکل ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ تب سے بابا صاحب نے اسے اسکول سے اٹھایا تھا وہ جیسے اپنے اندر ہی نہیں کم ہو گئی تھی۔ اس کے سب کام کسی معمول کی طرح کرتی مگر کھل کر کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ بابا صاحب کے ہاتھ سے تو آتی بھی کم تھی۔

آمنہ نے کچھ بے بسی سے اسے دیکھا۔

”کیا ہمارے گھر کا حال ہو گیا ہے، دونوں بھائیوں نے پلٹ کر نہیں پوچھا اور یہ دونوں گھر میں رہتے ہوئے بھی موندو نہیں۔“ وہ چائے پیئے لگی۔

”آمنہ! چلو میرے ساتھ۔ ماں کو بھی تیار کر لو۔ ادھر ایک میڈیکل کیمپ لگا ہے۔ فری علاج ٹیسٹ ڈوائزیاں وغیرہ۔ سب فری ہے اور بہت اچھے لائق ڈاکٹر شہر سے آئے ہیں۔ ایک ہفتے کے لیے کیمپ لگا ہے ایسی ڈاکٹرز بھی ہیں۔ مجھے ابھی آکر کسی نے بتایا ہے۔ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“

”مجھے اسکول جانا ہے بابا صاحب! آپ جویریہ کو لے جائیں۔“ وہ کہنا چاہتی تھی مگر کہ نہ سکی۔

”جویریہ! تم اماں جی کو کپڑے بدلوا دو تمہیں بھی بیچینگ کر کے ابھی آتی ہوں۔“

وہ کہہ کر اندر چلی گئی۔ پہلے بھی ایک دفعہ اماں جی کو سرکاری اسپتال لے کر گئے تھے مگر ڈاکٹروں نے بڑی بے توجہی سے دیکھا تھا۔ دو چار روٹیاں لکھ دیں جو اسپتال کے اسٹور سے لی ہی تھیں۔ کیمپ بھی ایسا ہی ہو گا تیار ہوتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

کیمپ کا شاید آج پہلا دن تھا یا شاید دو۔ بہت رش تھا۔

”بابا صاحب! ادھر تو باری ہی نہیں آئے گی۔“ وہ پریشان ہو گئی۔ پہلے ہی بہت بیل کر آئے تھے۔ اماں جی نے پوچھا۔
رہی تھیں اتنا بیل بیل کر۔ کیمپ لگا بھی تو آبادی سے بہت کر تھا۔

”اب چیک اپ تو کرانا ہے تمہیں۔ بیچ بچہ بنا کر لاتا ہوں تمہاں کو لے کر بیٹھو۔“

وہ اسے بیچ بچہ کر بھینٹ میں گم ہو گئے۔ وہی انسانیت کا جو دم لگا تھا۔

”پانچ ڈاکٹر بیٹھے ہیں اور دو ڈاکٹر تھیں پھر بھی انتظار ہے۔ میں تو منہ اندھیرے سے آئی بیٹھی ہوں۔ ابھی تک باری نہیں آ رہی۔“ اس کے ساتھ بیٹھی اماں بولی تو آمنہ نے خود کو ڈھیلا پھینک ڈیا۔
انہیں بیٹھے آ جاہتہ ہو چلا تھا۔ جب صوفی صاحب اسے آتے وہ کھائی دیے۔

”آمنہ! اٹھو بیٹا! ادھر تو باری آئے گی کوئی امید نہیں تھی مگر اللہ نے سب لگا دیا۔ میں چرچی بنوا لایا ہوں قطار میں کھڑا تھا کہ پیچھے سے کسی آدمی نے دھکا دیا۔ میں گرنے کو تھا کہ پاس سے گزرتے ڈاکٹر صاحب رک گئے اور مجھے اٹھنے میں مدد دی۔ پر پتی ہوا کر دی اور مریض کو اپنے دفتر لے کر گیا۔ اب وہ پھر کے کھانے کا وقفہ ہونے کو ہے ابھی فوراً“ لکھا وہیں تو اچھا ہے۔“ صوفی صاحب اسے رستے میں تحصیل بتا رہے تھے۔

گھر سے میں میرے دو سرے طرف بیٹھے نوبتوں ڈاکٹر کے علاوہ تین چار لوگ اور بھی تھے۔ جنہیں ڈاکٹر چیک کر رہا تھا۔ پاس ہی ایک نرس بھی کھڑی تھی جو مریضوں کا لی پی اور نبض وغیرہ چیک کر رہی تھی۔ ڈاکٹر کے اشارے پر وہ اب اماں جی کا لی پی لے رہی تھی۔ بخار کے لیے تھرما میٹر منہ میں لگا دیا۔

”بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب! آپ نے بلا لیا اور تھوڑا دیر تو شام تک ہماری باری نہ آئی۔“ صوفی صاحب عام طور پر کسی کا شکریہ ادا نہیں کیا کرتے تھے۔ واڑھی میں حلال کرتے ہوئے بولے تو ڈاکٹر مسکرایا۔ تھوڑی دیر بعد باقی کے مریض چائے تھے تو اماں جی کی باری آئی۔ وہ دست دھیان سے انہیں چیک کر رہا تھا۔

”یہ کب سے بیمار ہیں؟“ ان کی آنکھوں کے پونے اٹھا کر چیک کرتے ہوئے بولا۔

”کوئی مہینہ ہو گیا ہے۔“ ڈاکٹر نے یونہی غور سے صوفی صاحب کی طرف دیکھا۔

”معاف کیجئے گا اگر نقاب تھوڑا سا ہٹا دیں میں ان کا گلا وغیرہ چیک کرنا چاہتا ہوں کہ ان سے کچھ کھایا یا پیا کیوں نہیں چارہ۔“ اس کے کہنے پر آمنہ نے اماں جی کا نقاب چہرے سے نیچے کر دیا تو وہ ان کا گلا چیک کرنے لگا۔

”اس کے کچھ ٹیسٹ وغیرہ کروانے ہوں گے بلڈ اوہرے جائیں ٹیسٹوں کی رپورٹ کل شام تک آئے گی۔ ابھی میں عارضی طور پر روٹیاں لکھ رہا ہوں۔ وہ آپ کو ادھر سے لے جائے گی مگر اصل علاج ٹیسٹوں کی رپورٹ کے بعد شروع۔“

وہ کہتے کہتے پھر صوفی صاحب کو غور سے دیکھنے لگا جو بڑی توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔

”آپ۔۔۔ میں آپ کا نام معلوم کر سکتا ہوں۔“ وہ کچھ جھجک کر بولا۔

”صوفی عبد الرحمن کہتے ہیں مجھے۔“ وہ محنت سے بولے۔

”آپ کسی گاؤں وغیرہ میں پہلے رہ چکے ہیں۔“ وہ اپنی کینٹی برا لنگی مارنے لگا۔ ”مجھے گاؤں کا نام نہیں یاد آ رہا“ کسی مسجد وغیرہ میں۔

”آپ۔۔۔ صوفی صاحب نے مجھے اچھے انداز میں اسے دیکھا۔

”میرا نام معاف ہے۔ آپ کو شاید یاد ہو۔ وہ لڑکا جو ایک رات زخمی حالت میں بارش اور کچھ میں لپٹ پت مسجد کے دروازے پر آپ کو لے آیا تھا۔“ وہ صوفی صاحب کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میرے تم معاذ ہو ماشاء اللہ۔“ بڑا اکالفا۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ میں نے تمہیں کہیں نہ کہیں دیکھ رکھا ہے۔ ڈاکٹر نے ماشاء اللہ۔“

صوفی صاحب جو رش بھرتے انداز میں کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تو معاذ مسکراتے ہوئے ان سے گلے ملنے لگا۔

”آپ کی مریالی سے صوفی صاحب! آپ نے مجھے بنا دی تھی اور نہ شاید میں آج ادھر نہ ہوتا۔“ وہ مشکور لہجے میں گفتگو کرتے۔

”مقدر بنانے والا تو اللہ ہے۔ پر آج دیکھ لیا بیٹا کہ کبھی کبھی انسان خود بھی اپنا مقدر بناتا ہے۔ بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر بہت زیادہ۔“ وہ حقیقتاً خوش تھے۔ ایسے لائق فائق نوجوانوں سے مل کر یوں بھی نہیں بہت خوشی ہوئی تھی۔ معاذ تو پھر ان کا پندیدار نہ رہا تھا۔

”سوچا کرتا تھا کبھی آپ سے ملنے جاؤں گا۔ بس وقت نے مہلت ہی نہ دی۔ آپ گاؤں چھوڑ کر ادھر آ گئے ہیں؟“ اس کا سوال بہت اذیت دہ تھا۔ صوفی صاحب کی ساری رشائیت رخصت ہو گئی۔

”ہاں کافی سالوں سے۔“ وہ مزے جھانکے ہوئے لہجے میں بولے۔

”تم آنا ہمارے گھر۔ یہ ادھر مسجد کے اوپر رہائش ہے ہماری۔“ وہ اسے دعوت دیتے ہوئے محبت سے بولے۔
”مغزور ضرور انشاء اللہ میں پھر لگاؤں گا۔ ابھی کچھ دن ادھر ہوں۔ اماں جی کے علاج کے بارے میں اب آپ بے فکر ہو جائیں۔ کل شام رپورٹس وغیرہ میں خود لے آؤں گا آپ کے گھر تو ہیں اگر انہیں چیک بھی کر لوں گا۔ ادھر ابھی مریضوں کا بہت رش ہے۔ معاف کیجئے گا ورنہ میں آپ کی محبت میں کچھ اور دیر رہنا چاہتا تھا۔ یہ میرے

یہ باعث مسرت تھا۔ وہ موت بھرنے انداز میں معذرت کر رہا تھا۔

”کوئی بات نہیں معلوم ہے مجھے اللہ خوش رکھے تمہیں ۴ بج رہے ہیں۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔
”سٹر! نہیں یہ وہاں میں نے لکھی ہیں نوٹس اور ماں کی کالڈ بھی لے لیں۔ انشاء اللہ میں کل شام
میں آوں گا۔ ماں جی کو گھر جا کر رٹ کر دیا میں اور ہلکی غذا جیسے دودھ، دلیہ، کسٹرو وغیرہ دیں۔“ آخری ہدایت اس
نے شاید آمنت کو دی تھی وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔
”آمنت! ماں کا ہاتھ پکڑ لو۔“ مصوفی صاحب کہتے ہوئے ڈاکٹر معاذ کے ساتھ آفس سے نکل آئے۔
اور آمنت سر ہلا کر ماں جی کو سہارا دیتے ہوئے یاہر لے آئی۔



”سیفی! یہ تم کہہ رہا ہے جارہے ہو۔ دو گھنٹی کے لیے ماں کے پاس بھی بیٹھ جایا کرو۔ کتنے دنوں کے بعد آج
صبح میں تمہاری شکل نظر آئی ہے۔ رات کو پارہ بچے سے پہلے نہیں آتے اور صبح منہ اندھیرے نکل جاتے ہو۔
اسی محاذ پر جانا ہو۔ آخر ایسی کیا آفت آئی ہے کہ تمہاری مصروفیت کا کوئی وقت ہی نہیں رہا ہے۔“ ماما نے تیزی
سے پیڑھیاں اتر کر سٹری سوٹ کیس ہاتھ میں لیے سفیان کو ڈائٹنگ ٹیبل ہی سے پکارا۔
”اوہ سوری مام! میں ذرا جلدی میں ہوں پھر بات کریں گے میری فلائٹ سے نوبت ہے اور اب آٹھ بجتے کو ہیں۔
اے پورٹ جاتے جاتے ہی کھنڈ لگ جائے گا۔“ وہ مصوفی لہجے میں بولا۔

”کیا مطلب؟ تم کہاں جا رہے ہو؟“ رونا جیت زورہ کہیں۔
”میں نے آپ کو بتایا نہیں شاید۔ رات کو آپ کے کمرے میں آیا تھا۔ آپ سو چکی تھیں مام! میں ایک ہفتے
کے لیے کراچی جا رہا ہوں۔“
”خیر پتہ کراچی میں کیا اتنا ضروری کام آن پڑا ہے۔“
”میرا ایک دوست اینجیل ڈیوڈ لندن سے آیا ہے بزنس کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے کوئی سہارا دیا ہے۔
سرمایہ لگانا ہے تو ادھر پاکستان میں لگائے۔ دونوں میں ایک کے چار چار لاکھ۔ وہ اسی سلسلے میں آیا ہے۔“ سیفی کو
بروقت بہانا سوجھا۔

”تو تم اتنے اچھے بزنس مین ہو جو غیر ملکی سرمایے کو بھیج کر پاکستان لائیکو۔ تمہارے دوست اتنے سرمایہ دار
ہیں کہ وہ اپنے پیسے کو بزنس میں ہی غیر ضروری عیاشی میں جھونک لیں۔ سیفی! مجھے ٹھیک ہے بتاؤ۔ تم کراچی کیوں جا
رہے ہو؟“ وہ کچھ نقلی سے بولیں۔

”شک وہی شک۔“ وہ ایک دم سے بھڑک اٹھا۔ ”آخر آپ دونوں کو کچھ برقیں کیوں نہیں ہے؟“
”نہیں سکتا چاہے میں آپ دونوں کو سونے کا بن کر دکھا دوں۔ آپ دونوں میرا کبھی نہیں کریں گے اور جب
کسی کے والدین کو ہنی اس پر بھروسہ نہ ہو تو غیر کیا اس پر اختیار کریں گے۔“ وہ غصے سے بولا۔

”سیفی! میری جان! ایسی بات کر رہے ہو تم۔ ہم دونوں کو خدا انخواستہ کیوں تم پر یقین نہیں ہو گا۔ یقین ہے تو دفتر
نے آدھے سے زیادہ بزنس تمہارے حوالے کر دیا ہے اس پر بھی تمہیں ہماری محبت پر شک ہے۔“ رونا دل
بڑا اٹھ ہی ہو کر اٹھ آئیں۔

”بھروسہ۔“ وہ چونکا رہا۔ ”یہ ہے بھروسہ اس روپے کا چیک کیش کر دانا تو پہلے پیانے کے سائز ہوں گے۔ پھر وہ چیک
کیش ہو گا۔ میری حیثیت تو ایک سپروائزر کی ہی ہے۔ سارے کام کی کرائی کرنا اور بس بلکہ کچھ اختیار راستہ تو اس
کو بھی حاصل ہوتے ہیں مجھے تو وہ بھی نہیں۔“ اس کے لیے میں زہری زہر تھا۔
”سیفی! ایسے نہیں بولتے بیٹا! یہ سب کچھ تمہارا ہی تو۔“
”ہاں ماما! میں یہ رات ہی بہت سن چکا ہوں سب کچھ میرا ہی تو ہے میرے مرنے کے بعد ہو گا کیا یا نہیں پوڑھا ہو

جاؤں گا تب میرا ہو گا۔ ہر انسان اپنی عمر جیتا ہے تو ایسا مجھے خدا انخواستہ پیانے کے مرنے کا انتظار کرنا ہو گا اختیار ہاتھ میں
لینے کے لیے۔“ وہ گستاخ کیے میں چاہا۔

”سیفی۔“ رونا پٹی پٹی آنکھوں سے اسے دیکھے گئیں۔
”ایسی سوچ ہے تمہاری۔“ اتنی زہر آلود اتنی نفرت اٹھیں۔ ”وہاں میں بیڑا نہیں۔“

”آپ اوکوں کے رویے نے میری سوچ کو ایسا بنایا ہے۔ آئینے میں جا کر ڈرا لیتے رویوں کے بد صورت چہرے تو
دیکھیں ماما! آپ دونوں نے کبھی مجھ پر ٹرسٹ نہیں کیا۔ مجھے بھروسے کے قابل سمجھا ہی نہیں تب ہی تو شیخوپورہ
والی ٹیکسٹی کا بھی صرف انتظام میرے ہاتھ میں ہے اور ایک وہیلڈ لینے کی اجازت نہیں۔ گستاخی معاف ماما! یہ
صورت حال اب میری برداشت سے باہر ہے۔ آپ پیانے سے بات کریں۔ میں تو مجھے کچھ اور سوچنا ہو گا۔ اللہ
حافظ۔“ وہ تیز تیز کہتے ہوئے سوٹ کیس دھکیلا رونا کا جواب سننے بغیر باہر نکل گیا۔

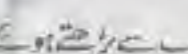
اؤرچ کے دروازے میں شکست خوردہ سے فخر حیات کھڑے تھے۔ وہ نظروں انداز کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔
”کیا لے ساجز اے کے پچھن۔“ وہ بت دینی رونا کے پاس آ کر بولے۔

”دونوں کے ٹکے بیٹے کے۔“ وہ گہری سانس لے کر بولیں۔ ”آپ دونوں کے۔“ وہ صوفی پر گری گئیں۔
”کیوں مجھے کیوں اس کا خلف کے ساتھ کھینٹ رہی ہو۔“

”آپ نے جیسا بویا ہے ویسا ہی کاٹیں گے۔ ابھی تک۔“ رونا نے ہونٹ کاٹے۔ ”رات کو آپ تین بجے
آئے تھے۔ رات کے تین بجے کون سی بڑھاپی میٹنگ ڈیریا ڈیل ہوتی ہے کچھ بتانا پسند کریں گے آپ؟“ وہ چہا چہا کر
بولیں۔

”نہیں کبھی نہیں۔“ وہ زور سے سر ہلا کر بولے۔ ”بزنس کے علاوہ کیا میری پرسل لائف کوئی معنی نہیں
رہتی۔“ وہ اولی آواز میں کہنے لگی۔
”آپ کی زندگی آپ کی ذاتی زندگی آپ کا کچھ آپ کی فیملی ہے جو رات کے تین بجے تک آپ کے گھر آنے کی
انتظار کیا رہی ہوگی ہے۔ آپ کا احساس ہے۔“

”تمہیں پھر بے خوابی کے دورے پڑنے لگے ہیں۔“ بستر پر نیند کی پلڑا بونڈی لے لیا کرو اور اپنی قنولیت کی
بوجھ مجھے نہ گردانا تمہارا بیٹا بھی اب کافی کچھ کھانے کے قابل ہو گیا ہے۔ میں آفس جا رہا ہوں۔ گڈ بائے۔“
وہ رونا کو سونکا ہوں سے دیکھتے ہوئے انہیں قدموں پر پلٹ گئے جن پر اندر آئے تھے۔
اور رونا کو لگا وہ پوری کھانکھان میں بالکل تنہا ہیں۔ اکیلی بے وزن ہے وجہ ہے مشق اپنے ہونے کی کوئی بھی
وجہ ان کی کچھ نہیں آ رہی تھی۔



”پاپا! میں بیچن میں اسکول میں قادری صاحب سے پڑھتے ہوئے ایک فقرے میں اکثر اچھ جابا کرنا تھا۔

”اہل عرب زمانہ جاہلیت میں اپنی بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زمین میں زندہ دفن کر دیا کرتے تھے کیوں؟“
اسکول بچے نے قادری صاحب نے میرے بیوڑے حتی الامکان مجھے اس کیوں کی لاجب سمجھانے کی کوشش
کی۔ مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ بیٹی کا وجود باعث شرم کیوں ہو سکتا ہے۔ بیٹیاں تو بہت اچھی
ہست خوب صورت بہت پیاری ہوتی ہیں۔ رات کے پچھلے پہر گھر کے آگن میں اتری سبک رو خوب رو تھی
پریاں پھرا نہیں جیتنے کی سانس لیتے ہوئے کوئی کیسے زمین میں گاڑ سکتا ہے کیوں؟
بڑے ہونے پر بھی مجھے اس کی بوجھ میں نہیں آتی تھی۔

”اور آج؟“ انہوں نے گہرا سانس لیا۔ ”اتنے سالوں بعد۔“ شہرہ انجھے یہ مطلب اس طرح سمجھا گئی ہے کہ
اس کا منجوس مطلب مرتے دم تک جب میری آنکھوں کے آگے موت کے تاریک اندھیرے چھا رہے ہوں
کہ یہ مطلب یہ مفہوم یہ وجہ میرے ذہن سے او جھل نہیں ہوگی۔ ”تاریک کرنے میں سیدہ اور سلطان جنت
بہت سویرے بیٹھے تھے جب سلطان جنت نے کہنا شروع کیا۔

سید شہین کے پاس ہر بات پر سوال پر دلیل کا مدلل جواب پیش تیار ہوتا تھا۔ انہیں سلطان بخت کو سمجھانے کی ذمہ داری تھی۔

گھر سے نکلنے والوں کی آتی جاتی سانسوں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ گونج رہی تھی۔

”سلطان بخت! اٹھ کر باہر جاؤ۔ جو ملی میں اقبوس کے لیے آنے والوں کا تانا بندھا ہے۔ بہت دیر بعد باہر سے آنے والی آوازوں کو سن کر سید نے روٹ کی سی مشینی آواز میں کہا تھا۔

”تو! میں کیا کروں گا باہر جا کر۔“ انہوں نے بیسے گراہ کر سکی لی تھی۔ سید خاموش ہو گئیں۔

”تو! میرا کیا ہے گا۔“ بہت دیر بعد ان کی آواز کسی کونوٹ سے آئی تھی۔ سید پھر چپ رہیں۔

”تو! میرے گلے میں تو موت کے پانچ طوق لٹک رہے ہیں۔ کیا میں اپنی زندگی میں پانچ بار اور مہروں کا ایسی اذیت ناک زندگی تو! کیا کبھی کوئی جیا ہو گا۔“ وہ شہر شہر کر تکلیف دہ انداز میں کہہ رہے تھے۔ سید تڑپ اٹھیں بے ساختہ

جی چاہا اٹھ کر اپنے شیر جوان بھائی کو اپنے گلے میں پھینکیں۔ ان کے سارے غم سارے دکھ اپنی پلکوں پر چن لیں۔

سید کی آنکھوں میں ڈھیروں پانی اکٹھا ہونے لگا۔ ان کے حوصلے کا دریا پڑا تھا۔

”تو! میں کہاں جاؤں۔“ سلطان بخت زخمی لہجے میں بولے۔

اسی وقت کسی نے اسٹ جلائی۔ موبائل کی بجٹی ہسپان کے پاس آئی۔

”شاہ سائیں! یہ آپ کا فون جی بچے جا رہا ہے۔“ مقبولان ان کے سر پر کھینچی تھی ان کا موبائل لیے۔ انہوں نے جھٹکے سر کے ساتھ موبائل اس سے لے لیا اور بے جان قدموں سے نکل گئے۔

”کو کیا بات ہے؟“ بے حد اچھی بیگانہ لہجہ تھا ان کا۔ نین تارا بے مزہ تو بہت ہوئی مگر یہ وقت جی جلائے کا نہیں تھا بلکہ شاہ جی کو تڑپانے کا تھا۔

”ایک خبر ہے میرے پاس آپ کے لیے شاہ جی! بڑی فٹنا شک۔“ وہ شوخ لہجے میں گویا ہوئی۔ سلطان بخت نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

”ایک سید زاوی جس نے رات کی تاریکی میں۔“

”تھو سنو۔“ سلطان بخت نے بارعب لہجے میں اس کی بات ٹکٹ کر کہا۔ ”ایک خبر میرے پاس بھی ہے۔“

”بھئی سے متعلقہ مگر شاہ جی تمہارا بھی اس سے کچھ تعلق نکل آئے۔“

انہوں نے جو خبر نین تارا کو سنائی وہ اتنی اچانک تھی کہ اس کے ہاتھ سے موبائل پھوٹ کر نیچے گر گیا۔ اتنی خوفناک خبر وہ زور زور سے سن کھڑی رہ گئی۔ اسے اپنی ”بھیا شک نیوز“ بھی رسول تھی۔

وہ منہ کھولے شاہ جی کی متعلقہ خبر کے زیر اثر کھڑی تھی۔

اب کیا فرمایا تمہارے شاہ جی نے کہ تمہرے کاحسین مجسین کر کھڑی ہو گئی ہو۔ کہیں تمہیں جو ملی لے جانے کا وعدہ تو نہیں کر رہے صرف یہی ایک بات تمہیں کھڑے کھڑے فریڈ کر سکتی ہے۔“

عید العیدین نے اسے یوں ساکت کھڑے دیکھ کر کہا۔ وہ ابھی گھر سے داخل ہوا تھا نین تارا نے اس سے تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ وہ سلطان بخت کو فون کرنے لگی ہے۔ عید العیدین اسے شمالی میں بات کرنے کا موقع دینے کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر نین تارا کے قدموں میں گرامو بائل اٹھا کر کان سے لگایا۔

وہ سری طرف مکمل خاموش تھی۔ اس نے گہرا سانس لے کر موبائل اٹھ کر دیا۔

”ہاں بولو۔ کیا ہوا ہے؟“ نین تارا اس کی طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”موبائل! وہ آہستگی سے بولی۔

”ہوں! کون۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”شہین مر گئی۔“ وہ اسی سحر زدہ لہجے میں بولی۔

”اس! وہ اپنی جگہ بے حس ہو گیا یہ کیا مطلب؟“ ایک لمحے کو تو اس کو یہ خبر بالکل سچ اور بالکل اچانک لگی تھی۔

”کل شام کو شہینہ اپنے ڈرائیور کے ساتھ شہر گئی تھی۔ اپنی شادی کی شاپنگ کرنے ڈاؤنسی پر گاڑی کا ٹارگٹ کے

میں اتر گیا اور گاڑی اسٹاپ تھی جس سے فوری طور پر اس کے انجن میں آگ بھڑک اٹھی۔ لمحوں میں وہاں آسمان

تک بلند شعلے اٹھنے لگے۔ لوگوں کے ہنسنے یا کسی اور مدد کے ملنے تک وہاں سوائے راکھ اور سہلے کو ٹلوں کے اور کچھ

بچا ہی نہیں۔ ایک گھنٹے بعد شہینہ کی تدفین ہے۔ شاہ جی اسی وجہ سے بہت غمگین اور افسردہ تھے اور مصروف بھی۔

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں اسے تفصیل بتا رہی تھی۔

”اوہ!“ عبد العیدین نے سینے میں رکھا ہوا سانس خارج کیا ”تو یہ بھگ (جاؤ) دکھایا ہے تمہارے شاہ جی کی منکار

فطرت نے۔ واث اسے پرفیکٹ اسٹوری۔ کہیں بھی بھول نہیں اور لاشوں کا پوسٹ مارٹم بھی نہیں بنا۔ راکھ کا

بھی پھلا پوسٹ مارٹم ہوتا ہے۔ میں نا! وہ بیسے خود سے بول رہا تھا۔

”تمہارا ہمارا ایمان قیل ہو گیا موبی وانا سنو! نین تارا طنزاً بولی۔

”میرا ایمان؟“ وہ بھونکا۔ ”میرا کون سا ایمان تھا؟“

”یو مت مانی ڈیر! تم نے شاہ جی کو بلیک میل کرنے کا خوب لباچہ ڈا ایمان بنا رکھا تھا۔ اب چاہے تم جیتی جاگتی

شہینہ کو تیا کی کسی بھی کورٹ میں پیش کر دو۔ تم ایک جھوٹے بلیک میلر اور فریڈی کے سوا اور کوئی خطاب نہ پاؤ

گے۔“ نین تارا نامعلوم کب سے اس کے آگے آگے بھاگنے لگی تھی۔

”ریش! اس نے ہاتھ ہلا کر جیسے ہوا میں کسی اڑائی۔“ ایسا کچھ کرنا ہوتا تو اب تک شہینہ یہاں ادھر ہے بس

بڑی ہوتی۔ اسے نالہ سے بھلا ہوتی۔ وہ لایا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ نیت تمہیں اس کی آفر کی تھی میں نے اور تم

اسی وقت عمل کرنے جا رہی تھیں کہ شاہ جی نے ساری سباط تم پر ہی اسٹ دی ہے۔ ویری سید مین دی!۔“

عید العیدین خود کو سنبھالنے کا ٹھکانہ تلاش کر رہی تھی اس کی یہ پلاننگ بھی تھی کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم شاہ جی کو زچ

ضرور کرنا ہے۔ اس حد تک کہ وہ خود کشی کرنے پر مجبور ہو جائے مگر شاہ جی کی عیار ذہنیت نے اس کی سازش کو اسی

کی طرف الٹ دیا تھا۔ النشا شہینہ اس کے گلے پر گئی تھی۔ شکر ہے وہ پہلے ہی اس سے پتھا چھڑا چکا تھا۔

”غیر معاف تو اس امیر زادے کو میں نے ابھی بھی نہیں کرنا۔ شہینہ بی بی جس کھٹکھٹے اور سارنگی کے

میوزیکل ففس میں قید ہے۔ اس بھنگار کی سٹھی سری ملی آواز بھی کبھی تو شاہ جی کو سنو ای دینا چاہیے۔ ان کے منہ

کا ڈا لٹھ بدلنے کے لیے۔ وہ اپنی سوچ پر خود ہی مسکرایا۔

”اب تمہاری سوچوں نے کون سا شیطانی فوج لیا ہے جو یوں مسکراتے جا رہے ہو۔“ نین تارا جو اس کے چہرے

کا بغور جائزہ لے رہی تھی نفورا بولی تھی۔

”کچھ بھی نہیں۔ تمہارے شاہ جی کی ذہانت کی داد دے رہا ہوں کہ کس صفائی سے انہوں نے ذلت کی کالک کا

ایک دھبہ بھی اپنے کینز چہرے پر لگنے نہیں دیا جو تقدیر نے ان کے نامہ مقدر میں ثبت کر دیا ہے۔“

وہ سر ہلا کر بولا۔ ”خیر یہ کریٹ سیاست دان اگر اس طرح اپنے خلاف کی جانے والی سازشوں اور تقدیر کے

کھیلوں کا منہ توڑ جواب دینے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو ایک پل کے لیے بھی اپنی مسند شاہانہ پر ٹک نہ سکیں۔

اپنی وے۔ جانے دو پھر اس موضوع پر بات کریں گے شاہ جی کی اس چال کا جواب تیار کرنے کے لیے تمہو ڈا سا

وقت تو ملنا چاہیے مجھے بھی۔“ اس نے اپنے کھٹکھٹے یا لے ہانوں میں انگلیاں پھیریں۔

”اور ہاں ایک اہم بات بلکہ گڈ نیوز ہو میں تمہیں بتانا ہی بھول گیا۔ امیرنگ۔ اتنی اہم خبر اور میں بھول گیا۔

”کیسی کیا خبر ہے۔“ نوا اتنی اہم ہے اور تمہنا بھی بھول گئے۔“

”تمہیں بتایا تھا نا سڑیوں کے ساتھ میں نے کنٹریکٹ کیا تھا دو ماہ پہلے۔“

"بس جی۔ اسی سلسلے میں ایک چین آف شووز ہونے جارہے ہیں۔ لندن جرمنی ٹورنو بیلیئم انگلینڈ اور آخر میں دینی شارجہ میں۔ اس کے دو ماہ بعد اسٹیشن جانے کا شیڈول ہے اور کل شام تو ہمیں معلوم ہے ناپی سی میں ہسنت ٹائٹ اسٹیشن ہو رہا ہے بہت بڑی ہو رہا ہوں میں آج کل کچھ بھی سوچنے کو نام نہیں۔" وہ جلدی جلدی اسے بتا رہا تھا۔

"واپس کب تک آؤ گے؟" میں نے تارا کو الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
"تقریباً" اٹھائیس دن کا پروگرام ہے۔" وہ بخاری صاحب کی انڈیا پاک مشترکہ ٹیلی فلم کے شوٹس بھی لندن میں ہی ہونے ہیں۔ کنسرٹس کے فوراً بعد ان کے ساتھ ڈیس ہے میری۔ اس لیے آتے آتے ایک ماہ سے ہفتہ بھر اوپر لگ ہی جاتے گا۔ تم بھی چلو تا میرے ساتھ۔" اس کے اواس چہرے کو دیکھ کر اس نے آفری۔
"متم چاہتے ہو میرے ساتھ سٹا پور؟" وہ شکایتا بولی۔

"یاد رہے کچھ امر کام ہیں لندن جانے کے سلسلے میں۔ پاپی پورٹ وغیرہ بنوانا ہے پھر کل میرا پرل کلینڈیل میں فنکشن بھی ہے۔ تم جلی چلو میرے ساتھ۔ تمہارے شادی تو اب اپنی بشیرہ کا چاہو اس کے لیے تمہیں انڈیا کریں گے۔ تم ایلٹی اور ہو۔" وہ میرے ساتھ چلو ٹوب انجوائے کریں گے۔" وہ اسے اسرارہا تھا۔
"اچھا۔ سوچوں گی۔" وہ ہم رشتہ مند لہجے میں بولا۔
"تکرو ویسا تم نے۔ اچھا ہے نا؟" عبدالصعبین کو یاد دیا۔

"اچھا ہے زبردست۔ پر تم تو اڑنے جارہے ہو بیوی اوروں پر۔ ان کو کون رستے گا۔"
"اے اے۔" وہ کھد سا آیا۔ شہرت کی ڈری سبھی صورت اس کی آنکھوں کے آگے لہرائی۔ "دیکھو شاید اماں جی وغیرہ کو لے آؤں اگر وہ مان گئیں تو۔" وہ سر جھٹک کر بولا۔
"موسیٰ اٹھئے اپنے پرٹس سے تو ملو آؤ بھی۔" میں تارا پر شوق لے کر بولی۔
"توبہ توبہ! امرواؤ کی جگہ میرے بابا صاحب میری شکل کتنے کو تیار نہیں۔" ہمیں ساتھ دیکھ لیا تو شاید قہر ڈالیں اور انہیں قہر سے کوئی روک بھی نہیں سکتا۔ "یہ قانون ہوتا تھا لگا کر دینا۔"

"اتنے سخت ہیں وہ۔" میں تارا کو ڈر لائی۔
"اتنے سے بھی بہت زیادہ۔" وہ ہاتھ بھرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔
"اوکے اب چلنا چاہیے۔ کچھ شاپنگ کرنے جانا ہے مجھے ساتھ چلو گی نا!"
"ہاں چلو میں آج شام تک تو فارغ ہی ہوں۔" میں ناراست لہجے میں بولی۔ "چائیں کیا حال اواس سا اور ہا

تھا۔
"چلو پھر تم گاڑی میں بیٹھو جا کر۔ میں ابھی آتا ہوں۔" وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تو میں تارا خالی ذہن سے ساتھ اسے جا نا دیکھتی رہی۔

اسے شہرت کی اچانک موت والی بات نے ڈسٹرب کر دیا تھا۔
اس کا دل چاہ رہا تھا وہ شاہ جی کو ساری صورت حال بتا دے مگر پھر سلطان ہسنت کا سخت انجیسی لہجہ اسے خاموش رہنے کی تلقین کر رہا تھا۔

معاذ اچھی شام اماں جی کے سینوں کی رپورٹس لے کر صوفی صاحب سے ملنے چلا آیا۔ وہ صوفی صاحب کے ساتھ لوہر آیا تو پتہ چلے سے اٹھانے میں نے ان کی رپارٹس کے دو کمرے اور مختصر ماسجن اسے حیران کر گیا۔ سال خورہ و رو دیو اور بوسیدہ چیمیں جیسے ابھی سر گر پڑیں گی سینٹ اگلے سیاہ میا لے فرش جھومتے لگتے کھن کھانی لکڑی کے دووازے کوئی ہوئی کھڑکیاں اور سامان کی بہتر حالت جھلنا چار پانیاں پیوندگی چادریں صحن کے ایک کونے میں مٹی کے تیل کا چولہا مٹی کے دو چار برتن لکڑی کی پرانی پھولی سی سامری پرو دھرتے تھے۔ بہت مختصر

سامان تھا۔ وہ بھی پرانا اور آؤٹ آف فیشن۔

"یہ ہمارے معلم دین کا طرز رہائش اور سر جھبانے کا ٹھکانا ہے۔ وہ معلم دین جو دنیا کے آفاقی فطری اور بہترین مذہب کی تعلیم ہماری نئی نسلوں کے دل و دماغ پر نقش کرتا ہے جس کے پیچھے ہاتھ باندھ کر پانچ وقت لوگ سر جھکا۔" خالق وہ جہاں کی برائی اور کبریائی کی ٹاکرتے ہیں۔ یہ اس عالم دین کی زندگی گزارنے کی جگہ ہے جہاں کوئی ذی نفس دس منٹ سے زیادہ شہرے تو اسے فضا میں آسپن کی شدید کمی کا احساس کیا رحوں منٹ آخری سیڑھی تک لے جائے۔ یہاں اس ڈرب نما چار دیواری میں یہ پورا اکیس سالوں سے دن بھی اور رات بھی زندگی بتائے جا رہا تھا۔ معاشی طور پر اتنے بد حال شخص نے دین کی ترویج کھلا کیا کرتی ہے۔ وہ تو صرف معاشرے میں "رٹو ملوٹے" پیدا کر رہا ہے جو ایک بار قرآن پڑھ لیتے ہیں پھر زندگی بھر اس کا مفہوم سمجھتا اور اس کے پوشیدہ فوائد کو جانے بغیر تیزی سے اس سپارے پر پارہ پڑتے جاتے ہیں اور بس۔

"بیشو بیٹا! صوفی صاحب اسے اماں جی کے کمرے میں ہی لے آئے تھے۔ وہ بستر پر لیٹی اسی کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ پچھلے سال پہلے کاؤچ میں اس نے خبرے کی درز سے جس اماں جی کو دیکھا تھا وہ ایک صحت مند مسخو سفید رنگت والی اور سانی صورت تھیں جو اپنے بچوں کے سچ کھال چولہے کے پاس بیٹھی تھیں اور یہ بستر پر لیٹی تھیں وہ اس کا کمزور عکس لگ رہی تھیں۔ پکی رنگت سفید ہونٹ بے رونق آنکھیں۔
وہ اماں جی کو سلام کر کے صوفی صاحب کی پیش کردہ کرسی پر بیٹھ گیا۔
"کیا حال ہے آپ کا اماں جی اب؟" اس نے محبت سے پوچھا۔

"بہتر ہوں بیٹا! اللہ کا شکر ہے۔" ان کا ہاتھ آنکھوں تک پہلے کاٹن کے دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی طرف دیکھے بغیر وہ آستلی سے بولیں۔

"نکل تو میں نے آپ کو دوا میں لکھ کر دی تھیں وہ سینوں کی رپورٹس کے بغیر تھیں۔ ان میں سے دو تو ابھی بھی دیکھ کر رکتا ہوں۔" وہ اور میں لکھ کر دے رہیوں۔ یہ میں ساتھ لے آیا ہوں۔ تین ٹائمہا قاعدگی سے دوائی ہے آپ نے اور ابھی خوراک بھی۔ اصل میں صوفی صاحب! انہیں کمزوری بھی بہت ہے۔ آپ انہیں دو دوہ گوشت پھل وغیرہ ذرا زیادہ استعمال کروائیں۔ انشاء اللہ بہت جلد یہ صحت یاب ہو جائیں گی۔" اس نے لکھا ہوا نسخہ اور دو اول کالفا فایس بڑی تیزی سے پکھا۔

"معاذ بیٹا! خدا نخواستہ کوئی اور چیز بیماری تو نہیں؟ صوفی صاحب نے پوچھا۔
"نہیں صوفی صاحب! ابھی تو ایسا کچھ نہیں لیکن اگر دوا اور علاج باقاعدگی سے نہ کروایا گیا تو خدا نخواستہ۔
بہر حال آپ انہیں دوا کریں دیں۔ یہ ٹھیک ہو جائیں گی۔" وہ انہیں تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"اصل میں ان کا بلکہ خون نہیں بتا رہا زیادہ سے بس مسئلہ نہیں۔ اللہ نے چاہا تو جلدی بھی ہو جائیں گی۔ اماں جی! آپ نے ابھی بیماری سر پر سوار نہیں کرنا ہے۔ زندگی ہو تو انسان بیمار شمارو آہی رہتا ہے۔ بلکہ کبھی بیمار ہونے سے انسان شکر۔" سستی روٹھن سے کچھ آرام بھی مل جاتا ہے مگر صرف چند دن کی بیماری۔ آپ کو بھی اپنی والدین اور سے بہت جلد بیماری کو شکست دینا ہے اور بہتر کو خدا امانت رکھ دینا ہے۔" ان کے افسردہ چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ مسکرا کر بولا۔

"کو شش کروں گی بیٹا! وہ بہت ہو لے سے بولیں۔
"اچھا تو میں اب چلتا ہوں صوفی صاحب! یہ میرا کارڈ ہے۔ شہر میں جس ہاسپتال میں جا رہا ہوں جب بھی خدا نخواستہ اماں جی کی طبیعت خراب ہو یا ویسے ہی آپ کو کچھ سے ملنا ہو تو ادھر آکر میرا پوچھ لیں۔ مجھے آپ کے کسی بھی کام کے خوشی ہوگی۔" اس نے کوٹ کی جیب سے اپنا ڈیٹنگ کارڈ نکال کر صوفی صاحب کو تھمایا۔
"شکریہ بیٹا! تمہاری اس توجہ اور محبت کا لیکن تم ایسے کیسے جا سکتے ہو بچائے تیار ہے۔ کھانا کھا کر جانا ہے۔"

چائے میں لارہا ہوں۔ صوفی صاحب بیٹھے لیجے میں کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔
اماں نے انہیں جاتے دیکھ کر ایک ٹھنڈی آؤ بھری۔

”اماں بی! آپ مایوس کیوں ہیں؟“ چند ثانیے بعد وہ بولا۔
وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہیں پھر آنکھیں جھپٹنے لگیں۔ وہ آنکھوں سے امدتے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”اماں بی! آنسوؤں کو روکا نہ کریں۔ انہیں رست دیا کریں۔ یہ آپ کے بوجھل دل کو اپنے بوجھ سے آزاد کر کے اسے ہلکا پھلکا کر دیں گے۔ کبھی کبھی روننا صحت کے لیے مفید ہوتا ہے۔“ وہ انہیں بغور دیکھ رہا تھا بولا۔

”اور جو ہر وقت رونا چاہے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ ”آنسو آنکھوں کے کناروں سے بے دھڑک نکل آئے تھے۔“

Excess of everything is bad

(ہر چیز کی زیادتی بری ہے) جس طرح بالکل نہ رونا دل کے بوجھ کو بھارتا ہے اسی طرح ہر وقت کا رونا زندگی کو بوجھ بنا دیتا ہے۔ ”معاذ کا دل ان کی حالت پر بہت ادا اس ہو چلا تھا۔“

”جب زندگی ہی بوجھ بن جائے اور اس بوجھ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے کمر کا نہ دھونڈنے لگ جائیں تو ایسے بوجھ کو اتار ہی پھینکنا چاہیے۔“ وہ مایوسی سے بولیں۔

”اماں بی! مایوسی کفر ہے۔“

”ایمان تو امید کا نام ہے۔ امید روشنی ہے اور روشنی زندگی اور جس کی زندگی میں کوئی امید ہی نہ ہو اس کا ایمان کفر ہی تو ہو گا میرے بیٹے۔“ وہ بہت پرشورہ تھیں بہت بیزار۔

”اللہ نہ کرے اماں بی! آپ کے ایمان پر کفر کا سایہ بھی پڑے۔“ وہ نے اٹھتار بولا۔ ”اگر کوئی میں ایمان پانٹنے والے ایمان پر ان کا یقین بچتے کرنے والے یوں مایوسی کا شکار ہو جائیں گے تو معاشرہ تو تباہ ہو جائے گا اس کا دل دہلا تھا۔“

”آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں۔“ اسے ان سے ہمدردی ہو رہی تھی۔

”جس ماں کے دو جوان پلے پلائے بیٹے اس عمر میں اسے پیشہ کے لیے بیٹے ڈکڑ کر چلے جائیں وہ ان کی صورتیں دیکھنے کو ترس جائے ایسی مایوس ماں ایمان تو کیا خدا سے بھی منکر ہو جائے تو ناقابل عقاب بات نہیں۔“ انہوں نے بالا حنر دل کا درد کہہ ہی ڈالا۔

”اوو! اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”کہاں ہیں دونوں؟ آپ کے بڑے بیٹے کو تو میں نے پکڑے بھی نہیں دیکھا تھا لیکن عبدالمبین ہی نام تھا نا دوسرے والے کا۔ میں اس سے ملا تھا۔ ویری انرجیٹک رنگ میں تھا۔ بہت پوٹینشل تھا اس میں کچھ کر دکھانے کا۔ کہاں ہے کن کل؟“ معاذ کو اپنے ماحول اور بابا صاحب کی بے جا سختی سے

تالاں وہ ”باشی“ عبدالمبین یاد آیا تھا۔

”گو تیار کیا ہے۔ شہر میں کاٹا ہے۔“ وہ دھیرے سے بولیں جسے وہ کسی بڑے جرم میں ملوث ہو۔

”چھبائیں کیا ہے۔“ معاذ کو زیادہ حیرت نہ ہوئی کیونکہ عبدالمبین کے خیالات جہاں تک وہ جان پایا تھا اسے اسی سچ تک لے کر جاسکتے تھے۔

”میرا بی! کو۔ بہت تھا میں صوفی صاحب اس سے۔ جیسے ہی اس کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں اور میں۔ میں کیا کر لوں میں تو۔“ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر روئے لگیں۔

”جو صلہ کریں اماں بی! سب صحیح ہو جائے گا۔ بس نوجوانوں کا خون گرم ہوتا ہے۔ انہیں کوئی نہ کوئی تخلیقی سرگرمی چاہیے ہوتی ہے۔ کچھ کر دکھانے کا شوق۔ عارضی لگن ہے لہذا جیسے ہی خود بخود تو تار مل ہو جائے گا وہ بھی۔“ معاذ نے انہیں سمجھایا۔

”وہ تو ٹھیک ہو گا یا نہیں مگر صوفی صاحب اسے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ ان کا غصہ عارضی ہوتا ہے نہ نفرت وقتی۔ انہوں نے تو مرزا جیون ختم کر ڈالا ہے دونوں بیٹوں سے اور مجھے جیسے ہی قبر میں اتارے۔“

”یہ لومعاذ بیٹا! چائے پیو اور کھانا تم نے کھا کر جانا ہے۔“ صوفی صاحب بڑے اٹھا کے اندر داخل ہوئے۔ ٹرے انہوں نے کر کے دوسری طرف بڑی تپائی پر رکھ دی اور خود بھی دوسری طرف بڑی چارپائی پر بیٹھ گئے۔

”شکر یہ صوفی صاحب! کھانا وغیرہ نہیں۔ مجھے ابھی کھر کے لیے روانہ ہوتا ہے۔ میں ٹیکے ہی لیٹ ہو چکا ہوں۔ انشاء اللہ دوبارہ حاضر ہوا تو ضرور آپ کو زحمت دیں گا۔“ ٹرے میں چائے کے دو گک اور نمکو کی پلیٹ بڑی تھی۔

”نہیں بیٹا! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی پھر آؤ گے تو پھر بھی کھالینا۔“ وہ بہت محبت و اصرار سے بولے تو اماں بی نے ایک دکھ بھری نظر ان کے چہرے پر ڈالی۔

”اتنا اصرار اتنی محبت کبھی اپنے کسی بیٹے سے نہ تھی صوفی صاحب آپ نے۔“ وہ دل میں کر رہیں۔

”اب عبدالمبین آج کل کہاں ہوتا ہے صوفی صاحب؟“ اس نے چند لمحوں بعد پوچھا تو صوفی صاحب نے چونک کر اسے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں واضح ناخوشگوار اثر تھا۔

”معلوم نہیں۔“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد انہوں نے روکھے لیجے میں کہا۔ ”میں اسے گھر سے نکال چکا ہوں۔ تم کو بچانے اچھی ہے تاؤ اور منگواؤں۔“ انہوں نے واضح طور پر موضوع بدل دیا تھا۔

”جی بہت اچھی ہے شکر یہ۔ اب میں چلتا ہوں۔ اماں بی کی یہ دو اپنی رہنمائی کی ہے۔ اگر طبیعت ٹھیک رہی تو صرف ایک یہ دو مزید ایک مہینہ جاری رکھیں۔ اپنی کی ختم کر دیں۔ ٹھیک ہے۔ اماں بی! اب آپ نے اپنی صحت کا خود خیال رکھنا ہے۔ ایک انسان کی زندگی کتنوں سے بندھی ہوئی ہے۔ وہ اگر سوچتے بیٹھے تو اپنے پیاروں کے لیے

سب ایسا ضرور خیال رکھے۔ اب سمجھ رہی ہیں نا۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اماں بی کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

”جی ہمارا آپ اور ہر پیاروں کا اور ہے۔“ فراغت ملی تو حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ اماں بی کا خیال رکھیے گا۔“ وہ انہیں تاکید کرتے ہوئے اماں بی کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔ سخن بالکل خالی تھا۔

اور آمنہ جو اس سے بات کرنا چاہ رہی تھی پیچھے آتے صوفی صاحب کو دیکھ کر فوراً ”دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔“

”وان ڈالنے کے لیے اچھا مہرنا ہے۔“ ناٹ بیڈ۔ ”زیادہ چورٹ چارپائی پر لیٹی تھی آمنہ کو تیزی سے باہر جاتے اور پھر فوراً ”دروازے کے پیچھے ہوتے دیکھ کر بولی تو آمنہ نے پلٹ کر اسے گھورا۔“

”اماں بی! آئیے میں ہمیشہ اپنی ہی صورت نظر آتی ہے۔“

”نہیں اپنی صورت کے ساتھ اکثر دوسروں کی حسرتیں بھی نظر آجاتی ہیں۔ اگر دیکھنے والی نظر ایک سپرٹ ہو۔“ وہ جو بابا بولی۔

”جیسے آپ کی۔“ جو یہ یہ بیل کر منہ میں بددانی۔

”لی میڈی کو زکام ہوا۔“ وہ حسرت جو یہ یہ کی طرف رخ کر کے بولی۔

”میں آپ کے منہ نہیں لگنا چاہتی۔“ وہ بے رخی سے کہہ کر حسرت سے اٹھی اور وہ باہر نکل گئی۔

”منہ لگنے کے لیے کچھ پلے بھی تو ہو بندے کے اور تمہارے جو پلے ہے اس کا گواہ تو پورا مٹل ہے۔“

”تمہاری دونوں بہنوں کی شادی طے کر دی ہے میں نے اور کیوں نہ کرتی۔ دونوں کی عمریں نکلی جا رہی ہیں۔ خدا خدا کر کے تو کام کے رشتے طے ہیں۔ اچھے رشتوں کے انتظار میں دونوں بوڑھی ہوئی جا رہی ہیں۔ رعنائی بی سے ہزار کروڑ فٹہ کہا کہ بی بی تمہارے حلقے میں بڑی بڑی رئیس زاریاں لیندیاں اٹھتی بیٹھتی ہیں۔ ذرا غریب بھیجیوں گا بھی خیال کرو۔ نہیں نبی بھلا یہ کب گوارا ہو گا کہ ان کے مقابل کوئی اچھے خاندان میں بیابا جائے۔ احسان فراموش بھول گئی۔ میں نے کیسا اپنا کایج کلٹ کر اس کی جلتی جلتی متاٹھندی کی تھی اور نہ تو وہ اب تک باہلی ہو کر کلیوں میں دھکے کھا رہی ہوتی۔“

عفت آرا کی فرمائے بھری زبان کہیں بھی مل کھا کر نہیں رکھی تھی۔ سفیان جو بوڑھے دھیان سے ان کی گفتگو سن رہا تھا ایک گہرا سانس لے کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”چھ ماہ کا تھا تو میرے لعل جب رعنائی کا چہ چھنا وہ رو کر کیا گل ہو رہی تھی اس وقت۔ میں نے اپنے کپڑے پھینک کر پتھر صبر کار کھا اور تمہارے باپ کی بات کے لیے بلکہ فرمائش کو جس نے امیر بہمن کے واہ طے کے آگے بیوی کی ممتا کی پروانہ کی اور تمہیں لے جا کر بہمن کی جھولی میں ڈال دیا۔ کتنی راتیں میں سو نہ سکی۔ آٹھ آٹھ کر اپنے پہلو کے خالی بستر کو دیکھتی رہتی اور گھٹ گھٹ کر روتی رہتی۔ رات بھر مجھے یہ خیال نہ لگانے دیتا کہ تو رو نہ رہا ہو تجھے بھوک نہ لگی ہو۔ اس لینڈ لینڈی کی آیا جو اس نے تمہارے لیے رکھی تھی وہ کبھوت تو رات بھر سوئی مری رہتی تھی تم سو رہے ہو اور وہ حشمت سو رہی ہو۔ میرا دل اس خیال ہی سے پھل پھل جاتا۔ آنکھوں میں رات رات کتنی اور صبح سویرے ہی میں بہانے بہانے رعنائی کو بچ جاتی۔ صبح میں تو دونوں میاں بیوی میری خوب قدر کرتے۔ خاطر تواضع کے لیے پیچھے جاتے پر آہستہ آہستہ انہوں نے طوطے کی طرح آنکھیں پھینکی شروع کر دیں۔ ادھر میں جاتی ادھر ان کے ماتھے شکنوں سے لبریز ہو جاتے۔ میری ماستا نے ایک گھر دیکھنے کو تڑپ جاتی تھی۔ وہ کھتے میں کچھ مانگتے آتی ہوں۔ ارے بھکاری تو وہ تھے جو میرے گھر کا سب سے اچھا اور سیرا کے اڑنے۔ عفت آرا نے بے اختیار احساس محبت سے مغلوب ہو کر سفیان کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اس کا سر ماتھا چومنے لگیں۔

”اری نیک بہنت! نیکی کی تھی تو اس کا اجر بھی اللہ سے مانگنا تھا۔ پر تم وہ شہسواران سے بد نیت تھیں۔ اب بھی بددیانتی کر رہی ہو۔ جو عہد کیا تھا اس سے پھر گئی ہو۔ ان بے چاروں کو خبر بھی نہیں کہ تم سفیان کو اپنے نیک کارنامے کی ساری داستان تک مرچ لگا کر سنا بھی چکی ہو وہ تو ان بھول ہیں۔ تم نے تو ان سے وعدہ کیا تھا کہ کبھی اس راز سے پردہ نہیں اٹھاؤ گی کہ ہم اس کے ماں باپ ہیں۔ انہوں نے بھی نہیں دینے سے ہاتھ نہ کھینچا۔ رو پیسے زیور مانگا جو تم نے مانگا ہمیشہ دو کتاویا۔ تم پر بدلہ چکا یا ان کی محبت کا۔ پیسے کے لالچ میں اگر زبان سے مگرئی ہو۔ بڑا گناہ آیا ہے عفت آرا تم نے۔“ نواز جو دور پیسے کتاب پر نظرسن جمانے ماں بیٹی کی گفتگو بڑے دھیان سے سن رہے تھے روتے ہوئے قبول کرے۔

”ہاں ہاں میں میں زمانے بھر کی گناہ گار اور تم سب تمہاری بہن بہنوں کی زمانے بھر کے نیوکار۔ کبھی کسی نے میرے دل میں بھانکا کس برونخ میں جلتی رہتی ہوں میں۔ میں نے پیچہ دیا نیکی کی اور وہ اسے لے کر سلت سنڈریاں چلی گئی صاف مجھے ٹھیکہ کھا کر۔ میں جو ہفت چار دن بعد جا کر اس کی صورت دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر آئی تھی ظالم اس سے بھی محروم کر گئی اور اب۔۔۔ اب دیکھو کیسی بے انسانی۔ ارے چور تو ان کے دلوں میں ہے۔ محنت کرے میرا بیٹا۔ اپنا خون پیسے دن رات ایک کر کے دھوپ میں جل کر اس نے فیکٹری بنوائی۔ کھڑے کھڑے غریب کی کمر اور ٹانگیں تختہ ہو جاتی تھیں اور جب فیکٹری نوٹ چھانے لگی تو اس غریب کو اجازت نہیں کہ اپنی مرضی سے ایک دھیلا اپنی بیب میں ڈال لے۔ سب دستخط انگوٹھے فخر میاں کے چلتے ہیں۔ میرا بیٹا تو عفت کی بیگار کر رہا ہے۔ اس علی دھاندلی پر تو میں صبر نہ کروں گی۔ ممتا کو تو صبر کی زہر بھری گولی دے کر موت کی نیند سلا دیا پھر

یہ تو بڑا ظلم ہے اور ظلم کے خلاف آواز نہ اٹھانے والا ظالم کا ساتھی اس سے بڑا ظالم میرا بچہ کب تک خاموش رہے۔ بس اب سفیان ان کھل کر بات کرنا کہ ان دونوں کے دلوں کی چالاک سانسے آئے۔ فیکٹری تیرے نام ہے۔ آدھے سے زیادہ بزنس تیرے نام ہے۔ اسلام آباد والی کو بھی تیرے نام کا فٹن ان کے پاس امری کالیا ٹرسٹ تیرے نام کا فٹن ان کے قبضے میں۔ چالاک دیکھو ان کی۔ میں کہوں اس نام کرنے کا کیا فائدہ جب تو ان سے کوئی فیصل نہ اٹھا سکے۔“ وہ زور دار لہجے میں بولیں تو سفیان سر ہلانے لگا۔

”بس بہت ہو گئی اب ان سے بات کرو۔“ وہ پھر بولیں۔

”میں بھی تنگ آچکا ہوں امی! اس روز روز کے ہاتھ پھیلائے سے۔ دس ہزار عیس ہزار۔ بھلا یہ کوئی رقم ہوتی ہے۔ میری اپنی سو ضروریات ہوتی ہیں اور میں سب کچھ ہوتے ہوتے فقیروں کی سی زندگی گزار رہا ہوں۔“

سفیان نے بھی ماں کی ہاں میں ہاں ملائی تو نواز صاحب افسوس سے انہیں دیکھنے لگے۔

”صبر نہ ماں سے ہو۔ کائنات بیٹے سے ارے بے صبرے کو کچھ نہیں ملتا۔ نہ اللہ کی رحمت نہ دنیا کی نعمت۔ اپنی بے ڈرازیوں پر خود ہی تڑپ تڑپ کر لوٹتا ہے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔“

”ہاں ہاں تم تو چاہو گے جیسے تڑپ تڑپ کر میں نے میرے بچوں نے زندگی گزارنی ہے یہ معصوم بھی گزار دے۔ ہائے وہالی ہے ذرا ظلم پہلے ماں کی ممتا سے محروم کیا اب دولت پیسے کے ہوتے ہوئے روپے پیسے کی محرومی۔ کیا جرم کیا ہے میرے بچے کے۔ وہ چمک کر بولیں۔

”جرم تو میں نے کیا ہے جو تم جیسی عورت کے شادی کی۔“ وہ منہ میں پردہ لائے۔

”سن رہے ہو مسٹھیا گیا ہے یہ۔ پتھوڑو اس کو۔“ وہ الٹا ہاتھ مار کر بولیں۔ ”تم بس پچاس لاکھ کا انتظام کرو مجھے چاہیے اگلے ماہ کی ستر تاریخ تک۔ دونوں مالوں کو سلامی میں ایک ایک گھر اور ایک ایک گاڑی دینی ہے میں نے۔ تو عفت کے افسر ہیں دونوں پر گورنمنٹ کا افسر بھی تو تھا ہی ہوتا ہے۔ دس بیس ہزار روپے مہینے کے کٹے تو کیا آتا ہے۔“

”توبہ توبہ کرو عفت بیگم! اپنی ہوس کے ہاتھوں توبہ کرو اللہ کے آگے۔“ نواز صاحب کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولے۔

”انہی ہیرا جیسی اولاد لوگوں کی محرومیاں وہ لکرنے کے واسطے ان میں یا نشتی پھروں ترسوں بھی میں اور پھر توبہ بھی میں کروں۔ ارے نواز میاں! چاہو کچھ کر تم توبہ کرو۔ چھوڑو میری جان۔ بہت زندگی عذاب بنا دی تمہ نے میری۔ اب میرا بیٹا میرے دلدار رو کر کھوتے گا۔ گزار بنائے گا میری زندگی اور میرے بچے تو چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا۔ ان کی جائیداد کا شمار لاکھوں کروڑوں میں نہیں اس سے اوپر ہوتا ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے اس بہتی گنگا کو اپنے قابو میں کرنا ہوتا ہے۔ یہ بھائی جی! ابھی نہیں مرنے کے۔ سانب بن کر اور پچاس برس تک اس خزانے کے منہ پر چھٹے رہیں گے ارے ہر کوئی اپنی عمر جیتتا ہے گولی پٹے پر لکھو اگر آیا ہے کہ بڑھا ہے تو جلد مرے گا۔ جوان ہے تو ویر سے ارے آج کل تو بوڑھے سو سو سال رہی رہے ہیں۔ ایسی دنیا کی ہوس ہے کہ ادھر سے جانے کا کینچوس کا بگی ہی نہیں چاہتا۔ بڑھی کھوسٹ ہو چکی ہے یہ رعنائی جیسی تک بیوی پار لہر جا کر الزور شہزاد بن کر نکلتی ہے تو کیا ان کے مرنے کے انتظار میں بیٹھا ترستارے گا۔ جان سے دو ٹوک بات کرو۔“

عفت آرا کی زبان کے آگے خندق ہی نہیں بڑے بڑے طوفانی ندی تالے بھی شربانے تھے۔ سفیان نے سر ہلایا۔ وہ خود آج کل شدید تنگی کا شکار تھا۔ اس کے اکاؤنٹ میں سات آٹھ لاکھ تھے جن میں سے اکثر وہ بڑی بڑی رقمیں نکلا کرتا تھا۔ جب سے عفت آرا نے اس راز سے پردہ اٹھایا تھا کہ وہ ان کا بیٹا ہے۔ رونا اور فخر حیات کا نہیں۔ اس وقت سے تین چار لاکھ تو وہ زور چکی تھیں۔

اس کے اکاؤنٹ میں مشکل سے ساٹھ ستر ہزار روپے تھے اور اپنے اخراجات کے لیے اسے یہ رقم بہت حقیر لگ رہی تھی۔ وہ خود رعنائی اور فخر حیات سے آریا پار والا معاملہ کرنا چاہ رہا تھا اور کچھ نہیں تو کم از کم اس کی فیکٹری

اور فرم کی آبدی پر اس کا اختیار ہونا چاہیے تھا۔

”آپ فکر نہیں کریں میں دو چار روزی میں ان سے بات کر کے آپ کو خوش خبری سناؤں گا۔“ اس نے ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اصلی دبی تو عفت آرا کی آنکھوں کی چمک اور ہنسنے لگی۔ اسی دن کے لیے تو انہوں نے یہ سو بازی میں لگایا تھا۔ بلا ہر بات ہوئی تھی مگر آنے والی شان وادبیت کے احساس نے انہیں کبھی مرہٹا نہ دیا تھا۔ اسی دن کا تو انہیں انتظار تھا جب رعنا حیات کی پلمتی دگتی ایسا پارکے ماتھے پر عفت آرا کی ملکیت کا شیون سامن جگمگا رہا ہو گا۔ ”وہ وقت آیا ہے۔“ وہ مسکرائیں۔

”تم کہاں جا رہی ہو؟“ صوفی صاحب نے گرج دار آواز پر کالج یونیفارم میں سلیقے سے چادر اوڑھے اور کتابیں سینے سے لگائے بیڑھیوں کی طرف بروستی زینب سے کہا تو اس کے قدم بے اختیار کباب کر رہ گئے۔

”کاب۔ کالج بابا صاحب۔“ اس کی زبان یوں لڑکھرائی جیسے بابا صاحب کو خبر ہے کہ وہ کالج نہیں آئیں اور جا رہی ہے۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ تم اب کالج نہیں جاؤ گی۔“ وہ غصیلی نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے بولے۔

”بابا صاحب! امتحان۔“ اس نے تھوک نکالا۔ ”امتحان ہونے والے ہیں۔ بس چند دن اور جاؤں گی۔“ اس نے اپنا خشک ہوا مطلق تھوک سے تر کرنا چاہا۔

”ایک دن بھی نہیں سنا تم نے۔ جتنا پڑھ لیا بہت ہے پاس ہونا جو تم نے تو دو سال ہر پاونہ کرتیں۔ اب ایک دن بھی نہیں۔ امتحان کا اتنا شوق ہے تو پرائیویٹ تیار کر کے لے لو مگر کالج کاب نام نہیں لینا۔“ وہ اسی عقلمندی سے بولے۔

”بابا صاحب! پلیز صرف چند دن۔ میں پھر۔ چھٹیاں ہو جائیں گی کالج میں۔ نہیں جاؤں گی پھر۔“ وہ ہلکی لہجے میں بولی۔

”تم چند دن کی بات کر رہی ہو۔ اب ایک دن بھی نہیں۔ تم اپنے بھائیوں کی طرح غیر ذمہ دار خود غرض اور لا پرواہ ہو۔ تمہیں کچھ خبر ہے کہ تمہاری ماں کی کیا حالت ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کھر کے کاموں میں ذرا دلچسپی نہیں لیتیں۔ کھر کا سارا کام ماں کی دیکھ بھال اور میرے ذاتی کام بھی اگتے ہو رہے ہیں۔ تم کھر میں ہوتی ہو تو پینک ٹوڈی ہو یا پھر یہ کالج کا ڈرامہ۔ تمہارا بابا صاحب بوڑھا ہو گیا ہے مگر اتنا بھی نہیں کہ تم پر نظر نہ رکھ سکے۔ تمہیں تم۔“ وہ گرج رہے تھے۔

”آمنہ کو اسکول جانا ہوتا ہے پھر بھی وہ ساری ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے نبھاتی ہے اور تم میں ذرا سا بھی احساس نہیں۔ ان دونوں نافرمانوں کی طرح۔ بہر حال یہ کتابیں سنا میں اندر جا کر رکھو اور کھرے بدل لو میں بیچنے ہی ہوں۔ جو میں نے کہا ہے اس کو ماننا ہی نہیں، عمل بھی کرنا ہے۔ جاؤ اب۔“ روکے لہجے میں کہتے ہوئے وہ بیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

آمنہ اسکول جانے کے لیے تیار ہو کر باہر نکل آئی تھی۔ بابا صاحب کا حکم نامہ اس نے بھی سن لیا تھا۔

”ناشتہ میں نے ماں جی کو کروا دیا ہے اور وہ بھی دے دی ہے لیکن دوپہر کے کھانے سے پہلے انہیں گولی دینی ہے جو ان کے سر پانے رکھی ہے۔ باقی میں اگر کھانے کے بعد کی دے دوں گی۔“

اس کے ہاتھ سے پھوٹ کر بیڑھیوں پر لڑھک گئی تھیں۔

”مجھے نہیں خبر تھی کہ تم اس حد تک آگے بڑھ چکی ہو ورنہ تمہیں اتنی پروا نہ ہوتی۔ کبھی نہ ہوتی۔ میں پہلے دن ہی تمہارے پر کٹر دینا مگر زینب لی لی اور ابھی بھی نہیں ہوتی۔ پہلے میں اتنی جلدی نہیں کرنا چاہ رہا تھا مگر اب زیادہ دیر نہیں کروں گا صرف ایک دو ہفتے تمہاری ماں کی ذرا سی طبیعت سمجھنے کے لیے تمہیں ادھر سے چلنا کروں گا۔ تمہیں تم اور اب یہاں سے فرج ہو جاؤ میں تمہاری صورت نہ دیکھوں گا۔“

صوفی صاحب شاید بیڑھیوں ہی میں کھڑے تھے۔ زینب جیسے ہی بیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ انہوں نے دو قدم اوپر چڑھ کر اس کے گال پر زنا کے وار پھینچ جایا تھا جس سے وہ تیرا کر بیٹھے جا گری تھی۔

وہ چادر سے الجھتی اپنے گال پر ہاتھ رکھے اور نچاؤ نچاوتے ہوئے اندر کمرے میں بھاگ گئی۔ آمنہ نے کچھ ڈر کر صوفی صاحب کی طرف دیکھا۔ عفت سے ان کا آتشیں چہرہ دیک رہا تھا۔

”تم پلو تمہیں اسکول سے دیر ہو رہی ہے۔ میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔“

وہ اس کی طرف دیکھ کر کچھ نرم لہجے میں بولے۔ آمنہ نے سر ہلا کر نقاب سے اپنا چہرہ ڈھلایا اور ایک نظر مڑ کر زینب کے بند دروازے کی طرف دیکھا اور صوفی صاحب کے پیچھے بیڑھیوں اتر گئی۔

جویریہ اماں جی کے کمرے کے دروازے میں کھڑی سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔ آمنہ کے جاتے ہی وہ باہر چولہے کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ وہ پھر کھلے اسے اماں جی کا پرہیزی کھانا بھی تیار کرنا تھا اور باقی سب کے لیے بھی سالن اور ابھی کھر کی صفائی بھی رہتی تھی اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے بہت سے کام۔ اسے معلوم تھا زینب اب نہ تو کمرے سے باہر نکلے گی نہ کوئی کام کرے گی مگر وہ سرے لہجے سے حیرت کا شدید جھوٹا لگا تھا۔ زینب کمرے سے اپنے اس تیار پیلے میں اگل گئی تھی۔ سلیقے سے بال بنائے صاف ستھرا چہرہ اور یونیفارم پر چادر اوڑھتے ہوئے وہ اندر سے آئی تھی۔

میں کالج جا رہی ہوں۔ بابا صاحب کو جانا چاہو تو بے شک بتا دینا مگر میں رک نہیں سکتی سنا تم نے۔“ وہ جارحانہ انداز میں کہتے ہوئے نقاب چہرے پر جھاتے ہوئے بیڑھیوں اتر گئی تھی۔

”میرے خدا یہ چھوٹی آئی کس قدر جھوٹا اور دلیر ہے۔ پتا نہیں انہیں کالج سے اتنا پار کیوں کر ہو گیا ہے۔ انہوں نے تو کبھی اچھی ڈویرن تک نہیں لی اور اب پڑھنے سے یہ عشق چھ مٹتی۔“ وہ بیڑھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچے جا رہی تھی۔ ”مذکورہ گولی اور پینک ہے ورنہ۔“ اسے خود ہی یہ خیال سوچھا تھا اور اس کے دل نے بھی اس کی تائید کی تھی۔

شکریہ ہو اگر صوفی صاحب اس دوران ایک بار بھی اوپر نہیں آئے۔ زینب آمنہ کے آنے سے دو منٹ پہلے ہی کھر میں داخل ہوئی تھی۔ لال بھجھو کا چہرہ لہجے سے اسے اندر کمرے میں چلی گئی۔

”مجھے بھوک نہیں لگتی مجھے کھانے کے لیے نہ بلائے۔“ کہہ کر ٹھک اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ آمنہ جو ابھی اوپر آئی تھی زینب کی بات پر استغما میرے نظروں سے جویریہ کی طرف دیکھنے لگی۔ جویریہ کندھے اچکا کر اماں جی کے کمرے میں آئی۔

”ہاں ہاں میں ابھی زندہ ہوں۔ جب مر جاؤں پھر بے شک چلے آنا کدھا دینے کے لیے۔ دل چاہے تو تب بھی نہ آتا۔ آکر دیکھو ماں کو کتنی لمبی سزا دی ہے تم نے اس جرم کی جو اس بد نصیب نے انجانے میں تمہاری بہتری کے لیے کر ڈالا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ میں جو تمہاری زندگی کا گلشن آباد کرنے چلی ہوں اپنی جھولی میں بد نصیبی اور محرومی کے کانٹے بھر رہی ہوں۔ بس کر شہباز اور ماں کو کتنا تڑپائے گا۔ رحم کر اس جہاں نصیب پر۔ مت دل دکھا اور میرا۔“

سرخان اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ سپاس بیٹھا ارغنی حیران ہو کر اپنی ہڈی ہڈی آنکھیں داہی پر جھانے

انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کے بے اختیار رونے پر اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے ان کا چہرہ صاف کرنے لگا۔ مسزخان نے اس کے ہاتھ چوم لیے۔

”دیکھ اس معصوم کو اگر بالکل تیرا بچپن ہے اتنا پارا اتنا معصوم کہ راہ چلتے رک رک کر باریا کرتے ہیں اور ماں باپ ایسے بد نصیب کہ اپنے بچے کے بچپن سے خود کو محروم کر لیا۔ شہباز بیٹا۔ آجا اب۔“ وہ رگیں۔

”اور جس کی وجہ سے تو نے کھانا چھوڑ دیا ماں کی ممتا کا جی بھر کر امتحان لے رہا ہے وہ ”وجہ“ تو کس کی قسم ہو چکی ہے۔ اب تیری کس سے لڑائی ہے، کسی اور سے نہیں بلکہ مجھ کو بڑھی جان سے تو بدل لے رہا ہے میرے تاکر وہ جرم کی سزا دے رہا ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں نا۔“ وہ غصے سے بولیں۔

”میں غلط نہیں کہہ رہی سچ کہہ رہی ہوں۔ اچھا سنو اگر تم اگلے ماہ تک نہ آئے تو شہباز! میرا یہ پوڑھا لڑتا ہاتھ تیرے بچے کے سر پر ہے اس کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ دوبارہ نہ تو کبھی تیری آواز سنوں گی نہ مجھے آنے کو کہوں گی۔ خدا کی قسم میرا دل کی شام تم نے۔ میں دن کے اندر اگر تم نہ آئے آج پندرہ ہے اگلی پندرہ کو اگر تم میرے سامنے نہ بیٹھے ہوئے تو سولہ کو میری موت کی خبر سنو گے اور اگر مجھے اپنی قسم بھانے کے لیے حرام موت کی مرنا پڑا تو خدا کی قسم میرا دل کی اس دنیا میں تیری نفرت جدائی کا عذاب سہا ہے۔ آخرت میں بھی تو چاہتا ہے میں خدا کے قہر کا نشانہ بنوں تو پونہ سی۔“ وہ روتے ہوئے زور زور سے کہہ رہی تھیں۔ آسمان کے کھربوں بھرے چہرے پر رواں تھے اور کارڈ لیس ان کے نحیف ہاتھ میں لرز رہا تھا۔

”ام جان! ام جان! آیا ہو گیا ہے آپ کو؟“
 معاذ اچانک اندر داخل ہو کر ان کے ہاتھ سے کارڈ لیس لیتے ہوئے بولا۔ اس نے فون کلن سے دیکھا تو لائن بے جاں ہو چکی تھی۔ مسزخان بھوٹ بھوٹ پوٹ کر رہی تھیں۔

”ہائے میں مر جاؤں۔ کیا ہو گیا ام جان! اللہ خیر کرے فون آیا ہے کون۔ شہباز تو ٹھیک ہے؟“ اس نے فون کر کے میں داخل ہوتے ہوئے مسزخان کو اس برقی طرح سے روتے دیکھ کر بول کر مسزخان کو اپنے فون دکھایا۔ اس نے ان کی ہچکچاہٹ دیکھی تو نہیں مگر دھیمی پڑ گئیں۔

”ٹھیک ہے سب کچھ نہیں ہوا۔“ رومال سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے انہوں نے سنہنصل کر جواب دیا۔
 ”کیوں رو رہی ہیں اس برقی طرح سے۔ شہباز نے تو کچھ نہیں کہہ دیا؟“ اس نے فون پر ہمدردی سے پاس بیٹھ کر بولی۔
 ”نہیں یونہی اس کی جدائی بدل بھر آیا۔ واپس آنے کا کہہ رہا ہے۔ دیکھو کب تک آتا ہے۔“ وہ اب سنہنصل سنہنصل کر بول رہی تھیں۔ ار ترضی ابھی بھی ہر اسان نظروں سے ادا کیے ہوئے رہا تھا۔

”ار ترضی! میرے پاس آؤ تم۔“ معاذ نے آگے بڑھ کر اسے اپنی گود میں اٹھالیا۔ سیمین نے ایک لمحہ نظر معاذ اور گود میں بیٹھے ار ترضی پر ڈالی۔

”اتنا بچہ نہ کرو پتے کو۔ کل کو تم مصروف ہو جاؤ گے تو یہ بڑھڑبڑ نہ ہو کر رہ جائے۔“ وہ ہنسنے لگے میں معاذ سے بولی۔

”میں بقنا بھی مصروف ہو جاؤں اپنے بیٹے کے لیے وقت نکال لوں گا۔“ وہ بڑے پیار سے اس کے گال چومتے ہوئے بولا۔

”نہیں! تمہارا پروگرام ہسپتال بنانے کا ہے اس کی کنسرکشن فنڈنگ سٹیٹنگ اور سارا انتظام۔ اف کوئی ایک ٹیم ہی ہونا ہے ہسپتال بنانے کا خود سوچو تمہارے پاس تو پھر شاید اپنے لیے بھی نام نہ نہ پتے یہ تو پھر پتہ ہے تو سرب ہو کر رہ جائے گا۔ تمہیں اتنا مصروف پا کر۔“ یا سیمین کے کہنے پر معاذ کچھ الجھ سا گیا۔

”مصروفیت تو واقعی بہت ہو جائے گی مجھے معلوم ہے اس پروفیشن میں اپنی ذات اپنی ترجیحات کی بھی نفی کرنا پڑتی ہے۔ سہراں میری سچی الامکان کوشش ہوگی کہ یہ آنور نہ ہو۔“
 ”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ یا سیمین نے کچھ بدل ہو کر کہا۔

”اس وقت تو اللہ جانے لیا ہو گا۔ ابھی دیکھ لو تم جلدی چلے گئے ہسپتال تو اس نے ناشتہ نہیں کیا۔ تم نے اس کی عادتیں اتنی بگاڑ دی ہیں کہ تمہارے ہاتھوں کے سوا اور کسی کے نوالے بھی اسے پسند نہیں اور اب ایک گھنٹے سے اسکول سے آیا بیٹھا ہے۔ ہزار سنتیں کر چکی ہوں۔ کچھ کھا لو۔ کتا ہے مجھے بھوک نہیں۔ ابھی ذقون بانو بتا رہی تھی اس کا توجہ بھی ہوں کاتوں واپس آیا ہے۔ اب بتاؤ بھلا میں اس کی کیا خبر گیری کروں جو خود محتاج ہو۔“ مسزخان ار ترضی کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”کیوں کامریڈ! یہ کیا شکایتوں کا سلسلہ ہے۔“ معاذ نے ار ترضی کو گد گدایا۔
 ”مجھے بھوک نہیں۔ اس لیے نہیں کھا رہا۔“ وہ کھکھلا کر ہنسنے لگی۔

”وہ کھانا جو میں کہہ رہی ہوں۔ ام جان! ابھی معاذ زیادہ مصروف نہیں اور ار ترضی آنور ہونا شروع ہو گیا ہے۔ کچھ ماہ تک اس کا ہسپتال والا پراجیکٹ شروع ہو جاتا ہے پھر شادی وغیرہ پتہ تو نظر انداز ہو کر رہ جائے گا۔“
 یہ سب سن کر ام جان نے کچھ کر پھر پوٹ لگانے کا ارادہ کیا۔

”ہاں دیکھی تم کہہ رہی ہوں۔ میں محتاج کیا کروں گی۔ ایک بچہ سبھانا میرے بس کی بات ہے بھلا۔“ وہ کچھ لاچار سی سے بولیں۔

”ام جان! یہاں پریشان ہوتی ہیں۔ ٹھیک ہو جائے گا سب اور فکر نہ کریں ار ترضی کبھی آنور نہیں ہو گا۔ سب سے پہلے میرا بیٹا۔ پھر تم اور۔“ معاذ نے پھر اسے گد گدایا۔

”نہیں تو کہتی ہوں ام جان! ار ترضی کو آپ ہاسٹل میں داخل کروادیں وہاں کی لائف بڑی ڈسپلنڈ ہوتی ہے۔ بچوں کو بہت انٹرنل منڈنٹ بنا دیتی ہے براعتا اور کانسٹنٹ دیکھے گا اس کی شخصیت میں ماں باپ کی کمی سے جو ظاہر ہوا ہو رہا ہے وہ ہاسٹل جا کر خود خود نکل جاتا ہے۔ وہاں پر پتے کو انفرادی توجہ جوتی ہے۔ بہت پالش ہوں گی اس کی پالش اور سرب۔“

”وہ ار ترضی کی طرف دیکھے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولی مسزخان چپ سی ہو گئیں۔
 ”جی نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر کے ہوتے ہوئے ار ترضی ہاسٹل کیوں جائے گا۔ دیکھے گا۔ ادھر ہی میں اس کی پر سنائی کیسے پالش کروں گا۔“ اس نے ہلکا سا سٹوڈنٹ لگے گا۔ کیوں کامریڈ؟“ معاذ نے پھر ار ترضی کو چھیڑا۔

”ہاں یا سیمین! میرا دل نہیں کرتا۔ اتنا سا توجہ ہے۔ اٹھا کر اسے اپنےوں سے دور تھانے داروں کے ہتے چڑھا دوں۔“ مسزخان سی فوراً بولیں۔

”ہاں۔“ معاذ نے بولیں نہیں کھایا۔ آؤ ذرا آج میں تمہاری کا اس لیتا ہوں۔“ معاذ ار ترضی کو گود میں چڑھانے پھر آیا۔

”ذقون بانو! ذرا ار ترضی کا کھانا لائیں۔“ اس نے ڈانٹنگ ٹھیل کے گرد پڑی دو کرسیاں کھینچیں۔ ایک پر خود بیٹھ گیا۔ دوسری پر ار ترضی کو بٹھا دیا۔

”بابا! میں نے اسکول میں کھایا تھا۔ اسی لیے بھوک نہیں ہے۔“ وہ ٹانگیں جھلا کر بولا۔
 ”بھوت۔ ام جان بتا رہی تھیں، تمہارا جی پاس Intact (مالم) آیا ہے۔“

”وہ میرے فریڈ کی ماما ہیں نا انہوں نے مجھے کھلایا تھا چچن سینڈویچ اور جوس کا جاکٹ۔ سینڈویچ بہت مزے کا تھا۔ چھٹی کے وقت وہ اپنے مئے کو لینے آئیں تو مجھ سے بھی ملیں۔ مجھے بھوک لگی تھی۔ انہوں نے پوچھا تو میں نے نہ نہیں کہا۔“ وہ جلدی جلدی تپانے لگا۔ معاذ ٹھٹک گیا۔

”گون ہی آئی؟ کس نے کھلایا تمہیں؟“ وہ اسے گھور کر بولا۔
 ”میرے فریڈ کی ماما! وہ اسی لایا وہ مجھے میں بولا۔“

”میں نے تمہیں منع کیا ہے نا۔ کسی سے کچھ نہیں لے کر کھاتے۔“ معاذ کچھ غصے سے بولا۔ ”وہ پہلے بھی تم

سے ملی ہیں؟

”تمہیں تو کبھی بھی نہیں۔ آج ہی آئی تھیں میرے فریڈ کو لینے تو مجھ سے ملیں۔ میں صبح بیک فاسٹ نہیں کر کے گیا تھا۔ صبح بھی گھنٹے اہو گیا تھا مجھے بھوک لگی تھی۔ آئی نے اصرار کیا تو میں نے کھایا۔“

”کل بھی آئی کی وہ؟“ معاذ نے پوچھا۔
”جائیں۔ میں نے نہیں پوچھا۔“

”اچھا! معاذ سوچنے لگا۔ ”میں کل تمہیں لینے آؤں گا۔“ وہ کہتے کہتے رک گیا مگر دل میں ٹھان لی کہ کل وہ اراضی کو خود لینے جائے گا۔



”ہیلو گڈ آرٹنگ کیا بات ہے ابھی سہرتیں ہو۔“ سلطان بخت کی فریش آواز سن کر عین تار کے خوابیدہ حواس ایک دم سے بیدار ہو اٹھے تھے وہ سگا پور سے تین دن کی شوٹنگ کے بعد رات ایک بجے تو لوٹی تھی اور ابھی اس کا بار بجے تک سونے کا ارادہ تھا اور ابھی تو صرف نو بجے تھے۔ اس نے مندی مندی آنکھوں سے والی کھانک کی طرف دیکھا۔ سلطان بخت کو اس نے اپنے سگا پور جانے کا نہیں بتایا تھا۔ وہ اپنا موبائل زیور گل کے پاس چھوڑ آئی تھی کہ اگر شاہی کافون آئے تو کوئی بہانہ کر کے سگا پور وہ دوسرا موبائل لے کر گئی تھی۔

”ہاں۔ بس رات آیرنگ جاتی رہی۔ اس لیے ابھی سو رہی تھی۔“ اس نے ایک بھر پورا اٹھرائی لے کر اپنا جسم ہیلو اچھوڑ دیا۔

”شیر بہت رات دیر تک کیوں جاگتی رہیں؟“ سلطان بخت بہت اچھے مہمانوں میں لگ رہے تھے۔
”رات آپ کی یاد آتی رہی اور نیند آنکھوں سے روٹھی رہی۔“ وہ لہجوں میں گنگائی۔

”بے نسبت کیا ہماری محبت آپ کے دل ناگزیر از سر نو حملہ آور ہوئی ہے؟“
”از سر نو کیوں شاہی! آپ کو دل ایک پل تو بھونکتا نہیں۔ خیر رات تو میں ایک اور طرح سے تپ گیا اور رہی تھی۔“ وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔

”میں ٹھیک تین گھنٹوں میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔ تم ایک ٹیک اپنے بہت اچھے ڈریسز اور جیولری کا تیار کر لو اور خود بھی بہت چارمنگ قیامت سا روپ اپنا لو۔ میں آؤں تو تم ریڈی ہو بالکل۔ ہم کوئی پندرہ دنوں کے لیے شمالی علاقہ جات کی طرف جا رہے ہیں جہاں صرف میں اور تم ہوں گے اور قدرت کے ہو شریا نظارے اور تمہاری یا گل کر دینے والی رفاقت۔ کہو ہے نا سر پر اترنا؟“ وہ واقعی مہذب تھے اور ایک اچھے بہت پروگرام بنا کر نکلے تھے۔

”زیور سٹ سر پر اتر کر۔“ وہ ایک دم خوشی سے چلائی۔ ”سگا پور سے واپسی پر جو مارے راستے یہ صبح سوچ کر ہانک ہوئی آئی تھی کہ سولی تو اپنے ٹرپ پر نکل چکا ہو گا۔ لندن برٹنی وغیرہ اسے بتا بھی چکا تھا فون پر رابطہ کر کے اور ایک ماہ کتنا طویل ہوتا ہے اسے سوچ سوچ کر ہشت ہو رہی تھی کہ وہ اپنی خوفناک بوریت سے کیسے چھٹکارا پائے گی اور رستے بھر بچھتاوی بھی رہی تھی کہ کاش وہ سولی کی بات مان لیتی اور اس کے ساتھ ہی چلی جاتی اور اب سوچ رہی تھی اچھا وہ اوہ اس کے ساتھ نہیں گئی ورنہ سلطان بخت تو ادھر طوفان اٹھا دیتے۔ وہ واقعی بال بال بچ گئی تھی ان۔ کہ قہر کا نشانہ بننے سے۔“

”شاہی اتنے صبران نہیں نہیں آ رہا۔“

”تم تو سدا کی لے لی ہیں وہ مائی سویٹ ہارٹ اور اس بار تمہیں ہر چیز کا یقین دلا دوں گا۔ اپنی دائمی محبت سمیت سب باتوں کا۔ اس بار تمہیں قطعاً کوئی مایوسی نہیں ہوگی۔ کچھ ایسا نہیں ہو گا کہ تمہا کو اور ہم عطا نہ کریں۔ اس بار عین تارا! تم ہماری اس محبت کو مجھ سے بھوکے دل میں تمہارے لیے ہے۔“ وہ تمہیں لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ”اس بار ہماری محبت کا ساون ٹوٹ کر ہم پر برسے گا اور تم اس بارش میں بھیک بھیک جاؤ گی۔ چاہو بھی تو گریز نہ کرناؤ گی۔ آئی پر اس۔“

”جو مانگوں گی نہیں کے؟“ عین تارا کی آنکھیں چمکیں۔

”میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں تم جو مانگو گی میں ضرور دوں گا۔ چاہے تم آسمان سے تارے توڑ کر لانے کی فرمائش کرو۔ پوری کروں گا۔“ وہ دل و جان لٹانے کو تیار تھے۔
”کاوعدہ؟“

”ایک ایلٹی سے بھی منسوب۔ اوکے سی ریڈی آئی ایم جسٹ کننگ۔“

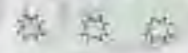
وہ ہلکے پھلکے لہجے میں بولے۔ ”ملتے ہیں ابھی تین گھنٹوں بعد پھر نکل کر تمام باتیں ہوں گی۔ تمام وعدے و وعید وعدہ و پیمان اور محبت کے پھیل پائے۔“

کہتے ہوئے انہوں نے موبائل آف کر دیا۔ عین تارا ”یا ہو۔“ کا زور دار اٹھوا گا کر بستر سے اتر آئی۔ پھر تین گھنٹے جیسے تین منٹوں میں گزر گئے۔ ستر کے لیے پیروں کی پینٹنگ، ٹیکنگ نیو لرنی کا سٹیکس میٹھل اور پورے چائے کیا کیا یاد کرتے بھی اس کے دو بیگ تیار ہو گئے ابھی اس کی اپنی تیاری رہتی تھی۔

”ڈیوٹی میں ظہران! سچو بہ ہمارے پاس آخری موقع ہے اس جا کیر زاوے کو چھوڑنے کا۔ دو ماہ تک تمہاری تینوں فلمیں سن ایئر آجائیں گی پھر دیکھنا یہ شاہی تمہارے ہاتھوں سے کیسے چھلکتے ہیں۔ ان کے طوفان کا مقابلہ کون کرے گا۔ مجھے تو سوچ کر ہلکی چھری جاتی ہے۔ جو کھانا ہے جو چھانا ہے، میٹھا ہے اس دور سے میں سمیٹ لیما۔ اس کے بعد تو زندگی بچانے کی نوبت آجائے گی۔ اب کوئی کسر نہ چھوڑ کر آنا۔“

زیور گل اس کے پیچھے پیچھے پھرتے ہوئے ہر لبت نامہ اس کے ذہن میں گھونس رہی تھی۔
”عین لیا بھجھ لیا۔ نام اچھے تیار ہونے دیں۔ شاہی آنے ہی والے ہیں۔“ اس نے زیور گل کی کوئی بات سنی ہی نہیں تھی۔ اسے شاہی کی بر لطف عادت کا سہن خیال ابھی سے بے چین کیوں رہا تھا۔

”ایک تین گھنٹے بعد سلطان بخت کی گاڑی ان کے لیٹ کے باہر کھڑی تھی۔ وہ اندر نہیں آئے۔ ملازم نے عین تارا کے بیگ گاڑی میں جا کر رکھے اور فریش فریش سی کھری کھری عین تارا ان کے برابر جا بیٹھی۔ انہوں نے سر اٹھنے والی نظروں سے اس کے دل میں اترتے روپ کو دیکھا اور مسکرا کر سر ہلا دیا۔
عین تارا کو اپنی ”فرمائش“ کی کامیابی کا اتنی قصور نہیں ہو گیا۔



فون کی مسلسل بچھتی گئی نے عبد العین کی گہری نیند کو توڑ دیا تھا۔

”کیا میسج ہے؟“ اس نے بے شکل آنکھیں کھول کر تینے فون کو دیکھا ابھی رات کے تین بجے تو وہ عین سے اٹھا تھا ایک مہینے کے مسلسل شوز میں پر فارمنس نے اسے اس طرح حتمی کر رکھا تھا کہ اب کم از کم ایک ہفتہ اس کا ارادہ عملی ریسٹ کرنے کا تھا مگر یہاں تو ایک رات کی پوری نیند بھی لیٹا سما تھا۔ اس نے غصے سے ریسیور اٹھا کر کان سے لٹکایا۔

”سولی حد ہو گئی۔“ گھنٹے سے فون کر رہی ہوں۔ موبائل تمہارا آف ہے اور فون تم نہیں اٹھا رہے۔“ زیور گل نے اس کے ”ہیلو“ کہنے کا بھی انتظار نہیں کیا تھا چھوٹے ہی بولی۔

”آخر ایسی کیا ایئر جنسی نازل ہو گئی ہے جو یوں رات کے چار بجے فون کر رہی ہیں۔“ وہ بھلا کر بولا۔

”صبح کے چار گھنٹے سے رات نہیں آتے۔“ زیور گل اس سے زیادہ بھلا ہٹ کا شکار تھی۔ اور اب یہ نیند ویند کو گولی مارہ اور جلدی پہنچو تم جو عذاب میرے گلے منڈھ گئے تھے وہ آج رنگ لایا ہے۔ شہر نے خود کو شوٹ کر لیا ہے۔ جلدی پہنچو۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“

زیور گل نے کہہ کر کھٹ سے فون بند کر دیا۔ عبد العین کا دل غصے سے اڑ گیا۔

”شہر نے خود کو شوٹ کر لیا ہے۔“ زیور گل کی آواز کی باز رشت اس کے کانوں میں بھجھنا رہی تھی۔

"بس کریں شاہی اور کتا نہیں گے یہ زہر۔" عین تارا بولے پتلی سے ٹپکتے ہوئے سلطان جنت کو مسلسل ڈرنک کرتے دیکھ رہی تھی روتہ سکی۔ وہ ان کے ہاتھ سے چو تھا بھرا ہوا گلاس پھینکتے ہوئے تڑپتی سے بولی۔

"تمت رو کو گھٹھے پیتے ہو۔" سلطان جنت لڑکھاتے ہوئے لہجے میں تھوڑے آنکھیں اس پر بھا کر بمشکل بولے۔ عین تارا کی آنکھوں میں نمی سی آئی وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شاہی بھی کبھی اس کے سامنے یوں بے بسی کی حالت میں بیٹھے ہوں گے۔ وہ تو اکثر دو پوٹلیں پانی ملائے بغیر اس کے سامنے چھا جاتے تھے اور کبھی ان کی سوچ تو کیا زبان تک نہیں لڑکھاتی تھی اور اب محض چار گلاموں میں وہ یوں بے خود ہو چکے تھے۔

"ایک تم اچھی ایک۔ یہ اچھی۔" انہوں نے لڑکھاتے ہوئے بولنے کی طرف اشارہ کیا اور سر پید کی کرسی کی بیک پر گر آیا۔ عین تارا کو وہ بہت کمزور لگ رہے تھے۔

"سب نے چھوڑا۔ سب چھوڑیں گے۔ سب چھوڑیں دیا کرتے ہیں انہیں ملتی دل کی۔ دل کی تمنا نہیں ملتی مجھے۔ دل کی کلی نہیں کھلتی۔"

تیسری زلفوں کے گھٹے سامنے میرے سر پر محبت کا سایا بان۔ جس سے وفا کرو، پیار کرو، پیار کرو، پیار کرو۔ وہ چھوڑ جاتا ہے زندگی بے وفا محبت بے وفا۔ جا دیکھ لیا تجھے ارے بے وفا۔

وہ سر شیش کر عجب ہنسی ہنسی سی باتیں کر رہے تھے۔ ایک تو صحتی کر آکوہ شام کا وہند تھا۔ تیس کے بالکل سامنے آسمان سے تپتے پرتے برف پوش بیت ناک پہاڑ اس تاریک منظر میں کسی قوی زلزلے کی طرح تپتے کھڑے تھے اور ان کے قدموں تلے راس راس سر سر ہٹ اور دھبے دھبے شور کے ساتھ بتا دیر مانے سوات اس بالکنی سے اتنا قریب تھا کہ ذرا سا نیچے ٹنگ کر ہاتھ سے چھو لو تو ٹھنڈا ٹھنڈا ریل پانی سارے جسم میں موت کی جھڑکتی اور ڈرتا تھا۔

"رات۔ ایک اور طویل بے درد رات آنے والی ہے۔" عین تارا نے سر اٹھا کر میناٹوں سے گھر پر سیاہ ہونے آسمان کو دیکھا۔

"جنا نہیں شاہی کا اس خوفناک ویرانے میں اور کتنے دن رہے گا پروگرام ہے۔" اس نے کچھ اکتا کر بے دم سے رے سلطان جنت کی طرف دیکھا۔ اتنی شدید سردی میں بھی انہوں نے ہاف سویٹر کے علاوہ کچھ بھی نہیں پہن رکھا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے موسم کی شدت سے بے خبر تھے۔ ایک ان کی حالت پر بہت تڑپ آیا تھا۔

اس نے اندر سے گرم چادر اور ان پر ڈالی تو وہ جیسے گرمی بیٹھ سے جاگے تھے۔

"اندر چلیں شاہی راہ ہر بہت سردی ہے۔" اس نے ملائیت سے ان کے بالوں میں انگلیاں چلائی۔

"ہاں چلتے ہیں چلتے ہی جانا ہے۔" وہ ہونٹوں میں پھینکے۔

"شاہی! آپ اس قدر ڈر رہیں کیوں ہیں؟ آپ کو کیا چیز تنگ کر رہی ہے؟ پلیز مجھ سے شیش کر لیں۔ آپ کے دل کا بوجھ کم ہو جائے گا۔" وہ ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر وہ انہوں کے پاس بیٹھ گئی۔

"دل کا بوجھ آہ! وہ ہے۔" دل کا بوجھ کم ہو جائے گا تو ثنائوں کا بوجھ جائے گا۔ عین تارا اتم نہیں سمجھو گی میرے دل کے بوجھ کو۔ تمہارے لائف سیٹ اپ میں ایسے بوجھ کو بوجھ نہیں کہتے۔ خود ساختہ دلوائی کہتے ہیں۔ تمہاری سوسائٹی کی ویلیو ہڈی قدروں سے بالکل مختلف ہیں میں تمہیں سمجھا تا ہوں تو سمجھا نہیں پاؤں گا۔ یہ غیرت، مردانگی کی الجھنیں ہیں جو تم سے نہیں سنبھیں گی میری جان یا آروزی کی ذلیل کھٹ۔" وہ اس کے کال کو ذرا سا چھو کر بولے۔

"شاہی! میں آپ سے علیحدہ ہوں کیا؟" اس نے لاڈ سے شکوہ کیا۔

"نہیں۔ تم تو میری جان ہو۔" انہوں نے بے اختیار اس کے گھٹنوں پر رکھے ہاتھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ لیے۔

"پھر میری ویلیو آپ سے مختلف کیسے ہو سکتی ہیں۔ میں تو آپ سے بڑی ہوں۔ ازل سے آپ سے بندھی ہوں۔ چاہوں بھی تو خود کو آپ سے الگ نہیں کر سکتی۔" وہ ان کے سر ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر گراتے ہوئے بولی۔

"تم الگ ہو کر نہیں بھاگ بھی نہیں سکتیں۔ تم تو میری ہو جب تک میرے سینے میں یہ سانسوں کا زیروم جاری ہے۔ تم میری ہو صرف میری۔" ان کی آنکھوں کی طرح ان کا لہجہ بھی خوب نیشلا ہو رہا تھا۔

"میں نہیں بھاگ بھی نہیں سکتی شاہی! میں تو سرتاپا آپ کی ہوں۔ جب بھی آپ نے پکارا کچھ بھاگے سے بندھی چلی آئی۔ آپ کی تمام تر ساقبت کج ادائیاں بے وفائیاں نظر انداز کر کے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ان کے شانوں کے گرو اپنے بازو جمائل کرتے ہوئے اک اداسے بولی۔

"تم بہت اچھی ہو عین! بہت اچھی۔ میری توقعات سے بڑھ کر اچھی نکلی ہو۔ شروع شروع میں تو میں تمہاری طرف صرف دل بھلانے کو ہی بڑھا تھا مگر جب واپس پلٹا چلا تو پتا چلا۔ دل تو تمہارے قدموں سے لپٹا بیٹھا ہے۔"

اب دل کے بیٹھے میں کیسے پٹ جاؤں۔ بس پھر سارے کا سارا افسوس ہوا تو پتا چلا گیا۔ تمہیں اپنا پتا لیا۔ کچھ لیا۔ کچھ بھی کوئی کی چھوڑی ہے جس نے تمہیں دینے میں کبھی ہاتھ کھینچا۔ سیم وزر کی بات ہو یا پناہ محبت کی۔ کبھی کوئی کی رکھی اس لیے کہ تم مجھے سب سے بڑھ کر عزیز ہو۔ اپنی زندگی کی سب تر جماعت سے بڑھ کر۔"

وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہے تھے جسے انہیں لفظ جوڑنے میں وقت ہو رہی ہو۔

"سب تر جماعت نہ کہیں شاہی! وہ وہی ہے سے بولی۔

"کیوں بولو گیا کی دیکھی تم نے میرے پیاد میں؟"

"بناؤں گی آپ بھڑک اٹھیں گے۔ تو تیرس کی رنگ سے تک کر سیاہ بنیالے ہتے پانیوں کو کھینچے گی۔"

"نہیں عین! میں تم سے ناراض نہیں رہ سکتا ناراض یا خفا ہو تو سکتا ہوں مگر تیار رہ نہیں سکتا۔ اس کی گواہ تم ہی ہو۔" وہ اس کے ہاتھ چومش میں آتے جا رہے تھے۔

"چلیں اندر چل کر باتیں کرتے ہیں۔" عین تارا کو بلند دبالا بیت ناک پہاڑوں سے ایک دم ہی خوف سا آیا تھا۔ یوں جیسے پہاڑوں کے دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھ کر رہے ہوں پانی میں قدم ہمتے ہوئے نہ جانے سلطان جنت کو اس منحوس ہونٹوں میں کیا نظر آیا تھا جو عین دریا کے ساتھ بڑا کھڑا تھا اور اوھر سے جانے کا ہم بھی نہیں لے رہے تھے۔ عین تارا یہ بات کئی بار بھی چلی تھی مگر کہ نہ سکی۔

"میلو! سلطان جنت ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔"

"آپ کو معلوم ہے رات کو اوھر لائٹ چلی جاتی ہے۔ عمل اندر میرا ہو جاتا ہے۔ گھپ اندر میرا۔" اندر آتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔ یہ لوگ جزیئر سے بجلی ماصل کرتے ہیں۔ اس لیے رات کو جزیئر آف کر دیتے ہیں۔" سلطان جنت کہتے ہوئے پتلی کر گئے۔

"باہر بول پڑی ہے۔ یاد! ایک گلاس تو بھر کر لاؤ۔" تھوڑی دیر بعد وہ بولے۔

"شاہی! پلیز۔ بس کریں۔" وہ ان کے پاس آکر لگا جنت سے بولی۔ "میرے ہوتے ہوئے بھی آپ کو کسی نفسی ضرورت سے۔" وہ پاس بیٹھ کر ان کے بال بٹھانے لگی۔

"اسی لیے تو تمہیں اوھر لے کر آیا ہوں۔"

وہ گہرا سانس لے کر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "چند دن چند اچھے دن باہر کی عالم دنیا سے کٹ کر بالکل علیحدہ ہر فکر سے آزاد تمہاری زلفوں کی چھاؤں میں بیٹھا سکوں دل پر تم نے ست کا بوجھ کچھ تو کم محسوس ہو۔" شاہی نے اچھے پتا ہے۔ آپ اپنا تم تو مجھے بتائیں گے نہیں۔" وہ چند منوں بعد بولی دونوں کے درمیان خاموشی کا ایک نغمہ سا وقفہ آیا۔

زیور گل سانس لینے لڑکی۔ عبدالمعین کو اس بے ہودہ گفتگو سے سخت کوفت ہو رہی تھی حالانکہ شوہر میں "ان" ہونے کے بعد یہ ساری باتیں اس کے لیے بھی اجنبی نہ تھیں بلکہ اب تو اس کا اپنا گزارہ ان کے بغیر نہیں ہو تا تھا مگر شہرینہ۔ اس کے لیے یہ سب بکواس۔ اس کے خون میں شرارے سے دوڑ رہے تھے یہ شہرینی پر پڑے دو بل گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

"میں نہ پہنچتی تو یہ ڈاکٹر۔ ارے ساری کی ساری دنیا حرام ہو رہے جب تک تھی نہ گرم کرو وہ بھی ٹھیک ٹھاک "تب تک کوئی جائز و ناجائز کام کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا۔ اس شخص شریف زادی کو چار ہاسپٹلز میں لے کر پھرے مجال ہے کوئی ڈاکٹر ہاتھ ڈالے۔ کجرت قانون کے مارے۔ پولیس کیس ہے جی۔ ہم نے مرنا ہے بس وہ تو میرا ہی مہتر پھر گیا تھا جو ڈاکٹر و جید کا ٹینک بروقت یاد نہ آیا پھر اس کی حالت اچھی نہیں۔ کیا کہوں اسے ہے تو ابھی تم ساری بیوی ہی بنا۔ زوجہ منکوت باہا۔"

وہ فضول سا شخص مار کر بچی عبدالمعین کو زیور گل کبھی اتنی بری نہیں لگی تھی۔

"یا تم اس کے وارث نہیں بننے تو کہو اس کے وارثوں کو اطلاع کروں جنہوں نے اس کے قریب کے ایک بی دن ملک کے تین بڑے اخباروں میں اس کی تصدیق شدہ موت کی خبریں شائع کروائی تھیں۔ اسے دن قتل کی خبر بھی پہلے صفحے پر لکوائی تھی ویسے برا تمنا ہے گا اگر تم کو تو ذرا پریس والوں کو نہ ایک فون کھڑا دوں۔ ایمان سے تسلسلہ بچ جائے گا۔" زیور گل ایک آنکھ دبا کر پتھر اڑا لیتے ہوئے بولی۔ "وزیر اعلیٰ سلطان بخت کی پاک پوتر پکڑی کو بھی اتھیا اتھیا نہ کرواؤ۔ برا مزہ آئے گا۔" عبدالمعین نے ہنوز کوئی جواب نہ دیا۔

"تم نہ تمنا سائے۔ میں آج کل فارغ ہوں۔ یہ میں تارا بھی ظاہر کر دینا کئی سوات کا امام اپنے شاہ جی کا غم غلط کرنے۔ وہ سوات سے آئے تو نئی کیم شروع ہو۔ کچھ پچھلے حساب بھی نکلتے ہیں اس کی طرف تیسرے ہاتھ میں کھلی ہو رہی ہے۔ اس شاہ کو تمہوڑا سا تاریخ بچاؤں۔ میری نازک سنی میں کو کھلنا ہوتا ہے اس پر مجھے نے کیا خیال ہے میں تارا کی دوستی کا اتنا تو حق ہے نام پر۔" زیور گل کی آنکھیں اپنے ہی خیال پر چمک رہی تھیں۔

"ابھی یہ سچ جائے تو پھر یہ عالی شان منصوبہ بنائے گا۔" عبدالمعین ہنر بیزاری سے بولا۔

"ہاں یہ بھی سب ڈاکٹر زکب نسلی دے رہے ہیں۔ کوئی کجرت کے سینے کے پتھر میں چھس کر رہ گئی ہے۔ نکلے گی تو سنے کی نا۔ تمہیں گھٹے سے تو لگے ہیں آپریشن تھیں میں چپ چھاؤ کر گئے۔"

زیور گل نے منہ کھول کر ایک بھر پور رسائی لی۔

"مجھے تو اب سخت نیند آرہی ہے اے لے کے اس مستاب کی بچی نے کمری نیند سے جگا دیا ہے۔ تو نیند بھی جیتی ہوں سائنس کی ان بیوہ ایجادات پر۔ نیلی فون کیا تم تھا ہو۔ نیلی فون کی آفت آئی۔ راتوں کی نیند بھی اب تو انسان پر حرام ہو گئی ہے۔" کہتے کہتے وہ صوفے پر گر کر گھبر ہو گئی۔

"یہ شہرینہ تو گلے کا کاٹنا بن گئی نہ اگلنے کے قابل نہ نکلنے کےائق۔ مریہا نے تو اچھا ہے۔" عبدالمعین اپنا سر پکڑ کر دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت آپریشن ٹھیکر کا دروازہ کھلا اور ایک بڑا حال سا ڈاکٹر ہارنکا۔

"ڈاکٹر صاحب! ایسا حال ہے مریض کا؟" وہ تیزی سے اپنی جاگ سے اٹھتے ہوئے ڈاکٹر کے پاس آیا۔

"بہت مشکل ہے آپ دعا کریں۔ بہت تکلیف میں ہے وہ اللہ اس کی مشکل آسان کرے۔ کبھی کبھی جب مریض اتنی تکلیف میں ہو تو ڈاکٹر بھی دعا خیز۔" اس نے ایک کمر اس اس آیا۔ "کوئی ڈاکٹر لی ہے مگر پچانے والا تو اللہ ہے آپ دعا کریں۔" وہ کہتے ہوئے اس طرف ہی لیبارٹری میں گھس گیا۔

"اللہ اس کی مشکل آسان کرے۔" عبدالمعین بڑبڑایا۔

"یا اللہ اگر یہ سچ بھی گئی تو کیا کرنے کی۔ میں۔ میں کیا کروں گا اس کا۔ اور وہ تو میری شکل پر اب تمہو کنا بھی گوارا نہیں کرے گی اور اس کے گھر والے وہ تو اس کی نماز جنازہ بھی پڑھا کر فارغ ہو چکے ہیں۔ زندہ سلامت بھی سامنے لے جا کر کھڑا کروں تو نفرت سے منہ پھیر لیں گے۔ زندگی تو اس کے لیے موت سے بھی مشکل ہے یا اللہ تو اسے

موت ہی دے دے۔"

وہ پوری لگن سے آنکھیں بند کر کے دل میں شہرینہ کی موت کی آرزو کرنے لگا بلکہ ٹک گھڑی کی سوئیاں آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ زیور گل صوفے پر بے ہنگم طریقے سے ہاتھ پاؤں چھوڑے بلکہ منہ خراٹے لیتے ہوئے سو رہی تھی نہ جانے کتنا وقت گزر گیا تب آپریشن ٹھیکر کا دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ وہ ڈاکٹر ہارن آئے۔ دونوں کے چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے اور قدم بے حد ہلکے تھے۔

عبدالمعین کا دل بے اختیار دھڑکا۔

"تو شہرینہ مر گئی۔" اس سے اپنی جگہ سے اٹھا بھی نہیں گیا۔



"اللہ کے بعد کا وقت تھا۔ شام دھیرے دھیرے ان کے چھوٹے سے تاریک آئینے میں اپنے قدم ہمارے ہی تھے۔ یہیں غسل خانے کے پاس بیٹھی کپڑے دو سو رہی تھی بلکہ دھو چکی تھی۔ اب وہاں سے سامان سمیٹ رہی تھی۔ آمنہ سلامتی ٹھیکوں کے آگے بیٹھی گھٹے سے سلامتی کے لیے آیا سوٹ سی رہی تھی۔"

"جویریہ! یہ زینب لگی تک سو رہی ہے۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔" مشین چلاتے چلاتے آمنہ کو خیال آیا۔ زینب آج صبح پھر کاج کی تھی جیسے ہی صوفی صاحب کسی کام سے باہر گئے۔ وہ تیار ہو کر کاج چلی گئی تھی اور تقریباً "ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی واپس آئی تھی۔ آتے ہی وہ پونفارم سمیٹ جو چارپائی پر گری تھی پھر ساری دوپہرا سنی طہن پڑی رہی تھی۔ وہ پھر کے کھانے پر بلائے گئے باوجود نہیں آئی تھی۔

"اس کا دماغ دن بدن خراب ہو تا جا رہا ہے۔ گر رہا ہوں میں اس کا بندوبست۔ بس ہفتہ دس دن اور ٹھہر جائے۔ دو جانے کا اس کا علاج درست۔" کھانا کھانے ہوئے صوفی صاحب نے غصے سے کہا تھا اور جویریہ کو اسے دوبارہ کھانے کے بلائے تھی روک دیا تھا وہ پھر بھی اٹھ کر نہیں آئی تھی۔

جویریہ نے کمر لگائی۔ کونوی بواب نہیں دیا اور کھلے ہوئے کپڑوں کا تسلسلہ اٹھا کر اوپر پھت پڑا لٹنے کے لیے چلی گئی۔

"میں خود ہی دیکھتی ہوں اسے جا کر۔" آنکھ اپنی جگہ سے اٹھ کر زینب کے پاس کمرے میں چلی آئی زینب جاگ رہی تھی اور سیاٹ نظروں سے وہ لڑکے کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

"زینب! کیا بات ہے۔ تم ساری طبیعت تو ٹھیک ہے نا تم نے کھانا بھی نہیں کھایا۔"

آمنہ کو اس پر ایک دم سے بہت ترس آیا تھا۔ کئی دنوں سے وہ پیسے پورے کمرے سے کٹ کر رہ گئی تھی۔ الگ تھلک اور اپنے پیمانے "اجنبی اجنبی سی نہ ڈھنگ سے کچھ کھاتی نہ پیتی۔ رات کو بھی آمنہ نے اکثر اسے جاگتے دیکھا تھا۔ آج وہ تو بہت زندہ دل تھی۔ بہت باتوں اور جھوک کی بچی اور آج کل وہ وہو ٹائم کے فاقے کر رہی تھی۔ زینب چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ کوئی بھی جواب دیے بغیر۔ اس کا رنگ روپ جیسے کھلا کر رہ گیا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اچھے ہوئے ہاں۔ ٹیکر ابو اعلیٰ۔

"زینب! کیا بات ہے؟" آمنہ اس کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔ وہ پھر بھی نہیں بولی۔

"انھو نا شام ہو رہی ہے۔ اٹھ کر کچھ کھالی لو۔ کھانے کے آؤں تمہارے لیے۔" آمنہ نے اس کے ماتھے پر آنے والے پیچھے ہٹاتے ہوئے محبت سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلادیا۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا تھا۔

"زینب! میری بہن! تمہیں کیا پریشانی ہے۔ دیکھو تو اپنا کیا حال بنا لیا ہے۔ ٹھہرے کو تم تو مجھ سے دل کی ہر بات کر لیا کرتی تھیں۔ اب کیا بات ہے۔" وہ اس کے چہرے کو پیار سے سلاتے ہوئے بولی۔ زینب کی آنکھوں میں آنکھوں سے والایابی برآمد نکلا۔

"زینب! میری بہن! بولو نا۔ تم صبح کاج کی تھیں پھر تھوڑی دیر میں لوٹ بھی آئیں۔ آخر مسئلہ کیا ہے؟"

"آمنہ۔ آمنہ۔ آمنہ۔" وہ بے اختیار اس سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگی۔

”زہنب! زہنب! کیا بات ہے زہنب!“ آمنہ نے اس کے ہونے اختیار کرنے پر گھبرا کر بولی۔
 ”آمنہ! وہ مجھے نہیں ملتا۔ نہیں نظر نہیں آتا۔ میں گھنٹوں گھنٹوں کے سامنے سڑک کے کنارے کھڑی رہتی ہوں۔ ہر جگہ اسے تلاش کر چکی ہوں۔ اس نے جو فون نمبر دیا تھا۔ ہزار بار اوہ فون کر چکی ہوں۔ کوئی نہیں اٹھاتا۔ آمنہ! میں مرجاؤں گی۔ اس کے بغیر میں مرجاؤں گی۔“
 وہ اس کے ساتھ چھٹی زور زور سے رونے جا رہی تھی۔
 ”کون؟ تم کس کی بات کر رہی ہو؟“ آمنہ نے اسے خود سے الگ کرنے کی کوشش کی۔
 ”سیٹی۔ سیٹی پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے۔ وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔ کبھی نہیں۔ وہ ایسا نہیں تھا۔ آمنہ! مجھے معلوم ہے۔“ وہ ابھی بھی اس سے لپٹی رہتی تھی۔
 ”کون سیٹی؟“ آمنہ کے لئے تو یہ انکشاف ہی بہت انوکھا اور پریشان کن تھا اسے کچھ شک تو تھا کہ زہنب ضرور کسی لڑکے کے ساتھ نوالہ بے گھر سے اس کا لیٹن نہیں تھا۔ ”روز مت تمہاری آواز باہر تک جا رہی ہے۔ بابا صاحب آئے والے ہوں گے پھر ماں دے گی۔ کون سیٹی بتاؤ مجھے۔“
 ”وہ۔۔۔“ زہنب اس سے الگ ہو کر اپنا چہرہ صاف کرنے لگی۔ آمنہ منتظر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
 ”یو لو نا کون سیٹی؟“ آمنہ نے اس کا ہاتھ ہلا دیا۔
 ”وہ پہلی بار مجھے بازار میں ملا تھا۔ تم میرے ساتھ تھیں۔ دوسری بار تمہاری پرنسپل کے آفس میں۔ اور تیسری بار میرے کان کے باہر۔ پھر میں اکثر۔۔۔“ وہ جھجک کر چپ سی ہو گئی۔
 ”کیا کہہ رہی ہو تم؟“ آمنہ پریشان ہو کر بولی۔ ”کون ہے یہ سیٹی؟“
 ”تمہاری پرنسپل کا بیٹا۔ شہر میں گھر ہے ان کا۔ اوہر قلیکٹری بھی ہے اور بہت سی دوسری جائیداد۔ بہت دولت مند ہے۔ اتنی بڑی گاڑی۔“
 ”تمہاری پرنسپل تو فرزانہ حبیب ہیں اور وہ تو غیر شادی شدہ ہیں۔ ان کا بیٹا کہاں سے آیا۔“ آمنہ کچھ الجھ کر بولی۔
 ”نہیں اس نے مجھے خود بتایا تھا کہ وہ تمہاری پرنسپل کا بیٹا ہے۔ مجھے خود بھی معلوم ہے۔ یہ جھوٹ نہیں تھا۔“
 ”یہ کب کی بات ہے؟“ آمنہ کو کسی بہت بڑی لڑکے کا احساس ہوا لے لگا تھا۔
 ”جب تم نے جاب کی تھی اسکول میں شاید سہ ماہی دو سہ ماہی تھا تمہارا اوہر۔“ زہنب یاد کرتے ہوئے بولی۔
 ”اچھا نہیں تم مسز عثمانی کی بات تو نہیں کر رہی ہو تو وہ دوسرے ماہ ہی چلی گئی تھیں۔ ان کا کوشل ریٹائرمنٹ کا بخار اتر گیا تھا تو اس کے بعد فرزانہ حبیب ان کی جگہ۔ مگر تمہارا اس لڑکے سے کیا تعلق ہے؟“ آمنہ نے زہنب کو آنکھیں سکیر کر غور سے دیکھا۔
 ”وہ میں۔۔۔ مجھ سے۔ اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ۔۔۔“ زہنب سے بات نہیں بن پارہی تھی۔
 ”کہ وہ تم سے شادی کرے گا۔“ آمنہ نے اس کا دھورا فقرہ پورا کیا۔
 ”ہاں!“ زہنب نے سر جھٹکا کر گردن ہلائی۔
 ”یہ قوف! احمق لڑکی! کہیں کچھ لڑ پوتو نہیں کر رہی تھیں۔“
 زہنب چپ رہی۔
 ”یو لو زہنب! میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔“
 ”آمنہ! اسے دھونڈنے میں میری مدد کرو پلےز۔ میں بہت پریشان ہوں۔ بہت زیادہ۔ میرے سر میں درد ہے۔ مجھے چکر آرہے ہیں۔ مجھے وہ کیوں نہیں مل رہا۔ وہ کہاں چلا گیا۔“ وہ اپنا سر گھنٹوں میں دے کر رونے لگی۔
 ”وہ کوئی سولی نہیں جو گم ہو گیا ہے۔ اس کا یقیناً ”مطلب“ نکل گیا ہو گا جو اس نے تمہاری چھٹی کر دی۔ پائل

لڑکی! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اوہ میرے خدا آیا۔“ آمنہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔
 ”اس ذلت کی کسر وہ کئی تھی۔ بابا صاحب اور اماں جی کی کمر میں تو پہلے ہی دونوں بیٹوں سے لٹی ہوئی ہیں اور اب تم بھی۔“
 ”آمنہ! میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں مرجاؤں گی۔“ اس نے جیسے آمنہ کا دکھ بھرا دیا سنا ہی نہیں تھا۔
 ”مرجاؤ تم اللہ کرے۔ تم جیسی ناخلف احسان فراموش اولادوں کو مرنے جانا چاہیے۔“ آمنہ نفرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ اسی وقت اسے سیڑھیوں کے پاس بدر سے کا ایک بچہ کھڑا نظر آیا۔
 ”کیا بات ہے؟“ آمنہ اٹھ کر باہر چلی آئی۔
 ”بابا جی! نیچے کوئی ڈاکٹر صاحب آئے ہیں اماں جی کو دیکھئے۔ صوفی صاحب تو نیچے نہیں ہیں۔ انہیں اوپر لے آؤں جی؟“ وہ کھڑا پوچھ رہا تھا۔ آمنہ نے کچھ دیر سوچا۔
 ”لے آؤ انہیں۔“ وہ کہتے ہوئے اماں جی کے کمرے کی طرف مڑ گئی۔ وہ جاگ رہی تھیں۔
 ”اماں جی! وہ ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔ اب بابا صاحب تو نیچے نہیں ہیں۔ آپ انہیں چیک کرادیں۔“
 ”معاذ بیٹا ہے۔“ اماں جی کی آنکھیں چمکیں ”ہاں بلاو۔“ وہ اپنی چادر سینے پر درست کرتے ہوئے ہاتھ اٹھاؤ دھکنے لگیں۔ اسی وقت وہ بچہ معاذ کے ہاتھ سیڑھیوں پر چڑھ کر اوپر آ گیا۔ آمنہ نے جلدی سے اپنے دوپٹے سے آہٹا چہرہ ڈھانپا اور دروازے سے ذرا ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔
 ”السلام علیکم اماں جی! کیا حال ہے آپ کا اب؟“ وہ آمنہ کے پاس سے گزرتے اماں جی کی طرف بڑھا۔
 ”وعلیکم السلام بیٹا! اللہ کا شکر ہے آپ سناؤ۔“ اماں جی کی آنکھوں کا سہارا لیتے ہوئے اٹھ بیٹھی تھیں۔
 ”آج تو ماشاء اللہ کافی بہتر نظر آ رہی ہیں۔ دراصل آج اوہر ہمارے کچھ کا آخری دن تھا۔ میں نے سوچا جاتے۔ پہلے آپ کو دیکھ جاؤں۔“ وہ اپنے چیک سے بی بی آپریشن نکالتے ہوئے بولا ”صوفی صاحب مجھے نیچے نہیں دے۔“
 وہ اب اماں جی کی چیک کر رہا تھا۔
 ”اس وقت وہ بچوں کو گھر پر قرآن پاک پڑھانے جاتے ہیں۔ بس آنے والے ہی ہیں۔“ اماں جی بولیں۔ ”آمنہ! معاذ بیٹا کے لیے چائے بناؤ۔“ اماں جی نے دروازے کے پاس کھڑی آمنہ سے کہا۔
 ”ارے نہیں۔ شکر ہے۔ صوفی میں چائے پی کر ہی آ رہا ہوں۔ ویسے بھی مجھے کافی دیر ہو گئی ہے۔ گھر کے لیے روانہ ہو چکا تھا کہ آپ کا خیال آیا۔ اس وقت تو میں جلدی میں ہوں۔ انشاء اللہ پھر بھی سہی۔“ اس نے فوراً چائے سے دست بردار کر لیا۔
 ”اللہ کرے وہ میرے جانے سے پہلے آجائیں ورنہ پھر کسی دن حاضر ہو جاؤں گا۔ اماں جی! آپ کا بی بی بالکل ٹھیک ہے۔ بخار بھی نہیں ہے۔ آپ وہ اسی طرح باقاعدگی سے جی رہیں۔ انشاء اللہ بالکل تندرست ہو جائیں گی۔“ وہ اب اسٹھسکوپ ان کی گمر سے لگائے انہیں چیک کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے جانے کے لیے اجازت طلب کی۔
 ”بیٹا! کچھ دیر انتظار کر لیتے۔ صوفی صاحب آتے ہی ہوں گے۔“ اماں جی اسے جانے کے لیے کھڑے دیکھ کر بولیں۔
 ”اماں جی! صوفی صاحب سے نہ ملنے کا قوس تو مجھے بھی ہے مگر انشاء اللہ میں جلد ہی کسی چھٹی والے دن ان سے ملنے ضرور آؤں گا اور آپ کو چیک کرنے بھی۔ اب مجھے واقعی دیر ہو رہی ہے۔ ورنہ ضرور رکتا۔ آپ اللہ کے فضل سے اب بالکل ٹھیک ہیں۔ خوش خوش رہا کریں۔ زندگی اوج سچ کا نام ہے۔ میں کسی دن وقت نکال کر آؤں گا پھر آپ سے خوب باتیں ہوں گے۔ اب اجازت اماں جی!“
 اس نے محبت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اپنا سمر ذرا سامان کے آگے بھکایا تو انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ دیا۔

”جیتے رہو۔ اللہ تمہیں اس نیکی کا اجر دے۔ زندگی میں کامیابیاں عطا فرمائے۔ اپنے ہر نیک مقصد میں کامیاب ہو۔ اللہ کی امان میں رہو۔“

وہ ان کی دعائیں لیتا سلام کر کے باہر نکل آیا۔ وہ تیزی سے سیرھیوں کی طرف بڑھا۔ صحن میں شیلا سا اندھیرا تھا۔ بلب کی بنا روختی اس کی تاریکی دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

”نہیں ایک منٹ۔“ وہ پہلی سیرھی پر قدم رکھنا ہی چاہتا تھا کہ اسے پیچھے سے کسی نے پکارا۔ وہ ذرا سا مڑا۔ آمنت دوڑنے کے نقاب سے اپنا نصف چہرہ ڈھانپے کھڑی تھی۔

”بی فرمائیے!“ وہ نظریں جھٹکا کر بولا۔

”یہ آپ کی امانت۔ شاید آپ کو یاد ہو۔“ اس نے اپنی گلابی پتیلی اس کے آگے کھولی۔ اس پر سنہری گولڈ میڈل چمک رہا تھا۔ معاذ کو حیرت کا خوشکوار جھٹکا سا لگا۔

”یہ آپ کے پاس تھا؟“ وہ مسکراتے ہوئے حیران سا بولا۔

”جی۔“

”مگر کیسے؟ میں تو سمجھا تھا شاید یہ کیس کر گیا ہے۔“

”یہ آپ تیکے کے نیچے بھول گئے تھے۔ بابا صاحب کے حجرے میں۔ مجھے وہیں سے ملا تھا۔ میں نے سوچا تھا بابا صاحب کو دے دوں گی کہ آپ تک پہنچاؤں مگر ان ہی دنوں ہمیں بہت سی باتیں گھڑی میں گاؤں پہنچوڑ کر آیا پھر اوہر آکر میں بھول گئی۔ اس روز آپ کو دیکھا تو مجھے آپ کی یہ امانت یاد آئی۔“

وہ آہستہ آہستہ تفصیل بتاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”بہت بہت شکریہ۔ بہت بہت زیادہ واقعی یہ ایک بیوقوف اور ناپختہ کا بہت خوبصورت ریوارڈ۔“

اور میں تو بھول چکا تھا۔ کس الگین تھیک یو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے میڈل اس کی پتیلی سے اٹھایا۔ اس کی انگلیوں نے ذرا سا آمنت کی پتیلی کو مڑس کیا تھا۔ بجلی کی ایک لہری اس کے ہاتھ سے بالادنگ بوڑھی سلس نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔

”اگر میں نہ ملتا تو۔“ اس نے آمنت کی روشن روشن سیاہ آنکھوں میں جھانکا۔ ”آپ اسے یونہی سنبھالے پھر تیں۔“

”تنب کی تب یکھی جاتی۔ اب تو آپ مل گئے ہیں نا!“ وہ آہستہ سے بولی۔

”آپ کو میرے ملنے کی زیادہ خوشی ہوئی ہے یا امانت پہنچا دینے کی؟“ نہ جانے کون سا معاذ کامل چاہ رہا تھا کہ یہ آنتنکو طہ لیں ہو جائے اور کسے طویل تر۔

”ظاہر ہے۔ امانت پہنچانے کی۔“

”یعنی میرے ملنے کی خوشی نہیں ہوئی آپ کو؟“ وہ یونہی اسے چہیننے کو بولا تھا۔

”وہ تو۔“ آدھا سٹے میں مڑکی۔ ”اس کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی تھی اور وہ پٹے کا کونہ جس سے اس نے چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ ہراساں قدموں سے پھلانگ دگا کر سامنے کے دروازے کے پاس جا کھڑی ہوئی اور خوف زدہ نظروں سے زمین پر اس جگہ کو دیکھ رہی تھی جہاں موٹی تازی چھپکلی پڑی تڑپ رہی تھی اور معاذ کے بے ساختہ تھپتھے پر وہ خائف سی ہو کر چہرہ جھٹک لیا۔“

”اب مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے پتا چل گیا ہے۔ آپ کو مجھ سے ملنے کی کس قدر خوشی ہوئی ہے۔ آپ کے چہرے سے ظاہر ہے۔“ اس کی بات پر آمنت کو بے اختیار ہی احساس ہوا کہ وہ بے حجاب کھڑی ہے

دوسرے بل وہ تیزی سے اندر کمرے کی طرف مڑ گئی جہاں زینب اسے چشمکین نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ آمنت تھنک سی گئی۔

”میں اگر بچ بولوں تو ڈوب مرنے کی مستحق۔ والدین کی ناشکری اور ناخلف اولاد ٹھہریں اور تم نیک بی بی پروتے

کی آڑ میں سارے سزے لو پھر بھی والدین کی پسندیدہ نیک چچی اور بیاری شرم والی بیٹی۔“ وہ چپا چپا کر بول رہی تھی۔ ”گھر میں بیٹھی سب گل کھا رہی ہو۔“ آمنت چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گئی۔ زینب کو اس وقت ہوا ب دینے کا مطلب اس کی فرسٹریشن کو ہوا بنا تھا۔

اور سیرھیوں اترتے ہوئے معاذ سوچ رہا تھا۔ صوفی صاحب سے ملاقات ہو جاتی تو اچھا تھا ورنہ اب تو ان سے ملنے دوبارہ آنا ہی بڑے کا۔“

آمنت کا ساہو نقوش والا کندھی روشن چہرے سے اس کی بصراتوں پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

آج شام ایک عجیب بات ہوئی۔

عجیب بات وہ ہوتی ہے جو ہمیں لگتی ہے۔

ورنہ تو روزانہ ہی بہت سی باتیں واقعات جنہیں ہم درخور اعتنا بھی نہیں جانتے اپنے اندر بہت سے عجائبات لیے ہوتے ہیں۔

وہ اپنے دوست کے ساتھ اینجیل فاسٹیٹس کے سیلون کٹنگ کروانے گئے تھے۔ سیلون تو کھلا تھا مگر اینجیل موجود نہیں تھا اور وہ اینجیل کے سوا اپنا کام کسی اور سے نہیں کرواتے تھے۔ اینجیل کے پیلیور نے بتایا کہ وہ اپنی ماں سے ملنے ایڈز سینٹر گیا ہے اور یہ تو انہیں معلوم بھی تھا کہ اینجیل ہر ایک اینڈ پر اپنی ایڈز زدہ ماں کے پاس تین گھنٹے گزارنے جاتا ہے جبکہ یہ تین گھنٹے وہ بھی ایک اینڈ پر اس کے سیلون پر بہت رشت کا وقت ہوتا تھا مگر اس کے باوجود وہ اپنی ماں سے ملنے ضرور جاتا تھا کیونکہ اس کے خیال میں اس کی ماں پر اہمیت ان تین گھنٹوں کے انتظار میں گزارتی تھی اور وہ اپنی ماں کے انتقال کو ہوس میں نہیں بہا سکتا تھا۔

اور یہ بات انہیں یہ لگی کہ اینجیل کے پیلیور نے مزید بتایا کہ اینجیل کی ماں اپنے زمانے کی مشہور کل گرل رہ چکی ہے۔

اور اس کے باوجود وہ اپنی ماں سے اتنی محبت کرتا ہے۔ اس کی اتنی کراہیت انگیز بیماری کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر ہفتے اس سے ملنے جاتا ہے۔ اپنی ماں کے قابلِ نفرت ماضی کو جانتے ہوئے بھی۔

مغرب میں ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

”اور مشرق میں مجھے ایسی مثالیں بھی بہت کم ملیں گی۔“

”میری ماں انہی سے اتنی محبت کرتی ہے۔ اس نے اپنی معذوری کے باوجود کبھی مجھ پر اپنی توجہ محبت اور التفات کو کم نہیں کیا۔ میری ہر جائزہ ناجائز کو پیش اپنی ترجیحات سے بھی مقدم جانا۔ میں نے اس کے محبت بھرے دل کو اس بڑھاپے کے عالم میں کیا صلہ دیا ہے۔“

زینب میری ہی تو خند تھی کہ مجھے اسی سے شادی کرنی ہے۔ ام جان نے بابا جان کی مخالفت لے کر یہ رشتہ طے کر دیا۔ دونوں بھائی اس رشتے سے ناخوش تھے مگر ام جان نے فقط میری خوشی کی خاطر کسی کی ناراضی کی پروا نہ کی۔ میں نے آری جوانی کی تو بابا جانی پھر خفا ہو گئے کہ ان کا اتنا بڑا بیٹس کون سنبھالے گا۔ سب سے بڑھ کر میں ان سے دور چلا جاؤں گا میری اس ضد کو بھی ام جان نے سب سے بخوشی منوایا۔

اور پھولنی بڑی کتنی ہزاروں باتیں سوچوں تو شمار نہ کر سکوں جو ام جان نے میری خوشی کی خاطر مانیں اور میں نے ان کی اس خصوصی توجہ اور محبت کا انہیں یہ صلہ دیا کہ انہیں اس بڑھاپے میں معذوری و بیماری کی حالت میں تنہا چھوڑ دیا کہ وہ پانچ برسوں سے میری شکل کو مڑس رہی ہیں۔

ان کا گناہ کیا ہے؟“

باہر ریف باری شروع ہو چکی تھی۔ شدید سردی بہت ہو کھڑی سے اندر آ رہی تھی مگر انہوں نے کھڑکی بند نہ کی۔

625

”کہ انہوں نے میری پسند کو بد نظر رکھتے ہوئے نہایت سے میری شادی کر دی اور میری ناراضی کی وجہ سے کہ اب میری پسند نہایت کے لیے بدل چکی تھی اگر وہ نہایت سے میری شادی نہ کرتیں جبکہ نکاح میری پسند کے بدل جانے سے پہلے ہو چکا تھا اگر وہ میری ضد پر نہایت کو چھوڑ دیتیں تو اپنے ضمیر کا سامنا کیسے کرتیں اور میں۔ میں کیا ساری زندگی آئینہ دیکھ سکتا اگر یہ سب کچھ ہو جاتا۔“

آج کی رات بہت ظالم تھی۔ گزشتہ پانچ سالوں سے گہری غیند سہ سوا لوں کے نوکیلے پنجان کے مثل ہوتے دماغ میں چھنے جا رہے تھے۔

”شاید میں نہایت کے سوا کسی سے بھی شادی نہیں کر سکتا تھا۔ آج بھی اپنا دل چاک کر کے دیکھوں تو اس میں نہایت کے سوا کوئی اور سے بھی نہیں۔ ان پانچ سالوں کی صحرا نوردی نگر نگر گھومنے کے بعد بھی میں دعوت سے کہہ سکتا ہوں۔ آج تک کوئی لڑکی مجھے نہایت سے بڑھ کر نظر آئی ہی نہیں۔“

”تو پھر یہ کیسی سزا ہے؟“ انہوں نے کھڑکی کی بریکٹ پر بے چینی سے منگنا مارا۔

”میں یہ سزا کس کو دے رہا ہوں؟ ام جان کو نہایت کو اپنے بیٹے کو یا پھر خود کو۔“ انہوں نے سر اٹھا کر بے بسی سے آسمان سے گرتے سفید سفید روئی کے سے نرم گالوں کو دیکھا۔

”وہ قدرت جو اس سپاٹ آسمان میں سے برف برسا رہی ہے وہی ہم انسانوں کی تقدیر لکھنے والی ہے وہی ہمارے دلوں کے سوچوں کے رخ پھیرنے والی ہے۔ کب نہایت کی طرف سے میرا دل معلق ہو اور ایسا ہو کہ پھر مڑنے کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی یا شاید میں نے پلٹ کر سوچنا ہی نہیں چاہا بس اپنی تمام تر سوچوں کو ایک ہی نقطے پر فریز کر کے اپنی بہت پڑ گیا۔“

زندگی جو ایک بار ملتی ہے۔ جوانی اس زندگی کا بہترین حصہ ہوتی ہے میں اس حصے کو اپنے ہاتھوں سے تباہ کر چکا ہوں۔ کر رہا ہوں۔ صرف اپنی انا کی وجہ سے۔ اپنی ایک ضد کے لیے۔

ہم سے روزانہ ویڈیو وائس ہزاروں گناہ چھوٹے بڑے سرزد ہوتے ہی رہتے ہیں اور ہمارے خالق کا ہم سے وعدہ ہے کہ ایک بار اس کی بارگاہ میں رو کر معافی مانگ لیں وہ ہمارے سارے گناہ معاف کر دے گا اور بہت سے ایسے گناہ جن میں سے اکثر تو ہمیں یاد ہی نہیں ہوتے کہ انہیں بخشوانے کا وہ جس۔ اس کے باوجود وہ ہمیں اپنی گرفت میں نہیں لیتا۔

انجانے میں اس ایک خدا کے ساتھ بہت سے شریک بناتے رہے ہیں جس کی انا توجوش میں نہیں آتی۔ اس کی غیرت کو تو خدا نہیں آتی کہ میں اب اس کو بیٹھ کے لیے راند ڈر گاہ کروں گا۔ کبھی معاف نہیں کروں گا چاہے روئے چاہے معافی مانگے گا گڑاٹے میں نہیں معاف کروں گا۔

وہ ہمارا خالق ایک بار معافی مانگنے پر بڑے سے بڑا گناہ بخش دیتا ہے اور میں کیا نحوذابتہ اس سے بھی بڑھ کر ہوں کہ کسی کی غلطی کو معاف ہی نہیں کر پاتا جبکہ وہ ہزار بار رو کر مجھ سے کہہ چکی ہے کہ اس سے وہ غلطی سرزد ہوئی ہی نہیں۔

اور مزہ تو تب تھا نا میں نہایت کو سزا دے کر خود لائق انجوائے کر رہا ہوتا اپنی زندگی میں بہت خوش ہوتا بہت مطمئن مگر یہاں خوشی اور اطمینان تو دور کی بات۔ مجھے تو اپنی زندگی سے ہی نفرت ہو چلی ہے۔ ایک سزا ایک بوجھ بن گیا ہے یہ میرے لیے کیونکہ میں نے اپنیوں کے دل دکھا کر خود کو اپنی انا کو اپنے نفس کو خوش کرنا چاہا ہے اور یہ انا یہ نفس ایسے ظالم نامراد ہیں کہ آپ ان کو خوش کرنے کے لیے ساری دنیا کو بھی ہم سے اڑا دو تو بھی یہ خوش نہ ہوں گے۔ انہیں تو آپ کا خون چوس کر بھی مکمل خوشی نہیں ملے گی پھر میں یہ کیا کر رہا ہوں۔ ان سے تو نجات کا ایک ہی طریقہ ہے جہاں یہ سر اٹھانے لگیں ان کی تپنی کر کے ان کا پھین چل دو ورنہ یہ من مانی کے زہریلے ڈنک سے آپ کی ہستی کلیاتی، مطمئن، قناعت پسند زندگی کو ہوش کے لیے بے سکون کر دیں گے جیسے میری۔“

انہوں نے ایک کمر سانس لیا۔

ذہن پر لگے سارے جانے ایک ایک کر کے اترتے چلے گئے۔

”یہ رات پہلے میری زندگی میں کیوں نہ آئی۔“ انہوں نے سوچا۔

”نہایت اگر گناہگار ہے بھی تو وہ بہت سزا پا چکی اور اس اکیلی نے یہ سزا کب کالی ہے۔ میں خود بھی تو قطرہ قطرہ اس عذاب میں جلا ہوں اور ام جان نے اگر میری یہ ناجائز ضد نہیں مانی تو بھی میں انہیں بہت سزا دے گا ہوں اور سب سے بڑھ کر میرا وہ نتھا قرض خواہ جس کی چار سالہ تھپتھپ کا قرض میری اس نا آسودہ زندگی کو مزید بے سکون بنا رہا ہے جہاں کسی چھوٹے بچے کو کھیلنے کو دے دیتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے۔ میری زندگی کے کتنے بل اس کی ہنسی میں گم گئے۔“

”بس شہباز خان! بہت ہو گیا سزا کا یہ مگر وہ تکلیف وہ کھیل۔ بہت ہو گیا اب اس انا کا خون کر کے اپنی اور اپنے پیاروں کی خوشیوں کو نئی زندگی دو۔“

انہوں نے کھڑکی بند کر دی اور اپنا رخ اندر کمرے کی روشنی کی طرف کر دیا یہ دیکھنے کے لیے کہ خود احتسابی کا جو عمل اندھیرے سے کھرا کر ان کے اندر شروع ہوا تھا۔ وہ روشنی میں آکر نظر میں تو نہیں چرا رہا۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

”یہ ایک لڑکی کی زندگی کا تو وہ سزا نام ہی روشنی ہے۔ اندھیرے تو ابہام پھیلاتے ہیں۔ خود آئی کی روشنی اب میرے اندر نہیں یا ہر بھی پھیل چکی ہے۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر سانسے جلتی روشنیوں کو دیکھ رہے تھے جیسے بہت زمانہ بعد انہوں نے یہ روشنیوں کو دیکھا ہوں۔“

دونوں بعد وہ وطن واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔

انہوں نے گھر فون کر کے ام جان کو بھی آنے کا نہیں بتایا تھا۔ وہ انہیں بہت بڑا سرباز ترونا چاہتے تھے۔ اب تو خود ان کا دل اڑ کر اپنے گھر اپنے وطن اور ام جان کے پاس جانے کو چاہ رہا تھا۔

”اور سب سے بڑھ کر نہایت اور ارتضیٰ کے پاس۔“

انہوں نے سکرانے ہوئے ایک خوب صورت لیڈر سوٹ بیگ سے اتارتے ہوئے سوچا۔ آج ان کی شاپنگ کا آخری دن تھا۔ کل شام پانچ بجے ان کی فلائٹ تھی اور انہیں آج رات تک اپنی سب تیاری مکمل کرنی تھی اور آج کا سارا دن تو انہوں نے صرف نہایت کی شاپنگ میں ہی گزارا تھا۔ اس کا ناراض ناراض ساروپ دیکھنے کے لیے دل بے چین ہوا جا رہا تھا۔ وہ جلدی جلدی شاپنگ مکمل کرنا چاہ رہے تھے۔ رات کے آٹھ تو بج رہے تھے۔ انہوں نے ٹرائی کا رخ موڑا اور ریسپشن کی طرف بڑھے۔

”ایک سیکورٹی آپ شہباز خان ہیں نا۔“ ایک اجنبی آواز انہیں اپنے عقب سے سنائی وہی تو ان کے تیزی سے اٹھتے قدم کر رک گئے۔

”میرا فریڈ، فریڈ۔“ ارتضیٰ اپنے جیسے یونیفارم میں ملبوس اپنے ہم عمر لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معاذ سے ملا۔

”سیلو بیٹا! بو آ رہا! معاذ نے بچے کا برہسا ہوا ہاتھ تھامتے ہوئے مگر جوشی سے پوچھا۔

”آئی ایم فائن انکل۔ آپ ارتضیٰ کے بابا ہیں۔“ بچہ اچھا خاصا ہوشیار تھا۔

”میں! معاذ نے کہتے ہوئے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ اسکول میں چھٹی ہو چکی تھی گیٹ سے بچے تیزی سے نکل رہے تھے اور اپنی اپنی کونٹیس کا رخ کر رہے تھے جو گیٹ کے ارد گرد سڑک پر دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

آج تیسری دفعہ مسز خان نے معاذ کو بتایا تھا کہ ارتضیٰ اس بچے کی آئی سے کچھ نہ کچھ لے کر کھالیتا ہے ملکہ ایک بار جب ڈرائیور لیٹ ہو گیا تھا۔ وہ بچہ اپنی آئی کے ساتھ اسے گھر تک بھی ڈراپ کر گیا تھا۔ معاذ کو فکر لاحق ہوئی۔ وہ کل بھی آیا تھا مگر کل فمد چھٹی پر تھا۔

”آپ کس کے ساتھ جاتے ہیں؟“ معاذ نے فمد سے پوچھا۔

”ڈرائیور کے ساتھ۔“ بچہ ڈرا سا ایک کر معاذ کے بچھ دیکھنے لگا شاید وہ اپنی گاڑی دیکھ رہا تھا۔

”روڈ آپ ڈرائیور کے ساتھ جاتے ہو؟“ معاذ نے پھر پوچھا۔

”جی! وہاں تین قدم گیٹ سے یا ہر دو گھر بھاگنے لگا۔“

میں آگ بگولہ ہوتے ہوئے اس کے سامنے تن کر آکھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے پنداریاں سی پھوٹنے لگی تھیں۔

”ہائے کرینی!“ اس نے کسی کی طرف کیہ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔
”اٹکل! میری کرینی!“ اس نے معاذ سے تعارف کرایا۔ ایک دراز قد فریبی مائل گوری چینی اوہیز عمر عورت سیاہ چہرے کے ساتھ آٹھالی گھڑی ساڑھی میں مایوس اس بچے کے پاس کھڑی تھی۔
”گورنی! میرے فرزند ار تھنی کے بابا ہیں۔“ بچے نے اس عورت سے معاذ کا تعارف کرایا۔
عورت نے سر کو اڑسا نہیں ہوتے ہوئے معاذ کے سامنے کا جواب دیا تھا۔
”آپ تو کافی تنگ ہیں۔ بابا لگتے تو نہیں۔“ عورت نے اچھی خاصی برہانہ دیا۔ ”وہ ایسے فمد کافی ذکر کرتا ہے اپنے دوست ار تھنی کا۔“ وہ عورت بات کرتے ہوئے مسلسل مسکراتی تھی۔ ”چلو بیٹا گاڑی میں بیٹھ چل کر۔ اوگے جی اجازت دیجئے۔ کبھی آئیے گا ہمارے گھر اپنے بیٹے کو لے کر۔“ وہ جلدی میں لگ رہی تھی۔

”نور آپ سی فمد کو لینے آتی ہیں؟“ اس سے پتے کہ وہ جانے کے لیے مڑتی، معاذ نے اس سے پوچھا۔
”نہیں، کبھی بھارورنہ تو یہ ذرا سیر کے ساتھ ہی آجاتا ہے۔“ ترخ تو میں شہانگ کے لیے آئی ہوئی تھی۔
”یہ اسے لینے آئی۔“ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل آئے۔ ار تھنی دونوں کے پیچھے رہ گیا تھا۔
”اور فمد کے مانا پیا میرا مطلب ہے، وہ آپ کے ساتھ رہتے ہیں؟“ معاذ اس تھنی کو آگے بٹھایا جاتا تھا۔
کیونکہ اسے یوں رہنا ار تھنی کے اسکول آنے کا نام نہیں مل سکتا تھا۔ وہ عورت معاذ کا سوال سن کر روک گئی۔
ایک نظر گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھے ہوئے فمد کو دیکھا اور پھر معاذ کی طرف مڑا۔
”اس کے بچے تمہاری ایک روڈ ایبل ٹرنٹ میں ڈھنڈھ ہو چکی ہے۔ جب یہ شخص ایک سال کا تھا اور اتفاق سے میرے پاس ہی رہ گیا تھا۔ بس اس دن سے میں ہی اس کی ماما ہوں اور میں ہی بابا۔ خدا حافظ!“ وہ اپنے چہرے پر آتے تھیں وہ تاثرات کو پھینکتی تیزی سے مڑی اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ معاذ اس بات سے عورت کو دیکھتا رہ گیا۔

”تو پتہ کون ہے، وہ ار تھنی سے ملتی ہے۔“ اس کی الجھن پھر بھی نہیں سمجھ سکی تھی۔
”ار تھنی! وہ کون ہیں جو آپ سے ملتی ہیں فمد کی کرینی! گاڑی اجازت کرتے ہوئے معاذ نے ار تھنی سے پوچھا۔
”نہیں۔ وہ تو فمد کی آٹھ ہیں۔ میں نے آٹھ کریم کھانی ہے۔“ وہ سیدھا پھل کر بیٹھے ہوئے بولا۔ ”اب فمد کی آٹھ سے ملوں یا ہسپتال سے ملوں۔“ وہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔
گھر میں داخل ہوتے ہی اس کا سامنا مٹی سے ہو گیا۔ شاید معاذ کو اس سے سامنا ہو جانا اچھا لگتا۔ گزرتا آگروہ اسے اتنے فضول بیٹے میں نہ ملتی۔ اس نے ریڈ جارجس کی سیلویس کی شارت شرت کے ساتھ ایک ساٹھینس پہن رکھی تھی اور اس کے کمرے میک اپ سے لگ رہا تھا کہ وہ نہیں جانے کے لیے تیار ہے۔
”تھنک گاڈ! تم جلدی آگے میں تمہارا ہی وٹ کر رہی تھی۔“ معاذ نے اسے لے جانا ہے۔ ”وہ جلدی جلدی بولی اور ار تھنی کے باہر نکلتے ہی فرنٹ ڈور کھڑ کر کھڑی ہو گئی۔
”اس جیلے میں۔“ معاذ نے ایک ناگوار سی نظر اس کے سر اے پر ڈالی۔
”کیوں کہ ہوا ہے میرے جیلے کو۔“ وہ ماتھے پر ہل ڈال کر بولی۔ بلیک فگر کے بیٹے بڑے ایر برنگز اس کے کالوں کو پھوڑ رہے تھے۔

”تم پروگرام سیٹ کرنے سے پہلے کم از کم مجھے انفارم کرنے کی ذمہ داری تو کر لیا کرو۔“ معاذ نے فوراً ”موضوع بدلتے ہوئے لوجہ کچھ نرم کیا۔“ مجھے ابھی کھانے کے فوراً بعد سٹیٹ پر جانا ہے۔ کیونکہ کے لیے زمین دیکھ رہا ہوں۔ ٹاٹا ہیلر کے ساتھ میری دو بچے اپنا سہ ہے۔ اس کے بعد ہسپتال آج میری ٹائٹ شفٹ ہے تمہیں پروگرام کسی اور دن کے لیے رکھ لو۔“ وہ گاڑی سے اترتے ہوئے دروازہ بند کر کے بولا۔
”تمہارے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے، جب میں تمہیں جیلے کو کہتی ہوں۔ تمہیں ہسپتال کیلنک ’مریٹس‘

”میرا کیا ہوا ہے سہنی، تمہاری کل۔“ فخر حیات نے اپنے سامنے بڑی فائل کو پرے کرتے ہوئے پاس بیٹھی۔
”میرا کیا ہوا ہے، کبھی فائل کے لیے فائل فائل کرنے میں مصروف تھیں۔ ان کے تیزی سے حرکت کرتے ہاتھ۔“
”ہاں۔ دیکھا ہے۔“ وہ ایک کمر اسٹریٹ لے کر بولیں۔
”تو تبدیلیاں دیکھنا آ رہا ہے۔“ ان کا لوجہ عجیب و کھی سا ہو رہا تھا۔
”ہوں! رخصت ہوا اس موضوع پر بات کرتے کھیرا رہی تھیں۔“
”کیلنک ہی بھی نہیں۔“ وہ بڑے ترخ ترخ اور آٹھ تو اس نے کئی دنوں سے جانا پھوڑ رکھا ہے۔“
”اس کی وجہ سے آپ کو تادی تھی۔“ وہ شکت لہجے میں بولیں۔
”اس کا کام خراب ہو گیا ہے کیا میرا بھی خراب ہے۔“ وہ چمک کر بولے۔ ”اپنے ہاتھ پر کھانا کرا کے کھاؤں کہ اوصاف جڑا ہے، ہو تمہارے ہی میں آتے کرتے پھوڑا دیا کرو، سفید کرو چاہے نہیں چاہے فلا۔ تمہیں کھلی چھٹی ہے۔“

”خیر۔ سب ایسا تھی نہیں وہ۔“ رخصت کا لوجہ کھڑ رہا تھا۔
”تمہاری خوش تمہیں ابھی تک رفع نہیں ہوئیں۔“ فخر حیات نے گلہ آمیز نگاہوں سے پاس بیٹھی بیوی کو دیکھا۔
”خوش تمہیں یہ بالوں تو اور کیا کروں۔“ حقیقتوں کے ٹانگ بہت زور پلے ہیں۔ ان کا تو ایک ڈنک ہی مجھے مار دینے کے لیے کافی ہے۔“

”اس لیے نو فریبی میں بیٹھا ہو۔“ وہ طنز سے بولے۔
”آپ اس کے نام کیلنک ہی تو کر چکے ہیں۔ اس کے تمام معاملات بھی اس کے حوالے کر دیں۔“ خواجہ خواہ کا جھنجھٹ۔ آپ کی جان بھی چھوٹ جائے کی ویسے اتنے زیادہ کھیلوں کا رونا رو تے رہتے ہیں۔“ رخصت جھنجھلا کر بولیں۔

”ہائے کرینی!“ اس نے کسی کی طرف کیہ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔
”اٹکل! میری کرینی!“ اس نے معاذ سے تعارف کرایا۔ ایک دراز قد فریبی مائل گوری چینی اوہیز عمر عورت سیاہ چہرے کے ساتھ آٹھالی گھڑی ساڑھی میں مایوس اس بچے کے پاس کھڑی تھی۔
”گورنی! میرے فرزند ار تھنی کے بابا ہیں۔“ بچے نے اس عورت سے معاذ کا تعارف کرایا۔
عورت نے سر کو اڑسا نہیں ہوتے ہوئے معاذ کے سامنے کا جواب دیا تھا۔
”آپ تو کافی تنگ ہیں۔ بابا لگتے تو نہیں۔“ عورت نے اچھی خاصی برہانہ دیا۔ ”وہ ایسے فمد کافی ذکر کرتا ہے اپنے دوست ار تھنی کا۔“ وہ عورت بات کرتے ہوئے مسلسل مسکراتی تھی۔ ”چلو بیٹا گاڑی میں بیٹھ چل کر۔ اوگے جی اجازت دیجئے۔ کبھی آئیے گا ہمارے گھر اپنے بیٹے کو لے کر۔“ وہ جلدی میں لگ رہی تھی۔
”نور آپ سی فمد کو لینے آتی ہیں؟“ اس سے پتے کہ وہ جانے کے لیے مڑتی، معاذ نے اس سے پوچھا۔
”نہیں، کبھی بھارورنہ تو یہ ذرا سیر کے ساتھ ہی آجاتا ہے۔“ ترخ تو میں شہانگ کے لیے آئی ہوئی تھی۔
”یہ اسے لینے آئی۔“ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل آئے۔ ار تھنی دونوں کے پیچھے رہ گیا تھا۔
”اور فمد کے مانا پیا میرا مطلب ہے، وہ آپ کے ساتھ رہتے ہیں؟“ معاذ اس تھنی کو آگے بٹھایا جاتا تھا۔
کیونکہ اسے یوں رہنا ار تھنی کے اسکول آنے کا نام نہیں مل سکتا تھا۔ وہ عورت معاذ کا سوال سن کر روک گئی۔
ایک نظر گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھے ہوئے فمد کو دیکھا اور پھر معاذ کی طرف مڑا۔
”اس کے بچے تمہاری ایک روڈ ایبل ٹرنٹ میں ڈھنڈھ ہو چکی ہے۔ جب یہ شخص ایک سال کا تھا اور اتفاق سے میرے پاس ہی رہ گیا تھا۔ بس اس دن سے میں ہی اس کی ماما ہوں اور میں ہی بابا۔ خدا حافظ!“ وہ اپنے چہرے پر آتے تھیں وہ تاثرات کو پھینکتی تیزی سے مڑی اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ معاذ اس بات سے عورت کو دیکھتا رہ گیا۔
”تو پتہ کون ہے، وہ ار تھنی سے ملتی ہے۔“ اس کی الجھن پھر بھی نہیں سمجھ سکی تھی۔
”ار تھنی! وہ کون ہیں جو آپ سے ملتی ہیں فمد کی کرینی! گاڑی اجازت کرتے ہوئے معاذ نے ار تھنی سے پوچھا۔
”نہیں۔ وہ تو فمد کی آٹھ ہیں۔ میں نے آٹھ کریم کھانی ہے۔“ وہ سیدھا پھل کر بیٹھے ہوئے بولا۔ ”اب فمد کی آٹھ سے ملوں یا ہسپتال سے ملوں۔“ وہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔
گھر میں داخل ہوتے ہی اس کا سامنا مٹی سے ہو گیا۔ شاید معاذ کو اس سے سامنا ہو جانا اچھا لگتا۔ گزرتا آگروہ اسے اتنے فضول بیٹے میں نہ ملتی۔ اس نے ریڈ جارجس کی سیلویس کی شارت شرت کے ساتھ ایک ساٹھینس پہن رکھی تھی اور اس کے کمرے میک اپ سے لگ رہا تھا کہ وہ نہیں جانے کے لیے تیار ہے۔
”تھنک گاڈ! تم جلدی آگے میں تمہارا ہی وٹ کر رہی تھی۔“ معاذ نے اسے لے جانا ہے۔ ”وہ جلدی جلدی بولی اور ار تھنی کے باہر نکلتے ہی فرنٹ ڈور کھڑ کر کھڑی ہو گئی۔
”اس جیلے میں۔“ معاذ نے ایک ناگوار سی نظر اس کے سر اے پر ڈالی۔
”کیوں کہ ہوا ہے میرے جیلے کو۔“ وہ ماتھے پر ہل ڈال کر بولی۔ بلیک فگر کے بیٹے بڑے ایر برنگز اس کے کالوں کو پھوڑ رہے تھے۔
”تم پروگرام سیٹ کرنے سے پہلے کم از کم مجھے انفارم کرنے کی ذمہ داری تو کر لیا کرو۔“ معاذ نے فوراً ”موضوع بدلتے ہوئے لوجہ کچھ نرم کیا۔“ مجھے ابھی کھانے کے فوراً بعد سٹیٹ پر جانا ہے۔ کیونکہ کے لیے زمین دیکھ رہا ہوں۔ ٹاٹا ہیلر کے ساتھ میری دو بچے اپنا سہ ہے۔ اس کے بعد ہسپتال آج میری ٹائٹ شفٹ ہے تمہیں پروگرام کسی اور دن کے لیے رکھ لو۔“ وہ گاڑی سے اترتے ہوئے دروازہ بند کر کے بولا۔
”تمہارے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے، جب میں تمہیں جیلے کو کہتی ہوں۔ تمہیں ہسپتال کیلنک ’مریٹس‘

کہتے ہوئے اس نے انتہائی پھرتی سے پیٹ کی جیب سے پھونسا سیاہ ریا اور نکالا اور فنی چہرہ لے کر خیرات پر تان لیا۔

”سینیفی! سیفی! کیا کر رہے ہو تم۔ باپ ہے یہ تمہارا پالہ۔“
 ”بالا نہیں۔ تمہارا اڑا یا ہے آپ لوگوں نے ہماری عزت کا۔ آج میں سارے حساب چکا دوں۔“ کہتے کہتے اس نے ٹریگر دبا دیا اور پھر دیا تابی چلا گیا۔
 لاؤنچ اندوہناک چیخوں سے گونج اٹھا۔

”آمنہ! خدا کے واسطے۔ تمہیں اللہ کا واسطہ تم تو بہت اچھی ہو اس گھر میں ایک تم ہی تو اس قدر اچھی ہو جس سے یہ گھر گھر لگتا ہے۔ اس گھر سے باہر جا کر واپس آنے کو جی چاہتا ہے۔ تمہاری گھر میں مودودی سب کے لیے ہمارے ہے تم سب پر مہربان ہو سب کا خیال رکھتی ہو سب سے محبت۔“
 زینب پاٹلوں کی طرح تیز تیز بولے جا رہی تھی۔ اس نے آمنہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ رکھے تھے۔

”بس کرو۔ پاگل ہو گئی ہو زینبی! اور یوں بھی میں اس قدر اچھی نہیں ہوں اور جو گھر سے جا کر لوٹ آنے کا خیال میری وجہ سے ہے تو میرے دونوں بھائی یوں گھر چھوڑ کر ہم سے ایسے منہ موڑ کر تو نہ چلے جاتے۔ ہمارا گھر تو ان سے قائم تھا ہمارا ہنستا گھر ان کے بچے کس قدر رو رہا ہے۔“ وہ داد سی ہو کر بولی۔

”ہنستا ہنستا کہو اس گھر کو اس گھر میں بابا صاحب کی دولت نے کبھی کسی کو کھل کر شہنہ ہی نہیں دیا۔ انہوں نے تو ہم سب کی زندگی کو خوف اور دہشت کی علامت بنائے رکھا بہت اچھا ہوا جو عبدالمعین اور عبدالمبین یہ زندگی چھوڑ کر چلے گئے۔ لڑکے تھے اڑ سکتے تھے ہمارے تو پر بھی نہیں کہ اس دہشت خانے سے نہیں بھاگ جائیں تھیں زندگی کی کچھ سانسیں تو کھل کر لے سکیں بابا صاحب نے ہمیں فرشتے بنانے کے چکر میں انسان بھی نہیں بننے دیا نرمل انسان آمنہ ہم سب اینارمل ہیں۔ میں تم جویریہ بھائی ہم سب اینارمل ہیں اور ہماری اس ذہنی اینارملی کے ذمہ دار بابا صاحب ہیں۔ ہر گز نہیں بابا صاحب جیسے انسان شادی کیوں کرتے ہیں۔ گھر کیوں بناتے ہیں۔ گھر بسائیں تو بچے کیوں پیدا کرتے ہیں۔ بچے پیدا کرتے ہیں تو پھر انہیں انسان کے بچے کیوں نہیں سمجھتے انہیں محض کوئی شے کیوں سمجھتے ہیں۔ ہمیں وہ ساری زندگی توڑ مروڑ کر اپنے ہی بنائے ہوئے اصولوں کے سانچوں میں فٹ کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ کبھی مار پیٹ کر کبھی جھج جھج کر کبھی ڈرا دھمکا اور بالآخر ہم جیسے عجیب و غریب انسان ان سانچوں سے باہر آتے ہیں۔ ہیں نا۔“ وہ کھٹکھٹا کر بولی۔

آمنہ کو اس کی کلامی حالت پر شبہ سا ہوا تھا۔ کتنی کمزور ہو گئی تھی۔ مرمجایا ہوا رنگ و روپ آنکھوں کے نیچے گہرے گہرے خشک ہونٹ بے رونق بکھرے ہوئے بال اسے جیسے اپنا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔
 ”زینب! تمہیں کیا ہوا جا رہا ہے؟ تم نے اپنے چہرے پر کبھی نظر ڈالی ہے۔ اینارمل تو تم خود اپنے آپ کو بتا رہی ہو۔ کیوں پہلے کی طرح ہستی بولتی نہیں ہو۔ اماں کی نظر میں ہر وقت تمہیں تلاش کرتی رہتی ہیں۔ وہ بد وقت چل کر تمہارے پاس آتی ہیں کہ زینب مجھے صبح سے نظر نہیں آ رہی۔ کم از کم ان کی خاطر ہی پہلے جیسی بن جاؤ۔“ آمنہ نے اسے احساس دلانا چاہا۔

”پہلے جیسی ہونے میں تو وہی نہیں بن پائی۔ جیسی بابا صاحب بنانا چاہ رہے تھے اور اب وہ بھی نہیں بن سکتی۔ جیسی خود بننا چاہ رہی تھی۔ پہلے میں ہستی بولتی رہتی تھی تو مجھے قوی امید تھی کہ میں اس عقوبت خانے سے ایک دن ایک دن چھٹکارا پاؤں گی۔ بابا صاحب کی آمریت سے کہیں دور بھاگ جاؤں گی مگر اب۔“

وہ پھر وہی اپنا سرو پار سے نکا کر چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ کیسی وحشت سی برتنے لگی تھی آج کل اس کی آنکھوں سے۔

”اب کیا ہو گیا ہے یہ نا امید کیوں زینب؟ تم یوں پریشان کیوں ہوتی ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں اچھے

”اس میں کچھ احساس ذمہ داری تو پیدا ہو جائے۔ سب کچھ اسی کا تو ہے۔ ہم تو محض چوکیدار ہیں۔“ فخریات تھکے تھکے لہجے میں بولے۔

”آپ اس کے حوالے کرویں خود ہی اس کے اندر احساس ذمہ داری پیدا ہو جائے گا۔“
 ”رعننا! میں یہ غلطی دو سرے پار نہیں کرنا چاہتا۔ ایک بار پہلے بڑس میں سب کچھ لٹا کر میں نے زیرو سے اشارت لیا تھا۔ اب جو کچھ بھی کرتا ہوں۔ بہت سوچ سمجھ کر۔“
 ”اور کتنا سوچیں گے آپ؟ ماما! آپ نے بات نہیں کی ان سے۔“ سینیفی کی ان کے عقب سے بیڑھیاں اتر کر اچانک سامنے آکر اہوا تھا۔

”کی ہے بیٹا بات اور۔!“
 ”میں۔۔۔ مت کہیں مجھے بیٹا۔ نہیں ہوں میں آپ کا بیٹا۔“ وہ تیزی سے ان کی بات کاٹ کر بولا تو رعنا کے چہرے کا رنگ ہی اڑ گیا اور فخریات کا منہ بھی کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”کیا بولو اس کر رہے ہو تم۔“ وہ آہستگی سے غرائے۔
 ”وہی جو آپ نے سنی اور سوچ ہے۔“ وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔
 ”سینیفی! رعنا تجھیں۔“ تمہیں بہ الدین کا احترام بھی کھواتا جا رہا ہے۔“
 ”آپ کے منہ میں انہی بات کیا ہے۔ والدین کا احترام۔“ وہ کھنکھن سے ہنسا۔
 ”وہ تو میں کرتا ہوں۔ اپنے والدین کا۔“ وہ چپا چپا کر بولا۔
 ”کیا مطلب؟“ رعنا نے پرہیزگار نظروں سے اسے دیکھا۔

”آپ مطلب و طلب کو کوئی ماریں۔ آپ مجھے یہ بتائیں۔ آپ نے بہت کچھ میرے حوالے کرنے کے لیے پیرز تیار کر دیا ہے۔ میں یا نہیں۔ میں پچھلے ہفتے آپ کو قاضی کو پکڑا ہوں۔“ وہ بے جا غلی سے بولا۔
 ”کیسے پیرز؟“ فخریات ماتھے پر ہل ہل کر بولے۔

”سب کچھ میرے نام کرنے کے۔“
 ”سب کچھ تمہارے نام ہی ہے۔ تمہوڑا صبر کر لو۔“ وہ رکھائی سے بولے۔
 ”اکتھا صبر ہے۔“ وہ چہرہ بھکا کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کے بچے نے تک کا صبر۔ اس کی بات پر رعنا بے ہوش ہونے کو تھیں۔“

”چلو یہی سمجھ لو۔“ وہ غصے سے اٹھنے لگے۔
 ”اکتھا صبر تو میں نہیں کر سکتا۔“ وہ سر دھجے میں بولا۔
 ”تو پھر ابھی مارو اوتھو۔ تمہارا صبر بھی تمام ہو جائے گا اور۔“

”سینیفی! رعنا نے اٹھ کر ایک زوردار تمہیں اس کے منہ پر کھینچ مارا۔“
 ”ہاں سینیفی کو ماریں۔ کون سی آپ کی اپنی اولاد ہے۔ میں تو کھلو تا ہوں نا جو آپ نے میری ماں سے چھینا تھا۔ اپنا دل ہلانے کے لیے اپنے دکھی دل پر پھیا ہارنے کے لیے۔ کیا صلہ دیا آپ نے اس قربانی کا مجھے۔ میری ماں کو۔“
 وہ صبح کر بولا۔

”وہ سب پیسے کو ترستے رہتے ہیں اور آپ دونوں اس خزانے پر سناپ بن کر بیٹھے ہیں مجھے بھی کسی چیز کو چھونے ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں۔ کون ہوں میں آپ کا۔“ وہ زور سے دھاڑا۔

”کوئی نہیں۔ کوئی بھی تو نہیں۔ صرف آپ نے اپنا غم غلط کرنے کے لیے مجھے اپنا یا تھا۔ غم غلط ہو گیا۔ آپ کا مطلب نقل کیا۔ اسی لیے تو مجھے کوڑی کوڑی کو مٹانے کو رکھا ہے کہ سدا آپ کے آگے ہاتھ پھیلا تا رہوں۔ چھوڑ کر نہ بھاگ سکوں نہ اپنے ماں باپ کے پاس نہ کہیں اور۔ مگر مجھ سے اب صبر نہیں ہوتا۔ آج فیصلہ ہو کر رہے گا۔ آپ دونوں یا میں۔“

دن بھی آئیں گے بلکہ آنے ہی والے ہیں وہ بھی تمہارے۔" آمنہ نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ کو محبت سے دایا۔

"یہ منہ! اتنے دن وہ بھی اس نارج پیل میں بند رہے۔" وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ "آمنہ! تمہیں ابھی امید ہے کہ اتنے دن آئیں گے؟" وہ اس کی آنکھوں میں اکیہ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "ہاں آجھی سکتے ہیں۔" پھر وہ خود ہی بولی۔

"سہمی تو میں کہہ رہی ہوں۔" آمنہ خوش ہو کر بولی۔ "بس تم ہمت کرو خود کو پہلے جیسا۔"

"پلیز آمنہ! مجھے کوئی نصیحت مت کرو تم میرا ایک کام کرو پلیز۔"

"کیسا کام؟" آمنہ نے الجھن پھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"تمہاری وہ جو سابقہ پر نپیل تمہیں ناروغنا حیات مجھے ان کے گھر کا ایڈریس لادو، ہمیں سے بھی۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔" وہ بتتی لیجے میں بولی۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ فتناس ابھی تمہارے دماغ سے نکلا نہیں۔" آمنہ تلخی سے بولی۔ "بھول جاؤ اس فراڈے کو۔"

"نہیں بھول سکتی میں اسے۔" زہنب زور سے چینی "آمنہ نے گہرا اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔"

"آہستہ بولو۔" وہ ڈانڈیا بولی۔

"آہستہ بولو، آہستہ چلو، آہستہ آہستہ کھاؤ، آہستہ پیو، آہستہ روو، آہستہ مرو، ساری زندگی اس ایک لفظ سے عبارت ہے ہماری۔ بے فکر ہو، آہستہ آہستہ مر رہی ہوں۔ میں مر جاؤں گی۔" وہ تلخی سے کہتے ہوئے اپنے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔

"زہنب! یہاں اپنا دماغ خراب کر رہی ہو، جبکہ سب کچھ آہستہ آہستہ ٹھیک ہونے جا رہا ہے، لہذا تمہاری صحت اللہ کا شکر ہے بہت بہتر ہو گئی ہے۔ آج تو وہ سارا دن باہر بیٹھی رہی ہیں۔ بابا صاحب بھی اب تمہیں اتنا نہیں ڈانٹتے ڈپٹتے۔ میری تنخواہ میں پورے دو سو روپے کا اضافہ ہوا ہے اور سب سے بہتر کہہ سکتے ہیں۔"

اس نے سپینس پیدا کرنے کی کوشش میں جان بوجھ کر بات اور خودی یہ جوڑی۔

"اور سب سے بہتر کہہ سکتے ہیں۔" زہنب پاٹ لیجے میں بولی۔

"اسی مہینے بابا صاحب تمہارا انکج نڈیر سے کر رہے ہیں۔ اس کا کوئی میں اپنا گھر ہے بابا صاحب دیکھ کر آئے ہیں۔ بہت برا تمہارے بچے گھر جیسا وہ تمہیں ادھر ہی رکھے گا اور۔"

"نٹ اپ آہنہ۔" وہ غرائی۔ "اس سے آگے مزید کچھ اس نہ کرنا میں کچھ اٹھا کر ماراؤں گی۔"

"بابا صاحب! اس میں بکواس کیا ہے؟" آمنہ کو اس کی ناراضی کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔

"تم خود ہی تو پہلے شادی کو تمام ہو، ہوں کا اصل قرار دیتی تھیں۔ بھول گئیں۔" آمنہ کچھ شرارت سے بولی۔ "شادی کو قرار دیتی تھی بربادی کو نہیں اور آمنہ میرے سامنے اس لیلی کے مرلیش کا نام مت لیدنا ڈرن، مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔ اس سے اگلے ہفتے نکاح کر لیں خود بابا صاحب۔ اس سے نکاح کر لی ہے میری ہوتی۔" وہ ترخ کر بولی۔

پھر بولی۔

"بد تمیز! ایسے بولتے ہیں بابا صاحب نے من لیا تو پھر اس میں کیا برائی ہے؟"

"انکانہی تمہیں پسند ہے تو تم کر لو اس سے نکاح۔ یوں بھی تم بڑی ہو پہلا حق تمہارا ہے۔ پھر بابا صاحب یہ سنگی میرے ساتھ ہی فرمائے گا ارادہ کیوں رکھتے ہیں۔ ہاں پچھتے ہیں وہ بھی بے چارے۔" وہ مسخرے ہنسی۔

"بابا صاحب! وہ اس کی ہنسی کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"بابا صاحب کو ڈر ہے میں نہیں بھاگ نہ جاؤں۔" وہ زور سے ہنسی "میں یہ بھی کر گزرتی اگر۔" آخری جملہ وہ بولیں میں دیا گئی۔

"اچھا مہ بولو۔ میرا یہ کام کرو گی کہ نہیں۔" وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

"تمہیں کبوں گی۔"

"ٹھیک ہے ایک تم سے مجھے اچھائی کی امید تھی سو وہ بھی نہیں رہی اور یہ کوئی ایسا مشکل کام بھی نہیں۔ میں خود جا کر تمہارے اسکول کے آفس سے یہ ایڈریس لے سکتی ہوں۔ تم سے صرف اس لیے کہہ رہی تھی کہ وہ بھولوں تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو۔ چلو کوئی بات نہیں۔ میں خود کر لوں گی۔" وہ آرام سے بولی۔

"تم آخر ان کے ایڈریس کا کرو گی کیا؟" آمنہ ترخ ہو کر بولی۔

"۱۲ شہسار چیمپاؤں کی ان کی نیک نامی کا۔" وہ جل کر بولی۔ "صفت کی نیکیاں کما رہی ہیں وہ دور افتادہ دیہات میں اسکول کھلو اگر کچھ روشنی علم کی پھیلاتی ہیں، کچھ اپنے لائق فرزند کے وجاہت کی۔ جدھر سے جاتی ہیں پیچھے ان کی عزت کے ڈٹتے جتتے ہی رہتے ہیں۔"

"زہنب! تم کیا کرنا چاہتی ہو؟" آمنہ کچھ ڈر کر بولی۔

"بتا دیا ہے۔" وہ سیدھا کر کے لیٹ گئی۔

"تم اس سے ملنے جاؤ گی؟"

"شاید ہاں شاید نہیں۔" وہ لاپرواہی سے بولی۔

"تم ایسا نہیں کرنا، بابا صاحب کو۔"

"پلیز اب مزید بابا صاحب کو کھول کر بیٹھ جانا۔ میں سونا چاہ رہی ہوں۔" وہ ہیزاری سے بولی۔

"دعوت کا نام ہو رہا ہے منحوس، ہوتی سے اس وقت سونا۔"

"جو خود منحوس ہو اس کا وقت کی منحوس لیا گاڑے گی۔ سونے دو مجھے جاؤ تم یہاں سے۔" وہ کہتے ہوئے دو سرے طرف کروٹ لے کر لیٹ گئی۔

"تھکتی نہیں ہو۔ تم دن رات پیگے توڑتے توڑتے۔" آمنہ کچھ جل کر بولی مگر زہنب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آمنہ کچھ دیر کے بعد کھینچی پھر اٹھ کر جا گئی۔



کتی ساری قیامتیں ایک ساتھ نواز صاحبہ ٹوٹ پڑی تھیں۔

سینٹی اور عفت آرا کی سر جوڑ سازشوں کا ایک نہ ایک دن کوئی غلط نتیجہ تو انہیں نکلتا نظر آتی رہا تھا مگر وہ اس طرح اتنی دیدہ دلیری سے فخر حیا سے اور زرخا پرستوں کی تان گزرتے صرف کھڑا ہو جائے گا بلکہ انہیں یوں گولیوں سے بھی بھونکے گا اس کا تو انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ عفت آرا خود یہ خبر سن کر نہ مپا گل سی ہو گئی تھیں ایسی بے خوفی اور بڑا کی توقع تو انہیں بھی اپنے لاپرواہی سپوت سے نہیں تھی۔

کی کوئی بچے باہر نکل کر نواز صاحب کی ٹائٹل شکل ہو چکی تھیں عفت آرا اور صوفے پر بے جان سی پڑی تھیں۔

"عورت کی فطرت خدا نے کتنے کیسے مادے سے بنائی ہے۔ اس کی ہوس کا پیٹ تو دوزخ کے منہ سے بھی بڑا ہے جس میں دنیا جہان کی نعمتیں ڈالتے جاؤ سیر نہیں ہوتا۔ یہ عورت ساری زندگی بوجھن دولت کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتی رہتی اور ہاتھ کیا آیا؟" وہ تھک کر کہے۔ "مگر سب عورتیں اس جیسی بھی نہیں ہوتیں بہت نیک صابر اور قناعت پسند عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ اور ایسی صابر شاکر عورتیں جن کے نصیب میں ہوتی ہیں ان سے بڑا مال دار بھی کوئی نہیں ہوتا۔ کاش اللہ میرا شمار بھی ایسا کر دیتا۔" وہ حسرت سے سوچ رہے تھے۔

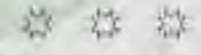
"مگر میں تو وہ کم نصیب ہوں جیسے نا صرف عورت ہی لاپرواہی اور کینہ فطرت ملی بلکہ اولاد بھی سفیان جیسی جو اس عمر میں مجھے ذلت اور رسوائی کا وہ تاج پہنا گئی ہے کہ میں اپنا سر بھی کاٹ ڈالوں تو بھی یہ تاج میرے نام کے ساتھ جڑا ہی رہے گا۔" سی سی یو کے باہر پولیس کی وردی میں ملبوس تین گارڈز کو دیکھ کر انہوں نے سوچا۔ اخباری پورٹز ٹھوڑی ٹھوڑی دیر بعد پورے آگے میں منتظر رہے تھے۔ ایسی مسالے دار خبر ضرور ان کے اخبار کی سیل کو

دو گنا کر سکتی تھی کہ بیٹے نے ماں باپ کو قتل کرنے کے لیے اندھا دھند ان پر فائرنگ کر ڈالی۔
جیسے ہی سفیان نے دیکھا حیات پر فائر کھولا۔ پہلی دو گولیاں تو ان کے کندھے اور سینے میں لگیں۔ تیسری گولی چلنے سے پہلے جتنا نہ جانے کہاں سے ان کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ تین گولیاں جتناں کے سینے میں بھی اتریں۔ ایک گولی اس نے بے حد سفاکی سے فخر حیات کے سر میں ماری تھی رعنا جو تڑپ کر شوہر کے سامنے آئی تھی۔ ایک گولی اس کے بیٹ میں لگی تھی۔

تینوں ناحال بے ہوش تھے جتناں اور فخر حیات کی حالت بہت سیریس تھی اور بچنے کے چانسز بھی بے حد کم تھے۔ ابھی تو ڈاکٹرز نے رعنا کے بارے میں بھی تسلی نہیں دی تھی۔ اسے تو نروس بریک ڈاؤن بھی ہوا تھا ڈاکٹرز نے کہا تھا اگر اگلے دو گھنٹے تک اسے ہوش نہ آیا تو شاید وہ کوسے میں چلی جائے۔
سیٹی جاتے جاتے گیت پر کھڑے گاڑی کو بھی زخمی کر گیا تھا اور اب مفروز تھا۔ پولیس اس کی تلاش میں جگہ جگہ چھانے مار رہی تھی۔ حیات ولا کے باہر بھی پولیس کا سخت پہرہ تھا گھر کو سیل کر دیا گیا تھا۔
”اگر فخر حیات یا جتناں کو کچھ ہو گیا تو سیٹی کا کیا بے گاہ؟“ نہیں سوچتے سوچتے جھرمجھری سی آئی۔

”اور رعنا؟“

”رعنا کو ہوش آیا تو کیا میں اس سے نظریں ملا یاؤں گا؟ کبھی اس کے سامنے جا یاؤں گا میرے خدا!“ وہ وہیں بیٹن پر اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر اکڑوں بیٹھ گئے۔ پولیس اہلکار سپاٹ نظروں سے انہیں زمین پر بیٹھے ہوئے دیکھ رہے تھے۔



”ہیلو!“ سیل فون کی بپ بجنے پر نین نارائے کسل مندی سے مچا کل کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ اسے کلام سوات سے آئے تقریباً ”بندرہ دن ہو چکے تھے ٹھکر ابھی تک جیسے اس کی تھکان ہی نہیں اتر رہی تھی کچھ اس خوش گوار سفر کی حسین یادیں تھیں جنہیں سوچتے ہوئے اس کا جی چاہتا کہ کوئی ان یادوں میں غل نہ ہو اور وہ اکیلی بیوی ان خوشگوار لمحوں کو سوچتی جائے جن میں شاہ جی نے اپنی تمام تر محبت کا خزانہ اس پر خالی کر دیا تھا شاہ جی یوں اس پر ”مہربان“ ہوں گے اس کا یقین تو اسے ابھی تک نہیں آ رہا تھا اور اب وہ اکیلی بیٹی سوتے جاتے ان خوبصورت محبت بھرے لمحوں کا کوئی من چاہا بیٹا جاگتا رزلٹ آنے کی خدا سے دعا کرتی رہتی تھی۔

شاہ جی اسے چھوڑ کر گاؤں چلے گئے تھے۔ جس دن گاؤں گئے تھے صرف اسی دن انہوں نے نین نارائے کو فون کیا تھا۔ اس کے بعد چھ دن بیت گئے نین نارائے کے موبائل پر جب بھی کال لگتی تو آف ملا۔ جو بی فون کرنے کی شاہ جی نے اسے سختی سے ممانعت کر رکھی تھی اور آج کل وہ واقعی ان کے فون نہ کرنے پر کچھ پریشان سی ہو چکی تھی۔

”تم مجھ سے ابھی آوے گھنٹے کے اندر ایئر پورٹ پر ملنے آسکتی ہو فون آئی بی لاؤنچ میں میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“ اس کا بیلو ہستے ہی سلطان بخت نے کوئی بھی تمہید باندھے بغیر اسے جیسے حکم دیا۔
”خیر بیٹ شاہ جی! اور اتنے دن آپ نے مجھے فون بھی نہیں کیا۔ میں تو سخت فکر مند تھی کہ خدا خیر کرے۔“ وہ جلدی سے اٹھتے ہوئے بولی ان کی آواز نے جیسے اس کے اندر زندگی کی تکی لہرو ڈاوی تھی۔

”نین نارائے! یہ باتیں ملنے پر ہوں گی آسکتی ہو تو آجاؤ پھر مجھ سے شکایت نہ کرنا ایک گھنٹے بعد فلائٹ ہے میں تمہارا ویٹ کر رہا ہوں۔“ کہتے ہوئے انہوں نے اس کی مزید کوئی بات سے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

”واہ شاہ جی! آپ بھی شاہ جی ہی ہیں۔ جب چاہا جس کو چاہا جس گھڑی چاہا کرٹ لگا دیا چاہے اگلے کامیوڈ کرٹ کھانے کا ہو یا نہ ہو۔“ وہ کچھ سانس سے سہلا تے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ گھڑی پر نگاہ کی۔ شام کے پانچ بج رہے تھے گویا سلطان بخت کی فلائٹ چھ بجے کی ہے اور اسے آوے گھنٹے تک ایئر پورٹ پہنچنا ہے آوے گھنٹے کا تو راستہ ہی ہے پھر اگر راستے میں ٹریفک زیادہ ہو تو دس پندرہ منٹ زیادہ بھی لگ سکتے ہیں۔ اور کیا میں اس طیلے میں

اٹھ کر چل پڑوں۔“ اس نے کچھ جھنجھلا کر خود کو آئینے میں دیکھا بیچ کلر کا کالین چکن کا جدید تراش کا سلا ہوا سوٹ اس نے دوپہر میں ہی پہنا تھا اور ابھی بھی اس کی استری خراب نہیں ہوئی تھی۔
”چلے گا یہی چلے گا۔“ اس نے جلدی سے ڈریسنگ ٹیبل سے برش اٹھا کر اپنے بالوں میں چلایا، ہانکا پھانکا میک اپ کیا سینڈل پینٹی۔ شوئرز بیگ لے کر سن گلاسز پہنتے ہوئے وہ تیزی سے باہر نکل گئی اس تیاری میں اسے بے شکل پانچ منٹ لگے تھے۔

”کہاں جا رہی ہو؟ بخاری صاحب کی طرف نہیں جانا۔ چھ بجے ان کے ہاں ٹی پارٹی ہے۔“ زیور گل لاؤنچ میں ہی بیٹھی تھی۔ اسے یوں تیزی سے باہر جانے دیکھ کر فوراً بولی۔

”نام مجھے دیر ہو رہی ہے میں ایک گھنٹے تک آجاؤں گی ڈر کے بغیر تیزی سے کہہ کر باہر نکل گئی۔ زیور گل اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

شام ابھی گہری نہیں ہوئی تھی اس لیے ٹریفک بھی کچھ کم ہی تھا پھر بھی اسے ایئر پورٹ پہنچنے پہنچتے چاہیے منٹ لگ گئے۔

”میں نے تم سے کہا تھا آوے گھنٹے میں پہنچ جاؤ اور تم۔“ سلطان بخت اسے دیکھتے ہی تھکے لمبے میں بولے۔
”میرے کیا پر تھے بوا! کب۔“ اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی وہ تو سلطان بخت کو دیکھ کر وہلک سے رہ گئی تھی۔ یہ وہ والے سلطان بخت تو نہیں تھے جو پندرہ دن قبل اسے گل کدے پر ڈراپ کر کے گئے تھے یہ تو اس خوش بات صحت مند وجہ۔ سلطان بخت کا سنا لگ رہے تھے۔

”آپ۔ آپ کو کیا ہوا شاہ جی؟“ سفید بے باغ لٹھے کے کڑکڑاتے شلوار کرتے میں بھی وہ اچھے خاصے کمزور اور مڑھانے ہوئے لگ رہے تھے رنگ بھی سنوٹا یا ہوا تھا۔

”کیا ہوا مجھے؟“ وہ کچھ ہنسی سی مسکراہٹ لیے بولے۔ وہ ان کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔
”آپ۔ آپ بیمار ہیں؟“ وہ دم بخود سی ان کا ہاتھ ہولے سے تھام کر بولی تو سلطان بخت اسے دیکھتے رہ گئے۔ چند گھنٹے پہلے بول ہی نہ سکے۔

”بتائیے نا۔ میں کیا پوچھ رہی ہوں۔ آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے کیا ہوا ہے آپ کو؟“ وہ بے تابی سے ان پر نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔

”نین نارائے! اگر تم زیور گل کی بیٹی نہ ہو تیں تو زندگی بھر مجھے اپنے انتخاب پر فخر دیتا۔“
”ایا اب آپ مجھے منتخب کرنے پر ترمندہ ہیں؟“ وہ ایک دم تلخی سے بولی۔
وہ چپ چاپ ہلستے بیٹھے رہے۔

”کیسے یہ میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔ آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے۔“ کہتے ہوئے اس نے آہستگی سے ان کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور آنکھوں میں آئی گی کو چھپانے کے لیے ہاتھ میں پکڑے گلاسز آنکھوں پر لگانے لگی۔
”ٹھیک ہوں میں۔“ وہ بھی سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

”شاید آپ نے مجھے کبھی دل سے اپنی بیوی سمجھائی نہیں۔ صرف محبوب ہی سمجھا۔“
”بیوی تو تم میری ہو مگر محبوب واقعی زیادہ ہو خیر میرا دل تھا کہ تمہیں اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتا تھا۔“ اس لیے۔

”کہاں جا رہے ہیں؟“
”نیو جرسی۔“

”خیر بیٹ کیوں اچانک؟ پتا نہیں آپ جواب دینا پسند کریں گے بھی یا نہیں۔“ وہ کچھ افسردگی سے بولی۔
”تم ہی تو ایک ہو جس سے میں اپنے دل کی ہر بات بے دھڑک کر لیتا ہوں۔ پھر بھی تمہیں میری محبت پر شک دیتا ہے۔“

انہوں نے کہتے ہوئے رشتہ داروں پر نگاہ ڈالی۔ زمین تارائے ان کے پاس دھرتے بڑے سے مغزی سوٹ کیس اور ایک خوب بچولے ہوئے لیدر بیگ کو دیکھا۔

"تکتے دنوں کا پروگرام ہے؟"

"تقریباً" زمین تارائے۔

"استون۔ زمین تارائے لڑپ لڑپ۔" استون رہیں گے میرے بغیر؟"

"جی نہیں۔" وہ کہتی سانس بھرے ہوئے بولے۔ "رہ نہ پایا تو جلدی آجاؤں گا۔"

"جا کس لیے رہے ہیں۔ بتاتے بھی نہیں۔" وہ ہانک بھینچا لڑپ لڑپ۔

"چیک اپ کے لیے۔"

"ایا چیک اپ۔" وہ ہونٹوں کی رہ گئی۔

"تیرے دن بل اچانک اس بل کے قرار نے اچھی خاصی بے وقافی دکھائی تھی۔ اب اسی کے کان کھینچوانے جا رہا ہوں۔" وہ کچھ ہنس کر بولے۔ زمین تارائے کی حالت میں انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"پارٹ پر ایلم۔" وہ بڑبڑائی۔

"ہیں۔ میری زندگی کا ایک ایک بیماریاں۔"

"آپ نے مجھے خبر بھی نہ دی۔"

"میں خود اپنے آپ سے بے خبر تھا تو تمہیں۔"

"شادی میں اتنی تیرے ہوں آپ کے لیے۔" وہ بولے۔ "وہ دینے کو تھی۔"

"غیر سمجھتا تو ان آخری لمحات میں تیرے بغیر ہی جاسکتا تھا۔"

"غیر ہی سمجھتے ہیں آپ۔" وہ تکی سے ہونٹیں لپیٹ کر صرف آپ کی طرف سے بخشی گئی خوشیوں اور عنایات کی حق دار ہوں آپ کے دکھ درد سے میرا کچھ واسطہ نہیں۔ آپ نے واقعی مجھے کال کر لیا تھا۔ مجھے شادی اور کچھ نہیں۔"

"پلیز زمین تارائے! اس وقت کسی بھی تکلیف دہ موضوع کو نہ چھیڑنا۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولے۔

"کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

"ہاں غلط کہہ رہی ہوں۔" وہ جیسے تھک کر بولے۔

"نہیں۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آپ نے بیشک مجھے اپنے سے الگ سمجھا لیا۔ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولی۔

"دیکھیے؟ کہ ڈالو ہو کہنا چاہتی ہو۔"

"آخر ایسا کیوں ہے شاہ بی! آپ سے متعلق احتمالی ضروری اور اہم خبریں مجھے ہمیشہ اخباروں کے ذریعے ہی ملتی ہیں۔" وہ پلٹ کر دیکھی ہو کر بولی۔

"تمہارا شاہ سے آپ کی شادی کی خبر بھی مجھے اخبار سے ملی اور شہرینہ کے گھر پہنچنے کی بھی۔" اس کی بات پر سلطان بخت کے چہرے کا رنگ ایک ہی بل میں زرد ہو گیا اور آنکھیں جیسے پتھر اسی گئیں۔

"کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

"یہ نام آئندہ کبھی تمہاری زبان پر آیا تو زمین تارائے! میں تمہاری زبان گدی سے کھینچ دوں گا۔ تم نے صرف سلطان بخت کی محبت دیکھی ہے اس کا غصہ اور نفرت نہیں دیکھا اور آئندہ کبھی یہ نام لے کر میرے غصے کو دعوت نہ دینا انڈرا سٹیڈ اپ تم پہلی جاؤ۔ ہوسکا تو تمہیں فون کرتا ہوں گا خدا حافظ۔" وہ کہتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

دور کھڑا ملازم انہیں بول اٹھتے دیکھ کر تیزی سے لپکا اور دونوں ہاتھوں میں سامان اٹھا کر ان سے دو قدم آگے بڑھ گیا۔

"شاہ بی! شاہ بی! انی ایم سوہی۔ رتلی سوہی۔ پلیز یقین کرو آئندہ ایسا کچھ نہیں کہوں گی۔ جو یوں آپ کو خفا کرے یوں ناراض ہو کر مت جائیں۔ پلیز شاہ بی! وہ تیز تیز چلتی ان کا بازو تھام کر بولی تو وہ اسے گھور کر دیکھنے لگے۔

"ٹھیک ہے۔ میں ناراض نہیں ہوں جاؤ اب فلائٹ کا ٹائم ہو گیا ہے خدا حافظ اور ہاں۔"

وہ جاتے جاتے رکے اور ویسٹ کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک تھم شدہ چیک اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ تمہاری ضروریات کے لیے، اگر میں ایسٹ ہو گیا یا کچھ کی محسوس کرو تو مجھے فون کر کے بتا دینا۔" وہ نارمل لہجے میں بولے۔

اس نے مہرے مہرے ہاتھوں سے چیک کھول کر دیکھا۔ وولا کہ کی رقم درج تھی۔

"شاہ بی! یہ میں نہیں لوں گی۔ کم از کم آج نہیں۔" وہ انہیں چیک لوٹاتے ہوئے بولی تو آنکھوں میں نمی تھی۔

"کیا مطلب؟" وہ حیرانی سے بولے۔ پائی با رہیں تارائے ان سے رقم لینے سے انکار کیا تھا۔

"شاہ بی! اگر تمہیں میں نے یہ چیک لے لیا تو مجھے لگے گا میں واقعی ایک کال کر لیں آپ کی بیوی نہیں آپ جس سفر پر جا رہے ہیں میرا خفا آپ کو اس سے بغیر تارائے تو پھر میں آپ سے ڈبل رقم لوں گی، صرف آج اس لئے مجھے ایک بیوی کی طرح آپ کو رخصت کر لینے دیجئے۔ پلیز شاہ بی! وہ چیک ان کی منگی میں دباتے ہوئے رو پڑی۔

"زمین تارائے! میں تمہیں سمجھ نہیں پا رہا۔"

"شاہ بی! بیشک سے آپ ہی دیتے رہتے ہیں۔ آپ ہی دینے کے مگر آج نہیں۔ آج میں آپ سے کچھ نہیں لوں گی بلکہ آپ کو دل کی دھیر ساری دعاؤں اور ایک بیوی دو دو دیکھنے کے شہر پر جاتے ہوئے اپنے شوہر کو دیتی ہے۔

شاہ بی! وہ بولی۔

وہ ڈارو تھارو رہی تھی۔ سلطان بخت حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس طرح تو صالحہ شاہ بھی نہیں روئی تھی اس کا چہرہ ضرور دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ آٹکھیں نم ہوئی تھیں نہ اس نے اپنی زبان کو کسی جذبے کے اظہار کی اجازت دی تھی۔

"اوکے ریٹیکس اور بہت شکر تمہاری دعاؤں کا۔" آج واقعی میں تم سے لینے کا حق دار ہوں دینے کا نہیں۔

آج میں واقعی اقرار کرتا ہوں کہ تم ایک اچھی بیوی ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کا رویا رویا چہرہ دیکھ کر بولے۔

"سبس۔" وہ جیسے چہرے کے ساتھ اسی تو سلطان بخت کو لگا اس سے زیادہ خوبصورت منظر ان کی آنکھوں میں آئی۔

"اب اس اقرار پر قائم رہے گا۔ ہو سکتا ہے جلد ہی آپ کو یہ اقرار از سر نو ملی جائے اور پھر آپ نے منکر نہیں ہونا۔" وہ اب نشو سے اپنا چہرہ صاف کرنے لگی۔ دو دھیار رنگت میں سرخیاں ہی کھل رہی تھیں۔

"کیا مطلب؟" وہ مجھے نہیں۔

"جب واپس آئیں گے تو اس کا مطلب بھی سمجھا دوں گی۔ ابھی آپ جاتیے اور پلیز شاہ بی! فون ضرور کرتے رہیں گے۔"

"اوکے ضرور فون کروں گا۔ اپنا خیال رکھنا اللہ حافظ۔"

"آپ کو اللہ کی امان میں دیا اینڈ ٹیک کیئر اللہ حافظ۔" زمین تارائے ان کی آخری بھر پور الوداعی نظر کو اپنی نظروں میں جذب کیا اور ان کی چوڑی پشت کو بصارتوں سے ابو بقل ہونے تک دیکھتی رہی اسے لگا وہ ایک ایسے بڑے کمپائونڈ میں بانٹل تھا کہ شادی ہے۔ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی کے باوجود اس کی آنکھیں پھر نم ہونے لگیں۔

”کچھ پتا چلا اس عورت کا جو ارتضیٰ سے ملتی ہے؟“ معاذ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا تو مسزخان نے اس سے پوچھا۔

”نہیں ام جان! میں نے بہت کوشش کی بلکہ اب میں سوچ رہا ہوں اسکول کی پرنسپل سے یہ معاملہ ڈسکس کروں۔“ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”پرنسپل سے کیا کہو گے؟“ وہ اس پر نظر میں جلتے ہوئے بولیں۔

”جی کہ کوئی عورت۔ لیکن ارتضیٰ تو کہتا ہے کہ وہ فمد کی آٹی ہے جبکہ فمد کی گریٹی کہتی ہیں کہ فمد کے ماں باپ نہیں ہیں اور وہ ان کے ساتھ ہی رہتا ہے تو پھر۔۔۔“ وہ جیسے خود الجھ گیا۔

”جی کبھی تو۔“ وہ رکیں۔ ”مجھے لگتا ہے کیا پتا وہ نہ بہت ہی ہو۔“ مسزخان کچھ دیر بعد جیسے خلا میں گھورتے ہوئے بولیں۔

”کیا بات کرتی ہیں آپ ام جان! آپی تو۔ نہیں وہ بھلا کیسے ہو سکتی ہیں جبکہ میں نے خود۔ نہیں نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا بلکہ وہ فمد کی کوئی جاننے والی خاتون ہوں گی اور اپنے بچے کو لینے آئی ہوں گی تو انہیں ارتضیٰ پر یار آیا ہو گا بس اتنی ہی بات ہے۔“ اس نے جیسے بات ہی سمجھ گئی۔

”تم جو بھی کو معاذا جیسے یقین نہیں آتا کہ نہ بہت اس طرح۔“ وہ امید بھری نظروں سے معاذا کو دیکھنے لگیں۔ معاذا کا حوصلہ نہیں بڑا کہ وہ ان کی امیدوں کو جھٹکے۔ چپ چاپ انہیں دیکھتا رہا۔

”انجھانی ہوا جو بھی ہوا۔ اس بے چاری کے ساتھ اس گھر میں کیا سلوک ہو رہا تھا پتا نہیں کبھی کبھی زندگی کسی انسان کے ساتھ اتنی سنگدل کیوں ہو جاتی ہے کہ شہ دور ستم اور معافی نہیں تم کو دکھ بھیلے ہیں

مسزخان بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔
”اور ارتضیٰ تو ایسا بچہ ہے کہ کوئی پتھر بھی اسے دیکھے تو اس کی معصومیت پر پھل جاسکے۔“ انہوں نے ایک ہر سانس لیا۔

”شہباز بھائی کا کوئی فون نہیں آیا؟“ معاذا چند لمحوں بعد بولا۔

”اس سے بڑا پتھر بھی ہو گا کوئی زمانے میں۔“ مسزخان تیزی سے بولیں۔ اس شقی کا دل نہ تو یوی کے لیے پھل سکا نہ ماں کے پوجا پے اور بیماری پر اور نہ اس معصوم کے بچنے پر پتا نہیں اس لڑکے کو کیا ہو گیا۔ وہ تو بالکل بھی ایسا نہیں تھا۔ فسول ہی ضد کے بچے اس نے تین زندگیوں والی دکھوں کے جو گے کھوس۔ دن رات سوتے جاتے دعا کرتی ہوں کہ میرے مولا اس کا دل خود بخود پھیر دے اس کے ذہن پر لگے غلط فہمی اور غم و غصہ کے جالے اتر جائیں اسے خود ہی احساس ہو جائے کہ وہ کیا حماقت کیے جا رہا ہے۔ تو یہ اندہی دیا کروا کا وہ سزا کا نام ہی مجھو ہے جو بات ہمارے بس میں نہیں ہوتی۔ اسی کی دعا تو ہم خدا سے کرتے ہیں۔ مجھے بھی یقین ہے کہ خدا میری یہ دعا

رو نہیں کرے گا۔ ایک ماں کے دکھی دل کی دعا۔“

معاذ نے ان کے یقین بھرنے لگے پر دل میں زور سے آمین کہا۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ وہ یقیناً دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے۔“ وہ ہولے سے بولا۔

”تم نے اپنے کلینک کے لیے زمین پسند کر لی؟“ چند لمحوں بعد انہوں نے پوچھا۔

”ام جان! میں ہائز اسٹریز کے لیے باہر جانا چاہتا۔“

”چلیز معاذا بیٹا! اگر شہباز میرے پاس ہوتا نہ بہت۔ اتنی بڑی ذمہ داری میرے کندھوں پر نہ ڈال جاتی تو میں تمہیں کبھی نہ روکتی مگر اب سارے حالات تمہارے سامنے ہیں پھر بھی تم۔“

وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔
”زمین میں دیکھ رہا ہوں جیسے ہی کوئی جگہ پسند آئی آپ کو بتا دوں گا۔“ وہ چند لمحے بعد بولا مبادا مسزخان اس کی خاموشی کو اس کی خطلی نہ سمجھ لیں۔

”تم آج کل ہائز سٹریٹ کر رہے ہو؟“

”نہیں۔ ابھی تو مارٹنک پل رہی ہے۔“

”تو پھر شام کو کدھر جا رہے ہو؟“

”میں نے پرو فیسر داؤد کا کلینک جو آئن کر لیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے نا وہ شہر کے مشہور ترین کارڈیا لو جسٹ ہیں۔ ان کے اسٹاف میں کام کرنا بھی بڑے اعزاز کی بات ہے۔ وہ تو مجھے پسند کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے مجھے رکھ لیا۔ میں نے سوچا کہ ابھی باہر نہیں جا سکتا تو پرو فیسر صاحب کے ساتھ مل کر کچھ تجربہ ہی حاصل کر لوں۔ میں نے ٹھیک کیا نام جان؟“ اپنی بات مکمل کر کے اس نے پوچھا۔

”نہیں جو آئن کرنے سے پہلے پوچھنا تھا نا۔“ وہ مسکرائیں۔

”آپ کو اچھا نہیں لگا؟“

”اس طرح تم نے خود کو بہت مصروف کر لیا ہے۔ ابھی تمہارے کیمپ کی مصروفیات تمام نہیں ہوئیں کہ میں گھر پر تو بڑا بوجھ دے رہا ہوں۔ ارتضیٰ کی اسٹریز بھی چیک کرتا رہتا ہوں اور ام جان! اس قیلند میں تو جتنا انسان ان ریج رہے پر نہیں کرتا ہے۔ اتنا ہی اس کی مہارت میں نکھار آتا ہے۔“

”مگر تمہیں اپنے متعلقہ لوگوں کا بھی سوچنا چاہیے۔“

”میں نے کس کی حق تلفی کی ہے ام جان! میں تو۔“

”مستی کل مجھ سے لگ کر رہی تھی۔ پرسوں شام تم اس کے ساتھ باہر گئے تم دونوں میں پھر جھگڑا ہو گیا تھا۔ یہ سب کیا ہے معاذا؟“ وہ تأسف بھرے لہجے میں پوچھنے لگیں۔

”مافی کا۔“ وہ جیسے سر پکڑا بیٹھ گیا۔ ”ام جان! آپ کی یہ پوتی تو مجھے کوئی سائیکو کیس لگتی ہے۔“ وہ چند لمحوں بعد بولا۔

”کیا مطلب؟“ وہ اسے گھور کر بولیں۔

”پرسوں ہم ڈنر کے لیے گئے تھے۔ آپ کے کمرے پر کہ مجھے کچھ وقت اسے بھی دینا چاہیے۔ ہم آواری کی پارکنگ میں گاڑی پارک کر کے اندر جا رہے تھے کہ ایک لڑکی نے مجھ سے حفوظ سینٹر کا ایڈریس پوچھا۔ وہ چائیزنگ رہی تھی میں نے اسے ایڈریس دکھایا۔ بس اس بات پر مٹی کا پارہ ہالی ہو گیا کہ میں اس لڑکی کو ایڈریس نہیں سمجھا رہا تھا۔ بلکہ اس کا ”اسٹریٹ“ کر رہا تھا وہ تو وہیں مجھ سے تیز تیز بولنا شروع ہو گئی کہ میں اگر اس کے ساتھ باہر نکلتا ہوں تو اپنی نظروں کو کنٹرول میں رکھا کروں اور نہ جانے کیا کیا۔ ارد گرد کھڑے لوگ مجھے مسخرانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے بلکہ کئی ایک کی نظروں سے تو صاف رحم ٹپک رہا تھا مت پوچھیں ام جان! اس اسٹوڈنٹ نے تو مجھے اپنی پر اپنی سمجھ رکھا ہے۔ آپ اسے سمجھائیں ورنہ پھر مجھے کچھ مت کہیے گا۔ میری ہواشت کی بھی ایک حد ہے۔ میں نے آپ کو اگر کچھ نہیں بتایا اور اس کی ڈھٹائی دیکھیں۔ غلط ہونے کے باوجود آپ کو سب کچھ بتا گئی

معاف کیے گا ام جان! مجھے یہ گاڑی بہت دور تک چلتی نظر نہیں آ رہی۔ اس کی اور میری ذہنیت میں بہت فرق ہے۔ آپ پلیرنیا تو اسے سمجھائیں جس کا شاید ہی کوئی فائدہ ہو یا پھر۔ میں چلتا ہوں مجھے کلینک جانا ہے۔ رات کو دیر سے آؤں گا۔“

”تیز تیز کہتے ہوئے رکا نہیں اور مسزخان کچھ حیران سی اور کچھ تأسف زدہ اسے دیکھتی رہ گئیں کوشش کے باوجود وہ اسے رکنے کا نہ کہہ سکیں۔“

”شاید معاذا ٹھیک کہتا ہے۔ مجھے اس معاملے پر ازمرو سوچنا چاہیے کہیں جانتے تو جتنے میں پھر نہ بہت اور شہباز والی کہانی دہرا بیٹھوں۔“ وہ خود سے کہتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

چون کون لوگ آپ نے پڑھا لیا ہے؟" اماں جی کو وہ گوری صحت مند کھٹوسلی بی بی یاد دہانی تھی جو بہت پیٹھے لہجے میں بات کرتی تھی۔ اور یہی ملاقات میں ہی مقناہ کا دل موہ لیتی تھی۔

"نہ ہورے آئے ہیں۔ وہیں اپنا ذاتی کمرہ بھی ہے۔ میں نے کالرا سفر ادھر ہوا ہے تو ادھر آئے ہیں۔" "تج نہیں کیا لکھا ہے میرے بچوں کے نصیب میں۔ کسی کی بھی خوشی تو دیکھی نہیں ابھی تک۔ اللہ ہماری خطاؤں کو معاف کرنے والا ہے۔ وہ میرے بچوں پر رحم کرے۔" اماں جی نے اتنی آسٹلی سے کہا کہ صوفی صاحب بھی بمشکل سن پاتے تھے۔ اماں جی نے آنکھیں موٹدیں تو وہ بھی خاموشی سے کچھ سوچنے لگے۔ "میں نے تمہارے والد محترم کے شاندار پلان ہمارے مستقبل کے بارے میں جہان کے ٹھکڑیوں نے ایجاد فرمائے ہیں۔" تمہوڑی دیر بعد زینب آمنت سے بولی آمنت اسے ایک نظر دیکھ کر رو گئی۔ "تم نے میرا کام نہیں کیا تھا۔ میں کل خود جاؤں گی تمہارے اسکول۔" "وہ جیسے خود سے بولی۔" "تم کیا کرو گی اس منکر کا پتالے کر۔"

"تاک ہی سوال بار بار۔ آمنت! تم تو بہت توڑھ مغز ہو۔" وہ تنک کر بولی بولوں کی اس سے وفا سے جا کر اور کیا سہرا پھوڑوں کی اس کو پوراوں سے ٹکرا کر۔ "اگر اس نے مجھے انکار کر دیا۔ بچانے سے ہی انکار کر دیا تو کیا رہ جائے گا تمہارے پاس۔" آمنت اس پر نظریں جم کر بولی۔ "مجھے تم سے ایسے ہی فضول حد تک کی توقع ہے۔ انسان کی اگر شکل اچھی نہ ہو تو منہ سے بات تو اچھی نکالے وہ مجھے بچانے سے انکار کرے گا تو میں بد بختی کو دعوت دے گا ویسے تم فکر نہ کرو یہ میرا بیٹا ہے اور میں اس سے پتہ اچھی طرح جانتی ہوں۔" وہ بے ساختگی سے بولی۔

"اگر اس نے تمہیں روکا۔ اگر جانے۔ تمہارے جذبات سے کھیل کر وہ اب تمہیں بچانے کا بھی نہیں۔" "اگر اس نے تمہیں روکا۔ اگر اس کے دل میں تمہارے لیے کچھ ہونا تو وہ ضرور تم سے ایک بار روابط کرے گا۔" "میں نے تمہاری جگہ پر اپنی جگہ پر بھی جا چکی ہوں۔ جہاں وہ ملا کر آتا تھا۔ اتنی ہی بات تمہاری سمجھ میں آئی کہ وہ ایک صوفی کا بیٹا تھا۔" آمنت زچ ہو کر بولی۔ "آئی ہے ساری بات سمجھ آئی ہے۔ آمنت! ایک بار صرف ایک بار مل کر اس کا سامنا کر کے میں حقیقت کو اپنی آنکھوں سے جانچ لیتا جاؤ تو ہوں۔ ایک بار اس دل کی تسلی کے لیے۔ صرف ایک بار میں اس سے ملنا چاہتی ہوں اگر یہ سب سچ ہے۔" "وہ کچھ غلط ہے۔" وہ آنکھوں میں آنسو بھرا لئی۔

"تمہاری منہدی ہو زینب! آمنت دھیرے سے بولی۔ "چائے۔" جو میری نے وہ نونوں کے مک ان کے سامنے لا کر رکھے۔ "باہر آتا اچھا موسم ہو رہا ہے۔ کالے نیا ہاں آتے ہوئے ہیں۔ منہدی منہدی ہوا چل رہی ہے اور لونڈیں بھی پڑنا شروع ہوا لگی ہیں۔" جو میری نے ان دونوں کو اطلاع فراہم کی۔

"تو؟" زینب نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور کر دیکھا۔ "جاؤ جا کر چھت پر آزادانہ بیٹھو گاؤ ناچو خوش ہو چرو کھنا یا صاحب کیے ٹانگیں توڑ کر تمہارے خوبصورت ہاتھوں میں تھماتے ہیں۔" "آپ تو بالکل ہی ہونٹی ہیں چھوٹی آئی۔" جو میری کہتے ہوئے تیزی سے اپنا مکہ کے گریا ہر نکلی گئی۔ "زینب! اس سے ایسے مت بولا کرو تو خود بہت چپ چپ سی ہونٹی سے۔ یا صاحب کی غلط فہمی نے اس سے اس کا بچپن چھین لیا ہے پھر اہرے گھر کے حالات میں کون سے اسے خود شکوہا رہیں۔" "ہم لوں ایک دوسرے کو بات بات پر کات کھائے کو روڑیں۔" آمنت نے اسے سمجھایا۔ "ہمارے حالات تو پیدا اتنی ایسے ہیں اور ایسے ہی رہیں گے مہرے دم تک۔"

"یہ لوہو ہزار روپے۔" صوفی صاحب نے اماں جی کی طرف ہزار ہزار کے نوٹ بڑھائے۔ "یہ کس لیے؟" انہوں نے حیران ہوتے ہوئے نوٹ پکڑے۔

"ان سے زینب کے لیے ایک دو جوڑے اور ایک نذر کے لیے اچھا سا موٹا سوٹ لے آنا جا کر۔ میں اب دس پندرہ روز تک اس فرض سے فارغ ہو جانا چاہتا ہوں۔" کہتے ہوئے وہ اپنی واڈھی میں دھیرے دھیرے اٹھیاں چلانے لگے۔

"اتنی جلدی۔" اماں جی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "یہ تمہارے لیے جلدی ہے راجہ بی بی! وہ ایک دو دن کی طرف دیکھ کر غرا آئے۔" میں اپنے حساب سے پہلے ہی خاصی دیر کرچکا ہوں اور اس سے زیادہ دیر نہیں کر سکتا۔ نذر اپنے گاؤں گیا ہوا ہے اپنے گھر والوں کو خیر کرنے پر سوں تک۔ آجائے گا تو تاریخ رکھ میں کے۔ ویسے بھی اس کا نرا سفر اسی گاؤں میں ہونے والا ہے۔ اگلے مہینے تک وہ ادھر ہی چلا جائے گا۔ بس اب تم مزید تاخیر کا مت سہو۔ کل بازار جا کر ضرورت کی کچھ چیزیں لے آنا میرے پاس لے آئیے۔ میں اور کون ٹوٹ نہ رکھنا۔" وہ جی سے کہتے ہوئے بیٹھ گئے۔

"اور اس کو اب زاوی سے بھی کہہ دینا اپنا امان غٹھانے پر لے آئے بہت گستاخا لگی ہے وہ بہت دنوں سے برداشت کر رہا ہوں میں۔" وہ درشتی سے بولے۔ "تمہاری طبیعت تو اس قدر اچھی رہتی ہے نا؟" انہیں کا ایک خیال آیا۔ "وہ بہت آہستگی سے بولیں۔"

"اچھا تو لہجے سے یہ معاذ! ملنے جاؤں گا کسی دن اس سے کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بتا دینا۔" "نذر کا گھر بار خاندان لاغیرا میرا مطلب ہے آپ نے سب پتا کر لیا ہے۔" صوفی صاحب نے ہلان پتہ کر کے انہیں کشمکشیں لگا ہوں سے گھور تو وہ جیسے گڑبڑائیں۔ "مٹی کا معاملہ ہے نا۔" وہ نظریں پٹی کرتے ہوئے بولیں۔ "معلوم ہے مجھے بچہ سمجھ رکھا ہے۔" ان کے منہ میں جیسے کوئی کھلی ہوئی تھی۔ ایک بوڑھی ماں ہی تو ہے اس کی۔ بس شادی شدہ کوئی سہا پوڑا خاندان نہیں۔ تم کوئی فلموں میں پانچ ست ہو ویسے بھی تمہاری صحت ان فضول فلموں کو پالنے کی اجازت نہیں دیتی۔" وہ کچھ غلط سے بولے۔

"اور آمنت۔ آمنت کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے۔ اس پر بڑی بے زینب سے پتے لگائے۔" "اس کا بھی ہو جائے گا۔ وہ اس تالاق سے زیادہ کچھ دار ہے۔ مجھے اس خاندان سے اس کی تباہی ہو گئی۔" "سہرا حال میں لے کر رکھا ہے آمنت کا بھی۔" پھر راجہ بی بی کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر بولے۔ "صوفی صاحب نے پتہ پور میں جو ماں بیٹا اگر وہ رہے ہیں تمہیں معلوم ہے اس کے بارے میں؟ بڑی بھلی عورت ہے۔ گھر سے چہرہ ڈھانپ کر پرہ کر کے نکلتی ہے۔" "کون۔ میں سمجھی نہیں؟"

"وہ ایک دو بار اپنے نواسے کے پکڑے بھی آمنت سے سلوانے کے لئے لائی ہے۔ مجھے حاجی صاحب نے اس کے بارے میں بتایا تھا۔ ویسے تو اس کا بیٹا بھی اچھا ہے۔ خوش شکل سے، تعلیم یافتہ، نوجوان ہے۔ محکمہ جنگلات میں ملازم ہے۔ میں اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں ویسے وہ عورت رشتے بھی گرواتی ہے۔ میں نے حاجی صاحب کے ہاتھ سے آمنت کے لیے کھلوایا ہے۔ اس نے بڑی امید لائی ہے۔ ہفت دس دن میں شاید وہ کسی اچھے نیک شریف خاندان کے لڑکے کا رشتہ لے کر آئے گی۔"

دوسرے کمرے میں بیٹھی آمنت اور زینب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ "مجھے یاد آیا کھٹوسلی بی بی نام ہے اس کا۔ اچھی عورت ہے۔ بی بی سے مجھ سے بھیارت کو بھی آئی تھی میری جھمکی۔"

اس نے تک اٹھا کر اہوں سے لگا لیا تیز گرم چائے نے اس کا منہ جلا ڈالا مگر اس نے سی بھی نہیں کی۔
 "میں رعنا حیات کا لیدر بس لے آئی تھی تاج۔" آمنہ چند لمحوں بعد بولی۔
 "کیا؟ کیا واقعی؟" زینب خوشی سے یوں اٹھتی جیسے اسے سیفی مل گیا ہو۔

"ہاں! اب کیا کرو گی؟" آمنہ اس کے پریشانی پر سے کو کچھ کر رہا تھا۔
 "نکل صبح دس بجے تک چلیں گے بابا صاحب کے اوپر آنے سے پہلے واپس آجائیں گے ٹھیک ہے نا۔ میں صبح تمہارے ساتھ ہی نکل جاؤں گی کہہ دینا اسکول میں کسی فنکشن کی تیاری ہو رہی ہے اس سلسلے میں مجھے بھی ساتھ لے کر جا رہی ہو۔"

زینب نے جلدی جلدی خود ہی سارا پلان تیار کر لیا۔

"میں۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گی؟" آمنہ حیرت سے بولی۔

"تو کیا میں اکیلی جاؤں گی۔ تم میرے ساتھ چلو گی۔" وہ دعب سے بولی تو آمنہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

اگلی صبح وہ آمنہ سے بھی پہلے تیار ہو چکی تھی۔

"آمنہ کے اسکول میں فنکشن ہے۔ اسی لیے تو یہ دیر سے جا رہی ہے میں بھی اس کے ساتھ جا رہی ہوں۔ گھر میں بیٹھ بیٹھ کر رو رہی ہوں۔"

جویریہ نے اس سے پوچھا بھی نہیں تھا وہ تو کل سے اس سے ناراض تھی اسے دیکھتے ہی منہ پھیر لیتی۔ زینب خود ہی وضاحت کرنے لگی جویریہ نے جواباً کچھ نہیں کہا تھا خوشی سے رتیں دھرتی رہی۔

وہ دونوں گھر سے ساڑھے نو بجے نکل گئیں۔ اس وقت صوفی صاحب کسی اور در سے میں بچوں کو قرآن پاک پڑھانے جاتے تھے۔

"زینب! موسم کے تیور بھی ٹھیک نہیں لگ رہے اور ہم اتنی دور جا رہے ہیں بالکل اجنبی راستوں پر۔ اب بھی آسمان پر بادلوں ہیں رات بھر بھی وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی تھی مجھے ہاتھ لگ رہا ہے۔"

"کچھ نہیں ہوتا اب گھر سے نکل پڑے ہیں واپس تو نہیں جاسکتے اور ویسے بھی ہمیں کون سا پیدل جانا ہے۔
 وہ لیکن میں بیٹھیں گے اور گھنٹہ ڈیرہ گھنٹہ تک بیٹھ بھی جائیں گے۔ امن میں ڈرنے کی کون سی بات ہے۔" آمنہ کو وہ آن پہلے والی زینب لگ رہی تھی تڑا اور پر جوش۔

دونوں بمشکل لیکن میں سوار ہوئیں۔ لیکن پہلے ہی مسافروں سے کچھ کچھ بھری ہوئی تھی انہیں بمشکل آخری سیٹ پر ڈرا سی جگہ ملی تھی دونوں تقریباً ایک دوسرے کی گود میں سوار ہو کر بیٹھی گئیں۔ آمنہ تو دل میں قرآنی آیات کا ورد کرنے لگی تھی۔ پاریا نقاب درست کرتی کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ جبکہ زینب تو کوشش سے بے خبر سیفی کی یادوں میں گم ہو چکی تھی۔ لیکن جگہ جگہ رکتی رہی بھانٹ بھانٹ کے مسافر چڑھتے اترتے۔

سکڑی کی یادوں میں گم ہو چکی تھی۔ لیکن جگہ جگہ رکتی رہی بھانٹ بھانٹ کے مسافر چڑھتے اترتے۔ زینب نے دونوں سے کڑی کٹھنی کو نے میں بیٹھی گئیں پہلی بار تو دونوں اس طرح گھر سے نکلے تھیں اگر کسی نے دیکھ لیا کوئی مل گیا تو۔

آمنہ بار بار خوفزدہ ہو کر زینب سے ان خدشوں کا اظہار کرتی رہی مگر زینب کو تو جیسے کسی بھی بات کا ڈر نہیں تھا۔ خدا خدا کر کے لیکن کا سفر تمام ہوا۔

رکتے نے انہیں "حیات والا" سے تھوڑا پہلے ہی اتار دیا تھا۔

"آپ کو کہاں جانا ہے؟" رکتے والے نے تیسری دفعہ پوچھا۔

"حیات والا بتایا تو ہے۔" زینب نے اونچی آواز میں جواب دیا تو رکتے والے نے گردن گھما کر دونوں کو کچھ عجیب نظروں سے دیکھا۔

"وہ سامنے جو سفید گیٹ والی بڑی سی کوٹھی نظر آ رہی ہے وہی "حیات والا" ہے۔ آپ چلی جائیے۔" اس نے رکتے کا سخن بند نہیں کیا تھا۔

"تو تم آگے لے جاؤ۔ پیسے بھی تو پورے لے رہے ہو۔" زینب اڑ کر بولی۔

"زینب! تیرا جادو ہمیں بھٹ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ دو قدم تو ہیں۔" آمنہ نے اس کا ہاتھ دیا اور کہتے ہوئے نیچے اتر گئی۔ رکتے والے کو پیسے دے کر دونوں کو ٹھنی کی طرف بڑھیں۔ آسمان پر بادلوں گہرے ہو چکے تھے۔
 دوپہر میں شام کا سماں لگ رہا تھا۔

"کتنی خوبصورت، کتنی بڑی کوٹھی ہے۔ بالکل بالکل۔" زینب سحر زدہ سی سر اٹھا کر کوٹھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"بالکل تمہارے خوابوں جیسی ہے نا؟" آمنہ طنزاً بولی۔

"جیسی بھی خواب ہے کچھ بھی تو ہو جاتے ہیں آمنہ! وہ اب بھی پر امید تھی جیسے گیٹ کھلتے ہی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔"

"یہ امکان سوچ صرف خوابوں میں رہنے والوں کی ہی ہو سکتی ہے ورنہ حقیقت بہت آفیلٹ ہو جاتی ہے اور پلیز تمہارا تیز پہلو ابھی ہمیں واپس بھی جانا ہے موسم کے تیور بھی ٹھیک نہیں لگ رہے۔" اس نے کہتے ہوئے قدم تیز کر لیے تھے۔

"وہ کتنی رعنا حیات صاحبہ کا ہی گھر ہے نا؟" کوٹھی کے قریب پہنچ کر اس نے گیٹ کی طرف سے آتے ہوئے ایک شخص سے پوچھا۔

"جی مگر آپ کون ہیں؟ وہ شخص دونوں کو عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔

"ہمیں سفیان صاحب سے ملنا ہے وہ اندر ہی ہیں نا۔" زینب جلدی سے بولی۔

"وہ تو۔" وہ آدمی کہتے کہتے رکا وہ ان دونوں کے پیچھے دیکھ رہا تھا۔ آمنہ نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں جلدی سے گردن موڑ کر دیکھا تو وہ دھک سے رز گئی۔ اس طرف تو دونوں کا وہ بیان ہی نہیں کیا تھا کوٹھی کے ارد گرد پولیس سٹیشن اور سڑک کے اوپر طرف بھی پولیس کی اچھی خاصی نفری موجود تھی۔

"ہاں پولیس کس لئے ہے؟" آمنہ نے گہرا کر پوچھا۔

"اب وہاں سفیان صاحب کو کسے جانا ہے؟" اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا آمنہ کے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔

"نہیں ہم تو نہیں جانتے۔ چلو زینب! آمنہ نے زینب کا ہاتھ نور سے پکڑا اور پیچھے مڑی۔

"کیا کرتی ہو۔ اندر تو جانے دو مجھے کتنی سے ملنا ہے۔" زینب اس کے یوں پلٹنے پر تھنبل گئی۔

"چلو تم۔" آمنہ نیچے آواز میں غرائی تو زینب چل پڑی۔

"کون ہیں یہ دونوں نقاب پوش لڑکیاں؟" اسے اپنے پیچھے سے آواز سنائی دی جو یقیناً کسی پولیس مین کی تھی۔

"بیتاب! وہ سیفی صاحب کو پوچھ رہی تھیں۔" اس آدمی نے جواب دیا۔

"کیا؟ رو کو ان کو۔ ارے جو حرام زاہد اپنے ماں باپ پر گولی چلا سکتا ہے اس کی تو ایسی بہت سی معشوقائیں ہوں گی۔ ان سے ہمیں اس کے بارے میں بہت سے کلید مل سکتے ہیں۔ پکڑو انہیں جانے نہ دینا۔"

اس کی تیز آواز پر آمنہ اور زینب کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔

"زینب دوڑو۔" آمنہ نے کہا اور دونوں تیزی سے بھاگنے لگیں انہیں اپنے پیچھے بھاری بوٹوں کے لہجے لہجے قریب آئے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔



"جی نہیں شہباز خان ہوں آپ کون؟" شہباز خان نے مڑ کر پکارنے والی اس خاتون کو دیکھا جو حیرت اور خوشی کے طے طے آثارات کے ساتھ انہیں دیکھ رہی تھی۔

"آپ نے مجھے نہیں پہچانا؟"

"مجھے افسوس ہے۔ میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولے۔
"نہت آپ کے ساتھ نہیں ڈے۔" اس نے ان کے پیچھے بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے کچھ بے تکلفی سے

کہا۔ "نہت نہیں۔" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیوں؟" وہ جبرن والے انداز میں بولی۔

"میں کام طلب تو محترم خالقون لڑائی ہوتا ہے۔" وہ کچھ تلخی سے بولے تو اس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار نمودار ہو گئے۔ "نہت پاکستان میں ہے میں ادھر آیا تھا تو ویسے میں کل واپس جا رہا ہوں پاکستان۔ آپ نے اپنا تعارف نہیں کروایا۔"

"سوری آپ کو برا لگا۔ اصل میں شہباز بھائی! آپ مجھ سے صرف ایک پارٹے تھے وہ بھی نہت کی سہیلی والے دن اور یہ بات یقیناً بہت پرانی ہے۔ میرا نام راجیلہ ہے میں نہت کی انکوئی ہسٹ فرینڈ ہوں۔ نہت کی سہیلی ہے؟" وہ بہت جلدی جلدی بول رہی تھی۔

"ٹھیک۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" وہ اس کے سوال کو ٹال گئے۔

"اس کے ساتھ جو کچھ اس کی بھالی ریشم نے کیا اس کی سزا تو قدرت کی طرف سے اس ظالم کورٹ کو مل ہی گئی۔ مگر مجھے بہت عرصے تک اس بات کا قلق رہا کہ میں مشکل پر نہت کی شہادت کی طرف سے مدد نہیں کر سکی۔ اصل میں میں بھی مجبور تھی اور اسی مجبوری میں میں نے اسے لاہور کے لیے کوچ میں بٹھایا اور بعد میں اس کا پتا بھی نہیں کر سکی کہ آیا وہ صحیح جگہ پہنچ گئی ہے یا نہیں۔ مگر میں نے اس کے لیے بہت دعا کی تھی اور مجھے یقین تھا آپ اور اس کی پچھو جس قدر اچھے اور اس پر مہیاں ہیں۔ اس سے محبت کرتے ہیں" آپ نے یقیناً کھلے دل سے اس کی ناکرہ خطا کو نظر انداز کر دیا ہو گا اور۔"

"کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ ہم نہیں بیٹھ کر باتیں کر لیں۔" شہباز خان کو اسے تو بتا دیا۔

"اے سوری۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا۔" وہ ایک بار پھر شرمندہ ہو گئی۔ "ویسے اس وقت نہیں۔ میرے سینٹر باہر گاڑی میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ میرا ایڈریس رکھیں۔ آپ کل شام کو مجھ سے ملنے آسکتے ہیں۔" اس نے اپنے پرس سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر انہیں دکھایا۔

"سوری کل شام کو تو میری فلائٹ ہے واپسی کی۔" انہوں نے کارڈ پر سرسری ہی نظر ڈالتے ہوئے بتایا۔

"اورد! وہ جیسے سوچ میں پڑ گئی" اصل میں مجھے آپ سے کئی کو ملوانا تھا۔ بہت ضروری۔ نہت ہوتی تو زیادہ اچھا تھا۔ بہ حال۔" وہ بولی۔

"کل کس وقت آپ میری طرف آسکتے ہیں؟" اس نے چند لمحوں بعد پوچھا۔

"آپ کو کچھ کہنا ہے تو ابھی کہہ ڈالیں یا میں گھر جا کر آپ کو موبائل پر رٹک کر لیتا ہوں۔"

"نہت یہ بات نہیں۔ مجھے آپ سے کسی کو ملوانا ہے۔ بہت ضروری۔" وہ جلدی سے بولی۔

"اوکے۔ میں کل صبح نو بجے آپ سے ملنے آ جاؤں گا۔" وہ جان چھڑانے کو بولے۔

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کا ویٹ کروں گی۔ شہباز بھائی! آپ کا اس شخص سے ملنا بہت ضروری ہے۔ آپ کے لیے شاید نہ ہو مگر اس کے لیے یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ آپ سمجھتے ہیں نا؟" وہ آہستگی سے بولی تو انہوں نے سر ہلادیا چند لمحوں بعد وہ انہیں اللہ حافظ کہہ کر چاٹ گئی۔

"آخر ایسا کون سا شخص ہے، وہ مجھ سے ملنے کے لیے مرا جا رہا ہے۔" وہ سوچتے ہوئے اپنا سامان لے کر شاپنگ سینٹر سے باہر نکلتے۔

ایک نئی انجمن۔ "وہ سوچوں میں کب سے رہے گا؟" اس کی طرف بڑھے۔

"زینب! تیرا بھانجرا۔" آمنہ نے اس کا ہاتھ خوب مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ تیز و ڈرتے ہوئے پھولے سانپوں کے درمیان وہ بولی۔ دونوں نے اندھا دھند بھاگتے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے سڑک سنان تھی بھاگتے بھاری قدموں کی آواز تو آ رہی تھی مگر کچھلے موڑ سے۔ دائیں طرف ایک خوبصورت گھسی ٹائٹ انہیں کھلا نظر آیا۔

"ابھی اس کو ٹھی میں نہ چھپ جائیں۔" آمنہ نے جلدی سے کہا۔

"وہ آرہے ہیں پکڑ لیں گے۔" زینب سخت خوف زدہ ہو رہی تھی۔ چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

"بہم بہت زیادہ نہیں بھاگ سکتے اور آگے اور تک کوئی موڑ بھی نظر نہیں آ رہا۔ چلو۔"

آمنہ نے کہا اور اس کا ہاتھ اسی طرف پکڑنے کھلے گیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔ گیٹ کے دونوں اطراف کے وسیع برے بھرے لان ویران پڑے تھے۔ سامنے کوٹھی کی عمارت کے دونوںوں میں بھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ آمنہ نے جلدی سے سڑک گیٹ بند کر کے اس کا لاک لگا دیا۔ زینب تو اب باقاعدہ کانپ رہی تھی دونوں ڈرتے ڈرتے اندر کی طرف بڑھیں۔

"دیکھو ان دونوں کو ادھر ہی ہوں گی۔ کسی کو ٹھی میں میں نہ گھس گئی ہوں۔" باہر سے انہیں بلند آواز آتی تھی۔ دونوں نے دوڑ کر سامنے نظر آتا ہوا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو لیں۔

"اے ہون ہو تم دونوں؟" باہر دوڑتی سے اندر آئی تھیں۔ فوری طور پر چھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یا میں طرف سے آنے والی کڑک دار آواز پر دونوں اچھل پڑیں۔ سر کھما کر آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگیں۔

"کون ہو دونوں چورتیاں؟" آواز لگنے آئی تو "ملازموں جیسے علیے گا درمیانی عمر کا ٹھی سا شخص کھڑا انہیں گھور رہا تھا۔ زینب تھوڑا سا آمنہ کے پیچھے ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس پر خوف سے لرزہ سا طاری تھا۔ ساری ہمدردی ہوا ہو چکی تھی۔

لوہا تیریں میں کوئی بھلا؟

وہ پھر گر جائے بلے سلمے جسم میں بلا کا اسٹیکر فٹ ہے۔" آمنہ نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے سوچا۔

"تیز سے بات کرو، ہم تمہارے صاحب سے ملنے آئے ہیں ان کی کزن ہیں۔ انہیں اطلاع کرو جا کر۔" آمنہ اس سے زیادہ بارعب اور بلند آواز میں بولی۔

"صاحب کی کزن ہیں۔" وہ کچھ گڑبڑایا پھر مشکوک نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

"کون سی کزن ہیں؟" سب کے اس کا لہجہ کچھ بہت سا تھا۔

"صاحب کے رشتہ داروں کا حساب کتاب کیا تمہارے پاس ہے جو تمہاری کچھ میں آئے گی۔ جاؤ جا کر اطلاع دو ان کے بھائی بیٹیاں۔" شو پورہ سے آئی ہیں۔" جلدی میں آمنہ کے منہ سے یہی کچھ نکل گیا تھا۔ وہ مشکوک نظروں سے ملنے تو انہیں کھڑا گھور رہا پھر باہل خواست چل ہی پڑا۔

"دونوں یہاں سے ہلنا تمہیں میں اطلاع کر کے آتا ہوں۔ بیٹھ جاؤ دونوں۔" وہ جاتے جاتے انہیں تنبیہ کر کے بولا تو آمنہ نے زینب کو دو قدم پر بڑے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔" زینب ادھر ادھر دیکھتے ہوئے چھنی ہوئی آواز میں بولی۔

"اب تو جو بھی مصیبت آئے گی وہ تمہاری ہی ہلاکتی ہوئی ہے۔" آمنہ سچ کر بولی۔

"صاحب جی! ملازم نے عبدالحسین کے کمرے کا بند دروازہ ہولے سے بجایا۔

"کیا تکلیف ہے؟" وہ اندر سے چلا آیا۔

"نہی وہ آپ کی کوئی مہمان آئی ہیں۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کمرے کے دروازے سے ڈرا سا اندر ہو کر کہا۔ عبدالحسین اپنے بند پر بیٹھا تھا بائیں بازو کی آستین فولڈ کیے سرخ میں کوئی دوائی بھر کر وہیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی۔ وہ ملازم کو کھانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔

"لوئی سی مہمان میں نے تم سے جو اس کی تھی کہ تم نے مجھے بالکل ڈسٹرب نہ کرنا۔" وہ اب آنکھیں بند کیے سرخ کی سوئی بائیں بازو کے گوشت میں گھونپے پچھ آہستگی سے بولا۔ ملازم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے مالک کو دیکھ رہا تھا۔

"صاحب سہی۔ یہ۔ یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔" وہ پھر ڈرتے ڈرتے بولا۔
"تمہیں اس سے مطلب اور دفع ہو جاؤ جو بھی ہے کہ وہ مجھے اس وقت کسی سے نہیں ملنا شام کو آئے۔" اس نے خالی سرخ کھینچ کر باہر نکالی۔ سوئی والی جگہ کو ہاتھ سے ہلکا سا مسلایا۔ سرخ نیلے کے پاس پڑی باسکٹ میں بیٹلی اور خود نکلیں پھیلا کر بیڈ کے کراؤن سے سر نکالتے ہوئے بولا۔

"وہ جی کہ رہی ہیں آپ کے بچا کی بیٹیاں ہیں۔ ش۔ شیخوپورہ سے آئی ہیں۔" وہ پھر بھی نہیں ٹلا۔ اسے ادھر ملازمت کرتے ابھی ایک ماہ ہوا تھا صاحب کی ہر قسم کے نشے کے استعمال کی کھلی ڈلی عادت کے بارے میں تو اس نے آتے ہی باقی ملازمین سے سن لیا تھا مگر ملاحظہ کرنے کا حسین اتفاق آج ہوا تھا۔ اس کے لیے تو سارا منظر ہی انوکھا تھا۔

"اوسے گدھے" انوکھا لہجہ اذوق ہوتا ہے کہ نہیں۔ نہ میرا کوئی باپ نہ بچا نہ تاپا تو ان کی بیٹیاں کہاں سے آگ آئیں۔ جا میرا دلخ نہ خراب کر۔ مجھے سکون لینے دے تین چار گھنٹے۔ رات کو پھر میرا شو ہے مجھے کچھ ریسٹ کر لینے دو۔ اب کوئی میرے کمرے میں نہ آئے ورنہ میں اس کا سر بھاڑ دوں گا۔ تجھے۔" اس نے واقعی سر پھاڑنے کے لیے کسی چیز کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں گھمایں تو ملازمین کے لئے دروازہ بند کر کے دوڑ گیا۔

"پاکل کا پتر میرے چاچے کی بیٹیاں شیخوپورہ سے۔" وہ سر تکیے پر گالتے ہوئے بڑبڑایا۔ "شیخوپورہ سے۔" غیہ میں ڈونڈا اس کا ذہن ایک لمحے کو ٹھنکا۔ وہ کتنے دنوں سے میں نے گھر چتا نہیں کیا، نہیں کوئی۔ اس سے زیادہ اس کا شیشی شینڈلی واڈی میں اترتا نہیں کچھ سوئے نہ دے رہا تھا۔
"شہزادہ کے واقعے نے ہر چیز ہر منظر گم۔ گم۔ کھو گیا ہے۔" اس کے بیڑے گھومتے ہوئے وہ گھر کی نیر سوچ کا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے زینب! بغیر بت نکل آئے۔" دونوں دیگن کی سیٹ پر بیٹھیں تو آمنہ نے اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے کہا۔

"ہوں!" زینب نے دھیرے سے کہا۔ دیگن چل پڑی تھی۔ کچھ کھینچ بھری دیگن میں لوگ مرغوں کی طرح سر نہیوڑے کھڑے بیٹھے تھے۔ باہر سڑکوں پر بھی سر نہی سڑکوں پر تھے۔ انہوں نے تو اس کی خلوت بھی پہلی بار دیکھی تھی۔ شام ہونے کو تھی اور بادل برسنے کو تیار ہر کسی کو اپنے ٹھکانے پر جلد پہنچ جانے کی گئی تھی کسی لیے ٹریفک کارش بھی بڑھ گیا تھا۔

"زینبی! مجھے وہاں اس شاندار کو تھی میں بیٹھے ایک عجیب سا خیال آیا تھا۔" آمنہ پھر بولی۔ زینب نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"یہاں دونوں بھائی شہر میں ہیں اور سنا ہے دونوں ہی بڑی شاندار کوچیوں میں رہ رہے ہیں۔ کیا پتا ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم جس کو تھی میں بنا لینے کے لیے چھپی تھیں وہ عبدالمتین کی ہو یا۔ عبدالعین کی۔ ہے نا۔ ہو سکتا ہے نا۔" آمنہ نے حسرت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے زینب کی طرف دیکھا۔
"پتا نہیں۔" زینب نے رکھالی سے کہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"ہاں واقعی پتا نہیں۔ ایسے بھی بھائی ہوتے ہیں۔ بے جس بے خبر ہے پتا۔"
آمنہ نے سیٹ کی پشت سے سر نکالیا۔ دیگن کی کھڑکی کے بیٹھے پریالی کی دو تین بوئیں پھیلیں۔
"دیکھ لیا پتا چل گیا کتنا غیبت لگا وہ تمہارا شیخی۔ جو شخص اسے ماں باپ سے دفا نہیں کرے گا ان پر بددوق تان سکتا ہے وہ تمہارے ساتھ سوچو۔" کیا سلوک کرنا اور تمہاری گلوں کی طرح اس کی تلاش میں کہاں تک نکل

آئیں۔ ہمارے گھر تو اخبار بھی نہیں آتا ورنہ اس غیبت کا کچھ پٹھا تو پہلے ہی معلوم ہو جاتا۔ ہم اس طرح گھر سے ہی نہ نکلتیں۔ زینب! اگر ہم دونوں خدا نخواست بکڑی جاتیں، جس میں کچھ کسر بھی نہیں رہ گئی تھی تو سوچو ہمارا کیا حال ہوتا۔"

"تم نے آج صوبانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اب دعا کرو گھر۔ بابا صاحب نہ ہوں اور اللہ کرے بارش بھی تیز نہ ہو ورنہ آج سے برا دن بھی ہماری زندگی میں کبھی نہیں آئے گا۔" آمنہ پھر بولی۔
زینب نے پھر کچھ جواب نہیں دیا۔ اس پر تو جیسے موت کے گہرے سناٹے چھارے تھے۔

"آخر آپ مجھے کہاں لے کر جانا چاہتی ہیں۔" شہباز خان نے راحیلہ سے اس سفر کے دوران تیسری بار پوچھا تھا وہ بڑی مہارت سے ڈرائیو کر رہی تھی۔ چند گھنٹوں کی خاموشی کے بعد گاڑی ایک بڑی سی بلڈنگ کے گیٹ کے اندر داخل ہو رہی تھی۔

"مجھے آگنی ہماری منزل۔" اس نے گاڑی پارکنگ ایریا میں کھڑکی کی۔ شہباز خان نے سر اٹھا کر بلڈنگ کا سرٹیم پڑھا۔ "ایڈز سٹریٹ" بہت بڑا بڑا لکھا تھا ان کی ابجمن اور سوا ہو گئی۔
"ہماری منزل۔" وہ بولے۔

"آئیے پلیز۔" وہ ان سے وہ قدم آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ مختلف دروازوں اور برآمدوں سے گزرتے ہوئے دونوں سفید دروازوں کی ایک قطار کی طرف بڑھے۔

"آپ نے چند سال پہلے اخباروں میں اس قتل کی خبر کے بارے میں شاید پڑھا ہو گا جس میں سیمل نامی ایک شخص نے اپنی اویاش بیوی ریتم کو اس کے آنتنا کے ہمراہ نازیباحالت میں دیکھ کر گولی مار دی تھی اور خود ہی دن ملک قرار ہو گیا تھا۔" ایک سفید دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر راحیلہ نے میکانکی انداز میں بتایا۔
"کیا؟" شہباز خان کے حلق سے اٹکی سی چیخ نکلی تھی۔

اس برآمدے میں داخل ہوئے ہی دونوں نے لکھی ہوئی یہ آیات کے مطابق اپنے جوتے پہلے ہی اتار دیے تھے اور وہاں سٹیا کر وہ سلپر زپین لیے تھے۔ راحیلہ نے ایک کمراسٹاں لیتے ہوئے ہولے سے دروازہ بجایا۔
"طیس!" چند گھنٹوں بعد بہت مدھم آواز آئی تھی۔ دونوں آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ چھوٹا سا مربع شکل کا کمرہ تھا جیسا باہر سے لگتا تھا۔ سینٹر میں ایک بیڈ لگا تھا۔ بیڈ کے دونوں اطراف دو انیوں کے ریک رکھے تھے۔ کمرے میں بیٹھے کے لیے کوئی کرسی وغیرہ بھی نہیں پڑی تھی۔ سامنے کی کھڑکی میں لگا سفید جالی کا مہین پر وہ کھلی کھڑکی سے آئی نرم ہوا کے جھونکوں سے سر سر رہا تھا۔ شہباز خان کی نظریں کھڑکی سے ہوتی ہوئی سیدھی بیڈ پر لگ رہی تھیں۔ بیڈ پر ایک نیم مرہ پڑیوں کا ڈھانچہ پڑا تھا۔ پہلی نظر میں وہ شہباز خان کو کوئی مرہ ہی لگا تھا۔ راحیلہ دو قدم بڑھا کر بیڈ کے پاس جا پہنچی تھی۔ شہباز خان نے آہستگی سے ایک قدم بڑھایا۔

"السلام علیکم سیمل بھائی! میں راحیلہ ہوں نرس کی دوست۔ آپ سے پہلے بھی ملنے آئی تھی آپ کو یاد ہے وہ ذرا سا جھک کر نرمی سے کہہ رہی تھی۔ شہباز خان کو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا تھا وہ تیزی سے آگے بڑھے اور بغور دیکھنے پر بھی انہیں فوری طور پر محسوس نہیں ہوا رہا تھا کہ یہ سیمل ہے۔ اس کی آنکھوں کی جگہ وہ اندھے گڑھے نظر آ رہے تھے جنہیں دیکھ کر بہت خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا چہرہ ہی نہیں گردن اور دونوں استخوانی ہاتھ بھی بالکل سیاہ نیالی رنگت کے ہو رہے تھے۔ راحیلہ کی بات کے جواب میں اس نے کچھ کہا نہیں بس آہستگی سے سر ہلایا تھا۔

"سیمل بھائی! ان کو بچانا آپ نے؟"
وہ مڑ کر شہباز کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ سیمل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں بھی شہباز کو نہیں لگ رہا تھا ان اندھے گڑھوں میں نور کی کوئی بھی کرن نہ پئی ہوگی۔

”شہباز خان سے ہے نا؟“ چند لمحوں کی مہیب خاموشی کے بعد سہیل کی بے حد نجف کمزور آواز جیسے کسی غالی برتن سے برآمد ہوئی تھی۔ شہباز خان حیرت سے آگے بڑھے۔

”سہیل۔ سہیل۔ تم یہاں کیسے؟“ وہ اس پر ڈراما جھک کر بولے۔ سہیل نے بد وقت تمام اپنا استخوانی ہاتھ اٹھایا اور اس کی شہادت کی انگلی سے اوپر بھت کی طرف اشارہ کیا۔

”جو لوگ۔ اللہ کی زمین پر بہت اگڑا کر۔ کہ جلتے ہیں ان کا حال میرے۔ میرے جیسا ہوتا ہے اور۔ میری موت کا فرشتہ تو یہاں موجود تھا۔ اس لیے مجھے نہیں اتنا پرا اپنی خوف ناک موت کو گلے لگانے۔“ وہ بولتے بولتے ہانسنے لگا۔

”شہباز بھائی! اگر آپ ان کی چادر گروں سے نیچے ہٹا کر دیکھیں تو شاید آپ جینیں مارتے اور ہر سے بھاگ جائیں۔ بہت اذیت بہت تکلیف میں ہیں یہ۔ میں ادھر اپنے ایک سسرالی عزیز کو دیکھنے آئی تھی تو انہیں باہر لان میں نرس کے ہمراہ دیکھا۔ میں تو شاید انہیں نہ پہچانتی انہوں نے مجھے پہچان لیا اور آپ سے اور بہت سے ملنے کی التجا کی تھی۔ نرس تو مجھے نہ مل سکی میرا اس سے رابطہ بھی نہیں تھا پاکستان ابھی میرا جانا ممکن نہیں تھا۔ شکر ہے آپ مل گئے ہو سکتے۔ آپ سے ملنے کے بعد ان کو جان کنی کے اس عذاب سے نجات مل گئی۔“

راجیل بہت آہستگی سے انہیں تفصیل سے آگاہ کر رہی تھی۔

”شہباز! تم بہت۔ کئی ہو۔ زمین پر ہی تمہیں۔ جنت۔ جنت کا تھکا۔ ایک بار کہا کیزہ ہوئی۔“ سہیل اٹک اٹک کر بولا۔ ”اور میں بہت بد نصیب۔ میں نے اپنی معصوم بے حیا بہن پر اس۔ اس بازاری عورت کے کہنے میں آگے اسے گندے الزامات کی دلدل میں دھکیل دیا۔“

بولتے بولتے اس کی آواز ڈوب گئی۔ کتنے لمحے اس کے بعد بے جان خاموشی کی نذر ہو گئے۔ سہیل کی سانسیوں کا زور و مہمتا رہا تھا وہ اگلے جملوں کے لیے اپنے ناتواں جسم کی تمام توانیاں جمع کر رہا ہے۔ وہ روٹی رہی ہیبت سے سر ٹکراتی رہی۔ اپنی تکی پائیز کی۔ کی کوالی دیتی رہی اور اس میں پتھر سنگل چٹان بنا اس خوبصورت بلا کی مکالموں کے جال میں پھنسا اسے ٹھوکریں ملتا مارتا۔ ”وہ اب شاید رو رہا تھا۔ اس کے گلے سے عجیب خرخر کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ سفید چادر اس کے نجف جسم کے جھٹکوں سے ہولے ہولے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔

”نرس تو شاید مجھے معاف کر دیتی مگر اللہ کا انصاف۔ زندگی کا قانون۔ کافیات۔ میں کہاں تک بھاگ سکتا تھا۔“

”میں اس حسین چمکتی صورت کے حسن پر مر مٹا اور اپنے شریف ماں باپ کی عزت کی بے ادب شاخ کو روندنا اسے سزا بٹھا لیا۔ اپنی۔ اپنی اس اذیت ناک موت کا پروانہ ہاتھ میں لیے۔ میں تین ماہ کے کورس پر چھ مہینے آ رہا تھا۔ فلائٹ و حند کی وجہ سے وہ کھٹے لیٹ ہو گئی اور میرا ایک۔ ضروری بیبر گھر رہ گیا تھا میں لینے۔ لوٹا۔ وہ ذلیل عورت اپنے کسی نئے شکار کو میری معصوم بہن کے اس کے دھوکے میں آجانے کی ساری کمائی تھمتے گا لگا کر اور میری زان مریدی اندھے بن کو خوب ہنس ہنس کر۔ بیان۔ کہ رہی تھی۔ اس کا پار مجھے دیکھ کر بھاگ نکلا اور وہ۔ میری گولی سے نہ بچ سکی۔ میں اس کے تپاک مرہوہ جسم کو ہاتھ روم میں بند کر کے گھر کو لاک کر کے ایروپورٹ۔ مجھے کیا معلوم تھا میری سزا تو ادھر شروع ہوگی۔ قانون کی سزا سے میں بچ گیا۔ اللہ سے کیسے۔“ وہ اب سردائیں پائیں مار رہا تھا۔

”گھر کے گانڈ میں نے نرس کے نام کر دیے ہیں۔ ڈاکٹر رابرٹ کے پاس لمانت۔ شہباز! جانتے ہوئے وہ ضرور لے جاتا۔“

”نرس بہت سے کہنا مجھے معاف۔ معاف۔ معاف۔ میرے اللہ۔ معافی۔“ اس کی سانسیں بری طرح سے اکٹرنے لگی تھیں۔

”وہ کس قدر جاہل ہیں آپ لوگ۔ کیا اسے فرشتوں کے حوالے کر کے جائیں گے جاؤ اور ہر سے۔“ سفید اور لب میں ملبوس مولی خراش پھرے والی نرس دوڑتی دوڑتی آئی تھی اور روال جرمن میں انہیں لٹاڑتے ہوئے باہر پھیلنے لگی۔

”اللہ حافظ سہیل۔ اللہ تمہاری مشکل آسان کرے اور۔“ شہباز خان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے سہیل کے ڈیوں بھرے چہرے کو ڈراما چھو اور دونوں باہر کی طرف بڑھے آئے۔

”شہباز! نرس کی امانت۔ لے جاؤ۔ ڈاکٹر رابرٹ۔“ وہ پوری قوت سے چلا آیا تھا۔ نرس نے پیچھے سے زور سے دروازہ بند کر لیا۔

راجیل بری طرح سے رو رہی تھی۔ شہباز خان سے اپنے آنسو ضبط کرنا محال ہو رہے تھے۔ اور جب ان کا جنازہ پاکستان کے لیے ٹیک آف کر رہا تھا تو ان پر لندرن کی دنیا کے بہت سے راز منکشف ہو رہے تھے۔

”جو سہیل سے سرزد ہوا وہی تو میں نے کیا اور مسلسل کرتا چلا آ رہا ہوں۔ اس کی معصومیت کو مسلسل نشانہ بناتے ہوئے اس کے گناہ کے گناہ گناہ کو اشتہار بناتے ہوئے اسے مسلسل ذلیل کرتا رہا۔ یہ دنیا مکافات عمل ہے۔ اگر میرا دل اللہ کے لیے تو شاید چند سال بعد میں بھی سہیل کی جگہ۔“

سیٹ پیٹ باندھتے ہوئے انہیں اپنے اختیار چھری سی آگئی۔

”بے گناہ معصوم باکرہ عورت پر بنا جھوٹ کے بہتان باندھنا اللہ کے نزدیک کس قدر ناپسندیدہ ہے کہ وہ اس ناراضی کے اظہار کے لیے آسمان سے اپنا عذاب بھی نازل کر سکتا ہے اور ایسے بہتان باندھنے والوں کی سزا۔ کیا وہ مرتے دم تک سہیل کی حالت کو بھول پڑیں گے۔“

”میں نہیں۔“

”میں نرس کے کہوں اور سہیل کے لیے بہت دعا کرے اس کی دعاؤں میں یقیناً بہت اثر ہے۔ اللہ اس کے لیے آسانی فرمائے گا۔ دیار غیر میں اس طرح کی موت۔ دنیا میں ہی اتنی بڑی سزا مل گئی۔ اللہ تعالیٰ اس کی آخرت سہل کرے۔“ دل کا جام۔ نرس کی محبت کے لبالب بھر گیا تھا۔

”کیا میں نرس کو سہیل کے بارے میں بتاؤں گا۔“

”گھر سے تیار ہو کر کتنے چلے ہو۔ نالے گلے کئے ہو۔“

”نرس نے کہا۔“ اور نیا اور نیا سربلی آواز میں گائی لاؤنچ میں داخل ہوئی تھی۔ زیور گل جو ہمیں جاننے کے لیے تیار تھا۔ سہیل سے تیار نہیں تھی۔ نرس کی آواز گنگناہٹ پر ماتھے پر مل ڈال کر اسے دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے بہت خوش اور یہ تم صبح سے عتاب کدھر تھیں؟“ زیور گل نے اپنی دھالی سلی ساڑھی کا پلو اپنے عریاں کندھوں پر نراکت سے جھاتے ہوئے پوچھا۔

”خوش تو ہاں میں بہت ہوں بہت زیادہ۔“ وہ اس کے بازو سے ڈراما لٹک کر بولی۔

”ہاں وہی تو پوچھ رہی ہوں اور جلدی کرو مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

”آپ کو کہاں جانا ہے؟“

”آج مولی کا شو ہے بہت زبردست۔ بہت بڑے پیمانے پر۔ غسٹریٹ کے گیٹ انوائٹ ہیں۔ وہ مجھے شو میں اپنی گاڈ فادر کے طور پر انٹرویو س کروائے گا۔“ زیور گل نے آکڑی ہوئی گردن کو مزید اگڑا کر کہا۔

”زبردست۔ آج کل تو ہاں ہر طرف مولی سوئنگ کا کریر ہو رہا ہے۔ اس سبب شلی بنگ جنریشن میں بہت اونچی گڈی اڑ رہی ہے اس کی۔ ویسے ماں اب یہ مولی بڑا محسن ٹائپ بندہ نکلا ہے۔ اس سے ڈراما سی ٹکی آپ نے فرمائی یہ گلے پڑ گیا۔“

"دل کا بہت اچھا ہے، بس دنیا اچھے دل والوں کی قدر نہیں کرتی ہے۔ دیکھتی ہوں تو بے اختیار خیال آتا ہے۔ کاش ہم نے شاہجی والی حماقت نہ کی ہوتی یا پھر اس سے اب تک ٹھوٹا خاصا کر لی ہوتی تو۔"

"پلیز نام ایہ دیکھیں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا کانڈر کھول کر اس کے چہرے کے پاس کیا۔

زیور گل ماتھے پر تل ڈال کر کانڈر لکھی تحریر پڑھنے لگی۔ جوں جوں اس کی نظریں سطروں پر پھسلتی گئیں اس کے ماتھے کے تل گرے ہوتے چلے گئے۔

"یہ کیا لکھا اس ہے تم پھر یہ تماقت کرنے چلی ہو۔ پچھلی دفعہ کا انجام بھول گئی ہو۔" زیور گل پھٹ پڑی تھی۔

"نام ڈونٹ شاؤٹ۔" اس نے چہرہ جھکا کر کانڈر تہہ کیا۔ "یہ میرے دل کی سب سے بڑی خوشی ہے میں شاہجی کے بچنے کی ماں ہوں، میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش۔" وہ رک رک کر بولی تھی۔

"نہیں تارا، زیور گل نے اسے پھینکارنے کو ہاتھ اٹھایا جسے نہیں تارائے رستے ہی میں تھام لیا۔

"نام! آپ کو اس کا کوئی حق نہیں۔" وہ سرد لہجے میں غرائی۔

"ماں بننے کا برا شوق ہے پہلے ماں کے حقوق تو جان لو۔" وہ طنز سے بولی۔

"ماں کے حقوق پہنچاتی ہوں تو اب تک بلا چون و چرا آپ کی ہر بات ماننی آتی ہوں، مگر اب سے دل کی یہ اکلوتی خوشی بنو میں نے وہ ساری بار بہت مشکل سے حاصل کی ہے۔ اب اسے کسی کے بھی لٹنے پر برباد نہیں ہونے دوں گی۔ نہ ماں کے کہنے پر نہ شاہجی کے کہنے پر اور نہ کسی اور کے کہنے پر۔ ایڈوائسینڈ۔" وہ تکتی ہوئی بھاگ گئی اور اپنے کمرے میں کھس کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

"نہیں تارا! چلو شو میں نہیں جانا۔ موبلی کے تین فون آچکے ہیں۔ تم نے اپنا موبائل بھی آف کر رکھا ہے۔" تھوڑی دیر بعد زیور گل دروازہ دھڑو دھڑاتے ہوئے کمرہ ہی گئی۔

"نام! آئندہ کے سات ماہ میں بغیر کسی انتہائی ضرورت کے میں نہ تو گل کمرے سے باہر جاؤں گی نہ کسی اور سے غیرے سے موبلی اور ایسی مخلوط مخلوطوں میں تو پائل بھی نہیں۔ مجھے شاہجی کی نسل کو ایسی مخلوطوں کے ہر گز سے سائے سے بچا کر اپنی کوکھ میں پالنا ہے۔ آپ جانیے میں موبلی سے خود معذرت کر لوں گی۔" وہ دروازہ کھولے بغیر مزے سے بولی تھی۔ باہر کھڑی زیور گل کو گویا آگ ہی لگ گئی۔

"نیا فتور اٹھا ہے تمہارے دل غ میں۔ تم چاہے سات ہزار پردوں میں بچ کر بھی اس جاگیر واد کی نسل کی افزائش کرو، وہ پھر بھی صرف تمہارا پتہ کھلائے گا۔ سلطان بخت اسے کبھی بھی تسلیم نہیں کرے گا۔ چاہو تو میری اس بات کو حرف بحرف لکھ لو۔ احق ہے و قوف لڑکی!"

"ہونہ۔ ایسا ہانکا سمجھ رکھا ہے مجھے۔ شاہجی جان بچھا اور کرتے ہیں مجھ پر۔ نام! تمہیں کیا خبر ہے کچھ میں نے ان سے باقاعدہ اجازت لے کر ان کی خوشی سے یہ خوشی اور حسی ہے۔ اب بھلا وہ اس کو تسلیم نہ کریں گے۔ ہونہ! احق میں نہیں بھولی میری ماں ہے۔" کہتے ہوئے وہ فون اٹھا کر سلطان بخت کو فون کرنے کی۔ تیسری زانی میں کال مل ہی گئی۔

"شاہجی ایسے ہیں آپ؟" ان کی آواز سنتے ہی اس کی خوشی جیسے دوبالا ہو گئی تھی۔ "خوشخبری! پھپھانا محال لگتے لگا تھا۔"

"ٹھیک ہوں۔ آواز بہت مدھم آ رہی تھی۔"

"کب آ رہے ہیں۔"

"ابھی نہیں۔"

"کیوں چیک اپ نہیں ہوا؟"

"ہو گیا ہے؟" آواز اور بھی کم ہو گئی تھی۔

"پھر؟"

"بائی پاس ہو گا۔" اس نے بے مشکل سنا۔

"کیا۔ مانی گاڈ۔" وہ چلائی۔ "میں آپ کے پاس آنا چاہتی ہوں پلیز۔"

"نہیں۔ سیدہ آیا آ رہی ہیں اگلے پھٹے تک۔" اسی وقت میں تارائے دوسری طرف ایک مترنم ہنسی کی جھنکار سنی۔

"آپ کے پاس کون ہے؟" وہ جلدی سے بولی۔

"تم ہو میری جان۔" وہ گنہگار آواز میں بولے۔ لائن اب کچھ صاف ہو گئی تھی۔

"شاہجی اکلے۔" دوسری طرف ہلکی سی نسوانی آواز ابھری تھی۔

"نہیں تارا کی ساری حیات جاگ انھیں۔"

"شاہجی! آپ سے کون بات کر رہا ہے۔"

"تھمرا بھائی۔" کہہ جو رہا ہوں، تم ہومالی سوٹ ہارٹ۔" وہ کچھ جھلا کر بولے تھے۔

"شاہجی! مجھے آپ کو ایک خوش خبری سنانا ہے۔" اس کی نظریں سائڈ ٹیبل پر پڑے کانڈر پر پھسلیں۔

"کہو۔" لائن پھر خراب ہو رہی تھی۔

"نہیں۔ آپ آئیں گے تو آپ کو خوش خبری آئے۔ دکھاؤں گی۔" وہ ہنس کر بولی۔

"اوکے میں تمہیں کل فون کر لوں گا۔" انہوں نے شاید اس کا جملہ سنا ہی نہیں تھا۔

"کیا صاف شاہجی آ رہی ہے؟" وہ رہ نہ سکی پوچھ بیٹھی۔

"مجھے بائی پاس کرانا ہے اپنا ہارٹ ٹیل نہیں۔ اوکے۔ اللہ حافظ۔" وہ جلدی میں تھے شاید۔ لائن بے جان ہو گئی۔

سزا جانا اور اتنی تو ابھی تک نہیں آیا۔" وہ ہاسپٹل سے جیسے ہی گھر میں داخل ہوا، زنتون بانو نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اسی کے اسکول سے آ رہا ہوں، وہ اپنے دوست فمد کے ساتھ چلا گیا ہے اور فمد کے گھر کا مجھے علم نہیں۔"

ایڈریس لینے گیا تو آفس بند ہو چکا تھا۔ اوپر سے ام جان کی حالت اچھی نہیں۔ میں ہاسپٹل میں انہیں اسی حالت میں چھوڑ کر ارٹھنی کو لینے گیا تھا۔" وہ پریشانی سے صوفے پر اپنا سر تھام کر بیٹھ گیا۔

"بیگم صاحب کی طبیعت ابھی سنبھلتی نہیں؟" زنتون بانو بھی پریشان تھی۔ مسز خان گزشتہ تین دن سے پروفیسر داؤد کے کلینک میں ایڈمٹ تھیں۔ تین دن پہلے اچانک ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔

"کلینک ختم کو تو کچھ بہتر ہو گئی تھیں مگر صبح سے پھر خراب ہے۔ بہت محسوس کر رہی ہیں شہباز بھائی کی لگی۔ بار بار مجھ سے پوچھتی ہیں۔ کوئی فون تو نہیں آیا۔ گھر فون کر کے پوچھو شاید کوئی فون آیا ہو۔ مجھے امید تو تھی کہ وہ آجائے گا۔ کچھ ایجنٹیکشن ہے کچھ بیماری کی انتہا پھر بھی ام جان کی بڑی ہمت ہے۔ اوپر سے اس بد تمیز نے تنگ کر رکھا ہے۔ پتا نہیں کہاں ہے۔ اس نے یہ فمد کی دوستی پال لی ہے۔ اب بھلا چھٹی کے بعد اس کے گھر جانے کی کیا

تک۔ ڈرائیور نہیں تھا تو میں تو چلا گیا تھا اسے لینے۔ آج میں اس کی اچھی طرح نکال لوں گا۔ چوکیدار کو بھی خوب سنا کر آیا ہوں ان لوگوں کی کوئی ذمہ داری ہی نہیں۔ بچہ چاہے جس کے ساتھ مرضی چلا جائے۔"

وہ صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے غصے سے بولا۔ وہ مسز خان کی وجہ سے بہت پریشان تھا ان کی صحت تو دن بدن گرتی جا رہی تھی مگر اب تو جیسے ان کی دل بادر بھی دم توڑتی چلی جا رہی تھی۔

"مگر ام جان کو کچھ ہو گیا تو میں شہباز بھائی کو کیا جواب دوں گا جو اپنے کندھوں کی ساری ذمہ داریاں بٹھ پر ڈال گئے ہیں۔" اب اسے شہباز پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ آخر ایسی بھی کیا تارا تھی۔

"کیا بات ہے اب میرے علاوہ کیا ہواؤں سے بھی لڑنا شروع کر دیا ہے وہ بھی اکیلے میں۔" مٹی خدا جانے کہاں سے نازل ہوئی۔ اس کا موڈ اور بگڑ گیا۔

"ہوا سے لڑنے کے لیے بھی کسی بریزن کا ہونا ضروری ہے جبکہ تم سے۔" اس نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یعنی مجھ سے لڑنے کے لیے۔ مطلب میں بااوج لڑتی ہوں۔ گویا پاگل ہوں نہیں۔" وہ ابروا پکا کر غصے میں بولی۔ پوں بھی اسے غصہ دلانا کون سی مشکل بات تھی۔

"میں نہیں، یہ تم خود فرما رہی ہو، وہ بھی اپنے بارے میں۔"

"معاذ! تم آخر مجھ سے چاہتے کیا ہو؟" وہ کمر پاتھ رکھے پھر سے لڑنے کو تیار کھڑی تھی۔

"پلیز! اس وقت کوئی جھگڑا نہیں کرنا۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ ام جان کی طبیعت اچھی نہیں اور

ارتعاشی ابھی تک گھر نہیں آیا۔ مجھے ابھی ہسپتال بھی جانا ہے۔" وہ کچھ بیزاروی سے بولا۔

"تمہارا مطلب ہے میں لڑتی ہوں، جھگڑا ہوں، کیا میں جاہل ہوں، بولا وجہ۔" وہ حسب عادت تیز تیز بولنا شروع ہو گئی۔

"تم تو یار! اچھی خاصی سانسلی ہو۔" وہ بیروا تے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت ارتعاشی اسکول کے گلے میں

لٹکانے اندر داخل ہوا۔

"السلام علیکم۔" عادت کے مطابق اس نے بلند آواز میں سلام بھاڑا۔

"کہاں سے آرہے ہو تم اور کس کے ساتھ؟" معاذ تیزی سے اس کی طرف پرجھٹکا گلے سے بیک اتارتے

ہوئے کچھ غصے سے بولا۔

"فرد کے ساتھ۔ اس کی گریبی اور آٹھ کے ساتھ۔ ڈرائیور مجھے لینے نہیں آیا تو انہوں نے مجھے پک کر لیا۔

راستے میں اس کہ ہم بھی گھلائی اور چپس بھی۔" وہ مزے سے ہنسا ہوا تھا۔

"کیا ان کی گاڑی ہے یا ہر؟" وہ پوچھتے ہوئے تیزی سے باہر کی طرف بھاڑا۔

"نہیں تو وہ تو مجھے ڈراپ کر کے چلے گئے۔" وہ کہتے ہوئے صوبے سے رجوع ہوا تھا۔

"بس تم ان ہی بے سرو پا الجھنوں میں الجھتے بوڑھے ہو جانا گھر میں تمہیں وارن کر رہی ہوں کہ اب تمہارے یہ

فضول معاملات میری پریشانی سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ بہتر ہے تم ان پر غور کر لو۔" وہ جاتے جاتے وارننگ

کے سے انداز میں غرائی تھی۔

"تم رعب کس کو دے رہی ہو اور کس چیز کا دے رہی ہو، گریج کا میں غور۔" معاذ نے غراتے ہوئے

اچانک پلٹ کر اس کی نکالی اپنے مضبوط پتے میں جکڑ لی تھی۔ مٹی حیرت اور غصے کے ساتھ پھر کو گلگ سی رہ گئی

تھی۔

"آریوان یور سینسز۔" (تم اپنے حواسوں میں ہو۔) وہ اس کی آنکھوں میں غصے سے دیکھ کر بولی۔ معاذ کی ابھی

انڈیاں اس کی نازک گھلائی میں بھی جا رہی تھیں۔

"میرے حواس صحیح کام کر رہے ہیں۔ تم اپنا علاج کراؤ اور جب کرا چکو تو پھر مجھے اپنی یہ فضول شکل دکھانا۔ تم

نے عطفہ زنج کر رکھا ہے اور آئندہ مجھے دھمکی نہیں دینا، ورنہ یہ ایک انگوٹھی کا رشتہ تو بچے دھاگے سے بھی نازک

ہے اتار کر مڑک پر پھینک دوں گا۔ سمجھیں۔" اس نے غصے میں مٹی نے معاذ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"تم۔ تمہاری یہ بہت۔ ہمارے ٹکڑوں۔"

"ٹٹ اپ۔" اس کا ہاتھ رک نہیں سکا۔ نکالی پھوڑ کر اس نے اپنا آہنی پنجہ اس کے چہرے پر بھاڑا تھا۔ اتنا

زور وار تھا نچ مٹی نے اپنی زندگی میں پہلی بار کہا تھا۔ چار قدم تورا کر پیچھے صوبے پر جا کر ہی۔ آنکھوں کے

آگے رنگ برنگے تارے سے چمکتے لگے۔

"تم جھکی ہو جی، بھوکے، جھکے فقیر ہمارے گھر میں پلنے والے کتے۔" وہ غصے میں بالکل آوٹ ہو چکی تھی۔

اس نے اپنے ہاتھ کی تیری انگلی میں پڑی ڈائمنڈ رنگ انار کر معاذ کے منہ پر دے ماری۔

"میں تو خود تم جیسے بیچ بکھیا بیچ اساتھ سے رشتہ جوڑ کر بچھتا رہی ہوں۔ اب بہتر ہے اپنا بوریا لہڑا تھاؤ اور

کہیں اور جا کر ٹھکانا کرو ورنہ مٹی اب تمہیں اس گھر میں نہیں رہنے دے گی۔ کی کہیں فقیر تم سے اچھے۔

مانگتے ہیں تو دینے والے کا احسان بھی مانتے ہیں۔ تم تو فقیریوں سے بھی بدتر لگے۔ اس گھر کا کھاتے بھی ہو اور

آنکھیں بھی دکھاتے ہو۔ یو یا سڑو۔"

"ٹٹ اپ! ٹٹ اپ! یو ماؤ تھ یو۔" کالیوں کا ایک طوفان تھا جو اس نے دانت بھینچ کر روکا تھا۔ وہ غصے میں

کاہتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

باہر لان میں کڑی دھوپ تھی دو دو سیافید چمکتی۔ وہ بیڑھیوں میں آتی بیٹھ گیا۔

"یہ دھوپ اس کی سچین زندگی کے امتحانوں سے تو کڑی نہیں جن سے میں گزر رہا ہوں۔ بے نشان ہے۔

وقت ہے تو قیور اور بے قاب۔ اور یہ دونوں میاں پوی ذمہ داریوں کی گھڑی جو میرے کندھوں پر ڈال گئے ہیں۔ جی

کراتے اسے پھینک پھانک اس وقت کہے سے بھاگ جاؤں۔" وہ تیز دھوپ میں بیٹھا جھک رہا تھا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے وہ دن کسی جیتی جاگتی فلم کی طرح پھرتے لگا۔ جب ارتعاشی کی پہلی سالگرہ سے ایک

دن پہلے نہ بہت ارتعاشی کا جو ما اور مسز خان کا سوٹ ٹیلر سے لینے معاذ کے ساتھ گئی تھی اور۔

اور پھر کچھ ختم ہو گیا ایک ہی بل میں ایک ہی جھکے میں۔ اس کا داغ چلتی ہانڈی کی طرح پک رہا تھا۔



رعنا حیات کو ہوش آچکا تھا۔ اگرچہ ان کا ہوس بریک ڈاؤن بھی ہوا تھا مگر اس کے باوجود ڈاکٹرز کی توقع کے

برعکس انہیں بہت جلد ہوش آیا تھا۔

"ختر کہاں ہیں، ختر ٹھیک ہیں، مجھے ان کے پاس لے چلیں۔" آنکھ کھلنے سے لے کر اب تک ان کی ان تین

سالوں کی مسلسل گھماؤں سے ڈاکٹرز اور سسٹمز تقریباً "تک آپکے تھے ان کی زبان ہر ایک منٹ بعد ان تین

سالوں اور کے بغیر ہلکتے جا رہی تھی۔

"مسز حیات! آخر صاحب ٹھیک ہیں ان کی حالت خطرے سے باہر ہے مگر ابھی انہیں ہوش نہیں آیا اور آپ کی

حالت بھی ابھی ایسی نہیں کہ ہم آپ کو ان کے پاس لے جا سکیں۔ پلیز آپ تھوڑی دیر آنکھیں بند کر کے خاموشی

سے لیٹ جائیں ورنہ خدا نخواستہ آپ کی طبیعت پھر خراب ہو جائے گی۔ ہمارا یقین کریں، ختر حیات صاحب

بفضل تعالیٰ حیات ہیں۔ بہت جلد حالت جلد آپ سپاس ہوں گے آپ بھی دل میں ان کے لیے بہت دعا کریں

کہ وہ جلدی جلدی ہوش چلنا آجائیں۔"

ڈاکٹر رفاقت بیڈ ڈاؤن پارٹمنٹ تھے۔ تینوں میجر آپریشن ان کی نگرانی میں ہی ہوئے تھے خود آکر انہیں

تلی ہوئے تھے۔

"اگر وہ حیات ہیں زندہ ہیں تو خدا را مجھے صرف ایک لمحے کے لیے ان کے پاس لے چلیں۔ آپ کو اللہ کا واسطہ

میں انہیں ایک نظر دیکھ لوں پھر جو آپ کہیں گے کروں گی۔" وہ بہت لاجپاری سے ان کے آگے ہاتھ جوڑتے

ہوئے بولیں۔

"مسز حیات۔ مسز حیات! گناہگار نہ کریں۔ میرا یقین کریں! چھ ماہ صرف ایک گھنٹہ اور انتظار۔"

"جو اکٹہ ڈاکٹر صاحب! جلدی آئیے، ٹیڈ نمبر تین کی پیشنٹ، جو ان کے ساتھ ہیں ان کی حالت بگڑ گئی ہے۔"

جو اس باختر نرس اندر آکر چلائی۔ ڈاکٹر رفاقت نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"مسٹر! آپ کو کسی نے اتنا نہیں بتایا کہ کسی دوسرے سیرکس پیشنٹ کے سامنے اس دیوانگی سے آکر چلانا کتنا

خطرناک ہو سکتا ہے۔" وہ سخت پیش میں آکر بولے۔

"سوری سر! وہ پیشنٹ۔" وہ آہستگی سے معذرت کرتے ہوئے اٹک کر بولی۔

"چلیں میں دیکھتا ہوں۔ مسز حیات! آپ پلیز ریلیکس۔"

”ڈاکٹر صاحب! اس کی حالت خطرے میں ہے، اس کی بات کر رہی ہے سسٹر؟“
رعنا حیات کے چہرے کا رنگ اڑا جا رہا تھا۔ ڈرپ کی سونپوں سے جکڑے دونوں بازو اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ اٹھنے لگی تھیں۔

”پلیز مسز حیات! کیوں آپ اپنے ساتھ ہماری بھی زندگی خراب کرنے چلی ہیں لیٹ جائیں پلیز۔ ڈاکٹر! انہیں کوئی سکون اور انجکشن دیں۔“ ڈاکٹر رفاقت ڈاکٹر فرہاد سے جاتے ہوئے تیزی سے بولے۔

”ڈاکٹر صاحب! میرا بچا بہت مشکل ہے، مجھے پتا ہے۔“ جنتاں بمشکل سانس لے رہی تھی۔ اس کا سینہ سانس کے آثار چڑھاؤ سے باقاعدہ ہلتا نظر آ رہا تھا۔

”ماہوسی گناہ ہے اللہ سے! اچھی امید رکھیں۔ جنہوں نے زندگی دی ہے، وہ صحت بھی دے گا۔“ ڈاکٹر جلدی سے اس کے زخم دیکھتے ہوئے بولا۔

”ڈاکٹر صاحب! میں ناامید نہیں مگر مجھے مضموم ہے۔ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔ آپ مہربانی کر کے میرا ایک کام۔ صرف ایک کام کریں۔“ اس کے سینے سے زور زور سے آوازیں نکل رہی تھیں۔

”کیا کام؟“ ڈاکٹر اب اس کے چہرے کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ اسے جنتاں کا کماج ہوتا نظر آ رہا تھا۔
”مجھے میری بیگم صہبہ کے پاس۔ پاس لے چلیں یا انہیں میرے پاس۔“

”اچھی دونوں کام نائن ہیں تم۔“
”ڈاکٹر صاحب! میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“ تطیف کی شدت سے اس کی آنکھیں باہر کو نکل رہی تھیں۔

”میرے سینے پر بڑا بھاری بوجھ ہے، ان کی ایک امت ایک راز پہنچانا ہے۔ قبر میں لے کر جاؤں گی تو قبر ہی پناہ نہیں دے گی۔ وہاں جا کر بھی تڑپتی رہوں گی۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کریں۔“ وہ اپنا سر رخ رہی تھی۔

”اچھا میں دیکھتا ہوں۔“ ڈاکٹر کو اس کی طبیعت واقعی اچھی نہ لگ رہی تھی۔
بہتر شکل رعنا حیات کو ہیل چیئر پر بٹھا کر جنتاں کے بیڈ کے پاس لایا گیا۔

”جنتاں! تمہارا بہت شکر ہے۔ تم نے فخر حیات کی زندگی بچائی۔ اس چاہوں بھی تو تمہارا یہ احسان۔“ رعنا حیات جنتاں سے کہہ رہی تھیں کہ اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔

”بیگم صہبہ! وقت نہیں ہے میرے پاس ان باتوں کا۔ صاب کی زندگی بچا کر میں نے احسان نہیں کیا اپنے سر پر پڑے اس بھاری قرض کا تھوڑا سا بوجھ بٹا کر دیا ہے۔ وہ بھی اگر میرے سوا کون۔ منگور ہوا تو شاید معافی۔“

بیگم صہبہ! میرے بندھے ہاتھ دیکھیں۔“ اس نے بہت مشکل سے ڈرپس نکالیں انہوں کو جوڑنا چاہا۔
”ارے ارے کیا کر رہی ہو لالہ! صرف منہ سے بات کرو۔ وہ بھی صرف دو منٹ اور میں بیگم صاحبہ کو دوسرے کمرے میں لے جا رہا ہوں۔“ پاس کھڑے ڈاکٹر نے جلدی سے اس کے دونوں بازو سنبھال دیے اور رکھتے ہوئے کہا۔

”بیگم صہبہ! میں آپ کی مجرم آپ کی دوشی، خطار کار۔ بیگم صہبہ! آپ کا تمک کھایا۔ ساری زندگی کبھی تمک حرامی کا سوچا بھی نہیں تھا۔ آپ نے ایک دن میرے ساتھ ناحق ظلم کھایا۔ مجھ بیوہ کی کمائی، میرا حاصل۔“

میرے مرحوم شوہر کی نشانی، میرا بچہ میری نظروں کے سامنے کیسے چلا ہے بیگم صہبہ! آپ کو وہ محسوس دن جب میری گود اجڑی تھی۔ میں نے تو بھی آپ کی ذرا سی بھی حکم عدولی نہ کی تھی پھر بھی آپ نے میرے ساتھ کیسی بے رحمی کی کہ میں۔“

”تم لیا کہہ رہی ہو جنتاں! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ رعنا حیات کا سر گھومنے لگا تھا۔
”بیگم صہبہ! سمجھ کر بھی انجان بنیں تو کوئی بات نہیں۔ آپ نے میری گود اجڑی میں نے آپ کا گھر سونا کر دیا۔ آپ کا بیٹا یاد ہے نا آپ کو۔ گیارہ ماہ کا پاؤں پاؤں چلنا صحت مند، مس خوشنویس۔“

”جنتاں! جنتاں! میں اس کو بھول سکتی ہوں۔ اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنے جگر کوٹے کو جو میری کل کائنات

تھا۔ میرا سب کچھ۔ میری زندگی اور کسی ظالم نے۔“ رعنا تڑپ تڑپ کر رونے لگیں۔
”بیگم صہبہ! اسی طرح میرا جگر گوشہ، میرا لخت جگر بھی آپ کے ظلم کی نذر ہو گیا۔ آپ اپنے بچے کو نہیں بھول سکتیں تو کیا میں ماں نہیں تھی؟“

جنتاں کی کھلتی بند ہوتی آنکھوں میں عجیب سی وحشت نالچ رہی تھی۔
”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“

”میں تو شاید قدرت کے اس فیصلے پر صبر کر سکتی پر میرے چاہنے کا پتہ جو میرا دیوار بھی تھا، میرے بچے کا چاہا جب وہ ہسپتال میں مجھے دیکھنے آیا۔ ساری بات کا اسے پتا چلا تو مجھ سے کچھ بھی کہے بغیر وہ اٹھ کر چلا گیا اور اگلے دن چھوٹے بابا صاحب گھر سے غائب تھے۔ سارے ملازموں کو قحانے لے جایا گیا۔ کئی کوششیں کی گئیں بابا صاحب کو ڈھونڈنے کی مگر کسی کو کچھ پتا ہوا تو پتا چلانا۔“

”جنتاں! جلدی بولو میں مر جاؤں گی۔“ رعنا حیات اس پر جھک کر از حد بے قراری سے بولیں۔
”بیگم صہبہ! اسی طرح قطرہ قطرہ میں مری ہوں عمر بھر۔“ وہ طنز سے ہنسی۔

”میرے چاہنے کے پتہ فضل داد نے بابا صاحب کو کون بھی سے انخوا کیا اور پتہ کی کسی شہم خانے میں داخل کرا دیا۔ اس نے مجھے بھی روکا ہوا بتایا تھا۔“

”کیا۔ تمہیں علم تھا؟“ رعنا حیات پانگلوں کی طرح چلا گئیں۔
”بیگم صاحب! پلیز آہستہ۔“ ڈاکٹر نے رعنا حیات کے کندھوں پر ہولے سے ہاتھ رکھا جسے رعنا حیات نے زور سے برے جھٹکا تھا۔

”بیگم صہبہ! بیگم صہبہ۔“ جنتاں کی سانس میں ٹوٹنے لگیں۔
”بولو جلدی بولو جنتاں! میرا بچہ کہاں ہے میرا بچہ۔ بولو۔“ وہ اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہی تھیں۔

”میرے گودا میں جس۔“ صدق وقت۔ کونالہ۔ کپڑوں کے نیچے۔ کافہ پر شہیم خانے کا پتا۔ مجھے معاف کر دیں۔ اللہ معاف۔ معافی۔“ سانس کا کوئی بھی فقرہ پورا نہیں ہو سکا تھا مگر وہ اپنے سینے کا سارا بوجھ اتار گئی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں مٹانے والی مشین پانگلوں سیدھی ساٹ لائن دکھا رہی تھی۔ اس کے لب خاموش ہو چکے تھے، سینے کا شور ختم چکا تھا اور گھٹے کی گھڑ گھڑ بھی۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اس کی کھلی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں بند کر دیا۔

”جنتاں۔ جنتاں۔ تم نے کیا کیا۔ میں کے الزاموں۔ جنتاں۔ میں تجھے بدعا دوں کہ دعا۔“ رعنا حیات اس کے بیڈ سے پھرتا رخ کر رونے لگیں۔

”میرے سبب۔ از سبب۔! اماں ہے یہ زہن سب۔ آمت! بلاؤ اس کو۔“ اماں جی نے تیسری بار زہن سب کو پکارا تھا۔
”اماں جی! وہ سو رہی ہے رات بھر سوئی نہیں۔ ابھی آنکھ لگی ہے اس کی۔“ آمت جو جن میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ آہستہ آواز میں بولی۔

”کیوں نہیں سوئی رات بھر، پتہ تو ہے مجھے تو وہ دن سے اس نے اپنی شکل نہیں دکھائی۔ میں اٹھ کر خود جا کر دیکھتی ہوں۔“ وہ اپنے بستر سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

”اماں جی! اس کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ کل صبح بھی اس نے کچھ نہ کھایا، وہ پھر کو بھی کھانے کے لیے بلا تے رہے نہیں آئی۔ شام کو اٹھ کر وہ دن کی باسی بننے کی دال رات کی روٹی کے ساتھ کھال۔ بس رات بھر الٹیاں، موٹن کرتی رہی ہے اس لیے سو نہیں سکی۔ اب کچھ اس کی حالت سنبھلی تھی تو سو گئی ہے۔ میں نے ناشتے کے لیے بھی نہیں اٹھایا۔ ابھی وہ پیر میں اس کے لیے جو پیر یہ پھجڑی بنا رہی ہے، ابھی اٹھاتی ہوں پھر آپ کے پاس لے آؤں گی۔ آپ کی طبیعت اب اچھی ہے نا۔“ وہ ان کے پاس ہی آ بیٹھی تھی۔

"بچے! میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ کل تمہارے ساتھ بازار بھی تو جئی تھی۔ ساری تیاری تو ہو گئی ہے نامکمل۔
 اچھے جوڑے مل گئے ہیں زیب اور نذر کے۔ تم نے اپنے بابا صاحب کو دکھائے تھے نا۔"
 "جی اماں جی ارات کو ہی دکھائیے تھے۔"
 "پسند آئے انہیں؟"
 "جی ہاں۔"

"وہ تو اب ہمارے پاس ہون کی مہمان ہے۔ تمہارے بابا صاحب نے بھی ایسی جلدی بچائی ہے۔ کیا کے گی میری
 بیٹی ماں نے ڈھنگ سے رخصت بھی نہ کیا۔ تم نے ٹرنک کا سارا سامان جو میں نے تمہارے لیے جمع کر رکھا تھا
 نکال کر ترتیب سے رکھ دیا ہے نا۔"

"جی اماں جی! رکھ دیا ہے۔" وہ کچھ سستی سے بولی۔
 "ٹرنک ادھر لے آؤ۔ میں بھی دیکھوں ذرا۔" وہ شوق سے بولیں۔
 "میں صفائی کر لوں پھر لاتی ہوں۔" وہ اٹھ کر دوبارہ جھاڑو لگانے لگی۔
 شام ہونے کو تھی جب اماں نے زیب کے پاس آئیں وہ جاگ رہی تھی مگر وہ مہنگی سی ہنسی بول رہی تھی۔
 "میری بیٹی! میری زینبی! کیسی ہو بیٹا! ماں سے کیوں رو تھی پڑی ہو۔ کل سے بے کل ہو رہی ہوں تمہیں دیکھنے
 کو سال سے ناراض ہو گیا؟" وہ اس کے بال سلجھاتے ہوئے بڑے پیار سے بولیں۔
 "آمنہ! اسے تو بخار بھی ہے۔" ان کے بال سنوارتے ہاتھ اس کے ہاتھ پر آکر ٹھک گئے تھے۔
 "جی اماں جی! اللہ کی قسم نہیں رک رہیں اور اس نے کچھ کھلایا بھی نہیں۔" آمنہ بھی ان کے پاس آ بیٹھی۔
 "تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔" وہ پریشانی سے بولیں۔
 "کیا بتاتی اماں جی! یہ خود ہی ہوش نہیں کر رہی۔ بتائیں اسے کیا کیا ہے۔ بالکل کوجھا کھٹک گئی
 ہوں۔" وہ ہنس کر ہنسی سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کون سی بات سمجھا سمجھا کر؟" اماں نے چونک کر پوچھا۔
 "میں کہ اچھے پٹے پھرے گھر کے کاموں میں دلچسپی۔"
 "زندگی بڑی ہے ان کاموں میں جتنے کو۔ صحت تو دیکھو اس کی کتنی کمزور ہو گئی ہے۔ اٹھ نہ سکتی میری بیٹی! میں
 تجھے کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔ تمہارے بابا صاحب کہاں ہیں؟"
 "وہ اس وقت قرآن پڑھانے جاتے ہیں معلوم تو ہے آپ کو؟"

"میری اور اپنی چادریں لاؤ" اسے ڈپٹری لے جانی ہوں سات بجے تک کھلی ہوتی ہے۔ بلائی کر دو شام
 ہونے کو ہے۔ تمہارے بابا صاحب آگے تو پھر حکیم صاحب سے کوئی دوا لادیں گے۔ پر سوں اس کا نکاح ہے اور یہ
 سدھ پڑی ہے۔ بچی میں جان نہیں ہوگی تو لسن نی کیا بچگی۔ اٹھو تم۔" پھر اماں نے زیب کی ایک نہیں سنی۔
 زبردستی اسے چادر اوڑھنا کر ڈپٹری تک لے لی آئیں۔
 ڈپٹری میں زیادہ رش نہیں تھا۔ ہفتے میں تین دن ڈاکٹر آتی تھی۔ تین دن وہ کسی دوسرے کلینک میں بیٹھتی
 تھی۔ آج خوش قسمتی سے موجود تھی۔
 ڈاکٹر نے زیب کی نبض دیکھی بخار چیک کیا۔

"اللہ لیاں اور موشن کب سے آرہے ہیں؟"
 "جی پر سوں سے۔" زیب آہستگی سے بولی۔ وہ اس کی آنکھیں چیک کرنے لگی۔
 "آپ ڈرا اندر آکر چیک کروائیں پلیز۔" وہ اسے اٹھا کر اندر لے گئی۔
 "پر سوں سے اپنی جان بھگان کر رہی تھی۔ تم دونوں بہنوں نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی کیا۔ بھلا مجھے تو
 بتاتیں گی یا خدا! خواستہ اس کے مرنے کا انتظار کر رہی تھیں۔" ڈاکٹر کے اندر جاتے ہی اماں جی اس پر برس پڑیں۔

آمنہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تو یہی سمجھے ہوئے تھی کہ اسے سینٹی کی جہاد کا نم لگا ہے۔ وہ چار دن میں سنبھل
 جائے گی۔

"اماں جی! آپ پلیز ادھر آئیں۔" ڈاکٹر نے باہر آکر اماں جی سے اپنے قریب پڑی کرسی پر آکر بیٹھنے کے لیے کہا
 تو اماں جی اٹھ کر اس کرسی پر جا بیٹھیں۔
 "ٹھیک ہے تو ڈاکٹر صاحب! بہت کمزور لگ رہی ہے۔ خدا! خواستہ کوئی خطرے والی بات تو نہیں۔" اماں جی
 پاس بیٹھی زیب کو تشویش سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

"خطرے والی بات ابھی تو کوئی نہیں مگر آپ مزید دیر کر دیتیں تو شاید ہو بھی جاتی۔ میں یہ دوا نہیں لکھ کر دے رہی
 ہوں۔ باقاعدگی سے استعمال کروائیں۔ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گی اور ایسی حالت میں یہ اللہ کی دیکھو تو آپ کو پتا
 ہے ہوتی جاتی ہیں۔ معمول کی بات ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

وہ تیزی سے پلڈر قلم دوڑاتے ہوئے بول رہی تھی۔
 "لگے۔ کیسی حالت میں ہے؟" اماں جی انک کر بولیں۔
 "آپ کی بیٹی انشاء اللہ آگے سے ہے۔ کتنے ماہ ہوئے ہیں شادی کو۔ کمزور ہے نا اس لیے یہ حالت ہو گئی ہے۔
 ٹھیک ہو جائے گی یہ دوا نہیں استعمال کروائیں۔"
 اماں جی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھیڑ عمر بزرگ کا ڈاکٹر کو دیکھتے جا رہی تھیں۔
 "آپ کی بیٹی امید سے ہے۔" انہیں لگا پوری کائنات میں صرف اسی ایک جملے کی بازگشت گونج رہی ہے اور
 کہیں کوئی آواز نہیں۔

UrduPhoto.com

"صوفی صاحب! ایک بات پوچھوں۔"
 صوفی صاحب صغیر کی نماز کے بعد اپنے گھونٹے کے وٹا ٹکڑے سے فارغ ہو کر بستر پر آکر بیٹھے ہی تھے کہ راجہ جی
 نے بے حد پست لہجے میں ان سے پوچھا۔ صغیر سے غلام اتار کر ننگے کے دو سرے جانت رکھتے ہوئے ان کے ہاتھ
 ایک بل کر کے پھر غلام رکھ کر انہوں نے کچھ غور سے بیوی کی شکل دیکھی۔ آج راجہ جی نے عشاء کی نماز بھی
 مختصر پڑھی تھی اور معمول کے وٹا ٹکڑے پختے بغیر بستر پر آکر لیٹ گئی تھیں کافی دیر سے صوفی صاحب بیوی کا یہ کھویا
 کھویا انداز اور ٹھنڈی آنکھیں دیکھ رہے تھے۔
 "پوچھیں! انہوں نے ایک کھرا سا لے کر لویا اجازت دی اور خود ٹھیک کی پشت سے کندھا لگا کر بیٹھ گئے۔
 "آپ کا دل کتنا مضبوط ہے؟" وہ متذنب لہجے میں بولیں۔

میرادل؟" راجہ جی نے عجیب سے سوال پر وہ سوالیہ انداز میں بولے۔ "تمہیں ابھی اندازہ ہی نہیں ہوا
 راجہ جی! اگر میرادل کتنا مضبوط ہے۔" وہ پھلکی سی ہنسی میں کر بولے۔ "جو شخص اپنے جوان بیٹوں کو محض اپنے
 اصولوں کی خاطر گھر سے باہر نکال سکتا ہے۔ درختوں پر خوب اچھے پھل آئیں اور مال اپنے ہاتھوں میں آری گے
 کر خود ان درختوں کو کاٹ ڈالے تو کیا تمہیں اس کے دل کی مضبوطی پر کوئی شک ہو سکتا ہے؟"
 انہوں نے اپنے چہرے کا رخ پھت کی طرف کر لیا کہ انہیں ان کی آنکھوں کے بھیکے گوشے بیوی کی نظروں میں
 نہ آتیاں۔

"بات اس سے بڑی ہے راجہ جی! میرادل کا شکست خوردگی سے بولیں۔
 "پھر تو قیامت کا ہی کچھ ذکر ہو گا۔" وہ پھر اسی بھیکے لہجے میں بولے۔
 "انہم جیسے سفید پوش عزت داروں کی عزت پر حرف آنے لگے تو پھر یہ قیامت ہی ہوتی ہے۔" وہ اور بھی مدہم
 آواز میں بولیں۔
 "راجہ جی! صوفی صاحب کو جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا تھا تڑپ کر بولے۔ "کیا کتنا چاہتی ہو صوفی صاحب
 کو۔"

خاصی دونوں میاں بیوی میں ناراضی چل رہی تھی یا شاید علیحدگی ہو چکی تھی۔ دو سال سے تو شہباز کی شکل نہیں دیکھی۔ ہم نے تو سنا ہے وہ مری وری کوئی نہیں پھر سے بھاگ گئی ہے۔ اسے جس کولت لگی ہو حزامی کی وہ یوں تن تھما پڑھی جوانی کے ساتھ کتنے دن رہ سکتی تھی۔

کون کہہ رہا تھا پیچھے مڑ کر دیکھنے کے باوجود معاذ کو بتا نہیں چلا۔ پھر یہ چہ گویاں گونج دار سرگوشیوں میں بدل گئیں۔

اظہار اور ایاز نے چوتھے دن سوگ ختم کرنے کا اعلان کر کے افسوس کے لیے آنے والوں سے معذرت کرنی تھی۔

”ہم جان! موت وہ ہوتی ہے جس میں کوئی مزاج نظر آتا ہے۔ وہاں اتنے لوگوں کی اور بھی تو لاٹھیں ملی ہیں نا ایک بس نزہت کی نہیں ملی۔ اللہ جانے کیا پلہ بنے کیا نہیں۔ آپ پلینریہ ماتم ختم کریں۔ یہ سب آپ کی صحت کے لیے بھی اچھا نہیں اور لوگ افسوس کے بہانے آکر گھٹیا طنز کی گند پھیری سے ہمیں ذرا گرجاتے ہیں آخر ہم کب تک سب برداشت کریں گے۔“

اظہار نے مسزخان کے کمرے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر جملے کئے انداز میں کہا تھا اور مسزخان سر جھکا کر رہ گئیں۔ اور ساری افواہوں کو جیسے ثبوت مل گیا۔ یوں اس پر نصیب کی موت کو بھی کسی نے موت تسلیم نہیں کیا بلکہ بدنامی اور ذلت کے نئے اشتهار مانگ گئے اور ان اشتهاروں کو نبی پرانی سرخیوں سے سجانے والی مسزخان کی دونوں بڑی ہوسئیں تھیں۔

ان دنوں شہباز خان کا رابطہ گھر سے مکمل طور پر منقطع تھا۔ نزہت کی موت کے چند سات ماہ بعد جب شہباز خان نے مسزخان کو فون کیا تو انہوں نے نہ جانے کیوں شاید اس کی موت سے بڑی گھٹیا کہانی سے گھبرا کر نزہت کی موت کے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا بلکہ اس دن کے بعد سے کسی نے بھی ان کے منہ سے نزہت کا نام نہ سنا۔ انہوں نے جیسے سب ہی بے تھے۔

اور ذلت سے گورہ گیا معاذ جس نے اس واقعے کے فوراً بعد (جس میں معاذ کو بھی انوالو کیا جا رہا تھا) بارہا گھر چھوڑ کر جانا چاہا اور ہر بار مسزخان آنسو بھری آنکھوں اور خاموش لبوں سے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیتیں تو وہ بے بس ہو کر رہ جاتا۔

لوگوں کی باتیں سن کر اس کے دل میں بھی کبھی کبھی یہ شک جڑ پکونے لگتا کہ کیا واقعی نزہت اس حادثے کا شکار نہیں ہوئی لیکن اگر وہ مری نہیں تو پھر کہاں جا سکتی ہے۔ وہ بھی ار تھنی کو چھوڑ کر جبکہ اس شہر میں اس کا اور کون سا ٹھکانا ہو سکتا ہے؟ مسزخان نے پنڈری میں اسمیل کو بھی اطلاع کروائی تھی اس نے آنے کے بجائے فون کر کے کہا تھا۔ ”خس کم جہاں پاک!“

اس دن کہ بعد سے اس گھر میں جیسے نزہت کا نام لینا گناہ سمجھا جانے لگا تھا۔ لیکن یہ سب کب تک یونہی چل سکتا ہے یہ پتہ تو اس دن پھر کھلے گا جب شہباز خان واپس لوٹیں گے یا ار تھنی شعور کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھے گا تو اس کا پہلا سوال یہی ہوگا۔ ”میری ماں کہاں ہے اور اس کا جواب گھر سے زیادہ باہر والے لوگوں کے اور یہ جواب سن کر وہ۔“

معاذ کو پھر پھر ہی آئی۔ وہ صوب میں اس کا پورا بدن جیسے جل چکا تھا۔ وہ انٹی جیک سے اٹھ کر اہوا سے آج مسزخان کو ہسپتال سے ڈیپارچ بھی کروانا تھا اور پھر انہیں یہ ”خوشخبری“ بھی تو سنانا تھی کہ مشی منگنی کی انکو تھی اس کے منہ پر مار کر جا چکی ہے۔ اسے پھر اپنی انسلٹ کا منظر یاد آیا وہ جھلسا بدن اور سنگٹا دماغ لیے اندر چلا گیا۔

اور پھر شاید نیند اور اباس ٹھلنے کا وقت آیا تھا۔

”آئی! آپ پھر جلدی سے جائیے اور دونوں کام کر آئیں میں ادھر آپ کا ویٹ کرتا ہوں۔“ معاذ نے گاڑی کے اوپر کھٹے فرنٹ ڈور میں کھڑے ہو کر شاپنگ سینٹر کے رش کا جائزہ لیتے ہوئے نزہت سے کہا۔

”افوہ معاذ! اتنا رش ہے۔ میں اکیلی جاؤں۔ تم آجاؤ گا ساتھ۔“ وہ یوں بھی گھر سے کم نکلتی تھی۔ معاذ ہمراہ نہ ہوتا تو وہ زنتون بانو کو ساتھ لے لیتی کہ وہ اکیلی شاپنگ کے لیے نہیں جیاتی۔“

”اگر میں بھی آپ کے ساتھ چل پڑا تو گاڑی ابھی لفٹر ایک لے جائے گا پھر کون گاڑی چھڑانے کے پیچھے ڈوار ہوتا پھرے گا۔ پلیز ذرا سا تو کام ہے اور وہ بھی نواتین سے متعلق آپ خود ہی ہو آئیے۔ دس منٹ بھی نہیں لگیں گے۔“ وہ ہنسی مچاتی ہوئی نزہت کو جیسے دلا سارے رہا تھا۔

”پھر بھی۔ میں تو اس طرح بھی اکیلی۔“ وہ متذنب کھڑی انگلیاں پٹخا رہی تھی۔

”آئی پلیز۔ اب جائیے ہی۔ اتنی دیر میں تو آپ واپس بھی آجاتیں۔“ وہ اب کے کچھ بیزار سی سے بولا تو نزہت ست قدموں سے آگے بڑھی۔ معاذ کی نظروں کے سامنے وہ شاپنگ سینٹر کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی۔ اس نے منظر میں ہو کر ہجرت۔ سنگھ کی کیسٹنگ اور ریٹ کی ایک سے سرنگار منزل کے مدھم سروں سے لطف اندوز ہونے لگا۔

ایکایک اسے احساس ہوا کہ نزہت کو گئے آدھے گھنٹے سے زائد ہونے کو ہے۔ پھر کی دکان تو تیسرے چوتھے نمبر پر تھی اور لکھتر شاپ جہاں سے ار تھنی کا کھسہ لینا تھا وہ بھی ٹیلر کی دکان سے چند قدم پر تھی۔ وہ کچھ پریشان ہو کر گاڑی سے نکل آیا۔

گاڑی اشارت کر کے اس نے سڑک کر اس کی اور شاپنگ سینٹر میں گیا۔ سچا سچ سات منٹ ادھر ادھر دکانوں میں ٹاک بھاگ کے باوجود اسے نزہت نہیں نظر نہ آئی۔ وہ بارہ بار باہر آگیا کہ شاید وہ گاڑی کے پاس جا چکی ہو سڑک کے دونوں اطراف رش بڑھ چکا تھا۔ وہ گاڑی کے پاس بھی نہیں پہنچی تھی۔

”کمال ہے۔ اتنی دیر اتنے سے کام میں کیسے لگ سکتی ہے۔“ وہ اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پریشانی سے سوچنے لگا۔

”دوبارہ جا کر پتا کروں۔“ سوچتے ہوئے ابھی اس نے سڑک کی طرف توجہ بڑھانے ہی تھے کہ یکے بعد دیگرے زوردار دھماکوں سے سڑک کے ارد گرد ہی کیا۔ دھرتک کی دھارتیں لرزنی لگیں۔

اور سامنے۔ سامنے شاپنگ پلازہ جیسے مٹی کی بھر بھری عمارت کی طرح دھو میں اور آگ کے باولوں میں زمیں پوس ہونا صاف نظر آ رہا تھا۔ معاذ کے منہ سے بے اختیار چیخ اٹھی تھی اور یہ چیخ صرف اس کے منہ سے نہیں نکلی تھی پورے علاقے میں گہرا سچ گیا تھا۔ وہ دیوان وار آگ اور جھاک کے اس سرنگٹک طوفان کی طرف لپکا تھا۔

پھر اس بھیا تک تباہی کی زد میں صرف نزہت ہی نہیں آئی تھی نہ جانے کتنی دوسری نزہت اور معاذ بھی آگے تھے۔ جیتے جاتے بنتے کھیلنے موت کی آغوش میں جا سائے تھے۔

لاٹھیں ہت کم سچ و سالم ملی تھیں شام تک جب آگ بجھی اور بلے کو ہٹانے کو کام شروع ہوا تو کچھ بھی نہیں بچا تھا مگر جسم تک نہیں پھر نزہت کی لاش کہاں سے ملتی۔

اس نے کیسے جا کر مسزخان کو بتایا اور کس طرح قیامت کی وہ کہانیاں گزریں اسے کچھ پتا نہیں چلا۔ اسے تو جیسے اپنے ارد گرد کا ہوش نہیں تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ نزہت مر سکتی ہے وہ اس کی آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی باتیں کرتی پٹکیا تھی۔ کاش میں ان کے ساتھ چلا جاتا انہیں جلدی لے کر باہر آجاتا۔“

بغیر سروے کے بھلا کیا جائزہ لھنا تھا۔ بس ایک صف ماتم تھی جو پورے گھر میں چھ گئی تھی۔ اسے ہوش تو اس دن آیا جب اس نے سر جھکانے وہ چہ گویاں سنی تھیں۔

”ارے پہلے بھی گھر سے بھاگ گئی تھی۔ بھائی نے قبول کرنے سے انکار کر دیا دھکے دے کر نکالا تو ادھر آگئی۔ بے چاری پیچھی اچھی لگی۔ بڑے دل کی مالک بیٹے کی بیوی کے طور پر قبول کر لیا مگر بیٹے نے قبول نہ کیا۔ اچھی

”جلد از جلد مجھے سب معلومات حاصل کر کے فون کرو۔ میں ویٹ کر رہی ہوں۔“ کہتے ہوئے انہوں نے فون رکھ دیا۔

”جنتا۔“ ان کے منہ سے بے اختیار نکلتے نکلتے رہ گیا۔ کس قدر عاوی تھیں وہ جنتا کے بے ضرر سے وجود کی فکر بے ضرر کب۔ وہ تو انہیں ناقابل تلافی نقصان پہنچا چکی تھی۔

”اس نے تو پھر جانتے جانتے اس کی تلافی کر دی مگر میں نے اس نے کیا کیا ہاں بے بس عورت کے ساتھ۔“ انہوں نے بے ساختہ نوحہ سے پوچھا۔

ان کی نظروں کے سامنے بنوری کی وہ سرد ترین صبح آگئی جب فخر حیات نے گھر میں بہت بڑی پارٹی ادا کی تھی۔ گھر میں ایک نہیں بیس بیس ملازم تھے مگر جنتا کی اپنی اہمیت تھی۔ رعنا حیات کی شادی کو ابھی دو سال کا عرصہ ہوا تھا۔ ان کی گود میں گیارہ ماہ کا بچہ تھا اور جنتا نے نئی نئی بیوی کی چادر اوڑھی تھی۔ اس کا شوہر بھی حیات والا کار انا ڈرائیور تھا۔ وہ فیکٹری کے کام سے شہر سے باہر گیا تھا جب ایک ٹرک نے اس کی گاڑی کچل ڈالی تھی۔

جنتا کے آنسو ہی خشک نہ ہوتے تھے۔ اس واقعہ کو جتنے ہی سال ہونے کو آیا تھا۔ اس کا بچہ پانچ ماہ کا تھا۔ انتہائی کمزور لاغر اور بیمار سا کچھ پیدا نش سے پہلے تھیں گے سائے نے اپنے حلقے میں لے لیا۔ پتھریاں لگی بے توجہی نے۔ وہ دن بدن مزید لاغر ہوتا چلا گیا۔ ان دنوں سردی بھی بہت شدید پڑ رہی تھی۔ ٹھنڈی تو صبر نڈرا تھا کہ بھیستی جنوری نے ہر طرف قیامت کی سروی پھیلا رکھی تھی۔ جنتا کے بچے کو ڈبل نمونہ ہو گیا تھا۔

”بیکم صیب امیرا بچہ بیمار ہے میں نے اسے ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔“ وہ ہاتھ جوڑے مرل سے بچے کو سینے سے لگا لگا کر لگا لگا کر بول رہی تھی۔ باہر تیز ہوا لگتی بادلوں کے ساتھ ہوا میں چل رہی تھی۔ بچے نے ناکالی کپڑے پہن رکھے تھے وہ اچھا خاصا نینا ہو رہا تھا۔ ماں کے سینے سے چمکنے کے باوجود۔

”تو کام تیرا باپ کرے گا۔ سب کچھ تو بکھرا پڑا ہے اور شام ہونے کو ہے۔“ رعنا حیات بجلی کی طرح کڑکی تھیں۔

”بیکم صیب! آج نہیں۔ آج جی میرا بچہ صبح نہیں جی مجھے مجھ سے لگتی آج ہی کو دے دیں وہ فیس کے پیسے۔“ کڑکڑاتے ہوئے بولی۔

پیسے سے دو ان مفت نوروں کو ڈھراموں کو جب کام کا وقت آتا ہے تو سوجھے سوجھانے جا دھو رہاں سے اپنا منہ کالا کر کوئی چیز دھیلا۔ “کہتے کہتے رعنا حیات نے جو اسے زوردار دکھایا۔ وہ کمزور لاغر کا مٹی مڑوہ شہنی کی طرح لاہلٹی ایک ہی دھکے سے سامنے مار بل کے ہلو سے لگرائی تھی۔ بچہ پہلے ہلو سے لگرایا پھر اس کے کمزور ہاتھوں سے ہاسٹ کر مار بل کے ننگے کیلے فرش پر کراچ کے نازک برتن کی طرح گرا اور وہیں ٹوٹ کر چلنا چور ہو گیا۔ منہ سے ہلکی سی چیخ نکال کر بیٹھ کے لیے خاموش ہو گیا۔

جنتا اپنے ماتھے سے رستے خون سے بے پروا پٹی پٹی آنکھوں سے اپنی عمر بھر کی کمائی کو یوں ریزہ ریزہ ہونے دیکھتی رہ گئی۔

اور اس کے بعد شخص چند ہی دنوں بعد ان کی گود بھی پونسی آجڑ گئی۔ اس دن سے وہ قطرہ قطرہ صبح کی طرح کھلتی اس دائمی غم میں کھلی جا رہی تھیں۔

”اب بھی اگر یہ حادثہ پیش نہ آتا تو یہ جنتا کچھ عرصہ اور شاید مرتے دم تک کچھ نہ بکتی۔ خبیث، مکار، بڑھیلا۔ انہیں پھر سے اس پر شدید غصہ آیا تھا۔

”تم نے تو اس کی دنیا ہی اجاڑ ڈالی تھی جو پھر کبھی آباد نہ ہو سکی۔ اس نے تو تمہارے ساتھ اتنا بڑا ظلم نہیں کیا۔ تمہارا بچہ اب جوان ہو گیا جو گاؤں میں جوان اور جنتا کی یہ قربانی جو وہ فخر حیات کی زندگی بچا گئی۔ یہ تو اس کیسے تم سے بھی نہ ہو سکا۔ سید تان کر فخر حیات کے آگے آکھڑی ہوئیں۔ یہ تو اس تک حلال ملازمہ کی ہمت تھی جو اپنے مالک پر قربان ہو گئی۔ تم نے تو اپنی ساری عیش بھری زندگی میں ایک بل بھی اس کے اس گھاؤ کے متعلق نہ

سوچا جسے صرف موت ہی بھر سکی۔ رعنا حیات! تم اس معمولی ملازمہ سے بڑھ کر ظالم بے حس اور شقی القیب ہو۔ تم تو اس رعایت کی بھی مستحق نہیں تھیں جو جاتے جاتے وہ تم سے کر گئی۔“ کوئی پوری قوت سے ان کے اندر چیخا تھا۔

”ہاں جنتا! تم بہت عظیم ہو۔ اپنی غلطی کا کفارہ بھی ادا کر گئیں اور میں نے تو ایک بار بھی اس گناہ اس معصوم کے قتل کے بارے میں سوچا تک نہیں جو میرے ان خون آلود ہاتھوں سے سرزد ہوا اور میں ہر طرح کی سزا سے بھی بچ گئی۔“ وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھیں۔

”سزا تو مجھے بھی عمر بھر کی ملی ہے میری ممتا کو سزا ملی ہے۔“ اسی وقت فون کی کھنٹی بج اٹھی۔

”ہیس۔“ بے شکل وہ خود کو لپوڑ کر پالی تھیں۔

”مڈم! میں نے سب بتا دیا ہے۔ اس نام کا مہتمم خانہ تو اب ادھر نہیں ہے وہ تو آج سے تقریباً بیس برس پہلے ہی ختم ہو گیا تھا جب اس کے مالک کی ایک حادثے میں دونوں ٹائٹلس ضائع ہو گئی تھیں۔ اس نے مہتمم خانہ ختم کر دیا تھا۔ میرے لیے اور کوئی حکم مڈم؟“ پیچھے تفصیل بتاتے ہوئے مڈم کے لیے بولا۔

”اور یہ کہ تم دغذ ہو اور اچھے خاصے کم عقل انسان بھی نہ جانے فخر نے کیا سوچ کر تمہیں اتنی اہم سیٹ دے رکھی ہے۔ یہ تمام معلومات تو میں خود بھی یہاں بیٹھی فون پر حاصل کر سکتی تھی۔ تم ابھی اپنی سیٹ سے اٹھو اور راولپنڈی جاؤ اور کل صبح آگے رپورٹ دو کہ اس مہتمم خانے کے بچے کہاں گئے۔ انہیں کہاں شفٹ کیا گیا۔“ میرے مالک میری ممتا کا اور گناہ اتنا باقی ہے۔ معاف کرو۔ مجھے میرے بچے سے ملاوے۔ میرے صدیوں سے بے چین بے قرار دل کو قرار دے۔ میرے اللہ۔“ وہ بے اختیار ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑیں۔



”شادی اتنے دنوں کا آپ مجھ سے کر کے تھے اور کتنے دن آپ ادھر لگا چکے ہیں کچھ احساس ہے آپ کو؟“

”معلوم ہے مجھے۔ دیکھو اگر بائی پاس ہو جاتا تو میں اب سے مہینہ بھر پہلے آڈکا ہوتا۔ ڈاکٹرز نے کہا کہ سب کچھ میڈیسن کے ذریعے ہی ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ اس ٹریٹمنٹ کی وجہ سے اتنا ٹائم لگ گیا۔ میں تو خود اب ادھر رہتے رہتے تک آچکا ہوں۔ تمہاری بہت یاد آ رہی ہے۔ کیسی ہو؟“ وہ مشتاق لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

”کچھ بڑھ چکی۔“ وہ ریکولڈ جٹ دیا کر آستلی سے بولی۔

”کیا مطلب؟“

”کچھ نہیں۔ آپ جو نہیں اس لیے کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ آپ مجھے بھی آنے نہیں دے رہے۔ سیدہ آیا کیا اپنی جی آپ کے پاس ہیں؟“

”نہیں وہ تو بمشکل دو ہفتے رہ سکیں۔ جو ادھر جتا کی شادی کر رہی ہیں دو چار ماہ میں۔ اس لیے میں بھی اب جلد وطن لوٹنا چاہ رہا ہوں۔ سیدہ آپ کے روز فون آر ہے ہیں شاید اگلے ماہ تک آجاؤں۔“ وہ اچھے خاصے آگائے ہوئے لگ رہے تھے۔

”ادھر آپ کے پاس کون ہوتا ہے؟“ وہ کہنے والے انداز میں بولی۔

”تمہاری خوبصورت یادیں اور حسین چہرے کی تصویر جو میری آنکھوں کے سامنے ہر وقت رہتی ہے۔“

”شادی! میں مذاق نہیں کر رہی۔“

”بھئی ملازم ہیں دو تین اور کس کو ہونا ہے۔“

”شاہد! میرے پاس آپ کے لیے ایک خوشخبری ہے۔“

”کیا ہے نین! ہر کال پر یہی ایک فقرہ بولتی ہو۔ پوچھتا ہوں تو بتاتی بھی نہیں ہو۔ آخر کیا مسئلہ ہے؟ ایک تو تم نے

مجھے بے چین کر رکھا ہے۔ وہ کچھ بھلا کر بولے۔
”مسئلہ تو نہیں شادی انوشخیری ہے۔“ وہ ”نوشخیری“ پر زور دے کر بولی۔

”وہی تو پوچھ رہا ہوں۔“ وہ آگے بڑھا۔
”آپ آئیں گے تو پھر خود ہی دیکھ لیتے ہیں۔“ وہ جیسے لہجے میں بولی۔

اسی وقت عبدالعصین اندر داخل ہوا اور ہاتھ کے اشارے سے دوش کرتا ہوا امین تارا کے سامنے پڑے صوفے پر بے تکلفی سے بیٹھ گیا۔

”اوکے شاہمی! پھر بات کریں گے۔ خدا حافظ۔“ اس نے جلدی سے کہہ کر فون بند کر دیا۔
”کر لینی تھی اور بات۔ میرے سامنے کیا شرم آتی ہے۔“ وہ ٹائٹس پھیلاتے ہوئے بولا۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ کارڈ لیس سائیز پر رکھتے ہوئے بولی۔
”ہاں۔ یہ تو مجھے معلوم ہے شرم اور تم! وہ الگ چیزیں ہیں۔“

”مولی! وہ تیسہ ہی انداز میں انکی اٹھا کر بولی۔
”تم شاہمی کو خیر سے یہ ”نوشخیری“ سنا کیوں نہیں دیتیں۔“

”سناؤں گی وہ آتو جائیں۔“
”جائے ان کا کمزور دل اتنی بڑی خوشی کی خبر کو سہاری نہ سکے اور۔“ وہ شرارتی لہجے میں جملہ ادھورا چھوڑ کر امین تارا کو دیکھنے لگا۔

”مولی! افضل باتوں کی ضرورت نہیں۔“ وہ سائیز نیبل پر بڑی مساج کریم اٹھا کر ہاتھوں کا مساج کرنے لگی۔
”امین تارا! تم نے کیا بالکل بن کر رہی ہو۔ تم بچے و بچے کا گردنی کیا اور پھر تمہارے خیال میں شاہمی اس بچے کو

Own (اپنا) کر لیں گے۔ کبھی نہیں۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔
”مولی! ایسے مت کہو۔ میں مر جاؤں گی۔ اگر ایسا کچھ بھی ہوا تو۔“ وہ دہل کر بولی۔

”حماقت تو تم خود کر رہی ہو۔ اچھا اگر یہ سب کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو تم شاہمی سے اس کا ذکر تو کرو۔ دیکھو تو
سہی وہ کیا رپانس دیتے ہیں۔ تم کیوں اپنا آپ اور نگار رہی ہو۔“ وہ بھی شجیدگی سے بولا۔

”اگر یہ خود کو داؤ پر لگانے والی بات ہے تو یہی سہی۔ مولی! میں بچے کے لہجے میں رہ سکتی۔ وہ بھی سید سلطان
بخت کا بچہ۔ تمہیں میں کیا بتاؤں۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہے۔“ وہ ٹھوس لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”کہا تم شاہمی کا وارث سید اگر کے ان کی وراثت میں حصے دار۔“
”پلیز مولی! میری ٹیک تپتی کو غلط رنگ مت دو۔ مجھے اگر محض ان کی دولت و جائیداد کی ضرورت ہوتی تو وہ میں

ان سے یوں بھی بڑے آرام سے ہتھیار سکتی تھی۔ تمہیں معلوم ہے۔“
”تو پھر؟“

”مجھے ان کا نام لیا اچھا ہے وہ بھی وہ بنو میرے وجود کا حصہ ہو۔ اسے تم میرے دماغ کا غلط سمجھ لو۔ چھوٹو اس
موضوع کو۔“ وہ سر جھٹک کر بولی۔ ”آج کل بڑا اونچا لڑ رہے ہو۔ سنی وی آن کرو تو تقریباً ہر چیز میں پر تمہارے ہی

نمبر زچل رہے ہوتے ہیں۔ پانچویں والیوم کار سپانس کیسا رہا؟“
”زبردست بہت شاندار۔“

”اتنی مدت سے سینماؤں میں فلاپ فلمیں چل رہی ہیں اور تم اپنی لگ دیکھو۔ صرف دو فلموں میں کام کیا اور
دونوں سپر ہٹ گئی ہیں۔ انٹرنیشنل فلم فیسٹیول میں ٹاپ آف دی لسٹ رہی ہیں۔ بہت بڑی بات ہے عین واقعی تم

سے بہت اسپرٹس ہوتی ہوں۔ اگر انسان کے اندر لگن ہو کچھ کرنے کا جذبہ ہو تو پھر یہ کچھ معنی نہیں رکھتا کہ
آپ کا بیک گراؤ نہ کیا ہے اور آپ کا تعلق کس کلاس سے ہے۔ آپ کا نام آپ کا بیک گراؤ نہ اور آپ کی کلاس

بن جاتا ہے ہے نا؟“ وہ متاثر ہو جانے والے انداز میں کہہ رہی تھی۔
”بالکل درست کہا تم نے۔“ عبدالعصین نے گہرا سانس لیا۔

”آج کل کیا کر رہے ہو؟“
”فی الحال تو تین دن مکمل ریسٹ کر رہا ہوں۔ چونکہ دن کی شام کو بوسے جا رہا ہوں۔ ڈیڑھ ماہ کا ٹور ہے۔ تقریباً

سات شہروں میں میگا شو ز ہوں گے۔ کچھ ٹچل ڈونگ والے بھی ادھر پروگرام کر رہے ہیں۔ اس میں شرکت کرنا ہے
یہی مصروفیت۔“ وہ اپنا سر صوفے کی پشت سے ٹکاتے ہوئے بولا۔

”ویسے تم یہ کیا صاف کر رہے ہو۔“ امین تارا اچانک بولی۔
”ایسا مطلب؟“

”میرے ہاؤس پر۔ اندر گراؤ نہ مافیا کا سرخوردہ اور شو بزم میں ہونے والی تمام ترقی سرگرمیوں کا مرکز۔ مام بتا رہی تھیں۔
تم آج کل ان کے ساتھ بہت دیکھے جا رہے ہو۔ یہ تم بہت غلط کر رہے ہو۔ اس سے تمہاری بھی ریپویشن خراب

ہو سکتی ہے۔“
”ہو نہ۔ کچھ نہیں ہوتا۔ وہ بہت اچھا انسان ہے بہت نیک دل اور دوستی میں بالکل فیر۔ ایک دو فنکشنز میں

ملاقات ہوئی تو وہ مجھ سے اور میں اس سے تھوڑا بہت انسپائر ہوا۔ یوں دوستی ہو گئی جہاں ملتا ہے محبت اور خلوص
سے ملتا ہے۔“

”اور تم محبت کے ترسے ہوئے ہو۔“ وہ ٹھٹھ سے بولی۔ ”میں نے تو سنا ہے تم اس وائٹ بلیس میں ہونے والی ہر
تقریب میں انوکھی ہوتے ہو اور موج تھی کے پروگرام میں بھر پور حصہ لیتے ہو؟“ وہ اسے کڑی نظروں سے

نظر کرتے ہوئے بولی۔
”اود کم تو ان میں مارا! تمہیں یہ اماؤں والی باتیں سوٹ نہیں کرتیں دوستی میں یہ سب چلتا ہے۔“ وہ اٹھنے لگا۔

”جس دن یہ دوستی تمہارے گلے پر گئی تاکہ لوگ پتا جائے گا۔ کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا۔ سنا تو ہو گا تم نے اور
مام بتا رہی تھیں تم نے بہت ڈر گزارا استعمال کر لیا ہے۔ والٹس پر اہم دو یومی فرینڈ۔ کیوں خود کو تباہ کر رہے ہو۔

اپنی صورت دیکھی ہے آئینے میں۔ بیمار لگتے لگے ہو۔“
وہ اس پر بہت دغوں کو بھرا اس نکال رہی تھی۔

”بیچارہ تو ہم ہیں تمہارے عشق کے بیچار
منا دے جو عمر رائیگاں کا احساس بھی

ایسا ہی کوئی خواب کوئی خواہش شدید بن کر آؤ
پھوٹے جس کی ہر لہر سے نغمہ بہاراں

شوق تمنا کے اس دریا کی تمہید بن کر آؤ
”اب یہ کیا ہے؟“ امین تارا نے اس کو گھور کر دیکھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ پونسی ہنس دیا۔ ”ڈنر پر چلو گی رات کو میرے ساتھ؟“
”نہیں شکر۔“ وہ رکھائی سے بولی۔

”اب بھلا ناراضی کی کیا بات ہے؟“
”کوئی ناراضی نہیں اور ڈنر تمہا ہر جا کر نہیں کرو گے بلکہ ہمیں گھر میں ہمارے ساتھ۔ اوکے تم ڈراما مے کپاس

چل کر بیٹھو۔ میں فریش ہو کر آئی ہوں پھر ہارلان میں چل کر چائے پیتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟“ امین تارا کمر پر ہاتھ
رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
”اچھا آئیڈیا ہے۔ تم آؤ پھر گپ شپ کرتے ہیں۔“ وہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

”یہ لوہے“ شام کی نماز کے بعد صوفی صاحب نے ایک چھوٹی سی پڑیا لاکر رابعی بی بی کو تھمائی۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”حکیم صاحب نے دی ہے۔“ وہ جھکی نظروں سے کہتے ہوئے پٹنگ پر بیٹھ گئے۔

”کیسی رہی اس کی طبیعت دن بھر؟“ صوفی صاحب تو سارا دن اوپر آئے ہی نہیں تھے۔ وہ پسر کا کھانا بھی نیچے ہی منگوا لیا تھا اور صبح ناشتہ تو کر کے ہی نہیں گئے تھے اور اب رات کے کھانے میں بھی برائے نام دو چار تھے لیے تھے۔ ”اچھی نہیں۔“ رابعی بی بی نے گہرا سانس لیا۔ ”تو نہیں کیا ہو گیا ہے اس کے اندر کوئی چیز تک ہی نہیں رہی۔ نرم غذا دینے کے باوجود ابھی سیون اپ کی بوتل منگوا کر دی۔ آمنہ نے کسٹرو بھی پکا کر دیا مگر اس سے کچھ بھی ہضم نہیں ہو پارہا۔ ڈاکٹری کی دوائی تو۔۔۔ میں دن بھر آپ کا انتظار کرتی رہی ہوا کے لیے۔“

”صبح حکیم صاحب کے پاس رش بہت تھا کافی دیر بیٹھا رہا ان کے فارغ ہونے کے انتظار میں، کیسے اپنا مدعا بیان کرتا۔ آخر ظہر سے پہلے اٹھ کر آیا۔“ انہوں نے پٹنگ سے کمر نکالی۔ ”ابھی بھی مغرب کے بعد کیا تھا زبان سے لفظ ہی ادا نہیں ہو رہے تھے۔“

”تم یہ پڑیا ابھی جا کر دے دو۔ اٹلیاں رک جائیں گی۔ صبح تک طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ بہت تسلی دی ہے حکیم صاحب نے۔“ انہوں نے کہتے کہتے آنکھیں بند کر لیں۔

”اس لڑکی نے تو ہمیں جیتے جی مار ڈالا ہے۔ نہ نکل سکتے ہیں نہ اگل سکتے ہیں۔ بڑی سناٹا ہے۔“ رابعی بی بی اٹھتے ہوئے بولیں۔

”کچھ خاص نہیں میں نے کہہ دیا ابھی کچھ مسئلہ ہو گیا ہے اس لیے دو چار ہفتے ٹھہر جائے اور کیا کتاب۔“ انہوں نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا۔ رابعی بی بی نے ایک نظر رک کھانے پر غیرت مند شوہر کی بند آنکھوں کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر ہر چلی گئیں۔

آمنہ زینب کے پاس چارپائی پر بیٹھی تھی۔ زینب کسی بے جان موبے کی طرح ہوتی تھی۔ اس کے جڑوں کی پڑیاں نکل آئی تھیں۔ رنگ پیلا زور ہو رہا تھا اور ہونٹ بالکل خشک سا۔ ان کے گل سے آہی نکل رہی تھی۔ اس حال میں دیکھ کر۔ جویریہ بھی اپنی چارپائی پر پاؤں لٹکانے سر تھکانے بیٹھی تھی۔

”آمنہ! بی بی لاؤ اور اسے یہ دوا دے دو۔“ رابعی بی بی کی آواز پر زینب نے آنکھیں کھولیں، ”کچھ طبیعت اچھی ہوئی؟“ چاہنے کے باوجود رابعی بی بی اپنے لہجے میں ملاہٹ نہیں لاسکی تھیں۔ بہت غصہ تھا انہیں زینب پر۔

وہ جواب دینے کے بجائے انہیں خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔ عجیب سی وحشت اور ہراس اس کی نگاہوں سے ٹپک رہا تھا۔ آمنہ پانی کا گلاس لے آئی۔ جویریہ نے آگے بڑھ کر زینب کو گلاسوں کے پیچھے ہٹتے ہوئے تھوڑا سا سارا دے کر بٹھایا۔

آمنہ اسے دوا کھلانے لگی۔

”اماں بی! اسے کسی ڈاکٹر کو۔“

”ٹھیک ہو جائے گی اور کتنے ڈاکٹروں کے پاس جا کر اپنی ہنسی اڑواؤں گی۔ اس نے تو ہمیں کسی کو منہ دکھانے لائق نہیں چھوڑا۔ اللہ جانے کس گناہ کی اپنی کڑی سزا دی ہے۔ کسی اولاد نے کایہ ٹھنڈا نہ کیا مگر مول کا لکھا بھگت رہے ہیں۔ اس کا علاج کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں میری بی بی! رابعی بی بی کہتے ہوئے رکیں نہیں۔ زینب نے دوا پانی کے ساتھ نکل لی تھی اور پھر فوراً ہی بے دم ہو کر لیٹ گئی تھی۔ جویریہ جا کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

”کمر کی فضا کس قدر سوگوار ہو رہی ہے جیسے خدا خواست کسی کا ماتم ہو رہا ہو اور آمنہ کا تو شام ہی سے دل گھبرا رہا تھا۔ کچھ زینب کی حالت کچھ ماں باپ کے کم صدم رویے۔ اسے اندر ہی اندر بہت ڈر لگ رہا تھا۔

وہ اسی طرح زینب کی پانٹنی پر بیٹھی رہی پھر تھوڑی سی آڑی ہو کر تہم دراز ہو گئی۔ بازو کا تکیہ بنا کر زینب کو یک

تک دیکھنے لگی۔

”خواہش کا بچھو اگر ایک بار انسان کو ڈنک مار لے پھر اس کا تریاق کہیں نہیں ملتا۔ خواہش پاؤں مگر انہیں بچھو نہ بناؤ کہ وہ تمہارا سارا بدن نکل و نکل کر ڈالیں۔“

کہیں پر بھی ہوئی بات اسے یاد آئی۔ اسے لگا زینب کے چہرے پر لکھا ہوا ہے کہ۔

”اچھی زندگی تو ہر پیدائش ہونے والے انسان کا حق ہوتی ہے۔ کسی کو پیدا کئی طور پر یہ حق مل جاتا ہے۔ کوئی اس کے لیے ہزار جتن کرنا ہے اور کوئی محض اس کی خواہش میں ہی خود کو ہلاکت میں ڈال لیتا ہے۔ یہ خواہشوں کا آئو پیس کیوں انسان کے ساتھ چٹ کر اس دنیا میں آتا ہے کہ اسے کچھ اور سوچنے ہی نہیں دیتا۔“

عجیب و غریب باتیں سوچتی نہ جانے کس وہ گہری فینڈ سو گئی۔

”آں! زور وار گراہ براس کی ایک دم آنکھ کھلی تھی۔ زینب اپنا سینہ اور گلا دونوں ہاتھوں میں جکڑے پھٹی پھٹی آنکھوں سے آمنہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جویریہ گہری فینڈ سو گئی تھی۔ رات کافی بیت گئی تھی۔ آمنہ نے تک تک کرتے کارنس پر رکھے ٹائم ٹیس پر نظر ڈالی رات کے پونے تین بج رہے تھے۔

”زینب! آیا اب اٹھتے تو ہے۔“

”مم۔۔۔ میرا گلاس۔۔۔ میں مر گئی۔ میرا سینہ کوئی چھری سے کاٹ رہا ہے۔ آہ۔ ہا۔۔۔ وہ دہری ہوئی جا رہی تھی۔

”کیا بات ہے زور ہو رہا ہے یا تے آرہی ہے؟“ آمنہ اٹھ کر اسے کندھے سے تھامتے ہوئے بولی۔

”مم۔۔۔ مجھے سانس نہیں آرہا۔“ اس نے سر اٹھا کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے آمنہ کو دیکھا۔

”یا ہر لے جاؤں؟ آؤ یا ہر چلتے ہیں۔“ آمنہ نے اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ جھکی جھکی سی اٹھی تھی۔ چارپائی کی چارپائی سے جویریہ کی بھی آنکھ کھلی تھی۔ وہ بھی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

آمنہ اور جویریہ نے پٹنگ سے باہر صحن میں لائی تھیں۔

وہ لوگ کھڑے ہوئے۔ غسل خانے کی طرف بڑھی۔

تالی پر جھکی کتنی دیر زور لگا کر قے کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر اس کے گلے میں جیسے کوئی پتھر کوئی اینٹ چھس کر رہ گئی تھی۔ سینہ پیٹ آنتیں جیسے کئی جا رہی تھیں اور دم گھٹنا جا رہا تھا۔

دس پندرہ منٹ کی ناکام کوشش کے بعد وہ تڑھال ہو کر غسل خانے کے باہر ہی گر گئی۔ جویریہ اور آمنہ بڑی مشکل سے اسے کھینچ کھانچ کر تخت تک لائی تھیں اندر کمرے میں صوفی صاحب تہجد کی نماز کے لیے مصلے پر کھڑے ہو چکے تھے۔ صوفی صاحب کی آواز سن کر رابعی بی بی نیت توڑ کر باہر آ گئیں۔

”کیا ہوا؟“ وہ فکر مندی سے اسے ہلا رہی تھیں۔ زینب کی آنکھیں اوپر کو پلٹ رہی تھیں۔

”کیا ہو گیا زینب؟“ رابعی بی بی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

”صوفی صاحب! صوفی صاحب! دیکھیں اگر زینب کو کیا ہوا ہے۔“

وہ وہیں سے چلا گئیں۔ صوفی صاحب کتنی دیر سے رکوع میں جھکے تھے اسی طرح سکون سے جھکے رہے۔ رابعی بی بی کے بار بار ہلانے پر زینب نے آنکھیں کھولیں ماں کو دیکھا پھر دیکھتی رہی۔

”اماں بی! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا تھا۔ صرف۔۔۔ صرف۔۔۔ اچھی زندگی تھوڑی سی روشنی۔۔۔ اندھیرا۔۔۔ مجھے اندھیرا اچھا نہیں لگتا۔ اندھیرا ہر طرف ہو رہا۔ اماں بی!“

وہ رک رک کر بمشکل بول رہی تھی۔ میں ٹھیک ہوں۔ سوؤں گی۔“ اگلے پل وہ گردن سیدھی کر کے آمنہ کی گود میں لیٹ گئی۔

”میری بی! میری بی بی۔۔۔ تجھے اللہ کی اماں ہو۔ کیوں تو نے یہ ناوائی کی؟“ رابعی بی بی رونے لگیں۔

”رابعی بی بی! اندر آ کر اپنی نماز پڑھیں وہ اب ٹھیک ہے۔“

اور تقدیر پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔ صوفی عبدالرحمن کے ان عقارت بھرے بھلوں پر۔

”کیا یہ سب کرنا آسان ہوتا ہے؟“ زینب کا باپ ان کے اندر گرا ہوا۔

”صوفی صاحب! بہت افسوس ہوا۔“ کوئی ان سے کہہ رہا تھا۔

صوفی صاحب خالی خالی نظروں سے اس افسوس کرنے والے کو تک رہے تھے۔ اسے بھی شاید ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ تھا۔ افسوس نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے سر تھکا کر بیٹھ گیا۔

”جو ہوا ٹھیک ہوا۔ زینب نے جو کچھ کیا تھا اس کے ساتھ یہی کچھ ہونا تھا ہونا چاہیے تھا۔ اس نے میرا میری عزت کا اپنے پریشان حال دل کی گھر والوں میں سے کسی کا بھی خیال کیا تھا جو اس کے ساتھ اچھا ہوتا۔ یہ سب کچھ نہ ہوتا۔“ انہوں نے ایک گہرا سانس لے کر بیسے فیصلہ سنایا۔

”ٹھیک ہوا اس کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔“ انہوں نے اپنے جھگے ہوئے کندھے سیدھے کیے اور صراحتاً کر چاروں جانب دیکھا۔

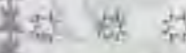
”زینب۔ کوئی اور نہیں۔ زینب مر گئی۔ ٹھیک ہوا۔“ کوئی اندر بیٹھا انہیں کچھ کے جا رہا تھا۔

”ہاں ٹھیک ہوا۔“ وہ اپنے اڑی ہٹ دھرم انداز میں خود سے بولے تو اندر بیٹھ کر ایک خاموشی چھا گئی۔ انہیں اس خاموشی سے اطمینان سا ہوا۔

”مگر زینب۔ زینب کہاں ہے۔ صدی زینب جو ہر وقت میرے لیے کوئی نہ کوئی فرمائش تیار رکھتی تھی۔

زینب میرے کمر کی بلبل، میری چڑیا۔ میرے کمر کی رونق۔ اعلیٰ آواز۔ زینب۔ زینب۔ زینب۔ نہ جانے کیسا شور مچا تھا۔ ان کے اندر چھتری جنگ کا دوا دیا سینے کی دیوار میں توڑ کر پھرا تھا۔ ان کے سارے بدن میں ایک سنسناسی دوڑی تھی۔ جسم کا دایاں حصہ ایک پل کو اس سنسناسی سے سن سا کر رہ گیا تھا۔

”زینب! زینب! زینب۔“ کوئی دیوانوں کی طرح ان کے اندر بھجے جا رہا تھا۔ وہ بھگے سچ میں کھٹی کھٹی چنگیوں سے رونے لگے۔



”کیا ہو رہا ہے؟“ مسزخان کے نحیف بدن سے گرج وار آواز نکلی تھی۔

”آپ کو نظر نہیں آ رہا کیا ہو رہا ہے یہ مزید تشریحات کی ضرورت ہے۔“ اسٹاپائی میری بیٹی کا حال تو دیکھو۔ اس درد سے نے کیا کر ڈالا۔ منوں تھی وہ کھڑی جب یہ سنبھل گیا اس کمر میں آیا۔ ہائے میرے دشمنوں نے سانب کو مارا پالا کر مجھے ڈسنے کو پالا پوسا۔ نو آج ساروں کے ارمان پورے ہو گئے پر جہانے سب کے دشمنوں میں ٹھنڈ۔

میری پھول سی بیٹی کانٹوں میں دل گئی۔ اللہ تیرا قہر کیوں نہیں ٹوٹا ان ظالموں پر جن کے دل یکسے گئے۔ ہوتے ہیں۔“ یا یامین سینے پر دو ہتھ مار کر رونے لگی۔ مسزخان نے بمشکل اپنے منہ سے پر قابو پایا۔

”بھو! بھوش میں ہوش کونہ بھو! بھو! ایسا نہ ہو کہ ہوش میں آؤ تو تمہیں اپنے گے ہوئے الفاظ سوچ کر خود سے بھی ندامت محسوس ہونے لگے۔ یہ باتیں اس رونے دھونے سے بہت پہلے سوچنے کی ہوتی ہیں مگر تم مجھسی مانتیں تو تہ نہیں دیتیں۔“ وہ چپا چپا کر بول رہی تھیں۔

”ہاں ہاں خاک ڈالو اگر سارے زمانے کی میرے سر پر۔ ظلم کا بڑا ڈبھی ہم پر ڈالنا ستم بھی ہم پر ہوا اور سزاوار بھی ہم صبر۔ ظلم کی انتہا ہے۔ میں تو جب سے اس کمر میں آئی نا انصافی اور تعصب ہی سہہ رہی ہوں۔ آج اس تک ظلم کی کاٹکار میری معصوم بیٹی بھی ہو گئی پھر بھی پتھر کا ٹاپیر سینے میں لے کے داوی مجھے ہی کوس رہی ہے۔ کوئی ہے اس ظلم گھر میں ہمارا بھی ہمدرد میں تو پولیس میں جاؤں گی۔ اس تک ماور کونہ زمانے بھر کی خاک چھوٹی تو میرا نام بدل دینا۔ بہت سن لی میں نے سب کی بکواس۔“ یا یامین غصے میں آگ بگولہ ہو رہی تھی۔ مٹی کو جھنجھوڑنے

”مٹی کو جھنجھوڑنے کی بجائے اس حالت میں رہنے لکھو انے لے جاؤں گی۔ سارا زمانہ دیکھے گا اور ان پر تھو تھو کرے

کا اٹھ۔“ وہ اسے پاگلوں کی طرح جھنجھوڑ رہی تھی۔ مسزخان نے انتہائی غصے کے عالم میں اس پاگل عورت کو دیکھا۔

”تم نے ایک۔ ایک دن یونہی میرا سر شرم سے جھکانا تھا۔ مجھے معلوم تھا۔ ایک پل کو بھی تمہیں میرا شہباز کے ان احسانات کا خیال نہ آیا جن کو آج تک تم پر کسی نے جتایا نہیں۔ اس کمرے میں قدم رکھنے سے پہلے تم سر کیوں نہ گئے۔ یہ جلد دیا میری پر خلوص محبت اور بے ریا عتقا کا۔“ وہ چونٹوں اور زخموں سے بے حال معاذ پر برس پڑیں۔

”ام جان! یہ بھوٹ ہے بکواس ہے بہتا۔“

”تم کیوں مانو گے تم بیسے عادی مجرم بھی کبھی آسانی سے مانتے ہیں۔“

اظہار نے اسے ایک زوردار دھکا دیا۔ دھکا تو زوردار تھا مگر معاذ اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ پوری قوت مجتمع کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا ناٹھ سوٹ گریبان سے پھٹ دکا تھا۔ ہونٹوں کے کناروں سے خون بہہ رہا تھا۔ پیشانی پر بھی دو جگہ سے گہرے ابھر آئے تھے۔ ایک سے تو خون بھی رس رہا تھا۔

”ام جان! آپ مجھے ایسا ہی سمجھتی ہیں۔“ وہ دھک بھری آواز میں مسزخان سے بولا۔

”مجھے کس بات سے مجھے میں۔“ اب میں سچھاؤں گا۔ تو نے کیا سمجھا تھا کہ ہم لوگ لنگڑے ہیں۔ تیری بد معاشی کو اپنی عزت کی بدنامی سمجھ کر چپ چاپ بی جائیں گے؟ میں پولیس کو فون کرنے جا رہا ہوں دیکھتا ہوں مجھے کون روکتا ہے۔“ اظہار منہ سے کف اڑاتے ہوئے خوار لہجے میں کہتے ہوئے باہر کی طرف بڑھے۔

”نہو پولیس کو بلائے کی ضرورت نہیں۔“ مسزخان محکم سے بولیں۔ ”مگر کے اکل صبح نکلنے والا سورج تمہیں اس کمر میں نہ لگے۔ یہ تمہارے ان میں اچھا ہو گا اور شاید ہم سب کے حق میں بھی۔ تم نے ہماری نیک بیٹی کا سہل بہت کھپا انہا میں لیا۔ ہمیں بیوش اور تے کا کسی برا احسان کرنے سے پہلے۔“ مسزخان سر دھکے میں عداوت سے بولیں تو وہ ایک پل کو ہنسنے سا رہ گیا۔ بے یقینی سے انہیں دیکھنے لیا۔

”جاؤ یہاں سے۔“ مسزخان زور سے بولیں تو اس نے دکھ بھری نظر ان پر ڈالی اور وہ سر سے مل باہر جانے لگا۔

”ام جان! میں اسے ایسے نہیں جانتے ہوں گا۔“ رستے ہاتھوں پکڑے جانے والے مجرم کو آپ یوں جانے کا موقع دے رہی ہیں۔ آپ تو اس کے ساتھ مزید سیلی کر رہی ہیں۔“ ایاز نے پھر سے معاذ کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

”تو کیا کروں پولیس کو بلا کر سارے زمانے میں اپنی عزت کا پرچہ کٹاؤں۔ تم لوگوں کو کیوں سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ ہم سب کے حق میں بلکہ مٹی کے حق میں بہت برا ہو گا۔ جانے دو اسے۔ غیرت والا ہو گا تو کبھی زندگی بھر اس حرکت کے بارے میں سوچے گا بھی نہیں اور اتنی غیرت کی توقع تو مجھے ہے اس سے۔ جانے دو اس کو۔“

مسزخان ایسی نظروں سے معاذ کو تکتے ہوئے بولیں تو اس پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اگلے پل وہ ایاز سے اپنا گریبان پھینا کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

”مجھے معلوم تھا آپ ہی کریں گی اس کے ساتھ۔ آپ کے دل میں کبھی میرے لیے یا میری اولاد کے لیے ذرا سی ہمدردی و پیار نہیں ہو سکتا۔ یہ آخری چر کہ بھی مجھے آپ کی وجہ سے اس کمر میں لگنا تھا۔ کل کا سورج اس مردود تو اس کمر میں دیکھے گا یا نہیں مگر کل کا سورج مجھے اور میری بیٹی کو بھی اس کمر میں نہیں دیکھے گا۔ بہت عذاب۔“ لہجے میں نے یہاں نہیں بائیں حال۔ اظہار نے اگر ہمارے پیچھے آنا ہوا تو آجائے اور نہ ماں کے قدموں سے لپٹنا بیٹھار ہے۔“

یا یامین نے غصے سے کہتے ہوئے مسزخان کو نفرت بھری نظروں سے دیکھا اور مٹی کی الماری کی طرف بڑھی۔

”یہ تم لوگوں کا آپس کا معاملہ ہے چلو زینب جانو! مسزخان نے سرو لہجے میں جواب دیا اور پیچھے کھڑی زینب جانو کو چلنے کا اشارہ کیا۔ وہیل چیئر موڑتے ہوئے یکا یک ان کی نظر بلڈ کی بیک کے پیچھے پڑی ایک چیئر پر لہجے بھر کو اٹک ہی گئی۔ کمرے سے باہر اٹتے ہوئے ان کا سر تھکا ہوا تھا۔ وہ اپنے بھریوں بھرے کمزور دو دھیا ہاتھوں کو تکتے ہوئے

کچھ سوچ رہی تھیں پھر رات کے باقی پر انہیں ایک بل کو بھی غیند نہیں آئی اور صبح تک وہ نتیجے پر پہنچ چکی تھیں۔
 ”زیتون بانو! ایاز کو بلا کر لاؤ۔“ جیسے ہی صبح کی مددشن کرئیں ان کے کمرے کی مشرقی کھڑکیوں سے اندر داخل ہوئیں انہوں نے زیتون بانو سے کہا۔

”جی، وہ تو گھر پہ نہیں ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے کہیں گئے ہیں۔“

”اچھا جاؤ پھر معاذ کو بلا کر لاؤ۔“ وہ کچھ سوچ کر بولیں۔

”معاذ کو؟“ زیتون بانو استعجاب بھرے لہجے میں پوچھنے لگی۔

”ہاں معاذ کو۔ سنائیں تم نے؟“ وہ کچھ جھلا کر بولیں۔ رات بھر کی بے خوابی سے ان کا سراپا تھا خاصا بھاری ہو رہا تھا۔

”جی، وہ تو رات کو اسی وقت چلا گیا تھا۔ جاتے ہوئے اپنی چند کتابوں کے سوا کچھ بھی ساتھ نہیں لے کر گیا۔ ایک کپڑا جو آٹک نہیں۔“ زیتون بانو کچھ دکھی لہجے میں آہستہ آہستہ بتا رہی تھی۔

”کیا؟“ مسز خان بھونچکی سی رہ گئیں۔

”آپ نے خود ہی تو اسے جانے کا کہہ دیا تھا، وہ تو پھر ایک منٹ بھی نہیں رکا۔ صرف کچھ منٹ بولے، وہ چار کتابیں کاغذات لیے اور نکل گیا۔“

”اوہ! ان کے سینے سے ایک گہرا سانس خارج ہوا۔“

”یہ میں نے کیا کیا؟“ وہ تاسف بھرے لہجے میں خود سے بولیں۔

”جی! زیتون بانو زینان نظروں سے انہیں تک رہی تھیں۔“

”اس نے جی حرکت بھی تو اتنی غلط کی تھی۔ آپ نے تو کچھ بھی برا نہیں کیا اس کے ساتھ۔“ زیتون بانو دوشے لہجے میں بولی۔

”اس نے کچھ برا نہیں کیا تھا، کوئی خطا نہیں تھی اس کی۔“ وہ بڑبڑائیں۔

”آپ کو کیسے پتا جی؟ آپ نے رات کو مشی بی بی کی حالت نہیں دیکھی تھی۔ مجھے تو سوچ کر شرم آرہی ہے۔ یہ معاذ اندر سے اتار کر اہوا۔“

”بس زیتون بانو! آگے کچھ مت کہنا، پہلے میں بھی یہی سمجھی تھی مگر وہ پچھتو گندن ہے، ڈھلا ڈھلایا سونا۔ تم نے مشی کے بیلے کے پیچھے بڑی وہ چیز نہیں دیکھی تھی؟ وہ اس سے پوچھنے لگیں۔

”اگن سی چیز جی؟ زیتون بانو کو پہلی بار اپنی ممر سپدہا لگن کی ذہنی حالت پر شک سا کڑرا۔“

”میں نے دیکھی تو اسی بل مجھے معاذ کے بے قصور ہونے کا یقین ہو گیا تھا۔ پتا ہے وہ چیز کیا تھی؟“ ان کی آنکھیں اس خیال سے ہی پلپٹنے لگی تھیں کہ معاذ جس پر اتنے سالوں ان کے دل نے اندھا اعتبار کیا تھا، وہ کج خلقی اعتبار کے قابل ہے۔

”وہ۔“ اسی وقت فون کی بیل بجنے لگی۔ ”سنو جا کر۔“ انہوں نے تھک کر بیل کے پشت سے سر نکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔ زندگی پھر سے انہیں ایک لمبی مسافت کی نوید سنارہی تھی جس کی محسوس انہی سے ان کی پٹلوں پر آرکی تھی۔

پر آرکی تھی۔

”اسلام علیکم۔ میڈم! میں رضا کھوکھریا ت گرہا ہوں۔“ رعنا حیات نے ریسیور کان سے نگایا۔ وہ سری طرف نیچر کی آواز سنائی دی۔

”ہوں۔ و علیکم السلام۔“

”میڈم! میں نے اوپر سب پتا کر لیا ہے جس جگہ بچے کو جمع میرا مطلب ہے جس سٹیٹیم خانے میں داخل کر لیا گیا تھا اس کا مالک تو اسے کسی اور کے سیرور کے خود باہر چلا گیا تھا۔“

اس کا مالک تو اسے کسی اور کے سیرور کے خود باہر چلا گیا تھا۔“

”یہ سب تم مجھے پہلے بتا چکے ہو۔ آگے بواؤ۔“ وہ جھنجھلا کر بولیں۔

”میڈم! میں نے اس شخص کو ڈھونڈ لیا ہے۔ وہ اب بیرون ملک سے آچکا ہے اور پینڈی ہی میں رہائش پذیر ہے۔“

”تمہاری ملاقات ہوئی اس سے؟“ وہ جلدی سے بولیں۔

”بس میم! میں ان سے مل چکا ہوں۔ انہوں نے ہی مجھے یونس بیگ کا ایڈریس دیا جس کے حوالے وہ یہ سٹیٹیم خانہ کر گئے تھے اور اس کے بچے بھی۔“

”تم یونس بیگ سے ملے؟“ ان کی بے تابی پر مدتی جا رہی تھی۔

”بس میم! میں ان سے مل چکا ہوں۔“

”پھر؟“

”میں نے اپنی نشانیاں میں نے انہیں بتائیں ان کے پاس اس طرح کا ایک بچہ آیا تھا اس کی انہوں نے تصدیق کی ہے۔“

”تھا۔ کیا مطلب؟“ وہ بے صبری سے چلائیں۔

”میم! اب تو وہ یقیناً جوان ہو چکا ہو گا۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”تو اتنی عقل ہے مجھ میں آگے بتاؤ، کیا کرتا ہے؟“

”میم! وہ یہ تو مان رہے ہیں کہ اس عمر کے لڑکے لباس والا بچہ ان کے پاس جمع کر دیا گیا تھا پھر وہ کچھ کہاں گیا، وہ اس کے بارے میں مزید بتانے کو تیار نہیں۔ میرے بہت مجبور کرنے پر انہوں نے مجھے یہی بتایا کہ وہ کچھ کسی مالدار کے بے اولاد شخص کو دے دیا گیا تھا۔ وہ شخص کون ہے کہاں کا تھا اس بارے میں یونس بیگ مجھے کچھ کہی بتانے کو راضی نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ راز ان کے پاس امانت آتا ہے جسے وہ کسی بھی صورت نہیں بتائے گا۔ میم! آپ۔ کو خود اتار دے گا۔“ وہ کچھ جھجک کر بولا۔

”رضاکھو کر صاحب! اگر تم جیسے سمجھو اور کہو، ہوں تو آئرز کو ہر جگہ خود جا کر اپنا کام آگے بڑھانا پڑتا ہے۔“ وہ تلخی سے بولیں۔

”میم! میں بہت کوشش کر چکا ہوں، مگر اتنا ہے کہ اول تو وہ مجھے اس بچے کے بارے میں کچھ بھی بتانے کا مجاز نہیں۔ دو سہراہ بچے بالکل لاوارث۔“

”شٹ اپ! جیسے شٹ اپ۔ یو اینڈ۔“ رعنا حیات تڑپ کر چیخیں۔

”تم اور صبر کو کل کے دن بھی۔ کل فخر حیات کو ڈسپارچ کیا جا رہا ہے، کل شام جو بھی پہلی فلائٹ ملے گی اس پر میں پینڈی آ جاؤں گی۔ تمہاری ڈے ان میں کوئی بھی روم بک کرالو۔ لوگے۔“

”بس میم! وہ آہستگی سے بولا۔“

”اور سنو! اب اگر دوبارہ فون کرنا ہو تو میرے سیل فون پر کرنا اور کسی سے اس بات کا تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ تم کس کام سے پینڈی گئے ہو۔ انڈر اسٹینڈ۔“ وہ اسے ہدایت دیتے ہوئے بولیں۔

”بس میم! آئی انڈر اسٹینڈ۔“

”لوگے۔“ رعنا حیات نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

اسی وقت ملازم اندر داخل ہوا۔

”وہ جی نواز صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔“ اس نے اطلاع دی تو رعنا کو جیسے اندر تک کوئی چیز تلخ کر گئی۔ وہ ملازم کو گھورنے لگی۔

”جی کہہ دوں آپ گھر پر نہیں؟“ وہ جلدی سے گھبرا کر بولا۔

”نہیں۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور الماری کھول کر کھڑکی ہو گئیں۔ چند لمبے اوپر اوپر کچھ ڈھونڈتی رہیں۔

"یہ انہیں دے دو جا کر اور میرا پوچھتے تو کہہ دینا آرام کر رہی ہوں۔" نیلے ٹولوں کی ایک گڈی ملازم کو ہاتھ دے ہوئے وہ بولیں۔ وہ ٹوٹ ہاتھ میں لے کر باہر نکل گیا۔

"اور کس لیے ملنے آئے ہوں گے مجھ سے تمہاری زندگی ان کا یہی تو رشتہ رہا ہے۔" وہ کمرے میں ٹھلکتے ہوئے خود سے بولیں۔

اسی وقت پھر وہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"نہیں۔" وہ ٹھلکانا موقوف کر کے بولیں۔

"رعنا! تو آواز اس کے سامنے ٹوٹ ہاتھوں میں لیے کھڑے تھے۔

"کیا کم ہیں اور دوں؟" وہ کہتے ہوئے تیزی سے بڑھیں اور الماری کی دروازہ کھول کر مزید رقم نکالنے لگیں۔

"ہاں کرو اور کتنا مجھے زمین میں دھنساؤ گی۔" وہ ہاتھ میں پکڑے ٹوٹ سینٹرل ٹیبل پر رکھتے ہوئے مرہ لہجے میں بولے۔

"کیوں اس میں زمین میں دھنسانے والی کون سی بات ہے۔ یہ تو یہ ہیں جو بندے کو ہوا میں اڑاتے ہیں۔ آپ نے کیا یہ پہلی بار ہاتھ میں لیے ہیں جو اس کے بوجھ سے خود کو زمین میں دھنستا ہوا محسوس کرنے لگے ہیں۔" وہ طنز لہجے میں بولیں۔

"رعنا! یوں بات مت کرو مجھ سے۔ زندگی پہلے ہی ایک اذیت ناک بو ہو چکی ہے۔ اور یہ تمہاری باتیں مجھے پاتال میں گراتی جا رہی ہیں۔ میں تمہارا مجرم ہوں۔ اگرچہ میں نے کیا کیا بھی نہیں چاہا تھا۔ تم میرے بارے میں جانتی ہو پھر بھی۔" وہ بے بسی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"کاش سب جانتی ہوئی کہ آپ کا خون کس قدر بے وفا سنگدل۔

"تمک حرام ہو تمک حرام۔" وہ جلدی سے بولے۔

"مجھے اب اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔" وہ بے نیازی سے بولیں۔

"عفت آرا ہسپتال میں ہے۔" وہ چند ٹانگوں بعد پھر بولے۔

"رقم چاہیے علاج کے لیے ایسی لے تو دے رہی ہوں اور بھی ہے۔ کتنی کم ہے۔؟"

وہ تیزی سے الماری سے اور رقم لینے کو بڑھیں۔

"بلکہ آپ مجھے ایک ہی پارتیاؤں کہ آپ کو مجھ سے اور کتنا خرچ چاہیے۔ اس مہربانی کے عوض جو اور آپ نے آپ کی بیوی نے مجھ پر بھی فرمائی تھی۔ ایک بار ہی اس کا معاوضہ وصول کر لیجئے۔ کل خرچہ اتنا ہے۔ اس شخص کے سامنے بار بار آکر اس پچھیا کر مجھے مزید اس کی نظروں میں مت گرائیے گا۔ جتنا چاہیے مجھ سے آج ہی لے لیجئے۔ پر نہیں آپ کا ایک بار سے کب پورا پڑے گا۔ آپ تو مجھے قطرہ قطرہ آخری قطرے تک ٹھونک کر لٹا پیند کریں گے۔ جسم سے لہو کی آخری بوند تک ہے نا۔"

"رعنا! تو آزی برداشت جواب دے گئی تھی۔

"سچ کہہ رہی ہوں نا۔ اچھا مجھے ہسپتال جانا ہے الماری کے تمام لاکرز کھلے پڑے ہیں۔ کہتے ہیں تو چیک بک پر بھی سائن کئے دیتی ہوں۔ آپ کو جو چاہیے یہی رقم اس میں سے لے لیجئے مگر آئندہ ادھر مت آئیے گا۔ مت آئیے گا۔ میرے زخموں کو اوجھڑنے میں آپ کو کیا مزہ آتا ہے۔ کیسے بھائی ہیں آپ بار بار میرے زخموں میں منجر کھونٹے چلے آتے ہیں۔"

وہ دُور دُور سے کہتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئیں تو آواز آنکھوں میں آنسو لیے شکستہ قدموں سے اس کے پیچھے باہر نکل آئے۔

"میں کیسے اسے اپنی ندامت اپنی بے بسی اور مجبوری کا یقین دلاؤں۔"

کو تھی کا پھانک عبور کرتے ہوئے وہ سوچ رہے تھے۔

"بیلو۔۔۔ بیلو۔۔۔ کون۔ شاہ بی۔۔۔ جی میں عین تارا ہوں۔ آواز بالکل نہیں آ رہی۔ لائن پار پار ڈراپ ہو رہی ہے۔ بیلو۔۔۔"

عین تارا ریپور کان سے اگائے زور زور سے بول رہی تھی۔ اسے سلطان بخت کی آواز بہت جلدی بہت دم ستانی آ رہی تھی۔ وہ پوری توجہ سے انہیں سننے کی کوشش کر رہی تھی۔

"نئی میں ٹھیک ہوں آپ ٹھیک ہیں۔" دوسری طرف کی آواز اور بھی کم ہو گئی۔

"کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟" وہ اور اونچا بولی۔ "کیا مصیبت ہے بالکل آواز نہیں آ رہی۔ میں بند کر رہی ہوں دوبارہ کریں یا میں کرتی ہوں۔" انہوں نے جو اہا "فون بند نہ کرنے کو کہا۔"

"مجھے آواز نہیں آ رہی۔" وہ بے بسی ہو کر بولی۔ دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

"میرا یونین تارا اب آواز آ رہی ہے۔" اب اسے کافی صاف آواز آئی تھی۔

"جی ہاں ہے آپ کیسے ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ شاہ جی اب تو میں آپ کی شکل بھی بھولتی جا رہی ہوں۔ کب آپمیں کے والیں؟" وہ رو دینے کو تھی۔

"اگلے ہفتے بدھ کی رات عین جے جے کی فلائٹ ہے میری۔"

"کیا واقعی۔" وہ خوشی سے چیخ پڑی۔

"ڈاکٹرز نے سفر کی اجازت دے دی۔ آپ جاتی آرہے ہیں؟" وہ بے یقینی سے بولی۔

"ہاں بھی نہیں آ رہا ہوں۔ ڈاکٹرز نے اجازت دے دی ہے تو آ رہا ہوں نا۔"

"سدا حالاً جو رہی آپمیں کے نا؟"

"میں اسلام آباد آ رہی ہوں دو تین دنوں کا کام ہے۔ کچھ دن لگ جائیں گے۔"

"میں شاہ جی کے علاوہ بات ہے۔ آپ سیدھا ادھر آئیں لاہور میرے پاس۔" وہ اصرار سے بولی۔

"نہی! اجاں اتنا صبر کیا ہے وہاں دو چار دن اور نہیں کر سکتیں۔ اسلام آباد میں بہت ضروری کام ہیں اسی لیے تو جلدی بھی آ رہا ہوں۔"

"کیا الیکشن ہو رہے ہیں؟" اسے پتا تھا شاہ جی کے لیے پیسہ اور سیاسی ساکھ سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

"کہہ بھی سکتی ہو اور نہیں سکتی۔ سینٹ کی سیٹ پر الیکشن ہے۔ بلا مقابلہ ہی کھڑا ہوں۔ بابا جان کی خاندانی سیٹ ہے۔ چند ضروری بندوبست کروانے ہیں۔ اس کے فوراً بعد ادھر پور جانا ہے پھر انشاء اللہ تمہارے پاس آؤں گا۔"

وہ اسے بار بار کراہتا رہے تھے۔ عین تارا پر اوس پڑ گئی۔

سب سے آخر میں۔ کس چیز کا بدلہ لے رہے ہیں آپ مجھ سے۔" وہ تڑپا تھی۔

"سب سے آخر میں نہیں سب کاموں سے فارغ ہو کر بالکل ریٹائیکس موڈ میں اپنی سویت ہارٹ کے پاس پھر تمہیں یہ گلہ نہیں رہے گا کہ ابھی آئے لو اور ابھی چل دیے۔ پورا ایک ہفتہ رہوں گا۔ اس کے بعد سیدہ آپنی کے دونوں بچوں کی شادیاں ہیں۔ اگلے مہینے کے اختتام پر ان تقریبات کی لمبی مصروفیات ہوں گی۔"

"شاہ جی۔ میں۔۔۔ شادی میں شرکت کروں گی۔" وہ اپنی خواہش زیادہ دیر تک دل میں دیا نہ سکی۔

"لو کہ عین تارا اب رو آئی سے کل تمہیں کال کروں گا پھر وطن آکر ہی قصیدہ "یات ہو سکتی۔ ٹیک کیسے تیار ہائے۔" سلطان بخت نے اس کی خواہش کو سرا سر مان سنی کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔

عین تارا بوجھل دل کے ساتھ صوفے کی بیک سے سر ٹکا کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ آج کل یوں بھی بیٹھے بیٹھے اس کا سانس پھولنے لگتا تھا۔ باہر آنا جانا تو اس نے آج کل بالکل موقوف کر رکھا تھا۔

اسی وقت پھر فون کی بیل بج اٹھی۔

"گلتا ہے مشاورتی کو میری حتمی کا احساس ہو گیا ہے جو فوراً ہی پھر فون کر دیا ہے۔" اس نے جلدی سے آنکھوں کے نم کو شہا تھہ کی پشت سے صاف کیے اور ریپور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

"ہیلو۔۔۔ اوہ لیزی کرل۔ کیا سوری تھیں؟" دوسری طرف عبدالعزیز تھا۔
"اوہ۔۔۔ یہ تم ہو۔" اس نے کہا سانس لیا۔

"کیا مشاورتی کا فون آتا تھا جو میری آواز سن کر جھٹکا لگا ہے۔" وہ فوراً بولا۔ منہ پھٹا تو وہ بہت ہی تھا۔
"ایسی کوئی بات نہیں۔ مشاورتی سے ابھی بات ہو چکی ہے میری۔"

"گلتا ہے انہوں نے وہاں کوئی چوتھا یا تینواں یا چھٹا سا ٹواں بیاہر چلا لیا ہے جو جا کر آنے کا نام نہیں لے رہے۔ مجھے ان کا ایڈریس لکھواؤ۔ اگلے ہفتے میرا اس انجیلس میں شو ہے ذرا سن گن تولے کر آؤں تمہارے بیمار مجازی خدا کی۔"

"اس کی ضرورت نہیں وہ اگلے ہفتے آرہے ہیں۔" عین تارا جلدی سے بولی۔

"مبارک! پھر تو پیشگی۔"

"مصدقہ یو۔" وہ پچھلے لمحے میں بولی۔ "تم سناؤ کیسا چارہ ہے تمہارا نور؟"

"اچھا۔"

"صرف اچھا۔"

"نہیں بہت زبردست ہے لیکن۔" وہ رکا۔

"لیکن کیا؟"

"چتا نہیں عین تارا! کیا بات ہے دو چار دن سے طبیعت بڑی بوجھل ہی ہے اور کل رات سے تو اس قدر ڈپریشن ہے کہ جی چاہتا ہے ارد گرد کی ہر چیز کو جس جس کر ڈالوں یا سب کو اک لگا دوں یا کہیں سے چھپا کر ڈھیر سا مارا دوں۔" وہ زیادہ دیر تک اپنی کیفیت چھپانے لگا۔

"کیوں ایسی کیا بات ہے؟" عین تارا اچھی چوٹی۔

"چتا نہیں مگر کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ یوں لگ رہا ہے جیسے کچھ ہونے جا رہا ہے یا ہونے والا ہے یا ہو چکا ہے۔ عین تارا! میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔ میوزک کے شور میں لوگوں کی ہا ہو جی واپک میں مجھے رونے دھونے عین کرنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ میرا دل بہت پریشان ہے۔" وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔

"اوہ! عین تارا کچھ پریشان ہی ہو گئی۔" ہوم سک، ورہے ہو۔"

"نہیں کوئی پہلی بار تھوڑی کیا ہوں۔"

"تو واپس آجاؤ اور اپنے کمرے کو آ جا کر شاید ان کی طرف سے خدا نخواستہ کوئی پریشانی ہو۔"

"واپس کیسے آ جاؤں کنٹریکٹ کیا ہے۔ ابھی تو میویارک میرس نہ جانے کدھر کدھر بھٹکتا ہے۔ ڈسٹائی باہ کائنات ہے۔ عین بھی ہو سکتے ہیں۔" وہ تھکا تھکا سا کہہ رہا تھا۔

"کیا محسوس ہوتا ہے؟" عین تارا ہمدردی سے بولی۔

"جو محسوس ہوتا ہے وہ کہہ تو چکا ہوں۔ ویسے اب جی کا بوجھ کچھ ہلکا محسوس ہو رہا ہے۔ تم سے بات جو کر لی ہے۔" وہ پچھلی ہی مسکراہٹ سے بولا۔

"تم اپنے کمرے فون تو کر لو مولی!"

"اوہ فون کہاں ڈرا بیٹے کی کوئی بھی تصویر نہیں۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"جو کسی کو دکھ دیتا ہے مسکون اسے بھی نہیں ملتا شاید۔" وہ بڑبڑایا۔

"کیا۔ کیا۔" عین تارا نے سنا نہیں تھا۔

"کچھ نہیں۔"

"اے فجر سے یا کسی بلازم سے کوئی چا کر پنا کر آئے۔"

"نہیں رہنے دو۔ میں کوشش کر رہا ہوں جلد آنے کی۔"

"اور ہاں نام تم سے سخت تھا ہے۔" عین تارا کو یاد آیا۔

"اسی وہ کیوں؟ ابھی کچھلے ہفتے تو میری میڈم سے بات ہوئی ہے۔"

"نام تمہارے کھڑکی تھیں۔ ایک بچہ کئی ان کی گاڑی تمہارے گھر کے قریب ہی کہیں خراب ہو گئی۔ انہوں نے سوچا تمہاری گاڑی جو کیراج میں کھڑی ہے وہ جا کر لے لیں گی مگر تم تو لگتا ہے کارڈ کی پوری فوج ہی گھر کے گرد الٹ کر واگئے ہو۔ تمہارے کارڈ نے مانا کو اندر ہی نہیں جانے دیا۔ آخر ایسا کون سا خزانہ دمن کر کے ہو جو اس قدر حفاظتی اقدامات ضروری تھے۔"

"وہ وہ۔" وہ ہنسا۔ "یار ایسی کوئی بات نہیں۔ اصل میں میں اوپر سے بھی ماڈرن نظر آؤں مگر وہ تو مولوی کا بیٹا تھا۔ گھر کے معاملے میں ذرا کنزرویٹو بے چارے جلیل کو چودھواں سن لگا اور وہ وہ۔" بھول کر گھر کی ڈیوڑھی پار کر جانا تو ایسا صاب مار مار کر اس بے چارے کا بھر کس نکال دیتے تھے۔ سمجھو وہی تنگ نظری میرے اندر لاشعوری طور پر پچھلے گاڑ کر بیٹھ گئی ہے۔ ویسے فون دوج تو کوئی نہیں صرف دو کارڈ ہی تو ہیں۔ وہ بھی چوکیدار کے نکتے پن کی وجہ سے رکے تھے۔ میں کہہ دوں گا ان سے میڈم کے بارے میں۔"

"نام خود تم سے بات کریں گی اور تمہاری نکال بھی لیں گی۔"

"شوق سے لیں مگر میرے آنے کے بعد سارے کے اب اجازت دو۔ شو کا نام ہونے والا ہے۔ فریش ہونے کے لیے کچھ لینا ہوں۔ دو راتوں سے شو ز اور اس ڈپریشن کی وجہ سے سو نہیں سکا پائے۔"

"تم پھر ڈر کر لو گے۔" عین تارا نے ہنسنے لگی۔ "مگر اس نے فون بند کر دیا تھا۔"

"آخر تمہارا جلد کب پورا ہو گا اس سوال کی شہ نشینی کا۔"

زور رکھ کر خطرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اندر داخل ہوئی تھی۔

"اب کیا ہو گیا؟" وہ سخت بیزار ہی سے بولی۔

"مجھے کیا پتا تھا تم نے جو ان ہو کر مجھے یہ سنا دینے ہیں تو میں تمہارے پیدا ہونے کی آرزو ہی نہ کرتی۔ اس برصاے میں میں دو چار ہزار کے لیے دھکے کھاتی پھوں۔ تم جو یہ مشقت کی مصیبت پال کر بیٹھ گئی ہو۔" زیور گل نے اس کے برصے ہونے کی طرف اشارہ کر کے نفرت سے کہا۔

"نام اچھے جو کہنا ہے پورا نہیں مگر میرے ہونے والے سب کے بارے میں ایک حرف نہیں۔" وہ غرائی۔

"بڑا دردناک ہے ابھی سے اس منحوس اولاد کے لیے۔" عین تارا نے بھی تو دیکھو، ہمیں ان ہی ناز نوروں سے پالا تھا۔

کیا اس دن کے لیے کہ اس برصاے میں تمہاری منتیں کرتی پھوں۔ پروڈیو سوز سے ساری امیدوار کھڑی اسامیوں سے جھوٹ بول بول کر میرا منہ شیرھا ہو گیا ہے کہ تم ہانگ کاٹل گئی ہو، کبھی سنگ پور اور کبھی لندن۔"

"تو مت بولیں جھوٹ باتیں سچ سب کو۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ میں نے کوئی گناہ کیا ہے جو چھپاتی پھوں۔" وہ تڑخ کر بولی۔

"پہلے تو سچ اپنے اس سید زادے کو تو پتا پھر اگر مجھ سے آنکھیں پھا کر نہ ناہ مانے گا کہ تیرے پیٹ میں ایک طوائف زاوی کے بطن میں اس کا پائیز خون پروان چڑھ رہا ہے۔ بھی بھی نہیں۔ مان گیا تو اگر میرے منہ پر تھوک دینا ہے بال و صوب میں سفید نہیں کے میں نے۔" زیور گل ہنریانی انداز میں چلا رہی تھی۔

"کتنی رقم چاہیے آپ کو؟" عین تارا تحمل سے بولی۔

"جتنی بھی مل جائے میرے اکاؤنٹ میں اب پھونٹی کوڑی بھی نہیں چاہیے تو پتا کرو الو اور گھر میں راشن تک نہیں۔" وہ رکھائی سے بولی۔

”مام! اتنا جھوٹ بولیں جو آپ کی عمر کی کچھ تواریج رکھ سکے۔ خیر اشرف کو بھیجیں میں چیک لکھ دیتی ہوں۔“
 ”دس ہزار کا بیس ہزار کا بس۔“ زبور گل چلائی۔ ”میرا اب ان خیرات کے چند روپوں میں گزارا نہیں ہوتا۔
 ستا تم نے اس دن کے لیے میں نے تمہیں جو ان کیا تھا کہ نکلے نکلے کے لیے تمہارے آگے ہاتھ پھیلاؤں۔“
 ”میرے پاس جو کچھ ہے میں وہی دوں گی۔ آپ نے اپنے بھسپے کے آسرے کے لیے میری پرورش کی تھی
 تا اس کے اخراجات جمع سو میں چکا چکی ہوں اور اب میں بھی اپنے آنے والے بھسپے کے لیے کوئی آسرا چاہتی
 ہوں اولاد کی شکل میں۔ کیا یہ میرا حق نہیں۔ اب پلیز مجھے آرام کرنے دیں۔“ سرو مہری سے کہتے ہوئے بیڈ پر
 لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

”یہ کیوں ترکی طرح دو چار دن آنکھیں بند کر لو۔ جس دن اس سلطان بخت نے دھکے دے کر نکالا۔ وہ تے، صو تے
 میرے پاس آؤ کی یاد رکھنا۔ اس دن زبور گل بھی تمہیں پناہ نہیں دے گی۔ وہاں باقری لڑکی۔“ زبور گل غصے سے
 بل کھاتی باہر نکل گئی تو عین تارا آنکھوں پر بازو رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔



”اماں دبی! جویریہ قرآن پڑھتی اماں جی کے پاس آئیں۔ انہوں نے متورم آنکھوں سے اپنے دیکھا مگر بولیں
 کچھ نہیں۔“
 ”اماں دبی! چھوٹی آبی کے بغیر کھرتا سونا سونا لگ رہا ہے۔ او اس ڈیران سے کھتے کھتے رک گئی۔
 ہوں۔“ ”سورہ مہم زم زبیر اب پڑھتے ہوئے انہوں نے آیت پر ذرا سہارا لگ کر کہا۔

”صبح سے بڑھ راتی ہیں۔ اب بس کریں تھک جائیں گی۔“ وہ ان کے کندھے دبا تے ہوئے بولی۔ انہوں نے
 پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ آنکھیں سطوں پر دوڑتے دوڑتے بھیگ گئیں۔

”اماں دبی! اس نے ان کے کندھے پر اپنا چہرہ ٹکا دیا۔“ چھوٹی آبی ان کی طرف سے ہاتھ پھینک کر
 خفا رہتی تھی۔ کتنے دنوں سے یونہی چپ چپ سی تھی۔ کسی سے بات بھی نہیں کرتی تھی۔ چنانچہ شام کے
 اپنے یوں چلے جانے کا پہلے سے علم ہو گیا تھا۔ ایسی چپ سا دھلی تھی اس نے۔ اس کے باوجود اس کی کئی زیادہ
 محسوس ہو رہی ہے۔“ جویریہ اداسی سے بولا۔

”کتنی راتیں کی دن رات پڑھتی رہتی ہیں۔ آپ کی طبیعت بھی اچھی نہیں۔“ چند لمحوں بعد وہ پھر بولی۔
 ”تو اور کیا کروں؟“ انہوں نے قرآن پاک بند کر دیا۔ ”اور کسی بھی طرح تو سگھو نہیں سکتا اس کی یاد اس کی
 صورت بھلائے نہیں بھولتی اور وہ کیا اتنی جلدی بھلائے جانے کے قابل ہے۔ مگر وہ بھی نہیں تو معصوم چہرے کو
 چھوٹے سے دوپٹے کے ہالے میں چاند کی طرح نکالے ہاتھ میں نورانی قاعدہ پکڑے منہ بسورے کھڑی ہے۔ مجھے
 بابا صاب سے نہیں پڑھنا بابا صاب مارتے ہیں مجھے بابا صاب سے ڈر لگتا ہے بابا صاب۔“ اماں جی کہنے لگی
 چکیوں سے رونے لگیں۔

”اماں جی! نہ روئیں بابا صاب آنے والے ہیں۔ کل رات کو بھی وہ جویریہ کے رونے پر کس قدر خفا ہوئے تھے
 کہ شرع میں صرف تین دن کا سوگ ہوتا ہے صرف عورت اپنے شوہر کا سوگ چار مہینے دس دن تک منا سکتی
 ہے۔ اس کے علاوہ اور کسی کا سوگ جائز نہیں۔“ آمنت ماں کے رونے کی تو اسن کر جلدی سے اندر آکر ان سے
 پٹینے ہوئے بولی۔

”انہوں نے تین دن بھی کیا سوگ منانے دیا ہے، قل تک تو بے چاری کے کرنے نہیں دیے۔ کہتے رہتے
 تھے۔ بتاؤ کون سی حدت میں یہ قل ختم چالیسواں ثابت ہے۔ کوئی چالیسواں کوئی برسی کچھ بھی تو تین دن میں درج
 نہیں۔ جو پیدا ہوتا ہے اس کا جانا اٹل ہے۔ وہ خدا کی امانت ہے اور امانت لوٹا دینے پر کیا سوگ، ایسی جیل و
 جنت۔ کوئی صبح سے شام تک تھیلیاں نہیں پڑھے گا نہ کوئی جمعرات نہ گیارہواں آلیسواں۔ امام بخاری کی تینوں
 جلدیں اٹھا کر کھول لو، کہیں ان بدعات کا ذکر نہیں جو ہم نے اپنی زندگی کے معمولات میں شامل کر لی ہیں۔“ جویریہ

ہاتھ مسلتے ہوئے دکھی لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”سچ کہتے ہیں تمہارے بابا صاب! اماں جی نے ایک گہرا سانس بھرتے ہوئے اپنی آنکھیں صاف کیں۔
 ”اور سب لوگ کو دیکھا کیسے دلی دلی باتیں کر رہے ہیں کہ دیکھو تو مولوی صاحب اپنے گھر کے لیے کتنے سیانے
 ہیں۔ دو سہروں کے ختم قل پر کیسے دغوتیں اڑانے جاتے تھے اور اب اپنے گھریات آئی تو کیسی شرع تفسیریں نکالی
 ہیں۔ دو سہروں پر فتوے جڑتے تو شرع کا خیال انہیں کبھی نہیں آیا۔ بریائی کی دیکوں اور قورسے کی ڈشوں پر ہاتھ
 صاف کرتے تو بھی حدتوں کا خیال نہ آیا اور اپنی با۔۔۔“

”ہم نے کیا حق ادا کیا زینب کا وہ تشنہ لب اس دنیا میں آئی اور ناکام حسرتوں کا ماتم کرتی چلی گئی۔ ہم تو اسے ایک
 نام کا اچھا کھانا بھی اللہ کے نام پر نہیں بھیج سکے۔ وہ زندگی بھر اچھی چیزوں اچھے لباس اچھے کھانوں کو ترستی چلی گئی
 اس کے مرنے کے بعد بھی بابا صاب نے ایسا کچھ نہیں کرنے دیا۔ برسوں مسجد میں کھانا بیچنے لگی تو کہنے لگے۔

”مہینہ سوا مہینہ کھانا کپڑے مسجد پہنچاؤ گی تو باقی کی عمر تو سوا مہینہ تمہارے کھانوں کے انتظار میں بھوکا ہی رہے گا۔
 اڑنے کا ناظر! موت ان چیزوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ بھوک تو ہم زندوں کی احتیاج ہے۔ ہمارے ہی گلے کا
 ملوک اور بیٹ کا دل نہ جو بیٹے ہی بھگتا پڑتا ہے۔ مردوں کو ان جمعرات کے کھانوں سے کچھ غرض نہیں ہوتی۔“
 آمنت آہستہ آہستہ صوفی صاحب کی مسجد میں نماز عصر کے بعد کی تقریر سن رہی تھی جو اس نے آخری زینے پر
 کھڑے ہو کر سنی تھی۔ شاید وہ اللہ جل جلالہ کے اعتراضات کا منہ بند کرنا چاہ رہے تھے۔

”دورست کہتے ہیں تمہارے بابا صاب۔ وہ ان چیزوں ان ضرورتوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ خود تو چلا جاتا
 ہے بس پیچھے رہ جانے والوں کو مار جاتا ہے۔ زینب! تم مجھے کیوں نہیں نظر آتیں میری بیٹی! یہ تمہاری جانے کی
 عمر۔“

اماں جی پھر سے وہ چٹ میں منہ پھینکا کر رونے لگیں کہ صوفی صاحب کے بیڑھیال چڑھتے قدموں کی آواز پر
 انہوں نے بے اختیار اپنی سیدوں کا کاٹا کھینچ لیا۔

”جاؤ باپ کو پوچھو جا کر میرا پوچھیں تو کہنا سو رہی ہیں۔“ اماں جی کرٹ پٹینے ہوئے جلدی سے بولیں۔
 آمنت اور جویریہ نے دکھ بھری نظروں سے ماں کو دیکھا کہ وہ اب جی بھر کر روئیں گی اور صبر تو آتے آتے ہی آتا ہے۔
 ”بابا صاب! آپ کے لیے چائے لائیں۔ آمنت باہر آکر بولی۔ وہ تخت پر ہی بیٹھ گئے تھے۔
 ”نہیں۔“ انہوں نے غماز لگا کر تخت کے سرہانے رکھا اور ٹانگیں اوپر رکھ کر ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے
 آہستہ آہستہ گرانے لگی۔ آمنت اور جویریہ چپ چاپ اندر کمرے میں جا کر بیٹھ گئیں۔

”عبدالرحمن! عبدالرحمن! کو میں نے گھر سے نکال دیا۔ اس کے باوجود میں زمانہ کے سامنے پیمان بن کر ڈٹا رہا۔
 بیٹی! چھوٹی ہے۔ بیٹی۔ اور بیٹی بھی زینب جیسی جسرا نے زندگی بھر مجھ سے ڈانٹ ہی کھائی۔ کبھی مجھے دل سے
 خوش نہ کیا۔ میری ضد میں ہمیشہ ہر الٹا کام کیا۔ وہ چلی گئی ہے تو مجھے لگتا ہے میں اندر سے ڈھکے گیا ہوں بالکل ٹوٹ
 پھوٹ کر رہ گیا ہوں۔ وہ میری مہ جوگی کا خیال کیے بغیر کیسے گھر بھر میں چمکتی پھرتی تھی۔ ہر قرآن ہر ضد کیسے
 دھڑلے سے میرے منہ پر کہہ دیا کرتی تھی۔ جبکہ اسے معلوم تھا کہ میرا اس کا بے بس باپ اس کی چھوٹی سے
 چھوٹی جائز خواہش بھی پوری کرنے کے قابل نہیں پھر بھی۔ پھر بھی اس بے وقوف نے خواہش سے اپنا تانا
 توڑا بلکہ اور شہوٹ کر لیا۔“ وہ تسبیح کے دانے کو اٹھوٹے اور انٹلی کے سچ پکڑے سوچے جا رہے تھے۔

”اور خواہش کڑی کا وہ جالا بنو بظاہر بے ضرر مگر موت کا سا طاقت ور اور مضبوط جس کے اندر ایک بار جو پھنس
 گیا پھر اس کا پچھا محال ہوتا ہے۔ زینب بھی خواہشوں میں گھٹ کر مر گئی۔ میرے اللہ۔ یہ تیری کسی تقسیم ہے۔
 تو نے کیوں انسانوں کے نصیب اتنے جدا جدا بنائے۔ بیٹے مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کے دکھ ان کی جدائی نے مجھے
 کبھی یوں دکھی رنجیدہ نہ کیا اور زینب میں نے عزت بچالی زینب گنواوی پھر کیوں دکھی ہوں۔“ وہ سر اٹھا کر
 غمگین نظروں سے اوپر دیکھنے لگے۔

”وہ یوں رخصت نہ ہوتی تو اس نے ویسے بھی تو آج اس نذیر کے ساتھ رخصت ہو ہی جاتا تھا۔ بیٹیاں تو ہوتی ہی رخصت ہونے کے لیے ہیں مگر وہ رخصتی ایسی تو نہ ہوتی تھی بے رحم اتنی داغی۔“

”صوفی عبدالرحمن! تم نے ایک بیٹی تو ایسے رخصت کر دی! کیا باقی دونوں کو بھی ایسے ہی رخصت کرو گے؟“

کوئی ان کے اندر وحشت بھری آواز میں بولا۔ وہ تڑپ کر سامنے کمرے کی طرف دیکھنے لگے۔

ان کے دائیں بازو اور سینے کے دائیں حصے میں تیزی سننا ہٹ ہوئی اور ایک پل کو انہیں لگان کا دایاں حصہ آنکھ لگرون ہاتھ بازو انگلیاں سب مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں۔

انہوں نے ایک جھٹکے سے اپنا سر ہلایا۔ بازو جھٹکا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اسی وقت کلثوم بی بی بیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی انہیں دیکھ کر سلام کرتے ہوئے جھک کر راجہ بی بی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”آمنہ! ہر نکل کر دیکھو بیٹا! تمہاری ماں کے پاس کلثوم بی بی کو ہی انہوں نے آمنہ کے رشتے کے لیے کہہ رکھا تھا۔ ان چار بیٹیوں میں اس نے اور اس کے بیٹے نے صوفی صاحب کے گھرانے کی بڑی دلجوئی کی تھی۔ پہلے وہ ان کو تین وقت کا کھانا بھی ادا ہری سے آتا رہا تھا۔ کلثوم بی بی نے انہوں نے نظروں سے نیچے جاتے صوفی صاحب کو دیکھا اور راجہ بی بی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔



رجحان حیات کا بیڑی جانا بھی بے فائدہ رہا۔

یونس بیگ نے بتایا کہ اس بچے کو ٹھیک تین ماہ بعد سلمان سبزواری نامی کوئی بزنس مین اڈاپٹ کر کے لے گیا تھا۔ اس کا ایڈریس جو یونس بیگ نے رجحان حیات کو دیا تھا جب وہ اپنی ایڈریس پر پہنچیں تو پتا چلا وہ شخص آج سے پانچ برس پہلے ہی اپنا سارا کاروبار اور گھر پارچ کر سٹی چلا گیا تھا۔ بچہ اس کے ساتھ ہی تھا۔ ساری باتیں اس علاقے کے ایک پرانے رہائشی نے بتائی تھی۔ پھر لاکھ کوشش کے باوجود رجحان حیات سلمان سبزواری کے بارے میں اور کچھ بھی نہ جان سکیں۔

تیسرا دن تھا جب وہ فخر حیات کو سوپ پارٹی تھیں۔ جب ملازم کارڈ لیس اٹھائے فخر حیات کے پاس آیا۔

”سر! کسی سلیمان سبزواری کا فون ہے۔ آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔“ رجحان حیات کے ہاتھ سے سوپ کا پیالہ گرتے گرتے پچان کا مٹی چاہا کارڈ لیس خود بچپٹ لیں۔

”کون سلیمان سبزواری میں نہیں جانتا۔ فون بند کرو۔“ فخر حیات نے بیزاری سے کہا تو رجحان حیات کارڈ لیس کی طرف جھپٹیں۔ انہوں نے ریسیور کان سے لگایا۔ وہ سری طرف لائن بے جان ہو چکی تھی۔ انہوں نے دھواں دھواں نظروں کے ساتھ اس بے جان آئے لے کر دیکھا۔



”آپ جانتے ہیں یہ۔ یہ کون ہے؟ سلمان سبزواری!“ رجحان نے کارڈ لیس کان سے ہٹا کر فخر حیات سے بے تاب پوچھا۔

”نہیں۔“ انہوں نے بے تاثر لہجے میں جواب دیا۔

”تو پھر اس کا فون کیوں آیا تھا آپ کے لیے؟“

”مجھے کیا معلوم کوئی رنگ نمبر مل گیا ہو گا۔“ وہ کچھ جھٹکا کر لے۔ بیماری نے انہیں چڑھا کر دیا تھا۔

”کیا کہہ رہے تھے یہ صاحب! کہ کس سے بات کرنی ہے۔“ رجحان فخر حیات کو چھوڑ کر ملازم سے بات کرنے لگیں۔

”جی انہوں نے یہی کہا تھا کہ فخر حیات صاحب ہیں تو میں نے کہہ دیا تھی ہیں۔“ ملازم جلدی سے بولا۔

”بھئی میں اسے نہیں جانتا۔ میں تو یہ نام بھی پہلی بار سن رہا ہوں۔ آخر تمہیں کیا دلچسپی ہے اس شخص میں۔ اور تمہیں ہٹاؤ میرے پیچھے سے۔“ وہ بے زاری سے بولے تو ملازم نے مستعدی سے آگے بڑھ کر تکیہ ان کے پیچھے سے نکال دیا۔ ان کے سینے کے زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے تھے اس لیے وہ ابھی زیادہ مل جل نہیں سکتے تھے۔

رجحان چھپے ہٹ کر صوفی پر بے دم سی ہو کر بیٹھ گئیں جیسے کسی نے ان کے جسم کی ساری توانائی چوڑی ہو۔

”منزل قریب آتے آتے دور ہو جاتی ہے۔ میرے اللہ! میری ماما کا اور کتنا امتحان باقی ہے۔“

رجحان کا بی جاپا اپنے گھٹنوں پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں ٹھنڈا کرتے کرتے بھی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ کچھ بے درپے ہونے والے غیر متوقع واقعات اور کچھ بیٹے کے ملنے یا نہ ملنے والی کیفیت نے انہیں بہت زور دینا کر دیا تھا۔ بات بات پر آنکھ بھر آتی تھی۔

”اب کیا سوچنے لگیں؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ آنکھیں جھپکتے ہوئے آنسو پینے کی کوشش کرنے لگیں۔

”تم نے مجھے جنتاں کی موت کا کیوں نہ بتایا؟“ چند لمحوں بعد فخر حیات بولے۔ ”کوئی بڑی قربانی دے گئی وہ۔ میری ذات پر ایسا احسان کر گئی جس کا میں اسے کوئی بدلہ بھی نہیں دے سکتا۔ اس کے کوئی آگے پیچھے بھی نہیں جس کی کفالت کرنے میں اس احسان کا کچھ بوجھ ہی کم کر سکوں۔“

وہ آہستہ آہستہ بول رہے تھے اور رجحان کا بی جاپا خوب چیخ کر اس مظلوم صورت منکار جنتاں کا کارنامہ بتائیں۔ کس طرح اس نے ان کی گود اجاڑ کر ان کے گھر کی خوشیاں بریاد کیں مگر پھر اس طرح انہیں اپنے اس مکروہ فعل کا بھی بتانا پڑتا جس کے رد عمل میں جنتاں نے ان کی گود اجاڑی تھی۔ یہی سوچ کر وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گئیں۔

”تم کہاں کوئی ہوئی؟“ فخر حیات نے دعویٰ عدم توجہی محسوس کر کے بولے۔

”کس نہیں۔“ وہ بے ادبی سے بولیں۔

”میں گھر میں پڑ گیا ہوں۔ تم میری شمارہ لیس سے عاجز آ گئی ہو۔“ وہ چند لمحوں بعد خود تری کی کیفیت میں گھر کر بولے۔

”تھکوتو یا تمیں نہ سوچیں اس طرح آپ کو بہتر ہونے میں مزید تاخیر لگے گا۔“ رجحان نے کچھ مشینی انداز میں ان کی دلجوئی کی بھی دور نہ اس وقت وہ سوہر کا دل بھالنے کے موڈ میں قطعاً نہیں تھیں۔

”کسی دینے کا شکر۔“ فخر بھی بیوی کا انداز سمجھ کر طنز لہجے میں بولے۔

”فخر! ایک بات ہوں۔“ رجحان نے فخر حیات کے طنز پر غور نہیں کیا۔

”میں۔“ وہ آنکھیں بند کر کے بولے۔

”کیا۔ کیا آپ کو بھی خیال آتا ہے؟“ وہ کچھ ہرجوش سی ہو کر سیدھی ہوئیں۔

”کس بات کا؟“ وہ اسی طرح جہند آنکھیں کیے بولے۔

”اگر ہمارا بیٹا ہمیں مل جائے! اگر وہ۔“ وہ اٹھ کر ان کے قریب چلی گئیں۔

”ایک بار لے پا لک کے ہاتھوں زندہ بیچ گیا ہوں۔ اپنا بیٹا شاید یہ رعایت بھی نہ دے۔“ وہ تکی سے بولے۔

”اوسوں فخر! ہمارا بیٹا ہمارا اپنا بیٹا۔“ وہ محبت سے ان کے ہاتھ کے بال ستارے ہوتے بولیں۔

”کون سا ہمارا بیٹا؟“ انہوں نے اچھ کر آنکھیں کھول دیں۔

”ہمیں کون سے اللہ نے دس بیٹے دیے تھے۔ ایک ہی تو بیٹا ہوا تھا بھول گئے کیا؟“ وہ رنجیدہ ہو کر بولیں۔

”یعنی اولاد کو بھی کوئی بھول سکتا ہے مگر یا میں برس رجحان! ایسا کچھ بھی بھلا دینے کو مست ہوتے ہیں۔“ سمجھو میں بھی بھول گیا۔“ وہ آہ بھر کر بولے۔

”مگر میں تو نہیں بھولی۔ ایک لمحہ ایک پل بھی نہیں بھولی۔“ ان کی آنکھوں میں پھر سادہ اترنے لگا۔

”جی! جویریہ سہراٹھا کر دیکھنے لگی۔

”تم مجھے اب بڑی آبی نہ کہا کرو، صرف آبی کہہ لیا کرو۔ تمہاری پھولی آبی تو چلی گئی اب کون سی۔“ اسے اس سے بولا ہی نہیں گیا۔ گلے میں آنسوؤں کا کولہ سا انگ گیا تھا۔ جویریہ بھی ڈبڈبالی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی تو وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

زہنب کے جانے کے بعد تو اس پھولے سے گھر میں اور بھی سنائے کو بچنے لگے تھے۔ خاموشی اور وحشت بھی صحیح کراچی موہو گی کا اعلان کرنے لگی تھی۔ اماں جی کی حالت بھی اسے کچھ اتنی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ دونوں سے تو ان کی دو ایسے ہی ختم ہو چکی تھی، تو ایک آواز کوئی آواز نہیں رہی تھی دیکھنے کی کوشش بھی کرتی تو وہ لپٹے سے انکار کر دیتیں۔ ان کے تمام جسم اور خصوصاً پیرے پر سو جن دن بدن بڑھتی جا رہی تھی اور وہ مستقل غنودگی میں رہنے لگی تھیں۔

آمنہ نے باہر آکر گرم چائے کے تین چار گھونٹ بے دلی سے پیتے اور اٹھ کر اماں جی کے پاس آئی۔ وہ جاگ رہی تھیں اور دروازے کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔

”اماں جی! آپ کھانگ رہی تھیں نہیں تھوڑی دیر پہلے دیکھ کر گئی تو آپ سو رہی تھیں۔“ وہ ان کو یوں بیٹھے ہوئے دیکھ کر لہجے کو شائش بنا کر بولی۔

”کیا جاگنا کب سوتا تب ایک برابر لگتا ہے۔“ وہ ایک سرد آواز بھر کر بولیں۔

”اماں جی! آپ ڈاکٹر کو دکھائیں مجھے آپ کی طبیعت اچھی نہیں لگ رہی۔“ وہ ہلے ہولے ان کے ہاتھ اور بازو دباتے ہوئے بولی۔

”ڈاکٹر کی آغوش سے تمہارے پاس۔“ یہ کہتے ہوئے لپٹے میں بولیں تو آمنہ نظریں پر آگئی۔

”ہو جائے گی جیسی بھی تھی طبیعت دو چار دن میں بخیر ہو جائے گی۔“

”جب تک مائل جانے تک سب سے پہلے گھر میں آنا ڈالیں اور ضرورت کا وہ سراسمان ڈالنے کے بارے میں سوچنا۔ مجھے اب میرے حال پر چھوڑ دو۔“ وہ اپنی اب مجھ پر کچھ اثر نہیں کریں گی۔“

”اماں جی! ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کر رہتی ہیں۔“ وہ شکوہ بھرے انداز میں بولی۔

”نہیں میری بیٹی! یہ مایوسی نہیں۔ اچھے حال پر عمل طور پر قانع ہو جانے کی کیفیت ہے۔“

”کیا مطلب؟“ آمنہ کو ان کی بات سے ٹوٹ سا محسوس ہوا۔

”زہنب۔“ وہ کہیں۔ ”زہنب کو گئے آج کتنے دن ہو گئے۔“ وہ اچانک بولیں۔

”اماں جی! اس کی آنکھیں بھر آئیں۔“ اماں جی! جانے والوں کو اتنا نہیں سوچا کرتے آپ کی طبیعت بھی۔“ اس کا دل تو پہلے ہی بھر بھر آ رہا تھا۔

”تم بہت بہادر ہو اپنے باپا صاحب کی طرح۔ زندگی کا مقابلہ ڈٹ کر کیا جاتا ہے ہتھیار ڈال کر نہیں۔“ وہ اس کی طرف بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔

”اماں جی! وہ پریشان ہو گئی۔ آنسو پونچھ کر انہیں دیکھنے لگی۔“ میں اتنی بہادر نہیں ہوں اور اگر پہلے تھی بھی تو اب نہیں رہی۔ بہت ڈرنے لگی ہوں میں۔“

”تم جویریہ کا بہت خیال رکھنا اور اپنا بھی۔ ادھر زہنب تو اکیلے ہی ہے نا، وہ تم دونوں سے زیادہ ڈر نوک تھی۔ اندھیرے میں مٹی کو دیکھ کر چیخنے لگتی تھی۔“ وہ جیسے اپنی آنکھوں کے سامنے ڈری کسی زہنب کو دیکھ رہی تھیں۔

”اماں جی۔“ آمنہ کچھ تیز آواز میں بولی۔ ”خدا کے لیے اماں جی! ہمیں اور نہیں ماریں ایسی باتیں کر کے ہم تو پہلے ہی۔“

”تمہارے باپا صاحب چلے گئے؟“

”جی!“

تین شفٹوں کے آئینے میں سے صرف ایک شفٹ میں کام ہو رہا تھا۔ بچوں کی تعداد بھی دن بدن اسکول میں کم ہوتی جا رہی تھی۔ کسی بھی کلاس میں پندرہ سے زیادہ بچے نہیں تھے۔ ٹیچرز بھی بدل ہو چکی تھیں۔ دو ٹیچر تو یہ اسکول چھوڑ کر کسی دوسرے اسکول میں چلی گئی تھیں۔ این جی او کے ہیڈ آفس سے اسکول کی تنخواہوں کا چیک آئی نہیں پارہا تھا۔

اسکول کا اکاؤنٹ بالکل خالی تھا۔ آمنہ بھی کسی دوسرے اسکول میں جا ب کرنے کا سوچ رہی تھی مگر دوسرے سب ہی اسکول ان کے گھر سے کافی فاصلے پر تھے۔ دوسرے معلوم نہیں صوفی صاحب سے اجازت دیتے یا نہیں۔ وہ خود آج کل خاصے اچھے ہوئے تھے۔

”کیا بات ہے باپا صاحب! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا بازو میں تکلیف ہے کیا؟“ اس بار جو انہوں نے فور سے بازو بٹھا کر آمنہ رہ نہ سکی۔ اٹھ کر ان کے پاس چلی آئی اور ان کے پاس کھڑی ہو کر نرم لہجے میں پوچھنے لگی۔

”اں نہیں کچھ نہیں۔“ وہ بری طرح سے چوٹے۔

”میں آپ کا بازو دبا دوں۔“ اسے ان کی تکلیف کا سوچ کر ہی پریشانی ہو رہی تھی۔

”نہیں ڈرو تو نہیں ہے۔“ وہ ٹانگیں نیچے لٹکا کر بیٹھ گئے۔

”تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایسے لگتا ہے جیسے سن ہو گیا ہے۔ عجیب سی سننا ہے ہی ہونے لگتی ہے اس میں۔“ وہ اپنے جوتے سیدھے کر کے بیٹھے لگے۔

”آپ کسی ڈاکٹر کو دکھائیں نا۔“ وہ تشویش سے بولی۔ ”کافی دنوں سے ہے آپ کو یہ تکلیف۔“

”ہوں ٹھیک ہو جائے گا خود ہی۔“ وہ جوتے پہن چکے تھے۔

”کہاں جا رہے ہیں؟“ آمنہ کو ان کی پریشان صورت بے چین کر رہی تھی۔

”آرڈر ٹینسل کرانے کی کوششیں کر رہا ہوں ابھی میرا ایک سال باقی ہے۔ حالانکہ وائرس ڈاکٹر ٹیسٹ آفس کے دونوں بڑے افسر میرے شاگرد رہ چکے ہیں۔ ایک پار میں ان سے کل کرائی عرصی پیش بھی کر چکا ہوں مگر اب چنٹ بھی جاتا ہوں چہ اسی ملنے ہی نہیں رہتا کہ دیتا ہے سر میٹنگ میں جس یا وہ ابھی آئے ہی نہیں۔ سوچ رہا ہوں

صفر صاحب کے گھر جا کر مل لوں۔“ وہ پر سوچ انداز میں جیسے خود سے شوروہ کر رہے تھے۔

”آپ کا کیا خیال ہے چہ اسی جھوٹ بولتا ہے یا ایسا اپنے افسر کے کہنے پر کہتا ہے؟“ آمنہ کو ان کی افسر کے گھر جانے والی بات اچھی نہیں لگی تھی۔

”چنانچہ دونوں ہی باتیں ہو سکتی ہیں۔ بہر حال اس وقت تو مجھے غرض ہے وہ جو بھی کہیں مجھے ماننا پڑے گی۔“

”آج کل دفتروں کا کچھ ایسا چلن ہو گیا ہے اگر آپ چہ اسی کو کچھ دے دلا کہ میرا مطلب ہے۔“ آمنہ ان کی غصیلی نظروں سے گزیرا گئی۔

”میں چلتا ہوں تم اپنی ماں کو دیکھو جا کر۔ مجھے پھر اس کی طبیعت اچھی نہیں لگ رہی۔ دو اتو باقاعدگی سے دے رہی ہوتا؟“ وہ جاتے جاتے بولے۔

”جی وہ تو دے رہی ہوں۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔ اب وہ انہیں کیا بتاتی کہ ان کی آدمی سے زیادہ دو اتو لگتی

دونوں سے ختم ہے۔

”آپ دوپہر کے کھانے تک آجائیں گے؟“

”معلوم نہیں کوشش کروں گا۔“ وہ کہتے ہوئے سیڑھیاں اتر گئے تو آمنہ سوچ میں پڑ گئی۔

دوپہر کے لیے تو آج بھی نہیں ہے۔ آج صبح بھی جویریہ نے کنستریجھا ڈگریہ چار روٹیوں کا آٹا نکالا تھا۔ وہ ایک گراسٹس لے کر بیٹھی۔

”بڑی آبی! آپ نے ناشتہ نہیں کرنا کیا؟“ وہ صرف اپنا ناشتہ دیکھ کر بولی۔

”نہیں میں صرف چائے لوں گی اور جویریہ۔“ وہ جاتے جاتے رکی۔

”جنا کر گئے کہاں گئے ہیں؟“

”ای سرکاری دفتر اپنی ریٹائرمنٹ کے آرڈر تبدیل کروانے بہت پریشان تھے۔“

”انہوں نے تم سے اپنی پریشانی منہ سے لئی؟“

”جی۔ تو کچھ نہیں سمجھی۔“

عبدالمتین بڑا بیٹا ہونے کے علاوہ لائق ذہین اور فرمانبروار بھی تھا اس لیے ان کی آنکھ کا تارا تھا پھر اسے بھی ان کی بھرپور توجہ اور محبت کی ایسی چاہت ملی کہ وہ ان کی نظموں میں خوب اچھا بچنے کے لیے بہت لگن سے پڑھتا اور آتا اور۔ کوئی پتہ نہ تو لائق تھا۔ عبدالمتین کی طرح ہشیار۔ وہ ان کی ساری شایاخی وصول کر لیتا۔ نئے عبدالصعبین کے حصے میں کچھ ہی نہ آتا۔ کچھ وہ شرارتی بھی بہت تھا۔

بابا صاحب کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اس کے حصے ذہن نے دوسرے طریقے سوچ لیے۔ صوفی صاحب کھر میں داخل ہوئے تو وہ ان کی باتوں سے لپٹ جاتا۔ وہ بڑے دھمکتے وہ کندھے سے جھول جاتا وہ پھر جھٹکتے تو وہ ان کا تمام کھول دیتا۔ وہ اسے جھڑکتے تو وہ تمام یا ان کی سچی یا گھڑی اٹھا کر بھاگ لیتا۔

صوفی صاحب جو عبدالمتین کے ساتھ محبت بھری آنکھوں میں ملے ہوتے عبدالصعبین کی شرارتوں پر نہیں ہونگے اور اسے ڈانٹنے ڈپٹنے اور مارنے پیٹنے میں لگ جاتے۔ یوں وہ ان کی توجہ حاصل کر ہی لیتا۔ ”راہِ عملی کی بہت لگن سے انداز میں بول رہی تھیں۔ وہ ماضی کے اس گھٹے وسیع آئین میں اپنے بچوں کے دورانی صوفی ہوتی تھیں۔“

”انہیں اس کی معصوم شرارتیں بھی شیطانیاں اور بے ادبیاں نظر آتیں۔ وہ کسی زبردستی کی توجہ دینے کے لیے سبق سے بھی بھاگتے لگا۔ اسے باپ کا چار تو تہ ملا ان کے دل میں اس نے ایک مستقل بڑ کی جگہ حاصل کر لی۔“ وہ سانس لینے کو رکھیں۔

عبدالمتین لائق اور ذہین تھا مگر جب اس نے شہر جا کر لوگوں کی برائیوں اور دکھائی دیکھی تو محض بابا صاحب کی محبت پانے کے لیے خوب محنت کرنے کا شوق اسے فضول سا لگنے لگا۔ وہ ان برائیوں کی طرف متوجہ لگا۔ اسے ماں باپ سے چھوٹے چھوٹے جھوٹ بولنے کا فن آئے آگاہ۔ میں نے صوفی صاحب کو خبردار کیا مگر ان کا دل عجیب جو ایسا جو دانے ایک بار سی کے بارے میں طے کر لیتے تھے۔ پھر کسی جگہ بھی کہنے اس میں رد بدل نہیں کرتے

عبدالمتین کے دل میں والدین اور گھر کی محبت کا رنگ پھینکا پانے لگا۔ وہ ان سے فرار اور اونچے درجے کی کامیابی حاصل کرنے کے طریقے سوچنے لگا۔ عبدالمتین کو واپس لایا جاسکتا تھا۔ اگر صوفی صاحب اس کے بدلے ہوتے تو وہ ہنگ بچان کر اسے واپسی کا احساس دلانے کی کوشش کرتے اپنے رویے میں تھوڑی سی چٹک پیدا کر لیتے۔

اسی چٹک اسی وسعت کی ضرورت عبدالصعبین کے معاملے میں بھی تھی۔ وہ شدید اور سرکش تھا مگر جب عبدالمتین اور نافرمان نہیں تھا۔ شروع شروع میں صرف باپ کی توجہ پانے کے لیے ان کی مرضی کے خلاف کام کرتا پھر انہیں چرانے کے لیے کہ شاید بابا صاحب کچھ جائیں مگر ماں بھی صوفی صاحب نے پہلی رائے کو حسی قرار دے دیا۔ جو وقت کے ساتھ تبدیل نہیں ہوتے وقت انہیں خود بدل دیتا ہے۔

بہت کی فطرت بھی بڑی حد تک عبدالمتین کی طرح تھی۔ اسے تو محبت توجہ پیار اور من پسند چیزیں سب ایک ساتھ چاہیے تھیں اور اس میں وہ بھی کامیاب نہ ہوتے یا انتظار کے لیے تیار نہ تھی۔ بڑا ہر حد تک جانے کا اہتمام کرتی کہ شاید اس کی آرزوؤں کی شہوان ہو سکے۔ یہ سب رویے صوفی صاحب کے انتہائی رویے کی ضد میں پیدا ہوئے۔

عبدالمتین کو اس کی من پسند دنیا مل گئی پکا چوند کرتی ہوئی تو اس نے صوفی صاحب کی سنگلاخ صحبت سے کنارہ کشی نہیں ہی خالی تھی۔ عبدالصعبین تو تقاضا ہی شروع سے ایسا ان کی ضد میں مرضی کے راستے پر چل پڑا۔ صوفی صاحب کی ہیشن گویاں سچ ثابت کر کے لیے اور زہن بے صبری اور بے وقوفی کی وجہ سے اپنی خواہشوں کے

عبدالمتین کو اس کی من پسند دنیا مل گئی پکا چوند کرتی ہوئی تو اس نے صوفی صاحب کی سنگلاخ صحبت سے کنارہ کشی نہیں ہی خالی تھی۔ عبدالصعبین تو تقاضا ہی شروع سے ایسا ان کی ضد میں مرضی کے راستے پر چل پڑا۔ صوفی صاحب کی ہیشن گویاں سچ ثابت کر کے لیے اور زہن بے صبری اور بے وقوفی کی وجہ سے اپنی خواہشوں کے

اندھے جال میں پھنس کر رہ گئی۔ آخر تک وہ بہت کچھ پالنے کی امید لگانے بیٹھی تھی اس لیے واپسی کا سہنے مل سکا۔ اس سے پلٹنے کی کوشش کی ورنہ تو بڑے بڑے کناہ کرنے والے بھی توجہ کر کے مذاب کی دلدل سے نکل جاتے ہیں۔ ایک میرے بچے ہیں۔ وہ پچھلے پچھلے کر رہے لگیں۔

”تمہارے بابا صاحب کا ایک ہی اصول تربیت تھا الف سیدھا۔ وہ انسانوں کو بطور انسان قبول نہیں کرتے تھے۔ انہیں تو بالکل سیدھی راہ پر کامزن نیک کامیاب فرما دینا یعنی فرشتے فرشتے درکار تھے۔ انہوں نے کسی کے لیے بھی چٹک نہیں رکھی۔ کسی کو بھی پلٹنے کا معافی مانگ لینے کا معذور گزار کاموقع نہیں دیا۔ پہلا اور آخری فیصلہ سنا ڈالا۔ خود بھی ٹوٹ گئے میرے بچوں کو بھی تباہ کر دیا۔“

”اب سے میرے پیارے دن میں اتنی اتنی تھی کب ہے اتنا تجربہ اگر اسلام اسی خبر ہی تلووار کے زور پر پھیلنا ہوتا تو آج مسلمان مٹھی بھر تعداد میں بھی نہ ہوتے۔ میرے پیارے اللہ نے توجہ دینا سچا مسلمان دن اتنا اپنی دلوں میں لھر کرنے کے لیے ہے۔ اس کا لب لباب سناؤ یہ خود خود دلوں میں اترنا چاہتا ہے جیسے خشک سوکے پودوں کو پانی اور خود خود پھولوں کی رنگ میں اتر کر پودوں کو دیکھتے ہی دیکھتے ہر ابھرا کر دیتا ہے۔“

ایسا ہی ہے میرا اسلام ایسا ہی ہے میرا دین۔ یہ تو خود خود دلوں میں اتر جانے والا ہے۔ صوفی صاحب کو اللہ نے اتنا علم دیا مگر انہوں نے ہمارا علم نماز روزے قرآن مجید مکتب کے احکام پر سختی سے عمل کرنے تک محدود کر دیا۔ ان چار پانچ حدوں سے باہر تو کسی کو سانس لینے کی بھی اجازت نہیں دی۔ دیکھو کیسے میرا آشیانہ بڑھ گیا پھر بھرا کھ نسل خالی ہو گیا۔ میرے شیر جوان اپنے میری شیرازوں ہی تن بان والی زہن میں ان تینوں کو نہ دیکھوں اور جیتی رہوں سانس لیتی رہوں کیسے۔ میری بیٹی۔ وہ ہلکے ہلکے کر رہے لگیں۔

”ارے کہاں گئے سب لوگ۔ آمت بھی لو اب۔ بس۔“ ماں ہر سے کٹھنوں کی بی بی شاش آواز اندر آئی تھی۔ ماں نے خط لکھی ہے۔ اسے انا چھوڑنے سے رٹا لگا۔ ابھی پٹنگ سے نچے اتر آئی۔

”اسلام کلمہ معالیٰ ہے۔ بس آتے آتے آپ کو بے آرام کیا۔“ وہ اپنی چادر کی ہٹل کو اوڑھ لیا کرتے ہوئے بے تکلفی سے بولیں۔

”تو علیکم السلام ایسی کوئی بات نہیں آتے کا اپنا گھر ہے۔“ ماں ہی خود کو سنبھال چکی تھیں۔ متورم چہرے پر چٹکی سی مسکراہٹ ملاتے ہوئے بولیں۔ ”آمت کٹھنوں کی بی بی کو سلام کر کے باہر چلی گئی۔“

”آمت! خالہ کے لیے چائے بناؤ۔“

”نہ بہن! اس وقت چائے نہیں میں تو منہ ہٹھا کرنے آئی ہوں۔ ایسی خوش خبری لائی ہوں کہ صوفی صاحب سانس کے تو مجھے ہلے سے بہن مان لیں گے۔“ وہ خوب اونچا اونچا بول رہی تھی۔ جو یہ بھی گھر سے باہر نکل کر

آتا اعلیٰ رشتہ اپنی آمت بیٹی کے لیے لڑکا سمجھو شہزادہ آسمان سے اترتا ہے سیدھا۔ آپ کی نیک طبیعت بیٹی کے لیے صورت سیرت سب میں یکساں۔ شہر کے پوش ترین علاقے میں گھر ہے۔ اپنا کاروبار کچھ گاڑی سب کچھ۔ سمجھو آپ کی تو لاٹری نکل آئی وہ بھی گھر بیٹھے صوفی صاحب کہاں ہیں انہوں نے آج شام کو ہی آنا ہے۔ لڑکا بھی ساتھ آئے گا صوفی صاحب خوب تسلی کر لیں۔ وہ ہیں کہاں؟“ وہ نان اسباب بولتے ہوئے رہیں۔

آمت تو اپنی جگہ سن ہی کھڑی رہ گئی تھی۔ جو یہ یہ کی بھی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ اس خبر پر وہ کس کیفیت کا اظہار کرے اس گھر سے تو دنوں سے خوشیوں نے منہ موڑ رکھا تھا۔ وہ تو خوشیوں کا استقبال کرنا بھی بھول چکے تھے۔ دونوں بس ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔



”نامہ۔ ماں سے ویری گڈ نیوز آئی ایم سوہی۔“ ہمیں نار ااپنے گھر سے جو فیملی آواز میں کہتے ہوئے باہر آئی تھی۔ اس کا چہرہ کسی اچانک مل جانے والے خوشی کے احساس سے تھم رہا تھا اور سانس اچھی خاصی بے

ترتیب ہو رہی تھیں اور آج کل وہ جس بے ہنگم وجود کے ساتھ پھر رہی تھی۔ زیور گل کو تو اس کی طرف دیکھتے ہوئے بھی سخت کوفت ہوتی تھی یا تو اس کا پارہ ہانی ہو جانا یا بیٹھے بیٹھے لی لو ہو جانا اور ابھی اس کوفت زدہ حالت میں مزید ڈیڑھ دو ماہ گزارنے تھے۔

”اب کیا ہو گیا؟“ زیور گل کے لیے میں زمانے بھری بیزار رہی رہی۔ ”تمہاری گڈ نیوڈ ملنے میں تو ابھی ڈیڑھ دو ماہ کا طویل عرصہ ہے۔“ وہ ایک گہرا سانس لے کر بولی۔

زیور گل رات کے کھانے کے لیے ملازم کی نگرانی میں ڈائٹنگ ٹیبل سیٹ کروا رہی تھی۔ آنا تو کسی خاص مہمان نے نہیں تھا مگر کوئی ابھی سکنا تھا ”کھل کوئے“ کے دروازے زیور گل کے شناساؤں کے لیے دن بھر تو ایسا رات بھر بھی کھلے رہتے تھے۔

”شاہدتی آرہے ہیں۔“ وہ کرسی پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولی۔
”وہ تو میں کئی ماہ سے سن رہی ہوں اس میں گڈ نیوڈ والی کون سی تو کئی بات ہے۔“ وہ بیچ کائے ہلٹھوں کے دائیں بائیں سیٹ کرتے ہوئے اسی انکراہٹ بھرنے انداز میں بولی۔

”گوٹھوں مام وہ لاہور آرہے ہیں۔“ اس نے سامنے گئے کاک کو دیکھا۔ ”ابھی پندرہ بیس منٹ میں پہنچنے والے ہیں۔ آپ کھانا ان کے آتے ہی لگوا دیجئے گا۔ میں ذرا تیار ہو جاؤں۔“ وہ اپنے پیچھے کھانے کے تسلیوں بھرے لباس کو دیکھتے ہوئے فوراً ”انٹھ کھڑی ہوئی۔

”تو وہ کھڑی آن بیٹی۔“ زیور گل کا بچے رکھتا ہاتھ ایک لحظے کو شلوار سے ہٹا کر اپنے جینس کی جیب سے نکال کر دیکھا۔ ”مہم چاہے جتنی مرضی تک سے تیار ہو جاؤ شاہدتی کو بھانپا تو میں جھوٹوں کی دنیا میں ابھی بھی مجھ سے روکنا ہوتے ہیں۔“ وہ لاطعلقی سے کہتے ہوئے اپنے ہاتھ کی سیٹ کر رہی تھی ”اور تمہارے شاہدتی نے کھانا تو لیا ابی تک میں بیٹا اس لیے ان کا انتظار فضول ہے اور مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ میں کھانا لگوا رہی ہوں مہم کو آنا ہوتا تو اس سے پہلے۔“ وہ اس بات سے کلاما زوم کو آواز دے رہی تھی۔

”مہم مام کو تو خدا بپا نے کیا میرا ہو گیا ہے میرے ساتھ ہر وقت اکٹھی رہتی ہیں جیسے میں کوئی دنیا کا شرم ناک ترین فعل انجام دیتے جاری ہوں جیسے خود تو ماں بنی نہیں تھیں میں آسمان سے اتر کر ان کی گود میں آسانی تھی۔“ نین تارا پر ہونے والے ہونے والے کے اجنبی رویے پر کھستی۔ اپنے کھینے میں تیار ہونے چل دی۔

آج کل تو یوں بھی اس کے سارے خوبصورت ڈریسز بے کار ہونے لگے تھے۔ انٹھوں میں ڈھیلے ڈھالے لباس سے اسے سلوانے پڑے تھے۔ لباس کی ٹوٹا سورتی تو جسم کی خوبصورتی سے نمایاں ہوتی ہے اور اس کا جسم آج کل اپنی چال بھی بھولا ہوا تھا۔ کوئی لباس اس پر کیا جاتا تھا۔

وہ باہر آئی تو اس نے گولڈن اور ڈارک براؤن کلر کا ٹائٹ سا بلوس زیب تن کر رکھا تھا گولڈن اور براؤن لائٹنگ سے ایک اور لائٹ بیچنگ چوہا لہری میں اس کے چہرے کی چمک بڑھ گئی تھی۔ سامتا کے نور نے اس کے چہرے کو مقدس سا پیش دیا تھا وہ نظر لگ جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔

زیور گل نے کن اکھیوں سے نظر بھر کر دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ نین تارا ڈائٹنگ ٹیبل کی پیچھے بیٹھ گئی اور کلاس میں پائی ڈال کر گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ سارا ہوش اب گھبراہٹ میں تبدیل ہو چکا تھا۔

”گر مام کے خدشے درست ثابت ہوئے تو۔“ نیملے گھونٹ کے حلق سے پیچھے جاتے ہی اسے خیال آیا۔ شاہ جی کے غصے کی تہا سے خبر تھی۔ کیسا خوف ناک غصہ آتا تھا انہیں مگر انہوں نے یہ حق خود یا تھا مجھے پورے ہوش و حواس کے ساتھ پھر وہ کیوں غصہ کریں گے۔“

”نادان لڑکی آباد شاہ صفت لوگ مہمان ہوں تو ایسی مہربانیاں ان کمزور لمحوں کی گرفت میں آکر کرنی جایا کرتے ہیں۔ یہ تو۔“ اسے باہر کسی گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی تھی۔
اسی وقت ملازم گرم گرم بھاپ اڑاتے اشتہا انگیز کھانوں کی ڈشز ٹرے میں رکھے چلا آیا۔ نین تارا کو غصہ تو

بہت آیا۔ مام و س منٹ مہر نہیں کر سکتی تھیں۔ زیور گل صوفے سے اٹھ کر اپنی نشست پر آئی تھی اور ملازم کو کھانا ٹیبل پر رکھتے ہوئے کچھ بے مہربانی سے دیکھنے لگی۔

”میرے خیال سے شاہدتی آگئے۔“ زیور گل میں کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی تھی۔ نین تارا بے چینی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی پھر پلٹ کر بیٹھ گئی۔ زیور گل بھی کی بے چینی کو دیکھتے ہوئے ملازم کو گرم پچھتایاں اور چاول لانے کی ہدایت کرتے ہوئے سلاؤ ٹوٹنے لگی۔ نین تارا کے کھانے دل کی کوئی بات نکل درست تھی۔

سیاہ ڈنرسوٹ میں اپنے دراز قد اور شاندار پرستانہی کے ساتھ سید سلطان بخت ڈائٹنگ روم میں داخل ہو رہے تھے۔ باہر کی صحت افزا فضاؤں نے ان کو جیسے اور بھی پر کشش بنا دیا تھا۔ بھری بھری سی ذرا سی باہر تھقی تو نند جو یہاں سے جانے سے پہلے محسوس ہوتی تھی۔ اب بالکل عائب تھی۔

شانے اسی طرح مضبوط اور تیز ہوئے تھے۔ کپڑوں پر ہلکے ہلکے سفید بال روشنی میں آتے ہی نمایاں ہو کر اٹھیں کچھ اور گریں فل بتا رہے تھے۔ آنکھوں میں چھینکی سی چمک تھی جو ان کے چہرے کا خاصا کئی اور خلاف معمول داخل ہوتے سے چہرے پر مسکراہٹ بھی تھی جو نین تارا کو سامنے دیکھ کر مزید بھل گئی تھی۔

”آہ آداب شاہدتی! اتنی دیر لگا دی۔ میں تو کافی دیر سے انتظار کر رہی ہوں۔“ نین تارا کو ان سے عجیب سی شرم اور گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ سارا اعتماد و خصلت ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ دل تو خیر بے ہنگم طریقے سے دھڑک ہی رہا تھا۔ اسے اپنی پیشانی سے بھی پسینہ پھوٹا محسوس ہو رہا تھا۔

”نہیں دیر تو نہیں ہوئی۔ میں تو۔“ وہ خوش دلی سے کہتے ہوئے آگے بڑھے اور فقہرہ مکمل کرتے کرتے رک گئے۔ زیور گل فریڈز مش اپنی پلیٹ میں نکلتی ترچھی نظروں سے سلطان بخت کے چہرے کے بدلنے والے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھی۔ دل تو اس کا بھی کچھ اور اسے اپنا اڑاؤ میں دھڑک رہا تھا مگر وہ خود کو بے نیاز پوز کر رہی تھی۔

نین تارا اتنا ہی کے استقبال کو کھڑی ہو چکی تھی۔ پورے وجود اور قد کے ساتھ اس کا قد تو اتنا ہی تھا مگر وہ۔ سلطان بخت کی نظروں میں پرکشش رک گئی تھیں۔ انہیں لگا وہ جیسے بھڑکتے شعلوں کی زد میں آگئے ہیں۔ ان کے پورے جسم پر جیسے چوٹیاں سی رہنے لگیں۔ سر کا درجہ حرارت ایک دم سے اوپر چڑھتا محسوس ہوا تھا۔ دل تو نیملے بھی اپنی دگر بیا سے ملنے کی خوشی میں خوب ترنگ میں دھڑک رہا تھا مگر اب اس کے دھڑکنے کی رفتار میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

”یہ۔۔۔“ وہ لاطعلقی انداز میں اشارہ واضح طور پر نین تارا کے ہونے پیٹ کی طرف تھا۔ وہ تو فریڈز مش اسٹارٹ پر کشش نین تارا سے ملنے آئے تھے بلکہ اپنے سفر کی تمکناں اس کے دل پر بدن کی تڑپ سے ملنے میں کم کرنے آئے تھے مگر یہاں تو انہیں سب کچھ ہی بدلا بدلا بلکہ بہت کچھ بدل جانے کا اعلان کرنا محسوس ہوا۔

”یہی تو وہ خوش خبری تھی شاہدتی! جو میں آپ کو۔“ فون پر بتانا۔ چاہ رہی تھی۔ س۔ سر براؤن۔“ وہ کچھ ڈری ڈری کچھ خوشی سے شیلی کا پتی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”تو یہ تھا تمہارا سر براؤن۔“ وہ کسی نوتی چٹان کی طرح تڑپے تھے۔
”آہ۔۔۔ آپ آئیں تو بیٹھیں نا۔ میں۔۔۔“ نین تارا کی گھبراہٹ ان کے انداز دیکھ کر بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے اپنے ہاتھ اور ناک میں واضح طور پر کا پتی محسوس ہو رہی تھی۔

”تو تمہیں نام بھی وہی زیور گل طوائف کی بیٹی۔ دے دیا بیوت اپنی کلاس اپنی ذہنیت کا مگر تمہارے اس ڈرامے کے فریب میں میں نہیں آنے والا۔“ نین تارا اہم خود کو دھوکا دے سکتی ہو مگر مجھے نہیں۔ آئندہ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔“ وہ پھونکارتے ہوئے کہہ کر پلٹے اور قد موں کی دھمک پیدا کرتے باہر جانے لگے۔

نین تارا کو پہلے تو ان کا لب و لہجہ پھر ان کی بات سمجھنے میں کچھ وقت لگا اور جب بات سمجھ میں آئی تو اس کے گویا ہاتھوں کے طولے اڑ گئے۔ اس نے اڑی اڑی رنگت سے اطمینان سے کچھ کچھ سلاؤ کھاتی ماں کو دیکھا جو کندھے

اپکا کر جیسے کہہ رہی تھی۔ ”دیکھا میں نہ کستی تھی۔“ ”میں تارا ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کر آیا اور تقریباً دوڑتے ہوئے باہر نکلی۔“

”شاہی... شاہی... آپ اس طرح نہیں جاسکتے۔ آپ اس طرح کیسے جاسکتے ہیں۔ میں نے اسے ماہ مہر مر کر آپ کا انتظار کیا ایک ایک صبر آزمائے کو اپنے اوپر گزرتے محسوس کیا اور آپ۔“ وہ ان کے خوشبو لٹاتے دھندلے کپاس آکر رہ گئی ہوتی آواز میں بولی۔ وہ اس کے سامنے کسی آہنی چٹان کی طرح کھڑے تھے۔

”مجھے بے حد افسوس ہے کہ میری نظروں نے تمہارا انتخاب کیا تھا۔ میں تمہیں تمہاری کلاس سے الگ کچھ منفرد سمجھا تھا مگر نہیں تم کیسے اپنی کلاس سے الگ ہو سکتی ہو۔ ایک رات کالا کھوں کمانے والی اتنے مہینوں کا خسارہ کیسے برداشت کر سکتی تھیں۔“ وہ چہچہایا کر نظروں میں نفرت لیے بول رہے تھے۔

”شاہی! آپ میری توڑیں کر رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں یہ خدا نخواستہ کوئی غلط یا ناجائز نہیں۔ یہ آپ کا اپنا جائز بچہ ہے۔“ وہ پوری طاقت جمع کر کے بولی۔

”گت آپ۔“ ان کا مشہور ہاتھ فضا میں اٹھا مگر نین تارا کے چہرے کے پاس آکر رک گیا۔

”آئندہ یہ بات تمہاری زبان پر آئی تو تمہاری زبان میں گدی سے کھینچو آؤں گا سنا تم نے۔“ وہ خوشخوار شیرکی طرح غرائے تھے۔

”کیوں بچی بات ہے اس لیے بھول گئے۔ آپ شاہی! سب کچھ بھول گئے۔ میرا پیار میری محبت میں۔“ وہ ان کی گوت کی آستین تھام کر بے اختیار رونے لگی۔

”بھولا ہو تانا دواہر آتاتی کیوں۔ میں تو اسی پیار اسی محبت کی تلاطم میں ادھر آیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا تم نے شخص چند دنوں کے انتظار کے بعد اپنے بھوکے جسم پر ”فٹار سیل“ کا ٹیکہ کر چکا کر خود کو ہی نہیں مجھے بھی اپنی نظروں میں کتنا گرا دیا ہے۔“

”شاہی! یہ بھوت ہے بہشتان ہے۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔“ وہ اب باقاعدہ رو رہی تھی۔

”میں غلط سوچ رہا ہوں اور تم غلط ترین کر گزریں پھر بڑے فخر سے اسے میرے ”کھاتے“ میں شمار بھی کروا لا۔ میں واہ دیتا ہوں تمہاری جرات کی۔“ ان کی نگاہوں سے اجنبیت اور غیرت کے شرارے نکل رہے تھے۔

”شاہی...“ وہ چیخی۔ ”آپ مجھ پر اتنا گندہ الزام مت لگائیں یہ سب کچھ میں نے اپنے آپ سے پوچھ کر آپ کی اہواز سے۔“

”میں تارا!“ وہ اتنی زور سے دھارے کہ گیت پر کھڑا چونک کر اپنی گن سیدھی کر کے ادھر دیکھنے لگا۔ ”اپنے جسم کی دکان بھرنے بازار میں جانے کی میں نے تمہیں اجازت کب دی تھی۔“

”شاہی! یہ ”توقف“ بازار کا نہیں آپ کی محبت کا ہے۔ بھول رہے ہیں یا میرے ساتھ بھولیں گاؤرامہ کر رہے ہیں۔ بھول رہے ہیں تو یاد کروانے دیتی ہوں۔ جب آپ جانے سے پہلے مجھے اپنے ساتھ واہی سوات لے کر گئے تھے اپنی بہن کے گھر سے بھاگ جانے کا تم غلط کرنے کے لیے اس وقت آپ نے اپنی خوشی سے میری یہ ”خوشی“ پوری کی تھی۔“

”کیوں اس بند کرو اپنی دو ٹکے کی طوائف زادی ہو تم۔“ وہ بہن کے نام پر تڑپ اٹھے تھے۔ ”بہت سن رہا تھا تمہاری یا رسائی کے قصے اس بازار کی گویے کے ساتھ دن رات پیار کی جھلکیں بڑھاری تھیں۔ مجھے وہاں بیٹھے تمہارے سارے کارناموں کی خبریں مل رہی تھیں۔ سترے مزید پیسے ہتھیانے کے چکر میں تم مجھ پر یہ گھنیا ہمت تھوپنے کہ بجائے خود ان پر زور ڈالو اور اطمینان سے بیٹھ کر سوچو تمہارے اس غلط ”تھے“ کا صحیح حقدار کون ہے۔ یاد آجائے تو جا کر اس کے گلے پڑنا نہ یاد آئے تو کسی بے وقوف دولت مند آشنا کو بلیک میل کر لینا اور نہ کوئی ایسا بے وقوف سستے چڑھے تو اس کے باپ کا کوئی خوبصورت سا فرضی نام سوچ کر سارے جگہ میں اس کے

مرحوم ہو جانے کا باعث و راہیت ڈالنا“ یہی تمہارے لیے ستر ہے۔ ایڈر اسٹینڈ اور آئینہ مجھے مشرب نہیں کرنا“ ان سے میرے اور تمہارا۔ اسے جدا جدا لکڑیاں۔“ ان کے لیے تو یہ محبت شامالی گویا ایک کمزور دھاکا تھا جسے انہوں نے ایک جھٹکے سے توڑا اور جھٹک کر آگے چل دیے۔

”شاہی! شاہی!۔ آپ بھلے مجھ سے اسے راتے جدا کر لیں مگر اس بچے کو آپ کو اپنا پاپے گا۔ یہ آپ کا بچہ ہے۔ مجھ سے نہیں اپنے دل سے پوچھیے۔“ آپ کا دل سب جانتا ہے یوں جھوٹ بول کر آپ اپنا واسن چھڑا کر نہیں جاسکتے۔ یہ آپ کا بچہ ہے آپ کا جائز۔ ہمارے پیار کی نشانی۔ شاہی! خدا کے لیے مجھے یوں ٹھوکر مار کر نہ جائیں۔ میں برباد ہو جاؤں گی۔ نہ اپنے بھری نظروں میں مجھے یوں تو اٹھائیں کہ جائیں شاہی!۔“ وہ ان کے گوت کا کون پکڑے بے قابو ہو کر رونے جاری تھی۔

”بند کرو یہ ڈرامے بازی! اپنی ماں سے اچھی ایکٹرو ہو۔ اس ”دھندے“ سے فارغ ہو جاؤ تو بڑھاپے کے لیے اس ایکٹنگ سے مزید چارپے بنا لینا مگر آئینہ مجھ سے کانٹہ کھٹ کرنے کی کوشش نہ کرنا سنا تم نے۔“

وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھے۔ گاڑی میں بیٹھے اور زمین پر پھینک کر مار کر بیٹھی دھواں دھار روٹی زمین تارا کو دیکھے بغیر آندھی طوفان کی طرح گاڑی ریورس کر کے کھٹے گیت سے باہر نکال لیے گئے۔

”گماتھا میں نے زمین تارا! یہ حماقت مت کرو۔ یہ امیر زاوے وقتی دل لگی کے لیے ہمارے پاس آتے ہیں۔ اللہ کے سامنے یا اپنے مورخہ کے سامنے سرخرو ہونے کو نکاح کے دو بول بھی پڑھو لیتے ہیں مگر پتہ نہیں کبھی ہم سے نہیں چاہتے۔“

باقی کے تمام بات جیسے ناگمانا“ گئے ہوتے چلے گئے۔

سیدہ عالی بیگم نے اپنی سالانہ خوش شکل خوش قامت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معاشی طور پر مستحکم نوجوان تھا۔ اسے اپنی شہریت کی سبھی ساری ساری مری کفایتیں اور ہوتی محسوس ہوئیں۔ بہت کچھ ہوا پڑھا لکھا شریف نوجوان جسے اپنی اپنی نظر نے ہی اذ کے کر دیا تھا۔

”بہت نیک شریف اور مذہب سے پھرا بیٹا۔ باہر کے ملکوں میں تعلیم حاصل کی ہے اور ابھی بھی زیادہ تر برنس یا ہری ہے مگر اس کی شرط بھی تھی کہ لڑکی کسی مذہبی گھرانے کی نیک سیرت شریف والدین کی اولاد ہو۔ مجھے دولت پیسہ کچھ نہیں چاہیے۔ بس لڑکی کا مذہب ہی ہونا شرط ہے۔“

سیدہ عثمانی کی والدہ بھی ہوتی پڑھی لکھی پتھرے مہرے سے ہی خاندانی عورت لگ رہی تھیں۔ آسمانی رنگ کی قیمتی سارنگی میں ملبوس لائٹ جیولری کے ساتھ ان کے چہرے پر گلبریا گھنڑ کا نشانہ تک نہیں تھا۔

تین سال یہ فرانس میں رہا اور دو سال لندن میں۔ وہاں کی عورت آزادی کے نام پر جو بے حیائی کے کارنامے کرتی پھر رہی ہے بس میرا پتہ اسی سے پتہ چلا کہ میں شادی کروں گا تو کسی مذہبی گھرانے میں۔ میری بیٹی وہی میں ہوتی ہے۔ آج کل خیر سے اس کے گھر خوشی کی خبر آنے کو ہے اور وہ ہمارے ساتھ آئی۔ دو سہرا بیٹا میرا انگلیڈہ میں وکالت کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ سمد کے ادھر بھی دو کارخانے ہیں۔ ایک گلاس گاؤں کا اور ایک ایڈر گڈز کا۔ اس کے علاوہ وہی ملل ایسٹ وغیرہ سے چو لری لاکرا دھر بھی شروع چلا رہا ہے۔ اللہ کا بڑا فضل ہے بس گھر میں بیٹی کی کسی محسوس ہوتی ہے۔ یہ تو شادی کے لیے مان ہی نہیں رہا تھا خدا خدا کر کے اس نے ہاٹی بھری۔ میں تو چاہتی ہوں کل ٹاؤن نہ ظلم ہو اور میں اپنے دل کا یہ بولوں کا زبان خوب صوم صوم سے پورا کروں۔“

وہ بہت رسبان سے باتیں کر رہی تھیں۔ جیسے بولوں سے ان کا اس وزنی نما گھر میں آنا جانا رہا ہو۔ انہیں اس کی شکل سے بھی کوئی گھبراہٹ نہیں ہو رہی تھی نہ ان کے پہلو میں سر جھکانے اپنے نپٹے سیاہ بولوں پر نظریں جمائے سیدہ عثمانی کو۔

”بس اس کی ایک ہی شرط ہے کہ لڑکی کو ایک نظر تو دیکھے گا اب ماشاء اللہ کلثوم بہن نے صوفی صاحب کی اتنی تعریف کی کہ مجھے تو یہ شرط پیش کرتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔ یہ کیا کریں آج کل لڑکے ان باتوں کو نہیں

کھتے امید ہے، ہمن جی! آپ محسوس نہیں کریں گی۔ وہ بہت لجا بہت سے اماں جی سے کہہ رہی تھیں۔ اماں جی نے نظریں اٹھا کر صوفی صاحب کو دیکھا۔

”جی شریع کا حکم ہے اس میں کیا غار ہے، ہمیں ہی سہی آپ کی خوشی۔“ اماں جی سمیت جویریہ اور آمنہ کو لگا دونوں بے ہوش ہو جائیں گی۔ کیا زینب کے مرنے کے بعد واقعی بابا صاب میں اتنی لگت آئی ہے۔

کلاٹوم خالہ نے آمنہ کو مشروب کی برے لانے کا اشارہ کیا تو وہ خوف زدہ نظروں سے بابا صاب کی طرف دیکھنے لگی، جنہوں نے خفیف سا مثبت انداز میں سر ہلا کر سر جھکا لیا تھا۔

وہ تینوں کو کاہنتے ہاتھوں سے مشروب دے کر چند لمحوں کے لیے سرید عثمانی کے سامنے پڑی خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کیا نام ہے آپ کا۔“ وہ پورے اعتماد سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

”آمنہ! اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلے۔

”کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے آپ نے۔“ اس کی نظریں آمنہ کے چہرے پر گڑھی ہوئی تھیں۔

”گر بیویشن۔ ایک سیکوریزی۔“ اس سے زیادہ نہ تو اس میں حوصلہ تھا نہ ہمت۔ وہ کانپتی ہاتھوں کے ساتھ اندر بٹلی آئی۔

اگلے دن صوفی صاحب اور اماں جی خالہ کلاٹوم کے ساتھ ان کے گھر ہو آئیں۔ واپس آکر بھی خالہ کلاٹوم جیسے واپس نہیں آئی تھیں۔

”اللہ! شام اللہ انا بڑا گھریو نہیں پھرنے بھی لگو تو صبح سے دوپہر ہو جائے۔ اتنے بڑے بڑے وسیع گھاس کے برے بھرے لان، یاد ہی رنگ کا پتھر سارے گھر میں لگا لگا کیا آکھوں کہ بھارہا تھا۔ صوفی صاحب ایہ ہونا ہے مہر کا پھل۔ اللہ ایسے نیک بندوں کو آزماتا ہے تو ان کی آزمائش کا یوں انعام بھی دیتا ہے۔“ وہ تشریفی وقت کے دوران بولیں تو صوفی صاحب سرخ تھمتاتے چہرے کے ساتھ محض سر ہلا کر رہ گئے۔

دل تو ان کا بھی خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا مگر اپنے جذبات پر قابو رکھنے کا انہیں ہنر آتا تھا۔

”اللہ نیک نصیب کرے میری بیٹی کے۔“ اماں جی بھی خوش تھیں۔ انہیں تو اتنا اچھا رشتہ مل جانے کا ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔

”کتے ہیں۔“ منگنی اس ہنسنے کریں گے اور شادی ایک دو ماہ بعد۔ ان کی بیٹی خیر سے فامیغ ہو جائے تو پھر۔“

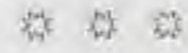
”منگنی پر خرچہ کلاٹوم ہمن!“ اماں جی بولیں۔

”ایک پائی نہیں لگے گی آپ کی۔ دو تین لوگ آئیں گے، صرف بیٹی کو انکو بھی پرمانے۔“

”پھر بھی۔“ اماں جی سوچتی میں بڑی تھیں۔

وہی ہوا تین دن بعد جمعہ کی شام کو وہ صرف پانچ لوگ آئے تھے خالہ کلاٹوم چھٹی پر تھیں۔ منگنی کا سامان بہت شاندار تھا تو جوڑا بہت عالی شان اور ڈائمنڈ کی انگوٹھی۔ اس پھولے سے کیو ترخانے میں یہ سب جیسے کوئی عجوبہ لگ رہا تھا۔

”میں تپ تو لے کر گئی تھی پھر بھی انکو بھی تمہیں ڈھیلی ہے۔ چلو وہ ہزاروںوں میں آکر بڈ لوجاؤں گی۔“ اس کی سانس اٹلی میں گھومتی انکو بھی کا جائزہ لے کر بولیں۔ سرید عثمانی بیٹی نظروں سے وقفے وقفے سے اس کے جھٹکے ہوئے چہرے پر نظریں جمالیتا۔



”حیات ولا“ میں رنگ و نور کا سماں بندھا تھا۔

ترجہ خیر حیات کے غسل صحت کی خوشی میں جشن منایا جا رہا تھا۔ شہر بھر کی بڑی سی کیوٹی کی کریم اور اعلا سرکاری انفران منج تھے۔ وسیع لان میں سارا انتظام کیا گیا تھا۔ ہنگامہ موزک پس پر وہ بچہ بچہ رہا تھا۔ اسٹیج پر آرکسٹرا کی میٹھی

دھن دھن بج رہی تھی جگر کسی کا اس طرف دھیان نہیں تھا۔ سب لوگ مشروبات کے گلاس ہاتھ میں لیے خوش گلیوں پر ہانگے تھے۔

”اورے رعنا! وہر آؤ ذرا۔“ خیر حیات نے خوشگوار لہجے میں بے حد قیمتی آتشیں ساڑھی اور جیولری میں جلی سنو ری یاں سے گزرتی رعنا کو پکارا تھا۔

”جی! وہ یاں آکر بولیں۔ دھیان ابھی بھی اشارہ کر کے بلائی تکم صبر کی طرف تھا۔

”ان سے ملو یہ ہیں سلمان بنواری۔ تم اس دن پوچھ رہی تھیں نا۔“ خیر حیات کسی کا تعارف کر رہے تھے۔



رستہ حیات مسلمان بنواری کے شانہ ڈراٹنگ روم میں بڑے تکلف سے اکڑ کر بیٹھیں کیا صرف صوفی کے کنارے پر ذرا سا ٹھیں اور ناقہ دان نظروں سے ڈراٹنگ روم کا جائزہ لینے لگیں۔

کل رات فنکشن میں مسلمان بنواری سے مل کر انہیں جو خوشی حاصل ہوئی تھی اس کو وہ کسی بھی تپانے سے تپ چھین سکتی تھیں مگر کوشش کے باوجود وہ رات مسلمان بنواری سے اس مسئلے پر بات نہ کر سکیں جس کی وجہ سے وہ جلد از جلد ان سے ملاقات کرنا چاہتی تھیں، لیکن انہیں اس موضوع پر بات کرنے سے خوف بھی محسوس ہو رہا تھا اگر اس شخص سے بھی کوئی نشان چہانہ مل سکا۔ وہ تو مرجا میں گی۔

مہمانوں کے ساتھ رات مسلمان بنواری بھی رخصت ہونے لگا تو وہ زیادہ دیر تک ضبط نہ کر سکیں جیسے ہی فجر حیات اپنے کسی دوست کو الوداع کہنے گئی آگے تک گئے تو رعنا حیات نے مسلمان بنواری سے اس کے گھر آنے کی خواہش کا اظہار کر دیا اور کچھ بھر کو کچھ حیران سا ہوا پھر مسکرا کر موسٹ ویکم کہتے ہوئے اس نے اپنا وزٹنگ کارڈ ان کو تمنا کیا۔

رات بھر وہ سو نہیں سکی تھیں اور باقی دن بھی اسی اضطراب میں کٹا۔ انتظار کی گھنٹیاں کتنی طویل اور قیامت خیز ہوتی ہیں انہیں وہ ساری پہلی بار اس کا احساس ہو رہا تھا۔ پانچ بجے سے پہلے ہی وہ کھڑے چل پڑی تھیں حالانکہ انہوں نے چوبے تک آنے کا کہا تھا۔ لازم ابھی انہیں ڈراٹنگ روم میں بٹھا کر گیا تھا۔ چند لمحے بیٹھنے کے بعد وہ اٹھ کر نکلنے لگیں۔

”مغذرت چاہتا ہوں مجھے آنے میں کچھ تاخیر ہو گئی۔ بہر حال مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائیں۔ عمدہ ملن اس سے چھ اور سات کے درمیان لوٹنا ہوں۔ آج آپ نے آنے کا کہہ رکھا تھا سو میں جلدی گھر آ گیا۔ آپ پلیز تشریف رکھیں نا کیا میں کی بات اور کولڈ؟“

مسلمان بنواری شاید ابھی ابھی اس سے آیا تھا اس نے براؤن کمر کا سوٹ پہن رکھا تھا اور صرف کوٹ ہی اتار رکھا۔

”جی شکریہ کچھ نہیں مجھے آپ سے ایک اہم سلسلے میں بات کرنا تھی۔“ وہ اپنی ہتھیاریاں مسلتے ہوئے بولیں۔

”موسٹ ویکم پلیز آپ تشریف رکھیں نا۔ میرا خیال ہے کولڈ ڈرنکس منگو الیتا ہوں۔“

دروازے کے قریب کھڑے ملازم کو اس نے اشارہ کیا تو وہ سر ہلا کر باہر نکل گیا۔

”جی! اب بتائیے کیا مسئلہ ہے۔ ویسے معاف کیجئے گا اگر میں بھول نہیں رہا تو ہم کل رات سے پہلے تو کبھی نہیں ملے۔“ اس نے ہاتھ خرپوچھ ہی لیا۔ کیونکہ پہلی رسمی ملاقات کے بعد رعنا حیات کا یوں اگلے دن ان کے گھر چلے آنا کچھ الجھن آمیز تھا۔

”ہم کل رات کو ہی پہلی بار ملے تھے۔“ رعنا حیات کہتے ہوئے گہری سانس لے کر بیٹھ گئیں۔

”آپ یہ ماں اکیلے رہتے ہیں؟“ وہ اوہر اوہر دیکھتے ہوئے بولیں۔

”جی تیں اور میرا بیٹا میری سسر کا تقریباً پانچ برس پہلے انتقال ہو گیا تھا۔“

”آپ کا بیٹا۔“ وہ پل بھر کو رکس۔ ”وہ کہاں سے؟“ وہ جھجک کر بولیں۔

”آفس میں ہوتا ہے“ کہنے والے ہونگے۔ ایجوکیشن تو اس کی مکمل ہو گئی ہے۔ میں نے اسے الگ آفس سیٹ کر کے دیا ہے۔ اصل میں ہمیں ابھر آئے زیادہ عرصہ۔۔۔ وہ انفیل میں جانے لگا تھا جس سے رعنا کو کوئی غرض نہ تھی۔

”آپ کے بیٹے کا نام کیا ہے؟“ انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔
 ”شعیب سزواری۔“

نام سن کر وہ کچھ سوچ میں پڑ گئیں۔ اسی وقت ملازم کو لڈو ریکس لے کر آیا اور دونوں کے آگے سرو کر کے چلا گیا۔

”یہ آپ کا وہی بیٹا ہے جو آپ نے تقریباً بیس یا تیس سال پہلے پنڈی کے ایک یتیم خانے سے ایڈاپٹ کیا تھا؟“ یونس بیک نامی شخص کے یتیم خانے سے؟“

وہ سلیمان سزواری کی طرف دیکھ کر بولیں۔ جس کے ہرے کارنگ لہجہ بھر کو متغیر ہوا۔
 ”نہیں یہ میرا اپنا بیٹا ہے۔ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”دیکھیں سلمان سزواری صاحب میرے پاس سب معلومات اور ثبوت ہیں اور یونس بیک ایڈریس بھی اگر یہ آپ کا اپنا بیٹا ہے تو آپ ایک بار میرے ساتھ چل کر یونس بیک کے سامنے بات کر سکتے ہیں۔“

”تھیک صاحب! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“
 ”مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ کیا آپ نے بچہ ایڈاپٹ نہیں کیا تھا؟“ وہ کچھ درشتی سے بولیں۔

”میں مانتا ہوں اس بات کو۔“ وہ جیسے تھک کر بولا۔ ”میں نے یونس بیک کے یتیم خانے سے بچہ ایڈاپٹ کیا تھا۔ بہت خوبصورت بہت کیونٹ بچہ تھا تقریباً دو برس کا بہت محبوم صورت جسے دیکھتے ہی پیار آجاتے اسی لیے تو میں نے اور میری مسز نے اسے بہت سے بچوں میں سے پسند کیا تھا۔ ہم اسے خوش خوش کر لے آئے تھے شادی کے سات برس گزر جانے کے بعد بھی ہم دونوں اولاد سے محروم تھے۔ میری بیوی یا بھجھ گئی تھی کہ جب سے ہم نے بچہ ایڈاپٹ کیا تھا۔ ہم اسے سنی کتے تھے ہم نے اپنے دلوں میں پھاسا سارا پیار تو اسے دیا تھا۔ ڈھیوں لھلھونے کیڑے اور ن جانے کیا کیا۔ اسے ہمارے پاس آئے چھ ماہ ہوئے تھے۔ پتا نہیں قدرت کو ہماری کون سی ادا بھائی کہ ساتویں مہینے میری بیوی کے یہاں امید پیدا ہوئی۔ بغیر کسی علاج اور دوائی کے ہم دونوں نے حد حیران بے حد خوش تھے۔ یہ بچہ ہمارے لیے رحمت بن کر آیا تھا۔ مجھے تو وہ اور بھی اچھا لگنے لگا تھا۔ ہر لمحہ میں دیکھ رہا تھا کہ میری بیوی کا رویہ اس سے بدلتا جا رہا تھا سرد اور بے مزہ اس کے پاس آتا تو وہ جسنما جاتی۔ خواہ تو اہلست جھڑکے لگتی۔ وہ کچھ فرمائش کرتا تو وہ ملازم پر ہر سنے لگتی پہلے پہل تو میں سمجھتا رہا کہ ماں بننے کے مراحل سے گزر رہی ہے۔ وہ

چوتھی ہوتی جا رہی ہے۔ مگر تین چار ماہ کے دوران میں نے ایک بار بھی اس کا رویہ سنی کے ساتھ کارڈ نہیں دیکھا ویسے وہ بہت خوش رہتی تھی۔ اس کی موجودگی ہر لمحہ اسے کھٹکنے لگی تھی۔ آخر ایک دن میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ وہ یہ سب کیوں کر رہی ہے تو اس نے صاف کہہ دیا کہ میں اس بچے کو دوبارہ یتیم خانے میں چھوڑ آؤں اب جب کہ ہمارا اپنا بچہ ہونے جا رہا ہے۔ ہم اس کے جھٹکے کی توجہ اور محبت کسی اور کو کیوں دیں۔ میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ ہمارے اتنے وسائل ہیں کہ ہم با آسانی دو بچے انورڈ کر سکتے ہیں اور نہ ہمارے دل اتنے تنگ ہیں کہ تھوڑی سی محبت اس معصوم کو دیں گے تو اپنے بچے کے لیے کم پڑ جائے گی پھر یہ بھی تو سوچو اس کے مبارک قدموں سے تو خدا نے ہم پر یہ رحم فرمایا ہے مگر عورت کئی معاملوں میں بہت جھڑم ہوتی ہے۔ اس پر میری باتوں کا کوئی بھرا اثر نہیں ہوا اپنی اولاد کے معاملے میں وہ کسی دوسرے کی اولاد کو ایک یونٹ محبت بھی دینا نہیں چاہ رہی تھی اسی کشش کے دوران ہمارے ہاں بیٹا پیدا ہوا شعیب سزواری۔

اس کے بعد تو میری بیوی اور بھی غصیلی ہو گئی۔ سنی بے چارہ شعیب کے کٹ کے پاس بھی چلا جاتا تو وہ اسے پیٹ ڈالتی ہر وقت اس پر بیچنچ چلاتی رہتی۔ آخر یکار حویں دن وہ ننھ سے مکمل طور پر ناراض ہو گئی کہ اس وقت

تک دوبارہ بات نہ کرنے کی جب تک اس منحوس کو یتیم خانے میں پھینک کر نہ آؤں۔ بچہ بھی بری طرح سے سہم کر رہ گیا تھا۔

میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا کہ اس وقت ہم لوگ پنڈی سے لاہور شفٹ ہو چکے تھے۔ آخر بیوی کی ضد سے تنگ آکر میں اس بچے کو دوبارہ یتیم خانے میں داخل کر آیا۔ اس کے خرچے کا ذمہ میں نے اٹھایا بلکہ اس کو اسکول داخل کرانے اور پہلے تین سالوں کی فیس اور دوسرے اخراجات کے لیے بھاری رقم بھی دے کر آیا تھا مگر یہ تلافی۔۔۔

”کون سے یتیم خانے میں داخل کروا کے آئے تھے آپ؟“ وہ تھکے تھکے لہجے میں پوچھنے لگیں۔
 ”سوری مجھے یاد نہیں سنا کہ کا نام سنا ہو گا آپ نے وہیں ایک چھوٹا سا یتیم خانہ تھا۔ اب نہ تو مجھے اس کے منتظم کا نام یاد ہے نہ یتیم خانے کا۔ اس کے چند ماہ بعد تو ہم آسٹریلیا چلے گئے تھے پھر۔۔۔“

”کیا آپ یاد نہیں کر سکتے؟“ آپ نے کہیں لکھ رکھا ہو وہ ایڈریس۔“ رعنا حیات رو پینے کو تھیں۔
 ”سوری مجھے صاحب! مجھے کچھ یاد نہیں پڑتا۔ وہ بچہ آپ کا کون تھا؟“

”پتا نہیں۔“ رعنا حیات کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہو میں اور کچھ بھی کہنے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گئیں تو سلمان سزواری کو اس ”پتا نہیں“ سے بہت کچھ پتا چل گیا۔

”کاش میں اس بچے کو اس بے رحم سے یتیم خانے میں نہ پھینک آیا ہوتا تو آج بیگم صاحبہ کی آنکھوں میں اتنی ویرانیاں نہ ہوتیں۔“

رعنا حیات گاڑی میں بیٹھ رہی تھیں جب انہوں نے شعیب سزواری کو اندر داخل ہوتے دیکھا وہ سلمان سزواری کی کافی تھا۔

تو سلمان سزواری ہیچ کر رہا تھا۔
 ”مجھے اس میں کب ماں تلاش کروں پھر بچے؟“ اسٹیرنگ پر سر رکھ کر بے اختیار رو دیں۔

زیتون بانو کمرے میں داخل ہوئی تو مسز خان فون کا ریسیور کریڈل پر رکھ رہی تھیں۔
 ”کھانا لے آؤں گی؟“ زیتون بانو نے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ جیسے جھٹک کر بولی تھیں۔ ”بڑی عجیب سی بات ہے۔“
 ”کون سی بات ہے؟“

”شہباز خان کی کچھ خیر خبر نہیں آتے دنوں سے دل عجیب وسوسوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کے فلیٹ پر کال ملائی ہوں تو آنسر مشین سے ایک ہی جواب آتا ہے کہ آپ پیغام ریکارڈ کروادیں ابھی مجھے شہباز کے دوست نے فون کر کے بتایا ہے کہ شہباز خان پاکستان آچکا ہے کئی دنوں پہلے۔“

”وااقعی جی!“ زیتون بانو خوش ہو کر آگے بڑھی۔ ”تو پھر وہ کھڑکیوں نہیں آئے؟“
 ”میں تو مجھے فکر ہے اگر وہ پاکستان آچکا ہے تو اس نے مجھے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی۔“

اسی وقت دروازے کے باہر قدموں کی آواز آئی۔ اظہر کے پیچھے یا سمین اور مشی داخل ہوئیں۔ تینوں سلام کر کے بیٹھ گئے۔

”کیسی طبیعت ہے اب آپ کی ام جان!“ اظہر نے پوچھا۔
 ”اللہ کا شکر ہے۔“ مسز خان نے وزیدہ نظروں سے بہو کے فروٹھے انداز کو دیکھا جب کہ مشی بالکل لا تعلق سی بیٹھی تھی۔

”وہ ام جان میں نے آپ کو بتایا تھا آج حشام کو چھ بچے ہماری فلائٹ ہے۔“ اظہر نے چند لمحوں بعد کہا۔

”تو تم جا رہے ہو۔“ بیٹے کی طرف شکوہ کنناں نظروں سے دیکھتے ہوئے مسزخان نے کہا۔
 ”جلے جاتے ہیں کے مرنے کا تو انتظار کر لیتے۔“ وہ پرشورہ سی منی کے ساتھ بولیں۔ اظہر نے جزیز ہو کر ماں کی طرف دیکھا اور پھر پوچی کے لا تعلق چہرے کو۔
 ”کون جانے کس کی پہلے آجائے۔ بعض لوگ تو لوہے کی سائیس لکھوا کر آتے ہیں اور آج کل تو موت نہ جوان دیکھتی ہے نہ بچہ۔“ یا سمین جلے کئے انداز میں طنز سے بولی۔
 ”ہاں تم ٹھیک کہتی ہو ہو! مجھ جیسے بوزھے تو شاید موت کا بھی امتحان بنے ہوئے ہیں۔ کسے کیسے غم کے پہاڑ ٹوٹے ہیں اور میں واقعی پستھن میں اوہ کے۔“ ہنس لیے جیسے جارہی ہوں۔ ”مسزخان سر ہلا کر بولیں۔
 ”یا سمین کا یہ مطلب نہیں تھا ام جان! اظہر جلدی سے بولے۔
 ”یا سمین دور سے ہنسی پٹی پٹی نہیں اظہر! جو تم اس عمر میں بھی اس کے حملوں کے خفیہ مطالب کی وضاحت کرتے پھر خیر۔“ وہ کہہ سانس لے کر بولیں۔
 ”اب تک اونوکے امریکہ سے؟“
 ”کچھ کہہ نہیں سکتا ام جان! ابھی آرٹھیل ہونے کا ارادہ ہے۔ اگر سیٹ ہو گئے تو پھر جلدی پھر لگاؤں گا آپ سے ملنے کے لیے۔“ اظہر نے بتایا۔
 ”یہ ساتھ دیوار ملی ہے تو تم ہمیں سیدھے اپنے شکل سے ترساتے رہتے ہو۔ اب تو پھر سات سمند پر پار جا رہے ہو۔ کبھی بھولے سے فون ہی کرو گے تو میں سمجھوں گی تم ملنے آگے۔“
 ”ملاحظہ فرمائیے طنز؟“ یا سمین ڈیر لب شوہر سے بولی۔
 ”ہو! یہاں کوئی خیر نہیں بیٹھا۔ اوچھا بولو۔“
 ”میں پہلے ہی بہت اونچا نیچا بول کر بڑی بن چکی ہوں اس لیے آپ میری زبان نہ ہی کھلوائیں تو مہمانی۔“ وہ کہتے ہوئے اظہر کھڑکی ہوئی۔ ”چلو مش! ابو کی سلامی۔“
 اس نے مڑ کر اعلق سی اپنے ناخنوں سے کھیٹی مشی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو مشی نے ایک نظر واوی کے چہرے کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر ان کے پاس آئی۔
 ”اوکے واوا! اپنا خیال رکھیے گا۔ خدا حافظ۔“ وہ ڈرا سا ان کا ہاتھ دیا اور ان کے پیچھے کمرے سے باہر نکل گئی۔
 مسزخان اس کے اتنی ہی رقبے کو دیکھتی رہ گئیں۔
 ”مجھے یقین تھا اظہر! تم ایک دن مجھے ضرور بدانی دے جاؤ گے۔ آخر کب تک ہوئی گی فوٹو شٹ ٹالنے جس کے دونوں بھائی برسوں سے امریکہ میں سہل ہیں۔“ مسزخان یا سمین کے باہر جاتے ہی بولیں۔
 ”ام جان! آپ سے سامنے میں نے یہاں کوشش کی سے سیٹ ہونے کی ایک ہی بیٹی ہے میری اور جو بچاؤ اس کے ساتھ ہوا وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں اب مجھے اس کا ایس تو کرنا ہی ہے۔ یہاں تو وہ نفسیاتی مریض بنتی جا رہی ہے۔ ابراہیم بھائی کا بیٹا ہے۔ وہ بہت عرصے سے رشتہ مانگ رہے ہیں۔“ مشی اتنی دور بیاہ کر چلی گئی تو پھر ہم دونوں یہاں رہ کر کیا کریں گے۔ اسی لیے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔“ اظہر کچھ شرمندہ سے کہہ رہے تھے۔
 ”میری کچھ کرنا تھا تو اس غریب کو کیوں نکالوایا تمہاری لادلی بیٹی نے؟“ مسزخان کچھ غصے میں بڑبڑائیں۔
 ”آپ ابھی بھی اس کو بے قصور سمجھتی ہیں۔ جب کہ سب کچھ تو آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی لیا تھا۔“ اظہر گئی سے بولے۔
 ”ظہر میاں! زندگی میں صرف آنکھوں سے ہی نہیں دیکھا جاتا۔ کسی اور چیز سے بھی بصارت کا کام لیتے ہیں۔ خیر تمہیں یہ بات کہاں سمجھ میں آئے گی تم تو مدت سے یا سمین کی آنکھوں سے دیکھنے کے عادی ہو۔“
 ”ام جان! آپ زیادتی کر رہی ہیں۔“ اظہر احتجاجاً بولے۔
 ”فون تو کیا کرو گے نا؟“ مسزخان کچھ عاجزی سے بولیں۔

”کیوں نہیں ام جان! سیٹ ہو گیا تو پھر ان شاء اللہ آپ کو بھی بلوا لوں گا۔“ وہ جلدی سے بولے۔
 ”نہیں میرے بیٹے! مجھے تو اب صرف اس بلاؤے کا انتظار ہے جو آئیں رہا چاہو تم اللہ تمہارا نگہبان۔ پتا نہیں یہ بوزھی آنکھیں دوبارہ تمہارا چہرہ دیکھ پائیں گی یا نہیں۔ جب تک جیتی رہوں گی دعاؤں کے خطا سمجھتیں لکھتی رہوں گی۔“ مسزخان کے آیدیدہ ہونے پر اظہر نے بے اختیار آنکھیں اپنی یا سمین میں بھر لیا۔
 ”ام جان! میں آپ کو بھول سکتا ہوں۔ کبھی نہیں۔“ وہ ان کے بوزھے و جھوکی خوشبو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں بولے۔
 ”کوئی دعا مانگ کر وہ نہیں ہر پابندی سے آزاد کیا۔ خوش رہو۔ آیا دور۔“ مسزخان نے اظہر کا ہاتھ چوم کر الوداعی دعا دی تو اظہر نے ان کے دونوں ہاتھ چوم کر اپنی آنکھوں سے اٹکالیے اور دھیرے سے خدا حافظ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئے۔
 مسزخان کے بھریوں بھرے رخساروں پر آنسوؤں کی لکیر رواں ہو گئی۔
 ”جیون باجوہ چپ چاپ بیٹھی ان کی ٹانگیں دیا کرتی رہیں۔
 ”یہ ہوتی ہے اظہر! زنتون بانو! جس کے لیے آدمی مہر اجاتا ہے۔“ جب کچھ دیر کے بعد ان کا دل سنبھلا تو وہ بولیں۔ زنتون بانو نے اظہر کو بلانے پر اکتفا کیا۔
 ”ویسے بیگم صاحب! وہ کیا چیز تھی کہ آپ اس دن کہہ رہی تھیں کہ مشی بی بی کے بیٹے کے نیچے دیکھ کر آپ کو معاذ کی بے گناہی کا ثبوت مل گیا تھا۔“ زنتون بانو کو لگا لگا کھانک خیال آیا تو پوچھنے لگی۔
 ”معاذ کا فرسٹ ایڈ باکس وہ کہہ رہا تھا نا کہ مشی نے اسے خود بلایا تھا کہ اسے درد ہو رہا ہے اور مجھے جو معاذ پر تیسر تھا نہ جانے کیسے ان لمحوں میں اٹھ گیا۔ شاید مسلسل بیماری اور بوجھتی عمر کے تقاضے نے مجھ میں قوت اٹھائی اور قوت اٹھائی۔ وہ تو اس کی مٹی لڑی ہے۔ مگر زنتون بانو شہباز کہاں چلا گیا ہے۔ مجھے اس کی فکر لگ گئی ہے۔“
 ”میں ایک دم سے پھر آیا تو بولیں۔“
 ”واقعی بیگم صاحب! یہ تو عمر کی بات ہے۔“
 ”کس سے پتا کروں۔ ار تھنی آیا اسکول ہے؟“
 ”جی ابھی تو نہیں آئے آئے والے ہوں گے۔“
 ”آج کتنے دنوں بعد تو وہ اسکول گیا ہے۔ معاذ سے کس قدر اٹیج تھا۔ آیا زبھی گھر پر نہیں ہوگا کہ میں اس سے بات کر لیں۔“ وہ بے چینی سے بولیں۔
 ”تی وہ گھر پر ہی ہیں۔ اظہر صاحب کو ایر پورٹ چھوڑنے جانا تھا۔“
 ”معاذ! میں چھوڑ کر آجائے تو کہاں میں نے بلایا ہے۔ مگر مجھے لگتا ہے معاذ جس قدر مجھ سے خفا ہے اور یہ شہباز جو روٹھ کر چھپ گیا ہے۔ دونوں کو بلانے کے لیے مجھے اخبار میں اپنی موت کی خبر کا اعلان کروانا پڑے گا پھر ہی دونوں آئیں گے۔ انتظار کی اب تک نہیں نہ مہلت ہے۔“
 ”اللہ نہ کرے بیگم صاحب! زنتون بانو جلد سے بولی تو مسزخان نے کچھ جواب نہیں دیا۔ آنکھیں بند کر کے سر بیڈ کے پشت سے نکاویا۔
 ”ماں دتی! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ جویریہ ان کے سر میں تیل لگا رہی تھی۔ پوچھنے لگی۔
 ”تمہیں کیسی نظر آ رہی ہوں؟“
 ”آج کل ماشاء اللہ اچھی نظر آ رہی ہے۔“ جویریہ پیار سے گل چوم کر بولی۔
 ”تو پھر اچھی ہی ہوگی۔ آمنہ کہاں ہے؟“
 ”اسکول گئی تھیں ابھی واپس آئی ہیں۔ کپڑے بدل رہی ہوں گی۔ ان کا اسکول بھی بند ہی ہونے والا ہے۔“
 ”چلو اچھا ہے اب اسے یہ چھ سات سو کی نوکری کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ اس کے سسرال والے لکھ پتی

”نہیں تارا! تو پاگل ہو گئی ہے، تجھے ان امیر زادوں کی طاقت کا اندازہ نہیں۔ کیوں اپنی میری اور اس بچے و جان کی دشمن ہو رہی ہے۔ سلطان بخت کبھی نہیں مانے گا۔ ہاں اگر تو انتظار کرے تو دیکھنا وقت خود اس سے یہ امت مزائے گا وہ خود بخود ہو کر تیرے قدموں میں آئے گا۔ نہ صرف اس بچے کو تسلیم کرے گا بلکہ اس کا اعلان بھی کرے گا۔ اگر تو اس وقت صبر کر کے بالکل خاموشی اختیار کر کے تو بہت کچھ پالے گی۔“ زیور گل تجرے کا انداز میں اسے سمجھانے لگی۔

”مام! مجھ میں صبر نہیں۔ جب میں حق پر ہوں تو وقت کا انتظار کیوں کروں۔ خود وقت کی آواز کیوں نہ بن جاؤں۔“ وہ جذباتی پن سے بولی۔

”نہیں تارا! ہر کام میں جلدت اور حق یہ ہونا کافی نہیں ہوتا ہے۔ وقف! اس وقت وہ طاقت اور دولت کے نشے میں کسی بھی گری ہوئی حرکت پر اتر سکتا ہے۔ تمہاری یا تمہارے بچے کی خدائخواستہ جان بھی لے سکتا ہے۔ ان شریف زادوں کو اپنی عزت، نیک نامی ہر چیز سے بڑھ کر باری ہوتی ہے۔ اس نفس کی لذت سے بھی زیادہ جس کے بے لگام ٹرانس میں یہ ہمارے قدموں میں غلیٹا کتوں کی طرح لوٹ اٹھتے ہیں۔ برابر تو نشہ اترنے کے بعد موسم ہے اور یہ موسم ہر خفیہ شادی کرنے والی عورت کو صبری سے جھیلنا پڑتا ہے۔“ زیور گل دانش مندی سے کہہ رہی تھی۔

”گناہم! نہیں تارا! احتیاجاً بولی۔
”دیکھتے تو آج ہی لہر جانا ہے۔ بہت پریشان رہا ہوں سب کی غیبت سے متعلق۔“

”جہاں اتنے دن گزار آئے ہو وہاں چند دن اور کسی۔ تمہاری دوست کو اس وقت تمہاری اشد ضرورت ہے۔“ زیور گل اصرار سے بولی۔

”میری نہیں میڈم! شاہ کی کی۔ آپ بھول رہی ہیں۔“
”بھول تو اس نادان سے ہو چکی ہے جو شاہ کی جیسے طوطا چشم نواز سے دل لگانے اور حماقت بھی کر چکی۔“

”سبھی سمجھا کر میں تھک گئی لیکن مجال ہے جو اس کے پلے پکھ بڑا ہو۔ اب تمہی رو رہی ہے۔“ زیور گل کہنے سے تیار ہر لنگھ گئی۔

”کیا ہوا فریڈ! ایسا پھر کوئی جھگڑا ہو گیا۔ شاہ کی تو شاید اس ہنسنے اور لہکنے میں تو کیا آتے ہی پڑیں؟“ وہ بولا تو وہ یکدم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”ارے ارے نہیں! یہ کیا کر رہی ہو، جو صلہ ہے وقف اتنی جلدی بہت نہیں ہاں! تمہی بتاؤ مجھے کیا ہوا ہے؟“
”مائی پھیلو! میری! وہ ہنسنے ہوئے الگ ہوا۔“

”ارے مہولی! کیسی ہو اور پھیل گئی ہو۔“ اس نے نین تارا کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔
”بہت زبردست لگ رہے ہو ایک دم سے اسمارٹ اور قیامت خیز۔“ نانا تارا دیکھو تو اس کو۔“ زیور گل ستائشی نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولی تو عبد العزیز نے بچپن کی اور کی رنگ بھلاتے ہوئے نین تارا کے سامنے جا بیٹھا۔

”دیکھیں میڈم! آفت اور اتنی بڑی قیامت تو نین تارا بھی ہو گئی ہے۔“ وہ اس کے پھیلے ہوئے جسم کو دیکھ کر شرارت سے بولا۔

”آئے کی اطلاع تو کی ہوتی۔ میں تمہیں خود میری پورٹ پر لینے آئی۔“ زیور گل اسی خوشگوار لہجے میں بولی۔

”سربراہ میڈم!۔“
”کب آئے ہو؟“ نین تارا پوچھنے لگی۔

”اوہ تو ابھی تمہارے سامنے آیا ہوں۔“
”بھئی لاہور کب پہنچے؟“ وہ زنج ہو کر بولی۔

”بارہ بچے مسکھوں کے نام۔“
”اور آکر فون تک کرنے کی زحمت نہیں کی۔ کیسا ربا نور تمہارا؟“

”میں نے سوچا اب صبح ہی جا کر ملوں گا اور نور اے ون رہا۔“
”یہ تمہاری صبح ہے بارہ بجتے کو ہیں۔“ زیور گل شکایتی لہجے میں بولی۔

”نہیں! میری تو صبح ہے میں نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا۔“
”رسولی! میں لکوائی ہوں ناشتہ اور اب تم آگے ہونا تو ابھی اوہ رہی رہو گے، کم از کم ایک ہفتہ اس اتحق بیوقوف لڑکی کے پاس۔“

”زیور گل ایک دم سے خود کو تانا محسوس کرنے لگی تھی۔ اپنا نیت بھرے لہجے میں بولی۔
”کیوں اس نے پھر کوئی بے وقوفی دکھوائی ہے؟“

”اس سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے؟“
”مام! میں نے کبھی صبر کیا ہے۔ نہ کروں گی۔ یہ بچہ پیدا ہو گا تو کھنا خدا کی قسم میں اسی لہجے سے جو بلی لے جاؤں گی اور سادھی رینا کے سامنے اسے شاہ جی کو پیش کروں گی اور انہوں نے اس وقت بھی اسے اپنانے سے انکار کیا تو نام! قسم سے میں نہیں کھڑے کھڑے اس کی جان لے لوں گی۔ چاہے بعد میں خود بھی جان سے جاؤں یا ہوش و حواس سے اور میں منہ کر کے پھوٹوں گی اور صبر تو آپ کو مظلوم ہے مجھ میں ہے نہیں اور نہ میں کروں گی۔“ نین تارا اتنے خوف ناک لہجے میں کہہ رہی تھی کہ زیور گل کو لگا وہ یہ سب کر گزرنے کی۔ ضدی تو وہ شروع ہی سے تھی۔

”خبردار جو تم نے ایسا کچھ کرنے کا سوچا بھی تو۔“
”ارے مہولی! مائی! وارننگ ہاؤ آر یو۔“ سب سے انتظار کرنا تم نے لڑکے۔“ اندر داخل ہوتے عبد العزیز کو دیکھ کر زیور گل حقیقتاً گھل گئی تھی۔ بڑے شوٹ میں اٹھ کر اس کو گلے سے لگالیا۔

”بہت میں کر رہی تھی میں نہیں۔“ وہ تو زیور گل کے ویلکم کے انداز ہی سے لگ رہا تھا کہ وہ عبد العزیز کو کتنا مس کر رہی تھی۔
”وہ گھبرا کر اٹھا اور اس کے پاس بیڈ کے کنارے پر ٹکا اپنی جیب سے نشوونکال کر اس کے رخساروں پر بستے آنسو صاف کرنے لگا۔“

”تھینک یو۔“ اس نے نشوونکال کے ہاتھ سے لے لیا۔
”کیا ہوا! کچھ بتاؤ کی نہیں؟“ چند لمحوں بعد عبد العزیز کے پوچھنے پر وہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔ عبد العزیز غور سے سنتے لگا۔

”ہیلو کون بیگم رعنا حیات؟“ ان کے سیل فون پر کوئی اجنبی آواز ابھری تھی۔
”جی بول رہی ہوں۔“ وہ کچھ اکتائے ہوئے لہجے میں بولیں۔

”بیگم صاحب! مجھے پہچانا آپ نے؟“ مخاطب کو نہ جانے کیا خوش فہمی تھی۔
”نہیں۔“ وہ اور بیزار ہو گئیں۔

”میں سلمان سبزواری۔“ وہ کچھ مایوس ہو کر بولا۔
”اوہ! اچھا۔ کیسے ہیں آپ؟“ وہ مرونا بولیں۔ ”موسوی میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

”ورشہہ! اسے کیسے بھول سکتی تھیں جب سے مل کر آئی تھیں ان کی راتیں اور بھی بے چین ہو گئی تھیں۔
”اومحی! اومحی! رات کو اٹھ کر اللہ کے آگے گڑ گڑائیں، سکتی رہیں۔ کئی بار تو جا کر سامنے ہو آئی تھیں۔“

”شہر کے باقی علاقوں کی طرح بیس بائیس سالوں میں اوہر بھی بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ بہت زیادہ گنجان

آباد اس علاقے کے یتیم خانے میں بھی وہ کئی بار ہو آئی تھیں مگر انہیں اپنے بیٹے کا کچھ بھی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ اب تو انہیں لگتا وہ چل چل کر تھک گئی ہیں۔ ان کے اعصاب شل ہو چکے ہیں۔ تین دن سے وہ اس پریشانی میں گھر پر بیٹھی ہیں۔ آج این جی اوڑکی میٹنگ میں شرکت کے لیے گھر سے نکلی تھیں تو پھر سلمان سبزواری ان کے زخم اوھڑنے سے آمو جوہ ہوا۔

”بیگم صاحب! آپ کے لیے ایک گڈ نیوز ہے میرے پاس۔ آپ فوری طور پر میرے آفس آسکتی ہیں۔“ وہ بے دبی پر جوش بے ہوش لہجے میں کہہ رہا تھا۔
 ”کیسی گڈ نیوز؟“ وہ زرا سا چونکیں۔
 ”آپ کے بچے کے متعلق۔“
 ”کیا؟“ ان کے ہاتھ میں اسٹینڈنگ ڈول گیا۔

”آپ شاید مذاق کر رہے ہیں۔“ انہوں نے گاڑی سڑک کے ایک طرف کھڑی کر لی۔
 ”نہیں بیگم صاحب! میری اتنی جرات نہیں کہ آپ سے مذاق کر سکوں پھر اس نازک مسئلے پر کوئی بھی صاحب دل کسی ہاں سے مذاق نہیں کر سکتا۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔
 ”پھر؟“ انہیں انکان کی آواز کانپ رہی ہے۔
 ”آپ فوراً میرے آفس آجائیں۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہو گئیں۔

”خدا کی قدرت دیکھیں میں آفس میں بیٹھا تھا کہ میرے پی اے نے مجھے انٹرکام پر بتایا کہ کوئی یتیم خانے والے آئے ہیں چند ماٹھے کے لیے۔ یتیم خانے میں تعمیرات کا کام ہو رہا ہے۔ میرے ذہن میں نہ جانے کیا خیال آیا ورنہ ایسے کاموں کے لیے میرے پی اے کے پاس ہدایت ہے کہ ٹھکانہ جتنا کہیں انہیں باہر ہی سے دے کر رخصت کر دیا کرے مگر آج میں نے اس شخص کو اندر بلوایا اور اسے دیکھ کر میری حیرت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا کہ یہ وہی شخص تھا جس کے پاس یتیم خانے میں میں آپ کا بچہ بھیج کر واکے آیا تھا۔ یا میں برسوں میں بھی اس شخص میں کوئی نمایاں فرق نہیں آیا تھا۔ میں نے اسے چند لمحوں میں پہچان لیا تھا۔“

”وہ کیا کہتا ہے؟“ رعنا حیات کپکپاتی آواز میں بولیں۔
 ”وہ بھی مجھے پہچان گیا ہے۔ اس کا یتیم خانہ دوسری بلکہ منتقل ہو چکا ہے آج سے تقریباً اٹھارہ انیس سال۔“
 ”تو وہ بچہ میرا بچہ۔“

”جی وہ کہتا ہے ہمارے یتیم خانے میں لڑکیوں کو بارہ سال کی عمر تک اور لڑکوں کو سولہ سال کی عمر تک رکھا جاتا ہے جو نشانیاں میں نے اسے بتائی ہیں وہ اس بچے کو شناخت کر چکا ہے۔ اب آپ آئیں تو ہم دونوں اس کے ساتھ یتیم خانے ملتے ہیں۔“
 ”تو وہ یتیم خانے میں ہے؟“

”ارے نہیں بیگم صاحب!“ سلمان سبزواری جلدی سے بولا۔
 ”انہوں نے تو اسے سولہ سال کی عمر میں فارغ کر دیا تھا۔ ان کے پاس اس کی تصاویر ہیں جس سے آپ کو اب اسے ڈھونڈنے میں آسانی ہوگی۔ آپ آرہی ہیں نا پھر؟“
 ”آپ پلیز مجھے اپنے آفس کا ایڈریس سمجھائیں۔“ وہ جلدی سے بولیں تو سلمان سبزواری انہیں آفس کا پتہ سمجھانے لگا۔

ایبٹ آباد کے ڈسٹرکٹ ہسپتال کے چلڈرن وارڈ میں معاذ سینئر ڈاکٹرز کے ساتھ راؤنڈ ٹیبل پر تھا۔ وہ باری باری

سب بچوں کے ریز کے قریب رکھے اس کی فائل اٹھا کر چیک کرتے بیمار واروں اور نرسز کو مختلف ہدایات جاری کرتے تباہی کی طرف آرہے تھے۔

”میرا خیال ہے براٹیوٹ روز کا وزٹ دس پندرہ منٹ بعد رکھ لیتے ہیں۔ شاید ایم ایس میٹنگ کے لیے کال کریں۔ ویسے آپ ڈاکٹر معاذ ڈرا ان روز کا ایک وزٹ کر آئیں، اگر کوئی سیریس پر ایلم ہو تو آکر مجھ سے ڈسکس کریں۔“ ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر فواد کہتے ہوئے وہاں سے چلے گئے تو معاذ نے براٹیوٹ روز کا رخ لیا۔
 اسے ادھر لپائنٹ ہوئے تقریباً ”مہینہ ہو چکا تھا“ اس دوران وہ صرف ایک بار لاہور گیا تھا، وہ بھی اپنے کچھ ضروری ڈاکو سٹس لینے اور پرو فیسر واؤس سے معذرت کرنے کے لیے، وہ ابھی انہیں جوائن نہیں کر سکتا۔ لاہور سے واپسی پر ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ مسز خان کی خیریت فون کے ذریعے دریافت کرے مگر پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ اس رات کی اذیت کوئی بھلا دینے والی تو نہیں تھی۔

”ارے فدا تم یہاں؟“ وہ جیسے ہی روم نمبر تھری میں داخل ہوا بیڈ پر لیٹے فمد کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بے ساختہ اسے از قلم کی یاد آئی تھی وہ بہت دنوں سے مس کر رہا تھا۔ فمد کی ٹانگ پر تھتے کہ پاس بیٹھی بندھی تھی۔
 ”نکل! آپ یہاں۔“ وہ بھی حیران ہوا۔ ”آپ ڈاکٹر ہیں؟“ اسے دوسری حیرانی نے آن گھیرا۔ ”گھر جی۔“
 ”اگر جی۔ ادھر آئیں، دیکھیں کون آیا ہے۔“ وہ خوشی سے چلانے لگا۔
 ”آہستہ فمد بیٹا! اور یہ چوٹ کیسے لگی تمہیں؟“ وہ اس کی فائل اٹھا کر پڑھنے لگا۔

”مسلا بیڈ سے گرا ہوں۔ گرجی کے اسکول کے بچوں کے ساتھ پکنک پر آئے تھے اور آج تو ہمیں واپس جانا تھا۔“ وہ منہ بسور کر بولا، اسی وقت فمد کی گرجی پوش روم کا دروازہ کھول کر نکلیں تو معاذ کو دیکھ کر انہیں بھی خوشگوار حیرت ہی ہوئی۔ کسی سلام دعا کے بعد معاذ فمد کی چوٹ کے بارے میں پوچھنے لگا۔
 ”نکل ہمارے قلم اسکول کیوں نہیں آ رہا؟“ وہ بات جو معاذ فمد سے پوچھنے کے لیے دل میں بہانے گھڑ رہا تھا فمد نے خود بخود بول دیا۔
 ”اسکول نہیں آ رہا؟“ اس نے کچھ چونکنے کی ایکٹنگ کی۔

”ہاں اس کی اہلیہ کمیشن دوبار آئی ہے کہ اس کا بخار نہیں اتر رہا۔ اب مجھے سمجھ میں آیا کہ اس کا بخار کیوں نہیں اتر رہا۔ آپ جو ادھر ہیں۔“ اس نے خود ہی معاذ سے کہہ کر اسے کسی لمبے چوڑے بھوٹ سے بچا لیا۔
 ”بس والدین ادھر ادھر ہو چکے ہیں تو پتے پوچھنے کو نہیں بتا رہے جاتے ہیں۔ ویسے فمد کو ادھر کتنے دن لگیں گے؟“ گرجی فمد کے یہاں سنوارتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”معمولی چوٹ ہے شاید کل تک فارغ کریں۔ اوکے جی میں فارغ ہو کر چکر لگاؤں گا۔ آپ اسے تھوڑی دیر کو ملادیں تو زیادہ ستر ہے وہ اب لے چکا ہے نا؟“ معاذ نے فائل رکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”ہاں دو تو کھلا دی ہے“ اسکول کے بچوں کو ابھی میں واپس بھجوا رہی ہوں۔ ویسے اگر اسے بھی شام تک ڈسچارج کر دیا جائے تو مجھے آسانی ہوگی۔“

”میں بات کرتا ہوں آپ فکر نہ کریں۔ اوکے جی ٹیک کیئر۔“ وہ کہتے ہوئے باہر نکل آیا۔
 ”بائی کمروں کے وزٹ کے بعد جب وہ دوبارہ روم نمبر تھری کے سامنے سے گزر رہا تھا تو گمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا اور بیڈ کے پاس کوئی کھڑا تھا، یونہی معاذ کی نظر پڑی اور جیسے وہیں جم کر رہ گئی۔
 وہ چہرے سے لاشعوری طور پر وہ بہت دنوں سے تلاش کر رہا تھا۔ ہنسا مسکراتا، جیتا جاتا اس کے سامنے تھا اور وہ ایک تک و لمحے جا رہا تھا۔ اس کی نظروں کا راز تھا جس نے اس چہرے کو بے اختیار اس کی طرف متوجہ کیا تھا اور اب کے ہنسنے کی باری اس کی تھی۔ نظروں کا تصادم ہوا اور بہت سے عقیدے و اہوتے کو بے چین نظر آنے لگے۔

”میں یہ کیا حماقت کر رہا ہوں۔ ادھر پڑا کتنی نیکیاں کما رہا ہوں۔ اگر واپس آکر یونہی منہ چھپا کر کسی کو نے میں

بنا تھا تو اس سے بہتر تھا میں واپس ہی نہیں آتا۔ شہباز خان اکتائے ہوئے لمبے میں کھڑکی سے باہر بھاگتی دوڑتی ترقیب کو دیکھ کر خود سے سوال کر رہے تھے۔

”پورے تیس دن ہو چکے ہیں مجھے اس ہوٹل میں پڑے ہوئے“ آخر یہاں بلا مقصد رہنے کا جواز کیا ہے۔ میں کیوں حالات کا سامنا نہیں کر سکتا اور کچھ نہیں تو ام جان کا خیال ہی مجھے کیوں گھر جانے پر مجبور نہیں کیا رہا۔ پتا نہیں وہ کس حال میں ہوں گی۔ وہ کھڑکی سے جھک کر نیچے دیکھنے لگے۔ سامنے کتنے درختوں کے پتے سے طلوع ہونا سورج ایک نئے دن کی آمد کا پتا دے رہا تھا۔

”نیا دن یا پرانا۔ آخر میں کیوں پونہی دن کتنا بے جا رہا ہوں!“

”تڑپت زندہ ہے یا مر گئی یا کہیں بھاگ گئی۔ ان تینوں میں سے ایک بات تو ہے اور میرے اندر اتنا جو صلہ کیوں نہیں کہ میں اس حقیقت کا سامنا کر جا کر کروں۔ کیا میرے یہاں چھپ کر بیٹھے رہنے سے حقیقت بدل جائے گی اور میں تو اسے ہر الزام سے بری کر کے یہاں تک آیا تھا پھر یہاں آ کر ایت کتنا دور۔ میری زندگی کتنی بے مقصد گزر رہی ہے، صرف ایک اس ایشو نے مجھے کیا سے کیا بنا ڈالا ہے۔ حالات سے فرار کے لیے میں نے باب بھی پھوڑ دی جو کبھی میری زندگی کا بڑا خوبصورت مقصد تھا اور اب یہ بے مقصد۔ آخر کب تک وہ پلٹ کر کمرے میں آئے۔“

”مجھے گھر جانا چاہیے، کم از کم ام جان اور ارٹھنی کی خاطر اور اگر سب کچھ ویسا ہوا جیسے میں چھوڑ کر گیا تھا طعنے اور بھائیوں کے طنز تو میں ام جان اور ارٹھنی کو لے کر کہیں اور شہرت ہو جاؤں گا۔ آخر کب تک اس چار دیواری میں منہ پھپھکا کر رہا رہوں۔ مجھے آج یا کل یہ فیصلہ کر لینا چاہیے۔“ دروازے پر ہونے والی دستک نے ان کی سوچوں کا ارتکاؤ توڑا۔

”نہیں۔“ ڈیوٹر ورنہ کھول کر اندر آیا اور ٹرے میں رکھا اخبار ان کے سامنے پیش کرنے لگا۔

”سبز پیک فاسٹ۔“

”ابھی نمبر۔“ وہ اخبار کھول کر دیکھنے لگے۔ چند منٹ صفحات پلٹ کر دیکھے اور پچھلے صفحے کے پتے چھنے میں سب سے نمایاں خبر ہو تصویر کے ساتھ چھپی تھی اس نے انہیں چونکا کر رکھ دیا۔

دوسرے پل وہ وہ سہ سہ سہ سہ پر فون کر رہے تھے کہ ان کے واجبات کا بل کمرے میں بھیج دیا جائے، وہ چیک آؤٹ کرنا چاہ رہے ہیں۔ محض دس منٹ بعد وہ گھر جانے کے لیے تیار تھے۔ اخبار ان کے ہاتھوں میں تھا اور نظریں ایک بار پھر اس خبر اور تصویر پر لگی تھیں جس نے چند منٹ میں ان سے اتنا مشکل فیصلہ کھول دیا تھا۔



صوفی صاحب ناشتہ کرنے کے لیے آمنہ کے بلانے پر کمرے سے باہر نکل رہے تھے جب چھوٹی اماں بی بی کو اٹھانے اندر داخل ہوئی۔

”اماں جی نہیں اٹھیں؟“ جویریہ نے صوفی صاحب سے پوچھا۔

”نہیں، رات ویر تک باتیں کرتی رہیں پھر کچھ طبیعت بھی مجھے تمہاری ماں کی ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ سجد کے لیے بھی نہیں اٹھی۔ کہہ رہی تھی صوفی صاحب! اٹھا نہیں جا رہا۔ فجر کے قریب آنکھ لگی اسی لیے میں نے اٹھایا نہیں۔ اب کافی سوچنی ہے تم ناشتہ کے لیے اٹھاؤ اور بعد میں دو ابھی دے دو۔“ صوفی صاحب تھکے سے کہتے ہوئے باہر کی طرف بڑھے رات بھر تو وہ خود بھی نہیں سو سکے تھے۔ ملازمت ختم ہو گئی تھی اور گھر تلاش کرنے کا تین مرحلہ سمر بر آن پڑا تھا۔ سرکاری آرڈر تو آگئے تھے مگر انہوں نے رات اپنے دل کو طفل تسلیوں سے بہلا لیا تھا کہ وہ دوبارہ اپنے شاگرد افسروں کی جا کر منت ساجت کریں گے تو شاید آرڈر واپس لے لیا جائے“ ورنہ دوسری صورت میں انہوں نے ہفتہ بھر کے اندر آمنہ کی رخصتی اور جویریہ کی بات طے کر کے اس کے نکاح کا فیصلہ کر لیا تھا۔ باقی دونوں میاں بیوی ہوں گے، کہیں بھی صوفی صاحب بچوں کو قرآن پڑھا کر تھوڑے بہت

زندگی گزارنے کے وسائل پیدا کر ہی لیں گے۔ اسی ہی تسلیاں وہ رات بھر راجہ بی بی کو بھی دیتے رہے تھے جو سرکاری حکم نامے پر اچھی خاصی پریشان تھیں۔

”اماں جی۔ اماں جی۔ اٹھیں نا۔ دیکھیں، کتنا دن چڑھ آیا ہے۔ آج آپ نے نماز بھی قضا کر دی۔ اماں جی۔“ جویریہ بہت آہستہ آہستہ ان کا کندھا ہلا کر انہیں جگانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”اماں جی۔ اماں جی۔“ اس نے ان کا بازو پکڑ کر اٹھایا جو کسی مردہ شے کی طرح اس کے ہاتھ سے جھوٹ کر پہلو میں جا گیا۔

”اماں جی۔ بابا صاحب۔ اماں جی۔“ اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی اور صوفی صاحب جو بیٹھے بیٹھا چاہ رہے تھے بیدم انہیں لگا ان کا سر پکڑا رہا ہے اور قدم جیسے زمین کے اندر گڑ گئے ہیں۔ وہ کرنے کو تھے، کھینچنے کے لیے قدم کو پی سہارا نہیں تھا۔ اٹھنے قدم پل کر وہ زور سے دیوار سے ٹکرائے تھے۔ آمنہ بھاگی بھاگی اندر گئی۔

آمنہ اور جویریہ چیخ چیخ کر اماں کو آوازیں دے رہی تھیں اور صوفی صاحب دیوار سے لگے آٹھے کھڑے آٹھے بیٹھے کچھ کہنے کی کوشش نہیں کر رہے تھے طرف گھمانا چاہ رہے تھے مگر انہیں لگا وہ ایسا نہیں کیا نہیں کے ان کا جسم ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا۔

وہ کس کو پکاریں کہ انہیں سہارا دے۔ ان کی نگاہوں میں عبدالمبین اور عبدالمبین کے تو منہ جسم آگئے۔



ایک ساتھ دو وقت میں ان کے گس ٹوٹی تھیں۔ ایک ساتھ دو طاقت ور اور مضبوط ستون گرہے تھے۔ دوستوں تو پہلے ہی اس مٹی کے گھروندے کو چھوڑ کر چلے گئے تھے ان کے جانے کے بعد یہ گھروندہ ان ہی دو ستونوں پر ٹکا اٹھا، آج وہ بھی ڈھے گئے۔

اور لمبے کے نیچے سے صوفی صاحب کا آٹھا زندہ آدھا مردہ جسم نکلا تھا۔ جب کہ سفید کفن اوڑھے راجہ بی بی کا پرنور پڑ سکون چہرہ جو ہر بے سکون اور پریشان حال دل سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔

”جو لوگ عمر بھر متوازن رستوں پر چلتے ہیں ان کے آخری لمحات ایسے ہی پُر سکون ہوتے ہیں۔“ انہوں نے سبک رفتار ہوا کے زخم بھونکوں کی مانند زندگی گزار لی تھی۔ ہوا جو ہولے ہولے چلتی رہے تو اس کے پاس ہونے کی خبر بھی نہیں ہوتی اور چوہل بھر کے لیے بھی سانسوں سے دور ہوتی محسوس ہوتی حلقہ حیات تنگ پڑتا محسوس ہونے لگتا ہے۔

وہ تو صوفی صاحب کی طرح بچوں کی معمولی یا غیر معمولی گفتگوں پر آپے سے باہر ہوتی تھیں اور ان کی محبت میں کسی انتہا کو چھوتی تھیں۔ ہر جذبے کو انہوں نے ساری زندگی صبر کی ہلکی آہ پر پکا کر ہی سینے میں سلایا تھا۔

وہ ماں تھیں اور ایک ماں کی سی زندگی گزار کر چیکے سے آنکھیں موند لی تھیں۔ ایک تکلیف وہ حسرت بھری زندگی گزار کر کسی سے بھی ان تکلیفوں کا تذکرہ کیے بغیر کسی کو بھی برا بھلا کہے بغیر وہ مزاج کے تکلیف وہ لمحات کو بھی خاموشی سے سہہ گئی تھیں کہ پاس یا انکل پاس دو ہاتھ پر لیٹے عمر بھر کے ساتھی کو بھی خبر نہ ہو سکی تھی کہ کب تیس سال طویل رفاقت کا یہ سفر چیکے سے تمام ہو گیا۔ کب راجہ بی بی کا ہاتھ بے حد آہستگی سے صوفی عبد الرحمن کے ہاتھوں سے پھسل گیا۔

مگر جب خبر ہوئی۔ تو صوفی عبد الرحمن کے حوصلے اور ضبط کا آخری بند بھی ٹوٹ گیا۔ وہ اچاری سے بے بس و وحشت بھری نظروں سے آخری نیند صوفی راجہ بی بی کے پنجک کے ارد گرد آتے جاتے روتے افسوس کرتے، ترس بھری نظروں سے دیکھتے، لبوں میں کوئی نہ کوئی ہمدردی بھرا فقرہ کہتے لوگوں کو بس دیکھتے رہ گئے تھے۔ انہیں تو ان چہروں میں ایک بھی اپنا شاسا چہرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا کیوں جیسے وہ اجنبی لوگوں کے نجوم میں گہر گئے ہوں۔ ان کا وجود جیسے پتھر کا ہو چکا تھا۔ انہیں تو ملکی اور خضیاں اوڑھے بے آسرا ہوتی آمنہ اور جویریہ بھی کیس نظر نہیں

آرہی تھیں۔ ان کے شناہنا منظر جانے بو تھے چہرے ان کا داغ جیسے آج جان بوجھ کر انہیں نہیں پہچان رہا تھا۔ سب کچھ دھندلا دھندلا کر اور کمر کی گہری چادریں لپٹا کر انہیں ان کے ساتھ ان کے اعصاب کو شل کر رہا تھا۔

اور کلمہ شہادت کی بلند تکبیروں کے ساتھ رابعی بی بی انجان لوگوں کے کندھوں پر سوار ہو کر اپنی آخری آرام گاہ کی طرف روانہ ہو گئیں۔ جوان صحت مند خوبصورت بیٹوں اور جیتے جاگتے شوہر کے ہوتے ہوئے اجنبی لوگوں نے انہیں آخری گاندھا دیا تھا۔ انہیں انکار رابعی بی بی کفن سے سر نکال کر شکوہ بھری نظروں سے انہیں مڑ مڑ کر دیکھ رہی ہیں۔

جویریہ اور آمنہ کی بے قابو ہوتی چیخیں اور پچھاڑیں کھا کھا کر کہاں کے پلنگ سے لپٹنے کا منظر ان کے اندر کے غصے اور ناراضگی کو چھوڑ رہا تھا۔ جویریہ کا وہ پٹہ اترا کر کندھوں اور سینے پر آ رہا تھا مگر اسے جیسے ہوش ہی نہیں تھا۔ اس کی بددلی کے غم میں پاکوں کی طرح بال بھرائے بیچ رہی تھی۔ اجنبی عورتوں کو پکڑ پکڑ کر رابعی بی بی کے پلنگ سے پرے ہٹا رہے تھے۔

”اماں جی۔ اماں جی۔ ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہی ہیں۔ اماں جی۔ ہم کیا کریں گے۔ اماں جی۔ آجاؤ۔“ اور ان کی دل خراش چیخیں پتھر سے پتھروں کو بکھلا رہی تھیں اور صوفی صاحبہ کی لگائے پتھر ہوتے جسم کے ساتھ غصے اور غم کے اوج میں کئی بار اٹھنے کی ناکام کوشش کر چکے تھے کہ انہیں اور ان دونوں کو پکڑ کر اپنے سینے میں سماییں پھیلائیں۔ یہ کیوں نا محرموں کے درمیان یوں بیچ بیچ کر اپنے معصوم چہرے نکلے کر کے صوفی صاحبہ کے نام کو تسمت لگا رہی ہیں مگر ان سے تو ہلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ بائیں ٹانگ اور بازو تو وہ آرام سے ہلا رہے تھے مگر نچلا دھڑ اور دائیں ٹانگ وایاں بازو اور بار بار پکڑ کھا تا سرکاشش کے باوجود منہ کے اندر دانتوں کے پیچھے بھٹی ہوئی زبان ایک بھی لفظ ادا کرنے سے قاصر محسوس ہو رہی تھی۔

”یا اللہ! یہ مجھے کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔“ انہوں نے آخر تک کرا کھڑی لبتوں کی دیوار کے ساتھ گردن نکا کر سر پر سے شامیانے کے آخری کنارے سے اور شام کے تاریک سائے میں ڈوبتے آسمان کو دیکھا اور بے اختیار فریاد کی۔

”دیکھا بابا صاحب! اماں جی میرے پاس آئیں۔“ انہیں لگا زینب کھکھلا کر تالی بجا کر ہنسی تھی، آسمان کے اسی آخری سرخ ہوتے کنارے سے۔ انہوں نے جلدی سے نگاہوں کا رخ بدل کر آمنہ اور جویریہ کو تلاش۔ جنازہ اٹھ جانے کے بعد اب دونوں اجنبی عورتوں کے سینوں میں منہ چھپائے کھٹی کھٹی آواز میں سو رہی تھیں۔

ان کا بے اختیار دل چاہا دونوں کو زوردار آواز میں پکار کر کہیں۔ اوپر چلو اوپر چل کہاں کے چلے جانے کا سوگ منانا۔ یوں گلی کے پتھروں سے نکلے سر بیٹھ کر رونا دھونا بند کر دو۔

”توبہ۔ اللہ معاف کرے۔ ایسے بھی کیا گناہ کہ بے چاروں کی شامت ہی آگئی ہے۔“ کوئی عورت کہہ رہی تھی۔ جو صوفی صاحبہ کو تاحد کوشش گردن موڑنے کے باوجود نظر نہیں آسکی تھی۔

”کتے ہیں۔ غم، قرب خدا کی نشانی ہے۔ پر ایسا قرب۔ اللہ معاف کرے، ہم گناہ گاروں کو ہم ایسے قرب کے مستحق کہاں؟ پہلے جوان بیٹے چھوڑ کر چلے گئے۔ اللہ جانے کیا چکر تھا پھر جوان جمان بیٹی مر گئی۔ اس کے بچھن کون سے اچھے تھے اور اب یہ بے چاری، نیک بے زبان روح کب تک غم جمیلیتی اور صوفی صاحبہ کو دیکھو اللہ جانے کیا ہوا ہے۔ پتھر بے بڑے ہیں۔ ہتھو سب کو دیکھے جا رہے ہیں جیسے۔ جنازہ ان کی بیوی کا نہیں، مکے کی کسی عورت کا ہے۔ دیکھو تو سنگولی جنازے کو کندھا تک نہیں دیا۔ ساتھ تک نہیں گئے۔ ایسی بھی کیا شقی النفسی۔“

عورتیں اب جنازے سے فارغ ہو کر کھل کر باتیں کر رہی تھیں۔ ان آوازوں کی سبھناہٹ میں اس عورت کا تبصرہ جو یقیناً صوفی صاحبہ کے کہیں قریب ہی بیٹھی تھی سب سے نمایاں تھا۔

”ہوا ہو گا کوئی بڑا جھگڑا بے چاری دل پر لے کر چلی گئی۔ توبہ تولا کرے صوفی صاحبہ کا گھرانہ۔ میں تو کہتی ہوں“

آیت کریمہ کا رو کر ناچا ہے انہیں ہر روز سوا مینہ تک سوا لاکھ دفعہ اللہ ان کے گناہ معاف کرے۔ کوئی صدقہ کریں۔ یہ تو خود لوگوں کے گناہ بخشواتے پھرتے ہیں ان کا یہ حال ہے تو عام ہندے کا سوچو۔ توبہ میری۔“

صوفی صاحبہ نے سر گھمانے کی آخری بے سود کوشش میں سرخ دیا تھا۔

”یہ تو حال ہے آج کل کے مولویوں کا۔ اب بھلا پتا دہندہ کس کو نیک سمجھے، کس کو بد۔ نہ جانے کہاں سے آئے ہیں، نیچے کیا گل کھلا کر آئے ہیں۔ جب سے آئے ہیں بے چاروں کے اوپر ایک کے بعد ایک آفت ٹوٹ رہی ہے۔ اوھر بھی اب چند دنوں کا مسمان سمجھو۔ سنا ہے مسجد کی ڈیوٹی سے تو فارغ ہو چکے ہیں بے چارے۔“ وہ منہ پھٹ عورت پھر بولی تھی۔ ان کو لگا ان کا پیش آخری حد کو چھو کر پلٹنا تھا۔

انہوں نے پھر سے نگاہوں کا رخ بدلا۔

آمنہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ آنسوؤں سے ترچہ لے کر ان کی طرف آرہی تھی۔

پہلا مانوس بے حد اپنا چہرہ وہ رابعی بی بی کی وانگی جدائی کا غم اس بل بھلا کر اٹھ کر اسے اپنے سینے سے لگانا چاہ رہے تھے اور صوفی عبد الرحمن اس بے بسی کے عالم میں کسی مردہ کبوترے کی طرح زمین پر پڑا رہے یہ تو ان کی غیرت کو ہرگز گوارا نہیں تھا۔

انہوں نے اپنے جسم کی پوری طاقت کو مجتمع کیا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سے پہلے کہ وہ بازو پھیلا کر وہ سر پر کھڑی آمنہ کو گلے سے لگاتے ان کی دائیں ٹانگ نے ان کے جسم کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا۔ سارا وزن بائیں حصے پر ڈال کر وہ فقط چند بل ہی کھڑے رہ سکے اور بائیں ہاتھ کو پھیلا کر دیوار پر کوئی سہارا تلاش کرتے پھر بھری مٹی کی طرح دائیں طرف گرتے چلے گئے۔

”بابا صاحب! بابا صاحب!“

انہوں نے منہ ہوتے داغ کے ساتھ آمنہ کی چیخیں سنی تھیں۔ درد کی تیز لہر کے ساتھ وہی ظالم سنسناہٹ ان کے جسم کے دائیں حصے میں دوڑ گئی تھی اور ان کا وجود جیسے کسی پہاڑ کے نیچے دتا چلا جا رہا تھا۔

”بیگم صاحبہ۔ بیگم صاحبہ دیکھیں تو کون آیا ہے۔“ زیتون بانو کی آواز خوشی کی انتہاؤں کو چھو رہی تھی اور کتاب پڑھتی مسر خان نے کتاب اپنے زانو پر رکھ کر آنکھوں سے عینک اتارتے ہوئے استفسار میں نظروں سے کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔

زیتون بانو جو اس باختہ کی اندر داخل ہوئی تھی۔

”کیا ہوا زیتون! ان کا فقرہ پورا بھی نہیں ہوا تھا جب شہباز خان اندر داخل ہوئے تھے ان کے ہاتھ سے چشمہ چھوٹ کر نیچے جا کر اٹھا۔“

”شہباز۔ شہباز۔“ وہ کپکپاتے لبوں سے محض سرگوشی میں کہہ سکی تھیں۔

”تم جان۔ تم جان۔ میں آیا ہوں آپ کے پاس۔ آپ سے معافی مانگنے۔“ وہ کہتے ہوئے ان کے زانوؤں پر سر رکھ کر بے اختیار رو پڑے۔

”شہباز! میری جان میرے بیٹے میرے کلچے کی ٹھنڈک۔ کتنا انتظار کرایا تم نے۔ کتنا اس بوڑھی جان کو تڑپایا۔ شاید اس جوانی کے عالم اس کی سرمستی میں تمہیں اس کا احساس بھی نہیں ہو سکا۔“

وہ لرزتے کانٹے ہاتھوں میں شہباز خان کا چہرہ لیے برستی آنکھیں لیے کہہ رہی تھیں۔

”تم جان! مجھے معاف کر دیں میں آپ کا مجرم، آپ کا گناہ گار، ام جان! بہت مس کر رہا ہوں آپ کو بہت زیادہ۔“ وہ ماں کے ہاتھ چومتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”تو تمہارا کیا خیال تھا ماں! کون تمہاری یادوں سے خالی ہو گیا ہے جو تم سے یاد نہ آتے ہو گے۔ میرے بچے! بل بل ان بچتے دیوں نے تیری راہ دیکھی ہے۔ ان پانچ سالوں میں کون سا بل کون سی گھڑی ایسی تھی جب تیرے پلٹنے کی دعا نہیں کی میں نے۔“

وہ ایک بار پھر شہباز خان کو اپنے سینے میں بچھپتے ہوئے بولیں۔
 ”آپ کی دعاؤں نے ہی تو میرے دل کی حالت بدلی ہے کہ آپ کی طرف آپ کی خاطر لوٹ آیا ہوں۔ میری پیاری ام جان! وہ بھی وارفتگی سے ان کے تحیفہ جو کو اپنی مضبوط بانہوں میں بھرتے ہوئے بولے۔
 ”اب تو نہیں جاؤ گے نا؟“ وہ ہاتھوں کے پالے میں بیٹے کا چہرہ سجا کر بے اختیار بولیں۔
 ”کبھی نہیں ام جان! کبھی بھی نہیں۔ اپنی جنت کو چھوڑ کر کبھی بھی نہیں جاؤں گا۔ آپ کی قسم۔“ وہ ان کے دونوں ہاتھوں کو باری باری محبت سے چومتے ہوئے کہہ رہے تھے۔
 ”واقعی سچ کہہ رہے ہو نا؟“ وہ بے یقینی سے بولیں۔

”اپنے سر کی قسم ام جان! بالکل سچ“ آپ کے بغیر در در بھٹکا ہوں سکون کی تلاش میں اور مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ میرا سکون میرا قرار تو آپ کے پاس ہے آپ کے قدموں میں۔ میری ضد اور اٹانے مجھے محض بے سکونی ہی دی ہے اور کچھ بھی نہیں۔“ وہ تھکے تھکے سے بولے۔
 ”میری دعا میں بے اثر نہیں جائیں گی۔ مجھے یقین تھا خدا مجھے مرنے سے پہلے یہ مبارک لمحے ضرور دکھائے گا۔ وہ بڑا رحیم ہے بڑا مہربان بڑا بخشنے والا۔ ہماری کوتاہیوں اور غلطیوں سے چشم پوشی اختیار کرے۔ نوازے والا وہ کسی کے بھی آسودہ قرار یا گناہ نہیں جانے دیتا۔“ وہ بے خودی کے عالم میں بچے خود سے کہہ رہی تھیں۔
 ”ام جان! ار ترضی۔ ار ترضی کہاں ہے؟“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد شہباز خان نے سر اٹھا کر کچھ بھونکنے ہوئے پوچھا تو مسز خان نے ایک شکایتی نظر ڈالی۔
 ”اسکول گیا ہوا ہے۔“ وہ اس کے گھٹنے بالوں میں اٹھکھیاں چلاتے ہوئے محبت سے بولیں۔
 ”وہ اسکول جانے لگا ہے؟“ وہ خوشگوار حیرت سے بولے۔

”ہاں ماشاء اللہ پانچ سال کا ہونے والا ہے۔ خوب بڑی بڑی باتیں کرنے لگا ہے۔ پڑھائی میں بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ بغیر کسی شور کی ہمد کے صرف معاذ سے۔“ وہ کہتے کہتے ایک کمرے سے پیپ ہو گئیں۔
 ”اوہ یاد آیا ام جان! میں اسی لیے آیا ہوں۔ میرا مطلب ہے مجھے آئے تو اوہ۔“
 ”معلوم ہے مجھے تمہیں پاکستان آئے کتنے دن ہو چکے ہیں۔“ وہ جلدی سے نقلی بھرے لہجے میں بولیں۔
 ”ام جان! آپ کا سامنا کرنے کا خود میں جو صلہ نہیں پار رہا تھا۔“ وہ خجالت سے سر کھجاتے ہوئے کرسی کھینٹ کر ماں کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ مسز خان نے آنکھیں پوچھتے ہوئے زنتون بانو کو پوچھ لکھنے کے بعد اپنے منہ کا اشارہ کیا تو وہ سر ہلاتے یا ہر کھل گئی۔
 ”تو آج کیسے جو صلہ کرایا۔“ وہ کچھ تھکے لہجے میں بولیں۔

”اس اشتہار کی وجہ سے۔“ وہ کوٹ کی بیوی جیب سے تہ شدہ اخبار نکالتے ہوئے بولے۔
 ”ام جان! معاذ کہاں ہے؟“ انہوں نے اخبار پھیل کر مسز خان کے آگے کر دیا۔ مسز خان ان کے سوال کا جواب دے بغیر بیٹھے گئی ہوئی ٹینک اٹھا کر آنکھوں پر لگاتے ہوئے اخبار میں اس جگہ دیکھنے لگیں جہاں شہباز خان نے انگلی رکھی تھی۔
 ہوں ہوں سطوں پر نظریں دوڑتی گئیں ان کا دل تیز تیز ہلکنے لگا۔

”دیکھیں بیگم صاحبہ! ہمارے پاس تو پچھلے میٹرک تک رہتے ہیں۔ تقریباً دو تین سال کی عمر کا بچہ ہم لیتے ہیں۔ اس کے بعد بیچوں کو توبارہ تیرہ سال کی عمر میں ہم لڑکیوں کے کسی ادارے میں بھیج دیتے ہیں۔ البتہ لڑکوں کو تقریباً سولہ سترہ سال تک ہمارے ادارے میں رہنے کی اجازت ہوتی ہے۔ اگر کوئی پڑھ لے تو میٹرک تک ورنہ عمر کا حساب تو مسائبان کے رجسٹر میں ہوتا ہی ہے۔“
 ادویہ عمری سے آگے کے سالوں کی طرف کامزن وہ شخص اپنی ٹانگ پر پھسلتی ٹینک جھاتے ہوئے رعنا حیات کو

تذلیل بتا رہا تھا۔
 ”تو یہ بچہ جس کی میں نے آپ کو تمام نشانیوں بتائی ہیں، میرا بیٹا علی شہباز شہباز ہے۔ کیا آپ کو یقین ہے آپ کے پاس ہی تھا؟“
 وہ بے یقین سے لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔ سلمان سبزواری ایک ٹکڑے رعنا حیات کی مضطرب و بے قرار حیرت کو نکتے ہوئے دل میں ان کی مستانگی پاس بچھنے کی دعا کر رہے تھے۔
 ”جو نشانیاں آپ نے بتائی ہیں وہ ہر وہ ہمارے ریکارڈ میں درج ہیں۔ ریکارڈ کا وہ رجسٹر جو میری ریٹائرمنٹ تک ریکارڈ روم میں محفوظ تھا اب کی جگہ خبر نہیں۔ اصل میں آپ کا بیٹا معاذ۔“
 ”علی شہباز شہباز ہے؟“ وہ جلدی سے ان کی بات کاٹ کر بولیں۔
 ”اس سے پہلے دن سے پنڈی والے تیم خانے میں بھی معاذ کے نام سے داخل کروایا گیا تھا، مجھے اس کے ساتھ ملنے والا ریکارڈ یاد ہے۔ کیوں صاحب! آپ کو تو علم ہے نا؟ آپ نے ہی اسے ہمارے پاس لا کر اس کا نام بتایا تھا۔“
 وہ شخص سلمان سبزواری سے مخاطب ہو کر بولا۔

”جی مسز حیات! میں نے بھی اسے اسی نام سے داخل کروایا تھا۔ وہ ہمارے پاس جتنے دن رہا ہم اسے محض بیچ کے نام سے پکارتے رہے۔ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ اسے کوئی اچھا سا نام دیں کہ ہمارے ہاں خدا کی رحمت۔“
 ”ہاں مجھے یاد آیا۔“ وہ سر ہلا کر بولیں۔
 ”جی کیا؟“ وہ شخص جلدی سے بولا۔

”جنتار کے بیٹے کا یہی نام تھا۔ کتنی ہی بیگم صاحبہ! میں اسے اللہ کا سپاہی بناؤں گی فوج میں بھیجوں گی اپنے بیٹے کو۔ تو مجھے ہنسی آئی تھی۔ اس مرل سے بھارت کے کو تم اللہ کا سپاہی بناؤں گی تو اس نے اپنے بیٹے کے نام سے ہی شہباز کو تیم خانے میں داخل کرایا تھا۔“ وہ سوچتے ہوئے نام کا عقیدہ حل کر رہی تھیں۔
 ”آپ کیا کہہ رہی ہیں بیگم صاحبہ؟“ وہ شخص بولا۔
 ”کچھ نہیں آپ آگے بتائیے۔“ وہ کہہ کر اس کے لیے کر بولیں۔

”میں آگے کیا بتاؤں آپ ابھی چلے میرے ساتھ مسائبان“ وہاں اپنی آنکھوں سے ریکارڈ چیک کر لیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ آپ ہی کا بیٹا ہے یا نہیں۔ بہت ذہین بہت لائق بچہ تھا۔ شروع میں تو بہت اچھے مہنگے اسکول میں داخل کروائے تھے۔ مسلمان صاحب اسے دو تین سال تک اس کے اخراجات بھی جمع کرواتے رہے پھر شاید دھندوں میں الجھ کر بھول گئے تھے۔“

سلمان سبزواری نے کچھ شرمسار ہو کر گردن جھکا لی۔
 ”سبزواری میں نے اس بچے کا شوق اور لگن دیکھ کر پانچویں کے بعد اسے گورنمنٹ اسکول میں داخل کروایا تھا۔ ہر جماعت میں اول آتا تھا۔ بہت ٹیک شریف، سبھا ہوا۔ اسے دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ کسی ٹیک ماں باپ کی اولاد ہے۔ آپ کو مسائبان سے اتنی مدد مل سکتی ہے کہ اس کے میٹرک کے رزلٹ کے ساتھ جو تصویر ہے اسے دیکھ کر آپ اسے آسانی سے تلاش کر سکیں گے۔ ٹاپ کیا تھا اس نے دسویں جماعت کے امتحان میں ہمارے ادارے کا نام روشن کیا تھا اس نے۔ اس کی تصویریں مسائبان کے آفس میں بھی لگی ہیں۔“

”چلیں۔“ رعنا حیات فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔
 ”میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔“ سلمان سبزواری بھی اٹھ کھڑے ہوئے تو رعنا حیات نے انہیں منع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انہیں تو بس ایک ہی لگن لگی تھی کہ جلد سے جلد اپنے گھر مقصود کو پالیں۔
 اور انہیں نکال کر کوئی مجھوتی رونما ہونے والا ہے۔

علی شہباز اس روز جس رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ جوتے، موزے، سوئیر، نیچے کی بنیان کا سائز بالوں کی رنگت، کٹنگ، آنکھوں کی رنگت، چہرہ ہونڈ، ہاتھ، پاؤں، وزن، قد اور آخری ہڈی نشانی کان کی نوکے نیچے گردن

سے اوپر سیاہیوں بالکل وسائل جیسا فخر حیات کے کان کے پیچھے تھا۔ سب کچھ ریکارڈ میں حرف۔ حرف درج تھا۔ اندران نامہ پڑھتے پڑھتے خوشی سے ان کا جسم کانپنے لگا تھا اور آنکھیں شفاف بن گئیں۔
 ”کیا میں واقعی اپنے بیٹے سے ملنے جا رہی ہوں؟ وہ واقعی زندہ ہے مجھے مل جائے گا؟“ مجھے یقین کیوں نہیں آ رہا۔“

ملازم کا پیش کردہ ٹھنڈے پانی کا گلاس ایک ہی سانس میں چڑھا کر وہ اب ٹکٹکی باندھے گولڈ میڈل لیے اس پر کشش چہرے والے لڑکے کو غور سے دیکھ رہی تھیں جس کے چہرے کا ایک ایک نقش انہیں اپنے ہاتھوں سے تراشا ہوا لگ رہا تھا۔ کھلی کھلی سیاہ شفاف ذہن آنکھیں چوڑی پیشانی، کھٹے سیاہ بال، کھڑی ناک کے نیچے بھیکتی نہیں مسکراتے لب۔ وہ ہاتھ پھیر پھیر کر اسے محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”اب اس کا تو ایک ہی طریقہ ہے سز حیات!“ وہ سلمان سبزواری کی آواز پر چونکی تھیں۔
 ”آپ اخبار میں اس تصویر کے ساتھ اشتہار دیں۔ ویسے تو میڈیکل کالج سے بھی پتا کروایا جاسکتا ہے۔ اتنا

الٹن لڑکا ضرور ڈاکٹر بنا ہو گا مگر اس طریقے میں بہت تاخیر ہو گا۔“
 ”تی درست کہا آپ نے اور اب مجھ میں انتظار کی مزید تاب نہیں۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولیں ”اور ابھی تو فخر

حیات کو بھی یہ سب بتانا ہے وہ سن کر کس قدر حیران ہوں گے۔“
 وہ ریکارڈ کی تفصیل مہیا کر دے فونو کالی اور تصویر اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اپنے شوئزر بیگ سے چیک بک نکال کر انہوں نے پانچ لاکھ کی خطیر رقم ”سائبان“ کے لیے لکھی تو ”سائبان“ کے موجودہ منتظم کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ سراجیک انہوں نے اس شخص کے نام لکھا جو انہیں یہاں تک لے کر آیا تھا۔ ”سائبان“ کے سراجیک منتظم انعام کو دلا کہ کاچیک۔

”نہیں نہیں بیگم صاحب! مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔“
 ”پلیز اسے میری خوشی سمجھیں اور میرے حق میں دعا کریں۔“
 جانے سے پہلے انہوں نے اپنے پرس میں ہاتھ ڈال کر جتنے بڑا بڑا ہزار کے نوٹ تھے سب نکال کر میز پر رکھ لیے۔

”ان پیسوں سے آج ”سائبان“ کے تمام بچوں کے لیے اچھا کھانا اور مٹھائی تیار کروادینے گا۔ میں ان شاء اللہ اب آتی جاتی رہوں گی۔ مجھے تو کبھی زندگی بھر اس کا احساس ہی نہیں ہوا کہ ان زندان خانوں میں پنے والے معصوم بچاری بچاری صورتوں والے بچے ہماری توجہ اور محبت کے کتنے مستحق ہوتے ہیں۔ حالات اور تقدیر کی ٹھوکروں کی زد میں آئے یہ کتنے سچے بچوں کیسے منتظر نگاہوں سے زندگی کی ہر اس آسائش کا انتظار کرتے ہیں جو ہم یونہی اپنے بچوں کو فراہم کر دیتے ہیں اور بھی ایک بل کو ان کے بارے میں سوچتے بھی نہیں جن کے منتظر ہم ہیں بھی ہمارے بچوں جیسے ہوتے ہیں۔“

اور سلمان صاحب! ہم لوگ ساری زندگی ایک ٹھوکروں کے منتظر کیوں رہتے ہیں کہ یہ سبق آموز ٹھوکروں نہیں لگے اور ہمیں ان سچے حقیقتوں کا اور اک ہو۔ ٹھوکروں کے بغیر ہمیں اپنے ارد گرد بیٹے والے ان بے شمار انسانوں کی موجودگی کا احساس کیوں نہیں ہوتا کہ ہماری ذرا سی توجہ محبت ان کی زندگیاں بدل سکتی ہے۔“
 وہ گہرا سانس لیتے ہوئے دھول اڑاتے پھوٹے سے مٹی کے اجاٹے میں گھلتے بچوں کو دیکھ کر دکھی لہجے میں کہ رہی تھیں۔

”سچ کتنی ہیں آپ۔“ سلمان سبزواری سر ہلاتے ہوئے بولے۔
 ”اور یہ کتنی بڑی خوشخبری تھی فخر حیات کے لیے اس کا اندازہ تو رعنا حیات کو انہیں یہ ساری بات بتانے کے دوران ہوا۔ انہیں لگا فخر حیات کے چہرے کا دوران خون ایک نخت برہہ گیا ہے۔“
 ”رعنا! کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟“ وہ جوش جذبات میں رعنا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں بھینچ کر سرگوشی نما

آوازیں بولے۔

”بالکل سچ یہ دیکھیے۔“ وہ چمکتی آنکھوں سے پرس میں سے تصویر اور ریکارڈ نکال کر دکھانے لگیں۔
 اور آج اخبار میں اشتہار دیے دو سراہن تھا۔

ساری رات مارے بے چینی کے انہیں نیند نہیں آئی تھی سلیڈنگ پلر لینے کے باوجود۔ انہوں نے تصویر کے ساتھ انعام کی لمبی چوڑی رقم بھی رکھی تھی مگر اس کے باوجود وہ لاؤنج میں بے مقصد ٹکے جا رہی تھیں جیسے کوئی آنے والا ہو۔

اسی وقت فون کی تیز بیل بجی تو وہ بڑتی ہوئی فون کی طرف لگی تھیں۔



”ہیلو فنی کیوٹ سفرنگ گرل بلکہ بدر“ مین آرا کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب عبدالعزیز پشاش نے فون اٹھا لیا تو اس کے پاس آکر بیٹھا تھا۔ اس نے چونک کر عبدالعزیز کو دیکھا اور ایک عجیبی ہوئی پشیموہ کی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی۔

”مہربانی آپ کی ٹکٹکی بیکار مسکراہٹ سے مجھے ڈاکٹر نے پرہیز بتایا ہے۔ تازہ ہوا میں بیٹھنے کے باوجود جنتیہ کے دل کی کلی کھل نہیں رہی۔ ہوں، کیسی فریض ایر ہے خوشبودار۔“ اس نے ناک کے منتھوں سے زور سے ہوا اندر کھینچتے ہوئے کہا۔

”قربیب اندر کا موسم ایسا پشیموہ ہو رہا ہے تو باہر کی تازگی کیا کرے گی۔“

وہ اسی عجیبی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”مجم گاڑی میں نہیں آئے۔“

مین آرا نے کچھ چونک کر حراک سے آگے پورچ کی طرف نگاہ کر کے پوچھا۔

”مجم! اس شہر میں، ہمارے ہاں۔“ وہ بے چینی کی کام کے نہیں۔ جب تک آپ چار پہیوں پر سوار نہ ہوں۔ ایک جگہ دو مری جگہ جانے کے لیے گولیس لازمی ہے۔ میری گاڑی باہر کھڑی ہے۔“ وہ ٹانگیں پھیلا کر کرسی کی پشت سے سر نکالتے ہوئے بولا۔

”کیوں خیریت۔ بیٹھو گے نہیں۔؟“

”دل کے خراب موسم کے ساتھ کیا آپ کی نظر بھی خراب ہو چکی ہے۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”کیا مطلب؟“ وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔

”بھئی! میں بیٹھا ہوں تمہارے استپاس۔ کو تو اور پاس آجاؤں۔“ وہ اس کے قریب جھکتے ہوئے بولا۔

”شہنشاہ! مین آرا نے ذرا سانس کر اسے ہاتھ سے پرے دھکیلا۔

”جیسے شہنشاہ پر حضور سوار قربان جاؤں۔“ وہ نالی بجا کر بولا۔

”آج کل کیا چیزوں کے ساتھ زیادہ آگے بیٹھنے لگے ہو۔“ مین آرا اس کا انداز دیکھ کر ہنسی۔

”بچروں کا تو تھا نہیں آج کل تو آپ کی کبھی میں اٹھ بیٹھ رہا ہوں۔“

”اچھا۔“ گاڑی اندر کیوں نہیں لائے۔؟“ وہ نہج آکر بولی۔

”بھئی! جلدی میں ہوں نا۔“

”کیوں تمہاری نہیں گاڑی پھوٹ رہی ہے۔؟“

”وہ دن بھی کبھی آئی جائے گا۔“ مین آرا اسے دیکھ کر بولی۔

”ایسے کیا دلچھ رہی ہو کیا مینوں کے رستے دل میں قید کرو گی۔“

”موتی! تمہیں ہو کیا گیا ہے۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔

”کیوں میرے کیا سینگ نکل آئے ہیں یا تمہاری طرح۔“ وہ شرارت سے اس کے حلیے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

37000

"اوکے میں اب چلتا ہوں۔ کل آؤں گا کراچی جانے سے پہلے۔ ٹیک کیر پائے۔" وہ کہتے ہوئے مڑ گیا۔

"مام سے نہیں ملو گے؟" "نہیں تارا اچھے سے پکاری۔"

"کل ان شاء اللہ۔" وہ ہاتھ ہلانے لگا۔

"کاش میں شاہجی کی محبت کے جال میں اس بری طرح سے نہ الجھ گئی ہوتی تو مولیٰ تمہاری دوستی میرے لیے ایک پرائڈ ہوتی۔"

Just like a pride of Love "وہ کرسی سے سر اٹھا کر خود سے کہہ رہی تھی۔"



"نہت۔ نہت۔ آئی۔" معاذ کے لب بے اختیار کھینچے تھے مگر قدم ابھی بھی اسی جگہ تھے۔ نہت کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی اور اس کی جگہ ایک گہری سنجیدگی نے لے لی تھی۔ وہ فمد کی گہری سے معذرت کر کے ست قدموں سے باہر نکل آئی۔

"نہت آئی! آپ یہاں۔۔۔" وہ اس کے پاس آنے پر محض یہی کہہ سکا۔

"آپ رکتے ہیں۔" اگلے لمبے اس کے منہ سے نکلا۔

"زندگی کی قید میں ہوں تو تمہارے سامنے کھڑی ہوں نا۔" وہ تلخی سے بولی۔

"اب میری سمجھ میں آیا۔ تمہاری کرسی کو اسکول میں فمد کی کون سی آئی جو اس اور اسٹینکس وغیرہ کھلاتی تھیں تو وہ آپ تھیں۔ وہ ہوا کے ساتھ ٹیکسٹ کیلکولر کے معاذ کو پلک جھپکے بغیر دیکھ رہی تھی۔

"پچاسی مہتا کو کب تک ہمدادوں سے کرسی کو تو سمجھاتی تھی مگر ایک ماں کے دل کو کیسے سمجھاتی۔" وہ آہ بھر کر بولی۔

"نہت نے یہ کیا کیا۔" کون یہ حقیقت کی؟ "معاذ جلدی سے بولا۔

"ایسا نہیں کرتے۔" وہ اس کے لیے پوچھنے لگی۔ "وہ پچاسی کی مسکراہٹ سے بولی۔

"ارٹھنی کیسا ہے؟" وہ چند لمحوں بعد بولی۔

"چتا نہیں۔" وہ نظریں چرا کر بولا۔

"کیا مطلب؟"

"میں گھر چھوڑ کر آچکا ہوں بلکہ مجھے نکال دیا گیا ہے۔" وہ اسٹینتھو اسکوپ بے چینی سے ہاتھ میں گھماتے ہوئے بولا۔

"چلیں کبیں چل کر بیٹھے ہیں۔" معاذ نہت کی کتھانے کو بے چین تھا۔

"مہول۔" وہ محض سر ہلا کر رہ گئی۔

"وہا کٹر معاذ! پلیز ذرا ایمر جنسی میں آجائیے۔ ایک کار کا ایک سیڈنٹ ہو گیا ہے جلدی ذرا۔" پاس سے گزرتے جو نیڑا کٹر عرفان نے معاذ سے کہا تو اسے مجھورا وہاں سے ہلانا پڑا۔

"آئی! آپ کو کہیں جانا نہیں ہے۔ پلیز میں آؤسے گھٹنے میں آتا ہوں۔" وہ تاکید کرتے ہوئے مڑ گیا تو نہت اسے جاتے دیکھ کر کچھ سوچنے لگی۔

"معاذ سے رابطہ کا مطلب پھر اسی اذیت ناک صورت حال کا سامنا کرنا پھر یہ مجبور کرے گا اور میرا دل تو پہلے ہی ہمانے ڈھونڈ رہا ہے ارٹھنی کے پاس جانے کے لیے اور جو خود سے وعدہ کیا ہے کہ اب دوبارہ اس ہندی خانے میں نہ جانے کا۔ وہ اس کا کیا ہو گا۔ نہیں۔۔۔" وہ ہوا پر سے گئی سوچے جا رہی تھی۔

تقریباً پونے گھنٹے بعد معاذ روم نمبر تھری میں آیا تو فمد کا خالی بستر اور خالی کمرہ اس کا منہ چرا رہا تھا۔ پاس سے گزرتی نرس نے پوچھنے پر تصدیق کر دی کہ وہ لوگ نیچے کوڈ سچارج کرا کے تقریباً آٹھ گھنٹے پہلے لے چکے ہیں۔

"شٹ اپ۔" وہ سمٹ سی گئی۔ "ہمت نہ کرنے لگے ہو کیا؟"

"ہمت تو نہیں بس تھوڑا تھوڑا نشے میں ہوں۔" وہ نظریں کشا کر کے بولا۔

"اپنی شکل دیکھی ہے کبھی آئینے میں؟"

"روز دیکھتا ہوں مگر کیوں کی فون کالز اور مسیلا کالز بڑھتی جا رہی ہیں۔"

"بڑھوں کے پیار لگ رہے ہو اگر اسی طرح تمہاری صحت گرتی رہی تو لڑکیاں کیا کوئی بھی منہ نہ لگائے گا تمہیں اور مام بتا رہی تھیں کہ تمہارے اندر مافیاء کے دست کیا نام ہے۔" وہ ذہن پر زور سے کرسوچنے لگی۔

"اوہ! بواٹ ڈیر! مام کی اوٹ پنا لگ رہی ہے وہاں نہ دیا کرو۔ ان سے کہو اب ان کی عمر اللہ اللہ کرنے کی ہے اوہرا دھر کن سوچیاں لینے کی نہیں اور تم بھی ان باتوں پر نہ سوچو۔ ان دنوں تمہاری صحت کے لیے مفید نہیں۔ میں چلتا ہوں۔" وہ ایک دم سے موضوع بدل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں جا رہے ہو۔" "نہن تارا کچھ حیرانی سے بولی۔ "مجھے تو تم آئے ہو بیٹھو تھوڑی دیر اور۔"

"کچھ دیر تو رک جاؤ برسات کے ہمانے۔" وہ گنٹایا۔ "تم ذرا برسات کا انتظام کرو میں پھر آتا ہوں رکنے کے لیے۔" اس نے پھر اسے ٹالا۔

"مولی۔" "نہن تارائے اسے نقلی سے پکارا۔

"بھئی گھر جا رہا ہوں کہاں ہی سے ملنے ہمت دن ہو گئے یا با صاب کے ہوتے کھانے باہر بھی بے چین رہا ہوں اور اب اوہرا اگر کبھی مصروفیات جان نہیں چھوڑیں۔ کل شام کراچی کی فلائٹ ہے میری وہاں پندرہ میں دن لگ جائیں گے۔ وہاں سے سیدھا اسلام آباد وہاں دیکھو کتنے دن لگتے ہیں اس لیے سوچا ہے پہلے گھر ہو آؤں۔"

"تم کچھ زیادہ ہی مصروف نہیں ہوتے جا رہے۔" "نہن تارا شکایت بولی۔

"تو کیا کروں پھر؟" "کرسی کی بیٹ پر وہ تو ہاتھ رکھ کر نہن تارا کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

"کسی کا ہاتھ کیوں نہیں تمام لیتے تمہا کب تک ان فضول مصروفیات میں خود کو الجھاتے رہو گے۔"

"تمہارا ہاتھ نہ تمام لوں تم ذرا بڑھے کھوسٹ شاہجی سے ہاتھ تو چھوڑو۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا

تو نہن تارا کا دل خواہ مخواہ زور سے دھڑکا تھا اور پلکیں لرز کر رہ گئی تھیں۔

"اور یہ فضول مصروفیات کب ہیں۔ روزی روٹی کا پکڑے یا رات تم بھی تو تھا ہوتا شاہجی کے نام کا خفیہ اسٹیکر چپکانے کے باوجود اپنی تمنا کیوں کی تو پتھ خبر لو۔" اس نے نہن تارا کی دکھتی رگ کو پھینچ دیا تھا۔

"ایسا کیوں؟" وہ روہینے کو گئی۔ "مہرجانے کوئی چاہتا ہے۔"

"بھری ہوائی میں اور اس عالم و حشرت میں۔ نہ نہ میری جان! میں تمہارے دشمن جو تمہارے سامنے کھڑے ہیں۔"

"ہنس کر بولا۔

"تم کیوں مورا اپنی زندگی میں نے خود حرام کی ہے میں کیوں نہ مہرجاؤں۔"

وہ کچھ مچھوڑ پڑی۔

"نہن! بری بات! اب اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے تو حوصلہ بھی کرو۔ میری جان! میں ہوں نا تمہارا ہر وہ کھ شہر کرنے کے لیے تمہارا دوست تمہارا مولی۔" وہ قریب آ کر محبت سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔

"کب ہوتے ہو میرے پاس۔ ہوا کے جھونکے کی طرح آتے ہو اور پل بھر میں اٹھ کر چل دیتے ہو۔" وہ بھگی آنکھوں سے اسے دیکھ کر بولی۔

"اوکے برا مس۔ بس گھر سے ہو آؤں اور یہ مہینہ بھر کے شوڈ کا پروگرام بنالوں پھر تمہاری قسم کم از کم دو ماہ تک کوئی اور ٹیکریٹ سائن نہیں کروں گا۔ اگر تمہیں فل نا تمہوں کا پکا وعدہ۔" وہ شاید اسے ہمدارہا تھا۔

"چلو شکریہ تمہارے ان ہمدادوں کا۔" وہ اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے طنزاً مسکرا کر بولی۔

"پھر شک! دوستی پر شک! بری بات ہے پر بری فریڈ! "عبدالعبین نے نقلی اٹھا کر گویا اسے تنبیہ کی۔"

کی ضدی طبیعت کا خیال اسے روکتا بھی رہا مگر پھر بھی وہ شام بڑھنے سے پہلے اس کا ایک نما گھر میں بے چین سا ہو کر چلا آیا۔
صوفی صاحب گاؤں کے سہارے آمد کے ہاتھوں سے سختی کے ساتھ روٹی کھا رہے تھے۔ جویریہ پانچٹی کی طرف بیٹھی ہوئے ہوئے ان کا دایاں ہاتھ پار ہی تھی۔

عبدالستین بھونٹے سے سخن سے اندر آتے ہوئے کمرے کی چوکھٹ سے قدرے سر جھکا کر اندر آیا تھا۔ سیاہ ٹوپی میں اونچا لہبا سحت مند عبد الستین۔ ایک دم سے چھوٹا سا گھر اور بھی مختصر لگنے لگا اور کمرے میں جویریہ اور آمد کو ایسی کوئی چیز نظر نہ آئی جہاں وہ اپنے بوسے بھائی کو بیٹھنے کے لیے کہیں۔
بلب کی چمکی زرد روشنی میں صوفی صاحب نے سامنے آکر کھڑے عبد الستین کو جو خوشی دکھا، ان کے حلق سے غراہٹ سی نکلی تھی۔

”تم اوھر کیوں آئے ہو؟“ وہ پوری قوت سے حلق کے بل دھاڑے۔ ان کی بل کھاتی زبان ذرا کی ذرا لڑکھرائی تھی۔ آنکھوں سے جیسے شعلے سے ٹپکنے لگے تھے۔

”بابا صاحب! میں اماں ہی۔“ عبد الستین کو اپنی ساری جرات صوفی صاحب کی سخن گرج کے آگے ریزہ ریزہ ہوتی محسوس ہوئی۔

”کون بابا صاحب؟ کون اماں کی؟ تم۔ تو انہیں سات آٹھ برس پہلے قبر میں اتار چکے ہو۔ اب اوھر۔ کیا۔ کیا لینے آئے ہو۔ دفع۔ ہو جاؤ۔“ وہ اپنی فطری آواز میں چلا رہے تھے۔ صرف زبان کی لڑکھرائی ہٹ رہی تھی۔

”بابا صاحب! بس کریں اور کتنی سزا دیں گے ہمیں اپنی اولاد ہونے کی۔ ان دونوں کو دیکھیں کیا یہ آپ کو زندہ لگتی ہیں۔ آپ نے تو ہم سب کو بچتے ہی مار ڈالا۔ اگر میں نے ذرا سا اپنی زندگی کو سنوارنے کے لیے اس حقیقت کو زبان سے کہہ ڈالا تو کیا ہوا؟“ عبد الستین جیسے چپٹے پردے۔

”تم۔ بگڑ کر نہیں گیا۔ برا نہیں لگتا۔ تمہیں اپنے خون جگر پلا کر جوان کیا۔ تعلیم دی پڑھایا خواب دیکھے اور پھر تو نے ان خوابوں کو چور چور کر دیا۔ چھوٹے۔ وہ چھوٹا کیوں بیچھے رہتا وہ بھی تیری راہ چلا۔ ہمیں بیچتے ہی مار کر دنیا کی رنگ رلیوں میں مزے کرنے۔ اب مردوں کو اٹھانے کیوں آئے ہو جاؤ۔“ صوفی صاحب زور زور سے اپنا دایاں ہاتھ دھو کر کرنے کے لیے جھک جھک کر کہہ رہے تھے۔

”چھوڑو میں اپنی ضد کو کچھ نہیں دیا آپ نے ہمیں سوائے جہنم دینے کے یا چند برسوں کی روٹی دینے کے۔ وہ بھی گھروں سے مانگ مانگ کر آپ نے ہمیں دیا۔ کیا ہے سوائے نفرت، نفیس اور غصے کے۔ واپسی پر آپ کیا چاہیں گے جو دیا ہے وہ ہاں میں گے نا!“ وہ بھی دہرہ چلا کر بولا۔

”صاحب کتاب کرنے آئے ہو تو کرو حساب۔“ وہ آمد کے ہاتھوں سے منہ تک جانا نوالہ پر سے پھینک کر غصے میں چلائے۔

”میں کوئی حساب کتاب کرنے نہیں آیا۔ اماں ہی چلی گئیں نہ نہیں سکا۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔
”مرد۔ تیری ماں کا جنازہ غیروں نے اٹھایا تو بیٹا تھا؟ کہاں مر گیا تھا اس وقت کر حساب بے شرم بے غیرت!“ صوفی صاحب سچ رہے تھے۔

”بابا صاحب! پلیز آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔“ جویریہ ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں بکڑ کر بولی۔
”اسے حساب کرنے دو بیب۔“ وہ ہانپنے لگے تھے۔

”بابا صاحب! آپ کو یہاں نوکری سے بھی فارغ کر دیا گیا ہے اور اس گھر میں بھی دو تین مہینوں کی مہلت ہے۔ آپ اس تلخ حقیقت سے کیوں نظر نہیں چرا رہے ہیں۔ آپ بیٹوں کو میں کہیں چھوٹا سا گھر لے دوں گا ہوں نا مانہ۔ خرچ کو کسی معقول رقم دیتا ہوں۔“

”تو نے خود اپنے ہاتھوں سے کبھی ایک روپیہ بھی کمایا ہے۔ بے شرم! دو سوں کی کمائی ہم میں بانٹ کر کئی بننے

”تو زہت آئی! آپ میرا سامنا نہیں کرنا چاہتیں۔ کم از کم آپ کو میرے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ دونوں میاں بیوی کو ہر مسئلے کا ایک ہی حل نظر آتا ہے، فرار۔ حالات سے فرار، حقیقت سے فرار۔ آخر آپ دونوں یہ کیوں نہیں سوچتے کہ آپ دونوں کے مسائل کا حل فرار نہیں ہے اور یہ کب تک چلے گا۔ آپ دونوں کو احساس ہی نہیں کہ آپ کے اس غیر ذمہ دارانہ رویے کی جھنڈ وہ معصوم بچہ رہا ہے جس کا اس سارے قصے میں کہیں کوئی قصور نہیں۔ آپ دونوں کی اتاؤں کی جنگ میں اگر ار تفضی ذاتی طور پر ڈسٹرب ہو گیا تو قصور وار کون ہوگا؟“ وہ کھڑا کڑھتا رہا۔

”میں آپ کو یہ احساس دلا کر رہوں گا میں ار تفضی کو اپنے جیسی محرومیوں بھری زندگی گزارنے نہیں دوں گا۔ ماں باپ کے ہوتے ہوئے کیوں تیریوں کی طرح جھجے۔ میں آپ کو گھر لے جانے تک آپ کا تعاقب کروں گا۔ زہت آئی! میں آپ کو ار تفضی کے پاس پہنچا کر دم لوں گا۔ اب اس بی چوہے کے کھیل کو ختم ہونا چاہیے۔ چاہے مجھے اس کے لیے کتنی ہی ذلت کیوں نہ سہنی پڑے۔“

وہ اپنے کمرے میں آکر چھٹی کی درخواست لکھتے ہوئے دل میں ارادہ باندھ رہا تھا۔



صوفی صاحب باہپشل میں ایک ہفتہ ایڈمٹ رہنے کے بعد کل شام ہی ڈسچارج ہو کر گھر آئے تھے۔ ان پر فالج کا بہت شدید ایک ہوا تھا اور ڈاکٹر زحیر ان تھے کہ اتنے شدید ایک کے باوجود، تا صرف ان کی دماغی حالت بالکل درست رہی تھی بلکہ یادداشت کا کوئی بھی حصہ متاثر نہیں ہوا تھا۔ حملے کے اثرات صرف جسم کے دائیں حصے پر پڑے تھے وہ بھی زیادہ شدید نہیں تھے اور ڈاکٹر زحیر امید تھے کہ جتنی دل یا اور صوفی صاحب میں ہے وہ چند ہفتوں میں ہی اپنے قدموں پر اٹھ کر چلنے پھرنے لگیں گے۔ دایاں بازو تقریباً پیرالائز ہو چکا تھا جبکہ دائیں ٹانگ بے حد کوشش کے بعد تھوڑی بہت حرکت کر رہی تھی، بروقت باہپشل پہنچ جانے کی وجہ سے ان کی کافی بچت ہو گئی تھی اور اب گھر آکر بھی وہ تیزی سے رو بہ صحت تھے۔

گھر آتا تو ان کے لیے دشوار ترین لمحات میں سے ایک تھا جس کا باہپشل میں سوچتے ہوئے بھی انہیں وحشت سی ہو رہی تھی۔ سونا سونا آجڑا ہوا، خالی خالی گھر۔ ابھی تو ان کا دماغ زہن کی غیر موجودگی کو صبح سے تسلیم نہیں کر پایا تھا کہ رابعہ بی بی ہاتھ پھڑا کر چل پڑیں، عمر بھر کا ساسھی۔ شادی کے بعد جی انہوں نے اپنا گھر رابعہ بی بی کے وجود کے بغیر نہ پایا تھا اور آج جب وہ دونوں کے سہارے بمشکل سیر پڑھیاں پڑھ کر اوپر گئے تو کوٹنے میں سٹری کشی آمد اور جویریہ تنہا کھڑی انہیں رابعہ بی بی کے چلے جانے کا ثبوت پیش کر رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے کھٹکتے ہوئے اندر بستر تک آئے تھے۔ اسی بل انہوں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ انہیں بہت جلد محض چند دنوں میں اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر اسی رعب سے جینا ہے جو ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ صرف اور صرف جویریہ آمد کی خاطر۔ انہوں نے رابعہ بی بی کے جدائی کے تکلیف وہ احساس کو بھلا کر ساری توجہ خود کو صحت مند کرنے کی طرف مبذول کر لی تھی۔

مدرسے کا ایک لڑکا ان کی خدمت پر مامور تھا، دو سرائی کا دو نام انہیں ایک سرساز کروانے آتا تھا جس کی مدد لینے سے انہوں نے تیسرے دن ہی انکار کر دیا تھا اور پچھری کے سہارے دیوار کے ساتھ ساتھ خود چلنا شروع کر دیا تھا۔
”مجھے اپنی بیٹیوں کے سامنے کمزور نہیں پڑنا۔“ بیگی آنکھوں کے ساتھ دوپٹے میں چہرہ چھپائے ساتھ چلتی آمد کو دیکھ کر انہوں نے دل میں قطعی فیصلہ کر لیا تھا۔

اور یہ سچ اسی شام کھل کر سامنے بھی آ گیا کہ وہ صرف جسمانی طور پر کچھ لاغر ہوئے ہیں ورنہ ان کی دماغی حالت ابھی بھی پہلے کی طرح تازہ اور مضبوط ہے اور وہ ابھی بھی اپنے فیصلے پر اڑ جانے کی قوت رکھتے ہیں۔

نہ جانے کیسے عبد الستین کو خبر ہو گئی تھی کہ اماں کی پانچ روز پہلے اس جہان فانی سے کوچ کر گئی ہیں۔ بابا صاحب

آیا ہے۔ تو تو خود دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا کر زندگی گزار رہا ہے۔ ہمیں کیا دے گا فقیر، منگتے۔ صوفی صاحب پھولے سانسوں کے درمیان ہاتھ نچا کر بولے۔
"بابا صاحب! اتنا کچھ برباد ہو گیا مگر آپ کو عقل نہیں آئی۔" وہ افسوس سے گردن ہلا کر بولا۔ "ٹھیک ہے جانے پر راضی نہیں تو یہ رقم رکھ لیں۔ آپ کے علاج اور کمر کے خرچے۔"
وہ کوٹ کی جیب سے دو پھولے ہوئے لفافے نکال کر ان کے سرہانے رکھنے ہی لگا تھا کہ صوفی صاحب یوں تڑپ کر پٹے جیسے کسی پچھونے انہیں کاٹا ہو۔ بابا صاحب ہاتھ گھما کر انہوں نے دونوں لفافے اٹھا کر عبدالمعین کے منہ پر زہار سے تھے۔

"چلا جانا یہ زکوٰۃ اور خیرات لے کر۔ اتنا عرصہ ہم کھائے پیے بغیر نہیں جیتے رہے جو اب تیرے ان ٹوٹوں کی چمک میں آجا میں گے۔ چلا جاو رہ میں نیچے سے کسی کو بلا تا ہوں، پھر دھکے دے کر ادھر سے نکالے۔"
وہ بے قابو ہو کر چلا رہے تھے ان کے منہ سے کف نکل رہا تھا اور مارا جسم لرز رہا تھا۔
"جائیں اب کیا انہیں مار کر جائیں گے۔ نہیں چاہیے ہمیں آپ کی یہ ادا۔" آمنہ سے باپ کی حالت دیکھی نہیں گئی تو وہ چلا آئی۔
"رہو مواس گمری زندگی میں۔ میں ہی پاگل ہوں۔" وہ دونوں لفافے اٹھا کر پھیلا تا ہوا جس طرح آیا تھا اسی طرح نکل گیا۔

صوفی صاحب زور زور سے سانس لے رہے تھے۔
اور اچھی صبح ان کی طبیعت کچھ ہی بہتر ہوئی تھی۔ آمنہ معمول کے کاموں کے بعد کلام پاک کھول کر بیٹھی تھی کہ کسی کے سیرھیاں چڑھنے کی چاپ سنائی دی۔ اس نے کلام پاک بند کر کے بے ساختہ بیڑھیوں کی طرف دیکھا۔
عبدالمعین مسکراتا چہرہ لیے آیا تھا۔ آمنہ نے خوف زدہ نظروں سے آنکھیں بند کر کے صوفی صاحب کو دیکھا۔
"السلام علیکم۔" عبدالمعین نے آخری بیڑھی پر قدم رکھتے ہی بلند آواز میں۔
اس نے باخصوص کسی کو سلام نہیں کیا تھا۔ نہ صوفی صاحب کو نہ آمنہ کو۔ دونوں کی طرف ایک مسکراتی ہوئی تازہ دم مسکراہٹ اچھالتے ہوئے آگے بڑھا۔ اگرچہ آمنہ کو اس کے چہرے پر پہلے کی نسبت تازگی اور تندہی مستقوت نظر آ رہی تھی پھر بھی اچھا لگ رہا تھا۔ آمنہ نے کلام پاک بند کر کے صوفی صاحب کے چہرے کے نعوش ایک دم جیسے تن گئے۔ آنکھوں میں سرور مہر اتر آئی تھی۔
"کیسی ہو آمنہ؟" وہ خوش دلی سے کہتے ہوئے آمنہ کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

دوسرے بل اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ صوفی صاحب سامنے بستر پر تقریباً بے ہوش و حرکت پڑے تھے وہ بھی دن کے گیارہ بجے۔ اس کی زندگی کا یہ ان کن واقعہ اس نے فوری طور پر شعور باپ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اسے سرور نظروں سے منگلی باندھے دیکھ رہے تھے جن کا وہ بہت عرصے سے عادی ہو چکا تھا۔
"بابا صاحب! خیریت۔ آپ اس طرح کیوں لیتے ہیں؟" وہ کچھ تشویش سے بولا۔
آمنہ اب نظریں نیچی کیے کلام پاک کے زرد شیلے رنگ کے خلاف کو دیکھتے ہوئے آنے والے لمحوں کا کوئی شعور تڑا شنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی جھکی ہوئی آنکھیں پانیوں سے بھر رہی تھیں۔
"کیوں۔ آئے ہو؟" اپنی زبان کی لگت اور آنتیں لیجے لہے حد کنٹرول کرتے ہوئے صوفی صاحب بظاہر متحمل لہجے میں بولے۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟" عبدالمعین نے ان کے بے حد زور بڑتے چہرے کو جیسے ابھی دیکھا تھا ہاتھوں کی رگت بھی بھلی ہو رہی تھی سینے پر دونوں ہاتھ بے جس تھے ان کی آنکھیں بالکل سفید ہو رہی تھیں بے رونق۔ وہ بہت بوڑھے بہت کمزور لگ رہے تھے۔ عبدالمعین کے دل میں درو کی ایک لہری ابھری تھی۔ اتنے

توانا، غصے اور شہرہ زور باپ کی اس کمزور حالت کو دیکھ کر۔
"تم کیوں۔ آئے ہو؟" آمنہ نے سر آکر ان کی زبان کوشش کے باوجود دور تک پھیلی تھی۔
"آمنہ۔ آمنہ! کیا ہوا ہے بابا صاحب کو؟" وہ ان کے سوال کو دوسری بار نظر انداز کر کے آمنہ کی طرف مڑا اور بے قراری سے پوچھنے لگا۔ آمنہ کا پورا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ خلاف پر دوسری تھوڑی انگلیاں ہولے ہولے کانپ رہی تھیں۔ سامنے کمرے کی دروازے پر لگے لباس میں لکڑی جویریہ بھی بے آواز آنسوؤں سے رو رہی تھی۔

"بولو نا کیا ہوا ہے؟" وہ آمنہ کا ہاتھ زور سے ہلاتے ہوئے بولا۔
"تمہیں اب خیال آیا یہ پوچھنے کا کہ کیا ہوا ہے؟" آمنہ خود پر جیسے ضبط کھو بیٹھی۔ زور سے چیخ کر بولی۔
"میں یہاں نہیں تھا کیا ہوا ہے؟" وہ قدرے پرست آواز میں بولا۔
"تم یہاں کبھی بھی نہیں تھے تم یہاں ہوتے تو دیکھتے ہم کیسی بے کسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ کشاکش، رونق تو کبھی بھی نہیں تھا جس نے ہمیں اس گھر سے منہ موڑنے پر مجبور کیا اور اب تو اس مختصر سے آسٹن میں زندگی بھی اپنا دامن بیٹھے جا رہی ہے۔" وہ کلام پاک پر ہاتھ رکھے بہت کمزور آواز میں کہہ رہی تھی۔
"جویریہ! اماں جی کہاں ہیں زینب؟" عبدالمعین بے بس سا ہو کر بولا۔
"ہم سے کیا پوچھتے ہو بھائی، جا کر کھانسی کی دھیر یوں سے پوچھو۔ تمہارا انتظار کرتے کرتے جہاں انہوں نے جا کر اپنے گھر بسا لیے ہیں۔" جویریہ حلقے سے اٹھانے والی چیخوں کو بمشکل دباتے ہوئے چلائی تھی۔
"کک۔ کک۔ کیا کیا اس۔ کیا کہہ رہی ہے یہ آمنہ! بولو بیٹا۔ اماں جی زینب کدھر ہیں؟" اس نے آمنہ کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر تجھن بولا۔

چھٹی گھنٹہ پہلی تھی۔ کیا کہا تھا ان کے لیے اس دکھ بھری زندگی میں۔ کانٹے جھتے جھتے اماں جی کی انگلیاں دکھار ہوئی تھیں اور زینب نے اسے دیکھا تو اتنا حوصلہ ہی نہیں تھا۔ ناویدہ آنے والے آتھے دنوں کا انتظار کرتی وہ بہت کمزور بہت تازگ اور تھوڑی سی نادان بے صبری تھی۔ اتنی بھاری بو، جھل زندگی کے بوجھ سے اس کے کندھے اتنی کم عمری میں ہی تھک گئے تھے۔ جب زندگی پہاڑ جیسا بوجھ بن کر کندھوں پر آجائے تو کمر ٹوٹ ہی جایا کرتی ہے۔ "وہ اب سسکیاں لے رہی تھی۔
"اوستہ میرے خدا! میرے اللہ! یہ میں کیا بن رہا ہوں زینب! اماں جی۔ نہیں آمنہ! ایلیزیہ مت کہو یہ سب میں مر جاتی کا اماں جی! "وہ بے اختیار اپنے بال نوچتے ہوئے سسکتے لگا تھا۔
"ہم بولتے ہیں تو تم سر جاؤ گے۔ تم تو بہترین آسانسوں بھری زندگی کے شہری نکل میں رہ رہے ہو، مرنے بھی چاہو گے تو اس حسین زندگی کی کشش تمہیں مرنے نہیں دے گی۔ کبھی کسی کو خود سے اپنا کاٹا کھونٹے دیکھا ہے۔"

آمنہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ صاف کیا اور سرخ آنکھوں سے بے آواز آنسوؤں سے روٹے عبدالمعین کو دیکھنے لگی۔
"تم لوگوں نے مجھے کیوں نہ بتایا۔" وہ گھٹی گھٹی ہی آواز میں بولا۔
"چہ خوب۔ کتنے ہر کار سے تھے ہمارے پاس جو تمہیں خبر کرنے کو دوڑاتے۔" وہ طنز سے بولی۔ اسے عبدالمعین پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ جوان بیٹوں کے ہوتے ہوئے اماں جی کا جنازہ خیموں نے اٹھایا تھا۔ بہن کی ڈولی کو آخری کندھا دیتے کو دونوں میں سے ایک بھائی بھی موجود نہیں تھا۔ ان تظیفہ منظر کو یاد کرتے ہوئے آمنہ کا جی چاہا وہ عبدالمعین کا گریبان پکڑ کر چہرہ اڑوے اس کے ہتھ تھامے تو یسور ت بال اور صاف ستھرے لباس کی رچیوں کر والے اسے کبھی معاف نہ کرے۔ اس کا جرم ناقابل معافی تھا۔ صوفی صاحب کو دیکھتے ہوئے اس کے سسکتے دل نے فیصلہ سنایا تھا۔

اسی وقت چارپائی چڑھائی کی آواز خاموش فضا میں ابھری۔ صوفی صاحب اپنی ساری توانائیاں جمع کر کے ایک
تھلے سے بائیں کھینے کے بل اٹھ بیٹھے۔ بائیں ہاتھ سے بستر کے دو سرے جانتی پڑی چھتری اٹھائی اور بستر پر رکھ دی
پھر بائیں ہاتھ سے دونوں ٹانگوں کو براری باری چارپائی سے نیچے لٹکایا۔ چھتری اٹھا کر بائیں ہاتھ میں مضبوطی سے تھام
کر اب وہ قبلی ٹنگوں سے آنسو بہاتے عبدالمبین کو دیکھ رہے تھے۔
"اب اگر تم رو چکے اپنی ماں اور بہن کو۔ تو۔ جاؤ۔ یہاں سے۔" اب کے وہ کافی صاف اور بہتر آواز میں
بولے تھے۔

"بابا صاحب! بس لیں اور کتنا تاوان لیں گے مجھ سے اپنی بار لاؤ ہونے کا۔" وہ بے بسی سے پتلیا۔
"ہاں یہ میری قسمت کہ تم میری اولاد ہو۔ اور میں قسمت بدلنے پر قابو نہیں۔ مگر تم دونوں کے ہونے
کو میں فراموش تو کر سکتا ہوں۔ جاؤ۔ یہاں سے۔" وہ غصہ پھیر کر لگت زہ آواز میں کہہ رہے تھے۔
"میں جاؤں گا کیا نہیں ہے آپ؟" وہ آنسو پونچھ کر جارحانہ انداز میں بولا۔
"میری حالت نہ بدلتے۔" وہ غرارے "بہتر ہے چلے جاؤ۔" ان کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔
"ہاں چلا جاؤں گا مگر آپ قینوں کو یہاں سے لے کر۔" وہ پُر غم لہجے میں بولا۔
"ابھی ہم قینوں زندہ ہیں۔ مہمہ بائیں کے تو آکر۔ چار اسی طرح کے چھریلے آنسو بہا لینا۔ اب۔
جانو۔" ان کے بائیں ہاتھ کے پدوں کے نیچے وہی چھتری پکی پارہی تھی وہ اس کی کھینچ کر رہے تھے۔
"بابا صاحب! بس لیں اور کتنی خود کو ان معصوموں کو جینے کی سزا دینا کہ۔ میں آپ قینوں کو یہاں سے لیے بغیر
نہیں جاؤں گا۔ چلو آمنہ بھوری۔"

وہ دونوں۔ ٹنگوں کے بے تاثر چہروں کو دیکھ کر بولا جن کی نظریں صوفی صاحب پر جمی ہوئی تھیں۔
"تم ہمارے کیا لگتے ہو؟" وہ اسی لہجے میں چلائے تھے جس میں بے جلال کرنے کے کو لفظوں کی ہر دور
تک جھیل کر حضور سامنے ہونے اپنا کھل صوفی تاثر قائم نہیں کر سکی تھیں۔
"بابا صاحب! بس آپ کا بیٹا ہوں۔" وہ چہرہ چا کر بولا۔
"تم میرے بیٹے نہیں ہو۔ میرا کوئی بیٹا نہیں۔ وہ بیٹے تھے دو اولاد بھری جوانی میں مر گئے۔ تم۔ کون ہو؟"
ان کا لہجہ "آنکھیں لٹھا اور لفظوں کی آوازیں اتنی اچھی تھی کہ عبدالمبین کو شدید غصے کے باوجود رونا آگیا۔
وہ بابا صاحب تو نہیں تھے جن کی ایک لڑک دار آواز سے اس کا خون خشک ہو جاتا تھا۔
"بابا صاحب! مجھے مخالف کریں۔ اگر میں نے آپ کی مرضی کے برخلاف کچھ کیا ہے مگر مجھ کے لیے میرے
ساتھ چلیں۔" وہ اٹھ کر ان کے پاس آیا اور ان کے کھنٹوں پر ہاتھ رکھ کر وہ زانو بیٹھے ہونے لگی۔
"جب تمہارا۔ تم سے کوئی تعلق۔ یہی نہیں تو تمہارے ساتھ۔ جانے نہ جانے کا کیا سوال؟" وہ بیگانگی
اتھا سے بولے۔

"بابا صاحب! اتنی ضد اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔ پلیز چلیں مجھے مخالف کریں۔ سوچیں آپ اس حال میں ہیں
ان دونوں کا کیا ہے گا کون ان کی مخالفت کرے گا۔" وہ انہیں حالات کی نزاکت کا احساس دلاتے ہوئے نرم لہجے
میں بولا۔
"عیر اللہ۔ جو یہ اطاقت ہے۔ ہر کمزور کی طاقت۔ اس کے بعد میں۔ جس دن میں مر جاؤں۔ اگر بے
شک۔ انہیں لے جانا تمہارا ہی تمہارا ہے۔" وہ بولا چلے جاؤ۔"
وہ زور زور سے اپنا بائیں ہاتھ اسے پرے دھکیلتے کے لیے ہوا میں لہرا رہے تھے اتنے میں ہی ان کا لاغر جسم کلپنے
لگا تھا۔ منہ کے دھانوں سے رال ہی نکلنے لگی تھی۔
"بابا صاحب! پلیز۔" وہ لا چاری سے بولا۔
"جاؤ۔ جاؤ۔ میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا۔ جاؤ۔ آمنہ! میں مر جاؤں گا تو بھی اس مرید کے

ساتھ۔ نہ جانا۔ اس نے میرا نام پتلیا۔ میرے علمائے کی حرمت۔ بھرے بازار میں گاگا کر۔ شروخت کی سیہ
بیوپاری ہے۔ دنیا کے مال کا۔ یہ میرا بیٹا نہیں یہ تمہارا بھائی نہیں یہ یہ بیوپاری ہے یہ دنیا کی خاطر سب کچھ بیچ
دے گا۔ اپنا جسم اپنی آواز، آنکھیں، چہرہ عزت۔ غیرت۔ یہ تمہیں بھی بیچ دے گا۔ سو اگر تمہارا
قراڈیا لیا۔"

وہ زور زور سے بائیں ہاتھ ہوا میں لہرا کر بڑی انداز میں بول رہے تھے۔ آنکھیں حلقوں سے اٹلی پڑ رہی تھیں
اور منہ سے رال بہنے لگی تھی۔ ان کے ساتوں کا زور مہم بے حکم ہوا جا رہا تھا۔
"عبدالمبین! جاؤ یہاں سے۔" آمنہ ان کی حالت دیکھ کر پٹائی اور گلابی پیکر تخت کے مہانے رکھ کر بستر پر
گرتے ہوئے صوفی صاحب کی طرف لپکی۔

"آمنہ! میں بابا صاحب کو اور تم لوگوں کو اس حالت میں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں ڈاکٹر کو۔"
"تھوڑی دیر میں اس سے بری حالت میں بغیر علاج کے مر گئی ماں کی بغیر کسی دوا کے چپ چاپ اذیتیں سہہ کر رہا
تھیں۔ اس وقت تو تمہیں خیال نہ آیا کہ ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔ اب کیا کرنے آئے ہو جاؤ یہاں سے۔"
وہ صوفی صاحب کو جھلایا رہے ہوئے بستر لٹانے لگی۔ انہوں نے پوری قوت سے آمنہ کا ہاتھ جھٹک دیا۔
"ہیں سے کوئی فوج ہو سکتی ہے اس کی خیرات نہیں چاہیے۔ جانے یہاں سے میرے سامنے سے ہٹ۔
جاؤ۔"

انہوں نے پوری طاقت سے بائیں ہاتھ اٹھا کر عبدالمبین کو ٹھوکر لگائی تھی۔ ٹھوکر عبدالمبین تک تو نہ پہنچی
مگر ان کا زانو تک لٹھے کی طرح حریف ہو گیا تھا۔

"جاؤ عبدالمبین! ایسا نہیں کرنا۔" وہ بولے "میں نہیں جانا تمہارے ساتھ۔ کبھی بھی نہیں۔ اگر
میرے ہاں ایسے تھوکر ہوتے تو میں بائیں ہاتھ سے نہیں ہوسکتے تو ہم کبھی کبھی تمہاری طرف نہیں دیکھیں گے ہمیں
اپنے سینوں کے ساتھ۔" وہ دوسرے ہاتھ سے اپنی آنکھ دھو کر دنیا میں چلے جاؤ۔"

وہ پھر سے صوفی صاحب کو کدھوں سے لڑ کر لٹا رہی تھی مگر وہ لیٹنے پر آمادہ نہیں تھے۔
"آمنہ! انہیں ڈاکٹر کی اچھی کیتر کی ضرورت ہے۔ یہ تو بتا رہے ہیں تم مجھ سکتی ہو۔ بے جا ضد نہ ان کی صحت کے
لیے اچھی ہے نہ تمہارے لیے۔" وہ اسی لہجے میں کہتے ہوئے اٹھا۔

"تمہیں کتنے پتلا نہیں ہے۔" وہ بولے "عبدالمبین! یہ تو بہت سوال سے بیمار ہیں مگر تمہارے خود ار
باپ نے کبھی کسی کے ہاتھ سے نہیں پھیلا دیا۔ آج تمہاری حزام کی کمانی کا علاج کیسے قبول کر لیں گے ڈاکٹر دوا
جس کی بھی ضرورت ہوگی ہم خود کر لیں گے۔ نہ ہمیں نہ بابا صاحب کو تمہاری ضرورت ہے۔ بہتر ہے ہمیں
اپنے سینوں کے ساتھ رہنا۔" آمنہ پر جیسے کوئی ہتھون طاری ہو گیا تھا۔

"پاگل ہو گئی ہو نا روکی انہیں گھر میں رکھ کر۔" وہ غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے بولا۔
"مگر بائیں کے تو ہمیں زحمت نہیں دیں گے۔ تمہارے مشاغل میں کوئی ظلم نہیں کئے گا۔
"میں جا رہا ہوں ڈاکٹر کو لینے۔" وہ کہتے ہوئے نرزا۔

"تمہیں شاید عزت سے جانا پند نہیں۔ آج تمہیں یہ دورانہ کھلا مل گیا ہے۔ دوبارہ نہیں ملے گا۔"
صوفی صاحب بہت کمزور آواز میں بولے تھے عبدالمبین نے ایک آسف بھری نظر صوفی صاحب اور آمنہ پر
ڈال دیا۔ وہ ان کی آنکھوں میں اس کے لیے شدید بیزارگی کے عکس نمایاں تھے اسے لگا۔ اب کچھ بھی کہنا
الحاصل ہو گا۔ وہ کھٹکے کھٹکے قدموں سے چلنا ہوا سیڑھیاں اتر گیا۔ چہرہ پر منہ پر ہاتھ رکھ کر سسکیاں دیا تی اندر
بھاگ گئی۔ اسے آمنہ سے ایسی سنگ دلی کی توقع نہیں تھی۔ آمنہ اب صوفی صاحب کا سینہ سارا ہی تھی۔



اسی شام عصر کے بعد ٹھوکر ملی اپنی۔

صوفی صاحب ضمن میں ایک طرف چھتری کے سارے دو سرے طرف آتے کا سارا لیے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ ایک لمبے وقت کے بعد اٹھائے جانے والے قدم کے دوران وہ کس لذت سے گزر رہے تھے وہ ان کے چہرے سے مترشح تھی۔ کلثوم بی بی سلام کر کے تخت کے کنارے بیٹھ گئی۔ صوفی صاحب بمشکل ٹھٹھٹے ہوئے اپنے بستر پر بیٹھے۔

”اب تو اب اللہ کے فضل سے بہت بہتر معلوم ہو رہے ہیں۔“ اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”اللہ کے فضل سے۔“ وہ تکلیف منہا کر کے دانت بیچتے ہوئے بمشکل بولے۔

”آمنہ! چاہئے رکھو۔“ انہوں نے کمرے کی طرف مڑی آمنہ سے کہا۔ جویریہ تو عبد العین کے ہانٹے کے بعد سے کمرے سے ہی نہیں نکلی تھی۔ ساری دوپہر اس نے روتے گزاردی تھی۔ کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ آمنہ نے بھی اسے نہیں چھیڑا تھا۔ لب سپرے پھونکے پھونکے کاموں میں لگی رہی۔

”بہت شکریہ صوفی صاحب! میں انہی چائے پی کر ہی آ رہی ہوں۔“ وہ فوراً ہاتھ اٹھا کر آمنہ کو روکتے ہوئے بولی۔

”میں بتا لیتی ہوں۔“ آمنہ نے وہ لیٹر کھڑے کھڑے تعلقاً کہا۔

”وہ نہیں بیٹی! شکریہ۔ اللہ تمہاری عمر و روزگارے اور تمہارے باصاحب کو صحت دے کہ تم دونوں کے فرض سے جلد از جلد بندوش کرے ساتھ خیریت کے ساتھ۔“

اس نے گویا صوفی صاحب کے دل کی بات چھیڑ دی تھی جو وہ کئی دنوں سے کلثوم بی بی کو بلا کر کتنا جا رہے تھے۔ آمنہ آستلی سے اندر چلی آئی۔ جویریہ سوئی آنکھوں کے ساتھ کرسی پر بیٹھی تھی بے حد چپ اور غمگین۔ آمنہ کو اس پر ترس بھی کیا اور پیار بھی۔

”کھانا لاؤں تمہارے لیے؟“ جویریہ نے نفی میں سر ہلادیا تو وہ بھی خاموشی سے چنگ پر بیٹھ کر مہلے رکھی کتاب کے اوراق اٹھنے پڑھنے لگی۔

”بیگم عثمانی بہت دنوں سے نہیں آئیں۔“ دونوں کادھیان باہر ہونے والی گفتگو پر خود بخود لگ گیا۔

”میں تو میں بتانے آئی ہوں وہ اپنی بیٹی کے سلسلے میں کل شام کی ملاقات سے وہی چلی گئی ہیں۔“ کلثوم بی بی نے گلا صاف کر کے جواب دیا۔

”تو اتنے دن رہیں گی؟“ صوفی صاحب چند لمحوں بعد بولے۔

”اللہ بہتر جانتا ہے، ویسے مجھے تو دو یا تین ہفتوں کا کہہ کر گئی ہیں۔ میرا خیال ہے اس میں کوئی تازگی لگ جائے گا۔“

”مگر وہ تو اسی ماہ رخصتی لیتا جا رہی تھیں۔“ صوفی صاحب کچھ بے چینی سے بولے۔

”اسی ماہ سے۔“ کلثوم بی بی اچھے سے بولی۔ ”ابھی تو اللہ بخشے رابع بی بی کو گزرے دو ہفتے ہوئے ہیں مہر جوہر کا کفن بھی میلا نہیں ہوا ہو گا۔ ابھی چالیسویں تک تو میرا خیال تھا کہ آپ یہ ذکر بھی نہیں چھیڑیں گے۔“ وہ دل کی بات کے بغیر نہ سکی۔

”تو بہت آفتہ دین کی کسی بھی کتاب میں چالیسویں دسویں گیارہویں کا حقیر سا بھی تذکرہ موجود نہیں ہے۔ یہ سب بد نہیں ہیں جو بے حد خاموشی سے ہمارے دین کا حصہ بن گئی ہیں۔ دین سے تھوڑی بہت واقفیت کی بنا پر میں ان کو نہیں مانتا۔“

وہ بہت آستلی سے رک رک کر بول رہے تھے۔ کلثوم بی بی ایک گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ اندر بیٹھی آمنہ اور جویریہ کے دل یکدم دو ہفتے پہلے گزری ماں کے لیے بے تحاشا اواس ہو گئے۔ جویریہ تو ہاتھوں میں منہ چھپا کر بے آواز آسوں سے روتے گئی۔

”آپ نے جویریہ کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“ چند لمحوں کی خاموشی کو کلثوم بی بی کے سوال نے توڑا۔

”ابھی میں آمنہ کے فرض سے فارغ ہو جاؤں تو۔“
”میں نے تو پہلے ہی آپ سے ذکر کیا تھا۔“ وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولی۔
”کیا؟“

”سرد عثمانی کا بھائی سعد عثمانی ماں کے ساتھ ہی وہی سے آئے گا۔ اگر آپ اس کے بارے میں سوچ لیتے تو دونوں کی آکھڑے رخصتی کر لیتے۔“

جویریہ رونامہ صونا بھول کر کلثوم بی بی کے پیش کردہ نئے ”نقشے“ کو سننے لگی۔ یہ بات آمنہ کے لیے بھی تیراں کن تھی۔

”کلثوم بی بی! وہ لوگ انجان لوگ ہیں۔ پہلے۔۔۔ میں بڑی کا کر لوں تو ہوا۔ ان کے طور طریقوں کا۔۔۔ پتا چل جائے۔ اچھے لگے تو مجھے جویریہ کے لیے زیادہ سوچنا نہیں پڑے گا۔ سرد اچھا لڑکا ہے اس کا بھائی۔ کیسا ہے۔۔۔ میں نہیں جانتی۔ یوں اتنا بڑا فیصلہ نہیں کر سکتی۔“ وہ لفظ سنبھال سنبھال کر بول رہے تھے پھر بھی قرینے سے ادا کیل حال لگ رہی تھی۔

”میں نے تو آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔ سرد سے بھی اچھا ہے۔ باہر میٹل ہے۔ اپنا کمر تو گرنی ہر لحاظ سے بہتر ہے۔ ہر حال آپ کی مرضی جیسے ہی بیگم عثمانی واپس آئی ہیں میں ان سے کہہ کر دو چار دنوں میں ہی کوئی بھی مارچ کر کھالوں گی۔“

”بہت شکریہ بہن!“
”میں صوفی صاحب! میری اپنی بچیاں ہیں پھر آپ اس قدر نیک اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ آپ کے کسی کام آکر مجھے خوشی ہوگی۔“ وہ بکھار رہی تھی۔

”میں اس کی طرف ہی ہونے لگی۔“ جویریہ نے کچھ ہی جلد خالی کرنا ہے۔ لے امام صاحب آپ کے ہیں۔ اچھے انسان ہیں۔ انہوں نے بھی اپنے بچوں کو لڑا لڑا ہے اس لیے۔ جتنی جلدی ہو اچھا ہے۔“ پھر پھر پھر کر انہوں نے طویل پتلی بولے۔

”تو آپ کہاں جائیں گے؟“ کلثوم بی بی کچھ حیرت سے بولیں۔
”میں۔۔۔“ وہ غالباً ہنسے تھے۔ ”تعمیر کیا ہے پتا نہیں دو دنوں کو رخصت کر کے۔ اگلی گھڑی جیتا بھی ہوں یا نہیں۔“

”اللہ نہ کرے۔“ صوفی صاحب! آپ کی عمر و روز ہو۔ اللہ آپ کا نیک سایہ ہم پر قائم رکھے پھر بھی آپ نے کیا سوچا ہے۔“

”کاول۔۔۔ چلا جاؤں گا۔۔۔ میرے بڑے اچھے دوست ہیں اور ہر ماہ صاحب۔۔۔ وی کو رخصت کر کے۔ وہ بھی میری طرح پھرتے پھرتے ہو چکے ہیں۔ خوب گزرے کی ہم دونوں کی۔“

آمنہ نے جویریہ کی طرف دیکھا۔ صوفی صاحب کے اس ایرادے کی دونوں کو خبر نہیں تھی اور یوں بھی صوفی صاحب نے اپنے ایرادوں کی خبر اپنے سوا کسی کو نہیں ہونے دینی تھی۔

کلثوم بی بی شاید چاچگی تھی۔ باہر اب مکمل خاموشی ہو چکی تھی مگر جویریہ کے اندر جیسے بے تحاشا شور جاگ اٹھا۔ سمجھت کے آولین دنوں کی وہ نو شہوار کو نیل جو ابھی کھلی بھی نہیں تھی کہ اس کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ وہ رات اس کے دل میں پوری جزئیات کے ساتھ دھڑکنے لگی جب صوفی صاحب نے جیل کو مار مار کر اصرار سے نکالا تھا۔

جویریہ آنکھیں بند کیے دل کے بند درپوں میں سے جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آمنہ خاموشی سے اٹھ کر چائے بنانے باہر نکل گئی۔



”کم از کم آپ کو میرے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا نہ بہت آئی! آپ نے مجھے بھی غیر سمجھا ان جیسا؟“

معاذِ نزیہت کے سامنے بیٹھا شکوہ آمیز لہجے میں بولا۔ پورے دن کی بیدوچہ کے بعد وہ نزیہت کا لیڈر بس حاصل کر پایا تھا۔

”غیر تو ہر وہ چیز ہوتی ہے جو اپنے من سے باہر ہو۔“ وہ لوگوں میں بیروانی معاذاً قطعاً نہیں سمجھا۔
 ”پلیئر مجھ سے پیلیوں میں بات مت کیجئے گا۔ مجھے تا کیل آپ نے ایسا کیوں کیا؟“ وہ خاصی بے تابی سے بولا۔
 ”کچھ عرصہ اس راز کی برقی اسٹیمز اور خود کھولنے کی اس نے سستی کی تھی مگر کچھ بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔“
 ”کیوں؟“ وہ اسی۔ ”زندگی تو خود ایک پیلی ہے۔“

”اگر زندگی ایک پیلی ہے تو بھی آپ نے اسے مزید الجھا کر نہ سلجھنے والی بھارت بنا دیا ہے۔“
 ”صحیح کہا تم نے میں اس پیلی کے نالوں بانوں میں خود ہی الجھ کر رہ گئی ہوں۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولی۔
 ”میں آپ سے پوچھ رہا ہوں آپ نے ایسا کیوں کیا؟“ شہباز بھائی کا سلوک کچھ نیا تو نہیں تھا۔ اتنے معصوم چھوٹے سے بچے کو پھوٹتے ہوئے آپ کا دل ذرا بھی نہیں لرزا۔ ”معاذ کی بات نزیہت نے تڑپ کر دیکھا۔“
 ”یہ دل ہی تو خانماں برباد ہے جو کسی طور ارتقائی کے معاملے میں مجھ سے سنبھل نہیں پایا اور تڑپا۔“
 ”بھئی نہ ڈھونڈ پاتے۔“

”ڈھونڈ تو میں نے آپ کو تب بھی لیتا تھا۔“ وہ جلدی سے بولا۔
 ”میرے مرنے کا یقین نہیں آیا تھا۔“
 ”میرے مرنے کا یقین نہیں آیا تھا۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”میرے مرنے کا یقین نہیں آیا تھا۔“ وہ جلدی سے بولا۔
 ”میرے مرنے کا یقین نہیں آیا تھا۔“ وہ جلدی سے بولا۔
 ”میرے مرنے کا یقین نہیں آیا تھا۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”میرے مرنے کا یقین نہیں آیا تھا۔“ وہ جلدی سے بولا۔
 ”میرے مرنے کا یقین نہیں آیا تھا۔“ وہ جلدی سے بولا۔
 ”میرے مرنے کا یقین نہیں آیا تھا۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”میرے مرنے کا یقین نہیں آیا تھا۔“ وہ جلدی سے بولا۔
 ”میرے مرنے کا یقین نہیں آیا تھا۔“ وہ جلدی سے بولا۔
 ”میرے مرنے کا یقین نہیں آیا تھا۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”میرے مرنے کا یقین نہیں آیا تھا۔“ وہ جلدی سے بولا۔
 ”میرے مرنے کا یقین نہیں آیا تھا۔“ وہ جلدی سے بولا۔
 ”میرے مرنے کا یقین نہیں آیا تھا۔“ وہ جلدی سے بولا۔

برداشت سے باہر تھی۔

”نزیہت! تم میری بہن ہو پھر بھائی کے رشتے سے ہماری بھانجی بھی نہیں تھی جان سے عزیز ہو اور اپنی عزیز تر ہو تمیں اگر شہباز تمہارے ساتھ کبھی خوشی رہ رہا ہوتا۔“

کل شام کو شہباز کا میرے پاس فون آیا تھا ام جان کی خیریت و ریاضت کرنے کے لیے تو میں نے کہا کہ تم خود ام جان کو فون کرو وہ تمہارے فون کی منتظر ہیں تو اس نے صاف لفظوں میں مجھ سے کہا کہ بھائی جان ڈب تک وہ بہ کردار عورت وہاں موجود ہے۔ میں نہ وہاں فون کروں گا نہ ام جان سے ملنے آؤں گا۔ مجھے اس سے شدید نفرت ہے تو میں نے کہا۔ تم اسے اس قدر ناپسند کرتے ہو تو اسے طلاق دے دو تو اس نے کہا کہ وہ ام جان کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتا جن کے کتے پر زبردستی اس نے نزیہت کو اپنا لیا تھا۔ ”ان کی باتیں میرے لیے ناقابل برداشت تھیں۔“

میں اپنے آنسوؤں پر بند باندھے انہیں سن رہی تھی جب انہوں نے میرے آگے ہاتھ بٹور دیے۔
 ”نزیہت! تم یہاں سے چلی جاؤ۔ کہیں دور بہت دور۔ تمہیں جتنی رقم بھتا پیسہ چاہیے میں دے دیتا ہوں مگر تم یہاں سے چلی جاؤ۔ وہ بھی اس طرح کہ ام جان کو خبر نہ ہو۔ ام جان کی شہباز میں جان ہے یہ تم بھی جانتی ہو۔ وہ اس کو بھتہ دلا اور نہیں دیکھیں گی تو مر جائیں گی اور ان کا خون تمہارے سر ہو گا۔“ اتنی بڑی بات وہ آرام سے کہہ گئے اور اس روز بھی خاموش دور بھری دعا کے باوجود نہ نسن میرے لیے شق ہوئی نہ آسمان ٹوٹ کر گرا۔ میں ڈھیسوں کی طرح سب کچھ سمجھ چکی تھی۔

”مہم۔ میں کہاں جاؤں۔“ ان کی اتنی اچانک فرمائش مجھے پوری کرنا محال نظر تھی تو میں سسکتے ہوئے بولی

”تمہیں بھی چلی جاؤ کسی دارالامان میں کسی ادارے میں۔ تمہیں یہاں پناہ ملتی ہے تب بھی تمہارا ٹھکانہ ایسا ہی کوئی ادارہ ہونا چاہیے۔ تمہارا ایک ہی گھر ہے معاشرے میں ایک باعزت مقام ہے اور ہمارا بھائی بہت نیرت والا ہے اس کی محبت میں تم سے شادی تو کر لیتا ہے مگر اسے بھلا نہیں پارہا اور بھلا سکتا بھی نہیں۔ تمہیں بھی اسے دونوں میں اس کا اندازہ ہو چکا ہے۔ تمہیں اگر تھوڑی سی بھی غیرت ہے تو۔“

”بس کریں اظہر بھائی! مجھے اور کتنا بے بسی میں گرائیں گے۔ چلی جاؤں گی میں یہاں سے ارتقائی کو لے کر۔“ میں رو پڑی۔

”خبردار ارتقائی کا نام نہیں لیا۔ تم اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتیں۔“ وہ غرا کر بولے۔
 ”مجھے آپ لوگوں کی منطق سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک طرف تو مجھے بد کردار سمجھتے ہیں وہ میری طرف اگر ارتقائی کا پتہ پھر پھر لگائی گا وہ بتا ہے تو آپ اس کو بھی تسلیم نہیں کرتے مگر ارتقائی کے وجود سے بھی منکر نہیں ہوتے۔ آخر ایسا کیا کتاہ سرزد ہو گیا ہے مجھ سے جو کسی کی بھی نظر میں قابل معافی نہیں۔ کیا آپ سب کو اللہ کا وہ بھول گیا ہے۔“ میرے آنسو بے قابو ہو گئے تھے۔

”وہ کچھ تمہارے یہ آنسو، ہم دو ڈھائی سالوں سے دیکھ رہے ہیں اب مزید بہانے کی ضرورت نہیں۔ تم یہاں سے جاؤ گی تو شہباز آنے کا ورنہ اس کی بوڑھی ماں پونہی اس کی جدائی میں تڑپ تڑپ کر جان دے دے گی پھر تم اس الزام سے بچ نہیں سکو گی اور جو ارتقائی کو اپنے ساتھ لے جاؤ گی۔ ذرا بہا ہوا تو اس کے سوالوں کے کیا جواب دو گی کہ اس کے باپ نے تمہیں کیوں نہ بسایا؟ اس کے ساتھ تم جہاں بھی جاؤ گی وہ تمہارے کردار کے لیے ایک سوالیہ نشان بن کر رہ جائے گا۔ سوچ لو اور فیصلہ کر لو تمہارے پاس اس کے سوال اور کوئی راستہ نہیں۔“

وہ میرے لیے زندگی کے سب دروازے بند کرتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔

پھر میں نے اس کے بعد بہت سوچا بہت سارے دن بہت ڈھسانی سے رہنا بھی چاہا مگر ام جان کا رویہ مجھ سے بہتر نہ ہوا نہ شہباز خان کا کوئی فون آیا۔ آرمی سے انہوں نے رپورٹ لے لیا تھا۔ ان کی خود ساختہ جلا وطنی ماں کے لیے احتجاج کا ایک طریقہ تھا۔

ام جان کی بے قراری دھکی چھپی نہیں تھی اور نہ ان کی آنکھوں سے بھانکتی بیزاری جو مجھے دیکھتے ہی نمایاں ہو جاتی۔

بالآخر بہت سوچ بچار کے بعد میں نے طے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس روز جب میں تمہارے ساتھ شاپنگ کے لیے نکلے تو تمہیں باہر ٹھہرا کر میں شاپنگ مال کے اندر گئی۔ میرا ارادہ کچھ بھی خریدنے کا نہیں تھا۔ میں شاپنگ مال کے پچھلے دروازے سے باہر نکل کر رکشے میں بیٹھ کر ابھی تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ بم بلاسٹ ہو گیا اور یوں خدا نے میرا بھرم رکھ لیا۔ یقیناً سب نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہو گا مگر سب کے سمجھ لینے سے کوئی جیتا جاگتا انسان مردہ نہیں ہو جاتا۔

میں چند ماہ ایک دارالامان میں رہی۔ وہیں میری فمد کی کرنی سے ملاقات ہوئی۔ انہیں اپنی مونیٹسوری کے لیے ایک پر خلوص اور منتہیٰ آئیڈنٹسٹرٹری کی ضرورت تھی۔ اوچار ملاقاتوں میں ہی اللہ نے ان کا دل میری طرف متاثر کر لیا۔ انہوں نے مجھے جاب بھی دی اور یہ پھت بھی اس دن سے میں ادھر ہی ہوں۔ جب جب متا کی بے قراری بے چین کرتی تھی مکمل نقاب کر کے دور سے ارٹھنی کو دیکھ آتی تھی۔ جب بھی تم اسے گھر سے باہر لے کر نکلے تھے پھر جب اس کا اسکول شروع ہوا تو بھی اسے تقریباً روز جا کر دور سے دیکھ آتی تھی۔ کسی کچھ دنوں سے دل پر اختیار نہ رہا تو اسے اسٹیکس، ہوس دینے کے بہانے اپنی ریاس بھانے لگی جس کے نتیجے میں میں تمہارے سامنے بیٹھی ہوں۔ کیسی ہیں ام جان؟ وہ ساری تفصیل کے اختتام پر بولی۔

”جانتی نہیں۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولا۔

”ہاں تم نے شاید بتایا تھا کہ تم گھر چھوڑ آئے ہو۔ کیوں؟“

”پھر بتاؤں گا۔“ وہ نال کیا۔ ”آپ نے اب کیا سوچا ہے؟“

”کیا سوچنا ہے۔“ وہ پتیلی سی ہنس کے ساتھ بولی۔

”مجھے صرف ایک بات کا جواب دیں۔“

”کیا؟“

”ارٹھنی کا کیا تصور؟ اس کے پاس باپ ہے نہ ماں۔“

”نہت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انگلیاں پختا رہی۔“

”آخر اظہر بھائی نے ایسا کیوں کیا؟“ چند لمحوں بعد معاذ بولا۔

”اظہر بھائی اگر ایسا کرتے تو مجھے جب ہوتا۔“ وہ سر ہلا کر بولی۔

”پھر بھی۔“

”ازل سے زر زمین انسان کی دشمن رہی ہے۔ شہباز میری وجہ سے پہلے ہی نام نہاد غیرت کے ہاتھوں بھاننا منہ پھپھاتے پھرتے تھے۔ اظہر بھائی کے اگسٹے پر میں ایک بار پھر گھر چھوڑ آئی۔ دوسرے لفظوں میں پھر بھاگ گئی۔

قدرت نے اس پر میری موت کا پروہ ڈالنا چاہا مگر مجھے یقین ہے اظہر بھائی جیسے شخص نے اس پروہ کو بھی بہت سے رنگ دیے ہوں گے۔ شہباز جیسا شخص جو اپنی انا کے بے درگند میں مقید ہے میرے جانے کا سن کر اور بھی اظہر بند ہو کر رہ گیا ہو گا۔ سارا بڑا سن پلازے کے گرائے وغیرہ سب کچھ وہ لوگوں بھانپوں کے درمیان تقسیم ہو جاتا۔ اظہر بھائی نے اپنے حصے کے علاوہ شہباز کے نام کی ایک ساریٹھ تو سیل بھی کر دی تھی۔ اسی یاد اور آف اٹارنی کے تھوڑے جو

شہباز نے جانے سے پہلے ان کے نام کی تھی۔“

”آپ کے اہوازے کافی حد تک درست ثابت ہوئے۔ اظہر بھائی اس کے علاوہ بھی بہت کچھ سچ باریج کر سمیٹ چکے ہیں۔“ معاذ بولا۔ ”شاید وہ اب یہاں ہوں بھی یا نہیں۔ ان کا بہت عرصے سے امریکہ میں ہونے کا پتہ ان تھا۔“

”ہوں۔“ نہت کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

”نہت آئی، ایک بات پوچھوں؟“

”پوچھو۔“

”شہباز خان اب آپ کے دل کے کون سے حصے میں ہیں؟“

”حصے۔“ وہ مسکرائی۔ ”دل ہی ختم ہو گیا تو کیسے حصے بخرے۔“

”پھر بھی۔“

”انہیں معاذ اب کچھ نہیں بچا۔ اتنی ”عزت افزائی“ کے بعد کوئی عورت اس مرد کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی جو بارہا اسے سب کے سامنے بد کروا کر دکھا ہو۔ میں اس موضوع پر اس شخص کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ تم پلیز کھانا کھا کر جانا میں کھانا لگواتی ہوں۔“ وہ بات ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ معاذ اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔

کھانا کھا کر وہ نہت سے پھر آنے کا کہہ کر باہر نکل آیا۔

مجھے شاید ادھر بار بار آنا پڑے۔ ہو سکتا ہے نہت آپ کے دل میں اس پتھر دل انسان کی محبت کی کوئی چنگاری کہیں دلی بڑی ہو۔“ وہ سڑک کے کنارے کھڑا سوچ رہا تھا۔

”کیا فائدہ اس چنگاری کو کہیڈ نے گا۔ اگر شہباز بھائی نے ایک بار پھر اسے رسوا کر دیا تو یہ عورت شاید تیسری بار جی نہ پائے پھر اس کی موت کی ذمہ داری معاذ میاں تمہارے کندھوں پر ہوگی۔“ اسے فوری دوسرا خیال آیا تھا۔

”کچھ بھی ہو مجھے کوشش کرنی ہے۔ ارٹھنی کے لیے ان دونوں کی محبت کا قرض چکانے کے لیے ایک آخری بھر پور کوشش۔“ سامنے سے آتے رکشے کو اٹھ دیتے دیتے بے اختیار اس کی نظر سامنے سے گزرتی گاڑی پر

بڑی۔ ایک لمحے کو وہ بھونچکا سا رہ گیا۔

”مجھے کم از کم ایک دوا کی پھٹی لٹی ملے گی۔“ رکشہ جو کسی روانہ ہوا وہ دل میں فیصلہ کر چکا تھا۔

UrduPhoto.com

”پہچانا آپ نے مجھے۔“ فخر حیات سے گری خوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے شہباز خان نے پوچھا۔

”آپ؟“ فخر حیات نے جیسے یاد کرنے کی کوشش کی۔ ”چہو آپ کا اچھا خاصا دکھا بھالا محسوس ہو رہا ہے۔

ہم پہلے ایک سے زائد بار مل چکے ہیں۔“

انہوں نے شہباز خان کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ رعنا حیات پہلے ہی سامنے والی نشست پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک روز پہلے شہباز خان نے رعنا حیات کو فون کر کے ان کے گمشدہ بیٹے کے بارے میں اطلاع دینا چاہی تھی اور ان سے گھر آنے کی اجازت لی تھی۔ رعنا حیات تو اسی وقت ان سے ملنا چاہ رہی تھیں مگر شہباز

خان نے کہا کہ وہ فخر حیات کی موجودگی میں یہ ملاقات کرنا چاہ رہے ہیں جو ایک بڑا سن ڈرل کے سلسلے میں کراچی گئے ہوئے تھے اور آج شام ہی لوٹے تھے۔ رعنا حیات بھی شہباز خان کو دیکھ کر کچھ چونکی تھیں مگر اس وقت ان کا ذہن صرف اور صرف اپنے بیٹے کے بارے میں ملنے والی اطلاع میں اٹکا ہوا تھا جو شہباز خان نے انہیں فراہم کرنا

تھی۔

”جی ہم دیا رل چکے ہیں۔ کیا یہ کم صاحب! آپ نے بھی مجھے نہیں پہچانا۔“ وہ گم صم سی بیٹھی رعنا حیات سے مسکراتے ہوئے بولے تو رعنا حیات نے ہلکی سی مسکراہٹ پر اکتفا کرتے ہوئے کوئی جواب نہیں دیا۔

”اچھا میں آپ کو پہنٹ دیتا ہوں۔ میں آپ کی کوئی گمشدہ چیز آپ تک پہنچانے آیا تھا۔“

”اوہ ایس اتنی ری ممبر۔“ فخر حیات نے خوشی سے ہنسی بجاائی۔ ”دیکھیں شہباز خان ہے نا۔“

”جب ہم لاسٹ ٹائم ملے تھے تب میں واقعی کیٹین تھا۔ اب اگر میں آپ سے پانچ برس بعد مل رہا ہوں تو کم از کم بجز تو ہو چکا ہوتا اگر میں نے ریڈائن نہ دے دیا ہوتا۔“ آپ نے مجھے ٹھیک پہچانا۔“

”بیمک صاحب! اسی لیے میں فخر حیات کی موجودگی میں یہ ملاقات کرنا چاہتا تھا لیکن پلیز آپ فکر نہیں کریں میں دو چار دنوں میں ہی اس کا پتہ لگا لوں گا۔ آج کل وہ ایٹ آباد میں ہوتا ہے لیکن کل ہی اس نے ایک ماہ کی لائٹ بولے کی ہے ورنہ میں ایٹ آباد جا کر اسے لے آتا۔ بہر حال ادھر بھی میں اس کے جاننے والوں سے پتہ لگا کر آپ کو دو تین دنوں میں ہی اس کے بارے میں بتا دوں گا۔“ وہ تسلی دینے کے سے انداز میں کہہ رہے تھے۔

”انتظار۔ انتظار۔ انتظار!“ کہتے کہتے وہ روئے لگیں۔ ”آخر یہ انتظار تمام کیوں نہیں ہوتا۔ میرے مولائی یہ آزمائش مجھ پر سے ختم کیوں نہیں ہوتی۔ میں مر جاؤں گی اس کرب کے ہاتھوں۔ یا اللہ مجھ پر رحم کر۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگیں۔

”رعنا! بیویا! رات تم تو بہت بہاؤ ہو۔ اس صبا کے معاملے میں اس طرح کے ایس اینڈ ڈاؤن تو آتے ہی ہیں۔ اب تو بس دو چار دنوں کی بات ہے پلیز خود کو سنبھالو۔“

فخر حیات بیوی کے پاس آکر مہمان لہجے میں بولے تو رعنا حیات کی سسکیاں اور تیز ہو گئیں۔ فخر حیات کچھ لمبے لمبے شہساز خان کی طرف دیکھنے کے جواب سوچ رہے تھے انہیں اتنی جلد بازی نہیں دکھانی چاہیے تھی۔ چند دن میں معاذ کو گھر لے کر اپنے ساتھ لے آتے تو آج ایک ماہ کے جذبات یوں بھجوج نہ ہوتے۔

عبدالصعبین دو سرے دن پہنچا تھا۔

مگر کوئی گھر میں نہیں تھا۔ بیڑیوں کے اختتام پر لکڑی کے سیال خورہ دروازے کے کندھے میں اتنا بولساہ والا بھول رہا تھا۔ اسی دن آتے کو دو سرے اسکول میں جا بھل گئی تھی۔ آج اس کا ادھر پہلا دن تھا۔ جو یہ بھٹکھٹھولی کی گئے گھر گئی تھی اور صوفی صاحب کلثوم ملی کے بیٹے کے ساتھ اپنا چیک اپ کرانے گئے تھے اور انہوں نے ہی بطور خاص جو یہ کلثوم ملی کے گھر لے گیا تھا۔ شاید انہیں علم تھا عبدالصعبین اگلے روز ضرور آئے گا۔

وہ اپنے کافی کے بیٹے کے ساتھ اپنے گھر کو آئے اور کوفت سے کڑا تار بارات بھر وہ سوئیں۔ سکا تھا۔ ہوسنی ڈرگزیلے کے باوجود اسے ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی۔ ماں ہی اور ذہن سب کا سوچ سوچ کر وہ رات کو کئی بار اٹھ کر رویا تھا پھر سب سے بڑھ کر صوفی صاحب کی حالت۔

”کاش۔ میں نے بابا صاب کو اس حد تک ناراض نہ کیا ہوتا۔ طبلے سار گئی نماز سے جس قدر انہیں نفرت تھی میں نے اس فیصلہ میں آکر انہیں خود سے اتنا نفرت نہ کیا ہوتا۔“

وہ جتنی بار بے چین تھی اسے جاگا اتنی بار بچھتا تھا۔ اسے یاد تھا صوفی صاحب کو بچپن سے لے کر بڑھپن تک اس کی آواز سہ سہ سہ تھی اور جب وہ چھولی چھولی سورتیں تلاوت کرتا تو صوفی صاحب کی خوشی دیدنی ہوتی تھی۔

”خوشی کی آوازیں تو واقعی عبدالصعبین سے ٹیڑھے سال کے گلیوں عرصے میں اس نے قرآن پاک حفظ کر لیا مگر جو کشش جو نماز اور نماز ماہ عبدالصعبین کی آواز میں ہے اس کی تلاوت سنو تو لگتا ہے آدمی اس کے ہماؤ میں رہتا چلا جا رہا ہے۔ اللہ نے بہت خوبصورت آواز دی ہے اسے۔ نالائق! اگر وہ لگا کر حفظ کر لے تو سال بھر میں اس کا بیڑا پار لگ سکتا ہے۔ دیکھنا میری گدی ہی سنبھالے گا۔“

وہ جوش میں آکر کہتے مگر جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا اس کے بارے میں ان کی رائے بدلتی چلی گئی اور آج وہ اس کی صورت سے بھی نفرت کرنے لگے تھے۔

”مگر بھئی! آج تو میرا والٹ میری جیب میں ہے۔ ایرپورٹ سے میں سیدھا گھر آیا ہوں۔“ انہوں نے جیب میں بڑا سیاہ والٹ نکال کر انہیں دکھایا۔

”مگر آپ کا کچھ تو کم ہوا ہے جس کا اشتہار آپ نے اخبار میں دیا ہے۔“ اب کے وہ کچھ سنجیدہ لہجے میں بولے۔

”اوپ۔“ فخر حیات کا سکر اتا چہرہ بھی یکدم مہم چمک گیا۔

”تو آپ اس اشتہار سے متعلق کچھ بتانا چاہ رہے ہیں۔“ فخر حیات نے بے چینی سے یہ سلبوداتی بیوی کو ایک نظر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آف کورس۔“ کہہ کر وہ چپ ہو گئے۔ رعنا حیات کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ چہرے کی رنگت سرخی مائل ہو چکی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ کچھ بول نہیں پاری تھی۔

ڈرامٹک روم میں چند لمحوں کو خاموشی چھا گئی۔

”بھئی! میں بتاتے کیوں نہیں۔ کہاں سے میرا بیٹا ہے؟“ جب خاموشی کا وقفہ طویل ہوا تو رعنا حیات کھڑے ہوتے ہوئے جیسے پھٹ پڑیں۔ ان کی حالت دیدنی تھی۔

”بیمک صاحب! پلیز ریٹیکس ہو جائیں۔ میں بتا رہا ہوں۔“ شہساز خان رعنا حیات کی کیفیت سے کچھ گریبہ خیرا کر بولے۔

”رعنا! بیٹو! جاؤ۔ شہساز! آپ تسلی سے آرام سے جہاں آتے رہیں جہاں آتے رہیں۔ پر پتھر رکھ کر اس گھڑی کا انتظار کیا ہے وہاں کچھ مل اور کسی۔ خدا کا شکر ادا کر رعنا! ہم تو یقیناً تارا بھائی کے پاس گئے تھے۔“

فخر حیات خنجر تھم کر پرسکون لہجے میں بولے تو رعنا حیات ایک گراہی لہجے میں گھٹکیں مگر ان کے چہرے کے اثرات میں بدلے تھے۔

”کیا آپ اپنے بیٹے کو پہچان سکتے ہیں اگر وہ آپ کے سامنے آئے؟“ شہساز خان نے پوچھا۔

”کیا آپ کو یہ سوال ایک ماں سے پوچھنا چاہیے؟“ رعنا حیات نے بولے۔

”ہاں پوچھنا چاہیے۔ اگر اس کا تخت جگر بے حد کم سنی میں لگتی ہے پھڑاہو۔“

”میں اسے پہچان لوں گی یوں بھی“ مسائبان سے ہمیں اس کی سولہ سترہ سال کی عمر میں اتاری گئی تصاویر ملی ہیں۔ میں نے ان تصاویر میں بھی اسے شناخت کر لیا ہے تو پانچ چھ سالوں میں اس میں کتنا تغیر آ گیا ہوگا۔“ وہ بے قراری سے بولیں۔

”درست کہا آپ نے۔“ شہساز خان نے کہہ کر صوفی سے ٹیک لگالی۔

انہیں تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ بابا صاحب دوبارہ اپنے قدموں پر چل بھی سکتے ہیں۔ ڈاکٹر حیران تھے۔
صوفی صاحب اب یقیناً بیماری کی شکست اور آپ کی مضبوط قوت ارادی کی جیت ہے۔ اصل میں انسان تب
ہی پیر الائنز (مخدر) ہوتا ہے جب مایوسی اور ناامیدی اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے اور وہ بے دم ہو کر ہتھیار
ڈال دیتا ہے اور جو اس بیماری کو شکست دینے کی ٹھکان لیتے ہیں وہ آپ کی طرف چند ہفتوں یا مہینوں میں چلتے پھرتے
نظر آتے ہیں مبارک ہو بہت آپ کو۔

وقت رخصت ڈاکٹر نے ان سے گرم جوشی سے مدعا فرما کر دے ہوئے پر خوش انداز میں کہا کہ مگر خیال رہے یہ
بیماری اگر مضبوط قوت ارادی سے شکست کھا سکتی ہے۔ تو کسی کمزور لمحے میں جب آپ اپنے حوصلوں کو دم توڑنا
محسوس کرنے لگیں تو یہ چپکے سے دوبارہ حملہ آور بھی ہو سکتی ہے اور اس کا وہ سرا انیکہ یقیناً بہت شدید اور ناقابل
برداشت ہوتا ہے۔ اس لیے کبھی بے حوصلگی اور بے احمادی کو اپنے قریب نہ چھنکے دیکھئے گا۔ مسئلے مسائل
پریشانیوں زندگی کا حصہ ہیں۔ زندگی سے بڑھ کر نہیں۔ اپنے لیے اپنی خاطر ان بہت خیال رکھیے گا۔

جو صاحب ڈاکٹر کا لہجہ ہی نہیں الفاظ بھی بہت حوصلہ افزا تھے۔ صوفی صاحب کا زندگی سے بھرپور ولولہ لے ہوئے
توانا دل ہر لمحہ اپنی تازگی کو تیار کر کے رکھنے کو تیار تھا۔

آج بہت دنوں بعد صبح سویرے اٹھ کر تیار ہوئے تھے۔ اپنے سب سے اچھے کپڑے استری کروا کے پہننے اپنے
بالوں کو چہرے کو ڈاڑھی کو اپنے ہاتھوں سے سنوارا تھا۔ اپنے جوتے آمنے کے اصرار کے باوجود خود پہنے اپنے
ہاتھوں سے خود ناشتہ کیا اگرچہ ان کے ہاتھوں میں لہو اور باتھ میں ابھی بھی مستقل لڑاؤ تھا۔ موجود تھی مگر انہیں اس
بات کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ وہ وقفے وقفے سے کونوں بازوؤں کو اوپر نیچے لاکر گردش کرتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا
تھا۔ یہ بھی چند ہفتوں میں ٹھیک ہو جائے گا۔

Urdu Photo.com

وہ ناشتہ کر کے اپنے کمرے کے ساتھ ہی اٹھ کر بیٹھے تھے۔
"اب ایک صاحب نے کہا کہ چلتے ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "تو وہ بالآخر آمنے نے پوچھ ہی لیا۔
"ایک بہت ضروری کام ہے۔ اگر تازگی کی باتیں۔ چھٹی کتنے بیٹے ہوگی؟" وہ دیوار کا سارا لیے بہت سنبھل
سنبھل کر اتر رہے تھے۔

"ایک بچے" آمنے ان پر نظر سے تنہا نظر نہ تھم کر اتر رہی تھی۔
"چلو اس وقت تک میں بھی اپنی جاؤں گا۔" وہ آخری قدم پر پہنچ کر بولے۔ "اسکول تک میں تمہارے ساتھ
ہی نہیں آؤں گا۔" انہوں نے کہا تو آمنے سر ہلاتے ہوئے ان کے ساتھ چلنے لگی۔ وہ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ بابا صاحب مجھے
دیر ہو جائے گی۔ بہت بہت آہستہ چل رہے ہیں۔

وہ پوچھا۔ "کیسا ہے؟"

راتے بھر میں انہوں نے صرف یہی پوچھا تھا اور اسے اسکول چھوڑتے ہوئے آگے نکل گئے۔
وہ تقریباً ایک بجے واپس لوٹے تھے۔ ان کا چہرہ بے حد سرخ ہو رہا تھا۔ دایاں بازو ہاتھ سمیت بڑی طرح سے
کانپ رہا تھا۔ بائیں ہاتھ میں کچڑی چھڑی ان کی کھٹکی میں جیسے کھب کر رہی تھی۔ شاید وہ کافی دور سے پیدل
آ رہے تھے یا پھر یہ سڑکیاں چڑھتے ہوئے ان کی یہ حالت ہو گئی تھی۔

"جویریہ پانی!" وہ تخت پر تقریباً گرتے ہوئے ہتھکڑی لاکے۔ جویریہ اسے قدموں پانی لینے دوڑی۔
"بابا صاحب! آپ ٹھیک ہیں نا؟" کاہلے ہاتھوں سے پانی پیتے ہوئے پانی ان کی داڑھی اور کپڑوں پر چھٹک
چھٹک کر گرائند کے دہانوں سے بھی ادھر ادھر سے نکلا تھا۔ جویریہ ڈر گئی کہیں چھب۔
"بابا صاحب! میں پلاؤں؟" اس نے گلاس تھامنا چاہا۔
"نہیں یہ لو۔" انہوں نے تقریباً تین چوتھائی گلاس خالی کر کے اسے تھما دیا۔ جویریہ گلاس رکھنے لگی تو وہ تخت

سرخ ہی نہیں کیا۔ بڑے سید صاحب کی نوازشیں کیا ان کی محنت کی کمائی ہوتی تھی جسے وہ خوشامد کر کے حاصل
کرتے تھے۔ آج میری محنت کی کمائی بھی انہیں پلید نظر آ رہی ہے اور یہ آمنے۔ کس قدر داغ خراب ہو چکا ہے
اس گلہ باپ کی چچی جیسے میں تو ان کا کچھ لگتا ہی نہیں۔ اماں جی کی بیماری عموت سب چھپا یا مجھ سے۔ میں ہر لمحہ
ان کے لیے تڑپتا رہتا ہوں اور یہ بے حس پتھریلوں کو مجھے ادھر آتا ہی نہیں چاہیے۔ عید التین بالکل درست
کرتا ہے یہ ہیں ہی نہیں اس قابل۔ سب انہیں میری پروا نہیں تو میں کیوں ان کے لیے مہراجارہا ہوں؟

طوفانی رفتار سے گاڑی دوڑاتے وہ واپس آیا تھا۔
اپنے بیدروم میں آکر کھلنے داغ کو اس نے پوری بوتل سے مدہ ہوش کیا تھا۔
تو کر کے بار بار دستک دیتے پروو ہتھکڑی اپنے چکراتے سر کو ہٹام کر اٹھا تھا۔ قریش ہو کر ہر آیا تو اس کی نئی المیہ کا
اسیانسہ وحید بیٹ بیٹھا تھا۔ اگرچہ آج اس کا کسی سے ملنے کوئی نہیں چاہ رہا تھا مگر وحید بیٹ نہ صرف اس کا دوست
تھا بلکہ وہ حنیف کوئی کارائنت چند بھی تھا۔ حنیف کوئی ایڈورڈو لڈو مافیا کا کرتا دھرتا۔
"صوفی صاحب! اس پر سناؤں کروا لے تھے۔" عبدالعصین کو دیکھتے ہی وحید بیٹ ہنسل اٹھا۔ ایک لمحے میں اس کے آگے
کرتے ہوئے بولا۔

"کیسے ساؤن؟" جی بی بی زاری پھینچا کر وہ ہتھکڑی بولا۔
"جی جی شوے ہسایہ ملک میں۔ ادھر سے ادھر سے چوٹی کے سنگھ کے پاس ہوز رہے ہیں۔ شوعد میں دنی شارجہ
اور مل ایسٹ کے تقریباً تمام ممالک میں پر فارم کرے گا۔ اس سلسلے میں یہ ایک بڑا سٹپ ہے۔"
"میرا جی نہیں چاہ رہا۔" کتنے کتنے دورک گیا۔
"کب جانا ہے؟"

"کل شام کی ٹکٹ کر دینی ہے میں نے تمہاری کوئی بیار بھی جارہا ہے۔ تم سائیکل روٹوں کے سفر کو روکنا۔"
بے تکلفی سے اس کے ہاتھ میں پین دیتے ہوئے بولا۔
"کتنے دن لگیں گے؟" اس نے متذہب نظروں سے اسے دیکھا۔
"یار! تم لوٹ لو تو دن کیوں کتنے لگے۔ چل کھئی (سائون) مار۔" وہ عبدالعصین کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر
بولا۔

"اچھا ہے" میں یہاں سے چلا ہی جاؤں۔ انہوں نے کون سا مجھے یا میری محبت کو کسی طرح شہار کرنا ہے۔ روز
جا تا رہوں گا روز دھتکارے رہیں گے۔ ادھر رہ کر چن کر ہتھ تائی ہے، ہتھ ہے یہاں سے دوڑ چلا جاؤں۔" اس نے موج
اس کے داغ میں ابھری اور وہ سرت پل اس نے مسائون کہیے۔
"زور سے۔" بھٹی چل تیار کی پکڑ میں اور دوسرے ضروری انتظامات کریں۔ کل صبح چکر لگاؤں گا۔" کتنے
ہوئے وہ باہر نکلی گیا۔

عبدالعصین نے اپنا بوجھل سر صوفی کی بیک پر ٹکا دیا۔ چند لمحوں میں وہ بیٹھے بیٹھے سوچ کا تھا۔

ایک بہت بڑا معجزہ!
یہ یقیناً معجزہ ہی تو تھا جو سب کی آنکھوں سے دیکھا۔ صوفی صاحب حسن پر انجانا اور فلاح کا شدید انیکہ ہوا تھا وہ
بھی اس طرح کہ بچنے کی امید بھی کم لگ رہی تھی اور جس طرح وہ صاحب فرمائش ہوئے ان کی عمر کا قاعدہ ان کی
کمزور صحت گھریلو زندگی میں آنے والی اچانک آفتیں اور نہ حل ہونے والے مسائل کا انبار تو مسائل کا تقدان مگر
ان سب کے باوجود صوفی صاحب اتنی جلدی اپنے پیروں پر کھڑے تھے تا صرف کھڑے تھے بلکہ جما جما کر زمین پر قدم
رکھتے ہوئے چل بھی رہے تھے۔ تکلیف برداشت کرنے کے احساس سے ان کا چہرہ سرخ قدھاری انداز کی طرح
دکھ رہا تھا وہیں اپنا کامیابی پر خوشی سے چمک بھی رہا تھا۔ صلیب کہ آمنے اور جویریہ تو باقاعدہ روٹنے لگی تھیں۔

”نہیں جب تک اس جسم میں دم ہے مجھے ہمت نہیں ہارتی۔“



جیسے ہی سید سلطان بخت ڈائمنگ نیبل کی سینٹرل چیئر پر آکر بیٹھے ملازم نے گرم گرم ناشتہ سرو کرنا شروع کر دیا۔ صالحہ پانچویں بیچوں کے ساتھ پہلے ہی ڈائمنگ نیبل پر موجود تھیں۔ وہ تینوں بڑی بیچوں کو بڑے اہتمام اور توجہ سے ناشتہ کروا رہی تھیں۔ جبکہ دونوں چھوٹی بیچیاں اپنی بی بی چیئر پر بیٹھی آگے بڑے کھلونوں اور کچھ جھڑوں سے کھیل رہی تھیں۔ تینوں بڑی بیچیاں صاف تھوڑے آستری شدہ یونیفارم پہنے سلیقے سے بالوں کی بھونپی پونیاں بنانے اپنی ہلٹوں پر جھکی ہوئی تھیں۔ حالانکہ باپ کے آنے سے پہلے تینوں ناشتہ کرنے میں خوب خرمے دکھا رہی تھیں۔ صالحہ منتوں سے انہیں ایک ایک نوالہ بنا کر کھلا رہی تھیں۔ جیسے ہی سلطان بخت سامنے آکر بیٹھے وہ تینوں سہم کر آگے بڑی ہلٹوں پر جھک گئیں۔ ملازم نے گرم گرم گھنے کا برا تھا سرونگ ڈش میں ان کے آگے رکھا جس میں سے اٹھتی خوشبودار مہاب ان کے منہوں سے نکلا رہی تھی مگر ان کی توجہ پرانے کی طرف مبذول نہ ہو سکی۔ وہ ابھی بھی سر اٹھائے تینوں بیچوں کو ہی دیکھ رہے تھے۔

بڑی شاندار کھانا کھا کر تھیں اور آٹھ بجیں شریقی وہ بالکل شہینہ کی کافی تھی۔ اسی کی طرح دیکھی شہر جیسی رنگت ویسے ہی چہرے کے نیچے نقوش۔ اس کے ساتھ حلینہ بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ کتنا تھا مگر نکلتا اس کی بچی شہینہ جیسی تھی اور ناک بھی بالکل اسی کی طرح اٹھی، موٹی اور تیسری شہینہ۔ وہ توفی بناتی شہینہ تھی۔ یہ وہ تھی

ایک ایک انہیں لگا ان تینوں کرسیوں پر تھی شہینہ بورڈنگ جانے کے لیے تیار بیٹھی ہے اور ان کے یوں گھومنے پر مستکراتے ہوئے ان کو مت چڑھا رہی ہے۔ منہ چراتے ہوئے وہ ایک دم سے بڑی ہو گئی۔

”صالحہ بیگم! وہ ایسے بے قابو ہوتے ہیں۔ قابو پاتے ہوئے خاصی اونچی آواز میں دھاڑے۔“

”جی۔“ صالحہ جو تینوں میں مگن تھیں، ”جی۔“

”انہوں نے جلدی کروا رہے ہیں۔“ صالحہ نے کہا۔ ”انہوں نے کڑی یا ہر نکالی۔“ وہ گرونگ مہو کر ملازم سے بولی۔

”یہ تینوں اسکول نہیں جاسکیں گی۔ سنا تمہارے۔“ وہ تیز آواز میں دھاڑے۔

”کسب کا کیا ہے؟“ صالحہ نے کڑے تیروں سے پوچھا۔

”تینوں کو شیورنگھریہ پڑھانے آجایا کرے گا مگر تینوں اسکول نہیں جاسکیں گی اور یہ میرا حکم ہے جسے آج سے ہی لاگو سمجھو۔ ان کو ناشتہ کروا کے کمرے میں لے جاؤ اور کپڑے تبدیل کراؤ۔“

”دماغ خراب ہو گیا ہے آپ کا۔“ گرونگ میں ابھی پائل نہیں ہوئی۔ میرے جیسے ہی میری بیچوں کی لہجہ کے رستے میں کوئی بھی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ سنا آپ نے۔“ صالحہ اپنے پرانے انداز میں ہوا پا چلا گئیں۔

”تو کیا ان کو اسکول بھیجنے سے روکنے کے لیے تمہارا مرنا ضروری ہے تو میں تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دوں گا مگر یہ تینوں آج سے اسکول نہیں جاسکیں گی۔“

”لاوارثہ نہیں ہوں میں اور نہ بھیک منگی۔ آپ کے دماغ سے یہ خناس نکلیں کیوں نہیں جاتا۔ کرتی ہوں میں ابھی آپ کی کپا جان اور حسین لالہ کو فون۔ نہ میں اس فضول حکم کو ماننی ہوں۔ مانوں گی۔ چلو تم تینوں انھوں۔ تمہیں اسکول سے دیر ہو رہی ہے۔“

سبے رنگی نہ ہوئی۔ کاش میں دنیا کے عام باپوں جیسا باپ ہوتا۔ اولاد کی غلطیوں کو نظر انداز کر دینے والا۔ ان کو آخرت کے لیے تیار کرنے کے بجائے دنیا کی تیاری میں لگا رہنے دیتا تو میرا آئین بھی سب گھروں جیسا ہوتا کھلتا ہوتا مگر میں نے ان کی دنیا کے بجائے عاقبت سنوارنا چاہی۔ بس یہی جرم ہے میرا۔ میرے اللہ! امن یہی جرم ہے میرا۔ میں اپنے بچوں کو تیرے نام لیاؤں کی صف میں سب سے آگے دیکھنا چاہتا تھا۔ سب سے آگے ہر اول دستے میں اور۔ سب مجھ سے روٹھ گئے۔ ناراض ہو گئے۔ چلے گئے۔“

”صوفی صاحب ایک دم سے رونے لگے۔“

”بابا صاحب! بابا صاحب! پلیز۔“ آمنہ اٹھ کر ان کے پاس آئی۔

جو یہ بے اختیار روتی ہوئی ان کا بازو ہولے ہولے دبانے لگی۔ صوفی صاحب کا روتا ہوا شکست خور چہرہ آمنہ کے اندر جیسے ہست ہست کچھ توڑ پھوڑ گیا۔ اس نے تو کبھی انہیں یوں شرمندہ ہو کر روئے نہیں دیکھا تھا۔ آج ہی لاہور میں وہ ایک دم کی شہزادے کی کہانی پڑھ رہی تھی۔ شیکسپیر جس کا اپنی زبان میں بیان کرتا ہے۔

Time is out of joint o'cursed spite
That ever I was born to set it right

ان لوگوں کا دکھ جو سب کچھ ٹھیک کرنے کا بیڑا اٹھاتے ہیں اور آخر میں لا حاصل جدوجہد کا نتیجہ یہ دکھ سنانا کی کہ وہ اپنے ناہونے کی تمنا کرنے لگتے ہیں۔ ان کا یہ دکھ آمنہ کو تیرا گیا۔

”بابا صاحب! آپ نے کچھ غلط نہیں کیا کوئی جرم نہیں کیا۔ آپ نے اپنی اولاد کی نیک تربیت کرنا چاہی تھی۔ انہیں بھی حرام نہیں کھلایا اور کبھی حرام مال پر نظر نہیں رہی۔ آپ اپنی اولاد کی آخرت سنوارنا چاہتے تھے۔ اگرچہ آپ کو اس کا علم ایک حد تک دیا گیا تھا مگر پھر بھی آپ نے ان حد سے آگے تک کوشش کی تو جو غلو صول صدق دل سے کوشش کرتے ہیں اللہ ان کی کوشش کو بے ثمر نہیں دیتے۔ آپ آخرت کے لیے کوشش کرتے تھے۔“

”اس کا نتیجہ اس کا ثمر بھی آپ کو آخرت ہی میں ملے گا۔ دنیا کی وہ دولتیں جو آپ نے کبھی تنہا نہیں کی تھی۔ تینوں بچوں شرمندہ ہوتے ہیں بابا صاحب! آپ یقین رہیں۔ آپ نے کبھی غلط نہیں کیا اور انہیں سب کو غلو صول دیا۔ ان کی اولاد آپ کے بیٹوں سمیت آخرت میں اللہ کے حضور آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دے گی۔ یہ یقیناً اللہ کے نام لیاؤں کی صف میں سب سے آگے نہیں تو سب سے پیچھے بھی نہیں ہوں گے۔ آپ نے حق جو پایا ہے۔ ابھی تو فصل پوری طرح سے تیار بھی نہیں ہوئی۔ یہ فصل اللہ کے نام کی تیار ہوگی۔ آپ دیکھیں گا یہاں نہیں تو وہاں آپ یقیناً دیکھیں گے۔ بابا صاحب! آپ تو دنیا کے تمام باپوں کے لیے ایک نمونہ ہیں۔ برائی کے ساتھ سمجھوتہ کرنے والے اپنے پیچھے قابل تقلید مثال چھوڑ جاتے ہیں۔ آپ قابل فخر ہیں۔ دنیا کی ہاتھ کئی لذتوں کو چھوڑ کر جو شخص آخرت کی خاطر کاستوں بھرا راستہ چلتے اس سے زیادہ بہادر اور قابل رشک کوئی نہیں ہو سکتا۔ آپ میری باتوں کو محض سلیبی نہ سمجھیں بابا صاحب! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ آپ قابل فخر ہیں۔“

اس نے پھر یقین نظروں سے صوفی صاحب کی بے یقین آنکھوں میں دیکھا۔

”جو یہ۔“ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟“ تو جو یہ اثرات میں سہلا کر اپنے آنسو پونچھے گئی۔

”بابا صاحب! ہم دونوں تو ہیں نا آپ کے ساتھ آپ کیوں غم کرتے ہیں۔“

وہ اپنی انگلیوں کی ٹرم پوروں سے ان کی نیچلی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔

”زندگی ہمیں بھلے سب کچھ دے ڈالے تو بھی آپ جیسی نیک تربیت نہیں دے سکے گی۔ بابا صاحب! آپ کی بتلی آپ کی کوشش کچھ بھی رائیگاں نہیں گئی۔“ وہ اس پر یقین کچھ میں بولی تو ایک دم حم سی مسکراہٹ صوفی صاحب کے خنک ہونے پر ابھری۔

اسی وقت ظہر کی آذان ہونے لگی۔

”تم دونوں نماز پڑھ کر کھانا کھاؤ۔ میں ابھی نماز پڑھ آؤں۔“ وہ نیچے اترنے لگی۔

”بابا صاحب! پھر سیر چھیاں اتریں گے اور صوفی پڑھ لیں۔“ جو یہ بولی۔

چاہیے۔ وہ خودکامی کرتے ہوئے ایک پی سی او میں کھس گیا۔
بنت بھجکتے ہوئے اس نے نمبر ملایا۔
اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

”ہیلو! چوٹی قتل پر فون اٹھا لیا تھا۔ آواز سننے ہی اس کا دل جیسے اچھل کر طوق میں گیا۔ اس سے جو لایا بولا
نہیں جا رہا تھا۔
”ہیلو! کون ہے بھئی؟“ دوسری طرف سے بی زاری سے کہا گیا۔ اسے لگا اگھے ہی پل فون رکھ دیا جائے گا اس
نے ہمت باندھی۔

”ہیں۔“ ہلکہ پھر بھی نہ بن سکا۔
”میں۔ یہ میں کون؟“ دوسری طرف اچھے سے پوچھا گیا۔
”آپ شہباز خان بات کر رہے ہیں نا؟“ وہ چہرہ لحوں کے سکوت کے بعد بولا۔
”آف کورس۔ اوف کون۔ کون بات کر رہا ہے؟“ وہ کچھ ٹھٹک کر بولے۔
”پہچانا نہیں۔“ معاذ پھینکی سی ہنسی میں کر بولا۔
”معاذ۔ معاذ کے بچے تم کہاں روپوش ہو؟“ شہباز خان اتنی زور سے چیخے کہ معاذ کو پتہ پورکان سے پرے

کرنا پڑا۔
”تمہارا آپ روپوش تھے۔“
”اور بھائی! بھدا کا نام تو اس جگہ جا کر نہ روپوش ہونا تھا میں اسحق بولا تھا۔“ وہ جلدی سے بولے۔
”تو آج آپ نے مان لیا؟“

”ہاں بھئی مان لیا کہ مجھ سے بڑا اسحق اور کوئی نہیں ہے۔“ وہ ہنس کر بولا۔
”یک ہنر کرو اور جلدی سے گھر آؤ یا مجھے ایڈریس بتاؤ میں شیخ باہوں۔“ اس نے کہا۔
”توڑ سے۔“ وہ بے تابی سے بولے۔

”میں ایک شرط پر آؤں گا۔“ اس نے سوچ کر کہا۔
”ایک چھوڑو میں تمہاری دس شرطیں ماننے کو تیار ہوں۔ تم گھر آؤ۔“ اس نے کہا۔
”صرف ایک شرط۔ پولیس ہا میں گے؟“ وہ اڑ کر بولا۔
”یار! میرے بھائی میرے باپ۔ سب مانوں گا۔ چاہے تم قسم لے لو۔“ وہ جلدی سے بولے۔
”تم آؤ سہی۔“

”آپ سوچ سمجھ کر بولیں۔ ہو سکتا ہے میری بات سن کر آپ سوچ میں پڑ جائیں۔“ معاذ نے انہیں دیکھا۔
”میں قسم کھا کر کہتا ہوں جو تم کو ملے مالوں گا۔ ارے اگر اپنے اس لائڈے کو سنبھالو جو میری شکل دیکھتے ہی
روئے لگ جاتا ہے۔“

”کون کس کی بات کر رہے ہیں؟“ معاذ کو خوشگوار سا احساس ہوا۔
”ار تھی اور کون؟“ وہ شہباز کر بولے۔ ”تم کب تک پہنچ رہے ہو؟“

”آپ میری بات مانیں۔“
”ار تھی کی قسم مانوں گا۔ آپ تو آ جاؤ۔“ وہ بے تابی سے بولے۔
”اوکے نہیں آسے کھنے میں پہنچ رہا ہوں۔“

”واؤ! زبردست۔ میں گٹ کر کھا ہوں جلدی کا پتہ۔“ انہوں نے کہہ کر فون رکھ دیا تو وہ بھی مسکراتے چہرے
کے ساتھ فون بند کر کے سمسٹ کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔
اب اس کا رخ بس اسٹیپ کی طرف تھا۔

”میں بھی کس قدر اسحق تھا۔ نہ ہمت آتی سے سر بھوڑ رہا تھا۔ اگر وہ مان جاتیں اور شہباز بھائی نہ مانتے تو میری
نہت آتی کی نظروں میں کیا عزت رہ جاتی۔ لگتا ہے میری عقل بھی گھاس چرنے چلی گئی ہے۔“
وہ خود سے باتیں کرتا جا رہا تھا۔ اسے پیچھے سے مسلسل بارن بجاتی گاڑی کا بھی احساس نہیں ہوا۔

رہتا حیات بروقت بریک نہ لگاتیں تو معاذ کا ہٹ ہونا یقینی تھا وہ اچھل کر پڑتا۔
”ہندسے ہویا ہندسے چل رہے ہو یا کسی دیہات سے آئے ہو۔“ سڑک پر چلنے کی تمیز نہیں۔ جاہل گمنوار پھر کہتے
ہیں گاڑی والے کا تصور ہے۔ ال سینور ڈی جنٹی۔“

وہ کھڑکی سے منہ نکال کر بری طرح سے اس پر برس پڑی تھیں۔ وہ منہ کھولے انہیں دیکھا گیا اور وہ ہوا کی
طرح گاڑی آگے بڑھانے لگی۔
”ان امیروں کے مزاج کا بھی پتا نہیں چلتا کہاں پر ہم ہو جائے۔“ اس نے پیچھے سے اٹھتی دھول کو دیکھ کر مہر
جھنکا اور سامنے سے گزرتے رکشے کو رکشے کا اشارہ کرنے لگا۔

”نامہ۔“ سڑک کہاں ہیں آپ؟“ نہیں تارا خوشی سے چلائے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوئی اور اب زیور گل کو
دیکھتے ہی اس کے سر پر تلک آگئی تھی۔
”کیا ہو گیا؟ کون سا خزانہ ہاتھ لگ گیا جو یوں باؤلوں کی طرح چلا رہی ہو۔“ زیور گل جو ایک ایونٹ فنکشن کے
لیے الماری کھولے اپنے لیے لباس دیکھتے کر رہی تھی پلٹتے ہوئے کچھ جھلا کر بولی۔
”مام! خزانہ ہی سمجھو اور ہاتھ لگائی۔“ زیور گل سے پلٹتے ہوئے بولی۔

”اؤ ٹو ٹو۔“ آج کل تو یہ بچوں والی حرکتیں چھوڑو۔“ زیور گل نے اسے دونوں ہاتھوں سے تھام کر پتہ پتہ بٹھایا۔
”جنتہ دل میں مشکل سے مام پریشاں ہیں۔“ وہ بیڈ کے کراؤن سے نیک لگاتے ہوئے مزے سے بولی۔
”خیر یہ کیا ہے؟“ زیور گل الماری میں چھوڑ کر اس کے پاس آئی تھی اور اس کے چمکتے چہرے کو دیکھنے لگی۔
”جہاں ہی اسحق خوشی کے اچانک ہی جانے کا تینوں سامن پوری آہ و تاب سے چمک رہا تھا۔“ شاہ جی پلٹ آئے
کیا معذرت مانے سمیت۔“ وہ جا چکی تھیں۔

”شاہ جی بھی پلٹ آئیں گے بلکہ ان کے والد حضور بھی یہ خبر سن کر قبر سے نکل آئیں گے۔ اب سب مام!
سارنی نیم تھارے ہاتھ میں سے گروپ کارڈ میری پاکٹ میں۔“ دیکھنا پچھنگوں کی تو ساری بساط ہی الٹ جائے گی۔
شاہ جی تاک رہتے نہ سمجھتے ہوئے چائے آئے تو نامہ ہیل دینا میرا۔“ وہ سرخوشی کے عالم میں کہنے لگی۔
”پتہ پتہ تو پتہ۔“ زیور گل آگیا کر بولی۔
”میں ان جیک اپ کے لیے گئی تھی۔“

”اؤ ہاں مجھے یاد آیا۔ آج تو تمہاری اپائنٹمنٹ تھی اور میں بھول گئی۔“
”ہرا چینی، فکر مندوں کی طرح ہے نا۔“ نہیں تارا طنز سے بولی۔

”میں نے ایسا حوالہ بھی نہیں کیا جبکہ مجھے معلوم ہے میں کیسی مال ہوں۔ جتنا نے اور بے جا مظاہرے کرنے کا
مجھے شوق نہیں۔“ زیور گل تاک چڑھا کر بولی۔
”کیا کہاؤ! کہنے لگے کون سی تاریخ آوی ہے۔“
”اگھے مہینے کا بسا ہفتہ۔“

”وہ خوشخبری تو تمہاری بی بی میں رہ گئی۔“
”بی بی میں کہاں مام! یہی تو خوشخبری ہے۔“ نہیں تارا مزے سے بولی۔
”کیا مطلب؟“

”ہوا کمر نے الٹا سا حوالہ دیا تھا۔“ انہیں سید سلطان بخت کا اکلوتا وارث، جانشین پیدا کرنے جا رہی ہوں۔ ٹھیک

وس بارہ دن بعد۔ "نہین تارا نے آنکھیں بند کر کے جیسے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔
"تو اٹھی۔ اچھا۔" زیور گل کھل کر سمجھی تھی۔

"چلو کچھ تو ہونا ہی تھا بیٹیا بیٹی۔ تمہاری آرزو پوری ہونا تھی یا میری۔"
"کیوں آپ کو میری آرزو نہیں تھی؟"

"بے وقوف؟ ہماری کلاس کی عورتیں بھول کر بھی بیٹے کی تمنا نہیں کرتیں۔"

"اوہ ہاں آہ۔ آج کل جس طرح شرفاؤ کی کلاس میں بیٹی اس اہمیت کی حامل ہو چکی ہے جس طرح کبھی ان کے ہاں بیٹے ہوا کرتے تھے، اسی طرح ہماری کلاس میں بھی بیٹے اتنے ہی اہم ہو چکے ہیں جتنی بیٹیاں۔" نہین تارا ٹانگیں پھیلا کر بولی۔

"جیسے بڑی رپورٹیں ہیں نئے رجحانات کی۔" زیور گل کچھ جھک کر بولی۔

"ہاں آج کل کے دور میں ایسی کامیاب ہے جو باخبر ہے۔"

"اچھا گویا بارہ باخبری کو شہادت تو تمہارا ماں بنا قبول نہیں کر رہا اس بچے کو کہاں مانے گا۔ تو تو جی ہے ابھی تک خوش فہمیوں کے جھلے میں بھول رہی ہے۔ میں تو اس کے تیور بھانپ چکی ہوں۔ میں سے ایسی آس رکھنا فضول ہے۔ چپ کر کے بیٹے کو پالتا ہے تو پال بونفصول میں اس سے بچنا نہیں بلکہ زیور گل انصوفی سے کہنے لگی۔

وہ شاہجی کا جلا کر بھانپ کر سوچ کر مسکراتی لگی۔ ایک دم دھماکے سے دروازہ کھلا۔ حالانکہ دروازہ پہلے ہی ادھ کھلا تھا اندر داخل ہونے والے نے کلا شکوف کاٹ بٹ بٹھے ہوئے پتے لٹکائے۔ زیور گل اپنی جگہ سے اچھی تو نہین تارا کے منہ سے مٹی بلی بیج نکلتی لگی۔ خوشخوار تیور لیے اچھی خاصی جھریں جیسی شکلوں والے دو گن مین کھڑے انہیں کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔

"کسے کون ہو تم۔ تمہاری اتنی جرأت کیسے ہوئی بغیر اجازت میرے بیڈروم میں داخل ہونا میرا۔"
زیور گل نے اپنے چوکیدار کو پکارا۔

"جین جن رکھو گاؤں انہیں سو ساٹھ۔ اب اپنے بیڈروم کے دروازے کس لیے بند کرتی ہو بھئی۔ اس بچے ہوئے حسن میں سے گری کی پنگاری دعوت دے کون بولا آئے گا۔"

ڈارک براؤن شلوار کیس والے دروازہ تو منہ شخص نے ذرا آگے بڑھ کر کھٹکھٹ کر زیور گل کے سینے سے لگاتے ہوئے ٹھیک آہر لہجے میں کہا۔ "تو جو چوکیدار کی خبر لیتی ہے تو ہم سے لو، دونوں اپنی پہلی ہوئی باتوں سمیت گیٹ کے اندر پڑے تڑپ رہے ہیں اور تمہیں تو اب یوں بھی چوکیدار رکھنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے حسن کا کون سا موٹی چھپا پڑا ہے جسے کوئی ٹونٹے آئے گا اور تمہاری یہ بیٹی جو سارے زمانے کا گندہ سمیٹ کہاں سے چلی سے اور کچھ اچھا اتنی سے شریفوں پر۔ کو تو ابھی اس کا ماں بننے کا شوق نہ پورا کروں۔" وہ سفاکی سے کہتے ہوئے نہین تارا کی طرف بڑھا جو ڈر کر بیڈ کے کونے میں سمٹ گئی تھی۔

"نہین۔ نہیں۔ کون ہو تم۔ خبردار میری بیٹی کو۔" زیور گل جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھی۔ اس نے بالکل اچانک پلٹ کر کلا شکوف کاٹ بٹ اس کے ہاتھ پر دے مارا تھا۔ خون کی ایک باریک لکیر اس کے ہاتھ سے بہنے لگی۔

"نام۔ نہین تارا زور سے چلائی۔

وہ تمہارے منہ سے بیج تو کیا بھاب بھی نہیں نکلتی چاہے ڈرنے۔" وہ جن نما شخص آگے بڑھا اور دوسرے لمحے نہین تارا کو کسی گریبا کی مانند دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر اوپر تک لے گیا۔

"نام۔ نام۔" وہ چلا رہی تھی۔

"چھوڑو پھوڑو اسے۔ ظالمہ۔ برقم کرو اس کی حالت پر۔ تم نے کسی ماں کے بیٹے سے جنم نہیں لیا۔"

زیور گل اپنا ذہم بھول کر کہا گلوں کی طرح اس کی طرف لپکی۔ اس نے مزہ کر ایک نفرت بھری نظر زیور گل پر ڈالی اور نہین تارا کو زور سے بند پیرچ دیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی بیج نکلی کر رہ گئی۔ دوسرے لمحے وہ اپنے منہ کے آگے ہاتھ رکھے اپنی جینز دہرا رہی تھی۔

"نام نہ نکلے تم دونوں کے منہ سے سلطان بخت کا۔ اگر کچھ دن اور بیٹے کی تمنا ہے تو نشا۔" وہ غراتا ہوا زیور گل کو دھکا دے کر باہر نکل گیا۔ اگلے بل دونوں باہر جا چکے تھے۔

"نہین۔ تم ٹھیک ہو میری بیٹی۔" زیور گل اس پر ہلکی جو گھڑی بی اپنی جینز دہرائے اثبات میں سر ہلانے جا رہی تھی۔

"میں دیکھتی ہوں اس خراپ کو۔" زیور گل کا لہجہ بڑھ گیا اور زور سے نکل کر پلٹ کر زیور گل کو اٹھا کر تیزی سے لمبیریش کرنے لگی۔

ظالمہ زور سے بھیڑیے انسانوں کا خون چوسنے والے آدم خور اچھے میں نے ساری دنیا کے سامنے نہ بچا کیا تو زیور گل نے کھنکھائی۔ ہم تو ہیں ہی پیدا نہیں بے عزت لوگ۔ اب تمہری عزت کی دھجیاں نہ میں نے کٹی گئی ادا نہیں تو میرے منہ پر اگر گھوڑا چڑھ جائے تو یہ بیج کر بول رہی تھی۔

"نام۔" نہین تارا کے منہ سے دھواڑی نکلتی تھی۔ وہ بیٹے کے بچے ہاتھ رکھے دہری ہوئی چلی گئی۔ زیور گل کے ہاتھ سے موبائل چھوٹ گیا۔ وہ اگلے دنوں الوداعی کے ساتھ نہین تارا کی طرف لپکی جس کی جینز اب بالکل خاموش ہو چکی تھیں۔ زیور گل پتھر لٹی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

مسٹر کلثوم بی بی والدین پاکستان آئی تھیں اور کلثوم بی بی کے ساتھ جا کر صوفی صاحب ایک ہفتے بعد آمد اور جویریہ کے نکاح کی باتیں کر رہے تھے۔ مسٹر کلثوم بی بی کا بیٹا تھا جیسی انہیں جویریہ کے لیے دل و جان سے پسند آیا تھا۔ لہر کتے ہوئے وہ مٹھالی بھی لے آئے تھے اور سارے محلے میں بڑا بھی وی تھی۔

آمد اور جویریہ بالکل گم صدم تھیں۔ انجنا صاحب خائف دونوں کے ولوں کو دھڑکا رہا تھا اتنی جلدی جلدی سب کچھ بوری تھا کہ دونوں کی تیا میں ٹنگ اور وہاں بیٹے پتھر کر رہ گئے تھے۔

"مجھ کو نکال سے ہفتہ والے دن یہ خر خالی کہیں گے ہم میں ایک دون بچے حجرے میں ٹھہروں گا۔ اس کے بعد تم دونوں سے مل کر گاؤں چلا جاؤں گا۔" صوفی صاحب خود ہی ساری پلاننگ کیے بیٹھے تھے اور وہ دونوں جیسے مورتلال بن چکی تھیں۔ صوفی صاحب کے اصرار کے باوجود دونوں خریداری پر جانے کے لیے راضی نہیں ہو رہے تھے۔ آج وہ مجبور ہو کر کلثوم بی بی کی طرف آئے تھے کہ اس کے ساتھ دونوں کو خریداری کے لیے بھیج دے۔

کلثوم بی بی کے گھر کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔

انہوں نے ہولے سے دستک دی۔ نیک تو ان کی خراب تھی۔ اندر کھیر خاموشی تھی۔ دستک کا کوئی رد عمل نہ ہوا۔ انہوں نے ایک بار اور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا تو دروازہ آہستہ سے کھل گیا۔

"دو دن تو کھلا ہوا ہے۔" اب وہ سوچ میں پڑ گئے کہ اندر جائیں یا نہیں۔ اس پل انہیں کلثوم بی بی کی کسی سے باتیں کرنے کی توازا آئی تو وہ مسکراتے ہوئے سر جھٹک کر آہستہ سے اندر بیٹھ گئے۔

"کلثوم بی بی کتنی تھی۔ صوفی صاحب! میں آپ کی بہن ہوں اور بندہ۔ ان کے گھر تو بلا اجازت آجا سکتا ہے۔ اب خدا کے لیے دروازے کھٹکھٹانے اور کھینٹاں بچانے کی تکلیف نہ کیا کریں۔"

مگر انہوں نے ایسا کبھی نہیں کیا تھا اور آج وہ بلا اجازت اندر چلے ہی گئے۔

"ارے میں نے کب کہا تھا کہ ہفتہ سے نکاح کی بیج لگاؤ۔ میں لڑکیاں آگے جا کر بیچتی ہیں۔ کوئی گھر نہیں ہلانے جو یہ شادیاں مقلتیاں کرتے پھریں۔" مسٹر کلثوم بی بی کی آواز سن کر وہ ایک پل کے لیے شوشر ہوئے تھے کہ اچھا ہے کلثوم

گزرتے آخری لمحات کو دیکھ رہے تھے جیسے یہ سب ان کے لیے روز کا منظر ہو جیسے ہی ان کا موسم آخری لمحہ کا کھا کر بے بان ہوا چند لمحوں بعد اس لڑکے نے اپنے دونوں ہاتھ آہستہ سے کھینچ لیے۔
 "ناصہ ہائے میں مرگئی تائیے میں مرگئی۔ ہم لٹ گئے نیرا ہونگے۔ لوگو کیا قبر ہے اللہ کا اپنے پیارے بندوں پر۔ کھو تو قبر ساقی اللہ تجھے ذرا رحم نہ کیا۔ لوگو دیکھو تو۔ ہائے قیامت ہے قیامت۔"
 اپنے سینے پر دو ہتھ پرتی زور زور سے چلاتی "میں کرتی کھٹوم لی لی نے آہستہ سے بند دروازے کی چنجی گراتے ہوئے دونوں گواڑوں کو ایسے لوریا ہر نکل کر واہلا کرتی زور زور سے چلانے لگی۔
 دونوں لڑکے صوفی صاحب کو بے حد آرام سے نیچے لٹا چکے تھے۔ سہارے بہت آہستہ سے ان کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پونے بند کر دیے۔ ان کا غما۔ آواہا کھول کر گردن کے گرد پونسی پیٹ دیا۔ مسز عثمانی نے ان کی چٹھری لاکر ان کے اوامیر ہاتھ کے پاس رکھ دی اور اب پاس بیٹھی پچھلے پچھلے کر رہی تھی۔ دونوں لڑکے بے حد

تھکے ہوئے تھے۔
 "آمنہ! اللہ تعالیٰ نے سنا ہا ہر شور کیسا ہے؟" جویریہ جو اس باختمہ ہی کمرے سے نکلی تھی۔
 "ہ تمہیں باہر شور سنائی ہے؟" میرے اندر نہ جانے کیسا طوفان اٹھا ہے۔" وہ پچھلی پچھلی آنکھوں سے جویریہ کو دیکھ رہی تھی۔ جویریہ اس کی خاموشی پر تیزی سے میڑھیوں کی طرف بھاگی۔
 شور میڑھیوں کے قریب آیا تھا۔

میری شہزادیوں! میری بیٹیو! تمہارا باہل چلا گیا۔ تمہیں اپنے ہاتھوں سے رخصت کرنے کا ارمان دل میں لیے ہائے ریاہ قبر۔ کھٹوم لی لی کی چیخ دیکر کچھ اٹھیں سنائی دے رہی تھی۔
 "ہا صاحبہ! جویریہ کی دل دونوں لڑکوں کے دروازے پر ہلا دیے تھے اور اس کے پیچھے اترتی آمنہ میڑھیوں کے پاس سے گزرتی ہوئی تھی۔

UrduPhoto.com

"تھک چکا تو تم آگئے۔" جیسے ہی معاذ رکھنے والے کو جیسے تمہا کر گیت کی طرف بھلا۔ ایک دم سے شہباز خان گیت کے اندر سے نکلے اور بے حد گرم جوشی سے اسے گلے لگا لیا۔
 "کیسے ہو یہ پوچھنے کی تو ضرورت نہیں! شہداء اللہ سے میرے ہاتھوں میں نہیں سارے۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور تم جوان۔" وہ اسے ہاتھوں لگدھوں سے قلم کر کے حد محبت سے بولے تو معاذ جھپک کر رہ گیا۔
 "اچھے بچکے! کتے رہے ہیں پمے کی طرح اسٹارٹ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ ڈشنگ اور خود کو بوڑھا کہہ کر تعریف کرنا چاہتے ہیں تو سن میں ابھی لڑکیوں کی قطار آپ کے پیچھے ہاتھ باندھے چل سکتی ہے جو آپ ارادہ فرمائیں۔" وہ بھی آہستہ آہستہ ہی نظروں سے گمنا ہوا بے تعلق سے بولا۔
 "ارے بھیا! ہم تو ایک لڑکی کو نہ باندھ سکے تم لڑکیوں کی قطار بند ہوانے کی بات کر رہے ہو۔" کو کیسے ہو؟"
 اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے۔

"جیسا آپ کو نظر آ رہا ہوں اور لڑکی کو نہ باندھ سکتے ہیں آپ جناب کی کمزوری شامل تھی ورنہ کون کا فر ہوگی جو آپ سے بندھن جوڑ کر توڑنا چاہے گی۔" وہ فوجی انداز میں بولا۔
 "ہوں کافی ترقی کر لی ہے۔ خوب نسلے بازی کرنے لگے ہو۔ یہ تمہیں نکل پڑھ رہے تھے یا کچھ اور؟" وہ اسے گھورتے ہوئے بولے۔ "چلو اندر۔ میں ام جان سے تمہاری اسٹڈیز کی تفصیل پوچھتا ہوں۔" وہ اس کا بازو پکڑ کر اندر کی طرف کھینچتے ہوئے بولے۔

"آپ بات کو چاہے جس رخ پر لے جائیں" اس موضوع پر آئے بغیر آپ کی جان نہیں چھوٹنے والی۔" وہ انہیں گویا دھمکاتے ہوئے بولا۔ "وہ سرے ام جان۔ شہباز بھائی! میں ام جان کا سامنا نہیں کر سکتا۔" وہ اچانک رکتے ہوئے بولا۔

"آمنہ جویریہ۔ میری بیٹی۔ تمہیں اللہ کے حوالے۔ میں نے تمہاری حفاظت کے لیے خود پرمان کیا تھا۔ اللہ کو شاید بھول گیا تھا۔ دیکھو اس جھوٹے مان کا نتیجہ۔"

وہ ہاتھ ان کی گردن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے کانوں میں سیٹھیاں اسی بجتے لگیں۔ یہ وہ بیٹائی پر سلیبی سی تڑپ۔ نہیں۔ مہم۔ میں۔ مجھے مت مارو۔ میں نے کیا کیا؟" زور زور سے آخری مزاحمت کے طور پر آنکھیں کھول کر فریاد کی تھی۔

"ارے اے صوفی صاحب! انا تہا۔ بری بات۔ یوں بچوں کی طرح دوتے نہیں۔ چس۔ جب۔ آپ تو اللہ کے پیارے بندے ہو ٹیک اور پرہیزگار۔ آپ نے تو ساری زندگی نیکیوں کے انبار کھائے ہیں دنیا کی آرام و آسائش کو ٹھوکر پر رکھا۔ آپ کو زندگی کا لالچ کا بے کو۔ آپ تو موت کی تمنا کرو۔ جنت کے پانوں کی تمنا جہاں دودھ کی شہریں جوڑوں کے مورچوں میووں کے درخت، قسم قسم کی نعمتیں آپ کی منتظر ہیں۔ ہائے ہر اتوار سے ہاتھ ہو گا۔ ساری زندگی نہ کوئی نیکی نہ نیکی کا ارادہ ہی کیا۔ ساری زندگی گناہ گمانے گناہ کھائے اور گناہ کے مزے اڑائے۔ مرنے سے تو ہم جیسے ملعونوں کو ڈرنا چاہیے۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔ ہم آپ کی منزل کے قریب تر کر رہے ہیں۔ شاید اس ذرا سی نیکی کے عوض ہم بھی بخشے جائیں۔" سید عثمانی کا شیطانی انداز۔ ان کا ہنسی چاہا اس کے منہ پر تھوک میں۔

"ہیں اب تیاری پکڑو۔ اتنا نام نہیں ہے ہمارے پاس۔" اس نے بخالی سے کہتے ہوئے لڑکے کو اشارہ کیا تھا۔
 "میرے اللہ مجھے بخش دینا۔ میرے بچوں کی حفاظت فرمنا۔ آمنہ جویریہ تیرے حوالے تو میرے ہر عمل کا گواہ مجھے موافق۔"

ان کی واٹھی آنسوؤں سے بھیگ رہی تھی۔ سرسئی آنکھیں پانیوں سے بھر رہی تھیں۔ کئی لمحوں کی گزیر پر اگر تم گیا تھا۔

اسی لمحے بے اختیار زنب کے آخری لمحات ان کے سامنے آئے۔ مری ہوئی تڑپ ہوئی، چنجی ہوئی زنب۔ اس کی شکوہ کرنی ملا متنی نظریں۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی میں سرور ہری دوڑی تھی۔
 "یا اللہ مجھے معاف کر دینا۔ زنب میری بیٹی۔ میرے اللہ! ان کی ہر بات پر دیاؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ان کی سانسیں رکنے لگیں۔

"جلدی کرو لینی آ رہا ہے۔" ان کی سماعتوں میں اس دنیا کی آخری آواز پڑی۔
 ان کے سینے میں رکی سانسیں باہر آنے کو پھنسنے لگیں۔ نیچے کا دھڑ دھڑ جان ہو کر ٹک رہا تھا۔ بے آوازگی کی طرح تڑپنے لگا۔

"بیٹی جان ہے اس بڑھے میں۔ آ۔ آ۔" اس لڑکے نے کہتے ہوئے اپنا پورا زور لگایا تھا۔ ان کی آنکھیں جیسے باہر گواہیں پڑیں۔
 "صوفی عبدالرحمن احمد پور۔ بچپن لگیا۔ لڑکین قرآن مجید۔ جوانی۔ راجہ بی بی۔ کل نفس زانق۔ الموت۔

زنب۔ معاف۔ اللہ۔"
 "لا الہ الا اللہ۔" ان کے منہ سے آخری جتنی پھیٹی توف زنگی۔ بے تحاشا ابلی ہوئی سرسئی آنکھوں میں حیرت اور رنج کا سمندر موجزن تھا۔ ان کا تھلا دھڑ بے جان ہو کر ٹک گیا۔ دو سرے پل دونوں ہاتھوں کی شاخوں کی طرح دونوں اطراف آگے تھے۔ ان کے جسم نے آخری زور دھڑکا کھایا اور منہ سے باہر نکلی زبان حلقوں سے اٹھا ہوئی سرسئی آنکھیں اور مزاحمت میں لرزنا سر تک لخت بے جان ہو گئے تھے۔ نبض اور دھڑکن ختم تھی۔
 چند لمحے تک وہ لڑکا انہیں اسی قوت سے دبوچے کھڑا رہا۔ چاروں طرف خاموشی دانت کھینچتے مت غور سے ان پر

اب کہہ جانا ہے؟ معاذ نے پوچھا۔

ابھی انگریزاں تھیں۔ انہوں نے کمرے کے اندر سے جواب دیا۔

جائے بیٹے ہی شہباز خان نے چلو چلو کی رٹ لگا دی۔

جانا کہاں ہے پتا بھی تو چلے؟ معاذ نے پھر پوچھا۔

تم چلو تو سہی راستے میں بیٹا تھو۔ وہ ام جان کو گاڑی میں بٹھاتے ہوئے بولے۔

شہباز! انسانی اعصاب بھی اتنے مضبوط ثابت نہیں ہوتے جتنی ہم توقع کرتے ہیں۔ تم معاذ کو سب کچھ ابھی بتا دو۔ گاڑی میں بیٹھے ہی مسز خان بولیں تو معاذ نے الجھن بھرے انداز میں شہباز خان کو دیکھا۔

نچلو بھئی معاذ میاں! بیٹھو تمہیں آج ایک کہانی سناتے ہیں۔ وہ ڈورائی ٹک سیٹ پر بیٹھے ہوئے بولے۔

یہی تمہیں بتا کیسے چلا کہ میں پاکستان آچکا ہوں؟ گاڑی اشارت کرتے ہی انہیں بھولا ہوا سوال یاد آیا۔

میں نے آپ کو اسی گاڑی میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ معاذ بے ہوشی سے بولا۔ اس کا ذہن کہانی سننے کو

تیار نہیں تھا۔ گاڑی گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔

تم نے کبھی کبھی نام سنا ہو خیر حیات کا۔ بڑس کیوٹی کا ایک چمکتا رنگتا نام۔ اگر نہیں بھی سنا تو اب سن لو۔

پھر شہباز خان اسے بتاتے چلے گئے۔ وہ کم عزم سا سنتا جا رہا تھا۔

ایک لمبی تھا کہ سینے والی تھا جس لیے اس کے بعد بالآخر رونا خیر حیات نے تمہیں یعنی اپنے بیٹے علی شہباز یعنی معاذ

کو دھونڈ ہی نکالا۔ اسے میں ایک ماں کا چھانچہ نہ محبت ہی کہہ سکتا ہوں اور اب تم ہو اس خیر حیات والا۔ اور اس

کے لیے چوڑے بڑس بیک بیٹلس کے انگوٹھے وارث خیر حیات کے بیٹے۔ تمہیں اپنی پہچان کی تلاش تھی تا اور

تم اپنے بارے میں مشکوک بھی ہو جایا کرتے تھے۔ اندر کو اور خود کو پہچانو۔ تمہیں کسی سے بھی کچھ پوچھنے کی

ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ کیونکہ خیر حیات کے ساتھ تمہیں کھڑا کرو تو ان کی ذوالی مقابل آکھنی ہوتی ہے۔

سری لنکا سے وہ ملاقات چھ سال پہلے ہوئی تھی اور مجھے ان کے چہرے پر کسی اور کے چہرے کا گمان ہوا تا رہا جسے

میں کو سس کے باوجود سمجھ پایا کہ وہ میرا چہرہ ہمارا تھا۔

گاڑی گیٹ کے اندر داخل ہو چکی تھی۔ معاذ سماعت سا سامنے کھڑی پر ٹشوہ عمارت اور پیچھے رہ جانے

والے قوی بیٹل آہنی گیٹ کو دیکھ رہا تھا۔

برسوں پہلے جب اس شہر میں میرا کیا تھا اور اگر اس کی یادداشت وحوکہ نہیں کھا رہی تھی تو یہی وہ کو تھی تھی

جس کے گیٹ سے اندر چلے پر جو کیدار اس کے پیچھے چور چور کہہ کرھا کا تھا اور وہ شہباز خان کی گاڑی سے ٹکرا

کر گئی ہو گی۔

معاذ نے کچھ سوچا۔ وہ کچھ سمجھتا۔ شہباز خان کی آواز پر وہ بے اختیار چوکا۔ وہ اس کی طرف کا

دروازہ کھولے اس کے منتظر کھڑے تھے۔ کسی معمول کی طرح ہا پر نقل آیا۔

پور نیلو سے میں بلڈنگ کی طرف وہ بالکل غائبہ دائمی سے آیا تھا۔ لاؤنچ کے کھلے دروازے میں چہروں پر بے

فحاشا خوشی کی جگمگ اور ذہیب ساری مسکراہٹ لیے ایک خوب صورت عورت اور مرد اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

مجھے جناب! میں وعدے کے مطابق آپ کی امانت آپ تک لے آیا ہوں۔ لگتا ہے اللہ میاں نے مجھے آپ

کے گھر اس ذہیب پر لگا دیا ہے کہ آپ چیزیں تم کرتے جائیں۔ میں ڈھونڈنا ضرورت نہ کرانا چاہوں گا۔ شہباز خان کی

چکار پروہ پھر چونکا تھا۔

رہنا حیات سے چہرے پہلے سزا پر ہونے والی لہجہ سے یاد آئی تھی۔

وہ دونوں اب بیکس تکے بغیر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس چہروں اور چمکتی آنکھوں کے ساتھ۔

شہباز نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دونوں کے سامنے لاکھڑا کیا۔ معاذ کی عجیب ذہنی کیفیت ہو رہی تھی۔

میرا بیٹا! میرا بچہ! شہباز مجھے بالکل یقین نہیں آ رہا۔ رونا حیات کی پائی تو انہیں رہ رہی تھیں۔ ان کی

مشرم کرو کتنے دنوں سے تم نے ان کی خبر تک نہیں لی اس لیے میں تمہیں یہ ذمہ داری سونپ کر گیا تھا؟ ام

جان اس وقت سے نہایت بے بسی سے تمہارا انتظار کر رہی ہیں جب سے میں نے انہیں بتایا ہے کہ تم آ رہے ہو

اور جس بات کی وجہ سے تم تنگ رہے ہو اس کا تو یہ پتہ بھی مٹ چکا۔ بھائی یا سمیٹن بھائی اور مٹی کے ساتھ

امریکا چلے گئے ہیں۔ یوں بھی وہ سارا مٹی کا ہرام تھا تمہیں حاصل نہ کر سکنے پر اتفاقاً تمہیں سب کی نظروں سے

گرا گئے۔ اس بات کو ایسا بھائی بھی سب پر واضح کر چکے ہیں اور تم بھی یہ ہونے کے باوجود یوں کی طرح بھاگ

نکلے۔ ام جان کے وقتی غصے کو ان کی نفرت اور ناراضی جان کر۔ اس لیے اب میرا فرما کر اگر اپنی جان عزیز ہے تو

ام جان کے سامنے اس فضول شرمندگی کا ذکر نہ کرنا۔ وہ اسے غلطی سے گھورتے ہوئے بولے۔

اس وقت ایسا بھائی کو خیال نہ آیا کہ سبے حق میں ایک جملہ ہی یوں دیتے۔ معاذ روز سے کھو رہی تھی سچے میں

بول اٹھا۔ تمہیں شرمندگی کرنے سے اس رات انہی آپ ہوتے تو کیجئے۔

جان بولیں۔ انہوں نے گرا سنا سنا لیا۔ خیر حضور اور میرا مشورہ، اوتو تکلیف دینے والی یادوں اور توجہ

کو بھلا دینا کہ عمت قائمہ مشہور ہے۔ وہ بٹکے پھیلے انداز میں بولے۔

آپ بٹھال سکتے ہیں نہ بہت آہی کے متعلق ہر بات ہر جھوٹے بیچ فضول قصہ گوئی کو سنا دینا ہی سے بولا تو وہ

اسے ایک لمحے کو دیکھ کر بولے۔

یہاں اس بات کا کوئی ذکر نہیں۔ وہ کہہ کر آگے کی طرف بڑھے۔

آپ مجھ سے میری بات سامنے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ وہ وہیں رک کر بولا۔

تو میں کمرے والوں میں سے نہیں ہوں۔ تم اندر تو آؤ۔ وہ اپنی بیٹری پر کھڑے تھے۔ تم نے آتے میں

پندرہ میں مشہور کی ماسی کی رود کوئی بہت بے چینی سے تمہارا انتظار کیا ہے۔

گوان؟ وہ استغناء سے انداز میں انہیں دیکھتے ہوئے بولا۔ اسے اس رات یاد ہے۔ وہ اندر سے بولے۔

چندہ مشہور کیل چھو چکا ہوتا۔

تمہارے کمرے میں چار پانچ گاڑیاں کھڑی ہیں اور تمہارا نشانہ میں لٹکے کھانے پھر رہے سو۔ وہ آہستگی سے

بولے۔

ایسا مطلب؟ معاذ ان کے قریب آچکا تھا۔

نہیں چلو اب اندر۔ ام جان سے ملو۔ تمہاری ہی وجہ میں سارے مطلب بھلاؤں گا۔ وہ اسے بازو سے

تھپتھپے ہوئے اندر لے آئے تھے سامنے ہی ام جان والی کھینچ کر کھینچیں۔ معاذ کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں

آنسو آئے۔

معاذی ہاتھ کا سوجھ تو رہے مجھے۔ وہ جیسے ہی ان کے گلے لگا رہا کہ انہیں۔

اس جان! گناہ گار نہ کریں مجھے۔

تو کوئی ایسے رو ٹھنکتا کہ اپنا کوئی نشانہ نہیں چھوڑتا۔ اتنے سارے دن کتنی پریشانی میں گزرتے نہ تمہارا کوئی

آگیا نہ شہباز کی کوئی خبر نہ لڑھی جان کو اتنے طاقتور سمجھو رکھو ہے تم دونوں نے۔ وہ خفا لہجے میں بولے۔

ام جان پھر وہی دکھ دینے والی باتیں دہرا رہی ہیں۔ ہاتھ آئی خوشی کو خراب کرنے والی بات۔ دکھ دینے والی

باتوں کو فعل جا میں تو زندگی بہت سہل ہو جائے گی۔

وہ بھروسے کو نصیحت خود میاں نصیحت۔ ام جان بڑھا نہیں۔

ہر نفس کہاں ہے؟ معاذ نے مشتاق نظروں سے اوجھرا دیکھا۔

اس کے ایک دوست کی ہر تھوڑے سے شام کو اس کے ساتھ چلا گیا ہے بلکہ میں ہی چھوڑ کر آیا تھا۔ اگر اسے

تمہارے آنے کا پتہ ہو تا تو بھی نہ جاتا۔ ابھی تک مجھ سے مانوس نہیں ہوا۔ زینون بانو! کچھ کھانے پینے کو لے آؤ۔

ام جان! میں ذرا ایک ضروری ٹون کر لوں پھر چلتے ہیں۔ وہ جگت میں کہتے ہوئے اندر کی طرف بڑھے۔

عبدالعبید بن جراح کرانٹھ بیٹھا تھا۔

اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ اے کنڈیشن چل رہا تھا مگر اس کا جیسے دم گھٹا جا رہا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اپنا سینہ مسلنے لگا۔ دوسرے پل اس نے ساری لائیں آن کر دیں۔

ابھی تو ڈھائی بجے تھے۔ گویا اسے لینے ہوئے محض آدھا گھنٹہ ہوا تھا۔ ڈیرہ بجے کے قریب تو اس کا فکشن ختم ہوا تھا اور آج تو اس نے خلاف معمول ڈرگزم بھی نہیں لی تھیں۔ ویسے ہی بہت تھکاوٹ ہو رہی تھی۔

دن کے گیارہ بجے تھے جب وہ اس گلی میں داخل ہوا جس کے سرے سے ایک ہجوم نمودار ہو رہا تھا۔ ایک جنازہ کندھے پر رکھے ہوئے، مگر شہادت کی صدا بلند کرنا ہوا۔ اس کا پورا جسم بے جان ہو گیا تھا اور وہاں غم میں گھینٹاں سی جتنے گلی تھیں۔

”وہ وہ ہو گیا جس کے ہونے کا خوف مجھے میلوں دور سے یہاں بھگا کر لایا۔“ اس کی چھٹی جس سے الارم بے رہی تھی کہ ایسا ہو چکا ہے مگر وہ اس الارم کو سنتا نہیں چاہ رہا تھا اور اب اس کی خواہش کے بالکل برعکس وہ الارم بجسم ہو کر سامنے آ گیا تھا۔

تعمیریں بڑھتا ہجوم ایک لمحے کو اسے بالکل سامنے دیکھ کر ٹھٹکا تھا۔

پلنگ کا سامنے والا پایا شیخ صاحب نے تمام رکھا تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھے اور پلنگ سے وہ پایا عبدالعبید کے کندھے پر رکھ دیا اور عبدالعبید بہت کوشش کے باوجود یہ نہیں پوچھ سکا تھا کہ یہ جنازہ کس کا ہے۔ وہ کچھ دیر اور اس خوش تمنی میں رہتا چاہتا تھا کہ یہ جنازہ صوفی صاحب کا نہیں ہے۔

فلزہ شہادت پڑھتا ہر ہجوم مختلف بازاروں سے گزر کر شہر قوسٹان میں داخل ہو گیا تھا۔ گورکن قبر گھونڈ کا تھا، تازہ لگی مٹی دیکھ کر جھری سی آئی۔

جنازہ بے حد آسٹنی سے قبر کے قریب رکھ دیا گیا۔ سارے رستے جنہوں کو اطلاع تھی کہ یہ وہاں ہے ان کے پاس یا کندھے میں تھکن کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ بس ایک شدید خوف کا احساس تھا۔ اس کی جڑیں کے پھولے رکھا تھا۔

نماز جنازہ بھی پڑھ لی گئی۔

لا تین آدمی یا ہر سے دوڑے دوڑے آئے۔

”ہم چہ نہیں دیکھ سکے۔ یہ تھے جو گئے تھے ایک نظر میں۔“

ان میں سے ایک آدمی کو عبدالعبید بیچتا تھا۔ وہ صوفی صاحب کا بہت پرانا شاگرد تھا۔ اکثر ان سے ملنے آیا کرتا تھا۔ اس کی بے تالی کا عالم دیکھ کر عبدالعبید کا ذہن بھینٹا اٹھا تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھا اور اس آدمی کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ چہرے سے پہلے چادر اور پھر کفن کا لپٹا لپٹا لیا۔

”ناشہ انتہ۔ کتنا اور ہے۔ سبحان اللہ صوفی صاحب تو۔“ وہ آدمی کہہ رہا تھا۔

عبدالعبید چینی پیش آنکھوں سے صوفی صاحب کے ٹرور ڈررنگت اور بند آنکھوں والا چہرہ دیکھے جا رہا تھا۔ وہ آنکھیں جن سے ہمیشہ جلال نکلتا تھا جو ہمیشہ عبدالعبید کو قہار نظموں سے گھورا کرتی تھیں۔ ہمیشہ ناراض تھا اور غصے میں رہتی تھیں۔ آج بند تھیں بالکل بند۔ اسنے لوگوں کی موجودگی کے باوجود عبدالعبید کے سامنے ہونے کے باوجود بالکل بند۔

”پایا صاحب۔“ اس کا ضبط جواب دے گیا تھا اور اس کی چیخ نے جنازہ گاہ میں موجود لوگوں کو ہلکا کر دیا تھا۔

”پایا صاحب۔ نہیں آپ یہ نہیں کر سکتے۔ یوں مجھ سے تھا ہو کر نہیں جاسکتا۔ پایا صاحب۔ پایا صاحب۔“

وہ ان کے پلنگ کے پاس سے گلزمیں مار رہا تھا اور زور سے اندھا ہند۔

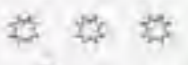
”اسے بیٹا! سو صلب۔ طیبہ صبر کرو۔ نیچے۔ یہ تو حکم ربی ہے۔ کب مل سکتا ہے۔ یوں روہنے سے انہیں تکلیف ہوگی۔ بہت نیک انسان تھے۔“

کوئی اسے کندھوں سے پکڑے کہہ رہا تھا مگر اسے ہوش کہاں تھا۔

”آپ یوں مجھ سے ناراض نہیں ہو سکتے، مجھ سے ایسے خفا ہو کر نہیں جاسکتے، مجھے معاف کیے بغیر۔ پایا صاحب۔ ایچھے، آنکھیں کھولیں۔ مجھے ماسیے، گالیاں دیتے مگر ایسے چپ نہ ہوں۔ ایسے تو آنکھیں بند نہ کریں۔ پایا صاحب۔ پایا صاحب۔“

سلسل گمروں سے اس کے ماتھے سے خون بہنے لگا تھا۔ دو تین گومیوں نے اسے مضبوطی سے پکڑ کر پیچھے کیا۔ ”جلدی کرو۔ بھئی اہل شام کے فوت ہوئے ہیں اب اور دیر نہ کرو۔ اچھا ہوا بیٹے نے منہ دیکھ لیا۔“

اس کی چیخ دیکار کے باوجود فلزہ شہادت کے دور کے دوران صوفی صاحب کے جسد خاکی کو لحد میں اتار دیا گیا۔ ”تو بیٹا! امشی ڈالو۔ تمہارے دل کو صبر ملے گا۔“ کوئی کدال اسے پکڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر کسی نے رومال باندھ دیا تھا، وہ تو بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے مٹی سے پر ہوتے اس خلا کو دیکھ رہا تھا جس میں ابھی اس کی نظروں کے سامنے پایا صاحب کم ہوتے تھے ہمیشہ کے لیے۔



”عبید تارا! دیکھو تو۔“ زبور گل کہتی ہوئی تیزی سے اندر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ سامنے خالی بیڈ دیکھ کر اس کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔

”عبید تارا۔ کہاں ہو تم؟“ وہ کمرے میں ادھر ادھر لگا دوڑانے لگی۔

آگے بڑھ کر ہولے سے واش روم کا دروازہ پہلے کھٹکھٹایا پھر آگے کو دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ صاف ستھرا ہاتھ روم بالکل خالی تھا۔

”کہاں ہے وہ؟“ وہ تارک گھبرا کر ہر طرف پلٹی۔ کارڈز دریا بالکل خالی تھا۔

”کونسی تھی؟“ وہ تارک دوبارہ کمرے میں گئی۔ کمرے اٹھا کر دیکھا اس کا موبائل موجود نہیں تھا۔ الماری کے پیٹ کھول کر دیکھے تو مگر اسرار اسلامان موجود تھا بس نین تارا کا بیڈ بیگ موجود نہیں تھا۔

”کہاں چلی گئی؟“ آدھا گھنٹہ پہلے تو میں اسے واک گرا کے گھر گئی ہوں۔ اب تو اچھی خاصی شام ہو رہی ہے۔ کہاں جاسکتی ہے۔“ وہ تیزی سے فریڈک روم کی طرف بڑھی۔

”شاید بچے کو دیکھنے چلی گئی ہو۔“ اسے آئی سی۔ یو میں رکھا گیا تھا۔ بچے کو سانس کا رالم تھا۔

زبور گل پریشانی کے عالم میں بے بسی وارڈ کی طرف جا رہی تھی جب ایک نرس دوڑتی ہوئی اس کی طرف آئی۔ ”نرس! آپ کے میری۔“

”نرس! آپ کے لیے ایک بہت بڑی خبر ہے۔“

وہ پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔ زبور گل کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

”آپ کا تراسا“ مس نین تارا کا بیڈا نرسری میں موجود نہیں ہے۔“ نرس پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان اٹک اٹک کر بولی۔

”کیا مطلب؟“ زبور گل خواہ اس باختی ہی ہو کر بولی۔

”مہم۔ میں ابھی نرسری سے ہو کر آ رہی ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے جب میں نے چیک کیا تو بچے کی حالت بالکل اچھی نہیں تھی۔ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس گئی تو انہوں نے ڈی ایچ جکشن لگھ دیے جو فوری طور پر اسے لگانے تھے۔ میں ڈی جکشن لے کر پہنچی تو بے بسی کا گٹ خالی تھا۔“ وہ جلدی جلدی تھمیل بتا رہی تھی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ نین تارا۔ ”زبور گل زور سے آئی میں سہلا کر بولی۔ ”یہ اس ہاسپتال کی انتظامیہ کی غیر ذمہ داری کی انتہا ہے۔ ایک پچھ دن دیوانے نرسری سے انعام ہو چکا۔“ وہ بھی اتنے لوگوں کی موجودگی میں۔ کیا نرسری میں کوئی ایشیڈنٹ موجود نہیں ہوتا۔“

زیور گل اب زور زور سے بول رہی تھی اور گروسے گزرتے اسٹاف کے لوگ اور دوسرے وزیٹرز ان کے گرو جمع ہونے لگے تھے۔

”ہو۔ ہوتے ہیں میڈم ابھی بھی سائمنڈ سسٹم اور ایس موبو تھیں۔ جب میں بچے کی کنڈیشن دیکھتا ہوں تو اسے ڈاکٹر کو بھی آپ خود چیل کر معلوم کر لیں۔“

نرس اچھی خاصی نموس ہو چکی تھی۔ زیور گل کے تیور اسے بوکھلائے دے رہے تھے۔

”میں اس ہاسپٹل کی اسٹنٹ سے اسٹنٹ بجاؤں گی۔ اگر میرے نواسے کا پتھریا نہ چلا۔ میں نے شہر کے اس بڑے ترین ہاسپٹل کا انتخاب اس لیے نہیں کیا تھا کہ ہمارے بچے کو مناسب طبی سولیات تو کیا سیکورٹی بھی نہیں مل سکتی۔ یہ تو سرکاری ہواخانوں سے بھی کیا گزرا ہے۔ دس منٹ میں اگر میرا بچہ مجھے نہ ملا تو میں پولیس کو کال کروں گی بیٹا جو جا کر اپنے بھوں کو۔“

وہ شخصے میں زور زور سے چلا رہی تھی۔ ایک حقیر سی نظر اس نے کاچی نرس پر ڈالی اور مڑ کر مین تارا کے کمرے میں آئی۔

میں تارا اور بچے کا اکٹھے ٹائپ ہونا اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجاتا تھا۔

”یہ شیطانی یقیناً سلطان بخت کی ہوگی وہ اب اپنا دامن بچانے کے لیے مین تارا اور اس کے بچے کا صفایا کرنا چاہے گا۔ لیوٹنل مائینڈ ایس تک سوچ سکتا ہے جو چیز اپنی عزت کے لیے خطرہ بن جائے اس کا نام نشان مڑاؤ۔“

وہ زور لب برہماتے ہوئے مین تارا کے کمرے کی تلاشی لے رہی تھی۔

اس نے بہت دھیان سے ایک بار پھر مین تارا کے ہینڈ بیگ اور گلوبال کو تلاش کرنا چاہا۔ دونوں چیزیں غائب تھیں۔ بیڈ کے پاس پڑے ہاسپٹل کے سلیپر ز اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ مین تارا اپنے سینڈل پہن کر گئی ہے۔

بیڈ کے دو سرے پر مین تارا کو تو بے ہوشی کی حالت میں ہاسپٹل میں لایا گیا تھا۔

”کیا مین تارا کو اغوا کرنے والے نے پہلے اسے سینڈل پہنائے ہوں گے۔“ امداری کا عمل جان بوجھ کر لینے کے لیے وہ دونوں بٹ تھام کر سوچنے لگی۔

”صرف یہ شو کرنے کے لیے کہ مین تارا اپنی مرضی سے گئی ہے۔ اس کے سینڈل غائب کیے گئے ہیں۔“ زیور گل نے خود کو ایک اور تھوٹی تھوٹی اور نہ اس کا دل تو پتھرا اور ہی کہ رہا تھا۔

کمرے سے باہر شور مچا رہا تھا آوازوں کا بھی اور بھانگے ہوئے قدموں کا بھی۔ زیور گل نے ایک آخری نظر کمرے پر ڈالی اور اپنا ہینڈ بیگ سنبھال کر باہر نکل آئی۔

”آپ کی بیٹی اپنے روم میں ہے میڈم ڈاکٹر ٹورین پریشان صورت لیے اسے کارڈیو روم میں لے گئی تھی۔“

”بچے کا پتھرا چلا۔؟“ زیور گل اس کا سوال نظر انداز کر کے تڑپتی سے بولی۔

”نہیں۔ عجیب بات بہت عجیب بات ہوئی ہے۔ ہمارے ہاسپٹل میں آج تک ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہم خود سخت پریشان ہیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”ڈاکٹر ٹورین! غور سے سنیے“ اگر میرے نواسے یا میری بیٹی کو کچھ ہوا تو یاد رکھیے میں اس ہاسپٹل کی بلڈنگ کو اس کے مالکان سمیت ہلا کر رکھ دوں گی۔ میری بیٹی نہ تو لاوارث ہے نہ کسی نٹ پونجی کی اولاد جو آپ کی اس لاپرواہی اور غیر ذمہ دارانہ حرکت کی نذر ہو جائے اور آپ پر کوئی حرف بھی نہ آسکے۔ یہ بات ذہن سے نکال دیجئے۔“

میں ابھی آئی ہوں اور میرے آنے تک بچے کا پتا چل جاتا چاہے اور نہ یہ کسی کے حق میں بھی اچھا نہیں ہوگا۔“

زیور گل جس تختے سے بول رہی تھی ڈاکٹر ٹورین کا رنگ زرد ہو گیا۔ زیور گل نے ایک تحقیق بھری نظر اس پر ڈالی اور پھر پتلی بنا کر نکل گئی۔

وہ اپنا ٹھک کی تصویر کرنا چاہ رہی تھی اس لیے فوراً سے پیشتر لکھ جانا چاہ رہی تھی۔

”میں تارا بہت جلد باز ہے۔ جذباتی اور احمق۔“ وہ پاپلوں کی طرح اندھا دھند گاڑی دوڑاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”گھر جانے سے بہتر ہے میں یہیں معلوم کروں۔“ وہ سنگلز توڑتے ہوئے ٹریفک مار جنٹ کے پیچھا کرنے پر ایک چھوٹی سی ذیلی سڑک پر مڑ گئی تھی۔ گاڑی سائیڈ روک کر اس نے گھر کا نمبر ملایا۔

”شرف۔ مین تارا ابھی گھر آئی تھی کیا؟“ ملازم کی آواز سنتے ہی وہ زور سے بولی۔

”جی! وہ شاید اس کی تیز آواز یہ گھبرا گیا تھا ٹھیک سے سن نہ پایا۔“

”جی کے بچے حرام خور! میں سیکواس کر رہی ہوں۔ پھوٹی بی بی ابھی کچھ ویر پمے گھر آئی تھی؟“ وہ اتنے زور سے چیخی کہ اشرف کو لگا اس کے کان کا پرہ پھٹ جائے گا۔

”جی جی آئی تھیں۔“

دوسری طرف اشرف جو کچھ بتا رہا تھا اسے سن کر اس کا شک یقین بن چکا تھا وہ موبائل آف کر کے تیزی سے گاڑی میں بیٹھی اور گاڑی ریورس کرتے ہوئے واپس موبائل لگی۔

اداس شام رات لگے دامن میں منہ چھپا رہی تھی جب عبد الصبیب اپنے تھکے ہارے وجود کو بمشکل گھسیٹتے ہوئے اوپر آیا تھا۔ صحن میں تھوٹی روٹیوں پر اب کوئی نہیں بیٹھا تھا۔ بد وقت سب کی منحوس زور روشنی میں ہر طرف ویرانی آوازی اور وقت کے سائے منڈلاتے محسوس ہو رہے تھے جیسے وہ اس گھر کی پچی پچی خوشیوں کو تلاش رہے ہیں۔

وہ سر جھکا کر تخت پر ہی بیٹھ گیا۔

اس نے کچھ یہ تصور بھی نہیں ہو چکا تھا کہ وہ اپنے گھر میں ہو گا اور صوفی صاحب نہیں ہوں گے۔ ایسا خیال اسے صوفی صاحب کے شہسوار کے دنوں میں بھی نہیں گزرا۔ کل سے سب کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے ہو جانے کے باوجود صوفی صاحب کو خود اپنے ہاتھوں سے گھر میں اتار دینے کے باوجود اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ہر لمحے یہ گمان سا گارتا کہ ابھی اس شخص سے گھر کے کسی کو نے سے صوفی صاحب اپنی بھاری آواز میں کسکھارتے ناراض نظروں سے گھورتے نکل آئیں گے اور پھر اسے جی بھر کر کہیں گے برا بھلا کہیں گے۔

”کو میں جی بھر کر تاربا نہیں ہوں مجھے کبھی معاف نہ کریں گھریوں ہوش کے لیے منہ چھپا کر مٹی اور نہ کر تو نہ ہو نہیں۔ بابا صاحب! میری سزا نہ دس مجھے بابا صاحب بلینے۔“ گواہی نے گریہ ان پر جھکا ہونے لگا۔

آمنہ اور جویریہ صوفی صاحب کے کمرے میں دو تین خواتین کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ تینوں خواتین چند منٹوں پہلے گھر آئی تھیں۔

عبد الصبیب نے سر اٹھا کر کمرے کی دلہیز بر لٹی بی بی سی او اس صورتوں والی دونوں بہنوں کو دیکھا بالکل خالی تھی دامن نے آسمانی۔ اس کا کچھ متہ کو آنے لگا۔ بی بی چاہا دوڑ کر بھانے اور دونوں کو اپنے اندر نہیں سمولے ساری دنیا کے دکھوں سے کہیں دور چھپا لے۔

”بھوئی! آمنہ ادھر آؤ۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ آمنہ سر جھکا کر اپنے پیروں کو تھکتے لگی۔ جویریہ عبد الصبیب کو دیکھتے ہوئے بے اختیار رونے لگی اور پھر بے قابو سی ہو کر روتی ہوئی آگے بڑھی اور عبد الصبیب کے زانو پر سر رکھ کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

”بھائی! بابا صاحب چلے گئے ہمیں چھوڑ کر میں اکیلا بابا صاحب۔“

وہ ہچکیوں کے درمیان تڑپ کر کہنے لگی۔ عبد الصبیب اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا خود بھی رو رہا تھا۔ آمنہ کی آنکھوں سے بے آواز آنسو ٹپ ٹپ اس کے قدموں میں گر رہے تھے۔

”جو وصلہ ہوئی۔ میری سخی! مین۔ تم نے اس چھوٹی سی عمر میں کتنے بے شمار غم دیکھے لیے ہیں۔ زیست کو

755

”اوصی دنیا اپنا منہ کالا کرے کہ تو میں کو جو جائے یا آگ سے خود کو جلا ڈالے۔ لازم ہے ہم بھی وہی کریں اور“
 وہ سچ کر بولی۔

”مسٹر مولیٰ! گناہ بیٹہ گناہ ہے گا اور نیکی بیٹہ نیکی۔ زمانہ بدلنے سے ان کے پیمانے نہیں بدل سکتے اور اس معاملے میں انسان کو دو سروں کی پسند و ناپسند کے بجائے اسے ذاتی نفع و نقصان کو نظر رکھنا چاہیے۔“

وہ اسے ان ہی بیگانہ نظروں سے تنک رہی تھی۔ ”اور تمہیں شاید یاد نہیں کہ ہمارے باپ نے ہماری تربیت اس طرح نہیں کی کہ ہم اس دنیا کے نفع کی خاطر آخرت کا گھانا کھا لیں۔ تمہارے نظریات تمہارے ذاتی ہیں، وہ تمہیں زمانے بھر کا نفع پہنچا رہے ہیں سو تم جو جی چاہے کہہ سکتے ہو۔“ وہ پہنچا چہا کر کہہ رہی تھی۔

”ابھی کچھ کتابا باقی ہے یا سب کچھ چکیں۔“ عبدالعزیز نے کچھ جمل کر بولا۔ ”مہر جلال اس وقت اس مہمان سے کچھ حاصل نہیں، تم لوگ کل صبح جلدی تیار ہو جانا۔ ہم صبح چل پڑیں گے۔“ وہ گویا اپنی بات ختم کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

”نفل تو جانیں گے مگر تمہارے ساتھ نہیں۔“ آمنہ دو ٹوک انداز میں بولی۔

”ہم کہاں جاتے ہیں یہاں ٹھکانا کرتے ہیں اس سے تمہیں کچھ غرض نہیں ہونا چاہیے جیسے کل صبح سے پہلے تنک تمہیں ہم سے کچھ غرض نہیں تھی کہ ہم جی رہے ہیں یا مر رہے ہیں بالکل اسی طرح۔“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“
 ”اب تو ٹھیک ہوا ہے تمہاری خدمات سے ہمارے باپ نے آخری دم تک فیض نہ اٹھایا اپنے اصولوں کی خاطر اور تمہارا خیال ہے ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی ہم ان کے اصولوں کو دھس دیتے ہوتے ہوتے تمہارے ساتھ چل پڑیں۔“

”میرا دل بڑا بڑا ہے کچھ بڑا دل نظروں سے جو ریبہ کی طرف دکھتا۔“
 ”ابھی یہی مناسب ہے ہم اور کہاں جاؤ گے۔“ جو ریبہ دھیمی آواز میں بولی۔

”تم تو سدا سے اس نفس سے لگنا چاہتی تھی۔ سو تمہیں اللہ نے موقع دیا تم چلی جاؤ میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ کو بھروسہ کرنا چاہیے اور جو ریبہ حیرت سے بولی۔“
 ”اب ہم سب بالغ ہیں اور بوجھور نہیں۔ اسے بارے میں ہمیں جو فیصلہ درست اور بہتر نظر آتا ہے وہ کرنے میں حق بجانب ہیں جو ہمیں بہتر نظر آئے وہ ہم کو جو مجھے مناسب لگے گا میں کروں گی اور مجھے یقین ہے ہمیں کوئی نقصان نہیں ہو سکتا۔“ وہ ایک تکیہ جتا جاتی ہوئی نظر عبدالعزیز پر ڈالتے ہوئے اندر کمرے میں چلی جی بوجھت پر سر تھام کر بیٹھ گیا تھا۔

”شکر ہے تمہیں بھی فرصت ملی ہم غریبوں سے ملنے کی ورنہ میں تو تم سے باقاعدہ پائٹیشن لینے کی سوچ رہا تھا۔“ کاؤچ میں بیٹھتی ہی شہباز خان نے معاذ کی طرف دیکھ کر طنز سے کہا۔

”یہ مسٹر ذہانت کا جال بھی آپ نے میرے گرد بنا ہے۔“
 ”اور وہ کھو تمہاری اس معصوم خواہش کے ساتھ بطور بونس اللہ میاں نے تمہیں زمین سے آسمان پہنچا دیا۔“

”کیا لگ رہا ہے؟“
 ”اچھا بھی اور کچھ بے یقین سا بھی۔“ وہ رک کر بولا۔

”بے یقین کیوں؟“
 ”ہاں، ماما دو دنوں اتنے اچھے ہیں کہ مجھے پلے ایک دو روز تو ان کی اتنی محبتیں کو دیکھ کر عجیب سی بے چینی ہونے لگی بہت مشکل لگ رہا تھا یوں ایک دم سے وہ اتنی بگ بگوں کو اسے قریبی رشتوں کی جگہ دیکھنا میں سانسبان بھی گیا۔“

زہریلا کرنے کے لیے ایک ہستی کا غم ہی بہت ہے۔ اس پر مفلسی کا عذاب اور یہ دائمی جدائیوں کے پھاؤ کس کس غم کو روو گی۔ صبر کرو، موصول کرو اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں۔“

”صبر۔ صبر۔ بھائی! تم صبر؟“ وہ ہراٹھا کر مسخ آنکھوں کے ساتھ پلائی۔

”اتنے غم اتنے صدمے ان پر صبر نہیں ہو سکتا۔ صرف بھجوتہ ہو سکتا ہے۔ زندہ رہتے کا ہر جان یہ سمجھوتہ ہے مجبوری ہے پر صبر نہیں، صبر نہیں۔ یہ دکھوں کے پھاؤ جو ہم پر اس آدھی زندگی میں ٹوٹے ہیں باقی آدھی زندگی میں خوشیوں کے اتار بھی مل جائیں تو بھی ہمارے سینوں سے ان پھاؤں کو نہ سرکا سکیں گے پھر صبر کیسا۔“ بہت دنوں بعد اس نے اپنے اندر کی بھڑاس نکالی تھی۔

”صبر کہو۔ بھجوتہ یا مجبوری زندہ رہنے کے لیے کرنا ہی پڑے گا۔“ عبدالعزیز سختی سانس بھر کر بولا۔
 اسی وقت میزٹیوں سے در سے کالز کا اوپر آیا۔

”آپ کو نیچے امام صاحب بلا رہے ہیں۔“ وہ فراسا سر اندر کر کے اطلاعی انداز میں بولا تو عبدالعزیز اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں ابھی آتا ہوں۔“ کہہ کر میزٹیوں اتر گیا۔
 ”دیکھ تو تھی آپ کا ایسا ہے کہ اس زخم کو بھرتے بھرتے بھی زمانے لگیں گے پھر بھی میرے اٹھانے کے لیے اللہ تعالیٰ آپ، من بھائیوں کو صبر جمیل عطا کرے اور صوفی صاحب جیسے نیک، برگزیدہ شخص کو آخرت کا سکون۔“ امام صاحب کہہ رہے تھے۔

”آگرتہ یہ بات کرنے کا ابھی موقع تو نہیں ملے گا۔“ امام صاحب نے صوفی صاحب سے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کل شام تک گھر خالی کریں گے۔ اصل میں میرا گاؤں ادھر سے بہت دور ہے، دو گاؤں بدل کر جانا پڑتا ہے۔ اس میں بھی چھ سات گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ ادھر گاؤں میں میری بیوی دو بچھوٹے بچوں کے ساتھ اٹھ چکی ہے۔ میرے بچے دونوں بیمار ہیں۔ کل شام کو میری بیوی اپنے بھائی کے ساتھ وہاں سے چل پڑے گی۔ میرا اس سے ایسا کوئی برا بھلا بھی نہیں کہ میں اسے منع کروں کہ چاروں اور کالے اور شمشیر کا کوئی واقعہ کار نہیں کہ بیوی بچوں کو ادھر بٹھراؤں۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا۔“

”مواؤی صاحب، بھجک بھجک کر اپنا مدعا بیان کر رہے تھے۔“
 ”جی سمجھ رہا ہوں۔ سمجھ گیا ہوں۔“ وہ گرا سانس لے کر بولا۔ ”کچھ فکر نہیں کریں میں کل شام سے پہلے آپ کو گھر خالی کروں گا۔“

”تو آپ لوگ۔“
 ”بہت شکر ہے بہت مہربانی ہے! آپ کو اس کڑے وقت میں ایسی بات نہ کہتا مجبوری۔“

”کوئی بات نہیں۔ گھر پھر بھی خالی کرنا ہی تھا۔ دو چار دن بعد سہی نکل سکی۔“

”تمہارے لیے کیا سچو کی پریشانی تھی اور جو ریبہ تخت پر۔“
 ”کل شام سے پہلے امام صاحب کو گھر خالی چاہیے، تم دونوں اپنا ضروری سامان ایک ایک رکھ لو باقی ادھر ہی رہنے دو۔ ہم کل وہی سرتک ادھر سے نکل جائیں گے۔“ عبدالعزیز سخت بیٹھتے ہوئے بولا۔

”تو تمہیں جانیوں کے کہاں؟“ جو لے کے سوراخوں میں سے نکلنے کے لیے قیل ڈالتی آمنہ بولی۔
 ”میرے گھر اور کہاں۔“ عبدالعزیز بولا۔

”تمہارا گھر۔“ فوج گانے کی حرام کمائی سے بنا گھر جس پر میرے باپ نے کبھی تھوکتا گوارا نہیں کیا۔ مفلسی میں آخری سانسیں بتا رہی۔ ”آمنہ سرو جیسے میں بولی۔“

”وہ میرا ذاتی گھر نہیں گرا ہے۔“ عبدالعزیز چند لمحوں بعد جمل سے بولا۔
 ”انگرا یہ بھی تو اسی کمائی سے دیتے ہوتا۔“ بہت ہی کمائی سے۔ ”وہ استہرا یہ انداز میں بولی۔“
 ”آج کل آدھی دنیا کی کہہ رہی ہے۔“

تھا اور اس سے آگے تک جہاں سے میری شناخت کا سفر شروع ہوتا ہے خود کو یقین دلانے کے لیے۔

”پھر آیا یقین؟“ وہ کچھ خفگی سے بولے۔

”وہ تو اتنا ہی تھا، بس دکھ ہوا تو اس بات کا کہ میری آمدگی کی جہیز میں کسی کے انتقامی جذبے سے جانتی ہیں۔ جتنا جس کے بچے کے ساتھ اتنا بد نما سلوک کیا مانا نے کہ مجھے یقین نہیں آتا ان کی سویت ٹیچر دیکھ کر لیکن نہیں۔“ وہ خود ہی لٹی میں سر ہلا کر بولا۔

”ماما کی سویت ٹیچر کو دیکھ کر کوئی بندہ ایسا سوچ نہیں سکتا کہ انہوں نے جتنا اس کے ساتھ یہ کیا ہو گا لیکن اس روز ان کی گاڑی کے آگے آجانے پر جس حقارت بھرے انداز میں انہوں نے مجھے جھڑکا تھا، مانا نے یقیناً جتنا غریب کے ساتھ ایسا ہی کیا ہو گا۔“ وہ خود ہی مسکرایا تھا۔

”تمہیں جھڑکا تھا؟ کب؟“ شہباز خان حیرت سے بولے تو معاذ انہیں بتانے لگا کہ کس طرح وہ اس دن اپنے خیالوں میں کم جا رہا تھا اور ان کی گاڑی کا ہارن نہیں سن پایا تھا۔

”اسٹائل میری جان تو میں کلاس اسٹائل۔ آہستہ آہستہ تمہیں بھی یہی اسٹائل آجانے کا سب کچھ ایک اشارہ اور بر مل جانے ہو جائے، گر گزرتے کا اسٹائل۔“ شہباز خان ہنسے۔

”مجھے کم از کم ایسی بدیہی تو دے دیں، میں نے زندگی گلیوں میں گزارنی ہے بلکہ یتیم خانے کے بچے قرض پر خدانہ کرے، میں ان دنوں کی رنج و یادوں کو بھی بھلا سکوں۔ آپ برسوں ماما کی گریڈ پرائی میں آگئے ہیں، ہاں انہوں نے میرے اعزاز میں بلکہ مجھے اپنی کلاس میں متعارف کرانے کے لیے ارہنچی ہے۔ معاذ کو یاد آیا تو پوچھ بیٹھا۔

”بھئی پور ڈوا کلاس کا تو دعوت نامہ ملنا ہی پورے اعزاز کی بات ہے، کیا اس میں شرکت کرنے سے انکار کرنا ایسا گستاخ سمجھ رکھتا ہے مجھے۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولے۔

”آپ کے طرز کچھ بڑھتے نہیں جا رہے؟“ معاذ انہیں گھور کر بولا۔

”بھئی، جناب کا رتبہ بھی تو بڑھ گیا ہے۔ مجھے اپنا سر عزیز ہے گردن۔“ وہ ہنسنے سے بات کھیل گیا۔

”کوئی آپ پہلے والے معاذ ٹھوڑی ہیں۔“

”شہباز بھائی، ایک بات بتائیں۔“

”پوچھو۔“

”آج کل آپ اتنے خوش کیوں ہیں؟“

”اس لیے کہ مطمئن ہوں۔“

”اور اس اطمینان کی وجہ؟“

”تمہیں تمہاری منزل تک پہنچانے کی خوشی، ام جان سے ملنے کی خوشی، ارتضیٰ کا ساتھ۔ بتاؤ میں یہ کیا خوش نہیں ہوں گا۔“

”ایک اہم ساتھ کو آپ بھول رہے ہیں۔“

”ایسا مطلب؟“ وہ کچھ چونکے۔

”میری بیٹی تانہوں۔“ گاڑی اب ایک نسبتاً کم آباد مرکز کی طرف مڑی تھی۔

”تم جا کہاں رہتے ہو؟“

”آپ کو منزل تک پہنچانے کی ضروری ہے کہ آپ مجھے ہی مقروض کرتے جائیں۔ کچھ قرض تو مجھے بھی چھیننا پڑے۔“

”مطلب؟“ گاڑی اب ایک گیٹ کے آگے کھڑی کی کہ دونوں باہر نکل آئے تھے۔

گیٹ کھولنے کوئی ملازم آیا تھا جو معاذ کی شکل دیکھ کر انہیں اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ وہ انہیں ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

”میرے کس کا گھر ہے؟“ شہباز نے ڈرائنگ روم کی سجاوٹ کا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔

”ارتضیٰ کے کلاس فیلو فمدا کا۔“

”اچھا۔ ہاں ارتضیٰ اکثر ذکر کرتا ہے مگر ہم یہاں کیوں آئے ہیں، وہ بھی ارتضیٰ کے بغیر۔“ ابھی وہ کہہ ہی رہے تھے کہ ڈارک ہراؤن پلین سوٹ میں نہایت اندر داخل ہوئی۔ نہایت کو دیکھ کر جہاں شہباز خان کے الفاظ منہ میں رہ گئے، وہیں نہایت کے قدم جیسے زمین میں پیوست ہو کر رہ گئے۔ نگاہوں کے بے اختیار تصادم کا انتقام کچھ غصے اور بیزاری کی شکل میں ہوا تھا۔

”نہایت تم۔“ شہباز خان نے ایک گہرا سانس لے کر کمرے میں چھائے سکوت کو توڑا تھا۔

”معاذ! تم یہ بہت غلط کر رہے ہو میرے ساتھ بہت غلط۔“ وہ نیچی آواز میں غصے سے بولی۔

”پلیز نہ بہت آئی! مجھے غلط مت سمجھیں، آپ دونوں ایک بار بیٹھ کر اطمینان سے ٹھنڈے دل سے ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سن لیں اس طرح۔“

”بس بہت کر سن چکی۔ اب مزید کی کنجائش نہیں۔ میں ان کے لیے اور یہ میرے لیے مرچے اور گڑے مرے باہر لیا کھا ڈو تو بھی کچھ ہاتھ نہیں آتا، سوائے اپنے ہاتھ میلے کرنے کے۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”جینے کی ضرورت اگر ایسی اذیت ناک ہو جیسی ہم پر بہت رہی ہے تو سوچو مرے کی تکلیف کس درجے زیادہ ہوگی۔ ہم دن میں دس بار کھانے آجینوں سے نجات پانے کے لیے مرے کی تمنا کرتے ہیں جو کچھ مرنا پڑ جائے تو کیا تم ایک بار بھی مہلت نہ مانو گی زندگی سے پھیل کچھ دن کچھ مجھے اور جینے کے لیے۔“ شہباز خان اس کے پیچھے آ کر بولے تھے۔

”نہیں بالکل نہیں۔ میں تو کب سے اپنی خوش نصیب لہجوں کی منتظر ہوں۔ جب موت مجھے اس تکلیف دہ زندگی سے نجات دلانے آئے گی۔“

”زندگی کی تمہیں خوش احساس دلا رہی ہیں تاکہ تم زندہ ہو۔ کبھی سوچا تم نے کہ ہماری زندگی اتنی تکلیف دہ لگتی ہے، اس لیے؟“

”بہت غصہ ہوا۔ میں نے اس پر سوچنا شروع کر دیا ہے اور نہ مجھے سوچنے کی ضرورت ہے اور پلیز، آپ لوگ میرا پیچھا چھوڑیں، ورنہ۔“

”پورنہ کیا ایک بار پھر مرے کا چھوٹا بھائی رچاؤ کی۔“ وہ بے اختیار بولے تو نہایت نے ایک کٹھلی نگاہ ان پر ڈالی۔

”میری تو پوری زندگی ایک ڈھنگ سے رچانے کی کیا ضرورت۔“ وہ کہہ کر رکی نہیں اور دوڑتے قدموں سے باہر نکل گئی۔

”یہ کیا کیا کب نے؟“ معاذ نے انہیں اس غلط جملے کا احساس دلایا جو ان کی زبان سے پھسلا تھا۔

”مذہ سے نکل گیا۔“ وہ حققت بھرے انداز میں سر ہلا کر بولے۔

”کس خوشی میں بھلا؟“ معاذ نے پوچھا۔

”نہایت کو زندہ سلامت اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر۔“ وہ اقرار کرتے ہوئے بولے۔

”تو یہ معاملہ ہے۔ گویا اب میرے واسطے کی ضرورت تو نہیں رہی۔ آپ خود ہی روٹھے یا رگو منانے کے بچھن کر لیں گے۔“ وہ سکون بھر اسانس لے کر بولا۔

”خاطر ہے کہ تو پڑیس کے مگر تمہارے واسطے کی بھی ضرورت ہے ورنہ یہ محترمہ پھر کہیں روپوش ہو جائیں گی۔ حالانکہ حالات سے فرار کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہوتا، پانچ سال میں نے بھی روپوش نہ کر دیکھا لیا کہ اس سے خود اذیتی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔“

”کیا آپ نہایت آئی کو منائیں گے؟“

”اسے ماننا پڑے گا جیسے میں نے خود کو منایا ہے، ارتضیٰ کی خاطر۔ ایک بار قدم غلط رستے پر اٹھ جائیں تو پلٹنا

بہت مشکل ہونا ہے مگر بیٹے کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہوتا۔ بس سنی مجھ سے۔ وہ مسکراتے ہوئے چلو چلتے ہیں۔ انہوں نے قدم باہری طرف بڑھائے۔

اسی وقت ایک پنڈت سم ورا زقند نوجوان پولیس کی یونیفارم میں انہیں کارڈور سے اندر جاتا دکھائی دیا۔ اس نے ان دونوں کو نہیں دیکھا۔ دونوں بندھے کھڑے رہے پھر اس سوائے سوچ کو لے کر باہر آگئے۔

”میں نے اس سے پہلے تو اس نوجوان کو ادھر نہیں دیکھا۔“ معاذ گاڑی اشارت کرتے ہوئے کہہ رہا تھا اور کن اکھیوں سے شہناز خان کے بے تاثر چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے جواباً ”کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اور کمرے کی کھڑکی کے آگے کھڑی اشک بھائی نہ بہت سوچ رہی تھی اسے آج کل میں نماں سے کہیں دور چلے جانا چاہیے۔ یہ شخص جو اب بہت اچھا بن کر آیا ہے جیسے ہی مجھے شمالی میں ملے گا پھر انہیں شرمناک الزامات کو پھرانے کا پتہ ہو ہی سوال ہو ہی جو اب تو وہی بے یقینی ہوئی بدگمانی، نفرت، اضطراب۔ کیا اسی دن کے انتظار میں یہ دوسری بے نام زندگی جی رہی تھی۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ مجھے دوسری بار اس شخص کا سامنا نہیں کرنا جس کے الو ڈنڈے سے پیچھا چھڑانے میں مجھے زمانے لگے ہیں۔ اب بھی یہی کجیوں کی یہ ملاقاتیں۔ ساتھ ہی ایک الٹا سنی تھا ایک دہمہ ایک خواب اور بس۔ مجھے اب یہاں نہیں رہنا بالکل نہیں۔ وہ زار و قطار دوتے ہوئے دل میں منہمک ارادے پاندھ رہی تھی۔



”تم نے اپنا ضروری سامان بیک کر لیا ہو تو چلیں؟“

”جی ہاں۔ مجھے کے قریب عبد العین نے کمرے میں جھانک کر آمنہ اور جویریہ سے کہا جو اپنی اپنی سوچوں میں گم ہو چکی تھیں۔ جویریہ نے عبد العین کی تواڑ پر ایک نظر کچھ فاصلے پر رہنے کی اپنی سب سے گود دیکھا اور دوسری ڈری ڈری سی نظر آمنہ کے بے تاثر چہرے پر پڑی تھی۔

”سامان تو بیک سے چند جوڑے کپڑے کچھ یادیں اور بس۔“ جویریہ نے اسے دیکھتے ہوئے اشارت کرتی ہوئی۔

”آمنہ بھی اس کے ساتھ ہی اٹھی تھی۔

”لیکن ہم تمہارے ساتھ نہیں جا رہے۔“ آمنہ سکون سے بولی۔ جویریہ کی طرح عبد العین بھی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

”تو کہاں جاؤ گی؟“

”کہیں بھی اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔ تم فکر نہیں کرو۔“ وہ اجنبیت کے آخری کنارے پہنچ چکی تھی۔

”آمنہ۔“ عبد العین غصے سے دانت بچھڑ کر بولا۔

”جویریہ! تم میرے ساتھ چلو گی یا اپنے اس عزت مآب سنگر بھائی کے ساتھ؟“

وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ جویریہ کی طرف پلٹ کر بولی۔

”آئی اور تم کہاں جاؤ گی؟“ وہ متذہب سی ہو کر بولی۔

”یوں کہو تم اس کے علاوہ اور کہیں جاتا ہی نہیں چاہتیں۔ اچھا تو پھر خدا حافظ۔“ وہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ جویریہ بوکھلا کر اس کے پیچھے چلی۔

”آئی۔ آئی۔ کہاں جاؤ گی؟“ وہ عقب سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”کی حالت کتنی ہی بی بی کی طرف۔ ویسے میں نے گرتا بائٹل میں بات کر رکھی ہے۔ کل ڈیو جمع کرا کے ادھر ہی جاؤ گی۔“

اس نے ایک شاپنگ بیگ میں شاید کپڑوں کا ایک جوڑا رکھا ہوا تھا۔ ”اور یہ رقم جو باہا صاحب نے میرے پاس امانتاً رکھوائی تھی۔ تم رکھ لو تمہارے بھائی کی حرام کی کمائی کے مقابلے میں یہ معمولی رقم تمہاری آئندہ زندگی میں بہت کام آسکتی ہے۔ اگر تم اسے یقین سے استعمال کر دو گی تو۔“ اس نے شاپنگ بیگ سے وہی خالی لفافہ نکال کر

جویریہ کو گھمایا جو اسے صوفی صاحب نے دیا تھا۔ عبد العین کا چہرہ آمنہ کی بات پر مسخ ہو گیا تھا۔

”آمنہ! تم حد سے بڑھ رہی ہو۔“ وہ اس کے پاس آکر بولا۔

”مجھے میری حدود کا علم ہے، تمہاری طرح لامحدود نہیں۔“ وہ ایک آخری نظر اڑتے ہوئے بوسیدہ دروازے پر ڈالتے ہوئے بولی۔ ایک گہرا سانس لیا اور میرے پیوں کی طرف بڑھ گئی۔

”آمنہ! دیکھو مجھے غلط نہیں سمجھو۔ اچھا تم کو کوئی نہیں وہی کہیں گا۔ گلوکاری پھونڈوں گا، مزوری کر لوں گا مگر تم یوں اکیلے نہ جاؤ۔ پلیز۔“ آمنہ کے تیرے تھانے پر عبد العین مت سہجت پر اتر آیا۔

”اچھا!“ وہ طنزیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اتنا نیک خیال تمہیں ماں باپ کی زندگی میں کیوں نہ ہو جھٹاؤ کیا یہ شوق شخص ان بد نصیبوں کے دل جھلانے کے لیے اپنا پاپا تھا اور اب ان سے چھٹکارا پانے کی خوشی میں اس سے امتیاز اٹھارے ہو۔“

وہ بدگمانی سے کہہ رہی تھی اور عبد العین بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی آمنہ ہے جس کی عقل مندی، عقل مزاجی اور برواقت پر اسے سب سے بڑھ کر ٹھہرا تھا۔

”پچھلے تم مجھ سے ناراض ہو۔ اب تم میرے گھر چل کر وہاں کاپالی نہ چکھنا۔ یہ باہا صاحب کے پیسوں سے چند دن کیلانی لینا۔ میں تمہیں الگ جگہ لے دوں گا اور تمہیں جا بے دلا دوں گا۔“

”آمنہ! آمنہ! روکو! یہ حماقت نہیں کرو۔ سنو تو۔“ عبد العین اس کے پیچھے دیوانہ وار دوڑا تھا۔

جویریہ اس کے پیچھے تھی اور ان دونوں کے پیچھے تھکنے تک وہ تیز رفتاری سے چلی عبور کر کے کٹھنوں کی آخری سرے پر بنے گھر کے کھلے دروازے میں آکر داخل ہو رہی تھی۔ اس نے ایک آخری اٹھنی نظر خود کو پکارتے عبد العین پر ڈالی اور گھر کا دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی اور اب اس کے پیچھے جاننا مٹلے والوں کے لیے ایک نئے

تمنا کے ساتھ کرنے کے مترادف تھا۔

”بھائی! یہ ٹھیک نہیں ہوا۔ مجھے یہ عورت اچھی نہیں لگتی۔ پتا نہیں باہا صاحب اس پر کیسے ایشیا کر بیٹھے تھے اور اب چلے۔“ جویریہ اس کے پیچھے کھڑی ہو رہی تھی۔

”ہم اب کیا کر سکتے ہیں جوئی! جو خود دیکھنا چاہے اسے کوئی نہیں بچا سکتا سوائے اللہ کے۔ تم چلو آؤ میرے ساتھ۔“ وہ اپنی لینے اور چلا گیا۔

”وس منٹ بعد ان کی گاڑی ان کیوں سے باہر نکل رہی تھی جن میں وہ اپنے سارے پیاروں کو کھو آئے تھے۔“

سید سلطان بخت زمینوں سے آئے تو سید عیال کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ ان کا فک و دست تھا۔ اندر سیدو آ کر انہیں اور صالحہ کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔ سلطان بخت، امن کا حال چال پوچھ کر صوفے پر بیٹھ گئے اور اہستہ اہستہ اپنا پایاں باروہ بانے لگے۔

”خیر تو ہے سلطان بخت طبیعت تو اچھی ہے تاہم“ سیدو تو بھائی کے چہرے کی ایک ایک لکیر پڑھ لیا کرتی تھیں۔

”ٹھیک ہوں آپا! بس جھکن سی ہو گئی ہے۔“

”تو کیا ضرورت ہے بختے میں وہ دو بار زمینوں کا دور کرنے کی۔ سارے ملازم حرام خور مرگے ہیں کیا“ وہ اپنے مخصوص لہجے میں تیزی سے بولیں۔

”آپا! مالک سر پر نہ ہوں تو مزار عیال کو کیا پڑی ہے؟ وہیمان سے کام کریں۔ اب میں نہیں دیکھوں گا تو اور کون دیکھے گا۔“

”صالح! خیال رکھا کرو اس کا۔ دیکھو تو کس قدر کمزور ہو رہا ہے۔ آنکھوں کے گرد بھی حلقے پڑے ہیں۔ خدا نخواستہ کون سی ٹھہریں پال رہی ہیں تمہارے۔“ سیدو پر تشریح لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

”یہ خیر سے اپنا خیال خود دیکھنے کو کال ہیں بھائی! بیہم! مجھے میری فکر کو کیا بچتے ہیں۔“

صالحہ نے استثنائی سے بولیں تو سلطان بخت نے ایک دکھ بھری نظر اس کے بے مہر چہرے پر ڈالی۔ اس وقت ان کے موبائل کی بیل بج اٹھی۔ اسکرین پر نظر ڈالتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور گمرے کے دو سرے کوٹے میں جا کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔
"اس کلومیٹی طوائف زادی کے عشق کا بھوت اس کے سر سے اترا نہیں ابھی۔" سیدہ جیلے کئے انداز میں

بولیں۔
صالحہ تنفر بھرے لہجے میں بولیں تو صالحہ کا چہرہ جھٹکتے سیدہ کی نظروں کے سامنے انجانے میں ہی برسوں پہلے اسلام آباد کی کوٹھی کا وہ ماسٹر پیڈروم ٹھوم گیا، جہاں انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے سلطان بخت کے عشق کا ایک اور بھوت ملاحظہ کیا تھا۔

صالحہ کی بات پر سیدہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئیں۔
سلطان بخت موبائل تک کر کے چہرے صوفے پر آئیٹھے سان کے چہرے سے سیدہ کو شش کے باوجود کچھ بھی نہ جان پائیں۔

"جو اوکی بیوی کیسی ہے؟" معنی خیز خاموشی کو سلطان بخت نے ہی توڑا۔
"مجھی ہے۔" سیدہ نے ہنس مہم سا جواب دیا۔

"آپ نے مت جلدی کی ہوا کی شادی کرنے میں۔" سلطان بخت سرسری لہجے میں بولے۔
"شادی لڑکی کی ہو یا لڑکے کی وقت پر ہو جائے تو اچھی رہتی ہے ورنہ سو سو سال تک جہنم لے لیتے ہیں جیسے۔"
تم دونوں کی کہتے کہتے ان کی زبان رگ اٹھی۔ صالحہ نے ایک تیز نظر بھرا ڈالی۔ سیدہ شرمندہ سی ہو گئیں۔

"خیر سے دو سرے ہی سے ہے جو اوکی بیوی۔ اللہ اسے جتنا دے جس نے یہی سوچ رکھا ہے اسے لا کر تمہاری بھولی میں ڈال دیا۔" میں نے تو کہا تھا ایک بار اور کوشش کر لیتے مگر تم دونوں تو۔"

"مگر ایک طوق اور گنگے میں ڈال لیتا۔" سلطان بخت غصے سے بولے۔
"اور یہ ہوا کے بچے کی خوشی اپنے تک اسی رحیم ہانگے کی خوشی ہے۔ کسی کو اس کا کیا پتہ ہے؟"

زیرِ لب دو سروں کی خوشیاں فوج کران و پران و رو پوار پر پا کھٹنا چاہتی ہیں۔ اس حویلی کی قسمت میں وارث بننے ہی نہیں۔ آخر آپ اس حقیقت کو تسلیم کیوں نہیں کرتے ہیں۔" سلطان بخت ہست ہستوں کا وہ باغضہ نکال رہے تھے۔
"تم ہاؤس ہو سکتے ہو۔ میں نہیں میں ابھی بھی اللہ کے گھر سے کچھ پامائید ہوں۔ اس حویلی کو وارث ضرور ملے گا۔ یہ حویلی و پران نہیں ہے اور نہ رہے گی۔ تم کھنا میرا اللہ ایک دن ضرور کھائی دے گا۔"
سیدہ نہ جلنے کس لہجے میں تھیں۔ پر ہوش آواز میں کے کہیں۔ صالحہ اور سلطان بخت نے سیدہ کے بوڑھے چہرے کو یوں دیکھا جیسے ان کا داغ چل گیا ہو۔

اسی وقت باہر نامانوس سا شور مچا تھا جو ان کے کمروں کی طرف بڑھتا محسوس ہو رہا تھا۔
"سید سلطان بخت کہاں ہو تم؟ کھو تم سے ملنے کون آیا ہے؟" آواز تھی کہ لگا کر سید سلطان بخت سمیت سیدہ اور صالحہ بھی اپنی جگہ اچھل کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ اور ہر اسماں نظروں سے سلطان بخت کے دھواں دھواں ہوتے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔

"ہمت اچھا کیا، بچی تم نے۔ ہمت اچھا نہیں تمہاری خالہ نہیں ماں ہوں۔ تمہاری ماں جیسی نیک پریہیزگار تو نہیں تمہاراں جیسی محبت ضرور تم سے کرتی ہوں۔ اسی محبت کی کشش ہے جو تم اپنے اس گلے بجانے والے بھائی کی دولت کو ٹھوکرا کر اس غریب ماں کی محبت پر بھروسہ کر کے چلی آئیں۔ جیتی رہو ہر خوشی یاد تم نے اوھر کر میرا مان بڑھایا ہے۔ میرے جیسے جس ٹھنڈے ڈال دی ہے۔"

کلثوم بی بی اسے سینے سے لگائے بھگی آنکھوں کے ساتھ کہنے جا رہی تھی۔ اس کی باتوں سے آمنہ کے دل میں رہے کے صوفے بھی ہوا ہو گئے وہ تو سوچ رہی تھی۔ پتا نہیں کلثوم خالہ یوں اکیلے اسے اوھر رہے بھی وہ۔

بھٹکر یہ خالہ! میں کل تک مگر لڑھاکہ میں اپنا انتظام کر لوں گی۔" وہ سیدھا ہوتے ہوئے آہستگی سے بولی۔
"نہ میری بچی! میری بیٹی! اللہ نے شاید اسی دن کے لیے مجھے کوئی بیٹی نہیں دی تھی کہ اس نے تیری شکل میں یہ رحمت میرے گھر میں اتارنا تھی۔ اگر میرا مان بڑھایا ہے تو اس پر بھروسہ بھی کرنا، ویسا بھروسہ جیسا صوفی صاحب نے آخری دم تک اس غریب بڑھیا پر کیا، رکھنا میں جیسے اس ماں پر پورا اترتی ہوں۔ اللہ صوفی صاحب کی مغفرت کرے۔ ہمت نیک، ہمت پرہیزگار انسان تھے۔ ہانے ان کے دم قدم سے تو اس محلے پر رحمت کے فرشتے نازل ہوتے تھے۔ ورنہ ہم جیسے گناہ گار تو اس دھرتی کا بوجھ ہیں۔ سو تو پھول کی طرح رہتے، خوشبو بن کر اس دھرتی کو معطر کرتے رہتے، کتنی دنیا ان کے علم سے فیض یاب ہوئی۔ علم کا سند رکھتے اور ہم جہالت کا دریا بے گناہے کنار۔"
کلثوم بی بی نے پچھ اس طرح صوفی صاحب کا ذکر پھیرا کہ آمنہ کا بھی دل بھر آیا۔

"کیسی تمنا تھی ان کے دل میں کہ دونوں بچیوں کو آج کے دن اپنے ہاتھوں سے رخصت کر دیں۔ موت نے انہیں اتنی صلت ہی نہ دی۔ برسوں ہی بات کرنے کو میری طرف آئے تھے۔ مہرہ کی ماں اور بھائی تینوں کو اسی لیے بلایا تھا کہ ان کے معاملے طے ہو گئے تھے۔ اچھے بھلے بنتے کھلتے ہم سے رخصت لے کر باہر نکلے کہ قضا نے دلہیز عبور کرنے کی طاقت نہ دی تھی۔ سو جتی ہوں تو کچھ بھٹے لگتا ہے کہ میرے گھر تو وہ اللہ کی رحمت بن کر آئے تھے۔ میرے تو قدم زمین پر نہیں ٹپک رہے تھے کہ مجھ ناچیز پر اتنا یاد بھروسہ کیا انہوں نے۔ دونوں بیٹیوں کے ہاتھ میرے کہنے پر دونوں لڑکوں کو دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ قدرت کو بھی میرا یہ مان نہ بھایا، بس ایک کاٹھا حق میں گزارا گیا ہے۔ وعدہ کیا تھا انہوں نے ایسا بھی نہ کر پائے۔ کلثوم بی بی کی چٹکوں پہ کولوں روئے گئی۔
"کلثوم خالہ! آمنہ نے چہرہ پونچھا اور صالحہ آواز میں بولی۔

"خالہ! صدقے میری وہی۔" وہ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر محبت سے بولی۔
"میں اپنے باپ صاحب کا قول نبھاؤں۔ آپ مجھے چند دن صرف سنبھلنے کا موقع دیں۔
"خیر سیدہ! میں بھگتا ہے کہ تمہاری بی بی کو لگا دو جہاں کی دولت کسی نے اس کے قدموں میں ڈھیر کر دی ہے۔"

"میں صدقے میں قربان اپنی بچی کے نیک والدین کی نیک اولاد ایسی ہی ہوتی ہے۔ بالکل ایسی میری بچی! تو نے میرا مان بڑھایا، میرے ڈولے دل کو صدمہ دیا۔ ورنہ میں تو برسوں سے مری بیٹی تھی۔ کہ اب میری زبان کا کیا بنے گا۔ کس منہ سے اس منہ بولازت کو جواب دوں گی۔ کیا کہوں گی صوفی صاحب! کیا گئے کلثوم بی بی بھولی پرانی۔ سات ہندوں میں زبان بولیں گی، کیسے بھولوں۔" وہ ایک بار پھر آمنہ کو گلے سے لگا کر رہنے لگی۔
"صوفی صاحب بی بی روح کو میرا قرار ملا ہو گا اپنی نیک بخت بچی کی بات سن کر اور جو برا خیال نہ کرو آمنہ! تو ان کی ہمت کو بڑھانے کے لیے مجھے تو یہی ایک رست نظر آتا ہے کہ مرے دم ان کے دل و داغ میں یہی بات تھی کہ آمنہ اور جو رہے، سو اگلے ہی دن اپنے گھروں کی کھول بیٹی اگر تم اجازت دو تو۔" وہ ہنک کر چپ ہو گئی۔
"بی بی کیسے۔"

"بیٹا! نیک کلہ جس کا ارادہ بنا دھا ہے کل بھی کرنا ہے۔ برسوں بھی اور چند دن بعد بھی۔ اگر صوفی صاحب کی روح کو سکون مل سکتا ہے وہ کب قائل تھے۔ سو تم چالیسویں کے تم تو انہیں سب سے زیادہ جانتی ہو۔ میری بات سمجھ سکتی ہو۔" کلثوم بی بی صوفی صاحب کا حوالہ دے کر اس کے گرد گھیرا لٹک کر رہی تھی۔
آمنہ چند لمحے چپ رہی۔

"ٹھیک ہے۔ آپ کل شام کو ان لوگوں کو بلا کر نکال پڑھا دیں۔ میں تیار ہوں۔" وہ مرتھکا کر بولی۔
"میری بچی! میری بچی! ایسی نیک بخت اولاد رب سب کو دے تو نے مجھے نئی زندگی دی ہے جیتی رہو سدا خوش رہو۔" وہ بھولی پھیلا پھیلا کر اسے دعا میں سینے لگی۔
وہ سر شام ہی سرور کی گول لے کر سوئی تھی۔ گول کھاتے ہی اس کا سر بھاری پتھر کی طرح ہو گیا تھا۔ چند

منٹوں میں وہ گہری نیند سوچتی تھی۔ اور اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ تینوں سرد عثمانی اس کی نام نہاد ماں اور بھائی کلتھومہلی بی کے گھر آئے تھے۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب ایک ڈراؤنے خواب نے آمنہ کو بھنجوڑ کر بگاڑ دیا تھا۔ اس کا شعور اسی خواب کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا تھا مگر وہ جیسے ابھی بھی سن تھا۔ نہ جسم میں حرکت پیدا ہو رہی تھی۔ اس نے ذرا سی آنکھیں کھول کر دیکھا اور پر لگی کھڑکی کو دیکھا۔ بونے تین بج رہے تھے۔

”دن کے یا رات۔“ اس نے بند کھڑکی کے پار دیکھنے کی کوشش کی، زبردیا اور سلب کی روشنی میں اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

”رات ہی ہوگی، جو ہر طرف سناٹا ہے۔“ اس نے وکتے سر کو دیا، وہ کلتھومہلی بی کی بیٹھک میں سوئی تھی۔ جس کا ایک دروازہ باہر کھلی میں کھلتا تھا اور اندر صحن میں۔

”اس کو کہتے ہیں۔ آپ اپنے نام میں صبا آلیا، بلکہ سونے کی چیز یا آگنی کیسا۔“ مردانہ آواز اور ایک زوردار قہقہہ۔ آمنہ کا ذہن ایک جھٹکے سے بیدار ہو رہا تھا۔

”کھو بھئی کلتھومہلی بی اب کے سب سے لفظی پر سنٹ نہیں مل سکتا۔ اس میں تمہاری کوئی محنت نہیں دکھائی خود چل کر آیا ہے۔“ اس کے کان دھوکا نہیں کھارے تھے۔ یہ آواز تیکم عثمانی کی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

”شکار صرف چل کر آیا تھا۔ اسے کل کے لیے تکان پر شیشے میں کس نے اتار دیا اور جو اس دن موا صوفی خود خراباں خراباں لٹوڑا تا دھرا کر ہماری باتیں نہ سن لیتا تو ساری محنت میں نہ ہی کسی ایک نہیں اور سونے کی چیزیاں پھانسی چکی تھی میں۔ اس پر مجھے نے سب کچھ سن لیا اور مجبوراً اس کا ٹیٹو اور پانا پڑا اور نہ تو میں اپنی ذہانت سے ساری بساط چھپا چکی تھی۔ تم لوگوں کو تو ذرا ہاتھ پیر نہیں ہلانے پڑے۔ میرا حصہ بلا مبالغہ ساٹھ ستر فیصد بنتا ہے۔

میں بتا رہی ہوں۔“ کلتھومہلی بی بائیں دار آواز میں کسی اور ہی دنیا کی باسی لگ رہی تھی۔

”ہستہ بولو کہتے۔ اور جاگ نہ جائے۔ اس دن بھی تم لوگوں کے اٹھانے کا کام خراب کیا تھا۔ اس پر مجھے نے سب کچھ سن لیا تھا۔“

”ارے جو کوئی میں نے اسے وہی ہے۔ کل وہ میرے پہلے نہیں اٹھے گی اور اس وقت تو سارا زمانہ خواب خروگوش کے مزے لے رہا ہے اچھا ہوتا ہے، بکو اس لاؤٹو با بیٹھو۔ کر لو جا کر کھٹو۔“

آمنہ نے بے حد آہستگی سے بیٹھک کے بیرونی دروازے کی چوٹی کھولی اور میں اپنا چہرہ اور وہ دروازہ اچھی طرح چھپاتے ہوئے اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور وہ پہلی سی چوٹی کے ساتھ کھل گیا۔

وہ تیزی سے باہر نکلی، کھلی میں گھب اندھرا تھا۔ کھلی کے آخری سرے پر کھبے میں ایک بلب لگا تھا۔ وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر اندھا دھند کھلی میں بھاگ نکلی۔

اسی وقت کھٹکے کی آواز سرد کے کانوں میں بڑی تھی۔

”لڑکی بھاگ گئی۔“ سے صاف سنائی دیا تھا۔ اس نے اپنی رفتار بڑھائی۔ لڑکی پھوٹی کھلی کے پتھر اس کے رستے میں آ رہے تھے اسے اپنے پیچھے بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی۔

کھلی کے سرے پر بنی مسجد کا دروازہ اس کے لیے مقناطیس ثابت ہوا۔ وہ بائیں طرف کی طرح بند دروازے کی طرف بڑھی اور اسے اندر کی طرف دھکیلا۔ دروازہ بند ہی نہیں مقفل بھی تھا۔ کھڑکی میں ٹکٹا تالا اسے دکھائی نہیں دیا تھا اس نے زور زور سے دروازہ پھینا شروع کر دیا۔

”کھولو کھولو خدا کے لیے کھولو۔“ سناتے میں اس کی آواز گونجی۔

وہ تینوں اس کے پیچھے دوڑنے لگے۔ آہستہ سے۔

”کھولو کون ہے جس نے خدا کے گھر کو نالے لگائے ہیں۔ کھولو۔ میں تو مسجد کی بیٹی ہوں۔ مجھ پر یہ دروازہ کھول بند ہے۔ کھولو۔“ وہ زور زور سے اپنا سر بند دروازے سے ٹکراتی تھی۔

وہ تینوں اس کے بائیں قریب آچکے تھے آمنہ کے حواس جواب دے گئے اور وہ اذہ پیٹے اس کے ہاتھ بے جان ہو کر ٹنگ گئے اور وہ لہرا کر گری گئی۔

نرس نے بے جس پڑے کچے کو کچھ گھبرا کر دیکھا۔ اس نے جلدی جلدی نیچے کی بخش چیک کی جو بالکل خاموش تھی۔ سینہ ٹٹولا جس میں دھڑکتا دل نہ جانے کس پل سر ہو چکا تھا۔

”اومالی گاڈ!“ اس نے بے اختیار سینے پر ہاتھ مارا۔

”کیا کریوں؟“ اس نے کن آنکھوں سے اوپر اُدھر دیکھا۔ سہائیڈ روم میں موجود دونوں نرسیں موبائل فون سے کھیل رہی تھیں۔ فائر کے ”تفریح“ کی تصاویر تھیں جس میں دونوں ٹھوٹھیں۔ ایک پل کو اس کا جی چاہا کہ شور مچا دے کہ کچے کو اگر چیک کیا جائے کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا۔

”یہ یقیناً مر چکا ہے، یہاں خود کو دھوکا دے رہی ہوں۔“ کسی نے اس کے اندر جھٹکے سے سرزنش بھری سرگوشی کی۔ وہ کھٹکے میں اس کا دھیان بغل میں دے اسے اس لٹاؤ کی طرف چلا گیا جس میں ان گنت نیلے لوٹ تھے جو چند منٹ پہلے تین مارا کھٹکے سے لے کر اپنا سارا ہینڈ بیگ خالی کر کے۔

”مجھے فقط آٹھے کھٹکے کے لیے میرا پتھر لاؤ اور اس آٹھے کھٹکے کے دوران کوئی میزے روم کا رت نہ کرے۔ یہ رقم اس ڈیوٹی کی ہے۔ کم سے دو گنی لے لو۔“

اس نے کھٹکے سے ہینڈ بیگ نکال کر اس کے ہاتھوں پر پڑے ٹوٹوں کے اوپر دھری۔ جس حالت کی وہ کھڑکی تھی نرس کی آنکھیں مل بھر میں چند صبا گئی تھیں۔

”نرس۔“ اس نے کھڑکی دیکھ کر اپنی چاہی۔ ”اوس کے منہ میں نیچے کو لے کر آ رہی ہوں لیکن فقط آٹھے کھٹکے کے لیے۔“ اس نے کھڑکی دیکھ کر اپنی چاہی۔ ”اوس کے منہ میں نیچے کو لے کر آ رہی ہوں لیکن فقط آٹھے کھٹکے کے لیے۔“ اس نے کھڑکی دیکھ کر اپنی چاہی۔

”زیادہ نفاذی کی ضرورت نہیں جلدی کریو۔“ نرس نے اس کی بات کاٹ کر عجبت بھرے انداز میں بولی اور بیڈ سے ٹانگیں لٹکا کر سائیڈ پر پڑے اپنے جوتے چھوڑنے لگی۔

نرس نے مرد پتھر اٹھا کر کھیل میں لگ گیا۔ اس کے کاٹ میں ایک چھوٹا سا کٹن رکھ کر اس پر کپڑا ڈال دیا اور محتاط قدموں سے کچھ بیڈ چھوڑ کر اس نے کھٹکے کے حوالے کر دیا تھا۔

”میرا اگر آپ بیڈ میں کھٹکے کے دس یہ ٹھیک نہیں۔“ اس نے کھیل میں اپنے نیچے کو کھٹکے سے ہونے کو کھٹکے بھرے انداز میں کہا۔

نرس نے اب! تم آٹھے کھٹکے کی قیمت وصول کر چکی ہو۔ اور یہ اونمبر میری مدد رکھو۔ تمہیں جاگرفون کر آؤ کہ وہ فوراً میرے پاس پہنچیں۔ میرے موبائل سے ان سے رابطہ نہیں ہو پارہا۔“ اس نے کاٹھکے کے ایک پر ڈسے پر لکھا نمبر نرس کی طرف بڑھایا نرس ایک پل کو ہچچکی۔

”یہ میرا اس دوران کوئی ادھر آ گیا تو۔“

”کوئی نہیں آئے گا۔ اب جاؤ تم۔“ وہ کہتے ہوئے ڈر اس کا کھیل بھر کا کھینچے کا چہرہ دیکھنے لگی۔ نرس کا دل زور سے دھڑکا۔ نرس نے تارے کھیل دیا وہ نیچے کے چہرے پر ڈال دیا تھا۔

نرس کے باہر نکلتے ہی نرس نے تارے پھرتی سے بیڈ کی سائیڈ پر پڑی چادر اٹھا کر اوٹھی۔ شو لڈریک اور موبائل اٹھایا اور نیچے کو سینے سے لگائے چادر میں چھپا کر بالکل ٹارٹل انداز میں چلتے ہوئے چھپکے دروازے سے باہر نکل گئی تھی جہاں اس کا ڈرائیور ابھی اس کی گاڑی پارک کر کے گیا تھا۔

چند لمحوں میں اس کی گاڑی ہواسے باتیں کرتی سلطان بخت کی حویلی کی طرف اڑتی جا رہی تھی۔

بہت مشکل سے ڈرائیو کرتے اس نے آمنہ کی سیٹ پر لڑھکی ہوئی گردن کو ایک ہاتھ سے سیدھا کیا اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

آمنہ اس کے خوب ہلانے اور بار بار پکارنے پر بھی ہوش میں نہیں آئی تھی۔ کہیں کوئی سیریس مسئلہ نہ ہو۔ وہ جلد از جلد اسے کسی ہسپتال میں لے جانا چاہ رہا تھا اور دور اسے کسی ہسپتال کی عمارت دکھائی دئی تو اس نے اسپینڈ بڑھا دی۔

”آپ زہت آبی سے دوبارہ ملنے نہیں گئے“ معاذ نے شہباز خان سے پوچھا تو وہ جیسے نظر میں چر اگئے۔
”اس آفس میں بیٹھے بہت ہی رہے ہو۔ کیا الگ رہا ہے سیکھائی کی خواری میں ہونے والی بھاگ دوڑ چھوڑ کر یوں کر سی جھماکھا کر حکم چلانا۔“

وہ چند لمحوں کی معنی خیز خاموشی کو توڑتے ہوئے بولے۔ معاذ چلیں جھپکائے بغیر انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی جھپکتی ہوئی نظریں جیسے ان کے آ رہا جا رہی تھیں۔

”کیسے لگتا ہے خور کرو کچھ رہے ہو۔ کیا میرے سینک آگ رہے ہیں۔“ وہ اس کے یوں دیکھتے پر کچھ جھلا کر بولے۔

”سینکوں والے جانور م اگر کھلتے ہیں تو آگھے ہوتے ہیں۔“ وہ سینے سے گہرا سانس خارج کرتے ہوئے کچھ افسردگی سے بولا۔

”وہ ایسے بھی؟ وضاحت کرو۔“ وہ لایروالی سے اسے دیکھ رہا تھا۔
”شہباز بھائی! ایک بات کہوں مبرا تو نہیں آئیں گے۔“ وہ تھیل پر ذرا سا آگے ہو کر انہیں اپنی گہری نظروں کی فرشت میں لے کر بولا۔

پوچھو یا انہماں کی باتوں کا میں نے کسی پر نہیں مانا اور پلیز بایہ میرا ایک سر سے لینا بند کرو۔“ وہ اس کی چہیتی ہوئی نظروں پر کچھ جھلا کر بولا۔

”میں آپ کو سمجھ نہیں سکا۔ معاف کیجئے آپ کا مسئلہ کیا ہے؟“

شہباز خان نے کچھ غور سے اسے دیکھا اور پھر بولے۔ ”وہ پھر سے اسے کھو کھلا سا تقبہ قضا میں اچھا لیا۔“
”تم نے ہسپتال جانا چھوڑ دیا ہے کیا؟“ وہ اس کا سوال صاف نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔

”نہیں۔ میں ہسپتال کے لیے چند ایک ماہ میں برطانیہ جانے والا ہوں اور اپنے سوال کو نظر انداز کیے جانے کی وجہ پوچھ رہا ہوں۔“ وہ کچھ خفا سے بولا۔

”اگر آپ نے بھائی کو نہیں سمجھا تو پھر مجھ سے پوچھو بھائی بنو۔“ وہ پھر سے اسے ٹالنے والے انداز میں بولے۔
”آپ مجھے جواب نہیں دیں گے۔“ وہ کچھ دھمکانے والے انداز میں بولا۔

”کیسا جواب؟“ وہ کچھ اکتا کر بولا۔
”آپ آئینے کا سامنا کیوں نہیں کرتے؟“

”تمہیں کیا خبر نہیں کب سے آئینے کے سامنے کھڑا ہوں۔“ وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔
”صرف سامنے کھڑے ہونے کی مشقت اٹھا رہے ہیں مگر اس سے نظریں نہیں ملا رہے۔“ معاذ کی بات پر انہوں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

”آپ مجھ سے کہا کرتے تھے۔ معاذ بایہ زندگی بہت قیمتی ہے بہت اعمول اور اس کے بیش قیمت ہونے کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو اس کے ایک ایک لمحے کی قدر جانتے ہیں۔ آپ لمحوں کو ہی نہیں گھنٹوں، دنوں، مہینوں اور سالوں کو براد کر رہے ہیں بلکہ کر چکے ہیں اور ابھی بھی آپ کا انداز اسی طرح کا ہے۔ آخر کیوں؟“ وہ ڈٹ کر ان سے پوچھ رہا تھا۔

”مجھے خود نہیں معلوم۔“ کہاں تو آپ زہت آبی کو معاف کر کے انہیں دھوڑنے کے لیے بے چین تھے

اور جب نرس رائنگ نمبر پر بار بار ٹرائی کرنے کے بعد ماوس نمین تارا کے روم کی طرف بڑھی اس وقت تک بچے کی کشدگی کی جھلک ڈچا ہوں طرف سچ چلی تھی اور زیور گل انتہائی غصے کے عالم میں ڈاکٹر کو جھاڑتا رہی تھی۔

نرس چپکے سے چلتی ہوئی اسٹاف روم کے الیچ وائش روم میں کھس گئی۔
”صدا شکر بچے لے کر جاتے مجھے کسی نے نہیں دیکھا۔“ اس نے وائش روم میں گئے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے مطمئن لہجے میں کہا اور لفافہ کھول کر لوٹ گئے۔



عین اسی لمحے علی کے موڑ پر کوئی گاڑی آکر رکی تھی۔ اس کی تیز فریٹ لائنس آمنہ کے گرتے ہوئے وجود پر پڑ رہی تھی۔

آمنہ کے پیچھے دوڑ کر آتے ہوئے قدم اس میں مہکتے ہوئے تھے اور جس لمحے گاڑی کا دروازہ کھلا اور اونچے لمبے قد کے سوٹ میں ملبوس کوئی شخص باہر نکلا۔ وہ چاروں سامنے دھڑکتے ہوئے گھروں کے دروازوں

اور دیواروں کی اوٹ میں ہوئے۔
اس شخص نے سر اٹھا کر اندھیرے میں ان کو دیکھنے کی ناکام کوشش کی۔

”جو کوئی ہے وہ سامنے آئے۔“ اس نے کڑک وار آواز میں کہا۔ اس کے پیچھے ہاتھ میں کوئی سیاہ چیز بھی چمکی تھی۔ کلمہ پہلی ہی نے تو اس کے بلند ہاتھ کو دیکھ کر آتی جاتی سانسوں کو بھین ہو کر لیا تھا۔ کچھ ایسا تو حال باقی نفوس کا بھی تھا۔

”حق لڑکی یا اگر مجھے ذرا سی بھی ذیرو جاتی تو۔“

اس نے جھک کر اسے اپنی بانہوں میں اٹھایا اور ڈرائیو تک سیٹ والے کھلے دروازے سے اسے اندر کیا۔
گھر آکر اسے ایک پل کو بھی تو چین نہیں آیا تھا۔ کہنے کو تو اس نے جو یہ بولے کہ یہ تو خیر ہونا چاہئے

اسے کوئی بھی نہیں بچا سکتا مگر اپنے دل کا کیا کرتا جو مسلسل ان دیکھے نظروں کی کھنٹی بھجائے جا رہا تھا۔
جو یہ تو اس کی اپنی خوبصورت اور بڑی کو بھی کو دیکھ دیکھ کر تپتی تھی اور ہر خوش ہوئی جا رہی تھی۔

”بھائی! آپ کا پڑا کھر ہے۔ اتنا بڑا اتنا خوبصورت۔“ وہ سارے غم کو ختم کر کے عین عبد العین سے بولے۔

”تم اپنے لیے کوئی سا بھی کمرو پند لرو ملازم سے تمہارے لیے سیٹ کروں گے۔“ وہ کچھ دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا جس کی توجہ عبد العین کے بجائے اوہرا اور بڑی قیمتی اشیاء پر جھکتی پھر رہی تھی۔

”میں ابھی ایک کمرے میں۔“ اس کھر کے تو کمرے بھی اتنے بڑے بڑے ہیں جتنا ہمارا پورا گھر تھا۔
کہتے کہتے اس کی زبان میں لگت آئی۔ اس کی ساری بھٹکی بھٹکی توجہ ایک دم سے سمت آئی۔ اس کے پر جوش

چہرے پر ایک دم سے اواسی اور محرومی کا غبار سا چھا گیا۔ وہ وہیں بڑی کر سی پڑھے تھی۔
”بھائی! آمنہ آبی اوہرا آبی ہیں۔ آپ مجھے واپس چھوڑ آئیں پلیز۔“ وہ کہتے کہتے آنکھوں میں آنسو جھرا لگی تھی۔

”چھا، شام کو چلیں گے۔ تم نہادھو کر فریش ہو جاؤ کھانا کھاؤ۔“ وہ تو آرام کرو پھر دیکھتے ہیں۔ مجھے گھنٹے بھر کے لیے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ واپس آؤں گا تو پھر لے چلوں گا۔ تم زیادہ فکر نہیں کرو۔ وہ ٹھیک ہوگی۔“ وہ اسے ٹال کر سسلی دیتے ہوئے اٹھ کر باہر آ گیا تھا۔

اس کا ہنسنے بھر کا کام پانچ گھنٹوں میں سمٹا تھا اور گھر کا رخ کرتے ہی اسے آمنہ کی یاد نے اس بری طرح سے گھیرا کہ اس نے لیے اختیار گاڑی کا رخ مخالف سمت میں موڑ دیا تھا۔

اس کا دل واپس غلط ہوئی تھی۔ وہ رہا تھا اور صد شکر وہ بالکل وقت پر پہنچا تھا ورنہ شاید وہ ایک اور ناقابل فراموش دائمی غم کا سامنا کر بیٹھتے۔

UrduPhoto.com

کتنے کہتے ہیں نے وحشت بھرے انداز میں بچے پر لپٹا کھیل کھینچ کر پرے اچھا۔ ایک آخری نظر اس کے معصوم سونے ہوئے چہرے پر ڈالی اور بے حد جنونی انداز میں اپنا دایاں پنجہ اس کے منہ سے گلے پر پورے زور سے جما دیا۔

”یا گل! یا گل! ہو گئی ہو۔ تم تکیا۔ رفع ہو جاؤ۔ بند کرو یہ ڈرامہ۔“
سلطان بخت اس کی اس جنونی حرکت پر بے اختیار چیختے ہوئے دو قدم آگے بڑھے تھے۔ صالح اور سیدہ بھی اس کی اتنی اچانک حرکت پر بل بھر کر پتھرا سی گئیں۔

شاید بچے نے ایک ہی جھوٹا کھایا تھا شاید اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ بھی لگی تھی۔ شاید اس کے جسم میں زندگی کی کوئی رمت باقی تھی۔ اس کو جنم دینے والے ایک پل کو اس کے بارے میں اس محبت کے ہزاروں حصے کے برابر ہی سمجھ لیتے۔ جس کے تحت وہ اس دنیا میں آیا تھا شاید اس کی زندگی ہی جاتی۔

اور جب تک سلطان بخت سیدہ اور صالح اس سے بچے کو جھیننے کے لیے آگے بڑھتے وہ بے جان ہو کر گوشت کے ٹوکڑے کی طرح زمین تاراکے یا زوروں میں جھول رہا تھا۔ زمین تاراکے آنکھوں میں اترا خون اور وحشت کی اس کے چہرے پر بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک جھیلے بغیر بھری لپٹ پر کراہتی دوڑتی تھی اس کے معصوم سونے ہوئے چہرے کے چہرے کی جگہ اس کی جگہ زور ویشمال میں اٹھ کھلی فریاد گرتی پوریں آنکھیں جو زمین تاراکے آنکھوں میں براہ راست دیکھ رہی تھیں اس کا چھوٹا سا منہ ہونٹوں والا ہوا۔ بچے نے حد خود بصورت تھا۔ بچہ تاراکے کیوں لگا جیسے اس نے پہلی بار اسے دیکھا ہو۔ اس کے منہ کی حدت کو پہلی بار اس کے ہاتھوں سے محسوس کیا ہو۔ اور مٹا کے اس اپنے چہرے کو بھی بھرا اس سے کو ایسے ہاتھوں سے مار دینے کے بعد اس کے بدن کے اندر ایک دم سے چھوٹا تھا۔

”مہ میرا بچہ میرا بیٹا میری جان۔ میں نے۔ میں نے تمہیں مار ڈالا میرا بچہ میرا دل۔“ وہ ایک تک اسے دیکھتے ہوئے پڑ پڑاتی تھی۔ اس کے جسم سے جان نکلنے لگی۔ ٹانگوں سے اس نے جان ڈھکی ڈھالی لاش کا درجہ اٹھانے سے انکار کر دیا وہ اسی جگہ زمین پر گرتی چلی گئی۔ اس کی نظریں ابھی بھی اپنے چہرے پر جمی تھیں۔ اس کے وہ بالکل بے خبر ہو چکی تھی۔ سلطان بخت کے قدموں کے پاس ہی وہ ڈوب رہی تھی۔ مگر ایسے کہ پچھلے ہی اس کے بازوؤں کے ہاتھ تیر تھیں بند سو رہا تھا۔ اور وہ اس کو دیکھنے جا رہی تھی۔

اسی وقت کھلے گیت سے تین گاڑیاں آگے چھپتا اندر داخل ہوئی تھیں۔ وہاں موجود سارے نفوس جیسے ہوش میں پلٹے تھے۔ تینوں گاڑیوں کے دروازے زور زور سے کھلے اور ان میں موجود لوگ ڈوبنے والے دار زمین پر گرتی تھیں۔ تاراکے کی طرف لپکے تھے۔



خود کو بے حد سمجھا کر منا کر کہا لاخروہ تو مت کہ پاس آئے کو تیار ہوتی گئے تھے۔ ارتضیٰ کو بھی ساتھ لے کر چلا گیا۔
”چھو نہیں تمہارے دوست فمد سے مولا اوس۔“ انہوں نے اس کی خوشی کو دیکھا کرتے ہوئے کہا۔ وہ تو اس میں نہلا۔ تھا کہ پیاسے اپنے ساتھ باہر لے کر جا رہے ہیں۔

رستے بھر سوچتے آئے کہ نہ بہت سے کیا کہیں گے۔ ساتھ چلنے کو اپنے لیے پر اعتماد کے چند الفاظ یا بھولی ہستی محبت کی کوئی یاد دہانی۔

”معلوم نہیں آتے دلوں میں اس نے کیا سوچا ہوگا وہ کب خوش میرے ساتھ آئے کو تیار ہے۔ میں خود ہی سارے فیصلے اپنے لیے سے کر رہا ہوں۔ اور یہ بھول گیا ہوں اب تو جو ہوگا اسی کی رضا سے ہوگا۔ اور اس کی رضا کیا ہے۔ کاش میں جان سکتا۔“

”یا! آئی فمد کہ۔“ ان کی ابھی بکھری سوجھ کو ارتضیٰ کی آواز نے سنا دیا تھا۔ انہوں نے ایک گہرا سانس لے کر گاڑی گیت کے باہر ہی روک ل۔

”کیا صرف فمد سے ملنے کی خوشی ہے میرے لیے؟“ گاڑی لاک کرتے ہوئے انہوں نے ارتضیٰ کے مسرور

چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔
”یہ کیا! اب چلیں اندر۔“ وہ کچھ بے قراری سے بولا۔ ”اور وہاں وہ فمد کی اتنی بھی تو ہیں ان کے ساتھ باتیں کرنے میں بھی بہت مزہ آتا ہے۔ سیلا! بس آج اور شام تک رہوں گا۔“ وہ جلدی جلدی بولا۔
”نہیں بیٹا! اتنی دیر نہیں۔ آپ اسکول میں روز تو فمد سے کھیل لیتے ہو۔ اس وقت تو بس تھوڑی دیر کے لیے اوس کے“ وہ اس کے بے ہوش ہونے بال بکاڑتے ہوئے بولے۔

”تو آپ کیا کریں گے اور میرا مطلب ہے آپ کا تو کوئی دوست نہیں ہے تو پھر آپ کس سے باتیں کریں گے۔“ وہ پوچھتے ہوئے کھلتے گیت سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ شہباز خان بیٹے کی نہایت پر ہنسکرائے۔ اس کی تھلید میں جلتے ہوئے اندر داخل ہوئے گیت کے سامنے دور تک جاتی سڑک پر کوئی نہیں تھا۔ یونہی آوازوں پر ان ناز سیمان و امیں لان کی طرف چلا گیا۔ سلان میں فمد نے جال کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ سامنے ہی نہ بہت کریں گے۔ سوٹ میں ملبوس کھلی کھلی سی فمد کی گرتی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے بالکل بالمقابل پڑتی گرتی ہی اس دن والی اور پچھلے ہی شہباز تھا۔ اس کے چہرے کا ایک سرخ شہباز خان کو دور سے دکھائی دے گیا۔ ان کے چہرے پر کئی بوجھیں چلی گئی۔ اس کو شہباز خان کے باتیں کرنے کی آواز گیت تک آ رہی تھی۔ وہ دونوں اس کو سن رہی تھیں۔ شہباز خان کے قدم زمین نے پکڑے تھے۔

”یا! آئیے نا۔“ ارتضیٰ نے فمد کو اپنے گونڈے دیکھ کر بے قرار ہو گیا تھا۔ ان کا ہاتھ ہلا کر بولا۔
”ارتضیٰ بیٹا تم جاؤ کھیلو۔“ شہباز نے فمد کی ضروری کاہم یاد آ گیا ہے اس آگے کھینچنے میں نہیں لینے آجائوں گا۔ ٹھیک سے کھیلو جا کر۔“ وہ کہہ کر گرتے گئے اور مرکز کھینچ دیا۔ فمد سے جلتے باہر نکل گئے۔ اسی وقت نہ بہت کی نظر ان پر پڑی تھی۔ وہ بے چین کی ہو کر آگے بڑھی ہوئی۔ اتنی دیر میں وہ گیت گرا اس کے چکے تھے۔ دست سی ہو کر ڈرا کر چلا گیا۔ شہباز خان نے فمد کو دیکھا ہوا۔ اس کی طرف آ رہا تھا۔ نہ بہت کے مڑھانے ہوئے چہرے پر خوشی کی انوکھی سی جگہ ابھری تھی۔

”شہباز خان! میرے لیے زندگی کا کوئی دور آؤ تو کھلا چھوڑ دیجئے گا۔“ وہ دل میں ابھرتے دکھی سے احساس کو روکتے ہوئے ارتضیٰ کی طرف بہت ہی



آہ اور بہت مشکل سے بولتی تھی۔

جو بریہ کے لاکھ کھاتے اور منت کرنے کے باوجود کہ اگر وہ وہوں کی کوشش کریں تو عبد العین کوئی زندگی کی طرف لوٹ سکتے ہیں۔ وہ یہاں رکے کو تیار نہیں تھی۔

”خیر! بلا حاصل کوششوں میں خود کو برباد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ گناہ کی لذت ایسی ہی ہے کہ آدمی چاہے جی تو اس لذت سے چھٹکارا نہیں پاسکتا۔ عبد العین اپنی مرضی اپنے دل کی خوشی سے اس زندگی میں داخل ہوا ہے۔ اور یہ اس وقت تک پلٹ نہیں سکتا جب تک یہ خود سے نہیں چاہے گا۔ میری یا تمہاری کوشش کچھ اثر نہیں رکھا کرتی۔ اب یہی دیکھ لو۔ یہ ہم سے کہہ رہا تھا کہ وہ جلد خود کو بدنے کی کوشش کرے گا۔ اور اب مجھے اس قسم کی بات سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ میں دو تین اسکولوں میں انہی روزے آتی ہوں۔ امید ہے میں نہ کہیں سے مجھے کال آجائے گی۔ بس اس کے بعد ہمیں اور ہمیں رہنا۔“ وہ حتمی انداز میں بولے۔

”ہوں۔“ جو بریہ مایوسی سے سر جھکا کر بولی۔

”تم نے دیکھا ہے اس کاربن سن ہر دو سرے چوتھے ہو گاڑیاں بھر بھر کر مشکوک لوگ آتے ہیں ہند کمروں میں اونچا اونچا بلا گد ہوتا ہے۔ وہ حرام ہے اس گھر میں بول کھلے عام چلتی ہے جیسے پانی کی بوتلیں۔ مجھے تو رات رات بھر خیمہ نہیں آتی کہ بابا صاحب کی ریح کیسی بے چین ہوئی۔ ان کی اولاد کس حرام زندگی کے شعلے میں بکھرتی جا رہی ہے۔ جو بریہ! خدا کے لیے خود کو اس گھر کی آسائشوں اور راحتوں کا عادی نہ بنانا۔ بس ایک آدھ ہفتے سے زیادہ ہمیں اور ہمیں رہنا۔“

وہ بے چین سی اٹھتے ہوئے بولی، "جب سے اس نے عبدالعزیز کو ڈرگ کا انجکشن لگاتے، نشے میں بہت ہوتے دیکھا تھا۔ اسے اور بھی اس سے نفرت ہو گئی تھی۔"

"اس کا ہم سے محبت ہر روزی کا رویہ فراڈ حکومتلے جب اسے خود پر اپنے نفس پر کوئی قابو ہی نہیں تو یہ ہماری کوششوں سے کیا بدلے گا اور جوچ پوجھو تو میں خود کو اس گھر میں بالکل محفوظ نہیں سمجھتی، مجھے لگتا ہے میں ایک کلثوم بنی لی کے جنگل سے نکل کر جو رہا ہے میں آکھڑی ہوئی ہوں جہاں پر آتی جاتی آندی نگاہ میرے بدن کو پلید کر رہی ہے۔ مجھے تو اس گھر کے ملازم بھی قابل اعتبار نہیں لگتے۔ جو یہ لہو اکر وہم اور ہر سے جلد از جلد بحفاظت نکل سکیں۔ عبدالعزیز نشے میں ہوتا ہے اپنی خبر نہیں ہوتی۔ ہماری نمکبانی وہ کیا کرے گا۔" وہ کہتے کہتے دکھی سی ہوتی۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔" جو یہ ایک گہرا سانس لے کر بولی۔

اور اس دن آمنہ کے شکوک بچتے بچتے یقین میں بدلنے لگے۔ وہ وہ پہرے کے کھانے کے بعد بلا متعذر دلوانج میں نکل رہی تھی۔ جب اس نے ایک ملازم کو چیک سے کھانے کی جی سبائی ٹرے چکن کے پچھلے دروازے سے باہر لے جاتے دیکھی۔ چکن میں اس وقت اور کوئی تھی نہیں تھا۔ آمنہ چیک سے اس کے پیچھے ہوئی۔

ملازم بہت احتیاط سے دیباؤں سے بیڑیوں کی طرف بڑھی تھی۔ یہ ملازم کھانا کو مشورہ دن سے بہت پر اسرار سی لگی تھی۔ ظہر میں تمہیں بالکل چپ چاپ رہنا۔ اور آج اس وقت بھری رو میں یہ کھانے کا خان سجا کر کس کے پاس لے جا رہی تھی۔

اس نے بیڑیوں کے پیچھے رک کر اس کے اوپر پیچھے کا انتظار کیا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ اوپر پہنچ چکی ہے تو وہ بے قدموں سے بیڑیاں چڑھ گئی۔

ملازم تیسرے کمرے کے دروازے سے باہر آ رہی تھی۔ آمنہ کو اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر گھبراہٹ سی لگی۔

"کون سے اندر کس کو کھانا دے کر آئی ہو؟" آمنہ تیز لہجے میں بولی۔

"کس کوئی نہیں لی، آپ بیٹھے جا میں ٹھاپا لے کر آیا ہے۔"

"مہلو چھوڑو، دیکھتے دیکھتے" آمنہ اسے دھکا دے کر تیزی سے بند ہونے والے دروازے کے اندر گھس گئی۔ دروازہ بند کرتے ہاتھ ایک مہ سے ٹھٹھک گئے اور آمنہ تو اسے دیکھ کر کھڑکی کی کھڑکی رہ گئی۔

"تمہیں؟" چند ثانیوں بعد اس کے ہونٹ ہولے سے واہونے تھے۔ آنکھوں میں بے تحاشا خیر لہو تھا۔

وہ تو اس کے یہاں ہونے کے بارے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

"یقین تارا! میری بچی! سب سے پہلے تیزی سے اس تک آئے وہاں زیور گل تھی جو گاڑی سے نکلے گا گئے اتنی پانٹی ہارے ہوش و خروش سے بے گانہ یقین تارا سے پٹ تھی۔ یقین تارا نے زیور گل کو ایک ہاتھ سے پرے دھکیلا اس کی نظریں بدستور دوسرے ہاتھ میں جو خواب بچنے پر لگی ہوئی تھیں۔

"ہام! دیکھیں یہ رو نہیں رہا نام! میں نے اسے مار ڈالا۔ میں نے خود اس کا کلا گھونٹ دیا۔ ہام! اسے درد تو ہوا ہوگا۔ پھر یہ رویا کیوں نہیں۔ ہام! جب درد ہوتا ہے تو سب روتے ہیں تو یہ کیوں نہیں رو رہا۔ ہام! دیکھیں اس کو چیک کریں یہ کیسی مرتو نہیں گیا۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ نہیں مر سکتا۔ یہ تو اس حویلی کا وارث ہے۔ یہ تو بہت بہت منتوں مراءوں سے پیدا ہوا ہے۔ شاہی نے تو ابھی اس کے پیدا ہونے کا جشن بھی منانا ہے۔ بہت بڑا بہت یادگار جشن۔ اس علاقے کے لوگ بدلتوں یا درگھس گئے۔ ہاں مجھے تو ابھی سے وحول کی آواز سنائی دے رہی ہے ہام! آپ سن رہی ہیں نا وحول یا جاس۔ مگر آپ کیوں رو رہی ہیں۔ شش بینی بات خوشی کے موقع پر رونا نہیں ہوتا ہے۔ آپ ہی تو کہتی ہیں۔ اسے اٹھائیں نا یہ کیوں نہیں اٹھیں کھولتے۔"

وہ پتھرائی ہوئی نظریں نیچے پر جمائے اور گروسے بے خبر بے ربط فقرے بول رہی تھی۔

"میری بیٹی میری جان! یہ مرد کا ہے۔ اور اچھا ہی ہوا یہ مر گیا اور نہ آئندہ زندگی میں اس نے جو ذلت اٹھانی تھی۔ اپنے باپ کے ہوتے بے تانی اور تیزی کی بے رحم حالت سے گزرتا تھا۔ اچھا ہوا جو یہ مر گیا۔ اس نے اپنے سنگ دل بے رحم اور پتھریا پ کی صورت دیکھے بغیر آنکھیں موند لیں تو اچھا کیا۔ اس بے رحم دنیا کی کوئی بھی بد صورت شہید اس کی معصوم بصراتوں پر نقش نہیں ہو سکتی۔ یہ معصوم معصوم ہی چلا گیا۔ اچھا ہوا! تو چلو یہاں سے۔ یہ پتھروں کی ہستی ہے اور تو کالج سے بنی ہے۔ میری بیٹی! یہی یوں لہو لہان ہوئی ہے اٹھ چل یہاں سے یہ انسانوں کا نہیں جنگلی جانوروں کی ہستی ہے۔ تیرے اس نیم مراد جسم کی بھی یوشیاں لڑج ڈالیں گے۔ مجھے چل۔"

زیور گل اب آواز لگاتے ہوئے اسے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"نہیں! مام! میں نہیں جاؤں گی۔ میں اپنے بچے کو اس کے اصل گھر میں لے آئی ہوں! اب بھلا میں کہاں جا سکتی ہوں۔ اب تو میں وہیں رہوں گی جہاں یہ رہے گا۔ اور بھلا شاہی اپنے اکلوتے وارث کو گل کدے میں رہنے دینے لگے۔ کبھی نہیں۔ میری بات اور تھی۔ اب تو یوں بھی سب کو پتہ چل گیا ہے۔ میں اس حویلی کے اکلوتے وارث کی ہوں۔ اب تو میں یہاں ہی شان سے رہوں گی۔ دیکھا، مام! اسے اٹھاؤ نا یہ کیوں سو رہا ہے؟ اس کی تیز کیوں میں اٹھ رہی۔"

عزیز تارا اب ہولے ہولے بچے کا ہاتھ تھکے لگی۔ اسی لمحے پیچھے کھڑے کسی پرائیویٹ چینیل کے کیمرو میں نے ذرا آئے ہو کر کھٹا کھٹ تین تصویریں امارت میں۔ کیمرے کا فلش دھوپ میں چمکا تو جیسے پتھر کا بت بے سلطان بخت کو ہوش آ گیا۔ رما، رصالحہ شاہ پہلے ہی اندر بولی دروازے کی آڑ میں ہو چکی تھیں۔

"اوستے! سلطان بخت سے خبر ہے۔ انداز میں ہاتھ اٹھا کر زور سے کہا تو ان سب لوگوں کو جیسے سلطان بخت کا ہونے کی خبر ہو چکی ہو۔ اس وقت سلطان بخت کے وقادار کیمرو میں سے کیمرو چھیننے کے لیے اس کی طرف بھاگے۔

"خبردار! ہم اسے اخبار اور میڈیا کو سب سے پہلے بتا کر آئے ہیں۔ یہاں کسی بھی گزری کی صورت میں نتائج کے ذمہ دار آپ لوگ خود ہوں گے۔"

اسی کیمرو میں نے تیز لہجے میں ان لوگوں کو کوئی اطلاع دی تو سلطان بخت کا جلال بھی کسی جھاگ کی طرح جینہ گیا۔

"کرم داد! یہ ہونے مسلمان ہیں۔ ان کے لیے مہمان خانہ کھلو! اتنی دھوپ میں آپ لوگ ادھر کیوں کھڑے ہیں۔ اس وقت کیمرو میں۔"

سلطان بخت نے بالکل بدلے ہوئے لہجے میں ان ساتوں پر زور سے کہا۔ اور ساتھ ہی اپنے ملازموں کو آنگھ سے اشارہ کیا۔

"دشمنیہ! کیمرو وہی ٹھٹھک ہیں۔ بی بی ٹیکم صاحبہ! آپ کچھ کتنا چاہیں گی؟"

وہ آکھڑے کیمرو میں زیور گل کی طرف بھاگا تو سلطان بخت کے ہاتھ کی شکنیں اور گہری ہونٹیں۔ ہنسیوں اور پرتو تن گئیں۔

"جو پوچھتا ہے آپ لوگ مجھ سے پوچھیں۔ پہلی بات یہ کہ آپ لوگ بلا اجازت حویلی میں داخل ہوتے ہیں تو کسی بھی جرم سے کم نہیں لیکن پھر بھی میں آپ کو مہمان جان کر آپ کی یہ گستاخی نظر انداز کرتا ہوں کہ اب ستر ہے۔ آپ لوگ اندر چل کر آرام سے بیٹھیں۔ اور جو پوچھتا ہے اندر چل کر پوچھیں۔ یوں سرور آپ کو کوئی بھی تمہارا نام نہیں دیتا ہے۔ کرم داد مہمان خانے کا دروازہ کھولو۔"

وہ جاتے ہوئے اپنے ملازمین سے بولے تو زیور گل نے تڑپ کر اس شقی القلب انسان کی طرف دیکھا۔ "خدا کرے تم اس اونچی حویلی کی دیواروں میں یونہی بے نام و نشان موت کو زمو اور تمہیں موت نہ آئے۔"

اچھانے کے لیے اس سلسلے کا کوئی تدارک ہونا چاہیے۔ اور آپ لوگ اس سلسلے میں ہماری مدد کریں گا۔
 ایک رپورٹر کا قلم اپنے پیڈ پر تیزی سے چل رہا تھا۔ جب کہ باقی تائیدی انداز میں زور و شور سے سر ہلارہے
 تھے۔ ”کریم رادا“ سلطان بخت نے پیچھے مڑ کر آواز لگائی تو کریم رادا بوقت کے جن کی طرح اسی فوٹو گرافر کا کیمرہ اور سمات
 لٹکانے ہاتھ میں لیے دوڑتا ہوا آیا تھا۔
 ”یہ آپ کا کیمرہ اور یہ ہماری طرف سے تحفہ آپ سب کے لیے امید ہے آپ لوگ آئندہ بھی ہماری مہمان
 نوازی کا خیال رکھیں گے۔“
 سلطان بخت نے انتہائی بااخلاق لہجے میں ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ ایک ایک الفاظہ ان ساتوں کی طرف
 بڑھایا جسے انہوں نے ایک ہلکی سی ہچکچاہٹ کے ساتھ تمام لیا اور سلطان بخت سے ہاتھ لگے کے اپنی گاڑیوں میں
 جا بیٹھے۔

زبور کل حلق پھاڑ کر چی رہی تھی۔ جب ایک نو مند ملازم نے اسے بانو سے پکڑ کر یونٹ سے باہر اچھال
 جیسے وہ حویلی کی کوئی بگاڑے ہوئے دزن چڑھو۔ زمین پر گرتے ہی اس کا ویسٹ عمریدن حج اٹھا کر تکلیف کے اس عالم میں
 بھی وہ اپنے رو کو سمیٹتی زمین تارا کی طرف دوڑی تھی۔
 ”مخدہ میری بیٹی! اجس یہاں سے پہلے۔“
 وہ گرتی پڑتی اس تک پہنچی تھی۔ اور اب زمین تارا کے پتھر جو کو ہلانے اور اٹھانے کی ناکام کوشش کرتے
 ہوئے آسو ہمار ہی تھی۔
 آج پہلی بار سے پتا چلا کہ اس کی عمر پچاس کا سن تجاوز کر چکی ہے۔ اس کے سنے سنورے جسم میں طاقت نام
 کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ اس کی معمولی سی کمزور نظر اس کے تیزی سے اندھے پن کی طرف دوڑنے لگی تھی۔ زور
 زور سے آنکھیں ملنے کے باوجود زبور کل کو بہت سے منظر و مناظر نظر آ رہے تھے۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں
 خود کو اتنا بے بس بھی محسوس نہیں کیا تھا۔

”محمد! فوراً ہو گئے ہو تم۔ ان ”بیڈا توں“ کو باہر نکال کر تو اندر آ کر مہمانوں کو دیکھو۔“ سلطان بخت کے
 خاص کی کراری آواز ملک کے گھر سے شہر کا پتہ دے رہی تھی۔
 ”محمد نے آگے ڈیڑھ منٹ میں زبور کل اور زمین تارا کو اس کے مہرے پچے سمیت گاڑی میں ڈال کر ان کی گاڑی
 کو حویلی سے بیس فٹ دور مڑا کر لے جا کر چھوڑ دیا تھا۔
 اور حویلی کے اندر پیشہ نری میں کھڑی صالحہ شاہ آسو ہمارے ہوئے ایک ہی بات سوچے جا رہی تھی۔
 ”اللہ تبارک و تعالیٰ شکر تو نے مجھے صالحہ شاہ بنایا۔ میں جب سے اس حویلی میں آئی تھی دن میں ہزار بار تجھ سے گلے
 کرتی تھی کہ تو نے مجھے زمین تارا کیوں نہیں بنایا۔ تو نے مجھے صالحہ شاہ کیوں بنایا۔ میں زمین تارا ہوتی تو کم از کم
 سلطان بخت کی محبت بھری نگاہ کا تارا تو ہوتی۔ پر نہیں! آج مجھے پتا چلا سلطان بخت کی محبت اس نہر کے سامنے
 زور ہے جو اس کے میں سب حد درجہ اور نشہ آور ہوتا ہے۔ اور تاخیر میں اپنی کھڑکی میں اسے بٹھو کر دیکھا اور
 شرم ناک۔ میرے مولا تبارک و تعالیٰ شکر تو نے مجھے صالحہ شاہ بنایا۔“
 وہ ایک ہی بات کی تکرار کرتے دیوار سے سر ٹکائے روئے جا رہی تھی۔

”محمد! فوراً ہو گئے ہو تم۔ ان ”بیڈا توں“ کو باہر نکال کر تو اندر آ کر مہمانوں کو دیکھو۔“ سلطان بخت کے
 خاص کی کراری آواز ملک کے گھر سے شہر کا پتہ دے رہی تھی۔
 ”محمد نے آگے ڈیڑھ منٹ میں زبور کل اور زمین تارا کو اس کے مہرے پچے سمیت گاڑی میں ڈال کر ان کی گاڑی
 کو حویلی سے بیس فٹ دور مڑا کر لے جا کر چھوڑ دیا تھا۔
 اور حویلی کے اندر پیشہ نری میں کھڑی صالحہ شاہ آسو ہمارے ہوئے ایک ہی بات سوچے جا رہی تھی۔
 ”اللہ تبارک و تعالیٰ شکر تو نے مجھے صالحہ شاہ بنایا۔ میں جب سے اس حویلی میں آئی تھی دن میں ہزار بار تجھ سے گلے
 کرتی تھی کہ تو نے مجھے زمین تارا کیوں نہیں بنایا۔ تو نے مجھے صالحہ شاہ کیوں بنایا۔ میں زمین تارا ہوتی تو کم از کم
 سلطان بخت کی محبت بھری نگاہ کا تارا تو ہوتی۔ پر نہیں! آج مجھے پتا چلا سلطان بخت کی محبت اس نہر کے سامنے
 زور ہے جو اس کے میں سب حد درجہ اور نشہ آور ہوتا ہے۔ اور تاخیر میں اپنی کھڑکی میں اسے بٹھو کر دیکھا اور
 شرم ناک۔ میرے مولا تبارک و تعالیٰ شکر تو نے مجھے صالحہ شاہ بنایا۔“
 وہ ایک ہی بات کی تکرار کرتے دیوار سے سر ٹکائے روئے جا رہی تھی۔

”میرے ہاں کیسے؟“ ملازم دوڑوں کو ہاتھ لگا کر کچھ کچھ سے بیڑھیاں اتر گئی۔
 ”یہ تم سے نہیں! تم نے اسے مارا تھا۔“
 ”میرے ہاں کیسے؟“ ملازم دوڑوں کو ہاتھ لگا کر کچھ کچھ سے بیڑھیاں اتر گئی۔
 ”یہ تم سے نہیں! تم نے اسے مارا تھا۔“
 ”میرے ہاں کیسے؟“ ملازم دوڑوں کو ہاتھ لگا کر کچھ کچھ سے بیڑھیاں اتر گئی۔
 ”یہ تم سے نہیں! تم نے اسے مارا تھا۔“

”میرے ہاں کیسے؟“ ملازم دوڑوں کو ہاتھ لگا کر کچھ کچھ سے بیڑھیاں اتر گئی۔
 ”یہ تم سے نہیں! تم نے اسے مارا تھا۔“
 ”میرے ہاں کیسے؟“ ملازم دوڑوں کو ہاتھ لگا کر کچھ کچھ سے بیڑھیاں اتر گئی۔
 ”یہ تم سے نہیں! تم نے اسے مارا تھا۔“

”اور باقری صاحب! آپ کو تو معلوم ہے ان کبھی عورتوں کا حال کیسی بیڈا ذات ہوتی ہے۔ جہاں رو پیہ پیہ
 دیکھا۔ کبھی کی طرح منڈلانے لگتی ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ بھلا کیا تھی مگر ان کے چار پیسے گناہوں میں
 نے انہیں بیوی درت کروائے عزت و لوالی۔ اور یہ ہاتھ دھو کر میرے ہی پیچھے پڑ گئیں۔ سچ کہا ہے کہ
 رعزای طھوانف بھی کبھی کسی کی بیٹی ہے۔ ان کی اپنی تو کوئی عزت ہوتی نہیں۔ اسی لیے ذرا ذرا اسی بات پر کپڑے
 اتار کر بیس کے سامنے سچ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ سارے زمانے میں مظلوم بن کر سب کی ہمدردیاں سمیٹنے اور ہم جیسے
 عزت داروں کی پگڑیاں اچھاننا تو ان بد بختوں کا اڈل پیشہ ہے۔ پہلے تو یہ بازار حسن تک محدود تھیں۔ اب تو سوسائٹی
 کے پوش ترین علاقوں تک ان کی رسائی ہو چکی ہے۔ پیسے اور جسم فروشی کے بل بوتے پر جس کو چاہے اپنا ہمنوا
 بنا سکتی ہیں۔“
 اب خدا جلنے کس کا لند تھا جو لا کر میرے سر منڈھنا چاہتی تھیں اور آپ لوگوں کو بھی ان کے ساتھ چلنے
 ہوئے کچھ خیال کرنا چاہیے کہ ہر من گھڑت مسالدار کھانی سچ نہیں ہوتی۔ اور میں تو کہتا ہوں ان جیسی بدکار اور
 سینہ زور معاشرے کے ناسوروں کو میڈیا ہی خواہم کے سامنے بنگا کر رکھتا ہے۔ اور میڈیا کو اپنا یہ کردار ادا بھی کرتا
 چاہیے چوری دیانت داری سے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم معاشرے کو اس سر اٹھاتی گندگی سے پاک نہ کر سکیں۔ یہ
 آپ لوگوں کی کمزوری ہے جو آگے دن کوئی نہ کوئی جھوٹا اسکینڈل اٹھ کھڑا ہوتا ہے کسی بھی عزت دار پر پتھر
 پھینکتی ہیں۔“

”میرے ہاں کیسے؟“ ملازم دوڑوں کو ہاتھ لگا کر کچھ کچھ سے بیڑھیاں اتر گئی۔
 ”یہ تم سے نہیں! تم نے اسے مارا تھا۔“
 ”میرے ہاں کیسے؟“ ملازم دوڑوں کو ہاتھ لگا کر کچھ کچھ سے بیڑھیاں اتر گئی۔
 ”یہ تم سے نہیں! تم نے اسے مارا تھا۔“

”اس کے بارے میں مجھے خیال کرنے کی ضرورت نہیں آپ جو ہیں۔“

معاذ نے براہِ اختیار لہجے میں رعنائیات کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

”تھینک یو مائی سوٹ سن اور اسی خیال کے لیے تو میں نے تمہیں روکا ہے۔“

”بھئی تم ذرا بات مختصر کرو۔ ہم دونوں ہی لیٹ ہو رہے ہیں۔ اور ٹیکم صاحب کا سسپنس طویل ہوتا جا رہا ہے۔“

”اب کے فخر حیات نے پتھو جھٹلا کر کہا تو معاذ بھی ان کی تائید میں سر ہلانے لگا۔

”بھئی میں چاہتی ہوں کہ اب معاذ شادی کر لے۔ میں نے ایک غرض اس کی بددلتی میں تمہا تو تہے ہوئے گزارا ہے۔ اور اس کے مل جانے کے بعد بھی صورت حال تقریباً وہی ہی ہے کہ آپ دونوں صبح کے نکلے اسی رات کو

شکل دکھاتے ہیں اور صبح سے رات گزرتی نظر حال ہو جاتی ہوں۔“

”ویسے ٹیکم صاحب اپنا مل جانے کے بعد آپ کو کھڑی کچھ زیادہ پیارا ہو گیا ہے۔ ساری باہر کی سرگرمیاں

تڑک کر کے گھری ہوئی ہیں۔ اس لیے تک تو نہیں کی ویسے تھیڈیا ہے زبردست۔“

معاذ نے فخر حیات نے

”تھینکس۔ آپ کو میرا تھنیا تو پسند آیا۔ اب پوچھیں اس سے اگر کوئی اس کی لہجہ کو بوجھائے نما ہر پتے

ترجیح تو معاذ کی جو انہیں کوئی جانے لی۔“

”بالکل بالکل۔“ فخر حیات نے فوراً کہا۔

”صورتی مانا اول تو میری کوئی پسند نہیں اور اگر کوئی پسند آئی تو سب سے پہلے آپ سے کہوں گا۔ اس وقت میں

لیٹ ہو رہا ہوں۔ اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ انا کہے یا اللہ حافظ۔“

معاذ نے تیزی سے باہر کی

طرف پلٹ کر کہا۔

”مانا تو لگتا ہے وہ چاروں میں ہی میرے سر پر سراجوں کی گھنٹی لگتی ہے۔ اور میں

پتہ کا پتہ پوچھ رہی ہوں جیسے اب تک میں تڑکیاں پسند۔“

دفعہ اس کے ذہن میں ایک بھلا سا ہوا تھا۔

قیاب سے بھلائی بوسیا ہنسنے اور اس آکھیں اور آواز نہ سمجھے۔ اٹھارہ کشتی سرایا اور کھٹک دار سرلی آواز۔

”آمنہ! پتہ معلوم میں ہی اس کا مانغ یہ عقدہ حل کر چکا تھا۔“

معاذ نے کہا۔ ”میں نے کچھ نہیں کہا۔“

صوفی صاحب کی خبر نہیں لی۔ حالانکہ اس وقت مجھے خود بہت اچھی طرح معلوم ہوا تھا کہ ان کا گھرانہ شدید

کرافٹس سے گزر رہا ہے۔ اور میں نے آخری بار وہاں سے لوٹتے وقت دل میں یہ آگے ہی کیا تھا کہ آتا جانا

رہوں گا۔ اور اپنی زندگی کی الجھنیں سمجھتے ہی میں ان کے مسائل تو کیا انہیں بھی بھول گیا۔

اس آج ہی شہنشاہ پور جاؤں گا۔ صوفی صاحب سے ملنے۔“

اور اس دن دوپہر کے فوراً بعد صوفی صاحب سے ملنے چل پڑا۔

”کیا پتا وہ یہاں سے جا چکے ہوں۔“ مٹی کے موڑ پر پہنچ کر اس کے دل میں خیال گزرا۔

وہ گاڑی لاک کر کے نیچے اتر آیا۔

”جی صوفی صاحب! مسجد کے باہر ہی اسے ایک شخص مل گیا تھا۔ صوفی صاحب کے بارے میں پوچھنے پر کچھ

خبر سے اسے دیکھنے لگا۔

”لگتا ہے آپ بہت عرصے بعد ادھر آئے ہیں۔“ وہ اس کا اچھی طرح جائزہ لے کر بولا۔

”ہاں غرض تو واقعی طویل نہیں لگا۔ پہلے صوفی صاحب کی بیٹی بیٹی کیا بھلا سا نام تھا اس کا۔“

وہ کھینچ پرائیگی

رکھ کر سونے لگا۔

”آمنہ! معاذ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”شاید یہی ہو۔ اس نے خود کتنی کھینچ لیا تھا اس کی ہے۔“

”جی! معاذ بھونپکا رو گیا۔“

”پھر ٹھوڑے ہی دنوں میں صوفی صاحب کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔“

”کیا۔“ بیمار تو وہ تھیں مگر اتنی ہی نہیں کہ۔“ وہ بڑبڑایا۔

”بس جی موت تو پیچھے لگی ہے۔ صحت بیماری کب دیکھتی ہے۔ اس کے بعد تو جیسے صوفی صاحب بے چارے

جیتے جی قبر میں اتر گئے۔ ایسا بیماری کی پکڑ میں آئے پھر خدا کے فضل سے بچھلے جتنے بھی جلدی ہو گئے۔ بڑی موذی

بیماری کو شکست دی تھی انہوں نے۔ پر موت کے آگے ہار گئے۔ قضا انہیں لے کر ہی گئی۔“ وہ شخص دکھ بھرے

لہجے میں بولا۔

”اومانی گاڑ۔“ معاذ نے سر تھام لیا۔

”ہاں جی نمب ہی کو جس جس نے سنا دیکھا مہمت دکھ ہوا۔ بڑے بچھے ہنس اچھے اور نیک انسان تھے۔ آجکل

تو ایسے انسان بھی نایاب ہو چکے ہیں۔ سچ ہے اچھے لوگ اچھے چارے ہیں۔ تو است تم جیسے بڑوں پر ہی قائم ہو گئی۔“

معاذ نے

”اور ان کی بھلائی بھلائی بھولنی۔“ معاذ نے آستلی سے پوچھا۔

”معلوم نہیں جی کہ کتنے کتنے دیسے صوفی صاحب اس مسجد سے تو فارغ ہو چکے تھے۔ اس لیے انہیں کھڑی

خالی کرنا پڑا شاید بھائیوں کے پاس لڑکی تھی ہوں۔ بیٹے بڑے بے وفا لگے۔ صوفی صاحب کو بس یہی روک ٹوک عمل اور

وقت قیام لے گیا اور نہ تو۔“

”اچھا جی شکریہ آپ کا وقت لیا میں۔“ معاذ نے جلدی سے اس سے مصافحہ کیا اور گاڑی کی

طرف پلٹ آیا۔

”تو میری ہنسنے کی وجہ سے کہہ رہی تھی کہ تمہیں میں نے دیر تو نہیں کر دی۔“ گاڑی اشارت کرتے ہوئے اس

طرف اشارت کرتے ہوئے صوفی صاحب کی موت کا سن کر بہت دکھ ہوا تھا۔

”کاش میں تمہارا بیٹا بھائی تھا تو شاید ان سے آخری ملاقات ہو ہی جاتی۔“

”مگر آمنہ نے خود کتنی۔“ ناممکن نہیں ہو سکتا ہے۔“

”شاید اسے بھائیوں کے پاس لڑکی تھی ہوں۔“

عبدالصبیح ہاں وہ تو اشارتیں بن چکا ہے۔ اس کا لڑکیس یا آسمانی

مل سکتا ہے۔ آمنہ نہیں مر سکتی۔ میرا دل کہہ رہا ہے۔ ابھی تو میرے دل کی کھلی ہے اس کا نام لے کر مسکانا سیکھا

ہے کہ اس کا نام لے کر مسکانا سیکھا

میں نے خیال ہے اس کے اندر تو اتنی ہی بھڑکی تھی۔ اس نے گاڑی کی اسپینڈر بھاری۔

”تو یہ وجہ تھی ہماری تقدیر میں آئے والی بے حساب گردشوں کی۔ میں اکثر ہی سوچتی کیوں ہمارے نیک اعمال

ہماری صدقہ دل سے مانگی دعا میں ہماری فریادیں آہیں روکی جا رہی ہیں کہ ہم تو کسی مظلوم کی آہوں کی زبردست تھے۔“

پھر ہمارے دعا میں مقبول کیسے ہو سکتی تھیں۔ کیسے رب تعالیٰ ہماری فریادیں پر کان دہر سکتا تھا کہ ہم سے وابستہ ایک

شخص نے کسی پر ظلم کی انتہا کر رکھی تھی۔ بہت بہت افسوس ہوا ہے مجھے۔ عبدالصبیح! بہت زیادہ ہی تم ہو؟۔“

رات کے ڈھالی بچے عبدالصبیح مقامی ہوٹل میں ہونے والے کھڑے۔ سے فارغ ہو کر تھکا ہارا گھر لوٹا اپنے

کمرے میں آکر ابھی اس نے بیدار کی جیکٹ اتار کر چھٹی ہی تھی کہ آمنہ نے دھارے دروازہ کھولا اور اسے صوبہ

لگا ہوں سے کہتے ہوئے زہر خند لہجے میں بولنے لگی۔

”کیا مطلب آپ کیا ہو گیا ہے؟“

عبدالصبیح پہلے تو اسے یوں کہتی رات کو اپنے سامنے دیکھ کر جو لگا اور پھر قدرے بے زاری سے جھک کر

اس نے ہم صدمہ پیشے عبد العبین کو زور سے ہلایا۔ وہ جیسے گہری نیند سے جاگا۔ ایک دم جھٹکے سے اٹھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دروازے تک کھینچتا ہوا لایا اور اسے دروازے سے باہر کھیل دیا۔
 ”جس چیز کا علم انسان کو کسی گہرے دکھ سے آشنا کر دے۔ سترے اسے تابی جانا جائے۔ وہ اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی تھی۔ بعد میں میرے دل سے اتر گئی۔ اس کا بھی نشہ اتر گیا۔ میں اس سے کہہ چکا ہوں وہ جانا چاہے تو بے شک چل جائے۔ اب وہ اپنی مرضی سے اوپر بیٹھی ہے۔ اور اس سے زیادہ نہ مجھے علم ہے نہ مجھ سے کچھ پوچھتا۔ اب سوچا جا کر وہ اپنی زلت بھری زندگی کا سبب خود ہے۔ اپنا پوچھ بلکا کرنے کے لیے اب دوسروں کو مورد الزام ٹھہرا رہی ہے۔ اب دوبارہ مجھ سے کچھ نہیں پوچھنا سونے دو مجھے بھی اب۔ شب بخیر۔“ اس نے کہہ کر زور سے دروازہ بند کر لیا اور باہر کھڑی آمد۔ پہلے غصے سے بند دروازے کو گھورتی رہی پھر بے بس ہو کر بے اختیار رونے لگی۔

اور اپنے بازو میں انجیشن لگا تا عبد العبین صرف چند لمحوں کے لیے اس کی سسکیوں سے ڈسٹرب ہوا اس کے بعد اس کے ہنڈر گرا سکون اتر آیا۔ چلا گیا۔ ہماری کلفت ہماری پریشانی رفع ہو گئی۔ اس کا ہاں سرور کے انوکھے نشے میں ہلکورے سے لگا۔ اس کا تو حادہ مزید سے نیچے آڑا تر چھانک رہا تھا۔ وہ چند منٹوں میں ہی حافل ہو چکا تھا۔ آمد نے اوندھلی کھلی کھلی سے اس کو یوں مدہوش سوئے ہوئے دکھا۔ پاس پڑی خالی سرنگ نے اسے بہت سچا سمجھا دیا تھا۔
 ”یا اللہ! ابھی اور کتنے امتحان باقی ہیں۔ ابھی آج آج۔ اب ہمارے پاس پہلا کرنے کو کچھ بھی نہیں بچا۔ میرے بھائی! نکل کو اس ذات کے گھر سے۔ کچھ ہمارا ہی خیال کر لو۔ عبد العبین! میرے بھائی!“

”تمہاری اہانت تمہارے پاس قسمتوں سے۔“ شہباز خان نے ایک بڑا سا خاکاکی لٹاف نہرت کی طرف بڑھا۔ وہ لٹاف کو ہاتھ لگا کر بغیر سوال غصوں سے دیکھے گئی۔
 ”یہ تمہارے پنڈی والے گھر کے کاغذات ہیں جو اسمیل نے تمہارے نام کر دیا تھا۔“ وہ اس کے صلیب پھرنے کو نظروں میں جذب کرتے ہوئے بولے۔
 ”اسمیل بھائی نے۔ مگر وہ تو میرا بہن بھائی نہیں۔ شکل دیکھنا نہیں چاہتے پھر یہ گھر میرے نام۔ وہ خود کہاں ہیں؟ پنڈی میں؟ کیا ابھی بھی مجھ سے لپک لپکا چاہتے پھر یہ کھڑے۔“ وہ لٹاف پکڑے بغیر ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔
 شہباز خان نے ایک کھلی نظر اس کے ذہنی چہرے پر ڈالی اور آگے بڑھ کر لٹاف سینئر اسمیل پر رکھ دیا۔
 ”وہ تمہارے گھر میں آسکتے۔“ وہ دھت سے بچے میں کہہ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔

”ابھی اس وقت سے ملنا نہیں چاہتے تو پھر گھر میرے نام کرنے کا مطلب؟ میں نے کب ایسی کوئی خواہش کی تھی کب یہ شک یہ کاغذات انہیں لوٹاؤں۔“ وہ آنسو پیتے ہوئے رخ پھیر کر بولی۔
 ”کہاں جا کر لوٹاؤں؟“ وہ اس کی طرف دیکھ کر قدرے بے بسی سے بولے۔
 ”جہاں وہ ہیں۔“ وہ قہقہے ہونے آواز میں بولی۔ ”اگر انہیں مجھ سے ملنا پند نہیں تو میں اس گھر کا کیا کروں گی۔“ وہ جہاں سے وہاں سے اکر کوئی چاہے تو بھی کسی سے ملنے نہیں آسکتا۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔
 ”کیا مطلب؟ کہاں ہیں وہ۔ وہ ٹھیک تہیں نا؟“ وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کھنکی۔
 ”وہ اب اس دنیا میں نہیں۔“ شہباز خان نے کہتے ہوئے اس کے زرد بڑتے چہرے کو دیکھا۔
 ”کیا۔“ وہ زور سے چلائی۔ ”نہیں۔ نہیں۔ میں نے ایسا تو کبھی نہیں چاہا تھا۔ کبھی نہیں۔ اس وقت بھی نہیں جب انہوں نے مجھے دیکھے وہ کمرنگ کے کچھ کھڑا کر دیا تھا۔ تب بھی نہیں۔ پھر وہ کیسے۔“ وہ ایک دم سے نیچے جھٹک کر چھوٹ چھوٹ کر رونے لگی۔
 ”اس کی زندگی میں پہلے کون سے کچھ ہیں جو میں اک اور دکھ بھری کہانی کا اضافہ کروں۔“

جوتے کے لمبے کھولے لگا۔ اس کی آنکھیں کچھ رت جھنگے سے اور کچھ پینے سے مرخ ہو رہی تھیں۔ منہ سے اٹھتے ہوئے بھٹکے اسے خود بھی محسوس ہو رہے تھے۔ اسی لیے اسے آمد کو سامنے دیکھ کر کوئی سی ہو رہی تھی کہ اگر آمد کو پتا چل گیا تو۔ وہ کسی بھی بات کی پروا کیے بغیر اسے ٹھیک ٹھاک تازہ کر رکھ دے گی۔ مگر وہ تو پینے ہی کوئی کیس تیار کے سر پر کھڑی تھی۔
 ”تم نے شہرت کے ساتھ کیا ظلم کیا ہے؟“ وہ پھرنے ہوئے انداز میں اس کے بالکل سامنے آکھڑی ہوئی اور شعبے پر ساتی نگاہیں اس پر بھا کر بولی۔
 ”اوہ۔ تو یہ بات ہے۔“

عبد العبین نے جراتیں اتار کر جوتوں میں رکھیں۔ اور جوتے صوفے کے نیچے دیکھ لیا۔ پھر ناگھیں سامنے کی طرف پھیرا کر آمد کو دیکھنے لگا جواب بھی اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔
 ”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اس حد تک بھی گرسکتے ہو۔“
 ”بھئی تو اچھی طرح جتنی بھر کر سوچ لو کہ میں ایک بے حد گرا ہوا انسان ہوں۔ سو ہر حد سے آگے جا سکتا ہوں۔“
 عبد العبین نے قدرے بے زاری سے اس کے آگے دونوں ہاتھ جوڑے۔
 ”اور اب خدا کے لیے مجھے دو گھڑی آرام کرنے دو۔“ تھکن سے میرا برا حال ہے۔“
 ”کسی کی زندگی پر یادو کر کے سکون تباہ کر کے تم سوچنا چاہتے ہو۔ اس مظلوم لڑکی کو یوں زنداں میں قید کر کے تمہیں پر سکون نیند آجانی ہے؟ بولو۔“ وہ زور سے چلائی۔
 ”بھئی میں نے اسے قید نہیں کر رکھا۔ جاؤ جا کر دیکھ لو۔ اب بھی اس کے دروازے پر کوئی تالا نہیں ہے۔ وہ فتنہ واری اپنی خوشی سے قیدی بنی تھی۔ اور مظلومیت کا ڈھنڈورا بھی پیٹ رہی ہیں۔“
 ”تم نے اس کے پاس چھوڑا ہی کیا ہے۔ وہ کسی کو نہ دکھانے کے لائق ہے۔ کسی کا سامنا کرنے۔ کہاں جاؤ وہ؟“ آمد کا اس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کرنا ہے۔
 ”میں نے اسے اغوا نہیں کیا تھا۔ وہ وہ وہ جیتی جیتی ہے۔ اپنی خوشی اور سرگمی سے ابھی میرے ساتھ۔ اور اب جاؤ یہاں سے۔“

عبد العبین اٹھتے ہوئے آمد کو زور سا پرے دیکھ لیا۔ اس کا نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ جسم زہری طرح سے اٹھنے لگا تھا۔
 ”کیسے چلی جاؤں تمہیں بتانا پڑے گا سب کچھ مجھے۔“ وہ اسے بازو سے کھینچ کر اپنی طرف جھماتے ہوئے سختی سے بولی۔
 ”بابا صاحب کی کالی کرنے کی کوشش مت کرو۔“ وہ اس کے تحت لہجے پر زور کر بولا۔ ”آمد! اصل وقت میرا دل غم مت خراب کرو نہیں سچ تمہاری ساری ہک ہک سن لوں گا اور ہر فضول سوال کا جواب بھی پوری تفصیل سے دے دوں گا۔ اب خدا کے لیے جاؤ یہاں سے۔“ وہ بیڈ پر گرتے ہوئے لہجے میں بولا۔
 ”کیسے چلی جاؤں وہ اپنی اس حالت کی ذمہ دار میرا سر مجھے ٹھہرا رہی ہے۔ کیوں؟ تم نے اسے جو کاپیا نہیں محبت کا جھوٹا خواب دکھا کر اسے اس قید تمنا کی دولت میں ڈال دیا اور اس کے ان سارے ناقابل بیان دھماکے سببتی میں؟ کیسے بتاؤ مجھے؟ ابھی اسی وقت ورنہ میں رات بھر سو نہیں سکوں گی۔ بولو عبد العبین۔“
 وہ اس کے قریب آکر اس کا کندھا جھنجھوڑتے ہوئے تڑپتی سے بولی تو عبد العبین کئی کے سمارے ذرا سا پیشے ہوئے گہری نظروں سے دیکھتے لگا۔

”بلو! جواب دو۔ میں نے کیا بگاڑا ہے اس کا جو وہ میری وجہ سے ویرا ہوئی۔ میں تو خود تقدیر کی ٹھوکروں میں پڑی ہوں پھر میں کسی اور پر ظلم کا باعث کیسے بن سکتی ہوں۔ بولتے کیوں نہیں تم بہت اذیت سے گزر رہی ہوں میں۔ بتاؤ مجھے۔“

پوری طاقت سے مزاحمت کرتے ہوئے بھی آمنہ کا جسم محض پھرتا پھرتا ہی لٹکا تھا اور نشے میں ہونے کے باوجود اس کی گرفت بے حد مضبوط تھی۔ اسی وقت باہر کھولوں کی تیز تڑپاہٹ کو سنبھلنے لگی اور ساتھ ہی چیخ و پکار بھی۔ اندھیرا تو پہلے ہی ہر طرف چھا چکا تھا۔

زمین کو تھر تھرا دینے والا آکر کسرا تو کب کا خاموش ہو چکا تھا مگر اب وہ سراہنگامہ شروع ہو چکا تھا۔ شاید باہر لڑائی ہو رہی تھی۔ "کیا ہم سب کا انجام ایسا ہی عبرتناک ہو گا؟" وہ بچی نیشنل کے درمیان آخری تکلیف دہ سوچ آمنہ کے دھیان کی دیواروں سے سر ٹکرانے لگی۔

"پہلے زہب بھراں ہی اس کے بعد بابا صاحب اور اب میں۔ عبدالصغیر اور مجیر یہ مجیر یہ کہاں سے؟" یہ آخری سوال اتنیجیشان کن تھا کہ اس شہم جان جسم میں جیسے کوئی برق دو دو گئی تھی۔ مجیر یہ فنکشن رکھنے کے شوق میں پھلکے سے باہر گئی تھی۔ عبدالصغیر کے ہچکل چاڑھتے والے گلے سننے آمنہ کے متع کرنے کے باوجود۔ "وہ کہاں ہو گی؟"

آمنہ نے ایک آخری بھروسہ کو شش کے طور پر اپنی دونوں ٹانگیں زور سے اوپر کواٹھا لیں اور کھڑکی کے پاس رکھا لکڑی کا سینڈیلا ہرانا ہوا اس کے جسم کے ساتھ لگا۔ ایک لمحے کو اس درد نے کی گرفت آمنہ کی کمر کے گرد گھوم پڑی تھی۔ اس نے تڑپ کو ایک اور زوردار جھٹکا دیا اور لڑکھائی ہوئی کھڑکی کے پوکھنے سے جا لگرائی۔

وہ ششوں کی طرح اندھیرے میں اس کی طرف جھپٹا۔ آمنہ نے وہی سینڈیلا اٹھا کر پوری قوت سے اسے مارا تھا۔ ایک گھبراہٹ میں اس کے حلق سے نفی پھرا اس نے وہی بھاری سینڈیلا اٹھا کر پے درپے زمین پر تڑپتے اس زور سے کہ اس کے سر سے پانی پھرا۔

یاد رہے اور جھٹکا رہا تھا۔ باہر فائرنگ اور چیخ و پکار میں تیزی آچکی تھی۔ آمنہ نے ایک آخری زوردار ضرب اس ڈکراتے صلیبے کو لگائی اور زمین سے باہر کی طرف بھاگی۔ اس وقت وہ لان کی طرف سے باہر جانے والے دروازے تک بھی نہیں جاسکتی تھی۔ وہ پھلکے جسے کی طرف اندھیرا بھاگ رہی تھی۔ راستے میں بڑی ایست سے وہ اپنے گہری طرف سے لڑی تھی۔ شاید اس کے گھٹنے کے انگوٹھے کا ناخن اکھڑ گیا تھا۔ اس کی کہنیاں بھی پھل گئی تھیں اور تھوڑی پر بھی شدید چوٹ لگی تھی کوئی اس کے پیچھے زور سے چھٹا تھا اس نے اٹھتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔

وہی وحشی خون سے تھرتھرا اور لباس لیے اس کے پیچھے رختا ہوا آکر باقی محض چند قدموں کے فاصلے پر۔ آمنہ کے منہ سے خوف کے بارے میں چیخ نکلی تھی۔ وہ کانٹوں بھری بازو میں ابھی تھی۔

اس کا سارا جسم جگہ جگہ سے چھو گیا تھا اور ڈائن کا سوٹ بنا نہیں کہاں کہاں اٹک کر چھتھروں میں بدل گیا تھا مگر اس وقت اسے کوئی زخم کوئی خراش تکلیف نہیں دے رہی تھی۔

دوسری طرف وہ بھی لڑی جانب سے پولیس کا ڈیوٹی کے سائنٹ کی گواہی آتے لگی تھیں۔ آمنہ کے جسم میں جیسے کسی نے بجلی بھری تھی۔ بھاگتے بھاگتے اس کا سانس پھول گیا تھا اور جسم پیٹنے سے جھک گیا تھا۔ ایک بل کو اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیل چھایا تھا اسے سامنے بچھو دکھائی نہیں دیا اور چشم لٹان میں وہ گویا اندھی ہوئی کسی گاڑی کے بوئٹہ پر جا لگی تھی۔

بھاگتے کس طرح شروع ہوا یہ تو عبدالصغیر کو بھی پتا نہیں چل سکا تھا۔ مگر جب اس کا نشہ کچھ ہرن ہوا تو تھوڑی دیر میں والا خود کھوار بر لطف کیدرنگ کا منظر ایک وحشت ناک لہری میں بدل چکا تھا۔ ارد گرد میزوں لٹی چاری تھیں کون کس پر گولیاں برس رہی تھیں سر جھٹک جھٹک کر دیکھا مگر پتا نہیں چل رہا تھا۔ "بھگوان کو مولیٰ لینڈا لیا اور کروڑوں والوں نے حملہ کر دیا ہے زندگی چاہتے ہو تو بھاگ نکلو۔" پتا نہیں کون تھا جس نے اندھیرے میں اسے زور سے چھتے ہوئے کہا تھا۔

"آمنہ مجیر یہ اندر رہیں۔" یا ہر کی طرف دوڑتے ہوئے اس کے قدم بے اختیار تھم گئے۔ وہ دوسری جانب سے کھوم کر کو بھی کے اندر دینی جسے کی طرف بڑھا جو پکڑنے سے اندر جاتا تھا۔ "آمنہ مجیر یہ! آمنہ" وہ کمروں میں چلا آ پھر رہا تھا۔

"کہاں گئیں دونوں؟" وہ دونوں کی طرح اندھیرے میں چکر اڑا تھا۔ بار بار گھومتے ہوئے مگر کوئی کام نہ کر سکتے تھے۔ "میں تو برسے مان سے انہیں محفوظ دینے کو لایا تھا یہ کہہ کر کہ میں نے اپنی پاک باز سمنوں کی حفاظت۔" یہ وہ چھتے چلا ناٹک تھا اس پر رستے لگا۔

"اس کے اسی لمحے میں ان دونوں کے ساتھ تم جیسے مڑو کے گھر نہیں آنا چاہتا تھا مجھے پتا تھا تمہارا سہارا دنیا کے بوڑھے ترین سہاروں میں سے ایک ہے۔ اسے تم تو اپنی حفاظت نہیں کر کے تو ان دونوں کی جیسے کرتے ملحت ہو تم پر عبدالصغیر۔" اسے لگا صوفی صاحب اندھیرے میں لڑتے دونوں ہاتھ اٹھا اٹھا کر اسے کوس رہے ہیں۔

وہ ایک کمرے سے بھاگ کر دوسرے میں آیا۔ صوفی صاحب کا چہرہ اور جسم اس کے ساتھ وہ ادھر سے بھاگا۔ "وہاں اس کے حلق سے پانی پھرا۔" شہریتہ نے ایک بجلی کی لہر اس کے دماغ میں کوندی دیا گھولوں کی طرح میرے پیڑھیوں کی طرف دوڑا۔

شہریتہ میرے پیڑھیوں کے پاس ہی مہو حشر کی کھڑی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ "کے کیا ہوا ہے ابھر؟" اس نے پوچھا عبدالصغیر کا بازو پکڑا۔ "نکلو یہاں سے نکل چلو۔" وہ گویا ہوئی تو پکڑا نہیں چکے گا۔ بھاگو۔" عبدالصغیر اسے گھسیٹے ہوئے میرے پیڑھیوں سے نیچے لے آیا۔

دونوں جھپٹتے ہوئے پھیل دیوار بھانڈ کر اس کانٹوں بھری بازو میں گھرے تھے۔ "شہریتہ کس کس کی۔" شہریتہ کے منہ سے بے اختیار دہلی دہلی چیخیں نکلی تھیں۔ زندگی پھولوں کی چیخ تڑارنے والی شہریتہ کو اس کے پتا چلا زندگی کے کانٹے کتنے آگیا۔ وہ ہوتے ہیں۔

"بھاگو اگر عزت و جان سلامت چاہیے جلدی۔" عبدالصغیر اسے سنبھالتے ہوئے خود منہ کے بل کرنا تھا اس کے ماتھے سے بے اختیار خون بہنے لگا۔ وہ شہریتہ کو گھسیٹتے ہوئے مڑا کر لے آیا۔ مڑا کر رات کے اس پیریا لنگ ویران تھی کچھ علاقہ بھی شہر سے ڈراہٹ کے تھا۔ دائیں ہاتھ پر جھڑک خالی پلاٹ تھے جن پر پہلی خاص چھوٹی اور درخت اسے ہوتے تھے وہ دونوں وہیں آ کر رہے تھے۔

"تمہارا ماتھے سے لٹان نکلا رہا ہے۔" نگار جسم سے اٹھتی تھیں کو دباتے ہوئے شہریتہ نے عبدالصغیر کی جانب دیکھا۔ "مجھے پھر روستو۔" عبدالصغیر نے اس کا ہاتھ کی جانب دیکھا ہاتھ جھٹکا۔ "میں جا رہا ہوں۔" آج سے اس لمحے سے میری طرف سے آکر وہ جہاں ہی چاہے چلی جاوے اور اب وہ نہ کو جاوے۔" عبدالصغیر نے سر کے زخم سے اٹھتی تھیں کو دباتے ہوئے رخصتی سے کہا۔

"چنانچہ میں اس بچے کو کیا ہو گیا ہے اسے دن اسے بخار چھارہتا ہے۔ صحت دیکھو اس کی، کتنی خراب ہو چکی ہے۔ اللہ جانے اتنی ہی جان کو کیا غم لگ گیا ہے۔" زینون بانو کر تضحیٰ کو غصہ سے پانی کی پٹیاں گری رہی تھیں اور مسز خان قہر مند لہجے میں اسے دیکھتے ہوئے شہباز خان سے کہہ رہی تھیں۔

"ام جان بچہ ہے اور بچے بیمار ہوتے ہی رہتے ہیں اس میں فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"شہباز خان تھے بچوں سے ہر بات میں یوں نہ پھلا میں نے ابھی تک نہیں کہا ہے اور آگے سے ان کے بچے بھی کوئی بھی بچہ پونہ بیمار نہیں ہوا تم نے خود کو کاروباری مصروفیات میں گم کر لیا ہے اور میں صحت کی وجہ سے اس بچے کو ناگرم نہیں دے پالی ہمارا دن اسکول سے آنے کے بعد بولایا بولایا پھرنا ہے۔" آخر یہ سب تک بچے کے لیے گا۔ "وہ ایک دم غصے میں آکر بولیں۔

"کیا مطلب؟ کیا سب کچھ۔" دو بچہ حیران ہو کر بولے۔

"شہباز خان اس نے تو مکمل توجہ کی ضرورت ہے تم کیوں نہیں سمجھتے۔" وہ ان کی حیرت پر جھلا کر بولیں۔

"ام جان کچھ شش و گرتا ہوں شام کو جلدی آگرا سے باغیچوں۔ اب یہ بھی آپ کی طرف نظر آئی کہ میں برنس کو توجہ دلاں، محض گریباں میں انحصار کر کے نہ بیٹھ جاؤں، اب سنے ٹکڑو بار کو اتارنے کے لیے باغیچہ اور توجہ کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے اب کو معلوم ہے۔"

"شہباز خان تم جرم جرم برنس کرنا اور توجہ کا بھی سوچو۔"

"کیا سوچوں۔" وہ اب کے جھجھلا کر بولے۔

"تم وہ سری شامی کر لو۔" وہ غصے سے غصے میں بولیں تو ایک بل کو شہباز خان کچھ بول ہی نہ سکے نہ بہت چمچے سے ان کے سر پر آگے سے ہی گئی وہ بڑی سچی نظروں سے مسز خان کو دیکھنے لگے کیا ام جان نہ بہت کے زندہ ہونے کی شہباز خان کی طرف سے انہیں اس کا ٹکڑو ہو کر دیکھ کر بچ کرنا چاہتا تھا تو جواب نفی میں ملا بھی نہیں۔

"کیا کے لون سے سمجھ دے یہی ہوں سری کر لوں" وہ ہڑلا کے۔

"ام جان دو سری بونی سوئیں ہاں بول ہے آپ یہ یوں بھول رہی ہیں۔" وہ تضحیٰ سے بولے۔

"پانچوں انقلابیوں برابر نہیں ہوتیں، انہوں نے میں انہیں لڑکیوں۔"

"میں نام جان پھر بھی بہت ساری باتیں کہیں گے میں انہیں کو بھلانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس نے دہائی ہوئی ہے اسے اب سوچنا چاہیے۔" انہوں نے آگے بڑھ کر خالی خالی نظروں سے تکتے اور تضحیٰ کو اپنی باتوں میں بھر لیا۔

ار تضحیٰ تو اس کے میں آکر تو صے گھنے میں مو گیا تھا حیران کی نیند جیسے کوسوں دور چلی گئی تھی۔

"بہت کے ہوتے دو سری شامی۔" دو سری بونی کی سہمی بہت کا خیال ہی اس قدر متھلے خیر چوٹا دینے والا تھا کہ انہیں لگا کہ وہ اس خیال کو سوچتے رہے تو شاید زندگی بھر اٹھ نہیں جھپک سکیں گے۔

"میں ایسا کچھ نہیں ہوسکتا،" تکتے تکتے انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر وہاں نہیں کر لیتے یوں بے چینیاں یہاں غصہ اسیاں رکھتا ہے۔" ان کے اندر کوئی چلایا۔

"میرا گریز اپنی جگہ وہاں ہو کر نہیں سوچ سکتی، ار تضحیٰ کی خاطر اپنی انا کو لات نہیں مار سکتی، بچے کی جدائی اس کی بیماری دینا کی کسی بھی ماں کو بے چین و بے قرار کرنے کے لیے کافی ہے تو یہ کیسی ماں ہے۔" انہوں نے سارا بوجھ نہ بہت کی انا پر ڈال کر خود کو خالص باکا محسوس کیا۔

"ہاں بے سے بے وہ ایک بھولی بھولی تھی تم اسے بھولی کا مقام نہ سبناں کچھ بھی نہ دے سکتے تو ایک ماں کی قدر کیا کرو گے۔" جتنا نہیں اندر کا انسان اتنا ظالم ناقد کیوں ہوتا ہے، کچھ بھی پچھا رہتے نہیں دیتا۔ انہیں اور غصہ آیا۔

"ٹھیک ہے میں کل آخری بار جاؤں گا اور اسے ساتھ لے کر لوں گا، آروہ مانی تو ہیں۔" انہوں نے رک کر فیصلہ کر لیا۔

"ہاں آروہ مانی تو وہاں کے راستے الگ تم اسے آرا کر دینا اور کسی دوسرے راستے کے پارے میں ار تضحیٰ

منو لو۔ تم جو یہ ہونا،" وہ لاکھڑم اس کے پاس دوڑا تو بیٹھ گیا تو اس کے یوں ایک ٹکڑو دیکھنے پر توریہ کے ذہن میں ایک گوند سا پکا آسے یوں لگا اس نے نہیں یہ یہ چہ بہت قریب سے دیکھ رکھا ہے یا یہ چہ اس کے تخیل کو اتنا ازربے کہ اسے اپنے دھیان کو ٹٹولنے کی بھی ضرورت نہیں اس کے سر دھکتے ہوئے ہونٹ محض پھر پھر کر رہ گئے۔

"اوہ میرے خدا! میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم سے یہاں اس جگہ ملاقات ہوگی، وہ بھی ایسی حالت میں۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بے یقینی سے بولا۔

"تم یہاں کیسے؟" جو یہ یہ کی سسلیاں اور بھی تیز ہو گئیں۔

"یہ کھرب۔" اس کے ہاتھ پر الجھن بھری ششیں تھیں اس وقت ارد گرد بھاگتے دوڑتے قدموں میں تیزی آئی، شاید کوئی اٹا افسر آیا تھا۔

"تو میرے ساتھ اٹھو جلدی کرو، اس سے پہلے کہ تمہیں بھی شامل تفتیش کر لیا جائے، ابھی تمہیں کھینچے نہیں دیکھا۔" تیزی سے کتے ہوئے اس نے سرچ لائٹ بند کر دی۔ اور جو یہ یہ کا ٹھنڈا رقبہ ہاتھ اپنے سر پر منو لو ہاتھ میں جکڑتے ہوئے اسے کھینچے گا۔

"کہاں۔ کہاں جاؤں گی میں۔" وہ اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ پھڑکانے لگی۔

"تو میرے ساتھ سوال نہیں کرو۔" وہ اسے کھینچتے ہوئے باہر بڑی لائٹ کا ڈی کے قریب لے آیا۔ گاڑی کی ڈرائیو تک سیٹ پہ بیٹھے یونیفارم میں بیٹوں وہ ان سے اس نے پوچھا تو وہ ڈرائیو تک سیٹ پر چھوڑ کر باہر نکل آیا اس نے برق رفتاری سے چوریہ کو دو سری نشست پر بٹھایا اور خود گاڑی تک سیٹ سنبھال کر بے حد تیزی سے گاڑی یہاں سے نکال لے آیا۔

معاذ نے کسی کو تیزی سے بھاگ کر گاڑی کے آگے آتے دیکھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہاں سے گاڑی کے آگے سے تیزی سے گاڑی کے ہونٹ سے ٹکر کر پھٹنے لگا تھا، معاذا گاڑی بند کر کے تیزی سے باہر نکلا تو گھرے ہوئے شخص کو دیکھ کر اسے جھٹکا سا لگا۔

وہ ایک لڑکی تھی اور وہ بھی بے حد خستہ حال میں۔

اس کا جسم سر پر لٹنے والی بوٹ کے علاوہ جگہ جگہ سے زخمی تھا اور اس کا لباس کھینچنے سے بھی سالم نہیں تھا۔

"پتا نہیں زندہ بھی ہے کہ لڑ چکی۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے لڑکی کو یہ ملو کے بل سے سیرکھا لیا۔

وہ چہ جو کئی دنوں سے اس کے شعور اور لا شعور کی جو کھٹ کے پچھلے خطرہ سے براہمان تھا، تھوڑی تیزی سے حالت میں یوں سر راہ اس کے سامنے تھا۔ معاذا کا دل بلبا رہی تو زور سے دھڑکا۔ اس کے ہاتھ بے اختیار اس کے دل اور گلابی کی بوہنوں کو ٹٹولنے لگے۔ وہ سر سے بل ہوا سے سرعت سے اٹھا کر گاڑی میں ڈال چکا تھا۔

"تو نہیں زیادہ لہری نہیں تھیں، تمہیہ اس وقت اس خیال میں۔" اس کا ذہن ریش ڈرائیو تک کے دوران بھی الجھ رہا تھا، امن کے جسم پر تو کوئی چیز بھی پورا نہیں تھا۔ نفی کہ وہ پلہ بھی نہیں اور اس حال میں وہ اسے نکال لے جائے۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔

فخر حیات اور رخصتا حیات آج شام ہی کو لندن گئے تھے۔ جہاں فخر حیات کا مکمل میڈیکل چیک اپ ہونا تھا۔ اور ان دونوں کی واپسی ڈیڑھ ہفتے بعد تھی یوں اس حال میں وہ اسے گھر بھی نہیں لے جاسکتا تھا۔

اس کی گاڑی آپوں آپ جاتے پچھانے دستوں پر مڑنے لگی۔

ار تضحیٰ کو بہت تیز بخار تھا، ڈاکٹر کو چیک کرانے اور وہ ایسے کے باوجود کو صبحی رات تک اس کا بخار کم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دوبار معاذا کو بھی کل کر چکے تھے جو ہسپتال میں موجود نہیں تھا، ڈاکٹر اوکے کے ساتھ شہر سے باہر نہیں گیا ہوا تھا۔

کہتے تو کیا۔ وہ زیور گل کے چہرے کے بدلے رنگوں کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر خیر انداز میں کہہ رہے تھے۔ جب میں مارا کمرے سے باہر نکلی تو وہی آئی۔

”ابو شاہو جی! بعد کوئی آپ نے میں کب سے آپ کا نمبر ملا رہی تھی۔ آپ نے میپائل کیوں آف کر رکھا ہے۔ پھر میں حویلی کرتی تو آپ کھانا ہوتے۔ مجھے نہ آن چیک اپ کے لیے جانا تھا سوچا آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ اب تھوڑے دن تو رہ گئے ہیں ڈاکٹر کہہ رہی تھی اب ہر پھٹے آنا ہوگا چلیں۔“

میں تارا پر جوش لیے اور کھلے کھلے چہرے کے ساتھ سید سلطان بخت کے بازو سے لپٹے ہوئے بالکل نارمل انداز میں کہہ رہی تھی۔ ایک بل کو تو سید سلطان بخت نے بھی خاصی حیران نظروں سے اس کے اس روپ کو دیکھا اس کے چہرے پر کسی بھی نفرت وغصے یا تعجب کا تاثر نہیں تھا۔ انہوں نے فوری طور پر زیور گل کی طرف دیکھا جو کسی بھلاک کی طرح حوصوفے پر بیٹھا ہوا ہو کر گر چکی تھی۔

”شیوڑ کیوں نہیں میری جان! میں آج آیا ہی اس لیے ہوں کہ اپنی جان کو اپنے ساتھ چیک اپ کے لیے لے کر جاؤں بعد میں وہ میری ساری شائستگی کریں گے نہ باہر اور بعد میں سید ہاؤس چلو گی نا۔“ وہ چلنے لگی اور اس کے ساتھ پروگرام ملے کرتے ہوئے بولے تو وہ اثبات میں سمہلانے لگی۔

”ہو اس صدمہ کو تم سے نہیں لے کر جاؤں تمہارا سے دفع ہوتے ہو یا میں پولیس کو فون کر دوں۔“ زیور گل اٹھتے ہوئے اذیت میں گر غرائی۔

”تمام کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ آپ شاہو جی کیسے بات کر رہی ہیں۔ میرے سبب ہیں مجھے کہیں بھی لے جا سکتے ہیں۔ آپ پلینز مجھے شادی کا خیال رکھنے گا۔ اس کی نیند بچل چکی ہے نہیں اٹھ نہ جائے۔“ میں مارا نے آگے بڑھ کر زیور گل کے گلے میں بازو سما کر کے اس کا منہ چھو کر اسے لٹ کر سلطان بخت کو دیکھنے لگی۔

”اب زیور گل! میں ذمہ کے بعد عین تارا کو اور میری ڈراپ کیوں کر دوں۔ اور اس میں چھوٹا سا زخمی ہے۔ فرینڈ کے ساتھ جا کر لو تو تمہارا ذہن بگ بگ ہوا جائے گا۔ یہ ایک لاکھ روپے کا چیک ہے۔ کاہر ہے نا۔ اس ہوگا۔ آج شام کے لیے فی الحال اس میں لاہارا کو لو تو اس بارہ کے قریب ہیں۔“ سلطان بخت نے کوٹ کی جیب سے چیک نکال کر زیور گل کی گود میں چھپنے کے بعد ہزار ہزار کے دس لاکھ نوٹ اس کی گود میں اچھالے اور چند لمحوں میں میں مارا کو لیے مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے اور زیور گل کسی پتھر کے بخت کی مانند اس کھلا کھاتے چیک اور مسکراتے لوٹوں کو دیکھنے لگی۔

اب میں تارا فی الحال اس کے کسی کام کی نہیں تھی۔ اس کا حسن نے اس کی تو از اور اس کا جسم کچھ بھی مزاح بخش نہیں رہا تھا۔ اور یہ سچ تھا زیور گل کے ایک پر بے حد کھی تھی اگر یہ بھی سچ تھا اس نے بہت دنوں بعد اسے سارے نوٹ اکٹھے دیکھے تھے اور لگا بڑا چیک تھی اور یہ بھی سچ تھا کہ وہی دنوں سے نئی شاموں سے ہٹی کے وکھ کی وجہ سے کھر تھی خود بھی شہ پارک ہو رہی تھی اور یہ بھی سچ تھا وہ دنوں سے کئی اچھے دوست کے ساتھ ایک اچھی شام نہیں مناسی تھی۔

اس چیک اور نوٹوں کو دیکھتے دیکھتے اس کا جسم ڈھیلا ہوا چلا گیا۔ عین مارا کا حسن آواز اور رنگ اور جسم کچھ بھی متاثر نہیں رہا تو لیا ہوا اس کی ویو اگی کیسا ہر اہم نظر اس کی آنکھوں کو دکھانے لگی تھی کہ کئی دنوں سے بوجھاپ کے دوست چچا اس کا جسم یکدم جیسے تن اٹھا تھا۔ وہ اب اپنے پرانے دوستوں کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ کس کو فون کر کے اچھی شام چرانے کا پروگرام بنائے۔

دیکھو نوبت! جو نوبت! کتاب جلدی کرو جتنی تاخیر کوئی فیصلہ و شمار ہوتا جائے گا۔ اور ابھن بڑھتی جائے گی اگر تم رست الگ کرنا چاہتی ہو تو طلاق لے لو۔ غم کی گریں کی بات پر نوبت نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا۔

”تو طلاق نہیں لینا چاہتیں۔“ وہ مسکراتی رہی اور ان کے گھوڑے سے بھی نیچے نہیں اترنا چاہتیں۔

”ایسی کوئی بات نہیں آپ کو معلوم ہے میں نے بہت دفعہ خود کو ان کے قدموں میں گرا کر رکھی معافی مانگی ہے۔ اس گناہ کی توبہ میں نے کیا ہی نہیں مگر اس کے پاؤں کسی نے میرا نہیں۔“

”نوبت! یہ سب پہلے کی باتیں ہیں وہ بھی میرا خیال ہے یہ سب کچھ بھلا کر تمہاری طرف آیا ہے۔“

”تو پھر کیا چیز انہیں روکتی ہے۔ کھل کر کہتے کیوں نہیں۔“ وہ تیزی سے بولی۔ ”ابھی تک انہوں نے ایک بار بھی اسے دل کی بات نہیں کہی اس تعجب کو میں کیا سمجھوں۔“

”تم مجھے اپنے دل کی بات بتاؤ۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔

”یہ تو مجھے بھی نہیں بتا۔“ وہ جیسے تھک کر بولی۔ ”یاس آتے ہیں تو انہیں دور بھٹکے بنا چاہتی ہوں اور جاتے ہیں تو بے قراری ہی لگ جاتی ہے۔“ وہ بولے سے اعتراف کرتے ہوئے بولی۔

”میں انہیں سے تم دونوں کے بیچ وہ مضبوط دھکا جس کا ایک ایک مڑا تم دونوں نے مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔ مگر اس کا اثر نہیں کرتے۔“

”ایسی بات نہیں وہ میرے اقرار کو میری کمزوری سمجھتے ہیں۔ میرے اقرار کا کچھ بھی فائدہ نہیں۔“

”نہیں یہ ایک گمان ہے جو تمہارے دل پر رکھا ہے کہ ایسے ہی ہوگا۔ نوبت! کبھی ایسا نہیں ہوتا جیسا ہم نے حساب لگا رکھا ہوتا ہے کہ ہم جھگیں کے تونکا نہیں تم تریا کمزور سمجھے گا۔ نوبت! میاں بیوی کے رشتے میں سب سے بڑی دشمنی کہہ لو یہ انا ہوتی ہے کیا پتا تم کو اور وہ تمہاری پہل کا منتظر ہو۔“

”نہیں میں پہل نہیں کر سکتی۔ تمہاری بار نہیں بہت بار خود کو گرا کر دیکھ چکی ہوں۔ اب یوں گرا کر محبت نہیں مانگیں کی اور میں محبت مانگتی نہیں کرتی مجھے پتا ہے۔“ وہ آنکھوں میں اترتی ہی گویا تھوں سے صاف کر کے لے کر چلی گئی۔

”تو اتنی ہی اس کے بارے میں تم دونوں نے پچھو تم نے لیا سوچا ہے۔ اس کی زندگی کے یہ ابتدائی قیمتی سال جس میں اس کی نفسیات ڈیولپ ہو رہی ہے۔ تم دونوں کی یہ خود پسندی کیا رول پلے کرے گی۔ ایک نہ ایک دن تو حقیقت اس پر منکشف ہوگی۔ تب یہ خود کو اس لذت سے لڑے گا۔ بروکن فیملی کے بچے کیسی نفسیات لے کر رہے ہوتے ہیں۔“

”نوبت! اس کے بارے میں تم دونوں نے پچھو تم نے لیا سوچا ہے۔ اس کی زندگی کے یہ ابتدائی قیمتی سال جس میں اس کی نفسیات ڈیولپ ہو رہی ہے۔ تم دونوں کی یہ خود پسندی کیا رول پلے کرے گی۔ ایک نہ ایک دن تو حقیقت اس پر منکشف ہوگی۔ تب یہ خود کو اس لذت سے لڑے گا۔ بروکن فیملی کے بچے کیسی نفسیات لے کر رہے ہوتے ہیں۔“

”کون ہے یہ لڑکی؟ اور اوھر کیوں رہ رہی ہے۔ کیا اسے بھی خیر سے شہباز میاں لانے ہیں آپ تو جماندہ ہیں۔ کم از کم کسی نیا کت کا ہی خیال کریں۔“ وہ تڑخ کر بولی۔

”بھائی! شہباز خان نے جتنا ضبط کر لیا ان کے نزدیک کافی سے زیادہ تھا۔ وہ غصے سے منہ چھو لیے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایا نے بھی ہنسی کو گھور کر دیکھا۔ مگر وہ کندھے اچکا کر مسز خان کے دوسری جانب سر جھکا کر بیٹھی آئے کو مستنجر بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

”آج مجھے روک رہے ہو، کل کو سارا زمانہ کسے کا پھر کس کس پر آنکھیں نہ لگو گے، بھئی شہباز میاں! تمہارا تو ہر کام نرالا۔“ وہ اسی جملے کے انداز میں بولی تو شہباز خان نے ہنسنے سے انکار کیا۔

”آج تمہیں خاص سوش رہنے کا کہہ رہی تھیں۔“

”آخر آپ کتنا کیا چاہتی ہیں؟ شہباز خان نے ضبط بھرے لہجے میں پوچھا۔

”بھئی کیا فارسی بول رہی ہوں یہ لاوارث لڑکی کون ہے اور اوھر ڈیرے ڈالنے کیوں بیٹھی ہے۔ اور آپ کو یوں کھانا پلانے کیوں ہے؟“ وہ طنز لہجے میں بولی۔

”معاف کیجئے گا، آئندہ لاوارث نہیں اور نہ اس کے اوھر ڈیرے ڈالنے کے ارادے ہیں کیونکہ میں اسے لے جا رہا ہوں مہیا اپنے لیے اور ارادے۔“ معاذ کہتے کہتے رکھا اور مڑ کر شہباز خان اور مسز خان کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں آمنت سے نفاق کر رہا ہوں، ارادے ہیں۔“ وہ خسر خسر کر بولا تو آمنت نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

”ماشاء اللہ بہت نیک ارادے ہیں، غصے سے اٹھایا اور بیچ پر بٹھایا بہت خوب، بھئی ایا ز ہمیں تو جھک سے نرالا سسرال ملا اور عجوبہ روزگار سسرالی۔ ویسے معاذ میاں! آپس کی بات ہے لڑکی سے پوچھ لیا یا اس کی بھی ضرورت نہیں۔“ اور آنکھیں گھما کر آمنت کو دیکھتے ہوئے مستنجرانہ انداز میں بولی۔

”آمنت بھئی آپ ان کی فضول باتوں کو نہ ماننا یہ ان کی عادت ہے جس سے یہ مجبور ہیں۔“ معاذ آمنت کو روٹے دیکھ کر بیٹھی کے بولا۔

”تمہیں آپ سے شادی ہرگز نہیں کروں گی آپ نے یہ سوچا بھی کیسے؟“ وہ غصے سے ایک دم چیخی تو کمرے میں ایک بل کو سنا نا پھا گیا۔

”غصے میں چند ثانیے کے لیے کھانا پھا گیا، صرف آمنت کی اپنی اپنی سی سسکیاں تھیں جو اس سانسے میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔“

معاذ نے ایک نظر آمنت کو دیکھا اور سر جھکا کر پناہ لیا۔

”نہ روزی تو معاذ کے ساتھ کوئی زیورستی نہیں کر سکتا۔“ مسز خان نے ہاتھ بڑھا کر آمنت کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

نزہت نے ایک نظر ان کے ناراض چہرے پر ڈالی اور کوئی بھی جواب دینے بغیر اپنے کمرے میں آگئی اور بستر پر بیٹ جانے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ جن باتوں سے بچنے کے لیے وہ اس کمرے میں آچھی ہے وہ تو پہلے سے اس کے تکیے کے نیچے سے سر اٹھائے جھانک رہے ہیں۔

”کاش صرف میرا جھکننا کام آسکتا تو اتنی تھنی میری جان میں سو بار جھک جاتی میں ایک نظروں سے گری ہوئی بیوی بن کر تو رہ سکتی تھی۔ مگر اپنے بیٹے کے سامنے اس کی ماں کی تدبیریں نہیں سہ سکتی یہ بہت مشکل ہے بہت مشکل یہ میری خود غرضی سہی مگر میں یہ نہیں کر سکتی۔ کاش میں بہت کر کے بہت پہلے بہت کر کے یہ شہر چھوڑ کر جا چکی ہوتی تو آج ان کڑے سوالوں سے بچ جاتی۔“ روٹے روٹے وہ تھک گئی تھی۔

”فرار کب تک، تم دونوں اس مسئلے سے بھاگتے رہو گے۔“ کھڑکی سے جھانکتے چاند سے سوال کیا تو اس نے تکیے میں منہ چھپا لیا۔

رات بھی اتنی طویل تھی کہ گزرنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کمرے میں بدل بدل کر اس کا جسم دیکھنے لگا۔ اسی وقت کال بیل بجی۔

”اس وقت کون آیا۔“ اس نے ڈھائی بجانے والی کلاک کی طرف تشویش سے دیکھا۔

شاید جو کیدار نے دروازہ کھول دیا تھا۔ قدموں کی آواز کارینڈو سے آتی آتی اس کے کمرے کے آگے بڑھ گئی۔ اس نے جلدی سے اپنا چہرہ صاف کر کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ کوئی دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

”ہائیک۔“ کہتے ہوئے اس نے خود ہی دروازہ کھول دیا۔

”آئی یہ جویریہ ہے۔ جویریہ۔“ کارینڈو میں جلتے نائٹ بلب جگمگا رہتی تھی اس نے ساؤنڈ میں بیٹھی اس کی کم سن پرکشش چہرے کو دیکھا جس کی متورم آنکھیں اس کے ہاتھوں کی طرف تھیں۔ اور دونوں پر بھی پڑی اس کے پاس سے ہونے کی۔

کوئی سوال پوچھنے کی بہت سی نہ ہوئی۔

”آجاؤ۔“ اس نے جویریہ کو رست دیا۔

”میں جا رہا ہوں۔ اس وقت آن ڈیوٹی ہوں آپ پلیز اس کو کچھ حلا پلا دیجئے۔ میں صبح جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔“ وہ کمرے میں اور خدا حافظ کہتا واپس مڑ گیا۔

نزہت نے ایک کمرہ اس کے دروازہ بند کیا اور جھکاتے ہوئے سہمی کھڑی جویریہ کو دیکھنے لگی۔ جو آنکھوں میں اترتے آنسوؤں کو چپک چپک چپک کر روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ارے واہ یہ اچھا آپ لوگوں نے گھر کو تمہیں خانہ بنا رکھا ہے جو زمانے میں بے سہارا لاوارث متا ہے تھا کر لے آتے ہیں نہ آگے کا پتا ہوتا ہے نہ پیچھے کا اور پھر یہ مہمانی کافی نہیں ہوتی بلکہ اسے تا عمر اوھر ہی گھر کا مین ہڈی محبت و مہمانی سے پناہا جاتا ہے۔ واہ ایسے حتی تو نہ دیکھے نہ سنے۔“ یا سمیمن کے جانے کے بعد ایا ز کی بیوی نے اس کی سیٹ سنبھال لی تھی۔ اور وہ اس کا کردار بڑی خوبی سے ادا بھی کر رہی تھی۔

”بسوا! انسان کو بولنے کے پہلے کم از کم ایک بل کو سوچنا ضرور چاہیے مگر تمہیں قدرت نے مجھے دونوں ہونٹیں اس وصف سے بنائی کیوں عطا کیں۔“ مسز خان نے کچھ دیکھی لہجے میں کہا۔

”چلیں خدا نے تیری ہونٹ سارے گنوں والی دی تھی۔ آپ نے تو اس کو بھی نہ دیکھے دیا۔“ وہ فوراً چپک کر بولی تو شہباز خان کے چہرے پر ایک مہابہ ساہرا گیا۔

”چھانم کڑے نمونے نہ اٹھاؤ یہ بتاؤ اب کیا مسئلہ ہے؟“ مسز خان نے قدرے اکتا کر کہا۔

تو پھر اپنے اعتبار کے دائرے کو توڑا سما اور پھیلا کر اپنے دل کو یقین دلاؤ کہ تم اچھے لوگوں میں ہو اور تمہاری خوش قسمتی و شکر ہے رہی ہے۔ معاذ کوان ہی بوڑھے ہاتھوں نے پروان چڑھایا ہے اور ان آنکھوں نے اس نئے کو بوش اختیار کی نظر سے دکھا ہے۔ میں تم پر کوئی زبردستی نہیں کرتا چاہتی تھی نہ اپنا کوئی فیصلہ یا ارادہ تم سے زبردستی منوانا چاہتی ہوں۔ میری تو اس میں خواتین سے کہ تم اس وقت زندگی کے جس اندھے موڑ پر کھڑی ہو، میں روشن رستے کا پتا تمہیں بتا سکوں۔ میں صرف تمہیں اس رستے کے بارے میں بتا سکتی ہوں اس کے روشن یا تاریک ہونے کی گواہی تمہارا وجدان ہی دے سکتا ہے۔ معاذ کے کردار میں اگر کوئی کھوٹ یا کجی ہوتی تو وہ تمہیں اس اندھیری رات میں ادھر بھی نہ لاتا۔ اس کے کردار کے مضبوط ہونے کی گواہی تم اپنے دل سے بھی لے سکتی ہو، چاہو تو اس معاملے میں سوچ بچار کرو ایک دن دو دن گزرنا وہ نہیں۔ میں تمہیں یہاں ہمیشہ کے لیے بھی رکھ سکتی ہوں مگر دنیا کے طے اور ظالم نظریں تمہیں چند ہی دنوں میں لہو بہان کر دیں گی۔ یوں بھی مجھے تو اپنی اگلی سانس کا بھی اعتبار نہیں اس لیے میری وہی خواہش ہے کہ تم معاذ جیسے مضبوط سارے کا ہاتھ تمام لوہ جلدیاد میں تمہیں اس نوعیت کا کوئی نہ کوئی فیصلہ تو کرنا ہی پڑے گا۔

وہ رگ کر کے چہرہ پر دیکھنے لگیں۔ وہ مستبذیب سی اپنی آنکھیاں چٹکارتی تھی۔ مسزخان کی نظروں کا ارتکا اپنے چہرے پر محسوس کر کے اس نے نظریں اٹھائیں۔
 ”میری بہن جو یہ بھالی۔ اس کے بغیر میں یہ کہنے کر سکتی ہوں خود سے۔ وہ اٹک اٹک کر بولی۔
 ”ایک بار تم اپنے قدم زمین پر مضبوطی سے جما لو گی تو پھر ان کی تلاش نیا وہ سہل طریقے سے کر سکو گی۔ وہ کہتے ہیں نا ایک سے دو بھلے۔ معاذ تمہارے ساتھ ہو گا تو دیکھنا، دنیا بھر کی انمول خوشیاں کیسے تمہاری جھولی میں آکر گر سکیں گی۔“

”آپ مت اچھی ہیں۔“ وہ بے حد آسکتی سے بولی۔ اس کا ہاتھ اس کے منہ میں تھا۔
 ”بیٹا! اچھی میں نہیں تم ہو۔ اس لیے میں تمہیں اچھی نظر رکھنے کی بات کہتا ہوں۔ یہ چھائی میں بھی اچھی نظر رکھنے کی بات کہتا ہوں۔ اپنا عیت مغیریت یہ سب دلوں کے ریلٹے ہوتے ہیں۔ آپ کو دوسرے کے لیے اپنے دل میں وہی کچھ نظر آئے گا جو مقابل کے دل میں آپ کے لیے ہے۔ کسی کی محبت اور محبت کو پرکھنے کا یہ سب سے آسان طریقہ ہے۔ اپنے دل میں جھانکنا اور جتنی پورا آپ کے دل کو دوسرے کی ہوگی اتنی ہی دوسرے کے دل کی ہوگی۔ نہ رتی کم نہ رتی زیادہ۔ جب دل چاہے اس تسلی کو پرکھ لینا۔“ آمنت کچھ بھی کہے بغیر انہیں دیکھتی رہی۔
 ”آمنت! تم زندگی کے اس موڑ پر کھڑی ہو، جہاں تمہارے پاس کوئی بھی اپنا خون کا رشتہ موجود نہیں کہ جن پر بندہ آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکتا ہے۔ اگر کوئی دکھا جائے تو یہ بھی کوئی فارمولا نہیں کہ خون کے رشتہ پریشانی آپ کے اعتبار پر پورا اثر نہیں مگر جس حال میں تم اپنے بھائی کے گھر سے عزت اور جان بچا کر نکلیں۔ انہوں نے آمنت کے لیے زخم کو پھیل دیا۔ اس کی آنکھوں میں پھرتے وندھ جھانے لگی۔
 ”میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا، صرف یہ بتانا تھا کہ اگر ایسا اپنا کوئی بھی پاس نہ ہو سمارے کے لیے تو پھر آہی کو اپنے اندر کی آنکھ سے کام لے کر اعتبار کے رشتے ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ اب تم نے ہم پر اعتبار کیا ہے تو اوپر بھی ہونا پڑے گا۔ چند روز پہلے تک نہ تم ہمیں جانتی تھیں نہ ہم تمہیں۔“
 وہ سانس لینے کو نہیں۔ آمنت دہنے کے پلو سے آنکھیں رگڑنے لگی۔
 ”میرا تم سے کوئی خون کا رشتہ نہیں اس کے باوجود کیا تم مجھ پر اعتبار کرتی ہو؟“ انہوں نے شہادت کی انگلی سے اس کی ٹھوڑی ڈرا سی اور پوچھا۔ آمنت نے روئی روئی آنکھوں سے آنکھیں دیکھا۔
 ”بولو بیٹا، مجھ پر پتا اعتبار ہے؟“
 ”نہیں۔“ اس نے خفیہ سا سر ہلایا۔

تو کیلا تیرا اپنے سینے پر رکھتے ہیں اور اپنے بچوں تک ان تیروں کی ڈرا سی آج بھی نہیں بچنے دیتے اور جب اس باپ بندہ رہیں تو بچوں کو خود ہمارا بن کر ان تیروں کے سامنے سینہ سپر ہو جانا چاہیے ورنہ یہ ظالم دنیا چند ہی ٹھوکوں میں انہیں چل کر رکھ دے گی اور بہت خاص ہوتے ہیں وہ لوگ جن کو تقدیر زمانے کے سامنے سینہ سپر ہونے کا موقع دیتی ہے اور جب وہ ہمارا ہی سے ڈٹ کر دنیا کے حقائق کا مقابلہ کرتے ہیں تو کچھ اور بھی خاص ہو جاتے ہیں ورنہ تو بہت سے ان حقائق کے سامنے آتے ہی بہت ہار دیتے ہیں۔ یہ سختیاں تو خام ہندوں کو کندن بنا تی ہیں اور کندن بننے سے پہلے کے مراحل واقعی بہت آہستہ آہستہ ہوتے ہیں۔ ہر بندہ انہیں سہ نہیں سکا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا۔“

انہوں نے اس کے جھکے سر پر ہولے سے ہاتھ پھیرا۔ آمنت نے جھکی ہوئی بھگی پلکیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔
 ”یہ سب آنا نہیں تمہارے کردار کی مضبوطی چاہنے کے لیے تمہیں اور جب ہم ان آنا کٹوں پر پورا اترتے ہیں تو قدرت ہمیں اس کے بدلے ایسا انعام عطا کرتی ہے کہ ہم اپنی جھپٹی تمام تر آنا کٹیں بھول جاتے ہیں۔ آنا کٹ کے بعد جڑ کا عمل شروع ہوتا ہے اور یہ لمحات بھی بڑے نازک ہوتے ہیں۔ سختیوں کا بار بار بندہ اتنی جلدی اپنی خوش بختی کو قبول نہیں کر پاتا۔ اکثر خوش بختی اس کے وروازے پر دستک دیتی رہتی ہے اور وہ کون پیسے اس دستک کو بھی کسی آنا کٹ کا پیش خیمہ جان کر بیٹھا رہتا ہے اور کبھی کبھی خوش قسمتی ہاؤس ہو کر پلٹ جاتی ہے مگر مجھے یقین ہے کہ تمہیں اللہ نے ایسی روشن آنکھ دی ہے کہ تم آنا کٹ اور جڑ میں کبھی فرق کر سکتی ہو۔“

وہ آمنت کے ہاتھ کو اپنے ضعیف جسم پر بھرے ہاتھوں میں لے کر بولی۔
 ”بیٹا! وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔ ”میں کبھی نہیں۔“
 ”تمہاری بختی کے دن گزر چکے اچھا بتاؤ تم مجھے کیا سمجھتی ہو؟“ ان کے چہرے پر کیسی ملاحظہ کیسی نرمی تھی کہ آمنت کو شش کے باوجود اس میں بیگانگی یا غیریت تلاش نہ کر سکتی۔

Urdu Photo.com

”دو میڈیم سائز ہندی بیڑ“ تین بارہلی ڈالز“ ایکسٹرا اٹک گنار“ یہاں تو دو اسپورٹس کاریں ایک حد تک عیسوی بورڈ کیم چار ہایا سوت ڈیپیشن۔“
 سیلز میں ایک ایک چیز شاپنگ بیگ میں ڈالتے ہوئے میکا کی انداز میں بول رہا تھا۔
 ”کیس بزار سات سو سو روپے سوا“ کپیوڈ کے آگے بیٹھے دو بھرے سیلز میں نے رسید نکال کر سلطان بخت کے آگے کی تو ایک بل کوان لاتی چاہا سارا سامان اٹھا کر اسی سیلز میں کے سر پر سے مار میں یا اپنا سر پھوڑا لیں۔ انہوں نے ایک عیسوی گنا ڈرا سی کہ دن موڈ کو پاس کھڑی زمین مارا پڑا ہی جو تھماتے چہرے کے ساتھ شاپنگ بیگ میں بڑے سامان کو دیا روچیک کر رہی تھی۔ سید سلطان بخت نے خون کا گھونٹ بھرتے ہوئے والٹ نکال کر رگم کاؤنٹر پر رکھی اور خود تیز قدموں سے باہر کی جانب بڑھ گئے۔
 اس طرح کی بیورو اور فضول شاپنگ انہوں نے عین تار کے کہنے پر بولیا یا نہیں کی تھی۔

”کیا۔ ایک لاوارث، یتیم، مسکین، بے نام و نشان لڑکی کو میں اپنے اکلوتے بیٹے کی بیوی بنالوں، امپا سبل۔“
رعنا حیات تو آمنہ کے بارے میں سن کر ہی بھڑک اٹھی تھیں۔

”اما! امت بھولیں، آج سے چند ماہ پہلے تک آپ کا بیٹا بھی لاوارث، یتیم، مسکین، بے نام و نشان تھا۔ لوگوں کی وی ہوئی زکوٰۃ خیرات پر ملنے والا ایک بے حد معمولی انسان۔“ معاذ نے بے تاثر لہجے میں جواب دیا۔ ”اور اما! مجھے چاہے ایک دنیا کی یاد شاہت مل جائے تو بھی میں اپنی وہ حیثیت، وہ اوقات نہیں بھول سکتا۔“
رعنا حیات کا غصہ جھاگ کی طرح بجھ گیا۔

”مگر ہمارا سوسائٹی میں ایک اسٹیٹس ہے، ایک مقام جو ڈھماکہ کرتا ہے کہ ہماری ہموہاری ہم مرتبہ نہ سہی مگر اس قدر حقیر۔“

”پلیز اما! اسٹاپ اسٹاپ ابھی بھی آپ حیثیت، مرتبے، مقام اسٹیٹس جیسے بے حقیقت تصورات کے ذریعے بلیک میل ہو سکتی ہیں۔“ معاذ نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”رعنا! بھول گئیں، جنٹل کی موت کے بعد تم نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ انسان کو صرف انسانیت کی نظر سے دیکھو گی، دولت و مرتبے کی غیبت سے نہیں۔“

”خیر حیات نے جانتے ہوئے ایذا میں کہا تو رعنا حیات پہلو بدل کر رہ گئیں اور پھر اختلاف کی گنجائش تھی بھی نہیں۔ وہ برسوں بعد ملنے والے بیٹے کو اپنے لیے کھودینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔“

”آمنہ کی انٹلی میں اتنی بھی حسد نہ ہوتی کہ وہ ایک لڑکی کو بڑی سی ہو میں۔ اپنی این جی او کے ایک معمولی سے اسکول کی معمولی سی بچی کو اپنے اکلوتے لخت جگر کی شریک سفر بنانے کے خیال سے انسانی نفس بڑا وحیث ہے اسے بار بار سرزنش کے درے پڑتے رہیں۔“

”خیر حیات نے بولی کی گنجائش کو کبھی نظر سے نہ لیا اور رعنا حیات نے ایک گہرا سانس لے کر بے حد قیمتی ڈائمنڈ جڑی مگوئی آمنہ کی انٹلی میں پھینکا اس کا ہاتھ چوم لیا۔“

”آج سے پہلے یہ لڑکی جو بھی تھی اس کی وہ حیثیت اس کے ماضی کا حصہ ہے۔ ابھی اس لمحے سے یہ میرے معاذ کی پسند اس کی چاہت کی حیثیت سے مجھے بھی معاذ ہی کی طرح عزیز ہونی چاہیے۔“ آمنہ کی ٹھنڈی پیشانی کے بوسے میں نہ جانے کیسا مس انہیں محسوس ہوا کہ چند لمحات پہلے کے محسوسات اور ہی طرح کے احساس میں ڈھل گئے تھے۔ ڈھیر سارا ان کو کھلا نظر آیا ان کے اندر اتر گیا تھا۔

”مسز خان کے بزرگ، چچے کی نرم سکراہٹ جو آمنہ کے لیے تھی، انہیں ذرا سا شرمندہ کر گئی۔“

”خیر حیات نے غور سے حیثیت و مرتبے میں، مجھ سے کسی بھی طور کم نہیں مگر بے سارا انسانوں کے لیے قدرت نے اس کے سینے میں کتنا بڑا دل رکھا ہے اور میری ہڈت پر تو ان کے احسانات کا بوجھ اتنا ہے چاہوں بھی تو ان کا بدل نہ دے سکوں۔“

”مسز خان آمنہ کو یاد کر رہی تھیں اور رعنا حیات ان کے بے لوث انداز کو دیکھ کر بہت کچھ سیکھ رہی تھیں۔“

”کل شام کو نکاح ہو گا ولیمہ البتہ دو دن بعد ہم خوب دھوم دھام سے کریں گے۔“ شہباز خان نے اتنی ہی معاذ کو پسائی تو خیر حیات نے گویا اعلان کیا۔

”چلو ابھی معاذ میاں! آج سے تم سے دوہرے رشتے ہو گئے اور یاد رکھنا، دو ہزار رشتہ مجھے پہلے سے زیادہ عزیز ہے۔ آمنہ میری چھوٹی بہن ہے ہمیشہ یہ بات یاد رکھنا۔“ شہباز خان نے معاذ کو گویا یاد دہرایا۔

”میں تو آپ کی ہر بات یاد رکھتا ہوں، آپ کو بھول جانے کی عادت ہے۔ حتیٰ کہ رشتے بنا کر بھی بھول جاتے ہیں۔“ معاذ نے جتا کر کہا تو وہ ان سنی کر کے، دوسری طرف دیکھنے لگا۔



گزشتہ چھ ماہ کے دوران وہ کئی بار اس طرح کی بلکہ اس سے کئی گنا مہنگی شاپنگ کر چکی تھی اور سید سلطان بخت صرف اس خوشی میں کہ نین تارے انہیں ”معاف“ کر دیا ہے، ہنسی خوشی یہ شاپنگ کروا دیتے تھے مگر اب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ نہ جانے اس کی یہ کیسی دیوانگی تھی جو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کبھی کبھی تو انہیں یہ سب نین تارا کا ڈھونگ لگتا۔ وہ ان کی بے بسی کو انجوائے کر رہی ہے اور بھی اس کی وحشت سے انہیں ایسا خوف آتا کہ وہ دل میں اس کی دیوانگی کبھی نہ ختم ہونے کی دعا مانگتے، ورنہ جس دن وہ ہوش میں آگئی نہ جانے سلطان بخت کا کیا حشر کروا لے۔ صرف ایک بار انہوں نے اس کی اس فضول شاپنگ سے تنگ آکر اسے غصے میں جھنجھوڑتے ہوئے بتانے کی کوشش کی تھی کہ جس بیٹے کے لیے وہ یہ خرافات خریدتی پھر رہی ہے، وہ مر چکا ہے۔

اس لمحے ایک بل کو تو نین تارا کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا تھا مگر دوسرے لمحے اس نے اپنے کئی اونچ لے خوفناک زہریلے نائنوں سے سید سلطان بخت کا پورا چہرہ چھیل ڈالا تھا اور جب تک وہ اس کے اس جنونی انداز کو سمجھتے ہوئے اپنا بیجاؤ کرتے، ان کا چہرہ لبو لبسان ہو چکا تھا۔ وہ تو شاید انہیں مار رہی ڈالتی۔ اگر وہ خود کو بچا کر وہاں سے بھاگ نہ نکلے اور پھر اس زخمی چہرے کے زخم بھرنے تک وہ کئی دن تک اسلام آباد کی کوٹھی میں بیٹھ کر صدمے سے

تھے۔ رخساروں کے ڈیرہ ڈیرہ اونچ زخم بھرنے میں بہت دن لگے تھے۔ اس کے بعد وہ پھیلائی ماہ بین مارا سے نہیں ملے تھے مگر پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کہ اس دل کی مجبوری نے ہی انہیں ساری ذلتیں دی تھیں۔ اس سے ملنے گئے تو وہ ان کی بے وفائی کا کلمہ کرتے ہوئے بہت معصومیت سے ان کے چہرے کے مندرمل زخموں کے نشانوں کے بارے میں پوچھنے لگی۔ اس لمحے ان کے دل میں احساس چاگا کہ وہ نین تارا کو کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔ کیا

ہوا جو تھوڑی سی دیوانی ہوئی تھی۔ یہ دیوانہ پن بھی تو ان کی دین تھی۔

”چلیں شاہ جی! شہروز یا باکی شاپنگ کرنا ہے۔ میں لٹے پھول سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔“

وہ جیسے ہی ایک دو مہینوں بعد کھل کر دے، ”میں قدر دیکھتے نہیں گہرا انہیں فوراً“ سے پہلے شاپنگ کے لیے تھسیٹ لے جاتی۔ وہ جتنے کھلے دل سے اسے شاپنگ کر لیتے، اس کا ہاتھ اتنی ہی دیوانہ ہوتا تھا۔ صرف اس کے چہرے پر کھلتے ان خوبصورت رتوں کو دیکھنے کے لیے سلطان بخت اپنے پرس کا حصہ کھول دیتے نہ صرف نین تارا کے لیے بلکہ اس بڑھی گھوڑی زیور گل کے لیے بھی۔ سلطان بخت سے شدید نفرت کرتی تھی مگر مانسوں کی ذور سے جڑی قمیش کی ہوس اسے اس خاموش سمجھوتے پر مجبور کر دیتی۔ نوٹوں کی ایک ڈگڈیوں کے عوض وہ نین تارا کو ایک آدھ رات کے لیے ان کے ساتھ سیدھا اس جانے کی اجازت سے آرام سے دیتی۔

کبھی کبھی ان کا دل اس ملی چوہے کے کھیل سے بری طرح اوب جاتا تو وہ سمجھنے کے لیے غائب ہو جاتے مگر پھر نین تارا کے حسن کا جاوہی سحر انہیں اپنی جانب کھینچنے لگتا۔

”اوکے، ہیٹ ہارٹ! میں اب چلتا ہوں۔ اگلے ہفتے آؤں گا۔“ سید سلطان بخت نے نین تارا کو ہاتھوں سے

”کدے“ کے باہر ہی ڈراپ کر دیا۔

”انداز نہیں آئیں گے۔“ وہ بمشکل ڈھیر سارے شاپنگ بیگز سنبھالتے ہوئے بڑی لگاوت سے بولے۔

”نہیں انداز گیا تو پھر ہیٹ ہو جاؤں گے۔ ٹیک کیئر اینڈ بائے۔“ وہ گاڑی آگے بڑھانے گئے تو نین تارا کے چہرے پر یکدم سختی ہوئی جلد والادورشت چہرہ ابھر آیا۔ اس نے ایک انتہائی نفرت بھری نظر دوڑ جالی بی ایم ویلیو پر ڈالی اور ہیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔

چند لمحوں بعد وہ اپنی گاڑی میں سارے شاپنگ بیگز رکھے شہر کے نواح میں واقع یتیم خانے کی طرف جا رہی تھی۔

”تم نے میری گویا اجاڑی، اللہ تمہارا سکون اجاڑو۔ تم یونہی بے قرار و مشطرب رہو شاہ جی! تمہیں کہیں سکون نہ ملے۔“ ہر بار کی طرح گاڑی ڈرا سب کرتے ہوئے وہ سخت چہرے بے ہیز داری تھی۔



پڑی، اسی بل اس آنچل کی اوٹ سے دو حیران سی آنکھیں اس کے چہرے پر ٹھہریں۔ جلیل کو اپنی جانب دیکھتے پا کر جویریہ بڑبڑا کر تھپتھپے ہٹ گئی تو جلیل کے لبوں پر بڑی جان واری مسکراہٹ ابھری۔

”تو مبارک ہو جویریہ ماں گئی ہے۔“ نزہت اس کی مسکراہٹ پر بولی تو وہ لست کھورنے لگا۔
”تو آپ میرے جذبات کی گہرائی جانچ رہی تھیں۔“
”جانچ چکی جناب! آپ ہی ہیں مجھوں نے رائے اور میں سوال کے رٹیل جانئیں۔ میں نے انہی سے بات کر لی ہے“
اسی ہفتے نکاح کر دیتے ہیں تم دونوں کا۔ اب خوش۔“

”اسی ہفتے نہیں بلکہ کل شام کو، میں سارے انتظامات کر آیا ہوں اور میں نے چھٹی کے لیے بھی ایلائی کر دیا ہے۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

”تو گویا تمہیں جویریہ کے انکار اقرار کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ تم مجھے یہ یوقوف بنا رہے تھے؟“ نزہت حنقل سے بولی۔

”جلیل! یہ غلط بات ہے، رکو۔“ وہ نزہت کی پکار کو نظر انداز کرتا ہر نکل گیا۔
اسی لمحے معاذ ملازم کے ساتھ اندر داخل ہوا تو نزہت کا سارا ہوش یکدم سرور پڑ گیا۔

”یوں منہ نہ لگاتے تھے آپ کے پتھروں صدم کا کوئی پیام نہیں لایا ہوں۔ یہ الوی میٹن کارڈ سے اور آپ کو آنا ہے، لازمی۔ ویسے شہباز بھائی کراچی کے ہیں ایک ہفتے کے لیے آپ آسانی سے آسکتی ہیں۔“ اس نے کھڑے کھڑے کارڈ تھماتے ہوئے تاکید کی۔

”بہت خوب۔ اکیلے اکیلے دلہا بھی بن گئے اور بہن کو ویسے کارڈ دینے چلے آئے رہے ویسے کیا ضرورت تھی۔“ نزہت کا رڈ کھینچ کر طنز سے بول۔

”دلہا نہیں بنا صرف بی بی صاحبہ کی تھی۔“ وہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور آپ نے آنا ہے لازمی وعدہ کریں۔“ وہ اصرار سے بولی۔

”وعدہ آؤں گی۔ ضرور آؤں گی۔ بلکہ میرے ساتھ دو گیسٹ اور بھی ہوں گے۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولی۔
”دو چھوڑو آپ اس گیسٹ لائیں مگر اتنا ضرورت ہے جلد میں خود آپ کو لینے آجاؤں گا۔“

”جلیل! ادھر آؤ۔“ نزہت نے باہر کی طرف جاتے جلیل کو پکارا تو وہ اندر آ گیا۔ ”معاذ! یہ ایس بی جلیل ہے۔ تمہاری طرح میرا منہ بولا بھائی اور آؤں گا۔“ وہ فرما کر باہر دیا اور جلیل آئے معاذ نے میں نے تمہیں بتایا تھا نا۔“

جلیل نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کر مجوشی سے معاذ سے مصافحہ کیا۔
”مگر میرا نمبر سہا ہے، آپ کو؟“ معاذ ہنستے ہوئے جتا کر بولا۔
”مجھے لا سب یا دے لیکن۔“ وہ کہتے کہتے رک گئی تو معاذ نے جلیل کو نزہت کے ساتھ آنے کی دعوت دی جسے قبول کرتے ہوئے جلیل خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔

”پچھو آئیں گی؟“ نزہت نے پوچھا۔
”مشکل ہے۔ ان کی صحت اب اس کی اجازت نہیں دیتی۔“ معاذ نے جواب دیا تو نزہت چپ ہو گئی۔

”م جان! آپ سے ایک بات کہنا تھی۔“ رات گئے جب شہباز خان ماں کے کمرے سے اٹھ کر جانے لگے تو وہ لیز تک پہنچ کر واپس مڑتے بغیر بولے اور یہ بات تو مسز خان کافی دیر سے ٹوٹ کر رہی تھیں کہ وہ کوئی بات کہنا چاہ رہے ہیں۔

”میں سن رہی ہوں شہباز خان۔“ چند لمحوں کے معنی خیز سکوت کے بعد مسز خان نے نرم لہجے میں کہا تو شہباز خان کے حوصلے کی طنائیں پھر سے ہاتھوں سے نکتے لگیں۔ وہ انہیں قدموں پر کھڑے سوچتے لگے۔

”حق بات پر بھی اس قدر سوچ بچار کی ممانعت کی گئی ہے شہباز خان!“

”کیا جواب دیا جویریہ نے نزہت آپنی؟“ جیسے ہی نزہت کمرے میں داخل ہوئی، جلیل نے بے قراری سے پوچھا۔

”تمہاری بے قراری اگر وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی تو شاید اقرار ہی کر لیتی۔“ نزہت اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اطمینان سے بولی۔
”تو کیا اس نے انکار کر دیا؟“ جلیل نے ذوقی آواز میں پوچھا۔

”نہیں۔“
”اقرار بھی نہیں کیا؟ انکار بھی نہیں تو پھر۔“ وہ پریشانی میں قدرے جھٹا کر بولا۔

”میرے ہونق بھائی! نزہت نے اس کے سر پر ہلکی سی چپٹ لگائی۔“ ابھی وہ شاک کی حالت میں ہے اتنی جلدی اپنے دل میں ان نازک جذبات کو جگہ نہیں دے سکتی۔ وہ ان جانے لگی تھوڑا انتظار کر لو۔“

”جب تک وہ ہی نہیں تھی تو یہ بے قراری نہیں تھی مگر اب صبر نہیں ہوتا۔“ وہ سر جھٹا کر بولا۔
”اللہ رے یہ بے قراری۔ بھیا! ابھی منہ دھور کھو تو اتنی جلدی نہیں مانے کی۔ وہ اپنی بہن اور بھائی کے لیے بہت پریشان ہے۔ کچھ بتا چنانہ دونوں کا؟“

”تمہیں کو بھی تو سبیل کر دی گئی ہے اور میں نے اپنے ہر ممکن ذرائع سے ان کو لگانے کی کوشش کی ہے مگر کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ میں خود جویریہ سے بات کر لوں؟“ وہ بے چینی سے بولا۔
”کر لو بات۔ ویسے چند دن انتظار کر لو تو اچھا نہیں۔ وہ تمہارے جذبات کو سمجھتی ہے۔“

”وقت۔“ اس نے ایک آہ سی بھری۔ ”نزہت آپنی ویسے وقت بہت ظالم چیز ہے اور مجھے اس پر اعتبار نہیں۔ بے اعتباری سے بڑھ کر تکلیف دہ احساس اور کوئی نہیں ہے۔ میں اس لمحے سے بے اعتباری کے بربخ میں جل رہا ہوں۔ جب صوفی صاحب نے مجھ پر شک کر کے اپنے گھر سے نکالا تو ٹھیک ہے کہ ان کا شک غلط نہیں تھا۔ میں نے جویریہ سے محبت کی تھی اور اس کو خیر محبت کے جوش میں میں نے صوفی صاحب کے اعتماد کو الٹا پھینکا۔“

”بھی سچ ہے اس عمر میں اگر محبت ہو جائے تو کچھ اور سوچنا پڑتی نہیں۔ ان دنوں میں خود پر تھوڑا کنٹرول کر لیتا تو بھی صوفی صاحب کو پتا چل جاتا تھا۔ میری حالت ہی کچھ ایسی تھی۔“ وہ ہولے سے ہنسا۔ ”اور صوفی صاحب محبت جیسی خرافات کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں مجھے معلوم تھا۔ اس لمحے کا وجود مجھ سے یہ جرم سرزد ہو گیا جسے میں نے تسلیم بھی کیا مگر ان کا جلال۔ اللہ تو بے۔ شکر ہے انہوں نے مجھے بالکل نہیں ڈالا۔ صوفی صاحب کے مجھ پر اس احسان کے علاوہ ان گنت احسانات ہیں جنہیں میں ساری زندگی نہ چکا سکوں۔ انہوں نے مجھ سے یتیم لاوارث کو خاک سے اٹھا کر اپنے برابر بٹھایا۔ مجھے علم کی روشنی سے متعارف کرایا اور نہ شاید میں کسی یتیم خانے یا کسی فٹ پاتھ پر بیٹھا بھید مانگ رہا ہوتا اور بھٹکنے کے لیے تو وہ لمحات بھی بہت نازک تھے جب انہوں نے سچارے میں مجھے دھتکار دیا۔ اگر آئی (خند کی گریں) مجھے نہ ملتیں مجھ پر اعتبار کر کے اپنے ساتھ شفقت میں پناہ نہ دیتیں تو شاید آج میں اس باعزت مقام پر نہ ہوتا۔ پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہوں تو پوری زندگی میں مجھے کہیں بھی اپنی ذات سے متعلق خصوصی توجہ محبت کے حوالے سے کوئی مینھا جذبہ خوشی کا احساس دل کے تار نہیں ہلا تا سوائے ایک جویریہ کے خیال کے۔ سو بے اعتبار سا ہو رہا ہوں کہ کہیں زندگی کو طے والی یہ اگلی خوشی بھی نہ چھن جائے اور میری بھی مجھ سے نہیں ہو رہا کہ مجھے آفس کی طرف سے گھرا لٹا ہو گیا ہے اور اب میں اس گھر کو آبا کرنا چاہتا ہوں۔ اس اگلو تے خواب کی تعبیر سے جو میری آنکھ نے دیکھا ہے۔“ جلیل آہستہ آہستہ بولتے ہوئے آخر میں جیسے جبراً مسکرایا تھا۔

”اللہ تمہارا خواب مبارک کرے اور گھر کی بھی مبارک پاؤ۔ اگر جویریہ تمہیں نہ ملتی تو۔“ نزہت نے پوچھا۔
”تو میں اس کی تلاش میں نکل پڑتا۔ صوفی صاحب کے پاؤں پر جانا مگر یہ طے تھا کہ میری ہم سفر جویریہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔“ وہ دونوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھا تو اس کی نظر آہستہ کھلی کھڑکی سے نظر آتے گلابی آنچل پر

”اللہ تمہارا خواب مبارک کرے اور گھر کی بھی مبارک پاؤ۔ اگر جویریہ تمہیں نہ ملتی تو۔“ نزہت نے پوچھا۔
”تو میں اس کی تلاش میں نکل پڑتا۔ صوفی صاحب کے پاؤں پر جانا مگر یہ طے تھا کہ میری ہم سفر جویریہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔“ وہ دونوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھا تو اس کی نظر آہستہ کھلی کھڑکی سے نظر آتے گلابی آنچل پر

”اللہ تمہارا خواب مبارک کرے اور گھر کی بھی مبارک پاؤ۔ اگر جویریہ تمہیں نہ ملتی تو۔“ نزہت نے پوچھا۔
”تو میں اس کی تلاش میں نکل پڑتا۔ صوفی صاحب کے پاؤں پر جانا مگر یہ طے تھا کہ میری ہم سفر جویریہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔“ وہ دونوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھا تو اس کی نظر آہستہ کھلی کھڑکی سے نظر آتے گلابی آنچل پر

”اللہ تمہارا خواب مبارک کرے اور گھر کی بھی مبارک پاؤ۔ اگر جویریہ تمہیں نہ ملتی تو۔“ نزہت نے پوچھا۔
”تو میں اس کی تلاش میں نکل پڑتا۔ صوفی صاحب کے پاؤں پر جانا مگر یہ طے تھا کہ میری ہم سفر جویریہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔“ وہ دونوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھا تو اس کی نظر آہستہ کھلی کھڑکی سے نظر آتے گلابی آنچل پر

”اللہ تمہارا خواب مبارک کرے اور گھر کی بھی مبارک پاؤ۔ اگر جویریہ تمہیں نہ ملتی تو۔“ نزہت نے پوچھا۔
”تو میں اس کی تلاش میں نکل پڑتا۔ صوفی صاحب کے پاؤں پر جانا مگر یہ طے تھا کہ میری ہم سفر جویریہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔“ وہ دونوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھا تو اس کی نظر آہستہ کھلی کھڑکی سے نظر آتے گلابی آنچل پر

”اللہ تمہارا خواب مبارک کرے اور گھر کی بھی مبارک پاؤ۔ اگر جویریہ تمہیں نہ ملتی تو۔“ نزہت نے پوچھا۔
”تو میں اس کی تلاش میں نکل پڑتا۔ صوفی صاحب کے پاؤں پر جانا مگر یہ طے تھا کہ میری ہم سفر جویریہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔“ وہ دونوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھا تو اس کی نظر آہستہ کھلی کھڑکی سے نظر آتے گلابی آنچل پر

”اللہ تمہارا خواب مبارک کرے اور گھر کی بھی مبارک پاؤ۔ اگر جویریہ تمہیں نہ ملتی تو۔“ نزہت نے پوچھا۔
”تو میں اس کی تلاش میں نکل پڑتا۔ صوفی صاحب کے پاؤں پر جانا مگر یہ طے تھا کہ میری ہم سفر جویریہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔“ وہ دونوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھا تو اس کی نظر آہستہ کھلی کھڑکی سے نظر آتے گلابی آنچل پر

”ام جان۔“ وہ بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے ان کے پاس آئے اور روزانوہو کر نیچے کو جھکے۔ مسزخان کے سینے پر پڑے ضعیف ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر انہیں دیکھنے لگے۔

”ام جان۔ نہ بہت زندہ ہے۔“ ان کے ہاتھوں کو ذرا سادبا کر انہوں نے بے حد دم سسر میں کہا اور ماں کے زور عمل کے انتظار میں ان کا چہرہ ٹھنکنے لگے جو پہلے کی طرح پرسکون تھا۔

”مجھے معلوم ہے۔“ وہ اسی پرسکون لہجے میں بولیں۔

”آپ کو معلوم ہے؟“ شہباز خان کی حیرت دو چند ہوئی۔ ”کب سے۔ کیسے۔ آپ نے مجھ سے ذکر کیوں نہیں کیا؟“ وہ شکوہ آمیز لہجے میں بولے۔

”بتایا تو خیر تم نے بھی مجھے نہیں۔ میں نے تو غلط نہیں کیا۔ مجھے چند روز پہلے معاذ نے بتایا تھا۔“ انہوں نے ذرا سا سہرا اونچا کر کے کہا۔

”میں چاہتی تھی اس بار فیصلہ تم خود کرو۔“ وہ رکیں۔ ”اور جو بھی فیصلہ کرو اس انتظار میں رکھ لینا۔ چند سالوں بعد جب ارتضیٰ سوال کرنے کے قابل ہو گا تو اپنی ماں کے بارے میں تم سے چند چٹھے ہوئے سوالیہ سوالات کرنے گا۔ تم ان کے جواب ذہن میں تیار رکھنا۔ اب جاؤ آرام کرو۔ آج آمنہ اپنے گھر کی ہوئی۔ چند دن ہی وہ لڑکی اس گھر میں رہ کر گئی ہے اور یوں لگ رہا ہے جیسے سالوں سے ادھر ہی تھی۔ سالہا قضا اس کے جانے سے اداس ہی لگ رہی ہے۔ بیٹیاں خوشبو کی طرح ہوتی ہیں۔ رخصت ہو جاتی ہیں تو پیچھے بے نام سی او اسی چھوڑ جاتی ہیں۔ اللہ سے بہت سی خوشیاں اور نعمتیں عطا کرے۔ ہم جیسے جوان محرمی کے ہاتھوں میں تو بس دعا کے دیے ہوتے ہیں جو کسی کی زندگی کو روشن کی اس ولا سکیں اور بس۔“

”کتے کتے انہوں نے آنکھیں موندیں تو شہباز خان عجیب سے احساس ندامت میں گھر کر رہا ہر نگل آئے۔

”ام جان! بیٹا ہوا انسان کبھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا اس لیے میری طرح بے چین رہتا ہے۔ میں خود اپنی ذات کے بھنور میں پکرا رہا ہوں۔ ارتضیٰ کے سوالوں کے کیا جواب ہوں گا۔“

یہ وہی گھر تھا جس میں داخل ہونے کی ناکام حسرت دل میں لیے لہنب اس دنیا سے چلی گئی۔ اس طرح کے گھر اس طرح کی خواہشیں اس پارہ صفت لڑکی کو کتنا بے چین رکھتی تھیں۔ کاش زینب! تم تھوڑا دھیرے چلتیں تو شاید ایسی ہی کوئی تعبیر تمہاری تقدیر کا بھی حصہ بن جاتی۔ خواہش جتنی زور دلا ہوگی، آدمی کی زندگی اتنی ہی تنگ کر دے گی۔ میری! بس اللہ تمہاری آخری آرام گاہ میں تمہیں ڈھیر سارا سکون دے گا۔ تم اس جہان میں اماں ہی اور باپا صاحب کے ساتھ بہت آرام سے ہو۔“

آمنہ نے آنکھوں کے جھینگے گوشوں کی نمی کو چپکے سے ہتھیلی پر اتارا۔ بہت ساری رسموں کے بعد ابھی رخصت جیات اپنی ملازمہ اور چند خواتین کے ساتھ اسے اس بچے سنورے کمرے میں بٹھا کر گئی تھیں جسے اس نے ایک نظر دیکھ کر ہی چہرہ چمکا لیا تھا کہ اتنے کی تمنا تو اس کے دل نے کبھی نہیں کی تھی۔ اتنے کی تمنا تو وہ کھکھلاتی تھی والی ذہن کر گئی تھی اور اس پر بھی آمنہ اسے ٹوک دیا کرتی تھی۔

”جویریہ عابد العین۔ کاش تم دونوں ہی میرے پاس ہوتے۔ وقت اور تقدیر دونوں کتنے بے رحم ہوتے ہیں۔ کوئی باپ پاس ہو یا نہ ہو وہ اپنا فیصلہ منوا کرتی چھوڑتے ہیں۔“

”میں اس ملاپ کو اتفاقاً تو نہیں کہوں گا مگر یہ میری اور تمہاری بلا تنگ کا بھی یقیناً حصہ نہیں تھا تو پھر یہ ہماری قسمتوں کی ہی بھگت ہوئی نا جو ہم دونوں کو مخالف کناروں سے گھسیٹ کر اس خوبصورت بیدروم میں لے آئی ہے۔ کیا خیال ہے آمنہ! تمہارا اس بارے میں؟“ معاذ اس کے پاس کس وقت آکر بیٹھا اپنی سوچوں میں گم اسے پتا ہی نہیں چل سکا۔ جواب میں اس کی جھکی گردن کچھ اور بھی جھک گئی۔

”مگر کھو تقدیر کے لکھے کی سزا انسانی اعضاء کو دینا کس طور پر بھی انصاف ہے نہ عقل مندی گمردن کو اتنا چمکاؤ گی

تو بہت کچھ غیر متوازن ہو کر بالآخر تمہیں ہی تکلیف دے گا۔ پلیز زرا میری طرف دیکھو۔“ معاذ نے اس کی جھکی گردن کو اٹھانے کے لیے شہادت کی انگلی سے اس کی ٹھوڑی کو اوپر اٹھایا تو وہ کچھ اور بھی سمٹ گئی۔

”آمنہ! کیا اپنے ہم سفر کے طور پر تم نے کبھی میرے بارے میں سوچا تھا؟“ وہ اس کے بچے سنورے روپ کو نگاہوں کے رستے دل میں اتارتے ہوئے گہیر لہجے میں پوچھنے لگا۔

”بولو نا۔“ آمنہ لب نہلنے آنکھیں میچے کسی مورتی کی طرح ساکت تھی۔ معاذ کے اعصرار پر اس نے خفیف سا سرنفشی میں ہلا دیا۔

”تو پھر یہ ہوئی نا قسمتوں کی ملی بھگت۔ اب ہم دونوں کو مجبوراً یہ سب بھگتنا پڑے گا۔ کیا کر سکتے ہیں۔“ اس نے بے بس لہجے میں کہا تو آمنہ نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔ نظریں ملتے ہی معاذ نے سر اٹھا کر ایک دھیمی سی مسکان اس کے بولوں پر بھی دوڑ گئی۔

”ہاں! اب تو مجبوری ہے۔“ وہ بھی شرارت سے بولی۔

”میرا ساری مجبوری کی ایسی کی تھی محترمہ! آپ کی تلاش میں معلوم ہے، میں کدھر کدھر پھرتا رہا ہوں۔ نہ جانے کس کونے میں کدو پھونسی ہوئی تھی۔“

معاذ نے آمنہ کی گود میں چھڑے دونوں ستانی مہکتے ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے قدرے بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ آمنہ کو اس کی جسارت پر کھٹ سا لگا۔ تڑپ کر نگاہیں اٹھائیں اور دوسرے ہل گھبرا کر پھر سے جھکا لیں۔

”کیا کیا جہاں آیا تھا میں نے آپ کا میڈل تو دیکھا میں کر دیا تھا۔“ وہ ہاتھ چھڑانے کے لیے مزاحمت کرتے ہوئے بولے۔

”میرا میڈل آپ کو تھا اور میں جہاں آیا تھا وہی جہاں تھی شے کے چور کونہ تلاشتا بھلا؟“ وہ اس کے قریب نیم دراز ہو کر بولے۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ملنے لگی۔

”یہ جھوٹ ہے۔“ وہ کسمسا کر اپنے ہاتھ چھڑائے گئی۔

”مگر یہ تو جھوٹ نہیں کہ پہلی نگاہ کا تصادم کیا جاں لیوا تھا۔ اسی بل میں نے سچے دل سے تمہیں پانے کی دعا کی تھی اور آج مجھے یقین آ گیا کہ اللہ دل سے کی ہی دعا کو کبھی رو نہیں کرنا۔ تم تک پہنچنے میں مجھے کچھ تاخیر ضرور ہوگی، میری وہی خواہش تھی کہ میں اللہ ہی اور صوفی صاحب کی دعاؤں کے سائے میں تمہیں رخصت کر کے لانا۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔ آمنہ! ہر انسان اپنے لیے ایک ایسے اور نیک ہم سفر کی تمنا کرتا ہے اور صوفی صاحب نے تمہاری شہادت جس وجہ سے کی ہے، مجھے یقین ہے کہ تمہارا ساتھ میرے لیے اور میرے گھر کے لیے کسی معمول نعمت سے کم نہیں ہوگا۔ میرے والدین نے ایک عرصے تک میری جدائی سہی ہے اس لیے میری یہ کوشش ہے اور ہوگی کہ میری طرف سے انہیں کبھی کوئی دکھت لے۔ کیا میری اس خواہش کی تکمیل میں تم میرا ساتھ دو گی۔“ آمنہ نے معاذ کے کھیلے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”میں زندگی کے ہر قدم پر موڑ پر آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ کے ہر فیصلے میں آنکھیں بند کر کے پورے یقین کے ساتھ شریک۔“

وہ مستحکم لہجے میں پورے اعتماد سے بولی تو معاذ کو لگا تو صوفی عمری تھکن ان الہی لحات نے چپکے سے چرا کر کہیں سے ڈھیر ساری ان پھوٹی خوشیاں اس کے دامن میں بھردی ہیں۔ ایسی ہی سرشار کیفیت آمنہ کے دل پر سب چہرے پر موجزن تھی۔ دونوں کے دل ان اچھوتے لحات میں یقین کی دولت سے بالمال ہو رہے تھے کہ جس کو یقین مل گیا زندگی کی ساری روشنی مل گئی۔ معاذ نے آمنہ کے مہکتے ہاتھوں پر اپنے لب رکھتے ہوئے یقین کی عمر شہادت کی رات کی تاریکی میں جیسے ڈھیر سارا جگنو ٹھٹھانے لگے۔

رہا ہے ایک بار پھر ہوا ڈالے۔

اس کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چلی رہی تھیں اور جسم کسی مردہ لاش کی طرح بے جان ہوا جا رہا تھا۔ وہ عقل کے فیصلے پر دل سے کوراضی نہیں کر پاتا رہی تھی۔

کاش وہ ادھر نہ ہی آئی ہوتی۔ آخری کاش جو اس کے ذہن کی دیواروں سے ٹکرایا۔

”چلیں پھر۔“ بے حد تمہیں محبت بھری مدھم سرگوشی اس کے کانوں میں گونجی اور اس کا دل چپکاپکاپا تباہ تھا شہباز خان کے مضبوط گرم توانا ہاتھ کی آغوش میں پناہ گزین ہو گیا۔

زندگی سے بھرپور گرم گرم لہریں سنسنائی ہوتی اس کے پورے بدن میں دوڑ گئیں۔ وہ کسی پھول کی طرح ہلکی پھلکی ہو کر اپنی نشست سے اٹھی اور اسی مضبوط سہارے کے حصار میں چلتی یا ہر تک آئی۔

”کچھ کہو گی نہیں؟“ رات بہت گہری ہو چکی تھی سیدھی شفاف سڑکیں پول لائٹس میں چمکتی شاماسی لگ رہی تھیں۔

اسے لگا وہ ان رستوں سے گزرتی رہی ہے۔ کتنے اپنے اپنے سے رستے لگ رہے تھے اس نے ایک کرا سا اس لے کر اپنے دائیں جانب بیٹھے اس شخص کو دیکھا جس کے وصل میں بھی اس نے بجز کاٹھ اٹھایا تھا اور آج اس لمحے جیسے سب فیصلے ہوتے جا رہے تھے وصل میں بھرا۔ ایک لمحے کے بعد وصل کا حسین اتفاق۔

گاڑی کی ہنستی فضا میں شہباز خان کا جملہ کسی بازگشت کی طرح لہرا کر چپ ہو گیا۔ انہوں نے ذرا سی گرون موٹر کراسے دیکھا جو انہیں آج بھی اتنی حسین اور پرکشش لگ رہی تھی جتنی۔ جتنی ہمیشہ لگا کرتی تھی۔ شاید یہ اس کے حسن کلی بے اختیار جاوے تھا جس نے انہیں کبھی بھی اکتا رہا نہیں دیکھا۔

”میں اپنے جیسے کے سب لفظ بول چکی ہوں۔ انہیں ایک اور پھر ہونے سے باز رکھتا ہوں۔ بہت سے بعد بہت سے سوچ سوچ کر بولی تھی۔ اس نے ایک بار پھر فیصلے کی گیت شہباز خان کے کورے میں بھونک کر کہی۔

”شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔“ انہوں نے گاڑی کی اسپید بے غلط آہستہ کر دی۔

”اتنے برس کی جدائی ہو تو آخر کام کر جاتی ہے۔“ انہوں نے اس کے دلچسپ چہرے پر اپنی نگاہیں جمائیں۔

برسوں میں میری سوچیں کس کس انتہا تک نہیں پہنچیں۔ میں اس بارے میں کیا کہوں۔ بس یہ سن لو میں محبت گمشدہ کی تلاش میں قریب قریب بھٹکتا رہا اور مجھے پتا چلا کہ میری گمشدہ محبت تو میرے اندر ہی ہے تو مجھے اپنی اس لا حاصل جو پتہ بہت روٹا آیا۔ جب اتنا بھٹکنے کے بعد بھی تم میرے پہلو میں بیٹھی ہو تو جان لو۔

I cant live without you (میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔)

میرا خیال ہے دنیا کے پہلے مرنے دنیا کی پہلی عورت سے یہ الفاظ کہے ہوں گے اور خوش کنہ چپکے لیا ہو گا۔ آج ان لمحوں میں میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے بہت سوچا بہت کوشش کی مگر تمہارے خیال سے نہیں بھاگ سکا۔ فاصلے دوریاں کچھ بھی نہیں آسکیں۔ تم تو میرے اندر رہا جتنا تمہیں پھر میں کہاں بھاگتا میرا تو یہ اجوال ہے فرار تو تم بھی حالات سے ہوئی تھیں تم کو۔

گاڑی رک چکی تھی اور شہباز خان کی گرم نگاہیں اس کے چہرے کے بے حد قریب اپنا جاوے گا رہی تھیں۔

”اگر میرے ساتھ بھی یہی کچھ نہ بیٹا ہوتا تو میں اس وقت آپ کے ساتھ نہ ہوتی۔ بہت پہلے اپنی زندگی کا ستمی فیصلہ کر چکی ہوتی۔“ اس نے لڑوٹی پلکوں اور کانپتے ہونٹوں سے ہنسنے لگا۔ گاڑی میں ایک پل کو تعنی خیز خاموشی چھا گئی۔

”پھر تو ہم دونوں پاگل ہیں۔ ایک دوسرے تک پہنچنے کے لیے ایک دوسرے سے بھاگتے ہوئے ہیں تک آئیے۔“ ان کی مدھم مدھم سی ہنس نہت کو بہت اپنی اپنی ہی لگی۔

”بعض اوقات جذبات انسان سے مشکل ترین فیصلہ پلک جھپکتے میں کرا دیتے ہیں۔ آپ کو یاد ہے نام میں وہی

نہت ہوں جس کی شکل سے آپ کو نفرت۔“ شہباز خان نے بے اختیار اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”تم وہ نہت ہو جس کے بغیر شہباز خان کے لیے زندگی زندگی نہیں رہتی۔ ایک بو جھن جاتی ہے مجھے اس تھا کہ دینے والی مسافت نے صرف یہ نکتہ سمجھایا ہے اس کے علاوہ میں کچھ اور نہیں سمجھتا چاہتا۔ تم میرے پاس میرے بے حد قریب ہو گی تو بہت سی قلبی ذہنی کٹافٹیں خود بخود محبت کے فلٹرز سے کشید ہو کر ٹھہر جائیں گی۔ بہت

ساری ذہنی فرسٹریشن محبوب سے دوری کا بھی تو نتیجہ ہوتی ہے۔ دوریاں دوسرے اور شکوک کو جنم دیتی ہیں۔ میں آج ان دوریوں کو ختم کرتے ہوئے پورے یقین کے ساتھ اس شہر محبت میں داخل ہونا چاہتا ہوں جہاں صرف تمہاری حکومت ہے جہاں ڈھیر ساری سچی خوشیاں اور ڈھیر ساری روشتیاں ہم دونوں کی غنچن ہیں۔ بس اس ظالم

انا اور خود پسندی کے بھنور سے نکلنے کے لیے میرا ہاتھ تھام لو۔“ ان کے لیے ان کی نگاہوں سے کیسی آج کل رسی تھی کہ نہت کا پورا وجود جیسے پھلنے لگا۔ اس نے بے اختیار ان کے پھیلے ہاتھوں پر اپنا چہرہ گرا دیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو ان ہتھیلیوں پر گرے تو شہباز خان نے جھک کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

”بس نہت۔ تم اپنے جیسے کے سارے آنسو بہا چکیں۔ اب تمہارے جیسے کی ہنسی تمہارے لبوں سے آزاد ہونے کو بے چین ہے کیا تمہیں ان خوبصورت لمحوں میں یہ حسین تجھ نہیں دو گی۔ ایک بیٹھی مسکان کہ میرے ڈولتے دل کو یقین آجائے کہ یہ سارے خیالات میرے نہیں تمہارے بھی ہیں۔“

وہ دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لیے بے خود گئے جا رہے تھے نہت کو ایک دم ہنسی آئی۔

”ویسے آپ بھول رہے ہیں یہ شاہراہ عام ہے آپ کا بیڈروم نہیں۔“ کہتے ہوئے وہ ذرا سما پرے کھسکی۔ انہوں نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد تھام لیا۔

”یہ شاہراہ عام ہے جسے شاہراہ دل کہتے ہیں۔ اے سڑک تیرا شکر یہ۔ کیا خیال ہے شکر یہ سے کام چل جائے گا۔“

”پہلے کا میں دوڑے گا اب جلدی چلیں گا۔“ چپکے چپکے اور اتنی تعنی تھی۔

”انہو یہ بے چینیاں۔“ ان کے ذمہ سنی انداز پر وہ جھینپ کر باہر دیکھنے لگی۔ اسے پہلی بار رات کی ان تاریکیوں پر اس قدر حیران آیا تھا۔ ان تاریکیوں نے اس کا سب کچھ چھینا تھا اور ان ہی تاریکیوں نے آج سب کچھ لوٹا دیا تھا۔ نہت نے ایک مسکراتی نگاہ آسمان پر پھینکتے ستاروں پر ڈالی تو وہ بھی جیسے اس کے ساتھ ہنس پڑے۔



”امت! جلدی چلو تمہارے لیے ایک سربراہ ہے۔“ معاذ نے بیڈروم میں داخل ہوتے ہی سامنے بیٹھی آمنت سے کہا اور حیران ہی کھنکے لگی۔

”کیسا سربراہ؟“

”تم چلو گی تو خود سے دیکھ لیتا۔ چلو اب اور دیر نہیں کرو۔“ وہ اس کا بازو کھینچ کر باہر کی طرف لے جانے لگا۔

”نہت! معاذ نے اس کی ایک نہیں سنی۔“

”آخر کچھ بتائیں تو سہی۔“ جیسے ہی گاڑی روانہ ہوئی آمنت رہ نہ سکی۔

”سب سے اچھی خاموشی مانی وا کھت۔ ایک منٹ اترو اور دوسرے پھولوں کا بکے لینا ہے اچھا سارا۔“ معاذ نے ایک فلاڈ شاپ کے سامنے گاڑی روکی تو آمنت بھی اس کے پیچھے اتر گئی۔

پھول لے کر دونوں باہر نکلے معاذ گاڑی کی طرف بڑھا اور آمنت کی نظروں سے بالکل اتفاقاً سامنے گاڑی سے اترتے پل پر ٹھہر گئی۔

تھی۔ اس وقت بھی وہ نفل سیلوز کے ساتھ سر پر سیتھے سے دینہ اور اڑھے معاذ کے پہلو میں فخر حیات کے بالمقابل کھڑی آنے والے مہمانوں کا استقبال کر رہی تھی۔

شروع شروع میں رعنا حیات نے آمنہ کے لباس پر تنقید کی تھی مگر معاذ نے انہیں فوراً ٹوک دیا۔
 ”مہمان مجھے آمنہ اسی طرح اچھی لگتی ہے۔ پلیز آپ اسے ٹوکیں نہیں۔“ اور معاذ کی خوشی رعنا حیات کی کمزوری تھی۔

”مسٹر عبدالتین اور مسز اور یہ میری ڈائمر ان لا آمنہ معاذ اور یہ میرا بریلینٹ سن معاذ حیات۔ آپ تو پہلے بھی مل چکے ہیں۔“ فخر حیات کی فریٹش آواز آمنہ کی سن ہوتی سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ پتھرائی آنکھوں سے اپنے ماں جانے کو دیکھنے لگی۔

”ارے آمنہ! یہ تم ہو نہیں سکتی۔ ان بلیو ایبل۔“ آمنہ کو لگا وہ خواب دیکھ رہی ہے۔ عبدالتین اسے کندھوں سے پکارتے ہوئے خوشی سے کہہ رہا تھا۔

”آپ جانتے ہیں اس کا کون سا کون سا فخر حیات کچھ حیران ہوئے۔“
 ”ہیں سربامالی رتیل سنسز۔ اس کا آپسی ہو تم کیا بچانا نہیں۔ اصل میں میں ایک عرصہ تو باہر رہا ہوں۔ پہلی کے ساتھ۔“

”کیسے ہیں بھائی آپ! آمنہ بمشکل مسکرائی۔
 ”اے دن۔ تم سناؤ! ایڈیٹ کلاس کی ممبر شپ مہلک ہو۔“ اس کی سرگوشی اتنی بلند تھی کہ آمنہ کے ساتھ پاس کھڑے معاذ نے بھی سن لیا۔ وہ بے ساختہ مسکرایا۔

”تو آپ صنف ان تھی سے لانا اور کلاس کی ممبر شپ حاصل کر سکیں۔ بہت ذہین ہیں آپ! معاذ کے طنز کو سمجھتے ہوئے عبدالتین مسکرائے لگا تو آمنہ کو بہت عجیب لگا۔
 ”تو آج دولت نے سفید خون کو پھر سے سرخ کر دیا۔“ وہ پاس کھڑے مسکرا کر باتیں کرتے عبدالتین کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

”آؤ آمنہ! تمہیں ایک اسپیشل گیٹ سے ملو گی۔“ معاذ کچھ دیر بعد اسے دوسری طرف لے گیا۔
 ”ان سے ملو یہ ہیں مس شہاب۔ امریکہ سے اپنی میڈسن کی تعلیم مکمل کر کے چند ماہ پہلے ہی واپس آئے ہیں۔ دو تین سیمینارز میں ہمارا کلوز کانٹیکٹ ہے۔ وہ ان کے خیالات سے بہت متاثر ہوا۔ سوچا تمہیں ضرور ملو آؤں گا۔“
 آمنہ کو کابل کی ساری ڈرنشیاں اس پر ہی چہرہ کے حسن کے سامنے مدھم رہ گئی ہیں۔

”یون اور ڈیپ ریڈ کنٹراسٹ میں وہ شعلہ جوالہ سارے بال میں منظر دکھائی دے رہی تھی۔ آمنہ نے اپنی زندگی میں اتنا مکمل حسن شاید ہی دیکھا ہو کہ بد مقابل سلام کا جواب دینا بھول جائے۔ معاذ اسے چھوڑ کر دوسری طرف مڑ گیا۔

”آمنہ! آپ ہیں۔ ڈاکٹر معاذ نے بہت وقار۔“ کہتے کہتے رک کر وہ کچھ الجھن بھری نظروں سے آمنہ کو دیکھنے لگی۔ کچھ ایسا ہی حال آمنہ کا تھا۔
 ”بھو مر!“ آمنہ کے بیوں سے سرگوشی سی نکلی۔ ”آپ۔ تم احمد پور۔“
 مس شہاب نے ایک گہرا سانس لیا۔

”کو گویا میں تمہیں یاد ہوں۔ آؤ اور بیٹھتے ہیں۔“ وہ دونوں سائیڈ میں رکھے صوفے پر بیٹھ گئیں۔
 ”تم تو چلی گئی تھیں شاید حویلی کے کسی ملازم کے ساتھ۔ مجھے ٹھیک سے نام یاد نہیں۔“ آمنہ نے قصداً اس کے بھاگ جانے کا ذکر نہ کیا۔ ان دنوں جب زینب اور وہ بلکہ پورے گاؤں کی زبان پر جھومر کے حسن کے چرچے تھے۔

عبدالتین اپنی بیوی کے ساتھ بالکل اسی کا دور کے سامنے تھا۔ اس کی نظریں بھی آمنہ کے چہرے پر رکی تھیں۔ ایک سروسی شامانی کی لہران لگا۔ اس میں لگی۔

”چلو نا۔“ عبدالتین کی بیوی نے اس کی موت پر اسے ٹوکا دیا پھر شوہر کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔
 ”یہ۔ آپ جانتے ہیں کون ہے؟“ وہ مجھس سے میں پوچھ رہی تھی۔
 ”نہیں۔ کوئی نہیں۔“ اس نے اسی اجنبی آواز میں کہا اور دوسری جانب مڑ گیا۔

سامنے سڑک پر بھاگتی دوڑتی گاڑیاں شور مچانے لگیں۔
 ”نہیں۔ کوئی نہیں۔ نہیں کوئی نہیں۔ نہیں۔“
 سامنے شاپنگ آرکیڈ کی گلاس لفٹ بجلی کی سی تیزی سے شور مچاتی اوپر بیچے دوڑنے لگی۔ ”نہیں۔ کوئی نہیں۔ نہیں کوئی۔“

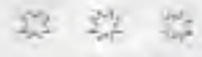
وہ سر ہٹام کر گرنے کو تھی کہ معاذ نے اسے سہارا دیا۔
 ”دیکھا ہوا آمنہ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ وہ اس کی اڑنی رنگت دیکھ کر بولا۔
 ”ٹھیک ہوں میں۔“ وہ خود کو سنبھال کر گاڑی میں جا بیٹھی۔

سارا راستہ وہ فاقب و باغ سی بیٹھی رہی۔
 گاڑی کسی ٹھیک کے سامنے آ کر رکی تھی۔
 وہ کسی معمول کی طرح معاذ کے ساتھ چلتے ہوئے ٹھنڈے کھانے اور سے گزرتی اس روم میں داخل ہوئی۔
 سامنے سفید براق بستر نجیف و نزار۔ شاید۔ عبدالتین کا ڈھانچہ پڑا تھا اور اس کے سر جانے۔ کمزور پر مشورہ لگنے لباس میں شہرینہ۔

آمنہ کو زور کا چکر آیا اس نے بہت مضبوطی سے معاذ کا ہاتھ تھام لیا۔
 ”یہ۔ یہ عبدالمبین۔ اس حال میں۔“ وہ بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ شاید میں اٹھایا ہے۔
 ”وہ بے آواز آنسوؤں سے روٹی رہی اور شہرینہ بے تاثر چہرے کسی رپوٹ کی مانند بیٹھی رہی۔
 ”تو کثرت سے نشہ آور ادویات کے استعمال سے اس کا یہ حال ہوا ہے۔ سہر حال علاج شروع کر دیا گیا ہے۔ انشاء اللہ عبدالمبین جلد ہی اچھا ہو جائے گا۔“ معاذ نے اسے کس کو دوا دینا ہے رہا تھا بہت ہی شہرینہ گویا روٹی آمنہ کو۔
 ایک گھنٹے بعد وہ ندر حال سی گھر واپس آئی۔

دونوں بھائی ملے اور دونوں نے اس کو نظر پھر کر دیکھا تک نہیں۔
 ”تم فکر نہیں کرو عبدالمبین جلد ٹھیک ہو جائے گا۔“ معاذ سے راستہ بھر تسلیاں دیتا آیا تھا۔
 اور اس کی یہ ساری تسلیاں دوسرے دن ہوا میں تحلیل ہو گئیں۔
 ”خدا اچانے دونوں رات ہی میں کہاں چلے گئے عہمت ڈھونڈنا۔“ معاذ اگلی صبح اسے تھکا تھکا سا بتا رہا تھا۔
 آمنہ بھر بھری رست کی طرح بیٹھتی چلی گئی۔

”میرا خیال ہے وہ اس شہر میں ہی نہیں ہیں۔ ہر جگہ کوشش کی ہے۔“ معاذ نے اکیلے اس کی آس بھری نظروں کے جواب میں آہستگی سے کہا تو آمنہ ایک آدھ بھر کر چپ کر گئی۔
 اس نے توجہ دیر یہ کو بھی اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔ یوں بھی بتانے کو تھا بھی کیا۔



فانیہ اشارہ ہوئی میں گرینڈ فنکشن تھا۔ مگس گید رنگ کے ساتھ۔
 فخر حیات نے معاذ کے ہاسپٹل کی تحلیل کے اعزاز میں یہ شاندار تقریب رکھی تھی۔
 اگرچہ اس گھر میں اس طرح کے فنکشن روز کا معمول تھا مگر آمنہ ابھی تک اس معمول کی عادی نہیں ہو سکی

"نہیں میں کسی کے ساتھ نہیں بھاگی تھی۔ میں چھوٹے شادھی سید سلطان بخت کے ساتھ اسلام آباد چلی گئی تھی جہاں انہوں نے مجھ سے نکاح کیا اور پھر مجھے وہیں رکھا۔ مجھے دولت مند بننے کا شائبہ تھا اور شاہ جی حسن کے ولد اور سو داہرا نہیں تھا۔ وہ سینے دو سینے بعد چار پانچ دنوں کے لیے آتے اور باقی وقت میں اس چار کنال کی کوٹھی میں باگھوں کی طرح پھرتی۔ بس پھر میں نے بڑھنے کا فیصلہ کیا اور بڑھتی چلی گئی۔ شکر ہے شادھی نے مجھے اس معاملے میں روکا نہیں۔ اب میری تعلیم مکمل ہو گئی ہے اور میں میسرز آکسفورڈ میں داخل ہوئی ہوں مگر شاہ جی۔ انہیں یہ بات پسند نہیں۔" وہ کہہ کر چپہ مگر گئی۔

"تو کیا تم واپس چلی جاؤ گی؟"

"ہاں مگر امریکہ نہیں اپنے گاؤں سوات کے اس مضافاتی گاؤں میں جہاں آج بھی زندگی کی بنیادی سہولتیں تک میسر نہیں ہیں۔ وہاں اسپتال بنا رہی ہوں بہت بڑا نہیں مگر اتنا کہ اس بچے تاروے کا کچھ کفارہ ادا ہو سکے جو میں نے اپنے ماں باپ کو دکھ دے کر مول لیا۔ تم شاہ زینب کہاں ہوتی ہے۔ اس کے بھی تو بڑے بڑے خواب تھے۔"

جھومر کے سوال پر آمنہ کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نمودار ہو گئے۔

"زینب یہاں ہے جہاں ہر خواب ہر خواہش مٹی میں مل جاتی ہے۔ انسانی جسم کے ساتھ۔"

"کیا! اس نے بے اختیار اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور آہستہ آہستہ بولنا کہ وہ کچھ دیر اور اصرار نہیں رہتی تو اس کا دل ضبط غم سے پھٹ جائے گا۔ وہ ایک دم سے اٹھی اور "اگے کھڑی" کہہ کر داش روم میں چلی گئی۔ جھومر افسوس بھری نظروں سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

"میرے اللہ۔ تو نے آدمی کو خواب دیکھنے والی آنکھوں میں کیوں نہ نہا۔"

وہ تھیل پر سر رکھ کر اپنے آنسوؤں کا راستہ روکنے لگی۔



"انف! آپ کو کچھ احساس بھی ہے پھر میں فاطمہ اور وحید مہاراجہ کو لکھتا تک کر رہے ہوں گے۔ آج ہمیں گھر سے نکلے تیسرا دن ہے اور اب بھی آپ کا واپس کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

آمنہ کچھ تو اس تیز برستی بارش سے خائف ہو رہی تھی کچھ معاذ سے نکل کر رو رہے تھے۔

"میری جان! ہم شادی کے پورے آٹھ سال بعد اس شخص سے بے ہوشی کے لیے نکل سکے ہیں وہ بھی تمہیں تین دن سے چیخ رہا ہے اور ان شخصے شیطانوں میں داوا دہی کی جان ہے۔ ابھی چند بجٹ پہلے تو تمہارے سامنے مہاراجہ سے بات ہوتی ہے۔ انہوں نے ہمیں جب دل چاہے واپس کا تہذیب دیا ہے۔ معاذ کے برستی بارش سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ بارش کی وجہ سے گاڑی کی اسپید بھی خاصی کم تھی۔

"اور آپ کو کھلی چھٹی مل گئی اور اتنی ناشکری کیوں کر رہے ہیں۔ اسپتال ٹرینشن کے لیے تین سال آپ بوسے میں گزار کر آئے ہیں پچھ ماہ کے لیے میں بھی آپ کے ساتھ تھی۔ ایک نہیں کاٹا نکلتا آپ کے دل سے تو اس نئی مومن کا۔" آمنہ قدرے جھلا کر بولی۔

"ہاں تو ٹھیک ہے نا اسپتال ٹرینشن کے لیے جانا تو کہیں سے بھی نہیں مومن نہ ہوا۔ وہ تو ابھی بھی (due) ڈیو ہے۔" وہ شہرت سے اس کے ہتھے ہونے چہرے کو دیکھ کر بولا۔

"یہ۔ یہ گاڑی کدھر موڑ رہے ہیں آپ! موڑیں اس نے سنگ میل پر کیا پڑھا تھا کہ اس کی بصارتیں چونک سی گئی تھیں۔ اندھیرے میں کچھ ٹھیک سے پڑھ نہیں سکی تھی۔

"پروفیسر داؤد کے بہت خاصیشنٹ ہیں اوہ۔ حال ہی میں سر جری کروا کے آئے ہیں۔ ان کی فریش رپورٹس مجھے لے کر جاتی ہیں پروفیسر صاحب کے لیے۔ بس اتنا سا کام ہے۔"

"مجھے اب بیس اتار دیں داغ خراب ہے۔ اتنے طوفانی موسم میں رپورٹس منج کرنے پھرو۔ چلیں واپس آئیے۔" وہ خفگی سے بولی۔

"یار! موسم کے تیور دیکھو ذرا اس وقت یہی بہتر ہے کہ کچھ دیر کہیں رک جایا جائے جیسے ہی یہ طوفانی بارش ختمے گی ہم واپس نکل پڑیں گے۔ ابھی تو بہت سفر باقی ہے۔" معاذ نے اسے نرمی سے سمجھایا تو وہ بھی چپ کر گئی۔ بارش کے ساتھ ہوا بہت زوردار تھی اور وقفے وقفے سے بجلی بھی چمک رہی تھی۔

جس وقت ان کی گاڑی حویلی کے گیٹ میں داخل ہوئی، آمنہ کی ساری نیم خوابیدہ حسیں جیسے ایک جھٹکے سے بیدار ہوئی تھیں۔

"یہ۔ یہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔" اس نے اپنی چادر سر پر جھمکتے ہوئے پوچھا۔

"جان نہیں رہے پتہ کون ہے۔" گاڑی رک گئی تھی اور میزبان استقبال کو برآمدے میں کھڑے تھے۔ آمنہ کے کسی سوال کی منتظر نہیں تھی۔

وہ رسمی سلام دعا کے بعد صالہ شاہ کے ساتھ زنان خانے میں آگئی اور معاذ سید سلطان بخت کے ساتھ بیرونی گیٹ روم میں۔

صالہ شاہ بہت کم گو تھیں یا گزرتے وقت نے انہیں ایسا کر دیا تھا۔ کچھ ایسی ہی کم صم سی ان کی پانچوں بیٹیاں ایک تو بالکل شہرت کی چلتی پھرتی تصویر تھی۔ آمنہ کے زخم جیسے ہرے ہو گئے۔

گیٹ روم کی کھڑکیوں سے سر نکراتی بارش اور تین گھنٹی ہوا اسے یادوں کے دکھ بھرے جہان کی طرف بلا رہی تھی۔

"میرے اللہ! یہ وہ راز ہے اور پھر اس کی بالکل ایسی ہی تھیں جیسی وہ بچپن میں دیکھا کرتی تھی۔ کچھ بھی نہیں بدل تھا۔ اس کی زندگی کی کہاں کہیں اس حویلی کی سنگلاخ دیواروں نے جنم دیا تھا اور پھر سب کچھ ہاتھوں سے کھڑا چلا گیا۔"

"اگر وہ اسی گاؤں میں رہتے تو شاید۔۔۔ شاید اس کی بچپن کی زندگی کی یادیں اتنی کربناک نہ ہوتیں۔"

وہ طوفانی رات آمنہ کے دل و دماغ میں بھی جیسے بہت سے طوفان جگاتی۔ سیاہ ہر رستا آسمان اور اندر یاہوں کا رت جگا وہ رات بھر آٹھ نہ جھپک سکی۔

صبح منہ اندھیرے وہ دونوں واپس کھانے تیار تھے میزبان کے بہت اصرار کے باوجود۔ آسمان رات بھر برستے کے بعد بالکل صاف ہو چکا تھا۔ آسمان پر غنماتے ستارے ایک روشن دن کے طلوع ہونے کی خبر دے رہے تھے۔

آمنہ نے آخری الوداعی نظر صالہ شاہ اور اس کے ساتھ ایک قطار میں کھڑی ان پانچوں سید زادوں پر ڈالی اور دو سری نظر اس ڈھلتے سورج جیسے اوجڑے ہوئے گیارہ سالہ لڑکی کی طرف سے لیا اور پھر وہی ہوتے ہاتھوں کے ساتھ ہاتھ میں صندلی چھڑی لیے اسی ٹھنڈے سے کھڑا تھا جو اس خاندان کے جاگیرداروں کا خاصا تھی۔ سید سلطان بخت نے بے حد سرسری نظر آمنہ کے چہرے پر ڈالی اور ایک نمائشی مدبرانہ مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجالی۔

"اگر اس روز بھی تیری یہ نظر اتنی ہی سرسری اتنی ہی عام ہوتی جتنی آج ہے تو سید سلطان! میرا خاندان یوں دیر دیر ہو کر برباد نہ ہوتا۔ تیری ایک میلی نگاہ نے ہماری زندگی کی ساری روخنیاں گل کر کے سیاہ اندھیرے بھر دیے۔ میں بددعا نہیں دیتی مگر اللہ تیری وہ میلی نگاہ تیری کسی بیٹی کی طرف نہ لوٹائے۔" آمنہ چادر کے پلو کو منہ پر سر کا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

گاڑی چل پڑی۔ ابھی تو چار سو اندھیرا سا تھا صبح صادق کی روشنی یکر اقل سے نمودار ہونے کی تیاری کر رہی

